بلوغ المرام
اُردو ترجمہ
مِن أدلّةِ الأحكامِ
جلد اوّل
تألیف / ابو الفضل شہاب الدین احمد ابن حجر العسقلانی
شارح / مولانا صفی الرحمن مُبارکپوری
دار السّلام
کتاب و سُنّت کی اشاعت کا عالمی ادارہ

جمادی الاوّل ۱۴۱۸ھ ستمبر ۱۹۹۷ء

پبلشرز اینڈ ڈسٹری بیوٹرز
پوسٹ بکس نمبر ۲۲۷۴۳ ریاض ۱۱۴۱۶ مملکت سعودی عرب
فون نمبر ۴۰۳۳۹۶۲ فیکس ۴۰۲۱۶۵۹

بلوغ المرام

من أدلة الأحكام

جلد اوّل

تألیف

ابو الفضل شہاب الدین احمد ابن حجر العسقلانی

(۷۷۳-۸۵۲ھ)

اتحاف الکرام شرح بلوغ المرام

شارح
مولانا صفی الرحمن مبارکپوری

مترجم
مولانا عبد الوکیل علوی

تصحیح وتنقیح
مولانا ارشاد الحق الاثری

دار السلام
پبلشرز اینڈ ڈسٹری بیوٹرز
ریاض - لاہور

فہرست مضامین

جلد اوّل

فہرست ائمہ مشاہیر
(حالات زندگی)

فہرست اسماء الرواۃ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عرض ناشر

دارالسلام -- الریاض، لاہور -- اپنی علمی و دینی مطبوعات کی وجہ سے دینی اور علمی حلقوں میں محتاج تعارف نہیں۔ الحمدللہ، اس کی مطبوعات ہی اس کا بہترین تعارف ہیں۔جو تحقیقی اعتبار سے بلند پایہ بھی ہیں، زبان و بیان کے لحاظ سے معیاری بھی، اور طباعت و کتابت کے ظاہری حسن و جمال سے آراستہ بھی۔

اس کے اسی معیار اور کام نے اسے نہ صرف پاک و ہند کا ایک معیاری نشریاتی ادارہ بنا دیا ہے بلکہ اسے ایک بین الاقوامی ادارے کی حیثیت حاصل ہو چکی ہے۔

یہ سب اللہ تعالیٰ کی توفیق خاص اور اس کی مہربانی کا نتیجہ اور کارکنان ادارہ اور اس سے وابستہ اہل علم و تحقیق کی محنت و جانفشانی کا صلہ ہے، بس پر ہم بارگاہ الٰہی میں سجدہ ریز اور وابستگان ادارہ کے مشکور ہیں۔ جَزَاهُمُ اللهُ أَحْسَنُ الْجَزَاءِ، وَوَفَّقَنَا اللهُ وَإِيَّاهُمْ لِمَا يُحِبُّ وَيَرْضَى

ادارے کی مطبوعات میں ایک اہم عربی کتاب "بلوغ المرام فی ادلۃ الاحکام" بھی ہے، ہم نے اسے پہلی مرتبہ جیبی سائز میں نہایت دیدہ زیب انداز میں شائع کیا، اس سے قبل اسے مختصر عربی شرح کے ساتھ شائع کیا تھا، یہ شرح عالم اسلام کی ممتاز شخصیت مولانا صفی الرحمٰن مبارکپوری حفظہ اللہ تعالیٰ کی تحریر کردہ ہے۔

"بلوغ المرام" پاک و ہند کے دینی مدارس میں بھی داخل نصاب ہے اور علمی و دینی حلقوں میں بھی متد اول۔ اس لیے اس کی اہمیت و افادیت مسلم ہے۔ حدیث کا یہ مجموعہ اپنے ایجاز و جامعیت کے اعتبار سے یقیناً بے مثال ہے، چنانچہ ہم نے اس کی اسی حیثیت کے پیش نظر اسے اردو میں مولانا مبارکپوری حفظہ اللہ کی شرح کے ساتھ شائع کرنے کا پروگرام بنایا، تاکہ اردو دان حلقہ بھی اس سے

استفادہ کر سکے۔

چنانچہ اس کے لیے ہم نے اپنے فاضل دوست اور برادر محترم مولانا عبدالوکیل علوی صاحب کی خدمات حاصل کیں' انہوں نے اسے اس کی عربی شرح سمیت اردو کے قالب میں ڈھال دیا' فاضل محقق مولانا ارشاد الحق اثری حفظہ اللہ (فیصل آباد) نے اس پر نظرثانی فرمائی' اس کے بعد بھی اس کی نوک پلک درست کرنے میں ادارے کے بعض اور رفقاء نے بھی حصہ لیا۔

عزیزم حافظ عبدالعظیم سلمہ اللہ تعالیٰ میرے خصوصی شکریے کے مستحق ہیں کہ اس سارے کام کی نگرانی میں انہوں نے بڑی محنت فرمائی اور اسے بہتر سے بہتر بنانے میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کیا۔ اس طرح رفیق ادارہ جناب محمود الحسن اسد نے بھی اس کی تصحیح و نظرثانی میں بڑی پرخلوص محنت کی ہے۔ جَزَاهُمُ اللهُ أَحْسَنُ الْجَزَاءِ

اس تمام تر سعی و کاوش کے باوجود اگر اس میں کچھ فروگزاشتیں رہ گئی ہوں تو قارئین کرام ان سے ہمیں آگاہ فرمائیں' ان شاء اللہ آئندہ ایڈیشن میں مزید اصلاح کر دی جائے گی۔ علمی و تحقیقی کاموں میں اصلاح و نظرثانی کی ہمیشہ گنجائش رہتی ہے' اس لیے ادارہ اس کو قارئین کی تجاویز و اصلاح کی روشنی میں مزید بہتر بنانے میں کبھی تامل نہیں کرے گا۔

خادم' توحید و سنت

عبدالمالک مجاہد

دارالسلام۔ الریاض لاہور

ربیع الاول ۱۴۱۸ھ / جولائی ۱۹۹۷ء

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

پیش لفظ

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ نَزَّلَ الْفُرْقَانَ عَلٰی عَبْدِهٖ لِیَکُوْنَ عَلَی الْعَالَمِیْنَ نَذِیْرًا وَبَعْدُ:

حافظ ابن حجر عسقلانی رحمہ اللہ کی کتاب "بلوغ المرام من ادلۃ الاحکام" اپنے موضوع میں درج ذیل متعدد خصائص کی بدولت نمایاں اور ممتاز حیثیت کی حامل ہے' یہ کہ مؤلف نے اس میں احکام کی احادیث میں سے ایسی احادیث کے جمع کرنے کا اہتمام کیا ہے جو عموماً صحیح اور قوی ترین ہیں' جس سے اس فن کا حسن و جمال کھل کر سامنے آ جاتا ہے۔ اور لمبی احادیث کا شاندار انداز میں اختصار پیش کیا اور حدیث کو ائمہ' حدیث کی طرف منسوب کرنے میں بڑی وسعت سے کام لیا ہے اور صحت و حسن اور ضعف کے اعتبار سے ہر حدیث کا درجہ بیان کرنے کا اعتناء کیا ہے' جیسا کہ بہت سی علل کی طرف بھی اشارہ فرمادیا ہے۔ واضح ہو کہ ان کے انتہائی عمدہ اور نفیس کاموں میں سے ایک کام یہ بھی ہے کہ آپ حدیث بیان کرنے کے بعد حدیث کے بعض طرق میں وارد متعدد ٹکڑے اور اضافے بھی بیان کرتے ہیں' جو مطلق کو مقید اور مجمل کو مفصل بنانے اور مغلق کو واضح' تعارض کو رفع اور باہمی اختلاف کو دور کرنے کا فائدہ دیتے ہیں' بلکہ بعض دفعہ یہ اضافے اختلاف کے موقع پر ایسی نص ثابت ہوتے ہیں' جو تاویلات کا قلع قمع اور بحث و تحقیق سے مستغنی کر دیتی ہے۔

مذکورہ بالا اور دیگر متعدد خصوصیات کی بنا پر اللہ تعالیٰ نے اہل علم میں اس کتاب کو مقبول عام بنایا' مشرق و مغرب کے طلبہ کے ہاتھوں کا زینہ بنی اور اہل مدارس نے اسے نصاب میں شامل کرلیا اور اس فن کے عالی مقام علماء نے اس کی شروح و توضیحات کا اہتمام کیا اور متعدد زبانوں میں اس کے ترجمے ہوئے۔

سابق الذکر اہتمام و اعتناء کے باوجود متعدد بھائیوں نے اپنی ضرورت کو ملحوظ رکھتے ہوئے مجھے اس کتاب کی ایسی مختصر مگر نفیس شرح لکھنے کی تجویز پیش کی' جس میں قدیم و جدید انداز کی معروف و مشہور شروح کے التزام کے ساتھ ساتھ معانی کی تفہیم اور خاص طریقے سے ان کی تسہیل کے پہلو کو مدنظر رکھا گیا ہو' چنانچہ میں نے اللہ تعالیٰ سے توفیق مانگتے ہوئے اس امید پر کہ اللہ تعالیٰ اسے دنیا و آخرت میں

میرے اور اہل علم کے لیے مفید اور نافع بنائے گا' اس عمل عظیم کو شروع کیا' بلاشبہ اللہ تعالیٰ ہی اس کا اہل اور اس پر قادر ہے۔

یاد رہے کہ قاری کو میری اس لطیف شرح میں بعض مقامات پر طوالت محسوس ہو گی' جو کہ اس شرح میں میرے عام اسلوب کے برعکس ہو گی' تاہم یہ اس وقت ہو گا جب میں کسی ایسے عمدہ فائدہ کا اثبات کرنا چاہوں جو عام کتابوں میں ناپید ہو یا میں یہ خیال کروں کہ حق اکثر یا جملہ شارحین کے مذہب کے برعکس ہے یا میں ایسے غامض اور مخفی امور پاؤں جن کے حل میں شارحین نے محض احتمالات پر بھروسہ کیا ہو' جب کہ وہ طبیعی' تاریخی' جغرافیائی اور دیگر قسم کی تحلیل کی روشنی میں علمی اور دقیق بحث کے محتاج ہوں' چنانچہ ایسے مقامات پر میں بحث میں کچھ طوالت دینے پر مجبور ہوا تاکہ حق اور صحیح مسلک واضح اور نمایاں ہو سکے۔ اللہ ہی توفیق دینے والا ہے اور وہی مجھے کافی اور اچھا کارساز ہے۔

وَصَلَّى اللهُ عَلَى نَبِيِّنَا مُحَمَّدٍ وَعَلَى آلِهِ وَصَحْبِهِ وَسَلَّمَ

صفی الرحمٰن مبارکپوری
شعبان ۱۳۹۴ھ

مؤلف کتاب کے مختصر حالات

ابوالفضل شہاب الدین احمد بن علی بن محمد بن محمد بن احمد کنانی شافعی' المعروف ابن حجر عسقلانی' سنت نبوی کا علم بلند کرنے والے قاضی القضاۃ اور حفاظ و رواۃ میں منفرد ہیں۔ دس شعبان ۷۷۳ھ کو مصر میں پیدا ہوئے اور مصر ہی میں پرورش پائی اور نو سال کی عمر میں قرآن مجید حفظ کیا اور الحاوی اور مختصر ابن حاجب اور دیگر کتب یاد کیں اور اپنے کسی ایک وصیت کرنے والے کے ساتھ مکہ مکرمہ کا سفر کیا اور وہاں اہل علم سے سماع کیا' پھر آپ کو طلب حدیث کا شوق ہوا تو آپ حجاز' شام اور مصر کے کبار شیوخ الحدیث سے علم حدیث حاصل کرنے میں مشغول ہوئے' چنانچہ آپ نے دس سال تک علم حاصل کرنے کے لیے زین عراقی کے پاس قیام کیا اور بلقینی' ابن الملقن اور دیگر اہل علم سے فقاہت حاصل کی' آپ کو جلیل القدر ائمہ و شیوخ الحدیث کے پاس بیٹھنے اور علم حاصل کرنے کا شرف حاصل ہوا' جو کسی دوسرے کو میسر نہ آیا' جیسا کہ متقدم الذکر ائمہ و شیوخ نے آپ کو فتویٰ دینے اور تدریس کرنے کا اجازت نامہ عطا کیا۔ اور آپ نے دونوں اصول یعنی کتاب و سنت اور دیگر علوم عز بن جماعہ سے' لغت المجد فیروز آبادی سے' عربی زبان عماری سے' ادب و عروض بدر مشتگی سے اور کتابت جماعہ سے حاصل کی اور فنون و علوم میں اس قدر سعی کی کہ ان کی چوٹیوں کو چھونے لگے اور قرأت سبعہ میں قرآن مجید کا کچھ حصہ تنوخی سے پڑھا۔

پھر علم حدیث کی نشرواشاعت کی طرف متوجہ ہوئے اور مطالعہ' قرأت' تدریس و تصنیف اور افتاء کی صورت میں اس پر جمے رہے اور متعدد جگہوں میں تفسیر' حدیث' فقہ اور وعظ و نصیحت کی تدریس کی اور ازھر' جامع مسجد عمرو اور دیگر مقامات پر خطبہ دیتے رہے اور اپنے سینے میں محفوظ خزینے کی املاء کروائی اور بڑے بڑے فضلاء اور نامور علماء آپ سے فیض یاب ہوئے اور آپ کے علمی چشمے سے سیراب ہونے کے لیے آپ کے پاس آتے رہے۔

آپ کی تصانیف ۱۵۰ کتب سے متجاوز ہیں۔ علم حدیث کے فنون میں شاید ہی کوئی ایسا فن ہو جس میں آپ نے ضخیم کتب تصنیف نہ کی ہوں' اور آپ کی یہ تصانیف آپ کی حیات ہی میں طباعت کے زیور سے آراستہ ہو گئی تھیں۔ اور بادشاہ اور امراء ایک دوسرے کو ان کتب کے تحائف دیا کرتے تھے اور اس پر مستزاد یہ ہے کہ اگر "فتح الباری شرح صحیح بخاری" کے علاوہ آپ کی کوئی اور تالیف نہ بھی ہوتی تو یہی

فتح الباری ہی آپ کی شہرت اور آپ کے عظیم المرتبت ہونے پر واقفیت حاصل کرنے کے لیے کافی تھی۔ اس بات میں کوئی شک و شبہ نہیں کہ آپ کی یہ کتاب سنت نبوی کے لیے قاموس کا مقام رکھتی ہے۔ ۸۱۳ھ میں اس کا مقدمہ مکمل کرنے کے بعد آپ نے ۸۱۷ھ میں اس کی تالیف کا آغاز کر کے شروع رجب ۸۴۲ھ میں اس کی تکمیل کی۔ اور اس کی تکمیل پر آپ نے ایک دعوت عام کا اہتمام کیا' جس میں تمام عام و خاص مسلمان شریک ہوئے۔ اس دعوت پر آپ نے پانچ سو دینار خرچ کیے اور ایک بادشاہ نے آپ سے یہ کتاب طلب کر کے تین سو دینار میں خرید لی۔ اللہ تعالیٰ آپ کو سنت نبوی کی نصرت پر نہایت اچھا صلہ عطا فرمائے۔ آمین!

اسی طرح حدیث کی کتابوں میں سے ان کی ایک کتاب "بلوغ المرام فی ادلۃ الاحکام" جو اس وقت قارئین کے ہاتھوں میں ہے' گو یہ کتاب مختصر ہے' مگر اس کی بہت سی شروحات لکھی گئی ہیں جن میں ایک یہی مولانا صفی الرحمان مبارکپوری حفظہ اللہ تعالیٰ کی اتحاف الکرام ہے جسے اردو دان طبقہ کے لیے اردو پیرائے میں ڈھالا گیا ہے۔

پہلے پہل آپ (حافظ ابن حجر رحمہ اللہ) مصری علاقوں کے قاضی بنے' پھر چند سال کے بعد مستقل طور پر شاہی علاقے بھی آپ کی قضاء میں شامل کر دیے گئے' جو اکیس سال سے زائد عرصہ تک آپ کے زیر قضاء رہے' شروع میں آپ قاضی بننے سے پرہیز کرتے رہے' حتیٰ کہ بادشاہ وقت نے آپ کو ایک خاص مقدمے میں قاضی مقرر کیا' پھر آپ بلقینی کے اصرار پر ان کے نائب بنے' بلقینی کی جانشینی کی وجہ سے انہیں کئی اور لوگوں کا نائب بننا پڑا' یہاں تک کہ آپ قاضی القضاۃ (چیف جسٹس) مقرر ہوئے' آپ کی یہ تقرری ۱۲ محرم بروز ہفتہ ۸۲۷ھ عمل میں آئی' پھر سات مرتبہ آپ کی قاضی القضاۃ کے عہدے پر تقرری ہوئی اور سات ہی مرتبہ اس سے الگ ہوئے' پھر جمادی الثانی ۸۵۲ھ کو آخری مرتبہ اس عہدہ سے دستبردار ہوئے اور اسی سال میں آپ کی وفات ہوئی۔

اس کے علاوہ آپ' تواضع' بردباری' صبر و تحمل' خوش طبعی' وسعت و ظرافت' قیام و صیام' احتیاط و ورع' جود و سخاء' برداشت' باریک و لطیف کلام اور عمدہ اور نفیس نوادر کی طرف میلان میں مشہور و مختار تھے' جیسا کہ آپ ائمہ متقدمین و متاخرین اور اپنے پاس بیٹھنے والے ہر چھوٹے بڑے کا ادب و احترام کرنے میں منفرد اور بے مثال تھے۔

آپ بروز ہفتہ آٹھ ذی الحجہ ۸۵۲ھ کو عشاء کی نماز کے بعد اپنے خالق حقیقی سے جا ملے۔ اللہ تعالیٰ ان کو اچھا ثواب اور بہتر بدلہ عطا فرمائے۔ آمین!

تلخیص از "التبر المسبوک وغیرہ"

کلمۂ مؤلف

بسم الله الرحمن الرحيم	آغاز اللہ رحمٰن اور رحیم کے نام سے
الحَمْدُ لِلَّهِ عَلَى نِعَمِهِ الظَّاهِرَةِ وَالبَاطِنَةِ قَدِيْماً وحَدِيثاً، والصَّلاَةُ والسَّلامُ عَلَى نَبِيِّهِ وَرَسُولِهِ مُحَمَّدٍ وآلِهِ وصَحْبِهِ الَّذِيْنَ سَارُوا فِي نُصْرَةِ دِينِهِ سَيْراً حَثِيثاً، وعلى أتْبَاعِهِمُ الَّذِين وَرِثُوا العِلْمَ، وَالعُلَمَاءُ وَرَثَةُ الأَنْبِيَاءِ، أَكْرِمْ بِهِم وَارِثاً ومَوْروثاً.	ظاہری، باطنی، قدیم و جدید انعامات و احسانات کی بنا پر تعریف صرف اللہ تعالیٰ ہی کا حق ہے اور درود و سلام اس کے نبی اور رسول حضرت محمد ﷺ پر اور (مزید برآں) اس کی آل اور اس کے اصحاب رضی اللہ عنہم پر جنہوں نے آپ ﷺ کے لائے ہوئے دین کی نصرت و اشاعت کے لیے اپنی پوری تندہی اور برق رفتاری کا مظاہرہ کیا اور تابعین کرام رحمہم اللہ پر جو "العلم" کے وارث ہوئے اور حقیقت ہے بھی یہی کہ علماء ہی انبیاء کرام علیہم السلام کے وارث ہوتے ہیں۔ کیا خوب ہیں یہ وارث اور کتنا عمدہ اور اچھا ہے یہ ورثہ۔
أما بَعدُ، فَهَذَا، مُخْتَصَرٌ يَشْتَمِلُ عَلَى أُصُولِ الأَدِلَّةِ الحَدِيْثِيَّةِ لِلأَحْكَامِ الشَّرْعِيَّةِ، حَرَّرْتُه تَحرِيْراً بَالِغاً، لِيَصِيْرَ مَنْ يَحْفَظُه مِنْ بَينِ أَقْرَانِهِ نَابِغاً، ويَسْتَعِيْنَ بِهِ الطَّالِبِ المُبْتَدِي، ولاَ يَسْتَغْنِي عَنْهُ الرَّاغِبُ المُنْتَهِي.	حمد و صلوٰۃ کے بعد عرض ہے کہ یہ ایک مختصر سی کتاب ہے جو احادیث میں احکام شرعیہ کے بنیادی دلائل پر مشتمل ہے۔ میں نے اس کی تنقیح و تہذیب میں بڑی جانفشانی اور تندہی سے کام لیا ہے تاکہ اسے یاد کرنے والا اپنے ساتھیوں میں بحیثیت ماہر اور بڑی شان والا بن جائے۔ مبتدی طالب علم اس کے ذریعہ مدد طلب کرے اور منتہی شوقین بھی اس کی اہمیت و ضرورت سے مستغنی نہ رہ سکے۔ (یعنی یہ کتاب مبتدی اور منتہی دونوں کے لیے یکساں مفید ہے۔)
وَقَدْ بَيَّنْتُ عَقِبَ كُلِّ حَدِيثٍ مَنْ أَخْرَجَهُ مِنَ الأَئِمَّةِ، لِإِرَادَةِ نُصْحِ	میں نے ہر حدیث نقل کرنے کے بعد اس محدث کا نام بھی بیان کر دیا ہے جس نے امت کی خیر

الأُمَّة، فَالمُرَادُ بِالسَّبْعَةِ: أَحْمَدُ والبُخَارِيُّ وَمُسْلِمٌ وأَبُو دَاوُدَ والنَّسَائِيُّ والتِّرْمِذِيُّ وَابنُ مَاجَه، وَبِالسِّتَةِ: مَنَ عَدَا أَحْمَدَ، وبِالخَمْسَةِ: مَنْ عَدَا البُخَارِيَّ وَمُسْلِماً، وَقَدْ أَقُولُ: الأَرْبَعَةُ وأَحْمَدُ وَبِالأَرْبَعَة: مَنْ عَدَا الثَّلاثَةَ الأُوَلَ، وَبِالثَّلاثَةِ: مَنْ عَدَاهُمْ وَالأَخِيرَ، وبالمُتَّفَقِ: البخاريُّ وَمُسْلِمٌ، وَقَدْ لاَ أَذْكُرُ مَعَهُمَا غَيْرَهُمَا، وَمَا عَدَا ذَلِكَ فهُو مُبَيَّنٌ.

خواہی کے لیے اس حدیث کو روایت کیا ہے۔ جہاں میں نے ﴿ اخرجه السبعة ﴾ نقل کیا ہے اس سے میری مراد امام احمد رحمہ اللہ ' بخاری رحمہ اللہ ' مسلم رحمہ اللہ ' ابوداؤد رحمہ اللہ ' ترمذی رحمہ اللہ ' نسائی رحمہ اللہ اور ابن ماجہ رحمہ اللہ ہیں اور جہاں ﴿ اخرجه الستة ﴾ نقل کیا ہے اس سے مراد امام احمد بن حنبل کے ماسوا باقی تمام آئمہ ہیں اور ﴿ اخرجه الخمسة ﴾ سے مراد بخاری و مسلم کے علاوہ باقی پانچ امام ہیں اور کبھی میں ﴿ اخرجه الاربعة ﴾ کہتا ہوں اور ﴿ اربعة ﴾ سے مراد پہلے تین امام یعنی احمد ' بخاری اور مسلم کے علاوہ باقی آئمہ مراد ہوتے ہیں اور ﴿ اخرجه الثلاثة ﴾ سے مراد پہلے تینوں اور آخری کے علاوہ بقیہ تین امام مراد ہیں (یعنی امام ابوداؤد ' نسائی ' ترمذی) اور ﴿ متفق علیه ﴾ سے مراد بخاری اور مسلم ہیں اور بسا اوقات میں بخاری و مسلم کے علاوہ دوسرے آئمہ کا ذکر چھوڑ دیتا ہوں۔ متذکرہ بالا صورتوں کے ماسوا باقی تمام صورتوں میں روایت کرنے والے آئمہ کا ذکر ہر موقع پر نمایاں طور پر ذکر کر دیتا ہوں۔

وَسَمَّيْتُه **بُلُوغُ المُرام مِنْ أَدِلَّةِ الأَحْكَام**، واللَّهَ أَسْأَلُ أَن لاَّ يَجْعَلَ مَا عَلِمْنَاهُ عَلَيْنا وَبَالاً وَأَنْ يَرْزُقَنَا العَمَلَ بِمَا يَرْضَاهُ سُبْحَانَهُ وَتَعَالَى.

میں نے اس مختصر کتاب کا نام ﴿ بلوغ المرام من ادلة الاحکام ﴾ تجویز کیا ہے۔

آخر میں رب کائنات کے حضور دست بدعا ہوں کہ وہ ہمارے علم کو ہمارے لیے وبال نہ بنائے بلکہ اپنے پسندیدہ اور محبوب عمل کی توفیق سے نوازے۔ آمین۔

لغوی تشریح: ﴿ بسم الله الرحمن الرحیم ﴾ سے مؤلف نے اپنی کتاب کا آغاز قرآن پاک کے طریقہ کی پیروی اور نبی ﷺ سے ایسے پسندیدہ اسلوب کے ساتھ ابتداء کرنے کی تعمیل کے لیے کیا ہے۔ ﴿ الحمد ﴾ میں حمد سے مراد ہے بہترین تعریف۔ بہترین اسلوب کے ساتھ جو انسان کے اختیار میں ہو۔ ﴿ النعم ﴾ ن پر دو اعراب منقول ہیں۔ کسرہ اور فتح۔ یہ جمع ہے اس کا واحد نعمة ہے۔ اس سے مراد ہر وہ چیز ہے کہ جس سے انسان فائدہ اٹھاتا ہے۔ ﴿ الظاھرہ ﴾ سے مراد ایسی نعمتیں ہیں جن کا انسان ادراک کر سکتا ہے اور شعور رکھتا ہے۔ ظاہری انعامات و احسانات میں انسان کی شکل و صورت کا موزوں و مناسب بنانا اور لذیذ و عمدہ طرح طرح کے کھانے جو

اس کے منہ کے ذریعہ شکم میں جاتے ہیں شامل ہیں اور ظاہری نعمت سے اسلام بھی مراد ہے۔ ﴿ الباطنہ ﴾ ایسے انعامات جن کا انسان ادراک نہیں کر سکتا۔ بے شمار نعمتیں ایسی ہیں جو ارض و سماء میں ہی نہیں بلکہ انسان کے اپنے نفس میں پائی جاتی ہیں۔ جن کا علم بجز اللہ تعالیٰ کے کسی کو نہیں اور ایسی بہت سی نعمتیں ہیں جن کا انسان کو پہلے علم نہیں تھا پھر بعد میں اس کے علم میں آئی ہیں۔ باطنی نعمتوں میں عیوب پر پردہ پوشی بھی شامل ہے۔ قدیم و جدید سے مراد ایسی نعمتیں ہیں جن سے انسان نے اپنی زندگی کی سہولت اور آسانی کے لیے اللہ تعالیٰ کی عنایت کردہ عقل و خرد کو استعمال کر کے معیشت و معاشرت اور تمدن کے لیے ایجادات کی ہیں۔ دور جدید کے انکشافات نے انسانی تمدن کو ایسی نعمتوں سے روشناس کرایا ہے جن کے ذریعہ انسان بحر و بر تو درکنار فضا میں ہوا سے تیز رفتار ایجاد کی وجہ سے ہوا کے دوش پر سوار ہو کر مہینوں کا سفر دنوں میں طے کرنے کے قابل ہو گیا ہے۔ چند لمحوں میں ہزارہا میل دور بیٹھے ہوئے انسان سے گفتگو کر سکتا ہے۔ ﴿ الصلوۃ ﴾ کے معنی دعا رحمت' بزرگی اور عزت و تکریم کے ہیں ﴿ السلام ﴾ آفات ظاہری و باطنی سے تحفظ۔ مصنف نے کتاب کا آغاز حمد و ثنا کے بعد قرآن مجید میں رب کائنات کے ارشاد صلوا علیہ وسلموا تسلیما کی تعمیل اور سلف کی پیروی میں صلوٰۃ و سلام سے کیا ہے۔ مطلب یہ ہوا کہ اللہ رب العزت نبی کریم ﷺ کی عزت افزائی فرمائے اور آپ ﷺ کی شان بلند کرے۔ ﴿ ال ﴾ آدمی کے گھر کے افراد بھی اس میں شامل ہیں اور اس کے پیروکار بھی۔ یعنی اس لفظ میں بڑے لوگوں کی اولاد اور ان کے اتباع و پیروکار بھی شامل ہیں۔ مثلاً ال ابراہیم سے جس طرح ان کی اولاد مراد ہے اسی طرح ان کے متبعین بھی مراد ہیں بعینہ جس طرح ال فرعون میں فرعون کی اولاد بھی شامل ہے اور اس کے نظریہ کے پیروکار بھی۔ ﴿ صحبہ ﴾ فتح یعنی زبر کے ساتھ۔ صاحب کی جمع ہے اور صحابیٰ سے مراد وہ شخص ہے جس نے نبی کریم ﷺ سے بحالت ایمان ملاقات کی ہو اور ایمان کی حالت میں وفات پائی ہو۔ اس میں اور بھی اقوال ہیں مگر زیادہ صحیح یہی ہے۔ ﴿ الحثیث ﴾ تیز رفتاری' تیز گامی۔ ﴿ اتباع ﴾ ہمزہ کے فتح یعنی زبر اور تاء کے سکون۔ تابع کی جمع ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے دین اسلام کے حاصل کرنے اور اس کی نشر و اشاعت کے لیے ان تھک کوششیں کیں۔ تحصیل علم کے بعد اس کے دقیق مسائل نکالے۔ یہ بزرگ اگر جانفشانی اور سعی و جدوجہد کر کے علم حقیقی ہم تک نہ پہنچاتے تو آج انسانیت کفر و الحاد کے اندھیروں میں ٹامک ٹوئیاں مارتی پھرتی۔ ﴿ اکرم بہم فعل تعجب ﴾ یعنی کتنے معزز و مکرم ہیں یہ لوگ۔ ﴿ وارثا ﴾ اکرم ھم میں ضمیر مجرور کی تمیز کے طور پر ہے۔ اسے منصوب لایا گیا ہے۔ یعنی تابعین صحابہ کرامؓ سے دین حقیقی کے علم کو وراثت میں پانے کی وجہ سے بہت ہی معزز و مکرم ہیں۔ ﴿ اما بعد ﴾ حرف شرط ہے اور بعد کے "د" پر ضمہ ہے گویا مبنی بر ضمہ ہے۔ یہاں ظرف واقع ہو رہا ہے مضاف الیہ کی نیت موجود ہے مگر اضافت بظاہر موجود نہیں۔ مطلب یہ ہے کہ حمد و صلوٰۃ کے بعد۔ ﴿ اصول ﴾ جمع ہے اصل کی۔ جس پر کسی چیز کا انحصار ہو۔ ﴿ الادلۃ ﴾ ہمزہ کے فتح "د" کے کسرہ اور "ل" کی تشدید دلیل کی جمع ہے۔ لغوی اعتبار سے دلیل کا معنی مطلوب و مقصود کی طرف راہنمائی کرنے والا ہے۔ ﴿ الاحکام ﴾ حکم کی جمع ہے اس سے مراد اللہ تعالیٰ کا خطاب جو مکلفین کے افعال سے متعلق ہو۔ ﴿ حررتہ ﴾ تحریر سے ہے جس کے معنی تنقیح تہذیب کے ہیں۔ ﴿ نابغہ ﴾ عظیم الشان ماہر کو کہتے ہیں۔ ﴿ المبتدی ﴾ فن

حدیث کا ابتدائی طالب علم۔ ﴿المنتھی﴾ اس شخص کو کہتے ہیں جو اپنے مطلوب و مقصود کی انتہا تک پہنچے۔ مطلب یہ ہے کہ یہ مختصر مگر جامع کتاب ابتدائی طلباء سے لے کر کامل ماہرین دونوں کے لیے یکساں طور پر مفید ہے۔ ﴿عقب﴾ "ع" کے فتح اور "ق" کے کسرہ۔ بعد کے معنی میں استعمال کیا گیا ہے۔ ﴿من اخرجه﴾ اس میں "من" موصولہ ہے اور اخرجہ کے ساتھ مل کر بینت کا مفعول ہے اس میں اخراج، تخریج اور روایت کے معنی میں استعمال ہوا۔ مطلب یہ ہوا کہ محدث کا اس حدیث کو اپنی سند کے ساتھ کتاب میں بیان کرنا اور مصنف نے مخرجین کے ذکر کے ساتھ ہی حدیث کی حیثیت بھی بیان کر دی ہے کہ یہ حدیث محدثین کی نظر میں صحیح ہے حسن یا ضعیف ہے۔ ﴿النصح﴾ بھلائی اور خیر خواہی۔ ﴿فالمراد﴾ کا مطلب ہے میری مراد۔ یعنی اس کتاب میں جب میں بالسبعۃ کہتا ہوں تو میری مراد اس سے یہ ہوتی ہے کہ اس حدیث کو سات محدثین نے اپنی کتابوں میں نقل کیا ہے۔ اور جب میں حدیث بیان کرنے کے بعد "اخرجه السبعة" کہتا ہوں تو اس کا بھی وہی مطلب ہوتا ہے کہ اس حدیث کو سات محدثین نے اپنی کتابوں میں بیان کیا ہے۔ ﴿عدا﴾ غیر اور سوئی کے معنی میں استعمال ہوتا ہے اور یہ ان الفاظ میں سے ہے جو استثناء کے لیے ہیں اور اس کے بعد آنے والا لفظ منصوب ہوتا ہے اور کبھی میں ﴿الاربعة واحمد﴾ کہتا ہوں تو اس سے مراد ﴿اخرجه الخمسة﴾ کی طرح پانچ محدث مراد ہوتے ہیں ﴿الاربعة واحمد﴾ اور ﴿اخرجه الخمسة﴾ بیان کا طریق مختلف ہے مگر مفہوم و مراد دونوں سے ایک ہی ہے۔ ﴿الثلاثة الاول﴾ الاول ہمزہ کے ضمہ اور "و" کے فتح۔ اول کی جمع ہے اور ثلاثہ سے میری مراد پہلی تین کتابوں بخاری، مسلم اور احمد کے علاوہ ہے۔ ﴿الاخير﴾ سے ابن ماجہ مراد ہے۔ یعنی پہلی تین اور آخری ابن ماجہ کے علاوہ باقی ابوداؤد، ترمذی اور نسائی رہ جاتی ہیں بالثلاثة سے یہی تین مراد ہیں۔ ﴿معهما﴾ اس سے مراد بخاری و مسلم کے ساتھ۔ ﴿غيرهما﴾ حدیث کی نسبت بخاری و مسلم کی جانب ہے۔ حدیث کے مرتبہ صحت کے لیے کافی ہے مگر مزید برآں تائید کے لیے ان دونوں کے علاوہ دوسرے محدثین نے بھی اس حدیث کو روایت کیا ہے۔ ﴿ما عدا ذلك﴾ ان سات محدثین کے علاوہ اور محدثین نے بھی روایت کیا ہے ان کے اسماء گرامی بھی واضح طور پر بیان کر دیئے ہیں۔ ﴿المرام﴾ کے معنی طلب کے ہیں اور مراد سے مطلوب ہے۔ ﴿والله﴾ مفعول مقدم ہے اس لیے منصوب ہے اسال کا مفعول ہے۔ مفعول کو مقدم بیان کرنے سے مقصود کلام میں حصر کرنا ہے یعنی میں صرف اللہ تعالیٰ سے دست سوال دراز کرتا ہوں۔ بجز اس کے کسی اور سے سوال نہیں کرتا۔ ﴿ما علمناه﴾ اپنے صلہ کے ساتھ مل کر جعل فعل کا پہلا مفعول ہے اور دوسرا مفعول و بالاً ہے۔ وبال کی "و" پر فتح ہے اس کے معنی برے انجام کے ہیں۔ اس دعا کے ساتھ اللہ کے حضور استدعا کی ہے کیونکہ نیکی جب تک خالصۃً اللہ کے لیے نہ کی جائے تو وہ برائی اور گناہ بن جاتی ہے اور ان یرزقنا کے معنی ہیں یوفقنا یعنی ہمیں اللہ توفیق دے۔

۱۔ كِتَابُ الطَّهَارَةِ

طہارت کے مسائل

١ - بابُ المِياه

پانی کی اقسام

(مختلف ذرائع سے حاصل شدہ پانی کا بیان)

(١) عَنْ أبي هُرَيرَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قال رسولُ الله ﷺ في البَحْرِ: «**هُوَ الطَّهُورُ مَاؤُهُ والحِلُّ مَيْتَتُهُ**». أخرَجَهُ الأَرْبَعَةُ وَابنُ أبي شيبَةَ وَاللَّفْظُ لَهُ، وَصَحَّحَهُ ابنُ خُزَيْمَةَ والتِّرمِذِيُّ، وَرَوَاهُ مَالِكٌ وَالشَّافِعِيُّ وَأَحْمَدُ.

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے سمندر کے پانی کے متعلق (ایک شخص کے استفسار کے جواب میں) فرمایا کہ "اس کا پانی پاک ہے اور اس کا مردار حلال ہے۔" (اس حدیث کو ابوداؤد' ترمذی' نسائی' ابن ماجہ اور ابن ابی شیبہ نے روایت کیا ہے۔ متن حدیث کے الفاظ ابن ابی شیبہ کے ہیں۔ ابن خزیمہ اور ترمذی نے اسے صحیح قرار دیا ہے۔ علاوہ ازیں اس روایت کو مالک' شافعی اور احمد نے بھی روایت کیا ہے)

لغوی تشریح: ﴿كتاب الطهارة﴾ کتاب' کتب سے مشتق ہے جس کے معنی جمع کرنے اور ملانے کے ہیں اور مصنفین کے نزدیک کتاب مسائل کے اس مجموعے کو کہتے ہیں جو مستقل حیثیت کے حامل ہوں چاہے وہ کئی انواع یعنی مختلف ابواب پر مشتمل ہو یا نہ ہو۔ اور طہارت پلیدی یا ناپاکی کے ازالے کو کہتے ہیں۔

﴿باب المياه﴾ باب ایک ہی نوع سے متعلق مسائل جس میں بیان کئے جائیں اسے باب سے تعبیر کرتے ہیں اور ﴿مياه﴾ ماء کی جمع ہے "مویہ" اس کی تصغیر آتی ہے۔ بدوی عربوں نے اس کی صورت بگاڑ کر "مویہ" کر دی ہے۔ مصنف اس کو جمع اس بنا پر لائے ہیں کہ اس باب میں وہ کنوئیں کا پانی' دریا اور سمندر کا پانی اور چشموں اور باران رحمت کے پانی کا ذکر کریں گے۔

﴿ عن ابی ھریرۃ ﴾ اس کا تعلق محذوف سے ہے جو روی یا مروی وغیرہ ہو سکتا ہے اور ﴿ فی البحر ﴾ کا مطلب ہے دریا و سمندر کے پانی کا کیا حکم ہے۔ پھر ﴿ الطھور ﴾ کا لفظ استعمال ہوا ہے "طاء" کے فتح سے اگر اسے ادا کیا جائے تو اس صورت میں وہ اسم مراد ہوگا جو مطہر یعنی پاک کرنے والا کے معنی میں ہوگا۔ دریا و سمندر کا پانی بذات خود پاک بھی ہے اور پاک کرنے والا بھی ہے۔ ﴿ الحل ﴾ "حاء" کے کسرہ اور "لام" کی تشدید کے ساتھ۔ اس کے معنی ہیں حلال۔ ﴿ میتتہ ﴾ سے وہ جانور مراد ہے جو پانی میں ہی صرف زندہ رہ سکتا ہے۔ اس سے وہ جانور مراد نہیں جو پانی کے باہر بھی زندہ رہ سکتا ہو۔

حاصل کلام: یہ حدیث دراصل ایک سائل کے جواب میں ارشاد فرمائی گئی ہے جسے امام مالک رحمۃ اللہ علیہ وغیرہ نے یوں روایت کیا ہے کہ ایک آدمی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا اے اللہ کے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم)! ہم سمندر میں سفر کرتے ہیں' ہمارے ساتھ تھوڑا بہت پانی ہوتا ہے' اب اگر ہم اس پانی سے وضو کریں تو پیاسے مرجائیں تو کیا ہم سمندر کے پانی سے وضو کر سکتے ہیں؟ فرمایا "وہ پانی پاک ہے۔"

یہ حدیث دلیل ہے' اس کی کہ سمندری پانی بغیر تفصیل کے مطلقاً پاک ہے۔ نیز یہ کہ سمندری جانور بھی حلال ہیں خواہ وہ کتے اور خنزیر کی شکل کے ہوں۔ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ' امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ اور امام احمد رحمۃ اللہ علیہ کی یہی رائے ہے البتہ امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ سمندری جانوروں میں سے صرف مچھلی کو حلال سمجھتے ہیں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے سائل کو سمندری پانی کی حلت کے ساتھ بغیر سائل کے دریافت کئے' اس میں طبعی موت مرے ہوئے جانور کی حلت بھی مزید بتا دی۔ اس لئے کہ جو آدمی سمندری پانی کی حلت کے متعلق شک میں مبتلا ہو سکتا ہے وہ تو اس میں مرے ہوئے جانور کی حلت کے بارے میں اس سے کہیں زیادہ شک و شبہ میں رہ سکتا ہے۔ خاص کر جب کہ قرآن مجید میں مردار کی حرمت نص سے واضح ہے مگر اس کی تفصیل نہیں اور یہ بات معلوم ہے کہ سمندر میں سفر کرنے والا اس صورتحال میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ لہٰذا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا جواب حکمت و دانائی اور شفقت پر مبنی ہے۔ یہ سائل کون تھا؟ اس بارے میں مختلف اقوال ہیں۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس کا نام عبداللہ المدلجی رضی اللہ عنہ تھا اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس کا نام عبدالعرکی رضی اللہ عنہ تھا اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ وہ عبیدالعرکی رضی اللہ عنہ تھا اور عرکی سمندر و دریا میں کشتی چلانے والے کو کہتے ہیں۔ یعنی ملاح۔

اس حدیث سے ثابت ہوتا ہے کہ سمندری پانی کا پاک ہونا' اس سے وضو کرنا' اس کو (صاف کر کے) اپنے استعمال میں لانا صحیح ہے اور اسی طرح یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ جو جانور صرف سمندر کے ہیں (یعنی وہ سمندر کے باہر زندہ نہیں رہ سکتے) وہ سب حلال ہیں' چاہے سمندر میں مرجائے یا نکالنے کے بعد مر جائے اور یہ کہ سمندر میں سفر کرنا جائز ہے۔

راوی حدیث: ﴿ حضرت ابوہریرۃ رضی اللہ عنہ ﴾ وہ جلیل القدر صحابی رسول ہیں جن سے سب سے زیادہ احادیث نبوی ہم تک پہنچی ہیں۔ صاحب استیعاب کی رائے کے مطابق ان کا نام عبداللہ یا عبدالرحمٰن تھا۔ قبیلہ دوس سے تھے۔ ۷ھ میں مشرف بہ اسلام ہوئے۔ اٹھتر سال کی عمر پائی اور ۵۹ھ میں اس دنیائے فانی

سے کوچ کیا اور مدینہ منورہ کے بقیع غرقد نامی قبرستان میں دفن کئے گئے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانۂ خلافت میں مفتی کے فرائض انجام دیتے رہے۔ ان سے کم و بیش ۵۳۸۴ احادیث مروی ہیں۔ واللہ اعلم۔

(۲) وعَنْ أَبِيْ سَعِيدٍ الخُدْرِيِّ رَضِيَ اللهُ تَعَالَى عَنْهُ، قَالَ: قال رسول الله ﷺ: «إِنَّ المَاءَ طَهُورٌ لاَ يُنَجِّسُهُ شَيْءٌ». أَخْرَجَهُ الثَّلاثَةُ وَصَحَّحَهُ أَحْمَدُ.

حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ "پانی پاک ہے' اسے کوئی چیز ناپاک نہیں کرتی۔" (اس روایت کو ابوداؤد' ترمذی اور ابن ماجہ نے روایت کیا ہے اور احمد نے اسے صحیح قرار دیا ہے)

لغوی تشریح: ﴿الخدری﴾ "خاء" کے ضمہ اور "د" کے سکون کے ساتھ۔ "خدرۃ" کی طرف منسوب ہے جو انصار کا ایک معروف و مشہور قبیلہ ہے۔ ﴿طهور﴾ "طاء" کے فتح کے ساتھ اس کے معنی پاک کے بھی ہیں اور پاک کرنے والے کے بھی۔ ﴿لا ینجسه﴾ میں ینجسه تنجیس سے بنا ہے جس کے معنی ہیں کہ کوئی چیز اسے نجس یعنی ناپاک نہیں کرتی۔ مفہوم و معنی یہ ہے پانی میں نجاست کا محض گر جانا اسے ناپاک نہیں کرتا۔

حاصل کلام: حدیث کا مقصود یہ ہے کہ پانی پاک ہے محض نجاست کے واقع ہونے سے پانی ناپاک نہیں ہوتا خواہ پانی کی مقدار کم ہو یا زیادہ۔ امام مالک رحمہ اللہ اور ظواہر اور ایک قول کے مطابق امام احمد رحمہ اللہ کی بھی یہی رائے ہے۔ امام مالک رحمہ اللہ نے مشروط بات کی ہے کہ جب تک اوصاف ثلاثہ میں سے کوئی وصف عملاً رونما نہ ہو جیسا کہ آگے ابوامامہ باہلی رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں بیان ہوا ہے لیکن ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث ایک خاص واقعہ سے متعلق ہے اور وہ یہ کہ رسول اللہ ﷺ سے دریافت کیا گیا کہ کیا ہم بئر بضاعہ کے پانی سے وضو کر سکتے ہیں؟ (بئر بضاعہ ایک پرانا کنواں تھا جس میں حیض والے کپڑے' کتے کے گوشت کے ٹکڑے اور بدبودار چیزیں ڈالی جاتی تھیں) آپ نے اس کے جواب میں فرمایا "پانی تو پاک ہے۔" بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ الماء میں جو "لام" ہے یہ لام عہد کا ہے جس کے معنی یہ ہوں گے کہ سائل کے ذہن میں جس کنوئیں کا پانی مراد تھا اور وہ بئر بضاعہ کا پانی تھا' اس کنوئیں کی چوڑائی چھ ہاتھ تھی۔ زیادہ سے زیادہ اس میں پانی ناف سے اوپر کی حد تک رہتا تھا اور جب کم ہوتا تو ناف سے نیچے کی حد تک ہو جاتا۔ جیسا کہ ابوداؤد نے اپنی سنن میں اس کا ذکر کیا ہے۔

یہ حدیث اس پر دلالت کرتی ہے کہ جب پانی اتنی کثیر مقدار میں ہو تو محض نجاست کا اس میں گر جانا اسے ناپاک نہیں کرتا۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ مطلق پانی میں نجاست گرنے سے وہ ناپاک نہیں ہوتا۔ (اگر مذکورہ کثیر مقدار ہو تو اس میں نجاست واقع ہونے سے وہ ناپاک نہیں ہوتا ورنہ ناپاک ہو جاتا ہے)۔

راوی حدیث: ﴿ابو سعید الخدری رضی اللہ عنہ﴾: ابوسعید کنیت ہے اور ان کا اسم گرامی سعد بن مالک بن سنان رضی اللہ عنہ ہے۔ انصار کے قبیلہ خزرج سے ان کا تعلق تھا۔ کبار صحابہ رضی اللہ عنہم میں ان کا شمار ہوتا ہے۔ خدرہ

ایک انصاری قبیلہ ہے جس کی طرف یہ منسوب ہیں۔ تقریباً چھیاسی برس کی طویل عمر پائی اور ۷۴ھ کے آغاز میں وفات پائی۔ رضی اللہ عنہ ۔ ان سے بھی بکثرت احادیث مروی ہیں۔

(۳) وعَنْ أَبِي أُمامَةَ البَاهِلِيِّ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رسولُ الله ﷺ: «إِنَّ المَاءَ لاَ يُنَجِّسُهُ شَيْءٌ إِلاَّ مَا غَلَبَ عَلَى رِيحِهِ وَطَعْمِهِ وَلَوْنِهِ». أخرَجَهُ ابنُ مَاجَه، وَضَعَّفَهُ أَبُو حَاتِمٍ، وَلِلْبَيْهَقِيِّ: الماءُ طَهُورٌ إِلاَّ إِن تَغَيَّر رِيْحُه أو طَعْمُه أو لَونُه بَنَجَاسَةٍ تَحدُثُ فِيْهِ.

حضرت ابوامامہ الباہلی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ”یقیناً پانی کو کوئی چیز ناپاک و پلید نہیں کرتی الا یہ کہ پانی پر اس ناپاک و پلید چیز کی بو' ذائقہ اور رنگت غالب ہو جائے۔“ (اسے ابن ماجہ نے روایت کیا ہے اور ابوحاتم نے اسے ضعیف قرار دیا ہے) بیہقی میں الفاظ حدیث اس طرح ہیں ”پانی پاک ہے (اور پاک کرنے والا بھی ہے) بجز اس کے وہ ناپاک پانی میں گرنے والی چیز پانی کی بو' ذائقہ اور رنگت کو تبدیل کر دے۔“

لغوی تشریح: ﴿ لا ینجسہ ﴾ تنجیس سے ہے۔ محض نجاست کا پانی میں گر جانا اسے ناپاک نہیں بناتا۔ یہ اس صورت میں ہے جبکہ پانی کی مقدار کثیر ہو یعنی دو بڑے مٹکوں کی مقدار کے برابر ہو۔ پھر اگر پانی دو بڑے مٹکوں کی مقدار کے مساوی ہو اور اس میں نجاست گر کر اس کی بو' ذائقہ اور رنگت میں سے کوئی ایک وصف بھی تبدیل کر دے تو پانی ناپاک ہو جائے گا۔ اس میں پانی کی مقدار قلیل یا کثیر کا اعتبار نہیں ہو گا ﴿ تحدث فیہ ﴾ معنی نجاست پانی میں واقع ہو جائے۔

حاصل کلام: اس حدیث کی سند میں رشدین بن سعد راوی متروک ہے اور وہ اسے موصول بیان کرتا ہے جبکہ راشد بن سعد جو ثقہ راوی ہے اسے مرسل بیان کرتا ہے۔ یہ حدیث اگرچہ اپنی سند کے اعتبار سے ضعیف ہے تاہم معنوی اعتبار سے اس کی صحت پر اجماع ہے۔ امام شافعی رحمہ اللہ اور بیہقی رحمہ اللہ اور ابن منذر رحمہ اللہ نے اس بات پر اہل علم کا اجماع نقل کیا ہے کہ پانی خواہ تھوڑا ہو یا زیادہ نجاست کے اس میں گرنے سے اس کے تین اوصاف میں سے کسی ایک کی تبدیلی کی صورت میں وہ ناپاک ہو جاتا ہے۔

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ پانی کو اگر زیادہ مقدار مثلاً دو قلے' یا اس سے زیادہ ہو تو کوئی چیز پلید نہیں کرتی۔ ہاں اگر نجاست گرنے کی وجہ سے اس کا رنگ' بو یا مزہ بدل جائے تو وہ پلید ہو جاتا ہے۔

راوی حدیث: ﴿ ابو امامۃ الباھلی رضی اللہ عنہ ﴾: ابوامامہ کنیت۔ امامہ ہمزہ کے ضمہ کے ساتھ۔ باہلہ قبیلہ میں سے ہونے کی وجہ سے باہلی کہلائے۔ ان کا نام صدی (تصغیر) بن عجلان ہے۔ مشہور صحابی رسول ﷺ ہیں۔ یہ ان صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں سے ہیں جن سے بکثرت روایات مروی ہیں۔ مصر میں سکونت اختیار کی پھر حمص کی جانب منتقل ہو گئے۔ ان کی وفات ۸۱ھ یا ۸۶ھ میں ہوئی۔ شام میں وفات پانے والے سب سے آخری صحابی رضی اللہ عنہ یہی ہیں۔

(٤) وعَنْ عَبدِاللهِ بْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللَّهُ تَعالَى عَنْهُما قَالَ: قَالَ رسولُ الله ﷺ: «إِذَا كَانَ المَاءُ قُلَّتَيْنِ لَمْ يَحمِلِ الخَبثَ». وفي لَفْظٍ: «لَمْ يَنْجُسْ». أخرجَهُ الأربَعَةُ، وَصَحَّحَهُ ابنُ خُزَيْمَةَ وابْنُ حِبَّانَ وَالحَاكِمُ.

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "جب پانی کی مقدار دو بڑے مٹکوں کے برابر ہو تو وہ نجاست کو قبول ہی نہیں کرتا۔" ایک دوسری روایت کے الفاظ ہیں کہ "پانی نجس (ناپاک) نہیں ہوتا۔" (اسے ابوداؤد' ترمذی' نسائی اور ابن ماجہ نے روایت کیا ہے۔ ابن خزیمہ' ابن حبان اور حاکم نے اسے صحیح قرار دیا ہے)

لغوی تشریح: ﴿قلتین﴾ "قاف" کے پیش اور "لام" کی تشدید۔ بڑے مٹکے کو کہتے ہیں۔ اس کے چھوٹے اور بڑے ہونے کی وجہ سے اس کی مقدار میں اختلاف رائے واقع ہوا ہے۔ لیکن عرب میں ھجر کے مٹکے مشہور و معروف تھے۔ شعراء نے اپنے اشعار میں بکثرت اس کا استعمال کیا ہے اور امثال میں بھی اسے بہت بیان کیا ہے۔ اس طرح حدیث میں بیان شدہ مٹکے سے مراد یہی ھجر کا مٹکا ہے اور دوسرا کوئی مراد نہیں ہو سکتا اور ان کے مٹکے میں اڑھائی سو رطل پانی کے سمانے کی گنجائش تھی لہٰذا دو قلوں کے پانی کی مقدار پانچ صد رطل ہوئی جو موجودہ زمانہ کے پیمانہ کے مطابق دو سو ستائیس کلوگرام ہوتی ہے۔ ﴿یحمل الخبث﴾ الخبث میں "خاء" اور "با" دونوں پر زبر ہے۔ معنی اس کے نجاست اور گندگی کے ہیں۔ ﴿لم یحمل الخبث﴾ کے معنی ہیں کہ پانی اس نجاست کو قبول ہی نہیں کرتا' قبول کرنے سے انکاری ہے اور صرف نجاست کے پانی میں گرنے سے وہ ناپاک ہوتا بھی نہیں۔ وفی لفظ ﴿لم ینجس﴾ میں ایک قرأت کے مطابق تو "جیم" پر زبر (فتح) ہے اور دوسری قرأت کے مطابق پیش (ضمہ) ہے' دونوں صورتوں میں معنی ایک ہی ہیں۔

حاصل کلام: یہ حدیث پانی کی قلیل و کثیر مقدار کے فرق اور حد بندی میں بالکل واضح اور صریح ہے۔ ان تمام احادیث سے جو چیز حاصل ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ جب پانی کی مقدار دو قلوں (مٹکوں) سے کم ہوگی تو نجاست کے اس میں محض گرنے سے ہی وہ ناپاک ہو جائے گا۔ خواہ اوصاف ثلاثہ میں سے کوئی ایک وصف میں تغیر واقع ہوا ہو یا نہ اور اس کی مقدار قلتین (مٹکوں) کے برابر یا اس سے زیادہ ہوگی۔ تو محض وقوع نجاست سے وہ ناپاک نہیں ہوگا بلکہ وہ خود بھی پاک ہی رہے گا اور دوسری چیز کو پاک کرے گا اور جب ان اوصاف ثلاثہ (بو' ذائقہ اور رنگت) میں سے کوئی وصف اس کی وجہ سے رونما ہوگا تو وہ پانی ناپاک شمار ہوگا۔ جیسا کہ ابوامامہ سے مروی حدیث اس پر دلالت کرتی ہے۔

جہاں تک "بئر بضاعۃ" والی حدیث کا تعلق ہے اس کے متعلق تمہیں علم ہے کہ اس میں پانی دو قلوں سے بھی زیادہ تھا۔ اس حدیث کو ائمہ حدیث کے ایک جم غفیر امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ' ابوعبید رحمۃ اللہ علیہ' احمد رحمۃ اللہ علیہ' اسحٰق رحمۃ اللہ علیہ' یحییٰ بن معین رحمۃ اللہ علیہ' ابن خزیمہ رحمۃ اللہ علیہ' طحاوی رحمۃ اللہ علیہ' ابن حبان رحمۃ اللہ علیہ' دار قطنی رحمۃ اللہ علیہ' ابن مندہ رحمۃ اللہ علیہ'

حاکم رحمہ اللہ' خطابی رحمہ اللہ' بیہقی رحمہ اللہ' ابن حزم رحمہ اللہ اور دیگر ائمہ نے صحیح قرار دیا ہے۔ جیسا کہ علامہ سیوطی نے قوت المغتذی میں نقل کیا ہے۔ یہ اہلحدیث اور شوافع کی دلیل ہے کہ دو قلوں سے کم پانی کثیر کے زمرہ میں نہیں آتا اور دو قلوں یا اس سے زیادہ پانی کی مقدار کثیر ہے۔ احناف کا "دہ دردہ" کا مسئلہ عقلی ہے۔ حدیث کے مقابلہ میں عقل کی کیا حیثیت ہے۔

معلوم ہوا کہ کھڑے پانی میں نہ تو نجاست ڈالی جائے اور نہ جنبی نہائے۔ پانی اگر دو قلوں سے کم ہو تو نجاست پڑنے سے ناپاک ہو جاتا ہے' چاہے اس کا رنگ' بو اور مزہ بدلے یا نہ بدلے اور اگر دو قلوں سے زیادہ ہو تو اس وقت تک پلید نہیں ہوتا جب تک اس کا رنگ' بو اور مزہ نجاست پڑنے سے بدل نہ جائے۔

راوی حدیث: ﴿ عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما ﴾ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں سب سے زیادہ زاہد اور وسیع علم کے مالک تھے۔ صغر سنی میں مشرف بہ اسلام ہوئے۔ مکہ سے مدینہ کی جانب ہجرت بھی کی۔ پہلی مرتبہ غزوۂ خندق میں شریک ہوئے۔ ۷۳ھ میں مکہ مکرمہ میں وفات پائی اور ذی طوی نامی جگہ میں دفن ہوئے۔

(٥) وَعَنْ أَبِي هُرَيرَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رسولُ اللهِ ﷺ: «لا يَغْتَسِلْ أَحَدُكُمْ فِي المَاءِ الدَّائِمِ وَهُوَ جُنُبٌ». أخرجه مسلم.

وللبخاري: «لاَ يَبُولَنَّ أَحَدُكُمْ فِي المآءِ الدَّائِمِ الَّذي لاَ يَجْرِي، ثُمَّ يَغْتَسِلُ فِيهِ». ولِمُسْلِمٍ «منه» وَلأَبي دَاوُد «وَلاَ يَغْتَسِلْ فِيهِ مِنَ الجَنَابَةِ».

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "تم میں سے جو شخص حالت جنابت میں ہو وہ کھڑے (ساکن) پانی میں غسل نہ کرے۔" (مسلم) اور بخاری کے الفاظ ہیں کہ "تم میں سے کوئی بھی کھڑے پانی میں پیشاب نہ کرے اور پھر اس میں غسل کرے۔" صحیح مسلم کے الفاظ فیہ کے بجائے منہ ہیں یعنی اس سے کچھ پانی لے کر غسل کرے اور ابوداؤد کے الفاظ ہیں "ولا یغتسل فیہ من الجنابۃ " یعنی "جنابت لاحق ہو جانے کی صورت میں اس میں غسل نہ کرے۔"

لغوی تشریح: ﴿ الدائم ﴾ ایسا ساکن جو بہتا نہ ہو ﴿ جنب ﴾ جیم اور نون کے ضمہ (پیش) کے ساتھ۔ جسے جنابت لاحق ہو جائے اور جنابت ایسی کیفیت ہے جو جماع یا احتلام کی وجہ سے انزال کے بعد پیدا ہو۔ ﴿ ثم یغتسل فیہ ﴾ اس میں ثم دوری ظاہر کرنے کے لئے ہے یعنی عقل مند آدمی سے یہ بعید ہے کہ وہ ایسا کرے۔ اور ﴿ یغتسل ﴾ میں پیش (رفع) بھی جائز ہے' مبتدا محذوف "ھو" کی خبر ہونے کے اعتبار سے اور سکون (جزم) پڑھنا بھی جائز ہے ﴿ لایغتسل ﴾ کی نہی پر عطف کی وجہ سے اور زبر (نصب) پڑھنا بھی جائز ہے' (ان) پوشیدہ (مقدر) مان لینے کی وجہ سے۔

حاصل کلام: مسلم کی روایت میں "فیہ" کی جگہ "منہ" ہے اگر "فیہ" ہو تو اس سے مراد ہے کہ اس

پانی میں داخل ہونا اور غوطہ لگانا منع ہے اور "منہ" ہو تو اس سے مراد ہے کہ اس سے کسی برتن میں پانی لے کر الگ طور پر غسل کرنے کی بھی نہی ہے۔ بہرحال مسلم کی روایت سے صرف غسل کرنے کی ممانعت نکلتی ہے اور بخاری کی روایت میں اس میں پیشاب کرنے اور اس میں غسل کرنے دونوں کی ممانعت ہے۔ ابوداؤد کی روایت کی رو سے دونوں کی انفرادی طور پر ممانعت ہے یعنی اس میں پیشاب کرنا بھی ممنوع ہے اور اس پانی میں یا اس میں سے کچھ لے کر نہانا دونوں کی ممانعت ہے۔ تمام روایات سے حاصل یہ ہوا کہ دونوں عمل ہی ممنوع ہیں۔ یہ اس بنا پر کہ کھڑا پانی اگر مقدار میں کم ہے تو پھر وہ ناپاک ہو جائے گا اور کثیر مقدار میں ہے تو یکے بعد دیگرے پیشاب اور غسل کرنا پانی کے اوصاف میں تغیر و تبدل کا موجب ہو گا۔

پس نہی تحریم کیلئے ہے جبکہ پانی کم مقدار میں ہو اور جب پانی مقدار میں کثیر ہو تو پھر نہی تنزیہی ہے کیونکہ کثیر مقدار رواں اور جاری کے حکم میں ہوتا ہے اور وہ ناپاک و نجس نہیں ہوتا۔

(٦) وعَنْ رَجُلٍ صَحِبَ النَّبِيَّ ﷺ قَالَ: نَهَى رَسُولُ اللهِ ﷺ أَنْ تَغْتَسِلَ المَرأَةُ بِفَضْلِ الرَّجُلِ، أَوِ الرَّجُلُ بِفَضْلِ المَرْأَةِ، وَلْيَغْتَرِفَا جَمِيْعاً. أَخْرَجَهُ أَبُو دَاوُدَ وَالنَّسَائِيُّ، وَإِسْنَادُهُ صَحِيْحٌ.

ایک ایسے آدمی سے روایت ہے جو نبی ﷺ کی صحبت سے فیض یاب ہوا کہ رسول اللہ ﷺ نے منع فرمایا ہے کہ "عورت' مرد کے بچے ہوئے غسل کے پانی سے غسل کرے یا مرد' عورت کے باقی ماندہ غسل کے پانی سے غسل کرے۔ ہاں دونوں اکٹھے چلو سے لے لیں۔ (تو کوئی مضائقہ اور حرج نہیں) "

(ابوداؤد و نسائی۔ اور اس کی سند صحیح ہے)

لغوی تشریح: ﴿ عن رجل صحب ﴾ صحب باب سمع یسمع سے فعل ماضی ہے اور اس مرد کی صفت میں واقع ہو رہا ہے۔ صحابی کا نام ظاہر نہ ہونا روایت حدیث میں ضرر رساں نہیں' کیونکہ اہل السنہ کا اتفاق ہے کہ "الصحابۃ کلھم عدول" کہ تمام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم عادل ہیں اور ﴿ بفضل الرجل ﴾ سے مراد ہے کہ آدمی کے غسل کرنے کے بعد جو پانی بچ جائے۔ ﴿ ولیغترفا ﴾ میں "لام" امر کا ہے اور ﴿ اغتراف ﴾ کے معنی ہیں دونوں ہاتھوں کو ملا کر پانی لینا۔ یعنی دونوں چلو سے پانی لینا۔

حاصل کلام: اس حدیث میں نھی سے مراد نہی تنزیہی ہے۔ آئندہ حدیث میں اس کا جواز منقول ہے' تاکہ کوئی یہ نہ سمجھ بیٹھے کہ عورت کے غسل سے بچا ہوا پانی اپنے غسل کے لئے استعمال نہیں کر سکتا۔ چلو سے بیک وقت مرد و عورت کا پانی لینا ایسا فعل ہے کہ جس میں ایک کا اثر دوسرے پر پڑ سکتا ہے اس طرح دونوں ایک دوسرے کا بدل بن جاتے ہیں اس میں چونکہ کوئی مضائقہ نہیں تھا اس لئے اس کی اجازت دے دی گئی۔

اگر خاوند و بیوی دونوں اکٹھے ایک برتن سے پانی لے کر نہائیں تو جائز ہے۔ لیکن صرف خاوند یا صرف بیوی کے غسل جنابت کے بعد اس کا بچا ہوا پانی دوسرے کیلئے اپنے استعمال میں لانا جائز نہیں ہے'

تاکہ دونوں کے ذہن میں کسی قسم کا شک باقی نہ رہے۔

(۷) وعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُمَا، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ كَانَ يَغْتَسِلُ بِفَضْلِ مَيْمُونَةَ رَضِيَ الله تعالى عنها. أخرجه مسلم. وَلِأَصْحَابِ السُّنَنِ: اغْتَسَلَ بَعْضُ أَزْوَاجِ النَّبِيِّ ﷺ فِي جَفْنَةٍ، فَجَاءَ النَّبِيُّ ﷺ لِيَغْتَسِلَ مِنْها، فَقَالَتْ له: إِنِّي كُنْتُ جُنُباً، فَقَالَ: «إِنَّ المَاءَ لاَ يَجْنُبُ». وَصَحَّحَهُ التِّرْمِذِيُّ وَابنُ خُزَيْمَةَ.

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما روایت کرتے ہیں کہ نبی ﷺ اپنی اہلیہ میمونہ رضی اللہ عنہا کے بچے ہوئے غسل کے پانی سے نہالیا کرتے تھے۔ (مسلم) اصحاب سنن کی روایت میں اس طرح ہے کہ ازواج مطہرات میں سے ایک نے ٹب نما برتن میں غسل کیا۔ نبی ﷺ تشریف لائے کہ اس میں باقی بچے ہوئے پانی سے غسل فرمالیں تو اس نے آپؐ سے عرض کیا کہ میں نے اس میں حالت جنابت سے غسل کیا ہے تو آپؐ نے فرمایا "پانی ناپاک نہیں ہوتا۔" (اس روایت کو ترمذی اور ابن خزیمہ نے صحیح قرار دیا ہے)

لغوی تشریح: ﴿ لاصحاب السنن ﴾ سے ابوداؤد، ترمذی، نسائی، ابن ماجہ، اسی طرح دارمی، دارقطنی، ابن خزیمہ اور حاکم مراد ہیں۔ ﴿ جفنۃ ﴾ "جیم" کے فتح اور "فاء" کے سکون کے ساتھ۔ ایک بڑا سا پیالہ اور عام لوگ اسے "اجانۃ" (یعنی چمڑے کی ٹوکری) کہتے ہیں۔ ﴿ یغتسل منھا ﴾ یعنی اس کے پانی سے ﴿ فقالت: انی کنت جنبا ﴾ سے مراد ہے کہ میں نے اس پانی سے غسل کیا ہے اور یہ پانی میرے غسل کا بچا ہوا ہے۔ ﴿ لایجنب ﴾ میں جنب سمع اور کرم دونوں ابواب سے پڑھنا جائز ہے اور یہ بھی احتمال ہے کہ یہ باب اکرام سے ہو۔ اس کا معنی ہے کہ جنبی کے کسی پانی والے برتن سے پانی لے کر غسل کرنے کی وجہ سے وہ پانی ناپاک نہیں ہو جاتا۔

حاصل کلام: اس حدیث سے کسی کو یہ شک پیدا نہ ہو کہ یہ حدیث پہلی کے مخالف ہے۔ درحقیقت امت کی سہولت اور آسانی کیلئے ایسا فرمایا ہے اور خود عمل کر کے بتا دیا دونوں احادیث اپنی جگہ صحیح ہیں۔ اس حدیث میں جو نہی ہے وہ نہی تنزیہی ہے، تحریمی نہیں۔ یہ حدیث جواز پر دلالت کرتی ہے اور پہلی ترک اولیٰ پر۔

رسول اللہ ﷺ اپنی زوجہ میمونہ رضی اللہ عنہا کے بچے ہوئے غسل کے پانی سے نہا لیتے تھے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا اور آپ دونوں ایک برتن سے پانی لے کر نہاتے تھے۔ جیسا کہ صحیح مسلم کی اسی حدیث کی دوسری سند سے واضح ہے۔ اصحاب سنن والی روایت بلحاظ سند ضعیف ہے۔ لہٰذا راجح یہی ہے کہ خاوند اور بیوی دونوں اکٹھے تو ایک برتن سے پانی لے کر نہا سکتے ہیں مگر علیحدہ علیحدہ نہانے کی صورت میں ایک کو دوسرے کا بچا ہوا پانی استعمال نہیں کرنا چاہئے۔

راوی حدیث: ﴿ عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما ﴾ ان کا نام عبداللہ بن عباس بن عبدالمطلب رضی اللہ

عنہما تھا۔ یہ وہی ہیں جنہیں اس امت کے بحر العلم ہونے کا اعزاز حاصل ہے۔ بہت ذہین تھے۔ اپنی احاصت علمی کی شہرت کی وجہ سے تعریف سے مستغنی ہیں اس لیے کہ آپؓ کو نبی صلی اللہ علیہ و سلم نے علم و حکمت اور فقہ و تاویل میں زیادتی کی دعا دی تھی۔ ہجرت سے تین سال پہلے پیدا ہوئے اور ۶۷ھ میں طائف میں وفات پائی۔

﴿میمونہ رضی اللہ عنہا﴾ میمنہ بنت حارث الھلالیہؓ۔ رسول اللہ ﷺ نے ۷ ھ میں عمرۃ القضاء کے موقع پر ان سے نکاح کیا۔ ۶۱ھ یا ۵۱ھ یا ۶۶ھ کو وفات پائی۔

(۸) وعَنْ أبي هُرَيرَةَ رضي اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رسولُ الله ﷺ: طُهُورُ إِنَاءِ أَحَدِكُمْ إِذَا وَلَغَ فِيهِ الكَلْبُ أَنْ يَغْسِلَهُ سَبْعَ مَرَّاتٍ، أُوْلاَهُنَّ بِالتُّرَابِ». أخرَجَهُ مُسْلِمٌ، وَفِي لَفْظٍ لَهُ «فَلْيُرِقْه». وَلِلْتِرْمِذِيِّ: «أُخْرَاهُنَّ أَوْ أُولاَهُنَّ بِالتُّراب».

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے کہ ”تم میں سے کسی کے برتن میں جب کتا منہ ڈال جائے تو اسے سات مرتبہ دھویا جائے۔ سب سے پہلے اسے مٹی مل کر (صاف کرنا چاہئے) “ (مسلم) اور مسلم نے ”فلیرقہ“ یعنی اس کو گرا دینا چاہئے‘ نقل کیا ہے اور ترمذی نے یہ الفاظ نقل کئے ہیں ”پہلی یا آخری مرتبہ مٹی کے ساتھ صاف کرنا چاہئے۔“

لغوی تشریح: ﴿طھور﴾ طاء کے پیش (ضمہ) کے ساتھ۔ یہ مصدر ہے اور ترکیب میں مبتدا واقع ہو رہا ہے اور لفظ ﴿اناء﴾ جس کا معنی برتن ہے‘ کی طرف مضاف ہے۔ ﴿ولغ﴾ ولوغ الکلب کتے کا اپنی زبان کے اطراف کے ساتھ پینا (چاٹنا) ولغ باب فتح یفتح سے بھی آتا ہے اور اسی طرح حسب یحسب اور سمع یسمع سے بھی آتا ہے۔ ﴿ان یغسلہ﴾ یہ خبر واقع ہو رہی ہے جو جزاء شرط پر دلالت کرتی ہے۔ ﴿اولاھن﴾ کا مطلب یہ ہے سات مرتبہ دھونے کی صورت میں سب سے پہلی مرتبہ۔ ﴿فلیرقہ﴾ یہ ”اراقۃ“ سے مشتق ہے جس کے معنی ہیں برتن میں خورد و نوش کی جو چیز ہو اسے انڈیل کر فارغ کر دینا۔

حاصل کلام: ترمذی کی یہ عبارت کہ اخراھن او اولاھن غالب گمان یہ ہے کہ یہ راوی کا شک ہے ورنہ ایسا نہیں کہ دھونے والے کو اختیار دیا جا رہا ہے کہ وہ چاہے پہلی مرتبہ مٹی سے صاف کرے یا آخری مرتبہ اور اولاھن کا لفظ بکثرت روایات میں آنے کی وجہ سے اور خاص طور پر بخاری و مسلم کے روایت کرنے کی وجہ سے راجح ہے۔ یعنی اس بات کو ترجیح ہے کہ پہلی مرتبہ مٹی سے صاف کرنا چاہئے۔ یہ حدیث اس پر دلالت کرتی ہے کہ کتے کا منہ‘ اس کا لعاب دہن اور اس کا جوٹھا نجس و ناپاک ہے اور یہی اس کے سارے بدن کے نجس و ناپاک ہونے پر دلالت کرتی ہے اور برتن کے سات مرتبہ دھونے کو واجب ٹھہراتی ہے اور مٹی کے ساتھ صاف کرنا بھی واجب ہے۔ یہی محققین کی رائے ہے اور بعض نے کہا

کہ سات مرتبہ دھونا اور ایک مرتبہ مٹی سے صاف کرنا مندوب ہے واجب نہیں اور بعض کا یہ بھی قول ہے کہ تین مرتبہ دھویا جائے لیکن سچ بات یہی ہے کہ دلیل ان دونوں اقوال کی تائید نہیں کرتی اور معلوم رہے کہ جب محض نجاست کے ازالہ کیلئے سات مرتبہ دھونے کی شرط نہیں ہے تو پھر ضروری ہے کہ نجاست کے علاوہ سات مرتبہ دھونے کے حکم کی حکمت اور ہو۔ دور حاضر کے کچھ اطباء نے واضح کیا ہے کہ اکثر کتوں کی آنتوں میں بہت چھوٹے چھوٹے جرثومے پائے جاتے ہیں۔ یہ چار ملی میٹر لمبے ہوتے ہیں۔ جب کتا اپنا فضلہ خارج کرتا ہے تو اس فضلہ سے بکثرت انڈے خارج ہوتے ہیں اور فضلہ خارج ہونے کی جگہ (دبر) کے اردگرد بالوں کے ساتھ ان میں کثرت سے چمٹ جاتے ہیں۔ پھر جب کتا اپنی زبان سے اپنا وجود صاف کرتا ہے تو یہ انڈے اس کی زبان اور منہ کے ساتھ لگ جاتے ہیں۔ پھر جب کتا کسی برتن میں منہ ڈالتا ہے یا پانی پیتا ہے یا انسان اس کے منہ کا بوسہ لیتا ہے جیسا یورپین اقوام اور اس کے مقلدین عموماً ایسا کرتے ہیں تو یہ انڈے ان اشیاء کے ساتھ چمٹ جاتے ہیں اور خورد و نوش کے وقت آسانی سے اس کے منہ تک پہنچ جاتے ہیں۔ منہ میں رسائی حاصل کرنے کے بعد اس انسان کے معدہ میں پہنچ جاتے ہیں۔ پھر اس سے جرثومے نکل کر معدہ کی دیواروں میں سوراخ کر کے خون کی نالیوں میں داخل ہو جاتے ہیں اور اس طرح دل' دماغ اور پھیپھڑے کی بے شمار بیماریاں پیدا کرتے ہیں۔ مذکورہ بالا تمام چیزوں کا یورپین اطباء اپنے شہروں میں مشاہدہ کر چکے ہیں۔ ان جراثیم زدہ کتوں کی پہچان اور امتیاز بڑا مشکل کام ہے۔ اس کیلئے وقت درکار ہے اور انتہائی دقیق بحث مطلوب ہے۔ ایسے آلات کے ذریعہ جن کا استعمال بہت کم لوگ جانتے ہیں۔ شرعاً اسے نجس و ناپاک قرار دینا اور سات مرتبہ دھونا برتنوں کی صفائی اور نظافت کیلئے ہے تاکہ مذکورہ بالا کوئی چیز برتن کے ساتھ لگی نہ رہ جائے اور یہ سراسر حکمت ہے اور قرین صواب ہے۔ حقیقت حال اللہ کے علم میں ہے۔

(احکام الاحکام شرح عمدۃ الاحکام لابن دقیق العید' ج ا' ص: ۲۷) خورد و نوش کی جس چیز میں کتا منہ ڈال جائے اسے استعمال میں نہ لانا چاہئے اسے گرا دینا چاہئے اور حدیث کی رو سے اس برتن کو سات مرتبہ دھونا چاہئے۔ اس سے معلوم ہوا کہ کتا خود بھی ناپاک ہے اور جس چیز کو منہ لگائے وہ بھی ناپاک ہو جاتی ہے۔ اگر برتن ہو تو اسے سات مرتبہ دھونا چاہئے۔ مسلم کی ایک روایت میں تو ساتویں بار کی بجائے آٹھویں مرتبہ مٹی سے دھونے کا ذکر ہے۔ یعنی پہلی بار مٹی سے صاف کیا جائے پھر سات بار پانی سے دھویا جائے۔ اس طرح کرنے سے مزید صفائی اور پاکیزگی حاصل ہو جاتی ہے۔ احناف تین مرتبہ دھونے سے برتن کے پاک ہونے کے قائل ہیں۔ ان کی دلیل دار قطنی اور طحاوی میں منقول حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کا فتویٰ ہے کہ اگر کتا کسی برتن میں منہ ڈال دے تو اسے تین مرتبہ دھونا چاہئے' حالانکہ صحیح سند کے ساتھ ان کا فتویٰ یہ بھی منقول ہے کہ ایسے برتن کو سات بار دھویا جائے۔ لہٰذا جو فتویٰ روایت کے موافق ہے' وہی راجح ہے اور وہ اسناد کے اعتبار سے بھی تین بار دھونے کے فتویٰ سے زیادہ صحیح ہے۔ (فتح الباری' ج ا' ص: ۲۷۷) تعجب ہے کہ عموماً فقہائے حنفیہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کو غیر فقیہ کہتے ہیں (معاذ اللہ) مگر یہاں حدیث مرفوع

اور صحیح کے مقابلہ میں ان کے مرجوح فتویٰ اور رائے کو ترجیح بھی دیتے ہیں۔ مولانا عبدالحیٔ لکھنوی مرحوم نے اس سلسلے میں علامہ عینی رحمۃ اللہ علیہ اور علامہ ابن ہمام رحمۃ اللہ علیہ کے اعتراضات باردہ کا کافی و شافی قابل دید جواب دیا ہے۔ (السعایۃ' ج ۱' ص: ۴۴۹۔ ۴۵۴)

(۹) وعن أَبِيْ قَتَادة رضي الله تعالى عنه أَنَّ رَسولَ الله ﷺ قَالَ في الهِرَّةِ: «إِنَّهَا لَيْسَتْ بِنَجَسٍ، إِنَّمَا هِيَ مِنَ الطَّوَّافِينَ عَلَيْكُمْ». أَخْرَجَهُ الأَرْبَعَةُ، وَصَحَّحَهُ التِّرْمِذِيُّ وَابْنُ خُزَيْمَةَ.

حضرت ابو قتادۃ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بلی کے متعلق ارشاد فرمایا کہ ''وہ نجس نہیں ہے کیونکہ یہ ہر وقت آمدورفت رکھنے والا گھریلو جانور ہے۔'' (اس روایت کو چاروں (ابوداؤد' نسائی' ترمذی' ابن ماجہ) نے روایت کیا ہے۔ ترمذی اور ابن خزیمہ نے صحیح قرار دیا ہے)

لغوی تشریح: ﴿ فی الھرۃ ﴾ اس کا مطلب ہے کہ بلی کے بارے میں حکم شرعی کیا ہے؟ ھرۃ کے علاوہ اسے قط اور سنور بھی کہتے ہیں۔ ﴿ الطوافین ﴾ ''واؤ'' کی تشدید۔ واحد اس کا طواف ہے اور یہ ایسا جانور ہے جن کی آمدورفت بکثرت رہتی ہے اور وہ گھر کا خادم ہے۔ بلی کو خادم کے ساتھ تشبیہہ دینے سے مقصود یہ اشارہ کرنا ہے کہ بلی کی نوعیت اس گھریلو خادم کی سی ہے جس کا گھریلو کام کے سلسلہ میں اہل خانہ کے پاس ملنے جلنے اور ان کی ضروریات کی فراہمی کیلئے کثرت سے آنا ناگزیر ہوتا ہے۔ دشواری اور دقت کے دور کرنے کی غرض سے بلی کو غیر نجس قرار دیا گیا ہے۔ اس کے غیر نجس ہونے کی بدولت ہی اس کے جوٹھے کو پاک قرار دیا گیا ہے۔

حاصل کلام: اس حدیث کا پس منظر یہ ہے کہ حضرت ابو قتادہ رضی اللہ عنہ نے اپنے وضو کا برتن ایک جگہ رکھا تھا۔ اتنے میں بلی آئی اور اس برتن میں منہ ڈال کر پانی پینے لگی تو حضرت ابو قتادہ رضی اللہ عنہ نے اس برتن کو فوراً جھکا دیا تاکہ بلی آسانی سے اور سیر ہو کر پی لے۔ لوگوں نے دریافت کیا کہ یہ کیا ماجرا ہے؟ حضرت ابو قتادہ رضی اللہ عنہ نے جواب دیا کہ میں نے رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے سنا ہے کہ ''بلی نجس نہیں ہے۔''

اس روایت سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ بلی کا جوٹھا پلید نہیں ہے بشرطیکہ اس کے منہ پر نجاست نہ لگی ہو۔

راوی حدیث: ﴿ ابوقتادہ رضی اللہ عنہ ﴾ ابو قتادہ رضی اللہ عنہ ان کی کنیت ہے۔ اصل نام حارث بن ربعی ہے۔ بڑے مشہور و معروف صحابی رضی اللہ عنہ ہیں۔ (فارس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم) کے لقب سے مشہور ہیں۔ انصار سے تعلق رکھنے کی وجہ سے انصاری کہلائے۔ غزوۂ احد وغیرہ میں شریک جنگ رہے۔ سن وفات میں اختلاف ہے۔ بعض نے ۴۰ھ بعض نے ۵۴ھ بیان کیا ہے۔ آخری قول زیادہ مشہور ہے۔ (تہذیب الاصابہ)

(۱۰) وعَنْ أَنَسِ بْنِ مَالِكٍ رضي الله تعالى عنه قال: جَآءَ أعرابيٌّ،

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ ایک بدوی آیا اور مسجد کے کونے میں پیشاب کرنا

فَبَالَ فِي طَآئِفَةِ الْمَسْجِدِ، فَزَجَرَهُ النَّاسُ، فَنَهَاهُمْ رسولُ الله ﷺ، فلما قَضَى بَولَهُ أَمَرَ النَّبِيُّ ﷺ بِذَنُوبٍ من مَآءٍ فَأُهْرِيقَ عَلَيْهِ. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.	شروع کر دیا تو لوگوں نے اسے ڈانٹا۔ لیکن نبی ﷺ نے انہیں ایسا کرنے سے منع فرمایا' جب وہ بدوی پیشاب سے فارغ ہوا تو آنحضرت ﷺ نے پانی کا ایک ڈول طلب فرمایا اور اس جگہ پر بہا دیا (جہاں اس نے پیشاب کیا تھا)۔ (بخاری و مسلم)

لغوی تشریح: ﴿ اعرابی ﴾ اعراب کی جانب منسوب ہونے کی وجہ سے اعرابی یعنی بادیہ نشین۔ اس کے معنی بدوی و دیہاتی کے ہیں۔ یہ اعرابی کون تھے؟ یہ کہا گیا ہے کہ وہ ذوالخویصرہ یمانی تھے اور وہ بڑے پیٹ والے آدمی تھے اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ وہ معکبر الضبی تھے۔ ﴿ طائفۃ المسجد ﴾ مسجد کا کوئی کونہ یا کنارہ۔ مسجد کی کسی جانب۔ ﴿ فزجرہ الناس ﴾ لوگوں نے اسے ڈانٹا' جھڑکا' سختی سے منع کیا۔ ﴿ فنھاھم رسول اللہ ﷺ ﴾ رسول اللہ ﷺ نے لوگوں کو ڈانٹ ڈپٹ کرنے اور پیشاب رکوانے کی کوشش سے منع فرمایا کیونکہ پیشاب منقطع کرنا مرد کی شرم گاہ کیلئے ضرر رساں ہے اور بسا اوقات ایسا کرنے کی وجہ سے گردہ اور مثانہ کا خبیث مرض لاحق ہو جاتا ہے اور اس لئے بھی آپؐ نے لوگوں کو منع فرمایا کہ پیشاب کا منقطع کرنا بدن' لباس اور مسجد کے دوسرے حصے جہاں پیشاب نہیں کیا کے نجس اور گندہ کرنے کا موجب بن جائے گا۔ ظاہر ہے کہ اگر وہ ادھورا پیشاب لے کر بھاگ کھڑا ہوتا تو اس کے اپنے کپڑے اور بدن کے علاوہ مسجد کے دوسرے حصوں میں پیشاب کے چھینٹوں کا گرنا ممکن تھا جس سے گندگی زیادہ پھیلتی۔ ﴿ بذنوب ﴾ ذال کے زبر کے ساتھ۔ پانی سے لبالب بھرے ہوئے ڈول کو کہتے ہیں۔ ﴿ فاھریق ﴾ دراصل اریق تھا "ھا" کو ھمزہ سے بدل کر اس پر مزید ایک ھمزہ کا اضافہ کر دیا گیا۔ جس کے معنی ہیں انڈیل دیا گیا۔

حاصل کلام: ترمذی نے بھی حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے یہ روایت اسی طرح بیان کی ہے اور اسے حسن صحیح قرار دیا ہے۔ اس حدیث سے یہ بات واضح ہوئی کہ آدمی کا پیشاب ناپاک ہے۔ امت مسلمہ کا اس پر اجماع ہے نیز یہ بھی مسئلہ ثابت ہوا کہ زمین اگر ناپاک ہو تو پانی سے پاک ہو جاتی ہے۔ خواہ زمین نرم و سہل ہو یا سخت و صعب۔ مزید برآں اس حدیث سے مسجد کی عظمت اور اس کا احترام' نادان آدمی کے ساتھ نرمی کرنا سختی اور درشتی نہ کرنا' حضور ﷺ کا حسن خلق اور نہایت عمدہ طریقہ سے تعلیم دین دینا وغیرہ باتیں نمایاں ہیں۔

راوی حدیث: ﴿ حضرت انس رضی اللہ عنہ ﴾: حضور ﷺ کے خادم خاص ہیں ان کی والدہ ام سلیم نے آپؐ کی خدمت کیلئے خدمت گار کے طور پر پیش کر کے سعادت حاصل کی۔ مدنی زندگی میں آخری سانس تک خدمت کرتے رہے۔ ابو حمزہ ان کی کنیت تھی۔ خزرج کے قبیلہ نجار سے ہونے کی وجہ سے نجاری خزرجی کہلائے۔ وہ ۹۱ھ کو فوت ہوئے اور بصرہ میں ہی دفن ہوئے۔

(١١) وعن ابن عمر رضي الله تعالى عنهما قال: قال رسول الله ﷺ: «أُحِلَّتْ لَنَا مَيْتَتَانِ وَدَمَانِ، فَأَمَّا الْمَيْتَتَانِ فَالْجَرَادُ وَالْحُوتُ، وَأَمَّا الدَّمَانِ فَالْكَبِدُ وَالطِّحَالُ».

أَخْرَجَهُ أَحْمَدُ وَابْنُ مَاجَهْ، وَفِيهِ ضَعْفٌ.

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "دو مری ہوئی چیزیں اور دو خون ہمارے لئے حلال کئے گئے ہیں۔ دو مری ہوئی چیزیں (جنہیں ذبح نہ کیا گیا) ایک ٹڈی اور دوسری مچھلی۔ باقی رہے دو خون تو اس سے مراد ایک جگر اور دوسری تلی ہے۔" (احمد اور ابن ماجہ نے اسے روایت کیا ہے اور اس میں کمزوری ہے)

حاصل کلام: مصنف نے اس روایت کو اس باب میں اس لئے ذکر کیا ہے کہ اس پر تنبیہہ ہو جائے کہ مچھلی اور ٹڈی جب پانی میں مر جائیں خواہ پانی کی مقدار کم ہو یا زیادہ' وہ پانی نجس و ناپاک نہیں ہوتا۔ اس روایت کی سند عبدالرحمٰن بن زید بن اسلم وہ اپنے باپ سے اور وہ آگے عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کے سلسلہ سے مروی ہے۔ امام احمد رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ عبدالرحمٰن سے مروی حدیث منکر ہے اور صحیح یہ ہے کہ یہ موقوف ہے۔ جیسا کہ امام ابو زرعہؒ اور ابوحاتم نے کہا ہے۔ بیہقی نے کہا کہ اس حدیث کو زید بن اسلم کی اولاد یعنی عبداللہ اور عبدالرحمٰن اور اسامہ نے مرفوع بیان کیا ہے اور ابن معین نے ان (یعنی زید بن اسلم کی اولاد) کو ضعیف قرار دیا ہے البتہ احمد بن حنبل ان میں سے عبداللہ کو ثقہ کہتے ہیں۔ گو اس حدیث کا سنداً موقوف ہونا صحیح ہے' مگر یہ مرفوع ہے کیونکہ صحابی کا "احلت لنا" کہنا حکماً مرفوع تسلیم کیا گیا ہے یا "حرم علینا" کہنا اسی طرح حکماً مرفوع ہے جیسے "امرنا" یا "نھینا"۔

یہ حدیث دلیل ہے اس کی کہ ٹڈی بہرصورت حلال ہے۔ خواہ اپنی طبعی موت مرے یا کسی دوسرے سبب سے۔ امام مالک رحمہ اللہ کا فتویٰ ہے کہ اگر ٹڈی آدمی کے پکڑے یا سر کے کٹنے سے مرے تو حلال ہے بصورت دیگر حرام ہے۔ حدیث بالا امام صاحب کے فتویٰ کے خلاف ہونے کی بنا پر اس کی تردید کرتی ہے۔ یہی حال مچھلی کا ہے خواہ پکڑنے کے بعد مری ہو خواہ دریائی لہروں نے باہر پھینک دی ہو اور وہ مر گئی ہو۔ دونوں صورتوں میں حلال ہے۔ احناف کے ہاں اگر مچھلی پکڑنے یا دریا کے باہر پھینک دینے اور دیگر کسی سبب سے مری ہو تو حلال ہے اور اگر وہ خود بخود مر جائے یا کسی حیوان کے مارنے سے مرے تو حلال نہیں حرام ہے۔ حدیث بالا احناف کے بھی خلاف ہے۔ احناف نے ابوداؤد کی جس روایت سے استنباط کیا ہے اسے محدثین نے ضعیف قرار دیا ہے۔ لہٰذا ٹڈی اور مچھلی کی حلت کو کسی شرط سے مشروط کرنا صحیح نہیں ہے۔ اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ مچھلی اور ٹڈی دل دونوں حلال ہیں چاہے خود مر جائیں یا کسی طریقہ سے مار دیا جائے دونوں مردار کے عمومی حکم سے خارج ہیں' ان کا ذبح کرنا مشروع نہیں ہے۔

(١٢) وعن أبي هريرة رضي الله تعالى عنه قال: قال رسول الله

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا "جب تمہارے کسی

ﷺ: «إِذَا وَقَعَ الذُّبَابُ فِي شَرَابِ أَحَدِكُمْ فَلْيَغْمِسْهُ، ثُمَّ لِيَنْزِعْهُ فَإِنَّ فِي أَحَدِ جَنَاحَيْهِ دَاءً، وَفِي الآخَرِ شِفَاءً». أَخْرَجَهُ الْبُخَارِيُّ وَأَبُو دَاوُدَ، وَزَادَ: «وَإِنَّهُ يَتَّقِي بِجَنَاحِهِ الَّذِي فِيهِ الدَّاءُ».

مشروب میں مکھی گر جائے تو اسے اس میں ڈبکی دے کر نکالنا چاہئے اس لئے کہ اس کے ایک پر میں مرض (کے جراثیم) ہوتے ہیں اور دوسرے میں شفا و علاج کے۔" (اس کو بخاری اور ابوداؤد نے روایت کیا ہے۔) ابوداؤد کی روایت میں اتنا مزید اضافہ ہے کہ مکھی مشروب میں اپنا وہ پر ڈبوتی ہے جس میں بیماری کے جراثیم ہوتے ہیں۔

لغوی تشریح ﴿ الذباب ﴾ پیش اور تخفیف کے ساتھ۔ سب کے جانی پہچانی۔ یعنی مکھی۔ ﴿ شراب ﴾ پینے کا ہر مشروب۔ ﴿ فليغمسه ﴾ "میم" کے زیر کے ساتھ۔ ﴿ غمس ﴾ سے۔ "غمس" کے معنی پانی یا مائع یعنی بہنے والی چیز میں غوطہ لگانا' ڈبکی مارنا۔ ﴿ لينزعه ﴾ نزع سے۔ باہر نکالنا' کھینچ کر نکالنا۔ دونوں صیغوں پر لام' لام امر ہے اور معنی ہوئے کہ غوطہ دینا اور نکالنا چاہئے۔ ﴿ والجناح ﴾ سے مراد پر' جس کے ذریعہ پرندہ پرواز کرتا ہے' اڑتا ہے۔ ﴿ داء ﴾ بیماری اور مرض اور ایک روایت میں "سما" بھی منقول ہے۔

حاصل کلام : ابوداؤد نے اتنا اضافہ نقل کیا ہے کہ مکھی اپنا وہ پر بچا کر رکھتی ہے جس میں بیماری اور مرض کے جراثیم ہوتے ہیں۔ یعنی مکھی جب مشروب میں پر ڈالتی ہے تو اپنا بیماری والا پر اس لئے ڈالتی ہے کہ اپنا آپ بیماری سے بچا لے۔ امام احمد رحمۃ اللہ علیہ اور ابن ماجہ رحمۃ اللہ علیہ کے ہاں یہ ہے کہ مکھی زہروالا پر آگے کرتی ہے اور جس میں شفاء ہوتی ہے اسے پیچھے رکھتی ہے۔ غوطہ دینا اور ڈبکی دے کر نکالنے میں مقصود بیماری کو توڑنا اور زہر کو شفا کے ذریعہ زائل کرنا ہے۔

حدیث مذکور اس بات کی واضح دلیل ہے کہ مکھی اگر کسی سیال چیز میں گر کر مرجائے تو وہ نجس نہیں ہو جاتی۔ اس سے یہ حکم بھی نکالا گیا ہے کہ جس میں بہنے والا خون ہی جسم میں موجود نہ ہو۔ مثلاً شہد کی مکھی' مکڑی' بھڑ وغیرہ اور انہیں سے ملتے جلتے دیگر پرند۔ تو ان کے کسی مشروب یا بہہ نکلنے والی چیز میں گر کر مرجانے سے وہ نجس اور ناپاک نہیں ہو جاتا' کیونکہ نجاست زدہ ہونے کا سبب تو بہہ جانے والا خون ہے جو اس کی موت کے وقت جسم سے بہہ کر نکل جاتا ہے اور مذکورہ حیوانات میں یہ سبب یعنی خون ہی موجود نہیں۔ اس لئے ان کے مائع قسم کی چیز میں گر کر مرجانے سے وہ نجس نہیں ہوتا۔

اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ دفع ضرر کیلئے مکھی کا مارنا جائز ہے ورنہ بغیر کسی ضرورت معقول کے کسی کو مارنا ناروا فعل ہے۔ یہ تو معلوم حقیقت ہے کہ اکثر اوقات مکھی گرم چیز میں گر کر مرہی جاتی ہے اور بعض اوقات ٹھنڈی چیز میں ڈبکی دینے سے بھی اس کی موت واقع ہو جاتی ہے۔ پینے کی کسی چیز میں مکھی کے گرنے سے وہ چیز ناپاک نہیں ہو جاتی بلکہ اس صورت میں اسے ڈبکی دے کر باہر پھینک دینا

چاہیے۔

(١٣) وعَنْ أَبِيْ واقِدٍ اللَّيثِيِّ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسولُ الله ﷺ: «مَا قُطِعَ مِنَ البَهِيمَةِ، وَهِيَ حَيَّةٌ، فَهُوَ مَيِّتٌ». أَخْرَجَهُ أَبُو دَاوُدَ وَالتِّرْمِذِيُّ، وَحَسَّنَهُ، وَاللَّفْظُ لَهُ.

حضرت ابو واقد لیثی رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "زندہ جانور میں سے جو کچھ کاٹ لیا جائے وہ مردار ہے۔" (اسے ابوداؤد اور ترمذی نے روایت کیا ہے اور یہ الفاظ ترمذی کے ہیں اور ترمذی نے اس حدیث کو حسن قرار دیا ہے)

لغوی تشریح: ﴿ما قطع﴾ یہاں "ما" موصولہ ہے اور "قطع" فعل مبنی مفعول کے لئے ہے۔ یعنی جو کچھ زندہ جانور کے جسم سے کاٹ لیا گیا۔ ﴿البھیمۃ﴾ ہر چار پاؤں پر چلنے والا جانور مگر چیر پھاڑ کرنے والا نہ ہو۔ ﴿وھی حیۃ﴾ اس میں "واؤ" حالیہ ہے یعنی اس حال میں کہ اسے ذبح نہ کیا گیا بلکہ زندہ ہو۔ ﴿فھو﴾ سے مراد زندہ جانور سے جو کچھ کاٹ کر الگ کر لیا گیا وہ مردہ ہے' اس کا کھانا حرام اور نجس ہو جاتا ہے۔ پانی وغیرہ کو نجس کر دینے والے باقی نجاسات کے حکم میں یہ بھی شامل ہے۔

حاصل کلام: اہل جاہلیت زندہ جانوروں سے کچھ گوشت کاٹ کر کھایا کرتے تھے۔ اس حدیث میں ان کے اس فعل شنیع کا رد ہے اور یہ کہ ایسا کاٹا ہوا گوشت مردار اور پلید ہے۔ لہٰذا اس کا کھانا حرام ہے۔

راوی حدیث: ﴿ابوواقد لیثی﴾ ابو واقد کنیت ہے اصل نام حارث بن عوف ہے۔ بنی عامر بن لیث کی طرف منسوب ہیں اس لئے لیثی کہلائے۔ قدیم الاسلام ہیں۔ ان کا شمار اہل مدینہ میں ہوتا ہے۔ ایک قول کے مطابق یہ بدر کے غزوہ میں شریک تھے۔ بعد میں مکہ کی رہائش اختیار کر لی۔ ۶۵ھ / ۶۸ھ میں وفات پائی۔ جبکہ ان کی عمر ۷۵ برس تھی۔ فنج میں مدفون ہوئے۔

٢ - بَابُ الآنِيَةِ — برتنوں کا بیان

(١٤) عَنْ حُذَيْفَةَ بْنِ اليَمَانِ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا قَالَ: قَالَ رَسولُ الله ﷺ: «لاَ تَشْرَبُوا فِي آنِيَةِ الذَّهَبِ وَالفِضَّةِ وَلاَ تَأْكُلُوا فِي صِحَافِهَا، فَإِنَّهَا لَهُمْ فِي الدُّنْيَا وَلَكُمْ فِي الآخِرَةِ». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت حذیفہ بن یمان رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا "سونے اور چاندی کے برتنوں میں نہ پیا کرو اور ان کے پیالوں میں کھایا بھی نہ کرو۔ دنیا میں یہ کافروں کیلئے ہیں اور آخرت میں فقط تمہارے لئے۔" (بخاری و مسلم)

لغوی تشریح: ﴿باب الانیۃ﴾ آنیۃ' اناء کی جمع ہے جس کے معنی برتن کے ہیں۔ "ابواب الطہارت" کے درمیان میں برتنوں کے احکام بیان کرنے سے یہ بتانا مقصود ہے کہ شریعت اسلامیہ میں بعض برتن ایسے ہیں جنہیں استعمال کرنا جائز ہے اور کچھ ایسے ہیں جن کا استعمال ممنوع ہے۔ اس طرح ایک پاکباز

انسان کو جائز اور ممنوع برتنوں میں امتیاز حاصل ہو جاتا ہے۔ ﴿ صحافها ﴾ صحاف صحفة کی جمع ہے جس کے معنی پیالہ کے ہیں۔ ﴿ لهم ﴾ سے مشرکین مراد ہیں۔ ﴿ في الدنيا ﴾ یعنی دنیا میں یہ برتن ان کیلئے ہیں' کا یہ مطلب نہیں کہ سونے اور چاندی کے برتن مشرکین کیلئے حلال ہیں بلکہ اس کا مفہوم و معنی یہ ہے کہ جس پر یہ مشرکین عملاً کاربند ہیں۔ یعنی دنیا میں یہ برتن مشرکین کے استعمال میں ہیں۔

حاصل کلام : اس حدیث سے یہ معلوم ہوا کہ سونے چاندی کے برتنوں میں کھانا' پینا حرام ہے اور ان برتنوں کے پانی سے وضو اور غسل کرنا عموم کے اعتبار سے حرام ہے کہ ان کا استعمال درست نہیں' ورنہ اس حدیث کا اصل مقام کھانے پینے کا باب تھا۔ ضمناً یہ بھی معلوم ہوا کہ جواہرات و یاقوت وغیرہ کے برتنوں میں کھانا اور پینا اور وضو و غسل کرنا جائز ہے۔ البتہ جن برتنوں پر سونے چاندی کا پانی ملمع کیا گیا ہو ان کے بارے میں اختلاف ہے۔ اجتناب کرنا بہرحال بہتر اور اولیٰ ہے۔

سونے چاندی کے برتنوں میں کھانا پینا یا ان برتنوں کے پانی سے وضو و غسل کرنا سب حرام ہے۔

راوی حدیث : ﴿ حضرت حذیفه رضی اللہ عنہ ﴾ : حذیفہ تصغیر ہے۔ ان کی کنیت ابوعبداللہ ہے۔ مشہور صحابی ہیں اور صحابی باپ یمان رضی اللہ عنہ کے بیٹے ہیں اور راز دان رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کے لقب سے مشہور و معروف ہیں۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ (ذوالنورین) کی شہادت کے چالیس روز بعد ۳۶ یا ۳۵ھ میں مدائن میں فوت ہوئے۔

(۱۵) وعن أُمِّ سَلَمَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعالَى عَنها قالت: قَالَ رسولُ الله ﷺ: «الَّذِي يَشْرَبُ فِي إِنَآءِ الفِضَّةِ إِنَّمَا يُجَرْجِرُ فِي بَطْنِهِ نَارَ جَهَنَّمَ». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.	حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا روایت کرتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ "جو شخص چاندی کے برتنوں میں (کھاتا) پیتا ہے تو وہ اپنے پیٹ میں جہنم کی آگ انڈیلتا ہے۔" (بخاری و مسلم)

لغوی تشریح : ﴿ يجرجر ﴾ "جرجرة" سے ماخوذ ہے۔ پیٹ میں داخل ہوتے وقت گلے میں پانی سے جو آواز پیدا ہوتی ہے اسے "جرجرة" کہتے ہیں۔

حاصل کلام : اس حدیث میں بھی سونے چاندی کے برتنوں میں خورد و نوش کی ممانعت ہے اور اس ممانعت پر عمل پیرا نہ ہونے والوں کیلئے جہنم کی آگ کی وعید ہے کہ ایسے لوگ نار جہنم کا ایندھن ہوں گے۔

راوی حدیث : ﴿ ام سلمة رضی اللہ عنہا ﴾ ان کا نام ھند بنت ابی امیہ۔ ابوسلمہ عبداللہ بن عبدالاسواد المخزومی کی زوجیت میں تھیں۔ حبشہ کی جانب پہلی ہجرت میں ان کے ساتھ تھیں۔ غزوۂ احد میں ابوسلمہ کو جو زخم لگا تھا اس کی وجہ سے یہ وفات پا گئے۔ ان کی وفات کے بعد شوال ۴ھ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو اپنے حرم میں داخل فرما لیا۔ ۵۹ھ میں یا ۶۲ھ میں وفات پائی۔ اس وقت ان کی عمر ۸۴ برس کی تھی۔ بقیع قبرستان میں

دفن ہوئیں۔

(۱٦) وعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُمَا قَالَ: قَالَ رسولُ الله ﷺ: «إِذَا دُبِغَ الإِهَابُ فَقَدْ طَهُرَ». أَخْرَجَهُ مُسْلِمٌ، وَعِنْدَ الأَرْبَعَةِ «أَيُّما إِهابٍ دُبِغَ».

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے کہ "جب کچے چمڑے کو (مسالہ لگا کر) رنگ دیا جائے تو وہ پاک ہو جاتا ہے۔" (مسلم) اور سنن اربعہ میں یہ الفاظ منقول ہیں کہ "جونسا چمڑہ بھی رنگا جائے۔"

لغوی تشریح: ﴿ دبغ ﴾ دباغ سے ماخوذ ہے۔ یہاں مفعول واقع ہو رہا ہے۔ معنی اس کا یہ ہے کہ چمڑے کی رطوبت اور دیگر فضلات (گندگیوں) کو خشک کرنا اور جو چیز اس کی بدبو اور خرابی کی موجب ہو اسے زائل کرنا۔ ﴿ الاھاب ﴾ بروزن کتاب۔ مطلق چمڑے کیلئے استعمال ہوتا ہے یا پھر اس چمڑے کو بھی کہتے ہیں جسے ہنوز رنگا نہ گیا ہو۔ ﴿ ایما اھاب دبغ ﴾ کا مطلب یہ ہے کہ اس میں تمام چمڑے شامل ہیں۔ "ایما" عمومیت کا مفہوم ادا کرتا ہے۔

حاصل کلام: پس حدیث اپنے عموم پر رہتے ہوئے یہ مطلب دے رہی ہے کہ ہر قسم اور ہر نوع کے حیوانات کے چمڑے اس میں شامل ہیں اور خنزیر یعنی سور کا چمڑہ بالاتفاق اس سے مستثنیٰ ہے اور اکثریت کے نزدیک کتے کا چمڑا بھی اس زمرے میں شامل ہے اور محققین علماء کے نزدیک ان تمام جانوروں کا چمڑا بھی اس میں شامل ہے جن کا گوشت کھایا نہیں جاتا۔ حدیث مذکور سے معلوم ہوا کہ دباغت (رنگائی) کے بعد ہر قسم کا چمڑہ پاک ہو جاتا ہے' وہ چمڑہ خواہ حلال جانور کا ہو یا حرام کا ہو' جانور خواہ شرعی طریقہ سے ذبح کیا گیا ہو یا خود اپنی طبعی موت مرا ہو۔ اس اصول عمومی کے باوجود بعض جانور ایسے ہیں جن کے چمڑے کو دباغت کے باوجود پاک قرار نہیں دیا گیا' مثلاً خنزیر کا چمڑہ ہے اسے نجس عین ہونے کی بنا پر پاک قرار نہیں دیا گیا اور انسان کا چمڑہ ہے اسے بھی بوجہ اس کی کرامت و بزرگی اور شرف کے حرام ٹھہرایا گیا ہے' تاکہ بے قدری سے اسے محفوظ رکھا جائے۔ بعض لوگوں کی رائے ہے کہ خنزیر اور کتے پر اگر تکبیر پڑھ کر انہیں ذبح کیا جائے تو اس صورت میں وہ بھی پاک ہو جاتا ہے۔ یہ صحیح رائے نہیں ہے اسی طرح احناف کا کتے کے چمڑے کو دباغت کے بعد حلال قرار دینا بھی صائب و صحیح رائے پر مبنی نہیں ہے۔ یہ ذہن نشین رہے کہ جن جانوروں کے چمڑے دباغت کے بعد پاک ہو جاتے ہیں ان کے سینگ' بال' دانت اور ہڈیاں وغیرہ کام میں لائی جا سکتی ہیں نیز ان کی تجارت بھی کی جا سکتی ہے۔

(۱۷) وعن سَلَمَةَ بْنِ المُحبّقِ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قال رسولُ الله ﷺ: «دِبَاغُ جُلُودِ المَيْتَةِ طُهُورُهَا». صَحَّحَهُ ابْنُ حِبَّانَ.

حضرت سلمہ بن محبق رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "مردہ جانوروں کے چمڑوں کو رنگنا ہی ان کی طہارت و پاکیزگی ہے۔" (ابن حبان نے اسے صحیح قرار دیا ہے۔)

راوی حدیث: ﴿ سلمۃ ﴾ "سین" "لام" اور "میم" کے زبر کے ساتھ۔ ﴿ المحبق ﴾ "میم" کی پیش، حاء کی زبر، "باء" کی تشدید اور زیر کے ساتھ، مگر محدثین "با" پر فتح کے قائل ہیں اور یہی زیادہ مشہور ہے۔ ابو سفیان ان کی کنیت ہے۔ بصری صحابہ میں ان کو شمار کیا جاتا ہے۔ هذیل بن مدرکہ بن الیاس کی طرف منسوب ہونے کی وجہ سے هذلی کہلاتے ہیں۔ وہ حنین میں تھے جب انہیں ان کے بیٹے "سنان" کی پیدائش کی خوشخبری دی گئی تو انہوں نے فرمایا۔ جو تیر میں رسول اللہ ﷺ کی مدافعت میں چلاتا تھا اس کی خوشی مجھے میرے بیٹے کی بشارت سے زیادہ ہے۔

(١٨) وعَنْ مَيْمُونَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهَا قَالَتْ: مَرَّ النَّبِيُّ ﷺ بِشَاةٍ يَجُرُّونَها، فَقَالَ: «**لَوْ أَخَذْتُمْ إِهَابَها**» فقَالُوا: إِنَّهَا مَيْتَةٌ، فَقَالَ: «**يُطَهِّرُهَا المَاءُ وَالقَرَظُ**». أَخْرَجَه أَبُو دَاوُدَ وَالنَّسَائِيِّ.

حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا **روایت کرتی** ہیں کہ رسول اللہ ﷺ **کا گزر ایک مردہ بکری کے پاس سے ہوا جسے لوگ گھسیٹتے ہوئے لئے جا رہے تھے۔ آپؐ نے ان سے فرمایا کہ "کاش تم نے اس کی کھال ہی اتار لی ہوتی۔" اس پر وہ بولے، (حضور ﷺ) وہ تو مری ہوئی ہے۔ آپؐ نے (یہ سنکر کر فرمایا پھر کیا ہوا؟) "اس کو پانی اور کیکر کی چھال پاک کر دیتی ہے۔"** (ابوداؤد۔ نسائی)

لغوی تشریح: ﴿ القرظ ﴾ "قاف" اور "راء" کے زبر کے ساتھ۔ کیکر کے پتے، چھال۔ عرب میں اس کے ساتھ چمڑے کی دباغت مشہور و معروف تھی۔

حاصل کلام: یہ اور پہلی دونوں احادیث اس پر دلالت کرتی ہیں کہ مردار کے چمڑے دباغت سے پاک ہو جاتے ہیں تو پھر ان کے برتنوں سے وضو وغیرہ بھی جائز ہے۔

معلوم ہوا کہ مردار چوپائیوں کی کھال دباغت سے پاک ہو جاتی ہے لہٰذا ایسی کھال سے ڈول وغیرہ بنانا جائز ہے۔

(١٩) وعَنْ أَبِي ثَعْلَبَةَ الخُشَنِيِّ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قُلْتُ: يَا رَسُولَ اللهِ إِنَّا بِأَرْضِ قَومٍ أَهْلِ كِتَابٍ، أَفَنَأْكُلُ فِي آنِيَتِهِمْ؟ قَالَ: «**لاَ تَأْكُلُوا فِيهَا إِلاَّ أَنْ لاَ تَجِدُوا غَيْرَهَا، فَاغْسِلُوهَا، وَكُلُوا فِيهَا**». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت ابو ثعلبہ خشنی رضی اللہ عنہ **روایت کرتے** ہیں کہ میں نے عرض کیا اے اللہ کے رسول (ﷺ)! ہم اہل کتاب کے علاقے میں رہتے ہیں کیا ہم ان کے استعمال کے برتنوں میں کھا سکتے ہیں؟ جواب میں آپؐ نے فرمایا "ان کے برتنوں میں نہ کھاؤ، البتہ اگر ان کے ماسوا اور برتن میسر نہ ہو سکیں تو پھر ان کو دھو کر ان میں کھا سکتے ہو۔" (بخاری و مسلم)

لغوی تشریح: ﴿ انا ﴾ ہمزہ کے کسرہ "نون" کی تشدید کے ساتھ، ضمیر متکلم کے ساتھ حرف تاکید ہے، ﴿ اھل الکتاب ﴾ کتاب والے، مراد یہود و نصاریٰ ہیں اور یہ لفظ ان کیلئے بطور صفت استعمال ہوا ہے۔ ﴿ افنا کل فی انیتھم ﴾ ایک تردد اور تذبذب پیدا ہوتا تھا کہ یہود و نصاریٰ اکثر اوقات اپنے برتنوں میں سور کا گوشت پکاتے ہیں اور ان میں شراب پیتے ہیں۔ ابوداؤد اور مسند احمد کی روایت میں یہ صراحت و وضاحت موجود ہے کہ ہم اہل کتاب کے ساتھ رہتے ہیں۔ دیکھتے ہیں کہ وہ اپنی ہانڈیوں میں خنزیر کا گوشت پکا رہے ہوتے ہیں اور اپنے پینے کے برتنوں میں شراب نوشی کر رہے ہوتے ہیں تو آپؐ نے ارشاد فرمایا "پھر ان کے برتنوں میں مت کھاؤ، پیو۔" آپؐ کا جواب اس پر دلالت کرتا ہے کہ ان کے برتنوں میں خورد و نوش سے احتراز کرنا چاہئے تاوقتیکہ ان کے استعمال کرنے میں اضطراری حالت پیش نہ آجائے۔ پھر جب مجبوری لاحق ہو جائے اور کوئی چارۂ کار باقی نہ رہے تو پھر بھی ان کے پاک کرنے پر اعتماد نہ کیا جائے بلکہ خود ان کو پاک کیا جائے۔ اس حدیث میں نہی حرمت کیلئے نہیں ہے بلکہ طبعی منافرت کیلئے کہ ذوق سلیم ان برتنوں میں کھانے سے انکار کرتا ہے اور اس سے بھی نفرت کرتا ہے کہ جن برتنوں میں ایسی گندگی اور نجس چیزیں پکائی جائیں ان میں پکی ہوئی چیز استعمال کی جائے۔

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ اہل کتاب یعنی یہود و نصاریٰ کے زیر استعمال برتنوں میں کھانا، ان میں پینا اور ان برتنوں کے پانی سے وضو کرنا وغیرہ جائز نہیں۔ اس کی علت اور وجہ واضح ہے کہ یہ لوگ ناپاک اور نجس چیزیں ان میں پکاتے ہیں۔ جب اہل کتاب کے برتنوں میں کھانا پینا وغیرہ جائز نہیں تو ہنود، دہریوں اور ملحدوں کے ان برتنوں میں بھی کھانے پینے سے اجتناب کرنا چاہئے جن میں ناپاک و نجس چیزیں پکائی اور کھائی جاتی ہوں۔

راوی حدیث: ﴿ ابوثعلبۃ الخشنی ﴾ "خاء" کے پیش اور "شین" کی زیر کے ساتھ، خشین بن نمر جس کا تعلق قبیلہ قضاعہ سے تھا، کی جانب منسوب ہونے کی وجہ سے خشنی کہلائے۔ بیعت رضوان کرنے والوں میں سے تھے۔ اپنی قوم کی طرف بھیجا گیا تو وہ سب اسلام لے آئے۔ شام میں قیام پذیر ہوئے اور وہیں ۷۵ھ میں وفات پائی۔ نماز پڑھ رہے تھے کہ سجدہ کی حالت میں روح پرواز کر گئی۔ ان کے اور ان کے والد کے نام میں شدید اختلاف ہے۔ کنیت ہی سے زیادہ مشہور ہیں۔

(۲۰) وَعَنْ عِمْرَانَ بْنِ حُصَيْنٍ رَضِيَ اللهُ تعالى عنهما: أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ وأَصْحابَه تَوَضَّؤُوا مِن مَزادَةِ امْرَأَةٍ مُشْرِكَةٍ. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ فِي حَدِيْثٍ طَوِيْلٍ.	حضرت عمران بن حصین رضی اللہ عنہما روایت کرتے ہیں کہ نبی ﷺ اور آپؐ کے صحابہ رضی اللہ عنہم نے ایک مشرکہ عورت کے مشکیزہ سے پانی لے کر اس سے وضو کیا۔ (بخاری و مسلم۔ یہ ایک طویل حدیث کا ٹکڑا ہے)

لغوی تشریح: ﴿ مزادۃ ﴾ میم کے زبر اور زائے معجمہ کے ساتھ۔ مشکیزہ کے معنی میں آیا ہے۔ جس کی

ساخت چمڑے سے ہوتی ہے۔

حاصل کلام: اس حدیث سے اہل کتاب کے علاوہ مشرکین کے بھی زیر استعمال برتنوں کے پاک ہونے کی جانب راہنمائی ملتی ہے اور یہ اس پر بھی دلالت کرتی ہے کہ مردہ جانور کی کھال دباغت کے بعد پاک ہو جاتی ہے کیونکہ جس مشکیزہ سے آپؐ نے پانی لیا وہ ایک مشرکہ عورت کے قبضہ میں تھا اور مشرکین کے ذبح کردہ جانور کی کھال سے تیار کیا گیا تھا اور ان کے ذبائح تو مردار ہی ہوتے ہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ مشرکین کے ایسے برتن جن میں نجاست وغیرہ کا اندیشہ نہ ہو ان کا استعمال بغیر کسی تردد و تذبذب کے جائز و درست ہے اور اس حدیث سے دباغت شدہ کھال کے پاک ہونے کا ثبوت بھی ملتا ہے۔

راوی حدیث: ﴿ عمران بن حصين رضی اللہ عنہ ﴾ خزاعی کعبی تھے۔ ان کا شمار اکابر صحابہ رضی اللہ عنہم میں ہوتا تھا۔ ان کی کنیت ابونجید تھی۔ غزوۂ خیبر کے زمانہ میں دائرہ اسلام میں داخل ہوئے۔ بصرہ میں سکونت پذیر ہوئے اور وہیں ۵۲ھ یا ۵۳ھ میں وفات پائی۔

(۲۱) وعن أَنَسِ بْنِ مَالِكٍ رَضِيَ الله تعالى عنه: أَنَّ قَدَحَ النَّبِيِّ ﷺ انْكَسَرَ فَاتَّخَذَ مَكَانَ الشَّعْبِ سِلْسِلَةً مِنْ فِضَّةٍ. أَخْرَجَهُ البُخَارِيُّ.

حضرت انس رضی اللہ عنہ **بن مالک سے روایت ہے کہ نبی کریم** ﷺ **کا ذاتی پیالہ ٹوٹ گیا تو آپؐ نے اس ٹوٹی جگہ پر چاندی کا تار لگوا دیا۔** (بخاری)

لغوی تشریح: ﴿ القدح ﴾ "قاف" اور "دال" دونوں پر زبر۔ چھوٹا "پیالہ"۔ ﴿ الشعب ﴾ "شین" کے زبر اور "عین" کے سکون کے ساتھ۔ ٹوٹی ہوئی جگہ۔ ﴿ سلسلة ﴾ دونوں جگہ سین پر زبر۔ ایک چیز کو دوسری کے ساتھ ملانا' جوڑنا اور دونوں جگہ سین کے زیر کے ساتھ بھی ہے تو اس صورت میں لڑی' زنجیر وغیرہ کے معنی ہوں گے۔ وہ لوہے کی زنجیر دھاگے کی طرح باریک ہوگی۔ معنی یہ ہوا کہ دونوں جانب شکستہ مقام کو چاندی کے تار سے ملا دیا۔

حاصل کلام: یہ حدیث اس کی دلیل ہے کہ ایسی ضروریات و اغراض کیلئے تھوڑی سی چاندی استعمال کرنا جائز ہے۔ گویا کھانے پینے کے برتنوں میں ضرورتاً اتنی کم مقدار میں سونا اور چاندی اگر لگا ہو تو ایسے برتنوں میں کھانا پینا جائز ہے اور ان سے وضو' غسل وغیرہ کرنا بھی بلا کراہت درست اور جائز ہے۔ سونے' چاندی سے بنے ہوئے برتنوں کے استعمال میں تکبر اور تعلی کا عمل دخل ہوتا ہے۔ کبر و نخوت اور تعلی خالق کائنات کو پسند نہیں۔ اس لئے ان کا استعمال ناجائز قرار دیا گیا اور شکستہ کو تار کے ذریعہ پیوستہ کر کے استعمال کرنے میں ضرورت ہوتی ہے۔ اس میں کبر و غرور اور تعلی کا کوئی عمل دخل نہیں۔ اس بنا پر استعمال کی اجازت دی گئی ہے۔

۳ - بَابُ إِزَالَةِ النَّجَاسَةِ وَبَيَانِهَا — نجاست کی تفصیل اور اسے

دور کرنے کا بیان

(۲۲) عَنْ أَنَسِ بْنِ مَالِكٍ رضي الله عنه قَالَ: سُئِلَ رَسُولُ اللهِ ﷺ عَنِ الخَمْرِ تُتَّخَذُ خَلاًّ؟ قال: «لاَ». أَخرَجَهُ مُسْلِمٌ وَالتِّرْمِذِيُّ، وَقَالَ حَدِيثٌ حَسَنٌ صَحِيحٌ.

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ سے شراب سے سرکہ بنانے کے بارے میں دریافت کیا گیا تو آپؐ نے ایسا کرنے سے منع فرمایا۔ (مسلم و ترمذی۔ اور ترمذی نے اسے حسن اور صحیح قرار دیا ہے)

لغوی تشریح: ﴿ عن الخمر ﴾ یعنی حرمت شراب کے بعد۔ شراب سے سرکہ بنانے کے بارے میں دریافت کیا گیا۔ ﴿ خل ﴾ "خاء" کے فتح اور لام کی تشدید' شراب یا انگور وغیرہ کے شیرہ سے تیار کردہ سرکہ' یعنی کیا شراب کی صورت تبدیل کر کے سرکہ بنا لینا جائز ہے یا نہیں؟ ﴿ فقال : لا ﴾ اس کے جواب میں فرمایا ایسا کرنا جائز نہیں۔ اس میں نہی تحریم کیلئے ہے۔

حاصل کلام: اس میں یہ دلیل پائی جاتی ہے کہ شراب کا سرکہ بنانا حرام ہے۔ البتہ اس میں فقہاء کی آراء مختلف ہیں کہ شراب جب سرکہ بن جاتا ہے تو اس کے جواز اور حرمت کے بارے میں کیا رائے ہے۔ صحیح یہ ہے کہ ایسی صورت میں اس کی حرمت پر کوئی واضح دلیل نہیں اور یہ حقیقت معلوم ہے کہ ایک چیز کی حالت کے بدلنے سے اس کا حکم بھی تبدیل ہو جاتا ہے لیکن شراب کا سرکہ بنانا ممنوع ہے۔

اس حدیث کا پس منظر کچھ اس طرح ہے کہ حضرت ابوطلحہ رضی اللہ عنہ کے پاس یتیموں کی شراب تھی۔ حرمت شراب کے حکم آنے کے بعد انہیں اندیشہ لاحق ہوا کہ یتیموں کا بڑا نقصان ہو گا۔ اس نقصان سے بچنے کیلئے انہوں نے رسول اللہ ﷺ سے شراب کو سرکہ میں تبدیل کرنے کی اجازت طلب کی۔ جس کے جواب میں آپؐ نے ایسا کرنے سے صاف طور پر منع فرما دیا۔ اس کھلی اور واضح ممانعت کے باوجود جس کسی نے شراب سے سرکہ بنانے کے جواز کا فتویٰ دیا اس نے نص صریح کی خلاف ورزی کی۔ اس حدیث (اور دیگر ادلہ شرعیہ) سے معلوم ہوا کہ شراب کا ہر قسم کا استعمال ناجائز ہے اور اس سے سرکہ بنانا بھی ممنوع ہے۔

(۲۳) وعَنْهُ قَالَ: لَمَّا كَانَ يَومُ خَيْبَرَ أَمَرَ رَسُولُ اللهِ ﷺ أَبَا طَلْحَةَ فَنَادَى: أَنَّ اللَّهَ وَرَسُولَهُ يَنْهَيَانِكُمْ عَنْ لُحومِ الحُمُرِ الأَهْلِيَّةِ، فإِنَّها رِجْسٌ. مُتَّفَقٌ عَلَيْه.

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ ہی سے روایت ہے کہ جس روز غزوۂ خیبر تھا رسول اللہ ﷺ نے ابوطلحہ رضی اللہ عنہ کو حکم دیا (کہ لوگوں کو مطلع کر دیں) انہوں نے بآواز بلند اعلان کیا کہ اللہ اور اس کا رسول ﷺ دونوں تمہیں گھریلو گدھوں کے گوشت کو کھانے سے منع فرماتے ہیں' کیونکہ وہ رجس (ناپاک) ہے۔ (بخاری

و مسلم)

لغوی تشریح: ﴿ یوم خیبر ﴾ سے غزوۂ خیبر کے روز مراد ہے ۔ خیبر مدینہ کے شمالی جانب ۹۶ میل کے فاصلہ پر ایک شہر ہے۔ یہاں یہود رہتے تھے۔ صلح حدیبیہ کے بعد محرم ۷ھ میں یہ غزوۂ یہود کے ساتھ واقع ہوا۔ فتح خیبر کے بعد نبی ﷺ نے ان کو اسی جگہ پر اس شرط کے ساتھ رہنے کا حق دیا کہ وہ اپنے کھیتوں کے اناج اور باغات کے پھلوں کا آدھا حصہ مسلمانوں کو دیں گے۔ پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے دور خلافت میں ان کو تیماء اور اریحا کی طرف جلا وطن کر دیا۔ ﴿ ینھیانکم ﴾ میں تثنیہ کی ضمیر اللہ اور اس کے رسول کی طرف راجع ہے۔ یعنی تمہیں اللہ اور اس کا رسول منع فرماتے ہیں۔ ﴿ الحمر ﴾ "حاء" اور "میم" کے پیش کے ساتھ۔ اس کا واحد حمار ہے۔ اردو میں جسے گدھا کہتے ہیں۔ ﴿ الاھلیۃ ﴾ گھریلو (جنگلی نہیں) اھلیۃ کی نسبت اھل کی طرف ہے یعنی وہ جسے انسان اپنے گھر میں اہل و عیال کے ہاں پرورش کرتا اور پالتا ہے۔ ﴿ رجس ﴾ راء کے زیر سے۔ ہر وہ چیز جسے ایک انسان گندگی تصور کرتا ہے خواہ وہ نجس ہو یا نہ ہو۔ لہٰذا اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ گدھے کا جوٹھا نجس اور ناپاک ہے۔

حاصل کلام: گدھے کا گوشت بالاتفاق حرام ہے۔ صرف ابن عباس رضی اللہ عنہ اسے جائز سمجھتے ہیں۔ گدھے کا جوٹھا ائمہ اربعہ کے نزدیک پاک ہے۔ بعض فقہاء مثلاً امام حسن بصری رحمہ اللہ اور امام اوزاعی رحمہ اللہ وغیرہ اسے ناپاک کہتے ہیں۔ اس بارے میں ائمہ اربعہ کی رائے قابل ترجیح اور زیادہ قرین صواب ہے۔

راوی حدیث: ﴿ حضرت ابو طلحہ رضی اللہ عنہ ﴾ : ابوطلحہ کنیت۔ نام زید بن سہل بن الاسود بن حرام انصاری، کبار صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں سے تھے۔ بیعت عقبہ میں شریک تھے اور اس کے ساتھ تمام غزوات میں شریک رہے۔ غزوۂ احد میں حضور ﷺ کا دفاع کرتے ہوئے ہاتھ شل ہوگیا۔ معرکہ حنین میں بیس دشمنان اسلام کو قتل کیا۔ ۳۴ھ یا بقول بعض ۵۱ھ میں وفات پائی۔

(٢٤) وعن عَمْرِو بْنِ خَارِجَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: خَطَبَنَا رَسُولُ اللهِ ﷺ بِمِنًى وَهُوَ عَلَى رَاحِلَتِهِ، وَلُعَابُهَا يَسِيْلُ عَلَى كَتِفِي. أَخْرَجَهُ أَحْمَدُ وَالتِّرْمِذِيُّ وَصَحَّحَهُ.

حضرت عمرو بن خارجہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اپنی سواری پر مقام منیٰ میں ہمیں خطاب فرمایا اور اس اونٹنی کا لعاب دہن میرے کندھوں پر بہتا تھا۔ (احمد و ترمذی۔ اور ترمذی نے اس کو صحیح قرار دیا ہے)

لغوی تشریح: ﴿ بمنی ﴾ تنوین کے ساتھ مکہ مکرمہ کے ساتھ یہ وہ جگہ ہے جہاں حج کے مشہور ترین شعائر میں سے قربانی کے جانور ذبح کئے جاتے ہیں۔ ﴿ لعابھا ﴾ "لام" کے ضمہ کے ساتھ۔ منہ سے پانی کی صورت میں جو رال ٹپکتی اور گرتی ہے۔

حاصل کلام: یہ حدیث اس بات کی دلیل ہے کہ ان حیوانات کا لعاب دہن پاک ہے جن کا گوشت کھایا جاتا ہے۔

راوی حدیث: ﴿ عمرو بن خارجہ بن منتفق اسدی ﴾ : بقول بعض اشعری اور بقول شخصے انصاری اور کسی کے بقول جمحی قبیلے سے ہیں۔ ابوسفیان کے حلیف تھے۔ ان کے اسدی ہونے کے بارے میں زیادہ شہرت ہے۔ مشہور صحابی رضی اللہ عنہ ہیں۔ شام میں سکونت اختیار کی۔

(٢٥) وعَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهَا قَالَتْ: كَانَ رسولُ الله ﷺ يَغْسِلُ المَنِيَّ ثُمَّ يَخْرُجُ إِلَى الصَّلاَةِ في ذَلِكَ الثَّوبِ وَأَنَا أَنْظُرُ إِلَى أَثَرِ الغَسْلِ فِيْهِ. متفق عليه.

ولمسلم: «لَقَدْ كُنْتُ أَفْرُكُه مِنْ ثَوبِ رَسولِ اللهِ ﷺ فَرْكاً، فَيُصلِّي فِيْهِ. وَفِي لفظٍ لَهُ: «لَقَد كُنْتُ أَحُكُّهُ يَابِساً بِظُفرِي مِنْ ثَوْبِهِ».

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا روایت کرتی ہیں کہ نبی ﷺ (کپڑے پر لگی ہوئی) منی کو دھویا کرتے تھے۔ پھر اسی کپڑے کو زیب تن فرما کر نماز پڑھ لیتے تھے اور میں دھونے کے نشان اور اثر کو صاف طور پر (اپنی آنکھوں سے) دیکھتی تھی۔ (بخاری و مسلم)

اور مسلم کی روایت میں ہے کہ میں رسول اللہ ﷺ کے کپڑے سے منی کو کھرچ دیا کرتی تھی۔ پھر آپؐ اسی کپڑے میں نماز ادا فرما لیتے تھے۔

اور مسلم ہی کی ایک روایت میں اس طرح ہے کہ جب منی خشک ہو جاتی تو میں اپنے ناخن سے اسے کھرچ کر کپڑے سے اتار دیتی۔

لغوی تشریح: ﴿ افرکہ ﴾ اس میں ضمیر متصل "ہ" سے مراد منی ہے۔ راء کے کبھی پیش سے اور کبھی زیر کے ساتھ۔ باب نصر ینصر اور ضرب یضرب دونوں سے آتا ہے۔ ﴿ الفرک ﴾ کے معنی مل کر صاف کرنا کہ اس کا اثر زائل ہو جائے۔ ﴿ احکہ ﴾ میں بھی ضمیر متصل ہ سے مراد منی ہے۔ "حاء" کے پیش کے ساتھ "حک" سے ماخوذ ہے اور اس کے معنی بھی ملنا کے آتے ہیں۔ ﴿ یابسا ﴾ حال واقع ہوا ہے جس کے معنی خشک کے ہیں۔

حاصل کلام: اس بارے میں وارد تمام روایات اس پر دلالت کرتی ہیں کہ منی کو مطلقاً کپڑے سے دھونا واجب نہیں خواہ وہ خشک ہو یا تر' بلکہ اس کو زائل کرنے کیلئے جبکہ وہ خشک ہو اتنا کافی ہے کہ اسے صاف کر دے ہاتھ سے یا کپڑے کے ٹکڑے سے یا اذخر گھاس سے اور ان دونوں جیسی چیزوں مثلاً لکڑی یا سرکنڈے وغیرہ سے۔ ایک گروہ نے ان احادیث کی روشنی میں یہ استدلال کیا ہے کہ منی پاک ہے۔ مگر اس میں ایسی کوئی چیز نہیں جو اس پر دلالت کرتی ہو کہ منی پاک ہے۔ علامہ شوکانی رحمہ اللہ نے نیل الاوطار میں کہا ہے کہ تعبدا منی کو دھو کر' ہاتھ کے ساتھ صاف کر کے' اسے مل کر' رگڑ کر وغیرہ طریقوں سے زائل کرنا ثابت ہے۔ کسی چیز کا نجس ہونا یہ معنی نہیں رکھتا۔ پس صحیح موقوف اور صائب مسلک یہی ہے کہ منی ناپاک ہے لہٰذا مذکورہ بالا تمام طریقہ ہائے طہارت میں سے کسی ذریعہ سے اس کو پاک کیا جائے۔

مگر علامہ شوکانی نے السیل الجرار اور الدرر البھیھہ میں منی کو پاک قرار دیا ہے اور کہا ہے کہ اس کی نجاست پر کوئی نص نہیں۔ گویا اس بارے میں ان کی رائے مختلف ہے۔

واضح رہے کہ اس مسئلہ میں اختلاف رائے پایا جاتا ہے کہ انسان کا مادہ منویہ پاک ہے یا ناپاک۔ اس میں دو مکتب فکر پائے جاتے ہیں۔ ایک مکتب فکر کی رائے ہے کہ منی آب بینی اور لعاب دہن کی طرح پاک ہے۔ اس نقطہ نظر کی نمائندگی امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ' داؤد ظاہری رحمۃ اللہ علیہ' امام احمد رحمۃ اللہ علیہ ائمہ میں سے اور صحابہ میں سے حضرت علی رضی اللہ عنہ ' حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ ' حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ اور ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کرتی ہیں اور دوسرے مکتب فکر کی نمائندگی ائمہ میں سے امام مالک رحمۃ اللہ علیہ اور امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کرتے ہیں لیکن امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک خشک منی کھرچ دینے سے کپڑا پاک ہو جاتا ہے۔ پانی سے دھونا ضروری نہیں۔ دونوں مکتب فکر کے پاس دلائل ہیں۔ منی کو پاک قرار دینے والوں کی دلیل اسے کھرچ دینا ہے' اس کے بعد چونکہ کپڑا دھویا نہیں گیا اس لئے یہ پاک ہے ورنہ کھرچنے کے بعد اسے دھویا ضرور جاتا اور جس گروہ نے اسے ناپاک کہا ہے ان کی دلیل منی سے آلودہ جگہ کو پانی سے دھونا ہے اگر یہ پاک ہوتی تو دھونے کی چنداں ضرورت نہ تھی۔ اسے پاک کہنے والوں کا جواب یہ ہے کہ کپڑے کو دھویا تو صرف نظافت کی بنا پر گیا ہے نجاست کی وجہ سے نہیں۔ حافظ ابن قیم رحمۃ اللہ علیہ نے بدائع الفوائد' ص: ۱۱۹۔ ۱۲۶' ج ۳ میں اس پر بڑی نفیس بحث کی ہے۔

راوی حدیث: ﴿عائشہ صدیقہ بنت ابی بکر الصدیق رضی اللہ عنہما﴾: ہجرت مدینہ سے دو سال قبل ماہ شوال میں رسول اللہ ﷺ نے ان کو اپنی زوجیت میں لیا اور رخصتی اھ میں ہوئی۔ رخصتی کے وقت ان کی عمر نو سال تھی۔ تعریف و توصیف سے مستغنی ہیں۔ ۵۷ھ یا ۵۸ھ کے ماہ رمضان کی ۱۷ تاریخ کو فوت ہوئیں۔ حضرت ابوہریرۃ رضی اللہ عنہ نے ان کی نماز جنازہ پڑھائی اور بقیع کے قبرستان میں دفن کی گئیں۔ بڑی عالمہ فاضلہ تھیں۔ بکثرت احادیث کی راویہ ہیں۔ اشعار عرب سے بخوبی واقف تھیں۔ آپ کی برأت آسمان سے نازل ہوئی۔ جس کا قرآن مجید کی سورۂ نور میں ذکر ہے۔ حضور پاک ﷺ انہی کے حجرہ میں مدفون ہیں۔

(٢٦) وعَن أَبِي السَمْحِ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسولُ اللهِ ﷺ: «يُغْسَلُ مِنْ بَوْلِ الجَارِيَةِ، وَيُرَشُّ مِنْ بَوْلِ الغُلَامِ». أَخرَجَهُ أَبُو دَاوُدَ وَالنَّسائِيُّ، وَصَحَّحَه الحَاكِمُ.

حضرت ابوالسمح رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے کہ "لڑکی کے پیشاب سے کپڑا دھویا جائے گا اور لڑکے کے پیشاب سے کپڑے پر پانی کے چھینٹے مارے جائیں گے۔" (اسے ابوداؤد و نسائی اور حاکم نے اس کو صحیح قرار دیا ہے)

لغوی تشریح: ﴿من بول الجاریۃ﴾ اس میں "من" تعلیل یعنی علت و وجہ کیلئے ہے۔ معنی یہ ہوئے کہ کپڑے' بدن وغیرہ پر لڑکی کے پیشاب لگنے کی وجہ سے۔ ﴿الجاریۃ﴾ لڑکی' بچی کے معنی۔ ﴿یرش﴾

"رش" سے ماخوذ ہے اور مجہول کا صیغہ ہے اور معنی اس کے چھڑکنے کے ہیں۔ وہ اس طرح کہ جہاں پیشاب لگا ہو وہاں پانی اتنا چھڑکا جائے کہ اتنے متاثرہ حصہ پر پانی غالب آئے اور متاثرہ جگہ کو ڈھانپ لے مگر اتنی کثیر مقدار میں چھڑکنے کی چنداں ضرورت نہیں کہ پانی وہاں سے بہہ نکلے اور قطروں کی صورت میں نیچے گرنے لگے۔

حاصل کلام: حدیث سے یہ ثابت ہوا کہ لڑکے اور لڑکی کے پیشاب میں شرعی حکم الگ الگ ہے۔ لڑکی کے پیشاب سے کپڑے کو دھونے کا اور لڑکے کے پیشاب کیلئے پانی کا چھڑکنا اس وقت تک ہے جب تک دونوں کی غذا دودھ ہے۔ دودھ کے علاوہ غذا کھانے کی صورت میں دونوں کے پیشاب نجاست کے اعتبار سے یکساں حکم رکھتے ہیں۔ بچے کے پیشاب پر پانی چھڑکنے کا یہ مطلب نہیں ہے کہ وہ پاک ہے۔ بس حدیث میں اس سے زیادہ کچھ نہیں کہ بچے کے پیشاب کو پاک کرنے میں شریعت نے ذرا نرمی دی ہے۔

حاصل کلام یہ ہے کہ لڑکی اور لڑکے کے پیشاب میں فرق ہے۔ شیر خوارگی کے ایام میں لڑکی کا پیشاب لڑکے کی بہ نسبت زیادہ ناپاک ہے۔ شیر خوارگی کے بعد دونوں میں کوئی فرق نہیں۔ امام شافعی رحمہ اللہ، امام احمد رحمہ اللہ، ابن وہب رحمہ اللہ، حضرت علی رضی اللہ عنہ، حسن بصری رحمہ اللہ اور اسحٰق بن راھویہ رحمہ اللہ کے نزدیک لڑکے کے پیشاب پر پانی چھڑکنا کافی ہے۔ امام مالک رحمہ اللہ اور امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ دھونا قرار دیتے ہیں جو صحیح نہیں۔

راوی حدیث: ﴿ ابوالسمح ﴾ "سین" پر زبر اور "میم" ساکن۔ ابوالسمح اس کی کنیت ہے۔ ایاد (ھمزہ کے کسرہ کے ساتھ) ان کا نام ہے۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ نام اور کنیت ایک ہی ہے۔ رسول اللہ ﷺ کے آزاد کردہ غلام اور آپؐ کے خادم تھے۔ ابن عبدالبر نے کہا ہے کہ ان کے بارے میں کہا گیا ہے کہ وہ گم ہوگئے تھے۔ معلوم نہیں کہاں وفات پائی؟ ان سے صرف یہی ایک حدیث مروی ہے۔

(۲۷) وعَنْ أَسْمَآءَ بِنْتِ أَبِي بَكْرٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ قَالَ فِي دَمِ الحَيْضِ يُصِيْبُ الثَّوْبَ: «تَحُتُّهُ، ثُمَّ تَقْرُصُهُ بِالمَاءِ، ثُمَّ تَنْضَحُهُ، ثُمَّ تُصَلِّي فِيهِ». مُتَّفَقٌ عَلَيهِ.

حضرت اسماء بنت ابی بکر الصدیق رضی اللہ عنہما روایت کرتی ہیں کہ نبی ﷺ نے حیض کا خون جو کپڑے کو لگ جائے کے متعلق فرمایا۔ "پہلے اسے کھرچ ڈالو پھر پانی سے مل کر دھو لو پھر اس پر کھلا پانی بہاؤ پھر اس میں نماز پڑھ لو۔" (بخاری و مسلم)

لغوی تشریح: ﴿ تحته ﴾ "تا" کے فتح "حاء" کے ضمہ اور دوسرے "تا" کے تشدید اور ضمہ کے ساتھ، باب نصرینصر سے صیغہ مؤنث "حت" سے ماخوذ ہے جس کے معنی تلنا اور کھرچنا ہیں۔ مراد اس سے یہ ہے کہ کپڑے پر لگے ہوئے خون کو اچھی طرح مل کھرچ کر دور کر دینا اور "ہ" کی ضمیر منصوب "دم" کی جانب راجع ہے۔ ﴿ ثم تقرصه ﴾ اس میں "ہ" کی ضمیر کپڑے کی طرف راجع ہے "ر" پر ضمہ ہے، باب نصرینصر سے ہے۔ اس سے مراد ہے کہ کپڑے کو اپنے ہاتھ کی انگلیوں کے پوروں سے خوب مل کر دھویا

جائے۔ یعنی عورت اس کپڑے پر پانی ڈال کر اچھی طرح بھگو کر تر کر لے پھر اپنے ہاتھ کی انگلیوں کے اطراف کے ساتھ اچھی طرح مل کر دھوئے' تاکہ خون کا جتنا حصہ کپڑے میں جذب ہو چکا تھا وہ اس سے خارج ہو جائے۔ ﴿ ثم تنضحه ﴾ "ضاد" پر فتحہ اور اسے کسرہ دینا بھی جائز ہے۔ فتح یفتح اور ضرب یضرب سے۔ معنی یہ ہوئے کہ آخر میں اس پر اچھی طرح پانی بہاؤ۔

حاصل کلام: خون کو اولاً خوب رگڑنے کا حکم ہے' تاکہ پانی کے اس میں سرایت کرنے کا راستہ بن سکے پھر اسے دھونے کا حکم ہے' تاکہ خون کا اثر زائل ہو جائے۔ محض دھونے سے ایسی صفائی حاصل ہونا مشکل تھا۔ نضح کا اس مقام پر موقع کی مناسبت سے معنی غسل کیا گیا ہے۔ جیسا کہ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے ترجمہ باب میں غسل کا ذکر کیا ہے اور اس کے تحت جو حدیث نقل کی ہے وہ نضح اور غسل دونوں پر حاوی ہے پس یہ حدیث ہی نضح کے معنی غسل کے لینے کی واضح دلیل ہے۔

خون حیض رگڑنے اور مل کر دھونے کے باوجود اپنے اثرات اور نشانات باقی چھوڑے تو اس میں کوئی مضائقہ اور حرج نہیں۔ ایسے کپڑوں میں نماز پڑھی جا سکتی ہے جیسا کہ آنے والی حدیث اس کی تائید کرتی ہے۔

راوی حدیث: ﴿ اسماء بنت ابی بکر رضی اللہ عنہا ﴾ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا زوجہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی بڑی بہن۔ عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما کی والدہ تھیں۔ مکہ میں ایمان لانے والے قدیم الاسلام مسلمانوں میں سے تھیں۔ مدینہ منورہ کی طرف ہجرت کی۔ ۷۳ھ میں اپنے بیٹے عبداللہ کے قتل کئے جانے کے ایک ماہ بعد مکہ مکرمہ میں وفات پائی۔ اس وقت ان کی عمر تقریباً سو برس تھی۔ ایسی پیرانہ سالی کے باوجود نہ ان کا کوئی دانت گرا اور نہ ہی عقل میں کسی قسم کا کوئی تغیر پیدا ہوا۔

(۲۸) وعَنْ أَبيْ هُرَيْرَةَ رضي الله تعالى عنه قال: قَالَتْ خَولَةُ: يَا رَسُولَ اللهِ! فَإِن لَمْ يَذْهَبِ الدَّمُ؟ قَالَ: «**يَكْفِيكِ المَاءُ، وَلاَ يَضُرُّكِ أَثَرُهُ**». أَخْرَجَهُ التِّرْمِذِيُّ، وَسَنَدُهُ ضَعِيفٌ.

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ خولہ رضی اللہ عنہا نے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم)! سے استفسار کیا کہ اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم (اگر خون آلود کپڑے کو اچھی طرح مل کر دھونے کے باوجود) خون کا نشان ختم نہ ہو تو پھر کیا کیا جائے؟ ارشاد فرمایا "بس تیرا اس پر اچھی طرح پانی بہانا کافی ہے' اس کا نشان تیرے لئے ضرر رساں نہیں۔" (اسے امام ترمذی نے روایت کیا ہے۔ اس کی سند ضعیف ہے)

لغوی تشریح: ﴿ فان لم یذهب ﴾ یعنی خون آلود کپڑے کو خوب ملنے' رگڑنے اور کھرچنے کے اور اچھی طرح پانی سے دھونے کے بعد بھی اگر خون کا اثر نہ جائے۔ ﴿ یکفیک الماء ﴾ یعنی پانی کے ساتھ دھونا تیرے لئے کافی ہے۔ اس کے بعد کسی تذبذب' تردد اور شک کی ضرورت نہیں۔

حاصل کلام : یہ حدیث اس بات کی دلیل ہے کہ نجاست عین کو زائل کرنے کے بعد کپڑا پاک ہو جاتا ہے۔ اس کے باقی ماندہ اثرات و نشانات کو دور کرنا کپڑے کی پاکیزگی کیلئے شرط نہیں ہے۔ اس روایت کی سند میں چونکہ ابن لھیعہ ایک ایسا راوی ہے جسے علماء فن رجال نے ضعیف قرار دیا ہے ورنہ جہاں تک حدیث میں مذکورہ مسئلہ کا تعلق ہے وہ معنوی اعتبار سے صحیح ہے۔

راوی حدیث : ﴿ خولہ رضی اللہ عنہا ﴾ خاء کے فتح اور واؤ کے سکون کے ساتھ۔ خولہ سے مراد خولہ بنت یسار ہے۔ مشہور صحابیہ ہیں۔ ابو سلمہ بن عبدالرحمٰن نے ان سے روایت کیا ہے۔ ابن عبدالبر کا خیال ہے کہ مجھے اندیشہ تھا کہ یہ خولہ بنت یمان ہوں گی۔ مگر مؤلف نے اس کی تردید کر دی ہے۔ (الاصابہ)

٤ - بَابُ الوُضُوءِ — وضو کا بیان

(٢٩) عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رضي الله تعالى عنه عن رسول اللهِ ﷺ أَنَّهُ قَالَ: «لَوْلاَ أَنْ أَشُقَّ عَلَى أُمَّتِي لأَمَرْتُهُمْ بِالسِّوَاكِ مَعَ كُلِّ وُضُوءٍ». أَخرَجَهُ مَالِكٌ وَأَحْمَدُ وَالنَّسَائِيُّ، وَصَحَّحَهُ ابْنُ خُزَيْمَةَ، وَذَكَرَهُ البُخَارِيُّ تَعْلِيقاً.

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے کہ "اگر مجھے اپنی امت کو مشقت و تکلیف میں مبتلا کرنے کا اندیشہ نہ ہوتا تو میں ہر وضو کے ساتھ مسواک کرنے کا حکم دے دیتا۔" (مالک' احمد اور نسائی نے اسے روایت کیا ہے اور ابن خزیمہ نے اسے صحیح قرار دیا ہے اور بخاری نے اس کو تعلیقاً نقل کیا ہے۔)

لغوی تشریح: ﴿ باب الوضوء ﴾ "واؤ" کے ضمہ کے ساتھ مصدر ہے۔ لغوی طور پر اس کے معنی ہیں ہاتھوں اور پاؤں وغیرہ کے اطراف کو دھونا۔ مطلقاً اور شرعاً دونوں طرح دھونے کو شامل ہے۔ وضو کا عمل' اس سے سب واقف ہیں اور معروف و مشہور ہے۔ اگر وضو میں "واؤ" کے فتح کے ساتھ پڑھا جائے تو اس کے معنی اس برتن میں موجود پانی کے ہیں جس سے وضو کیا جاتا ہے۔

﴿ لو لا ان اشق ﴾ کا مطلب ہے کہ اگر مجھے یہ خوف لاحق نہ ہوتا کہ میں اپنی امت کو کہیں تکلیف اور مشقت میں مبتلا نہ کر دوں۔ ﴿ لامرتھم ﴾ تو میں ان کو حکم دیتا۔ اس میں امر ایجاب کے حکم میں۔ یعنی میں واجب قرار دیتا۔ ایسا حکم صادر ہے۔ فرمانے سے رکنا رفع مشقت کی مصلحت کے پیش نظر اس کا مقتضی ہے۔ مسواک کرنا مسنون ہے۔

حاصل کلام : اس حدیث سے معلوم ہوا کہ جب بھی وضو کیا جائے اس کے ساتھ مسواک کرنا مسنون ہے۔ مسلم اور ابوداؤد میں مروی ہے کہ مسواک کرنا منہ کو صاف اور اپنے پروردگار کو راضی کرنے کا موجب ہے۔ مزید یہ کہ مسواک تمام انبیاء و رسل کی سنت ہے۔ مسند امام احمد' ابن خزیمہ' حاکم اور دار قطنی وغیرہ میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ جو نماز مسواک کر کے پڑھی گئی ہو اس کا ثواب

بے مسواک نماز سے ستر گنا زیادہ ہے۔ مگر یہ روایت ضعیف ہے۔ اگر پہلے سے وضو موجود ہو تو نماز کی ادائیگی سے پہلے مسواک کر لینی چاہیے تاکہ اتباع سنت کا تقاضا پورا ہو سکے۔

(٣٠) وعَنْ حُمْرَانَ مَوْلَى عُثْمَانَ رضي الله تعالى عنه: أَنَّ عُثْمَانَ دَعَا بَوَضُوءٍ فَغَسَلَ كَفَّيْهِ ثَلاَثَ مَرَّاتٍ، ثُمَّ تَمَضْمَضَ وَاسْتَنْشَقَ وَاسْتَنْثَرَ، ثُمَّ غَسَلَ وَجْهَهُ ثَلاَثَ مَرَّاتٍ، ثُمَّ غَسَلَ يَدَهُ الْيُمْنَى إِلَى الْمِرْفَقِ ثَلاَثَ مَرَّاتٍ، ثُمَّ الْيُسْرَى مِثْلَ ذَلِكَ، ثُمَّ مَسَحَ بِرَأْسِهِ، ثُمَّ غَسَلَ رِجْلَهُ الْيُمْنَى إِلَى الْكَعْبَيْنِ ثَلاَثَ مَرَّاتٍ، ثُمَّ الْيُسْرَى مِثْلَ ذَلِكَ، ثُمَّ قَالَ: رَأَيْتُ رَسُولَ اللهِ ﷺ تَوَضَّأَ نَحْوَ وُضُوئِيْ هَذَا. مُتَّفَقٌ عَلَيْه.

حضرت حمران مولیٰ عثمان رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے وضو کا پانی طلب فرمایا۔ پہلے اپنے ہاتھوں کی ہتھیلیاں تین مرتبہ دھوئیں۔ پھر منہ میں پانی ڈال کر کلی کی پھر ناک میں پانی چڑھایا اور اسے جھاڑ کر صاف کیا۔ پھر تین مرتبہ اپنا چہرہ دھویا۔ پھر اپنا دایاں ہاتھ کہنی تک تین مرتبہ دھویا۔ پھر اسی طرح بایاں ہاتھ کہنی تک تین مرتبہ دھویا۔ پھر اپنے سر کا مسح کیا۔ پھر اپنا دایاں اور بایاں پاؤں ٹخنوں تک تین' تین مرتبہ دھویا۔ پھر فرمایا کہ "میں نے رسول اللہ ﷺ کو اسی طرح وضو کرتے دیکھا ہے جس طرح ابھی میں نے وضو کیا ہے۔" (بخاری و مسلم)

لغوی تشریح: ﴿بوضوء﴾ "واؤ" کے فتح کے ساتھ۔ وہ پانی جس سے وضو کیا جائے۔ ﴿تمضمض﴾ المضمضہ سے ماخوذ ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ منہ میں پانی داخل کر کے اسے وہیں گردش کرائے۔ پھر باہر پھینک دے۔ ﴿استنشق﴾ استنشاق سے ماخوذ ہے۔ پانی کا ناک کے داخلی حصہ میں پہنچا کر بذریعہ سانس سے اوپر چڑھانا۔ ﴿استنثر﴾ ناک سے داخل شدہ پانی کو باہر نکالنا۔ ﴿المرفق﴾ کسرہ کے ساتھ۔ "ر" ساکن اور "فا" کی فتح کے ساتھ۔ بازو کی ہڈی یعنی کلائی کے جوڑ سے بازو کے اوپر والے حصے کا ہڈی کا جوڑ۔ یعنی کہنی۔ ﴿الی الکعبین﴾ ٹخنوں تک۔ پنڈلی اور پاؤں کے ملنے کی جگہ۔ ابھری ہوئی ہڈیاں۔ اس حدیث کے آخر میں یہ الفاظ بھی ہیں جنہیں مؤلف نے اختصاراً حذف کر دیا ہے۔ ان کا تعلق وضو سے ہے۔ آپؐ نے فرمایا: من توضا نحو وضوئی هذا ثم صلی رکعتین لایحدث فیها نفسه غفرله ما تقدم من ذنبه۔ کہ "جس شخص نے میرے اس وضو کی طرح وضو کیا' پھر اس نے اپنے دل میں کوئی ایسی بات بھی نہ کی جس کا نماز سے کوئی تعلق نہ ہو تو اس کے گزشتہ گناہ معاف کر دیئے جائیں گے"۔

حاصل کلام: اس حدیث سے اعضاء وضو میں سے ہاتھ منہ اور پاؤں کا تین تین مرتبہ دھونا ثابت ہوتا

ہے۔ دوسری روایت میں دو' دو مرتبہ اور بعض روایات میں ایک ایک مرتبہ دھونے کا ذکر بھی آیا ہے۔ محدثین فقہاء نے ان روایات میں اس طرح تطبیق دی ہے کہ ہر عضو کا ایک ایک مرتبہ دھونا واجب اور تین تین مرتبہ دھونا مسنون ہے' دو دو مرتبہ بھی دھو لیا جائے تو بھی کافی ہے۔ امام نووی رحمۃ اللہ علیہ نے اس پر اجماع نقل کیا ہے کہ واجب تو صرف ایک مرتبہ دھونا ہی ہے۔

راوی حدیث: ﴿حمران رضی اللہ عنہ﴾ "حاء" کے ضمہ اور "میم" کے سکون۔ حمران بن ابان۔ ہمزہ کے فتح کے ساتھ۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے عہد خلافت میں خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے ایک غزوہ میں اسے قید کیا۔ جو مسیب بن نجبہ کے حصہ میں آیا۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے مسیب سے خرید کر آزاد کر دیا۔ طبقہ ثانیہ سے تعلق رکھتا ہے ثقہ ہے اور ۷۵ھ میں فوت ہوا۔ بعض نے سن وفات ۷۶ھ اور ۷۱ھ بھی ذکر کی ہے۔

﴿عثمان رضی اللہ عنہ﴾ عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ ۔ تیسرے خلیفہ راشد' سابقین اولین میں سے ہیں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی دو لخت جگر رقیہ رضی اللہ عنہا اور ام کلثوم رضی اللہ عنہا یکے بعد دیگرے ان کی زوجیت میں رہیں۔ اسی وجہ سے ذوالنورین کے لقب سے مشہور و معروف ہوئے۔ جمعہ کے روز جام شہادت نوش کیا۔ یہ ۳۵ھ / ۱۸ ذی الحجہ کا واقعہ ہے۔

(۳۱) وعَنْ عَلِيٍّ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ - فِيْ صِفَةِ وُضُوءِ النَّبِيِّ ﷺ - قَالَ: وَمَسَحَ بِرَأْسِهِ وَاحِدَةً. أَخْرَجَهُ أَبُو دَاوُدَ، وَأَخْرَجَهُ النَّسَائِيُّ وَالتِّرْمِذِيُّ بِإِسْنَادٍ صَحِيحٍ، بَلْ قَالَ التِّرْمِذِيُّ: إِنَّهُ أَصَحُّ شَيْءٍ فِي الْبَابِ.

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے وضو کے متعلق بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ "آپؐ نے اپنے سر کا مسح ایک مرتبہ کیا۔" (اسے ابوداؤد' نسائی اور ترمذی نے صحیح سند کے ساتھ روایت کیا ہے بلکہ ترمذی نے تو یہاں تک کہا ہے کہ اس باب میں یہ حدیث سب سے زیادہ صحیح ہے)

حاصل کلام: اس حدیث سے ثابت ہوتا ہے کہ سر کا مسح ایک مرتبہ ہی فرض ہے۔ علماء امت کی غالب اکثریت کا یہی مسلک ہے البتہ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ مسح میں تکرار کے قائل ہیں اور دوسرے اعضاء کی طرح تین بار مسح کو مستحب قرار دیتے ہیں۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا استدلال ابوداؤد کی ایک روایت سے ہے لیکن اکثر احادیث (جو صحیحین اور سنن میں مروی ہیں) کی بناء پر جمہور علماء کا مسلک ہی راجح ہے اور اقرب الی الصواب ہے۔

راوی حدیث: ﴿علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ﴾ چوتھے خلیفہ راشد۔ حضرت حسن رضی اللہ عنہ و حسین رضی اللہ عنہ کے والد ماجد اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے حقیقی چچا زاد بھائی اور داماد تھے۔ ماسوا جنگ تبوک کے تمام غزوات میں شریک ہوئے۔ ۱۸ ذی الحجہ ۳۵ھ کو منصب خلافت پر فائز ہوئے اور ۱۷ رمضان المبارک ۴۰ھ کو جمعہ کی صبح کوفہ میں ایک شقی القلب عبدالرحمٰن بن ملجم نے پے درپے تین وار کر کے شہید کر دیا۔

(۳۲) وعَنْ عَبْدِ اللهِ بْنِ زَيْدِ بْنِ

حضرت عبداللہ بن زید بن عاصم رضی اللہ عنہ سے وضو کے

عَاصِمٍ رضي الله تعالى عنه - فِيْ صِفَةِ الوُضُوءِ - قَالَ: وَمَسَحَ رَسُولُ اللهِ ﷺ بِرَأْسِهِ فَأَقْبَلَ بِيَدَيْهِ وَأَدْبَرَ. مُتَّفَقٌ عَلَيْه.

متعلق مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اپنے سر کا مسح اس طرح کیا کہ دونوں ہاتھ سر کے آگے سے پیچھے کی طرف لے گئے اور پھر پیچھے سے آگے کی جانب واپس لے آئے۔ (بخاری و مسلم)

وَفِيْ لَفْظٍ لَهُمَا: بَدَأَ بِمُقَدَّمِ رَأْسِهِ حَتَّى ذَهَبَ بِهِمَا إِلَى قَفَاهُ، ثُمَّ رَدَّهُمَا حَتَّى رَجَعَ إِلَى المَكَانِ الَّذِيْ بَدَأَ مِنْهُ.

ایک روایت میں جسے بخاری و مسلم نے روایت کیا ہے اس طرح ہے کہ آپؐ سر کے اگلے حصہ سے شروع کر کے ہاتھوں کو سر کے پچھلے حصہ یعنی گدی تک لے گئے اور پھر اسی طرح دونوں ہاتھوں کو سر کے بالوں کا مسح کرتے ہوئے اسی جگہ واپس لے آئے جہاں سے مسح کا آغاز کیا تھا۔

لغوی تشریح: ﴿ اقبل بيديه وادبر ﴾ یعنی مسح دونوں ہاتھوں سے سر کے اگلے حصہ سے شروع کیا اور سر کے آخری حصہ تک لے جا کر واپس اسی مقام پر لے آئے۔ اس کی وضاحت ﴿ بدا بمقدم راسه ﴾ کا جملہ کرتا ہے۔ ﴿ قفا ﴾ سر کے آخری حصہ کو کہتے ہیں جو گردن کے پیچھے حصہ کے ساتھ ملحق ہے۔ ﴿ رجع ﴾ رجع سے ماخوذ ہے اور یہاں متعدی استعمال ہوا ہے۔

حاصل کلام: اس حدیث سے یہ ثابت ہوا کہ سر کے مسح کا آغاز سر کے اگلے حصہ سے کیا جانا چاہئے۔ ائمہ اربعہ (امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ، امام مالک رحمۃ اللہ علیہ، امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ) کے علاوہ اسحٰق بن راہویہ کی یہی رائے ہے۔ لیکن ترمذی میں منقول ایک روایت جسے ترمذی نے حسن کہا ہے سے معلوم ہوتا ہے کہ سر کے مسح کا آغاز پچھلے حصہ سے کرنا بھی جائز ہے۔ اس بنا پر بعض اہل کوفہ کا یہی مذہب ہے۔ وکیع بن جراح بھی انہی لوگوں میں سے ایک ہیں۔ مگر یہ روایت حسن نہیں اس کا ایک راوی عبداللہ بن محمد بن عقیل متکلم فیہ ہے۔ محدثین کی ایک جماعت نے اس پر حافظے کی وجہ سے جرح کی ہے۔

راوی حدیث: ﴿ عبدالله بن زيد بن عاصم رضی اللہ عنہ ﴾ انصاری تھے۔ انصار کے قبیلہ بنی مازن بن نجار کے فرد تھے۔ غزوۂ احد میں شریک ہوئے۔ جنگ یمامہ میں وحشی کے ساتھ مل کر مدعی نبوت مسیلمہ کذاب کو قتل کیا۔ ۶۳ھ میں معرکہ حرہ کے روز شہادت کے اعلیٰ مرتبہ پر فائز ہوئے۔ یہاں یہ شبہ نہ رہے کہ یہ عبداللہ بن زید وہ ہیں، جنہوں نے خواب میں اذان سنی تھی۔ یہ عبداللہ بن زید بن عاصم ہیں اور وہ عبداللہ بن زید بن عبد ربہ تھے۔ گویا دادا دونوں کے الگ الگ تھے۔ ابن عبد ربہ کا ذکر باب الاذان میں آئے گا۔ انشاء اللہ۔

(۳۳) وَعَنْ عَبْدِ اللهِ بْنِ عَمْرٍو رضي الله تعالى عنهما، فِيْ صِفَةِ

حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما سے وضو کی کیفیت کے بارے میں روایت ہے کہ آپؐ نے اپنے سر کا مسح

الوُضُوءِ قَالَ: ثُمَّ مَسَحَ ﷺ بِرَأْسِهِ وَأَدْخَلَ إِصْبَعَيْهِ السَّبَّاحَتَيْنِ فِيْ أُذُنَيْهِ، وَمَسَحَ بِإِبْهَامَيْهِ عَلَى ظَاهِرِ أُذُنَيْه. أَخْرَجَهُ أَبُو دَاوُدَ وَالنَّسَائِيُّ، وَصَحَّحَه ابْنُ خُزَيْمَةَ.

کیا اور اپنے ہاتھوں کی دونوں شہادت والی انگلیوں کو کانوں میں داخل کیا اور انگوٹھوں سے کانوں کے باہر کا مسح کیا۔ (اس روایت کو ابوداؤد اور نسائی نے روایت کیا ہے اور ابن خزیمہ نے اسے صحیح قرار دیا ہے)

لغوی تشریح: ﴿ السباحتين ﴾ ۔ "اصبعیه" کی صفت واقع ہو رہا ہے۔ اس کا واحد السباحة اس انگلی کو کہتے ہیں جو انگوٹھے اور انگشتِ وسطی کے مابین ہے۔ ﴿ عند التسبيح ﴾ چونکہ اس سے اشارہ کیا جاتا ہے اس بنا پر اسے سباحة کہتے ہیں۔ سباحتين ' اس کا تثنیہ ہے۔ یعنی دونوں ہاتھوں کی انگشتہائے شہادت۔ ﴿ الابهام ﴾ پانچوں انگلیوں میں پہلے نمبر۔ پانچوں انگلیوں سے زیادہ فائدہ بخش اور رسغ (کٹ) کے زیادہ قریب۔ ﴿ ظاهر اذنيه ﴾ سے مراد دونوں کانوں کا بالائی حصہ۔

حاصل کلام: یہ حدیث اس بات کا بین ثبوت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے کانوں کے ظاہر اور باطن دونوں پر مسح فرمایا ہے۔ ظاہر سے مراد کان کا وہ حصہ ہے جو سر کے ساتھ متصل ہوتا ہے اور باطن وہ ہے جو منہ کے قریب ہوتا ہے۔ ترمذی نے کانوں کے ظاہر اور باطن پر مسح کی حدیث بیان کرکے کہا کہ اہل علم کا عمل اسی پر ہے۔

راوی حدیث: ﴿ عبد الله بن عمرو بن العاص بن وائل سهمي قريشي رضى الله عنهما ﴾ ہیں۔ آپ کا سلسلہ نسب کعب بن لوی پر جا ملتا ہے۔ اپنے والد سے پہلے اسلام سے مشرف ہوئے۔ اپنے والد محترم سے صرف تیرہ برس چھوٹے تھے۔ بڑے پایہ کے عالم فاضل' حدیث کے حافظ اور عابد تھے۔ بکثرت احادیث نبوی ان سے مروی ہیں۔ یہ ارشادات نبوی ﷺ کو قلم بند کر لیا کرتے تھے۔ ۶۳ھ یا ۷۰ھ میں وفات پائی۔ تدفین کے بارے میں مختلف اقوال ہیں۔ مکہ مکرمہ میں' طائف میں اور مصر میں۔

(٣٤) وعَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَ رضي الله تعالى عنه قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «إِذَا اسْتَيْقَظَ أَحَدُكُمْ مِنْ مَنَامِهِ فَلْيَسْتَنْثِرْ ثَلاَثاً، فَإِنَّ الشَّيْطَانَ يَبِيتُ عَلَى خَيْشُومِهِ». مُتَّفَقٌ عَلَيْه.

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "تم میں سے جب کوئی نیند سے بیدار ہو تو تین مرتبہ اپنا ناک جھاڑ کر صاف کرے اس لئے کہ شیطان ناک کے نتھنوں کی ہڈی پر رات بسر کرتا ہے۔" (بخاری و مسلم)

(٣٥) وعَنْهُ: «إِذَا اسْتَيْقَظَ أَحَدُكُمْ مِنْ نَوْمِهِ فَلاَ يَغْمِسْ يَدَهُ فِي الإِنَاءِ حَتَّى يَغْسِلَهَا ثَلاَثاً، فَإِنَّهُ لاَ يَدْرِي

یہ روایت بھی حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ ہی سے ہے جس میں مذکور ہے کہ "تم میں سے جب کوئی نیند سے بیدار ہو تو تین مرتبہ دھونے سے پہلے اپنا ہاتھ پانی

أَيْنَ بَاتَتْ يَدُهُ». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ، وَهَذَا لَفْظُ مُسْلِمٍ.

کے برتن میں نہ ڈالے۔ کیونکہ اسے یہ معلوم نہیں کہ رات بھر ہاتھ کہاں کہاں گردش کرتا رہا (اور کس کس چیز کو چھوتا اور مس کرتا رہا) " (بخاری و مسلم' مذکورہ بالا حدیث میں مذکورہ الفاظ مسلم کے ہیں)

لغوی تشریح: ﴿ فلا يغمس ﴾ میم کے کسرہ کے ساتھ۔ معنی ہیں کہ داخل نہ کرے۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ اور اکثر علماء کے نزدیک یہ حکم استحباب پر مبنی ہے مگر امام احمد رحمۃ اللہ علیہ اسے واجب قرار دیتے ہیں اور جمہور کی رائے ہی اقرب الی الصواب ہے۔ البتہ جب اسے یقین حاصل ہو جائے کہ اس کا ہاتھ نجاست و گندگی سے آلودہ ہوا ہے تو ہاتھ کا دھونا ضروری ہے۔ نیز یہ مقدمات وضو میں سے بھی ہے۔

حاصل کلام: حدیث میں مذکور لفظ فی الانـاء اس پر دلالت کرتا ہے کہ جو شخص شب و روز میں جس وقت نیند سے اٹھے تو اس کیلئے مستحب ہے کہ کسی برتن میں ہاتھ ڈالنے سے پہلے اسے تین مرتبہ دھو لے۔ یہ حکم ہر قسم کے برتن کے لئے ہے البتہ نہر اور بڑا حوض و تالاب اس حکم سے مستثنیٰ ہیں اور ان میں ہاتھ داخل کرنا جائز ہے۔ علامہ ابن حجر عسقلانی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی فتح الباری میں یہی رائے بیان کی ہے۔

(٣٦) وعَنْ لَقِيطِ بْنِ صَبِرَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «أَسْبِغِ الوُضُوءَ، وَخَلِّلْ بَيْنَ الأَصَابِعِ، وَبَالِغْ فِي الاسْتِنْشَاقِ إِلاَّ أَنْ تَكُونَ صَائِماً». أَخرَجَهُ الأَرْبَعَةُ، وَصَحَّحَهُ ابْنُ خُزَيْمَةَ. وَلِأَبِي دَاوُدَ فِي رِوَايَةٍ: «إِذَا تَوَضَّأْتَ فَمَضْمِضْ».

حضرت لقیط بن صبرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "وضو اچھی طرح پورا کرو اور انگلیوں کا خلال کرو' ناک میں پانی اچھی طرح چڑھایا کرو مگر روزے کی حالت میں (ایسا نہ کرو)" (اس روایت کو ابوداؤد' ترمذی' نسائی اور ابن ماجہ نے روایت کیا ہے اور ابن خزیمہ نے اسے صحیح قرار دیا ہے) ابوداؤد کی ایک روایت کے الفاظ ہیں "جب تو وضو کرے تو کلی کر۔"

لغوی تشریح: ﴿ اسبغ ﴾ اسباغ سے فعل امر ہے۔ اسباغ کے معنی ہیں' اعضاء وضو کو پوری طرح اور اچھی طرح دھونا۔ ﴿ خلل ﴾ تخلیل سے فعل امر ہے۔ "خلال" یہ ہے کہ انگلیوں کے درمیان انگلی اس طرح داخل کرے کہ دونوں انگلیوں کا درمیانی حصہ پوری طرح تر ہو جائے۔ ﴿ الا ان تکون صائما ﴾ روزے دار کو پانی اتنا اوپر نہ چڑھانا چاہیئے' تاکہ کہیں پانی گلے میں نہ اتر جائے اور روزہ ٹوٹ جائے۔ ناک کے اندرون پانی مبالغہ سے چڑھانا مستحب ہے۔

حاصل کلام: اعضاء وضو کو اچھی اور پوری طرح دھونا۔ ہاتھوں اور پاؤں کی انگلیوں کا خلال کرنا' تاکہ کہیں کوئی جگہ خشک نہ رہ جائے۔

راوی حدیث: ﴿ لقیط بن صبرۃ رضی اللہ عنہ ﴾ "لام" کے فتحہ اور "قاف" کے کسرہ سے۔ صبرۃ "صاد"

کے فتحہ اور "باء" کے کسرہ کے ساتھ۔ نسب نامہ یوں ہے لقیط بن صبرہ بن عبداللہ بن المنتفق بن عامر العامری رضی اللہ عنہ۔ وفد بنی المنتفق کے قائد تھے اور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ وہ لقیط بن عامر بن صبرہ ہیں جو ابورزین العقیلی کے نام سے مشہور ہیں۔ علامہ ابن عبدالبر وغیرہ کی رائے یہ ہے کہ یہ ایک ہی شخص کے دو نام ہیں اور ایک رائے یہ بھی ہے کہ یہ دونوں الگ الگ شخصیات ہیں۔ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے اسی کو ترجیح دی ہے۔ امام علی بن مدینی اور امام مسلم رحمہ اللہ وغیرہ کی بھی یہی رائے ہے۔ (الاصابہ۔ تہذیب)

(۳۷) وعَنْ عُثْمَانَ رضي الله تعالى عنه: أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ كَانَ يُخَلِّلُ لِحْيَتَهُ فِي الوُضُوءِ. أَخرَجَهُ التِّرْمِذِيُّ، وَصَحَّحَهُ ابْنُ خُزَيْمَةَ.

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی ﷺ وضو کرتے ہوئے اپنی داڑھی کا خلال کیا کرتے تھے۔ (ترمذی۔ اور ابن خزیمہ نے صحیح قرار دیا ہے)

حاصل کلام: داڑھی کا خلال نبی کریم ﷺ سے ثابت ہے اور یہ مسنون ہے واجب نہیں۔

(۳۸) وَعَنْ عَبْدِ اللهِ بْنِ زَيْدٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ: أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ أُتِي بِثُلُثَي مُدٍّ فَجَعَلَ يَدْلُكُ ذِرَاعَيْهِ. أَخرَجَهُ أَحْمَدُ، وَصَحَّحَهُ ابْنُ خُزَيْمَةَ.

حضرت عبداللہ بن زید رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں دو تہائی مد پانی پیش کیا گیا تو آپؐ نے دھونے کیلئے بازوؤں کو ملنا شروع کیا۔ (احمد نے اسے روایت کیا ہے اور ابن خزیمہ نے اسے صحیح قرار دیا ہے)

لغوی تشریح: ﴿ اتی ﴾ مفعول واقع ہوا ہے۔ ﴿ مد ﴾ میم کے ضمہ اور دال کی تشدید کے ساتھ۔ پانی کا پیمانہ جس میں ایک رطل اور تہائی رطل پانی سمائے۔ آج کل کی اصطلاح میں چھ سو گرام وزن بنتا ہے۔ ﴿ یدلک ﴾ ملتے ہوئے دھونا۔ ﴿ ذراعیہ ﴾ ہتھیلی سے لے کر کہنی تک کے حصہ کو ذراع یعنی ہاتھ کہتے ہیں۔ مطلب یہ ہوا کہ حضور ﷺ نے اتنی مقدار پانی سے وضو فرمایا۔ یہ کم سے کم پانی ہے جو وضو کے بارے میں نبی ﷺ سے مروی ہے کہ آپؐ نے اتنا پانی وضو میں استعمال کیا۔

حاصل کلام: دو تہائی مد کی مقدار والی حدیث بخاری و مسلم میں ہے کہ حضور ﷺ نے اتنے پانی سے وضو کیا اور ایک روایت میں ایک مد سے وضو کرنے کا ذکر بھی ہے۔ حجازی مد' انگریزی سیر اور کلو سے کچھ زیادہ کا ہوتا ہے اس سے معلوم ہوا کہ زیادہ مقدار میں پانی بلا ضرورت استعمال کرنے سے اجتناب کرنا بہتر ہے۔

(۳۹) وعَنْهُ: أَنَّهُ رَأَى النَّبِيَّ ﷺ يَأْخُذُ لِأُذُنَيْهِ مَاءً خِلاَفَ المَاءِ الَّذِيْ أَخَذَهُ لِرَأْسِهِ. أَخرَجَهُ البَيْهَقِيُّ، وَقَالَ:

حضرت عبداللہ بن زید رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ انہوں نے نبی ﷺ کو دیکھا آپؐ جو پانی سر کے مسح کیلئے لیتے تھے' کانوں کے مسح کیلئے اس سے الگ

إِسْنَادُهُ صَحِيْحٌ، وَصَحَّحَهُ التِّرْمِذِيُّ أَيْضاً.

لیتے تھے۔ (اسے بیہقی نے روایت کیا ہے اور کہا ہے کہ اس کی سند صحیح ہے اور ترمذی نے بھی اسے صحیح قرار دیا ہے۔)

وَهُوَ عِنْدَ مُسْلِمٍ مِنْ هَذَا الْوَجْهِ بِلَفْظِ: وَمَسَحَ بِرَأْسِهِ بِمَاءٍ غَيْرِ فَضْلِ يَدَيْهِ. وَهُوَ الْمَحْفُوظُ.

اور مسلم کے ہاں اسی سند سے یہ روایت بایں الفاظ منقول ہے کہ "آپ نے سر کا مسح کیا مگر وہ ہاتھوں سے بچا ہوا پانی نہیں تھا" یعنی نیا پانی استعمال کیا اور یہی مسلم کی روایت محفوظ ہے۔

لغوی تشریح: ﴿ وهو عند مسلم ﴾ سے مراد ہے کہ یہ الفاظ مسلم کے ہیں۔ ملاحظہ ہو (مسلم کتاب الطهارت باب وضو النبی ﷺ) ﴿ من هذا الوجه ﴾ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ جس سند سے بیہقی نے اس کو بیان کیا ہے مسلم میں بھی اسی سند سے بیان ہوئی ہے۔ ﴿ بماء ﴾ همزه مجرور ہے۔ تنوین کے ساتھ۔ گرائمر کے اعتبار سے موصوف واقع ہو رہا ہے اور ﴿ غیر فضل یدیه ﴾ اس کی صفت ہے اور ﴿ الفضل ﴾ کے معنی ضرورت سے زائد بچا ہوا یعنی وضو پوری طرح مکمل کرنے کے بعد جو کچھ باقی بچ جائے۔ پورے جملہ کے معنی یہ ہوئے کہ دونوں ہاتھوں کو دھونے کے بعد جو پانی کی تری ہاتھوں کے ساتھ لگی رہی اس سے سر کا مسح نہیں کیا' بلکہ مسح کیلئے نیا پانی لیا۔ ﴿ وهو المحفوظ ﴾ سے مراد یہ ہے کہ مسلم نے جس سیاق سے روایت بیان کی ہے وہ محفوظ ہے۔ اس میں کسی قسم کا کلام نہیں اور بیہقی کے الفاظ اس پر دلالت کرتے ہیں کہ کانوں کے مسح کیلئے نیا پانی لینا مشروع ہے مگر مصنف نے اس کے غیر محفوظ ہونے کی جانب اشارہ کر دیا۔ علامہ ابن قیم رحمۃ اللہ علیہ نے "زاد المعاد" میں پورے یقین و وثوق کے ساتھ کہا ہے کہ نبی ﷺ سے کانوں کیلئے نیا پانی لینا ثابت نہیں۔ البتہ ابن عمر رضی اللہ عنہما کے اپنے عمل سے ثابت ہے۔ امام عبدالرحمٰن مبارک پوری نے تحفۃ الاحوذی (ج ۱' ص: ۴۹) میں کہا ہے کہ میں کسی مرفوع صحیح حدیث سے واقف نہیں جس میں یہ بیان ہو کہ آپؐ نے کانوں کیلئے نیا پانی لیا اور اس پر کلام نہ ہو۔ ہاں! ابن عمر رضی اللہ عنہ کے اپنے فعل سے یہ ثابت ہے۔ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے مؤطا میں نافع کے حوالہ سے روایت کیا ہے کہ عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما اپنی دونوں انگلیوں سے اپنے کانوں کیلئے نیا پانی لیتے تھے۔

حاصل کلام: امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ وغیرہ کی یہی رائے ہے کہ کانوں کے مسح کیلئے نیا پانی لینا چاہئے۔ مگر امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اور سفیان ثوری رحمۃ اللہ علیہ کی رائے یہ ہے کہ جب کان سر کے ساتھ شامل ہیں تو پھر سر کے مسح کا پانی ہی کانوں کیلئے کافی ہے۔ بکثرت احادیث صحیحہ اسی رائے کی تائید کرتی ہیں۔ بیہقی' ابن خزیمہ اور ابن حبان میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے صراحتاً مروی ہے کہ فمسح براسه واذنيه کہ آپؐ نے پانی لیا تو اس سے سر اور دونوں کانوں کا مسح کیا۔ واللہ اعلم بالصواب۔

(٤٠) وَعَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ میں نے

تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: سَمِعْتُ رَسُولَ اللهِ ﷺ يَقُولُ: «إِنَّ أُمَّتِي يَأْتُونَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ غُرًّا مُحَجَّلِينَ مِنْ أَثَرِ الْوُضُوءِ، فَمَنِ اسْتَطَاعَ مِنْكُمْ أَنْ يُطِيلَ غُرَّتَهُ فَلْيَفْعَلْ». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ، وَاللَّفْظُ لِمُسْلِمٍ.

رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے سنا ہے کہ "قیامت کے روز میری امت کے لوگ ایسی حالت میں آئیں گے کہ وضو کے اثرات کی وجہ سے ان کے ہاتھ پاؤں چمکتے ہوں گے۔ تم میں سے جو شخص اس چمک اور روشنی کو زیادہ بڑھا سکتا ہو اسے ضرور بڑھانی چاہیئے۔" (بخاری و مسلم اور الفاظ مسلم کے ہیں)

لغوی تشریح: ﴿ غرا ﴾ یاتون کی ضمیر سے حال واقع ہو رہا ہے۔ اعراب اس طرح ہے کہ غین پر ضمہ اور راء پر تشدید ہے اور اغر کی جمع ہے اور "اغر" اسے کہتے ہیں جس کے سفیدی ہو اور ﴿ غرۃ ﴾ دراصل اس سفید چمک کو کہتے ہیں جو گھوڑے کی پیشانی میں ہوتی ہے۔ ﴿ محجلین ﴾ تحجیل سے اسم مفعول واقع ہو رہا ہے اور اس سفیدی کو کہتے ہیں جو گھوڑے کے پاؤں میں ہوتی ہے۔ مطلب یہ ہوا کہ وضو کی چمک کی وجہ سے ان کے چہرے، ہاتھ اور پاؤں دمک اور چمک رہے ہوں گے۔ ﴿ یطیل ﴾ اطالۃ سے ماخوذ ہے۔ دراز کرنے، لمبا کرنے اور طویل کرنے کے معنی میں آتا ہے۔ ﴿ غرتہ ﴾ اپنی چمک، روشنی۔ مطلب یہ ہوا کہ جہاں تک پانی پہنچانا ضروری و لازمی ہو وہاں سے آگے تک پہنچانا۔

حاصل کلام: اس حدیث کے کئی مطلب ہو سکتے ہیں ایک یہ کہ اعضاء وضو کو حد فرض سے زیادہ تک دھونا مثلاً ہاتھوں کو کندھوں تک اور پاؤں کو گھٹنوں تک۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ راوی حدیث نے یہی مفہوم سمجھا اور اسی پر ان کا اپنا عمل تھا۔ امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ اور امام شافعی رحمہ اللہ بھی اسے مستحب سمجھتے ہیں مگر امام مالک رحمہ اللہ اسے مستحب نہیں سمجھتے، وہ فرماتے ہیں کہ وضو کی حد متعین ہے اور زیور اپنے مقام پر ہے۔ ایک دوسرا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ہر عضو وضو کو تین، تین مرتبہ دھوئے اور ایک تیسرا مفہوم یہ بھی ممکن ہے کہ وضو موجود ہو مگر ثواب کی نیت سے تازہ وضو کرے اور ہر وقت باوضو رہنا بھی مراد ہو سکتا ہے لیکن یہ دونوں مفہوم ظاہر کے خلاف ہیں۔ اس آخری جملہ کے بارے میں راوی کو تردد ہے کہ یہ مرفوع ہے یا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کا قول ہے جیسا کہ مسند امام احمد اور فتح الباری میں ہے۔ اس لئے اس سے مقررہ حد سے زائد حصہ کو دھونے پر استدلال محل نظر ہے۔ (اغاثۃ اللھفان، ص: ۲۰۰، ج ۱)

(٤١) وعَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللهُ تعالى عنها قَالَتْ: كَانَ رَسُولُ اللهِ ﷺ يُعْجِبُهُ التَّيَمُّنُ فِي تَنَعُّلِهِ وَتَرَجُّلِهِ وَطُهُورِهِ، وَفِيْ شَأْنِهِ كُلِّهِ. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا روایت کرتی ہیں کہ "رسول اللہ ﷺ جوتا پہننے، بالوں میں کنگھی کرنے اور وضو کرنے بلکہ ہر کام کیلئے دائیں جانب کو پسند فرماتے تھے۔" (بخاری و مسلم)

لغوی تشریح: ﴿ یعجبہ التمین ﴾ یعنی آپ ﷺ کو دایاں آگے کرنا محبوب و پسندیدہ تھا۔ ﴿ فی تنعلہ ﴾

جوتا پہننے کے وقت ﴿ وترجلہ ﴾ بالوں میں کنگھی کرتے وقت۔

حاصل کلام: آنحضور ﷺ ہر اچھے کام میں دائیں جانب کو پسند فرماتے۔ مثلاً مسجد میں داخل ہونے' نماز سے فارغ ہونے کے وقت سلام پھیرنے' اعضاء وضو کو دھونے' کھانے پینے' مصافحہ کرنے' دودھ دوھنے' لباس پہننے' سرمہ لگانے اور مسواک کرنے کے وقت وغیرہ۔ دور جدید کا مسلمان ان گراں مایہ چیزوں کو فراموش کر بیٹھا ہے اور غیروں کی نقالی میں دائیں کی بجائے بائیں کو پسند کرنے لگا ہے۔ بڑی قابل افسوس بات ہے۔

(٤٢) وعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رضي الله تعالى عنه قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «إِذَا تَوَضَّأْتُمْ فَابْدَءُوا بِمَيَامِنِكُمْ». أَخرَجَهُ الأَرْبَعَةُ وَصَحَّحَهُ ابْنُ خُزَيْمَةَ.

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "جب تم وضو کرنے لگو تو اپنے دائیں جانب سے ابتدا کیا کرو۔" (اسے ابوداؤد' ترمذی' نسائی اور ابن ماجہ چاروں نے روایت کیا ہے اور ابن خزیمہ نے اسے صحیح قرار دیا ہے)

حاصل کلام: اس حدیث سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے کہ آپؐ کو دایاں پہلو ہی پسند اور محبوب تھا۔ خود بھی اسی پر عمل پیرا رہے اور امت کو بھی حکم فرمایا کہ دائیں جانب سے ابتدا کرنی چاہئے۔

(٤٣) وعَنِ المُغِيْرَة بْنِ شُعْبَةَ رضي الله تعالى عنه، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ تَوَضَّأَ فَمَسَحَ بِنَاصِيَتِهِ وَعلَى العِمَامَةِ وَالخُفَّيْنِ. أَخرَجَهُ مُسْلِمٌ.

حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے وضو کیا تو اپنی پیشانی کے بالوں' پگڑی اور موزوں پر مسح کیا۔ (مسلم)

لغوی تشریح: ﴿ بناصیتہ ﴾ سر کا اگلا حصہ۔ جہاں سے بال کاٹے جاتے ہیں۔ یعنی وہ جگہ جہاں بال اگتے ہیں۔ یہ حصہ پیشانی سے متصل ہوتا ہے۔ ﴿ العمامۃ ﴾ اس کپڑے کو کہتے ہیں جو سر پر باندھا جاتا ہے اور سر پر باندھنے کیلئے اسے کئی بل دینے پڑتے ہیں۔ ﴿ الخفین ﴾ خف کا تثنیہ ہے۔ پاؤں میں ٹخنوں تک جو چیز پہنی جائے اسے خف یعنی موزہ کہتے ہیں جو چمڑے سے تیار ہوتا ہے۔

حاصل کلام: یہ حدیث اس پر دلالت کرتی ہے کہ محض پیشانی پر مسح کرنا کافی نہیں اور پگڑی پر مسح کے جمہور قائل نہیں۔ مگر علامہ ابن قیم نے زاد المعاد میں بیان کیا ہے کہ آپؐ کبھی صرف ننگے سر پر مسح فرما لیتے اور کبھی پگڑی پر اور کبھی پگڑی اور پیشانی سمیت دونوں پر اور فقط پیشانی پر مسح کرنا آپؐ سے ثابت نہیں ہے۔ یہ حدیث اس بات کا بھی ثبوت ہے کہ موزہ پر مسح کرنا جائز ہے اسی طرح یہ حدیث اس کا بھی ثبوت ہے کہ پگڑی پر مسح جائز اور درست ہے۔اس کی دو صورتیں ممکن ہیں۔ پہلی صورت یہ کہ کچھ مسح سر پر کیا جائے اور کچھ پگڑی پر۔ اس میں اختلاف نہیں ہے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ صرف پگڑی پر مسح کیا جائے۔ ترمذی میں منقول ایک صحیح حدیث سے یہ بھی ثابت ہے کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ' عمر رضی اللہ عنہ'

انس رضی اللہ عنہ کبار صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے علاوہ عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ ' حسن بصری رحمہ اللہ ' مکحول رحمہ اللہ ' ابو ثور رحمہ اللہ ' امام احمد رحمہ اللہ ' اوزاعی رحمہ اللہ ' اسحٰق بن راہویہ رحمہ اللہ اور وکیع رحمہ اللہ وغیرہ اس کے قائل ہیں۔ باقی ائمہ ثلاثہ محض پگڑی پر مسح کو ناکافی سمجھتے ہیں۔

راوی حدیث: ﴿ مغیرة بن شعبة رضی اللہ عنہ ﴾ ان کی کنیت ابو عبداللہ یا ابو عیسیٰ ہے۔ سلسلہ نسب یوں ہے۔ مغیرہ بن شعبہ بن مسعود ثقفی۔ مشہور و معروف صحابیؓ ہیں۔ غزوۂ خندق کے ایام میں مسلمان ہوئے اور ہجرت کر کے مدینہ آئے۔ صلح حدیبیہ میں شامل ہوئے۔ یہ ان کا پہلا معرکہ تھا جس میں وہ شریک ہوئے۔ امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کی طرف سے کوفہ کے گورنر مقرر ہوئے اور ۵۰ھ میں کوفہ ہی میں وفات پائی۔

(٤٤) وعَنْ جَابِرِ بْنِ عَبْدِ اللهِ رضي الله تعالى عنهما - فِيْ صِفَةِ حَجِّ النَّبِيِّ ﷺ - قَالَ ﷺ: «ابْدَءُوا بِمَا بَدَأَ اللَّهُ بِهِ». أَخرَجَهُ النَّسَائِيُّ هَكَذا بِلَفظِ الأَمْرِ، وَهُوَ عِنْدَ مُسْلِمٍ بِلَفظِ الخَبَرِ.

حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما نے نبی ﷺ کے حج کی تفصیل بیان کرتے ہوئے کہا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "آغاز اسی طرح کرو جس طرح اللہ تعالیٰ نے آغاز کیا ہے۔" (نسائی نے امر کے صیغہ کے ساتھ روایت کیا ہے یعنی حکماً فرمایا کہ "ابتدا کرو" جبکہ امام مسلم نے جملہ خبریہ میں اسے بیان کیا ہے یعنی ہم شروع کرتے ہیں)

لغوی تشریح: ﴿ فی صفة حجة النبی ﷺ ﴾ دراصل یہ اشارہ ہے اس لمبی حدیث کی طرف جو کتاب الحج میں بیان ہوئی ہے۔ ﴿ ابدو وابما بدا اللہ بہ ﴾ جس کا ذکر اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں پہلے فرمایا ہے۔ اسے عملاً پہلے انجام دیا جائے اور یہ بات معلوم ہے کہ حضور ﷺ نے یہ ارشاد اس وقت فرمایا جب آپؐ نے صفا و مروہ کے درمیان سعی کرنے کا ارادہ کیا اور اس بات کا عزم کیا کہ پہلے صفا سے سعی کا آغاز کیا جائے۔ اس لئے کہا کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن میں صفا کا ذکر پہلے کیا "ان الصفا والمروة من شعائر اللہ" (۲ : ۱۵۸) لیکن مصنف حدیث کا اتنا ٹکڑا وضو کے باب میں اس لئے لائے ہیں کہ لفظ کے عموم کی طرف اشارہ ہو جائے کہ یہ لفظ عام ہے کسی سبب کے ساتھ مخصوص نہیں ہے۔ اگرچہ یہ سعی کے مسئلہ کے بارے میں مخصوص طور پر ذکر کیا ہے لیکن اس کے لفظ کی عمومیت اس پر دلالت کرتی ہے کہ یہاں قاعدہ کلیہ کے ضمن میں وضو کی آیت بھی داخل ہے اور وہ ہے : "فاغسلوا وجوھکم وایدیکم الی المرافق وامسحوا برئوسکم وارجلکم الی الکعبین۔ (۵:۶) اس بنا پر وضو میں چہرہ پہلے دھویا جائے گا اور باقی ماندہ اعضاء علی الترتیب دھوئے جائیں گے اور لفظ الخبر لانے سے مراد ہے کہ ابدئووا کی بجائے نبدئا سے کہنا چاہئے۔ چنانچہ نسائی نے صیغہ امر(ابدووا) کے ساتھ اور مسلم نے جملہ خبریہ یعنی (نبداء) سے نقل کیا ہے۔

حاصل کلام: مصنف اس حدیث کو باب الوضو میں لا کر یہ بتانا چاہتے ہیں کہ اعضاء وضو کے دھونے میں

بھی ترتیب ملحوظ رکھنی چاہئے۔ قرآن نے جس عضو کو پہلے دھونے کا حکم دیا ہے اسے پہلے دھویا جائے جس طرح قرآن مجید نے مناسک حج کی ادائیگی کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا "ان الصفاء والمروۃ " یعنی سعی کا آغاز صفا سے کیا جائے اسی طرح وضو کی آیت میں جو ترتیب مذکور ہے اس کا لحاظ رکھا جائے اور آیت وضو میں چہروں کا دھونا پہلے مذکور ہے ہاتھ اور باقی اعضاء بعد میں ہیں۔ اسی ترتیب سے وضو کیا جانا چاہئے۔

راوی حدیث : ﴿ جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما ﴾ ان کی کنیت ابوعبداللہ ہے۔ انصار کے قبیلہ "سلم" سے تعلق کی بنا پر انصاری سلمی کہلائے۔ مشہور اور کبار صحابہ ؓ میں شمار ہوتے ہیں۔ آخر عمر میں بصارت سے محروم ہوگئے تھے۔ ۷۴ھ میں ۹۴ برس کی عمر پا کر فوت ہوئے۔ کہا گیا ہے کہ مدینہ منورہ میں وفات پانے والے سب سے آخری صحابی ہیں۔

(٤٥) وعَنْهُ قَالَ: كَانَ النَّبِيُّ ﷺ إِذَا تَوَضَّأَ أَدَارَ المَآءَ عَلَى مِرْفَقَيْهِ. أَخْرَجَهُ الدَّارَقُطْنِي بِإِسْنَادٍ ضَعِيفٍ.

حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما ہی سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ جب وضو کرتے تو اپنی کہنیوں پر اچھی طرح پانی ڈالتے۔ (اسے دارقطنی نے روایت کیا ہے اس کی سند ضعیف ہے۔)

لغوی تشریح : ﴿ ادار الما ﴾ پانی بہانا۔ اس حدیث کی سند میں قاسم بن محمد بن عقیل متروک راوی ہے۔

(٤٦) وعَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «لاَ وُضُوءَ لِمَنْ لَمْ يَذْكُرِ اسْمَ اللَّهِ عَلَيْهِ». أَخْرَجَهُ أَحْمَدُ وَأَبُو دَاوُدَ وَابْنُ مَاجَه بِإِسْنَادٍ ضَعِيفٍ. وَالتِّرْمِذِيُّ عَنْ سَعِيدِ بْنِ زَيْدٍ وَأَبِي سَعِيدٍ نَحْوَهُ. وَقَالَ أَحْمَدُ: لاَ يَثْبُتُ فِيهِ شَيْءٌ.

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے "وضو کا آغاز کرتے وقت جس نے پہلے بسم اللہ نہ پڑھی اس کا کوئی وضو نہیں۔" (اس حدیث کو احمد' ابوداؤد' ابن ماجہ نے روایت کیا ہے مگر ان کی بیان کردہ سند ضعیف ہے اور ترمذی نے یہ حدیث سعید بن زید سے روایت کی ہے اور اسی طرح اسے ابوسعید سے بھی روایت کیا ہے۔ امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ کا قول ہے کہ اس بارے میں کوئی چیز ثابت نہیں)

لغوی تشریح : ﴿ لا وضوء ﴾ یہ عبارت اس پر دلالت کرتی ہے کہ بسم اللہ کا پڑھنا وضو کیلئے رکن ہے یا شرط ہے۔ کیونکہ ظاہر عبارت سے کمال کی نفی نہیں بلکہ صحت اور وجود کی نفی مراد ہے۔ جیسا کہ لا (جو نفی جنس پر دلالت کرتا ہے) کی ہوتی ہے۔ امام احمد رحمہ اللہ نے گویا کہا ہے کہ اس باب میں کوئی چیز ثابت نہیں مگر اس کے مختلف طرق اور کثیر شواہد کی بنا پر حافظ ابن الصلاح' ابن کثیر اور علامہ عراقی وغیرہ نے اسے حسن کہا ہے۔ عصر حاضر میں علامہ البانی حفظہ اللہ نے بھی اسے حسن قرار دیا ہے۔ اس لئے وضو کی ابتدا میں بھی بہر نوع بسم اللہ پڑھنا چاہئے۔

حاصل کلام: ائمہ ثلاثہ کے نزدیک وضو کے آغاز میں بسم اللہ پڑھنا مسنون ہے۔ امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ اور داؤد ظاہری کے نزدیک وضو کے شروع میں بسم اللہ پڑھنا واجب ہے۔ اسحاق بن راہویہ کا قول ہے کہ جس نے عمداً بسم اللہ نہ پڑھی اس کا وضو نہیں ہوا۔

راوی حدیث: ﴿ سعید بن زید رضی اللہ عنہ ﴾ اس سے مراد سعید بن زید بن عمرو بن نفیل العدوی القرشی ہے۔ ان کی کنیت ابوالاعور ہے۔ ان خوش قسمت دس صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں سے ہیں جنہیں لسان رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم سے دنیا ہی میں جنت کی بشارت دی گئی ہے۔ یہ قدیم الاسلام صحابی ہیں۔ ان کی زوجیت میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی ہمشیرہ فاطمہ بنت خطاب رضی اللہ عنہا تھیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دائرہ اسلام میں آنے کا یہ دونوں حضرات ذریعہ اور سبب بنے۔ معرکہ بدر کے علاوہ باقی تمام غزوات میں شریک ہوئے۔ ۵۱ھ میں وفات پائی اور بقیع کے قبرستان میں دفن ہوئے۔

(٤٧) وعَنْ طَلْحَةَ بْنِ مُصَرِّفٍ عَنْ أَبِيهِ عَنْ جَدِّهِ قَالَ: رَأَيْتُ رَسُولَ اللهِ ﷺ يَفْصِلُ بَيْنَ الْمَضْمَضَةِ وَالاِسْتِنْشَاقِ. أَخْرَجَهُ أَبُو دَاوُدَ بِإِسْنَادٍ ضَعِيفٍ.

حضرت طلحہ بن مصرف رحمۃ اللہ علیہ اپنے باپ سے وہ اپنے دادا سے روایت کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بچشم خود دیکھا ہے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کلی اور ناک کیلئے الگ الگ پانی لیتے تھے۔ (اس روایت کو ابوداؤد نے ضعیف سند کے ساتھ روایت کیا ہے)

لغوی تشریح: ﴿ یفصل ﴾ یفرق کے معنی میں، جس کے معنی فرق کرنا ہے۔ یعنی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کلی کرنے کیلئے پانی الگ لیتے تھے اور ناک میں پانی چڑھانے کیلئے الگ لیتے تھے۔

حاصل کلام: اس حدیث سے کلی کے الگ اور ناک کیلئے الگ پانی لینا ثابت ہوتا ہے۔ مصنف نے اس روایت کو سند کے اعتبار سے ضعیف قرار دیا ہے، کیونکہ اس کی سند میں مصرف بن کعب مجہول اور لیث بن ابی سلیم راوی ضعیف ہے۔ اس کے برعکس بخاری اور مسلم کی احادیث میں یہ مذکور ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ایک ہی چلو سے ناک میں بھی پانی چڑھا لیتے اور کلی بھی کر لیتے تھے، جیسا کہ آئندہ حدیث کے تحت آ رہا ہے۔

راوی حدیث: ﴿ طلحہ بن مصرف ﴾ ان کی کنیت ابومحمد یا ابوعبداللہ ہے۔ مصرف کا اعراب۔ "میم" کا ضمہ اور "راء" پر کسرہ اور تشدید۔ تابعین میں ثقہ شمار کئے گئے ہیں۔ طبقہ خامسہ میں سے ہیں۔ بہترین قاری اور فاضل شخصیت ہیں۔ ۱۱۲ھ میں وفات پائی۔ البتہ ان کے والد مصرف مجہول الحال ہیں۔

﴿ عن جدہ ﴾ ان کا نام کعب بن عمرو یا عمرو بن کعب بن جحدب الیامی رضی اللہ عنہ ہے۔ یمن کے قبائل ہمدان میں مشہور و معروف قبیلہ "یام" کی جانب منسوب ہونے کی بنا پر یامی کہلاتے ہیں۔ ابن عبدالبر کے قول کے مطابق انہوں نے کوفہ میں سکونت اختیار کر لی تھی۔ صحابی ہیں۔ کچھ لوگوں نے ان کی صحابیت سے انکار کیا ہے لیکن انکار کرنے والوں کے انکار کی کوئی وجہ نہیں۔

(٤٨) وعَنْ عَلِيٍّ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ - فِي صِفَةِ الوُضُوءِ -: ثُمَّ تَمَضْمَضَ ﷺ وَاسْتَنْثَرَ ثَلاَثاً، يُمَضْمِضُ وَيَنْثُرُ مِنَ الكَفِّ الَّذِيْ يَأْخُذُ مِنْهُ المَآءَ. أخرَجَهُ أبُو دَاوُدَ وَالنَّسَائِيُّ.

حضرت علی رضی اللہ عنہ سے وضو کے بیان کے بارے میں روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے تین بار کلی کی اور ناک میں پانی ڈالا۔ آپؐ کلی اور ناک میں پانی اسی ہاتھ سے داخل کرتے جس سے پانی لیتے تھے۔ (ابوداوٗد' نسائی)

لغوی تشریح: ﴿ یمضمض وینثر من الکف الذی یاخذ منہ الماء ﴾ یعنی چلو بھر پانی لیتے۔ اس میں سے کلی کرنے کیلئے کچھ پانی منہ میں داخل کرتے اور بقیہ پانی ناک میں چڑھاتے۔ یہ عمل آپؐ تین مرتبہ فرماتے۔ یہاں ﴿ ینثر ﴾ سے دراصل استنشاق مراد ہے۔ یعنی پانی ناک میں ڈالنا۔

حاصل کلام: اس حدیث سے ثابت ہوا کہ ایک ہی چلو پانی منہ اور ناک دونوں کیلئے استعمال ہو سکتا ہے اور نیز یہ بھی ثابت ہوا کہ اس عمل کو حضور ﷺ تین مرتبہ کرتے تھے اور نسائی کی روایت میں صراحت ہے کہ آپؐ ناک بائیں ہاتھ سے جھاڑتے تھے۔ منہ اور ناک میں پانی دائیں ہاتھ سے داخل کرتے۔

(٤٩) وعَنْ عَبْدِ اللهِ بْنِ زَيْدٍ رضي الله تعالى عنه - فِيْ صِفَةِ الوُضُوءِ -: ثُمَّ أَدْخَلَ ﷺ يَدَهُ فَمَضْمَضَ وَاسْتَنْشَقَ مِنْ كَفٍّ وَاحِدٍ، يَفْعَلُ ذَلِكَ ثَلاَثاً. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت عبداللہ بن زید رضی اللہ عنہما سے وضو کے سلسلہ بیان میں مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے اپنا ہاتھ پانی میں ڈالا' پھر کلی کی اور ناک میں پانی چڑھایا' ایک ہی چلو سے' ایسا آپؐ نے تین مرتبہ کیا۔ (بخاری و مسلم)

لغوی تشریح: ﴿ من کف واحد ﴾ کف مذکر اور مؤنث دونوں طرح استعمال ہوتا ہے۔ مراد ہے پانی کا ایک چلو (چلو بھر پانی) آپؐ نے کلی کرنے کیلئے تھوڑا سا پانی منہ میں ڈالا اور باقی پانی ناک جھاڑنے کیلئے ناک میں چڑھایا۔

حاصل کلام: دونوں احادیث کلی اور ناک میں پانی چڑھانے کیلئے ایک ہی چلو کے کفایت کرنے پر دلالت کرتی ہیں۔ طلحہ بن مصرف کی حدیث علیحدگی اور تفریق کی مقتضی ہے' لیکن وہ مصرف کے مجہول الحال ہونے کی بنا پر ضعیف ہے۔ صاحب السبل نے اپنی رائے اس طرح دی ہے کہ دونوں طرح کی روایات یعنی جمع اور عدم جمع کے بارے میں اقرب بات یہ ہے کہ اختیار دیا گیا ہے' دونوں میں سے جس پر عمل کر لے۔ دونوں مسنون ہیں۔ اگرچہ جمع کرنے کی روایات تعداد میں بھی زیادہ ہیں اور صحیح بھی ہیں۔ اس لئے انصاف کا تقاضا ہے کہ جو روایات صحیح اور متعدد ہیں وہ راجح اور دوسری مرجوح ہیں۔

(٥٠) وَعَنْ أَنَسٍ رضي الله تعالى

حضرت انس رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم

عنه قَالَ: رَأَى النَّبِيُّ ﷺ رَجُلاً وَفِي قَدَمِهِ مِثْلَ الظُّفْرِ لَمْ يُصِبْهُ المَآءُ، فَقَالَ: «ارْجِعْ فَأَحْسِنْ وُضُوءَكَ». أَخْرَجَهُ أَبُو دَاوُدَ وَالنَّسَائِيُّ.

ﷺ کی نظر ایک ایسے آدمی پر پڑی جس کے پاؤں کی ناخن برابر جگہ پر پانی نہ پہنچا یعنی خشک رہ گئی۔ آپؐ نے اسے حکم دیا کہ "واپس جاؤ اور اچھی طرح عمدہ طریق سے وضو کرو۔" (اسے ابوداؤد اور نسائی نے روایت کیا ہے)

حاصل کلام: یہ حدیث اس پر واضح دلیل ہے کہ سارا پاؤں دھونا فرض ہے۔ ایک دوسری حدیث میں جسے مسلم نے روایت کیا ہے کہ پاؤں کا جتنا حصہ خشک رہ گیا اس کیلئے آگ ہے۔ ابوداؤد میں بھی خالد بن معدانؓ سے ایک روایت اسی معنی میں منقول ہے کہ آپؐ نے ایک آدمی کو نماز پڑھتے دیکھا کہ اس کے قدم کی پشت پر تھوڑا سا خشک داغ تھا۔ آپؐ نے اسے حکم دیا کہ جا پہلے تازہ وضو کر اور پھر نماز پڑھ۔ یہ اور اسی قبیل کی دوسری روایات اس پر دال ہیں کہ پاؤں کو دھونا فرض ہے، مسح ناکافی ہے۔ انہی احادیث کی روشنی میں ائمہ اربعہ اہل سنت اور مجتہدین امت نے بالاتفاق پاؤں کے دھونے کو فرض قرار دیا۔ جو لوگ پاؤں کے دھونے کو فرض قرار نہیں دیتے اور مسح کے قائل ہیں۔ ان احادیث سے ان کے نظریئے کی تردید ہوتی ہے۔

(۵۱) وعَنْهُ قَالَ: كَانَ رَسُولُ اللهِ ﷺ يَتَوَضَّأُ بِالمُدِّ، وَيغْتَسِلُ بِالصَّاعِ إِلَى خَمْسَةِ أَمْدَادٍ. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت انس رضی اللہ عنہ ہی سے یہ روایت بھی ہے کہ رسول اللہ ﷺ "مد" پانی سے وضو اور "صاع" یعنی چار سے پانچ مد تک پانی سے غسل کر لیا کرتے تھے۔ (بخاری و مسلم)

لغوی تشریح: ﴿الصاع﴾ چار مد کا ہوتا ہے اور مد ۱/۳۔۱ رطل کا ہوتا ہے۔ صاع موجود زمانہ کے پیمانہ کے حساب سے ۲.۵۰ کلوگرام ہوتا ہے۔ حدیث سے ظاہر طور پر تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ نبی ﷺ عموماً غسل کیلئے چار یا پانچ مد پانی استعمال فرماتے تھے۔

حاصل کلام: وضو اور غسل کیلئے حتی الوسع اتنا ہی پانی استعمال کرنے کی کوشش کرنی چاہئے جتنا نبی کریم ﷺ نے کیا ہے۔ بلاوجہ ضرورت سے زائد پانی استعمال کرنا اسراف میں شمار ہوگا۔ جو شریعت کی رو سے پسندیدہ نہیں ہے۔ مسلم میں ایک "فرق" پانی سے آنحضور ﷺ کے غسل کرنے کی روایت بھی منقول ہے۔ فرق ایک برتن ہوتا تھا جس میں تقریباً ساڑھے نو سیر پانی آتا تھا۔ اس سے یہ معلوم نہیں ہوتا کہ وہ لبالب بھرا ہوا تھا بلکہ ایک روایت میں تو یہ ذکر بھی ہے کہ حضرت عائشہؓ اور حضور ﷺ دونوں ایک فرق" سے غسل فرما لیا کرتے تھے۔ اسی بنا پر امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ اور امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا ہے کہ ان احادیث میں پانی کی مقدار متعین کرنا مقصود نہیں بلکہ یہ ذکر کرنا ہے کہ رسول اللہ ﷺ اتنے پانی سے وضو یا غسل کر لیا کرتے تھے۔

(٥٢) وعَنْ عُمَرَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «مَا مِنْكُمْ مِنْ أَحَدٍ يَتَوَضَّأُ فَيُسْبِغُ الوُضُوءَ، ثُمَّ يَقُولُ: أَشْهَدُ أَنْ لاَ إِلَهَ إِلاَّ اللَّهُ، وَحْدَهُ لاَ شَرِيكَ لَهُ، وأَشْهَدُ أَنَّ مُحَمَّداً عَبْدُهُ وَرَسُولُهُ، إِلاَّ فُتِحَتْ لَهُ أَبْوَابُ الجَنَّةِ». أَخرَجَهُ مُسْلِمٌ وَالتِّرْمِذِيُّ، وَزَادَ: «اللَّهُمَّ اجْعَلْنِي مِنَ التَّوَّابِينَ وَاجْعَلْنِيْ مِنَ المُتَطَهِّرِيْنَ».

حضرت عمر رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا "تم میں سے کوئی بھی ایسا نہیں کہ وہ وضو کرے اور خوب اچھی طرح کرے پھر یوں کہے کہ میں اس بات کی شہادت دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی الٰہ نہیں' اس کا کوئی ساجھی و شریک نہیں اور نیز میں اس بات کی بھی شہادت دیتا ہوں کہ محمد ﷺ اس کے بندے اور رسول ہیں' مگر اس کیلئے جنت کے آٹھوں دروازے کھول دیئے جاتے ہیں کہ اب جس دروازے سے چاہے داخل جنت ہو۔" (مسلم' ترمذی) اور ترمذی نے اتنا اضافہ کیا ہے کہ "اے اللہ مجھے توبہ کرنے اور پاک رہنے والوں میں سے کر دے۔"

لغوی تشریح: ﴿ الا فتحت ﴾ یہ الا استثناء کا ہے۔ اس سے مراد کلام اول میں جو حصر ہے اس کی نفی مقصود ہے اور ﴿ فتحت ﴾ صیغہ مجہول ہے۔ اس صورت میں معنی یہ ہیں کہ قیامت کے روز کھولے جائیں گے۔ صیغہ ماضی سے تعبیر کرنے سے مقصود یہ ہے کہ اس کا وقوع یقینی اور حتمی ہے جس طرح ماضی کے گزر جانے کا یقین ہوتا ہے اسی طرح اس کا واقع ہونا بھی یقینی اور لابدی امر ہے۔ ﴿ وزاد ﴾ سے مراد یہ ہے کہ ترمذی نے ﴿ محمدا عبده ورسوله ﴾ نقل کرنے کے بعد "اللهم اجعلني ....الخ" کے الفاظ مزید نقل کئے ہیں اور ﴿ التواب ﴾ میں "واوَ" مشدد ہے جس کے معنی ہیں جو شخص کثرت سے توبہ کرنے والا ہو۔

راوی حدیث: ﴿ عمر رضی اللہ عنہ ﴾ سے مراد عمر بن الخطاب بن نفیل بن عبدالعزی رضی اللہ عنہ۔ کنیت ابو حفص ہے۔ نادر الوجود شخصیت تھے۔ مسلمانوں کے دوسرے خلیفہ تھے۔ انہوں نے آفاق ارض کو حکم' عدل اور فتوحات سے بھر دیا تھا۔ دور جاہلیت میں قبیلہ قریش کے سفیر تھے۔ ٦ نبوت ذی الحجہ کو دارارقم میں دست نبوت پر بیعت کر کے دائرہ اسلام میں داخل ہوئے۔ ان کے قبول اسلام میں ان کے بہنوئی سعید رضی اللہ عنہ اور بہن فاطمہ رضی اللہ عنہا کا بڑا کردار ہے۔ سارے غزوات میں شریک رہے مگر تبوک میں شرکت نہ کر سکے۔ ان کے عہد خلافت میں فتوحات کا سیلاب امنڈ آیا تھا۔ عراق' فارس' شام اور مصر وغیرہ کے علاقے اسلامی سلطنت کی حدود میں شامل ہوئے۔ مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ کے غلام ابو لولو کے اقدام سے مقام شہادت پر فائز ہوئے۔ یہ شہادت کا واقعہ ۲۴ھ محرم کا ہے۔

٥ - بَابُ المَسحِ عَلَى الخُفَّينِ — موزوں پر مسح کرنے کا بیان

(٥٣) عَنِ المُغِيْرَةِ بْنِ شُعْبَةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: كُنْتُ مَعَ النَّبِيِّ ﷺ، فَتَوَضَّأَ فَأَهْوَيْتُ لِأَنْزِعَ خُفَّيْهِ، فَقَالَ: «دَعْهُمَا فَإِنِّي أَدْخَلْتُهُمَا طَاهِرَتَيْنِ» فَمَسَحَ عَلَيْهِمَا. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ میں نبی ﷺ کے ساتھ تھا' آپؐ نے وضو کرنا شروع کیا تو میں آپؐ کے موزے اتارنے کیلئے لپکا۔ آپؐ نے فرمایا "چھوڑ دو میں نے جب یہ موزے پہنے تھے تو میں وضو سے تھا۔" پھر آپؐ نے ان پر مسح فرمایا۔ (بخاری و مسلم)

لغوی تشریح: ﴿فاھویت﴾ میں نے اپنے ہاتھوں سے مدد لی' سہارا لیا یا پھر یہ معنی ہیں' حالت قیام سے نیچے کی طرف بیٹھنے کیلئے جھکا۔ ﴿لانزع﴾ اخرج کے معنی میں ہے کہ میں نکالوں۔ ﴿خفیه﴾ آپؐ کے موزے پاؤں سے نکالوں۔ ﴿دعھما﴾ اترک کے معنی میں آیا یعنی موزوں کو چھوڑ دو۔ ﴿طاھرتین﴾ حال واقع ہو رہا ہے معنی یہ ہوئے کہ دونوں پاؤں پاک ہیں۔ اس لئے موزوں کو نہ نکالو اور ابوداؤد کی ایک روایت میں ہے کہ میں نے موزوں میں پاؤں جب داخل کئے ہیں اس وقت وہ پاک تھے۔

حاصل کلام: اس حدیث سے یہ ثابت ہوا کہ موزوں پر مسح اسی صورت میں درست اور جائز ہے جبکہ وضو کر کے پہنے گئے ہوں۔ ابوداؤد اور مؤطا امام مالک میں یہ صراحت موجود ہے کہ یہ واقعہ غزوۂ تبوک کے موقع پر نماز فجر کے وقت پیش آیا۔

(٥٤) وللأَرْبَعَةِ عَنْهُ إِلاَّ النَّسَائِيَّ: أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ مَسَحَ أَعْلَى الخُفِّ وَأَسْفَلَهُ. وَفِي إِسْنَادِهِ ضَعْفٌ.

نسائی کے علاوہ باقی سنن کی چاروں کتابوں میں مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ ہی سے یہ الفاظ منقول ہیں کہ نبی ﷺ نے موزوں کے اوپر اور نیچے دونوں جانب مسح کیا۔ (اس روایت کی سند ضعیف ہے)

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ موزوں پر مسح اوپر اور نیچے دونوں جانب ہونا چاہئے۔ مگر یہ روایت ضعیف ہے اور صحیح حسن روایت کے مخالف ہے جیسا کہ آئندہ حدیث میں آرہا ہے۔ ابوداؤد' ترمذی اور ابن ماجہ میں منقول اس روایت کے ضعیف ہونے کی وجہ یہ ہے کہ اس کی سند میں ثور بن یزید ہے جو رجاء بن حیوۃ کے واسطہ سے بیان کرتا ہے اور امام ابوداؤد رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ ثور کا رجاء سے سماع ثابت نہیں۔ اس لئے یہ روایت ضعیف ہے۔

(٥٥) وعَنْ عَلِيٍّ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: لَوْ كَانَ الدِّينُ بِالرَّأْيِ لَكَانَ أَسْفَلُ الخُفِّ أَوْلَى بِالمَسْحِ

حضرت علی رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ "اگر دین کا دارومدار رائے اور عقل پر ہوتا تو پھر موزوں کی نچلی سطح پر مسح اوپر کی بہ نسبت زیادہ قرین قیاس تھا۔ میں

مِنْ أَعْلاَهُ، وَقَدْ رَأَيْتُ رَسُولَ اللهِ ﷺ يَمْسَحُ عَلَى ظَاهِرِ خُفَّيْهِ. أخرجهُ أبو داوُد بإسْنَادٍ حسَن.

نے خود رسول اللہ ﷺ کو موزے کے بالائی حصہ پر مسح کرتے دیکھا ہے۔" (ابوداؤد نے اس کو حسن سند کے ساتھ روایت کیا ہے)

حاصل کلام: اس کا مطلب یہ ہے کہ احکام دین کی بنیاد وحی الٰہی پر ہے عقل و رائے پر نہیں۔ اگر عقل پر اس کا انحصار اور دارومدار ہوتا تو موزوں کی بالائی سطح پر مسح کبھی جائز نہ ہوتا' بلکہ نچلی سطح پر ہوتا' کیونکہ گندگی سے آلودہ نچلا حصہ ہوتا ہے۔ لہٰذا نص صحیح کی موجودگی میں عقل اور رائے پر عمل کرنا درست نہیں۔

(٥٦) وَعَنْ صَفْوَانَ بْنِ عَسَّالٍ رضي الله تعالى عنه قَالَ: كَانَ النَّبِيُّ ﷺ يَأْمُرُنا إِذَا كُنَّا سَفراً أَن لاَّ نَنْزِعَ خِفَافَنَا ثَلاَثَةَ أَيَّامٍ ولَيَالِيَهُنَّ إلاَّ مِنْ جَنَابَةٍ، وَلَكِنْ مِنْ غَائِطٍ وَبُولٍ وَنَوْمٍ. أخرجهُ النَّسَائِيُّ والتِّرْمِذِيُّ، وَاللَّفْظُ لَهُ، وابْنُ خُزَيْمَةَ وصَحَّحاهُ

حضرت صفوان بن عسال رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ جب ہم مسافر ہوتے تو رسول اللہ ﷺ ہمیں حکم دیتے کہ ہم تین دن اور تین راتیں موزے نہ اتاریں' الا یہ کہ حالت جنابت لاحق ہو جائے۔ البتہ بیت الخلاء جانے کی صورت میں' پیشاب اور نیند کی وجہ سے اتارنے کی ضرورت نہیں۔" (اسے نسائی اور ترمذی نے روایت کیا ہے۔ یہ الفاظ ترمذی میں منقول روایت کے ہیں۔ ترمذی اور ابن خزیمہ دونوں نے اس کو صحیح قرار دیا ہے)

لغوی تشریح: ﴿ سفرا ﴾ یعنی مسافرین سین کے فتح اور "فاء" کے سکون کے ساتھ۔ مسافر کی جمع ہے جسے "رکب" اور "تجر" راکب اور تاجر کی جمع ہے اور ﴿ خفاف ﴾ خف کی جمع ہے اور ﴿ الامن جنابہ" ﴾ اور ﴿ ان لا ننزع ﴾ میں جو نفی ہے اس سے استثناء ہے۔ جنابت کی حالت لاحق ہونے کی صورت میں موزے اتارنے ضروری ہیں۔ خواہ ابھی مدت پوری نہ ہوئی ہو۔ البتہ بول و براز اور نیند کی وجہ سے موزے اتارنے کی ضرورت نہیں۔ ہاں تین شب و روز مدت پوری ہونے پر اتارنا پڑیں گے۔

حاصل کلام: موزوں پر مسح بلااختلاف جائز ہے۔ موزوں پر مسح کی روایات بیان کرنے والے صحابہ رضی اللہ عنہم کی تعداد اسی (٨٠) کے لگ بھگ ہے۔ جن میں عشرہ مبشرہ بھی شامل ہیں۔ علامہ ابن عبدالبر نے اس کے ثبوت پر اجماع نقل کیا ہے۔ امام کرخی کی رائے ہے کہ مسح خفین کی احادیث تواتر کی حد تک پہنچتی ہیں۔ انکار کرنے والے کے بارے میں ان کا قول ہے کہ مجھے ان کے کفر کا اندیشہ ہے۔

مقیم اور مسافر کی مدت مختلف ہے مسافر کیلئے تین شب و روز اور مقیم کیلئے ایک دن رات شرعی حد ہے۔ مدت کا آغاز وضو ٹوٹنے کے وقت سے شروع ہوگا' موزہ پہننے کے وقت سے نہیں' مثلاً ایک شخص نماز ظہر کے وقت وضو کر کے موزے پہنتا ہے اور اس کا وضو شام کو جا کر ٹوٹتا ہے تو اس کیلئے آغاز مدت

شام کا وقت ہوگا۔ مسح کا طریقہ اس طرح ہے کہ ہاتھ کی پانچوں انگلیوں کو پانی سے تر کرکے ان کے پوروں کو پاؤں کی انگلیوں سے پنڈلی کے آغاز تک کھینچ لے جائے۔ حدث لاحق ہونے کی صورت میں اگر موزہ اتار لیا جائے تو مسح ٹوٹ جاتا ہے اور اختتام مدت کے بعد بھی مسح ٹوٹ جاتا ہے۔

راوی حدیث: ﴿ صفوان رضی اللہ عنہ ﴾ "صاد" کی فتحہ اور "فاء" کے سکون کے ساتھ۔ بن عسال عین کے فتح اور سین کی تشدید۔ صفوان بن عسال مرادی الجملی۔ مشہور و معروف صحابی ہیں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی قیادت میں لڑے جانے والے ۱۲ غزوات میں شریک ہوئے۔ کوفہ میں سکونت اختیار کی۔ کہا جاتا ہے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں سے عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے ان سے روایت کی ہے۔

(٥٧) وعَنْ عَلِيٍّ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: جَعَلَ النَّبِيُّ ﷺ ثَلاَثَةَ أَيَّامٍ وَلَيَالِيَهُنَّ لِلْمُسَافِرِ، وَيَوماً وَلَيْلَةً لِلْمُقِيْمِ، يَعْنِيْ فِي المَسْحِ عَلَى الخُفَّيْنِ. أَخْرَجَهُ مُسْلِمٌ.

حضرت علی رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مسافر کیلئے موزوں پر مسح کے لئے تین شب و روز اور مقیم کیلئے ایک دن رات مدت مقرر فرمائی ہے۔ (مسلم)

(٥٨) وعَنْ ثَوْبَانَ رضي الله تعالى عنه قَالَ: بَعَثَ رَسُولُ اللهِ ﷺ سَرِيَّةً فَأَمَرَهُمْ أَنْ يَمْسَحُوا عَلَى العَصَائِبِ، يَعْنِي العَمَائِمَ، وَالتَّسَاخِيْنَ، يَعْنِي الخِفَافَ. رَوَاهُ أَحْمَدُ وَأَبُو دَاوُدَ، وَصَحَّحَهُ الحَاكِمُ.

حضرت ثوبان رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک سریہ (یعنی چھوٹا لشکر) روانہ فرمایا اور انہیں پگڑیوں اور موزوں پر مسح کرنے کا حکم دیا۔ (اسے احمد اور ابوداؤد نے روایت کیا ہے اور حاکم نے اسے صحیح قرار دیا ہے)

لغوی تشریح: ﴿ سریۃ ﴾ سین پر فتح "راء" پر کسرہ اور "یا" پر تشدید۔ چھوٹا سا لشکر جسے دشمن کے علاقہ میں بھیجا جاتا۔ اہل مغازی نے سریہ اس کو قرار دیا ہے جس میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم بنفس نفیس شامل نہ ہوئے ہوں اور جس میں آپ ؐ نے شمولیت بصورت قیادت فرمائی اسے علمائے مغازی کی اصطلاح میں غزوہ کہتے ہیں اور اس مقام پر اصطلاحی معنی مراد ہیں۔ ﴿ عصائب ﴾ عصابۃ کی جمع ہے اور ﴿ عمائم ﴾ عمامۃ کی جمع ہے۔ عصابۃ کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ اس کے ساتھ سر کو باندھا جاتا ہے اور ﴿ تساخین ﴾ "تاء" کے فتح کے ساتھ تسخان کی جمع ہے۔ جن کے معنی بالترتیب کسی راوی نے پگڑی اور موزہ کے کئے ہیں۔ عصابۃ تو دراصل پٹیوں کیلئے استعمال ہوتا ہے۔ یہ اس کے حقیقی معنی نہیں بلکہ مرادی معنی ہیں۔ ابن ارسلان نے کہا کہ التساخین ہر اس چیز پر بولا جاتا ہے جس سے پاؤں سردی سے بچ سکیں خواہ وہ موزہ ہو یا جراب۔

حاصل کلام: پٹیوں سے مراد ایسی پٹیاں بھی ہو سکتی ہیں جو زخمیوں کے زخموں پر باندھی جاتی ہیں یا کسی کا باوز یا ٹانگ ٹوٹنے کی صورت میں لکڑی کی پھٹیاں رکھ کر باندھ دیتے ہیں انہی کو عصائب کہا جاتا ہے۔ جنگ کیلئے روانہ کرتے وقت اس قسم کا حکم دینا بظاہر تو یہی معنی رکھتا ہے کہ معرکہ آرائی کے دوران زخمی حضرات اعضاء وضو دھونے کی بجائے زخم کی پٹیوں ہی پر مسح کر لیا کریں۔ ابوداؤد میں ہے کہ سریہ سے واپسی پر صحابہ کرامؓ نے سردی کی شکایت کی تو آپؐ نے پگڑی اور تساخین پر مسح کا حکم دیا۔

راوی حدیث: ﴿ثوبان بن بجدد بن جحدر رضی اللہ عنہ﴾ ان کی کنیت ابو عبداللہ تھی۔ ثوبان کا اعراب۔ "ثاء" پر فتح "واؤ" ساکن۔ اور بجدد میں "با" کے ضمہ جیم ساکن اور دال اول پر ضمہ اور دال ثانی ساکن اور بن جحدار میں جیم پر فتح "حاء" ساکن' دال پر فتح۔ یہ سراۃ کے باشندے تھے جو مکہ و مدینہ کے مابین ایک جگہ کا نام ہے اور یہ بھی کہا گیا کہ حمیر قبیلہ میں سے تھے۔ زندگی بھر حضر و سفر میں رسول اللہ ﷺ کے ہم رکاب رہے اور ہر طرح کی خدمت بجا لاتے رہے۔ ان کو نبی کریم ﷺ نے خرید کر آزادی سے ہمکنار کیا تھا۔ آپؐ کی وفات کے بعد شام میں رہائش پذیر ہو گئے۔ شام سے پھر حمص کی طرف نقل مکانی کر گئے۔ ۵۴ھ میں وفات پائی۔

(٥٩) وعَنْ عُمَرَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ مَوْقُوفاً، وأنسٍ مَرْفوعاً: «**إِذَا تَوَضَّأَ أَحَدُكُمْ وَلَبِسَ خُفَّيْهِ فَلْيَمْسَحْ عَلَيْهِمَا، وَلْيُصَلِّ فِيهِمَا، وَلاَ يَخْلَعْهُمَا إِنْ شَاءَ إِلاَّ مِنْ جَنَابَةٍ**». أَخْرَجَهُ الدَّارَقُطْنِيُّ وَالحَاكِمُ وَصَحَّحَهُ.

حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے موقوف اور حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مرفوع روایت ہے کہ "جب تم میں سے کوئی موزے پہن کر وضو کرے تو ان پر مسح کر لینا چاہئے اور ان کو پہنے ہوئے نماز پڑھ لے۔ اگر چاہے تو ان کو نہ اتارے' الاّ یہ کہ غسل جنابت کی ضرورت پیش آجائے۔" (اسے دارقطنی نے روایت کیا اور حاکم نے اسے صحیح قرار دیا ہے۔)

لغوی تشریح: ﴿لا یخلعهما﴾ یعنی موزوں کو نہ کھینچے اور پاؤں سے انہیں نہ نکالے۔

(٦٠) وعَنْ أَبِي بَكْرَةَ رَضِي الله تَعالى عنه عَنِ النَّبيِّ ﷺ، أَنَّهُ رَخَّصَ لِلْمُسَافِرِ ثَلاَثَةَ أَيَّامٍ وَلَيالِيَهُنَّ، وَلِلْمُقِيمِ يَوْماً ولَيْلَةً، إِذَا تَطَهَّرَ فَلَبِسَ خُفَّيْهِ، أَنْ يَمْسَحَ عَلَيْهِمَا. أَخْرَجَهُ الدَّارَقُطْنِيُّ وَصَحَّحَهُ ابْنُ خُزَيْمَةَ.

حضرت ابوبکرہ رضی اللہ عنہ نے نبی ﷺ سے روایت بیان کی ہے کہ آپؐ نے مسافر کیلئے (مسح کی مدت) تین دن اور تین راتوں کی رخصت فرمائی ہے اور مقیم کیلئے ایک دن اور ایک رات۔ اس حالت میں کہ اس نے باوضو ہو کر موزے پہنے ہوں تو ان پر مسح کر لینا چاہئے۔ (دارقطنی نے اسے روایت کیا ہے اور ابن خزیمہ نے اسے صحیح قرار دیا ہے)

راوی حدیث: ﴿ابوبکرۃ رضی اللہ عنہ﴾ ان کا نام نفیع (تصغیر نافع کی) بن حارث ہے۔ یہ طائف کے قلعہ سے کچھ نوجوانوں کے ہمراہ چرخی کے ذریعہ باہر آئے۔ اسلام قبول کر لیا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو آزاد کر دیا۔ یہ کبار و فضلاء صحابہ میں شمار کئے جاتے ہیں۔ ۵۱ھ یا ۵۲ھ میں بصرہ میں وفات پائی۔ کثیر الاولاد تھے۔

(٦١) وعَنْ أُبَيِّ بْنِ عِمَارَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ أَنَّهُ قَالَ: يَا رَسُولَ اللهِ! أَمْسَحُ عَلَى الخُفَّيْنِ؟ قَالَ: **نَعَمْ**، قَالَ: يَوْماً؟ قَالَ: **نَعَمْ**، قَالَ: ويَوْمَيْنِ؟ قَالَ: **نَعَمْ**، قَالَ: وثَلاَثَةَ أَيَّامٍ؟ قَالَ: **نَعَمْ، وَمَا شِئْتَ**. أخرَجَهُ أَبُو دَاوُدَ، وَقَالَ: لَيْسَ بِالقَوِيِّ.

حضرت ابی بن عمارۃ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ میں نے عرض کیا یارسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم)! کیا میں موزوں پر مسح کر سکتا ہوں؟ فرمایا "ہاں کر سکتے ہو" عرض کیا ایک دن؟ آپؐ نے فرمایا "ہاں ایک دن" عرض کیا دو دن؟ آپ نے فرمایا "ہاں دو دن" میں نے عرض کیا تین دن؟ آپؐ نے فرمایا "ہاں تین دن اور جب تک تیری مرضی ہو"۔ (ابوداؤد نے اسے روایت کیا ہے اور ساتھ ہی کہا ہے کہ یہ حدیث قوی نہیں ہے)

حاصل کلام: اس حدیث کو اس کے ضعیف ہونے کی بنا پر اور صحیح و حسن احادیث جو مدت کی تعیین کرتی ہیں کے خلاف واقع ہونے کی وجہ سے نہیں لیا گیا۔ چونکہ حدیث کی سند صحیح نہیں اور وہ حدیث صحیح ہے جس میں مسافر کیلئے تین دن، تین راتیں اور مقیم کیلئے ایک دن اور ایک رات کی حد مقرر کر دی گئی ہے۔ صحیح اور قوی حدیث کے مقابلہ میں ضعیف کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔ امام نووی رحمۃ اللہ علیہ نے تو "شرح المہذب" میں اس حدیث کے ضعیف ہونے پر ائمہ حدیث کا اتفاق نقل کیا ہے اور امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ اس کے رجال غیر معروف ہیں۔ ابن الجوزی نے تو اس حدیث کو موضوع گردانا ہے۔

راوی حدیث: ﴿ابی بن عمارۃ رضی اللہ عنہ﴾ همزہ کے ضمہ "باء" کے فتح اور "یاء" پر تشدید۔ عمارۃ عین کے نیچے کسرہ اور کبھی اوپر ضمہ بھی پڑھا گیا ہے۔ مدینہ کے انصار میں سے مشہور صحابی ہیں۔ مصر میں سکونت پذیر ہوئے۔ ابن حبان کا قول ہے کہ یہ وہ صحابی ہیں جنہیں دو قبلوں (بیت المقدس اور بیت اللہ) کی جانب رخ کر کے نماز پڑھنے کا شرف و فضل حاصل ہے مگر اس کی حدیث و سند پر مجھے اعتماد نہیں ہے۔

٦ - بَابُ نَوَاقِضِ الوُضُوءِ — وضو توڑنے والی چیزوں کا بیان

(٦٢) عَنْ أَنَسٍ رضي الله تعالى عنه قَالَ: كَانَ أَصْحَابُ رَسُولِ اللهِ ﷺ عَلَى عَهْدِهِ يَنْتَظِرُونَ العِشَاءَ. حتَّى تَخْفِقَ رَءُوسُهُم، ثُمَّ يُصَلُّونَ وَلاَ يَتَوَضَّئُونَ. أَخْرَجَهُ أَبُو دَاوُدَ وَصَحَّحَهُ

حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ عہد رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم میں صحابہ کرامؓ نماز عشاء کا اتنا انتظار کرتے کہ غلبہ نیند کی وجہ سے ان کے سر جھک جاتے۔ مگر وہ از سر نو وضو کئے بغیر نماز پڑھ لیتے۔ (ابوداؤد نے روایت کیا ہے۔ دارقطنی نے اسے صحیح قرار دیا ہے اور اس کی

الدَّارَقُطْنِيُّ، وَأَصْلُه فِي مُسْلِمٍ. اصل مسلم میں ہے)

لغوی تشریح: ﴿ باب نواقض الوضو ﴾ نواقض' ناقض کی جمع ہے۔ اس سے مراد وہ چیزیں جن سے وضو ٹوٹ جاتا ہے۔ ﴿ تخفق ﴾ نیند کے غلبہ کی وجہ سے جھک جاتے۔ ﴿ روسھم ﴾ راس کی جمع ہے۔ جس کے معنی ہیں سر۔

حاصل کلام: یہ حدیث اس پر دلالت کرتی ہے جب تک انسان گہری نیند نہ سوئے اس وقت تک اس کا وضو نہیں ٹوٹتا۔ اس سے پہلے صفوان بن عسال کی روایت گزشتہ باب میں گزر چکی ہے جس میں مطلق نیند سے وضو کے ٹوٹنے پر دلالت ہوتی ہے۔ اس روایت کی روشنی میں اس کو بھی گہری نیند پر محمول سمجھا جائے گا یا یہ کہا جائے گا کہ اس حدیث میں نبی کریم ﷺ نے نیند سے مراد معمول کی نیند لی ہے اور صحابہ کرام اس نیند سے بھی واقف تھے جس سے وضو ٹوٹ جاتا ہے اور اس نیند سے بھی جس سے وضو نہیں ٹوٹتا۔ اس کی وضاحت اور بیان کی ضرورت نہیں۔ بہرصورت یہ بات معلوم ہوئی کہ ٹیک یا تکیہ لگا کر سونے کی صورت میں نیند ناقض وضو ہوگی بصورت دیگر نیند سے وضو نہیں ٹوٹتا۔ ٹیک لگانے یا تکیہ کا سہارا لینے کی حالت میں جسم انسانی کے جوڑ ڈھیلے ہو جاتے ہیں۔ ایسی صورت میں پیٹ سے ریح کے خروج کا غالب امکان ہوتا ہے' اسی بنیاد پر احتیاط کے پیش نظر وضو نئے سرے سے کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

(٦٣) وعَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهَا قَالَتْ: جَاءَتْ فَاطِمَةُ بِنْتُ أَبِي حُبَيْشٍ إِلَى النَّبِيِّ ﷺ فَقَالَتْ: يَا رَسُولَ اللهِ! إِنِّي امْرَأَةٌ أُسْتَحَاضُ فَلاَ أَطْهُرُ، أَفَأَدَعُ الصَّلاَةَ؟ قَالَ: «**لاَ، إِنَّمَا ذَلِكِ عِرْقٌ وَلَيْسَ بِحَيْضٍ، فَإِذَا أَقْبَلَتْ حَيْضَتُكِ فَدَعِي الصَّلاَةَ، وإِذَا أَدْبَرَتْ فَاغْسِلِي عَنْكِ الدَّمَ ثُمَّ صَلِّي**». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ فاطمہ بنت ابی حبیش رضی اللہ عنہا نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئی اور اس نے عرض کیا یارسول اللہ (ﷺ)! میں ایسی عورت ہوں جو ہمیشہ استحاضہ کے خون میں مبتلا رہتی ہوں' پاک ہوتی ہی نہیں۔ کیا ایسی حالت میں نماز چھوڑ دوں؟ آپؐ نے فرمایا "نہیں' یہ تو ایک رگ ہے (جو پھٹ جاتی ہے اور خون بہتا رہتا ہے) حیض کا خون نہیں ہے۔ ہاں جب ایام حیض شروع ہوں تو نماز کو چھوڑ دو اور جب یہ ایام پورے ہو جائیں تو خون دھو کر نماز پڑھو۔" (بخاری و مسلم)

وَلِلْبُخَارِيِّ: «ثُمَّ تَوَضَّئِيْ لِكُلِّ صَلاَةٍ». وَأَشَارَ مُسْلِمٌ إِلىٰ أَنَّهُ حَذَفَهَا عَمَداً.

اور بخاری میں مزید یہ الفاظ ہیں "پھر ہر نماز کے لئے وضو کرو" مسلم نے اشارہ کیا ہے کہ اسے انہوں نے عمداً چھوڑا ہے۔

لغوی تشریح: ﴿ استحاض ﴾ صیغہ مجہول واحد متکلم کا صیغہ ہے۔ استحاضہ ایام ماہواری کے مقرر اوقات کے علاوہ عورت کے اندام نہانی سے نکلنے والے خون کو کہتے ہیں۔ ﴿ افادع ﴾ اس میں ھمزہ استفہام کا ہے اور "فاء" تعقیب کیلئے ہے اور ﴿ ادع ﴾ ودع سے واحد متکلم کا صیغہ ہے۔ معنی یہ ہے کیا میں نماز چھوڑ دوں؟ ﴿ انما ذلک ﴾ اس میں "کاف" کے نیچے کسرہ ہے۔ اس لئے کہ مخاطب عورت ہے اور معنی یہ ہیں۔ خون کا بہنا۔ ﴿ عرق ﴾ عین کے کسرہ اور راء کے سکون کے ساتھ۔ معنی یہ ہوئے رگ سے خون بہنے کی وجہ سے۔ اس رگ کا نام عاذل یا عاذر ہے۔ ﴿ ولیس بحیض ﴾ یہ حیض کا خون نہیں کیونکہ وہ خون رگ کے پھٹنے سے جاری نہیں ہوتا بلکہ عورت کے رحم کے اندر سے خارج ہوتا ہے۔ ﴿ فاذا اقبلت حیضتک ﴾ "حا" پر فتح اور کسرہ بھی جائز ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جب حیض کا خون شروع ہو۔ ﴿ فدعی ﴾ چھوڑ دو۔ ﴿ واذا ادبرت ﴾ یہ مؤنث کا صیغہ ہے۔ فاعل واقع ہو رہا ہے اور ضمیر حیض کی جانب راجع ہے۔ مطلب یہ ہے جب خون بند ہو جائے۔ ﴿ ثم توضئی لکل صلاۃ ﴾ پھر ہر نماز کیلئے نیا وضو کرو۔ یہ اس بات پر دلالت ہے کہ استحاضہ ایسی ناپاکی ہے جو ناقض وضو ہے۔ اس باب میں اس حدیث کے لانے کی غرض یہی بتانا ہے کہ استحاضہ سے وضو ٹوٹ جاتا ہے۔

حاصل کلام: عورت کو تین طرح کے خون سے واسطہ پڑتا ہے۔ ایک حیض کا خون' یہ خون ہر ماہ عورت کے بالغ ہونے سے لے کر بڑھاپے تک ایام حمل کے علاوہ برابر آتا رہتا ہے۔ اس کا رنگ سیاہ ہوتا ہے اور دوسرا نفاس کا خون ہے یہ وہ خون ہوتا ہے جو بچہ کی پیدائش کے بعد تقریباً چالیس دن' یا اس سے کم و بیش زچگی میں آتا رہتا ہے۔ تیسرا خون استحاضہ کا ہے' یہ خون متذکرہ دونوں خونوں سے الگ نوعیت کا ہوتا ہے یہ ایک عاذل نامی رگ کے پھٹنے سے جاری ہوتا ہے اور مسلسل جاری رہتا ہے اور بیماری کی صورت اختیار کر لیتا ہے اس کا رنگ سرخ ہوتا ہے اس کے جاری ہونے کا کوئی مقرر و متعین وقت نہیں ہے' ساری عمر بھی جاری رہ سکتا ہے۔

راوی حدیث: ﴿ فاطمہ بنت ابی حبیش رضی اللہ عنہا ﴾ حبیش ۔ حبش کی تصغیر ہے۔ مشہور صحابیہ ؓ ہیں۔ قبیلہ قریش کی شاخ اسد سے تھیں۔ ان کے باپ کا نام قیس بن مطلب بن اسد بن عبدالعزی بن قصی۔ یہ عبداللہ بن جحش رضی اللہ عنہ کی زوجیت میں تھیں۔ بڑے رتبے والی تھیں۔ انہوں نے ہجرت بھی کی تھی۔

(٦٤) وعَنْ عَلِيٍّ بْنِ أَبِي طَالِبٍ رضي الله تعالى عنه قَالَ: كُنْتُ رَجُلاً مَذَّاءً فَأَمَرتُ المِقْدَادَ أَن يَسْأَلَ النَّبِيَّ ﷺ، فَسَأَلَهُ، فَقَالَ: فِيْهِ الوُضُوءُ. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ، وَاللَّفْظُ لِلْبُخَارِيِّ.

حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں کثرت سے مذی کے خارج ہونے کا مریض تھا۔ میں نے مقداد رضی اللہ عنہ سے کہا کہ وہ نبی کریم ﷺ سے اس کے متعلق دریافت کریں۔ مقداد رضی اللہ عنہ نے نبی ﷺ سے اس کے بارے میں دریافت کیا (کہ اس کی وجہ سے وضو کرنا ہو گا یا غسل جنابت؟) آپ ؐ نے فرمایا "ایسی حالت

میں وضو ہی ہے۔" (بخاری و مسلم' البتہ یہ الفاظ بخاری کے ہیں)

لغوی تشریح: ﴿ مذاء ﴾ ذال پر تشدید۔ مبالغہ کا صیغہ ہے۔ مطلب یہ ہے کہ مجھے بکثرت مذی خارج ہوتی رہتی ہے۔ مذی کیا ہے؟ مذی سفید' رقیق لیس دار پانی ہے جو بیوی سے چھیڑ چھاڑ کے وقت اور جماع کے ارادے کے وقت مرد کی شرمگاہ سے خارج ہوتی ہے۔ ﴿ فامرت المقداد ﴾ مقداد کو مسئلہ کی بابت پوچھنے کیلئے کہا۔ اس لئے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی زوجیت میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی لخت جگر فاطمہ رضی اللہ عنہا تھیں۔ حیا داری کے پیش نظر حضرت علی رضی اللہ عنہ نے براہ راست سوال کرنے سے گریز کیا۔

راوی حدیث: ﴿ مقداد رضی اللہ عنہ ﴾ میم کے کسرہ کے ساتھ۔ مقداد بن عمرو بن ثعلبہ البھرانی الکندی۔ ان کی کنیت ابوالاسود یا ابوعمرو ہے اور مقداد بن اسود کے نام سے مشہور ہیں اور اسود سے مراد اسود بن عبد یغوث الزھری ہے۔ اس لئے کہ اس نے مقداد کو متبنیٰ بنا لیا تھا اور جاہلیت میں اس کے ساتھ حلیفانہ تعلقات و روابط قائم کر لئے تھے۔ اسلام لانے والوں میں ان کا نمبر چھٹا ہے۔ دو مرتبہ ہجرت کے شرف سے شرف یاب ہوئے۔ کبار' فضلاء اور بہترین اوصاف و خصائل کے مالک صحابہ میں ان کا شمار ہوتا ہے۔ عہد رسالت میں واقع ہونے والے تمام غزوات میں شریک رہے۔ معرکہ بدر کے روز گھڑ سواروں میں شامل تھے۔ فتح مصر میں حاضر تھے۔ ۳۳ھ میں جوف کے مقام پر جو مدینہ سے تین میل کے فاصلہ پر واقعہ ہے' وفات پائی۔ ان کی میت کو اٹھا کر مدینہ لائے اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے نماز جنازہ پڑھائی اور قبرستان بقیع میں دفن کئے گئے۔ اس وقت ان کی عمر ۷۰ برس کی تھی۔

(٦٥) وَعَنْ عَائِشَةَ رضي الله تعالى عنها، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ قَبَّلَ بَعْضَ نِسَآئِهِ ثُمَّ خَرَجَ إِلَى الصَّلَاةِ وَلَمْ يَتَوَضَّأْ. أَخرَجَهُ أَحْمَدُ وَضَعَّفَهُ الْبُخَارِيُّ.

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا روایت کرتی ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی کسی اہلیہ کا بوسہ لیا اور نماز کے لئے نکل گئے اور وضو نہیں فرمایا۔ (اسے احمد نے روایت کیا ہے اور بخاری نے اسے ضعیف قرار دیا ہے)

حاصل کلام: حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے یہ روایت ابراہیم تیمی کرتے ہیں مگر ابراہیم نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے کچھ نہیں سنا۔ اس لئے یہ مرسل اور کمزور ہے۔ مگر بخاری میں ایک حدیث اس کی مؤید ہے۔ چنانچہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا ہی فرماتی ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم رات کی تاریکی میں نماز تہجد ادا فرمایا کرتے تھے۔ میرے پاؤں آپؐ کی سجدہ گاہ میں ہوتے تھے۔ سجدہ کیلئے جانے سے پہلے میرے پاؤں کو آپؐ اپنے ہاتھ سے چھوتے تو میں پاؤں دور کر لیتی۔ اس سے معلوم ہوا کہ عورت کے اعضاء جسم میں سے کسی کو چھونے سے وضو نہیں ٹوٹتا۔ اسی طرح بوسہ لینے اور محض چھونے سے بھی وضو نہیں ٹوٹتا خواہ شہوت سے چھوئے یا شہوت کے بغیر۔ صحابہ کرامؓ میں سے حضرت علی رضی اللہ عنہ اور عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما اس کے قائل ہیں اور ائمہ میں

سے امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا مذہب بھی یہی ہے۔ البتہ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک عورت کو چھونے سے وضو ٹوٹ جاتا ہے۔

(٦٦) وعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسولُ اللهِ ﷺ: «إِذَا وَجَدَ أَحَدُكُمْ فِي بَطْنِهِ شَيْئاً فَأَشْكَلَ عَلَيْه، أَخَرَجَ مِنْهُ شَيْءٌ أَمْ لاَ؟ فَلاَ يَخْرُجَنَّ مِنَ المَسْجِدِ، حَتَّى يَسْمَعَ صَوْتَاً أَوْ يَجِدَ رِيحاً». أَخْرَجَهُ مُسْلِمٌ.

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ”جب تم میں سے کوئی اپنے پیٹ میں ہوا کی حرکت محسوس کرے اور فیصلہ کرنا مشکل ہو جائے کہ آیا پیٹ سے کوئی چیز خارج ہوئی ہے یا نہیں تو ایسی صورت میں (وضو کرنے کیلئے) وہ مسجد سے باہر نہ جائے' تاوقتیکہ (یقین نہ ہو جائے) ہوا کے خارج ہونے کی آواز یا بدبو سے محسوس کرے۔“ (مسلم)

لغوی تشریح: ﴿ وجدفی بطنه شیئا ﴾ اپنے پیٹ میں کسی چیز کو محسوس کیا۔ گویا ریح گردش کر رہی ہے۔ ﴿ اشکل ﴾ مشتبہ ہو جائے۔ مشکل ہو جائے۔ ﴿ اخرج ﴾ ھمزہ اس میں استفہام کا ہے۔ یعنی اسے یہ شک میں مبتلا کر دے کہ آیا ریح خارج ہوئی ہے یا نہیں۔ ﴿ فلا یخرجن ﴾ محض شک اور تردد کی بنا پر نماز نہ توڑے۔ ﴿ حتی یسمع ﴾ تاآنکہ وہ ہوا کے بآواز خارج ہونے کو سنے ﴿ اویجدریحا ﴾ یا پھر بے آواز ہوا کا پیٹ سے خارج ہونے والی بدبو محسوس کرے۔ مقصود یہ ہے کہ انسان کو یقین ہو جائے کہ ہوا پیٹ سے خارج ہوئی ہے خواہ ان دو طریقوں کے علاوہ اور کوئی طریقہ ہو۔ ان دو کا بالخصوص ذکر محض اس لئے کیا ہے کہ اس باب میں یہی دو ذرائع غالب ہیں۔

حاصل کلام: اس حدیث کی رو سے صاف معلوم ہوا کہ شک کی وجہ سے وضو نہیں ٹوٹتا۔ اس مفہوم کو ذرا وسیع کریں تو اس سے ایک اصول کی طرف اشارہ بھی ملتا ہے کہ ہر چیز اپنے حکم پر قائم رہتی ہے' تاوقتیکہ اس کے برخلاف یقین و وثوق نہ ہو جائے۔ شک و تردد کوئی قابل اعتبار چیز نہیں۔

(٦٧) وعَنْ طَلْقِ بْنِ عَلِيٍّ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَجُلٌ: مَسَسْتُ ذَكَرِي، أَوْ قَالَ: الرَّجُلُ يَمَسُّ ذَكَرَهُ فِي الصَّلاَةِ أَعَلَيْهِ وُضُوءٌ؟ فَقَالَ النبي ﷺ: «لاَ إِنَّمَا هُوَ بَضْعَةٌ مِنْكَ». أَخْرَجَهُ الخَمْسَةُ، وَصَحَّحَهُ ابْنُ حِبَّانَ، وَقَالَ ابْنُ المَدِينِي: هُوَ

حضرت طلق بن علی رضی اللہ عنہ نے بیان کیا کہ ایک شخص نے کہا میں نے اپنی شرم گاہ کو ہاتھ لگایا ہے یا یوں کہا کہ ایک آدمی نماز میں اپنی شرم گاہ کو ہاتھ لگاتا ہے تو کیا اسے نئے سرے سے وضو کرنا چاہئے؟ تو نبی کریم ﷺ نے فرمایا ”نہیں' وہ تو تیرے اپنے جسم کا ایک ٹکڑا ہے' (اسے پانچوں نے روایت کیا ہے اور ابن حبان نے اسے صحیح قرار دیا ہے۔“ ابن مدینی کہتے ہیں

أَحْسَنُ مِنْ حَدِيْثِ بُسْرَةَ. بسرہ کی حدیث سے یہ حدیث بہت بہتر ہے)

لغوی تشریح: ﴿ اوقال ﴾ اس میں فاعل وہ ضمیر ہے جو اس میں مخفی ہے اور جس مرد کا پہلے ذکر آیا ہے اس کی طرف راجع ہے۔ ﴿ الرجل یمس ﴾ مبتداء اور خبر ﴿ بضعۃ ﴾ "باء" پر فتح اور کسرہ دونوں جائز ہیں اور "ضاد" ساکن ہے معنی اس کے گوشت کا ٹکڑا۔ ﴿ منک ﴾ سے مراد ہے کہ تیرے جسم کا ٹکڑا ہے جس طرح دیگر اعضاء جسم ہیں اسی طرح یہ بھی ہاتھ پاؤں کی طرح گوشت کا ٹکڑا ہے۔ یہ تو معلوم شدہ ہے کہ انسان اپنے جسم کے کسی دوسرے حصہ کو چھو کر وضو نہیں کرتا تو اسی طرح شرم گاہ کو چھو لینے سے بھی وضو کی ضرورت نہیں۔ جو بھی اس کلام پر غور و فکر کرے گا وہ سمجھ جائے گا کہ یہ قیاس و اجتہاد کی بنا پر تھا اور اس وقت شرم گاہ کو چھونے کے بارے میں نفی یا اثبات میں کوئی واضح حکم نہیں دیا تھا۔

حاصل کلام: علی بن عبداللہ جو ابن المدینی کے نام سے مشہور ہیں ۱۶۱ھ میں پیدا ہوئے اور ۲۲۴ھ میں وفات پائی۔ یہ امام بخاری رحمہ اللہ اور ابوداؤد کے اساتذہ میں سے ہیں۔ ترمذی نے کہا ہے بہت سے صحابہ رضی اللہ عنہم اور تابعین مس ذکر (یعنی شرمگاہ کو چھونے) سے وضو کے قائل نہ تھے۔ علی بن عبداللہ یعنی ابن المدینی اور ابن المبارک اور اہل کوفہ بھی اسی کے قائل ہیں۔ دوسری طرف بہت سے صحابہ رضی اللہ عنہم و تابعین مس ذکر سے وضو ٹوٹ جانے کے قائل ہیں' ان کی دلیل بسرہ کی روایت ہے جو آئندہ آرہی ہے۔ امام احمد رحمہ اللہ اور امام شافعی رحمہ اللہ اسی کے قائل ہیں۔

راوی حدیث: ﴿ طلق بن علی رضی اللہ عنہ ﴾ ابوعلی ان کی کنیت ہے۔ "طاء" پر فتح' "لام" ساکن ہے۔ نسب نامہ یوں ہے طلق بن علی بن طلق بن عمرو حنفی' سحیمی' یمامی۔ جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ منورہ میں تشریف لائے اسی وقت یہ آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور مسجد نبوی کی تعمیر میں زور و شور اور شوق سے حصہ لیا۔ کہتے ہیں کہ ان سے چودہ احادیث نبویہ مروی ہیں۔

(٦٨) وعَنْ بُسْرَةَ بِنْتِ صَفْوَانَ رضي الله تعالى عنها أَنَّ رَسُولَ اللهِ ﷺ قَالَ: «مَنْ مَسَّ ذَكَرَهُ فَلْيَتَوَضَّأْ». أَخْرَجَهُ الخَمْسَةُ، وَصَحَّحَهُ التِّرْمِذِيُّ وَابْنُ حِبَّانَ، وَقَالَ البُخَارِيُّ: هُوَ أَصَحُّ شَيْءٍ فِي هَذَا البَابِ.

بسرہ بنت صفوان رضی اللہ عنہا کہتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "جس نے اپنی شرم گاہ کو ہاتھ لگایا اسے وضو کرنا چاہیے۔" (اسے پانچوں نے روایت کیا ہے۔ ترمذی اور ابن حبان نے صحیح قرار دیا ہے۔ امام بخاری کی رائے یہ ہے کہ اس باب میں یہ صحیح ترین حدیث ہے)

لغوی تشریح: ﴿ من مس ذکرہ ﴾ جس نے اپنی شرمگاہ کو ہاتھ لگایا یا ایسی حالت میں جب کہ درمیان میں کوئی چیز حائل نہ ہو۔ ﴿ فلیتوضا ﴾ اسے وضو کرنا چاہیئے یعنی نئے سرے سے نماز کیلئے وضو کرنا چاہیئے۔

حاصل کلام: یہ حدیث صریح طور پر اس پر دلالت کرتی ہے کہ مس ذکر سے وضو ٹوٹ جاتا ہے اور یہی راجح قول ہے' اس لئے کہ کلام میں ایک مقرر حکم ہے' اجتہاد کا اس میں کوئی عمل دخل نہیں۔ متقین

ائمہ جن میں امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ، ابوزرعہ رحمۃ اللہ علیہ، ابوحاتم رحمۃ اللہ علیہ، دارقطنی رحمۃ اللہ علیہ، بیہقی رحمۃ اللہ علیہ اور ابن جوزی رحمۃ اللہ علیہ شامل ہیں نے طلق بن علی سے مروی حدیث کو ضعیف اور بسرہ بنت صفوان سے مروی حدیث کو صحیح قرار دیا ہے اور جہاں تک ابن مدینی کے اس قول کا تعلق ہے کہ طلق بن علی کی روایت بسرہ کی روایت سے زیادہ بہتر ہے۔ اس رائے کو ائمہ نے قبول نہیں کیا۔ تقریباً اٹھارہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے بسرہ والی حدیث کی تائید میں مروی ہے، مزید برآں یہ کہ بسرہ والی حدیث کی سند کے راوی صحیحین کے راویوں کے ہم پلہ ہیں اور طلق بن علی کی روایت کے سند کے راویوں میں سے ایک بھی ایسا نہیں جو صحیحین کے راویوں جیسا ہو اور ابوہریرہ رضی اللہ عنہ ان راویوں میں سے ہیں جو مس ذکر سے وضو ٹوٹنے کے قائل ہیں اور راوی حدیث ہیں۔ یہ طلق بن علی کی آمد کے چھ سال یا اس سے بھی زیادہ عرصہ بعد اسلام لائے تھے اور طلق بن علی ابتدا ہی میں (جبکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہجرت فرما کر مدینہ تشریف لائے تھے اور مسجد نبوی کی تعمیر شروع کی) مدینہ میں آئے تھے پھر اپنے وطن یمامہ کی طرف واپس چلے گئے اور حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ ۶ھ کے آخر میں دائرہ اسلام میں داخل ہوئے۔ بایں صورت بھی بعد میں حاضر ہونے والے صحابی کی روایت راجح ہے۔

راوی حدیث: ﴿ بسرۃ بنت صفوان رضی اللہ عنہا ﴾ بسرۃ کے باء پر ضمہ اور سین ساکن ہے۔ پورا نام بسرہ بنت صفوان بن نوفل بن اسد بن عبدالعزیٰ قرشیہ اسدیہ۔ سابقین صحابہ میں ان کا شمار ہوتا ہے۔ پہلے پہل ہجرت کرنے والوں میں ان کا شمار ہوتا ہے۔ امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے دور اقتدار تک بقید حیات رہیں۔

(٦٩) وعَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهَا أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ قَالَ: «مَنْ أَصَابَهُ قَيْءٌ أَوْ رُعَافٌ أَوْ قَلَسٌ أَوْ مَذْيٌ، فَلْيَنْصَرِفْ فَلْيَتَوَضَّأْ، ثُمَّ لِيَبْنِ عَلَى صَلاَتِهِ، وَهُوَ فِي ذَلِكَ لاَ يَتَكَلَّمُ». أَخْرَجَهُ ابْنُ مَاجَه، وَضَعَّفَهُ أَحْمَدُ وَغَيْرُهُ.

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "جس کو نماز میں قے آجائے یا نکسیر پھوٹ پڑے یا پیٹ کے اندر کی چیز منہ کے راستہ سے باہر آجائے یا مذی کا خروج ہو جائے تو اسے نماز سے نکل کر وضو کرنا چاہئے اور جہاں سے نماز چھوڑی تھی اسی پر بنا کر لے۔ بشرطیکہ اس دوران میں اس نے گفتگو نہ کی ہو۔" (ابن ماجہ نے اسے روایت کیا ہے اور احمد نے اسے ضعیف قرار دیا ہے)

لغوی تشریح: ﴿ رعاف ﴾ "راء" پر ضمہ۔ ناک کے راستہ سے جو خون نکلتا ہے اسے "رعاف" یعنی نکسیر کہتے ہیں۔ ﴿ قلس ﴾ "قاف" پر فتح اور "لام" ساکن۔ خورد و نوش کی کوئی چیز جو منہ کے راستہ سے باہر آجائے۔ ﴿ لیبن ﴾ اس میں لام، لام امر ہے اور بناء یہ ہے کہ آدمی نے نماز شروع کی ایک یا دو یا زیادہ رکعات پڑھ چکا تھا کہ بے وضو ہو گیا۔ اب تازہ وضو کر کے بغیر کسی قسم کی گفتگو کئے آکر نماز شروع کر دے۔ جتنی پہلے پڑھ چکا تھا انہیں شمار کرے اور باقی ماندہ رکعات پوری کر کے سلام پھیر دے۔ اس بے وضو ہونے سے پہلے کی پڑھی ہوئی رکعات بھی ضائع نہیں جائیں گی اور از سر نو پوری نماز بھی پڑھنا نہیں

پڑے گی۔ ﴿ وهو فی ذلک لا یتکلم ﴾ اور وہ اس دوران میں کسی قسم کی گفتگو نہ کرے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جب اس کا وضو ٹوٹ گیا تو بناء کیلئے یہ شرط ہے کہ وضو کر کے واپس آنے اور نماز میں شامل ہونے تک کسی قسم کی بات چیت نہ کرے۔ اگر بات چیت کر لی تو بناء نہیں کر سکتا' از سر نو پوری نماز پڑھنا ہوگی۔

حاصل کلام: مذی کے خارج ہونے کی صورت میں فقہاء بالاتفاق وضو کے ٹوٹ جانے کے قائل ہیں البتہ قے آنے' پیٹ میں سے کھانے پینے کی کوئی چیز منہ کے راستہ سے نکلنے اور ناک میں سے خون کے جاری ہونے یعنی نکسیر پھوٹنے کی صورت میں ایک گروہ کا خیال ہے کہ وضو ٹوٹ جاتا ہے جبکہ دوسرا گروہ اس کا قائل ہے کہ وضو نہیں ٹوٹتا۔ اسی طرح بناء کے بارے میں اختلاف رائے ہے۔ بناء والی حدیث ضعیف ہے اور مرسل ہے۔ نیز احادیث صحیحہ کے معارض و مخالف بھی ہے' لہٰذا اس کے ذریعہ حجت قائم نہیں ہوتی۔

ائمہ و فقہاء کا بناء کے بارے میں اختلاف ہے۔ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ اور امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ دونوں بناء کے قائل ہیں اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ اس کے قائل نہیں۔ پہلے گروہ کی دلیل یہی حدیث ہے جسے احمد نے ضعیف قرار دیا ہے اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں: جب نمازی بے وضو ہو گیا تو نماز نہ رہے گی۔ جب نماز ہی نہ رہی تو بناء کس پر ہوگی۔ اسی طرح نکسیر سے وضو ٹوٹنے کے مسئلہ میں بھی ائمہ کا اختلاف ہے۔ امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ قے اور نکسیر دونوں سے وضو ٹوٹ جاتا ہے۔ اس کے برخلاف امام مالک رحمۃ اللہ علیہ اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ نکسیر وغیرہ سے وضو نہیں ٹوٹتا۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں سے عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما' جابر بن یزید رضی اللہ عنہ' عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما' ابن ابی اوفی رضی اللہ عنہ' ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ اور تابعین میں ابن مسیب رحمۃ اللہ علیہ' مکحول رحمۃ اللہ علیہ اور ربیعہ رحمۃ اللہ علیہ وغیرہ بھی قے اور نکسیر سے وضو ٹوٹ جانے کے قائل نہیں۔

(۷۰) وَعَنْ جَابِرِ بْنِ سَمُرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُ أَنَّ رَجُلاً سَأَلَ النَّبِيَّ ﷺ: أَتَوَضَّأُ مِنْ لُحُومِ الْغَنَمِ؟ قَالَ: إِنْ شِئْتَ. قَالَ: أَتَوَضَّأُ مِنْ لُحُومِ الإِبِلِ؟ قَالَ: نَعَمْ. أَخْرَجَهُ مُسْلِمٌ.

حضرت جابر بن سمرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک شخص نے نبی ﷺ سے دریافت کیا' کیا میں بکری کا گوشت کھاؤں تو بعد میں وضو کروں؟ آپ ؐ نے فرمایا "اگر دل چاہے تو کر لو۔" اس شخص نے پھر عرض کیا اور اونٹ کے گوشت سے؟ فرمایا "اونٹ کا گوشت کھانے کے بعد وضو کرنا چاہئے۔" (مسلم)

لغوی تشریح: ﴿ فاتوضاء ﴾ ھمزہ استفہام اس جگہ حذف ہے اور یہ واحد متکلم کا صیغہ ہے۔ ﴿ من لحوم الغنم ﴾ یعنی بکری کا گوشت کھانے کی وجہ سے۔

حاصل کلام: یہ حدیث اس کی دلیل ہے کہ اونٹ کا گوشت کھانے کے بعد وضو کرنا چاہئے۔ عام طور پر اصحاب حدیث کی رائے یہی ہے۔ اس کے گوشت کے ناقض وضو ہونے کی حکمت اور سبب معلوم ہونا

ضروری نہیں کیونکہ تعبدی احکام کی حکمت کا عقل میں آنا ضروری نہیں۔ علامہ ابن قیم رحمۃ اللہ علیہ نے ''اعلام الموقعین'' ج :۱' ص: ۱۴۷ پر اس کی بڑی عمدہ اور معنوی اعتبار سے بڑی معقول وجہ بیان کی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ ہر اونٹ کی کوہان پر شیطان ہوتا ہے اور یہ معلوم حقیقت ہے کہ جن کی پیدائش آگ سے کی گئی ہے۔ کھانے والے کی مشابہت کھانے کے ساتھ ہوگی۔ لہٰذا جب اونٹ کا گوشت کھائے گا (اور وہ اس کی خوراک ہوگا) تو اس میں ازخود قوت شیطانیہ پیدا ہوگی۔ اور شیطان کی تخلیق بھی آگ سے ہوئی ہے اور آگ کو پانی کے ذریعہ بجھایا جاتا ہے۔ حدیث مذکور بھی اسی کیفیت کی ترجمان ہے۔ جب بندہ اونٹ کا گوشت کھا کر بعد میں وضو کرے گا تو اس کے وضو میں وہ چیز شامل ہوگی جو اس شیطانی قوت کو بجھائے گی تو ایسی صورت میں یہ فساد انگیز چیز زائل ہو جائے گی۔

اونٹ کا گوشت کھانے سے وضو ٹوٹ جاتا ہے یا نہیں؟ اس بارے میں ائمہ اہل سنت میں اختلاف ہے۔ امام احمد' اسحاق بن راہویہ' ابن منذر' ابن خزیمہ وغیرہ محدثین علماء کا یہی مذہب ہے کہ اونٹ کا گوشت کھانے سے وضو برقرار نہیں رہتا۔ بیہقی اور تمام اہل حدیث کا بھی یہی مذہب ہے۔ اس کے برعکس امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ اور امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اور بہت سے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور تابعین عظام کسی بھی حلال جانور کے گوشت کھانے سے وضو ٹوٹ جانے کے قائل نہیں ہیں۔ ان کے نزدیک وضو برقرار رہتا ہے۔ ان کی دلیل ابوداؤد' ترمذی' نسائی' ابن ماجہ اور ابن حبان وغیرہ کی روایت ہے۔ یہ حضرات اس حدیث سے وضو سے ہاتھ منہ دھونا مراد لیتے ہیں جس طرح خوردونوش سے فارغ ہو کر ہاتھ منہ دھویا جاتا ہے۔ اس اعتبار سے ان کے نزدیک وضو کا لغوی معنی مراد ہوگا' اصطلاحی معنی نہیں۔ آخری حکم یہ ہے کہ آگ سے پکی ہوئی چیز کھانے سے وضو کی ضرورت نہیں' مگر یہ بات درست نہیں۔ امام نووی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ ''امام احمد وغیرہ کا مسلک دلیل کے اعتبار سے مضبوط ہے' ابوداؤد وغیرہ کی حدیث عام ہے اور مسلم کی یہ حدیث خاص اونٹ کے بارے میں ہے اس لئے خاص حکم عام حکم سے مقدم ہے۔'' نیز ایک شرعی لفظ ''وضو'' کو بلا دلیل لغوی معنی پر محمول کرنا بھی درست نہیں۔

راوی حدیث: ﴿جابر بن سمرة رضی اللہ عنہ﴾ جابر بن سمرہ بن جنادہ مشہور و معروف صحابی رضی اللہ عنہ ہیں۔ کوفہ میں رہے۔ غالباً ان سے ایک سو چھیالیس احادیث مروی ہیں۔ ۷۳ھ میں وفات پائی۔

(۷۱) وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ النَّبِيُّ ﷺ: «مَنْ غَسَّلَ مَيِّتاً فَلْيَغْتَسِلْ، وَمَنْ حَمَلَهُ فَلْيَتَوَضَّأْ». أَخْرَجَهُ أَحْمَدُ وَالنَّسَائِيُّ وَالتِّرْمِذِيُّ، وَحَسَّنَهُ، وَقَالَ أَحْمَدُ: لاَ يَصِحُّ شَيْءٌ فِي هَذَا البَابِ.

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ نبی ﷺ نے فرمایا ''جس نے میت کو غسل دیا وہ خود بھی غسل کرے اور جس نے میت کو اٹھایا وہ وضو کرے۔'' (اس حدیث کو احمد' نسائی اور ترمذی نے روایت کیا ہے۔ ترمذی نے اسے حسن کہا ہے اور احمد کا قول ہے کہ اس باب میں کوئی بھی حدیث صحیح ثابت نہیں ہے)

لغوی تشریح: ﴿ قال احمد ﴾ سے مراد امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ ہیں۔ ﴿ لا یصح شئی فی ھذا الباب ﴾ اس باب میں کوئی حدیث صحیح نہیں۔ مگر صحیح یہ ہے کہ بحیثیت مجموعی یہ روایت حسن درجہ سے کم نہیں جیسا کہ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے کہا ہے۔ امام احمد رحمہ اللہ کا خیال ہے کہ یہ حدیث ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی حدیث کی بنا پر منسوخ ہے اور وہ یہ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "میت کو غسل دینے کی وجہ سے تم پر غسل نہیں ہے۔ صرف ہاتھوں کو دھو لینا ہی کافی ہے۔" (حاکم' بیہقی)

حاصل کلام: صحیح یہ ہے کہ ﴿ من غسل میتا فلیغتسل ﴾ میں حکم استحباب کیلئے ہے یعنی میت کو نہلانے والے کیلئے خود غسل کرنا ضروری نہیں۔ اس کی دلیل سنن دار قطنی اور مسند احمد میں عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کا یہ بیان ہے کہ ہم میت کو غسل دیا کرتے تھے پھر بعد میں بعض لوگ غسل کر لیتے اور بعض نہیں کرتے تھے۔ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے اس روایت کی سند کو صحیح قرار دیا ہے۔ بیہقی اور حاکم میں ابن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت بھی اس کی مؤید ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما' ابن عمر رضی اللہ عنہما' عائشہ رضی اللہ عنہا' حسن بصری رحمہ اللہ' ابراہیم نخعی رحمہ اللہ' امام شافعی رحمہ اللہ' اسحٰق رحمہ اللہ اور اکثر اہل علم کا یہی قول ہے۔ البتہ بعض وجوب کے بھی قائل ہیں مگر جنازہ اٹھانے والے پر وضو کے وجوب کا کوئی بھی قائل نہیں۔

(۷۲) وعَنْ عَبْدِ اللهِ بِنْ أَبِي بَكْرٍ رضي الله تعالىٰ عنهما أَنَّ فِي الكِتَابِ الَّذي كَتَبَهُ رَسولُ اللهِ ﷺ لِعَمْرِو بْنِ حَزْمٍ: أَنْ لاَ يَمَسَّ القُرْآنَ إِلاَّ طَاهِرٌ. رَوَاهُ مَالِكٌ مُرْسَلاً، وَوَصَلَهُ النَّسَائِيُّ وابْنُ حِبَّانَ، وَهُوَ مَعْلُولٌ.

حضرت عبداللہ بن ابی بکر رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے احکام کی جو تحریر عمرو بن حزم رضی اللہ عنہ کو لکھ کر دی تھی اس میں تحریر تھا کہ "قرآن پاک کو پاکیزہ انسان (جس نے وضو کیا ہو) ہی ہاتھ لگائے۔" (امام مالک نے اسے مرسل روایت کیا ہے' نسائی اور ابن حبان نے اس کو موصول بیان کیا ہے' دراصل یہ حدیث معلول ہے)

لغوی تشریح: ﴿ الاطاھر ﴾ بظاہر اس سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ حدث اکبر ہو یا اصغر دونوں سے پاک ہونا چاہئے۔ ﴿ وھو معلول ﴾ مصنف نے اس روایت کو معلول غالباً اس بنا پر کہا ہے کہ ان کے خیال میں یہ روایت سلیمان بن داؤد یمامی سے مروی ہے اور یہ شخص واقعتاً ایسا ہے جس کو ترک کرنے پر سب کا اتفاق ہے اور صحیح یہ ہے کہ اس روایت کے راوی سلیمان بن داؤد خولانی ہیں اور وہ ثقہ راوی ہے۔ ائمہ حدیث نے اس کی تعریف کی ہے۔ اس لئے حدیث معلول نہ ہوئی۔ (السبل)

حاصل کلام: طہارت دو قسم پر ہے ایک طہارت تو وہ ہے جس کی تعبیر حدث اکبر سے کی جاتی ہے اور دوسری حدث اصغر سے۔ اگر حدث اکبر یعنی جنابت وغیرہ ہو تو ایسی صورت میں قرآن مجید کو چھونا' ہاتھ لگانا ممنوع اور ناجائز ہے۔ محض بے وضو ہونے کی صورت میں اختلاف ہے بہتر ہے کہ باوضو ہاتھ لگایا جائے۔

راوی حدیث: ﴿ عبداللہ بن ابی بکر رضی اللہ عنہما ﴾ یہ عبداللہ بن ابی بکر بن محمد بن عمرو بن حزم انصاری'

رضی اللہ عنہ مدنی قاضی ہیں۔ مشہور تابعی ہیں۔ ۱۳۵ھ میں وفات پائی۔ اس وقت ان کی عمر ستر برس کی تھی۔
﴿ عمرو بن حزم رضی اللہ عنہ ﴾ عمرو بن حزم بن یزید خزرجی نجاری مراد ہیں۔ ابو ضحاک ان کی کنیت ہے۔ غزوۂ خندق میں شریک ہوئے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو نجران کی طرف عامل بنا کر اس لئے بھیجا کہ وہاں کے لوگوں کو دینی احکام و مسائل کی تعلیم سکھائیں۔ قرآن مجید پڑھائیں' لوگوں سے ملاقات کی وصولی کیلئے حسابات و نصابات ان کو تحریر کر کے سپرد کئے۔ عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے دور خلافت میں وفات پائی۔ جو تحریر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو دی تھی اس میں فرائض' سنن' صدقات اور دیات کی تفصیلات تھیں۔ اسی مکتوب کی طرف اس حدیث میں اشارہ کیا گیا ہے۔ ۵۰ھ کے بعد مدینہ میں وفات پائی۔

(۷۳) وعَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهَا قَالَتْ: كَانَ رَسُولُ اللهِ ﷺ يَذْكُرُ اللَّهَ عَلَى كُلِّ أَحْيانِهِ. رَوَاهُ مُسْلِمٌ، وَعَلَّقَهُ البُخارِيُّ.

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہر حالت میں اللہ تعالیٰ کا ذکر کرتے تھے۔ (اسے مسلم نے روایت کیا اور بخاری نے اس کو تعلیقاً نقل کیا ہے)

حاصل کلام: مطلب اس کا یہ ہے کہ جماع' بول و براز وغیرہ کی حالت میں ذکر سے اجتناب کرنا ہے باقی اوقات میں ذکر کی اجازت ہے۔ احادیث سے ثابت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جنابت کی حالت کے ماسوا قرآن پڑھا کرتے تھے' زبان پاک ہے زبانی ذکر الٰہی ہر وقت کیا جا سکتا ہے۔

(۷٤) وعَنْ أَنَسِ بْنِ مَالِكٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ: أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ احْتَجَمَ وَصَلَّى، وَلَمْ يَتَوَضَّأْ. أَخْرَجَهُ الدَّارَقُطْنِيُّ، وَلَيَّنَهُ.

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے پچھنے لگوائے اور نیا وضو کئے بغیر نماز ادا کی۔ (اسے دارقطنی نے روایت کیا ہے اور اسے کمزور کہا ہے)

لغوی تشریح: ﴿ احتجم ﴾ پچھنے لگوائے۔ حجامت عربی میں سینگ یا کسی دیگر آلہ کے ذریعہ جسم کے حصہ سے خون نکلوانے کو کہتے ہیں۔ اس حدیث سے ثابت ہوا کہ بول و براز کے دونوں قدرتی راستوں کے علاوہ دوسرے کسی ذریعہ سے اخراج خون سے وضو نہیں ٹوٹتا۔ جس کی تائید حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی حدیث سے بھی ہوتی ہے جسے امام ابوداؤد رحمہ اللہ نے روایت کیا ہے۔ ﴿ لینه ﴾ تلیین سے ماخوذ ہے۔ جس کے معنی کمزوری و ضعف کے ہیں۔ اس کے ضعف کی وجہ اس روایت کے راویوں میں صالح بن مقاتل ایسا راوی ہے جو قوی نہیں ہے۔ اسی وجہ سے اس کو کمزور قرار دیا گیا ہے۔

حاصل کلام: اس حدیث سے ثابت ہوتا ہے کہ بول و براز کے قدرتی دونوں راستوں کے علاوہ بدن سے خون کا نکلنا ناقض وضو نہیں۔ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ' ابن عباس رضی اللہ عنہ وغیرہ صحابہ کرام اور تابعین عظام کی ایک کثیر جماعت کے علاوہ امام مالک رحمہ اللہ اور امام شافعی رحمہ اللہ کا بھی یہی مذہب ہے۔

(۷۵) وعَنْ مُعَاوِيَةَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «**العَيْنُ وِكَاءُ السَّهِ، فَإِذَا نَامَتِ العَيْنَانِ اسْتَطْلَقَ الوِكَاءُ**». رَوَاهُ أَحْمَدُ وَالطَّبرَانِيُّ، وَزَادَ: «**وَمَنْ نَامَ فَلْيَتَوَضَّأْ**».

حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ **روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ** ﷺ **کا ارشاد ہے "آنکھوں کا کھلا رہنا ریح خارج ہونے کا بندھن ہے جب آنکھ سونے کی وجہ سے بند ہو جاتی ہے تو بندھن ڈھیلا ہو جاتا ہے۔ (کھل جاتا ہے)** (مسند احمد' طبرانی) (طبرانی نے اتنا اضافہ بھی اپنی روایت میں بیان کیا ہے کہ "جس شخص کو نیند آجائے وہ از سر نو وضو کرے۔"

وَهَذِهِ الزِّيَادَةُ فِي هَذَا الحَدِيْثِ عِنْدَ أَبِي دَاودَ مِنْ حَدِيث عَلِيٍّ دُونَ قَوْلِهِ: «اسْتَطْلَقَ الوِكَاءُ» وَفِي كَلاَ الإِسْنَادَيْنِ ضَعْفٌ.

اتنا اضافہ ابوداؤد کی اس روایت میں بھی ہے جسے انہوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ **کے واسطہ سے روایت کیا ہے البتہ اس روایت میں استطلق الوکاء "یعنی بندھن کھل جاتا ہے" والی عبارت نہیں ہے۔** (باعتبار سند دونوں احادیث ضعیف ہیں)

وَلأَبِي دَاوُدَ أَيْضاً عَنِ ابْنِ عَبَّاس رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا مَرْفُوعاً: «إِنَّمَا الوُضُوءُ عَلَى مَنْ نَامَ مُضْطَجِعاً». وفي إسناده ضعف أيضاً.

اور ابوداؤد میں ابن عباس رضی اللہ عنہما **کے واسطہ سے یہ مرفوع روایت بھی مروی ہے "وضو تو اس شخص پر ہے جو لیٹ کر سو جائے۔"** (سند کے اعتبار سے یہ حدیث بھی ضعیف ہے)

لغوی تشریح: ﴿ وکاء السہ ﴾ الوکاء واؤ پر کسرہ اور کاف پر مد۔ اس دھاگے یا رسی کو کہتے ہیں جس سے مشکیزہ وغیرہ کا منہ باندھا جاتا ہے۔ ﴿ والسہ ﴾ سین پر فتح اور "ھا" مخفف۔ دبر کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔ ﴿ استطلق ﴾ کھل جانا۔ ڈھیلا ہونا۔ ﴿ مضطجعا ﴾ پہلو کے بل لیٹ کر۔

حاصل کلام: حدیث مذکور سے معلوم ہوتا ہے کہ نیند فی نفسہ ناقض وضو نہیں ہے بلکہ اس سے وضو کے ٹوٹ جانے کا گمان اور ظن پیدا ہو جاتا ہے۔ مگر دونوں روایتوں کی سندوں میں ضعف ہے کیونکہ ان میں ایک "بقیہ" نامی راوی ہے جس کے بارے میں بہت سے محدثین نے کہا ہے کہ یہ قوی نہیں ہے۔ اگرچہ یہ ضعف خفیف سا ہے۔ منذری' نووی اور ابن الصلاح نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی حدیث کو حسن قرار دیا ہے۔

حدیث میں ہے کہ لیٹ کر سونے کی حالت میں وضو ٹوٹ جاتا ہے اور ایک روایت میں ہے مطلق نیند سے بھی وضو ٹوٹ جاتا ہے۔ دونوں احادیث میں موافقت و تطابق اس طرح ہے کہ پہلو کے بل گہری نیند آتی ہے۔ ایسی حالت میں اعضاء جسم ڈھیلے پڑ جاتے ہیں۔ اس صورت میں ریح خارج ہونے کا گمان

غالب ہوتا ہے' جبکہ ہلکی نیند میں ایسا نہیں ہوتا۔ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ سیدھا یا چت لیٹ کر گہری نیند کی صورت میں بھی وضو نہیں ٹوٹتا ایسا نہیں۔ گہری جس صورت میں ہو وہ ناقض وضو ہوگی۔ پہلو کے بل عموماً نیند گہری ہوتی ہے اس لئے اس کا خاص ذکر کر دیا۔

راوی حدیث: ﴿ معاویہؓ ﴾ معاویہ سے مراد معاویہ بن ابی سفیان بن حرب رضی اللہ عنہما ہے۔ فتح مکہ کے موقع پر اسلام قبول کیا۔ ان کے بھائی یزید بن ابی سفیان کی وفات کے بعد حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان کو شام کا والی مقرر فرما دیا۔ یہ اس ولایت پر حضرت علی رضی اللہ عنہ کے عہد خلافت تک رہے۔ حضرت حسن رضی اللہ عنہ کے خلافت سے دستبرداری کے اعلان کے بعد ان کی بیعت کی گئی اور بالاتفاق وہ امیر مقرر ہوئے۔ یہ ۴۰ھ کا واقعہ ہے۔ ۶۰ھ ماہ رجب میں وفات پائی۔ اس وقت ان کی عمر ۷۸ برس تھی۔

(٧٦) وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رضي الله تعالى عنهما، أَنَّ رَسُولَ الله ﷺ قَالَ: «يَأْتِي أَحَدَكُمُ الشَّيْطَانُ فِي الصَّلاَةِ فَيَنْفُخُ فِي مَقْعَدَتِهِ، فَيُخَيَّلُ إِلَيْهِ أَنَّهُ أَحْدَثَ، وَلَمْ يُحْدِثْ، فَإِذَا وَجَدَ ذَلِكَ فَلاَ يَنْصَرِفْ حَتَّى يَسْمَعَ صَوْتاً أَوْ يَجِدَ رِيحاً». أَخرَجَهُ البَزَّارُ.

وَأَصْلُهُ فِي الصَّحِيْحَيْنِ مِنْ حَدِيْثِ عَبْدِ اللهِ ابْنِ زَيْدٍ.

وَلِمُسْلِمٍ عَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ نَحْوُهُ.

وَلِلْحَاكِمِ عَنْ أَبي سَعِيْدٍ مَرْفُوعاً: «إِذَا جَآءَ أَحَدَكُمُ الشَّيْطَانُ، فَقَالَ: إِنَّكَ قَدْ أَحْدَثْتَ، فَلْيَقُلْ: إِنَّكَ كَذَبْتَ». أَخرَجَهُ ابنُ حِبَّانَ بَلَفظ: «فَلْيَقُلْ فِي نَفْسِهِ».

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ "نماز میں تم میں سے کسی کے پاس شیطان آتا ہے اور اس کی مقعد میں پھونک مارتا ہے اور اس کے ذہن میں یہ خیال ڈال جاتا ہے کہ وہ بے وضو ہو گیا ہے حالانکہ وہ بے وضو نہیں ہوا ہوتا۔ للذا تم میں سے جب کوئی ایسا محسوس کرے تو ریح کے خارج ہونے کی آواز سننے یا اس کی بدبو پانے تک نماز سے نہ پھرے۔" (اسے بزار نے روایت کیا ہے اور اس حدیث کی اصل بخاری میں عبداللہ بن زید اور مسلم میں ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے موجود ہے) صحیح مسلم میں حضرت ابو ہریرہؓ سے ان جیسے ہی الفاظ مروی ہیں۔

اور حاکم نے ابوسعید کے واسطہ سے مرفوعاً بیان کیا ہے کہ "جب تم میں سے کسی کے پاس شیطان آئے اور ذہن میں وسواس ڈالے کہ تو بے وضو ہو گیا تو یہ شخص اسے جواب میں کہے کہ تو جھوٹ بولتا ہے۔" اس کو ابن حبان نے ان الفاظ سے روایت کیا ہے کہ "وہ شخص اپنے دل میں کہے کہ تو جھوٹا ہے۔"

٧ - بَابُ آدَابِ قَضَاءِ الحَاجَةِ

قضائے حاجت کے آداب کا بیان

(٧٧) عَنْ أَنَسِ بْنِ مَالِكٍ رضي الله تعالى عنه قَالَ: كَانَ رَسُولُ اللهِ ﷺ إِذَا دَخَلَ الخَلَاءَ وَضَعَ خَاتَمَهُ. أَخْرَجَهُ الأَرْبَعَةُ، وَهُوَ مَعْلُولٌ.

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ جب قضاء حاجت کیلئے تشریف لے جاتے تو انگشتری (اپنے دست مبارک سے) اتار کر الگ رکھ دیتے تھے۔ (اسے ابوداؤد' ترمذی' نسائی اور ابن ماجہ نے روایت کیا ہے اور یہ روایت معلول ہے)

لغوی تشریح: ﴿ باب آداب قضاء الحاجۃ ﴾ قضاء حاجت۔ بول و براز سے کنایہ ہے۔ ﴿ الخلاء ﴾ "خاء" کے فتحہ اور آخر پر الف ممدودہ۔ خالی جگہ۔ خالی مکان۔ پھر کثرت استعمال میں یہ قضاء حاجت کی جگہ کیلئے بولا جانے لگا۔ (بیت الخلاء) کیونکہ قضاء حاجت کے اوقات کے علاوہ یہ جگہ عموماً خالی رہتی ہے اور اس لئے بھی اسے خلا کہتے ہیں کہ انسان کیلئے اس میں تنہائی میسر آتی ہے۔ ﴿ وضع خاتمہ ﴾ اپنی انگوٹھی اتار کر رکھ دیتے' کیونکہ اس میں "محمد رسول اللہ" منقش تھا اور اس میں تنبیہہ اور خبردار کرنا مقصود ہے کہ گندگی والی جگھوں سے ایسی چیزوں کو دور ہی رکھا جائے جس میں اللہ کا ذکر ہو۔ ﴿ وھو معلول ﴾ معلول اس لئے ہے کہ یہ روایت ھمام' ابن جریج' عن الزھری کے واسطہ سے روایت کرتا ہے' حالانکہ ابن جریج نے یہ روایت زہری سے نہیں سنی' بلکہ اس نے تو زیاد بن سعد کے واسطہ سے زھری سے سنا ہے اور اس کے الفاظ بھی دوسرے ہیں اور وہ یہ ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے اپنے لئے چاندی کی انگوٹھی بنوائی پھر اسے اتار دیا۔

حاصل کلام: اس روایت کو ابوداؤد نے معلول قرار دیا ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ اس میں "ہمام" راوی کو وہم ہوا ہے حالانکہ ابن معین ایسے نقاد حدیث نے اسے ثقہ قرار دیا ہے نیز یہ کہ اس حدیث کو ہمام کے علاوہ اور طرق سے بھی روایت کیا گیا ہے۔ متن حدیث سے معلوم ہوا کہ بیت الخلاء وغیرہ ناپاک اور گندی جگھوں میں ایسی کوئی چیز لے کر دیدہ دانستہ داخل نہیں ہونا چاہئے جس پر اللہ تعالیٰ کے اسماء حسنیٰ یا آیات قرآن مجید وغیرہ لکھی ہوئی ہوں۔

(٧٨) وَعَنْهُ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: كَانَ النَّبِيُّ ﷺ إِذَا دَخَلَ الخَلَاءَ قَالَ: «**اللَّهُمَّ إِنِّي أَعُوذُ بِكَ مِنَ الخُبْثِ وَالخَبَائِثِ**». أَخْرَجَهُ السَّبْعَةُ.

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ ہی روایت کرتے ہیں کہ نبی ﷺ قضاء حاجت کیلئے بیت الخلا میں داخلہ کے وقت یہ دعا پڑھتے تھے "اللھم انی اعوذبک من الخبث والخبائث" اے اللہ! میں آپ کی پناہ پکڑتا ہوں' خبیث جنوں اور خبیث جنیوں سے۔ (اس کو ساتوں" یعنی بخاری' مسلم' احمد' ابو داؤد' نسائی' ابن ماجہ اور ترمذی)

لغوی تشریح: ﴿ اذا دخل ﴾ جب بیت الخلاء میں داخل ہونے کا ارادہ کرے۔ ﴿ الخبث ﴾ "خاء" اور

"باء" دونوں پر ضمہ۔ اور "با" پر سکون بھی پڑھا گیا ہے۔ یہ خبیث کی جمع ہے۔ ﴿الخبائث﴾ خبیثۃ کی جمع ہے۔ اول کا معنی نر' شیطان اور ثانی کا معنی مادہ شیطان مراد ہے اور یہ بھی علم میں رہے کہ بیت الخلاء قسم کی جگہیں ایک کنارے یا دور بنائے جاتے ہیں اور متذکرہ دعا کے کلمات دخول سے پہلے پڑھنے چاہئیں بعد میں نہیں۔ ہاں اگر کھلی فضا ہو' تعمیر شدہ مکان میں بیت الخلاء نہ ہو تو رفع حاجت کیلئے نیچے بیٹھنے کیلئے کپڑا اٹھاتے وقت اس دعا کو پڑھنا چاہئے۔

حاصل کلام: گندے مقامات اور جگہوں پر گندگی سے انس رکھنے والے جنات بسیرا کرتے ہیں۔ اس لئے نبی کریم ﷺ نے قضائے حاجت کیلئے بیت الخلاء میں داخلہ سے پہلے دعا سکھائی ہے۔ انسان کی مقعد بھی چونکہ قضاء حاجت کے وقت گندی ہوتی ہے' اس لئے جنات انسان کو اذیت دیتے اور تکلیف پہنچاتے ہیں' ان سے محفوظ رہنے کیلئے دعا کی تعلیم دی۔

(٧٩) وَعَنْهُ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: كَانَ رَسُولُ اللهِ ﷺ يَدْخُلُ الخَلَآءَ، فَأَحْمِلُ أَنَا وَغُلَامٌ نَحْوِي إِدَاوَةً مِنْ مَّاءٍ، وَعَنَزَةً فَيَسْتَنْجِيَ بِالْمَآءِ. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ ہی سے یہ روایت بھی ہے کہ رسول اللہ ﷺ قضاء حاجت کیلئے بیت الخلاء میں داخل ہوتے تو میں اور ایک میرا ہم عمر لڑکا پانی کا ایک برتن اور ایک چھوٹا سا نیزہ لے کر ہمراہ جاتے۔ اس پانی سے آپؐ استنجا فرمایا کرتے۔ (بخاری و مسلم)

لغوی تشریح: ﴿اداوۃ﴾ ہمزہ کے کسرہ کے ساتھ۔ چمڑے کا بنا ہوا چھوٹا سا برتن جس میں پانی ڈالا جاتا ہے۔ ﴿من ماء﴾ پانی سے بھرا ہوا۔ ﴿وعنزۃ﴾ منصوب۔ اداوۃ پر عطف کی وجہ سے۔ عین اور نون دونوں پر فتح۔ ایسا لمبا عصا جس کے نیچے لوہے کا پھل لگا ہوتا ہے یا پھر چھوٹا سا تیر بھی اس کے معنی کئے گئے ہیں۔

حاصل کلام: اس حدیث سے کئی مسائل نکلتے ہیں مثلاً اپنے سے کم عمر یا کم مرتبے والے سے خدمت لینا۔ پانی کے ساتھ استنجاء کرنا۔ نیز پانی سے استنجا کا افضل ہونا۔ ڈھیلا اور پانی دونوں سے استنجا کرنا تو افضل ترین ہے جیسا کہ جمہور علماء کا مذہب ہے۔

(٨٠) وعَنِ الْمُغِيرَةِ بْنِ شُعْبَةَ رضي الله تعالى عنه قَالَ: قَالَ لِيْ رَسُـولُ اللهِ ﷺ: خُـذْ الإِدَاوَةَ، فَانْطَلَقَ حَتَّى تَوَارَى عَنِّيْ، فَقَضَى حَاجَتَهُ. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ نبی ﷺ نے مجھے فرمایا "پانی کا برتن (ساتھ) لے چلو۔ چنانچہ آپؐ رفع حاجت کیلئے (اتنی دور) تشریف لے گئے کہ میری نظر سے اوجھل ہوگئے۔ وہاں آپؐ قضائے حاجت سے فارغ ہوئے۔" (بخاری و مسلم)

لغوی تشریح: ﴿تواری﴾ چھپ گیا۔ آنکھوں سے اوجھل ہوگیا۔

حاصل کلام: آنحضرت ﷺ کا فعل اس پر دلالت کرتا ہے کہ قضائے حاجت کرنے والے کو پردہ کا انتظام کرنا چاہئے یا ایسی جگہ ہو جہاں سے اس کو کوئی دیکھ نہ سکے۔ ایک دوسری حدیث میں ارشاد نبوی ﷺ ہے کہ ''اگر رفع حاجت کھلی جگہ میں کرنا پڑے اور پردہ پوشی کیلئے کوئی اوٹ وغیرہ نہ ہو تو ریت یا مٹی وغیرہ جو چیز دستیاب ہو اسے اوٹ کیلئے استعمال کرے ورنہ شیطان اس کی مقعد کے ساتھ تمسخر کرے گا۔''

(٨١) وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رضي الله تعالى عنه قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «**اتَّقُوا اللاَّعِنَيْنِ، الَّذِي يَتَخَلَّى فِي طَرِيقِ النَّاسِ، أَوْ فِي ظِلِّهِمْ**». رَوَاه مُسْلِمٌ.

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا دو لعنت کا سبب بننے والی جگہوں سے اجتناب کرو۔ ایک لوگوں کے راستہ میں' دوسرا (ان کے بیٹھنے آرام کرنے کی) سایہ دار جگہ میں قضاء حاجت کرنے سے۔'' (مسلم)

وَزَادَ أَبُو دَاوُدَ عَنْ مُعَاذٍ: «وَالمَوَارِدَ». وَلَفْظُه: «**اتَّقُوا المَلاعِنَ الثَّلاثَةَ، البَرَازَ فِي المَوَارِدِ، وَقَارِعَةِ الطَّرِيْقِ، والظِّلِّ**». ولأحمد عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهما: «أَوْ نَقْعِ مَآءٍ». وَفِيْهِمَا ضَعْفٌ.

اور ابوداؤد نے حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کے واسطہ سے جو روایت کی ہے' اس میں اس طرح ہے کہ ''لعنت کے تین اسباب سے اجتناب کرو۔ گھاٹوں پر' شاہراہ عام پر اور سایہ کے نیچے رفع حاجت کرنے سے۔'' اور امام احمد نے ابن عباس رضی اللہ عنہما کے حوالہ سے جو روایت بیان کی ہے اس میں ہے ''جہاں پانی جمع ہوتا ہو وہاں بھی رفع حاجت سے بچنا چاہئے۔'' (یہ دونوں روایتیں ضعیف ہیں)

وَأَخْرَجَ الطَّبْرَانِيُّ: النَّهْيَ عَنْ قَضَاءِ الحَاجَةِ تَحْتَ الأَشْجَارِ المُثْمِرَةِ وَضَفَّةِ النَّهْرِ الجَارِي، مِنْ حَدِيْثِ ابْنِ عُمَرَ بِسَنَدٍ ضَعِيْفٍ.

اور طبرانی نے ابن عمر رضی اللہ عنہما سے جو روایت بیان کی ہے اس میں ہے کہ ''پھل دار و سایہ دار درخت کے نیچے اور جاری و ساری نہر کے کنارے پر قضاء حاجت نہ کرے۔'' (اس کی سند میں بھی ضعف ہے)

لغوی تشریح: ﴿ اتقوا ﴾ پرہیز کرو' اجتناب کرو۔ ﴿ لاعنین ﴾ لاعن سے تثنیہ ہے۔ مطلب ہے ان دو امور سے اجتناب کرو جو لعنت کا سبب بنتے ہیں۔ اس کا بھی احتمال ہے کہ لاعن سے مراد صاحب لعن ہو۔ جیسے صاحب ابن کو لابن اور صاحب تمر کو ''تامر'' کہہ دیتے ہیں اور ایک قول یہ بھی ہے کہ لاعن ملعون کے معنی میں ہو۔ ﴿ الذی یتخلی ﴾ جو قضائے حاجت سے فارغ ہوتا ہے۔ ﴿ فی طریق الناس ﴾ لوگوں کے عام آمدورفت کے راستہ میں۔ یہ لعنت زدگی کے اسباب میں سے ایک ہے اور دوسرا ﴿ او فی ظلھم ﴾ وہ مقام و جگہ جہاں لوگ سایہ حاصل کرتے ہوں اور قیلولہ کیلئے استعمال میں لاتے ہوں اور

اپنے اترنے اور آرام کرنے کیلئے بیٹھنے کے طور پر استعمال کرتے ہوں اور اس سے مطلق سایہ مراد نہیں ہے کیونکہ جس سایہ کی لوگوں کو ضرورت نہ ہو وہاں قضاء حاجت میں کوئی مضائقہ اور حرج نہیں ہے۔ ﴿ الملاعن ﴾ ملعن کی جمع "میم" پر فتح۔ ایسی جگہیں اور مقامات جو لعنت کا موجب ہوں۔ ﴿ الثلاثۃ ﴾ منصوب ہے' ملاعن کی صفت ہونے کی بنا پر۔ ﴿ البراز ﴾ "باء" پر فتحہ اصل میں تو کھلی اور وسیع جگہ کو کہتے ہیں' مگر یہ ﴿ الغائط ﴾ یعنی پیٹ سے بذریعہ مقعد خارج ہونے والا فضلہ سے کنایہ ہے۔ اگر البراز کو منصوب پڑھیں تو اس صورت میں ملاعن سے بدل ہوگا اور اگر اسے مرفوع پڑھیں تو پھر یہ مبتداء محذوف کی خبر ہے۔ ﴿ في الموارد ﴾ مورد کی جمع ہے۔ اس جگہ یا مقام' چشمہ یا نہر وغیرہ کو کہتے ہیں جہاں لوگ پانی پینے یا پلانے یا وضو اور غسل وغیرہ کیلئے حصول پانی کیلئے جاتے ہیں (جنہیں گھاٹ کہتے ہیں) ﴿ قارعۃ الطریق ﴾ ایسے کھلے راستہ کو کہتے ہیں جہاں سے لوگ گزرتے ہوں اور اپنے جوتے' پاؤں اور چوپایوں کے ذریعے اسے پامال کرتے ہیں۔ ﴿ او نقع ماء ﴾ نون پر فتح اور قاف ساکن۔ جمع شدہ اور روکا ہوا پانی۔ ﴿ فیھما ضعف ﴾ دونوں سے۔ مراد ہے' حضرت معاذ رضی اللہ عنہ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی دونوں روایات ضعیف ہیں۔ حضرت معاذ رضی اللہ عنہ سے مروی روایت تو اس وجہ سے ضعیف ہے کہ اس کو ابوسعید حمیری' حضرت معاذ رضی اللہ عنہ سے روایت کرتا ہے حالانکہ وہ ان کو ملا تک نہ تھا' للذا یہ روایت منقطع ہے اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی روایت کے ضعیف ہونے کے دو سبب ہیں۔ ایک تو یہ کہ اس کی سند میں ایک راوی ابن لھیعہ ہے جب اس کی کتابیں خاکستر ہو گئیں تو اس نے روایات کو خلط ملط کرنا شروع کر دیا اور دوسرا سبب یہ ہے کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے جو راوی روایت کرتا ہے وہ مبہم ہے' اس کا نام نہیں لیا گیا۔ ﴿ تحت الاشجار المثمرۃ ﴾ پھل دار درختوں کے نیچے گندگی کرنے سے مطلب ہے جو پھل پک کر نیچے گرے وہ گندگی سے ملوث ہو کر گندا ہو جائے گا جو کھانے اور استعمال کرنے کے قابل نہ رہے گا۔ یہاں سے گزرنے والا نادانستگی میں انہیں اٹھائے یا کسی اور ضرورت و حاجت کیلئے یہاں سے گزرے تو ان گندگیوں سے اذیت پائے گا۔ ﴿ ضفۃ النھر ﴾ ضاد پر فتحہ اور "فاء" پر تشدید۔ کنارے اور ساحل کو کہتے ہیں اور اس کا سبب بھی وہی ہے کہ لوگ اس سے اذیت و تکلیف اٹھائیں گے۔ ﴿ بسند ضعیف ﴾ اس کی سند میں فرات بن سائب متروک راوی ہے۔ اس وجہ سے یہ ضعیف ہے۔

حاصل کلام : ان احادیث میں قضائے حاجت کے آداب کی تعلیم دی گئی ہے۔ پانچ مقامات اور جگہیں ایسی ہیں جہاں رفع حاجت کرنے کی ممانعت ہے وہ یہ ہیں: عام راستہ پر' سایہ دار درخت کے نیچے' پانی کے گھاٹ پر' پھل دار درخت کے نیچے' رواں دواں نہر کے کنارے۔ شارع عام پر عموماً رفع حاجت ممنوع ہے البتہ جو متروک ہو چکا ہو عام گزرگاہ نہ رہی ہو تو وہاں گنجائش ہے۔

راوی حدیث : ﴿ معاذ رضی اللہ عنہ ﴾ انصاری تھے۔ قبیلہ خزرج سے تعلق تھا' بڑے معزز اور بزرگ فقہاء صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں سے تھے۔ بیعت عقبہ اور غزوۂ بدر وغیرہ میں شریک ہوئے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو یمن کا والی

(گورنر) بنایا اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت ابوعبیدہ بن الجراح رضی اللہ عنہ کے بعد شام کا والی مقرر کیا۔ ۱۷ھ میں طاعون عمواس میں اور ایک قول کے مطابق ۱۸ھ میں وفات پائی۔ اس وقت ان کی عمر ۳۸ سال تھی۔

(۸۲) وعَنْ جَابِرٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «إِذَا تَغَوَّطَ الرَّجُلاَنِ فَلْيَتَوَارَ كُلُّ وَاحِدٍ مِنْهُمَا عَنْ صَاحِبِهِ، وَلاَ يَتَحَدَّثَا، فَإِنَّ اللَّهَ يَمْقُتُ عَلَى ذَلِكَ». رَوَاهُ أَحْمَدُ وَصَحَّحَهُ ابْنُ السَّكَنِ وَابْنُ الْقَطَّانِ، وَهُوَ مَعْلُولٌ.

حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ”جب دو آدمی قضاء حاجت کریں تو ان کو ایک دوسرے سے پردہ میں ہونا چاہئے اور اس حالت میں ایک دوسرے سے باہم گفتگو بھی نہ کریں۔“ اس لئے کہ ایسے فعل پر اللہ تعالیٰ ناراض ہوتے ہیں۔ (اس روایت کو احمد نے روایت کیا ہے اور ابن سکن اور ابن قطان نے اسے صحیح قرار دیا ہے مگر یہ حدیث معلول ہے)

لغوی تشریح: ﴿ تغوط ﴾ قضاء حاجت کیلئے نکلے اور اپنی حاجت پوری کی۔ ﴿ فليتوار ﴾ اس میں لام امر کا ہے اور ”راء“ پر فتح ہے۔ معنی ہے کہ چھپنا چاہئے' پردہ میں ہونا چاہئے۔ ﴿ ولا يتحدثا ﴾ قضاء حاجت کے وقت دونوں کو بات چیت نہیں کرنی چاہئے۔ ﴿ يمقت ﴾ مقت سے ماخوذ ہے۔ اللہ تعالیٰ سخت ناراض ہوتا ہے۔ ﴿ على ذلك ﴾ دونوں کے مابین آڑ اور پردہ کا نہ ہونا اور رفع حاجت کی صورت میں بات چیت کرنا مراد ہے۔ ﴿ وهو معلول ﴾ کہا گیا ہے کہ اس حدیث میں علت یہ ہے کہ اسے عکرمہ بن عمار نے یحییٰ بن ابی کثیر سے روایت کیا ہے۔ عکرمہ منفرد ہے اور اس کی یحییٰ سے روایت میں کلام ہے۔ البتہ امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ اور امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے استدلال کیا ہے۔

حاصل کلام: علامہ ابن حجر عسقلانی رحمۃ اللہ علیہ نے اس حدیث کو عکرمہ بن عمار عن یحییٰ بن ابی کثیر کی وجہ سے معلول قرار دیا ہے' اس لئے کہ یہ راوی ان کے نزدیک معلول ہے' حالانکہ عکرمہ کی روایت کو امام مسلم نے قبول کیا ہے اور امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے بھی اس سے استشہادا روایت کی ہے۔ یہ حدیث واضح ثبوت ہے اس کا کہ قابل ستر اعضاء کو چھپانا واجب ہے نیز قضاء حاجت یعنی بول و براز کے وقت باہم گفتگو کرنا حرام ہے۔ اس لئے ایسے فعل پر اللہ تعالیٰ کی ناراضگی اور بغض شدید کی صورت میں وعید فرمائی گئی ہے اگر یہ فعل بقول بعض کے مکروہ ہوتا تو اتنی سخت وعید کی ضرورت نہیں تھی۔ ایسے موقع پر حضور ﷺ سے سلام کا جواب چھوڑنا بھی عملاً ثابت ہے جو اس کا مؤید ہے۔

(۸۳) وعَنْ أَبِيْ قَتَادَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رسول الله ﷺ: «لاَ يَمَسَّنَّ أَحَدُكُمْ ذَكَرَهُ بِيَمِينِهِ وَهُوَ يَبُولُ، وَلاَ يَتَمَسَّحْ مِنَ الخَلاَءِ

حضرت ابوقتادہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے کہ ”تم میں سے کوئی بھی پیشاب کرتے وقت دائیں ہاتھ سے اپنے عضو مخصوص کو ہرگز نہ چھوئے اور قضاء حاجت کے بعد سیدھے

بِيَمِينِهِ، وَلاَ يَتَنَفَّسْ فِي الإِنَاءِ». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ، وَاللَّفْظُ لِمُسْلِمٍ.

ہاتھ سے استنجا بھی نہ کرے نیز پانی پیتے وقت اس میں سانس بھی نہ لے۔" (بخاری و مسلم۔ یہ الفاظ مسلم کے ہیں)

لغوی تشریح: ﴿لا یمسن﴾ مس سے نہی کا صیغہ ہے اور نون ثقیلہ تاکید کیلئے ہے۔ ﴿ولا یتمسح﴾ یعنی استنجاء نہ کر اور ﴿تمسح﴾ کے معنی ہیں ہاتھ کو بہنے والی چیز کے ساتھ ملنا یا پھیرنا کہ گندگی دور ہو جائے یا ناپاک چیز سے لتھڑی ہو' اسے ہاتھ سے صاف کرنا۔

حاصل کلام: اس حدیث میں دو مسئلے بیان کئے گئے ہیں۔ ایک تو یہ کہ اپنے سیدھے ہاتھ سے اپنے عضو مخصوص کو پیشاب کرتے ہوئے نہ چھوئے اور نہ پکڑے۔ ایسا کرنا حرام بھی ہے اور سوء ادب بھی اور کم ظرفی بھی اور دوسرا کوئی مشروب وغیرہ پیتے وقت برتن میں سانس لینا۔ برتن میں سانس لینا اس لئے ممنوع ہے کہ سانس کے ذریعہ خارج ہونے والے جراثیم پئے جانے والے مشروب وغیرہ میں شامل ہو کر معدہ میں داخل ہوں گے۔ یہ جراثیم طبی تحقیق کی رو سے صحت کیلئے نقصان دہ اور ضرر رساں ہیں۔ جس حدیث میں سانس لینے کا ذکر ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ پینے والا ایک ہی سانس میں غٹ غٹ نہ چڑھا جائے بلکہ تین دفعہ پئے اور سانس باہر نکالے۔

(٨٤) وَعَنْ سَلْمَانَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: لَقَدْ نَهَانَا رَسُولُ اللهِ ﷺ أَن نَسْتَقْبِلَ القِبْلَةَ بِغَائِطٍ أَوْ بَوْلٍ، أَوْ أَنْ نَسْتَنْجِيَ بِاليَمِيْنِ، أَوْ أَن نَسْتَنْجِيَ بِأَقَلَّ مِنْ ثَلاَثَةِ أَحْجَارٍ أَوْ أَنْ نَسْتَنْجِيَ بِرَجِيْعٍ أَوْ عَظْمٍ. رَوَاهُ مُسْلِمٌ.

حضرت سلمان رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں منع فرمایا کہ ہم قضاء حاجت اور پیشاب کے وقت قبلہ رخ ہوں یا دائیں ہاتھ سے استنجا کریں یا تین ڈھیلوں سے کم سے استنجا کریں یا گوبر' لید اور ہڈی سے استنجا کریں۔ (مسلم)

لغوی تشریح: ﴿نستنجی﴾ الاستنجاء سے ماخوذ ہے۔ یعنی پتھر یا پانی سے گندگی کو دور کرنا۔ اور ﴿النجو﴾ اس گندگی کو کہتے ہیں جو مقعد سے خارج ہوتی ہے۔ ﴿الرجیع﴾ لید یا گوبر۔

راوی حدیث: ﴿سلمان رضی اللہ عنہ﴾ ان کی کنیت ابوعبداللہ ہے۔ اصل میں ان کا تعلق فارس سے تھا۔ دین (حق) کی تلاش میں گھر سے نکلے اور نصرانی (عیسائی) بن گئے۔ پھر مدینہ میں منتقل ہو گئے۔ مدینہ میں آتے ہی نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لے آئے۔ سلمان الخیر ان کا لقب تھا۔ اسلام میں داخل ہونے کے بعد اسے بڑی اچھی طرح نبھایا۔ ان کے خلوص اور محبت دین کی وجہ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے حق میں ارشاد فرمایا کہ "سلمان ہمارے اہل بیت میں سے ہے۔" حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان کو مدائن کا والی مقرر کیا۔ محنت مزدوری کر کے جو کچھ کماتے اسے راہ للہ میں خیرات کر دیتے۔ ۳۲ھ کو وفات پائی۔ ان کی عمر ۲۵۰ یا ۳۵۰ برس تھی۔

(٨٥) وَلِلسَّبْعَةِ مِنْ حَدِيْثِ أَبِي

حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ

أَيُّوبَ: لاَ تَسْتَقْبِلُوا القِبْلَةَ بِغَائِطٍ أَوْ بَوْلٍ، وَلاَ تَسْتَدْبِرُوهَا، وَلٰكِنْ شَرِّقُوا أَو غَرِّبُوا.

''قضاء حاجت اور پیشاب کرتے وقت قبلہ رخ نہ بیٹھو اور نہ اس کی طرف پشت کرو بلکہ مشرق یا مغرب کی جانب کرو۔'' اس کو ساتوں (یعنی امام بخاری' مسلم' احمد' ابوداؤد' ترمذی' نسائی اور ابن ماجہ نے روایت کیا ہے)

لغوی تشریح: ﴿ لاتستدبروھا ﴾ اس کی طرف اپنی پشت بھی نہ کرو۔ ﴿ ولکن شرقوا اوغربوا ﴾ تشریق تغریب سے امر کا صیغہ ہے۔ مطلب یہ ہے کہ قضاء حاجت کے وقت اپنے چہرے مشرق یا مغرب کی طرف کرو۔ یہ خطاب اہل مدینہ سے ہے۔ ان کا قبلہ بجانب جنوب پڑتا ہے۔ اہل مدینہ یا اسی طرح کے دوسرے لوگ جن کا قبلہ جنوب یا شمال میں پڑے گا وہ اپنے رخ مشرق یا مغرب کی طرف کریں گے اس طرح استقبال اور استبدار دونوں سے بچ جائے گا اور جن کا قبلہ مشرق یا مغرب ہوگا تو وہ اپنا رخ شمال یا جنوب کی طرف کریں گے۔ استقبال و استدبار قبلہ سے بچنے کیلئے اہل مدینہ کو مشرق اور مغرب کا رخ کرنے کا حکم اسی وجہ سے دیا گیا ہے۔ حکم کا دارومدار اسی پر ہے۔

حاصل کلام: اس حدیث میں ﴿ لا تستقبلوا ولا تستدبروھا ﴾ کا حکم نہی ایسی جگہ کیلئے ہے جہاں کوئی اوٹ وغیرہ نہ ہو اور کھلا میدان ہو۔ گھروں میں جہاں آدمی کے سامنے دیوار وغیرہ حائل ہو تو وہاں کیلئے یہ حکم نہیں ہے جیسا کہ مسلم میں حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کی روایت سے واضح ہے۔ وہ بیان کرتے ہیں کہ ایک روز میں اپنی ہمشیرہ حفصہ بنت عمر رضی اللہ عنہا کے حجرہ کی چھت پر کسی ذاتی ضرورت کیلئے چڑھا تو (کیا دیکھتا ہوں) کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قضاء حاجت فرما رہے تھے اور اس وقت آپؐ کا رخ شام کی طرف تھا اور پشت بیت اللہ کی جانب۔ مشرق اور مغرب کی طرف رخ کرنے کا مطلب یہ ہے کہ قضاء حاجت کے وقت اپنا رخ قبلہ کی طرف نہ کرے اور نہ پشت۔ یہ حکم تو اہل مدینہ کیلئے مخصوص ہے اس لئے کہ ان کیلئے قبلہ جنوب کی طرف پڑتا ہے۔

راوی حدیث: ﴿ ابو ایوب انصاری رضی اللہ عنہ ﴾ ابوایوب ان کی کنیت ہے' ان کا نام خالد بن زید بن کلیب ہے۔ مدینہ میں تشریف آوری کے وقت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی اونٹنی ان کے دولت کدہ پر فروکش ہوئی تھی۔ آپ کا شمار کبار اور اکابر صحابہ میں ہوتا ہے۔ غزوۂ بدر میں شریک تھے۔ ارض روم میں جہاد کرتے ہوئے جام شہادت نوش کیا۔ (۵۰ھ میں) ان کی قبر دیوار قسطنطنیہ کے زیر سایہ ہے۔

(٨٦) وَعَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ الله تعالى عنها، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ قَالَ: مَنْ أَتَى الغَائِطَ فَلْيَسْتَتِرْ. رَوَاهُ أَبُو دَاوُدَ.

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''جو قضاء حاجت کیلئے جائے اسے پردہ کر کے بیٹھنا چاہئے۔'' (ابوداؤد)

(٨٧) وعَنْهَا رَضِيَ الله عَنْهَا أَنَّ

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا ہی سے مروی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم

النَّبِيَّ ﷺ كَانَ إِذَا خَرَجَ مِنَ الغَائِطِ قَالَ: «غُفْرَانَكَ». أَخرَجَهُ الخمسة وصححه أَبُو حَاتِمٍ وَالحَاكِمُ.

جب قضاء حاجت سے فارغ ہو کر بیت الخلاء سے باہر آتے تو "غفرانک" فرماتے (اے اللہ! تیری بخشش اور پردہ پوشی مطلوب ہے) (اس روایت کو پانچوں احمد' ابوداؤد' ترمذی' نسائی اور ابن ماجہ نے روایت کیا ہے' ابوحاتم اور حاکم دونوں نے اسے صحیح قرار دیا ہے)

لغوی تشریح: ﴿ غفرانک ﴾ منصوب واقع ہوا ہے' فعل محذوف ہے۔ معنی یہ ہیں کہ میں بخشش طلب کرتا ہوں یا پھر مصدر بھی ہو سکتا ہے۔ اس صورت میں مجھے بخش دے اچھی طرح بخشنا۔

(۸۸) وعَنِ ابْنِ مَسْعُودٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: أَتَى النَّبِيُّ ﷺ الغَائِطَ، فَأَمَرَنِي أَنْ آتِيَهُ بِثَلاَثَةِ أَحْجَارٍ، فَوَجَدْتُ حَجَرَيْنِ، وَلَمْ أَجِدْ ثَالِثاً، فَأَتَيْتُه بِرَوْثَةٍ، فَأَخَذَهُمَا وَأَلْقَى الرَّوْثَةَ، وَقَالَ: «إِنَّها رِكْسٌ». أَخرَجَهُ البُخَارِيُّ. وَزَادَ أَحْمَدُ وَالدَّارَقُطْنِيُّ «ائتنِيْ بِغَيْرِها».

حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ نبی ﷺ قضاء حاجت کو چلے تو مجھے حکم دیا کہ میں ان کیلئے تین پتھر لے آؤں۔ مجھے دو پتھر تو مل گئے تیسرا نہ مل سکا۔ میں (مجبوراً گوبر کا ایک خشک ٹکڑا لے آیا۔ آپؐ نے دونوں پتھر تو لے لئے اور گوبر کے خشک ٹکڑے کو دور پھینک دیا اور فرمایا "یہ تو بذات خود پلیدی ہے۔" (اسے بخاری نے روایت کیا ہے) احمد اور دار قطنی نے اتنا اضافہ اور کیا ہے کہ "اس کی بجائے اور لے آؤ۔"

لغوی تشریح: ﴿ بروثۃ ﴾ چوپائے جانور کا گوبر یا لید۔ ابن خزیمہ نے اتنا اضافہ کیا ہے کہ وہ گدھے کی لید تھی۔ ﴿ رکس ﴾ "را" پر کسرہ "کاف" ساکن۔ نجاست اور گندگی و پلیدی۔ ﴿ ائتنی بغیرھا ﴾ "اتیان" سے امر ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ قضاء حاجت کے بعد مقعد کی صفائی کیلئے تین پتھر استعمال کرنا واجب ہے۔ خواہ صفائی اس سے کم ہی سے حاصل ہو جائے اور اگر تین سے بھی مطلوب صفائی حاصل نہ ہو تو پھر مزید بھی استعمال کئے جا سکتے ہیں۔ البتہ ان کی تعداد طاق ہونی چاہئے۔ (یعنی پانچ' سات علی ھذا القیاس) آج کل ٹشو پیپر سے بھی صفائی ہو سکتی ہے۔ اس کی تعداد بھی اتنی ہی ہونی چاہئے۔

حاصل کلام: اس سے ثابت ہوا کہ جو چیز خود ناپاک و نجس ہو اس سے طہارت حاصل نہیں ہو سکتی لہٰذا ان سے اجتناب کرنا ضروری ہے۔ تعداد کے ساتھ صفائی بھی مشروط ہے۔ خواہ تعداد میں اضافہ ہی کرنا پڑے۔

راوی حدیث: ﴿ ابن مسعودؓ ﴾ نام ان کا عبداللہ تھا۔ بزرگ اور نہایت عقلمند و دانش مند فقہاء صحابہ کرامؓ میں شمار ہوتے تھے۔ غزوۂ بدر اور دیگر معرکوں میں شریک ہوئے۔ رسول اللہ ﷺ کے خادم

خاص تھے۔ حضر و سفر کے ساتھی تھے۔ انہیں رسول اللہ ﷺ کا تقرب حاصل تھا۔ صاحب النعلین تھے۔ ان کے مناقب و فضائل بے شمار ہیں۔ مدینہ منورہ میں ۳۲ھ میں فوت ہوئے۔ اس وقت ان کی عمر تقریباً ساٹھ برس کی تھی۔

(۸۹) وعَنْ أَبِيْ هُرَيرَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: إِنَّ رَسُولَ اللهِ ﷺ نَهَى أَنْ نَسْتَنْجِيَ بِعَظْمٍ أَوْ رَوْثٍ، وَقَالَ: «**إِنَّهُمَا لاَ يُطَهِّرَانِ**». رَوَاهُ الدَّارَقُطْنِيُّ وَصَحَّحَهُ.

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ہمیں ہڈی اور گوبر سے استنجا کرنے سے منع فرمایا ہے' ساتھ ہی فرمایا کہ "یہ دونوں پاک نہیں کر سکتے۔" (دارقطنی نے اسے روایت کیا ہے اور صحیح بھی قرار دیا ہے)

لغوی تشریح: ﴿ انهما لا يطهران ﴾ (یہ دونوں پاک نہیں کر سکتے) گوبر اس وجہ سے پاک نہیں کر سکتا کہ وہ خود نجس و ناپاک ہے اور ہڈی میں چکناہٹ ہوتی ہے۔ اس سے نجاست کی صفائی نہیں ہو سکتی اور تری کو خشک نہیں کر سکتی ہے اور ان کے استعمال سے منع کا سبب نبی کریم ﷺ نے یہ بیان کیا ہے کہ وہ جنوں کا طعام ہے اور ﴿ روث ﴾ ان کے جانور کا چارہ ہے۔ ایک چیز کے کئی اسباب ہو سکتے ہیں ان میں باہمی کوئی منافات نہیں ہے۔

حاصل کلام: امام بیہقی نے یہ روایت نقل کی ہے کہ ایک دفعہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ ﷺ سے سوال کیا کہ یارسول اللہ! ہڈی اور گوبر سے استنجا نہ کرنے کی کیا حکمت ہے؟ آپؐ نے فرمایا: نصیبین کے علاقہ سے جنوں کا ایک وفد میرے پاس آیا اور انہوں نے مجھ سے خوراک کے متعلق استفسار کیا۔ تو اللہ رب العزت کے حضور دعا کی کہ یا اللہ! ان کو ہڈیوں اور گوبر وغیرہ سے خوراک دستیاب ہوتی رہے۔ لہٰذا (دعا قبول ہوئی) یہ ان کی خوراک ہے' اسے گندا نہ کرو۔ بظاہر تو اس سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ ہڈی اور لید بذات خود ان کی خوراک ہے۔ درحقیقت ایسا نہیں بلکہ قدرتی طور پر ان کے اوپر کوئی غیر مرئی کھانے والی چیز پیدا ہوتی ہے جو ان کی خوراک ہوتی ہے جسے یہ جنات کھانے کے طور پر استعمال کرتے ہیں گویا دونوں ان کی خوراک کی پیدائش کا مقام ہیں۔

(۹۰) وعَنْ أَبِي هُرِيرَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «**اسْتَنْزِهُوا مِنَ البَوْلِ، فَإِنَّ عَامَّةَ عَذَابِ القَبْرِ مِنْهُ**». رَوَاهُ الدَّارَقُطْنِيُّ،

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "پیشاب (کی چھینٹوں) سے بچو۔ اکثر عذاب قبر اسی کی وجہ سے ہوتا ہے۔" (دارقطنی نے اسے روایت کیا ہے)

وَلِلْحَاكِمِ: «أَكْثَرُ عَذَابِ القَبْرِ مِنَ البَوْلِ» وَهُوَ صَحِيحُ الإِسْنَادِ.

اور حاکم کی روایت میں ہے اکثر عذاب قبر پیشاب کی وجہ سے ہوتا ہے۔ (اس کی سند صحیح ہے۔)

لغوی تشریح: ﴿ استنزهوا ﴾ اجتناب کرو۔ بچو۔ ﴿ منه ﴾ میں من تعلیلیہ ہے۔ مطلب یہ ہوا۔ پیشاب

سے پرہیز اور اجتناب نہ کرنے کی وجہ سے۔

(٩١) وعَنْ سُرَاقَةَ بْنِ مَالِكٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: عَلَّمَنَا رَسُولُ اللهِ ﷺ فِي الخَلاَءِ أَنْ نَقْعُدَ عَلَى اليُسْرَى ونَنْصِبَ اليُمْنَى. رَوَاهُ البَيْهقيُّ بِسَنَدٍ ضَعِيفٍ.

حضرت سراقہ بن مالک رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے قضاء حاجت کی تعلیم دیتے ہوئے ہمیں فرمایا کہ "ہم بائیں پاؤں پر وزن دے کر بیٹھیں اور دائیں کو کھڑا رکھیں (اس پر بوجھ کم ڈالیں)" (اس کو بیہقی نے ضعیف سند کے ساتھ روایت کیا ہے)

لغوی تشریح: ﴿علمنا﴾ تعلیم سے ماخوذ ہے' صیغہ غائب ہے۔ "نا" ضمیر متکلم جمع کی ہے اور مفعول واقع ہو رہا ہے۔ ﴿فی الخلاء﴾ قضاء حاجت کے آداب کے بارے میں۔ ﴿ننصب﴾ نصب سے ماخوذ ہے۔ کسی چیز کو کھڑے کرنے' قائم کرنے کیلئے استعمال ہوتا ہے۔ بسند ضعیف اس لئے کہ اس کی سند میں ایک غیر معروف راوی ہے۔

حاصل کلام: حکیم کا کوئی حکم حکمت سے خالی نہیں ہے۔ وہ حکمت خواہ کسی کی سمجھ میں آئے یا نہ آئے۔ اس حدیث میں نبی کریم ﷺ نے بائیں پاؤں پر بیٹھنے کا حکم دیا ہے اس کی وجہ یہ سمجھ میں آتی ہے کہ انسان کا معدہ بائیں طرف ہوتا ہے۔ بائیں پاؤں پر' بیٹھنے سے اخراج فضلہ میں سہولت اور آسانی ہوتی ہے۔

راوی حدیث: ﴿سراقہ﴾ سین پر ضمہ۔ سراقہ بن مالک بن جعشم' جعشم جیم پر ضمہ' عین ساکن اور شین پر ضمہ۔ قبیلہ مدلج میں سے تھے' اس لئے مدلجی کہلائے۔ ابوسفیان ان کی کنیت تھی۔ مشہور و معروف صحابی ہیں۔ یہ وہی شخص ہے جو ہجرت کے موقع پر نبی ﷺ کو انعام کے لالچ میں گرفتار کرنے کیلئے آپؐ کے تعاقب میں نکلا اور جب آپؐ کے قریب پہنچا تو اس کا گھوڑا گھٹنوں تک زمین میں دھنس گیا تھا۔ تو اس نے امان طلب کی۔ آپؐ نے امان دے دی۔ ۲۴ھ میں وفات پائی۔ فتح مکہ کے موقع پر مسلمان ہوئے۔

(٩٢) وَعَنْ عِيْسَى بْنِ يَزْدَادَ (بُزْدَادَ) عَنْ أَبِيْهِ قَالَ: قَالَ رسولُ الله ﷺ: «إِذَا بَالَ أَحَدُكُمْ فَلْيَنْتُرْ ذَكَرَهُ ثَلاَثَ مَرَّاتٍ». رَوَاهُ ابْنُ مَاجَهْ بِسَنَدٍ ضَعِيفٍ.

حضرت عیسیٰ بن یزداد نے اپنے والد سے روایت بیان کی کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "تم میں سے جب کوئی پیشاب کرے تو عضو مخصوص کو تین مرتبہ جھاڑ لے۔" (اسے ابن ماجہ نے ضعیف سند کے ساتھ روایت کیا ہے)

لغوی تشریح: ﴿فلینتر﴾ "نتر" سے ماخوذ ہے۔ جو کچھ نالی کے اندر رہ گیا ہو اسے جھاڑ کر نکالنا۔ اس کی سند میں ضعف ہے۔ یہ روایت مرسل ہے کیونکہ "یزداد" صحابی نہیں بلکہ مجہول راوی ہے اس کا بیٹا عیسیٰ بھی مجہول ہے۔

حاصل کلام: پیشاب سے فراغت کے بعد عضو مخصوص کو تین مرتبہ سونتنا یا جھاڑنا اس لئے ہے کہ اگر قابل

خارج قطرۂ پیشاب کہیں رک گیا ہو تو وہ خارج ہو جائے اور پوری طرح اطمینان ہو جائے۔ یہ روایت گو ضعیف ہے مگر پیشاب کے قطروں سے محفوظ رہنے کی روایت اس کی مؤید ہے۔ جس میں ذکر ہے کہ عذاب قبر اس لئے ہو رہا ہے کہ پیشاب کے قطروں سے بچتے نہ تھے۔

راوی حدیث: ﴿عیسی بن یزداد﴾ یہ دونوں باپ بیٹا مجہول ہیں۔ ابن معین کہتے ہیں کہ عیسیٰ اور اس کے باپ کی کوئی جان پہچان نہیں ہے۔ عقیلی کہتے ہیں۔ ان کی متابعت نہیں کی گئی اور نہ ہی ان کا تعارف ہے۔ یزداد کو باء کے ساتھ بھی پڑھا گیا ہے۔

(٩٣) وعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رضي الله تعالى عَنْهما، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ سَأَلَ أَهْلَ قُبَآءٍ فَقَالَ: **إِنَّ اللَّهَ يُثْنِي عَلَيْكُمْ**. فَقَالُوا: إِنَّا نُتبِعُ الحِجَارَةَ الماءَ. رَوَاهُ البَزَّارُ بِسَنَدٍ ضَعِيفٍ. وَأَصْلُه فِي أَبِي دَاوُدَ وَالتِّرْمِذِيِّ، وَصَحَّحَهُ ابْنُ خُزَيْمَةَ مِنْ حَدِيْثِ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، بِدُوْنِ ذِكْرِ الحِجَارَةِ.

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے اہل قباء سے سوال کیا کہ اللہ تعالیٰ نے تمہاری (پاکیزگی کے بارے میں) بڑی تعریف فرمائی ہے' اس کی وجہ کیا ہے؟ انہوں نے عرض کیا کہ ہم ڈھیلوں کے استعمال کے بعد مزید طہارت کیلئے پانی بھی استعمال کرتے ہیں۔ (اسے ضعیف سند کے ساتھ بزار نے روایت کیا ہے۔ اس کی اصل ابوداؤد اور ترمذی میں موجود ہے (اسی سلسلے میں) ابن خزیمہ نے ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت کو صحیح قرار دیا ہے البتہ اس میں ڈھیلوں کا ذکر نہیں ہے)

لغوی تشریح: ﴿اهل قباء﴾ سَأل فعل کا مفعول ہے اور قباء قاف پر ضمہ اور آخر پر الف ممدودہ اور کسرہ کے ساتھ۔ بعض کہتے ہیں کہ یہ مذکر ہے اور منصرف ہے اور بعض کہتے ہیں کہ یہ مؤنث غیر منصرف ہے مدینہ کے جنوب میں تین میل کے فاصلہ پر ایک مشہور مقام کا نام ہے۔ ﴿یثنی علیکم﴾ یعنی اللہ رب العزت نے اپنے اس قول کے ساتھ تمہاری تعریف کی ہے کہ ﴿فیه رجال یحبون ان یتطهروا والله یحب المطهرین﴾ (٩: ١٠٨) ان میں ایسے بھی لوگ ہیں جو طہارت کو پسند کرتے ہیں اور اللہ پاک رہنے والوں کو پسند کرتا ہے"۔ ﴿نتبع الحجارة الماء﴾ یعنی پہلے ہم پتھر سے استنجاء کرتے ہیں پھر اس کے بعد پانی سے صفائی حاصل کرتے ہیں اور ﴿نتبع﴾ باب افعال سے ہے اور ﴿الحجارة﴾ اس کا مفعول اول ہے ﴿الماء﴾ مفعول ثانی ہے۔ ﴿بسند ضعیف﴾ سے مراد ہے کہ چونکہ بزار نے محمد بن عبدالعزیز زھری سے روایت کیا ہے اور وہ ضعیف ہے اسی طرح اس سند میں عبداللہ بن شبیب بھی ضعیف راوی ہے۔

حاصل کلام: مسند بزار کی روایت اس لئے ضعیف ہے کہ اس کی سند کے دو راوی محمد بن عبدالعزیز اور عبداللہ بن شبیب ضعیف ہیں۔ "قباء" مدینہ طیبہ سے تین میل بجانب جنوب ہے۔ ہجرت کے موقعہ پر آپؐ نے پہلے یہیں قیام فرمایا تھا۔ اس حدیث سے معلوم ہوا کہ استنجاء میں ڈھیلے کے ساتھ پانی استعمال کرنا افضل ہے۔

٨ - بَابُ الغُسلِ وَحُكْمُ الجُنُبِ غسل اور جنبی کے حکم کا بیان

(٩٤) عَنْ أَبِيْ سَعِيْدٍ الخُدْرِيِّ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: «اَلْمَاءُ مِنَ الْمَاءِ». رَوَاهُ مُسْلِمٌ، وَأَصْلُهُ فِي البُخَارِيِّ.

حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "پانی کا استعمال خروج پانی سے ہے۔" (یعنی جب تک منی کا خروج نہ ہو اس وقت تک غسل واجب نہیں ہوتا۔) (اسے مسلم نے روایت کیا ہے اور اصل روایت بخاری میں بھی ہے)

لغوی تشریح: ﴿الماء من الماء﴾ اس میں "من" تعلیل کا ہے اور بعض روایات میں ﴿انما الماء من الماء﴾ کلمہ حصر کے ساتھ۔ پہلے ماء سے معروف پانی مراد ہے اور دوسرے "ماء" سے منی مراد ہے۔ معنی یہ ہے کہ پانی کے ساتھ غسل اس وقت واجب ہو گا جب انزال ہو اور منی خارج ہو جائے۔ کوئی آدمی جب اپنی بیوی کے ساتھ اکٹھے لیٹ جائے اور وہ عمل کرے جس سے منی کا خروج ہو تو غسل ضروری ہو گا اگر اتنے عمل کے باوجود بھی منی کا خروج نہ ہو تو غسل واجب نہیں ہوتا۔ اس میں جماع اور احتلام دونوں شامل ہیں۔ روایات میں یہ صراحت موجود ہے کہ یہ حکم جماع کے بارے میں وارد ہے۔ اس کا مقتضا یہ ہے کہ اگر ایک آدمی جماع تو کرتا ہے مگر انزال نہیں ہوا تو اس پر غسل واجب نہیں۔ ابتداء اسلام میں حکم اسی طرح تھا مگر حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث جو آگے آرہی ہے اور دیگر روایات سے یہ حکم منسوخ ہو گیا۔ اب صرف جماع سے غسل واجب ہوتا ہے' انزال ہوا ہو یا نہ ہو۔ احتلام کے بارے میں یہ حدیث وارد نہیں ہوئی' مگر الفاظ چونکہ عام ہیں اس لئے یہ بھی اس میں شامل ہے اور وہ یہ کہ احتلام میں بھی جب تک انزال نہ ہو غسل واجب نہیں ہوتا۔

حاصل کلام: اس حدیث کو احتلام کے بارے میں سمجھا گیا ہے جماع سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔ جمہور علماء کی یہی رائے ہے۔ حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ اسلام کے آغاز میں یہ حکم بھی تھا کہ جماع سے اس وقت غسل فرض ہوتا ہے جب آدمی کو انزال ہو۔ لیکن کچھ مدت بعد یہ حکم منسوخ ہو گیا۔ قاضی ابن عربی نے کہا ہے کہ اس مسئلہ میں تمام مسلمانوں کا اجماع ہے کہ مرد و عورت کے اعضاء مخصوص ایک دوسرے سے ملاپ کر لیں تو غسل واجب ہو جاتا ہے خواہ انزال کی نوبت پیش نہ آئی ہو۔

(٩٥) وعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «إِذَا جَلَسَ أَحَدُكُمْ بَيْنَ شُعَبِهَا الأَرْبَعِ ثُمَّ جَهَدَهَا، فَقَدْ وَجَبَ الغُسْلُ». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ، وَزَادَ مُسْلِمٌ: «وَإِنْ لَمْ

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "کہ جب تم میں سے کوئی عورت کی چار شاخوں کے درمیان میں بیٹھے پھر اپنی پوری کوشش کر لے تو اس پر غسل واجب ہو گیا۔" (بخاری و مسلم) اور مسلم نے اتنا اضافہ نقل کیا ہے کہ

يُنْزِلْ». "خواہ انزال نہ ہوا ہو۔"

لغوی تشریح: ﴿ اذا جلس ﴾ یعنی مرد جب بیٹھ جائے ﴿ بین شعبها ﴾ عورت کی شاخوں میں۔ ﴿ شعب ﴾ شعبہ کی جمع ہے۔ شین پر ضمہ ہے عین پر فتحہ۔ درخت کی شاخ کیلئے استعمال ہوتا ہے یا کسی چیز کا کچھ حصہ بھی اس سے مراد لیا جاتا ہے۔ عورت کی چار شاخوں سے مراد اس کے دو بازو اور دو پاؤں یعنی ٹانگیں اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس سے مراد عورت کے پاؤں اور رانیں ہیں اور یہ بھی ایک قول ہے کہ اس سے عورت کی دونوں پنڈلیاں اور دونوں رانیں مراد ہیں۔ جو بھی مراد ہو مقصود اس سے عورت سے جماع سے کنایہ ہے اور ابوداؤد کی ایک روایت میں ﴿ والزق الختان الختان ﴾ بھی مروی ہے۔ (عضو مخصوص کے عورت کی شرم گاہ سے ملاپ پر غسل واجب ہو جاتا ہے) ﴿ ثم جهدها ﴾ اس میں کنایہ ہے مرد کے عضو مخصوص کا عورت کی شرم گاہ میں دخول سے۔

حاصل کلام: مرد کا عضو مخصوص جب عورت کی شرم گاہ میں داخل ہو جائے خواہ حشفہ ہی غائب ہو ایسی صورت میں غسل واجب ہو جاتا ہے۔ خلفاء اربعہ' ائمہ اربعہ کے علاوہ اکثر صحابہ کرامؓ اور تابعین عظام کا یہی مذہب ہے۔ اس کو جماع پر محمول کیا جائے تو اس حدیث کو پہلی حدیث کا ناسخ سمجھا جائے گا۔

(٩٦) وَعَنْ أُمِّ سَلَمَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهَا أَنَّ أُمَّ سُلَيْمٍ - وَهِيَ امْرَأَةُ أَبِي طَلْحَةَ - قَالَتْ: يا رسولَ اللهِ! إِنَّ اللَّهَ لاَ يَسْتَحِيي مِنَ الحَقِّ، فَهَلْ عَلَى المَرأَةِ مِنْ غُسْلٍ إِذَا احْتَلَمَتْ؟ قَالَ: «نَعَمْ، إِذَا رَأَتِ المَاءَ»، الحديث مُتَّفَقٌ عَلَيْه.

حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ ام سلیم ابوطلحہ کی اہلیہ نے رسول اللہ ﷺ سے پوچھا یا رسول اللہ (ﷺ)! اللہ تعالیٰ حق بیان کرنے سے حیاء نہیں کرتا تو بتائیں کیا عورت کو جب احتلام ہو جائے تو اس پر بھی غسل فرض ہے؟ فرمایا "ہاں! جب وہ پانی دیکھے" (بخاری و مسلم)

لغوی تشریح: ﴿ لا يستحيى من الحق ﴾ "حاء" کے بعد دو یاء ہیں "حاء" اس میں ساکن ہے۔ معنی یہ ہیں کہ وہ حق کے بیان کرنے سے رکتا اور حیا کی بنا پر اسے ترک نہیں کرتا۔ اسی طرح جن مسائل کے دریافت کرنے کی مجھے ضرورت و احتیاج ہے ان سے میں رک نہیں سکتی۔ ساتھ ہی مزید کہا۔ ایسے ہی مسائل جن کو دریافت کرنے سے عورتیں عموماً شرماتی ہیں اور عذر پیش کرتی ہیں۔ ﴿ اذا احتلمت ﴾ جب اسے احتلام ہو جائے ایک دوسری روایت میں ﴿ اذا رات ان زوجها يجامعها فى المنام ﴾ کے الفاظ بھی منقول ہیں۔ یعنی جب وہ دیکھے کہ خواب میں اس کا شوہر اس سے زن و شو کے تعلقات کئے ہوئے ہے۔ ﴿ اذ رات الماء ﴾ جب نیند سے بیدار ہو تو منی دیکھے۔

راوی حدیث: ﴿ ام سليم رضی اللہ عنہا ﴾ ان کا نام رمیصاء یا غمیصاء بنت ملحان تھا۔ حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ کی والدہ تھیں۔ فاضلہ و عالمہ خاتون تھیں۔ مالک بن نصر کی زوجیت میں تھیں۔ یہ مسلمان ہو گئیں۔ اس نے اپنے

خاوند کے سامنے اسلام پیش کیا۔ اس وجہ سے ناراض ہو کر شام کی طرف بھاگ گیا اور فوت ہو گیا۔ مالک بن نضر کی وفات کے بعد ابو طلحہؓ نے ان کو پیغام نکاح دیا۔ ابو طلحہؓ ابھی مشرک تھے۔ ام سلیم رضی اللہ عنہا نے شرط پیش کی کہ اسلام قبول کر لو تو میں تمہارے ساتھ نکاح کر لوں گی۔ اس شرط کو ابو طلحہ رضی اللہ عنہ نے قبول کیا اور مسلمان ہو گئے تو ام سلیم رضی اللہ عنہا نے ان سے نکاح کر لیا۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے دور خلافت میں وفات پائی۔

(٩٧) وعَنْ أَنَسٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ، فِي المَرأَةِ تَرَى فِي مَنَامِها مَا يَرَى الرَّجُلُ، قال: **تَغْتَسِلُ**. مُتَّفَقٌ عَلَيْه، وَزَادَ مُسْلِمٌ: «فَقَالَتْ أُمُّ سَلَمَةَ: وَهَل يَكُونُ هَذا؟ قَالَ: «نَعَمْ، فَمِنْ أَيْنَ يَكُونُ الشَّبَهُ؟».

حضرت انس رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے اس عورت کے متعلق فرمایا جو خواب میں وہی کچھ دیکھے جو ایک نوجوان مرد دیکھتا ہے (احتلام) کہ وہ غسل کرے۔ (بخاری و مسلم)

اور مسلم نے اتنا اضافہ بھی نقل کیا ہے کہ ام سلمہ رضی اللہ عنہا نے آپؐ کے جواب دینے پر مزید دریافت کیا' کیا ایسا (عورت) کے ساتھ بھی ہوتا ہے؟ آپؐ نے فرمایا ہاں' اگر ایسا نہ ہوتا تو مشابہت کہاں سے ہوتی۔"

لغوی تشریح: ﴿ما یری الرجل﴾ اس سے مراد ہے احتلام۔ ﴿فمن این یکون الشبہ؟﴾ شبہ میں شین پر کسرہ ہے اور "با" ساکن ہے اور دونوں پر فتحہ بھی جائز ہے۔ مماثلت کے معنی ہیں اور اس میں (این) استفہامیہ ہے جو دراصل حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا کے اس خیال کی تردید کیلئے ہے کہ آیا عورت کو بھی احتلام ہوتا ہے۔ گفتگو کا ماحصل یہ ہے کہ بچہ کبھی باپ سے مشابہت رکھتا ہے اور کبھی ماں سے اور ننھیال سے اور یہ اسی صورت میں ہی ہو سکتا ہے کہ شہوت کے وقت عورت کے اندر بھی منی کود کر خارج ہو اور بچہ کی خلقت و ساخت میں حصہ دار بنے۔ حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا کا انکار اس پر دلالت کرتا ہے کہ عورتوں کو احتلام بڑی نادر صورت ہے۔ یعنی بہت کم ہوتا ہے مردوں کی طرح کثرت سے نہیں ہوتا۔

حاصل کلام: جس طرح مردوں کو احتلام لاحق ہوتا ہے اور ان پر غسل کرنا فرض ہے اسی طرح عورتوں کو بھی یہ صورت لاحق ہوتی ہے ان کو غسل کرنا بھی فرض ہے باقی رہا بچہ کی مشابہت کا مسئلہ تو اس بارے میں حدیث سے ثابت ہے کہ جب مرد کا پانی غالب ہوتا ہے تو نومولود کی مشابہت باپ پر ہوتی ہے اور جب ماں کا پانی غالب ہو تو بچہ کی مشابہت والدہ سے ہوتی ہے۔

(٩٨) وَعَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهَا قَالَتْ: كَانَ رَسُولُ الله ﷺ يَغْتَسِلُ مِنْ أَرْبَعٍ: مِنَ الجَنَابَةِ،

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ چار چیزوں کی وجہ سے غسل فرمایا کرتے تھے۔ جنابت' جمعہ کے روز' سینگی لگوانے کے بعد اور میت

وَيومَ الجُمُعَةِ، وَمِنَ الحِجَامَةِ، وَمِنْ غُسْلِ المَيِّتِ. رَوَاهُ أَبُو دَاوُدَ، وَصَحَّحَهُ ابنُ خُزَيْمَةَ.

کو غسل دینے کی وجہ سے۔ (ابوداوُد نے اسے روایت کیا ہے اور ابن خزیمہ نے صحیح قرار دیا ہے)

حاصل کلام : اس حدیث میں جن چار چیزوں سے غسل کرنے کا ذکر ہے ان میں غسل جنابت بالاتفاق فرض ہے۔ جمعہ کے روز غسل جمہور صحابہ و تابعین اور اکثر ائمہ کے نزدیک مسنون ہے البتہ امام احمد اور امام مالک کا ایک قول یہ ہے کہ وہ فرض ہے۔ امام داوُد ظاہری اور ابن خزیمہ کا بھی یہی مسلک ہے اور حافظ ابن قیم کا زاد المعاد میں اسی طرف رجحان ہے۔ سینگی لگوانے سے غسل مسنون ہے فرض نہیں۔ پہلے حضرت انس رضی اللہ عنہ کی حدیث گزر چکی ہے کہ آپؐ نے سینگی لگوائی اور وضو کئے بغیر نماز پڑھی۔ جو اس بات کی دلیل ہے کہ آپؐ نے غسل تو کیا کبھی وضو بھی سنگی لگوانے کے بعد نہیں کیا۔ رہا میت کو غسل دینے سے غسل، تو پہلے اس کے بارے میں بھی گزر چکا ہے کہ یہ مستحب ہے' فرض نہیں۔ جمہور اہل علم کا یہی فیصلہ ہے۔

(۹۹) وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رضيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ - فِي قِصَّةِ ثُمَامَةَ بْنِ أُثَالٍ عِنْدَمَا أَسْلَمَ - وَأَمَرَهُ النَّبِيُّ ﷺ أَنْ يَغْتَسِلَ. رَوَاهُ عَبدُ الرَّزَّاقِ، وَأَصلُهُ مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے ثمامہ بن اثال رضی اللہ عنہ کے اسلام لانے کے واقعہ کے متعلق مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے اسے غسل کرنے کا حکم ارشاد فرمایا۔ (عبدالرزاق نے اسے روایت کیا ہے اور اس کی اصل بخاری و مسلم میں موجود ہے)

حاصل کلام : کافر جب اسلام لانے کیلئے آمادہ ہو تو پہلے اسے غسل کرنا چاہئے۔ یہ غسل واجب ہے یا مسنون و مستحب اس میں بھی علماء کے مابین اختلاف ہے۔ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ اور امام احمد رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک واجب ہے۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ' امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اسے مستحب سمجھتے ہیں۔

راوی حدیث : ﴿ثمامہ بن اثال رضی اللہ عنہ﴾ دونوں لفظوں کے پہلے حرف یعنی "ثا" اور "الف" دونوں پر ضمہ ہے۔ یمامہ کے قبیلہ بنو حنیفہ کے فرد تھے اور سرداری کے منصب پر بھی فائز تھے۔ عمرہ ادا کرنے نکلے تھے کہ رسول اللہ ﷺ کے گشتی شاہ سواروں کے ہاتھوں گرفتار ہوئے۔ وہ ان کو مدینہ منورہ میں رسول اللہ ﷺ کی خدمت اقدس میں لائے اور انہیں مسجد نبوی کے ایک ستون کے ساتھ باندھ دیا گیا۔ تین روز بعد نبی ﷺ نے بطور احسان انہیں آزاد فرما دیا۔ اس کے بعد یہ مسلمان ہوگئے اور بہت عمدہ اسلام کا ثبوت دیا۔ جن دنوں لوگ مرتد ہو رہے تھے یہ بڑی مضبوطی اور ثابت قدمی سے اسلام پر ڈٹے رہے۔ جب اس کی قوم کے لوگ مسیلمہ کذاب کے فتنہ کا شکار ہوگئے تو یہ ان کے خلاف بڑے حوصلے اور عزم و ہمت سے ثابت قدم رہے۔

(۱۰۰) وعَن أَبِي سَعِيْدٍ الخُدْرِيِّ حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ

رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُ، أَنَّ رَسُولَ اللهِ ﷺ قَالَ: «غُسْلُ يَوْمِ الْجُمُعَةِ وَاجِبٌ عَلَى كُلِّ مُحْتَلِمٍ». أَخْرَجَهُ السَّبْعَةُ.

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "جمعہ کے روز غسل کرنا ہر بالغ پر واجب ہے۔" (اس کو ساتوں یعنی بخاری، مسلم، ابوداؤد، ترمذی، نسائی، ابن ماجہ اور احمد نے روایت کیا ہے)

لغوی تشریح: ﴿ محتلم ﴾ بالغ کو کہتے ہیں۔

حاصل کلام: یہ حدیث ان لوگوں کی دلیل ہے جو غسل یوم جمعہ کو واجب قرار دیتے ہیں کیونکہ اس میں "واجب" کا لفظ صراحتاً آیا ہے۔ مگر جہاں تک جمہور کا تعلق ہے وہ اسے مسنون قرار دیتے ہیں اور اس میں وجوب کے حکم کو تاکید کیلئے سمجھتے ہیں۔

(۱۰۱) وَعَنْ سَمُرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «مَنْ تَوَضَّأَ يَوْمَ الْجُمُعَةِ فَبِهَا وَنِعْمَتْ، وَمَنِ اغْتَسَلَ فَالْغُسْلُ أَفْضَلُ». رَوَاهُ الْخَمْسَةُ، وَحَسَّنَهُ التِّرمِذِيُّ.

حضرت سمرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "جمعہ کے روز جس نے وضو کیا اس نے اچھا اور بہتر کیا اور جس نے غسل کیا تو غسل تو بہرحال افضل ہے اور بہترین ہے۔" (اس کو پانچوں یعنی احمد، ابوداؤد، ترمذی، نسائی اور ابن ماجہ نے روایت کیا ہے اور ترمذی نے اسے حسن قرار دیا ہے)

لغوی تشریح: ﴿ فبها ﴾ ایک مفہوم اس کا یہ ہے کہ یہ طریقہ مسنون ہے یا پھر اسے رخصت پر محمول کیا گیا ہے کہ ایسا کرنے کی اجازت و رخصت ہے یا یہ بھی معنی کئے گئے ہیں کہ جمعہ کے روز وضو پر اکتفا کرنا ایک اچھی اور عمدہ عادت ہے۔ ﴿ ونعمت ﴾ کا بھی وہی مفہوم ہے جو ﴿ فبها ﴾ کے ضمن میں بیان کیا گیا ہے کہ یہ طریقہ مسنون بھی ہے یا اچھی اور عمدہ خصلت بھی اور یہ حدیث جمعہ کے روز غسل کے وجوب کے موقف کی تائید کرتی ہے، لیکن جو حدیث اس کے وجوب پر دال ہے وہ زیادہ صحیح اور راجح ہے اور عدم وجوب پر دلالت کرنے والی حدیث سے زیادہ قوی ہے۔ اس لئے زیادہ صحیح، راجح اور قوی کو اختیار کرنا زیادہ محتاط طریقہ ہے۔

حاصل کلام: اس حدیث کی روشنی میں معلوم ہوا کہ جمعہ کا غسل واجب نہیں۔ اس لئے کہ واجب کو افضل نہیں کہا جاتا غالباً اسی وجہ سے جمہور علماء نے واجب سے لغوی معنی مراد لئے اصطلاحی نہیں۔ لغوی معنی کو تقویت مسلم کی روایت سے ملتی ہے جو اس کے فرض نہ ہونے پر دلالت کرتی ہے۔ البتہ نہایت اولیٰ بات یہی ہے کہ مسلمان کو جمعہ کے روز غسل کرنے میں بہت احتیاط ملحوظ رکھنی چاہئے۔ صاحب زاد المعاد علامہ ابن قیم رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ غسل کیلئے بہت تاکید ہے۔ یہ بھی ذہن نشین رہے کہ لفظ وجوب وتر کے سلسلہ میں اگر کچھ قوت رکھتا ہے تو غسل جمعہ کیلئے اس سے زیادہ باعث قوت ہے۔

راوی حدیث: ﴿ سمرہؓ ﴾ سین کے فتحہ اور میم کے ضمہ کے ساتھ۔ ﴿ جندب ﴾ جیم کے ضمہ، نون

ساکن اور دال پر ضمہ۔ مشہور صحابی رسول ﷺ ہیں۔ ان کی کنیت ابو عبداللہ ہے اور فزار قبیلہ کے فرد ہونے کی وجہ سے فزاری کہلائے۔ انصار سے حلیفانہ روابط و تعلقات تھے۔ یہ ان حفاظ میں سے تھے جنہیں بکثرت احادیث و قرآن یاد تھا۔ بصرہ میں سکونت پذیر ہوئے۔ خوارج کے گروہ حروریہ کے سلسلہ میں بڑے سخت تھے۔ ۵۹ھ کے آخر میں وفات پائی۔

(۱۰۲) وعَنْ عَلِيٍّ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: كَانَ النَّبِيُّ ﷺ يُقْرِئُنَا القُرْآنَ مَا لَمْ يَكُنْ جُنُباً. رَوَاهُ أَحْمَدُ وَالأَرْبَعَةُ، وَهَذَا لَفْظُ التِّرْمِذِيِّ، وَحَسَّنَهُ، وَصَحَّحَهُ ابْنُ حِبَّانَ.

حضرت علی رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ حالت جنابت کے علاوہ ہر حالت میں ہمیں قرآن مجید پڑھا دیا کرتے تھے۔ (اسے پانچوں احمد' ابوداؤد' ترمذی' نسائی' ابن ماجہ نے روایت کیا ہے۔ متن حدیث کے الفاظ ترمذی کے ہیں اور ابن حبان نے صحیح قرار دیا ہے)

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ جنبی مرد کو غسل سے پہلے قرآن پاک کی تلاوت نہیں کرنی چاہئے۔ جبکہ قرآن کی نیت سے ایک آیت بھی نہیں پڑھنی چاہئے' چنانچہ امام ابو یعلیٰ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے بیان کیا ہے کہ میں نے نبی کریم ﷺ کو دیکھا ہے کہ آپؐ نے پہلے وضو کیا اور پھر بعد میں قرآن مجید پڑھا اور ارشاد فرمایا کہ "جس کسی کو جنابت لاحق ہو اس کیلئے مناسب یہی طریقہ ہے (کہ وضو کر کے تلاوت قرآن مجید کرے) اور جنبی نہ پڑھے اگرچہ ایک ہی آیت کیوں نہ ہو"۔

(۱۰۳) وَعَنْ أَبِي سَعِيْدٍ الخُدرِيِّ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «**إِذَا أَتَى أَحَدُكُمْ أَهْلَهُ، ثُمَّ أَرَادَ أَنْ يَعُودَ، فَلْيَتَوَضَّأْ بَيْنَهُمَا وُضُوءًا**». رَوَاهُ مُسْلِمٌ، زَادَ الحَاكِمُ: «**فَإِنَّهُ أَنْشَطُ لِلْعَوْدِ**».

حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے کہ "جب تم میں سے کوئی اپنی اہلیہ کے پاس جائے (یعنی تعلق زن و شو قائم کرے) پھر دوبارہ لطف اندوز ہونے کا ارادہ ہو تو درمیان میں وضو کر لے۔" (مسلم)

اور حاکم نے اتنا اضافہ نقل کیا ہے کہ (یہ وضو دوبارہ مباشرت کیلئے زیادہ باعث نشاط ہے یعنی فرحت بخش اور تازگی پیدا کرتا ہے

وَلِلأَرْبَعَةِ عَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهَا، قَالَتْ: كَانَ رَسُولُ اللهِ ﷺ يَنَامُ وَهُوَ جُنُبٌ، مِنْ غَيْرِ أَنْ يَمَسَّ مَاءً. وَهُوَ مَعْلُولٌ.

اور سنن اربعہ (یعنی ابوداؤد' ترمذی' نسائی اور ابن ماجہ) میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ حالت جنابت میں پانی کو ہاتھ لگائے بغیر سو جاتے۔ (یہ روایت معلول ہے۔)

لغوی تشریح: ﴿انشط﴾ اسم تفضیل کا صیغہ ہے۔ بہت نشاط و مسرت اور فرحت و تازگی بخش ہے۔

اطیب اور اجود ہے تروتازگی اور عمدگی لذت طبیعت میں پیدا کرتا ہے۔ ﴿من غیر ان یمس ماء﴾ اس جملہ میں جس نفی کا ذکر ہے وہ غسل اور وضو دونوں کو شامل ہے۔ یعنی نبی کریم ﷺ نہ وضو فرماتے اور نہ ہی غسل کرتے۔ اس حدیث کی روشنی میں یہ بات واضح اور صاف ہوگئی کہ حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ والی روایت میں وضو کرنے کا جو حکم ارشاد ہوا ہے وہ مستحب ہے، واجب نہیں یا جو پہلو زیادہ مفید ہے اس کی جانب اشارہ کرنا مطلوب ہے۔ ﴿وھو معلول﴾ اس حدیث کے معلول ہونے کی وجہ محدثین کی نظر میں ابواسحٰق کا ابوالاسود کے واسطہ سے روایت کرنا ہے۔ کہا گیا ہے کہ ابواسحٰق کا ابواسود سے سماع ثابت نہیں لیکن امام بیہقی نے اسے صحیح قرار دیا ہے اور انہوں نے اس کا سماع ثابت کیا ہے۔ حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے بھی معلول اس لئے کہا کہ ان کے نزدیک بھی ابواسحٰق کا ابو اسود سے سماع ثابت نہیں مگر امام بیہقی رحمۃ اللہ علیہ کے یہ ثابت کرنے سے کہ ان کا سماع یقینی ہے، حدیث معلول نہیں رہتی۔

حاصل کلام: مسلم کی روایت سے ثابت ہوتا ہے کہ آپ ؐ خورد و نوش اور مباشرت کیلئے عضو مخصوص دھو کر وضو فرمالیتے تھے۔ اکثر علماء امت کے نزدیک یہ وضو واجب نہیں مستحب ہے۔

(۱۰٤) وَعَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهَا قَالَتْ: كَانَ رَسُولُ اللهِ ﷺ إِذَا اغْتَسَلَ مِنَ الجَنَابَةِ يَبْدَأُ فَيَغْسِلُ يَدَهُ، ثُمَّ يُفْرِغُ بِيَمِيْنِهِ عَلَى شِمَالِهِ فَيَغْسِلُ فَرْجَهُ، ثُمَّ يَتَوَضَّأُ ثُمَّ يَأْخُذُ المَآءَ فَيُدْخِلُ أَصَابِعَهُ فِي أُصُولِ الشَّعْرِ، ثُمَّ حَفَنَ عَلَى رَأْسِهِ ثَلاَثَ حَفَنَاتٍ، ثُمَّ أَفَاضَ عَلَى سَائِرِ جَسَدِهِ، ثُمَّ غَسَلَ رِجْلَيْهِ. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ، وَاللَّفْظُ لِمُسْلِمٍ.

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ جب غسل جنابت کرتے تو اس طرح آغاز کرتے۔ پہلے ہاتھ دھوتے پھر سیدھے ہاتھ سے بائیں ہاتھ پر پانی ڈالتے اور اپنا عضو مخصوص دھوتے۔ پھر وضو کرتے، پھر پانی لے کر اپنی انگلیوں کے ذریعہ سر کے بالوں کی تہہ (جڑوں) میں داخل کرتے۔ پھر تین چلو پانی کے بھر کر یکے بعد دیگرے سر پر ڈالتے۔ پھر باقی سارے وجود پر پانی بہاتے (سب سے آخر میں) پھر دونوں پاؤں دھوتے۔ (بخاری و مسلم، متن حدیث کے الفاظ مسلم کے ہیں)

وَلَهُمَا فِي حَدِيْثِ مَيْمُوْنَةَ: «ثُمَّ أَفْرَغَ عَلَى فَرْجِهِ وَغَسَلَهُ بِشِمَالِهِ، ثُمَّ ضَرَبَ بِهَا الأَرْضَ».

اور بخاری و مسلم میں حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا کی روایت میں اس طرح ہے "پھر اپنے عضو مخصوص پر پانی ڈالتے اور اپنے بائیں ہاتھ سے اسے دھوتے اور ہاتھوں کو زمین پر مار کر مٹی سے ملتے اور (صاف کرتے)"

وَفِيْ رِوَايَةٍ: «فَمَسَحَهَا بِالتُّرَابِ».

اور ایک دوسری روایت میں اس طرح ہے۔ "پھر دونوں ہاتھ مٹی سے مل کر اچھی طرح

وَفِي آخِرِهِ: «ثُمَّ أَتَيْتُهُ بِالمِنْدِيْلِ

فَرَدَّهُ»، وَفِيْه: «وجَعَلَ يَنْفُضُ الْمَآءَ بِيَدِهِ». صاف کرتے۔" اس روایت کے آخر میں ہے کہ "میں نے آپ کی خدمت میں رومال (تولیہ) پیش کیا مگر آپ نے اسے واپس لوٹا دیا اور بدن (پر جو پانی رہ گیا تھا) اسے اپنے ہاتھ سے جھاڑنا شروع کیا۔"

لغوی معنی: ﴿ یفرغ ﴾ افراغ سے ماخوذ ہے۔ جس کے معنی ہیں پانی چھڑکتے تھے۔ ڈالتے تھے۔ انڈیلتے تھے۔ ﴿ یغسل فرجه ﴾ عضو مخصوص اوراس کے اردگرد کے حصے کو جو رانوں کے ساتھ ملحق ہوتا دھوتے تھے جیسا کہ ابوداؤد میں وارد ﴿ مرافغ ﴾ کے لفظ سے یہ مفہوم ہوتا ہے۔ ﴿ مرافغ ﴾ مرفغ کی جمع ہے، یعنی شرم گاہ کا اردگرد۔ ﴿ فیدخل ﴾ ادخال سے یدخل بنا ہے۔ باب افعال ہے۔ ﴿ فیدخل اصابعه ﴾ اپنی انگلیوں کو داخل کرتے اپنے سر کے بالوں کی جڑوں تک۔ ﴿ فی اصول الشعر ﴾ اپنی انگلیوں سے سر کے دائیں پہلو والے بالوں میں پہلے ڈالتے اور بائیں جانب بعد میں تاکہ بالوں کی جڑوں اور جسم کی کھال تک پانی کی تری پہنچ جائے۔ ﴿ ثم حفن ﴾ دونوں ہاتھوں کو ملا کر پانی بھر کر ڈالتے۔ ﴿ حفنات ﴾ حفنۃ کی جمع ہے "حاء" اور "فاء" دونوں پر فتحہ ہے۔ ﴿ حفنۃ ﴾ کے معنی لپ اور چلو کے آتے ہیں یعنی دونوں ہاتھوں کو ملا کر دونوں ہتھیلیوں کو پانی سے بھرنا ﴿ ثم افاض الماء ﴾ پھر پانی بہاتے یا انڈیلتے۔ یعنی کھلا پانی جسم پر بہا دیتے۔

حاصل کلام: حدیث مذکور میں کچھ پہلو وضاحت طلب ہیں۔ مختلف احادیث کے ملانے سے وضاحت ہوتی ہے کہ غسل کرنے سے پہلے آپ ہاتھ دھوتے۔ اس میں تعداد کا ذکر نہیں کہ کتنی بار دھوتے۔ ام المومنین میمونہ کی روایت میں دو یا تین بار دھونے کا ذکر ہے پھر آپ اپنی شرمگاہ کو دھوتے پھر ہاتھ مٹی پر مار کر ہاتھ صاف کرتے پھر اسی طرح غسل کرتے جس طرح نماز کیلئے غسل کیا جاتا ہے۔ پھر سر کے بالوں کا خلال کرتے۔ پہلے سر کے دائیں جانب بالوں میں خلال کر کے پانی کی تری جڑوں تک پہنچاتے پھر بائیں طرف والے بالوں میں اسی طرح کرتے۔ پھر سارے جسم پر پانی بہاتے اور آخر میں پاؤں دھوتے۔ حضرت میمونہ کی روایت میں ہے کہ پہلے ایک طرف ہو جاتے پھر دونوں پاؤں دھوتے۔ اسی غسل میں کئے گئے وضو سے نبی کریم ﷺ نے صبح کی دو سنتیں اور نماز فجر کے فرض ادا فرمائے گویا دوبارہ از سر نو وضو کرنے کی ضرورت و حاجت نہیں۔ نیز اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ وضو اور غسل کے بعد چہرے اور ہاتھوں اور باقی بدن پر پانی کے اثرات کو تولئے یا رومال وغیرہ سے صاف کرنا ضروری نہیں کیونکہ بعض روایات میں کپڑے سے پانی خشک کرنے کا ذکر بھی آیا ہے اور وضو کے پانی کو ہاتھ سے جھاڑنے میں کوئی مضائقہ بھی نہیں اور جس روایت میں ہاتھ سے پانی جھاڑنے کی ممانعت آئی ہے وہ حدیث ضعیف ہے۔ صحیح حدیث کی موجودگی میں ضعیف کی کوئی وقعت و حیثیت نہیں۔

(۱۰۵) وعَنْ أُمِّ سَلَمَةَ رضي الله حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ میں نے عرض کیا

تعالی عنھا قَالَتْ: قُلْتُ: يَا رَسُولَ اللهِ! إِنِّي امْرَأَةٌ أَشُدُّ شَعَرَ رَأْسِي، أَفَأَنْقُضُهُ لِغُسْلِ الجَنَابَةِ؟ وَفِيْ رِوَايَةٍ: وَلِلْحَيْضَةِ؟ فَقَالَ: **لاَ، إِنَّمَا يَكْفِيْكِ أَنْ تَحْثِي عَلَى رَأْسِكِ ثَلاَثَ حَثَيَاتٍ**. رَوَاهُ مُسْلِمٌ.

یارسول اللہ (ﷺ)! میں اپنے سر کے بال (یعنی مینڈھیوں کی شکل میں) باندھ لیتی ہوں۔ کیا غسل جنابت کے موقع پر ان کو کھولوں؟ اور ایک روایت میں حیض سے فارغ ہو کر غسل کے وقت کے الفاظ ہیں۔ آپؐ نے فرمایا ”نہیں (کھولنے کی ضرورت نہیں) بس تیرے لئے یہی کافی ہے کہ تو اپنے سر پر تین چلو پانی بہا دیا کر۔“ (مسلم)

لغوی تشریح: ﴿ اشد ﴾ شد یشد سے واحد متکلم کا صیغہ ہے۔ جس کے معنی باندھنا مضبوطی کے ساتھ۔ ﴿ اتحثی ﴾ انڈیل تو' ڈال تو۔ ﴿ حثیات ﴾ خفنات کے معنی میں ہے۔ پانی سے بھرے ہوئے دونوں ہاتھوں کے چلو۔

حاصل کلام: یہ حدیث اس کی دلیل ہے کہ جسے جنابت لاحق ہو جائے اور جسے حیض آیا ہو اس کیلئے غسل کیلئے بالوں کا کھولنا ضروری نہیں البتہ حضرت عائشہؓ کی روایت میں ہے کہ آپؐ نے بالوں کو کھولنے کا حکم فرمایا مگر یہ دونوں روایتیں باہم متعارض نہیں کیونکہ بال کھولنے کا حکم محض استحباب کیلئے ہے جنابت اور غسل حیض میں عورت پر واجب نہیں کہ وہ سر کے بال کھولے صرف بالوں کی جڑ یا سر کا چمڑا تر ہونا چاہئے۔ سارے بال تر ہونا ضروری نہیں۔ مسلم اور مسند احمد میں ہے کہ حضرت عائشہؓ کو کسی ذریعہ سے اطلاع ملی کی حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما عورتوں کو غسل جنابت و حیض کے وقت سر کے بال کھولنے کا حکم دیتے ہیں۔ اس پر حضرت عائشہؓ نے اظہار تعجب فرمایا کہ عبداللہ رضی اللہ عنہ کو معلوم نہیں کس طرح عورتوں کو بال کھولنے کا حکم دیتے ہیں اس سے تو بہتر ہے کہ وہ عورتوں کو سر منڈوانے کا حکم دیں۔ میں اور آنحضور ﷺ ایک ہی ٹب نما برتن میں غسل کر لیا کرتے تھے اور میں سر پر صرف تین بار پانی ڈال لیتی تھی۔ گویا سر کے بال کھولنے کی ضرورت نہیں سمجھتی تھی۔

(١٠٦) وَعَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهَا قَالَتْ: قَالَ رَسُولُ اللَّهُ ﷺ: «**إِنِّي لاَ أُحِلُّ الْمَسْجِدَ لِحَائِضٍ وَلاَ جُنُبٍ**». رَوَاهُ أَبُو دَاوُدَ، وَصَحَّحَهُ ابْنُ خُزَيْمَةَ.

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا روایت کرتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ”میں حائضہ عورت اور حالت جنابت میں مبتلا مرد کیلئے مسجد میں داخلہ حلال نہیں کرتا (یعنی ان دونوں کو مسجد میں داخل ہونے کی بھی اجازت نہیں دیتا)“ (اس کو ابوداؤد نے روایت کیا ہے اور ابن خزیمہ نے اسے صحیح قرار دیا ہے)

لغوی تشریح: ﴿ لا احل المسجد ﴾ احلال سے واحد متکلم کا صیغہ ہے۔ میں مسجد میں داخلہ کو حلال

نہیں کرتا۔ یہ صیغہ تحریم کے بارے میں صریح ہے۔

حاصل کلام: یہ حدیث اس بات کی دلیل ہے کہ حائضہ عورت اور جنبی مرد دونوں مسجد میں نہ قیام کر سکتے ہیں اور نہ عام حالت میں مسجد میں داخل ہو سکتے ہیں البتہ اگر مسجد کے علاوہ دوسرا کوئی راستہ گزرنے کا نہ ہو تو ائمہ میں سے امام مالک رحمۃ اللہ علیہ ' امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ اور امام احمد رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک مسجد میں سے گزرنا جائز ہے۔ مگر امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ دونوں کا مسجد میں سے گزرنا ناجائز قرار دیتے ہیں۔ یہ حدیث امام موصوف کی رائے کی تائید کرتی ہے۔ جائز ہونے کی دلیل قرآن مجید کی آیت ﴿ الاعابری سبیل ﴾ ہے' یعنی جنبی مسجد میں نہ جائے ہاں اگر مسجد میں سے گزرنا پڑے تو مجبوراً گزر سکتا ہے اور حدیث سے مراد ٹھہرنے کی ممانعت ہے۔ نہ کہ گزرنے کی۔ امام احمد رحمۃ اللہ علیہ تو آثار صحابہ رضی اللہ عنہم کی بنا پر وضو کے بعد مسجد میں ٹھہرنے کو بھی جائز سمجھتے ہیں اور جو کوئی آدمی ضرورتاً مسجد میں سو گیا ہو اس حالت میں اسے حالت جنابت لاحق ہو گئی تو ایسے آدمی کیلئے بالاتفاق مسجد سے نکل جانا جائز ہے۔

(۱۰۷) وَعَنْهَا رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهَا قَالَتْ: كُنْتُ أَغْتَسِلُ أَنَا وَرَسُولُ اللهِ ﷺ مِنْ إِنَاءٍ وَاحِدٍ، تَخْتَلِفُ أَيْدِيْنَا فِيْهِ، مِنَ الجَنَابَةِ. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ، وَزَادَ ابْنُ حِبَّانَ: «وَتَلْتَقِي».

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا ہی سے یہ روایت بھی ہے کہ میں اور رسول اللہ ﷺ دونوں ایک ہی برتن سے غسل جنابت کر لیا کرتے تھے۔ اس برتن میں ہمارے ہاتھ یکے بعد دیگرے داخل ہوتے تھے۔ (بخاری و مسلم) اور ابن حبان نے اتنا اضافہ مزید نقل کیا ہے کہ بسا اوقات دونوں کے ہاتھ ایک دوسرے سے چھو جاتے تھے۔

لغوی تشریح: ﴿ تختلف ایدینا فیہ ﴾ کا مطلب یہ ہے کہ ہمارے ہاتھ ایک دوسرے کے بعد برتن میں داخل ہوتے تھے۔ مثلاً پہلے میرا ہاتھ داخل ہوتا تو بعد میں حضور ﷺ کا یا پھر پہلے حضور ﷺ کا ہاتھ داخل ہوتا تو بعد میں میرا۔ ﴿ من الجنابۃ ﴾ جنابت کی وجہ سے۔ اس میں غسل کرنے کی وجہ بیان ہوئی ہے کہ غسل کس وجہ سے کرتے تھے؟ ﴿ تلتقی ﴾ مل جاتے' چھو جاتے' ایک دوسرے سے۔ جب ایک ہی برتن میں یکے بعد دیگرے ہاتھ داخل ہوں گے تو ان کا باہمی طور پر دوسرے کے ساتھ چھو جانا غسل کیلئے باعث نقصان نہیں۔ لہٰذا ثابت ہوا کہ میاں بیوی دونوں اکٹھے ایک برتن سے غسل کر سکتے ہیں۔ ایسا کرنے میں کوئی قباحت اور مضائقہ نہیں۔ نیز اس سے یہ بھی ثابت ہوا کہ ایک برتن کے پانی سے میاں بیوی کا اکٹھے غسل کرنا بھی جائز ہے۔

(۱۰۸) وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «إِنَّ تَحْتَ كُلِّ شَعَرَةٍ جَنَابَةً،

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے کہ "ہر بال کی تہہ (نیچے) میں جنابت کا اثر ہوتا ہے اس لئے بالوں کو

فَاغْسِلُوا الشَّعْرَ، وَأَنْقُوا البَشَرَ». رَوَاهُ أَبُو دَاوُدَ وَالتِّرْمِذِيُّ، وَضَعَّفَاهُ، وَلأَحْمَدَ عَنْ عَآئِشَةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهَا نَحْوُه، وَفِيْهِ رَاوٍ مَجْهُولٌ.

(اچھی طرح) دھویا کرو اور جسم کو اچھی طرح (مل کر) صاف کیا کرو۔" (ابوداؤد اور ترمذی دونوں نے اسے روایت کیا ہے اور ساتھ ہی ضعیف بھی قرار دیا ہے۔ مسند احمد میں بھی حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے اسی طرح روایت ہے اور اس میں ایک راوی مجہول الحال ہے)

لغوی تشریح: ﴿ انقوا ﴾ انقاء سے ماخوذ ہے۔ امر کا صیغہ ہے۔ صاف کرنے کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔ (صاف کرو) ﴿ البشر ﴾ "با" اور شین پر فتحہ۔ انسان کی جلد کا ظاہر۔ آدمی کی جلد و کھال کی اوپر والی سطح۔ ﴿ وضعفاہ ﴾ دونوں (ابوداؤد و ترمذی) نے اسے ضعیف قرار دیا ہے اس لئے کہ اس کی سند میں ایک راوی حارث ابن وجیہ نامی ضعیف ہے۔ محدثین نے اس کی روایت کو منکر قرار دیا ہے۔

حاصل کلام: حدیث مذکور اس کی دلیل ہے کہ غسل جنابت کی صورت میں سارا جسم دھونا فرض ہے البتہ کلی کرنے اور ناک میں پانی چڑھانے میں فقہاء کی آراء مختلف ہیں۔ احناف کے نزدیک یہ بھی فرضیت کے حکم میں شامل ہیں۔ امام احمد رحمۃ اللہ علیہ کا بھی مشہور قول یہی ہے جبکہ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک یہ مسنون ہے۔ بہرحال حدیث ہذا کی روشنی میں یہ واضح ہے کہ غسل جنابت میں سارا بدن حتیٰ کہ بالوں کو خوب اچھی طرح مل کر دھونا چاہئے' ایسا نہ ہو کہ بلا کسی اشد مجبوری کے جسم کا کوئی حصہ بال برابر یا بالوں کے نیچے جگہ خشک رہ جائے۔

***

٩ - بَابُ التَّيَمُّمِ

تیمم کا بیان

(١٠٩) عَنْ جَابِرِ بْنِ عَبْدِ اللهِ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُ، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ قَالَ: «أُعْطِيتُ خَمْساً لَمْ يُعْطَهُنَّ أَحَدٌ قَبْلِي، نُصِرْتُ بِالرُّعْبِ مَسِيرَةَ شَهْرٍ، وَجُعِلَتْ لِيَ الأَرْضُ مَسْجِداً

حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "مجھے پانچ ایسی چیزیں عطا فرمائی گئی ہیں جو مجھ سے پہلے کسی کو بھی نہیں دی گئیں۔ مجھے ایک مہینہ کی مسافت سے (دشمن پر) رعب و دبدبے سے مدد دی گئی ہے۔ ساری زمین میرے لئے سجدہ گاہ اور

وَطَهُوراً، فَأَيُّما رَجُلٍ أَدْرَكَتْهُ الصَّلاَةُ فَلْيُصَلِّ». وذَكَرَ الحَدِيْثَ.

وَفِيْ حَدِيْثِ حُذَيْفَةَ عِنْدَ مُسْلِمٍ: «وَجُعِلَتْ تُرْبَتُهَا لَنَا طَهُوراً إِذَا لَمْ نَجِدِ المَآءَ».

وَعَنْ عَلِيٍّ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ، عِنْدَ أَحْمَدَ: «وَجُعِلَ التُّرَابُ لِيَ طَهُوراً».

طہارت و پاکیزگی کا ذریعہ بنائی گئی ہے' اب جس آدمی کو (جہاں بھی) نماز کا وقت آجائے اسے نماز پڑھ لینی چاہئے۔" اور آگے پوری حدیث ذکر کی۔ مسلم میں حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ "جب ہمیں پانی دستیاب نہ ہو تو زمین کی مٹی ہمارے لئے حصول طہارت و پاکیزگی کیلئے پاک بنا دی گئی ہے۔" مسند احمد میں حضرت علی رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ "مٹی میرے لئے حصول طہارت کا ذریعہ بنائی گئی ہے۔"

لغوی تشریح: ﴿باب التیمم﴾ تیمم کا لغوی معنی ہے قصد و ارادہ کرنا۔ شرعی اصطلاح میں پاک و صاف مٹی کی طرف قصد و ارادہ کرنا۔ نماز وغیرہ کو مباح کرنے کی غرض سے چہرہ اور دونوں ہاتھوں پر مٹی ملنے کو کہتے ہیں۔ ﴿اعطیت﴾ مجھے دی گئی۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے مجھے عطا فرمائی ہیں۔ ﴿خمسا﴾ پانچ ممیّزات و خصائص۔ ﴿نصرت﴾ مدد دیا گیا ہوں صیغہ مجہول ہے۔ ﴿بالرعب﴾ "راء" پر ضمہ اور عین ساکن ہے۔ معنی اس کے خوف ہیں۔ ﴿مسیرة شهر﴾ مہینہ بھر کی مسافت و دوری سے۔ میرے دشمن پر میرا رعب و دبدبہ پڑ جاتا ہے۔ ممیّزات خمسہ میں سے یہ پہلا امتیاز ہے اور دوسرا ﴿جعلت لی الارض مسجدا﴾ کا امتیاز ہے۔ یہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا کسی کو بھی نہیں دیا گیا۔ کیونکہ اس سے پہلے یہود و نصاریٰ صرف اپنے گرجوں اور عبادت گاہوں ہی میں نماز ادا کر سکتے تھے۔ ﴿وطهورا﴾ "طاء" پر فتحہ ذریعہ پاکیزگی و طہارت' جنابت اور ناپاکی کو دور کرنے اور زائل کرنے کا ذریعہ۔ اس طرح سے ادائیگی نماز کیلئے جائز ہونے کا موقع پیدا کیا گیا ہے۔ ﴿ادرکته﴾ اس کا وقت آپہنچے' یعنی نماز کا وقت ہو جائے۔ ﴿فلیصل﴾ تو اسے نماز پڑھ لینی چاہئے خواہ مسجد نہ ملے اور پانی بھی مہیا نہ ہو سکے۔ ﴿وذکر﴾ سے مراد راوی حدیث ہے۔ یعنی راوی نے باقی حدیث بیان کی ہے۔

حاصل کلام: اس حدیث میں سے مصنف نے بالخصوص آپؐ کو عطا کئے جانے والے دو امتیازات و خصائص کا ذکر کیا ہے اور باقی تین یہ ہیں۔ غنائم کا حلال کیا جانا۔ یعنی دوران جنگ دشمن سے جو اموال افواج اسلام کے قبضہ میں آئیں وہ آپؐ کیلئے اور امت مسلمہ کیلئے حلال کئے گئے ہیں۔ نیز شفاعت کبریٰ بھی آپؐ ہی فرمائیں گے۔ یہ امتیاز بھی صرف آپؐ ہی کا طرۂ امتیاز ہے' تاکہ روز محشر کی تکلیف سے لوگوں کو آرام و سکون اور راحت نصیب ہو اور روئے ارض کے تمام انسانوں اور جنوں کیلئے آپؐ کو نبی بنا کر مبعوث فرمایا ہے۔ مصنف رحمۃ اللہ علیہ نے یہاں آخری تین امتیازات کو حذف کر دیا ہے اور انہی کے ذکر پر اکتفا کیا ہے جن کا تعلق طہارت اور نماز سے ہے۔

پانی کے دستیاب نہ ہونے کی صورت میں شریعت اسلامیہ نے تیمم کی سہولت بہم پہنچا کر امت مسلمہ

کیلئے بہت بڑی آسانی پیدا کر دی ہے۔ زمین کے تمام اجزاء سے تیمم درست ہے۔ زمین سے نکلنے والی معدنیات جو زمین کا حکم رکھتی ہوں ان سے بھی تیمم کیا جا سکتا ہے بشرطیکہ یہ معدنیات غبار رکھنے والی ہوں۔

(۱۱۰) وَعَنْ عَمَّارِ بْنِ يَاسِرٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا قَالَ: بَعَثَنِي النَّبِيُّ ﷺ فِيْ حَاجَةٍ، فَأَجْنَبْتُ، فَلَمْ أَجِدِ الْمَآءَ، فَتَمَرَّغْتُ فِي الصَّعِيدِ، كَمَا تَمَرَّغُ الدَابَّةُ، ثُمَّ أَتَيْتُ النَّبِيَّ ﷺ، فَذَكَرْتُ لَهُ ذَلِكَ، فَقَالَ: **إِنَّمَا كَانَ يَكْفِيْكَ أَنْ تَقُولَ بِيَدَيْكَ هَكَذَا،** ثُمَّ ضَرَبَ بِيَدَيهِ الأَرْضَ ضَرْبَةً وَاحِدَةً، ثُمَّ مَسَحَ الشِّمَالَ عَلَى الْيَمِيْنِ وظَاهِرَ كَفَّيْهِ وَوَجْهَهُ. متفق عليه وَاللَّفْظُ لِمُسْلِمٍ.

حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ عنہما **روایت کرتے ہیں کہ مجھے** نبی کریم ﷺ نے کسی ضرورت و حاجت کے سلسلہ میں بھیجا۔ میں جنبی ہوگیا اور پانی مجھے دستیاب نہ ہو سکا تو میں مٹی میں اس طرح لوٹ پوٹ ہوا جس طرح چوپایہ لوٹ پوٹ ہوتا ہے۔ (ضرورت سے فارغ) ہو کر میں نبی ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور سارا واقعہ آپؐ سے ذکر کیا۔ آپؐ نے فرمایا "تجھے اپنے ہاتھ سے اس طرح کر لینا ہی کافی تھا۔" پھر آپؐ نے اپنے دونوں ہاتھوں کو ایک مرتبہ زمین پر مارا پھر بائیں کو دائیں پر ملا اپنے ہاتھوں کی پشت اور چہرے پر۔ (بخاری اور مسلم' اور متن حدیث کے الفاظ مسلم کے ہیں)

وَفِيْ رِوَايَةٍ لِلْبُخَارِيِّ «وَضَرَبَ بِكَفَّيْهِ الأَرْضَ، وَنَفَخ فِيْهِمَا، ثُمَّ مَسَحَ بِهِمَا وَجْهَهُ وَكَفَّيْهِ.

اور بخاری کی روایت میں ہے کہ اپنی دونوں ہتھیلیاں زمین پر ماریں اور پھونک مار کر گرد و غبار اڑا دیا پھر ان کو اپنے چہرے اور ہاتھوں پر مل لیا۔

لغوی تشریح: ﴿ فاجنبت ﴾ میں جنبی ہوگیا۔ ﴿ فتمرغت ﴾ لوٹ پوٹ ہوا۔

حاصل کلام: یہ حدیث قول و فعل دونوں اعتبار سے یہ فائدہ دے رہی ہے کہ تیمم کیلئے ایک ضرب ہی کافی ہے اور ہتھیلیوں کی بیرونی اور اندرونی سطح پر مسح کرنا ہے۔ کہنیوں تک نہیں۔ اس باب میں یہ حدیث صحیح ترین ہے۔ اس کے مقابلہ میں جو دوسری روایات ہیں وہ یا تو ضعیف ہیں یا پھر موقوف جو اس حدیث کا مقابلہ نہیں کر سکتیں۔

اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ تیمم میں چہرے اور ہاتھوں کیلئے ایک ہی ضرب کافی ہے۔ جمہور محدثین و فقہاء کا یہی مذہب ہے' البتہ احناف اور شافعی دو ضربوں کے قائل ہیں۔ ایک ضرب چہرے کیلئے اور دوسری ہاتھوں کیلئے ہے۔ مذکورہ بالا عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث ان کی دلیل ہے۔ اس باب میں صحیح ترین روایت ہونے کے اعتبار سے اسی پر عمل ہے۔ نیز عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ نے پانی نہ ملنے پر اپنی عقل و

دانش سے زمین پر لوٹ پوٹ ہونے کا عمل اختیار کیا کہ جب پانی سے غسل کیا جاتا ہے تو سارا بدن دھویا جاتا ہے اور مٹی بھی چونکہ پانی کے قائم مقام ہے اس لئے سارے جسم پر مٹی لگنی چاہئے۔ نص کا علم نہ ہونے کی بنا پر انہوں نے ایسا عمل کیا ورنہ نص کی موجودگی میں مجتہد کے قیاس کی کوئی حیثیت نہیں' لہٰذا جب نص قیاس کے مخالف ہو تو اس صورت میں کسی کیلئے بھی یہ روا نہیں کہ وہ نص کو چھوڑ کر قیاس پر عمل کرے۔ رسول اللہ ﷺ کے عمل سے یہ بھی ثابت ہے کہ آپؐ نے زمین پر اپنی ہتھیلیاں ماریں اور ان پر پھونک دیا۔ لہٰذا ضرب لگانے کے بعد پھونک دینا بھی مسنون ہے۔ ایک جنبی کیلئے پانی کی عدم موجودگی میں اتنا تیمم کر لینا کفایت کر جاتا ہے۔

راوی حدیث: ﴿عمار بن یاسر رضی اللہ عنہما﴾ عین پر فتحہ' میم پر فتحہ اور تشدید۔ ان کی کنیت ابو الیقظان تھی۔ اولین سابقین صحابہ کرامؓ میں شمار ہوتے ہیں۔ مکہ میں انہیں طرح طرح کی اذیتیں دی گئیں مگر ان کے پایہ ثبات میں ذرہ بھر لغزش نہ آئی۔ دونوں ہجرتیں کیں۔ (یعنی ہجرت حبشہ' ہجرت مدینہ) غزوۂ بدر سمیت سارے معرکوں میں شمولیت کی۔ نبی کریم ﷺ نے ان کے بارے میں ارشاد فرمایا تھا ''افسوس اے عمار! تجھے باغی گروہ قتل کرے گا۔'' ۳۶ھ میں معرکہ صفین کے موقع پر یہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے طرفداروں میں سے تھے تو حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کے لشکریوں میں سے ایک باغی اور سرکش گروہ نے ان کو قتل کر دیا۔ اس وقت ان کی عمر ۷۳ برس کی تھی۔

(۱۱۱) وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «**التَّيَمُّمُ ضَرْبَتَانِ، ضَرْبَةٌ لِلْوَجْهِ، وَضَرْبَةٌ لِلْيَدَيْنِ إِلَى الْمِرْفَقَيْنِ**». رَوَاهُ الدَّارَقُطْنِيُّ، وَصَحَّحَ الأَئِمَّةُ وَقْفَهُ.

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما نے بیان کیا کہ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے ''تیمم دو ضربوں سے (مکمل) ہوتا ہے (تیمم میں دو ضربیں ہیں) ایک ضرب چہرے کیلئے اور ایک ضرب دونوں ہاتھوں کیلئے کہنیوں تک۔'' (اس کو دارقطنی نے روایت کیا ہے اور دوسرے ائمہ نے اس کے موقوف ہونے کو صحیح کہا ہے)

حاصل کلام: ﴿التیمم ضربتان ..... الخ﴾ والی حدیث کو حاکم اور بیہقی نے مرفوعاً روایت کیا ہے۔ ائمہ حدیث نے علی بن ظبیان کے ضعیف ہونے کی وجہ سے اس حدیث کو ضعیف کہا ہے اور دیگر علماء نے بھی اس کو ضعیف ہی قرار دیا ہے۔ اس کے اور بھی کئی طرق ہیں مگر سبھی ضعیف شمار کئے گئے ہیں۔

(۱۱۲) وَعَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «**الصَّعِيدُ وَضُوءُ الْمُؤْمِنِ الْمُسْلِمِ، وَإِنْ لَمْ يَجِدِ الْمَاءَ عَشْرَ سِنِينَ، فَإِذَا وَجَدَ الْمَاءَ فَلْيَتَّقِ اللَّهَ،**

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ''مٹی مومن مسلمان کا وضو ہے خواہ دس برس تک اسے پانی نہ ملے۔ مگر جب پانی دستیاب ہو جائے تو پھر اللہ سے ڈرنا چاہئے اور اسے اپنے جسم پر پانی پہنچانا چاہئے۔'' (اس کو بزار نے

وَلْيُمِسَّهُ بَشَرَتَهُ». رَوَاهُ الْبَزَّارُ، وَصَحَّحَهُ ابنُ الْقَطَّانِ، وَلٰكِن صَوَّبَ الدَّارَقُطْنِيُّ إِرْسَالَهُ، وَلِلتِّرْمِذِيِّ عَنْ أَبِي ذَرٍّ نَحْوُه، وَصَحَّحَهُ وَالحاكِمُ أَيْضاً.

روایت کیا ہے اور ابن القطان نے صحیح قرار دیا ہے' تاہم دارقطنی نے اس کے مرسل ہونے کو درست اور قرین صواب کہا ہے اور ترمذی میں حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ سے بھی اسی طرح مروی ہے جسے ترمذی نے صحیح قرار دیا ہے اور حاکم نے بھی صحیح کہا ہے)

لغوی تشریح: ﴿ الصعید ﴾ پاکیزہ مٹی کو کہتے ہیں۔ ﴿ وان لم یجد ﴾ اس میں "ان" وصلیہ ہے۔ ﴿ عشر سنین ﴾ دس برس۔ اس سے مراد مبالغہ ہے وقت و مدت کا تعین مقصود نہیں۔ مطلب ہے کہ جتنی مدت تک پانی دستیاب نہ ہو اس وقت تک تیمم کی اجازت ہے۔ ﴿ فلیتق اللہ ﴾ اللہ سے ڈرنا چاہئے کا مفہوم یہ ہے کہ طہارت و وضو میں کسی قسم کی کمی واقع نہ ہونے پائے اور صرف مٹی پر انحصار نہ کرے۔ ﴿ ولیمسہ ﴾ امساس سے ماخوذ ہے۔ یعنی پانی پہنچائے۔ ﴿ بشرتہ ﴾ "با" اور شین دونوں پر فتحہ ہے۔ مراد جسم کی کھال ہے۔ ﴿ صوب ﴾ تصویب سے ماخوذ ہے اور معنی یہ ہوئے کہ اس حدیث کا مرسل ہونا درست اور صحیح ہے۔ یہ حدیث یہ فائدہ دے رہی ہے کہ تیمم کیلئے وقت و مدت کا تعین نہیں اور جب پانی کی دستیابی کی صورت میں عذر باقی نہ رہے تو پھر پانی کا استعمال واجب ہے۔

حاصل کلام: اس حدیث میں تیمم کو وضو قرار دیا ہے تو گویا تیمم وضو کا قائم مقام اور بدل ہے۔ جب یہ پانی کا بدل ہے تو پھر دونوں کے احکام بھی ایک جیسے ہوں گے۔ یعنی ایک وضو سے جتنی نمازیں پڑھ سکتا ہے تیمم سے بھی اتنی پڑھی جاسکتی ہیں۔ بعض لوگ اس حدیث کی رو سے تیمم سے رفع حدث کے قائل نہیں ان کے نزدیک صرف نماز مباح ہوتی ہے' جب نماز سے فارغ ہوگا تو پھر ویسا ہی جنبی ہوگا جیسا کہ تیمم سے پہلے تھا۔ پہلا مسلک احناف کا ہے ان کے نزدیک ایک تیمم سے جب تک تیمم قائم رہے کئی فرائض ادا ہو سکتے ہیں۔ سعید بن المسیب' حسن بصری' زہری' سفیان ثوری کی بھی یہی رائے ہے مگر امام شافعی رحمہ اللہ' امام مالک رحمہ اللہ اور امام احمد رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ تیمم سے طہارت کاملہ حاصل نہیں ہوتی' بلکہ اس سے جو طہارت حاصل ہوتی ہے اس کی حیثیت معذور کی اس طہارت کی طرح ہے جو محض ضرورت کیلئے ایک محدود مدت تک حاصل ہوتی ہے اور اس سے صرف ایک ہی فرض جس کیلئے تیمم کیا گیا ہو ادا ہو سکتا ہے۔

ترمذی میں ابوذر رضی اللہ عنہ سے مروی صحیح حدیث جس کا حوالہ دیا گیا ہے اس طرح ہے "ابوذر رضی اللہ عنہ کو جب مدینہ منورہ کی آب و ہوا راس نہ آئی تو انہوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کا ذکر کیا آپ ؐ نے ابوذر رضی اللہ عنہ کو اونٹوں میں رہنے کا حکم فرمایا۔ ابوذر رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ میں نے اونٹوں میں رہنا شروع کیا۔ کچھ دیر بعد ابوذر رضی اللہ عنہ نے آنجناب صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں عرض کی ابوذر رضی اللہ عنہ تو تباہ ہوگیا۔ آپ ؐ نے دریافت فرمایا کہ "کیا ہوا؟" ابوذر رضی اللہ عنہ نے عرض کیا جنابت لاحق ہو جاتی ہے اور میرے پاس پانی نہیں ہوتا (کیا کروں؟) ارشاد ہوا "جسے پانی نہ ملے اس کیلئے مٹی پاک کرنے کا ذریعہ ہے اگرچہ دس سال تک یہی حال رہے۔"

راوی حدیث: ﴿ ابوذر رضی اللہ عنہ ﴾ "راء" پر تشدید۔ نام ان کا جندب بن جنادہ تھا۔ جنادہ میں جیم پر ضمہ ہے۔ ان صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں سے تھے جو زاہد' دنیا سے بے رغبت تھے۔ مکہ میں ابتداء اسلام میں ہی دائرہ اسلام میں داخل ہوئے۔ پھر اپنی قوم کی طرف واپس چلے گئے۔ مدینہ میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے حضور پیش ہوئے۔ مقام ربذہ میں رہائش رکھی۔ ۳۲ھ میں وفات پائی۔ بہت متقی' پرہیزگار اور توکل علی اللہ کرنے والے تھے۔

(١١٣) وَعَنْ أَبِيْ سَعِيْدٍ الخُدرِيِّ رَضِيَ اللَّهُ تَعالَى عَنْهُ، قَالَ: خَرَجَ رَجُلاَنِ فِي سَفَرٍ، فَحَضَرَتِ الصَّلاَةُ، وَلَيْسَ مَعَهُمَا مَآءٌ، فَتَيَمَّمَا صَعِيْداً طَيِّباً، فَصَلَّيَا، ثُمَّ وَجَدَا المَآءَ فِي الوَقْتِ، فَأَعَادَ أَحَدُهُمَا الصَّلاَةَ، وَالوُضُوءَ، وَلَمْ يُعِدِ الآخَرُ، ثُمَّ أَتَيَا رَسُولَ اللَّهِ ﷺ، فَذَكَرَا ذَلِكَ لَهُ، فَقَالَ لِلَّذِي لَمْ يُعِدْ: «**أَصَبْتَ السُّنَّةَ، وَأَجْزَأَتْكَ صَلاَتُكَ**»، وَقَالَ لِلآخَرِ: «**لَكَ الأَجْرُ مَرَّتَيْنِ**». رَوَاهُ أَبُو دَاوُدَ وَالنَّسائِيُّ.

حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ دو آدمی سفر پر نکلے' نماز کا وقت آگیا مگر ان کے ساتھ پانی نہیں تھا۔ دونوں نے پاک مٹی سے تیمم کیا اور نماز پڑھ لی۔ پھر پانی بھی دستیاب ہوگیا جبکہ ابھی نماز کی ادائیگی کا وقت باقی تھا ان میں سے ایک صاحب نے وضو بھی کیا اور نماز دوبارہ ادا کرلی مگر دوسرے نے نہ وضو کیا اور نہ ہی نماز دہرائی۔ سفر سے واپسی پر وہ دونوں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اپنا واقعہ سنایا۔ آپؐ نے اس شخص کو جس نے نماز دوبارہ نہیں پڑھی تھی فرمایا "تو نے سنت کے مطابق کیا اور تیری نماز کافی ہوگئی" اور دوسرے سے فرمایا "تجھے دگنا اجر ملے گا۔" (ابوداؤد - نسائی)

لغوی تشریح: ﴿ اصبت السنۃ ﴾ تو نے شرعی طریقہ پالیا۔ ﴿ اجزاتک ﴾ یعنی تجھے کافی ہوگئی۔

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ اگر تیمم کرکے نماز ادا کرلی گئی ہو اور بعد میں دوران وقت ہی پانی مل گیا ہو تو ایسی صورت میں نماز دوبارہ پڑھنے کی ضرورت نہیں۔ فقہائے اربعہ کا یہی مذہب ہے۔

جس آدمی نے نماز دوبارہ پڑھی تھی اسے دوگنا اجر ملنے کی توجیہ کیا ہے؟ اس کی وجہ یہ تھی کہ ایک اجر تو اسے نماز پڑھنے کا ملا اور دوسرا اجتہاد کرنے کا۔ اجتہاد اگرچہ درست نہیں تھا تاہم غلط اجتہاد پر بھی ایک اجر ملتا ہے۔

(١١٤) وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا، فِي قَوْلِهِ عَزَّ وَجَلَّ: ﴿وَإِنْ كُنْتُمْ مَرْضَى أَوْ عَلَى سَفَرٍ﴾ قَالَ: إِذَا كَانَتْ بِالرَّجُلِ الجِرَاحَةُ فِي سَبِيلِ اللهِ وَالقُرُوحُ،

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ ان سے اللہ تعالیٰ کے ارشاد "وان کنتم مرضی او علی سفر" کے متعلق دریافت کیا گیا تو انہوں نے جواب دیا کہ جب کسی شخص کو راہ خدا میں زخم اور گھاؤ لگے اور اسی حالت میں اسے جنابت لاحق ہو جائے

فَيُجْنِبُ، فَيَخَافُ أَن يَموتَ إِنِ اغْتَسَلَ، تَيَمَّمَ. رَوَاهُ الدَّارَقُطْنِيُّ مَوْقُوفاً وَرَفَعَهُ البَزَّارُ، وَصَحَّحَهُ ابْنُ خُزَيْمَةَ وَالحَاكِمُ.

اور غسل کرنے کی صورت میں مرجانے کا اندیشہ ہو تو وہ تیمم کر لے۔ (اس روایت کو دارقطنی نے موقوف' بزار نے مرفوع اور ابن خزیمہ اور حاکم نے صحیح قرار دیا ہے)

لغوی تشریح : ﴿ مرضی ﴾ مریض کی جمع۔ بیمار آدمی ﴿ علی سفر ﴾ علی فی کے معنی میں استعمال ہوا' یعنی مسافر ہو اور بعد کی آیت او جاء منکم من الغائط او لا مستم النساء فلم تجدوا ماء فتیمموا صعیدا طیبا (٦:٥) کی تفسیر ابن عباس رضی اللہ عنہما نے یوں بیان فرمائی۔ کہ جب کسی انسان کو ایسا زخم لگے جو اسلحہ وغیرہ کا ہو اور ﴿ القروح ﴾ قرح کی جمع ہے جس کے معنی پھوڑے کے ہیں اور قرآنی آیت کی روشنی میں قروح ان زخموں اور گھاؤ کیلئے استعمال ہوتا ہے جو میدان جنگ میں اسلحہ کی وجہ سے لگے۔ جیسا کہ قرآن مجید میں ارشاد ہے : ان یمسسکم قرح فقد مس القوم قرح مثله ''اگر (آج) تمہیں زخم لگا ہے تو اسی طرح کا زخم ان لوگوں کو بھی لگ چکا ہے۔''

حاصل کلام : اگر تم بیمار ہو یا سفر میں ہو اور تمہیں پانی دستیاب نہ ہو سکے تو تیمم کرو۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جب نماز پڑھنا چاہو اور وضو یا غسل میں کوئی امر مانع ہو تو تیمم کر کے نماز پڑھ لو۔ اس آیت میں بیماری اور مرض سے کیا مراد ہے؟ اس سے مراد معمولی پھوڑا پھنسی' خارش اور خراش تو بہرحال نہیں ہو سکتے لہٰذا اس سے مراد وہ بیماری ہے جسے عرف عام میں بیماری و مرض سمجھا جاتا ہے اور یہ بیماری کس درجہ کی ہو تو تیمم جائز ہے اس بارے ائمہ کے مابین اختلاف رائے ہے۔ امام شافعی رحمہ اللہ کے نزدیک ایسی بیماری میں تیمم جائز درست ہے جس سے انسان کی موت واقع ہونے کا اندیشہ ہو یا کسی عضو اور حصہ جسم کے ضائع یا عیب دار ہونے کا خوف ہو۔ امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کے نزدیک اگر بیماری کے طول پکڑ جانے کا ڈر ہو تب بھی تیمم جائز ہے۔ اس آیت میں سفر میں ہونے کی صورت میں بھی تیمم کرنے کی اجازت ہے۔ اس سفر سے وہ سفر مراد نہیں ہے جس میں نماز قصر ادا کی جاتی ہے اور روزہ افطار کرنے کی اجازت ہے بلکہ اس سفر سے مطلق سفر مراد ہے اور مقصود اس سے صرف سفر میں پانی کا نہ ہونا ہے۔ امام مالک رحمہ اللہ اور امام شافعی رحمہ اللہ کا یہی مسلک ہے۔

محدثین کی اس حدیث کے بارے میں مختلف آراء ہیں۔ اس معاملہ میں دارقطنی کی رائے زیادہ صحیح ہے کیونکہ بزار نے اس روایت کو جریر بن عطاء کے حوالہ سے نقل کیا ہے حالانکہ ابن معین نے کہا ہے کہ جریر کا عطاء سے سماع اس موقع پر ہے جب ان کے حافظہ میں اختلاط پیدا ہو چکا تھا اس اعتبار سے اس کا مرفوع ہونا درست نہ ہوا۔

(١١٥) وَعَنْ عَلِيٍّ رَضِيَ اللَّهُ تَعالَى عَنْهُ قَالَ: انْكَسَرَتْ إِحْدَى

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے بیان کیا کہ میرا گٹ ٹوٹ گیا تو میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے وضو کے بارے میں

زَنْدَيَّ، فَسَأَلْتُ رَسُولَ اللهِ ﷺ فَأَمَرَنِيْ أَنْ أَمْسَحَ عَلَى الجَبَائِرِ. رَوَاهُ ابْنُ مَاجَهْ بِسَنَدٍ وَاهٍ جِدًّا.

پوچھا (کہ اب میں کیا کروں؟) تو آپؐ نے ارشاد فرمایا "پٹیوں پر مسح کر لیا کرو۔" (اسے ابن ماجہ نے نہایت ہی کمزور و ضعیف سند سے روایت کیا ہے)

لغوی تشریح: ﴿ زندی ﴾ "زاء" پر فتحہ، نون ساکن اور "یا" پر تشدید۔ زندو احد، تثنیہ زندی اور یاء متکلم کی طرف مضاف ہے اور "زند" ہتھیلی کی جانب بازو کا جوڑ جسے ﴿ رسغ ﴾ یعنی گٹ کہتے ہیں الجبائر﴾ جبیرہ کی جمع ہے۔ کپڑے کا ٹکڑا یا لکڑی کا جسے ٹوٹی ہوئی ہڈی پر مضبوطی سے لپیٹ کر باندھا جاتا ہے۔ ﴿ واہ ﴾ وھی یھی وھیا سے ماخوذ ہے۔ نہایت کمزور اور ضعیف۔ اس حدیث کے ضعیف ہونے کا سبب یہ ہے کہ اس حدیث کی سند میں ایک راوی عمرو بن خالد الواسطی ہے وہ نہایت جھوٹا اور دروغ گو آدمی ہے۔ امام نووی رحمہ اللہ کے بقول اس حدیث کے ضعیف ہونے پر حفاظ حدیث کا اتفاق ہے۔

(١١٦) وَعَنْ جَابِرٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُ، فِي الرَّجُلِ الَّذِي شُجَّ فَاغْتَسَلَ فَمَاتَ: إِنَّمَا كَانَ يَكْفِيهِ أَن يَّتَيَمَّمَ وَيعْصِبَ عَلَى جُرْحِهِ خِرْقَةً ثُمَّ يَمْسَحَ عَلَيْهَا، وَيَغْسِلُ سَائِرَ جَسَدِهِ. رَوَاهُ أَبُو دَاوُدَ بِسَنَدٍ فِيهِ ضَعْفٌ، وَفِيهِ اخْتِلَافٌ عَلَى رَاوِيهِ.

حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے اس شخص کے بارے میں جس کے سر پر زخم آیا تھا اور اسی حالت میں اس نے غسل کر لیا اور وفات پا گیا، کہ اسے تو تیمم کر لینا ہی کافی تھا۔ اپنے زخم پر پٹی باندھ کر مسح کرتا اور باقی بدن کو دھو لیتا۔ (اس روایت کو ضعیف سند کے ساتھ ابوداؤد نے روایت کیا ہے اور اس کے راویوں میں بھی اختلاف ہے)

لغوی تشریح: ﴿ شج ﴾ شج سے ماخوذ ہے، صیغہ مجہول ہے۔ سر میں جو زخم آئے اسے شج کہتے ہیں۔ ابوداؤد نے جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ سے اس قصہ و واقعہ کو بیان کیا ہے کہ ہم ایک سفر میں نکلے۔ ہم میں سے ایک آدمی کے سر پر پتھر لگا اور وہ زخمی ہو گیا۔ اسی حالت میں اسے احتلام کی نوبت پیش آ گئی۔ اس نے اپنے ساتھیوں سے دریافت کیا کہ آیا وہ میرے لئے تیمم کی گنجائش و رخصت رکھتے ہیں؟ انہوں نے کہا جب تمہیں پانی کے استعمال کی طاقت ہے تو ہم تیرے لئے کوئی رخصت نہیں پاتے (یعنی ہم ایسی حالت میں تمہیں تیمم کی اجازت نہیں دے سکتے) اپنے ساتھیوں کے کہنے کی بنا پر اس نے غسل کر لیا اور فوت ہو گیا۔ جب ہم واپس ہوئے تو نبی ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اس کے فوت ہونے کی اطلاع دی (اور سارا واقعہ بیان کیا) آپؐ نے فرمایا "ان لوگوں نے اسے قتل کر دیا۔ اللہ تعالیٰ کی مار ہو ان پر۔ جب انہیں مسئلہ کی نوعیت کا علم نہیں تھا تو انہوں نے دریافت کیوں نہیں کیا۔ بے خبری اور عدم واقفیت کا علاج دریافت کرنا ہے۔" پھر آپؐ نے مندرجہ بالا ارشاد فرمایا۔ "یہ اس کیلئے کافی ہوتا۔" الخ۔ ﴿ یعصب ﴾ تعصیب سے ماخوذ ہے۔ مطلب یہ ہے کہ پٹی کو مضبوطی سے باندھنا۔ زخمی جگہ پر پٹی وغیرہ باندھنے سے پہلے تیمم کرنا۔ جنابت کا اثر زائل کرنے کیلئے ہے، جیسا کہ موزے پہننے سے پہلے پاؤں دھونا طہارت کیلئے

ہوتا ہے' تاکہ حالت طہارت میں موزے پہنے جائیں اور پھر ان پر مسح کیا جا سکے۔

راوی حدیث: ﴿ وفیہ اختلاف علی راویہ ﴾ اس راوی کا نام عطاء ہے۔ اس سے جابر کے حوالہ سے بھی مروی ہے اور ابن عباس رضی اللہ عنہما کے حوالہ سے بھی اور ایک نسخہ میں ﴿ علی رواتہ ﴾ بھی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ عطاء کے نیچے یعنی عطاء کے شاگردوں میں اختلاف رائے ہے۔

(۱۱۷) وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُمَا قَالَ: مِنَ السُّنَّةِ أَنْ لاَّ يُصَلِّيَ الرَّجُلُ بِالتَّيَمُّمِ إِلاَّ صَلاَةً وَاحِدَةً، ثُمَّ يَتَيَمَّمُ لِلصَّلاَةِ الأُخْرَى. رَوَاهُ الدَّارَقُطْنِيُّ بِإِسْنَادٍ ضَعِيفٍ جِدًّا.

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ سنت یہی ہے کہ تیمم کرنے والا شخص تیمم سے ایک ہی نماز پڑھے اور دوسری نماز کیلئے ازسر نو تیمم کرے۔ (اس کو دارقطنی نے بہت ہی ضعیف سند سے روایت کیا ہے)

لغوی تشریح: ﴿ من السنۃ ﴾ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت اور طریقہ۔

حاصل کلام: حدیث ضعیف ہے' اس لئے کہ اس کے راوی حسن بن عمارہ ہیں اور وہ ضعیف ہے اور سابقہ حدیث نمبر ۱۳۰ اس کے بظاہر خلاف ہے۔ جس سے عیاں ہوتا ہے کہ تیمم وضو کا قائم مقام ہے۔ اس لئے تیمم سے بھی کئی نمازیں ادا ہو سکتی ہیں۔

۱۰ - بَابُ الْحَيْضِ

حیض (سے متعلق احکام) کا بیان

(۱۱۸) عَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهَا قَالَتْ: إِنَّ فَاطِمَةَ بِنْتَ أَبِي حُبَيْشٍ كَانَتْ تُسْتَحَاضُ، فَقَالَ لَهَا رَسُولُ اللهِ ﷺ: «**إِنَّ دَمَ الْحَيْضِ دَمٌ أَسْوَدُ يُعْرَفُ، فَإِذَا كَانَ ذَلِكَ فَأَمْسِكِي عَنِ الصَّلاَةِ، فَإِذَا كَانَ الآخَرُ فَتَوَضَّئِي وَصَلِّي**». رَوَاهُ أَبُو دَاوُدَ وَالنَّسَائِيُّ، وَصَحَّحَهُ ابْنُ حِبَّانَ وَالحَاكِمُ، وَاسْتَنْكَرَهُ أَبُو حَاتِمٍ.

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا روایت کرتی ہیں کہ فاطمہ بنت ابی حبیش رضی اللہ عنہا استحاضہ کی دائمی مریضہ تھیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے فرمایا کہ "حیض کے خون (کی رنگت) سیاہ ہوتی ہے' آسانی سے پہچان ہو سکتی ہے۔ جن ایام میں یہ خون آرہا ہو تو ان ایام میں نماز چھوڑ دو اور جب کوئی دوسرا ہو تو وضو کر کے نماز پڑھ لیا کرو۔" (ابوداؤد اور نسائی نے اسے روایت کیا ہے ابن حبان اور حاکم نے اسے صحیح قرار دیا ہے اور ابوحاتم کے نزدیک یہ منکر ہے)

وَفِي حَدِيثِ أَسْمَاءَ بِنْتِ عُمَيْسٍ عِنْدَ أَبِي دَاوُدَ: وَلْتَجْلِسْ فِي مِرْكَنٍ، فَإِذَا رَأَتْ صُفْرَةً فَوْقَ الْمَاءِ

ابوداؤد میں مروی اسماء بنت عمیس رضی اللہ عنہا کی حدیث میں ہے کہ ایک ٹب میں بیٹھ جائے اور جب وہ پانی کے اوپر زردی دیکھے تو ظہر اور عصر دونوں نمازوں

فَلْتَغْتَسِلْ لِلظُّهْرِ وَالعَصْرِ غُسْلاً وَاحِداً، وَتَغْتَسِلْ لِلْمَغْرِبِ وَالعِشَآءِ غُسْلاً وَاحِداً، وَتَغْتَسِلْ لِلْفَجْرِ غُسْلاً وَاحِداً، وَتَتَوَضَّأُ فِيْ مَا بَيْنَ ذَلِكَ.

کیلئے ایک غسل کر لے اور اسی طرح مغرب اور عشاء کی نماز کیلئے ایک غسل کر لے اور نماز فجر کیلئے الگ سے ایک غسل کر لے اور ان کے درمیان میں وضو کر لے۔

لغوی تشریح: (باب الحیض) حیض اس خون کو کہتے ہیں جو بالغ ہونے پر عورت کے رحم سے ہر مہینہ خارج ہوتا ہے۔ یہ چند مخصوص دن میں ہوتا ہے' ناامیدی کی زندگی تک یہ آتا رہتا ہے۔ یعنی زیادہ عمر ہونے سے یہ ختم ہو جاتا ہے۔ اور یہ کسی بیماری ی ولادت کی وجہ سے نہیں ہوتا ﴿یعرف﴾ معرفت سے ماخوذ ہے۔ صیغۂ مجہول۔ مطلب اس کا یہ ہے کہ خواتین اسے جانتی اور پہچانتی ہیں کہ کون سا خون ہے؟ یہ بھی ایک رائے ہے کہ ﴿یعرف﴾ باب افعال سے ہے۔ اس صورت میں "یاء" پر ضمہ اور "راء" مکسور ہوگی۔ معنی یہ ہوں گے کہ خون کی بو ہی بتا دے گی کہ کونسا خون ہے؟ ﴿فاذا کان ذلک﴾ کاف کے نیچے کسرہ۔ یعنی جب تیری حالت ایسی ہو۔ ﴿فامسکی﴾ امر کا صیغہ ہے۔ واحد مونث۔ معنی نماز سے رک جا۔ ﴿فاذا کان الاخر﴾ جب خون کا وصف مذکورہ بالا نہ ہو۔ ﴿واستنکر﴾ اسے منکر قرار دیا۔ اس کے منکر ہونے کی وجہ اس حدیث کی سند میں عدی بن ثابت عن ابیہ عن جدہ ہے۔ اس کا دادا غیر معروف آدمی ہے۔ ابوداوٗد نے بھی اس حدیث کو ضعیف کہا ہے۔ ﴿مرکن﴾ بہت بڑا پیالہ نما برتن (ٹب کی قسم کا) اس میں "میم" پر کسرہ اور "کاف" پر فتحہ ہے۔ ﴿فاذا رات صفرۃ فوق الماء﴾ جب وہ پانی پر زردی دیکھے تو اسے جان لینا چاہئے کہ یہ حیض کے جانے اور اس کے اختتام کی علامت ہے۔ ﴿فلتغتسل للظهر والعصر غسلا واحدا﴾ تو اسے ظہر اور عصر کی نمازوں کیلئے ایک ہی غسل کر لینا چاہئے۔ اس کی عملی صورت اس طرح ہوگی کہ ظہر کے وقت کو مؤخر کرے اور عصر کے وقت کو ذرا مقدم کرے اس طرح دونوں نمازیں اپنے اصلی وقت میں ادا بھی ہو جائیں گی اور جمع صوری بھی بن جائے گی اور اسی طرح مغرب و عشاء کی نمازوں کیلئے کر لے۔ ﴿وتتوضا فیما بین ذلک﴾ ان دونوں (ظہر اور عصر) اور مغرب و عشاء کے درمیان وضو کر لے۔ اس سے یہ معلوم ہوا کہ صلاۃ ظہر کے وضو سے نماز عصر ادا نہیں کر سکتی اور اسی طرح مغرب کی نماز کے وضو سے عشاء کی نماز نہیں پڑھ سکتی۔ یہ مستحاضہ عورت کیلئے ہے۔ اگر دو نمازیں مستحاضہ اکٹھی پڑھنا چاہے تو وہ ایک وضو کے ساتھ صرف ایک فرض نماز ہی ادا کرے گی۔

حاصل کلام: نوجوان عورت کو تین طرح کے خون سے واسطہ پڑتا ہے۔ ایک حیض (ایام ماہواری) دوسرا دم نفاس جو بچے کی پیدائش سے لے کر چالیس ایام یا کم و بیش جاری رہتا ہے اور تیسرا دم استحاضہ۔ استحاضہ کا خون اسے کہتے ہیں جو ایام ماہواری اور نفاس کے چالیس یوم کے علاوہ جاری رہے۔ حیض کی اقل مدت امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک ایک دن اور زیادہ سے زیادہ پندرہ دن تک ہے اور امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں

کہ تین روز سے لے کر دس روز تک ہو سکتا ہے۔ ملکی' موسمی اور عورتوں کی طبائع کے اعتبار سے دونوں ائمہ کی رائے اپنی اپنی جگہ صائب ہو سکتی ہے۔ ویسے ہر عورت کو اپنی طبیعت اور عادت کی روشنی میں علم ہوتا ہے کہ اس کے ایام کی تعداد کتنی ہے۔ اس تعداد سے زیادہ خون جاری رہے تو اسے استحاضہ قرار دے کر اس کے مطابق عمل کرنا چاہیئے۔

راوی حدیث : ﴿اسماء بنت عمیس رضی اللہ عنہا﴾ حضرت جعفر بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کی اہلیہ محترمہ۔ اپنے خاوند کے ساتھ ہجرت حبشہ کی۔ وہاں انہیں اللہ تعالیٰ نے اولاد سے نوازا' جن سے ایک عبداللہ ہے۔ غزوہ کے بعد حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے ان کو اپنی زوجیت میں لے لیا۔ اب ان کے بطن سے محمد نے جنم لیا جو محمد بن ابی بکر کے نام سے مشہور ہیں۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی وفات کے بعد حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اپنی زوجیت میں لے لیا اور ان کے بطن سے یحییٰ پیدا ہوا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ ان سے خوابوں کی تعبیر دریافت فرمایا کرتے تھے۔ ان کی وفات حضرت علی رضی اللہ عنہ کی وفات کے بعد ہوئی۔ (ذہن نشین رہے کہ عمیس عربی قوائد کی رو سے تصغیر ہے)

(۱۱۹) وَعَنْ حَمْنَةَ بِنْتِ جَحْشٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهَا قَالَتْ: كُنْتُ أُسْتَحَاضُ حَيْضَةً كَثِيْرَةً شَدِيْدَةً، فَأَتَيْتُ النَّبِيَّ ﷺ أَسْتَفْتِيْهِ، فَقَالَ: «إِنَّمَا هِيَ رَكْضَةٌ مِنَ الشَّيْطَانِ، فَتَحَيَّضِي سِتَّةَ أَيَّامٍ أَوْ سَبْعَةَ أَيَّامٍ، ثُمَّ اغْتَسِلِي، فَإِذَا اسْتَنْقَأْتِ فَصَلِّي أَرْبَعَةً وَعِشْرِينَ أَوْ ثَلاَثَةً وَعِشْرِينَ، وَصُومِي وَصَلِّي، فَإِنَّ ذَلِكَ يُجْزِئُكِ، وَكَذَلِكَ فَافْعَلِي كُلَّ شَهْرٍ، كَمَا تَحِيضُ النِّسَاءُ، فَإِنْ قَوِيتِ عَلَى أَنْ تُؤَخِّرِي الظُّهْرَ وَتُعَجِّلِي العَصْرَ، ثُمَّ تَغْتَسِلِي حِينَ تَطْهُرِينَ، وَتُصَلِّينَ الظُّهْرَ وَالعَصْرَ جَمِيعاً، ثُمَّ تُؤَخِّرِينَ المَغْرِبَ وَتُعَجِّلِينَ العِشَاءَ، ثُمَّ تَغْتَسِلِينَ وَتَجْمَعِينَ بَيْنَ الصَّلاَتَيْنِ،

حضرت حمنہ بنت جحش رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ میں سخت قسم کے عارضہ استحاضہ میں مبتلا رہتی تھی۔ میں نبی ﷺ کی خدمت میں استفسار کیلئے حاضر ہوئی تو آپؐ نے فرمایا "یہ تو شیطان کی چوک (مار) ہے۔ لہٰذا تو چھ یا سات روز ایام حیض شمار کر کے پھر نہا لے' جب تو اچھی طرح پاک و صاف ہو جائے تو پھر چوبیس یا تئیس روز نماز پڑھ اور روزہ بھی رکھ۔ یقیناً یہ تیرے لئے کافی ہے پس ہر ماہ اسی طرح کر لیا کر جیسا کہ حیض والی خواتین کرتی ہیں۔ پھر اگر تم میں ظہر کو ذرا مؤخر کرنے اور عصر کو ذرا مقدم کرنے کی ہمت و طاقت ہے تو پھر غسل کر لے جب پاک و صاف ہو جائے تو ظہر اور عصر دونوں کو اکٹھا لا کر پڑھ لے۔ پھر مغرب کو مؤخر اور عشاء کو ذرا مقدم کر کے غسل کر لے اور جمع صلاتین کر لے۔ تو ایسا کر لے (یعنی ایسا کرنے کی اجازت ہے) اور صبح کی نماز کیلئے الگ غسل کر لے اور نماز پڑھ لے۔" پھر فرمایا "دونوں

فَافْعَلِي، وَتَغْتَسِلِينَ مَعَ الصُّبْحِ وَتُصَلِّينَ، قَالَ: وَهُوَ أَعْجَبُ الأَمْرَيْنِ إِلَيَّ». رَوَاهُ الخَمْسَةُ إِلاَّ النَّسَائِيُّ، وَصَحَّحَهُ التِّرْمِذِيُّ، وَحَسَّنَهُ البُخَارِيُّ.	باتوں میں سے مجھے یہ زیادہ پسند اور محبوب ہے۔" (اس کو نسائی کے علاوہ باقی پانچوں نے روایت کیا ہے۔ ترمذی نے صحیح قرار دیا ہے اور بخاری نے اسے حسن کہا ہے)

لغوی تشریح: ﴿ استفتیه ﴾ میں نے آپؐ سے فتویٰ پوچھا۔ ﴿ رکضۃ ﴾ چوک مارنا وغیرہ۔ ﴿ فتحیضی ستۃ ایام او سبعۃ ایام ﴾ یہ اس بات کا اعلان ہے کہ کچھ عورتوں کو حیض چھ روز آتا ہے اور کسی کو سات روز۔ اس میں عمر اور مزاج کو بھی دخل ہے۔ ﴿ فاذا استنقات ﴾ جب تو پاک صاف ہو جائے۔ ﴿ صومی وصلی ﴾ روزہ رکھ، نماز پڑھ، فرض ہو یا نفلی جو جی میں آئے ﴿ وھو اعجب الامرین الی ﴾ الامرین سے مراد ہر نماز کیلئے الگ الگ وضو کرنا اور دن رات میں تین مرتبہ نہانا اور غسل کرنا (یعنی میرے نزدیک پسندیدہ عمل شب و روز میں تین مرتبہ غسل کرنا ہے)

حاصل کلام: اس حدیث سے حمنہ بنت جحش رضی اللہ عنہا کو دن رات میں تین مرتبہ غسل کرنے کا حکم دیا۔ ایک ظہر اور عصر کیلئے دوسرا مغرب اور عشاء کیلئے اور تیسرا نماز فجر کیلئے۔ اس سے پہلی حدیث میں فاطمہ بنت ابی حبیش کو ہر نماز کیلئے وضو کا حکم دیا ہے اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ استحاضہ کے مرض میں مبتلا عورت پر غسل واجب نہیں ہے البتہ ہر نماز کیلئے از سرنو وضو فرض ضرور ہے۔ غسل بس مستحب ہے وہ بھی صحت اور موسم اگر ساتھ دیں ورنہ چنداں ضرورت نہیں۔

راوی حدیث: ﴿ حمنہ بنت جحش ﴾ حمنہ میں "حا" اور جحش کی جیم دونوں پر فتح ہے اور "میم" اور "حا" دونوں ساکن ہیں۔ یہ ام المومنین حضرت زینب بنت جحش کی بہن تھیں۔ پہلے یہ مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ کی زوجیت میں تھیں۔ غزوہ احد میں مصعب شہید ہو گئے تو یہ طلحہ بن عبداللہ رضی اللہ عنہ کی زوجیت میں آگئیں۔

(۱۲۰) وَعَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهَا أَنَّ أُمَّ حَبِيبَةَ بِنْتَ جَحْشٍ شَكَتْ إِلَى رَسُولِ اللهِ ﷺ الدَّمَ، فَقَالَ: «اُمْكُثِي قَدْرَ مَا كَانَتْ تَحْبِسُكِ حَيْضَتُكِ، ثُمَّ اغْتَسِلِي»، وَكَانَتْ تَغْتَسِلُ لِكُلِّ صَلاَةٍ. رواه مسلم.	حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ حضرت ام حبیبہ بنت جحش رضی اللہ عنہا نے رسول اللہ ﷺ سے دم استحاضہ کا شکوہ کیا۔ آپؐ نے فرمایا کہ "تمہارے ماہواری کے ایام جس قدر پہلے سے متعین ہیں اتنے ایام میں (نماز، روزہ) چھوڑ دے۔ اس کے بعد نہا دھو کر نماز ادا کرو۔" ام حبیبہ رضی اللہ عنہا اس کے بعد ہر نماز کیلئے تازہ غسل کیا کرتی تھیں۔ (مسلم)
وَفِيْ رِوَايَةِ الْبُخَارِيِّ «وَتَوَضَّئِي	اور بخاری کی روایت میں ہے کہ "پھر ہر نماز کیلئے

لِكُلِّ صَلاَةٍ». وَهِيَ لأَبِيْ دَاوُدَ وَغَيْرِهِ مِنْ وَجْهٍ آخَرَ. ازسر نو وضو کر لیا کر۔" ابوداؤد وغیرہ محدثین نے اس حدیث کو دوسرے طریقے سے روایت کیا ہے)

لغوی تشریح: ﴿ تحبسک ﴾ تیری ادائیگی نماز میں مانع ہو۔ رکاوٹ کا باعث بنے۔ چنانچہ ام حبیبہ رضی اللہ عنہا کے ہر نماز کیلئے غسل سے یہ لازم نہیں آتا کہ ایسا کرنے کا نبی ﷺ نے حکم دیا تھا۔

حاصل کلام: اس حدیث اور اس باب میں بیان شدہ احادیث کا ماحصل یہ ہے کہ مستحاضہ' استحاضہ کے خون اور حیض کے خون کو ان کی تین علامات میں سے کسی کی بنیاد پر دونوں میں فرق کرے گی۔ جہاں تک دونوں خونوں میں تمیز کا تعلق ہے تو اس طرح ہے کہ ایام ماہواری کا خون سیاہ رنگت کا اور گاڑھا ہوتا ہے اس کی بو بھی بڑی کریہ ہوتی ہے اور استحاضہ کے خون کی رنگت سرخ ہوتی ہے اور وہ رقیق یعنی پتلا ہوتا ہے یا پھر خون استحاضہ کے جاری ہونے سے پہلے اس عورت کی معمول بہ عادت کی طرف رجوع کیا جائے گا کہ کتنے روز تک ایام ماہواری جاری رہتے تھے یا پھر دوسری صورت بھی ہو سکتی ہے کہ اس کی ہم عمر اور ہم مزاج خواتین پر اس کو قیاس کیا جائے گا کہ ایسے مزاج اور اتنی عمر کی خواتین کو کتنے دن ایام ماہواری آسکتے ہیں یا آیا کرتے ہیں اور اگر مستحاضہ میں ایک سے زائد علامات جمع ہو جائیں تو پھر زیادہ قوی طریقے اور واضح دلیل سے اس کا تعین ہو سکے گا۔ دو یا تین علامات اگر باہم متعارض ہوں تو پھر بغیر تردد و شک کے حیض کے خون کے سیاہ رنگ کو مقدم رکھا جائے گا اور عقل بھی اس کو مقدم رکھنے کا تقاضا کرتی ہے۔ اس کے بعد دوسرے نمبر پر عادت کا لحاظ رکھا جائے گا پھر ہم عمر اور ہم مزاج عورتوں کا خیال رکھا جائے گا۔ مندرجہ بالا مذکورہ علامتوں میں امتیاز و فرق کرنا نہایت آسان اور سہل ہے۔ عقلمند اور کند ذہن عورت اس فرق کو بآسانی اخذ کر سکتی ہے اور جس کی طرف فقہاء کی جماعت بالخصوص احناف گئے ہیں وہ بحث بڑی دقیق' گنجلک اور مغلق ہے۔ وہ عورتوں کے فہم و عقل سے بعید ہے بلکہ بہت ہی دور ہے اور یہ احادیث بھی اس مفہوم کا انکار کرتی ہیں۔ شریعت بیضاء جو سہل الفہم ہے وہ بھی اس کی طرف توجہ نہیں کرتی۔

حضرت ام حبیبہ رضی اللہ عنہا ہر نماز کیلئے غسل فرمایا کرتی تھیں۔ اس غسل کی نوعیت جمہور کے نزدیک تطوع کی ہے۔ ورنہ شریعت نے مستحاضہ پر ہر نماز کیلئے ازسرنو غسل کرنا فرض و واجب قرار نہیں دیا۔ فتح الباری میں علامہ ابن حجر عسقلانی رحمہ اللہ نے بھی اسی رائے کی تائید کی ہے۔ امام شوکانی رحمہ اللہ نے بھی یہ دعویٰ کیا ہے کہ کسی صحیح حدیث سے مستحاضہ کیلئے ہر نماز کے وقت نیا غسل کرنا ثابت نہیں۔ مستحاضہ اپنے مقرر ایام ماہواری پورے ہونے کے بعد غسل کرے۔ اس کے بعد ہر نماز کیلئے استنجا کر کے وضو کرے اور نماز ادا کرے۔ مذکورہ حدیث دلیل ہے اس کی کہ مستحاضہ کو کسی نہ کسی شناخت کرانے والی علامت کی جانب توجہ کرنا چاہیے۔ پھر جس علامت سے اس کو پہچان ہو جائے' اسی پر کاربند ہو جائے۔

راوی حدیث: ﴿ ام حبیبہ رضی اللہ عنہا ﴾ بعض کا خیال ہے اس سے حمنہ بنت جحش رضی اللہ عنہا ہی مراد ہے۔ ایسا نہیں

بلکہ صحیح اور درست یہ ہے کہ یہ ان کی بہن تھیں۔ یہ عبدالرحمٰن بن عوف کے نکاح میں تھیں۔ مسلم کی روایت کی رو سے انہیں مسلسل سات سال تک استحاضہ کا مرض لاحق رہا۔ ۴۴ھ میں وفات پائی۔ رضی اللہ عنہا بعض نے کہا کہ جحش کی تین بیٹیاں تھیں۔ تینوں عارضہ استحاضہ کا شکار تھیں۔ ایک ام المومنین زینب' دوسری حمنہ اور تیسری ام حبیبہ۔ مگر صحیح یہ ہے کہ حضرت زینب رضی اللہ عنہا اس عارضہ سے محفوظ تھیں۔ کہتے ہیں کہ عہد رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم میں دس خواتین ایسی تھیں جو مستحاضہ کے عارضہ میں مبتلا رہتی تھیں۔

(۱۲۱) وَعَنْ أُمِّ عَطِيَّةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهَا قَالَتْ: كُنَّا لاَ نَعُدُّ الْكُدْرَةَ وَالصُّفْرَةَ بَعْدَ الطُّهْرِ شَيْئاً. رَوَاهُ الْبُخَارِيُّ وَأَبُو دَاوُدَ، وَاللَّفْظُ لَهُ.

حضرت ام عطیہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ ہم (ایام ماہواری کے اختتام پر) نہا دھو کر پاک و صاف ہونے کے بعد گدلے اور زرد رنگ کی چیز کو (اس چیز کے خارج ہونے کو) کوئی اہمیت نہیں دیتی تھیں (یعنی ایسے مادہ کے خروج کو حیض تصور نہیں کرتی تھیں۔)

(بخاری' ابوداؤد۔ متن حدیث کے الفاظ ابوداؤد کے ہیں)

لغوی تشریح: ﴿ الكدرة ﴾ میل کچیل سے آلودہ رنگت والا پانی۔ ﴿ والصفرة ﴾ زنگ والی رنگت۔ جس پر زردی غالب ہو۔ ﴿ بعد الطهر ﴾ ایام حیض سے پاک و صاف ہونے کے بعد۔ ﴿ شيئا ﴾ یعنی ہم اسے حیض تصور نہیں کرتی تھیں۔ حدیث سے یہ فائدہ حاصل ہوا کہ حیض کے خون کے بعد جاری رہنے والے پانی کو جبکہ ایام ماہواری کی مدت پوری ہو جاتی تو ہم حیض شمار نہیں کرتے تھے۔

حاصل کلام: ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ زرد اور گدلے رنگ کے پانی کو حیض سمجھا اور شمار کیا جاتا تھا اور حدیث مذکور میں ہے کہ ہمارے نزدیک ایسے پانی کی کوئی اہمیت نہ تھی۔ بظاہر ان احادیث میں اختلاف معلوم ہوتا ہے لیکن درحقیقت ذرا سا غور کرنے سے یہ اختلاف دور ہو جاتا ہے اگر مذکورہ بالا رنگت کا پانی دوران ایام حیض میں خارج ہو تو اسے حیض شمار کیا جائے اور مدت ایام کے بعد اس قسم کے پانی کی کوئی اہمیت نہیں۔ حدیث میں مذکور ﴿ بعد الطهر ﴾ کے الفاظ بھی اس طرف اشارہ کر رہے ہیں۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں عورتیں ایام ماہواری کے بعد حصول طہارت کے بعد رحم وغیرہ سے گدلے یا زرد رنگ کے پانی کو کوئی اہمیت نہ دیتی تھیں اور نہ اسے شمار کرتی تھیں۔ گویا نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کا علم تھا۔ آپؐ کی اس پر خاموشی' تقریری حدیث کہلاتی ہے۔

راوی حدیث: ﴿ ام عطیہ رضی اللہ عنہا ﴾ ان کا اسم گرامی نسیبہ تھا۔ کعب کی بیٹی تھیں اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ حارث کی بیٹی تھیں۔ یہ بزرگ ترین مرتبہ کی صحابیات میں سے تھیں۔ غزوات میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ہوتی تھیں۔ مریضوں کی تیمار داری اور زخمیوں کی مرہم پٹی کرتی تھیں۔ غزوۂ احد میں بہادر مردوں کی طرح لڑیں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی صاحبزادی کے غسل کے وقت یہ موجود تھیں۔ انہوں نے بڑی صفائی سے ان کو

نہلایا۔ بصرہ کے ایام مقام میں ان سے علماء و تابعین کی کثیر تعداد نے احادیث اخذ کیں۔ ان کی اصل حدیث غسل میت کے بارے میں ہے اور ان کا شمار بصریوں میں ہوتا ہے۔

(۱۲۲) وَعَنْ أَنَسٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، أَنَّ الْيَهُودَ كَانُوا إِذَا حَاضَتِ الْمَرْأَةُ فِيهِمْ لَمْ يُؤَاكِلُوهَا، فَقَالَ النَّبِيُّ ﷺ: «اصْنَعُوا كُلَّ شَيْءٍ إِلاَّ النِّكَاحَ». رَوَاهُ مُسْلِمٌ.

حضرت انس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ یہودیوں کے ہاں جب کسی عورت کو حیض آتا تو وہ اس عورت کے ساتھ کھانا پینا ترک کر دیتے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ''(اے مسلمانو!) تم ہم بستری کے علاوہ ہر قسم کا فعل عورت کے ساتھ کر سکتے ہو۔'' (مسلم)

لغوی تشریح: ﴿لم يواكلوها﴾ یعنی اس (ایام ماہواری میں مبتلا) عورت کے ساتھ بیٹھ کر کھاتے پیتے نہ تھے۔ ﴿الا النكاح﴾ نکاح یہاں جماع کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔

حاصل کلام: نبی آخر الزماں ﷺ کے ارشاد کی روشنی سے مسلمانوں کیلئے حائضہ عورت کے ساتھ بیٹھنا' لیٹنا' کھانا اور پینا سب جائز ہے صرف تعلق زن و شو سے اجتناب کرنا ضروری ہے۔ یہ چھوت چھات کی بیماری ہنود و یہود کے ہاں ہے مسلمانوں کیلئے اس کی کوئی اہمیت نہیں۔

(۱۲۳) وَعَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهَا قَالَتْ: كَانَ رَسُولُ اللهِ ﷺ يَأْمُرُنِي فَأَتَّزِرُ، فَيُبَاشِرُنِيْ وَأَنَا حَائِضٌ. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ مجھے تہبند مضبوطی سے باندھنے کا حکم فرماتے پھر میرے ساتھ چمٹ کر لیٹ جاتے حالانکہ میں اس وقت حالت حیض میں ہوتی تھی۔ (بخاری و مسلم)

لغوی تشریح: ﴿فاتزر﴾ باب افتعال سے صیغہ واحد متکلم ہے جس کے معنی ہیں میں ازار پہن لیتی۔ ﴿فيباشرني﴾ میرے ساتھ اپنا جسم لگاتے اور یہ جماع کے علاوہ ہوتا تھا۔ یعنی مباشرت جماع کے معنی میں نہیں ہے۔

حاصل کلام: ﴿باشريباشر مباشرة﴾ ایک دوسرے کے ساتھ اپنا جسم لگانا۔ یہ اس کے لغوی معنی ہیں مجازی طور پر اس سے جماع کے معنی بھی لئے جاتے ہیں۔ ستم ظریفی دیکھئے منکرین حدیث کی کہ انہوں نے عوام کو احادیث نبویہ سے بدظن اور متنفر کرنے کیلئے اس کا معنی کیا ہے کہ نعوذ باللہ آنحضور ﷺ حالت حیض میں اپنی بیویوں سے مباشرت (جماع) کر لیتے تھے جب کہ قرآن مجید میں اس کی صریحاً ممانعت ہے۔ نتیجہ اس سے یہ برآمد کرتے ہیں کہ احادیث جھوٹی ہیں' یہ قابل اعتبار نہیں حالانکہ جیسا کہ اوپر بیان ہوا کہ مباشرت کے معنی جسم کے ساتھ جسم لگانا ہے تو اس سے جماع کے معنی کرنا بددیانتی نہیں تو اور کیا ہے۔ شریعت نے زیر ناف کے علاوہ عورت کے جسم سے لذت حاصل کرنا جائز قرار دیا ہے۔

(۱۲٤) وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا، عَنْ رَسُولِ اللهِ ﷺ

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما روایت کرتے ہیں کہ نبی ﷺ نے ایسے آدمی کے بارے میں بیان کیا ہے جو

ﷺ، فِيْ الَّذِيْ يَأْتِي امْرَأَتَهُ وَهِيَ حَائِضٌ، قَالَ: «يَتَصَدَّقُ بِدِيْنَارٍ أَوْ بِنِصْفِ دِيْنَارٍ». رَوَاهُ الخَمْسَةُ، وَصَحَّحَهُ الحَاكِمُ وَابْنُ القَطَّانِ، وَرَجَّحَ غَيرُهُمَا وَقْفَهُ.

اپنی بیوی کے پاس ایسی حالت میں جائے جبکہ وہ حالت حیض میں ہو ''وہ ایک دینار یا نصف دینار صدقہ و خیرات کرے۔'' (اس حدیث کو پانچوں نے روایت کیا ہے۔ حاکم اور ابن قطان دونوں نے اس کو صحیح قرار دیا ہے اور ان دونوں کے علاوہ دوسرے محدثین نے اسے موقوف کہا ہے)

لغوی تشریح: ﴿ یاتی امراتہ ﴾ کا معنی ہے کہ اپنی بیوی سے جماع کرے اور جہاں تک دینار یا نصف دینار خیرات کرنے کا تعلق ہے تو ایک گروہ نے اسے جائز رکھا ہے جبکہ دوسروں نے حدیث میں اضطراب اور عدم صحت کی وجہ سے کفارے کا حکم نہیں دیا۔ پھر جو لوگ کفارہ کے قائل ہیں ان میں سے کسی نے کہا ہے کہ دینار یا نصف بیان کرنا راوی کا تردد ہے اور ان میں سے کسی نے یہ تاویل کی ہے کہ یہاں نوعیت بتانا مقصود ہے کہ اگر حیض کا آغاز ہو تو ایسی حالت میں جماع کرنے والا ایک دینار صدقہ کرے اور دوسری کوئی نوعیت ہو تو نصف دینار خیرات کرے۔ ان میں سے کسی نے یہ بھی کہا ہے کہ یہاں اختیار دیا گیا ہے خواہ دینار صدقہ کرے خواہ نصف دینار۔ بہرحال یہاں امر وجوب کیلئے نہیں ہے بلکہ مندوب و مستحب ہے۔ باعتبار دلیل یہی رائے قابل ترجیح ہے۔

(١٢٥) وَعَنْ أَبِي سَعِيْدٍ الخُدْرِيِّ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ: «أَلَيْسَ إِذَا حَاضَتِ المَرْأَةُ لَمْ تُصَلِّ وَلَمْ تَصُمْ؟». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ فِي حَدِيْثٍ طَوِيْلٍ.

حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے ''کیا عورت جب حالت حیض میں ہوتی ہے تو نماز اور روزہ چھوڑ نہیں دیتی؟'' (بخاری، مسلم۔ یہ لمبی حدیث کا ٹکڑا ہے)

لغوی تشریح: ﴿ الیس ﴾ اس میں ہمزہ انکار کے معنی میں استعمال ہوا ہے جب نفی کا انکار ہو تو اثبات ثابت ہو جاتا ہے۔ اس صورت میں معنی یہ ہوئے کہ شریعت میں تو ایسی عورت کیلئے ترک صلاۃ و صوم ثابت ہے (البتہ روزے دوسرے ایام میں قضا کرے گی۔ (دلائل سے یہ ثابت ہے) جبکہ نماز کی قضا نہیں۔ اس لئے اس کا قضا کرنا عورت کے بس میں نہیں ہے۔

(١٢٦) وَعَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهَا قَالَتْ: لَمَّا جِئْنَا سَرِفَ حِضْتُ، فَقَالَ النَّبِيُّ ﷺ: «افْعَلِي مَا يَفْعَلُ الحَاجُّ، غَيْرَ أَنْ لاَ تَطُوْفِي

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ جب مقام سرف میں آئے تو مجھے ایام ماہواری شروع ہو گئے (میرے بتانے پر) نبی ﷺ نے فرمایا ''مناسک حج تم بھی اسی طرح ادا کرو جس طرح دوسرے حاجی کرتے ہیں

بِالبَيْتِ حَتَّى تَطْهُرِي». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ فِيْ حَدِيثٍ طَوِيْلٍ.

البتہ طواف بیت اللہ ایام سے فارغ ہو کر نہا دھو کر کرنا۔" (بخاری و مسلم یہ لمبی حدیث کا ٹکڑا ہے)

لغوی تشریح: ﴿لما جئنا﴾ جب ہم آئے۔ یہ دراصل حجۃ الوداع کے دوران سفر کا واقعہ ہے۔ اس وقت حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا حالت احرام میں تھیں۔ ﴿سرف﴾ سین پر فتحہ اور "راء" پر کسرہ۔ غیر منصرف ہے دو اسباب کی وجہ سے ایک علمیت یعنی جگہ کا نام اور دوسرے تانیث کی وجہ سے۔ مکہ کے قریب ایک جگہ کا نام ہے۔ تقریباً دس میل کے فاصلہ پر۔ ﴿حضت﴾ واحد متکلم کا صیغہ ہے۔ مجھے ایام ماہواری شروع ہو گئے۔

حاصل کلام: اس حدیث کی رو سے حائضہ عورت بیت اللہ کا طواف نہیں کر سکتی۔ اس لئے کہ طواف کیلئے پاکیزگی شرط ہے۔ حالت حیض میں عورت چونکہ ناپاک ہو جاتی ہے۔ ناپاک عورت تو مسجد میں داخل بھی نہیں ہو سکتی خانہ کعبہ تو افضل المساجد ہے۔ اس لئے طواف بدرجہ اولیٰ نہیں کر سکتی۔ بلکہ ایسی حالت میں تو وہ نماز بھی نہیں پڑھ سکتی۔ اسی لئے مصنف نے اس حدیث کو اس باب میں ذکر کیا ہے۔

(۱۲۷) وَعَنْ مُعاذِ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، أَنَّهُ سَأَلَ النَّبِيَّ ﷺ، مَا يَحِلُّ لِلرَّجُلِ مِنَ امْرَأَتِهِ وَهِيَ حَائِضٌ؟ فَقَالَ: «مَا فَوْقَ الإِزَارِ». رَوَاهُ أَبُو دَاوُدَ، وضَعَّفَهُ.

حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ انہوں نے نبی ﷺ سے سوال کیا کہ جب عورت ایام ماہواری میں ہو تو عورت کی اپنے شوہر کیلئے کیا کیا چیز حلال ہے؟ آپؐ نے فرمایا "پاجامہ یا تہ بند میں جسم کا جتنا حصہ ہے اسے چھوڑ کر باقی حصہ اس کیلئے حلال ہے۔" (اسے ابوداؤد نے روایت کیا ہے اور ضعیف قرار دیا ہے)

لغوی تشریح: ﴿الازار﴾ اس کے دو معنی ہو سکتے ہیں ایک تو ازار سے مراد جماع و باہم ہم بستری یعنی شوہر کیلئے جماع کے علاوہ باقی سب کچھ کر گزرنا جائز ہے اور دوسرا معنی پاجامہ و تہ بند کی جگہ یعنی ناف سے گھٹنے تک کا حصہ چھوڑ کر باقی حصہ جسم سے مباشرت حلال ہے اور دوسرے معنی کی رو سے تو یہ حضرت انس رضی اللہ عنہ کی حدیث ۱۴۱ کے الفاظ ﴿اصنعوا كل شئى الا النكاح﴾ کہ جماع کے علاوہ ہر قسم کا کام اس سے کرو۔ کیونکہ سابقہ حدیث سے صرف جماع کی ممانعت ہے اور اس میں ناف سے گھٹنے تک کے سارے حصہ سے استمتاع کی ممانعت ہے مگر اولاً تو یہ روایت ضعیف ہے۔ ثانیاً اس سے مراد صرف جماع اور وطی ہے جس سے یہ پہلی روایت کے معارض نہیں رہتی۔

(۱۲۸) وَعَنْ أُمِّ سَلَمَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهَا قَالَتْ: كَانَتِ النُّفَسَاءُ تَقْعُدُ على عَهْدِ النَّبِيِّ ﷺ بَعْدَ

حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ عہد رسالت مآب ﷺ میں عورتیں بچے کی ولادت کے بعد چالیس روز تک ناپاک بیٹھی رہتی تھیں۔ (نسائی

نِفَاسِهَا أَرْبَعِيْنَ يَوْماً. رَوَاهُ الخَمْسَةُ إِلاَّ النَّسَآئِيَّ، وَاللَّفْظُ لِأَبِيْ دَاوُدَ.

(نسائی کے علاوہ پانچوں نے اسے روایت کیا ہے اور متن حدیث کے الفاظ ابوداؤد کے ہیں۔)

وَفِيْ لَفْظٍ لَهُ: وَلَمْ يَأْمُرْهَا النَّبِيُّ ﷺ بِقَضَآءِ صَلاَةِ النِّفَاسِ. وَصَحَّحَهُ الحَاكِمُ.

اور اس کی ایک روایت میں ہے کہ نبی ﷺ نے ایام نفاس میں چھوٹی ہوئی نمازوں کی قضا کا حکم نہیں دیا۔ (اسے حاکم نے صحیح قرار دیا ہے)

لغوی تشریح: ﴿نفساء﴾ نون پر ضمہ' فا اور سین پر فتحہ۔ ان عورتوں کو کہتے ہیں جنہوں نے بچے کو جنم دیا ہو۔ نفاس اس خون کو کہتے ہیں جو ولادت کے بعد عورت کے رحم سے عموماً چالیس روز تک خارج ہوتا رہتا ہے۔ ﴿اربعین یوما﴾ چالیس روز نفاس کی کثیر مدت ہے۔ ابن ماجہ میں ایک روایت حضرت انس رضی اللہ عنہ کے حوالہ سے بایں الفاظ بھی مروی ہے کہ نبی ﷺ نے حالت نفاس میں مبتلا عورتوں کیلئے مدت نفاس چالیس روز مقرر فرمائی' البتہ اگر وہ چالیس روز سے پہلے پاک ہو جائے تو (اس کی مدت یہی شمار ہوگی)

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ نفاس والی خواتین کی اکثر مدت چالیس روز ہے۔ اس کی کم از کم مدت کوئی نہیں' ہاں اگر چالیس روز سے تجاوز کر جائے تو پھر وہ حالت استحاضہ شمار ہوگی۔ اس حالت میں نماز' روزہ ترک نہ کئے جائیں گے۔ تعلق زن و شو بھی قائم ہو سکتے ہیں۔ البتہ نفاس کا حکم تو حیض کی طرح ہے۔ نفاس والی عورت' نماز روزہ ترک کر سکتی' مسجد میں داخل نہیں ہو سکتی۔ طواف کعبہ بھی نہیں کر سکتی۔ تلاوت قرآن اور قرآن کو چھونے سے اجتناب کرے گی۔ اس دوران جتنے روزے چھوٹ گئے تھے ان کی دوسرے ایام میں قضا ضرور دے گی۔ نماز کی قضا نہیں دے گی۔

٢ - كِتَابُ الصَّلاَةِ

نماز کے احکام

١ - بَابُ المَوَاقِيتِ

اوقات نماز کا بیان

(١٢٩) عَنْ عَبْدِ اللهِ بْنِ عَمْرٍو رَضِيَ اللهُ تَعَالَى عَنْهُمَا أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ قَالَ: «وَقْتُ الظُّهْرِ إِذَا زَالَتِ الشَّمْسُ، وَكَانَ ظِلُّ الرَّجُلِ كَطُولِهِ، مَا لَمْ يَحْضُرِ العَصْرُ، وَوَقْتُ العَصْرِ مَا لَمْ تَصْفَرَّ الشَّمْسُ، وَوَقْتُ صَلاَةِ المَغْرِبِ مَا لَمْ يَغِبِ الشَّفَقُ، وَوَقْتُ صَلاَةِ العِشَاءِ إِلَى نِصْفِ اللَّيْلِ الأَوْسَطِ، وَوَقْتُ صَلاَةِ الصُّبْحِ مِنْ طُلُوعِ الفَجْرِ مَا لَمْ تَطْلُعِ الشَّمْسُ». رَوَاهُ مُسْلِمٌ.

حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا ”نماز ظہر کا وقت زوال آفتاب سے شروع ہوتا ہے اور نماز عصر کے وقت کے آغاز تک رہتا ہے‘ اور عصر کا وقت جب آدمی کا اصل سایہ اس کے قد کے برابر ہو جائے (تب شروع ہوتا ہے) اور نماز عصر کا آخری وقت سورج کی رنگت زرد ہو جانے تک رہتا ہے اور نماز مغرب کا وقت (غروب آفتاب کے ساتھ ہی شروع ہوتا اور) شفق کے غائب ہونے تک رہتا ہے۔ عشاء کی نماز کا وقت رات کے درمیانے نصف تک ہے اور نماز فجر کا وقت صبح صادق کے آغاز سے شروع ہو کر طلوع شمس تک رہتا ہے۔“ (مسلم)

وَلَهُ مِنْ حَدِيْثِ بُرَيْدَةَ فِي العَصْرِ: «وَالشَّمْسُ بَيْضَاءُ نَقِيَّةٌ» وَمِنْ حَدِيْثِ أَبِيْ مُوسَى: «وَالشَّمْسُ مُرْتَفِعَةٌ».

اور اسی (یعنی مسلم) میں بریدہ رضی اللہ عنہ سے عصر کے بارے میں مروی ہے کہ ”سورج سفید اور بالکل صاف حالت میں ہو“ اور ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ”آفتاب بلند ہو۔“

لغوی تشریح: ﴿كتاب الصلاة﴾ صلاة کے لغوی معنی دعا کے ہیں اور اصطلاح شرع میں معروف

عبادت کو کہتے ہیں۔ ﴿ باب المواقیت ﴾ مواقیت' میقات کی جمع ہے۔ اس سے مراد وہ وقت محدود ہے جو کسی کام کیلئے مقرر کیا گیا ہو۔ بلحاظ زمانہ یا مکان۔ یہاں اس سے مراد نمازوں کی ادائیگی کیلئے اللہ تعالیٰ کا مقرر و متعین فرمایا ہوا وقت ہے۔ ﴿ اذا زالت الشمس ﴾ جب سورج زوال پزیر ہو۔ یعنی آسمان کے عین درمیان سے جب بجانب مغرب سورج ڈھل جائے۔ ﴿ وکان ظل الرجل کطولہ ﴾ اور انسان کا سایہ اپنے قد کے برابر ہو۔ یعنی عصر کا وقت تب تک رہتا ہے جب تک کہ ہر چیز کا سایہ اصل چیز کے قد کے برابر ہو جائے۔ ﴿ مالم یحضر العصر ﴾ تاوقتیکہ نماز عصر کا وقت آجائے۔ یعنی آدمی کا (اصلی) سایہ اس کے قد کے برابر ہونا۔ ﴿ الشفق ﴾ غروب آفتاب کے بعد افق آسمان پر جو سرخی نمودار ہوتی ہے۔ ﴿ الی نصف اللیل الاوسط ﴾ یہاں لفظ اوسط نصف کی صفت بن رہی ہے اور اس سے مراد رات کا پہلا حصہ ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ رات کو دو حصوں میں تقسیم کریں تو پہلا نصف حصہ اوسط کہلائے گا' اب پہلے نصف حصہ رات تک نماز عشاء کا وقت رہتا ہے۔ ﴿ نقیۃ ﴾ فعیلۃ کے وزن پر آیا ہے۔ صاف ستھرا کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔ ایسا صاف و شفاف جس میں زرد رنگ کی آمیزش نہ ہو۔ ﴿ مرتفعۃ ﴾ آسمان میں بلند و بالا ہو اور مغرب کی جانب مائل نہ ہو۔ حدیث بالا میں نماز کی ادائیگی کے اوقات بیان کئے گئے ہیں۔ نماز عشاء کا آخری وقت کون سا ہے؟ اس میں مختلف آراء ہیں۔ جمہور علماء کہتے ہیں کہ یہ طلوع فجر تک ہے۔ اس حدیث میں جو بیان ہوا ہے اس سے مراد مختار وقت ہے اور بعض کا یہ بھی قول ہے کہ آدھی رات کو عشاء کی نماز کا وقت ہوتا ہے۔

حاصل کلام: اس حدیث سے ظہر کا وقت ایک مثل تک ثابت ہوتا ہے اس کے بعد عصر کا وقت شروع ہو جاتا ہے۔ ائمہ ثلاثہ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ' امام مالک رحمۃ اللہ علیہ' امام احمد رحمۃ اللہ علیہ کے علاوہ امام ابویوسف رحمۃ اللہ علیہ اور امام زفر رحمۃ اللہ علیہ کا یہی مذہب ہے' ایک روایت کی رو سے امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی رائے بھی اسی طرح ہے لیکن ان کی طرف جو مشہور روایت منسوب ہے وہ دو مثل کی ہے۔ علمائے احناف نے امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی اس روایت کو قبول نہیں کیا۔ کسی صحیح مرفوع حدیث سے بھی دو مثل تک ظہر کا وقت ثابت نہیں۔ بہتر یہی ہے کہ نماز ظہر ایک مثل کے درمیان ہی میں ادا کر لی جائے۔ امام ابوحنیفہ رضی اللہ عنہ کے دونوں شاگرد قاضی ابویوسف اور امام محمد کا بھی یہی فیصلہ ہے۔ اس حدیث سے ایک مسئلہ شفق کا بھی ہے۔ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ غروب آفتاب کے بعد افق آسمان پر سرخی نمودار ہوتی ہے اس کے معاً بعد جو سفیدی ظاہری ہوتی ہے شفق سے وہ سفیدی مراد ہے۔ اس کے برعکس امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ اس سے مراد وہ سرخی ہے جو غروب شمس کے ساتھ افق آسمان پر نمایاں ہوتی ہے۔ قرین قیاس بھی یہی بات معلوم ہوتی ہے۔

اس حدیث میں طلوع آفتاب اور غروب آفتاب کے وقت نماز پڑھنا ممنوع ہے یعنی جب سورج طلوع ہونے لگے تو نماز بند کر دینی چاہئے۔ اس لئے کہ اس وقت سورج شیطان کے دو سینگوں میں طلوع ہوتا ہے اور وہ آفتاب پرستوں کا مخصوص وقت ہے۔ اس لئے عین غروب شمس کے وقت نماز پڑھنی شروع

نہیں کرنی چاہئے۔ اس حدیث سے اوقات صلاۃ خمسہ بھی معلوم ہوتے ہیں اور یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ہر نماز کیلئے اول اور آخر وقت یہی ہے جو اس حدیث میں مذکور ہے۔ رہا یہ مسئلہ کہ دھوپ کے زردی مائل ہو جانے اور دو مثل سایہ کے بعد عصر کا وقت اور آدھی رات کے بعد عشاء کا وقت رہتا بھی ہے یا نہیں۔ اس حدیث سے یہی ثابت ہو رہا ہے کہ نہیں رہتا۔ البتہ کسی خاص مجبوری اور عذر کی حالت میں دھوپ کے زرد ہونے کے بعد عصر کا وقت اور نصف شب کے بعد عشاء کا وقت ہوتا ہے' بہرحال مختار وقت تو نہیں رہے گا۔ نیز بغیر عذر معقول کے سورج کے زرد ہونے کے بعد نماز پڑھنے والے کو حدیث میں منافق شمار کیا گیا ہے۔

راوی حدیث: ﴿ بریدہ ؓ ﴾ ان کی کنیت ابوعبداللہ اور بریدہ بن حصیب رضی اللہ عنہ نام ہے۔ بریدہ اور حصیب دونوں تصغیر ہیں۔ قبیلہ اسلم سے ہونے کی وجہ سے اسلمی کہلائے۔ جب نبی ﷺ ہجرت مدینہ کے دوران اس کے پاس سے گزرے تو اس موقع پر جو اسی آدمی مسلمان ہوئے ان میں یہ بھی شامل تھے۔ غزوۂ احد کے بعد حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ تمام غزوات میں شریک ہوئے۔ بیعت رضوان میں حاضر تھے۔ بصرہ کی طرف چلے گئے تھے پھر وہاں سے خراسان کی جانب جہاد کیلئے نکل گئے اور مرو میں قیام پذیر ہوئے۔ وہیں ان کی وفات ہوئی۔ ۶۲ھ یا ۶۳ھ میں ان کی تدفین عمل میں آئی۔

﴿ ابو موسی اشعری رضی اللہ عنہ ﴾ اس سے مراد عبداللہ بن قیس اشعری رضی اللہ عنہ ہیں۔ جلیل القدر صحابہ ؓ میں ان کا شمار ہے۔ حبشہ کی طرف ہجرت کی۔ غزوۂ خیبر کے موقع پر رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ زبید اور عدن پر عامل مقرر ہوئے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دور خلافت میں یہ کوفہ اور بصرہ کے والی مقرر ہوئے۔ ان کے ہاتھوں تستر فتح ہوا اور دیگر بہت سے شہر بھی انہوں نے فتح کئے۔ ۴۲ھ میں وفات پائی۔

(۱۳۰) وَعَنْ أَبِيْ بَرْزَةَ الأَسْلَمِيِّ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: كَانَ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ يُصَلِّي العَصْرَ، ثُمَّ يَرْجِعُ أَحَدُنَا إِلَى رَحْلِهِ فِي أَقْصَى المَدِيْنَةِ وَالشَّمْسُ حَيَّةٌ، وَكَانَ يَسْتَحِبُّ أَنْ يُؤَخِّرَ مِنَ العِشَآءِ، وَكَانَ يَكْرَهُ النَّوْمَ قَبْلَهَا وَالحَدِيْثَ بَعْدَهَا، وَكَانَ يَنْفَتِلُ مِنْ صَلاَةِ الغَدَاةِ حِيْنَ يَعْرِفُ الرَّجُلُ جَلِيْسَهُ، وَكَانَ يَقْرَأُ بِالسِّتِّيْنَ إِلَى المِائَةِ. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت ابوبرزہ اسلمی رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نماز عصر (ایسے وقت) میں پڑھتے کہ ہم میں سے کوئی ایک مدینہ کی آخری حدود تک چلا جاتا پھر آفتاب زندہ (روشن' صاف) ہوتا اور آپ ؐ نماز عشاء کو تاخیر سے پڑھنا پسند فرماتے تھے۔ نماز عشاء سے پہلے سونے اور بعد از نماز عشاء (غیر ضروری) باتیں کرنے کو ناپسند اور مکروہ خیال فرماتے اور نماز فجر سے ایسے وقت فارغ ہوتے جب نمازی اپنے ساتھ والے شخص کو پہچان لیتا (عموماً) ساٹھ سے سو آیات کی تعداد تک تلاوت فرمایا کرتے تھے۔ (بخاری و مسلم)

وَعِنْدَهُمَا مِنْ حَدِيْثِ جَابِرٍ: «وَالعِشَآءُ أَحْياناً يُقَدِّمُهَا، وَأَحْيَاناً يُؤَخِّرُهَا، إِذَا رَآهُمُ اجْتَمَعُوا عَجَّلَ وَإِذَا رَآهُمْ أَبْطَؤُوا أَخَّرَ، وَالصُّبْحُ كَانَ النَّبِيُّ ﷺ يُصَلِّيْهَا بِغَلَسٍ.

اور جابر رضی اللہ عنہ کی روایت میں ہے کہ آپ نماز عشاء کبھی جلدی پڑھ لیتے اور کبھی تاخیر سے۔ اس کی صورت یہ ہوتی کہ آپ دیکھتے کہ نمازی جمع ہو چکے ہیں تو جلد پڑھا دیتے اور اگر دیکھتے کہ نمازی دیر سے آتے ہیں تو تاخیر کرتے (البتہ صبح کی نماز آپ

وَلِمُسْلِمٍ مِنْ حَدِيْثِ أَبِي مُوْسَى: «فَأَقَامَ الفَجْرَ حِيْنَ انْشَقَّ الفَجْرُ، وَالنَّاسُ لاَ يَكَادُ يَعْرِفُ بَعْضُهُمْ بَعْضاً».

اندھیرے ہی میں پڑھتے) (بخاری و مسلم) مسلم میں ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ صبح کی نماز صبح صادق طلوع ہوتے ہی شروع فرما دیتے یہاں تک کہ اندھیرے کی وجہ سے صحابہ ایک دوسرے کو پہچان نہیں سکتے تھے۔

لغوی تشریح: ﴿ رحلہ ﴾ "راء" پر فتحہ "حاء" ساکن' جائے سکونت۔ ﴿ فی اقصی المدینۃ ﴾ گرائمر کے اعتبار سے یہ رحل سے حال واقع ہو رہا ہے۔ مدینہ کی انتہائی اور دور ترین جگہ۔ ﴿ والشمس حیۃ ﴾ اس میں "واؤ" ﴿ یرجع ﴾ کی ضمیر سے حال واقع ہو رہا ہے۔ معنی یہ ہیں' نماز سے فراغت کے بعد جانے والا آدمی سورج غروب ہونے سے پہلے ہی اپنی جائے رہائش پر پہنچ جاتا (یعنی عصر کی نماز اتنی جلدی ادا کی جاتی تھی) اور سورج کے زندہ رہنے کا مطلب یہ ہے کہ ابھی سورج کی سفیدی باقی ہوتی تھی۔ اور ﴿ من العشاء ﴾ میں من تبعیضیہ ہے مطلب یہ ہے عشاء میں تھوڑی بہت تاخیر آپ کو پسند تھی۔ ﴿ ینفتل ﴾ ینصرف کے معنیٰ' میں فارغ ہوتے' پھرتے ﴿ الغداۃ ﴾ فجر' صبح ﴿ بالستین ﴾ ساٹھ آیات سے۔ ﴿ الی المائۃ ﴾ سو تک۔ یعنی آیات اگر لمبی ہوتیں تو ساٹھ تک تلاوت فرماتے اور اگر آیات چھوٹی چھوٹی ہوتیں تو سو تک پڑھتے۔ نماز فجر میں ساٹھ آیات تلاوت فرماتے اور اگر آیات چھوٹی چھوٹی ہوتیں تو سو تک پڑھتے۔ نماز فجر ایسے وقت میں پڑھتے کہ ایک ساتھی بھی دوسرے ساتھی کو (اچھی طرح) پہچان نہ سکتا تھا۔ اتنی طویل قرأت اس بات کی دلیل ہے کہ نماز فجر اول وقت میں پڑھتے تھے ﴿ الغلس ﴾ اول وقت ہوتی ہے اسے غلس کہتے ہیں۔ ﴿ انشق ﴾ پھٹنا' تاریکی شب سے سپیدۂ صبح کا ظہور ہونا۔

حاصل کلام: اس حدیث میں لفظ "غلس" سے معلوم ہوتا ہے کہ حضور ﷺ نماز فجر اول وقت اندھیرے میں پڑھتے تھے اور صبح کی نماز میں آپ ساٹھ سے سو آیات تک تلاوت فرمایا کرتے تھے اور وہ بھی ترتیل سے ٹھہر ٹھہر کر۔ اس سے بھی اندازہ کر لیجئے کہ آپ نماز کا آغاز کس وقت میں کرتے ہوں گے۔ اس سے صاف معلوم ہوا کہ نماز فجر اول وقت اندھیرے میں پڑھنی چاہئے مگر صبح صادق کا اچھی طرح نمایاں ہونا ضروری ہے' اس لئے کہ اس سے پہلے تو نماز کا وقت ہی نہیں ہوتا۔

راوی حدیث: ﴿ ابوبرزہ اسلمی رضی اللہ عنہ ﴾ ابوبرزہ ان کی کنیت ہے۔ نفلہ بن عبید نام ہے۔ قدیم الاسلام صحابہؓ میں سے ہیں۔ فتح مکہ اور بعد والے غزوات میں شریک رہے۔ بصرہ میں سکونت اختیار کر لی تھی پھر بعد میں خراسان میں چلے گئے اور ایک قول کے مطابق مرو میں ۶۰ھ میں وفات پائی اور ایک قول یہ بھی ہے کہ ان کا سن وفات ۶۴ھ ہے۔

(۱۳۱) وَعَنْ رَافِعِ بْنِ خَدِيْجٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: كُنَّا نُصَلِّي الْمَغْرِبَ مَعَ رَسُولِ اللهِ ﷺ، فَيَنْصَرِفُ أَحَدُنَا وَإِنَّهُ لَيُبْصِرُ مَوَاقِعَ نَبْلِهِ. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت رافع بن خدیج رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ ہم نماز مغرب نبی کریم ﷺ کے ساتھ پڑھتے پھر ہم میں سے کوئی نماز سے فارغ ہو کر واپس ہوتا (تو اتنی روشنی ابھی باقی ہوتی تھی) کہ تیر کے گرنے کی جگہ دیکھ لیتا۔ (بخاری و مسلم)

لغوی تشریح: ﴿ مواقع نبلہ ﴾ موقع کی جمع۔ تیروں کے گرنے کی جگہیں۔ ﴿ والنبل ﴾ نون پر فتحہ اور "با" ساکن۔ ان لفظوں میں اس کا واحد استعمال نہیں ہوتا۔ اس کے معنی ہیں تیر۔

حاصل کلام: نماز مغرب میں زیادہ تاخیر جائز نہیں۔ اس کے ادا کرنے میں جلدی ہی بہتر ہے جیسا کہ اس حدیث سے ظاہر ہوتا ہے۔

راوی حدیث: ﴿ رافع بن خدیج رضی اللہ عنہ ﴾ ان کی کنیت ابوعبداللہ تھی۔ کم عمری و صغر سنی کی وجہ سے غزوۂ بدر میں شریک نہ ہو سکے۔ غزوۂ احد اور بعد کے غزوات میں برابر شریک رہے۔ ۷۳ھ یا ۷۴ھ میں ۸۶ برس کی عمر میں وفات پائی۔

(۱۳۲) وَعَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهَا قَالَتْ: أَعْتَمَ النَّبِيُّ ﷺ ذَاتَ لَيْلَةٍ بِالْعِشَاءِ، حَتَّى ذَهَبَتْ عَامَّةُ اللَّيْلِ، ثُمَّ خَرَجَ فَصَلَّى، وَقَالَ: «إِنَّهُ لَوَقْتُهَا، لَوْلاَ أَنْ أَشُقَّ عَلَى أُمَّتِي»، رَوَاهُ مُسْلِمٌ.

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا روایت کرتی ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ایک شب نماز عشاء اتنی تاخیر سے پڑھی کی رات کا اول حصہ زیادہ تر گزر گیا تھا۔ آپؐ نماز کیلئے تشریف لائے اور نماز پڑھی اور فرمایا کہ اگر میری امت پر (یہ وقت) گراں نہ ہوتا تو میں نماز عشاء کا یہی وقت مقرر کرتا۔" (مسلم)

لغوی تشریح: ﴿ اعتم ﴾ تاخیر کی' دیر کی اعتام سے ماخوذ ہے۔ معنی یہ ہوئے کہ ﴿ عتمۃ ﴾ میں داخل ہوئے۔ عتمۃ ' شفق کے غائب ہونے کے بعد' یا مطلق تاریکی کے غائب ہونے کے بعد رات کے تیسرے حصے کے گزر جانے کو کہتے ہیں اور ایک قول کے مطابق یہ ﴿ العتم ﴾ سے ماخوذ ہے۔ جس کے معنی تاخیر اور دیر کے ہیں۔ ﴿ عامۃ اللیل ﴾ رات کا اکثر حصہ۔ ﴿ انہ لوقتھا ﴾ اس سے مختار وقت بھی مراد ہو سکتا ہے اور افضل وقت بھی۔

حاصل کلام: یہ حدیث اس بات کا واضح ثبوت ہے کہ نماز عشاء تاخیر سے پڑھنا افضل ہے۔ تاخیر سے

ادائیگی کی صورت میں افضلیت کا ثواب صرف اسی نماز کے ساتھ مخصوص ہے اور کسی نماز کے ساتھ نہیں۔ پہلے گزر چکا ہے کہ رسول اللہ ﷺ اس نماز کیلئے کبھی نمازیوں کی آمد کا انتظار بھی کر لیا کرتے تھے اگر دیر سے جمع ہوتے تو نماز میں بھی تاخیر فرما لیتے اور اگر نمازی جلد جمع ہو جاتے تو جلدی جماعت کرا دیتے۔ تو گویا آنحضور ﷺ اپنی امت کا خیال رکھتے جو چیز افراد امت کیلئے مشقت اور دشواری کا باعث ہوتی اسے آسان اور سہل بنانے کی کوشش فرماتے۔

(١٣٣) وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «إِذَا اشْتَدَّ الحَرُّ فَأَبْرِدُوا بِالصَّلَاةِ، فَإِنَّ شِدَّةَ الحَرِّ مِنْ فَيْحِ جَهَنَّمَ». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "جب گرمی کی شدت ہو تو اس وقت (ٹھنڈے وقت میں) نماز پڑھو (یعنی ذرا انتظار کر لو کہ وقت ذرا ٹھنڈا ہو جائے) کیونکہ گرمی کی شدت جہنم کی سانس کی لپیٹ سے پیدا ہوتی ہے۔" (بخاری و مسلم)

لغوی تشریح: ﴿ فابردوا ﴾ ابراد سے ماخوذ ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ٹھنڈے وقت میں داخل ہو جاؤ۔ ﴿ بالصلاۃ ﴾ سے مراد نماز ظہر ہے یعنی نماز ظہر کو ٹھنڈے اور سرد وقت میں ادا کرو۔ ﴿ من فیح جهنم ﴾ فیح کی "فا" پر فتحہ اور "یا" ساکن ہے۔ جہنم کی گرمی و حرارت کی لپیٹ اور اس کے پھیلاؤ کی وسعت اور جہنم کے سانس کو بھی فیح کہتے ہیں۔

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ موسم گرما میں نماز ظہر ذرا تاخیر سے پڑھنی چاہیئے۔ مگر اس تاخیر کی حد کیا ہونی چاہیئے' اس بارے میں ابوداؤد اور نسائی میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ موسم گرما میں اتنی تاخیر کرتے کہ سایہ تین قدم سے لے کر پانچ قدم تک ہو جاتا۔ مگر علامہ خطابی نے کہا کہ یہ بھی تمام ممالک کیلئے قاعدہ کلیہ نہیں ہے بلکہ طول بلد و عرض بلد کے اعتبار سے اس کا حساب بھی مختلف ہوگا۔ بہرحال موسم گرما میں نماز ظہر ذرا تاخیر سے پڑھنی مستحب ہے یہی جمہور اہل علم کی رائے ہے۔

(١٣٤) وَعَنْ رَافِعِ بْنِ خَدِيْجٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «أَصْبِحُوا بِالصُّبْحِ، فَإِنَّهُ أَعْظَمُ لِأُجُورِكُمْ». رَوَاهُ الخَمْسَةُ وَصَحَّحَهُ التِّرْمِذِيُّ وَابْنُ حِبَّانَ.

حضرت رافع بن خدیج رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "نماز فجر صبح کے خوب واضح ہونے پر پڑھا کرو۔ یہ تمہارے اجر میں اضافہ کا موجب ہوگی۔" (اس کو پانچوں احمد' ابوداؤد' ترمذی' نسائی اور ابن ماجہ نے روایت کیا ہے۔ ترمذی اور ابن حبان نے اسے صحیح قرار دیا ہے)

لغوی تشریح: ﴿ اصبحوا بالصبح ﴾ اور ایک دوسری روایت میں ﴿ اصبحوا بالصبح ﴾ کے بجائے ﴿ اسفروا بالفجر ﴾ کے الفاظ بھی منقول ہیں۔ بعض نے اس کا مفہوم یہ بیان کیا ہے کہ نماز فجر

اس وقت پڑھو جب صبح خوب روشن اور واضح ہو جائے۔ مگر اس معنی کے اعتبار سے یہ حدیث غلس والی حدیث کے معارض ہے۔ بعض حضرات نے کہا ہے کہ نماز کا آغاز تاریکی اور اندھیرے میں کیا جائے اور قرأت لمبی کی جائے کہ صبح خوب روشن اور واضح ہو جائے۔ حافظ ابن قیم رحمۃ اللہ علیہ اور علامہ طحاوی رحمۃ اللہ علیہ نے اسی کو ترجیح دی ہے مگر امام احمد رحمۃ اللہ علیہ اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ وغیرہ نے "اسفار" کا مفہوم یہ بتلایا ہے کہ فجر واضح ہونے میں کوئی شک نہ رہے۔

حاصل کلام: احناف نے اسی حدیث کی روشنی میں اسفار کو افضل قرار دیا ہے لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دائمی عمل، خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم، جمہور صحابہ رضی اللہ عنہم اور تابعین رحمہم اللہ کے عمل کی بناء پر یہ استدلال وزنی نہیں رہتا۔ ابوداؤد میں حضرت ابومسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آپؐ نے ایک بار نماز فجر غلس (تاریکی) میں پڑھی اور ایک بار اسفار میں بھی پڑھی۔ بعد ازاں وفات تک ہمیشہ غلس ہی میں پڑھتے رہے۔ حدیث کا مطلب صرف اتنا معلوم ہوتا ہے کہ صبح واضح اور صاف طور پر معلوم ہونے لگے۔ کسی قسم کا شک باقی نہ رہے جیسا کہ امام احمد رحمۃ اللہ علیہ وغیرہ نے فرمایا ہے۔

(١٣٥) وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ قَالَ: «مَنْ أَدْرَكَ مِنَ الصُّبْحِ رَكْعَةً قَبْلَ أَنْ تَطْلُعَ الشَّمْسُ فَقَدْ أَدْرَكَ الصُّبْحَ، وَمَنْ أَدْرَكَ رَكْعَةً مِنَ الْعَصْرِ قَبْلَ أَنْ تَغْرُبَ الشَّمْسُ فَقَدْ أَدْرَكَ الْعَصْرَ». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "طلوع آفتاب سے پہلے جس نے نماز فجر کی ایک رکعت پالی اس نے صبح کی نماز پالی اور جس نے غروب آفتاب سے قبل نماز عصر کی ایک رکعت پالی اس نے عصر کی نماز پالی۔" (بخاری و مسلم)

وَلِمُسْلِمٍ عَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهَا نَحْوُهُ، وَقَالَ: «سَجْدَةً» بَدْلَ «رَكْعَةً» ثُمَّ قَالَ: وَالسَّجْدَةُ إِنَّمَا هِيَ الرَّكْعَةُ.

مسلم میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی حدیث میں بھی اسی طرح بیان ہے مگر اس میں رکعة کی جگہ (سجدة) کا لفظ ہے پھر کہا کہ (سجدة) سے مراد تو رکعت ہی ہے)

لغوی تشریح: ﴿لا صلاة﴾ یعنی کوئی نماز۔ اس سے نفل نماز مراد ہے۔ ﴿بعد الصبح﴾ یعنی نماز فجر کے بعد کوئی نفلی نماز جائز نہیں۔ ﴿من ادرك ركعة﴾ جس نے ایک رکعت پالی۔ یعنی مکمل ایک رکعت، قیام، قراءۃ فاتحہ اور رکوع و سجود پالئے۔ ﴿قبل ان تطلع الشمس﴾ یعنی آفتاب کے طلوع ہونے سے پہلے ﴿فقد ادرك الصبح﴾ تو اس نے صبح پالی۔ یعنی اس کی نماز ادا ہوگئی۔ (قضاء نہیں ہوئی)

حاصل کلام: عین طلوع آفتاب اور غروب آفتاب کے وقت نماز کا آغاز ممنوع ہے لیکن اگر کسی نے نماز پہلے شروع کر لی پھر طلوع یا غروب آفتاب کا موقع آگیا تو نمازی کو چاہئے کہ دوسری رکعت پوری کر لے

اس کی نماز ہو جائے گی۔

(١٣٦) وَعَنْ أَبِيْ سَعِيْدٍ الْخُدْرِيِّ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: سَمِعْتُ رَسولَ اللهِ ﷺ يَقُوْلُ: «**لاَ صَلاَةَ بَعْدَ الصُّبْحِ حَتَّى تَطْلُعَ الشَّمْسُ وَلاَ صَلاَةَ بَعْدَ العَصْرِ حَتَّى تَغِيبَ الشَّمْسُ**». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ، وَلَفْظُ مُسْلِمٍ: «لاَ صَلاَةَ بَعْدَ صَلاةِ الفَجْرِ».

حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ نے بیان کیا کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ ارشاد فرماتے سنا ہے کہ "صبح کی نماز ادا کر لینے کے بعد طلوع آفتاب تک کوئی نماز (جائز) نہیں اور اسی طرح نماز عصر ادا کر چکنے کے بعد غروب آفتاب تک کوئی دوسری نماز (جائز) نہیں۔ (بخاری و مسلم)

اور مسلم کے الفاظ ہیں کوئی نماز' نماز فجر کے بعد نہیں۔

وَلَهُ عَنْ عُقْبَةَ بْنِ عَامِرٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ: ثَلاَثُ سَاعَاتٍ كَانَ رَسُولُ اللهِ ﷺ يَنْهَانَا أَنْ نُصَلِّيَ فِيْهِنَّ وَأَنْ نَقْبُرَ فِيْهِنَّ مَوْتَانَا: حِيْنَ تَطْلُعُ الشَّمْسُ بَازِغَةً حَتَّى تَرْتَفِعَ، وَحِيْنَ يَقُوْمُ قَائِمُ الظَّهِيْرَةِ حَتَّى تَزُوْلَ الشَّمْسُ، وَحِيْنَ تَتَضَيَّفُ الشَّمْسُ لِلْغُرُوبِ.

اور مسلم میں عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ تین اوقات ایسے ہیں جن میں نماز پڑھنے اور میت کی تدفین سے رسول اللہ ﷺ ہمیں منع فرمایا کرتے تھے۔ اول یہ کہ جب آفتاب طلوع ہو رہا ہو تاآنکہ وہ بلند ہو جائے۔ دوم جب سورج نصف آسمان پر ہو تاوقتیکہ وہ ڈھل نہ جائے اور سوم جس وقت سورج غروب ہونا شروع ہو۔ دوسرا حکم (یعنی نصف النہار کے وقت نماز کی ادائیگی ممنوع ہونا) امام

وَالحُكْمُ الثَّانِيْ عِنْدَ الشَّافِعِيِّ رَحِمَهُ اللَّهُ تَعَالَى مِنْ حَدِيْثِ أَبِي هُرِيْرَةَ بِسَنَدٍ ضَعِيْفٍ وَزَادَ: «إِلاَّ يَومَ الجُمُعَةِ» وَكَذَا لِأَبِيْ دَاوُدَ عَنْ أَبِي قَتَادَةَ نَحْوُهُ.

شافعی رحمہ اللہ نے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے ضعیف سند سے روایت کیا ہے' مگر اس میں (الا یوم الجمعۃ) کے الفاظ زیادہ ہیں۔ (یعنی نصف النہار کے وقت نماز نہ پڑھو مگر جمعہ کے روز پڑھ سکتے ہو) اور ابوداؤد نے بھی حضرت ابوقتادہ رضی اللہ عنہ سے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی مانند روایت نقل کی ہے (جس میں جمعہ کے دن کا استثناء ہے)

لغوی تشریح: ﴿ لاصلاۃ ﴾ یعنی نفلی نماز نہیں ﴿ بعد الصبح ﴾ نماز فجر کی ادائیگی کے بعد اور اس سے صبح کی سنتوں کے علاوہ نماز مراد ہے کیونکہ ان دونوں کی قضا جائز ہے یہ نہی مطلق نفل نماز کی ہے۔ ﴿ نقبر ﴾ "با" پر ضمہ اور کسرہ۔ دونوں درست ہیں۔ معنی ہیں کہ ہم تدفین عمل میں لائیں ﴿ موتانا ﴾ موتی میت کی جمع ہے۔ اپنے مرنے والوں کو۔ ﴿ بازغۃ ﴾ چمکتے ہوئے۔ روشن ﴿ الظھیرۃ ﴾ نصف

النہار یعنی آدھے دن کا وقت۔ جب سورج چند ساعت کیلئے سیدھا قائم ہوتا۔ اس وقت ہر چیز کا سایہ بالکل اس چیز کی سیدھ میں ہوتا ہے۔ ادھر' ادھر' مشرق اور مغرب کی جانب جھکا ہوا نہیں ہوتا۔ ﴿ تزول ﴾ آسمان کے وسط (درمیان) سے دوسری جانب مائل ہونا۔ ﴿ تضیف ﴾ بھی مائل کے معنی میں استعمال ہوا ہے ﴿ والحکم الثانی ﴾ سے مراد عین نصف النہار کا وقت ہے کیونکہ حضرت عقبہ رضی اللہ عنہ کی روایت میں یہ حکم دوسرے نمبر پر آیا ہے۔ ﴿ وکذا لابی داود ﴾ ابوداؤد میں ابوقتادہ رضی اللہ عنہ سے اسی طرح ہے کہ بروز جمعہ نصف النہار کے وقت نماز کی اجازت ہے۔ جس طرح حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت میں ہے۔

حاصل کلام: اس حدیث میں ممنوع اوقات میں جو کام ممنوع ہیں ان کا ذکر ہے۔ ان میں پہلا یہ کہ ہم میت کو ان تین اوقات میں دفن نہ کریں۔ یہاں تدفین سے مراد نماز جنازہ بھی ہے کہ اس ممنوع وقت میں نماز جنازہ نہ پڑھی جائے اور نہ میت کو دفن کیا جائے۔ البتہ اگر کوئی عذر ہو تو پھر جائز ہے۔ اور دوسرا حکم یہ کہ دوپہر کا وقت ہے۔ جب سورج عین وسط آسمان پر قائم ہو' مغرب کی جانب زوال پذیر نہ ہوا ہو تو ایسے وقت میں بھی نماز پڑھنا یا نماز جنازہ پڑھنا اور میت کو دفن کرنا ممنوع ہے۔ لیکن جمعہ کا دن ایسا ہے کہ جس میں زوال کے وقت نوافل ادا کئے جا سکتے ہیں۔ امام شافعی رحمہ اللہ اسی کے قائل ہیں۔ جمعہ کے روز زوال کے وقت نماز جمعہ بھی ادا کی جا سکتی ہے جیسا کہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں جمعہ کے دن کا استثناء صراحت کے ساتھ منقول ہے اور تیسرا حکم یہ ہے کہ غروب آفتاب کے وقت بھی نماز جنازہ یا میت کو دفن کرنا ممنوع ہے اور حدیث میں جو طلوع آفتاب کے بعد "ترتفع" کا ذکر ہے کہ وہ بلند ہو جائے تو' اس بلندی سے کیا مراد ہے؟ ابوداؤد اور نسائی وغیرہ کی روایت میں اس اونچائی کا اندازہ ایک نیزہ یا دو نیزہ مذکور ہے جب سورج مشرق کے افق پر ایک نیزہ یا دو نیزہ برابر اونچا ہو جائے تو پھر نماز پڑھنے کی اجازت ہے۔

راوی حدیث: ﴿ عقبہ بن عامر جھنی رضی اللہ عنہ ﴾ عین پر ضمہ اور "قاف" ساکن۔ ان کی کنیت ابوحماد یا ابوعامر ہے۔ قدیم الہجرت تھے۔ صحابیت کے شرف سے مشرف تھے۔ کتاب اللہ کے قاری اور علم میراث اور فقہ کے مشہور عالم تھے۔ فقیہہ ہونے کے ساتھ شاعر بھی تھے۔ بصرہ میں سکونت اختیار کر لی تھی۔ معرکہ صفین میں حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے ساتھ تھے۔ تین سال مصر کے والی رہے۔ نیز غزوۃ البحر کے امیر رہے۔ مصر میں ۵۸ھ میں وفات پائی۔ اور مقطم میں دفن ہوئے۔

(۱۳۷) وَعَنْ جُبَيْرِ بْنِ مُطْعِمٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «يَا بَنِي عَبْدِ مَنَافٍ لاَ تَمْنَعُوا أَحَداً طَافَ بِهَذَا الْبَيْتِ، وَصَلَّى أَيَّةَ سَاعَةٍ شَآءَ مِنْ لَيْلٍ أَوْ

حضرت جبیر بن مطعم رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "اے عبد مناف کی اولاد! بیت اللہ کا طواف کرنے والے کسی کو مت منع کرو (کہ وہ طواف نہ کرے) اور نہ کسی نماز پڑھنے والے کو (نماز پڑھنے سے منع کرو) خواہ وہ شب و روز کی

نَهَارٍ». رَوَاهُ الخَمْسَةُ، وَصَحَّحَهُ التِّرْمِذِيُّ وَابْنُ حِبَّانَ.

کسی گھڑی میں یہ کام کرے۔" (اسے پانچوں (احمد' ابوداؤد' ترمذی' نسائی اور ابن ماجہ) نے روایت کیا ہے اور ترمذی اور ابن حبان نے اسے صحیح قرار دیا ہے)

لغوی تشریح: ﴿ یا بنی عبد مناف ﴾ عبد مناف کی اولاد کو مخاطب اس لئے کیا ہے کہ یہ اس وقت کعبہ کے متولی تھے۔ ﴿ وصلی ایة ساعة شاء ...... الخ ﴾ یہ الفاظ ممنوعہ تین اوقات میں بھی نماز پڑھنے کی اجازت پر دلالت کرتے ہیں۔ جن احادیث میں ممانعت ہے یہ حدیث اس عام حکم کو بیت اللہ کی وجہ سے خاص قرار دیتی ہے کہ بیت اللہ میں یہ ممانعت نہیں۔

حاصل کلام: اس حدیث میں مذکورہ کونسی نماز ہے جسے ادا کرنے کی اجازت حکماً دی جا رہی ہے۔ بعض حضرات کی رائے یہ ہے کہ اس سے مراد طواف کعبہ کے بعد پڑھے جانے والے نوافل ہیں۔ عام نوافل اس سے مراد نہیں مگر ابوداؤد میں مروی ایک حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ اس سے عام نوافل مراد ہیں۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کی رائے بھی یہی ہے۔ جن تین اوقات میں نماز پڑھنے کی ممانعت آئی ہے جمہور علماء اسے خانہ کعبہ میں پڑھے جانے والے نوافل پر منطبق نہیں کرتے۔ وہ اس حدیث سے ان اوقات میں بھی بیت اللہ شریف میں پڑھنے کی اجازت دیتے ہیں۔

راوی حدیث: ﴿ جبیر بن مطعم رضی اللہ عنہ ﴾ ان کی کنیت ابو محمد یا ابو امیہ تھی۔ جبیر تصغیر ہے جابر سے۔ پورا نام جبیر بن مطعم بن عدی بن نوفل قرشی تھا۔ بڑے حلیم الطبع اور باوقار شخصیت کے مالک تھے۔ خاندان قریش کے نسب نامے کو جانتے تھے۔ فتح مکہ سے قبل اسلام قبول کر کے مدینہ تشریف لے آئے۔ ان کی تاریخ وفات میں اختلاف ہے۔ ۵۴ھ' ۵۷ھ یا ۵۹ھ کو فوت ہوئے۔

﴿ عبد مناف ﴾ مناف کا غلام۔ مناف مشہور بت تھا۔ والدہ نے اس کا خادم بنا دیا تھا اس وجہ سے عبد مناف کہلائے۔ ورنہ ان کا نام تو مغیرہ تھا' کنیت ابوعبد شمس تھی۔ بنو مخزوم اور بنو عبد مناف دونوں سے تعلق تھا۔ یاد رہے یہ عبد مناف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے جد امجد تھے۔ قریش کے ذی وقار سردار شمار ہوتے تھے۔

(۱۳۸) وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ قَالَ: «الشَّفَقُ الحُمْرَةُ». رَوَاهُ الدَّارَقُطْنِيُّ، وَصَحَّحَ ابْنُ خُزَيْمَةَ وَغَيْرُهُ وَقْفَهُ.

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ "شفق سے مراد سرخی ہے۔" (دارقطنی نے اسے روایت کیا ہے اور ابن خزیمہ وغیرہ نے کہا ہے صحیح یہ ہے کہ یہ موقوف ہے)

لغوی تشریح: ﴿ الشفق الحمرة ﴾ شفق سے مراد سرخی ہے (جو غروب آفتاب کے ساتھ ہی افق آسمان پر نمودار ہوتی ہے) بلوغ المرام کی شرح سبل السلام میں ہے کہ لغوی بحث کیلئے اہل لغت کی طرف رجوع کیا جائے اور ابن عمر رضی اللہ عنہما اہل لغت میں سے ہیں۔ ان کی بات دلیل و حجت ہے خواہ موقوف ہی

کیوں نہ ہو۔ لغت کی مشہور کتاب "القاموس" میں شفق کا معنی وہ سرخی ہے جو غروب آفتاب سے لے کر عشاء تک یا اس کے قریب تک آسمان پر نمودار رہتی ہے۔

حاصل کلام: شفق سے وہ سرخی مراد ہے جو سورج کے غروب ہونے کے بعد نمودار ہوتی ہے۔ اس تعریف پر تمام آئمہ اور اہل لغت متفق ہیں مگر امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ تنہا اس کے خلاف شفق سے وہ سفیدی مراد لیتے ہیں جو سرخی کے غائب ہونے کے بعد ظاہر ہوتی ہے۔ لطف کی بات یہ ہے کہ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے دو شاگردان رشیدان نے بھی سرخی ہی مراد لی ہے۔ موجودہ احناف کا فتویٰ بھی غالباً صاحبین کے قول پر ہے۔

(١٣٩) وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُمَا قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ:

«الفَجْرُ فَجْرَانِ، فَجْرٌ يُحَرِّمُ الطَّعَامَ وَتَحِلُّ فِيهِ الصَّلاَةُ، وَفَجْرٌ تَحْرُمُ فِيهِ الصَّلاَةُ، أَيْ صَلاَةُ الصُّبْحِ، **وَيَحِلُّ فِيهِ الطَّعَامُ»**. رَوَاهُ ابْنُ خُزَيْمَةَ وَالحَاكِمُ، وَصَحَّحَاهُ، وَلِلْحَاكِمِ مِنْ حَدِيثِ جَابِرٍ نَحْوُهُ، وَزَادَ فِي الَّذِي يُحَرِّمُ الطَّعَامَ: إِنَّهُ يَذْهَبُ مُسْتَطِيلاً فِي الأُفُقِ. وَفِي الآخَرِ: «إِنَّهُ كَذَنَبِ السِّرْحَانِ».

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "فجر کی دو قسمیں ہیں' ایک وہ فجر جس میں کھانا حرام ہے اور نماز ادا کرنا جائز و حلال اور ایک وہ فجر ہے جس میں نماز پڑھنا حرام ہے اور کھانا جائز و حلال۔" (اسے ابن خزیمہ اور حاکم نے روایت کیا ہے اور دونوں نے اسے صحیح بھی قرار دیا ہے) اور مستدرک حاکم میں جابر رضی اللہ عنہ سے بھی اسی طرح مروی ہے اس میں اتنا اضافہ ہے کہ "جس صبح میں کھانا حرام ہے وہ آسمان کے کناروں اور اطراف میں پھیل جاتی ہے اور دوسری بھیڑیئے کی دم کی طرح اونچی چلی جاتی ہے۔"

لغوی تشریح: ﴿ یحرم الطعام ﴾ کھانا حرام کرتی ہے روزے دار کیلئے ﴿ وتحل فیہ الصلوۃ ﴾ اور اس میں نماز جائز و حلال ہے یعنی نماز فجر۔ اس سے مراد صبح صادق ہے۔ ﴿ زاد ﴾ یعنی حاکم نے یہ بات زائد ذکر کی ہے۔ ﴿ فی الذی ﴾ اس فجر میں جس میں کھانا حرام ہو جاتا ہے (اس کی نشانی اور علامت یہ ہے) کہ وہ آسمان پر پھیل جاتی ہے یعنی مشرقی کنارے پر اور "افق" آسمان کے اس حصہ کو کہتے ہیں جو زمین کے ساتھ ملتا ہوا محسوس و معلوم ہوتا ہے اور بخاری کی ایک روایت میں تو اس طرح بھی منقول ہے کہ آپؐ نے اپنے دونوں بازو دائیں بائیں پھیلا کر سمجھایا۔ ﴿ وفی الاخر ﴾ سے مراد یہ ہے کہ اس سے وہ فجر مراد ہے جس میں صبح کی نماز ادا کرنا حرام ہے اور روزے دار کیلئے کھانا حلال ہے۔ یہ وہی صبح ہے جسے صبح کاذب کہا جاتا ہے۔ ﴿ کذنب السرحان ﴾ کاف برائے تشبیہ اور ذنب میں ذال اور نون پر فتحہ۔ معنی بھیڑیئے کی دم۔ ﴿ والسرحان ﴾ سین پر کسرہ اور "راء" ساکن۔ بھیڑیے کو کہتے ہیں۔ مراد اس سے یہ ہے کہ یہ فجر جب نمودار ہوتی ہے تو یہ ستون کی طرح بالکل سیدھی آسمان میں اوپر چڑھتی معلوم ہوتی

ہے۔ اطراف و اکناف میں پھیلی ہوئی نہیں ہوتی۔ صبح صادق اور صبح کاذب۔ دونوں کے مابین کچھ وقفہ اور فاصلہ ہوتا ہے۔

(١٤٠) وَعَنِ ابْنِ مَسْعُودٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «أَفْضَلُ الأَعْمَالِ الصَّلَاةُ فِي أَوَّلِ وَقْتِهَا». رَوَاهُ التِّرمِذِيُّ وَالحَاكِمُ، وَصَحَّحَاهُ، وَأَصْلُه فِي الصَّحِيحَيْنِ.

حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "اول وقت نماز پڑھنا سب اعمال سے افضل ہے۔" (اسے ترمذی اور حاکم نے روایت کیا ہے اور دونوں نے اسے صحیح بھی قرار دیا ہے۔ اس حدیث کی اصل بخاری و مسلم میں موجود ہے)

حاصل کلام: اس حدیث میں نماز کو اول وقت پر پڑھنا تمام اعمال سے افضل بیان کیا گیا ہے۔ جب کہ دوسری احادیث میں ایمان' صدقہ اور جہاد کو افضل اعمال بتایا گیا ہے۔ ساری احادیث اپنے اپنے مفہوم میں صحیح ہیں' ان میں موافقت اور تطابق اس طرح ہوگا۔ ایمان کا تعلق قلب و ضمیر سے ہے لہٰذا ایمان قلبی اعمال میں سب سے افضل ہے اور نماز کا تعلق بدنی عبادات سے ہے' یہ بدنی اعمال میں سب سے افضل ہے اور صدقہ کا تعلق مالیات سے ہے' مالی اعمال میں سب سے افضل صدقہ ہے اور جہاد جوانی و توانائی' صحت کا سب سے بہترین اور افضل عمل ہے۔ اس طرح ان میں باہمی منافات نہیں رہتی۔ یہ حدیث عام ہے مگر اس سے عشاء کی نماز خارج ہے کہ اسے تاخیر سے پڑھنا افضل ہے۔

(١٤١) وَعَنْ أَبِي مَحْذُوْرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُ، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ قَالَ: أَوَّلُ الوَقْتِ رِضْوَانُ اللهِ، وَأَوْسَطُهُ رَحْمَةُ اللهِ، وَآخِرُهُ عَفْوُ اللهِ». أَخرَجَهُ الدَّارَقُطْنِيُّ بِسَنَدٍ ضَعِيفٍ جِدًّا وَلِلتِّرمِذِيِّ مِنْ حَدِيثِ ابْنِ عُمَرَ نَحْوُهُ دُوْنَ الأَوْسَطِ وَهُوَ ضَعِيفٌ أَيْضاً.

حضرت ابو محذورہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا "اول وقت میں (نماز پڑھنا) رضاء الٰہی کا موجب ہے اور درمیانی وقت میں (ادائیگی نماز) رحمت الٰہی کا سبب ہے اور اس کو آخر وقت میں ادا کرنا اللہ تعالیٰ سے معافی کا موجب ہے۔" (دار قطنی نے اسے نہایت ہی ضعیف سند سے روایت کیا ہے اور ترمذی میں ابن عمر رضی اللہ عنہما کی حدیث بھی اسی طرح ہے لیکن اس میں لفظ وسط مذکور نہیں اور وہ ضعیف بھی ہے)

لغوی تشریح: ﴿ دون الاوسط ﴾ ابن عمر رضی اللہ عنہما کی روایت میں درمیانی وقت کا ذکر نہیں۔ اس میں تو صرف اول اور آخر کا ذکر ہے۔ یہ دونوں احادیث انتہائی ضعیف ہیں۔ ان پر اعتماد مناسب نہیں۔ جہاں تک دار قطنی کی روایت کا تعلق ہے تو وہ روایت یعقوب بن ولید کے واسطہ سے مروی ہے۔ امام احمد رحمہ اللہ کا ان کے بارے میں قول ہے کہ بڑے بڑے دروغ گو لوگوں میں سے ہے اور ابن معین نے بھی اسے جھوٹا اور کذاب قرار دیا۔ امام نسائی رحمہ اللہ نے تو اسے نظرانداز ہی کر دیا ہے اور ابن حبان نے کہا ہے کہ یہ حدیث

وضع کیا کرتا تھا اور اس کی سند میں ابراہیم بن زکریا بجلی بھی موجود ہے' جسے متہم قرار دیا گیا ہے۔ رہی ترمذی میں ابن عمر رضی اللہ عنہما کی روایت تو اس میں بھی یعقوب بن ولید موجود ہے۔ محدثین ناقدین کی نقد و جرح کے بعد حدیث قابل اعتنا ہی نہیں رہتی۔

راوی حدیث: ﴿ ابومحذورۃ رضی اللہ عنہ ﴾ ان کا نام سمرہ یا اوس تھا۔ مؤذن رسول تھے۔ فتح مکہ کے موقع پر اسلام قبول کیا۔ مکہ میں قیام پذیر ہو گئے۔ نماز پنج گانہ کی اذان دیتے تھے۔ ۵۹ھ میں وفات پائی۔

(١٤٢) وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا، أَنَّ رَسُولَ اللهِ ﷺ قَالَ: «لاَ صَلاَةَ بَعْدَ الفَجْرِ إِلاَّ سَجْدَتَيْنِ». أَخرَجَهُ الخَمْسَةُ إِلاَّ النَّسَائِيَّ.

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے "فجر کی (فرض نماز) کے بعد صرف دو سنتوں کے علاوہ اور کوئی (نفل) نماز نہیں۔" (اسے نسائی کے سوا پانچوں نے روایت کیا ہے)

وَفِي رِوَايَةِ عَبْدِ الرَّزَّاقِ: «لاَ صَلاَةَ بَعْدَ طُلُوعِ الفَجْرِ إِلاَّ رَكْعَتَيِ الفَجْرِ» وَمِثْلُهُ لِلدَّارَقُطْنِيِّ عَنِ ابْنِ عَمْرِو بْنِ العَاصِ.

اور عبدالرزاق کی روایت میں ہے کہ "طلوع فجر کے بعد صرف فجر کی دو رکعات ہیں اور دار قطنی میں ابن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ سے بھی اسی طرح مروی ہے۔

لغوی تشریح: ﴿ لا صلوۃ بعد الفجر ﴾ بعد الفجر سے مراد طلوع فجر ہے۔ ﴿ الا سجدتین ﴾ یہاں سجدتین کا معنی رکعتیں ہے (دو رکعتیں) اور ایک نسخہ میں رکعتین ہے سجدتین کی جگہ۔ ان دو رکعتوں سے فجر کی دو سنتیں مراد ہیں۔

حاصل کلام: اس حدیث کی بناء پر طلوع فجر کے بعد صبح کی دو سنتوں کے علاوہ نوافل پڑھنا ممنوع و مکروہ ہے۔

(١٤٣) وَعَنْ أُمِّ سَلَمَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهَا قَالَتْ: صَلَّى رَسُولُ اللهِ ﷺ العَصْرَ، ثُمَّ دَخَلَ بَيْتِيْ، فَصَلَّى رَكْعَتَيْنِ، فَسَأَلْتُهُ فَقَالَ: شُغِلْتُ عَنْ رَكْعَتَيْنِ بَعْدَ الظُّهرِ فَصَلَّيْتُهُمَا الآنَ. قُلْتُ: أَفَنَقْضِيهِمَا إِذَا فَاتَتَا قال: «لاَ». أَخرَجَهُ أَحْمَدُ، وَلِأَبِي دَاوُدَ عَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهَا بِمَعْنَاهُ.

حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نماز عصر پڑھ کر میرے حجرے میں تشریف لائے اور دو رکعت نماز ادا فرمائی۔ میں نے عرض کیا یہ دو رکعت کیسی ہیں؟ آپؐ نے جواب میں ارشاد فرمایا "ظہر کے فرائض کے بعد کی دو سنتیں پڑھ نہیں سکا تھا وہ اب میں نے پڑھی ہیں"۔ میں نے پھر عرض کیا کہ اگر یہ دو سنتیں قضا ہو جائیں تو کیا ہم بھی ان کی قضاء دیا کریں۔ فرمایا "نہیں۔" (اسے احمد نے روایت کیا ہے اور ابوداؤد میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے بھی اسی

طرح کی روایت ہے)

لغوی تشریح: ﴿ شغلت ﴾ صیغہ مجہول۔ اس کا معنی ہے کہ مجھے روک دیا گیا۔ اس طرف سے توجہ پھیر دی گئی۔ مانع یہ تھا کہ قبیلہ عبدالقیس کے کچھ لوگوں کی آمد نیز صدقہ کا مال بھی پہنچ گیا تھا۔ تقسیم مال اور ان سے گفتگو کرتے رہنے کی وجہ سے ظہر کی دو سنتیں رہ گئی تھیں وہ میں نے ابھی پڑھی ہیں۔ حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا نے عرض کیا کہ ہم بھی چھوٹ جانے کی صورت میں اس وقت قضا کریں؟ جواب میں ارشاد فرمایا کہ "تم اس وقت انہیں قضا ہونے کی صورت میں ادا نہ کرو"۔ علامہ الیمانی نے کہا ہے کہ اس سے ثابت ہوا نماز عصر کے بعد ان سنتوں کی قضا نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خصوصیت ہے کسی بھی دوسرے کیلئے یہ جائز نہیں ہے اور ایک دن کے عمل کے بعد ہمیشہ انہیں نماز عصر کے بعد ادا کرتے رہنا اس بنا پر تھا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی عادت تھی کہ جب ایک عمل ایک مرتبہ کر لیا تو اسے ہمیشہ انجام دیتے تھے۔ تو گویا یہ بھی آپؐ کی خصوصیت تھی۔

حاصل کلام: حدیث مذکور سے معلوم ہوتا ہے کہ عصر کے بعد ظہر کی چھوٹی ہوئی سنتوں کی قضا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا خاصہ اور امتیاز تھا جیسا کہ امام طحاوی رحمہ اللہ اور علامہ الیمانی رحمہ اللہ نے کہا ہے مگر امام بیہقی رحمہ اللہ اور حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس روایت کا آخری حصہ "افنقضیهما اذا فاتتا لم قال لا" کہ کیا جب رہ جائیں تو ہم ان کی قضاء دیں؟ تو آپؐ نے فرمایا "نہیں" ضعیف اور غیر محفوظ ہے۔ صحیح یہ ہے کہ عصر کے بعد قضاء نماز فرض ہو یا سنت ادا ہو سکتی ہے۔ جس کی تفصیل "اعلام اهل العصر" میں شارح ابوداؤد شیخ شمس الحق محدث ڈیانوی نے خوب بیان کی ہے۔

٢ - بَابُ الأَذَانِ

اذان کا بیان

(١٤٤) عَنْ عَبْدِ اللهِ بْنِ زَيْدِ بْنِ عَبْدِ رَبِّهِ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: طَافَ بِيْ - وَأَنَا نَائِمٌ - رَجُلٌ، فَقَالَ: تَقُولُ «اللَّهُ أَكْبَرُ اللَّهُ أَكْبَرُ» فَذَكَرَ الأَذَانَ بِتَرْبِيْعِ التَّكْبِيْرِ بِغَيْرِ تَرْجِيْعٍ، وَالإِقَامَةَ فُرَادَى، إِلاَّ «قَدْ قَامَتِ الصَّلاَةُ» قَالَ: فَلَمَّا أَصْبَحْتُ أَتَيْتُ رَسُولَ اللهِ ﷺ، فقال: «إِنَّهَا لَرُؤْيَا حق»، الحديث. أَخْرَجَهُ أَحْمَدُ وَأَبُو دَاوُدَ وَصَحَّحَهُ التِّرْمِذِيُّ وَابْنُ خُزَيْمَةَ.

حضرت عبداللہ بن زید بن عبدربہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ خواب میں مجھے ایک آدمی ملا جس نے مجھے کہا کہ کہو اللہ اکبر، اللہ اکبر پھر اس نے ساری اذان کہی، چار مرتبہ اللہ اکبر کہا۔ بغیر ترجیع کے اور اقامت میں صرف ایک ایک مرتبہ کہا، مگر (قد قامت الصلاۃ) کو دو مرتبہ کہا۔ صبح جب بیدار ہوا تو میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا (اور اپنا خواب آپؐ کو سنایا) آپؐ نے فرمایا "یقیناً یہ خواب سچا ہے۔" (اس حدیث کو احمد اور ابوداؤد نے روایت کیا ہے۔ ترمذی اور ابن خزیمہ نے صحیح قرار دیا ہے۔)

وَزَادَ أَحْمَدُ فِي آخِرِهِ قِصَّةَ قَوْلِ بِلاَلٍ فِيْ أَذَانِ الفَجْرِ «الصَّلاَةُ خَيْرٌ مِنَ النَّوْمِ».

احمد نے اس روایت کے آخر میں حضرت بلال رضی اللہ عنہ کی فجر کی اذان میں (الصلاہ خیر من النوم) کا قصہ بھی مزید بیان کیا ہے اور ابن خزیمہ میں حضرت

وَلاِبْنِ خُزَيْمَةَ عَنْ أَنَسٍ قَالَ: مِنَ السُّنَّةِ إِذَا قَالَ المُؤَذِّنُ فِي الفَجْرِ «حَيَّ عَلَى الفَلاَحِ» قَالَ: «الصَّلاَةُ خَيْرٌ مِنَ النَّوْمِ».

انس رضی اللہ عنہ سے ہے کہ انہوں نے فرمایا سنت ہے کہ جب موذن صبح کی اذان میں حی علی الفلاح کہے تو وہ کہے (الصلاۃ خیر من النوم)

لغوی تشریح: ﴿ بتربیع التکبیر ﴾ اللہ اکبر کی تکبیر کو چار مرتبہ کہنا۔ ﴿ بغیر ترجیع ﴾ ترجیع کا معنی ہے کہ اذان میں ﴿ اشہد ان لا الہ الا اللہ ﴾ کو پہلے پست آواز (آہستہ آواز) سے ادا کرنا' دوبارہ دو مرتبہ بآواز بلند ادا کرنا ﴿ والاقامۃ ﴾ اس سے مراد کلمات اقامت ہیں ﴿ فرادی ﴾ اقامت میں ہر کلمہ صرف ایک ایک مرتبہ ادا کرنا البتہ ﴿ قد قامت الصلاۃ ﴾ دو مرتبہ ﴿ لرئویا حق ﴾ "لام" اس میں برائے تاکید ہے اور روٴیا حق کی طرف مضاف ہے یا مراد ہے وہ خواب جو عبداللہ بن زید رضی اللہ عنہ نے دیکھا حق ہے۔ اس کی تین حالتیں ممکن ہیں۔ ایک یہ کہ اسے مرفوع پڑھا جائے تو اس صورت میں یہ مبتداء ہوگا اور اس کی خبر محذوف تصور ہوگی اور وہ لفظ ﴿ بتمامہ ﴾ ہو سکتا ہے یا پھر دوسری صورت میں اسے منصوب پڑھا جائے (الحدیث) تو اس صورت میں "اقرا الحدیث وتممہ" ہوگا اور تیسری صورت میں اسے مجرور بھی پڑھا جا سکتا ہے۔ اس صورت میں ﴿ الی آخر الحدیث ﴾ ہوگا۔ ﴿ زاد احمد فی آخرہ ﴾ حدیث کے ظاہر الفاظ سے یہ وہم پیدا ہوتا ہے کہ احمد نے عبداللہ بن زید رضی اللہ عنہ کی مذکورہ بالا حدیث میں ان الفاظ کا اضافہ نقل کیا ہے۔ حالانکہ یہ اضافہ حدیث بلال (رضی اللہ عنہ) میں ہے' تاکہ عبداللہ بن زید رضی اللہ عنہ کی حدیث میں مراد یہ امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے اذان کے بارے میں حضرت بلال رضی اللہ عنہ کی حدیث بیان کرتے ہوئے صبح کی اذان میں ﴿ الصلاۃ خیر من النوم ﴾ کا اضافہ کیا ہے۔

حاصل کلام: مدینہ طیبہ میں ہجرت کے پہلے سال آپ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے مشورہ کیا کہ نماز باجماعت کیلئے بلانے کا کیا طریقہ ہونا چاہئے۔ بعض نے کہا نماز کیلئے ناقوس (گھڑیال) بجایا جائے۔ بعض نے بلندی پر آگ روشن کرنے کا مشورہ دیا۔ بعض نے "بوق" (بگل) سے کام لینے کا مشورہ دیا۔ اسی دوران حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے مشورہ دیا کہ نمازوں کی طرف بلانے کیلئے اذان دی جائے۔ چنانچہ آپ ﷺ نے حضرت بلال رضی اللہ عنہ کو باواز بلند "الصلاۃ جامعۃ" کہنے کا حکم دیا۔ اسی اثناء میں عبداللہ بن زید رضی اللہ عنہ جو مذکورہ بالا حدیث کے راوی ہیں' نے خواب میں دیکھا کہ ایک آدمی ناقوس اٹھائے ہوئے ہے۔ عبداللہ بن زید رضی اللہ عنہ نے اس سے دریافت کیا اللہ کے بندے کیا ناقوس فروخت کرتے ہو؟ اس نے پوچھا تم اس سے کیا کرو گے؟ عبداللہ بن زید رضی اللہ عنہ نے کہا ہم اس کے ذریعہ (لوگوں کو) نماز باجماعت کیلئے بلائیں گے۔ اس شخص نے کہا میں

تمہیں اس سے کہیں بہتر طریقہ سے آگاہ نہ کر دوں؟ عبداللہ بن زید عنہما نے کہا ہاں (ضرور بتائیں) تو اس نے (موجودہ) اذان اور اقامت کے الفاظ انہیں سکھائے۔ یہی خواب عبداللہ رضی اللہ عنہ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے بیان کیا جسے آپؐ نے سچا اور صادق قرار دیا۔ اذان میں ترجیع مسنون ہے یا نہیں۔ اس بارے میں ائمہ کی آراء مختلف ہیں۔ ایک رائے یہ ہے کہ ترجیع ثابت ہے‘اہلحدیث حضرات کی رائے یہی ہے اور ایک رائے یہ ہے کہ ترجیع جس صحابی سے ثابت کی جاتی ہے اس صحابی کو تعلیم دینا مقصود تھا اس لئے کہ ابومحذورہ رضی اللہ عنہ جنہیں آپؐ نے یہ تعلیم دی‘ نے پہلی مرتبہ اذان میں شہادتین "اشهد ان لا اله الا الله" "اشهد ان محمدا رسول الله" کو دھیمی اور پست آواز میں ادا کیا تھا‘ حالانکہ یہ درست نہیں۔ حضرت ابومحذورہ رضی اللہ عنہ اور ان کے بعد بھی مکہ مکرمہ میں اذان ترجیع سے ہوتی رہی۔ اس لئے اس کا انکار محض مجادلہ ہے‘ البتہ اذان ترجیع اور بغیر ترجیع دونوں طرح جائز ہے مگر صحیحین کی روایات کی بناء پر راجح یہ ہے کہ ترجیع کے ساتھ اقامت اکہری کہی جائے۔

راوی حدیث: ﴿ عبدالله بن زيد بن عبدربه رضی اللہ عنہ ﴾ ابومحمد ان کی کنیت تھی۔ انصار کے قبیلہ خزرج سے تعلق کی وجہ سے انصاریؒ خزرجی کہلائے۔ غزوۂ بدر کے علاوہ باقی غزوات میں بھی شریک رہے۔ ہجرت مدینہ کے پہلے سال میں انہوں نے خواب میں موجودہ اذان کی کیفیت دیکھی تھی اور یہ واقعہ مسجد نبویؐ کی تعمیر کے بعد کا ہے۔ انہوں نے ۳۲ھ میں ۶۴ برس کی عمر میں وفات پائی۔

﴿ بلال رضی اللہ عنہ ﴾ یہ قبیلہ تیم کے آزاد کردہ غلام بلال بن رباح تھے۔ قدیم الاسلام ہیں۔ ان کو راہ حق میں بہت اذیتیں اور تکالیف دی گئیں۔ ان کو بھی غزوات بدر و احد‘ احزاب وغیرہ سبھی میں شرکت کا شرف حاصل ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مؤذن تھے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد انہوں نے اذان کہنا بند کر دی تھی اور مدینہ طیبہ چھوڑ کر دمشق میں سکونت اختیار کر لی تھی۔ ۱۷ھ یا ۱۸ھ میں ساٹھ سال سے اوپر عمر پا کر فوت ہوئے۔ ان کی کوئی اولاد نہیں تھی۔

(١٤٥) وَعَنْ أَبِي مَحْذُوْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ عَلَّمَهُ الأَذَانَ، فَذَكَرَ فِيهِ التَّرْجِيعَ. أَخرَجَهُ مُسْلِمٌ، وَلٰكِن ذَكَرَ التَّكْبِيْرَ فِي أَوَّلِهِ مَرَّتَيْنِ فَقَطْ، وَرَوَاهُ الخَمْسَةُ فَذَكَرُوْهُ مُرَبَّعاً.

حضرت ابومحذورہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو اذان سکھائی۔ اس میں انہوں نے ترجیع کا ذکر کیا ہے۔ (مسلم نے روایت کیا ہے لیکن اس میں پہلی دفعہ اللہ اکبر کو صرف دو مرتبہ کہنے کا ذکر ہے۔ ابومحذورہ رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث کو پانچوں نے روایت کیا ہے اور انہوں نے اللہ اکبر کو پہلی دفعہ چار مرتبہ کہنے کا ذکر کیا ہے)

لغوی تشریح: ﴿ علمه الاذان ﴾ علم‘ تعلیم سے ماخوذ ہے۔ اسی واقعہ کی طرف اشارہ ہے جس میں ذکر ہے کہ ابومحذورہ رضی اللہ عنہ کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے خود اذان کی تعلیم دی جیسا کہ ابومحذورہ رضی اللہ عنہ کا اپنا بیان ہے کہ فتح مکہ کے بعد حنین کی طرف جانے کیلئے ہم نو ساتھی مکہ سے نکلے۔ جب ان نوجوانوں نے اذان سنی تو

مسلمانوں کا مذاق اور استہزاء اڑانے کیلئے انہوں نے اذان کہنا شروع کر دی۔ نبی ﷺ نے فرمایا "میں نے ان لوگوں میں ایک خوش الحان آدمی کی اذان سنی ہے۔" پھر ہماری طرف کسی کو بھیج کر ہمیں اپنے پاس بلایا اور ہم میں سے فرداً فرداً اذان کہلوا کر سنی۔ میں سب سے آخری آدمی تھا جس نے اذان کہی۔ میری اذان سن کر آپؐ نے مجھے اپنے پاس بلایا اور اپنے روبرو بٹھا کر میری پیشانی پر دست مبارک پھیرا اور تین مرتبہ برکت کی دعا فرمائی۔ پھر فرمایا "جاؤ اور مسجد حرام کے پاس کھڑے ہو کر اذان کہو۔" میں نے عرض کیا۔ اے اللہ کے رسول (ﷺ)! مجھے پہلے اذان تو سکھائیں۔ پھر انہوں نے حدیث اذان بیان کی۔ ﴿ فذكر الترجيع ﴾ اس میں ابو محذورہ رضی اللہ عنہ نے ترجیع کا بھی ذکر کیا' یعنی کلمہ شہادتین کو دو' دو مرتبہ دہرایا۔ جمہور علماء نے اس سے ترجیع اذان (دوہری آذان) کی مشروعیت پر استدلال کیا ہے اور یہ ایسی ثابت شدہ حقیقت ہے جس سے انکار کی مجال نہیں۔ ﴿ فذكروه ﴾ انہوں (پانچوں) نے اذان کے آغاز میں تکبیر (مربعاً) کو چار مرتبہ کہنے کا ذکر کیا ہے۔ "مربعا" تربیع سے ہے۔ جس کے معنی ہیں چار مرتبہ۔ صاحب السبل شارح بلوغ المرام نے کہا ہے یہ جملہ (یعنی چار بار تکبیر) ثقہ راویوں سے محفوظ ہے۔

حاصل کلام: حدیث مذکور اس بات کی دلیل ہے کہ اذان کے آغاز میں اللہ اکبر دو دفعہ نہیں بلکہ چار مرتبہ کہنا ہی صحیح ہے اور اذان کیلئے مؤذن ایسا منتخب اور مقرر کیا جائے جس کی آواز اچھی اور بلند ہو۔ اس سلسلہ میں انتخاب کیلئے مقابلہ اذان کا ثبوت ملتا ہے۔

(١٤٦) وَعَنْ أَنَسٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: أُمِرَ بِلاَلٌ أَن يَشْفَعَ الأَذَانَ، وَيُوتِرَ الإِقَامَةَ إِلاَّ الإِقَامَةَ. يَعْنِيْ إِلاَّ قَوْلَهُ. قَدْ قَامَتِ الصَّلاَةُ. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ، وَلَمْ يَذْكُرْ مُسْلِمٌ الاسْتِثْنَاءَ، وَلِلنَّسَائِيِّ: أَمَرَ النَّبِيُّ ﷺ بِلاَلاً.

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ بلال رضی اللہ عنہ کو اذان کے کلمات دو' دو مرتبہ اور تکبیر (قد قامت الصلاۃ) کے علاوہ باقی جملہ کلمات کو ایک ایک مرتبہ کہنے کا حکم دیا گیا۔ (بخاری و مسلم)
البتہ مسلم نے (قد قامت الصلاۃ) کے استثناء کا ذکر نہیں کیا اور نسائی میں ہے کہ نبی کریم ﷺ نے بلال رضی اللہ عنہ کو حکم دیا تھا۔

لغوی تشریح: ﴿ امر ﴾ صیغہ مجهول ہے ۔ اس میں حکم صادر فرمانے والے خود نبی کریم ﷺ ہیں۔ نسائی میں اس کی صراحت موجود ہے۔ ﴿ ان يشفع الاذان ﴾ یعنی ہر کلمہ کو دو' دو مرتبہ ادا کرنا۔ ﴿ ويوتر الاقامة ﴾ اقامت میں ہر کلمہ ایک ایک مرتبہ کہنا ﴿ الا الاقامه ﴾ بجز اقامت کے یعنی ﴿ قد قامت الصلاة ﴾ کے۔ اسے دو' دو مرتبہ کہنا ہے۔ ﴿ ولم يذكر مسلم الاستثناء ﴾ اور مسلم نے الا الاقامہ کا استثناء نقل نہیں کیا۔

(١٤٧) وَعَنْ أَبِيْ جُحَيْفَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: رَأَيْتُ بِلاَلاً حضرت ابو جحیفہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے بلال رضی اللہ عنہ کو اذان دیتے دیکھا کہ وہ اپنا چہرہ' ادھر ادھر

يُؤَذِّنُ، وَأَتَتَبَّعُ فَاهُ هٰهُنَا وَهٰهُنَا، وَإِصْبَعَاهُ فِيْ أُذُنَيْهِ. رَوَاهُ أَحْمَدُ وَالتِّرمِذِيُّ، وَصَحَّحَهُ.

پھیرتے تھے۔ اس وقت ان کی دونوں انگلیاں (انگشت ہائے شہادت) ان کے کانوں میں تھیں۔ (احمد اور ترمذی نے اسے روایت کیا ہے اور ترمذی نے اسے صحیح قرار دیا ہے۔)

وَلِابْنِ مَاجَهْ: وَجَعَلَ إِصْبَعَيْهِ فِي أُذُنَيْهِ. وِلأَبِي دَاوُدَ: لَوَى عُنُقَهُ لَمَّا بَلَغَ «حَيَّ عَلَى الصَّلاَةِ» يَمِيْناً وَشِمَالاً، وَلَمْ يَسْتَدِرْ. وَأَصْلُهُ فِي الصَّحِيْحَيْنِ.

ابن ماجہ کی روایت میں ہے کہ انہوں نے اپنی انگلیاں اپنے کانوں میں داخل کرلیں اور ابوداؤد میں ہے کہ جب (حی علی الصلاۃ) کہتے تو اپنے دائیں بائیں ذرا رخ موڑ لیتے بالکل گھومتے نہیں تھے۔ اس کی اصل صحیحین میں ہے۔

لغوی تشریح: ﴿ اتتبع فاہ ﴾ تتبع باب تفعل سے ہے۔ مطلب ہے کہ میں ان کے چہرے کی طرف نظریں لگائے ہوئے تھا اور ان کے منہ کو بغور ملاحظہ کر رہا تھا ﴿ ھھنا ﴾ دائیں جانب ﴿ وھھنا ﴾ اور بائیں جانب۔

حاصل کلام: اذان قبلہ رخ کھڑے ہو کر کہنا مسنون ہے۔ اسی طرح حی (علی الصلاۃ ' حی علی الفلاح) کہتے وقت دائیں' بائیں اپنے چہرے کی حد تک پھیرنا مسنون ہے۔ اذان کہتے ہوئے کانوں میں انگلیاں داخل کرنے کے دو فائدے ہیں۔ کانوں میں انگلیاں ڈالنے سے آواز بلند ہو جاتی ہے۔ کوئی بہرہ آدمی مؤذن کو ایسی حالت میں دیکھ کر معلوم کر سکتا ہے کہ نماز کیلئے اذان کہی جا رہی ہے۔

راوی حدیث: ﴿ ابوجحیفہ رضی اللہ عنہ ﴾ ابوجحیفہ کنیت ہے۔ وھب بن عبداللہ سوائی نام ہے۔ جحیفہ میں جیم پر ضمہ ہے اور تصغیر ہے۔ سوائی میں سین پر ضمہ ہے۔ سوائی عامری مشہور ہیں۔ صغار صحابہؓ میں شمار کئے گئے ہیں۔ کوفہ میں پہنچ کر قیام کیا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ان کو بیت المال پر عامل مقرر کیا۔ تمام مشاہد و غزوات میں شریک ہوئے۔ کوفہ میں ۷۴ھ میں وفات پائی۔

(١٤٨) وَعَنْ أَبِي مَحْذُوْرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُ، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ أَعْجَبَهُ صَوْتُه فَعَلَّمَهُ الأَذَانَ. رَوَاهُ ابنُ خُزَيْمَةَ.

حضرت ابومحذورہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ کو ان کی آواز بہت پسند آئی۔ چنانچہ آپؐ نے اسے (ابومحذورہ رضی اللہ عنہ کو) اذان کی تعلیم خود دی۔ (اذان سکھائی) (ابن خزیمہ)

حاصل کلام: یہ حدیث اس بات کا ثبوت ہے کہ مؤذن کے انتخاب اور چناؤ اور تقرر میں آواز کو ملحوظ رکھنا چاہئے۔ اچھی آواز دلوں پر جادو کا اثر رکھتی ہے۔ اپنا اثر دکھائے بغیر نہیں رہ سکتی۔

(١٤٩) وَعَنْ جَابِرِ بْنِ سَمُرَةَ حضرت جابر بن سمرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ میں نے

رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: صَلَّيْتُ مَعَ النَّبِيِّ ﷺ الْعِيْدَيْنِ، مِنْ غَيْرِ مَرَّةٍ وَلاَ مَرَّتَيْنِ، بِغَيْرِ أَذَانٍ وَلاَ إِقَامَةٍ. رَوَاهُ مُسْلِمٌ، وَنَحْوُهُ فِي الْمُتَّفَقِ عَلَيْهِ عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ وَغَيْرِهِ.

ایک مرتبہ نہیں' دو مرتبہ نہیں متعدد مرتبہ نبی ﷺ کے ساتھ نماز عیدین پڑھی ہے۔ اس کیلئے نہ اذان کہی جاتی تھی اور نہ ہی اقامت۔ (اس روایت کو مسلم نے روایت کیا ہے اور بخاری و مسلم میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے بھی اسی طرح مروی ہے)

حاصل کلام: اس حدیث سے ثابت ہوا کہ دور رسالت مآب ﷺ میں نماز عیدین باجماعت ادا کی جاتی تھیں۔ اس کے باوجود نہ ان کیلئے اذان کہی جاتی تھی اور نہ اقامت اور امت کا بھی اس پر عمل ہے۔

(۱۵۰) وَعَنْ أَبِيْ قَتَادَةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُ فِي الْحَدِيْثِ الطَّوِيْلِ فِيْ نَوْمِهِمْ عَنِ الصَّلاَةِ: ثُمَّ أَذَّنَ بِلاَلٌ، فَصَلَّى النَّبِيُّ ﷺ كَمَا كَانَ يَصْنَعُ كُلَّ يَوْمٍ. رَوَاهُ مُسْلِمٌ.

حضرت ابوقتادہ رضی اللہ عنہ (ایک لمبی حدیث جس میں دوران سفر غلبہ نیند اور تھکاوٹ سفر کی وجہ سے سو جانے کا ذکر ہے) سے مروی ہے' جب نیند سے بیداری ہوئی تو پھر بلال رضی اللہ عنہ نے اذان کہی اور نبی ﷺ نے اسی طرح نماز پڑھی جس طرح روزانہ پڑھتے تھے۔ (مسلم)

وَلَهُ عَنْ جَابِرٍ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ: أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ أَتَى الْمُزْدَلِفَةَ، فَصَلَّى بِهَا الْمَغْرِبَ وَالْعِشَآءَ بِأَذَانٍ وَاحِدٍ وإِقَامَتَيْنِ.

اور مسلم میں حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی ﷺ مزدلفہ میں پہنچے تو وہاں آپؐ نے مغرب اور عشاء کی نماز ایک اذان اور دو اقامتوں سے پڑھی

وَلَهُ عَنِ ابْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُمَا: جَمَعَ النَّبِيُّ ﷺ بَيْنَ الْمَغْرِبِ وَالْعِشَآءِ بِإِقَامَةٍ وَاحِدَةٍ. وَزَادَ أَبُو دَاوُدَ: «لِكُلِّ صَلاَةٍ» وَفِيْ رِوَايَةٍ لَه: وَلَمْ يُنَادِ فِي وَاحِدَةٍ مِنْهُمَا.

اور مسلم ہی میں ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے مغرب اور عشاء دونوں نمازیں جمع کر کے ایک ہی اقامت کے ساتھ ادا فرمائیں اور ابوداؤد نے اتنا اضافہ نقل کیا ہے کہ ہر نماز کیلئے تکبیر کہی گئی اور اسی کی ایک روایت میں منقول ہے کہ ان دونوں نمازوں میں سے کسی کے لئے بھی اذان نہیں کہی گئی۔

لغوی تشریح: ﴿ فی نومهم عن الصلاة ﴾ سونے کا واقعہ نماز فجر کا ہے۔ واقعہ کی نوعیت کچھ اس طرح آئی ہے کہ آپؐ خیبر سے واپس تشریف لا رہے تھے کہ رات کے آخری حصہ میں کہیں پڑاؤ کیا۔ نبی ﷺ نے حضرت بلال رضی اللہ عنہ کو بیدار رہنے کا حکم ارشاد فرمایا کہ جب طلوع فجر ہو تو وہ انہیں جگا دیں۔ نبی کریم ﷺ سو گئے اور بلال رضی اللہ عنہ پر نیند کا غلبہ ہوا اور وہ بھی سو گئے۔ پس طلوع آفتاب کے بعد آنکھ کھلی تو

(یہ صورتحال ملاحظہ فرما کر) نبی ﷺ نے اس وادی سے نکلنے کا حکم دیا (تعمیل حکم میں) سب صحابہؓ اس وادی سے نکل گئے (اور آگے دوسری جگہ پڑاؤ ڈالا) تو نبی ﷺ کے فرمان کے مطابق بلال رضی اللہ عنہ نے اذان کہی اور آپؐ نے نماز پڑھائی۔ ﴿ مزدلفۃ ﴾ یہ ایک مقام کا نام ہے جو منیٰ اور عرفات کے مابین واقع ہے۔ یہ حج کے مشہور شعائر میں سے ہے۔ عرفات میں وقوف کے بعد دسویں ذی الحجہ کی شروع رات کو حجاج کرام اس جگہ آتے ہیں۔ ﴿ ولم ینادفی واحد منهما ﴾ ان دونوں میں سے کسی کیلئے بھی منادی (اذان) نہیں کہی گئی۔

حاصل کلام: اس حدیث سے یہ مسئلہ ثابت ہوتا ہے کہ نیند کی وجہ سے نماز کا وقت فوت ہو جائے اور نماز باجماعت کا ارادہ ہو تو پھر نماز کیلئے اذان کہنی چاہئے۔ ابن عمر رضی اللہ عنہما کی یہ حدیث اور جابر رضی اللہ عنہ سے مروی پہلی حدیث باہم متعارض معلوم ہوتی ہیں کیونکہ یہ حدیث مزدلفہ کے قیام میں مغرب و عشاء دونوں کو جمع کر کے پڑھنے کی صورت میں اذان کہنے کی نفی کرتی ہے جبکہ حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی روایت سے ثابت ہوتا ہے کہ "ایک اذان اور دو اقامتیں کہی گئیں۔ مگر یہ حدیث جابر رضی اللہ عنہ اولیٰ ہے کیونکہ مثبت کو منفی پر مقدم تسلیم کیا گیا۔

(۱۵۱) وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ وَعَائِشَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمْ، قَالاَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ «إِنَّ بِلاَلاً يُؤَذِّنُ بِلَيْلٍ، فَكُلُوا وَاشْرَبُوا حَتَّى يُنَادِيَ ابْنُ أُمِّ مَكْتُومٍ، وَكَانَ رَجُلاً أَعْمَى لاَ يُنَادِي حَتَّى يُقَالَ لَهُ: أَصْبَحْتَ أَصْبَحْتَ». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ، وَفِي آخِرِهِ إِدْرَاجٌ.

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا دونوں سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "بلال (رضی اللہ عنہ) رات کو اذان کہتا ہے تم لوگ ابن ام مکتوم (رضی اللہ عنہ) کی اذان تک کھا پی لیا کرو۔" ابن ام مکتوم (رضی اللہ عنہ) نابینا آدمی تھے جب تک لوگ انہیں یہ نہ کہتے کہ (صبح ہوگئی' صبح ہوگئی) وہ اذان نہ کہتے تھے۔ (بخاری و مسلم)

لغوی تشریح: ﴿ یوذن بلیل ﴾ رات کو اذان کہنے کا مطلب ہے کہ طلوع فجر سے قبل اذان کہتا ہے۔ ﴿ فکلوا واشربوا ﴾ کھاؤ پیو سے مراد ہے کہ اگر تم روزہ رکھنے کا ارادہ رکھتے ہو تو سحری کا وقت باقی ہے کھا پی سکتے ہو۔ ﴿ ادراج ﴾ راوی کا اپنی طرف سے اضافہ (تشریح و توضیع) کی صورت میں داخل کرنا۔ ادراج سے مراد یہاں ﴿ وکان رجلا اعمی ﴾ کا فقرہ ہے جو ابن عمر رضی اللہ عنہما یا زہری کی طرف سے اضافہ شدہ ہے۔ اس سے یہ لازم نہیں ہوتا کہ اول وقت سے اذان کو مؤخر کیا جائے' کیونکہ اطلاع دینے والا ابن ام مکتوم رضی اللہ عنہ کو یا تو فجر کے طلوع ہونے کے قریب وقت اطلاع دیتا (کہ فجر ہوگئی ہے) یا جب فجر کا کچھ حصہ نمودار ہو جاتا (اس وقت اسے مطلع کرتا)

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ طلوع فجر سے پہلے بھی اذان کہنا مشروع ہے۔ لیکن یہ اذان اس غرض کیلئے نہیں ہوتی جس غرض کیلئے معمول کی اذان دی جاتی ہے بلکہ اس سے مقصود سوئے ہوئے

لوگوں کو بیدار کرنا کہ وہ اٹھیں اور نماز کی تیاری کریں۔ نیز یہ بھی معلوم ہوا کہ ایک مسجد میں نماز کی اذان دینے کیلئے دو موذن رکھنا درست ہے۔

(١٥٢) وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُما: أَنَّ بِلاَلاً أَذَّنَ قَبْلَ الفَجْرِ، فَأَمَرَهُ النَّبِيُّ ﷺ أَنْ يَرْجِعَ فَيُنَادِيْ: **أَلاَ إِنَّ العَبْدَ نَامَ.** رَوَاهُ أَبُو دَاوُدَ، وَضَعَّفَهُ.

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ (ایک روز) بلال رضی اللہ عنہ نے طلوع فجر سے پہلے ہی اذان کہہ دی تو نبی کریم ﷺ نے انہیں دوبارہ اذان کہنے کا حکم دیا (تو بلال رضی اللہ عنہ نے یہ الفاظ کہہ کر منادی کی) "خبردار! سنو بندہ کو نیند آ گئی تھی۔" (ابوداؤد نے اسے روایت کیا اور ضعیف قرار دیا ہے)

لغوی تشریح: ﴿اذن قبل الفجر﴾ طلوع فجر سے قبل اذان کہی' اس گمان کی بنا پر کہ فجر طلوع ہو چکی ہے (حالانکہ طلوع نہیں ہوئی تھی) یہ اس وقت کی بات ہے جبکہ قبل طلوع فجر اذان دینا مشروع نہیں تھا۔ ﴿وضعفه﴾ ابو داؤد رحمہ اللہ نے اس حدیث کو یہ کہہ کر ضعیف قرار دیا ہے کہ ایوب سے صرف حماد بن سلمہ ہی روایت کرتا ہے اور امام ابن مدینی رحمہ اللہ نے فرمایا ہے کہ یہ غیر محفوظ ہے اور حماد بن سلمہ نے اس میں خطا کھائی ہے۔

حاصل کلام: یہ حدیث ضعیف ہے لیکن تسلیم کر لی جائے تو پھر یہ روایت اس موقع پر محمول ہو گی جب ابتداء میں صرف حضرت بلال رضی اللہ عنہ ہی اذان کہتے تھے۔ پھر جب ان کے ساتھ حضرت عبد اللہ بن ام مکتوم رضی اللہ عنہ کو بھی مقرر کیا گیا تو بلال رضی اللہ عنہ پہلی اذان صبح سے پہلے دیتے اور ابن مکتوم رضی اللہ عنہ صبح ہونے کے بعد' جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔

راوی حدیث: ﴿ابن ام مکتوم رضی اللہ عنہ﴾ ان کا نام عمرو یا عبد اللہ بن قیس قرشی عامری تھا' جن کا ذکر سورہ عبس کے شان نزول کے سلسلہ میں مفسرین نے بیان کیا ہے۔ قدیم الاسلام تھے۔ ہجرت بھی کی تھی۔ نبی کریم ﷺ نے اپنی عدم موجودگی میں ان کو تیرہ مرتبہ مدینہ میں اپنا نائب (قائم مقام) مقرر فرمایا کہ لوگوں کی امامت کے فرائض انجام دے۔ جنگ قادسیہ میں جام شہادت نوش فرمایا۔ اس روز جھنڈا ان کے ہاتھ میں تھا۔

(١٥٣) وَعَنْ أَبِي سَعِيدِ الخُدْرِيِّ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «**إِذَا سَمِعْتُمُ النِّدَاءَ فَقُولُوا مِثْلَ مَا يَقُولُ المُؤَذِّنُ**» مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ

حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "جب تم اذان سنو تو تم بھی اسی طرح کہتے جاؤ جس طرح مؤذن کہہ رہا ہے۔" (بخاری و مسلم)

وَلِلْبُخَارِيِّ عَنْ مُعَاوِيَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ مِثْلُهُ.

بخاری میں معاویہ رضی اللہ عنہ سے بھی اسی طرح روایت ہے۔ اور مسلم نے عمر رضی اللہ عنہ سے روایت بیان کی ہے جو

وَلِمُسْلِمٍ عَنْ عُمَرَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، فِي فَضْلِ القَوْلِ كَمَا يَقُولُ المُؤَذِّنُ كَلِمَةً كَلِمَةً سِوَى الحَيْعَلَتَيْنِ ، فَيَقُولُ: لاَ حَوْلَ وَلاَ قُوَّةَ إِلاَّ بِاللهِ.

مؤذن کے جواب میں اسی طرح ایک ایک کلمہ کہنے کی فضیلت کے بارے میں ہے بجز (حی علی الصلاۃ) اور (حی علی الفلاح) کے کہ ان کلمات کی جگہ (لاحول ولا قوۃ الا باللہ) کہے۔

حاصل کلام: اس حدیث سے یہ ثابت ہوتا ہے جس طرح مؤذن کلمات اذان کہے' سننے والا اسی طرح کہتا جائے اور یہ جواب ہر حالت میں مشروع ہیں خواہ انسان پاک ہو یا ناپاک۔ البتہ بول و براز وغیرہ میں مصروف ہو تو جواب دینا جائز نہیں اور (حی علی الصلاۃ 'حی علی الفلاح) کے جواب میں (لاحول ولا قوۃ الا باللہ) کہا جائے اور جس روایت میں یہ آیا ہے کہ جس طرح مؤذن کہے تم بھی اسی طرح کہو۔ تو یہ حکم عام ہے' (حی علی الصلاۃ) اور (حی علی الفلاح) کے جواب میں "لاحول ولا قوۃ الا باللہ" کہنے کا حکم خاص ہے اور یہ طے شدہ اصول ہے کہ خاص کو عام پر اور مقید کو مطلق پر ترجیح دی جائے گی۔ جمہور علماء کے نزدیک یہی مسنون ہے۔

(١٥٤) وَعَنْ عُثْمَانَ بْنِ أَبِي العَاصِ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ أَنَّهُ قَالَ: يَا رَسُولَ اللهِ! اجْعَلْنِيْ إِمَامَ قَوْمِي، فَقَالَ: «أَنْتَ إِمَامُهُمْ وَاقْتَدِ بِأَضْعَفِهِمْ، وَاتَّخِذْ مُؤَذِّناً لاَ يَأْخُذُ عَلَى أَذَانِهِ أَجْرَاً». أَخْرَجَهُ الخَمْسَةُ وَحَسَّنَهُ التِّرمِذِيُّ، وَصَحَّحَهُ الحَاكِمُ.

حضرت عثمان بن ابی العاص رضی اللہ عنہ سے مروی ہے انہوں نے عرض کیا یارسول اللہ (ﷺ)! مجھے میری قوم کا امام مقرر فرما دیں۔ ارشاد ہوا "تم ان کے امام ہو (تمہیں تمہاری قوم کا امام مقرر کر دیا گیا) ان میں کمزور و ضعیف لوگوں کا خیال رکھو اور مؤذن ایسے آدمی کو مقرر کرو جو اذان کہنے کی اجرت نہ طلب کرے۔" (اس کو احمد' ابوداؤد' ترمذی' نسائی اور ابن ماجہ نے روایت کیا ہے اور ترمذی نے اسے حسن قرار دیا ہے اور حاکم نے صحیح کہا ہے)

لغوی تشریح: ﴿ واقتد باضعفهم ﴾ اقتداء سے فعل امر ہے۔ یعنی اپنے نمازیوں میں سے ضعیف و کمزور نمازیوں کا خیال رکھنا' ان کی منشاء کا' ان کے احوال کا خیال رکھنا گویا کہ تم انہی کو نماز پڑھا رہے ہو۔

حاصل کلام: مؤذن کا اذان کی اجرت و معاوضہ لینا جائز ہے یا ناجائز۔ اس بارے میں اختلاف ہے۔ اس حدیث سے معاوضہ کی حرمت ثابت نہیں ہوتی۔ البتہ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ بغیر معاوضہ لئے اذان کہنا مندوب و مستحسن ہے۔

اس حدیث سے ثابت ہوتا ہے کہ ہر حال میں نمازیوں کی رعایت ملحوظ رکھنی چاہیئے اور دیگر ارکان و واجبات کو اتنا لمبا نہ کرے کہ کمزور و ناتواں لوگ اکتا جائیں اور نماز باجماعت سے محروم رہ جائیں۔ نیز اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ مؤذن کو اذان کی اجرت نہ لینی چاہیئے۔ اکثر فقہاء کے نزدیک یہ مکروہ ہے حرام نہیں بلکہ متاخرین علماء نے ناگزیر وجوہ کی بناء پر معاوضہ لینے کو جائز قرار دیا ہے۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ بھلائی اور نیکی کے کام میں امامت کی طلب جائز ہے۔ اس کے آداب و شرائط کماحقہ پورا کرنے کی صورت میں اس کا حاصل کرنا بھی جائز ہے۔

راوی حدیث : ﴿ عثمان بن ابی العاص رضی اللہ عنہ ﴾ ابو عبداللہ ان کی کنیت تھی۔ طائف سے جو وفد نبی ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا تھا یہ ان میں سب سے کم عمر تھے۔ نبی ﷺ نے ان کو وفد پر عامل مقرر فرمایا۔ انہوں نے اپنی قوم کو مرتد ہونے سے بچایا اور وہ اسلام پر ثابت قدم رہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے دور خلافت میں ان کو بحرین اور عمان پر عامل مقرر فرمایا۔ بصرہ میں ۵۱ھ میں فوت ہوئے۔

(١٥٥) وَعَنْ مَالِكِ بْنِ الْحُوَيْرِثِ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ لَنَا النَّبِيُّ ﷺ: «**إِذَا حَضَرَتِ الصَّلَاةُ، فَلْيُؤَذِّنْ لَكُمْ أَحَدُكُمْ**» الحَدِيثَ، أَخْرَجَهُ السَّبْعَةُ.

حضرت مالک بن حویرث رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ہم سے ارشاد فرمایا کہ "**جب نماز کا وقت آجائے تو تم میں سے کوئی ایک آدمی تمہیں بلانے کیلئے اذان کہے**" پھر پوری حدیث بیان کی۔ (اسے ساتوں احمد' بخاری و مسلم' ابوداؤد' ترمذی' نسائی اور ابن ماجہ نے روایت کیا ہے)

راوی حدیث ﴿ مالک بن حویرث رضی اللہ عنہ ﴾ ان کی کنیت ابوسلمان تھی۔ نبی ﷺ کی خدمت میں حصول تعلیم دین کیلئے آئے تھے۔ بیس روز تک آپؐ کے پاس قیام کیا جب واپس جانے لگے تو حضور ﷺ نے فرمایا کہ "راستہ میں جب وقت نماز آجائے تو تم میں سے کوئی اذان کہے اور جو تم میں سے عمر میں بڑا ہو وہ جماعت کرائے۔" اس سے یہ مسئلہ معلوم ہوا کہ مسافروں کو بھی اذان اور جماعت کا اہتمام کرنا چاہیئے۔ انفرادیت کی بجائے اجتماعیت کو برتری اور فضیلت حاصل ہے۔ ۷۴ھ کو بصرہ میں وفات پائی۔

(١٥٦) وَعَنْ جَابِرٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، أَنَّ رَسُولَ اللهِ ﷺ قَالَ لِبِلَالٍ: «**إِذَا أَذَّنْتَ فَتَرَسَّلْ، وَإِذَا أَقَمْتَ فَاحْدُرْ، وَاجْعَلْ بَيْنَ أَذَانِكَ وَإِقَامَتِكَ قَدْرَ مَا يَفْرُغُ الآكِلُ مِنْ أَكْلِهِ،**» الحديث. رَوَاهُ التِّرمِذِيُّ، وَضَعَّفَهُ.

حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے بلال رضی اللہ عنہ سے فرمایا "**جب اذان کہو تو ٹھہر ٹھہر کر کہو اور تکبیر ذرا جلدی جلدی کہو۔ اذان اور اقامت کے مابین اتنا وقفہ ہونا چاہیئے کہ کھانا کھانے والا اپنے کھانے سے فارغ ہو کر جماعت میں شریک ہو سکے۔**" (پھر حدیث پوری بیان کی۔ اسے ترمذی نے روایت

وَلَهُ عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ قَالَ: «لاَ يُؤَذِّنُ إِلاَّ مُتَوَضِّىءٌ». وَضَعَّفَهُ أَيضاً.

اور ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "وضو کے بغیر کوئی اذان نہ کہے" (ترمذی نے اسے بھی ضعیف قرار دیا ہے۔)

وَلَهُ عَنْ زِيَادِ بْنِ الحَارِثِ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «وَمَنْ أَذَّنَ فَهُوَ يُقِيمُ». وَضَعَّفَهُ أَيضاً.

اور ترمذی نے زیاد بن حارث رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جو اذان کہے وہی اقامت کہے۔ اسے بھی ضعیف قرار دیا ہے

وَلأَبِيْ دَاوُدَ من حَدِيْثِ عَبْدِ اللهِ بْنِ زَيْدٍ، أَنَّهُ قَالَ: أَنَا رَأَيْتُهُ، يَعْنِي الأَذَانَ، وَأَنَا كُنْتُ أُرِيْدُه، قَالَ: فَأَقِمْ أَنْتَ. وَفِيهِ ضَعْفٌ أَيضاً.

اور ابوداؤد میں عبداللہ بن زید رضی اللہ عنہما کی روایت میں ہے کہ میں نے اذان کو خواب میں دیکھا تھا۔ میری تمنا تھی کہ مجھے مؤذن مقرر کیا جائے آپ ؐ نے فرمایا "تو تکبیر کہا کر۔" اس میں بھی ضعف ہے۔

لغوی تشریح: ﴿ فترسل ﴾ ترسل سے امر کا صیغہ ہے۔ یعنی ٹھہر ٹھہر کر آرام سے کلمات اذان ادا کر۔ جلدی اور تیزی نہ کر۔ ﴿ فاحدر ﴾ نصر ینصر باب سے امر کا صیغہ ہے۔ جس کا معنی جلدی جلدی ادا کرنا۔ اس حدیث کی سند میں عبدالمنعم نامی راوی ہے۔ جسے محدثین نے متروک کہا ہے۔ ﴿ وضعفه ﴾ ایضا اس کو بھی اس نے ضعیف قرار دیا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ معاویہ بن یحییٰ یہ حدیث زھری سے روایت کرتے ہیں اور زھری حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے اور معاویہ ضعیف ہے اور زھری کا حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے سماع ہی ثابت نہیں۔ اس اعتبار سے یہ روایت منقطع ہے اور اس لئے بھی کہ معاویہ بن یحییٰ راوی زھری کے حوالہ سے ضعیف ہے۔ ﴿ ومن اذن ﴾ ماقبل پر عطف ہے اور وہ نبی ﷺ کا یہ ارشاد ہے ﴿ ان اخا صداء اذن ﴾ یعنی صداء قبیلہ کے ایک شخص نے اذان کہی۔ اس کے بعد آپ ؐ نے فرمایا (ومن اذن فهو يقيم) کہ "جو اذان کہے وہی اقامت کہے"۔ اس حدیث سے مصنف رحمۃ اللہ علیہ نے یہ ٹکڑا حذف کر دیا۔ مکمل حدیث اس طرح ہے کہ زیاد بن حارث رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "اے قبیلہ صداء کے آدمی! اذان کہو۔" میں نے اذان کہی۔ جب آپ ؐ نماز پڑھانے لگے تو بلال رضی اللہ عنہ نے اقامت کہنا چاہی تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "صدائی بھائی نے اذان کہی ہے اور جو اذان کہے وہی اقامت کہے گا۔" ﴿ صداء ﴾ کے "صاد" پر ضمہ ہے۔ ایک قبیلہ کا نام ہے۔ ترمذی نے اس حدیث کو ضعیف کہا ہے۔ اس کا ضعف اس وجہ سے ہے کہ اس کی سند میں عبدالرحمٰن بن زیاد بن انعم افریقی ہے' امام قطان وغیرہ نے اسے ضعیف کہا لیکن ثوری رحمۃ اللہ علیہ نے اسے اچھا کہا ہے اور بخاری رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ وہ حدیث کے قریب رہنے والا ہے۔ ابن حبان نے اسے ثقہ کہا ہے اور درست بات بھی یہی ہے کہ وہ ثقہ ہے۔ طبرانی میں ابن عمر رضی اللہ عنہما کی روایت میں اس کی تائید ہوتی ہے جس کے الفاظ ہیں۔ اقامت کہنا اسی کا حق ہے جس

نے اذان کہی لیکن یہ روایت بھی ضعیف ہے۔ امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں اہل علم کی اکثریت کے نزدیک اسی پر عمل ہے کہ جو اذان کہے وہی اقامت کا حقدار ہے۔ ہاں یہ حدیث عبداللہ بن زید رضی اللہ عنہ کی حدیث کے معارض ہے جو ۱۹۸ نمبر پر ہے۔ احادیث میں تطبیق کی صورت یہ ہے کہ اس معاملہ میں وسعت ہے دوسرا بھی تکبیر کہہ سکتا ہے۔ ﴿ وفیہ ضعف ایضا ﴾ بیہقی نے بیان کیا ہے کہ اس حدیث کی سند اور متن میں اختلاف پایا جاتا ہے اور فرمایا ہے کہ عبداللہ بن زید رضی اللہ عنہ اور "الصدائی" رضی اللہ عنہ کی یہ دونوں احادیث اگر صحیح ہوں تو صدائی کی حدیث راجح ہے کیونکہ وہ عبداللہ بن زید رضی اللہ عنہ کی حدیث سے بعد کی ہے۔

راوی حدیث : ﴿ زیاد بن حارث رضی اللہ عنہ ﴾ صداء قبیلہ کے فرد تھے۔ یہ یمن کا ایک قبیلہ تھا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے بیعت کی ہوئی تھی۔ آپ کے روبرو اذان دی۔ بصریوں میں شمار کئے جاتے ہیں۔

(۱۵۷) وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ: «الْمُؤَذِّنُ أَمْلَكُ بِالأَذَانِ، وَالإِمَامُ أَمْلَكُ بِالإِقَامَةِ». رَوَاهُ ابْنُ عَدِيٍّ، وَضَعَّفَهُ، وَلِلْبَيْهَقِيِّ نَحْوُهُ عَنْ عَلِيٍّ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُ مِنْ قَوْلِهِ.

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "موذن اذان کا زیادہ حقدار ہے اور امام تکبیر کہنے کا زیادہ حق رکھتا ہے۔" (اسے ابن عدی نے روایت کیا ہے اور ضعیف قرار دیا ہے اور بیہقی میں بھی حضرت علی رضی اللہ عنہ سے اسی طرح منقول ہے)

لغوی تشریح : ﴿ رواہ ابن عدی و ضعفہ ﴾ ابن عدی نے اسے ضعیف اس بناء پر قرار دیا ہے کہ شریک قاضی تنہا اسے روایت کرتا ہے لیکن ابن معین نے کہا شریک صدوق، ثقہ ہے۔ البتہ اگر اس کی مخالفت ہو تو پھر ہمیں دوسرا محبوب ہے اور نسائی نے کہا ﴿ لیس بہ باس ﴾ (اس میں کوئی حرج نہیں۔) اور احمد نے کہا کہ وہ عاقل اور صدوق ہے۔ امام مسلم نے اس سے متابعتاً روایت لی ہے۔ **حاصل کلام :** موذن اذان کا زیادہ استحقاق رکھتا ہے کیونکہ اس کو اذان کے وقت کا محافظ بنایا گیا ہے لہٰذا موذن کو اذان دینے میں تاخیر یا تقدیم پر مجبور کرنے کا کوئی بھی مجاز نہیں اور امام، تکبیر کہلانے میں حقدار ہے، یعنی اس کے اشارہ و اجازت کے بغیر تکبیر نہ کہی جائے۔

(۱۵۸) وَعَنْ أَنَسِ بْنِ مَالِكٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ: «لاَ يُرَدُّ الدُّعَاءُ بَيْنَ الأَذَانِ وَالإِقَامَةِ». رَوَاهُ النَّسَائِيُّ وَصَحَّحَهُ ابْنُ خُزَيْمَةَ.

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے کہ "اذان اور اقامت کے درمیانی وقفہ میں دعا مسترد نہیں کی جاتی۔" (اسے نسائی نے روایت کیا ہے اور ابن خزیمہ نے صحیح قرار دیا ہے)

حاصل کلام : ترمذی میں حدیث کے آخر میں اتنا اضافہ بھی منقول ہے کہ صحابہ رضی اللہ عنہم نے عرض کیا یا رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم)! تو پھر ہم (اس وقت) کیا دعا کریں؟ فرمایا "سلوا اللہ العفو والعافیۃ فی الدنیا والاخرۃ

کہ اللہ تعالیٰ سے عفو و بخشش اور دنیا و آخرت میں عافیت کا سوال کرو۔ اس حدیث سے معلوم ہوا کہ مقبولیت دعا کیلئے یہ وقت نہایت موزوں اور مناسب ہے۔

(١٥٩) وَعَنْ جَابِرٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ أَنَّ رَسُولَ اللهِ ﷺ قَالَ: «مَنْ قَالَ حِينَ يَسْمَعُ النِّدَاءَ: اللَّهُمَّ رَبَّ هَذِهِ الدَّعْوَةِ التَّامَةِ، وَالصَّلَاةِ الْقَآئِمَةِ، آتِ مُحَمَّداً الْوَسِيْلَةَ وَالْفَضِيْلَةَ، وَابْعَثْهُ مَقَاماً مَحْمُوداً الَّذِيْ وَعَدتَّهُ حَلَّتْ لَهُ شَفَاعَتِيْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ». أَخْرَجَهُ الأَرْبَعَةُ.

حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "جس آدمی نے اذان سن کر یہ دعا کی تو اس کے لئے قیامت کے روز میری شفاعت حلال ہو گئی۔ "اے اللہ! اے اس کامل دعا و پکار اور قائم ہونے والی نماز کے مالک! محمد ﷺ کو وسیلہ (مقام محمود) اور فضیلت عطا فرما اور مقام محمود پر جس کا تو نے ان سے وعدہ فرمایا ہے پہنچا دے (کھڑا فرما دے) تو اس کیلئے قیامت کے روز میری شفاعت حلال ہو گئی۔"

(اس کو ابوداؤد' ترمذی' نسائی اور ابن ماجہ چاروں نے روایت کیا ہے)

لغوی تشریح: ﴿ نداء ﴾ بمعنی اذان۔ رب منصوب ہے منادی سے بدل ہونے کی وجہ سے یا پھر دوسرے منادی سے اور وہ مضاف ہے۔ ﴿ هذه الدعوة التامة ﴾ کے قول کی طرف۔ اس دعوت سے مراد توحید کی دعوت ہے۔ اس کے مکمل ہونے کی وجہ سے اسے ﴿ تامة ﴾ کے لفظ سے بیان کیا گیا ہے اس لئے کہ رب ہی توحید کاملیت اور تمامیت کا استحقاق رکھتا ہے۔ اس کے علاوہ سب کچھ نقص اور فساد کی زد میں ہے ﴿ والصلوة القائمة ﴿ قیامت تک باقی رہنے والی۔ ﴿ الوسيلة ﴾ اس کی وضاحت خود نبی کریم ﷺ نے اپنی زبان مبارک سے ارشاد فرما دی ہے کہ وہ جنت میں ایک مقام ہے۔ اللہ کے بندوں میں سے ایک بندے کو وہ لائق ہے اور مجھے توقع ہے کہ وہ بندہ میں ہی ہوں گا ﴿ والفضيلة ﴾ اس مرتبہ کو کہتے ہیں جو ساری مخلوق سے برتر ہو ﴿ وابعثه ﴾ اس کو وہاں پہنچا دے' بھیج دے ﴿ مقاما محمودا ﴾ یہ وہ مقام ہے جہاں نبی کریم ﷺ رب کائنات کے حضور سجدہ ریز ہوں گے اور اللہ تعالیٰ کی ان کلمات کے ساتھ حمد و ستائش کریں گے جو اس موقع پر انہیں الہام کئے جائیں گے۔ اس سے پہلے ان کا علم آپؐ کو نہیں ہوگا اور اسی دعا و درخواست کی وجہ سے آپؐ کو شفاعت کبریٰ کی اجازت ہوگی۔ ﴿ حلت ﴾ واجب ہو جائے گی۔ میری شفاعت کا مستحق قرار پائے گا۔

حاصل کلام: اس حدیث سے ثابت ہوا کہ اذان سننے کے بعد اس دعا کا پڑھنا مسنون ہے اور اس کی فضیلت بھی بڑی ہے۔ اس سے بڑا شرف اور فضل کیا ہوگا کہ پڑھنے والے کیلئے نبی کریم ﷺ کی بروز قیامت شفاعت ہوگی۔ جس کی آپؐ نے سفارش فرمائی وہ بالآخر جنت میں چلا ہی جائے گا۔ "مقام محمود" کا ذکر قرآن مجید کی سورہ بنی اسرائیل میں ہے۔ ﴿ عسى ان يبعثك ربك مقاما محمودا ﴾ یعنی امید

ہے کہ تیرا رب تجھے مقام محمود پر پہنچا دے گا۔

٣ - بَابُ شُرُوطِ الصَّلاَةِ

شرائط نماز کا بیان

(١٦٠) عَنْ عَلِيِّ بْنِ طَلْقٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ ﷺ: «إِذَا فَسَا أَحَدُكُمْ فِي الصَّلاَةِ، فَلْيَنْصَرِفْ، وَلْيَتَوَضَّأْ وَلْيُعِدِ الصَّلاَةَ». رَوَاهُ الخَمْسَةُ، وَصَحَّحَهُ ابْنُ حِبَّانَ.

حضرت علی بن طلق رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "دوران نماز جب تم میں سے کسی کی ہوا خارج ہو جائے تو وہ واپس جائے' از سر نو وضو کرے اور نماز دوبارہ پڑھے۔" (اسے احمد' ابوداؤد' ترمذی' نسائی اور ابن ماجہ پانچوں نے روایت کیا ہے اور ابن حبان نے صحیح قرار دیا ہے)

لغوی تشریح: ﴿باب شروط الصلاۃ﴾ شرط اسے کہتے ہیں جو اصل چیز سے خارج ہو اور اس حیثیت سے اس کیلئے لازمی اور ضروری ہے کہ اس کی عدم موجودگی میں وہ بھی نہیں رہتی۔ یعنی اس کا ہونا اس چیز کے ساتھ لازم ہے۔ بالفاظ دیگر شرط اس کام کو کہتے ہیں کہ جس کے نہ ہونے سے شرط والا کام نہ ہو۔ "اذافات الشرط فات المشروط" جب شرط نہ رہے تو مشروط بھی معدوم ہو جاتا ہے۔ ﴿فسا﴾ فسو سے ماضی کا صیغہ ہے۔ مقعد سے بغیر آواز کے جو ہوا خارج ہوتی ہے۔ ﴿ولیعد الصلاۃ﴾ ولیعد میں یعد اعادہ سے ماخوذ ہے۔ جس کے معنی لوٹانا' دوبارہ ادا کرنا۔ اس سے یہ معلوم ہوا کہ نماز میں جس کا وضو ٹوٹ جائے اسے از سر نو دوبارہ نماز پڑھنا واجب ہے۔ پہلی نماز پر بنا کسی صورت بھی صحیح نہیں۔ یہ اس حدیث کے معارض ہے جو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے نواقض الوضو کے باب میں پہلے گزر چکی ہے جس میں مذکور ہے کہ حالت نماز میں بے وضو آدمی نیا وضو کرے اور اپنی نماز پر بنا کرے۔ لیکن جیسا پہلے بھی بیان کیا جا چکا ہے کہ یہ حدیث ضعیف ہے۔ لہٰذا اس حدیث کا باب مذکور کی حدیث سے کوئی مقابلہ نہیں ہو سکتا۔ لہٰذا راجح اور قابل ترجیح یہی بات ہے کہ غیر مشروط طور پر نماز نئے سرے سے پڑھی جائے۔

راوی حدیث: ﴿علی بن طلق رضی اللہ عنہ﴾ پورا نام علی بن طلق (طاء پر فتحہ' لام ساکن) بن المنذر بن قیس سحمی' یمامی حنفی' بنو حنیفہ کی طرف نسبت کی وجہ سے حنفی ہیں' صحابی ہیں۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ طلق بن علی کے والد ہیں اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ دونوں ایک ہی شخص کے نام ہے۔

(١٦١) وَعَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهَا، عَنِ النَّبِيِّ ﷺ، قَالَ: «لاَ يَقْبَلُ اللّٰهُ صَلاَةَ حَائِضٍ إِلاَّ بِخِمَارٍ». رَوَاهُ الخَمْسَةُ إِلاَّ النَّسَائِيَّ وَصَحَّحَهُ ابْنُ خُزَيْمَةَ.

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نبی ﷺ سے روایت کرتی ہیں کہ نبی ﷺ نے فرمایا "جسے حیض آتا ہے (یعنی وہ عورت جو بالغہ ہے) اللہ تعالیٰ اس کی نماز دوپٹہ کے بغیر قبول نہیں کرتا۔" (اسے بجز نسائی کے پانچوں نے روایت کیا ہے اور ابن خزیمہ نے صحیح قرار دیا ہے۔)

لغوی تشریح: ﴿ حائض ﴾ اس سے بالغ و نوجوان عورت مراد ہے۔ ﴿ الخمار ﴾ "خاء" کے نیچے کسرہ' اس کپڑے کو کہتے ہیں جس سے عورت اپنا سر اور گردن ڈھانپتی اور چھپاتی ہے۔
حاصل کلام: یہ حدیث ثابت کرتی ہے کہ نماز کے وقت بالغ و نوجوان عورت کا سارا جسم چھپا ہوا ہونا چاہئے حتیٰ کہ سر کے بال بھی چھپے ہوئے ہوں۔

(١٦٢) وَعَنْ جَابِرٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ قَالَ لَهُ: «**إِنْ كَانَ الثَّوْبُ وَاسِعاً فَالتَحِفْ بِهِ، يَعْنِي فِي الصَّلاَةِ**». وَلِمُسْلِمٍ: **فَخَالِفْ بَيْنَ طَرَفَيْهِ، وَإِنْ كَانَ ضَيِّقاً فَاتَّزِرْ بِهِ**». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت جابر رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے مجھے فرمایا "جب کپڑا بڑا اور فراخ ہو تو (نماز میں) کپڑا خوب (جسم پر) لپیٹ لو" اور مسلم کی روایت میں ہے کہ کپڑا کشادہ ہو تو کپڑے کے دونوں کناروں کو کندھوں پر دونوں طرف ڈال لو اور اگر کپڑا تنگ اور چھوٹا ہو تو اسے تہبند کی صورت میں باندھ لو۔ (بخاری و مسلم)

وَلَهُمَا مِنْ حَدِيْثِ أَبِي هُرَيْرَةَ: «**لاَ يُصَلِّي أَحَدُكُمْ فِي الثَّوْبِ الْوَاحِدِ، لَيْسَ عَلَى عَاتِقِهِ مِنْهُ شَيْءٌ**».

اور بخاری و مسلم میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ "تم میں سے کوئی ایک کپڑے میں نماز نہ پڑھے جب تک کہ اس کپڑے کا کوئی حصہ اس کے کندھوں پر نہ ہو۔"

لغوی تشریح: ﴿ فالتحف ﴾ التحاف سے امر کا صیغہ ہے۔ چادر کے اوڑھنے یا پہننے کو کہتے ہیں۔ جس کی وضاحت اگلا جملہ کر رہا ہے۔ ﴿ فخالف بین طرفیه ﴾ اس کی صورت یہ ہوگی کہ دونوں بغلوں کے نیچے سے کپڑا نکال کر کندھوں پر ڈال دے۔ دائیں طرف کا بائیں کندھے پر اور بائیں طرف کا دائیں کندھے پر اور گدی کے پاس دونوں کونوں کو گانٹھ دے لے (یعنی گرہ لگا لے۔) ﴿ فاتزر ﴾ باب افتعال سے اتزر امر کا صیغہ ہے اور تہبند باندھنے کو کہتے ہیں۔
حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ نمازی کے کندھے بھی نماز میں ننگے نہیں ہونے چاہئیں۔

(١٦٣) وَعَنْ أُمِّ سَلَمَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهَا أَنَّهَا سَأَلَتِ النَّبِيَّ ﷺ: أَتُصَلِّي الْمَرْأَةُ فِي دِرْعٍ وَخِمَارٍ بِغَيْرِ إِزَارٍ؟ قَالَ: «**إِذَا كَانَ الدِّرْعُ سَابِغاً يُغَطِّي ظُهُورَ قَدَمَيْهَا**». أَخْرَجَهُ أَبُو دَاوُدَ،

حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا روایت کرتی ہیں کہ میں نے نبی ﷺ سے دریافت کیا کہ کیا کوئی عورت تہبند کے بغیر محض کرتے اور اوڑھنی میں نماز پڑھ سکتی ہے؟ آپ ؐ نے ارشاد فرمایا کہ "کرتا اگر اتنا لمبا ہو کہ قدم کی پشت تک پہنچ جاتا ہے تو جائز ہے۔" (اسے ابوداؤد

وَصَحَّحَ الأَئِمَّةُ وَقْفَهُ.

نے روایت کیا ہے اور ائمہ نے اس کے موقوف ہونے کو صحیح قرار دیا ہے)

لغوی تشریح: ﴿ درع ﴾ دال پر کسرہ "راء" ساکن۔ قمیص ﴿ سابغا ﴾ اتنی لمبی چوڑی اور فراخ کہ پورے جسم کو ڈھانپ لے ﴿ یغطی ﴾ تغطیۃ سے ماخوذ ہے۔ پردہ پوشی کرتا ہے' ڈھانپتا ہے ﴿ ظھور قدمیہ ﴾ پاؤں کا اوپر والا حصہ۔ پاؤں کی بالائی سطح۔

حاصل کلام: عورت کو نماز کی ادائیگی کیلئے سارا جسم مستور کرنا ضروری ہے۔ ایک لمبے چوڑے کرتے اور ایک سربند یعنی دوپٹہ کے ساتھ بھی نماز پڑھ سکتی ہے بشرطیکہ کرتہ اتنا دراز ہو کہ پاؤں کی بالائی سطح بھی چھپ جائے۔ اس سے معلوم ہوا کہ عورت کو اپنے پاؤں چھپانے ضروری ہیں گویا پاؤں کا ڈھانپنا بھی عورت کیلئے شرط ہے۔ اس حدیث کی روشنی میں بعض علماء نے عورت کے پاؤں کو بھی ستر میں شمار کیا ہے۔ اس حدیث کے موقوف ہونے کو ائمہ نے صحیح قرار دیا ہے مگر امام حاکم نے اس کا مرفوع ہونا بخاری کی شرائط کے مطابق کہا ہے۔ یہاں یہ ملحوظ رہے کہ ایک ایسی حدیث جو موقوف ہے اور اس کے مضمون میں اجتہاد کا دخل نہ ہو تو ایسی حدیث محدثین کے نزدیک مرفوع کے حکم میں شمار ہوتی ہے۔ اس لئے اگر اسے موقوف تسلیم کر لیا جائے تو یہ حکماً مرفوع ہے۔

(١٦٤) وَعَنْ عَامِرِ بْنِ رَبِيْعَةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: كُنَّا مَعَ النَّبِيِّ ﷺ فِيْ لَيْلَةٍ مُظْلِمَةٍ، فَأَشْكَلَتْ عَلَيْنَا الْقِبْلَةُ، فَصَلَّيْنَا، فَلَمَّا طَلَعَتِ الشَّمْسُ إِذَا نَحْنُ صَلَّيْنَا إِلَى غَيْرِ الْقِبْلَةِ، فَنَزَلَتِ الآيَةُ ﴿فَأَيْنَمَا تُوَلُّوا فَثَمَّ وَجْهُ اللّٰهِ﴾ أَخْرَجَهُ التِّرْمِذِيُّ، وَضَعَّفَهُ.

حضرت عامر بن ربیعہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ ایک تاریک و اندھیری رات میں ہم نبی کریم ﷺ کے ساتھ تھے' قبلہ کا رخ شناخت کرنا ہم پر دشوار و مشکل ہوگیا۔ ہم نے (اندازاً قبلہ کا رخ متعین کر کے) نماز پڑھ لی۔ جب آفتاب طلوع ہوا تو معلوم ہوا کہ ہم نے تو غیر قبلہ کی جانب رخ کر کے نماز پڑھی تھی۔ پس پھر یہ آیت نازل ہوئی "فاینما تولوا فثم وجہ اللہ" "پس جدھر تم رخ کرو گے اسی طرف اللہ کی ذات موجود ہے۔" (اس کو ترمذی نے روایت کیا ہے اور ضعیف قرار دیا ہے)

لغوی تشریح: ﴿ مظلمۃ ﴾ میم پر ضمہ اور لام پر کسرہ۔ تاریک رات ﴿ فاشکلت ﴾ مشتبہ ہو گئی ﴿ تولوا ﴾ رخ کرو گے۔ ﴿ فثم ﴾ "ثا" پر فتحہ اور میم پر تشدید اور فتحہ۔ یہاں کے معنی میں۔

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ عدم واقفیت' ابر آلودگی یا دیگر کسی سبب کے باعث سمت قبلہ صحیح طور پر معلوم نہ ہو سکے اور آدمی اپنی دانست کے مطابق غور و فکر اور سوچ بچار کے بعد یہ فیصلہ کر کے نماز پڑھ لے کہ قبلہ اس جانب ہوگا مگر دراصل قبلہ اس رخ پر نہ ہو تو صحیح سمت قبلہ معلوم

ہونے پر اس نماز کا اعادہ ضروری نہیں۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک وقت نکلنے سے پہلے اور بعد میں ہر صورت میں اعادہ واجب ہے کیونکہ قبلہ رخ ہونا فرض ہے۔ اس حدیث کو وہ ضعیف کہتے ہیں۔ ترمذی نے اس حدیث کو اس بنا پر ضعیف کہا ہے کہ اس روایت کی سند میں اشعث بن سعید راوی ضعیف قرار دیا گیا ہے۔ مگر اس کی تائید حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کی حدیث سے بھی ہوتی ہے۔ اسی لئے اکثر علماء کے نزدیک اعادہ کی ضرورت نہیں۔

راوی حدیث : ﴿عامر بن ربیعہ رضی اللہ عنہ﴾ قبیلہ عنز بن وائل میں سے تھے۔ بکر اور تغلب جو وائل کے بیٹے تھے ان کے بھائی تھے۔ قدیم الاسلام صحابی تھے۔ ہجرت حبشہ اور ہجرت مدینہ دونوں سے شرف یاب ہوئے۔ غزوۂ بدر اور دیگر تمام معرکوں میں داد شجاعت دیتے رہے۔ ان کی سن وفات میں اختلاف ہے۔ ۳۲ھ، ۳۳ھ یا ۳۵ھ میں سے کسی سن میں وفات پائی۔

(١٦٥) وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «مَا بَيْنَ المَشْرِقِ وَالمَغْرِبِ قِبْلَةٌ». أَخرَجَهُ التِّرمِذِيُّ، وَقَوَّاهُ البُخَارِيُّ.

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ "مشرق اور مغرب کے مابین قبلہ ہے۔" (ترمذی نے روایت کیا ہے اور بخاری نے قوی قرار دیا ہے)

لغوی تشریح : ﴿مابین المشرق والمغرب قبلۃ﴾ یہ اہل مدینہ اور اسی سمت پر واقع دوسرے لوگوں کیلئے ہے۔ اس لئے کہ مدینہ مکہ کے شمال میں واقع ہے۔ جب مدینہ والے اپنا رخ جنوب کی جانب کرتے ہیں تو اس صورت میں مغرب ان کے دائیں طرف اور مشرق بائیں طرف پڑتا ہے لہٰذا ان کا قبلہ ان دونوں سمتوں کے درمیان ہوا۔ مقصد یہ ہے کہ جب نمازی قبلہ سے دور دراز فاصلہ پر ہو تو اس کیلئے عین قبلہ رخ ہونا لازمی نہیں کیونکہ ایسا اس کیلئے بڑا مشکل اور دشوار ہے۔ بس اس کیلئے اپنا چہرہ اور رخ ادھر کرنا کافی ہے۔ دیگر شہروں کیلئے بھی یہ وسعت اسی طرح ہے جس طرح اہل مدینہ کیلئے ہے۔

(١٦٦) وَعَنْ عَامِرِ بْنِ رَبِيْعَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: رَأَيْتُ رَسُولَ اللهِ ﷺ يُصَلِّي عَلَى رَاحِلَتِهِ حَيْثُ تَوَجَّهَتْ بِهِ. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ، زَادَ البُخَارِيُّ: يُوْمِىءُ بِرَأْسِهِ، وَلَمْ يَكُنْ يَصْنَعُهُ فِي المَكْتُوبَةِ.

حضرت عامر بن ربیعہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو اپنی اونٹنی پر نماز پڑھتے دیکھا ہے۔ اونٹنی جس طرف بھی رخ کرتی آپؐ نماز پڑھتے رہتے۔ (بخاری و مسلم) اور بخاری نے اتنا اضافہ بھی نقل کیا ہے کہ آپؐ اپنے سر مبارک سے اشارہ کے ساتھ (نماز ادا) فرما رہے تھے۔ فرض نماز میں ایسا نہ کرتے تھے

وَلأَبِيْ دَاوُدَ مِنْ حَدِيْثِ أَنَسٍ: وَكَانَ إِذَا سَافَرَ فَأَرَادَ أَنْ يَتَطَوَّعَ

اور ابوداؤد میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ جب آپؐ سفر کرتے اور نماز نفل پڑھنا چاہتے تو (ایک مرتبہ) اپنی

اسْتَقْبَلَ بِنَاقَتِهِ الْقِبْلَةَ، فَكَبَّرَ ثُمَّ صَلَّى حَيْثُ كَانَ وَجْهُ رِكَابِهِ. وَإِسْنَادُهُ حَسَنٌ.

اونٹنی کا رخ قبلہ کی طرف موڑ دیتے' اس کے بعد پھر سواری کا رخ جس جانب بھی ہو جاتا' نماز پڑھتے رہتے۔ (اس حدیث کی سند حسن ہے)

لغوی تشریح: ﴿یومی براسہ﴾ اپنے سر سے رکوع و سجود کیلئے اشارہ کرتے اور سجدہ کیلئے رکوع کے بہ نسبت ذرا زیادہ جھکتے ﴿المکتوبۃ﴾ مکتوب لکھی ہوئی یعنی فرض نماز ﴿الرکاب﴾ "را" کے نیچے کسرہ اور کاف مخففہ۔ سواری' اونٹنی یا پھر ہر وہ چیز جس سے سواری کا کام لیا جائے۔ یہاں مراد سواری اور اونٹنی ہی ہے۔

حاصل کلام: حدیث ہذا سے معلوم ہوا کہ سفر کی حالت میں نفلی نماز سواری پر ادا کی جا سکتی ہے۔ ایک دفعہ سواری کا رخ یا اپنا رخ قبلہ رو کر کے شروع کر لے پھر اگر سواری کا رخ کسی دوسری جانب ہو جائے تب بھی نماز درست ہے۔ اسی طرح دور حاضر میں ریل گاڑی' ہوائی جہاز اور بحری جہاز پر نماز پڑھنا جائز ہے۔ ان کا حکم کشتی کا ہوگا۔ کشتی میں نماز پڑھنا ثابت ہے اور تمام فقہاء بھی اس کے جواز پر متفق ہیں۔

(١٦٧) وَعَنْ أَبِيْ سَعِيْدِ الْخُدْرِيِّ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ قَالَ: «**الأَرْضُ كُلُّهَا مَسْجِدٌ إِلاَّ الْمَقْبَرَةَ وَالْحَمَّامَ**». رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ، وَلَهُ عِلَّةٌ.

حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا **"قبرستان اور حمام کے ماسوا ساری زمین مسجد ہے** (جہاں چاہے نماز پڑھ لے)" (ترمذی)

لغوی تشریح: ﴿ولہ علۃ﴾ وہ علت یہ ہے کہ حماد نے اسے موصول روایت کیا ہے جبکہ ثوری رحمہ اللہ نے اسے مرسل روایت کیا ہے اور امام ثوری کی روایت صحیح ہے۔ امام دارقطنی اور بیہقی نے کہا ہے کہ یہ حدیث مرسل سند سے ہی محفوظ ہے۔ بعض حضرات نے اس کا موصول ہونا صحیح قرار دیا ہے اور اس کی تائید دیگر احادیث سے بھی ہوتی ہے۔

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ قبرستان اور حمام میں نماز پڑھنی درست نہیں۔ حمام میں اس لئے کہ وہ جگہ ناپاک ہے اور قبرستان میں ممانعت کا سبب سد ذرائع کے طور پر شرک سے بچنے کیلئے ہے۔

(١٦٨) وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهما قَالَ: نَهَى رَسُولُ اللهِ ﷺ أَن يُصَلَّى فِي سَبْعَةِ مَوَاطِنَ: الْمَزْبَلَةِ، وَالْمَجْزَرَةِ، وَالْمَقْبَرَةِ، وَقَارِعَةِ الطَّرِيْقِ، وَالْحَمَّامِ،

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے سات مقامات میں نماز پڑھنے سے منع فرمایا ہے۔ کوڑا کرکٹ (ڈالنے) کی جگہ' ذبح خانہ' قبرستان' شارع عام' حمام' اونٹ باندھنے کی جگہ (باڑا) اور بیت اللہ کی چھت پر۔ (ترمذی نے اسے

وَمَعَاطِنِ الإِبِلِ، وَفَوْقَ ظَهْرِ بَيْتِ اللهِ. رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ، وَضَعَّفَهُ.
ضعیف سند کے ساتھ روایت کیا ہے)

لغوی تشریح: ﴿ المزبلة ﴾ "میم" اور "با" پر فتحہ۔ وہ جگہ جہاں گوبر اور لید وغیرہ ڈالے جاتے ہوں۔ ﴿ المجزرة ﴾ "جیم" اور "زا" پر فتحہ جہاں جانور کو ذبح اور نحر کیا جاتا ہے ﴿ معاطن ﴾ معطن کی جمع ہے۔ میم پر فتحہ اور "طاء" کے نیچے کسرہ اونٹوں کے باندھنے کی جگہ (باڑا) یعنی حوض کے اردگرد ان کے بیٹھنے کی جگہ ﴿ وضعفه ﴾ اس روایت کی سند میں ایک راوی زید بن جبیرہ ہے' اس کے متعلق امام بخاری رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ متروک ہے۔

حاصل کلام: حدیث میں روئے زمین کو مسجد قرار دینے کے باوجود کچھ مقامات اور جگہیں ایسی ہیں جہاں نماز پڑھنا شرعاً ممنوع ہے۔ جہاں لوگ کوڑا کرکٹ ڈالتے ہیں' ظاہر ہے وہ جگہ پاک تو نہیں رہ سکتی۔ اس لئے جگہ ہی جب ناپاک ہو گئی تو نماز کیسے ہوگی کیونکہ جگہ کا پاک ہونا نماز کیلئے شرط ہے۔ اسی طرح مذبح خانہ جہاں جانور ذبح کئے جاتے ہیں۔ خون اور دوسری گندگیاں اس جگہ کو پاک نہیں رہنے دیتیں اس لئے یہ جگہ بھی نماز کی ادائیگی کیلئے درست نہیں۔ شارع عام جو عام لوگوں کی گزرگاہ ہو۔ جو راستہ تنگ ہوگا جہاں گزرنے کی پہلے ہی 'دقت اور دشواری ہو وہاں نماز پڑھنا لوگوں کیلئے موجب اذیت ہے' توجہ اور خشوع و خضوع بھی نہیں رہ سکتا۔ خانہ کعبہ کی چھت پر نماز اس لئے ممنوع ہے کہ نماز میں بیت اللہ کی طرف متوجہ ہونا بھی شرط ہے۔ چھت پر نماز پڑھنے کی صورت میں ایسا ناممکن ہے۔ جب شرط ہی نہ پائی گئی تو نماز کیسے ہوگی۔

(١٦٩) وَعَنْ أَبِي مَرْثَدٍ الْغَنَوِيِّ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: سَمِعْتُ رَسُولَ اللهِ ﷺ يَقُوْلُ: «لاَ تُصَلُّوا إِلَى الْقُبُورِ، وَلاَ تَجْلِسُوا عَلَيْهَا». رَوَاهُ مُسْلِمٌ.

حضرت ابو مرثد غنوی رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے سنا ہے کہ قبروں کو سامنے (رکھ کر) نماز نہ پڑھو اور نہ ان پر بیٹھو۔ (مسلم)

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ قبروں کی طرف رخ کر کے نماز پڑھنا ممنوع ہے۔ بعض حضرات بزرگوں کی قبروں کے پاس اس لئے مسجدیں تعمیر کرتے ہیں کہ بزرگوں کی ارواح سے فیض حاصل ہوگا۔ اس کی بھی ممانعت ہے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی حدیث میں بالکل واضح طور پر یہ ارشاد نبوی ہے کہ اللہ یہود و نصاریٰ پر لعنت کرے کہ ان لوگوں نے اپنے انبیاء کی قبروں کو سجدہ گاہ (مسجد) بنا لیا۔ اس کا ایک مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ جو افعال مساجد میں اللہ تعالیٰ کیلئے انجام دیئے جاتے ہیں انہیں قبروں پر نہ کرے اور ایک مفہوم یہ بھی ہو سکتا ہے کہ قبروں کو سامنے رکھ کر نماز نہ پڑھی جائے۔ اس سے شرک کا شبہ پڑ سکتا ہے۔

اور قبروں پر بیٹھنے کے بھی دو مفہوم ممکن ہیں' ایک تو یہ کہ قبر کو بطور تکیہ استعمال کیا جائے جس طرح تکیہ پر ٹیک لگاتے ہیں اسی طرح قبر کو تکیہ بنانا ممنوع ہے اور دوسرا یہ کہ قبروں پر مجاور بن کر بیٹھنا نیز قبروں پر قضاء حاجت کیلئے بیٹھنا بھی ممنوع و حرام ہے۔

راوی حدیث : ﴿ ابومرثد غنوی رضی اللہ عنہ ﴾ ابو مرثد کنیت ہے۔ کناز نام ہے۔ کاف پر فتحہ اور نون پر تشدید۔ کناز بن حصین بن یربوع الغنوی۔ غنوی غین اور نون دونوں پر فتحہ۔ قبیلہ غطفان کے ایک شخص غنی بن یعصر کی جانب منسوب ہونے کی بنا پر غنوی کہلائے۔ بدری صحابی ہیں۔ حمزہ بن عبدالمطلب کے حلیف تھے۔ تمام غزوات میں شریک ہوئے۔ ۱۲ھ میں ۶۶ برس کی عمر پا کر وفات پائی۔ مرثد میم پر فتحہ' "راء" ساکن "ثا" پر فتحہ "دال" ساکن۔

(۱۷۰) وَعَنْ أَبِي سَعِيْدٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «إِذَا جَاءَ أَحَدُكُمُ الْمَسْجِدَ فَلْيَنْظُرْ فَإِنْ رَأَى فِي نَعْلَيْهِ أَذىً أَوْ قَذَراً فَلْيَمْسَحْهُ، وَلْيُصَلِّ فِيهِمَا». أَخْرَجَهُ أَبُو دَاوُدَ. وَصَحَّحَهُ ابْنُ خُزَيْمَةَ.

حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ "تم میں سے جب کوئی مسجد میں آئے تو (مسجد میں داخل ہونے سے پہلے) اسے چاہئے کہ (اپنی جوتی) دیکھ لے۔ اگر اپنی جوتی میں گندگی یا ناپاک چیز لگی ہوئی دیکھے تو اسے چاہئے کہ اسے صاف کرے اور اس میں نماز پڑھ لے"۔ (ابوداؤد نے اس کی روایت کی ہے اور ابن خزیمہ نے اسے صحیح قرار دیا ہے)

لغوی تشریح : ﴿ اذی ﴾ طبائع جس سے اذیت محسوس کریں۔ ﴿ قذر ﴾ طبائع جسے گندہ تصور کریں اور اس سے نفرت کریں۔ مراد اس سے نجاست و گندگی ہے ﴿ اذی او قذر ﴾ بھول کر' راوی نے اپنے شک کا اظہار کیا ہے۔

حاصل کلام : یہ حدیث اس کی کھلی ہوئی دلیل ہے کہ جوتے پہن کر نماز پڑھنا جائز ہے بشرطیکہ جوتے پاک و صاف ہوں۔ نیز یہ کہ جوتے پر لگی ہوئی نجاست کو رگڑ کر صاف کرنے سے جوتا پاک و صاف ہو جاتا ہے۔ حدیث کے بظاہر ہر لفظ سے تو یہی مترشح ہوتا ہے کہ نجاست خشک ہو یا تر دونوں کا حکم یکساں ہے۔ اس ارشاد نبوی ؐ کا سبب یہ ہے کہ ایک مرتبہ آپ ؐ نے جوتا پہنے ہوئے نماز ادا فرمائی۔ آپ ؐ کو اس کا علم نہیں تھا کہ جوتا ناپاک ہے اور اس کے نیچے گندگی اور نجاست لگی ہوئی ہے' دوران نماز ہی جبریل امین ؑ نے آپ ؐ کو مطلع فرمایا کہ آپ ؐ کے جوتے نجاست آلودہ ہیں۔ آپ ؐ نے نماز ہی میں جوتے اتار دیئے اور نماز جاری رکھی۔ مقتدیوں نے امتثال فعل نبوی ؐ میں اپنے جوتے بھی اتار دیئے اور نماز پڑھتے رہے۔ نماز سے فارغ ہو کر آپ ؐ نے صحابہ ؓ سے جوتے اتارنے کی وجہ دریافت فرمائی' انہوں نے جواب میں عرض کیا ہم نے آپ ؐ کی اتباع میں جوتے اتارے ہیں۔ پھر آپ ؐ نے اپنا جوتا اتارنے کی وجہ بتائی۔ اس حدیث

سے یہ معلوم ہوا کہ نمازی کو اگر نماز کے آغاز کے وقت اس کا علم نہ ہو سکا ہو کہ اس کے کپڑے یا جوتے وغیرہ پر نجاست لگی ہوئی ہے اور دوران نماز کسی طرح علم ہو جائے تو وہ نمازی اس ناپاک چیز کو اسی حالت میں اتار کر نماز کو پورا کر لے۔ نماز بالکل صحیح ہوگی۔

(١٧١) وَعَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ: «إِذَا وَطِىءَ أَحَدُكُمُ الأَذَى بِخُفَّيْهِ فَطَهُورُهُمَا التُّرَابُ». أَخرَجَهُ أَبُو دَاوُدَ، وَصَحَّحَهُ ابْنُ حِبَّانَ.

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ "جب تم میں سے کوئی ایک اپنے موزوں سے گندگی پر چلے تو بے شک مٹی اسے پاک و صاف کرنے والی ہے۔" (ابوداؤد نے اسے روایت کیا ہے اور ابن حبان نے صحیح قرار دیا ہے)

لغوی تشریح: ﴿ وطئی احدکم الاذی ﴾ نجاست کو اپنے پاؤں سے پامال کرے اور اس پر سے گزرے اور چلے وطئی باب سمع یسمع سے ہے۔ ﴿ بخفیہ ﴾ خف کا تثنیہ ہے۔ ضمیر کی طرف مضاف ہے۔ اس میں "باء" حرف جر ہے۔ یہ اور پہلے گزری ہوئی حدیث اس پر دلالت کرتی ہے کہ جوتے' موزے اور ایسی دوسری چیزیں مٹی سے رگڑنے سے پاک ہو جاتے ہیں' خواہ نجاست خشک ہو یا تر۔

حاصل کلام: جوتوں اور موزوں پر اگر کسی قسم کی نجاست خواہ وہ خشک ہو یا تر' مرئی ہو یا غیر مرئی' خفیف ہو یا غلیظ' لگ جائے تو وہ پاک مٹی پر اچھی طرح رگڑنے سے پاک و صاف ہو جاتے ہیں۔ دھونے کی چنداں ضرورت نہیں۔ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کا مسلک اس کے برعکس ہے البتہ احناف نے امام شافعی رحمہ اللہ کے مسلک کو صحیح مانا ہے۔ امام شافعی رحمہ اللہ اور ایک روایت کی رو سے' امام احمد رحمہ اللہ نے بھی یہی رائے دی ہے کہ نجاست خشک ہو یا تر صرف زمین پر جوتا یا موزہ اچھی طرح رگڑنے سے پاک و صاف ہو جاتا ہے' پانی سے دھو کر پاک و صاف کرنے کی ضرورت نہیں۔

(١٧٢) وَعَنْ مُعَاوِيَةَ بْنِ الحَكَمِ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ: «إِنَّ هَذِهِ الصَّلاَةَ لاَ يَصْلُحُ فِيهَا شَيْءٌ مِنْ كَلاَمِ النَّاسِ إِنَّمَا هِو التَّسْبِيحُ وَالتَّكْبِيرُ وَقِرَاءَةُ الْقُرْآنِ». رَوَاهُ مُسْلِمٌ.

حضرت معاویہ بن حکم رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "نماز میں انسانی گفتگو کی کوئی گنجائش نہیں۔ نماز میں تو صرف تسبیح (سبحان اللہ) تکبیر (اللہ اکبر) اور تلاوت قرآن ہونی چاہئے۔" (مسلم)

حاصل کلام: اس حدیث کا پس منظر یہ ہے کہ دوران نماز ایک نمازی نے چھینک ماری اس نے (الحمد للہ) کہا اس کے جواب میں نماز ہی میں ہوتے ہوئے معاویہ رضی اللہ عنہ نے (یرحمک اللہ) کہہ دیا۔ نماز سے فارغ ہو کر آپ ؐ نے مندرجہ بالا حدیث ارشاد فرمائی۔ اس سے معلوم ہوا کہ نماز میں دوسرے کو مخاطب کر کے بات کرنا حرام ہے۔

راوی حدیث: ﴿ معاویہ بن حکم رضی اللہ عنہ ﴾ ان کا شمار اہل حجاز میں ہوتا ہے۔ مدینہ میں سکونت اختیار کی اور بنی سلیم میں رہنے لگے۔ شرف صحابیت سے مشرف تھے۔

(۱۷۳) وَعَنْ زَيْدِ بْنِ أَرْقَمَ قَالَ: إِنْ كُنَّا لَنَتَكَلَّمُ فِي الصَّلاَةِ عَلَى عَهْدِ رَسُولِ اللهِ ﷺ: يُكَلِّمُ أَحَدُنَا صَاحِبَهُ بِحَاجَتِهِ، حَتَّى نَزَلَتْ ﴿حَافِظُوا عَلَى الصَّلَوَاتِ وَالصَّلاَةِ الْوُسْطَى وَقُومُوا للهِ قَانِتِينَ﴾ فَأُمِرْنَا بِالسُّكُوتِ، وَنُهِينَا عَنِ الْكَلاَمِ. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ، وَاللَّفْظُ لِمُسْلِمٍ.

حضرت زید بن ارقم رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں ہے کہ عہد رسالت مآب ﷺ میں دوران نماز ہم ایک دوسرے سے بات چیت کر لیا کرتے اور اپنی ضرورت و حاجت ایک دوسرے سے بیان کر دیتے تھے تاآنکہ ”حافظوا علی الصلوات والصلوۃ الوسطی وقوموا للہ قانتین“ آیت نازل ہوئی تو ہمیں خاموش رہنے کا حکم دیا گیا اور نماز میں گفتگو اور کلام کرنے سے منع کر دیا گیا۔ (بخاری و مسلم۔ اور یہ الفاظ مسلم کے ہیں)

لغوی تشریح: ﴿ وان کنا ﴾ ان ۔ یہ نون ثقیلہ ہے جو اس جگہ نون مخففہ کے طور پر استعمال ہوا ہے اور اس کا اسم محذوف ہے یعنی انا یا انہ اور کنا اس کی خبر ہے۔ ﴿ والصلاۃ الوسطی ﴾ ”واؤ“ اس جگہ تخصیص کیلئے ہے یعنی خاص طور پر صلاۃ وسطی پر محافظت کرو اور صحیح احادیث کی روشنی میں اس سے نماز عصر مراد ہے۔ ﴿ قانتین ﴾ ڈرتے‘ سہمے اور خاموش رہتے ہوئے۔ قنوت کے معنی متعدد ہیں اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے سکوت کا معنی یہی لیا ہے۔ یہ یا تو انہوں نے قرائن کی بنا پر اخذ کیا ہے یا نبی ﷺ کی تفسیر کی روشنی میں۔

حاصل کلام: اس حدیث سے ثابت ہوتا ہے کہ نماز میں کسی قسم کی گفتگو اور بات چیت ممنوع ہے۔ آغاز اسلام میں کلام کی اجازت تھی جسے بعد میں ممنوع قرار دے دیا گیا۔

راوی حدیث: ﴿ زید بن ارقم رضی اللہ عنہ ﴾ انصار کے قبیلہ خزرج میں سے تھے۔ ابو عمرو ان کی کنیت ہے۔ غزوۂ خندق میں پہلی مرتبہ شامل ہوئے۔ نبی کریم ﷺ کے ساتھ سترہ غزوات میں شریک ہوئے۔ معرکہ صفین کے موقع پر حضرت علی رضی اللہ عنہ کے طرفداروں میں تھے بلکہ ان کے مخصوص اصحاب رضی اللہ عنہم میں شامل تھے۔ کوفہ میں سکونت اختیار کی اور ۶۶ھ میں فوت ہوئے۔

(۱۷٤) وَعَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «التَّسْبِيحُ لِلرِّجَالِ وَالتَّصْفِيقُ لِلنِّسَاءِ». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ، زَادَ مُسْلِمٌ: «فِي

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ”(نماز میں ضرورت کے وقت) مردوں کیلئے تسبیح (سبحان اللہ کہہ کر امام کو مطلع کرنا) اور عورتوں کیلئے تالی بجانا ہے۔) (بخاری و مسلم نے

الصَّلاَةِ».

اسے روایت کیا ہے اور مسلم نے "فی الصلاۃ" یعنی نماز میں کا اضافہ کیا ہے۔)

لغوی تشریح: ﴿التسبیح للرجال﴾ جب نمازی امام کو درپیش ناگہانی صورتحال سے مطلع اور متنبہ کرنا چاہے تو وہ سبحان اللہ کہہ کر امام کو اس کی غلطی پر مطلع کرے اور اگر عورت ہو تو وہ تالی بجائے' بایں صورت کہ اپنے دائیں ہاتھ کی انگلیوں کو بائیں ہاتھ کے اوپر (الٹی جانب پر) مارے۔

حاصل کلام: جب امام نماز میں بھول جائے تو اسے متوجہ کرنے کیلئے مرد مقتدی سبحان اللہ کہہ کر اسے غلطی پر خبردار کرے اور اگر مقتدی عورت ہو تو وہ ہاتھ پر ہاتھ مار کر مطلع کرے گی۔ زبان سے سبحان اللہ وغیرہ کچھ نہیں کہے گی۔ عیسیٰ بن ایوب نے تالی پیٹنے کی صورت اس طرح بیان کی ہے کہ اپنے سیدھے ہاتھ کی دو انگلیاں اپنے بائیں ہاتھ کے باطن یعنی الٹی جانب پر مارے۔ عورت کو تالی بجا کر مطلع کرنے سے مقصود یہ ہے کہ اس کی آواز غیر مرد نہ سنیں گویا عورت کی آواز بھی پردہ ہے۔ اس پر دور حاضر کی آزاد منش خواتین کو صد بار غور کرنا چاہئے۔ نیز اس میں اس کی بھی تردید ہے کہ بعض نادان لوگ سبحان اللہ کی بجائے اللہ اکبر کہہ کر امام کو متوجہ کرتے ہیں یہ صحیح نہیں ہے کیونکہ سنت سے یہ ثابت نہیں ہے۔

(١٧٥) وَعَنْ مُطَرِّفِ بْنِ عَبْدِ اللهِ بْنِ الشِّخِّيْرِ عَنْ أَبِيْهِ قَالَ: رَأَيْتُ رَسُولَ اللهِ ﷺ يُصَلِّي وَفِي صَدْرِهِ أَزِيْزٌ كَأَزِيْزِ المِرْجَلِ، مِنَ البُكَاءِ. أَخْرَجَهُ الخَمْسَةُ إِلاَّ ابْنَ مَاجَه، وَصَحَّحَهُ ابْنُ حِبَّانَ.

حضرت مطرف اپنے باپ عبداللہ بن شخیر رضی اللہ عنہ سے بیان کرتے ہیں انہوں نے کہا کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو نماز پڑھتے دیکھا ہے اس وقت آپ کے سینہ مبارک سے گریہ و زاری کی وجہ سے ایسی آواز آرہی تھی جیسے جوش کھاتی ہوئی ہنڈیا سے آواز آتی ہے۔ (اسے احمد' ابوداؤد' ترمذی' نسائی نے روایت کیا ہے اور ابن حبان نے صحیح قرار دیا ہے)

لغوی تشریح: ﴿ازیز﴾ ہمزہ پر فتحہ اور زا پر کسرہ۔ جوش مارتے وقت ہنڈیا سے جو آواز آتی ہے۔ ﴿المرجل﴾ میم کے نیچے کسرہ "راء" ساکن اور جیم پر فتحہ۔ ہنڈیا کے معنی میں۔

حاصل کلام: اس حدیث سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ دوران نماز خوف الٰہی سے رونا نماز کیلئے موجب فساد نہیں ہے۔ اس سے نماز میں کسی قسم کا نقص واقع نہیں ہوتا۔

راوی حدیث: ﴿مطرف﴾ میم پر ضمہ اور را پر تشدید اور کسرہ۔ بن عبداللہ بن شخیر۔ شخیر۔ شین پر کسرہ اور "خاء" پر تشدید حرشی عامری بصری مشہور ہیں۔ کبار تابعین میں شمار ہوتے ہیں۔ ثقہ ہیں' عبادت گزار اور فاضل آدمی تھے۔ ان کے مناقب بے شمار ہیں۔ ۹۵ھ میں فوت ہوئے۔

﴿عن ابیہ﴾ اس سے مراد ہے عبداللہ بن شخیر بن عوف بن کعب الحرشی العامری رضی اللہ عنہ شرف صحابیت

سے سرفراز ہیں۔ بنی عامر کا جو وفد حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا تھا ان میں یہ بھی نمایاں فرد تھے۔ بصریوں میں شمار کئے جاتے ہیں۔

(۱۷۶) وَعَنْ عَلِيٍّ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: كَانَ لِيْ مِنْ رَسُولِ اللهِ ﷺ مَدْخَلاَنِ ، فَكُنْتُ إِذَا أَتَيْتُهُ وَهُوَ يُصَلِّي، تَنَحْنَحَ لِيْ. رَوَاهُ النَّسَائِيُّ وَابْنُ مَاجَهْ.

حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہونے کے میرے دو اوقات تھے۔ جب میں آپؐ کی خدمت میں حاضر ہوتا اور آپؐ نماز ادا فرما رہے ہوتے تو مجھے مطلع کرنے کیلئے کھنکار دیتے۔ (نسائی' ابن ماجہ)

لغوی تشریح: ﴿ مدخلان ﴾ "میم" اور "خاء" دونوں پر فتحہ اور درمیان میں واقع دال ساکن ہے۔ آپؐ کی خدمت میں حاضری کے دو اوقات۔ ﴿ تنحنح ﴾ حلق میں آواز کو گردش دینا۔ کھنکھارنا (اخ' اخ کرنا)

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ دوران نماز ضرورت کے وقت ایسی آواز نکالنا جس میں حروف کی ادائیگی نہ ہو نماز کیلئے موجب فساد نہیں۔

(۱۷۷) وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُمَا قَالَ: قُلْتُ لِبِلاَلٍ : كَيْفَ رَأَيْتَ النَّبِيَّ ﷺ يَرُدُّ عَلَيْهِمْ حِيْنَ يُسَلِّمُونَ عَلَيْهِ، وَهُوَ يُصَلِّي؟ قَالَ: يَقُوْلُ هٰكَذَا وَبَسَطَ كَفَّهُ. أَخْرَجَهُ أَبُو دَاوُدَ وَالتِّرْمِذِيُّ، وَصَحَّحَهُ.

حضرت (عبداللہ) ابن عمر رضی اللہ عنہما روایت کرتے ہیں کہ میں نے بلال رضی اللہ عنہ سے دریافت کیا کہ نماز پڑھتے وقت جب لوگ نبی ﷺ کو سلام کرتے تو آپؐ ان کو کیسے جواب دیتے؟ انہوں نے جواب دیا کہ اس طرح کرتے اور اپنا ہاتھ پھیلایا۔ (اسے ابوداؤد اور ترمذی نے روایت کیا ہے اور ترمذی نے اسے صحیح قرار دیا ہے)

لغوی تشریح: ﴿ یرد علیھم ﴾ علیھم میں ھم ضمیر سے اہل قباء مراد ہیں ﴿ یقول ھکذا ﴾ عملاً کرتے یا اشارہ فرماتے۔ قول یہاں فعل کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔ کلام عرب میں ایسا اکثر اوقات ہوتا ہے۔ ﴿ وبسط کفہ ﴾ دراز کیا' پھیلایا۔

حاصل کلام: یہ حدیث اس پر دلیل ہے کہ نماز میں سلام کا جواب اشارے سے دینا مشروع ہے۔ بہت سے لوگوں کی یہی رائے ہے اور کچھ ایسے بھی ہیں جو نماز میں سلام کا جواب دینا ممنوع سمجھتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ یہ اس وقت کی بات ہے جب نماز میں جواب دینا جائز تھا۔ جب بعد میں نماز کی حالت میں گفتگو اور کلام کرنا حرام کر دیا گیا تو اسی وقت سے سلام کا جواب بھی حرام ہوگیا۔ مگر قابل غور بات یہ ہے کہ یہ تو اس موقع کی بات ہے جبکہ نماز میں سلام کا جواب جائز تھا تو پھر اشارہ سے سلام کے جواب کی کیا ضرورت و حاجت رہ جاتی ہے۔ گفتگو کی ممانعت اور اشارہ سے سلام کا جواب تو اس بات کی دلیل ہے کہ

جب نماز میں بات چیت کرنا حرام تھا اس وقت اشارہ سے جواب جائز تھا۔ صحیح بات یہی ہے کہ بلاریب و تردد نماز کی حالت میں اشارہ سے سلام کا جواب جائز ہے۔

اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ باہر سے نمازی کو سلام کہنا درست اور جائز ہے۔ البتہ جواب کلام سے نہیں بلکہ اشارہ سے دینا جائز ہے۔ اس اشارہ کی نوعیت کیا تھی تو اس بارے میں روایات مختلف ہیں۔ مسند احمد میں حضرت صہیب رضی اللہ عنہ کی حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے اپنی انگلی سے اشارہ کیا۔ جعفر بن عون نے ابن عمر رضی اللہ عنہما سے اس طرح بیان کیا ہے کہ آپ نے اپنا ہاتھ لمبا کیا یعنی ہاتھ اوپر اٹھایا کہ ہاتھ کی پشت اوپر اور پیٹ نیچے تھا اور بیہقی نے حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے قصہ میں یہ ذکر کیا ہے کہ آپ نے اپنے سر مبارک سے اشارہ فرمایا تھا۔ ان احادیث سے مترشح ہوا کہ سر سے اشارہ کرے یا ہاتھ پھیلا کر یا انگشت سے اشارہ کرے۔ تینوں صورتوں میں جواب دینا جائز ہے۔

(١٧٨) وَعَنْ أَبِيْ قَتَادَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: كَانَ رَسُولُ اللهِ ﷺ يُصَلِّيْ، وَهُوَ حَامِلٌ أُمَامَةَ بِنْتَ زَيْنَبَ، فَإِذَا سَجَدَ وَضَعَهَا، وَإِذَا قَامَ حَمَلَهَا. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ، وَلِمُسْلِمٍ: «وَهُوَ يَؤُمُّ النَّاسَ فِي الْمَسْجِدِ».

حضرت ابو قتادہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نماز پڑھاتے ہوئے (اپنی نواسی) امامہ بنت زینب رضی اللہ عنہا کو گود میں لیے رہتے' جب سجدہ میں جاتے تو اسے گود سے نیچے اتار دیتے اور سجدہ کر کے کھڑے ہوتے تو اسے (دوبارہ) گود میں اٹھا لیتے۔ (بخاری و مسلم) مسلم میں اتنا اضافہ ہے کہ آپ لوگوں کو نماز پڑھاتے ہوئے یہ عمل کرتے تھے۔

لغوی تشریح: ﴿ حامل ﴾ مرفوع اور تنوین کے ساتھ ہے۔ ﴿ امامۃ ﴾ حامل کا مفعول ہونے کی وجہ سے منصوب ہے۔ ﴿ وھو یوم الناس ﴾ ام یوم نصر ینصر' لوگوں کی امامت کراتے۔ یہ الفاظ دلالت کرتے ہیں کہ وہ نماز فرضی نماز تھی۔ یہ حدیث اس بات کی دلیل ہے کہ نماز میں خواہ وہ نماز فرض ہو یا نفل ضرورت کے وقت نمازی بچے کو گود میں اٹھا سکتا ہے اور یہ "عمل کثیر" ایسا نہیں کہ اس سے نماز باطل ہو جائے۔ امام شوکانی رحمہ اللہ سے کسی نے دریافت کیا کہ کیا نماز میں اگر سر سے پگڑی (یا ٹوپی وغیرہ) گر جائے تو اسے اٹھا کر سر پر رکھ سکتا ہے؟ انہوں نے جواب دیا کہ نبی کریم ﷺ نے تین سال کی بچی امامہ بنت زینب کو اٹھا لیا تھا تو پگڑی یا ٹوپی وغیرہ گرنے کی صورت میں اٹھا لینے میں آخر کیا مضائقہ ہے۔ یعنی اٹھا لینا جائز ہے۔ اتنا عمل' عمل کثیر نہیں۔

راوی حدیث: ﴿ امامہ بنت زینب رضی اللہ عنہا ﴾ امامہ حضور ﷺ کی لخت جگر زینب رضی اللہ عنہا کی صاحبزادی تھیں۔ ان کے والد کا نام ابوالعاص بن ربیع تھا۔ فاطمہ رضی اللہ عنہا کی وصیت کے مطابق حضرت علی رضی اللہ عنہ نے حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کی وفات کے بعد ان سے نکاح کر لیا تھا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد مغیرہ بن نوفل رضی اللہ عنہ نے ان کو اپنی زوجیت میں لے لیا اور ان کے ہاں ہی انہوں نے وفات پائی۔

(۱۷۹) وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «أُقْتُلُوا الأَسْوَدَيْنِ فِي الصَّلاَةِ: الحَيَّةَ وَالعَقْرَبَ». أَخْرَجَهُ الأَرْبَعَةُ، وَصَحَّحَهُ ابْنُ حِبَّانَ.

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے کہ "نماز میں دو سیاہ فام جانوروں سانپ اور بچھو کو مار دیا کرو۔" (اس حدیث کو چاروں ابوداؤد' ترمذی' نسائی اور ابن ماجہ نے روایت کیا ہے اور ابن حبان نے اسے صحیح قرار دیا ہے)

لغوی تشریح: ﴿ الحیۃ ﴾ سانپ' ﴿ العقرب ﴾ بچھو۔ دونوں اسودین کا بدل ہونے کی وجہ سے منصوب ہیں۔ اسودین سے مراد سانپ اور بچھو دونوں ہیں۔ خواہ ان کا رنگ کوئی سا بھی ہو۔ یہ ضروری نہیں کہ لازماً ان کی رنگت سیاہ ہو۔

حاصل کلام: اس حدیث سے یہ ثابت ہوا کہ نماز کی حالت میں سانپ' بچھو کو مارنے سے نماز باطل نہیں ہوتی۔ نیز یہ بھی معلوم ہوا کہ ان دونوں موذی جانوروں کا مارنا بھی ضروری ہے۔ جمہور علماء کی یہی رائے ہے کہ نماز کے دوران سانپ' بچھو کو مارنے سے نماز فاسد نہیں ہوتی۔ امام ترمذی رحمہ اللہ نے بعض لوگوں سے اس کی کراہت بھی نقل کی ہے مگر دلائل کی روشنی میں جمہور کا فیصلہ ہی صحیح ہے۔

٤ - بَابُ سُتْرَةِ المُصَلِّي — نمازی کے سترے کا بیان

(۱۸۰) عَنْ أَبِي جُهَيْمِ بْنِ الحَارِثِ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «لَوْ يَعْلَمُ المَارُّ بَيْنَ يَدَيِ المصَلِّي مَاذَا عَلَيْهِ مِنَ الإِثْمِ، لَكَانَ أَنْ يَقِفَ أَرْبَعِينَ خَيْراً لَهُ مِنْ أَنْ يَمُرَّ بَيْنَ يَدَيْهِ». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ، وَاللَّفْظُ لِلْبُخَارِيِّ. وَوَقَعَ فِي البَزَّارِ مِنْ وَجْهٍ آخَرَ: «أَرْبَعِيْنَ خَرِيْفاً».

حضرت ابو جہیم بن حارث رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "اگر نمازی کے آگے سے گزرنے والے کو یہ معلوم ہو جائے کہ ایسا کرنے کا کتنا گناہ ہے تو اس کو نمازی کے آگے سے گزرنے کے مقابلے میں چالیس (برس) تک وہاں کھڑا رہنا زیادہ پسند ہو۔" (بخاری و مسلم اور یہ الفاظ بخاری کے ہیں۔ یہ حدیث (مسند) بزار میں ایک دوسری سند سے ہے اس میں چالیس سال کا ذکر ہے)

لغوی تشریح: ﴿ باب سترۃ المصلی ﴾ سترہ۔ سین پر ضمہ اور "تاء" ساکن۔ جسے نمازی اپنی سجدہ گاہ کے آگے نصب کر لے یا کھڑا کرے خواہ دیوار ہو' ستون ہو' نیزہ ہو یا لکڑی وغیرہ' تاکہ یہ سترہ گزرنے والے اور اس نمازی کے درمیان حائل رہے۔ ﴿ المار ﴾ مرور سے اسم فاعل ہے۔ گزرنے والا ﴿ خریفا ﴾ سال کو کہتے ہیں نیز خریف ربیع کے بالمقابل ایک فصل کا بھی نام ہے اور یہ سال بھر میں ایک ہی مرتبہ وصول ہوتی ہے۔ یہاں جزء بول کر کل مراد لیا گیا ہے۔ یہ مجاز مرسل ہے اور یہی مجاز مرسل کی شان ہے۔

راوی حدیث: ﴿ ابوجهیم بن حارث رضی اللہ عنہ ﴾ کہا گیا ہے کہ ان کا نام عبداللہ تھا۔ حارث بن صمہ انصاری کے بیٹے تھے جو خزرج قبیلہ سے تعلق رکھتے تھے۔ مشہور و معروف صحابی تھے۔ امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کی خلافت تک زندہ رہے۔ جهیم جهم سے تصغیر ہے اور (الصمة) صاد کے نیچے کسرہ اور میم پر تشدید ہے۔

(۱۸۱) وَعَنْ عَآئِشَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهَا قَالَتْ: سُئِلَ رَسُولُ اللهِ ﷺ فِي غَزْوَةِ تَبُوكَ عَنْ سُتْرَةِ الْمُصَلِّي، فَقَالَ: «مِثْلُ مُؤْخِرَةِ الرَّحْلِ». أَخْرَجَهُ مُسْلِمٌ.

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ غزوۂ تبوک کے موقع پر رسول اللہ ﷺ سے سترہ کے متعلق پوچھا گیا (کہ اس کی لمبائی کتنی ہونی چاہئے؟) تو آپ نے فرمایا "اونٹ کے پالان کے پچھلے حصہ کی اونچائی کے برابر ہونا چاہئے۔" (مسلم)

لغوی تشریح: ﴿ فی غزوة تبوك ﴾ ۹ھ رجب کے مہینہ میں رومیوں کے خلاف یہ غزوہ واقع ہوا مگر لڑائی کی نوبت نہیں آئی۔ تبوک حجاز کے شمال میں فلسطین کے قریب ایک جگہ ہے ﴿ موخرة ﴾ میم پر ضمہ واو ساکن "خاء" پر فتحہ اور نیچے کسرہ بھی ہو سکتا ہے اور همزہ پر فتحہ اور "خاء" پر تشدید اور فتحہ اور کسرہ دونوں اور میم پر فتحہ اور واؤ پر سکون بھی جائز ہے اور همزہ کے بغیر بھی ہے اور "خا" کے نیچے کسرہ۔ یہ وہ لکڑی ہوتی ہے جس پر سوار ٹیک لگاتا ہے ﴿ الرحل ﴾ کجاوے وغیرہ کا وہ حصہ جو اونٹ کی پشت پر رکھا جاتا ہے۔

حاصل کلام: احادیث سے ثابت ہوتا ہے کہ جنگل میں سترہ کھڑا کرنا چاہئے۔ سترہ اتنا بلند اور لمبا ہونا چاہئے جتنی اونٹ کے کجاوے کے پچھلے حصے کی لکڑی ہوتی ہے۔

(۱۸۲) وَعَنْ سَبْرَةَ بْنِ مَعْبَدٍ الْجُهَنِيِّ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «لِيَسْتَتِرْ أَحَدُكُمْ فِي الصَّلَاةِ وَلَوْ بِسَهْمٍ». أَخْرَجَهُ الْحَاكِمُ.

حضرت سبرہ بن معبد جهنی رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "نماز (ادا کرتے وقت) تم میں سے ہر ایک کو سترہ ضرور ہی قائم کرنا چاہئے اگرچہ تیر ہی سہی۔" (مستدرک حاکم)

لغوی تشریح: ﴿ ولو بسهم ﴾ اگرچہ تیر ہی سہی۔ اس سے یہ معلوم ہوا کہ سترہ خواہ موٹا ہو یا باریک و پتلا۔ بس اونٹ کے کجاوے کے پچھلے حصہ کی لکڑی کی اونچائی اور لمبائی جتنا ہو۔

راوی حدیث: ﴿ سبرہ بن معبد جهنی رضی اللہ عنہ ﴾ مدنی صحابی ہیں۔ ذی المروة میں رہائش اختیار کی۔ ان کی کنیت ابوثریہ تھی (ثاء) پر ضمہ (راء) پر فتحہ اور "یاء" پر تشدید۔ پہلا غزوہ جس میں شامل ہوئے غزوۂ خندق تھا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے عہد خلافت میں حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ان کو اپنی طرف سے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے پاس اہل شام سے بیعت لینے کیلئے بھیجا تھا۔ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے آخر دور حکومت میں وفات

پائی۔

(١٨٣) وَعَنْ أَبِي ذَرٍّ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «يَقْطَعُ صَلاَةَ المَرْءِ المُسْلِمِ - إِذَا لَمْ يَكُنْ بَيْنَ يَدَيْهِ مِثْلُ مُؤَخِّرَةِ الرَّحْلِ - المَرْأَةُ وَالحِمَارُ وَالكَلْبُ الأَسْوَدُ». الحَدِيْثَ. وَفِيهِ: «الكَلْبُ الأَسْوَدُ شَيْطَانٌ». أَخْرَجَهُ مُسْلِمٌ.

حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ”مسلمان مرد کی نماز کو جب کہ اس کے آگے پالان کے پچھلے حصہ کے برابر سترہ نہ ہو عورت، گدھا اور کالا کتا توڑ دیتا ہے۔ اس حدیث میں یہ الفاظ بھی مروی ہیں کہ ”کالا کتا شیطان ہوتا ہے“ (مسلم)

وَلَهُ عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ نَحْوَهُ دُوْنَ الكَلْبِ، وِلأَبِيْ، دَاوُدَ وَالنَّسَآئِيِّ عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ نَحْوُهُ دُوْنَ آخِرِهِ، وَقَيَّدَ المَرْأَةَ بِالحَآئِضِ.

اور اس میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت بھی ہے مگر اس میں کتے کا ذکر نہیں ہے۔ نیز ابوداؤد اور نسائی نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے بھی اسی طرح نقل کیا ہے مگر اس میں حدیث کا آخری حصہ نہیں ہے اور عورت کے متعلق حائضہ ہونے کی قید لگائی ہے۔

لغوی تشریح: ﴿ يقطع صلاة المرء ﴾ اس فقرے کا مطلب ہے کہ نماز کی برکت کم ہو جاتی ہے المراة فاعل ہے۔ مطلب یہ ہے عورت کا نمازی کے سامنے سے گزرنا نماز کو توڑ دیتا ہے۔ ﴿ وفيه ﴾ یعنی اس حدیث کا آخری حصہ۔ ﴿ الكلب الاسود شيطان ﴾ کالے کتے کو شیطان قرار دینے کی وجہ سے اس کی خباثت اور انتہائی برے منظر والا ہونا۔ ﴿ وله ﴾ میں ہ ضمیر راجع ہے۔ مسلم کی طرف یعنی مسلم میں۔ ﴿ عن ابی هريرة نحوه دون الكلب ﴾ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت میں کلب کا لفظ نہیں ہے۔ اس میں صرف عورت اور گدھے کے ذکر پر اکتفا کیا گیا ہے لیکن مسلم کے تمام نسخوں میں لفظ کلب موجود ہے تو پھر مصنف کا یہ کہنا کہ دون الکلب کے علاوہ باقی روایت اسی طرح ہے اور ﴿ دون الكلب ﴾ کے معنی مصنف کی نظر میں یہ ہیں کہ اس روایت میں کتے کی صفت کا ذکر نہیں ہے مطلق کتے کا ذکر ہے یعنی الکلب الاسود شیطان کا ذکر نہیں ہے۔ ﴿ ولابی داود ..... نحوه ﴾ ابوداؤد اور نسائی میں ابن عباس رضی اللہ عنہما سے اسی طرح مروی ہے (دون آخره) سوائے آخری حصہ کے یعنی حدیث ابوذر رضی اللہ عنہ کی روایت کے آخر میں جو ﴿ الاسود الكلب شيطان ﴾ ہے وہ ابوداؤد، نسائی میں ابن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت میں نہیں۔ نحوہ اور آخرہ دونوں میں ”ضمیر“ کا مرجع حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث ہے باوجودیکہ ابوذر رضی اللہ عنہ سے مروی روایت دور ہے اور ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت قریب ہے کیونکہ حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث اس کتاب میں اصالۃ ذکر کی گئی ہے اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی متابعت کے طور پر۔ پھر حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث کا آخری حصہ مذکور نہیں۔ ﴿ قيد ﴾ تقید سے ماضی کا صیغہ ہے۔ حضرت ابن

عباس رضی اللہ عنہ کی حدیث کے الفاظ میں کہ حائضہ عورت اور کتا نماز کو توڑ دیتے ہیں۔ (عون المعبود مطبوعہ ھند۔ ج ۱' ص: ۲۵۹)

حاصل کلام: سترہ کی مشروعیت کی حکمت کیا ہے۔ اچھی طرح جان لو کہ جب بندہ نماز کیلئے کھڑا ہوتا ہے تو رحمت الٰہی اس کے سامنے ہوتی ہے جیسا کہ حدیث میں وارد ہے۔ جب نمازی سترہ اپنے سامنے قائم کر لیتا ہے تو یہ سترہ حد فاصل کا کام دیتا ہے۔ اس کی حدود میں داخل ہونے والے کے بالمقابل ہو جاتا ہے' کیونکہ پس پردہ مقابل کا کوئی فائدہ نہیں۔ اگر سترہ کے آگے سے کوئی گزرتا ہے تو رحمت اس کے مزاحم نہیں ہوتی۔ تو پھر کسی قسم کا نماز میں خلل اور نقص واقع نہیں ہوتا اور جب نمازی اپنے آگے کوئی سترہ قائم نہیں کرتا تو کوئی معین حد مقابلے میں نہیں ہوتی۔ پھر میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ رحمت سجدہ کی جگہ تک دراز ہوتی ہے کہ اب اگر کوئی ان جگہوں میں گزرتا ہے تو رحمت اس سے مزاحمت کرتی ہے تو یہ نماز کی برکت میں نقص اور چہرے کے سامنے رحمت کے نزول کے انقطاع کا سبب بن جاتی ہے۔ جونہی آپ اس حکمت میں ذرا تامل سے کام لیں گے اور غور کریں گے تو حقیقت کھل کر سامنے آجائے گی اور حق واضح ہو جائے گا۔ سترہ کے مسائل۔ ان بڑے بڑے مسائل میں سے ہیں جن کے بارے میں اختلاف رائے پایا جاتا ہے۔ پس اتنی گفتگو اور بحث سے یہ واضح ہوگیا کہ نماز کے ٹوٹنے سے مراد' نماز سرے سے باطل ہونا نہیں ہے بلکہ اس کا مفہوم و معنی یہ ہے کہ نماز کی برکت اور ثواب میں کمی واقع ہو جاتی ہے اور جس آدمی نے سترہ قائم کئے بغیر نماز پڑھی اور اس کے آگے سے اتنے فاصلہ سے کوئی گزر گیا جتنا فاصلہ ایک چٹکی کے ذریعہ پھینکے ہوئے سنگریزے کا ہوتا ہے تو گزرنے والا نماز کی برکت اور ثواب کو قطع کرنے کا موجب و باعث نہیں بن سکتا اور نہ وہ گناہ گار ہی ہوگا اس لئے کہ وہ رحمت کے نزول کے مقامات اور مواقع کے درمیان خلل انداز نہیں ہوا۔ اس سے یہ بھی واضح ہوگیا کہ امام غیر مشروط طور پر مقتدی کیلئے سترہ کا کام دیتا ہے خواہ اس کے آگے سترہ ہو یا نہ ہو کیونکہ رحمت الٰہی کے متوجہ ہونے کی جگہ ان کیلئے ہے اور وہ ان مقتدیوں اور امام کے درمیان ہے اور یہ بات کہ عورت' کتا اور گدھا کا خاص کر ذکر کیوں کیا گیا؟ کیا ان کے علاوہ اور کسی چیز سے نماز نہیں ٹوٹتی؟ ایسا نہیں ہے کہ ان کے علاوہ کوئی دوسری چیز نماز کی برکت کو قطع نہیں کرتی۔ اگر یہ بات ہوتی تو پھر نمازی کے آگے سے گزرنے والے مرد کیلئے گناہ گار ہونے کی کوئی وجہ سمجھ میں نہیں آتی۔ آگے سے گزرنے کے گناہ والی حدیث پہلی گزر چکی ہے۔ درحقیقت بات یہ معلوم ہوتی ہے کہ یہ تینوں چیزیں وجود شیطان اور اس کی فتنہ انگیزی کی جگہیں گمان کی جاتی ہیں۔ دوسروں کی بہ نسبت ان سے نماز کے فاسد ہونے کی وجہ سے زیادہ شدید' زیادہ گھناؤنی ہے۔ ترمذی نے عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً روایت نقل کی ہے کہ عورت چھپائے جانے والی چیز ہے۔ پس جب یہ گھر سے باہر نکلتی ہے تو شیطان اس پر جھانکتا اور تاکتا ہے اور مسلم میں حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً روایت ہے کہ عورت آتی ہے تو بصورت شیطان آتی ہے اور جب واپس جاتی ہے تب بھی شیطان کی صورت میں جاتی ہے اور گدھے کی آواز کے متعلق وارد ہے کہ گدھا شیطان کو دیکھ کر ہینگتا ہے اور جہاں تک

کتے کا تعلق ہے تو اس کے متعلق تو حدیث میں الکلب الاسود شیطان کی وضاحت موجود ہے۔ مطلق کتے کی خباثت بھی جانی پہچانی ہے کہ جہاں کتا ہوتا ہے وہاں رحمت کے فرشتے داخل نہیں ہوتے اور جس شخص نے کتا پالا جب کہ شرع میں دی گئی اجازت کے مطابق نہ ہو تو اس نے ہر روز اپنے اجر و ثواب میں دو قیراط کی کمی واقع کر لی۔

(١٨٤) وَعَنْ أَبِيْ سَعِيْدِ الخُدْرِيِّ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: **إِذَا صَلَّى أَحَدُكُمْ إِلَى شَيْءٍ يَسْتُرُه مِنَ النَّاسِ، فَأَرَادَ أَحَدٌ أَنْ يَجْتَازَ بَيْنَ يَدَيْهِ، فَلْيَدْفَعْهُ، فَإِنْ أَبَى فَلْيُقَاتِلْهُ، فَإِنَّمَا هُوَ شَيْطَانٌ**». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ، وَفِي رِوَايَةٍ: فَإِنَّ مَعَهُ القَرِيْنَ.

حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ”جب تم میں سے کوئی سترہ قائم کر کے نماز پڑھنے لگے اور کوئی آدمی اس کے سامنے (یعنی سترہ اور نمازی کے درمیان فاصلہ) سے گزرنے لگے تو (نمازی کو چاہئے کہ) وہ اسے روکنے کی کوشش کرے اگر وہ (گزرنے والا پھر بھی) باز نہ آئے تو اس سے لڑائی کرے کیونکہ وہ شیطان (بصورت انسان) ہے۔“ (بخاری و مسلم) اور ایک روایت میں ہے کہ اس کے ساتھ اس کا ساتھی ہے۔

لغوی تشریح: ﴿یجتاز﴾ گزرتا ہے ﴿بین یدیه﴾ اس کے آگے سے' سامنے سے۔ یعنی نمازی اور قائم شدہ سترہ کے درمیانی جگہ سے گزرتا ہے۔ بظاہر دونوں حکم یعنی دفع کرنا اور لڑنا وجوب پر دلالت کرتے ہیں اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ واجب نہیں مندوب ہے ﴿فانما هو شیطان﴾ اس کا یہ عمل شیطانی اکساہٹ کی وجہ سے ہے ﴿القرین﴾ ساتھی' مراد وہ شیطان ہے جو ہر لمحہ انسان کے ساتھ چمٹا رہتا ہے۔ مطلب یہ ہوا کہ شیطان اس گزرنے والے کو اکساتا اور ابھارتا رہتا ہے' تاکہ نمازی حصول برکت اور رحمت سے محروم رہ جائے۔

حاصل کلام: نمازی کے سامنے سے گزرنا جب کہ اس نے سترہ قائم کیا ہو مکروہ ہے اور گزرنے والے کو روکنا واجب ہے یا مستحب و مندوب۔ ظاہر ہے کہ نزدیک تو بزور اسے روکنا واجب ہے۔ انہوں نے حدیث کے ظاہر الفاظ سے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے اور یہی حدیث ان کی دلیل ہے۔ باقی سب کے نزدیک یہ مستحب ہے۔ نمازی گزرنے والے کو اشارہ سے روکنے کی کوشش کرے' اس کے باوجود اگر وہ گزرنے پر بضد ہو تو ذرا سختی سے دھکا دے کر روکے پھر بھی وہ باز نہ آئے تو اسے مارے۔ بس اتنی لڑائی اس سے مراد ہے' دھینگا مشتی مراد نہیں۔ یہ اسی صورت میں ہے جبکہ نمازی نے اپنے سامنے سترہ قائم کر رکھا ہو۔ اگر سترہ قائم نہیں تو پھر اس نمازی کا قصور ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ دوران نماز اتنے عمل سے بھی نماز نہیں ٹوٹتی۔

(١٨٥) وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ أَنَّ رَسُولَ اللهِ ﷺ قَالَ: «إِذَا صَلَّى أَحَدُكُمْ فَلْيَجْعَلْ تِلْقَاء وَجْهِهِ شَيْئاً، فَإِنْ لَمْ يَجِدْ فَلْيَنصِبْ عَصاً، فَإِنْ لَمْ يَكُنْ فَلْيَخُطَّ خطاً، ثُمَّ لاَ يَضُرُّهُ مَنْ مَرَّ بَيْنَ يَدَيْهِ». أَخرَجَهُ أَحْمَدُ وَابْنُ مَاجَهْ، وَصَحَّحَهُ ابْنُ حِبَّان، وَلَمْ يُصِبْ مَنْ زَعَمَ أَنَّهُ مُضْطَرِبٌ بَلْ هُوَ حَسَنٌ.

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ”جب تم میں سے کوئی نماز پڑھنے لگے تو اپنے سامنے کوئی چیز گاڑ لے یا قائم کرلے اگر کوئی چیز دستیاب نہ ہو سکے تو اپنی لاٹھی ہی کھڑی کر لے۔ اگر لاٹھی بھی ممکن نہ ہو سکے تو (زمین پر) خط ہی کھینچ لے۔ اب آگے سے گزرنے والا نمازی کو کوئی نقصان نہیں پہنچا سکے گا۔“ (اسے احمد اور ابن ماجہ نے روایت کیا ہے اور ابن حبان نے اسے صحیح قرار دیا ہے اور جس کسی نے یہ گمان کیا ہے کہ یہ حدیث مضطرب ہے اس نے صحیح نہیں کہا (وہ غلطی پر ہے) بلکہ یہ حدیث حسن کے مرتبہ کی ہے۔)

لغوی تشریح: ﴿ فلینصب ﴾ نصب سے ماخوذ ہے باب ضرب یضرب ہے۔ زمین میں کسی چیز کو گاڑنا‘ قائم کرنا‘ کھڑا کرنا وغیرہ۔ ﴿ لم یصب ﴾ اصابۃ سے ماخوذ ہے۔ یعنی وہ صواب کو بھی نہیں پہنچ سکا‘ نہیں پا سکا‘ حاصل نہیں کر سکا۔ سترہ قائم کرنے کی بجائے صرف خط کھینچنے میں اختلاف ہے۔ ایک گروہ تو اسے منع کرتا ہے اور ایک جماعت اس کی قائل ہے۔ سترہ کیلئے جب کوئی چیز دستیاب نہ ہو سکے تو ایسی صورت میں خط کھینچنے کو کافی سمجھا ہے۔ پھر اس میں بھی اختلاف رائے ہے کہ سترہ کی کیفیت کیسی ہو؟ امام احمد رحمہ اللہ کے نزدیک وہ ہلالی صورت کا ہونا چاہئے (چاند کی شکل کا) یعنی محراب کی طرح قوس دار اور بعض نے کہا ہے قبلہ رخ لمبا خط کھینچا جائے اور یہ بھی رائے ہے دائیں‘ بائیں کھینچا جائے۔

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ سترہ ہر چیز کا ہو سکتا ہے۔ کوئی چیز میسر نہ ہو تو خط بھی کھینچا جا سکتا ہے۔ اس حدیث کو مضطرب کہنے والے ابن الصلاح ہیں۔ مصنف نے النکت علی بن الصلاح میں تفصیل سے اس پر نقد کیا ہے۔

(١٨٦) وَعَنْ أَبِي سَعِيْدٍ الْخُدْرِيِّ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «لاَيَقْطَعُ الصَّلاَةَ شَيْءٌ، وَادْرَءُوا مَا اسْتَطَعْتُمْ». أَخرَجَهُ أَبُو دَاوُدَ، وَفِي سَنَدِهِ ضَعْفٌ.

حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ”نماز کو کوئی چیز نہیں توڑتی (البتہ سامنے سے) گزرنے والے کو حتی الوسع روکنے کی کوشش کرو۔“ (ابوداؤد نے اسے روایت کیا ہے‘ اس کی سند میں ضعف ہے)

لغوی تشریح: ﴿ لا یقطع الصلاۃ ﴾ اس کی نماز کو باطل نہیں کرتی ﴿ ادرء وا ﴾ دفع کرو‘ ہٹاؤ‘ دور کرو۔

اس کی سند میں "مجالد" نامی راوی ہے جس کے متعلق کلام کیا گیا ہے۔ یعنی اکثر ائمہ جرح و تعدیل نے ضعیف کہا ہے۔

٥ - بَابُ الحَثّ عَلَى الخُشُوعِ فِي الصَّلاَةِ

نماز میں خشوع و خضوع کی ترغیب کا بیان

(١٨٧) عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: نَهَى رَسُولُ اللهِ ﷺ أَنْ يُصلِّيَ الرَّجُلُ مُخْتَصِراً. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ، وَاللَّفْظُ لِمُسْلِمٍ، وَمَعْنَاهُ أَنْ يَجْعَلَ يَدَهُ عَلَى خَاصِرَتِهِ.

وَفِي البُخَارِيِّ عَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهَا: «أَنَّ ذَلِكَ فِعْلُ اليَهُودِ».

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز میں اپنے دونوں کولھوں (پہلوؤں) پر ہاتھ رکھ کر نماز پڑھنے سے منع فرمایا ہے۔ (بخاری اور مسلم۔ الفاظ حدیث مسلم کے ہیں)

اور بخاری میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ یہ یہودیوں کی نماز کا طریقہ ہے۔

لغوی تشریح: ﴿ باب الحث ﴾ حث یحث حثا ترغیب دلانا' ہمت دلانا' نشاط ابھارنا ﴿ الخشوع ﴾ تذلل اور سکون ظاہری اور باطنی طور پر۔ یعنی تمام اعضاء انسانی آنکھ' دل' ہاتھ' پاؤں وغیرہ کی ہر قسم کی حرکت صرف اللہ تعالیٰ ہی کیلئے ہو۔ ﴿ مختصرا ﴾ اختصار سے اسم فاعل ہے۔ اس کی تفسیر خود مصنف نے بیان کی ہے یعنی کولھوں (پہلوؤں) پر اپنا ہاتھ رکھنا۔ خاصرہ انسان کے جسم کے اس حصہ کو کہتے ہیں جو سرین کے اوپر سے پسلیوں کے نیچے تک ہوتا ہے۔

حاصل کلام: نماز چونکہ خالص اللہ کیلئے پوری توجہ اور انہماک کے ساتھ ادا کرنی چاہئے۔ ایسی ہیئت' حرکت اور فعل سرزد نہیں ہونا چاہئے جو نماز کے اس وصف کے منافی ہو۔ دست بستہ کھڑا ہونا ہی ادب ہے۔ پہلو پر ہاتھ رکھ کر کھڑے ہونا متکبرانہ فعل ہے جو عاجزی و انکساری کے خلاف ہے۔ نماز میں تو عجز و انکسار اور فروتنی و مسکین صورت و ہیئت ہونی چاہئے جو اللہ کو پسند ہے۔ تکبر و نخوت کی حالت ناپسندیدہ ہے۔ اس لئے نماز میں "اختصار" کو ناپسندیدہ قرار دیا گیا ہے۔ نیز یہ ہیئت یہود کی ہے اس لئے ان کے ساتھ مشابہت سے اجتناب بھی ضروری ہے۔

(١٨٨) وَعَنْ أَنَسٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، أَنَّ رَسُولَ اللهِ ﷺ: قَالَ: «إِذَا قُدِّمَ العَشَاءُ فَابْدَءُوا بِهِ

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "جب شام کا کھانا پیش کیا گیا ہو تو مغرب کی نماز ادا کرنے سے پہلے کھانا' کھالو۔"

قَبْلَ أَنْ تُصَلُّوا الْمَغْرِبَ». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ. (بخاری و مسلم)

لغوی تشریح: ﴿ قدم ﴾ تقدیم سے مجہول کا صیغہ ہے۔ معنی ہے حاضر کیا گیا' پیش کیا گیا ﴿ العشاء ﴾ عین اور شین پر فتحہ اور مد رات کا کھانا۔ مطلب اس کا یہ ہے کہ نماز شروع کرنے سے پہلے اگر کھانا تیار ہو چکا ہو (اور بھوک لگی ہو) تو پہلے کھانا تناول کر لینا چاہئے' تا کہ نماز کے خشوع میں نقص پیدا نہ ہو جائے کہ دھیان اور توجہ کھانے کی طرف رہے۔

(۱۸۹) وَعَنْ أَبِي ذَرٍّ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «إِذَا قَامَ أَحَدُكُمْ فِي الصَّلاَةِ فَلاَ يَمْسَحِ الحَصَى، فَإِنَّ الرَّحْمَةَ تُوَاجِهُهُ». رَوَاهُ الْخَمْسَةُ بِإِسْنَادٍ صَحِيحٍ، وَزَادَ أَحْمَدُ: «وَاحِدَةً أَوْدَعْ». وَفِي الصَّحِيحِ عَنْ مُعَيْقِيبٍ نَحْوُهُ بِغَيْرِ تَعْلِيلٍ.

حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ "جب تم میں سے کوئی شخص نماز ادا کر رہا ہو تو (سجدہ گاہ) سے سنگریزوں (کنکریوں) کو اپنے ہاتھ سے نہ ہٹائے۔ کیونکہ (اس وقت) رحمت خداوندی نمازی کی طرف متوجہ ہوتی ہے۔" (اسے پانچوں احمد' ابوداؤد' ترمذی' نسائی اور ابن ماجہ نے صحیح سند کے ساتھ روایت کیا ہے۔

مسند احمد میں اتنا اضافہ ہے کہ اگر کنکریاں ہٹانا ہی ہیں تو ایک مرتبہ ہٹا دو یا چھوڑ دو اور صحیح بخاری میں حضرت معیقیب سے یہی روایت مروی ہے اس میں سبب کا بیان نہیں ہے)

لغوی تشریح: ﴿ فلا یمسح ﴾ یعنی پیشانی رکھنے کی جگہ یا سجدہ کرنے کی جگہ (سے کنکریاں نہ ہٹائے) ﴿ والحصی ﴾ الحصبۃ چھوٹے سنگریزے' چھوٹی چھوٹی کنکریاں ﴿ زاد احمد فی روایتہ ﴾ احمد نے اپنی روایت میں اتنا اضافہ نقل کیا ہے کہ اگر کنکریوں کے ہٹانے کی اشد ضرورت ہو تو پھر ایک مرتبہ ہٹا لے ورنہ چھوڑ دے ہاتھ بھی نہ لگائے۔ ﴿ بغیر تعلیل ﴾ یعنی اس میں علت بیان نہیں کی یعنی اس روایت میں یہ نہیں ہے کہ رحمت الٰہی اس کی طرف متوجہ ہوتی ہے۔

حاصل کلام: یہ حدیث ہمیں راہ نمائی کرتی ہے کہ نماز میں سجدہ گاہ کو ہموار اور صاف نہیں کرنا چاہئے اگر ضرورت اس بات کی متقاضی ہو تو آغاز نماز سے پہلے یہ عمل کر لیا جائے۔ اس ممانعت کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ نماز میں' نماز کے ماسوا دوسری کسی چیز کا خیال نہ رہے۔ اگر سجدہ کی وجہ سے پیشانی خاک آلود ہو جائے تو دوران نماز اسے ہاتھ یا کپڑے سے صاف نہیں کرنا چاہئے اس لئے کہ اس موقع پر رحمت خداوندی نمازی کی جانب متوجہ ہوتی ہے' اگر نمازی ایسا فعل انجام دے گا تو رحمت سے محروم رہ جانے کا اندیشہ ہے البتہ شدید ضرورت کے لاحق ہونے کی صورت میں جائز ہے۔ راوی حدیث: ﴿ معیقیب رضی اللہ عنہ ﴾ میم پر ضمہ اور عین پر فتحہ۔ معیقیب بن ابی فاطمہ (ابوفاطمہ کے بیٹے) قبیلہ دوس سے تعلق رکھنے کی

وجہ سے دوسی کہلائے۔ مکہ میں قدیم الاسلام صحابہؓ میں سے ہیں۔ حبشہ کی ہجرت ثانیہ میں شامل تھے۔ غزوۂ بدر میں شریک ہوئے۔ نبی ﷺ کی مہر نبوت پر متعین تھے۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ و عمر رضی اللہ عنہ نے ان کو بیت المال کا عامل مقرر کیا۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی خلافت میں وفات پائی۔

(١٩٠) وَعَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهَا قَالَتْ: سَأَلْتُ رَسُولَ اللهِ ﷺ عَنِ الالتِفَاتِ فِي الصَّلاَةِ، فَقَالَ: «**هُوَ اخْتِلاَسٌ يَخْتَلِسُهُ الشَّيْطَانُ مِنْ صَلاَةِ العَبْدِ**». رَوَاهُ البُخَارِيُّ.

وَلِلتِّرمِذِيِّ عَنْ أَنَسٍ - وَصَحَّحَهُ - : «إِيَّاكَ وَٱلالتِفَاتَ فِي الصَّلاَةِ، فَإِنَّهُ هَلَكَةٌ، فَإِنْ كَانَ لاَ بُدَّ فَفِي التَّطَوُّعِ».

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے آنکھوں کے گوشوں سے نماز کے دوران ادھر ادھر دیکھنے کے بارے میں دریافت کیا۔ ارشاد فرمایا "یہ تو شیطان کا جھپٹا ہے جس کے ذریعہ شیطان انسان کی نماز کو جھپٹ لیتا ہے۔" (بخاری)

ترمذی کی حدیث (جسے اس نے صحیح قرار دیا ہے) میں ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا "نماز میں التفات (ادھر ادھر نظر دوڑانے) سے بچنے کی کوشش کرو یہ موجب ہلاکت ہے۔ اگر شدید اور ناگزیر مجبوری لاحق ہو تو نوافل میں ایسا کیا جا سکتا ہے۔"

لغوی تشریح: ﴿الالتفات﴾ دائیں بائیں نظر کرنا ﴿الاختلاس﴾ کسی چیز کو سلب کرنا۔ جلدی سے کسی سے چیز چھین لینا۔ ﴿ایاک﴾ کاف پر فتحہ۔ مرد کو خطاب ہے اور ترمذی میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے مجھے فرمایا بیٹے! نماز میں اپنے آپ کو التفات سے بچاؤ ایاک منصوب ہے تحذیر یعنی ڈرانے اور خوف دلانے کیلئے۔ مطلب یہ ہوا کہ ڈرو اور التفات سے بچنے کی کوشش کرو۔ ﴿ھلکہ﴾ "ھاء" اور "لام" اور "کاف" تینوں پر فتحہ۔ معنی ہلاکت کے ہیں کیونکہ یہ تو شیطان کی اطاعت و فرمان برداری ہے اور وہی اس پر برانگیختہ کرتا ہے۔

حاصل کلام: شیطان انسان کا ازلی دشمن ہے وہ کوئی موقع انسان کو نقصان اور ضرر پہنچانے کا ضائع نہیں کرتا' حتیٰ کہ نماز میں بھی اس کی پوری کوشش ہوتی ہے کہ کسی طرح نماز سے غافل کر دے اور کچھ نہیں تو کم از کم نمازی کی توجہ منتشر کرنے کی کوشش کرتا ہے اور ادھر ادھر نظر پھیرنے کی ترغیب دیتا ہے کہ نمازی نماز کے کسی نہ کسی جزء سے غافل اور بے پرواہ ہو جائے اور پورے ثواب سے محروم رہ جائے۔ اس لئے نبی کریم ﷺ نے نمازی کو ہوشیار اور محتاط رہنے کی تاکید فرمائی ہے۔ شدید اور سخت ضرورت کے وقت التفات کی اجازت ہے بشرطیکہ گردن گھومنے اور گردش نہ کرنے پائے صرف آنکھوں کے کونوں سے دیکھا جائے۔

(١٩١) وَعَنْ أَنَسٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ

حضرت انس رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "جب تم میں سے کوئی نماز میں ہوتا

ﷺ: «إِذَا كَانَ أَحَدُكُمْ فِي الصَّلاَةِ فَإِنَّهُ يُنَاجِي رَبَّهُ فَلاَ يَبْصُقَنَّ بَيْنَ يَدَيْهِ وَلاَ عَنْ يَمِينِهِ، وَلَكِنْ عَنْ شِمَالِهِ تَحْتَ قَدَمِهِ». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ، وَفِي رِوَايَةٍ: «أَوْ تَحْتَ قَدَمِهِ».

ہے تو اپنے آقا و پروردگار سے باتیں کر رہا ہوتا ہے (لہٰذا ایسی حالت میں) اپنے سامنے کی طرف اور دائیں جانب نہ تھوکے بلکہ اپنی بائیں جانب پاؤں کے نیچے (تھوکے)" (بخاری و مسلم) اور ایک روایت میں ہے کہ بائیں طرف یا اپنے پاؤں کے نیچے۔

لغوی تشریح: ﴿ ینـاجی ﴾ مناجاۃ سے ماخوذ ہے۔ خفیہ طور پر گفتگو اور بات چیت کرنے کو کہتے ہیں۔ مراد اس سے یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنی رحمت کے ساتھ بندے کی طرف توجہ فرماتا ہے۔ ﴿ فلا یبصقن ﴾ پس مت تھوکے۔ یہ ممانعت تھوک وغیرہ کو شامل ہے ﴿ ولا عن یمینہ ﴾ دائیں جانب تھوکنے کی ممانعت کا سبب دائیں جانب کی تعظیم و تکریم ہے اور حدیث میں اس کا سبب یہ بھی مذکور ہے کہ دائیں جانب فرشتہ ہوتا ہے۔

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ نماز کے دوران تھوک یا ناک وغیرہ آجائے تو سامنے اور دائیں جانب تھوکنے سے اجتناب کرنا چاہئے۔ اگر نمازی مسجد میں ہو اور یہ ضرورت پیش آجائے تو کسی رومال یا کپڑے وغیرہ پر لے کر اسے مل دینا چاہئے۔ اگر کوئی چیز اس وقت دستیاب نہ ہو تو پھر تھوک وغیرہ اپنی بائیں جانب پاؤں کے نیچے پھینک دے اور یہ اسی صورت میں ممکن ہوگا جب مسجد میں قالین وغیرہ نہ ہوں۔ پھر نماز سے فارغ ہوتے ہی اس جگہ کو صاف بھی کرے اور مزید برآں وہاں کوئی خوشبو چھڑک دے' تاکہ اثر زائل ہو جائے اور اس کی مجبوری کے گناہ کا کفارہ بھی بن جائے۔ بہرحال نماز میں قبلہ رو تھوکنا نہیں چاہئے۔ بعض صحابہ رضی اللہ عنہم و تابعین رحمہم اللہ نماز سے باہر بھی اس کا اہتمام کرتے تھے۔ ادب و احترام اور پاکیزگی کا یہی تقاضا ہے۔ ابوداؤد وغیرہ میں ہے کہ نبی ﷺ نے ایک امام کو نماز کے دوران قبلہ رخ تھوکنے کی وجہ سے منصب امامت سے معزول فرما دیا تھا۔

(۱۹۲) وَعَنْهُ قَالَ: كَانَ قِرَامٌ لِعَائِشَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهَا، سَتَرَتْ بِهِ جَانِبَ بَيْتِهَا، فَقَالَ لَهَا النَّبِيُّ ﷺ: «أَمِيطِي عَنَّا قِرَامَكِ هَذَا، فَإِنَّهُ لاَ تَزَالُ تَصَاوِيرُهُ تَعْرِضُ لِي فِي صَلاَتِي». رَوَاهُ الْبُخَارِيُّ.

حضرت انس رضی اللہ عنہ ہی سے مروی ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے پاس ایک زیبائشی چادر (برائے پردہ) تھی جو انہوں نے اپنے حجرے کے ایک طرف لٹکا رکھی تھی۔ رسول اللہ ﷺ نے ان سے فرمایا کہ "زیبائشی چادر کو ہمارے سامنے سے ہٹا دو کیونکہ اس کی تصویریں میری نماز میں میرے سامنے (آکر) نماز میں خلل اندازی اور خرابی کا باعث بنتی ہیں۔" (بخاری)

وَاتَّفَقَا عَلَى حَدِيثِهَا فِيْ قِصَّةِ

بخاری اور مسلم دونوں ابوجہم کی چادر انبجانیہ کے

أَنْبِجَانِيَّةِ أَبِي جَهْمٍ، وَفِيْهِ: «فَإِنَّهَا أَلْهَتْنِي عَنْ صَلاَتِيْ». قصہ میں متفق ہیں اس میں ہے کہ اس چادر نے مجھے میری نماز سے غافل کر دیا۔"

لغوی تشریح: ﴿قرام﴾ قاف کے نیچے کسرہ۔ راء پر تخفیف۔ مختلف رنگوں والا باریک کپڑا ﴿امیطی﴾ مجھ سے دور کر دو۔ ﴿تصاویرہ﴾ اس کی علامات اور نقوش۔ ضروری نہیں کہ یہ نقوش حیوانات کے ہوں کہ جس سے حیوان اور انسان کی تصویر کے جواز کی دلیل بنا لی جائے۔ ﴿تعرض﴾ ظاہر اور نمایاں ہوتے ہیں۔ ﴿فی قصة انبجانیة﴾ ہمزہ مفتوح' نون ساکن "با" کے نیچے کسرہ اور جیم مخفف۔ الف کے بعد والا نون مکسورہ اور یاء نسبتی پر تشدید یعنی "اونی چادر بغیر نقوش کے" قصہ اس کا یہ ہے کہ ابو جہم رضی اللہ عنہ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں ایک چادر تحفہ کے طور پر پیش کی۔ اس چادر میں کچھ نقوش و اعلام تھے اور وہ چادر تھی بھی باریک۔ آپؐ نے اسے پہن کر یا اوڑھ کر نماز ادا فرمائی تو آپؐ کی نظر بھی اعلام و نقوش کی جانب مبذول ہو گئی۔ نماز سے فارغ ہوتے ہی فرمایا "اس چادر کو ابو جہم رضی اللہ عنہ کے پاس ہی لے جاؤ اور اس سے مجھے ﴿انبجانیة﴾ لا دو۔" آپؐ نے ابو جہم رضی اللہ عنہ کی خمیصہ (نقش دار چادر) کے بدلہ میں بغیر نقوش والی ﴿انبجانیة﴾ اسی سے طلب فرمائی تا کہ ایسا نہ ہو کہ ابو جہم رضی اللہ عنہ کے دل کو چوٹ لگے کہ اس کے تحفہ کو سرکار دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم نے واپس فرما دیا۔ ﴿فانها الهتنی عن صلاتی﴾ یعنی ابو جہم رضی اللہ عنہ کی چادر نے مجھے غافل اور مشغول کر دیا ﴿الهتنی لهی یلهی﴾ "ها" کے نیچے کسرہ بمعنی غفلت' غافل کر دینا اور یہ ﴿لها لهوا﴾ جس کے معنی کھیلنے کے آئے ہیں سے ماخوذ نہیں ہے۔

حاصل کلام: اس حدیث سے یہ سبق ملتا ہے کہ ہر وہ چیز جس سے نمازی کی توجہ نماز سے ہٹ کر اس کی طرف ہو جانے کا اندیشہ ہو اسے دور کر دینا چاہئے' تا کہ وہ نماز میں خلل انداز نہ ہو۔ اگر اسے دور کرنا اور ہٹانا بس میں نہ ہو تو خود سامنے سے ہٹ جانا چاہئے' تا کہ خشوع و خضوع اور توجہ میں کمی پیدا نہ ہو۔

راوی حدیث: ﴿ابوجهم رضی اللہ عنہ﴾ یہ ابن حذیفہ بن غانم قرشی العدوی ہیں۔ عدی قبیلہ میں سے ہونے کی وجہ سے عدوی کہلائے۔ ان کا اصل نام عامر یا عبید ہے۔ فتح مکہ کے سال اسلام قبول کیا۔ عمر رسیدہ لوگوں میں سے تھے۔ جب قریش نے کعبہ کو تعمیر کیا' اس موقع پر موجود تھے اور ابن زبیر رضی اللہ عنہما کے تعمیر خانہ کعبہ کے وقت بھی۔ ابن زبیر رضی اللہ عنہما کی خلافت کے ابتدائی ایام میں وفات پائی۔

(۱۹۳) وَعَنْ جَابِرِ بْنِ سَمُرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «لَيَنْتَهِيَنَّ أَقْوَامٌ يَرْفَعُونَ أَبْصَارَهُمْ إِلَى السَّمَاءِ فِي الصَّلَاةِ، أَوْلاَ تَرْجِعُ إِلَيْهِمْ» رَوَاهُ مُسْلِمٌ

حضرت جابر بن سمرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "مسلمان قوم نماز میں اپنی نظریں آسمان کی جانب اٹھانے سے باز آجائیں ورنہ ایسا نہ ہو کہ پھر ان کی نظریں واپس ہی نہ آئیں۔ (یعنی نابینا ہو جائیں)" (مسلم)

اور مسلم ہی میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے

عَنْهَا قَالَتْ: سَمِعْتُ رَسُولَ اللهِ ﷺ يَقُولُ: «لاَ صَلاَةَ بِحَضْرَةِ الطَّعَامِ، وَلاَ وَهُوَ يُدَافِعُهُ الأَخْبَثَانِ». کہ میں نے نبی ﷺ کو فرماتے سنا ہے کہ جب کھانا حاضر ہو اور قضائے حاجت درپیش ہو تو نماز نہیں ہوتی۔

لغوی تشریح: ﴿لینتھین﴾ انتہاء سے ماخوذ ہے اور اس میں لام قسم محذوف کا جواب ہے۔ آخر میں نون مشددہ تاکید کیلئے ہے اور یہ خبر ہے امر کے معنی میں۔ یعنی رک جائیں' باز آجائیں' منع ہو جائیں ﴿اولا ترجع﴾ یعنی واپس نہیں لوٹیں گی ان کی نظریں ﴿الیھم﴾ ان کی طرف۔ یعنی وہ نابینا ہو کر رہ جائیں گے۔ دونوں میں سے ایک کا وقوع لازمی ہے یا تو لوگ آسمان کی طرف اوپر نماز میں اپنی نظریں اٹھانے سے باز آجائیں گے یا پھر بطور سزا اللہ تعالیٰ ان کی نظروں کو اچک لے گا۔ ﴿ولا وھو یدافعہ الاخبثان﴾ یعنی اس وقت نماز نہیں ہوتی جب نمازی پیشاب یا پاخانہ روک کر نماز پڑھے

حاصل کلام: نماز کے دوران آسمان کی جانب اوپر نظریں اٹھانا حرام ہے۔ ابن حزم رحمۃ اللہ علیہ نے تو یہاں تک کہا ہے کہ ایسا کرنے والے کی نماز ہی نہیں رہتی۔ امام نووی رحمۃ اللہ علیہ نے شرح مسلم میں کہا ہے کہ اس میں سخت نہی اور وعید ہے آسمان کی طرف دیکھنے کی۔ انہوں نے اس نہی کے تحریمی ہونے پر علماء کا اجماع نقل کیا ہے۔ نماز شروع کرنے سے پہلے قضائے حاجت کی اگر شدید حاجت ہو تو اسے روک کر نماز ادا نہ کرنی چاہئے۔ ایسی نماز نہیں ہوگی۔ پیشاب' پاخانہ کی جب شدید حاجت ہو تو اس وقت یہ دونوں نمازی کو ان سے فراغت کی جانب بزور کھینچ لے جانے کی کوشش کرتے ہیں جس سے نماز میں یکسوئی نہیں رہتی۔

(١٩٤) وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُ. أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ: قَالَ: «التَّثَاؤُبُ مِنَ الشَّيْطَانِ فَإِذَا تَثَاءَبَ أَحَدُكُمْ فَلْيَكْظِمْ مَا اسْتَطَاعَ». رَوَاهُ مُسْلِمٌ وَالتِّرْمِذِيُّ، وَزَادَ: «فِي الصَّلَاةِ». حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا "جمائی کا آنا شیطانی حرکت ہے۔ تم میں سے اگر کسی کو جمائی آجائے تو حتی الوسع اسے روکنے کی کوشش کرے۔" (مسلم اور ترمذی۔ ترمذی نے اپنی روایت میں "نماز میں" کا اضافہ نقل کیا ہے)

لغوی تشریح: ﴿التثاوب﴾ ہمزہ کے ساتھ۔ التثاوب کے معنی دل کے عضلات میں جو بخارات اور گیسیں جمع ہو جاتی ہیں ان کو خارج کرنے کیلئے منہ کا کھولنا کہ وہ خارج ہو جائیں التثاوب کہلاتا ہے۔ ﴿من الشیطان﴾ اس کا مطلب ہے کہ تثاوب (جمائی) معدہ کا خوب پر ہونا' بدن کا بوجھل اور بھاری ہونا۔ ان حواس کا مکدر ہونا جو سوء فہم اور سستی اور نیند کا موجب ہوتا ہے' کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے اور یہ سب چیزیں شیطان کو مرغوب اور پسندیدہ ہیں۔ اس وجہ سے کہا گیا ہے کہ جمائی شیطانی حرکت ہے ﴿فلیکظم﴾ یاء مضارع پر فتحہ اور "ظاء" کے نیچے کسرہ یعنی اس کو روکے' باز رکھے' اسے روکنے کیلئے دونوں ہونٹوں کو بند رکھے یا منہ پر ہاتھ رکھ لے۔

حاصل کلام: جیسا کہ اوپر بیان ہوا کہ جمائی نتیجہ ہوتی ہے سستی' کاہلی اور معدہ کو خوب پر کرنے کا۔

ایسی حالت میں بندے کو دیکھ کر شیطان خوش ہوتا ہے۔ اس خوشی کو اس کی طرف منسوب کر دیا ہے "فی الصلاۃ" کی زیادتی بخاری میں بھی مروی ہے اور اس میں یہ بھی ہے کہ جمائی کے دوران آواز نہیں نکالنا چاہئے۔

٦ - بَابُ المَسَاجِدِ — مساجد کا بیان

(١٩٥) عَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهَا قَالَتْ: أَمَرَ رَسُولُ اللهِ ﷺ بِبِنَاءِ المَسَاجِدِ فِي الدُّوْرِ. وَأَنْ تُنَظَّفَ وَتُطَيَّبَ. رَوَاهُ أَحْمَدُ وَأَبُو دَاوُدَ وَالتِّرْمِذِيُّ، وَصَحَّحَ إِرْسَالَهُ.

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا روایت کرتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے گھروں میں جائے نماز متعین کرنے اور ان کو صاف ستھرا رکھنے کا حکم دیا تھا۔ (اسے احمد، ابوداؤد اور ترمذی نے روایت کیا ہے اور ترمذی نے اس کے مرسل ہونے کو صحیح قرار دیا ہے)

لغوی تشریح: ﴿باب المساجد﴾ مساجد مسجد کی جمع ہے۔ مسجد میں واقع جیم پر کسرہ ہے وہ جگہ جسے نماز پڑھنے کیلئے مخصوص کر لیا گیا ہو اور جیم پر فتحہ بھی جائز ہے اس صورت میں اس کا معنی سجدہ کرنے کی جگہ۔ ﴿فی الدور﴾ دور، دار کی جمع ہے جس کے معنی گھر "دور" سے مراد محلّہ یا قبیلہ ہے اس لئے کہ محلّہ اور قبیلہ میں بہت سے گھر ہوتے ہیں یا گھر میں نماز پڑھنے کی جگہ مراد ہے۔ پہلا معنی زیادہ عمدہ اور قریب الفہم ہے ﴿وان تنظف﴾ تنظیف سے ماخوذ ہے صیغۂ مجہول ہے۔ گندگیوں اور ناپاکیوں سے صاف کیا جائے ﴿وتطیب﴾ تطیب سے ماخوذ ہے اور صیغۂ مجہول ہے اور اس میں خوشبو از قسم بخور وغیرہ لگائی یا جلائی جائے۔

حاصل کلام: مسجد اور نماز پڑھنے کی جگہوں کو صاف ستھرا اور پاکیزہ رکھنا چاہئے اور ان میں خوشبو لگانی چاہئے۔ اس حدیث میں "دور" سے مراد محلے ہیں۔ محلوں میں چھوٹی چھوٹی مسجدیں ضرور ہونی چاہئے۔ انہیں خوشبو کی دھونی دے کر معطر رکھنا چاہئے۔ ذاتی گھروں میں بھی نماز پڑھنے کی جگہ مخصوص ہونی چاہئے جہاں سنن و نوافل ادا کئے جا سکیں اور خواتین نماز ادا کر سکیں۔

(١٩٦) وَعَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «قَاتَلَ اللَّهُ اليَهُودَ، اتَّخَذُوا قُبُورَ أَنْبِيَائِهِمْ مَسَاجِدَ». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ، وَزَادَ مُسْلِمٌ: «وَالنَّصَارَى».

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "اللہ تعالیٰ یہودیوں کو غارت و برباد کرے انہوں نے انبیاء کرام کی قبروں کو سجدہ گاہ بنا لیا تھا۔" (اسے بخاری و مسلم دونوں نے روایت کیا ہے اور مسلم نے نصاریٰ کے لفظ کا اضافہ بھی نقل کیا ہے)

وَلَهُمَا مِنْ حَدِيْثِ عَائِشَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهَا: كَانُوا إِذَا مَاتَ

بخاری و مسلم میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ "جب ان میں صالح آدمی فوت ہو جاتا ہے تو یہ

فِيهِمُ الرَّجُلُ الصَّالِحُ بَنَوا عَلَى قَبْرِهِ مَسْجِداً. وَفِيهِ: أُولَئِكَ شِرَارُ الخَلقِ. اس کی قبر کو سجدہ گاہ بنا لیتے۔" اس حدیث میں یہ الفاظ بھی ہیں کہ "یہ بدترین مخلوق ہیں۔"

لغوی تشریح: ﴿قاتل﴾ لعن اور اھلک کے معنی میں استعمال ہوا ہے' جس کے معنی ہیں اللہ کی لعنت ہو اور اللہ انہیں تباہ و برباد کرے۔ قبروں کو مساجد بنا لینے کی وجہ سے ملعون قرار دینا اس بات کی دلیل ہے کہ یہ فعل حرام ہے ﴿زاد مسلم والنصاری﴾ مسلم نے یہود کے بعد لفظ نصاریٰ کا اضافہ نقل کیا ہے (یعنی اس فعل کے نصاریٰ بھی مرتکب ہوتے ہیں) ﴿شرار﴾ شر کی جمع ہے جو اسم تفضیل اشر کے معنی میں استعمال ہوا ہے جس کے معنی بدترین اور شریر ترین کے ہیں اور خلق مخلوق کے معنی میں استعمال ہوا ہے کہ اللہ کی تمام قسم کی مخلوقات میں بدترین مخلوق ہے۔

حاصل کلام: قرآن کے بیان کے مطابق یہ اہل کتاب ہیں جنہیں آسمانی کتب دی گئیں۔ مگر ان بدبختوں نے اپنے انبیاء کرام ؑ کی وفات کے بعد ان کی قبروں کو سجدہ گاہ بنالیا۔ اپنی حاجات طلب کرنا شروع کر دیں۔ اس فعل حرام کا ارتکاب جس طرح یہودیوں نے کیا اسی طرح عیسائیوں نے بھی کیا۔ اس طرح یہ شرک جلی کے مرتکب ہوئے جو خالق کائنات کی نظر میں سنگین ترین اور ناقابل معافی جرم ہے۔ اب نام کے مسلمانوں کو غور کرنا اور سوچنا چاہئے کہ قبروں کو سجدہ گاہ بنا کر کن گمراہ لوگوں کی یاد تازہ کر رہے ہیں اور جس جرم بدتر کا ارتکاب کر کے شرار الخلق کے زمرہ میں شامل ہو رہے ہیں۔ یہ فعل بت پرستی کے مشابہ ہے۔ یہی کام غیر کرے تو قابل صد لعنت اور اگر مسلمان کہلانے والا کرے تو باعث اجر و ثواب۔ یہ اپنے آپ کو فریب اور دھوکہ میں مبتلا کرنے کے سوا اور کیا ہے۔ اس قبر پرستی کے جو نتائج آج برآمد ہو رہے ہیں وہ سب کے سامنے روز روشن کی طرح عیاں ہیں کہ بت پرستوں کی تہذیب غالب آ رہی ہے' ان کا تمدن ہر سو چھایا ہوا ہے' ان کے طور طریقے اپنائے جا رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو ایسے افعال قبیح سے بچنے کی توفیق عطا فرمائے۔

مسجدوں کو سجدہ گاہ بنانے کے دو مطلب ہو سکتے ہیں ایک تو یہ کہ جو افعال مساجد میں صرف خدا کیلئے انجام دیئے جاتے ہیں وہی قبروں پر انجام دیئے جائیں مثلاً سجدہ' رکوع کیا جائے یا دو زانو ہو کر ہاتھ باندھ کر تعظیماً ان کے سامنے قیام کیا جائے یا قبروں کے نزدیک مساجد تعمیر کی جائیں۔ میت کی تعظیم و تکریم کی بنا پر یا دوسری مساجد سے انہیں متبرک سمجھا جائے۔ یہ شرعاً درست نہیں۔

(١٩٧) وَعَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: بَعَثَ النَّبِيُّ ﷺ خَيْلاً، فَجَاءَتْ بِرَجُلٍ، فَرَبَطُوْهُ بِسَارِيَةٍ مِنْ سَوَارِ الْمَسْجِدِ»، الحَدِيْثَ. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک مختصر سا دستہ کسی طرف روانہ کیا۔ یہ لوگ ایک (مشرک) کو گرفتار کر کے آپ ؐ کی خدمت میں لائے اور اس قیدی کو مسجد (نبوی) کے ستونوں میں سے ایک ستون کے ساتھ باندھ دیا (قید

کر دیا)۔ (بخاری و مسلم)

لغوی تشریح: ﴿ خیلا ﴾ گھوڑ سواروں کا دستہ۔ جماعت ﴿ فربطوہ ﴾ اس کو باندھ دیا (مضبوطی کے ساتھ) ﴿ بساریۃ ﴾ ستون کے ساتھ ساریۃ کی جمع سواری آتی ہے۔ یہ قیدی جسے یہ دستہ گرفتار کر کے لایا' ثمامہ بن اثال رضی اللہ عنہ تھے۔ گرفتاری کے موقع پر یہ کافر تھے۔ بعد میں مسلمان ہوگئے تھے۔

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ بوقت ضرورت مشرک کا مسجد میں داخل ہونا جائز ہے نیز ضرورتاً مسجد کو جیل قرار دینا بھی ثابت ہوتا ہے۔ حکمت یہ معلوم ہوتی ہے کہ کافر و مشرک مسجد میں مسلمانوں کے ارکان اسلام میں سے نماز کو ادا کرتے اپنی آنکھوں سے ملاحظہ کریں' تلاوت قرآن سنیں' صف بندی سے اتفاق و اتحاد اور یگانگت کا مظاہرہ دیکھیں۔ امیر و غریب کو ایک ہی صف میں دست بدستہ کھڑے دیکھیں اور ان سے تاثر قبول کریں۔ قیدی ہو کر آنے والا یمامہ کا سردار ثمامہ بن اثال تھا۔ عمرہ کی غرض سے آرہا تھا کہ مسلمانوں کے ہاتھوں گرفتار ہوگیا۔ مسجد نبویؐ میں اسے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے تین روز تک ستون سے باندھے رکھا آخر کار وہ دائرہ اسلام میں داخل ہوگیا۔

(۱۹۸) وَعَنْهُ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ أَنَّ عُمَرَ مَرَّ بِحَسَّانَ يُنْشِدُ فِي الْمَسْجِدِ، فَلَحَظَ إِلَيْهِ، فَقَالَ: قَدْ كُنْتُ أُنْشِدُ فيه، وَفِيْهِ مَنْ هُوَ خَيْرٌ مِّنْكَ. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ ہی سے یہ حدیث بھی مروی ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا گزر حضرت حسان رضی اللہ عنہ کے پاس سے ہوا' وہ مسجد میں اشعار پڑھ رہے تھے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان کی طرف گھور کر دیکھا (اس پر) حضرت حسان رضی اللہ عنہ نے کہا (گھورتے کیوں ہو؟) میں تو اس وقت مسجد میں شعر پڑھا کرتا تھا جب مسجد میں وہ ذات گرامی موجود ہوتی تھی جو تم سے افضل تھی (یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم) (بخاری و مسلم)

لغوی تشریح: ﴿ ینشد ﴾ انشاد سے ماخوذ ہے "یاء" پر ضمہ اور "شین" پر کسرہ۔ اشعار پڑھنا ﴿ فلحظ الیہ ﴾ دیکھنا۔ ناپسندیدہ نگاہوں سے ﴿ فقال ﴾ سے مراد حضرت حسان رضی اللہ عنہ ہیں۔ ﴿ وفیہ ﴾ "واوَ" حالیہ ہے یعنی جبکہ وہ مسجد میں تھے۔ ﴿ من ھو خیر منک ﴾ اس سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی مراد ہے۔

حاصل کلام: اس حدیث کی رو سے مسجد میں اشعار پڑھنا جائز ہے مگر ایسے اشعار نہ ہوں جو توحید کے خلاف ہوں' جن میں سے شرک کی بو آتی ہو' جو مذموم اور برے اشعار ہوں یا نمازیوں کیلئے دخل اندازی کا باعث ہوں کہ نماز میں توجہ منتشر کر دیں۔ حضرت حسان رضی اللہ عنہ مسجد میں ایسے اشعار پڑھتے تھے جن میں کفار کی ہجو ہوتی تھی۔ آپؐ سن کر فرماتے تھے "روح القدس تیری مدد فرمائے۔ تمہارے اشعار کفار کو تیر کی طرح لگتے ہیں۔"

راوی حدیث: ﴿ حسان رضی اللہ عنہ ﴾ حسان بن ثابت انصار کے قبیلہ خزرج میں سے تھے۔ شاعر رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے لقب سے مشہور تھے۔ ابوعبیدہ کا قول ہے کہ عرب متفق ہیں کہ شہری شعراء میں حضرت حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ سب سے بڑے شاعر تھے۔ ۵۴ھ میں حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے دور خلافت میں وفات پائی۔ بعض کے نزدیک ۵۵ھ میں فوت ہوئے۔ وفات کے وقت ان کی عمر ایک سو بیس سال تھی۔

(۱۹۹) وَعَنْهُ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «مَنْ سَمِعَ رَجُلاً يَنْشُدُ ضَالَّةً فِي الْمَسْجِدِ فَلْيَقُلْ: لاَ رَدَّهَا اللَّهُ عَلَيْكَ، فَإِنَّ الْمَسَاجِدَ لَمْ تُبْنَ لِهَذَا». رَوَاهُ مُسْلِمٌ.

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ ہی سے یہ حدیث بھی مروی ہے کہ جو کوئی یہ سنے کہ کوئی آدمی مسجد میں اپنی گم شدہ چیز تلاش کر رہا ہے تو سننے والا اسے یہ کہے کہ اللہ کرے وہ چیز تمہیں واپس نہ ملے۔ مسجدیں اس مقصد کیلئے تو نہیں بنائی گئی ہیں۔ (مسلم)

لغوی تشریح: ﴿ ینشد ﴾ "یاء" پر فتحہ اور "شین" پر ضمہ۔ باب نصر ینصر کے وزن پر۔ تلاش و طلب کرنا۔ ڈھونڈنا یا تلاش کرنے کیلئے اونچی آواز سے پکارنا ﴿ ضالۃ ﴾ گم شدہ حیوان۔ اصلی معنی تو یہی ہیں پھر غیر حیوان کو بھی اسی پر قیاس کر لیا جاتا ہے ﴿ لاردھا اللہ علیک ﴾ بظاہر تو لا اس میں نافیہ معلوم ہوتا ہے اور نفی فعل پر وارد ہوئی ہے۔ دراصل یہ بددعا ہے گم شدہ چیز کے تلاش کرنے والے کیلئے کہ خدا کرے وہ چیز جس کی وہ تلاش کر رہا ہے اسے نہ ملے۔ کیونکہ وہ مسجد میں ایسے کام کا ارتکاب کر رہا ہے جو اس مقام پر کرنا جائز نہیں ہے۔ ﴿ لم تبن ﴾ بناء سے ماخوذ ہے۔ صیغہ مجہول ہے یعنی اس غرض کیلئے ان کی تعمیر نہیں کی گئی۔

حاصل کلام: اس حدیث میں جو ڈانٹ ڈپٹ اور زجر و توبیخ ہے اس سے مقصود لوگوں کو اس بات سے باز رکھنا ہے کہ باہر کہیں اس کی کوئی چیز گم ہو جائے اور وہ مسجد میں آکر اس کی تلاش شروع کر دے۔ یہ آداب مسجد کے خلاف ہے۔ آج کل مسجدوں میں جو اعلانات کی بھرمار ہے وہ بھی اصلاح طلب ہے۔ البتہ مسجد کے دروازے پر کھڑے ہو کر آنے جانے والوں سے دریافت کرنے کی گنجائش ہے۔ اس حدیث میں جانور کا بطور خاص ذکر ہے کیونکہ جانور مسجدوں میں آکر گم تو نہیں ہوتے۔ تو پھر ان کی تلاش یہاں کیا معنی رکھتی ہے۔

(۲۰۰) وَعَنْهُ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ أَنَّ رَسُولَ اللهِ ﷺ قَالَ: «إِذَا رَأَيْتُمْ مَنْ يَبِيعُ أَوْ يَبْتَاعُ فِي الْمَسْجِدِ فَقُولُوا: لاَ أَرْبَحَ اللَّهُ تِجَارَتَكَ». رَوَاهُ النَّسَائِيُّ وَالتِّرْمِذِيُّ، وَحَسَّنَهُ.

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ ہی سے یہ روایت بھی مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "جب تم کسی شخص کو مسجد میں خرید و فروخت کرتے دیکھو تو اسے کہو کہ اللہ تعالیٰ تمہارے کاروبار و تجارت میں نفع نہ دے۔" (اس حدیث کو ترمذی اور نسائی نے روایت کیا ہے اور ترمذی نے اسے حسن قرار دیا ہے)

لغوی تشریح: ﴿ یبتاع ﴾ یشتری کے معنی میں، جس کے معنی خریدنا ہے ﴿ لا اربح اللہ تجارتک ﴾ یعنی اللہ تعالیٰ تیری اس تجارت کو سود مند اور منافع بخش نہ بنائے۔

حاصل کلام: اس حدیث سے مساجد میں بیع و شراء، خرید و فروخت کی ممانعت ثابت ہوتی ہے۔ اس سے مقصود یہ ہے کہ مسجدیں تجارتی منڈیاں نہ بنالی جائیں۔ مسجدیں تو صرف عبادت الٰہی کیلئے تعمیر کی جاتی ہیں اگر ان میں بھی تجارت شروع ہو جائے تو یہ اپنا مقصد تعمیر کھو بیٹھیں گی۔ ان کو صرف یاد الٰہی کیلئے ہی مخصوص ہونا چاہیئے۔

(۲۰۱) وَعَنْ حَكِيمِ بْنِ حِزَامٍ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «لاَ تُقَامُ الحُدُودُ فِي المَسَاجِدِ، وَلاَ يُسْتَقَادُ فِيهَا». رَوَاهُ أَحْمَدُ وَأَبُو دَاوُدَ بِسَنَدٍ ضَعِيفٍ.

حضرت حکیم بن حزام رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "مساجد میں نہ تو حدود قائم کیئے جائیں اور نہ ہی ان میں قصاص (خون کا بدلہ) لیا جائے۔" (اس حدیث کو ابوداؤد اور احمد نے ضعیف سند سے روایت کیا ہے)

لغوی تشریح: ﴿ لاتقام ﴾ اقامۃ سے ماخوذ ہے نہ نافذ کی جائیں نہ جاری کی جائیں۔ ﴿ الحدود ﴾ وہ سزائیں جن کی اللہ تعالیٰ نے سزا مقرر فرما دی ہے کہ فلاں جرم کی فلاں سزا ہے اور اتنی ہے ﴿ ولا یستقاد ﴾ صیغۂ مجہول۔ قصاص لیا جائے ﴿ بسند ضعیف ﴾ ضعیف سند سے۔ مقصد یہ ہے کہ یہ حدیث ضعیف ہے اور یہی بات درست ہے کہ اس کی سند حسن درجہ کی ہے۔ (مرعاۃ)

حاصل کلام: اس حدیث سے ثابت ہوتا ہے کہ مسجدوں میں حدود قائم نہ کی جائیں اور قصاص بھی نہ لیا جائے۔ اس بات کا احتمال ہے کہ سزا پانے والے کا خون یا گندگی پیٹ سے خارج ہو جائے اور مسجد گندی ہو جائے۔

راوی حدیث: ﴿ حکیم بن حزام رضی اللہ عنہ ﴾ حزام "حاء" کے نیچے کسرہ۔ ان کی کنیت ابو خالد تھی۔ قبیلہ قریش کے اسد قبیلہ سے تعلق رکھتے تھے۔ حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا کے بھائی کے بیٹے (بھانجے) تھے۔ اشراف قریش میں شمار ہوتے تھے۔ واقعہ فیل سے ۱۳ سال پہلے خانہ کعبہ میں پیدا ہوئے۔ فتح مکہ کے موقع پر اسلام قبول کیا۔ ۵۴ھ میں یا اس کے بعد مدینہ منورہ میں وفات پائی۔ اس وقت ان کی عمر ۱۲۰ برس تھی۔ ساٹھ برس دور جاہلیت میں گزرے اور ساٹھ سال اسلام میں۔ ان کے چار بیٹے تھے۔ چاروں کو صحابیت کا شرف حاصل تھا۔ خود بھی نہایت شریف القدر صحابی تھے۔

(۲۰۲) وَعَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللّهُ تَعَالَى عَنْهَا قَالَتْ: أُصِيبَ سَعْدٌ يَوْمَ الخَنْدَقِ، فَضَرَبَ عَلَيْهِ رَسُولُ اللهِ ﷺ خَيْمَةً فِي المَسْجِدِ، لِيَعُودَهُ مِنْ

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا روایت کرتی ہیں کہ غزوۂ خندق کے روز حضرت سعد رضی اللہ عنہ زخمی ہو گئے تھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کیلئے مسجد میں خیمہ لگوا دیا تھا، تاکہ قریب سے ان کی تیمارداری (بآسانی) کر سکیں۔

قَرِيْبٍ . مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ. (بخاری و مسلم)

لغوی تشریح: ﴿ اصیب سعد ﴾ سعد سے مراد سعد بن معاذ ہیں جو اوس کے سردار تھے۔ غزوہ خندق کے موقع پر ان کے بازو کی رگ (اکحل ہفت اندام رگ) میں دشمن کا تیر لگا اور خون جاری ہو گیا۔ خون رکنے میں نہیں آتا تھا کہ انہوں نے اللہ تعالیٰ سے استدعا کی کہ وہ انہیں اس وقت تک وفات نہ دے جب تک وہ بنی قریظہ کا انجام نہ دیکھ لیں۔ اسلامی لشکر نے ان کا محاصرہ کیا ہوا تھا۔ خون بہنا بند ہو گیا' پھر جب بنو قریظہ ان کے فیصلہ کے مطابق گڑھیوں سے نیچے اتر آئے اور ان کو قتل کر دیا گیا (قابل جنگ مردوں کو) تو خون دوبارہ جاری ہو گیا' یہاں تک کہ وفات پا گئے اور ان کی وفات غزوۂ خندق میں تیر لگنے کے ایک ماہ بعد ہوئی۔ اور غزوہ احزاب شوال ۵ھ میں پیش آیا۔ اس معرکہ میں قریش' غطفان وغیرہ قبائل یہودی سازش سے مسلمانوں کے خلاف اکٹھے ہو گئے تھے اور سب نے مل کر مدینہ کا گھیراؤ کر لیا تھا۔ مسلمانوں کو جب ان لوگوں کی سازش کا علم ہوا تو انہوں نے مدینہ کی شمالی جانب خندق کھود لی۔ محاصرے نے پچیس (۲۵) روز تک طول کھینچا۔ پھر ناکام و نامراد ہو کر واپس لوٹ گئے۔ ﴿ ضرب علیہ ﴾ خیمہ اس کے لئے نصب کیا۔ ﴿ لیعودہ ﴾ عیادۃ سے ماخوذ ہے۔ عیادت کہتے ہیں مریض کے حال احوال پوچھنے کے لئے جانے کو' ملاقات کرنے کو۔

حاصل کلام: اس سے معلوم ہوا کہ ضرورت کے وقت مسجد میں مریض کے قیام کے لئے خیمہ وغیرہ نصب کرنا جائز ہے۔ نیز مسجد میں سونا' بیمار یا زخمی کی بیمار پرسی اور تیمار داری کرنا اور اس کے علاج کا بندوبست کرنا بھی درست اور جائز ہے۔

راوی حدیث: ﴿ سعد رضی اللہ عنہ ﴾ یہ سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ ہیں جو قبیلہ اوس کے سردار تھے۔ کبار صحابہ میں شمار ہوتا ہے انہوں نے عقبہ اولیٰ و ثانیہ میں شرکت کی اور اسلام قبول کیا۔ اور ان کے اسلام قبول کرنے کی وجہ سے بنو عبدالاشہل نے اسلام قبول کیا۔ اپنی قوم میں سردار اور شریف انسان تھے قوم ان کی پیروی کرنے میں فخر محسوس کرتی۔ ان کی رگ اکحل میں غزوۂ خندق کے موقع پر ایک تیر لگا جس کی وجہ سے ذی قعدہ ۵ھ کو واقعہ بنی قریظہ کے بعد فوت ہوئے۔

(۲۰۳) وَعَنْهَا قَالَتْ: رَأَيْتُ رَسُولَ اللهِ ﷺ يَسْتُرُنِيْ، وَأَنَا أَنْظُرُ إِلَى الحَبَشَةِ يَلْعَبُونَ فِي المَسْجِدِ، اَلْحَدِيْثَ . مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا ہی سے یہ مروی ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا کہ آپ میرے لئے پردہ بنے ہوئے تھے اور میں حبشیوں کے کھیل کو دیکھ رہی تھی جو وہ مسجد میں کھیل رہے تھے۔ یہ طویل حدیث کا جزء ہے۔ (بخاری و مسلم)

لغوی تشریح: ﴿ یسترنی ﴾ آپ نے مجھے پردہ میں لیا ہوا تھا یعنی نبی صلی اللہ علیہ وسلم حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے حجرے کے دروازے پر کھڑے تھے اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا آپ کے پیچھے کھڑی ہو کر حبشیوں کا کھیل دیکھ

رہی تھیں۔ ﴿ الحبشۃ ﴾ حبشی کی جمع ہے یعنی ملک حبش کے باشندے ﴿ یلعبون ﴾ گرائمر میں یہ جبشہ سے حال واقع ہو رہا ہے۔ روایات سے یہ واضح ہوتا ہے کہ ان کا کھیل نیزے اور ڈھال کے ساتھ تھا اور عید کا دن تھا۔ اس قسم کا کھیل جنگی مشق کی قسم میں سے ہے۔ اس قسم کی جنگی مشق کا مظاہرہ مسجد میں جائز ہے۔

حاصل کلام: یہ حدیث اس بات کی دلیل ہے کہ خوشی کے دن جنگی کرتب کا مظاہرہ مسجد میں جائز ہے۔ نیز عورت اجنبی مرد کو فی الجملہ دیکھ سکتی ہے مگر تفصیل سے نہیں یعنی اجنبی مرد کے اعضاء جسم کو بغور ملاحظہ نہیں کر سکتی۔

(٢٠٤) وَعَنْهَا أَنَّ وَلِيْدَةً سَوْدَآءَ كَانَ لَهَا خِبَاءٌ فِي الْمَسْجِدِ، فَكَانَتْ تَأْتِيْنِي، فَتَحَدَّثُ عِنْدِي. اَلْحَدِيْثَ. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا ہی سے مروی ہے کہ **ایک سیاہ رنگ لڑکی کا خیمہ مسجد میں تھا وہ میرے پاس باتیں کرنے کیلئے آیا کرتی تھی۔** (بخاری و مسلم)

لغوی تشریح: ﴿ ولیدۃ ﴾ لونڈی ﴿ خباء ﴾ "خاء" کے نیچے کسرہ "باء" مخفف۔ خیمہ کے معنی میں استعمال ہوا ہے ﴿ فتحدث ﴾ دراصل تتحدث تھا۔ تتکلم کے معنی میں' بات کرنے 'گفتگو کرنے کیلئے آتی ہے۔ حدیث سے ثابت ہوا کہ عورت بھی مسجد میں رات بسر کر سکتی ہے بشرطیکہ کسی فتنہ و فساد کا خطرہ نہ ہو اور اس کیلئے مسجد میں خیمہ بھی قائم کیا جا سکتا ہے۔ یہ ایک لمبی حدیث کا ٹکڑا ہے۔ پوری حدیث بخاری میں ہے۔

(٢٠٥) وَعَنْ أَنَسٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «**الْبُصَاقُ فِي الْمَسْجِدِ خَطِيئَةٌ، وَكَفَّارَتُهَا دَفْنُهَا**». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت انس رضی اللہ عنہ **روایت کرتے ہیں رسول اللہ** ﷺ **نے فرمایا "مسجد میں تھوکنا گناہ ہے۔ اس کا کفارہ تھوک کو دفن کرنا ہے۔"** (بخاری و مسلم)

حاصل کلام: مسجد اللہ تعالیٰ کی عبادت اور اس کی بندگی کیلئے تعمیر کی جاتی ہے' اسے ظاہری اور باطنی گندگی اور نجاست سے پاک رکھنے کا حکم ہے۔ مسجد میں تھوکنا آداب مسجد کے خلاف ہے شائستگی اور نظافت اور ذوق سلیم پر بھی ناگوار گزرتا ہے۔ اس لئے تھوکنا گناہ ہے اور اس کا کفارہ اسے دفن کرنا ہے' تاکہ اس کا کوئی اثر باقی نہ رہے۔

(٢٠٦) وَعَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «**لاَ تَقُومُ السَّاعَةُ حَتَّى يَتَبَاهَى النَّاسُ فِي الْمَسَاجِدِ**». أَخْرَجَهُ الخَمْسَةُ إِلاَّ التِّرْمِذِيَّ، وَصَحَّحَهُ ابْنُ خُزَيْمَةَ.

حضرت انس رضی اللہ عنہ ہی نے بیان کیا کہ رسول اللہ ﷺ **نے فرمایا "قیامت اس وقت تک قائم نہ ہوگی جب تک کہ لوگ مسجدوں (کی تعمیر) میں فخر نہ کرنے لگیں۔"** (اسے پانچوں نے روایت کیا ہے بجز ترمذی کے۔

ابن خزیمہ نے اسے صحیح قرار دیا ہے)

لغوی تشریح: ﴿ یتباھی ﴾ ایک دوسرے پر فخر کریں گے ﴿ فی المساجد ﴾ یعنی مسجدوں کی تعمیر کی بلندی میں۔ علو شان میں۔ اس کی زیبائش و تزئین میں اور خوبصورتی میں۔

حاصل کلام: قیامت کے قریب ایک زمانہ ایسا آئے گا کہ لوگ مسجدیں تعمیر کریں گے خوب نقش و نگار اور بیل بوٹوں سے آراستہ کریں گے پھر باہمی مقابلہ کریں گے کہ ہماری مسجد فلاں کی مسجد سے خوبصورت اور بہترین بنی ہوئی ہے مگر آباد نہ ہوں گی۔ نمازیوں سے خالی ہوں گی' تعمیر کرنے والوں کی بے حسی اور عدم توجہ کا نوحہ کر رہی ہوں گی۔

(۲۰۷) وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «مَا أُمِرْتُ بِتَشْيِيدِ الْمَسَاجِدِ». أَخْرَجَهُ أَبُو دَاوُدَ، وَصَحَّحَهُ ابْنُ حِبَّانَ.

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "مجھے مساجد کی آرائش و زیبائش (بناؤ سنوار) کا حکم نہیں دیا گیا۔" (اسے ابوداؤد نے روایت کیا ہے۔ ابن حبان نے اس کو صحیح قرار دیا ہے)

لغوی تشریح: ﴿ ما امرت ﴾ "ما" اس میں نافیہ ہے۔ صیغہ مجہول ہے۔ ﴿ بتشیید المساجد ﴾ چونا گچ کرنا' آرائش کرنا' نقش نگاری کرنا۔

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ مساجد کو نقش و نگار اور بیل بوٹوں سے مزین کرنا منع ہے۔ مسجدوں کو ذکر الٰہی اور خالص عبادت سے آباد کرنے کا حکم ہے۔ تزئین و آرائش سے توجہ الی اللہ میں فرق آجاتا ہے۔ مسجد کی عمارت سے مقصود تو عبادت گاہ کی علامت ہے۔ گرمی' سردی اور بارش وغیرہ سے تحفظ اور بچاؤ ہے۔ مساجد کی آرائش اور نقش و نگاری بادشاہوں کی سنت ہے۔ ولید بن عبدالملک پہلا شخص ہے جس نے مسجد نبوی ﷺ میں نقش و نگاہ کرائے۔ ورنہ عہد رسالت مآب' خلافت راشدہ میں کہیں دور دور تک بھی اس کے نشانات نہیں ملتے۔ علماء حق کو مجبوراً خاموشی اور سکوت اختیار کرنا پڑا۔

(۲۰۸) وَعَنْ أَنَسٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «عُرِضَتْ عَلَيَّ أُجُورُ أُمَّتِي، حَتَّى الْقَذَاةُ يُخْرِجُهَا الرَّجُلُ مِنَ الْمَسْجِدِ». رَوَاهُ أَبُو دَاوُدَ وَالتِّرْمِذِيُّ، وَاسْتَغْرَبَهُ، وَصَحَّحَهُ ابْنُ خُزَيْمَةَ.

حضرت انس رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "مجھ پر میری امت کے اعمال پیش کئے گئے۔ (جو باعث ثواب ہیں) یہاں تک کہ وہ تنکا بھی میں نے ان اعمال میں دیکھا جسے آدمی مسجد سے نکال کر باہر پھینک دیتا ہے۔" (اس حدیث کو ابوداؤد اور ترمذی نے روایت کیا ہے اور ترمذی نے اسے غریب کہا ہے اور ابن خزیمہ نے اسے صحیح قرار دیا ہے)

لغوی تشریح: ﴿عرضت﴾ صیغۂ غائب صیغۂ مجہول ہے۔ ظاہر کئے گئے۔ سامنے کئے گئے ﴿اجور امتی﴾ اس کا نائب فاعل ہے۔ میری امت کے نامہ اعمال۔ ﴿علی﴾ "یاء" پر تشدید۔ ساتھ والی "یاء" کو یائے متکلم میں مدغم کر دیا گیا ہے ﴿القذاۃ﴾ قاف پر فتحہ۔ تنکا وغیرہ۔ جو مشروب میں گر جاتا ہے یا آنکھ میں پڑ جاتا ہے یا گھروں کے اندر عموماً پڑا ہوتا ہے ﴿واستغربہ﴾ اسے غریب کہا ہے۔

حاصل کلام: اس سے معلوم ہوتا ہے کہ معمولی سے معمولی کام بھی اجر و ثواب سے خالی نہیں۔ مساجد کی صفائی اور پاکیزگی کی اسلام نے بہت تاکید کی ہے۔ تنکا تک مسجد میں رہنے نہ دیا جائے۔ جو شخص اتنا سا معمولی کام اس نظریہ کے پیش نظر انجام دیتا ہے کہ (تنکا اٹھا کر باہر پھینک دیتا ہے) اسے بھی اجر ضرور ملے گا۔ ترمذی نے اس کو غریب اس وجہ سے کہا ہے کہ اس کی سند میں "مطلب بن عبداللہ عن انس" کے واسطہ سے ہے اور مطلب نے حضرت انس رضی اللہ عنہ بلکہ کسی بھی صحابی سے سماع نہیں کیا۔

(٢٠٩) وَعَنْ أَبِي قَتَادَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «إِذَا دَخَلَ أَحَدُكُمْ المَسْجِدَ فَلاَ يَجْلِسْ حَتَّى يُصَلِّيَ رَكْعَتَيْنِ». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت ابو قتادہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "تم میں سے کوئی جب (بھی) مسجد میں داخل ہو تو بیٹھنے سے پہلے دو رکعت (نفل) ادا کر لے۔" (بخاری و مسلم)

حاصل کلام: حدیث میں جن نوافل کے پڑھنے کا حکم ہے اسے ﴿تحیۃ المسجد﴾ کہتے ہیں۔ شوافع کے نزدیک یہ واجب ہیں جبکہ جمہور اسے مستحب کہتے ہیں۔ حدیث کے ظاہر الفاظ کو سامنے رکھتے ہوئے بعض علماء نے ان نوافل کو مکروہ اوقات میں پڑھنے کی بھی اجازت دی ہے۔ اور بعض اوقات ممنوعہ میں ممنوع کہتے ہیں۔ اس سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ خطیب منبر پر خطبہ بھی دے رہا ہو تو اس وقت بھی مسجد میں داخل ہونے والا دو رکعت پڑھ کر بیٹھے۔

٧ - بَابُ صِفَةِ الصَّلاَةِ — نماز کی صفت کا بیان

(نماز ادا کرنے کا مسنون طریقہ)

(٢١٠) عَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ قَالَ: إِذَا قُمْتَ إِلَى الصَّلاَةِ فَأَسْبِغ الوُضُوءَ، ثُمَّ اسْتَقْبِلِ القِبْلَةَ فَكَبِّرْ، ثُمَّ اقْرَأْ مَا تَيَسَّرَ مَعَكَ مِنَ القُرْآنِ، ثُمَّ ارْكَعْ حَتَّى تَطْمَئِنَّ رَاكِعاً، ثُمَّ ارْفَعْ حَتَّى

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا "جب تم نماز ادا کرنے کیلئے کھڑا ہونے کا ارادہ کرو تو پہلے وضو اچھی طرح کر لو پھر قبلہ رو ہو کر تکبیر (اللہ اکبر) کہو۔ پھر قرآن کا جتنا حصہ تمہیں یاد ہو اس میں سے جتنا آسانی سے پڑھ سکتے ہو' پڑھو۔ پھر رکوع کرو اور پوری طرح اطمینان سے

تَعْتَدِلَ قَائِماً، ثُمَّ اسْجُدْ حَتَّى تَطْمَئِنَّ سَاجِداً، ثُمَّ ارْفَعْ حَتَّى تَطْمَئِنَّ جَالِساً، ثُمَّ اسْجُدْ حَتَّى تَطْمَئِنَّ سَاجِداً، ثُمَّ افْعَلْ ذَلِكَ فِي صَلاَتِكَ كُلِّهَا». أَخْرَجَهُ السَّبْعَةُ، وَاللَّفْظُ لِلْبُخَارِيِّ.

رکوع کرو۔ پھر سیدھا کھڑے (ہو جاؤ) اور پورے اطمینان سے کھڑے رہو' پھر سجدہ کرو اور پورے اطمینان کے ساتھ سجدہ کرو پھر سجدہ سے اپنا سر اٹھا کر پورے اطمینان سے بیٹھ جاؤ پھر دوسرا سجدہ کرو اور پورے اطمینان سے کرو۔ پس پھر باقی ساری نماز میں اسی طرح (اطمینان سے ارکان نماز ادا کرو)'' (اسے بخاری' مسلم' ابوداؤد' ترمذی' نسائی' ابن ماجہ اور امام احمد نے روایت کیا ہے اور یہ الفاظ امام بخاری کے ہیں۔)

وَلاِبْنِ مَاجَهْ بِإِسْنَادِ مُسْلِمٍ: «حَتَّى تَطْمَئِنَّ قَآئِماً» وَمِثْلُهُ فِي حَدِيْثِ رِفَاعَةَ بْنِ رَافِعِ بْنِ مَالِكٍ عِنْدَ أَحْمَدَ وَابْنِ حِبَّانَ. وَفِي لَفْظٍ لِأَحْمَدَ: فَأَقِمْ صُلْبَكَ حَتَّى تَرْجِعَ العِظَامُ.

ابن ماجہ نے مسلم کی سند سے رکوع سے کھڑے ہونے کے وقت یہ الفاظ نقل کئے ہیں کہ پورے اطمینان سے کھڑے ہو جاؤ۔ احمد اور ابن حبان میں رفاعہ بن رافع بن مالک کی روایت میں بھی اسی طرح ہے اور مسند احمد کی ایک روایت میں ہے کہ اپنی کمر (پشت) کو سیدھا کرو کہ ہڈیاں اپنے مقام میں واپس آجائیں۔

وَلِلنَّسَائِيِّ وَأَبِيْ دَاوُدَ مِنْ حَدِيْثِ رِفَاعَةَ بْنِ رَافِعٍ: إِنَّهَا لَنْ تَتِمَّ صَلاَةُ أَحَدِكُمْ حَتَّى يُسْبِغَ الوُضُوءَ كَمَا أَمَرَهُ اللَّهُ تَعَالَى، ثُمَّ يُكَبِّرَ اللَّهَ تَعَالَى، وَيَحْمَدَهُ، وَيُثْنِيَ عَلَيْهِ. وفيها: فَإِنْ كَانَ مَعَكَ قُرْآنٌ فَاقْرَأْ، وَإِلاَّ فَاحْمَدِ اللَّهَ، وَكَبِّرْهُ، وَهَلِّلْهُ. وَلأَبِي دَاوُدَ «ثُمَّ اقْرَأْ بِأُمِّ القُرْآنِ، وَبِمَا شَآءَ اللَّهُ» وَلاِبْنِ حِبَّانَ: «ثُمَّ بِمَا شِئْتَ».

نسائی اور ابوداؤد میں رفاعہ بن رافع سے ہے کہ جب تک وضو کامل نہ ہو جس طرح اللہ نے حکم دیا ہے اس وقت تک نماز مکمل نہیں ہو سکتی۔ پھر تکبیر کہے اور اللہ کی حمد و ثناء کرے اور اس روایت میں یہ بھی مذکور ہے اگر تجھے قرآن کا کچھ حصہ یاد ہو تو اسے پڑھ بصورت دیگر اللہ کی حمد و توصیف کر اللہ اکبر اور لا الٰہ الا اللہ۔ ابوداؤد میں ہے کہ ''پھر سورۂ فاتحہ پڑھ اور مزید جو اللہ نے چاہا۔'' ابن حبان میں ہے ''پھر جو تم چاہو پڑھو۔''

لغوی تشریح: ﴿ فاسبغ الوضو ﴾ اسبغ امر کا صیغہ ہے' مبالغہ کرو' پوری طرح کرو۔ ﴿ تعتدل ﴾ اعتدال پر آجائیں' برابر اپنی جگہ پر آجائیں۔ ﴿ قائما ﴾ سیدھے کھڑے ہونا جس میں دائیں بائیں جانب جھکاؤ نہ ہو ﴿ فاقم صلبك ﴾ رکوع سے جب سر اٹھائے تو اپنی پشت اس طرح سیدھی کر کہ اس میں

کسی قسم کا ٹیڑھ اور جھکاؤ کی جانب میلان نہ ہو ﴿ العظام ﴾ ہڈیاں۔ پشت کی ہڈیاں اور اس کے سرے مراد ہیں۔ ریڑھ کی ہڈی بھی ہو سکتی ہے ﴿ یثنی علیہ ﴾ باب افعال سے "یاء" پر ضمہ ہے۔ اس کی حمد و تعریف اور تعریف بھی مبالغہ کی حد تک۔ ﴿ وھللہ ﴾ تھلیل سے امر کا صیغہ ہے مطلب ہے کہ لا الہ الا اللہ کہو۔ یہ حدیث حدیث مسئی الصلاۃ کے نام سے مشہور و معروف ہے۔

حاصل کلام: اس حدیث میں نبی ﷺ نے نمازی کو ارکان نماز پورے اطمینان اور سکون کے ساتھ ادا کرنے کی ہدایت فرمائی ہے۔ ہر رکن نماز کو اپنی جگہ اور دو ارکان کے درمیانی وقفہ میں اطمینان و اعتدال واجب ہے۔ حدیث کے الفاظ "ثم اقرا ما تیسر" سے ظاہر ہوتا ہے کہ قرأت قرآن واجب ہے ایک دوسری روایت میں "ثم اقرا بام القرآن" کے الفاظ بھی منقول ہیں اس سے معلوم ہوا کہ ماتیسر اور بام القرآن دونوں ایک ہی معنی دے رہے ہیں اور وہ فاتحہ ہی ہے۔ اس حدیث میں نماز کی ترتیب کی تعلیم دی گئی ہے۔ اس میں امام' مقتدی اور منفرد نماز ادا کرتے ہیں' انہیں سوچنا چاہئے کہ وہ کیا کر رہے ہیں۔ ایسے ہی لوگوں کو آپؐ نے بدترین چور اور ایسی نماز کو منافق کی نماز قرار دیا ہے۔

راوی حدیث: ﴿ رفاعہ بن رافع بن مالک رضی اللہ عنہما ﴾ ابو معاذ ان کی کنیت ہے' زرقی انصاری مدنی مشہور ہیں۔ جلیل القدر صحابی ہیں۔ یہ اپنے باپ کے ساتھ بیعت عقبہ میں حاضر تھے۔ ان کے والد انصار میں سب سے پہلے اسلام قبول کرنے والے ہیں۔ رفاعہ بن رافع بدر کے علاوہ باقی سب غزوات میں شریک رہے ہیں۔ جنگ جمل و صفین میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کے طرفداروں میں شامل تھے۔ امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کی خلافت کے شروع میں ۴۱ھ میں وفات پائی۔

(٢١١) وَعَنْ أَبِي حُمَيْدٍ السَّاعِدِيِّ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: رَأَيْتُ رَسُولَ اللهِ ﷺ إِذَا كَبَّرَ جَعَلَ يَدَيْهِ حَذْوَ مَنْكِبَيْهِ، وَإِذَا رَكَعَ أَمْكَنَ يَدَيْهِ مِنْ رُكْبَتَيْهِ ثُمَّ هَصَرَ ظَهْرَهُ، فَإِذَا رَفَعَ رَأْسَهُ ٱسْتَوَى، حَتَّى يَعُودَ كُلُّ فَقَارٍ مَكَانَهُ، فَإِذَا سَجَدَ وَضَعَ يَدَيْهِ غَيْرَ مُفْتَرِشٍ وَلاَ قَابِضِهِمَا، وَاسْتَقْبَلَ بِأَطْرَافِ أَصَابِعِ رِجْلَيْهِ القِبْلَةَ، وَإِذَا جَلَسَ فِي الرَّكْعَتَيْنِ جَلَسَ عَلَى رِجْلِهِ اليُسْرَى، وَنَصَبَ اليُمْنَى، وَإِذَا جَلَسَ فِي الرَّكْعَةِ الأَخِيرَةِ قَدَّمَ رِجْلَهُ

حضرت ابوحمید ساعدی رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو تکبیر (اولیٰ) کے وقت اپنے دونوں ہاتھ کندھوں کے برابر تک اٹھاتے دیکھا ہے اور جب رکوع کرتے تو اپنے دونوں ہاتھوں سے اپنے گھٹنوں کو مضبوطی سے پکڑ لیتے تھے اور اپنی پشت مبارک جھکا لیتے پھر جب اپنا سر رکوع سے اوپر اٹھاتے تو اس طرح سیدھے کھڑے ہوتے کہ ہر جوڑ اپنی اپنی جگہ پر پہنچ جاتا (اس کے بعد) پھر جب سجدہ فرماتے تو اپنے دونوں ہاتھ (زمین) پر اس طرح رکھتے کہ نہ زیادہ سمٹے ہوتے اور نہ زمین پر بچھے ہوئے ہوتے۔ حالت سجدہ میں دونوں پاؤں کی انگلیاں قبلہ رخ ہوتیں۔ جب آپؐ دو رکعت پڑھ کر قعدہ کرتے

الْيُسْرَى، وَنَصَبَ الأُخْرَى، وَقَعَدَ عَلَى مَقْعَدَتِهِ. أَخْرَجَهُ الْبُخَارِيُّ.

تو بایاں پاؤں زمین پر بچھا لیتے اور دایاں پاؤں کھڑا رکھتے اور جب آخری قعدہ کرتے تو بایاں پاؤں (دائیں ران کے نیچے سے) آگے بڑھا دیتے اور دایاں کھڑا رکھتے اور سرین پر بیٹھ جاتے۔ (بخاری)

لغوی تشریح: ﴿حذو منكبيه﴾ الحذو "حاء" پر فتحہ' ذال ساکن۔ مقابل برابر۔ دونوں ہاتھوں کو کندھوں کے مقابل (برابر) اٹھاتے۔ ﴿المنكب﴾ "میم" پر فتحہ' نون ساکن۔ کاف کے نیچے کسرہ۔ کندھے اور بازو کے باہم ملنے کی جگہ ﴿امكن يديه من ركبتيه﴾ الركبة پنڈلی اور ران کے ملنے کی جگہ امکان مضبوطی سے پکڑنا۔ یعنی دونوں ہاتھوں سے دونوں گھٹنوں کو مضبوطی سے پکڑ لیا ﴿هصر ظهره﴾ اپنی کمر جھکائی' پشت نیچے کی ﴿فقار﴾ "فا" پر فتحہ اور قاف مخفف۔ پشت کی وہ ہڈی جو اوپر سے نیچے والے جوڑوں کو باہم ملاتی ہے ﴿غير مفترش﴾ نہ پھیلانے والے اپنے بازوؤں کو ﴿ولا قابضهما﴾ اور نہ ہاتھوں کو اپنے پہلوؤں کی طرف سکیڑنے' سمیٹنے والے ﴿قدم رجله اليسرى﴾ قدم تقدیم سے ماخوذ ہے جس کے معنی آگے بڑھانا' دراز کرنا۔ یعنی دائیں ران کے نیچے سے بڑھا کر دوسری جانب نکالنا ﴿نصب﴾ کھڑا رکھنا' قائم کرنا' دایاں پاؤں کھڑا رکھا وقعد على مقعدته بائیں چوتڑ پر بیٹھ گئے اسے تورک کہتے ہیں۔

حاصل کلام: اس حدیث میں نبی ﷺ کی نماز کی پوری کیفیت بیان کی گئی ہے کہ آپؐ ارکان نماز کو کس طرح ادا فرماتے تھے۔ لہٰذا اہل ایمان کو اسی طرح نماز ادا کرنے کی حتیٰ الامکان کوشش کرنی چاہئے۔ آپؐ کا ارشاد گرامی ہے "صلوا كما رايتموني اصلي" نماز پڑھو جس طرح تم نے مجھے نماز پڑھتے دیکھا ہے۔ فرمان نبویؐ کی موجودگی میں اپنی سی کوشش کرنی چاہئے کہ نماز اسی طرح آرام' سکون و اطمینان سے ٹھہر ٹھہر کر ادا کی جائے جس طرح آپؐ نے پڑھ کر عملاً تعلیم دی ہے۔ جلدی جلدی ارکان نماز ادا کر کے نماز کو خراب نہیں کرنا چاہئے۔ تنگ وقت میں جلدی جلدی نماز پڑھنے والے کو مرغ کی ٹھونگوں سے تشبیہ دے کر منافق کی نماز قرار دیا گیا ہے۔ نمازیوں کو بہت فکر کرنی چاہئے کہ نمازیں بھی پڑھیں مگر حاصل بھی کچھ نہ ہو۔ ایسی نمازوں کا کیا خاک فائدہ۔

راوی حدیث: ﴿ابو حميد الساعدی رضی اللہ عنہ﴾ ابو حمید (تصغیر کے ساتھ) ان کا نام عمرو تھا۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ وہ منذر بن سعد بن منذر تھے۔ بعض نے مالک انصاری خزرجی مدنی بھی نام بتایا ہے۔ خزرج کے باپ ساعدہ کی طرف منسوب ہونے کی وجہ سے ساعدی کہلائے۔ احد اور بعد کے غزوات میں شریک ہوئے۔ ۶۱ھ میں امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے دور امارت کے آخر میں یا یزید کے شروع دور میں فوت ہوئے۔

(۲۱۲) وَعَنْ عَلِيِّ بْنِ أَبِيْ طَالِبٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، عَنْ رَسُولِ

حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی ﷺ جب نماز کیلئے کھڑے ہوتے تو پہلے یہ دعا پڑھتے کہ "میں

اللهِ ﷺ، أَنَّهُ كَانَ إِذَا قَامَ إِلَى الصَّلاَةِ، قَالَ: «وَجَّهْتُ وَجْهِيَ لِلَّذِي فَطَرَ السَّمَاوَاتِ وَالأَرْضَ - إِلَى قَوْلِهِ - مِنَ الْمُسْلِمِينَ. اللَّهُمَّ أَنْتَ المَلِكُ، لاَ إِلاَّ أَنْتَ، أَنْتَ رَبِّي وَأَنَا عَبْدُكَ، إلى آخره». رَوَاهُ مُسْلِمٌ.

نے اپنے چہرے کو آسمانوں اور زمینوں کے خالق کی طرف متوجہ کیا اور میں مشرکوں سے نہیں۔ میری نماز و قربانی' میرا جینا و مرنا اللہ رب العزت ہی کے لئے ہے' اس کا کوئی شریک نہیں' اسی کا مجھے حکم ہے اور میں مسلمانوں میں سے ہوں۔ اے اللہ! تو ہی مالک' تو ہی معبود ہے' تو میرا رب اور میں تیرا بندہ ہوں......" (آخر تک) (مسلم)

وَفِي رِوَايَةٍ لَهُ إِنَّ ذَلِكَ فِي صَلاَةِ اللَّيْلِ.

اور مسلم ہی کی ایک روایت میں ہے کہ آپؐ یہ رات کی نماز (تہجد) میں پڑھا کرتے تھے۔

لغوی تشریح: ﴿ اذا قام الی الصلاة ﴾ جب نماز کیلئے کھڑے ہوتے سے' مراد ہے تکبیر تحریمہ کے بعد دعائے افتتاح کے طور پر پڑھتے۔ ﴿ وجهت ﴾ توجیہ سے ماخوذ ہے۔ میں نے چہرہ پھیرلیا ﴿ فطر ﴾ خلق کے معنی میں (پیدا کیا) ﴿ من المسلمین ﴾ تک اس بارے میں دو روایتیں مروی ہیں۔ ایک روایت میں ﴿ انا اول المسلمین ﴾ ہے۔ میں پہلا مسلمان (مطیع فرمان بندہ) ہوں۔ آیت قرآنی میں مذکور لفظ ﴿ وانا اول المسلمین ﴾ سے الفاظ کے لحاظ سے اور دوسرا ﴿ انا من المسلمین ﴾ معنیٰ کا لحاظ رکھتے ہوئے۔ مصنف نے اسی جانب اشارہ کیا ہے۔ تمام آیت اس طرح ہے ﴿ انی وجهت وجهی للذی فطر السموات والارض حنیفا وما انا من المشرکین۔ ان صلاتی و نسکی و محیای و مماتی لله رب العالمین لا شریک له' وبذلک امرت وانا اول المسلمین (٦: ٧٩' ١٦٢' ١٦٣) ﴿ الی آخره ﴾ سے مراد اس مشہور و معروف دعا کے اختتام تک۔ پوری دعا کا ترجمہ اس طرح ہے: "میں نے اپنا رخ اس ذات اقدس کی جانب کر لیا جو آسمانوں اور زمین کی خالق ہے' یکسو ہو کر اور میں مشرکین میں سے نہیں ہوں۔ یقیناً میری نماز' میری ہر عبادت' میرا جینا مرنا بھی اسی اللہ کیلئے ہے جو تمام جہانوں کا مالک و پروردگار ہے۔ اس کا کوئی شریک نہیں (ذات' صفات' حقوق و اختیارات میں) اسی کا مجھے حکم دیا گیا ہے اور میں مطیع فرمان بندوں میں سے ہوں۔ اے اللہ! تو ہی بادشاہ ہے۔ تیرے سوا کوئی آقا و مالک نہیں۔ تو ہی میرا آقا و پروردگار ہے اور میں تیرا بندہ و غلام ہوں۔ میں نے (یقیناً) اپنی جان پر ظلم کیا اور میں نے اپنے گناہ کا اعتراف کیا۔ لہٰذا میرے سارے (ہی) گناہ بخش دے (حقیقت بھی یہی ہے) کہ تیرے سوا کوئی بھی دوسرا گناہ بخش نہیں سکتا۔ مجھے عمدہ اور اچھے اخلاق کی طرف راہنمائی فرما۔ تیرے سوا بہترین اخلاق کی راہ کوئی دوسرا نہیں دکھا سکتا۔ مجھ سے میری بری خصلتیں ہٹا دے اور حقیقت ہے بھی یہی کہ تیرے سوا برے اخلاق کو ہٹا بھی کوئی نہیں سکتا۔ بار بار تیرے حضور حاضر ہوں اور تیرا فرمانبردار ہوں۔ بھلائی ساری کی ساری تیرے قبضہ قدرت میں ہے اور برائی تیری جانب رجوع نہیں کر سکتی۔ میں تیرے ساتھ اور تیری

جانب ہوں۔ تو ہی بہت برکت والا اور بہت بلندی و برتری والا ہے۔ بخشش و خطا بخشی کا تجھی سے طلبگار ہوں اور توبہ کی صورت میں تیری جناب میں رجوع کرتا ہوں۔ اسے مسلم نے روایت کیا ہے اور مسلم کی ایک دوسری روایت میں ہے کہ یہ دعا رات کی نماز (تہجد) میں پڑھتے تھے۔

مشہور محقق و محدث مولانا عبدالرحمٰن مبارک پوری نے ترمذی کی شرح تحفۃ الاحوذی (ج:۱' ص: ۲۰۳) پر اس حدیث پر عالمانہ گفتگو کی ہے۔ وہ بیان کرتے ہیں کہ یہ حدیث مسلم شریف کے باب صلاۃ اللیل میں دو طریق سے منقول ہے۔ ان دونوں طرق سے مروی روایت میں کسی میں بھی یہ نہیں ہے کہ یہ دعا آپؐ رات کی نماز میں پڑھتے تھے۔ نیز اس حدیث کو ترمذی نے ابواب الدعوات میں تین طرق سے روایت کیا ہے۔ تینوں میں سے کسی میں بھی یہ نہیں ہے کہ یہ دعا آپؐ نماز شب میں پڑھتے تھے۔ بلکہ اس کے برعکس ایک روایت میں ہے کہ جب آپؐ فرض نماز کی ادائیگی کیلئے کھڑے ہوتے (تو اس موقع پر یہ دعا پڑھتے) اور ابوداؤد نے اپنی سنن کی کتاب الصلوٰۃ میں بھی دو طریق سے روایت نقل کی ہے۔ ان میں سے کسی میں بھی یہ نہیں ہے کہ یہ دعا آپؐ رات کی نماز میں مانگتے تھے بلکہ ان میں سے ایک تو یہ ہے کہ آپؐ جب فرض نماز کی ادائیگی کیلئے کھڑے ہوتے تو اس وقت یہ دعا مانگتے اور دار قطنی کی ایک روایت میں ہے جب آپؐ فرض نماز کا آغاز فرماتے تو اس وقت وجھت وجھی الخ پڑھتے۔ امام شوکانی رحمہ اللہ نے اپنی مشہور و معروف کتاب نیل الاوطار میں کہا ہے کہ ابن حبان نے بھی اسی طرح اس حدیث کی تخریج کی اور اتنا اضافہ نقل کیا ہے کہ جب آپؐ فرض نماز کیلئے کھڑے ہوتے اور اسی طرح امام شافعی رحمہ اللہ نے بھی اسے روایت کیا ہے' انہوں نے فرض نماز کی قید لگائی ہے۔ ان دونوں کے علاوہ دوسروں نے بھی اسی طرح کہا۔ یہ قول کہ یہ دعا نفلی نماز کے ساتھ مخصوص ہے اور فرض نماز میں مشروع نہیں بالکل ہی باطل ہے۔

حاصل کلام: اس ضروری تفصیل سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ یہ دعا فرض نماز کے آغاز پر کرنا مسنون ہے۔ تلخیص میں یہ نہیں۔ سبل السلام میں تلخیص کا حوالہ ہے مگر صحیح نہیں۔

(۲۱۳) وَعَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: كَانَ رَسُولُ اللهِ ﷺ إِذَا كَبَّرَ لِلصَّلاَةِ سَكَتَ هُنَيْهَةً قَبْلَ أَنْ يَقْرَأَ، فَسَأَلْتُهُ، فَقَالَ: أَقُولُ: «**اللَّهُمَّ بَاعِدْ بَيْنِي وَبَيْنَ خَطَايَايَ، كَمَا بَاعَدْتَ بَيْنَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ، اللَّهُمَّ نَقِّنِي مِنْ خَطَايَايَ، كَمَا يُنَقَّى الثَّوْبُ الأَبْيَضُ مِنَ الدَّنَسِ، اللَّهُمَّ**

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کا معمول تھا کہ تکبیر تحریمہ کے بعد تھوڑا سا وقفہ فرماتے پھر قرأت شروع کرتے (ایک روز) میں نے عرض کیا یارسول اللہ (ﷺ)! وقفہ کے دوران آپؐ کیا پڑھتے ہیں؟ فرمایا "اللھم باعد بینی وبین خطایای الخ پڑھتا ہوں۔ اے اللہ! میرے اور میرے گناہوں کے مابین اتنا فاصلہ اور دوری فرما دے کہ جتنا مشرق و مغرب کے درمیان فاصلہ ہے۔ اے اللہ! مجھے گناہوں اور خطاؤں سے

اغْسِلْنِي مِنْ خَطَايَايَ بِالمَاءِ وَالثَّلْجِ وَالبَرَدِ». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

اس طرح صاف فرما دے کہ جس طرح سفید کپڑا میل کچیل سے صاف کیا جاتا ہے۔ اے اللہ! میرے گناہوں کو پانی' برف.اولوں سے دھو ڈال"۔ (بخاری و مسلم)

لغوی تشریح: ﴿ هنيهة ﴾ "ھاء" پر ضمہ۔ "نون" پر فتحہ "یاء" ساکن۔ ھاء پر فتحہ۔ تھوڑا سا وقفہ ﴿ نقني ﴾ "نون" پر فتحہ۔ "قاف" پر تشدید نیچے کسرہ۔ تنقیۃ سے امر کا صیغہ ہے۔ پاک و صاف کر دے ﴿ ينقى ﴾ صیغہ مجہول ﴿ الدنس ﴾ دال اور نون پر فتحہ' میل کچیل۔ ﴿ الثلج ﴾ "ثاء" پر فتحہ' لام ساکن۔ بخار جو فضا میں سردی کے درجہ انجماد تک پہنچنے کی وجہ سے منجمد ہو جاتا ہے اور سفید روئی کی طرح ہو کر زمین پر گرتا ہے (جسے برف کہتے ہیں) ﴿ والبرد ﴾ "باء" اور "راء" دونوں پر فتحہ ہے۔ بادلوں کا پانی جو سرد ہوا میں جم کر اولوں کی صورت میں زمین پر گرتے ہیں۔

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ تکبیر تحریمہ کے بعد قرأت سے پہلے قدرے وقفہ ہے اور اس میں یہ دعا پڑھنی مسنون ہے۔ نیز اس سے یہ بات بھی معلوم ہوئی کہ دعائے افتتاح بلند آواز سے نہیں بلکہ آہستہ پڑھنی چاہئے۔

(٢١٤) وَعَنْ عُمَرَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، أَنَّهُ كَانَ يَقُوْلُ: «سُبْحَانَكَ اللَّهُمَّ، وَبِحَمْدِكَ، وَتَبارَكَ اسْمُكَ، وَتَعالَى جَدُّكَ، وَلاَ إِلَه غَيْرُكَ». رَوَاهُ مُسْلِمٌ بِسَنَدٍ مُنْقَطِعٍ، وَالدَّارَقُطْنِيُّ مَوْصُولاً، وَهُوَ موقُوفٌ.

حضرت عمر رضی اللہ عنہ (وقفہ کے دوران میں) سبحانك اللهم وبحمدك الخ پڑھتے تھے اے اللہ! تو پاک ہے (ہر عیب اور ہر نقص سے) سب تعریفیں تیرے ہی لئے ہیں۔ بابرکت ہے تیرا نام اور بلند ہے تیری شان اور تیرے سوا کوئی معبود نہیں۔ (اسے مسلم نے منقطع اور دار قطنی نے موصول روایت کیا ہے اور یہ موقوف ہے۔

وَنَحْوُهُ عَنْ أَبِي سَعِيْدٍ الخُدْرِيِّ مَرْفُوعاً عِندَ الخَمْسَةِ، وَفِيْهِ: وَكَانَ يَقُولُ بَعْدَ التَّكْبِيْرِ: «أَعُوذُ بِاللهِ السَّمِيْعِ العَلِيْمِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيْمِ مِنْ هَمْزِهِ، وَنَفْخِهِ، وَنَفْثِهِ».

احمد' ابوداؤد' ترمذی' نسائی اور ابن ماجہ پانچوں نے حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ کے حوالہ سے اسی طرح روایت کیا ہے اور اس میں یہ بھی ذکر ہے کہ تکبیر تحریمہ کے بعد تعوذ یعنی اعوذ بالله السميع العليم من الشيطان الرجيم من همزه ونفخه و نفثه پڑھتے تھے "میں اللہ سمیع و علیم کی شیطان مردود سے پناہ لیتا ہوں اس کے وسوسوں سے' اس

کے پھونکنے سے یعنی کبر و نخوت سے اور اس کے
اشعار اور جادو سے"۔

لغوی تشریح: ﴿ وبحمدك ﴾ تیری حمد کے ساتھ تیری حمد و ستائش کرتا ہوں ﴿ وتعالی جدك ﴾ تیری عظمت و کبریائی بلند و بالا ہے۔ ﴿ موصولاً ﴾ یعنی یہ حدیث متصل سند کے ساتھ مروی ہے کسی قسم کا انقطاع نہیں ہے۔ ﴿ وھو ﴾ یعنی دار قطنی کی یہ حدیث موقوف ہے مرفوع نہیں اور ﴿ نحوہ ﴾ یعنی حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث کی طرح ﴿ وفیہ ﴾ حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ کی روایت میں الرجیم مردود' ذلیل' دھتکارا ہوا ﴿ من ھمزہ ﴾ اس کے جنون سے یعنی اس سے اللہ کی پناہ کہ وہ کسی کو مجنون بنا دے۔ اس سے شیطان کی وسوسہ اندازی مراد ہے ﴿ ونفخہ ﴾ اس کے تکبر سے یعنی اس تکبر و نخوت سے اللہ کی پناہ جو وہ لوگوں کے دماغوں میں بھر دیتا ہے اور وہ لوگ اپنے آپ کو دوسروں کے مقابلہ میں برتر اور بڑا سمجھنے لگتے ہیں گویا ان کے دماغوں میں کبر و غرور کی ہوا بھر دیتا ہے ﴿ ونفثہ ﴾ یعنی شعرہ۔ اس کے اشعار سے اللہ کی پناہ۔ اس سے وہ مذموم اشعار مراد ہیں جن کو وہ لوگوں کے دماغوں میں ڈالتا ہے اور جادو بھی اس سے مراد ہے۔ ان تینوں کلمات کا پہلا حرف مفتوح اور دوسرا ساکن ہے۔

حاصل کلام: تکبیر تحریمہ کے بعد سورۂ فاتحہ سے پہلے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے اللھم باعد الخ والی دعا ثابت ہے۔ بعض روایات کے مطابق انی وجھت وجھی والی دعا اور سبحانك اللھم الخ دونوں کو جمع بھی کیا جا سکتا ہے سبحانك اللھم والی حدیث اگرچہ موقوف ہے' مگر حضرت عمر رضی اللہ عنہ ایسے جلیل القدر صحابی اسے بطور تعلیم بلند آواز سے پڑھتے تھے اور دوسرے لوگوں کو سکھاتے تھے اس لئے یہ حکماً مرفوع ہے۔ امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے اسی کو اختیار کیا ہے۔ نیز سورۂ فاتحہ کے شروع کرنے سے پہلے قرآن مجید کی موافقت کرتے ہوئے اعوذ باللہ ...... الخ کے پڑھنے کا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم فرمایا ہے اس لئے تعوذ پڑھنا ضروری ہے۔

(٢١٥) وَعَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهَا قَالَتْ: كَانَ رَسُولُ اللهِ ﷺ يَسْتَفْتِحُ الصَّلاَةَ بِالتَّكْبِيْرِ، وَالقِرَاءَةَ بِـ«الحَمْدُ لِلَّهِ رَبِّ العَالَمِينْ»، وَكَانَ إِذَا رَكَعَ لَمْ يُشْخِصْ رَأْسَهُ وَلَمْ يُصَوِّبْهُ، وَلٰكِنْ بَيْنَ ذَلِكَ؛ وَكَانَ إِذَا رَفَعَ رَأْسَهُ مِنَ الرُّكُوعِ لَمْ يَسْجُدْ حَتَّى يَسْتَوِيَ قَائِماً، وَإِذَا رَفَعَ رَأْسَهُ مِنَ السُّجُودِ لَمْ يَسْجُدْ حَتَّى يَسْتَوِيَ

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا روایت کرتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نماز کا آغاز اللہ اکبر سے کیا کرتے تھے اور قرأت الحمد للہ رب العالمین (سورہ فاتحہ) سے شروع کرتے اور جب رکوع کرتے تو اپنا سر مبارک نہ اونچا کرتے اور نہ نیچا کرتے بلکہ اس کے درمیان کی حالت میں رکھتے اور جب رکوع سے سر اٹھاتے تو اس وقت تک سجدہ میں نہ جاتے جب تک کہ بالکل سیدھے کھڑے نہ ہو جاتے اور جب سجدہ سے سر اٹھاتے تو دوسرا سجدہ اس وقت تک نہ کرتے جب

جَالِساً ، وَكَانَ يَقُولُ فِيْ كُلِّ رَكْعَتَيْنِ التَّحِيَّةَ ، وَكَانَ يَفْرِشُ رِجْلَهُ الْيُسْرَى ، وَيَنْصِبُ الْيُمْنَى ، وَكَانَ يَنْهَى عَنْ عُقْبَةِ الشَّيْطَانِ ، وَيَنْهَى أَنْ يَفْتَرِشَ الرَّجُلُ ذِرَاعَيْهِ افْتِرَاشَ السَّبُعِ ، وَكَانَ يَخْتِمُ الصَّلاَةَ بِالتَّسْلِيمِ . أَخْرَجَهُ مُسْلِمٌ، وَلَهُ عِلَّةٌ.

تک کہ ٹھیک آرام سے بیٹھ نہ جاتے اور ہر دو رکعت کے بعد تشہد پڑھتے اور اپنے بائیں پاؤں کو زمین پر بچھا لیتے اور دائیں کو قائم رکھتے (کھڑا رکھتے) شیطان کی چوکڑی سے منع فرماتے اور درندوں کی طرح بازو آگے نکال کر بیٹھنے سے بھی منع فرماتے تھے اور نماز کو سلام کے ساتھ ختم کرتے۔ (مسلم۔ اس کی سند معلول ہے)

لغوی تشریح: ﴿ یستفتح ﴾ آغاز فرماتے' شروع کرتے' ابتدا کرتے ﴿ والقراۃ ﴾ منصوب ہے۔ اس صورت میں معنی ہوگا کہ قرأت شروع فرماتے ﴿ لم یشخص ﴾ اشخاص سے ماخوذ ہے (باب افعال) اونچا نہ اٹھاتے ﴿ ولم یصوبه ﴾ تصویب سے ماخوذ ہے (باب تفعیل سے) یعنی بہت زیادہ نیچے نہ جھکاتے ﴿ بین ذلک ﴾ یعنی ان دونوں کیفیتوں (اونچ' نیچ) کے مابین رکھتے۔ ﴿ فی کل رکعتین ﴾ یعنی دونوں رکعتوں کے بعد ﴿ التحیۃ ﴾ یقول کا مفعول واقع ہو رہا ہے۔ یعنی تشہد ہے ﴿ التحیات للہ ﴾ الخ پڑھتے اور ﴿ وکان یفرش رجلہ الیسری ﴾ اپنا بایاں پاؤں زمین پر بچھا لیتے یعنی اس پر بیٹھ جاتے۔ یہ کیفیت دو سجدوں کے مابین اور پہلے تشہد کے موقع پر رکھتے جیسا کہ ابوحمید ساعدی رضی اللہ عنہ سے مروی روایت میں اس کی وضاحت ہے ﴿ وعقبۃ الشیطان ﴾ عین پر ضمہ اور قاف ساکن (شیطان کی چوکڑی) اسے اقعاء الکلب بھی کہتے ہیں اس کی صورت یہ ہوتی ہے کہ آدمی اپنی سرین کو زمین پر رکھے' گھٹنے اور پنڈلیاں کھڑی کر لے اور اپنے دونوں ہاتھ زمین پر رکھ لے۔ اقعاء کی ایک تعریف یہ بھی کی گئی ہے کہ وہ یہ ہے کہ اپنے دونوں پاؤں کھڑے رکھے اور زمین پر بیٹھ جائے۔ یہ ممنوع نہیں ہے۔ آخری تشہد کے علاوہ ﴿ افتراش السبع ﴾ سبع سین پر فتحہ اور "با" پر ضمہ۔ درندوں کے پھیلانے کی طرح اور درندوں کا بیٹھنا اسی طرح ہے کہ اپنی سرین پنڈلیوں پر بچھا کر بیٹھے اور اپنے ہاتھ آگے پھیلا کر ان پر جھک جائے۔ ایک روایت میں لفظ الکلب مذکور ہے السبع کی بجائے ﴿ ولہ علۃ ﴾ علۃ اس روایت میں یہ ہے کہ ابوالجوزاء نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے اس کو روایت کیا اور ابوالجوزاء کا حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے سماع ہی ثابت نہیں۔ اس وجہ سے اس حدیث کو معلول قرار دیا گیا ہے۔

(٢١٦) وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُمَا ، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ كَانَ يَرْفَعُ يَدَيْهِ حَذْوَ مَنْكِبَيْهِ إِذَا افْتَتَحَ الصَّلاَةَ وَإِذَا كَبَّرَ لِلرُّكُوعِ ، وَإِذَا رَفَعَ

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ نبی ﷺ جب نماز کا آغاز فرماتے تو اپنے دونوں ہاتھ کندھوں کے مقابل تک اٹھاتے اور جب رکوع کیلئے اللہ اکبر کہتے تو بھی اور جب رکوع سے سر اٹھاتے تب بھی اپنے دونوں ہاتھ کندھوں کے مقابل تک اٹھاتے۔

رَأْسَهُ مِنَ الرُّكُوعِ. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

(رفع الیدین کرتے) (بخاری و مسلم)

وَفِي حَدِيْثِ أَبِي حُمَيْدٍ عِنْدَ أَبِي دَاوُدَ يَرْفَعُ يَدَيْهِ حَتَّى يُحَاذِيَ بِهِمَا مَنْكِبَيْهِ، ثُمَّ يُكَبِّرُ.

اور ابوداؤد میں ابوحمید سے مروی حدیث میں ہے کہ اپنے دونوں ہاتھوں کو کندھوں کے برابر اٹھاتے پھر اللہ اکبر (تکبیر) کہتے۔

وَلِمُسْلِمٍ عَنْ مَالِكِ بْنِ الْحُوَيْرِثِ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ. نَحْوَ حَدِيْثِ ابْنِ عُمَرَ، لَكِنْ قَالَ: حَتَّى يُحَاذِيَ بِهِمَا فُرُوْعَ أُذُنَيْهِ.

اور مسلم میں مالک بن حویرث رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں بھی اسی طرح منقول ہے، جس طرح ابن عمر رضی اللہ عنہما کی روایت میں ہے لیکن اس میں "کندھوں کے مقابل" کی جگہ اپنے کانوں کے مقابل تک اٹھاتے مذکور ہے۔

لغوی تشریح: ﴿ یحاذی ﴾ یقابل کے معنی یعنی بالمقابل ﴿ ثم یکبر ﴾ افتتاح صلاۃ کے وقت پہلے دونوں ہاتھ کندھوں کے مقابل اٹھاتے پھر اللہ اکبر کہتے۔ اس کے برعکس پہلے تکبیر پھر رفع الیدین اور تکبیر کے ساتھ ہی رفع الیدین کا ذکر بھی حدیث سے ثابت ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ اس فعل میں یہ وسعت ہے۔ ابوحمید ساعدی رضی اللہ عنہ کی روایت جسے ابوداؤد نے روایت کیا ہے اور مصنف نے اسی پر انحصار کیا ہے۔ اس میں رکوع کے موقع پر اور رکوع سے اٹھتے وقت کا بھی ذکر ہے۔ ﴿ نحو حدیث ابن عمر ﴾ یعنی جس طرح ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی روایت میں تین مواقع پر رفع الیدین ثابت ہے ﴿ فروع اذنیہ ﴾ کانوں کے اطراف۔ یہ اس روایت کے مخالف ہے جس میں رفع الیدین کندھوں تک کرنے کا ذکر ہے۔ دونوں روایتوں میں تطبیق و موافقت اس طرح ہے کہ ہاتھوں کی ہتھیلیاں تو کندھوں کے برابر اور انگلیوں کے پورے کانوں کے مقابل تک اٹھائے جائیں۔ یہ تطبیق اچھی ہے اور اس سے بہتر یہ ہے کہ اسے بھی توسع پر محمول کیا جائے کہ کبھی کانوں کے برابر اور کبھی کندھوں کے برابر اٹھاتے۔

حاصل کلام: ان احادیث سے ثابت ہوتا ہے کہ تکبیر تحریمہ، رکوع کو جاتے اور رکوع سے سر اٹھاتے ہوئے رفع الیدین مسنون ہے۔ بعض احادیث میں دو رکعتوں کے بعد تیسری رکعت کی ابتدا میں بھی رفع الیدین ثابت ہے۔ اکثر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور تابعین عظام رحمہم اللہ کا اسی پر عمل ہے۔ امام شافعی رحمہ اللہ، احمد رحمہ اللہ، ابوثور رحمہ اللہ، ابن مبارک رحمہ اللہ، اسحٰق بن راہویہ رحمہ اللہ اور صحیح روایت کے مطابق امام مالک رحمہ اللہ سے بھی یہی منقول ہے۔ بلکہ زاد المعاد اور التلخیص الحبیر وغیرہ میں مروی روایات سے ثابت ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تادم زیست رفع الیدین کرتے رہے۔ خلفائے راشدین بلکہ باقی عشرہ مبشرہ سے بھی رفع الیدین کرنا ثابت ہے۔ اس کے برعکس رفع الیدین نہ کرنے کی کوئی روایت صحیح سند سے ثابت نہیں۔ جس کی تفصیل فتح الباری، التلخیص الحبیر اور "جلاء العینین فی تخریج روایات البخاری فی جزء رفع الیدین" وغیرہ میں دیکھی جا سکتی ہے۔ حضرت وائل بن حجر رضی اللہ عنہ کی شہادت اس مسئلہ میں اس بات کی دلیل ہے کہ رفع الیدین پر

نبی کریم ﷺ کا ہمیشہ عمل رہا۔

چنانچہ فتویٰ ہے کہ وائل بن حجر رضی اللہ عنہ غزوۂ تبوک کے بعد ۹ھ میں دائرۂ اسلام میں داخل ہوئے (البدایہ والنہایہ' ج ۵ ص: ۷۵۔ شرح العینی علی صحیح البخاری ج ۹' ص: ۴۳)

آئندہ سال جب دوبارہ آپ ؐ کی خدمت اقدس میں حاضر ہوئے تو وہ سخت سردی کا موسم تھا۔ انہوں نے صحابہ کرام ؓ کو کپڑوں کے نیچے سے رفع الیدین کرتے دیکھا' یہ ۱۰ھ کے آخری مہینے تھے۔ اس کے بعد ۱۱ھ میں سرور دوعالم ﷺ کا انتقال ہوا۔ اس سے معلوم ہوا کہ آپ ؐ کی زندگی کے آخری حصے تک رفع الیدین کرتے رہے۔ نہ یہ عمل منسوخ ہوا نہ اس پر عمل متروک ہوا۔ اکثر صحابہ کرام ؓ بلکہ کوفہ کے علاوہ باقی تمام بلاد اسلامیہ میں اس پر عمل رہا۔ فقہائے اسلام کی اکثریت نے اس کو پسند کیا ہے۔ (بخاری و مسلم کے علاوہ مندرجہ ذیل کتب میں بھی یہ حدیث موجود ہے: سنن ابی داوٗد' جامع ترمذی' سنن نسائی' سنن ابن ماجہ' سنن دارمی' موطا امام مالک' مصنف عبدالرزاق' المصنف لابن ابی شیبہ' مسند احمد' صحیح ابن خزیمہ' صحیح ابن حبان' مسند ابی عوانہ' سنن دارقطنی' سنن کبریٰ' للبیہقی وغیرہ۔)

(۲۱۷) وَعَنْ وَائِلِ بْنِ حُجْرٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: صَلَّيْتُ مَعَ النَّبِيِّ ﷺ، فَوَضَعَ يَدَهُ الْيُمْنَى عَلَى يَدِهِ الْيُسْرَى عَلَى صَدْرِهِ. أَخْرَجَهُ ابْنُ خُزَيْمَةَ.

حضرت وائل بن حجر رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ میں نے نبی کریم ﷺ کے ساتھ نماز ادا کی آپ ؐ نے اپنا دایاں ہاتھ اپنے بائیں ہاتھ پر رکھ کر سینے پر باندھ لئے۔ (ابن خزیمہ)

حاصل کلام: اس حدیث سے دو مسئلوں پر روشنی پڑتی ہے۔ پہلا مسئلہ تو یہ کہ نماز میں ہاتھ باندھ کر دست بستہ کھڑا ہونا مسنون ہے اور ہاتھ کھلے چھوڑنا غیر مسنون۔ شوافع' احناف اور حنابلہ سب اس پر متفق ہیں کہ نماز میں ہاتھ باندھنا ہی سنت رسول مقبول ﷺ ہے۔ علامہ ابن عبدالبر نے لکھا ہے کہ نبی کریم ﷺ سے اس کے خلاف نہیں آیا۔ جمہور صحابہ اور تابعین کا یہی قول ہے۔ ابن المنذر وغیرہ نے امام مالک رحمہ اللہ سے اس کے سوا دوسرا کوئی قول نقل نہیں کیا بلکہ مؤطا امام مالک میں بھی ہاتھ باندھنے کی روایت موجود ہے تو پھر روایت پر عمل کرنا چاہئے۔ اس کے برعکس امام مالک رحمہ اللہ سے جو ہاتھ چھوڑنے کا ذکر ہے' وہ شاذ ہے' صحیح نہیں۔

اب رہا یہ مسئلہ کہ ہاتھ باندھے کہاں جائیں سینے پر یا زیر ناف۔ بعض حضرات زیر ناف باندھتے ہیں' مگر زیر ناف ہاتھ باندھنے والی حدیث ضعیف ہے' صحیح نہیں۔ متذکرہ بالا حدیث کو ابن خزیمہ نے اپنی الصحیح میں لکھا ہے جس کی تائید مسند احمد میں حضرت ہلب کی حدیث سے ہوتی ہے کہ آنحضرت ﷺ اپنے ہاتھ سینے پر باندھتے تھے اور ایک روایت میں فوق السرۃ کے الفاظ بھی منقول ہیں۔ تحت السرۃ کے مقابلہ میں فوق السرۃ والی روایت وزنی ہے اور اہلحدیث علماء کرام کے نزدیک قوی دلائل کی روشنی میں سینے پر ہاتھ

باندھنا ہی راجح ہے اور تحت السرۃ یعنی زیر ناف والی حدیث ضعیف ہے' قابل اعتبار نہیں۔

راوی حدیث : ﴿ وائل بن حجر رضی اللہ عنہ ﴾ ان کی کنیت ابوھنیدہ یا ابوھندہ ہے۔ حجر "حا" پر ضمہ اور جیم ساکن۔ جلیل القدر صحابی تھے۔ حضر موت کے بادشاہوں میں سے تھے۔ جب یہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں اپنے وفد کے ساتھ حاضر ہوئے تو آپ ؐ نے (ان کے اعزاز میں) اپنی چادر مبارک ان کے بیٹھنے کیلئے بچھا دی اور ان کیلئے اور ان کی اولاد کے حق میں برکت کی دعا فرمائی۔ حضر موت کے قبائل پر ان کو عامل مقرر فرمایا۔ کوفہ میں سکونت پذیر ہوئے اور خلافت معاویہ ؓ کے دور میں وفات پائی۔

(۲۱۸) وَعَنْ عُبَادَةَ بْنِ الصَّامِتِ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «**لاَ صَلاَةَ لِمَنْ لَمْ يَقْرَأْ بِأُمِّ الْقُرْآنِ**». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا "جس نے (نماز میں) ام القرآن نہ پڑھی اس کی کوئی نماز نہیں۔" (بخاری و مسلم)

وَفِي رِوَايَةٍ لاِبْنِ حِبَّانَ وَالدَّارَقُطْنِيِّ: «**لاَ تُجْزِىءُ صَلاَةٌ لا يُقْرَأُ فِيهَا بِفَاتِحَةِ الْكِتَابِ**».

ابن حبان اور دار قطنی میں روایت ہے کہ "جس نماز میں سورۂ فاتحہ نہ پڑھی گئی ہو وہ نماز کافی نہیں ہوتی۔"

وَفِي أُخْرَى لِأَحْمَدَ وَأَبِي دَاوُدَ وَالتِّرْمِذِيِّ وَابْنِ حِبَّان: «**لَعَلَّكُمْ تَقْرَءُونَ خَلْفَ إِمَامِكُمْ؟**» قُلْنَا نَعَمْ؛ قَالَ: «**لاَ تَفْعَلُوا إِلاَّ بِفَاتِحَةِ الْكِتَابِ، فَإِنَّهُ لاَ صَلاَةَ لِمَنْ لَّمْ يَقْرَأْ بِهَا**.»

احمد' ابوداؤد' ترمذی' ابن حبان کی ایک دوسری روایت میں ہے کہ "شاید تم لوگ امام کے پیچھے (کچھ) پڑھتے ہو' ہم نے عرض کیا جی ہاں (پڑھتے ہیں) فرمایا ایسا نہ کیا کرو بجز سورۂ فاتحہ کے۔ اس لئے کہ جس نے اسے نہ پڑھا اس کی (تو) نماز ہی نہیں۔"

لغوی تشریح : ﴿ بام القرآن ﴾ ام القرآن سے مراد سورۂ فاتحہ ہے۔ یہ حدیث سورۂ فاتحہ کے (نماز میں) پڑھنے کی فرضیت پر دلالت کرتی ہے اس لئے کہ "لام" نافیہ جس پر آتا ہے اس سے ذات کی نفی مراد ہوتی ہے اور یہ اس کا حقیقی معنی ہے۔ یہ صفات کی نفی کیلئے اس وقت آتا ہے جب ذات کی نفی مشکل اور دشوار ہو اور اس حدیث میں ذات کی نفی کوئی مشکل نہیں ہے کیونکہ نماز کا شرعاً معنی تو یہ ہے کہ وہ اقوال اور افعال کا مجموعہ ہے لہٰذا بعض یا کل کی نفی سے اس کی نفی ہوگی۔ اگر بالفرض ذات کی نفی میں دشواری پیش آئے تو پھر حقیقت کے قریب والی صفت پر محمول کیا جائے گا مثلاً اس کی صحت کی نفی اور اس کے کافی ہونے کی نفی۔ اس معنی کی تائید حدیث میں وارد الفاظ ﴿ لا تجزی صلاۃ ﴾ سے ہوتی ہے اس کے معنی ہوئے کہ نہ نماز کافی ہوگی اور نہ صحیح۔ ابن حبان اور دار قطنی میں ہے کہ جب اس حدیث

سے نماز کی نفی اور اس کا صحیح نہ ہونا سورۂ فاتحہ کی قراءت پر منحصر ہے تو پھر معلوم ہوا کہ سورۂ فاتحہ پڑھنا فرض ہے اس میں سب شامل ہیں خواہ امام ہو یا مقتدی یا اکیلا نماز پڑھنے والا۔ سورۂ فاتحہ کا امام کے پیچھے پڑھنا واجب ہے اس پر امام احمد رحمۃ اللہ علیہ اور ابوداؤد رحمۃ اللہ علیہ کی روایت جسے مصنف نے بیان کیا ہے کھلی اور واضح دلیل ہے۔

حاصل کلام: یہ حدیث کھلا اور واضح ثبوت ہے کہ سورۂ فاتحہ پڑھے بغیر نماز نہیں ہوتی۔ امام ہو خواہ مقتدی یا اکیلا ہو۔ صحیح ترین مرفوع احادیث کی روشنی میں یہی مذہب حق اور مبنی بر صداقت ہے۔ شوافع' اہل حدیث اور اہل ظواہر اسی طرف گئے ہیں کہ ہر نمازی کو ہر رکعت میں سورۂ فاتحہ کا پڑھنا واجب ہے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور تابعین میں سے جمہور علماء کا یہی مسلک ہے کہ نماز کی ہر رکعت میں ہر ایک کیلئے اس کا پڑھنا واجب ہے۔ اس میں امام اور مقتدی کا کوئی فرق نہیں اور نہ ہی جہری اور سری کا۔ مسلم میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے کہ امام کے پیچھے بھی الحمد (سورۂ فاتحہ) کا پڑھنا لازمی اور لابدی ہے۔ ابوداؤد' ترمذی اور نسائی وغیرہ میں حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز کے بعد صحابہ رضی اللہ عنہم سے پوچھا کہ کیا تم امام کے پیچھے پڑھتے ہو؟ انہوں نے عرض کیا۔ جی ہاں! اس پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ الحمد (سورۂ فاتحہ) کے سوا اور کچھ نہ پڑھا کرو کیونکہ اس کے بغیر نماز ہی نہیں ہوتی اور احادیث سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ فاتحہ کے بغیر نماز قطعاً نہیں ہوتی۔

مولانا عبدالحی لکھنوی حنفی نے "ام الکلام" اور "التعلیق الممجد" میں کہا ہے کہ "کسی بھی صحیح حدیث سے فاتحہ خلف الامام کی ممانعت ثابت نہیں اور اس سلسلے میں جو نقل کیا جاتا ہے وہ صحیح نہیں۔ صحیح یہ ہے کہ سری نمازوں میں اور جہری کے سکتات میں مقتدی کو امام کے پیچھے سورۂ فاتحہ پڑھنی چاہئے۔ محدثین کی ایک جماعت کا یہی مذہب ہے۔" ان کے علاوہ متقدمین و متاخرین علمائے احناف کی ایک جماعت دلائل کی بناء پر فاتحہ خلف الامام کی قائل رہی ہے۔ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ' شاہ عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ اسی کے قائل تھے حتیٰ کہ مولانا رشید احمد گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ وغیرہ نے بھی سری نمازوں کے علاوہ جہری کے سکتات میں فاتحہ خلف الامام کو جائز قرار دیا ہے جس کی باحوالہ تفصیل توضیح الکلام جلد اول میں دیکھی جا سکتی ہے۔

راوی حدیث: ﴿عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ﴾ انصار کے قبیلہ خزرج کے فرد تھے۔ سرداران انصار میں نمایاں شخصیت کے حامل تھے۔ بیعت عقبہ اولیٰ اور ثانیہ دونوں میں شریک تھے۔ غزوۂ بدر کے ساتھ دوسرے معرکوں میں بھی شریک ہوئے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان کو شام کی طرف قاضی اور معلم بنا کر بھیجا۔ پہلے حمص میں قیام پذیر ہوئے بعد ازاں فلسطین کی طرف منتقل ہوگئے اور "رحلہ" میں وفات پائی اور بقول بعض ۳۴ھ میں ۷۲ برس کی عمر میں بیت المقدس میں فوت ہوئے۔

(۲۱۹) وَعَنْ أَنَسٍ رَضِيَ اللّٰهُ حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم ابوبکر

تَعَالَى عَنْهُ، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ وَأَبَا بَكْرٍ وَعُمَرَ كَانُوْا يَفْتَتِحُونَ الصَّلاَةَ بِـ«الحَمْدُ لِلَّهِ رَبِّ العَالَمِيْنَ» مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

اور عمر رضی اللہ عنہما سب نماز کا آغاز الحمد لله رب العالمین سے کرتے تھے۔ (بخاری و مسلم)

زَادَ مُسْلِمٌ: لاَ يَذْكُرُونَ «بِسْمِ اللهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ» فِي أَوَّلِ قِرَاءَةٍ وَلاَ فِي آخِرِهَا.

مسلم نے اتنا اضافہ بھی نقل کیا ہے۔ قراءت کے شروع اور آخر دونوں موقعوں پر بسم الله الرحمان الرحیم نہیں پڑھتے تھے۔

وَفِيْ رِوَايَةٍ لِأَحْمَدَ وَالنَّسَائِيِّ وَابْنِ خُزَيْمَةَ: لاَ يَجْهَرُوْنَ بِبِسْمِ اللهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيْمِ.

مسند احمد' نسائی اور ابن خزیمہ کی ایک روایت میں ہے کہ بسم الله الرحمان الرحیم کو جہری طور (اونچی آواز) پر نہیں پڑھتے تھے۔

وَفِيْ أُخْرَى لاِبْنِ خُزَيْمَةَ: «كَانُوا يُسِرُّونَ». وَعَلَى هَذَا يُحْمَلُ النَّفْيُ فِيْ رِوَايَةِ مُسْلِمٍ، خِلاَفاً لِمَنْ أَعَلَّهَا.

نیز ابن خزیمہ کی ایک دوسری روایت میں ہے کہ وہ بسم اللہ' آہستہ پڑھتے تھے اور اسی پر مسلم کی نفی کو محمول کیا جائے گا بخلاف ان لوگوں کے جنہوں نے اسے معلول کہا ہے۔

لغوی تشریح: ﴿ لا یذکرون بسم اللہ ﴾ بسم اللہ نہیں پڑھتے تھے۔ یہ فقرہ اس پر دلالت نہیں کرتا کہ آپ ؐ کے صحابہ کرام ؓ مطلقاً بسم اللہ الخ نہیں پڑھتے تھے۔ یہ تو صرف اس پر دلالت کرتا ہے کہ بسم اللہ الخ کو جہری (بآواز بلند) نہیں پڑھتے تھے۔ ﴿ یسرون ﴾ اسرار سے ماخوذ ہے۔ صحابہ کرام ؓ بسم اللہ بغیر آواز نکالے آہستہ آہستہ پڑھتے تھے ﴿ وعلی ھذا ﴾ بسم اللہ کو بے آواز یعنی سراً پڑھنے کی بنیاد پر۔ ﴿ یحمل ﴾ صیغہ مجہول۔ محمول کیا جائے گا ﴿ النفی ﴾ بسم اللہ کی نفی کو ﴿ فی روایۃ مسلم ﴾ مسلم کی وہ روایت جو ابھی الفاظ میں بیان کی گئی ہے ﴿ خلافا لمن اعلھا ﴾ یہ توجیہہ اس شخص کے خلاف ہے جو یہ کہتا ہے کہ مسلم میں بسم اللہ کی نفی کا جو اضافہ ہے یہ معلول ہے۔ پس وہ کہتا ہے کہ نفی کو حقیقی پر محمول کیا جائے گا لیکن اس کے معلول ہونے کی صورت میں اس سے دلیل نہیں پکڑی جا سکتی۔ علت دراصل یہ ہے کہ اوزاعی نے یہ اضافہ قتادہ کے واسطہ سے مکاتبتاً نقل کیا ہے حالانکہ یہ علت درست نہیں کیونکہ اوزاعی اس کے روایت کرنے میں تنہا نہیں ہے بلکہ ان کے علاوہ اور بھی اس کو روایت کرنے والے ہیں جن کی روایت صحیح ہے۔ لہذا نفی کی وہ تاویل صحیح ہے جو پہلے گزر چکی ہے۔ (تحفۃ الاحوذی ج ۱' ص : ۲۰۴)

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ رسول اللہ ﷺ سورۂ فاتحہ سے قرأت کا آغاز کرتے اور بسم اللہ آہستہ پڑھتے تھے۔ بعض روایات میں بسم اللہ اونچی آواز سے پڑھنے کا بھی ثبوت ہے اس لئے بسم اللہ

کو آہستہ اور اونچی آواز سے پڑھنا یعنی دونوں طرح جائز ہے تاہم اکثر اور صحیح تر روایات سے آہستہ پڑھنا ہی ثابت ہے۔ یہ موقف شارح بلوغ المرام نیز قاضی شوکانی وغیرہ اور علامہ مبارکپوری کے موقف کے خلاف ہے اور دلائل سے درست بھی نہیں۔ علی رضی اللہ عنہ کی حدیث میں اس کے برعکس لکھا گیا ہے۔

(۲۲۰) وَعَنْ نُعَيْمِ الْمُجْمِرِ قَالَ: صَلَّيْتُ وَرَاءَ أَبِيْ هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، فَقَرَأَ بِسْمِ اللهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيْمِ، ثُمَّ قَرَأَ بِأُمِّ الْقُرْآنِ، حَتَّى إِذَا بَلَغَ «وَلاَ الضَّآلِّيْنَ» قَالَ: آمِيْنَ. وَيَقُولُ كُلَّمَا سَجَدَ، وَإِذَا قَامَ مِنَ الْجُلُوسِ: اَللَّهُ أَكْبَرُ، ثُمَّ يَقُوْلُ إِذَا سَلَّمَ: وَالَّذِيْ نَفْسِيْ بِيَدِهِ إِنِّي لأَشْبَهُكُمْ صَلاَةً بِرَسُولِ اللهِ ﷺ. رَوَاهُ النَّسَائِيُّ وَابْنُ خُزَيْمَةَ.

حضرت نعیم المجمر رحمہ اللہ سے مروی ہے کہ میں نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی امامت میں نماز پڑھی تو انہوں نے پہلے بسم اللہ تلاوت فرمائی پھر بعد ازاں ام القرآن (سورۂ فاتحہ) پڑھی تاآنکہ آپ ولا الضالین پر پہنچ گئے اور آمین کہی۔ راوی کا بیان ہے کہ جب سجدہ کیا اور جب بیٹھنے کے بعد کھڑے ہوئے تو اللہ اکبر کہتے۔ پھر سلام پھیر کر فرمایا مجھے قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضۂ قدرت میں میری جان ہے! یقیناً میں تم سے نماز کی ادائیگی میں رسول اللہ ﷺ کے بہت مشابہ ہوں۔ (میری نماز رسول اللہ ﷺ کی نماز کے بہت مشابہ ہے) (نسائی ' ابن خزیمہ)

حاصل کلام: یہ حدیث بسم اللہ الخ اور آمین بالجہر کی مشروعیت پر دلالت کرتی ہے اس لئے کہ جو آدمی امام سے متصل صف سے پچھلی صف میں ہوگا اسے امام کی قرأت اور دعا اسی صورت میں سنائی دے گی کہ وہ بلند آواز سے پڑھے (ورنہ اسے سنائی نہیں دے گی) پھر بسم اللہ اور آمین کے بلند آواز سے کہنے میں اختلاف رائے ہے باعتبار دلیل قابل ترجیح بات یہی ہے کہ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کو آہستہ اور آمین بلند آواز سے کہی جائے۔ اکثر اوقات جہری نماز میں بسم اللہ آہستہ پڑھی گئی ہے اور کبھی جہری طور پر بھی۔

سورۂ فاتحہ کے اختتام و اتمام پر آمین کہنا بالاتفاق مسنون ہے خواہ امام ہو یا مقتدی یا تنہا۔ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے نزدیک آمین کہنا واجب ہے اور اسے چھوڑنے والا گنہگار ہے۔ آمین کے معنی ہیں "اے اللہ! میری دعا قبول فرما۔"

راوی حدیث: ﴿ نعیم المجمر رحمہ اللہ ﴾ ان کی کنیت ابوعبداللہ تھی۔ نعیم' نعم کی تصغیر ہے۔ مجمر میں میم پر ضمہ' جیم ساکن اور دوسرے میم کے نیچے کسرہ۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی آل کے آزاد کردہ غلام تھے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے حکم کی تعمیل کرتے ہوئے ہر جمعہ کو دوپہر کے بعد مسجد نبویؐ میں خوشبو کی دھونی دیا کرتے تھے۔ اسی وجہ سے ان کا نام مجمر مشہور ہوگیا۔ مشہور تابعی تھے۔ ابوحاتم' ابن معین' ابن سعد اور نسائی نے ان کو ثقہ قرار دیا ہے۔

(۲۲۱) وَعَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ ہی سے مروی ہے کہ رسول

تَعَالَی عَنْهُ قَالَ: قال رَسُولُ اللهِ ﷺ: «إِذَا قَرَأْتُمُ الفَاتِحَةَ فَاقْرَؤُا بِسْمِ اللهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ، فَإِنَّهَا إِحْدَى آيَاتِهَا». رَوَاهُ الدَّارَقُطْنِيُّ وَصَوَّبَ وَقْفَهُ.

اللہ ﷺ نے فرمایا "جب تم سورۂ فاتحہ پڑھو تو بسم اللہ الرحمٰن الرحیم بھی ساتھ ہی پڑھا کرو' اس لئے کہ وہ بھی سورۂ فاتحہ کی ایک آیت ہی ہے۔" (دارقطنی نے اس کا موقوف ہونا درست قرار دیا ہے)

لغوی تشریح: ﴿ صوب ﴾ تصویب سے ماخوذ ہے۔ حقیقت کو پہنچنے والی بات یہی ہے کہ یہ حدیث موقوف ہے۔ جب بسم اللہ فاتحہ کی آیت ہے تو یہ جہراً پڑھنے کی دلیل ہوئی جب فاتحہ جہراً پڑھی جائے تو یہ بھی جہراً پڑھی جائے۔

حاصل کلام: اس حدیث سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ بسم اللہ سورۂ فاتحہ کی ایک آیت ہے مگر یہ حدیث موقوف ہے جبکہ مسلم میں صحیح حدیث اس کے معارض ہے۔ جس میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اس سورۂ کو تقسیم کیا تو پہلا جزء الحمد للہ کو قرار دیا۔ بسم اللہ کو اس میں شمار نہیں کیا۔ واللہ اعلم۔

(۲۲۲) وَعَنْهُ قَالَ: كَانَ رَسُولُ اللهِ ﷺ إِذَا فَرَغَ مِنْ قِرَاءَةِ أُمِّ الْقُرْآنِ، رَفَعَ صَوْتَهُ وَقَالَ: آمِينَ. رَوَاهُ الدَّارَقُطْنِيُّ وَحَسَّنَهُ، وَالحَاكِمُ وَصَحَّحَهُ. وِلأَبِي دَاوُدَ وَالتِّرْمِذِيِّ مِنْ حَدِيثِ وَائِلِ بْنِ حُجْرٍ نَحْوُهُ.

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ جب ام القرآن (سورۂ فاتحہ) کی قراءت سے فارغ ہوتے تو آمین بلند آواز سے کہتے۔ (اسے دارقطنی نے روایت کیا ہے اور اسے حسن کہا ہے اور حاکم نے اسے صحیح قرار دیا ہے نیز ابوداؤد اور ترمذی میں وائل بن حجر رضی اللہ عنہ کی روایت بھی اسی طرح ہے)

حاصل کلام: اس حدیث میں ہے کہ سورۂ فاتحہ کی قرأت کے اختتام پر آپؐ باآواز بلند آمین کہتے تھے۔ مگر آمین بالجہر اور بالسر ایسا مسئلہ ہے جس میں اختلاف ہے۔ آمین کہنے میں کسی کا اختلاف نہیں۔ اختلاف جو کچھ ہے وہ بلند آواز یا آہستہ کہنے میں ہے۔ احناف آمین آہستہ کہنے کے قائل ہیں جبکہ دوسرے تین ائمہ' محدثین اور اہلحدیث بلند آواز سے آمین کہنے کے قائل ہیں۔

بہت سی صحیح احادیث سے آمین بالجہر کی تائید و توثیق ہوتی ہے چنانچہ ترمذی' ابوداؤد اور دارمی میں وائل بن حجر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے آمین کہی اور اپنی آواز کو دراز کیا اور ابوداؤد کے الفاظ ہیں کہ آپؐ نے آمین بلند آواز سے کہی۔ اس حدیث کو ترمذی نے حسن اور دارقطنی نے صحیح قرار دیا ہے اور حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے بھی اس کی سند کو صحیح کہا ہے۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے صحیح ابن حبان' دارقطنی' حاکم وغیرہ میں مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ جب ام القرآن کی قراۃ سے فارغ ہوتے تو اونچی آواز سے آمین کہتے۔ اس حدیث کو امام حاکم نے صحیح' امام بیہقی نے حسن صحیح کہا ہے اور امام دارقطنی نے اس کی سند کو حسن قرار دیا ہے اور امام ابن حبان اور ابن

خزیمہ نے اپنی کتاب "الصحیح" میں ذکر کیا ہے۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی ایک اور حدیث بھی گزر چکی ہے۔

صحیح ابن خزیمہ میں حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے ہے کہ وہ جب امام کے پیچھے نماز پڑھتے لوگ بھی آمین کہتے اور ابن عمر رضی اللہ عنہما بھی آمین کہتے اور اسے سنت سمجھتے تھے۔ ان کے شاگرد نافع فرماتے ہیں کہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما آمین نہیں چھوڑتے تھے بلکہ ہمیں آمین کہنے کی ترغیب دیتے تھے۔

حضرت عطاء بن ابی رباح جو کہ امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے مشہور استاد ہیں' کا بیان ہے کہ مکہ مکرمہ میں حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما بلند آواز سے آمین کہتے اور وہ لوگ بھی بلند آواز سے آمین کہتے جو انکے پیچھے تھے یہاں تک کہ مسجد گونج اٹھتی۔ امام بخاری نے اسے مطلقاً روایت کیا ہے۔ ابن ابی شیبہ' عبدالرزاق اور مسند الشافعی وغیرہ میں یہ صحیح سند سے مروی ہے۔

حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "یہود مسلمانوں سے تین باتوں کی بنا پر حسد کرتے ہیں سلام کے جواب پر صفوں کی درستگی اور امام کے پیچھے آمین کہنے پر۔" امام طبرانی نے الاوسط میں اسے بیان کیا ہے اور علامہ ہیثمی نے اس کی سند کو حسن قرار دیا ہے اسی طرح سنن ابن ماجہ میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "یہود تمہارے ساتھ کسی چیز پر اتنا حسد نہیں کرتے جتنا سلام اور آمین پر حسد کرتے ہیں۔" امام منذری رحمۃ اللہ علیہ نے اس کی سند کو صحیح قرار دیا ہے۔ یہ اور اسی نوعیت کی دیگر احادیث کی بنا پر امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ' امام احمد رحمۃ اللہ علیہ وغیرہ فرماتے ہیں کہ نماز میں جب امام سورۂ فاتحہ ختم کرے تو امام و مقتدی کو بلند آواز سے آمین کہنی چاہئے اور علمائے احناف کے مقتدر علماء نے بھی اس حقیقت کو تسلیم کیا ہے۔

امام ابن ہمام حنفی رحمۃ اللہ علیہ نے فتح القدیر شرح ہدایہ میں متوسط درجہ کی آواز سے آمین کہنے کو پسند فرمایا ہے۔ مدارج النبوۃ اور اشعۃ اللمعات میں شیخ عبدالحق محدث دہلوی نے کہا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جہری نمازوں میں بلند آواز سے آمین کہتے اور مقتدی بھی آپ ؐ کی موافقت کرتے اور جہراً آمین کہنے کی احادیث زیادہ اور بہت صحیح آئی ہیں۔ حضرت شاہ اسماعیل شہید رحمۃ اللہ علیہ نے بھی تنویر العینین میں کہا ہے کہ جہراً آمین کہنے کی احادیث اکثر اور واضح ہیں اور التعلیق الممجد میں مولانا عبدالحی لکھنوی لکھتے ہیں کہ انصاف کی بات تو یہی ہے کہ آمین زور سے کہنا دلیل کی روشنی میں قوی ہے اور یہی بات انہوں نے "سعایہ" میں فرمائی ہے بلکہ وہاں تو صاف طور پر اس کی بھی وضاحت کر دی ہے کہ "آہستہ آمین کہنے والی روایات ضعیف ہیں جو جہراً آمین کہنے والی روایات کا مقابلہ نہیں کر سکتیں"۔ اس اظہار حقیقت کے بعد ہم مزید کسی بات کی ضرورت محسوس نہیں کرتے۔

(۲۲۳) وَعَنْ عَبْدِ اللهِ بْنِ أَبِي أَوْفَى رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: جَاءَ رَجُلٌ إِلَى النَّبِيِّ ﷺ فَقَالَ: إِنِّي

حضرت عبداللہ بن ابی اوفیٰ رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ ایک آدمی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا کہ میں قرآن میں سے کچھ بھی یاد نہیں رکھ

لاَ أَسْتَطِيْعُ أَنْ آخُذَ مِنَ الْقُرْآنِ شَيْئاً، فَعَلِّمْنِي مَا يُجْزِئُنِي مِنْهُ، فَقَالَ: «قُلْ: سُبْحَانَ اللهِ، وَالحَمْدُ لِلَّهِ، وَلاَ إِلَهَ إِلاَّ اللَّهُ، وَاللَّهُ أَكْبَرُ، وَلاَ حَوْلَ وَلاَ قُوَّةَ إِلاَّ بِاللهِ العَلِيِّ العَظِيمِ» الحَدِيْثَ. رَوَاهُ أَحْمَدُ وَأَبُو دَاوُدَ وَالنَّسَائِيُّ، وَصَحَّحَهُ ابْنُ حِبَّانَ وَالدَّارَقُطْنِيُّ وَالحَاكِمُ.

سکتا۔ لہٰذا مجھے کوئی ایسی چیز سکھا دیں جو (میری نماز کے لئے) اس کی جگہ کافی ہو جائے۔ فرمایا " سبحان اللہ والحمد للہ ولا الہ الا اللہ واللہ اکبر ولا حول ولاقوہ الا باللہ العلی العظیم پڑھ لیا کرو۔" الحدیث (اس روایت کو احمد' ابوداؤد اور نسائی نے روایت کیا ہے۔ ابن حبان اور دار قطنی اور حاکم نے صحیح قرار دیا ہے)

لغوی تشریح: ﴿ فعلمنی ﴾ تعلیم سے امر کا صیغہ ہے ﴿ ما یجزئنی ﴾ زاء کے بعد همزہ ہے' معنی ہیں جو میرے لئے کافی ہو جائے ﴿ منه ﴾ قرآن کے بدلہ میں ﴿ الحول ﴾ قدرت اور حیلہ۔

حاصل کلام: اس حدیث سے ثابت ہوا کہ اگر کسی کو قرآن پاک میں سے کچھ بھی نہیں آتا تو مجبوری کی صورت میں یہ کلمات پڑھنے سے نماز ہو جائے گی۔ اس روایت سے اگر کوئی یہ استدلال کرے کہ سورۂ فاتحہ نماز میں فرض نہیں ہے تو یہ سینہ زوری ہے ورنہ کہاں مجبوری کی حالت اور کہاں غیر مجبوری۔ یہ آدمی تو معذور تھا اس لئے معذوری کے دور ہونے تک اسے متبادل راستہ بتلایا گیا ہے۔ معذور کیلئے شریعت مطہرہ نے بہرصورت رعایت ملحوظ رکھی ہے۔ عارضی رعایت سے احکام میں تغیر و تبدل نہیں ہو جاتا۔ ایک معذور آدمی اگر یہ کہے کہ میں وضو نہیں کر سکتا اور کہا جائے کہ بھئی پھر تم تیمم کر لو تو کیا اس کا یہ مطلب لینا صحیح ہوگا کہ اب وضو فرض ہی نہیں رہا ایسا کوئی بھی نہیں جو اس کا قائل ہو کہ عدم استطاعت وضو کی صورت میں تیمم کا مشورہ وضو کی فرضیت ساقط کر دے گا۔ اس لئے مجبوری کی صورت میں اگر ان کلمات کے پڑھنے کا حکم دیا تو اس سے فاتحہ کی فرضیت کیسے ساقط ہو گئی؟

راوی حدیث: ﴿ عبداللہ بن ابی اوفی رضی اللہ عنہ ﴾ ان کی کنیت ابو محمد یا ابو معاویہ ہے۔ ان کے والد کا نام علقمہ بن حارث اسلمی ہے۔ خود بھی شرف صحابیت سے سرفراز اور باپ بھی (باپ بیٹا دونوں صحابی) صلح حدیبیہ اور خیبر میں شریک ہوئے اور بعد والے غزوات میں بھی حصہ لیا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد کوفہ کی طرف منتقل ہو گئے۔ ۸۷ھ میں وفات پائی۔ کوفہ میں وفات پانے والے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں سب سے آخر میں وفات پانے والے صحابی ہیں۔ ان کی بینائی جاتی رہی تھی۔

(٢٢٤) وَعَنْ أَبِيْ قَتَادَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: كَانَ رَسُولُ اللهِ ﷺ يُصَلِّي بِنَا فَيَقْرَأُ فِي الظُّهْرِ وَالعَصْرِ فِي الرَّكْعَتَيْنِ الأُوْلَيَيْنِ بِفَاتِحَةِ

حضرت ابو قتادہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہمیں نماز پڑھاتے تھے تو ظہر اور عصر کی پہلی دو رکعتوں میں سورۂ فاتحہ اور دو سورتیں پڑھتے تھے اور کبھی ہمیں کوئی آیت سنا بھی دیتے تھے۔ پہلی

الكِتَابِ وَسُورَتَيْنِ ، وَيُسْمِعُنَا الآيَةَ أَحْيَاناً، وَيُطَوِّلُ ٱلرَّكْعَةَ الأُوْلٰى ، وَيَقْرَأُ فِي الأُخْرَيَيْنِ بِفَاتِحَةِ الكِتَابِ . مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

رکعت بھی لمبی کرتے تھے اور آخری دونوں رکعتوں میں صرف فاتحۃ الکتاب پڑھتے تھے۔ (بخاری و مسلم)

لغوی تشریح : ﴿ بفاتحۃ الکتاب ﴾ یعنی فاتحۃ الکتاب (سورۂ فاتحہ) ہر رکعت میں پڑھتے تھے ﴿ وسورتین ﴾ ہرایک رکعت میں ایک سورۃ پڑھتے۔ ﴿ یسمعنا ﴾ اسماع سے ماخوذ ہے' ہمیں سناتے تھے ﴿ احیانا ﴾ حین کی جمع ہے' بسا اوقت' بعض اوقات ﴿ یطول ﴾ تطویل یعنی باب تفعیل سے۔ طول دینا' لمبا کرنا۔

حاصل کلام : اس حدیث سے چند مسائل پر روشنی پڑتی ہے۔ ایک تو یہ کہ ظہراور عصر کی نمازوں میں قرأت بالاتفاق سری (خاموشی سے) ہے۔ جہری نہیں۔ تو پھر بعض اوقات کوئی آیت سنانے کی کیا حکمت اور وجہ ہے۔ اس میں حکمت یہ معلوم ہوتی ہے کہ نمازیوں کو یہ معلوم ہو جائے کہ آپؐ اس وقت قرآن مجید ہی کا کوئی حصہ تلاوت فرما رہے ہیں دوسرا کوئی ذکر یا دعا نہیں پڑھ رہے۔ دوسرے یہ کہ اس کا بھی نمازیوں کو علم ہو جائے کہ اس نماز میں فلاں سورت پڑھی جا رہی ہے۔

ایک مسئلہ یہ بھی اس حدیث سے مترشح ہوتا ہے کہ پہلی رکعت میں قرأت ذرا نسبتاً لمبی اور دوسری میں چھوٹی ہونی چاہئے۔ ائمہ ثلاثہ امام احمد رحمۃ اللہ علیہ' امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ اور امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھ امام محمد رحمۃ اللہ علیہ کی بھی یہی رائے ہے۔ البتہ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اور ابویوسف رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک دونوں رکعتوں میں قرأت مساوی ہونی چاہئے۔ ظہر' عصر اور فجر میں تو پہلی رکعت کا لمبا ہونا نص سے ثابت ہے باقی دو کو انہی پر قیاس کرلیا ہے۔ ایسا آپؐ کیوں کرتے تھے؟ اس کی حکمت یہ معلوم ہوتی ہے کہ لوگ پہلی رکعت میں شامل ہو جائیں۔ اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ پچھلی دو رکعتوں میں صرف الحمد کے سوا اور کچھ نہ پڑھے۔ لیکن بعض احادیث سے پچھلی رکعتوں میں قرأت کرنا بھی ثابت ہے۔ اس لئے آخری دو رکعتوں میں فاتحہ سے زائد نہ بھی قراءت پڑھی جائے تب بھی درست ہے۔ ایک مسئلہ یہ بھی اخذ ہوتا ہے کہ سری نمازوں میں کسی آیت کا بلند آواز سے پڑھنے سے سجدہ سہو لازم نہیں آتا اور یہ بھی معلوم ہوا کہ ایسا فعل آپؐ سے ایک مرتبہ ہی عمل میں نہیں آیا بلکہ متعدد بار ایسا ہوا ہے۔

(۲۲۵) وَعَنْ أَبِيْ سَعِيْدِ الخُدْرِيِّ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: كُنَّا نَحْزُرُ قِيَامَ رَسُولِ اللّٰهِ ﷺ فِي الظُّهْرِ وَالعَصْرِ، فَحَزَرْنَا قِيَامَهُ فِي الرَّكْعَتَيْنِ الأُوْلَيَيْنِ مِنَ ٱلظُّهْرِ قَدْرَ

حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ ہم ظہر اور عصر میں نبی ﷺ کی قرأت کا اندازہ لگایا کرتے تھے (کہ آپ دونوں رکعتوں میں کتنا قیام فرماتے تھے) ہم نے اندازہ لگایا کہ آپؐ ظہر کی پہلی دونوں رکعتوں میں اتنا قیام فرماتے جتنی دیر میں سورۂ

﴿آلم تنزيل﴾ السجدة وفي الأُخْرَيَيْنِ قدر النِّصْفِ مِنْ ذَلِكَ وَفي الأُوْلَيَيْنِ مِنَ العَصْرِ، عَلَى قَدْرِ الأُخْرَيَيْنِ مِنَ الظُّهْرِ، وَالأُخْرَيَيْنِ عَلَى النِّصْفِ مِنْ ذَلِكَ. رَوَاهُ مُسْلِمٌ.

الم السجدۃ کی تلاوت کی جا سکے اور آخری دونوں رکعتوں میں پہلی دونوں سے نصف کے برابر اور عصر کی پہلی دونوں رکعتوں میں ظہر کی آخری دونوں رکعتوں کے برابر اور عصر کی آخری دونوں میں عصر کی پہلی دو رکعتوں سے نصف۔ (مسلم)

لغوی تشریح: ﴿ نحزر ﴾ باب نصر ینصر تخمینہ لگاتے۔ قیاس کرتے۔ اندازہ لگاتے۔ ﴿ قدر الم تنزیل السجدۃ ﴾ یعنی فاتحہ کے بعد اس سورۃ کی مقدار کے برابر قرأت فرماتے۔ اس سے معلوم ہوا کہ ظہر کی پہلی اور دوسری رکعت میں قرأت برابر ہوتی تھی۔ یہ بات پہلی مذکور حدیث کے خلاف ہے۔ اسے اوقات کے مختلف ہونے پر محمول کیا جائے گا کہ کبھی برابر پڑھتے اور کبھی پہلی رکعت بڑی اور دوسری چھوٹی ہوتی تھی یا پھر یہ کہا جائے گا کہ پہلی رکعت میں چونکہ دعائے افتتاح اور تعوذ زائد پڑھے جاتے ہیں۔ اس طرح دونوں احادیث میں تطابق پیدا ہو جائے گا اور اختلاف باقی نہیں رہے گا۔ ﴿ وفی الاخریین قدرالنصف ﴾ یعنی نصف مقدار ﴿ من ذلک ﴾ یعنی پہلی دو رکعتوں کی طوالت سے کم۔

حاصل کلام: اس حدیث سے ظہر و عصر کی نمازوں میں رسول اللہ ﷺ کی مقدار قرات کا اندازہ معلوم ہوتا ہے۔ نیز یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ پچھلی دو رکعتوں میں بھی سورۂ فاتحہ کے بعد کوئی دوسری آیت پڑھنا مسنون ہے۔ جس طرح کبھی نہ پڑھنا بھی مسنون ہے' لہٰذا نمازی اگر آخری دونوں رکعتوں میں فاتحہ کے ساتھ دوسری آیات بھی پڑھ لے تو اس کی اجازت ہے اور نہ پڑھے تب بھی گنجائش ہے۔

(٢٢٦) وَعَنْ سُلَيْمَانَ بْنِ يَسَارٍ قَالَ: كَانَ فُلاَنٌ يُطِيْلُ الأُوْلَيَيْنِ مِنَ الظُّهْرِ وَيُخَفِّفُ العَصْرَ وَيَقْرَأُ فِي المَغْرِبِ بِقِصَارِ المُفَصَّلِ، وَفِي العِشَاءِ بِوَسَطِهِ، وَفِي الصُّبْحِ بِطِوَالِهِ، فَقَالَ أَبُوْ هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ: مَا صَلَّيْتُ وَرَاءَ أَحَدٍ أَشْبَهَ صَلاَةً بِرَسُولِ اللهِ ﷺ مِنْ هَذَا. أَخْرَجَهُ النَّسَائِيُّ بِإِسْنَادٍ صَحِيحٍ.

حضرت سلیمان بن یسار رحمہ اللہ نے بیان کیا کہ فلاں صاحب ظہر کی پہلی دو رکعتیں لمبی کرتے ہیں (ان میں قرأت لمبی کرتے ہیں) اور نماز عصر میں تخفیف کرتے ہیں اور نماز مغرب میں قصار مفصل (چھوٹی سورتیں) اور عشاء میں اوساط مفصل اور صبح کی نماز میں طوال مفصل پڑھتے ہیں۔ تو ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے کہا میں نے کسی کی امامت میں اس سے زیادہ نبی کریم ﷺ کی نماز سے مشابہ نماز نہیں پڑھی۔ (نسائی نے اسے صحیح سند سے روایت کیا ہے)

لغوی تشریح: ﴿کان فلان ﴾ سے مراد امیر مدینہ عمرو بن سلمہ ہیں اور بعض نے کہا ہے کہ اس سے عمر

بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ مراد ہیں مگر یہ صحیح نہیں اس لئے کہ عمر بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ کی تو ولادت ہی حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی وفات کے بعد ہوئی ہے ﴿ یخفف العصر ﴾ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ تخفیف ظہر کے اعتبار سے عصر کی سب رکعتوں میں ہے ﴿ بقصار المفصل ﴾ قصار میں قاف پر کسرہ قصیرہ کی جمع ہے اور مفصل جس کے درمیان میں فاصلہ زیادہ ہو۔ یاد رہے کہ قرآن کا آخری حصہ جن چھوٹی چھوٹی سورتوں پر مشتمل ہے اس کا نام مفصل ہے۔ کیونکہ اس حصہ کی سورت چھوٹی ہے اور ہر سورت کی نوعیت یہ ہے کہ جیسے گفتگو میں فاصلہ ہوتا ہے۔ اس میں اختلاف ہے کہ مفصل کہاں سے شروع ہوتی ہیں۔ مشہور تو یہی ہے کہ اس کا آغاز سورۃ الحجرات سے ہوتا ہے اور یہ بھی رائے ہے کہ دوسری کسی سورت سے اس کی ابتدا ہوتی ہے اور اس کی انتہا آخر قرآن تک ہے۔ پھر مفصل کی تین اقسام ہیں۔ طوال مفصل' اوساط مفصل اور قصار مفصل۔ پس طوال مفصل سورۂ حجرات سے شروع ہو کر سورۂ بروج تک اور اوساط مفصل سورۂ بروج سے شروع ہو کر سورۂ بینہ تک اور سورۂ بینہ سے لے کر قرآن پاک کے اختتام تک قصار مفصل کہلاتی ہیں۔

حاصل کلام : اس حدیث سے معلوم ہوا کہ سورۂ حجرات سے لے کر اختتام قرآن مجید تک مفصلات کہلاتی ہیں۔ مفصلات کی تین اقسام ہیں جیسا کہ اوپر ذکر ہوا۔ صبح کی نماز میں طوال مفصل اور نماز عشاء میں اوساط مفصل اور مغرب کی نماز میں قصار مفصل سورتوں کا پڑھنا مسنون ہے۔

راوی حدیث : ﴿ سلیمان بن یسار رحمۃ اللہ علیہ ﴾ ان کی کنیت ابو ایوب تھی۔ یسار "یاء" پر فتحہ ہے۔ کبار تابعین میں سے ہیں۔ فقہائے سبعہ میں ان کا شمار ہوتا ہے۔ بڑے عابد اور فقیہہ تھے۔ بہت بڑے مرتبہ کے عالم تھے۔ بے شمار احادیث ان سے مروی ہیں۔ حضرت ام المومنین میمونہ رضی اللہ عنہا کے آزاد کردہ غلام تھے۔ ۱۰۷ھ میں ۷۳ سال کی عمر میں وفات پائی۔

(۲۲۷) وَعَنْ جُبَيْرِ بْنِ مُطْعِمٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: سَمِعْتُ رَسُولَ اللّٰهِ ﷺ يَقْرَأُ فِي الْمَغْرِبِ بِالطُّورِ. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت جبیر بن مطعم رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ میں نے نبی کریم ﷺ کو نماز مغرب میں سورۂ طور پڑھتے سنا ہے۔ (بخاری و مسلم)

لغوی تشریح : ﴿ بالطور ﴾ یعنی سورۂ طور نماز مغرب میں پڑھتے سنا ہے۔

حاصل کلام : عام معمول تو آنحضور ﷺ کا یہی تھا کہ مغرب میں قصار مفصل پڑھتے تھے جیسا کہ اوپر ذکر ہوا ہے مگر بعض اوقات لمبی سورت بھی پڑھتے تھے۔ جیسا کہ اس حدیث میں سورۂ طور پڑھنا ثابت ہوا۔ بعض روایات میں المص' صافات' اور حم الدخان کا نماز مغرب میں پڑھنا بھی ثابت ہے اور آپ ؐ کے عمل سے یہ بھی ثابت ہے کہ آپ ؐ نے سفر کے دوران صبح کی فرض نماز میں صرف معوذتین کی تلاوت کی۔ بہرحال عام معمول وہی تھا جو اوپر مذکور ہوا البتہ کبھی کبھی اس کے خلاف بھی جائز ہے۔

(۲۲۸) وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: كَانَ رَسُولُ اللهِ ﷺ يَقْرَأُ فِي صَلاَةِ الفَجْرِ يَوْمَ الجُمُعَةِ (آلم تَنْزِيلُ) السَّجْدَةَ، «وَهَلْ أَتَى عَلَى الإِنْسَانِ». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ. وَلِلطَّبْرَانِيِّ مِنْ حَدِيْثِ ابْنِ مَسْعُودٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ: «يُدِيْمُ ذَلِكَ».

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ جمعہ کے روز نماز فجر کی پہلی رکعت میں الم تنزیل السجدۃ اور دوسری میں ھل اتی علی الانسان (سورہ دھر) پڑھا کرتے تھے۔ (بخاری و مسلم) اور طبرانی میں ابن مسعود سے مروی روایت میں ہے کہ ایسا آپ ہمیشہ کرتے تھے۔

لغوی تشریح: ﴿ یدیم ذلک ﴾ ادامۃ سے ماخوذ ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جمعہ کے روز صبح کی نماز میں ان سورتوں کو ہمیشہ پڑھتے رہے۔

حاصل کلام: ان سورتوں کا التزام کیوں کرتے تھے؟ شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس کی مصلحت و حکمت یہ سمجھ میں آتی ہے کہ ان سورتوں میں تخلیق آدم' روز قیامت بندوں کا میدان محشر میں جمع ہونا مذکور ہے اور احادیث میں مذکور ہے کہ قیامت بھی جمعہ کے روز قائم ہوگی غالباً اسی مناسبت کو ملحوظ رکھتے ہوئے آنجناب ﷺ جمعہ کے روز ان کا التزام فرماتے تھے۔ اس لئے جمعہ کے روز صبح کی فرض نماز میں ان دونوں کو پڑھنا مسنون ہے۔ جن سورتوں کو نبی کریم ﷺ نے کسی نماز میں بالالتزام پڑھا ہو ہمارے لئے امتثال امر اور تعمیل عمل کرتے ہوئے ان سورتوں کو انہی نمازوں میں پڑھنا افضل اور مسنون ہے۔ اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ کوئی دوسری سورت نہیں پڑھی جا سکتی۔ مگر اتباع سنت کا تقاضا ہے کہ انہی سورتوں کو پڑھا جائے جو رسول اللہ ﷺ نے پڑھی ہیں اور آج بحمد اللہ علمائے اہلحدیث اس کی پابندی کرتے ہیں۔

(۲۲۹) وَعَنْ حُذَيْفَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: صَلَّيْتُ مَعَ النَّبِيِّ ﷺ فَمَا مَرَّتْ بِهِ آيَةُ رَحْمَةٍ إِلاَّ وَقَفَ عِنْدَهَا يَسْأَلُ، وَلاَ آيَةُ عَذَابٍ إِلاَّ تَعَوَّذَ مِنْهَا. أَخْرَجَهُ الخَمْسَةُ وَحَسَّنَهُ التِّرْمِذِيُّ.

حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ میں نے نبی کریم ﷺ کے ساتھ نماز پڑھی جب ایسی آیت گزرتی جس میں رحمت الٰہی کا ذکر ہوتا تو آپ وہاں وقفہ فرما کر رحمت طلب فرماتے اور جب آیت عذاب گزرتی تو وہاں ذرا وقفہ فرما کر اس سے پناہ مانگتے۔ (اسے احمد' ابوداؤد' ترمذی' نسائی اور ابن ماجہ پانچوں نے روایت کیا ہے اور ترمذی نے اسے حسن قرار دیا ہے)

لغوی تشریح: ﴿ وقف ﴾ رک جاتے قرأت سے وقفہ فرما کر۔ ﴿ یسال ﴾ اللہ کی رحمت طلب فرماتے۔

حاصل کلام: یہ عمل غالباً آپ ؐ کا نماز تہجد میں ہوتا تھا۔ چنانچہ مسند احمد اور ابن ماجہ میں عبدالرحمٰن بن

ابی لیلیٰ عن ابیہ سے روایت ہے کہ ایسا آپؐ نفل نماز میں کرتے تھے۔ اسی طرح مسند احمد میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اور ابوداؤد اور نسائی میں حضرت عوف بن مالک رضی اللہ عنہ کی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ عمل تہجد کی نماز میں تھا اور اگر کوئی یہ عمل فرض نماز میں بھی کرے تو اس میں کوئی حرج نہیں بالخصوص جبکہ وہ اکیلا فرض نماز پڑھ رہا ہو کیونکہ ایسی صورت میں وہ کسی کو مشقت میں مبتلا نہیں کرتا۔ (سبل السلام)

(٢٣٠) وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُمَا قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «أَلاَ وَإِنِّي نُهِيتُ أَنْ أَقْرَأَ الْقُرْآنَ رَاكِعاً أَوْ سَاجِداً، فَأَمَّا الرُّكُوعُ فَعَظِّمُوا فِيهِ الرَّبَّ، وَأَمَّا السُّجُودُ فَاجْتَهِدُوا فِي الدُّعَاءِ، فَقَمِنٌ أَنْ يُسْتَجَابَ لَكُمْ». رَوَاهُ مُسْلِمٌ.

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "لوگو! سن لو کہ مجھے رکوع اور سجدہ میں قرآن پڑھنے سے منع کیا گیا ہے۔ لہٰذا رکوع میں اپنے مالک و پروردگار کی عظمت بیان کرو اور سجدہ میں دعا مانگنے کی کوشش کرو۔ یہ اس لائق ہے کہ تمہاری دعا قبول کر لی جائے۔" (مسلم)

لغوی تشریح: ﴿ فقمن ﴾ اس میں "فا" جزاء کیلئے ہے۔ قمن میں "قاف" پر فتحہ اور میم کے نیچے کسرہ یعنی اس کی مستحق ہے۔ اس لائق ہے۔

حاصل کلام: نماز کے مختلف ارکان ہیں۔ ان میں سے ہر ایک کی ہیئت الگ الگ ہے۔ ہر ایک کے حسب حال اذکار مقرر ہیں اور سنت سے ثابت ہیں۔ نبی کریم ﷺ نے تلاوت قرآن رکوع و سجود میں ممنوع قرار دی ہے۔ اس کی جگہ آپؐ نے رکوع میں عظمت رب یعنی سبحان ربی العظیم اور سجدہ میں دعا کرنے کی تلقین فرمائی ہے۔ بعض محدثین اور امام احمد رحمہ اللہ کے نزدیک رکوع میں تعظیم رب اور سجدہ میں دعا کرنا واجب ہے البتہ جمہور علماء نے مستحب قرار دیا ہے۔ سجدہ قبولیت دعا کا ایک اہم ترین مقام ہے۔ اسی لئے آپؐ نے اس میں دعا کی ترغیب دی ہے۔ خود بھی سجدہ میں مختلف دعائیں کرتے تھے۔ ان میں سے ایک دعا آئندہ حدیث میں آرہی ہے۔

(٢٣١) وَعَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهَا قَالَتْ: كَانَ رَسُولُ اللهِ ﷺ يَقُولُ فِي رُكُوعِهِ وَسُجُودِهِ: «سُبْحَانَكَ اللَّهُمَّ رَبَّنَا وَبِحَمْدِكَ، اللَّهُمَّ اغْفِرْ لِي». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے بیان کیا کہ رسول اللہ ﷺ رکوع و سجود میں سبحانک اللھم ربنا وبحمدک اللھم اغفرلی "تو پاک ہے اے اللہ! اے ہمارے پروردگار! اپنی حمد و ثنا کے ساتھ۔ اے اللہ! مجھے بخش دے۔" پڑھا کرتے۔ (بخاری و مسلم)

لغوی تشریح: ﴿ وبحمدک ﴾ اس میں "واؤ" عطف کیلئے ہے۔ میں تیری پاکی بیان کرتا ہوں اور تیری

حمد و توصیف میں محو ہوتا ہوں اور اس کا بھی احتمال ہے کہ "واؤ" حالیہ ہو۔ اس صورت میں معنی یہ ہوں گے کہ تیری پاکی بیان کرتا ہوں اس حال میں کہ میں تیری حمد و ثنا میں محو ہونے والا ہوں۔ رکوع و سجود کیلئے متعدد اذکار اور دعائیں حضور ﷺ سے ثابت ہیں۔ نمازی ان میں سے جسے چاہے منتخب کر سکتا ہے۔

حاصل کلام: یہ حدیث اس کی دلیل ہے کہ رکوع میں (سبحان ربی العظیم) اور سجدہ میں (سبحان ربی الا علی) کے علاوہ مذکورہ بالا دعا بھی پڑھی جا سکتی ہے بلکہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ (اذا جاء نصر اللہ والفتح) نازل ہونے کے بعد آپ ہمیشہ رکوع و سجود میں یہ دعا پڑھتے تھے۔ نمازی ان مسنونہ دعاؤں میں سے وقتاً فوقتاً جسے چاہے پڑھ سکتا ہے۔

(٢٣٢) وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: كَانَ رَسُولُ اللهِ إِذَا قَامَ إِلَى الصَّلاَةِ يُكَبِّرُ حِيْنَ يَقُوْمُ، ثُمَّ يُكَبِّرُ حِيْنَ يَرْكَعُ، ثُمَّ يَقُولُ: سَمِعَ اللّٰهُ لِمَنْ حَمِدَهُ، حِيْنَ يَرْفَعُ صُلْبَهُ مِنَ الرُّكُوعِ، ثُمَّ يَقُولُ وَهُوَ قَائِمٌ. رَبَّنَا وَلَكَ ٱلْحَمْدُ، ثُمَّ يُكَبِّرُ حِيْنَ يَهْوِي سَاجِداً، ثُمَّ يُكَبِّرُ حِيْنَ يَرْفَعُ رَأْسَهُ، ثُمَّ يُكَبِّرُ حِيْنَ يَسْجُدُ. ثُمَّ يُكَبِّرُ حِيْنَ يَرْفَعُ، ثُمَّ يَفْعَلُ ذَٰلِكَ فِي الصَّلاَةِ كُلِّهَا، وَيُكَبِّرُ حِيْنَ يَقُوْمُ مِنَ الثِّنْتَيْنِ بَعْدَ الجُلُوسِ. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ جب نماز کیلئے کھڑے ہوتے تو اللہ اکبر کہتے۔ پھر جب رکوع کیلئے جاتے تو اس وقت اللہ اکبر کہتے۔ پھر رکوع سے اٹھتے وقت سمع اللہ لمن حمدہ کہتے ہوئے کھڑے ہو جاتے اور پھر جب رکوع سے سیدھے کھڑے ہو جاتے تو ربنا ولک الحمد کہتے۔ پھر سجدے میں جاتے وقت تکبیر کہہ کر سجدے کیلئے جھکتے پھر سجدے سے اٹھتے ہوئے اللہ اکبر کہتے پھر سجدے میں جاتے تو اللہ اکبر کہتے پھر سجدے سے سر اٹھاتے ہوئے اللہ اکبر کہتے پھر ساری نماز میں اسی طرح کرتے جاتے تھے۔ پھر جب دوسری رکعت کی (تکمیل) کے بعد تشہد پڑھ کر اٹھتے تو بھی اللہ اکبر کہتے۔ (بخاری و مسلم)

لغوی تشریح: ﴿ ربنا لک الحمد ﴾ بعض روایات میں ﴿ ربنا ولک الحمد ﴾ بھی مروی ہے یعنی "لک" سے پہلے "واؤ" ہے بھی اور نہیں بھی۔ دونوں طرح ثابت ہے۔ "واؤ" کو جب ثابت رکھیں گے اس صورت میں تو محذوف پر عطف ہوگا۔ جیسے ہم نے آپ کی اطاعت اور حمد و ستائش کی یا "واؤ" کو حالیہ تسلیم کیا جائے گا یا پھر اسے زائدہ قرار دیا جائے۔ ساری صورتیں ممکن ہیں۔ بعض روایات میں اللھم ربنا لک الحمد بھی آیا ہے۔ ﴿ یھوی ﴾ باب ضرب یضرب سے ھوی یھوی جھکنا' مائل ہو جانا' گر جانا وغیرہ۔

حاصل کلام: نماز میں جو تکبیریں کہی جاتی ہیں ان میں سے پہلی تکبیر کو تکبیر تحریمہ' تکبیر افتتاح یا تکبیر

اولیٰ کہتے ہیں جس کا مطلب ہے کہ اب نماز میں داخلہ کے بعد وہ سارے کام اور چیزیں حرام ہوگئیں جو نماز شروع کرنے سے پہلے حلال تھیں۔ باقی تکبیرات کو تکبیرات انتقال کہتے ہیں یعنی ایک رکن نماز سے دوسرے رکن کی طرف منتقل ہونے کی تکبیریں۔ پہلی تکبیر (تکبیر تحریمہ) تو فرض ہے اور باقی تکبیریں عند البعض واجب ہیں مگر اکثر کے نزدیک مسنون ہیں۔ بنو امیہ کے دور میں بعض امراء بنی امیہ نے ان تکبیروں کو غیر اہم اور معمولی سمجھ کر چھوڑ دیا تھا مگر اس دور کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم لوگوں کو ان کے مسنون ہونے کی تعلیم و یاد دھانی کراتے تھے' تاکہ لوگ سنت نبویؐ پر عمل پیرا رہیں اور سنت رسول اللہ ﷺ سے ان کا تعلق منقطع نہ ہونے پائے۔ ہر دور میں علماء حق کا فریضہ ہے کہ وہ نادان اور جاہل لوگوں کو سنت رسول ﷺ کی اہمیت و فضیلت سے آگاہ رکھیں اور انکار سنت کے فتنہ سے بچانے کی ہر ممکن کوشش کرتے رہیں۔

(٢٣٣) وَعَنْ أَبِيْ سَعِيْدٍ الخُدْرِيِّ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: كَانَ رَسُولُ اللهِ ﷺ إِذَا رَفَعَ رَأْسَهُ مِنَ الرُّكُوعِ قَالَ: «اللَّهُمَّ رَبَّنَا لَكَ الحَمْدُ مِلْءَ السَّمواتِ وَالأَرْضِ، وَمِلْءَ مَا شِئْتَ مِنْ شَيْءٍ بَعْدُ، أَهْلَ الثَّنَاءِ وَالمَجْدِ، أَحَقُّ مَا قَالَ العَبْدُ - وَكُلُّنَا لَكَ عَبْدٌ - اللَّهُمَّ لاَ مَانِعَ لِمَا أَعْطَيْتَ، وَلا مُعْطِيَ لِمَا مَنَعْتَ، وَلاَ يَنْفَعُ ذَا الجَدِّ مِنْكَ الجَدُّ». رَوَاهُ مُسْلِمٌ.

حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ جب رکوع سے اپنا سر اوپر اٹھاتے تو اللهم ربنا لك ...... الخ کہتے تھے۔ (یعنی) اے اللہ! ہمارے آقا و پروردگار تعریف صرف تیرے ہی لئے ہے اتنی تعریف جس سے آسمان و زمین بھر جائے اور اس کے بعد ہر وہ چیز بھر جائے جسے تو چاہے۔ اے بزرگی اور تعریف کے مالک! تو اس کا زیادہ مستحق ہے جو کچھ بندہ کہے اور سبھی تیرے بندے ہیں۔ اے اللہ! جو کچھ تو عطا فرمائے اسے کوئی روکنے والا نہیں اور جسے تو ہی نہ دے اسے کوئی عطا کرنے والا نہیں اور کسی کو اس کی بزرگی اور بخت آپ کے عذاب کے مقابلے میں کوئی فائدہ نہیں دے سکتا۔ (مسلم)

لغوی تشریح: ﴿ ملء السموات ﴾ "مل,ء" کے ہمزہ کو منصوب پڑھیں تو یہ مصدر ہوگا اور اگر مل,ء کے ہمزہ کو مرفوع پڑھنے کی صورت میں یہ مبتداء محذوف کی خبر ہوگی۔ ﴿ من شئی ﴾ "ما شئت" کا بیان ہے۔ یعنی جو کچھ بھی تو چاہے۔ ﴿ بعد ﴾ مبنی علی الضم اس کے بعد مضاف الیہ محذوف ہوتا ہے' مگر نیت میں موجود ہوتا ہے۔ مطلب یہ ہوگا کہ آسمانوں اور زمین بھر کی حمد و ثنا کے بعد۔ ﴿ اهل الثناء والمجد ﴾ اگر اهل کے لام پر ضمہ پڑھیں تو اس صورت میں یہ مبتداء محذوف کی خبر بنے گا۔

یعنی اے بزرگی اور تعریف کے مالک! اور حرف نداء کے محذوف ماننے کی صورت میں اسے منصوب بھی پڑھا گیا ہے اور "ثناء" کے معنی زبان سے کسی کی تعریف کرنا ﴿ والمجد ﴾ عظمت و بزرگی۔ ﴿ احق ما قال العبد ﴾ احق کے قاف پر رفع اور ما موصولہ کی طرف مضاف ہے اور مبتداء محذوف کی خبرواقع ہو رہا ہے اور وہ ہے ربنا لک الحمد کا قول۔ بندے کے اقوال کا وہ زیادہ استحقاق رکھتا ہے اور یہ بھی امکان ہے کہ یہ ﴿ اللهم لا مانع ﴾ خبر کا مبتداء ہو اور اس کا یہ قول کہ "ہم سب تیرے بندے ہیں" مبتداء اور خبر کے درمیان بطور جملہ معترضہ آیا ہو۔ لیکن پہلی تاویل زیادہ مناسب ہے۔ ﴿ ذاالجد ﴾ صاحب بزرگی۔ اس صورت میں کہ جد کی جیم پر فتحہ پڑھا جائے تو اس کا معنی ہوگا۔ نصیبہ۔ وافر حصہ۔ استغنی۔ عظمت و غلبہ۔ ﴿ منك ﴾ تیرے مؤاخذہ اور گرفت سے یا یہ معنی کہ تیرے ہاں جو پکڑ اور مواخذہ ہے ﴿ الجد ﴾ دال پر رفع ہونے کی صورت میں فاعل ہے قول ﴿ لا ینفع ﴾ کا۔ یعنی کسی مالدار آدمی کو اس کی بزرگی اور تونگری کوئی فائدہ نہیں دے گی اور اسے تیری پکڑ اور گرفت مواخذہ سے بچا نہیں سکتی۔ بس عمل صالح ہی وہاں نفع دے گا۔

حاصل کلام: یہ حدیث اس پر دلیل و حجت ہے کہ قومہ کی حالت میں یہ دعا پڑھنا مسنون و مشروع ہے۔ جن حضرات نے اس دعا کو نفل نماز کے ساتھ مخصوص کیا ہے ان کے پاس اس کی کوئی دلیل نہیں۔ صرف اپنے ذہن کی بات ہے۔ مسلم میں براء بن عازب رضی اللہ عنہ کی روایت اس خیال کی تردید کیلئے کافی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ فرض نماز میں اس کا پڑھنا ثابت ہے۔ نیز اس دعا کے اس جملہ "ولا ینفع ذاالجد منك الجد" سے واضح ہوتا ہے کہ کائنات کے مالک و خالق کے پاس محض دنیوی جاہ و جلال اور عظمت و بزرگی کچھ بھی کام نہ دے گی اور نہ کسی حسب و نسب کا امتیاز کچھ فائدہ مند ثابت ہوگا وہاں تو عمل صالح کی قدر و قیمت ہوگی اور بس۔ کسی کا عالی نسب ہونا' بزرگوں کی اولاد ہونا' کسی معروف و مشہور خاندان سے متعلق ہونا عذاب الٰہی سے نہیں چھڑا سکتا۔ اگر ایسا ہوتا تو نوح علیہ السلام کا بیٹا' حضرت ابراہیم علیہ السلام کا باپ اور نبی آخر الزماں (ﷺ) کے حقیقی چچا ابو طالب عتاب الٰہی اور عذاب الٰہی کا شکار نہ ہوتے۔ آنحضور ﷺ نے تو اپنے خاندان والوں کو بلا کر صاف طور پر کہہ دیا کہ عمل صالح کرو ورنہ اللہ کے عذاب سے بچنا مشکل اور اپنی لخت جگر حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا سے صاف فرما دیا تھا کہ "بیٹی! میں تجھے عذاب الٰہی سے ہرگز نہیں بچا سکتا' گھمنڈ اور خوش فہمی میں نہ رہ جانا کہ میں نبی آخر الزماں (ﷺ) کی لخت جگر ہوں۔ محض میری بیٹی ہونا تجھے اللہ تعالیٰ کے عذاب کی گرفت اور پکڑ سے نہیں بچا سکتا۔ عمل صالح کیا کرو جو تجھے عذاب الٰہی سے بچا سکے" اولوالعزم پیغمبروں اور خاص کر رسول آخر الزمان ﷺ جب اپنی اولاد سے یہ فرما دیں تو اور کون ہے جو غرور نسب میں مبتلا ہو کر بھی کامیاب و کامران ہو جائے۔ نیز اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ قومہ میں صرف سیدھا کھڑا ہونا ہی کافی نہیں ہے بلکہ مسنون دعاؤں میں سے کوئی دعا مثلاً یہ ہی دعا پڑھنی چاہئے۔

(۲۳٤) وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُمَا قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: أُمِرْتُ أَنْ أَسْجُدَ عَلَى سَبْعَةِ أَعْظُمٍ: عَلَى الجَبْهَةِ - وَأَشَارَ بِيَدِهِ إِلَى أَنْفِهِ - وَالْيَدَيْنِ، وَالرُّكْبَتَيْنِ وَأَطْرَافِ الْقَدَمَيْنِ». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ”مجھے سات ہڈیوں (اعضاء) پر سجدہ کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ اپنے دست مبارک سے اشارہ کر کے فرمایا ”پیشانی و ناک پر اور دونوں ہاتھوں اور دونوں گھٹنوں اور دونوں قدموں پر۔“ (بخاری و مسلم)

لغوی تشریح: ﴿ امرت ﴾ صیغہ مجہول۔ حکم صادر فرمانے والا اللہ تعالیٰ ہے۔ ﴿ اعظم ﴾ ظاء پر ضمہ، عظم کی جمع ہے اور اشارہ ناک کی جانب۔ یہ دلیل ہے اس کی کہ پیشانی اصل ہے اور ناک اس کے تابع ہے۔ حدیث مذکور اس پر دلالت کرتی ہے کہ متذکرہ بالا سات اعضاء پر اکٹھے سجدہ کرنا واجب ہے اس لئے کہ امر وجوب کیلئے آتا ہے۔

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ پیشانی اور ناک دونوں مل کر ایک عضو ہے اگر ان کو الگ الگ عضو شمار کیا جائے تو یہ آٹھ اعضاء بن جاتے ہیں اس لئے ان دونوں کو ایک عضو ہی شمار کیا جانا چاہئے۔ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ، امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ تینوں امام اور امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے دونوں شاگردان رشید امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ اور امام محمد رحمۃ اللہ علیہ بھی اس کے قائل ہیں کہ صرف پیشانی یا صرف ناک زمین پر رکھ کر سجدہ کرے تو یہ سجدہ ناتمام متصور ہوگا اور اسے سجدہ ہی شمار نہیں کیا جائے گا۔ اس کے برعکس امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ یہ دونوں الگ الگ عضو ہیں۔ ان میں سے کوئی ایک اگر زمین پر رکھا گیا تو سجدہ ہو جائے گا اور کسی قسم کا کوئی نقص نہیں رہے گا۔ لیکن ایک تو یہ اکثریت کے خلاف ہے کیونکہ تین امام اور دو مزید حنفی امام ایک طرف اور امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ تنہا ایک طرف۔ پھر یہ مذکورہ بالا حدیث کے بھی خلاف ہے۔ اس لئے امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی رائے کمزور ہے۔ ابن ابی شیبہ میں حضرت عکرمہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ کا گزر ایک ایسے نمازی پر ہوا جس کی ناک زمین پر لگ نہیں رہی تھی۔ آپؐ نے فرمایا ”جس کسی کی پیشانی اور ناک زمین پر نہ لگے اس کی تو نماز ہی نہیں ہوتی۔“ یعنی ناک اور پیشانی دونوں کا حالت سجدہ میں زمین پر لگنا ضروری ہے۔ خلاصہ گفتگو یہ کہ سجدہ ساتوں اعضاء پر کیا جانا چاہئے ورنہ سجدہ صحیح نہیں۔

(۲۳۵) وَعَنِ ابْنِ بُحَيْنَةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُ. أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ كَانَ إِذَا صَلَّى وَسَجَدَ، فَرَّجَ بَيْنَ يَدَيْهِ حَتَّى يبدو بَيَاضُ إِبطَيْهِ. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت ابن بحینہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ جب نماز ادا فرماتے اور سجدہ کرتے تو اس حالت میں اپنے دونوں بازو اپنے پہلوؤں سے الگ رکھتے تھے، یہاں تک کہ آپؐ کی بغلوں کی سفیدی

نظر آنے لگتی تھی۔ (بخاری و مسلم)

لغوی تشریح: ﴿ فرج ﴾ تفریج (باب تفعیل) سے ماخوذ ماضی کا صیغہ ہے۔ جس کے معنی دوری اور دونوں پہلوؤں کے درمیان کشادگی اور فراخی پیدا کرنا ہے۔

حاصل کلام: اس حدیث سے یہ مسئلہ واضح ہوتا ہے کہ سجدہ کرتے وقت اپنی رانوں کو اپنے بازوؤں سے اتنا الگ رکھے کہ بغلوں کا اندرون بھی نمایاں ہو جائے۔ اس حدیث کی بناء پر امام طبری رحمہ اللہ وغیرہ نے کہا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بغلیں جسم اطہر کے دوسرے اعضاء کی طرح سفید تھیں۔ سیاہ نہ تھیں۔ یہ آپ کی دیگر خصوصیات و امتیازات کی طرح ایک خصوصیت ہے۔ اس خصوصیت کی تصریح طبری نے کتاب الاحکام کے باب الاستسقاء میں کی ہے کہ آپ کی بغلیں دوسروں کی طرح سیاہ نہ تھیں بلکہ سفید تھیں۔

راوی حدیث: ﴿ ابن بحینہ رضی اللہ عنہ ﴾ ان کا پورا نام یہ تھا عبداللہ بن مالک بن القشب (قاف پر کسرہ "شین" ساکن) الازدی۔ اور بحینہ تصغیر' ان کی والدہ کا نام ہے۔ والدہ کے نام سے مشہور ہوئے ہیں ورنہ والد کا نام مالک ہے۔ قدیم الاسلام ہیں۔ بڑے زاہد' شب زندہ دار' صائم النہار تھے۔ دنیا سے بڑے بے رغبت تھے۔ مدینہ سے تیس میل کے فاصلہ پر واقع جگہ وادی ریم میں ۵۴ھ اور ۵۸ھ کے درمیان وفات پائی۔

(۲۳۶) وَعَنِ الْبَرَاءِ بْنِ عَازِبٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «إِذَا سَجَدْتَ فَضَعْ كَفَّيْكَ، وَارْفَعْ مِرْفَقَيْكَ». رَوَاهُ مُسْلِمٌ.

حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "جب تو سجدہ کرے تو (اس وقت) اپنی ہتھیلیوں کو زمین پر ٹکا دے اور اپنی کہنی کو اوپر اٹھا لے۔" (مسلم)

لغوی تشریح: ﴿ فضع ﴾ اس میں "فاء" جزاء کیلئے ہے اور ﴿ ضع ﴾ وضع سے امر کا صیغہ ہے۔ معنی اس کے یہ ہوئے کہ دونوں ہتھیلیوں کو زمین پر ٹکا دو۔ رکھ دو۔

حاصل کلام: اس حدیث میں سجدہ کرتے وقت ہتھیلیوں کو زمین پر رکھنے اور کہنیوں کو اوپر اٹھانے کا حکم ہے۔ البتہ ابوداؤد میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ایک روز صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے سجدہ کو لمبے کرنے کی وجہ سے تھکاوٹ کا شکوہ کیا تو آپ نے انہیں کہنیوں کو گھٹنوں پر رکھ کر ذرا آرام لینے کی اجازت مرحمت فرما دی۔ مگر یہ روایت سنداً صحیح نہیں۔ بصورت دیگر یہ عذر پر تو محمول ہے۔ اکثر و بیشتر روایات میں یہی مذکور ہے کہ سجدہ میں آپ کی کہنیاں نہ زمین پر لگتیں اور نہ ہی رانوں وغیرہ سے جس کی وجہ سے آپ کی بغلوں کی سفیدی نظر آتی۔ آپ کا یہ عمل امت کے ہر فرد کیلئے ہے خواہ مرد ہو یا عورت۔ آپ کا حکم بھی یہ ہے (صلوا کما رایتمونی اصلی) کہ "تم اسی طرح نماز پڑھو جیسا تم مجھے نماز پڑھتے ہوئے دیکھتے ہو۔" کسی بھی صحیح و مرفوع روایت میں عورت کیلئے اس کے برعکس حکم ثابت نہیں۔

راوی حدیث: ﴿ براء بن عازب رضی اللہ عنہ ﴾ ابوعمارہ ان کی کنیت ہے۔ براء "باء" پر فتحہ ہے۔ باپ کا نام

عازب بن حارث بن عدی ہے۔ انصار کے قبیلہ اوس کے فرد تھے۔ باپ بھی شرف صحابیت سے بہرہ ور اور بیٹا بھی۔ غزوۂ بدر کے موقع پر کم عمری کی وجہ سے شریک جہاد نہ ہو سکے۔ پہلا معرکہ جس میں انہوں نے شرکت کی وہ احد یا خندق دونوں میں کوئی ایک ہے۔ رے کو فتح کیا۔ جنگ جمل' جنگ صفین اور معرکہ نھروان میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کے رفقاء میں سے تھے۔ کوفہ میں ۷۲ھ میں فوت ہوئے۔

(۲۳۷) وَعَنْ وَائِلِ بْنِ حُجْرٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ كَانَ إِذَا رَكَعَ فَرَّجَ بَيْنَ أَصَابِعِهِ، وَإِذَا سَجَدَ ضَمَّ أَصَابِعَهُ. رَوَاهُ الحَاكِمُ.

حضرت وائل بن حجر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی ﷺ جب رکوع میں ہوتے تو اپنی (ہاتھوں کی) انگلیاں کھلی رکھتے اور جب سجدہ میں ہوتے تو اپنی (ہاتھوں کی) انگلیاں باہم ملا لیا کرتے تھے۔ (مستدرک حاکم)

لغوی تشریح: ﴿ ضم اصابعه ﴾ اپنی انگلیاں باہم ملا لیتے۔ یعنی اس طرح اپنی انگلیاں اکٹھی کر کے ایک دوسرے سے ملاتے کہ ان کا رخ قبلہ کی طرف ہو جاتا۔

حاصل کلام: یہ حدیث بتاتی ہے کہ رکوع و سجود میں انگلیوں کی کیفیت کیسی ہونی چاہیئے؟ معلوم ہوا کہ رکوع کی حالت میں انگلیوں کو کھلا رکھنا ہی مسنون ہے۔ نیز اس میں حالت سجدہ میں انگلیوں کا باہم ضم کرنا اس لئے ہے کہ انگلیوں کا رخ قبلہ کی طرف ہو جائے۔

(۲۳۸) وَعَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهَا قَالَتْ: رَأَيْتُ رَسُولَ اللهِ ﷺ يُصَلِّي مُتَرَبِّعاً. رَوَاهُ النَّسَائِيُّ، وَصَحَّحَهُ ابْنُ خُزَيْمَةَ.

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا روایت کرتی ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو چار زانوؤں پر بیٹھ کر نماز ادا فرماتے دیکھا ہے۔ (نسائی نے اسے روایت کیا ہے اور ابن خزیمہ نے اسے صحیح قرار دیا ہے)

لغوی تشریح: ﴿ متربعا ﴾ تربع سے ماخوذ ہے۔ تربع یہ ہے کہ دائیں پاؤں کے نچلے حصہ کو اپنی بائیں ران کے نیچے کر لینا اور بائیں قدم کا باطنی حصہ دائیں ران کے نیچے پورے اطمینان اور سکون کی حالت کے ساتھ اور اپنی دونوں ہتھیلیاں اپنے گھٹنوں پر اس طرح رکھے کہ انگلیاں کھلی ہوئی ہوں جس طرح حالت رکوع میں کھلی ہوتی ہیں۔ اس طرح بیٹھنا مرض کی وجہ سے ہے اور یہ حدیث نبی ﷺ کی اس نماز کی کیفیت بیان کرتی ہے جب آپ گھوڑے سے نیچے گر گئے تھے اور پاؤں پر چوٹ آگئی تھی (پاؤں کا جوڑ کھل گیا تھا) (سبل السلام)

حاصل کلام: یہ حدیث دلالت کرتی ہے کہ جب آدمی کسی وجہ سے معمول کے مطابق نماز ادا کرنے سے معذور ہو جائے اور قیام پر قادر نہ ہو تو اس کیلئے چار زانوں بیٹھ کر نماز ادا کرنی جائز ہے۔

(۲۳۹) وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ كَانَ

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ دونوں سجدوں کے درمیان یہ دعا پڑھتے تھے

يَقُولُ بَيْنَ السَّجْدَتَيْنِ : اَللَّهُمَّ اغْفِرْ لِيْ، وَارحَمْنِيْ، وَاهْدِنِي، وَعَافِنِيْ، وَارْزُقْنِيْ . رَوَاهُ الأَرْبَعَةُ إِلاَّ النَّسَائِيَّ، وَاللَّفْظ لِأَبِيْ دَاوُدَ، وَصَحَّحَهُ الحَاكِمُ.

اللهم اغفرلی .... الخ یا اللہ! میری پردہ پوشی فرما دے (یا مجھے بخش دے) مجھ پر رحم فرما۔ مجھے راہ ہدایت پر چلا (اور گامزن رکھ) مجھ سے درگزر فرما (معاف کر دے) مجھے رزق (حلال) عطا فرما۔ (اسے نسائی کے علاوہ چاروں نے روایت کیا ہے۔ یہ الفاظ ابوداؤد کے ہیں۔ حاکم نے اس کو صحیح قرار دیا ہے)

لغوی تشریح: ﴿عافنی﴾ معافات سے ماخوذ ہے۔ یہ دعائیہ صیغہ ہے۔ معنی ہے کہ مجھے سلامتی اور عافیت سے نواز۔

حاصل کلام: نماز میں مختلف مواقع پر نبی ﷺ سے مختلف دعائیں منقول ہیں۔ اسی طرح دو سجدوں کے مابین جلسہ کے موقع پر مذکورہ بالا دعا آپؐ نے پڑھی ہے۔ لہٰذا سب نمازیوں کو یہ دعا مسنون پڑھنی چاہئے۔ بعض روایات میں "وارفعنی" اور بعض میں "واجبرنی" کا اضافہ منقول ہے اور بعض میں مختصراً "رب اغفرلی" کے الفاظ بھی آئے ہیں۔ اس لئے حسب حال جو دعا پڑھ لی جائے درست ہے۔

(۲۴۰) وَعَنْ مَالِكِ بْنِ الحُوَيْرِثِ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، أَنَّهُ رَأَى النَّبِيَّ ﷺ يُصَلِّي، فَإِذَا كَانَ فِيْ وِتْرٍ مِنْ صَلاَتِهِ لَمْ يَنْهَضْ حَتَّى يَسْتَوِيَ قَاعِداً . رواه البخاري.

حضرت مالک بن حویرث رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ انہوں نے نبی ﷺ کو نماز ادا فرماتے دیکھا' جب آپ اپنی نماز کی وتر (رکعت) پڑھتے تو (پہلے تھوڑا) بیٹھتے پھر سیدھا کھڑے ہو جاتے۔ (بخاری)

لغوی تشریح: ﴿فی وتر من صلاته﴾ یعنی جب آپؐ پہلی یا تیسری رکعت مکمل فرما لیتے اور دوسری یا چوتھی کیلئے کھڑا ہونا چاہتے (تو اس وقت ایسا کرتے) ﴿لم ینهض﴾ نہ کھڑے ہوتے۔ ﴿حتی یستوی قاعدا﴾ پہلے سیدھے مکمل طور پر بیٹھتے' اس کو جلسہ استراحت کہتے ہیں اور یہ مسنون و مشروع ہے۔

حاصل کلام: اس حدیث سے جلسہ استراحت کی مشروعیت ثابت ہوتی ہے۔ امام شافعی رحمہ اللہ اس کے قائل ہیں مگر امام احمد رحمہ اللہ اور امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ اس کے قائل نہیں اور وہ اسے بڑھاپے پر محمول کرتے ہیں۔ مگر یہ تاویل درست نہیں۔ آنحضرت ﷺ نے مالک رضی اللہ عنہ اور ان کے رفقاء سے فرمایا تھا "صلوا کما رایتمونی اصلی" کہ "تم اس طرح نماز پڑھو جس طرح تم نے مجھے نماز پڑھتے دیکھا ہے۔" اور وہی بیان کرتے ہیں کہ آپؐ جلسہ استراحت کرتے تھے۔ خود راوی حدیث نے جب اسے بڑھاپے پر محمول نہیں کیا تو پھر یہ محمول محض دفع الوقتی ہے۔

(۲۴۱) وَعَنْ أَنَسِ بْنِ مَالِكٍ حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی

رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ قَنَتَ شَهْراً بَعْدَ الرُّكُوعِ ، يَدْعُوْ عَلَى أحياءِ من أَحْيَاءِ العَرَبِ ، ثُمَّ تَرَكَهُ. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

وَلِأَحْمَدَ وَالدَّارَقُطْنِيِّ نَحْوُهُ مِنْ وَجْهٍ آخَرَ، وَزَادَ: فَأَمَّا فِي الصُّبْحِ فَلَمْ يَزَلْ يَقْنُتُ حَتَّى فَارَقَ الدُّنْيَا.

کریم ﷺ نے پورا مہینہ رکوع کے بعد دعائے قنوت پڑھی پھر اسے چھوڑ دیا۔ (بخاری و مسلم)

احمد اور دارقطنی وغیرہ نے ایک اور طریق سے اسے روایت کیا ہے' اس میں اتنا اضافہ ہے صبح کی نماز میں دعائے قنوت تادم زیست ہمیشہ کرتے رہے۔

لغوی تشریح: ﴿ قنت ﴾ قنوت سے ماخوذ ہے۔ اس کے متعدد معنی ہیں۔ یہاں مراد ہے قیام کی حالت میں دوران نماز دعا کرنا۔ یہ دعا قبل از رکوع ہے یا بعد از رکوع۔ ﴿ علی احیاء ﴾ علی اس جگہ نقصان' ضرر کیلئے استعمال ہوا ہے یا یوں بھی کہا گیا ہے بددعا کی۔ یعنی جب کسی کے نقصان اور ضرر کیلئے دعا کی جائے تو اس موقع پر دعا علیہ بولا جاتا ہے یعنی فلاں نے فلاں کیلئے نقصان و ضرر کی دعا کی اور احیاء جمع ہے "حی" کی۔ جس کے معنی قبیلہ کے ہیں اور یہ قبائل (عہد شکن) رعل' ذکوان' عصیہ اور بنو لحیان تھے۔ ان کیلئے رسول اللہ ﷺ نے بددعا فرمائی۔ اس لئے کہ آپؐ نے ان کی درخواست پر پروردگار کے احکامات پہنچانے اور تبلیغ اسلام کیلئے ان قبائل کی طرف اپنے ستر قاری اصحاب کرامؓ کو بھیجا تھا' جب یہ قافلہ مبلغین' بئر معونہ پر پہنچا (اور یہ کنواں یا چشمہ بنی عامر اور حرہ بنی سلیم کے علاقہ میں واقع تھا بلکہ یہ حرہ بنی سلیم سے زیادہ قریب تھا) تو بنو سلیم کے قبائل میں سے عامر بن طفیل ان کی طرف نکلا اور یہ قبائل رعل' ذکوان و عصیہ تھے۔ جہاں یہ قراء حضرات ٹھہرے ہوئے تھے وہیں ان قبائل کے لوگوں نے ان کو گھیرے میں لے لیا۔ ان قاریوں نے بھی اپنی تلواریں نکال لیں اور مد مقابل دشمنوں سے خوب لڑے کہ سب کے سب جام شہادت نوش کر گئے۔ صرف کعب بن زید رضی اللہ عنہ زندہ بچے۔ کفار نے انہیں اس حالت میں چھوڑا تھا کہ زندگی کی رمق ابھی ان کے اندر باقی تھی مگر انہوں نے اپنے گمان کے مطابق انہیں مار دیا تھا۔ مقتولین میں سے صرف یہی بچے۔ بالآخر غزوۂ خندق میں جام شہادت نوش فرمایا۔ یہ المناک اور دردناک واقعہ ۴ھ ماہ صفر میں پیش آیا۔ یعنی غزوۂ احد کے چار ماہ بعد۔ بنو لحیان کے حق میں بددعا کی وجہ یہ تھی کہ عضل و قارہ کے قبائل نے نبی کریم ﷺ سے ایسے (عالم) آدمیوں کا مطالبہ کیا تھا جو انہیں اسلام کی دعوت دے سکیں اور انہیں احکام شریعت کی تعلیم دے سکیں۔ چنانچہ آپؐ نے دس مردان عظیم ان کی جانب بھیجے۔ جب یہ حضرات رجیع تک پہنچے (یہ جگہ رابغ اور جدہ کے درمیان واقع ہے) تو ان قبائل کے لوگوں نے ان دس آدمیوں کے ساتھ دھوکہ کیا اور بنو لحیان کو بھی اشارہ کیا (شہہ دی) یہ ھذیل کے قبائل سے ایک قبیلہ تھا۔ یہ سب لوگ ان کی طرف نکل کھڑے ہوئے اور ان کو گھیرے میں لے لیا۔ چنانچہ دو کے علاوہ باقی کو قید کر لیا یعنی صرف خبیب بن عدی رضی اللہ عنہ اور زید بن دثنہ رضی اللہ عنہ بچ گئے۔ ان دونوں کا قصہ مشہور و معروف

ہے یہاں بیان کرنے کی چنداں ضرورت نہیں۔ ان دونوں کے علاوہ باقی تمام کو انہوں نے تہ تیغ کر دیا اور یہ واقعہ بھی مذکورہ بالا ماہ صفر کا ہے۔ نبی ﷺ کو ان دونوں المناک واقعات کی اطلاع ایک ہی شب میں ملی۔ اس سے نبی ﷺ نہایت ہی افسردہ اور غمگین ہوئے کہ پورا ایک مہینہ ان کیلئے بددعا فرماتے رہے اور پھر بددعا کرنا ترک کر دیا۔ اس قسم کی دعاء قنوت کو قنوت نازلہ کہا جاتا ہے۔ یہ دعاء قنوت بڑے بڑے المناک اور دردناک واقعات کے ساتھ مخصوص ہے۔ ورنہ نبی ﷺ دعا قنوت نہیں پڑھتے تھے' الا یہ کہ مسلمانوں میں سے لوگوں کیلئے دعا فرمائیں یا کفار میں سے بد عہد' عہد شکن قسم کے لوگوں کیلئے بددعا فرمائیں۔ رہا نماز فجر میں مسند احمد اور دارقطنی کے حوالہ سے قنوت کے پڑھنے کا التزام و مواظبت کا اضافہ تو یہ قابل استدلال نہیں۔ نیز یہ حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت آگے آنے والی حدیث کے بھی معارض ہے اور قنوت نازلہ کسی نماز کے ساتھ مخصوص نہیں ہے۔ اسے تمام نمازوں میں پڑھا جا سکتا ہے۔

حاصل کلام : اس حدیث سے کئی مسائل پر روشنی پڑتی ہے۔ نماز فجر میں آپؐ سے دعاء قنوت ثابت ہے۔ مہینہ بھر آپؐ عہد شکنی اور بد عہدی کی بناء پر مقتول صحابہؓ کی وجہ سے بددعا کرتے رہے۔ ظاہر ہے یہ فرض نماز ہی تھی اور یہ بھی معلوم ہوا کہ رکوع کے بعد دعا فرماتے رہے۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ اسلام دین تبلیغ ہے۔ مبلغین کی جماعت تیار رہنی چاہئے' جہاں تبلیغ کی ضرورت ہو وہاں جماعتی شکل میں تبلیغ کیلئے جانا چاہئے۔ نظم جماعت کی طرف بھی اس سے اشارہ ملتا ہے اور اطاعت امیر بھی اس سے ظاہر ہے۔ ایک بات یہ بھی واضح ہوتی ہے کہ نبی کریم ﷺ ذاتی علم غیب نہیں رکھتے تھے اگر ان کو علم غیب ہوتا تو اپنے تیار مبلغین کو قتل کیلئے کیوں بھیجتے۔ جان بوجھ کر نعوذ باللہ تو آپؐ نے ایسا ہرگز نہیں کیا۔ جب تک اللہ تعالیٰ کی طرف سے اطلاع موصول نہیں ہوئی اس وقت تک آپؐ کو اپنے بھیجے ہوئے مبلغین کی صورت حال کی کچھ خبر نہیں تھی۔ احناف اسی حدیث کی روشنی میں عند الضرورت قنوت نازلہ کے قائل ہیں۔ جبکہ امام شافعی رحمہ اللہ نماز فجر میں ہمیشہ دعاء قنوت پڑھنے کے قائل ہیں اور اسے مسنون قرار دیتے ہیں۔ طریقہ دعا یہ ہے کہ امام رکوع کے بعد ہاتھ اٹھا کر دعائے قنوت نازلہ پڑھے اور مقتدی آمین کہیں۔

(٢٤٢) وَعَنْهُ أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ كَانَ لاَ يَقْنُتُ إِلاَّ إِذَا دَعَا لِقَوْمٍ أَوْ عَلَى قَوْمٍ. وَصَحَّحَهُ ابْنُ خُزَيْمَةَ.

حضرت انس رضی اللہ عنہ ہی سے یہ روایت بھی مروی ہے کہ نبی ﷺ جب کسی قوم کے حق میں یا کسی کیلئے بددعا کرتے تو اس صورت میں قنوت پڑھتے ورنہ نہیں پڑھتے تھے۔ (اس کو ابن خزیمہ نے صحیح قرار دیا ہے)

لغوی تشریح : ﴿کان لا یقنت﴾ یعنی قنوت نازلہ نہیں پڑھتے تھے۔ ﴿الا اذا دعا لقوم﴾ مگر جب کسی قوم کے نفع کیلئے دعا کرتے۔ مصیبت سے نجات و چھٹکارے کیلئے اور ﴿دعا علی قوم﴾ یا کسی قوم پر بددعا کرتے۔

حاصل کلام : بظاہر ان احادیث میں تعارض محسوس ہوتا ہے کہ پہلی حدیث میں نماز فجر میں قنوت کا ہمیشہ

پڑھنا ثابت ہے اور دوسری سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ کسی قوم کے نفع کیلئے دعا یا کسی کی ہلاکت کیلئے بددعا کرتے تھے اور تیسری کے جو اس کے بعد آرہی ہے سے معلوم ہوتا ہے کہ نماز فجر میں قنوت پڑھنا بدعت ہے۔ ان میں تطبیق یوں ہو سکتی ہے کہ آپؐ اور صحابہ کرامؓ اور خصوصاً خلفاء راشدینؓ نماز فجر میں قنوت پڑھتے رہے ہیں۔ جس حدیث میں بدعت قرار دیا گیا ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ بالالتزام' مسلسل اور بلاناغہ ایسا نہیں ہوتا تھا۔ اس التزام کو مسنون قرار دینا غیر مسنون اور بدعت ہے۔ مطلب یہ نکلا کہ صبح کی نماز میں ہمیشہ بلاناغہ' بلاضرورت قنوت نہ پڑھی جائے۔ جس حدیث میں صبح کی نماز میں ہمیشہ قنوت پڑھنے کا ذکر ہے اس کا مطلب تو یہ ہے کہ قنوت کبھی منسوخ نہیں ہوئی۔ ضرورت پیش آنے پر آپؐ قنوت پڑھتے رہے اور جس حدیث میں کسی کے حق میں دعا اور کسی کیلئے بددعا کا ذکر ہے یہ تطبیق کی صورت ہی ہے کہ ضرورت لاحق ہونے کی صورت میں دعا و بددعا کرتے تھے۔ احناف اسی کے قائل ہیں۔ نیز احناف وتروں کے علاوہ کسی نماز میں ہمیشہ اور مسلسل قنوت پڑھنے کے حق میں نہیں ہیں اور جب مسلمانوں پر کوئی ناگہانی آفت' مصیبت نازل ہو جائے مثلاً دشمن نے اسلامی ریاست پر حملہ کر دیا ہے' کوئی وباء پھوٹ پڑی ہے' قحط سالی کا سماں پیش آگیا ہے۔ ایسے حالات میں تو احناف بھی نماز پنج گانہ میں قنوت پڑھنا مسنون سمجھتے ہیں اور شوافع حضرات آدھے آخری رمضان میں قنوت وتر کے قائل ہیں باقی ایام میں وہ قائل نہیں البتہ فجر کی نماز میں ہیشگی اور دوام کے قائل ہیں اور دوسری نمازوں میں جب کوئی مصیبت ٹوٹ پڑے یا وبا پھوٹ پڑے تو پڑھنے کے قائل ہیں۔

(۲٤۳) وَعَنْ سَعْدِ بْنِ طَارِقٍ الأَشْجَعِيِّ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قُلْتُ لِأَبِي: يَا أَبَتِ! إِنَّكَ قَدْ صَلَّيْتَ خَلْفَ رَسُولِ اللهِ ﷺ وَأَبِيْ بَكْرٍ وَعُمَرَ وَعُثْمَانَ وَعَلِيٍّ، أَفَكَانُوا يَقْنُتُوْنَ فِيْ الفَجْرِ؟ قَالَ: أَيْ بُنَيَّ مُحْدَثٌ. رَوَاهُ الْخَمْسَةُ إِلاَّ أَبَا دَاوُدَ.

حضرت سعد بن طارق اشجعی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ میں نے اپنے والد سے استفسار کیا کہ ابا جان! آپ نے رسول اللہ ﷺ' ابوبکر رضی اللہ عنہ و عمر رضی اللہ عنہ اور عثمان رضی اللہ عنہ و علی رضی اللہ عنہ کے پیچھے نماز پڑھی ہے۔ کیا یہ سب نماز فجر میں قنوت پڑھا کرتے تھے؟ انہوں نے جواب دیا کہ بیٹا! یہ نئی بات ہے۔ (اس کو ابوداؤد کے سوا پانچوں نے روایت کیا ہے)

لغوی تشریح: ﴿ای بنی﴾ ای حرف ندا ہے اور بنی "با" پر ضمہ اور "یا" پر فتحہ اور تشدید۔ "ابن" کی تصیغر ہے یائے متکلم مضاف ہے۔ معنی اے میرے بیٹے ﴿محدث﴾ احداث سے اسم مفعول ہے یعنی گھڑی ہوئی۔ تصنیف شدہ بات۔ (بدعت) جو دور رسالت میں موجود نہیں تھی۔ پس اس گفتگو کا نچوڑ اور خلاصہ یہ ہے کہ قنوت نازلہ بسا اوقات پڑھنا ثابت ہے' اس پر دوام اور ہیشگی ثابت نہیں۔

حاصل کلام: اس حدیث کی روشنی میں یہ استدلال کرنا کہ نماز میں قنوت پڑھنا بدعت ہے درست نہیں۔ اس سلسلہ کی ضروری وضاحت ہم پہلے بھی بیان کر چکے ہیں کہ اس سے مراد التزام اور ہیشگی ہے۔

مطلقاً قنوت کی نفی مراد نہیں۔

راوی حدیث: ﴿ سعد رحمۃ اللہ علیہ ﴾ پورا نام سعد بن طارق بن اشیم (احمد کے وزن پر) بن مسعود اشجعی کوفی ہے۔ ان کی کنیت ابو مالک تھی۔ ثقہ تابعین میں ان کا شمار ہوتا ہے۔ ۱۴۰ھ کے آخر پر فوت ہوئے۔

﴿ طارق اشجعی رضی اللہ عنہ ﴾ طارق بن اشیم بن مسعود اشجعی کوفی۔ مشہور صحابی ہیں۔ ان سے صرف چودہ احادیث نقل کی گئی ہیں اور ان کے بیٹے سعد کے علاوہ ان سے کسی نے روایت نہیں کی۔ کوفیوں میں ان کا شمار ہوتا ہے۔

(٢٤٤) وَعَنِ الْحَسَنِ بْنِ عَلِيٍّ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا قَالَ: عَلَّمَنِي رَسُولُ اللهِ ﷺ كَلِمَاتٍ أَقُولُهُنَّ فِي قُنُوتِ الوِتْرِ: «**اللَّهُمَّ اهْدِنِيْ فِيمَنْ هَدَيْتَ، وَعَافِنِيْ فِيْمَنْ عَافَيْتَ، وَتَوَلَّنِيْ فِيمَنْ تَوَلَّيْتَ، وَبَارِكْ لِيْ فِيْمَا أَعْطَيْتَ، وَقِنِي شَرَّ مَا قَضَيْتَ، فَإِنَّكَ تَقْضِي وَلاَ يُقْضَى عَلَيْكَ، إِنَّهُ لاَ يَذِلُّ مَنْ وَّالَيْتَ، تَبَارَكْتَ رَبَّنَا وَتَعَالَيْتَ**». رَوَاهُ الخَمْسَةُ، وَزَادَ الطَّبَرَانِيُّ وَالبَيْهَقِيُّ: «**وَلاَ يَعِزُّ مَنْ عَادَيْتَ**». زَادَ النَّسَائِيُّ مِنْ وَجْهٍ آخَرَ فِي آخِرِهِ: «**وَصَلَّى اللَّهُ عَلَى النَّبِيِّ**».

وَلِلْبَيْهَقِي عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا قَالَ: كَانَ رَسُولُ اللهِ ﷺ يُعَلِّمُنَا دُعَاءً نَدْعُو بِهِ فِي القُنُوتِ مِنْ صَلاةِ الصُّبْحِ. وَفِيْ سَنَدِهِ ضَعْفٌ.

حضرت حسن بن علی رضی اللہ عنہما نے بیان کیا کہ رسول اللہ ﷺ نے مجھے چند کلمات ایسے سکھائے ہیں جنہیں میں وتروں میں (دعائے قنوت کے طور پر) پڑھتا ہوں۔ اللھم اھدنی فیمن ہدیت ...... الخ "اے اللہ! مجھے ہدایت دے کر ان لوگوں کے زمرہ میں شامل فرما جنہیں تو نے رشد و ہدایت سے نوازا ہے اور مجھے عافیت دے کر ان میں شامل فرما دے جنہیں تو نے عافیت بخشی ہے اور جن کو تو نے اپنا دوست قرار دیا ہے ان میں مجھے بھی شامل کر کے اپنا دوست بنا لے۔ جو کچھ تو نے مجھے عطا فرمایا ہے اس میں میرے لئے برکت ڈال دے اور جس شر و برائی کا تو نے فیصلہ فرما دیا ہے اس سے مجھے محفوظ رکھ اور بچا لے۔ یقیناً فیصلہ تو ہی صادر فرماتا ہے تیرے خلاف فیصلہ صادر نہیں کیا جا سکتا اور جس کا تو والی بنا وہ کبھی ذلیل و خوار اور رسوا نہیں ہو سکتا۔ آقا ہمارے پروردگار تو ہی برکت والا اور بلند و بالا ہے" (اسے پانچوں (احمد، ابوداؤد، ترمذی، نسائی، ابن ماجہ) نے روایت کیا ہے۔) طبرانی اور بیہقی نے ولا یعز من عادیت کا اضافہ بھی نقل کیا ہے۔ نیز نسائی نے ایک دوسرے طریق سے اس دعا کے آخر میں وصلی اللہ علی النبی کا اضافہ بھی روایت کیا ہے۔

اور بیہقی میں ابن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت میں ہے
کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہمیں دعا سکھاتے تھے جسے ہم
صبح کی نماز میں دعا قنوت کی صورت میں مانگتے تھے۔

(اس کی سند میں ضعف ہے)

لغوی تشریح : ﴿ تولنی ﴾ یعنی میرے کام کو پھیر دے' اس کی اصلاح کر دے۔ ﴿ فیمن تولیت ﴾ یعنی ان لوگوں کے کاموں کی طرح جن کی تو نے اصلاح کی ہے ﴿ وقنی ﴾ میری حفاظت فرما ﴿ شرما قضیت ﴾ یعنی ہر اس شر سے جو اللہ کی تقدیر میں ہے۔ ﴿ فانک تقضی ﴾ یعنی تو مقدر کرتا ہے اور حکم فرماتا ہے جس کا بھی تو ارادہ کرتا ہے ﴿ ولا یقضی علیک ﴾ مجہول کا صیغہ ہے۔ یعنی تجھ پر کسی قسم کا حکم نہیں لگایا جا سکتا۔ ﴿ انہ ﴾ اس کی شان یہ ہے۔۔ ﴿ لایذل ﴾ "یاء" پر فتحہ اور ذال پر کسرہ۔ یعنی وہ ذلیل نہیں ہوتا' رسوا نہیں ہوتا ﴿ من والیت ﴾ یہ "مولاہ" سے ماخوذ ہے۔ "معاداۃ" کی ضد ہے۔ یعنی جس کا تو والی بن جاتا ہے۔ ﴿ ولا یعز ﴾ "یاء" پر فتحہ اور عین کے نیچے کسرہ۔ یعنی وہ صاحب عزت و شرف نہیں ہو سکتا۔ ﴿ من عادیت ﴾ یعنی جس کا تو دشمن ہو جائے۔ اس دعا کے ساتھ صبح کی نماز میں قنوت کرنا کسی صحیح حدیث سے ثابت نہیں۔ ﴿ یعلمنا ﴾ تعلیم سے ماخوذ ہے یعنی وہ ہمیں سکھاتے تھے۔ "دعاء" گزشتہ دعا یعنی اللھم اھدنی والی دعا۔ اور یہ بات کہ وہ ہمیں صبح کی نماز میں کرنے کے لئے یہ سکھاتے تھے' ضعیف ہے۔ جس طرح مصنف نے بھی اس کی صراحت کی ہے۔ اس میں عبدالرحمٰن بن ھرمز راوی ضعیف ہے۔

حاصل کلام : اس حدیث سے ثابت ہوا کہ نماز وتر میں یہ دعا پڑھنا چاہئے۔ یہ دعا رکوع سے پہلے اور بعد دونوں طرح درست ہے لیکن مستدرک حاکم اور بیہقی میں جو یہ الفاظ ہیں کہ جب رکوع سے اٹھو تو یہ دعا پڑھو۔ یہ الفاظ شاذ اور محل نظر ہیں جیسا کہ مرعاۃ المفاتیح اور ارواء الغلیل میں ہے۔ اس دعا کے آخر میں جو "صلی اللہ علی النبی" کے الفاظ ہیں۔ بعض حضرات نے انہیں ضعیف قرار دیا ہے مگر علامہ البانی نے کہا ہے کہ یہ زیادت صحیح ہے۔ (ارواء الغلیل ج ۲ ص ۱۷۷) اور یہی بات درست ہے۔ نماز وتر کی حیثیت کیا ہے اور ان کی تعداد کتنی ہے اس بارے میں فقہاء میں اختلاف ہے۔ احناف کے نزدیک یہ واجب ہے مگر جمہور علماء کے نزدیک یہ سنت ہے اور یہی بات راجح ہے۔

رہا تعداد کا معاملہ۔ تو اس کی تعداد ایک سے لے کر گیارہ تک احادیث سے معلوم ہوتی ہے۔ احناف تین کے قائل ہیں البتہ ان کے پڑھنے کی نوعیت مختلف ہے۔ تین وتر ایک ہی تشہد سے یا دو کے بعد تشہد' درود شریف' دعا اور سلام پھر ایک وتر علیحدہ پڑھا جائے۔ اکثر احادیث میں یہی دوسری کیفیت مروی ہے۔ پانچ یا سات وتر میں بھی صرف آخر میں ایک تشہد ہے۔ البتہ نو وتر اکٹھے پڑھے جائیں تو آٹھ میں تشہد درود شریف و دعا کے بعد بغیر سلام کے نویں رکعت پوری کر کے سلام پھیر دیا جائے یا یہ کہ دو دو

رکعت پر سلام اور آخر میں ایک وتر پڑھا جائے۔ مگر احناف صرف تین وتر کے قائل ہیں اور اس میں دو تشہد پڑھتے ہیں لیکن یہ صحیح تر روایات کے خلاف ہے اور دعائے قنوت رکوع سے پہلے یا بعد دونوں طرح درست ہے۔ دعائے قنوت ہاتھ اٹھا کر پڑھنی چاہئے جیسا کہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے منقول ہے۔

راوی حدیث: ﴿ حسن بن علی رضی اللہ عنہما ﴾ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نواسے اور ان کے دل کا سرور اور دنیا میں ان کے لئے خوشبو تھے۔ جنت کے نوجوانوں کے سرداروں میں سے ایک یہ بھی ہیں۔ حضرت حسن رضی اللہ عنہ ۳ھ کو پیدا ہوئے اور انہیں حضرت علی رضی اللہ عنہ ان کے والد گرامی کی شہادت کے بعد مسلمانوں کا خلیفہ بنایا گیا۔ لیکن اپنی خلافت کے سات ماہ بعد جمادی الاولیٰ ۴۱ھ کو حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے حق میں دستبردار ہونے کا اعلان کر دیا۔ تاکہ مسلمانوں کی دو جماعتوں کے درمیان خون نہ بہے۔ ۴۹ھ کو فوت ہوئے اور بقیع میں دفن ہوئے۔

(٢٤٥) وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «**إِذَا سَجَدَ أَحَدُكُمْ فَلاَ يَبْرُكْ كَمَا يَبْرُكُ البَعِيرُ، وَلْيَضَعْ يَدَيْهِ قَبْلَ رُكْبَتَيْهِ**». أَخْرَجَهُ الثَّلاَثَةُ.

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "تم میں سے جب کوئی سجدہ کرے تو اونٹ کی طرح نہ بیٹھے اور گھٹنوں سے پہلے اپنے ہاتھ زمین پر رکھے۔" (نسائی' ترمذی اور ابن ماجہ)

وَهُوَ أَقْوَى مِنْ حَدِيْثِ وَائِلِ ابْنِ حُجْرٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ: «رَأَيْتُ النَّبِيَّ ﷺ إِذَا سَجَدَ وَضَعَ رُكْبَتَيْهِ قَبْلَ يَدَيْهِ». أَخْرَجَهُ الأَرْبَعَةُ. فَإِنَّ لِلأَوَّلِ شَاهِداً مِنْ حَدِيْثِ ابْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُما، وَصَحَّحَهُ ابْنُ خُزَيْمَةَ. وَذَكَرَهُ البُخَارِيُّ مُعَلَّقاً مَوْقُوفاً.

اور یہ حدیث وائل بن حجر رضی اللہ عنہ کے حوالہ سے مروی اس حدیث سے قوی تر ہے جس میں ہے کہ میں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو سجدہ میں جاتے دیکھا ہے کہ آپؐ اپنے گھٹنے ہاتھوں سے پہلے زمین پر رکھتے تھے۔ (اس کو چاروں ابوداؤد' ترمذی' نسائی اور ابن ماجہ نے روایت کیا ہے۔ پہلی حدیث کا شاہد ابن عمر رضی اللہ عنہما کی حدیث ہے۔ ابن خزیمہ نے اسے صحیح قرار دیا ہے اور بخاری نے اسے تعلیقاً موقوف بیان کیا ہے)

لغوی تشریح: ﴿ اذا سجد احدکم ﴾ یعنی جب سجدہ کرنے کیلئے جھکے۔ ﴿ فلا یبرک ﴾ باب نصر ینصر سے نہی کا صیغہ ہے۔ یعنی نہ بیٹھے۔ ﴿ کما یبرک البعیر ﴾ جس طرح اونٹ بیٹھتا ہے۔ یہ حدیث اس کی دلیل ہے کہ سجدہ کرنے کیلئے جھکتے وقت زمین پر پہلے ہاتھ رکھنے چاہیں بعد میں گھٹنے۔ ﴿ وھو ﴾ سے مراد یہاں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی یہی حدیث ہے۔ ﴿ اقوی ﴾ سند کے اعتبار سے قوی تر ہے۔ ﴿ من حدیث وائل بن حجر ﴾ وائل بن حجر سے مروی حدیث سے جس میں گھٹنوں کو ہاتھوں سے پہلے زمین پر رکھنے کا ذکر ہے۔ ﴿ فان للاول ﴾ سے مراد حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی مذکورہ بالا حدیث ہے

﴿ شاھدا ﴾ یعنی گواہ، اس سے مراد حدیث کو تقویت پہنچانے والا ہے۔ جسے "دراوردی" نے عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مرفوع روایت کیا ہے مگر ﴿ وذکرہ ﴾ یعنی وہ شاھد ذکر کیا ہے۔ ﴿ البخاری موقوفا ﴾ یعنی بخاری نے موقوفاً چنانچہ نافع کا قول ہے کہ ابن عمر رضی اللہ عنہما اپنے ہاتھوں کو گھٹنوں سے پہلے زمین پر رکھتے تھے۔ بخاری نے تو موقوفاً نقل کیا ہے۔

حاصل کلام: حضرت وائل رضی اللہ عنہ کی حدیث بیان کرنے میں شریک تنہا ہے اور وہ جب تنہا کوئی روایت بیان کرے تو اس کی روایت میں محدثین نے کلام کیا ہے اور وائل رضی اللہ عنہ کی حدیث کی تائید گو حضرت انس رضی اللہ عنہ کی روایت سے بھی ہوتی ہے لیکن اس کی سند میں ایک راوی ایسا ہے جو مجہول ہے۔ للذا ثابت ہوا کہ باعتبار سند حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث راجح ہے اور بحیثیت معنی تو یہ معلوم حقیقت ہے کہ حیوان کے گھٹنے اس کے ہاتھوں میں ہوتے ہیں یعنی اس کے پہلے دونوں پاؤں اور یہ مشاہدہ شدہ حقیقت ہے کہ اونٹ جب نیچے بیٹھنے کیلئے جھکتا ہے تو پہلے اپنے گھٹنے زمین پر ٹیکتا ہے پھر بیٹھتا ہے۔ جس کی تفصیل تحفۃ الاحوذی میں دیکھی جا سکتی ہے۔ سجدے میں جاتے وقت پہلے ہاتھ زمین پر رکھنے چاہئیں یا گھٹنے۔ اس سلسلہ میں دو روایتیں منقول ہیں۔ ایک حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے جس میں ہاتھوں کو پہلے زمین پر رکھنے کا ثبوت ہے اور دوسری حضرت وائل بن حجر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے جس میں پہلے گھٹنے رکھنے کا ذکر ہے۔ مصنف یعنی حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث کو راجح قرار دیا ہے اور اس کی تائید ابن عمر رضی اللہ عنہما کی روایت سے بھی ہوتی ہے۔ عموماً محدثین اور حنابلہ اسی کے قائل ہیں مگر احناف اور شوافع حضرت وائل رضی اللہ عنہ کی حدیث کے مطابق پہلے گھٹنے رکھنے کے قائل ہیں مگر صحیح بات یہی ہے کہ پہلے ہاتھ رکھے جائیں جیسا کہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی صحیح حدیث سے معلوم ہوتا ہے۔

(٢٤٦) وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُمَا، أَنَّ رَسُولَ اللهِ ﷺ كَانَ إِذَا قَعَدَ لِلتَّشَهُّدِ وَضَعَ يَدَهُ الْيُسْرَى عَلَى رُكْبَتِهِ الْيُسْرَى، وَالْيُمْنَى عَلَى الْيُمْنَى، وعَقَدَ ثَلَاثاً وَخَمْسِيْنَ، وَأَشَارَ بِإِصْبَعِهِ السَّبَّابَةِ. رَوَاهُ مُسْلِمٌ.

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ جب تشہد کیلئے بیٹھتے تو اپنا بایاں ہاتھ اپنے بائیں گھٹنے پر دایاں ہاتھ اپنے دائیں گھٹنے پر رکھتے اور ترپن کی گرہ دیتے (یعنی ترپن کا عدد بناتے) اور اپنی انگشت شہادت سے اشارہ کرتے۔ (مسلم)

وَفِيْ رِوَايَةٍ لَّهُ: وَقَبَضَ أَصَابِعَهُ كُلَّهَا، وَأَشَارَ بِالَّتِيْ تَلِي الإِبْهَامَ.

اور ایک روایت میں ہے جسے مسلم ہی نے روایت کیا ہے کہ اپنی تمام انگلیاں بند کر لیتے اور انگوٹھے کے ساتھ ملی ہوئی انگلی سے اشارہ کرتے۔

لغوی تشریح: ﴿ عقد ثلاثا وخمسین ﴾ اپنی انگلیوں کو گرہ دے کر ترپن کے عدد کی شکل بنا لے۔ اس کی صورت اس طرح ہوتی کہ اپنے انگوٹھے کو سبابہ (انگشت شہادت) کے نیچے کر لیتے۔ ﴿ سبابۃ ﴾

"با" پر تشدید انگوٹھے کے متصل انگشت کو کہتے ہیں۔ اس انگشت کا نام سبابہ یعنی گالی دینے والی کیوں پڑ گیا؟ اس لئے کہ دور جاہلیت میں گالی گلوچ کے موقع پر اس انگلی سے اشارہ کرتے ہیں بلکہ ہمارے مہذب زمانے میں بھی آج کل لوگ اس طرح اشارہ کر کے گالی مراد لیتے ہیں۔ روایات سے تشہد کی حالت میں بیٹھتے وقت دائیں ہاتھ کو گرہ دینے کی صورت میں تین حالتیں یا صورتیں بنتی ہیں۔ پہلی تو یہی ترپن کی شکل جو اسی حدیث میں مذکور ہے اور دوسری اس طرح کی انگشت شہادت کو چھوڑ کر باقی ساری انگلیوں کو ہتھیلی کے ساتھ ملا دینا اور یہ وہی ہیئت ہے جس کا "وقبض اصابعه کلها" کے ذریعہ اشارہ کیا گیا ہے اور تیسری ہیئت یہ ہے کہ انگشت وسطیٰ اور انگوٹھے کا حلقہ بنایا جائے۔ اسے ابن ماجہ نے وائل بن حجر رضی اللہ عنہ سے مرفوع بیان کیا ہے۔ اس موقع پر مناسبت کے لحاظ سے یہ ذہن نشین رہے کہ حساب کا شمار کرنے کیلئے اہل عرب بھی ایک معروف طریقہ استعمال کرتے رہے ہیں۔ جیسے صاحب سبل السلام نے ذکر کیا ہے اور وہ یہ ہے۔ ایک کے عدد کیلئے خنصر (یعنی چھوٹی انگلی) کو ہتھیلی کے باطن (اندرونی طرف) کے قریب گرہ کی شکل میں موڑ دینا اور دو کے عدد کیلئے خنصر اور بنصر (چھوٹی کے ساتھ والی) دونوں کو ہتھیلی کے اندرونی طرف موڑ دینا اور تین کیلئے انگشت وسطیٰ (بڑی درمیانی) کو بھی خنصر اور بنصر کے ساتھ بند کر دینا اور چار کے عدد کیلئے خنصر کو کھول دینا اور پانچ کیلئے بنصر کو خنصر کے ساتھ کھول دینا اور وسطیٰ کو بدستور بند رکھنا اور چھ کے عدد کیلئے تنہا بنصر کو بند کر دینا اور باقی انگلیوں کو کھلا رکھنا اور سات کے عدد کیلئے خنصر کو ہتھیلی سے ملے ہوئے انگوٹھے کے حصہ کی طرف دراز کر دینا اور آٹھ کے عدد کیلئے بنصر کو ان کے اوپر پھیلا دینا اور نو کے عدد کیلئے ان پر انگشت وسطیٰ کو پھیلا دینا۔ یہ طریقہ تو تھا اکائی کی گنتی کیلئے۔ اب دہائی کو لے لیں۔ دس کے عدد کو نمایاں کرنے کیلئے انگوٹھے کا سر انگشت شہادت کی طرف گرہ کی صورت میں موڑ دیا جائے اور بیس کے عدد کیلئے انگشت شہادت اور وسطیٰ کے درمیان میں انگوٹھے کو داخل کرنا اور تیس کے عدد کیلئے انگشت سبابہ کے سر کو انگوٹھے کے سر پر گرہ کی شکل دے دیں۔ یعنی دس کے عدد کے اظہار کیلئے جو صورت بنتی ہے یہ اس کے برعکس ہے اور چالیس کیلئے انگوٹھے کو انگشت سبابہ کے درمیان جہاں گرہ پڑتی ہو پر سوار کر دینا اور انگوٹھے کو اس کی جڑ کی طرف موڑ دینا اور پچاس کیلئے انگوٹھے سبابہ کی جڑ کی طرف موڑ دینا۔ یعنی انگوٹھے کے اندرونی حصہ کو اس خط پر رکھنا جو سبابہ اور انگوٹھے کے درمیان ہے اور ساٹھ کے عدد کیلئے سبابہ کو انگوٹھے کی پشت پر سوار کر دینا یعنی چالیس کی جو صورت بنتی ہے اس کے برعکس اور ستر کے عدد کیلئے انگوٹھے کے سر کو سبابہ کی وسطی گرہ (باطنی حصہ) پر ڈال دینا اور سبابہ کی ایک طرف کو انگوٹھے کی طرف لوٹا دینا اور اسی کے عدد کیلئے سبابہ کی ایک جانب کو اس کی جڑ کی طرف لوٹا دینا اور انگوٹھے کی جانب سے سبابہ کے پہلو پر انگوٹھے کو پھیلا دینا اور نوے کے عدد کے لئے سبابہ کو انگوٹھے کی جڑ کی طرف موڑ دینا اور انگوٹھے کو اس کے اوپر پھیلا دینا پکڑنے کی صورت میں۔ رہی سینکڑوں کی گنتی کا طریقہ تو اکائیوں کی طرح ہے نو سو تک بائیں ہاتھ میں اور ہزاروں کی گنتی کا طریقہ شمار بائیں ہاتھ میں جس سے دہائیاں شمار کی گئی ہیں۔

اب رہا تشہد کے موقع پر انگشت شہادت سے اشارہ کرنا کہ یہ کب اور کس طرح کیا جائے تو اس بارے میں اختلاف ہے۔ ایک قول یہ ہے کہ تشہد کے آغاز ہی سے لے کر اختتام تشہد تک انگلی کو ایک ہی ہیئت میں رکھے اور یہ صورت ترپن کے عدد کی سی بنتی ہے۔ یہ اشارہ کرنے کے طریقوں میں سے ایک طریقہ ہے مگر یہ روایت جس کی ہم شرح کر رہے ہیں اس کی تردید کرتی ہے کیونکہ ﴿ واشار باصبعه السبابة ﴾ کا عطف قول ماقبل پر ہے اور عطف مغایرت کا متقاضی ہے اور اشارہ ترپن کی گرہ سے پیدا شدہ ہیئت پر زائد چیز ہے نیز ابن خزیمہ اور بیہقی میں حضرت وائل رضی اللہ عنہ کی حدیث سے بھی اس کی تردید ہوتی ہے۔ جس میں مذکور ہے کہ "نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی انگلی اوپر اٹھائی پھر میں نے دیکھا کہ آپؐ اسے حرکت دیتے رہے اور دعا کرتے رہے" ظاہر ہے کہ حرکت تو کسی چیز کو ایک ہی ہیئت پر برقرار رکھنے کے منافی ہے اور جس روایت میں آیا ہے کہ آپؐ حرکت نہیں دیتے تھے۔ حافظ ابن قیم رحمۃ اللہ علیہ نے زاد المعاد میں کہا ہے کہ وہ ضعیف ہے۔ ایک قول یہ بھی ہے کہ آپؐ اشارہ اس وقت کرتے جب لا الٰہ الا اللہ کہتے۔ اس سے توحید کی طرف اشارہ ہے۔ کیونکہ تشہد کی حالت میں جو اشارہ کیا جاتا ہے یا تو وہ کسی محسوس چیز کی طرف ہوگا یا کسی معنی کی جانب جو ذہن میں ہوگا۔ نماز تو بہرحال کسی حسی اشارہ کا موقع و محل نہیں اور نہ امام کے سامنے کوئی ایسی چیز ہوتی ہے جس کی طرف وہ اشارہ کرے۔ لہٰذا اشارہ میں کوئی ایسی چیز ہی ہو سکتی ہے جس کا ذہن میں تصور ہو اور اس کے لئے سب سے زیادہ مناسب کلمۂ توحید لا الٰہ الا اللہ ہے کیونکہ کسی چیز کی وحدانیت بیان کرنے کیلئے ایک انگلی اٹھا کر اشارہ کرنا لوگوں کے ہاں متعارف اور مشہور ہے۔ لیکن یہ بات گو عقلاً قابل توجہ ہے مگر سنت سے اس کی تائید نہیں ہوتی کہ آپؐ لا الٰہ الا اللہ پر یوں اشارہ کرتے کہ "لا الٰہ" پر انگلی کو اوپر اٹھاتے اور "الا اللہ" پر نیچے کر لیتے۔ یہ اشارہ بلاشبہ اشارۂ توحید بھی ہے جیسا کہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ایک صحابیؓ دو انگلیوں سے اشارہ کر رہے تھے تو آپؐ نے فرمایا "احد، احد کہ ایک ہی انگلی سے اشارہ کرو" اور اسی بنا پر یہ شیطان کیلئے بمنزلہ نیزہ کے ہے لیکن کلمۂ توحید پر یوں اشارہ کی کیفیت بہرحال سنت سے ثابت نہیں۔ اس کے برعکس حدیث کے ظاہری الفاظ "یدعوبها" سے معلوم ہوتا ہے کہ اس سے مراد طلب مغفرت اور دعا ہے اور اسی سے یہ بات بھی ثابت ہوتی ہے کہ یہ اشارہ ابتدا سے آخر تشہد تک ہونا چاہئے، کیونکہ آداب دعا میں سے ایک یہ بھی ہے کہ انگشت شہادت سے اشارہ کیا جائے جیسا کہ امام بیہقی رحمۃ اللہ علیہ وغیرہ نے فرمایا ہے اور آثار سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے اور لا الہ الا اللہ فی الجملہ دعا بھی ہے کیونکہ دعا کی دو قسمیں ہیں۔ ایک دعائے ثنا اور دوسری دعائے طلب اور پورا تشہد دعا کی ان دونوں قسموں پر مشتمل ہے۔ اس لئے صحیح بات یہی ہے کہ اشارہ ابتدا سے اختتام دعا تک ہونا چاہئے اور اشارہ کے ساتھ انگلی کو حرکت بھی دینی چاہئے۔

حاصل کلام: اس حدیث میں (عقد ثلاثا و خمسین۔) تشہد میں بیٹھے ہوئے جب اشارہ فرماتے تو اپنے انگوٹھے کو پاس والی انگلی کی جڑ میں رکھتے اور باقی انگلیوں کو بند رکھتے۔ اسی طرح ہمیں کرنا چاہئے، تاکہ سنت پر عمل ہو جائے۔ تشہد میں انگشت شہادت سے اشارہ پر سب ائمہ متفق ہیں۔ ملا علی قاری

مشہور حنفی عالم نے رفع سبابہ پر دو مستقل رسالے لکھے ہیں جن میں صحیح احادیث لا کر ثابت کیا ہے کہ رفع سبابہ مسنون ہے اور خلاصہ کیدانی وغیرہ میں جو اسے حرام لکھا گیا ہے اس کی بڑی سخت تردید کی ہے' جو قابل دید ہے۔ فقہ حنفی کی مشہور کتب رد المختار' شامی اور شرح وقایہ وغیرہ میں بھی اسی طرح ہے۔

(۲٤٧) وَعَنْ عَبْدِاللهِ بْنِ مَسْعُودٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: اَلْتَفَتَ إِلَيْنَا رَسُولُ اللهِ ﷺ، فَقَالَ: «إِذَا صَلَّى أَحَدُكُمْ فَلْيَقُلِ: «التَّحِيَّاتُ للهِ وَالصَّلَوَاتُ وَالطَّيِّبَاتُ، السَّلاَمُ عَلَيْكَ أَيُّهَا النَّبِيُّ! وَرَحْمَةُ اللهِ وَبَرَكَاتُهُ، السَّلاَمُ عَلَيْنَا وَعَلَى عِبَادِ اللهِ الصَّالِحِينَ، أَشْهَدُ أَنْ لاَ إِلَه إِلاَّ اللَّهُ وَأَشْهَدُ أَنَّ مُحَمَّداً عَبْدُهُ وَرَسُولُهُ» ثُمَّ لِيَتَخَيَّرْ مِنَ الدُّعَاءِ أَعْجَبَهُ إِلَيْهِ، فَيَدْعُو». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ، وَاللَّفْظُ لِلْبُخَارِيِّ.

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ہماری طرف توجہ فرمائی اور ارشاد فرمایا کہ ''جب تم میں سے کوئی نماز پڑھے تو تشہد میں یوں کہے۔ تمام سلامیاں اللہ ہی کیلئے ہیں اور نمازیں اور پاکیزیاں بھی (زبانی' بدنی اور مالی عبادتیں صرف اللہ کیلئے ہیں) اے نبی! سلام ہو تجھ پر اور اللہ کی رحمت اور اس کی برکتیں ہوں۔ سلام ہو ہم پر اور اللہ کے صالح بندوں پر۔ میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی لائق عبادت (معبود) نہیں اور اس کی بھی گواہی دیتا ہوں کہ محمد (ﷺ) اللہ کے بندے اور اس کے رسول ہیں۔ پھر اسے دعا کا انتخاب کرنا چاہئے کہ جو اسے سب سے اچھی لگے وہ مانگے۔'' (بخاری و مسلم ۔ متن حدیث کے الفاظ بخاری کے ہیں)

وَلِلنَّسَائِيِّ: «كُنَّا نَقُولُ قَبْلَ أَنْ يُفْرَضَ عَلَيْنَا التَّشَهُّدُ». وَلأَحْمَدَ: أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ عَلَّمَهُ التَّشَهُّدَ، وَأَمَرَهُ أَنْ يُعَلِّمَهُ النَّاسَ.

اور نسائی میں ہے کہ ہم تشہد فرض ہونے سے پہلے کہا کرتے تھے اور احمد میں ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ان کو تشہد سکھایا اور حکم دیا کہ لوگوں کو اسے سکھاؤ

وَلِمُسْلِمٍ عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا قَالَ: كَانَ رَسُولُ اللهِ ﷺ يُعَلِّمُنَا التَّشَهُّدَ: «التَّحِيَّاتُ المَبارَكَاتُ الصَّلَوَاتُ الطَّيِّبَاتُ للهِ» إِلَى آخِرِهِ.

اور مسلم میں ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ ہمیں تشہد سکھاتے تھے (وہ اس طرح تھا التحیات المبارکات الصلوات الطیبات للہ ....الی آخرہ)

لغوی تشریح: ﴿ التحيات ﴾ التحیۃ کی جمع ہے۔ معنی اس کے عظمت و بزرگی' دوام و ہمیشگی یا پھر اس سے مراد قولی و زبانی عبادات۔ ﴿ الصلوات ﴾ نماز پنج گانہ یا پھر مطلق عبادات یا عبادات فعلیہ' فعلی و بدنی عبادتیں۔ ﴿ الطيبات ﴾ عمدہ کلام۔ مثلاً اللہ کی حمد و ثناء اور ذکر الٰہی اور اقوال صالحہ مراد ہیں یا پھر

ان سے اعمال صالحہ عامہ مراد ہیں یا مالی عبادات بھی مراد ہو سکتی ہیں اور ان کے طیب ہونے سے مراد ان کا ہر قسم کے شوائب سے خالص ہونا جن سے اللہ کی خوشنودی مطلوب ہو۔ ﴿اعجبه﴾ جو اسے سب سے زیادہ پسندیدہ و محبوب ہے اور اس کے نزدیک سب سے عمدہ' اچھا اور احسن ہے۔ ﴿كنا نقول﴾ مصنف نے اس کا ذکر نہیں کیا کہ وہ کیا کہتے تھے بلکہ تمام حدیث کو حذف کر دیا ہے۔ اس لئے ذکر نہیں کیا کہ مصنف اس پر متنبہ کرنا چاہتے ہیں کہ ﴿قبل ان يفرض﴾ کا جملہ فرضیت تشہد پر دلالت کرتا ہے۔ اس کے بعد احمد کی وہ روایت بیان کی ہے جو اس کی تائید کرتی ہے کیونکہ تشہد کی تعلیم کا حکم فرمانا اس کے وجوب پر دلالت کرتا ہے اور مصنف کا مقصد تشہد کے فرض ہونے سے پہلے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کیا کہتے تھے کو بیان کرنا نہیں ہے۔ اس لئے اسے حذف کر دیا ہے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم یہ کہا کرتے تھے۔ السلام علی اللہ۔ السلام علی جبرئیل و میکائیل۔ اس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرما دیا کہ "اس طرح نہ کہا کرو' بلکہ اس طرح کہا کرو: التحيات لله .... الخ۔"

حاصل کلام: اس حدیث سے ثابت ہوتا ہے کہ تشہد کے بعد دعا مانگنا مسنون ہے۔ دعا کونسی مانگی جائے اس پر کوئی پابندی نہیں۔ جو چاہے جتنی چاہے مانگ سکتا ہے۔ تاہم نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی فرمودہ دعائیں افضل ہیں۔ قرآنی دعائیں بھی مانگ سکتا ہے اور اپنی ضروریات کے لئے دیگر دعائیں بھی اس حدیث سے تشہد کا واجب ہونا بھی ثابت ہوتا ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ' حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ اور امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ وجوب کے قائل ہیں۔ دوسرے اہل علم کے نزدیک فرض ہے۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے تشہد کے جو الفاظ مروی ہیں۔ امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ اور اکثر علماء نے انہیں پسند کیا ہے کیونکہ یہ تشہد کے باب میں صحیح ترین روایت ہے اور امام شافعی رحمہ اللہ نے حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی تشہد کو اختیار کیا ہے۔

(٢٤٨) وَعَنْ فَضَالَةَ بْنِ عُبَيْدٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: سَمِعَ رَسُولُ اللهِ ﷺ رَجُلاً يَدْعُو فِي صَلاَتِهِ، وَلَمْ يَحْمَدِ اللَّهَ، وَلَمْ يُصَلِّ عَلَى النَّبِيِّ ﷺ، فَقَالَ: **عَجِلَ هٰذَا**، ثُمَّ دَعَاهُ، فَقَالَ: **إِذَا صَلَّى أَحَدُكُمْ فَلْيَبْدَأْ بِتَحْمِيْدِ رَبِّهِ وَالثَّنَاءِ عَلَيْهِ، ثُمَّ يُصَلِّيْ عَلَى النَّبِيِّ ﷺ، ثُمَّ يَدْعُوْ بِمَا شَاءَ.** رَوَاهُ أَحْمَدُ وَالثَّلاَثَةُ، وَصَحَّحَهُ التِّرْمِذِيُّ وَابْنُ حِبَّانَ وَالحَاكِمُ.

حضرت فضالہ بن عبید رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک آدمی کو اپنی نماز میں دعا کرتے سنا۔ نہ تو اس نے اللہ کی حمد کی اور نہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر درود بھیجا۔ آپؐ نے فرمایا "اس نے جلدی کی" پھر آپ نے اسے اپنے پاس بلایا اور سمجھایا کہ "تم میں سے کوئی جب دعا مانگنے لگے تو پہلے اسے اپنے رب کی حمد و ثنا کرنی چاہئے پھر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر درود بھیجنا چاہئے پھر اس کے بعد جو چاہے دعا مانگے۔" (اسے احمد' ترمذی' نسائی اور ابن ماجہ نے روایت کیا ہے۔ ترمذی' ابن حبان اور حاکم نے اسے صحیح قرار دیا ہے۔)

لغوی تشریح: ﴿عجل﴾ باب سمع يسمع سے عجل يعجل۔ اپنی دعا میں جلدی کی بایں صورت

کہ حمد اور درود کو چھوڑ دیا تھا۔ ﴿ ثم دعاہ ﴾ پھر اسے اپنے پاس بلایا کہ اسے آداب دعا سکھائیں۔

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ دعا جلدی جلدی نہیں کرنی چاہئے۔ دعا تو نام ہی عاجزی و انکساری اور اظہار تذلل کا ہے۔ اس لئے جب دعا کی جائے تو پورے اہتمام و اطمینان سے دعا کی جائے۔ پہلے اللہ تعالیٰ کی حمد و ثناء کی جائے پھر رسول اللہ ﷺ پر درود شریف پڑھا جائے پھر دعا کی جائے۔ یہ حدیث حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی حدیث تشہد کے عین مطابق ہے کہ تشہد میں بھی پہلے اللہ تعالیٰ کی تعریف و ثنا ہے اور حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے یہ حدیث تشہد کے بعد لا کر اشارہ کیا ہے کہ اس کا محل تشہد ہے۔

تشہد میں پہلے السلام علیک ایھا النبی اور پھر السلام علینا و علی عباد اللہ الصالحین کی حکمت یہ معلوم ہوتی ہے کہ آپؐ نے اور آپؐ ہی کی بدولت ہمیں نماز کا طریقہ و سلیقہ حاصل ہوا۔ اس میں خطاب کا لفظ "السلام علیک" حکائی ہے جیسا کہ علامہ ملا علی قاری نے شرح مشکوٰۃ میں کہا ہے۔ آپؐ خود بھی یہ کلمات یوں ہی پڑھتے تھے۔ نیز آپؐ کے انتقال کے بعد صحابہ کرام السلام علی النبی کے الفاظ پڑھنے لگے تھے۔ (بخاری) خطاب کبھی حاضرفی الذہن کیلئے بھی ہوتا۔ بہرنوع تشہد میں اس خطاب سے خرافیوں کا وجودی و حسی حاضر و ناظر مراد لینا غلط اور بے بنیاد ہے۔

راوی حدیث: ﴿ فضالۃ بن عبید رضی اللہ عنہ ﴾ "فا" پر فتحہ اور عبید' عبد سے تصغیر۔ فضالہ بن عبید بن نافذ بن قیس۔ ان کی کنیت ابو محمد تھی۔ انصار کے قبیلہ اوس کے فرد تھے۔ پہلا معرکہ' جس میں یہ شریک ہوئے معرکہ احد تھا۔ اس کے بعد سب غزوات میں شریک رہے۔ بیعت رضوان میں شامل تھے۔ شام کی طرف نقل مکانی کر گئے تھے اور دمشق میں سکونت پذیر ہوئے۔ جس زمانے میں امیر معاویہ رضی اللہ عنہ صفین کی جنگ کیلئے نکلے اس وقت یہ وہاں کے قاضی (جج) تھے۔ ۵۶ھ میں انہوں نے وفات پائی۔

(۲۴۹) وَعَنْ أَبِيْ مَسْعُودٍ الأَنْصَارِيِّ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ بَشِيْرُ بْنُ سَعْدٍ: يَا رَسُولَ اللهِ! أَمَرَنَا اللَّهُ أَنْ نُصَلِّيَ عَلَيْكَ، فَكَيْفَ نُصَلِّي عَلَيْكَ؟ فَسَكَتَ؟ ثُمَّ قَالَ: «قُولُوا: اللَّهُمَّ صَلِّ عَلَى مُحَمَّدٍ، وَعَلَى آلِ مُحَمَّدٍ، كَمَا صَلَّيْتَ عَلَى إِبْرَاهِيمَ، وَبَارِكْ عَلَى مُحَمَّدٍ، وَعَلَى آلِ مُحَمَّدٍ، كَمَا بَارَكْتَ عَلَى إِبْرَاهِيمَ فِي العَالَمِينَ،

حضرت ابو مسعود انصاری رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ بشیر بن سعد رضی اللہ عنہ نے عرض کیا یارسول اللہ (ﷺ)! اللہ تعالیٰ نے ہمیں آپؐ پر درود بھیجنے کا حکم ارشاد فرمایا ہے لہٰذا ہم کس طرح آپؐ پر درود بھیجیں؟ تھوڑے سے توقف کے بعد فرمایا "اس طرح کہا کرو اللھم صل علی محمد .... الخ اے اللہ! محمد (ﷺ) اور آل محمدؐ پر رحمت نازل فرما جس طرح تو نے رحمت نازل فرمائی' ابراھیمؑ پر اور برکت نازل فرما محمد (ﷺ) اور آل محمد ﷺ پر جس طرح تو نے برکت نازل فرمائی ابراھیمؑ پر دونوں جہانوں میں۔ یقیناً

إِنَّكَ حَمِيدٌ مَجِيدٌ. والسَّلَامُ كَمَا عَلِمْتُمْ». رَوَاهُ مُسْلِمٌ، وَزَادَ ابْنُ خُزَيْمَةَ فِيهِ: فَكَيْفَ نُصَلِّي عَلَيْكَ إِذَا نَحْنُ صَلَّيْنَا عَلَيْكَ فِي صَلاَتِنَا؟.

تو ستودہ صفات ہے اور بزرگ ہے اور رہا سلام تو اس کا علم تمہیں سکھلا دیا گیا ہے۔" (مسلم) اور ابن خزیمہ نے اس میں اتنا اضافہ نقل کیا ہے کہ ہم جب نماز پڑھ رہے ہوں تو اس وقت آپؐ پر درود کس طرح پڑھیں۔

لغوی تشریح: ﴿ امرنا الله ان نصلی علیک ﴾ اللہ کا حکم ﴿ صلوا علیہ وسلموا تسلیما ﴾ میں ہے "والسلام کما علمتم" تعلیم سے صیغہ مجہول ہے۔ یعنی جس طرح تمہیں سکھایا گیا ہے تعلیم دی گئی ہے اور اس کا احتمال ہے کہ علم سے ماخوذ صیغہ معلوم ہو اور وہ اس طرح کہ نبی ﷺ نے التحیات للہ الخ کی صورت میں تمہیں سکھایا ہے۔

حاصل کلام: اس حدیث سے نبی ﷺ پر نماز میں درود و سلام بھیجنا واجب معلوم ہوتا ہے۔ امام شافعی رحمہ اللہ سمیت بہت سے ائمہ رحمہم اللہ اسے واجب ہی قرار دیتے ہیں۔ درود شریف کے مختلف الفاظ احادیث میں مروی ہیں۔ جس کی تفصیل جلاء الافہام اور القول البدیع میں موجود ہے اور صحیح ترین روایت جو نماز میں درود شریف پڑھنے کی ہے وہ یہی ہے۔ "آل" میں لغوی اعتبار سے گو آپؐ پر ایمان لانے والے تمام مومن و متقی بھی مراد ہیں مگر صحیح تر بات یہ ہے کہ یہاں اس سے آپؐ کے وہ رشتہ دار مراد ہیں جن پر صدقہ و زکوٰۃ حرام ہے۔

راوی حدیث: ﴿ ابومسعود انصاری رضی اللہ عنہ ﴾ ان کا نام عقبہ بن عمرو ہے اور ابومسعود ان کی کنیت ہے۔ انصار مدینہ میں ہونے کی بنا پر انصاری کہلائے۔ بدر میں شامل ہونے والے جلیل القدر اور بزرگ صحابہ کرامؓ میں سے تھے۔ بیعت عقبہ ثانیہ میں شریک تو تھے مگر کم سن تھے۔ کوفہ میں رہائش پذیر ہوئے اور وہیں وفات پائی اور ایک قول یہ بھی ہے کہ ۴۰ھ کے بعد انہوں نے مدینہ میں وفات پائی۔

﴿ بشیر بن سعد (رضی اللہ عنہ) ﴾ ابونعمان کنیت تھی۔ بشیر ("باء" پر زبر "شین" کے نیچے کسرہ اور "یا" ساکن) بن سعد بن ثعلبہ بن جلاس (جیم کے ضمہ کے ساتھ) یا خلاس ("خاء" کے فتحہ اور لام کی تشدید کے ساتھ)۔ انصار میں سے ہونے کی وجہ سے انصاری اور قبیلہ خزرج میں سے ہونے کی وجہ سے خزرجی کہلائے۔ بدر اور بیعت عقبہ میں شامل ہونے والے صحابی تھے۔ احد و خندق اور بعد کے معرکوں میں شامل رہے۔ عین تمر میں ۱۳ھ کو شہید ہوئے۔

(۲۵۰) وَعَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ: «إِذَا تَشَهَّدَ أَحَدُكُمْ فَلْيَسْتَعِذْ بِاللَّهِ مِنْ أَرْبَعٍ، يَقُولُ: اللَّهُمَّ إِنِّي

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "جب تم میں سے کوئی تشہد پڑھ چکے تو چار چیزوں سے اللہ کی پناہ طلب کرے (اور پوری کہے) اے اللہ! میں تجھ سے عذاب جہنم سے پناہ مانگتا

أَعُوذُ بِكَ مِنْ عَذَابِ جَهَنَّمَ، وَمِنْ عَذَابِ الْقَبْرِ، وَمِنْ فِتْنَةِ الْمَحْيَا وَالْمَمَاتِ، وَمِنْ شَرِّ فِتْنَةِ الْمَسِيحِ الدَّجَّالِ». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ، وَفِي رِوَايَةٍ لِمُسْلِمٍ: إِذَا فَرَغَ أَحَدُكُمْ مِنَ التَّشَهُّدِ الْأَخِيرِ.

ہوں اور عذاب قبر سے پناہ طلب کرتا ہوں اور موت و حیات کے فتنہ سے تیری پناہ کا طلبگار ہوں اور مسیح دجال کے فتنہ کے شر سے تیری پناہ مانگتا ہوں۔ (بخاری و مسلم) اور مسلم میں ایک روایت کے یہ الفاظ بھی ہیں۔ "جب تم سے کوئی آخری تشہد سے فارغ ہو۔ تو اس وقت ان چار چیزوں سے اللہ کی پناہ طلب کرے۔"

لغوی تشریح: ﴿ فتنة المحيا ﴾ محیا سے زندگی مراد ہے اور اس کے فتنہ سے مراد انسان کو جو آزمائشیں دنیا میں پیش آتی ہیں اور وہ خواہشات یا نادانی و جہالت کی وجہ سے جن دشواریوں اور پریشانیوں سے سامنا کرنا پڑتا ہے یا وہ بلائیں جو صبر و تحمل نہ کرنے کی وجہ سے پیش آتی ہیں۔ سب ہی مراد ہیں۔ ﴿ الممات ﴾ ممات سے مراد موت ہے اور موت کے فتنہ سے مراد برا خاتمہ ہے۔

حاصل کلام: تشہد میں درود و سلام کے بعد اس استعاذہ کو ابن حزم نے واجب قرار دیا ہے۔ تابعین میں امام طاؤس رحمہ اللہ کا بھی موقف یہی تھا۔ بلکہ حافظ ابن حزم تو دونوں تشہدوں میں استعاذہ واجب سمجھتے ہیں۔ ان کے علاوہ باقی علماء اسے آخری تشہد میں درود کے بعد پڑھنے کو مستحب ہی کہتے ہیں۔

اس حدیث سے عذاب قبر کا ثبوت بھی ملتا ہے۔ اہل سنت کے نزدیک عذاب قبر برحق ہے اور قرآن و حدیث سے ثابت ہے اس کا انکار نص قرآن اور حدیث صحیح کا انکار ہے۔

(٢٥١) وَعَنْ أَبِي بَكْرٍ الصِّدِّيقِ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، أَنَّهُ قَالَ لِرَسُولِ اللهِ ﷺ: عَلِّمْنِي دُعَاءً أَدْعُو بِهِ فِي صَلَاتِي! قَالَ: «قُلْ: اللَّهُمَّ إِنِّي ظَلَمْتُ نَفْسِي ظُلْماً كَثِيراً، وَلَا يَغْفِرُ الذُّنُوبَ إِلَّا أَنْتَ، فَاغْفِرْ لِي مَغْفِرَةً مِنْ عِنْدِكَ، وَارْحَمْنِي، إِنَّكَ أَنْتَ الْغَفُورُ الرَّحِيمُ». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں عرض کی کہ مجھے ایسی دعا سکھائیں جسے میں اپنی نماز میں پڑھا کروں۔ آپ ؐ نے فرمایا "یہ دعا پڑھا کرو۔ اللھم انی ظلمت نفسی الخ اے پروردگار! میں نے اپنی جان پر بہت ہی ظلم کیا ہے۔ تیرے سوا کوئی گناہوں کو بخشنے والا نہیں۔ لہٰذا تو مجھے اپنی جناب سے معاف فرما دے اور مجھ پر رحم فرما۔ بے شک تو ہی بخشنے والا اور ہمیشہ رحم فرمانے والا ہے۔" (بخاری و مسلم)

حاصل کلام: اس حدیث سے ہمیں یہ سبق حاصل ہوتا ہے کہ ہر انسان کو اپنی کوتاہیوں اور لغزشوں کی معافی مانگتے رہنا چاہئے۔ کیونکہ انسان سے ہر وقت لغزش اور غلطی و خطا کا امکان رہتا ہے۔ ابوبکر الصدیق

رضی اللہ عنہ جیسا انسان بھی اپنے آپ کو اس سے مستغنی نہیں سمجھتا۔ حالانکہ ان کو رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے الصدیق کا خطاب عطا ہوا تھا۔

راوی حدیث : ﴿ ابوبکر الصدیق رضی اللہ عنہ ﴾ ابوبکر کنیت تھی۔ الصدیق لقب تھا۔ عبداللہ بن عثمان نام تھا۔ عثمان جو ابو قحافہ کی کنیت سے مشہور تھے۔ تیم قبیلہ سے تعلق رکھتے تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد پہلے خلیفہ راشد تھے۔ انبیائے کرام؈ کے بعد تمام انسانوں میں افضل انسان تھے۔ سفر ہجرت مدینہ کے موقع پر غار ثور میں آپؐ کے ساتھی تھے۔ اسی بنا پر ان کو صاحب غار کہا جاتا ہے۔ گورے چٹے' دبلے پتلے جسم کے انسان تھے۔ تعریف سے مستغنی ہیں۔ بڑے عزم و استقلال اور صمیم الارادۃ تھے۔ احباب و رفقاء کیلئے رحیم و رقیق اور اعداء السلام اور دشمنان دین کیلئے ناقابل شکست چٹان تھے۔ ۱۳ھ میں جمادی الاخریٰ میں وفات پائی۔

(۲۵۲) وَعَنْ وَائِلِ بْنِ حُجْرٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: صَلَّيْتُ مَعَ النَّبِيِّ ﷺ، فَكَانَ يُسَلِّمُ عَنْ يَمِيْنِهِ: السَّلاَمُ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَةُ اللهِ وَبَرَكَاتُهُ، وَعَنْ شِمَالِهِ: السَّلاَمُ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَةُ اللهِ وَبَرَكَاتُهُ. رَوَاهُ أَبُوْ دَاوُدَ بِإِسْنَادٍ صَحِيْحٍ.

حضرت وائل بن حجر رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ میں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نماز پڑھی آپؐ نے دائیں جانب سلام پھیرتے ہوئے کہا السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ اور اسی طرح بائیں طرف سلام پھیرتے ہوئے کہا "السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ" (ابوداؤد نے اسے صحیح سند سے روایت کیا ہے)

حاصل کلام : اس حدیث سے معلوم ہوا کہ نماز کے سلام میں "وبرکاتہ" کا اضافہ صحیح حدیث سے ثابت ہے یہ اضافہ گو اس موضوع کی اکثر روایات میں نہیں ہے لیکن یہ اور اس کے علاوہ بعض دیگر روایات سے بھی اس کی صحت ثابت ہے جیسا کہ حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے نتائج الافکار میں تفصیل سے اس پر بحث کی ہے۔ اس لئے السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ کہنا بھی درست ہے۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ بلکہ کبار صحابہ و تابعین کے نزدیک السلام علیکم کہہ کر نماز سے فارغ ہونا فرض ہے مگر احناف اسے صرف سنت قرار دیتے ہیں اور کسی بھی ایسے عمل کو نماز سے فارغ ہونے کیلئے کافی سمجھتے ہیں جو نماز کے منافی ہو لیکن یہ صریح احادیث کے خلاف ہے اور سنت قولی و عملی کے منافی ہے۔

(۲۵۳) وَعَنِ الْمُغِيْرَةِ بْنِ شُعْبَةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُ، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ كَانَ يَقُولُ فِي دُبُرِ كُلِّ صَلاَةٍ مَكْتُوبَةٍ: «لاَ إِلَهَ إِلاَّ اللّٰهُ، وَحْدَهُ لاَ شَرِيْكَ لَهُ، لَهُ الْمُلْكُ، وَلَهُ الْحَمْدُ،

حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم ہر فرض کے اختتام پر یہ دعا پڑھا کرتے تھے لا الہ الا اللہ وحدہ لا شریک لہ .... اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں' اس کا کوئی شریک و ساجھی نہیں۔ فرمانروائی اسی کی ہے اور حمد و ثناء اسی کے لئے ہے

وَهُوَ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ، اَللّٰهُمَّ لاَ مَانِعَ لِمَا أَعْطَيْتَ، وَلاَ مُعْطِيَ لِمَا مَنَعْتَ، وَلاَ يَنْفَعُ ذَا الجَدِّ مِنْكَ الجَدُّ». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

اور وہ ہر چیز پر قدرت رکھنے والا ہے۔ اے اللہ! جو کچھ تو عطا فرمائے اسے کوئی روکنے والا نہیں اور جو کچھ تو روک لے اسے عطا کرنے والا کوئی نہیں اور کسی صاحب نصیبہ کو تیرے بغیر کوئی نصیبہ فائدہ نہیں دیتا۔ (بخاری و مسلم)

حاصل کلام: اس حدیث میں منقول دعا اس پر دلالت کرتی ہے کہ اللہ وحدہ کے ماسوا کوئی بھی معبود نہیں کہ جس کی طرف حاجات و ضروریات کی تکمیل کیلئے رجوع کیا جا سکے۔ دنیا و مافیہا اور آسمانوں کی ہر ایک چیز اس کی مخلوق ہے اور مخلوق اپنے خالق کی ہر وقت محتاج ہے۔ وہ قادر مطلق ہے کسی کو کچھ دینے اور نہ دینے کے جملہ اختیارات بلا شرکت غیرے اسی کے قبضہ قدرت میں ہیں۔ اس کی سرکار میں دنیوی جاہ و حشمت' عزت و سلطنت اس کے فضل اور رحمت کے سوا ذرا بھر بھی کارگر اور منافع بخش ثابت نہیں ہو سکتے ہیں۔ یہ دعا نماز فرض سے فارغ ہو کر پڑھنی مستحب ہے۔

(٢٥٤) وَعَنْ سَعْدِ بْنِ أَبِي وَقَّاصٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُ، أَنَّ رَسُولَ اللهِ ﷺ كَانَ يَتَعَوَّذُ بِهِنَّ دُبُرَ كُلِّ صَلاَةٍ: «اللّٰهُمَّ إِنِّيْ أَعُوذُ بِكَ مِنَ البُخْلِ، وَأَعُوذُ بِكَ مِنَ الجُبْنِ، وَأَعُوذُ بِكَ مِنْ أَنْ أُرَدَّ إِلَى أَرْذَلِ العُمُرِ، وَأَعُوذُ بِكَ مِنْ فِتْنَةِ الدُّنْيَا، وَأَعُوذُ بِكَ مِنْ عَذَابِ القَبْرِ». رَوَاهُ البُخَارِيُّ.

حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ ہر نماز کے آخر میں یہ تعوذ پڑھا کرتے تھے۔ اللھم انی اعوذبک من البخل .... الخ "اے اللہ! میں تیری پناہ لیتا ہوں بخل سے اور بزدلی سے اور تیری پناہ لیتا ہوں اس سے کہ میں رذیل ترین عمر کی طرف لوٹایا جاؤں اور میں دنیا کے فتنہ اور عذاب قبر سے تیری پناہ لیتا ہوں۔ (بخاری)

لغوی تشریح: ﴿ بھن ﴾ ان کلمات کے ذریعہ سے مراد ہیں وہ کلمات جو اس حدیث میں مذکور ہیں ﴿ دبر کل صلاۃ ﴾ نماز کے اختتام کے موقع پر یا سلام پھیر دینے کے بعد۔ ﴿ الجبن ﴾ جیم پر ضمہ اور "با" ساکن۔ کمزوری اور ضعف یا پھر دشمن سے نبرد آزمائی کا خوف و اندیشہ۔ ﴿ من ان ارد ﴾ ارد صیغہ متکلم ہے۔ صیغہ مجہول ہے۔ یعنی میں لوٹایا جاؤں یا اس طرف پھیرا جاؤں۔ ﴿ الی ارذل العمر ﴾ یعنی خسیس اور ذلت آمیز عمر کی طرف وہ اس وقت ہوتی ہے جب بڑھاپا شدت اختیار کر جائے اور کبر سنی انسان کو بچوں سے بھی زیادہ کمزور و ناتواں اور حیوان سے زیادہ رذیل بنا دیتی ہے۔ نوبت یہاں تک پہنچ جاتی ہے کہ بول و براز بھی اپنے کپڑوں میں نکل جاتے ہیں اور کھانا پینا اور خورد و نوش بھی بستر پر ہو جاتا

ہے۔ اللہ سے استدعا ہے کہ ہم سب کو ایسی رسوا کن اور رذیل ترین عمر سے اپنی پناہ میں رکھے۔

حاصل کلام: حدیث کے الفاظ سے مترشح ہوتا ہے کہ یہ تعوذ اختتام نماز یعنی سلام پھیرنے سے پہلے بھی پڑھے جاسکتے ہیں اور سلام پھیرنے کے بعد بھی۔ بڑی بامعنی دعا ہے۔ اس کا التزام کرنا چاہئے۔

راوی حدیث: ﴿سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ﴾ ابو اسحٰق ان کی کنیت تھی۔ باپ کا نام مالک تھا۔ قریش سے تعلق رکھنے کی بنا پر قرشی کہلائے۔ اسلام قبول کرنے والوں میں پانچواں نمبر ہے یا بقول بعض ساتواں نمبر۔ عشرہ مبشرہ میں سے تھے۔ (جنہیں حضور ﷺ نے زندگی ہی میں جنت کی خوشخبری و بشارت دے دی تھی) اللہ کی راہ میں تیر اندازی کرنے والے یہ پہلے شخص ہیں۔ یعنی سب سے پہلے اللہ کی راہ میں انہوں نے تیر چلایا۔ تمام غزوات میں شریک رہے۔ فاتح عراق ہیں۔ مستجاب الدعوات تھے۔ پستہ قامت مگر گٹھا ہوا بدن' گندمی رنگ' مدینہ سے دس میل دور واقع مقام عقیق میں وفات پائی۔ وہاں سے ان کی میت مدینہ طیبہ لائی گئی اور ۵۵ھ میں جنت البقیع میں دفن کئے گئے۔

(٢٥٥) وَعَنْ ثَوْبَانَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: كَانَ رَسُولُ اللهِ ﷺ إِذَا انْصَرَفَ مِنْ صَلاَتِهِ اسْتَغْفَرَ اللَّهَ ثَلاَثاً، وَقَالَ: «اللَّهُمَّ أَنْتَ السَّلاَمُ، وَمِنْكَ السَّلاَمُ، تَبَارَكْتَ يَا ذَا الجَلاَلِ وَالإِكْرَامِ». رَوَاهُ مُسْلِمٌ.

حضرت ثوبان رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ جب سلام پھیرتے تو تین مرتبہ استغفراللہ کہتے اور پھر اللھم انت السلام ومنک السلام تبارکت یا ذاالجلال والاکرام پڑھتے۔ "اے اللہ! میں تجھ سے مغفرت کا طالب ہوں اور اے اللہ! تو سلام ہے یعنی تو ہی سلامتی والا ہے اور سلامتی تجھ ہی سے ہے اے بزرگی و برتری کے مالک! تو بڑی برکت والا ہے) (مسلم)

حاصل کلام: اس حدیث سے نماز کے ان اذکار کا استحباب ثابت ہوتا ہے۔ نبی ﷺ کا استغفار بطور شکر اور تعلیم کے تھا اور اہل ایمان کا استغفار نماز میں کمی و بیشی' وسواس اور خیالات کے پیدا ہونے کی وجہ سے ہوتا ہے جو کمی و زیادتی اور آمد خیالات کی بنا پر نماز میں نقص واقع ہوگیا۔ بتقاضائے بشریت ہم اس کی مغفرت اور درگزر کی درخواست کرتے ہیں۔ یہی عبدیت کا تقاضا ہے کہ بندہ اپنے معبود سے معافی کی استدعا کرتا ہی رہے۔

نبی ﷺ استغفار کس طرح پڑھتے تھے۔ امام نووی رحمۃ اللہ علیہ نے اذکار میں بیان کیا ہے کہ امام اوزاعی سے استفسار کیا گیا کہ رسول اللہ ﷺ کا استغفار کون سا تھا؟ تو انہوں نے بتایا کہ حضور ﷺ استغفر اللہ' استغفر اللہ' استغفر اللہ فرماتے۔

اس حدیث میں دعا کے جتنے فقرات مذکور ہیں وہی پڑھنے مسنون ہیں مگر یار لوگوں نے اس پر صبر نہیں کیا بلکہ اپنی جانب سے اضافہ فرما کر کچھ کا کچھ بنا دیا۔ مثلاً اسی دعا میں اس طرح اضافہ کر دیا اللھم

انت السلام ومنک السلام والیک یرجع السلام حینا ربنا بالسلام تبارکت یا ذالجلال والکرام وغیرہ کا۔ بہرحال حدیث میں یہ اضافہ کہیں منقول نہیں اپنی طرف سے یہ اضافہ ریشم میں ٹاٹ کا پیوند کے مصداق ہے۔

(٢٥٦) وَعَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُ، عَنْ رَسُولِ اللهِ قَالَ: «مَنْ سَبَّحَ اللّٰهَ دُبُرَ كُلِّ صَلاَةٍ ثلاثاً وَثلاَثِيْنَ، وَحَمِدَ اللّٰهَ ثَلاَثاً وَثلاَثِيْنَ وَكَبَّرَ اللّٰهَ ثَلاَثاً وَثلاَثِيْنَ، فَتِلْكَ تِسْعٌ وَتِسْعُونَ، وَقَالَ تَمَامَ المِائَةِ «لاَ إِلَهَ إِلاَّ اللّٰهُ، وَحْدَهُ لاَ شَرِيْكَ لَهُ، لَهُ المُلْكُ، وَلَهُ الحَمْدُ، وَهُوَ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ» غُفِرَتْ لَهُ خَطَايَاهُ وَلَوْ كَانَتْ مِثْلَ زَبَدِ البَحْرِ». رَوَاهُ مُسْلِمٌ، وَفِي رِوَايَةٍ أُخْرَى: أَنَّ التَّكْبِيْرَ أَرْبَعٌ وَثَلاثُونَ.

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "جس شخص نے ہر نماز کے سلام پھیرنے کے بعد ٣٣ مرتبہ سبحان اللہ پڑھا اور ٣٣ مرتبہ الحمد للہ اور اللہ اکبر بھی ٣٣ مرتبہ یہ مجموعی طور پر ٩٩ یعنی ایک کم سو ہوئے اور سو مکمل کرنے کیلئے لا الہ الا اللہ وحدہ لا شریک لہ لہ الملک ولہ الحمد وھو علی کل شئی قدیر کہا تو اس کے تمام گناہ بخش دیئے جاتے ہیں خواہ ان کی تعداد سمندر کی جھاگ کے مساوی ہو۔" (مسلم) اور ایک دوسری روایت میں ہے کہ اللہ اکبر ٣٤ مرتبہ کہے

لغوی تشریح: ﴿ سبح ﴾ تسبیح بیان کی یعنی سبحان اللہ کہا۔ ﴿ زبد البحر ﴾ زاء اور "با" دونوں پر فتحہ۔ جھاگ۔ جب پانی موجزن ہوتا ہے تو اس کے اوپر جھاگ آ جاتی ہے۔ اس قسم کی عبارت بیان کرنے سے مقصود کسی شے کی کثرت بیان کرنا ہوتا ہے۔ آیات قرآنیہ اور احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ ان میں جن گناہوں اور خطاؤں کے معاف کئے جانے کا ذکر ہے ان سے چھوٹے گناہ مراد ہیں۔ مگر جہاں تک کبائر کا تعلق ہے تو ان کیلئے توبہ ناگزیر ہے۔

حاصل کلام: اس حدیث سے ایک تو یہ معلوم ہوا کہ ہر نماز کے اختتام پر خواہ وہ نفل نماز ہو یا فرض یہ کلمات پڑھنے مسنون بھی ہیں اور بکثرت گناہوں کے بخشے جانے کی نوید بھی۔ اگرچہ بعض علماء نے ان کلمات کا فرائض کے بعد پڑھنا مشروع ہونا ثابت کیا ہے۔

اس دعا کا پس منظر جو بخاری میں مذکور ہے وہ کچھ اس طرح ہے کہ ایک روز فقراء مہاجرین نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا۔ اے اللہ کے رسول (ﷺ)! مالدار صاحب ثروت لوگ تو سب نیکیاں اور بھلائیاں لوٹ کر لے گئے۔ وہ لوگ ہماری طرح نماز بھی پڑھتے ہیں اور روزہ بھی رکھتے ہیں اور وہ صدقہ و خیرات بھی ہم سے زیادہ کرتے ہیں اور ہم ان کا مقابلہ نہیں کر سکتے (کیونکہ ہمارے پاس مال و دولت کی فراوانی نہیں ہے) آپ ؐ نے (انہیں تسلی دیتے ہوئے) فرمایا "میں تمہیں ایسا عمل نہ سکھاؤں یا بتلاؤں کہ تم اپنے سے بڑھ جانے والوں کا ثواب بھی حاصل کر لو اور کوئی تم سے آگے بھی نہ بڑھ سکے

بشرطیکہ کوئی وہی عمل کرے جو تم کرو۔" اس موقع پر آپؐ نے ہر نماز کے بعد مذکورہ کلمات کہنے کا حکم ارشاد فرمایا۔

ان کلمات کو پڑھنے کی دو صورتیں اس حدیث سے معلوم ہوتی ہیں۔ ایک یہ کہ سبحان اللہ ۳۳ مرتبہ اور الحمد للہ ۳۳ مرتبہ اور اللہ اکبر ۳۳ مرتبہ یا ۳۴ مرتبہ۔ دوسرا یہ کہ ۳۳، ۳۳ مرتبہ تینوں کلمات اور ۳۴ویں مرتبہ لا الہ الا اللہ وحدہ لا شریک لہ، لہ الملک ولہ الحمد وھو علی کل شئی قدیر پڑھ کر سو کی تعداد پوری کرے۔ اگر تینوں کلمات بالترتیب ۳۳، ۳۳ اور ۳۴ مرتبہ پڑھے جائیں تو پھر لا الہ الا اللہ ...... الخ نہیں پڑھنا چاہئے کیونکہ اس طرح تعداد ۱۰۰ میں ایک عدد کا اضافہ ہو کر سو کی بجائے تعداد ایک سو ایک ہو جائے گی جو سنت سے ثابت نہیں۔

(٢٥٧) وَعَنْ مُعَاذِ بْنِ جَبَلٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُ، أَنَّ رَسُولَ اللهِ ﷺ قَالَ لَهُ: «أُوصِيكَ يَا مُعَاذُ: لَا تَدَعَنَّ دُبُرَ كُلِّ صَلَاةٍ أَنْ تَقُولَ: اللّٰهُمَّ أَعِنِّي عَلَى ذِكْرِكَ، وَشُكْرِكَ، وَحُسْنِ عِبَادَتِكَ». رَوَاهُ أَحْمَدُ وَأَبُو دَاوُدَ وَالنَّسَائِيُّ بِسَنَدٍ قَوِيٍّ.

حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے مجھے فرمایا "اے معاذ! میں تجھے وصیت کرتا ہوں کہ ہر نماز کے اختتام کے بعد ان کلمات کو کبھی فراموش نہ کرنا "اللھم اعنی علی ذکرک وشکرک و حسن عبادتک" اے اللہ! مجھے اپنے ذکر اور شکر اور حسن عبادت کی توفیق سے نواز یا اے اللہ! میری مدد فرما کہ میں ذکر کروں تیرا اور شکر ادا کر سکوں تیرا اور عمدہ اور بہتر عبادت بجالاؤں تیری۔" (اسے احمدؒ ابوداؤد اور نسائی نے قوی سند کے ساتھ روایت کیا ہے)

لغوی تشریح: ﴿ لاتدعن ﴾ تا، دال اور عین تینوں پر فتحہ۔ معنی ہیں نہ ترک کرنا۔ ودع یدع سے نہی کا صیغہ ہے جب اسے چھوڑ دے، نظرانداز کر دے۔ ﴿ اعنی ﴾ ھمزہ پر فتحہ اور عین کے نیچے کسرہ اور نون پر تشدید۔ ﴿ الاعانۃ ﴾ سے دعا کا صیغہ ہے۔ ایک نون کو دوسرے نون وقایہ میں مدغم کر دیا گیا اس طرح وہ مشددہ ہوگیا۔ معنی یہ ہوئے کہ میری نصرت فرما اور مجھے توفیق سے نواز۔

حاصل کلام: "لا تدعن" اس پر مدلول ہے کہ اس دعا کو فرض نماز کے بعد نظرانداز کرنا اور ترک کر دینا مناسب نہیں۔ اس لئے کہ نہی اصل تو تحریم کا فائدہ دیتی ہے۔ اس دعا کے علاوہ کتب احادیث مثلاً مسلم، ابوداؤد، نسائی، احمد اور ترمذی وغیرہ میں اور بہت سی دعائیں آپؐ سے پڑھنا ثابت ہیں۔ حتی الوسع زیادہ سے زیادہ پڑھنے کی کوشش کرنی چاہئے تاکہ سنت پر عمل بھی ہو اور اس کی اشاعت و ترویج بھی۔

(٢٥٨) وَعَنْ أَبِي أُمَامَةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ

حضرت ابوامامہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "جس شخص نے ہر فرض نماز کے

ﷺ: «مَنْ قَرَأَ آيَةَ الْكُرْسِيِّ دُبُرَ كُلِّ صَلاَةٍ مَكْتُوبَةٍ، لَمْ يَمْنَعْهُ مِنْ دُخُولِ الْجَنَّةِ إلاَّ الْمَوْتُ». رَوَاهُ النَّسَائِيُّ، وَصَحَّحَهُ ابْنُ حِبَّانَ، وَزَادَ فِيهِ الطَّبَرَانِيُّ: «وَقُلْ هُوَ اللّٰهُ أَحَدٌ».

ادا کرنے کے بعد آیت الکرسی پڑھی۔ اس کو جنت میں داخل ہونے سے موت کے سوا اور کوئی چیز روکنے والی نہیں۔ (مرتے ہی جنت میں داخل ہو جائے گا بشرطیکہ عقیدۂ توحید صحیح ہو) (اسے نسائی نے روایت کیا ہے اور ابن حبان نے صحیح قرار دیا ہے اور طبرانی نے اس میں اتنا اضافہ کیا ہے کہ "قل ھو اللہ احد" بھی پڑھے)۔

حاصل کلام: آیت الکرسی کی فضیلت کے بارے میں آپؐ کے اور بھی ارشادات کتب حدیث میں منقول ہیں۔ اس کی اتنی فضیلت کی وجہ غالباً یہ ہے کہ اس میں توحید الٰہی کو صاف طور پر نکھار کر بیان کیا ہے۔ اللہ کی وحدانیت' اس کی قدرت اور اس کا علم ما کان و ما یکون اور کائنات کی حفاظت وغیرہ صفات کا ذکر ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کو بہت محبوب ہیں اور سورۂ اخلاص تو تہائی قرآن کے برابر ثواب رکھتی ہے۔ اس لئے کہ اصل میں تین بنیادی عقائد ہیں۔ توحید' رسالت اور آخرت۔ اس سورت میں توحید کوٹ کوٹ کر بھر دی گئی ہے۔ اس سورۃ میں اللہ کی وحدانیت' اس کی صمدیت کا ذکر ہے۔ اس لئے یہ سورۃ بھی اللہ کو بہت ہی محبوب ہے۔ لہٰذا جو آدمی اہتمام کے ساتھ ان کو نماز فرض کے بعد پڑھے گا اسے مرتے ہی جنت میں داخلہ مل جائے گا۔ (انشاء اللہ)

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ موت ایک ایسی حقیقت ہے جس کا دنیا میں کوئی منکر آج تک نہیں پایا گیا۔ نیز اس سے جنت کا وجود بھی معلوم ہوا اور یہ بھی معلوم ہوا کہ جنت بھی مخلوق ہے یعنی اللہ کی پیدا کی ہوئی۔

راوی حدیث: ﴿ ابو امامہ رضی اللہ عنہ ﴾ ابوامامہ کنیت ایاس بن ثعلبہ بلوی نام تھا اور انصار کے قبیلہ بنو حارثہ کے حلیف تھے۔ شرف صحابیت سے مشرف تھے۔ ان سے کئی احادیث مروی ہیں۔ والدہ کی تیمار داری میں مشغولیت کی وجہ سے غزوۂ بدر میں شرکت نہ کر سکے۔

(٢٥٩) وَعَنْ مَالِكِ بْنِ الْحُوَيْرِثِ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «صَلُّوا كَمَا رَأَيْتُمُونِي أُصَلِّي». رَوَاهُ الْبُخَارِيُّ.

حضرت مالک بن حویرث رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "نماز اسی طرح پڑھو جس طرح مجھے پڑھتے تم نے دیکھا ہے۔" (بخاری)

حاصل کلام: اس حدیث سے براہ راست تو خطاب صحابہ کرامؓ سے ہے۔ لیکن عمومی حکم میں امت مسلمہ کا ہر فرد اس کا مخاطب ہے۔ امیر یمانی نے کہا ہے کہ اس حدیث سے ثابت ہوتا ہے کہ نماز میں آپؐ نے جو افعال جس طرح ادا فرمائے بعینہٖ اسی طرح ادا کرنا واجب ہے۔ البتہ جس کا کسی دوسری دلیل

سے غیر واجب ہونا ثابت ہو جائے تو وہ اس حکم سے مستثنیٰ ہوگا۔ (سبل)

(٢٦٠) وَعَنْ عِمْرَانَ بْنِ حُصَيْنٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُما قَالَ: قَالَ لِيْ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «صَلِّ قَائِماً، فَإِنْ لَمْ تَسْتَطِعْ فَقَاعِداً، فَإِنْ لَمْ تَسْتَطِعْ فَعَلَى جَنْبٍ، وَإِلاَّ فَأَوْمِ». رَوَاهُ الْبُخَارِيُّ.

حضرت عمران بن حصین رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے مجھے فرمایا "نماز کھڑے ہو کر پڑھو اگر کھڑے ہو کر نہیں پڑھ سکتے تو بیٹھ کر پڑھو اور بیٹھ کر پڑھنے کی استطاعت بھی نہیں تو پہلو کے بل لیٹ کر پڑھو۔ ان میں سے کسی پر بھی عمل نہ ہو سکے تو اشارہ سے ہی پڑھ لو۔" (بخاری)

لغوی تشریح: ﴿ فعلی جنب ﴾ اپنی دائیں جانب لیٹ کر۔ اس صورت میں پاؤں کا رخ قبلہ رخ نہ ہونا چاہئے بلکہ استقبال قبلہ کے وقت بائیں جانب ہونا چاہئے۔ ﴿ فاوم ﴾ ایماء' سے امر کا صیغہ ہے۔ اشارہ کرنے کو کہتے ہیں۔

حاصل کلام: اس حدیث سے ثابت ہوتا ہے کہ نماز کسی صورت بھی معاف نہیں بجز مدہوشی کی حالت کے۔ نیز ثابت ہوا کہ نماز کھڑے ہو کر پڑھنا چاہئے بامر مجبوری یا بیماری کی صورت میں کھڑے ہو کر نماز ادا کرنا مشکل ہو تو بیٹھ کر پڑھ لے۔ اگر ایسا بھی کرنا دشوار ہو تو لیٹ کر پڑھ لے۔ ان حالتوں میں کسی پر بھی اگر قادر نہ ہو تو پھر اشاروں سے۔ گویا نماز کسی صورت بھی ترک نہ کرے۔

(٢٦١) وَعَنْ جَابِرٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ قَالَ لِمَرِيْضٍ - صَلَّى عَلَى وِسَادَةٍ، فَرَمَى بِهَا، - وقَالَ: «صَلِّ عَلَى الأَرْضِ إِنِ اسْتَطَعْتَ، وَإِلاَّ فَأَوْمِ إِيْمَاءً، وَاجْعَلْ سُجُودَكَ أَخْفَضَ مِنْ رُكُوعِكَ». رَوَاهُ الْبَيْهَقِيُّ بِسَنَدٍ قَوِيٍّ، وَلٰكِن صَحَّحَ أَبُو حَاتِمٍ وَقْفَهُ.

حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی ﷺ نے ایک مریض سے جس نے تکیہ پر نماز پڑھی تھی آپ نے اس کا تکیہ پھینک دیا اور فرمایا "اگر پڑھ سکتے ہو تو زمین پر نماز پڑھو ورنہ پھر اشارہ سے پڑھو البتہ اپنے سجدہ کو رکوع سے ذرا نیچے کرو۔" (اسے بیہقی نے قوی سند کے ساتھ روایت کیا ہے لیکن ابو حاتم نے اس کا موقوف ہونا صحیح قرار دیا ہے۔)

لغوی تشریح: ﴿ وسادة ﴾ میں "واؤ" پر تینوں اعراب آ سکتے ہیں وسادة وسادة وسادة) تکیہ۔ جسے سونے والا اپنے سرہانے رکھتا ہے۔ ﴿ فرمی بها ﴾ اس آدمی سے اسے دور ہٹا دیا۔ ﴿ فاوم ایماء ﴾ یعنی اشارہ سے نماز پڑھو۔ ﴿ اخفض ﴾ اسے اسفل کے معنی میں استعمال کیا گیا ہے جس کے معنی اس سے نیچا۔

حاصل کلام: یہ حدیث دلیل ہے کہ نمازی کا کسی اونچی چیز پر سجدہ کرنا درست نہیں۔ اسے زمین پر ہی سجدہ کرنا چاہئے۔ اگر کسی امر کی وجہ سے ایسا کرنا مشکل ہو تو پھر نمازی کو اشارہ ہی پر قناعت کرنی چاہئے۔

البتہ سجدہ اور رکوع کے اشارہ میں فرق کیا جائے۔ سجدہ کا اشارہ ذرا نیچے ہونا چاہئے بہ نسبت رکوع کے۔ اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ انسان کا تعلق اس کے خالق و مالک سے کسی صورت اور کسی لمحہ بھی منقطع نہیں ہونا چاہئے۔ ہر آن اس کی یاد دل و دماغ میں رچی بسی رہنی چاہئے۔ یہی مقام عبدیت ہے۔

٨ - بَابُ سُجُودِ السَّهْوِ وَغَيْرِهِ

سجود سہو وغیرہ کا بیان

(٢٦٢) عَنْ عَبْدِاللهِ بْنِ بُحَيْنَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: إِنَّ النَّبِيَّ ﷺ صَلَّى بِهِمُ الظُّهْرَ فَقَامَ فِي الرَّكْعَتَيْنِ الأُوْلَيَيْنِ، وَلَمْ يَجْلِسْ، فَقَامَ النَّاسُ مَعَهُ، حَتَّى إِذَا قَضَى الصَّلاَةَ، وَانْتَظَرَ النَّاسُ تَسْلِيْمَهُ كَبَّرَ وَهُوَ جَالِسٌ، وَسَجَدَ سَجْدَتَيْنِ قَبْلَ أَنْ يُسَلِّمَ، ثُمَّ سَلَّمَ. أَخْرَجَهُ السَّبْعَةُ، وَهَذَا لَفْظُ الْبُخَارِيِّ. وَفِيْ رِوَايَةٍ لِمُسْلِمٍ: يُكَبِّرُ فِي كُلِّ سَجْدَةٍ وَهُوَ جَالِسٌ، وَسَجَدَ النَّاسُ مَعَهُ، مَكَانَ مَا نَسِيَ مِنَ الْجُلُوسِ.

حضرت عبداللہ بن بحینہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی ﷺ نے ان کو نماز ظہر پڑھائی تو دو رکعتیں ادا کر کے تشہد میں نہ بیٹھے اور سیدھے کھڑے ہو گئے اور مقتدی بھی آپ کے ساتھ ہی کھڑے ہو گئے تاآنکہ جب آپ نے نماز پوری ادا کر لی' لوگ سلام پھیرنے کے انتظار میں تھے کہ آپ نے بیٹھے ہی اللہ اکبر کہا اور دو سجدے کئے۔ سلام پھیرنے سے پہلے۔ پھر سلام پھیرا۔ (اسے ساتوں (احمد' بخاری' مسلم' ابوداؤد' ترمذی' نسائی اور ابن ماجہ) نے روایت کیا۔ البتہ یہ الفاظ بخاری کے ہیں) اور مسلم کی روایت میں ہے کہ ہر سجدہ کیلئے اللہ اکبر کہتے تھے بیٹھے ہوئے اور لوگوں نے بھی آپ کے ساتھ سجدہ کیا بھول جانے کے قائم مقام۔ (دو رکعت کے بعد تشہد میں بیٹھنا بھول گئے تھے اس کی تلافی کیلئے دو سجدے کئے۔

لغوی تشریح: ﴿ باب سجود السهو ﴾ سہو بھول کر کمی بیشی کرنے کو کہتے ہیں اور یہاں نماز میں بھول مراد ہے۔ ﴿ فقام فی الرکعتین الاولیین ﴾ یعنی دو رکعتیں مکمل کرنے کے بعد۔ ﴿ ولم یجلس ﴾ پہلے تشہد کیلئے نہ بیٹھے۔ ﴿ قضی الصلاة ﴾ سلام کے ماسوا ارکان نماز سارے پورے کر لئے۔

حاصل کلام: عربی میں بھول کیلئے دو الفاظ مستعمل ہیں۔ ایک سہو اور دوسرا نسیان۔ پہلے کا اطلاق عموماً افعال کیلئے ہوتا ہے اور دوسرے کا بالعموم معلومات کیلئے۔ اس کے باوجود کبھی کبھی یہ دونوں الفاظ ایک دوسرے کے ہم معنی بھی آجاتے ہیں۔ علماء میں سے شاید ایک بھی ایسا نہیں ہے جو نبی کریم ﷺ کیلئے نسیان کا قائل ہو۔ یہی وجہ ہے کہ حضور ﷺ کو کبھی بھی ابلاغ احکام الٰہی اور شریعت کے پہنچانے میں

نسیان لاحق نہیں ہوا۔ لاحق ہونے کا امکان بھی نہیں اس لئے کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے (سنقرئک فلا تنسی) باقی سہو کا جہاں تک معاملہ ہے۔ اہل حق کا مذہب یہ ہے کہ سہو کا امکان ہے اور عملاً ہوا بھی ہے۔ متعدد صحیح احادیث اس بارے میں کتب احادیث میں موجود ہیں اور بہت سے واقعات عملی طور پر اس کا ثبوت ہیں۔ ائمہ اربعہ رحمہم اللہ بھی سہو کو نبی کریم ﷺ کیلئے ثابت سمجھتے ہیں۔ غالباً آج تک کسی نے اس پر اعتراض بھی نہیں کیا بلکہ اس کی تو بہت سی حکمتیں ہیں' جنہیں صاحب علم و بصیرت لوگ ہی اچھی طرح سمجھتے ہیں۔

دوسرا مسئلہ اس حدیث سے یہ ثابت ہوا کہ اگر تشہد اول بھول کر رہ جائے تو اس نقصان کی تلافی سجدہ سہو سے ہو جاتی ہے۔ سجدہ سہو قبل از سلام کیا جائے یا بعد از سلام۔ احادیث سے آپؐ کا عمل دونوں طرح ثابت ہے۔ زندگی بھر ایک لگے بندھے طریقے پر آپؐ ﷺ کا عمل ثابت نہیں ہوتا کہ بس فلاں طریقہ پر ساری عمر عمل فرماتے رہے۔ البتہ جب ائمہ رحمہم اللہ کا دور آیا اور تقلید شخصی پر عمل درآمد شروع ہوا تو ائمہ کرام رحمہم اللہ کے مقلدین نے اپنے اپنے دائرہ میں صورتیں معین کر لیں۔ بہرحال ایک رائے یہ بھی ہے کہ حضور ﷺ نے جس جس مقام پر جو طرز عمل اختیار فرمایا وہاں اسی طرح عمل کیا جائے۔ مگر باقی مواقع پر جس طرح تحقیق سے ثابت ہوا ہو اس پر عمل کرے۔ امام شوکانی رحمہ اللہ نے نیل الاوطار میں اس طرز عمل کو بہتر قرار دیا ہے کہ نماز میں کمی واقع ہو جانے کی صورت میں سجدۂ سہو سلام پھیرنے سے پہلے کیا جانا چاہئے اور اگر زیادتی واقع ہو جائے تو سلام پھیرنے کے بعد کیا جائے۔ البتہ ایک طرف سلام پھیر کر سجدہ کرنا پھر تشہد وغیرہ پڑھ کر سلام پھیرنا' صحیح احادیث کی روشنی میں آنحضور ﷺ کے عمل سے ثابت نہیں۔

(٢٦٣) وَعَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: صَلَّى النَّبِيُّ ﷺ إِحْدَى صَلَاتَيِ الْعَشِيِّ رَكْعَتَيْنِ، ثُمَّ سَلَّمَ، ثُمَّ قَامَ إِلَى خَشَبَةٍ فِي مُقَدَّمِ الْمَسْجِدِ، فَوَضَعَ يَدَهُ عَلَيْهَا وَفِي الْقَوْمِ أَبُو بَكْرٍ وَعُمَرَ، فَهَابَا، أَنْ يُكَلِّمَاهُ، وَخَرَجَ سَرَعَانُ النَّاسِ فَقَالُوا: أَقَصُرَتِ الصَّلَاةُ، وَرَجُلٌ يَدْعُوهُ النَّبِيُّ ﷺ ذَا الْيَدَيْنِ، فَقَالَ: يَا رَسُولَ اللّٰهِ! أَنَسِيْتَ أَمْ قَصُرَتِ الصَّلَاةُ؟ فَقَالَ: لَمْ أَنْسَ وَلَمْ

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ نبی ﷺ نے بعد از دوپہر کی دو نمازوں (ظہر و عصر) میں سے ایک میں دو رکعت پڑھ کر سلام پھیر دیا اور مسجد کے سامنے رکھی ہوئی لکڑی کے پاس جا کر کھڑے ہو گئے اور اپنے ہاتھ اس پر رکھ لئے۔ نمازیوں میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ و عمر رضی اللہ عنہ بھی موجود تھے' یہ دونوں آپؐ سے اس بارے میں بات کرنے سے ذرا خوفزدہ تھے۔ جلد باز لوگ مسجد سے نکل گئے تو لوگوں نے آپس میں سرگوشی کے انداز میں ایک دوسرے سے پوچھنا شروع کیا کہ کیا نماز میں کمی کر دی گئی ہے؟ ایک آدمی تھا جسے نبی ﷺ (اس کے لمبے ہاتھوں کی وجہ

تُقْصَرْ، قَالَ: بَلَى قَدْ نَسِيْتَ، فَصَلَّى رَكْعَتَيْنِ، ثُمَّ سَلَّمَ، ثُمَّ كَبَّرَ، فَسَجَدَ مِثْلَ سُجُودِهِ أَوْ أَطْوَلَ، ثُمَّ رَفَعَ رَأْسَهُ فَكَبَّرَ، ثُمَّ وَضَعَ رَأْسَهُ فَكَبَّرَ، فَسَجَدَ مِثْلَ سُجُودِهِ أَوْ أَطْوَلَ، ثُمَّ رَفَعَ رَأْسَهُ وَكَبَّرَ. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ، وَاللَّفْظُ لِلْبُخَارِيِّ.

سے) ذوالیدین کہہ کر بلاتے تھے' نے عرض کیا اے اللہ کے رسول (ﷺ)! آپ (آج) بھول گئے ہیں یا نماز کم کر دی گئی ہے۔ آپ نے فرمایا "نہ میں بھولا ہوں اور نہ نماز میں کمی کی گئی ہے"۔ اس شخص نے پھر عرض کیا ہاں آپ ضرور بھول گئے ہیں۔ تو پھر آپ نے دو رکعتیں جو چھوٹ گئی تھیں پڑھیں اور سلام پھیرا پھر اللہ اکبر کہہ کر معمول کے سجدوں کی طرح سجدہ کیا یا اس سے ذرا لمبا پھر سجدہ سے اللہ اکبر کہہ کر سر اوپر اٹھایا پھر اللہ اکبر کہہ کر زمین پر رکھا اور معمول کے سجدہ کی طرح یا ذرا اس سے طویل سجدہ کیا اور پھر اللہ اکبر کہہ کر اپنا سر اٹھایا۔ (بخاری و مسلم۔ یہ الفاظ بخاری کے ہیں)

وَفِيْ رِوَايَةٍ لِّمُسْلِمٍ: «صَلاَةَ الْعَصْرِ». وَلأَبِيْ دَاوُدَ: فَقَالَ: أَصَدَقَ ذُو الْيَدَيْنِ؟ فَأَوْمَئُوا أَيْ نَعَمْ. وَهِيَ فِي الصَّحِيْحَيْنِ، لٰكِنْ بِلَفْظِ: «فَقَالُوا». وَفِيْ رِوَايَةٍ لَّهُ: «وَلَمْ يَسْجُدْ حَتَّى يَقَّنَهُ اللَّهُ تَعَالَى ذٰلِكَ».

اور مسلم کی ایک روایت میں ہے کہ یہ عصر کی نماز تھی اور ابوداؤد میں مروی روایت میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے دریافت فرمایا کہ "کیا ذوالیدین نے ٹھیک کہا ہے؟" تو لوگوں نے سر ہلا کر اشاروں سے کہا ہاں! یہ اضافہ صحیحین میں بھی ہے لیکن ان میں "فقالوا" کے لفظ کے ساتھ مروی ہے (یعنی زبان سے انہوں نے کہا) اور مسلم ہی کی ایک روایت میں ہے کہ نبی ﷺ کو جب تک اللہ کی جانب سے یقین نہ ہوا اس وقت تک سجدہ سہو نہیں کیا۔

لغوی تشریح: ﴿ العشی ﴾ عین پر فتحہ۔ شین کے نیچے کسرہ اور "یاء" پر تشدید۔ عشی زوال آفتاب سے لے کر غروب شمس تک کے درمیانے وقت کو کہتے ہیں۔ بعض روایات سے نماز ظہر کا تعین ثابت ہوتا ہے اور بعض سے نماز عصر کا مگر شک بدستور باقی رہا رفع نہیں ہوا۔ ﴿ فی مقدم المسجد ﴾ تقدیم سے اسم مفعول کے وزن پر ہے۔ معنی مسجد کے سامنے' آگے' دروازے پر۔ ﴿ هابا ﴾ دونوں خوفزدہ ہوئے۔ ﴿ سرعان الناس ﴾ ان نمازیوں میں جو جلدی میں تھے۔ "سرعان" میں سین پر فتحہ راء ساکن ہے اور فتحہ بھی

ہے اور ایک قراءت کے مطابق سرعان کے سین پر ضمہ ہے اور راء ساکن ہے۔ ﴿ اقصرت؟ ﴾ همزہ یہاں استفہام کیلئے ہے۔ یعنی سوالیہ۔ اس امر واقع میں یہ دلیل ہے کہ صحابہ کرام ؓ کسی معاملہ کے بارے میں بغیر علم کے پختہ رائے قائم نہیں کرتے تھے۔ نبی ﷺ سے اس بارے میں پوچھنے کیلئے دوڑے۔ انہوں نے دریافت کرنے کا طرز عمل اس لئے اختیار کیا کہ وہ زمانہ نسخ کا زمانہ تھا کیونکہ نبی کی ذات گرامی بنفس نفیس موجود تھی۔ ایک فعل (عمل) کی جگہ دوسرے فعل کا حکم آسکتا تھا۔ ﴿ قصرت ﴾ قاف پر ضمہ اور راء کے نیچے کسرہ۔ صیغہ مجہول ہے اور ایک قراءت کی رو سے قاف پر فتحہ اور صاد پر ضمہ صیغہ معروف باب کرم یکرم کے وزن پر۔ معنی یہ ہوا کہ نماز مختصر اور چھوٹی ہوگئی ہے۔ ﴿ ورجل یدعوہ ﴾ اسے نام لے کر بلاتے تھے۔ ﴿ ذا الیدین ﴾ ذوالیدین اس کو اس لئے کہتے کہ اس کے ہاتھ نسبتاً لمبے تھے اور اس کا نام تو خرباق بن عمرو تھا۔ ﴿ انسیت؟ ﴾ اس میں همزہ استفہامیہ ہے اور نسیت میں تا خطاب کیلئے ہے۔ ﴿ ام قصرت؟ ﴾ صیغہ واحد غائب صیغہ معروف بھی ہو سکتا ہے اور صیغہ مجہول بھی۔ ﴿ لم انس ﴾ انس میں همزہ اور سین دونوں پر فتحہ ہے۔ معنی ہے میں نہیں' بھولا۔ مضارع پر لم داخل ہو کر اسے ماضی کے معنی میں کر دیتا ہے۔ یہ حدیث سجود سہو کے علاوہ اور مسائل پر بھی دلالت کرتی ہے کہ جب نمازی کو گمان غالب ہو کہ اس نے نماز مکمل پڑھ لی ہے پھر سلام بھی پھیر دے تو اس کی نماز باطل نہیں ہوتی۔ نیز نماز میں کمی و بیشی کی اطلاع دینے کی صورت میں دیدہ و دانستہ اور عمداً گفتگو کرنا نماز کو فاسد نہیں کرتا۔ ﴿ فاوموا ﴾ تو انہوں نے اشارہ کیا کہ ہاں۔ ﴿ ولکن بلفظ فقالوا ﴾ اس کا مطلب یہ ہے کہ بخاری میں مروی روایت میں ﴿ فاوموا ﴾ کی جگہ فقالوا کا لفظ ہے۔ یعنی انہوں نے سر کے اشارہ سے نہیں بلکہ زبان سے بول کر۔ ذوالیدین کی بات کی تصدیق کی۔ ﴿ یقنہ اللہ ﴾ باب تفعیل سے دل میں اس کا یقین ڈال دیا۔ یقین پیدا کر دیا۔

حاصل کلام: اس حدیث سے ثابت ہوا کہ رسول اللہ ﷺ سے سہو سرزد ہوا ہے اور یہ نبوت کے مخالف و متضاد نہیں۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ آپ ؐ بھی انسان تھے۔ سہو وغیرہ ایک انسان سے ہی سرزد ہوتا ہے۔ نیز یہ بھی معلوم ہوا کہ آپ ؐ عالم الغیوب نہ تھے اور نہ آپ ؐ نے کبھی عالم ما کان وما یکون ہونے کا دعویٰ کیا ہے۔ اگر علم غیب ہوتا تو سہو کی تصدیق کیلئے لوگوں سے دریافت نہ فرماتے کہ کیا ذوالیدین نے ٹھیک اور سچ کہا ہے؟ سہو کی تصدیق ہونے پر اسے تسلیم کر لیا۔ اگر غلطی سرزد ہو جانے پر کوئی اصلاح کرے تو اسے صحیح ہونے پر مان لینا چاہئے۔ اس سے یہ بھی ثابت ہوا کہ سجدۂ سہو کرتے اور اٹھتے وقت اللہ اکبر کہنا چاہئے۔ اس حدیث سے سجدہ سہو سلام سے پہلے ثابت ہے اور یہ بھی معلوم ہوا کہ پہلا تشہد بھول جائے تو اس کی تلافی سہو کے دو سجدوں سے ہو جاتی ہے۔

اس حدیث میں تو صرف "صلی النبی" ہے' مگر بعض روایات میں "صلی بناء" کا لفظ منقول ہے۔ یعنی ہمیں نماز پڑھائی۔ اس صورت میں راوی حدیث بھی ان نمازیوں میں شریک تھے۔ للذا معلوم ہوا کہ یہ حدیث قرآن مجید کی آیت (قوموا للہ قانتین) سے منسوخ نہیں کیونکہ حضرت ابو ہریرہ ؓ اس

آیت کے نزول سے چار پانچ سال بعد اسلام لائے ہیں۔ صحابہؓ کی یہ گفتگو سہواً نہیں قصداً ہوئی ہے۔ للذا اصلاح نماز کیلئے اتنی سی بات نماز کو باطل قرار نہیں دیتی۔

راوی حدیث : ﴿ خرباق بن عمرو سلمی رضی اللہ عنہ ﴾ بنو سلیم سے ہونے کی وجہ سے سلمی کہلائے۔ سہیلی نے الروض الانف میں لکھا ہے کہ انہوں نے امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے دور خلافت میں وفات پائی اور ابوعوانہ نے اپنی صحیح میں کہا ہے کہ انہوں نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے عہد خلافت میں ذی خشب مقام پر وفات پائی اور بعض روایات میں ذوالیدین کی بجائے ذوالشمالین بھی وارد ہے۔ بعض کا خیال ہے دونوں سے ایک ہی شخص مراد ہے۔ یہ وہم ہے۔ صحیح بات یہی ہے کہ یہ دو شخص تھے۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ ذوالشمالین بدر میں شہید ہوئے ہیں اور یہ واقعہ بیان کرنے والے ابوہریرہ رضی اللہ عنہ اور عمران بن حصین رضی اللہ عنہ ہیں اور یہ دونوں تو اسلام غزوۂ خیبر کے سال لائے ہیں۔

(٢٦٤) وَعَنْ عِمْرَانَ بْنِ حُصَيْنٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُما، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ صَلَّى بِهِمْ فَسَهَا، فَسَجَدَ سَجْدَتَيْنِ، ثُمَّ تَشَهَّدَ، ثُمَّ سَلَّمَ. رَوَاهُ أبو دَاوُدَ وَالتِّرْمِذِيُّ، وَحَسَّنَهُ، وَالحَاكِمُ، وَصَحَّحَهُ.

حضرت عمران بن حصین رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی ﷺ نے انہیں نماز پڑھائی تو آپ کو سہو ہوگیا (یعنی آپؐ بھول گئے) تو (پہلے) دو سجدے کئے پھر تشہد پڑھا اور پھر سلام پھیرا۔ (اسے ابوداؤد' ترمذی نے روایت کیا ہے اور ترمذی نے اسے حسن قرار دیا ہے اور حاکم نے اسے صحیح قرار دیا ہے)

حاصل کلام : نماز میں بھول لاحق ہونے والا واقعہ وہی ہے جس میں ذوالیدین نے دریافت کیا تھا کہ کیا نماز کم ہوگئی ہے یا آپؐ بھول گئے ہیں؟ ذوالیدین والا واقعہ صحیحین اور سنن کی تمام کتب میں مذکور ہے۔ کسی کتاب میں مروی حدیث میں سجود سہو کے بعد تشہد کا کہیں ذکر نہیں۔ بلکہ صحیح مسلم میں خود حضرت عمران کی اسی روایت میں تشہد کا ذکر نہیں۔ اس لئے صحیح یہ ہے کہ ترمذی کی اس روایت میں تشہد کا لفظ شاذ ہے جیسا کہ امام بیہقی وغیرہ نے کہا۔ مگر حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ فی الجملہ تشہد کا ذکر ثابت ہے۔ جمہور کے نزدیک سلام سے پہلے سجدہ سہو ہو تو تشہد پڑھنے کی ضرورت نہیں' البتہ اگر سلام کے بعد سجدۂ سہو کیا جائے تو اختیار ہے خواہ تشہد پڑھے یا نہ پڑھے۔

(٢٦٥) وَعَنْ أَبِي سَعِيْدٍ الخُدْرِيِّ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «إِذَا شَكَّ أَحَدُكُمْ فِي صَلاَتِهِ فَلَمْ يَدْرِ كَمْ صَلَّى أَثلاَثاً أَمْ أَرْبَعاً؟ فَلْيَطْرَحِ الشَّكَّ، وَلْيَبْنِ عَلَى مَا اسْتَيْقَنَ، ثُمَّ يَسْجُدْ

حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "تم میں سے کسی کو جب نماز میں یہ شک ہو جائے کہ اس نے کتنی رکعتیں پڑھی ہیں تین یا چار؟ تو ایسی صورت میں شک کو نظر انداز کر کے جس پر یقین ہو اس پر نماز کی بنا رکھے۔ پھر سلام پھیرنے سے پہلے سہو کے دو سجدے کر لے۔

سَجْدَتَيْنِ قَبْلَ أَنْ يُسَلِّمَ، فَإِنْ كَانَ صَلَّى خَمْساً شَفَعْنَ لَهُ صَلاَتَهُ، وَإِنْ كَانَ صَلَّى تَمَاماً كَانَتَا تَرْغِيماً لِلشَّيْطَانِ». رَوَاهُ مُسْلِمٌ.

پس اگر تو اس نے پانچ رکعتیں پڑھی ہوں گی تو یہ دو سجدے اسے چھٹی رکعت کے قائم مقام ہو کر (طاق رکعات کو جفت بنا دیں گے) چھ بنا دیں گے اور اگر وہ پہلے ہی پوری نماز پڑھ چکا ہے تو یہ دو سجدے شیطان کیلئے باعث ذلت و رسوائی ہوں گے۔" (مسلم)

لغوی تشریح: "فلم یدر" را کے نیچے کسرہ۔ درایۃ سے ماخوذ ہے مگر حرف علت (همزہ) حذف ہوگیا ہے مضارع پر لم کے داخل ہونے کی وجہ سے۔ معنی اسے علم نہیں' اسے معلوم نہیں۔ "فلیطرح" چھوڑ دے' ترک کر دے' دور پھینک دے۔ "ولیبن" بناء سے ماخوذ ہے۔ "علی ما استیقن" جس پر یقین ہو۔ مثلاً جب اسے شک ہوا کہ آیا اس نے تین رکعات پڑھی ہیں یا چار۔ تو اس صورت میں اسے تین شمار کرنی چاہیں اور چوتھی کو پورا کرنے کیلئے کھڑے ہو کر ایک رکعت مزید پڑھ لے۔ ﴿فان کان صلی خمسا﴾ یہ اس صورت میں ہوگا جبکہ نمازی چار رکعت والی نماز پڑھے گا۔ "شفعن صلاتہ" تو دو سجدے نماز کو جفت بنا دیں گے اور یہ سجدے ایک رکعت کے قائم مقام ہوں گے۔ شفع وتر کے مقابلہ میں یعنی وتر کے معنی طاق جو جوڑا نہ بن سکے اور شفع کا معنی جفت جو جوڑا بن سکے۔

"تماما" تماما سے مراد چار رکعت جو نمازی کو مطلوب ہیں۔ "ترغیما تذلیلا" اور اھانۃ کے معنی میں ترغیم دراصل تو ناک کا مٹی کے ساتھ رگڑنا' خاک آلود کرنا' خاک آلودگی' ذلت' رسوائی اور اہانت کے معنی میں ہے۔

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ جب نمازی کو رکعات کی تعداد میں اشتباہ پڑ جائے تو اسے کم پر بنا رکھنی چاہیے۔ اس میں یقین کا امکان ہے۔ امام مالک رحمہ اللہ' امام شافعی رحمہ اللہ' امام احمد رحمہ اللہ اور جمہور علماء کا یہی مذہب ہے۔ البتہ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ نماز میں شک واقع ہونے کی صورت میں اسے تحری کرنی چاہیے۔ یعنی یاد کرنے کی انتہائی کوشش کر دیکھے اگر گمان غالب کسی طرف ہو جائے تو اس پر عمل کرے اور اگر تحری کے باوجود دونوں اطراف مساوی نظر آئیں تو پھر کم پر بنا رکھے۔

(٢٦٦) وَعَنِ ابْنِ مَسْعُودٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: صَلَّى رَسُولُ اللهِ ﷺ، فَلَمَّا سَلَّمَ قِيلَ لَهُ: يَا رَسُولَ اللهِ أَحَدَثَ فِي الصَّلاَةِ شَيْءٌ؟ قَالَ: «وَمَا ذَاكَ؟» قَالُوا: صَلَّيْتَ كَذَا وَكَذَا، قَالَ: فَثَنَى رِجْلَيْهِ، وَاسْتَقْبَلَ الْقِبْلَةَ، فَسَجَدَ سَجْدَتَيْنِ،

حضرت عبداللہ بن مسعود سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے نماز پڑھائی۔ سلام پھیرا تو آپ کی خدمت میں عرض کیا گیا اے اللہ کے رسول (ﷺ) کیا نماز میں کوئی نئی چیز رونما ہوئی ہے؟ آپ نے فرمایا "وہ کیا ہے؟" انہوں نے عرض کیا آپؐ نے تو اتنی اتنی نماز ادا فرمائی ہے۔ ابن مسعود کا بیان ہے کہ آنحضور نے اپنے دونوں پاؤں دوہرے کئے (اور

ثُمَّ سَلَّمَ، ثُمَّ أَقْبَلَ عَلَيْنَا بِوَجْهِهِ فَقَالَ: «إِنَّهُ لَوْ حَدَثَ فِي الصَّلاَةِ شَيْءٌ أَنْبَأْتُكُمْ بِهِ، وَلَكِنْ إِنَّمَا أَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ، أَنْسَى كَمَا تَنْسَوْنَ، فَإِذَا نَسِيْتُ فَذَكِّرُونِيْ، وَإِذَا شَكَّ أَحَدُكُمْ فِي صَلاَتِهِ فَلْيَتَحَرَّ الصَّوَابَ، فَلْيُتِمَّ عَلَيْهِ، ثُمَّ لِيَسْجُدْ سَجْدَتَيْنِ». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

ان پر بیٹھ گئے) اور قبلہ رو ہو کر دو سجدے کئے پھر سلام پھیرا پھر ہماری جانب متوجہ ہو کر ارشاد فرمایا "اگر نماز میں کوئی نئی چیز پیدا ہوئی ہوتی تو میں خود تمہیں اس سے باخبر کرتا۔ لیکن یہ یاد رکھیں کہ میں بھی انسان ہوں' اسی طرح بھول جاتا ہوں جس طرح تم لوگ بھول جاتے ہو' لہٰذا جب میں بھول جاؤں تو تم مجھے یاد کرا دیا کرو اور تم میں سے جب کسی نماز میں شک واقع ہو جائے تو صحیح صورت حال تک پہنچنے کی کوشش کر لے پھر اپنی نماز اس بنیاد پر مکمل کر لے۔ پھر دو سجدے کر لے۔ (بخاری و مسلم)

وَفِيْ رِوَايَةٍ لِّلْبُخَارِيِّ: «فَلْيُتِمَّ، ثُمَّ يُسَلِّمْ، ثُمَّ يَسْجُدْ». وَلِمُسْلِمٍ: أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ سَجَدَ سَجْدَتَيِ السَّهْوِ بَعْدَ السَّلاَمِ وَالكَلاَمِ.

اور بخاری ہی کی ایک دوسری روایت میں ہے کہ " (پہلے) نماز مکمل کرنی چاہئے پھر سلام پھیرے اور پھر سجدہ کرے" اور مسلم کی روایت میں ہے کہ نبی ﷺ نے سجدہ سہو سلام و کلام کے بعد کئے ہیں۔

وَلِأَحْمَدَ وَأَبِيْ دَاوُدَ وَالنَّسَائِيِّ مِنْ حَدِيْثِ عَبْدِاللهِ بْنِ جَعْفَرٍ مَرْفُوعاً: مَنْ شَكَّ فِيْ صَلاَتِهِ فَلْيَسْجُدْ سَجْدَتَيْنِ بَعْدَ مَا يُسَلِّمُ. وَصَحَّحَهُ ابْنُ خُزَيْمَةَ.

مسند احمد' ابوداؤد اور نسائی میں مروی عبداللہ بن جعفر رضی اللہ عنہ سے مرفوع روایت میں ہے کہ جس شخص کو نماز میں شک واقع ہو جائے تو اسے سلام پھیرنے کے بعد دو سجدے کرنے چاہئیں۔ (اسے ابن خزیمہ نے صحیح قرار دیا ہے۔)

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ رسول اللہ ﷺ نے انا بشر مثلکم کے الفاظ اپنے لئے ارشاد فرمائے ہیں۔ اس سے ان لوگوں کو اپنے نظریات و عقائد کی اصلاح کرنی چاہئے جو بشریت رسول اللہ ﷺ کے منکر ہیں اور قرآنی نصوص صریحہ کی یہ تاویل کرتے ہیں جو سراسر باطل اور لغو ہے کہ قرآن مجید میں تو منکروں کو خاموش کرنے کیلئے بشر کہا گیا ہے ورنہ درحقیقت تو وہ بشر نہیں تھے بشریت کا لبادہ اوڑھ رکھا تھا' لیکن ان عقلمندوں سے ذرا کوئی پوچھے کہ اس حدیث میں جن لوگوں کو (انا بشر کم مثلکم) کہہ کر مخاطب فرما رہے ہیں کیا وہ بھی کافر تھے کہ انہیں خاموش کرانا مقصود تھا یا وہ اہل ایمان صحابہ کرام رضی اللہ عنہم تھے جن کی صداقت ایمانی پر قرآن خود شاہد ہے۔

اس حدیث میں تحری الی الصواب کا حکم ہے۔ تحری دراصل وہ ہے جسے عبدالرحمٰن بن عوف

رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بیان کیا ہے کہ نمازی کو اگر ایک اور دو میں شبہ ہو تو ایک کو یقین سمجھے اور دو اور تین میں شک لاحق ہو تو دو رکعت کو درست قرار دے اور تین اور چار میں اگر اشتباہ پڑ جائے تو تین کو یقینی تصور کرے اور نماز سے فارغ ہو کر سلام پھیرنے سے پہلے دو سجدے سہو کے کر لے۔ نیز یہ بھی مسئلہ معلوم ہوا کہ مقتدیوں کو امام کی اتباع کرنی چاہئے خواہ امام بھول ہی کیوں نہ جائے۔ البتہ بھولنے کی صورت میں مقتدی امام کو سبحان اللہ کہہ کر متنبہ کرنے کی کوشش ضرور کریں۔ جیسا کہ دوسری احادیث میں اس کی وضاحت موجود ہے۔

راوی حدیث : ﴿ عبداللہ بن جعفر رضی اللہ عنہما ﴾ ابو جعفر ان کی کنیت ہے۔ عبداللہ بن جعفر بن ابی طالب نام ہے۔ ان کی والدہ کا نام اسماء بنت عمیس تھا۔ ہجرت حبشہ کے دوران اسلام میں سب سے پہلے یہی پیدا ہوئے تھے۔ ۷ھ کے اوائل میں اپنے والد کے ہمراہ مدینہ میں واپس آئے۔ بڑے سخی' بہادر' پاک دامن اور خوش مزاج تھے۔ کثرت سے سخاوت کرنے کی وجہ سے بحر الجود (سخاوت کا سمندر) کہلاتے تھے۔ مدینہ منورہ میں ۸۰ھ میں اسی برس کی عمر میں فوت ہوئے۔

(۲٦٧) وَعَنِ الْمُغِيْرَةِ بْنِ شُعْبَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، أَنَّ رَسُولَ اللهِ ﷺ، قَالَ: «إِذَا شَكَّ أَحَدُكُمْ، فَقَامَ فِي الرَّكْعَتَيْنِ، فَاسْتَتَمَّ قَائِماً، فَلْيَمْضِ، وَلاَ يَعُودُ، وَلْيَسْجُدْ سَجْدَتَيْنِ، فَإِنْ لَمْ يَسْتَتِمَّ قَائِماً فَلْيَجْلِسْ، وَلاَ سَهْوَ عَلَيْهِ». رَوَاهُ أَبُو دَاوُدَ وَابْنُ مَاجَهْ وَالدَّارَقُطْنِيُّ، وَاللَّفْظُ لَهُ، بِسَنَدٍ ضَعِيفٍ.

حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے کہ "تم میں سے جب کسی کو دو رکعتوں میں شک پیدا ہو جائے اور کھڑا ہو جائے بلکہ بالکل سیدھا کھڑا ہو جائے تو اسے جاری رکھے اور واپس نہ لوٹے بعد میں اسے دو سجدے سہو کے کر لینے چاہئیں اور اگر بالکل سیدھا کھڑا نہ ہوا ہو تو بیٹھ جائے تو اس صورت میں اس پر سجدہ سہو نہیں۔" (اسے ابوداؤد اور ابن ماجہ اور دار قطنی نے روایت کیا ہے۔ یہ الفاظ بھی اسی دار قطنی کے ہیں۔ اس کی سند ضعیف ہے)

۳۳۲

لغوی تشریح : "فقام فی الرکعتین" یعنی پہلے تشہد میں نہ بیٹھے۔ "فاستتم قائما" پوری طرح سیدھا کھڑا ہو جائے۔ "ضعیف" اس لئے ضعیف ہے کہ اس روایت کے تمام طرق جابر جعفی پر مدار رکھتے ہیں اور یہ سخت ضعیف ہے۔

(۲٦٨) وَعَنْ عُمَرَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ:

حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "کسی مقتدی پر سجدۂ سہو نہیں ہے۔ ہاں اگر امام

«لَيْسَ عَلَى مَنْ خَلْفَ الْإِمَامِ سَهْوٌ، فَإِنْ سَهَا الإِمَامُ فَعَلَيْهِ وَعَلَى مَنْ خَلْفَهُ». رَوَاهُ البَزَّارُ وَالبَيْهَقِيُّ بِسَنَدٍ ضَعِيفٍ.

بھول جائے تو پھر امام اور مقتدی دونوں پر سجدۂ سہو ہے" (اسے بزار اور بیہقی نے ضعیف سند کے ساتھ روایت کیا ہے)

لغوی تشریح: "ضعیف" یہ روایت اس وجہ سے ضعیف ہے کہ اس کی سند میں ایک راوی خارجہ بن مصعب ہے' جو ضعیف ہے۔

(۲۶۹) وَعَنْ ثَوْبَانَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ: «لِكُلِّ سَهْوٍ سَجْدَتَانِ بَعْدَ مَا يُسَلِّمُ». رَوَاهُ أَبُو دَاوُدَ وَابْنُ مَاجَهْ بِسَنَدٍ ضَعِيفٍ.

حضرت ثوبان رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا کہ "ہر سہو کیلئے دو سجدے ہیں جو سلام پھیرنے کے بعد ہیں۔" (اسے ابوداؤد اور ابن ماجہ دونوں نے ضعیف سند سے روایت کیا ہے)

لغوی تشریح: ﴿لكل سهو سجدتان بعد ما يسلم﴾ اس سے دو مسئلے مستنبط ہوتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ نماز میں جتنی بار بھول ہوئی ہے تو ہر بھول کے عوض دو سجدے کئے جائیں۔ لیکن یہ حدیث چونکہ ضعیف ہے اس لئے اس سے احتجاج و استدلال درست نہیں ہے۔ کیونکہ ذوالیدین والی حدیث اس کے معارض ہے جس میں ہے کہ نبی ﷺ نے سلام پھیرا اور پھر نادانستہ وہاں سے چل کھڑے ہوئے تو انہوں نے دو سجدے ہی کئے تھے۔ دوسرا مسئلہ یہ ثابت ہوا کہ سجدۂ سہو کا موقع و محل سلام پھیرنے کے بعد ہے۔ سجدۂ سہو کے محل وقوع میں احادیث مختلف ہیں۔ اس باب کی دو احادیث جو عبداللہ بن بحینہ اور ابوسعید الخدری سے مروی ہیں ان دونوں سے معلوم ہوتا ہے کہ سجدۂ سہو سلام پھیرنے سے پہلے مسنون ہے اور ذوالیدین اور عبداللہ بن مسعود اور عبداللہ بن جعفر کی روایات سے ثابت ہوتا ہے کہ سجدۂ سہو کا محل اور موقع سلام پھیرنے کے بعد ہے۔ اسی اختلاف کی بنا پر ائمہ کرام ؒ کی آراء میں اختلاف ہے۔ چنانچہ ایک قول یہ ہے کہ ہر قسم و نوع کا سجدۂ سہو صرف سلام پھیرنے سے پہلے ہے اور دوسری رائے یہ ہے کہ سلام پھیرنے کے بعد ہے اور ایک رائے یہ بھی ہے کہ نمازی کو اختیار ہے چاہے سلام سے پہلے سجدہ کر لے اور چاہے سلام پھیرنے کے بعد کر لے اور ایک رائے یہ بھی ہے کہ اگر سجدہ نماز میں کسی اضافہ کی وجہ سے کیا جائے تو پھر سلام پھیرنے کے بعد ہے اور اگر نماز میں کسی کمی واقع ہونے کی وجہ سے سجدہ کرنا پڑے تو پھر سلام پھیرنے سے پہلے ہے اور ایک رائے یہ بھی ہے کہ کسی حدیث میں جس موقع پر جس طرح سجدہ ثابت ہے اسی طرح کرنا چاہئے۔ باقی کے بارے میں قیاس نہیں کیا جائے گا۔ صحیح بات یہ معلوم ہوتی ہے کہ جس سہو میں آنحضرت ﷺ نے پہلے سجدہ سہو کیا وہاں پہلے اور جہاں بعد میں کیا وہاں بعد میں کیا جائے۔ اس کے علاوہ نمازی کو اختیار ہے خواہ سلام سے پہلے کرے یا بعد میں۔ دونوں طرح درست ہے۔ جہاں تک اس حدیث کے ضعیف ہونے کا معاملہ ہے تو اس کا سبب یہ ہے کہ اس کی سند

میں اختلاف ہے اور اسماعیل بن عیاش متکلم فیہ ہے۔ جب یہ شامیوں سے روایت کرتا ہے تو وہ صحیح ہوتی ہے اور یہ روایت بھی شامیوں سے ہے اور ایک اور راوی ابوبکر بن عیاش اس میں ضعیف ہے۔ امام اثرم نے تو فرمایا ہے کہ یہ حدیث منسوخ ہے کیونکہ ذوالیدین کی حدیث اس کے برعکس ہے جیسا کہ پہلے وضاحت ہو چکی ہے۔

(۲۷۰) وَعَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: سَجَدْنَا مَعَ رَسُولِ اللهِ ﷺ فِي «إِذَا السَّمَاءُ انْشَقَّتْ» و«اقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّكَ». رَوَاهُ مُسْلِمٌ.

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ہم نے سورہ اذا السماء انشقت و سورہ انشقاق و سورہ اقراء باسم ربک (سورۃ علق) میں رسول اللہ ﷺ کے ساتھ سجدۂ تلاوت کیا ہے۔ (مسلم)

حاصل کلام: اس حدیث سے سجدۂ تلاوت کا مشروع ہونا ثابت ہے۔ اس کی مشروعیت پر سب علماء کا اتفاق ہے۔ مگر اس کے وجوب میں اختلاف آراء ہے۔ جمہور علماء کا موقف یہ ہے کہ سجدۂ تلاوت مسنون ہے' واجب نہیں مگر امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ یہ واجب ہے۔ سجود قرآن کی تعداد کے بارے میں اختلاف ہے۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ سورہ ص اور مفصل کی سورتوں میں سجدۂ تلاوت نہیں ہے۔ اس طرح ان کے نزدیک ان کی کل تعداد گیارہ ہے۔ یہ حدیث ان کے خلاف جاتی ہے اور امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ مفصل سمیت چودہ سجدے ہیں۔ سورۂ حج کے پہلے سجدے کے تو قائل ہیں مگر دوسرے کے قائل نہیں اور امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک سورہ حج کے دونوں سجدوں سمیت کل پندرہ ہیں اور زیادہ وزنی اور قابل ترجیح امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ کا مسلک ہی معلوم ہوتا ہے۔

(۲۷۱) وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُمَا قَالَ: (صٓ) لَيْسَتْ مِنْ عَزَائِمِ السُّجُودِ، وَقَدْ رَأَيْتُ رَسُولَ اللهِ ﷺ يَسْجُدُ فِيْهَا. رَوَاهُ الْبُخَارِيُّ.

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ سورۂ ص کا سجدہ ان میں سے نہیں ہے جن کا کرنا ضروری ہے البتہ میں نے یقیناً رسول اللہ ﷺ کو اس میں سجدہ کرتے دیکھا ہے۔ (بخاری)

لغوی تشریح: ﴿ ص ﴾ اس سے مراد یہ ہے کہ سورۂ ص میں سجدہ تلاوت ہے۔ ﴿ لیست من عزائم السجود ﴾ یعنی یہ ان سجدوں میں سے نہیں ہے جن کے کرنے کیلئے تاکید کی گئی ہے' بلکہ حضرت داؤد علیہ السلام سے جس سجدے کے کرنے کا ذکر ہے' اس میں صرف خبر و اطلاع دی گئی ہے کہ انہوں نے سجدہ کیا اور نبی کریم ﷺ نے ان کی اقتداء کے طور پر سجدہ کیا' اللہ تعالیٰ کے ارشاد ﴿ فبھدا ھم اقتدہ ﴾ (ان کی راہ راست کی اقتداء کر) کی تعمیل میں۔ اس میں یہ دلیل ملتی ہے کہ مسنون اعمال میں بعض کی زیادہ تاکید ہے اور بعض کی کم۔ (سبل السلام)

حاصل کلام: اس سے معلوم ہوا کہ سورۂ ص میں تو آنحضرت ﷺ نے سجدہ کیا ہے' البتہ آپؐ نے اس کا حکم نہیں فرمایا اور اس کی تاکید نہیں کی۔ اس سے معلوم ہوا کہ بعض اعمال اگرچہ مسنون ہیں' مگر ان کے بارے میں تاکید نہیں۔ وہ بھی سنت خیر الانام کے زمرہ میں آتے ہیں۔

(۲۷۲) وَعَنه أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ سَجَدَ بِالنَّجمِ. رَوَاهُ البُخَارِيُّ.

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے یہ بھی مروی ہے کہ نبی ﷺ نے سورۂ نجم میں سجدۂ تلاوت کیا۔ (بخاری)

حاصل کلام: اس حدیث سے ثابت ہوتا ہے کہ نماز میں سے سورۂ نجم کا سجدہ مشروع ہے۔ جو مفصل میں سجدۂ تلاوت کے قائل نہیں انہیں غور کرنا چاہئے۔

(۲۷۳) وَعَنْ زَيْدِ بْنِ ثَابِتٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَرَأْتُ عَلَى النَّبِيِّ ﷺ النَّجْمَ، فَلَمْ يَسْجُدْ فِيْهَا. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ میں نے نبی ﷺ کے روبرو سورۂ النجم کی قرأت کی' مگر آپؐ نے اس میں سجدۂ تلاوت نہیں کیا۔ (بخاری و مسلم)

حاصل کلام: نبی کریم ﷺ کا سورۂ نجم میں سجدہ نہ کرنا اس بات کو مستلزم نہیں ہے کہ النجم کا سجدہ مشروع نہیں ہے' بلکہ مقصود یہ واضح کرنا تھا کہ اس میں کبھی سجدہ آپؐ نے چھوڑ بھی دیا ہے۔ یہ سجود قرآن کے سنت ہونے کی دلیل ہے۔ ورنہ اگر واجب ہوتا تو پھر کبھی نہ چھوڑتے۔ کبھی کر لینا اور کبھی نہ کرنا ہی اس کے سنت ہونے کی کھلی دلیل ہے۔ لہٰذا جمہور کا مسلک ہی صحیح ہے۔

راوی حدیث: ﴿زید بن ثابت رضی اللہ عنہ﴾ ابوسعید ان کی کنیت تھی یا ابوخارجہ۔ انصار کے مشہور قبیلہ نجار سے تعلق رکھتے تھے۔ وحی کی سب سے زیادہ کتابت یہی کیا کرتے تھے اور صحابہ کرامؓ میں فرائض یعنی میراث کے بڑے ماہر تھے۔ خندق کا معرکہ وہ پہلا معرکہ ہے جس میں یہ شریک ہوئے۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے عہد خلافت میں جمع قرآن کی خدمت انہی نے انجام دی تھی اور عہد خلافت عثمان رضی اللہ عنہ میں اس کی نقول بھی انہی نے تیار کی تھیں۔ نبی ﷺ کے ارشاد گرامی کی تعمیل میں یہود کا رسم الخط صرف پندرہ دن میں سیکھ لیا تھا اور وہی آپؐ کے خطوط تحریر کیا کرتے تھے۔ کتابت کے بعد آپؐ کو پڑھ کر سنا دیا کرتے تھے۔ ۴۵ھ میں مدینہ میں وفات پائی۔ بعض کی رائے یہ ہے کہ مدینہ کے علاوہ کسی دوسری جگہ وفات پائی۔

(۲۷٤) وَعَنْ خَالِدِ بْنِ مَعْدَانَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: فُضِّلَتْ سُوْرَةُ الحَجِّ بِسَجْدَتَيْنِ. رَوَاهُ أَبُو دَاوُدَ فِي المَرَاسِيْلِ، وَرَوَاهُ أَحْمَدُ وَالتِّرْمِذِيُّ مَوْصُولاً مِنْ حَدِيْثِ عُقْبَةَ بْنِ عَامِرٍ، وَزَادَ: «فَمَنْ لَمْ

حضرت خالد بن معدان رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ سورۂ حج کو دو سجدۂ تلاوت کی وجہ سے فضیلت دی گئی ہے۔ (اس کو ابوداؤد نے مراسیل میں ذکر کیا ہے) اور احمد اور ترمذی نے عتبہ بن عامر کی حدیث سے اسے موصول قرار دیا ہے اور اس میں اتنا اضافہ ہے۔ جس

يَسْجُدْهُمَا فَلاَ يَقْرَأْهَا». وَسَنَدُهُ ضَعِيفٌ.

نے اس سورہ کے دونوں سجدے نہ کئے وہ اسے نہ پڑھے۔ اس کی سند ضعیف ہے)

لغوی تشریح: ﴿ فصلت ﴾ غائب کا صیغہ ہے۔ تفضیل سے ماخوذ ہے۔ باب تفعیل ہے۔ مبنی للمفعول ہے۔ ﴿ فی المراسیل ﴾ سے مراد کتاب المراسیل ہے اور سنن کی کتب میں موصول بیان ہوئی ہے۔ ﴿ ومن لم یسجدھما ﴾ سورۂ حج کے دونوں سجدے جس نے نہ کئے۔ ﴿ فلا یقراھا ﴾ تو پھر وہ سورۂ حج نہ پڑھے اور اصول کی کتابوں میں تثنیہ کے ساتھ ہے یعنی ﴿ فلا یقراھما ﴾ یعنی دونوں آیات سجدہ نہ پڑھے۔ ﴿ وسندہ ضعیف ﴾ اس کی سند میں ابن لھیعہ نامی راوی ہے اس لئے یہ ضعیف ہے۔ لیکن اس حدیث کے ایسے شواہد موجود ہیں جو اس حدیث کی تائید کرتے ہیں۔ شیخ عبیداللہ مبارک پوری نے تحقیق سے ثابت کیا ہے کہ یہ حدیث درجۂ حسن سے گری ہوئی نہیں ہے۔ اس کیلئے ملاحظہ ہو (مراعاۃ المفاتیح شرح مشکاۃ المصابیح ج ۲ ص ۱۴۸۔ طبع اول) حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے اس روایت کو مراسیل ابی داؤد کی طرف منسوب کیا ہے حالانکہ سنن ابی داؤد میں بھی یہ روایت موجود ہے۔

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ سورۂ حج کے دونوں سجدے کرنے چاہئیں۔ نہ کرنے والے کے بارے میں فرمایا کہ پھر اسے پڑھے ہی ناں۔ اس کی حکمت یہ معلوم ہوتی ہے کہ قرآن مجید کی تلاوت مستحب ہے اور سجدۂ تلاوت کرنا مسنون ہے۔ ترک سنت سے بہتر ہے کہ مستحب عمل ہی نہ کرے یعنی اس کی تلاوت نہ کرے' تاکہ ترک سنت کا مرتکب نہ ہو۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ ' عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما ' عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہما ' عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما ' ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ ' ابودرداء رضی اللہ عنہ اور عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ وغیرہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سورۂ حج میں دونوں سجدے کرتے تھے' اس لئے اس روایت کو ناقابل عمل کہنا غلط ہے۔

راوی حدیث: ﴿ خالد بن معدان رحمۃ اللہ علیہ ﴾ ان کی کنیت ابوعبداللہ کلاعی (کاف پر فتحہ) ہے۔ حمص کے رہنے والے تھے۔ فقہاء تابعین میں شمار ہوتے تھے۔ ان کا قول ہے کہ میں نے ستر صحابہ رضی اللہ عنہم سے ملاقات کی ہے۔ ان کی وفات ۱۰۳ھ یا ۱۰۴ھ یا ۱۰۸ھ میں ہوئی۔ معدان کے میم پر فتحہ اور عین ساکن ہے۔

(۲۷۵) وَعَنْ عُمَرَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: يَآ أَيُّها النَّاسُ! إِنَّا نَمرُّ بِالسُّجُودِ، فَمَنْ سَجَدَ فَقَدْ أَصَابَ، وَمَنْ لَّمْ يَسْجُدْ فَلاَ إِثْمَ عَلَيْهِ. رَوَاهُ الْبُخَارِيُّ.

وَفِيْهِ: إِنَّ اللَّهَ تَعَالَى لَمْ يَفْرِضِ السُّجُودَ إِلاَّ أَنْ يَشَآءَ. وَهُوَ فِي الْمُوَطَّإِ.

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا' لوگو! ہم آیات سجدہ کرتے ہوئے گزرتے ہیں جس نے سجدہ کیا اس نے درست کیا اور جس نے نہ کیا اس پر کوئی گناہ نہیں۔ (بخاری) اور مؤطا میں یہ الفاظ ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے سجدۂ تلاوت فرض نہیں کیا مگر قاری اگر چاہے تو کر سکتا ہے

لغوی تشریح: ﴿لم یفرض السجود﴾ فرض' یفرض باب ضرب یضرب سے ہے۔ معنی یہ ہوئے کہ اسے فرض نہیں کیا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا یہ قول اس کی دلیل ہے کہ سجود تلاوت واجب نہیں۔

حاصل کلام: بعض نسخوں میں ان یشاء کی جگہ ان نشا جمع کے صیغہ سے بھی منقول ہے (ہم چاہیں تو سجدہ کریں) یعنی قاری کو اختیار ہے' فرض و واجب میں اختیار نہیں دیا جاتا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی موجودگی میں یہ فرمایا تھا۔ سامعین صحابہ سب خاموش رہے۔ اس سے اجماع سکوتی کا ثبوت ملتا ہے۔ نیز لم یفرض اور ان یشاء بھی اس کی تائید مزید ہے۔ ائمہ اربعہ میں امام مالک رحمہ اللہ اور امام شافعی رحمہ اللہ کا یہی مسلک ہے۔ اہلحدیث بھی سجود تلاوت کو مسنون ہی قرار دیتے ہیں مگر احناف اسے واجب کہتے ہیں۔

(٢٧٦) وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُمَا قَالَ: كَانَ النَّبِيُّ ﷺ يَقْرَأُ عَلَيْنَا الْقُرْآنَ، فَإِذَا مَرَّ بِالسَّجْدَةِ كَبَّرَ وَسَجَدَ، وَسَجَدْنَا مَعَهُ. رَوَاهُ أَبُو دَاوُدَ بِسَنَدٍ فِيهِ لِيْنٌ.

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ نبی ﷺ ہمارے سامنے قرآن مجید کی تلاوت فرماتے تھے جب آیت سجدہ پر سے گزرتے تو اللہ اکبر کہہ کر سجدہ کرتے اور ہم بھی آپ ؐ کے ساتھ ہی سجدہ کرتے۔ (ابوداؤد نے اسے کمزور سند کے ساتھ روایت کیا ہے)

لغوی تشریح: ﴿فیہ لین﴾ لام کے نیچے کسرہ اور "یاء" ساکن۔ معنی ضعف اور کمزوری' کیونکہ اس روایت کی سند میں عبداللہ عمری ہے جو ضعیف ہے۔

حاصل کلام: اس حدیث سے ثابت ہوتا ہے کہ سجدۂ تلاوت کیلئے اللہ اکبر کہہ کر سجدہ کرنا مشروع ہے۔ حاکم نے اس روایت کو عبیداللہ عمری کے حوالہ سے نقل کیا ہے جسے انہوں نے ثقہ کہا ہے اور اس حدیث کے متعلق وہ کہتے ہیں کہ یہ حدیث شیخین (بخاری و مسلم) کی شرط پر ہے اور ابوداؤد کی روایت جسے متن میں بیان کیا گیا ہے عبداللہ اکبر کی ہے' وہ ایک ضعیف راوی ہے۔ لہٰذا ثابت ہوا کہ سامع پر بھی سجدہ مشروع ہے خواہ نماز میں مصروف و مشغول ہو۔ سجدۂ تلاوت کیلئے طہارت ضروری اور لازمی نہیں تاہم طہارت کا ہونا بہتر اور افضل ہے۔ عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما' شعبی رحمہ اللہ اور ابن حزم رحمہ اللہ طہارت کو لازمی شرط قرار نہیں دیتے۔ سجدہ تلاوت میں یہ دعا پڑھنی چاہئے: سجد وجھی للذی خلقه وصوره وشق سمعه وبصره وبحوله وقوته "میرا سر اس ذات کے سامنے جھک گیا جس نے اسے پیدا کیا اور اسے صورت دی اور اسکو سماعت عطاء کی اور بینائی سے نوازا۔ طاقت وقوت بھی عنایت کی"۔ اور ایک روایت میں فتبارك الله احسن الخالقين بھی منقول ہے۔

(٢٧٧) وَعَنْ أَبِيْ بَكْرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُ أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ كَانَ إِذَا جَاءَهُ أَمْرٌ يَسُرُّهُ خَرَّ سَاجِداً لِلّٰهِ. رَوَاهُ الْخَمْسَةُ إِلاَّ النَّسَائِيَّ.

حضرت ابوبکرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی ﷺ کو جب کوئی خوشخبری ملتی تو اللہ کے حضور سجدے میں گر پڑتے۔ (نسائی کے علاوہ پانچوں نے اسے روایت کیا ہے)

لغوی تشریح: ﴿ یسرہ ﴾ ایسا کام جو آپؐ کی خوشی، فرحت و سرور اور بشارت کا باعث ہوتا۔ ﴿ خر ﴾ گر پڑتے۔ اس میں دلیل ہے کہ کسی نعمت کے حصول اور ناپسندیدہ کام سے بچنے کے موقع پر سجدے میں گر پڑتے۔ اب سوال یہ رہ جاتا ہے کہ ایسے سجدوں کیلئے باوضو ہونا ضروری ہے یا نہیں؟ اس میں اختلاف ہے۔ صحیح یہ ہے کہ اس کیلئے طہارت شرط نہیں۔

حاصل کلام: کسی نئی نعمت کے حاصل ہونے پر، کسی مصیبت سے بچ نکلنے پر، کسی خوشی و مسرت کے موقع پر سجدۂ شکر بجالانا شریعت سے ثابت ہے۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ اور امام احمد رحمۃ اللہ علیہ اس کے قائل ہیں۔ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ اور امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نہ اسے مستحسن سمجھتے ہیں اور نہ مکروہ۔ حدیث سے تائید امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ اور امام احمد رحمۃ اللہ علیہ کی ہوتی ہے۔

(٢٧٨) وَعَنْ عَبْدِ الرَّحْمَنِ بْنِ عَوْفٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: سَجَدَ النَّبِيُّ ﷺ فَأَطَالَ السُّجُودَ، ثُمَّ رَفَعَ رَأْسَهُ وَقَالَ: **إِنَّ جِبْرِيْلَ أَتَانِيْ، فَبَشَّرَنِيْ، فَسَجَدْتُ لِلّٰهِ شُكْراً.** رَوَاهُ أَحْمَدُ، وَصَحَّحَهُ الحَاكِمُ.

حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے سجدہ کیا اور لمبا سجدہ کیا پھر سجدے سے سر اٹھا کر فرمایا کہ "ابھی جبرئیلؑ ایک خوشخبری لے کر میرے پاس آئے تو وہ مژدہ سن کر میں نے اللہ کے حضور سجدۂ شکر ادا کیا۔" (اسے احمد نے روایت کیا ہے اور حاکم نے اسے صحیح قرار دیا ہے)

حاصل کلام: مسند احمد میں یہ حدیث متعدد اسانید سے مروی ہے اور اس میں یہ تفصیل بھی ہے کہ وہ بشارت اور خوشخبری یہ تھی کہ جو شخص حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر ایک مرتبہ درود بھیجے گا اللہ تعالیٰ اس پر دس رحمتیں اپنی طرف سے نازل فرمائے گا۔ یہ خوش کن اطلاع پا کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم سجدۂ میں گر پڑے اور شکریہ ادا کیا۔ لہٰذا جب کسی کو ایسا موقع پیش آجائے تو اسے بھی سجدۂ شکر ادا کرنا چاہئے۔

راوی حدیث: ﴿ عبدالرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ ﴾ ان کی کنیت ابو محمد تھی۔ قریش کے زہرہ قبیلہ سے تھے۔ قدیم الاسلام تھے۔ حبشہ کی دونوں ہجرتوں میں شریک تھے۔ بدر و احد کے علاوہ باقی سب غزوات وغیرہ میں شامل رہے۔ ان کا شمار ان خوش قسمت دس انسانوں میں ہوتا ہے جنہیں رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے دنیا ہی میں جنت کی بشارت دی گئی۔ یہ ان چھ افراد میں سے ایک تھے جنہیں خلیفۂ ثانی حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے خلیفہ کے انتخاب کیلئے نامزد فرمایا تھا۔ عہد نبوی میں انہوں نے ایک مرتبہ چار ہزار اور پھر چالیس ہزار دینار صدقہ و خیرات کئے پھر انہوں نے پانچ سو گھوڑے اور پانچ سو اونٹ جہاد کیلئے پیش کئے۔ امہات المؤمنینؓ کیلئے اپنے ایک حصہ کی وصیت کی کہ ان کی نذر کر دیا جائے، اس کی بعد میں قیمت لگوائی گئی تو وہ چار لاکھ دینار تھی۔ ٣٢ھ میں وفات پائی اور بقیع میں تدفین ہوئی۔

(٢٧٩) وَعَنِ الْبَرَاءِ بْنِ عَازِبٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُ، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ

حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو یمن کی طرف بھیجا۔

بَعَثَ عَلِيّاً إِلَى اليَمَنِ، فَذَكَرَ الحديث. قال: فكتب عليٌّ بإسلامهم، فَلَمَّا قَرَأَ رَسُولُ اللهِ ﷺ الكِتَابَ خَرَّ سَاجِداً، شُكْراً للهِ عَلَى ذَلِكَ. رَوَاهُ البَيْهَقِيُّ، وَأَصْلُهُ فِي البُخَارِيِّ.

راوی نے حدیث بیان کی جس میں اس نے کہا ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اہل یمن کے اسلام میں داخل ہونے کی روداد حضور ﷺ کی خدمت میں ارسال فرمائی۔ جب رسول اللہ ﷺ نے وہ مکتوب پڑھا تو آپؐ اللہ کا شکر ادا کرنے کیلئے سجدہ ریز ہوگئے۔ (بیہقی نے اسے روایت کیا ہے اور اس کی اصل بخاری میں موجود ہے)

حاصل کلام: آپؐ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے مکتوب میں اہل یمن کے اسلام قبول کرنے پر سجدۂ شکر ادا کیا۔ مسلمانوں کی تعداد میں اضافہ باعث خوشی اور مقام مسرت ہے اور یہ بھی ایک عظیم نعمت الٰہی ہے اس لئے بطور شکریہ کے سجدۂ شکر بجا لانا مشروع ہے۔ ایک وہ وقت تھا جب مسلمانوں کی کثرت تعداد باعث مسرت اور موجب انبساط ہوا کرتی تھی اور ایک یہ دور ہے کہ مسلمان بچوں کی پیدائش روکنے کی شب و روز سکیمیں اور عملی تدبیریں بروئے کار لانے کی کوششیں کی جا رہی ہیں اور ستم ظریفی یہ ہے کہ حکومتی سطح پر زور و شور سے اس مہم کو چلایا جا رہا ہے اور کروڑہا روپیہ اسے کامیاب بنانے پر صرف کئے جا رہے ہیں۔

٩ - بَابُ صَلاَةِ التَّطَوُّعِ

نفل نماز کا بیان

(٢٨٠) عَنْ رَبِيْعَةَ بْنِ كَعْبٍ الأَسْلَمِيِّ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ لِيَ النَّبِيُّ ﷺ: «سَلْ»، فَقُلْتُ: أَسْأَلُكَ مُرَافَقَتَكَ فِي الجَنَّةِ، فَقَالَ: «أَوَ غَيْرَ ذَلِكَ؟» فَقُلْتُ: هُوَ ذَاكَ، قَالَ: «فَأَعِنِّي عَلَى نَفْسِكَ بِكَثْرَةِ السُّجُودِ». رَوَاهُ مُسْلِمٌ.

حضرت ربیعہ بن کعب اسلمی رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ ایک روز نبی ﷺ نے مجھے (مخاطب کر کے) فرمایا "مانگ لے (جو کچھ مانگنا ہے)" میں نے عرض کیا میں جنت میں آپؐ کی رفاقت کا طلبگار ہوں۔ آپؐ نے فرمایا "کچھ اس کے علاوہ مزید بھی۔" میں نے عرض کیا بس وہی مطلوب ہے۔ آپؐ نے فرمایا "تو پھر اپنے مطلب کے حصول کیلئے کثرت سجود سے میری مدد کر۔" (مسلم)

لغوی تشریح: ﴿باب صلاة التطوع﴾ یعنی نفلی نماز۔ اور نفلی عبادت یہ ہے کہ آدمی اپنی طرف سے ہی کوئی عبادت کرے جو کہ شارع علیہ السلام کی طرف سے فرض نہیں کی گئی۔ ﴿سل﴾ سوال سے صیغہ امر ہے۔ معنی ہے کہ طلب کرو، مانگو۔ ﴿مرافقتك﴾ رفاقت و مصاحبت۔ ﴿فاعني﴾ یہ "اعانة" سے امر کا صیغہ ہے اور اس میں "یا" یاء متکلم ہے۔ ﴿على نفسك﴾ یعنی اپنے جی کی خواہش و مراد

کے حصول کیلئے۔ ﴿ بکثرۃ السجود ﴾ سجود سے یہاں نفل نماز مراد ہے۔ بعض نوافل کثرت سے پڑھا کر۔ سجدہ کی کثرت تو کثرت نماز کی صورت میں ہی ممکن ہے۔ کثرت یا قلت تو نفل نماز ہی میں ہو سکتی ہے۔ (فرائض میں تو کمی بیشی ناممکن ہے۔)

حاصل کلام: اس حدیث سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے سجدہ سے مراد نفل نماز لی ہے اور اس حدیث سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ سجدہ کو سارے ارکان نماز پر فضیلت حاصل ہے۔ سجدہ تقرب الٰہی کا سب سے مؤثر ذریعہ ہے۔ نیز اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ قرب الٰہی اور نبی کریم ﷺ کی رفاقت کیلئے کثرت سے نوافل ادا کرنے کی ضرورت ہے۔ افسوس ان لوگوں پر جو اتباع سنت کا دعویٰ تو کرتے ہیں مگر نوافل سے اتنی رغبت نہیں جتنی تاکید ان کے بارے میں معلوم ہوتی ہے اور کچھ لوگ تو زبانی عاشق رسول ہونے کے دعویدار ہیں مگر نفل تو کجا فرائض بھی نہیں پڑھتے' رہتے پھر بھی وہ عاشق رسول ہی ہیں بلکہ نادان اور بے علم و جاہل لوگوں نے ان کو رتبہء ولائت پر بٹھا رکھا ہے جنہوں نے کبھی نماز پڑھ کر نہ دیکھی ہو۔

راوی حدیث: ﴿ ربیعہ بن کعب رضی اللہ عنہ ﴾ ابو فراس ان کی کنیت ہے۔ اسلم قبیلہ سے تھے اس لئے اسلمی کہلائے۔ اصحاب صفہ میں سے تھے' مدینہ کے رہنے والے تھے۔ رسول اللہ ﷺ کے خادم خاص تھے۔ حضر و سفر میں آپؐ کے ساتھ رہتے تھے۔ ۶۳ھ میں وفات پائی۔

(۲۸۱) وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُمَا قَالَ: حَفِظْتُ مِنَ النَّبِيِّ ﷺ عَشْرَ رَكْعَاتٍ: رَكْعَتَيْنِ قَبْلَ الظُّهْرِ، وَرَكْعَتَيْنِ بَعْدَهَا، وَرَكْعَتَيْنِ بَعْدَ المَغْرِبِ فِي بَيْتِهِ، وَرَكْعَتَيْنِ بَعْدَ العِشَاءِ فِيْ بَيْتِهِ، وَرَكْعَتَيْنِ قَبْلَ الصُّبْحِ. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ. وَفِي رِوَايَةٍ لَّهُمَا: وَرَكْعَتَيْنِ بَعدَ الجُمُعَةِ فِيْ بَيْتِهِ.

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ مجھے نبی ﷺ کی دس رکعتیں یاد ہیں۔ دو رکعتیں ظہر کی نماز سے پہلے اور دو بعد میں اور مغرب کے بعد دو رکعتیں گھر پر ادا فرماتے تھے۔ اسی طرح دو رکعتیں عشاء کی فرض نماز کے بعد گھر پر اور دو رکعتیں صبح سے پہلے۔ (بخاری و مسلم)

اور بخاری و مسلم دونوں کی روایت میں یہ بھی ہے کہ دو رکعتیں نماز جمعہ کی (فرض) نماز کے بعد گھر پر پڑھتے تھے۔

وَلِمُسْلِمٍ: كَانَ إِذَا طَلَعَ الفَجْرُ لاَ يُصَلِّي إِلاَّ رَكْعَتَيْنِ خَفِيْفَتَيْنِ.

اور مسلم کی روایت میں یہ بھی ہے کہ صبح صادق کے بعد صرف ہلکی سی دو رکعتیں ادا فرمایا کرتے تھے۔

حاصل کلام: اس حدیث سے ظہر کی صرف دو رکعتیں فرض نماز سے پہلے اور دو رکعتیں بعد کی ثابت ہوتی ہیں اور دوسری حدیث سے چار پہلے اور دو بعد میں کا ثبوت بھی موجود ہے۔

(۲۸۲) وَعَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللّٰهُ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ

تَعَالَى عَنْهَا أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ كَانَ لاَ يَدَعُ أَرْبَعاً قَبْلَ الظُّهْرِ، وَرَكْعَتَيْنِ قَبْلَ الغَدَاةِ. رَوَاهُ البُخَارِيُّ.

نے ظہر کی نماز سے پہلے چار رکعتیں کبھی نہیں چھوڑیں اور دو رکعتیں نماز فجر کی بھی نہیں چھوڑیں۔ (بخاری)

لغوی تشریح: ﴿ لا یدع ﴾ نہیں چھوڑتے تھے۔ یہ جملہ ہمیشگی اور دوام پر دلالت کرتا ہے۔ بہرحال اس سے مراد یہ ہے کہ ان رکعات کو بکثرت ادا فرمایا کرتے تھے۔ ﴿ اربعا قبل الظہر ﴾ ظہر سے قبل چار رکعتیں۔ یہ اس سے پہلے ابن عمر رضی اللہ عنہما روایت کے خلاف ہے (اس میں دو رکعتوں کا ذکر ہے اور اس میں چار کا) دونوں میں تطبیق اس طرح ہے کہ آپؐ نے کبھی ظہر کے فرضوں سے پہلے چار رکعتیں پڑھی ہیں اور کبھی دو ادا فرمائی ہیں۔ اس جگہ صرف دونوں صورتوں کے متعلق ارشاد نبوی ﷺ کی خبر دی گئی ہے کہ آپؐ کا طرز عمل دونوں طرح تھا اور ایک قول یہ بھی ہے کہ ظہر سے پہلے چار رکعتیں سنن رواتب میں سے نہیں بلکہ یہ تو زوال کا سایہ ڈھلنے کے وقت کی نماز تھی اور یہ ایسی گھڑی تھی جس میں آسمانوں کے دروازے کھولے جاتے تھے اور اللہ تعالیٰ اپنی مخلوق کی طرف نظر رحمت سے دیکھتا ہے جیسا کہ بزار نے حضرت ثوبان سے روایت کیا ہے اور ایک قول یہ بھی ہے کہ آپؐ جب یہ نماز گھر پر ادا فرماتے تو چار رکعت ادا فرماتے اور جب ان کو مسجد میں پڑھتے تو دو رکعتیں پڑھتے۔ راوی نے جو کچھ جس شکل میں ملاحظہ کیا ہے اسے بیان کر دیا ہے۔ پہلی صورت بہتر اور عمدہ ہے۔ ﴿ قبل الغداة ﴾ نماز فجر سے پہلے۔

حاصل کلام: روز و شب میں نبی کریم ﷺ فرائض کے علاوہ کچھ نوافل بھی ادا فرمایا کرتے تھے جن کا زیادہ اہتمام فرمایا اور اس کی ترغیب دی۔ ان کو سنت مؤکدہ اور جن پر دوام اور ہمیشگی نہیں فرمائی ان کو سنت غیر مؤکدہ اور نوافل کا نام دے دیا گیا۔ ہیں یہ سب نوافل ہی۔ اس حدیث میں ظہر کے فرائض سے پہلے چار رکعت کا ذکر ہے اور عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کی روایت سے جو پہلے گزری ہے دو رکعتیں پہلے اور دو بعد میں ثابت ہوتی ہیں۔ دونوں میں تطبیق کی صورت ہم پہلے بیان کر آئے ہیں۔ امام شافعی رحمہ اللہ کے نزدیک ظہر سے قبل دو رکعتیں قابل ترجیح ہیں اور امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے نزدیک چار رکعات قابل ترجیح ہے۔ اس سلسلہ کی ساری روایات سامنے رکھتے ہوئے یہ کہنا مناسب اور موزوں معلوم ہوتا ہے کہ آپؐ کا عمل دونوں طرح تھا۔ اس کے باوجود چار پڑھنا دو کے مقابلہ میں زیادہ ثواب کا باعث ہے۔

(٢٨٣) وَعَنْهَا رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهَا قَالَتْ: لَمْ يَكُنِ النَّبِيُّ ﷺ عَلَى شَيْءٍ مِّنَ النَّوَافِلِ أَشَدَّ تَعَاهُداً مِّنْهُ عَلَى رَكْعَتَيِ الفَجْرِ. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.
وَلِمُسْلِمٍ: «رَكْعَتَا الفَجْرِ خَيْرٌ مِّنَ الدُّنْيَا وَمَا فِيهَا».

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا ہی سے یہ روایت بھی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نوافل میں سے سب سے زیادہ اہتمام فجر کی دو سنتوں کا رکھتے تھے۔ (بخاری و مسلم) اور مسلم میں ہے کہ نماز فجر کی دو (رکعتیں) (سنتیں) دنیا و مافیہا سے بہتر ہیں۔

لغوی تشریح: ﴿ علی شئی ﴾ کسی چیز کی اتنی حفاظت نہیں کرتے۔ ﴿ اشد ﴾ اکثر کے معنی میں یعنی بہت زیادہ۔ کثرت کے ساتھ۔ گرائمر میں یہ یا تو لم یکن کی خبر واقع ہو رہا ہے یا حال یا پھر مصدر اور اس صورت میں علی شئی کی خبر ہوگی۔ ﴿ تعاھدا ﴾ تحفظ کرنے اور اہتمام کرنے کے معنی میں۔ ﴿ منہ ﴾ اس سے (معنی یہ ہے کہ آپؐ کے کسی چیز کا اہتمام و تحفظ کرنے کی بہ نسبت) یعنی نبی ﷺ کا فجر کی دو سنتوں پر التزام و دھیان دوسری سنتوں کے مقابلہ میں بہت زیادہ ہوتا تھا۔

حاصل کلام: اس میں شک کی ذرا برابر گنجائش نہیں کہ حضور ﷺ نے سنن رواتب میں سے فجر کی دو سنتوں کا جتنا التزام فرمایا اتنا دوسری سنتوں کا اہتمام نہیں کیا۔ حتیٰ کہ حضر و سفر میں بھی انہیں کبھی نہیں چھوڑا۔ ان دو سنتوں کی اتنی تاکید کے پیش نظر احناف نے تو جماعت کھڑی ہو جانے کے باوجود ان کو پہلے پڑھنا لازمی قرار دے رکھا ہے۔ حالانکہ یہ صراحتاً حدیث کے مخالف ہے کیونکہ فرض جماعت کے ہوتے ہوئے دوسری کوئی نماز پڑھنا درست نہیں۔ چنانچہ آپؐ کا فرمان ہے کہ اذا اقیمت الصلوۃ فلا صلاۃ الا المکتوبۃ "کہ جب اقامت ہو جائے تو فرض نماز کے علاوہ اور کوئی نماز نہیں"۔

(۲۸٤) وَعَنْ أُمِّ حَبِيْبَةَ أُمِّ الْمُؤْمِنِينَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهَا قَالَتْ: سَمِعْتُ رَسُولَ اللهِ ﷺ يَقُولُ: «مَنْ صَلَّى اثْنَتَيْ عَشْرَةَ رَكْعَةً فِي يَوْمٍ وَلَيْلَةٍ بُنِيَ لَهُ بِهِنَّ بَيْتٌ فِي الْجَنَّةِ». رَوَاهُ مُسْلِمٌ، وَفِي رِوَايَةٍ: «تَطَوُّعاً».

ام المومنین حضرت ام حبیبہ رضی اللہ عنہا نے بیان کیا کہ میں نے خود رسول اللہ ﷺ کو یہ ارشاد فرماتے سنا ہے کہ "جو شخص شب و روز میں بارہ رکعت نوافل پڑھے اس کیلئے ان کے بدلہ میں جنت میں گھر تعمیر کر دیا گیا۔" (مسلم) اور ایک روایت میں تطوعا بھی ہے (نفل کے طور پر پڑھے)

وَلِلتِّرْمِذِيِّ نَحْوُهُ وَزَادَ: أَرْبَعاً قَبْلَ الظُّهْرِ، وَرَكْعَتَيْنِ بَعْدَهَا، وَرَكْعَتَيْنِ بَعْدَ الْمَغْرِبِ، وَرَكْعَتَيْنِ بَعْدَ الْعِشَاءِ وَرَكْعَتَيْنِ قَبْلَ صَلاَةِ الْفَجْرِ.

اور ترمذی کی روایت میں بھی اسی طرح ہے اور اتنا اضافہ بھی ہے کہ "چار رکعت ظہر سے پہلے اور دو رکعت بعد میں اور دو رکعت نماز مغرب کے بعد اور دو رکعت عشاء کے بعد اور دو رکعت صبح کی نماز سے پہلے۔

وَلِلْخَمْسَةِ عَنْهَا: «مَنْ حَافَظَ عَلَى أَرْبَعٍ قَبْلَ الظُّهْرِ، وَأَرْبَعٍ بَعْدَهَا، حَرَّمَهُ اللّٰهُ تَعَالَى عَلَى النَّارِ».

اور پانچوں (احمد' ابوداؤد' ترمذی' نسائی اور ابن ماجہ) نے حضرت ام حبیبہ رضی اللہ عنہا سے ہی روایت کیا ہے کہ "جس شخص نے ظہر کی پہلی چار رکعتوں کی حفاظت کی اور چار رکعت بعد میں باقاعدگی سے پڑھتا رہا تو اللہ تعالیٰ نے اس کو آتش جہنم پر حرام کر دیا۔"

لغوی تشریح: ﴿ وللخمسۃ عنھا ﴾ عنھا کی ضمیر راجع ہے حضرت ام حبیبہؓ کی طرف یعنی پانچوں نے ان کے حوالہ سے روایت نقل کی ہے ﴿ واربع بعدھا ﴾ اس میں یہ احتمال ہے کہ یہ دو سنتیں پڑھنے کے بعد چار مزید مراد ہوں یعنی ظہر کے بعد چار رکعات اور یہ بھی احتمال ہے کہ دو پہلے جو عام طور پر پڑھی جاتی ہیں اور دو مزید ان میں شامل کر لی جائیں تو یہ چار بن جائیں گی ﴿ حرمہ اللہ ﴾ تحریم سے ماخوذ ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو جہنم کی آگ میں داخل ہونے سے محفوظ کر دیا۔

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ شب و روز میں بارہ رکعتیں سنت مؤکدہ ہیں۔ ان پر التزام کرنا چاہئے کیونکہ نبی ﷺ نے ان پر اہتمام فرمایا ہے۔ ظہر کی فرض نماز کے بعد دو کی بھی گنجائش اور چار کی بھی۔ چار کی فضیلت بڑی بیان ہوئی ہے اور اگر کوئی چھ پڑھ لیتا ہے تو یہ جائز ہے۔

راوی حدیث: ﴿ ام حبیبہ رضی اللہ عنہا ﴾ ان کا نام رملہ تھا۔ ابوسفیان کی بیٹی امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کی بہن تھیں۔ قدیم الاسلام تھیں اور ہجرت حبشہ کرنے والوں میں شامل تھیں۔ ان کا شوہر عبیداللہ بن جحش بھی ان کے ساتھ تھا مگر وہ وہاں جا کر نصرانی بن گیا اور وہ وہیں فوت ہو گیا۔ اس کے بعد ۷ھ میں رسول اللہ ﷺ نے ام حبیبہ رضی اللہ عنہا سے نکاح کر کے اپنے حرم میں داخل فرمالیا۔ یہ نکاح کے وقت وہیں حبشہ ہی میں تھیں۔ پھر مہاجرین حبشہ کے ساتھ مدینہ تشریف لائیں۔ ۴۲ھ یا ۴۴ھ یا ۵۰ھ میں فوت ہوئیں۔

(۲۸۵) وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «رَحِمَ اللَّهُ ٱمْرَأً صَلَّى أَرْبَعاً قَبْلَ الْعَصْرِ». رَوَاهُ أَحْمَدُ وَأَبُو دَاوُدَ وَالتِّرمِذِيُّ، وَحَسَّنَهُ، وَابْنُ خُزَيْمَةَ، وَصَحَّحَهُ.

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ”اللہ تعالیٰ اس شخص پر رحم فرمائے جس نے نماز عصر سے پہلے چار رکعت پڑھیں۔“ (اسے احمد، ابوداؤد اور ترمذی نے روایت کیا ہے اور ترمذی نے اسے حسن قرار دیا ہے اور ابن خزیمہ نے اس کو صحیح کہا ہے)

حاصل کلام: نماز عصر سے پہلے یہ چار رکعتیں سنن رواتب (موکدہ سنتیں) نہیں ہیں بلکہ نفل ہیں۔ اس کی فضیلت پر رحم اللہ امرا کے دعائیہ کلمات دلالت کرتے ہیں کہ جو یہ چار رکعتیں پڑھے اس پر اللہ تعالیٰ کی رحمت ہو۔

(۲۸۶) وَعَنْ عَبْدِ اللهِ بْنِ مُغَفَّلٍ الْمُزَنِيِّ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ: «صَلُّوا قَبْلَ الْمَغْرِبِ، صَلُّوْا قَبْلَ ٱلْمَغْرَبَ»، ثُمَّ قَالَ فِي الثَّالِثَةِ: لِمَنْ شَاءَ، كَرَاهِيَةَ أَنْ يَتَّخِذَهَا النَّاسُ سُنَّةً. رَوَاهُ الْبُخَارِيُّ.

حضرت عبداللہ بن مغفل مزنی رضی اللہ عنہ نبی ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ آپؐ نے فرمایا ”مغرب سے پہلے نماز پڑھو۔ مغرب سے پہلے نماز پڑھو پھر تیسری مرتبہ فرمایا یہ حکم اس شخص کیلئے ہے جو پڑھنا چاہے“ آپؐ نے یہ اس اندیشہ کے پیش نظر فرمایا کہ لوگ اسے سنت نہ بنا لیں۔“ (بخاری)

وَفِيْ رِوَايَةٍ لابْنِ حِبَّانَ: أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ صَلَّى قَبْلَ المَغْرِبِ رَكْعَتَيْنِ.

ابن حبان کی ایک روایت میں ہے کہ نبی ﷺ نے مغرب سے پہلے دو رکعت ادا فرمائیں

وَلِمُسْلِمٍ عَنْ أَنَسٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: كُنَّا نُصَلِّي رَكْعَتَيْنِ بَعْدَ غُرُوبِ الشَّمْسِ، وَكَانَ النَّبِيُّ ﷺ يَرَانَا، فَلَمْ يَأْمُرْنَا، وَلَمْ يَنْهَنَا.

اور مسلم میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ہم لوگ غروب شمس کے بعد (فرض نماز سے پہلے) دو رکعت پڑھتے تھے اور نبی ﷺ ہمیں ملاحظہ فرما رہے ہوتے تھے' نہ تو آپ ہمیں اس کا حکم دیتے اور نہ منع فرماتے۔

لغوی تشریح: ﴿لمن شاء﴾ یعنی یہ حکم اس شخص کیلئے جو پڑھنا چاہے ﴿كراهية﴾ تعلیل کی وجہ سے منسوب ہے۔ مطلب یہ ہوا کہ آپؐ نے لمن شاء اس لئے فرمایا کہ آپؐ کو یہ اندیشہ تھا ﴿ان يتخذها الناس﴾ کہ لوگ اسے چھ بنا لیں۔ ﴿سنة﴾ ہمیشہ کیلئے مسنون طریقہ اور اسے چھوڑنا ناپسند کریں۔ اس سے یہ معنی نہیں کہ آپؐ نے اس کے استحباب کو ناپسند کیا ہے۔ کیونکہ یہ ممکن نہیں ہے کہ جو کام مستحب بھی نہ ہو اس کے لئے برانگیختہ کیا جائے اور اس میں ترغیب دی جائے۔ اس حدیث سے یہ معلوم ہوا کہ نماز مغرب کے فرائض سے پہلے دو رکعت پڑھنا مستحب ہے اور یہ حدیث قولی ہے اور جس روایت کو ابن حبان نے روایت کیا ہے وہ فعلی حدیث ہے اور جو روایت مسلم نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے نقل کی ہے وہ تقریری ہے۔ پس مغرب سے پہلے نفل پڑھنا سنت کی تینوں قسموں (قولی' فعلی' تقریری) سے ثابت ہے اور صحیح مسلم کے حوالہ سے جو حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ﴿فلم يامرنا﴾ آپؐ نے ہم کو اس کا حکم نہیں دیا تو یہ حضرت عبداللہ بن مغفل رضی اللہ عنہ کی روایات کے منافی ہے۔ جنہیں ان کے پڑھنے کا حکم ہے۔ ممکن ہے کہ حضرت انس رضی اللہ عنہ کو یہ حکم کی روایت نہ ملی ہو یا ان کا اس سے مراد تاکیدی حکم ہو۔

حاصل کلام: مغرب کے فرضوں سے پہلے دوگانہ پڑھنا سنن زائدہ میں شمار ہوتا ہے۔ سنن موکدہ میں نہیں۔ ان کا پڑھنا مستحب ہے۔

راوی حدیث: ﴿عبدالله بن مغفل مزنی رضی اللہ عنہ﴾ مزنیہ قبیلہ سے تعلق رکھنے کی بنا پر مزنی کہلائے۔ مغفل میں میم پر ضمہ' غین پر فتحہ اور "فاء" پر فتحہ اور تشدید۔ یہ اصحاب شجر میں شمار کئے گئے ہیں۔ پہلے مدینہ میں رہائش رکھی۔ بعد ازاں مصر میں سکونت اختیار کر لی۔ یہ ان دس اصحابؓ میں شامل تھے جن کو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اہل بصرہ کو تعلیم دینے کیلئے بھیجا۔ ۶۰ھ میں وفات پائی۔

(۲۸۷) وَعَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْها قَالَتْ: كَانَ النَّبِيُّ ﷺ يُخَفِّفُ الرَّكْعَتَيْنِ اللَّتَيْنِ قَبْلَ صَلاَةِ

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ نبی ﷺ نماز فجر سے پہلے دو رکعت ہلکی پڑھتے تھے۔ میں خیال کرتی کہ کیا آپؐ نے صرف ام الکتاب (فاتحہ) ہی پڑھی

الصُّبحِ، حَتَّى إِنِّي أَقُولُ: أَقَرَأَ بِأُمِّ الكِتَابِ؟ مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

ہے؟ (بخاری و مسلم)

لغوی تشریح: ﴿ اقرا ﴾ اس میں همزه استفهام کیلئے اور یہاں شک و تردد کیلئے استعمال ہوا ہے۔ یعنی کیا آپؐ نے ام القرآن کو پڑھا یا نہیں؟ اور یہ شک اس لئے واقع ہوا کہ اس میں آپؐ کا قیام مختصر ہوتا تھا۔

حاصل کلام: اس حدیث سے ثابت ہوتا ہے کہ آپؐ صبح کی دو سنتیں مختصر ہلکی پڑھتے تھے۔ امام شافعی رحمہ اللہ اور جمہور علماءؒ نے اسی بنا پر کہا ہے کہ ان دو رکعتوں میں مختصر قیام افضل ہے۔ مگر امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ ان میں بھی لمبا قیام افضل قرار دیتے ہیں۔ لیکن یہ صحیح نہیں۔ ان کے دو تلامذہ امام ابو یوسف رحمہ اللہ اور امام محمد رحمہ اللہ نے بھی ان کی مخالفت کی۔ سورۂ فاتحہ کے علاوہ آپؐ چھوٹی سورتیں پڑھتے تھے جیسا کہ آئندہ حدیث میں ہے۔

(۲۸۸) وَعَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ قَرَأَ فِيْ رَكْعَتَيِ الفَجْرِ «قُلْ يَا أَيُّهَا الكَافِرُونَ» وَ «قُلْ هُوَ اللَّهُ أَحَدٌ». رَوَاهُ مُسْلِمٌ.

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی ﷺ نے فجر کی دو رکعتوں میں سے پہلی میں قل یا ایہا الکفرون اور دوسری میں قل ھو اللہ احد پڑھی۔ (مسلم)

حاصل کلام: ان دو رکعتوں میں ان دونوں سورتوں کا پڑھنا مسنون ہے۔ اتباع سنت کے جذبہ کے تحت ان کو پڑھنا چاہئے۔ اس کا یہ مطلب معلوم نہیں ہوتا کہ دوسری کوئی سورۃ پڑھنا ممنوع ہے۔

(۲۸۹) وَعَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهَا قَالَتْ: كَانَ النَّبِيُّ ﷺ إِذَا صَلَّى رَكْعَتَيِ الفَجْرِ اَضْطَجَعَ عَلَى شِقِّهِ الأَيْمَنِ. رَوَاهُ البُخَارِيُّ.

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ نبی ﷺ جب نماز فجر کی دو رکعت سنت پڑھ کر فارغ ہوتے تو اپنے دائیں پہلو کے بل لیٹ جاتے۔ (بخاری)

لغوی تشریح: ﴿ علی شقه ﴾ پہلو کے بل۔

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ نماز فجر سے پہلے دو سنتوں کو ادا کر کے آپؐ اپنے دائیں پہلو پر تھوڑا سا لیٹ کر استراحت فرمایا کرتے تھے بلکہ ایک روایت میں آپؐ نے اس کا حکم بھی فرمایا ہے جیسا کہ آئندہ حدیث میں آ رہا ہے۔

(۲۹۰) وَعَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «إِذَا صَلَّى أَحَدُكُمُ الرَّكْعَتَيْنِ

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "تم میں سے کوئی شخص جب نماز فجر سے پہلے دو رکعتیں پڑھ چکے تو اسے اپنے دائیں پہلو

قَبْلَ صَلَاةِ الصُّبْحِ فَلْيَضْطَجِعْ عَلَى جَنْبِهِ الأَيْمَنِ». رَوَاهُ أَحْمَدُ وَأَبُو دَاوُدَ وَالتِّرْمِذِيُّ، وَصَحَّحَهُ.

کے بل لیٹ جانا چاہئے۔'' (اس حدیث کو احمد' ابوداؤد اور ترمذی نے روایت کیا ہے اور ترمذی نے اسے صحیح قرار دیا ہے)

حاصل کلام: ان دو احادیث سے فجر کی سنتوں کی ادائیگی کے بعد دائیں پہلو پر تھوڑا سا لیٹ کر استراحت حاصل کرنا مسنون ثابت ہوتا ہے۔ ایک حدیث سے حضور ﷺ کا عمل اور دوسری سے آپؐ کا حکم ثابت ہے۔ اس بنا پر اہل الظواہر کے نزدیک یہ لیٹنا واجب ہے جو نمازی اس پر دیدہ دانستہ عمل نہیں کرتا اس کی نماز فجر نہیں ہوتی۔ لیکن امام نووی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ صحیح قول یہ ہے کہ یہ سنت ہے۔ بعض نے اسے مکروہ سمجھا ہے مگر صحیح حدیث کے مقابلے میں یہ رائے قطعاً درست نہیں۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مصنف عبدالرزاق میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ کا صبح کی سنتوں کے بعد لیٹنا سنت کی بنا پر نہ تھا۔ آپؐ چونکہ رات کو طویل قیام کرتے اس لئے سنتوں کے بعد استراحت کے لئے تھوڑا سا لیٹ جاتے۔ لیکن یہ ان کا قول سنداً صحیح نہیں ہے۔ اس مسئلے پر شارح ابوداؤد مولانا شمس الحق ڈیالوی رحمہ اللہ نے "اعلان اهل العصر باحکام رکعتی الفجر" میں بڑی تفصیل سے قابل دید بحث کی ہے بلکہ صبح کی سنتوں کے متعلقہ سب مسائل کے حل کیلئے اس رسالہ سے کوئی صاحب علم بے نیاز نہیں ہو سکتا۔

(۲۹۱) وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «صَلَاةُ اللَّيْلِ مَثْنَى مَثْنَى، فَإِذَا خَشِيَ أَحَدُكُمُ الصُّبْحَ صَلَّى رَكْعَةً وَاحِدَةً، تُوتِرُ لَهُ مَا قَدْ صَلَّى». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ، وَلِلْخَمْسَةِ - وَصَحَّحَهُ ابْنُ حِبَّانَ - بِلَفْظِ «صَلَاةُ اللَّيْلِ وَالنَّهَارِ مَثْنَى مَثْنَى». وَقَالَ النَّسَائِيُّ: هَذَا خَطَأٌ.

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "رات کی نماز دو' دو رکعت کی صورت میں (پڑھی جائے) اور جب تم میں سے کسی کو صبح کے طلوع ہونے کا خدشہ و اندیشہ لاحق ہونے لگے تو (آخر میں) ایک رکعت پڑھ لے۔ پہلے پڑھی ہوئی اس کی ساری نماز وتر (طاق) بنا دی جائے گی۔'' (بخاری و مسلم۔ اور پانچوں (احمد' ابوداؤد' ترمذی' نسائی اور ابن ماجہ) میں بھی یہ روایت اسی طرح ہے)

اور ابن حبان نے صلاۃ الیل والنھار مثنی' مثنی "دن رات کی نماز دو دو رکعت ہے۔" کو صحیح قرار دیا ہے۔ البتہ نسائی نے کہا ہے کہ یہ خطا ہے۔

لغوی تشریح: ﴿ مثنی مثنی ﴾ دو دو رکعتیں۔ یعنی ہر دو رکعت کی ادائیگی کے بعد سلام پھیرا جائے۔ ﴿ توترله ما قد صلی ﴾ اس کی ادا شدہ نماز وتر (طاق) بنا دی جائے گی۔ ﴿ هذا خطا ﴾ یعنی روایت میں

دن کا ذکر خطا ہے۔ کسی ایک راوی کا وہم ہے۔

حاصل کلام: اس حدیث سے ایک تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ رات کے اوقات میں پڑھی جانے والی نماز کو دو' دو رکعتوں کی صورت میں پڑھنا چاہئے اور دو کے بعد سلام پھیرنا چاہئے۔ امت کی غالب اکثریت نے اسی کو تسلیم کیا ہے۔ دوسری بات یہ معلوم ہوتی ہے کہ وتر کی نماز کی تعداد ایک بھی ثابت ہے بلکہ بعض نے تو یہ کہا ہے کہ وتر کی نماز کی تعداد ایک ہی ہے۔ لیکن احادیث سے تین' پانچ' سات' نو اور گیارہ تک کا ثبوت بھی ملتا ہے۔

جہاں تک امام نسائی رحمۃ اللہ علیہ کے لفظ النھار (یعنی دن) کو خطا کہنے کا تعلق ہے۔ ان کی یہ رائے محل نظر ہے۔ اس لئے کہ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ' امام ابن حبان رحمۃ اللہ علیہ اور بیہقی رحمۃ اللہ علیہ وغیرہ نے اسے صحیح قرار دیا ہے اور علامہ البانی نے بھی سلسلہ الصحیحین میں اسے ذکر کیا ہے۔ اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ دن ہو یا رات نوافل دو' دو کی تعداد میں پڑھنا زیادہ ثواب کا موجب ہے کیونکہ دو دو رکعتوں کے پڑھنے کی صورت میں درود اور بعد از درود دعائیں زیادہ مرتبہ پڑھی جائیں گی۔ اس لئے ثواب بھی زیادہ ہوگا۔ ویسے دن کو دو' دو کر کے پڑھے یا چار' چار دونوں طرح جائز ہے کیونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے دن کو چار رکعتیں ایک سلام سے پڑھنا بھی ثابت ہے۔

ایک رکعت وتر پڑھنے کی صورت میں تو تشہد ایک ہی مرتبہ پڑھا جائے گا۔ اگر تین بار زائد پڑھے تو کیا صورت ہوگی؟ احمد' نسائی' بیہقی اور حاکم وغیرہ نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے جو روایت نقل کی ہے اس میں تو صاف طور پر بیان ہوا ہے کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم جب تین وتر پڑھتے تھے تو صرف آخری رکعت میں ہی تشہد پڑھا کرتے تھے۔ اس لئے صحیح یہ ہے کہ تین رکعت وتر پڑھے جائیں تو درمیان میں تشہد نہ پڑھا جائے مگر احناف رات کے وتروں کو مغرب کی تین رکعات پر قیاس کر کے دو مرتبہ تشہد پڑھنے کے قائل ہیں۔ حالانکہ وتروں کو مغرب کی نماز کی طرح پڑھنے کی ممانعت حدیث سے صراحتاً وارد ہے۔

(۲۹۲) وَعَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «أَفْضَلُ الصَّلَاةِ بَعْدَ الفَرِيضَةِ، صَلَاةُ اللَّيْلِ». أَخرَجَهُ مُسْلِمٌ.

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "فرض نماز کے بعد افضل نماز رات کی نماز ہے۔" (مسلم)

حاصل کلام: اس حدیث سے تہجد کی نماز کی فضیلت معلوم ہوتی ہے۔ اس کی فضیلت پر خود قرآن مجید کی شہادت کا واضح ثبوت ہے۔ کتب احادیث میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا گیا کہ فرض نماز کے بعد کونسی نماز افضل ہے؟ فرمایا رات کے آخری حصہ کی نماز۔ ترمذی میں عمرو بن عبسہ کی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ بندہ کو اپنے پروردگار سے تمام اوقات سے زیادہ تقرب رات کے آخری حصہ میں حاصل ہوتا ہے۔ اس لئے بندگان خدا کو چاہئے کہ خواصان خاص کے زمرہ میں شامل

ہونے کیلئے شب بیداری کو اپنا معمول بنانے کی کوشش کریں۔ یہ بارگاہ رب العزت میں حاضری اور سرگوشی و مناجات کا سب سے اچھا موقع ہوتا ہے۔

(٢٩٣) وَعَنْ أَبِيْ أَيُّوبَ الأَنْصَارِيِّ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُ، أَنَّ رَسُولَ اللهِ ﷺ قَالَ: «الوِتْرُ حَقٌّ عَلَى كُلِّ مُسْلِمٍ، مَنْ أَحَبَّ أَنْ يُوتِرَ بِخَمْسٍ فَلْيَفْعَلْ، وَمَنْ أَحَبَّ أَنْ يُوتِرَ بِثَلاَثٍ فَلْيَفْعَلْ، وَمَنْ أَحَبَّ أَنْ يُوتِرَ بِوَاحِدَةٍ فَلْيَفْعَلْ». رَوَاهُ الأَرْبَعَة إِلاَّ التِّرْمِذِيَّ، وَصَحَّحَهُ ابْنُ حِبَّانَ، وَرَجَّحَ النَّسَائِيُّ وَقْفَهُ.

حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے کہ "وتر ہر مسلمان پر حق ہے (اس کا ادا کرنا ضروری ہے) جسے پانچ وتر پڑھنا پسند ہو تو ایسا کرے اور جسے تین وتر پسند ہوں تو وہ اس طرح کرے اور جسے ایک وتر پڑھنا پسند ہو تو وہ ایسا کرے۔" (ترمذی کے علاوہ اسے چاروں نے روایت کیا ہے اور ابن حبان نے اسے صحیح قرار دیا ہے البتہ نسائی نے اس کے موقوف ہونے کو ترجیح دی ہے)

لغوی تشریح: ﴿الوتر حق﴾ ثابت ہے۔ شریعت میں اس کا ثبوت ہے۔ امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ کے دادا نے المنتقی میں بیان کیا ہے کہ ابن منذر نے اس حدیث کے الفاظ یوں نقل کئے ہیں۔ الوتر حق ولیس بواجب کہ وتر برحق ہے مگر واجب نہیں اور یہ الفاظ اس بات کی واضح دلیل ہیں کہ اس حدیث میں لفظ حق وتر کی مشروعیت پر دال ہے وجوب پر نہیں۔ لہٰذا جس نے لفظ "حق" کی بنیاد پر وتر کو واجب قرار دیا ہے اس کا یہ استدلال باطل ہے۔

حاصل کلام: وتر واجب ہے یا سنت؟ اس میں ائمہ کا اختلاف ہے۔ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ اسے واجب کہتے ہیں مگر جمہور علماء اسے سنت قرار دیتے ہیں۔ "وتر کا پڑھنا حق ہے" کے الفاظ وجوب پر تو دلالت نہیں کرتے۔ البتہ اس کی اہمیت پر ضرور دال ہیں۔ ایک دوسری حدیث میں بھی ہے الوتر حق فمن لم یوتر فلیس منا "وتر برحق ہے۔ جس نے وتر نہ پڑھے وہ ہم سے نہیں"۔ اس حدیث میں بھی وتروں کو پڑھنے کی تاکید بیان کی گئی ہے مگر وجوب کا بیان نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ آپؐ نے سفر و حضر میں وتر پڑھے ہیں اور سواری پر بھی' سفر کے دوران وتر پڑھے ہیں جو اس کی دلیل ہے کہ وتر واجب نہیں۔ اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ وتر ایک' تین' پانچ سب درست ہیں۔ احناف کا صرف تین وتر پر اکتفا کرنا صحیح اور صریح روایات کی بنا پر درست نہیں۔

(٢٩٤) وَعَنْ عَلِيِّ بْنِ أَبِيْ طَالِبٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: لَيْسَ الوِتْرُ بِحَتْمٍ كَهَيْئَةِ الْمَكْتُوبَةِ، وَلَكِنْ

حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ وتر فرضوں کی طرح حتمی اور لازمی نہیں ہے بلکہ سنت ہے جسے رسول اللہ ﷺ نے مقرر فرمایا ہے۔

سُنَّةٌ سَنَّهَا رَسُولُ اللهِ ﷺ: رَوَاهُ النَّسَائِيُّ وَالتِّرمِذِيُّ وَحَسَّنَهُ، وَالحَاكِمُ وَصَحَّحَهُ. (اسے ترمذی اور نسائی نے بیان کیا ہے اور حسن قرار دیا ہے اور حاکم نے اس کو صحیح کہا ہے)

لغوی تشریح: ﴿ لیس بحتم ﴾ حتم کے معنی واجب اور ضروری کے ہیں۔ ﴿ کھیئۃ المکتوبۃ ﴾ فرض نماز کی طرح لازمی نہیں۔

حاصل کلام: یہ حدیث جمہور علماء کی دلیل ہے جو وتر کے وجوب کے قائل نہیں۔ امام ترمذی رحمہ اللہ نے اسے حسن اور امام حاکم رحمہ اللہ نے صحیح کہا ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ اس کی سند میں عاصم بن ضمرہ کوفی متکلم فیہ ہے۔ مگر حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے تقریب میں اعدل الاقوال ذکر کیا ہے کہ وہ صدوق ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہاں انہوں نے امام ترمذی رحمہ اللہ اور حاکم رحمہ اللہ کی تحسین و تصحیح نقل کر کے کوئی کلام نہیں کیا۔

(۲۹۵) وَعَنْ جَابِرٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، أَنَّ رَسُولَ اللهِ ﷺ قَامَ فِي شَهْرِ رَمَضَانَ، ثُمَّ انْتَظَرُوهُ مِنَ القَابِلَةِ فَلَمْ يَخْرُجْ، وَقَالَ: إِنِّي خَشِيْتُ أَن يُكْتَبَ عَلَيْكُمُ الوِتْرُ. رَوَاهُ ابْنُ حِبَّانَ.

حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ماہ رمضان میں قیام فرمایا پھر اگلے دن کیلئے صحابہ آپ ؐ کا انتظار کرتے رہے اور آپ ؐ حجرے سے باہر تشریف نہ لائے۔ آپ ؐ نے فرمایا کہ مجھے یہ اندیشہ ہوا کہ کہیں یہ وتر کی نماز تم پر فرض نہ کر دی جائے۔ (اس روایت کو ابن حبان نے روایت کیا ہے)

لغوی تشریح: ﴿ القابلۃ ﴾ آئندہ آنے والی رات۔ ﴿ ان یکتب ﴾ فرض قرار دے دی جائے۔ یکتب یہاں مجہول واقع ہو رہا ہے۔ یہاں ایک اشکال پیدا ہوتا ہے اور وہ یہ کہ شب معراج میں جب اللہ نے پانچ نمازیں فرض قرار دے کر ثواب پچاس کے برابر رکھا اور فرما دیا کہ میرے فرمان میں تبدیلی نہیں کی جاتی تو خوف اور اندیشہ کس بات کا لاحق ہوا؟ مصنف علامہ ابن حجر عسقلانی رحمہ اللہ نے فتح الباری شرح بخاری میں اس کے تین جواب دیئے ہیں۔ ان جوابات کا خلاصہ یہ ہے: آپ ؐ کو یہ خوف لاحق ہوا کہ نوافل جن کا رات کے اوقات میں ادا کرنا صحیح ہے کہیں ایسا نہ ہو نماز تہجد کو مسجد میں باجماعت ادا کرنا مقرر کر دیا جائے یا یہ خوف لاحق ہوا کہ قیام اللیل کو فرض عین کی طرح نہ سہی بہرحال فرض کفایہ کے طور پر لازمی قرار دے دیا جائے۔ جیسا کہ نماز عید کے سلسلہ میں لوگوں نے کہا ہے یا پھر یہ اندیشہ دامن گیر ہوا کہ قیام رمضان کو خصوصی طور پر فرض نہ کر دیا جائے اور اس صورت میں یہ پانچ نمازوں پر ایک زائد نماز نہ ہوئی کیونکہ سال بھر میں قیام رمضان ہر روز تو بار بار نہیں کیا جاتا۔ پھر مصنف نے خود یہ فیصلہ کیا ہے کہ میری دانست میں تینوں جوابات میں سے پہلا جواب ہی قوی ہے اور یہ حدیث نماز تراویح باجماعت پڑھنے کے مستحب ہونے کی دلیل ہے کیونکہ نبی ﷺ کی وفات کے بعد اندیشہ مذکور کیلئے کوئی گنجائش باقی نہیں رہی۔ مصنف نے اس حدیث کو یہاں یہ بتانے کیلئے بیان کیا ہے کہ وتر واجب نہیں۔ ضمناً یہ مسئلہ بھی مترشح ہوتا ہے کہ نبی ﷺ علم غیب نہیں رکھتے تھے۔ اگر آپ ؐ کو علم غیب ہوتا تو اندیشہ

اور خوف لاحق ہونے کی کیا وجہ ہو سکتی ہے؟ نیز اس حدیث کی رو سے آپؐ نے نماز تراویح صرف ایک ہی روز پڑھائی ہے مگر دوسری احادیث میں تین رات۔ بلکہ صحیح ابن حبان میں حضرت جابر رضی اللہ عنہ ہی سے مروی ہے کہ جن تین راتوں میں آپؐ نے نماز تراویح پڑھائی ان میں تراویح کی تعداد آٹھ رکعت تھی۔

(٢٩٦) وَعَنْ خَارِجَةَ بْنِ حُذَافَةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «إِنَّ اللّٰهَ أَمَدَّكُمْ بِصَلَاةٍ هِيَ خَيْرٌ لَّكُمْ مِنْ حُمْرِ النَّعَمِ»، قُلْنَا: وَمَا هِيَ يَا رَسُولَ اللهِ؟ قَالَ: «الوِتْرُ، مَا بَيْنَ صَلَاةِ العِشَاءِ إِلَى طُلُوعِ الفَجْرِ». رَوَاهُ الخَمْسَةُ إِلاَّ النَّسَائِيَّ، وَصَحَّحَهُ الحَاكِمُ.

وَرَوَى أَحْمَدُ عَنْ عَمْرِو بْنِ شُعَيْبٍ عَنْ أَبِيهِ عَنْ جَدِّهِ نَحْوَهُ.

حضرت خارجہ بن حذافہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ”اللہ تعالیٰ نے ایک ایسی نماز کے ساتھ تمہاری مدد فرمائی جو تمہارے لئے سرخ اونٹوں سے بہت بہتر ہے۔“ ہم نے عرض کیا اے اللہ کے رسول (ﷺ)! وہ کونسی نماز ہے؟ فرمایا ”وتر نماز جو نماز عشاء اور طلوع فجر کے درمیان ہے۔“ (اسے نسائی کے سوا پانچوں نے روایت کیا ہے اور حاکم نے اسے صحیح قرار دیا ہے۔ احمد نے عمرو بن شعیب سے انہوں نے اپنے باپ کے واسطہ سے اپنے دادا سے اس کی مانند روایت نقل کی ہے)

لغوی تشریح: ﴿ امدکم ﴾ امداد سے ماضی کا صیغہ ہے۔ تمہاری مدد فرمائی ﴿ بصلاۃ ﴾ ایک نماز سے۔ یعنی تمہارے لئے ایک اور نماز کا اضافہ کر دیا ہے۔ یہی اس کی دلیل ہے کہ وہ نماز لازم نہیں۔ اگر یہ واجب ہوتی تو عبارت بھی وجوب و التزام والی ہوتی۔ ﴿ حمر النعم ﴾ ”حا“ پر ضمہ اور میم ساکن۔ احمر کی جمع ہے اور نعم نون اور عین دونوں پر فتحہ۔ چوپایہ جانور کے معنی میں اور یہاں اس سے مراد اونٹ ہے اور اہل عرب کے نزدیک اونٹ ان کے اموال میں عزیز ترین اور معزز مال شمار ہوتا تھا۔

حاصل کلام: امداد کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ پہلے سے چیز تو موجود ہے اسے تقویت دینے کیلئے مدد دی ہے۔ اصل اور امدادی چیز کی شان یکساں تو نہ ہوگی اور نماز کو سرخ اونٹوں سے تشبیہہ دی گئی ہے۔

راوی حدیث: ﴿ خارجہ بن حذافہ رضی اللہ عنہ ﴾ خارجہ بن حذافہ قرشی عدوی۔ (حذافہ کے حاء پر ضمہ اور ذال پر تخفیف)۔ یہ اتنے شجاع تھے کہ ایک ہزار سوار کے برابر تھے۔ عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے تین ہزار شہ سواروں کی مدد طلب کی تو انہوں نے اس کے جواب میں تین بہادر و شجاع آدمی بھیج دیے جن میں ایک زبیر بن عوامؓ دوسرے مقداد بن اسودؓ اور تیسرے خارجہ بن حذافہؓ تھے۔ عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ کے کہنے پر مصر کے قاضی بنے۔ ۴۰ھ میں رمضان المبارک میں قتل ہوئے۔ انہیں ایک خارجی نے عمرو بن عاصؓ سمجھ کر قتل کیا تھا کیونکہ خوارج نے حضرت علیؓ حضرت امیر معاویہؓ اور حضرت عمرو بن عاصؓ کو بیک وقت قتل کرنے کی سازش کی تھی۔

﴿ عمرو بن شعیب ﴾ ابو ابراہیم ان کی کنیت تھی۔ عمرو بن شعیب بن عبداللہ بن عمرو بن عاص سہمی

قرشی مدنی۔ طائف میں رہائش پذیر ہو گئے تھے۔ نسائی نے انہیں ثقہ قرار دیا ہے۔ ۱۱۸ھ میں وفات پائی۔
﴿ شعیب ﴾ ثقہ تابعین میں سے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ ان کے والد جن کا نام محمد تھا ان کے زمانہ صغر سنی میں وفات پا گئے تھے تو ان کی کفالت ان کے دادا عبداللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ مشہور صحابی نے کی۔ اس سے ان کا سماع صحیح ہے۔ یہ اسناد نہ تو مرسل ہے اور نہ منقطع بلکہ متصل ہے اور حسن کے درجہ سے کم نہیں ہے۔ ان کے دادا کا تعارف پہلے گزر چکا ہے۔

(۲۹۷) وَعَنْ عَبْدِ اللهِ بْنَ بُرَيْدَةَ، عَنْ أَبِيهِ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا، قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «الوِتْرُ حَقٌّ، فَمَنْ لَمْ يُوتِرْ فَلَيْسَ مِنَّا». أَخْرَجَهُ أَبُو دَاوُدَ بِسَنَدٍ لَيِّنٍ، وَصَحَّحَهُ الحَاكِمُ، وَلَهُ شَاهِدٌ ضَعِيفٌ عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ عِنْدَ أَحْمَدَ.

حضرت عبداللہ بن بریدہ اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "وتر برحق ہے جس نے وتر نہ پڑھے اس کا ہم سے کوئی تعلق نہیں۔" (ابوداؤد نے اسے کمزور سند کے ساتھ نقل کیا ہے اور حاکم نے اسے صحیح کہا ہے احمد کے نزدیک اس کا شاہد بھی ہے جو حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے مگر وہ ضعیف ہے)

لغوی تشریح: ﴿ الوتر حق ﴾ حق کے معنی پہلے بیان ہو چکے ہیں کہ یہ لفظ وجوب پر دلالت نہیں کرتا ﴿ فمن لم یوتر فلیس منا ﴾ جس نے وتر نہ پڑھے اس کا ہم سے کوئی تعلق نہیں۔ بعض نے اس سے وتر کے واجب ہونے پر استدلال کیا ہے مگر یہ حدیث ضعیف ہے۔ اس لئے کہ اس کی سند میں ابوالمنیب عبیداللہ بن عبداللہ عتکی متکلم فیہ ہے۔ امام بخاری رحمہ اللہ اور نسائی نے اسے ضعیف قرار دیا ہے بلکہ امام ابن معین رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ روایت موقوف ہے یعنی یہ حضرت بریدہ رضی اللہ عنہ کا قول ہے مرفوع حدیث نہیں۔ جیسا کہ مصنف رحمہ اللہ نے کہا ہے کیونکہ خلیل بن مرة عن معاویہ بن قرة عن ابی ہریرۃ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے اور معاویہ بن قرہ کا حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے سماع ثابت نہیں۔ اس نے تو ان سے کچھ بھی نہیں سنا۔ اس لئے یہ منقطع روایت ہے اور خلیل بن مرة بذات خود منکر حدیث ہے۔ لہٰذا یہ حدیث اور اس کی شاہد حدیث' دونوں ہی احتجاج کے لائق نہیں اور ان احادیث صحیحہ کا مقابلہ نہیں کر سکتیں جو وتر کے سنت ہونے پر دلالت کرتی ہیں۔ ابھی ایک حدیث کے تحت "الوتر حق" کے مفہوم کی وضاحت ہو چکی ہے کہ اس سے مراد وتر کی اہمیت ہے اس سے وجوب ثابت نہیں ہوتا۔

راوی حدیث: ﴿ عبداللہ بن بریدہ رحمہ اللہ ﴾ ان کی کنیت ابوسہل ہے۔ مرو میں منصب قضاء پر فائز رہے۔ مشاہیر اور ثقہ تابعین میں شمار کئے گئے۔ تیسرے طبقہ کے مشاہیر میں سے تھے۔ ۱۱۵ھ میں مرو ہی میں فوت ہوئے۔

(۲۹۸) وَعَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهَا قَالَتْ: مَا كَانَ رَسُولُ ﷺ

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ رمضان اور غیر رمضان میں گیارہ رکعات سے

اللهِ ﷺ يَزِيْدُ فِيْ رَمَضَانَ وَلاَ فِيْ غَيْرِهِ عَلَى إِحْدَى عَشْرَةَ رَكْعَةً، يُصَلِّيْ أَرْبَعاً، فَلاَ تَسْأَلْ عَنْ حُسْنِهِنَّ وَطُولِهِنَّ، ثُمَّ يُصَلِّي أَرْبَعاً، فَلاَ تَسْأَلْ عَنْ حُسْنِهِنَّ وَطُولِهِنَّ، ثُمَّ يُصَلِّيْ ثَلاَثاً، قَالَتْ عَائِشَةُ فَقُلْتُ: يَا رَسُولَ اللهِ أَتَنَامُ قَبْلَ أَنْ تُوْتِرُ؟ قَالَ: **يَا عَائِشَةُ إِنَّ عَيْنَيَّ تَنَامَانِ، وَلاَ يَنَامُ قَلْبِي**. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

زائد نہیں پڑھتے تھے۔ چار رکعتیں ایسی حسن خوبی سے ادا فرماتے تھے کہ ان کے حسن اور طوالت کا کیا کہنا۔ پھر چار رکعات ادا فرماتے بس ان کی خوبی اور طوالت کے بارے میں کیا پوچھتے ہو پھر تین رکعتیں پڑھتے تھے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا بیان ہے کہ میں نے عرض کیا یارسول اللہ! کیا آپؐ وتر ادا کئے بغیر سو جاتے ہیں۔ فرمایا "عائشہ (رضی اللہ عنہا) میری آنکھیں سوتی ہیں اور دل نہیں سوتا۔" (بخاری و مسلم)

وَفِيْ رِوَايَةٍ لَهُمَا عَنْهَا رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهَا كَانَ يُصَلِّي مِنَ اللَّيْلِ عَشْرَ رَكْعَاتٍ، وَيُوتِرُ بِسَجْدَةٍ، وَيَرْكَعُ رَكْعَتَيِ الفَجْرِ، فَتِلْكَ ثَلاَثَ عَشْرَةَ.

اور بخاری و مسلم دونوں کی ایک دوسری روایت میں ہے کہ رات کو آپؐ دس رکعتیں پڑھتے تھے اور بعد میں ایک وتر اور اس کے بعد فجر کی دو رکعتیں۔ یہ سب ملا کر کل تیرہ رکعتیں ہوتیں۔

لغوی تشریح: ﴿ ما كان يزيد الخ ﴾ اس سے تو یہی ثابت ہوتا ہے کہ نماز تراویح کی رکعات کی تعداد گیارہ ہی مسنون ہے اور بس۔ تہجد اور تراویح دونوں ایک ہی چیز ہے۔ ﴿ يصلى اربعا ﴾ بظاہر الفاظ سے تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ چاروں رکعتوں کو مسلسل ایک ہی سلام سے پڑھتے تھے۔ لیکن یہ صحیح نہیں۔ آپؐ دو' دو رکعت پڑھتے۔ چار کے بعد کچھ توقف کرتے اس لئے انہیں چار سے تعبیر کیا گیا ہے۔ پہلے گزر چکا ہے کہ آپؐ نے فرمایا رات کی نماز دو' دو رکعت ہے تو اس کے علاوہ دیگر احادیث سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔ ﴿ فلا تسال عن حسنهن وطولهن ﴾ دریافت کرنے سے منع کر دیا گیا اور یہاں نہی مقصود نہیں ہے بلکہ مقصود نماز کی تعریف کرنا ہے اور یہ انتہائی عمدہ و بہترین اور طوالت سے کنایہ ہے۔ ﴿ اتنام قبل ان توتر ﴾ اس میں ھمزہ استفہام کیلئے ہے۔ گویا آپؐ آٹھ رکعت نماز پڑھ کر سو جاتے تھے۔ پھر کھڑے ہو کر تین وتر ادا فرماتے بغیر اس کے کہ سونے کے بعد اٹھنے کے وقت وضو فرماتے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا خیال ہوگا کہ نیند نواقض وضو میں سے ہے اس لئے انہوں نے نبی ﷺ سے دریافت کیا' جس کا جواب آپؐ نے ان کو ﴿ ان عينى ﴾ کے فقرے میں دیا۔ عينى نون پر فتحہ اور "یا" پر فتحہ اور تشدید۔ عین کا تثنیہ ہے اور یاء متکلم کی طرف مضاف ہے اور معنی یہ ہیں حدث اگر واقع ہو تو اس کا تعین ہو جاتا ہے کیونکہ میرا دل بیدار رہتا ہے سوتا نہیں اور مجرد نیند ناقض وضو نہیں ہے۔ یہ تو ہوا کے خارج ہونے

کے احتمال کی وجہ سے وضو ٹوٹنے کا گمان ہے۔

حاصل کلام: اس حدیث سے کئی مسئلے معلوم ہوتے ہیں: (۱) نبی ﷺ کا دل نہیں سوتا صرف آنکھیں سوتی تھیں اور یہ آپؐ کی خصوصیت تھی بلکہ بخاری کی ایک روایت میں ہے کہ تمام انبیاء کے دل جاگتے اور آنکھیں سوتی ہیں۔ (۲) گہری نیند جس میں دل غافل ہو جائے ناقض وضو ہے۔ (۳) نماز تہجد عمدہ طریقے پر ٹھہر ٹھہر کر پڑھنی چاہئے۔ (۴) ثابت ہوا کہ حضور ﷺ نے نماز تراویح گیارہ رکعت ہی پڑھی ہے۔ اس سلسلہ میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی روایت قابل ترجیح ہے۔ اس لئے کہ آپؐ یہ نماز گھر ہی میں ادا فرمایا کرتے تھے۔ آپؐ کے وہ اعمال جو آپؐ عموماً گھر میں سرانجام دیتے تھے بالخصوص رات کے ان کی صحیح خبر اہل خانہ ہی کو صحیح طور پر ہو سکتی ہے۔

بیس رکعت تراویح کے متعلق ایک بھی صحیح حدیث نہیں ہے۔ عبد بن حمید اور طبرانی نے ابوشیبہ' ابراہیم بن عثمان' عن الحکم' عن مقسم' عن ابن عباس کے طریق سے جو روایت نقل کی ہے کہ آنحضرت ﷺ نے بیس رکعت تراویح پڑھیں' وہ سخت ضعیف ہے کیونکہ ابوشیبہ کے بارے میں امام احمد رحمۃ اللہ علیہ' ابن معین رحمۃ اللہ علیہ' امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ' امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ' ابوداؤد رحمۃ اللہ علیہ' ترمذی رحمۃ اللہ علیہ اور نسائی رحمۃ اللہ علیہ سبھی کی یہ رائے ہے کہ یہ شخص ضعیف ہے۔ شعبہ نے تو اسے کذاب قرار دیا ہے۔ اس کے مقابل صحیح مرفوع روایات میں آٹھ رکعت تراویح کا ذکر ہے۔ اس لئے تراویح آٹھ رکعت ہی سنت ہے۔ علامہ ابن ھمام رحمۃ اللہ علیہ نے یہی کہا ہے۔ ہدایہ کی شرح فتح القدیر میں کہا ہے کہ تراویح کی مسنون تعداد تو آٹھ رکعات ہے اور اس سے زائد مستحب اور نفل ہیں۔ اسی طرح علامہ محمد انور کاشمیری رحمۃ اللہ علیہ سابق شیخ الحدیث دارالعلوم دیوبند نے "عرف الشذی" میں کہا ہے کہ یہ تسلیم کئے بغیر چارہ نہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے تراویح آٹھ رکعت پڑھی ہیں اور کسی روایت سے یہ بھی ثابت نہیں کہ آپؐ نے تراویح اور تہجد علیحدہ علیحدہ پڑھی ہوں۔ (۵) اس حدیث کے آخری حصے سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ حضور ﷺ نے نماز تہجد کی دس رکعتیں بھی پڑھی ہیں اور آخر میں ایک وتر پڑھا یوں یہ کل گیارہ رکعتیں ہوئیں۔ (۶) نیز یہ بھی معلوم ہوا کہ آپؐ نے کبھی تیرہ رکعت بھی پڑھیں ہیں۔ جس میں آٹھ نفل اور پانچ وتر پڑھتے تھے۔

(۲۹۹) وَعَنْهَا رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰی عَنْهَا قَالَتْ: كَانَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ يُصَلِّيْ مِنَ اللَّيْلِ ثَلاَثَ عَشْرَةَ رَكْعَةً، يُوْتِرُ مِنْ ذٰلِكَ بِخَمْسٍ، لاَ يَجْلِسُ فِيْ شَيْءٍ إِلاَّ فِي آخِرِهَا.

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا ہی سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ رات کو تیرہ رکعت ادا فرماتے تھے۔ ان میں پانچ وتر ہوتے تھے اور ان پانچ وتروں میں تشہد کیلئے صرف آخری رکعت میں بیٹھتے تھے۔

لغوی تشریح: ﴿ لا یجلس فی شئی ﴾ کہ پانچ وتر پڑھتے اور آخری رکعت کے علاوہ کسی رکعت کے بعد نہ بیٹھتے یعنی پانچویں رکعت متصل پڑھتے تھے درمیان میں تشہد نہیں پڑھتے تھے۔ اس حدیث سے

احناف کے مذہب کی تردید ہوتی ہے جو صرف تین رکعات کے تعین پر ہی اصرار کرتے اور درمیان میں تشہد پڑھتے ہیں۔

(۳۰۰) وَعَنْهَا رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهَا قَالَتْ: مِنْ كُلِّ اللَّيْلِ قَدْ أَوْتَرَ رَسُولُ اللهِ ﷺ، وَانْتَهَى وِتْرُهُ إِلَى السَّحَرِ. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِمَا.

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا ہی سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے رات کے ہر حصے میں وتر پڑھا ہے اور آپ ﷺ کے وتر پڑھنے کی انتہا سحر تک تھی۔ (دونوں روایتوں کو بخاری و مسلم نے روایت کیا ہے)

لغوی تشریح: ﴿السحر﴾ سحر سے مراد صبح کاذب ہے۔ یہ وہ سفیدی ہے جو مشرقی افق میں طلوع فجر سے پہلے سیدھے ستون کی مانند نظر آتی ہے۔

حاصل کلام: اس حدیث سے ثابت ہوا کہ حضور ﷺ نے وتر رات کے شروع اور وسط شب اور رات کے آخری حصہ میں پڑھے ہیں۔ وتروں کا وقت عشاء کی نماز کے بعد سے شروع ہو کر طلوع فجر تک رہتا ہے جو لوگ نماز تہجد کے عادی ہوں انہیں وتر رات کے آخری حصہ میں پڑھنے چاہئیں اور جو سحری کے وقت اٹھ نہ سکتے ہوں وہ نماز عشاء کے بعد پڑھیں۔ کسی مجبوری اور عذر کی وجہ سے اگر وقت پر وتر نہ پڑھے جا سکیں تو فجر کی جماعت کھڑی ہونے تک انہیں پڑھ لے۔ ہاں! اگر سو جائے یا اسے یاد ہی نہ رہے تو جس وقت بیدار ہو یا جس وقت یاد آئے پڑھ لے' اس کا یہی وقت ہے۔

(۳۰۱) وَعَنْ عَبْدِ اللهِ بْنِ عَمْرِو بْنِ العَاصِ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا قَالَ: قَالَ لِيْ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «يَا عَبْدَ اللهِ لَا تَكُنْ مِثْلَ فُلَانٍ، كَانَ يَقُوْمُ مِنَ اللَّيْلِ. فَتَرَكَ قِيَامَ اللَّيْلِ». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے مجھے فرمایا "اے عبداللہ! فلاں آدمی کی طرح تم نہ ہو جانا کہ وہ قیام اللیل کرتا تھا پھر بعد میں اسے ترک کر دیا۔" (بخاری و مسلم)

حاصل کلام: یہ حدیث اس بات کی دلیل ہے کہ قیام اللیل واجب نہیں مندوب ہے اور عمل خیر پر مداومت اور ہمیشگی پسندیدہ اور بہترین عمل ہے۔ نیز یہ بھی معلوم ہوا کہ ایک آدمی جب کسی مستحب و مندوب عمل کی عادت بنا لے تو پھر اس میں غفلت' تساہل اور سستی کا مظاہرہ نہیں کرنا چاہئے' اس پر ہمیشہ عمل پیرا رہنے کی کوشش کرنی چاہئے۔ نبی کریم ﷺ کی عادت مبارک تھی کہ جب کوئی عمل شروع فرما لیتے تو اس پر دوام کرتے خواہ عمل معمولی سا ہوتا۔

اس حدیث سے یہ سبق بھی حاصل ہوتا ہے کہ جب کسی کی بری عادت کسی دوسرے کے سامنے بیان کرنی ہو تو اس کا نام پس پردہ رکھا جائے۔ حضور ﷺ نے لاتکن فی مثل فلان فرمایا' اس شخص کا نام نہیں لیا۔ اس آدمی کا نام ظاہر نہ فرما کر پردہ پوشی فرمائی ہے۔

(۳۰۲) وَعَنْ عَلِيِّ بْنِ أَبِيْ طَالِبٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ: «أَوْتِرُوا يَا أَهْلَ الْقُرْآنِ! فَإِنَّ اللّٰهَ وِتْرٌ، يُحِبُّ الْوِتْرَ». رَوَاهُ الْخَمْسَةُ، وَصَحَّحَهُ ابْنُ خُزَيْمَةَ.

حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "اے قرآن والو! وتر پڑھا کرو۔ اللہ خود بھی وتر ہے اور وتر کو پسند کرتا ہے۔" (اسے پانچوں (احمد' ابوداؤد' ترمذی' نسائی' ابن ماجہ نے روایت کیا ہے اور ابن خزیمہ نے اسے صحیح قرار دیا ہے)

لغوی تشریح: ﴿ اوتروا ﴾ یعنی وتر پڑھو۔ یہ امر وجوب کیلئے نہیں بلکہ ترغیب کیلئے ہے۔ ﴿ یااھل القرآن ﴾ سے مراد حفاظ قرآن ہیں اور یہ قرینہ ہے کہ وتر واجب نہیں' ورنہ محض اہل القرآن کو بالخصوص اسی کے پڑھنے کا حکم نہ دیا جاتا۔ وتر سے مراد یہاں قیام اللیل ہے اور وتر بول کر اطلاق قیام اللیل پر کیا گیا ہے کیونکہ وہ تمام نمازوں کے آخر میں پڑھے جاتے ہیں اور وتر باقی ساری نماز کو بھی وتر (طاق) بنا دیتے ہیں۔

حاصل کلام: اس حدیث سے حفاظ قرآن کو ترغیب ہے کہ وہ قیام اللیل کا اہتمام کریں کیونکہ اس سے قرآن یاد رکھنے میں مدد ملتی ہے۔

(۳۰۳) وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُمَا، عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ: «اجْعَلُوا آخِرَ صَلَاتِكُمْ بِاللَّيْلِ وِتْراً». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا "اپنی رات کی آخری نماز کو وتر بناؤ۔" (بخاری اور مسلم)

حاصل کلام: اس حدیث میں رات کی نماز کا آخری حصہ وتر بنانے کا امر وجوب کیلئے نہیں بلکہ مندوب ہے۔ اگر کسی نے رات کے اول حصہ میں وتر پڑھا ہے پھر رات کے درمیان میں یا رات کے آخری حصہ میں جاگ اٹھا تو وہ جو چاہے پڑھے وتر کو نہ پڑھے یعنی جوڑا (شفع) بنانے کی کوشش نہ کرے بلکہ اگر کوئی وتر کے ادا کرنے کے بعد دو رکعت پڑھ لے تو کوئی مضائقہ نہیں اس لئے کہ صحیح مسلم میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے منقول ہے کہ نبی کریم ﷺ وتر کے بعد دو رکعت بیٹھ کر پڑھتے تھے۔

(۳۰۴) وَعَنْ طَلْقِ بْنِ عَلِيٍّ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: سَمِعْتُ رَسُولَ اللّٰهِ ﷺ يَقُولُ: لَا وِتْرَانِ فِي لَيْلَةٍ. رَوَاهُ أَحْمَدُ وَالثَّلَاثَةُ، وَصَحَّحَهُ ابْنُ حِبَّانَ.

حضرت طلق بن علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے سنا ہے کہ "ایک رات میں دو مرتبہ وتر نہیں۔" (اسے احمد نے اور تینوں (ترمذی' نسائی' ابن ماجہ) نے روایت کیا ہے اور ابن حبان نے صحیح قرار دیا ہے)

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ ایک رات میں دو بار وتر نہیں پڑھنے چاہئے۔ بعض حضرات جو اس بات کے قائل ہیں کہ اگر اول رات میں وتر پڑھے ہوں پھر رات کے آخری حصہ میں بیدار ہو تو

پہلے ایک رکعت پڑھ کر شفع بنا لے پھر نفل پڑھ کر آخر میں وتر پڑھ لے۔ یہ عمل اس حدیث کے خلاف ہے۔ مزید تفصیل کیلئے امام مروزی رحمہ اللہ کی "قیام اللیل" ملاحظہ ہو۔

(٣٠٥) وَعَنْ أُبَيِّ بْنِ كَعْبٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: كَانَ رَسُولُ اللهِ ﷺ يُوتِرُ «بِسَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الأَعْلَى» وَ«قُلْ يَآ أَيُّهَا الكَافِرُوْنَ» و«قُلْ هُوَ اللّٰهُ أَحَدٌ» رَوَاهُ أَحْمَدُ وَأَبُو دَاوُدَ وَالنَّسَائِيُّ وَزَادَ: وَلاَ يُسَلِّمُ إِلاَّ فِي آخِرِهِنَّ.

حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ تین رکعات وتر کی صورت میں بالترتیب پہلی رکعت میں سبح اسم ربک الاعلی دوسری میں قل یا ایھا الکفرون اور تیسری میں قل ھو اللہ احد پڑھتے تھے۔ (اس کو احمد' ابوداؤد اور نسائی نے روایت کیا ہے) اور نسائی نے اتنا اضافہ بھی نقل کیا ہے "اور سلام آخری رکعت میں پھیرتے تھے"۔

وَلأَبِيْ دَاوُدَ وَالتِّرْمِذِيِّ نَحْوُهُ عَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهَا، وَفِيْهِ: كُلُّ سُورَةٍ فِي رَكْعَةٍ، وَفِي الأَخِيْرَةِ «قُلْ هُوَ اللّٰهُ أَحَدٌ» وَ«الْمُعَوِّذَتَيْنِ».

ابوداؤد اور ترمذی نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے حوالہ سے اسی طرح روایت نقل کی ہے اور اس روایت میں ہے کہ ہر رکعت میں ایک سورۃ تلاوت فرماتے تھے اور آخری رکعت میں قل ھو اللہ احد اور معوذتین پڑھتے تھے۔

لغوی تشریح: ﴿کل سورۃ﴾ ہر رکعت میں ایک سورۃ۔ یعنی ایک رکعت میں "سبح اسم ربک الاعلی" اور دوسری میں "قل یایھا الکفرون" مکمل سورت پڑھے ﴿فی رکعۃ﴾ سے مراد پہلی اور دوسری رکعت میں ﴿المعوذتین﴾ تعویذ سے ماخوذ اسم مفعول کا صیغہ ہے۔ اس سے مراد قل اعوذ برب الفلق اور قل اعوذ برب الناس ہے۔ معوذتین کا اضافہ پہلی روایت کے خلاف نہیں ہے۔ ان دونوں صورتوں کو مختلف اوقات پر محمول کیا جائے گا کہ کبھی صرف سورۂ اخلاص پڑھ لیتے اور کبھی معوذتین بھی شامل فرما لیتے۔

حاصل کلام: حدیث سے معلوم ہوا کہ رسول اللہ ﷺ تین وتر ادا فرمایا کرتے تھے۔ ہر رکعت میں سورۂ فاتحہ کے ساتھ دوسری سورت بھی پڑھتے تھے اور آخری رکعت میں قرآن مجید کی آخری تین سورتیں پڑھتے لیکن اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ تین وتر دو تشہد سے پڑھتے تھے۔ اگر احناف نے ایسی احادیث سے استدلال کیا ہے تو یہ استدلال واضح نہیں ہے۔

راوی حدیث: ﴿ابی بن کعب رضی اللہ عنہ﴾ ابومنذر ان کی کنیت تھی۔ انصار کے قبیلہ خزرج کی شاخ نجار سے ہونے کی وجہ سے انصاری' نجاری خزرجی کہلائے۔ قراء کے سربراہ تھے اسی وجہ سے سید القراء کے لقب سے مشہور ہوئے۔ کاتبین وحی میں سے تھے اور ان خوش قسمت لوگوں میں سے تھے جنہوں نے جمع قرآن کا شرف پایا۔ عہد رسالت مآب ﷺ میں فتویٰ کے فرائض بھی انجام دیتے تھے۔ بیعت عقبہ ثانیہ میں

شریک تھے۔ بدر اور بعد کے غزوات میں شریک رہے۔ ان کی وفات کے سن میں اختلاف ہے۔ ۱۹ھ سے لے کر ۳۳ھ کے درمیان میں کوئی وقت ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

(۳۰٦) وَعَنْ أَبِيْ سَعِيْدِ الْخُدْرِيِّ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُ أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ قَالَ: «أَوْتِرُوا قَبْلَ أَنْ تُصْبِحُوا». رَوَاهُ مُسْلِمٌ.

وَلِابْنِ حِبَّانَ: مَنْ أَدْرَكَ الصُّبْحَ وَلَمْ يُوتِرْ، فَلاَ وِتْرَ لَهُ.

حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ "وتر صبح ہونے سے پہلے پڑھ لیا کرو" (مسلم)

اور ابن حبان میں ہے کہ "جس کسی نے صبح تک وتر نہ پڑھے اس کا کوئی وتر نہیں ہے۔"

حاصل کلام: یہ حدیث اس کی دلیل ہے کہ وتر کا وقت صبح کے نمودار ہونے سے پہلے تک ہے۔ جب فجر طلوع ہو گئی تو ادائیگی وتر کا وقت نکل گیا "لا وتر لہ" کے معنی ہیں کہ اس کا وتر ادا نہیں ہو گا۔ رہا اس کی قضاء کا مسئلہ تو وہ جب اور جس وقت چاہے پڑھ سکتا ہے جس پر آئندہ آنے والی حدیث دلالت کرتی ہے۔ وتر ہر وقت ادا کرنے کی بنا پر ہی آپؐ نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے فرمایا تھا کہ سونے سے پہلے وتر پڑھ لیا کرو۔ اس لئے کہ جو لوگ صبح اٹھ نہ سکیں انہیں چاہئے کہ عشاء کی نماز کے ساتھ وتر بھی پڑھ لیا کریں۔

(۳۰۷) وَعَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ: «مَنْ نَامَ عَنِ الوِتْرِ أَوْ نَسِيَهُ، فَلْيُصَلِّ إِذَا أَصْبَحَ أَوْ ذَكَرَ». رَوَاهُ الخَمْسَةُ إِلاَّ النَّسَائِيَّ.

حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ ہی سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "جو سو جائے بغیر وتر پڑھے یا اسے یاد نہ رہے ہوں تو اسے چاہئے کہ صبح کے وقت پڑھ لے یا پھر جب اسے یاد آئے۔" (اسے نسائی کے علاوہ پانچوں نے روایت کیا ہے)

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ جب وتر کسی بھی صورت پڑھنے سے رہ جائیں تو انہیں بہر صورت پڑھنا چاہئے۔ اس سے بھی نماز وتر کی بڑی اہمیت معلوم ہوتی ہے۔

(۳۰۸) وَعَنْ جَابِرٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ: «مَنْ خَافَ أَنْ لاَ يَقُومَ مِنْ آخِرِ اللَّيْلِ فَلْيُوتِرْ أَوَّلَهُ، وَمَنْ طَمِعَ أَنْ يَقُومَ آخِرَهُ فَلْيُوتِرْ آخِرَ اللَّيْلِ، فَإِنَّ صَلاَةَ آخِرِ اللَّيْلِ مَشْهُودَةٌ، وَذَلِكَ

حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "جس کسی کو یہ اندیشہ اور خوف لاحق ہو کہ وہ رات کے آخری اوقات میں بیدار نہیں ہو سکے گا اسے چاہئے کہ رات کے پہلے حصہ میں ہی وتر پڑھ لے اور جسے یہ توقع اور امید ہو کہ وہ بیدار ہو جائے گا تو اسے رات کے آخری حصہ میں وتر

أَفْضَلُ». رَوَاهُ مُسْلِمٌ.

پڑھنے چاہئیں کیونکہ رات کے آخری حصہ کی نماز میں فرشتے حاضر ہوتے ہیں اور یہ بہت بہتر ہے۔" (مسلم)

لغوی تشریح: ﴿ مشھودۃ ﴾ یعنی رات کی نماز کے وقت شب و روز کے ملائکہ حاضر ہوتے ہیں۔

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ فرشتے بھی مخلوق ہیں۔ وہ اپنے فرائض کی انجام دہی کرتے ہیں اور ان کی ڈیوٹیاں بھی بدلتی رہتی ہیں۔ نیز ثابت ہوتا ہے کہ وتر آخری رکعت میں پڑھنے افضل ہیں بشرطیکہ شب بیداری کی عادت ہو ورنہ پہلی رات پڑھ کر ہی سونا چاہیے۔

(٣٠٩) وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُمَا، عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ: «إِذَا طَلَعَ الفَجْرُ، فَقَدْ ذَهَبَ وَقْتُ كُلِّ صَلاَةِ اللَّيْلِ، والوِتْرِ، فَأَوْتِرُوا قَبْلَ طُلُوعِ الفَجْرِ». رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ.

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا "جب فجر طلوع ہو جائے تو پھر رات کو پڑھی جانے والی ہر نماز کا وتروں سمیت وقت چلا جاتا ہے (ختم ہو جاتا ہے) لہٰذا تم طلوع فجر سے پہلے پہلے وتر پڑھ لیا کرو۔" (ترمذی)

لغوی تشریح: ﴿ کل صلاۃ اللیل ﴾ رات کی ہر نماز سے مراد وہ نوافل ہیں جو مشروع ہیں یعنی جن نوافل کو ادا کیا جانا شریعت محمدیہؐ سے ثابت ہو۔ ﴿ والوتر ﴾ یہ رفعی صورت میں ہے۔ اس کا عطف "کل" پر ہوگا یعنی رات کی ہر نماز اور وتر بھی۔ یہاں وتر کے مزید مقام و مرتبہ کی بنا پر یہاں خاص کا عام پر عطف ہے۔

(٣١٠) وَعَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهَا قَالَتْ: كَانَ رَسُولُ اللهِ ﷺ يُصَلِّي الضُّحَى أَرْبَعاً، وَيَزِيْدُ مَا شَآءَ اللّٰهُ. رَوَاهُ مُسْلِمٌ.

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نماز ضحیٰ (چاشت کی نماز) چار رکعات پڑھا کرتے تھے اور جتنی اللہ چاہتا زیادہ بھی کرتے تھے۔ (مسلم)

وَلَهُ عَنْهَا أَنَّهَا سُئِلَتْ: هَلْ كَانَ رَسُولُ اللهِ ﷺ يُصَلِّي الضُّحَى؟ قَالَتْ: لاَ إِلاَّ أَن يَجِيْءَ مِن مَغِيْبِهِ.

اور مسلم ہی میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی روایت میں ہے کہ ان سے دریافت کیا گیا کیا رسول اللہ ﷺ ضحیٰ کی نماز پڑھا کرتے تھے؟ تو انہوں نے فرمایا کہ نہیں الا یہ کہ جب اپنے سفر سے واپس تشریف لاتے

وَلَهُ عَنْهَا: مَا رَأَيْتُ رَسُولَ اللهِ ﷺ يُصَلِّي سُبْحَةَ الضُّحَى قَطُّ، وَإِنِّي لأُسَبِّحُهَا.

اور مسلم ہی میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو نماز ضحیٰ پڑھتے کبھی نہیں دیکھا اس کے باوجود میں یہ نوافل پڑھتی

ہوں۔

لغوی تشریح: ﴿کان یصلی الضحی﴾ اس مقام پر کان استمرار کا معنی نہیں دے رہا کہ آپؐ نماز ضحیٰ ہمیشہ بلاناغہ ادا فرماتے رہے۔ یہاں تو صرف اتنا بتانا مقصود ہے کہ نبی کریم ﷺ جب نماز ضحیٰ کے نوافل پڑھتے تو ان کی تعداد چار ہوتی جہاں تک نماز ضحیٰ کا تعلق ہے وہ تو نفل نماز ہے' مستحب ہے جو چاشت کے وقت ادا کی جاتی ہے۔ اس کی کم از کم رکعتیں دو ہیں اور زیادہ سے زیادہ کے بارے میں نبی ﷺ سے بارہ رکعتوں سے زیادہ کچھ بھی مروی نہیں ہے ﴿مغیبة﴾ اپنے سفر سے واپسی۔ ﴿سبحة الضحی﴾ سین پر ضمہ اور "با" ساکن یعنی نماز ضحیٰ کے نوافل ﴿وانی لاسبحھا﴾ تسبیح سے ماخوذ ہے یعنی میں صلاۃ ضحیٰ پڑھتی ہوں۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا یہ عمل باوجودیکہ انہوں نے نبی ﷺ کو پڑھتے نہیں دیکھا اس کا سبب یہ ہوگا کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو نبی ﷺ کے ارشاد گرامی سے اس نماز کی فضیلت معلوم ہوگئی ہوگی یا پھر انہیں یہ بات پہنچی ہوگی کہ آپؐ نے یہ نماز پڑھی ہے۔ رؤیت کی عدم موجودگی اس کو تو مستلزم نہیں ہے کہ آپؐ نے اس کو مطلقاً پڑھا نہیں۔ یوں یہ حدیث پہلی دونوں احادیث کے معارض نہیں ہے اور ان کے درمیان تطبیق کی ایک صورت یہ بھی ہے کہ پہلی حدیث تو مطلقاً اثبات پر دلالت کرتی ہے (یعنی آپؐ نے یہ نماز پڑھی ہے) اور تیسری مطلقاً نفی پر دلالت کرتی ہے یعنی آپؐ نے یہ عمل کیا ہی نہیں اور دوسری حدیث سفر سے واپسی کی قید سے مشروط ہے یعنی سفر سے واپسی کے وقت پڑھی ہے۔ ان کے درمیان جمع کی صورت یہ ہے کہ تیسری حدیث میں سبب کی کوئی قید نہیں ہے اور پہلی حدیث سبب کے ساتھ مقید ہے اور وہ ہے سفر سے واپسی۔ جمع کی یہ صورت پہلی سے بہتر اور اولیٰ ہے۔ اس باب کی آخری حدیث بھی اس پر دلالت کرتی ہے جو اس بات کی دلیل ہے کہ آپؐ یہ نماز پڑھا کرتے تھے۔

حاصل کلام: نماز اشراق' صلاۃ ضحیٰ اور صلاۃ اوابین تین الگ الگ نمازیں ہیں یا ایک ہی نماز کا تین الفاظ سے ذکر کیا گیا ہے۔ عربی زبان کا دامن بہت وسیع اور کشادہ ہے اس میں ایک ہی چیز بے شمار الفاظ سے تعبیر کی جا سکتی ہے۔ چنانچہ طبرانی کی ایک روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے اپنی چچا زاد بہن ام ہانی رضی اللہ عنہا کے گھر نماز پڑھی اور ام ھانی رضی اللہ عنہا کو بلا کر بتایا کہ یہ اشراق کی نماز ہے اور حضرت انس رضی اللہ عنہ کی ایک روایت میں اس کا نام صلاۃ ضحیٰ معلوم ہوتا ہے۔ یہ نماز طلوع آفتاب سے لے کر دن کے چوتھائی حصہ تک پڑھی گئی ہے اور اوابین کی نماز کا وقت جب آفتاب کی تمازت سے زمین گرم ہو جائے کہ اونٹنی کا بچہ گرمی محسوس کرنے لگے۔ اونٹ کا بچہ معمولی حرارت کی پروا نہیں کرتا بلکہ ذرا تپش زیادہ ہو تو وہ گرمی محسوس کرتا ہے۔ گویا اس نماز کا وقت سورج کے کافی اوپر چڑھنے کے بعد ہے۔ اس طرح بعض کے نزدیک تینوں نمازیں دراصل ایک ہی ہیں نام مختلف ہیں۔ لیکن ایک رائے یہ بھی ہے کہ اشراق اور ضحیٰ ایک ہی نماز کے دو نام ہیں البتہ صلاۃ اوابین ان سے الگ ہے۔ اب رہا یہ مسئلہ کہ نماز ضحیٰ کی رکعت کتنی ہیں؟ تو اس کی کم از کم دو اور زیادہ سے زیادہ بارہ رکعات کا حدیث سے ثبوت ملتا ہے۔

(٣١١) وَعَنْ زَيْدِ بْنِ أَرْقَمَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، أَنَّ رَسُولَ اللهِ ﷺ قَالَ: «صَلاَةُ الأَوَّابِينَ حِينَ تَرْمَضُ الفِصَالُ». رَوَاه التِّرْمِذِيُّ.

حضرت زید بن ارقم رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "اوابین کی نماز کا وقت وہ ہے جب اونٹنی کے بچے تپش و حرارت اور گرمی محسوس کریں۔" (ترمذی)

لغوی تشریح: ﴿الاوابین﴾ اواب کی جمع ہے۔ اس میں "واو" پر تشدید ہے معنی اس کے بکثرت رکوع کرنے والے ہیں اور منکرات و سیئات کو چھوڑنے اور ترک کرنے والے ہیں۔ ﴿حین﴾ وقت کے معنی میں۔ یہ جب جملہ کی طرف مضاف ہو تو اکثر و بیشتر مبنی بر فتح ہوتا ہے ﴿ترمض﴾ سمع یسمع باب سے یعنی گرمی اور تمازت کی وجہ سے جلن محسوس کرے اور یہ کیفیت اس وقت ہوتی ہے جب سورج کی گرم شعاعیں زمین پر پڑتی ہیں اور یہ وہی وقت ہے جب سورج کافی اونچا ہو اور نصف النہار کے قریب پہنچ چکا ہو ﴿الفصال﴾ "فا" کے نیچے کسرہ فصیل کی جمع ہے۔ اونٹنی کے بچہ کیلئے یہ لفظ استعمال ہوتا ہے گویا کنایہ مقصود ہے کہ صلاۃ اوابین کا وقت اس وقت ہوتا ہے جب اونٹنی کے چھوٹے بچے دن کی حرارت و تمازت سے جلن اور تپش محسوس کریں اس وقت پڑھی جانے والی نماز کا نام صلاۃ اوابین اس لئے ہے کہ اس وقت طبیعت انسانی آرام و استراحت اور سکون کی جانب مائل ہوتی ہے مگر یہ نماز پڑھنے والا نفس کی مراد پوری کرنے کی بجائے اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرتا ہے۔

(٣١٢) وَعَنْ أَنَسٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «مَنْ صَلَّى الضُّحَى ثِنْتَيْ عَشْرَةَ رَكْعَةً، بَنَى اللَّهُ لَهُ قَصْراً فِي الجَنَّةِ». رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ، وَاسْتَغْرَبَهُ.

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "جس کسی نے صلوٰۃ الضحیٰ کی بارہ رکعتیں پڑھیں اللہ تعالیٰ اس کیلئے جنت میں محل تعمیر فرمائے گا۔" (اسے ترمذی نے روایت بھی کیا ہے اور اسے غریب بھی قرار دیا ہے)

حاصل کلام: یہ حدیث جسے امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے غریب کہا ہے۔ اس سے نماز ضحیٰ کی فضیلت ثابت ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ اور بھی احادیث اس کی فضیلت میں منقول ہیں مگر وہ بھی ضعیف ہیں۔

(٣١٣) وَعَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهَا قَالَتْ: دَخَلَ رَسُولُ اللهِ ﷺ بَيْتِيْ، فَصَلَّى الضُّحَى ثَمَانِيَ رَكَعَاتٍ. رَوَاهُ ابْنُ حِبَّانَ فِي صَحِيحِهِ.

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ میرے گھر میں تشریف لائے اور نماز ضحی کی آٹھ رکعتیں ادا فرمائیں۔ (ابن حبان نے اسے اپنی صحیح میں روایت کیا ہے)

حاصل کلام: اس حدیث سے حضورؐ کا حضرت عائشہؓ کے حجرے میں آٹھ رکعت نماز ضحیٰ پڑھنے کا ثبوت ملتا ہے' ممکن ہے اس نماز سے مراد سفر سے واپسی پر پڑھی گئی نماز ہو۔ نماز ضحیٰ کا بڑا فائدہ مسلم کی روایت

میں منقول ہے کہ انسان کے ہر جوڑ پر ایک حق واجب ہے' انسان کے جسم میں تین سو ساٹھ جوڑ ہوتے ہیں۔ اس نماز کی دو رکعت ادا کرنے سے وہ حقوق ادا ہو جاتے ہیں جو ان تمام جوڑوں پر واجب ہوتے ہیں۔

١٠ - بَابُ صَلاةِ الجَمَاعَةِ وَالإِمَامَةِ نماز باجماعت اور امامت کے مسائل کا بیان

(٣١٤) عَنْ عَبْدِ اللهِ بْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا أَنَّ رَسُولَ اللهِ ﷺ قَالَ: صَلاَةُ الجَمَاعَةِ أَفْضَلُ مِنْ صَلاَةِ الفَذِّ بِسَبْعٍ وَعِشْرِينَ دَرَجَةً». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "باجماعت نماز پڑھنا تنہا نماز پڑھنے سے ستائیس گنا زیادہ فضیلت رکھتی ہے۔" (بخاری و مسلم)

وَلَهُمَا عَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَ: «بِخَمْسٍ وَعِشْرِينَ جزءًا» وَكَذَا لِلْبُخَارِيِّ عَنْ أَبِيْ سَعِيْدٍ، وَقَالَ: «دَرَجَةً».

اور بخاری و مسلم میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ "پچیس گنا زیادہ ثواب ملتا ہے" اور بخاری میں حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے اس میں جزء کی جگہ درجۃ کا لفظ ہے۔

لغوی تشریح: ﴿باب صلاۃ ......الخ﴾ امامت کا عطف صلاۃ پر ہے۔ جماعت کے لفظ پر نہیں ہے۔ ﴿من صلاۃ الفذ﴾ "فا" پر فتحہ اور ذال پر تشدید۔ "فذ" کے معنی تنہا اور منفرد "جزء" همزہ پر نصب۔ درجہ کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔ اس مقام پر درجہ اور جزء سے مراد نماز ہے ﴿وکذا للبخاری﴾ یعنی بخاری کی روایت میں بھی پچیس گنا ہے ﴿وقال درجۃ﴾ جزء کی جگہ درجۃ کا لفظ ہے۔ رہا یہ دونوں عددوں کا اختلاف تو اس بارے میں کہا گیا ہے کہ دونوں کے مابین کوئی منافات نہیں۔ یہاں عدد کا مفہوم مراد نہیں ہے۔ ستائیس میں پچیس شامل ہیں۔ یہ بھی احتمال ہے کہ پہلے آپؐ نے پچیس گنا ثواب کا ذکر کیا ہو بعد میں ستائیس گنا کا اور بعض نے کہا ہے کہ یہ فرق مسجد کے قریب و بعید ہونے کی وجہ سے ہے اگر مسجد دور ہوگی تو اجر زیادہ اور قریب ہونے کی صورت میں کم اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس سے خشوع کی قلت و کثرت مراد ہے اگر نماز میں خشوع زیادہ ہوگا تو ثواب زیادہ ملے گا اور اگر خشوع کم ہوگا تو اجر کم ملے گا اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ فرق جماعت کی تعداد کی کثرت و قلت کی وجہ سے ہے اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ پوری نماز میں شمولیت ہوگی تو زیادہ ثواب ملے گا اور اگر تھوڑی سی نماز میں شمولیت ہوگی تو اجر کم ملے گا۔ واللہ اعلم۔

حاصل کلام: اس حدیث سے بظاہر ان حضرات کی تائید ہوتی ہے جو کہتے ہیں کہ نماز باجماعت پڑھنا

واجب نہیں کیونکہ انفرادی اور اجتماعی میں مختلف اسباب کی وجہ سے درجات میں کمی و بیشی ہوتی ہے تو گویا منفرد کی بھی نماز ہوگئی خواہ مراتب اور درجات کم ہی ہوں۔ اگر جماعت نماز واجب ہوتی تو پھر منفرد کی نماز تو جائز نہ ہوتی حالانکہ ایسا نہیں ہے۔ لہٰذا معلوم ہوا کہ نماز جماعت سے پڑھنا سنت مؤکدہ ہے۔

(٣١٥) وَعَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُ، أَنَّ رَسُولَ اللهِ ﷺ قَالَ: «وَالَّذِي نَفْسِي بِيَدِهِ، لَقَدْ هَمَمْتُ أَنْ آمُرَ بِحَطَبٍ فَيُحْتَطَبَ، ثُمَّ آمُرَ بِالصَّلاَةِ فَيُؤَذَّنَ لَهَا، ثُمَّ آمُرَ رَجُلاً فَيَؤُمَّ النَّاسَ، ثُمَّ أُخَالِفَ إِلَى رِجَالٍ لاَ يَشْهَدُونَ الصَّلاَةَ فَأُحَرِّقَ عَلَيْهِمْ بُيُوتَهُمْ، وَالَّذِي نَفْسِي بِيَدِهِ لَوْ يَعْلَمُ أَحَدُهُمْ أَنَّهُ يَجِدُ عَرْقاً سَمِيناً، أَوْ مِرْمَاتَيْنِ حَسَنَتَيْنِ لَشَهِدَ العِشَاءَ».

مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ، وَاللَّفْظُ لِلْبُخَارِيِّ.

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "اس ذات گرامی کی قسم جس کے قبضہٴ قدرت میں میری جان ہے! میں نے ارادہ کیا کہ میں لکڑیوں کے جمع کرنے کا حکم دوں پھر نماز کیلئے اذان کا حکم دوں پھر کسی کو نماز پڑھانے کیلئے کہوں پھر میں خود ان لوگوں کی طرف جاؤں جو نماز میں شریک نہیں ہوتے ان کے گھروں میں موجود ہونے کی صورت میں ان کے گھروں کو ان پر آگ لگا کر جلا دوں۔ قسم اس ذات گرامی کی جس کے قبضہٴ قدرت میں میری جان ہے کہ ان میں سے کسی کو اگر یہ علم ہو جائے کہ اس کو گوشت سے پر موٹی ہڈی مل جائے گی یا دو پائے مل جائیں گے تو نماز عشاء میں لپک کر شامل ہو جائے گا۔ (بخاری و مسلم) متن حدیث کے الفاظ بخاری کے ہیں)

لغوی تشریح: ﴿ هممت ﴾ میں نے ارادہ کیا' قصد کیا ﴿ بحطب ﴾ "حا" اور "طا" پر فتحہ خشک لکڑی جو جلانے کے کام آسکے ﴿ فیحتطب ﴾ لکڑیاں جمع کی جائیں۔ صیغہٴ مجہول ہے۔ منصوب اس لئے ہے کہ اس سے پہلے واقع فعل منصوب کا جواب ہے ﴿ فیوذن ﴾ تاذین سے ماخوذ ہے۔ اذان دی جائے ﴿ فیوم الناس ﴾ جو لوگوں کو نماز پڑھائے۔ یعنی لوگوں کا امام بن کر نماز باجماعت پڑھائے ﴿ ثم اخالف الی رجال ﴾ پھر میں ان کے پیچھے سے آؤں یا محض یہ معنی ہے کہ میں ان کی طرف چلا جاؤں۔ ﴿ فاحرق ﴾ تحریق سے ماخوذ ہے' یعنی میں آگ لگا کر جلا ڈالوں یہاں مضارع کے تمام صیغے منصوب واقع ہوئے ہیں سوائے صیغہ جمع مذکر کے۔ ﴿ عرقا ﴾ عین پر فتحہ "را" ساکن۔ وہ ہڈی جس پر کچھ گوشت باقی ہو اور اس کا زیادہ حصہ اخذ کر لیا گیا ہو اور اصمعی کا قول ہے کہ عرق گوشت کے ٹکڑے کو کہتے ہیں۔ زیادہ عمدہ۔ اس جگہ پہلا ہی معنی مراد ہے کیونکہ لوگوں کی بدترین خصلت و عادت کو زیادہ شدید مبالغہ کے اظہار کیلئے ہے ﴿ سمینا ﴾ سمانة سے ماخوذ ہے۔ لاغر کے مقابلہ میں بولا جاتا ہے۔ موٹا تازہ اس کے معنی

ہیں۔ کیونکہ اس میں چکنائی ہوتی ہے۔ اس کی وجہ سے اس کے چبانے میں رغبت زیادہ ہوتی ہے ﴿ مرماتین ﴾ مرماۃ کا تثنیہ ہے۔ میم کے نیچے کسرہ ہے اور کبھی فتحہ سے بھی پڑھا گیا ہے۔ بکری کا کھر یا وہ گوشت جو دونوں کھروں کے درمیان میں ہوتا ہے۔ اس حدیث سے یہ استدلال کیا گیا ہے کہ نماز جماعت کے ساتھ پڑھنا واجب ہے۔ کیونکہ اس قسم کی سخت و شدید وعید تو صرف واجب کے ترک پر ہوتی ہے اور جس نے اس وعید کو زجر و توبیخ پر محمول کیا ہے اور واجب تسلیم نہیں کیا ہے اس نے تاویل سے کام لیا ہے۔ اس کی حقیقت یہاں مراد نہیں۔

حاصل کلام: اس حدیث سے یہ سمجھا گیا ہے کہ جماعت کے ساتھ نماز ادا کرنا فرض عین ہے۔ فرض کفایہ یا سنت مؤکدہ نہیں ہے۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ تارکین جماعت کیلئے اتنی سخت اور شدید وعید اور دھمکی نہ دی جاتی اگر یہ فرض عین نہ ہوتی۔ ظاہریہ' عطاء' اوزاعی' امام احمد' ابوثور' ابن خزیمہ' ابن منذر اور ابن حبان رحمہم اللہ وغیرہ کا یہی موقف ہے کہ جماعت کے ساتھ نماز ادا کرنا فرض ہے۔ مگر امام شافعی رحمہ اللہ فرض کفایہ کہتے ہیں کہ کچھ لوگ اگر جماعت کے ساتھ ادا کر لیں تو باقی لوگوں سے عدم ادائیگی کی باز پرس نہیں کی جائے گی۔ متقدمین شافعیہ اور بعض احناف اور مالکیہ کا بھی یہی قول ہے البتہ صاحبین اور امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے نزدیک سنت مؤکدہ ہے۔ فرض کفایہ تو اس لئے نہیں کہ جب کچھ لوگ جماعت میں شامل ہو گئے پھر شامل نہ ہونے والوں کے گھروں کو آگ لگا کر جلا دینے کی کیا ضرورت تھی؟ فرض کفایہ تو چند لوگوں کے ادا کرنے سے پورا ہو جاتا ہے۔

(٣١٦) وَعَنْهُ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: **أَثْقَلُ الصَّلَاةِ عَلَى الْمُنَافِقِينَ صَلَاةُ الْعِشَاءِ وَصَلَاةُ الْفَجْرِ، وَلَوْ يَعْلَمُونَ مَا فِيهِمَا لَأَتَوْهُمَا وَلَوْ حَبْواً**». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "منافقین پر سب سے ثقیل و بوجھل نمازیں' نماز عشاء اور نماز فجر ہیں اگر ان کو علم ہو جائے کہ ان دونوں میں حاضر ہونے کا کتنا (عظیم) اجر و ثواب ہے تو یہ لازماً ان میں شامل ہوتے خواہ ان کو گھٹنوں کے بل گھسٹ کر آنا پڑتا۔" (بخاری و مسلم)

لغوی تشریح: ﴿ لاتوھما ﴾ اس میں لام تاکید کیلئے ہے یعنی ضرور آتے اتیان سے ماخوذ ہے "ولو حبوا" خواہ انہیں گھٹنوں پر گھسٹ کر ہی آنا پڑے۔ حبو "حا" پر فتحہ اور "با" ساکن ہے۔ بچے کا اپنے ہاتھوں اور گھٹنوں کے بل گھسٹنا اور ایک قول یہ بھی ہے کہ بچے کا اپنی سرین پر گھسٹ کر آگے بڑھنا۔

حاصل کلام: ان دونوں نمازوں کو نہایت بوجھل اور بھاری کہا گیا ہے۔ عشاء تو اس لئے ثقیل ہے کہ اس وقت تھکے ماندے لوگ سو جانے کی کوشش کرتے ہیں یا اکیلے ہی نماز ادا کر کے سو جاتے ہیں۔ جماعت کو خاص اہمیت ہی نہیں دیتے اور فجر اس لئے گراں ہوتی ہے کہ شیطان نیند کے مارے ہوئے لوگوں کو

اٹھنے ہی نہیں دیتا۔

(۳۱۷) وَعَنْهُ قَالَ: أَتَى النَّبِيَّ ﷺ رَجُلٌ أَعْمَى فَقَالَ: يَا رَسُولَ اللهِ! إِنَّهُ لَيْسَ لِيْ قَائِدٌ يَقُودُنِيْ إِلَى المَسْجِدِ، فَرَخَّصَ لَهُ، فَلَمَّا وَلَّى دَعَاهُ فَقَالَ: «هَلْ تَسْمَعُ النِّدَآءَ بِالصَّلاَةِ؟» قَالَ: نَعَمْ، قَالَ: «فَأَجِبْ». رَوَاهُ مُسْلِمٌ.

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ایک نابینا شخص نبی ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا : اے رسول اللہ (ﷺ)! میرے پاس ایسا کوئی آدمی نہیں جو مجھے پکڑ کر مسجد میں لے آئے۔ آپؐ نے اسے رخصت عنایت فرما دی (کہ وہ گھر پر ہی نماز پڑھ لیا کرے) مگر جب وہ واپس جانے لگا تو آپؐ نے اسے واپس بلا کر فرمایا کہ "تم اذان سنتے ہو؟ اس نے عرض کیا جی ہاں' تو آپؐ نے فرمایا "تو پھر اذان کا جواب دے (یعنی مسجد میں جماعت سے نماز پڑھ) " (مسلم)

لغوی تشریح: "رجل اعمی" نابینا آدمی سے یہاں مراد عبداللہ بن ام مکتوم رضی اللہ عنہ ہیں۔ غالبًا اس ارشاد کے بعد مسجد میں اتنی باقاعدگی سے حاضری دی کہ بالآخر مسجد کے منصب اذان پر مقرر ہونے کا شرف حاصل ہوا۔ ﴿قائد﴾ وہ آدمی جو نابینا کا ہاتھ تھام کر جہاں وہ جانا چاہے وہاں اسے لے جائے ﴿ولی﴾ تولیت سے ماخوذ ہے۔ واپس ہوا۔ واپس جانے کیلئے مڑا اور اپنا رخ پھیرا۔ ﴿النداء﴾ اذان ﴿فاجب﴾ اجابۃ سے امر کا صیغہ ہے۔ یعنی اذان کا جواب دے۔ اس سے مراد نماز باجماعت ادا کرنا ہے۔

حاصل کلام: اس حدیث سے یہ ثابت ہوا کہ اذان کی آواز سننے کے بعد معذور آدمی کو بھی مسجد میں آنا چاہئے۔ معذور کی نماز گھر پر پڑھنے سے ادا تو ہو جائے گی مگر جماعت کا ثواب تو نہیں ملے گا۔ نیز اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اذان کی آواز نہ سننا قابل قبول عذر ہے۔ سننے کے بعد یہ عذر باقی نہیں رہتا۔ بارش' سخت آندھی' باد صرر' شدید بھوک' قضائے حاجت' بیماری اور دشمن کا خوف وغیرہ ایسے عذرات ہیں جنہیں جماعت میں عدم شمولیت کیلئے تسلیم کیا گیا ہے۔ اس حدیث سے جماعت میں شمولیت کو فرض عین کہنے والوں نے فرضیت عین پر استدلال کیا ہے اور سنت مؤکدہ کہنے والوں نے اس حدیث کو تاکید مزید پر محمول کیا ہے۔ دونوں کیلئے اپنے اپنے نظریہ کی رو سے گنجائش موجود ہے۔

(۳۱۸) وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُمَا، عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ: «مَنْ سَمِعَ النِّدَاءَ فَلَمْ يَأْتِ فَلاَ صَلاَةَ لَهُ إِلاَّ مِنْ عُذْرٍ». رَوَاهُ ابْنُ

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا "جو شخص اذان سنے اور پھر نماز باجماعت میں شامل نہ ہو اس کی کوئی نماز نہیں' الا یہ کہ کوئی عذر مانع ہو۔" (اسے ابن ماجہ' دارقطنی' ابن حبان' حاکم

مَاجَهْ والدَّارَقُطْنِيُّ وَابْنُ حِبَّانَ وَالحَاكِمُ، وَإِسْنَادُهُ عَلَى شَرْطِ مُسْلِمٍ، لَكِن رَجَّحَ بَعْضُهُمْ وَقْفَهُ.

نے روایت کیا ہے اور اس کی سند مسلم کی شرط کے مطابق ہے لیکن بعض نے اس کے موقوف ہونے کو ترجیح دی ہے)

حاصل کلام : اس حدیث سے بھی نماز باجماعت ضروری معلوم ہوتی ہے۔ ابوداؤد میں اسی حدیث کے آخر میں ہے کہ صحابہ کرامؓ نے عرض کیا وہ عذر کیا ہے؟ آپؐ نے فرمایا "خوف اور بیماری" نیز اس میں لا صلاۃ کی بجائے یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کی وہ نماز قبول نہیں کرتا مگر اس کی سند میں ضعف ہے۔ باد و باراں' باد صرصر اور خوف وغیرہ کے ساتھ یہ عذر بھی حدیث سے ثابت ہوتا ہے کہ جس نے کچا پیاز' لہسن' مولی اور گندنا وغیرہ تازہ ہی کھائے ہوں تو وہ مسجد میں نہ آئے کیونکہ ان کے استعمال سے منہ میں ایسی ناخوشگوار بساند پیدا ہو جاتی ہے جو ملائکہ اور نمازیوں کیلئے باعث اذیت ہوتی ہے۔ اسی طرح تمباکو نوش بھی کم از کم نماز کے اوقات میں تمباکو نوشی سے مکمل پرہیز کریں' تاکہ خدا کی مخلوق کو اذیت دینے کا موجب نہ بنیں۔

(٣١٩) وَعَنْ يَزِيْدَ بْنِ الأَسْوَدِ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، أَنَّهُ صَلَّى مَعَ رَسُولِ اللهِ ﷺ صَلاَةَ الصُّبْحِ، فَلَمَّا صَلَّى رَسُولُ اللهِ ﷺ، إِذَا هُوَ بِرَجُلَيْنِ لَمْ يُصَلِّيَا، فَدَعَا بِهِمَا، فَجِيءَ بِهِمَا، تَرْعَدُ فَرَائِصُهُمَا، فَقَالَ لَهُمَا: **«مَا مَنَعَكُمَا أَنْ تُصَلِّيَا مَعَنَا»؟** قَالاَ: قَدْ صَلَّيْنَا فِيْ رِحَالِنَا، قَالَ: **«فَلاَ تَفْعَلاَ، إِذَا صَلَّيْتُمَا فِي رِحَالِكُمَا ثُمَّ أَدْرَكْتُمَا الإِمَامَ وَلَمْ يُصَلِّ فَصَلِّيَا مَعَهُ، فَإِنَّهَا لَكُمَا نَافِلَةٌ»**. رَوَاهُ أَحْمَدُ، وَاللَّفْظُ لَهُ، وَالثَّلاَثَةُ، وَصَحَّحَهُ التِّرْمِذِيُّ وَابْنُ حِبَّانَ.

حضرت یزید بن اسود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ انہوں نے رسول اللہ ﷺ کے ساتھ صبح کی نماز پڑھی۔ جب رسول اللہ ﷺ نماز پڑھ چکے تو دو ایسے آدمیوں پر نظر پڑی جنہوں نے نماز (آپؐ کے ساتھ) نہیں پڑھی۔ آپؐ نے دونوں کو اپنے پاس بلوایا۔ دونوں آپؐ کی خدمت میں حاضر کئے گئے تو (خوف کے مارے) ان کے شانے کانپ رہے تھے۔ آپؐ نے دریافت فرمایا "تمہیں ہمارے ساتھ نماز پڑھنے سے کس چیز نے روکا؟" دونوں نے عرض کیا: ہم اپنے گھروں پر نماز پڑھ چکے ہیں۔ فرمایا "ایسا مت کیا کرو۔ اگر تم اپنے گھروں پر نماز پڑھ چکے ہو پھر تم امام کو پالو اور امام نے ابھی نماز نہ پڑھی ہو تو اس کے ساتھ تم نماز پڑھو' یہ تمہارے لئے نفل ہو جائے گی۔" (اسے احمد نے روایت کیا ہے۔ متن حدیث کے الفاظ بھی اسی کے ہیں۔ اس کے علاوہ تینوں (ترمذی' نسائی اور ابن ماجہ) نے بھی اسے روایت کیا ہے۔ ترمذی اور ابن حبان نے اسے صحیح قرار دیا ہے)

لغوی تشریح: ﴿ اذا ھو ﴾ ھو سے یہاں مراد نبی ﷺ ہیں ﴿ برجلین ﴾ ان سے مراد دو آدمی ہیں جو لوگوں کے آخر میں بیٹھے ہوئے تھے ﴿ فجئی ﴾ اس میں "فا" تعقیب کے لئے اور "جئی" فعل ماضی ہے' صیغہ مجہول ہے مجیئۃ سے۔ معنی ہے ان دونوں کو لایا گیا ﴿ ترعد ﴾ صیغہ مجہول۔ معنی ہیں مضطرب ہونا' کانپنا' خوف اور ڈر کی وجہ سے لرزہ براندام ہونا ﴿ فرائصھما ﴾ جمع فریصۃ ' اس گوشت کو کہتے ہیں جو پہلو اور بازو کے درمیان ہوتا ہے۔ ان کے لرزہ براندام ہونے اور کانپنے کی وجہ سے رسول اللہ ﷺ کی عظمت و ہیبت ہے' حالانکہ آپ کی طبیعت میں تواضع' نرمی اور شفقت توکوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی ﴿ رحالنا ﴾ رحل کی جمع ہے "راء" پر فتح اور "حاء" ساکن ہے۔ معنی جائے سکونت گھر کے ہیں۔ ﴿ فلا تفعلا ﴾ ایسا نہ کرنا یا ایسا تمہیں نہیں کرنا چاہئے۔ یعنی ابھی جو جماعت میں حاضر ہونے کے باوجود تم نے ترک جماعت کا عمل کیا ہے (یہ نہ ہونا چاہئے) ﴿ فانھا لکما نافلۃ ﴾ اس سے وہ نماز مراد ہے جو انہوں نے امام کے ساتھ ادا کی تھی۔ اس لئے کہ فرض نماز تو پہلی نماز کی صورت میں ادا ہو گئی' اب فرض نماز تو کوئی باقی رہی نہیں جو ادا کی جاتی لہٰذا دوسری نماز جو امام کے ساتھ ادا کی تھی وہ نفل نماز قرار پائے گی۔ ابوداؤد اور دارقطنی میں ہے کہ امام کے ساتھ جو نماز پڑھی وہ فرض ہوگی اور جو پہلے اکیلے پڑھی وہ نفل ہوگی۔ مگر یہ روایت ضعیف ہے اور یزید بن اسود کی اس صحیح حدیث کے خلاف ہے۔

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ کوئی شخص پہلے نماز پڑھ چکا ہو اور پھر جماعت کے ساتھ شامل ہونے کا موقع بھی میسر آجائے تو اسے جماعت کے ساتھ شامل ہونا چاہئے خواہ کوئی نماز ہو۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا یہی قول ہے۔ اس کے برعکس امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک صرف ظہر اور عشاء دو نمازوں میں کر سکتا ہے باقی میں نہیں' لیکن جب دوبارہ نماز پڑھنے کی دلیل یہی حدیث ہے تو پھر صبح کی نماز دوبارہ کیوں نہیں پڑھ سکتا؟ اس لئے امام شافعی کا موقف ہی درست ہے۔

راوی حدیث: ﴿ یزید بن اسود رضی اللہ عنہ ﴾ ان کی کنیت ابوجابر سوائی عامری ہے۔ان کے قبیلے کے قریش سے حلیفانہ تعلقات تھے۔ مشہور صحابی ہیں۔ طائف میں فروکش ہوئے۔ ان سے صرف یہی ایک حدیث مروی ہے۔ ان سے ان کے لڑکے جابر رحمۃ اللہ علیہ نے اس روایت کو بیان کیا ہے۔

(۳۲۰) وَعَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «إِنَّمَا جُعِلَ الإِمَامُ لِيُؤْتَمَّ بِهِ، فَإِذَا كَبَّرَ فَكَبِّرُوا، وَلاَ تُكَبِّرُوا حَتَّى يُكَبِّرَ، وَإِذَا رَكَعَ فَارْكَعُوا، وَلاَ تَرْكَعُوا حَتَّى يَرْكَعَ وَإِذَا قَالَ: «سَمِعَ

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ "امام کو اسی لئے مقرر کیا گیا ہے کہ اس کی پیروی کی جائے لہٰذا جب وہ اللہ اکبر کہے تو تم بھی اللہ اکبر کہو اور تم اللہ اکبر نہ کہا کرو' تاآنکہ امام اللہ اکبر کہے اور جب وہ رکوع کرے تو تم بھی رکوع کرو اور تم رکوع اس وقت تک نہ کرو جب

اللَّهُ لِمَنْ حَمِدَهُ» فَقُولُوا: «اللَّهُمَّ رَبَّنَا لَكَ الحَمْدُ» وَإِذَا سَجَدَ فَاسْجُدُوا، وَلاَ تَسْجُدُوا حَتَّى يَسْجُدَ، وَإِذَا صَلَّى قَائِماً فَصَلُّوا قِيَاماً، وَإِذَا صَلَّى قَاعِداً فَصَلُّوا قُعُوداً أَجْمَعِينَ». رَوَاهُ أَبُو دَاوُدَ، وَهَذَا لَفْظُهُ، وَأَصْلُهُ فِي الصَّحِيحَيْنِ.

تک کہ امام رکوع نہ کرے اور جب امام سمع اللہ لمن حمدہ کہے تو تم اللھم ربنا لک الحمد کہو اور جب وہ سجدہ کرے تو تم بھی سجدہ کرو اور اس سے پہلے سجدہ نہ کرو تاوقتیکہ وہ سجدہ کرے اور جب امام کھڑا ہو کر نماز پڑھے تو تم بھی کھڑے ہو کر نماز پڑھو اور جب وہ بیٹھ کر نماز پڑھے تو تم سب بھی بیٹھ کر پڑھو۔" (اسے ابوداؤد نے روایت کیا ہے۔ متن حدیث کے الفاظ ابوداؤد کے ہیں اور اس کی اصل صحیحین (بخاری و مسلم) میں ہے)

لغوی تشریح: ﴿ لیوتم ﴾ تا کہ اس کی اتباع و پیروی اور اقتدا کی جائے ﴿ حتی یرکع ﴾ اس کا مطلب یہ ہے کہ رکوع میں جھک جائے' یہ معنی نہیں کہ رکوع پورا کرے (پھر تم رکوع کرو) ﴿ واذا قال سمع اللہ الخ ﴾ بعض علمائے احناف نے اس سے استدلال کیا ہے کہ سمع اللہ لمن حمدہ کہے اور مقتدی صرف حمد و ثنا کرے لیکن یہ حدیث اس بارے میں واضح نہیں ہے' بلکہ صحیح بخاری میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نماز پڑھاتے ہوئے سمع اللہ لمن حمدہ کے بعد ربنا لک الحمد بھی کہتے تھے۔ اسی طرح مقتدی کا سمع اللہ لمن حمدہ کہنا بھی درست ہے کیونکہ یہ وظیفہ انتقال ہے۔ اس حدیث میں دراصل امام اور مقتدی کو آگاہ کرنا مقصود ہے کہ وہ امام کی اقتدا کس طرح کرے۔ راوی حدیث حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بھی مقتدی کیلئے تسبیح و تحمید پڑھنے کو جائز سمجھتے تھے۔ علامہ سیوطی رحمۃ اللہ علیہ نے اس پر مستقل رسالہ لکھا ہے جو ان کے فتاویٰ الحاوی میں مطبوع ہے۔ ﴿ فصلوا قعودا ﴾ تو تم بھی بیٹھ کر نماز پڑھو۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ وغیرہ نے کہا ہے کہ یہ حکم نبی ﷺ کی مرض کے دوران نماز سے منسوخ ہو چکا ہے' اس لئے کہ آپؐ نے اس وقت امام کی حیثیت سے بیٹھ کر نماز ادا فرمائی تھی اور باقی سب نمازیوں نے کھڑے ہو کر' لیکن امام احمد رحمۃ اللہ علیہ وغیرہ فرماتے ہیں کہ یہ حکم اپنے حال پر باقی ہے' منسوخ نہیں۔ جب امام کے عذر کے دور ہونے کی توقع نہ ہو تو اس وقت مقتدیوں کو بیٹھ کر نماز پڑھنی چاہئے بشرطیکہ قبلہ کا امام مستقل ہو اور نماز کی ابتدا بیٹھ کر کرتا ہو۔ ورنہ مقتدیوں کیلئے قیام ہی متعین ہے۔ مولانا صفی الرحمٰن مبارک پوری رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ امر دراصل وجوب کیلئے ہے۔ اگر حکم کو اس بارے میں کھڑے ہونے پر محمول کریں تو پھر اس میں کوئی شک نہیں کہ آپؐ کے آخری عمل سے یہ منسوخ ہے اور رہا اس کا مندوب ہونے پر محمول کرنا اور مذکورہ شرائط کی قید لگانا تو پھر حدیث سے ایسی کوئی دلیل نہیں کہ نبی ﷺ نے جب اس کا حکم ارشاد فرمایا اس وقت خود ان شرائط کو ملحوظ رکھا۔ بلکہ نبی ﷺ کا ارشاد "واذا صلی قاعدا فصلوا قعودا اجمعین" مطلق حکم کا مقتضی ہے اور شرائط مذکورہ کی بھی کوئی قید نہیں۔ لہٰذا اس حکم کے منسوخ ہونے اور مقتدیوں کیلئے قیام کی

تعین میں ایک راستہ باقی رہ جاتا ہے۔ یعنی یہ حکم منسوخ ہوگیا اور مقتدیوں کیلئے قیام کرنا جائز ہے۔

حاصل کلام: اس حدیث سے ثابت ہوتا ہے کہ مقتدیوں کو امام کی پیروی و اتباع کرنی چاہئے۔ کسی چیز میں امام سے آگے نہ بڑھے۔ تکبیر تحریمہ سے لے کر سلام پھیرنے تک امام کے پیچھے پیچھے رہنے کی کوشش کرے۔ صحابہ فرماتے ہیں کہ جب آپ سجدہ میں سر مبارک رکھ لیتے تو ہم سجدہ کیلئے جھکتے تھے۔ البتہ امام جب سمع اللہ لمن حمدہ کہے تو مقتدی ربنا لک الحمد کہیں۔ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کی یہی رائے ہے اور احناف کا یہی مسلک ہے' لیکن امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے شاگردان رشیدان صاحبین اور اہل حدیث اور امام شافعی رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ مقتدی بھی سمع اللہ کہہ کر ربنا لک الحمد الخ تک کہیں۔

(۳۲۱) وَعَنْ أَبِي سَعِيْدِ الْخُدْرِيِّ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُ، أَنَّ رَسُولَ اللهِ ﷺ رَأَى فِيْ أَصْحَابِهِ تَأَخُّراً، فَقَالَ «تَقَدَّمُوْا، فَائْتَمُّوا بِيْ، وَلْيَأْتَمَّ بِكُمْ مَنْ بَعْدَكُمْ». رَوَاهُ مُسْلِمٌ.

حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اپنے صحابہ کو پیچھے ہٹے ہوئے دیکھا تو فرمایا "آگے آجاؤ اور میری پیروی کرو اور تمہارے پیچھے والے تمہاری پیروی کریں۔" (مسلم)

لغوی تشریح: ﴿تاخرا﴾ پیچھے رہ جانا' دور رہ جانا۔ یعنی وہ آپ کے قریب نہیں پیچھے دور ہو کر کھڑے تھے۔ آپ نے آگے بڑھنے کا حکم فرمایا۔ ﴿فاتموابی﴾ میری اقتدا کرو یہ ائتمام سے امر کا صیغہ ہے۔ اقتداء' پیروی اور اتباع کے معنی میں۔ "ولیاتم" اس میں لام امر کا ہے۔ یہ گرائمر کے اعتبار سے ساکن بھی ہو سکتا ہے اور مکسور بھی ﴿من بعدکم﴾ تمہارے پیچھے والے۔ یعنی تم پہلی صف والے امام کے افعال' حرکات و سکنات اور احکام نماز کو پہلے نبی ﷺ سے حاصل کر لو پھر یہی افعال و احکام اور آداب و صفات نماز تم سے بعد والے یعنی پچھلی صف میں شریک نمازی سیکھ لیں اور اسی طرح ان سے پچھلی صف میں شامل لوگ اپنے سے پہلی میں شریک نمازیوں سے ان آداب و صفات کی تعلیم حاصل کر لیں۔ علی ھذا القیاس۔

حاصل کلام: اس حدیث سے پہلی بات تو یہ معلوم ہوئی کہ نماز باجماعت میں پہلی صف کا درجہ اور مرتبہ دوسری صفوں سے زیادہ ہے اور افضل ہے اور دوسری بات یہ ہے کہ پہلی صف والوں کو امام کی اقتداء کرنی چاہئے۔ اس ضرورت کیلئے امام کو دیکھنا جائز ہے اور دوسری صف والوں کو پہلی صف کے مقتدیوں کی اسی طرح اقتداء کرنی چاہئے۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ جو نمازی براہ راست امام کو نہ دیکھ سکتا ہو اور نہ اس کی آواز سن سکتا ہو تو وہ دوسرے مقتدی کی پیروی کرے۔ اس سے اشارتاً یہ بھی مسئلہ نکلتا ہے کہ جس کے پاس براہ راست کسی چیز کا علم نہ ہو تو اسے دوسرے صاحب علم سے معلوم کر لینا چاہئے۔

(۳۲۲) وَعَنْ زَيْدِ بْنِ ثَابِتٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: اَحْتَجَرَ رَسُولُ

حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے گھاس پھوس سے بنی ہوئی چٹائی

اللهِ ﷺ حُجْرَةً مُخَصَّفَةً، فَصَلَّى فِيْهَا، فَتَتَبَّعَ إِلَيْهِ رِجَالٌ، وَجَاءُوْا يُصَلُّوْنَ بِصَلاَتِهِ، اَلْحَدِيْثَ. وَفِيْهِ: «أَفْضَلُ صَلاَةِ المَرْءِ فِيْ بَيْتِهِ، إِلاَّ المَكْتُوبَةَ». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

سے ایک چھوٹا (خیمہ نما) حجرہ بنایا اور اس میں نماز پڑھنے لگے۔ لوگوں کو جب معلوم ہوا تو وہ آئے اور آپؐ کے ساتھ نماز میں شامل ہوگئے۔ اس حدیث میں یہ بھی ہے کہ مرد کی اپنے گھر میں نماز افضل ہے (سوائے فرض نماز کے)۔ (بخاری، مسلم)

لغوی تشریح: ﴿ احتجر ﴾ حجرہ کی طرح کا ایک خیمہ سا بنایا ﴿ مخصفۃ ﴾ تخصیف سے اسم مفعول ہے۔ چٹائی سے بنایا ہوا۔ ﴿ فتتبع الیہ رجال ﴾ لوگ تلاش کی جستجو اور کاوش کر کے اس جگہ پہنچ گئے جہاں آپؐ نماز ادا فرما رہے تھے۔ حدیث سے ثابت ہوتا ہے کہ نفل نماز کی جماعت کرانا مشروع ہے۔

حاصل کلام: یہ ماہ رمضان کا موقع تھا کہ آپؐ نے اپنے لئے مسجد میں الگ سے ایک مختصر سی مخصوص جگہ بنا لی۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ مقتدیوں اور نمازیوں کیلئے ایسا کرنا باعث ضرر اور تکلیف نہ ہو تو مسجد میں مخصوص جگہ بنائی جا سکتی ہے۔ مکمل روایت کا خلاصہ یہ ہے کہ نبی ﷺ جب نماز پڑھتے تھے تو صحابہ کرامؓ کو علم ہوا تو انہوں نے آپؐ کے پیچھے نماز پڑھنا شروع کر دی۔ آنحضرت ﷺ ایک رات دیر سے اس حجرہ سے باہر نکلے اور فرمایا "میں نے تمہارا حال دیکھ لیا ہے اپنے گھروں میں نماز پڑھو کیونکہ فرض نماز کے علاوہ مردوں کی نماز گھر میں افضل ہے۔"

(۳۲۳) وَعَنْ جَابِرٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: صَلَّى مُعَاذٌ بِأَصْحَابِهِ العِشَاءَ، فَطَوَّلَ عَلَيْهِمْ، فَقَالَ النَّبِيُّ ﷺ: «أَتُرِيْدُ أَنْ تَكُونَ يَا مُعَاذُ فَتَّاناً؟ إِذَا أَمَمْتَ النَّاسَ فَاقْرَأْ «بِالشَّمْسِ وَضُحَاهَا» وَ«سَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الأَعْلَى» وَ«اَقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّكَ» «وَاللَّيْلِ إِذَا يَغْشَى» مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ، وَاللَّفْظُ لِمُسْلِمٍ.

حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ حضرت معاذ رضی اللہ عنہ نے اپنے مقتدیوں کو عشاء کی نماز پڑھائی۔ انہوں نے قرأت لمبی کر دی۔ نبی ﷺ نے فرمایا "اے معاذ! کیا تو نمازیوں کو فتنہ میں مبتلا کرنا چاہتا ہے۔ جب تو لوگوں کو امامت کرائے تو والشمس وضحاھا اور سبح اسم ربک الاعلی (سورۃ شمس وسورۃ اعلی) واقراء باسم واللیل اذا یغشی (سورہ علق وسورہ لیل) پڑھنی چاہئیں۔" (بخاری و مسلم دونوں نے اسے روایت کیا ہے۔ متن حدیث کے الفاظ مسلم کے ہیں)

لغوی تشریح: ﴿ فطول ﴾ تطویل (باب تفعیل) سے ماضی کا صیغہ ہے "فا" برائے تعقیب ہے۔ یعنی قراءت لمبی کر دی۔ صحیح بخاری میں ہے کہ حضرت معاذ رضی اللہ عنہ نے سورۂ بقرہ پہلی رکعت میں اور سورۂ نساء

دوسری رکعت میں پڑھی۔ ﴿ اتریـد ﴾ همزه اس میں سوالیہ ہے (استفہام کیلئے ہے) اور استفہام بھی انکاری ﴿ فتـانـا ﴾ فا پر فتحہ اور "تا" پر تشدید یعنی تو عذاب اور آزمائش میں مبتلا کرنے والا ہے ﴿ امـمـت ﴾ پہلی میم پر فتحہ اور دوسری میم ساکن۔ باب نـصـر یـنـصـر معنی یہ ہوئے کہ جب لوگوں کی امامت کر رہے ہو۔

حاصل کلام : اس حدیث سے ایک تو یہ معلوم ہوا کہ امام کو قرأت اتنی لمبی اور طویل نہیں کرنی چاہئے کہ نمازی تنگ آجائیں اور جماعت سے گریز کریں مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ قرأت اتنی کم ہو کہ مقصد قرأت ہی فوت ہو جائے بلکہ ادائیگی ارکان اور تلاوت کلام مجید میں اعتدال اور توازن ہونا چاہئے اور مسنون طریقے سے نماز پڑھانی چاہئے۔ طویل قرأت بھی جائز ہے' جبکہ نمازی متحمل ہوں۔ حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کی نماز کا واقعہ بخاری نے اس طرح بیان کیا ہے کہ ایک روز حضرت معاذ رضی اللہ عنہ عشاء کی نماز پڑھا رہے تھے اور انہوں نے قراءت معمول سے زیادہ لمبی کر دی۔ ایک راہ چلتا مسافر جس کے پاس دو اونٹنیاں بھی تھیں وہ اپنی اونٹنیاں باہر چھوڑ کر نماز میں شامل ہو گیا جب اس نے دیکھا کہ قراءت بہت طویل ہے تو اس نے نماز توڑ کر الگ بغیر جماعت کے نماز پڑھی اور اپنی راہ لی۔ حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کو معلوم ہوا تو کہا کہ یہ منافق ہے۔ وہ شخص نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کی شکایت کی۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے معاذ رضی اللہ عنہ کو بلوایا اور مذکورہ بالا حدیث کے الفاظ سے نصیحت فرمائی۔ فتنہ میں مبتلا کر دینے کا مطلب یہ ہے کہ مقتدیوں میں ہر قسم کے لوگ ہوتے ہیں۔ بوڑھے' کمزور و ناتواں' ضرورت مند' تھکے ماندے وغیرہ تو ان سب کا لحاظ ملحوظ خاطر رکھنا امام کیلئے ضروری ہے ایسا نہ ہو کہ لوگ اکتا کر نماز باجماعت سے گریز کرنے لگیں۔ دوسری حدیث میں مذکور ہے کہ حضرت معاذ رضی اللہ عنہ فرض نماز پہلے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی امامت میں پڑھ کر پھر جا کر محلہ کی مسجد میں نمازیوں کو فرض نماز پڑھاتے اور خود نفل ادا کرتے تھے۔ عبدالرزاق' شافعی اور طحاوی نے حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے صحیح سند کے ساتھ یہ بیان کیا ہے کہ معاذ رضی اللہ عنہ کی یہ (دوسری) نماز نفل ہوتی تھی۔ ایک مسئلہ یہ بھی ثابت ہوا کہ امام اور مقتدی کی نیت اگر مختلف ہو تب بھی دونوں کی نماز صحیح ہوگی۔ مثلاً امام کی نیت نفل پڑھنے کی ہے اور مقتدی کی فرض کی یا امام نماز ظہر اور مقتدی نماز عصر کی نیت کرے یا اس کے برعکس تو دونوں صورتوں میں دونوں کی نماز جائز ہوگی۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ بھی اسی کے قائل ہیں۔ اس حدیث سے یہ بھی اشارتاً نکلتا ہے کہ مقتدی اگر امام کا کوئی فعل ناپسند سمجھتا ہے اور نماز توڑ کر الگ اپنی نماز ادا کر لیتا ہے (اسی جگہ) تو اس کی نماز ہو جائے گی۔ اگر نہ ہوتی تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم اسے ضرور تنبیہہ فرماتے کہ آئندہ ایسا مت کرنا اور نماز بھی دوبارہ پڑھو۔ ایسا چونکہ نہیں فرمایا اس لئے یہ جائز ہے۔

(٣٢٤) وَعَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهَا، فِيْ قِصَّةِ صَلاَةِ رَسُولِ اللهِ ﷺ بِالنَّاسِ وَهُوَ مَرِيْضٌ، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی اس نماز کے ضمن میں فرماتی ہیں جو انہوں نے لوگوں کو اس حالت میں پڑھائی کہ آپ بیمار تھے کہ آپ تشریف لائے اور

قَالَتْ: فَجَاءَ حَتّٰى جَلَسَ عَنْ يَسَارِ أَبِي بَكْرٍ، فَكَانَ يُصَلِّيْ بِالنَّاسِ جَالِساً، وَأَبُو بَكْرٍ قَائِماً، يَقْتَدِيْ أَبُو بَكْرٍ بِصَلاَةِ النَّبِيِّ ﷺ، وَيَقْتَدِي النَّاسُ بِصَلاَةِ أَبِيْ بَكْرٍ. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت ابوبکرؓ کی بائیں جانب بیٹھ گئے۔ پس آپ ؐ لوگوں کو بیٹھے بیٹھے نماز پڑھا رہے تھے اور حضرت ابوبکرؓ کھڑے ہوئے تھے۔ حضرت ابوبکرؓ نبی ﷺ کی اقتدا کر رہے تھے اور لوگ ابوبکرؓ کی پیروی (میں نماز پڑھ رہے تھے) (بخاری، مسلم)

لغوی تشریح: ﴿ وھو مریض ﴾ یہاں "واؤ" حالیہ ہے۔ ایسی حالت میں تشریف لائے جبکہ آپ ؐ بیمار تھے اور یہ مرض الموت کا واقعہ ہے اور غالب گمان ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی یہ آخری نماز ہے جو آپ ؐ نے باجماعت لوگوں کو پڑھائی۔ اس کے بعد مرض کی شدت کی وجہ سے گھر سے باہر تشریف نہیں لا سکے اور یہ نماز ظہر تھی۔ نبی ﷺ کا ابوبکر رضی اللہ عنہ کی بائیں طرف بیٹھنا اس پر دلالت کرتا ہے کہ وہ امام تھے کیونکہ امام کے محل و مقام پر کھڑے تھے اور یہ حدیث ان حضرات کی دلیل ہے کہ کھڑے ہو کر نماز پڑھنے والے کی نماز بیٹھ کر نماز پڑھنے والے کی اقتدا میں جائز ہے۔

حاصل کلام: یہ حدیث رسول اللہ ﷺ کے مرض الموت کے موقع پر نماز پڑھانے کے بارے میں ہے۔ واقعہ کی مختصر صورت یہ تھی کہ آپ ؐ بیمار ہوگئے۔ بیماری نے شدت اختیار کی۔ اس اثناء میں آپ ؐ ہی کے ارشاد کے بموجب حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ لوگوں کو نماز پڑھانے پر مامور ہوگئے۔ ایک دن آپ ؐ کو قدرے افاقہ ہوا تو آنجناب ﷺ دو آدمیوں کے سہارے مسجد میں تشریف لائے۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ امامت کے فرائض انجام دے رہے تھے۔ آپ ؐ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے بائیں جانب بیٹھ گئے اور نماز پڑھانا شروع کی۔ آپ ؐ امام تھے اس لئے بائیں طرف بیٹھے اور ابوبکر رضی اللہ عنہ مقتدی تھے اس لئے دائیں جانب رہے۔ بیماری کی وجہ سے کمزوری زیادہ ہوگئی تھی اس لئے تکبیروں کیلئے آواز بلند نہیں نکلتی تھی۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ مکبر کا کام دیتے تھے اور آپ ؐ کی تکبیروں کو بلند آواز سے لوگوں کو پہنچاتے تھے تو وہ ارکان نماز ادا کرتے تھے۔ اس حدیث سے شوافع نے استدلال کیا ہے کہ راتب اور افضل امام کے آنے پر دوسرے امام کو اپنی جگہ دے دینی چاہئے۔ مگر ابن عبدالبر نے اسے آنحضرت ﷺ کا ہی خاصہ قرار دیا ہے۔

(۳۲۵) وَعَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُ، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ قَالَ: «إِذَا أَمَّ أَحَدُكُمُ النَّاسَ فَلْيُخَفِّفْ، فَإِنَّ فِيهِمُ الصَّغِيرَ وَالكَبِيرَ والضَّعِيفَ وَذَا الحَاجَةِ، فَإِذَا صَلَّى وَحْدَهُ فَلْيُصَلِّ كَيْفَ شَاءَ». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا "جب تم میں سے کوئی لوگوں کی امامت کے فرائض انجام دے تو اسے قراءت میں تخفیف کرنی چاہئے۔ اس لئے کہ مقتدیوں میں بچے، بوڑھے، کمزور اور حاجت مند لوگ ہوتے ہیں ہاں جب تنہا نماز پڑھے تو پھر جس طرح چاہے پڑھے۔"

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ ایک آدمی جب فرائض امامت ادا کر رہا ہو تو اس وقت نماز

میں لمبی لمبی قراءت سے احتیاط کرنی چاہئے اس لئے کہ اس میں ہر قسم کے لوگ شریک ہوتے ہیں۔ سب کی ضروریات و حاجات پیش نظر رکھنی چاہئیں۔ البتہ جب ایک آدمی اکیلا نماز پڑھتا ہے تو اسے اپنے اشغال، ضروریات اور حالات کا اچھی طرح علم ہوتا ہے تو ایسے آدمی کو فرصت اور قوت کے اوقات میں جتنی چاہے لمبی قراءت کرے اسے اختیار ہے مگر بیماری اور ضرورت کے وقت اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈالنا کسی صورت میں بھی درست اور جائز نہیں۔ شریعت نے نفس کا بھی حق رکھا ہے۔

(٣٢٦) وَعَنْ عَمْرِو بْنِ سَلَمَةَ قَالَ: قَالَ أَبِيْ: جِئْتُكُمْ مِنْ عِنْدِ النَّبِيِّ ﷺ حَقًّا، قَالَ: «فَإِذَا حَضَرَتِ الصَّلَاةُ فَلْيُؤَذِّنْ أَحَدُكُمْ، وَلْيَؤُمَّكُمْ أَكْثَرُكُمْ قُرْآناً»، قَالَ: فَنَظَرُوْا، فَلَمْ يَكُنْ أَحَدٌ أَكْثَرَ قُرْآناً مِنِّيْ، فَقَدَّمُوْنِيْ، وَأَنَا ابْنُ سِتٍّ أَوْ سَبْعِ سِنِيْنَ. رَوَاهُ الْبُخَارِيُّ وَأَبُو دَاوُدَ وَالنَّسَائِيُّ.

حضرت عمرو بن سلمہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ میرے والد نے اپنی قوم سے کہا کہ میں تمہارے پاس رسول اللہ ﷺ کے ہاں سے حق لے کر آرہا ہوں ان کا ارشاد گرامی ہے کہ "جب نماز کا وقت ہو جائے تو تم میں سے کوئی ایک اذان کہے اور امامت ایسا شخص کرائے جو قرآن حمید کا زیادہ عالم ہو۔" عمرو نے کہا (میری قوم نے دیکھا میرے سوا کوئی دوسرا قرآن کا عالم نہیں ہے تو انہوں نے مجھے آگے کر دیا۔ اس وقت میری عمر چھ، سات برس کی تھی۔) (بخاری، ابوداؤد اور نسائی)

لغوی تشریح: ﴿قال ابی: جئتکم من عند النبی صلی اللہ علیہ وسلم حقا﴾ یہ صاحب فتح مکہ کے بعد اپنی قوم کے آنے والے وفد میں نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے تھے اور یہ لوگ دائرہ اسلام میں داخل ہونے کیلئے فتح (فتح مکہ) کا اسی طرح انتظار کر رہے تھے جس طرح باقی ماندہ عرب منتظر تھا کہ اس معرکہ آرائی کا اونٹ کس کروٹ بیٹھتا ہے۔ پس جب فتح مکہ کا عمل اپنے انجام کو پہنچ گیا (مکہ فتح ہوگیا) اور اہل عرب کو خوب معلوم ہوگیا کہ رسول اللہ ﷺ جو پیغام لے کر تشریف لائے ہیں مبنی بر صداقت اور سراسر حق ہے تو یہ لوگ پے درپے اسلام لانے کیلئے آپؐ کی خدمت میں حاضر ہونے لگے ﴿فلم یکن احد اکثر قرآنا منی﴾ ان میں مجھ سے زیادہ ایک بھی قرآن کا عالم نہیں تھا۔ اس کا سبب اس نے یہ بیان کیا ہے کہ ہم لوگ آپؐ کی خدمت میں حاضر ہونے کیلئے جا رہے تھے کہ راستہ میں ہمارے پاس سے لوگ گزرتے تھے اور ہمیں یہ اطلاع دیتے تھے کہ رسول اللہ ﷺ نے یوں ارشاد فرمایا، اس طرح فرمایا۔ میں چونکہ ابھی بچہ تھا ان کی زبان سے سن سن کر قرآن مجید کا کافی حصہ ازبر کر چکا تھا اس لئے میرے قافلہ والوں نے مجھے اپنے لئے بطور امام منتخب کیا۔ یہ حدیث دلیل ہے کہ نابالغ فرض نمازوں کی امامت کرا سکتا ہے۔ جب فرض نماز کی امامت درست اور صحیح ہے تو نوافل کی جماعت بالاولیٰ کرا سکتا ہے۔

حاصل کلام: اس حدیث نے امام کیلئے ایک اصول مقرر کیا ہے کہ جو قرآن مجید زیادہ جانتا ہو' امامت کے منصب کیلئے اسی کا انتخاب کیا جائے۔ جیسا کہ عمرو رضی اللہ عنہ کو اس کی قوم کے لوگوں نے منتخب کیا۔ اس حدیث سے ایک بات یہ بھی واضح ہوتی ہے کہ امامت کا منصب اذان کے منصب سے افضل ہے اس لئے کہ مؤذن کیلئے کسی قسم کی شرط نہیں لگائی گئی صرف حسن صوت اور بلند آواز والا ہونا چاہئے۔ چھ سات سالہ بچے کو امام مقرر کرنا صرف اسی وجہ سے تھا کہ اسے دوسروں کے مقابلہ میں قرآن زیادہ یاد تھا۔ حسن بصری رحمہ اللہ' امام شافعی رحمہ اللہ' ابن راھویہ رحمہ اللہ اور اہلحدیث اس کے قائل ہیں کہ نابالغ لڑکے کی امامت میں بڑے بوڑھے لوگوں کی نماز درست ہے مگر امام مالک رحمہ اللہ اور امام ثوری رحمہ اللہ وغیرہ اسے مکروہ سمجھتے ہیں۔ امام احمد رحمہ اللہ اور امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ سے دو قول منقول ہیں دونوں میں مشہور قول یہ ہے کہ بچہ (نابالغ) کی امامت میں نفل نماز درست ہے اور فرض نماز جائز نہیں۔ یہ حضرات کہتے ہیں کہ عمرو بن سلمہ کو امام نہ تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان کے تحت مقرر کیا گیا اور نہ ہی آپؐ سے پوچھ کر اس کا انتخاب کیا گیا۔ یہ دلیل اتنی وزنی نہیں کہ اسے درخور اعتنا سمجھا جائے۔ اس کا تقرر و انتخاب اگر درست نہ ہوتا تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم بذریعہ وحی لازماً اسے آئندہ کیلئے روک دیتے مگر ایسا نہیں ہوا۔ چونکہ اس کا تعلق اسلام کے بڑے اہم رکن نماز سے ہے اس لئے اگر یہ درست نہ ہوتا تو اسے ضرور ممنوع قرار دے دیا جاتا یا پھر نفلی اور فرضی امامت کی وضاحت کر دی جاتی کہ نفل میں اس کی گنجائش ہے اور فرض میں نہیں۔ ایسا بھی کہیں نہیں لہٰذا قرین صواب یہی ہے کہ ضرورت کے وقت ایسا کرنا بلا کراہت درست ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

راوی حدیث: ﴿عمرو بن سلمہ رضی اللہ عنہ﴾ سلمہ کے لام کے نیچے کسرہ ہے۔ جرم قبیلہ سے ہونے کی وجہ سے جرمی کہلائے۔ ابویزید یا ابوبرید کنیت تھی۔ اپنے والد کی معیت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے' اس وقت ان کی عمر چھ سات برس تھی۔ ایک قول یہ بھی ہے کہ یہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر نہیں ہوئے۔ عمرو بن سلمہ اور قبیلہ بنو سلمہ کے علاوہ باقی تمام جگہ سلمہ کے لام پر فتحہ ہے اور ان دونوں پر لام کے نیچے کسرہ ہے۔

(۳۲۷) وَعَنِ ابْنِ مَسْعُودٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «يَؤُمُّ الْقَوْمَ أَقْرَؤُهُمْ لِكِتَابِ اللهِ تَعَالَى، فَإِنْ كَانُوا فِي الْقِرَاءَةِ سَوَاءً فَأَعْلَمُهُمْ بِالسُّنَّةِ، فَإِنْ كَانُوا فِي السُّنَّةِ سَوَاءً فَأَقْدَمُهُمْ هِجْرَةً، فَإِنْ كَانُوا فِي الْهِجْرَةِ سَوَاءً فَأَقْدَمُهُمْ سِلْماً - وَفِي رِوَايَةٍ «سِنا» - وَلاَ يَؤُمَّنَّ

حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "لوگوں کا امام ایسا آدمی ہو جسے قرآن حمید کا علم زیادہ ہو۔ اگر اس وصف میں لوگ مساوی ہوں پھر وہ امام بنے جسے سنت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کا علم زیادہ ہو اور اگر سنت کے علم میں بھی لوگ مساوی ہوں تو پھر وہ امام بنے جس نے ہجرت پہلے کی ۔ اگر اس وصف میں سب برابر ہوں تو پھر وہ امام بنے جس نے پہلے اسلام قبول کیا ہو اور ایک روایت

الرَّجُلُ الرَّجُلَ فِي سُلْطَانِهِ، وَلاَ يَقْعُدُ فِي بَيْتِهِ عَلَى تَكْرِمَتِهِ، إِلاَّ بِإِذْنِهِ». رَوَاهُ مُسْلِمٌ.

میں سلما (اسلام) کی بجائے سنا (عمر) کا لفظ بھی ہے یعنی اگر مذکورہ بالا اوصاف میں سبھی برابر ہوں تو پھران میں جس کی عمر زیادہ ہو اسے امام بنایا جائے۔ کوئی آدمی کسی آدمی کے دائرہ اقتدار میں امامت نہ کرائے اور نہ گھر میں اس کی مخصوص نشست (بستر) پر اس کی اجازت کے بغیر بیٹھے۔" (مسلم)

لغوی تشریح: ﴿ اقروھم لکتاب اللہ ﴾ اس جملہ کا ظاہری مفہوم تو یہی ہے کہ ایسا آدمی امام بنے جسے قرآن کا زیادہ حصہ حفظ ہو اور بعض نے کہا ہے کہ اس سے مراد یہ ہے کہ قرآن کو زیادہ جاننے والا یعنی احکام شریعت سے زیادہ واقف ہو لیکن ﴿ فان کانوا فی القراۃ سواء فاعلمھم بالسنۃ ﴾ سے پہلے مفہوم کی تائید ہوتی ہے۔ ﴿ سلما ﴾ سین کے نیچے کسرہ اور لام ساکن۔ اسلام کے معنی ﴿ وفی روایۃ سنا ﴾ ایک دوسری روایت میں سلما کی جگہ لفظ "سنا" بھی منقول ہے ﴿ ولا یومن ﴾ امامت سے ماخوذ ہے صیغۂ مجہول ہے اور نون اس جگہ نون تاکید ہے (یعنی نون ثقیلہ) ﴿ الرجل الرجل ﴾ پہلا الرجل فاعل ہونے کی وجہ سے مرفوع ہے اور دوسرا مفعول ہونے کی وجہ سے منصوب ہے۔ ﴿ فی سلطانہ ﴾ اس کے دائرہ اقتدار میں' ہ کی ضمیر اس میں دوسرے آدمی کی طرف راجع ہے اور اسی طرح (فی بیتہ) اور ﴿ فی تکرمتہ ﴾ کے قول میں بھی ہ کی ضمیر دوسرے شخص کی طرف جاتی ہے ﴿ التکرمۃ ﴾ "تا" پر فتحہ' کاف ساکن اور "را" پر کسرہ۔ ایسے بستر وغیرہ اور تکئے جو صاحب خانہ کیلئے مخصوص ہوتے ہیں ﴿ الا باذنہ ﴾ بظاہر یہ استثناء دونوں صورتوں کیلئے ہے' امامت اور بستر مخصوص پر بیٹھنا اجازت کے ساتھ مشروط ہے اگر اجازت مل جائے تو دونوں جائز ہیں۔

حاصل کلام: اس حدیث کی رو سے امامت ایسے شخص کے سپرد کی جانی چاہئے جو قرآن کو زیادہ یاد رکھتا ہو' سنت سے باخبر ہو' دین کی خاطر ترک وطن کی سعادت' قبول اسلام میں اولیت رکھتا ہو اور عمر رسیدہ ہو کیونکہ زیادہ امید ہے کہ جس کی عمر دراز ہوگی اس کے اعمال حسنہ بھی زیادہ ہوں گے۔

(۳۲۸) وَلِابْنِ مَاجَهْ مِنْ حَدِيْثِ جَابِرٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ: «وَلاَ تَؤُمَّنَّ امْرَأَةٌ رَجُلاً، وَلاَ أَعْرَابِيٌّ مُهَاجِراً، وَلاَ فَاجِرٌ مُؤْمِناً»، وَإِسْنَادُهُ وَاهٍ.

ابن ماجہ میں حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ "کوئی عورت کسی مرد کی امام نہ بنے اور نہ کوئی بدوی دیہاتی کسی مہاجر کی امامت کرائے اور نہ کوئی فاجر کسی مومن کا امام بنے۔" اس روایت کی سند (واہ) ضعیف ہے۔

لغوی تشریح: اس روایت میں دیہاتی و بدوی کا مہاجر کی امامت کی ممانعت کو کراہت پر محمول کیا گیا ہے کیونکہ بدوی لوگ ابتداء اسلام میں مہاجرین کے مقابلہ میں قرآن کی تعلیم اور علم دین سے کم واقف تھے

﴿ واسنادہ واہ ﴾ واہ کا معنی ضیعف و کمزور ہے۔ اس لئے کہ اس کی سند میں ایک راوی عبداللہ بن محمد عدوی ایسا ہے جسے وکیع نے وضع حدیث کے الزام سے متہم کیا ہے اور عبداللہ بن محمد کے شیخ استاد علی بن زید بھی ضعیف ہیں یہ روایت ایک اور سند سے بھی منقول ہے مگر ان میں ایک راوی عُبدالملک بن حبیب ایسا ہے جسے احادیث کی چوری کرنے اور سندوں کو خلط ملط کرنے کے الزام سے متہم کیا گیا ہے۔

حاصل کلام : یہ روایت نہایت ہی کمزور سند سے منقول ہے' اس لئے اس سے مسائل کا استنباط کرنا درست نہیں۔

(۳۲۹) وَعَنْ أَنَسٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ قَالَ: «رُصُّوا صُفُوفَكُمْ، وَقَارِبُوا بَيْنَهَا، وَحَاذُوا بِالأَعْنَاقِ». رَوَاهُ أَبُو دَاوُدَ وَالنَّسَائِيُّ، وَصَحَّحَهُ ابْنُ حِبَّانَ.

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی ﷺ کا ارشاد گرامی ہے "اپنی صفوں کو مضبوطی سے ملاؤ اور ان کے درمیان فاصلہ کم رکھو اور اپنی گردنوں کو ایک محاذ پر رکھو (برابر برابر رکھو) " (اسے ابوداؤد' نسائی نے روایت کیا ہے اور ابن حبان نے اسے صحیح قرار دیا ہے۔)

لغوی تشریح : ﴿ رصوا ﴾ "را" پر ضمہ اور صاد پر تشدید "رص الجدار او البناء" سے امر ہے یعنی دیوار یا عمارت کی ایک اینٹ کو دوسری کے ساتھ ملا کر یا جوڑ کر اس طرح مضبوط اور پختہ کیا جائے کہ درمیان میں کوئی خلا اور خالی جگہ نہ چھوڑی جائے۔ اس سے "رص الصف" ہے جس کا مطلب ہے کہ نمازی اپنی صفوں کو ایک دوسرے سے قدم سے قدم اور کندھے سے کندھے کو ملا کر درمیان میں کوئی خلا اور خالی جگہ نہ چھوڑ کر ایسی مضبوطی سے بنائیں کہ چنی ہوئی مضبوطی اور پختہ دیوار معلوم ہوں ﴿ وقاربوا بینھا ﴾ بایں طور کہ دو صفوں کے درمیان ضرورت سے زیادہ فاصلہ نہ چھوڑیں ﴿ وحاذوا بالاعناق ﴾ گردنوں کو ایک دوسرے کے بالمقابل رکھیں۔ بایں طور پر کہ سب نمازیوں کی گردنیں ایک ہی صف میں سیدھی معلوم ہوں۔ ایسا نہ ہو کہ کسی نمازی کی گردن امام کی طرف نکلی ہوئی معلوم ہو اور کسی کی پیچھے نکلی ہوئی۔

حاصل کلام : اسلام میں صف بندی اور شیرازہ بندی کی بڑی تاکید اور اہمیت ہے۔ اس کی تربیت و ٹریننگ اسلام کے اہم ترین بنیادی رکن' نماز میں صف بندی کے ذریعہ سے دی گئی ہے۔ جہاد میں نبیان مرصوص کی جتنی ضرورت و اہمیت ہے۔ اس کے بیان کرنے کی اس مقام پر چنداں ضرورت نہیں' اشارہ ہی کافی ہے۔ صف بندی میں اگر رخنہ پڑ جائے یا صفوں میں خلل واقع ہو جائے تو باہمی ربط و ضبط اور محبت میں بھی خلل پڑ جاتا ہے۔ اسلام دلوں کو جوڑنے اور باہمی تعلقات کو استوار کرنا چاہتا ہے اور اسلامی برادری میں مساوات کے ذریعہ ایک ہی صف میں محمود و ایاز کو کھڑا کرنا چاہتا ہے۔ شیطانی دخل اندازی سے اسے

بچانا اور محفوظ رکھنا چاہتا ہے۔ چنانچہ صحیحین میں روایت ہے کہ نماز کھڑی ہونے کے موقع پر نبی کریم ﷺ نے نمازیوں کی طرف رخ موڑ کر فرمایا کہ "اپنی صفوں کو سیدھا کرو ورنہ اللہ تعالیٰ تمہارے دلوں میں کجی و ٹیڑھ اور مخالفت ڈال دے گا۔" راوی کا بیان ہے کہ میں نے نمازیوں کو دیکھا کہ جماعت میں اپنا کندھا دوسرے کے کندھے سے اور اپنا قدم ساتھ والے کے قدم سے ملایا کرتے تھے۔ آنحضور ﷺ نے قسم کھا کر فرمایا "قسم ہے مجھے اس ذات اقدس کی جس کے قبضۂ قدرت میں میری جان ہے۔ میں دیکھتا ہوں کہ شیطان صفوں کے درمیان بھیڑ کے بچہ کی صورت میں گھس جاتا ہے" یعنی وہ نمازیوں کے دلوں میں وسوسہ ڈالتا ہے۔ خشوع و خضوع سے بیگانہ کر دیتا ہے۔ توجہ الی اللہ سے ہٹانے کی کوشش کرتا ہے۔ نماز میں صفوں کی درستگی کے بارے میں اور بھی بہت سی احادیث منقول ہیں الغرض نماز باجماعت کی صورت میں صف بندی کی بہت تاکید ہے۔ مل کر کھڑا ہونا چاہئے اور درمیان میں قطعاً جگہ نہیں چھوڑنی چاہئے۔

(٣٣٠) وَعَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «خَيْرُ صُفُوفِ الرِّجَالِ أَوَّلُهَا، وَشَرُّهَا آخِرُهَا، وَخَيْرُ صُفُوفِ النِّسَاءِ آخِرُهَا، وَشَرُّهَا أَوَّلُهَا». رَوَاهُ مُسْلِمٌ.

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا مردوں کی بہترین اور سب سے زیادہ خیروبھلائی والی صف' ان کی پہلی صف ہے اور بدترین اور بڑی صف ان کی آخری صف ہے اور خواتین کی بہترین اور خیروبھلائی ان کی آخری صف ہے اور بدترین اور بری صف ان کی پہلی صف ہے۔ (مسلم)

لغوی تشریح: ﴿ اولھا ﴾ پہلی صف سے مراد وہ صف ہے جو امام کے متصل ہوتی ہے۔ ﴿ وشرھا آخرھا ﴾ جس میں خیر و بھلائی اور اجر و ثواب کم ہو وہ صف ہے جو سب سے آخر میں ہے۔ اس سے یہ مراد نہیں کہ جو اس صف میں شامل ہوگا وہ گناہ گار ہوگا۔ آخری صف کو شر الصفوف اس وجہ سے قرار دیا گیا ہے کہ پہلی صف میں شریک نمازی سے اس کا معاملہ برعکس ہوتا ہے اور خواتین کی آخری صف کو بہترین اور خیر و بھلائی والی صف قرار دیا گیا ہے برعکس مردوں کی صفوف کے کیونکہ خواتین کا آخری صف میں ہونا مردوں سے دور رہنے کا موجب ہے نیز ان کے دیکھنے اور ان کی گفتگو سننے سے دور رہتی ہیں۔

حاصل کلام: جماعت میں مردوں اور عورتوں کی صفوں میں تفاوت اپنے اندر بھلائی اور بہتری کے کئی پہلو سمیٹے ہوئے ہے۔ پہلی صف میں شریک نمازی عموماً وہی ہوں گے جو مسجد میں پہلے آئے ہوں۔ مسجد میں پہلے آنا بھی باعث ثواب ہے نیز پہلی صف میں شامل لوگ صاحب علم' بزرگ اور دینی فہم زیادہ رکھنے والے ہوں گے۔ امام کے دوسرے نمازیوں کی بہ نسبت زیادہ قریب ہونے کی وجہ سے براہ راست فائدہ اٹھاتے ہیں۔ تلاوت قرآن' تکبیرات سنتے ہیں۔ خواتین سے دور رہنے کی وجہ سے خلل انداز ہونے والے وسوسوں اور برے خیالات سے بچے رہتے ہیں۔ مردوں کی سب سے پچھلی صف میں شریک نمازی ان سے

محروم رہتے ہیں۔ اس لئے اجر و ثواب میں کمی واقع ہو جاتی ہے کیونکہ برائی اور بھلائی دونوں نسبتی معاملات ہیں۔ خواتین کی سب سے آخری صف اس لئے بہتر ہے کہ ایک عورتیں دیر سے مسجد میں آئیں گی۔ مردوں سے دور ہوں گی کیونکہ مرد و زن کا اختلاط اچھے نتائج و ثمرات بر آمد نہیں کرتا۔ یہ حکم ایسی صورت واقعہ کیلئے ہے جہاں مردوں اور عورتوں کی صفیں آگے پیچھے ہوں ورنہ اگر عورتیں الگ جگہ میں ہوں تو پھر ان کی بھی پہلی صف بہتر شمار ہوگی یا یہ صورت ہو کہ عورتوں کی جماعت الگ سے ہو اور ان کی امامت (پہلی صف کے درمیان میں کھڑے ہو کر) عورت ہی کر رہی ہو تو ایسی صورت میں بھی خواتین کی پہلی صف بہترین اجر و ثواب کی مستحق ہے اور آخری کم ثواب کی۔

(۳۳۱) وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُمَا قَالَ: صَلَّيْتُ مَعَ رَسُولِ اللّٰهِ ﷺ ذَاتَ لَيْلَةٍ، فَقُمْتُ عَنْ يَسَارِهِ، فَأَخَذَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ بِرَأْسِيْ مِنْ وَّرَائِيْ، فَجَعَلَنِيْ عَنْ يَمِينِهِ، مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ میں نے ایک رات رسول اللہ ﷺ کے ساتھ نماز ادا کی میں آپؐ کے بائیں جانب کھڑا ہوگیا۔ رسول اللہ ﷺ نے پیچھے سے میرا سر پکڑا اور مجھے اپنی دائیں جانب کھڑا کر لیا۔ (بخاری و مسلم)

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ اگر جماعت سے نماز پڑھنے والے دو ہی شخص ہوں تو مقتدی کو امام کے دائیں طرف کھڑا ہونا چاہئے اور اگر غلطی و نادانی سے مقتدی بائیں طرف کھڑا ہو جائے تو امام اسے اپنے دائیں طرف کھینچ کر (یا اشارہ سے) کر لے۔ اتنے سے عمل سے نماز فاسد نہیں ہوتی کیونکہ یہ فعل بھی نماز ہی کیلئے کیا گیا ہے۔ نماز سے باہر کے کسی کام کیلئے نہیں۔ مقتدی کو بھی فوراً تعمیل کر کے بائیں سے دائیں جانب آجانا چاہئے۔ تبدیلی مکان و جگہ سے نماز فاسد نہیں ہوتی جو تبدیلی نماز کی اصلاح و درستگی کیلئے کی گئی ہو۔ نیز اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ جماعت دو افراد سے بھی ہو جاتی ہے ۔ گویا دو کی تعداد جماعت کی تعریف میں آجاتے ہیں۔ مزید برآں یہ بھی معلوم ہوا کہ نفل نماز کی جماعت بھی جائز ہے۔

(۳۳۲) وَعَنْ أَنَسٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: صَلَّى رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ، فَقُمْتُ أَنَا وَيَتِيْمٌ خَلْفَهُ، وَأُمُّ سُلَيْمٍ خَلْفَنَا . مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ، وَاللَّفْظُ لِلْبُخَارِيِّ.

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے نماز پڑھائی میں اور یتیم دونوں نے آپ کے پیچھے نماز پڑھی اور ام سلیم رضی اللہ عنہا نے ہمارے پیچھے (تنہا) نماز ادا کی۔ (بخاری و مسلم۔ متن حدیث کے الفاظ بخاری کے ہیں)

حاصل کلام: اس حدیث سے بھی ثابت ہوا کہ نفل نماز کی جماعت جائز ہے۔ نیز اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ عورت اگر اکیلی ہو تو وہ اکیلی ہی صف میں کھڑی ہوگی۔ مردوں یا بچوں کے ساتھ کھڑی نہیں ہوگی۔ مرد پہلے، بعد میں بچوں کی صف اور آخر میں عورتوں کی صف ہونی چاہئے۔ البتہ ایک آدمی ہو تو بچے کو

ساتھ کھڑا کر کے ایک ہی صف بنانی چاہیئے۔ خیر و برکت کے حصول کے نقطہ نظر سے گھر میں کسی نیک شخصیت کی امامت میں نماز نفل پڑھنی جائز ہے۔ ام سلیم راوی حدیث حضرت انس رضی اللہ عنہ کی والدہ تھیں۔ انہوں نے حضرت انس رضی اللہ عنہ کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت گاری کیلئے پیش کیا تھا۔ اس حدیث سے صاف طور پر معلوم ہوا کہ عورت اپنے لخت جگر کے ساتھ بھی نماز ادا کرنے کیلئے ایک صف میں کھڑی نہیں ہو سکتی۔

(۳۳۳) وَعَنْ أَبِي بَكْرَةَ أَنَّهُ انْتَهَى إِلَى النَّبِيِّ ﷺ وَهُوَ رَاكِعٌ، فَرَكَعَ قَبْلَ أَنْ يَصِلَ إِلَى الصَّفِّ، ثم مشي إلى الصف وَذَكَرَ ذَلِكَ لِلنَّبِيِّ ﷺ، فَقَالَ لَهُ النَّبِيُّ - ﷺ -: «**زَادَكَ اللَّهُ حِرْصاً، وَلاَ تَعُدْ**». رَوَاهُ الْبُخَارِيُّ، وَزَادَ أَبُو دَاوُدَ فِيهِ: «فَرَكَعَ دُوْنَ الصَّفِّ، ثُمَّ مَشَى إِلَى الصَّفِّ».

حضرت ابوبکرہ رضی اللہ عنہ سے نے بتایا کہ وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس عین اس وقت پہنچے جبکہ آپؐ رکوع فرما رہے تھے۔ پس انہوں نے صف تک پہنچنے سے پہلے ہی رکوع کر لیا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ”اللہ تعالیٰ تیری حرص و طمع میں اضافہ فرمائے آئندہ ایسا مت کرنا“ (بخاری)

ابوداؤد نے اتنا اضافہ نقل کیا ہے کہ انہوں نے رکوع کیا صف میں شامل ہونے سے پہلے پھر حالت رکوع ہی میں چل کر صف میں شامل ہوئے۔

لغوی تشریح: ﴿ولا تعد﴾ بظاہر یہ ”عود“ سے ماخوذ معلوم ہوتا ہے جس کے معنی ہیں کہ آئندہ ایسا مت کرنا۔ اس حدیث سے استدلال کیا گیا ہے منفرد کی نماز صف کے پیچھے پڑھنا جائز ہے کیونکہ ابوبکرہ نے اپنی نماز کا آغاز صف میں شامل ہونے سے پہلے ہی کر لیا تھا۔ مگر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو نماز دوبارہ پڑھنے کا حکم نہیں دیا۔ لیکن یہ درست نہیں کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد لا تعد اس فعل کی عدم صحت پر دلالت کرتا ہے اور رہا یہ معاملہ کہ آپؐ نے اسے نماز کے لوٹانے اور دوبارہ پڑھنے کا حکم نہیں دیا تو وہ اس لئے نہیں دیا کہ اس وقت وہ اس کی حکمت نہیں جانتا تھا اور کسی چیز کا علم نہ ہونا عذر تسلیم کیا جاتا ہے۔ اگر بایں صورت نماز صحیح ہونا تسلیم کر لیا جائے تو پھر بھی اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ ایک تنہا آدمی صف کے پیچھے نماز پڑھ لے تو اس کی نماز صحیح ہوگی۔ اس قسم کے معمولی سے فعل کو تو درگزر اور نظرانداز کر دیا جاتا ہے بالخصوص جبکہ دوڑ کر کوشش سے پہلی صف میں داخل ہونے کی نیت پہلی مرتبہ کی ہو اور جب فعل ہمیشہ اور مسلسل ہو تو پھر مستقل حکم کا تقاضا کرتا ہے جو صحت پر مبنی ہو یا فساد پر اور جس کی ابتدا اور آغاز درست اور صحیح ہو کوئی ضروری اور لازمی نہیں کہ اس کو باقی رکھنا بھی صحیح ہو۔ بہت سی احادیث اس پر دلالت کرتی ہیں کہ منفرد کی نماز صف کے پیچھے نہیں ہوتی جیسا کہ آئندہ حضرت وابصہ رضی اللہ عنہ کی روایت سے معلوم ہوتا ہے۔ اس حدیث سے یہ بھی استدلال کیا گیا ہے کہ جس آدمی نے امام کے ساتھ رکوع پا لیا اس نے رکعت پا لی، کیونکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے اس رکعت کے اعادہ کا حکم نہیں دیا۔ مگر یہاں اس بات کا احتمال ہے کہ حضرت ابوبکرہ رضی اللہ عنہ اس مسئلہ سے بخوبی آگاہ ہوں کہ رکوع میں شامل ہونے والے کی رکعت

نہیں ہوتی اور یوں انہوں نے رکعت پوری کر لی ہو تو اس صورت میں نماز کو دہرانے کا حکم دینے کی ضرورت ہی نہیں تھی۔

(٣٣٤) وَعَنْ وَابِصَةَ بْنِ مَعْبَدٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُ، أَنَّ رَسُولَ اللهِ ﷺ رَأَى رَجُلاً يُصَلِّيْ خَلْفَ الصَّفِّ وَحْدَهُ، فَأَمَرَهُ أَنْ يُعِيْدَ الصَّلاَةَ. رَوَاهُ أَحْمَدُ وَأَبُو دَاوُدَ وَالتِّرْمِذِيُّ، وَحَسَّنَهُ، وَصَحَّحَهُ ابْنُ حِبَّانَ.

حضرت وابصہ بن معبد رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی نظر ایسے آدمی پر پڑی جو صف کے پیچھے تنہا کھڑا نماز پڑھ رہا تھا۔ آپؐ نے اسے نماز کو دوبارہ پڑھنے کا حکم ارشاد فرمایا۔ (احمد' ابوداؤد اور ترمذی نے اسے روایت کیا ہے۔ ترمذی نے اس کو حسن قرار دیا ہے اور ابن حبان نے اسے صحیح کہا ہے)

وَلَهُ عَنْ طَلْقٍ: لاَ صَلاَةَ لِمُنْفَرِدٍ خَلْفَ الصَّفِّ. وَزَادَ الطَّبْرَانِيُّ فِي حَدِيْثِ وَابِصَةَ: أَلاَ دَخَلْتَ مَعَهُمْ أَوِ اجْتَرَرْتَ رَجُلاً؟

اور اس طرح طلق بن علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ صف کے پیچھے اکیلے آدمی کی نماز نہیں ہوتی اور طبرانی نے وابصہ کی حدیث میں اتنا اضافہ بھی نقل کیا ہے کہ ''تو ان کے ساتھ ہی داخل کیوں نہ ہو گیا یا پھر تو کسی نمازی کو پہلی صف میں سے پیچھے کھینچ لیتا۔''

لغوی تشریح : ''الادخلت'' ھمزہ استفہام کا ہے ساتھ ہی معنی نفی کا دے رہا ہے یا پھر ھمزہ پر فتحہ ہے اور لام پر تشدید ہے۔ اس صورت میں اسے حرف تحضیض قرار دیا گیا ہے۔ ابھارنے اور برانگیختہ کرنے والا حرف ﴿ اجتررت رجلا ﴾ اگلی صف میں سے ایک آدمی کو کھینچ کر اپنے ساتھ کھڑا کر لیتا۔ یہ دونوں احادیث صفؔ کے پیچھے تنہا نماز پڑھنے والے کی نماز کو باطل قرار دیتی ہیں۔

حاصل کلام : اس مسئلہ میں اختلاف ہے کہ صف کے پیچھے منفرد (اکیلے) آدمی کی نماز درست ہے یا نہیں۔ امام احمد رحمہ اللہ اور بعض دیگر اہل علم کے نزدیک صف کے پیچھے اکیلے آدمی کی نماز نہیں ہوتی۔ دلیل اس کی یہی حدیث ہے کہ جس میں حضور ﷺ نے ایسے آدمی کو دوبارہ نماز پڑھنے کا ارشاد فرمایا ہے اور بعض کہتے ہیں کہ ایسے شخص کی نماز ہو جاتی ہے۔ اس آدمی کو تو آپؐ نے بطور تنبیہہ نماز دوبارہ پڑھنے کی تلقین فرمائی تھی۔ اس بارے میں صحیح احادیث سے جو معلوم ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ اگلی صف کو مکمل اور پورا کیا جائے اگر پہلی صف میں جگہ نہ ہو تو اکیلے ہی پڑھ لو کیونکہ درمیان میں سے آدمی کو کھینچ کر اپنے ساتھ ملانے کی صورت میں پہلی صف میں خلا پیدا ہو جائے گا جسے پر کرنے کیلئے نمازیوں کو حرکت کرنا پڑے گی اور ایک کنارے سے آدمی کو کھینچ کر لائے گا تو نماز کی حالت میں اتنا چلنا بہتر معلوم نہیں ہوتا۔ پس بہتر یہی ہے کہ وہ اکیلا ہی پڑھ لے۔ ائمہ رحمہ اللہ میں سے امام مالک رحمہ اللہ' امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ اور امام شافعی رحمہ اللہ کی یہی رائے ہے اور شیخ الاسلام امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے بھی اس کو ترجیح دی ہے۔ طبرانی وغیرہ

میں جو پہلی صف سے آدمی کھینچنے کا حکم ہے وہ سنداً ضعیف ہے۔

راوی حدیث: ﴿ وابصہ بن معبد رضی اللہ عنہ ﴾ معبد میں "میم" کے نیچے کسرہ "عین" ساکن اور "با" پر فتحہ۔ ان کی کنیت ابو قرصافہ ہے۔ انصار کے قبیلہ اسد بن خزیمہ سے تھے۔ قرصافہ میں قاف کے نیچے کسرہ اور "را" ساکن۔ ۹ھ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں نمائندہ کی حیثیت سے حاضر ہوئے۔ کوفہ فروکش ہوئے۔ بعد ازاں حیرہ کی طرف چلے گئے۔ ۹۰ھ میں رقہ میں وفات پائی۔

(۳۳۵) وَعَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُ، عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ: «إِذَا سَمِعْتُمُ الإِقَامَةَ فَامْشُوا إِلَى الصَّلَاةِ، وَعَلَيْكُمُ السَّكِيْنَةُ وَالوَقَارُ، وَلاَ تُسْرِعُوا، فَمَا أَدْرَكْتُمْ فَصَلُّوْا، وَمَا فَاتَكُمْ فَأَتِمُّوْا»، مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ. وَاللَّفْظُ لِلْبُخَارِيِّ.

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا ہے کہ آپؐ نے فرمایا "جب تم نماز کی اقامت سنو تو نماز کی طرف اطمینان و سکون اور وقار کے ساتھ چل کر آؤ' جلدی اور عجلت مت کرو۔ جتنی نماز جماعت کے ساتھ پالو اتنی پڑھ لو اور باقی جو رہ جائے اسے (بعد میں) پورا کر لو۔" بخاری و مسلم۔ متن حدیث کے الفاظ بخاری کے ہیں)

لغوی تشریح: ﴿ السکینۃ ﴾ یعنی حرکات میں سکون ہو اور عبث حرکات سے اجتناب ہو ﴿ والوقار ﴾ وقار کا معنی سکینت کے قریب قریب ہے۔ وقار انسان کی ہیئت میں ہوتا ہے۔ مثلاً اپنے دائیں بائیں التفات کئے بغیر نگاہیں بچاتے ہوئے دھیمی آواز سے گفتگو کرنے اور چال ڈھال میں شریفانہ انداز اختیار کرنے کو وقار کہتے ہیں۔

حاصل کلام: اس حدیث کی رو سے نمازی جب مسجد میں نماز باجماعت کیلئے آئے تو بڑے آرام و سکون' وقار و عزت کے ساتھ آئے۔ دوڑتا ہوا نہ آئے۔ چلتے ہوئے نگاہیں نیچی رکھے۔ بولنے کی ضرورت ہو تو دھیمی اور پست آواز سے بولے۔ یوں اطمینان سے آنے کے بعد امام کو جس حالت میں پائے نماز میں شریک ہو جائے باقی نماز کو بعد میں کھڑا ہو کر پورا کر لے۔ ایسی صورت میں مقتدی نے جو نماز امام کے ساتھ پڑھی وہ اس نمازی کی پہلی رکعتیں شمار ہوں گی یا پچھلی۔ اس میں ائمہ رحمہم اللہ کا اختلاف ہے امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے نزدیک اس مقتدی کی پچھلی رکعتیں شمار ہوں گی' جبکہ امام شافعی رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ مقتدی کی یہ پہلی شمار ہوں گی۔ یہی بات حدیث کے الفاظ "فاتموا" کے موافق ہے۔ نیز یہ بھی مسئلہ مختلف فیہ ہے کہ رکوع میں شامل ہونے والے کی یہ رکعت شمار ہوگی یا نہیں۔ محتاط ترین اور قرین صواب بات یہ ہے کہ رکعت نہیں ہوگی۔ کیونکہ رکوع میں شامل ہونے کی صورت میں سورۂ فاتحہ اور قیام کی ادائیگی نہیں ہو پاتی' یہ دونوں فرض ہیں۔ دونوں کے فقدان سے نماز کیسے ہوگی؟

(۳۳۶) وَعَنْ أُبَيِّ بْنِ كَعْبٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ

حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "ایک آدمی کا دوسرے آدمی کے

رَسُولُ اللهِ ﷺ: «صَلاَةُ الرَّجُلِ مَعَ الرَّجُلِ أَزْكَى مِنْ صَلاَتِهِ وَحْدَهُ، وَصَلاَتُهُ مع الرَّجُلَيْنِ أزكى من صلاته مَعَ الرَّجُلِ، وَمَا كَانَ أَكْثَرُ فَهُوَ أَحَبُّ إِلَى اللهِ عَزَّ وَجَلَّ». رَوَاهُ أَبُو دَاوُدَ وَالنَّسَائِيُّ، وَصَحَّحَهُ ابْنُ حِبَّانَ.

ساتھ مل کر نماز پڑھنا تنہا نماز پڑھنے سے کہیں زیادہ پاکیزہ اور اجر و ثواب کا موجب ہے اور دو آدمیوں کے ساتھ مل کر نماز پڑھنا (پہلی صورت سے بھی) زیادہ اجر و ثواب کا باعث ہے۔ اسی طرح جتنے افراد زیادہ ہوں اتنا ہی اللہ تعالیٰ کے ہاں زیادہ محبوب ہے۔" (اسے ابوداوُد اور نسائی نے روایت کیا ہے اور ابن حبان نے اسے صحیح قرار دیا ہے)

لغوی تشریح: ﴿ ازکی ﴾ اطھر کے معنی ہیں نہایت پاکیزہ اور بہت ہی اجر و ثواب کا موجب۔ اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ جماعت کی کم از کم تعداد دو ہے۔ ایک امام اور دوسرا مقتدی (اور زیادہ کی کوئی حد نہیں)

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ جماعت میں نمازیوں کی تعداد جتنی زیادہ ہوگی اتنی ہی وہ نماز اللہ کے نزدیک محبوب ہوگی اور اجر و ثواب بھی زیادہ ملے گا۔

(٣٣٧) وَعَنْ أُمِّ وَرَقَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهَا، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ أَمَرَهَا أَنْ تَؤُمَّ أَهْلَ دَارِها. رَوَاهُ أَبُو دَاوُدَ، وَصَحَّحَهُ ابْنُ خُزَيْمَةَ.

حضرت ام ورقہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ نبی ﷺ نے اسے اپنے گھر والوں کی امامت کرنے کا حکم فرمایا تھا۔ (اسے ابوداوُد نے روایت کیا ہے اور ابن خزیمہ نے صحیح قرار دیا ہے)

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ عورت فرائض امامت انجام دے سکتی ہے مگر کن کی؟ اس سے بعض لوگوں کو مغالطہ ہوا ہے کہ گھر کے افراد میں تو مرد بھی ہوتے ہوں گے۔ لہٰذا اس سے تو عورت کا مرد کی امام بننا بھی ثابت ہوتا ہے۔ مگر یہ قطعاً درست نہیں۔ اولاً تو اس حدیث کا راوی عبدالرحمٰن بن خلاد مجہول ہے۔ ثانیاً بعض روایات میں "نساء اھل دارھا" کی صراحت ہے کہ گھر کی عورتوں کو نماز پڑھائے۔ مردوں پر فرض نماز کیلئے مسجد میں حاضری ضروری ہے۔ جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے اس لئے یہ کیسے باور کیا جا سکتا ہے کہ مرد حضور اکرم ﷺ کی اقتداء کو چھوڑ کر عورت کی اقتداء و امامت میں نماز پڑھتے ہوں۔ مردوں اور عورتوں کی صفوں میں فاصلہ والی حدیث بھی اس کی تائید میں ہے کہ مردوں کا عورتوں سے دور رہنا ہی بہتر ہے۔ نیز حضرت انس رضی اللہ عنہ اور یتیم اور ام سلمہ رضی اللہ عنہا کو جب آپؐ نے جماعت کرائی تو ام سلیم اپنے بچوں کے ساتھ بھی کھڑی نہیں ہوئی۔ جب اپنے لخت جگر کے ساتھ کھڑی نہیں ہو سکتی تو امامت کیسے کرائے گی۔ عورت جماعت کی امامت کے وقت مرد امام کی طرح الگ صف میں تنہا کھڑی نہیں ہوگی بلکہ بقول امام شوکانی رحمۃ اللہ علیہ عورتوں کے ساتھ ہی پہلی صف میں وسط صف میں کھڑی ہوگی۔ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا اور حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا اسی طرح نماز پڑھاتی تھیں۔

راوی حدیث: ﴿ ام ورقہ رضی اللہ عنہا ﴾ بنت نوفل یا بنت عبداللہ بن حارث۔ انصار میں سے تھیں۔ انہوں نے سارا قرآن سینے میں جمع کر رکھا تھا۔ غزوۂ بدر میں شریک ہونے کی آپؐ سے اجازت طلب کی مگر آپؐ نے ان کو اجازت نہیں دی کیونکہ ان کو اپنے گھر ہی شہادت کا مرتبہ ملنے والا تھا۔ آپؐ اس سے ملاقات کیلئے تشریف لے جایا کرتے تھے۔ آپؐ نے ان کو شہید کے نام سے موسوم کر رکھا تھا۔ اس کے دو غلام (غلام اور لونڈی) تھے جن کو انہوں نے مدبر کر رکھا تھا (ان کی موت کے بعد از خود آزاد ہو جائیں گے) مگر ان دونوں نے مل کر رات کے وقت ان کے گلے میں چادر کا پھندا ڈال کر مار دیا اور خود راتوں رات فرار ہوگئے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان کو گرفتار کروایا اور دونوں کو سولی پر چڑھا دیا۔ مدینہ منورہ میں یہ پہلے مصلوب ہیں۔ یہ خاتون تھیں جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اجازت سے اہل محلّہ کی امامت کراتی تھیں۔ اس لئے کہ ان کو قرآن مجید ازبر تھا۔

(۳۳۸) وَعَنْ أَنَسٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ اسْتَخْلَفَ ابْنَ أُمِّ مَكْتُومٍ، يَؤُمُّ النَّاسَ وَهُوَ أَعْمَى. رَوَاهُ أَحْمَدُ وَأَبُو دَاوُدَ، وَنَحْوُهُ لابْنِ حِبَّانَ عَنْ عَائِشَةَ.

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ابن ام مکتوم رضی اللہ عنہ کو اپنا نائب بنایا وہ لوگوں کی امامت کراتے تھے جبکہ وہ نابینا تھے۔ (اس روایت کو احمد' ابوداؤد نے روایت کیا ہے اور ابن حبان نے بھی اسی طرح کی حدیث حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے حوالہ سے نقل کی ہے)

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ امام کو اپنا نائب مقرر کرنا جائز ہے جو لوگوں کو نماز پڑھائے۔ دوسرا مسئلہ یہ ثابت ہوا کہ نابینا کی امامت درست اور جائز ہے۔ تیسرا یہ بھی معلوم ہوا کہ نابینا دوسروں کی بہ نسبت علم شریعت کا زیادہ عالم ہو سکتا ہے۔ نیز یہ بھی معلوم ہوا کہ افضل کی موجودگی میں دوسرا بھی نائب مقرر کیا جا سکتا ہے۔ یہ نابینا صحابی عبداللہ بن ام مکتوم رضی اللہ عنہ تھے۔ ابن ام مکتوم رضی اللہ عنہ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی عدم موجودگی میں غالبًا تیرہ مرتبہ اپنا نائب مقرر فرمایا اور غزوۂ تبوک کے موقع پر حضرت علی رضی اللہ عنہ کو انتظامی امور وغیرہ کیلئے اپنا نائب مقرر فرمایا اور عبداللہ بن ام مکتوم رضی اللہ عنہ کو حضرت علی رضی اللہ عنہ کی موجودگی میں نماز کی امامت کیلئے مقرر فرمایا۔

(۳۳۹) وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «صَلُّوا عَلَى مَنْ قَالَ لاَ إِلَهَ إِلاَّ اللَّهُ، وصَلُّوا خَلْفَ مَنْ قَالَ لاَ إِلَهَ إِلاَّ اللَّهُ». رَوَاهُ الدَّارَقُطْنِيُّ بِإِسْنَادٍ ضَعِيفٍ.

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "جس کسی نے لا الہ الا اللہ زبان سے کہا اس کی نماز جنازہ پڑھو اور جو لا الہ الا اللہ کہے اس کے پیچھے نماز بھی پڑھ لیا کرو۔" (اسے دارقطنی نے ضعیف سند سے روایت کیا ہے)

لغوی تشریح: ﴿ صلوا علی من ... الخ ﴾ جس آدمی نے لا الٰہ الا اللہ کا اقرار کر لیا خواہ وہ نیک ہو یا بد اس کی نماز جنازہ پڑھو اور اسی طرح ہر اس شخص کے پیچھے نماز پڑھ لو جس نے کلمۂ شہادت کہا۔ حدیث

سند کے اعتبار سے اگرچہ کمزور اور ضعیف ہے مگر محققین کے نزدیک اس پر عمل کرنا قابل ترجیح ہے۔ اس لئے کہ اصول اور روایات اس کی صحت کی تائید کرتی ہیں کہ جس شخص کی نماز صحیح ہے' اس کی امامت بھی صحیح ہے۔ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما نے حجاج بن یوسف کے پیچھے نماز پڑھی ہے۔ ہاں یہ مناسب ہے کہ فاجر آدمی کو امامت کیلئے آگے نہ کیا جائے کیونکہ اس کے مکروہ ہونے پر سب کا اتفاق ہے۔ بخاری میں حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کا حجاج بن یوسف کے پیچھے نماز پڑھنا ثابت ہے۔

حاصل کلام: اس حدیث سے ثابت ہوتا ہے کہ فرائض کی پروا نہ کرنے والے کلمہ گو آدمی کی نماز جنازہ درست ہے۔ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اس کے تو قائل ہیں مگر راہزن اور باغی کی نماز جنازہ کے قائل نہیں۔ بہرحال علماء اور بزرگ لوگوں کو فاسق و فاجر اور خودکشی کرنے والے کی نماز جنازہ نہیں پڑھنی چاہئے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک خودکشی کرنے والے شخص کی نماز جنازہ نہیں پڑھی تھی۔ البتہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے فرمایا کہ "جاؤ تم اس کی نماز جنازہ پڑھ لو۔"

(٣٤٠) وَعَنْ عَلِيِّ بْنِ أَبِي طَالِبٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «إِذَا أَتَى أَحَدُكُمُ الصَّلاَةَ، وَالإِمَامُ عَلَى حَالٍ، فَلْيَصْنَعْ كَمَا يَصْنَعُ الإِمَامُ». رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ بِإِسْنَادٍ ضَعِيفٍ.

حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "جب تم میں سے کوئی نماز پڑھنے کیلئے آئے تو امام کو جس حالت میں پائے اسی میں امام کے ساتھ شامل ہو جائے۔" (ترمذی نے اسے ضعیف سند کے ساتھ روایت کیا ہے)

حاصل کلام: اس حدیث سے ثابت ہوتا ہے کہ امام کے ساتھ بعد میں شامل ہونے والا نمازی جس حالت میں امام کو پائے اسی میں شامل ہو جائے۔ امام اگر رکوع میں ہے تو اسے بھی رکوع میں اللہ اکبر کہہ کر چلے جانا چاہئے اور امام کو سجدہ کی حالت میں پائے تو اس کو سجدہ میں اللہ اکبر کہہ کر چلے جانا چاہئے اور اگر امام بیٹھا ہو تو مسبوق کو بھی اسی حالت میں بیٹھ جانا چاہئے۔ ترمذی کی یہ حدیث گو سنداً ضعیف ہے مگر دوسری صحیح احادیث سے اس کی تائید ہوتی ہے۔

١١ - بَابُ صَلاَةِ المُسَافِرِ وَالمَرِيضِ

مسافر اور مریض کی نماز کا بیان

(٣٤١) وَعَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهَا قَالَتْ: أَوَّلُ مَا فُرِضَتِ الصَّلاَةُ رَكْعَتَانِ، فَأُقِرَّتْ صَلاَةُ السَّفَرِ، وَأُتِمَّتْ صَلاَةُ الحَضَرِ. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے بیان کیا کہ ابتدا میں دو رکعات فرض کی گئی تھیں (سفر و حضر میں) جتنی نماز فرض کی گئی وہ دو رکعت تھی۔ اسے (سفر کی نماز کو) باقی رکھا اور حضر (مقیم) کیلئے نماز مکمل کر دی گئی۔ (چار رکعتیں کر دی گئیں) (بخاری و مسلم)

وَلِلْبُخَارِيِّ: ثُمَّ هَاجَرَ، فَفُرِضَتْ أَرْبَعاً، وَأُقِرَّتْ صَلاَةُ السَّفَرِ عَلَى الأَوَّلِ.

اور بخاری کی ایک روایت میں ہے کہ پھر آپؐ نے ہجرت کی تو چار رکعت فرض کر دی گئیں اور سفر کی نماز پہلی حالت پر برقرار رکھی گئی۔

وَزَادَ أَحْمَدُ: إِلاَّ المَغْرِبَ، فَإِنَّهَا وِتْرُ النَّهَارِ، وَإِلاَّ الصُّبحَ، فَإِنَّهَا تُطَوَّلُ فِيْهَا القِرَاءَةُ.

احمد نے اتنا اضافہ کیا ہے "سوائے نماز مغرب کے کیونکہ وہ دن کے وتر ہیں اور بجز صبح کی نماز کے کیونکہ اس نماز میں قرأت لمبی کی جاتی ہے۔

لغوی تشریح: ﴿ اول ما فرضت الصلاۃ ﴾ حضر و سفر دونوں میں رکعتان دو' دو رکعتیں مغرب کی نماز کے علاوہ۔ گرائمر کے اعتبار سے اول مبتداء ہے اور رکعتان اس کی خبر ہے اور ایک نسخہ میں رکعتین ہے' یعنی منصوب ہے اور اس کا منصوب ہونا اس لئے درست اور صحیح ہے کہ یہ قائم مقام خبر کا حال واقع ہو رہا ہے۔ ﴿ فاقرت ﴾ اقرار سے ماخوذ ہے' صیغہ مجہول' معنی ہے کہ ان کو دو رکعت کی حالت پر برقرار رکھا گیا یا ان کو ان کی حالت پر چھوڑ دیا گیا۔ ﴿ واتمت ﴾ یہ بھی صیغہ مجہول ہے۔ یعنی مکمل کر دی گئی۔ ﴿ صلاۃ الحضر ﴾ حضر کی نماز میں دو رکعتوں کا اضافہ کر دیا گیا اور وہ چار پوری ہو گئیں۔ الحضر میں "حا" اور "ضاد" دونوں پر فتحہ ہے۔ سفر کے مقابلہ میں حضر کہا جاتا ہے۔ اس حدیث سے یہ استدلال کیا گیا ہے کہ سفر میں قصر کرنا فرض ہے اور اسے پورا پڑھنا جائز نہیں بعینہ جس طرح حضر میں چار رکعت پر اضافہ جائز نہیں۔ مدار استدلال لفظ "فرضت" اور "اقرت" ہے یعنی فرض کی گئی' برقرار رکھی گئی کیونکہ یہ دونوں الفاظ اس پر دلالت کرتے ہیں کہ دو رکعتیں فرض ہیں رخصت نہیں اور فرائض میں نہ کمی و بیشی کرنا جائز ہے اور نہ اس میں کسی قسم کا تغیر و تبدل۔ مگر یہ استدلال محل نظر ہے کیونکہ "فرضت" کا لفظ "قدرت" کے معنی کا احتمال رکھتا ہے' اس صورت میں اس میں کوئی دلیل نہیں بنتی بلکہ یہ تو تعبیر کے انواع میں سے ایک نوع (قسم) ہے جو محض حضر و سفر کے فرق کے بیان کرنے کیلئے آیا ہے۔ بغیر اس کے کہ اس میں کوئی اشارہ رخصت یا عزیمت کی طرف پایا جاتا ہو' خود حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا جو اس حدیث کی راویہ ہیں انہوں نے سفر میں قصر نماز بھی پڑھی ہے اور پوری بھی۔

حاصل کلام: اس حدیث سے ثابت ہوتا ہے کہ ابتدا میں حضر و سفر کی نماز دو' دو رکعت فرض تھی' بعد میں سفر کی نماز کو علی حالہ رکھا گیا البتہ حضر کی نماز میں دو رکعتوں کا مزید اضافہ کر دیا گیا۔ قرآن مجید میں نماز قصر کا جو بیان ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ سفر میں قصر نماز پڑھنا جائز ہے واجب نہیں۔ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کا مسلک ہے کہ سفر میں قصر واجب ہے جبکہ امام احمد رحمہ اللہ' امام شافعی رحمہ اللہ وغیرہ اسے سنت قرار دیتے ہیں اور اسے رخصت پر محمول کرتے ہیں اور یہی قول راجح ہے۔ دار قطنی میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے بسند حسن مروی ہے کہ دوران سفر میں نے پوری نماز پڑھی۔ آپؐ کو اس کی خبر دی تو آپؐ نے میری تحسین کی۔ شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ کی اتباع میں حافظ ابن قیم رحمہ اللہ اور دیگر متاخرین نے اس حدیث کو ضعیف

قرار دیا ہے جو صحیح ہے جبکہ امام دارقطنی رحمۃ اللہ علیہ نے اسے حسن کہا ہے۔

(٣٤٢) وَعَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهَا أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ كَانَ يَقْصُرُ فِي السَّفَرِ وَيُتِمُّ، وَيَصُومُ وَيُفْطِرُ. رَوَاهُ الدَّارَقُطْنِيُّ، وَرُوَاتُه ثِقَاتٌ، إِلاَّ أَنَّهُ مَعْلُولٌ، وَالمَحْفُوظُ عَنْ عَائِشَةَ مِنْ فِعْلِهَا، وَقَالَتْ: إِنَّهُ لاَ يَشُقُّ عَلَيَّ. أَخْرَجَهُ البَيْهَقِيُّ.

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ نبی ﷺ سفر میں قصر اور اتمام دونوں پر عمل فرماتے تھے نیز روزہ رکھتے بھی تھے اور افطار بھی کر لیتے تھے۔ (دارقطنی) اس کے راوی ثقہ ہیں' مگر حدیث معلول ہے اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے ذاتی فعل کی صورت میں محفوظ ہے اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا کہ "روزہ مجھ پر گراں نہیں۔" (بیہقی نے اس کی تخریج کی ہے۔)

لغوی تشریح: ﴿ یقصر ﴾ قصر فرماتے۔ یعنی کبھی چار رکعتوں والی نماز' دو رکعتیں ہی ادا فرماتے۔ قصر' یقصر۔ باب نصر ینصر کے وزن پر ہے۔ ﴿ ویتم ﴾ پوری نماز ادا فرماتے۔ یعنی چار رکعتیں پوری ادا فرماتے۔ ﴿ ویصوم ﴾ سفر میں بھی کبھی روزہ رکھتے اور ﴿ یفطر ﴾ کبھی افطار فرما لیتے۔ اس حدیث سے ثابت ہوا کہ نماز قصر کرنا اور روزہ افطار کرنا مسافر کیلئے دونوں طرح رخصت ہے اور اسے اختیار دیا گیا ہے کہ چاہے سفر میں قصر و افطار پر عمل کرے چاہے نہ کرے۔ امام دارقطنی رحمۃ اللہ علیہ اور بیھقی رحمۃ اللہ علیہ نے اسے صحیح کہا ہے۔ حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے اس کے راویوں کو ثقہ قرار دیا ہے البتہ فرمایا ہے کہ یہ معلول ہے۔ غالبًا علت یہ ہے کہ صحیح بخاری میں ابن عمر رضی اللہ عنہما کی حدیث اس کے معارض ہے کہ آپؐ سفر میں دو رکعتوں سے زیادہ نہیں پڑھتے تھے۔ یہ علت صحیح نہیں دونوں میں تطبیق ممکن ہے کہ کبھی اتمام کرتے اور اکثر و بیشتر قصر کرتے۔ ویسے بھی طے شدہ اصول ہے کہ مثبت' نافی پر مقدم ہوتا ہے۔ واللہ اعلم۔

(٣٤٣) وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ أَنْ تُؤْتَى رُخَصُهُ، كَمَا يَكْرَهُ أَنْ تُؤْتَى مَعْصِيَتُهُ». رَوَاهُ أَحْمَدُ، وَصَحَّحَهُ ابْنُ خُزَيْمَةَ وابْنُ حِبَّانَ، وَفِي رِوَايَةٍ: «كَمَا يُحِبُّ أَنْ تُؤْتَى عَزَائِمُهُ».

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ "اللہ تعالیٰ کو یہ اسی طرح پسند ہے کہ جن کاموں میں اس نے رخصت عنایت فرمائی ہے' ان میں رخصت پر عمل کیا جائے' جس طرح اسے یہ ناپسند ہے کہ معصیت والے کاموں کو کیا جائے۔" (اسے احمد نے روایت کیا ہے۔ ابن خزیمہ اور ابن حبان نے اسے صحیح قرار دیا ہے) اور ایک روایت میں ہے کہ "جیسا اللہ تعالیٰ کو پسند ہے کہ اس کے تاکیدی احکام (فرائض) کو ادا کیا جائے"

لغوی تشریح: ﴿ ان تـوتـی ﴾ گرائمر میں یہ مجہول واقع ہوا ہے اور ﴿ رخصـه ﴾ فاعل ہونے کی وجہ سے مرفوع ہے اور "را" پر ضمہ اور "خا" پر فتحہ' رخصـة کی جمع ہے' یعنی جن امور میں رخصت کی گنجائش دی گئی ہے ان میں رخصت پر عمل کیا جائے۔ ﴿ عـزائـمـه ﴾ عـزيـمـة کی جمع ہے اور یہ رخصت کے بالمقابل ہے۔ رخصت کا مفہوم یہ ہے کہ شارع نے بعض واجبات کی ادائیگی میں شدت اور تکلیف کی وجہ سے یا کسی عذر کی بنا پر چھوڑنے کی اجازت دے دی ہے اور بعض محرمات کو ضروتاً مباح قرار دے دیا ہے اور عزیمت' رخصت کے مقابلے میں بولا جاتا ہے۔

حاصل کلام: اس حدیث سے ثابت ہوتا ہے کہ سفر میں نماز قصر کر کے پڑھنا بہتر ہے۔ عملاً یہ اگرچہ تعداد میں مکمل چار رکعتیں پڑھنے سے کم ہے مگر افضل یہی دو رکعتیں ہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی رخصت کو قبول کرنا اللہ کے ہاں اسی طرح محبوب ہے جیسے عزیمت پر عمل کرنا محبوب اور پسندیدہ ہے۔

(٣٤٤) وَعَنْ أَنَسٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: كَانَ رَسُولُ اللهِ ﷺ إِذَا خَرَجَ مَسِيْرَةَ ثَلاَثَةِ أَمْيَالٍ أَوْ ثَلاَثَةِ فَرَاسِخَ صَلَّى رَكْعَتَيْنِ. رَوَاهُ مُسْلِمٌ.

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ جب تین میل یا تین فرسخ کی مسافت پر' سفر کیلئے تشریف لے جاتے تو دو رکعتیں (نماز قصر) ادا فرماتے تھے۔ (مسلم)

لغوی تشریح: ﴿ امیـال او فـراسـخ ﴾ اس حدیث کے سند کے ایک راوی شعبہ نے "او" بیان کر کے اپنے شک کا اظہار کیا ہے ورنہ ایسا نہیں ہے کہ مختلف احوال بیان کرنا مقصود ہے۔ "امیـال" میل کی جمع ہے۔ میل کی مقدار کیا ہے' کتنی ہے اس بارے میں اختلاف پایا گیا ہے۔ اس بارے میں تین اقوال مشہور ہیں۔ پہلا قول یہ ہے کہ اس سے مراد چھ ہزار ہاتھ جتنی مسافت ہے۔ دوسرا قول یہ ہے کہ چار ہزار ہاتھ اور ایک ہاتھ کی لمبائی ان دونوں اقوال میں۔ چوبیس انگشت ہے اور تیسرا قول یہ ہے کہ تین ہزار ہاتھ کے برابر اور ہاتھ سے مراد ہے بتیس انگشت۔ دوسرے اور تیسرے قول میں کوئی نمایاں فرق نہیں۔ تقریباً ایک ہی مقدار بنتی ہے۔ فقط تعبیر کا فرق ہے۔ رہا "فراسخ" تو یہ فرسخ کی جمع ہے۔ ایک فرسخ تین میل کا ہوتا ہے اور یہ لفظ فارسی زبان کے فرسنگ سے معرب ہے اور تین فرسخ ساڑھے چوبیس کلومیٹر کے مساوی ہوتے ہیں۔ جب ہم کہتے ہیں کہ ایک میل چھ ہزار ہاتھ کا ہوتا ہے یا جب ہم یہ کہتے ہیں کہ وہ چار ہزار ہاتھ کا ہوتا ہے تو پھر تین فرسخ کا فاصلہ پونے سترہ کلومیٹر فاصلہ کے مساوی بنتا ہے۔ یہ فاصلہ کا تعین اندازاً ہے یقینی اور حتمی نہیں۔ یہ حدیث اس پر دلالت کرتی ہے کہ جس آدمی نے نو میل کی مسافت سے سفر پر نکلنے کا عزم کیا ہو اس کیلئے قصر نماز پڑھنا صحیح ہے۔ وہ مسافت جس میں نماز قصر پڑھی جائے کے بارے میں بہت اختلاف پایا جاتا ہے۔ اکثریت کی رائے یہ ہے کہ وہ مسافت چار برد ہے (اڑتالیس میل) اس کی دلیل آئندہ آئے گی۔ رہی یہ حدیث تو اس کے مطابق کسی فقیہہ کا قول ہماری نظر سے نہیں گزرا۔ اگر کوئی

فقیہہ اس طرف جاتا تو اس کیلئے بڑی قوی وجہ موجود تھی۔ ہمارے زمانے کے علماء اہلحدیث کی اکثریت اس طرف گئی ہے کہ نو میل کی مسافت پر قصر کرنا جائز ہے۔

حاصل کلام: حدیث میں وارد الفاظ "میل' فرسخ" کی تعریف تو اوپر ہو چکی ہے کہ نماز قصر کیلئے کتنی مسافت ہونی چاہئے۔ اس کے متعلق شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ اور ان کے تلمیذ رشید حافظ ابن قیم رحمۃ اللہ علیہ کا خیال ہے کہ قصر نماز کیلئے کوئی مسافت محدود و متعین نہیں ہے۔ مطلق سفر سے اس کی اجازت دی گئی ہے۔ اور جب کوئی کسی مسافت کو سفر خیال کرے وہاں قصر نماز پڑھے۔ بلاشبہ قرآن مجید میں قصر کیلئے مطلقاً سفر کا ذکر ہے' جیسے سفر میں تیمم کے لئے سفر کی کوئی تعین نہیں مگر اس حدیث سے ثابت ہوتا ہے کہ تین میل کا سفر بھی شرعی سفر شمار ہوتا ہے لیکن راوی حدیث امام شعبہ رحمۃ اللہ علیہ تین میل یا تین فرسخ کے قائل تھے۔ جس سے علماء نے احتیاط کا پہلو اختیار کیا ہے کہ یہاں تین فرسخ مراد لئے جائیں اور تین فرسخ سے نو میل مسافت بنتی ہے لہٰذا نو میل مسافت پر نماز قصر ادا کی جاسکتی ہے۔ ظاہریہ نے تو تین میل تک مسافت کو نماز قصر کے لئے جائز قرار دیا ہے بلکہ بعض نے تو یہاں تک کہہ دیا ہے کہ ایک میل پر بھی جائز ہے۔ مگر ان کی پشت پر مضبوط عقلی و نقلی ثبوت نہیں ہے اور بعض حضرات نے ۳۶ میل اور بعض نے ۴۸ میل اور بعض نے ۵۲ میل کی مسافت مقرر کی ہے۔ بہرحال یہ سب قیاسات پر مبنی ہیں کسی کی تائید میں صحیح حدیث موجود نہیں۔ رہی چار برد والی روایت کہ چار برد (اڑتالیس میل) سے کم مسافت پر قصر جائز نہیں' سو یہ حدیث مرفوع نہیں بلکہ موقوف ہے نیز اس کے ایک راوی عبدالوہاب بن مجاہد بن جبیر مکی کی روایت کو ناقابل قبول قرار دیا گیا ہے بلکہ ثوری نے تو اس کو کذاب کہا ہے' اس لئے یہ استدلال کے لائق نہیں۔

(٣٤٥) وَعَنْهُ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: خَرَجْنَا مَعَ رَسُولِ اللهِ ﷺ مِنَ الْمَدِيْنَةِ إِلَى مَكَّةَ، فَكَانَ يُصَلِّيْ رَكْعَتَيْنِ رَكْعَتَيْنِ، حَتَّى رَجَعْنَا إِلَى الْمَدِيْنَةِ. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ، وَاللَّفْظُ لِلْبُخَارِيِّ.

حضرت انس رضی اللہ عنہ ہی سے مروی ہے کہ ہم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نکل کر مدینہ سے مکہ تک کا سفر کیا' آپؐ مدینہ واپسی تک دو' دو رکعتیں ہی ادا فرماتے رہے۔ (بخاری و مسلم۔ البتہ متن حدیث کے الفاظ بخاری کے ہیں)

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ جب ایک آدمی اپنے گھر سے سفر کی نیت سے نکل پڑے تو وہ مسافر کی تعریف میں آجاتا ہے۔ حدود شہر یعنی موجودہ اصطلاح میں میونسپلٹی کی حدود سے نکلنے کے بعد خواہ ایک میل کا سفر طے کیا ہو نماز قصر ادا کرنا شروع کر سکتا ہے اور واپسی تک دوگانہ نماز پڑھ سکتا ہے۔

(٣٤٦) وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُمَا قَالَ: أَقَامَ النَّبِيُّ ﷺ تِسْعَةَ عَشَرَ يَوْماً يَقْصُرُ وَفِيْ

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما روایت کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ١٩ روز قیام فرمایا آپؐ قصر ہی فرماتے رہے اور ایک روایت میں ہے کہ مکہ میں ١٩ روز قیام

لَفْظٍ: «بِمَكَّةَ، تِسْعَةَ عَشَرَ يَوْماً». رَوَاهُ الْبُخَارِيُّ. وَفِي رِوَايَةٍ لأَبِي دَاوُدَ: «سَبْعَ عَشْرَةَ». وَفِي أُخْرَى: «خَمْسَ عَشْرَةَ».

وَلَهُ عَنْ عِمْرَانَ بْنِ حُصَيْنٍ: «ثَمَانِيَ عَشْرَةَ». وَلَهُ عَنْ جَابِرٍ: أَقَامَ بِتَبُوكَ عِشْرِينَ يَوْماً يَقْصُرُ الصَّلاَةَ. وَرُوَاتُهُ ثِقَاتٌ، إِلاَّ أَنَّهُ اخْتُلِفَ فِي وَصْلِهِ.

فرمایا۔ (بخاری) اور ابوداؤد کی روایت میں ۱۷ روز ہے اور ایک دوسری روایت میں ۱۵ روز ہے۔

اور ابو داؤد میں ہی عمران بن حصین رضی اللہ عنہ سے ہے کہ آپ ؐ کی مدت قیام اٹھارہ دن تھی اور اسی میں حضرت جابر رضی اللہ عنہ کا قول ہے کہ آپ ؐ نے تبوک میں بیس دن قیام فرمایا اور نماز قصرادا کرتے رہے' اس روایت کے راوی ثقہ ہیں' مگر اس کے موصول ہونے میں اختلاف ہے۔

حاصل کلام: مکہ میں مدت قیام کے بارے میں جو مختلف روایات منقول ہیں کہ آپ ؐ ایک روایت کی رو سے وہاں ۱۹ روز یا ۱۸ روز اور ایک روایت کی رو سے ۱۷ روز یا پندرہ روز قیام پذیر رہے۔ ان میں سے ہر مدت قیام کے حق میں کچھ نہ کچھ لوگوں کی رائے ہے۔ یہ ذہن نشین رہے کہ مدت قیام میں اختلاف فتح مکہ کے موقع کا ہے۔ حجۃ الوداع کے موقع کا نہیں ہے۔ کیونکہ تحقیق سے یہ ثابت ہے کہ وہ تو صرف دس روز تھا۔ ان روایات میں جمع و تطبیق کی صحیح صورت یہ معلوم ہوتی ہے کہ ۱۹ روز والی روایت دوسری روایات کے مقابلہ میں صحیح ترین اور قوی ترین ہے۔ اس کی تائید اہل مغازی کا وہ بیان ہے کہ نبی ﷺ مکہ میں بروز منگل صبح داخل ہوئے وہ رمضان کی سترہ تاریخ تھی اور حنین کی جانب بروز ہفتہ چھ شوال روانہ ہوئے۔ پس ان ایام کی تعداد' دخول اور خروج کے ایام سمیت ۱۹ روز بنتے ہیں اور ۱۸ روز والی روایت تو اپنے ضعف کی وجہ سے اس کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ اس احتمال کے باوجود کہ راوی کے ذہن میں راتوں کی تعداد ہو' دنوں کی تعداد نہ ہو کیونکہ آپ ؐ مکہ میں داخل تو دن کو ہوئے تھے اور یہاں سے نکلے رات کو تھے۔ یوں ۱۹ دن کی تعداد پوری ہوگئی اور راتوں کی تعداد ۱۸ ہوئی۔ اس طرح ان دونوں میں کوئی فرق اور منافاۃ باقی نہ رہا اور اس تاویل کی تائید اس طرح بھی ہوتی ہے کہ ۱۸ شب والی روایت میں لفظ لیل (شب) موجود ہے اور سترہ یوم والی روایت کی صورت میں تطبیق اس طرح ہوگی کہ راوی نے مکہ میں دخول اور خروج کے دونوں دن شمار نہیں کئے لہٰذا دو یوم انیس میں سے نکال دیں تو باقی سترہ ہی رہ جاتے ہیں اور رہی پندرہ یوم والی روایت تو وہ روایت شاذ ہے اور ثقہ راویوں کی روایت کردہ روایات کے مخالف ہے' لہٰذا اس کا کوئی اعتبار نہیں اور اس کا بھی احتمال ہے کہ راوی نے سترہ یوم والی روایت کو اصل قرار دے کر مکہ میں آپ ؐ کے داخل اور خارج ہونے کا دن نکال دیا ہو اس طرح سترہ میں سے دو نکال دیئے جائیں تو باقی پندرہ دن رہ جاتے ہیں۔ ان روایات سے ہر نماز کی مدت کے تعین کا استدلال کرنا ہی صحیح نہیں ہے۔ اس لئے کہ یہ سفر تو آپ ؐ کا غزوہ اور لڑائی کا سفر تھا۔ محارب کو ہر لمحہ ایسے مواقع پیش آسکتے ہیں کہ اسے آگے بھی بڑھنا پڑے اور پیچھے بھی ہٹنا اور واپس ہونا پڑے۔ یہ صورت حال بذات خود

نبی ﷺ کو بھی پیش آئی کہ فتح مکہ کے فوراً بعد آپؐ کو ایک چھوٹا سا دستہ مجاہدین کا عزیٰ کے انہدام کیلئے روانہ کرنا پڑا اور اس دستہ کی قیادت اور امارت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کے ہاتھ میں دی۔ پھر معاً بعد دوسرا دستہ سواع بت کے انہدام کیلئے روانہ فرمایا اس لشکر کی قیادت و امارت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ کے سپرد فرمائی۔ پھر تیسرا دستہ مناۃ بت کے انہدام کیلئے روانہ فرمایا اس کی امارت پر سعد بن زید کو مقرر فرمایا اور پھر چوتھا دستہ جذیمہ کی طرف روانہ فرمایا اس کی قیادت بھی خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کو تفویض فرمائی۔ اس کے بعد تھوڑا ہی وقت گزرا تھا کہ قبائل ثقیف و ھوازن کے اجتماع کی اطلاع ملی تو آپؐ نے خود آگے بڑھ کر ان کا سامنا کیا کہ وادی حنین میں ان سے مڈبھیڑ ہوگئی۔ یہاں پر پھر وہ معرکہ آرائی ہوئی اور گھمسان کا رن پڑا جو مشہور و معروف ہے۔ اس سے یہ بات واضح ہوگئی کہ مجاھد و سپاہی اگر قیام کا ارادہ کرے خواہ فتح یابی و کامرانی کے بعد ہی ہو اس کی نیت معتبر تسلیم نہیں کی جائے گی۔ بلکہ اس کی تو کیفیت اس مسافر کی سی ہوگی جو اس تذبذب و تردد میں مبتلا ہو کہ آج واپسی ہوتی ہے یا کل۔ پس ایسا متردد و متذبذب مسافر ہمیشہ قصر نماز ہی ادا کرتا رہے گا خواہ یہ کیفیت سالوں اور مہینوں پر محیط ہو۔ پس صحیح بات یہی ہے کہ نبی ﷺ کا فتح مکہ اور غزوۂ تبوک کے مواقع پر قصر نماز ادا فرمانا' قصر نماز کی مدت متعین پر دلالت ہی نہیں کرتا۔ اس بارے میں راجح مسلک وہی ہے جسے ائمہ ثلاثہ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ' امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ اور امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ نے اختیار کیا ہے کہ جو آدمی داخل اور خارج ہونے کے دونوں ایام کو چھوڑ کر صرف چار روز قیام کا ارادہ رکھتا ہو اسے پوری نماز پڑھنی چاہیئے۔ یہ اس بنیاد پر ہے کہ نبی ﷺ نے حجۃ الوداع کے موقع پر مکہ اور گرد و نواح میں دس دن گزارے تھے تو آپؐ ان ایام میں قصر نماز ادا فرماتے رہے۔ آپؐ مکہ میں ذی الحجہ کی چار تاریخ کو صبح داخل ہوئے اور مکہ سے آٹھ ذی الحجہ کے شروع دن سے نکلے تھے۔ اس دوران آپؐ ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہوتے رہے کہ مناسک کی تکمیل فرمالی۔ اس اعتبار سے آپؐ کے قیام کی مدت صرف تین دن بنتی ہے داخل ہونے اور وہاں سے نکلنے کے دو دن اس سے خارج ہیں۔ آپؐ کے عمل سے یہ ثابت نہیں ہے کہ آپؐ نے اس مدت سے زیادہ قیام فرمایا ہو اور آپؐ نے قصر نماز ادا کی ہو' یا اس سے کم مدت قیام فرمایا ہو اور قصر نماز ادا نہ فرمائی ہو۔ مناسک حج کی تکمیل کے بعد حضور ﷺ کا مہاجرین کو مکہ میں تین دن سے زائد قیام کرنے سے منع فرمانا بھی ان کی دلیل ہے کہ مسافر اگر چار دن کا ارادہ کرے گا تو مقیم سمجھا جائے گا نیز ان کا استدلال اس سے بھی ہے جو امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے بیان کیا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جب یہود کو حجاز سے جلا وطن کیا پھر ان میں جو تاجر کی حیثیت سے حجاز میں آنا چاہے اسے بھی تین دن قیام کی اجازت دی تھی۔ مصنف نے اسے اپنی کتاب التلخیص الجبیر میں نقل کیا ہے اور ابوزرعہ نے اسے صحیح قرار دیا ہے۔ اس حدیث میں ۱۹' ۱۸' ۱۷ اور ۱۵ روز قصر نماز پڑھنے کا ثبوت ملتا ہے۔ اس کی تطبیق اور روایات کے مابین جمع کی صورت تو اوپر مذکور ہے۔ اس لیے مختلف مکاتب فکر کے ہاں مدت قیام بھی مختلف ہے۔ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے ہاں تین دن۔ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک ۱۵ دن۔ مگر جب مسافر حالت تردد میں مبتلا ہو جائے اور واپسی کا حتمی فیصلہ نہ کرپائے تو ایسی صورت

میں بھی اختلاف آراء پایا جاتا ہے۔ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ اپنے اصحاب سمیت اور ایک قول کی رو سے امام شافعی رحمہ اللہ بھی اسی کے قائل ہیں کہ ایسا متردد و متذبذب مسافر تادم زیست یا واپسی تک قصر کر سکتا ہے۔ چنانچہ عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے آذر بائیجان میں چھ ماہ تک قصر نماز پڑھی اور اسی طرح حضرت انس رضی اللہ عنہ کو نیشاپور سال یا دو سال حالت تردد میں رہنا پڑا تو قصر ہی کرتے رہے۔ اور کچھ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو رامہرمز میں نو ماہ تک رکنا پڑا تو وہ قصر ہی کرتے رہے۔ ان واقعات سے یہی مترشح ہوتا ہے کہ تردد اور تذبذب کی حالت میں قصر کی مدت مقرر نہیں ہے' بلکہ جب تک ضرورت کا تقاضا ہو اتنی مدت تک قصر جائز ہے۔

(٣٤٧) وَعَنْ أَنَسٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: كَانَ رَسُولُ اللهِ ﷺ إِذَا ارْتَحَلَ قَبْلَ أَنْ تَزِيْغَ الشَّمْسُ، أَخَّرَ الظُّهْرَ إِلَى وَقْتِ الْعَصْرِ، ثُمَّ نَزَلَ فَجَمَعَ بَيْنَهُمَا، فَإِنْ زَاغَتِ الشَّمْسُ قَبْلَ أَنْ يَرْتَحِلَ صَلَّى الظُّهْرَ ثُمَّ رَكِبَ. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ جب زوال آفتاب سے پہلے سفر کا آغاز فرماتے تو ظہر کی نماز کو عصر کی نماز تک مؤخر کر لیتے تھے۔ پھر سواری سے نیچے تشریف لاتے اور ظہر و عصر دونوں نمازوں کو اکٹھی ادا فرماتے اور جب آفتاب آغاز سفر سے پہلے زوال پذیر ہو جاتا تو پھر نماز ظہر ادا فرما کر سوار ہو کر سفر پر روانہ ہوتے۔ (بخاری و مسلم)

وَفِيْ رِوَايَةِ الْحَاكِمِ فِي الْأَرْبَعِيْنَ بِالإِسْنَادِ الصَّحِيحِ: صَلَّى الظُّهْرَ وَالْعَصْرَ ثُمَّ رَكِبَ.

اور حاکم کی اربعین میں سند صحیح ہے کہ آپ ﷺ نے ظہر و عصر کی نمازیں پڑھیں پھر سواری پر سوار ہوئے۔

وَلِأَبِيْ نُعَيْمٍ فِيْ مُسْتَخْرَجِ مُسْلِمٍ: كَانَ إِذَا كَانَ فِيْ سَفَرٍ فَزَالَتِ الشَّمْسُ صَلَّى الظُّهْرَ وَالْعَصْرَ جَمِيْعاً، ثُمَّ ارْتَحَلَ.

اور ابونعیم کی "مستخرج" میں ہے کہ جب آپ ﷺ سفر میں ہوتے اور آفتاب زوال پذیر ہو جاتا تو آپ ظہر اور عصر دونوں اکٹھی ادا فرما کر وہاں سے کوچ کرتے۔

لغوی تشریح: ﴿ ارتحل ﴾ سفر میں آرام اور استراحت کے بعد دوبارہ سفر کا آغاز کرنا۔ ﴿ تزیغ الشمس ﴾ آفتاب کا نصف النہار سے مغرب کی جانب زوال پذیر ہونا "صلی الظھر ثم رکب" بظاہر تو اس سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ آپ ﷺ صرف نماز ظہر ادا فرماتے تھے' عصر کی نماز کو اس کے ساتھ نہیں ملاتے تھے لیکن حاکم اور ابونعیم کی روایت میں صاف صاف ذکر ہے کہ آپ ﷺ نے ظہر و عصر دونوں نمازوں کو ظہر کے وقت میں اکٹھے پڑھا۔ **حاصل کلام:** اس حدیث کی رو سے سفر میں ظہر و عصر اور مغرب و عشاء کو جمع کر کے پڑھنا جائز ثابت ہوتا ہے۔ اس میں جمع تقدیم ہو یا تاخیر دونوں طرح ثابت ہے۔ احناف جمع حقیقی کے قائل نہیں جمع صوری کے قائل ہیں۔ مگر ترمذی کی حدیث سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ جمع

صوری نہیں بلکہ جمع حقیقی تھی۔ چنانچہ اس کا مفہوم ہے کہ جب آفتاب زوال پذیر ہونے سے پہلے آپ سفر پر روانہ ہوتے تو ظہر کو مؤخر کر کے عصر کے ساتھ ملا کر دونوں کو اکٹھا ادا فرماتے اور جب سورج ڈھلنے کے بعد سفر کا آغاز فرماتے تو عصر کو ظہر کے ساتھ ملا کر دونوں کو اکٹھا ادا فرماتے۔ ترمذی نے اس روایت کو حسن کہا ہے اور مستخرج ابونعیم کی حدیث سے بھی اسی کی تائید ہوتی ہے جسے مصنف مرحوم نے ذکر کیا ہے۔

(٣٤٨) وَعَنْ مُعَاذِ بْنِ جَبَلٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: خَرَجْنَا مَعَ النَّبِيِّ ﷺ فِي غَزْوَةِ تَبُوكَ، فَكَانَ يُصَلِّي الظُّهْرَ وَالعَصْرَ جَمِيْعاً. رَوَاهُ مُسْلِمٌ.

حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ہم غزوۂ تبوک کے موقع پر رسول اللہ ﷺ کے ہمراہ نکلے تو آپؐ ظہر اور عصر کی نمازیں اکٹھی پڑھتے اور مغرب و عشاء اکٹھی پڑھتے تھے۔ (مسلم)

(٣٤٩) وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهما قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «**لاَ تَقْصُرُوا الصَّلاَةَ فِي أَقَلَّ مِنْ أَرْبَعَةِ بُرُدٍ، مِنْ مَكَّةَ إِلَى عُسْفَانَ**». رَوَاهُ الدَّارَقُطْنِيُّ بِإِسْنَادٍ ضَعِيفٍ، وَالصَّحِيحُ أَنَّهُ مَوقُوفٌ، كَذَا أَخْرَجَهُ ابْنُ خُزَيْمَةَ.

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا چار برد سے کم فاصلہ پر نماز قصر نہ کرو چار برد مکہ سے عسفان تک فاصلہ ہے۔ (اسے دار قطنی نے ضعیف سند سے روایت کیا ہے اور صحیح یہ ہے کہ یہ روایت موقوف ہے۔ ابن خزیمہ نے بھی اسی طرح روایت کیا ہے)

لغوی تشریح: ﴿ برد ﴾ "باء" اور "راء" دونوں پر ضمہ ہے۔ برید کی جمع ہے۔ ایک برید بارہ میل کا ہوتا ہے۔ لہٰذا چار برد کی مسافت کی مقدار اڑتالیس میل ہوئی۔ ﴿ عسفان ﴾ عین پر ضمہ بروزن عثمان ہے۔ بڑا قصبہ ہے مکہ سے تقریباً سو کلومیٹر فاصلہ پر واقع ہے۔ جس آدمی نے استدلال کیا کہ چار برد سے کم فاصلہ پر نماز قصر جائز نہیں اس نے اس حدیث سے احتجاج کیا ہے۔ مگر اس سے یہ استدلال صحیح نہیں کیونکہ اس کا راوی عبدالوہاب بن مجاہد متروک الحدیث ہے اور امام ثوری رحمۃ اللہ علیہ نے تو اسے کذاب تک کہا ہے اور ازدی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ اس سے روایت کرنا حلال نہیں ہے۔ مزید برآں یہ کہ اس کا اپنے باپ سے سماع ہی ثابت نہیں۔ لہٰذا یہ حدیث منقطع اور ضعیف ہے اور ناقابل استدلال ہے۔ صحیح بات یہی ہے کہ یہ حدیث موقوف ہے یعنی ابن عباس رضی اللہ عنہما خود مکہ اور طائف کے مابین جتنے فاصلہ پر قصر کرتے تھے۔ نیز مکہ اور عسفان اور مکہ اور جدہ کے مابین جتنے فاصلہ پر بھی قصر کرتے تھے اسے امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی مؤطا میں نقل کیا ہے مگر اس میں موقوف روایت سے فاصلہ کی تعیین نہیں ہوتی۔

(٣٥٠) وَعَنْ جَابِرٍ رَضِيَ اللَّهُ

حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے رسول اللہ ﷺ نے

تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «خَيْرُ أُمَّتِي الَّذِينَ إِذَا أَسَاءُوا اسْتَغْفَرُوا، وَإِذَا سَافَرُوا قَصَرُوا وَأَفْطَرُوا». أَخْرَجَهُ الطَّبَرَانِيُّ فِي الأَوْسَطِ بِإِسْنَادٍ ضَعِيفٍ، وَهُوَ فِيْ مَرَاسِيلِ سَعِيْدِ بْنِ الْمُسَيَّبِ عِنْدَ الْبَيهَقِيِّ مُخْتَصَراً.

فرمایا کہ ”میری امت کے بہترین لوگ وہ ہیں جو برائیاں کرکے بخشش کے طلبگار ہوتے ہیں اور جب سفر پر ہوتے ہیں تو نماز قصر کا اہتمام کرتے ہیں اور روزہ نہیں رکھتے۔“ (اسے طبرانی نے ضعیف سند کے ساتھ اپنی اوسط میں روایت کیا ہے اور یہ بیہقی کے ہاں مختصراً سعید بن مسیب کی مراسیل سے ہے۔ بیہقی نے اسے مختصر بیان کیا ہے)

راوی حدیث: ﴿ سعید بن مسیب رحمہ اللہ ﴾ کبار تابعین کے سردار تھے۔ علم کے اعتبار سے ان سب سے وسیع علم رکھتے تھے۔ انہوں نے فقہ' حدیث' زہد' عبادت اور تقویٰ و ورع کے بارے میں بہت کچھ جمع کیا ہوا تھا۔ یعنی جمع العلوم شخصیت تھے۔ ان کی پیدائش حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی خلافت کے دو سال بعد ہوئی تھی اور ۹۰ھ کے بعد فوت ہوئے۔ (مسیب) اس میں ”یاء“ پر تشدید اور فتحہ اور تشدید اور کسرہ دونوں طرح پڑھا گیا ہے۔

(۳۵۱) وَعَنْ عِمْرَانَ بْنِ حُصَيْنٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُما قَالَ: كَانَتْ بِيْ بَوَاسِيْرُ، فَسَأَلْتُ النَّبِيَّ ﷺ عَنِ الصَّلاةِ، فَقَالَ: «صَلِّ قَآئِماً، فَإِنْ لَّمْ تَسْتَطِعْ فَقَاعِداً، فَإِنْ لَّمْ تَسْتَطِعْ فَعَلَى جَنْبٍ». رَوَاهُ الْبُخَارِيُّ.

حضرت عمران بن حصین رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ مجھے بواسیر کا مرض تھا۔ اس صورت میں میں نے نبی ﷺ سے نماز پڑھنے کے بارے میں دریافت کیا تو آپ نے فرمایا ”کھڑے ہو کر پڑھو اگر کھڑے ہو کر نہ پڑھ سکو تو پھر بیٹھ کر پڑھو اور اس کی بھی طاقت و استطاعت نہ ہو تو پھر پہلو کے بل لیٹ کر پڑھ لو۔“ (بخاری)

لغوی تشریح: ﴿ بواسیر ﴾ یہ بہت برا مرض ہے۔ مقعد کے امراض سے تعلق رکھتا ہے۔ مقعد کی رگوں کا پھیل جانا اس کا سبب ہے اور بسا اوقات خون اس میں سے بہتا ہے۔ بواسیر جمع ہے اس کا واحد باسور ہے۔

حاصل کلام: بیٹھنے کی صورت بعض کے نزدیک چار زانو ہے اور بعض کے نزدیک تشہد کی سی صورت۔ دراصل بات یہ ہے کہ مریض جس طرح آسانی سے بیٹھ سکتا ہے اسی طرح بیٹھے اسے ہر طرح اجازت ہے۔ چت لیٹ کر پڑھنے کی بھی گنجائش ہے۔ اگر کسی حالت اور کسی پہلو بھی ممکن نہ ہو تو پھر جو صورت اختیار کر سکتا ہو کر لے۔

(۳۵۲) وَعَنْ جَابِرٍ رَضِيَ اللَّهُ

حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی ﷺ نے

تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: عَادَ النَّبِيُّ ﷺ مَرِيْضاً، فَرَآه يُصَلِّي عَلَى وِسَادَةٍ فَرَمَى بِهَا، وَقَالَ: «صَلِّ عَلَى الأَرْضِ إِنِ اسْتَطَعْتَ، وَإِلاَّ فَأَوْمِ إِيْمَاءً، وَاجْعَلْ سُجُودَكَ أَخْفَضَ مِنْ رُكُوعِكَ. رَوَاهُ البَيْهَقِيُّ، وَصَحَّحَ أَبُو حَاتِمٍ وَقْفَهُ.

ایک مریض کی عیادت فرمائی تو دیکھا کہ وہ تکیہ پر نماز پڑھ رہا ہے آپؐ نے وہ تکیہ دور پھینک دیا اور فرمایا کہ "زمین پر نماز پڑھ اگر تمہارے بس میں ہے ورنہ سر کے اشارہ سے پڑھ لے۔ ہاں اپنے سجدوں کیلئے رکوع کی بہ نسبت ذرا نیچے جھکو۔" (بیہقی نے اسے روایت کیا ہے اور ابوحاتم نے اس کے موقوف ہونے کو صحیح قرار دیا ہے)

لغوی تشریح: ﴿ عاد ﴾ عیادت سے ماخوذ ہے۔ عیادت کہتے کسی مریض سے ملاقات کرنے یا دریافت احوال کو ﴿ وسادة ﴾ تکیہ جو سونے والا اپنے سر کے نیچے رکھتا ہے۔ یہی حدیث اس سے پہلے بھی گزر چکی ہے۔

(٣٥٣) وَعَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْها قالت: رَأَيْتُ النَّبِيَّ ﷺ يُصَلِّيْ مُتَرَبِّعاً. رَوَاهُ النَّسَائِيُّ، وَصَحَّحَهُ الحَاكِمُ.

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا بیان ہے کہ میں نے نبی ﷺ کو متربعا (چار زانو) ہو کر نماز پڑھتے دیکھا ہے۔ (اسے نسائی نے روایت کیا ہے اور حاکم نے اس کو صحیح قرار دیا ہے)

لغوی تشریح: ﴿ متربعا ﴾ تربع سے ماخوذ ہے ہے۔ بیٹھنے کی ایک قسم ہے وہ اس طرح کہ اپنا دایاں پاؤں اپنی بائیں ران کے نیچے اور اپنا بایاں پاؤں اپنی دائیں ران کے نیچے بٹھا کر مقعد پر بیٹھنا۔

حاصل کلام: اس سے ثابت ہوا کہ چار زانو بیٹھ کر بھی نماز جائز ہے۔

١٢ - بَابُ صَلاَةِ الجُمُعَةِ

نماز جمعہ کا بیان

(٣٥٤) عَنْ عَبْدِ اللهِ بْنِ عُمَرَ، وَأَبِيْ هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمْ، أَنَّهُمَا سَمِعَا رَسُولَ اللهِ ﷺ يَقُولُ عَلَى أَعْوَاد مِنْبَرِهِ: «لَيَنْتَهِيَنَّ أَقْوَامٌ عَنْ وَدْعِهِمُ الجُمُعَاتِ، أَوْ لَيَخْتِمَنَّ اللَّهُ عَلَى قُلُوبِهِمْ، ثُمَّ لَيَكُونُنَّ مِنَ الغَافِلِينَ». رَوَاهُ مُسْلِمٌ.

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ (دونوں) سے مروی ہے کہ انہوں نے رسول اللہ ﷺ کو منبر کی سیڑھیوں پر یہ فرماتے سنا ہے کہ "لوگ نماز جمعہ چھوڑنے سے باز آجائیں ورنہ اللہ تعالیٰ ان کے دلوں پر مہر لگا دے گا پھر وہ لازماً غافل لوگوں میں شمار ہوں گے۔" (مسلم)

لغوی تشریح: ﴿ باب صلاة الجمعة ﴾ جمعہ کے جیم اور میم پر ضمہ اور میم پر فتح اور جزم بھی جائز

ہے۔ ﴿ اعواد ﴾ عود کی جمع جس کے معنی لکڑی ہیں' یہاں مراد منبر کی لکڑی سے ساختہ سیڑھیاں یا یہ بھی معنی ہو سکتا ہے کہ اس منبر پر تشریف فرماتے تھے جو عود سے بنا ہوا تھا۔ یہ منبر ۷ھ یا ۸ھ میں انصاری خاتون کے غلام میمون نامی نے تیار کیا تھا۔ اس کی تین سیڑھیاں تھیں۔ پھر بعد میں مروان نے امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے دور امارت میں پہلے منبر کے نچلے حصہ میں چھ سیڑھیاں مزید بنا دیں۔ یہ منبر ۶۵۴ھ تک باقی رہا اور مسجد نبوی جب ۶۵۴ھ میں آگ لگنے سے جل گئی تو یہ منبر رسول ﷺ بھی اسی آگ کی لپیٹ میں آکر خاکستر ہوگیا۔ (سبل السلام) ﴿ عن ودعهم ﴾ "واؤ" پر فتحہ اور "دال" ساکن' مصدر ہے اور فاعل کی طرف مضاف ہے۔ ﴿ الجمعات ﴾ اس کا مفعول ہے یعنی ان لوگوں کا جمعہ کو چھوڑنے کی وجہ سے ﴿ اولیختمن الله ﴾ اللہ تعالیٰ لازماً مہر لگا دے گا۔ ﴿ علی قلوبهم ﴾ ان کے دلوں پر بایں طور کہ دلوں پر زنگ چڑھا دے گا تو یہ لوگ جمعہ کے لطف اور اس کی فضیلت کے حصول سے محروم رہ جائیں گے اور ان کے دلوں میں سختی اور سنگ دلی پیدا فرما دے گا۔ ﴿ ثم لیکونن ﴾ پہلے نون پر ضمہ اور دوسرے پر تشدید۔ جمع کا صیغہ ہے۔ نون ثقیلہ برائے تاکید یعنی "پھر وہ لازماً ہو جائیں گے۔"

حاصل کلام: جمعہ کے لغوی معنی ایک جگہ جمع ہونے کے ہیں جسے دور جاہلیت میں "عروبہ" کہتے تھے۔ اسلام نے اس کا نام جمعہ رکھا کہ مسلمان ایک مخصوص دن میں مخصوص اوقات میں عبادت الٰہی کیلئے مجتمع ہوں اور مل کر سب اکٹھے عبادت کریں اور ایک دوسرے کے حالات سے باخبر بھی ہوں اور اجتماعی فیصلے بھی کئے جا سکیں۔

اس حدیث سے جمعہ کی فرضیت ثابت ہوتی ہے' اسے بغیر کسی عذر شرعی کے ترک کرنے پر دلوں پر مہریں لگ جاتی ہیں اور آدمی دین سے بے بہرہ ہو جاتا ہے آخر کار منافقین و غافلین کے زمرہ میں شامل ہو کر رہ جاتا ہے۔ گویا نماز جمعہ کو معمولی سمجھ کر اس بارے میں تساہل اور سستی کا مظاہرہ کرنا رسوائی اور خذلان کا موجب ہے اور توفیق الٰہی سے محروم رہنے کا باعث ہے۔

(۳۵۵) وَعَنْ سَلَمَةَ بْنِ الأَكْوَعِ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: كُنَّا نُصَلِّي مَعَ رَسُولِ اللهِ ﷺ الجُمُعَةَ، ثُمَّ نَنْصَرِفُ وَلَيْسَ لِلْحِيْطَانِ ظِلٌّ نَسْتَظِلُّ بِهِ. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ، وَاللَّفْظُ لِلْبُخَارِيِّ.

وَفِيْ لَفْظٍ لِمُسْلِمٍ: كُنَّا نُجَمِّعُ مَعَهُ إِذَا زَالَتِ الشَّمْسُ، ثُمَّ نَرْجِعُ، نَتَتَبَّعُ الفَيْءَ.

حضرت سلمہ بن اکوع رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ہم رسول اللہ ﷺ کے ساتھ جمعہ ادا کرتے تھے۔ جمعہ سے فارغ ہو کر جب ہم اپنے گھروں کو جاتے تو اس وقت دیواروں کا سایہ نہیں ہوتا تھا کہ ہم سایہ میں بیٹھ کر آرام کر لیتے (یا سایہ میں چل کر گھر پہنچ جاتے) ۔ (بخاری و مسلم) متن حدیث کے الفاظ بخاری کے ہیں) اور مسلم میں ہے کہ آپ کے ساتھ نماز جمعہ ادا کرتے جب زوال ہو جاتا پھر واپس ہوتے۔

لغوی تشریح: ﴿ حيطان ﴾ حائط کی جمع' دیوار کے معنی ہیں۔ ﴿ ظل نستظل به ﴾ دیواروں کا اپنا

اصلی سایہ اتنا بھی نہیں ہوتا تھا کہ ہم اس میں قدرے آرام کر سکتے۔ اس سے اصل سایہ کی نفی مراد نہیں ہے۔ اس حدیث سے قبل از زوال آفتاب نماز جمعہ ادا کرنا صحیح ثابت نہیں ہوتا۔ ہاں جمعہ کو جلدی ادا کرنے کی دلیل ضرور ہے کہ جونہی زوال آفتاب ہو جمعہ کی نماز ادا کر لی جائے۔ ﴿ کنا نجمع ﴾ تجمیع سے ماخوذ ہے ہم نماز جمعہ ادا کرتے تھے۔ ﴿ نتتبع ﴾ جستجو کر کے تلاش کرتے تھے۔ ﴿ الفیئی ﴾ سایہ' ایسا اس لئے ہم کرتے تھے کہ زوال کے آغاز ہی پر جلد ہم نماز ادا کر لیں۔

حاصل کلام: اس حدیث سے ثابت ہوتا ہے کہ نبی کریم ﷺ کے عہد مبارک میں نماز جمعہ بہت جلد ادا کی جاتی تھی۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ نماز جمعہ زوال سے پہلے بہرحال نہیں ہوتا تھا۔ اس کا وقت بھی نماز ظہر کا وقت ہی ہے۔ علماء اسلام کی اکثریت اسی طرف ہے البتہ امام احمد رحمۃ اللہ علیہ اور اسحٰق بن راھویہ رحمۃ اللہ علیہ کی رائے یہ ہے کہ جمعہ زوال سے پہلے بھی ہو جاتا ہے۔ نیز امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک خطبہ جمعہ تو زوال سے پہلے جائز ہے مگر نماز درست نہیں وہ زوال آفتاب کے بعد ہی ہے۔ اس دور میں جمعہ کی نماز ظہر کی نماز سے بھی زیادہ دیر سے پڑھتے ہیں جو سراسر حضور ﷺ کے عمل کے مخالف ہے۔ خطباء و ائمہ مساجد کو اس پر غور کرنا چاہئے۔

راوی حدیث: ﴿ سلمہ بن اکوع رضی اللہ عنہ ﴾ ابو مسلم ان کی کنیت ہے۔ سلمہ بن عمرو بن اکوع اور اکوع کا نام سنان بن عبداللہ اسلمی مدنی ہے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں نہایت بہادروں میں شمار ہوتے تھے۔ اتنے تیز رفتار تھے کہ دوڑنے میں گھوڑے سے بھی آگے نکل جاتے تھے۔ بہت سخی' فاضل اور بھلائی کا پتلا تھے۔ مدینہ منورہ میں ۷۴ھ میں وفات پائی۔

(٣٥٦) وَعَنْ سَهْلِ بْنِ سَعْدٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: مَا كُنَّا نَقِيلُ وَلاَ نَتَغَدَّى إِلاَّ بَعْدَ الْجُمُعَةِ. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ، وَاللَّفْظُ لِمُسْلِمٍ. وَفِي رِوَايَةٍ: فِي عَهْدِ رَسُولِ اللهِ ﷺ.

حضرت سہل بن سعد رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ (جمعہ کے روز) ہم دوپہر کا قیلولہ اور کھانا نماز جمعہ کے بعد کرتے تھے۔ (بخاری و مسلم۔ متن حدیث کے الفاظ مسلم کے ہیں) اور ایک روایت میں ہے "یہ رسول اللہ ﷺ کے عہد مبارک میں تھا۔"

لغوی تشریح: ﴿ نقیل ﴾ قیلولہ سے ماخوذ ہے باب ضرب یضرب ہے۔ قیلولہ دوپہر کے وقت ذرا ستانے اور آرام کرنے کو کہتے ہیں۔ خواہ نیند نہ آئے ﴿ نتغدی ﴾ غداء سے ماخوذ۔ اس کھانے کو کہتے ہیں جو دوپہر کے وقت کھایا جاتا ہے۔ اس سے یہ استدلال کیا گیا ہے کہ نصف النہار سے قبل نماز جمعہ پڑھنا صحیح ہے۔ مگر اس حدیث میں ایسی کوئی دلیل نہیں ہے' اس لئے کہ "قیلولہ" اور "غداء" کا اطلاق زوال کے بعد پر مجازاً کیا گیا ہے اور مدینہ و مکہ میں لوگ قیلولہ اور دوپہر کا کھانا نماز ظہر کے بعد ہی ہوتا تھا۔ جیسا کہ ارشاد باری سے ثابت ہوتا ہے۔ ﴿ وحین تضعون ثیابکم من الظهیرة ﴾ (۲۴/ ۵۸) یعنی جب تم دوپہر کو اپنے کپڑے اتار دیا کرتے تھے۔ (سبل)

حاصل کلام: اس حدیث سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے کہ عہد رسالت مآب ﷺ میں نماز جمعہ جلدی ادا کی جاتی تھی۔ صحابہ کرام؇ نماز جمعہ کے بعد گھر واپس جا کر دوپہر کا کھانا کھاتے تھے پھر دوپہر کا آرام (قیلولہ) کرتے تھے۔

راوی حدیث: ﴿سہل بن سعد رضی اللہ عنہ﴾ ان کی کنیت ابوالعباس ہے۔ خزرجی ساعدی انصاری ہیں۔ ان کا اسم گرامی حزن تھا۔ اسلام لانے کے بعد آنحضرت ﷺ نے ان کا نام تبدیل کر کے سھل رکھ دیا۔ معلوم ہوا کہ برا نام ہو تو اسے بدل دینا چاہئے۔ جب آپ ﷺ کی وفات ہوئی اس وقت سھل پندرہ برس کے تھے۔ ۹۱ھ میں مدینہ میں وفات پائی۔ مدینہ منورہ میں سب سے آخر میں فوت ہونے والے یہی صحابی تھے۔ ان سے تقریباً ایک سو احادیث مروی ہیں۔

(۳۵۷) وَعَنْ جَابِرٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ كَانَ يَخْطُبُ قَائِماً، فَجَاءَتْ عِيْرٌ مِنَ الشَّامِ، فَانْفَتَلَ النَّاسُ إِلَيْهَا، حَتَّى لَمْ يَبْقَ إِلاَّ اثْنَا عَشَرَ رَجُلاً. رَوَاهُ مُسْلِمٌ.

حضرت جابر رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ نبی ﷺ جمعہ کا خطبہ کھڑے ہو کر ارشاد فرمایا کرتے تھے کہ شام سے ایک تجارتی قافلہ آگیا۔ سب لوگ اس قافلہ کی طرف چھٹ گئے صرف بارہ آدمی خطبہ سننے کیلئے باقی رہ گئے۔ (مسلم)

لغوی تشریح: ﴿عیر﴾ عین کے نیچے کسرہ اور "یاء" ساکن۔ ساز و سامان سے لدے ہوئے اونٹ۔ مراد اس جگہ تجارتی قافلہ ہے۔ ﴿فانفتل﴾ جلدی سے لوگ اس کی طرف بھاگ گئے۔

حاصل کلام: اس حدیث سے ثابت ہوتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ خطبہ جمعہ کھڑے ہو کر ارشاد فرمایا کرتے تھے۔ مسنون یہی ہے اور خطبہ نماز سے پہلے ہوتا تھا۔ نماز کے بعد نہیں۔ نیز ثابت ہوا کہ بارہ افراد بھی ہوں تو جمعہ درست ہے۔ شوافع نے جو چالیس کی تعداد کو ضروری قرار دیا ہے وہ صحیح نہیں۔

(۳۵۸) وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُما قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «مَنْ أَدْرَكَ رَكْعَةً مِنْ صَلاَةِ الْجُمُعَةِ وَغَيْرِهَا فَلْيُضِفْ إِلَيْهَا أُخْرَى، وَقَدْ تَمَّتْ صَلاَتُهُ». رَوَاهُ النَّسَائِيُّ وَابْنُ مَاجَهْ وَالدَّارَقُطْنِيُّ، وَاللَّفْظُ لَهُ، وَإِسْنَادُهُ صَحِيحٌ، لَكِنْ قَوَّى أَبُو حَاتِمٍ إِرْسَالَهُ.

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "جس کسی نے نماز جمعہ اور دیگر نمازوں میں سے کسی کی ایک رکعت (جماعت کے ساتھ) پالی تو وہ دوسری اس کے ساتھ ملا لے۔ تو بس اس کی نماز پوری ہو گئی" (اسے نسائی، ابن ماجہ اور دارقطنی نے روایت کیا ہے۔ یہ الفاظ دارقطنی کے ہیں۔ اس کی سند صحیح ہے لیکن ابوحاتم نے اس کے مرسل ہونے کو قوی قرار دیا ہے)

لغوی تشریح: ﴿ فلیضف ﴾ اضافہ سے ماخوذ ہے۔ لام اس میں امر کا ہے۔ مطلب ہے کہ اسے ساتھ ملا لے ﴿ اخری ﴾ دوسری رکعت۔

حاصل کلام: اس حدیث سے ثابت ہو رہا ہے کہ جمعہ کی ایک رکعت پا لینے والا دوسری رکعت ساتھ ملا کر دوسری رکعت پوری مکمل کر لے۔ ظاہر ہے جو شخص ایک رکعت ہی پا سکے گا اس کا خطبہ جمعہ تو فوت ہوگا۔ مگر جمعہ اس کا صحیح ہوگا۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ اور امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ دونوں کی یہی رائے ہے۔ خطبہ جمعہ میں شریک ہونا ضروری نہیں۔ مصنف رحمۃ اللہ علیہ نے گو یہاں اس روایت کی سند کو صحیح کہا ہے مگر التلخیص میں اس کے ضعف کی طرف اشارہ کیا ہے' لیکن (من ادرك الركعة فقد ادرك الصلاة) کی صحت میں تو کسی کو کلام نہیں۔ جس کے عموم میں جمعہ بھی شامل ہے۔

(۳۵۹) وَعَنْ جَابِرِ بْنِ سَمُرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُ، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ كَانَ يَخْطُبُ قَائِماً، ثُمَّ يَجْلِسُ، ثُمَّ يَقُوْمُ فَيَخْطُبُ قَائِماً، فَمَنْ أَنْبَأَكَ أَنَّهُ كَانَ يَخْطُبُ جَالِساً فَقَدَ كَذَبَ. أَخْرَجَهُ مُسْلِمٌ.

حضرت جابر بن سمرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کھڑے ہو کر خطبہ جمعہ ارشاد فرماتے پھر درمیان میں تھوڑا سا بیٹھ جاتے پھر کھڑے ہو کر خطاب فرماتے۔ پس جس کسی نے تمہیں یہ اطلاع دی کہ آپؐ بیٹھ کر خطبہ ارشاد فرماتے تھے اس نے جھوٹ بولا۔ (مسلم)

لغوی تشریح: ﴿ انبـاك ﴾ انباء (باب افعال) سے ماخوذ ہے۔ جو تمہیں خبر دے' اطلاع دے۔

حاصل کلام: اس حدیث سے کئی مسئلے ثابت ہوتے ہیں۔ جمعہ کے دو خطبے ہیں۔ دونوں کے درمیان بیٹھنا مسنون ہے اور آپؐ دونوں خطبے کھڑے ہو کر ارشاد فرماتے تھے۔ شرعی عذر کے بغیر ان میں سے کسی کی بھی خلاف ورزی اگر مسنون سمجھ کر کی جائے تو بدعت ہوگی۔ ابن ابی شیبہ میں مروی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور ابوبکر رضی اللہ عنہ و عمر رضی اللہ عنہ اور عثمان رضی اللہ عنہ و علی رضی اللہ عنہ سب کھڑے ہو کر جمعہ کا خطبہ ارشاد فرماتے تھے۔ بعض احادیث سے آپؐ کا منبر پر چڑھ کر مقتدیوں کے رخ ہو کر السلام علیکم فرمانا بھی ثابت ہے۔

(۳۶۰) وَعَنْ جَابِرِ بْنِ عَبْدِ اللهِ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُما قَالَ: كَانَ رَسُولُ اللهِ ﷺ إِذَا خَطَبَ آحْمَرَّتْ عَيْنَاهُ، وَعَلَا صَوْتُهُ، وَاشْتَدَّ غَضَبُهُ، حَتَّى كَأَنَّهُ مُنْذِرُ جَيْشٍ يَقُوْلُ: «صَبَّحَكُمْ وَمَسَّاكُمْ»، وَيَقُوْلُ: «أَمَّا بَعْدُ، فَإِنَّ خَيْرَ الحَدِيثِ كِتَابُ اللهِ،

حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب خطبہ ارشاد فرماتے تو رخ انور سرخ ہو جاتا۔ آواز بلند ہو جاتی اور جوش بڑھ جاتا (جس سے غصہ کے آثار نمایاں ہوتے۔ بس اسی طرح کی کیفیت ہو جاتی) جیسے کسی لشکر کو ڈانٹ رہے ہیں کہ "دشمن کا لشکر صبح کو پہنچا یا شام کو پہنچا" اور فرماتے "حمد و صلاۃ کے بعد۔ بہترین بات اللہ کی

وَخَيْرَ الْهَدْيِ هَدْيُ مُحَمَّدٍ، وَشَرَّ الأُمُورِ مُحْدَثَاتُهَا، وَكُلَّ بِدْعَةٍ ضَلاَلَةٌ». رَوَاهُ مُسْلِمٌ.

کتاب ہے اور بہترین طریقہ محمد ﷺ کا طریقہ ہے۔ کاموں میں بدترین کام نئے کام ہیں (بدعت کے کام) اور ہر بدعت گمراہی و ضلالت ہے۔ (مسلم)

وَفِيْ رِوَايَةٍ لَّهُ: كَانَتْ خُطْبَةُ النَّبِيِّ ﷺ يَومَ الجُمُعَةِ: يَحْمَدُ اللَّهَ، وَيُثْنِيْ عَلَيْهِ، ثُمَّ يَقُولُ عَلَى إِثْرِ ذَلِكَ، وَقَدْ عَلاَ صَوْتُهُ.

اور مسلم کی ایک روایت میں ہے جمعہ کے روز نبی ﷺ کا خطبہ (یوں) ہوتا تھا کہ اللہ کی حمد اور اللہ کی ثنا بیان کرتے پھر اس کے بعد (خطبہ) فرماتے تو آپؐ کی آواز بلند ہوتی۔

وَفِيْ رِوَايَةٍ لَّهُ: «مَنْ يَهْدِ اللَّهُ فَلاَ مُضِلَّ لَهُ، وَمَنْ يُضْلِلْ فَلاَ هَادِيَ لَهُ». وَلِلنَّسَائِيِّ: «وَكُلُّ ضَلاَلَةٍ فِي النَّارِ».

اور مسلم کی ایک روایت میں یہ ہے ”جسے اللہ راہ ہدایت دکھا دے یا جسے راہ ہدایت پر گامزن فرما دے اسے پھر کوئی گمراہ کرنے والا نہیں۔ جسے وہ گمراہ کر دے پھر اسے راہ ہدایت دکھانے اور چلانے والا کوئی نہیں۔“ اور نسائی میں ہے ”وکل ضلالۃ فی النار“ ہر گمراہی انجام کار آگ میں داخلہ کا موجب ہے۔

لغوی تشریح: ﴿کانہ منذر﴾ یعنی اس شخص کی طرح جو اپنی قوم کو لشکر عظیم سے ڈراتا ہے جو غارت گری کرنے والا ہے۔ ﴿یقول﴾ وہ ڈرانے اور متنبہ کرنے والا اس قوم سے مخاطب ہے ﴿صبحکم﴾ باب تفعیل سے یعنی دشمن صبح سویرے تم پر یلغار کر کے ٹوٹ پڑے۔ ﴿مساکم"﴾ یہ بھی باب تفعیل سے ہے یعنی دشمن شام کے وقت تم پر حملہ آور ہو۔ دونوں کا مفہوم ہے کہ بالکل قریب ہے کہ دشمن تم پر نازل ہو جائے۔ ﴿الھدی﴾ ”ھاء“ پر فتحہ اور دال ساکن۔ راستہ اور طریق کے معنی۔ ﴿محدثاتھا﴾ نئی نئی چیزیں' بدعتیں۔ جن کا نہ ثبوت کلام الٰہی میں ہو اور نہ سنت نبویؐ میں۔ ﴿یثنی علیہ﴾ اثنی یثنی' باب افعال سے ثناء سے ماخوذ ہے ”یاء“ پر ضمہ اور نون پر کسرہ۔ تعریف اچھے اوصاف و اعمال پر ﴿ثم یقول علی اثر ذالک﴾ یعنی اس کے بعد خطبہ ارشاد فرماتے ”اثر“ ہمزہ پر فتحہ بھی ہے اور کسرہ بھی آسکتا ہے۔ ﴿من یھد اللہ﴾ یہ جملہ آپ حمد کے بعد اور شہادت سے پہلے ادا فرماتے ﴿وکل ضلالۃ﴾ کو ﴿کل بدعۃ ضلالۃ﴾ کے بعد کہتے۔ اس حدیث سے یہ تقسیم ثابت نہیں ہوتی کہ بدعت کی دو قسمیں ہیں ایک بدعت سیئہ اور دوسری بدعت حسنہ۔ بلکہ ہر بدعت ضلالت و گمراہی ہی ہے خواہ حسنہ ہو۔ سطحی عقل و خرد کے مالک حضرات کے نزدیک۔ اس کی بنیاد دراصل اللہ اور رسول ﷺ کے علاوہ کسی دوسرے کو شارح بنانا ہے اور یہ تو کھلی گمراہی و بدراہی ہے اور جو حسنہ (نیکی و بھلائی) ہے کیسے ہو سکتا ہے کہ وہ بدعت ہو اور جو بدعت ہو کیسے ممکن ہے کہ وہ حسنہ (نیکی و بھلائی) ہو۔

حاصل کلام: یہ وہ خطبہ مسنونہ ہے جو رسول کریم ﷺ کی زبان مبارک سے ثابت ہے۔ خطبہ کے دوران خطیب پر مختلف واردات ہوتی ہیں جس کی وجہ سے کسی وقت چہرے پر ایسے آثار نمایاں طور پر محسوس ہوتے ہیں اس سے سامعین کو متاثر کرنا مقصود ہوتا ہے۔ خطبہ میں اللہ تعالیٰ ہی کی حمد و ثنا ہونی چاہئے۔ خطبہ مختصر مگر جامع ہو۔ خطبہ میں ایسا انداز اختیار کیا جائے کہ سامعین اس سے متاثر بھی ہوں اور محظوظ بھی' لیکن تکلف سے اجتناب کرنا چاہئے۔ خطبہ کو طول دینے سے بھی احتراز کرنا چاہئے۔ اس لئے کہ مختصر' مگر جامع خطبہ سامعین کی سمع خراشی کا موجب نہیں بنتا بلکہ اسے یاد رکھنا سہل اور آسان ہوتا ہے اور اپنا بہترین اثر چھوڑتا ہے۔

(٣٦١) وَعَنْ عَمَّارِ بْنِ يَاسِرٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: سَمِعْتُ رَسُولَ اللهِ ﷺ يَقُولُ: «إِنَّ طُولَ صَلاَةِ الرَّجُلِ وَقِصَرَ خُطْبَتِهِ مَئِنَّةٌ مِنْ فِقْهِهِ». رَوَاهُ مُسْلِمٌ.

حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ میں نے رسول اللہ کو یہ فرماتے سنا ہے کہ "آدمی کی نماز لمبی اور خطبہ مختصر اس کی فقاہت کی نشانی ہے۔" (مسلم)

لغوی تشریح: ﴿ قصر ﴾ قاف کے نیچے کسرہ اور "صاد" پر فتحہ ہے۔ مختصر کے معنی میں ﴿ مئنة ﴾ میم پر فتحہ اور همزہ کے نیچے کسرہ اور نون پر فتحہ اور تشدید۔ معنی علامت' نشانی۔ یہ انسان کے فقیہہ و دانا ہونے کی علامت و نشانی ہے۔

حاصل کلام: اس حدیث میں خطیب کی عقلمندی کی علامت یہ بیان ہوئی ہے کہ اس کی نماز لمبی اور خطبہ چھوٹا ہوتا ہے۔ مختصر بات یاد رکھنی' ذہن نشین کرنی آسان ہوتی ہے۔ آنجناب ﷺ کے خطبات جمعہ عام طور پر مختصر مگر جامع ہوتے تھے جنہیں یاد رکھنا یا حفظ کرنا زیادہ مشکل نہیں ہوتا تھا' بآسانی نوک زبان ہو جاتے تھے۔ مگر صد افسوس کہ اس دور میں ہمارے خطباء کی عموماً گنگا الٹی چلتی ہے یعنی خطبہ لمبا اور نماز مختصر' خلاف سنت اس طریقہ کی بہرنوع اصلاح ضروری ہے۔

(٣٦٢) وَعَنْ أُمِّ هِشَامٍ بِنْتِ حَارِثَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهَا قَالَتْ: مَا أَخَذْتُ ﴿قٓ وَالْقُرْآنِ الْمَجِيْدِ﴾ إِلاَّ عَنْ لِسَانِ رَسُولِ اللهِ ﷺ، يَقْرَأُهَا كُلَّ جُمُعَةٍ عَلَى الْمِنْبَرِ إِذَا خَطَبَ النَّاسَ. رَوَاهُ مُسْلِمٌ.

حضرت ام ہشام بنت حارثہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ میں نے سورہ ق لسان مآب ﷺ سے سن سن کر ازبر کرلی آپؐ ہر جمعہ اس سورۃ کو منبر پر کھڑے ہو کر خطاب جمعہ میں تلاوت فرماتے تھے۔ (مسلم)

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ خطبہ جمعہ میں سامعین کو قرآن مجید سنانا اور سمجھانا چاہئے۔ اس حدیث میں وارد ہے کہ آپؐ نے عموماً سورۂ ق خطبہ جمعہ میں تلاوت فرمائی۔ یہاں تک کہ

حضرت ام ھشام رضی اللہ عنہا نے سن سن کر ساری سورۂ زبانی یاد کرلی۔ اس سورۂ میں چونکہ موت، قیامت، جنت، دوزخ اور پند و نصائح کا ذکر ہے اس لئے عموماً آپ ؐ اس کی تلاوت کرتے، تاکہ آخرت یاد آئے اور فکر و عمل کی طرف طبیعت مائل رہے۔ خطبہ میں لایعنی قصے، بے مقصد باتیں شعرو شاعری حتیٰ کہ شرکیہ اشعار مزاج شریعت کے منافی ہے۔ جس سے اجتناب کرنا چاہئے۔

راوی حدیث: ﴿ ام ھشام رضی اللہ عنہا ﴾ حارثہ بن نعمان کی بیٹی، عمرہ بنت عبدالرحمٰن کی ماں جائی بہن۔ انصار کے مشہور قبیلہ نجار سے تعلق کی وجہ سے انصاریہ نجاریہ کہلائیں۔ کہتے ہیں کہ یہ خاتون بیعت الرضوان میں شریک تھیں۔

(٣٦٣) وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «مَنْ تَكَلَّمَ يَوْمَ الْجُمُعَةِ: وَالإِمَامُ يَخْطُبُ، فَهُوَ كَمَثَلِ الحِمَارِ يَحْمِلُ أَسْفَاراً، وَالَّذِي يَقُولُ لَهُ: أَنْصِتْ، لَيْسَتْ لَهُ جُمُعَةٌ». رَوَاهُ أَحْمَدُ بِإِسْنَادٍ لاَ بَأْسَ بِهِ.

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "جس شخص نے جمعہ کے روز اس وقت بات کی جب امام منبر پر کھڑا خطبہ جمعہ دے رہا ہو تو وہ شخص اس گدھے کی طرح ہے جس نے کتابیں اٹھائی ہوئی ہیں اور اس کا بھی جمعہ نہیں جس نے اسے کہا کہ خاموش رہ (اسے احمد نے ایسی سند سے روایت کیا جس کے متعلق (لاباس بہ) کہا گیا ہے)

وَهُوَ يُفَسِّرُ حَدِيْثَ أَبِي هُرَيْرَةَ فِي الصَّحِيْحَيْنِ مَرْفُوعاً: «إِذَا قُلْتَ لِصَاحِبِكَ: أَنْصِتْ، يَوْمَ الجُمُعَةِ، وَالإِمَامُ يَخْطُبُ، فَقَدْ لَغَوْتَ».

اور یہ حدیث حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث کی تفسیر کرتی ہے جو صحیحین میں منقول ہے "جب تو نے اپنے ساتھی سے کہا کہ چپ رہ اور امام اس وقت خطبہ جمعہ دے رہا ہو تو تو نے بھی لغو بات کی یا اپنا جمعہ لغو کردیا۔

لغوی تشریح: ﴿ اسفارا ﴾ سفر کی جمع ہے۔ سفر کے سین کے نیچے کسرہ۔ سفر کے معنی کتاب اور صحیفہ کے ہیں اور اسفار کتابوں کے معنی میں ﴿ انصت ﴾ انصات سے ماخوذ ہے۔ امر کا صیغہ ہے، معنی ہے خاموش رہ۔ ﴿ لیست لہ جمعۃ ﴾ یعنی اسے جمعہ کی فضیلت نہیں ملے گی بلکہ اس سے محروم رہے گا۔ یہ معنی نہیں کہ اس کی نماز ہی نہیں ہوئی۔ کیونکہ اس بات پر اجماع ہے کہ اس کی نماز جمعہ تو ادا ہو جائے گی مگر وہ جمعہ کی فضیلت سے محروم رہے گا۔ (سبل) جو آدمی دوسرے کو دوران خطبہ بات کرنے سے منع کرتا ہے، اس کا حال یہ ہے تو جو گفتگو کرنے کا مرتکب ہوتا ہے اس کی حرمان نصیبی کے کیا کہنے اور اس دھمکی و وعید کا کتنا مستحق ہے۔ ایسے شخص کو گدھے سے تشبیہہ دی گئی جو کتابوں کا بوجھ اپنے اوپر اٹھائے ہوئے ہے کہ وہ صرف بوجھ تلے دبا ہوا ہے ورنہ ان سے استفادہ نہیں کر سکتا۔ اسی طرح وہ شخص ہے جو اپنا قیمتی وقت، کاروبار، گھر چھوڑ کر نماز جمعہ کیلئے دور سے چل کر آتا ہے مگر اپنی نادانی اور بیوقوفی کی وجہ سے

دوران خطبہ گفتگو کا ارتکاب کر کے ثواب اور اجر سے محروم رہ جاتا ہے اور جمعہ کا ثواب اسے نہیں ملتا۔ ﴿وھو یفسر﴾ ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی متن والی حدیث حضرت ابوھریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی روایات میں لفظ لغو کی وضاحت کرتی ہے کہ لغو کا کیا معنی ہے۔ ﴿لغوت﴾ یعنی تو نے لغو کام کیا اور بے فائدہ کام کا ارتکاب کیا۔

حاصل کلام: اس حدیث سے ثابت ہوتا ہے کہ خطبہ جمعہ نمازیوں کو پورے سکون و اطمینان سے پورے انہماک اور توجہ سے بغور سننا چاہئے۔ کسی قسم کی ناروا حرکت نہیں کرنی چاہئے حتیٰ کہ اگر کوئی آدمی بولنے اور گفتگو کرنے کی حماقت بھی کرتا ہے تو اسے بھی منع نہیں کرنا چاہئے۔ پورا دھیان خطبہ کے مضامین کی طرف ہو۔

(٣٦٤) وَعَنْ جَابِرٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: دَخَلَ رَجُلٌ يَوْمَ الْجُمُعَةِ، وَالنَّبِيُّ ﷺ يَخْطُبُ، فَقَالَ: «صَلَّيْتَ»؟ قَالَ: لاَ، قَالَ: «قُمْ فَصَلِّ رَكْعَتَيْنِ». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت جابر رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ جمعہ کے روز ایک آدمی مسجد میں داخل ہوا۔ نبی ﷺ اس وقت خطبہ ارشاد فرما رہے تھے۔ آپؐ نے آنے والے سے دریافت فرمایا نماز پڑھی ہے؟ وہ بولا' نہیں۔ آپؐ نے فرمایا تو پھر اٹھ اور دو رکعت نماز ادا کر۔ (بخاری و مسلم)

لغوی تشریح: ﴿قم فصل﴾ قم اور صل دونوں امر کے صیغے جس آدمی نے پہلے دو رکعت نماز نہ پڑھی ہو اسے دوران خطبہ بھی دو رکعت پڑھنی چاہئیں۔ یہ مستحب ہیں اور یہ حدیث اس کے استحباب پر دلیل ہے۔ یہ دونوں رکعتیں یا جمعہ سے پہلے کی ہیں یا پھر تحیۃ المسجد کی۔ اگر یہ تحیۃ المسجد کی شمار ہوں تو پھر یہ دلیل ہے اس بات کی کہ تحیۃ المسجد کسی کے پہلے بیٹھ جانے سے فوت نہیں ہو جاتیں۔ اس لئے کہ آپؐ کا اس آدمی کو فرمانا کہ کھڑے ہو کر دو رکعت نماز پڑھو اس پر دلالت کرتا ہے کہ وہ شخص مسجد میں آکر بیٹھ گیا تھا اور نماز نہیں پڑھی تھی۔

حاصل کلام: معلوم ہوا کہ خطبہ جمعہ کے دوران بھی دو رکعت نماز پڑھی جا سکتی ہے اور اس میں استماع خطبہ کے عام حکم کی تخصیص ہے۔ دوسرا یہ بھی معلوم ہوا کہ خطیب خطبہ جمعہ کے علاوہ بھی ضرورت کے وقت بات چیت کر سکتا ہے بلکہ نئے آنے والے کو دو رکعت نماز پڑھنے کی تلقین بھی کر سکتا ہے۔ احناف ان دو رکعتوں کے قائل نہیں۔ یہ حدیث ان کی تردید کرتی ہے۔

(٣٦٥) وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ كَانَ يَقْرَأُ فِي صَلاَةِ الْجُمُعَةِ سُورَةَ الْجُمُعَةِ وَالْمُنَافِقِينَ. رَوَاهُ مُسْلِمٌ.

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ نبی ﷺ عموماً جمعہ کی نماز میں سورۂ جمعہ اور سورۂ منافقین پڑھا کرتے تھے۔ (مسلم)

وَلَهُ عَنِ النُّعْمَانِ بْنِ بَشِيْرٍ كَانَ يَقْرَأُ فِيْ العِيْدَيْنِ وَفِيْ الجُمُعَةِ «بِسَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الأَعْلَى» «وَهَلْ أَتَاكَ حَدِيْثُ الغَاشِيَةِ».

اور مسلم ہی کی روایت میں، جس کے راوی نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ ہیں آپؐ نماز عیدین اور جمعہ کی نماز میں سبح اسم ربك الاعلی (سورۃ اعلی) اور وهل اتاك حديث الغاشية (سورۂ غاشیہ) پڑھتے تھے۔

حاصل کلام: اس حدیث سے یہ معلوم ہوا کہ بعض نمازوں میں آپؐ بالعموم مخصوص سورتیں تلاوت فرمایا کرتے تھے۔ حضور ﷺ کے اسوۂ کی پیروی میں وہی سورتیں انہیں نمازوں میں پڑھنی چاہئیں۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ ان سورتوں کے علاوہ دوسری سورتیں پڑھنی ممنوع ہیں۔ مذکورہ بالا سورتوں کا نماز عیدین اور جمعہ میں پڑھا جانا اپنے اندر بہت سی حکمتیں پنہاں رکھتا ہے۔ ان سورتوں میں سے سورۂ جمعہ کا پڑھنا یہ حکمت رکھتا ہے کہ اس میں نماز جمعہ کیلئے آنے کی سعی و کوشش کرنے کی ترغیب ہے جو جمعہ کی اہمیت پر دلالت ہے۔ نماز جمعہ میں مخلص مسلمانوں کے ساتھ منافقین بھی آتے تھے اس لئے ان کی گوشمالی کیلئے سورۂ منافقین پڑھتے تھے کہ ان کی ڈانٹ ڈپٹ ہو۔ نیز سورۂ اعلیٰ اور سورۂ غاشیہ میں احوال و اموال آخرت بکثرت بیان ہوئے ہیں۔ آخرت کی یاددہانی تازہ کرنے کیلئے پڑھتے تھے۔ سورۂ جمعہ میں نبوت کی فضیلت اور اس کی چار حکمتیں بھی مذکور ہیں اور امت پر حضور ﷺ کے احسان کی یاددہانی کرائی گئی ہے۔ نیز ذکر الٰہی کی طرف متوجہ کیا گیا ہے اور اور سورۂ منافقین میں نفاق پر زجر و توبیخ کے ساتھ صدقہ و خیرات کرنے کی طرف راغب کیا گیا ہے۔

راوی حدیث: ﴿نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہما﴾ ان کی کنیت ابوعبداللہ۔ انصار میں سے تھے۔ ہجرت کے ۱۴ ویں مہینے انصار میں پیدا ہونے والا پہلا بچہ۔ شام میں سکونت اختیار کی۔ پھر ان کو کوفہ کا والی بنایا گیا اس کے بعد حمص کا۔ ۶۴ھ راھط کے دن خالد بن خلی کلاعی نے ان کو قتل کر کے منصب شہادت پر فائز کیا۔

(٣٦٦) وَعَنْ زَيْدِ بْنِ أَرْقَمَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: صَلَّى النَّبِيُّ ﷺ العِيْدَ، ثُمَّ رَخَّصَ فِيْ الجُمُعَةِ، فَقَالَ: «مَنْ شَآءَ أَنْ يُصَلِّيَ فَلْيُصَلِّ». رَوَاهُ الخَمْسَةُ إِلاَّ التِّرْمِذِيُّ، وَصَحَّحَهُ ابْنُ خُزَيْمَةَ.

حضرت زید بن ارقم رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی ﷺ نے نماز عید پڑھی اور جمعہ کے بارے میں رخصت و اجازت دے دی اور فرمایا ”جو پڑھنا چاہے پڑھ لے۔“ (اسے پانچوں نے روایت کیا ہے۔ بجز ترمذی کے اور ابن خزیمہ نے اسے صحیح قرار دیا ہے)

حاصل کلام: اس حدیث سے ثابت ہوتا ہے کہ اگر ایک ہی دن میں جمعہ اور عید آجائیں تو آپؐ نے نماز عید ادا فرمائی اور جمعہ کو ہر آدمی کی صوابدید پر چھوڑ دیا۔ ابوداؤد میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت میں ہے کہ آپؐ نے فرمایا ”اس دن دو عیدوں کا اجتماع ہوگیا ہے پس جو چاہے عید کی نماز کو کافی سمجھ لے البتہ ہم جمعہ ضرور ادا کریں گے۔“ اس میں یہ دلیل ہے کہ اگر عید کے روز جمعہ ہو تو عید پڑھنے کے بعد جمعہ ادا کرنا فرض نہیں رہتا بلکہ ظہر کی نماز پڑھی جاسکتی ہے۔ مگر احناف اس کے قائل نہیں۔ نیز عوام

کالانعام کا یہ تصور کہ عید اور جمعہ اکٹھے ایک ہی دن آجائیں تو برسر اقتدار حکومت کا زوال ہوتا ہے تو یہ سراسر وہم پر مبنی ہے۔ آپؐ نے تو اسے دو عیدوں کا دن قرار دیا ہے مگر بے خبری میں عوام اس سے بدشگونی لیتے ہیں جو قطعاً غلط ہے۔

(٣٦٧) وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «إِذَا صَلَّى أَحَدُكُمُ الجُمُعَةَ فَلْيُصَلِّ بَعْدَهَا أَرْبَعاً». رَوَاهُ مُسْلِمٌ.

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "جب تم میں سے کوئی جمعہ پڑھے تو اس کے بعد چار رکعتیں پڑھے۔" (مسلم)

حاصل کلام: اس حدیث سے ثابت ہوتا ہے کہ جمعہ کے بعد چار رکعتیں پڑھنی چاہئیں۔ امام شافعی رحمہ اللہ، امام احمد رحمہ اللہ بلکہ اکثر علماء رحمہ اللہ کا یہی قول ہے۔ ایک روایت میں ہے کہ جمعہ کے بعد آپ ﷺ دو رکعتیں پڑھتے تھے۔ اس سے شیخ الاسلام امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ گھر پر جمعہ کے بعد دو اور مسجد میں چار رکعتیں پڑھی جائیں۔ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما بھی یوں ہی کرتے تھے۔ احناف جمعہ کے بعد چھ رکعتوں کے قائل ہیں مگر کسی بھی صحیح مرفوع روایت سے یہ ثابت نہیں۔ واللہ اعلم۔

(٣٦٨) وَعَنِ السَّائِبِ بْنِ يَزِيْدَ أَنَّ مُعَاوِيَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ لَهُ: إِذَا صَلَّيْتَ الجُمُعَةَ فَلاَ تَصِلْهَا بِصَلاَةٍ حَتَّى تَتَكَلَّمَ أَوْ تَخْرُجَ، فَإِنَّ رَسُولَ اللهِ ﷺ أَمَرَنَا بِذَلِكَ: أَنْ لاَ نُوْصِلَ صَلاَةً بِصَلاَةٍ حَتَّى نَتَكَلَّمَ أَوْ نَخْرُجَ. رَوَاهُ مُسْلِمٌ.

حضرت سائب بن یزید رحمہ اللہ کا بیان ہے کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا جب تم نماز جمعہ پڑھو تو پھر دوسری کوئی نماز اس کے ساتھ نہ ملاؤ تاوقتیکہ تم سے کوئی بات کر لے یا وہاں سے نکل جائے۔ کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے ہمیں اسی طرح حکم دیا تھا کہ ہم نماز جمعہ کے ساتھ دوسری نماز نہ ملائیں تاوقتیکہ ہم کوئی بات نہ کرلیں یا وہاں سے نکل جائیں۔ (مسلم)

لغوی تشریح: "فلا تصلها" "وصل" سے ماخوذ ہے۔ باب ضرب یضرب ہے۔ نہ ملا اس کے ساتھ فرض جمعہ کے ساتھ۔ "تخرج" نکل جا۔ اس سے یہ بھی مراد ہو سکتا ہے کہ مسجد سے باہر نکل جا اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ جہاں فرض نماز ادا کی ہے اس جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہو جا۔

حاصل کلام: اس حدیث سے ثابت ہوتا ہے کہ نماز جمعہ کے بعد اسی جگہ فوراً کھڑے ہو کر سنتیں نہیں پڑھنی چاہئے۔ یہ حکم صرف جمعہ کے ساتھ ہی مخصوص نہیں ہے بلکہ ہر نماز کے نفل اور فرض میں فرق بذریعۂ انتقال جگہ یا گفتگو کرلینی چاہئے۔ تاکہ نفل کا فرض پر اشتباہ نہ ہو۔ نبی ﷺ نوافل و سنن بالعموم گھر پر ادا فرمایا کرتے تھے اور بہتر بھی یہی ہے۔ نوافل و فرائض ایک ہی جگہ نہ پڑھنے کی حکمت یہ بھی ہو سکتی ہے کہ مختلف جگہوں پر نماز پڑھنا نامۂ اعمال میں درج ہو جائے اور اجر و ثواب بھی زیادہ ملے۔

راوی حدیث: ﴿ سائب بن یزید رضی اللہ عنہ ﴾ ان کی کنیت مشہور قول کے مطابق ابویزید کندی ہے۔ ۲ھ میں پیدا ہوئے۔ اپنے باپ کے ساتھ حجۃ الوداع میں شریک ہوئے۔ ۸۰ھ میں فوت ہوئے۔

(۳۶۹) وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «مَنِ اغْتَسَلَ، ثُمَّ أَتى الْجُمُعَةَ، فَصَلَّى مَا قُدِّرَ لَهُ، ثُمَّ أَنْصَتَ حَتَّى يَفْرُغَ الإِمَام مِنْ خُطْبَتِهِ، ثُمَّ يُصَلِّي مَعَهُ، غُفِرَ لَهُ مَا بَيْنَهُ وَبَيْنَ الْجُمُعَةِ الأُخْرَى، وَفَضْلُ ثَلاثَةِ أَيَّامٍ». رَوَاهُ مُسْلِمٌ.

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "جو آدمی غسل کر کے جمعہ کیلئے آئے پھر نماز پڑھے جتنی اس کیلئے مقدر ہو۔ پھر خاموشی سے اس وقت تک بیٹھا رہے کہ امام خطبہ جمعہ سے فارغ ہو پھر امام کے ساتھ فرض نماز ادا کرے تو اس کے دونوں جمعوں کے درمیان کے گناہ معاف کر دیئے جائیں گے بلکہ مزید تین دن کے اور بھی۔" (مسلم)

لغوی تشریح: "ما قدر لہ" تقدیر سے ماخوذ ہے۔ صیغہ مجہول ہے یعنی نماز پڑھے جتنی اللہ اسے توفیق دے اور اس کے مقدر میں ہو۔ "انصت" فعل ماضی۔ خاموش رہا۔ جمہور کے نزدیک صغائر گناہوں کی بخشش مراد ہے کیونکہ کبائر توبہ سے معاف ہوتے ہیں۔

حاصل کلام: اس حدیث میں نماز جمعہ کی بڑی ترغیب ہے۔ جو شخص غسل کر کے آئے خطیب کے آنے سے پہلے ذکر و عبادت میں مصروف رہے۔ امام خطبہ شروع کرے تو خاموشی سے خطبہ سنے اور نماز جمعہ پڑھے تو اس کے جمعہ سے جمعہ تک کے تمام صغیرہ گناہ معاف کر دیئے جاتے ہیں۔

(۳۷۰) وَعَنْهُ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ أَنَّ رَسُولَ اللهِ ﷺ ذَكَرَ يَوْمَ الْجُمُعَةِ، فَقَالَ: «فِيْهِ سَاعَةٌ لاَ يُوَافِقُهَا عَبْدٌ مُسْلِمٌ، وَهُوَ قَائِمٌ يُصَلِّيْ يَسْأَلُ اللَّهَ عَزَّ وَجَلَّ شَيْئاً، إِلاَّ أَعْطَاهُ إِيَّاهُ». وَأَشَارَ بِيَدِهِ يُقَلِّلُهَا. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ. وَفِيْ رِوَايَةٍ لِمُسْلِمٍ: «وَهِيَ سَاعَةٌ خَفِيفَةٌ».

یہ حدیث بھی حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے ہی مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک روز جمعہ کا ذکر فرمایا کہ اس میں ایک ایسی گھڑی ہے جو بندۂ مسلم اس گھڑی میں نماز پڑھتے ہوئے اللہ تعالیٰ سے کسی چیز کا سوال کرے تو اللہ تعالیٰ اسے ضرور عنائت فرماتا ہے اور آپؐ نے اپنے دست مبارک سے اشارہ کیا کہ وہ وقت بہت تھوڑا سا ہے۔" (بخاری و مسلم)
اور مسلم کی مروی روایت میں ہے کہ وہ وقت خفیف سا ہوتا ہے

لغوی تشریح: "یقللھا" تقلیل سے ماخوذ ہے۔ قلت وقت کی جانب اشارہ فرما رہے تھے "خفیفہ" کے معنی بھی قلیل، تھوڑا سا۔ وہ گھڑی بہت ہی مختصر سی ہے جس میں دعا کی قبولیت ہوتی ہے۔

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ جمعہ کے روز ایک مخصوص وقت ایسا ہے جس میں بندے کی ہر دعا (بجز قطع رحمی اور گناہ) شرف قبولیت سے ہمکنار ہوتی ہے۔ نبی ﷺ نے اس کی تعیین بیان نہیں فرمائی۔ اس گھڑی کو بھی شب قدر کی طرح مخفی اور پوشیدہ رکھا تاکہ لوگ اس کو تلاش کرنے میں اپنا زیادہ سے زیادہ قیمتی وقت صرف کریں۔ اس طرح ان کا شوق جستجو بڑھے اور ان کی نیکیوں میں اضافہ ہو۔

(٣٧١) وَعَنْ أَبِيْ بُرْدَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، عَنْ أَبِيْهِ، قَالَ: سَمِعْتُ رَسُولَ اللهِ ﷺ يَقُولُ: «**هِيَ مَا بَيْنَ أَنْ يَجْلِسَ الْإِمَامُ إِلَى أَنْ تُقْضَى الصَّلاةُ**». رَوَاهُ مُسْلِمٌ، وَرَجَّحَ الدَّارَقُطْنِيُّ أَنَّهُ مِنْ قَوْلِ أَبِي بُرْدَةَ.

حضرت ابوبردہ رضی اللہ عنہ نے اپنے والد سے بیان کیا کہ ان کے والد نے فرمایا کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے سنا ہے کہ "وہ گھڑی امام کے منبر پر بیٹھنے کے وقت سے لے کر اختتام جماعت تک کے دوران میں ہے۔" (مسلم) اور دارقطنی نے تو اس کو ترجیح دی ہے کہ یہ ابوبردہ رضی اللہ عنہ کا قول ہے۔

وَفِيْ حَدِيْثِ عَبْدِ اللهِ بْنِ سَلاَمٍ عِنْدَ ابْنِ مَاجَهْ، وَجَابِرٍ عِنْدَ أَبِيْ دَاوُدَ وَالنَّسَائِيِّ: أَنَّهَا مَا بَيْنَ صَلاَةِ العَصْرِ إِلَى غُرُوبِ الشَّمْسِ.

اور عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ سے ابن ماجہ نے اور جابر رضی اللہ عنہ سے ابوداؤد اور نسائی نے روایت نقل کی ہے کہ وہ گھڑی نماز عصر سے غروب آفتاب تک کے درمیانی عرصہ میں ہے۔

وَقَدِ اخْتُلِفَ فِيْهَا عَلَى أَكْثَرَ مِنْ أَرْبَعِيْنَ قَوْلاً أَمْلَيْتُهَا فِي شَرْحِ البُخَارِيِّ.

اس میں مختلف علماء کے چالیس اقوال ہیں۔ میں نے ان سب کو فتح الباری شرح بخاری میں لکھ دیا ہے۔

لغوی تشریح: ﴿ ھی ﴾ اس سے مراد جمعہ کے روز ایسی گھڑی ہے جس میں دعائیں شرف قبولیت سے ہمکنار ہوتی ہیں۔ ﴿ املیتھا ﴾ یہ سارے اقوال میں نے وہاں تحریر کر دیئے ہیں "املاء" دراصل اس کو کہتے ہیں کہ ایک آدمی لکھوائے اور دوسرا اسے لکھے۔ اس گھڑی کے بارے میں دو اقوال زیادہ مشہور ہیں (۱) عصر سے لے کے غروب آفتاب تک کے وقت میں (۲) آغاز خطبہ سے اختتام نماز کے دوران وہ گھڑی ہو سکتی ہے۔ پھر اس میں بھی اختلاف ہے کہ ان دونوں اقوال میں سے قابل ترجیح کونسا قول ہے؟ بعض نے ان کے مابین بایں طور پر جمع و تطبیق کی بھی کوشش کی ہے کہ یہ گھڑی ان دو وقتوں میں باری باری منتقل ہوتی رہتی ہے۔ جمع و تطبیق کی صورت میں یہ تطبیق سب سے اچھی ہے۔ لیکن جمع و تطبیق کی اس صورت میں مشکل یہ پیش آتی ہے کہ ان اوقات میں تو نماز پڑھنا ممنوع ہے اور گذشتہ حدیث میں ﴿ وھو قائم یصلی ﴾ کے الفاظ ہیں کہ وہ اس وقت نماز پڑھ رہا ہو تو گویا اس کا جواب یہ ہے کہ نماز کا انتظار کرنے

والا گویا نماز ہی میں ہوتا ہے۔ جیسا کہ حدیث میں آیا ہے۔

راوی حدیث: ﴿ ابوبردہ رحمۃ اللہ علیہ ﴾ عامر بن ابی موسیٰ اشعری۔ مشہور و معروف تابعین میں سے ہیں۔ انہوں نے اپنے والد اور حضرت علی رضی اللہ عنہ اور عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے حدیث سنی۔ اسی برس سے زیادہ عمر پا کر ۱۰۴ھ میں فوت ہوئے۔ بردہ کا اعراب۔ "با" پر ضمہ اور "را" ساکن۔

﴿ عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ ﴾ ان کی کنیت ابویوسف ہے۔ علماء یہود میں سے بڑے معتبر عالم تھے۔ حضرت یوسف علیہ السلام کی اولاد میں سے تھے۔ بنو قینقاع سے تعلق تھا۔ مدینہ منورہ میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریف آوری پر ہی اسلام قبول کر لیا تھا۔ یہ ان خوش بخت و خوش قسمت افراد میں سے ہیں جنہیں دنیا میں ہی جنت کی بشارت دی گئی۔ مدینہ منورہ میں ۴۳ھ میں وفات پا کر جنت میں آرام فرما رہے ہیں۔

(۳۷۲) وَعَنْ جَابِرٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: مَضَتِ السُّنَّةُ أَنَّ فِي كُلِّ أَرْبَعِيْنَ فَصَاعِداً جُمُعَةً. رَوَاهُ الدَّارَقُطْنِيُّ بِإِسْنَادٍ ضَعِيْفٍ.

حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ سنت طریقہ یہ جاری رہا ہے کہ چالیس یا اس سے کچھ اوپر کی تعداد پر جمعہ ہے۔ (اسے دارقطنی نے ضعیف و کمزور سند سے روایت کیا ہے)

لغوی تشریح: ﴿ مضت السنۃ ﴾ سنت طریقہ جاری ہے نافذ چلا آرہا ہے۔ ﴿ فصاعدا ﴾ چالیس کی تعداد سے زائد ﴿ باسناد ضعیف ﴾ یہ سند اس لئے ضعیف ہے کہ اس میں ایک راوی عبدالعزیز بن عبدالرحمٰن ضعیف ہے۔ امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے اس سے مروی احادیث کے متعلق کہا ہے کہ ان پر لکیر پھیر دو۔ اس لئے کہ وہ جھوٹ کا پلندہ ہیں اور اس کی اپنی گھڑی ہوئی ہیں (موضوع ہیں) نسائی نے کہا ہے کہ یہ راوی ثقہ نہیں اور دارقطنی نے اسے منکر حدیث قرار دیا ہے۔ ابن حبان نے کہا کہ اس کے ساتھ احتجاج ہی جائز نہیں۔ جب تجھے یہ معلوم ہوگیا تو جمعہ کیلئے کوئی متعین مقدار کی شرط لگانا ایسی حدیث کے ذریعہ جائز ہی نہیں۔

حاصل کلام: نماز جمعہ کیلئے نمازیوں کی تعداد کے بارے میں کسی صحیح حدیث میں کوئی ذکر نہیں۔ اس لئے علماء کے اس بارے میں مختلف اقوال ہیں۔ مثلاً کسی نے چار' کسی نے سات اور کسی کے نزدیک نو' بارہ اور کسی نے بیس اور چالیس اور پچاس اور ستر کی رائے دی ہے۔ ان میں سے کسی کی بنیاد و اساس مرفوع حدیث صحیح پر نہیں ہے۔ جماعت تو دو آدمی بھی کر سکتے ہیں چنانچہ آپ کا ارشاد ہے کہ سفر میں دو آدمی ہوں تو ایک اذان کہے اور جو زیادہ علم شریعت اور قرآن زیادہ جانتا ہو وہ جماعت کرائے۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک نماز جمعہ کیلئے چالیس کی تعداد ہونا ضروری ہے اور امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک امام کے علاوہ دو مزید آدمیوں کا ہونا کافی ہے۔ البتہ وہ جمعہ کیلئے بڑے شہر کی شرط عائد کرتے ہیں جو قطعاً صحیح نہیں۔ اسلام میں پہلا جمعہ جواثی بستی میں ادا کیا گیا جو بڑے شہر کی تعریف سے خارج ہے۔

(۳۷۳) وَعَنْ سَمُرَةَ بْنِ جُنْدُبٍ حضرت سمرہ بن جندب رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی

رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ كَانَ يَسْتَغْفِرُ لِلْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنَاتِ فِيْ كُلِّ جُمُعَةٍ. رَوَاهُ الْبَزَّارُ بِإِسْنَادٍ لَيِّنٍ.

ﷺ ہر جمعہ مومن مردوں اور عورتوں کیلئے بخشش کی دعا فرمایا کرتے تھے۔ (اسے بزار نے کمزور سند سے روایت کیا ہے)

حاصل کلام: اس حدیث سے ثابت ہوتا ہے کہ خطیب کو جمعہ میں اپنے لئے اور دوسرے مسلمان مردوں اور عورتوں کیلئے دعاء مغفرت کرنا مسنون و مشروع ہے۔ اس کی سند میں یوسف بن خالد بستی ضعیف ہے جسے بعض نے کذاب بھی کہا ہے۔

(۳۷۴) وَعَنْ جَابِرِ بْنِ سَمُرَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ كَانَ فِيْ الْخُطْبَةِ يَقْرَأُ آيَاتٍ مِّنَ الْقُرْآنِ، يُذَكِّرُ النَّاسَ. رَوَاهُ أَبُو دَاوُدَ، وَأَصْلُهُ فِي مُسْلِمٍ.

حضرت جابر بن سمرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی ﷺ قرآن حمید کی چند آیات خطبہ جمعہ میں تلاوت فرما کر لوگوں کو نصیحت فرماتے تھے۔ (ابوداؤد اور اس کی اصل مسلم میں ہے)

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ خطبہ جمعہ میں قرآن مجید کی آیات پڑھنی مسنون ہیں۔ خطیب کو ان آیات کے ذریعہ دنیا سے بے رغبتی اور آخرت کی ترغیب' اخلاق و کردار کی درستگی کی طرف توجہ دلانی چاہئے۔ جتنی اصلاح آیات قرآنیہ اور احادیث نبویہؐ کے ذریعہ سے ہو سکتی ہے اور کسی ذریعہ سے نہیں ہو سکتی۔ اس سلسلہ میں موضوع احادیث' من گھڑت قصوں کہانیوں سے اجتناب کرنا چاہئے۔

(۳۷۵) وَعَنْ طَارِقِ بْنِ شِهَابٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، أَنَّ رَسُولَ اللهِ ﷺ قَالَ: «**الْجُمُعَةُ حَقٌّ وَاجِبٌ عَلَى كُلِّ مُسْلِمٍ فِي جَمَاعَةٍ، إِلاَّ أَرْبَعَةً: مَمْلُوكٌ، وَامْرَأَةٌ وصبيٌّ ومَرِيضٌ**» رواه أبو داود وقال: لَمْ يَسْمَعْ طَارِقٌ مِنَ النَّبِيِّ ﷺ، وَأَخْرَجَهُ الحَاكِمُ مِنْ رِوَايَةِ طَارِقٍ المَذْكُورِ عَنْ أَبِي مُوْسَى.

حضرت طارق بن شہاب رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ "جمعہ کو باجماعت ادا کرنا ہر مسلم پر واجب ہے مگر چار قسم کے لوگ اس سے مستثنیٰ ہیں۔ غلام' عورت' بچہ اور مریض۔" (اسے ابوداؤد نے روایت کیا ہے اور ساتھ ہی یہ بھی کہا ہے کہ طارق براہ راست نبی ﷺ سے سماع نہیں کرتا۔ طارق کی یہی روایت حاکم نے ابوموسیٰ کے حوالہ سے ذکر کی ہے)

حاصل کلام: اس حدیث سے ثابت ہوا کہ غلام' عورت' بچہ اور مریض پر جمعہ فرض نہیں۔ اگر پڑھ لیں تو پھر ان کو ظہر نہیں پڑھنا پڑے گی۔ ورنہ نماز ظہر ادا کریں گے۔

راوی حدیث: ﴿ طارق بن شہاب رضی اللہ عنہ ﴾ یہ کوفہ کے باشندے تھے۔ قبیلہ بجیلہ سے تعلق تھا اس لئے کوفی اور بجلی کہلائے۔ نبی ﷺ کی زیارت ہوئی مگر آپؐ سے کچھ سنا نہیں' حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ و عمر رضی اللہ عنہ کے دور

خلافت میں ۳۳ یا ۳۴ غزوات میں شریک ہوئے۔ ۸۲ھ میں وفات پائی۔ انہوں نے دونوں دور پائے۔ دور جاہلیت بھی اور دور اسلام بھی اس لئے ان کو مخضرم کہا جاتا ہے۔

(۳۷۶) وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «لَيْسَ عَلَى مُسَافِرٍ جُمُعَةٌ». رَوَاهُ الطَّبَرَانِيُّ بِإِسْنَادٍ ضَعِيفٍ.

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "کسی مسافر پر جمعہ نہیں۔" (طبرانی نے اسے ضعیف سند سے روایت کیا ہے)

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ مسافر پر بھی جمعہ فرض نہیں۔ یہ حدیث گو سنداً ضعیف ہے مگر اس کی تائید اس سے ہوتی ہے کہ آنحضرت ﷺ نے دوران حج جمعہ نہیں پڑھا۔ (سبل)

(۳۷۷) وَعَنْ عَبْدِ اللهِ بْنِ مَسْعُودٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: كَانَ رَسُولُ اللهِ ﷺ إِذَا اسْتَوَى عَلَى الْمِنْبَرِ، اسْتَقْبَلْنَاهُ بِوُجُوهِنَا. رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ بِإِسْنَادٍ ضَعِيفٍ. وَلَهُ شَاهِدٌ مِنْ حَدِيثِ الْبَرَاءِ عِنْدَ ابْنِ خُزَيْمَةَ.

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ جب منبر پر کھڑے ہو جاتے تو ہم اپنے رخ آپ کی طرف موڑ لیتے۔ (اسے ترمذی نے ضعیف سند سے روایت کیا ہے۔ اس کا شاھد ابن خزیمہ میں موجود ہے)

حاصل کلام: اس حدیث کی رو سے سامعین کو اپنا رخ خطیب کی طرف کرنا چاہئے۔ قبلہ کی طرف ضروری نہیں۔ اس مسئلہ میں کسی کا کوئی اختلاف نہیں ہے۔ بلکہ اس پر اجماع ہے۔ (سبل) اس حدیث کے ضعف کی وجہ یہ ہے کہ اس کی سند میں محمد بن فضل بن عطیہ ایسا راوی ہے جسے متروک الحدیث قرار دیا گیا ہے مگر خود مصنف نے ذکر کیا ہے کہ اس کا شاہد موجود ہے اور اس پر اجماع بھی ہے۔

(۳۷۸) وَعَنِ الْحَكَمِ بْنِ حَزْنٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: شَهِدْنَا الْجُمُعَةَ مَعَ النَّبِيِّ ﷺ، فَقَامَ مُتَوَكِّئاً عَلَى عَصاً أَوْ قَوْسٍ. رَوَاهُ أَبُو دَاوُدَ.

حضرت حکم بن حزن رضی اللہ عنہ سے مروی ہے' ہم نبی ﷺ کے ساتھ جمعہ میں حاضر تھے۔ آپ لاٹھی یا کمان کا سہارا لے کر کھڑے ہوئے۔ (ابوداؤد)

حاصل کلام: اس حدیث کی رو سے خطیب خطبہ جمعہ کے وقت کسی چیز کا سہارا لے سکتا ہے۔ یہ مستحب ہے۔ حکمت اس کی یہ ہے کہ بولنے والے کیلئے ڈھارس کا کام دیتا ہے۔ ہاتھ بے فائدہ حرکت کرنے سے بچے رہتے ہیں اور آدمی میں تھکاوٹ کا احساس بھی پیدا نہیں ہوتا۔

راوی حدیث: ﴿حکم بن حزن رضی اللہ عنہ﴾ حکم میں "حا" اور "کاف" دونوں پر فتحہ۔ بن حزن "حا" پر فتحہ اور "زا" ساکن۔ ان کا پورا نام یہ ہے حکم بن حزن بن ابی وھب مخزومی۔ ان کے اسلام کے بارے میں

ایک قول یہ ہے کہ جنگ یمامہ سے پہلے اسلام قبول کیا اور صحیح یہ ہے کہ انہوں نے فتح مکہ کے موقع پر اسلام قبول کیا ہے۔ اس حدیث سے معلوم ہو رہا ہے کہ انہوں نے نبی ﷺ کی امامت میں نماز جمعہ ادا کی ہے۔

١٣ - بَابُ صَلاَةِ الخَوْفِ

نماز خوف کا بیان

(٣٧٩) عَنْ صَالِحِ بْنِ خَوَّاتٍ رحمه الله، عَمَّنْ صَلَّى مَعَ النَّبِيِّ ﷺ يَومَ ذَاتِ الرِّقَاعِ صَلاَةَ الخَوْفِ: أَنَّ طَائِفَةً صَفَّتْ مَعَهُ، وَطَائِفَةً وِجَاهَ العَدُوِّ، فَصَلَّى بِالَّذِيْنَ مَعَهُ رَكْعَةً، ثُمَّ ثَبَتَ قَائِماً، وَأَتَمُّوا لِأَنْفُسِهِمْ، ثُمَّ انْصَرَفُوْا، فَصَفُّوا وِجَاهَ العَدُوِّ، وَجَاءَتِ الطَّائِفَةُ الأُخرَى، فَصَلَّى بِهِمُ الرَّكْعَةَ الَّتِيْ بَقِيَتْ، ثُمَّ ثَبَتَ جَالِساً، وَأَتَمُّوا لِأَنْفُسِهِمْ، ثُمَّ سَلَّمَ بِهِمْ. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ. وَهَذَا لَفْظُ مُسْلِمٍ. وَوَقَعَ فِيْ المَعْرِفَةِ لِابْنِ مندَه: عَنْ صَالِحِ بْنِ خَوَّاتٍ، عَنْ أَبِيْهِ.

حضرت صالح بن خوات رضی اللہ عنہ نے ایسے شخص سے روایت کیا ہے جس نے ذات الرقاع کے دن نبی ﷺ کے ساتھ صلوٰۃ خوف پڑھی تھی۔ اس شخص نے بیان کیا کہ ایک گروہ نے آپ کے ساتھ نماز کیلئے صف بندی کی اور ایک دوسرا گروہ دشمن کے مقابلہ کیلئے اس کے روبرو صف بند ہوگیا۔ آپؐ نے ان لوگوں کو جو آپؐ کے ساتھ صف باندھ کر کھڑے تھے ایک رکعت پڑھائی اور آپؐ سیدھے کھڑے رہے اور انہوں نے اپنے طور پر باقی نماز مکمل کرلی اور چلے گئے۔ جا کر دشمن کے سامنے صف بند ہوگئے۔ پھر دوسرا گروہ آیا۔ آپؐ نے اسے باقی اپنی ایک رکعت پڑھائی اور بیٹھے رہے انہوں نے اس دوران میں اپنے طور پر نماز مکمل کرلی پھر آپؐ نے ان کے ساتھ سلام پھیرا۔ (بخاری و مسلم۔ مگر متن حدیث کے الفاظ مسلم کے ہیں۔ ابن مندہ کی "المعرفۃ" میں ہے کہ صالح بن خوات اپنے والد سے بیان کرتے ہیں)

لغوی تشریح: ﴿ باب صلاۃ الخوف ﴾ کا مطلب یہ ہے کہ خوف کی حالت میں نماز پڑھنا۔ اس کی صورت یہ ہے کہ مسلمانوں کا لشکر کفار کے لشکر کے بالمقابل ہو۔ ہنوز باہمی جنگ و جدال شروع نہ ہوئی ہو۔ نیزے پھینکنے اور شمشیر زنی کی نوبت نہ آئی ہو۔ رہی یہ صورت کہ فریقین میں مڈبھیڑ ہو چکی ہو' بندوقوں کے منہ کھل گئے ہوں' توپوں کے دھانے گولوں کی آگ اپنے دھانوں سے اگل رہے ہوں۔ ٹینک گولے برسا رہے ہوں۔ جنگی طیاروں کے ذریعہ بم گرائے جا رہے ہوں۔ تو ایسے وقت میں مخصوص طریقہ

سے نماز ادا کرنا ضروری نہیں بلکہ اس وقت تو جس طرح ٹولیوں کی صورت میں یا تن تنہا جس طرح ممکن ہو کھڑے ہو کر، چلتے ہوئے اور سوار ہو کر نماز پڑھی جا سکتی ہے۔ ﴿عمن صلی الخ﴾ جس نے آپؐ کے ساتھ نماز ادا کی۔ اس سے کون شخص مراد ہے۔ مسلم کی روایت میں تو سھل بن ابی حثمہ رضی اللہ عنہ کا نام آیا ہے اور یہ بھی قول ہے کہ راوی کا باپ خوات رضی اللہ عنہ ہی مراد ہے جیسا کہ مصنف نے ابن مندہ کے حوالہ سے حدیث کے آخر میں نقل کیا ہے اور یہی صحیح ہے۔ اس لئے کہ اس وقت سھل ابھی بچہ ہی تھا۔ غزوات میں شریک ہونے کے قابل ہی نہیں تھا۔ ﴿ذات الرقاع﴾ "راء" کے نیچے کسرہ اور قاف مخفف۔ ﴿نجد﴾ میں غطفان کے علاقہ میں ایک جگہ کا نام ہے۔ یہ غزوہ جیسا کہ صحیح روایت میں مذکور ہے ۷ھ میں غزوۂ خیبر کے بعد واقع ہوا ہے۔ اس کو ذات الرقاع کہنے کی وجہ ایک قول کے مطابق یہ تھی کہ مسلمان مجاہدین کے پاؤں ننگے ہونے کی وجہ سے زخمی ہو گئے تھے۔ انہوں نے جوتوں کی جگہ پاؤں پر پٹیاں باندھ لی تھیں۔ ﴿وجاہ العدو﴾ "واؤ" کے نیچے کسرہ۔ دشمن کے روبرو، بالمقابل۔ دشمن کے سامنے۔ واتموا لانفسھم اپنے طور پر نماز پوری کی یعنی دوسری رکعت پوری کر کے سلام پھیرا۔

حاصل کلام: صلاۃ خوف کئی طریقہ سے پڑھی گئی ہے جیسا موقع محل ہوتا تھا اس کی مناسبت سے نماز ادا کی گئی۔ مذکورہ بالا حدیث میں وہی صورت ذکر ہوئی ہے جسے قرآن مجید میں بیان کیا گیا ہے یعنی امام نے ہر ایک گروہ کو ایک ایک رکعت پڑھائی اور ایک، ایک رکعت انہوں نے اپنے طور پر پڑھی۔ پہلے گروہ نے تو خود سلام پھیرا مگر دوسرے گروہ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ۔ امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ، امام شافعی رحمہ اللہ، امام احمد رحمہ اللہ اور جمہور کے نزدیک خوف کی صورت میں سفر و حضر دونوں میں نماز خوف پڑھنا جائز ہے۔ امام مالک رحمہ اللہ صلاۃ خوف کیلئے سفر کی شرط لگاتے ہیں۔ قرآن مجید سے معلوم ہوتا ہے کہ آیت "اذا ضربتم فی الارض ......الایہ" میں دو شرطیں ہیں۔ ایک سفر اور دوسری خوف دشمن۔ مگر جمہور کا مسلک یہ ہے کہ نماز خوف اور نماز قصر دونوں الگ الگ نمازیں ہیں۔ سفر میں قصر کیلئے خوف دشمن کی شرط نہیں اور صلاۃ خوف کیلئے سفر کی شرط نہیں۔ دونوں نمازوں کے ساتھ کوئی شرط لگانا بے معنی ہے۔

راوی حدیث: ﴿صالح بن خوات﴾ خوات بن جبیر بن نعمان انصاری مدنی۔ "خا" پر فتحہ اور واو پر فتحہ اور تشدید۔ مشہور و معروف تابعین میں سے ہیں۔ بہت سے صحابہ کرامؓ سے حدیث سنی ہے۔ یہ حدیث انہوں نے یا تو حضرت سہل بن ابی حثمہ رضی اللہ عنہ صحابیؓ سے سنی ہے یا پھر اپنے والد سے۔ جس طرح اسی حدیث کے آخر سے واضح ہو رہا ہے۔

﴿خوات رضی اللہ عنہ﴾ جلیل القدر صحابی ہیں۔ پہلا غزوہ جس میں یہ شریک ہوئے غزوۂ احد ہے اور ایک قول کے مطابق غزوۂ بدر میں بھی شریک تھے۔ ۴۰ھ میں مدینہ منورہ میں وفات پائی اور ایک قول یہ بھی ہے کہ ۴۰ھ کے بعد فوت ہوئے ہیں۔ اس وقت ان کی عمر ۷۰ یا ۷۱ سال کی تھی۔

(۳۸۰) وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللّٰهُ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ میں نجد کی

تَعَالَى عَنْهُما قَالَ: غَزَوْتُ مَعَ رَسُولِ اللهِ ﷺ قِبَلَ نَجْدٍ فَوَازَينَا العَدُوَّ، فَصَافَفْنَاهُمْ، فَقَامَ رَسُولُ اللهِ ﷺ، فَصَلَّى بِنَا، فَقَامَتْ طَائِفَةٌ مَّعَهُ، وَأَقْبَلَتْ طَائِفَةٌ عَلَى العَدُوِّ، وَرَكَعَ بِمَنْ مَّعَهُ، وَسَجَدَ سَجْدَتَيْنِ، ثُمَّ انْصَرَفُوا مَكَانَ الطَّائِفَةِ الَّتِيْ لَمْ تُصَلِّ، فَجَاءُوْا، فَرَكَعَ بِهِمْ رَكْعَةً، وَسَجَدَ سَجْدَتَيْنِ، ثُمَّ سَلَّمَ فَقَامَ كُلُّ وَاحِدٍ مِّنْهُمْ، فَرَكَعَ لِنَفْسِهِ رَكْعَةً وَسَجَدَ سَجْدَتَيْنِ. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ، وَاللَّفْظُ لِلْبُخَارِيِّ.

طرف نبی ﷺ کی معیت میں کسی غزوہ میں گیا۔ ہم دشمن کے بالکل مقابل صف بستہ تھے کہ رسول اللہ ﷺ کھڑے ہوئے اور ہمیں نماز پڑھائی۔ ایک جماعت نماز ادا کرنے آپؐ کے ساتھ کھڑی ہوگئی اور ایک جماعت دشمن کے سامنے صفیں باندھ کر کھڑی ہوگئی۔ جو جماعت آپؐ کے ساتھ نماز میں شریک تھی اس نے آپؐ کے ساتھ ایک رکوع اور دو سجدے کئے اور اس گروہ کی جگہ واپس چلی گئی جس نے ابھی تک نماز نہیں پڑھی تھی۔ اس جماعت کے افراد آئے آپؐ نے ان کو بھی ایک رکعت پڑھائی دو سجدوں کے ساتھ۔ پھر آپؐ نے سلام پھیر دیا مگر دونوں گروہوں نے اٹھ کر الگ الگ اپنی رکعت پوری کی۔ (بخاری و مسلم۔ متن حدیث کے الفاظ بخاری کے ہیں)

لغوی تشریح: ﴿ قبل ﴾ قاف کے کسرہ اور فتحہ دونوں سے۔ طرف' جہت کے معنی میں۔ ﴿ نجد ﴾ بلاد عرب کی سطح مرتفع جو حجاز کے مشرق میں واقع ہے۔ ﴿ فوازینا ﴾ مقابلہ پر آئے۔ بالمقابل ﴿ فصافقنا ﴾ صف بندی کی ہم نے۔ ہم دو صفوں میں کھڑے ہوئے اور یہ موقع نماز عصر کا تھا ﴿ ثم انصرفوا ....الخ ﴾ پہلی رکعت مکمل کرکے واپس چلے گئے۔ ابھی دوسری رکعت نہیں پڑھی تھی اور سلام بھی نہیں پھیرا تھا اور اس وقت نبی ﷺ سیدھے کھڑے رہے ﴿ فجاووا ﴾ اس گروہ کے لوگ آئے جو پہرہ دے رہے تھے دشمن کے سامنے یا حفاظت کر رہے تھے ﴿ ثم سلم ﴾ پھر نبی ﷺ نے تنہا سلام پھیرا۔ ﴿ فقام کل واحد ....الخ ﴾ ہر گروہ الگ الگ اٹھا۔ اس سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے اپنی بقیہ رکعت ایک دوسرے کے بعد پوری کی اور ابوداؤد میں عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ دوسرے گروہ نے پہلے پوری دونوں رکعتوں کو ملا کر اکٹھے پڑھ لیا۔ پھر پہلے گروہ کی جگہ پر چلا گیا اور پہلا واپس آیا اور اس نے ایک رکعت مزید پڑھ کر سلام پھیرا اس طرح اس کی بھی نماز کی دو رکعتیں پوری ہوگئیں۔

حاصل کلام: امام احمد رحمہ اللہ کے بقول نماز خوف کے سلسلہ میں چھ یا سات صحیح احادیث بھی ثابت ہیں۔ ان میں سے جس کے مطابق پڑھی جائے جائز ہے۔ کوئی مخصوص طریقہ نہیں۔ حالات کے مطابق جس طور

پر پڑھنا ممکن ہو پڑھ لی جائے۔ اس نماز کے مسنون و مشروع ہونے میں کوئی اختلاف نہیں۔ شوکانی رحمہ اللہ نے نیل الاوطار میں اور صاحب زاد المعاد نے بھی اس نماز کی چھ یہی کیفیتیں بیان کی ہیں اور جن حضرات نے اس سے زیادہ کی ذکر کی ہیں۔ انہوں نے جہاں کہیں بیان واقعہ میں اختلاف دیکھا اسے الگ شمار کر لیا۔ حقیقت میں وہ الگ نہیں۔ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے بھی اسی قول کو قابل اعتماد قرار دیا ہے۔

(٣٨١) وَعَنْ جَابِرٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: شَهِدْتُ مَعَ رَسُولِ اللهِ ﷺ صَلاَةَ الخَوْفِ، فَصَفَفْنَا صَفَّيْنِ، صَفٌّ خَلْفَ رَسُولِ اللهِ ﷺ، وَالعَدُوُّ بَيْنَنَا وَبَيْنَ القِبْلَةِ، فَكَبَّرَ النَّبِيُّ ﷺ، وَكَبَّرْنَا جَمِيْعاً، ثُمَّ رَكَعَ، وَرَكَعْنَا جَمِيْعاً، ثُمَّ رَفَعَ رَأْسَهُ مِنَ الرُّكُوعِ، وَرَفَعْنَا جَمِيْعاً، ثُمَّ انْحَدَرَ بِالسُّجُودِ، وَالصَّفُّ الَّذِي يَلِيْهِ، وَقَامَ الصَّفُّ المُؤَخَّرُ فِي نَحْرِ العَدُوِّ، فَلَمَّا قَضَى السُّجُودَ قَامَ الصَّفُّ الَّذِيْ يَلِيْهِ، فَذَكَرَ الحَدِيْثَ.

حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ میں رسول اللہ ﷺ کے ساتھ نماز خوف میں حاضر تھا۔ ہم نے دو صفیں بنائیں ایک صف رسول اللہ ﷺ کے پیچھے کھڑی ہوئی جبکہ دشمن ہمارے اور قبلہ کے درمیان میں تھا۔ رسول اللہ ﷺ نے اللہ اکبر کہا اور ہم سب نے بھی اللہ اکبر کہا۔ پھر آپ ؐ نے رکوع کیا اور ہم سب نے بھی رکوع کیا۔ پھر آپ ؐ نے رکوع سے سر اوپر اٹھایا اور ہم سب نے بھی اپنے سر اٹھائے پھر آپ ؐ سجدے میں گر گئے اور آپ ؐ کے ساتھ والی صف بھی اور دوسری صف دشمن کے مقابلے کیلئے کھڑی رہی۔ جب آپ ؐ نے سجدہ پورا کر لیا تو وہ صف جو آپ ؐ کے قریب تھی کھڑی ہوگئی۔ پھر راوی نے ساری حدیث بیان کی۔

وَفِيْ رِوَايَةٍ: ثُمَّ سَجَدَ، وَسَجَدَ مَعَهُ الصَّفُّ الأَوَّلُ، فَلَمَّا قَامُوْا سَجَدَ الصَّفُّ الثَّانِيْ، ثُمَّ تَأَخَّرَ الصَّفُّ الأَوَّلُ، وَتَقَدَّمَ الصَّفُّ الثَّانِيْ، وَذَكَرَ مِثْلَهُ، وَفِي آخِرِهِ: ثُمَّ سَلَّمَ النَّبِيُّ ﷺ، وَسَلَّمْنَا جَمِيْعاً.

رَوَاهُ مُسْلِمٌ. وَلِأَبِيْ دَاوُدَ عَنْ أَبِي عَيَّاشٍ الزُّرَقِيِّ مِثْلُهُ، وَزَادَ: إِنَّهَا كَانَتْ بِعُسْفَانَ.

ایک روایت میں ہے کہ پھر آپ ؐ نے سجدہ کیا تو آپ ؐ کے ساتھ پہلی صف نے بھی سجدہ کیا اور جب یہ سب کھڑے ہوگئے تو دوسری صف سجدے میں چلی گئی اور پھر پہلی صف پیچھے ہٹ گئی اور دوسری صف آگے آگئی اور پہلے کی طرح ہی ذکر کیا اور آخر پر نبی ﷺ نے سلام پھیرا اور ہم سب نے بھی سلام پھیر دیا۔ (مسلم)

اور ابوداؤد نے ابوعیاش زرقی سے اس طرح روایت نقل کی ہے لیکن اس میں یہ اضافہ ہے کہ ”وہ عسفان مقام پر (ادا کی گئی) تھی۔“

وَلِلنَّسَائِيِّ مِنْ وَجْهٍ آخَرَ عَنْ جَابِرٍ، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ صَلَّى بِطَائِفَةٍ مِّنْ أَصْحَابِهِ رَكْعَتَيْنِ، ثُمَّ سَلَّمَ، ثُمَّ صَلَّى بِآخَرِيْنَ أَيْضاً رَكْعَتَيْنِ، ثُمَّ سَلَّمَ. وَمِثْلُهُ لِأَبِيْ دَاوُدَ عَنْ أَبِيْ بَكْرَةَ.	اور نسائی نے حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے ایک دوسری سند کے ساتھ روایت کیا ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اصحاب کے ایک گروہ کو دو رکعتیں پڑھائیں پھر سلام پھیر دیا پھر ایک دوسرے گروہ کو اسی طرح دو رکعات پڑھا کر سلام پھیر دیا۔ ابوداؤد میں حضرت ابوبکرہ رضی اللہ عنہ سے اسی طرح کی ایک روایت ہے۔

لغوی تشریح: ﴿ صف خلف رسول الله رضی اللہ عنہ ﴾ یعنی اس صف کے پیچھے ایک دوسری صف مراد ہے۔ ﴿ ثم انحدر ﴾ پھر جھکے سجدہ کرنے کیلئے۔ ﴿ والصف الذی یلیه ﴾ پھر وہ صف سجدہ کیلئے جھکی جو آپؐ کے قریب تھی اور پہلی تھی ﴿ فی نحر العدو ﴾ دشمن کے مقابل میں کھڑی ہوگئی۔ ہر چیز کا اول حصہ اس کا نحر کہلاتا ہے یہ دشمن جھینہ قبیلہ کے افراد تھے ﴿ فلما قضی السجود ﴾ جب سجدہ پورا کر لیا اور صحیح طور پر ادا کر لیا ﴿ فذکر ﴾ راوی حدیث نے ذکر کیا۔ ﴿ الحدیث ﴾ ذکر کا مفعول ہے یعنی ساری حدیث بیان کی اور اس میں ہے کہ دوسری صف سجدے میں گر گئی۔ ﴿ بعسفان ﴾ عسفان بروزن عثمان۔ غزوۂ عسفان ۶ھ میں عمرہ حدیبیہ کے موقع پر واقع ہوا اس میں لڑائی کی نوبت نہیں آئی۔ مشرکین نے یہ کوشش کی کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں کو بیت اللہ سے روکیں۔ چنانچہ انہوں نے خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کو دو سو گھوڑ سواروں کا دستہ دے کر بھیجا اور وہ مکہ کے راستہ میں حائل ہوگیا۔ انہوں نے مسلمانوں کو نماز ظہر میں دیکھا تو سوچا کہ اب مسلمان اس وقت بے خبری کے عالم میں ہیں۔ کاش! ہم ان پر حملہ آور ہوئے تو کامیاب ہو کر ان کو قتل کر سکتے ہیں پھر نماز عصر میں بھی ہجوم برقرار رہا تو اللہ تعالیٰ نے نماز خوف کا حکم نازل فرمایا اور یوں خالد بن ولید کو حملہ کرنے کا موقع نہ مل سکا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا راستہ ہی تبدیل کر لیا اور حدیبیہ کے مقام پر پہنچ گئے۔ اس مقام پر صلح ہوئی۔ جسے صلح حدیبیہ کہتے ہیں۔ پس عسفان وہ پہلا غزوہ ہے جہاں نماز خوف پڑھی گئی اور پہلی نماز جو اس جگہ نماز خوف کی صورت میں ادا کی گئی وہ نماز عصر تھی جس کا مذکورہ بالا حدیث میں ذکر ہوا ہے۔ ﴿ من وجه آخر ﴾ دوسری سند سے ﴿ صلی بطائفة ﴾ یعنی ایک جماعت نے فرض ادا کئے اور دوسری نے نفل۔ اس سے بھی یہ ثابت ہوتا ہے کہ مفترض کے پیچھے متنفل کی نماز جائز ہے اور یہ نماز مذکورہ نماز کے علاوہ دوسری نماز ہے۔ یہ نماز تو عسفان کے موقع پر پڑھی گئی اور یہ بطن نخلہ میں۔ نماز خوف کی صورتیں احوال کے مختلف ہونے کی وجہ سے مختلف ہیں۔ خوف کے موقع پر ان انواع میں سے جس نوعیت کی نماز پڑھے' جائز ہوگی۔

حاصل کلام: اس حدیث میں نماز خوف کی ایک اور صورت ہے۔ ہم پہلے ذکر کر آئے ہیں کہ نماز خوف اقوال کے مختلف ہونے کی وجہ سے مختلف طریقوں سے پڑھی گئی ہے۔ نسائی میں حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مروی روایت کی رو سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دونوں جماعتوں کو الگ الگ دو' دو رکعتیں پڑھائیں۔ اس

طرح آنجناب ﷺ کی چار رکعتیں ہوئیں۔ تو گویا آپ ؐ نے دو تو فرض پڑھے اور دو نفل ہوں گے۔ کیونکہ دو مرتبہ دو' دو فرض تو نہیں ہوتے۔ اس سے یہ معلوم ہوا کہ نفل پڑھنے والے امام کے پیچھے مقتدی فرض پڑھ سکتے ہیں۔ احناف نے اس مقام پر انصاف سے کام نہیں لیا بجائے اس کے قیاس کو چھوڑ کر حدیث صحیح کا اتباع کرتے بلکہ طحاوی ایسے صاحب علم و فضل نے تو الٹا اس حدیث کے منسوخ ہونے کا دعویٰ کر دیا۔ حالانکہ اس کے منسوخ ہونے کی کوئی وجہ نہیں۔

راوی حدیث: ﴿ابو عیاش زرقی﴾ ان کا نام زید بن ثابت ہے انصاری زرقی مشہور ہیں۔ زرقی کے "زا" پر ضمہ اور "را" پر فتحہ ہے۔ ان سے ایک جماعت نے روایت کیا ہے۔ ۴۰ھ کے بعد وفات پائی۔

(۳۸۲) وَعَنْ حُذَيْفَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ صَلَّى صَلاَةَ الخَوْفِ بِهٰؤُلاَءِ رَكْعَةً، وَهٰؤُلاَءِ رَكْعَةً، وَلَمْ يَقْضُوْا. رَوَاهُ أَحْمَدُ وَأَبُو دَاوُدَ وَالنَّسَائِيُّ، وَصَحَّحَهُ ابْنُ حِبَّانَ، وَمِثْلُهُ عِنْدَ ابْنِ خُزَيْمَةَ عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا.

حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی ﷺ نے ان کو بھی ایک رکعت پڑھائی اور ان کو بھی ایک ہی رکعت۔ انہوں نے نماز کو پورا نہیں کیا۔ (اسے احمد' ابوداؤد اور نسائی نے روایت کیا ہے اور ابن حبان نے اسے صحیح قرار دیا ہے۔ ابن خزیمہ نے ابن عباس کے حوالہ سے بھی اسی طرح کی حدیث نقل کی ہے)

حاصل کلام: یہ دونوں احادیث اس پر دلالت کرتی ہیں کہ نماز خوف کم از کم ایک رکعت ہے۔ سلف میں سے ایک گروہ اس نظریئے کا قائل ہے۔ تابعین میں سے حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ' ضحاک رحمۃ اللہ علیہ' ابن راھویہ رحمۃ اللہ علیہ' عطاء رحمۃ اللہ علیہ' طاؤس رحمۃ اللہ علیہ اور مجاھد رحمۃ اللہ علیہ' حکم بن عتیبہ رحمۃ اللہ علیہ' قتادہ رحمۃ اللہ علیہ اور ثوری رحمۃ اللہ علیہ صحابہ کرام میں سے ابن عباس رضی اللہ عنہما' ابوھریرہ رضی اللہ عنہ' ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ اس کے قائل ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ شدت خوف کے وقت اشاروں سے صرف ایک رکعت پڑھی جائے گی۔ ان کے نظریئے کی تائید ابن عباس رضی اللہ عنہما کی حدیث سے ہوتی ہے۔ جسے مسلم اور ترمذی کے علاوہ باقی پانچوں نے روایت کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تمہارے نبی ﷺ کی زبان مبارک پر حضر میں چار رکعتیں اور اور سفر میں دو رکعتیں اور خوف کے وقت ایک رکعت فرض فرمائی ہے۔ مگر جمہور علماء اور ائمہ اربعہ کہتے ہیں تعداد رکعات میں خوف کی کوئی تاثیر نہیں۔

ان حضرات نے پہلی احادیث کی بہت دور کی تاویلات کی ہیں مگر الفاظ حدیث ان کی تردید کرتے ہیں۔ جمہور کہتے ہیں جس حدیث میں ایک رکعت کا ذکر ہے اس کا معنی یہ ہے کہ انہوں نے دونوں رکعتیں امام کے ساتھ پوری نہیں کیں' بلکہ ایک رکعت اکیلے اکیلے پڑھی اور دو پوری کر لیں۔

(۳۸۳) وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «صَلاَةُ الخَوْفِ رَكْعَةٌ عَلَى أَيِّ

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "نماز خوف ایک رکعت ہی ہے جس طرح بھی ادا ہو جائے۔" (اسے بزار نے ضعیف

وَجْهٍ كَانَ». رَوَاهُ الْبَزَّارُ بِإِسْنَادٍ ضَعِيفٍ. سند سے روایت کیا ہے)

حاصل کلام: اس حدیث کی رو سے بعض حضرات امام اور مقتدی دونوں کیلئے ایک ہی رکعت کے قائل ہیں۔ چنانچہ سفیان اسی کے قائل ہیں۔ مگر یہ حدیث ضعیف ہے کیونکہ اس کی سند میں محمد بن عبدالرحمٰن الیمانی راوی سخت ضعیف ہے۔ اس حدیث میں "جس طرح بھی ادا ہو جائے گی" سے مراد ہے قبلہ رخ ہو سکے یا نہ ہو سکے۔ سوار ہو یا پیدل۔

(٣٨٤) وَعَنْهُ مَرْفُوعاً: لَيْسَ فِي صَلاَةِ الخَوْفِ سَهْوٌ. أَخرَجَهُ الدَّارَقُطْنِيُّ بِإِسْنَادٍ ضَعِيفٍ.

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مرفوعاً مروی ہے کہ نماز خوف میں سجدۂ سہو نہیں۔ (اسے دارقطنی نے ضعیف سند سے نکالا ہے)

لغوی تشریح: ﴿باسناد ضعيف﴾ ضعیف سند کے ساتھ کیونکہ یہ روایت عبدالحمید بن السری سے مروی ہے اور وہ ضعیف ہے۔ امیر الیمانی نے ذکر کیا ہے کہ علماء میں سے کوئی بھی اس کا قائل نہیں۔ (السبل)

١٤ - بَابُ صَلاَةِ العِيدَيْنِ

نماز عیدین کا بیان

(٣٨٥) عَنْ عائِشَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهَا قَالَتْ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «الفِطْرُ يَوْمَ يُفْطِرُ النَّاسُ، وَالأَضْحَى يَوْمَ يُضَحِّي النَّاسُ». رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ.

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "جس روز لوگ روزے پورے کر کے آخری افطار کرتے ہیں' اس دن عید ہے اور عید الاضحیٰ اس روز ہے جس دن لوگ قربانیاں کرتے ہیں۔" (ترمذی)

لغوی تشریح: ﴿باب صلاة العيدين﴾ عیدین سے مراد عید قربان اور عید فطر ہے۔ عید عربوں کے ہاں اظہار مسرت کیلئے ہر موسمی اجتماع کو کہتے ہیں۔ عید اسے اس لئے کہا جاتا ہے کہ یہ ہر سال کے بعد واپس لوٹ کر آتی ہے اور بار بار آتی رہتی ہے یا پھر یہ معنی ہیں کہ اس کے واپس آنے کی وجہ سے مسرت و سرور لوٹ آتا ہے۔ دراصل عید' عود سے ماخوذ ہے۔ عید کے عین کے نیچے کسرہ اور "یا" ساکن ہے واؤ کو "یا" میں تبدل کر دیا گیا "یا" کے ساکن ہونے کی وجہ سے اس کے ماقبل کسرہ واقع ہے (تو ایسی "یا" کو "واؤ" میں بدل دیتے ہیں) عید کی جمع اعیاد ہے "یا" کے ساتھ یہ اس لئے کہ اعواد جس کا معنی خشک لکڑیاں ہوتا ہے کے اور اعیاد کے درمیان فرق واقع ہو جائے (اور لوگوں کے ذہن نشین بھی رہے) عیدالفطر کا آغاز ۲ھ میں ہوا اور عیدالاضحیٰ جیسا کہ ایک قول ہے کہ اس کی ابتدا بھی ۲ھ میں ہوئی۔ ترمذی اور مسند احمد میں ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے مدینہ میں دس سال قیام فرمایا۔ قربانی کرتے رہے۔ یہ حدیث تو اس کی مقتضی ہے کہ قربانی کا آغاز ہجرت کے پہلے سال سے ہی ہوا ہے لیکن

اس کا بھی احتمال ہے کہ لفظ عشر بطور غلبہ بولا گیا ہے۔ واللہ اعلم۔ ﴿ یفطر الناس ﴾ افطار سے ماخوذ ہے۔ باب افعال ہے یہاں عیدالفطر کو بطور عید بتانا مقصود ہے۔ ﴿ یضحی الناس ﴾ یضحی تضحیۃ سے ماخوذ ہے اور یہ دراصل قربانی کے جانور کے ذبح کرنے کو کہتے ہیں اور پھر یوم اضحی (قربانی کا دن) کو عید بتانے کیلئے بغیر کسی شرط کیلئے استعمال ہوتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ عیدالفطر اور عیدالاضحیٰ وہ دن ہوں گے جن میں لوگ یہ دونوں عیدیں منائیں گے۔ بالفاظ دیگر معنی یہ ہوئے کہ اگر لوگ چاند دیکھنے میں غلطی یا خطا کر جائیں تو پھر رمضان اور ذوالقعدہ دونوں کی تعداد تیس دن مکمل کر لیں۔ پھر عیدالفطر اور عیدالاضحیٰ کیلئے باہر نکلیں اور مناسک حج بھی انہی تین دنوں کے حساب سے ادا کریں۔ اس کے بعد اگر ان کے سامنے یہ واضح اور ثابت ہو جائے کہ انہوں نے چاند دیکھنے میں غلطی کی اور خطا کھائی ہے اور مہینہ اگرچہ ۲۹ روز کا پورا ہوگیا ہو تو ایسی صورت میں ان پر کوئی گناہ اور عتاب نہیں ہے بلکہ وہ صحیح ہے۔ اللہ کے نزدیک وہ ہو چکا۔ یہ تو محض اللہ سبحانہ تعالیٰ کی جناب سے اپنے بندوں کیلئے تخفیف اور نرمی ہے اور یہ بھی قول ہے کہ اگر کسی شخص واحد نے اپنے طور پر عید کا چاند دیکھ لیا تو قاضی صرف اس ایک کی شہادت پر فیصلہ نہیں کرے گا لہٰذا تنہا یہ آدمی اپنی رؤیت کے یقینی ہونے کی بنیاد پر کوئی عمل نہیں کرے گا نہ وہ روزہ رکھے گا اور نہ افطار کرے گا اور نہ قربانی کرے گا۔ بلکہ ان تمام امور میں وہ عام لوگوں کے ساتھ ہی رہے گا یا پھر غالب اکثریت کے ساتھ رہے گا۔ مگر جمہور نے اس کی مخالفت کی ہے وہ کہتے ہیں جس پر اسے ذاتی طور پر یقین ہو اس کے مطابق وہ اس بارے میں فیصلہ کرے گا۔

حاصل کلام: اس حدیث سے پہلی بات تو یہ معلوم ہوئی کہ اہل اسلام کی صرف دو ہی عیدیں ہیں۔ عیدالفطر اور عیدالاضحیٰ۔ ان دونوں کے علاوہ تیسری یا چوتھی کسی عید کا تصور اور نشان اسلام میں کہیں دور دور تک بھی نہیں پایا جاتا۔ بعض مسلمانوں نے جو اور عیدیں منانا شروع کر رکھی ہیں ان کی شریعت اسلامیہ میں کوئی حیثیت نہیں ہے۔ دوسری بات یہ معلوم ہوتی ہے کہ عیدیں اجتماعیت کا سبق دیتی ہیں۔ اسلامی عبادات میں اجتماعیت کا تصور ہے۔ تنہا ایک آدمی چاند دیکھ کر کوئی عید اپنے طور پر نہیں منا سکتا۔ بلکہ اسے عیدالفطر اور عیدالاضحیٰ ادا کرنے میں لوگوں کی غالب اکثریت کی موافقت کرنی چاہئے اور اگر اسے یقین کامل ہو جائے تو پھر بھی عیدین کی نماز عام لوگوں کے ساتھ ہی ادا کرے گا البتہ روزہ افطار کر سکتا ہے۔

(۳۸۶) وَعَنْ أَبِي عُمَيْرِ بْنِ أَنَسٍ، عَنْ عُمُومَةٍ لَّهُ مِنَ الصَّحَابَةِ، أَنَّ رَكْباً جَاءُوا، فَشَهِدُوْا أَنَّهُمْ رَأَوْا الهِلَالَ بِالأَمْسِ، فَأَمَرَهُمُ النَّبِيُّ ﷺ أَنْ يُفْطِرُوْا، وَإِذَا أَصْبَحُوا أَنْ يَغْدُوا إِلَى مُصَلاَّهُمْ. رَوَاهُ أَحْمَدُ وَأَبُو دَاوُدَ، وَهَذَا

حضرت ابو عمیر بن انس رضی اللہ عنہ نے اپنے ایک چچا صحابی رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ چند سوار آپ ﷺ کی خدمت میں آئے اور انہوں نے شہادت دی کہ انہوں نے کل شام چاند دیکھا تھا۔ آپ ﷺ نے حکم دے دیا کہ "روزہ افطار کر دو اور کل صبح نماز عید کیلئے عید گاہ میں آجاؤ۔" (اسے احمد' ابوداؤد نے روایت کیا ہے یہ الفاظ

لَفظُهُ، وَإِسْنَادُهُ صَحِيحٌ. ابوداؤد کے ہیں اس کی سند صحیح ہے)

لغوی تشریح: ﴿ عمومة ﴾ عم کی جمع ہے۔ جس کے معنی چچا کے ہیں ﴿ من الصحابة ﴾ صحابہ میں سے۔ یہ عمومة کی صفت واقع ہو رہا ہے یعنی یہ چچا صحابی تھے۔ یہ حدیث متصل ہے اس کی سند میں کسی قسم کا ضعف نہیں۔ صحابی کا نام نہ لینا نقصان دہ نہیں۔ ﴿ رکبا ﴾ "را" پر فتحہ اور کاف ساکن' راکب کی جمع ہے سواروں کی جماعت ﴿ یغدوا ﴾ "یا" پر فتحہ' صبح چلیں دن کے اول حصہ میں۔

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ اگر ۲۹ رمضان کو ایسی جگہ چاند نظر آجائے جہاں کا مطلع مختلف نہ ہو تو دوسرے روز صحیح قابل اعتبار ذرائع سے اطلاع ملنے پر روزہ اسی وقت افطار کر دیا جائے گا۔ اگر قبل از زوال خبر ملی تو اسی روز نماز عید بھی ادا کر لی جائے ورنہ دوسرے روز عید کی نماز ادا کی جائے گی۔ اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ نماز عید عیدگاہ میں پڑھنی چاہئے اور اجتماعی طور پر پڑھنی چاہئے۔ اس حدیث سے یہ بھی اشارہ ملتا ہے کہ چاند کی رؤیت کا اعلان سرکاری طور پر بھی کیا جا سکتا ہے۔ اعلان جانی پہچانی شخصیت کے توسط سے کیا جانا چاہئے۔ فی زمانہ شہادتوں کے بعد ریڈیو' ٹی۔ وی سے اعلان کیا جا سکتا ہے۔

راوی حدیث: ﴿ ابو عمیر بن انس رحمۃ اللہ علیہ ﴾ ان کا نام عبداللہ بن مالک الانصاری تھا۔ انس کی اولاد میں سب سے بڑے تھے۔ صغار تابعین میں شمار ہوتا ہے' ثقہ تھے۔ چوتھے درجے کے راوی ہیں' اپنے باپ کے بعد کافی دیر زندہ رہے۔

(۳۸۷) وَعَنْ أَنَسٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: كَانَ رَسُولُ اللهِ ﷺ لاَ يَغْدُو يَومَ الفِطْرِ حَتَّى يَأْكُلَ تَمَرَاتٍ يأْكُلُهُنَّ وِتْرَاتٍ. أَخرَجَهُ البُخَارِيُّ، وَفِيْ رِوَايَةٍ مُعَلَّقَةٍ - وَوَصَلَها أَحْمَدُ -: (وَيَأْكُلُهُنَّ إِفْرَاداً).

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نماز عید فطر کیلئے نکلنے سے پہلے چند کھجوریں تناول فرمایا کرتے تھے اور طاق عدد میں کھجوریں کھایا کرتے تھے۔ (اسے بخاری نے روایت کیا ہے اور ایک معلق روایت میں بھی ایسا ہے) اور احمد نے موصول روایت میں ذکر کیا ہے کہ آپؐ ان کھجوروں کو ایک ایک کر کے تناول فرماتے تھے۔

حاصل کلام: اس حدیث سے کئی مسائل ثابت ہوتے ہیں۔ (۱) نماز عید کیلئے باہر جانا مسنون ہے۔ (۲) عیدالفطر کیلئے جانے سے پہلے کھجوریں طاق صورت میں کھانی مسنون ہیں۔ (۳) کھجوروں کو ایک ایک کر کے کھانا چاہئے۔ ایسا نہیں کرنا چاہئے کہ زیادہ کھجوریں منہ میں ٹھونس لی جائیں یہ تو تہذیب و اخلاق کے منافی ہے۔ اگر کسی کو کھجوریں دستیاب نہ ہو سکیں تو پھر کوئی میٹھی چیز طاق صورت میں استعمال کر لینی چاہئے۔

کھجوروں کو ایک ایک کر کے کھانے میں یہ حکمت معلوم ہوتی ہے کہ آدمی حریص و لالچی نہ بنے اور اللہ

تعالیٰ کی وحدانیت کی طرف بھی اشارہ نکلتا ہے کہ اللہ تعالیٰ وتر ہے اور طاق ہی کو پسند کرتا ہے۔ طبی اعتبار سے بھی ایک ایک کو خوب اچھی طرح چبا چبا کر لعاب دہن شامل کر کے نگلتے' تاکہ نظام انہضام میں معاون و مددگار ثابت ہو۔

(٣٨٨) وَعَنِ ابْنِ بُرَيْدَةَ، عَنْ أَبِيهِ قَالَ: كَانَ رَسُولُ اللهِ ﷺ لاَ يَخْرُجُ يَوْمَ الفِطْرِ حَتَّى يَطْعَمَ، وَلاَ يَطْعَمُ يَوْمَ الأَضْحَى حَتَّى يُصَلِّيَ. رَوَاهُ أَحْمَدُ وَالتِّرْمِذِيُّ، وَصَحَّحَهُ ابْنُ حِبَّانَ.

حضرت ابن بریدہ اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ نماز عید فطر کیلئے کچھ نہ کچھ کھائے بغیر نہ نکلتے تھے البتہ عید قربان کے دن جب تک نماز ادا نہ فرما لیتے کچھ تناول نہ فرماتے تھے۔ (اسے احمد اور ترمذی نے روایت کیا ہے اور ابن حبان نے اسے صحیح قرار دیا ہے)

لغوی تشریح: ﴿ ولا يطعم يوم الاضحى حتى يصلى ﴾ آپ عیدالاضحیٰ کو نماز سے پہلے کچھ نہیں کھاتے تھے۔ بیہقی نے اتنا اضافہ بھی نقل کیا کہ نماز سے فراغت کے بعد واپسی پر آپ اپنی قربانی کی کلیجی اور جگر وغیرہ تناول فرماتے۔

حاصل کلام: یہ حدیث بتاتی ہے کہ عید الفطر کے روز نماز سے پہلے کچھ کھانا اور عید قربان کے روز بغیر کچھ کھائے نماز ادا کرنا سنت رسول مقبول ﷺ ہے۔ اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ کھانے میں کسی خاص چیز کی ہدایت نہیں ہے۔ البتہ کھجوروں' چھواروں کو مسنون سمجھ کر کھائے تو سونے پر سہاگہ ہے۔

(٣٨٩) وَعَنْ أُمِّ عَطِيَّةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهَا قَالَتْ: أُمِرْنَا أَنْ نُخْرِجَ العَوَاتِقَ والحُيَّضَ فِيْ العِيْدَيْنِ، يَشْهَدْنَ الخَيْرَ وَدَعْوَةَ المُسْلِمِيْنَ، وَتَعْتَزِلُ الحُيَّضُ المُصَلَّى. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت ام عطیہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ ہمیں حکم دیا گیا کہ ہم جوان لڑکیوں اور حائضہ عورتوں کو بھی عیدین میں ساتھ لے کر نکلیں تاکہ وہ بھی مسلمانوں کے امور خیر اور دعاؤں میں شریک ہوں۔ البتہ حائضہ عورتیں عید گاہ کے کنارے پر رہیں۔ (نماز میں شامل نہ ہوں صرف دعا میں شرکت کریں) (بخاری و مسلم)

لغوی تشریح: ﴿ امرنا ﴾ صیغہ مجہول ہے۔ مجہول کا صیغہ اس لئے استعمال کیا گیا کہ حکم دینے والے کا علم ہو سکے اور وہ رسول اللہ ﷺ ہی ہیں اور بخاری کی ایک روایت تو صاف طور پر امرنا نبینا کے الفاظ ہیں۔ یعنی ہمارے نبی ﷺ نے ہمیں حکم ارشاد فرمایا ﴿ "ان نخرج" ﴾ اخراج سے ماخوذ ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ہم انہیں لے کر عید گاہ کی طرف نکلیں۔ ﴿ العواتق ﴾ نوجوان بالغ لڑکیاں۔ جو بالغ ہونے کی عمر کے قریب پہنچ چکی ہوں اور یہ عاتق کی جمع ہے اور نخرج کا مفعول واقع ہو رہا ہے۔ ﴿ والحيض ﴾ "حا" پر ضمہ اور "یا" پر فتحہ اور تشدید' حائض کی جمع ہے۔ وہ عورتیں مراد ہیں جنہیں ایام حیض آ رہے ہوں۔

عواتق پر اس کا عطف ہے۔ ﴿ یشھدن الخیر ﴾ اس روز کی برکت اور بھلائی اور فضیلت میں حاضر ہو کر حصہ دار بنیں۔ ﴿ ودعوۃ المسلمین ﴾ دعوت کا یہاں معنی دعا کے ہیں کہ سب عورتیں مسلمانوں کی دعا میں شامل ہوں۔ ﴿ وتعتزل ﴾ الگ رہیں۔ جائے نماز سے۔

حاصل کلام: نماز عید کیلئے خواتین کا گھروں سے نکل کر جانا اس حدیث کی رو سے ثابت ہے۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم خود اپنی ازواج مطہرات اور اپنی بیٹیوں کو عید گاہ میں لے جاتے تھے۔ حضرات ابوبکر رضی اللہ عنہ، عمر رضی اللہ عنہ اور علی رضی اللہ عنہ خواتین کا نماز عید میں حاضر ہونا واجب سمجھتے تھے۔

احناف نے اس حدیث کی تاویل کی ہے اور اسے ابتداء اسلام کا واقعہ بتایا ہے، تاکہ اہل اسلام کی تعداد زیادہ معلوم ہو اور کثرت تعداد اہل کفر و شرک کیلئے باعث اذیت ہو اور مسلمانوں کی دھاک بیٹھے۔ مگر یہ تاویل جس پر علامہ طحاوی نے بڑا زور قلم صرف کیا ہے، قابل لحاظ معلوم نہیں ہوتی۔ کیونکہ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما گواہی دیتے ہیں کہ ازواج مطہرات وغیرہ عید پڑھنے جاتی تھیں۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما کم عمر کے تھے ظاہر ہے کہ ان کی یہ گواہی فتح مکہ کے بعد کی ہے جس وقت اظہار قوت کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ اس لئے عورتوں کو عید گاہ میں بہر نوع حاضر ہونا چاہیئے۔

(٣٩٠) وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُمَا قَالَ: كَانَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ وَأَبُو بَكْرٍ وَعُمَرَ يُصَلُّونَ الْعِيْدَيْنِ قَبْلَ الْخُطْبَةِ. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ابوبکر رضی اللہ عنہ و عمر رضی اللہ عنہ عیدین کی نماز خطبہ عیدین سے پہلے پڑھتے تھے۔ (بخاری و مسلم)

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ عیدین میں نماز پہلے ادا کی جائے اور خطبہ بعد میں۔ بنو امیہ کے دور میں مروان وہ پہلا حکمران ہے جس نے نماز سے پہلے خطبہ پڑھنے کی بدعت کا آغاز کیا۔ اسی وقت حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ نے اس پر احتجاج کیا اور برملا کہا کہ تو نے سنت کے خلاف کیا ہے۔ (صحیح مسلم)

(٣٩١) وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُمَا، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ صَلَّى يَوْمَ الْعِيْدِ رَكْعَتَيْنِ، لَمْ يُصَلِّ قَبْلَهُمَا وَلَا بَعْدَهُمَا. أَخْرَجَهُ السَّبْعَةُ.

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے عید کے روز دو ہی رکعتیں ادا فرمائیں نہ پہلے کچھ پڑھا اور نہ بعد میں کوئی نماز پڑھی۔ (اسے ساتوں (احمد، بخاری، مسلم، ابوداؤد، ترمذی، نسائی، ابن ماجہ) نے روایت کیا ہے)

حاصل کلام: اس حدیث کی رو سے عید گاہ میں سوائے دو رکعت نماز کے اور کوئی نماز پہلے یا بعد پڑھنا حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت نہیں۔ البتہ واپس جب گھر تشریف لاتے تو دو رکعتیں پڑھتے تھے۔

(٣٩٢) وَعَنْهُ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما ہی سے مروی ہے کہ نبی

أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ صَلَّى العِيْد بِلاَ أَذَانٍ وَلاَ إِقَامَةٍ. أَخْرَجَهُ أَبُو دَاوُدَ وَأَصْلُهُ فِي البُخَارِيِّ.

ﷺ نے نماز عید بلا اذان و اقامت ادا فرمائی۔ (اسے ابوداوٗد نے روایت کیا ہے اور اس کی اصل بخاری میں ہے)

حاصل کلام: اس حدیث سے ثابت ہوا کہ نماز عید بغیر اذان و اقامت کے ادا کی جائے گی بلکہ عیدین کیلئے اذان و اقامت کو بدعت کہا گیا ہے۔ اذان اور اقامت کی قائم مقام کوئی دوسری صورت بھی غیر مسنون ہے۔

(۳۹۳) وَعَنْ أَبِيْ سَعِيْدٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: كَانَ النَّبِيُّ ﷺ لاَ يُصَلِّيْ قَبْلَ العِيْدِ شَيْئاً، فَإِذَا رَجَعَ إِلَى مَنْزِلِهِ صَلَّى رَكْعَتَيْنِ. رَوَاهُ ابْنُ مَاجَهْ بِإِسْنَادٍ حَسَنٍ.

حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ انہوں نے بیان کیا کہ نبی کریم ﷺ نماز عید سے پہلے کوئی نماز نہیں پڑھتے تھے۔ البتہ جب واپس گھر تشریف لے آتے تو دو رکعت نماز نفل ادا فرماتے۔ (اسے ابن ماجہ نے حسن سند کے ساتھ روایت کیا ہے)

حاصل کلام: اس سے ثابت ہوتا ہے کہ عیدگاہ میں نہیں البتہ گھر میں دو رکعت نماز پڑھی جا سکتی ہے۔

(۳۹٤) وَعَنْهُ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: كَانَ النَّبِيُّ ﷺ يَخْرُجُ يَومَ الفِطْرِ وَالأَضْحَى إِلَى المُصَلَّى، وَأَوَّلُ شَيْءٍ يَبْدَأُ بِهِ الصَّلاَةُ، ثُمَّ يَنْصَرِفُ، فَيَقُومُ مُقَابِلَ النَّاسِ - وَالنَّاسُ عَلَى صُفُوفِهِمْ - فَيَعِظُهُمْ وَيَأْمُرُهُمْ. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ ہی سے مروی ہے کہ نبی ﷺ عیدالفطر اور عید قربان کیلئے عیدگاہ کی طرف تشریف لے جاتے اور پہلی چیز جس کا آپؐ آغاز فرماتے وہ نماز ہوتی۔ ادائیگی نماز کے بعد رخ پھیر کر لوگوں کی طرف کھڑے ہوتے لوگ اس وقت اپنی صفوں میں بیٹھے رہتے اور آپؐ ان کو وعظ و نصیحت فرماتے اور نیکی کا حکم کرتے۔ (بخاری و مسلم)

حاصل کلام: اس حدیث سے حسب ذیل باتیں ثابت ہوتی ہیں (۱) عیدین کی نماز سے پہلے کوئی عمل آپؐ سے ثابت نہیں۔ (۲) خطبہ نماز کے بعد ہونا چاہئے۔ (۳) خطیب کا رخ سامعین کی طرف ہونا چاہئے۔ (۴) خطبہ کھڑے ہو کر دینا چاہئے نیز خطیب کو اپنے خطاب میں وعظ و نصیحت کرنا چاہئے۔ ادھر ادھر کے بے فائدہ قصے کہانیاں بیان نہیں کرنے چاہئیں۔ (۵) سامعین کو اپنی صفوں میں بیٹھے رہنا چاہئے اور رخ امام کی جانب ہونا چاہئے۔ (٦) نماز عیدین مسجد میں نہیں بلکہ عیدگاہ میں پڑھنی مسنون ہے۔ آج کل بلاعذر مسجدوں میں پڑھنے کا عام رواج ہوگیا ہے جو بہرحال ختم ہونا چاہئے۔ (۷) حضور ﷺ نے نماز عید میں منبر استعمال نہیں فرمایا۔ صحیح بخاری میں ہے کہ سب سے پہلے مروان نے عیدگاہ میں منبر رکھوا دیا اور اس پر خطبہ دیا۔ البتہ نبی کریم ﷺ نے ابن حبان کی روایت کے مطابق ایک مرتبہ اونٹنی پر بیٹھ کر خطبہ عید ضرور ارشاد

فرمایا ہے۔ جس سے سواری پر بیٹھ کر خطبہ دینا جائز ثابت ہوتا ہے۔

(٣٩٥) وَعَنْ عَمْرِو بْنِ شُعَيْبٍ، عَنْ أَبِيهِ، عَنْ جَدِّهِ قَالَ: قَالَ نَبِيُّ اللهِ ﷺ: «التَّكْبِيرُ فِي الفِطْرِ سَبْعٌ فِي الأُولَى، وَخَمْسٌ فِي الأُخْرَى، وَالقِرَاءَةُ بَعْدَهُمَا كِلْتَيْهِمَا». أَخْرَجَهُ أَبُو دَاوُدَ، وَنَقَلَ التِّرْمِذِيُّ عَنِ البُخَارِيِّ تَصْحِيحَهُ.

حضرت عمرو بن شعیب اپنے باپ سے اور وہ اپنے دادا سے روایت کرتے ہیں کہ نبی ﷺ نے فرمایا "عیدالفطر کی نماز کی پہلی رکعت میں سات تکبیریں اور دوسری میں پانچ ہیں۔ دونوں رکعتوں میں قراءت تکبیرات کے بعد ہے۔" (اسے ابوداؤد نے روایت کیا ہے اور ترمذی نے امام بخاری رحمہ اللہ سے اس کی صحت نقل کی ہے)

لغوی تشریح: ﴿سبع فی الاولی﴾ پہلی رکعت میں سات تکبیریں ہیں اور دعاء افتتاح خواہ تکبیرات سے پہلے پڑھے یا بعد میں دونوں طرح جائز ہے۔ ﴿وخمس فی الاخرۃ﴾ اور دوسری رکعت میں پانچ تکبیریں اور قیام کی تکبیر ان کے علاوہ' اس طرح چھ تکبیریں ہوئیں۔

حاصل کلام: اس حدیث سے ثابت ہوتا ہے کہ عیدین کی بارہ تکبیریں زائد ہیں۔ مگر اس کی سند میں بعض محدثین نے کلام کیا ہے کہ عن ابیہ عن جدہ سے اگر عمرو کا باپ شعیب اور عمرو کا دادا محمد بن عبداللہ مراد ہے تو یہ روایت مرسل ہے کیونکہ محمد بن عبداللہ تابعی ہیں اور اگر شعیب کے دادا عبداللہ مراد ہیں تو شعیب کا ان سے سماع ثابت نہیں۔ اس لئے یہ روایت منقطع ہے۔ لیکن یہ بات غلط ہے' امام دارقطنی وغیرہ نے تردید کی ہے کہ شعیب کا اپنے دادا سے سماع ثابت ہے اور یہاں "جدہ" سے مراد شعیب ہی کا دادا ہے۔ جمہور ائمہ جرح و تعدیل اس سند کو صحیح قرار دیتے ہیں۔ امام احمد رحمہ اللہ' امام علی بن مدینی رحمہ اللہ' امام اسحٰق رحمہ اللہ' امام ابوعبیدہ رحمہ اللہ' امام بخاری رحمہ اللہ' امام دارقطنی رحمہ اللہ' امام دارمی رحمہ اللہ وغیرہ نے اسے صحیح کہا ہے۔ بلکہ فقہاء اربعہ بھی اس سند سے استدلال کرتے اور اسے صحیح کہتے ہیں۔ امام ترمذی رحمہ اللہ سے جو حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے نقل کیا ہے کہ امام بخاری رحمہ اللہ نے اس کو صحیح کہا ہے اس کے بارے میں صاحب سبل السلام نے کہا ہے کہ امام ترمذی رحمہ اللہ نے اپنی جامع میں عمرو بن شعیب کی روایت ہی نقل نہیں کی۔ معلوم نہیں امام ترمذی رحمہ اللہ نے کہاں نقل کیا ہے۔ مگر مولانا صفی الرحمٰن مبارکپوری نے وضاحت کر دی ہے کہ امام ترمذی رحمہ اللہ نے اپنی "العلل الکبیر" میں یہ روایت نقل کی ہے۔ حافظ زیلعی نے "نصب الرایہ' ص ٢١٧' ج ٢" میں بھی اسی کے حوالہ سے یہ روایت نقل کی ہے۔ اس حدیث کی تائید حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا' حضرت سعد رضی اللہ عنہ' حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما وغیرہ صحابہ رضی اللہ عنہم کی روایات سے بھی ہوتی ہے مگر ان میں کلام ہے۔ اکثر صحابہ رضی اللہ عنہم و تابعین اور فقہاء مدینہ کے علاوہ امام احمد رحمہ اللہ' امام شافعی رحمہ اللہ وغیرہ کا بھی اسی حدیث کے مطابق عمل ہے۔ شارح ترمذی رحمہ اللہ علامہ عبدالرحمٰن مبارک پوری کا اس سلسلے میں مستقل رسالہ "القول السدید فیما یتعلق بتکبیرات العید" قابل دید ہے۔ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ اور بعض

دیگر فقہاء کوفہ چھ تکبیروں کے قائل ہیں۔ تین پہلی رکعت میں قراءت سے پہلے اور تین دوسری رکعت میں رکوع جانے سے پہلے۔ مگر اس بارے میں کوئی صحیح مرفوع روایت ثابت نہیں۔ جمہور صحابہؓ و تابعین کا عمل ہی راجح اور دلیل کے اعتبار سے قوی ہے۔ امام ابن المنذر رحمہ اللہ اور امام بیہقی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ عیدین کی زائد تکبیروں میں بھی رفع الیدین مسنون ہے۔

(٣٩٦) وَعَنْ أَبِي وَاقِدٍ اللَّيْثِيِّ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: كَانَ النَّبِيُّ ﷺ يَقْرَأُ فِي الأَضْحَى وَالفِطْرِ بِـ «قٓ، وَاقْتَرَبَتْ». أَخْرَجَهُ مُسْلِمٌ.

حضرت ابوواقد لیثی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی ﷺ عیدالاضحیٰ اور عیدالفطر کی نماز میں سورۂ ق اور سورۂ اقتربت الساعۃ تلاوت فرماتے تھے۔ (مسلم)

حاصل کلام: عیدین کی نمازوں میں ان سورتوں کو پڑھنا مسنون ہے۔ دوسری سورتیں پڑھنا بھی جائز ہے۔

(٣٩٧) وَعَنْ جَابِرٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: كَانَ رَسُولُ اللهِ ﷺ إِذَا كَانَ يَوْمُ العِيْدِ خَالَفَ الطَّرِيْقَ. أَخْرَجَهُ البُخَارِيُّ، وَلِأَبِي دَاوُدَ عَنِ ابْنِ عُمَرَ نَحْوُهُ.

حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ عید کے روز عید گاہ کیلئے جانے اور واپسی کیلئے راستہ تبدیل کرتے تھے۔ (اسے بخاری نے روایت کیا ہے اور ابوداؤد میں ابن عمر رضی اللہ عنہما سے بھی اسی طرح روایت ہے)

لغوی تشریح: ﴿خالف الطریق﴾ مطلب اس کا یہ ہے کہ عیدگاہ کو جاتے وقت ایک راستہ اختیار کیا جائے اور واپسی کیلئے دوسرا راستہ۔ نبی ﷺ کی اقتداء میں مسلمانوں کو بھی راستہ تبدیل کر کے آنا جانا چاہئے' تاکہ اس سے مختلف مقامات ان کی عبادت کے گواہ بنیں اور شوکت اسلام کا مظاہرہ بھی ہو۔

(٣٩٨) وَعَنْ أَنَسٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَدِمَ رَسُولُ اللهِ ﷺ المَدِيْنَةَ، وَلَهُمْ يَوْمَانِ يَلْعَبُونَ فِيهِمَا، فَقَالَ: قَدْ أَبْدَلَكُمُ اللَّهُ بِهِمَا خَيْراً مِّنْهُمَا: يَوْمَ الأَضْحَى، وَيَوْمَ الفِطْرِ. أَخْرَجَهُ أَبُو دَاوُدَ وَالنَّسَائِيُّ بِإِسْنَادٍ صَحِيحٍ.

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ مدینہ منورہ میں تشریف لائے تو اہل مدینہ کے دو روز کھیل کود کیلئے مقرر تھے۔ آپؐ نے فرمایا "اللہ تعالیٰ نے تمہارے ان دونوں کے بدلہ میں ان سے بہتر دو دن عنایت فرما دیئے ہیں۔ ایک عیدالاضحیٰ کا دن اور دوسرا عیدالفطر کا۔" (اسے ابوداؤد اور نسائی نے روایت کیا ہے اس کی سند صحیح ہے)

لغوی تشریح: ﴿ولهم﴾ ان کیلئے' سے مراد اہل مدینہ ہیں۔ ﴿یومان﴾ دو دن' عید کے۔ فرحت اور مسرت کیلئے۔ اہل مدینہ جو دو دن کھیل کود کر مناتے تھے وہ یوم نیروز اور یوم مہرجان۔ یہ دونوں کلمے فارسی

سے معرب کئے گئے ہیں۔ دراصل پہلا نو روز یعنی نیا اور جدید دن۔ اصل ہیئت کے نزدیک یہ شمسی سال کا پہلا دن ہوتا۔ اور پہلا دن وہ ہے جس روز سورج برج حمل میں منتقل ہوتا ہے اور دوسرے کلمے کی اصل مھرگان ہے یعنی گاف کے ساتھ۔ اس سے مراد وہ دن ہے جب سورج برج میزان میں منتقل ہوتا ہے اور اہل فارس نے اس مہینے کا اس نام کے ساتھ نام موسوم کر دیا ہے۔ یہ دونوں دن نہایت معتدل ہوتے ہیں' نہ ان میں گرمی ہوتی ہے اور نہ سردی۔ شب و روز بھی ان دونوں میں مساوی ہوتے ہیں اور یہ دونوں دن فارسیوں کے عید کے روز تھے بلکہ ہنوز بھی عید کے دن ہیں۔ بعض عربوں نے اس بارے میں فارسیوں کی تقلید اور نقالی کی ہے۔ مگر شارع علیہ السلام ان دنوں کی عید منانے سے منع فرماتے ہیں کیونکہ کفار کی عید کی تعظیم مکروہ یا حرام ہے بلکہ بعض نے مبالغہ میں یہاں تک کہہ دیا ہے کہ وہ کفر ہے یا پھر کفر کے بالکل قریب ہے۔

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ عیدین کے روز کھیلنا کودنا' اظہار مسرت و فرحت کرنا جائز ہے۔ البتہ مشرکوں اور کافروں کی عیدوں پر خوشی اور مسرت و انبساط کا اظہار کرنا مکروہ ہے یا بقول بعض حرام ہے۔

(۳۹۹) وَعَنْ عَلِيٍّ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: مِنَ السُّنَّةِ أَنْ يَخْرُجَ إِلَى العِيْدِ مَاشِياً. رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ، وَحَسَّنَهُ.

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ عید گاہ کی جانب پیدل چل کر جانا سنت ہے۔ (اسے ترمذی نے نقل کیا ہے اور حسن قرار دیا ہے)

حاصل کلام: اس حدیث سے یہ ثابت ہوا کہ عیدگاہ میں پیدل چل کر جانا مسنون ہے۔ جتنے قدم اٹھیں گے اتنی نیکیاں زیادہ لکھی جائیں گی۔ اگر عیدگاہ دور ہو تو سواری پر جانا بھی ناجائز نہیں۔

(٤٠٠) وَعَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، أَنَّهُمْ أَصَابَهُمْ مَطَرٌ فِي يَوْمِ عِيْدٍ، فَصَلَّى بِهِمُ النَّبِيُّ ﷺ صَلاَةَ العِيْدِ فِي ٱلْمَسْجِدِ. رَوَاهُ أَبُو دَاوُدَ بِإِسْنَادٍ لَيِّنٍ.

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے بتایا کہ ایک موقع پر عید کے روز مسلمانوں کو بارش نے آلیا تو نبی ﷺ نے انہیں نماز عید مسجد میں پڑھائی۔ (اسے ابوداؤد نے کمزور سند سے روایت کیا ہے)

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ معقول شرعی عذر کی وجہ سے مسجد میں نماز عید پڑھی جا سکتی ہے۔ آپؐ عموماً نماز عید باہر عیدگاہ میں جا کر ہی پڑھتے تھے۔ باران رحمت کی وجہ سے مسجد میں پڑھائی۔ مسئلہ کی نوعیت اپنے مقام پر ہے مگر اس کی سند میں ایک راوی عیسیٰ بن عبدالاعلیٰ بن ابی فروہ مجہول ہے۔ اس وجہ سے یہ روایت باعتبار سند کمزور ہے۔ علماء میں اختلاف ہے کہ نماز عید وسیع و کشادہ مسجد میں پڑھنا افضل ہے یا باہر نکل کر عیدگاہ میں۔ امام شافعی رحمہ اللہ کے نزدیک وسیع و فراخ اور کشادہ مسجد میں پڑھنا افضل ہے اور امام مالک رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ حضور ﷺ نے زندگی بھر نماز عید باہر عیدگاہ میں ادا فرمائی ہے

ہاں ایک مرتبہ بارش کی وجہ سے عذر پیش آگیا تو آپؐ نے نماز عید مسجد میں پڑھائی۔ اس لئے عیدگاہ میں پڑھنا افضل ہے۔ یہ بھی معلوم حقیقت ہے کہ حضور ﷺ نے حتیٰ الوسع ہمیشہ افضل کام پر مداومت و محافظت فرمائی ہے۔ نیز حضرت علی رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ وہ نماز عید کیلئے عیدگاہ تشریف لے گئے اور فرمایا کہ اگر باہر نکل کر نماز عید پڑھنا مسنون نہ ہوتا تو میں مسجد میں پڑھتا۔ اس لئے عیدگاہ میں نماز پڑھنا ہی مسنون اور افضل ہے۔

١٥ - بَابُ صَلاَةِ الْكُسُوفِ

نماز کسوف کا بیان

(گرہن والی نماز)

(٤٠١) عَنِ الْمُغِيْرَةِ بْنِ شُعْبَةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: انْكَسَفَتِ الشَّمْسُ عَلَى عَهْدِ رَسُولِ اللهِ ﷺ يَوْمَ مَاتَ إِبْرَاهِيْمُ، فَقَالَ النَّاسُ: انْكَسَفَتِ الشَّمْسُ لِمَوتِ إِبْرَاهِيْمَ، فَقَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «إِنَّ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ آيَتَانِ مِنْ آيَاتِ اللهِ، لاَ يَنْكَسِفَانِ لِمَوْتِ أَحَدٍ وَلاَ لِحَيَاتِهِ، فَإِذَا رَأَيْتُمُوهُمَا فَادْعُوا اللّٰهَ وَصَلُّوا، حَتَّى تَنْكَشِفَ». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

وَفِي رِوَايَةٍ لِلْبُخَارِيِّ: «حَتَّى تَنْجَلِيَ».

حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ عہد رسالت مآب ﷺ میں جس روز ابراہیم کی وفات ہوئی اس دن سورج گرہن لگا۔ لوگوں نے کہا کہ سورج گرہن ابراہیم کی وفات کی وجہ سے لگا ہے۔ جس پر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "شمس و قمراللہ کی نشانیوں میں سے دو نشانیاں ہیں۔ ان کو گرہن کسی کی موت و حیات کی وجہ سے نہیں لگتا۔ چنانچہ جب تم (ان کو) اس حالت میں دیکھو تو اللہ تعالیٰ سے دعا کرو اور نماز پڑھو یہاں تک کہ سورج گرہن کھل جائے۔" (بخاری و مسلم) اور بخاری کی ایک روایت میں ہے' "نماز پڑھتے رہو تاوقتیکہ وہ روشن ہو جائے۔"

وَلِلْبُخَارِيِّ مِنْ حَدِيْثِ أَبِي بَكْرَةَ: «فَصَلُّوا، وَادْعُوا، حَتَّى يَنْكَشِفَ مَا بِكُمْ».

اور بخاری میں ابوبکرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث میں ہے کہ "نماز پڑھو' دعا مانگو تاآنکہ وہ کیفیت تمہارے سامنے سے دور ہو جائے۔"

لغوی تشریح: ﴿باب صلاۃ الکسوف﴾ کسوف کہتے ہیں رنگت کی سیاہی مائل تبدیلی کو۔ جیسا کہ کہا جاتا ہے ﴿کسفت الشمس وانکسفت﴾ یعنی سورج بالکل سیاہ ہوگیا اس کی شعائیں غائب ہوگئیں اور خسوف کے بھی یہی معنی ہیں۔ اہل لغت نے کہا ہے سورج گرہن کیلئے کسوف اور چاند گرہن کیلئے خسوف کا لفظ بولنا زیادہ فصیح ہے۔ اگرچہ ایک دوسرے کیلئے ان الفاظ کا استعمال بھی صحیح ہے۔ ﴿یوم مات

ابراھیم ﴾ ابراہیم نبی کریم ﷺ کے صاحبزادے کا نام ہے۔ ۱۰ھ کے ۲۹ ویں شوال کا واقعہ ہے۔ نبی کریم ﷺ کے عہد مبارک میں جو سورج گرہن تھا وہ اسی روز صبح ساڑھے آٹھ بجے لگا تھا۔ ﴿ انکسفت لموت ابراھیم ﴾ یہ ان کے دور جاہلیت کے نظریہ و تخیل کے مطابق تھا کہ کسوف و خسوف دونوں کسی عظیم انسان کی موت یا اس کی ولادت کے موقع پر لگتا ہے۔ ﴿ آیتان ﴾ نشانیاں' علامات۔ ﴿ من آیات اللہ ﴾ اللہ کی وہ نشانیاں جو اس کی قدرت' وحدانیت اور عظمت پر دلالت کرتی ہیں یا اپنے بندوں کو ڈرانے' خوف دلانے کیلئے یا یہ نشانیاں اس پر دال ہیں کہ دونوں کو اس نے اپنی قدرت و طاقت سے مسخر کیا ہوا ہے۔ جب یہ دونوں اپنے نفع و نقصان اور دفع ضرر کے مالک و مختار نہیں تو پھر دوسروں کو کیا نفع و نقصان اور ضرر پہنچا سکیں گے۔ ﴿ حتی تنکشف ﴾ یہاں تک صاف ہو جائیں اور روشن ہو جائیں کہ ان پر چھائی ہوئی سیاہی اور بے نور پن دور ہو جائے۔ حتیٰ یکشف صیغۂ مجہول ہے یعنی بلند ہو جائے اور اس پر وارد کیفیت گرہن دور ہو جائے' زائل ہو جائے۔ ﴿ حتی تنجلی ﴾ یہاں تک صاف اور روشن ہو جائے۔ ﴿ حتی یکشف ﴾ صیغۂ مجہول ہے' یعنی بلند ہو جائے اور ڈھل جائے۔

حاصل کلام: آفتاب و ماہتاب کا گرہن اللہ تعالیٰ کی نشانیوں میں سے دو عظیم نشانیاں ہیں۔ اپنی قدرت کے اظہار اور بندوں کے خوف اور ڈرانے کیلئے اتنی بڑی مخلوق کو خدا کے حضور پر مارنے اور جنبش کرنے کی مجال نہیں نہ وہ اپنی آزاد مرضی سے طلوع ہو سکتے ہیں اور نہ غروب۔ وہ ضابطۂ خداوندی میں جکڑے ہوئے ہیں۔ اس ضابطہ سے سرمو انحراف ان کے بس میں نہیں۔ جب ان کی بے بسی کا یہ عالم ہے تو پھر یہ نفع و ضرر کے مالک کیسے بن سکتے ہیں؟ یہ دور جاہلیت کے نظریہ و خیال کی تردید ہے۔

اس موقع پر نماز و دعا مسنون ہے نماز کی دو رکعتیں جماعت کے ساتھ آپؐ سے ثابت ہیں ہر رکعت میں دو رکوع (واذا رایتموھا) اور جب تم انہیں دیکھو کے حکم سے معلوم ہوا کہ یہ نماز اوقات مکروہہ میں بھی پڑھنا جائز ہے۔ اس صورت کے علاوہ نماز کسوف و خسوف کی اور بھی کئی صورتیں منقول ہیں۔ یہ نماز سنت ہے یا واجب۔ اس بارے میں ایک رائے تو یہ ہے کہ یہ سنت ہے اور دوسری رائے ہے کہ یہ واجب ہے۔ امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ وجوب کے قائل ہیں۔ جمہور علماء کے نزدیک جیسا کہ آئندہ حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کی دو ہی رکعتیں ہیں اور ہر رکعت میں دو قیام' دو مرتبہ قراءت اور دو رکوع پہلی رکعت میں سورۂ فاتحہ کے پڑھنے میں اتفاق ہے مگر دوسرے قیام میں اختلاف ہے۔ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ تو دوسرے قیام میں بھی فاتحہ پڑھنا واجب قرار دیتے ہیں ورنہ ان کے نزدیک نماز صحیح نہیں ہوگی۔

رہا یہ مسئلہ کہ قراءت بلند آواز سے کی جائے گی یا آہستہ آواز سے۔ اس میں بھی چار اقوال ہیں۔ ایک قول کی رو سے بلند آواز سے پڑھی جائے گی۔ اس رائے کے حق میں امام احمد رحمۃ اللہ علیہ' اسحٰق بن راھویہ رحمۃ اللہ علیہ' امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ' ابن خزیمہ رحمۃ اللہ علیہ اور ابن منذر رحمۃ اللہ علیہ وغیرہ ہیں۔ ایک دوسرا قول یہ ہے کہ دونوں میں آہستہ پڑھ لی جائے یہ رائے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی ہے۔ ایک تیسرا قول ہے کہ دونوں میں اختیار ہے جس طرح چاہے پڑھ لی جائے اور ایک چوتھا قول یہ ہے کہ آفتاب کو گرہن لگے تو آہستہ

پڑھی جائے اور اگر ماہتاب کو گرہن لگے تو بلند آواز سے پڑھنی چاہئے۔

راوی حدیث: ﴿ ابراھیم رضی اللہ عنہ ﴾ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صاحبزادے۔ ان کی والدہ کا نام ماریہ قبطیہ رضی اللہ عنہا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زوجہ محترمہ۔ اسکندریہ اور مصر کے حکمران نے انہیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ہدیۃً دیا تھا۔ آپؐ کے بیٹے ابراهیمؓ جمادی الاولیٰ ۹ھ کو پیدا ہوئے اور اٹھارہ ماہ کے بعد ۲۹ شوال ۱۰ھ کو وفات پائی۔ بقیع میں دفن ہوئے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "جنت میں ایک دودھ پلانے والی نے اس کی مدت رضاعت کو پورا کیا ہے۔"

(٤٠٢) وَعَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهَا، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ جَهَرَ فِي صَلاَةِ الْكُسُوفِ بِقِرَاءَتِهِ، فَصَلَّى أَرْبَعَ رَكَعَاتٍ، فِي رَكْعَتَيْنِ وَأَرْبَعَ سَجَدَاتٍ. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ، وَهٰذَا لَفْظُ مُسْلِمٍ. وَفِي رِوَايَةٍ لَهُ: فَبَعَثَ مُنَادِياً يُنَادِيْ «اَلصَّلاَةُ جَامِعَةٌ».

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے گرہن کی نماز میں قرأت بلند آواز سے پڑھی اور دو رکعتوں میں چار رکوع اور چار ہی سجدے کئے۔ (بخاری و مسلم) اور اس حدیث کے الفاظ مسلم کے ہیں) اور مسلم کی ایک روایت میں ہے کہ آپؐ نے منادی کرنے والے کو بھیجا جو "الصلاۃ جامعۃ" کی منادی کرتا تھا۔

لغوی تشریح: ﴿ اربع رکعات ﴾ رکعات سے یہاں رکوع مراد ہیں ﴿ فی رکعتین ﴾ ہر رکعت میں دو رکوع ﴿ واربع سجدات ﴾ منصوب ہے اس وجہ سے کہ اس کا عطف اربع رکعات پر ہے۔ یہ اس بات پر متنبہ کرنے کیلئے ذکر کیا گیا ہے کہ سجود میں اضافہ و زیادتی نہیں ان کی تعداد ہر رکعت میں دو ہی رہے گی ﴿ الصلاۃ جامعۃ ﴾ دونوں مرفوع واقع ہو رہے ہیں' اس لئے کہ ایک مبتداء اور دوسرا اس کی خبر واقع ہو رہا ہے اور منصوب ہونے کی صورت میں پہلا فعل محذوف کا مفعول ہو گا جو احضروا ہو سکتا ہے اور دوسرا پھر حال واقع ہو گا۔ اس سے ثابت ہوا کہ اذان کے علاوہ نماز کسوف کیلئے کسی اور طرح اعلان کرنا مستحب ہے۔

حاصل کلام: اس حدیث سے ثابت ہوتا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز کسوف میں قراءت بلند آواز سے فرمائی۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے بھی ایک مرفوع روایت جہری (بلند) آواز سے قراءت کی ہے۔ نیز یہ بھی معلوم ہوا کہ یہ نماز عام نمازوں کی طرح نہیں ہے بلکہ رکوع کا اضافہ ہے۔ اس روایت کی رو سے آپؐ ایک رکعت میں دو رکوع فرماتے۔ ظاہر ہے ہر رکوع سے اٹھ کر نئے سرے سے قراءت کی ہو گی۔ اس طرح قراءت کا بھی اضافہ ہوا۔ نیز اس کا خاص وقت مقرر و متعین نہیں ہے' جب آفتاب کو گرہن ہو گا اسی وقت نماز پڑھی جائے گی۔ عام نمازوں کیلئے تو اذان مقرر ہے اور صلاۃ کسوف و خسوف کیلئے "الصلاۃ جامعۃ" کہنا مشروع ہے۔ نماز کیلئے یہ کہنا ثابت نہیں ہے۔

(٤٠٣) وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ رسول

اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا قَالَ: انْخَسَفَتِ الشَّمْسُ عَلَى عَهْدِ رَسُولِ اللهِ ﷺ فَصَلَّى، فَقَامَ قِيَاماً طَوِيْلاً نَحْواً مِّنْ قِرَاءَةِ سُورَةِ البَقَرَةِ، ثُمَّ رَكَعَ رُكُوعاً طَوِيْلاً، ثُمَّ رَفَعَ، فَقَامَ قِيَاماً طَوِيْلاً، وَهُوَ دُوْنَ القِيَامِ الأَوَّلِ، ثُمَّ رَكَعَ رُكُوعاً طَوِيْلاً، وَهُوَ دُونَ الرُّكُوعِ الأَوَّلِ، ثُمَّ سَجَدَ، ثُمَّ قَامَ قِيَاماً طَوِيْلاً، وَهُوَ دُوْنَ القِيَامِ الأَوَّلِ، ثُمَّ رَكَعَ رُكُوعاً طَوِيْلاً، وَهُوَ دُوْنَ الرُّكُوعِ الأَوَّلِ، ثُمَّ رَفَعَ، فَقَامَ قِيَاماً طَوِيْلاً، وَهُوَ دُونَ القِيَامِ الأَوَّلِ، ثُمَّ رَكَعَ رُكُوعاً طَوِيْلاً، وَهُوَ دُونَ الرُّكُوعِ الأَوَّلِ، ثُمَّ رَفَعَ رَأْسَهُ، ثُمَّ سَجَدَ، ثُمَّ انصَرَفَ، وَقَدِ انْجَلَتِ الشَّمْسُ، فَخَطَبَ النَّاسَ. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ، وَاللَّفْظُ لِلْبُخَارِيِّ.

اللہ ﷺ کے عہد مبارک میں سورج گرہن ہوا۔ آپؐ نے نماز کسوف ادا فرمائی' اس میں سورۂ بقرہ کی تلاوت کے برابر قیام کیا۔ پھر رکوع بھی بہت لمبا کیا۔ پھر کھڑے ہوئے تو قیام بھی طویل کیا مگر پہلے قیام سے کم۔ پھر لمبا رکوع کیا لیکن پہلے رکوع سے کم' پھر سجدہ ریز ہوئے (اس کے بعد) پھر لمبا قیام کیا اور وہ پہلے قیام سے کچھ کم تھا پھر ایک لمبا رکوع کیا جو پہلے رکوع سے کچھ کم تھا پھر (رکوع سے) اپنا سر مبارک اٹھایا اور ایک لمبا قیام کیا جو پہلے قیام سے کچھ کم تھا اس کے بعد پھر ایک اور لمبا رکوع کیا جو پہلے رکوع سے کچھ کم (لمبا) تھا' پھر اپنا سر مبارک (رکوع سے) اٹھایا۔ پھر سجدہ کیا پھر آخر کار سلام پھیر دیا تو (اس دوران) سورج روشن ہو چکا تھا۔ پھر آپؐ نے لوگوں کو وعظ بھی کیا۔ (بخاری و مسلم اور الفاظ مسلم کے ہیں)

وَفِيْ رِوَايَةٍ لِّمُسْلِمٍ: صَلَّى حِيْنَ كُسِفَتِ الشَّمْسُ ثَمَانِيَ رَكَعَاتٍ فِيْ أَرْبَعِ سَجَدَاتٍ.

مسلم کی ایک روایت میں ہے کہ آپؐ نے سورج گرہن کے موقع پر آٹھ رکوع چار سجدوں کے درمیان ادا کئے۔

وَعَنْ عَلِيٍّ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ مِثْلُ ذَلِكَ.

حضرت علی رضی اللہ عنہ سے بھی اسی طرح روایت ہے۔

وَلَهُ عَنْ جَابِرٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ: صَلَّى سِتَّ رَكَعَاتٍ بِأَرْبَعِ سَجَدَاتٍ.

اور مسلم ہی کی ایک روایت حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے یوں بھی ہے کہ آپؐ نے چھ رکوع چار سجدوں کے ساتھ ادا کئے ہیں۔

وَلِأَبِيْ دَاوُدَ عَنْ أُبَيِّ بْنِ كَعْبٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ: صَلَّى، فَرَكَعَ

اور ابوداؤد میں حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آپؐ نے نماز کسوف پڑھی اور پانچ

خَمْسَ رَكَعَاتٍ ، وَسَجَدَ سَجْدَتَيْنِ ، رکوع اور دو سجدے پہلی رکعت میں کئے اسی طرح
وَفَعَلَ فِي الثَّانِيَةِ مِثْلَ ذَلِكَ . دوسری رکعت میں کیا۔

لغوی تشریح: ﴿ نحوا من قراءة سورة البقرة ﴾ تقریباً سورۂ بقرہ کی قرأت کے برابر۔ اس سے استدلال کیا گیا ہے کہ نماز کسوف میں سورۂ فاتحہ آہستہ پڑھی گئی ہے بلند آواز سے نہیں۔ اس لئے کہ اگر نبی ﷺ نے سورۂ فاتحہ بلند آواز سے پڑھی ہوتی تو ابن عباس رضی اللہ عنہما نے اسے سنا ہوتا۔ روایات سے یہ معلوم ہے کہ ابن عباس رضی اللہ عنہما نے اس موقع پر نبی ﷺ کے پہلو میں کھڑے تھے۔ اگر ابن عباس رضی اللہ عنہما نے اسے خود اپنے کانوں سے سنا ہوتا تو اسے اندازاً اور تخمیناً بتانے کی کیا ضرورت تھی؟ مگر حقیقت یہ ہے کہ وہ ساری روایات جو ابن عباس رضی اللہ عنہما کا نبی ﷺ کے پہلو میں کھڑے ہونے کے بارے میں ہیں تمام کی تمام ضعیف اور نہایت کمزور ہیں۔ ایسی روایات سے استدلال کرنا صحیح نہیں ہے۔ بالفرض تسلیم کر لیا جائے کہ ابن عباس رضی اللہ عنہما آپ ؐ کے قریب ہی کھڑے تھے پھر بھی اس کا احتمال ہے کہ جو تلاوت حضور ﷺ نے فرمائی ہوگی۔ بعینہٖ وہ اسے یاد نہ رکھ سکے ہوں اور اس کی مقدار کو یاد رکھ لیا ہو تو ان کو اندازے اور تخمینے کی ضرورت پیش آئی ہوگی اور انہوں نے سورۂ بقرہ کی قرأت کا اندازہ لگایا ہو۔ اس کے باوجود بلند آواز سے پڑھنے والی روایت صحیح ترین ہے اور باعتبار تعداد بھی زیادہ ہیں۔ ان روایات کے راوی مثبت ہیں اور یہ اصول ہے کہ مثبت منفی پر مقدم ہوتا ہے۔ ﴿ دون القيام الاول ﴾ یعنی پہلے قیام سے کم۔ دون القيام الاولى اور دون الركوع الاول کہنے کا مطلب ہے کہ ہر قیام اور ہر رکوع اپنے سے پہلے والے قیام اور رکوع سے کم ہوتا۔

حاصل کلام: تعداد رکوع میں روایات مختلف ہیں جیسا کہ آپ ملاحظہ کر چکے ہیں۔ تمام روایات کو جمع کرنے کے بعد نتیجہ نکلتا ہے کہ دو دو رکوع تین تین رکوع چار چار رکوع اور پانچ پانچ رکوع ایک رکعت میں ثابت ہوتے ہیں۔ بعض نے ان کو جمع کر کے اس پر محمول کیا ہے کہ کسوف کی نماز آپ ؐ کی زندگی میں متعدد بار ہوئی ہے اور بعض کا قول ہے کہ کسوف حضور ﷺ کی حیات مبارکہ میں صرف ایک ہی مرتبہ ہوا ہے۔ بعض علمائے کرام نے ان احادیث کو راجح قرار دیا ہے۔ جن میں ہر رکعت میں دو رکوع کا ذکر آیا ہے۔ موقع کی مناسبت سے ہم اس جگہ چند امور کا بالاختصار اظہار ضروری سمجھتے ہیں۔ تاکہ صحیح صورت حال واضح ہو جائے اور اس مسئلہ کی تنقیح و تحقیق ہو جائے۔

چنانچہ یہ بات ذہن نشین رہے کہ محقق مؤرخین' پیچیدہ و باریک مسائل کی تحقیق کرنے والے ہیئت دان اور ماہرین فلکیات کا اس پر اتفاق ہے کہ ابراهیم رضی اللہ عنہ جس روز فوت ہوئے وہ ۱۰ھ ماہ شوال کی ۲۸ یا ۲۹ تاریخ تھی۔ جبکہ انگریزی ۶۳۲ء جنوری کی ۲۷ تاریخ بنتی ہے اور بعض نے یہ بھی کہا ہے کہ صبح کے ساڑھے آٹھ بجے کا وقت تھا اور اس پر بھی سب متفق نظر آتے ہیں کہ سورج گرہن نبی ﷺ کی حیات طیبہ میں اس کے بعد پھر نہیں ہوا البتہ اس سے پہلے وقوع کے متعلق محقق کبیر علامہ قاضی محمد سلمان

منصور پوری نے اپنی شہرۂ آفاق کتاب سیرت ''رحمت للعالمینؐ'' میں ذکر کیا ہے کہ سورج گرہن کی تعداد نبی ﷺ کے مکی و مدنی دور اور بالخصوص ہجرت کے بعد دس بنتی ہے۔ اس میں وہ سورج گرہن بھی شامل ہے جو آپؐ کے لخت جگر ابراھیم کی وفات کے موقع پر لگا تھا۔ یہ گرہن ان سب کے آخر میں واقع ہوا ہے۔ لیکن قاضی صاحب نے نہ تو ان کے اوقات کا ذکر فرمایا ہے اور نہ ان جگہوں اور علاقوں کا کہ کہاں واقع ہوئے ہیں' تاکہ مدینہ منورہ میں جو سورج گرہن ملاحظہ کیا گیا اس سورج گرہن سے ممیّز ہو جاتا جو وہاں ملاحظہ نہیں کیا گیا۔ رہا احادیث کا معاملہ تو مسلم نے عبدالرحمٰن بن سمرہ رضی اللہ عنہ کے حوالہ سے روایت کیا ہے۔ انہوں نے بتایا کہ میں نے نبی ﷺ کی زندگی میں مدینہ منورہ میں اپنے تیروں سے تیز اندازی کر رہا تھا کہ سورج کو گرہن لگ گیا۔ میں نے تیروں کو پھینک مارا اور دل میں کہا کہ سورج گرہن کی وجہ سے رسول اللہ ﷺ کو جو حادثہ پیش آیا ہے بخدا اسے ضرور میں دیکھوں گا۔ یہ سیاق دلالت کرتے ہیں کہ یہ نبی ﷺ کیلئے پہلا موقع تھا کہ سورج کو گرہن لگا۔ کم از کم اس وقت تک گرہن کے بارے میں کوئی حکم ثابت نہیں اور یہ تو معلوم ہے کہ عبدالرحمٰن بن سمرہ رضی اللہ عنہ فتح مکہ کے موقع پر اسلام لائے ہیں۔ یہ بات اس کا تعین تو کر دیتی ہے کہ نبی ﷺ کی زندگی میں پہلی مرتبہ جو سورج گرہن مشاہدہ کیا گیا وہ فتح مکہ کے بعد کا ہے' پہلے کا نہیں۔ مسلم اور نسائی میں جابر رضی اللہ عنہ کی روایت اس پر دلالت کرتی ہے کہ گرہن کا واقعہ شدید گرمی کے دن ہوا اور ہم ابھی بیان کر چکے ہیں کہ گرہن جو ابراھیم کی وفات پر لگا تھا وہ جنوری کے مہینے میں لگا تھا اور یہ وہ مہینہ ہے جس میں سردی شدید ہوتی ہے۔ لہٰذا یہ اس کا تقاضا کرتا ہے کہ دونوں واقعات الگ ہیں اور ایک واقعہ نہیں بلکہ متعدد ہیں۔ اس کے بعد جب ہم فلکیات کے حساب پر نظر ڈالتے ہیں جسے علامہ قاضی محمد سلیمان نے نمایاں کیا ہے تو فتح مکہ کے بعد ہمیں تین مرتبہ گرہن کا ثبوت ملتا ہے پہلا گرہن ۹ھ یا ۲۸ ربیع الاخر بمطابق ۱۳ اگست ۶۳۰ء کو اور اگست کا مہینہ جیسا کہ سب جانتے ہیں سخت گرمی کا مہینہ ہے اور بارش کی کمی کی وجہ سے جزیرۃ العرب میں دوسرے ملکوں اور علاقوں کے مقابلہ میں گرمی کی شدت زیادہ ہوتی ہے اور دوسرا گرہن ۹ھ ۲۹ شوال بمطابق فروری ۶۳۱ء میں واقع ہوا اور تیسرا گرہن ۱۰ھ ۲۸ شوال بمطابق ۲۷ جنوری ۶۳۲ء کو لگا اور جب ہم فلکیات کے حساب اور احادیث میں مذکور کسوف کو باہم ملاتے ہیں۔ تو ثابت ہوتا ہے کہ گرہن دو ہوئے ہیں جن کا ہم نے ذکر کیا ہے۔ ایک گرہن تو اگست کے مہینہ میں پہلا گرہن یہ شدید گرمی میں واقع ہوا اور ابراھیم کی وفات پر جو جنوری کے مہینہ میں ہوا وہ تیسرا سورج گرہن ہے اور جو ۹ھ شوال کے مہینہ میں (فروری) میں واقع ہوا وہ دوسرا گرہن ہے۔ مگر یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ مدینہ میں اس گرہن کا ملاحظہ کرنا ممکن بھی تھا یا نہیں؟ جو کچھ ہم نے ذکر کیا ہے یہ متعدد مرتبہ گرہن کے ہونے کا مقتضیٰ ہے۔ لیکن یہ تعدد روایات کے اختلاف اور رکوعات کی تعداد کی تلاش میں سود مند نہیں ہے کیونکہ دونوں واقعات سے متعلقہ روایات ہر رکعت میں دو رکوعوں کی صراحت کرتی ہیں۔ پھر باقی کون سے سورج گرہن رہ جاتے ہیں جن کی نماز میں تین تین' چار چار اور پانچ پانچ رکوع کئے۔ ابراھیم کی وفات کے روز گرہن کے بارے میں بھی روایات میں صریح تعارض ہے۔

عام طور پر روایات میں ہے کہ اس روز نماز کسوف ہر رکعت میں دو رکوع سے پڑھی گئی ہے جبکہ مسلم کی روایت سے نماز میں ہر رکعت تین رکوعوں سے پڑھی گئی ثابت ہے۔ پس احادیث کا باہمی تعارض بجز ترجیح کے دور کرنا ممکن ہی نہیں۔ پس ہمارے نزدیک خواہ ہم متعدد واقعات سے تسلیم کریں یا نہ کریں۔ وہ روایات جن میں ہر رکعت میں دو رکوع کا ذکر ہے وہ قوی ترین ہیں سب سے زیادہ ان کا ثبوت ہے اور قطعی طور پر سب سے صحیح ہونے کی وجہ سے راجح بھی ہیں۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ' امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ' شیخ الاسلام امام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ اور متاخرین میں شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کی بھی یہی رائے ہے کہ دو رکوع کی احادیث راجح ہیں۔ واللہ اعلم۔

اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ نماز کسوف کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خطبہ بھی ارشاد فرمایا مگر صاحب ہدایہ نے اس کا انکار کیا ہے کہ نماز کسوف میں خطبہ نہیں کیونکہ کسی حدیث میں اس کا ذکر نہیں ہے۔ حالانکہ اس حدیث میں صاف طور پر اس کا ذکر موجود ہے کہ آپؐ نے سامعین کے سامنے خطبہ ارشاد فرمایا۔

(٤٠٤) وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا قَالَ: مَا هَبَّتِ الرِّيحُ قَطُّ، إِلاَّ جَثَا النَّبِيُّ ﷺ عَلَى رُكْبَتَيْهِ، وَقَالَ: «اللَّهُمَّ اجْعَلْهَا رَحْمَةً، وَلاَ تَجْعَلْهَا عَذَاباً». رَوَاهُ الشَّافِعِيُّ وَالطَّبَرَانِيُّ.

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ جب ہوا تیز و تند چلتی تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اپنے گھٹنوں کے بل بیٹھ کر یوں (بارگاہ الٰہی میں) عرض کرتے۔ اے الٰہی! اس ہوا کو رحمت بنا' عذاب نہ بنا۔ (اسے شافعی اور طبرانی دونوں نے روایت کیا ہے)

لغوی تشریح: ﴿ هبت ﴾ هبوب سے ماخوذ ہے۔ نصر ینصر باب سے ہے' ہوا کا تیز و تند چلنا ﴿ ریح ﴾ مطلق ہوا کو بھی کہتے ہیں یا تیز و تند ہوا کو۔ ﴿ قط ﴾ "طاء" پر تشدید۔ اس پر ہمیشہ ضمہ ہی آتا ہے (مبنی بالضم) ہے اور یہ ماضی میں نفی کے استمرار کی تاکید کیلئے آتا ہے جس طرح ابداً کا لفظ مستقبل کیلئے آتا ہے ﴿ جثا ﴾ نصر ینصر باب سے ہے۔ گھٹنوں کے بل بیٹھنے کیلئے بولا جاتا ہے۔ خوف کے موقع پر اس طرح بیٹھا جاتا ہے۔

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ اندھیری کے وقت اللہ تعالیٰ سے دعا کرنی چاہئے کہ اے اللہ! اسے ہمارے لئے باعث رحمت بنا' باعث عذاب نہ بنا۔ ایک دوسری حدیث میں "ریح" کی بجائے "ریاح" کا لفظ بھی آیا ہے کہ یا الٰہی! اس تیز و تند آندھی کو ریاح بنا دے اور ریح نہ بنا کیونکہ قرآن کے بیان کی رو سے ریاح کا لفظ رحمت کیلئے ہے اور ریح کا لفظ عذاب کیلئے۔ معنی کے اعتبار سے کوئی فرق نہیں دونوں کا معنی ہوا ہے۔

(٤٠٥) وَعَنْهُ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما ہی سے یہ حدیث بھی مروی

عَنْهُ، أَنَّهُ صَلَّى فِي زَلْزَلَةٍ سِتَّ رَكَعَاتٍ، وَأَرْبَعَ سَجَدَاتٍ، وَقَالَ: هٰكَذَا صَلاَةُ الآيَاتِ. رَوَاهُ البَيْهَقِيُّ، وَذَكَرَ الشَّافِعِيُّ عَنْ عَلِيِّ بْنِ أَبِي طَالِبٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُ مِثْلَه، دُوْنَ آخِرِهِ.

ہے کہ انہوں نے زلزلے کے موقع پر نماز چار سجدوں اور چھ رکوعوں سے پڑھی اور فرمایا کہ آیات الٰہی کی نماز اسی طرح پڑھی جاتی ہے۔ (اسے بیہقی نے روایت کیا ہے اور شافعی نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے واسطہ سے اسی طرح کی روایت ذکر کی ہے البتہ اس میں روایت کے آخری الفاظ نہیں)

لغوی تشریح: ﴿ فی زلزلۃ ﴾ اس میں فی سبب بیان کرنے کیلئے ہے ("فاء" سببی ہے) معنی ہے زلزلہ کی وجہ سے ﴿ ست رکعات ﴾ '﴿ اربع سجدات ﴾ چھ رکوع اور چار سجدے یعنی اس طرح نماز پڑھی کہ ہر رکعت میں تین رکوع اور دو سجدے ہوتے تھے ﴿ صلاۃ الایات ﴾ آیات سے یہاں مراد ناگہانی اور پریشان کن واقعات ہیں ﴿ دون آخرہ ﴾ یعنی حدیث کے آخری الفاظ یعنی "ھکذا صلاۃ لہ الایات" نہیں ہیں۔

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ ناگہانی حادثہ' ارضی و سماوی مصیبت کے نزول کی صورت میں فی الفور نماز پڑھنی چاہئے۔ اسے "صلاۃ الایات" کہتے ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مصیبت اور تکلیف کے دور کرنے کیلئے رجوع صرف اللہ تعالیٰ کی طرف کرنا چاہئے غیر اللہ کی جانب متوجہ ہونا ان کو مصائب و آلام دور کرنے کا ذریعہ سمجھنا شرک ہے جو ناقابل معافی جرم ہے جس کی بخشش نہیں۔ اس لئے مسلمانوں کو اس کا خاص طور پر خیال رکھنا چاہئے ایسا نہ ہو کہ تمام کئے کرائے اعمال اکارت جائیں۔

١٦ - بَابُ صَلاَةِ الاسْتِسْقَاءِ

نماز استسقاء کا بیان

(بارش مانگنے کیلئے نماز)

(٤٠٦) عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهما قَالَ: خَرَجَ النَّبِيُّ ﷺ مُتَوَاضِعاً، مُتَبَذِّلاً، مُتَخَشِّعاً، مُتَرَسِّلاً، مُتَضَرِّعاً، فَصَلَّى رَكْعَتَيْنِ، كَمَا يُصَلِّي فِي العِيْدِ، لَمْ يَخْطُبْ خُطْبَتَكُمْ هٰذِهِ. رَوَاهُ الخَمْسَةُ، وَصَحَّحَهُ التِّرْمِذِيُّ وَأَبُو عَوَانَةَ وَابْنُ حِبَّانَ.

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ نبی ﷺ بڑی تواضع کے ساتھ' سادہ لباس میں نہایت عاجزی و انکساری' بہت خشوع اور بڑی زاری ااور تضرع کرتے ہوئے نماز کیلئے باہر نکلے۔ عید کی نماز کی طرح لوگوں کو دو رکعات نماز پڑھائی۔ تمہارے خطبہ کی طرح خطبہ ارشاد نہیں فرمایا۔ (اس روایت کو پانچوں نے روایت کیا ہے اور ترمذی' ابوعوانہ اور ابن حبان نے اسے صحیح قرار دیا ہے)

لغوی تشریح: ﴿ باب صلاۃ الاستسقاء ﴾ استسقاء کے معنی ہیں باران رحمت کی طلب کرنا۔ یعنی اللہ تعالیٰ سے قحط کے وقت بارش کی دعا کرنا۔ سقایہ اور سقی۔ پانی اور بارش کو کہتے ہیں اس لئے کہ پینے اور سیراب کرنے کے معنی میں آتا ہے۔ ﴿ خرج ﴾ عیدگاہ کی طرف نکلے ﴿ متواضعا ﴾ تواضع سے ماخوذ ہے تواضع کہتے ہیں بڑائی اور تکبر کی ضد کو۔ بڑائی اور تکبر اظہار شان و آن ہوتی ہے' تواضع میں عاجزی و انکساری۔ ﴿ متبذلا ﴾ تبذل سے ماخوذ ہے۔ اس کا مطلب ہے زیب و زیبائش کو چھوڑ دینا اور پھٹا پرانا کپڑا زیب تن کرنا اور ﴿ متخشعا ﴾ یعنی خشوع کو ظاہر کرنے والا اور اس کے بدن' نظر اور آواز سے دھیما پن نمایاں ہوتا ہے۔ باطنی طور پر خوف زدہ اور جھکا ہوا ہو تاکہ اس کے ذریعہ سے وہ چیز حاصل کر لے جو اللہ تعالیٰ کے پاس ہے۔ ﴿ مترسلا ﴾ جلد باز نہ ہو آرام و سکون سے چلنے والا۔ ﴿ متضرعا ﴾ تضرع کو نمایاں اور ظاہر کرنے والا۔ یعنی تذلل اور دست سوال دراز کرنے میں مبالغہ کرنے والا اور اپنی حاجت و ضروریات طلب کرنے والا۔ تمام صیغے اسم فاعل کے ہیں اور منصوب اس بنا پر ہے کہ حال واقع ہو رہا ہے۔ ﴿ لم یخطب خطبتکم ھذہ ﴾ تمہارے خطبہ کی طرح آپؐ خطبہ نہیں دیتے تھے بلکہ آپؐ خطبہ کی حالت میں دعا تضرع اور اللہ کی بڑائی و کبریائی بیان فرماتے جیسا کہ ابوداؤد میں روایت میں ہے۔

حاصل کلام: یہ حدیث اس کی دلیل ہے کہ نماز استسقاء رسول اللہ ﷺ سے ثابت ہے۔ استسقاء کے لغوی معنی پانی کیلئے درخواست کرنا' دعا کرنا۔ شرعی اصطلاح کی رو سے ایک مخصوص کیفیت سے نماز پڑھنا۔ استسقاء کی تین قسمیں ممکن ہیں۔ ادنیٰ' اوسط اور اعلیٰ۔ ادنیٰ کی صورت یہ ہے کہ صرف دعا کی جائے اور اوسط کی صورت یہ ہے کہ فرض نماز کے بعد باجماعت ادا کی جائے اور اعلیٰ کی صورت یہ ہے کہ طلب بارش کیلئے باہر نکل کر عاجزی و انکساری' خشوع و خضوع کی حالت میں نماز استسقاء ادا کی جائے اور خوب عاجزی کے ساتھ گڑگڑا کر دعا کی جائے۔

نبی ﷺ سے صرف دعا بھی ثابت ہے جیسا کہ خطبہ جمعہ ارشاد فرمانے کے دوران ایک آدمی نے آپؐ سے بارش کیلئے دعا کی درخواست کی تو آپؐ منبر پر کھڑے ہوئے اور دعا فرمائی جس کے نتیجہ میں بارش شروع ہو گئی اور آئندہ جمعہ تک مسلسل ہوتی رہی۔ اس سے معلوم ہوا کہ خطیب خطبہ کے دوران دعا کر سکتا ہے اس وقت قبلہ رو ہونا بھی ضروری نہیں۔ خطبہ کے دوران خطیب سے گفتگو ہو سکتی ہے۔ خطیب دوسرے کی درخواست پر عمل کرنے کا مجاز ہے۔

حدیث سے یہ بھی معلوم ہو رہا ہے کہ آپؐ نے نماز استسقاء عید کی نماز کی طرح ادا فرمائی۔ اس سے یہ ثابت ہوتا ہے جیسا کہ دارقطنی نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے حوالہ سے یہ روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے نماز استسقاء کی پہلی رکعت میں سات اور دوسری میں پانچ تکبیریں بھی کہی تھیں۔ اس روایت کی سند میں اگرچہ محمد اور اس کا والد عبدالعزیز دونوں کو ضعیف قرار دیا گیا ہے مگر مذکورہ بالا حدیث اس کی تائید کر رہی ہے۔

خطبہ نماز استسقاء مختصر مگر جامع ہونا چاہئے۔ خطیب مقاصد خطبہ سے تجاوز نہ کر جائے۔ بے موقع و

خلاف موقع گفتگو کر کے لمبا اور طویل بھی نہ کرے۔ شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی شہرۂ آفاق کتاب حجۃ اللہ البالغۃ میں لکھا ہے کہ نبی ﷺ سے نماز استسقاء ادا کرنے کے کئی طریقے منقول ہیں۔ مسنون طریقہ یہ ہے کہ سارے لوگ شہر سے یا آبادی سے باہر جمع ہوں۔ لباس پھٹا پرانا ہو' ڈرتے ہوئے اللہ کے حضور گریہ و زاری کرے۔ اس کے بعد امام ان کو دو رکعت نماز باجماعت پڑھائے اور قرأت بلند آواز سے کریں۔ اس کے بعد خطبہ پڑھے اور قبلہ رو ہو کر دعا مانگے اس دوران چادر کو الٹا کرے۔

(٤٠٧) وَعَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهَا قَالَتْ: شَكَا النَّاسُ إِلَى رَسُولِ اللهِ ﷺ قُحُوطَ المَطَرِ، فَأَمَرَ بِمِنْبَرٍ، فَوُضِعَ لَهُ فِي المُصَلَّى، وَوَعَدَ النَّاسَ يَوْماً يَخْرُجُونَ فِيهِ، فَخَرَجَ حِينَ بَدَا حَاجِبُ الشَّمْسِ، فَقَعَدَ عَلَى المِنْبَرِ، فَكَبَّرَ وَحَمِدَ اللَّهَ، ثُمَّ قَالَ: إِنَّكُمْ شَكَوْتُمْ جَدْبَ دِيَارِكُمْ، وَقَدْ أَمَرَكُمُ اللَّهُ أَنْ تَدْعُوهُ، وَوَعَدَكُمْ أَن يَسْتَجِيبَ لَكُمْ، ثُمَّ قَالَ: اَلْحَمْدُ للهِ رَبِّ العَالَمِينَ، الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ، مَالِكِ يَوْمِ الدِّينِ، لاَ إِلَهَ إِلاَّ اللَّهُ، يَفْعَلُ مَا يُرِيدُ، اللَّهُمَّ أَنْتَ اللَّهُ، لاَ إِلَهَ إِلاَّ أَنْتَ، أَنْتَ الغَنِيُّ، وَنَحْنُ الفُقَرَاءُ، أَنْزِلْ عَلَيْنَا الغَيْثَ، وَاجْعَلْ مَا أَنْزَلْتَ عَلَيْنَا قُوَّةً وَبَلاَغاً إِلَى حِينٍ. ثُمَّ رَفَعَ يَدَيْهِ، فَلَمْ يَزَلْ حَتَّى رُئِيَ بَيَاضُ إِبِطَيْهِ، ثُمَّ حَوَّلَ إِلَى النَّاسِ ظَهْرَهُ، وَقَلَّبَ رِدَاءَهُ، وَهُوَ رَافِعٌ يَدَيْهِ، ثُمَّ أَقْبَلَ عَلَى النَّاسِ، وَنَزَلَ،

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ لوگوں نے رسول اللہ ﷺ کے پاس بارش کے نہ ہونے کی وجہ سے قحط سالی کی شکایت کی۔ آپؐ نے عیدگاہ میں منبر لے جانے کا حکم ارشاد فرمایا۔ چنانچہ منبر عیدگاہ میں لا کر رکھ دیا گیا۔ لوگوں سے ایک دن کا وعدہ کیا جس میں وہ سارے باہر نکلیں۔ آپؐ خود اس وقت نکلے جب سورج کا کنارہ ظاہر ہوا۔ تشریف لا کر آپؐ منبر پر بیٹھ گئے اور اللہ اکبر کہا اور اللہ تعالیٰ کی حمد و ستائش کی پھر (لوگوں سے مخاطب ہو) کر فرمایا "تم لوگوں نے اپنے علاقوں کی خشک سالی کا شکوہ کیا ہے' اللہ تعالیٰ تو تمہیں یہ حکم دے چکا ہے کہ اس سے دعا کرو وہ تمہاری دعا کو قبول فرمائے گا" پھر فرمایا' تعریف اللہ ہی کیلئے سزاوار ہے جو کائنات کا پروردگار ہے۔ لوگوں کے حق میں بڑا مہربان اور ہمیشہ ہر وقت مہربان ہے۔ روز جزاء کا مالک ہے۔ اللہ کے سوا دوسرا کوئی الہ نہیں جو چاہتا ہے کر گزرتا ہے۔ الٰہی! تو ہی اللہ ہے تیرے سوا کوئی دوسرا معبود نہیں۔ تو غنی ہے اور ہم فقیر و محتاج ہیں۔ ہم پر باران رحمت کا نزول فرما جو کچھ تو ہم پر نازل فرمائے اسے ہمارے لئے روزی اور مدت دراز تک پہنچنے کا ذریعہ بنا۔ اس کے بعد آنجناب ﷺ نے اپنے دونوں دست مبارک اوپر

وَصَلَّى رَكْعَتَيْنِ، فَأَنْشَأَ اللّٰهُ تَعَالَى سَحَابَةً، فَرَعَدَتْ، وَبَرَقَتْ، ثُمَّ أَمْطَرَتْ. رَوَاهُ أَبُو دَاوُدَ، وَقَالَ: غَرِيبٌ، وَإِسْنَادُهُ جَيِّدٌ.

اٹھائے کہ وہ بتدریج آہستہ آہستہ اوپر اٹھتے گئے یہاں تک کہ آپؐ کی بغلوں کی سفیدی نظر آنے لگی۔ پھر لوگوں کی جانب اپنی پشت کر کے کھڑے ہوگئے اور اپنی چادر کو پھیر کر پلٹایا۔ آپؐ اس وقت اپنے دونوں ہاتھ اوپر اٹھائے ہوئے تھے۔ پھر لوگوں کی جانب متوجہ ہوئے اور منبر سے نیچے تشریف لے آئے اور دو رکعت نماز پڑھائی۔ اسی لحہ اللہ تعالیٰ نے آسمان پر بادل پیدا کیا وہ بدلی گرجی اور چمکی اور بارش برسنے لگی۔ (اسے ابوداؤد نے روایت کیا ہے اور اسے غریب کہا ہے اور اس کی سند نہایت عمدہ و جید ہے)

وَقِصَّةُ التَّحْوِيلِ فِي الصَّحِيحِ مِنْ حَدِيثِ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ زَيْدٍ، وَفِيهِ: فَتَوَجَّهَ إِلَى الْقِبْلَةِ يَدْعُو، ثُمَّ صَلَّى رَكْعَتَيْنِ، جَهَرَ فِيهِمَا بِالْقِرَاءَةِ.

صحیح بخاری میں عبداللہ بن زید رضی اللہ عنہ کی روایت میں (تبدیلی چادر) کا قصہ اس طرح ہے پھر آپؐ نے قبلہ کی طرف رخ کیا اور دعا فرماتے رہے پھر دو رکعت نماز ادا فرمائی۔ ان میں قرأت بلند آواز سے کی۔" اور

وَلِلدَّارَقُطْنِيِّ مِنْ مُرْسَلِ أَبِي جَعْفَرٍ الْبَاقِرِ: وَحَوَّلَ رِدَاءَهُ لِيَتَحَوَّلَ الْقَحْطُ.

دار قطنی میں ابو جعفر باقر کی مرسل روایت میں ہے کہ آپؐ نے اپنی چادر اس لئے پھیر کر بدلی کہ قحط سالی بھی اسی طرح پھر جائے۔

لغوی تشریح: ﴿ قحوط المطر ﴾ قحوط میں "قاف" پر ضمہ۔ قحط کی طرح یہ بھی مصدر ہے۔ معنی بندش بارش، باران رحمت کا نازل نہ ہونا ﴿ ووعد الناس یوما ﴾ یعنی ایک دن مقرر فرما دیا ﴿ بدا ﴾ نمایاں ہونا ظاہر ہے ﴿ حاجب الشمس ﴾ سورج کا ابرو، سورج کا پہلا حصہ ایک کنارہ یا آفتاب کی روشنی بھی ہو سکتی ہے۔ ﴿ جدب دیارکم ﴾ اپنے علاقوں کی قحط سالی کی کیفیت ﴿ ان یستجیب لکم ﴾ دعا کو قبول فرماتا ہے اپنے ارشاد کے مطابق جس میں ہے ﴿ ادعونی استجب لکم ۔ ۴۰/ ۶۰ ﴾ مجھ سے مانگو میں قبول کروں گا تمہاری پکار دعا کو اور فرمایا ﴿ اجیب دعوۃ الداع اذا دعان : ۱۸۶/ ۲ ﴾ میں تو پکارنے والے کی پکار سنتا ہوں جب وہ مجھے پکارتا ہے۔ ﴿ الغیث ﴾ بارش۔ ﴿ بلاغا الی حین ﴾ یعنی ایسی روزی عطاء فرما جو ہمیں لمبے عرصہ تک چلے۔ ﴿ البلاغ ﴾ کے معنی ہیں جو کسی کو اس کے مطلوب و مقصود تک پہنچا دے۔ ﴿ حتی رئی...الخ ﴾ صیغہ مجہول ہے ﴿ الابط ﴾ جو حصہ، جسم، بازو اور کندھے کے نیچے ہے ﴿ حول ﴾ تحویل سے ماخوذ ہے معنی ہے کہ اس نے پلٹایا، پھیرا ﴿ الی الناس ظھرہ ﴾

لوگوں کی طرف پشت کی اور رخ قبلہ کی طرف ﴿ وقلب ردائه ﴾ یعنی چادر کی بائیں طرف کو دائیں طرف اور نچلے حصہ کو اوپر کیا اور ظاہری حصہ کو باطن بنایا اور اس کی ہر کیفیت کو برعکس بھی کیا۔ کیفیت اس کی یوں ہے کہ اپنے سیدھے ہاتھ (دائیں) سے بائیں طرف سے نچلی طرف کو پکڑا اور بائیں ہاتھ سے دائیں طرف کے نچلے حصہ کو پکڑا پھر دائیں ہاتھ سے دائیں کندھے پر لے آئے اور بائیں ہاتھ سے بائیں کندھے پر لے آئے یوں تو اس عمل سے چادر تبدیل کرنے کی مذکورہ بالا کیفیت پوری ہو جاتی ہے۔ ﴿ وهو رافع يديه ﴾ یعنی جب لوگوں کی طرف پشت کی تو اس وقت اپنے دونوں ہاتھ اوپر اٹھائے ہوئے تھے ﴿ فانشئا ﴾ پیدا فرمایا ﴿ فرعدت ﴾ اس میں کڑک' گرج پیدا ہوئی۔ یہ بادل کی آواز ہے۔ ﴿ وبرقت ﴾ بادل کا چمکنا ﴿ في الصحيح ﴾ اور صحیح بخاری میں ہے ﴿ من حديث عبدالله بن زيد ﴾ اس سے عبداللہ بن زید بن عاصم انصاری مازنی مراد ہے وہ عبداللہ بن زید رضی اللہ عنہ مراد نہیں جن سے اذان کا واقعہ منقول ہے۔ ﴿ ليتحول القحط ﴾ تاکہ پلٹ جائے اور تبدیل ہو جائے یعنی قحط سالی اور خشک سالی سرسبزی و شادابی میں تبدیل ہو جائے۔

حاصل کلام : اس سے معلوم ہوا کہ نماز عید کے برعکس نماز استسقاء کے موقع پر منبر باہر لے جانا جائز ہے۔ نیز عید کی طرح خطبہ استسقاء نماز کے بعد پڑھا گیا اور استسقاء کیلئے دعا میں ہاتھ اتنے اوپر اٹھائے کہ بقول حضرت انس رضی اللہ عنہ میں نے رسول اللہ کو کسی موقع پر اتنے بلند ہاتھ اٹھاتے نہیں دیکھا۔ امام نووی رحمۃ اللہ علیہ نے ہاتھ اٹھا کر دعا کرنے کے بارے میں تیس احادیث جمع کی ہیں۔ اس سے یہ معلوم ہوا کہ ہاتھ اٹھا کر دعا کرنا بھی مسنون ہے۔ اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ خطبہ کا آغاز بسم اللہ سے نہیں بلکہ الحمد للہ سے کرنا مسنون ہے۔ اس کے علاوہ بھی کسی دوسرے لفظ سے آغاز صحیح نہیں۔

راوی حدیث : ﴿ ابوجعفر باقر ﴾ ابو جعفر محمد الباقر (قاف کے نیچے کسرہ) کی کنیت ہے۔ محمد بن علی زین العابدین بن حسین بن علی بن ابی طالب' امامیہ شیعہ کے عقیدے کے مطابق بارہ ائمہ میں سے ان کا پانچواں نمبر ہے۔ باقر ان کو اس لئے کہتے ہیں کہ ان کا علم بڑا وسیع تھا' بڑے ماہر و متبحر عالم تھے۔ ۵۶ھ میں پیدا ہوئے۔ ۱۱۷ھ میں تریسٹھ برس کی عمر میں وفات پائی اور جنت البقیع کے قبرستان میں دفن کئے گئے۔

(٤٠٨) وَعَنْ أَنَسٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، أَنَّ رَجُلاً دَخَلَ المَسْجِدَ يَوْمَ الجُمُعَةِ، وَالنَّبِيُّ ﷺ قَائِمٌ يَخْطُبُ، فَقَالَ: يَا رَسُولَ اللهِ! هَلَكَتِ الأَمْوَالُ، وَانْقَطَعَتِ السُّبُلُ، فَادْعُ اللَّهَ يُغِيثُنَا، فَرَفَعَ يَدَيْهِ، ثُمَّ قَالَ: «اللَّهُمَّ أَغِثْنَا، اللَّهُمَّ

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ایک آدمی جمعہ کے روز مسجد میں داخل ہوا' اس وقت نبی ﷺ کھڑے خطبہ ارشاد فرما رہے تھے' وہ بولا یا رسول اللہ (ﷺ)! اموال (مویشی) ہلاک ہو گئے اور آمدورفت کے راستے بند ہو گئے ہیں۔ اللہ کے حضور دعا فرمائیں کہ وہ ہم پر بارش نازل فرمائے۔ آپؐ نے اسی وقت اپنے ہاتھ اوپر اٹھائے اور دعا فرمائی۔ یا الٰہی! بارش

أَغِثْنَا، اللَّهُمَّ أَغِثْنَا»، فَذَكَرَ الحَدِيْثَ، وَفِيْهِ الدُّعَاءُ بِإِمْسَاكِهَا. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.	سے ہماری فریاد رسی فرما۔ یاالٰہی! باران رحمت سے ہماری فریاد رسی فرما۔ ساری حدیث بیان فرمائی۔ اس میں بارش کے بند کروانے کی دعا کا بھی ذکر ہے۔ (بخاری و مسلم)

لغوی تشریح: ﴿ السبل ﴾ سبیل کی جمع ہے جس کا معنی راستہ ہے۔ "سین" اور "باء" پر ضمہ ہے۔ راستوں کے بند ہونے کا مطلب یہ ہے کہ لوگوں نے بارش نہ ہونے کی وجہ سے سفر کرنا چھوڑ دیا کیونکہ بارش نہ ہونے کی وجہ سے سواری کے جانوروں کیلئے چارہ پیدا نہیں ہوا تھا اور یہ جانور اتنے کمزور ہو گئے کہ سفر کے قابل ہی نہ رہے یا یہ مفہوم ہے کہ بارش نہ ہونے کی وجہ سے وہ چیزیں ہی پیدا نہیں ہوئیں جنہیں اٹھا کر منڈی میں لایا جاتا ہے' جب چیزیں ہی نہیں تو باربرداری کے تمام جانور بے کار ہو کر رہ گئے اور راستے بے آباد اور آمدورفت سے خالی ہو کر رہ گئے۔ ﴿ یغیثنا ﴾ "یاء" پر ضمہ یعنی ہمیں فوری طور پر بارش سے نواز دے تاکہ ہماری تکلیف دور ہو۔ ﴿ فرفع یدیه ﴾ بخاری نے اتنا اضافہ نقل کیا ہے کہ آپؐ کے ساتھ لوگوں نے بھی ہاتھ اوپر اٹھا کر دعا مانگی۔ اس سے معلوم ہوا کہ ہاتھ اوپر اٹھانا آداب دعا میں شامل ہے۔ ﴿ اغثنا ﴾ اغاثہ سے ماخوذ ہے۔ دعائیہ صیغہ ہے۔ معنی ہے کہ ہمیں باران رحمت سے سیراب فرما۔ ﴿ فذکر الحدیث ﴾ اس نے ساری حدیث بیان کی جس میں مذکور ہے۔ اس دعا کے بعد بارش مسلسل و لگاتار نازل ہوتی رہی۔ حتیٰ کہ دوسرے جمعہ کے روز پھر ایک آدمی دوران خطبہ میں کھڑا ہوا اور کثرت بارش کی وجہ سے اموال کے ہلاک ہونے اور راستوں کے منقطع ہونے کا شکوہ کرنے لگا۔ تو نبی ﷺ نے پھر بارش کے رکنے کی دعا فرمائی تو بادل چھٹ گئے اور آفتاب روشن ہو گیا اور مصنف نے ﴿ وفیه الدعاء بامساکها ﴾ کے فقرے سے اسی طرف اشارہ کیا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ اس حدیث میں بارش کے رکوانے کی دعا بھی ہے۔

حاصل کلام: اس حدیث سے یہ بات بھی معلوم ہوئی کہ انبیاء کرامؑ بلکہ خاتم الانبیاء والمرسلین ﷺ بھی ہر چیز اللہ رب العالمین سے براہ راست طلب فرماتے تھے۔ بیچ میں کسی کو واسطہ یا ذریعہ بنانا صحیح نہیں سمجھتے تھے ورنہ نبی کریم ﷺ بھی ابوالانبیاء یا ابوالبشر یا کسی دوسرے اولوالعزم پیغمبر کا واسطہ دے کر بارش طلب فرماتے۔ نیز صحابہ کرامؓ بھی یہی سمجھتے تھے کہ نبی ازخود نہیں بلکہ اللہ کے حضور استدعا کرتے ہیں کہ وہ بارش برسا کر لوگوں کو قحط سالی سے نجات دیں۔ نیز یہ بھی معلوم ہوا کہ نبی ﷺ کان وما یکون کا علم بھی نہیں رکھتے تھے ورنہ انہیں معلوم ہوتا کہ قحط سالی کی وجہ سے بیرون شہر لوگوں کا کیا حال ہے۔ اس آدمی کے بتانے پر معلوم ہوا۔

وہ آدمی کون تھا' اس میں اختلاف ہے کسی نے ابوسفیان رضی اللہ عنہ کا نام لیا ہے حالانکہ ابوسفیان رضی اللہ عنہ اس وقت دائرۂ اسلام میں داخل ہی نہیں ہوئے تھے۔ انداز گفتگو اور طرز کلام سے محسوس ہوتا ہے کہ سائل

ضرور کوئی مسلمان ہے ورنہ آج کل کے نام نہاد مسلمانوں کی طرح آپؐ کو مشکل کشا سمجھ کر آپؐ ہی سے درخواست کرتا کہ یارسول اللہ (ﷺ)! ہمیں قحط سالی کی مصیبت سے نجات دلا۔ مسند احمد میں ہے کہ کعب بن مرہ صحابی رضی اللہ عنہ تھے۔

اس حدیث سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ آپؐ نے صرف دعا ہی فرمائی ہے بارش کیلئے نماز نہیں پڑھی۔ امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے غالباً اسی سے استدلال کیا ہے استسقاء کیلئے صرف دعا کرنا سنت ہے مگر دوسری احادیث سے نماز استسقاء پڑھنا بھی ثابت ہے۔

اس سلسلہ کی تمام روایات کو سامنے رکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ آپؐ نے بارش کیلئے چھ طرح مختلف اوقات میں دعا کی ہے۔ (۱) ایک دفعہ تو آپؐ لوگوں کو عیدگاہ میں لے گئے، نماز پڑھائی، خطبہ بھی دیا اور دعا بھی فرمائی۔ (۲) ایک دفعہ خطبہ جمعہ کے دوران ہی صرف دعا ہی منبر پر کھڑے ہوئے فرمائی۔ (۳) ایک مرتبہ آپؐ نے باقاعدہ منبر منگوایا اور اس پر بیٹھ کر صرف دعا فرمائی یہ الفاظ مروی ہیں بلکہ حدیث میں اس کے برعکس خطبہ کے لفظ بھی کہے اور نماز نہیں پڑھی۔ (۴) ایک مرتبہ نماز سے فارغ ہو کر سب لوگوں کے ساتھ اجتماعی دعا کی۔ (۵) ایک دفعہ آبادی سے باہر نکل کر احجار الزیت مقام میں جا کر دعا فرمائی۔ (۶) اور ایک دفعہ جنگ کے دوران بارش کیلئے دعا فرمائی۔ ہر دفعہ اللہ تعالیٰ نے دعا قبول فرمائی۔ (زاد المعاد۔ السبل)

(٤٠٩) وَعَنْهُ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، أَنَّ عُمَرَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ كَانَ إِذَا قَحَطُوا اسْتَسْقَى بِالْعَبَّاسِ بْنِ عَبْدِ الْمُطَّلِبِ، وَقَالَ: اللَّهُمَّ إِنَّا كُنَّا نَسْتَسْقِيْ إِلَيْكَ بِنَبِيِّنَا فَتَسْقِيْنَا، وَإِنَّا نَتَوَسَّلُ إِلَيْكَ بِعَمِّ نَبِيِّنَا فاسْقِنَا، فَيُسْقَوْنَ. رَوَاهُ الْبُخَارِيُّ.

حضرت انس رضی اللہ عنہ ہی سے مروی ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ جب لوگ قحط میں مبتلا ہو جاتے تو حضرت عباس بن عبدالمطلب رضی اللہ عنہ کو وسیلہ بنا کر بارش طلب فرماتے اور یوں دعا کرتے کہ اے اللہ! ہم تجھ سے تیرے نبی ﷺ کے واسطہ سے بارش طلب کرتے تھے تو ہمیں باران رحمت سے نواز دیتا تھا اور اب ہم تیرے حضور تیرے نبی ﷺ کے چچا کو بطور وسیلہ لائے ہیں لہٰذا تو ہمیں بارش سے سیراب فرما دے (اس دعا کی قبولیت کے نتیجہ میں) ان کو بارش سے سیراب کیا جاتا تھا۔ (بخاری)

لغوی تشریح: ﴿ قحطوا ﴾ صیغہ مجہول وہ قحط کا شکار ہوگئے۔ ﴿ یستسقی بالعباس بن عبدالمطلب ﴾ عباس رضی اللہ عنہ کو وسیلہ بنا کر اور ان سے شفاعت و سفارش کرا کر بارش طلب کرتے تھے اس لئے کہ وہ نبی ﷺ کے چچا تھے اور چچا والد کے مثل ہوتا ہے۔ ﴿ اللھم انا کنا نستسقی الیک بنبینا ﴾ یا الٰہی! ہم نبی ﷺ کی زندگی میں ان سے دعا اور سفارش کے ذریعہ سے بارش طلب کرتے تھے۔ ان کی ذات سے نہیں ﴿ وانا نتوسل الیک ﴾ اور اب ان کی وفات کے بعد آپؐ کے چچا

عباس بن عبدالمطلب رضی اللہ عنہ کو وسیلہ بنا کر لائے ہیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور حضرت عباس رضی اللہ عنہما دونوں منبر پر تشریف لے گئے۔ جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ یہ دعا پوری کر چکے تو حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے بارگاہ رب العزت سے عرض کیا۔ الٰہی! مصیبت اور بلائیں گناہ کے سبب سے نازل ہوتی ہیں اور توبہ کے بغیر وہ دور نہیں ہوتیں۔ اب لوگوں نے تیرے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی جگہ مجھے تیری جناب میں متوجہ کیا ہے' یہ ہمارے ہاتھ تیرے حضور اٹھے ہوئے ہیں' گناہوں سے لبریز ہیں۔ ہم تیری جناب سے توبہ کے ذریعہ فریاد رسی کے طلبگار ہیں تیرے حضور سر تسلیم خم کئے ہوئے ہیں۔ پیشانیاں تیرے آگے جھکی ہوئی ہیں۔ لہٰذا ہمیں بارش سے سیراب فرما دے۔ بس پھر کیا تھا پہاڑوں کی مانند بادل اٹھے اور آسمان پر چھا گئے۔ خوب بارش برسی' زمین سرسبز و شاداب ہو کر لہلہانے لگی۔ لوگوں میں زندگی آ گئی۔ اس واقعہ کو زبیر بن بکار نے اپنی الانساب میں ذکر کیا ہے۔ (مرعاۃ' ج: ۲' ص: ۳۹۹ اور سبل السلام)

حاصل کلام: قبہ و قبر پرستوں نے اس سے یہ استدلال کیا ہے کہ وسیلہ پکڑنا جائز ہے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے بھی حضرت عباس رضی اللہ عنہ کو طلب بارش کیلئے وسیلہ بنایا اور ان کے توسل سے بارش کیلئے دعا مانگی۔ حالانکہ یہ سراسر لغو اور مردود ہے۔ اس لئے کہ یہ حضرات تو زندہ و مردہ' حاضر و غائب بلکہ ان کے ناموں کا بھی وسیلہ پکڑتے ہیں۔ حالانکہ اس حدیث سے تو صرف زندہ انسانوں کی دعا کا وسیلہ پکڑنا ثابت ہوتا ہے۔ ان کے ناموں کو وسیلہ بنانا ثابت نہیں ہوتا۔ اگر ان حضرات کی طرح وسیلہ اور توسل پکڑنا جائز ہوتا تو پھر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے چچا کی عدم موجودگی میں بھی جائز ہوتا حالانکہ ایسا کسی حدیث سے اور قرآن مجید کی کسی آیت سے ثابت نہیں ہوتا۔

یہ حدیث ہمارے لئے تین باتوں کا ذکر کرتی ہے ایک تو یہ کہ بارش کی دعا کیلئے خیر اور خاندان نبوت کے کسی فرد کو جو نیکی و تقویٰ میں نمایاں مقام رکھتا ہو' ساتھ لے جانا چاہئے۔ اس حدیث سے حضرت عباس رضی اللہ عنہ کی فضیلت و بزرگی نمایاں ہوتی ہے کہ خاندان نبوت میں ان کا مقام و مرتبہ بہت بلند تھا۔ اس حدیث سے یہ بھی واضح ہو رہا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ میں تواضع و انکساری کس قدر پائی جاتی تھی اور اہل بیت کے کتنے قدر شناس و حق شناس تھے۔ نیز یہ بھی اس حدیث سے مترشح ہو رہا ہے کہ زندہ آدمی خواہ فوت شدہ سے مرتبے و منصب میں کم تر ہو' دعا اسی سے کرانی چاہئے۔ فوت شدہ کا وسیلہ اور توسل شریعت میں نہ ثابت ہے اور نہ ہی معتبر ہے۔

راوی حدیث: ﴿حضرت عباس بن عبدالمطلب رضی اللہ عنہ﴾ حضور کے چچا' ان کی کنیت ابوالفضل تھی۔ بیت اللہ کی آباد کاری اور حجاج کو پانی پلانے کا منصب ان کے پاس تھا۔ بیعت عقبہ میں حاضر تھے تاکہ انصار کو عہد وفا کرنے کی تاکید کریں۔ اگرچہ اس وقت وہ مسلمان نہ تھے۔ غزوۂ بدر کے موقع پر قیدیوں میں شامل تھے۔ فتح مکہ سے تھوڑا سا عرصہ پہلے اسلام قبول کیا اور اس غزوۂ میں شریک بھی ہوئے۔ غزوۂ حنین کے روز ثابت قدم رہے۔ ۳۲ھ میں رجب یا رمضان میں وفات پائی اور بقیع کے قبرستان میں دفن کئے گئے۔

(٤١٠) وَعَنْهُ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: أَصَابَنَا - وَنَحْنُ مَعَ رَسُولِ اللهِ ﷺ - مَطَرٌ، قَالَ: فَحَسَرَ ثَوْبَهُ حَتَّى أَصَابَهُ مِنَ الْمَطَرِ، وَقَالَ: إِنَّهُ حَدِيْثُ عَهْدٍ بِرَبِّهِ. رَوَاهُ مُسْلِمٌ.

حضرت انس رضی اللہ عنہ ہی سے یہ حدیث بھی مروی ہے کہ ہم ایک دفعہ بارش کی لپیٹ میں آگئے اور رسول اللہ ﷺ ہمارے ساتھ تھے۔ آنجناب ﷺ نے اپنے بدن اطہر سے کپڑا اوپر اٹھایا کہ بارش آپؐ کے جسم اطیب پر پڑنے لگی اور ارشاد فرمایا کہ "یہ اپنے آقا و مالک کے ہاں سے نئے نئے تحفہ کی صورت میں آرہی ہے۔" (مسلم)

لغوی تشریح: ﴿ فحسر ثوبه ﴾ حضور ﷺ نے اپنے بدن مبارک سے کچھ کپڑا اٹھا لیا۔ ﴿ حتى اصابه من المطر ﴾ کہ بارش کے کچھ قطرے آپؐ کے جسم پر پڑ گئے۔ ﴿ حديث عهد بربه ﴾ اپنے مالک کے ارشاد کے مطابق نئی نئی نازل ہوئی ہے یا یہ معنی ہے کہ اپنے مالک کے ایجاد کرنے سے برسی ہے۔ یعنی بارش رحمت ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اسے ابھی ابھی نازل فرمایا ہے۔ لہٰذا اس کے ذریعہ سے برکت حاصل کی جائے۔

حاصل کلام: حدیث کا خلاصہ یہ ہے کہ یہ بارش عالم قدس سے نازل ہوئی ہے۔ ہنوز یہ ایسی حالت میں ہے کہ کسی گنہگار کا ہاتھ اسے نہیں لگا ہے اور نہ ابھی ایسے مقام تک پہنچی ہے جہاں لوگ گناہ میں ملوث ہوتے ہیں۔ نیز اس میں خیر اور برکت والی اشیاء سے تبرک حاصل کرنے کی جانب رغبت دلائی گئی ہے۔ بارش کے پانی میں نہانا مفید اور جائز ہے۔

(٤١١) وَعَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهَا، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ كَانَ إِذَا رَأَى الْمَطَرَ قَالَ: «**اللَّهُمَّ صَيِّباً نَافِعاً**». أَخْرَجَاهُ.

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ نبی ﷺ جب بارش کو دیکھتے تو اس طرح دعا مانگتے۔ "اے اللہ! اس بارش کو منافع بخش و سود مند بنا دے۔" (بخاری و مسلم)

لغوی تشریح: ﴿ صيبا ﴾ صاد پر فتحہ "یاء" کے نیچے کسرہ اور تشدید۔ بہت بارش۔ فعل مقدر کی وجہ سے منصوب واقع ہوا ہے یعنی اس بارش کو نفع بخش بنا دے۔ ﴿ اخرجاه ﴾ ان دونوں سے بخاری و مسلم مراد ہیں۔

(٤١٢) وَعَنْ سَعْدٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ دَعَا فِي الاسْتِسْقَاءِ: «**اللَّهُمَّ جَلِّلْنَا سَحَاباً كَثِيفاً، قَصِيفاً، دَلُوقاً، ضَحُوكاً،**

حضرت سعد رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی ﷺ نے دعاء استسقاء میں یہ دعا مانگی۔ "یا الٰہی! ہمیں ایسے بادل سے جو ساری زمین پر چھایا ہوا ہو' گہرا ہو' کڑکنے والا' زور سے برسنے والا' چمکنے گرجنے والا' تہ

تُمْطِرُنا مِنْهُ رُذَاذاً، قِطْقِطاً، سَحْلاً، يَا ذَا الجَلاَلِ وَالإِكْرَامِ». رَوَاهُ أَبُو عَوَانَةَ فِيْ صَحِيْحِهِ.

بہ تہ ہو' سے بارش کی باریک بوندیں بہت زیادہ برسا دے۔ اے بزرگی اور عزت کے مالک!" (مسند ابی عوانہ)

لغوی تشریح: ﴿ جللنا ﴾ تجلیل سے ماخوذ ہے۔ دعائیہ صیغہ ہے۔ معنی ہے کہ یہ بادل روئے زمین پر چھا جائے۔ ﴿ کشیفا ﴾ گاڑھا تہ بہ تہ ﴿ قصیفا ﴾ ایسا بادل جس کی کڑک شدید ہو۔ یہ زور دار بارش کا پیش خیمہ ہوتا ہے۔ دونوں لفظ فعیل کے وزن پر ہیں ﴿ دلوقا ﴾ دال پر فتحہ اور لام پر ضمہ زور سے برسنے والا۔ جیسے کہتے ہیں سیلاب لوگوں پر ٹوٹ پڑا۔ ﴿ ضحوکا ﴾ "ضاد" پر فتحہ اور "حاء" پر ضمہ ہے۔ چمکنے والا۔ جس میں بجلی ہو۔ ﴿ رذاذا ﴾ "راء" پر ضمہ۔ چھوٹے چھوٹے قطرے' باریک باریک بوندیں ﴿ قطقطا ﴾ دونوں "قاف" پر کسرہ اور پہلا "طاء" ساکن۔ باریک بوندیں حتیٰ کہ رائی کے دانوں کے برابر۔ ﴿ سحلا ﴾ سین پر فتحہ' جیم ساکن۔ زور دار بارش۔ مصدر ہے۔ بادل کی تعریف کی گئی ہے۔ مبالغہ کے طور پر موسلا دھار برسنے والا۔

حاصل کلام: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دعائے استسقاء کی کئی دعائیں مختلف الفاظ سے منقول ہیں۔ یہ دعا ان میں سے ایک ہے' جو دعا چاہے پڑھے۔

(٤١٣) وَعَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، أَنَّ رَسُولَ اللهِ ﷺ قَالَ: خَرَجَ سُلَيْمَانُ عَلَيْهِ السَّلاَمُ يَسْتَسْقِيْ، فَرَأَى نَمْلَةً مُسْتَلْقِيَةً عَلَى ظَهْرِهَا، رَافِعَةً قَوَائِمَهَا إِلَى السَّمَآءِ، تَقُولُ: اللَّهُمَّ إِنَّا خَلْقٌ مِنْ خَلْقِكَ، لَيْسَ بِنَا غِنًى عَنْ سُقْيَاكَ، فَقَالَ: «ارْجِعُوا فَقَدْ سُقِيتُمْ بِدَعْوَةِ غَيْرِكُمْ». رَوَاهُ أَحْمَدُ وَصَحَّحَهُ الحَاكِمُ.

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "حضرت سلیمان علیہ السلام بارش طلب کرنے کیلئے باہر نکلے تو انہوں نے ایک چیونٹی کو پشت کے بل ٹانگیں آسمان کی جانب اٹھائے ہوئے دیکھا جو بارگاہ رب العزت میں عرض کر رہی تھی۔ الٰہی ہم تیری مخلوق ہیں تیری دوسری مخلوق کی طرح۔ ہم بھی تیری بارش سے بے نیاز و مستغنی نہیں ہیں۔ یہ سن کر حضرت سلیمان علیہ السلام نے فرمایا چلو واپس چلیں تمہیں بارش سے سیراب کر دیا گیا' غیروں کی دعا کی بدولت۔ (اسے احمد نے روایت کیا ہے اور حاکم نے صحیح قرار دیا ہے۔)

لغوی تشریح: ﴿ مستلقیۃ علی ظھرھا ﴾ اپنی گدی پر اوندھی لیٹی ہوئی تھی ﴿ قوائمھا ﴾ قائمۃ کی جمع ہے۔ پاؤں کے معنی میں۔ ﴿ خلق ﴾ "خاء" پر فتحہ اور لام ساکن۔ اس کی مخلوقات میں سے ایک مخلوق۔ ﴿ سقیاک ﴾ سین پر ضمہ اور "قاف" ساکن۔ تیری بارش ﴿ سقیتم ﴾ صیغہ

مجہول۔ بارش کے ساتھ سیراب کر دیئے گئے تم لوگ۔

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوا' کہ سابقہ پیغمبر بھی بارش کی بندش کے موقع پر شہر سے باہر نکل کر بارش طلب کرنے جاتے تھے۔ چھوٹی مخلوق کے ذریعہ انسان کو بارش سے سیراب کیا جاتا ہے۔ لہٰذا دعاء استسقاء یا نماز استسقاء آبادی سے باہر ہی کرنی چاہئے۔ اس طرح آبادی کی گہما گہمی' ہنگامہ خیزی اور شور و شغف سے دور توجہ زیادہ ہو جاتی ہے۔

(٤١٤) وَعَنْ أَنَسٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ اَسْتَسْقَى فَأَشَارَ بِظَهْرِ كَفَّيْهِ إِلَى السَّمَاءِ. أَخرَجَهُ مُسْلِمٌ.

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی ﷺ نے بارش کیلئے دعا فرمائی تو اپنے دونوں ہاتھ الٹی حالت میں آسمان کی طرف اٹھا کر ارشاد فرمایا۔ (مسلم)

لغوی تشریح: ﴿ اشار بظهر كفيه الى السماء ﴾ ہاتھوں کی پشت چہرے کی طرف کی۔ یہ صورت معمول کے مطابق دعا مانگنے کی صورت کے برعکس ہے۔ جب کسی ضرر کو دور کرنا مطلوب و مقصود ہو تو اس طرح دعا کرتے ہیں۔

حاصل کلام: اس حدیث میں الٹے ہاتھوں دعا مانگنے کا ذکر ہے حالانکہ عموماً آپؐ سیدھے ہاتھوں سے دعا کرتے تھے۔ ان دونوں میں علماء نے یہ تطبیق دی ہے کہ رحمت کی طلب کرنے کیلئے سیدھے ہاتھوں سے دعا کرنی چاہئے اور ضرر و مصیبت کو دور کرنے کیلئے دعا مانگی جائے تو الٹے ہاتھوں سے کی جائے۔ اس سے تفاءل مراد ہوتا ہے کہ حالت کو اس طرح تبدیل فرما دے۔ دعائے استسقاء کے وقت چادر کو الٹانے اور پھیرنے میں بھی غالباً یہی حکمت کارفرما ہے اور ہتھیلیوں کے نیچے کرنے میں بھی یہی حکمت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بادلوں کے منہ بھی نیچے کر دیئے تاکہ بارش خوب برسے اور خشک سالی کو سرسبزی سے بدل دیا۔

١٧ - بَابُ اللِّبَاسِ

لباس کا بیان

(٤١٥) عَنْ أَبِيْ عَامِرٍ الأَشْعَرِيِّ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «لَيَكُونَنَّ مِنْ أُمَّتِي أَقْوَامٌ يَسْتَحِلُّونَ الْحِرَ وَالْحَرِيرَ». رَوَاهُ أَبُو دَاوُدَ، وَأَصْلُه فِي الْبُخَارِيِّ.

حضرت ابوعامر اشعری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "میری امت میں لازماً کچھ ایسی قومیں ہوں گی جو (زنا) اور ریشم کو حلال سمجھیں گی۔" (اسے ابوداؤد نے روایت کیا ہے اور اس کی اصل بخاری میں ہے)

لغوی تشریح: ﴿ باب اللباس ﴾ لباس جو حرام اور حلال ہیں' ان کا بیان ہے۔ اور کتاب الصلوٰۃ میں اس کا ذکر اس لیے کر دیا ہے کہ نماز کے ساتھ اس کا بڑا گہرا تعلق ہے۔ ﴿ الحر ﴾ شیخ احمد محمد شاکر نے "الباعث الحثیث ص ٣٤" پر لکھا ہے کہ "حر" "حا" کے نیچے کسرہ اور "را" ساکن کی صورت میں

زنا کے معنی میں مستعمل ہے۔ یعنی یہ لوگ زنا کو حلال قرار دیں گے۔ یہ صحیح روایت بخاری وغیرہ کے تمام نسخوں میں موجود ہے۔ بعض نے یہ لفظ ﴿ خز ﴾ "خاء" اور "زاء" کے ساتھ بھی نقل کیا ہے۔ جس سے مراد ریشم ہے۔ مگر یہ دراصل حر سے تخفیف ہے۔ جیسا کہ حافظ ابوبکر بن عربی نے کہا ہے' ملاحظہ ہو: (فتح الباری ج: ۱۰' ص: ۴۵'۴۵'۴۹)۔ ﴿ الحریر ﴾ ریشم کی تمام اقسام کیلئے حریر کا لفظ مستعمل ہے۔

حاصل کلام: اس حدیث میں دو چیزیں حرام کی گئی ہیں ایک ریشم کا پہننا دوسرا زنا و بدکاری کرنا۔ ریشم کا لباس زیب تن کرنا انسان کے اندر رعونت اور کبر و نخوت پیدا کرتا ہے۔ اور یہ متکبرین کا لباس ہے۔ اسی لئے اسے امت پر حرام قرار دیا گیا ہے۔ نیز یہ زینت و لطافت کا لباس ہے جو مردوں کے برعکس عورت کا لباس شمار ہوتا ہے اور مردوں کیلئے عورتوں کی مشابہت اختیار کرنا حرام ہے۔ بخاری میں اس کی اصل ہے' جس کا مطلب یہ ہے کہ بخاری نے اسے معلق روایت کیا ہے۔ معلق بایں طور کہ عبدالرحمٰن جو اس کے راوی ہیں کو شک و تردد ہے کہ انہوں نے یہ حدیث ابوعامر رضی اللہ عنہ سے سنی ہے یا ابومالک سے۔

راوی حدیث: ﴿ ابوعامر اشعری رضی اللہ عنہ ﴾ ان کا نام عبداللہ بن ھانی یا عبید بن وھب رضی اللہ عنہ ہے۔ شرف صحابیت سے مشرف ہیں۔ شام میں سکونت اختیار کی۔ اموی خلیفہ عبدالملک بن مروان کے دور خلافت میں وفات پائی۔

(٤١٦) وَعَنْ حُذَيْفَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: نَهَى رَسُولُ اللهِ ﷺ أَنْ نَشْرَبَ فِي آنِيَةِ الذَّهَبِ وَالفِضَّةِ، وَأَنْ نَأْكُلَ فِيهَا، وَعَنْ لُبْسِ الحَرِيْرِ وَالدِّيْبَاجِ، وَأَنْ نَجْلِسَ عَلَيْهِ. رَوَاهُ البُخَارِيُّ.

حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں سونے چاندی کے برتنوں میں کھانے پینے' باریک اور گاڑھا ریشم پہننے اور ان پر بیٹھنے سے منع فرمایا ہے۔ (بخاری)

لغوی تشریح: ﴿ دیباج ﴾ گاڑھے ریشم کا ساختہ کپڑا۔ یہاں خاص کا عام پر عطف ہے۔

(٤١٧) وَعَنْ عُمَرَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: نَهَى رَسُولُ اللهِ ﷺ عَنْ لُبْسِ الحَرِيْرِ، إِلاَّ مَوْضِعَ أُصْبُعَيْنِ أَوْ ثَلاَثٍ أَوْ أَرْبَعٍ. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ، وَاللَّفْظُ لِمُسْلِمٍ.

حضرت عمر رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ریشم پہننے سے منع فرمایا۔ سوائے دو یا تین یا چار انگشت۔ (بخاری و مسلم۔ اور متن حدیث کے الفاظ مسلم کے ہیں)

حاصل کلام: مردوں کیلئے ریشم پہننا شرعی طور پر حرام ہے البتہ خارش وغیرہ عذر کی صورت میں وقتی اجازت ہے۔ اس کے علاوہ دو' چار انگشت کے برابر اگر کسی کپڑے پر ریشم لگا ہوا ہو تو اس کی گنجائش ہے۔

(٤١٨) وَعَنْ أَنَسٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ رَخَّصَ

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے دوران سفر عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ اور زبیر بن

لِعَبْدِ الرَّحْمٰنِ بْنِ عَوْفٍ وَالزُّبَيْرِ فِي قَمِيْصِ الحَرِيْرِ، فِي سَفَرٍ، مِنْ حِكَّةٍ كَانَتْ بِهِمَا . مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

عوام رضی اللہ عنہ کو ریشمی قمیص پہننے کی اجازت مرحمت فرمائی۔ اس وجہ سے کہ ان کو خارش تھی۔ (بخاری و مسلم)

لغوی تشریح: ﴿ فی سفر ﴾ غزوہ کیلئے جاتے ہوئے دوران سفر میں من حکہ خارش کی وجہ سے "حا" کے نیچے کسرہ اور کاف پر تشدید۔ خارش کی ایک قسم۔ ایک دوسری روایت میں ہے کہ انہوں نے جوؤں کی شکایت کی تھی تو آپ ؐ نے ریشم زیب تن کرنے کی اجازت عنایت فرما دی اور یہ بھی ممکن ہے کہ خارش جوؤں کی وجہ سے ہی ہوتی ہو۔ ان کو ریشم کی رخصت اس لئے دی کہ ریشم میں نرمی اور گداز پن ہوتا ہے جو خارش کی تکلیف میں کمی کا باعث ہے نیز اس کپڑے میں جوئیں بھی کم ہی پڑتی ہیں۔ گویا دفع ضرر کی حد تک ریشم کی اجازت ہے۔

راوی حدیث: ﴿ زبیر رضی اللہ عنہ ﴾ یہ زبیر بن عوام بن خویلد بن اسد قرشی اسدی۔ رسول اللہ ﷺ کے قریبی ساتھی' آپ ؐ کی پھوپھی صفیہ کے لخت جگر اور عشرہ مبشرہ میں سے تھے۔ غزوات میں اسلام کی جری اور بہادروں میں شمار ہونا۔ جنگ جمل سے واپسی کے بعد ۳۶ھ کو فوت ہوئے۔

(٤١٩) وَعَنْ عَلِيِّ بْنِ أَبِيْ طَالِبٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: كَسَانِي النَّبِيُّ ﷺ حُلَّةَ سِيَرَاءَ، فَخَرَجْتُ فِيْهَا، فَرَأَيْتُ الغَضَبَ فِيْ وَجْهِهِ، فَشَقَقْتُهَا بَيْنَ نِسَائِيْ . مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ، وَهٰذَا لَفْظُ مُسْلِمٍ.

حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی ﷺ نے مجھے سیراء کا پٹے دار' ریشمی جوڑا عنایت فرمایا۔ میں اسے پہن کر باہر نکلا تو میں نے حضور ﷺ کے رخ انور پر غصہ اور ناراضگی کے آثار دیکھے تو میں نے اسے ٹکڑے ٹکڑے کر کے اپنی گھریلو خواتین میں تقسیم کر دیا۔ (بخاری و مسلم۔ متن حدیث کے یہ الفاظ مسلم کے ہیں)

لغوی تشریح: ﴿ کسانی ﴾ مجھے پہنایا یعنی عنایت فرمایا ﴿ حلۃ ﴾ "حاء" پر ضمہ اور لام پر تشدید۔ نیا کپڑا' نیا لباس۔ حلۃ دراصل ایک رنگ کے دونوں کپڑے ازار (تہبند) اور چادر کو کہتے ہیں۔ جو سارے بدن کو ڈھانپ لے۔ ﴿ سیراء ﴾ نصب کی صورت میں حلۃ کی صفت ہے اور جر کی صورت میں حلۃ کی جانب مضاف۔ اور سیراء کی سین کے نیچے کسرہ اور "یاء" پر فتحہ۔ چادر جس میں دھاریاں ہوں یا جس میں ریشم استعمال ہوا ہو۔ فخرجت فیھا" میں اسے پہن کر باہر نکلا۔ ﴿ فرایت الغضب فی وجھہ ﴾ میں نے آپ ؐ کے رخ انور پر غصہ و ناراضگی کے آثار دیکھے اس لئے کہ یہ حلۃ ریشم ساختہ تھا۔ ﴿ فشققتھا ﴾ ٹکڑے ٹکڑے کر کے تقسیم کر دیا یا بانٹ دیا۔ ﴿ بین نسائی ﴾ اپنے گھر کی خواتین میں ایک قول کے مطابق اس سے مراد ان کی اہلیہ' والدہ' چچا زاد بہن اور بھاوج ہیں (عقیل کی بیوی) ان میں سے ہر ایک کا نام فاطمہ تھا۔ یعنی (فاطمہ بنت محمد' فاطمہ بنت اسد' فاطمہ بنت حمزہ اور فاطمہ زوجہ عقیل

رضی اللہ عنھن)

حاصل کلام: نبی ﷺ کو یہ حلہ تحفہ کے طور پر وصول ہوا تھا۔ آپؐ نے یہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو دے دیا۔ جسے حضرت علی رضی اللہ عنہ نے زیب تن فرمایا مگر آنحضرت ﷺ نے اس پر اظہار ناراضی فرمایا۔ صحیح مسلم میں ہے کہ آپؐ نے فرمایا "میں نے تمہیں پہننے کیلئے نہیں دیا تھا بلکہ اس لئے دیا تھا کہ گھر کی عورتیں پہن لیں۔" چنانچہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ٹکڑے ٹکڑے کر کے خواتین میں تقسیم کر دیا۔ اس سے ثابت ہوا کہ ہدیہ اور تحفہ قبول کرنا مسنون ہے، خواہ اس کا استعمال مرد کیلئے جائز نہ ہو۔

(٤٢٠) وَعَنْ أَبِيْ مُوسَى رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، أَنَّ رَسُولَ اللهِ ﷺ قَالَ: «أُحِلَّ الذَّهَبُ وَالحَرِيرُ لِإِنَاثِ أُمَّتِي. وَحُرِّمَ عَلَى ذُكُورِهِمْ». رَوَاهُ أَحْمَدُ وَالنَّسَائِيُّ وَالتِّرْمِذِيُّ وَصَحَّحَهُ.

حضرت ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "سونا اور ریشم میری امت کی عورتوں کیلئے حلال کر دیا گیا ہے اور ان کے مردوں پر حرام۔" (اسے احمد، نسائی اور ترمذی نے روایت کیا ہے اور ترمذی نے اسے صحیح بھی قرار دیا ہے)

حاصل کلام: اس سے معلوم ہوا کہ عورتوں کیلئے سونا پہننا بصورت زیور و لباس جائز ہے مگر ترغیب نہیں، اسی طرح خواتین کو ریشم کے استعمال کی بھی اجازت ہے۔

(٤٢١) وَعنْ عِمْرَانَ بْنِ حُصَيْنٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُما، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ قَالَ: «إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ إِذَا أَنْعَمَ عَلَى عَبْدِهِ نِعْمَةً، أَنْ يَرَى أَثَرَ نِعْمَتِهِ عَلَيْهِ». رَوَاهُ البَيْهَقِيُّ.

حضرت عمران بن حصین رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا "اللہ تعالیٰ کو یہ پسند و محبوب ہے کہ جب وہ اپنے کسی بندے پر انعام فرمائے تو اس نعمت کا اثر اس پر دیکھا جائے۔" (بیہقی)

حاصل کلام: اس سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ نعمتوں کا اظہار ہونا چاہئے۔ اپنی حیثیت و استطاعت کے مطابق کھانا پینا اور اچھا لباس پہننا تقویٰ کے خلاف نہیں۔ بہترین سواری بھی تکبر میں شمار نہیں بشرطیکہ آدمی دوسروں کو حقیر نہ سمجھے۔

(٤٢٢) وَعَنْ عَلِيٍّ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، أَنَّ رَسُولَ اللهِ ﷺ نَهَى عَنْ لُبْسِ القَسِّيِّ وَالمُعَصْفَرِ. رَوَاهُ مُسْلِمٌ.

حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی ﷺ نے قس (شہر کا نام) کے ساختہ کپڑے اور زرد رنگ کے کپڑے پہننے سے منع فرمایا ہے۔ (مسلم)

لغوی تشریح: ﴿القسی﴾ قاف پر فتحہ سین کے نیچے کسرہ اور اوپر تشدید اس کے بعد یائے نسبتی ہے۔ قس کی طرف منسوب ہے۔ بلاد مصر میں سے ایک جگہ کا نام جو ساحل سمندر پر تنیس کے قریب واقع ہے، یہ ایسا کپڑا تھا جس میں ریشم کی دھاریاں ہوتی تھیں اور مقام قس میں تیار کیا جاتا تھا اور ایک قول یہ

بھی ہے کہ یہ "قز" کی طرف منسوب ہے اور یہ ریشم کا بیکار' بچا کھچا مواد ہوتا ہے۔ "زا" اور سین کے قریب المخرج ہونے کی وجہ سے "زا" کو سین میں تبدیل کر دیا اور اس قز سے قس بن گیا۔ ﴿ والمعصفر ﴾ رباعی سے اسم مفعول کا صیغہ ہے۔ عصفر سے رنگا ہوا۔ عصفر ہندی زبان میں کسنبہ کو کہتے ہیں۔ اس کا رنگ سرخی اور زردی کے بین بین ہوتا ہے۔ ہندو کاہن' سادھو اور جوگی لوگ پہنتے ہیں۔ ممکن ہے کہ نبی ﷺ کے زمانہ کے کاہنوں کا بھی یہی لباس ہو۔ اسی بنا پر یہ رنگ پہننے کی ممانعت کی گئی ہے۔ (واللہ اعلم)

(٤٢٣) وَعَنْ عَبْدِ اللهِ بْنِ عَمْرٍو رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا قَالَ: رَأَى عَلَيَّ النَّبِيُّ ﷺ ثَوْبَيْنِ مُعَصْفَرَيْنِ، فَقَالَ: «أُمُّكَ أَمَرَتْكَ بِهٰذَا؟». رَوَاهُ مُسْلِمٌ.

حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ نبی ﷺ نے میرے جسم پر زرد رنگ کے دو کپڑے دیکھے تو فرمایا "کیا تیری والدہ نے یہ پہننے کا حکم دیا ہے؟" (مسلم)

لغوی تشریح: ﴿ رای علی ﴾ علی حرف جر ہے "یاء" پر تشدید "یاء" متکلم مجرور۔ ﴿ امک امرتک؟ ﴾ امر سے صیغہ غائب ہے۔ آپ نے ایسا شدید ناپسندیگی کے اظہار کے طور پر فرمایا۔

حاصل کلام: تیری ماں نے تجھے پہنایا ہے کیا؟ یعنی یہ رنگ تو خواتین پہنتی ہیں اس لئے تیری ماں نے تجھے پہنا دیا۔ یہ غالباً حضور ﷺ نے بطور تنبیہہ اور زجر و توبیخ ارشاد فرمایا۔ صحیح مسلم میں ہے کہ عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما نے عرض کیا یارسول اللہ (ﷺ)! میں اسے دھو ڈالوں؟ تو فرمایا "نہیں جلا کر خاکستر کر دو۔"

(٤٢٤) وَعَنْ أَسْمَاءَ بِنْتِ أَبِي بَكْرٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا، أَنَّهَا أَخْرَجَتْ جُبَّةَ رَسُولِ اللهِ ﷺ، مَكْفُوفَةَ الْجَيْبِ وَالْكُمَّيْنِ وَالْفَرْجَيْنِ بِالدِّيْبَاجِ. رَوَاهُ أَبُو دَاوُدَ، وَأَصْلُه فِي مُسْلِمٍ، وَزَادَ: كَانَتْ عِنْدَ عَائِشَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهَا حَتَّى قُبِضَتْ، فَقَبَضْتُهَا، وَكَانَ النَّبِيُّ ﷺ يَلْبَسُهَا، فَنَحْنُ نَغْسِلُهَا لِلْمَرْضَى، نَسْتَشْفِي بِهَا. وَزَادَ الْبُخَارِيُّ فِي الْأَدَبِ الْمُفْرَدِ: وَكَانَ يَلْبَسُها لِلْوَفْدِ وَالْجُمُعَةِ.

حضرت اسماء بنت ابی بکر رضی اللہ عنہما نے نبی ﷺ کا ایک چوغہ نکالا جس کی آستینوں' گریبان اور چاک پر دبیز ریشم کا حاشیہ تھا۔ (اسے ابوداؤد نے روایت کیا ہے اور اس کی اصل مسلم میں ہے۔) مسلم نے اتنا اضافہ نقل کیا ہے کہ وہ جبہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی تحویل میں تھا کہ وہ وفات پا گئیں تو میں نے اسے اپنے قبضہ میں لے لیا۔ نبی کریم ﷺ اسے زیب تن فرمایا کرتے تھے اور اسے دھو کر مریضوں کو پلاتے تھے اور شفاء طلب کرتے تھے اور بخاری نے الادب المفرد میں یہ اضافہ کیا ہے کہ حضور ﷺ اسے وفود کی آمد پر اور نماز جمعہ کیلئے پہنتے تھے۔

لغوی تشریح: ﴿ مکفوفة ﴾ منصوب ہے اور حال واقع ہو رہا ہے۔ ﴿ مکفوف ﴾ کا مطلب ہے ایسا کپڑا جس کے اطراف و جوانب میں دوسرے کپڑے کا نشان ہوتا تھا۔ ﴿ الجیب ﴾ جیم پر فتحہ اور یا ساکن۔ قمیص وغیرہ کا وہ حصہ جو گردن کے گرد ہوتا ہے۔ ﴿ والکمین ﴾ کاف پر ضمہ اور میم پر تشدید کم کا تثنیہ ہے قمیص کے اس حصہ کو کہتے ہیں جس میں سے ہاتھ داخل اور خارج ہوتا ہے۔ ﴿ والفرجین ﴾ فا پر فتحہ را ساکن فرج کا تثنیہ دراصل یہ کپڑے کا وہ حصہ ہے جو حلق سے شروع ہوتا ہے اور سینے تک جاتا ہے بسا اوقات وہ نیچے تک بھی چلا جاتا ہے۔ مگر پھر اس کا اطلاق سینے پر ملنے والے دونوں اطراف پر ہوتا ہے۔ ﴿ دیباج ﴾ دبیز و گاڑھا ریشم۔ فارسی کلمہ کو معرب بنایا گیا۔ ﴿ حتی قبضت ﴾ صیغہ مجہول۔ یعنی وفات پاگئیں۔ ﴿ فقبضتها ﴾ تو میں نے اس جبہ کو اپنے قبضہ میں لے لیا۔ ﴿ نستشفی بها ﴾ صیغہ معروف متکلم ہے۔ اور ایک نسخہ میں یستشفی صیغہ مجہول بھی ہے یعنی اس کی برکت سے شفا طلب کی جاتی تھی۔ ﴿ للوفد ﴾ واو پر فتحہ اور فا ساکن۔ معزز لوگوں کی جماعت جو امیر اور معزز آدمی کی خدمت میں حاضر ہوتے ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وفود کی آمد پر ان کے استقبال اور مجمعوں کے مواقع پر زینت و زیبائش کیلئے اچھا اور مخصوص قسم کا لباس پہننا مندوب ہے۔ چار انگشت کے مساوی ریشم کی رخصت کا معنی یہ ہے کہ یہ ریشم کے کپڑے کے عرض میں لگا ہوا (طول میں نہیں) اور آستینوں، گریبانوں اور چاک پر ان کے طول کے حساب سے جائز ہے۔

حاصل کلام: اس حدیث سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ سربراہ مملکت، امیر اور صاحب منصب و مرتبہ خطیب و امام اور دیگر معزز لوگوں اور وفود کی آمد اور جمعہ و جماعت اور دیگر خاص مجمعوں کیلئے عام معمول سے ہٹ کر اچھا لباس رکھنا جائز ہے اور عمدہ اور اچھا صاف ستھرا لباس زیب تن کر کے باہر نکلنا چاہئے۔ بشرطیکہ حدود شرعیہ سے تجاوز نہ کر جائے۔ فخر و ریا اور کبر و نخوت اور شان نمائی نہ ہو۔ ممنوع لباس سے پرہیز و اجتناب کیا گیا ہو۔

٣۔ كِتَابُ الْجَنَائِزِ

جنازے کے مسائل

(٤٢٥) عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «أَكْثِرُوا ذِكْرَ هَاذِمِ اللَّذَّاتِ: الْمَوْتِ». رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ وَالنَّسَائِيُّ، وَصَحَّحَهُ ابْنُ حِبَّانَ.

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "لذتوں کو توڑ دینے' کاٹ دینے والی کا ذکر کثرت سے کیا کرو (یعنی موت کا)" (اسے ترمذی اور نسائی نے روایت کیا ہے اور ابن حبان نے صحیح قرار دیا ہے)

لغوی تشریح: ﴿ کتاب الجنائز ﴾ جیم پر فتحہ۔ جنازہ کی جمع ہے۔ جنازہ کی جیم پر فتحہ اور کسرہ دونوں اعراب ہیں مگر کسرہ زیادہ فصیح ہے۔ چارپائی پر رکھی ہوئی میت اور ایک قول کے مطابق جیم پر فتحہ ہے اس صورت میں اس کا معنی میت کے ہیں اور کسرہ کی صورت میں اس چارپائی کو کہیں گے جس پر میت پڑی ہو اور ایک قول اس کے برعکس بھی ہے یعنی فتحہ کی صورت میں میت والی چارپائی اور کسرہ کی صورت میں میت "کتاب الصلوٰۃ" کے معاً بعد کتاب الجنائز لانے سے مقصود یہ ہے کہ میت کی تجہیز و تکفین کے جملہ امور و افعال میں نماز جنازہ زیادہ اہم ہے۔ لہٰذا اس طرح دونوں میں قریبی مناسبت اور تعلق کی وجہ سے کتاب الصلوٰۃ کے بعد کتاب الجنائز کو رکھا ہے۔ ایک قول کے مطابق جنازہ کی مشروعیت ا ہجری میں ہوئی۔

﴿ اکثروا ﴾ اکثار سے امر کا صیغہ ہے۔ زیادہ کرو ﴿ هاذم ﴾ مضاف ہونے کی بنا پر مجرور ہے اور "لذات" کی طرف مضاف ہے۔ "ذال" کے ساتھ ہونے کی صورت میں اس کا معنی کاٹ ڈالنے والی' توڑ دینے والی۔ اس سے مراد موت ہے۔ جب موت کسی پر وارد ہوتی ہے تو دنیوی لذتوں میں سے کوئی چیز باقی نہیں چھوڑتی' سب ختم ہو جاتی ہیں اور آدمی کو دنیا سے بے رغبت کر دیتی ہے اور ایک روایت میں هادم بھی منقول ہے جو ﴿ هدم البناء والجدار ﴾ کے محاورہ سے ہے جس کے معنی یہ ہوں گے کہ موت کو اکثر یاد رکھو جو دنیوی لذتوں کی عمارت کو منہدم کر دینے والی ہے۔ موت جب وارد ہوتی ہے تو لذات دنیوی کی تعمیر شدہ عمارت دھڑام سے زمین پر آ رہتی ہے۔ ﴿ الموت ﴾ جر (کسرہ) کی صورت میں عطف

بیان ہوگا اور رفعی صورت میں مبتداء محذوف کی خبر جو "ھو" ہو سکتا ہے اور نصب کی صورت میں "اعنی" کو مقدر تسلیم کرنا ہوگا اس صورت میں وہ ھاذم کا بیان ہوگا۔

حاصل کلام: موت ایک ایسی حقیقت ہے جس کا ابتدائے آفرنیش سے روز ابد تک کوئی منکر نہیں۔ یہ انسانوں کی مشاہدہ میں آنے والی چیز ہے کہ روزمرہ آنکھوں کے سامنے ہر ایک کے اعزاء و اقرباء' احباب و رفقاء میں سے کوئی نہ کوئی موت کا جام پیتا ہے' سب اس وقت بے بس ہوتے ہیں۔ ایسے موقع پر قدرتی طور پر دلوں میں نرمی' خوف' محاسبۂ اعمال' قیامت کے ہولناک مناظر آنکھوں کے سامنے گھوم جاتے ہیں جس سے طبیعت میں قیامت کی تیاری کا داعیہ پیدا ہوتا ہے اور انسان نیک اعمال کی طرف مائل ہو جاتا ہے۔ اسی لئے موت کو ہمیشہ یاد رکھنے کا حکم ہے۔

(٤٢٦) وَعَنْ أَنَسٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «لاَ يَتَمَنَّيَنَّ أَحَدُكُمُ المَوْتَ لِضُرٍّ نَزَلَ بِهِ، فَإِنْ كَانَ لا بُدَّ مُتَمَنِّياً، فَلْيَقُلِ: اللَّهُمَّ أَحْيِنِي مَا كَانَتِ الحَيَاةُ خَيْراً لِّي، وَتَوَفَّنِي مَا كَانَتِ الوَفَاةُ خَيْراً لِّي». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "تم میں سے کسی کو اس مصیبت و تکلیف کی وجہ سے جو اس پر نازل ہوئی ہو موت کی تمنا و خواہش ہرگز نہیں کرنی چاہئے اور اگر اس کی تمنا ضروری ہو تو پھر اس طرح کہنا چاہئے اے اللہ! جب تک جینا میرے لئے بہتر ہو اس وقت تک مجھے زندگی عطا فرما اور جب موت میرے لئے بہتر ہو تو مجھے وفات دے دے۔" (بخاری و مسلم)

لغوی تشریح: ﴿ لايتمنين ﴾ "تمنی" سے ماخوذ ہے۔ اس میں نون ثقیلہ تاکید کیلئے ہے اور نہی کا صیغہ ہے۔ "لضر" ضاد پر ضمہ اور کبھی فتحہ بھی آجاتا ہے۔ میرے جانی اور مالی نقصان اور ضرر کی وجہ سے ﴿ لابد ﴾ "با" پر ضمہ اور دال پر تشدید۔ ضروری اور لازمی طور پر۔ ﴿ احینی ﴾ همزہ اس میں قطعی ہے یعنی باب افعال کا ہے۔ معنی ہے مجھے زندگی عطا فرما ﴿ توفنی ﴾ مجھے وفات دے۔ یہ حدیث دنیوی مصائب و آلام اور رشتوں سے تنگ آکر موت کی تمنا و خواہش کرنے کو مکروہ قرار دیتی ہے کیونکہ یہ عدم رضا بالقضا کی خبر دیتی ہے اور شہادت فی سبیل اللہ کی خواہش اور دین کے بارے میں خوف کی وجہ سے موت کی تمنا کرنا مکروہ و ناپسندیدہ نہیں ہے۔

حاصل کلام: ایک سچے پکے مومن کیلئے زندگی اللہ تعالیٰ کی بڑی نعمت ہے۔ ارشاد نبوی ﷺ ہے کہ صالح آدمی زندگی کی صورت میں اپنے نیک اعمال اور صالح افعال میں اضافہ ہی کرے گا اور سابقہ گناہوں سے اسے تائب ہونے کا موقع نصیب ہوگا۔ اگر آدمی برا ہے' بدکردار' بداعمال ہے تو اسے موقع غنیمت ملے گا کہ توبہ کر لے اور راہ راست پر گامزن ہو کر اپنی اخروی زندگی سدھار لے۔ اس لئے دنیوی مصائب و آلام' مفلسی' غربت' بیماری وغیرہ سے تنگ آکر موت کی آرزو نہ کرے۔ البتہ رب کائنات سے

ملاقات کے شوق میں موت کی آرزو کمال ایمان کی نشانی اور علامت ہے۔ اگر دین کے بارے میں کسی فتنہ اور آزمائش کا اندیشہ ہو تو اس صورت میں بھی موت و آرزو کی تمنا کی جا سکتی ہے۔ دنیوی مشکلات و تکالیف تو مومن کو اونچا اڑانے کا باعث ہیں ؎
یہ تو چلتی ہے تجھے اونچا اڑانے کے لئے۔

(٤٢٧) وَعَنْ بُرَيْدَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ: «الْمُؤْمِنُ يَمُوتُ بِعَرَقِ الْجَبِينِ». رَوَاهُ الثَّلاثَةُ، وَصَحَّحَهُ ابْنُ حِبَّانَ.

حضرت بریدہ رضی اللہ عنہ نے نبی ﷺ سے بیان کیا کہ آپ نے فرمایا "مومن کی موت کے وقت اس کی پیشانی پر پسینہ رونما ہو جاتا ہے۔" (اس روایت کو تینوں (ترمذی، نسائی اور ابن ماجہ) نے روایت کیا ہے اور ابن حبان نے اسے صحیح قرار دیا ہے۔)

لغوی تشریح: ﴿ بعرق الجبین ﴾ "عرق" پسینہ۔ اس پانی کو کہتے ہیں جو محنت و مشقت یا گرمی و حرارت کی وجہ سے جسم سے خارج ہوتا ہے۔ ایک قول اس کے متعلق یہ ہے کہ یہ وہ پانی ہوتا ہے جو مومن کے گناہوں کی تطہیر کیلئے موت کے وقت اس کی پیشانی پر رونما ہوتا ہے اور ایک قول یہ بھی ہے کہ طلب حلال، صوم و صلاۃ کی ادائیگی، احکام شرعیہ پر محافظت کے سلسلہ میں جو محنت و مشقت اور کد و کاوش کرنی پڑتی ہے تاآنکہ موت واقع ہو جاتی ہے۔

(٤٢٨) وَعَنْ أَبِي سَعِيدٍ وَأَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا قَالاَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «لَقِّنُوا مَوْتَاكُمْ لاَ إِلَهَ إِلاَّ اللَّهُ». رَوَاهُ مُسْلِمٌ وَالأَرْبَعَةُ.

حضرت ابوسعید رضی اللہ عنہ اور حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "قریب المرگ آدمی کو "لا الٰہ الا اللہ" کی تلقین کرو۔" (اسے مسلم اور چاروں (ابوداؤد، ترمذی، نسائی اور ابن ماجہ) نے روایت کیا ہے)

لغوی تشریح: ﴿ لقنوا ﴾ تلقین سے ماخوذ امر کا صیغہ ہے معنی ہیں یاددہانی کراؤ۔ ﴿ موتاکم ﴾ میت کی جمع ہے۔ جب مرنے والے کا وقت قریب ہو تو اس کو سناتے ہوئے اس کے پاس پڑھا جائے، تاکہ وہ اسے سنے اور سمجھے اور پھر خود بھی پڑھے۔

حاصل کلام: اس حدیث میں گو صرف لا الٰہ الا اللہ کی تلقین کا ذکر ہے مگر اس سے مراد پورا کلمہ ہے کہ یوں مرنے والا توحید و رسالت دونوں کا اقرار کر لیتا ہے۔ قریب المرگ آدمی کے پاس بیٹھے ہوئے لوگ بھی اسے پڑھیں اور جب مرنے والے کے حواس قدرے ٹھیک ہوں تو اسے بھی پڑھنے کی تلقین کرنی چاہئے۔ نہ تو اسے مرنے والے ہی کو تلقین کرنے پر منحصر کیا جانا چاہئے اور نہ اعزاء و اقرباء اور قریب بیٹھے ہوئے لوگوں پر۔ نبی ﷺ نے خود ایک قریب المرگ آدمی کو لا الٰہ الا اللہ پڑھنے کیلئے فرمایا تھا۔ (مسند احمد) جس سے معلوم ہوا کہ مرنے والے کو بھی پڑھنے کیلئے کہا جا سکتا ہے۔

(٤٢٩) وَعَنْ مَعْقِلِ بْنِ يَسَارٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ قَالَ: «اقْرَءُوا عَلَى مَوْتَاكُمْ يس». رَوَاهُ أَبُو دَاوُدَ وَالنَّسَائِيُّ، وَصَحَّحَهُ ابْنُ حِبَّانَ.

حضرت معقل بن یسار رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا "اپنے مرنے والوں کے قریب سورۂ یٰس پڑھا کرو۔" (اسے ابوداؤد' نسائی نے روایت کیا ہے اور ابن حبان نے اسے صحیح قرار دیا ہے)

لغوی تشریح: ﴿ اقرءوا ﴾ امر کا صیغہ ہے۔ جس کا معنی ہے پڑھو' پڑھا کرو ﴿ علی موتاکم ﴾ جس کی موت کا وقت حاضر ہو رہا ہے۔ کہا گیا ہے کہ جس کی موت کا وقت قریب ہو اس کے پاس سورۂ یاسین پڑھنے سے میت سے جان کنی کی تکلیف میں تخفیف کر دی جاتی ہے مگر یہ حدیث صحیح نہیں ہے۔ تاہم امت کی اکثریت کا اس پر عمل ہے۔

راوی حدیث: ﴿ معقل بن یسار رضی اللہ عنہ ﴾ معقل میں میم پر فتح' "عین" پر سکون اور "قاف" پر کرہ ہے۔ مزینہ قبیلہ کے صحابی تھے۔ حدیبیہ سے پہلے اسلام قبول کیا۔ بیعت رضوان میں حاضر ہوئے۔ ان کی طرف بصرہ میں ایک نہر منسوب ہے جو انہوں نے حضرت عمرؓ کے حکم سے کھودی تھی اس لیے عربوں میں یہ مثل مشہور ہے کہ "اذا جاء نهر الله بطل نهر معقل" جب اللہ نہر (بارش) جاری ہو جاتی ہے تو معقل کی نہر کی کوئی حیثیت نہیں رہتی ہے۔ آپؓ امیر معاویہؓ کی خلافت کے آخر دور میں ٦٠ھ میں فوت ہوئے۔ اور بعض کے نزدیک یزید کے دور میں فوت ہوئے۔

(٤٣٠) وَعَنْ أُمِّ سَلَمَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهَا قَالَتْ: دَخَلَ رَسُولُ اللهِ ﷺ عَلَى أَبِي سَلَمَةَ، وَقَدْ شُقَّ بَصَرُهُ، فَأَغْمَضَهُ، ثُمَّ قَالَ: «إِنَّ الرُّوحَ إِذَا قُبِضَ اتَّبَعَهُ الْبَصَرُ»، فَضَجَّ نَاسٌ مِنْ أَهْلِهِ، فَقَالَ: «لاَ تَدْعُوْا عَلَى أَنْفُسِكُمْ إِلاَّ بِخَيْرٍ، فَإِنَّ الْمَلاَئِكَةَ تُؤَمِّنُ عَلَى مَا تَقُوْلُوْنَ»، ثُمَّ قَالَ: «اللَّهُمَّ اغْفِرْ لِأَبِي سَلَمَةَ، وَارْفَعْ دَرَجَتَهُ فِي الْمَهْدِيِّيْنَ، وَافْسَحْ لَهُ فِي قَبْرِهِ، وَنَوِّرْ لَهُ فِيْهِ، وَاخْلُفْهُ فِي عَقِبِهِ». رَوَاهُ مُسْلِمٌ.

حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ نبی ﷺ ابوسلمہ رضی اللہ عنہ کی موت کے وقت تشریف لائے تو اس وقت ان کی آنکھ کھلی ہوئی تھی آپؐ نے اسے بند کر دیا اور پھر فرمایا کہ "جب روح بدن سے نکل جاتی ہے تو آنکھ اس کا پیچھا کرتی ہے" اتنے میں گھر کے لوگ آہ و بکا کرنے لگے' چیخنے لگے۔ تو آپؐ نے فرمایا "اپنے لئے اچھی اور بہتر دعا کرنا کیونکہ جو کچھ تم کہتے ہو اس پر فرشتے آمین کہتے ہیں" پھر آپؐ نے دعا فرمائی کہ "الٰہی! ابوسلمہ رضی اللہ عنہ کی مغفرت فرما دے۔ ہدایت یافتہ لوگوں میں اس کا درجہ و مرتبہ بلند فرما اور اس کی قبر کشادہ و وسیع فرما دے اور اسے منور فرما دے اور اس کے پیچھے رہنے والوں میں نائب و قائم مقام ہو جا۔" (مسلم)

لغوی تشریح: ﴿ ابوسلمہ رضی اللہ عنہ ﴾ ام سلمہ رضی اللہ عنہا کے شوہر ﴿ شق ﴾ شین پر فتحہ صیغۂ معلوم۔ ﴿ بصرہ ﴾ اس کی آنکھ۔ رفعی صورت میں یہ شق کا فاعل ہے۔ اس صورت میں کہ وہ لازم ہے اور نصبی حالت میں یہ مفعول ہے۔ اس صورت میں یہ متعدی فعل ہوگا اور اس کا فاعل پوشیدہ ضمیر ہے جو ابوسلمہ کی طرف راجع ہے۔ یعنی ابوسلمہ کی آنکھ کھلی ہوئی تھی اور ﴿ شق بصرہ ﴾ کنایہ ہے موت سے کیونکہ میت کی نظر اس کی طرف لوٹتی نہیں۔ کھلی کی کھلی رہ جاتی ہے ﴿ فاغمضہ ﴾ آپؐ نے اسے بند کر دیا یعنی آنکھ کے پپوٹوں کو آپس میں ملا دیا۔ ﴿ قبض ﴾ صیغۂ مجہول ہے ﴿ فضج ﴾ اس میں فا تعقیب کیلئے ہے' یعنی معاً اہل خانہ نے رونا' چیخنا شروع کر دیا۔ شاید یہ لوگ دور جاہلیت کی طرح واویلاہ اور واثبورہ کہہ رہے تھے اس لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو تلقین فرمائی کہ اچھی اور خیر کی دعا کرو کہ فرشتے تمہارے لئے آمین کہتے ہیں۔ ﴿ تومن ﴾ تامین سے ہے یعنی آمین کہتے ہیں۔ ﴿ وافسح ﴾ وسیع و کشادہ فرما دے۔ ﴿ نور ﴾ تنویر سے امر کا صیغہ ہے یعنی اس کیلئے اس کی قبر میں نور پیدا فرما دے۔ ﴿ واخلفہ ﴾ باب نصر ینصر سے۔ یعنی اس کا نائب و قائم مقام ہو جا۔ ایسا قائم مقام جو اس کی تمام ضروریات پوری فرما دے۔ ﴿ فی عقبہ ﴾ عین پر فتحہ اور قاف پر کسرہ۔ اپنے پیچھے' یعنی اے اللہ! مرنے والے نے اپنے پیچھے دنیا میں اہل و عیال' مال و متاع جو کچھ چھوڑا ہے تو اس کا نائب و محافظ بن جا۔

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ مرنے والے کی جب روح جسد خاکی سے پرواز کر جائے تو اس کی آنکھیں عموماً کھلی رہ جاتی ہیں انہیں فوراً بند کر دینا چاہئے کیونکہ جسم ٹھنڈا ہونے کے بعد آنکھ کا بند ہونا دشوار ہو جاتا ہے۔ آنکھیں کھلی رہیں تو مردے سے دہشت و وحشت آنے لگتی ہے۔ اس حدیث سے معلوم ہوا کہ مرنے والے کے اہل و عیال اور حتیٰ الامکان اعزہ و اقرباء کو اس کے پاس ہونا چاہئے تاکہ مرنے سے پہلے اگر وہ کوئی بات یا نصیحت کرے تو اس کے گواہ بن سکیں۔ مزید برآں یہ بھی معلوم ہوا کہ مرنے والے کیلئے نماز جنازہ سے پہلے مغفرت و بخشش کی دعا کی جا سکتی ہے۔ جیسا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ابوسلمہ رضی اللہ عنہ کیلئے دعا فرمائی۔ مگر اس موقع پر ہاتھ اٹھانا اور اجتماعی دعا کرنا ثابت نہیں۔

راوی حدیث: ﴿ ابوسلمہ رضی اللہ عنہ ﴾ ان کا نام عبداللہ بن عبدالاسد مخزومی قرشی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا پھوپھی زاد بھائی۔ آپؐ اور حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ دونوں کا رضاعی بھائی ہے۔ ابولہب کی آزاد کردہ لونڈی نے انہیں اپنا دودھ پلایا۔ ہجرت اپنی اہلیہ کے ساتھ کی۔ غزوۂ بدر میں شریک ہوئے۔ غزوۂ احد میں زخمی ہوئے۔ زخم پہلے درست ہوگیا مگر پھر جاری ہوگیا۔ ۴ھ جمادی الاولیٰ میں وفات پائی۔ شوال میں ابوسلمہ رضی اللہ عنہا کی وفات کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ام سلمہ رضی اللہ عنہا کو حرم نبوی میں داخل فرمالیا۔

(٤٣١) وَعَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهَا، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ حِيْنَ تُوُفِّيَ، سُجِّيَ بِبُرْدٍ حِبَرَةٍ. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم جب فوت ہوئے تو آپؐ کو ایک دھاری دار چادر سے ڈھانپ دیا گیا۔ (بخاری و مسلم)

لغوی تشریح: ﴿ سجی ﴾ تسجیۃ یعنی باب تفعیل سے۔ صیغہ مجہول ہے۔ ڈھانپنے کے معنی میں۔ ڈھانپ دیا گیا۔ ﴿ ببرد حبرۃ ﴾ اس میں مضاف اور مضاف الیہ کی شکل بھی بنتی ہے اور صفت موصوف کی بھی اور ﴿ برد ﴾ کے "با" پر ضمہ ہے اور راء ساکن ہے۔ چادر یا دھاری دار کپڑا اور ﴿ حبرۃ ﴾ میں "حا" کے نیچے کسرہ بھی جائز ہے اور فتحہ بھی۔ بیل بوٹے والی چادر اور یہ ڈھانپنے کا عمل غسل سے پہلے تھا۔

حاصل کلام: میت کو غسل سے پہلے دھاری دار چادر سے ڈھانپ دینا بھی جائز ہے۔ دوسرا آپؐ پر بھی موت وارد ہوئی۔ اس سے حیات النبی کا مسئلہ بڑی آسانی سے حل ہو گیا کہ اگر آپؐ نے وفات نہیں پائی تو آپؐ کے ساتھ وہ عمل کیوں کیا ہے جو مرنے والوں کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ (غسل اور تدفین و تجہیز وغیرہ)

(٤٣٢) وَعَنْهَا أَنَّ أَبَا بَكْرٍ الصِّدِّيْقَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُ قَبَّلَ النَّبِيَّ ﷺ بَعْدَ مَوْتِهِ. رَوَاهُ الْبُخَارِيُّ.

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے آپؐ کی وفات کے بعد آپؐ (کی پیشانی) کا بوسہ لیا تھا۔ (بخاری)

لغوی تشریح: ﴿ قبل ﴾ تقبیل یعنی باب تفعیل سے۔ اس سے معلوم ہوا کہ میت کا تعظیم و تکریم کے نقطہ نظر سے بوسہ لینا جائز ہے۔ کیونکہ کسی ایک صحابی کی ابوبکر رضی اللہ عنہ کے اس فعل پر اظہار ناپسندیدگی منقول نہیں گویا اس پر صحابہ کرامؓ کا اجماع ہے۔ (نیل الاوطار للشوکانی)

(٤٣٣) وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُ، عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ: «نَفْسُ الْمُؤْمِنِ مُعَلَّقَةٌ بِدَيْنِهِ، حَتَّى يُقْضَىٰ عَنْهُ». رَوَاهُ أَحْمَدُ وَالتِّرْمِذِيُّ، وَحَسَّنَهُ.

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا "مومن کی روح قرض کے ساتھ اس وقت تک معلق (لٹکی) رہتی ہے جب تک اسے ادا نہیں کر دیا جاتا۔" (احمد اور ترمذی نے اسے روایت کیا ہے اور ترمذی نے اسے حسن قرار دیا ہے)

لغوی تشریح: ﴿ معلقۃ ﴾ تعلیق تعلیق یعنی باب تفعیل سے۔ جن نعمتوں اور انعامات کا وہ مستحق ہوتا ہے اس کیلئے بند کر دی جاتی ہیں۔ نہ اس کی نجات کا فرمان جاری کیا جاتا ہے اور نہ اس کی ہلاکت کا ﴿ بدینہ ﴾ دال پر فتحہ۔ قرض جس کا ادا کرنا مرنے والے کے ذمہ واجب ہو۔ ﴿ حتی یقضی عنہ ﴾ صیغہ مجہول یعنی تاوقتیکہ وہ قرض اس کی جانب سے ادا نہ کر دیا جائے۔

حاصل کلام: اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حقوق العباد مرنے والے سے معاف نہیں ہوتے تاوقتیکہ جس کا حق تھا وہ حق دار اسے از خود معاف نہ کر دے یا کوئی دوسرا اس کی طرف سے ادا نہ کر دے۔ اسی طرح قرض کا بار میت کے ذمے ہوتا ہے جب تک اس کی طرف سے وہ قرض ادا نہیں کر دیا جاتا۔ خواہ کوئی رشتہ دار ادا کرے یا احباب و رفقاء میں سے کوئی یا ریاست اپنے شہری کی حیثیت سے اس کا قرض ادا کر دے۔ اس سے ذرا اندازہ لگائیں کہ یہ مال تو مرنے والے نے مالک کی رضامندی سے واپسی کی نیت سے قرض لیا تھا۔ جب تک اس کی ادائیگی نہیں ہوتی میت اسی قرض سے معلق رہتی ہے مگر جن لوگوں نے

دوسروں کی کوئی چیز یا مال فریب' دھوکہ یا ڈاکہ ڈال کر حاصل کی ہو گی' اس کا کیا حشر ہو گا۔

اگر مرنے والے نے اپنا مال اتنا پیچھے چھوڑا ہو کہ اس سے اس کا قرض ادا ہو سکتا ہو تو وارث اس مال میں سے قرض کی ادائیگی کرنے کے پابند ہیں۔ اگر وہ مفلس و غریب تھا اتنا مال ہی ترکہ میں پیچھے نہیں چھوڑا تو پھر اسلامی ریاست اس کے قرض ادا کرنے کی پابند ہو گی۔ چنانچہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا "مرنے والا جو مال اپنے پیچھے چھوڑ کر مرے تو وہ وارثوں کا حق ہے اور جو قرض اس کے ذمہ تھا وہ میرے اور میرے والیان ریاست کے ذمہ ہے۔ ہم اسے ادا کریں گے۔" اس سے معلوم ہوا کہ قرض کی معافی نہیں کیونکہ یہ حقوق العباد سے متعلق ہے۔

(٤٣٤) وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُمَا، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ قَالَ فِي الَّذِيْ سَقَطَ عَنْ رَاحِلَتِهِ، فَمَاتَ: اغْسِلُوْهُ بِمَاءٍ وَسِدْرٍ، وَكَفِّنُوْهُ فِي ثَوْبَيْنِ. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ نبی ﷺ نے اس آدمی کے متعلق جو اپنی سواری سے گر کر جاں بحق ہو جائے فرمایا کہ "اسے پانی اور بیری کے پتوں سے غسل دو اور اسی کے دو کپڑوں میں کفن دے دو۔" (بخاری)

لغوی تشریح: ﴿ فی الذی سقط عن راحلته ﴾ یہ ایک صحابی رسول تھے۔ حج کا احرام باندھے مقام عرفہ میں ٹھہرے ہوئے تھے۔ اپنے اونٹ سے گر گئے اور ان کی گردن ٹوٹ گئی اور وفات پا گئے۔ ﴿ بماء وسدر ﴾ بیری کے پتوں کا طریق استعمال تین طرح پر ہے۔ پہلا طریقہ تو یہ ہے کہ بیری کے پتوں کو پانی میں ڈال کر اسے اتنا زور سے ہلائیں کہ اس کا جھاگ باہر نکل آئے۔ اس پانی سے میت کے جسم کو مل کر غسل دیا جائے۔ دوسرا طریقہ یہ ہے کہ پتوں کو پانی میں خوب ابالیں اور تیسرا طریقہ یہ ہے کہ بیری کے پتوں کو جلا کر راکھ بنا لی جائے اور اسے میت کے جسم پر خوب ملا جائے پھر خالص پانی سے بدن میت کو اچھی طرح صاف کیا جائے۔ یہ غسل دینا ایک ہی مرتبہ ہو گا۔ ﴿ کفنوہ ﴾ تکفین سے امر کا صیغہ ہے۔ (باب تفعیل ہے)

حاصل کلام: اس حدیث سے کئی مسائل ثابت ہوتے ہیں۔ (۱) عرفات میں سواری پر جانا جائز ہے۔ (۲) اونٹ کی سواری بھی استعمال کی جا سکتی ہے۔ (۳) حالت احرام میں جو آدمی گر کر فوت ہو جائے اسے بھی پانی اور بیری کے پتوں سے غسل دیا جائے۔ (۴) انہی احرام کے کپڑوں ہی میں اسے دفن کیا جائے۔ نیا کفن خریدنے کی ضرورت نہیں۔ اس کا سر ڈھانکا نہ جائے اور نہ خوشبو ہی لگائی جائے۔ سر ننگا رکھنے اور خوشبو نہ لگانے کی حکمت یہ ہے کہ قیامت کے روز یہ اسی حالت میں لبیک اللھم کا تلبیہ پڑھتا ہوا ننگے سر اٹھے گا۔ (بخاری) بیری کے پتوں میں یہ حکمت معلوم ہوتی ہے کہ ایک تو اس سے بدن صاف اور نرم بھی ہو جاتا ہے اور دوسرا اس پر خرچ کچھ بھی نہیں آتا۔ اس دور میں یہ سب سے آسان طریقہ تھا۔ صابن وغیرہ کا استعمال غالباً نہ ہونے کے برابر تھا۔

(٤٣٥) وَعَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهَا قَالَتْ: لَمَّا أَرَادُوا غُسْلَ النَّبِيِّ ﷺ، قَالُوا: وَاللهِ مَا نَدْرِيْ نُجَرِّدُ رَسُولَ اللهِ ﷺ كَمَا نُجَرِّدُ مَوْتَانَا أَمْ لاَ؟ اَلْحَدِيْثَ. رَوَاهُ أَحْمَدُ وَأَبُو دَاوُدَ.

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ جب صحابہ کرامؓ نے نبی کریم ﷺ کو غسل دینے کا ارادہ کیا تو انہوں نے کہا اللہ کی قسم! ہمیں علم نہیں کہ ہم نبی ﷺ کے کپڑے اتاریں جس طرح ہم اپنے مرنے والوں کے کپڑے اتارتے ہیں یا نہ اتاریں؟ پھر ساری حدیث بیان کی۔ (احمد اور ابوداؤد)

لغوی تشریح: ﴿ما ندری﴾ یعنی ہمیں معلوم نہیں۔ ﴿نجرد﴾ تجرید سے ماخوذ ہے (باب تفعیل) بدن سے کپڑے اتارنا۔ مصنف مرحوم رحمہ اللہ نے اس حدیث کا ابتدائی حصہ نقل کرنے پر اکتفا کیا ہے۔ مکمل حدیث کا خلاصہ یہ ہے کہ اسی تذبذب میں صحابہ کرامؓ پر غنودگی کی سی کیفیت طاری ہوگئی۔ اسی حالت میں انہوں نے کہنے والے سے سنا کہ رسول اللہ ﷺ کو کپڑوں سمیت غسل دو۔ لہٰذا صحابہ کرامؓ نے آپؐ کو بغیر کپڑے اتارے غسل دیا۔ یہ صحابہؓ کا اپنا تردد و تذبذب تھا کہ رسول اللہ ﷺ کو چونکہ دیگر مخلوق پر شرف و بزرگی حاصل ہے۔ اس لئے آپؐ کے بارے میں انہیں تردد ہوا کہ آپؐ کے کپڑے اتاریں یا نہ اتاریں۔ ورنہ ان کے ہاں میت کے کپڑے اتار کر غسل دینا بغیر کسی شک و ریب کے مشروع تھا۔ البتہ قابل ستر اعضاء کی پردہ پوشی واجب ہے۔

(٤٣٦) وَعَنْ أُمِّ عَطِيَّةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهَا قَالَتْ: دَخَلَ عَلَيْنَا النَّبِيُّ ﷺ وَنَحْنُ نُغَسِّلُ ابْنَتَه، فَقَالَ: «اغْسِلْنَهَا ثَلاَثاً أَوْ خَمْساً أَوْ أَكْثَرَ مِنْ ذٰلِكَ، إِنْ رَأَيْتُنَّ ذٰلِكَ، بِمَاءٍ وَسِدْرٍ، وَاجْعَلْنَ فِي الأَخِيْرَةِ كَافُوراً، أَوْ شَيْئاً مِنْ كَافُورٍ»، فَلَمَّا فَرَغْنَا آذَنَّاهُ، فَأَلْقَى إِلَيْنَا حِقْوَهُ، فَقَالَ: أَشْعِرْنَهَا إِيَّاهُ. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ. وَفِي رِوَايَةٍ: «اَبْدَأْنَ بِمَيَامِنِهَا، وَمَوَاضِعِ الْوُضُوءِ مِنْهَا». وَفِيْ لَفْظٍ لِلْبُخَارِيِّ: فَضَفَّرْنَا شَعْرَهَا ثَلاَثَةَ قُرُونٍ، فَأَلْقَيْنَاهَا خَلْفَهَا.

حضرت ام عطیہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ نبی ﷺ ہمارے پاس اس وقت تشریف لائے جب ہم آپؐ کی صاحبزادی کو غسل دے رہی تھیں۔ آپؐ نے فرمایا "اسے تین یا پانچ مرتبہ' یا اس سے بھی زیادہ مرتبہ غسل دو۔ اگر تم ضرورت محسوس کرو' غسل پانی اور بیری کے پتوں سے دو' آخر میں کافور یا فرمایا کچھ کافور ڈالو" جب ہم فارغ ہوئیں تو ہم نے آپؐ کو اطلاع بھجوا دی آپؐ نے اپنا تہ بند اتار کر ہماری طرف پھینک دیا اور فرمایا "اسے جسم کے ساتھ لگا دو۔" (بخاری و مسلم)

اور ایک روایت میں ہے کہ غسل دائیں طرف سے اور وضو کے اعضاء سے شروع کرنا۔ بخاری کی ایک روایت میں ہے کہ ہم نے اس کے سر کے بالوں کو

تین حصوں میں تقسیم کر دیا اور ان کو پشت پر ڈال دیا۔

لغوی تشریح: ﴿ ونحن نغسل ابنۃ ﴾ مشہور روایت کے مطابق یہ آپؐ کی صاحبزادی' ابو العاص کی اہلیہ حضرت زینب رضی اللہ عنہا تھیں۔ ان کی وفات ۸ھ کے آغاز میں ہوئی۔ ایک قول کے مطابق یہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی اہلیہ حضرت ام کلثوم رضی اللہ عنہا تھیں۔ حضرت ام عطیہ رضی اللہ عنہا ان دونوں کی وفات کے موقع پر حاضر تھیں۔ یہ صاحبہ خواتین کی میت کو غسل دیا کرتی تھیں۔ ﴿ ان رایتن ذلک ﴾ اگر تم یہ سمجھو کہ تین یا پانچ مرتبہ غسل دینے سے زائد کی ضرورت ہے تو زیادہ مرتبہ غسل دے سکتی ہو۔ ﴿ بماء وسدر ﴾ پانی اور بیری کے پتوں کے ساتھ کا تعلق ﴿ اغسلنھا ﴾ کے ساتھ ہے یعنی غسل پانی اور بیری کے پتوں کے ساتھ دو۔ ﴿ فی الاخیرۃ کافورا ﴾ راوی کو تردد ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے "کافور" کہا ہے یا ﴿ شیئا من کافور ﴾ فرمایا۔ جمہور کے نزدیک اس کا مفہوم یہ ہے کہ آخری دفعہ پانی میں کافور یا کچھ کافور ملا لینا۔ امام اوزاعی اور بعض علمائے احناف کہتے ہیں کہ اس کا مفہوم یہ ہے کہ غسل کے بعد جسم پر کافور ڈال دینا۔ نسائی کی حدیث کے الفاظ "واجعلن فی آخر ذلک کافورا" بظاہر اسی کے مؤید ہیں۔ ﴿ آذناہ ﴾ ایذان سے ماخوذ ہے۔ صیغہ جمع متکلم ہے۔ یعنی ہم نے آپؐ کو خبر دی۔ ﴿ حقوہ ﴾ "حا" پر فتحہ اور کسرہ بھی جائز ہے یعنی حاء کے نیچے کسرہ اور قاف ساکن ہے۔ اس سے مراد تہہ بند ہے۔ دراصل تو یہ تہبند باندھنے کی جگہ کو کہتے ہیں۔ مگر مجازی طور پر ازار کیلئے بولا جاتا ہے۔ ﴿ اشعرنھا ایاہ ﴾ اشعار سے امر کا صیغہ ہے۔ آپؐ کے ارشاد کا مطلب یہ تھا کہ میرے اس تہبند کو بطور شعار استعمال کرو۔ "شعار" اس کپڑے کو کہتے ہیں جو جسم کے ساتھ لگا ہوا ہو۔ آپؐ کے اس ارشاد کا مقصد یہ تھا کہ آپؐ کی صاحبزادی کو اس سے برکت حاصل ہو۔ ﴿ ابدان ﴾ آغاز کریں' ابتداء کریں ﴿ بمیامنھا ﴾ میمنہ کی جمع ہے یعنی اس کی دائیں جانب سے۔ ﴿ فضفرنا شعرھا ﴾ ﴿ الضفر ﴾ مینڈھی' بالوں کو اس طرح بٹ دے کر یا بن کر ایک دوسرے میں داخل کرنا کہ وہ رسی کی مانند ہو جائیں۔ ﴿ ثلاثۃ قرون ﴾ قرن کی جمع ہے۔ مینڈھیوں کو کہتے ہیں۔ یہ مینڈھیاں بھی نبی ﷺ کے حکم کے تحت بنائی گئیں۔

حاصل کلام: اس واقعہ سے معلوم ہوا کہ میت کو کم از کم تین مرتبہ غسل ضرور دینا چاہئے۔ البتہ بوقت ضرورت اگر زیادہ مرتبہ غسل دینے کی ضرورت محسوس ہو تو پھر پانچ یا سات مرتبہ یعنی طاق کا لحاظ رکھ کر غسل دینا چاہئے۔ غسل کا آغاز بھی دائیں جانب اور اعضاء وضو سے کرنا چاہئے۔ غسل کے بعد بھی دائیں جانب اور اعضاء وضو سے کرنا چاہئے۔ غسل کے بعد حصول برکت کی غرض سے کسی بزرگ کا خاص کپڑا پہنانا بھی جائز ہے۔ خاتون میت کے سر کے بالوں کو تین حصوں میں تقسیم کر کے پیچھے ڈال دیئے جائیں۔ انہیں دو حصوں میں تقسیم کر کے سینے پر ڈالنے کا کوئی صحیح ثبوت نہیں۔ نیز اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ میت کو پانی اور بیری کے پتوں سے غسل دینا چاہئے۔ اور آخر میں کافور پانی میں ملا کر جسم پر ڈال دینا

چاہئے یا جسم پر کافور مل دینا چاہئے۔ کافور کے علاوہ خوشبو کا استعمال بھی جائز ہے۔

(٤٣٧) وَعَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهَا قَالَتْ: كُفِّنَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ فِيْ ثَلَاثَةِ أَثْوَابٍ بِيْضٍ سَحُوْلِيَّةٍ مِنْ كُرْسُفٍ، لَيْسَ فِيْهَا قَمِيْصٌ وَلَا عِمَامَةٌ. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ کو سحولیہ کے ساختہ سوتی سفید رنگ کے تین کپڑوں میں کفن دیا گیا تھا۔ جس میں قمیص اور پگڑی نہیں تھی۔ (بخاری و مسلم)

لغوی تشریح: ﴿كفن﴾ تکفین سے ماخوذ ہے ﴿ثلاثة اثواب﴾ یعنی تین کپڑوں میں کفن دیا گیا۔ ﴿بيض﴾ "با" کے نیچے کسرہ ہے' بیض کی جمع ہے۔ ﴿سحولية﴾ "سین" اور "حا" دونوں پر ضمہ اور یہ بھی منقول ہے سین پر فتحہ اور "حا" پر ضمہ۔ سحول کی طرف منسوب ہے۔ یمن کا ایک قصبہ یا بستی اور ایک قول یہ بھی ہے کہ فتحہ کی صورت میں یہ قصار (دھوبی) کی طرف منسوب ہوگا۔ کیونکہ دھوبی کپڑے کو دھو کر صاف کرتا ہے۔ اس اعتبار سے سحولیہ کا معنی تقیہ (صفائی و طہارت اور پاکیزگی و نظامت) کے ہوں گے۔ ﴿كرسف﴾ کاف پر ضمہ "را" ساکن اور سین پر ضمہ یعنی کپاس۔

حاصل کلام: اس حدیث سے ثابت ہوتا ہے کہ میت مرد ہو تو اسے تین کپڑوں میں کفن دینا چاہئے۔ ان کپڑوں میں نہ تو قمیص ہو اور نہ ہی پگڑی اور کفن میں سوتی کپڑا بہتر ہے۔ تین کپڑوں سے مراد جمہور کے نزدیک تین بڑی چادریں ہیں اور بعض کے ہاں اس سے مراد کفنی' تہہ بند اور بڑی چادر ہے۔

(٤٣٨) وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُمَا، قَالَ: لَمَّا تُوُفِّيَ عَبْدُ اللّٰهِ بْنُ أُبَيٍّ جَاءَ ابْنُهُ إِلَى رَسُولِ اللّٰهِ ﷺ فَقَالَ: أَعْطِنِيْ قَمِيْصَكَ أُكَفِّنْهُ فِيْهِ، فَأَعْطَاهُ إِيَّاهُ. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما نے بتایا کہ عبداللہ بن ابی جب فوت ہوا تو اس کا بیٹا رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا آپؐ اپنی قمیص عنایت فرما دیں کہ میں اس میں اسے کفن دے دوں۔ آپؐ نے اپنی قمیص اتار کر عنایت فرما دی۔ (بخاری و مسلم)

لغوی تشریح: ﴿فاعطاه﴾ اپنی قمیص عطا فرما دی۔ بظاہر اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ عمل تدفین سے پہلے ہوا ہے۔ لیکن بخاری میں حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی روایت میں ہے کہ اسے قبر میں داخل کر دیا گیا تھا۔ آپؐ نے اسے باہر نکالنے کا حکم دیا۔ اسے باہر نکالا گیا۔ پھر اسے اپنی قمیص پہنائی۔ ممکن ہے آپؐ نے پہلے قمیص دینے کا وعدہ فرمایا ہو' دفن کے بعد یہ وعدہ جب یاد دلایا گیا تو آپؐ نے قمیص عنایت فرما دی۔ آپؐ نے اپنی قمیص اس لئے عنایت فرمائی تھی کہ غزوۂ بدر کے اسیران کو آپؐ نے لباس دیئے تھے اور ان میں حضرت عباس رضی اللہ عنہ بھی قیدی ہو کر آئے تھے ان کا قد لمبا تھا کسی کی قمیص انہیں پوری نہیں آتی تھی۔ عبداللہ بن ابی نے اپنی قمیص دی تو انہیں پوری آگئی۔ حضور ﷺ اس احسان کا بدلہ چکانا چاہتے تھے اس لئے یہ قمیص اس کو پہنائی۔

حاصل کلام : اس حدیث سے معلوم ہوا کہ میت کو ضرورت کے وقت قبر میں داخل کرنے کے بعد باہر نکالنا جائز ہے۔ نبی کریم ﷺ کو انسانوں سے محبت و شفقت کتنی تھی' اس واقعہ سے اندازہ لگا لیں۔ اپنے احباب و اصحاب کی خواہش کا کتنا پاس و لحاظ رکھتے تھے۔ (بلکہ منافق کی خواہش کا بھی احترام کیا) راہنمایان و لیڈر حضرات کو بھی اپنے ساتھیوں اور کارکنوں کا خیال رکھنا چاہئے۔

راوی حدیث : ﴿ عبداللہ بن ابی ﴾ جاہلیت میں خزرج کا سردار تھا اور بظاہر اسلام میں داخل ہونے کے بعد منافقین کا لیڈر بنا اور رئیس المنافقین کے لقب سے مشہور تھا۔ غزوۂ احد کے موقع پر لشکر اسلام کا تہائی حصہ لے کر واپس ہو گیا تھا۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے واقعہ افک میں مرکزی کردار اسی کا تھا۔ سورۂ منافقین میں آیت (لئن رجعنا الی المدینۃ لیخرجن الاعز منہا الاذل) اسی کا قول ہے۔ ۹ھ میں ذی قعدہ میں فوت ہوا۔ "ابی" ہمزہ پر ضمہ اور یا پر تشدید۔ سلول اس کی ماں کا نام تھا۔

﴿ ابنہ ﴾ اس سے عبداللہ بن عبداللہ بن ابی ابن سلول مراد ہیں۔ عظیم صحابہؓ میں ان کا شمار ہوتا تھا۔ تمام غزوات میں شریک رہے اور جنگ یمامہ میں شہید ہوئے۔ ان کا رویہ اپنے باپ کے بارے میں بہت سخت تھا۔ جب عبداللہ بن ابی نے لئن رجعنا .... الخ کہا تھا تو انہوں نے اپنے باپ کی گردن اڑا دینے کی اجازت طلب کی تھی۔ جاہلیت کے دور میں ان کا نام حباب تھا۔ نبی کریم ﷺ نے ان کا نام عبداللہ رکھا۔

(٤٣٩) وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ قَالَ: «البسُوا مِنْ ثِيَابِكُمُ البيضَ فَإِنَّهَا مِنْ خَيْرِ ثِيَابِكُمْ، وَكَفِّنُوا فِيهَا مَوْتَاكُمْ». رَوَاهُ الخَمْسَةُ إِلاَّ النَّسَائِيَّ، وَصَحَّحَهُ التِّرْمِذِيُّ.

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا "سفید لباس زیب تن کیا کرو یہ تمہارے ملبوسات میں بہترین اور عمدہ لباس ہے اور اپنے مرنے والوں کو بھی اس میں کفن دیا کرو۔" (نسائی کے علاوہ اسے پانچوں نے روایت کیا ہے اور ترمذی نے اسے صحیح قرار دیا ہے)

حاصل کلام : اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ سفید لباس آنحضور ﷺ کا پسندیدہ و محبوب لباس تھا۔ گو آپؐ نے کبھی کبھی رنگ دار لباس بھی زیب تن فرمایا ہے۔ مرنے والوں کو بھی سفید کفن ہی دینا چاہئے۔ بامر مجبوری دوسرے رنگ کا کپڑا بھی کفن میں استعمال کیا جا سکتا ہے۔

(٤٤٠) وَعَنْ جَابِرٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «إِذَا كَفَّنَ أَحَدُكُمْ أَخَاهُ فَلْيُحْسِنْ كَفَنَهُ». رَوَاهُ مُسْلِمٌ.

حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "تم میں سے جب کوئی اپنے بھائی کو کفن دے تو اسے اچھا کفن دینا چاہئے۔" (مسلم)

حاصل کلام : اس حدیث سے معلوم ہوا کہ ایک مسلمان دوسرے مسلمان کا بھائی ہے۔ اچھا و عمدہ کفن

دینے کا مطلب یہ ہے کہ کفن کا کپڑا صاف ستھرا اور عمدہ ہونا چاہئے اور وہ اس قدر ہو کہ میت کے جسم کو اچھی طرح ڈھانپ لے۔ اچھے کفن سے مراد یہ نہیں کہ وہ قیمتی ہو۔ قیمتی کفن کی ممانعت آئندہ آرہی ہے۔

(٤٤١) وَعَنْهُ قَالَ: كَانَ النَّبِيُّ ﷺ يَجْمَعُ بَيْنَ الرَّجُلَيْنِ مِنْ قَتْلَى أُحُدٍ فِي ثَوْبٍ وَاحِدٍ، ثُمَّ يَقُولُ: «أَيُّهُمْ أَكْثَرُ أَخْذاً لِلْقُرْآنِ»؟ فَيُقَدِّمُهُ فِي اللَّحْدِ، وَلَمْ يُغَسَّلُوا، وَلَمْ يُصَلِّ عَلَيْهِمْ. رَوَاهُ البُخَارِيُّ.

اور انہی (حضرت جابر رضی اللہ عنہ) سے مروی ہے کہ نبی ﷺ شہداء احد کے دو دو آدمیوں کو ایک لباس میں جمع کرتے تھے پھر فرمایا "ان میں سے قرآن کس کو زیادہ یاد تھا۔ جسے زیادہ یاد ہوتا' اسے لحد میں پہلے اتارتے۔ نہ تو ان شہداء کو غسل دیا گیا اور نہ ہی ان کی نماز جنازہ پڑھی گئی۔" (بخاری)

لغوی تشریح: ﴿قتلی﴾ قتیل کی جمع ہے۔ معنی مقتول کے ہی ہیں۔ ﴿احد﴾ "ہمزہ" اور "حا" دونوں پر ضمہ ہے۔ اضافت کی وجہ سے مجرور ہے۔ مدینہ کے شمال میں مشہور و معروف پہاڑ کا نام ہے۔ غزوۂ احد اسی پہاڑ کے پاس لڑا گیا۔ جو تاریخ اسلام میں معروف ہے۔ یہ غزوۂ ۳ھ میں شوال کے مہینہ میں ہوا تھا جس میں ستر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے جام شہادت نوش کیا اور نبی کریم ﷺ بھی زخمی ہوئے۔ ﴿ایھم اکثر اخذا للقران﴾ جسے قرآن زیادہ ازبر ہو۔ ﴿فیقدمه﴾ تقدیم سے ماخوذ ہے یعنی اسے آگے رکھا جائے۔ ﴿اللحد﴾ میت کو قبر میں رکھنے کیلئے قبر کے پہلو میں جو شگاف رکھا جاتا ہے اسے لحد کہتے ہیں۔

حاصل کلام: اس حدیث سے کئی مسائل ثابت ہوتے ہیں۔ (۱) ضرورت کے وقت ایک کفن میں دو آدمیوں کو کفنانا درست ہے۔ (۲) دو یا اس سے زیادہ میتوں کو ایک ہی قبر میں دفن کرنا بھی جائز ہے البتہ ان میں صاحب قرآن کو پہلے داخل کیا جانا چاہئے۔ (۳) شہداء فی سبیل اللہ کو غسل نہیں دیا جاتا۔ جیسا کہ حضور ﷺ نے شہداء احد کے بارے میں فرمایا کہ "ان کو غسل مت دو۔ ان کا ہر ایک زخم قیامت کے روز مشک کی سی خوشبو دے رہا ہوگا۔" (۴) شہداء کا جنازہ بھی ضروری نہیں۔ جن روایات میں شہداء احد کی نماز جنازہ پڑھنے کا ذکر ہے اور حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ پر ستر تکبیریں کہنے کا ذکر ہے' امام شافعی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ وہ روایات صحیح نہیں۔ صحیح بخاری میں عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ کی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ آپؐ نے آٹھ سال بعد شہدائے احد کا جنازہ پڑھا۔ امام شافعی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس سے مراد ان کیلئے دعائے مغفرت ہے۔ ورنہ شہید کی نمازہ جنازہ کے قائلین مدت دراز کے بعد قبر پر جنازہ پڑھنے کے قائل کیوں نہیں؟

(٤٤٢) وَعَنْ عَلِيٍّ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: سَمِعْتُ النَّبِيَّ ﷺ يَقُولُ: «لاَ تَغَالُوا فِي الكَفَنِ، فَإِنَّهُ

حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی ﷺ سے فرماتے سنا کہ (بہت) قیمتی کفن نہ دیا کرو۔ وہ تو بہت جلد بوسیدہ ہو جاتا ہے۔ (ابوداؤد)

يُسْلَبُ سَرِيعاً». رَوَاهُ أَبُو دَاوُدَ.

لغوی تشریح: ﴿ لا تغالوا ﴾ مغالاة سے ماخوذ ہے یا تغالی سے۔ اس صورت میں ایک "تا" محذوف ہوگا۔ اس کے معنی ہیں "بہت قیمتی" ﴿ یسلب ﴾ صیغۂ مجہول۔ بوسیدہ ہونے سے کنایہ ہے۔

حاصل کلام: بہت قیمتی کفن کی میت کو ضرورت ہی نہیں کیونکہ وہ دیر یا سویر بوسیدہ ہو جانا ہے۔ یہ روایت سنداً کمزور ہے مگر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کا وفات کے وقت فرمان اس کا مؤید ہے کہ میری چادروں کو دھو کر مجھے انہی میں کفن دینا۔ زندہ آدمی نئے لباس کا میت سے زیادہ حقدار ہوتا ہے۔ (بخاری)

(٤٤٣) وَعَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهَا، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ قَالَ لَهَا: «لَوْ مُتِّ قَبْلِي لَغَسَّلْتُكِ»، اَلْحَدِيْثُ. رَوَاهُ أَحْمَدُ وَابْنُ مَاجَهْ، وَصَحَّحَهُ ابْنُ حِبَّانَ.

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا بیان ہے کہ نبی ﷺ نے انہیں فرمایا کہ "اگر تو مجھ سے پہلے فوت ہو جائے تو میں تمہیں غسل دوں گا۔" (اسے احمد اور ابن ماجہ نے روایت کیا ہے اور ابن حبان نے اسے صحیح قرار دیا ہے)

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ شوہر اپنی اہلیہ کو غسل دے سکتا ہے۔ جمہور علماء اس کے قائل ہیں کہ خاوند اپنی بیوی کو غسل دے سکتا ہے۔ مگر امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ نے اس کی مخالفت کی ہے۔ لیکن صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا عمل امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کی رائے کی تردید کرتا ہے۔ مثلاً حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اپنی اہلیہ (رسول اللہ ﷺ کی لخت جگر) کو خود اپنے ہاتھوں سے غسل دیا اور حضرت اسماء رضی اللہ عنہا نے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو خود غسل دیا۔ جس سے ثابت ہوا کہ میاں بیوی ایک دوسرے کو غسل دے سکتے ہیں اور یہی بات راجح ہے۔

(٤٤٤) وَعَنْ أَسْمَاءَ بِنْتِ عُمَيْسٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهَا، أَنَّ فَاطِمَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهَا أَوْصَتْ أَنْ يُغَسِّلَهَا عَلِيٌّ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ. رَوَاهُ الدَّارَقُطْنِيُّ.

حضرت اسماء بنت عمیس رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا نے خود یہ وصیت کی تھی کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ خود ان کو غسل دیں۔ (سنن دارقطنی)

حاصل کلام: وصیت کا پورا کرنا اسلام میں نہایت ضروری ہے۔ اس لئے حضرت علی رضی اللہ عنہ نے خود حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کو غسل دیا۔ وصیت بھی پوری ہوگئی اور خاوند کا اپنی بیوی کو غسل دینا بھی ثابت ہوگیا۔

راوی حدیث: ﴿ فاطمہ بنت النبی رضی اللہ عنہا ﴾ نبی ﷺ کی سب سے چھوٹی لخت جگر تھیں۔ اس امت کی خواتین کی سردار۔ ۲ھ رمضان المبارک میں حضرت علی بن ابو طالب رضی اللہ عنہ نے ان کو اپنی زوجیت میں لیا۔ رخصتی کے وقت ان کی عمر پندرہ سال پانچ ماہ تھی۔ ۱۱ھ رمضان المبارک میں نبی ﷺ

کے چھ ماہ بعد مدینہ منورہ میں وفات پائی۔

(٤٤٥) وَعَنْ بُرَيْدَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ - فِيْ قِصَّةِ الغَامِدِيَّةِ، الَّتِيْ أَمَرَ النَّبِيُّ ﷺ بِرَجْمِهَا فِي الزِّنَا - قَالَ: ثُمَّ أَمَرَ بِهَا، فَصُلِّي عَلَيْهَا وَدُفِنَتْ. رَوَاهُ مُسْلِمٌ.

حضرت بریدہ رضی اللہ عنہ سے غامدیہ کے قصہ میں مروی ہے جسے رسول اللہ ﷺ نے ارتکاب زنا کی پاداش میں رجم و سنگساری کا حکم دیا تھا کہ آپ ؐ نے اس کی نماز جنازہ ادا کرنے کا حکم دیا پھر خود اس کی جنازہ پڑھی اور اسے دفن کیا گیا۔ (مسلم)

لغوی تشریح: ﴿ فی قصة الغامدية ﴾ غامدیہ غامد کی طرف منسوب ہونے کی وجہ سے غامدیہ کہلائی۔ جھینہ کی ایک شاخ تھی۔ قصہ اس کا یہ ہے کہ اس خاتون نے نبی ﷺ کے روبرو خود اس کا اعتراف کیا کہ وہ زنا سے حاملہ ہے۔ لہٰذا نبی ﷺ نے بچہ کا دودھ پلائی کا زمانہ گزار کر دودھ چھڑانے کے بعد رجم کا فیصلہ فرمایا اور حکم دیا کہ اسے سنگسار کر دیا جائے۔ رجم کہتے ہیں مجرم کو پتھروں سے مار مار کر موت کے گھاٹ اتار دیا جائے۔ یہ حدیث اس کی دلیل ہے کہ جسے شرعی حد لگی ہو اور وہ جاں بحق ہو جائے تو اس کی نماز جنازہ پڑھی جائے گی۔

حاصل کلام: صحیح روایات سے یہ ثابت ہے کہ آنجناب ﷺ نے بذات خود غامدیہ کی نماز جنازہ ادا فرمائی تھی۔ کبیرہ گناہوں کا ارتکاب کرنے والے مثلاً خود کشی کرنے والا زنا کرنے والد وغیرہ کے بارے میں قاضی عیاض نے کہا ہے کہ علماء کے نزدیک ان کا جنازہ پڑھا جائے گا۔ البتہ امام مالک رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ امام اور مفتی کو فاسق کا جنازہ پڑھانے سے گریز کرنا چاہئے' تاکہ فساق کو اس سے عبرت حاصل ہو۔

(٤٤٦) وَعَنْ جَابِرِ بْنِ سَمُرَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: أُتِيَ النَّبِيُّ ﷺ بِرَجُلٍ قَتَلَ نَفْسَهُ بِمَشَاقِصَ، فَلَمْ يُصَلِّ عَلَيْهِ. رَوَاهُ مُسْلِمٌ.

حضرت جابر بن سمرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی ﷺ کی خدمت میں ایک آدمی لایا گیا جس نے تیر سے خودکشی کی تھی۔ آپ ؐ نے اس کی نماز نہ پڑھی۔ (مسلم)

لغوی تشریح: ﴿ اتی ﴾ صیغہ مجہول لایا گیا ﴿ بمشاقص ﴾ مشقص کی جمع۔ مشقص کے میم کے نیچے کسرہ ہے۔ چوڑا نیزہ' ﴿ فلم یصل علیه ﴾ اس پر نماز جنازہ نہ پڑھی۔ یعنی بطور عبرت اور اس جیسا فعل کرنے والوں کو خوف زدہ کرنے اور ڈرانے' دھمکانے کیلئے آپ ؐ نے نماز جنازہ نہ پڑھی۔

حاصل کلام: خود کشی کرنے والے کی نمازہ جنازہ میں اختلاف ہے۔ ایک قول یہ ہے کہ اس کی نماز جنازہ نہیں پڑھی جائے گی اور ایک قول یہ ہے کہ قوم کے معزز و فضلاء تو اس کی نماز جنازہ نہیں پڑھیں گے۔ البتہ عام لوگ پڑھیں گے کیونکہ نسائی میں ہے کہ آپ ؐ نے فرمایا "میں اس پر نماز جنازہ نہیں پڑھوں گا۔" یہ اس بات کا قرینہ ہے کہ صحابہ کرام ؓ نے نماز جنازہ پڑھی تھی۔ جیسے ابتداء میں آپ ؐ مقروض کا جنازہ

نہیں پڑھتے تھے البتہ صحابہ ؓ کو فرما دیتے تھے کہ تم جنازہ پڑھو۔

(٤٤٧) وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ - فِي قِصَّةِ المَرأَةِ الَّتِيْ كَانَتْ تقُمُّ المَسْجِدَ - قَالَ: فَسَأَلَ عَنْهَا النَّبِيُّ ﷺ، فَقَالُوا: مَاتَتْ، فَقَالَ: «أَفَلاَ كُنْتُمْ آذَنْتُمُونِيْ»؟ - فَكَأَنَّهُمْ صَغَّرُوا أَمْرَهَا - فَقَالَ: «دُلُّوْنِيْ عَلَى قَبْرِهَا»، فَدَلُّوْهُ، فَصَلَّى عَلَيْهَا. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے اس عورت کے بارے میں جو مسجد میں جھاڑو دیا کرتی تھی' روایت ہے کہ نبی ﷺ نے اس کے متعلق صحابہ کرام ؓ سے دریافت فرمایا تو صحابہ کرام ؓ نے جواب دیا کہ وہ فوت ہو چکی ہے۔ آپ ؐ نے فرمایا "تم نے مجھے اطلاع کیوں نہ دی؟ گویا انہوں نے اس کے معاملہ' وفات کو معمولی خیال کیا۔ آپ ؐ نے فرمایا مجھے اس کی قبر کا راستہ بتاؤ۔" انہوں نے آپ کو اس کی قبر کر راستہ بتا دیا۔ آپ ؐ نے وہاں جا کر قبر پر نماز جنازہ پڑھی۔ (بخاری و مسلم)

وَزَادَ مُسْلِمٌ: ثُمَّ قَالَ: «إِنَّ هَذِهِ القُبُورَ مَمْلُوْءَةٌ ظُلْمَةً عَلَى أَهْلِهَا، وَإِنَّ اللَّهَ يُنَوِّرُهَا لَهُمْ بِصَلاَتِيْ عَلَيْهِمْ».

اور مسلم نے اتنا اضافہ نقل کیا ہے پھر آپ ؐ نے فرمایا "یہ قبریں اہل قبور کیلئے اندھیروں سے بھری ہوئی ہیں اور میری نماز سے ان کی قبروں میں روشنی ہو جاتی ہے۔"

لغوی تشریح: ﴿ تقم ﴾ قاف پر ضمہ اور میم پر تشدید یعنی جھاڑو دیا کرتی تھی۔ لکڑیوں' کپڑے کے چیتھڑوں کے ذریعہ کوڑا کرکٹ اور غبار اور بھوسا وغیرہ نکال باہر کرتی تھی۔ یہ خاتون سیاہ فام تھی اور اس کا نام ام محجن تھا۔ ﴿ آذنتمونی ﴾ اس کی وفات کی مجھے اطلاع دیتے کہ میں بھی اس کی نماز جنازہ پڑھتا۔ ﴿ صغروا ﴾ نبی ﷺ کی عظمت کے پہلو کے اعتبار سے انہوں نے اس کی وفات کو معمولی اور حقیر سمجھا۔ ﴿ دلونی ﴾ دال پر ضمہ۔ دلالت سے امر کا صیغہ ہے۔ ﴿ فدلوہ ﴾ دال پر فتحہ اور لام پر ضمہ دلالت سے ماضی کا صیغہ ہے۔ ﴿ ظلمۃ ﴾ منصوب ہے تمییز واقع ہونے کی بنا پر۔

حاصل کلام: اس حدیث سے کئی مسائل ثابت ہوتے ہیں۔ (۱) دفن کرنے کے بعد اس کی قبر پر بھی نماز جنازہ پڑھنا جائز ہے۔ گو تدفین سے پہلے بھی اس پر نماز جنازہ پڑھی جا چکی ہو۔ حضرت براء بن معرور رضی اللہ عنہ کی نماز جنازہ بھی آپ ؐ نے ایک ماہ بعد ان کی قبر پر پڑھی تھی کیونکہ ان کی وفات کے وقت آپ ؐ مکہ مکرمہ میں تھے۔ (۲) مرنے والے کی قبر وہی ہے جہاں اسے دفن کیا ہو۔ انہی قبروں کے بارے میں فرمایا ہے کہ ان میں تاریکی ہی تاریکی ہے روشنی نام کی کوئی چیز نہیں۔۔ (۳) مسجد کی صفائی کرنے والے کا مرتبہ اور مقام بہت بلند ہے۔ (۴) مسجد کی صفائی مسلمان خاتون بھی کر سکتی ہے۔ (۵) مسجد کو صاف ستھرا اور پاک رکھنا

ضروری ہے۔ صفائی' جھاڑو سے بھی کی جا سکتی ہے اور کپڑے سے بھی۔ (٦) نبی ﷺ کی غریبوں سے محبت کا ثبوت بھی ملتا ہے کہ آپ ؐ کو اپنے کارکن مرد و عورت دونوں سے کس قدر تعلق اور لگاؤ تھا۔

(٤٤٨) وَعَنْ حُذَيْفَةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُ، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ كَانَ يَنْهَى عَنِ النَّعْيِ. رَوَاهُ أَحْمَدُ وَالتِّرْمِذِيُّ، وَحَسَّنَهُ.

حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی ﷺ موت کے لئے کھلے عام منادی سے منع فرمایا کرتے تھے۔ (اسے احمد اور ترمذی نے روایت کیا ہے اور ترمذی نے اسے حسن قرار دیا ہے۔)

لغوی تشریح: ﴿ النعی ﴾ موت کی اطلاع دینا۔ مجرد اطلاع دینا۔ مجرد اطلاع تو ممنوع نہیں ہے بلکہ جاہلیت کے دور کے طریقے سے منادی کرنا ممنوع ہے۔ اس کی نوعیت یہ تھی کہ اس منادی میں نوحہ ہوتا اور مرنے والے کے افعال حمیدہ بیان کئے جاتے تھے۔

(٤٤٩) وَعَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُ، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ نَعَى النَّجَاشِيَّ فِي الْيَوْمِ الَّذِيْ مَاتَ فِيْهِ، وَخَرَجَ بِهِمْ إِلَى الْمُصَلَّى، فَصَفَّ بِهِمْ، وَكَبَّرَ عَلَيْهِ أَرْبَعاً. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی ﷺ نے نجاشی کی خبر وفات اسی روز دی جس روز وہ فوت ہوا تھا۔ آپ ؐ صحابہ کرام ؓ کو لے کر جنازگاہ کی طرف تشریف لے گئے۔ صف بندی کروائی اور اس پر چار تکبیریں کہیں۔ (بخاری و مسلم)

حاصل کلام: اس حدیث سے کسی کی موت کی اطلاع دینا ثابت ہو رہا ہے اور نماز غائبانہ بھی ثابت ہو رہی ہے۔ امام شافعی رحمہ اللہ اور امام احمد رحمہ اللہ اس کے قائل ہیں۔ مگر احناف اور مالکی علماء اسے آپ ؐ کی خصوصیت پر محمول کرتے ہیں۔ شیخ الاسلام امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ اور علامہ خطابی رحمہ اللہ وغیرہ کا خیال ہے کہ اگر کسی نے جنازہ نہ پڑھی ہو تو غائبانہ اس کی نماز جنازہ پڑھنی چاہئے۔ یہ بات گو وزنی ہے مگر حافظ ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ کسی روایت سے یہ ثابت نہیں کہ نجاشی پر حبشہ میں نماز جنازہ نہیں پڑھی گئی تھی۔

راوی حدیث: ﴿ نجاشی رضی اللہ عنہ ﴾ نون پر فتحہ۔ حبشہ کے بادشاہ کا لقب۔ جیسا کہ روم کے بادشاہ کو قیصر اور ایران کے بادشاہ کو کسریٰ کہتے تھے۔ نجاشی کا اصل نام اصحمہ بن ابجر رضی اللہ عنہ تھا۔ کفار مکہ کے فتنہ سے اپنے دین کو بچانے کیلئے مسلمانوں نے اسی بادشاہ کے دور میں حبشہ کی جانب ہجرت کی تھی۔ نبی ﷺ نے ٦ھ کے آخر میں یا محرم ٧ھ میں عمرو بن امیہ ضمری رضی اللہ عنہ کے ذریعہ اسلام قبول کرنے کی دعوت دی۔ اس نے آپ ؐ کے مکتوب گرامی کو بوسہ دیا اور اپنی آنکھوں سے بھی لگایا اور اپنے تخت شاہی سے نیچے اتر آیا اور حضرت جعفر بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کے ہاتھ پر اسلام قبول کر لیا اور نبی ﷺ کو یہ ساری صورتحال تحریر کر کے بھجوا دی۔ غزوۂ تبوک ٩ھ کے بعد ماہ رجب میں وفات پائی۔ پھر نبی ﷺ نے اس کے نائب کو بھی اسلام قبول کرنے کی دعوت دی۔

(٤٥٠) وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ میں نے

اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُمَا قَالَ: سَمِعْتُ النَّبِيَّ ﷺ يَقُولُ: «مَا مِنْ رَجُلٍ مُسْلِمٍ يَمُوتُ، فَيَقُومُ عَلَى جَنَازَتِهِ أَرْبَعُونَ رَجُلاً، لاَ يُشْرِكُونَ بِاللّٰهِ شَيْئاً، إِلاَّ شَفَّعَهُمُ اللّٰهُ فِيهِ». رَوَاهُ مُسْلِمٌ.

نبی ﷺ کو فرماتے سنا ہے کہ "کوئی مسلمان نہیں مرتا کہ اس کے جنازے میں ایسے چالیس آدمی شریک ہوں جو اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی بھی چیز کو شریک نہیں ٹھہراتے۔ مگر اللہ تعالیٰ اس مرنے والے کے حق میں ان کی شفاعت قبول فرما لیتا ہے۔" (مسلم)

حاصل کلام: اس حدیث سے کثرت جنازہ کی فضیلت ثابت ہوتی ہے۔ اس حدیث میں چالیس موحد لوگوں کی شفاعت کا ذکر ہے کہ بعض دوسری احادیث میں سو کی تعداد بھی ہے اور بعض میں تین صفوں کا ذکر بھی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ سائلین کے جواب میں موقع محل کے اعتبار سے آپؐ نے تعداد کا ذکر فرمایا دیا۔

(٤٥١) وَعَنْ سَمُرَةَ بْنِ جُنْدُبٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُ، قَالَ: صَلَّيْتُ وَرَاءَ النَّبِيِّ ﷺ عَلَى امْرَأَةٍ مَاتَتْ فِي نِفَاسِهَا، فَقَامَ وَسْطَهَا. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت سمرہ بن جندب رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ میں نے نبی ﷺ کے پیچھے ایک ایسی عورت کی نماز جنازہ پڑھی جو حالت نفاس میں فوت ہوئی تھی۔ آپؐ اس کے درمیان میں کھڑے ہوئے تھے۔ (بخاری و مسلم)

لغوی تشریح: ﴿فی نفاسها﴾ بچے کی پیدائش کے ایام میں۔ یہ خاتون ام کعب انصاریہ رضی اللہ عنہا تھیں۔

حاصل کلام: اس حدیث سے ثابت ہوتا ہے کہ میت اگر عورت ہو تو امام میت کے درمیان میں کھڑا ہو کر نماز جنازہ پڑھائے اور حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مسند امام احمد' ابوداؤد' ترمذی وغیرہ میں ہے کہ میت اگر مرد ہو تو امام کو اس کے سر کے برابر کھڑا ہو کر نماز جنازہ پڑھانی چاہئے۔ امام شافعی رحمہ اللہ کا یہی قول ہے بلکہ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ سے بھی ایک قول یہی منقول ہے جیسا کہ ہدایہ میں ہے۔ اس کے برعکس علمائے احناف عموماً مرد و عورت کے دل کے برابر کھڑا ہو کر نماز جنازہ پڑھاتے ہیں۔ مگر اس کی کوئی شرعی دلیل نہیں بلکہ نص صریح کے مقابلہ میں محض قیاس پر عمل کرتے ہیں کہ دل منبہ ایمان ہے اس لئے دل کے برابر کھڑا ہونا چاہئے۔ مگر یہ حقیقتاً حدیث کے خلاف ہے۔

(٤٥٢) وَعَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهَا قَالَتْ: وَاللّٰهِ لَقَدْ صَلَّى رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ عَلَى ابْنَيْ بَيْضَاءَ فِي الْمَسْجِدِ. رَوَاهُ مُسْلِمٌ.

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ اللہ کی قسم! رسول اللہ ﷺ نے بیضاء کے دونوں بیٹوں کی نماز جنازہ مسجد میں ادا فرمائی۔ (مسلم)

حاصل کلام: مسجد میں نماز جنازہ پڑھنا نبی ﷺ کے عمل سے ثابت ہے۔ مگر امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اور امام مالک رحمۃ اللہ علیہ دونوں مسجد میں نماز جنازہ کو مکروہ سمجھتے ہیں حالانکہ کوئی شرعی و نقلی دلیل ان کے پاس نہیں۔ بلکہ ابن ابی شیبہ میں ہے کہ خلیفہ اول حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کا جنازہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے مسجد ہی میں پڑھایا تھا۔ نیز مسند سعید منصور میں ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ خلیفۂ راشد دوم کا جنازہ بھی حضرت صہیب رضی اللہ عنہ نے مسجد ہی میں پڑھایا تھا اور ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کا جنازہ مسجد ہی میں پڑھا تھا۔ اگر ایسا کرنا ناجائز و مکروہ ہوتا تو خلفاء راشدین اس پر عمل نہ کرتے۔ نبی ﷺ کے اپنے عمل سے اور صحابہؓ کے اس پر عمل پیرا ہونے کی وجہ سے بغیر کسی قسم کی کراہت کے مسجد میں جنازہ پڑھا جا سکتا ہے۔

راوی حدیث: ﴿بیضاء﴾ سھل اور سہیل کی والدہ کا لقب ہے۔ ان کا نام دعد بنت جحدم فہریہ ہے اور ان کے خاوند کا نام وھب بن ربیعہ قرشی ہے۔ سھل تو ان لوگوں میں سے تھا جس نے قریش کے اس صحیفہ کو پاش پاش کیا تھا جس میں قریش نے بنو ہاشم اور مسلمانوں سے مقاطعہ کی قرارداد کی تھی۔ ایک قول کے مطابق انہوں نے اپنے اسلام کے قبول کا اظہار مکہ ہی میں کر دیا تھا اور ایک قول کے مطابق انہوں نے اپنے اسلام لانے کو چھپائے رکھا۔ اسی حالت میں بدر میں حاضر ہوئے۔ مسلمانوں نے اسے بھی قیدی بنا لیا مگر حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے شہادت دی کہ میں نے ان کو مکہ میں نماز پڑھتے دیکھا ہے تو ان کی شہادت پر آزادی دے دی گئی۔ انہوں نے مدینہ میں وفات پائی۔ رہے سہیل تو وہ قدیم الاسلام تھے۔ حبشہ کی ہجرت اور ہجرت مدینہ دونوں میں شریک رہے ہیں۔ بدر اور باقی تمام غزوات میں شامل رہے ہیں۔ غزوۂ تبوک ۹ھ کے بعد مدینہ میں وفات پائی۔ بیضاء کے تین بیٹے مشہور تھے۔ دو تو یہ تھے اور تیسرا صفوان تھا۔ غزوۂ بدر میں قتل ہو کر جام شہادت نوش کیا اور ایک قول یہ بھی ہے کہ انہوں نے نبی ﷺ کے کافی عرصہ بعد وفات پائی ہے۔

(٤٥٣) وَعَنْ عَبْدِ الرَّحْمٰنِ بْنِ أَبِي لَيْلَى قَالَ: كَانَ زَيْدُ بْنُ أَرْقَمَ يُكَبِّرُ عَلَى جَنَائِزِنَا أَرْبَعاً، وَأَنَّهُ كَبَّرَ عَلَى جَنَازَةٍ خَمْساً، فَسَأَلْتُهُ، فَقَالَ: كَانَ رَسُولُ اللهِ ﷺ يُكَبِّرُهَا. رَوَاهُ مُسْلِمٌ. وَالأَرْبَعَةُ.

حضرت عبدالرحمٰن بن ابی لیلیٰ سے روایت ہے کہ زید بن ارقم رضی اللہ عنہ ہمارے جنازوں پر چار تکبیریں کہتے تھے مگر (خلاف معمول) ایک مرتبہ انہوں نے پانچ تکبیریں کہیں تو میں نے ان سے دریافت کیا انہوں نے جواب دیا کہ نبی ﷺ بھی پانچ تکبیریں کہتے تھے۔ (اسے مسلم اور چاروں (ابوداؤد' ترمذی' نسائی اور ابن ماجہ) نے روایت کیا ہے)

حاصل کلام: اس حدیث سے ثابت ہوتا ہے کہ نماز جنازہ میں چار سے زیادہ تکبیریں بھی جائز ہیں۔ نبی کریم ﷺ اور صحابہ کرامؓ سے پانچ' چھ' سات اور آٹھ تکبیریں بھی منقول ہیں۔ مگر اکثر روایات میں چار

تکبیروں کا ذکر ہے۔ بیہقی وغیرہ میں ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے مشورہ سے چار تکبیریں کہنے کا حکم فرمایا۔ بعض نے اسے اجماع قرار دیا ہے مگر یہ درست نہیں جبکہ حضرت علی رضی اللہ عنہ وغیرہ سے چار سے زائد تکبیریں بھی ثابت ہیں۔ چوتھی تکبیر کے بعد کی تکبیرات میں میت کیلئے دعا ہوتی ہے۔ تکبیرات جنازہ میں رفع الیدین صحابہ سے ثابت ہے۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ اس کے قائل ہیں بلکہ بعض علمائے احناف کا بھی اس پر عمل ہے۔

راوی حدیث: ﴿ ابن ابی لیلی ﴾ انصاری مدنی ہیں۔ پھر کوفہ میں منتقل ہونے کی وجہ سے کوفی کہلائے۔ کبار تابعین میں سے تھے۔ صحابہ رضی اللہ عنہم کی ایک جماعت سے سماع ثابت ہے۔ ان کی کنیت ابوعیسیٰ ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی خلافت کے اختتام میں ابھی چھ سال باقی تھے۔ جب ان کی پیدائش ہوئی۔ ۸۲ھ میں معرکہ جماجم میں فوت ہوئے اور ایک قول یہ ہے کہ یہ نہر بصرہ میں ڈوب کر جاں بحق ہوئے۔

(٤٥٤) وَعَنْ عَلِيٍّ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، أَنَّهُ كَبَّرَ عَلَى سَهْلِ بْنِ حُنَيْفٍ سِتّاً، وَقَالَ: إِنَّهُ بَدْرِيٌّ. رَوَاهُ سَعِيدُ بْنُ مَنْصُورٍ. وَأَصْلُهُ فِي الْبُخَارِيِّ.

حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ انہوں نے سہل بن حنیف رضی اللہ عنہ کی نماز جنازہ میں چھ تکبیریں کہیں اور فرمایا کہ وہ بدری تھے۔ (اسے سعید بن منصور نے روایت کیا ہے اور اس کی اصل بخاری میں ہے۔)

لغوی تشریح: ﴿ بدری ﴾ بدری ہیں سے مراد ہے کہ وہ غزوۂ بدر میں شریک تھے۔ بدری ہونے کا شرف و بزرگی ایسی چیز ہے جس کی وجہ سے چھ تکبیریں کہیں کہ اس طرح اس کیلئے زیادہ دعا مانگی جا سکے۔

حاصل کلام: اس سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے کہ چار سے زائد تکبیریں کسی کی بزرگی اور شرف کا لحاظ رکھتے ہوئے کہی جا سکتی ہیں۔

راوی حدیث: ﴿ سہل بن حنیف رضی اللہ عنہ ﴾ حنیف تصغیر ہے حنیف کی۔ انصاری اوسی مدنی۔ بدر اور باقی غزوات و مشاھد میں حاضر تھے۔ غزوۂ احد میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ثابت قدم رہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ان کو بصرہ پر عامل مقرر کیا اور صفین میں بھی ان کے ساتھ تھے۔ ہجرت مدینہ کے بعد حضرت علی رضی اللہ عنہ اور ان کے مابین مؤاخاۃ ہوئی۔ ۳۸ھ میں وفات پائی۔

(٤٥٥) وَعَنْ جَابِرٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، قَالَ: كَانَ رَسُولُ اللهِ ﷺ يُكَبِّرُ عَلَى جَنَائِزِنَا أَرْبَعاً، وَيَقْرَأُ بِفَاتِحَةِ الْكِتَابِ فِي التَّكْبِيرَةِ الأُوْلَى. رَوَاهُ الشَّافِعِيُّ بِإِسْنَادٍ ضَعِيفٍ.

حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے جنازوں پر چار تکبیریں کہا کرتے تھے اور پہلی تکبیر میں سورۂ فاتحہ (بھی) پڑھتے تھے۔ (اسے شافعی نے ضعیف سند سے روایت کیا ہے)

حاصل کلام: اس سے اور آئندہ آنے والی روایت دونوں سے ثابت ہوا کہ نماز جنازہ کی پہلی تکبیر میں سورۂ فاتحہ پڑھنا مسنون ہے۔ اب یہ کہنا کہ قراءت کی نیت سے نہ پڑھے بلکہ صرف دعا کی نیت سے

پڑھے۔ محض ایسی تاویل ہے جس کی پشت پر کوئی شرعی دلیل نہیں۔ نسائی کی ایک روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ سورۂ عصر کا پڑھنا بھی منقول ہے۔ اس سورۂ میں تو دعا کا کوئی اشارہ اور لفظ تک نہیں۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ اور امام احمد رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک تو سورۂ فاتحہ کا نماز جنازہ میں پڑھنا واجب ہے۔ اور بعض حضرات اس کی مشروعیت کے قائل نہیں۔ مگر اس کی عدم مشروعیت پر کوئی صحیح دلیل نہیں۔

(٤٥٦) وَعَنْ طَلْحَةَ بْنِ عَبْدِاللهِ بْنِ عَوْفٍ، قَالَ: صَلَّيْتُ خَلْفَ ابْنِ عَبَّاسٍ عَلَى جَنَازَةٍ، فَقَرَأَ فَاتِحَةَ الكِتَابِ، فَقَالَ لِتَعْلَمُوا أَنَّهَا سُنَّةٌ. رَوَاهُ البُخَارِيُّ.

حضرت طلحہ بن عبداللہ بن عوف رحمۃ اللہ علیہ سے مروی ہے کہ میں نے ابن عباس رضی اللہ عنہما کے پیچھے نماز جنازہ پڑھی۔ انہوں نے اس میں سورۂ فاتحہ پڑھی اور فرمایا (میں نے اس لئے سورۂ فاتحہ پڑھی ہے) تاکہ تمہیں معلوم ہو جائے کہ یہ سنت ہے۔ (بخاری)

لغوی تشریح: ﴿لتعلموا انها سنة﴾ تاکہ تمہیں معلوم ہو کہ یہ طریقہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ماخوذ ہے۔ یہاں سنت سے وہ سنت مراد نہیں جو فرض کے مقابلہ میں ہوتی ہے۔ یہ فقہاء کرام کی جدید اصطلاح ہے۔ لہٰذا یہ اس کے وجوب کے منافی نہیں۔

حاصل کلام: ابن عباس رضی اللہ عنہما نے سورۂ فاتحہ بلند آواز سے پڑھی اور وجہ بھی بیان کر دی کہ تمہیں بتانے کیلئے کہ یہ مسنون ہے۔ گویا نماز جنازہ میں سورۂ فاتحہ اونچی آواز سے پڑھنا بھی جائز ہے۔

راوی حدیث: ﴿طلحه بن عبدالله بن عوف﴾ عبدالرحمٰن بن عوف مشہور و معروف صحابی کے بھائی کے بیٹے تھے۔ طلحہ ندی کے لقب سے مشہور تھے۔ ثقہ اور بڑے پایہ کے فقیہہ تھے۔ اوساط تابعین میں شمار کئے گئے ہیں۔ ۹۷ھ میں ۷۲ برس کی عمر پا کر فوت ہوئے۔

(٤٥٧) وَعَنْ عَوْفِ بْنِ مَالِكٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: صَلَّى رَسُولُ اللهِ ﷺ عَلَى جَنَازَةٍ، فَحَفِظْتُ مِنْ دُعَائِهِ «اللَّهُمَّ اغْفِرْ لَهُ، وَارْحَمْهُ، وَعَافِهِ، وَاعْفُ عَنْهُ، وَأَكْرِمْ نُزُلَهُ، وَوَسِّعْ مَدْخَلَهُ، وَاغْسِلْهُ بِالمَاءِ، وَالثَّلْجِ، وَالبَرَدِ. وَنَقِّهِ مِنَ الخَطَايَا، كَمَا نَقَّيْتَ الثَّوْبَ الأَبْيَضَ مِنَ الدَّنَسِ، وَأَبْدِلْهُ دَاراً خَيْراً مِّنْ دَارِهِ، وَأَهْلاً خَيْراً مِنْ أَهْلِهِ، وَأَدْخِلْهُ

حضرت عوف بن مالک رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک جنازہ پر نماز پڑھائی۔ میں نے آپ کی دعا میں سے اتنا حصہ یاد کر لیا۔ "اے اللہ! اس کی مغفرت فرما دے' اس پر رحم فرما' اسے عافیت و آرام سے رکھ۔ اس سے درگزر فرما۔ اس کی مہمان نوازی اچھی فرما۔ اس کی قبر کشادہ و فراخ کر دے' اسے پانی' برف اور ژالوں سے دھو دے (بالکل صاف کر دے) اسے گناہوں سے ایسا صاف کر دے جیسا کہ سفید کپڑا میل کچیل سے صاف کیا جاتا ہے اور اسے اس دنیاوی گھر سے بہتر اور عمدہ گھر اور

الجَنّة، وقِهِ فِتْنَةَ القَبْرِ، وَعَذَابَ النَّارِ». رَوَاهُ مُسْلِمٌ.

اہل و عیال سے بہتر اہل و عیال عطا فرما' اسے جنت میں داخل فرما' اسے قبر کے فتنہ و آزمائش اور عذاب دوزخ سے محفوظ رکھ۔" (مسلم)

لغوی تشریح: ﴿ نزله ﴾ "نون" اور "زا" دونوں پر ضمہ اور یہ بھی ممکن ہے کہ "زاء" ساکن ہو۔ خورد و نوش کی مہمان کے سامنے پیش کی جانے والی کوئی چیز اور یہاں اجر و ثواب مراد ہے۔ ﴿ وسع ﴾ توسیع باب تفعیل سے۔ کشادہ و وسیع کر۔ ﴿ مدخله ﴾ میم پر ضمہ' جائے داخلہ۔ مراد یہاں قبر ہے۔ ﴿ البرد ﴾ "با" اور "را" دونوں پر فتحہ اولے مراد ہیں۔ ﴿ نقه ﴾ "قاف" پر تشدید۔ تنقیۃ سے ماخوذ ہے' دعا ہے کہ پاک کر دے صاف ستھرا کر دے۔ ﴿ الدنس ﴾ دال اور نون دونوں پر فتحہ میل کچیل۔ ﴿ ابدله ﴾ ابدال سے ماخوذ ہے (باب افعال) بدل دے۔ اس کے عوض دے ﴿ وقه ﴾ اس میں واؤ عطف کی ہے۔ "قاف" کے نیچے کسرہ ہے۔ وقایۃ سے ماخوذ ہے۔ دعا ہے اور "ھاء" ضمیر میت کی طرف راجع ہے۔ بچا اسے' حفاظت فرما اس کی' محفوظ رکھ اسے۔

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ ؐ نے یہ دعا بھی بلند آواز سے پڑھی تھی۔ تبھی تو حضرت عوف بن مالک رضی اللہ عنہ نے اسے یاد کر لیا تھا۔ ابوداؤد وغیرہ میں تو "سمعت" کا لفظ صراحتاً منقول ہے کہ میں نے یہ دعا آپ ؐ سے سنی اور یہ بھی امکان ہے کہ راوی نے آپ ؐ سے بعد میں پوچھ کر یاد کر لیا ہو۔ اکثر فقہاء کی رائے یہی ہے کہ دعا آہستہ مانگی جائے اور بعض باآواز بلند کے بھی قائل ہیں۔ بعض نے یہ بھی رائے دی ہے کہ رات کے اوقات میں باآواز بلند اور دن میں آہستہ آواز سے مانگی چاہئے۔ دعا میں چونکہ افضل یہ ہے کہ آہستہ مانگی جائے اس لئے اکثر فقہاء نے آہستہ پڑھنے کو راجح قرار دیا ہے اور اکثر احادیث سے اسی کی تائید ہوتی ہے۔ البتہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی طرح بطور تعلیم اونچی آواز سے پڑھا جائے تو اس میں اعتراض کی گنجائش نہیں۔

راوی حدیث: ﴿ عوف بن مالك رضی اللہ عنہ ﴾ شرف صحابیت سے مشرف ہیں۔ قبیلہ اشجع سے تعلق کی وجہ سے اشجعی کہلائے۔ غزوۂ خیبر میں پہلی مرتبہ شریک جہاد ہوئے۔ فتح مکہ کے روز قبیلہ اشجع کا علم ان کے ہاتھ میں تھا۔ شام میں سکونت اختیار کی۔ ۷۳ھ میں فوت ہوئے۔

(٤٥٨) وَعَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُ، قَالَ: كَانَ رَسُولُ اللهِ ﷺ إِذَا صَلَّى عَلَى جَنَازَةٍ، يَقُولُ: «اللَّهُمَّ اغْفِرْ لِحَيِّنَا، وَمَيِّتِنَا، وَشَاهِدِنَا، وَغَائِبِنَا، وَصَغِيرِنَا، وَكَبِيرِنَا، وَذَكَرِنَا، وَأُنْثَانَا، اللَّهُمَّ مَنْ

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ جب کسی کی نماز جنازہ پڑھتے تو یہ دعا مانگتے۔ "الٰہی! ہمارے زندوں اور مردوں' ہمارے حاضر و غائب' ہمارے چھوٹوں اور بڑوں' ہمارے مردوں اور عورتوں کی مغفرت و بخشش فرما دے۔ الٰہی! ہم میں سے جسے تو زندہ رکھے اسے اسلام پر زندہ رکھ اور

أَحْيَيْتَهُ مِنَّا فَأَحْيِهِ عَلَى الإِسْلاَمِ، وَمَنْ تَوَفَّيْتَهُ مِنَّا فَتَوَفَّهُ عَلَى الإِيمَانِ، اللَّهُمَّ لاَ تَحْرِمْنَا أَجْرَهُ، وَلاَ تَفْتِنَّا بَعْدَهُ». رَوَاهُ مُسْلِمٌ وَالأَرْبَعَةُ.

جسے تو موت دے اسے ایمان کی موت سے سرفراز فرما۔ الٰہی! ہمیں اس کے اجر و ثواب سے محروم نہ رکھیو اور نہ ہمیں اس کے بعد گمراہ کرنا۔ (اسے مسلم اور چاروں (ابوداؤد' ترمذی' نسائی اور ابن ماجہ) نے روایت کیا ہے)

لغوی تشریح: ﴿شاهدنا﴾ جو حاضر ہیں۔ ﴿صغيرنا﴾ کم عمر اور چھوٹے عمر والوں کے حق میں بلندی درجات کی دعا یا اس کی دعا کہ اللہ تعالیٰ تکلیف و مصیبت کے وقت افعال صالحہ پر ثابت قدم رکھے۔ ﴿فاحيه﴾ احیاء سے ماخوذ ہے۔ زندگی کی دعا۔ ﴿لا تحرمنا﴾ "تا" پر فتحہ اور "را" کے نیچے کسرہ۔ حرمان سے ماخوذ و مشتق ہے۔ نہ محروم رکھ ہمیں۔ ﴿اجره﴾ اس کی موت کی وجہ سے ہمیں جو صدمہ پہنچا ہے اس پر صبر کے اجر سے۔ ﴿لاتفتنا﴾ دوسرے "تا" کے نیچے کسرہ اور نون جمع پر تشدید۔ باب ضرب یضرب سے اور فعل کے نون کو نون متکلم میں مدغم کر دیا گیا ہے۔ یعنی ہمیں اس کی موت کے بعد فتنہ و آزمائش میں مبتلا نہ کرنا بلکہ اس کی موت کو ہمارے لئے مقام عبرت بنا دے۔ یہ حدیث مسلم میں نہیں ہے۔ گمان غالب یہ ہے کہ یہ کسی کاتب کی کرم فرمائی ہے' مصنف کی نہیں۔

(٤٥٩) وَعَنْهُ أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ قَالَ: «إِذَا صَلَّيْتُمْ عَلَى المَيِّتِ فَأَخْلِصُوا لَهُ الدُّعَاءَ». رَوَاهُ أَبُو دَاوُدَ، وَصَحَّحَهُ ابْنُ حِبَّانَ.

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا "جب تم کسی میت کی نماز جنازہ پڑھو تو خوب خلوص دل سے اس کیلئے دعا کرو۔" (اسے ابوداؤد نے روایت کیا ہے اور ابن حبان نے صحیح قرار دیا ہے)

حاصل کلام: نماز جنازہ پڑھنے والے دراصل مرنے والے کیلئے رب کائنات کے حضور اس کی بخشش کی سفارش کرتے ہیں۔ ہر سفارشی کی خواہش ہوتی ہے کہ اس کی سفارش قبول ہو اس لئے سفارش کرنے والا بڑی آہ و زاری اور درد دل سے سفارش کرتا ہے۔ یہ میت کا آخری وقت ہوتا ہے۔ لہٰذا اس کیلئے جتنے خلوص قلب سے دعا کی جا سکتی ہو کرنی چاہئے۔ لیکن بعض لوگ تو صرف رسم ہی پوری کرتے ہیں۔ خلوص نام کی چیز بہت ہی کم نظر آتی ہے اور دو تین منٹ میں جنازے کا جھٹکا کر کے رکھ دیتے ہیں۔

(٤٦٠) وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، عَنِ النَّبِيِّ ﷺ، قَالَ: «أَسْرِعُوا بِالجَنَازَةِ، فَإِنْ تَكُ صَالِحَةً، فَخَيْرٌ تُقَدِّمُونَهَا إِلَيْهِ، وَإِنْ تَكُ سِوَى ذَلِكَ، فَشَرٌّ تَضَعُونَهُ عَنْ

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ نبی ﷺ نے فرمایا "جنازہ لے جانے میں جلدی کیا کرو۔ اس لئے کہ اگر مرنے والا صالح اور نیک آدمی تھا تو اس کیلئے بہتر ہو گا کہ اسے بہتر جگہ کی طرف جلدی لے جاؤ اور اگر دوسرا ہے (برا آدمی ہے) تو اپنی گردن

رِقَابِكُمْ». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

سے اتار کر رکھ دو۔" (بخاری و مسلم)

لغوی تشریح: ﴿اسرعوا﴾ موت کے وقوع کے یقینی ہونے کے بعد میت کو جلدی لے جاؤ اور تجہیز و تکفین میں جلدی کرو ﴿تضعونه﴾ وضع سے ماخوذ ہے جس کے معنی اتار کر رکھ دینے کے ہیں۔ یہ حمل کے مقابلہ میں بولا جاتا ہے جس کے معنی اٹھانا ہوتا ہے اور یہ کنایۃً اپنے سے دور کر دینے کے معنی میں مستعمل ہے۔

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ میت کے دفن کرنے میں بلا ضرورت تاخیر کرنا خلاف سنت ہے۔ میت کو جلدی دفن کرنے کی تاکید حضور ﷺ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو فرمائی تھی۔ نیز طبرانی میں سند حسن سے ابن عمر رضی اللہ عنہما کی روایت ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا "جب تم میں سے کسی کو موت آجائے تو اسے روک نہ رکھو بلکہ اسے قبر کی طرف جلدی سے لے جاؤ۔"

(٤٦١) وَعَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «مَنْ شَهِدَ الجَنَازَةَ حَتَّى يُصَلِّيَ عَلَيْهَا فَلَهُ قِيرَاطٌ، وَمَنْ شَهِدَهَا حَتَّى تُدْفَنَ فَلَهُ قِيرَاطَانِ»، قِيلَ: وَمَا القِيرَاطَانِ؟ قَالَ: «مِثْلُ الجَبَلَيْنِ العَظِيمَيْنِ». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ، وَلِمُسْلِمٍ: «حَتَّى تُوضَعَ فِي اللَّحْدِ».

وَلِلْبُخَارِيِّ: «مَنْ تَبِعَ جَنَازَةَ مُسْلِمٍ إِيْمَاناً وَاحْتِسَاباً، وَكَانَ مَعَها حَتَّى يُصَلَّى عَلَيْهَا وَيُفْرَغَ مِنْ دَفْنِهَا، فَإِنَّهُ يَرْجِعُ بِقِيرَاطَيْنِ، كُلُّ قِيرَاطٍ مِّثْلُ جَبَلِ أُحُدٍ».

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "جو شخص جنازہ کے ساتھ جائے یہاں تک کہ اس پر نماز پڑھی جائے اسے ایک قیراط کے برابر ثواب ملے گا اور جو شخص دفن ہونے تک حاضر رہے اسے دو قیراط اجر ملے گا۔" دریافت کیا گیا کہ دو قیراط سے کیا مراد ہے؟ فرمایا "دو قیراط دو بڑے پہاڑوں کے برابر۔" (بخاری و مسلم)

اور مسلم کی روایت میں ہے "میت کو قبر میں اتارے جانے تک حاضر رہے۔"

اور بخاری کی روایت میں ہے "جس نے کسی مسلمان کے جنازہ میں ایمان اور حصول ثواب کی نیت سے شرکت کی اور نماز جنازہ کے اختتام تک اس کے ساتھ بھی رہا اور تدفین سے فراغت کے بعد واپس لوٹا تو وہ دو قیراط لے کر واپس لوٹا۔ ہر قیراط احد پہاڑ کی مقدار کے برابر ہے۔"

لغوی تشریح: ﴿قیراط﴾ "قاف" کے نیچے کسرہ۔ نصف دانق اور دانق درہم کا چھٹا حصہ۔ قیراط سمجھ میں جلدی آجانے والا پیمانہ وزن تھا اس لئے قیراط بولا گیا ہے۔ اس زمانہ میں کام کی اجرت قیراط کی صورت میں دی جاتی تھی۔ مذکور قیراط وزن کے اعتبار سے تو بالکل معمولی اور حقیر ہے مگر اللہ تعالیٰ کے نزدیک قیراط بڑا عظیم ہے اور یہی بتانا مطلوب و مقصود تھا کہ اس کو دنیاوی قیراط نہ سمجھنا بلکہ وہ پہاڑوں جتنا عظیم ہے۔ ﴿ایمانا و

احتسابا ﴾ دونوں منصوب ہیں علت کی بنا پر یا پھر حال واقع ہو رہے ہیں۔ معنی یہ ہوئے کہ جنازہ میں شرکت کے ساتھ طلب اجر و ثواب کی غرض ہو۔ دکھلاوا اور اہل میت کے ہاں حاضری لگوانے کی نیت نہ ہو۔

حاصل کلام: اس حدیث میں جنازہ کے ساتھ چلنے اور نماز جنازہ ادا کرنے کے ثواب کو تمثیل کے رنگ میں بیان کیا گیا ہے۔ مطلب اس کا یہ ہے کہ مومن کی نماز جنازہ پڑھنے کا بہت بڑا ثواب ہے۔ اہل ایمان کو ترغیب دلائی گئی ہے کہ جنازہ میں شرکت کا اہتمام کریں۔ اس روایت میں لفظ "قیل" سے مراد حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ ہیں جیسا کہ ابو عوانہ میں ہے کہ انہوں نے یہ سوال آپ ؐ سے کیا تھا کہ قیراط کیا ہے؟

(٤٦٢) وَعَنْ سَالِمٍ عَنْ أَبِيهِ، أَنَّهُ رَأَى النَّبِيَّ ﷺ وَأَبَا بَكْرٍ وَعُمَرَ، يَمْشُونَ أَمَامَ الجَنَازَةِ. رَوَاهُ الخَمْسَةُ، وَصَحَّحَهُ ابْنُ حِبَّانَ، وَأَعَلَّهُ النَّسَائِيُّ وَطَائِفَةٌ بِالإِرْسَالِ.

حضرت سالم اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے نبی ﷺ' حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ و عمر رضی اللہ عنہ کو جنازے کے آگے چلتے دیکھا ہے۔ (اس کو پانچوں نے روایت کیا ہے اور ابن حبان نے صحیح قرار دیا ہے اور نسائی اور ایک گروہ نے اسے مرسل ہونے کی وجہ سے معلول کہا ہے)

حاصل کلام: جنازہ کے ساتھ قبرستان تک جانے کی صورت میں آگے چلنا چاہئے یا پیچھے۔ مختلف روایات سے آپ ؐ کا عمل دائیں' بائیں' آگے اور پیچھے ہر طرح ثابت ہے مگر بہتر کونسا ہے؟ اس میں ائمہ کرام کی آراء مختلف ہیں۔ جمہور علماء امام شافعی رحمہ اللہ' امام احمد رحمہ اللہ اور امام مالک رحمہ اللہ تینوں ائمہ آگے آگے چلنے کو بہتر خیال کرتے ہیں اور امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ اور اوزاعی رحمہ اللہ پیچھے چلنے کو بہتر سمجھتے ہیں۔ امام شوکانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ آگے پیچھے ہر سمت چلنا جائز ہے۔ کسی پر فوقیت و برتری اور ترجیح نہیں۔ چلنے والے جس طرح سہولت پائیں' اس پر عمل کریں۔ ایک رائے یہ بھی ہے کہ پیدل چلنے والے آگے چلیں اور سوار جنازے کے پیچھے پیچھے۔ یہ رائے سفیان ثوری اور کچھ دیگر علماء کی ہے اور ایک رائے یہ بھی ہے کہ اگر جنازے کے ساتھ خواتین بھی ہوں تو اس صورت میں مردوں کو جنازے کے آگے چلنا بہتر ہے ورنہ پیچھے چلیں گے۔ بہرحال جس طرح کی صورت درپیش ہو چلنے والے اپنے حالات کو سامنے رکھتے ہوئے اسی کو اختیار کر سکتے ہیں۔

راوی حدیث: ﴿ سالم ﴾ ان کی کنیت ابو عبداللہ یا ابو عمر ہے۔ سلسلۂ نسب یوں ہے۔ سالم بن عبداللہ بن عمر بن خطاب۔ سادات تابعین میں سے تھے اور مدینہ طیبہ کے فقہاءِ سبعہ میں ان کا شمار ہوتا تھا۔ علم و فضل میں اپنے والد سے بہت مشابہت رکھتے تھے۔ ١٠٦ھ میں ذی القعدہ یا ذی الحجہ کے مہینے میں فوت ہوئے۔

(٤٦٣) وَعَنْ أُمِّ عَطِيَّةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهَا قَالَتْ: نُهِينَا عَنِ اتِّبَاعِ الجَنَائِزِ، وَلَمْ يُعْزَمْ عَلَيْنَا. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت ام عطیہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ ہمیں جنازوں میں شرکت سے منع کر دیا گیا مگر یہ ممانعت ہم پر لازمی قرار نہیں دی گئی۔ (بخاری و مسلم)

لغوی تشریح: ﴿نهينا﴾ صیغہ مجہول ہے مگر یہ مرفوع کے حکم میں ہے بلکہ بخاری میں صراحت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ہمیں منع فرمایا۔ ﴿لم يعزم﴾ صیغہ مجہول۔ یعنی یہ ممانعت ہمارے لئے لازمی قرار نہیں دی گئی بلکہ یہ نفی کراہت و ناپسندیدگی کیلئے تھی۔

حاصل کلام: اس حدیث سے خواتین کی جنازوں میں شرکت ممنوع معلوم ہوتی ہے۔ عین ممکن ہے کہ پہلے خواتین کو جنازوں میں شریک ہونے اور قبرستان میں جانے سے منع فرما دیا گیا ہو مگر جب ان میں اسلامی شعور کافی حد تک بیدار ہوگیا تو جس طرح آپؐ نے قبرستان جانے کی اجازت دے دی اسی طرح جنازہ میں شرکت کی بھی اجازت دے دی ہو۔ چنانچہ حضرت ابوھریرہ رضی اللہ عنہ سے نسائی، ابن ماجہ اور ابن ابی شیبہ میں مروی ہے کہ ایک جنازہ میں عورتیں شریک ہوئیں تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے انہیں روکنا چاہا مگر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "انہیں جانے دو۔"

(٤٦٤) وَعَنْ أَبِيْ سَعِيْدٍ، أَنَّ رَسُولَ اللهِ ﷺ قَالَ: «إِذَا رَأَيْتُمُ الجَنَازَةَ فَقُومُوا، فَمَنْ تَبِعَهَا فَلاَ يَجْلِسْ حَتَّى تُوضَعَ». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت ابوسعید رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "جب تم کسی جنازے کو آتے دیکھو تو کھڑے ہو جاؤ۔ نیز جو شخص جنازے کے ساتھ ہو وہ جنازے کے زمین پر رکھے جانے سے پہلے نہ بیٹھے۔" (بخاری و مسلم)

لغوی تشریح: ﴿فقوموا﴾ امر کا صیغہ ہے مگر یہاں امر استحباب کے معنی میں ہے یا یہ حکم اب منسوخ ہے کیونکہ رسول اللہ ﷺ کے آخری دو ارشادات سے معلوم ہوتا ہے کہ آپؐ نے قیام چھوڑ دیا تھا (حتى توضع) آدمیوں کے کندھوں سے اتار کر زمین پر رکھنے تک اور یہ معنی بھی ہو سکتے ہیں کہ قبر میں اتارنے تک۔ دونوں کا احتمال ہے مگر پہلا قول راجح ہے۔ جنازہ کو زمین پر رکھنے سے پہلے بیٹھنے کی ممانعت بھی استحباب پر محمول ہے وجوب پر نہیں۔

حاصل کلام: موت کا عمل انسان کیلئے اضطراب اور بے چینی و بے قراری کا باعث ہوتا ہے۔ نیز میت کے ہمراہ فرشتے بھی ہوتے ہیں اس لئے ان کے احترام میں کھڑے ہونا لائق اعتبار ہے۔ مگر بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ جب آپؐ کو علم ہوا کہ جنازہ کیلئے کھڑا ہونا یہودیوں کا طریقہ ہے تو آپؐ نے بیٹھنے اور یہودیوں کی مخالفت کا حکم فرمایا۔ اس بنا پر بعض نے کھڑے ہونے کے حکم کو منسوخ قرار دیا ہے اور بعض نے اس حکم کو محض استحباب پر محمول کیا ہے۔ اس روایت سے یہ بھی ثابت ہوا کہ جنازہ کو زمین پر رکھنے سے پہلے بیٹھنا نہیں چاہیئے۔ نسائی میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ اور ابوسعید رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ہم نے ایسا کبھی نہیں دیکھا کہ نبی ﷺ کسی جنازے پر حاضر ہوئے ہوں اور جنازے کے زمین پر رکھے جانے سے پہلے ہی زمین پر بیٹھ گئے ہوں۔

(٤٦٥) وَعَنْ أَبِيْ إِسْحَاقَ، أَنَّ

حضرت ابواسحٰق رحمہ اللہ سے مروی ہے کہ عبداللہ بن

عَبْدَ اللهِ بْنَ يَزِيْدَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُ أَدْخَلَ المَيِّتَ مِنْ قِبَلِ رِجْلَي القَبْرِ، وَقَالَ: هٰذَا مِنَ السُّنَّةِ. أَخْرَجَهُ أَبُو دَاوُدَ.

یزید رضی اللہ عنہ نے میت کو اس کے پاؤں کی طرف سے قبر میں اتارا اور کہا کہ سنت طریقہ یہی ہے۔ (ابوداؤد)

لغوی تشریح: ﴿ من رجل القبر ﴾ یعنی اس جانب سے جس جانب سے میت کے پاؤں ہوتے ہیں یہ حال کا اطلاق محل پر ہے۔ یعنی حال بول کر محل مراد لیا ہے۔

حاصل کلام: اس سے معلوم ہوا کہ میت کو قبر میں پاؤں کی جانب سے اتارنا چاہئے۔ اہل حجاز میں اسی پر عمل تھا اور اسی کو امام شافعیؒ و احمدؒ نے اختیار کیا ہے اور یہی افضل ہے کیونکہ کوئی صحیح روایت اس کے برعکس ثابت نہیں۔

راوی حدیث: ﴿ ابواسحاق ﴾ عمرو بن عبداللہ سبیعی ہمدانی کوفی۔ مشہور تابعی کثیر الروایہ۔ مگر تدلیس کرتے تھے۔ آخر عمر میں ذہنی توازن بگڑ گیا تھا۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی خلافت کے ابھی دو سال باقی تھے کہ ان کی پیدائش ہوئی۔ ۱۲۹ھ میں فوت ہوئے۔

﴿ عبداللہ ابن یزید رضی اللہ عنہ ﴾ خطمی انصاری۔ قبیلہ اوس سے تھے۔ جس وقت صلح حدیبیہ میں حاضر ہوئے اس وقت ان کی عمر سترہ برس تھی۔ جنگ جمل و صفین میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ تھے۔ کوفہ میں آئے۔ ابن زبیر رضی اللہ عنہما کے عہد میں کوفہ کے والی تھے۔ اسی دور میں کوفہ میں فوت ہوئے۔

(٤٦٦) وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللهُ تَعَالَى عَنْهُمَا، عَنِ النَّبِيِّ ﷺ، قَالَ: «إِذَا وَضَعْتُمْ مَوْتَاكُمْ فِي الْقُبُوْرِ، فَقُوْلُوْا: بِسْمِ اللهِ، وَعَلَى مِلَّةِ رَسُوْلِ اللهِ». أَخْرَجَهُ أَحْمَدُ وَأَبُوْدَاوُدَ وَالنَّسَائِيُّ، وَصَحَّحَهُ ابْنُ حِبَّانَ، وَأَعَلَّهُ الدَّارَقُطْنِيُّ بِالْوَقْفِ.

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے کہ ”جب اپنے مرنے والوں کو قبروں میں اتارو تو ”بسم اللہ‘ وعلی ملۃ رسول اللہ“ کہو۔“ (اسے احمد‘ ابوداؤد اور نسائی نے نکالا ہے۔ ابن حبان نے اسے صحیح قرار دیا ہے اور دارقطنی نے اسے معلول قرار دیتے ہوئے اسے وقوف کہا ہے)

حاصل کلام: اس حدیث سے ثابت ہوا کہ میت کو قبر میں داخل کرتے ہوئے یہ دعا پڑھنی مسنون ہے۔ امام دارقطنی رحمہ اللہ کی طرح نسائی نے اس روایت کو گو موقوف ہی قرار دیا ہے مگر یہ صحیح نہیں۔ اس کی تائید مستدرک کی روایت سے بھی ہوتی ہے جس کی سند حسن ہے۔

(٤٦٧) وَعَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهَا، أَنَّ رَسُولَ اللهِ ﷺ قَالَ: «كَسْرُ عَظْمِ المَيِّتِ كَكَسْرِهِ

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا روایت کرتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ”کسی مردے کی ہڈی توڑنے (کا گناہ) زندہ انسان کی ہڈی توڑنے کے گناہ کی طرح ہے۔“

حَيًّا». رَوَاهُ أَبُو دَاوُدَ بِإِسْنَادٍ عَلَى شَرْطِ مُسْلِمٍ، وَزَادَ ابْنُ مَاجَهْ مِنْ حَدِيثِ أُمِّ سَلَمَةَ: «فِي الإِثْمِ».

(اسے ابوداؤد نے مسلم کی شرط کی سند سے روایت کیا ہے) اور ابن ماجہ نے ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے مروی روایت میں اتنا اضافہ نقل کیا ہے کہ (گناہ میں)۔"

لغوی تشریح: ﴿ فی الاثم ﴾ گناہ میں۔ یعنی کہ مردہ کی ہڈی توڑنا گناہ کے اعتبار سے ایسا ہے جیسے کسی زندہ کی ہڈی توڑنے کا ہے۔ یہ درد اور الم و تکلیف کے پہلو سے نہیں کیونکہ زندہ کو اس سے تکلیف ہوگی جبکہ مردے کو اس کا احساس بھی نہیں ہوتا۔

حاصل کلام: اس حدیث سے مسلمان خواہ وہ مردہ ہی ہو اس کی عزت و احترام کا سبق ملتا ہے۔ احترام میں زندہ اور مردہ میں کوئی خاص امتیاز نہیں رکھا۔ مگر اس دور میں سرجری نے اتنی ترقی کرلی ہے جس کا صدیوں پہلے خواب و خیال بھی نہ تھا۔ علماء کرام نے جرم کی تحقیق و تفتیش کیلئے پوسٹ مارٹم اور علاج معالجہ کیلئے چیر پھاڑ کی اجازت دی ہے۔

(٤٦٨) وَعَنْ سَعْدِ بْنِ أَبِي وَقَّاصٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، قَالَ: أَلْحِدُوا لِيْ لَحْداً وَانْصِبُوا عَلَيَّ اللَّبِنَ نَصْباً، كَمَا صُنِعَ بِرَسُولِ اللهِ ﷺ. رَوَاهُ مُسْلِمٌ.

حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ میرے لئے بغلی لحد والی قبر بنانا اور مجھ پر کچی اینٹیں چننا جس طرح رسول اللہ ﷺ کے ساتھ کیا گیا۔ (مسلم)

وَلِلْبَيْهَقِيِّ عَنْ جَابِرٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ نَحْوُهُ، وَزَادَ: وَرُفِعَ قَبْرُهُ عَنِ الأَرْضِ قَدْرَ شِبْرٍ. وَصَحَّحَهُ ابْنُ حِبَّانَ.

اور بیہقی نے حضرت جابر رضی اللہ عنہ کے حوالہ سے اسی طرح روایت کیا ہے اور اتنا اضافہ نقل کیا ہے کہ آپ ؐ کی قبر زمین سے صرف ایک بالشت برابر اونچی بنائی گئی۔ (ابن حبان نے اسے صحیح قرار دیا ہے)

وَلِمُسْلِمٍ عَنْهُ: نَهَى رَسُولُ اللهِ ﷺ، أَنْ يُجَصَّصَ القَبْرُ، وَأَنْ يُقْعَدَ عَلَيْهِ، وَأَنْ يُبْنَى عَلَيْهِ.

اور مسلم میں جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی ﷺ نے منع فرمایا ہے کہ "قبر کو پختہ کیا جائے اور اس پر بیٹھا جائے اور اس پر عمارت تعمیر کی جائے۔"

لغوی تشریح: ﴿ الحدوا ﴾ فتح یفتح سے امر کا صیغہ۔ لحد۔ قبر کے قبلہ رخ گڑھے کو کہتے ہیں جہاں سے میت کو قبر میں اتارا جاتا ہے ﴿ وانصبوا ﴾ ضرب یضرب سے صیغہ امر ہے۔ اقیموا کے معنی میں یعنی نصب کرو' قائم کرو ﴿ اللبن ﴾ لام پر فتحہ اور "با" کے نیچے کسرہ' اینٹ جو گارے سے بنائی جاتی ہے جب اسے آگ میں پکایا جائے تو "آجر" کہتے ہیں یہ جیم پر ضمہ اور "را" پر تشدید ﴿ قدر شبر ﴾ شین پر کسرہ اور "با" ساکن۔ یہ فاصلہ ہے جو انگوٹھے کے سرے سے لے کر چھنگلی کے سر تک۔ یعنی بالشت۔ ﴿ ان

﴿ یجصص القبر ﴾ تجصیص سے ماخوذ ہے اور صیغہ مجہول ہے یعنی چونا گچ اور پختہ عمارت۔ ﴿ وان یبنی علیہ ﴾ صیغہ مجہول۔ یعنی قبر کو بلند اور نمایاں کرنے کی غرض سے اس پر عمارت تعمیر نہ کی جائے یا قبر پر گنبد وغیرہ جیسی عمارت نہ بنائی جائے۔

حاصل کلام: اس حدیث سے کئی مسائل پر روشنی پڑتی ہے۔ (۱) قبر ایک بالشت سے زیادہ اونچی نہیں ہونی چاہیئے۔ (۲) قبر کو بغلی بنانا آپ ؐ کے نزدیک پسندیدہ تھا۔ (۳) کچی اینٹیں اندر لگانی چاہئیں۔ (۴) قبر پر کسی قسم کی عمارت تعمیر کرنا اور قبر کو پختہ بنانا شرعاً منع ہے اور یہ ممانعت تحریمی ہے۔ (۵) نیز قبر کو کوئی مخصوص شکل دینا بھی درست نہیں۔ نبی ﷺ کی ابدی آرام گاہ کوہان نما تھی اور ایک بالشت سے بلند نہیں تھی اور یہی کیفیت حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ و عمر رضی اللہ عنہ کی قبروں کی تھی۔

(٤٦٩) وَعَنْ عَامِرِ بْنِ رَبِيْعَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ صَلَّى عَلَى عُثْمَانَ بْنِ مَظْعُونٍ، وَأَتَى الْقَبْرَ، فَحَثَى عَلَيْهِ ثَلاثَ حَثَيَاتٍ، وَهُوَ قَائِمٌ. رَوَاهُ الدَّارَقُطْنِيُّ.

حضرت عامر بن ربیعہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی ﷺ نے عثمان بن مظعون رضی اللہ عنہ کی نماز جنازہ پڑھی اور ان کی قبر پر تشریف لائے اور کھڑے کھڑے تین لپ مٹی ڈالی۔ (سنن دار قطنی)

حاصل کلام: اس حدیث سے ثابت ہوا کہ میت کو قبر میں داخل کرنے کے بعد وہاں موجود آدمیوں کو تین تین مٹھیاں بھر کر مٹی کھڑے کھڑے ڈالنی چاہیئے۔

راوی حدیث: ﴿ عثمان بن مظعون جمحی قرشی رضی اللہ عنہ ﴾ آپ اکابر صحابہ ؓ میں سے تھے۔ بڑے عابد و زاہد صحابی ؓ تھے۔ جاہلیت ہی کے زمانہ میں انہوں نے اپنے اوپر شراب کو حرام قرار دے لیا تھا۔ ۱۳ آدمیوں کے بعد اسلام قبول کیا۔ دونوں ہجرتیں کیں۔ غزوۂ بدر میں حاضر ہوئے۔ مدینہ طیبہ میں ہجرت کے تیسویں ماہ، شعبان میں وفات پائی۔ مہاجرین میں سب سے پہلے یہی فوت ہوئے اور جنت البقیع میں دفن ہوئے۔ ان کی وفات کے بعد نبی ﷺ نے ان کو بوسہ دیا۔ جب تدفین سے فارغ ہوئے تو فرمایا وہ ہمارے بہترین پیشرو ہیں۔"

(٤٧٠) وَعَنْ عُثْمَانَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: كَانَ رَسُولُ اللهِ ﷺ إِذَا فَرَغَ مِنْ دَفْنِ الْمَيِّتِ وَقَفَ عَلَيْهِ، وَقَالَ: **اَسْتَغْفِرُوا لِأَخِيكُمْ، وَسَلُوا لَهُ التَّثْبِيتَ، فَإِنَّهُ الْآنَ يُسْأَلُ.** رَوَاهُ أَبُو دَاوُدَ، وَصَحَّحَهُ الْحَاكِمُ.

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ جب میت کی تدفین سے فارغ ہو جاتے تو قبر پر کھڑے ہو جاتے اور فرماتے کہ "اپنے بھائی کیلئے بخشش مانگو اور ثابت قدم رہنے کی دعا کرو کیونکہ اب اس سے باز پرس کی جائے گی۔" (اسے ابوداؤد نے روایت کیا ہے اور حاکم نے صحیح قرار دیا ہے)

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ میت سے قبر میں باز پرس ہوتی ہے۔ تدفین کے بعد دعا کرنا

میت کیلئے ثابت ہے۔ مگر اس دور میں لوگوں نے سنت کو پس پشت ڈال کر نئی نئی رسمیں ایجاد کر لی ہیں اور اذانیں شروع کر دی ہیں جس کا شریعت میں کوئی ثبوت نہیں۔

(٤٧١) وَعَنْ ضَمْرَةَ بْنِ حَبِيْبٍ - أَحَدِ التَّابِعِيْنَ - قَالَ: كَانُوا يَسْتَحِبُّونَ إِذَا سُوِّيَ عَلَى الْمَيِّتِ قَبْرُهُ وَانْصَرَفَ النَّاسُ عَنْهُ، أَنْ يُقَالَ عِنْدَ قَبْرِهِ: يَا فُلاَنُ! قُلْ لاَ إِلَهَ إِلاَّ اللَّهُ، ثَلاَثَ مَرَّاتٍ، يَا فُلاَنُ! قُلْ: رَبِّيَ اللَّهُ، وَدِيْنِي الإِسْلاَمُ، وَنَبِيِّ مُحَمَّدٌ ﷺ. رَوَاه سَعِيْدُ بْنُ مَنْصُورٍ مَوْقُوفاً، وَلِلطَّبَرَانِيِّ نَحْوُهُ مِنْ حَدِيْثِ أَبِي أُمَامَةَ مَرْفُوعاً مُطَوَّلاً.

حضرت ضمرہ بن حبیب رحمۃ اللہ علیہ جو ایک تابعی ہیں سے مروی ہے کہ لوگ مستحب سمجھتے تھے کہ جب میت کی قبر برابر و ہموار کر دی جاتی اور لوگ جانے لگتے تو قبر کے پاس کھڑے ہو کر میت کو مخاطب ہو کر یوں کہا جائے اے فلاں (لا الہ الا اللہ) کہو۔ (اللہ کے سوا کوئی معبود برحق نہیں)۔ اس کو تین مرتبہ کہتے۔ اے فلاں! "ربی اللہ و دینی الاسلام و نبی محمد" کہو۔ (میرا رب اللہ ہے' میرا دین اسلام ہے اور محمدؐ میرے نبی ہیں)

(سعید بن منصور نے اسے موقوف بیان کیا ہے اور طبرانی نے اسی طرح کی ابوامامہ رضی اللہ عنہ کی لمبی مرفوع حدیث بیان کی ہے)

لغوی تشریح: ﴿ کانوا یستحبون ﴾ پسند کرنے والوں سے یہاں صحابہ کرامؓ مراد ہیں۔ ﴿ سوی ﴾ تسویہ سے ماخوذ ہے' علامہ ابن قیم نے المنار میں کہا ہے کہ تلقین کی یہ مرفوع حدیث فن حدیث کی معرفت رکھنے والوں کے نزدیک موضوع ہونے میں ذرا بھر شک نہیں۔ اسی طرح انہوں نے "الھدیٰ" میں بھی پورے جزم اور اعتماد سے کہا ہے کہ یہ موضوع اور من گھڑت روایت ہے اور کتاب الروح میں اسے ضعیف کہا ہے۔ علامہ یمانی فرماتے ہیں کہ یہ حدیث ضعیف ہے اس پر عمل کرنا بدعت ہے اور اس پر اکثر لوگوں کے عمل سے دھوکہ نہیں کھانا چاہئے۔

حاصل کلام: میت کو دفن کرنے کے بعد میت کو مخاطب کر کے تلقین کرنا کسی بھی صحیح یا حسن روایت سے ثابت نہیں۔ امام احمد رحمۃ اللہ علیہ سے جب اس بارے میں سوال کیا گیا تو انہوں نے فرمایا اہل شام کے علاوہ میں نے یہ عمل کسی اور کو کرتے ہوئے نہیں دیکھا۔

راوی حدیث: ﴿ ضمرہ بن حبیب ﴾ ان کی کنیت ابوعتبہ ہے۔ ضمرہ میں ضاد پر فتحہ اور میم ساکن۔ سلسلہ نسب یوں ہے۔ ضمرہ بن حبیب بن صہیب زبیدی۔ زبیدی کی "زا" پر ضمہ ہے۔ حمص کے رہنے والے تھے اس لئے حمصی کہلائے۔ ثقہ تابعی ہیں اور چوتھے طبقہ میں شمار ہوتے ہیں۔

(٤٧٢) وَعَنْ بُرَيْدَةَ بْنِ الْحُصَيْبِ

حضرت بریدہ بن حصیب اسلمی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے

الأَسْلَمِيِّ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «كُنْتُ نَهَيْتُكُمْ عَنْ زِيَارَةِ القُبُورِ، فَزُورُوهَا». رَوَاهُ مُسْلِمٌ. زَادَ التِّرْمِذِيُّ: «فَإِنَّهَا تُذَكِّرُ الآخِرَةَ». زَادَ ابْنُ مَاجَهْ مِنْ حَدِيثِ ابْنِ مَسْعُودٍ: «وَتُزَهِّدُ فِي الدُّنْيَا».

کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا' میں نے تمہیں قبروں کی زیارت سے منع کیا تھا۔ اب ان کی زیارت کرو۔" (مسلم) ترمذی نے اتنا اضافہ کیا ہے کہ "قبروں کی زیارت آخرت کی یاد دلاتی ہے۔" اور ابن ماجہ نے ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی روایت میں اتنا اضافہ کیا ہے کہ "یہ زیارت دنیا سے بے رغبت بنا دیتی ہے۔"

لغوی تشریح: فزوروھا زیارت سے امر کا صیغہ ہے۔ ممانعت کے بعد اجازت کے معنی میں ہے۔ ﴿ تذکر ﴾ تذکیر سے ماخوذ ہے یعنی یاددہانی کراتی ہے۔ ﴿ تزھد ﴾ تزھید سے ماخوذ ہے۔ یعنی دنیا سے بے رغبت و زاہد بنا دیتی ہے۔ زیارت قبور سے بس یہی مقصود و مطلوب ہوتا ہے۔

حاصل کلام: اس حدیث سے ثابت ہوتا ہے کہ قبروں کی زیارت جائز ہے۔ ابتداء میں آپ ؐ نے اس سے منع فرمایا تھا مگر پھر اس کی اجازت دے دی اور اس سے مقصد آخرت کی یاد اور میت کیلئے بخشش و مغفرت کی دعا کرنا ہے۔ قبروں پر نذر و نیاز اور عرس کا شریعت مطہرہ میں کوئی جواز نہیں۔

(٤٧٣) وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، أَنَّ رَسُولَ اللهِ ﷺ لَعَنَ زَائِرَاتِ القُبُورِ. أَخْرَجَهُ التِّرْمِذِيُّ، وَصَحَّحَهُ ابْنُ حِبَّانَ.

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے قبروں کی زیارت کیلئے جانے والی خواتین پر لعنت فرمائی ہے۔ (اسے ترمذی نے نکالا ہے اور ابن حبان نے صحیح قرار دیا ہے)

حاصل کلام: یہ حدیث خواتین کا قبور کی زیارت کیلئے جانے کی حرمت پر دلالت کرتی ہے کیونکہ لعنت کسی حرام کام پر کی جاتی ہے حالانکہ بہت سی احادیث سے خواتین کا قبروں کی زیارت کیلئے جانا ثابت ہوتا ہے۔ ان میں تطبیق کی ایک صورت یہ ہے کہ یہ ممانعت زیارت قبور کی اجازت و رخصت سے پہلے کی ہے مگر جب اجازت و رخصت دی گئی تو اس میں مرد و عورت شامل ہیں اور ایک قول یہ بھی ہے کہ تاحال زیارت قبور کی حرمت خواتین کیلئے برقرار ہے' اس کی وجہ یہ ہے کہ عورتوں میں صبر کی کمی ہوتی ہے اور جزع و فزع' آہ و بکا کثرت سے کرتی ہیں اور بعض علماء کا قول ہے کہ خواتین کو زیارت قبور سے اس لئے منع کیا گیا ہے کہ وہ عموماً حرام کام کا ارتکاب کرتی ہیں۔ مثلاً جاہلیت کے طور طریقے اختیار کرتی ہیں' روتی پیٹتی اور بین کرتی ہیں' جزع و فزع کرتی ہیں اور چیختی چلاتی ہیں' یہ امور اسلام کی تعلیم کے منافی ہیں اس لئے ان سے منع کیا گیا ہے۔ اگر زیارت قبور عبرت حاصل کرنے' اخروی یاددہانی و تذکیر کیلئے ہو تو اس میں کوئی مضائقہ و حرج نہیں۔ علامہ شوکانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ صحیح حدیث میں "زوارات" کا لفظ ہے کہ عورتوں کے باکثرت قبرستان جانے پر آپ ؐ نے لعنت فرمائی۔ عبرت کیلئے گاہے بگاہے جانا جائز ہے۔

علامہ البانی نے بھی اسی بات کو صحیح کہا ہے اور فرمایا ہے "زائرات القبور" کے الفاظ ضعیف ہیں اور صحیح "زوارات القبور" کے الفاظ ہیں جن میں عورتوں کیلئے کثرت سے قبرستان جانے کی ممانعت ہے۔ (احکام الجنائز)

(٤٧٤) وَعَنْ أَبِيْ سَعِيْدِ الخُدْرِيِّ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: لَعَنَ رَسُولُ اللهِ ﷺ النَّائِحَةَ وَالمُسْتَمِعَةَ.

حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے نوحہ کرنے اور سننے والی پر لعنت فرمائی ہے۔ (ابوداؤد)

أَخْرَجَهُ أَبُو دَاوُدَ.

لغوی تشریح: نائحة نیاحة سے ماخوذ ہے۔ مرنے والے کے اوصاف و شمائل کو گن گن کر بلند آواز سے بیان کرنا اور رونا اور اچھے اور عمدہ کارناموں کو بیان کر کے چیخ و پکار کرنا۔

حاصل کلام: اس حدیث سے نوحہ کرنے اور سننے کی حرمت ثابت ہوتی ہے بلکہ نبی کریم ﷺ عورتوں سے نوحہ نہ کرنے کا باقاعدہ عہد لیتے تھے۔ جیسا کہ آئندہ حدیث میں آرہا ہے۔

(٤٧٥) وَعَنْ أُمِّ عَطِيَّةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهَا قَالَتْ: أَخَذَ عَلَيْنَا رَسُولُ اللهِ ﷺ أَنْ لاَ نَنُوحَ. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت ام عطیہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ہم سے بیعت کے موقع پر یہ عہد لیا تھا کہ ہم میت پر نوحہ نہ کریں گی۔ (بخاری و مسلم)

حاصل کلام: اس سے صاف طور پر معلوم ہو رہا ہے کہ مرنے والوں پر نوحہ اور بین کرنا، چیخنا چلانا، واویلا کرنا، گریباں چاک کرنا، منہ نوچنا حرام افعال ہیں۔ غمی سے آنکھوں کا اشک بار ہونا، آنسوؤں کا بے اختیار بہہ نکلنا حرام نہیں۔ گویا آنکھوں کا فعل حرام نہیں بلکہ زبان کا فعل حرام ہے۔

(٤٧٦) وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُمَا، عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ: «المَيِّتُ يُعَذَّبُ فِي قَبْرِهِ بِمَا نِيحَ عَلَيْهِ». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ، وَلَهُمَا نَحْوُهُ عَنِ المُغِيْرَةِ بْنِ شُعْبَةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُ.

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا "مرنے والے کو اس پر نوحہ کرنے والوں کے سبب سے قبر میں عذاب دیا جاتا ہے۔" (بخاری و مسلم نیز ان دونوں نے مغیرہ بن شعبہ کے واسطہ سے اسی طرح روایت بیان کی ہے۔)

لغوی تشریح: ﴿المیت یعذب﴾ اس حدیث میں ایک اشکال ہے کیونکہ اس کی رو سے دوسرے کسی کے رونے کی وجہ سے مرنے والے کو عذاب ثابت ہو رہا ہے حالانکہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ولا تزر وازرۃ وزر اخری (۱۵/۱۷) کہ "کوئی کسی کا بوجھ نہیں اٹھائے گا۔" اس لئے علماء کرام نے اس اشکال کے متعدد جوابات دیئے ہیں ان میں سے ایک قول ہے کہ اگر نوحہ مرنے والے کا اپنا طریقہ ہو اور زندگی میں اس نے اسے برقرار رکھا ہو پھر تو اسے عذاب ہوگا اور ایک قول یہ بھی ہے کہ مرنے والے کو عذاب اس صورت میں ہوگا کہ وہ خود اس کی وصیت کر گیا ہو۔ بصورت دیگر اسے عذاب نہیں دیا جائے گا۔

(٤٧٧) وَعَنْ أَنَسٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: شَهِدْتُ بِنْتاً للنَّبِيِّ ﷺ تُدْفَنُ، وَرَسُولُ اللهِ ﷺ جَالِسٌ عِنْدَ القَبْرِ، فَرَأَيْتُ عَيْنَيْهِ تَدْمَعَانِ. رَوَاهُ البُخَارِيُّ.

حضرت انس رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ میں نبی ﷺ کی ایک صاحبزادی کی تدفین کے موقع پر حاضر تھا۔ رسول اللہ ﷺ قبر کے پاس بیٹھے ہوئے تھے کہ میں نے دیکھا آپؐ کی دونوں آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔ (بخاری)

لغوی تشریح: ﴿شهدت بنتا﴾ یہ آپؐ کی صاحبزادی اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی زوجہ محترمہ حضرت ام کلثوم رضی اللہ عنہا تھیں۔ جنہوں نے ۹ھ میں وفات پائی۔ ﴿تدفن﴾ صیغہ مجہول ہے یعنی اس کی تدفین کے موقع پر۔ ﴿تدمعان﴾ "تا" اور میم دونوں پر فتحہ یعنی اشک رواں تھے۔ آنسو بہہ رہے تھے۔

حاصل کلام: اس حدیث سے ثابت ہوا کہ میت پر رونا جائز ہے۔ نبی ﷺ کے اپنے لخت جگر حضرت ابراہیم رضی اللہ عنہ کی وفات کے موقع پر آنسو بہہ نکلے تھے تو حضرت عبدالرحمٰن ابن عوف رضی اللہ عنہ نے کہا یا رسول اللہ (ﷺ)! کیا آپؐ بھی گریہ و زاری کرتے ہیں؟ آپؐ نے جواب میں فرمایا "یہ بے صبری کی وجہ سے نہیں بلکہ شفقت پدری کی بنا پر ہے۔" گویا غم کی وجہ سے شفقت پدری جوش مارے اور آنکھوں سے آنسو جاری ہو جائیں تو قابل مذمت و ملامت نہیں البتہ زبان سے چیخ و پکار اور نوحہ کرنا منع ہے۔

(٤٧٨) وَعَنْ جَابِرٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُ، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ قَالَ: «لاَ تَدْفِنُوا مَوْتَاكُمْ بِاللَّيْلِ إِلاَّ أَنْ تُضْطَرُّوا إِلَيْهِ». أَخْرَجَهُ ابْنُ مَاجَهْ، وَأَصْلُهُ فِيْ مُسْلِمٍ، لَكِنْ قَالَ: زَجَرَ أَنْ يُقْبَرَ الرَّجُلُ فِي اللَّيْلِ حَتَّى يُصَلَّى عَلَيْهِ.

حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا کہ "اپنے مرنے والوں کو رات کے اوقات میں دفن نہ کرو الاّ یہ کہ تم اس کیلئے مجبور ہو جاؤ۔" (ابن ماجہ) اس کی اصل مسلم میں ہے لیکن اسی میں ہے کہ آپؐ نے رات کو دفن کرنے پر ڈانٹا الاّ یہ کہ نماز جنازہ پڑھ لی جائے۔

لغوی تشریح: ﴿لا تدفنوا﴾ باب ضرب یضرب سے ہے۔ دفن نہ کرو۔ ﴿زجر﴾ زجر سے ماخوذ ہے۔ سختی سے ڈانٹ پلانا اور روک دینا۔ مسلم کی حدیث میں رات کے اوقات میں میت کو دفن کرنے کی ممانعت صرف اس گمان کے تحت ہے کہ رات کے وقت نماز جنازہ میں لوگ کم تعداد میں شریک ہوں گے۔

حاصل کلام: یہ وجہ بھی ہو سکتی ہے کہ رات کے وقت کفن اچھی طرح نہ دیا جا سکے گا۔ اگر نماز جنازہ دن کے وقت پڑھ لی جائے اور کسی عذر سے دفن کی نوبت رات کو آئے تو یہ منع نہیں۔ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا بنت محمد ﷺ کو رات ہی میں دفن کیا گیا تھا۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی تدفین بھی رات ہی کو ہوئی تھی بلکہ خود رسالت مآب ﷺ نے ایک صحابی کو رات کو دفن کیا تھا۔ (ترمذی' ابن ماجہ) یہ اور اسی موضوع کی دوسری احادیث سے ثابت ہوتا ہے کہ رات کو کسی خاص وجہ کے بغیر بھی دفن کرنا جائز ہے۔ جمہور اسی

کے قائل ہیں۔ مگر امام حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ ' سعید بن مسیب رحمۃ اللہ علیہ اور متاخرین میں ابن حزم رحمۃ اللہ علیہ کا خیال ہے کہ رات کو بلاضرورت دفن کرنا مکروہ ہے۔

(٤٧٩) وَعَنْ عَبْدِ اللهِ بْنِ جَعْفَرٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: لَمَّا جَاءَ نَعْيُ جَعْفَرٍ، حِيْنَ قُتِلَ، قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ، «اصْنَعُوا لِآلِ جَعْفَرٍ طَعَاماً، فَقَدْ أَتَاهُمْ مَا يَشْغَلُهُمْ». أَخرَجَهُ الخَمْسَةُ إِلاَّ النَّسَائِيُّ.

حضرت عبداللہ بن جعفر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ جب جعفر بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کی شہادت کی خبر موصول ہوئی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "جعفر رضی اللہ عنہ کے گھر والوں کیلئے کھانا تیار کرو۔ ان کو ایسی تکلیف وہ اطلاع ملی ہے جو ان کو کھانا پکانے سے مشغول رکھے گی۔" (نسائی کے علاوہ اسے پانچوں نے روایت کیا ہے۔)

حاصل کلام : اس حدیث سے معلوم ہوا کہ جن کا کوئی عزیز وفات پا جائے تو ان کو کھانا کھلانا مسنون ہے۔ ہمسایہ کا حق سب سے پہلے اور سب سے زیادہ ہے۔ کھانا صرف میت کے گھر والوں اور ان کے دور سے آئے ہوئے اعزاء و اقرباء کیلئے سنت ہے باقی محلے دار اور تدفین میں شریک لوگ اس کے مستحق نہیں ہیں۔ اہل خانہ کا کھانا پکانا اور ان کے ہاں جمع ہونا درست نہیں۔ حدیث میں اس کی ممانعت ثابت ہے۔

راوی حدیث : ﴿ جعفر بن ابی طالب رضی اللہ عنہ ﴾ حضرت جعفرؓ ابو طالب کے بیٹے اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بھائی تھے اور ان سے دس برس بڑے تھے۔ حبشہ کی طرف ہجرت کی۔ وہیں قیام پذیر ہوئے۔ نجاشی نے انہی کے ہاتھ پر اسلام قبول کیا۔ پھر انہوں نے مدینہ کی طرف بھی ہجرت فرمائی اور خیبر میں اس وقت پہنچے جب یہ فتح ہو چکا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی دونوں آنکھوں کے درمیان بوسہ دیا اور فرمایا "مجھے معلوم نہیں کہ جعفر کی آمد پر مجھے اتنی مسرت ہے یا خیبر کے فتح ہونے پر۔" انتہائی سخی انسان تھے۔ ۸ھ میں موتہ کے معرکہ میں جامِ شہادت نوش کیا اور جنت بریں کو سدھار گئے۔ اس معرکہ میں لشکر اسلام کی کمان ان کے ہاتھ میں تھی۔ دونوں بازو جنگ میں بدن سے کٹ کر جدا ہو گئے تھے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "اللہ تعالیٰ نے ان کے دونوں ہاتھ کے بدلہ ان کے دو پر لگا دیئے ہیں۔ جن سے وہ جنت میں جہاں چاہیں پرواز کرتے پھرتے ہیں۔" اسی وجہ سے ان کو جعفر طیار کہا جاتا ہے اور جعفر ذوالجناحین بھی انہی کا لقب ہے۔

(٤٨٠) وَعَنْ سُلَيْمَانَ بْنِ بُرَيْدَةَ، عَنْ أَبِيهِ قَالَ: كَانَ رَسُولُ اللهِ ﷺ يُعَلِّمُهُمْ إِذَا خَرَجُوا إِلَى المَقَابِرِ، أَنْ يَقُولُوا: السَّلَامُ عَلَى أَهْلِ الدِّيَارِ مِنَ المُؤْمِنِيْنَ وَالمُسْلِمِيْنَ، وَإِنَّا إِنْ

حضرت سلیمان بن بریدہ رحمۃ اللہ علیہ اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ صحابہ کرامؓ جب قبرستان جاتے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کو سکھلاتے کہ یوں کہو۔ سلام ہو تم پر اے گھر والو! مومنوں اور مسلمانوں میں سے اور ہم بھی انشاء اللہ تمہارے ساتھ ملنے والے ہیں

شَآءَ اللّٰهُ بِكُمْ لاَحِقُونَ، نَسْأَلُ اللّٰهَ لَنَا وَلَكُمُ العَافِيَةَ. رَوَاهُ مُسْلِمٌ.

اور ہم اپنے اور تمہارے لئے اللہ سے عافیت کا سوال کرتے ہیں۔ (مسلم)

لغوی تشریح: ﴿اھل الدیار﴾ ان سے مراد قبروں میں پڑے ہوئے لوگ ہیں۔ دیار' دار کی جمع ہے۔ گھر کو قبر سے تشبیہہ دی گئی ہے اس لئے کہ قبر میت کیلئے گھر کی مانند ہے کہ وہ اس میں رہائش پذیر ہے۔

حاصل کلام: اس حدیث سے قبرستان میں جانا اور پھر ان کیلئے اور اپنے لئے مغفرت و بخشش کی دعا کرنا ثابت ہوتا ہے۔ "من المومنین والمسلمین" سے معلوم ہوتا ہے کہ مشرک' کافر اور ملحد کے لئے دعا و بخشش جائز نہیں۔ اس کے برعکس جو لوگ اہل قبور کو فریاد رس' مشکل کشا سمجھ کر ان سے فریادیں کرتے ہیں اور ان سے مرادیں مانگتے ہیں یہ سب کام خلاف شرع ہیں اور شرکیہ افعال ہیں۔ مسلمانوں کو ان سے ہر ممکن طریقہ سے بچنے کی کوشش کرنی چاہئے۔

راوی حدیث: ﴿سلیمان بن بریدہ بن حصیب اسلمی مروزی رحمہ اللہ﴾ مشہور تابعی ہیں۔ ابن معین اور ابوحاتم نے ان کو ثقہ قرار دیا ہے۔ امام حاکم رحمہ اللہ اور امام بخاری رحمہ اللہ کی رائے ہے کہ ان کا اپنے والد سے سماع کہیں مذکور نہیں مگر خزرجی نے کہا کہ ان کی اپنے والد سے متعدد احادیث مسلم میں منقول ہیں۔

(٤٨١) وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُما قَالَ: مَرَّ رَسُولُ اللهِ ﷺ بِقُبُورِ المَدِيْنَةِ فَأَقْبَلَ عَلَيْهِمْ بِوَجْهِهِ، فَقَالَ: «السَّلاَمُ عَلَيْكُمْ، يَا أَهْلَ القُبُورِ! يَغْفِرُ اللّٰهُ لَنَا وَلَكُمْ، أَنْتُمْ سَلَفُنَا، وَنَحْنُ بِالأَثَرِ». رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ، وَقَالَ: حَسَنٌ.

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ کا گزر مدینہ کے قبرستان پر ہوا۔ آپؐ ان کی طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا "اے اہل قبور! تم پر سلام ہو۔ اللہ ہماری اور تمہاری مغفرت فرمائے۔ تم ہمارے پیشرو ہو اور ہم تمہارے پیچھے چلے آرہے ہیں۔" (اسے ترمذی نے روایت کیا اور حسن قرار دیا ہے۔)

لغوی تشریح: ﴿انتم سلفنا﴾ سلفنا میں سین اور لام دونوں پر فتحہ ہے۔ یعنی پہلے فوت ہونے والے۔ ﴿ونحن بالاثر﴾ اثر میں همزہ اور "ثا" پر فتحہ' ہم تمہارے پیچھے پیچھے آرہے ہیں اور تمہیں ملنے والے ہیں۔

(٤٨٢) وَعَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهَا قَالَتْ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «لاَ تَسُبُّوا الأَمْوَاتَ، فَإِنَّهُمْ قَدْ أَفْضَوْا إِلَى مَا قَدَّمُوا». رَوَاهُ البُخَارِيُّ،

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "مردوں کو گالی مت دو اس لئے کہ انہوں نے جو بھیجا ہے اسے حاصل کر لیا ہے۔" (بخاری) ترمذی نے مغیرہ کے حوالہ سے اسی طرح

وَرَوَى التِّرْمِذِيُّ عَنِ الْمُغِيْرَةِ نَحْوَهُ، لَكِنْ قَالَ: «فَتُؤْذُوا الْأَحْيَاءَ». روایت کیا ہے لیکن اس میں فتوذوا الاحیاء ہے یعنی گالی سے تم زندہ لوگوں کو تکلیف دیتے ہو۔

لغوی تشریح: ﴿ لاتسبوا ﴾ سب سے ماخوذ ہے۔ باب نصر ینصر گالی گلوچ' سب و شتم' برے اور قبیح وصف سے پکارنا۔ ﴿ افضو ﴾ افضاء سے ماخوذ ہے۔ پہنچ گئے ہیں۔ پا چکے ہیں ﴿ الی ماقدموا ﴾ جو اعمال و افعال وہ آگے بھیج چکے ہیں یہ تقدیم سے ماخوذ ہے۔ ﴿ فتوذوا الاحیاء ﴾ ایذاء سے ماخوذ ہے۔ یعنی تمہارا مردوں کو برا بھلا کہنا' سب و شتم کرنا' زندوں کیلئے باعث اذیت ہے کیونکہ مرنے والوں کا ان سے قرابت داری کا تعلق ہے۔

حاصل کلام: اس حدیث سے ثابت ہوا کہ مرنے والوں کو سب و شتم نہیں کرنا چاہئے۔ ابولھب کی بیٹی درۃ مسلمان ہوئی تو بعض نے کہا اللہ کے دشمن کی بیٹی مسلمان ہوئی ہے۔ اس نے اس کی شکایت رسول اللہ ﷺ سے کی تو آپؐ نے فرمایا "مرنے والوں کو برا مت کہو۔ اس سے ان کی مسلمان ہونے والی اولاد کو تکلیف پہنچتی ہے۔" (مسند احمد) غور فرمائیں جب کفار کو ان کی مسلمان اولاد کے سامنے گالی دینا جائز نہیں تو مسلمانوں کے اکابرین کو گالی دینا اسلام کی کونسی خدمت ہے؟

٤ ۔ كِتَابُ الزَّكَاةِ

زکوٰۃ کے مسائل

(٤٨٣) وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ بَعَثَ مُعَاذاً رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ إِلَى الْيَمَنِ، فَذَكَرَ الْحَدِيْثَ، وَفِيْهِ: «إِنَّ اللَّهَ قَدِ افْتَرَضَ عَلَيْهِمْ صَدَقَةً فِي أَمْوَالِهِمْ، تُؤْخَذُ مِنْ أَغْنِيَائِهِمْ، فَتُرَدُّ عَلَى فُقَرَائِهِمْ». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ، وَاللَّفْظُ لِلْبُخَارِيِّ.

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ نبی ﷺ نے حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کو یمن کی طرف روانہ فرمایا' پھر ساری حدیث بیان کی جس میں ہے کہ "اللہ تعالیٰ کی جانب سے ان کے اموال پر زکوٰۃ فرض کی گئی ہے۔ جو ان کے اغنیاء سے وصول کی جائے اور انہی کے محتاجوں اور غریبوں میں تقسیم کر دی جائے۔" (بخاری)

لغوی تشریح: ﴿کتاب الزکاۃ﴾ لغت میں زکوٰۃ نمو یعنی زیادہ ہونے کو کہتے ہیں۔ اور پاکیزہ ہونا۔ زکوٰۃ کو بھی زکوٰۃ اسی لئے کہتے ہیں کہ یہ مال کو پاک کر دیتی ہے اور صاحب مال کو گناہوں سے پاک کر دیتی ہے اور زکوٰۃ دینے والے کے مال کو اور بڑھا دیتی ہے اور اس کے وقت فرضیت میں علماء کا اختلاف ہے۔ اکثر علماء کا قول یہ ہے کہ یہ ۲ھ میں فرض ہوئی' رمضان کی فرضیت سے پہلے اور تحقیق کرنے والوں کا خیال ہے کہ یہ فرض تو مکہ میں ہی ہو گئی مگر اس کے تفصیلی احکام مدینہ میں ۲ھ کو نازل ہوئے ہیں۔ ﴿بعث معاذا الی الیمن﴾ آپؐ نے ۱۰ھ میں معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کو قاضی یا عامل بنا کر اہل یمن کی طرف روانہ فرمایا اور ایک قول کے مطابق ۹ھ میں اور ایک تیسرے قول کے مطابق ۸ھ میں بھیجا۔ معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے عہد خلافت تک یمن ہی میں رہے۔ پھر شام کا رخ کیا اور طاعون عمواس کے زمانہ میں وفات پائی۔ ﴿فذکر الحدیث﴾ اس میں حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کیلئے وصیت تھی کہ انہیں اہل یمن کے ساتھ کیا سلوک انجام دینا ہے ﴿افترض﴾ فرض قرار دی گئی۔ ﴿فترد﴾ اس میں "فا" تعقیب کیلئے ہے یعنی وصول کرنے کے بعد غرباء میں تقسیم کر دی جائے گی۔ ﴿ترد﴾ رد سے ماخوذ ہے

اور صیغۂ مجہول ہے۔

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ رسالت مآب ﷺ کے عہد باسعادت سے زکوٰۃ کی وصولی اور اس کے مصارف کا سرکاری سطح پر انتظام ہوگیا تھا۔ نیز اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ جہاں سے زکوٰۃ حاصل کی جائے گی وہیں کے محتاجوں اور ضرورت مندوں میں تقسیم کر دی جائے گی۔ مقامی فقراء سے اگر زکوٰۃ بچ جائے تو پھر دوسرے علاقوں میں زکوٰۃ منتقل کی جاسکتی ہے۔ یہ غرباء کا حق ہے ان پر کوئی احسان نہیں۔

(٤٨٤) وَعَنْ أَنَسٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ أن أبا بكر رضي الله عنه كَتَبَ لَهُ: هٰذِهِ فَرِيْضَةُ الصَّدَقَةِ، الَّتِيْ فَرَضَهَا رَسُولُ اللهِ ﷺ عَلَى الْمُسْلِمِيْنَ، وَالَّتِيْ أَمَرَ اللَّهُ بِهَا رَسُولَهُ: «فِيْ كُلِّ أَرْبَعٍ وَعِشْرِيْنَ مِنَ الإِبِلِ فَمَا دُوْنَهَا الغَنَمُ: فِي كُلِّ خَمْسٍ شَاةٌ، فَإِذَا بَلَغَتْ خَمْساً وَعِشْرِيْنَ إِلَى خَمْسٍ وَثَلاثِيْنَ، فَفِيْهَا بِنْتُ مَخَاضٍ أُنْثَى، فَإِنْ لَّمْ تَكُنْ فَابْنُ لَبُونٍ ذَكَرٌ. فَإِذَا بَلَغَتْ سِتّاً وَثَلاثِيْنَ، إِلَى خَمْسٍ وَأَرْبَعِيْنَ فَفِيْهَا بِنْتُ لَبُونٍ أُنْثَى. فَإِذَا بَلَغَتْ سِتّاً وَأَرْبَعِيْنَ، إِلَى سِتِّيْنَ، فَفِيْهَا حِقَّةٌ طَرُوقَةُ الجَمَلِ. فَإِذَا بَلَغَتْ وَاحِدَةً وَسِتِّيْنَ، إِلَى خَمْسٍ وَسَبْعِيْنَ، فَفِيْهَا جَذَعَةٌ. فَإِذَا بَلَغَتْ سِتّاً وَسَبْعِيْنَ، إِلَى تِسْعِيْنَ، فَفِيْهَا بِنْتَا لَبُونٍ. فَإِذَا بَلَغَتْ إِحْدَى وَتِسْعِيْنَ، إِلَى عِشْرِيْنَ وَمِائَةٍ، فَفِيْهَا حِقَّتَانِ طَرُوْقَتَا الجَمَلِ. فَإِذَا زَادَتْ عَلَى عِشْرِيْنَ

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے حضرت انس رضی اللہ عنہ کو فریضۂ زکوٰۃ کے سلسلہ میں یہ تحریر لکھ کر دی تھی۔ جسے رسول اللہ ﷺ نے مسلمانوں پر مقرر فرمایا تھا اور جس کا حکم اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی ؐ کو دیا تھا کہ اونٹوں کی چوبیس یا اس سے کم تعداد پر بکریاں ہیں ہر پانچ اونٹوں پر ایک بکری جب تعداد پچیس سے بڑھ کر پینتیس ہو جائے تو اس تعداد پر ایک سالہ اونٹنی اگر میسر نہ ہو تو پھر دو سالہ نر بچہ اور جب چھتیس سے تعداد بڑھ کر پینتالیس تک پہنچ جائے تو ان میں دو سالہ اونٹنی اور جب چھیالیس سے بڑھ کر ساٹھ تک تعداد پہنچ جائے تو ان میں تین سالہ جوان اونٹ کی جفتی کے قابل اونٹنی اور جب اکسٹھ سے بڑھ کر پچھتر تک پہنچ جائے تو ان میں چار سالہ اونٹ اور جب چھہتر سے تعداد بڑھ کر نوے ہو جائے تو ان میں دو' دو سالہ دو اونٹنیاں اور پھر اکانوے سے بڑھ کر تعداد ایک سو بیس تک پہنچ جائے تو ان میں تین' تین سالہ دو جوان اونٹنیاں۔ جو اونٹ کی جفتی کے قابل ہوں۔ اور جب تعداد ایک سو بیس سے زائد ہو جائے تو پھر ہر چالیس اونٹوں پر ایک دو سالہ اونٹنی اور ہر پچاس پر تین سالہ اور جس کے پاس صرف چار ہی اونٹ ہوں تو اس تعداد

وَمِائَةٍ، فَفِيْ كُلِّ أَرْبَعِيْنَ بِنْتُ لَبُونٍ، وَفِيْ كُلِّ خَمْسِيْنَ حِقَّةٌ. وَمَنْ لَّمْ يَكُنْ مَّعَهُ إِلاَّ أَرْبَعٌ مِنَ الإِبِلِ، فَلَيْسَ فِيْهَا صَدَقَةٌ، إِلاَّ أَنْ يَشَاءَ رَبُّهَا. وَفِيْ صَدَقَةِ الغَنَمِ، فِيْ سَائِمَتِهَا: إِذَا كَانَتْ أَرْبَعِيْنَ، إِلَى عِشْرِيْنَ وَمِائَةِ شَاةٍ، شَاةٌ. فَإِذَا زَادَتْ عَلَى عِشْرِيْنَ وَمِائَةٍ إِلَى مِائَتَيْنِ، فَفِيْهَا شَاتَانِ. فَإِذَا زَادَتْ عَلَى مِائَتَيْنِ، إِلَى ثَلاَثِمَائَةٍ، فَفِيْهَا ثَلاَثُ شِيَاهٍ. فَإِذَا زَادَتْ عَلَى ثَلاَثِمَائَةٍ، فَفِيْ كُلِّ مِائَةٍ، شَاةٌ. فَإِذَا كَانَتْ سَائِمَةُ الرَّجُلِ نَاقِصَةً عن أَرْبَعِيْنَ شَاةً، شَاةً، وَاحِدَةً، فَلَيْسَ فِيْهَا صَدَقَةٌ، إِلاَّ أَنْ يَّشَاءَ رَبُّهَا، وَلاَ يُجْمَعُ بَيْنَ مُتَفَرِّقٍ، وَلاَ يُفَرَّقُ بَيْنَ مُجْتَمِعٍ، خَشْيَةَ الصَّدَقَةِ. وَمَا كَانَ مِنَ خَلِيْطَيْنِ، فَإِنَّهُمَا يَتَرَاجَعَانِ بَيْنَهُمَا بِالسَّوِيَّةِ. وَلاَ يُخْرَجُ فِي الصَّدَقَةِ هَرِمَةٌ، وَلاَ ذَاتُ عَوَارٍ، وَلا تَيْسٌ، إِلاَّ أَنْ يَشَاءَ الْمُصَدِّقُ. وَفِي الرِّقَةِ: فِي مِائَتَي دِرْهِمٍ، رُبْعُ العُشْرِ، فَإِنْ لَّمْ تَكُنْ إِلاَّ تِسْعِيْنَ وَمِائَةً، فَلَيْسَ فِيْهَا صَدَقَةٌ، إِلاَّ أَن يَشَاءَ رَبُّهَا. وَمَنْ بَلَغَتْ عِنْدَهُ مِنَ الإِبِلِ صَدَقَةُ الجَذَعَةِ، وَلَيْسَتْ عِنْدَهُ جَذَعَةٌ، وَعِنْدَهُ حِقَّةٌ، فَإِنَّهَا تُقْبَلُ مِنْهُ الحِقَّةُ،

پر کوئی زکوٰۃ نہیں الاّ یہ کہ ان کا مالک چاہے اور بکریوں کی زکوٰۃ کہ جو باہر چرنے جاتی ہوں' چالیس سے لے کر ایک سو بیس کی تعداد پر صرف ایک بکری زکوٰۃ میں وصول کی جائے گی۔ جب یہ تعداد ایک سو بیس سے بڑھ کر دو سو تک پہنچ جائے گی تو دو بکریاں زکوٰۃ میں وصول کی جائیں گی۔ پھر جب دو سو سے بڑھ کر تین سو تک پہنچ جائے گی تو تین بکریاں وصول کی جائیں گی۔ جب تعداد تین سو سے بڑھ جائے گی تو ہر سو پر ایک بکری زکوٰۃ وصول ہو گی' اگر کسی کی باہر جنگل میں چرنے والی بکریاں چالیس سے ایک بھی کم تعداد میں ہوں تو مالک پر کوئی زکوٰۃ نہیں الاّ یہ کہ مالک چاہے۔ زکوٰۃ کے ڈر سے نہ تو الگ الگ چرنے والیوں کو اکٹھا کیا جائے اور نہ ہی اکٹھی چرنے والیوں کو الگ الگ۔ اور جو جانور دو آدمیوں کے درمیان مشترکہ ہوں وہ مساوی طور پر زکوٰۃ کا حصہ نکالیں۔ زکوٰۃ کی مد میں بوڑھا اور نہ یک چشم جانور اور نہ سانڈ لیا جائے الاّ یہ کہ زکوٰۃ دینے والا آپ چاہے اور چاندی کے سکوں کا نصاب دو سو درہم ہے اس میں سے چالیسواں حصہ زکوٰۃ ہے۔ اگر کسی کے پاس دو سو درہم سے ایک درہم بھی کم ہے تو اس پر زکوٰۃ واجب نہیں الاّ یہ کہ اس کا مالک خود دینا چاہے۔ اور جس کے اونٹوں کی زکوٰۃ میں چار سالہ اونٹ واجب الوصول ہو اور اس کے پاس اس عمر کا اونٹ نہ ہو اور یہ اس کے پاس تین سالہ ہو جوان اونٹنی تو اس سے دو بکریاں اور تین سالہ جفتی کے لائق جوان اونٹنی وصول کیا جائے بشرطیکہ بکریاں بآسانی دستیاب

وَيَجْعَلُ مَعَهَا شَاتَيْنِ إِنِ اسْتَيْسَرَتَا لَهُ، أَوْ عِشْرِيْنَ دِرْهَماً. وَمَنْ بَلَغَتْ عِنْدَهُ صَدَقَةُ الحِقَّةِ، وَلَيْسَتْ عِنْدَهُ الحِقَّةُ، وَعِنْدَهُ الجَذَعَةُ. فَإِنَّهَا تُقْبَلُ مِنْهُ الجَذَعَةُ، وَيُعْطِيْهِ المُصَدِّقُ عِشْرِيْنَ دِرْهَماً أَوْ شَاتَيْنِ. رَوَاهُ البُخَارِيُّ.

ہو سکیں یا بیس درہم دینا ہوں گے اور جس کی زکوٰۃ میں تین سالہ جوان اونٹنی آتی ہو ہو اور اس کے پاس چارسالہ اونٹ ہو تو اس سے وہی چار سالہ اونٹ ہی وصول کر لیا جائے گا مگر زکوٰۃ وصول کرنے والا اسے بیس درہم یا دو بکریاں واپس دے گا۔ (بخاری)

لغوی تشریح: ﴿ کتب لہ ﴾ حضرت انس رضی اللہ عنہ کو تحریر کر کے دیا جب ان کو بحرین کی طرف زکوٰۃ کی وصولی پر عامل بنا کر بھیجا۔ ﴿ ھذہ فریضۃ الصدقۃ ﴾ یہ فرضیت زکوٰۃ کا نوشتہ ہے۔ اس تحریری مکتوب کا آغاز اس سے ہوتا ہے۔ بخاری میں مکتوب سے پہلے بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ہے ﴿ فما دونھا ﴾ اس تعداد سے کم کا مطلب ہے جو بیس سے کم۔ الغنم بکری اور بھیڑ دونوں کیلئے استعمال ہوتا ہے۔ یہاں الغنم مبتداء مؤخر ہے اور اس کی خبر ﴿ فی کل اربع وعشرین فما دونھا ﴾ ہے جس کا مطلب ہے کہ اس تعداد و مقدار میں بکری یا بھیڑ زکوٰۃ میں نکالنا ہے۔ ﴿ فی کل خمس ﴾ ہر پانچ کی تعداد میں سے مراد اونٹ ہیں۔ جب پانچ اونٹ ہوں گے تو زکوٰۃ کا نصاب شروع ہوگا اور اس تعداد پر ﴿ شاۃ ﴾ ایک بکری یا بھیڑ دینا ہوگی ﴿ بنت مخاض ﴾ اس اونٹنی کو کہتے ہیں جو ایک سال پورا کر کے دوسرے سال میں قدم رکھ چکی ہو۔ "مخاض" اس اونٹنی کو کہتے ہیں جو اس عمر کو پہنچ چکی ہو کہ وہ حاملہ ہونے کی صلاحیت تو رکھتی ہو مگر ہنوز حاملہ نہ ہوئی ہو۔ اسے مخاض اس لئے کہا جاتا ہے کہ اس کی ماں کا شمار ان میں ہے جو حاملہ ہوتی ہیں اور مؤنث کی قید تاکید کیلئے ہے اور اس پر متنبہ کرنا مقصود ہے کہ نر اونٹ وہ کام نہیں دے سکتا جو مادہ دے سکتی ہے۔ ﴿ ابن لبون ﴾ لبون کے لام پر فتحہ ہے۔ وہ اونٹ جو دو سال مکمل کر کے تیسرے سال میں داخل ہو چکا ہو۔ ﴿ بنت لبون ﴾ وہ اونٹ جو دو سال مکمل کر کے تیسرے سال میں قدم رکھ چکی ہو۔ ﴿ حقہ ﴾ "حا" کے نیچے کسرہ اور قاف پر تشدید۔ مادہ (اونٹنی) جو تین سال کی عمر پوری کر کے چوتھے سال میں قدم رکھ چکی ہو۔ اس کی جمع حقاق آتی ہے اور مذکر اس کا ﴿ حق ﴾ "حاء" کا کسرہ ہے۔ "حقہ" اسے اس لئے کہتے ہیں کہ اس پر سواری کی جا سکتی ہے اور بار برداری کے قابل ہو جاتی ہے اور نر کی جفتی کے بھی قابل ہو جاتی ہے۔ اسی وجہ سے اسے ﴿ طروقۃ الجمل ﴾ کہا گیا ہے۔ مراد اس سے یہ ہے کہ یہ اس قابل ہو جاتی ہے کہ نر اگر اس پر جفتی کے ذریعہ وطی کرے تو کر سکتا ہے خواہ اس سے وطی نہ کی ہو۔ ﴿ جذعۃ ﴾ جیم اور ذال دونوں پر فتحہ جو پورے چار کو پہنچ چکی ہو اور پانچویں میں قدم رکھ چکی ہو۔ ﴿ فاذا زادت ﴾ جب تعداد اس سے زیادہ ہو جائے ﴿ علی عشرین

ومائۃ ﴾ ایک سو بیس سے خواہ ایک ہی کا اضافہ ہو۔ ﴿ ففی کل اربعین ﴾ تو ان کو چالیس اور پچاس کے دو زمروں میں تقسیم کر لیں گے۔ مثلاً جب مذکورہ تعداد میں ایک کا اضافہ ہو جانے کی صورت میں اس تعداد کو تین مرتبہ چالیس شمار کیا جائے گا اور ایک کے زائد عدد کا کوئی وزن نہیں۔ تین دفعہ چالیس کی صورت میں تین بنت لبون وصول کی جائیں گی۔ یہ ایک سو تیس تک کی زکوٰۃ ہوگی اور ایک سو تیس کی صورت میں پچاس پر حقہ اور چالیس پر دو بنت لبون' بس اسی طرح دس کے اضافہ کی صورت میں تبدیلی اور تغیر واقع ہوگا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا مکتوب گرامی اسی پر دلالت کرتا ہے کہ جب اونٹوں کی تعداد ایک سو اکیس ہو جائے تو ان میں تین بنت لبون زکوٰۃ ہوگی تاوقتیکہ یہ تعداد ایک سو انتیس تک پہنچ جائے۔ مدعا و مقتضاء کلام یہ ہے کسروں کو شمار میں نہیں رکھا جاتا اور تمام دہائیوں میں زکوٰۃ ہے (مثلاً دس' بیس' تیس علی ھذا القیاس)۔ (عون المعبود اور سبل الاسلام) الا ان یشاء ربھا الآیہ کہ اونٹوں کا مالک رضاکارانہ طور پر اپنی طرف سے نفلی طور پر زکوٰۃ کو نکالنا چاہے تو نکال سکتا ہے۔ اس پر واجب نہیں ہے۔ ﴿ فی سائمتھا ﴾ سے مراد زکوٰۃ میں وصول کی جانے والی بکریاں "سائمہ" وہ بکری جس کی زندگی کا انحصار جنگلوں میں چرنا ہو اور گھر پر چارہ بہت کم کھاتی ہو۔ جمہور کے نزدیک جنگل میں چرنے کی قید لازمی ہے۔

﴿ الی عشرین ومائۃ شاۃ شاۃ ﴾ ایک سو بیس تک کی تعداد میں صرف ایک بکری ہے پہلا "شاۃ" کا لفظ مائۃ کی تمیز ہے اور دوسرا شاۃ مرفوع ہے اور یہ مبتداء ہے اور اس کی خبر پہلا جملہ ﴿ فی صدقۃ الغنم ﴾ ہے اور شاۃ کے لفظ میں نر و مادہ' بھیڑ اور بکری دونوں شامل ہیں اور غنم کا لفظ شاہ کا مترادف ہے یعنی شاۃ اور غنم دونوں ہم معنی ہیں اور ﴿ فاذا زادت علی عشرین ومائۃ ﴾ جب ایک سو بیس پر اضافہ ہو جائے خواہ ایک ہی عدد کا کیوں نہ ہو اس میں دو بکریاں ہیں اور جب دو سو سے زیادہ ہو کر تین سو ہو جائیں تو تین بکریاں ﴿ فاذازادت علی ثلث مائۃ ففی کل مائۃ شاۃ ﴾ اور جب تین سو سے تعداد میں اضافہ ہو جائے تو ہر سو میں ایک بکری کی زکوٰۃ وصول کی جائے گی۔ بظاہر تو اس سے یہی مفہوم سمجھ میں آتا ہے کہ چوتھی بکری اس وقت دینا ضروری ہوتا ہے جبکہ تعداد چار سو تک پہنچ جائے۔ جمہور کا یہی قول ہے اور ایک قول یہ بھی ہے کہ جب تین سو پر ایک کا بھی اضافہ ہو جائے گا تو اس تعداد میں چار بکریاں دینا ہوں گی۔ پہلی بات قابل ترجیح ہے اور اس کی تائید وہ روایت بھی کر رہی ہے جسے ترمذی نے ابن عمر رضی اللہ عنہما کے حوالہ سے مرفوعاً نقل کیا ہے "کہ جب تین سو بکریوں میں ایک کا مزید اضافہ ہو جائے تو پھر ہر ایک سو بکریوں پر ایک بکری ہے' جب تک تعداد میں پورے سو کا اضافہ نہیں ہو جاتا اس میں کوئی زکوٰۃ نہیں۔" ﴿ فاذا کانت سائمۃ الرجل ﴾ جب آدمی کے جانور جنگل میں چرنے چگنے والے چالیس سے تعداد میں کم ہوں تو ان پر ایک بکری بھی زکوٰۃ دینا نہیں بنتی۔ ﴿ ناقصۃ ﴾ منصوب ہے۔ کانت کی خبر واقع ہو رہی ہے۔ ﴿ من اربعین شاۃ شاۃ واحدۃ ﴾ دونوں شاۃ پر فتحہ ہے اس لئے منصوب ہے پہلی صورت میں عدد سے تمیز واقع ہو رہی ہے اور دوسری صورت میں حرف جر محذوف ہے جسے نزع الخافض کہتے ہیں یعنی بشاۃ واحدۃ یا پھر یہ ناقصہ مفعول ہے۔ مطلب ساری گفتگو کا یہ ہوا کہ جب کسی آدمی کے

پاس باہر چرنے چگنے والے جانوروں کی تعداد چالیس سے ایک بھی کم ہو تو ان میں کوئی زکوٰۃ نہیں ہے اور جب تعداد ایک سے بھی زیادہ کم ہو پھر تو کسی صورت بھی زکوٰۃ نہیں۔ ﴿ ولا یجمع ﴾ صیغہ مجہول (نہ جمع کیا جائے گا نہ اکٹھا کیا جائے گا) "ولا یفرق" "را" پر تشدید (صیغہ مجہول) ﴿ خشیۃ الصدقۃ ﴾ منصوب' مفعول لہ واقع ہو رہا ہے یعنی زکوٰۃ زیادہ یا کم دینے کے خوف و اندیشہ کے پیش نظر' زیادہ کا اندیشہ ہو تو مالک کو ہوگا اور کم کا خوف زکوٰۃ وصول کرنے والے کیلئے۔ دونوں فریقین کیلئے یکساں طور پر عائد ہوتی ہے۔ الگ الگ کو جمع کرنے کی صورت یہ ہے کہ مثلاً تین آدمی ہیں ہر ایک کی چالیس چالیس بکریاں ہیں۔ الگ الگ کی صورت میں ہر ایک کو ایک بکری زکوٰۃ میں دینا واجب آتی ہے اس طرح مجموعی طور پر تین بکریاں دینا پڑتی ہیں مگر جب زکوٰۃ وصول کرنے والا ان کے پاس پہنچتا ہے تو انہوں نے بکریاں جمع کرلیں اور تعداد ایک سو بیس بن گئی۔ اس طرح ان کو صرف ایک بکری دینا پڑتی ہے اور جمع شدہ بکریوں کو الگ الگ کرنے کی صورت یہ ہے کہ دو آدمی اکٹھے ہیں دو سو اور ایک بکریاں ان کی ملکیت میں ہیں۔ اس طرح دونوں پر تین بکریاں زکوٰۃ دینا لازمی ہے مگر جب زکوٰۃ وصول کرنے والا ان کے پاس پہنچا تو دونوں نے اپنی اپنی بکریاں الگ کرلیں کہ اس طرح ان میں سے ہر ایک کے ذمہ ایک ایک بکری ہی آئے گی۔ ایسے مال کے مالکوں کو اس طرح حیلہ سازی کرنے سے منع کیا گیا ہے۔ زکوٰۃ وصول کرنے والے کو منع کرنے کی یہ صورت ہے کہ دو آدمی ہیں جو باہم نہ شریک ہیں اور نہ ایک دوسرے کے ساتھ اپنا مال ملایا ہوا ہے' ان دونوں میں سے ہر ایک کے پاس ایک سو بیس یا کم و بیش بکریاں ہیں تو اس صورت میں ہر ایک کو ایک بکری زکوٰۃ میں دینا آتی ہے۔ مگر زکوٰۃ وصول کرنے والا ان دونوں کی بکریاں از خود جمع کرتا ہے اور ان کی مجموعی تعداد دو سو سے زائد ہو جاتی ہے اور اس طرح وہ تین بکریاں وصول کرلیتا ہے اور جدا اور الگ الگ کرنے کی صورت یہ ہے کہ مثلاً ایک سو بیس بکریاں تین آدمیوں کی ملک میں ہیں۔ اس صورت میں صرف ایک ہی بکری زکوٰۃ میں دینا آتی ہے مگر زکوٰۃ وصول کرنے والا اسے تین حصوں میں تقسیم کردیتا ہے اور اس طرح تین بکریاں وصول کرلیتا ہے۔ بایں طور کہ ہر چالیس پر ایک بکری کے حساب سے۔ اس تفصیل سے ظاہر ہوا کہ ﴿ خشیۃ الصدقۃ ﴾ کا معنی یہ ہوا کہ کثرت کے خوف و اندیشہ کے پیش نظر یا تعداد کی قلت کے نقطہ نظر سے دونوں معنوں کا احتمال ہے۔ کسی کو کسی پر ترجیح نہیں۔ دونوں معنی اکٹھے بھی ہو سکتے ہیں۔ ﴿ وما کان من خلیطین ﴾ خلیطین کا معنی شریک ہیں اور اس میں "من" موصول کے بیان کیلئے ہے "والخلطۃ " اور شرکت یہ ہے کہ چرواہا' چراگاہ' نر اور پانی پلانا ایک طرح کا ہے۔ فانہما یترا جعان بینہما بالسویۃ سویۃ میں "یا" پر تشدید ہے معنی مساوات برابری کی سطح پر اور "تراجع" کا معنی یہ ہے کہ جب زکوٰۃ وصول کرنے والا دونوں کے مجموعہ پر واجب زکوٰۃ ایک بکری کی صورت میں وصول کرلیتا ہے حالانکہ اس کے ذمہ تو آدھی بکری آتی ہے اور باقی نصف اس کے دوسرے ساتھی پر۔ تو اب زکوٰۃ وصول کرنے والا دوسرے ساتھی سے نصف بکری کی قیمت اس سے لے کر دوسرے کے حوالہ کردے گا۔ اس طرح دونوں کی طرف سے ان پر واجب الادا زکوٰۃ ادا ہو جائے گی۔

کمی و بیشی کا شکوہ کسی کو نہیں رہے گا۔ بالسویۃ یہی سے۔ ہی برابری مراد ہے۔ ﴿ لایخرج ﴾ صیغہ مجہول نہیں نکالا جائے گا۔ ﴿ ھرمۃ ﴾ فتحہ اور کسرہ۔ "ھا" پر فتحہ "را" کے نیچے کسرہ۔ بوڑھی اور اتنی عمر رسیدہ جس کے دانت گر چکے ہوں۔ ﴿ ولا ذات عوار ﴾ عوار کے عین پر فتحہ اور ضمہ دونوں جائز ہیں۔ عیب کے معنی میں اور ایک قول یہ بھی ہے کہ عوار کے عین پر فتحہ کی صورت میں اس کا معنی عیب ہوگا اور ضمہ کی صورت میں کانا ہوگا اور بہتر یہی ہے کہ اسے فتحہ سے ہی پڑھا جائے تاکہ تمام عیوب و نقائص اس میں شامل ہو جائیں۔ ﴿ ولا تیس ﴾ "تا" پر فتحہ "یا" ساکن۔ سانڈ بکرا جو بکریوں پر جفتی کیلئے مخصوص ہوتا ہے۔ ﴿ الا ان یشاء المصدق ﴾ مصدق کے صاد پر تشدید اور تخفیف دونوں طرح ہے۔ پہلے کا اصل متصدق یعنی زکوٰۃ و صدقہ دینے والا۔ یعنی مال کا مالک۔ اس میں استثناء فقط لفظ تیس کی طرف راجع ہے۔ یعنی سانڈ بکرا کا لینا مالک کی مرضی پر منحصر ہے۔ کیونکہ اس کی ضرورت اسے ہی ہو سکتی ہے۔ اس کی رضامندی اور خوشی کے بغیر بکرے کا وصول کرنا مالک کو نقصان پہنچانے کے مترادف ہوگا۔ دوسری صورت میں مصدق کا صاد مخفف ہے۔ جس کا معنی صدقہ لینے والا' اس پر دوڑ دھوپ اور سعی کرنے والا اور استثناء تینوں کی طرف راجع ہے یعنی بوڑھی گھونسٹ۔ عیب والی اور سانڈ بکرے (بوک) کی طرف الآ یہ کہ زکوٰۃ لینے والا اس کے لینے میں مصلحت سے زیادہ موافقت محسوس کرے اور مساکین کیلئے زیادہ اچھا سمجھے۔ ﴿ وفی الرقۃ ﴾ اور چاندی میں زکوٰۃ کی نوعیت یہ ہے۔ رقۃ کے "را" کے نیچے کسرہ۔ دراصل یہ ورق سے ہے۔ ورق "واؤ" پر فتحہ اور "را" کے نیچے کسرہ۔ چاندی کو کہتے ہیں ﴿ ربع العشر ﴾ ربع کے راء اور عشر کے عین پر ضمہ ہے اور "با" اور شین ساکن ہیں یا دونوں پر ضمہ "ربع" کسی چیز کا چوتھا حصہ اور "عشر" دسواں حصہ اور ربع العشر چالیسواں حصہ ہوا اور دو سو درہم باون تولہ اور چھ ماشہ چاندی کے برابر ہوتے ہیں یعنی سات سو پینتیس گرام اور درہم تین ماشے ایک رتی کا اور پانچ رتی بڑے رائی کے دانوں کے برابر۔ ﴿ فان لم تکن ﴾ اور اگر چاندی ﴿ الا تسعین ومائۃ ﴾ ایک سو نوے درہم ہو یعنی جب دو سو درہم پورے نہ ہوں اس پر زکوٰۃ نہیں۔ نوے کا ذکر محض اس لئے کیا ہے کہ سو پورا ہونے سے پہلے آخری گنتی نوے ہی ہے اور حساب کا معاملہ تو یہ ہے کہ جب احاد سے اکائی تجاوز کر جائیں تو دہائیوں سے گنتی کی جاتی ہے۔ جیسے دہائیوں سینکڑوں اور ہزاروں ہیں۔ (فانھا تقبل منہ الحقۃ) جذعہ کی جگہ حقہ قبول کر لیا جائے گا۔ ﴿ ویجعل ﴾ مالک ساتھ شامل کرے گا۔ ﴿ معھا شاتین ﴾ دو بکریاں نقصان و کمی کی تلافی کرنے کیلئے کیونکہ حقہ جذعہ سے چھوٹا ہوتا ہے ﴿ ان استیسرتالہ ﴾ بایں صورت کہ دو بکریاں اس کے مویشیوں میں موجود ہوں ﴿ او عشرین درھما ﴾ او یہاں تخییر کیلئے ہے یعنی اختیار حاصل ہے کہ اگر چاہے تو یہ دے دے' چاہے وہ دے دے۔ ﴿ ویعطیہ المصدق ﴾ دال پر تشدید۔ زکوٰۃ و صدقہ وصول کرنے والا سرکاری کارندہ اور نمائندہ۔

حاصل کلام: اس حدیث میں مال و مویشی کی زکوٰۃ کا نصاب مذکور ہے نیز اس میں زکوٰۃ وصول کرنے کا طریق کار۔ زکوٰۃ میں وصول کئے جانے والے جانوروں کی عمروں کا بیان ہے اور زکوٰۃ کی وصولی کا اہتمام

مذکور ہے۔ نہ تو مالک کو دھوکہ دینے کی کوشش کی جائے اور نہ ہی سرکاری اہل کار کو دھوکہ میں رکھنے کی کوشش کی جائے۔ ہر قسم کے مویشیوں پر زکوٰۃ نہیں بلکہ جنگل میں چرنے چگنے والوں پر ہے۔

(٤٨٥) وَعَنْ مُعَاذِ بْنِ جَبَلٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ بَعَثَهُ إِلَى الْيَمَنِ، فَأَمَرَهُ أَنْ يَأْخُذَ مِنْ كُلِّ ثَلَاثِيْنَ بَقَرَةً تَبِيْعاً أَوْ تَبِيْعَةً، وَمِنْ كُلِّ أَرْبَعِيْنَ مُسِنَّةً، وَمِنْ كُلِّ حَالِمٍ دِيْنَاراً، أَوْ عَدْلَه مَعَافِرِيّاً. رَوَاهُ الخَمْسَةُ، وَاللَّفْظُ لِأَحْمَدَ، وَحَسَّنَهُ التِّرْمِذِيُّ، وَأَشَارَ إِلَى اخْتِلَافٍ فِيْ وَصْلِهِ، وَصَحَّحَهُ ابْنُ حِبَّانَ وَالحَاكِمُ.

حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی ﷺ نے ان کو یمن کی طرف (عامل مقرر کر کے) بھیجا۔ ان کو حکم دیا کہ وہ تیس گائیوں پر ایک سالہ مادہ گائے یا نر بچھڑا وصول کرے اور ہر چالیس کی تعداد پر ایک دو سالہ بچھڑا لیا جائے اور ہر نوجوان سے ایک دینار یا معافری کپڑا لیا جائے۔ (اسے پانچوں نے روایت کیا ہے۔ متن حدیث کے الفاظ احمد کے ہیں اور ترمذی نے اسے حسن قرار دیا ہے اور اس کے موصول ہونے کے بارے میں اختلاف کا اشارہ کیا ہے ابن حبان اور حاکم دونوں نے اسے صحیح کہا ہے۔)

لغوی تشریح: ﴿من کل ثلاثین بقرۃ﴾ یہ نصاب متفق علیہ ہے کسی کا اس میں اختلاف نہیں۔ تیس سے کم پر کوئی چیز واجب نہیں مگر امام زھری کی رائے ہے کہ ہر پانچ گائے کی تعداد پر ایک بکری ہے۔ انہوں نے اس مسئلہ کو اونٹوں کے نصاب پر قیاس کر کے کہا ہے۔ لیکن یہ بات مسلم ہے کہ نصاب کا تعین قیاس سے ثابت نہیں ہوتا۔ اور "بقرۃ" اسم جنس ہے اور "تا" اس میں "وحدۃ" کی علامت ہے' تانیث کی نہیں۔ یہ مذکر و مونث دونوں پر یکساں بولا جاتا ہے۔ تبیعا او تبیعۃ تبیعا اس کو کہتے ہیں جو ایک سال کی عمر مکمل کر کے دوسرے سال میں قدم رکھ چکا ہو اور "او" اس میں تخییر کیلئے ہے یعنی سرکاری وصول کنندہ کو اختیار ہے چاہے مادہ حاصل کرے اور چاہے نر وصول کرے۔ مسنۃ اس جانور کو کہتے ہیں جس کے دو دانت نکل آئے ہوں یعنی جو دو سال مکمل کر چکا ہو اور تیسرے سال میں داخل ہو چکا ہو۔ تحفۃ الاحوذی (ج ۲' ص ۴) میں ہے کہ طبرانی میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ ہر چالیس کی تعداد پر مسنہ یا مسن ہے ﴿ومن کل حالم﴾ ہر بالغ سے۔ خواہ احتلام سے دوچار ہوا ہو یا ہنوز نہ ہوا ہو پر "دینارا" ایک دینار بطور جزیہ وصول کیا جائے گا۔ ﴿او عدلہ﴾ عین پر فتحہ۔ دال ساکن ہے مراد ہے اتنی قیمت۔ اس کے برابر مساوی قیمت اور ایک قول یہ بھی ہے کہ فتحہ اور کسرہ دونوں برابر ہیں۔ ﴿معافریا﴾ وہ چادریں جو یمن کی بنی ہوئی ہیں۔ "معافر" بروزن مساجد ہے یہ ھمدان کا ایک قبیلہ ہے۔ انہی کی طرف معافری کپڑے منسوب ہیں۔

حاصل کلام: اس حدیث میں گائے کے نصاب کی تفصیل کے ساتھ ساتھ غیر مسلم سے جزیہ وصول کرنے کا بھی حکم ہے۔ بالاتفاق علماء نے بھینس کو گائے پر قیاس کیا اس کی حلت اور زکوٰۃ کا وہی حکم ہے جو گائے کا

ہے۔

(٤٨٦) وَعَنْ عَمْرِو بْنِ شُعَيْبٍ، عَنْ أَبِيهِ، عَنْ جَدِّهِ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «تُؤْخَذُ صَدَقَاتُ الْمُسْلِمِينَ عَلَى مِيَاهِهِمْ». رَوَاهُ أَحْمَدُ. وَلِأَبِي دَاوُدَ: «وَلَا تُؤْخَذُ صَدَقَاتُهُمْ إِلَّا فِي دُورِهِمْ».

حضرت عمرو بن شعیب اپنے باپ سے اور وہ اپنے دادا سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے کہ "مسلمانوں سے زکوٰۃ ان کے پانی پلانے کی جگہوں پر وصول کی جائے گی۔" (احمد) اور ابوداؤد کی روایت میں ہے کہ مسلمانوں کے صدقات ان کے گھروں ہی پر حاصل کئے جائیں گے۔

لغوی تشریح: ﴿ علی میاھھم ﴾ میاہ کی جمع ہے۔ اس سے مراد وہ چشمے ہیں جہاں لوگ اپنے جانوروں کو پانی پلانے کیلئے لے جاتے ہیں۔ ﴿ الا فی دورھم ﴾ دور' دار کی جمع ہے۔ ان کی اپنی رہائش گاہیں' جائے رہائش' مکانات' پانی کے گھاٹ' ان کے قبائل اور مویشیوں کی قیام گاہیں مراد ہیں۔ مطلب اس کا یہ ہے کہ سرکاری زکوٰۃ وصول کنندہ خود لوگوں کے پاس پہنچ کر زکوٰۃ کی وصولی کرے۔ ایسا نہیں کہ خود دور دراز جگہ میں ڈیرہ جما کر بیٹھ جائے اور لوگوں کو اپنے ہاں آکر زکوٰۃ جمع کرانے کا حکم دے۔ اس طرح لوگوں کا مشقت میں مبتلا ہونے کا اندیشہ ہے۔

حاصل کلام: اس حدیث میں عامل زکوٰۃ کو زکوٰۃ وصول کرنے کیلئے لوگوں کے پاس ان کے گھروں' مویشیوں کی قیام گاہوں میں جانے کا حکم ہے۔ تاکہ کسی قسم کے دھوکہ میں مبتلا نہ کیا جا سکے اور وہ اپنی حاکمیت کی دھونس بھی نہ جما سکے۔ بلکہ ایک خادم دین کی حیثیت سے گھر گھر جا کر زکوٰۃ وصول کرے۔ جابر بن عتیک کہتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ "تمہارے پاس زکوٰۃ وصول کرنے والے سرکاری نمائندے آئیں گے جب وہ تمہارے پاس پہنچیں تو ان کو خوش آمدید کہو اور جس چیز کا وہ مطالبہ کریں' وہ ان کے سپرد کر دو۔ اگر انہوں نے انصاف سے کام لیا تو انہیں ثواب ملے گا اور اگر ظلم کریں گے تو اس کا وبال انہی پر پڑے گا۔" اگر یہ زکوٰۃ مقدار وجوب سے زیادہ طلب کریں تو صحیح بخاری میں ہے کہ انہیں زیادہ ہرگز نہ دی جائے۔

(٤٨٧) وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «لَيْسَ عَلَى الْمُسْلِمِ فِي عَبْدِهِ وَلَا فِي فَرَسِهِ صَدَقَةٌ». رَوَاهُ الْبُخَارِيُّ. وَلِمُسْلِمٍ: لَيْسَ فِي الْعَبْدِ صَدَقَةٌ، إِلَّا صَدَقَةَ الْفِطْرِ.

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ "مسلمانوں پر نہ اس کے غلام میں زکوٰۃ ہے اور نہ اس کے گھوڑے میں۔" (بخاری) اور مسلم کی روایت میں ہے کہ "غلام میں زکوٰۃ نہیں مگر صدقہ فطر سے۔"

حاصل کلام: اس حدیث سے ثابت ہوا کہ غلام اور گھوڑے میں زکوٰۃ نہیں۔ یعنی جو غلام اپنی خدمت کیلئے اور جو گھوڑا اپنی سواری کے لئے مخصوص ہو ان پر کسی قسم کی زکوٰۃ نہیں۔ البتہ اگر برائے تجارت

ہوں تو ان پر زکوٰۃ ہوگی۔ جمہور علماء کا یہی مسلک ہے مگر علامہ ابن حزم اور دیگر ظاہریہ کے نزدیک گھوڑے تجارت کیلئے ہوں تو ان کی بھی زکوٰۃ نہیں۔

(٤٨٨) وَعَنْ بَهْزِ بْنِ حَكِيمٍ، عَنْ أَبِيهِ، عَنْ جَدِّهِ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «فِي كُلِّ سَائِمَةِ إِبِلٍ: فِي أَرْبَعِينَ بِنْتُ لَبُونٍ، لاَ تُفَرَّقُ إِبِلٌ عَنْ حِسَابِهَا، مَنْ أَعْطَاهَا، مُؤْتَجِراً بِهَا، فَلَهُ أَجْرُهَا، وَمَنْ مَنَعَهَا، فَإِنَّا آخِذُوهَا وَشَطْرَ مَالِهِ، عَزْمَةً مِنْ عَزَمَاتِ رَبِّنَا، لاَ يَحِلُّ لِآلِ مُحَمَّدٍ مِنْهَا شَيْءٌ». رَوَاهُ أَحْمَدُ وَأَبُو دَاوُدَ وَالنَّسَائِيُّ، وَصَحَّحَهُ الحَاكِمُ، وَعَلَّقَ الشَّافِعِيُّ القَوْلَ بِهِ عَلَى ثُبُوتِهِ.

حضرت بہز بن حکیم اپنے والد سے اور وہ اپنے دادا سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ ”چرنے والے تمام اونٹوں میں چالیس پر ایک دو سالہ اونٹنی ہے اور اونٹوں کو ان کے حساب سے جدا نہ کیا جائے گا اور جو شخص حصول ثواب کی نیت سے زکوٰۃ ادا کرے گا اس کو اس کا ثواب بھی ملے گا اور جس نے زکوٰۃ روک لی تو ہم زکوٰۃ زبردستی وصول کریں گے اور اس کا کچھ مال بھی' ہمارے پروردگار کے فرائض میں سے ایک لازمی حصہ ہے۔ ان میں سے کوئی چیز بھی آل محمد کیلئے حلال نہیں ہے۔“ (اسے احمد' ابوداؤد اور نسائی نے روایت کیا ہے اور حاکم نے اسے صحیح قرار دیا ہے اور شافعی نے اس کے ثابت ہونے پر اپنے قول کو معلق رکھا ہے۔)

لغوی تشریح: ﴿ سائمۃ ابل ﴾ سائمۃ' ابل کی طرف مضاف ہے۔ ﴿ فی اربعین بنت لبون ﴾ یعنی فی الجملہ چالیس میں ”بنت لبون“ دو سالہ اونٹنی ہے۔ حضرت انس کی روایت میں جو پہلے گزر چکی ہے ۳۶ سے زیادہ ۴۵ تک میں ایک بنت لبون کا ذکر ہے اور اس حدیث میں چالیس کی تعداد' اس وقت مراد ہے جب ایک سو بیس سے اونٹ زیادہ ہوں تو پھر چالیس پر بنت لبون ہے جیسا کہ حضرت انس رضی اللہ عنہ کی حدیث میں تفصیل موجود ہے یا یہ کہ ۴۰ کی تعداد بھی ۳۶ سے ۴۵ کے مابین ہے۔ ان دونوں کے مابین جتنے اونٹ ہوں ۴۰ ہوں یا اس سے کم و بیش ان پر زکوٰۃ ہے' یہ مفہوم ہے اور حضرت انس رضی اللہ عنہ کی روایت میں منطوق راوی ہے اس لئے اعتبار اسی روایت کا ہے۔ ﴿ لا یفرق ﴾ تفریق سے ماخوذ ہے۔ مبنی للمفعول ہے یعنی الگ الگ اور جدا جدا نہیں کیا جائے گا۔ ”ابل عن حسابها“ اس کا معنی ہے کہ مالک اپنی ملکیت کی چیزوں کو دوسرے کی ملکیت سے الگ نہ کرے جبکہ دونوں کے مویشی اکٹھے ہوں. جیسا کہ اس سے پہلے اس کا ذکر ہو چکا ہے۔ یا یہ معنی ہوں گے کہ تمام اونٹوں کو فی چالیس کے حساب سے شمار کیا جائے' اس صورت میں نہ مریل و کمزور کو چھوڑا جائے گا نہ کسی فربہ کو' نہ چھوٹے کو اور نہ بڑے کو ﴿ موتجرابها ﴾ اجر و ثواب کے حصول کے ارادے سے ان کو زکوٰۃ میں دینا ﴿ ومن منعها ﴾ جس نے

نہ دیا ﴿ فانا اخذوھا ﴾ تو ہم اسے بزور و زبردستی وصول کریں گے۔ ﴿ وشطر مالہ ﴾ کچھ مال یا آدھا مال۔ نہ زکوٰۃ نہ دینے کی سزا کے طور پر ﴿ اخذوھا ﴾ میں جو ضمیر مجرور ہے' اس پر اس کا عطف ہے اور ایک قول یہ بھی ہے کہ یہ تشطیر سے ماضی مجہول کا صیغہ ہے۔ اس صورت میں یہ معنی ہوگا کہ اس کے مال کو عامل دو نصف حصوں میں تقسیم کر دے اور بہترین و افضل حصہ خود وصول کر لے۔ ﴿ عزمۃ ﴾ رفعی حالت میں یہ مبتداء محذوف کی خبر ہوگی اور نصب کی صورت میں مصدر۔ مطلب ہے کہ یہ فریضہ ہے اور واجب حق ہے ﴿ من عزمات ربنا ﴾ اللہ تعالیٰ کے حقوق و واجبات میں سے ﴿ لایحل لال محمد ﴾ الخ آل محمد کیلئے یہ حلال نہیں۔ آل محمد سے کیا مراد ہے؟ ایک قول یہ ہے کہ اس سے بنو ہاشم' بنو عبدالمطلب بن عبد مناف مراد ہیں اور ایک قول یہ ہے اس سے مراد بالخصوص آل علی' آل عباس اور آل عقیل اور آل حارث بن عبدالمطلب ہیں۔ ﴿ اوعلق الشافعی ﴾ علق تعلیق سے ماخوذ ہے۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے اس حدیث کے ثبوت پر اپنا قول معلق رکھا ہے کہ اگر یہ صحیح ہے تو میرا قول اس کے مطابق ہے۔ کیونکہ اس کا دارومدار بھز بن حکیم پر ہے اور اس پر کلام ہے اور کسی دوسری صحیح حدیث میں زکوٰۃ نہ دینے والے سے مقدار زکوٰۃ سے زائد مال بطور جرمانہ وصول کرنے کا ذکر نہیں۔

حاصل کلام: زکوٰۃ کے ایک مسئلے کے علاوہ یہ بھی ثابت ہوا کہ بنو ہاشم' بنو عبدالمطلب زکوٰۃ نہیں لے سکتے۔ بنو ھاشم میں اولاد علی' اولاد عباس' اولاد عقیل اور اولاد حارث بن عبدالمطلب شامل ہیں۔ یہ بھی زکوٰۃ کا استحقاق نہیں رکھتے۔ امام یوسف کے بقول سید' سید کو زکوٰۃ دے سکتا ہے۔

راوی حدیث: ﴿ بھز بن حکیم ﴾ ابو عبدالملک ان کی کنیت ہے۔ بھز کی "با" پر فتحہ اور ھا ساکن۔ بھز بن حکیم بن معاویہ بن حیدہ۔ حیدہ کی "حا" پر فتحہ "یا" ساکن اور "دال" پر فتحہ' تصغیر ہے۔ بصری ہے۔ طبقہ سادسہ کے تابعی ہیں۔ اس حدیث سے حجت پکڑنے میں اختلاف ہے۔ ابوداؤد کا خیال ہے کہ اس کی احادیث صحیح ہیں۔ ابن معین' ابن مدینی اور نسائی نے ان کو ثقہ قرار دیا ہے لیکن ابوحاتم نے کہا ہے' اس سے احتجاج نہیں کیا جاتا اور ابن حبان نے کہا ہے کہ یہ غلطیاں بہت کرتے ہیں۔ ۱۴۰ھ کے بعد وفات پائی اور ایک روایت کے مطابق ۱۶۰ھ کے بعد۔

﴿ عن ابیہ ﴾ یعنی حکیم بن معاویہ' یہ بھی تابعی ہیں۔ ابن حبان نے ان کو ثقہ راویوں میں شمار کیا ہے۔

﴿ عن جدہ ﴾ معاویہ بن حیدہ بن معاویہ بن قشیر بن کعب قشیری صحابیت کے شرف سے مشرف تھے۔ بصرہ میں سکونت اختیار کی۔ ان سے بھی بہت سی احادیث منقول ہیں۔

(۴۸۹) وَعَنْ عَلِيٍّ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «إِذَا كَانَتْ لَكَ مائَتَا دِرْهَمٍ، وَحَالَ عَلَيْهَا الحَوْلُ، فَفِيهَا خَمْسَةُ

حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "جب تیرے پاس دو سو درہم ہوں اور ان پر پورا سال گزر جائے تو ان میں پانچ درہم زکوٰۃ ہے۔ جب تک تیرے پاس بیس دینار نہ ہوں اور ان

دَرَاهِمَ، وَلَيْسَ عَلَيْكَ شَيْءٌ، حَتَّى يَكُونَ لَكَ عِشْرُونَ دِينَاراً، وَحَالَ عَلَيْهَا الْحَوْلُ، فَفِيهَا نِصْفُ دِينَارٍ، فَمَا زَادَ، فَبِحِسَابِ ذَلِكَ، وَلَيْسَ فِي مَالٍ زَكَاةٌ، حَتَّى يَحُولَ عَلَيْهِ الْحَوْلُ». رَوَاهُ أَبُو دَاوُدَ، وَهُوَ حَسَنٌ، وَقَدِ اخْتَلَفُوا فِي رَفْعِهِ.

پر پورا سال نہ گزر جائے۔ اس وقت تک تجھ پر کوئی چیز نہیں جب بیس دینار ہوں تو ان میں نصف دینار زکوٰۃ ہے۔ جو اس سے زیادہ ہوگا تو اسی حساب سے زکوٰۃ ہوگی۔ کسی بھی مال پر اس وقت تک زکوٰۃ نہیں جب تک کہ اس پر پورا سال نہ گزر جائے۔" (ابوداؤد نے اسے روایت کیا ہے اور یہ حسن ہے۔ اس کے مرفوع ہونے میں اختلاف ہے) اور ترمذی میں ابن عمر رضی اللہ عنہما سے منقول ہے کہ جو مالی سال کے

وَلِلتِّرْمِذِيِّ عَنِ ابْنِ عُمَرَ: مَنِ اسْتَفَادَ مَالاً، فَلاَ زَكَاةَ عَلَيْهِ، حَتَّى يَحُولَ عَلَيْهِ الْحَوْلُ. وَالرَّاجِحُ وَقْفُهُ.

دوران حاصل ہو اس پر بھی سال گزرنے سے پہلے کوئی زکوٰۃ نہیں اور راجح یہی ہے کہ یہ روایت موقوف ہے۔

لغوی تشریح: ﴿ حال علیها الحول ﴾ یعنی اس مال پر پورا سال گزر جائے۔ ﴿ عشرون دینارا ﴾ بیس دینار موجود وزن کے مطابق ساڑھے سات تولہ یعنی ۱۰۵ گرام بنتا ہے۔ ﴿ فما زاد فبحساب ذلك ﴾ اس سے زائد ہو تو اسی حساب سے۔ اس سے معلوم ہوا کہ جو کچھ نصاب سے زائد ہوگا خواہ وہ قلیل ہے یا کثیر' اس پر زکوٰۃ واجب ہے۔ ﴿ من استفاد مالا ﴾ جو حاصل ہوا ہو۔ ﴿ والراجح وقفه ﴾ راجح بات کے مطابق یہ حدیث موقوف ہے مگر مرفوع کے حکم میں ہے کیونکہ اس میں اجتہاد کیلئے کوئی راستہ اور گنجائش نہیں ہے۔ (سبل)

حاصل کلام: اس حدیث میں سونے اور چاندی کی مقدار زکوٰۃ کا بیان ہے۔ چاندی اگر دو سو درہم سے کم ہو تو اس پر کوئی زکوٰۃ نہیں۔ یاد رہے کہ درہم کا وزن سوا تین ماشہ ہوتا ہے۔ احتیاطاً ساڑھے باون تولہ نصاب زکوٰۃ مقرر کیا گیا ہے اور سونے کے بیس دینار پر زکوٰۃ ہے۔ ایک دینار برابر ہے بیس مثقال کے یا نوے ماشہ کے جو ساڑھے سات تولہ بنتا ہے اور ایک حساب اس طرح بھی لگایا گیا ہے کہ درہم سوا تین ماشہ کا ہوتا ہے' اس لحاظ سے محتاط اندازے کے مطابق پچاس تولے مقرر کیا گیا ہے اور زکوٰۃ چالیسواں حصہ ہے اور سونے کا نصاب بیس مثقال ہے اور ایک مثقال بیس قیراط کا وزن تین ماشہ ایک رتی بتایا گیا ہے۔ اس حساب سے تو بیس مثقال سونے کے ساڑھے باسٹھ ماشہ بنتے ہیں (یعنی پانچ تولہ اڑھائی ماشہ) اور اس کی زکوٰۃ بھی چالیسواں حصہ ہے۔ کاغذی نوٹ جو روپیہ کا بدل ہے اس میں بھی زکوٰۃ چالیسواں حصہ ہی ہے۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ کی حدیث دو طریق سے منقول ہے۔ ایک عاصم بن ضمرہ عن علی اور دوسرا حارث الاعور عن علی۔ امام بخاری رحمہ اللہ کے نزدیک یہ دونوں طریق صحیح ہیں۔

(٤٩٠) وَعَنْ عَلِيٍّ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: لَيْسَ فِي الْبَقَرِ الْعَوَامِلِ صَدَقَةٌ. رَوَاهُ أَبُو دَاوُدَ وَالدَّارَقُطْنِيُّ، وَالرَّاجِحُ وَقْفُهُ أَيْضاً.

حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ کام کرنے والے بیلوں پر زکوٰۃ واجب نہیں۔ (اسے ابوداؤد اور دارقطنی نے روایت کیا ہے۔ راجح یہی ہے کہ یہ بھی موقوف ہے۔)

لغوی تشریح: ﴿ البقرا لعوامل ﴾ عوامل عاملہ کی جمع ہے۔ عاملہ وہ جانور جو کھیتی باڑی کیلئے جوتتے ہیں، گاہنے کا کام لیتے ہیں، کنوئیں سے پانی نکالنے کا کام لیتے ہیں اور وزنی چیزوں کو کھینچ کر لے جانے کا کام لیتے ہیں اور ایسی دوسری ضروریات کے کام آتے ہیں۔

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ جن جانوروں سے پیداوار حاصل کرنے کیلئے کام لیا جائے یعنی آلات و ذرائع کے طور پر استعمال ہوں ان پر کوئی زکوٰۃ نہیں۔ اسی طرح وہ کارخانے جن سے پیداوار حاصل ہوتی ہے اس کی مشینری پر بھی زکوٰۃ نہیں کیونکہ وہ بھی آلات پیداوار اور ذرائع پیداوار ہیں۔

(٤٩١) وَعَنْ عَمْرِو بْنِ شُعَيْبٍ، عَنْ أَبِيهِ، عَنْ جَدِّهِ عَبْدِ اللهِ بْنِ عَمْرٍو، أَنَّ رَسُولَ اللهِ ﷺ قَالَ: «مَنْ وَلِيَ يَتِيماً لَهُ مَالٌ، فَلْيَتَّجِرْ لَهُ، وَلاَ يَتْرُكْهُ حَتَّى تَأْكُلَهُ الصَّدَقَةُ». رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ وَالدَّارَقُطْنِيُّ، وَإِسْنَادُهُ ضَعِيفٌ، وَلَهُ شَاهِدٌ مُرْسَلٌ عِنْدَ الشَّافِعِيِّ.

حضرت عمرو بن شعیب اپنے والد اور وہ اپنے دادا عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "جو شخص کسی یتیم کا متولی بنے اسے چاہئے کہ مال یتیم کو تجارت میں لگائے۔ اسے یوں ہی بے کار پڑا نہ رہنے دے کہ زکوٰۃ ہی اسے کھا جائے۔" (اسے ترمذی اور دارقطنی نے روایت کیا ہے۔ اس کی سند ضعیف ہے، البتہ امام شافعی کے پاس ایک مرسل روایت اس کی شاہد ہے۔)

لغوی تشریح: ﴿ من ولی ﴾ علم، یعلم کے باب سے معروف کا صیغہ ہے۔ معنی ہے کہ جو شخص متولی ہے اور لام پر تشدید کی صورت میں بھی پڑھا گیا ہے۔ ﴿ فلیتجر ﴾ باب افتعال ہے۔ تجارت سے ماخوذ ہے۔ "ولا یترکہ" نہی کا صیغہ ہے یعنی مال یتیم کو یوں بے کار پڑا نہ رہنے دے۔ ﴿ حتی تاکلہ الصدقہ ﴾ کہ زکوٰۃ اسے کھا جائے۔ یعنی سال بہ سال اس پر زکوٰۃ فرض ہوتی رہے اور آہستہ آہستہ ساری جائیداد اسی کی مد میں ادا ہو جائے۔ اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ یتیم کے مال پر زکوٰۃ واجب ہے۔ اگر واجب نہ ہوتی تو مال یتیم کے ختم ہونے کا اندیشہ کیسے پیدا ہوتا۔ جمہور کی یہی رائے ہے اور یہی مسلک حق ہے۔

(٤٩٢) وَعَنْ عَبْدِ اللهِ بْنِ أَبِي أَوْفَى رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُ، قَالَ:

حضرت عبداللہ بن ابی اوفیٰ رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں جب لوگ زکوٰۃ لے

كَانَ رَسُولُ اللهِ ﷺ إِذَا أَتَاهُ قَوْمٌ بِصَدَقَتِهِمْ قَالَ: اللَّهُمَّ صَلِّ عَلَيْهِمْ. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

کر حاضر ہوتے تو آپؐ ان کیلئے یوں دعا فرماتے۔ "یااللہ! ان پر رحم و کرم فرما۔" (بخاری و مسلم)

حاصل کلام: نسائی میں ہے کہ ایک شخص اپنی زکوٰۃ لے کر خدمت میں حاضر ہوا تو آپؐ نے اس کیلئے ان الفاظ میں دعا دی۔ اللھم بارك فيه وفي اهله۔ الٰہی! اس شخص اور اس کے اھل میں برکت نازل فرما۔" اس حدیث سے ثابت ہوا کہ صحابہ کرامؓ خود حاضر ہو کر رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں زکوٰۃ پیش کرتے اور رسول اللہ ﷺ ان کیلئے خیر و برکت اور اللہ تعالیٰ کی رحمت کی دعا کرتے۔

(٤٩٣) وَعَنْ عَلِيٍّ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، أَنَّ العَبَّاسَ سَأَلَ النَّبِيَّ ﷺ فِيْ تَعْجِيْلِ صَدَقَتِهِ قَبْلَ أَنْ تَحِلَّ، فَرَخَّصَ لَهُ فِيْ ذٰلِكَ. رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ وَالحَاكِمُ.

حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے نبی ﷺ سے دریافت کیا کہ آیا زکوٰۃ اپنے مقررہ وقت سے پہلے ادا ہو سکتی ہے؟ تو آپؐ نے ان کو اس کی اجازت دے دی۔ (ترمذی اور مستدرک حاکم)

لغوی تشریح: ﴿قبل ان تحل﴾ مقررہ وقت آنے سے پہلے۔ یحل' حلول سے ماخوذ ہے۔ باب ضرب یضرب ہے۔ یعنی سائل نے پوچھا کہ کیا زکوٰۃ سال گزرنے اور وقت مقررہ سے پہلے ادا ہو سکتی ہے یا نہیں؟

حاصل کلام: زکوٰۃ فرض تو سال گزرنے کے بعد ہوتی ہے مگر نبی ﷺ نے پیشگی ادائیگی کو بھی جائز قرار دیا ہے۔ اس مسئلہ میں علماء کی آراء مختلف ہیں۔ ایک گروہ کہتا ہے کہ جس طرح نماز' روزہ اور حج ایسی عبادات اپنے وقت سے پہلے ادا نہیں ہو سکتیں۔ اسی طرح زکوٰۃ بھی عبادت ہے یہ بھی اپنے وقت سے پہلے ادا نہیں ہو سکتی۔ سفیان ثوری کی یہی رائے ہے حالانکہ یہ استدلال و قیاس کچھ زیادہ وزنی نہیں اس لئے کہ زکوٰۃ کا دیگر عبادات کی طرح ٹائم ٹیبل متعین نہیں۔ اسے اگر قدرے تاخیر سے دیا جا سکتا ہے تو پیشگی بھی ادا ہو سکتی جس کی دلیل یہی حضرت علی رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے۔ جمہور اہل عالم کی بھی یہی رائے ہے۔

(٤٩٤) وَعَنْ جَابِرِ بْنِ عَبْدِ اللهِ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُما، عَنْ رَسُولِ اللهِ ﷺ، قَالَ: «لَيْسَ فِيمَا دُونَ خَمْسِ أَوَاقٍ مِنَ الوَرِقِ صَدَقَةٌ، وَلَيْسَ فِيمَا دُونَ خَمْسِ ذَوْدٍ مِنَ الإِبِلِ صَدَقَةٌ، وَلَيْسَ فِيمَا دُونَ

حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا "پانچ اوقیہ سے کم چاندی پر کوئی زکوٰۃ نہیں۔ اسی طرح اونٹوں کی تعداد پانچ سے کم ہو تو ان پر بھی زکوٰۃ نہیں اور پانچ وسق سے کم کھجوروں پر بھی زکوٰۃ نہیں۔" (مسلم)

اور مسلم میں ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ

خَمْسَةِ أَوْسُقٍ مِنَ التَّمْرِ صَدَقَةٌ». رَوَاهُ مُسْلِمٌ.وَلَهُ مِنْ حَدِيثِ أَبِيْ سَعِيْدٍ؛ لَيْسَ فِيْمَا دُوْنَ خَمْسَةِ أَوْسَاقٍ مِنْ تَمْرٍ وَلاَ حَبٍّ صَدَقَةٌ. وَأَصْلُ حَدِيْثِ أَبِيْ سَعِيْدٍ. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

پانچ وسق سے کم کھجوروں یا غلہ میں زکوٰۃ نہیں۔ ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ کی روایت کی اصل بخاری و مسلم میں ہے)

لغوی تشریح: ﴿ اواق ﴾ اس پر تنوین ہے اور قاف کے بعد ''یاء'' مشددہ اور مخففہ کی صورت بھی جائز ہے۔ اوقیہ کی جمع ہے۔ اوقیہ کے ہمزہ پر ضمہ اور ''یا'' پر تشدید۔ ایک اوقیہ میں چالیس درہم ہوتے ہیں اور یوں پانچ اوقیہ کے دو سو درہم ہیں۔ جدید وزنی پیمانہ کی اصطلاح کے مطابق یہ سات سو پینتیس گرام بنتا ہے۔ ﴿ الورق ﴾ ''واؤ'' پر فتحہ اور ''را'' پر کسرہ اور ''را'' ساکن بھی پڑھی گئی ہے۔ معنی اس کے چاندی ''ذود'' ذال پر فتحہ اور ''واؤ'' ساکن۔ اونٹ کے معنی میں۔ یہ اسم جمع ہے اس میں مذکر و مؤنث سبھی شامل ہیں۔ اسی لئے خمس کی اضافت اس کی طرف جائز ہے۔ ﴿ اوسق ﴾ ھمزہ پر فتحہ ''واؤ'' ساکن اور سین پر ضمہ' وسق کی جمع۔ وسق کی ''واؤ'' پر فتحہ اور کسرہ دونوں جائز ہیں۔ ایک وسق ساٹھ صاع کا ہوتا ہے اور پانچ وسق تین سو صاع ہوئے اور ایک صاع میں چار مد آتے ہیں اور ایک مد ایک رطل اور تہائی رطل کے برابر ہوتا ہے۔ پس صاع جدید پیمانہ کی زبان میں اڑھائی کلوگرام کے قریب ہوتا ہے ﴿ اوساق ﴾ وسق کی جمع ہے' اوسق کی طرح ہے۔ ﴿ حب ﴾ ''حا'' پر فتحہ اور ''با'' پر تشدید۔ بیج' تخم مثلاً گندم کا بیج' جو' مسور وغیرہ اور لفظ ﴿ دون ﴾ چاروں جگہ ﴿ اقل ﴾ کے معنی میں ہے یعنی کم از کم مراد یہ ہے کہ مذکورہ اشیاء کی اس مقدار سے کم پر زکوٰۃ واجب نہیں۔

حاصل کلام: اس حدیث میں چاندی کا نصاب پانچ اوقیہ بیان ہوا ہے جبکہ اس سے پہلی حدیث میں دو سو درہم ہے۔ ان دونوں احادیث میں کوئی تفاوت و اختلاف نہیں ہے۔ اس لئے کہ ایک اوقیہ میں چالیس درہم ہوتے ہیں اور پانچ اوقیہ کے دو سو درہم ہوگئے کوئی تفاوت نہ رہا۔ تین سو صاع حجازی ہمارے ملک میں مروج انگریزی وزن کے اعتبار سے بیس من ہوتے ہیں۔ ایک وسق میں ساٹھ صاع ہوتے ہیں جو چار من کے برابر ہے۔ گویا ہمارے ملکی حساب سے بیس من غلہ سے کم پر کوئی زکوٰۃ نہیں۔ مگر احناف نے کتاب اللہ اور حدیث کے عموم کو سامنے رکھتے ہوئے یہ فتویٰ دیا ہے کہ غلہ اور کھجور خواہ ایک من یا اس سے بھی کم ہی کیوں نہ ہو اس پر بھی زکوٰۃ ہے مگر پہلی رائے ہی زیادہ صحیح ہے کیونکہ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم نے جب خود وزن مقرر فرمایا ہے تو پھر ہمیں اسی پر عمل کرنا چاہئے۔ اپنی جانب سے کم و بیش کرنے کا مجاز نہیں۔ ہر اس جنس میں جو سال بھر ذخیرہ ہو سکتی ہے۔ اس پر زکوٰۃ ہے۔ مثلاً گندم' چاول' جو' باجرہ' مکئی' ماش' مونگ' چنے وغیرہ۔

(٤٩٥) وَعَنْ سَالِمِ بْنِ عَبْدِ اللهِ، حضرت سالم بن عبداللہ رحمۃ اللہ علیہ اپنے والد سے روایت

عَنْ أَبِيْهِ، عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ: فِيْمَا سَقَتِ السَّمَاءُ وَالعُيُونُ، أَوْ كَانَ عَثَرِيّاً، اَلْعُشْرُ، وَفِيْمَا سُقِيَ بِالنَّضْحِ نِصْفُ الْعُشْرِ. رَوَاهُ الْبُخَارِيُّ. وَلِأَبِيْ دَاوُدَ: أَوْ كَانَ بَعْلاً اَلْعُشْرُ، وَفِيْمَا سُقِيَ بِالسَّوَانِي أَوِ النَّضْحِ نِصْفُ الْعُشْرِ.

کرتے ہیں' انہوں نے نبی ﷺ سے بیان کیا ہے کہ آپؐ نے فرمایا "جو زمین آسمانی بارش اور چشموں سے سیراب ہوتی ہو یا رطوبت والی ہو اس میں دسواں حصہ زکوٰۃ ہے (عشر ہے) اور جو زمین پانی کھینچ کر سیراب کی جاتی ہو۔ اس میں بیسواں حصہ (نصف عشر) ہے۔" (بخاری) ابوداؤد کی روایت میں "بعلا العشر" کا لفظ ہے "العشر" کی جگہ اور اگر جانوروں کے ذریعہ یا ڈول سے پانی نکال کر سیراب کی جاتی ہو اس میں بیسواں حصہ (نصف عشر) ہے۔

لغوی تشریح: ﴿ فیما سقت السماء ﴾ اس سے مراد بارش' اولے' برف' شبنم وغیرہ ہے اور یہ خبر مقدم ہے۔ ﴿ والعیون ﴾ عین کی جمع ہے۔ چشمے کو کہتے ہیں جو زمین کا پیٹ چاک کر کے نکل آتا ہے اور بلا کسی مشقت و محنت کے اس کا پانی حاصل ہو جاتا ہے۔ ﴿ او کان عثریا ﴾ "عین" اور "ثا" دونوں پر فتحہ ہے اور "را" کے نیچے کسرہ اور "یا" پر تشدید۔ زمین میں جو رطوبت ہوتی ہے' اس میں سے خوراک حاصل کر کے پروان چڑھتی ہے کیونکہ پانی سطح زمین کے قریب ہوتا ہے اس لئے وہ زمین بغیر سیراب کئے اور پانی چھوڑے پانی حاصل کر لیتی ہے "العشر" مبتداء مؤخر ہے۔ عین پر ضمہ ہے اور شین ساکن ہے۔ ایک چیز کے دس حصے کر لئے جائیں تو اس کا ایک جزء عشر کہلائے گا۔ ﴿ وفیما سقی ﴾ صیغۂ مجہول۔ اس زمین میں جسے سیراب کیا جائے ﴿ بالنضح ﴾ نضح کے نون پر فتحہ اور "ضاد" ساکن ہے۔ اصل میں پانی کا چھڑکاؤ کرنا بلکہ خوب پانی بہا دینا۔ یہاں وہ اونٹ مراد ہیں جن کے ذریعہ پانی لا کر زمین سیراب کی جاتی ہے۔ اونٹ کی طرح بیل اور گدھے جن سے پانی حاصل کرنے کی خدمت لی جاتی ہے۔ ﴿ بعلا ﴾ یعنی ﴿ عثریا ﴾ کے بدلے بعلا کا لفظ روایت کیا ہے۔ بعل کی "با" پر فتحہ اور عین ساکن۔ وہ زمین جو سیراب کئے بغیر زمین کی نمی و رطوبت یا آسمانی بارش کے ذریعہ سیراب ہوتی ہو۔ اس کا معنی بھی قریب قریب وہی ہے جو عثری (نمی والی زمین) کا ہے یا پھر دونوں مترادف المعنی ہیں۔ ﴿ بالسوانی اوالنضح ﴾ سوانی سانیۃ کی جمع ہے۔ عطف اس کا تقاضہ کرتا ہے کہ سانیہ اور نضح کے معنی الگ الگ ہوں مگر عموماً علماء نے انہیں مترادف قرار دیا ہے جیسا کہ ابھی ہم نے ذکر کیا ہے۔ قابل اعتماد بات یہ ہے کہ سانیہ جانوروں کے ذریعہ پانی لا کر زمین کو سیراب کرنے کا نام ہے اور "نضح" عام ہے اس میں سیراب کرنے کے تمام ذرائع و آلات شامل ہیں۔ اس طرح عام کا عطف خاص پر ہے۔

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ زمین کو مختلف ذرائع و وسائل سے سیراب کرنے کی صورت میں زکوٰۃ (عشر) کی نوعیت بھی مختلف ہے۔ مثلاً جو زمین مشقت طلب ذریعہ سے سیراب ہو جیسے اونٹ' بیل

یا آدمی پانی نکال کر یا لا کر سیراب کرتے ہوں تو اس زمین کی پیداوار پر نصف عشر (بیسواں) حصہ ہے۔ اسی طرح اگر زمین کنوئیں کے پانی' ٹیوب ویل کے پانی سے یا پانی خرید کر سیراب کیا جاتا ہو جیسے نہر کا پانی' ٹیوب ویل کا پانی خرید کر سیراب کیا جاتا ہے تو ایسی صورت میں بھی نصف عشر (بیسواں) حصہ ہے آج کل آبیانہ دے کر زمین سیراب کی جاتی ہے۔ یہ آبیانہ مشقت و محنت کے قائم مقام ہے لہٰذا موجودہ نظام کے تحت نہری پانی سے سیراب کی جانے والی زمینوں کی پیداوار میں بھی بیسواں حصہ ہے۔

(٤٩٦) وَعَنْ أَبِيْ مُوسَى الأَشْعَرِيِّ وَمُعَاذٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ قَالَ لَهُمَا: **لاَ تَأْخُذَا فِي الصَّدَقَةِ إِلاَّ مِنْ هٰذِهِ الأَصْنَافِ الأَرْبَعَةِ: الشَّعِيْرِ، وَالحِنْطَةِ، وَالزَّبِيْبِ، وَالتَّمْرِ.** رَوَاهُ الطَّبَرَانِيُّ وَالحَاكِمُ.

وَلِلدَّارَقُطْنِيِّ عَنْ مُعَاذٍ قَالَ: فَأَمَّا القِثَّاءُ وَالبِطِّيْخُ وَالرُّمَّانُ وَالقَصَبُ، فَقَدْ عَفَا عَنْهُ رَسُولُ اللهِ ﷺ. وَإِسْنَادُهُ ضَعِيفٌ.

حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ اور معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ دونوں سے مروی ہے کہ نبی ﷺ نے ان سے فرمایا کہ "جو' گندم' منقیٰ (کشمش) اور کھجور ان چار اصناف کے علاوہ کسی غلہ پر زکوٰۃ وصول نہ کی جائے۔ (اسے طبرانی اور حاکم نے روایت کیا ہے اور دارقطنی نے معاذ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ کھیرا ککڑی' تربوز' انار اور گنے میں البتہ رسول اللہ ﷺ نے زکوٰۃ معاف فرمائی ہے۔ مگر اس روایت کی سند میں ضعف ہے۔)

لغوی تشریح: ﴿الزبيب﴾ خشک انگور (کشمش) ﴿القثاء﴾ "قاف" کے نیچے کسرہ اور "ثا" پر تشدید۔ کھیرا ﴿البطيخ﴾ "با" کے نیچے کسرہ "طاء" پر تشدید۔ تربوز ﴿الرمان﴾ "را" پر ضمہ اور میم پر تشدید۔ انار۔ ﴿القصب﴾ قاف اور صاد دونوں پر فتحہ۔ گنا۔ یہ حدیث زکوٰۃ کی فرضیت کو غلہ اور پھلوں میں انہی چار اصناف پر انحصار کرتی ہے۔ یہ رائے ایک گروہ کی ہے اور دوسرے لوگوں کی رائے یہ ہے کہ ہر وہ چیز جو ان چار اصناف کے قائم مقام ہو اور جو ذخیرہ ہو سکتی ہو اور محفوظ رہ سکتی ہو اس میں زکوٰۃ واجب ہے۔ اس حدیث میں جو حصر ہے وہ حصر حقیقی نہیں ہے بلکہ وہ حصر اضافی ہے اس مناسبت سے کہ جو اجناس اس دور میں یمن میں دستیاب تھیں اور ان سبزیوں کی مناسبت سے جن پر زکوٰۃ فرض ہی نہیں۔ پس چاول اور مکئی وغیرہ غلہ قسم کی اجناس جنہیں شہروں میں بالعموم لوگ ذخیرہ کر لیتے ہیں' میں زکوٰۃ واجب ہے۔ محققین کے نزدیک یہ رائے زیادہ قابل لحاظ ہے۔

حاصل کلام: حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کی روایت جو دارقطنی کے حوالہ سے ہے اس میں ضعف اس لئے ہے کہ اس میں ایک راوی ضعیف ہے اور سند بھی منقطع ہے جیسا کہ مصنف نے التلخیص میں وضاحت بیان کی ہے۔

(٤٩٧) وَعَنْ سَهْلِ بْنِ أَبِيْ حَثْمَةَ حضرت سہل بن ابی حثمہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ

رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: أَمَرَنَا رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ: «إِذَا خَرَصْتُمْ فَخُذُوا، وَدَعُوا الثُّلُثَ فَإِنْ لَمْ تَدَعُوا الثُّلُثَ، فَدَعُوا الرُّبُعَ». رَوَاهُ الْخَمْسَةُ إِلَّا ابْنَ مَاجَهْ، وَصَحَّحَهُ ابْنُ حِبَّانَ وَالْحَاكِمُ.

ہمیں رسول اللہ ﷺ نے حکم دیا "جب تم غلہ کا تخمینہ اور اندازہ لگاؤ تو ایک تہائی چھوڑ دیا کرو اگر تہائی نہیں چھوڑ سکتے تو چوتھائی چھوڑ دیا کرو۔" (ابن ماجہ کے علاوہ اسے پانچوں نے روایت کیا ہے اور ابن حبان اور حاکم نے اسے صحیح قرار دیا ہے)

لغوی تشریح: ﴿ اذا خرصتم ﴾ یہ خطاب زکوٰۃ وصول کرنے والے عمال کو ہے اور ان کیلئے جو وصولی زکوٰۃ کیلئے دوڑ دھوپ اور سعی و جہد کرتے ہیں اور "خرص" اندازہ لگانے' تخمینہ کرنے کو کہتے ہیں۔ یہاں خرص سے مراد انگور اور تر کھجور کا درختوں پر اندازہ ہے۔ ان دونوں کا اندازہ کس طرح لگایا جائے۔ اسے اس طرح بیان کیا گیا ہے کہ اندازہ لگانے والا مرد درخت کے گرد چکر لگائے۔ جب انگور اور کھجور میں مٹھاس پیدا ہو جائے تو سارے پھل پر سرسری طور پر نظر دوڑائے پھر اندازہ لگائے کہ جب یہ انگور خشک ہو کر کشمش کی صورت اختیار کر لیں گے تو اس وقت ان کی مقدار اور وزن اتنا رہ جائے گا اور یہ کھجور جب خشک ہوگی تو اتنی مقدار میں باقی رہ جائے گی۔ اس تخمینہ اور اندازہ لگانے کیلئے ایک ہی آدمی کافی ہے بشرطیکہ وہ منصف مزاج اور عادل ہو ﴿ فخذوا ﴾ پس تخمینہ کے مطابق تم زکوٰۃ وصول کر لو۔ "خذوا" امر کا صیغہ ہے اور اخذ سے ماخوذ ہے۔ ﴿ ودعوا الثلث الخ ﴾ مال کے مالکوں کیلئے تخمینہ لگائی گئی مقدار میں سے ۳/۱ حصہ چھوڑ دو ایک قول یہ ہے کہ یہ ۳/۱ یا ۴/۱ حصہ جو مال کے مالکوں کیلئے چھوڑا جاتا ہے وہ اس لئے چھوڑا جاتا ہے کہ مالک خود اپنے اعزاء و اقرباء اور اپنے ہمسایوں کو اور اندازہ لگانے کے وقت پاس سے گزرنے والوں پر صدقہ و خیرات کر سکے اور مالک سے اس کا تقاضا و مطالبہ اسے کسی تنگی اور حرج میں مبتلا کئے بغیر کچھ محتاجوں اور مساکین کیلئے کیا جائے گا اور ایک قول یہ بھی ہے کہ ۳/۱ یا ۴/۱ عشر نکالنے سے پہلے ہی اصل مال سے الگ رکھا جائے گا فراخ دلی کے خیال سے کہ پھلوں کا مالک خود اور اپنے اہل و عیال کو کھلا سکے اور ان کی فروخت اس وقت ہوگی جبکہ کھجور رنگ پکڑ کر سرخی مائل ہو جائے۔ اہل و عیال' ہمسائے اور مہمانوں کو فوقیت اور ترجیح دینے کیلئے۔ یہ مقدار جس کے چھوڑنے کا حکم دیا گیا ہے' ان سبزیوں کے قائم مقام ہے جن پر زکوٰۃ نہیں۔ یہ حدیث شریعت اسلامیہ کی خوبیوں اور محاسن میں سے ہے۔ صاحب سبل السلام نے بتایا کہ امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ کا قول ہے کہ یہ تو معمول کی بات ہے کہ جب پھل پک جائے تو مال کے مالک کیلئے ناگزیر ہے کہ وہ خود اور اس کے اہل و عیال وہ پھل کھائیں اور لوگوں کو اس قدر کھلائیں کہ وہ ذخیرہ کر کے نہ رکھے جا سکیں۔ عرف عام میں خود کھانے اور دوسروں کو کھلانے کو ان سبزیوں کی جگہ تصور کیا جاتا ہے جو ذخیرہ کر کے رکھی نہیں جا سکتیں۔

راوی حدیث: ﴿ سهل بن ابی حثمه رضی اللہ عنہ ﴾ سھل کے سین پر فتحہ اور "ھاء" ساکن ہے۔ ان کا نام عبداللہ یا عامر بن ساعدہ بن عامر انصاری خزرجی مدنی ہے۔ صغار صحابہؓ میں شمار ہوتا ہے۔ ۳ھ میں پیدا

ہوئے۔ کوفہ میں سکونت اختیار کی اور ان کا شمار اہل مدینہ میں ہوتا ہے اور مصعب بن زبیر رضی اللہ عنہ کے عہد میں مدینہ ہی میں وفات پائی۔

(٤٩٨) وَعَنْ عَتَّابِ بْنِ أَسِيْدٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: أَمَرَنَا رَسُولُ اللهِ ﷺ أَنْ يُخْرَصَ العِنَبُ، كَمَا يُخْرَصُ النَّخْلُ، وَتُؤْخَذُ زَكَاتُه زَبِيْباً. رَوَاهُ الخَمْسَةُ، وَفِيْهِ انْقِطَاعٌ.

حضرت عتاب بن اسید رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ہمیں رسول اللہ ﷺ نے حکم فرمایا کہ "ہم انگوروں کا اندازہ بھی اس طرح لگائیں جس طرح کھجوروں کا اندازہ لگایا جاتا ہے اور اس کی زکوٰۃ میں کشمش وصول کی جائے۔" (اسے پانچوں نے روایت کیا ہے مگر اس میں انقطاع ہے)

حاصل کلام: اس حدیث میں انقطاع ہے اس لئے کہ اسے سعید بن مسیب' عتاب بن اسید سے روایت کرتے ہیں اور ابوداؤد کہتے ہیں کہ سعید بن مسیب کا عتاب سے سماع ہی ثابت نہیں۔ مگر امام نووی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ گو یہ حدیث مرسل ہے لیکن ائمہ کا فتویٰ اس کا مؤید ہے۔

راوی حدیث: ﴿عتاب بن اسید رضی اللہ عنہ﴾ عتاب میں عین پر فتحہ اور "تا" پر تشدید۔ بن اسید۔ اسید کے ہمزہ پر فتحہ اور سین کے نیچے کسرہ۔ بن ابی العیص بن امیہ بن عبد شمس اموی مکی۔ مشہور صحابی ہیں۔ جب نبی ﷺ فتح مکہ کے بعد حنین کی طرف جانے لگے تو ان کو مکہ پر اپنا عامل مقرر فرمایا۔ اس منصب پر عہد رسالت اور ابوبکر رضی اللہ عنہ کے عہد میں مامور رہے۔ ایک قول یہ ہے کہ ان کی وفات اسی روز ہوئی جس روز حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے وفات پائی اور ایک قول یہ ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی خلافت کے آخری ایام تک زندہ رہے۔

(٤٩٩) وَعَنْ عَمْرِو بْنِ شُعَيْبٍ، عَنْ أَبِيْهِ، عَنْ جَدِّهِ، أَنَّ امرَأَةً أَتَتِ النَّبِيَّ ﷺ وَمَعَهَا ابْنَةٌ لَّهَا، وَفِي يَدِ ابْنَتِهَا مَسْكَتَانِ مِنْ ذَهَبٍ، فَقَالَ لَهَا: «أَتُعْطِيْنَ زَكَاةَ هٰذَا»؟ قَالَتْ: لاَ، قَالَ: «أَيَسُرُّكِ أَنْ يُسَوِّرَكِ اللّٰهُ بِهِمَا يَوْمَ القِيَامَةِ سِوَارَيْنِ مِنْ نَارٍ»؟ فَأَلْقَتْهُمَا. رَوَاهُ الثَّلاَثَةُ، وَإِسْنَادُهُ قَوِيٌّ، وَصَحَّحَهُ الحَاكِمُ مِنْ حَدِيْثِ عَائِشَةَ.

حضرت عمرو بن شعیب رحمۃ اللہ علیہ اپنے والد اور وہ اپنے دادا سے روایت کرتے ہیں کہ ایک خاتون نبی ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئی۔ اس کے ہمراہ اس کی بیٹی بھی تھی۔ جس کے ہاتھ میں سونے کے دو کنگن تھے۔ آپؐ نے اس سے فرمایا "کیا تو اس کی زکوٰۃ دیتی ہے؟" اس نے عرض کیا نہیں! آپؐ نے فرمایا "کیا تجھے یہ پسند ہے کہ قیامت کے روز اللہ تعالیٰ ان کے بدلے تجھے آگ کے دو کنگن پہنائے؟" یہ سن کر اس خاتون نے دونوں کنگن پھینک دیئے۔ (اسے تینوں نے روایت کیا ہے۔ اس کی سند قوی ہے۔ حاکم نے اسے

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت کیا اور اسے صحیح کہا ہے)

لغوی تشریح: ﴿ ان امراہ ﴾ اس خاتون کا نام اسماء بنت یزید بن سکن ہے۔ ﴿ مسکتان ﴾ کے میم' سین اور کاف تینوں پر فتحہ ہے اور یہ مسکۃ کا تثنیہ ہے یعنی کنگن جو ہاتھوں میں پہنا جاتا ہے۔ فارسی میں کہا جاتا ہے دست برنجن اور کنگن بھی کہا جاتا ہے۔ مسکۃ پازیب کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ پازیب وہ زیور ہے جو پاؤں میں اس طرح پہنا جاتا ہے جس طرح کنگن ہاتھوں میں پہنے جاتے ہیں۔ "ایسرک" اس میں همزہ استفہامیہ ہے اور فعل مضارع ہے' سرور سے ماخوذ ہے اور کاف مؤنث کے خطاب کیلئے ہے۔ معنی ہے کیا تجھے یہ پسند ہے' خوش لگتا ہے' باعث سرور و مسرت ہے۔ ﴿ ان یسورک ﴾ تسویر سے ماخوذ ہے' کنگن پہننے کو کہتے ہیں۔ ﴿ بھما ﴾ ان دونوں کی جگہ ان دونوں کے بدلہ میں یا یہ معنی ہے کہ ان دونوں کے سبب تجھے آگ کے دو کنگن پہنائے جائیں۔ زکوٰۃ کی عدم ادائیگی کی صورت میں۔ ﴿ فالقتھما ﴾ اس نے وہ دونوں کنگن پھینک مارے۔

حاصل کلام: اس حدیث سے ثابت ہوتا ہے کہ زیورات پر زکوٰۃ ہے۔ لیکن اس کے بارے میں فقہاء کا اختلاف ہے۔ پہلا قول یہ ہے کہ زیور میں زکوٰۃ واجب ہے۔ دوسرا یہ کہ زیور میں زکوٰۃ فرض نہیں۔ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ' احمد رحمۃ اللہ علیہ اور ایک قول کے مطابق امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ بھی اسی کے قائل ہیں۔ تیسرا قول یہ ہے کہ زیور کی زکوٰۃ اسے عاریتاً دینا ہے' الگ زکوٰۃ نہیں۔ چوتھا قول یہ ہے کہ زیورات میں صرف ایک ہی بار زکوٰۃ دینا فرض ہے۔ راجح قول یہی ہے کہ زیورات پر زکوٰۃ فرض ہے اور یہ صحیح حدیث اس کی کھلی ہوئی دلیل ہے۔ اس کے مقابلے میں بعض آثار کی بنا پر جو کہا گیا ہے کہ زیورات میں زکوٰۃ نہیں وہ قابل التفات نہیں۔ (سبل)

(٥٠٠) وَعَنْ أُمِّ سَلَمَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهَا، أَنَّهَا كَانَتْ تَلْبَسُ أَوْضَاحاً مِنْ ذَهَبٍ، فَقَالَتْ: يَا رَسُولَ اللهِ! أَكَنْزٌ هُوَ؟ فَقَالَ: «إِذَا أَدَّيْتِ زَكَاتَهُ فَلَيْسَ بِكَنْزٍ». رَوَاهُ أَبُو دَاوُدَ وَالدَّارَقُطْنِيُّ، وَصَحَّحَهُ الحَاكِمُ.	حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ انہوں نے سونے کا زیور پہن رکھا تھا۔ انہوں نے دریافت کیا یارسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم)! کیا وہ کنز ہے؟ فرمایا "جب تو نے اس کی زکوٰۃ ادا کر دی تو پھر یہ کنز نہیں۔" (اسے ابوداؤد اور دارقطنی دونوں نے روایت کیا ہے اور حاکم نے اسے صحیح قرار دیا ہے)

لغوی تشریح: ﴿ اوضاحا ﴾ "ضاد" اور "حا" کے ساتھ "وضح" کی جمع ہے "وضح" کے معنی ہیں پازیب یعنی پاؤں کا زیور ﴿ اکنزھو ﴾ اس میں همزہ استفہامیہ ہے۔ یعنی دریافت کیا کہ آیا یہ کنز کی تعریف میں آتا ہے جس کے بارے میں قرآن حمید میں سخت وعید وارد ہے۔ والذین یکنزون الذھب والفضۃ ولا ینفقونھا فی سبیل اللہ فبشرھم بعذاب الیم یوم یحمی علیھا فی نار جھنم فتکوی بھا جباھم وجنوبھم وظھورھم' ھذا ما کنزتم لانفسکم' فذوقوا ما کنتم تکنزون (٩

: ۳۴-۳۵) ”یعنی جو لوگ سونے چاندی کو جمع کرتے ہیں اور اس میں سے خرچ نہیں کرتے ان کو عذاب کی خوشخبری سنا دیجئے......“ ﴿ اذا ادیت زکاته ﴾ اس سے زیور میں زکوٰۃ کا وجوب معلوم ہوتا ہے اور سنن ابی داؤد میں ہے کہ جب مال نصاب زکوٰۃ کو پہنچ جائے اور اس کی زکوٰۃ ادا کر دی جائے تو پھر وہ کنز نہیں رہتا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ زیور میں نصاب معتبر ہے۔ جب نصاب زکوٰۃ سے کم مالیت کا زیور ہوگا تو اس میں زکوٰۃ واجب نہیں۔

حاصل کلام: اوضاح جیسا کہ اوپر بیان ہوا وضح کی جمع ہے' وضح کہتے ہیں روشن اور چمک دمک کو۔ دراصل تو یہ زیور چاندی سے تیار ہوتا تھا۔ اس ظاہری چمک دمک اور سفیدی کی وجہ سے اسے اوضاح کہا جاتا تھا۔ بعد ازاں یہ زیور سونے کا بھی تیار کیا جانے لگا۔ اس حدیث سے بھی سونے چاندی سے ساختہ زیورات پر زکوٰۃ کی فرضیت ثابت ہوتی ہے۔ چاندی کے زیور پر بھی زکوٰۃ ہے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے ہاتھ میں چاندی کے چھلے دیکھے تو آپؐ نے دریافت فرمایا کہ ”اے عائشہ! تم اس کی زکوٰۃ دیتی ہو؟“ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے عرض کیا نہیں۔ فرمایا ”اچھا تو پھر جہنم کی آگ میں سے تمہارے لئے یہی کافی ہیں۔“ حاکم نے اس کی سند کو شیخین کی شرط کے مطابق کہا ہے۔

(۵۰۱) وَعَنْ سَمُرَةَ بْنِ جُنْدُبٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: كَانَ رَسُولُ اللهِ ﷺ يَأْمُرُنَا أَنْ نُخْرِجَ الصَّدَقَةَ مِنَ الَّذِي نَعُدُّهُ لِلْبَيْعِ. رَوَاهُ أبو دَاوُدَ، وَإِسْنَادُهُ لَيِّنٌ.

حضرت سمرہ بن جندب رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہمیں سامان تجارت سے زکوٰۃ نکالنے کا حکم دیا کرتے تھے۔ (اسے ابوداؤد نے کمزور سند کے ساتھ روایت کیا ہے)

لغوی تشریح: ﴿ نعده ﴾ ہم اسے تیار کرتے تھے اور فروخت کیلئے حاضر کرتے تھے۔ ﴿ نعده ﴾ میں نون پر ضمہ اور عین کے نیچے کسرہ۔ اعداد سے ماخوذ ہے۔ باب افعال ہے۔ یہ حدیث اموال تجارت پر زکوٰۃ کے وجوب کی دلیل ہے۔ ﴿ واسناده لین ﴾ ابوداؤد نے اس کے بارے میں خاموشی اختیار کی ہے۔ پھر منذری رحمہ اللہ نے بھی سکوت کیا ہے۔ ابن عبدالبر نے کہا ہے کہ اس کی سند حسن درجہ کی ہے۔ (عون المعبود' ج ۲ ص: ۳)

حاصل کلام: اس حدیث سے ثابت ہوتا ہے کہ اموال تجارت پر زکوٰۃ فرض ہے۔ مجاہد نے اس کی فرضیت پر قرآن مجید کی آیت ﴿ انفقوا من طیبات ماکسبتم ﴾ سے استدلال کیا ہے اور ابن منذر نے اس کی فرضیت پر اجماع کا دعویٰ کیا ہے۔ فقہاء سبعہ بھی اسی کے قائل ہیں اور ائمہ اربعہ کا بھی یہی مذہب ہے کہ مال تجارت پر زکوٰۃ فرض ہے۔ البتہ ظاہریہ اس کی فرضیت کے قائل نہیں۔ ان کی رائے یہ ہے کہ اس بارے میں کوئی صحیح روایت نہیں ہے اور اس روایت کا ایک راوی سلیمان بن سمرہ مجہول ہے۔ لیکن متقدمین کا اتفاق اور صحابہ کرامؓ کے فتاویٰ اس کے مؤید ہیں۔

(۵۰۲) وَعَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، أَنَّ رَسُولَ اللهِ ﷺ قَالَ: «وَفِي الرِّكَازِ الخُمُسُ». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "معدنیات میں خمس یعنی پانچواں حصہ ہے۔" (بخاری و مسلم)

لغوی تشریح: ﴿ وفی الرکاز ﴾ اس میں "واوٗ" پہلے جملہ پر عطف کیلئے ہے اور وہ جملہ ہے ﴿ العجماء جبار' والبئر جبار' والمعدن جبار ﴾ مصنف نے اختصار کے پیش نظر اتنا حصہ چھوڑ دیا ہے۔ ﴿ والرکاز ﴾ "را" کے نیچے کسرہ۔ جاہلیت کے زمانہ کا زمین میں مدفون خزانہ جو بغیر کسی کثیر عمل و مشقت کے حاصل ہوا ہو۔ ﴿ الخمس ﴾ خا اور میم دونوں پر ضمہ۔ کسی چیز کے پانچ برابر حصے کئے جائیں تو ان میں سے ایک حصہ پانچواں حصہ کہلاتا ہے اور یہ مبتداء مؤخر ہے اور خبر اس کی پہلا جملہ ﴿ فی الرکاز ﴾ ہے۔ یہ حدیث اس بات کی دلیل ہے کہ رکاز کے مال میں زکوٰۃ نہیں بلکہ خمس ہے۔ اس کی حیثیت اموال غنیمت کی سی ہے۔ اس میں خمس واجب ہے جو بیت المال میں جمع کیا جائے گا اور باقی تمام کا مالک وہ شخص ہوگا جسے یہ خزانہ ملا۔

(۵۰۳) وَعَنْ عَمْرِو بْنِ شُعَيْبٍ، عَنْ أَبِيْهِ، عَنْ جَدِّهِ أَنَّ رَسُولَ اللهِ ﷺ قَالَ فِي كَنْزٍ وَجَدَهُ رَجُلٌ فِيْ خَرِبَةٍ: «إِنْ وَجَدْتَهُ فِي قَرْيَةٍ مَسْكُونَةٍ فَعَرِّفْهُ، وَإِنْ وَجَدْتَهُ فِي قَرْيَةٍ غَيْرِ مَسْكُونَةٍ فَفِيهِ وَفِي الرِّكَازِ الخُمُسُ». أَخْرَجَهُ ابْنُ مَاجَه بِإِسْنَادٍ حَسَنٍ.

حضرت عمرو بن شعیب رحمہ اللہ اپنے والد سے اور وہ اپنے دادا سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے اس خزانے کے بارے میں جو کسی آدمی کو ویرانے سے حاصل ہوا ہو (ملا ہو) فرمایا "اگر تو نے یہ خزانہ کسی آباد جگہ سے پایا ہے تو اس کی تحقیق کیلئے اعلان کرو اور اگر تو نے کسی غیر آباد جگہ سے پایا ہے تو اس میں اور معدنیات میں (پانچواں حصہ) ہے۔" (اسے ابن ماجہ نے حسن سند سے نکالا ہے)

لغوی تشریح: ﴿ فی خربۃ ﴾ "خا" پر فتحہ اور "را" کے نیچے کسرہ۔ شکستہ' بے آباد مقام جہاں کوئی رہتا نہ ہو۔ ﴿ فی قریہ مسکونہ ﴾ جہاں لوگ آباد ہوں۔ یعنی یہ ویران اور بے آباد جگہ آبادی میں ہو ﴿ فعرفہ ﴾ تعریف سے امر کا صیغہ ہے تو لوگوں میں اس کا اس وقت تک اعلان کرو اور اس کی کیفیت بیان کرو کہ یا تو اس کا مالک آجائے اور یا پھر سال بھر اس پر گزر جائے تو ایسی صورت میں تمہارے لئے اس کا کھانا صحیح اور درست ہے تو گویا اس خزانے کی نوعیت گری پڑی چیز کی سی ہوگی۔ ﴿ وان وجدتہ ﴾ اور اگر تو اسے غیر آباد جگہ میں پائے تو اس کا حکم' رکاز کا حکم ہوگا اور دونوں کے حکم کی نوعیت اموال غنیمت کے حکم کی ہوگی۔ ﴿ وفی الرکاز ﴾ واوٗ عطف اس بات کا متقاضی ہے کہ جب خزانہ زمین کے پیٹ سے نہ نکالا جائے تو اسے رکاز نہیں کہتے ہیں۔

(۵۰۴) وَعَنْ بِلاَلِ بْنِ الحَارِثِ حضرت بلال بن حارث رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ

رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُ، أَنَّ رَسُولَ اللهِ ﷺ أَخَذَ مِنَ المَعَادِنِ القَبَلِيَّةِ الصَّدَقَةَ. رَوَاهُ أَبُو دَاوُدَ.

رسول اللہ ﷺ نے قبل جگہ میں واقع کانوں سے زکوٰۃ وصول کی۔ (ابوداؤد)

لغوی تشریح: ﴿معادن﴾ "معدن" کی جمع ہے۔ "معدن" میں دال کے نیچے کسرہ ہے۔ کان' زیر زمین اس حصہ کو کہتے ہیں جہاں سونا' چاندی اور جواہرات وغیرہ اللہ تعالیٰ نے بکثرت پیدا فرمائے ہوں۔ ﴿القبلیۃ﴾ "قاف" پر فتحہ اور "با" پر بھی "قبل" کی طرف نسبت ہے۔ "فرع" کے نواح میں ایک جگہ کا نام ہے اور "فرع" میں "فا" پر ضمہ ہے اور "را" ساکن ہے اور ایک قراءت کے مطابق دونوں پر ضمہ بھی ہے۔ مدینہ کے بالائی حصہ میں ساحل سمندر پر واقع زمین جو مکہ و مدینہ کے درمیان مدینہ سے آٹھ برد (تقریباً ۹۶ میل) کے فاصلہ پر ہے اور ایک قول یہ بھی ہے کہ یہ جگہ چار دن کی مسافت پر واقع ہے۔ اس میں بہت سی مساجد اور بستیاں ہیں۔ اس حدیث سے ثابت ہوتا ہے کہ کانوں پر زکوٰۃ واجب ہے ان میں خمس نہیں۔ معدن اور رکاز (کان اور دفینہ) دونوں ایک نہیں ہیں۔ لغوی اعتبار سے' حکماً نہ شرعاً۔

راوی حدیث: ﴿بلال بن حارث رضی اللہ عنہ﴾ بلال بن حارث مزنیہ قبیلہ سے ہونے کی وجہ سے مزنی کہلائے۔ آپ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں ۵ھ میں نمائندہ کی حیثیت سے آئے تھے۔ مدینہ میں سکونت اختیار کی۔ پھر بصرہ منتقل ہوگئے تھے۔ فتح مکہ کے روز انہوں نے مزنیہ قبیلہ کا جھنڈا اٹھایا ہوا تھا۔ ۸۰ برس کی عمر میں ۶۰ھ میں وفات پائی۔

١ - بَابُ صَدَقَةِ الفِطْرِ

صدقۂ فطر کا بیان

(٥٠٥) عَنِ ابْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُمَا قَالَ: فَرَضَ رَسُولُ اللهِ ﷺ زَكَاةَ الفِطْرِ صَاعاً مِنْ تَمْرٍ، أَوْ صَاعاً مِنْ شَعِيرٍ، عَلَى العَبْدِ وَالحُرِّ وَالذَّكَرِ وَالأُنْثَى وَالصَّغِيرِ وَالكَبِيرِ، مِنَ المُسْلِمِينَ، وَأَمَرَ بِهَا أَن تُؤَدَّى قَبْلَ خُرُوجِ النَّاسِ إِلَى الصَّلَاةِ. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے مسلمانوں کے غلام' آزاد' مرد' عورت' بچے' بوڑھے سب پر صدقہ فطر واجب کیا ہے۔ ایک صاع (ٹوپا) کھجوروں سے یا ایک صاع جو سے اور اس کے متعلق حکم دیا ہے کہ یہ فطرانہ نماز کیلئے نکلنے سے پہلے ادا کر دیا جائے۔ (بخاری و مسلم)

وَلِابْنِ عَدِيٍّ وَالدَّارَقُطْنِيِّ بِإِسْنَادٍ ضَعِيفٍ: أَغْنُوهُمْ عَنِ الطَّوَافِ فِي هٰذَا اليَوْمِ.

ابن عدی اور دارقطنی میں ضعیف سند سے ہے کہ اس روز غرباء کو دربدر پھرنے سے بے نیاز کر دو۔

لغوی تشریح: ﴿باب صدقة الفطر﴾ رمضان کے اختتام پر فطرانہ دینا۔ قسطلانی کے بقول فطرانہ کی فرضیت رمضان المبارک کے آغاز سے صرف دو روز پہلے ۲ھ میں ہوئی۔ ﴿فرض﴾ بمعنی واجب اور لازم۔ یعنی اسے واجب اور لازم قرار دیا گیا۔ یہ صدقہ فطر (فطرانہ) کے وجوب کی واضح دلیل ہے۔ ایک قول یہ بھی ہے کہ فرض قدر کے معنی میں استعمال ہوا ہے لیکن یہ ظاہر کے سراسر خلاف ہے۔ ﴿من المسلمين﴾ کافروں میں سے نہ ہو۔ اس لئے کافر غلام کا صدقہ فطر نہیں نکالا جاتا۔ ﴿اغنوهم﴾ اغناء سے امر کا صیغہ ہے۔ ضمیر منصوب فقراء کی طرف راجع ہے یعنی "ھم" ضمیر سے مراد محتاج و ضرورت مند لوگ ہیں۔ ﴿عن الطواف﴾ دست سوال دراز کرنے کیلئے گلی کوچوں اور بازاروں میں گھومنے پھرنے سے بے نیاز کر دیں اور لوگوں سے اپنی معاشی ضروریات طلب کرنے سے روک دیں۔ یہ بے نیازی اسی صورت میں حاصل ہو سکتی ہے کہ فطرانہ دن کے پہلے حصہ میں ادا کر دیا جائے تاکہ ضرورت مند لوگ اپنی ضروریات کا سامان خرید سکیں اور بے فکر ہو جائیں۔

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ فطرانہ مسلمانوں کے سب افراد پر واجب ہے اور اس کی ادائیگی کا حکم بھی نماز عید سے پہلے پہلے ہے تاکہ معاشرہ کے ضرورت مند حضرات اس روز مانگنے سے بے نیاز ہو کر عام مسلمانوں کے ساتھ خوشیوں اور مسرتوں میں شریک ہو سکیں۔ اس فطرانہ کی مقدار ایک صاع مقرر فرمائی ہے۔ غیر مسلم غلام کا فطرانہ نہیں۔ البتہ جن افراد کی کفالت کسی کے ذمہ ہو ان سب کا فطرانہ وہ خود ادا کرے گا۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ صدقہ فطر کیلئے نصاب کا مالک ہونا بھی ضروری نہیں۔ فرض کا لفظ بتا رہا ہے کہ فطرانہ ادا کرنا نہایت ضروری اور لازمی ہے۔ امام اسحٰق بن راھویہ رحمۃ اللہ علیہ نے تو فطرانہ کے وجوب پر اجماع کا دعویٰ کیا ہے۔

(۵۰۶) وَعَنْ أَبِيْ سَعِيْدِ الخُدْرِيِّ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: كُنَّا نُعْطِيْهَا فِي زَمَنِ النَّبِيِّ ﷺ صَاعاً مِنْ طَعَامٍ، أَوْ صَاعاً مِنْ تَمْرٍ، أَوْ صَاعاً مِنْ شَعِيْرٍ، أَوْ صَاعاً مِنْ زَبِيْبٍ. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ. وَفِيْ رِوَايَةٍ: «أَوْ صَاعاً مِنْ أَقِطٍ». قَالَ أَبُو سَعِيْدٍ: أَمَّا أَنَا فَلاَ أَزَالُ أُخْرِجُهُ، كَمَا كُنْتُ أُخْرِجُهُ فِي زَمَنِ رَسُولِ اللهِ ﷺ. وَلِأَبِيْ دَاوُدَ: «لاَ أُخْرِجُ أَبَداً إِلاَّ صَاعاً».

حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ہم نبی ﷺ کے زمانہ میں گندم سے ایک صاع اور کھجور سے ایک صاع اور جو سے ایک صاع اور کشمش (منقیٰ) سے ایک صاع (فطرانہ) دیا کرتے تھے۔ (بخاری و مسلم) اور ایک روایت میں ہے کہ پنیر میں سے ایک صاع نکالا کرتے تھے۔ ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ نے کہا کہ میں تو ہمیشہ وہی مقدار نکالتا رہوں گا جو میں رسول اللہ ﷺ کے زمانہ میں نکالا کرتا تھا اور ابوداؤد کی روایت میں ہے کہ میں تو ہمیشہ ایک صاع ہی نکالوں گا۔

لغوی تشریح: ﴿کنا نعطیھا﴾ ہم دیا کرتے تھے سے مراد ہم صدقہ فطر (فطرانہ) دیا کرتے تھے۔ ﴿صاعا من طعام﴾ طعام کا لفظ مابعد مذکور چیزوں کے مابین میں بولا گیا تا کہ طعام اور دوسری اجناس کے مابین فرق و تغائر واضح ہو جائے اور اس سے مراد گندم ہے۔ طعام بول کر اہل عرب عموماً اس سے مراد گندم لیتے ہیں اور ایک قول یہ بھی ہے کہ "طعام" میں اجمال ہے اور مابعد اس کی تفصیل ہے اور بعض روایات میں اس کی صراحت بھی ہے اس لئے یہی قول راجح ہے۔ ﴿اقط﴾ ہمزہ پر فتحہ اور قاف کے نیچے کسرہ۔ پنیر کو کہتے ہیں۔ یہ دراصل دودھ ہوتا ہے جو خشک کر کے جمایا ہوتا ہے اور پتھر کی طرح سخت ہو جاتا ہے۔ ﴿فلا ازال اخرجه﴾ اور میں ہمیشہ ایک صاع کی مقدار ہی فطرانہ نکالتا رہوں گا خواہ کوئی جنس ہو' گندم ہو یا دوسری اجناس اور ایک صاع میں پانچ رطل پورے اور ۳/۱ مزید ہوتے ہیں اور یہ وزن چار مد کے مساوی ہوتا ہے۔ جدید حساب کے مطابق ایک صاع کا وزن اڑھائی کلوگرام کے قریب ہوتا ہے اور اس کا مکمل ضبط تو ممکن نہیں۔ جب کوئی چیز ہلکے وزن کی ہوتی ہے جیسے جو تو صاع اس کی قلیل مقدار سے پورا ہو جاتا ہے اور جب بھاری و ثقیل وزن کی ہوتی ہے تو اس سے بھی زیادہ وزن سے پورا ہوتا ہے۔ یہ حدیث ہر چیز سے فطرانہ ایک صاع کا تقاضا کرتی ہے اور نصف صاع فطرانہ کے فرض کی ادائیگی کیلئے کافی نہیں ہے۔

حاصل کلام: یہ حدیث اس امر میں بالکل واضح ہے کہ فطرانہ ایک صاع ہی مسنون ہے۔ خواہ کوئی جنس ہو۔ حضرت ابوسعید رضی اللہ عنہ کا یہی موقف تھا۔ انہوں نے ایک صاع ہی دینے کا اظہار اسی لئے فرمایا کہ امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے اپنے دور خلافت میں آدھا صاع گندم کو پورے صاع جو کے برابر کر دیا اس لئے حضرت ابوسعید رضی اللہ عنہ کو کہنا پڑا کہ ہم تو اتنا ہی فطرانہ ہر جنس سے ادا کرتے رہیں گے جتنا آپ ؐ کے دور میں کرتے رہے ہیں۔ امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے اجتہاد سے کام لیا اور حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ نے رسالت مآب ﷺ کے ارشاد اور اس پر عمل صحابہ ؓ کو دلیل بنایا۔ حضرت ابوسعید رضی اللہ عنہ کی رائے وزنی ہے' اسی پر عمل ہونا چاہئے۔ حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ نے صاع کا اعتبار کیا ہے جنس کی گرانی اور ارزانی کا نہیں جبکہ دوسرے حضرات نے صاع کا نہیں بلکہ قیمت اشیاء کا اعتبار کیا ہے۔

(۵۰۷) وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُمَا قَالَ: فَرَضَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ زَكَاةَ الفِطْرِ طُهْرَةً لِلصَّائِمِ مِنَ اللَّغْوِ وَالرَّفَثِ، وَطُعْمَةً لِلْمَسَاكِينْ، فَمَنْ أَدَّاهَا قَبْلَ الصَّلاَةِ فَهِيَ زَكَاةٌ مَقْبُولَةٌ، وَمَنْ أَدَّاهَا بَعْدَ الصَّلاَةِ فَهِيَ صَدَقَةٌ مِنَ الصَّدَقَاتِ.

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے صدقہ فطر (فطرانہ) روزہ دار کی لغویات اور فحش گوئی سے روزہ کو پاک کرنے کیلئے اور مساکین کو کھانا کھلانے کیلئے مقرر کیا ہے۔ جو اسے نماز ادا کرنے سے پہلے ادا کر دے وہ تو مقبول ہے اور جو ادائیگی نماز کے بعد دیا جائے تو یہ صدقوں میں ایک صدقہ ہے۔ (اسے ابوداؤد اور ابن ماجہ نے روایت

رَوَاهُ أَبُو دَاوُدَ وَابْنُ مَاجَهْ، وَصَحَّحَهُ الحَاكِمُ. کیا ہے اور حاکم نے صحیح کہا ہے)

لغوی تشریح: ﴿ طهرة ﴾ "طا" پر ضمہ۔ منصوب ہے مفعول لہ ہونے کی وجہ سے۔ معنی روزہ دار کے نفس کی طہارت کیلئے۔ ﴿ من اللغو ﴾ لغو کا تعلق زبان و قول سے ہے' دل سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔ ﴿ والرفث ﴾ فحش کلامی۔ ﴿ طعمة ﴾ "طا" پر ضمہ۔ مراد کھانا اور اس کا عطف طهرة کے لفظ پر ہے۔ کہا گیا ہے کہ مساکین کا بالخصوص ذکر اس بات کی دلیل ہے کہ صدقہء فطر بھی انہی کا مخصوص استحقاق ہے اور ایک قول یہ بھی ہے کہ صدقہ فطر کا مصرف وہی جگہیں ہیں جو زکوٰۃ کے مصارف ہیں۔ بعض اصناف کا نص میں ذکر اس کی تخصیص کو مستلزم نہیں ہے۔ من اداها قبل الصلاة قبل صلاۃ سے مراد ہے نماز عید سے پہلے ﴿ صدقة من الصدقات ﴾ یعنی پھر یہ عام صدقہ ہو گا۔ صدقہء فطر نہیں ہو گا' اور آدمی فریضہ کا تارک ہی رہے گا۔

حاصل کلام: اس حدیث سے ثابت ہوا کہ فطرانہ مساکین کا حق ہے۔ یہ حق نماز عید سے پہلے ادا کر دینا چاہئے۔ نماز عید کے بعد ادا شدہ فطرانہ ایک عام صدقہ ہو گا' فطرانہ عید نہیں ہو گا۔

٢ - بَابُ صَدَقَةِ التَّطَوُّعِ — نفلی صدقے کا بیان

(٥٠٨) وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ: «سَبْعَةٌ يُظِلُّهُمُ اللَّهُ فِي ظِلِّهِ يَوْمَ لاَ ظِلَّ إِلاَّ ظِلُّهُ» - فَذَكَرَ ٱلْحَدِيْثَ - وَفِيْهِ: «وَرَجُلٌ تَصَدَّقَ بِصَدَقَةٍ فَأَخْفَاهَا، حَتَّى لاَ تَعْلَمَ شِمَالُهُ مَا تُنْفِقُ يَمِينُهُ». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا "سات قسم کے آدمی ایسے ہیں جن کو اللہ تعالیٰ ایسے روز میں سایہ عطا کرے گا جس روز اس کے سائے کے سوا کوئی اور سایہ نہ ہو گا۔" پھر ساری حدیث بیان کی۔ اس میں ہے کہ "ان سات آدمیوں میں وہ آدمی بھی شامل ہے جو ایسے طریقہ سے مخفی طور پر صدقہ دے کہ بائیں ہاتھ تک کو خبر نہ ہونے پائے کہ دائیں ہاتھ سے کیا دیا ہے۔" (بخاری و مسلم)

لغوی تشریح: ﴿ سبعة ﴾ سات اقسام و انواع کے لوگ۔ ﴿ يظلهم ﴾ باب افعال سے ماخوذ ہے۔ یعنی ان کو سایہ میں جگہ دے گا۔ ﴿ فی ظله ﴾ اپنے سائے میں۔ اس سے مراد اللہ تعالیٰ کے عرش عظیم کا سایہ ہے۔ جیسا کہ دوسری احادیث میں ہے یا اس سے مراد یہ ہے کہ انہیں اپنی حمایت و حفاظت میں لے لے گا۔ ﴿ یوم لاظل ﴾ جس روز کوئی سایہ نہ ہو گا اس سے مراد قیامت کا دن ہے ﴿ فذکر الحدیث ﴾ پھر حدیث بیان فرمائی اور اس میں ان ساتوں کا ذکر کیا جو یہ ہیں۔ (۱) امام عادل۔ (۲) وہ نوجوان جس کی نشوونما اللہ کی عبادت میں ہوئی ہو۔ (۳) وہ آدمی جس کا قلب مسجد سے معلق ہو۔ (۴) ایسے دو آدمی جن کی باہمی

محبت اللہ کیلئے ہو۔ اگر جمع ہوں تب بھی اللہ کی خاطر اور اگر جدا جدا ہوں تب بھی ان کی جدائی اللہ کیلئے ہو۔ (۵) وہ آدمی جسے حسب و نسب والی حسین و جمیل نوجوان عورت دعوت برائی دے اور وہ یہ کہہ کر کہ میں تو اللہ سے ڈرتا ہوں' اس کی دعوت کو ٹھکرا دے۔ (٦) وہ آدمی جو تنہائی اور کنج عزلت میں ذکر الٰہی میں ایسا مشغول ہو کہ اس کی آنکھوں سے اشک رواں ہو جائیں۔ (۷) اور ساتواں وہ آدمی ہے جو ایسے مخفی طریقہ سے صدقہ و خیرات کرتا ہے کہ اس کے بائیں ہاتھ کو بھی خبر نہیں ہوتی کہ دائیں ہاتھ نے کیا دیا ہے۔ ﴿ حتی لا تعلم شماله ﴾ بائیں کو خبر نہ ہو کہ دائیں نے کیا دیا۔ دراصل اس میں مبالغہ آرائی ہے کہ صدقہ دیتے وقت ریا کا شائبہ و گمان تک نہ ہو۔ یہ حدیث صدقہ واجبہ اور نافلہ دونوں پر محیط ہے۔

حاصل کلام: اس حدیث سے ثابت ہوا کہ قیامت قائم ہونے والی ہے۔ اس روز عرش الٰہی کے علاوہ اور کہیں سایہ میسر نہیں آئے گا۔ عرش کیا ہے۔ اس کی صحیح کیفیت و نوعیت تو اللہ تعالیٰ ہی کے علم میں ہے۔

اس حدیث میں مرد کی قید اتفاقی ہے ورنہ انہی اوصاف سے متصف اگر کوئی خاتون ہوگی تو اسے بھی یہی ثواب ملے گا۔ نیز اس حدیث سے صدقہ و خیرات مخفی طریقہ سے دینے کی فضیلت معلوم ہوتی ہے۔ اس سلسلہ میں یہ بات ذہن نشین رہنی چاہئے کہ فرض اور واجب صدقہ دکھا کر کھلے عام دینا چاہئے تاکہ لوگوں میں رغبت و شوق پیدا ہو اور نفلی چھپا کر بہتر ہے۔ ضروری اور لازمی نہیں کیونکہ اگر نفلی خیرات عمومی حیثیت کی حامل ہو اور ریا بھی مطلوب نہ ہو تو اس کا بھی کھلے عام دینا زیادہ بہتر ہے۔

(۵۰۹) وَعنْ عُقْبَةَ بْنِ عَامِرٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: سَمِعْتُ رَسُولَ اللهِ ﷺ يَقُوْلُ: كُلُّ امْرِىءٍ فِي ظِلِّ صَدَقَتِهِ حَتَّى يُفْصَلَ بَيْنَ النَّاسِ». رَوَاهُ ابْنُ حِبَّانَ وَالحَاكِمُ.

حضرت عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے سنا ہے کہ "ہر آدمی اپنے صدقہ کے سایہ میں کھڑا ہو گا یہاں تک کہ لوگوں کا فیصلہ ہو جائے۔" (ابن حبان اور مستدرک حاکم)

حاصل کلام: اس حدیث میں صدقہ کی فضیلت بیان ہوئی ہے کہ صدقہ کرنے والا قیامت کے روز اپنے صدقہ کے سایہ میں کھڑا ہوگا۔ اس روز گرمی و تمازت انتہائی درجہ پر پہنچی ہوئی ہوگی۔ سایہ کا نصیب ہونا اس روز بڑی غیر معمولی نعمت ہوگی۔ سایہ کے دو مفہوم ہو سکتے ہیں ایک تو یہ کہ واقعتاً صدقہ سائبان کی طرح سایہ دے رہا ہوگا اور صدقہ کرنے والا اس سایہ میں کھڑا سکون و طمانیت محسوس کر رہا ہوگا یا دوسرا معنی یہ کہ صدقہ آدمی کی حمایت کر رہا ہوگا اور اسے بخشوا کر رہے گا۔ صدقات نفلیہ کا ایک مفید پہلو یہ بھی ہے کہ فرض زکوۃ میں اگر کسی قسم کی کمی یا نقص رہ گیا ہوگا تو اس سے وہ پورا کر دیا جائے گا۔

(۵۱۰) وَعَنْ أَبِيْ سَعِيْدٍ الخُدْرِيِّ حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ کی نبی ﷺ سے روایت

رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰی عَنْهُ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ: أَيُّمَا مُسْلِمٍ كَسَا مُسْلِماً ثَوْباً عَلٰی عُرْيٍ كَسَاهُ اللّٰهُ مِنْ خُضْرِ الْجَنَّةِ، وَأَيُّمَا مُسْلِمٍ أَطْعَمَ مُسْلِماً عَلٰی جُوعٍ أَطْعَمَهُ اللّٰهُ مِنْ ثِمَارِ الْجَنَّةِ، وَأَيُّمَا مُسْلِمٍ سَقَى مُسْلِماً عَلٰی ظَمَإٍ سَقَاهُ اللّٰهُ مِنَ الرَّحِيقِ الْمَخْتُومِ». رَوَاهُ أَبُو دَاوُدَ، وَفِي إِسْنَادِهِ لِيْنٌ.

ہے کہ آپؐ نے فرمایا "جو مسلمان اپنے برہنہ بھائی کو کپڑا پہنائے گا تو اللہ تعالیٰ اسے جنت کے سبز ریشمی کپڑے پہنائے گا اور جو مسلمان اپنے کسی بھوکے مسلمان بھائی کو کھانا کھلائے گا اللہ تعالیٰ اسے جنت کے پھل کھلائے گا اور جو مسلمان اپنے پیاسے مسلمان بھائی کو پانی (یا مشروب) پلائے گا اللہ تعالیٰ اسے جنت کی مہربند پاکیزہ شراب پلائے گا۔" (اسے ابوداؤد نے روایت کیا۔ اس کی سند میں کمزوری ہے)

لغوی تشریح: ﴿كسا﴾ کے معنی ہیں کسی کو لباس پہنانا۔ ﴿علی عری﴾ "عری" کے عین پر ضمہ اور "را" ساکن یہ مصدر واقع ہو رہا ہے۔ یعنی ایسی حالت کہ اس کے جسم پر لباس نہیں۔ من خضر الجنہ - خضر کے "خا" پر ضمہ اور ضاد ساکن یہ اخضر کی جمع ہے۔ یعنی جنت کا سبز لباس۔ ﴿علی جوع﴾ بھوکے کو۔ ﴿جائعا﴾ بھوکا' خالی پیٹ۔ ﴿علی ظما﴾ شدید پیاس کی حالت میں۔ "ظا" اور "میم" دونوں پر فتحہ یعنی پیاسا۔ ﴿الرحيق﴾ خالص شراب جس میں نشہ نہ ہو۔ ﴿المختوم﴾ مہربند جسے مہر لگا کر منہ بند کر دیا گیا ہو۔ اللہ تعالیٰ ایسے آدمی کو جنت کی ایسی شراب پلائے گا جس کو کستوری کی مہر لگا کر بند کر دیا گیا ہو۔

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ دنیا کے عمل کا آخرت میں جو بدلہ عنایت فرمائے گا وہ اس کی جنس سے ہوگا۔ البتہ جنت کا لباس دنیا کے لباس سے عمدہ' بہترین' خوبصورت اور قیمتی ہوگا۔ بدلہ اسے ملے گا جس کا عمل شرف قبولیت سے مشرف ہوگا۔ قبولیت عمل کیلئے دو شرطیں ہیں۔ ایک تو یہ کہ وہ مشروع و مسنون ہو غیر مشروع نہ ہو اور دوسرا اس سے مقصود و مطلوب اللہ تعالیٰ کی خوشنودی اور اس کی رضا کا حصول ہو۔ شہرت و ریاکاری اور دکھاوا مطمع نظر نہ ہو۔

حدیث میں پیاسے' ننگے اور بھوکے کا ذکر کر کے یہ بتانا مقصود ہے کہ ہٹے کٹے نوجوان توانا کو اور مالدار اور پیشہ ور گداگر کو نہ دیا جائے۔ حقیقی ضرورت مند و حاجت مند کو دیا جائے۔ اس سے غرباء کی امداد پر جنت کی ابدی اور لازوال نعمتوں کی بشارت ملتی ہے۔ سربند شراب پیش کرنے سے عز و شرف بھی حاصل ہوگا اور شراب میں کسی قسم کی آمیزش بھی نہ ہوگی۔ اس حدیث میں کمزوری جس کی طرف مصنف نے اشارہ کیا ہے یہ ہے کہ اس کی سند میں ابوخالد یزید بن عبدالرحمٰن مختلف فیہ راوی ہے۔

(٥١١) وَعَنْ حَكِيمِ بْنِ حِزَامٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰی عَنْهُ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ: اَلْيَدُ الْعُلْيَا خَيْرٌ مِنَ الْيَدِ

حضرت حکیم بن حزام رضی اللہ عنہ کی نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت ہے کہ آپؐ نے ارشاد فرمایا "اوپر والا ہاتھ نیچے والے ہاتھ سے بہتر ہے۔ آغاز و ابتداء ان سے کر

السُّفْلَى، وَابْدَأْ بِمَنْ تَعُولُ، وَخَيْرُ الصَّدَقَةِ مَا كَانَ عَنْ ظَهْرِ غِنىً، وَمَنْ يَسْتَعْفِفْ يُعِفَّهُ اللَّهُ، وَمَنْ يَسْتَغْنِ يُغْنِهِ اللَّهُ». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ، وَاللَّفْظُ لِلْبُخَارِيِّ.

جن کی تو کفالت اور عیالداری کرتا ہے اور بہتر صدقہ وہ ہے جو اپنی ضروریات پوری کرنے کے بعد دیا جائے۔ جو شخص دست سوال دراز کرنے سے بچے گا اللہ تعالیٰ اسے بچا لے گا اور جو استغناء کا مظاہرہ کرے گا اللہ تعالیٰ اسے مستغنی (بے پروا) کر دے گا۔" (بخاری و مسلم' متن حدیث کے الفاظ بخاری کے ہیں)

لغوی تشریح: ﴿ الید العلیا ﴾ اوپر والے ہاتھ سے مراد دینے والا ہاتھ ہے۔ ﴿ الید السفلی ﴾ نیچے والے ہاتھ سے مراد ہے لینے والا' سوال کرنے والا۔ ﴿ ابدا ﴾ شروع کر' ابتداء و آغاز کر یعنی دو اور خرچ کرو۔ ﴿ بمن تعول ﴾ جن کا نان و نفقہ تیرے ذمہ ہو۔ ﴿ ماکان عن ظھرغنی ﴾ اپنی ضروریات کی تکمیل کے بعد جو زائد بچ رہے اور صاحب مال کو اس کی چنداں ضرورت و حاجت بھی نہ رہے اور لفظ ظھر محض کلام میں وسعت کیلئے استعمال کیا ہے۔ ﴿ ومن یستعفف ﴾ جو سوال کرنے' مانگنے سے بچنا چاہئے۔ ﴿ یعفه الله ﴾ باب افعال سے اعف یعف سے ہے۔ اسے اللہ تعالیٰ بچنے کی توفیق سے نواز دیتا ہے۔ ﴿ ومن یستغن ﴾ یعنی جو کچھ اس کے پاس ہے۔ خواہ کم مقدار میں ہو یا کثیر' اسی پر قناعت کرتا ہے۔

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ اگر گھر کے افراد ضرورت مند و محتاج ہوں تو ان پر اپنا مال خرچ کرنا بھی نیکی اور صدقہ ہے۔ ان کی موجودگی میں دوسرے کو صدقہ دینا کوئی مستحسن عمل نہیں۔ مسلم میں حضرت ثوبان رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ بہتر مال وہ ہے جسے آدمی اپنے اہل و عیال اور گھر والوں پر صرف کرے یا جہاد فی سبیل اللہ میں خرچ کرے یا پھر اپنے احباب و رفقاء اور دوستوں پر (شرعی حدود میں رہتے ہوئے) خرچ کرے۔ اس حدیث میں صدقہ دینے کی فضیلت کے ساتھ ساتھ سوال کرنے اور بلا ضرورت مانگنے کی حوصلہ شکنی کی گئی ہے اور جو از خود مانگنے سے بچنا چاہے اسے اللہ تعالیٰ اپنے ہاں سے اسباب پیدا فرما کر بچا لیتا ہے۔

(٥١٢) وَعَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قِيْلَ: يَا رَسُولَ اللهِ! أَيُّ الصَّدَقَةِ أَفْضَلُ؟ قَالَ: جُهْدُ الْمُقِلِّ، وَابْدَأْ بِمَنْ تَعُولُ. أَخْرَجَهُ أَحْمَدُ وَأَبُو دَاوُدَ، وَصَحَّحَهُ ابْنُ خُزَيْمَةَ وَابْنُ حِبَّانَ

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا گیا کہ کونسا صدقہ افضل ہے؟ آپؐ نے ارشاد فرمایا "کم مال والے کا صدقہ اور صدقہ کی ابتداء ان سے کر جن کی تو کفالت کرتا ہے۔" (اسے احمد' ابوداؤد نے روایت کیا ہے۔ ابن خزیمہ' ابن حبان اور

وَالحَاكِمُ.

حاکم نے صحیح قرار دیا ہے)

لغوی تشریح: ﴿ جهد المقل ﴾ الجھد کے "جیم" پر ضمہ اور "ھا" ساکن۔ ہمت، طاقت اور اگر فتحہ پڑھا جائے تو پھر اس کے معنی مشقت و محنت کے ہیں۔ المقل کے میم پر ضمہ اور قاف کے نیچے کسرہ۔ قلیل مال والا آدمی ہے معنی یہ ہوئے کہ جب آدمی کے پاس مال کی کمی ہو پھر اتنا صدقہ و خیرات کرے جتنی اس کی حالت اجازت دیتی ہے تو ایسی حالت میں کیا ہوا صدقہ دوسرے صدقات سے افضل ہے۔ بظاہر یہ حدیث پہلی حدیث کے معارض ہے جس کے الفاظ ہیں۔ افضل الصدقة ما كان عن ظهر غنى ان کے مابین تطبیق یہ ہے کہ اس دوسری حدیث سے وہ شخص مراد ہے جو صدقہ کرنے کے بعد فقر کی مشقت کو برداشت نہیں کر سکتا اور پہلی حدیث اس آدمی کے بارے میں ہے جو ایسے حالات میں صبرو برداشت کر سکتا ہے اور یہ بھی کہا گیا ہے غنی سے نفس و ضمیر کا استغناء مراد ہے اس اعتبار سے ان میں کوئی تفاوت نہیں رہتا۔

حاصل کلام: اس حدیث سے دو باتیں واضح طور پر معلوم ہوتی ہیں ایک یہ کہ امیرو مالدار اور غریب و مفلس کے صدقہ و خیرات میں نمایاں فرق ہے۔ اور دوسری یہ کہ اپنے اہل و عیال کے حقوق ادا کرنے کے بعد صدقہ و خیرات کرنا چاہئے۔ ایسا نہ ہو کہ خود تو صدقہ دیتا پھرے اور اس کے اہل و عیال محتاج ہوں اور دوسروں کے روبرو دست سوال دراز کرتے پھریں۔ اس لئے اپنے گھر والوں کی جائز شرعی ضروریات کی تکمیل کے بعد دوسروں کی طرف متوجہ ہونا چاہئے۔ اول خویش بعد درویش کا محاورہ اس پر خوب چسپاں ہے۔

(٥١٣) وَعَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «**تَصَدَّقُوا**»، فَقَالَ رَجُلٌ: يَا رَسُولَ اللهِ! عِنْدِيْ دِيْنَارٌ، قَالَ: «**تَصَدَّقْ بِهِ عَلَى نَفْسِكَ**»، قَالَ: عِنْدِيْ آخَرُ، قَالَ: «**تَصَدَّقْ بِهِ عَلَى وَلَدِكَ**»، قَالَ: عِنْدِيْ آخَرُ، قَالَ: «**تَصَدَّقْ بِهِ عَلَى زَوْجَتِكَ**»، قَالَ: عِنْدِي آخَرُ، قَالَ: «**تَصَدَّقْ بِهِ عَلَى خَادِمِكَ**»، قَالَ: عِنْدِيْ آخَرُ، قَالَ: «**أَنْتَ أَبْصَرُ بِهِ**». رَوَاهُ أَبُو دَاوُدَ وَالنَّسَائِيُّ وَصَحَّحَهُ ابْنُ حِبَّانَ وَالحَاكِمُ.

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ ہی سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "صدقہ و خیرات کرو۔" ایک آدمی نے کہا یا رسول اللہ ﷺ میرے پاس ایک دینار ہے۔ "آپؐ نے فرمایا "اسے تو اپنی ذات پر خرچ کر۔" وہ بولا میرے پاس ایک اور بھی ہے، آپؐ نے فرمایا "اسے اپنی اولاد پر صدقہ (خرچ) کر۔" اس نے پھر عرض کیا میرے پاس ایک اور بھی ہے، آپؐ نے فرمایا "اسے اپنی اہلیہ پر صدقہ (خرچ) کر۔" اس نے پھر عرض کیا میرے پاس ایک اور بھی ہے، آپؐ نے فرمایا "اسے اپنے خادم پر صدقہ (خرچ) کر" وہ بولا حضور ﷺ میرے پاس ایک اور بھی ہے۔ آپؐ نے

فرمایا "اس کے خرچ کرنے کی تجھے زیادہ سمجھ بوجھ ہے۔" (اسے ابوداؤد اور نسائی نے روایت کیا ہے اور ابن حبان اور حاکم نے صحیح قرار دیا ہے)

لغوی تشریح: ﴿ تصدق به علی نفسک ﴾ "تصدق" انفق کے معنی میں استعمال ہوا ہے یعنی خرچ کر۔ صدقہ کا لفظ بول کر مراد انفاق لینے سے اس جانب اشارہ کرنا مقصود ہے کہ حقدار کیلئے خرچ کرنا اجر و ثواب میں صدقہ کرنے کے برابر ہے۔ ﴿ انت ابصر ﴾ یعنی تجھے زیادہ علم ہے کہ تیرے خرچ کرنے کا کونسا زیادہ مستحق ہے؟ اب تیری مرضی پر منحصر ہے کہ چاہے تو اسے بھی خرچ کر دے اور چاہے اسے اپنے پاس روک رکھ۔

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ انسان کا اپنی ذات پر حدود شرعی کے اندر رہتے ہوئے خرچ کرنا بھی صدقہ و خیرات کرنے کی طرح اجر و ثواب رکھتا ہے۔ ترتیب اس طرح بیان ہوئی ہے کہ پہلے اپنی ذات پر پھر اولاد پر پھر بیوی پر پھر خادم پر جو کچھ بچ جائے اسے اس کی صوابدید پر چھوڑ دیا گیا ہے کہ چاہے تو کسی جگہ خرچ کر دے اور چاہے اسے اپنے پاس محفوظ رکھے' آئندہ کسی کام آئے گا۔ لہٰذا ثابت ہوا کہ اہل حقوق کی ترتیب کے اعتبار سے خرچ کرنا واجب ہے تاکہ کسی مستحق کا استحقاق مجروح نہ ہو۔

(٥١٤) وَعَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهَا قَالَتْ: قَالَ النَّبِيُّ ﷺ: «إِذَا أَنْفَقَتِ الْمَرْأَةُ مِنْ طَعَامِ بَيْتِهَا، غَيْرَ مُفْسِدَةٍ، كَانَ لَهَا أَجْرُهَا بِمَا أَنْفَقَتْ، وَلِزَوْجِهَا أَجْرُهُ بِمَا اكْتَسَبَ، وَلِلْخَازِنِ مِثْلُ ذَلِكَ، لاَ يَنْقُصُ بَعْضُهُمْ مِنْ أَجْرِ بَعْضٍ شَيْئاً». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا "جب عورت اپنے گھر کے مال سے فضول خرچی کئے بغیر خرچ کرے تو اسے خرچ کرنے کے بدلے میں اجر و ثواب ملے گا اور اس کے شوہر کیلئے کمانے کا ثواب اور اسی طرح خزانچی کیلئے بھی اجر ہے ہر ایک کا ثواب دوسرے کے ثواب میں سے کچھ بھی کم نہیں کرے گا۔" (بخاری و مسلم)

لغوی تشریح: ﴿ غیر مفسدۃ ﴾ یعنی فضول خرچی' اسراف و تبذیر بیوی کو خاوند کے مال سے خرچ کرنے کی اجازت۔ شوہر کی جانب سے بیوی کو صریح طور پر اجازت ملنے پر محمول کیا جائے گا یا کسی اشارہ وغیرہ پر۔ جیسا کہ معاشرہ میں یہ چیز معروف و معلوم ہے کہ خاوند کی اجازت کے بغیر معمولی چیزوں کو خیرات میں دے دینا قابل مؤاخذہ تصور نہیں کیا جاتا۔ ایسا سمجھا جاتا ہے کہ گویا اس کی بیوی کو اجازت دے دی گئی ہے۔

حاصل کلام: عورت کو خاوند کی اجازت کے بغیر اتنا صدقہ و خیرات نہیں کرنا چاہئے کہ خاوند کے گھر کا معاشی نظام متاثر ہو کر برباد ہو جائے اور شوہر کیلئے معاشی مشکلات اور دشواریاں کھڑی ہو جائیں۔ معمولی

صدقہ مثلاً سائل کو روٹی دے دی یا تھوڑا بہت آٹا دے دیا یا پڑوسی کو تھوڑی بہت نمک مرچ دے دی وغیرہ۔ اس صدقہ میں بیوی کے ساتھ اس کا شوہر کما کر لانے کی وجہ سے' خزانچی اس کی حفاظت کرنے کی وجہ سے اور خادم خدمت گاری کی بنا پر اجر و ثواب کے مستحق ہیں کسی کے اجر میں سے کمی نہیں کی جائے گی' ہر ایک کو اس کا پورا پورا اجر ملے گا۔

(٥١٥) وَعَنْ أَبِيْ سَعِيْدِ الْخُدْرِيِّ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: جَاءَتْ زَيْنَبُ امْرَأَةُ ابْنِ مَسْعُوْدٍ، فَقَالَتْ: يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ! إِنَّكَ أَمَرْتَ اليَوْمَ بِالصَّدَقَةِ، وَكَانَ عِنْدِي حُلِيٌّ لِيْ، فَأَرَدْتُ أَنْ أَتَصَدَّقَ بِهِ، فَزَعَمَ ابْنُ مَسْعُوْدٍ أَنَّهُ وَوَلَدَهُ أَحَقُّ مَنْ تَصَدَّقْتُ بِهِ عَلَيْهِمْ، فَقَالَ النَّبِيُّ ﷺ: «صَدَقَ ابْنُ مَسْعُوْدٍ، زَوْجُكِ وَوَلَدُكِ أَحَقُّ مَنْ تَصَدَّقْتِ بِهِ عَلَيْهِمْ». رَوَاهُ الْبُخَارِيُّ

حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی اہلیہ زینب رضی اللہ عنہا آئیں اور عرض کیا یارسول اللہ (ﷺ)! آپؐ نے آج صدقہ کرنے کا حکم ارشاد فرمایا ہے۔ میرے پاس میرا ذاتی زیور ہے میں اسے صدقہ کرنا چاہتی ہوں۔ عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کا خیال ہے کہ وہ اور ان کی اولاد میرے صدقے کے زیادہ حقدار ہیں آپؐ نے فرمایا "ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے ٹھیک کہا ہے' تیرا شوہر اور اس کی اولاد تیرے صدقے کے زیادہ مستحق ہیں۔" (بخاری)

لغوی تشریح: ﴿ حلی ﴾ "حا" پر ضمہ اور کسرہ دونوں ہیں اور "لام" پر کسرہ اور تشدید اور "یا" پر بھی تشدید۔ حلی کی جمع ہے حلی کی "حا" پر فتحہ اور لام ساکن۔ سونے چاندی کے وہ زیور جو عورت تزئین و آرائش کیلئے پہنتی ہے یا پھر اس سے ڈورے میں پروئے ہوئے گھونگے' سلیمانی منکے یا کوڑیاں مراد ہیں۔ نیز شیشے وغیرہ کے سوراخ دار دانے اور عمدہ پتھر کے نگینے وغیرہ۔ یہ اس امر کے جواز کی دلیل ہے کہ بیوی شوہر کے معاملات و مصالح میں اپنی زکوٰۃ دے سکتی ہے بشرطیکہ شوہر محتاج اور عیال دار ہو۔

حاصل کلام: لفظ صدقہ نفلی صدقہ اور فرض زکوٰۃ اور صدقہ فطر (فطرانہ) سب پر مشترک طور پر بولا جاتا ہے۔ قرآن مجید میں بھی زکوٰۃ کی تقسیم کے مصارف کے موقع پر لفظ صدقہ ہی استعمال ہوا ہے اگر اس بات کا کوئی قرینہ واضح موجود نہ ہو کہ یہاں عام صدقہ مراد ہے تو ایسی صورت میں اصول یہ ہے کہ اس سے مراد زکوٰۃ (فرضی صدقہ) ہوتا ہے۔ اس مقام پر بھی بظاہر تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ یہ فرضی صدقہ ہے اس لئے کہ نفلی صدقہ کے متعلق پوچھنے کی تو ضرورت ہی نہیں۔ جمہور علماء کے نزدیک بیوی اپنے شوہر کو اپنی زکوٰۃ دے سکتی ہے۔ مگر امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کے نزدیک بیوی اپنے شوہر کو زکوٰۃ نہیں دے سکتی مگر ان کا یہ قول اس صریح حدیث کے مخالف ہے اور اس پر سب کا اتفاق ہے کہ شوہر اپنی اہلیہ کو زکوٰۃ نہیں دے سکتا۔ اس حدیث کی روشنی میں جب بیوی فرضی زکوٰۃ دے سکتی ہے تو نفلی بدرجہ اولیٰ دے سکتی ہے۔

راوی حدیث: ﴿ زینب رضی اللہ عنہا ﴾ یہ عبداللہ بن مسعودؓ کی زوجہ محترمہ ہیں۔ بنو ثقیف سے

ہونے کی وجہ سے ثقفیہ کہلائیں۔ ان کے باپ کا نام معاویہ یا عبداللہ بن معاویہ یا ابو معاویہ ہے۔ یہ نبیؐ اور اپنے شوہر سے روایت کرتی ہیں اور حضرت عمرؓ سے بھی۔ ان سے ان کے بیٹے' بھتیجے اور بعض دوسرے احباب نے روایت کیا ہے۔

(٥١٦) وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «لاَ يَزَالُ الرَّجُلُ يَسْأَلُ النَّاسَ، حَتَّى يَأْتِيَ يَوْمَ القِيَامَةِ، وَلَيْسَ فِي وَجْهِهِ مُزْعَةُ لَحْمٍ». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "جو لوگ گداگری اور بھیک مانگنے کو پیشہ ہی بنا لیتے ہیں قیامت کے روز ایسی حالت میں آئیں گے کہ ان کے چہرے پر گوشت نہیں ہو گا۔" (بخاری و مسلم)

لغوی تشریح: ﴿ مضغة ﴾ اور ایک نسخہ میں ﴿ مزعة ﴾ بھی ہے۔ دونوں میں پہلے حرف پر ضمہ ہے اور دوسرا حرف ساکن ہے' اس کے معنی ٹکڑے کے ہیں۔ مطلب یہ ہے ایسے آدمی کی قیامت کے روز قدر و منزلت اور عزت و وجاہت نہیں ہوگی اور ذلیل و خوار اور گری ہوئی توقیر کے ساتھ آئے گا اور یہ بھی احتمال ہے کہ اس کا معنی یہ ہو کہ اسے اتنا عذاب دیا جائے گا کہ چہرے کا گوشت تک اڑ جائے اور جب اٹھایا جائے تو چہرہ صرف ہڈیوں کا خالی خولہ ڈھانچہ رہ جائے اور اسے اس کی پہچان کی علامت بنا دیا جائے۔

حاصل کلام: اس حدیث سے گداگری کے پیشہ کی مذمت معلوم ہو رہی ہے۔ سوال صرف تین قسم کے آدمیوں کیلئے جائز ہے۔ ایک وہ شخص جو آفات ناگہانی کی زد میں آجائے اور سارا مال برباد ہو جائے۔ خورد و نوش کیلئے بھی باقی کچھ نہ بچے۔ اسے اپنے گزارہ کی حد تک مانگنے کی اجازت ہے اور ایسے آدمی کی مدد کرنا ضروری ہے۔ دوسرا وہ شخص جو کسی ناحق تاوان یا قرض کے گرداب میں پھنس جائے تو وہ مانگ کر اتنی رقم پوری کر سکتا ہے اور تیسرا وہ شخص جو دیانت داری سے کام کرتا ہے اور کرنا بھی چاہتا ہے مگر پوری کوشش کے باوجود کام نہ مل سکے یا جائز مصارف و اخراجات سے آمدنی کم ہو اور گھریلو معاشی ضروریات پوری نہ ہو رہی ہوں اور فاقہ کشی کی نوبت کا اندیشہ لاحق ہو جائے تو ایسا آدمی بھی معاشرے کے دوسرے لوگوں سے مانگ کر اپنی ضروریات پوری کرنے کا استحقاق رکھتا ہے۔ ان کے علاوہ غیر مستحق لوگ محض پیسہ جمع کرنے کی خاطر مانگتے ہیں ان کا انجام قیامت کے روز وہی ہو گا جس کا ذکر مذکورہ بالا حدیث میں ہوا ہے۔

(٥١٧) وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «مَنْ سَأَلَ النَّاسَ أَمْوَالَهُمْ تَكَثُّراً، فَإِنَّمَا يَسْأَلُ جَمْراً، فَلْيَسْتَقِلَّ أَوْ لِيَسْتَكْثِرْ». رَوَاهُ مُسْلِمٌ.

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "جو آدمی اپنا مال بڑھانے اور زیادہ کرنے کی غرض سے لوگوں سے مانگتا ہے تو ایسا آدمی اپنے لئے انگاروں کے سوا اور کوئی چیز نہیں مانگتا۔ اب اس کی مرضی ہے چاہے انہیں کم کرلے چاہے

زیادہ۔" (مسلم)

لغوی تشریح: ﴿تکثرا﴾ مال کو زیادہ کرنے کی غرض سے۔ اپنی حاجت و ضرورت کو پورا کرنے کیلئے نہیں۔ ﴿جمرا﴾ آگ کا دھکتا ہوا انگارا۔ ﴿فلیستقل الخ﴾ یعنی چاہے کم لے یا زیادہ حاصل کرے۔

حاصل کلام: اس حدیث سے گداگری کا پیشہ ناجائز ثابت ہوتا ہے۔ توانا و قوی الجثہ آدمی کا سوال کرنا معاشرہ میں بے عزت کرنے کا موجب ہوتا ہے جن لوگوں نے بلاوجہ مانگنے کو اپنا معمول بنا لیا ہو ان کو خیرات دینا محل نظر ہے۔

(۵۱۸) وَعَنِ الزُّبَيْرِ بْنِ الْعَوَّامِ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ: **لأَنْ يَأْخُذَ أَحَدُكُمْ حَبْلَهُ، فَيَأْتِيَ بِحُزْمَةِ الحَطَبِ عَلَى ظَهْرِهِ، فَيَبِيْعَهَا، فَيَكُفَّ بِهَا وَجْهَهُ، خَيْرٌ لَّهُ مِنْ أَنْ يَسْأَلَ النَّاسَ، أَعْطَوهُ أَوْ مَنَعُوهُ.** رَوَاهُ الْبُخَارِيُّ.

حضرت زبیر بن عوام رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا "اگر تم میں سے کوئی رسی لے کر لکڑیوں کا گٹھا جنگل سے اپنی پشت پر اٹھا کر لائے پھر اسے فروخت کر دے پس اللہ تعالیٰ اس کے ذریعہ اس کے چہرے کو مانگنے سے روک دے تو یہ اس کے لئے بہتر ہے کہ وہ لوگوں سے مانگتا پھرے اور وہ اس کو دیں یا نہ دیں۔ (بخاری)

لغوی تشریح: ﴿بحزمة الحطب﴾ حزمة "حا" پر ضمہ اور "زا" ساکن۔ لکڑیوں کا گٹھا۔ ﴿فیکف الله بها وجهه﴾ یعنی اللہ اس کے ذریعہ سے اس کے چہرے کو محفوظ رکھتا ہے اور دست سوال دراز کرنے کی رسوائی سے باز رکھتا ہے۔

حاصل کلام: اس حدیث کی رو سے گداگری اور بھیک مانگنا قابل مذمت فعل ہے۔ کما کر کھانا' محنت و مشقت کر کے حاصل کرنا بہتر ہے۔ سوالی و گداگر کو اگر کچھ مل بھی جائے تو سوال کرنے کی ذلت کیا کچھ کم ہے۔ بھیک مانگنے سے عزت و آبرو نہیں رہتی۔ معاشرہ میں وقار کم ہو جاتا ہے۔ لوگوں کی نگاہوں میں ایسے آدمی کا کوئی مقام و مرتبہ نہیں رہتا۔ مفت خوری کی بد عادت ایسے آدمی کو کاہل و سست بنا کر رکھ دیتی ہے۔ معاشرے کی ترقی متاثر ہو جاتی ہے۔ نوبت بسا اوقات بایں جا رسید کہ خودکشی کی نوبت اور چوری اور ہیرا پھیری ایسی بری عادات کا خوگر بن کر رہ جاتا ہے۔

(۵۱۹) وَعَنْ سَمُرَةَ بْنِ جُنْدُبٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: **«المَسْأَلَةُ كَدٌّ يَكُدُّ بِهَا الرَّجُلُ وَجْهَهُ، إِلاَّ أَنْ يَسْأَلَ الرَّجُلُ سُلْطَاناً أَوْ فِي أَمْرٍ لاَ بُدَّ**

حضرت سمرہ بن جندب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "سوال کرنا ایک زخم ہے جس سے انسان اپنے چہرے کو زخمی کرتا ہے البتہ ایسا شخص جو مجبوری کی وجہ سے سوال کرے یا سربراہ مملکت سے۔" اس کے لیے کوئی حرج نہیں۔ (اسے

مِنْهُ». رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ، وَصَحَّحَهُ. ترمذی نے روایت کیا ہے اور صحیح قرار دیا ہے)

لغوی تشریح: ﴿ کدوح ﴾ "کاف" اور "دال" دونوں پر ضمہ۔ کدح کی جمع ہے اور کدح کے کاف پر فتحہ اور دال ساکن ہے۔ خراش' زخم کو کہتے ہیں یعنی اس کے چہرے پر زخموں کے نشانات اور خراشوں کی ایسی علامات ہوں گی جو فی الحقیقت ناپسندیدہ ہوں گی یا یہ کہ اس کے چہرے پر ذلت و رسوائی اور اہانت کے نشانات ہویدا ہو رہے ہوں گے۔

حاصل کلام: اس حدیث سے ثابت ہوا کہ بغیر ضرورت کسی سے مانگنا جائز نہیں اور ضرورت مند کو بھی بادشاہ اور سربراہ مملکت سے مانگنا چاہئے کیونکہ حاجت مندوں کا بیت المال پر حق ہے اور بادشاہ سے سوال اپنے حق کے حصول کیلئے ہے۔ اس میں کسی کے امتنان و احسان کا کوئی تعلق نہیں۔

٣ - بَابُ قِسْمِ الصَّدَقَاتِ — اشیاء خیرات کو بانٹنے کا بیان

(٥٢٠) عَنْ أَبِي سَعِيْدٍ الخُدْرِيِّ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «لاَ تَحِلُّ الصَّدَقَةُ لِغَنِيٍّ إِلاَّ لِخَمْسَةٍ: لِعَامِلٍ عَلَيْهَا، أَوْ رَجُلٍ اشْتَرَاهَا بِمَالِهِ، أَوْ غَارِمٍ، أَوْ غَازٍ فِي سَبِيلِ اللهِ، أَوْ مِسْكِينٍ تُصُدِّقَ عَلَيْهِ مِنْهَا فَأَهْدَى مِنْهَا لِغَنِيٍّ». رَوَاهُ أَحْمَدُ وَأَبُو دَاوُدَ وَابْنُ مَاجَهْ، وَصَحَّحَهُ الحَاكِمُ، وَأُعِلَّ بِالإِرْسَالِ.

حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "مالدار کیلئے پانچ صورتوں کے علاوہ صدقہ حلال نہیں ہے (١) زکوٰۃ کا مال اکٹھا کرنے کی صورت میں (٢) وہ شخص جو اپنے مال سے صدقہ کی کوئی چیز خریدے (٣) مقروض (٤) فی سبیل اللہ جہاد کرنے والا (٥) مسکین پر جو صدقہ کیا گیا ہو اس میں سے وہ کچھ مالدار کو تحفہ کے طور پر دے۔" (اسے احمد' ابوداؤد اور ابن ماجہ نے روایت کیا ہے اور حاکم نے اسے صحیح قرار دیا ہے اور اسے مرسل ہونے سے معلول قرار دیا گیا ہے)

لغوی تشریح: ﴿ لغنی ﴾ غنی اسے کہتے ہیں جس کی ملکیت میں اوقیہ کے مساوی چیز ہو یا اتنی کہ صبح و شام اس کیلئے کافی ہو جائے۔ ﴿ لعامل علیھا ﴾ عامل سے مراد وہ کارندہ اور تحصیل دار ہے جو صدقہ کی وصولی کیلئے کام کرتا ہے۔ مثلاً اسے اکٹھا کرنے والا' حساب رکھنے والا' تحریر کرنے والا۔ اس کیلئے کارکردگی کا معاوضہ لینا جائز ہے خواہ وہ خود مالدار ہی کیوں نہ ہو۔ ﴿ غارم ﴾ مقروض' قرضدار۔ ایک قول یہ بھی ہے کہ باہمی رقابت و دشمنی کی اصلاح کیلئے قرض لینا یا کسی پر کوئی بوجھ آن پڑا ہے اسے اتارنے کیلئے قرض لینا۔ رہا اپنی ذات کیلئے قرض کا حصول تو اگر وہ اس کے ادا کرنے کی قدرت و استطاعت ہی نہ رکھتا ہو تو پھر وہ فقراء کے زمرہ میں شامل ہو گا ورنہ اسے غنی شمار کیا جائے گا اس لئے صدقہ لینا حلال نہیں ہے۔

حاصل کلام: اس حدیث سے ثابت ہوا کہ غنی کیلئے زکوٰۃ لینا حلال نہیں۔ غنی کون ہے؟ اس کی تعریف

میں علماء کے اقوال مختلف ہیں۔ ابوداؤد میں ہے کہ آپؐ سے پوچھا گیا کہ غنی کون ہے؟ آپؐ نے فرمایا ”جس کے پاس اتنی چیز ہو کہ اس کی صبح و شام کی گزر بسر ہو سکے۔“ اور نسائی میں حضرت ابوسعید رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ”جس کی ملکیت میں ایک اوقیہ (دس روپیہ) ہو پھر وہ سوال کرے تو اس نے لپٹ چمٹ کر سوال کیا۔“

(٥٢١) وَعَنْ عُبَيْدِ اللهِ بْنِ عَدِيِّ بْنِ الخِيَارِ، أَنَّ رَجُلَيْنِ حَدَّثَاهُ: أَنَّهُمَا أَتَيَا رَسُولَ اللهِ ﷺ يَسْأَلاَنِهِ مِنَ الصَّدَقَةِ، فَقَلَّبَ فِيهِمَا البَصَرَ، فَرَآهُمَا جَلْدَيْنِ، فَقَالَ: **إِنْ شِئْتُمَا أَعْطَيْتُكُمَا، وَلاَ حَظَّ فِيهَا لِغَنِيٍّ، وَلاَ لِقَوِيٍّ مُكْتَسِبٍ**. رَوَاهُ أَحْمَدُ، وَقَوَّاهُ أَبُو دَاوُدَ وَالنَّسَائِيُّ.

حضرت عبیداللہ بن عدی بن خیار رحمہ اللہ بیان کرتے ہیں کہ دو آدمیوں نے انہیں اپنا واقعہ سنایا کہ وہ دونوں رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ دونوں نے آپؐ سے صدقہ کا سوال کیا۔ آپؐ نے ان دونوں کو ایک نظر اٹھا کر اوپر سے نیچے تک دیکھا تو دونوں کو طاقتور پایا۔ آپؐ نے فرمایا ”اگر تم چاہتے ہو تو تمہیں صدقہ دے دیتا ہوں مگر مالدار اور صحت مند کماؤ آدمی کے لیے اس میں کوئی حصہ نہیں۔“ (اسے احمد نے روایت کیا ہے اور ابوداؤد اور نسائی نے اسے قوی کہا ہے)

لغوی تشریح: ﴿فقلب فیھما البصر﴾ آپؐ نے اپنی نگاہیں ان کی طرف اٹھا کر اوپر نیچے سے ان کو دیکھا۔ ﴿جلدین﴾ جیم پر فتحہ اور لام ساکن اور اس پر کسرہ بھی جائز ہے۔ مضبوط و قوی آدمی ﴿لاحظ﴾ کوئی حصہ نہیں اور نہ کوئی حق ہے۔ ﴿لقوی مکتسب﴾ صیغہ اسم فاعل۔ اپنی ضرورت کے بقدر کمانے کی طاقت رکھنے والا ﴿ان شئتما اعطیکما﴾ یعنی صدقہ صحت مند اور غنی کیلئے لینا ذلت کا باعث اور حرام ہے۔ اس کے باوجود اگر تم حرام چاہتے ہو تو میں تمہیں دے دیتا ہوں۔ یہ بات آپؐ نے ان سے زجر و توبیخ کے طور پر فرمائی۔

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ غنی اور صحت مند کیلئے صدقہ و زکوٰۃ لینا جائز نہیں۔ صدقہ دینے والے کو بھی چاہئے کہ سائل کو اچھی طرح دیکھ لے کہ وہ اس کا مستحق ہے یا نہیں۔ بلکہ مناسب یہ ہے کہ وہ غیر مستحق کو سوال نہ کرنے کی تلقین کرے اور اس کو برے انجام سے خبردار کر دے۔

راوی حدیث: ﴿عبیداللہ بن عدی بن خیار قرشی نوفلی﴾ خاندان قریش سے تھے۔ ایک قول یہ ہے کہ ان کی پیدائش عہد رسالت مآب ﷺ میں ہوئی۔ اس لئے ان کا شمار تابعین میں کیا گیا ہے۔ انہوں نے عمر رضی اللہ عنہ و عثمان رضی اللہ عنہ وغیرہ سے روایت کی ہے اور ایک قول کے مطابق ان کا والد حالت کفر میں بدر میں قتل ہوا اور یہ فتح مکہ کے موقع پر عاقل بالغ تھے۔ اس اعتبار سے وہ صحابی ہیں۔ ان کا شمار قریش کے فقہاء و علماء میں ہوتا ہے۔ ٩٠ھ میں خلیفہ ولید بن عبدالملک کے دور میں وفات پائی۔

(۵۲۲) وَعَنْ قَبِيْصَةَ بْنِ مُخَارِقٍ الهِلاَلِيِّ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «إِنَّ المَسْأَلَةَ لاَ تَحِلُّ إِلاَّ لِأَحَدِ ثَلاَثَةٍ: رَجُلٍ تَحَمَّلَ حَمَالَةً، فَحَلَّتْ لَهُ المَسْأَلَةُ حَتَّى يُصِيبَهَا، ثُمَّ يُمْسِكُ، وَرَجُلٍ أَصَابَتْهُ جَائِحَةٌ اجْتَاحَتْ مَالَهُ، فَحَلَّتْ لَهُ المَسْأَلَةُ حَتَّى يُصِيبَ قِوَاماً مِنْ عَيْشٍ، وَرَجُلٍ أَصَابَتْهُ فَاقَةٌ، حَتَّى يَقُومَ ثَلاَثَةٌ مِنْ ذَوِي الحِجَى مِنْ قَوْمِهِ: لَقَدْ أَصَابَتْ فُلاَناً فَاقَةٌ، فَحَلَّتْ لَهُ المَسْأَلَةُ حَتَّى يُصِيبَ قِوَاماً مِنْ عَيْشٍ، فَمَا سِوَاهُنَّ مِنَ المَسْأَلَةِ يَا قَبِيصَةُ سُحْتٌ، يَأْكُلُهُ صَاحِبُهُ سُحْتاً». رَوَاهُ مُسْلِمٌ وَأَبُو دَاوُدَ وَابْنُ خُزَيْمَةَ وَابْنُ حِبَّانَ.

حضرت قبیصہ بن مخارق ہلالی سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "سوال کرنا صرف تین آدمیوں کیلئے حلال ہے" ایک وہ شخص جو کسی کا بوجھ اٹھالیتا ہے یہاں تک کہ اس کا قرض وغیرہ ادا ہو جائے پھر وہ سوال کرنے سے باز آجائے اور دوسرا وہ جو کسی ناگہانی مصیبت میں پھنس گیا ہو اور اس کا مال تباہ و برباد ہوگیا ہو اسے گزر اوقات کی حد تک سوال کرنا جائز ہے اور تیسرا وہ شخص جسے فاقے آرہے ہوں اور اس کی قوم کے تین صاحب عقل آدمی اس کی شہادت دیں کہ واقعی اسے فاقہ کشی کا سامنا ہے اسے بھی گزر اوقات کی حد تک سوال کرنا جائز ہے اور ان کے علاوہ اے قبیصہ! سوال حرام ہے اور سوال کرنے والا حرام کھاتا ہے۔" (مسلم' ابوداؤد' ابن خزیمہ' اور صحیح ابن حبان)

لغوی تشریح: ﴿ ثلاثۃ ﴾ اس پر تنوین ہے ﴿ رجل ﴾ ثلاثۃ سے بدل ہونے کی وجہ سے مجرور ہے یا پھر رفع ہے۔ اس صورت میں ﴿ احدھم ﴾ محذوف ہوگا۔ ﴿ تحمل ﴾ برداشت کیا' کفالت کی "حمالۃ" حا پر فتحہ ہے۔ وہ مال جو انسان دوسرے کی طرف سے ادا کرنے کی ذمہ داری اٹھاتا ہے۔ مثلاً دوسرے کا قرض ادا کرنے کی ذمہ داری اپنے سر لیتا ہے یا کسی کی دیت ادا کرنے کی حامی بھرتا ہے یا فریقین کے مابین تنازع کو دور کرنے کیلئے رقم کی ادائیگی کی ذمہ داری قبول کرلی ہو اور وہ ادا کرنے کی پوزیشن میں نہ رہا ہو تو وہ دوسروں سے تعاون کی اپیل کر سکتا ہے اور زکوٰۃ لے سکتا ہے۔ ﴿ ثم یمسک ﴾ اپنی ضرورت پوری ہونے کے بعد فوراً دست سوال دراز کرنے سے رک جائے۔ ﴿ جائحۃ ﴾ آسمانی یا زمینی آفت مثلاً ژالہ باری سے اس کی فصل تباہ ہوگئی' آگ لگنے سے اور ڈوب کر مرنے کی صورت میں تلافی مافات کیلئے ﴿ اجتاحت ﴾ ہلاک ہوگئی۔ ﴿ قواما ﴾ قاف کے نیچے کسرہ۔ قوام جس سے کوئی اپنی حاجت و ضرورت کا انتظام کرتا ہے اور اپنی خستہ حالی کا سدباب کرتا ہے۔ ﴿ الحجی ﴾ "حا" کے نیچے کسرہ یعنی عقل مند ﴿ سحت ﴾ سین پر ضمہ اور "حا" ساکن معنی حرام۔ یسحت البرکۃ کے معنی ہیں جو برکت کو لے اڑے۔

حاصل کلام: اس حدیث میں سوال کرنے والے کی پوزیشن معلوم کرنے کیلئے ایک ضابطہ بیان ہوا ہے وہ یہ کہ اس کی برادری یا قوم کے تین سرکردہ صاحب عقل و دانش آدمی اس کی حالت' کسمپرسی اور فاقہ کشی کی شہادت دیں تو اسے سوال کرنے کی اجازت ہے۔ اس حدیث سے معلوم ہوا کہ تین قسم کے آدمیوں کو سوال جائز ہے اور سائلین کی پوزیشن کو جانچنے اور تحقیق کرنے کا بھی حکم ہے کہ اگر کوئی ضرورت مند ہو اور اس کے قبیلے کے تین عقلمند افراد گواہی دے دیں تو اس کیلئے سوال کرنا جائز ہے۔ اس سے آپ اندازہ کرسکتے ہیں کہ اسلام نے گداگری کی کس طرح حوصلہ شکنی کی ہے اور محنت و مزدوری کی ترغیب دی ہے۔

راوی حدیث: ﴿ قبیصہ بن مخارق الھلالی رضی اللہ عنہ ﴾ ابو بشر کنیت ہے۔ قبیصہ میں "قاف" پر فتحہ اور "باء" پر کسرہ ہے۔ اور مخارق میں میم پر ضمہ ہے۔ سلسلہء نسب یوں ہے۔ قبیصہ بن مخارق بن عبداللہ بن شراد العامری الھلالی۔ شرف صحابیت سے مشرف تھے۔ بصرہ میں رہائش پذیر ہوئے' اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس وفد کے ساتھ آئے اور آپؐ سے احادیث سنیں چھ حدیثوں کے راوی ہیں۔

(٥٢٣) وَعَنْ عَبْدِ الْمُطَّلِبِ بْنِ رَبِيعَةَ بْنِ الحَارِثِ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «إِنَّ الصَّدَقَةَ لاَ تَنْبَغِي لِآلِ مُحَمَّدٍ، إِنَّمَا هِيَ أَوْسَاخُ النَّاسِ». وَفِي رِوَايَةٍ: «وَإِنَّهَا لاَ تَحِلُّ لِمُحَمَّدٍ وَلاَ لِآلِ مُحَمَّدٍ». رَوَاهُ مُسْلِمٌ.

حضرت عبدالمطلب بن ربیعہ بن حارث رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "صدقہ آل محمد صلی اللہ علیہ وسلم کیلئے مناسب ہی نہیں۔ یہ تو لوگوں کے اموال کی میل کچیل ہے" اور ایک دوسری روایت میں ہے کہ "صدقہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور آل محمد صلی اللہ علیہ وسلم کیلئے حلال نہیں۔" (مسلم)

لغوی تشریح: ﴿ اوساخ الناس ﴾ وسخ کی جمع ہے۔ میل کچیل۔ آل محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے بارے میں جو اختلاف پایا جاتا ہے اس کا ذکر کتاب الزکوٰۃ کی ایک ابتدائی حدیث میں گزر چکا ہے۔

راوی حدیث: ﴿ عبدالمطلب بن ربیعۃ بن حارث رضی اللہ عنہ ﴾ عبدالمطلب بن ربیعہ بن حارث بن عبدالمطلب بن ھاشم قرشی۔ مدینہ میں رہائش پذیر ہوئے۔ پھر دمشق تشریف لے گئے اور ٦٢ھ میں وہیں پر وفات پائی۔

(٥٢٤) وَعَنْ جُبَيْرِ بْنِ مُطْعِمٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: مَشَيْتُ أَنَا وَعُثْمَانَ بْنُ عَفَّانَ إِلَى النَّبِيِّ ﷺ، فَقُلْنَا: يَا رَسُولَ اللهِ! أَعْطَيْتَ بَنِي الْمُطَّلِبِ مِنْ خُمُسِ خَيْبَرَ وَتَرَكْتَنَا، وَنَحْنُ وَهُمْ بِمَنْزِلَةٍ وَاحِدَةٍ، فَقَالَ

حضرت جبیر بن مطعم رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ میں اور عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا یارسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم)! آپؐ نے بنو عبدالمطلب کو خیبر کے خمس میں سے حصہ عنایت فرمایا ہے اور ہمیں نظر انداز فرمایا حالانکہ آپؐ کے ساتھ تعلق کے لحاظ سے دونوں برابر ہیں۔ یہ سن کر

رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ : «إِنَّمَا بَنُو الْمُطَّلِبِ وَبَنُو هَاشِمٍ شَيْءٌ وَّاحِدٌ». رَوَاهُ الْبُخَارِيُّ.

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "بنو عبدالمطلب اور بنو ہاشم دونوں ایک ہی چیز ہیں۔" (بخاری)

لغوی تشریح: ﴿من خمس خيبر﴾ خمس میں خا اور میم دونوں پر ضمہ۔ مال غنیمت کی تقسیم سے پہلے کل اموال کا پانچواں حصہ اللہ' اس کے رسول اور رسول اللہ ﷺ کے قریبی رشتہ داروں' یتیموں' مسکینوں اور مسافر کیلئے لیا جانے والا مال خمس کہلاتا ہے۔ ﴿ ونحن وهم ﴾ "ھم" سے یہاں بنو عبدالمطلب مراد ہیں ﴿ بمنزلة واحدة ﴾ آپؐ سے قرابت داری کے اعتبار سے ایک ہی چیز ہیں۔ یہ اس لئے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا تعلق بنو عبد شمس بن عبد مناف سے تھا اور حضرت جبیر کا بنو نوفل بن عبدمناف سے تھا اس طرح دونوں ہاشم بن عبدمناف کے بھائی بنتے ہیں جس طرح مطلب بن عبد مناف۔ اس طرح یہ تینوں عبد شمس' نوفل اور مطلب' ہاشم کے ساتھ قرابت داری میں برابر ہیں۔ تو پھر جب قرابت داری کی بنا پر اگر مطلب کی اولاد استحقاق رکھتی ہے تو عبد شمس اور نوفل کی اولاد بھی استحقاق رکھتی ہے۔ ﴿ انما بنو عبدالمطلب وبنو هاشم شئی واحد ﴾ اس لئے کہ جاہلیت اور عہد اسلام میں ان کے مابین باہمی موالاۃ ہمیشہ سے چلی آرہی ہے جبکہ غیروں کے ساتھ ایسا نہیں ہے۔ اپنوں کے علاوہ یہ لوگ قرابت داروں کو حصہ دینے میں شریک ہیں۔ اگرچہ نسب میں یہ سب برابر ہیں۔ مصنف نے اس حدیث کو اس باب میں یہ تنبیہہ کرنے کیلئے بیان کیا ہے کہ بنو عبدالمطلب بھی بنو ہاشم کی طرح زکوٰۃ لینے کی حرمت میں برابر کے شریک ہیں۔ یعنی دونوں کیلئے زکوٰۃ لینا حرام ہے۔

حاصل کلام: حضرت جبیر بن مطعم اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا "ہم اور بنی مطلب برابر ہیں" کہنے کا کیا مطلب ہے؟ اس کے دو مطلب ہو سکتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ وفاداری اور اطاعت کیشی جیسی بنو مطلب کر رہے ہیں ویسی ہم بھی کر رہے ہیں۔ فرمانبرداری میں یکساں ہیں۔ دوسرا یہ کہ قرابت داری کے اعتبار سے بھی ہم اور ان میں زیادہ تفاوت نہیں۔ جتنا کچھ استحقاق قرابت انہیں آپؐ سے حاصل ہے اتنا ہی ہمیں بھی حاصل ہے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ بنو امیہ میں سے تھے ان کو شرف دامادی بھی حاصل تھا۔ بنو امیہ اور بنو ہاشم قریش میں بالکل برابر کے قبائل شمار ہوتے تھے۔ بالفاظ دیگر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ بنی عبد شمس میں سے اور حضرت جبیر رضی اللہ عنہ نوفل کی اولاد میں سے اور رسول اللہ ﷺ اور حضرت عباس رضی اللہ عنہ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ ہاشم کی اولاد سے ہیں۔ اس طرح گویا یہ سب مطلب کی اولاد ہیں۔ ہاشم' مطلب' نوفل اور عبد شمس یہ چاروں عبد مناف کے چار بیٹے تھے۔ اس طرح حضرت جبیر رضی اللہ عنہ' عثمان رضی اللہ عنہ اور علی رضی اللہ عنہ وغیرہ کا تعلق نبی ﷺ سے ایک ہی درجہ کا ہے۔ حضرت جبیر رضی اللہ عنہ و عثمان رضی اللہ عنہ کے سوال کا بھی یہی مطلب تھا۔

نبی ﷺ کے جواب کا مطلب یہ ہے کہ یہ ٹھیک ہے کہ زمانۂ قدیم سے بنو ہاشم اور بنو امیہ برابر چلے آرہے ہیں۔ آپؐ نے اس حیثیت سے تفریق نہیں فرمائی بلکہ اس حیثیت سے فرمائی کہ بنو ہاشم بنو امیہ کی بہ نسبت آپؐ کے زیادہ قریب تھے اس لئے ان کیلئے زکوٰۃ لینا حرام قرار دے دیا اور بنو امیہ کیلئے

حرام نہیں کیا۔ اس لئے بنو ہاشم کو خمس میں سے دیا گیا اور بنو امیہ کو خمس میں سے نہیں دیا۔ اسی بنا پر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو خمس میں سے نہیں دیا گیا۔

(٥٢٥) وَعَنْ أَبِيْ رَافِعٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُ، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ بَعَثَ رَجُلاً عَلَى الصَّدَقَةِ مِنْ بَنِيْ مَخْزُومٍ، فَقَالَ لِأَبِيْ رَافِعٍ: اصْحَبْنِيْ، فَإِنَّكَ تُصِيْبُ مِنْهَا: فَقَالَ: لاَ، حَتَّى آتِيَ النَّبِيَّ ﷺ، فَأَسْأَلَهُ، فَأَتَاهُ، فَسَأَلَهُ، فَقَالَ: «**مَوْلَى الْقَوْمِ مِنْ أَنْفُسِهِمْ، وَإِنَّها لاَ تَحِلُّ لَنا الصَّدَقَةُ**». رَوَاهُ أَحْمَدُ وَالثَّلاَثَةُ وَابْنُ خُزَيْمَةَ وَابْنُ حِبَّانَ.

حضرت ابو رافع رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی ﷺ نے بنو مخزوم کے ایک آدمی کو زکوٰۃ کی وصولی پر مقرر فرمایا۔ اس نے ابو رافع رضی اللہ عنہ کو کہا کہ تم میرے ساتھ چلو تجھے اس میں سے کچھ حصہ مل جائے گا۔ اس نے کہا میں نہیں جاؤں گا تاوقتیکہ میں نبی ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر اس بارے میں دریافت نہ کر لوں۔ چنانچہ وہ آپؐ کی خدمت میں آیا اور آپؐ سے دریافت کیا تو آپؐ نے فرمایا "قوم کا غلام بھی انہیں میں شمار ہوتا ہے اور ہمارے لئے صدقہ (زکوٰۃ) حلال نہیں ہے۔" (اسے احمد اور تینوں نے روایت کیا ہے اور ابن خزیمہ اور ابن حبان نے بھی)

لغوی تشریح: ﴿ بعث رجلا ﴾ آپؐ نے ایک آدمی کو بھیجا اس آدمی سے مراد حضرت ارقم رضی اللہ عنہ ہیں ﴿ تصیب منها ﴾ اس حاصل شدہ صدقہ میں سے تو اس کا معاوضہ اور اجرت لے لینا۔ اس حدیث سے معلوم ہوا کہ بنو ہاشم کے آزاد کردہ غلاموں پر بھی زکوٰۃ لینا حرام ہے۔

حاصل کلام: اس حدیث سے ثابت ہوا کہ جس آدمی کیلئے خود زکوٰۃ کا لینا حرام ہے اس کے غلام پر بھی حرام ہوتی ہے۔ ابو رافع رضی اللہ عنہ چونکہ نبی ﷺ کے غلام تھے اس لئے ان کیلئے بھی زکوٰۃ لینا حرام تھا۔

راوی حدیث: ﴿ ابورافع رضی اللہ عنہ ﴾ ان کے نام میں مختلف اقوال ہیں۔ چنانچہ ان کا نام اسلم تھا یا ھرمز یا ثابت یا ابراھیم، قبطی تھے۔ یہ دراصل حضرت عباس رضی اللہ عنہ کے غلام تھے۔ انہوں نے انہیں نبی ﷺ کو ہبہ کر دیا تھا۔ غزوۂ بدر سے پہلے ایمان قبول کر لیا تھا مگر اس میں شریک نہیں ہوئے اور بعد کے غزوات میں شریک رہے۔ جب حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے اسلام قبول کیا تو ان کے اسلام قبول کرنے کی بشارت ابو رافع رضی اللہ عنہ نے نبی ﷺ کو دی۔ آپؐ نے اس مقام مسرت پر اسے آزاد فرما دیا۔ ٣٦ھ میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خلافت کے شروع میں مدینہ میں وفات پائی۔

(٥٢٦) وَعَنْ سَالِمِ بْنِ عَبْدِ اللهِ بْنِ عُمَرَ، عَنْ أَبِيْهِ، أَنَّ رَسُولَ اللهِ ﷺ كَانَ يُعْطِي عُمَرَ الْعَطَاءَ،

حضرت سالم بن عبداللہ رحمۃ اللہ علیہ بن عمر رضی اللہ عنہما اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو کوئی چیز عطا فرماتے تو حضرت عمر

فَيَقُوْلُ: أَعْطِهِ أَفْقَرَ مِنِّيْ، فَيَقُولُ: خُذْهُ، فَتَمَوَّلْهُ، أَوْ تَصَدَّقْ بِهِ، وَمَا جَاءَكَ مِنْ هٰذَا الْمَالِ، وَأَنْتَ غَيْرُ مُشْرِفٍ وَلاَ سَائِلٍ، فَخُذْهُ، وَمالاَ فَلاَ تُتْبِعْهُ نَفْسَكَ. رَوَاهُ مُسْلِمٌ.

رضی اللہ عنہ عرض کرتے کہ جو لوگ مجھ سے زیادہ غریب ہیں انہیں عطا فرما دیجئے۔ اس کے جواب میں آپ ؐ فرماتے "اسے لے لو اور مالدار ہو جاؤ یا اسے صدقہ و خیرات کر دو جو مال بغیر عوض و لالچ اور مانگنے کے تمہارے پاس آئے اسے لے لیا کرو اور جو اس طرح نہ ملے اس کے پیچھے اپنے آپ کو نہ لگاؤ۔" (مسلم)

لغوی تشریح: ﴿ العطاء ﴾ کام کرنے کا معاوضہ اور اجرت یا عطیہ ہو ﴿ افقر ﴾ افعل التفضیل کا صیغہ یعنی جو زیادہ فقیر ہے۔ ﴿ فتمولہ ﴾ امر کا صیغہ ہے یعنی اسے اپنا مال بنا لو۔ ﴿ مشرف ﴾ اس کی خواہش کرتے ہوئے اس کی طرف نگاہیں اٹھا کر دیکھنا اور اس کا تعرض کرنا اور اس پر حریص و لالچی ہونا۔ ﴿ فلا تتبعہ ﴾ اتباع سے امر کا صیغہ ہے مطلب یہ ہے کہ اپنے آپ کو اس کی طلب میں معلق نہ کرو۔ سبل السلام میں ہے کہ یہ حدیث اس پر دلالت کر رہی ہے کہ عامل کو اپنی مزدوری و اجرت حاصل کر لینی چاہئے واپس نہیں کرنی چاہئے۔ اکثریت کی رائے کے مطابق یہاں امر ندب کیلئے ہے یعنی ایسا کرنا مندوب ہے فرض و واجب نہیں اور ایک رائے یہ ہے کہ اسے قبول کرنا واجب ہے اور ایک رائے یہ ہے کہ ہر وہ چیز جو انسان کو دی جائے اسے لے لینا چاہئے۔ لہٰذا اس کا قبول کرنا دو شرطوں سے مشروط ہے جو اس حدیث میں مذکور ہیں۔

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ عامل کو اپنے کام اور کارکردگی کی اجرت و معاوضہ لے لینا چاہئے کیونکہ اس حدیث میں "عطاء" سے مراد یہی ہے کیونکہ مسلم کی ایک حدیث میں ہے یہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو وصولی زکوٰۃ کی اجرت کے بارے میں آپ ؐ نے فرمایا تھا۔ یہ امر مستحب ہے' ایجابی نہیں اور اس سے مراد ہر عطیہ بھی ہے' جب دل میں حرص نہ ہو اور خود زبان سے یا حال سے اس کے حصول کا تقاضا بھی نہ ہو تو پھر جو کچھ وصول ہو اسے اخذ کر لے بشرطیکہ حلال ہو حرام نہ ہو۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ مالی حرص و طمع کے ساتھ سوال کرنا بھی حرام ہے۔

٥ـ كِتَابُ الصِّيَامِ

روزے کے مسائل

(٥٢٧) عَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «لاَ تَقَدَّمُوا رَمَضَانَ بِصَوْمِ يَوْمٍ وَلاَ يَوْمَيْنِ، إِلاَّ رَجُلٌ كَانَ يَصُومُ صَوْماً فَلْيَصُمْهُ». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "تم میں سے کوئی بھی رمضان سے پہلے ایک یا دو روزے نہ رکھے مگر جو شخص پہلے سے روزہ رکھتا آ رہا ہو اسے چاہئے کہ اس دن کا روزہ رکھ لے۔" (بخاری و مسلم)

لغوی تشریح: ﴿لا تقدموا﴾ یہ اصل میں "لا تتقدموا" تھا یعنی رمضان کے استقبال کیلئے رمضان سے پہلے ایک یا دو روزے مت رکھو ﴿کان یصوم صوما﴾ یعنی معمول کے گنے چنے دنوں میں جو وہ روزے رکھتا تھا اور وہ دن شعبان کے آخری دنوں میں واقع ہو جائیں۔ مثلاً ایک آدمی معمول کے مطابق ہر ہفتہ میں سوموار کا روزہ رکھتا ہے اور یہ سوموار کا دن شعبان کے آخر میں آ گیا تو اس طرح روزہ رکھنے میں کوئی مضائقہ نہیں وہ حسب معمول روزہ رکھ سکتا ہے۔ ﴿فلیصمہ﴾ اس میں لام امر جواز کے بیان کیلئے ہے یعنی معمول و عادت کے مطابق رمضان سے پہلے ایک یا دو روزے رکھ سکتا ہے۔

(٥٢٨) وَعَنْ عَمَّارِ بْنِ يَاسِرٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: مَنْ صَامَ الْيَومَ الَّذِيْ يُشَكُّ فِيْهِ، فَقَدْ عَصَى أَبَا الْقَاسِمِ ﷺ. ذَكَرَهُ الْبُخَارِيُّ تَعْلِيقاً، وَوَصَلَهُ الْخَمْسَةُ، وَصَحَّحَهُ ابْنُ حِبَّانَ.

حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ جس شخص نے مشکوک دن میں روزہ رکھا اس نے ابوالقاسم ﷺ کی نافرمانی کی۔ (بخاری نے اسے تعلیقاً اور پانچوں نے اسے موصولاً ذکر کیا ہے اور ابن حبان نے اسے صحیح کہا ہے)

لغوی تشریح: ﴿الیوم الذی یشک فیہ﴾ یشک صیغہ مجہول ہے۔ وہ شعبان کا تیسواں روز ہے جبکہ اس رات چاند ابر آلودگی وغیرہ کی وجہ سے نظر نہ آئے اور یہ شک واقع ہو جائے کہ آیا رمضان ہے یا شعبان۔

حاصل کلام: شریعت اسلامیہ نے یہ واضح اصول مقرر فرما دیا ہے کہ روزہ رکھو تو چاند دیکھ کر رکھو اور اسی طرح روزوں کا اختتام بھی عید کا چاند دیکھ کر کرو۔ اب اگر شعبان کی انتیسویں شب چاند نظر نہ آیا تو اس روز روزہ رکھنا مشکوک ہونے کی وجہ سے ممنوع ہے۔ علم فلکیات کے ماہرین کی آراء بھی لازماً قابل اعتماد و یقین نہیں۔

(۵۲۹) وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا قَالَ: سَمِعْتُ رَسُولَ اللهِ ﷺ يَقُوْلُ: «إِذَا رَأَيْتُمُوهُ فَصُومُوا، وَإِذَا رَأَيْتُمُوهُ فَأَفْطِرُوا، فَإِنْ غُمَّ عَلَيْكُمْ فَاقْدُرُوا لَهُ». مُتَفَقٌ عَلَيْهِ، وَلِمُسْلِمٍ: فَإِنْ أُغْمِيَ عَلَيْكُمْ فَاقْدُرُوا لَهُ ثَلاثِيْنَ. وَلِلْبُخَارِيِّ: فَأَكْمِلُوا العِدَّةَ ثَلاثِيْنَ. وَلَهُ فِي حَدِيْثِ أَبِيْ هُرَيْرَةَ: فَأَكْمِلُوا عِدَّةَ شَعْبَانَ ثَلاثِيْنَ.

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا کہ "جب تم چاند دیکھ لو تو روزہ رکھو اور جب (عید کے لیے) چاند دیکھ لو تو افطار کر دو اگر مطلع ابر آلود ہو تو اس کیلئے اندازہ لگا لو۔" (متفق علیہ) مسلم کے الفاظ ہیں کہ "اگر مطلع ابر آلود ہو تو پھر اس کے لئے تیس دن کی گنتی کا اندازہ رکھو اور بخاری کے الفاظ ہیں "پھر تیس روز کی گنتی و تعداد پوری کرو۔" اور بخاری میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت میں ہے کہ "پھر تم شعبان کے تیس دن پورے کرو۔" (بخاری و مسلم)

لغوی تشریح: ﴿ اذا رایتموہ ﴾ جب تم اسے دیکھ لو' اسے سے مراد چاند ہے یعنی جب چاند تمہیں نظر آجائے۔ ﴿ فان غم ﴾ غم کے غین پر ضمہ اور میم پر تشدید۔ صیغۂ مجہول۔ مطلب یہ ہے کہ جب چاند نظر نہ آئے مخفی اور پوشیدہ رہ جائے۔ ابر آلودگی کی وجہ سے یا کسی ایسی ہی دوسری وجہ سے۔ ﴿ فاقدروا لہ ﴾ قدر سے امر کا صیغہ ہے۔ فاقدوا لہ کے دال پر ضمہ اور کسرہ دونوں جائز ہیں۔ معنی یہ ہوئے کہ مکمل مہینہ کی گنتی اور تعداد پوری کرو اور تیسویں روز افطار کرو۔

(۵۳۰) وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا قَالَ: تَرَاءَى النَّاسُ الهِلاَلَ، فَأَخْبَرْتُ النَّبِيَّ ﷺ أَنِّي رَأَيْتُهُ، فَصَامَ، وَأَمَرَ النَّاسَ بِصِيَامِهِ. رَوَاهُ أَبُو دَاوُدَ، وَصَحَّحَهُ الحَاكِمُ وَابْنُ حِبَّانَ.

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ لوگوں نے چاند دیکھنا شروع کیا تو میں نے نبی ﷺ کو اطلاع دی کہ میں نے چاند دیکھ لیا ہے۔ آپؐ نے خود بھی روزہ رکھا اور لوگوں کو بھی روزہ رکھنے کا حکم دیا۔ (اسے ابوداؤد نے روایت کیا ہے اور حاکم اور ابن حبان نے صحیح قرار دیا ہے)

لغوی تشریح: ترا ای الناس الہلال لوگ عید کا چاند دیکھنے کیلئے اکٹھے ہوئے اور چاند دیکھنے کی کوشش کی۔ یہ حدیث اس بات کی واضح دلیل ہے کہ ماہ رمضان کا چاند دیکھنے کیلئے خبر واحد یعنی صرف ایک آدمی

کی شہادت مقبول ہے اور یہ جمہور کا مذہب ہے۔

حاصل کلام: ان احادیث سے یہ ثابت ہو رہا ہے کہ روزہ کا آغاز اور اختتام دونوں چاند کے نظر آنے پر منحصر ہے۔ چاند نظر آجائے تو روزہ رکھا جائے اور چاند دیکھ کر ہی روزے رکھنا بند کرے۔ اگر انتیس شعبان کو چاند نظر نہ آئے تو اس ماہ کے تیس دن پورے کئے جائیں اور اسی طرح اگر انتیس رمضان کو چاند نظر نہ آئے تو روزے تیس پورے کئے جائیں۔ اگر گرد و غبار اور ابر آلودگی کی وجہ سے ایک مقام پر چاند نظر نہ آئے مگر دوسری جگہ مطلع صاف ہونے کی بنا پر نظر آجائے تو روزہ سارے شہروں' قصبوں اور دیہاتوں میں رکھا جائے گا۔ اسی طرح عید بھی منائی جائے گی بشرطیکہ ان جگہوں کا مطلع ایک ہو۔ اگر فاصلہ اس قدر ہو کہ مطلع ہی تبدیل ہو جائے تو پھر وہاں کی رؤیت قابل قبول نہ ہوگی۔ جیسا کہ جمہور علمائے کرام نے کہا ہے۔ نیز اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ روزہ رکھنے کیلئے ایک معتبر و مقبول آدمی کی شہادت کافی ہے۔ جمہور علماء کا یہی مذہب ہے مگر ہلال عید کیلئے دو شہادتوں کا ہونا ضروری ہے۔ اس میں کسی کا اختلاف نہیں' سب متفق ہیں۔

(۵۳۱) وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُمَا، أَنَّ أَعْرَابِياً جَاءَ إِلَى النَّبِيِّ ﷺ فَقَالَ: إِنِّي رَأَيْتُ الهِلاَلَ، فَقَالَ: **أَتَشْهَدُ أَن لاَّ إِلٰهَ إِلاَّ اللّٰهُ؟** قَالَ: نَعَمْ. قَالَ: **أَتَشْهَدُ أَنَّ مُحَمَّداً رَسُولُ اللهِ؟** قَالَ نَعَمْ، قَالَ: **فَأَذِّنْ فِي النَّاسِ يَا بِلاَلُ أَنْ يَصُوْمُوا غَداً**. رَوَاهُ الخَمْسَةُ، وَصَحَّحَهُ ابْنُ خُزَيْمَةَ وَابْنُ حِبَّانَ، وَرَجَّحَ النَّسَائِيُّ إِرْسَالَهُ.

حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ ایک صحرا نورد نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا کہ میں نے چاند دیکھا ہے۔ آپؐ نے اس سے دریافت فرمایا "کیا تو اس بات کی شہادت دیتا ہے کہ اللہ کے سوا دوسرا کوئی الٰہ نہیں؟" اس نے کہا ہاں۔ آپؐ نے فرمایا "کیا تو اس بات کی گواہی دیتا ہے کہ محمد اللہ کے رسول ہیں؟" اس نے کہا ہاں! آپؐ نے فرمایا بلال اٹھو اور لوگوں میں منادی کر دو کہ کل روزہ رکھا جائے۔" (اسے پانچوں نے روایت کیا ہے۔ ابن خزیمہ اور ابن حبان نے صحیح قرار دیا ہے اور نسائی نے اس کے مرسل ہونے کو ترجیح دی ہے)

لغوی تشریح: ﴿ فاذن ﴾ تاذین سے ماخوذ ہے۔ امر کا صیغہ ہے۔ مراد اس سے عام اعلان اور منادی ہے۔ یہ حدیث مذہب جمہور کی تائید کرتی ہے کہ رمضان کے چاند کیلئے ایک عادل مسلمان کی گواہی کافی ہے اور یہی بات صحیح ہے۔

(۵۳۲) وَعَنْ حَفْصَةَ أُمِّ المُؤْمِنِيْنَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهَا، أَنَّ النَّبِيَّ

حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا ام المومنین سے مروی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "جس شخص نے صبح صادق سے

ﷺ قَالَ: «مَنْ لَمْ يُبَيِّتِ الصِّيَامَ قَبْلَ الْفَجْرِ فَلاَ صِيَامَ لَهُ». رَوَاهُ الخَمْسَةُ، وَمَالَ التِّرْمِذِيُّ وَالنَّسَائِيُّ إِلَى تَرْجِيحِ وَقْفِهِ، وَصَحَّحَهُ مَرْفُوعاً ابْنُ خُزَيْمَةَ وَابْنُ حِبَّانَ.

پہلے روزے کی نیت نہ کی اس کا کوئی روزہ نہیں۔" (اسے پانچوں نے روایت کیا ہے۔ ترمذی اور نسائی کا رجحان اس کے موقوف ہونے کی طرف ہے اور ابن خزیمہ اور ابن حبان نے اس کا مرفوع ہونا صحیح قرار دیا ہے) اور

وَلِلدَّارَقُطْنِيِّ: «لاَ صِيَامَ لِمَن لَمْ يَفْرِضْهُ مِنَ اللَّيْلِ».

دار قطنی کی روایت میں ہے "جس نے رات کو اپنے آپ پر واجب نہ کرلیا اس کا کوئی روزہ نہیں۔"

لغوی تشریح: ﴿ من لم يبيت ﴾ الخ تبييت سے ماخوذ ہے۔ یعنی رات میں روزے کی نیت کرنا ﴿ لم يفرضه ﴾ باب ضرب يضرب سے ہے۔ یعنی اس کو اپنے اوپر فرض نہیں کیا اور یہ اس طرح کہ اس نے اس کی نیت نہ کی۔

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ فرضی روزے کی نیت صبح صادق سے پہلے ہونی ضروری ہے گویا غروب آفتاب کے بعد سے لے کر صبح صادق کے طلوع ہونے سے پہلے تک نیت کی جا سکتی ہے۔ نیت اس لئے ضروری اور لازمی ہے کہ روزہ ایک عمل ہے اور عمل کیلئے نیت ضروری ہے اور ہر دن کے روزے کیلئے الگ الگ نیت شرط ہے۔ البتہ روزہ کی نیت کے جو الفاظ زبان سے کہے جاتے ہیں وہ بدعت ہے کیونکہ نیت دل کا عمل ہے' زبان کا اس سے کوئی تعلق نہیں اور نہ ہی یہ نبی کریم ﷺ یا صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین سے ثابت ہیں۔

راوی حدیث: ﴿ حفصه بنت عمر بن خطاب رضى الله عنهما ﴾ پہلے یہ خنیس بن حذافہ سہمی کے نکاح میں تھیں۔ ان کے ساتھ ہجرت کی۔ غزوۂ بدر کے موقع پر یہ وفات پا گئے تو رسول اللہ ﷺ نے ان کو اپنی زوجیت میں لے کر اپنے حرم میں داخل فرما لیا۔ یہ ۳ھ کی بات ہے۔ ساٹھ سال کی عمر میں شعبان ۴۵ھ میں فوت ہوئیں۔

(۵۳۳) وَعَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهَا، قَالَتْ: دَخَلَ عَلَيْنَا النَّبِيُّ ﷺ ذَاتَ يَوْمٍ فَقَالَ: هَلْ عِنْدَكُمْ شَيْءٌ؟ قُلْنَا: لاَ، قَالَ: فَإِنِّي إِذاً صَائِمٌ، ثُمَّ أَتَانَا يَوْماً آخَرَ، فَقُلْنَا: أُهْدِيَ لَنَا حَيْسٌ، فَقَالَ: أَرِينِيهِ فَلَقَدْ أَصْبَحْتُ صَائِماً، فَأَكَلَ. رَوَاهُ مُسْلِمٌ.

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ ایک روز نبی کریم ﷺ ہمارے پاس تشریف لائے اور دریافت فرمایا کہ "کیا تمہارے پاس کوئی چیز ہے؟" ہم نے عرض کیا' نہیں۔ تو آپؐ نے فرمایا "اچھا تو میں روزہ سے ہوں۔" اس کے بعد پھر ایک روز تشریف لائے تو ہم نے عرض کیا کہ حلوہ کا تحفہ ہمیں (کہیں سے) دیا گیا ہے۔ آپؐ نے فرمایا "ذرا مجھے تو دکھاؤ صبح سے میں روزے سے تھا۔" (یہ فرما کر) آپؐ نے حلوہ

تناول فرمالیا۔ (مسلم)

لغوی تشریح: ﴿ فانی اذا صائم ﴾ اذاً پر تنوین ہے۔ اس حدیث سے یہ امر واضح ہو رہا ہے کہ نفلی روزے کی نیت طلوع آفتاب کے بعد بھی ہو سکتی ہے اور یہ حدیث اس کا تقاضا کرتی ہے کہ حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا کی سابقہ روایت میں نیت کا لزوم فرض روزے کیلئے ہے، نفل روزے کیلئے نہیں ہے ﴿ حیس ﴾ "حا" پر فتحہ اور "یا" ساکن۔ جسے کھجور، مکھن، گھی اور پنیر شامل کر کے تیار کیا گیا ہو۔ ﴿ ارینیہ ﴾ اراءۃ سے امر مخاطب کا صیغہ ہے اور اس میں نون وقایہ کا ہے اور بعد کی "یا" یائے متکلم ہے اور یہ فعل کا پہلا مفعول واقع ہو رہا ہے اور دوسرا مفعول ضمیر غائب ہے ﴿ فاکل ﴾ پھر آپ نے اسے تناول فرمالیا۔ یہ حدیث اس پر دلالت کر رہی ہے کہ نفلی روزہ دار بغیر کسی عذر کے روزہ افطار کر سکتا ہے۔ (توڑ سکتا ہے)

حاصل کلام: یہ حدیث اس کی دلیل ہے کہ نفلی روزہ کی نیت طلوع فجر سے پہلے لازمی نہیں بلکہ طلوع آفتاب کے بعد بھی کی جا سکتی ہے۔ ائمہ اربعہ میں سے امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نفلی روزے کی نیت بھی صبح صادق سے پہلے کرنے کو لازمی قرار دیتے ہیں حالانکہ یہ صریح حدیث ان کے خلاف حجت ہے۔ نیز اس حدیث سے یہ بھی ثابت ہو رہا ہے کہ نفلی روزہ بغیر کسی عذر کے توڑا جا سکتا ہے۔ ائمہ ثلاثہ (امام مالک رحمۃ اللہ علیہ، امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ اور امام احمد رحمۃ اللہ علیہ) اور اکثر علماء کا یہی مذہب ہے۔ مگر امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک بلا عذر روزہ افطار کرنا جائز نہیں۔ اس کو پورا کرنا ان کے نزدیک واجب ہے۔ ان کے نزدیک عذر ضیافت کو قرار دیا گیا ہے۔ اگر افطار کر لیا تو اس کی قضاء توڑنے والے پر واجب ہے۔ امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے علاوہ کسی کے نزدیک قضاء واجب نہیں اور نفلی روزے کو قصداً توڑنے کا کفارہ کسی کے نزدیک بھی نہیں ہے۔

(٥٣٤) وَعَنْ سَهْلِ بْنِ سَعْدٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا، أَنَّ رَسُولَ اللهِ ﷺ قَالَ: «**لاَ يَزَالُ النَّاسُ بِخَيْرٍ مَا عَجَّلُوا الفِطْرَ**». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت سہل بن سعد رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ: "لوگ اس وقت تک بھلائی پر قائم رہیں گے جب تک روزہ افطار کرنے میں جلدی کریں گے" (بخاری و مسلم)

وَلِلتِّرْمِذِيِّ مِنْ حَدِيْثِ أَبِي هُرَيْرَةَ، عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ: قَالَ اللَّهُ عَزَّ وَجَلَّ: «أَحَبُّ عِبَادِي إِلَيَّ، أَعْجَلُهُمْ فِطْراً».

اور ترمذی میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی نبی ﷺ سے روایت میں ہے کہ آپ نے فرمایا کہ "اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے "میرے بندوں میں میرے محبوب و پسندیدہ بندے وہ ہیں جو افطار کرنے میں عجلت سے کام لیتے ہیں۔"

لغوی تشریح: ﴿ ما عجلوا الفطر ﴾ جب تک افطار کرنے میں جلدی کریں گے۔ یہ تعجیل سے ماخوذ ہے یعنی تحقیق سے جب یہ ثابت ہو جائے کہ سورج غروب ہو چکا ہے تو فوراً روزہ افطار کر دینا چاہئے۔ اس عجلت کو اللہ تعالیٰ کے نزدیک محبوب و پسندیدہ اس لئے قرار دیا گیا ہے کہ افطار میں جلدی کرنا اہل

اسلام کا شعار ہے جبکہ اہل کتاب تاخیر سے روزہ افطار کرتے ہیں۔ اس میں آسانی کا بھی پہلو ہے۔ اطاعت و فرمانبرداری کا بھی یہی تقاضا ہے اس لئے شعار اسلام کا اہتمام کرنا اور شریعت کی دی ہوئی سہولت کو لینا اور معاملات میں تکلیف و مشقت سے بچنا خیر و برکت کا باعث ہے۔

حاصل کلام: مطلع صاف ہو' گرد و غبار اور ابر آلودگی نہ ہو اور غروب آفتاب کا یقین ہو جائے تو پھر روزہ افطار کرنے میں بلاوجہ تاخیر کرنا جائز نہیں۔ تاخیر سے روزہ افطار کرنا اہل کتاب یہود و نصاریٰ کا طریقہ ہے اور مصابیح میں یہ بھی ہے کہ افطاری میں تاخیر و دیر کرنا اہل بدعت کی علامت ہے۔ للہٰذا غروب آفتاب کے فوراً بعد روزہ افطار کر لینا چاہیئے۔

(٥٣٥) وَعَنْ أَنَسِ بْنِ مَالِكٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «**تَسَحَّرُوا، فَإِنَّ فِي السَّحُورِ بَرَكَةً**». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "سحری کھایا کرو اس لئے کہ اس میں بڑی برکت ہے۔" (بخاری و مسلم)

لغوی تشریح: ﴿السحور﴾ سین پر فتحہ کی صورت میں طلوع فجر سے پہلے سحر کیلئے جو کچھ کھایا پیا جائے اسے سحور کہتے ہیں اور اس پر اگر ضمہ ہو تو پھر یہ مصدر ہو گا۔

حاصل کلام: اس حدیث میں سحری کھانے کی ترغیب ہے یہود و نصاریٰ چونکہ سحری کا اہتمام نہیں کرتے۔ مسلم کی روایت میں ہے کہ ہمارے اور اہل کتاب کے روزے میں فرق سحری کھانے کا ہے۔ اس سے روزے کی تکمیل میں آسانی اور سہولت پیدا ہو جاتی ہے۔

(٥٣٦) وَعَنْ سَلْمَانَ بْنِ عَامِرٍ الضَّبِّيِّ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ: «**إِذَا أَفْطَرَ أَحَدُكُمْ فَلْيُفْطِرْ عَلَى تَمْرٍ، فَإِنْ لَمْ يَجِدْ فَلْيُفْطِرْ عَلَى مَاءٍ، فَإِنَّهُ طَهُورٌ**». رَوَاهُ الخَمْسَةُ، وَصَحَّحَهُ ابْنُ خُزَيْمَةَ وَابْنُ حِبَّانَ وَالحَاكِمُ.

حضرت سلمان بن عامر رضی اللہ عنہ نبی ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ آپ ؐ نے فرمایا "جب تم میں سے کوئی روزہ افطار کرے تو اسے کھجور سے افطار کرنا چاہیئے۔ پھر اگر کھجور دستیاب نہ ہو سکے تو پانی سے افطار کر لے اس لئے کہ وہ پاک ہے۔" (اسے پانچوں نے روایت کیا ہے۔ ابن خزیمہ' ابن حبان اور حاکم نے اسے صحیح قرار دیا ہے)

حاصل کلام: اس حدیث سے ثابت ہوتا ہے کہ اگر ممکن ہو تو کھجور سے افطار کرنا چاہیئے کیونکہ کھجور مقوی معدہ' مقوی اعصاب اور جسم میں واقع ہونے والی کمزوری کا بدل ہے۔ اگر کھجور مہیا نہ ہو سکے تو پھر پانی سے افطار بہتر ہے۔ نبی ﷺ تازہ کھجوروں سے افطار فرمایا کرتے تھے۔ اگر تازہ نہ ملتی تو خشک کھجور سے افطار کرتے۔ اگر یہ بھی نہ ملتی تو پھر چند گھونٹ پانی سے روزہ افطار فرما لیتے تھے۔

راوی حدیث: ﴿سلمان بن عامر رضی اللہ عنہ﴾ سلمان بن عامر بن اوس بن حجر بن عمرو بن حارث الضبی۔

مشہور صحابی ہیں۔ بصرہ میں رہائش رکھی تھی۔ نبی ﷺ کی زندگی ہی میں یہ صاحب عمر رسیدہ تھے۔ خلافت معاویہ تک زندہ رہے۔ ایک قول یہ بھی ہے کہ جنگ جمل میں شہید ہوگئے۔ اس وقت ان کی عمر سو برس کی تھی۔ ایک قول یہ بھی ہے کہ ان کے ماسوا کوئی بھی ضبی صحابی نہیں۔

(٥٣٧) وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: نَهَى رَسُولُ اللهِ ﷺ عَنِ الوِصَالِ، فَقَالَ رَجُلٌ مِّنَ المُسْلِمِيْنَ: فَإِنَّكَ تَوَاصِلُ يَا رَسُولَ اللهِ؟ قَالَ: «**وَأَيُّكُمْ مِثْلِيْ؟ إِنِّي أَبِيْتُ يُطْعِمُنِيْ رَبِّيْ وَيَسْقِيْنِيْ**»، فَلَمَّا أَبَوْا أَنْ يَنْتَهُوا عَنِ الوِصَالِ وَاصَلَ بِهِمْ يَوْماً، ثُمَّ يَوْماً، ثُمَّ رَأَوُا الهِلاَلَ، فَقَالَ: «**لَوْ تَأَخَّرَ الهِلاَلَ لَزِدْتُكُمْ**»، كَالمُنْكِّلِ لَهُمْ حِيْنَ أَبَوا أَن يَنْتَهُوا. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے وصال سے منع فرمایا' مسلمانوں میں سے ایک صاحب نے سوال کیا کہ اللہ کے رسول (ﷺ)! آپ خود تو وصال فرماتے ہیں؟ آپ نے فرمایا "تم میں سے میرے جیسا کون ہے؟ میں تو اس حال میں رات گزارتا ہوں کہ میرا پروردگار مجھے کھلاتا اور پلاتا ہے۔" جب لوگوں نے وصال سے باز آنے سے انکار کر دیا تو آپ نے ان کے ساتھ ایک دن پھر دوسرے دن کا وصال کیا۔ پھر انہوں نے چاند کو دیکھ لیا تو آپ نے فرمایا کہ "اگر چاند آج نظر نہ آتا تو میں تمہارے لئے زیادہ دن وصال کرتا۔" گویا آپ لوگوں کو اس سے باز نہ رہنے کی وجہ سے سزا دے رہے تھے۔ (بخاری و مسلم)

لغوی تشریح: ﴿ الوصال ﴾ اس کو کہتے ہیں کہ آدمی قصداً دو دن یا زیادہ دن تک افطار نہ کرے اور مسلسل روزہ رکھے نہ رات کو کچھ کھائے پیئے اور نہ سحری کے وقت۔ جمہور علماء اسلام کا قول یہ ہے کہ وصال کرنا نبی کریم ﷺ کی خصوصیت ہے۔ آپ کیلئے جائز اور امت کیلئے ناجائز ہے۔ ائمہ ثلاثہ' امام مالک رحمہ اللہ' امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ اور امام شافعی رحمہ اللہ وصال کے روزے کو مکروہ سمجھتے ہیں۔ امام احمد رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ صبح تک وصال جائز ہے۔ سحری بہرنوع کھانی چاہئے۔ ﴿ یطعمنی ربی ویسقینی ﴾ میرا رب مجھے کھلاتا ہے' پلاتا ہے۔ جمہور نے اسے مجازاً قوت پر محمول کیا ہے کہ کھانے پینے سے جو قوت حاصل ہوتی ہے اللہ تعالیٰ وہ قوت مجھے عطا فرما دیتے ہیں۔ بعض نے اسے حقیقت پر معمول کرتے ہوئے کھانے پینے سے جنت کا کھانا پینا مراد لیا ہے۔ حافظ ابن قیم رحمہ اللہ فرماتے ہیں' اس سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کو اپنے معارف کی ایسی غذا کھلاتے ہیں جس سے آپ کے دل پر لذت سرگوشی و مناجات کا فیضان ہوتا ہے۔ اللہ کے قرب سے آپ کو آنکھوں کی ٹھنڈک ملتی ہے اور اللہ کی محبت کی نعمت سے آپ کو سرشاری نصیب ہوتی ہے اور اس کی جناب کی طرف شوق میں افزونی ہوتی ہے۔ یہ ہے وہ غذا جو آپ کو اللہ کی

جناب سے عطا ہوتی ہے۔ یہ روحانی غذا ایسی ہے جو آپؐ کو دنیوی غذا سے ایک لمبی مدت تک بے نیاز کر دیتی ہے۔ (تلخیص از زاد المعاد' ج ا' ص: ۱۵۴' ۱۵۵) ﴿كالمنكل لهم﴾ تنکیل سے ماخوذ اسم فاعل ہے۔ معنی زجر و توبیخ' ڈانٹ ڈپٹ۔ مطلب یہ ہے کہ آپ ﷺ بھی ان کے ساتھ مسلسل روزہ رکھتے ہیں۔ یہ بیان صرف جواز کیلئے نہیں ہے بلکہ زجر و توبیخ کیلئے ہے اور اس سے ممانعت کے عمل کو تاکید کے ساتھ بیان کرنا مقصود ہے۔ پس جب انہوں نے براہ راست صوم وصال رکھا تو ان کے سامنے اس کی حکمت ظاہر ہوئی۔ یہ چیز اسے قبول کرنے کی زیادہ داعی تھی۔

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ روزے میں وصال مکروہ ہے۔ اللہ تعالیٰ انسان کو مشقت میں مبتلا نہیں کرتا۔ مسلسل کچھ کھائے پئے بغیر روزہ رکھنا انسانی قویٰ کو کمزور کر دینے کا بھی موجب ہے۔ آنحضرت ﷺ کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے روحانی یا غذا کی قوت مل جاتی تھی اس لئے آپؐ وصال فرما لیتے۔ بعض صحابہ کرامؓ نے نیکی کے جذبہ اور آپؐ کے عمل کو دیکھ کر وصال کرنا شروع کیا تو آپؐ نے انہیں اس سے منع فرمایا مگر جب وہ باز نہ آئے تو آپؐ نے سبق سکھانے کیلئے مسلسل روزے رکھنا شروع کئے تو اتنے میں چاند نظر آ گیا تو آپؐ نے زجر و توبیخ کے طور پر فرمایا کہ ''کرو وصال کہاں تک کرو گے۔ اگر چاند نظر نہ آتا تو میں وصال صوم کو مزید طول دے دیتا تاکہ تمہیں سبق ملے۔'' البتہ بخاری میں ابوسعید رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آپؐ نے فرمایا ''وصال نہ کرو ہاں! اگر تم میں سے کوئی وصال کرنا ہی چاہے تو سحر تک وصال کرے۔'' جس سے امام احمد رحمہ اللہ وغیرہ کے موقف کی تائید ہوتی ہے کہ صبح تک وصال جائز ہے۔ سحری کا کھانا شعائر اسلام سے ہے۔ اس لئے سحری کھانا چاہئے اور رات دن کا وصال آنحضرت ﷺ کی خصوصیت ہے۔

(٥٣٨) وَعَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «مَنْ لَمْ يَدَعْ قَوْلَ الزُّورِ، وَالعَمَلَ بِهِ، والجَهْلَ، فَلَيْسَ لِلَّهِ حَاجَةٌ فِي أَنْ يَدَعَ طَعَامَهُ وَشَرَابَهُ». رَوَاهُ البخاريُّ وَأَبُو دَاوُدَ، وَاللَّفْظُ لَهُ.

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ ہی سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ''جس نے جھوٹ بولنا اور اس پر عمل کرنا نہ چھوڑا اور حماقت و بیوقوفی کو ترک نہ کیا تو اللہ تعالیٰ کو اس کے کھانے پینے کو چھڑانے کی ضرورت نہیں۔'' (بخاری اور ابوداؤد۔ اور الفاظ ابوداؤد کے ہیں)

لغوی تشریح: ﴿لم يدع﴾ نہ چھوڑا' ترک نہ کیا۔ ودع سے ماخوذ ہے۔ ﴿الزور﴾ زا پر ضمہ اور ''واو'' ساکن معنی جھوٹ ﴿الجهل﴾ حماقت و بیوقوفی اور سختی ﴿فليس لله حاجة﴾ تو اللہ کو اس کی طرف التفات و توجہ کی حاجت و ضرورت نہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ کے ہاں اس کا یہ عمل قابل قبول نہیں۔

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ روزے کی حالت میں جھوٹ' غلط بیانی' جہالت و نادانی

کے کام بھی ترک کر دینے چاہئیں۔ جھوٹ بولنے اور غلط بیانی سے روزے کی روح متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتی۔ اس لئے روزے کی حالت میں ایک روزے دار کا بچنا نہایت ضروری ہے۔ روزے دار کی جسمانی تربیت کے ساتھ روحانی تربیت بھی ہوتی ہے۔ گویا روزے کا مقصد یہ ہے کہ انسان اپنی طبیعت پر کنٹرول کرنا سیکھ جائے۔ جھوٹ' دغا' فریب اور نادانی کے کاموں سے اجتناب کرے۔ اگر یہی مقصود حاصل نہ ہوا تو پھر روزہ رکھنے کا کوئی فائدہ نہیں۔

(٥٣٩) وَعَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهَا قَالَتْ: كَانَ رَسُولُ اللهِ ﷺ يُقَبِّلُ وَهُوَ صَائِمٌ، وَيُبَاشِرُ وَهُوَ صَائِمٌ، وَلٰكِنَّهُ كَانَ أَمْلَكَكُمْ لِإِرْبِهِ. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ، وَاللَّفْظُ لِمُسْلِمٍ، وَزَادَ فِي رِوَايَةٍ: «فِي رَمَضَانَ».

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ روزے کی حالت میں اپنی بیوی کا بوسہ لے لیتے تھے اور معانقہ بھی فرما لیتے تھے لیکن آپؐ تمہاری نسبت اپنی طبیعت پر زیادہ کنٹرول اور ضبط کرنے والے تھے۔ (بخاری و مسلم' یہ الفاظ مسلم کے ہیں) اور ایک روایت میں اتنا اضافہ ہے کہ آپؐ یہ دونوں فعل رمضان میں کرتے تھے۔

لغوی تشریح: ﴿ یقبل ﴾ تقبیل سے ماخوذ ہے۔ ﴿ یباشر ﴾ میاں بیوی کا ایک دوسرے کے جسم سے جسم ملانا' بغل گیر ہونا۔ ﴿ لاربه ﴾ دونوں پر فتحہ ہے۔ یعنی حاجت' خواہش نفس (میاں بیوی کا صنفی تعلق) اور ایک قراءت کے مطابق ھمزہ کے نیچے کسرہ اور راء ساکن۔ اس صورت میں حاجت اور عضو مخصوص کا احتمال ہے۔ اس حدیث سے بوسہ اور مباشرت جسمانی ایسے آدمی کیلئے مباح ہے جو اپنے آپ پر قابو اور کنٹرول رکھنے کا حوصلہ اور طاقت رکھتا ہو اور یہ رعایت ایسے آدمی کیلئے نہیں جسے اپنے نفس پر پورا کنٹرول نہ ہو۔ یہ قول اس مسئلہ میں تمام اقوال و آراء میں زیادہ مناسب اور مبنی برعدل ہے۔

(٥٤٠) وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ احْتَجَمَ وَهُوَ مُحْرِمٌ، وَاحْتَجَمَ وَهُوَ صَائِمٌ. رَوَاهُ الْبُخَارِيُّ.

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے احرام اور روزے کی حالت میں پچھنے لگوائے۔ (بخاری)

حاصل کلام: اس حدیث سے ثابت ہوتا ہے کہ پچھنے یا سینگی لگوانے سے نہ احرام میں کوئی نقص واقع ہوتا ہے اور نہ روزے میں کوئی کمی آتی ہے۔ دونوں حالتوں میں پچھنے لگوانے جائز ہیں۔ البتہ اگر کمزوری واقع ہو جائے اور اس کی وجہ سے روزہ ٹوٹنے کا اندیشہ و خطرہ پیدا ہو تو پھر پچھنے لگوانے سے اجتناب کرنا بہتر ہے۔ اکثر ائمہ کرام کی رائے یہی ہے کہ پچھنے لگوانے سے روزہ نہیں ٹوٹتا۔

(٥٤١) وَعَنْ شَدَّادِ بْنِ أَوْسٍ حضرت شداد بن اوس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی

رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُ، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ أَتَى عَلَى رَجُلٍ بِالبَقِيْعِ، وَهُوَ يَحْتَجِمُ فِيْ رَمَضَانَ، فَقَالَ: «أَفْطَرَ الحَاجِمُ وَالمَحْجُومُ». رَوَاهُ الخَمْسَةُ إِلاَّ التِّرْمِذِيَّ، وَصَحَّحَهُ أَحْمَدُ وَابْنُ خُزَيْمَةَ وَابْنُ حِبَّانَ.

ﷺ بقیع میں ایک ایسے شخص کے پاس تشریف لائے جو رمضان میں پچھنے لگوا رہا تھا۔ اس کو دیکھ کر آپؐ نے فرمایا کہ "سینگی (پچھنے) لگانے اور لگوانے والے دونوں کا روزہ ٹوٹ گیا۔" (بجز ترمذی اسے پانچوں نے روایت کیا ہے۔ احمد' ابن خزیمہ اور ابن حبان تینوں نے اسے صحیح قرار دیا ہے)

لغوی تشریح: ﴿افطر الحاجم والمحجوم﴾ یہ حدیث اس بارے میں نص ہے کہ سینگی لگانے اور لگوانے والے دونوں کا روزہ ٹوٹ جاتا ہے۔ بظاہر یہ حدیث حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی سابقہ حدیث کے معارض ہے۔ جمہور علماء روزے دار کیلئے سینگی لگوانے کے جواز کے قائل ہیں اور اس حدیث کی تاویل میں ان کے مختلف اقوال ہیں۔ ایک قول یہ ہے کہ ان دونوں نے اپنے آپ افطار کیلئے خود کو پیش کر دیا ہے بلکہ قریب بھی پہنچ گئے جسے سینگی لگائی گئی وہ تو ضعف و کمزوری کی وجہ سے اور سینگی لگانے والا اس لئے کہ اس سے بچنا مشکل ہے کہ جب وہ خون چوس رہا ہو تو کوئی قطرۂ خون حلق میں چلا جائے اور روزہ ٹوٹ جائے اور ایک قول یہ ہے کہ یہ حدیث منسوخ ہے۔ اس کی ناسخ آئندہ حضرت انس رضی اللہ عنہ کی روایت ہے۔ لیکن جہاں تک تاویل مذکور کا تعلق ہے تو حدیث کے الفاظ اس کے اطلاق کا انکار کر رہے ہیں۔ یہی بات راجح ہے۔

حاصل کلام: یہ حدیث بتا رہی ہے کہ سینگی لگانے اور لگوانے والے دونوں کا روزہ ٹوٹ جاتا ہے۔ امام احمد رحمۃ اللہ علیہ کی یہی رائے ہے مگر جمہور اس کے قائل نہیں۔ انہوں نے اس کی جو تاویل کی ہے وہ گو اتنی اہمیت نہیں رکھتی مگر حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور آئندہ حضرت انس رضی اللہ عنہ کی حدیث میں اس کے نسخ کا احتمال قوی تر ہے۔

راوی حدیث: ﴿شداد بن اوس رضی اللہ عنہ﴾ ان کی کنیت ابویعلیٰ ہے۔ انصار میں سے ہونے کی وجہ سے انصاری مدنی کہلائے۔ حضرت حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ کے برادر زادہ (بھتیجے) تھے۔ علم و حلم کے مالک تھے۔ ۵۸ھ میں ۷۵ برس کی عمر پا کر شام میں وفات پائی۔

(۵۴۲) وَعَنْ أَنَسٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: أَوَّلُ مَا كُرِهَتِ الحِجَامَةُ لِلصَّائِمِ، أَنَّ جَعْفَرَ بْنَ أَبِيْ طَالِبٍ احْتَجَمَ وَهُوَ صَائِمٌ، فَمَرَّ بِهِ النَّبِيُّ ﷺ فَقَالَ: أَفْطَرَ هٰذَانِ. ثُمَّ رَخَّصَ النَّبِيُّ ﷺ بَعْدُ فِي

حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ سب سے پہلے روزہ دار کیلئے سینگی لگوانا اس لئے مکروہ ہوئی کہ جعفر بن ابی طالب رضی اللہ عنہ نے روزہ کی حالت میں سینگی لگوائی' نبی ﷺ اس کے پاس سے گزرے تو آپؐ نے فرمایا "ان دونوں کا روزہ ٹوٹ گیا۔" اس کے بعد نبی ﷺ نے روزہ دار کیلئے سینگی لگوانے کی رخصت دے دی

الحِجَامَةِ لِلصَّائِمِ ، وَكَانَ أَنَسٌ يَحْتَجِمُ وَهُوَ صَائِمٌ . رَوَاهُ الدَّارَقُطْنِيُّ وَقَوَّاهُ.

اور انس رضی اللہ عنہ روزہ کی حالت میں سینگی لگواتے تھے۔ (اسے دار قطنی نے روایت کیا ہے اور اس کو قوی کہا ہے)

لغوی تشریح : ﴿ بعد ﴾ کے دال پر عموماً ضمہ ہے۔ اسے مبنی علی الضم کہتے ہیں۔ نیت میں مضاف الیہ ہونے کے باوجود اسے حذف کر دیا جاتا ہے جیسے ﴿ بعد ذلک ﴾ اس میں "ذلک" ذہن میں ہوتا ہے مگر اسے حذف کر دیا جاتا ہے اس لئے بعد پر ضمہ پڑھا جاتا ہے۔

حاصل کلام : یہ حدیث واضح دلیل ہے کہ سینگی لگوانے سے روزہ ٹوٹ جانے کا حکم منسوخ ہو گیا ہے اور اس کی تائید حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی گزشتہ حدیث سے بھی ہوتی ہے۔

(۵۴۳) وَعَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهَا ، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ اكْتَحَلَ فِيْ رَمَضَانَ وَهُوَ صَائِمٌ. رَوَاهُ ابْنُ مَاجَهْ بِإِسْنَادٍ ضَعِيفٍ ،وَقَالَ التِّرْمِذِيُّ :لاَ يَصِحُّ فِيْهِ شَيْءٌ.

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے رمضان میں روزہ کی حالت میں سرمہ لگایا۔ (اسے ابن ماجہ نے بیان کیا ہے اور امام ترمذی رحمہ اللہ نے فرمایا ہے کہ اس بارے میں کوئی حدیث بھی صحیح نہیں)

حاصل کلام : سرمہ لگانے کے بارے میں اختلاف ہے۔ امام ترمذی رحمہ اللہ نے ذکر کیا ہے کہ امام احمد رحمہ اللہ ' اسحٰق رحمہ اللہ ' ابن مبارک رحمہ اللہ اور سفیان ثوری رحمہ اللہ روزہ دار کیلئے سرمہ لگانا مکروہ سمجھتے ہیں۔ البتہ امام شافعی رحمہ اللہ نے اس کی اجازت دی ہے اور یہی جمہور علماء کی رائے ہے۔ اس بارے میں گو مرفوعاً احادیث سب ضعیف ہیں جیسا کہ امام ترمذی رحمہ اللہ نے کہا ہے مگر حضرت انس رضی اللہ عنہ کا اثر ان کا موید ہے جس کے بارے میں حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے کہا ہے ﴿ لاباس باسنادہ ﴾ ابن شبرمہ اور اور ابن ابی لیلیٰ نے تو کہہ دیا ہے کہ سرمہ ڈالنے سے روزہ ٹوٹ جاتا ہے۔ اس لئے کہ ایک حدیث میں ہے کہ "روزہ اندر جانے والی چیز سے ٹوٹ جاتا ہے) اور سرمہ وغیرہ کا اثر حلق میں اتر جاتا ہے۔ مگر یہ قول درست نہیں کیونکہ سرمہ وغیرہ کا اثر مساموں کے ذریعہ حلق میں ظاہر ہوتا ہے۔ آنکھ براہ راست کھانے کی جگہ نہیں جیسے کوئی تمہ پاؤں کے تلوں پر ملے تو اس کی کڑواہٹ منہ میں محسوس ہوتی ہے حالانکہ اس سے کوئی بھی روزہ ٹوٹ جانے کا قائل نہیں۔ مزید برآں یہ روایت بھی ضعیف ہے کیونکہ اس کی سند میں فضل بن المختار اور شعبہ مولیٰ ابن عباس دونوں ضعیف ہیں۔ رہی ابوداؤد کی ایک حدیث کہ روزہ دار سرمہ لگانے سے پرہیز کرے تو اس کے بارے میں خود امام ابوداؤد نے وضاحت کر دی ہے کہ امام یحییٰ بن معین نے مجھ سے فرمایا ہے کہ یہ حدیث منکر ہے۔ (نیل ' سبل)

(۵۴۴) وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ : «مَنْ نَسِيَ وَهُوَ صَائِمٌ، فَأَكَلَ أَوْ شَرِبَ، فَلْيُتِمَّ صَوْمَهُ، فَإِنَّمَا

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "جو روزہ دار بھول کر کچھ کھا لے یا پی لے تو اسے چاہئے کہ اپنا روزہ پورا کر لے کیونکہ اسے اللہ تعالیٰ نے کھلایا پلایا ہے۔" (بخاری و مسلم)

أَطْعَمَهُ اللَّهُ، وَسَقَاهُ». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

وَلِلْحَاكِمِ: مَنْ أَفْطَرَ فِيْ رَمَضَانَ نَاسِياً فَلاَ قَضَاءَ عَلَيْهِ وَلاَ كَفَّارَةَ. وَهُوَ صَحِيْحٌ.

اور امام حاکم سے یوں روایت ہے کہ "اگر کوئی بھول کر رمضان میں روزہ کھول لے تو اس پر قضاء اور کفارہ نہیں۔" (اور یہ حدیث صحیح ہے۔)

(٥٤٥) وَعَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «مَنْ ذَرَعَهُ القَيْءُ فَلاَ قَضَاءَ عَلَيْهِ، وَمَنِ اسْتَقَاءَ فَعَلَيْهِ القَضَاءُ». رَوَاهُ الخَمْسَةُ، وَأَعَلَّهُ أَحْمَدُ، وَقَوَّاهُ الدَّارَقُطْنِيُّ.

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "جسے قے آجائے تو اس پر (روزہ کی) قضا نہیں اور جو جان بوجھ کر قے کرے اس پر قضا ہے۔" (اسے پانچوں نے روایت کیا ہے اور امام احمد نے اس کو معلول کہا ہے اور امام دارقطنی نے اسے قوی کہا ہے)

لغوی تشریح: ﴿ ذرعه القيئ ﴾ یعنی جو زور سے بغیر ارادہ اور قصد کے قے آئے اور "استقاء" کے معنی یہ ہیں کہ جو قصداً اور اراداتاً خود قے کرے۔

حاصل کلام: امام احمد رحمہ اللہ اور امام بخاری رحمہ اللہ وغیرہ نے اس حدیث کو معلول قرار دیا ہے مگر امام دارقطنی رحمہ اللہ' امام ابن حبان رحمہ اللہ اور امام حاکم رحمہ اللہ نے اسے صحیح کہا ہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ' ابن عمر رضی اللہ عنہما' زید بن ارقم رضی اللہ عنہ اور جمہور علماء کا اس روایت کے مطابق یہی قول ہے کہ قصداً قے کرنے سے ہی روزہ ٹوٹتا ہے بلکہ امام ابن منذر نے تو اس پر اجماع کا دعویٰ کیا ہے۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ اور بعض دیگر حضرات قے سے روزہ ٹوٹ جانے اور اس کی قضاء کے قائل نہیں مگر یہ قول دلیل کے اعتبار سے انتہائی کمزور ہے۔

(٥٤٦) وَعَنْ جَابِرِ بْنِ عَبْدِ اللهِ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا، أَنَّ رَسُولَ اللهِ ﷺ خَرَجَ عَامَ الفَتْحِ إِلَى مَكَّةَ، فِيْ رَمَضَانَ، فَصَامَ، حَتَّى بَلَغَ كُرَاعَ الغَمِيْمِ، فَصَامَ النَّاسُ، ثُمَّ دَعَا بِقَدَحٍ مِّنْ مَّاءٍ فَرَفَعَهُ، حَتَّى نَظَرَ النَّاسُ إِلَيْهِ، ثُمَّ شَرِبَ، فَقِيْلَ لَهُ بَعْدَ ذَلِكَ: إِنَّ بَعْضَ النَّاسِ قَدْ صَامَ، فَقَالَ: «أُوْلٰئِكَ العُصَاةُ، أُوْلٰئِكَ العُصَاةُ».

حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فتح مکہ کے سال مکہ مکرمہ کی طرف رمضان میں نکلے تو آپؐ نے روزہ رکھا یہاں تک کہ آپؐ کراع الغمیم (ایک جگہ کا نام) پہنچے۔ اس دن لوگوں نے بھی روزہ رکھا۔ آپؐ نے پانی کا پیالہ منگوایا اور اس کو اتنا اونچا کیا کہ لوگوں نے دیکھ لیا۔ پھر آپؐ نے اسے پی لیا۔ پھر اس کے بعد آپؐ سے کہا گیا کہ بعض لوگوں نے روزہ رکھا ہے۔ آپؐ نے فرمایا "یہی لوگ نافرمان ہیں' یہی لوگ نافرمان ہیں۔" اور ایک حدیث کے الفاظ یوں ہیں کہ آپؐ سے کہا

وَفِي لَفْظٍ: «فَقِيْلَ لَهُ: إِنَّ النَّاسَ قَدْ شَقَّ عَلَيْهِمُ الصِّيَامُ، وَإِنَّمَا يَنْتَظِرُوْنَ فِيْمَا فَعَلْتَ، فَدَعَا بِقَدَحٍ مِّنْ مَّاءٍ بَعْدَ الْعَصْرِ فَشَرِبَ». رَوَاهُ مُسْلِمٌ

گیا کہ بے شک لوگوں کو روزہ نے مشقت میں ڈال دیا ہے اور اس کے سوا اور کوئی بات نہیں کہ وہ آپؐ کے عمل کا انتظار کرتے ہیں تو آپؐ نے عصر کے بعد پانی کا پیالہ منگوایا اور پی لیا۔

لغوی تشریح: ﴿خرج عام الفتح﴾ نبی کریم ﷺ ۸ ہجری ۱۰ رمضان کو مکہ مکرمہ کی طرف روانہ ہوئے ﴿کراع الغمیم﴾ "کاف" پر ضمہ اور "راء" پر تخفیف اور "انعمیم" میں "غین" پر فتحہ اور "میم" پر کسرہ ہے۔ عسفان سے آگے ایک وادی کا نام ہے۔ ﴿دعا بقدح﴾ یعنی پیالہ طلب کیا۔ ﴿فرفعه﴾ الخ اس کو ہاتھ پر رکھ کر بلند کیا تاکہ لوگ دیکھ لیں اور روزہ افطار کر لینے کا انہیں علم ہو جائے۔ ﴿اولئك العصاة﴾ "عصاۃ" عاص کی جمع ہے یعنی نافرمان۔ کیونکہ انہوں نے اپنے آپ پر سختی کی اور روزہ افطار کرنے کے بارے میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے رخصت کو قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ علامہ الیمانی نے سبل السلام میں کہا ہے کہ یہ حدیث اس بات کی دلیل ہے کہ مسافر کو اختیار ہے کہ چاہے تو روزہ رکھے اور اگر چاہے تو روزہ نہ رکھے اور ضرورت پر مسافر روزہ افطار بھی کر سکتا ہے اگرچہ دن کا اکثر حصہ روزہ سے گزر چکا ہو۔ مولانا صفی الرحمٰن فرماتے ہیں کہ یہ حدیث اس بات کی بھی دلیل ہے کہ سفر کے دوران مشقت کی صورت میں روزہ افطار کرنا افضل ہے۔

(٥٤٧) وَعَنْ حَمْزَةَ بْنِ عَمْرٍو الأَسْلَمِيِّ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُ، أَنَّهُ قَالَ: يَا رَسُولَ اللهِ! إِنِّي أَجِدُ بِيْ قُوَّةً عَلَى الصِّيَامِ فِي السَّفَرِ، فَهَلْ عَلَيَّ جُنَاحٌ؟ فَقَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «**هِيَ رُخْصَةٌ مِّنَ اللهِ، فَمَنْ أَخَذَ بِهَا فَحَسَنٌ، وَمَنْ أَحَبَّ أَنْ يَصُومَ فَلاَ جُنَاحَ عَلَيْهِ**». رَوَاهُ مُسْلِمٌ، وَأَصْلُهُ فِي الْمُتَّفَقِ عَلَيْهِ مِنْ حَدِيْثِ عَائِشَةَ، أَنَّ حَمْزَةَ بْنَ عَمْرٍو سَأَلَ.

حضرت حمزہ بن عمرو اسلمی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ انہوں نے اللہ کے رسول (ﷺ) سے کہا: میں سفر میں روزہ رکھنے کی طاقت رکھتا ہوں (اگر میں روزہ رکھ لوں) تو کیا مجھ پر کوئی حرج ہے؟ تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے رخصت ہے جو اس کو لے لے تو بہتر ہے اور جو کوئی روزہ رکھنا پسند کرے تو اس پر کوئی حرج نہیں۔" (مسلم' اور اس حدیث کا اصل حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی متفق علیہ حدیث میں یوں ہے کہ حمزۃ بن عمرو رضی اللہ عنہ نے سوال کیا)

راوی حدیث: ﴿حمزہ بن عمرو اسلمی رضی اللہ عنہ﴾ حجاز کے رہنے والے صحابی ہیں جن کی کنیت ابوصالح یا ابومحمد ہے۔ ان سے ان کے فرزند اور ام المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا روایت کرتی ہیں۔ وہ ۶۱ھ میں فوت ہوئے اور ان کی عمر ۸۰ برس کی تھی۔

(٥٤٨) وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ

اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُمَا قَالَ: رُخِّصَ لِلشَّيْخِ الكَبِيْرِ أَنْ يُفْطِرَ وَيُطْعِمَ عَنْ كُلِّ يَوْمٍ مِّسْكِيْناً، وَلاَ قَضَاءَ عَلَيْهِ. رَوَاهُ الدَّارَقُطْنِيُّ وَالحَاكِمُ، وَصَحَّحَاهُ.

بڑی عمر والے بوڑھے کو رخصت دی گئی ہے کہ وہ افطار کرے اور ہر دن کے بدلے ایک مسکین کو کھانا کھلائے اور اس پر قضاء نہیں ہے۔ (اسے دار قطنی اور حاکم نے روایت کیا ہے اور دونوں نے اسے صحیح کہا ہے)

لغوی تشریح: ﴿ رخص ﴾ یہ "رخصت" سے ہے اور احتمال ہے کہ یہ رخصت حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے قرآن پاک کی آیت سے سمجھی ہو اور یہی بات زیادہ قرین قیاس ہے اور یہ بھی احتمال ہے کہ اس رخصت کی صراحت خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کی ہو۔ ﴿ ویطعم عن کل یوم مسکینا ﴾ کہ ہر روز ایک مسکین کو کھانا کھلائے۔ اس کی مقدار گندم اور کھجور وغیرہ کا ایک مد مراد ہے۔

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ بہت بوڑھا شخص جس کی طاقت بحال ہونے کی امید نہ ہو۔ اسی طرح علاج سے مایوس مریض کا بھی یہی حکم ہے کہ یومیہ ایک مسکین کے کھانے کے برابر صدقہ کرے۔ ایک روایت میں کھانے کا اندازہ آدھا صاع گندم آیا ہے۔ یعنی سوا کلو گندم۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ جب بہت بوڑھے ہو گئے تو انہوں نے کھانا تیار کرایا اور تیس مسکینوں کو بلا کر کھلایا۔ امام دار قطنی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور ابن عمر رضی اللہ عنہما سے نقل کیا ہے کہ حاملہ اور بچے کو دودھ پلانے والی عورت کا بھی یہی حکم ہے۔ مسکین کو کھانا کھلانے کے بارے میں اختلاف ہے۔ جمہور کے نزدیک ضروری ہے۔ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ اسے مستحب قرار دیتے ہیں اور بعض نے کھانا کھلانے کو منسوخ قرار دیا ہے۔ یعنی اتنی مقدار صدقہ کر دیا جائے تب بھی جائز ہے۔ (سبل، فتح)

(٥٤٩) وَعَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: جَاءَ رَجُلٌ إِلَى النَّبِيِّ ﷺ فَقَالَ: هَلَكْتُ يَا رَسُولَ اللهِ! قَالَ: «وَمَا أَهْلَكَكَ»؟ قَالَ: وَقَعْتُ عَلَى امْرَأَتِيْ فِي رَمَضَانَ، فَقَالَ: «هَلْ تَجِدُ مَا تُعْتِقُ رَقَبَةً»؟ قَالَ: لاَ، قَالَ: «فَهَلْ تَسْتَطِيْعُ أَنْ تَصُومَ شَهْرَيْنِ مُتَتَابِعَيْنِ»؟ قَالَ: لاَ، قَالَ: «فَهَلْ تَجِدُ مَا تُطْعِمُ سِتِّيْنَ مِسْكِيْناً»؟ قَالَ: لاَ، ثُمَّ جَلَسَ، فَأُتِيَ النَّبِيُّ ﷺ بِعَرَقٍ فِيْهِ تَمْرٌ،

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ایک آدمی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور کہنے لگا کہ اے اللہ کے رسول! (صلی اللہ علیہ وسلم) میں ہلاک ہو گیا۔ آپؐ نے فرمایا "کس چیز نے تجھے ہلاک کیا؟" اس نے کہا میں رمضان میں اپنی عورت سے مباشرت کر بیٹھا۔ تو آپؐ نے فرمایا "کیا تجھ میں اتنی طاقت ہے کہ ایک گردن کو آزاد کر دے؟" اس نے کہا نہیں۔ آپؐ نے فرمایا "کیا تو طاقت رکھتا ہے کہ دو ماہ کے متواتر روزے رکھے؟" اس نے کہا، نہیں۔ آپؐ نے فرمایا "کیا تیرے پاس اتنا مال ہے کہ ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلا سکے؟" اس نے کہا نہیں۔ پھر وہ بیٹھ گیا۔ تو نبی

فَقَالَ: «تَصَدَّقْ بِهٰذَا»، فَقَالَ: أَعَلٰى أَفْقَرَ مِنَّا؟ فَمَا بَيْنَ لَابَتَيْهَا أَهْلُ بَيْتٍ أَحْوَجُ إِلَيْهِ مِنَّا، فَضَحِكَ النَّبِيُّ ﷺ حَتّٰى بَدَتْ أَنْيَابُهُ، ثُمَّ قَالَ: «اذْهَبْ فَأَطْعِمْهُ أَهْلَكَ». رَوَاهُ السَّبْعَةُ وَاللَّفْظُ لِمُسْلِمٍ.

ﷺ کے پاس ایک ٹوکرا لایا گیا جس میں کھجوریں تھیں۔ آپؐ نے فرمایا "ان کو خیرات کر دو۔" اس نے کہا کیا اپنے سے زیادہ محتاج پر (خیرات کروں)؟ کیونکہ دو سنگلاخ پہاڑوں (مدینہ) کے مابین کوئی گھر والا مجھ سے زیادہ محتاج نہیں۔ تو نبی ﷺ مسکرائے یہاں تک کہ آپؐ کی داڑھیں ظاہر ہوگئیں۔ پھر آپؐ نے فرمایا "جاؤ اسے اپنے گھر والوں کو کھلا دو۔"
(اسے ساتوں نے روایت کیا ہے اور الفاظ مسلم کے ہیں)

لغوی تشریح: ﴿ جاء رجل ﴾ آدمی آیا۔ اس شخص کا نام سلمان یا سلمہ صخر بیاضی تھا۔ ﴿ وقعت علی امراتی ﴾ میں اپنی بیوی پر پڑ گیا۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی حدیث میں ہے میں نے اس سے وطی کی ہے اور اس کا یہ کہنا کہ ﴿ هلکت ﴾ میں ہلاک ہوگیا اس بات کی دلیل ہے کہ وہ روزہ کی حالت میں بیوی سے جماع کرنے کی حرمت سے باخبر تھا اور اس نے عمداً یہ حرکت کرلی۔ جس سے وہ شخص اس حکم سے خارج ہے جس نے بھول کر جماع کیا ہو۔ ﴿ رقبة ﴾ سے مراد غلام یا لونڈی ہے اور یہ ﴿ ماتعتق ﴾ میں "ما" کا بدل ہونے کی وجہ سے منصوب ہے۔ ﴿ فاتی ﴾ صیغۂ مجہول ہے یعنی نبی ﷺ کے پاس لایا گیا۔ ﴿ بعرق ﴾ سے مراد بڑا ٹوکرا ہے۔ ﴿ فیه تمر ﴾ جس میں پندرہ صاع یعنی ساٹھ مد کھجوریں تھیں۔ یہ اس لئے کہ ہر مسکین کیلئے ایک مد ہے اور دار قطنی میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کی حدیث میں ہے کہ تو ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلا ہر مسکین کیلئے ایک مد ہو ﴿ اعلی افقر ﴾ میں همزہ استفہام ہے اور "علی" حرف جر ہے۔ یعنی کیا میں ایسے شخص پر صدقہ کروں جو مجھ سے اور میرے اہل بیت سے بھی زیادہ محتاج ہو؟ ﴿ فما بین لابتیها ﴾ میں ﴿ لابتیها ﴾ لابة کا ﴿ تثنیة ﴾ ہے اور باء پر فتح ہے۔ یعنی وہ سیاہ پتھریلی زمین جسے آگ نے جلایا ہو اور "ها" کی ضمیر مدینہ طیبہ کی طرف ہے اور "لابتان" سے معروف دو حرے مراد ہیں جو مدینہ طیبہ کے شرقی اور غرقی جانب ہیں۔ ایک کا نام "حرة الواقم" اور دوسرے کا "حرة الوبرة" ہے اور مدینہ طیبہ ان دونوں کے مابین واقعہ ہے۔ لہٰذا "لابتین" سے مراد مدینہ منورہ ہے۔ یعنی مدینہ میں کوئی اہل خانہ مجھ سے زیادہ ان کھجوروں کا محتاج نہیں۔ ﴿ انیابه ﴾ یہ "ناب" کی جمع ہے اور یہ وہ دانت ہوتے ہیں جو "رباعی" کے ساتھ ملے ہوتے ہیں اور "رباعی" ثنایا کے ساتھ والے دانت کو کہتے ہیں اور "ثنایا" سے سامنے کے دو دانت مراد ہوتے ہیں اور اس کا اطلاق اوپر اور نیچے کے سامنے کے دو دانتوں پر ہوتا ہے۔ (اطعمه اهلك) یہ اپنے گھر والوں کو کھلاؤ۔ یہ حدیث اس بات کی قطعاً دلیل نہیں کہ فقیر پر کفارہ نہیں یا فقیر کا اپنے اہل و عیال پر خرچ کرنا ہی کافی ہے بلکہ یہ تنگ دستی کی بنا پر کفارہ مؤخر ہونے کی دلیل ہے کہ جب میسر آئے تب کفارہ ادا کرے۔

حاصل کلام : اس حدیث سے امام اوزاعی رحمہ اللہ اور ایک قول میں امام احمد رحمہ اللہ نے استدلال کیا ہے کہ تنگ دست پر کفارہ نہیں۔ مگر امام مالک رحمہ اللہ' امام شافعی رحمہ اللہ' امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ' امام ثوری رحمہ اللہ اور امام ابوثور رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس سے یہ استدلال درست نہیں' کفارہ جب میسر ہو بہرنوع ادا کیا جائے گا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے کفارہ کا ذکر کیا۔ تنگ دستی کی بنا پر کھجوریں اسے بطور صدقہ کے دیں کفارہ کے طور پر نہیں۔ اس حدیث میں قطعاً ذکر نہیں کہ آپ نے اس سے کفارہ کو ساقط قرار دیا ہو اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کی حدیث میں جو کفارہ کے سقوط کا ذکر ہے وہ سخت ضعیف اور ناقابل استدلال ہے۔ نیز اس حدیث میں گو روزہ قضا رکھنے کا حکم نہیں مگر دوسری احادیث میں قضا کا حکم موجود ہے۔ اس بنا پر ائمہ اربعہ اور جمہور علماء ایسی صورت میں مرد و زن دونوں کیلئے روزہ رکھنے کے قائل ہیں۔ الا یہ کہ عورت روزہ دار نہ ہو۔ تو عورت پر قضا نہیں۔ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے فتح الباری میں ذکر کیا ہے کہ بعض علماء نے اس حدیث پر دو جلدوں میں بحث کی ہے اور اس سے ایک ہزار فوائد و مسائل کا استنباط کیا ہے۔

(٥٥٠) وَعَنْ عَائِشَةَ وَأُمِّ سَلَمَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ كَانَ يُصْبِحُ جُنُباً مِنْ جِمَاعٍ، ثُمَّ يَغْتَسِلُ وَيَصُومُ. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ، وَزَادَ مُسْلِمٌ فِي حَدِيثِ أُمِّ سَلَمَةَ «وَلاَ يَقْضِي».

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اور حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم جماع سے جنبی ہوتے تو صبح ہونے پر آپ غسل کرتے اور روزہ رکھتے۔ (بخاری و مسلم) اور مسلم نے ام سلمہ رضی اللہ عنہما کی حدیث میں یہ زائد کیا کہ قضا نہیں دیتے تھے۔

حاصل کلام : یہ حدیث اس بات کی دلیل ہے کہ جنبی آدمی پر غسل سے پہلے صبح ہو جائے تو روزہ درست ہے۔ جمہور اسی کے قائل ہیں بلکہ علامہ نووی رحمہ اللہ نے اس پر اجماع کا دعویٰ کیا ہے اور اس کے معارض مسند امام احمد وغیرہ میں جو حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ اگر کسی پر حالت جنابت میں صبح ہو جائے تو روزہ نہ رکھے' اس کے بارے میں جمہور نے کہا ہے کہ وہ منسوخ ہے اور خود حضرت ابوھریرہ رضی اللہ عنہ جو ایسی صورت میں روزہ نہ رکھنے کے قائل تھے' نے جب یہ حدیث سنی تو انہوں نے اس سے رجوع کر لیا تھا۔ (سبل وغیرہ)

(٥٥١) وَعَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهَا، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ قَالَ: «مَنْ مَاتَ وَعَلَيْهِ صِيَامٌ، صَامَ عَنْهُ وَلِيُّهُ». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "جو شخص فوت ہو جائے اور اس پر روزہ لازم ہو تو اس کی طرف سے اس کا ولی روزہ رکھے۔" (بخاری و مسلم)

لغوی تشریح : ﴿ وعلیہ صیام ﴾ یعنی اس کے ذمہ روزہ لازم و واجب ہو کیونکہ "علی" کا لفظ وجوب کیلئے ہے۔ ﴿ صام عنہ ولیہ ﴾ اس کی طرف سے اس کا ولی روزہ رکھے۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ ولی یعنی وارث کو میت کی طرف سے روزہ رکھنا چاہئے اور روزہ میں نیابت جائز ہے اور جن حضرات نے

کہا ہے کہ روزہ میں نیابت نہیں ان کے پاس کوئی قابل اعتماد دلیل نہیں۔ راجح یہی ہے کہ روزہ میں نیابت ہے۔

حاصل کلام: عموماً محدثین نے اسی حدیث سے استدلال کیا ہے کہ حج کی طرح روزہ میں بھی نیابت درست ہے مگر امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ اور امام مالک رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ میت کی طرف سے روزہ نہیں بلکہ ایک مسکین کو کھانا کھلانا چاہئے۔ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا فتویٰ بھی یہی ہے۔ مگر اس صریح اور صحیح حدیث سے ثابت ہوتا ہے کہ روزہ میں نیابت بھی جائز ہے اور یہی بات راجح ہے۔ نیز حج کی طرح لازم نہیں کہ ولی ہی میت کی طرف سے روزہ رکھے کوئی اور دوسرا آدمی بھی روزہ رکھ سکتا ہے۔ حدیث میں ولی کا ذکر اغلبیت کی بنا پر ہے۔ (سبل)

١ - بَابُ صَوْمِ التَّطَوُّعِ، وَمَا نُهِيَ عَنْ صَوْمِهِ

نفلی روزے اور جن دنوں میں روزہ رکھنا منع کیا گیا ہے' کا بیان

(٥٥٢) عَنْ أَبِيْ قَتَادَةَ الأَنْصَارِيِّ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، أَنَّ رَسُولَ اللهِ ﷺ سُئِلَ عَنْ صَوْمِ يَوْمِ عَرَفَةَ، قَالَ: «يُكَفِّرُ السَّنَةَ المَاضِيَةَ وَالبَاقِيَةَ»، وَسُئِلَ عَنْ صَوْمِ يَوْمِ عَاشُورَاءَ فَقَالَ: «يُكَفِّرُ السَّنَةَ المَاضِيَةَ»، وَسُئِلَ عَنْ صَومِ يَوْمِ ٱلاثْنَيْنِ، فَقَالَ: «ذٰلِكَ يَوْمٌ وُلِدَتُ فِيْهِ، وَبُعِثْتُ فِيْهِ، وَأُنْزِلَ عَلَيَّ فِيْهِ». رَوَاهُ مُسْلِمٌ.

حضرت ابو قتادہ انصاری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ سے عرفہ (9 ذوالحج) کے دن روزے کے متعلق سوال کیا گیا تو آپ نے فرمایا کہ "(یہ روزہ) گزشتہ سال اور آئندہ سال کے گناہ دور کر دیتا ہے۔" اور آپ سے عاشورہ کے دن کے روزے کے بارے میں پوچھا گیا تو آپ نے فرمایا "یہ گزشتہ سال کے گناہ دور کر دیتا ہے۔" اور آپ سے سوموار کے دن کے روزے کے بارے میں پوچھا گیا تو فرمایا کہ "اس دن میں پیدا ہوا اور اسی دن مجھے نبوت دی گئی اور اسی دن مجھ پر قرآن اتارا گیا۔" (مسلم)

لغوی تشریح: ﴿ یوم عرفۃ ﴾ عرفہ کا دن' ذی الحجہ کا نواں دن ہوتا ہے اور جو میدان عرفات میں نہ ہو اس کیلئے اس دن کا روزہ مستحب ہے اور جو میدان عرفات میں ہو اس کے بارے میں ائمہ کرام کا اختلاف ہے۔ اس بارے میں سب سے معتدل قول یہ ہے کہ میدان عرفات میں حاجی کیلئے روزہ مستحب نہیں بلکہ مکروہ ہے۔ ﴿ یکفر ﴾ یہ تکفیر سے ہے یعنی اس کی برکت سے پہلے اور آنے والے سال کے گناہ معاف کر دیئے جاتے ہیں اور عرفہ کا روزہ دو سال کے گناہوں کا کفارہ بن جاتا ہے اور ان گناہوں سے صغیرہ

گناہ مراد ہیں کبیرہ نہیں کیونکہ وہ توبہ کے بغیر معاف نہیں ہوتے' یا یہ کہ اللہ سبحانہ و تعالیٰ اپنی رحمت سے معاف فرما دیں۔ "یوم عاشوراء" عاشورہ کا دن محرم الحرام کی دس تاریخ کو ہوتا ہے۔ یہود اس دن روزہ رکھتے تھے۔ آپؐ نے بھی اس دن روزہ رکھنے کی ترغیب دی' البتہ فرمایا کہ "یہود کی مخالفت میں ایک دن پہلے یا ایک دن بعد بھی روزہ رکھو" اور سوموار کے روز' روزہ رکھنے کے بارے میں آپؐ نے جو فرمایا ہے وہ اس بات کی دلیل ہے کہ جس دن اللہ تعالیٰ نے اپنے بندے کو اپنی کسی خاص نعمت سے نوازا ہو۔ بطور تشکر و تقرب اس دن روزہ مستحب ہے اور سوموار کے دن روزہ رکھنے کے بارے میں حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ کی حدیث میں ہے کہ آپؐ نے فرمایا "اس دن اللہ کے حضور اعمال پیش کئے جاتے ہیں اس لئے میں پسند کرتا ہوں کہ اللہ کے حضور میرے اعمال روزہ کی حالت میں پیش کئے جائیں۔"

(٥٥٣) وَعَنْ أَبِي أَيُّوبَ الأَنْصَارِيِّ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، أَنَّ رَسُولَ اللهِ ﷺ قَالَ: «مَنْ صَامَ رَمَضَانَ، ثُمَّ أَتْبَعَهُ سِتًّا مِنْ شَوَّال، كَانَ كَصِيَامِ الدَّهْرِ». رَوَاهُ مُسْلِمٌ.

حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "جو کوئی رمضان کے روزے رکھے پھر اس کے بعد چھ روزے شوال کے رکھے یہ عمل سارے سال (روزے رکھنے) کی مانند ہو گا۔" (مسلم)

لغوی تشریح: ﴿ثم اتبعه﴾ یعنی رمضان کے بعد روزہ رکھے۔ ﴿ستا من شوال﴾ چھ شوال کے۔ خواہ یہ شوال کے آغاز میں رکھے یا درمیان میں یا آخر میں اور خواہ متواتر رکھے یا متفرق ﴿کان کصیام الدھر﴾ گویا اس نے سال بھر کے روزے رکھے۔ یہ اس لئے کہ ہر نیکی کا بدلہ دس گنا ہوتا ہے۔ رمضان کے روزے دس ماہ کے برابر اور چھ شوال کے دو ماہ کے برابر۔

(٥٥٤) وَعَنْ أَبِي سَعِيْدِ الخُدْرِيِّ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «مَا مِنْ عَبْدٍ يَصُومُ يَوْماً فِي سَبِيلِ اللهِ إِلاَّ بَاعَدَ اللَّهُ بِذَلِكَ الْيَوْمِ عَنْ وَجْهِهِ النَّارَ سَبْعِينَ خَرِيفاً». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ، وَاللَّفْظُ لِمُسْلِمٍ.

حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "کوئی شخص ایسا نہیں جو اللہ کی راہ میں ایک دن روزہ رکھے مگر اللہ تعالیٰ اس کے چہرے کو ستر سال کیلئے جہنم کی آگ سے دور کر دیتے ہیں۔" (بخاری و مسلم اور یہ الفاظ مسلم کے ہیں)

لغوی تشریح: ﴿فی سبیل اللہ﴾ اللہ کی راہ میں' جب مطلقاً یہ لفظ بولا جاتا ہے تو اس سے مراد جہاد ہوتا ہے۔ یعنی جہاد کے دوران جو ایک دن روزہ رکھتا ہے اسے یہ فضیلت حاصل ہو گی لیکن اگر روزہ رکھنے سے کمزوری آجائے اور جہاد و قتال میں کمزوری کا باعث بنے تو پھر روزہ نہ رکھنا افضل ہے۔ "خریفا" سے مراد ایک سال ہے۔

(٥٥٥) وَعَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللَّهُ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ

تَعَالَى عَنْهَا قَالَتْ: كَانَ رَسُولُ اللهِ ﷺ يَصُومُ حَتَّى نَقُولَ لاَ يُفْطِرُ، وَيُفْطِرُ حَتَّى نَقُولَ لاَ يَصُومُ، وَمَا رَأَيْتُ رَسُولَ اللهِ اسْتَكْمَلَ صِيَامَ شَهْرٍ قَطُّ إِلاَّ رَمَضَانَ، وَمَا رَأَيْتُهُ فِي شَهْرٍ أَكْثَرَ مِنْهُ صِيَاماً فِيْ شَعْبَانَ. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ، واللَّفْظُ لِمُسْلِمٍ.

روزے رکھتے تھے یہاں تک کہ ہم کہتے: آپؐ کبھی افطار نہیں کریں گے اور آپؐ روزے چھوڑ دیتے یہاں تک کہ ہم کہتے تھے (اسی طرح) آپؐ کبھی روزے نہیں رکھیں گے۔ میں نے رسول اللہ ﷺ کو نہیں دیکھا کہ آپؐ نے کبھی سوائے رمضان کے کسی مہینے کے مکمل روزے رکھے ہوں اور میں نے آپؐ کو نہیں دیکھا کہ کسی مہینے میں آپؐ نے شعبان سے زیادہ روزے رکھے ہوں۔ (بخاری و مسلم اور یہ الفاظ مسلم کے ہیں)

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ رسول اللہ ﷺ کم و بیش ہر مہینے میں روزے رکھتے تھے۔ کبھی متواتر روزے رکھتے اور کبھی ضروری مشاغل کی بنا پر کئی کئی دن روزہ نہ رکھتے۔ البتہ رمضان کے علاوہ سب سے زیادہ روزے آپؐ شعبان میں رکھتے تھے۔

(٥٥٦) وَعَنْ أَبِيْ ذَرٍّ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: أَمَرَنَا رَسُولُ اللهِ ﷺ أَن نَصُومَ مِنَ الشَّهْرِ ثَلاَثَةَ أَيَّامٍ، ثَلاَثَ عَشْرَةَ، وَأَرْبَعَ عَشْرَةَ، وَخَمْسَ عَشْرَةَ. رَوَاهُ النَّسَائِيُّ وَالتِّرْمِذِيُّ، وَصَحَّحَهُ ابْنُ حِبَّانَ.

حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ ہمیں رسول اللہ ﷺ نے حکم دیا کہ ہم ہر ماہ تین دن کے روزے رکھیں یعنی تیرہ' چودہ اور پندرہ (تاریخ کو)۔ (اسے نسائی اور ترمذی نے روایت کیا ہے اور ابن حبان نے اسے صحیح کہا ہے)

(٥٥٧) وَعَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، أَنَّ رَسُولَ اللهِ ﷺ قَالَ: «**لاَ يَحِلُّ لِلْمَرْأَةِ أَنْ تَصُومَ، وَزَوْجُهَا شَاهِدٌ، إِلاَّ بِإِذْنِهِ**». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ، وَاللَّفْظُ لِلْبُخَارِيِّ، زَادَ أَبُو دَاوُدَ: «غَيْرَ رَمَضَانَ».

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ "کسی عورت کیلئے حلال نہیں کہ وہ روزہ رکھے جبکہ اس کا خاوند گھر میں ہو۔ الاّ یہ کہ شوہر اس کی اجازت دے۔" (بخاری و مسلم' یہ الفاظ بخاری کے ہیں) اور ابوداؤد نے "سوائے رمضان" کے الفاظ کا اضافہ کیا ہے۔

حاصل کلام: یہ حدیث دلیل ہے کہ شوہر کے حقوق کی ادائیگی نفلی روزہ سے مقدم ہے۔ نفلی روزہ خاوند کی اجازت کے بغیر رکھنا عورت پر حرام ہے۔ البتہ فرضی روزہ کا حکم اس سے مستثنیٰ ہے کہ فرض کی ادائیگی بہرنوع مقدم ہے۔

(٥٥٨) وَعَنْ أَبِيْ سَعِيْدٍ الْخُدْرِيِّ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُ، أَنَّ رَسُولَ اللهِ ﷺ نَهَى عَنْ صِيَامِ يَوْمَيْنِ: يَوْمِ الْفِطْرِ، وَيَوْمِ النَّحْرِ. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے دو دن روزہ رکھنے سے منع فرمایا۔ عیدالفطر کا دن اور قربانی کا دن۔ (بخاری و مسلم)

(٥٥٩) وَعَنْ نُبَيْشَةَ الْهُذَلِيِّ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «أَيَّامُ التَّشْرِيقِ أَيَّامُ أَكْلٍ وَشُرْبٍ وَذِكْرِ اللهِ عَزَّ وَجَلَّ». رَوَاهُ مُسْلِمٌ.

حضرت نبیشہ الھذلی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "تشریق کے دن کھانے' پینے اور اللہ تعالیٰ کے ذکر کے دن ہیں۔" (مسلم)

لغوی تشریح: ﴿ایام التشریق﴾ تشریق کے دن یوم النحر یعنی دس ذی الحجہ کو قربانی کے دن کے بعد۔ مزید تین دن ہیں۔ ﴿ایام اکل وشرب﴾ کھانے پینے کے دن ہیں۔ یہ دلیل ہے کہ ان دنوں روزہ رکھنا حرام ہے۔

راوی حدیث: ﴿نبیشۃ رضی اللہ عنہ﴾ تصغیر کے ساتھ' ان کے والد کا نام و نسب یوں ہے۔ عبداللہ بن عمرو بن عتاب الھذلی۔ مشہور صحابی ہیں اور ان سے گیارہ احادیث مروی ہیں۔ بصرہ میں سکونت اختیار کرلی تھی اور انہیں "نبیشۃ الخیر" کہا جاتا تھا۔

(٥٦٠) وَعَنْ عَائِشَةَ وَابْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُمْ قَالاَ: لَمْ يُرَخَّصْ فِي أَيَّامِ التَّشْرِيْقِ أَنْ يُصَمْنَ إِلاَّ لِمَنْ لَمْ يَجِدِ الْهَدْيَ. رَوَاهُ الْبُخَارِيُّ.

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اور حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ ایام تشریق میں روزہ رکھنے کی اجازت نہیں دی گئی سوائے اس شخص کے جسے قربانی کا جانور نہ ملا ہو۔ (بخاری)

لغوی تشریح: ﴿لم یرخص﴾ یہ صیغۂ مجہول ہے کہ رخصت نہیں دی گئی۔ بعض نے کہا ہے کہ یہ حکماً مرفوع ہے اور بعض نے کہا ہے ممکن ہے کہ ان دونوں (عائشہؓ اور ابن عمرؓ) نے سورۂ بقرہ کی اس آیت ۱۹۶ سے یہ مسئلہ سمجھا ہو۔ فمن لم یجد..... کہ جو ھدی نہ پائے وہ حج میں تین روزے رکھے۔ ﴿ان یصمن﴾ یہ بھی صیغۂ مجہول ہے۔ ﴿الا لمن یجد الھدی﴾ سوائے اس شخص کے جو ھدی نہ پائے۔ "ھدی" اس اونٹ کو کہتے ہیں جو کعبہ کی طرف حرم میں ذبح کرنے کیلئے بھیجا جاتا ہے۔ یعنی جو شخص حج تمتع یا قران کرنے والا ہو یا محصر ہو اور اس کے پاس قربانی نہ ہو تو اس کیلئے ایام تشریق میں روزے رکھنے جائز ہیں کیونکہ یہ حدیث حقیقی طور پر مرفوع نہیں اور جو اس بارے میں مرفوع روایات میں ہے وہ سند کے اعتبار سے صحیح نہیں ہیں۔

حاصل کلام: ایام تشریق میں روزہ رکھنے کی متعدد احادیث میں ممانعت آئی ہے اور اس بارے میں علماء کا

اختلاف ہے۔ بعض اہل علم مطلقاً ان دنوں روزہ رکھنا مکروہ قرار دیتے ہیں۔ امام شافعی رحمہ اللہ اور امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ وغیرہ کا یہی موقف ہے اور ان کا استدلال حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اور حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کی اس حدیث سے ہے مگر یہ حقیقتاً مرفوع نہیں۔ احتمال ہے کہ ان حضرات نے قرآن مجید کے ظاہری سیاق سے یہی سمجھا ہو کہ "ایام حج" سے مراد یہی ایام تشریق ہیں۔ جیسا کہ ابھی ذکر ہوا ہے۔ مگر امام شافعی رحمہ اللہ وغیرہ فرماتے ہیں کہ یہ آیت عام ہے۔ یوم النحر سے پہلے اور ایام تشریق کے بعد کے دن بھی مراد ہو سکتے ہیں اور سنن دار قطنی وغیرہ میں جو یہ مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ھدی نہ رکھنے والے متمتع کو روزہ کی رخصت دی تو وہ ضعیف ہے کیونکہ اس کا راوی یحیٰ بن سلام قوی نہیں۔ اس لئے راجح یہی ہے کہ ایام تشریق میں بہر نوع روزہ رکھنا مکروہ ہے۔

(٥٦١) وَعَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ: «لاَ تَخُصُّوا لَيْلَةَ الْجُمُعَةِ بِقِيَامٍ، مِنْ بَيْنِ اللَّيَالِي، وَلاَ تَخُصُّوا يَوْمَ الْجُمُعَةِ بِصِيَامٍ، مِنْ بَيْنِ الأَيَّامِ، إِلاَّ أَنْ يَكُونَ فِي صَوْمٍ يَصُومُهُ أَحَدُكُمْ». رَوَاهُ مُسْلِمٌ.

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "دوسری راتوں میں سے جمعہ کی رات کو قیام کرنے کیلئے مخصوص نہ کرو اور نہ ہی دوسرے دنوں میں سے جمعہ کے دن کو روزہ کیلئے مختص کرو سوائے اس کے کہ جمعہ کا دن ایسے دن میں آجائے جس دن روزہ رکھتا ہو۔" (مسلم)

لغوی تشریح: ﴿لا تختصوا یوم الجمعة﴾ یعنی اکیلا جمعہ کے دن کو روزہ کیلئے مختص نہ کرو۔ اس لئے کہ جمعہ کا دن عید کا دن ہے اور عید کے دن روزہ نہیں ہوتا۔ بعض نے کہا ہے کہ یہ ممانعت تحریمی ہے مگر جمہور نے اسے نہی تنزیہی پر محمول کیا ہے کیونکہ ترمذی میں ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بہت کم جمعہ کا روزہ چھوڑتے تھے۔ مگر اس میں احتمال ہے کہ شاید اس کے ساتھ آپؐ ایک دن پہلے یا بعد میں بھی روزہ رکھتے ہوں گے۔ یاد رہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بلا ریب جمعہ کو عید کا دن فرمایا ہے مگر عید اور جمعہ میں اتنا فرق ضرور ہے کہ عید کا دن روزہ اس سے ایک روز پہلے یا بعد روزہ رکھنے سے بھی جائز نہیں جبکہ جمعہ میں یہ صورت بالاتفاق جائز ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خود اس کی اجازت دی ہے جیسا کہ اس کی بعد کی حدیث میں آرہا ہے۔

(٥٦٢) وَعَنْهُ أَيْضاً قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «لاَ يَصُومَنَّ أَحَدُكُمْ يَوْمَ الْجُمُعَةِ، إِلاَّ أَنْ يَصُومَ يَوْماً قَبْلَهُ، أَوْ يَوْماً بَعْدَهُ». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "تم میں سے کوئی بھی جمعہ کے دن روزہ نہ رکھے سوائے اس کے کہ اس سے ایک دن پہلے یا ایک دن بعد روزہ رکھے۔" (بخاری و مسلم)

(٥٦٣) وَعَنْهُ أَيْضاً أَنَّ رَسُولَ اللهِ

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ ہی سے مروی ہے کہ رسول

ﷺ قَالَ: «إِذَا انْتَصَفَ شَعْبَانُ فَلاَ تَصُومُوا». رَوَاهُ الْخَمْسَةُ، وَاسْتَنْكَرَهُ أَحْمَدُ.

اللہ ﷺ نے فرمایا کہ "جب شعبان آدھا ہو جائے تو روزہ نہ رکھو۔" (اسے پانچوں نے روایت کیا ہے اور امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے اسے منکر کہا ہے)

حاصل کلام: یہ ممانعت اس لئے ہے کہ شعبان کے آخری دنوں میں روزے رکھ کر ضعف و کمزوری لاحق نہ ہو جائے اور رمضان المبارک کے روزہ میں قوت بحال رہے۔ یہ نہی تنزیہی ہے کیونکہ یہ ثابت ہے کہ رسول اللہ ﷺ شعبان کے آخری دنوں میں بھی روزہ رکھ لیتے تھے۔ امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے جو اس حدیث کو منکر کہا ہے تو اس بنا پر نہیں کہ اس کا کوئی راوی ضعیف ہے بلکہ اس وجہ سے کہ اسے بیان کرنے میں علاء بن عبدالرحمٰن منفرد ہیں اور امام احمد تفرد ثقہ پر بھی منکر کا لفظ بول دیتے ہیں۔ نیز اس ممانعت سے وہ روزے مستثنیٰ ہیں جو عادتاً رکھے جاتے ہیں مثلاً جو شخص ہر سوموار اور جمعرات کا روزہ رکھتا ہے تو نصف شعبان کے بعد بھی ان دنوں روزہ رکھنا جائز ہے۔ (فتح الباری وغیرہ)

(٥٦٤) وَعَنِ الصَّمَّاءِ بِنْتِ بُسْرٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهَا، أَنَّ رَسُولَ اللهِ ﷺ قَالَ: «لاَ تَصُومُوا يَوْمَ السَّبْتِ إِلاَّ فِيمَا افْتُرِضَ عَلَيْكُمْ، فَإِنْ لَمْ يَجِدْ أَحَدُكُمْ إِلاَّ لِحَاءَ عِنَبٍ، أَوْ عُودَ شَجَرَةٍ، فَلْيَمْضُغْهَا». رَوَاهُ الْخَمْسَةُ، وَرِجَالُهُ ثِقَاتٌ، إِلاَّ أَنَّهُ مُضْطَرِبٌ، وَقَدْ أَنْكَرَهُ مَالِكٌ، وَقَالَ أَبُو دَاوُدَ: هُوَ مَنْسُوخٌ.

حضرت صماء بنت بسر رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "ہفتہ کے دن کا روزہ نہ رکھو۔ سوائے اس روزہ کے جو تم پر فرض کیا گیا ہے۔ پس اگر تم میں سے کوئی انگور کا چھلکا یا کسی درخت کا تنکا پائے تو چاہئے کہ اس کو کھا لے۔" (اسے پانچوں نے روایت کیا ہے اور اس کے راوی ثقہ ہیں مگر اس میں اضطراب ہے۔ بے شک امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے اس کا انکار کیا ہے اور ابوداؤد نے کہا ہے کہ یہ منسوخ ہے)

لغوی تشریح: ﴿لحاء عنب﴾ کے لام پر فتحہ اور کسرہ دونوں طرح پر ہے اور آخر میں مد ہے۔ جس کے معنی ہیں چھلکا اور "العنب" کی عین کے نیچے زیر اور نون پر فتحہ ہے۔ مشہور پھل یعنی انگور کو "عنب" کہتے ہیں۔ ﴿فليمضغها﴾ یہ باب نصر اور فتح دونوں سے آتا ہے۔ یعنی اسے کھا لے اور اس سے روزہ افطار کر لے۔ امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ "ہفتہ کے روز روزہ کی یہ ممانعت اس لئے ہے کہ یہود ہفتہ کے دن کی تعظیم کرتے تھے۔" اور اس کی تائید آئندہ حدیث سے بھی ہوتی ہے۔

راوی حدیث: ﴿الصماء بنت بسر رضی اللہ عنہا﴾ صاد پر زبر اور میم مشدد ان کا نام بہیہ تھا اور بھیہ کی باء پر پیش "حاء" مفتوح اور باء مشدد اور ایک قول کے مطابق ان کا نام بھیمہ میم کے اضافہ کے ساتھ تھا۔ "بسر" کی باء پر پیش اور را ساکن قبیلہ مازن سے تعلق رکھتی تھیں۔ صحابیہ تھیں۔ ان کے بارے میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ وہ عبداللہ بن بسر کی بہن تھیں اور بعض نے پھوپھی اور بعض نے خالہ کہا ہے۔

(٥٦٥) وَعَنْ أُمِّ سَلَمَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهَا، أَنَّ رَسُولَ اللهِ ﷺ أَكْثَرَ مَا كَانَ يَصُومُ مِنَ الأَيَّامِ، يَوْمُ السَّبْتِ، وَيَوْمُ الأَحَدِ، وَكَانَ يَقُولُ: «إِنَّهُمَا يَوْمَا عِيدٍ لِلْمُشْرِكِينَ، وَأَنَا أُرِيدُ أَنْ أُخَالِفَهُمْ». أَخرَجَهُ النَّسَائِيُّ، وَصَحَّحَهُ ابْنُ خُزَيْمَةَ، وَهٰذَا لَفْظُهُ.

حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ ہفتہ اور اتوار کو اکثر روزہ رکھتے تھے اور فرمایا کرتے تھے کہ "یہ دونوں دن مشرکوں کی عید کے دن ہیں اور میں ان کی مخالفت کرنا چاہتا ہوں۔" (اسے امام نسائی رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے اور امام ابن خزیمہ رحمۃ اللہ علیہ نے اس کو صحیح کہا ہے اور یہ الفاظ ابن خزیمہ کے ہیں)

حاصل کلام: پہلی حدیث سے تو معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ہفتہ کے دن روزہ رکھنے سے منع فرمایا۔ لیکن وہ روایت مضطرب اور منسوخ ہے جیسا کہ مصنف علام نے ذکر کیا ہے اور اس کی ناسخ یہی حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا کی حدیث ہے کہ رسول اللہ ﷺ ہفتہ اور اتوار کو عموماً روزہ رکھتے تھے محض اس لئے کہ یہود و نصاریٰ کی مخالفت کی جائے۔ کیونکہ یہود ہفتہ کے دن کی اور نصاریٰ اتوار کے دن کی تعظیم کرتے تھے۔ آپؐ نے ان کے برعکس ان دنوں کا روزہ رکھ کر واضح کر دیا کہ یہ عید اور تعظیم کے دن نہیں ہیں۔

(٥٦٦) وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ نَهَى عَنْ صَوْمِ يَوْمِ عَرَفَةَ بِعَرَفَةَ. رَوَاهُ الخَمْسَةُ غَيْرَ التِّرْمِذِيِّ، وَصَحَّحَهُ ابْنُ خُزَيْمَةَ وَالحَاكِمُ، وَاسْتَنْكَرَهُ العُقَيْلِيُّ.

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے عرفات میں عرفہ کے دن کا روزہ رکھنے سے منع فرمایا ہے۔ (اسے ترمذی کے علاوہ باقی پانچوں نے روایت کیا ہے۔ امام ابن خزیمہ رحمۃ اللہ علیہ اور امام حاکم رحمۃ اللہ علیہ نے اسے صحیح کہا ہے اور امام عقیلی رحمۃ اللہ علیہ نے اسے منکر کہا ہے)

حاصل کلام: امام عقیلی رحمۃ اللہ علیہ نے اسے منکر اس لئے کہا ہے کہ اس کے راوی حوشب بن عقیل نے یہ حدیث مھدی بن حرب الھجری سے روایت کی ہے اور حوشب کی کسی نے بھی متابعت نہیں کی۔ مگر یہ اعتراض کوئی حیثیت نہیں رکھتا کیونکہ حوشب کو اکثر محدثینؒ نے ثقہ کہا ہے اور حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ کا فیصلہ بھی تقریب التھذیب میں یہی ہے کہ وہ ثقہ ہے۔ البتہ مھدی الھجری کے بارے میں امام ابن معین نے کہا ہے کہ میں اسے نہیں جانتا۔ لیکن امام حاکم رحمۃ اللہ علیہ نے اسے صحیح کہا ہے اور حافظ ذھبی نے تلخیص المستدرک میں ان کی تائید کی ہے اور امام ابن خزیمہ رحمۃ اللہ علیہ نے اسے صحیح کہا ہے۔ ابن حبان رحمۃ اللہ علیہ نے ثقات میں اسے ذکر کیا ہے اور حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے "مقبول" کہا ہے۔ یہ حدیث اس بات کی دلیل ہے کہ عرفات میں حاجی کو یوم عرفہ کا روزہ رکھنا حرام ہے۔ امام یحییٰ بن سعید انصاری کا یہی موقف ہے۔ اس کی تائید سنن نسائی' ترمذی وغیرہ میں حضرت عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ کی حدیث سے ہوتی ہے کہ "یوم عرفہ ہماری عید کا دن ہے" یعنی اہل عرفہ کیلئے یہ دن عید کا ہے۔ اس لئے انہیں اس روز روزہ رکھنے کی ممانعت ہے۔ البتہ جمہور کے نزدیک روزہ نہ رکھنا مستحب ہے۔ آنحضرت ﷺ نے بھی حجۃ الوداع کے موقعہ پر یوم

عرفہ کا روزہ نہیں رکھا تھا۔

(٥٦٧) وَعَنْ عَبْدِ اللهِ بْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «لاَ صَامَ مَنْ صَامَ الأَبَدَ». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ، وَلِمُسْلِمٍ عَنْ أَبِي قَتَادَةَ بِلَفْظِ: «لاَ صَامَ وَلاَ أَفْطَرَ».

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "جس نے ہمیشہ روزہ رکھا اس نے (گویا) روزہ نہیں رکھا۔" (بخاری و مسلم) اور مسلم میں ابو قتادہ رضی اللہ عنہ سے یہ الفاظ ہیں کہ "نہ روزہ رکھا نہ افطار کیا۔"

لغوی تشریح: ﴿لاصام من صام الابد﴾ میں "الابد" ہمیشہ اور سال بھر روزہ رکھنا مراد ہے اور ہمیشہ روزہ رکھنے کی ممانعت اس لئے ہے کہ یہ طریقہ نبی کریم ﷺ کی سنت کے خلاف ہے جس کا کوئی اجر و ثواب نہیں ملے گا۔ ﴿لاصام ولا افطر﴾ یعنی ہمیشہ روزہ رکھنے والے کا نہ روزہ ہے اور نہ افطار ہے۔ روزہ نہ ہونے کا مفہوم تو یہی ہے کہ یہ سنت کے خلاف ہے اور "نہ افطار کیا" کا مفہوم یہ ہے کہ وہ کھانے پینے کی چیزوں سے محروم رہا۔ یہ حدیث اس بات کی دلیل ہے کہ ہمیشہ روزہ رکھنا مکروہ ہے اور باقی سارا سال روزے رکھ کر صرف عیدین اور ایام تشریق کے روزے نہ رکھنے سے یہ کراہت رفع نہیں ہو جاتی۔

٢ - بَابُ الاعْتِكَافِ وَقِيَامِ رَمَضَانَ

اعتکاف اور قیام رمضان کا بیان

(٥٦٨) عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، أَنَّ رَسُولَ اللهِ ﷺ قَالَ: «مَنْ قَامَ رَمَضَانَ إِيمَاناً وَاحْتِسَاباً غُفِرَ لَهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِهِ». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "جو شخص ایمان اور ثواب کی نیت سے رمضان کا قیام کرتا ہے اس کے پہلے گناہ معاف کر دیئے جاتے ہیں۔" (بخاری و مسلم)

لغوی تشریح: ﴿باب الاعتکاف﴾ کے لغوی معنی روکنے اور بند کرنے کے ہیں اور شرعی مفہوم یہ ہے کہ مسجد میں ایک خاص کیفیت سے اپنے آپ کو روکنا اور "قیام رمضان" سے مراد رات کو نماز پڑھنا یا قرآن پاک کی تلاوت کرنا ہے اور اس کا غالب استعمال نماز تراویح پر ہوتا ہے۔ ﴿ایمانا﴾ مفعول ہونے کی بنا پر منصوب ہے یعنی اللہ تعالیٰ کی طرف سے ثواب پر یقین رکھتے ہوئے اور یہ بھی مفہوم ہو سکتا ہے کہ اس کا ایمان ہی اسے قیام رمضان پر آمادہ کرتا ہے جس میں اخلاص کی نیت کی طرف اشارہ ہے اور ریاء و نمائش سے اجتناب مقصود ہے۔ ﴿احتسابا﴾ یعنی اللہ تعالیٰ سے ثواب اور اس کی رضا کی نیت سے جو قیام کرتا ہے۔

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ رمضان المبارک کی راتوں کا قیام کتنے بڑے اجر و ثواب کا باعث ہے۔ آنحضرت ﷺ رمضان اور غیر رمضان میں عموماً آٹھ رکعت اور تین وتر پڑھتے اور قیام بہت لمبا کرتے تھے بلکہ جن تین راتوں میں رسول اللہ ﷺ نے نماز تراویح پڑھائی ان میں بھی آپ ﷺ

نے گیارہ رکعات ہی پڑھیں۔ (ابن حبان) اس لئے سنت نبوی ﷺ تو بہرنوع گیارہ رکعت ہے۔ علامہ ابن ہمام رحمۃ اللہ علیہ وغیرہ نے بھی اس سے زائد رکعتوں کو سنت نہیں بلکہ نفل قرار دیا ہے۔ (فتح القدیر)

(٥٦٩) عَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهَا قَالَتْ: كَانَ رَسُولُ اللهِ ﷺ إِذَا دَخَلَ العَشْرُ، - أَيِ العَشْرُ الأَخِيْرَةُ مِنْ رَمَضَانَ، - شَدَّ مِئْزَرَهُ، وَأَحْيَا لَيْلَهُ، وَأَيْقَظَ أَهْلَهُ مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ جب آخری دھاکہ شروع ہو جاتا تو رسول اللہ ﷺ اپنی کمر کس لیتے' رات بھر جاگتے رہتے اور اپنی بیویوں کو بھی جگاتے۔ (بخاری و مسلم)

لغوی تشریح: ﴿ شد مئزره ﴾ مئزر کی میم کے نیچے زیر' ہمزہ ساکن ہے۔ یعنی اپنی چادر باندھ لیتے۔ یہ دراصل کنایہ ہے کہ آپؐ عبادت کے لئے کمر ہمت باندھ لیتے اس کیلئے بڑی کوشش کرتے اور سب کچھ چھوڑ کر عبادت میں لگ جاتے اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس سے مراد یہ ہے کہ اپنی ازواج مطہرات سے عبادت کی وجہ سے علیحدگی اختیار کر لیتے۔ ﴿ واحيا ليله ﴾ یعنی نماز وغیرہ میں شب بیدار رہتے یا اس کا اکثر حصہ جاگتے۔ ﴿ وايقظ اهله ﴾ یعنی اپنے اہل خانہ کو بھی نماز و عبادت کیلئے نیند سے اٹھاتے۔

(٥٧٠) وَعَنْهَا رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهَا قَالَتْ: كَانَ النَّبِيُّ ﷺ إِذَا أَرَادَ أَنْ يَعْتَكِفَ، صَلَّى الفَجْرَ ثُمَّ دَخَلَ مُعْتَكَفَهُ. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا ہی سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ جب اعتکاف کا ارادہ کرتے تو فجر کی نماز پڑھتے اور پھر اعتکاف کی جگہ داخل ہو جاتے۔ (بخاری و مسلم)

لغوی تشریح: ﴿ صلى الفجر ﴾ صبح کی نماز پڑھتے' اکیس رمضان کی نماز مراد ہے۔ ﴿ ثم دخل معتكفه ﴾ اسم ظرف کا صیغہ ہے یعنی اپنے اعتکاف کی جگہ نماز فجر کے بعد آپؐ علیحدگی اختیار کر لیتے' یوں نہیں کہ یہ وقت اعتکاف کے ابتداء کا ہے بلکہ اعتکاف کیلئے تو آپؐ اکیس کی نماز مغرب ہی مسجد میں پڑھتے اور اعتکاف کی نیت سے مسجد ہی میں رات گزارتے' جب صبح کی نماز پڑھتے تو اعتکاف کی مخصوص جگہ میں تشریف لے جاتے جیسا کہ علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ نے تصریح کی ہے۔ اس حدیث کی یہ تاویل اس لئے ضروری ہے کہ آئندہ حدیث میں وضاحت ہے کہ آپؐ رمضان کے آخری دس دنوں کا اعتکاف کرتے تھے۔

(٥٧١) وَعَنْهَا أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ كَانَ يَعْتَكِفُ العَشْرَ الأَوَاخِرَ مِنْ رَمَضَانَ، حَتَّى تَوَفَّاهُ اللَّهُ عَزَّ وَجَلَّ، ثُمَّ اعْتَكَفَ أَزْوَاجُهُ مِنْ بَعْدِهِ. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

انہی (حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا) سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ رمضان کے آخری عشرہ کا اعتکاف کرتے تاآنکہ آپؐ وفات پاگئے۔ آپؐ کی بیویاں آپؐ کے بعد اعتکاف کرتیں۔ (بخاری و مسلم)

حاصل کلام: یہ اس بات کی دلیل ہے کہ اعتکاف سنت ہے۔ آنحضرت ﷺ نے ہمیشہ اس کا اہتمام کیا اور آپؐ کے بعد ازواج مطہرات بھی اس کا اہتمام کرتی تھیں۔ (سبل)

(۵۷۲) وَعَنْهَا قَالَتْ: إِنْ كَانَ رَسُولُ اللهِ ﷺ لَيُدْخِلُ عَلَيَّ رَأْسَهُ، - وَهُوَ فِي المَسْجِدِ، - فَأُرَجِّلُهُ، وَكَانَ لاَ يَدْخُلُ البَيْتَ إِلاَّ لِحَاجَةٍ، إِذَا كَانَ مُعْتَكِفاً. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ، وَاللَّفْظُ لِلْبُخَارِيِّ.

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ اپنا سر مبارک میرے آگے کر دیتے جبکہ آپؐ (اعتکاف کی حالت میں) مسجد میں ہوتے۔ پس میں آپؐ کو کنگھی کرتی اور جب آپؐ اعتکاف میں ہوتے تو آپؐ سوائے ضروری حاجات کے گھر میں داخل نہ ہوتے۔ (بخاری و مسلم اور یہ الفاظ بخاری کے ہیں)

لغوی تشریح: ﴿ ان كان ﴾ یہ "ان" حرف تاکید ہے اور یہ ان ثقیلہ سے خفیفہ استعمال ہوا ہے' اصل کلام "انه كان" تھا ﴿ ليدخل ﴾ ادخال سے ہے یعنی داخل ہوتے ﴿ على ﴾ یہ علی حرف جار نہیں بلکہ یاء مشددہ ہے یعنی میری جانب ﴿ فارجله ﴾ تو میں آپؐ کو کنگھی کرتی۔ آپؐ کے بالوں کو کنگھی سے درست کرتی' تیل لگاتی اور یہ اس بات کی دلیل ہے کہ اعتکاف کرنے والا اپنے جسم کا بعض حصہ مسجد سے باہر کر سکتا ہے اور اعتکاف میں اپنی بیوی سے خدمت لے سکتا ہے۔ ﴿ الا لحاجة ﴾ مگر ضروری حاجت کیلئے۔ اس سے بول و براز' غسل جنابت اور خون نکلوانا وغیرہ مراد ہے جو مسجد میں نہیں کئے جا سکتے۔

(۵۷۳) وَعَنْهَا قَالَتْ: السُّنَّةُ عَلَى المُعْتَكِفِ أَن لاَ يَعُودَ مَرِيْضاً، وَلاَ يَشْهَدَ جَنَازَةً، وَلاَ يَمَسَّ امْرَأَةً، وَلاَ يُبَاشِرَهَا، وَلاَ يَخْرُجَ لِحَاجَةٍ إِلاَّ لِمَا لاَ بُدَّ لَهُ مِنْهُ، وَلاَ اعْتِكَافَ إِلاَّ بِصَوْمٍ. وَلاَ اعْتِكَافَ إِلاَّ فِي مَسْجِدٍ جَامِعٍ. رَوَاهُ أَبُو دَاوُدَ، وَلاَ بَأْسَ بِرِجَالِهِ، إِلاَّ أَنَّ الرَّاجِحَ وَقْفُ آخِرِهِ.

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ اعتکاف کرنے والے پر سنت ہے کہ وہ نہ کسی مریض کی بیمار پرسی کرے نہ جنازہ میں شرکت کرے' نہ عورت کو ہاتھ لگائے اور نہ ہی اس سے مباشرت کرے اور سوائے حاجات ضروریہ کے مسجد میں سے نہ نکلے اور سوائے جامع مسجد کے اعتکاف نہ کرے۔ (ابوداؤد' اس کے راویوں میں کوئی خلل نہیں لیکن راجح یہ ہے کہ اس کے آخری الفاظ موقوف ہیں)

لغوی تشریح: ﴿ ان لايعود ﴾ یہ عیادت سے ہے یعنی اعتکاف کی جگہ سے عیادت کیلئے نہ نکلتے۔ البتہ اگر راہ چلتے مریض کی حالت کے بارے میں سوال کر لے تو اس میں کوئی حرج نہیں۔ ﴿ ولا يمس امراة ﴾ یعنی شہوت سے عورت کو ہاتھ نہ لگاتے۔ ﴿ ولا يباشرها ﴾ اور نہ اس سے جماع کرتے اور یہ بھی احتمال ہے کہ "لمس" سے جماع مراد ہو اور مباشرت سے گلے ملنا وغیرہ مراد ہو۔ ﴿ ولا اعتكاف الا بصوم ﴾

اور روزہ کے بغیر اعتکاف نہ کرتے۔ اس مسئلہ میں بہت اختلاف ہے' دلائل کا تقاضا یہ ہے کہ اعتکاف کے ساتھ روزہ مشروط نہیں ہے۔ ﴿ مسجد جامع ﴾ وہ مسجد جس میں باجماعت نماز ہوتی ہو۔ ﴿ الاان الراجح وقف آخرہ ﴾ یعنی آخری جملہ ﴿ والاعتکاف الا بصوم ﴾ موقوف ہے۔ مصنف علام نے فتح الباری میں کہا ہے کہ امام دارقطنی نے بالجزم فرمایا ہے کہ مرفوع حدیث صرف ﴿ لا یخرج لحاجة ﴾ ہے اور اس کے علاوہ باقی موقوف ہے اور یہاں فرمایا ہے آخری حصہ ہی موقوف ہے۔ امام ابوداؤد رحمہ اللہ نے فرمایا ہے عبدالرحمن بن اسحٰق کے علاوہ کوئی بھی یہ نہیں کہتا کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا ہو کہ یہ سنت ہے۔

(٥٧٤) وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ قَالَ: «لَيْسَ عَلَى الْمُعْتَكِفِ صِيَامٌ، إِلاَّ أَنْ يَجْعَلَهُ عَلَى نَفْسِهِ». رَوَاهُ الدَّارَقُطْنِيُّ وَالحَاكِمُ، وَالرَّاجِحُ وَقْفُهُ أَيْضاً.

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا کہ "اعتکاف کرنے والے پر روزہ نہیں الاّ یہ کہ وہ اسے اپنے آپ پر مقرر کر لے۔" (اسے دارقطنی اور حاکم نے روایت کیا ہے اور اس کا بھی موقوف ہونا ہی راجح ہے)

حاصل کلام: صحیح یہی ہے کہ یہ روایت موقوف ہے اور اس میں سے ﴿ لا یخرج لحاجة ﴾ کا جملہ ہی مرفوع ثابت ہے۔ جیسا کہ امام دارقطنی رحمہ اللہ نے فرمایا ہے۔ اعتکاف بہرنوع مسجد میں ہونا چاہئے۔ جامع مسجد سے مراد امام احمد رحمہ اللہ اور امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے نزدیک یہ ہے کہ اس میں نماز باجماعت ہوتی ہو۔ جمہور کا خیال ہے کہ جس پر جمعہ فرض نہیں وہ ہر اس مسجد میں اعتکاف کر سکتا ہے جس میں نماز باجماعت ہوتی ہو لیکن جس پر جمعہ فرض ہے اس کیلئے اس مسجد میں اعتکاف کرنا چاہئے جہاں جمعہ کی نماز ہوتی ہو۔ علماء کا اس میں بھی اختلاف ہے کہ اعتکاف کیلئے روزہ شرط ہے یا نہیں۔ اکثر کا خیال ہے کہ روزہ شرط ہے لیکن کوئی واضح نص اس بارے میں منقول نہیں۔ تاہم رسول اللہ ﷺ سے بلاصوم اعتکاف کرنا ثابت نہیں۔ لیکن اس سے روزہ شرط ہونا لازم نہیں آتا۔

(٥٧٥) وَعَنْ ابْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا، أَنَّ رِجَالاً مِنْ أَصْحَابِ النَّبِيِّ ﷺ أُرُوا لَيْلَةَ الْقَدْرِ فِي الْمَنَامِ، فِي السَّبْعِ الأَوَاخِرِ، فَقَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «أَرَى رُؤْيَاكُمْ قَدْ تَوَاطَأَتْ فِي السَّبْعِ الأَوَاخِرِ، فَمَنْ كَانَ مُتَحَرِّيَهَا، فَلْيَتَحَرَّهَا فِي

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ کے صحابہؓ میں سے کچھ مردوں کو آخری ہفتہ میں شب قدر دکھائی گئی۔ تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "میں تمہاری خواب کو دیکھتا ہوں جو آخری ہفتہ میں موافق آیا ہے۔ اگر کوئی اس کو تلاش کرنے والا ہو تو وہ آخری ہفتہ میں اسے تلاش کرے۔" (بخاری و مسلم)

السَّبْعِ الأَوَاخِرِ». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

لغوی تشریح: ﴿ اروا ﴾ اراءة سے مبنی بر مفعول ہے۔ ﴿ فی السبع الاواخر ﴾ سے آخری سات دن مراد ہیں جس کی ابتداء تیئس کی رات سے ہوتی ہے۔ ﴿ اری ﴾ کے معنی ظن و گمان کے ہیں کہ میں گمان کرتا ہوں۔ ﴿ تواطات ﴾ کے معنی موافقت کے ہیں۔ ﴿ متحریھا ﴾ جو اس کا طالب ہو۔ یہ "التحری" سے ہے جس کے معنی مطلوب کو حاصل کرنے میں کوشش اور جستجو کرنا ہے۔

(٥٧٦) وَعَنْ مُعَاوِيَةَ بْنِ أَبِيْ سُفْيَانَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُمَا، عَنِ النَّبِيِّ ﷺ، قَالَ فِي لَيْلَةِ الْقَدْرِ: «لَيْلَةُ سَبْعٍ وَعِشْرِينَ». رَوَاهُ أَبُو دَاوُدَ، وَالرَّاجِحُ وَقْفُهُ.

وَقَدِ اخْتُلِفَ فِيْ تَعْيِيْنِهَا عَلَى أَرْبَعِيْنَ قَوْلاً، أَوْرَدْتُها فِي فَتْحِ البَارِي.

حضرت معاویہ بن ابی سفیان رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے شب قدر کے بارے میں فرمایا "یہ ستائیس کی رات ہے۔" (ابوداؤد) اس حدیث کا موقوف ہونا زیادہ راجح ہے۔ (حافظ ابن حجرؒ فرماتے ہیں کہ) شب قدر کی تعیین میں اختلاف کیا گیا ہے' اس بارے میں چالیس اقوال ہیں۔ جنہیں میں نے فتح الباری میں نقل کیا ہے۔

لغوی تشریح: ﴿ والراجح وقفه ﴾ یعنی راجح یہ ہے کہ یہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کا قول ہے نبی ﷺ کا یہ فرمان نہیں۔ البتہ یہ حکماً مرفوع ہے۔ ﴿ قد اختلف ﴾ اس کے تعین میں اختلاف کیا گیا ہے۔ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے فتح الباری میں چالیس قول نقل کئے ہیں مگر ان میں راجح اور زیادہ قوی قول یہ ہے کہ شب قدر آخری عشرہ کی طاق راتوں میں سے ایک رات ہے اور وہ منتقل ہوتی رہتی ہے۔ کبھی اکیس' کبھی تیئس' کبھی پچیس' کبھی ستائیس اور کبھی انتیس کی رات کو اور جن روایات میں بڑے جزم سے تعین کا ذکر ہے جیسے اسی روایت میں ستائیس کا ذکر اور بعض روایات میں اکیس اور بعض میں تیئس کا ذکر ہے تو یہ اس لئے کہ اس سال اسی رات شب قدر تھی یوں نہیں کہ ہمیشہ اسی رات ہی شب قدر ہوگی۔ مگر بعض نے اس سے سمجھ لیا کہ ہمیشہ شب قدر اسی رات ہوگی۔ اس بارے میں اختلاف کا سبب بھی درحقیقت یہی ہے۔

(٥٧٧) وَعَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهَا، قَالَتْ: قُلْتُ: يَا رَسُولَ اللهِ! أَرَأَيْتَ إِنْ عَلِمْتُ أَيُّ لَيْلَةٍ لَيْلَةُ القَدْرِ، ما أقول فيها؟ قَالَ: «قُولِي اللَّهُمَّ إِنَّكَ عَفُوٌّ، تُحِبُّ

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ میں نے عرض کیا' اے اللہ کے رسول! (ﷺ) مجھے بتلائیں کہ اگر میں جان لوں' شب قدر کونسی ہے تو اس میں کیا کروں؟ آپؐ نے فرمایا "کہہ' اے اللہ! بے شک تو ہی درگزر کرنے والا ہے' تو درگزر کرنا پسند کرتا ہے' مجھ

العَفْوَ، فَاعْفُ عَنِّي». رَوَاهُ الخَمْسَةُ غَيْرَ أَبِي دَاوُدَ، وَصَحَّحَهُ التِّرْمِذِيُّ وَالحَاكِمُ.
سے درگزر فرما۔" (اسے ابوداؤد کے علاوہ پانچوں نے روایت کیا ہے اور اسے ترمذی اور حاکم نے صحیح کہا ہے)

لغوی تشریح: ﴿ ارایت ﴾ آپ مجھے بتلائیں یہ ﴿ اخبرنی ﴾ کے معنی میں ہے۔ ﴿ ای لیلۃ ﴾ مفعول ہونے کے اعتبار سے ﴿ ای ﴾ پر نصب اور مبتداء ہونے کے ناطے ضمہ ہوگا اور اس کے بعد اس کی خبر ہے۔ ﴿ عفو ﴾ کے عین پر زبر اور واؤ مشدد ہے۔ یعنی بہت درگزر کرنے والا' بہت معاف کرنے اور بخشنے والا۔

(٥٧٨) وَعَنْ أَبِي سَعِيْدٍ الخُدْرِيِّ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «لاَ تَشُدُّوا الرِّحَالَ إِلاَّ إِلى ثَلاَثَةِ مَسَاجِدَ، المَسْجِدِ الحَرَامِ، وَمَسْجِدِي هَذَا، وَالمَسْجِدِ الأَقْصَى». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "سوائے تین مسجدوں کے (کسی کیلئے) کجاوے نہ باندھو۔ (یعنی) مسجد الحرام' میری اس مسجد اور مسجد اقصیٰ کے علاوہ۔" (بخاری و مسلم)

لغوی تشریح: ﴿ لا تشدوا الرحال ﴾ "الرحال" رحل کی جمع ہے اور وہ اونٹ کے کجاوے کو کہتے ہیں جیسے گھوڑے کی کاٹھی ہوتی ہے اور کجاوے باندھنا سے کنایہ یہ ہے کہ ان تین مسجدوں کے علاوہ حصول برکت و فضیلت' سفر مت کرو۔

حاصل کلام: یہ حدیث اس بات کی واضح دلیل ہے کہ ان تین مقامات کے علاوہ کسی بھی مقام کو باعث برکت سمجھ کر یا وہاں نماز پڑھنے کی نیت سے سفر کرنا درست نہیں۔ تبرک کی تخصیص اس لئے ہے کہ ان تین مساجد کی طرف سفر اسی مقصد کیلئے ہوتا ہے۔ اس لئے ان کے علاوہ دوسرے مقامات کی طرف سفر کی ممانعت بھی اسی مقصد سے مختص ہے۔ البتہ دوسرے اغراض و مقاصد کیلئے سفر کرنا جائز ہی نہیں بلکہ بسا اوقات واجب ہے جس کی تفصیل الصارم المنکی وغیرہ میں دیکھی جا سکتی ہے۔ یہ حدیث ان تینوں مقامات کے شرف و فضل پر دال ہے اور اسے یہاں لانے کا مقصد بھی یہی ہے کہ ان مقامات میں اعتکاف کیا جائے' وہاں عبادت اور ذکر و تلاوت میں مقدور بھر کوشش کی جائے۔

٦ـ كِتَابُ الْحَجِّ

حج کے مسائل

(١) بَابُ فَضْلِهِ وَبَيَانُ مَنْ فُرِضَ عَلَيْهِ

حج کی فضیلت و فرضیت کا بیان

(٥٧٩) عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُ، أَنَّ رَسُولَ اللهِ ﷺ قَالَ: «**الْعُمْرَةُ إِلَى الْعُمْرَةِ كَفَّارَةٌ لِمَا بَيْنَهُمَا، وَالْحَجُّ الْمَبْرُورُ لَيْسَ لَهُ جَزَاءٌ إِلاَّ الْجَنَّةُ**». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت ابوھریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "عمرہ دوسرے عمرے تک دونوں کے مابین گناہوں کا کفارہ ہے اور حج مبرور کا بدلہ جنت کے علاوہ اور کوئی نہیں۔" (بخاری و مسلم)

لغوی تشریح: ﴿كتاب الحج﴾ کی حاء پر فتح اور کسرہ دونوں آتے ہیں' جس کے لغوی معنی ہیں قصد کرنا اور لغت کے امام خلیل نے کہا ہے کہ اس کے معنی محترم مقام کی طرف باکثرت قصد کرنا ہے اور اصطلاح شریعت میں مسجد الحرام کی طرف مخصوص اعمال سے قصد کرنا ہے اور یہ بالاتفاق اسلام کا پانچواں رکن ہے۔ جمہور علماء کے نزدیک اس کی فرضیت سن چھ ہجری میں ہوئی بعض نے نو یا دس ہجری کہا ہے۔ زاد المعاد میں حافظ ابن قیم رحمۃ اللہ علیہ کا رجحان اسی طرف ہے۔ ﴿العمرة﴾ لغت میں عمرہ کے معنی زیارت کے ہیں اور بعض نے اس کے معنی قصد و ارادہ کے کئے ہیں اور اصطلاح شریعت میں اس سے مراد احرام' طواف' سعی' صفا و مروہ' سر منڈانا یا بال کٹوانا ہے۔ اسے عمرہ اس لئے کہا جاتا ہے کہ انہی اعمال کو ملحوظ رکھتے ہوئے بیت اللہ کا قصد کیا جاتا ہے۔ ﴿الحج المبرور﴾ سے مراد وہ حج ہے جس میں کسی گناہ کا ارتکاب نہ ہو۔ بعض نے کہا ہے حج مبرور وہ ہے جس کے بعد حج کرنے والے کی دینی و اخلاقی حیثیت پہلے سے بہتر ہو جائے اور بعض نے اس کے معنی حج مقبول کے کئے ہیں اور یہ سب اقوال باہم قریب قریب ہیں' ان میں کوئی بڑا فرق نہیں۔

(۵۸۰) وَعَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهَا قَالَتْ: قُلْتُ: يَا رَسولَ اللهِ! عَلَى النِّسَاءِ جِهَادٌ؟ قَالَ: «نَعَمْ، عَلَيْهِنَّ جِهَادٌ لاَ قِتَالَ فِيهِ؛ الحَجُّ وَالعُمْرَةُ». رَوَاهُ أَحْمَدُ وَابْنُ مَاجَهْ، وَاللَّفْظُ لَهُ، وَإِسْنَادُهُ صَحِيحٌ، وَأَصْلُهُ فِي الصَّحِيحِ.

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ میں نے عرض کیا' اے اللہ کے رسول (ﷺ)! کیا عورتوں پر جہاد ہے؟ آپؐ نے فرمایا "ہاں! ان پر وہ جہاد ہے جس میں لڑائی نہیں (یعنی) حج اور عمرہ۔" (اسے احمد اور ابن ماجہ نے روایت کیا ہے اور یہ الفاظ ابن ماجہ کے ہیں۔ اس کی سند صحیح ہے اور اس کی اصل بخاری میں ہے)

لغوی تشریح: ﴿علی النساء جهاد﴾ کہ کیا عورتوں پر جہاد ہے؟ اس میں حرف استفہام محذوف ہے اور حج و عمرہ پر جہاد کا اطلاق مجازاً ہے کیونکہ ان میں بھی جہاد کی طرح مشقت و تکلیف برداشت کرنا پڑتی ہے۔ ﴿واصله في الصحيح﴾ اس کی اصل ﴿الصحيح﴾ میں ہے۔ صحیح سے یہاں صحیح بخاری مراد ہے اور یہ حدیث عمرہ کے وجوب کی دلیل ہے۔

(۵۸۱) وَعَنْ جَابِرِ بْنِ عَبْدِ اللهِ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا قَالَ: أَتَى النَّبِيَّ ﷺ أَعْرَابِيٌّ، فَقَالَ: يَا رَسُولَ اللهِ! أَخْبِرْنِي عَنِ العُمْرَةِ، أَوَاجِبَةٌ هِيَ؟ فَقَالَ: «لاَ، وَأَنْ تَعْتَمِرَ خَيْرٌ لَكَ». رَوَاهُ أَحْمَدُ وَالتِّرْمِذِيُّ، وَالرَّاجِحُ وَقْفُهُ. وَأَخْرَجَهُ ابْنُ عَدِيٍّ مِنْ وَجْهٍ آخَرَ ضَعِيفٍ وعَنْ جَابِرٍ مَرْفُوعاً: «اَلْحَجُّ وَالعُمْرَةُ فَرِيضَتَانِ».

حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں ایک بدوی حاضر ہوا تو اس نے کہا' اے اللہ کے رسول (ﷺ)! مجھے عمرہ کے بارے بتلائیے کہ کیا یہ واجب ہے؟ تو آپؐ نے فرمایا "نہیں اگر تو عمرہ کرے تو یہ تمہارے لئے بہتر ہے۔" (اسے احمد و ترمذی نے روایت کیا ہے اور اس کا موقوف ہونا راجح ہے) اور امام ابن عدی نے ایک اور ضعیف سند سے حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً روایت کیا ہے کہ "حج اور عمرہ دونوں فرض ہیں۔"

لغوی تشریح: ﴿والراجح وقفه﴾ راجح بات یہ ہے کہ یہ روایت موقوف ہے اور یہ حضرت جابر رضی اللہ عنہ کا قول ہے انہی سے ایک صحرا نورد بدو نے سوال کیا اور انہوں نے اسے یہ جواب دیا۔ رسول اللہ ﷺ کی طرف اس کی نسبت راوی کا وہم ہے بلکہ اس کی سند ضعیف اور ناقابل استدلال ہے جس کی تفصیل تحفۃ الاحوذی (ج ۲ : ص ۱۱۳) میں دیکھی جا سکتی ہے ﴿من وجه آخر ضعيف﴾ ایک اور ضعیف سند سے کیونکہ وہ عبداللہ بن لھیعہ عن عطاء عن جابر کی سند سے مروی ہے اور ابن لھیعہ اس میں کمزور ہے۔ امام ابن عدی نے کہا ہے کہ یہ عطاء سے غیر محفوظ ہے۔ امام دارقطنی رحمہ اللہ نے یہی روایت حضرت زید رضی اللہ عنہ بن ثابت سے مرفوعاً بیان کی ہے مگر اس میں اسماعیل بن مسلم المکی ضعیف ہے اور ابن سیرین کا حضرت زید

سے سماع بھی نہیں اور امام بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے اسے ایک اور سند سے ابن سیرین سے موقوف روایت کیا ہے اس کی سند پہلی سے زیادہ صحیح ہے۔ یعنی یہ بھی حضرت زید رضی اللہ عنہ کا قول ہے مگر سند میں انقطاع ہے۔ (سبل' التلخیص) عمرہ کے وجوب اور عدم وجوب کے بارے میں اختلاف ہے۔ راجح قول یہی ہے کہ یہ واجب ہے۔ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما' ابن عباس رضی اللہ عنہما' امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ' امام احمد رحمۃ اللہ علیہ اور امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ وغیرہ اس کے قائل ہیں۔

(۵۸۲) وَعَنْ أَنَسٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قِيلَ يَا رَسُولَ اللهِ! مَا السَّبِيْلُ؟ قَالَ: «الزَّادُ وَالرَّاحِلَةُ». رَوَاهُ الدَّارَقُطْنِيُّ، وَصَحَّحَهُ الحَاكِمُ، وَالرَّاجِحُ إِرْسَالُهُ، أَخْرَجَهُ التِّرْمِذِيُّ مِنْ حَدِيثِ ابْنِ عُمَرَ أَيْضاً، وَفِي إِسْنَادِهِ ضَعْفٌ.

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ عرض کیا گیا یارسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم)! "سبیل" سے کیا مراد ہے؟ آپ ؐ نے فرمایا "راستے کا خرچ اور سواری۔" (اسے دارقطنی نے روایت کیا ہے اور حاکم نے اسے صحیح کہا ہے مگر راجح اس کا مرسل ہونا ہے اور ترمذی نے اسے ابن عمر رضی اللہ عنہما کی حدیث سے روایت کیا ہے اور اس کی سند میں کمزوری ہے)

لغوی تشریح: ﴿ ما السبیل ﴾ "سبیل" کیا ہے؟ یعنی اللہ سبحانہ و تعالیٰ نے جو وجوب حج کیلئے "سبیل" کو شرط قرار دیا ہے یہ سبیل کیا ہے؟ جس کا حکم سورۂ ال عمران میں یوں ہے ولله على الناس حج البيت من استطاع اليه سبيلا (۳: ۹۷) ﴿ الزاد والراحلہ ﴾ راحلہ سے مراد سواری' خواہ وہ جانور ہو' موٹر کار ہو' بحری جہاز ہو یا ہوائی جہاز اور الزاد سے واپسی تک اہل و عیال کے خرچ سے زائد مال مراد ہے۔

(۵۸۳) وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ لَقِيَ رَكْباً بِالرَّوْحَاءِ، فَقَالَ: «مَنِ الْقَوْمُ»؟ قَالُوا: اَلْمُسْلِمُونَ، فَقَالُوْا: مَنْ أَنْتَ؟ قَالَ: «رَسُولُ اللهِ»، فَرَفَعَتْ إِلَيْهِ امْرَأَةٌ صَبِياً، فَقَالَتْ: أَلِهٰذَا حَجٌّ؟ قَالَ: «نَعَمْ، وَلَكِ أَجْرٌ». رَوَاهُ مُسْلِمٌ.

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم روحاء مقام پر کچھ سواروں سے ملے تو آپ ؐ نے فرمایا تم کون ہو؟ تو انہوں نے عرض کیا' ہم مسلمان ہیں۔ پھر انہوں نے پوچھا آپ کون ہیں؟ تو آپ ؐ نے فرمایا "اللہ کا رسول ہوں۔" پھر آپ ؐ کی خدمت میں ایک عورت اپنے بچے کو اٹھا کر لائی اور پوچھا کیا اس کا حج ہے؟ آپ ؐ نے فرمایا "ہاں! اس کا ثواب تجھے ملے گا۔" (مسلم)

لغوی تشریح: ﴿ رکبا ﴾ را پر زبر اور کاف ساکن یہ "راکب" کی جمع ہے۔ قافلے کو کہتے ہیں۔ ﴿ بالروحاء ﴾ راء پر فتحہ آخر میں مد ہے۔ مدینہ طیبہ کے قریب ایک جگہ کا نام ہے۔ ﴿ فقالوا من انت ﴾

تو انہوں نے کہا آپ کون ہیں؟ قاضی عیاض نے کہا کہ آپ انہیں رات کے وقت ملے ہوں اور وہ آپؐ کو پہچان نہ سکے ہوں اور یہ بھی ممکن ہے کہ دن کو ملے ہوں مگر پہلے انہوں نے آپؐ کو نہ دیکھا ہو ﴿ولك اجر﴾ اور اجر و ثواب تمہیں ملے گا اسے اٹھانے اور ساتھ لے کر حج کرنے کی بدولت۔ یہ حدیث اس بات کی دلیل ہے کہ نابالغ بچے کا حج درست ہے لیکن یہ حج اس سے بلوغت کے بعد کفایت نہیں کرتا جیسا کہ آئندہ چوتھی حدیث کے تحت آرہا ہے۔

(٥٨٤) وَعَنْهُ قَالَ: كَانَ الفَضْلُ بْنُ عَبَّاسٍ رَدِيْفَ رَسُولِ اللهِ ﷺ، فَجَاءَتِ امْرَأَةٌ مِّنْ خَثْعَمَ، فَجَعَلَ الفَضْلُ يَنْظُرُ إِلَيْها، وَتَنْظُرُ إِلَيْهِ، وَجَعَلَ النَّبِيُّ ﷺ يَصْرِفُ وَجْهَ الفَضْلِ إِلَى الشِّقِّ الآخَرِ، فَقَالَتْ: يَا رَسُولَ اللهِ! إِنَّ فَرِيْضَةَ اللهِ عَلَى عِبَادِهِ فِي الحَجِّ أَدْرَكَتْ أَبِيْ شَيْخاً كَبِيْراً، لاَ يَثْبُتُ عَلَى الرَّاحِلَةِ، أَفَأَحُجُّ عَنْهُ؟ قَالَ: «نَعَمْ»، وَذَلِكَ فِي حَجَّةِ الوَدَاعِ. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ، وَاللَّفْظُ لِلْبُخَارِيِّ.

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے ہی روایت ہے کہ فضل بن عباس رضی اللہ عنہ رسول اللہ ﷺ کے پیچھے سوار تھے کہ قبیلہ خثعم کی ایک عورت آئی تو فضل رضی اللہ عنہ اس کی طرف دیکھنے لگے اور وہ ان کی طرف دیکھنے لگی اور نبی ﷺ فضل رضی اللہ عنہ کا منہ دوسری جانب پھیرتے تھے۔ پس اس عورت نے کہا، اے اللہ کے رسول (ﷺ)! بے شک حج، اللہ کا فرض ہے اس کے بندوں پر۔ میرا باپ بڑی عمر والا بوڑھا ہے۔ وہ سواری پر بیٹھ نہیں سکتا کیا میں اس کی طرف سے حج کروں؟ آپؐ نے فرمایا "ہاں! اور یہ حجۃ الوداع کا واقعہ ہے۔" (بخاری و مسلم اور یہ الفاظ بخاری کے ہیں)

لغوی تشریح: ﴿ردیف﴾ ایک سواری پر دو بیٹھنے والوں میں سے پیچھے والے کو "ردیف" کہتے ہیں۔ ﴿خثعم﴾ خاء پر زبر اور ثاء ساکن اور عین پر زبر، یمن کے مشہور قبیلہ کا نام ہے اور اسے منصرف اور غیر منصرف دونوں طرح پڑھنا جائز ہے۔ ﴿الشق﴾ یعنی جانب۔ آپؐ نے حضرت فضل بن عباس رضی اللہ عنہ کا چہرا اس لئے پھیر دیا تا کہ شیطان انہیں فتنہ میں مبتلا نہ کر دے۔ ﴿حجۃ الوداع﴾ یہ وہ حج ہے جو نبی کریم ﷺ نے دس ہجری میں کیا اور اس کے تین ماہ بعد آپؐ وفات پا گئے اور "الوداع" کے واؤ پر زبر ہے اس کا مصدر "ودع تودیعا" ہے اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ واؤ کے نیچے کسرہ ہے یوں یہ موادعۃ کا مصدر ہے۔ آخری حج کا نام حجۃ الوداع اس لئے رکھا گیا کہ آپؐ نے اس سال لوگوں کو یا حرم کعبہ کو رخصت کیا۔ یہ حدیث دلیل ہے کہ زندہ آدمی اگر معذور ہو اور اس کی صحت کی امید نہ ہو تو اس کی جانب سے حج بدل جائز ہے۔

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ جس پر حج فرض ہو مگر وہ کسی مستقل بیماری یا بڑھاپے کی وجہ سے حج کرنے کی طاقت نہ پاتا ہو تو اس کی طرف سے حج بدل جائز ہے۔ لیکن عارضی بیماری جس کے دور

ہو جانے کا امکان ہو' میں نیابت درست نہیں یہ شرط حج فرض کیلئے ہے نفلی حج کیلئے اس میں بلا شرط نیابت جائز ہے۔ امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ اور امام احمد رحمہ اللہ کا یہی موقف ہے اور حج بدل کیلئے بہتر یہی ہے کہ اس کا قریبی ہی نائب بنے۔

راوی حدیث: ﴿ فضل بن عباس رضی اللہ عنہ ﴾ آپؓ رسول اللہ ﷺ کے چچا زاد بھائی تھے۔ ان کی والدہ کا نام ام الفضل لبابۃ الکبری بنت الحارث الھلالیۃ تھا۔ نہایت حسین و جمیل تھے۔ معرکہ حنین میں آپؓ کے ساتھ ثابت قدم رہے۔ آپؐ کو غسل دینے میں بھی شریک تھے اور حضرت عباس رضی اللہ عنہ کی اولاد میں سب سے بڑے یہی تھے۔ جہاد کیلئے شام تشریف لے گئے۔ کہا جاتا ہے کہ طاعون عمواس کے سال ۱۸ھ میں انتقال ہوا۔ بعض نے کہا ہے یرموک میں شہید ہوئے اور بعض نے کہا کہ دمشق میں وفات پائی۔ ان کے جسم پر نبی ﷺ کی چادر تھی۔

(٥٨٥) وَعَنْهُ أَنَّ ٱمْرَأَةً مِنْ جُهَيْنَةَ جَاءَتْ إِلَى النَّبِيِّ ﷺ، فَقَالَتْ: إِنَّ أُمِّي نَذَرَتْ أَنْ تَحُجَّ، فَلَمْ تَحُجَّ، حَتَّى مَاتَتْ، أَفَأَحُجُّ عَنْهَا؟ قَالَ: «نَعَمْ، حُجِّي عَنْهَا، أَرَأَيْتِ لَوْ كَانَ عَلَى أُمِّكِ دَيْنٌ أَكُنْتِ قَاضِيَتَهُ؟ اقْضُوا اللَّهَ، فَاللَّهُ أَحَقُّ بِالوَفَاءِ». رَوَاهُ البُخَارِيُّ.

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے ہی مروی ہے کہ قبیلہ جھینہ کی ایک عورت نبی ﷺ کے پاس آئی اور عرض کیا' بے شک میری ماں نے حج کرنے کی منت مانی تھی لیکن وہ حج نہیں کر سکی' اور فوت ہو گئی ہے کیا میں اس کی طرف سے حج کروں؟ آپؐ نے فرمایا "ہاں! اس کی طرف سے حج کر' اگر تیری ماں کے ذمہ ادھار ہوتا تو کیا تو وہ قرض نہ اتارتی؟ اللہ کا حق پورا کرو کیونکہ اللہ زیادہ حقدار ہے کہ اس کا حق پورا کیا جائے۔" (بخاری)

لغوی تشریح: ﴿ جھینہ ﴾ جیم پر پیش' ھا پر زبر۔ یہ تصغیر ہے اور مشہور قبیلہ کا نام ہے۔ اکثر کا خیال ہے یہ قحطان کی اولاد میں حمیر کی ایک شاخ ہے اور بعض نے کہا ہے کہ اس کا تعلق معد بن عدنان سے ہے۔ ﴿ حجی ﴾ امر مخاطب کا صیغہ ہے اور یہ دلیل ہے کہ میت کی طرف سے حج بدل جائز ہے۔ "دین" دال پر زبر یعنی قرض اور اسے دین اس لئے کہا گیا تاکہ اس کی اہمیت اجاگر ہو جائے۔

(٥٨٦) وَعَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «أَيُّمَا صَبِيٍّ حَجَّ، ثُمَّ بَلَغَ الحِنْثَ، فَعَلَيْهِ أَنْ يَحُجَّ حَجَّةً أُخْرَى، وَأَيُّمَا عَبْدٍ حَجَّ، ثُمَّ أُعْتِقَ فَعَلَيْهِ أَنْ يَحُجَّ حَجَّةً أُخْرَى». رَوَاهُ ابْنُ

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "جو بچہ حج کرے پھر وہ بلوغت کو پہنچ جائے تو اس پر ضروری ہے کہ دوسرا حج کرے اور جو غلام حج کرے پھر آزاد کر دیا جائے تو اس پر لازم ہے کہ دوسرا حج کرے۔" (اسے ابن ابی شیبہ اور

أَبِي شَيْبَةَ وَالبَيْهَقِيُّ، وَرِجَالُهُ ثِقَاتٌ، إِلاَّ أَنَّهُ اخْتُلِفَ فِي رَفْعِهِ، وَالمَحْفُوظُ أَنَّهُ مَوقُوفٌ.

بیہقی نے روایت کیا ہے اس کے راوی ثقہ ہیں مگر اس کے مرفوع ہونے میں اختلاف کیا گیا ہے اور محفوظ یہ ہے کہ یہ حدیث موقوف ہے)

لغوی تشریح: ﴿ بلغ الحنث ﴾ کی حاء کے نیچے کسرہ' نون ساکن' اس کے معنی گناہ کے ہیں۔ یعنی اس عمر کو پہنچ گیا کہ اس کے نامۂ اعمال میں جرم کی بنا پر گناہ لکھ دیا جاتا ہے کیونکہ بچپن میں کیا ہوا جرم اللہ کے ہاں قابل مواخذہ نہیں۔ بلوغت کی عام علامت احتلام کا ہونا ہے۔ جس سے وہ مرد بن جاتا ہے۔

(٥٨٧) وَعَنْهُ قَالَ: سَمِعْتُ رَسُولَ اللهِ ﷺ يَخْطُبُ يَقُولُ: «**لاَ يَخْلُوَنَّ رَجُلٌ بِامْرَأَةٍ إِلاَّ وَمَعَهَا ذُو مَحْرَمٍ، وَلاَ تُسَافِرُ المَرْأَةُ إِلاَّ مَعَ ذِي مَحْرَمٍ**»، فَقَامَ رَجُلٌ فَقَالَ: يَا رَسُولَ اللهِ! إِنَّ امْرَأَتِي خَرَجَتْ حَاجَّةً، وَإِنِّي اكْتُتِبْتُ فِي غَزْوَةِ كَذَا وَكَذَا، قَالَ: «**انْطَلِقْ فَحُجَّ مَعَ امْرَأَتِكَ**». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ، واللَّفْظُ لِمُسْلِمٍ.

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو خطبہ میں یہ ارشاد فرماتے سنا کہ "کوئی مرد کسی عورت کے ساتھ ہرگز اکیلا نہ ہو مگر اس کے ساتھ محرم ہو اور کوئی عورت محرم کے بغیر سفر نہ کرے۔" پس ایک آدمی کھڑا ہوا تو اس نے کہا اے اللہ کے رسول (ﷺ)! بے شک میری عورت حج کیلئے روانہ ہوئی اور میرا نام فلاں فلاں غزوہ میں شامل ہونے کیلئے لکھا گیا ہے۔ آپؐ نے فرمایا "جاؤ اپنی بیوی کے ہمراہ حج کرو۔" (متفق علیہ اور یہ الفاظ مسلم کے ہیں)

لغوی تشریح: ﴿ لا یخلون ﴾ یہ نون تاکید کے ساتھ "خلوۃ" سے نہی کا صیغہ ہے ﴿ ذومحرم ﴾ میم اور راء پر زبر اور ان کے مابین حاء ساکن ہے۔ اس سے عورت کے وہ قریبی مراد ہیں جن سے اس کا نکاح حرام ہے۔ جیسے باپ' بیٹا' بھائی وغیرہ ﴿ اکتتبت ﴾ باب افتعال سے متکلم مجہول کا صیغہ ہے یعنی میرا نام مجاہدین کی فہرست میں شامل ہے۔ فلاں غزوہ کیلئے متعین کیا گیا ہے۔ یہ حدیث اس بات کی دلیل ہے کہ عورت محرم کے بغیر حج نہیں کر سکتی اور عورت کیلئے یہ بھی فی الجملہ "من استطاع الیہ سبیلا" کے حکم میں شامل ہے۔

حاصل کلام: اس حدیث سے ثابت ہوا کہ غیر محرم مرد اور عورت کیلئے تنہائی میں علیحدہ ہونا حرام ہے بلکہ ایک حدیث میں ہے جب بھی دونوں علیحدہ ہوں گے تیسرا ان کے ساتھ شیطان ہوگا۔ اس طرح عورت کو تنہا محرم کے بغیر سفر کرنا بھی حرام ہے۔ بعض فقہاء نے بعض ادلہ کی بنا پر بوڑھی' قافلہ کی صورت میں یا ذی حشمت عورت کو اس کی اجازت دی ہے مگر حدیث کے صریح الفاظ اس کے خلاف ہیں۔ نیز یہ بھی معلوم ہوا کہ عورت پر حج فرض ہو تو نماز کی طرح اس کی اجازت خاوند سے ضروری نہیں۔ البتہ

نفلی حج ہو تو عورت کو بہرنوع اجازت لے کر جانا چاہئے۔

(٥٨٨) وَعَنْهُ أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ سَمِعَ رَجُلاً يَقُولُ: لَبَّيْكَ عَنْ شُبْرُمَةَ، قَالَ: «مَنْ شُبْرُمَةُ»؟ قَالَ: أَخٌ لِيْ، أَوْ قَرِيْبٌ لِيْ، قَالَ: «حَجَجْتَ عَنْ نَفْسِكَ»؟ قَالَ: لاَ، قَالَ: «حُجَّ عَنْ نَفْسِكَ، ثُمَّ حُجَّ عَنْ شُبْرُمَةَ». رَوَاهُ أَبُو دَاوُدَ وَابْنَ مَاجَهْ، وَصَحَّحَهُ ابْنُ حِبَّانَ، وَالرَّاجِحُ عِنْدَ أَحْمَدَ وَقْفُهُ.

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک آدمی سے سنا' وہ کہہ رہا تھا: ''شبرمہ کی طرف سے لبیک۔ آپؐ نے فرمایا ''شبرمہ کون ہے؟'' اس نے کہا میرا بھائی یا میرا قریبی ہے۔ تو آپؐ نے فرمایا ''تو نے اپنی طرف سے حج کیا ہے؟ اس نے کہا نہیں۔ آپؐ نے فرمایا'' پہلے اپنی طرف سے کر کر پھر شبرمہ کی طرف سے کرلینا۔'' (اسے ابوداؤد اور ابن ماجہ نے روایت کیا ہے اور ابن حبان نے اسے صحیح کہا ہے اور امام احمد کے نزدیک اس کا موقوف ہونا راجح ہے)

لغوی تشریح: ﴿ شبرمۃ ﴾ شین اور راء پر پیش ہے ان کے مابین باء ساکن۔ ﴿ او قریب لی ﴾ یہ راوی کا شک ہے کہ اس نے بھائی کہا یا کہ وہ میرا قریبی ہے۔ یہ حدیث دلیل ہے کہ اگر کسی نے خود حج نہیں کیا تو وہ دوسرے کی طرف سے نیابت نہیں کر سکتا اور اگر اس نے کسی کی جانب سے حج کی نیت سے احرام باندھا ہو تو وہ اسی کی جانب سے قرار پائے گا۔ دوسرے کی طرف سے نہیں۔

حاصل کلام: اس حدیث کی صحت و ضعف میں اختلاف ہے۔ امام احمد رحمۃ اللہ علیہ اور امام ابن المنذر رحمۃ اللہ علیہ نے اس کے مرفوع ہونے کی نفی کی ہے مگر امام احمد رحمۃ اللہ علیہ سے اس کی تصحیح بھی منقول ہے۔ امام بیہقی رحمۃ اللہ علیہ' ابن حبان رحمۃ اللہ علیہ وغیرہ نے اسے صحیح کہا ہے جبکہ امام دارقطنی رحمۃ اللہ علیہ نے اسے مرسل کہا ہے۔ بہرنوع اگر اسے موقوف بھی قرار دیا جائے تب بھی یہ قابل استدلال ہے کیونکہ ابن عباس رضی اللہ عنہما کی کسی بھی صحابی سے مخالفت ثابت نہیں۔ اس لئے صحیح یہی ہے کہ حج بدل میں نائب پہلے خود حج کرے پھر نیابت کرے۔

(٥٨٩) وَعَنْهُ قَالَ: خَطَبَنَا رَسُولُ اللهِ ﷺ فَقَالَ: «إِنَّ اللَّهَ كَتَبَ عَلَيْكُمْ الحَجَّ»، فَقَامَ الأَقْرَعُ ابْنُ حَابِسٍ، فَقَالَ: أَفِيْ كُلِّ عَامٍ يَا رَسُولَ اللهِ!؟ قَالَ: «لَوْ قُلْتُهَا لَوَجَبَتْ. الحَجُّ مَرَّةٌ، فَمَا زَادَ فَهُوَ تَطَوُّعٌ». رَوَاهُ الخَمْسَةُ غَيْرَ التِّرْمِذِيِّ، وَأَصْلُهُ فِي مُسْلِمٍ مِنْ حَدِيْثِ أَبِيْ هُرَيْرَةَ.

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما ہی فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں خطبہ دیا تو آپؐ نے فرمایا ''بے شک اللہ تعالیٰ نے تم پر حج فرض کیا ہے'' تو اقرع بن حابس رضی اللہ عنہ کھڑے ہوئے اور انہوں نے عرض کیا: کیا ہر سال' اے اللہ کے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم)! آپؐ نے فرمایا ''اگر میں ہاں کہہ دیتا تو یہ (ہر سال کے لیے) فرض ہو جاتا۔ حج ایک بار ہے پس اس سے جو زائد ہے وہ نفل ہے۔'' (اسے ترمذی کے علاوہ پانچوں نے روایت کیا

ہے اور اس کی اصل مسلم میں حضرت ابوھریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت سے ہے)

حاصل کلام: یہ حدیث دلیل ہے کہ حج عمر بھر میں صرف ایک بار فرض ہے اس سے زائد نفل ہے اور اس روایت میں جو یہ مذکور ہے کہ اگر میں ہر سال حج فرض ہونے کا کہہ دیتا تو ہر سال حج فرض ہو جاتا۔ مگر یہ نہیں کہتا تاکہ امت پر مشقت نہ پڑ جائے۔ اس سے بعض علماء کا خیال ہے کہ احکام شرعیہ کا تقرر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بھی اپنی مرضی سے کر سکتے تھے لیکن اکثر علماء اسے درست نہیں سمجھتے اور یہی موقف درست ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا تشریعی حکم اللہ سبحانہ و تعالیٰ کی رضا پر ہی موقوف ہوتا تھا۔ اس اصولی اختلاف کی تفصیل اصول و عقائد کی کتابوں میں موجود ہے جس کی تفصیل یہاں غیر ضروری ہے۔

راوی حدیث: ﴿ اقرع بن حابس رضی اللہ عنہ ﴾ یہ قبیلہ تمیم سے تعلق رکھتے تھے۔ فتح مکہ کے بعد جو وفد بنو تمیم کا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت اقدس میں حاضر ہوا اس میں شامل تھے اور مؤلفۃ القلوب میں ان کا شمار ہوتا ہے۔ جاہلیت اور اسلام میں اپنے قبیلہ کے سردار تھے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دور خلافت میں ان کا انتقال ہوا۔

٢ - بَابُ الْمَوَاقِيتِ

(احرام کے) میقات کا بیان

(٥٩٠) عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُمَا، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ وَقَّتَ لِأَهْلِ الْمَدِيْنَةِ ذَا الْحُلَيْفَةِ، وَلِأَهْلِ الشَّامِ الْجُحْفَةَ، وَلِأَهْلِ نَجْدٍ قَرْنَ الْمَنَازِلِ، وَلِأَهْلِ الْيَمَنِ يَلَمْلَمَ، هُنَّ لَهُنَّ، وَلِمَنْ أَتَى عَلَيْهِنَّ مِنْ غَيْرِهِنَّ، مِمَّنْ أَرَادَ الْحَجَّ وَالْعُمْرَةَ، وَمَنْ كَانَ دُوْنَ ذٰلِكَ فَمِنْ حَيْثُ أَنْشَأَ، حَتَّى أَهْلُ مَكَّةَ مِنْ مَكَّةَ. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ والوں کے لئے ذوالحلیفہ، شام والوں کیلئے جحفہ، نجد والوں کیلئے قرن منازل اور یمن والوں کیلئے یلملم کو احرام باندھ کر نیت کرنے کی جگہیں مقرر کیا ہے اور یہ میقاتیں ان کیلئے ہیں (جن کا ذکر ہوا) اور ان لوگوں کیلئے بھی، جو دوسرے شہروں سے ان کے پاس سے حج یا عمرہ کے ارادہ سے گزریں اور جو کوئی ان میقاتوں کے ورے (اندر) ہو وہ جہاں سے چلے وہیں سے (احرام باندھے) یہاں تک کہ مکہ والے مکہ سے احرام باندھیں۔ (بخاری و مسلم)

لغوی تشریح: ﴿ باب المواقیت ﴾ یہ میقات کی جمع ہے۔ وہ ہے جو ایک عبادت کے وقت اور جگہ کی حد بندی کرتا اور متعین کرتا ہے۔ اور یہاں ان سے وہ مقامات مراد ہیں جنہیں شارع علیہ السلام نے احرام کے لیے مقرر فرمایا ہے۔ اس سے آگے احرام باندھے بغیر حرم کی طرف جانا جائز نہیں ہے۔ ﴿ وقت ﴾ یعنی

احرام کیلئے میقات مقرر کیا اور یہ توقیت سے تحدید و تعین کے معنی کیلئے ہے۔ ﴿ ذوالحلیفۃ ﴾ حاء پر ضمہ' تصغیر ہے' جو مدینہ طیبہ کے وسط سے پانچ میل کی مسافت پر ہے جو آج کل "بئرِ علی" کے نام سے مشہور ہے۔ "الجحفۃ" جیم پر پیش اور حاء ساکن' مکہ مکرمہ اور مدینہ طیبہ کے درمیان ایک جگہ کا نام ہے جو سمندر کے قریب مکہ مکرمہ سے ساڑھے چار مراحل (مرحلہ ایک دن کی مسافت کے برابر فاصلے کو کہتے ہیں) پر اور مدینہ طیبہ سے پونے چھ مراحل پر واقع ہے اس کا نام مھیعہ تھا۔ سیلاب آیا تو وہ سب کچھ بہالے گیا جس کی بنا پر اسے جحفہ کہا جانے لگا۔ یہ بہت بڑی بستی تھی مگر اب ویران ہو چکی ہے۔ اسی لئے آج کل اس سے کچھ پہلے "رابغ" مقام سے احرام باندھتے ہیں۔ کیونکہ وہاں پانی کا انتظام ہے۔ ﴿ قرن المنازل ﴾ اسے ﴿ قرن الثعالب ﴾ بھی کہا گیا ہے یا یہ دو علیحدہ مقام ہیں۔ یہ بیضوی شکل کا چمکدار پہاڑ ہے جو مکہ مکرمہ سے مشرق کی جانب دو مرحلوں کی مسافت پر واقع ہے۔ ﴿ یلملم ﴾ یاء اور دونوں لام پر فتحہ ہے اور درمیانی میم ساکن' جو مکہ مکرمہ سے جنوب کی طرف دو مرحلوں کی مسافت پر واقع پہاڑ کا نام ہے۔ مکہ مکرمہ اور اس کے درمیان تقریباً تیس میل کی مسافت ہے۔ ﴿ ھن ﴾ یعنی یہ میقات اور مقامات ﴿ لھن ﴾ ان مذکورہ اہل بلدان کے لئے ہیں۔ ﴿ ممن اراد الحج والعمرۃ ﴾ جو حج اور عمرہ کا ارادہ رکھتے ہوں۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ جو حج اور عمرہ کی نیت سے نہ ہو وہ احرام کے بغیر مکہ مکرمہ میں داخل ہو سکتا ہے۔ ﴿ ومن کان دون ذلک ﴾ اور جو اس کے ورے ہو یعنی جو میقات اور مکہ مکرمہ کے درمیان ہو تو وہ احرام باندھے ﴿ من حیث انشا ﴾ جہاں سے نکلا ہے یا جہاں سے سفر کا آغاز کیا ہے۔ یعنی اپنے گھر اور اپنی بستی سے ہی احرام باندھے۔ ﴿ حتی اھل مکۃ من مکۃ ﴾ یہاں تک کہ اہل مکہ' مکہ مکرمہ ہی سے احرام باندھیں۔ یہ اس بات کی واضح دلیل ہے کہ اہل مکہ حج اور عمرہ کا احرام مکہ مکرمہ سے باندھیں جو حکماً اہل مکہ میں سے ہیں وہ بھی وہیں احرام باندھیں اور آج کل جو عمرہ کے احرام کیلئے میقات سے باہر جا کر احرام باندھنے کا طریقہ چل نکلا ہے' اس کی چنداں ضرورت نہیں۔

(٥٩١) وَعَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهَا أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ وَقَّتَ لِأَهْلِ الْعِرَاقِ ذَاتَ عِرْقٍ. رَوَاهُ أَبُو دَاوُدَ وَالنَّسَائِيُّ، وَأَصْلُهُ عِنْدَ مُسْلِمٍ مِنْ حَدِيثِ جَابِرٍ، إِلاَّ أَنَّ رَاوِيَه شَكَّ فِيْ رَفْعِهِ.

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے اہل عراق کیلئے ذات عرق کو۔ میقات مقرر کیا (اسے ابوداؤد اور نسائی نے روایت کیا ہے اور اس کی اصل مسلم میں حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی روایت سے ہے مگر اس کے راوی نے اس کے مرفوع ہونے میں شک کیا ہے)

وَفِيْ صَحِيْحِ الْبُخَارِيِّ: أَنَّ عُمَرَ هُوَ الَّذِيْ وَقَّتَ ذَاتَ عِرْقٍ.

اور صحیح بخاری میں ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ذات عرق کو میقات مقرر کیا تھا۔

وَعِنْدَ أَحْمَدَ وَأَبِيْ دَاوُدَ وَالتِّرْمِذِيِّ عَنْ ابْنِ عَبَّاسٍ، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ

احمد' ابوداؤد اور ترمذی میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے ہے کہ نبی ﷺ نے مشرق والوں کیلئے عقیق کو میقات مقرر فرمایا

وَقَّتَ لِأَهْلِ الْمَشْرِقِ الْعَقِيْقَ.   تھا۔“

لغوی تشریح: ﴿ ذات عرق ﴾ عین کے نیچے کسرہ ہے اور یہ مکہ مکرمہ سے دو مرحلوں کی مسافت پر واقع ایک جگہ کا نام ہے اور وہ قرن منازل کے شمال میں اس کے برابر واقع ایک چھوٹا سا پہاڑ ہے۔ ﴿ وفی البخاری ..... ﴾ اور بخاری میں ہے کہ ذات عرق حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے میقات مقرر کیا۔ تو یہ بظاہر حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی مرفوع روایت کے خلاف ہے اور ان دونوں میں جمع و تطبیق کی صورت یوں ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو مرفوع روایت نہ پہنچی ہو۔ انہوں نے اس بارے میں اجتہاد کیا تو ان کا اجتہاد درست اور سنت کے مطابق نکلا۔ ﴿ العقیق ﴾ یہ ”ذات عرق“ سے کچھ پیچھے ایک جگہ کا نام ہے اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ ”ذات عرق“ کی حدود میں داخل ہے اور اس کی اصل یہ ہے کہ ہر وادی جسے سیلاب نے وسیع کر دیا ہو اسے عقیق کہتے ہیں اور اہل مشرق سے اہل عراق اور ان کے راستے سے گزرنے والے مراد ہیں۔ ان دونوں احادیث میں تطبیق یہ ہے کہ ”ذات عرق“ میقات واجب ہے اور ”عقیق“ میقات مستحب ہے کیونکہ وہ بھی ذات عرق ہی سے ہے۔

حاصل کلام: خوب یاد رہے کہ وادی ”مر الظہران“ جو آج کل وادی فاطمہ کے نام سے مشہور و معروف ہے‘ وہ طائف کے سامنے مکہ کی مشرقی جانب سے شروع ہوتی ہے اور جنوب جدہ کے قریب بحر احمر کے مغربی جانب جا کر ختم ہوتی ہے۔ اس وادی کے دو کنارے ہیں۔ ایک جنوبی کنارہ جو طائف کے راستے میں بڑی وادی کے پاس نخلہ یمانیہ سے پہلے ہے اور اسی کو ”قرن المنازل“ کہتے ہیں اور دوسرا شمالی کنارہ ضریبہ کے قریب ہے جسے ”ذات عرق“ کہتے ہیں۔ جہاں سے اہل عراق‘ اہل نجد شمالی گزرتے ہیں اور یہ دونوں کنارے ایک دوسرے کے محاذات ہیں لیکن ان دونوں کے درمیان بہت مسافت ہے اور یہ مسافت مکہ مکرمہ سے ایک جیسی ہے۔ تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ذات عرق کو میقات مقرر کرنے میں اجتہاد سے کام لیا جو علاقے والوں کی ضرورت اور شریعت میں آسانی کے عین مطابق تھا جب وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے مقررہ میقات کے موافق ہوا تو گویا نور علی نور کا مصداق ہوا۔ یہاں یہ بات یاد رہے کہ جو شخص ان پانچوں میقات میں کسی ایک میقات پر سے نہ گزرے تو اسے چاہئے کہ وہ جونسے میقات کے برابر سے گزرے۔ وہاں احرام باندھ لے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اسی میقات کے محاذ اور برابری کی وجہ سے ہی ذات عرق کو اہل عراق کیلئے مقرر کیا تھا اور تمام علماء اس اصول و ضابطہ پر متفق ہیں۔ محاذات کا مفہوم یہ ہے کہ جو میقات کسی کے دائیں یا بائیں جانب ہو اور وہ مکہ کی طرف جانے والا ہو۔ اس کی وضاحت یوں سمجھئے کہ جب ہم ان پانچوں میقات کو ایک خط کے ذریعے ملائیں تو مکہ مکرمہ کو ہر جانب سے وہ خط گھیرے میں لے لے گا۔ لہٰذا جب بھی کوئی شخص مکہ مکرمہ کی طرف ان میقات کے علاوہ کسی بھی جگہ سے آئے تو لازمی ہے کہ وہ اس خط پر سے گزرے گا جو دوسرے میقات سے ملا رہا ہوگا۔ یہ خط ہی دراصل میقات کے برابر کا خط ہے۔

اس لئے حاجی جب اس خط سے باہر ہوگا وہ آفاق میں ہوگا اس پر احرام واجب نہیں مگر جب اس خط کے پاس سے گزرے گا تو وہ میقات کے محاذ پر ہوگا اس لئے اسے بغیر احرام کے آگے بڑھنا جائز نہیں ہوگا۔ پھر یہ تمام میقات خشکی پر ہیں اور ان کو ملانے والے خطوط بھی خشکی پر ہوں گے لہٰذا جب تک کوئی شخص بحری جہاز کے ذریعے سمندر میں سفر کر رہا ہوگا وہ ان میقات کے برابر نہیں ہوگا۔ یہ صورت تو تبھی ہوگی جب وہ سمندری سفر سے فارغ ہو کر خشکی کے راستہ پر پڑے گا۔ ہماری تحقیق سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ پاکستان اور ہندوستان سے جو حجاج کرام بذریعہ بحری جہاز حج کرنے کیلئے جاتے ہیں ان پر جدہ تک پہنچنے سے پہلے احرام باندھنا واجب نہیں کیونکہ وہ سمندری سفر میں نہ تو میقات پر سے گزرے ہیں اور نہ ہی کسی میقات کے برابر سے گزرے ہیں۔ ان کا جہاز ابھی یلملم اور اس کے محاذات سے دور آفاق میں ہے جبکہ ان کے اور حدود میقات کے مابین تقریباً ایک سو میل کی مسافت ہے۔ ان کی مثال تو ابھی اس شخص کی سی ہے جو خرمہ سے طائف یا لیث سے طائف جا رہا ہے یا مدینہ طیبہ سے یا خیبر سے ینبع کی طرف ذوالحلیفہ کے راستہ کے علاوہ کسی اور راستہ سے جا رہا ہو۔ بلاشبہ میقات اس کے دائیں یا بائیں جانب آئے گا لیکن ابھی وہ میقات کے برابر نہیں آیا کیونکہ ابھی وہ حدود میقات کے پیچھے ہے۔ اسی طرح بحری جہاز پر سفر کرنے والا جب تک سمندر میں رہے گا وہ حدود میقات کے پیچھے ہوگا اس کے برابر قطعاً نہیں ہوگا تا آنکہ جدہ پر جا کر نہ اترے کیونکہ جو خط یلملم اور جحفہ کو ملاتا ہے وہ سمندر کے قریب جدہ سے کچھ آگے مکہ مکرمہ کی جانب پڑتا ہے۔

٣ - بَابُ وُجُوهِ الإِحْرَامِ وَصِفَتُهُ — احرام کی اقسام اور صفت کا بیان

(٥٩٢) عَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهَا قَالَتْ: خَرَجْنَا مَعَ رَسُولِ اللهِ ﷺ عَامَ حَجَّةِ الوَدَاعِ، فَمِنَّا مَنْ أَهَلَّ بِعُمْرَةٍ، وَمِنَّا مَنْ أَهَلَّ بِحَجٍّ وعُمْرَةٍ، وَمِنَّا مَنْ أَهَلَّ بِحَجٍّ، وَأَهَلَّ رَسُولُ اللهِ ﷺ بِالحَجِّ، فَأَمَّا مَنْ أَهَلَّ بِعُمْرَةٍ فَحَلَّ عِنْدَ قُدُوْمِهِ، وَأَمَّا مَنْ أَهَلَّ بِحَجٍّ، أَوْ جَمَعَ بَيْنَ الحَجِّ وَالعُمْرَةِ، فَلَمْ يَحِلُّوْا حَتَّى كَانَ يَوْمُ النَّحْرِ. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ ہم رسول اللہ ﷺ کے ساتھ حجۃ الوداع کے سال نکلے، ہم میں سے بعض وہ تھے جنہوں نے عمرہ کیلئے تلبیہ کہا اور ہم میں سے کچھ وہ تھے جنہوں نے حج اور عمرہ کیلئے تلبیہ کہا اور ہم میں سے بعض وہ تھے جنہوں نے حج کیلئے لبیک پکارا اور رسول اللہ ﷺ نے صرف حج کا تلبیہ پکارا۔ پھر جنہوں نے عمرہ کیلئے لبیک کہا تھا وہ حلال ہوگئے اور جنہوں نے حج کیلئے لبیک کہا یا حج اور عمرہ کو جمع کیا تھا وہ حلال نہ ہوئے یہاں تک کہ قربانی کا دن ہوا۔ (بخاری و مسلم)

لغوی تشریح: ﴿باب وجوه الاحرام و صفته﴾ الوجوه وجه کی جمع ہے۔ اور اس سے اقسام احرام

مراد ہیں۔ اور وہ حج یا عمرہ یا دونوں ہیں اور صفتہ' سے مراد محرم کی وہ کیفیت ہے جسے وہ حالت احرام میں اختیار کرتا ہے۔ ﴿ خرجنا ﴾ ہم نکلے۔ حج کیلئے نبی کریم ﷺ کی معیت میں نکلنا ہفتہ کے روز نماز ظہر کے بعد تھا جبکہ ذی القعدہ کے پانچ دن ابھی باقی تھے۔ ﴿ حجۃ الوداع ﴾ حجۃ الوداع دس ہجری میں ہوا۔ آنحضرت ﷺ نے ہجرت کے بعد اس کے علاوہ اور کوئی حج نہیں کیا اور اسے حجۃ الوداع اس لئے کہتے ہیں کہ اس میں آپؐ نے لوگوں کو الوداع کہا تھا۔ ﴿ اهل بعمرۃ ﴾ یعنی صرف عمرہ کا احرام باندھا ایسے شخص کو متمتع کہتے ہیں۔ ﴿ اهل بحج وعمرۃ ﴾ حج و عمرہ دونوں کا احرام باندھا۔ ایسے شخص کو ''قارن'' کہتے ہیں اور جس نے صرف حج کیلئے احرام باندھا ہو اسے ﴿ مفرد ﴾ کہتے ہیں اور ﴿ الاهلال ﴾ بلند آواز کو کہتے ہیں اور اس سے مراد احرام باندھنے کے بعد بلند آواز سے تلبیہ کہنا ہے۔ ﴿ فحل ﴾ یعنی وہ حلال ہوگیا اور یہ تب ہوتا ہے جب بیت اللہ کے طواف اور صفا و مروہ کے مابین سعی کرنے کے بعد سر کے بال منڈوائے جاتے ہیں یا کٹوائے جاتے ہیں اور احرام کھول دیا جاتا ہے۔ ﴿ یوم النحر ﴾ نحر یعنی قربانی کا دن اور وہ دس ذی الحجہ ہوتا ہے۔ اس حدیث سے معلوم ہوا کہ آنحضرت ﷺ نے تنہا حج کا احرام باندھا تھا یعنی حج مفرد کیا تھا لیکن دوسرے بہت سے دلائل سے ثابت ہوتا ہے کہ آپؐ قارن تھے اور حج و عمرہ کا اکٹھا احرام باندھا تھا اور یہی بات صحیح ہے اور اقسام حج میں یہی قسم سب سے افضل ہے جس کی تفصیل دو بڑی بڑی شروح احادیث میں موجود ہے اور جو شخص ''مفرد'' ہوتا ہے تو وہ صرف قربانی کے دن ہی حلال ہوتا ہے۔ پھر یہ حدیث صحیح بخاری و مسلم کی ان روایات کے بھی مخالف ہے جن میں آپؐ نے جن صحابہ کرامؓ کے پاس ھدی یعنی قربانی نہ تھی انہیں فرمایا تھا کہ تم حج کو عمرہ بنالو۔ عمرہ کو مکمل کر کے حج کا احرام مکہ سے باندھ لو۔ اسی لئے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی یہ روایت دراصل ان صحابہ کرامؓ کے متعلق ہے جن کے پاس قربانی تھی۔

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ حج کی تین قسمیں ہیں۔ حج قران' حج تمتع' حج افراد۔ ان تینوں میں سے افضل کونسا حج ہے؟ عموماً اہل حدیث اور احناف حج قران کو افضل قرار دیتے ہیں کہ اللہ سبحانہ و تعالیٰ نے اپنے حبیب حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کیلئے یہی حج پسند کیا۔ اس میں مشقت بھی زیادہ اٹھانی پڑتی ہے۔ علامہ ابن قیم رحمہ اللہ نے زاد المعاد میں اس پر نفیس بحث کی ہے۔ مگر امام احمد رحمہ اللہ' امام مالک رحمہ اللہ وغیرہ حج تمتع کو افضل کہتے ہیں کہ اس میں سہولت ہے اور آنحضرت ﷺ نے ایک مرحلہ پر اس کی خواہش کا اظہار فرمایا تھا۔ علامہ شوکانی رحمہ اللہ کی یہی رائے ہے اور بعض حضرات حج افرا کو افضل قرار دیتے ہیں مگر پہلا قول ہی دلائل کے اعتبار سے بوجوہ راجح ہے۔

٤ - بَابُ الإِحْرَامِ وَمَا يَتَعَلَّقُ بِهِ. احرام اور اس کے متعلقہ امور کا بیان

(٥٩٣) عَنِ ابْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُمَا قَالَ: مَا أَهَلَّ رَسُولُ اللہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے نہیں لبیک پکارا مگر صرف مسجد کے

اللهِ ﷺ إلاَّ مِنْ عِنْدِ الْمَسْجِدِ. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ پاس۔ (بخاری و مسلم)

لغوی تشریح: ﴿ باب الاحرام ﴾ احرام کا باب' یہ حج یا عمرہ میں داخل ہونے کا نام ہے۔ "احرام" اس لئے کہا جاتا ہے کہ اس میں داخل ہو جانے والے پر بہت سی چیزیں حرام ہو جاتی ہیں جو اس سے پہلے حلال تھیں۔ ﴿ الامن عند المسجد ﴾ مگر صرف مسجد کے پاس۔

حاصل کلام: مسجد سے مسجد ذوالحلیفہ مراد ہے۔ جس وقت آپؐ اپنی اونٹنی پر سیدھے کھڑے ہوئے تھے یہ بات حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے ان حضرات کی غلط فہمی کا ازالہ کرنے کے لیے کہی ہے جو کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے "بیداء" کے مقام سے احرام باندھا تھا۔ احادیث میں منقول ہے کہ آپؐ نے تین بار لبیک پکارا تھا۔ جب آپؐ نے دو رکعات پڑھ لی تھیں۔ یعنی آپؐ مسجد کے اندر ہی تھے کہ آپؐ نے لبیک کہا اور یہ بھی منقول ہے کہ جب آپؐ "بیداء" کی چوٹی پر چڑھے تو آپؐ نے لبیک کہا۔ یہ احادیث بظاہر آپس میں متعارض ہیں مگر ان میں یوں تطبیق دی گئی ہے کہ آپؐ نے احرام تو مسجد کے اندر ہی باندھا اور جنہوں نے وہاں آپؐ کے احرام کا مشاہدہ کیا انہوں نے اسی کا ذکر کیا اور جب آپؐ مسجد سے باہر تشریف لائے اور اپنی اونٹنی پر سوار ہو کر باواز بلند لبیک کہا تو باہر دیکھنے والوں نے سمجھا کہ اب آپؐ نے احرام باندھا ہے۔ پھر جب بیداء پر پہنچے اور لبیک کہا تو جن حضرات نے وہاں لبیک کہتے سنا تو انہوں نے سمجھا کہ آپؐ نے یہاں سے احرام باندھا ہے گویا ہر فریق نے اپنے مشاہدہ کے مطابق خبر دی۔ اس لئے ان روایات میں کوئی تناقض نہیں۔

(٥٩٤) وَعَنْ خَلاَّدِ بْنِ السَّائِبِ، عَنْ أَبِيهِ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، أَنَّ رَسُولَ اللهِ ﷺ قَالَ: «أَتَانِي جِبْرِيلُ، فَأَمَرَنِي أَنْ آمُرَ أَصْحَابِي، أَنْ يَرْفَعُوا أَصْوَاتَهُمْ بِالإِهْلاَلِ». رَوَاهُ الخَمْسَةُ، وَصَحَّحَهُ التِّرْمِذِيُّ وَابْنُ حِبَّانَ.

خلاد بن سائب اپنے باپ سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ "جبرئیل علیہ السلام میرے پاس آئے اور مجھے حکم دیا کہ میں اپنے صحابہؓ کو حکم دوں کہ لبیک کہتے ہوئے اپنی آوازوں کو بلند کریں۔" (اسے پانچوں نے روایت کیا ہے۔ امام ترمذی اور امام ابن حبان نے اسے صحیح کہا ہے)

حاصل کلام: یہ حدیث صریح دلیل ہے کہ بلند آواز سے لبیک کہنی چاہئے۔ مصنف ابن ابی شیبہ میں ہے کہ صحابہ کرامؓ اس قدر اونچی آواز سے تلبیہ کہتے کہ ان کا گلا بیٹھ جاتا۔ جمہور علماء کرامؒ کی یہی رائے ہے۔ مگر امام مالک رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ بلند آواز سے تلبیہ صرف مسجد منیٰ اور مسجد حرام کے پاس کہنا چاہئے۔ (السبل)

راوی حدیث: ﴿ خلاد ﴾ کی خاء پر زبر اور لام مشدد۔ یہ خلاد بن سائب بن خلاد بن سوید انصاری خزرجی ہیں۔ ثقہ تابعیؒ ہیں جنہوں نے انہیں صحابی کہا انہیں وہم ہوا۔

﴿ ابیہ ﴾ ان کے والد سائب رضی اللہ عنہ مشہور صحابی ہیں۔ ان کی کنیت ابوسلمہ ہے۔ اور وہ بدر میں شہید

ہوئے۔ خلاد عہد معاویہ رضی اللہ عنہ میں یمن کے گورنر بنے۔ بعض نے کہا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے انہیں یمن کا عامل مقرر کیا اور ۷۱ھ میں فوت ہوئے۔

(۵۹۵) وَعَنْ زَيْدِ بْنِ ثَابِتٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ تَجَرَّدَ لِإِهْلاَلِهِ، وَاغْتَسَلَ. رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ، وَحَسَّنَهُ.

حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے احرام باندھنے کے وقت کپڑے اتارے اور غسل کیا۔ (اسے ترمذی نے روایت کیا ہے اور اسے حسن کہا ہے)

حاصل کلام: امام ترمذی رحمہ اللہ نے گو اس حدیث کو حسن کہا ہے مگر امام عقیلی رحمہ اللہ نے اسے ضعیف قرار دیا ہے لیکن اس بارے میں متعدد احادیث مروی ہیں اس لئے احرام کے وقت غسل کرنا مسنون ہے۔

(۵۹۶) وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا، أَنَّ رَسُولَ اللهِ سُئِلَ مَا يَلْبَسُ الْمُحْرِمُ مِنَ الثِّيَابِ؟ قَالَ: «لاَ يَلْبَسُ الْقَمِيصَ، وَلاَ الْعَمَائِمَ، وَلاَ السَّرَاوِيلاَتِ، وَلاَ الْبَرَانِسَ، وَلاَ الْخِفَافَ، إِلاَّ أَحَدٌ لاَ يَجِدُ نَعْلَيْنِ فَلْيَلْبَسِ الْخُفَّيْنِ، وَلْيَقْطَعْهُمَا أَسْفَلَ مِنَ الْكَعْبَيْنِ، وَلاَ تَلْبَسُوا شَيْئاً مِنَ الثِّيَابِ مَسَّهُ الزَّعْفَرَانُ، وَلاَ الْوَرْسُ». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ، وَاللَّفْظُ لِمُسْلِمٍ.

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ سے پوچھا گیا: احرام باندھنے والا کیا لباس پہنے؟ آپؐ نے فرمایا "وہ قمیص، پگڑی، شلوار و پاجامہ، کنٹوپ اور موزے نہ پہنے۔ لیکن اگر کسی شخص کے پاس جوتے نہیں تو وہ موزے پہن لے اور اسے چاہئے کہ دونوں کو ٹخنوں کے نیچے سے کاٹ لے اور ایسا کوئی کپڑا نہ پہنے جسے زعفران اور کیسو (ایک زرد رنگ کی خوشبو دار بوٹی) لگا ہوا ہو۔" (بخاری و مسلم اور یہ الفاظ مسلم کے ہیں)

لغوی تشریح: ﴿العمائم﴾ یہ عمامہ کی جمع ہے جو سر پر لپیٹا جاتا ہے اور ﴿السراویل﴾ چادر کی جگہ ٹانگوں میں پہنی جاتی ہے۔ جس کے دو حصے ہوتے ہیں۔ ﴿البرانس﴾ یہ برنس کی جمع ہے باء اور نون پر ضمہ اور راء ساکن ہے۔ یہ ہر اس کپڑے کو کہتے ہیں جس کا کچھ حصہ ٹوپی وغیرہ پر مشتمل ہو اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس سے مراد وہ لمبی ٹوپی ہے جو ابتدائے اسلام میں حج کرنے والے پہنتے تھے۔ ﴿الخفاف﴾ خاء کے نیچے زیر۔ خف کی جمع ہے یعنی موزے۔ ﴿من الکعبین﴾ کہ انہیں ٹخنوں کے نیچے سے کاٹ دے تاکہ وہ جوتے کے حکم میں ہو جائیں اور اس سے مقصود یہ ہے کہ احرام کے دوران ٹخنے ننگے رہیں اور "کعب" سے مراد وہ ابھری ہوئی دو ہڈیاں ہیں جو پاؤں اور پنڈلی کے جوڑ کے قریب دائیں بائیں ہوتی ہیں۔ ﴿الورس﴾ واؤ پر زبر اور راء ساکن زرد رنگ کی خوشبودار گھاس جس میں کپڑے رنگے جاتے ہیں۔ زعفران اور ورس کے رنگ سے رنگے ہوئے لباس کی ممانعت اس لئے ہے کہ ان میں خوشبو ہوتی ہے۔

حاصل کلام: اس حدیث سے ثابت ہوا کہ احرام باندھنے کیلئے قمیص' پاجامہ' شلوار' ٹوپی اور موزے پہننا درست نہیں۔ جوتا اگر میسر نہ ہو اور صرف موزے ہوں تو انہیں ٹخنوں کے نیچے سے کاٹ لینے کا حکم ہے۔ فقہاء کے مابین اس بارے میں اختلاف ہے۔ امام احمد رحمۃ اللہ علیہ موزے پہننے کو جائز قرار دیتے ہیں اور ابن عباس رضی اللہ عنہما کی حدیث سے استدلال کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ ابن عمر رضی اللہ عنہما کی حدیث میں موزوں کو کاٹنے کا حکم منسوخ ہے کیونکہ ابن عمر رضی اللہ عنہما کی حدیث ابتداء احرام کے وقت تھی اور ابن عباس رضی اللہ عنہما کی حدیث میں کاٹنے کا حکم نہیں اور یہ حکم آپؐ نے عرفات میں بیان فرمایا تھا۔ اس لئے کاٹنے کا حکم منسوخ ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ کاٹنے کا حکم اس حدیث سے واجب نہیں رہا۔ مگر جمہور علماء کاٹنے کے قائل ہیں اور وہ ابن عباس رضی اللہ عنہما کی مطلق روایت کو مقید پر محمول کرتے ہیں۔ امام ابن قدامہ (صاحب المغنی) نے کہا ہے کہ بہتر یہی ہے کہ حدیث پر عمل کرتے ہوئے موزوں کو ٹخنوں کے نیچے سے کاٹ لیا جائے تاکہ اختلاف سے بچ نکلے۔ اسی طرح شلوار کے بارے میں بھی امام احمد رحمۃ اللہ علیہ اور اکثر شوافع اس کو چادر نہ ہونے کی صورت میں مطلقاً پہننے کے قائل ہیں اور ان کا استدلال بھی ابن عباس رضی اللہ عنہما کی حدیث سے ہے۔ جبکہ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اور امام مالک رحمۃ اللہ علیہ اس کے قطعاً قائل نہیں۔ البتہ امام محمد بن حسن شیبانی اور بعض شوافع کا کہنا ہے کہ اگر چادر میسر نہ ہو تو شلوار کو پھاڑ کر چادر نما بنا کر پہننا جائز ہے۔ مگر ان کا یہ قول محض قیاس پر مبنی ہے جس پر کوئی نص نہیں۔ اس لئے شلوار کے بارے میں صحیح موقف امام احمد رحمۃ اللہ علیہ وغیرہ ہی کا معلوم ہوتا ہے کہ چادر نہ ہونے کی بنا پر احرام میں شلوار پہننا جائز ہے۔ نیز اس روایت سے یہ بھی معلوم ہوا کہ زعفران اور ورس سے رنگا ہوا لباس بھی احرام میں جائز نہیں۔ یہ ممانعت رنگ کی وجہ سے نہیں بلکہ خوشبو کی وجہ سے ہے کیونکہ احرام کے بعد خوشبو لگانا بالاتفاق حرام ہے۔ البتہ اگر اسے دھو کر اس کی خوشبو زائل کر دی جائے تب جائز ہے۔

(۵۹۷) وَعَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهَا قَالَتْ: كُنْتُ أُطَيِّبُ رَسُولَ اللهِ ﷺ لِإِحْرَامِهِ قَبْلَ أَنْ يُحْرِمَ، وَلِحِلِّهِ قَبْلَ أَن يَطُوفَ بِالْبَيْتِ . مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ احرام باندھنے سے پہلے میں رسول اللہ ﷺ کو احرام کے وقت اور احرام کھولنے کے وقت خوشبو لگاتی تھی۔ اس سے پہلے کہ آپؐ بیت اللہ کا طواف کریں۔ (بخاری و مسلم)

لغوی تشریح: ﴿ اطیب ﴾ یہ تطییب سے مضارع متکلم کا صیغہ ہے کہ اس میں خوشبو لگاتی تھی۔ ﴿ لاحرامہ ﴾ یعنی احرام پہننے سے پہلے۔ اس سے ثابت ہوا کہ احرام باندھنے سے پہلے خوشبو لگانا جائز ہے گو اس کی خوشبو حالت احرام میں بھی آتی رہے مگر احرام کی حالت میں خوشبو لگانا حرام ہے۔ ﴿ قبل ان یطوف بالبیت ﴾ بیت اللہ کے طواف سے پہلے' اس سے مراد طواف زیارت ہے جو دس ذی الحجہ کو رمی جمار' قربانی اور حلق یعنی سرمنڈوانے کے بعد کیا جاتا ہے۔

(۵۹۸) وَعَنْ عُثْمَانَ بْنِ عَفَّانَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُ، أَنَّ رَسُولَ اللهِ ﷺ قَالَ: «لاَ يَنْكِحُ الْمُحْرِمُ، وَلاَ يُنْكِحُ، وَلاَ يَخْطُبُ». رَوَاهُ مُسْلِمٌ.

حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "احرام والا نکاح نہ کرے اور نہ نکاح دے اور نہ منگنی کرے۔ (مسلم)

لغوی تشریح: ﴿ لا ینکح المحرم ﴾ یعنی خود نکاح نہ کرے ﴿ ولا ینکح ﴾ یہ پہلے نکاح سے ہے یعنی نہ کسی دوسرے کو نکاح دے۔ ﴿ ولا یخطب ﴾ یہ خطبہ خاء کی زیر سے ہے یعنی نہ منگنی کرے۔ نکاح کیلئے کسی عورت کا مطالبہ نہ کرے۔

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ احرام کی حالت میں خود نکاح کرنا یا کسی کو نکاح دینا کسی کو اپنے لئے یا کسی اور کیلئے شادی کا پیغام دینا ناجائز ہے اور ابن عباس رضی اللہ عنہما سے جو یہ مروی ہے کہ آنحضرت ﷺ نے حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا سے حالت احرام میں نکاح کیا تھا تو یہ محض وہم ہے۔ حافظ ابن قیم رحمہ اللہ نے زاد المعاد میں اس پر سیر حاصل بحث کی ہے۔

(۵۹۹) وَعَنْ أَبِي قَتَادَةَ الأَنْصَارِيِّ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُ - فِي قِصَّةِ صَيْدِهِ الحِمَارَ الوَحْشِيَّ وَهُوَ غَيْرُ مُحْرِمٍ - قَالَ: فَقَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ لِأَصْحَابِهِ - وَكَانُوا مُحْرِمِينَ -: هَلْ مِنْكُمْ أَحَدٌ أَمَرَهُ، أَوْ أَشَارَ إِلَيْهِ بِشَيْءٍ؟ قَالُوا: لاَ، قَالَ: «فَكُلُوا مَا بَقِيَ مِنْ لَحْمِهِ». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت ابو قتادہ انصاری رضی اللہ عنہ سے ان کے جنگلی گدھے کو شکار کرنے کے قصے میں جبکہ انہوں نے احرام نہیں باندھا تھا' مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اپنے صحابہ؆ سے فرمایا اور وہ احرام والے تھے "کیا تم میں سے کسی نے اسے حکم دیا تھا یا اس کی طرف کسی چیز سے اشارہ کیا تھا؟" انہوں نے کہا نہیں' آپ ؐ نے فرمایا "پس کھاؤ اس کے گوشت سے جو بچ گیا ہے۔" (بخاری و مسلم)

لغوی تشریح: ﴿ فی قصة الحمار الوحشی ﴾ جنگلی گدھے کو شکار کرنے کے قصہ میں' اس قصہ کی تفصیل یہ ہے کہ ابو قتادہ رضی اللہ عنہ رسول اللہ ﷺ کے ہمراہ کہیں نکلے تھے مگر اپنے چند ساتھیوں سمیت پیچھے رہ گئے۔ حضرت ابو قتادہ رضی اللہ عنہ نے احرام نہیں باندھا تھا مگر ان کے ساتھی احرام کی حالت میں تھے۔ انہوں نے جب وحشی گدھا دیکھا تو اسے نظر انداز کر دیا مگر جب ابو قتادہ رضی اللہ عنہ کی نظر اس پر پڑی تو وہ اپنے گھوڑے پر سوار ہوگئے اور ساتھیوں سے کہا کہ میری لاٹھی پکڑاؤ مگر انہوں نے اس سے انکار کر دیا۔ پھر ابو قتادہ رضی اللہ عنہ اس پر حملہ آور ہوئے اور اسے زخمی کر دیا۔ ذبح کر کے حضرت ابو قتادہ رضی اللہ عنہ نے بھی اس کا گوشت کھایا اور ان کے ساتھیوں نے بھی کھایا مگر پھر وہ پریشان ہوگئے۔ بالآخر جب وہ آنحضرت ﷺ سے جا ملے تو آپ ؐ نے یہ سارا ماجرہ عرض کیا جس کا جواب اس روایت میں مذکور ہے۔ یہ حدیث اس بات کی دلیل ہے کہ جنگلی جانور کا شکار جب غیر محرم کرے اور محرم نے اس سلسلے میں اس سے کوئی اعانت نہ کی ہو اور نہ ہی

اس بارے میں کوئی اشارہ کیا ہو تو محرم بھی اس سے کھا سکتا ہے مگر اس بارے میں مزید تفصیل ہے جو آئندہ حدیث کے تحت آ رہی ہے۔

(٦٠٠) وَعَنِ الصَّعْبِ بْنِ جَثَّامَةَ اللَّيْثِيِّ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، أَنَّهُ أَهْدَى لِرَسُولِ اللهِ ﷺ حِمَاراً وَحْشِياً، وَهُوَ بِالأَبْوَاءِ أَوْ بِوَدَّانَ، فَرَدَّهُ عَلَيْهِ، وَقَالَ: «**إِنَّا لَمْ نَرُدَّهُ عَلَيْكَ إِلاَّ أَنَّا حُرُمٌ**». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت صعب بن جثامہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ انہوں نے رسول اللہ ﷺ کو ایک وحشی گدھا بطور تحفہ بھیجا اور آپؐ "ابواء" یا "ودان" مقام پر تھے تو آپؐ نے وہ انہیں واپس کر دیا اور فرمایا کہ "ہم نے یہ اس لئے واپس کیا کہ ہم احرام والے ہیں۔" (بخاری و مسلم)

لغوی تشریح: ﴿حمارا وحشیا﴾ یعنی وحشی گدھے کا ایک ٹکڑا۔ کیونکہ صحیح مسلم میں اس کے گوشت اور گوشت کا کچھ حصہ کے الفاظ بھی ہیں۔ ملاحظہ ہو مسلم باب تحریم الصید للمحرم ﴿بالابواء﴾ الف پر زبر اور باء ساکن ہے۔ یہ مکہ مکرمہ اور مدینہ طیبہ کے مابین ایک پہاڑ کا نام ہے جس کے پاس ایک بستی آباد ہے اور وہ بستی بھی اسی کی طرف منسوب ہے۔ آنحضرت ﷺ کی والدہ کا انتقال اسی جگہ پر ہوا اس کے اور جحفہ کے مابین بیس یا تیس میل کی مسافت ہے۔ ﴿ودان﴾ واؤ پر زبر اور دال مشدد ہے۔ یہ ابواء کے قریب جگہ کا نام ہے۔ ﴿حرم﴾ حاء اور راء دونوں پر پیش ہے۔ یعنی ہم محرم ہیں۔ یہ حدیث بظاہر پہلی حدیث کے معارض ہے کیونکہ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ محرم کیلئے شکار کا گوشت حرام ہے گو اس کی اجازت یا اشارہ وغیرہ سے شکار نہ کیا گیا ہو مگر پہلی حدیث میں اس کی اجازت معلوم ہوتی ہے۔ ان دونوں کے درمیان تطبیق یہ دی گئی ہے کہ شکار جب محرم کیلئے کیا گیا ہو تو اس کا کھانا بھی محرم کیلئے حرام ہے گو اس نے اس کا اشارہ وغیرہ بھی نہ کیا ہو کیونکہ مسند امام احمد اور ابن ماجہ میں سند جید کے ساتھ حضرت ابو قتادہ رضی اللہ عنہ ہی کی حدیث میں مروی ہے کہ جب میں نے آپؐ نے عرض کیا کہ جناب یہ شکار میں نے آپؐ کیلئے کیا ہے تو آپؐ نے اس میں سے کچھ بھی تناول نہ فرمایا۔ اسی طرح ترمذی میں حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آپؐ نے فرمایا "حالت احرام میں زمین کا شکار تمہارے لئے حلال ہے بشرطیکہ تم نے اسے شکار نہ کیا ہو یا تمہارے لئے وہ شکار نہ کیا گیا ہو۔" جس سے معلوم ہوا کہ شکار جب محرم کے حکم سے یا اس کے اشارہ وغیرہ سے کیا گیا ہو یا شکار محرم کی ضیافت کیلئے کیا گیا ہو تو اس کیلئے اس کا کھانا ناجائز ہے۔ اگر یہ صورت نہ ہو تو محرم شکار کا گوشت کھا سکتا ہے۔

راوی حدیث: ﴿صعب رضی اللہ عنہ﴾ کی صاد پر زبر اور عین ساکن۔ بن ﴿جثامۃ﴾ جیم پر زبر اور "ثا" مشدد' اللیثی لیث قبیلہ سے تھے۔ ودان اور الابواء میں رہتے تھے۔ خلافت صدیقی میں ان کا انتقال ہوا مگر بعض کا قول ہے کہ خلافت عثمانؓ تک زندہ رہے۔

(٦٠١) وَعَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللَّهُ

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ رسول اللہ

تَعَالَى عَنْهَا، قَالَتْ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: خَمْسٌ مِنَ الدَّوَابِّ كُلُّهُنَّ فَوَاسِقُ، يُقْتَلْنَ فِي الحِلِّ وَالحَرَمِ: العَقْرَبُ، وَالحِدَأَةُ، وَالغُرَابُ، وَالفَأْرَةُ، وَالكَلْبُ العَقُورُ». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

ﷺ نے فرمایا "جانوروں میں سے پانچ سب کے سب شریر ہیں۔ حل اور حرم (سب جگہوں پر) مار دیئے جائیں اور وہ ہیں بچھو' چیل' کوا' چوہا اور کاٹ کھانے والا کتا۔" (بخاری و مسلم)

لغوی تشریح: ﴿ الدواب ﴾ باء پر شد ہے اور دابة کی جمع ہے۔ ہر اس جانور کو کہتے ہیں جو زمین پر چلتا ہے پھر عموماً اس کا استعمال چوپائے جانوروں پر ہونے لگا۔ ﴿ فواسق ﴾ فاسقة کی جمع اور ان کا فسق اور شران کی خباثت اور کثرت نقصان کی بنا پر ہے۔ ﴿ الحداة ﴾ حاء کی کسرہ کے ساتھ "عنبة" کے وزن پر وہ خبیث جانور جسے چیل کہتے ہیں۔ ﴿ العقرب ﴾ یعنی بچھو اور اس میں سانپ بالاولیٰ شامل ہے۔ ﴿ والکلب العقور ﴾ عین پر زبر ﴿ عقر ﴾ سے ہے جس کے معنی قتل کرنا اور زخمی کرنا ہیں اور اس سے مراد ہر چیرنے پھاڑنے والا درندہ مراد ہے۔ جیسے شیر' چیتا بھیڑیا وغیرہ۔

(٦٠٢) وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ احْتَجَمَ وَهُوَ مُحْرِمٌ. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ بے شک نبی ﷺ نے سینگی لگوائی جب کہ آپؐ احرام کی حالت میں تھے۔ (بخاری و مسلم)

(٦٠٣) وَعَنْ كَعْبِ بْنِ عُجْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: حُمِلْتُ إِلَى رَسُولِ اللهِ ﷺ وَالقَمْلُ يَتَنَاثَرُ عَلَى وَجْهِي، فَقَالَ: «مَا كُنْتُ أُرَى الوَجَعَ بَلَغَ بِكَ مَا أَرَى، أَتَجِدُ شَاةً؟» قُلْتُ: لاَ، قَالَ: «فَصُمْ ثَلاَثَةَ أَيَّامٍ، أَوْ أَطْعِمْ سِتَّةَ مَسَاكِينَ، لِكُلِّ مِسْكِيْنٍ نِصْفُ صَاعٍ». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت کعب بن عجرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ مجھے رسول اللہ ﷺ کے پاس اٹھا کر لایا گیا اور جوئیں میرے چہرے پر گر رہی تھیں۔ آپؐ نے فرمایا "میرا یہ خیال نہ تھا کہ تم کو بیماری نے اس حالت کو پہنچا دیا ہو گا جو میں دیکھ رہا ہوں' کیا تیرے پاس بکری ہے؟" میں نے عرض کیا کہ: نہیں۔ آپؐ نے فرمایا "تین دن روزہ رکھ یا چھ مسکینوں کو آدھا صاع ہر مسکین کے حساب سے کھانا دے۔" (بخاری و مسلم)

لغوی تشریح: ﴿ حملت ﴾ صیغۂ مجہول ہے یعنی مجھے اٹھا کر لایا گیا۔ ﴿ القمل ﴾ قاف پر زبر اور میم ساکن جنہیں جوئیں کہتے ہیں۔ ﴿ یتناثر ﴾ یعنی کثرت کی وجہ سے وہ سر سے میرے منہ پر گر رہی تھیں اور حضرت کعب رضی اللہ عنہ انہیں مارتے نہیں تھے کیونکہ وہ محرم تھے۔ "ما کنت اری" اری کے ہمزہ پر پیش صیغۂ مجہول کی وجہ سے یعنی مجھے یہ گمان نہ تھا۔ ﴿ الوجع ﴾ یعنی تکلیف ﴿ ما اری ﴾ ہمزہ پر زبر۔ دیکھنے کے معنی میں۔ یعنی جو میں دیکھ رہا ہوں۔ ﴿ اتجد شاۃ ﴾ یعنی حضرت کعب رضی اللہ عنہ کی یہ حالت دیکھ کر آپؐ نے انہیں سر منڈوانے کا حکم دیا اور اس کے کفارہ کے طور پر ایک بکری ذبح کرنے یا تین دن کا روزہ رکھنے

کا یا چھ مساکین کو کھانا کھلانے کا حکم دیا۔

راوی حدیث: ﴿کعب بن عجرہ رضی اللہ عنہ﴾ عجرہ کے عین پر پیش اور جیم ساکن' یہ جلیل القدر صحابی قبیلہ "البلی" سے تعلق رکھتے تھے جو انصار کا حلیف تھا۔ کوفہ چلے گئے تھے بالآخر مدینہ طیبہ میں ۵۱ھ میں ۷۵ سال کی عمر میں وفات پائی۔

(٦٠٤) وَعَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: لَمَّا فَتَحَ اللَّهُ عَلَى رَسُولِهِ مَكَّةَ، قَامَ رَسُولُ اللهِ ﷺ فِي النَّاسِ، فَحَمِدَ اللَّهَ، وَأَثْنَى عَلَيْهِ، ثُمَّ قَالَ: «إِنَّ اللَّهَ تَعَالَى حَبَسَ عَنْ مَكَّةَ الفِيلَ، وَسَلَّطَ عَلَيْهَا رَسُولَهُ وَالمُؤْمِنِينَ، وَإِنَّهَا لَمْ تَحِلَّ لِأَحَدٍ كَانَ قَبْلِي، وَإِنَّمَا أُحِلَّتْ لِي سَاعَةً مِنْ نَهَارٍ، وَإِنَّهَا لَنْ تَحِلَّ لِأَحَدٍ بَعْدِي، فَلاَ يُنَفَّرُ صَيْدُهَا، وَلاَ يُخْتَلَى شَوْكُهَا، وَلاَ يَحِلُّ سَاقِطَتُهَا إِلاَّ لِمُنْشِدٍ. وَمَنْ قُتِلَ لَهُ قَتِيلٌ فَهُوَ بِخَيْرِ النَّظَرَيْنِ»، فَقَالَ العَبَّاسُ: إِلاَّ الإِذْخِرَ، يَا رَسُولَ اللهِ! فَإِنَّا نَجْعَلُهُ فِي قُبُورِنَا وَبُيُوتِنَا، فَقَالَ: «إِلاَّ الإِذْخِرَ». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول ﷺ کو مکہ کی فتح دی تو رسول اللہ ﷺ لوگوں کے درمیان کھڑے ہوئے پھر اللہ کی حمد و ثنا بیان کی اور فرمایا "بے شک اللہ تعالیٰ نے ہاتھیوں کو مکہ سے روک دیا مگر اپنے رسول (ﷺ) اور مومنوں کو اس پر غلبہ عطا فرمایا اور تحقیق مجھ سے پہلے مکہ کسی پر حلال نہ تھا مگر میرے لئے دن کی ایک گھڑی حلال کر دیا گیا ہے اور یقیناً میرے بعد یہ کسی کیلئے حلال نہیں ہوگا یعنی نہ اس کا شکار بھگایا جائے' نہ اس کا کوئی کانٹے دار درخت کاٹا جائے اور نہ ہی اس کی گری ہوئی چیز سوائے شناخت کرنے والے کے کسی پر حلال ہے اور جس کا کوئی آدمی مارا جائے وہ دو بہتر سوچے ہوئے کاموں میں سے ایک کام میں اختیار رکھتا ہے۔" تو حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے عرض کیا : یارسول اللہ (ﷺ)! اذخر (ایک قسم کی گھاس) کے سوا' کیونکہ اسے ہم اپنی قبروں اور چھتوں میں رکھتے ہیں۔ تو آپؐ نے فرمایا "سوائے اذخر کے' (یعنی اسے کاٹنے کی اجازت ہے۔)" (بخاری و مسلم)

لغوی تشریح: ﴿حبس﴾ یعنی روکا اور منع کیا۔ ﴿الفیل﴾ ہاتھی جسے ابرہہ اور اس کا لشکر بیت اللہ کو گرانے کیلئے لے کر آیا تھا۔ جس کا قصہ مشہور و معروف ہے۔ "وسلط" یہ تسلیط سے ہے یعنی غلبہ کے معنی میں ﴿ساعۃ من نہار﴾ دن کی ایک گھڑی اور اس سے بیت اللہ میں داخل ہونے سے عصر تک کا وقت مراد ہے۔ ﴿لاینفر﴾ صیغہ مجہول تنفیر سے ہے یعنی بھگایا نہ جائے ﴿ولا یختلی﴾ یہ بھی صیغہ مجہول ہے یعنی نہ کاٹا جائے۔ ﴿ساقطتہا﴾ یعنی اس کی گری پڑی چیز۔ ﴿الا لمنشد﴾ یہ انشاد

سے ہے یعنی اس کی گری پڑی چیز کھانے یا قبضہ کرنے کی نیت سے نہ اٹھائی جائے البتہ اس کو اس نیت سے اٹھانا جائز ہے کہ اسے لوگوں میں متعارف کرایا جائے تاآنکہ اس کا مالک مل جائے اور وہ اسے حاصل کرے۔ ﴿قتیل﴾ یعنی مقتول۔ ﴿فھو﴾ یعنی مقتول کا ولی۔ ﴿بخیر النظرین﴾ یعنی ولی کو دو میں سے کسی ایک کو اختیار کرنے کا حق ہے' چاہے تو قصاص لے یا دیت وصول کرے۔ ﴿الا الاذخر﴾ یعنی آپؐ یہ فرمائیں "الا الاذخر" اذخر کے سوا کہ اس کو کاٹنے کی اجازت ہے۔ اذخر کے همزہ اور خاء کے نیچے زیر ہے اور ذال ساکن۔ یہ لمبے پتوں والی خوشبو دار گھاس ہے جسے گھروں کی چھتوں میں لکڑیوں کے اوپر رکھا جاتا تھا اور قبروں کو بند کرنے میں بھی اس کا استعمال ہوتا تھا۔ مکہ مکرمہ کی حرمت کا مفہوم یہ ہے کہ اس میں بسنے والوں کو قتل کرنا حرام ہے جو اس میں داخل ہوگیا اسے گویا امن مل گیا۔ اس کا شکار اور اس کے درخت اور جڑی بوٹی کاٹنا حرام ہیں۔ اس میں گری پڑی چیز اپنے استعمال کیلئے اٹھانی حرام ہے۔

(٦٠٥) وَعَنْ عَبْدِ اللهِ بْنِ زَيْدِ بْنِ عَاصِمٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، أَنَّ رَسُولَ اللهِ ﷺ قَالَ: «إِنَّ إِبْرَاهِيمَ حَرَّمَ مَكَّةَ، وَدَعَا لِأَهْلِهَا، وَإِنِّي حَرَّمْتُ المَدِينَةَ، كَمَا حَرَّمَ إِبْرَاهِيمُ مَكَّةَ؛ وَإِنِّي دَعَوْتُ فِي صَاعِهَا وَمُدِّهَا بِمِثْلِ مَا دَعَا بِهِ إِبْرَاهِيمُ لِأَهْلِ مَكَّةَ». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت عبداللہ بن زید بن عاصم رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "تحقیق ابراھیم علیہ السلام نے مکہ کو حرمت دی اور اس کے بسنے والوں کیلئے دعا کی اور بے شک میں نے مدینہ کو حرمت دی۔ جس طرح ابراھیم علیہ السلام نے مکہ کو حرام قرار دیا اور یقیناً میں نے مدینہ کے صاع اور اس کے مد کے متعلق ابراھیم علیہ السلام کی طرح دعا کی جو مکہ میں بسنے والوں کے متعلق تھی۔"

(بخاری و مسلم)

لغوی تشریح: ﴿حرم مکۃ﴾ یہ تحریم سے ہے یعنی اس کو حرم بنایا اور مدینہ طیبہ کی تحریم کا مفہوم یہ ہے کہ اس کا شکار حرام ہے۔ اس کے درخت کاٹنے حرام ہیں اور وہاں بدعات کا ارتکاب حرام ہے۔

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ مکہ مکرمہ کی طرح مدینہ طیبہ بھی حرم ہے اور ابراھیم علیہ السلام نے مکہ کو حرمت دی کا مفہوم یہ ہے کہ دعا سے اسے حرمت دی گئی کیونکہ ایک روایت میں ہے کہ ان اللہ حرم مکۃ کہ اللہ نے مکہ کو حرام قرار دیا ہے۔

(٦٠٦) وَعَنْ عَلِيِّ بْنِ أَبِي طَالِبٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «المَدِينَةُ حَرَامٌ مَا بَيْنَ عَيْرٍ إِلَى ثَوْرٍ». رَوَاهُ مُسْلِمٌ.

حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "مدینہ حرم ہے عیر سے ثور کے درمیان۔" (مسلم)

لغوی تشریح: ﴿عیر﴾ عین کے نیچے زیر اور یاء ساکن۔ یہ مدینہ طیبہ کے جنوب میں پہاڑ کا نام ہے جس

کے جنوب مغرب میں قباء واقع ہے ﴿ ثور ﴾ ثاء پر زبر' واؤ ساکن' یہ چھوٹا سا گول پہاڑ ہے جو مدینہ طیبہ کے شمال میں جبل احد کے پیچھے واقع ہے۔ ایک روایت میں ہے "مابین عیر واحد" کہ عیر اور احد کے درمیان یعنی ثور کی جگہ جبل احد کا ذکر ہے مگر دونوں میں کوئی جوہری فرق نہیں۔ احد اور ثور قریب قریب ہیں۔ جبل ثور مکہ مکرمہ میں بھی ہے۔ اس میں ہجرت کے موقعہ پر آپؐ چھپے تھے اور اس کا ذکر قرآن پاک کی اس آیت میں بھی ہے "اذهما فی الغار" یہاں سے یہ جبل ثور نہیں بلکہ مدینہ طیبہ کا جبل ثور مراد ہے۔ اس حدیث سے شمالاً جنوباً حرم مدینہ کی تحدید معلوم ہوتی ہے۔ شرقاً غرباً اس کی تحدید کے متعلق مروی ہے کہ "انها حرام مابین لابتيها" کہ دو حروں کے درمیان جو کچھ ہے حرام ہے اور اس سے مراد ایک "حرۂ و برہ" ہے جو مدینہ طیبہ کے مغرب میں ہے اور دوسرا حرۂ واقم جو مدینہ طیبہ کے مشرق میں ہے یوں چاروں سمت حرم مدینہ کی تحدید واضح ہو جاتی ہے۔

٥ - بَابُ صِفَةِ الحَجِّ وَدُخُولِ مَكَّةَ حج کا طریقہ اور مکہ میں داخل ہونے کا بیان

(٦٠٧) عَنْ جَابِرِ بْنِ عَبْدِ اللهِ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا، أَنَّ رَسُولَ اللهِ ﷺ حَجَّ، فَخَرَجْنَا مَعَهُ، حَتَّى إِذَا أَتَيْنَا ذَا الحُلَيْفَةِ فَوَلَدَتْ أَسْمَاءُ بِنْتُ عُمَيْسٍ، فَقَالَ: «اغْتَسِلِي، وَاسْتَثْفِرِي بِثَوْبٍ، وَأَحْرِمِي»، وَصَلَّى رَسُولُ اللهِ ﷺ فِي المَسْجِدِ، ثُمَّ رَكِبَ القَصْوَاءَ، حَتَّى إِذَا اسْتَوَتْ بِهِ عَلَى البَيْدَاءِ، أَهَلَّ بِالتَّوْحِيدِ: «لَبَّيْكَ اللَّهُمَّ لَبَّيْكَ، لاَ شَرِيكَ لَكَ، لَبَّيْكَ، إِنَّ الحَمْدَ وَالنِّعْمَةَ لَكَ وَالمُلْكَ، لاَ شَرِيكَ لَكَ»، حَتَّى إِذَا أَتَيْنَا البَيْتَ اسْتَلَمَ الرُّكْنَ، فَرَمَلَ ثَلاَثاً، وَمَشَى أَرْبَعاً، ثُمَّ أَتَى مَقَامَ إِبْرَاهِيمَ فَصَلَّى، ثُمَّ رَجَعَ إِلَى

حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے حج کیا تو ہم آپؐ کے ساتھ نکلے یہاں تک کہ ہم ذوالحلیفہ پہنچے تو اسماء بنت عمیس رضی اللہ عنہا نے بچہ جنا۔ آپؐ نے فرمایا "غسل کر اور کسی کپڑے سے لنگوٹ باندھ لے اور احرام باندھ لے۔" رسول اللہ ﷺ نے مسجد میں نماز پڑھی اور قصواء (آپؐ کی اونٹنی کا نام) پر سوار ہو گئے یہاں تک کہ جب آپؐ بیداء کے برابر آئے تو آپؐ نے توحیدی تلبیہ پکارا "حاضر ہوں' اے میرے اللہ! میں حاضر ہوں' تیرا کوئی شریک نہیں' میں حاضر ہوں' بلاشک سب تعریفیں اور انعامات تیرے ہیں۔ بادشاہت بھی تیری ہے' تیرا کوئی شریک نہیں۔" یہاں تک کہ ہم بیت اللہ میں داخل ہوئے۔ رکن (اسود) کو آپؐ نے بوسہ دیا' تین بار رمل کیا اور چار بار معمول کے مطابق چلے۔ پھر آپؐ مقام ابراھیم پر

الرُّكْنِ، فَاسْتَلَمَهُ، ثُمَّ خَرَجَ مِنَ البَابِ إِلَى الصَّفَا، فَلَمَّا دَنَا مِنَ الصَّفَا، قَرَأَ ﴿إِنَّ الصَّفَا وَالمَرْوَةَ مِنْ شَعَائِرِ اللهِ﴾ «أَبْدَأُ بِمَا بَدَأَ اللَّهُ بِهِ»، فَرَقِيَ الصَّفَا حَتَّى رَأَى البَيْتَ، فَاسْتَقْبَلَ القِبْلَةَ، فَوَحَّدَ اللَّهَ، وَكَبَّرَهُ، وَقَالَ: «لاَ إِلَهَ إِلاَّ اللَّهُ، وَحْدَهُ، لاَ شَرِيكَ لَهُ، لَهُ المُلْكُ، وَلَهُ الحَمْدُ، وَهُوَ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ، لاَ إِلَهَ إِلاَّ اللَّهُ، أَنْجَزَ وَعْدَهُ، وَنَصَرَ عَبْدَهُ، وَهَزَمَ الأَحْزَابَ وَحْدَهُ»، ثُمَّ دَعَا بَيْنَ ذٰلِكَ قَالَ مِثْلَ هٰذَا ثَلاَثَ مَرَّاتٍ، ثُمَّ نَزَلَ مِنَ الصَّفَا إِلَى المَرْوَةِ، حَتَّى إِذَا انْصَبَّتْ قَدَمَاهُ فِيْ بَطْنِ الوَادِيْ سَعَى، حَتَّى إِذَا صَعِدَ مَشَى إِلَى المَرْوَةِ، فَفَعَلَ عَلَى المَرْوَةِ كَمَا فَعَلَ عَلَى الصَّفَا، فَذَكَرَ الحَدِيْثَ، وَفِيْهِ: فَلَمَّا كَانَ يَوْمُ التَّرْوِيَةِ تَوَجَّهُوا إِلَى مِنًى، وَرَكِبَ النَّبِيُّ ﷺ، فَصَلَّى بِهَا الظُّهْرَ وَالعَصْرَ وَالمَغْرِبَ وَالعِشَاءَ وَالفَجْرَ، ثُمَّ مَكَثَ قَلِيْلاً حَتَّى طَلَعَتِ الشَّمْسُ، فَأَجَازَ حَتَّى أَتَى عَرَفَةَ، فَوَجَدَ القُبَّةَ قَدْ ضُرِبَتْ لَهُ بِنَمِرَةَ، فَنَزَلَ بِهَا، حَتَّى إِذَا زَالَتِ الشَّمْسُ أَمَرَ بِالقَصْوَاءِ فَرُحِلَتْ لَهُ، فَأَتَى بَطْنَ الوَادِيْ، فَخَطَبَ النَّاسَ، ثُمَّ أَذَّنَ، ثُمَّ أَقَامَ، فَصَلَّى الظُّهْرَ،

آئے اور نماز پڑھی پھر رکن (حجر اسود) کی طرف واپس آئے اور اس کو بوسہ دیا۔ پھر مسجد حرام کے دروازہ سے صفا کی طرف نکلے جب صفا کے نزدیک پہنچے تو یہ آیت پڑھی۔ ''تحقیق صفا اور مروہ اللہ تعالیٰ کی نشانیوں میں سے ہیں۔'' (پھر فرمایا) ''میں شروع کرتا ہوں (سعی کو) اس مقام سے کہ جہاں سے اللہ نے شروع کیا ہے۔'' پھر صفا پر چڑھے۔ یہاں تک کہ آپؐ نے بیت اللہ کو دیکھا۔ پھر قبلہ رخ ہوئے اور اللہ کی وحدانیت اور کبریائی بیان کی اور کہا'' اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں وہ اکیلا ہے کوئی اس کا شریک نہیں۔ بادشاہی اور سب خوبیاں اسی کی ہیں اور وہ ہر چیز پر قادر ہے اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں۔ اس نے اپنا وعدہ پورا کر دیا اور اپنے بندے کی مدد کی اور کفار کی جماعت کو اکیلے اسی نے شکست دی۔'' پھر اس کے درمیان تین بار دعا کی۔ پھر صفا سے اترے اور مروہ کی طرف گئے۔ یہاں تک کہ جب آپؐ کے دونوں پاؤں وادی کے نشیب میں پڑے تو دوڑے یہاں تک کہ آپؐ نشیب سے اوپر چڑھے اور مروہ کی طرف چلے۔ مروہ پر وہی کچھ کیا جو صفا پر کیا تھا۔ پھر جابر رضی اللہ عنہ نے ساری حدیث بیان کی جس میں یہ ہے کہ جب ترویہ کا دن (۸ ذی الحج) ہوا تو لوگ منیٰ کی طرف متوجہ ہوئے اور نبی ﷺ سوار تھے پھر وہاں ظہر' عصر' مغرب' عشاء اور صبح کی نماز پڑھی۔ پھر تھوڑی دیر ٹھہرے یہاں تک کہ سورج نکل آیا تو وہاں سے روانہ ہوئے اور مزدلفہ سے گزرتے ہوئے عرفات میں پہنچے تو خیمہ میں اترے جو آپؐ

ثُمَّ أَقَامَ فَصَلَّى العَصْرَ، وَلَمْ يُصَلِّ بَيْنَهُمَا شَيْئاً، ثُمَّ رَكِبَ حَتَّى أَتَى المَوقِفَ، فَجَعَلَ بَطْنَ نَاقَتِهِ القَصْوَاءِ إِلَى الصَّخَرَاتِ، وَجَعَلَ جَبَلَ المُشَاةِ بَيْنَ يَدَيْهِ، وَاسْتَقْبَلَ القِبْلَةَ، فَلَمْ يَزَلْ وَاقِفاً حَتَّى غَرَبَتِ الشَّمْسُ، وَذَهَبَتِ الصُّفْرَةُ قَلِيْلاً، حَتَّى إِذَا غَابَ القُرْصُ دَفَعَ، وَقَدْ شَنَقَ لِلْقَصْوَاءِ الزِّمَامَ، حَتَّى إِنَّ رَأْسَهَا لَيُصِيْبَ مَورِكَ رَحْلِهِ، وَيقُولُ بِيَدِهِ اليُمْنَى: «**يَا أَيُّهَا النَّاسُ! ٱلسَّكِيْنَةَ، ٱلسَّكِيْنَةَ**»، وَكُلَّمَا أَتَى جَبَلاً أَرْخَى لَهَا قَلِيْلاً حَتَّى تَصْعَدَ، حَتَّى أَتَى المُزْدَلِفَةَ، فَصَلَّى بِهَا المَغْرِبَ وَالعِشَاءَ، بِأَذَانٍ وَاحِدٍ وَإِقَامَتَيْنِ، وَلَمْ يُسَبِّحْ بَيْنَهُمَا شَيْئاً، ثُمَّ اضْطَجَعَ حَتَّى طَلَعَ الفَجْرُ، فَصَلَّى الفَجْرَ حِيْنَ تَبَيَّنَ لَهُ الصُّبْحُ، بِأَذَانٍ وَإِقَامَةٍ، ثُمَّ رَكِبَ حَتَّى أَتَى المَشْعَرَ الحَرَامَ، فَٱسْتَقْبَلَ القِبْلَةَ، فَدَعَا، وَكَبَّرَ، وَهَلَّلَ، فَلَمْ يَزَلْ وَاقِفاً حَتَّى أَسْفَرَ جِدًّا، فَدَفَعَ قَبْلَ أَنْ تَطْلُعَ الشَّمْسُ، حَتَّى أَتَى بَطْنَ مُحَسِّرٍ، فَحَرَّكَ قَلِيْلاً، ثُمَّ سَلَكَ الطَّرِيْقَ الوُسْطَى الَّتِيْ تَخْرُجُ عَلَى الجَمْرَةِ الكُبْرَى، حَتَّى أَتَى الجَمْرَةَ الَّتِيْ

کیلئے نمرہ میں لگایا گیا تھا۔ پھر جب سورج ڈھلنے لگا تو آپؐ نے قصواء پر پالان رکھنے کا حکم دیا۔ آپؐ سوار ہو کر وادی کے درمیان میں آئے اور لوگوں کو خطبہ دیا پھر اذان دلوائی پھر اقامت کہلوائی تو نماز ظہر ادا کی پھر اقامت کہلوائی تو عصر کی نماز پڑھی اور ان دونوں کے درمیان کوئی نماز نہ پڑھی۔ پھر سوار ہو کر ٹھہرنے کی جگہ پر پہنچے تو اپنی اونٹنی قصواء کا پیٹ پتھروں کی طرف کر دیا اور راہ چلنے والوں کو اپنے سامنے کر لیا اور اپنا رخ قبلہ کی جانب کر لیا۔ پھر آپؐ اس وقت تک ٹھہرے رہے کہ سورج غروب ہونے لگا اور تھوڑی سی زردی ختم ہو گئی حتیٰ کہ سورج مکمل طور پر غروب ہو گیا پھر آپؐ اسی حالت میں واپس ہوئے۔ آپؐ نے قصواء کی باگ اتنی تنگ کر رکھی تھی کہ اس کا سر آپؐ کے پالان کے اگلے ابھرے ہوئے حصے کو پہنچتا تھا اور آپؐ اپنے داہنے ہاتھ سے اشارہ کرتے ہوئے فرماتے تھے ''اے لوگو! تسکین و اطمینان اختیار کرو'' اور جب بھی آپؐ کسی ٹیلے پر آتے تو باگ تھوڑی سی ڈھیلی کر دیتے کہ وہ اوپر چڑھ جاتی یہاں تک کہ آپؐ مزدلفہ تشریف لائے اور وہاں ایک اذان اور دو اقامت کے ساتھ مغرب اور عشاء کی نماز پڑھی اور دونوں کے درمیان کوئی نفلی نماز نہیں پڑھی۔ پھر لیٹ گئے۔ یہاں تک کہ صبح ہو گئی۔ جب صبح کا وقت ظاہر ہوا تو آپؐ نے اذان اور اقامت سے فجر کی نماز پڑھی۔ پھر سوار ہو کر مشعر حرام پر آئے۔ پس آپؐ قبلہ رو ہوئے دعا کی اور تکبیر و تہلیل کہتے رہے۔ آپؐ وہاں اچھی طرح

عِنْدَ الشَّجَرَةِ، فَرَمَاهَا بِسَبْعِ حَصَيَاتٍ، يُكَبِّرُ مَعَ كُلِّ حَصَاةٍ مِّنْهَا، مِثْلِ حَصَى الْخَذْفِ، رَمَى مِنْ بَطْنِ الْوَادِيْ، ثُمَّ انْصَرَفَ إِلَى الْمَنْحَرِ، فَنَحَرَ، ثُمَّ رَكِبَ رَسُولُ اللهِ ﷺ فَأَفَاضَ إِلَى الْبَيْتِ، فَصَلَّى بِمَكَّةَ الظُّهْرَ. رَوَاهُ مُسْلِمٌ مُطَوَّلاً.

سفیدی ظاہر ہونے تک ٹھہرے رہے پھر سورج نکلنے سے پہلے واپس ہو کر وادی محسر کے نشیب میں آگئے تو سواری کو کچھ تیز کر دیا۔ پھر درمیانی راستہ پر چلے جو جمرہ کبریٰ (بڑا شیطان) پر پہنچتا ہے پھر آپؐ اس جمرہ پر آئے جو درخت کے پاس ہے تو اسے سات کنکریاں وادی کے نشیب سے ماریں' ہر کنکری کے ساتھ اللہ اکبر کہتے تھے' ان میں سے ہر کنکری خذف (لوبیے کے دانے) کے برابر تھی۔ پھر آپؐ قربان گاہ کی طرف گئے اور وہاں قربانی کی پھر رسول اللہ ﷺ سوار ہوئے اور بیت اللہ کی طرف روانہ ہوئے۔ پھر مکہ میں ظہر کی نماز پڑھی۔ (اسے مسلم نے تفصیل سے بیان کیا ہے)

لغوی تشریح: ﴿ اسماء بنت عمیس ﴾ یہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی زوجہ محترمہ کا نام ہے اور جو بچہ اس وقت پیدا ہوا اس کا نام محمد رضی اللہ عنہ تھا۔ ﴿ واستثفری ﴾ یہ "استثفار" سے امر کا صیغہ ہے جس کے معنی ہیں لنگوٹ کسنا اور وہ یوں کہ عورت اپنی کمر سے کوئی چیز یا (رسی یا ازار وغیرہ) بند باندھ لیتی ہے پھر ایک چوڑا کپڑا خون کی جگہ پر رکھ کر اسے آگے پیچھے سے کمر کی رسی کے ساتھ باندھ لیتی ہے۔ ﴿ واحرمی ﴾ احرام باندھ لے۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ نفاس کی حالت میں احرام باندھنا درست ہے۔ ﴿ القصواء ﴾ قاف پر زبر اور صاد ساکن' اس کے اصل معنی تو کان کٹا ہوا' کے ہیں مگر یہاں یہ آنحضرت ﷺ کی اونٹنی کا لقب ہے اس کا کان کٹا ہوا نہ تھا بلکہ آپؐ نے پیار سے اس کا یہ لقب رکھا تھا۔ ﴿ البیداء ﴾ دراصل بیابان جگہ جہاں کوئی چیز نہ ہو۔ اسے "البیداء" کہتے ہیں مگر یہاں ذوالحلیفہ کے قریب مخصوص جگہ کا نام مراد ہے۔ ﴿ اهل ﴾ اہلال سے ماضی کا صیغہ ہے یعنی آپ ﷺ نے اپنی آواز کو بلند کیا۔ ﴿ بالتوحید ﴾ یعنی تلبیہ میں صرف اللہ وحدہ لاشریک کا ذکر کیا جبکہ جاہلیت میں مشرکین تلبیہ میں شرکیہ کلمات بھی کہتے تھے۔ ﴿ لبیک ﴾ لبی کا مصدر ہے جب "لبیک" کہے کا تو یہ مصدری معنی میں منصوب ہوگا اور اس کا عامل محذوف ہوگا اور مکرر "لبیک" سے مقصود تکثیر و تاکید ہے۔ اے اللہ! میں حاضر ہوں۔ آپ کے دربار میں حاضر ہوں۔ یعنی آپ کی اطاعت پر قائم۔ آپ کی اطاعت پر قائم ہوں اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس کے معنی ہیں کہ میں نے آپ کی دعوت کو قبول کر لیا' قبول کر لیا۔ اور یہ تلبیہ دراصل حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعوت حج کا جواب ہے۔ ﴿ ان الحمد ﴾ ہمزہ کے نیچے زیر ہے جملہ مستانفہ کی بنا پر مگر تعلیل کی صورت میں اس پر زبر آئے گی۔ ﴿ استلم الرکن ﴾ رکن یعنی حجر اسود

پر ہاتھ رکھا اور اس کا بوسہ لیا۔ ﴿ فرمل ﴾ یعنی اپنے کندھوں کو ہلاتے ہوئے پہلوانوں کی طرح تیز تیز چلے۔ ﴿ ثلاثا ﴾ یعنی سات میں سے تین چکریوں دوڑ کر پورے کئے۔ ﴿ ومشی اربعا ﴾ اور باقی چار حسب عادت چل کر پورے کئے۔ اس طواف کو طواف قدوم کہتے ہیں نیز اسے طواف دخول' طواف ورود بھی کہتے ہیں اور یہ حج کا پہلا طواف ہے۔ ﴿ مقام ابراهیم ﴾ وہ معروف پتھر جس کے بارے میں مشہور ہے کہ اس پر حضرت ابراهیم علیہ السلام کے پاؤں کا نقش ہے۔ حضرت ابراهیم علیہ السلام نے بیت اللہ کی تعمیر اسی کے اوپر کھڑے ہو کر کی تھی۔ تعمیر کے وقت جب دیوار اوپر ہوتی تو یہ پتھر بھی خودبخود اوپر ہو جاتا تھا۔ ﴿ فصلی ﴾ پھر دو رکعت طواف کے بعد پڑھیں۔ پہلی رکعت میں سورۂ فاتحہ کے بعد قل یا ایھا الکفرون اور دوسری میں قل ھو اللہ احد پڑھی۔ ﴿ من الباب ﴾ یعنی الصفا کا معروف دروازہ۔ ﴿ دنا ﴾ قریب ہوئے۔ ﴿ شعائر ﴾ یہ شعیرۃ کی جمع ہے یعنی علامت اور یہاں شعائر سے مراد وہ مناسک ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ نے اپنی اطاعت کی علامت قرار دیا ہے۔ صفا اور مروہ بھی انہی شعائر میں سے ہیں جن کے مابین سعی کی جاتی ہے۔ ﴿ ابدا بما بدا اللہ ﴾ یعنی میں صفا سے شروع کرتا ہوں کیونکہ اللہ تعالیٰ نے بھی صفا کا ذکر پہلے کیا ہے۔ اور مروہ کا بعد میں ﴿ فرقی ﴾ سبل السلام میں ہے کہ قاف پر زبر ہے مگر مختار الصحاح میں ہے کہ اس کے نیچے زیر پڑھی جائے گی۔ یعنی چڑھے ﴿ انجز وعدہ ﴾ یعنی اپنے رسول اور دین کے بارے میں غلبہ کا جو وعدہ کیا تھا وہ پورا کر دیا۔ ﴿ نصر عبدہ ﴾ اپنے بندے کی مدد کی۔ بندہ سے خود آپؐ کی ذات گرامی مراد ہے۔ ﴿ وھم الاحزاب ﴾ یہ حزب کی جمع ہے اس کے معنی جماعت اور لشکر ہے۔ یعنی ان کے لشکر کو ختم کر دیا اور شکست سے دوچار کیا۔ ﴿ ثم دعا بین ذلک ﴾ یعنی مذکورہ ذکر کے درمیان دعا کی۔ ﴿ ثلاث مرات ﴾ تین مرتبہ اس سے لازم آتا ہے کہ آپؐ نے یہ ذکر تین بار کیا۔ ﴿ حتی اذا انصب ﴾ یہ انصباب سے ہے یعنی وادی میں نیچے اترے۔ ﴿ حتی اذا صعد ﴾ یعنی وادی کے نشیب سے اوپر چڑھے۔ ﴿ فذکر الحدیث ﴾ یعنی حضرت جابر رضی اللہ عنہ نے مکمل حدیث ذکر کی' مگر مصنف رحمہ اللہ علیہ نے اس میں سے بقدر ضرورت ذکر کی۔ ﴿ یوم الترویۃ ﴾ تاء پر زبر راء ساکن اور واؤ کے نیچے زیر اور یاء مخفف یہ مصدر ہے۔ "ارواء" یعنی پینے کے معنی میں اور "یوم الترویۃ" ذوالحجہ کی آٹھویں تاریخ ہوتی ہے۔ اسے یوم ترویہ اس لئے کہتے ہیں کہ اسی دن حجاج میدان عرفات کی ضرورت کیلئے پانی لیتے تھے کیونکہ وہاں ان دنوں پانی کا کوئی انتظام نہ تھا۔ ﴿ توجھوا ﴾ یعنی انہوں نے قصد کیا اور روانہ ہوگئے۔ ﴿ فصلی بھا ﴾ یعنی منیٰ میں پہنچنے کے بعد پانچوں نمازیں وقت کے مطابق ادا کیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آپؐ نے ایک دن اور ایک رات قیام فرمایا تھا ﴿ ثم مکث قلیلا ﴾ یعنی نو ذی الحجہ کی نماز فجر کے بعد تھوڑی دیر ٹھہرے۔ ﴿ فاجاز ﴾ یعنی پھر چلے اور آگے بڑھے ﴿ حتی اتی عرفۃ ﴾ یعنی میدان عرفات کے قریب پہنچ گئے۔ ﴿ القبۃ ﴾ قاف پر پیش' چھوٹے خیمے کو کہتے ہیں۔ ﴿ بنمرۃ ﴾ نون پر زبر' میم کے نیچے زیر اور راء پر زبر میدان عرفات سے کچھ پہلے معروف جگہ کا نام ہے جو عرفات کا حصہ نہیں۔ ﴿ فرحلت ﴾ مجہول کا صیغہ ہے۔ یہ ترحیل سے ہے یعنی اس پر کجاوا رکھا اور چلنے کی تیاری کی۔ ﴿ فاتی بطن الوادی ﴾

اس وادی سے مراد وادی عرنہ ہے جس کے عین پر پیش راء پر زبر اور اس کے بعد نون۔ وادی عرنہ امام شافعی رحمہ اللہ اور اکثر علماء کے نزدیک میدان عرفات میں سے نہیں مگر امام مالک رحمہ اللہ اسے عرفات کا حصہ قرار دیتے ہیں۔ جیسا کہ علامہ نووی رحمہ اللہ نے ذکر کیا ہے۔ ﴿ الموقف ﴾ قاف کے نیچے زیر یعنی عرفات میں ٹھہرنے کی جگہ۔ ﴿ الی الصخرات ﴾ پتھروں کی طرف۔ اس سے مراد وہ بکھرے ہوئے پتھر جو جبل رحمت کے دامن میں ہیں۔ یہ میدان عرفات کا درمیانی حصہ ہے اور یہاں ٹھہرنا مستحب ہے۔ ﴿ حبل المشاۃ ﴾ حاء کے اوپر زبر اور باء ساکن اور مشاۃ کی میم پر پیش "ماش" کی جمع ہے اس کے معنی ہیں پیدل چلنے کا راستہ۔ ریت کے درمیان ٹیلے کو بھی جبل کہتے ہیں اور بعض نسخوں میں یہ لفظ "جبل" بھی آیا ہے۔ ﴿ وذھبت الصفرۃ قلیلا ﴾ یعنی سورج غروب ہونے کے بعد اس کی کچھ زردی بھی ختم ہوگئی۔ جس سے اس کے غروب کا یقین ہوگیا۔ اس سے معلوم ہوا کہ سنت یہ ہے کہ میدان عرفات میں اپنے موقف میں اچھی طرح سورج غروب ہونے تک ٹھہرا جائے اور میدان عرفات میں وقوف کا وقت عرفہ کے دن سورج ڈھلنے سے لے کر یوم النحر کی طلوع فجر تک ہے۔ جو شخص اس وقت میں میدان عرفات میں ٹھہرے گا اس کا موقف صحیح ہے اور جو اس دوران یہاں قیام نہ کر سکا اس کا حج فوت ہوگیا۔ ﴿ حتی اذا غاب القرص ﴾ یعنی جب سورج کی ٹکیہ غائب ہوگئی اور وہ اچھی طرح غروب ہوگیا۔ قرص کسی گول چیز کو کہتے ہیں۔ ﴿ دفع ﴾ یہ "اذا" کا جواب ہے یعنی آپؐ عرفات سے روانہ ہوئے۔ ﴿ وقد شنق ﴾ واؤ حالیہ ہے اور ﴿ شفق ﴾ کی نون پر زبر یعنی ملا اور کھینچنے سے تنگ ہوا۔ ﴿ الزمام ﴾ زاء کے نیچے زیر یعنی اونٹنی کی مہار یعنی مہار کو کھینچا تنگ کیا تاکہ وہ نہ بھاگے۔ ﴿ لیصیب ﴾ لام تاکید کا ہے اور اس پر زبر ہے یعنی چھوٹا تھا اور پہنچ جاتا تھا۔ ﴿ مورک ﴾ میم پر زبر واؤ ساکن راء کے نیچے زیر۔ کجاوے کا اگلا حصہ جس پر سوار ہونے والا تھک کر کبھی اپنے پاؤں بھی رکھ لیتا ہے۔ ﴿ السکینۃ ﴾ اس پر زبر ہے یعنی اطمینان کو لازم پکڑو۔ ﴿ کلما اتی حبلا ﴾ حاء کے ساتھ یعنی جب بھی ریت کے کسی ٹیلے پر آتے ﴿ ارخی لھا ﴾ تو اس کی مہار ڈھیلی کر دیتے ﴿ لم یسبح ﴾ یہ تسبیح سے ہے یعنی نفل نہیں پڑھے۔ ﴿ اضطجع ﴾ یعنی سونے کیلئے لیٹ گئے۔ ﴿ لاتبین ﴾ یعنی ظاہر ہوا۔ ﴿ لمشعر الحرام ﴾ یہ مزدلفہ میں مشہور پہاڑ کا نام ہے جسے قزح بھی کہا جاتا ہے۔ ﴿ وھلل ﴾ یہ تھلیل سے ہے یعنی لا الٰہ الا اللہ پڑھا۔ ﴿ اسفر ﴾ یعنی جب روشن ہوگیا۔ ﴿ بطن محسر ﴾ میم پر پیش حاء پر زبر سین کے نیچے زیر اور شد مشہور وادی کا نام ہے جو منیٰ اور مزدلفہ کے درمیان ہے اور یہ نہ منیٰ کا حصہ ہے اور نہ ہی مزدلفہ کا اس کا نام "وادی محسر" اس لئے رکھا گیا کہ ابرھہ کے ہاتھی یہاں رک گئے اور آگے پیش قدمی سے عاجز آگئے۔ ﴿ فحرک ﴾ یہ تحریک سے ہے یعنی آپؐ نے اپنی اونٹنی کو حرکت دی تاکہ وہ تیز چلے اس لئے کہ یہ وادی عذاب کی جگہ ہے جیسے آپؐ سفر کے دوران میں قوم ثمود کی بستی سے جلدی سے گزر گئے تھے۔ ﴿ ثم سلک الطریق الوسطی ﴾ دونوں راستوں کے درمیان والے راستہ پر چلے اور یہ وہ راستہ تھا جو عرفات کے راستہ کے علاوہ تھا ﴿ التی تخرج علی الجمرۃ الکبری ﴾ اسے جمرۃ عقبہ بھی کہتے ہیں اور "جمرۃ" کنکریوں

کے جمع ہونے کا نام ہے۔ ﴿حتی اتی﴾ یعنی یہاں تک کہ آپ وہاں پہنچے۔ ﴿الجمرہ التی عند الشجرہ﴾ یہ جمرات میں سے سب سے آخری جمرہ ہے۔ سبل السلام میں ہے کہ یہ منیٰ کی حد کیلئے منیٰ کا حصہ نہیں۔ آپ کے زمانہ میں وہاں درخت تھا تبھی اسے کہا گیا ہے کہ جو جمرہ درخت کے قریب ہے۔ ﴿الخذف﴾ فاء پر زبر ذال ساکن' انگلیوں کے پوروں سے کنکری پھینکنا جو لوبیا کے دانہ کے برابر ہوتی ہو۔ ﴿رمی من بطن الوادی﴾ یعنی وادی کے نشیب سے کنکریاں ماریں۔ بایں طور پر کہ منیٰ' عرفہ اور مزدلفہ آپ کی دائیں جانب اور مکہ مکرمہ بائیں جانب تھا۔ اس رمی کے بعد تلبیہ ختم ہو جاتا ہے۔ ﴿المنحر﴾ یعنی قربان گاہ اور وہ منیٰ ہے۔ ﴿نحر﴾ یہ لبہ سے ہوتا ہے جیسے حلق سے دوسرا جانور ذبح کیا جاتا ہے ﴿افاض﴾ یعنی آپ روانہ ہوئے اور وہاں سے کوچ کیا۔ ﴿الی البیت﴾ یعنی کعبہ مکرمہ کی طرف طواف زیارت کیلئے اور اسے طواف افاضہ اور طواف الرکن بھی کہتے ہیں۔ یہ طواف حج میں فرض ہے۔ یوم النحر کو اگر یہ طواف نہ ہو سکے تو یہ ختم نہیں ہو جاتا بلکہ ہر صورت میں یہ طواف کرنا پڑے گا۔

(٦٠٨) وَعَنْ خُزَيْمَةَ بْنِ ثَابِتٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ كَانَ إِذَا فَرَغَ مِنْ تَلْبِيَتِهِ فِي حَجٍّ أَوْ عُمْرَةٍ سَأَلَ اللَّهَ رِضْوَانَهُ وَالجَنَّةَ، وَاسْتَعَاذَ بِرَحْمَتِهِ مِنَ النَّارِ. رَوَاهُ الشَّافِعِيُّ بِإِسْنَادٍ ضَعِيفٍ.

حضرت خزیمہ بن ثابت رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ جب حج یا عمرہ میں تلبیہ یعنی لبیک کہنے سے فارغ ہوتے تو اللہ تعالیٰ سے اس کی رضامندی اور جنت طلب کرتے اور اس کی رحمت کے ساتھ آگ سے پناہ مانگتے۔ (اسے امام شافعی رحمہ اللہ نے ضعیف سند سے روایت کیا ہے)

لغوی تشریح: ﴿اذا فرغ من تلبیته﴾ اس سے مراد ہر وہ تلبیہ ہے جو محرم کسی بھی وقت کہے۔ اس سے فارغ ہونے کے بعد دعا مستحب ہے اور یہ بھی احتمال ہے کہ فراغت سے مراد وہ وقت ہو جب لبیک کہنا ختم ہو جاتا ہے اور یہ روایت اس لئے ضعیف ہے کہ اس کا راوی محمد بن ابی زائدہ ضعیف ہے۔

راوی حدیث ﴿حضرت خزیمہ بن ثابت بن الفاکہ رضی اللہ عنہ﴾ انصار کے قبیلہ اوس کی خطمی شاخ سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کی کنیت ابوعمارہ ہے۔ بدر اور اس کے بعد تمام غزوات میں شریک ہوئے۔ فتح مکہ کے دن خطمی قبیلہ کا جھنڈا آپ ہی کے ہاتھ میں تھا۔ جنگ صفین میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ہمراہ تھے اور اسی موقعہ پر شہید ہوئے۔

(٦٠٩) وَعَنْ جَابِرٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «نَحَرْتُ هٰهُنَا، وَمِنًى كُلُّهَا مَنْحَرٌ، فَانْحَرُوا فِي رِحَالِكُمْ، وَوَقَفْتُ هٰهُنَا، وَعَرَفَةُ كُلُّهَا مَوْقِفٌ،

حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "میں نے قربانی اس جگہ کی ہے مگر منیٰ سارے کا سارا قربان گاہ ہے۔ لہٰذا تم اپنے اپنے ٹھہرنے کے مقامات پر قربانی کر دو اور میں نے اس جگہ قیام کیا ہے مگر عرفات کا سارا میدان جائے قیام

وَوَقَفْتُ هٰهُنَا، وَجَمْعٌ كُلُّهَا مَوْقِفٌ». رَوَاهُ مُسْلِمٌ.

ہے اور میں نے یہاں قیام کیا مگر مزدلفہ سارا جائے قیام ہے۔" (مسلم)

لغوی تشریح: ﴿ وجمع کلھا موقف ﴾ الجمع میں جیم پر فتحہ اور میم ساکن ہے۔ مزدلفہ کا دوسرا نام ہے اور ایک قول یہ بھی ہے کہ اسے جمع اس لئے کہتے ہیں کہ جب حضرت آدم و حوا کو جنت سے زمین پر اپنے اپنے مقام و ٹھکانے پر اتارا گیا تو دونوں کی اس مقام پر ملاقات ہوئی۔ ان کے یہاں جمع ہونے کی بنا پر اس جگہ کا نام جمع پڑ گیا اور ایک قول یہ بھی ہے کہ لوگوں کے اجتماع اور اکٹھے ہونے یا اس مقام پر مغرب اور عشاء دونوں نمازوں کو جمع کر کے ادا کرنے کی وجہ سے اسے "الجمع" کہا گیا ہے۔

(٦١٠) وَعَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهَا، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ لَمَّا جَاءَ إِلَى مَكَّةَ دَخَلَهَا مِنْ أَعْلاَهَا، وَخَرَجَ مِنْ أَسْفَلِهَا. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ جب حج کیلئے مکہ میں داخل ہوئے تو اس موقع پر مکہ کی بالائی جانب سے داخل ہوئے اور جب واپس جانے کیلئے مکہ سے نکلے تو زیریں حصہ سے نکلے۔ (بخاری و مسلم)

حاصل کلام: اس روایت میں رسول اللہ ﷺ کا مکہ میں داخل ہونے اور نکلنے کا راستہ بیان ہوا کہ آپؐ ثنیہ علیا کے راستہ سے داخل ہوئے اور ثنیہ سفلیٰ سے واپس ہوئے۔ بعض کے نزدیک حج کیلئے مکہ میں داخل ہونا انہی راستوں سے مسنون ہے اور بعض نے اسے سہولت اور آسانی پر محمول کیا ہے اور اسے مسنون قرار نہیں دیا۔

امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے رسول اللہ ﷺ کے اس طرح مکہ میں داخلہ کی حکمت یہ بیان کی ہے کہ بالائی جانب سے مکہ میں داخلہ کی صورت میں شہر مکہ اور خانہ کعبہ سامنے کی جانب پڑتے ہیں۔

(٦١١) وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُمَا، أَنَّهُ كَانَ لاَ يَقْدُمُ مَكَّةَ إِلاَّ بَاتَ بِذِيْ طُوًى، حَتَّى يُصْبِحَ، وَيَغْتَسِلَ، وَيَذْكُرُ ذٰلِكَ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ وہ جب بھی مکہ میں آتے تو ذی طویٰ میں صبح تک شب بسر کرتے اور غسل کرتے اور کہتے تھے کہ رسول اللہ ﷺ اسی طرح کیا کرتے تھے۔ (بخاری و مسلم)

لغوی تشریح: ﴿ بات ﴾ رات گزارتے۔ ﴿ بذی طوی ﴾ طویٰ کے "طا" پر ضمہ اور آخر پر تنوین۔ مکہ کے قریب ایک مقام و جگہ۔ (کہ جو آج کل --- ایک پرانے کنویں کی وجہ سے --- بئر طویٰ کے نام سے مشہور ہے)

(٦١٢) وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ آپؐ حجر

اللَّهُ تَعَالَى عَنهُمَا، أَنَّهُ كَانَ يُقَبِّلُ الحَجَرَ الأَسْوَدَ، وَيَسْجُدُ عَلَيْهِ. رَوَاهُ الحَاكِمُ مَرْفُوعاً، وَالبَيْهَقِيُّ مَوْقُوفاً.

اسود کو بوسہ دیتے اور اس کے سامنے سجدہ کرتے۔ (اسے حاکم نے مرفوع اور بیہقی نے موقوف روایت کیا ہے۔)

حاصل کلام: اس حدیث سے حجر اسود کو بوسہ دینے اور اس پر سجدہ کرنے کی مشروعیت معلوم ہوتی ہے۔ جمہور کی بھی یہی رائے ہے۔ لیکن اس حدیث میں وھم اور اضطراب پایا جاتا ہے اور امام مالک رحمہ اللہ سے مروی ہے کہ حجر اسود پر سجدہ کرنا بدعت ہے۔ اس کی تفصیل نیل الاوطار (ص: ۴۴) میں ملاحظہ کی جا سکتی ہے۔

غالباً مطلب یہ ہے کہ اس پر اپنی پیشانی رکھتے تھے۔ امام شافعی رحمہ اللہ' امام احمد رحمہ اللہ وغیرہ اسے جائز سمجھتے ہیں مگر امام مالک رحمہ اللہ نے اسے بدعت کہا ہے اور قاضی عیاض نے کہا ہے کہ یہ امام مالک رحمہ اللہ کا شذوذ ہے۔

(٦١٣) وَعَنْهُ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: أَمَرَهُمُ النَّبِيُّ ﷺ أَنْ يَرْمُلُوا ثَلَاثَةَ أَشْوَاطٍ وَيَمْشُوا أَرْبَعاً، وَأَن يَمْشُوا بَيْنَ الرُّكْنَيْنِ. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے ہی روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو حکم دیا کہ تین چکروں میں تیز قدم چلیں اور دونوں رکنوں کے درمیان چار چکر عام معمول کے مطابق چل کر لگائیں۔ (بخاری و مسلم)

لغوی تشریح: ﴿ امرھم ﴾ ھم سے مراد آپ ﷺ کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ہیں۔ ۷ھ میں عمرۃ القضاء کے موقع پر نبی ﷺ نے اپنے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو حکم ارشاد فرمایا تھا۔ ﴿ ان یرملوا ﴾ میم پر ضمہ۔ دوڑتے ہوئے۔ ﴿ اشواط ﴾ شوط کی جمع ہے جس کے معنی ہیں چکر لگانا۔

(٦١٤) وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُما (أَنَّهُ كَانَ إِذَا طَافَ بِالبَيْتِ الطَّوَافَ الأَوَّلَ خَبَّ ثَلَاثاً وَمَشَى أَرْبَعاً. وَفِي رِوَايَةٍ: رَأَيْتُ رَسُولَ اللهِ ﷺ إِذَا طَافَ فِي الحَجِّ أَوِ العُمْرَةِ أَوَّلَ مَا يَقْدُمُ فَإِنَّهُ يَسْعَى ثَلَاثَةَ أَطْوَافٍ بِالبَيْتِ وَيَمْشِيْ أَرْبَعَةً). مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما جب بھی بیت اللہ کا طواف قدوم (پہلا طواف) کرتے تو اس کے پہلے تین چکروں میں پہلوانوں کی سی چال چلتے اور (باقی) چار میں آہستہ چلتے۔ ایک اور روایت میں ہے کہ (حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما رسول اللہ ﷺ کا عمل بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں) میں نے اللہ کے رسول ﷺ کو دیکھا کہ آپ ﷺ نے حج یا عمرہ کے لیے بھی جب طواف قدوم کیا تو اس کے پہلے تین چکر دوڑ کر لگائے اور باقی چار میں آپ آہستہ چال چلتے۔

(متفق علیہ)

(٦١٥) وَعَنْهُ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: لَمْ أَرَ رَسُولَ اللهِ ﷺ يَسْتَلِمُ مِنَ الْبَيْتِ غَيْرَ الرُّكْنَيْنِ الْيَمَانِيَيْنِ. رَوَاهُ مُسْلِمٌ.

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما ہی اس کے راوی ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو سوائے دونوں یمانی رکنوں کے بیت اللہ کے کسی رکن کو چھوتے ہوئے نہیں دیکھا۔ (مسلم)

لغوی تشریح: ﴿ یستلم ﴾ یعنی ہاتھ سے چھوتے۔ یہ ہر طواف میں مسنون ہے ﴿ غیر الرکنین الیمانیین ﴾ نون کے بعد والی "یا" مخفف ہے اور یمن کی جانب منسوب ہونے کی وجہ سے اس پر تشدید ہے اور یمن کی طرف ان کا رخ ہے' اس لئے ان کو رکن یمانی کہتے ہیں اور ﴿ رکن البیت ﴾ یعنی حجر اسود کا رخ بھی اسی طرف ہے اور یہ دونوں رکن حجر اسود اور دوسرا رکن وہ ہے جو کعبہ کے جنوب مغرب میں ہے۔ ان دونوں کا استلام اس وجہ سے ہے کہ حضرت ابراہیمؑ کی رکھی ہوئی بنیادوں پر قائم ہیں۔ دونوں شامی رکنوں کی یہ حیثیت نہیں ہے۔

(٦١٦) وَعَنْ عُمَرَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُ أَنَّهُ قَبَّلَ الْحَجَرَ الأَسْوَدَ، وَقَالَ: إِنِّي أَعْلَمُ أَنَّكَ حَجَرٌ، لاَ تَضُرُّ وَلاَ تَنْفَعُ، وَلَوْلاَ أَنِّي رَأَيْتُ رَسُولَ اللهِ ﷺ يُقَبِّلُكَ مَا قَبَّلْتُكَ. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ انہوں نے حجر اسود کو بوسہ دیا اور فرمایا کہ مجھے اچھی طرح معلوم ہے کہ تو پتھر ہے کسی قسم کے نفع و نقصان کا مالک نہیں۔ اگر میں نے رسول اللہ ﷺ کو تجھے بوسہ دیتے ہوئے نہ دیکھا ہوتا تو میں تجھے بوسہ نہ دیتا۔ (بخاری و مسلم)

حاصل کلام: اس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ حجر اسود کو بوسہ اسے نفع و نقصان دینے والا سمجھ کر نہیں دیا جاتا۔ عمل تو صرف رسول اللہ ﷺ کے اسوہ کی پیروی میں کیا جاتا ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اس فرمان سے مشرکین کے اس نظریہ کی تردید مقصود تھی جو پتھروں کو بذات خود نفع و نقصان کا مختار و مالک سمجھتے تھے۔

(٦١٧) وَعَنْ أَبِي الطُّفَيْلِ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: رَأَيْتُ رَسُولَ اللهِ ﷺ يَطُوفُ بِالْبَيْتِ، وَيَسْتَلِمُ الرُّكْنَ بِمِحْجَنٍ مَعَهُ، وَيُقَبِّلُ الْمِحْجَنَ. رَوَاهُ مُسْلِمٌ.

حضرت ابو طفیل رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو بیت اللہ کا طواف کرتے دیکھا ہے آپؐ نوکیلے سرے والی چھڑی جو آپؐ کے پاس تھی' سے حجر اسود کو چھوتے اور اس چھڑی کو بوسہ دیتے تھے۔ (مسلم)

لغوی تشریح: ﴿ بمحجن ﴾ میم پر کسرہ۔ ٹیڑھے سرے والا ڈنڈا۔ خم دار چھڑی۔

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ اگر اژدھام اور رش زیادہ ہو اور حجراسود کو بوسہ دینا مشکل یا ناممکن نظر آئے تو چھڑی لگا کر اس چھڑی کو چوم لے۔ مسند احمد میں مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے فرمایا "تو طاقتور اور زور آور آدمی ہے۔ حجراسود تک رسائی حاصل کرنا تیرے لئے کوئی دشوار کام نہیں ہے مگر دھکم پیل سے کمزوروں کو اذیت اور تکلیف ہوتی ہے۔ اس لئے اگر تمہیں فارغ وقت میسر آجائے تو ہاتھ سے مس کرلیا کرو بصورت دیگر حجراسود کے سامنے کھڑے ہو کر لا الٰہ الا اللہ واللہ اکبر ہی کہہ لیا کرو۔ اس سے معلوم ہو رہا ہے کہ مناسک حج کے ادا کرتے ہوئے دوسروں کو تکلیف و اذیت دینا جائز نہیں اور اگر حجراسود کا استلام صرف ہاتھ کے اشارہ سے ہو تو ہاتھ کو چومنا نہیں چاہئے کیونکہ ہاتھ اور چھڑی وغیرہ کو تبھی بوسا دینا ہے جب وہ حجراسود سے لگیں۔

راوی حدیث: ﴿ابوالطفیل رضی اللہ عنہ﴾ عامر بن واثلہ لیثی کنانی رضی اللہ عنہ۔ حیات نبی ﷺ کے آٹھ سال پائے۔ ۱۰۰ھ میں مکہ مکرمہ میں وفات پائی اور ایک قول کے مطابق ۱۰۲ھ میں وفات پائی اور ایک قول ان کی وفات کے بارے میں ۱۰۳ھ کا بھی ہے۔ روئے زمین پر بسنے والے صحابہ کرامؓ میں سب سے آخر میں فوت ہونے والے یہ خوش قسمت صحابی ہیں۔

(٦١٨) وَعَنْ يَعْلَى بْنِ أُمَيَّةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: طَافَ رَسُولُ اللهِ ﷺ مُضْطَبِعاً بِبُرْدٍ أَخْضَرَ. رَوَاهُ الْخَمْسَةُ إِلاَّ النَّسَائِيَّ، وَصَحَّحَهُ التِّرْمِذِيُّ.

حضرت یعلیٰ بن امیہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک سبز چادر میں طواف کیا جس کو آپؐ نے دائیں بغل سے نکال کر بائیں کندھے پر ڈال رکھا تھا۔ (اسے نسائی کے سوا پانچوں نے روایت کیا ہے اور ترمذی نے اسے صحیح قرار دیا ہے۔)

لغوی تشریح: ﴿مضطبعا﴾ اضطباع سے ماخوذ ہے۔ اپنی چادر کے درمیانی حصہ کو اپنی دائیں بغل سے نکال کر بائیں کندھے پر ڈالنا۔ اس طرح دایاں کندھا ننگا و برہنہ رہتا ہے۔

حاصل کلام: اضطباع پہلے پہل عمرۃ القضاء میں کیا گیا کیونکہ اس وقت مشرکین کو یہ بتانا مقصود تھا کہ مسلمان جسمانی و بدنی طور پر کمزور نہیں۔ اس کے بعد ابن عباس رضی اللہ عنہما کے قول کے مطابق رمل اور اضطباع دونوں ہمیشہ کیلئے مسنون قرار پائے۔ اب اس طرح کے لباس کے علاوہ مردوں کیلئے دوسرے کسی بھی طرز و ڈھنگ کا لباس جائز نہیں۔ البتہ یہ اضطباع صرف پہلے سات چکروں کیلئے اور بعض نے کہا ہے کہ صرف رمل کی صورت میں اضطباع ہے بعد کے چار چکروں میں نہیں۔ (سبل)

راوی حدیث: ﴿یعلی بن امیہ رضی اللہ عنہ﴾ ان کی کنیت ابوصفوان تمیمی ہے۔ مکہ کے رہنے والے تھے اور قریش کے حلیف تھے۔ مشہور و معروف صحابی رسول ہیں۔ حنین، طائف اور تبوک کے معرکوں میں حاضر ہو کر داد شجاعت دیتے رہے۔ حضرات ابوبکر رضی اللہ عنہ و عمر رضی اللہ عنہ اور عثمان رضی اللہ عنہ کی جانب سے عامل مقرر کئے جاتے رہے۔ تقریباً پچاس برس کی عمر تک بقید حیات رہے۔

(٦١٩) وَعَنْ أَنَسٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: كَانَ يُهِلُّ مِنَّا الْمُهِلُّ فَلاَ يُنْكَرُ عَلَيْهِ، وَيُكَبِّرُ مِنَّا الْمُكَبِّرُ فَلاَ يُنْكِرُ عَلَيْهِ. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ہم میں سے کچھ لوگ لا الٰہ الا اللہ کہتے تھے، اسے بھی برا نہیں سمجھا جاتا تھا اور بعض ہم میں سے تکبیریں کہتے تھے ان کو بھی برا نہیں سمجھا جاتا تھا۔ (بخاری و مسلم)

حاصل کلام: اس حدیث میں منیٰ سے عرفات جانے کی کیفیت کا بیان ہے جو اس بات کی دلیل ہے کہ اس مقام پر تلبیہ کی جگہ تکبیر کہنا بھی صحیح اور درست ہے۔

(٦٢٠) وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا قَالَ: بَعَثَنِي النَّبِيُّ ﷺ فِي الثَّقَلِ، أَوْ قَالَ: فِي الضَّعَفَةِ، مِنْ جَمْعٍ، بِلَيْلٍ. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ مجھے نبی کریم ﷺ نے مسافروں کے سامان کے ساتھ (یا فرمایا) کہ کمزوروں کے ساتھ رات ہی کو مزدلفہ سے (منیٰ کی جانب) بھیج دیا تھا۔ (بخاری و مسلم)

لغوی تشریح: ﴿فی الثقل﴾ ثا اور قاف دونوں پر فتحہ۔ سامان مسافر ﴿الضعفۃ﴾ ضاد، عین اور فا پر فتحہ ضعیف کی جمع ہے۔ اس سے مراد خواتین، بچے، خادم وغیرہ ﴿من الجمع﴾ مزدلفہ سے منیٰ کی طرف لے جانے کیلئے مجھے بھیجا۔ ﴿بلیل﴾ رات کے وقت۔ طیبی کی رائے یہ ہے کہ کمزور و ضعیف حضرات کو اژدھام کی زحمت اور تکلیف سے بچنے کی غرض سے پہلے بھیج دینا مستحب ہے۔ یہ حدیث اس بات کی دلیل ہے کہ کمزور حضرات کیلئے مزدلفہ میں پوری رات گزارے بغیر ہی منیٰ کی جانب روانگی کی رخصت ہے اور جو اس اژدھام اور کثرت میں آئے اس کیلئے مزدلفہ سے نماز فجر سے پہلے واپس روانہ ہونا جائز نہیں۔

(٦٢١) وَعَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهَا قَالَتْ: اسْتَأْذَنَتْ سَوْدَةُ رَسُولَ اللهِ ﷺ لَيْلَةَ الْمُزْدَلِفَةِ أَنْ تَدْفَعَ قَبْلَهُ، وَكَانَتْ ثَبْطَةً، يَعْنِي ثَقِيْلَةً، فَأَذِنَ لَهَا. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ حضرت سودہ رضی اللہ عنہا نے مزدلفہ کی رات آپ ؐ سے اجازت طلب کی کہ وہ آپ ؐ سے پہلے واپس آجائے (یہ اجازت انہوں نے اس لئے طلب کی) کہ بھاری جسم والی تھیں۔ (اس وجہ سے آہستہ آہستہ اور ٹھہر ٹھہر کر چلتی تھیں) آپ ؐ نے ان کو اجازت دے دی۔ (بخاری و مسلم)

حاصل کلام: بیماری اور جسمانی کمزوری کے علاوہ بھاری بھرکم جسم بھی معذوری میں شامل ہے۔ ایسے حاجی کو بھی مزدلفہ میں پوری رات گزارے بغیر منیٰ کی طرف جانے کی رخصت و اجازت ہے۔

راوی حدیث: ﴿حضرت سودہ بنت زمعہ بن عبد شمس قرشیہ عامریہ رضی اللہ عنہا﴾

ان کا کا شمار امہات المومنین میں ہوتا ہے مکہ مکرمہ ہی میں ابتدائی دور میں اسلام قبول کیا اور اپنے خاوند کے ساتھ دوسری بار ہجرت حبشہ میں شریک ہوئیں۔ ان کا خاوند وہاں فوت ہوگیا۔ تو حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کی وفات کے بعد اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے نکاح سے پہلے آپؐ نے ان سے نکاح کر لیا۔ اور ۵۵ھ میں ان کا انتقال ہوا۔

(٦٢٢) وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا قَالَ: قَالَ لَنَا رَسُولُ اللهِ ﷺ: «لاَ تَرْمُوا الجَمْرَةَ حَتَّى تَطْلُعَ الشَّمْسُ». رَوَاهُ الخَمْسَةُ إِلاَّ النَّسَائِيَّ، وَفِيهِ انْقِطَاعٌ.

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ہمیں حکم دیا کہ "طلوع آفتاب سے پہلے کنکریاں نہ مارو۔" (اسے نسائی کے علاوہ پانچوں نے روایت کیا ہے۔ اس کی سند میں انقطاع ہے)

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ رات کو رمی جائز نہیں۔ جمہور علماء کے نزدیک رمی طلوع آفتاب کے بعد جائز ہے۔ امام شافعی رحمہ اللہ اور امام احمد رحمہ اللہ کے نزدیک آدھی رات کے بعد جائز ہے۔ امام ثوری رحمہ اللہ اور ابراهیم نخعی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ قادر اور باہمت آدمی طلوع فجر کے بعد رمی کرے۔ مجبور رات کو بھی کر سکتا ہے۔ جبکہ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ صرف طلوع آفتاب کے بعد ہی رمی کے قائل ہیں۔ ﴿وفیہ انقطاع﴾ اس کی سند منقطع ہے۔ اس لئے کہ اس کے راوی حسن عرنی کا ابن عباس رضی اللہ عنہما سے سماع ثابت نہیں۔

(٦٢٣) وَعَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهَا قَالَتْ: أَرْسَلَ النَّبِيُّ ﷺ بِأُمِّ سَلَمَةَ لَيْلَةَ النَّحْرِ، فَرَمَتِ الجَمْرَةَ قَبْلَ الفَجْرِ، ثُمَّ مَضَتْ، فَأَفَاضَتْ. رَوَاهُ أَبُو دَاوُدَ، وَإِسْنَادُهُ عَلَى شَرْطِ مُسْلِمٍ.

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ام سلمہ رضی اللہ عنہا کو قربانی والی رات پہلے بھیج دیا تھا۔ انہوں نے فجر کے طلوع ہونے سے پہلے کنکریاں ماریں پھر جا کر طواف افاضہ کیا۔ (اسے ابوداؤد نے روایت کیا۔ اس کی سند مسلم کی شرط پر ہے۔)

لغوی تشریح: ﴿فرمت الجمرة قبل الفجر﴾ انہوں نے فجر سے پہلے رمی کی یہ رعایت صرف عورتوں کیلئے اور ان کمزوروں کیلئے ہے جو ان کے ہمراہ جائیں۔ اس حدیث سے یہ دلیل پکڑنا صحیح نہیں ہے کہ اس وقت ان مذکورہ بالا حضرات کے علاوہ بھی دوسروں کیلئے کنکریاں مارنا جائز ہے۔ یہ حدیث پہلی حدیث سے سند کے اعتبار سے راجح ہے۔ اس لئے دونوں میں کوئی تعارض نہیں۔

(٦٢٤) وَعَنْ عُرْوَةَ بْنِ مُضَرِّسٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ

حضرت عروہ بن مضرس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "جو کوئی مزدلفہ میں ہماری

رَسُولُ اللهِ ﷺ: «مَنْ شَهِدَ صَلاَتَنَا هَذِهِ، يَعْنِي بِالمُزْدَلِفَةِ، فَوَقَفَ مَعَنَا حَتَّى نَدْفَعَ، وَقَدْ وَقَفَ بِعَرَفَةَ قَبْلَ ذَلِكَ لَيْلاً أَوْ نَهَاراً، فَقَدْ تَمَّ حَجُّهُ، وَقَضَى تَفَثَهُ». رَوَاهُ الخَمْسَةُ، وَصَحَّحَهُ التِّرْمِذِيُّ وَابْنُ خُزَيْمَةَ.

نماز میں شامل ہوا اور ہمارے ساتھ وقوف کیا یہاں تک کہ ہم نے کوچ کیا اور اس سے قبل عرفات میں رات یا دن میں قیام کر چکا ہو تو اس کا حج مکمل ہو گیا اور اس نے اپنی میل کچیل اتار لی۔" (اسے پانچوں نے روایت کیا ہے۔ ترمذی اور ابن خزیمہ نے اسے صحیح قرار دیا ہے)

لغوی تشریح: ﴿من شهد صلاتنا هذه﴾ جس نماز کیلئے اب ہم نکلے ہیں اس میں جو حاضر ہو گیا۔ ﴿ليلا او نهارا﴾ اس میں ایک فقہی مسئلہ بیان ہوا ہے کہ عرفہ کے روز زوال آفتاب کے بعد سے لے کر دسویں ذی الحجہ کی صبح تک جو عرفات میں قیام پذیر رہا اس نے حج پا لیا جیسا کہ خطابی نے کہا ہے۔ ﴿فقد تم حجه﴾ اس نے حج کو پورا کر لیا سے مراد ہے حج کا بڑا حصہ مکمل کر لیا۔ اس سے عرفہ کا وقوف مراد ہے کیونکہ اسی کے فوت ہونے کا خوف اور اندیشہ ہوتا ہے ﴿وقضى تفثه﴾ اس نے اپنے مناسک حج ادا کر لئے۔ "تفث" دراصل سر کے بال منڈوانے یا ترشوانے کے بعد محرم حلال ہونے کے موقع پر جو کچھ کرتا ہے اس میں اونٹوں کی قربانی اور دیگر سارے مناسک حج ادا کرنے بھی شامل ہیں کیونکہ "تفث" تو اس کے بعد ہی پورا ہوتا ہے۔ اصل میں "تفث" میل کچیل کو کہتے ہیں۔ اس حدیث کے شروع کا حصہ یوں ہے کہ عروہ بن مضرس نے فرمایا کہ میں نبی کریم ﷺ کے پاس مزدلفہ میں اس وقت پہنچا جب آپؐ نماز کیلئے تشریف لے جا رہے تھے۔ میں نے عرض کیا میں "طے" کے پہاڑوں سے آ رہا ہوں۔ میں نے اپنی سواری کو دوڑا دوڑا کر تھکا دیا ہے اور اپنے نفس کو مشقت میں مبتلا کیا ہے۔ خدا کی قسم میں ہر پہاڑ پر قیام کرتا رہا ہوں، کیا اب بھی مجھ پر حج کے کوئی ارکان باقی ہیں؟ پھر ساری حدیث ذکر کی۔

راوی حدیث: ﴿عروه بن مضرس رضی اللہ عنہ﴾ میم پر ضمہ، ضاد پر فتحہ اور راء مشدد اس کے نیچے زیر، سلسلہ نسب یوں ہے۔ ابن اوس بن حارثہ بن لام الطائی۔ حجۃ الوداع میں شامل ہوئے۔ کوفہ میں سکونت اختیار کر لی۔ ان سے دس احادیث مروی ہیں۔

(٦٢٥) وَعَنْ عُمَرَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: إِنَّ المُشْرِكِيْنَ كَانُوا لاَ يُفِيضُوْنَ حَتَّى تَطْلُعَ الشَّمْسُ، وَيَقُولُونَ: أَشْرِقْ ثَبِيْرُ! وَإِنَّ النَّبِيَّ ﷺ خَالَفَهُمْ، فَأَفَاضَ قَبْلَ أَنْ تَطْلُعَ الشَّمْسُ. رَوَاهُ البُخَارِيُّ.

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ مشرکین طلوع آفتاب کے بعد واپس لوٹتے تھے اور کہتے تھے ثبیر تو (ایک پہاڑ کا نام) روشن ہو گیا اور نبی ﷺ نے ان کی مخالفت کی اور طلوع آفتاب سے پہلے واپس تشریف لے آئے۔ (بخاری)

لغوی تشریح: ﴿لايفيضون﴾ واپس نہیں آتے تھے یعنی مزدلفہ سے منیٰ کی جانب۔ ﴿اشرق﴾ اشراق

سے امر کا صیغہ ہے۔ اشراق کہتے ہیں روشنی میں دخول کو۔ یعنی چاہیئے کہ تجھ پر سورج طلوع ہو۔ ثبیر کی ثا پر فتحہ اور باء کے نیچے کسرہ۔ مبنی علم الضم ہے۔ نداء محذوف کا منادیٰ ہونے کی وجہ سے ثبیر ہے۔ منیٰ کی طرف جانے والے کے بائیں پہلو معروف پہاڑ کا نام ہے۔ مکہ کے بڑے عظیم پہاڑوں میں اس کا شمار ہوتا ہے۔ قبیلہ ھذیل کے ثبیر نامی ایک شخص کے نام پر معروف ہوا۔ اسی پہاڑ پر وہ دفن ہوا۔ ایک روایت میں اتنا اضافہ بھی ہے "کیما نغیر" تاکہ ہم غارت گری کر سکیں۔ یا ہم چل سکیں۔ اس کے معنی یہ بھی کئے گئے ہیں تاکہ ہم چلیں اور ہمارے گھوڑے ہمیں لے کر سرپٹ دوڑیں۔ اس حدیث سے یہ دلیل ملتی ہے کہ مزدلفہ سے واپسی طلوع آفتاب سے پہلے روشنی میں ہونی چاہئے اور جو طلوع سورج تک وہاں وقوف نہ کر سکا اس کا وقوف فوت ہوگیا۔

(٦٢٦) وَعَنْ ابْنِ عَبَّاسٍ وَأُسَامَةَ بْنِ زَيْدٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُم، قَالاَ: لَمْ يَزَلِ النَّبِيُّ ﷺ يُلَبِّي حَتَّى رَمَى جَمْرَةَ العَقَبَةِ. رَوَاهُ البُخَارِيُّ.

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور اسامہ بن زید رضی اللہ عنہما دونوں سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ جمرہ عقبہ (چھوٹا شیطان) کو کنکری مارنے تک تلبیہ کہتے رہے۔ (بخاری)

لغوی تشریح: ﴿ حتی رمی جمرة العقبة ﴾ جمرہ عقبہ کو کنکری مارنے کے عمل سے فارغ ہونے کے بعد تلبیہ اپنے اختتام کو پہنچ گیا۔ یہ امام احمد رحمۃ اللہ علیہ کی رائے ہے اور جمہور کا مسلک یہ ہے کہ جونہی پہلی کنکری ماری جائے گی تلبیہ ختم ہو جائے گا۔

(٦٢٧) وَعَنْ عَبْدِ اللهِ بْنِ مَسْعُودٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، أَنَّهُ جَعَلَ البَيْتَ عَن يَسَارِهِ، وَمِنًى عَنْ يَمِيْنِهِ، وَرَمَى الجَمْرَةَ بِسَبْعِ حَصَيَاتٍ، وَقَالَ: هَذَا مَقَامُ الَّذِي أُنْزِلَتْ عَلَيْهِ سُوْرَةُ البَقَرَةِ. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ انہوں نے بیت اللہ کو اپنی بائیں جانب اور منیٰ کو اپنی دائیں جانب رکھا اور جمرہ کو سات سنگریزے مارے اور فرمایا کہ یہ ان کے کھڑے ہونے کی جگہ ہے جن پر سورۂ بقرہ کا نزول ہوا تھا۔ (بخاری و مسلم)

لغوی تشریح: ﴿ رمی الجمرة ﴾ اس جمرہ سے جمرۃ العقبہ مراد ہے۔ ﴿ انزلت علیه سورة البقرة ﴾ سورۂ کا بالخصوص ذکر اس لئے کیا کہ حج کے اکثر احکام اس میں بیان ہوئے ہیں۔ گویا اس سے اس پر متنبہ اور خبردار کرنا مقصود ہے کہ حج کے اعمال توقیفی ہیں۔ ان میں رد و بدل اور ترمیم و تنسیخ کا کوئی مجاز نہیں۔

راوی حدیث ﴿ اسامه بن زید رضی اللہ عنہما ﴾ ان کی کنیت ابو محمد یا ابو زید تھی۔ اسامہ کے ھمزہ پر ضمہ ہے۔ نسب نامہ اس طرح ہے۔ اسامہ بن زید بن حارثہ بن شراحیل کلبی۔ رسول اللہ ﷺ کے پیارے اور محبوب آزاد کردہ غلام کا بیٹا۔ ان کی والدہ محترمہ ام ایمن رسول اللہ ﷺ کی رضاعی والدہ۔ اپنی وفات سے

قبل ان کو ایسے لشکر کا سربراہ مقرر فرمایا جس میں اکابر صحابہ کرام ابوبکر رضی اللہ و عمر رضی اللہ جیسے بھی شامل تھے۔ اس وقت اٹھارہ برس کے نوجوان تھے۔ یہ لشکر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کی وجہ سے روانہ نہ ہو سکا۔ بعد میں حضرت ابوبکر رضی اللہ نے اسے روانہ فرمایا۔ حضرت عثمان رضی اللہ کی شہادت کے بعد ان کی وفات ۵۴ھ میں ہوئی۔

(٦٢٨) وَعَنْ جَابِرٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: رَمَى رَسُولُ اللهِ ﷺ الجَمْرَةَ يَوْمَ النَّحْرِ ضُحًى، وَأَمَّا بَعْدَ ذٰلِكَ، فَإِذَا زَالَتِ الشَّمْسُ. رَوَاهُ مُسْلِمٌ.

حضرت جابر رضی اللہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جمرہ کو قربانی کے روز چاشت کے وقت کنکریاں ماریں اور اس روز کے بعد آفتاب ڈھلنے کے بعد۔ (مسلم)

حاصل کلام: پہلے روز زوال آفتاب سے پہلے کنکریاں مارنی چاہئیں اور باقی ایام میں زوال آفتاب کے بعد۔ اگر دس تاریخ کو زوال آفتاب سے پہلے کنکریاں نہ مار سکے تو پھر اسی روز زوال آفتاب کے بعد مارنی چاہئیں۔

(٦٢٩) وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُمَا، أَنَّهُ كَانَ يَرْمِيْ الجَمْرَةَ الدُّنْيَا بِسَبْعِ حَصَيَاتٍ، يُكَبِّرُ عَلَى إِثْرِ كُلِّ حَصَاةٍ، ثُمَّ يَتَقَدَّمُ، ثُمَّ يُسْهِلُ، فَيَقُومُ، فَيَسْتَقْبِلُ القِبْلَةَ، فَيَقُومُ طَوِيلاً، وَيَدْعُو، فَيَرْفَعُ يَدَيْهِ، ثُمَّ يَرْمِي الوُسْطَى، ثُمَّ يَأْخُذُ ذَاتَ الشِّمَالِ، فَيُسْهِلُ، وَيَقُومُ مُسْتَقْبِلَ القِبْلَةِ، ثُمَّ يَدْعُو، فَيَرْفَعُ يَدَيْهِ، وَيَقُوْمُ طَوِيلاً، ثُمَّ يَرْمِي جَمْرَةَ ذَاتِ العَقَبَةِ، مِنْ بَطْنِ الوَادِيْ، وَلاَ يَقِفُ عِنْدَهَا، ثُمَّ يَنْصَرِفُ، فَيَقُولُ: هٰكَذَا رَأَيْتُ رَسُولَ اللهِ ﷺ يَفْعَلُهُ. رَوَاهُ البُخَارِيُّ.

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ وہ سب سے قریبی جمرہ کو سات سنگریزے مارتے اور ہر کنکری مارتے وقت تکبیر کہتے۔ پھر آگے تشریف لے جاتے اور میدان میں آکر کھڑے ہو جاتے اور قبلہ رخ ہو کر طویل قیام فرماتے اور اپنے ہاتھ اوپر اٹھا کر دعا کرتے۔ پھر جمرہ وسطیٰ (درمیانہ شیطان) کو کنکریاں مارتے۔ پھر بائیں جانب ہو جاتے اور میدان میں آکر قبلہ رخ کھڑے ہو جاتے۔ پھر اپنے ہاتھ اوپر اٹھاتے اور دعا فرماتے اور طویل قیام فرماتے۔ اس کے بعد جمرۂ عقبہ کو کنکریاں وادی کی نچلی جگہ سے مارتے مگر وہاں قیام نہ فرماتے پھر واپس تشریف لے آتے۔ ابن عمر رضی اللہ عنہما کا بیان ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اسی طرح عمل کرتے دیکھا ہے۔ (بخاری)

لغوی تشریح: ﴿الجمرة الدنيا﴾ دال پر ضمہ اور کسرہ دونوں طرح ہے۔ اس کے معنی قریب کے ہیں۔ مسجد خیف کے قریب ہونے کی وجہ سے اسے ﴿الجمره الدنيا﴾ کہا گیا ہے اور یہ پہلا جمرہ ہے جسے ایام تشریق میں کنکریاں ماری جاتی ہیں۔ ﴿ثم يسهل﴾ يسهل میں "یا" پر ضمہ معنی اس کے

میدان کی طرف آنے کے ہیں۔ زمین کا نشیبی حصہ۔ ﴿ یرمی الوسطی ﴾ وسطیٰ سے مراد جمرہ ثانیہ (دوسرا جمرہ) جو دونوں جمروں کے درمیان ہے۔

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ رسول اللہ ﷺ جمرہ کو سنگریزے مار کر وہیں کھڑے نہ رہتے بلکہ وہاں سے چل کر میدان میں آکھڑے ہوتے اور پورے اطمینان کے ساتھ قبلہ رخ ہو کر طویل دعا فرماتے۔ لہٰذا کنکریوں کے مارے جانے کے بعد وہیں کھڑے نہیں رہنا چاہئے بلکہ میدان میں کھلی جگہ آکر طویل دعا ہاتھ اوپر اٹھا کر کرنی چاہئے۔ اس طرح اژدھام کی زد سے بھی محفوظ رہے گا۔

(٦٣٠) وَعَنْهُ أَنَّ رَسُولَ اللهِ ﷺ قَالَ: «اللّٰهُمَّ ارْحَمِ الْمُحَلِّقِينَ»، قَالُوا: وَالْمُقَصِّرِيْنَ، يَا رَسُولَ اللهِ! قَالَ فِي الثَّالِثَةِ: «وَالْمُقَصِّرِينَ». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے ہی یہ حدیث بھی مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "الٰہی سر منڈوانے والے حاجیوں پر رحم فرما۔" صحابہؓ نے عرض کیا اے اللہ کے رسول (ﷺ)! بال ترشوانے والے پر بھی۔ تو رسول اللہ ﷺ نے تیسری مرتبہ فرمایا "بال ترشوانے والوں پر بھی۔" (بخاری و مسلم)

لغوی تشریح: ﴿ المحلقین ﴾ تحلیق سے اسم فاعل کا صیغہ ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو حج اور عمرہ سے حلال ہونے کے موقع پر اپنے سر منڈواتے ہیں۔ حلق دراصل بالوں کو جڑوں تک صاف کر دینا۔ ﴿ والمقصرین ﴾ یہ عطف تلقین ہے یعنی آپ یہ کہیں قل والمقصرین اور تقصیر بال ترشوانے کو کہتے ہیں جن میں بال جڑ سے صاف نہیں کئے جاتے۔

(٦٣١) وَعَنْ عَبْدِ اللهِ بْنِ عَمْرِو بْنِ الْعَاصِ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا، أَنَّ رَسُولَ اللهِ ﷺ وَقَفَ فِي حَجَّةِ الْوَدَاعِ، فَجَعَلُوا يَسْأَلُونَهُ، فَقَالَ رَجُلٌ: لَمْ أَشْعُرْ، فَحَلَقْتُ قَبْلَ أَنْ أَذْبَحَ، قَالَ: «اذْبَحْ وَلاَ حَرَجَ»، وَجَاءَ آخَرُ فَقَالَ: لَمْ أَشْعُرْ، فَنَحَرْتُ قَبْلَ أَنْ أَرْمِيَ، قَالَ: «ارْمِ وَلاَ حَرَجَ»، فَمَا سُئِلَ يَوْمَئِذٍ عَنْ شَيْءٍ قُدِّمَ وَلاَ أُخِّرَ إِلاَّ قَالَ: «افْعَلْ وَلاَ حَرَجَ». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ حجۃ الوداع میں ایک مقام پر کھڑے ہوگئے۔ صحابہؓ نے آپؐ سے سوالات کرنے شروع کئے۔ کسی نے کہا مجھے علم نہیں تھا میں نے قربانی سے پہلے حجامت بنوا لی۔ آپؐ نے اسے فرمایا قربانی کرو کوئی حرج نہیں اور ایک آدمی نے عرض کیا مجھے معلوم نہیں تھا کہ میں نے کنکریاں مارنے سے پہلے قربانی کر لی۔ آپؐ نے اسے فرمایا "اب کنکریاں مار لے کوئی حرج نہیں۔" اس روز آپؐ سے کسی عمل کے مقدم و مؤخر کرنے کے متعلق استفسار پر آپؐ نے فرمایا "جاؤ اب کر لو' کوئی حرج نہیں۔"

(بخاری و مسلم)

لغوی تشریح: ﴿وقف فی حجة الوداع﴾ دسویں ذی الحجہ کے روز زوال آفتاب کے بعد جب آپؐ اپنی سواری پر سوار رہتے ہوئے جمرہ کے پاس خطاب فرمانے کھڑے ہوتے۔ ﴿لم اشعر﴾ اشعر میں عین پر ضمہ، معنی ہے مجھے اس کا علم نہیں ہوا۔ میں سمجھ نہ سکا۔ ﴿قدم ولا اخر﴾ قدم، اخر دونوں باب تفعیل سے ماخوذ ہیں صیغۂ مجہول ہیں۔ یاد رہے کہ قربانی کے روز حجاج کرام کے ذمہ چار کام بالترتیب انجام دینا ہوتے ہیں۔ پہلا جمرہ عقبہ کو سنگریزے مارنا۔ دوسرا قربانی کرنا۔ تیسرا سر منڈانا یا بال ترشوانا۔ چوتھا طواف افاضہ۔ علماء کا اس پر تو اتفاق و اجماع ہے کہ یہ ترتیب شرعی طور پر مطلوب و مقصود ہے لیکن ان کے درمیان بعض معمولات کے آگے پیچھے ہونے کے جواز میں اختلاف ہے۔ اسی طرح یہ ترتیب آگے پیچھے ہونے پر وجوب دم میں بھی اختلاف ہے اور اس حدیث سے ان حضرات کی تائید ہوتی ہے جو تقدیم و تاخیر کے جواز کے قائل ہیں اور دم کے بھی قائل نہیں ہیں۔

(٦٣٢) وَعَنِ الْمِسْوَرِ بْنِ مَخْرَمَةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُمَا، أَنَّ رَسُولَ اللهِ ﷺ نَحَرَ قَبْلَ أَنْ يَحْلِقَ، وَأَمَرَ أَصْحَابَهُ بِذٰلِكَ. رَوَاهُ الْبُخَارِيُّ.

حضرت مسور بن مخرمہ رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے خود قربانی حجامت کرانے سے پہلے کی اور اپنے صحابہؓ کو بھی اس کا حکم دیا۔ (بخاری)

راوی حدیث: ﴿مسور بن مخرمه رضی الله عنهما﴾ مسور کے میم کے نیچے کسرہ ہے۔ سین ساکن اور "واوَ" پر فتحہ، بن مخرمہ۔ مخرمہ میں میم پر فتحہ اور "خاء" ساکن اور "راء" پر فتحہ۔ زھری قرشی ہیں۔ صاحب فضل لوگوں میں آپ کا شمار ہوتا تھا۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد مکہ منتقل ہوگئے۔ یزید بن معاویہ نے جب ۶۴ھ کے آغاز میں مکہ کا محاصرہ کیا تو اس وقت نماز پڑھتے ہوئے ان کو منجنیق کا گولہ آکر لگا اور وہ وفات پاگئے۔

(٦٣٣) وَعَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهَا قَالَتْ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «إِذَا رَمَيْتُمْ وَحَلَقْتُمْ، فَقَدْ حَلَّ لَكُمُ الطِّيبُ، وَكُلُّ شَيْءٍ، إِلاَّ النِّسَاءَ». رَوَاهُ أَحْمَدُ وَأَبُو دَاوُدَ، وَفِي إِسْنَادِهِ ضَعْفٌ.

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "جب کنکریاں مار چکو اور سر کے بال منڈوا لو تو تمہارے لئے خوشبو اور بیویوں کے علاوہ ہر چیز حلال ہوگئی۔" (اسے احمد اور ابوداؤد نے روایت کیا اور اس کی سند میں ضعف ہے۔)

لغوی تشریح: ﴿الا النساء﴾ یعنی بیویوں سے مجامعت جائز نہیں کیونکہ بیویوں سے مباشرت و ہم بستری طواف افاضہ کے بعد جائز ہوتی ہے ﴿وفی سنده ضعف﴾ اس لئے کہ اس کی سند میں حجاج بن ارطاۃ ایسا راوی ہے جس کے متعلق کلام ہے۔

(٦٣٤) وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ نبی کریم

اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ قَالَ: «لَيْسَ عَلَى النِّسَاءِ حَلْقٌ، وَإِنَّمَا عَلَى النِّسَاءِ التَّقْصِيرُ». رَوَاهُ أَبُو دَاوُدَ بِإِسْنَادٍ حَسَنٍ.

ﷺ نے فرمایا کہ ”عورتوں کیلئے سر منڈوانا نہیں بلکہ ان کیلئے صرف بال ترشوانا ہے۔“ (اسے ابوداؤد نے حسن سند سے روایت کیا ہے)

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ خواتین کو سر کے بال منڈوانا نہیں بلکہ انہیں صرف بال کترانا چاہئے اور علماء کا اس پر اتفاق ہے کہ ان کیلئے بال کترانا ہی مشروع ہے۔

(٦٣٥) وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا، أَنَّ العَبَّاسَ بْنَ عَبْدِ المُطَّلِبِ اسْتَأْذَنَ رَسُولَ اللهِ ﷺ أَنْ يَبِيْتَ بِمَكَّةَ لَيَالِيَ مِنًى، مِنْ أَجْلِ سِقَايَتِهِ، فَأَذِنَ لَهُ. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ عباس بن عبدالمطلب رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ ﷺ سے اجازت طلب کی کہ وہ منیٰ والی راتیں مکہ میں کاٹے تاکہ وہ آب زمزم پلا سکیں تو آپ نے ان کو اجازت دے دی۔ (بخاری و مسلم)

لغوی تشریح: ﴿لیالی منی﴾ منیٰ کی راتوں سے مراد' ۱۱ ویں' ۱۲ ویں اور ۱۳ ویں کی راتیں ہیں۔ یہ اجازت انہوں نے اس مقصد اور غرض کیلئے طلب کی کہ وہ اور اس کے ساتھی رات کو آب زمزم کھینچ کر حوض بھر لیتے تھے اور فی سبیل اللہ اس کو تقسیم کرتے تھے۔ ”فاذن لہ“ یہ اجازت اس بات کی دلیل ہے کہ جو لوگ معذور نہ ہوں ان کو منیٰ ہی میں یہ راتیں گزارنی واجب ہیں اور جس کو کوئی عذر پیش آجائے مثلاً منیٰ میں خیمے میں آگ بھڑک اٹھے اور طویل رات گزارنا ناممکن و مشکل نظر آئے تو وہاں رات گزارنا ضروری نہیں اور تیسری رات بھی وہاں گزارنا واجب نہیں کیونکہ جو شخص جلدی کر کے دو دن ہی منیٰ میں رہ کر چلا جائے تو اس پر کوئی گناہ نہیں۔ جیسا کہ اللہ سبحانہ و تعالیٰ نے سورۂ بقرہ میں فرمایا ہے۔

(٦٣٦) وَعَنْ عَاصِمِ بْنِ عَدِيٍّ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، أَنَّ رَسُولَ اللهِ ﷺ أَرْخَصَ لِرُعَاةِ الإِبِلِ فِي البَيْتُوتَةِ عَنْ مِنًى، يَرْمُونَ يَوْمَ النَّحْرِ، ثُمَّ يَرْمُونَ الغَدَ وَمِنْ بَعْدِ الغَدِ لِيَوْمَيْنِ، ثُمَّ يَرْمُونَ يَوْمَ النَّفْرِ. رَوَاهُ الخَمْسَةُ، وَصَحَّحَهُ التِّرْمِذِيُّ وَابْنُ حِبَّانَ.

حضرت عاصم بن عدی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اونٹ کے چرواہوں کو منیٰ سے باہر رات گزارنے کی اجازت دے دی کہ قربانی کے دن کنکریاں ماریں پھر دوسرے اور تیسرے دو روز بھی کنکریاں ماریں پھر کوچ کے روز سنگریزے ماریں۔ (اسے پانچوں نے روایت کیا ہے' ترمذی اور ابن حبان نے اسے صحیح قرار دیا ہے)

لغوی تشریح: ﴿ارخص﴾ اور ایک نسخہ میں رخص ہے۔ دونوں کا معنی ایک ہی ہے یعنی رخصت و اجازت دے دی۔ ﴿رعاۃ﴾ ”را“ پر ضمہ راع کی جمع ہے۔ ﴿فی البیتوتۃ﴾ بات کا مصدر ہے۔ رات

گزارنا کے معنی ہیں اور رات گزارنے سے مراد منیٰ میں مذکورہ راتوں میں سے رات کا بسر کرنا۔ عن منی عن یہاں بعد اور دوری کیلئے ہے۔ یعنی منیٰ سے باہر اس سے دور رہتے ہوئے یعنی نبی کریم ﷺ نے انہیں اپنے اونٹوں کی دیکھ بھال اور منیٰ سے دوران کی حفاظت و حراست کیلئے منیٰ میں رات نہ گزارنے کی اجازت دے دی۔ ﴿ ثم یرمون الغد ومن بعد الغد لیومین ﴾ یعنی وہ گیارہ اور بارہ ذوالحجہ کو کنکریاں مارتے تھے۔ مراد ہے کہ وہ دو دن کی رمی کو جمع کرتے تھے۔ ﴿ ثم یرمون یوم النفر ﴾ منی سے واپسی کا دن اور اس سے مراد ہے تیرہویں تاریخ۔ یہ حدیث دلیل ہے کہ عام حاجیوں کیلئے منیٰ میں شب باشی واجب ہے۔ دلیل اس کی یہ ہے کہ رخصت و اجازت واجب ہی کی صورت میں ہوتی ہے ورنہ اجازت کی ضرورت ہی نہیں۔

راوی حدیث: ﴿ عاصم بن عدی رضی اللہ عنہ ﴾ ان کی کنیت ابوعبیداللہ یا ابوعمرو ہے۔ بنو عبید بن زید کے حلیف تھے۔ بنو عبید کا تعلق بنو عمرو بن عوف جو انصار سے تھے' کے ساتھ تھا۔ غزوۂ بدر اور بعد کے غزوات میں حاضر رہے اور ایک قول یہ بھی ہے کہ بدر کے روز نبی قبائل عالیہ پر امیر تھے۔ نبی ﷺ نے ان کیلئے حصہ مقرر فرمایا۔ ۴۵ھ میں فوت ہوئے اور ایک قول یہ بھی ہے کہ یہ جنگ یمامہ کے روز شہید ہوئے اس وقت ان کی عمر ۱۲۰ برس تھی۔

(٦٣٧) وَعَنْ أَبِيْ بَكْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: خَطَبَنَا رَسُولُ اللهِ ﷺ يَوْمَ النَّحْرِ، اَلْحَدِيْثَ. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت ابوبکرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے قربانی کے روز خطبہ دیا اور ساری حدیث ذکر کی۔ (بخاری و مسلم)

حاصل کلام: حج کے دورانیہ میں نبی کریم ﷺ سے کئی خطبے ثابت ہیں۔ مالکیہ اور احناف کے نزدیک ایک خطاب ساتویں ذی الحجہ کو اور دوسرا عرفہ میں اور تیسرا گیارہویں ذی الحجہ کو۔ دسویں ذی الحجہ یعنی قربانی کے دن کے خطاب کو مالکیہ اور حنفیہ خطبہ نہیں صرف چند نصیحتیں کہتے ہیں۔ یہ عید کا خطبہ نہیں کیونکہ آنحضور ﷺ نے نماز عید تو ادا فرمائی نہیں تھی۔ بعض اسے بھی خطبہ ہی کہتے ہیں اس طرح چار خطبے مسنون ہو جاتے ہیں۔

(٦٣٨) وَعَنْ سَرَّآءَ بِنْتِ نَبْهَانَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهَا قَالَتْ: خَطَبَنَا رَسُولُ اللهِ ﷺ يَومَ الرُّءُوسِ فَقَالَ: «أَلَيْسَ هَذَا أَوْسَطَ أَيَّامِ التَّشْرِيقِ؟» الحَدِيْثَ. رَوَاهُ أَبُو دَاوُدَ بِإِسْنَادٍ حَسَنٍ.

حضرت سراء بنت نبہان رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ہمیں سروں والے دن خطاب فرمایا اور فرمایا "کیا یہ دن ایام تشریق کا درمیانہ دن نہیں ہے؟" اور ساری حدیث ذکر کی۔ (اسے ابوداؤد نے حسن سند کے ساتھ روایت کیا ہے)

لغوی تشریح: ﴿ یوم الرؤوس ﴾ اس میں سب کا اتفاق ہے کہ یوم الرؤس سے ذوالحجہ کی ۱۲ ویں تاریخ مراد ہے۔ اس کا نام یوم الرؤس اس لئے رکھا گیا ہے کہ اس روز کثرت سے قربانی کے جانوروں کے

سروں کو پکایا اور کھایا جاتا ہے۔ ﴿ اوسط ایام التشریق ﴾ سبل السلام میں ہے کہ اس سے اس دن کے افضل ہونے کا بھی احتمال ہے اور اوسط سے یہ بھی مراد ہو سکتا ہے کہ دونوں کے درمیان میں واقع ہے۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ یوم النحر بھی ایام تشریق میں شامل ہے مگر بہت سے علماء کی رائے یہ ہے کہ ایام تشریق سے مراد قربانی کے دن کو چھوڑ کر باقی تین دن ہیں کیونکہ وہاں کے لوگ ان تین ایام میں قربانی کے گوشت کو خشک کرنے کیلئے دھوپ میں رکھتے تھے۔ اس لئے ان ایام کا نام ایام تشریق ہے۔

راوی حدیث: ﴿ سراء بنت نبھان رضی اللہ عنہا ﴾ سراء کے را پر فتحہ اور تشدید اور نبھان کے نون پر فتحہ اور با ساکن ہے۔ قبیلہ غنو سے تھیں۔ ربیعہ بن عبدالرحمٰن نے اس سے روایت بیان کی ہے۔

(٦٣٩) وَعَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهَا، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ قَالَ لَهَا: «طَوَافُكِ بِالبَيْتِ، وَسَعْيُكِ بَيْنَ الصَّفَا وَالمَرْوَةِ، يَكْفِيكِ لِحَجِّكِ وَعُمْرَتِكِ». رَوَاهُ مُسْلِمٌ.

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ان سے فرمایا کہ "تیرا بیت اللہ کا طواف کر لینا صفا اور مروہ کے مابین سعی کر لینا حج اور عمرے کیلئے کافی ہے۔" (مسلم)

لغوی تشریح: معلوم رہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے تلبیہ عمرہ کا کہا تھا۔ مگر وہ ایام ماہواری میں مبتلا ہوگئیں تو ان سے نبی ﷺ نے فرمایا "عمرے کو چھوڑ دو اور ان سے فرمایا کہ حج کا احرام باندھ لو۔" ﴿ رفضها ﴾ کے معنی ہیں اسے ترک کر دے اور عمرے کے اعمال و افعال کو نظرانداز کر دے۔ اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ عمرے سے نکل جا اور اسے باطل کر دے۔ یہ ابطال کا فعل حج اور عمرہ میں صحیح نہیں بجز اس صورت کے کہ احکام سے فراغت کے بعد حلال ہو جائے۔ جب انہوں نے حج کا احرام باندھ لیا تو اب وہ قارنہ بن گئیں۔ یہ حدیث اس کی دلیل ہے کہ قارن کیلئے حج اور عمرہ دونوں کیلئے ایک ہی طواف اور ایک ہی سعی کافی ہے۔

(٦٤٠) وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُمَا، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ لَمْ يَرْمُلْ فِي السَّبْعِ الَّذِيْ أَفَاضَ فِيْهِ. رَوَاهُ الخَمْسَةُ إِلاَّ التِّرمِذِيَّ، وَصَحَّحَهُ الْحَاكِمُ.

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے طواف افاضہ میں طواف کے سات چکروں (پھیروں) میں کسی چکر میں بھی رمل نہیں فرمایا۔" (اسے ترمذی کے علاوہ پانچوں نے روایت کیا ہے اور حاکم نے اسے صحیح قرار دیا ہے)

لغوی تشریح: ﴿ فی السبع الذی افاض فیه ﴾ طواف افاضہ کے طواف کے سات پھیرے۔

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ طواف افاضہ میں رمل نہیں اور نہ ہی طواف وداع میں۔ رمل صرف طواف قدوم میں ہے۔ طواف قدوم اس طواف کو کہتے ہیں جو مکہ میں پہلے داخلہ کے وقت کیا جاتا ہے۔ نیز یہ بات بھی ذہن نشین رہے کہ رمل صرف مردوں کیلئے ہے۔ خواتین کیلئے نہیں ہے ہاں اگر

کسی وجہ سے کسی حاجی کا طواف قدوم میں رمل چھوٹ گیا ہو تو اس کی تلافی کیلئے طواف افاضہ میں رمل کر لے۔

(٦٤١) وَعَنْ أَنَسٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ صَلَّى الظُّهْرَ وَالعَصْرَ وَالمَغْرِبَ وَالعِشَاءَ، ثُمَّ رَقَدَ رَقْدَةً بِالمُحَصَّبِ، ثُمَّ رَكِبَ إِلَى البَيْتِ، فَطَافَ بِهِ. رَوَاهُ البُخَارِيُّ.

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے (بالترتیب اپنے اپنے وقت میں) ظہر اور عصر، مغرب اور عشاء کی نمازیں پڑھیں اور پھر مقام محصب پر تھوڑا سو گئے پھر سوار ہو کر بیت اللہ کی جانب تشریف لے گئے اور طواف کیا۔ (بخاری)

لغوی تشریح: ﴿ رقد رقدة ﴾ یعنی تھوڑا سا سو گئے۔ ﴿ بالمحصب ﴾ محصب اس جگہ کا نام ہے جہاں آپؐ نے نمازیں ادا فرمائیں اور استراحت بھی فرمائی اور یہ کوچ کا آخری دن تھا۔ یعنی ایام تشریق کا تیسرا دن۔ محصب بروزن محمد۔ جگہ کا نام ہے جو دو پہاڑوں کے درمیان پھیلی ہوئی ہے۔ وہ بہ نسبت مکہ سے منیٰ کے زیادہ قریب ہے اسے ابطح اور خیف بنی کنانہ بھی کہتے ہیں۔ فطاف به. اس سے طواف وداع مراد ہے اور یہ حج کا سب سے آخری طواف ہوتا ہے۔

(٦٤٢) وَعَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهَا، أَنَّهَا لَمْ تَكُنْ تَفْعَلُ ذٰلِكَ - أَيِ النُّزُولَ بِالأَبْطَحِ - وَتَقُولُ: إِنَّمَا نَزَلَهُ رَسُولُ اللهِ ﷺ لِأَنَّهُ كَانَ مَنْزِلاً أَسْمَحَ لِخُرُوجِهِ. رَوَاهُ مُسْلِمٌ.

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ وہ ابطح (محصب) میں فروکش ہونے کا عمل نہیں کرتی تھیں اور فرماتی تھیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس مقام پر اس لئے قیام فرمایا تھا کہ یہاں سے واپسی میں آسانی و سہولت زیادہ تھی۔ (مسلم)

لغوی تشریح: ﴿ بالابطح ﴾ ابطح سے محصب مراد ہے۔ ﴿ اسمح ﴾ زیادہ سہل و آسان ﴿ لخروجه ﴾ مکہ سے مدینہ کو جانے کیلئے۔ اس سے معلوم ہوا کہ محصب میں قیام کرنا ان مناسک حج میں سے نہیں ہے جو مستحب ہیں اور ایک قول یہ ہے کہ آپؐ اس مقام پر اس لئے اترے کہ یہ وہ مقام ہے جہاں قریش نے بنو ہاشم سے نبوت کے ساتویں سال میں قطع تعلق کا عہد و پیمان کیا اور وہاں بیٹھ کر اس بائیکاٹ کا معاہدہ لکھا اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم یہاں اللہ کا شکر ادا کرنے کیلئے اترے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے دین اور اپنے رسول کو غلبہ عطا فرمایا۔ اس لئے ان کا قول ہے کہ حاجیوں کو یہاں فروکش ہونا چاہئے۔ مگر میرے نزدیک حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا قول ہی درست ہے۔ واللہ اعلم۔

(٦٤٣) وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا قَالَ: أُمِرَ النَّاسُ أَن يَكُونَ آخِرُ عَهْدِهِمْ بِالبَيْتِ، إِلاَّ

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کو حکم دیا کہ سب سے آخر میں تمہارا عمل بیت اللہ کا طواف ہو مگر ایام ماہواری والی

أَنَّهُ خُفِّفَ عَنِ الحَائِضِ. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ. عورتوں کیلئے تخفیف کر دی گئی ہے۔ (بخاری و مسلم)

حاصل کلام: یہ طواف وداع ہے جو سب مناسک حج کے اتمام و اختتام پر کیا جاتا ہے۔ یہ طواف امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کے سوا سب کے نزدیک واجب ہے۔ اگر کسی وجہ سے رہ جائے تو دم دینا پڑتا ہے مگر ان عورتوں کیلئے معاف ہے جو ایام ماہواری میں ہوں۔

(٦٤٤) وَعَنِ ابْنِ الزُّبَيْرِ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «صَلاَةٌ فِي مَسْجِدِي هَذَا، أَفْضَلُ مِنْ أَلْفِ صَلاَةٍ فِيمَا سِوَاهُ، إِلاَّ الْمَسْجِدَ الحَرَامَ، وَصَلاَةٌ فِي الْمَسْجِدِ الحَرَامِ، أَفْضَلُ مِنْ صَلاَةٍ فِي مَسْجِدِي هَذَا بِمِائَةِ صَلاَةٍ». رَوَاهُ أَحْمَدُ وَصَحَّحَهُ ابْنُ حِبَّانَ.

حضرت ابن زبیر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ "میری اس مسجد میں ایک نماز ادا کرنے کا ثواب دوسری مساجد میں نماز ادا کرنے کے مقابلہ میں ہزار گنا زیادہ ہے۔ بجز مسجد حرام کے اور مسجد حرام میں ایک نماز کی ادائیگی میری اس مسجد میں سو نماز پڑھنے سے افضل ہے۔" (اسے احمد نے روایت کیا ہے اور ابن حبان نے صحیح قرار دیا ہے)

حاصل کلام: اس حدیث میں مسجد نبویؐ اور بیت اللہ میں نماز پڑھنے کا ثواب مذکور ہے۔ آپؐ نے اپنی مسجد کی طرف لفظ ھذا سے جو اشارہ فرمایا ہے اس سے یہ مطلب مفہوم ہوتا ہے کہ جتنی مسجد نبوی عہد نبوی میں تھی اس میں ایک نماز کا ثواب دوسری مساجد میں ایک ہزار نماز پڑھنے سے افضل ہے۔ بعد کے ادوار میں جو اضافے اور وسعت ہوئی ہے وہ گویا اس میں شامل نہیں مگر اضافہ شدہ حصہ بھی چونکہ اصل مسجد نبوی کے ساتھ ملحق ہے اس لئے وہ بھی مسجد نبوی کے حکم میں ہے اور اس میں بھی ثواب اسی قدر ملے گا جو حدیث میں بیان ہوا ہے۔ طبرانی کی ایک روایت میں ہے کہ مسجد اقصیٰ میں ایک نماز پڑھنے کا ثواب پانچ صد نمازوں کے ثواب کے برابر ملتا ہے اور مسجد نبویؐ میں ایک نماز ادا کرنے کا ثواب ایک ہزار نمازوں کے برابر اور مسجد حرام میں ایک نماز کی ادائیگی کا دوسری مساجد میں ایک لاکھ پڑھی جانے والی نمازوں کے برابر ثواب ملتا ہے۔

راوی حدیث: ﴿ابن الزبیر رضی اللہ عنہما﴾ ان کی کنیت ابوبکر ہے۔ نام ان کا عبداللہ بن زبیر بن عوام رضی اللہ عنہ ہے۔ قریش کے قبیلہ اسد سے ہیں۔ اس لئے قرشی اسدی کہلائے۔ ان کی والدہ محترمہ اسماء بنت ابی بکر رضی اللہ عنہما ہجرت مدینہ کے وقت حمل سے تھیں۔ جوں ہی یہ قباء پہنچیں ابن زبیر کی ولادت ہو گئی۔ ہجرت کے بعد پیدا ہونے والا یہ پہلا نومولود تھا۔ بکثرت روزے رکھتے۔ بہت نمازیں پڑھتے۔ بڑے جسیم اور مضبوط گرفت کے مالک تھے۔ فصیح اللسان تھے۔ حق و صداقت کو قبول کرنے والے اور رشتہ داروں کے دکھ تکلیف کو پہنچنے والے تھے۔ ۶۴ھ میں یزید بن معاویہ کی وفات کے بعد ان کی بیعت کی گئی۔ حجاز' عراق' یمن' مصر اور اکثر علاقہ شام پر یہ غالب آئے۔ حجاج بن یوسف ثقفی نے مکہ میں ان کا محاصرہ کر لیا اور ان

کو ۳۷ھ میں پھانسی پر لٹکا کر شہید کر دیا گیا۔

٦ - بَابُ الفَوَاتِ وَالإِحْصَارِ — حج سے رہ جانے اور روکے جانے کا بیان

(٦٤٥) عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُما قَالَ: قَدْ أُحْصِرَ رَسُولُ اللهِ ﷺ، فَحَلَقَ رَأْسَهُ، وَجَامَعَ نِسَاءَهُ، وَنَحَرَ هَدْيَهُ، حَتَّى اعْتَمَرَ عَاماً قَابلاً. رَوَاهُ البُخَارِيُّ.

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ کو بیت اللہ تک پہنچنے سے روک دیا گیا تو آپؐ نے اپنا سر منڈوایا اور قربانی کی اور اپنی ازواج سے تعلق زن و شو قائم کیا یہاں تک کہ آپؐ نے آئندہ سال عمرہ کیا۔ (بخاری)

لغوی تشریح: ﴿باب الفوات والاحصار﴾ فوات کے فاء پر فتحہ۔ یعنی اس کا کیا حکم ہے۔ جس نے حج کا احرام باندھا ہو مگر وہ حج نہ کر سکے۔ جیسے وہ شخص جو عرفہ میں اس وقت پر نہ پہنچ سکا جس میں وقوف عرفہ ضروری اور فرض ہے اور احصار کے معنی رکنا ہے۔ جیسے کوئی بیمار ہو جائے یا پہنچنے سے عاجز ہو جائے یا اس کے اور بیت اللہ کے درمیان دشمن حائل ہو جائے جو اسے بیت اللہ پہنچنے میں رکاوٹ ہو۔ جب دشمن کی وجہ سے پہنچنا ناممکن ہو تو دشمن کی اس رکاوٹ و ممانعت کو حصر کہتے ہیں۔ ﴿احصر﴾ صیغۂ مجہول یعنی عمرہ سے روک دیا گیا۔ یہ واقعہ صلح حدیبیہ کے موقع پر ٦ھ میں پیش آیا تھا۔ یہ حدیث اس کی دلیل ہے کہ محصر کو جہاں روک دیا گیا ہو وہیں احرام کھول کر حلال ہو جائے اور وہیں اپنی قربانی کر دے۔ ﴿حتی اعتمر عاما قابلا﴾ حتی کہ آئندہ سال عمرہ کیا اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ عمرہ کی قضا واجب ہے۔ اس میں زیادہ سے زیادہ یہی خبر ہے کہ آپؐ نے کیا اور یہ وجوب کو مقتضی نہیں ہے بلکہ اس سے یہ بھی لازم نہیں آتا کہ یہ عمرہ آپؐ کا پہلے عمرہ کی قضا تھی۔ بلکہ یہ تو مستقل طور پر دوسرا عمرہ تھا اور اس کا نام عمرۃ القضاء تو صرف اس لئے رکھا گیا کہ حدیبیہ کے موقع پر اس مسئلہ کا فیصلہ دونوں فریق کیلئے تھا۔

حاصل کلام: اس حدیث میں صلح حدیبیہ کے واقعہ کی طرف اشارہ ہے۔ ٦ھ میں رسول اللہ ﷺ احرام بند ہو کر اپنے اصحاب کے ہمراہ مکہ کی طرف آئے۔ مشرکین نے حدیبیہ کے مقام پر آگے بڑھنے سے روک دیا۔ آپؐ نے وہیں احرام کھول دیا' قربانی کی اور سر کے بال منڈائے۔ صحابہ نے بھی تھوڑے سے تامل کے بعد احرام کھول دیئے اور جن کے پاس قربانی کے جانور تھے وہیں نحر و ذبح کر دیئے۔

احصار میں کون سی چیزیں شمار ہوتی ہیں۔ جمہور کہتے ہیں کہ حج و عمرہ کے بجالانے میں جو چیز بھی مانع ہو اور رکاوٹ بنے اسی سے احصار پیدا ہو جاتا ہے۔ مگر بعض کہتے ہیں کہ احصار صرف دشمن کے مانع آنے کی صورت ہی میں ہوتا ہے۔ محصر کی قربانی کے بارے میں بھی اختلاف ہے۔ جمہور علماء کا مذہب ہے

کہ جس جگہ احرام کھولا جائے اسی جگہ قربانی کر دی جائے گی خواہ وہ جگہ حل ہو یا حرم اور یہی قول راجح ہے۔ مگر احناف کے نزدیک قربانی ہر صورت میں حرم میں ذبح و نحر ہونی چاہئے اور اسے کسی کے ذریعہ سے حرم میں بھیج دیا جائے۔ ایک رائے یہ بھی ہے کہ اگر قربانی کا جانور حرم میں پہنچانا ناممکن ہو تو جہاں ہو وہیں ذبح کر دے۔ رہا یہ مسئلہ کہ محصر پر قربانی واجب ہے یا نہیں اکثر علماء تو اسے واجب کہتے ہیں مگر امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کی رائے ہے کہ واجب نہیں کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے تمام اصحاب کے پاس ھدی تو نہیں تھی اگر واجب ہوتی تو پھر سب کیلئے اس کا وجوب ہوتا۔ حالانکہ ایسا ثابت نہیں اور یہی بات راجح معلوم ہوتی ہے۔

(٦٤٦) وَعَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهَا قَالَتْ: دَخَلَ النَّبِيُّ ﷺ عَلَى ضُبَاعَةَ بِنْتِ الزُّبَيْرِ ابْنِ عَبْدِ الْمُطَّلِبِ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا، فَقَالَتْ: يَا رَسُولَ اللهِ! إِنِّي أُرِيدُ الْحَجَّ، وَأَنَا شَاكِيَةٌ، فَقَالَ النَّبِيُّ ﷺ: «حُجِّي وَاشْتَرِطِي أَنَّ مَحِلِّي حَيْثُ حَبَسْتَنِي». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم ضباعہ بنت زبیر بن عبدالمطلب رضی اللہ عنہا کے ہاں تشریف لے گئے۔ اس نے عرض کیا اے اللہ کے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم)! میں حج کرنے کا ارادہ رکھتی ہوں مگر میں بیمار ہوں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے فرمایا کہ "حج کر مگر یہ شرط کر لے کہ میرے احرام کھولنے کی جگہ وہی ہوگی جہاں اے اللہ! تو نے مجھے روکا۔" (بخاری و مسلم)

لغوی تشریح: ﴿شاکیۃ﴾ بیمار۔ ﴿محلی﴾ میم پر فتحہ اور "حا" کے نیچے کسرہ یعنی حج سے خروج کا وقت اور احرام کھول کر میرے حلال ہو جانے کی جگہ۔ یعنی وقت اور مقام دونوں کا بیان مقصود ہے۔ ﴿حبستنی﴾ صیغہ مخاطب یعنی اے اللہ! جہاں تو مجھے روک لے گا۔ اس حدیث سے معلوم ہوا کہ احرام میں شرط لگانا صحیح ہے۔ شرط لگانے والے کو جب کوئی مانع پیش ہو جائے تو محصر کی طرح اس پر قربانی وغیرہ کرنا لازم نہیں۔

(٦٤٧) وَعَنْ عِكْرِمَةَ عَنِ الْحَجَّاجِ بْنِ عَمْرٍو الْأَنْصَارِيِّ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «مَنْ كُسِرَ أَوْ عَرِجَ فَقَدْ حَلَّ، وَعَلَيْهِ الْحَجُّ مِنْ قَابِلٍ»، قَالَ عِكْرِمَةُ: فَسَأَلْتُ ابْنَ عَبَّاسٍ وَأَبَا هُرَيْرَةَ عَنْ ذٰلِكَ، فَقَالَا: صَدَقَ. رَوَاهُ الْخَمْسَةُ، وَحَسَّنَهُ التِّرْمِذِيُّ.

حضرت عکرمہ رحمۃ اللہ علیہ نے حجاج بن عمرو انصاری رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "جس کا پاؤں توڑا جائے یا لنگڑا ہو جائے وہ احرام سے باہر آگیا اب اس پر آئندہ سال حج کرنا لازمی و ضروری ہے۔" عکرمہ کا بیان ہے کہ میں نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے اس کے متعلق دریافت کیا تو ان دونوں نے جواب دیا کہ حجاج بن عمرو نے ٹھیک اور سچ کہا ہے۔ (اسے پانچوں نے روایت کیا ہے اور ترمذی نے اسے حسن قرار دیا ہے۔)

قَالَ مُصَنِّفُهُ - حَافِظُ العَصْرِ، قَاضِي القُضَاةِ أَبُو الفَضْلِ أَحْمَدُ بْنُ عَلِيِّ بْنِ حَجَرٍ الكَنَانِيُّ العَسْقَلاَنِيُّ المِصْرِيُّ، أَبْقَاهُ اللَّهُ فِي خَيْرٍ -: آخِرُ الجُزْءِ ٱلأَوَّلِ، وَهُوَ النِّصْفُ مِنْ هٰذَا الكِتَابِ المُبَارَكِ، قَالَ: وَكَانَ الفَرَاغُ مِنْهُ فِي ثَانِيَ عَشَرَ شَهْرِ رَبِيْعٍ الأَوَّلِ سَنَةَ سَبْعٍ وَعِشْرِيْنَ وَثَمَانِمِائَةٍ، وَهُوَ آخِرُ رُبْعِ العِبَادَاتِ، يَتْلُوْهُ فِي الجُزْءِ الثَّانِي كِتَابُ البُيُوعِ. وَصَلَّى اللَّهُ عَلَى سَيِّدِنَا مُحَمَّدٍ وَآلِهِ وَصَحْبِهِ وَسَلَّمَ تَسْلِيْماً كَثِيْراً دَائِماً أَبَداً. غَفَرَ اللَّهُ لِكَاتِبِهِ وَلِوَالِدَيْهِ وَلِكُلِّ المُسْلِمِيْنَ، وَحَسْبُنَا اللَّهُ وَنِعْمَ الوَكِيْلُ.

بلوغ المرام کے مصنف حافظ العصر' قاضی القضاۃ (چیف جسٹس) ابوالفضل احمد بن علی بن حجر الکنانی العسقلانی مصری اللہ تعالیٰ ان کو بھلائیوں میں ہمیشہ زندہ رکھے نے کہا ہے کہ اتنا حصہ جزء اول کا آخری حصہ ہے اور وہ اس کتاب کا نصف ہے۔ انہوں نے بتایا کہ میں ۸۲۷ھ ماہ ربیع الاول کی ۱۲/ تاریخ کو اس سے فارغ ہوا اور یہ عبادات کے چوتھائی کا آخری حصہ ہے۔ اب اس کے ساتھ دوسرا نصف کتاب البیوع کا آغاز ہے۔ اللہ تعالیٰ اس کے کاتب اور اس کے والدین اور جمیع مسلمین کو اپنے دامن مغفرت میں ڈھانپ لے اور اللہ ہمارے لئے کافی ہے اور وہ بہترین کارساز ہے۔

لغوی تشریح: ﴿کسر﴾ صیغہ مجہول۔ ﴿اوعرج﴾ عین اور را دونوں پر فتحہ۔ پاؤں میں ایسی چوٹ آنا جو پیدائشی نہ ہو اور جب پیدائشی ہو تو اس صورت میں عرج را کو کسرہ سے پڑھا جائے گا۔ ﴿فقدحل﴾ یعنی اس کیلئے احرام ترک کر دینا جائز ہے اس کے بعد وہ اپنے وطن اور گھر کی طرف لوٹ سکتا ہے۔ ﴿وعلیہ الحج من قابل﴾ آئندہ سال حج کی قضائی دے گا جبکہ یہ فرضی حج ہو لیکن اگر حج نفلی ہو تو پھر کچھ بھی نہیں۔ اس سلسلے میں علامہ الیمانی کے کلام کا خلاصہ یہ ہے کہ مذکورہ بالا تینوں احادیث سے یہ معلوم ہوا کہ محرم احرام سے تین امور کی وجہ سے نکل سکتا ہے۔ (۱) احصار کی وجہ سے۔ یہ احصار خواہ کسی مانع کی وجہ سے پیدا ہوا ہو۔ (۲) اس نے شرط کرلی ہو۔ (۳) کسی حادثہ کی وجہ سے پاؤں وغیرہ میں چوٹ آگئی ہو یا وہ لنگڑا ہوگیا ہو۔ جس شخص کا حج احصار کے علاوہ کسی دوسری وجہ سے فوت ہوا ہو اس کے بارے میں ایک قول یہ ہے کہ حج اور عمرہ کیلئے جو احرام باندھا تھا اس سے حلال ہو جائے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور زید بن ثابت رضی اللہ عنہ سے اسی طرح مروی ہے اور ایک قول یہ ہے کہ عمرہ کے لئے تلبیہ کہے گا اور از سرنو دوبارہ احرام باندھے گا پھر جس کا حج فوت ہو جائے اس کیلئے دم دینے میں اختلاف ہے۔ ظاہر بات یہی ہے کہ دم دینا واجب نہیں ہے۔ (دم دینا --- یعنی قربانی کرنا)

حدیث کے بعد والی عبارت ۱۲۹۹ھ کے مطبوعہ نسخہ مطبع صدیقیہ جو بھوپال کا ایک سرکاری مطبع ہے میں موجود ہے۔ یہ نواب صدیق حسن خاں کے زمانہ کا مطبع ہے۔ اس طباعت کی چند خصوصیات و امتیازات ہیں۔ یہ مطبوعہ نسخہ شیخ الاسلام زکریا بن محمد انصاری کے تحریر کردہ مخطوطہ نسخہ سے لیا گیا ہے جو مؤلف کے مشہور شاگردوں میں سے ہیں۔ انہوں نے اس نسخہ کو اول تا آخر پوری احتیاط اور تحقیق سے ان کے روبرو پڑھا۔ اس مخطوطہ نسخہ میں ان کے بڑے بڑے شاگردوں کے نام بھی ہیں جنھوں نے شیخ الاسلام زکریا کے سامنے اس نسخہ کو پڑھا تھا۔ انہوں نے اس میں اپنے اپنے دستخطوں اور مہروں کے ساتھ اپنی شنید اور سنی ہوئی باتیں اور پیغامات اور اجازات کو ثبت کر دیا۔ مثلاً امام یوسف جو مصنف کی اولاد ہیں۔ شیخ عبدالباسط بن احمد ھیثمی' ازھری' شیخ محمد بن عبداللطیف ملیجی اور ان کے علاوہ اور بھی بہت سے مشائخ کا ذکر ہے۔ اس نسخہ کی طباعت نواب صدیق حسن خاں والی بھوپال کی زیر نگرانی ہوئی اور اس کی مراجعت و تصحیح بڑے بڑے محققین علماء نے فرمائی اور اس کے آخر میں کچھ کلمات جناب شیخ علی علاء الدین آلوسی مؤلف روح المعانی کے پوتے کے ہیں جو جمادی الاولیٰ ۱۲۹۹ھ میں بھوپال میں تشریف لائے تھے۔

راوی حدیث: ﴿ ضباعہ بنت زبیر ﴾ ان کی کنیت ام حکیم ہے۔ ضباعہ کے ضاد پر ضمہ۔ پورا نام ضباعہ بنت زبیر بن عبدالمطلب بن ھاشم بن عبد مناف ہے۔ وہ رسول اللہ ﷺ کی چچا زاد بہن ہیں۔ مقداد بن اسود کی اہلیہ تھیں اور ان کے دو بچے عبداللہ اور کریمہ تھے۔ حضرت علی؄ کی خلافت میں فوت ہوئیں۔

﴿ عکرمہ ﴾ عکرمہ کے عین پر کسرہ' کاف ساکن اور راء پر کسرہ۔ ابو عبداللہ کنیت۔ عکرمہ مدنی' عبداللہ بن عباس؄ کے غلام تھے۔ بربر قبیلہ سے تھے۔ بڑے بڑے علماء میں ان کا شمار ہوتا ہے۔ فقہاء مکہ میں سے تھے۔ تابعین کے درمیانے درجے میں شامل ہیں۔ ۱۰۷ھ میں اسی سال کی عمر پا کر فوت ہوئے۔ بعض نے سن وفات میں اختلاف کیا ہے۔

﴿ حجاج بن عمرو انصاری رضی اللہ عنہ ﴾ ان کا پورا نام حجاج بن عمرو بن غزیہ انصاری مازنی مدنی ہے۔ شرف صحابیت سے سرفراز ہیں۔ حضرت علی؄ کے ساتھ جنگ صفین میں شامل ہوئے۔ ان سے دو احادیث مروی ہیں' جن میں سے ایک یہ ہے۔

اردو ترجمہ
بلوغ المرام
من أدلة الأحكام
جلد دوم
تألیف / ابوالفضل شہاب الدین احمد ابن حجر العسقلانی
شارح / مولانا صفی الرحمٰن مبارکپوری
دارالسلام
کتاب وسنت کی اشاعت کا عالمی ادارہ

جمادی الاوّل ۱۴۱۸ھ ستمبر ۱۹۹۷ء

پبلشرز اینڈ ڈسٹری بیوٹرز
پوسٹ بکس نمبر ۲۲۷۴۳ ریاض ۱۱۴۱۶ مملکت سعودی عرب
فون نمبر ۴۰۳۳۹۶۲ فیکس ۴۰۲۱۶۵۹

بلوغ المرام
مِن أدلّةِ الأحكام

جلد دوم

تألیف

ابوالفضل شہاب الدین احمد ابن حجر العسقلانی

(۷۷۳-۸۵۲ھ)

اتحاف الکرام شرح بلوغ المرام

شارح
مولانا صفی الرحمٰن مبارکپوری

مترجم
مولانا عبدالوکیل علوی

تصحیح و تنقیح
مولانا ارشاد الحق الاثری

دار السلام
پبلشرز اینڈ ڈسٹری بیوٹرز
ریاض ۔ لاہور

٧ - كِتَابُ الْبُيُوْعِ

خرید و فروخت کے مسائل

بَابُ شُرُوطِهِ وَمَا نُهِيَ عَنْهُ مِنْهُ

بیع کی شرائط و اور بیع کی ممنوعہ اقسام کا بیان

(٦٤٨) عَنْ رِفَاعَةَ بْنِ رَافِعٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ سُئِلَ أَيُّ الكَسْبِ أَطْيَبُ؟ قَالَ: «عَمَلُ الرَّجُلِ بِيَدِهِ، وَكُلُّ بَيْعٍ مَبْرُورٍ». رَوَاهُ البَزَّارُ، وَصَحَّحَهُ الحَاكِمُ.

حضرت رفاعہ بن رافع رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی ﷺ سے پوچھا گیا کہ کونسی کمائی پاکیزہ تر ہے؟ آپؐ نے فرمایا ”آدمی کی اپنے ہاتھ کی کمائی اور ہر قسم کی تجارت جو دھوکہ اور فریب سے پاک ہو۔“ (اسے بزار نے روایت کیا ہے اور حاکم نے اسے صحیح قرار دیا)

لغوی تشریح: ﴿کتاب البیوع﴾ بیوع بیع کی جمع ہے' لغت میں مال دے کر کوئی چیز خریدنے کا نام بیع ہے۔ شرعی اصطلاح میں بھی اس کے یہی معنی ہیں' لیکن اس میں باہمی رضامندی کی قید کا اضافہ ہے۔ جمع اس لئے لائے ہیں کہ اس کی بہت سی اقسام و انواع ہیں اور تمام بیوع کی چار قسمیں ہیں (۱) " بیع العروض بالعروض " یعنی سامان کو سامان کے بدلہ فروخت کرنا' اسے مقایضہ (بیع تبادلہ) بھی کہتے ہیں۔ (۲) " بیع العروض بالنقود " یعنی نقدی کے ذریعے سامان کی بیع کرنا اور اسی کو ہی بیع کہا جاتا ہے' کیونکہ بیع کی ساری قسموں میں یہ سب سے زیادہ مشہور ہے اور یہی زیادہ معمول بہ ہے۔ (۳) " بیع النقود بالنقود " نقدی کے بدلے نقدی کی بیع یعنی مروجہ سکہ کو مروجہ سکہ کے بدلے خرید و فروخت کرنا' اسے بیع صرف بھی کہتے ہیں۔ (۴) " بیع المنفعة بالمال " یعنی منافع کو مال کے بدلے بیچنا' بصورت سامان ہو یا نقد۔ اسے "اجارہ" کہتے ہیں۔ مصنف نے اس کتاب کے تحت ۲۲ ابواب قائم کئے ہیں۔ جبکہ کئی باب ایسے ہیں جن کا بیع سے کوئی تعلق نہیں' اگر مصنف اس کا نام کتاب البیوع کی بجائے "کتاب البیوع والاموال" رکھتے تو زیادہ مناسب ہوتا۔

﴿باب شروطه﴾ شروطہ میں "ہ" ضمیر کا مرجع بیع ہے۔ یعنی بیع کی شروط کا بیان۔ شرط اسے کہتے ہیں کہ اگر وہ نہ پائی جائے تو اس کا حکم و سبب بھی معدوم ہو جائے۔ ﴿وما نهى عنه﴾ بصیغہ مجہول بیع کی

شروط حسب ذیل ہیں۔ (۱) بیع کرنے والا عاقل و ممیز ہو۔ (۲) عقد کا لفظ ماضی کے ساتھ ہو۔ (۳) مال ایسا ہو جو قابل قیمت اور طے شدہ ہو۔ (۴) فریقین کی باہمی رضامندی کے ساتھ طے پائے۔ (۵) فروخت کی جانے والی چیز بیچنے والے کی ملکیت میں ہو یا اس کی ولایت یعنی سرپرستی میں ہو۔ ﴿ اطیب ﴾ باعتبار عمل سب سے زیادہ فضیلت والا ہو اور برکت بھی زیادہ ہو اور اس کا کھانا حلال ہو۔ ﴿ وکل بیع مبرور ﴾ مبرور' بر سے ہے' یعنی نیکی اور یہ اثم یعنی گناہ کی ضد ہے۔ لہٰذا بیع مبرور وہ بیع ہے جس میں نہ دھوکہ و فریب ہو اور نہ ہی جھوٹی قسم۔ اور ہاتھ کے عمل کی بنیاد دو چیزوں پر ہے۔ (۱) زراعت۔ (۲) صناعت۔ ہاتھ کے عمل کو "بیع مبرور" سے مقدم رکھنا' اس بات کی دلیل ہے کہ یہ افضل ہے اور اس کا بھی احتمال ہے کہ دونوں مساوی ہوں اور "واؤ" عاطفہ ترتیب کیلئے نہیں' بلکہ مطلق جمع کیلئے ہو۔

(٦٤٩) وَعَنْ جَابِرِ بْنِ عَبْدِ اللهِ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا، أَنَّهُ سَمِعَ رَسُولَ اللهِ ﷺ يَقُولُ عَامَ الفَتْحِ، وَهُوَ بِمَكَّةَ: «إِنَّ اللَّهَ وَرَسُولَهُ حَرَّمَ بَيْعَ الخَمْرِ وَالمَيْتَةِ وَالخِنْزِيرِ وَالأَصْنَامِ». فَقِيلَ: يَا رَسُولَ اللهِ أَرَأَيْتَ شُحُومَ المَيْتَةِ؟ فَإِنَّها تُطْلَى بِهَا السُّفُنُ، وَيُدْهَنُ بِهَا الجُلُودُ، وَيَسْتَصْبِحُ بِهَا النَّاسُ، فَقَالَ: «لاَ هُوَ حَرَامٌ»، ثُمَّ قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ عِنْدَ ذٰلِكَ: «قَاتَلَ اللَّهُ اليَهُودَ، إِنَّ اللَّهَ لَمَّا حَرَّمَ عَلَيْهِمْ شُحُومَهَا جَمَلُوهُ، ثُمَّ بَاعُوهُ، فَأَكَلُوا ثَمَنَهُ». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ انہوں نے رسول اللہ ﷺ کو مکہ میں فتح مکہ کے سال یہ فرماتے سنا کہ "بے شک اللہ اور اس کے رسول ﷺ نے شراب کی خرید و فروخت' مردار اور خنزیر کی خرید و فروخت اور بتوں کی تجارت کو حرام کر دیا ہے۔" آپؐ سے پوچھا گیا کہ اے اللہ کے رسول (ﷺ)! مردار کی چربی کے متعلق کیا حکم ہے؟ اس لئے کہ اس سے کشتیوں کو طلاء کیا جاتا ہے اور چمڑوں کو چکنا کیا جاتا ہے اور لوگ اسے جلا کر روشنی حاصل کرتے ہیں۔ آپؐ نے فرمایا "نہیں وہ بھی حرام ہے۔" پھر اس کے ساتھ ہی فرمایا "اللہ تعالیٰ یہود کو غارت کرے کہ جب اللہ تعالیٰ نے چربیوں کو یہود کیلئے حرام کر دیا تو انہوں نے اسے پگھلا کر فروخت کیا اور اس کی قیمت کھائی۔" (بخاری و مسلم)

لغوی تشریح: ﴿ عام الفتح ﴾ عام الفتح سے مراد فتح مکہ کا سال ہے اور یہ رمضان ۸ھ میں فتح ہوا۔ ﴿ ان اللہ ورسولہ حرم ﴾ یہاں اللہ اور اس کے رسول دو کا ذکر ہے' مگر حرم صیغہ مفرد ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اصل میں حرام کرنے والا تو اللہ تعالیٰ ہے اور اس کا رسول تو حکم الٰہی کا اظہار کرنے والا ہے' آپؐ کا حکم درحقیقت اللہ تعالیٰ ہی کا حکم ہوتا ہے' اس لئے واحد کا صیغہ استعمال کیا گیا ہے۔ ﴿ اریت شحوم المیتۃ ﴾ مردار کی چربیوں کے متعلق ارشاد فرمائیں کہ ان کی تجارت حلال ہے یا نہیں؟ اور مسند احمد

کی روایت میں ہے کہ مردار کی چربیوں کی تجارت کے بارے میں کیا خیال ہے؟ ﴿ فانہ ﴾ شان یہ ہے "یطلی" طلا سے ماخوذ ہے' اور باب ضرب یضرب سے صیغہ مجہول ہے۔ معنی یہ ہیں کہ کشتیاں اس سے طلاء کی جاتی ہیں (یعنی چربی سے ان کی ملمع سازی کی جاتی ہے کہ جس سے دو فائدے حاصل ہوتے ہیں۔ نمبرا چربی سے دراڑیں بند ہو جاتی ہیں اور پانی اندر نہیں جاتا۔ نمبر۲۔ چربی' تختوں کو پانی کی خرابی سے محفوظ کر دیتی ہے۔ مترجم) ﴿ السفن ﴾ سین اور فا دونوں پر ضمہ ہے۔ سفینہ کی جمع ہے یعنی کشتیاں ﴿ یدھن ﴾ ادھان یا تدھین سے ماخوذ اور صیغہ مجہول ہے۔ ﴿ ویستصبح بھا الناس ﴾ لوگ اس کے ذریعہ چراغ جلاتے اور دیئے روشن کرتے ہیں۔ پوچھنے والے کے پیش نظر یہ تھا کہ جس سے اتنے فوائد اور مصالح حاصل ہوتے ہیں وہ اس کی تجارت کی صحت کو مقتضی ہیں۔ ﴿ فقال لا ھو حرام ﴾ ھو ضمیر کے متعلق ایک رائے اور قول یہ ہے کہ فانھا تطلی بھا السفن میں جو انتفاع کا مفہوم پایا جاتا ہے' اس کی طرف لوٹتی ہے لیکن راجح بلکہ صحیح بات یہ ہے کہ یہ ضمیر (ھو) بیع کی جانب راجع ہے' کیونکہ سائل نے صرف اس کی بیع کے بارے میں سوال کیا تھا اور گفتگو بھی اسی کیلئے کی تھی۔ اس کی تائید حدیث کا آخری حصہ ثم باعوہ سے بھی ہوتی ہے۔ ﴿ جملوہ ﴾ جیم اور میم دونوں پر فتحہ۔ انہوں نے اسے پگھلایا۔ اس میں مذکورہ تاویل کی بنا پر ضمیر منصوب شحوم کی طرف راجع ہے' یا پھر چربیوں میں سے جو چربی ذہن میں تھی' اس کی طرف راجع ہے۔ یہ حدیث اس کی دلیل ہے کہ جس چیز کا ذکر ہوا اسے فروخت کرنا حرام ہے' بلکہ مردار کے تمام اجزاء کی فروخت حرام ہے' البتہ اس کا چمڑا جب اسے رنگ دیا جائے' اس سے مستثنیٰ ہے' کیونکہ آغاز کتاب میں رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی گزر چکا ہے' ﴿ ایما اھاب دبغ فقد طھر ﴾ جو کچا چمڑا دباغت دے دیا جائے وہ پاک ہو جاتا ہے۔ جمہور نے مردار کے بالوں اور اون کو مستثنیٰ قرار دیا ہے کیونکہ ان پر مردار کا اطلاق نہیں ہوتا اور نہ اس پر زندگی وارد ہوتی ہے اور جو چیزیں اللہ اور اس کے رسول ﷺ نے حرام نہیں کیں' ان سے فائدہ حاصل کرنے اور نفع اٹھانے کے بارے میں اختلاف ہے۔ مثلاً چراغ جلانا' شکرے اور باز کو کھلانا۔ ایک رائے یہ ہے کہ ان سے انتفاع مطلقاً حرام ہے اور ایک رائے یہ ہے کہ ایسی چیزوں میں جواز ہے جن کی ظاہری اور باطنی ہیئت و شکل تبدیل ہو جائے اور علامہ خطابی نے بالاجماع ان سے انتفاع کے جواز پر استدلال کیا ہے کہ جب کسی کا جانور مر جاتا ہے تو اسے شکاری کتوں کے کھانے کیلئے پیش کرنا جائز ہے۔ اور اسی طرح مردار کی چربی سے کشتیوں کو طلاء کرنا بھی جائز ہے۔ ان دونوں صورتوں میں کوئی فرق نہیں' جیسا کہ عون المعبود (ج ۳) ص: ۲۹۸ میں فتح الباری کے حوالہ سے منقول ہے اور علامہ ابن القیم رحمہ اللہ نے زاد المعاد (ج ۴) ص: ۲۴۲ میں کہا ہے کہ یہ بات معلوم رہنی چاہئے کہ انتفاع کا باب' بیع سے زیادہ وسیع و کشادہ ہے۔ پس معلوم ہوا کہ ہر وہ چیز جسے فروخت کرنا حرام ہے' ضروری نہیں کہ اس کا انتفاع بھی حرام ہو۔ ان دونوں کے مابین تلازم نہیں ہے لہٰذا جس چیز کا فروخت کرنا حرام ہے اس سے حرمت انتفاع اخذ نہیں کی جائے گی۔ اصنام (بتوں) کی خرید و فروخت تو صرف اس لئے حرام کی گئی ہے کہ یہ شرک کے آلات میں سے ایک آلہ ہیں

اور اسی سے ہر آلہ شرک کی حرمت مستفید ہوتی ہے اور اسی پر باجے اور گانے بجانے کے آلات کو قیاس کیا گیا ہے اور شراب کی حرمت میں ہر نشہ آور چیز کی حرمت شامل ہو گئی۔ خواہ وہ چیز مائع (بہنے والی) ہو یا منجمد و جامد۔ کشید کی گئی ہو یا پکا کر تیار کی گئی۔ یہ حدیث تین قسم کی اجناس کی حرمت پر مشتمل ہے۔ مشروبات (پینے کی اشیاء) جو عقل کو فاسد کر دیتے ہیں۔ کھانے جو طباع میں فساد پیدا کرتے ہیں اور خبیث غذا بنتے ہیں اور نقود (دولت) جو فساد ادیان کا باعث ہوتے ہیں اور فتنہ اور شرک کی طرف دعوت دیتے ہیں۔ (الھدی) اس حدیث میں تنبیہہ شدید ہے کہ ہر وہ حیلہ جو حرام کو حلال بنانے کے راستہ کی طرف لے جاتا ہو وہ باطل ہے۔

(٦٥٠) وَعَنِ ابْنِ مَسْعُودٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: سَمِعْتُ رَسُولَ اللهِ ﷺ يَقُولُ: «إِذَا اخْتَلَفَ الْمُتَبَايِعَانِ، وَلَيْسَ بَيْنَهُمَا بَيِّنَةٌ، فَالقَوْلُ مَا يَقُولُ رَبُّ السِّلْعَةِ أَوْ يَتَتَارَكَانِ». رَوَاهُ الخَمْسَةُ وَصَحَّحَهُ الحَاكِمُ.

حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا' آپؐ فرماتے تھے کہ "جب فروخت کرنے والے اور خریدنے والے میں اختلاف واقع ہو جائے اور ثبوت و شہادت کسی کے پاس نہ ہو تو صاحب مال کی بات معتبر ہو گی' یا وہ دونوں اس سودے کو چھوڑ دیں۔" (اسے پانچوں نے روایت کیا ہے اور حاکم نے صحیح قرار دیا ہے)

لغوی تشریح: ﴿ اذا اختلف المتبایعان ﴾ متبایعان سے مراد سودا فروخت کرنے والا اور خریدنے والا۔ اختلاف خواہ تعین قیمت میں ہو' یا فروخت شدہ چیز کے بارے میں' یا کسی شرط کے طے کرنے میں ﴿ بینۃ ﴾ یعنی شہادت و گواہی اور دلیل ﴿ رب السلعۃ ﴾ فروخت شدہ چیز کا مالک اور ﴿ السلعۃ ﴾ سین کے نیچے کسرہ اور لام ساکن۔ یعنی ساز و سامان ﴿ یتتارکان ﴾ دونوں فروخت شدہ چیز کو واپس کر دیں اور بیع کو فسخ کر دیں اور صاحب مال کی بات کو تسلیم کیا جائے گا' جب کہ قواعد شرع کے مطابق وہ قسم کھائے' جس کی بات کو تسلیم کیا جائے گا قسم بھی اسی پر لازم ہے۔

حاصل کلام: اس حدیث سے ثابت ہوا کہ جب فروخت کنندہ اور خریدار کے مابین کسی چیز کے بارے میں اختلاف واقع ہو جائے تو فروخت کرنے والے کی بات کو ترجیح ہو گی' ورنہ خریدار اپنی ادا شدہ رقم واپس لے اور فروخت کرنے والا اپنی فروخت شدہ چیز واپس لے اور سودا فسخ کر دیا جائے۔ یہ اسی صورت میں ہو سکتا ہے جبکہ وہی چیز اپنی اصلی حالت میں موجود ہے۔ فروخت کنندہ کو قسم کھا کر کہنا ہو گا کہ جو بیان میں دے رہا ہوں وہ درست اور ٹھیک ہے اور قسم بھی شرعی قواعد کے مطابق ہو گی۔

(٦٥١) وَعَنْ أَبِي مَسْعُودٍ الأَنْصَارِيِّ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُ، أَنَّ رَسُولَ اللهِ ﷺ نَهَى عَنْ ثَمَنِ

حضرت ابو مسعود انصاری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے کتے کی قیمت' بدکار و فاحشہ عورت کی اجرت و کمائی اور کاہن کی شیرینی سے منع

الكَلْبِ، وَمَهْرِ البَغِيِّ، وَحُلْوَانِ الكَاهِنِ . مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

فرمایا۔ (بخاری و مسلم)

لغوی تشریح : ﴿ البغی ﴾ "با" پر فتحہ اور غین کے نیچے کسرہ اور یا پر تشدید۔ یعنی زانیہ یہاں فعیل فاعلۃ کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔ بغی، بغاء سے ماخوذ ہے۔ بغاء میں "با" کے نیچے کسرہ۔ اس کے معنی زنا ہیں اور مھر البغی سے مراد وہ اجرت و کمائی ہے جو زنا کاری کے عوض فاحشہ عورت حاصل کرتی ہے اسے مجازاً مھر کہا گیا ہے۔ ﴿ الکاھن ﴾ اس کو کہتے ہیں جو مخفی و پوشیدہ رازوں کے جاننے اور مستقبل میں رونما ہونے والے واقعات کے متعلق پیشگی مطلع کرنے کا دعویدار ہو۔ مثلاً نزول بارش کی اطلاع کا دعویٰ۔ وباء کے پھوٹ پڑنے اور واقع ہونے کے متعلق دعویٰ، قتل و قتال اور جنگ و جدال کے ظہور کا دعویٰ وغیرہ۔ ان چیزوں کی معرفت کا جو بھی دعویدار ہو وہ اس میں شامل ہے جیسے عراف، نجومی، رمال، کنکریوں پر مار کر بتانے والا اور جفر کا عامل (اسرار حروف کے علم کا دعویدار) وغیرہ اور ﴿ حلوان الکاھن ﴾ حلوان کے "حا" پر ضمہ اور لام ساکن۔ وہ معاوضہ و اجرت جو کاہن کو اس کے عمل کہانت کے بدلہ میں دی جاتی ہے۔ یہ حلاوت کے لفظ سے ماخوذ ہے۔ شیریں چیز کے ساتھ اس کی مشابہت سے مراد یہ ہے کہ یہ بغیر کسی مشقت و کلفت کے آسانی سے حاصل ہو جاتی ہے۔ اس حدیث سے مذکورہ بالا چیزوں کی حرمت ثابت ہے۔ مگر بعض ائمہ نے شکاری کتے کی قیمت کو مستثنیٰ کیا ہے اور اس کے جواز کا فتویٰ دیا ہے، لیکن جمہور علماء نے کتے کی مطلقاً قیمت کو حرام قرار دیا ہے۔

حاصل کلام : اس حدیث میں کتے کی قیمت اور بازاری عورت کی زنا کی کمائی اور کاھن کی کہانت کی اجرت حرام قرار دی گئی ہے۔ کتا بذات خود نجس ہونے کی بنا پر حرام ہے۔ حرام چیز کی قیمت لینا بھی حرام ہے۔ زنا اسلام میں قطعی حرام ہے اس کی کمائی بھی حرام۔ پیشہ کہانت حرام ہے تو اس کی اجرت بھی حرام ہے۔

(٦٥٢) وَعَنْ جَابِرِ بْنِ عَبْدِ اللهِ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا أَنَّهُ كَانَ يَسِيْرُ عَلَى جَمَلٍ لَّهُ قَدْ أَعْيَا، فَأَرَادَ أَن يُسَيِّبَهُ، قَالَ: فَلَحِقَنِي النَّبِيُّ ﷺ، فَدَعَا لِيْ، وَضَرَبَهُ، فَسَارَ سَيْراً لَمْ يَسِرْ مِثْلَهُ، قَالَ: بِعْنِيْهِ بِأُوقِيَّةٍ، قلت: لا ثم قال: بِعْنِيْهِ فَبِعْتُه بِأُوقِيَّةٍ، وَاشْتَرَطْتُ حُمْلاَنَهُ إِلٰى أَهْلِيْ، فَلَمَّا بَلَغْتُ أَتَيْتُهُ بِالجَمَلِ،

حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ وہ اپنے ایک درماندہ تھکے ماندے اونٹ پر سفر کر رہے تھے۔ انہوں نے اسے چھوڑنے کا ارادہ کر لیا۔ حضرت جابر رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ اتنے میں پیچھے سے نبی ﷺ مجھے آملے۔ آپ ؐ نے میرے لئے دعا فرمائی اور اونٹ کو مارا تو وہ ایسی تیز روی سے چلنے لگا کہ اس سے پہلے ایسی تیز رفتاری سے نہیں چلا تھا۔ آپ ؐ نے فرمایا "مجھے یہ اونٹ ایک اوقیہ چاندی کے عوض فروخت کر دو۔" میں نے عرض کیا نہیں۔ آپ ؐ نے

فَنَقَدَنِيْ ثَمَنَهُ، ثُمَّ رَجَعْتُ، فَأَرْسَلَ فِيْ أَثَرِيْ، فَقَالَ: أَتَرَانِي مَاكَسْتُكَ لِآخُذَ جَمَلَكَ؟ خُذْ جَمَلَكَ وَدَرَاهِمَكَ، فَهُوَ لَكَ. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ. وَهٰذَا السِّيَاقُ لِمُسْلِمٍ.

پھر دوبارہ فرمایا "مجھے یہ اونٹ بیچ دو۔" تو میں نے اسے آپؐ کو بیچ دیا اور شرط یہ طے کی کہ اپنے گھر والوں تک سوار ہو کر جاؤں گا۔ پس جونہی (مدینہ) پہنچا تو میں وہ اونٹ لے کر آپؐ کی خدمت میں حاضر ہو گیا۔ آپؐ نے اس کی نقد قیمت مجھے ادا فرما دی۔ پھر میں (رقم وصول کر کے) واپس آگیا۔ آپؐ نے میرے پیچھے (اونٹ) بھیج دیا اور فرمایا کہ "تیرا خیال ہے کہ میں نے اونٹ کی قیمت کم کی تا کہ تیرا اونٹ لے لوں؟ اپنا اونٹ لے لو اور رقم بھی اپنے پاس رکھو یہ تیرے لئے ہے۔" (بخاری و مسلم' یہ سیاق مسلم میں ہے)

لغوی تشریح: ﴿اعیا﴾ تھک گیا' درماندہ ہو گیا' چلنے سے رہ گیا۔ ﴿یسیبہ﴾ باب تفعیل سے ہے' معنی ہے اسے آزاد چھوڑ دے' جہاں چاہے چلے پھرے ﴿وقیۃ﴾ "واؤ" پر ضمہ' قاف کے نیچے کسرہ اور "یا" مشدد۔ اسے اوقیہ بھی کہا جاتا ہے۔ اوقیہ کے ہمزہ پر ضمہ "واؤ" ساکن۔ "یا" پر تشدید بھی ہے اور تخفیف بھی۔ چاندی کے چالیس درہم۔ ان کا وزن ساڑھے دس تولہ کے مساوی ہوتا ہے' جدید پیمانہ کے مطابق ۱۴۷ گرام بنتا ہے۔ ﴿حملانہ﴾ "حا" پر ضمہ' اس پر سوار ہونا' یعنی میں نے آپ سے یہ شرط طے کر لی کہ مدینہ تک سوار ہو کر جاؤں گا۔ ﴿فنقدنی﴾ باب نصر ینصر سے۔ مجھے اس کی قیمت نقد ادا فرما دی۔ ﴿اثری﴾ ہمزہ اور ثا پر فتحہ اور ہمزہ کے نیچے کسرہ اور "ثا" ساکن بھی منقول ہے۔ میرے پیچھے' میرے نقش قدم پر ﴿اترانی﴾ استفہام انکاری ہے۔ فعل صیغہ مجہول' ظن کے معنی میں' یعنی کیا تو نے گمان کر لیا اور میرے بارے میں سمجھ لیا کہ ﴿ماکستک﴾ صیغہ متکلم۔ مماکسۃ سے ماخوذ ہے' یعنی میں نے قیمت کم کرنے کی کوشش کی۔ آپ کا یہ اشارہ اس طے شدہ قیمت کی طرف تھا' جو بیع کے وقت طے ہوئی تھی۔ یہ حدیث دلیل ہے کہ چوپائے کو مشروط طور پر فروخت کرنا اور خریدنا جائز ہے اور جمہور کی رائے بھی یہی ہے اور امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک بھی یہ شرط جائز ہے' بشرطیکہ سفر کی مسافت تین روز سے زیادہ نہ ہو' لیکن امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ' امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اور بعض دوسرے علماء و فقہاء کے نزدیک مطلق جائز نہیں۔ مگر یہ حدیث ان اقوال میں سے کسی قول کے ساتھ مکمل مطابقت نہیں رکھتی۔ حدیث کا سیاق بتاتا ہے کہ دونوں سفر سے گھر واپس آرہے تھے اور دونوں کا راستہ بھی ایک ہی تھا اور حضرت جابر رضی اللہ عنہ کو سوار ہو کر گھر پہنچنے کی حاجت و ضرورت تھی اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی ایسے آدمی کی خدمت درکار تھی جو اسے ہانک کر مدینہ پہنچا دے۔ اس صورت میں جانبین و طرفین کیلئے اس شرط میں کوئی

مضائقہ و حرج نہیں تھا' بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ دونوں کیلئے اس میں نرمی و آسانی تھی اور دونوں کی مصلحت کی رعایت بھی تھی۔ پس حدیث میں اس سے زائد شرط کی کوئی دلیل نہیں کہ فروخت کنندہ اور خریدار کی مصلحتوں کا جو خاطر خواہ لحاظ رکھا گیا ہے' وہ جائز ہے۔ یوں نہیں کہ یہ شرط مطلقاً جائز ہے' خواہ خریدار کا اس میں نقصان ہی ہو اور نہ ہی مطلقاً ممنوع ہے' کیونکہ اس میں بغیر کسی مناسب وجہ کے حدیث کی تردید پائی جاتی ہے۔

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ کسی آدمی سے ازخود یہ مطالبہ کرنا کہ وہ اپنی فلاں چیز اسے فروخت کر دے' جائز ہے۔ قیمت طے کرنا اور قیمت میں کمی کا تقاضا کرنا بھی جائز ہے۔ اگر سواری ہو تو یہ شرط لگانا کہ میں اپنے گھر تک اس پر سوار ہو کر جاؤں گا' جائز ہے' بشرطیکہ اس میں کسی کے نقصان کا اندیشہ نہ ہو یا رہائشی جگہ ہو تو خریدار سے کچھ مدت تک کیلئے رہائش کی شرط طے کرنا جائز ہے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے بھی ایک مکان فروخت کیا۔ خریدار سے ایک ماہ تک رہائش کی شرط طے کر لی۔ اس حدیث سے یہ بھی مترشح ہو رہا ہے کہ کسی چیز کی قیمت کم کرانے میں جائز حدود سے اپنے اثر و رسوخ اور منصب کی وجہ سے فائدہ نہیں اٹھانا چاہئے۔ اسوۂ رسول سے یہ بھی ثابت ہو رہا ہے کہ ایثار سے کام لینا چاہئے اور اپنے بھائی کی حیثیت کا خیال رکھنا چاہئے۔ نیز اونٹ کی تیز رفتاری سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا معجزہ بھی ثابت ہوا۔

(٦٥٣) وَعَنْهُ قَالَ: أَعْتَقَ رَجُلٌ مِّنَّا عَبْداً لَّهُ عَنْ دُبُر، وَلَمْ يَكُن لَّهُ مَالٌ غَيْرُهُ، فَدَعَا بِهِ النَّبِيُّ ﷺ فَبَاعَهُ. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما ہی سے مروی ہے کہ ہم میں سے کسی شخص نے اپنا غلام مدبر کر دیا۔ اس غلام کے سوا اس کے پاس اور کوئی مال نہیں تھا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس غلام کو بلوایا اور اسے فروخت کر دیا۔ (بخاری و مسلم)

لغوی تشریح: ﴿ رجل منا ﴾ بعض انصار میں سے کوئی آدمی۔ اس کا نام ابومذکور انصاری تھا اور اس کے غلام کا نام یعقوب تھا اور وہ قبطی تھا۔ عبداللہ ابن زبیر رضی اللہ عنہ کے دور امارت کے آغاز ہی میں فوت ہو گیا تھا۔ ﴿ دبر ﴾ دال اور با دونوں پر ضمہ' معنی پیچھے۔ کسی چیز کا آخری حصہ۔ یعنی اس نے غلام سے کہا کہ میری وفات کے بعد تو آزاد ہے۔ ﴿ فباعه ﴾ آپ نے اسے آٹھ سو درہم میں فروخت کر دیا اور نعیم بن نحام رضی اللہ عنہ نے اسے خرید لیا۔ (بعض روایات میں ہے کہ وہ مقروض تھا' اسی لئے آپ نے اسے فروخت کیا تاکہ اس کا قرضہ اتار دیا جائے۔) اس حدیث سے معلوم ہوا کہ مدبر غلام کو ضرورت و حاجت کے وقت فروخت کرنا جائز ہے۔ امام شافعی رحمہ اللہ' اہل حدیث اور عام فقہاء اس کی مطلقاً فروخت کے قائل ہیں۔ حدیث سے بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ ضرورت کے موقع پر فروخت کرنا جائز ہے۔

(٦٥٤) وَعَنْ مَيْمُونَةَ رَضِيَ اللّٰهُ حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا زوجہ رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم سے

تَعَالَى عَنْهَا زَوْجِ النَّبِيِّ ﷺ، أَنَّ فَأْرَةً وَقَعَتْ فِيْ سَمْنٍ، فَمَاتَتْ فِيْهِ، فَسُئِلَ النَّبِيُّ ﷺ عَنْهَا فَقَالَ: «**أَلْقُوهَا وَمَا حَوْلَهَا وَكُلُوهُ**». رَوَاهُ الْبُخَارِيُّ، وَزَادَ أَحْمَدُ وَالنَّسَائِيُّ: «فِي سَمْنٍ جَامِدٍ».

روایت ہے کہ ایک چوہیا گھی میں گر کر مر گئی۔ اس کے متعلق نبی ﷺ سے دریافت کیا گیا۔ (جواب میں) آپ نے فرمایا "اسے نکال کر باہر پھینک دو اور اس کے اردگرد کا گھی بھی باہر ڈال دو اور (بقیہ) استعمال کر لو۔" (بخاری) نسائی اور احمد نے اتنا اضافہ نقل کیا ہے۔ "منجمد گھی میں۔"

(٦٥٥) وَعَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «**إِذَا وَقَعَتِ الْفَأْرَةُ فِي السَّمْنِ، فَإِنْ كَانَ جَامِداً فَأَلْقُوهَا وَمَا حَوْلَهَا، وَإِنْ كَانَ مَائِعاً فَلاَ تَقْرَبُوهُ**». رَوَاهُ أَحْمَدُ وَأَبُو دَاوُدَ، وَقَدْ حَكَمَ عَلَيْهِ الْبُخَارِيُّ وَأَبُو حَاتِمٍ بِالْوَهَمِ.

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "جب چوہا گھی میں گر جائے۔ اگر گھی منجمد ہو تو اس چوہے کو اور اس کے اردگرد کے گھی کو باہر پھینک دو اور اگر گھی سیال ہو تو اس کے قریب بھی نہ پھٹکو۔" (اسے احمد اور ابوداؤد نے روایت کیا ہے۔ بخاری اور ابوحاتم نے اس پر وہم کا حکم لگایا ہے)

حاصل کلام: ﴿ماحولها﴾ وہ حصہ جو اس چوہے کے جسم سے لگ ہو گیا ہو۔ ﴿مائعا﴾ بہنے والا' سیال ہو۔ اسے باہر پھینکنے کا حکم اور اس کے قریب پھٹکنے کی ممانعت' اس بات کی دلیل ہیں کہ نجس چکنائی (گھی' تیل) سے انتفاع مطلقاً جائز نہیں۔ لیکن پہلے یہ بیان ہو چکا ہے کہ انتفاع کا باب' باب بیع سے کہیں زیادہ وسیع ہے۔ تمام دلائل میں تطبیق یوں ہے کہ یہ ممانعت صرف انسان کے کھانے اور بطور تیل استعمال کرنے پر محمول ہے۔ جب اس کا کھانا اور بطور تیل استعمال کرنا درست نہیں تو اسے فروخت کر کے اس کی قیمت کھانا بالاولیٰ حرام ہے۔

جامد اور مائع کا فرق اس لئے ہے کہ جامد میں چوہے کی تمیز ہو سکتی ہے جبکہ مائع میں اس کا امکان نہیں کہ کس اور کتنے حصہ سے چوہے کا بدن ملوث ہوا ہے۔ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ اور ابوحاتم رحمۃ اللہ علیہ نے اس پر وھم کا حکم لگایا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ یہ حدیث مسند میمونہ کی ہے۔ مسند ابی ہریرہ سے نہیں ہے' لہٰذا اس پر وہم کا حکم سند کے اعتبار سے ہے متن کے اعتبار سے نہیں۔

(٦٥٦) وَعَنْ أَبِي الزُّبَيْرِ قَالَ: سَأَلْتُ جَابِراً عَنْ ثَمَنِ السِّنَّوْرِ وَالْكَلْبِ. فَقَالَ: زَجَرَ النَّبِيُّ ﷺ عَنْ ذٰلِكَ. رَوَاهُ مُسْلِمٌ وَالنَّسَائِيُّ وَزَادَ: «إِلاَّ

حضرت ابو الزبیر رحمۃ اللہ علیہ سے روایت ہے کہ میں نے حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے بلی اور کتے کی قیمت کے متعلق پوچھا تو انہوں نے جواب دیا کہ نبی ﷺ نے اس بارے میں زجر و توبیخ فرمائی ہے۔ (مسلم و نسائی) اور

كَلْبَ صَيْدٍ. نسائی میں اتنا اضافہ ہے کہ "شکاری کتے کے علاوہ۔"

لغوی تشریح: ﴿السنور﴾ سین کے نیچے کسرہ اور نون پر تشدید اور فتحہ' واؤ ساکن' معنی بلا۔ ﴿زجر﴾ ڈانٹ ڈپٹ کر روک دیا' منع کر دیا۔ نھی دراصل تحریم کیلئے ہے۔ بالخصوص جبکہ ڈانٹ ڈپٹ بھی ساتھ ہو۔ اس سے ثابت ہوا کہ بلی کا فروخت کرنا حرام ہے۔ یہ رائے ایک گروہ کی ہے اور جمہور اس طرف گئے ہیں کہ اس کا فروخت کرنا جائز ہے اور اس حدیث میں جو نھی ہے اس سے کراہت تنزیہی مراد ہے اور اس کا فروخت کرنا مکارم اخلاق اور مروت میں سے نہیں۔ یہ بات بھی مخفی نہیں کہ بغیر کسی مقتضیٰ کے نھی کو اس کے حقیقی معنی سے خارج کرنا درست نہیں' جیسا کہ علامہ شوکانی رحمہ اللہ نے کہا ہے اور جو شکاری کتے کے استثناء کا اضافہ ہے تو اس کے متعلق نسائی نے کہا ہے کہ یہ منکر ہے اور ابن حبان نے کہا ہے کہ یہ حدیث اس لفظ سے باطل ہے' اس کی کوئی اصل نہیں۔ جیسا کہ صاحب سبل السلام نے کہا ہے۔

راوی حدیث: ﴿ابوالزبیر﴾ محمد بن مسلم بن تدرس الاسدی المکی' یہ حکیم بن حزام کے غلام تھے' تابعی تھے۔ ان کے ثقہ ہونے اور ان کی روایت کے حجت ہونے پر سبھی کا اتفاق ہے' البتہ مدلس ہیں۔ ۱۲۸ھ کو فوت ہوئے۔

(٦٥٧) وَعَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهَا قَالَتْ: جَاءَتْنِي بَرِيْرَةُ، فَقَالَتْ: إِنِّي كَاتَبْتُ أَهْلِيْ عَلَى تِسْعِ أَوَاقٍ، فِي كُلِّ عَامٍ أُوْقِيَّةٌ، فَأَعِيْنِيْنِي! قُلْتُ: إِنْ أَحَبَّ أَهْلُكَ أَنْ أَعُدَّهَا لَهُمْ، وَيَكُونُ وَلَاؤُكِ لِيْ فَعَلْتُ، فَذَهَبَتْ بَرِيْرَةُ إِلَى أَهْلِهَا، فَقَالَتْ لَهُمْ، فَأَبَوا عَلَيْهَا، فَجَاءَتْ مِنْ عِنْدِهِمْ، وَرَسُولُ اللهِ ﷺ جَالِسٌ، فَقَالَتْ: إِنِّي قَدْ عَرَضْتُ ذٰلِكَ عَلَيْهِمْ فَأَبَوا، إِلاَّ أَنْ يَكُونَ الوَلاَءُ لَهُمْ، فَسَمِعَ النَّبِيُّ ﷺ، فَأَخْبَرَتْ عَائِشَةُ النَّبِيَّ ﷺ، فَقَالَ: «**خُذِيهَا وَاشْتَرِطِي لَهُمُ الوَلاَءَ فَإِنَّمَا**

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ بریرہ رضی اللہ عنہا (لونڈی) میرے پاس آئی اور کہنے لگی میں نے اپنے مالک سے نو اوقیہ چاندی پر مکاتبت کر لی ہے کہ ہر سال میں ایک اوقیہ ادا کرتی رہوں گی۔ لہٰذا میری (اس بارے میں) مدد کریں۔ میں نے (اسے) کہا کہ اگر تیرے مالک کو یہ پسند ہو کہ میں تیری مجموعی رقم یکمشت ادا کر دوں اور تیری ولاء میری ہو جائے تو میں ایسا کرنے کو تیار ہوں۔ بریرہ رضی اللہ عنہا یہ تجویز لے کر اپنے مالک کے پاس گئی اور ان سے یہ کہا تو انہوں نے اسے تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ بریرہ رضی اللہ عنہا ان کے پاس سے واپس آئی' اس وقت رسول اللہ ﷺ بھی تشریف فرما تھے۔ بریرہ رضی اللہ عنہا نے کہا کہ میں نے اپنے مالکوں کے سامنے وہ تجویز پیش کی تھی' مگر انہوں نے اسے تسلیم کرنے

الوَلاَءُ لِمَنْ أَعْتَقَ»، فَفَعَلَتْ عَائِشَةُ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهَا، ثُمَّ قَامَ رَسُولُ اللهِ ﷺ فِي النَّاسِ خَطِيْباً، فَحَمِدَ اللَّهَ وَأَثْنَى عَلَيْهِ، ثُمَّ قَالَ: «أَمَّا بَعْدُ، فَمَا بَالُ رِجَالٍ يَشْتَرِطُونَ شُرُوطاً لَيْسَتْ فِي كِتَابِ اللهِ عَزَّ وَجَلَّ؟ مَا كَانَ مِنْ شَرْطٍ لَيْسَ فِي كِتَابِ اللهِ فَهُوَ بَاطِلٌ، وَإِنْ كانَ مِائَةَ شَرْطٍ، قَضَاءُ اللهِ أَحَقُّ، وَشَرْطُ اللهِ أَوْثَقُ، وَإِنَّمَا الوَلاَءُ لِمَنْ أَعْتَقَ». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ، واللَّفْظُ لِلْبُخَارِيِّ، وَعِنْدَ مُسْلِمٍ قَالَ: «اشْتَرِيهَا، وَأَعْتِقِيهَا، وَاشْتَرِطِي لَهُمُ الوَلاَءَ».

سے انکار کر دیا ہے اور وہ کہتے ہیں کہ ولاء ان کیلئے ہے۔ یہ بات نبی ﷺ نے سنی اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے بھی اس واقعہ سے نبی ﷺ کو باخبر کیا۔ یہ سن کر نبی ﷺ نے فرمایا "اسے لے لو اور ان سے ولاء کی شرط کر لو کیونکہ ولاء کا حق دار وہی ہے جو اسے آزادی دے۔" حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے ایسا ہی کیا۔ اس کے بعد رسول اللہ ﷺ لوگوں میں خطاب فرمانے کھڑے ہوئے۔ اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا کی پھر فرمایا "لوگوں کو کیا ہو گیا ہے کہ ایسی شرطیں لگاتے ہیں جو کتاب اللہ میں نہیں۔ (یاد رکھو! کہ) جو شرط کتاب اللہ میں نہیں وہ باطل ہے' خواہ سینکڑوں شرطیں ہی کیوں نہ ہوں۔ اللہ کا فیصلہ نہایت برحق ہے اور اللہ کی شرط نہایت ہی پختہ اور پکی ہے۔ ولاء اسی کا حق ہے جو آزاد کرے۔" (بخاری و مسلم۔ یہ الفاظ بخاری کے ہیں) مسلم کے ہاں ہے کہ آپؐ نے فرمایا "اسے خرید لو اور آزاد کر دو اور ان سے ولاء کی شرط کر لو۔"

لغوی تشریح: ﴿کاتبت﴾ مکاتبت سے ماخوذ ہے۔ مکاتبت وہ پیمان ہے جو مالک اور اس کے غلام کے مابین ایک متعین رقم کے بدلہ میں طے ہوتا ہے کہ غلام جب وہ طے شدہ رقم ادا کر دے' وہ آزاد ہے۔ ﴿اھلی﴾ میرے مالک و آقا اور وہ قبیلہ انصار سے تعلق رکھتے تھے۔ ﴿اواق﴾ اوقیۃ کی جمع ہے' ایک اوقیہ چالیس درہم (سکہ چاندی) کا ہوتا ہے۔ ﴿فی کل عام اوقیۃ﴾ یعنی قسط وار۔ ہر سال ایک اوقیہ۔ خرید و فروخت میں اس طرح قسط طے کر لینا جائز ہے' یہ شرط کے طور پر نہیں تھا۔ ﴿فاعینینی﴾ اعانۃ سے ماخوذ ہے۔ امر سے مؤنث مخاطبہ کا صیغہ۔ مطلب ہے کہ میری مدد و اعانت کرو۔ ﴿الولاء﴾ ولاء کی واؤ پر فتحہ۔ مالک اور غلام کے درمیان آزادی سے حاصل ہونے والا ربط۔ اس کا فائدہ یہ ہے کہ مالک آزاد کردہ غلام کی میراث کا مستحق ہو جاتا ہے جبکہ اس کے نہ اصحاب فروض ہوں اور نہ ہی نسبی عصبہ۔ ﴿فابوا﴾ اباء سے ماخوذ ہے۔ انہوں نے اس شرط کے قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ ﴿خذیھا﴾ اخذ سے امر کا صیغہ ہے۔ اسے خرید کر لے لو۔ ﴿واشترطی لھم الولاء﴾ اور تو ان سے ولاء کی شرط کر لے۔ یہاں لام' علی کے معنی میں استعمال ہوا ہے' جیسا کہ اللہ تعالیٰ کے ارشاد میں ہے۔ "وان اساتم

فلھا" اور اگر برا کرو گے تو اپنے لئے برا کرو گے۔ (بنی اسرائیل : ۷) ﴿ فی کتاب اللہ ﴾ کتاب اللہ سے مراد وہ شریعت ہے جسے اللہ نے بندوں کیلئے لکھ دیا ہے۔ خواہ وہ قرآن میں ثابت ہو یا سنت رسول ﷺ میں۔ ﴿ اوثق ﴾ قوی ترین' استحکام کے اعتبار سے مضبوط و شدید۔ یہ حدیث اس بات کی دلیل ہے کہ جب مکاتب غلام کیلئے طے شدہ رقم ادا کرنا دشوار اور مشکل ہو تو اسے فروخت کرنا جائز ہے۔ ﴿ خذیھا واشترطیھا ﴾ کا جملہ اس پر دلالت کر رہا ہے۔ یہی امام احمد رحمہ اللہ و امام مالک رحمہ اللہ کا مسلک ہے۔ یہ حدیث بہت سے فوائد پر مشتمل ہے جو کسی صاحب علم پر مخفی نہیں۔

حاصل کلام: اس حدیث سے کئی مسائل ثابت ہوتے ہیں' مثلاً غلام اور اس کے مالک و آقا کے درمیان متعین رقم اور مقرر مدت کی صورت میں مکاتبت جائز ہے۔ اگر کوئی دوسرا شخص غلام کی طے شدہ رقم ادا کر دے اور اسے آزادی دے دے تو ایسا بھی جائز ہے۔ اس کے ترکہ و میراث کا حقدار یہ آزاد کرنے والا ہوگا۔ اگر غلام اپنی مکاتبت کی رقم ادا کرنے کیلئے کسی صاحب حیثیت سے سوال کرے تو یہ جائز ہے۔ مکاتبت کی رقم قسط وار ادا کی جا سکتی ہے۔ اگر مستحق آدمی سوال کرے تو اس کی مدد کرنی چاہئے۔ ناجائز شرط اگر عائد کرنے کی کوشش کی جائے تو اس شرط کی کوئی شرعی حیثیت نہیں۔ اعتبار صرف شرعی شرط کا ہوگا۔ اس حدیث سے باہمی مشورہ کرنا بھی ثابت ہے۔ بیوی شوہر سے مشورہ طلب کرے تو شوہر کو صحیح مشورہ دینا چاہئے۔ جس مسئلہ کا لوگوں کو علم نہ ہو وہ مسئلہ عوام کے سامنے بیان کرنا چاہئے۔ مسئلہ کسی کا نام لے کر نہیں' بلکہ عمومی صورت میں بیان کرنا چاہئے۔ عوام سے خطاب کرنے کے موقع پر سب سے پہلے خالق کائنات کی حمد و ثناء بیان کرنی چاہئے۔ پھر اپنا مدعا و مقصد بیان کرنا چاہئے۔ کسی سے درخواست و استدعا کرنے کا بھی یہی اسلوب و انداز ہونا چاہئے۔ مکاتب لونڈی اور غلام کو فروخت کرنا جائز ہے۔ امام احمد رحمہ اللہ و امام مالک رحمہ اللہ کا یہی مذہب ہے۔

راوی حدیث: ﴿ بریرۃ رضی اللہ عنہا ﴾ "باء" پر فتح اور "راء" پر کسرہ ہے' ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی لونڈی تھیں۔ مغیث جو کہ آل ابی احمد بن جحش کے غلام تھے' ان کی یہ بیوی تھیں۔ جب یہ آزاد ہوئی تو رسول اللہ ﷺ نے انہیں اختیار دیا تو اس نے اپنے خاوند مغیث جو کہ ابھی غلام ہی تھا' کو چھوڑ دیا۔

(٦٥٨) وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا قَالَ: نَهَى عُمَرُ عَنْ بَيْعِ أُمَّهَاتِ الأَوْلاَدِ، فَقَالَ: لاَ تُبَاعُ، وَلاَ تُوْهَبُ، وَلاَ تُوْرَثُ، يَسْتَمْتِعُ بِهَا مَا بَدَا لَهُ، فَإِذَا مَاتَ فَهِيَ حُرَّةٌ. رَوَاهُ الْبَيْهَقِيُّ وَمَالِكٌ، وَقَالَ: رَفَعَهُ بَعْضُ الرُّوَاةِ فَوَهِم.

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ام ولد کو فروخت کرنے سے منع کیا اور فرمایا کہ' نہ یہ فروخت ہو سکتی ہے اور نہ ہبہ کی جا سکتی ہے اور نہ میراث میں تقسیم ہو سکتی ہے۔ جب تک مالک چاہے رہے اس سے فائدہ اٹھائے اور جب فوت ہو جائے تو وہ آزاد ہے۔ (اسے بیہقی اور مالک نے روایت کیا ہے اور کہا ہے کہ بعض نے اسے مرفوع کہا ہے

جو وہم ہے)

لغوی تشریح: ﴿عن بیع امهات الاولاد﴾ ان لونڈیوں کی بیع جن کی ان کے مالکوں سے اولاد پیدا ہو چکی ہو۔ ﴿لیستمتع بها﴾ اس کا مالک فائدہ اٹھائے۔ ﴿مابدا﴾ جب تک چاہے۔

حاصل کلام: امہات الاولاد کا واحد ام ولد ہے' اس لونڈی کو کہتے ہیں جو اپنے مالک کا بچہ جنم دے۔ جب تک مالک زندہ رہے اس وقت تک وہ اس کی لونڈی ہے' اس سے ہر قسم کا فائدہ اٹھا سکتا ہے۔ جب فوت ہو جائے تو ازخود آزاد ہو جاتی ہے۔ آقا کی اولاد کا اس پر کسی قسم کا کوئی حق نہیں رہتا۔ لونڈی جب مالک سے بچہ جنم دے دے تو کیا اسے بیچا جا سکتا ہے یا نہیں؟ اس میں علماء کی آراء مختلف ہیں۔ اکثر علماء کی رائے یہ ہے کہ ام ولد کی خرید و فروخت حرام ہے۔ خواہ بچہ زندہ ہو یا نہ ہو۔ مگر امام داؤد ظاہری کے نزدیک یہ جائز ہے۔ آگے حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی روایت سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ وہ ان کی خرید و فروخت کرتے تھے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا ممانعت کا فرمان حرمت بیع کی تائید کرتا ہے۔ ممکن ہے کہ حضرت جابر رضی اللہ عنہ کا بیان اس وقت کا ہو جب بیع کی ممانعت کا فرمان جاری نہ ہوا ہو۔ ابن عمر رضی اللہ عنہما کی اس روایت کے مرفوع ہونے سے اختلاف ہے۔ محدثین کے طریق پر یہ حدیث اس حیثیت سے مرفوع ہو سکتی ہے کہ اس میں اجتہاد کو دخل نہ ہو۔ عموماً صحابہ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اس فیصلے کو قبول کیا ہے اور جمہور کا بھی یہی مذہب ہے۔

(٦٥٩) وَعَنْ جَابِرٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: كُنَّا نَبِيْعُ سَرَارِيَنَا أُمَّهاتِ الأَوْلاَدِ، والنَّبِيُّ ﷺ حَيٌّ، لاَ يَرَى بِذٰلِكَ بَأْساً. رَوَاهُ النَّسَائِيُّ وَابْنُ مَاجَهْ وَالدَّارَقُطْنِيُّ، وَصَحَّحَهُ ابْنُ حِبَّانَ.

حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ہم ام ولد لونڈیوں کو نبی ﷺ کی موجودگی میں فروخت کر دیا کرتے تھے۔ آپؐ اس میں کوئی قباحت و مضائقہ نہیں سمجھتے تھے۔ (اسے نسائی' ابن ماجہ اور دارقطنی تینوں نے روایت کیا ہے اور ابن حبان نے صحیح کہا ہے)

لغوی تشریح: ﴿سرارينا﴾ اس میں "یا" پر تشدید' سريه کی جمع ہے' سرية کے "سین" پر ضمہ "را" پر تشدید اور "یا" پر بھی تشدید۔ لونڈی جو کسی کی ملکیت میں ہو۔ یہ حدیث ام الولد کی بیع کے جواز کی مقتضی ہے' لیکن اکثر علماء اس کی حرمت کے قائل ہیں۔ یہاں تک کہ متاخرین کی ایک جماعت نے تو اس پر اجماع کا دعویٰ کیا ہے اور کہا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا اسے فروخت کرنے سے منع کرنا اور صحابہؓ کا مخالفت نہ کرنا' اس کی دلیل ہے کہ وہ اس کی ممانعت پر متفق تھے اور ان کی تائید نبی کریم ﷺ کے اس فرمان سے ہوتی ہے ایما امراه ولدت من سیدها فهی معتقة عن دبر منه کہ جو لونڈی اپنے مالک سے بچہ کو جنم دے' وہ اس کی وفات کے بعد آزاد ہو جاتی ہے۔ اسے احمد' ابن ماجہ' حاکم اور بیہقی نے روایت کیا ہے۔ اس حدیث کے اور بھی بہت سے طرق اور الفاظ ہیں۔ ملاحظہ ہو عون المعبود (ج ۴' ص: ۴۷) اس حدیث سے استدلال کی وجہ یہ ہے کہ یہ اصل عام اور ضابطہ کلیہ پر دلالت کرتی ہے اور وہ یہ

ہے کہ لونڈی جو ام الولد ہو' مالک کی موت کے بعد آزاد ہو جاتی ہے۔ اس اصل پر عمل اسی صورت میں ممکن ہے جب ام الولد لونڈی کی بیع ممنوع ہو اور رہی حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی روایت تو وہ بہت سے احتمالات رکھتی کسی وقت کسی فعل پر مجرد خاموشی ایسی تحدید کی معرفت فراہم نہیں کرتی جو اصل عام اور ضابطہ کلیہ کا مقابلہ کر سکے۔

(٦٦٠) وَعَنْ جَابِرِ بْنِ عَبْدِ اللهِ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُمَا قَالَ: نَهَى رَسُولُ اللهِ ﷺ عَنْ بَيْعِ فَضْلِ الْمَاءِ. رَوَاهُ مُسْلِمٌ، وَزَادَ فِي رِوَايَةٍ: «وَعَنْ بَيْعِ ضِرَابِ الْجَمَلِ».

حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے زائد از ضرورت پانی کے فروخت کرنے سے منع فرمایا ہے۔ (مسلم) اور ایک روایت میں یہ اضافہ ہے کہ اونٹ کی جفتی کا معاوضہ لینا بھی ممنوع ہے۔

لغوی تشریح: ﴿عن بیع فضل الماء﴾ زائد از ضرورت پانی سے مراد وہ پانی ہے جو ایسی مباح زمین میں ہو جو کسی اور کی ملکیت نہ ہو' اس پر جو سبقت کر کے پہلے پہنچ جائے' اس کیلئے خود پانی پینا' اپنی زمین کو سیراب کرنا اور جانوروں کو پلانا درست ہے۔ اپنی ساری ضرورت پوری کرنے کے بعد جتنا کچھ پانی بچ جائے اسے فروخت کرنا' اس کیلئے جائز نہیں۔ رہا یہ معاملہ کہ ایک آدمی اپنی ملکیت والی زمین میں گڑھا کھودتا ہے اور اس میں باہر سے پانی ذخیرہ کر لیتا ہے' یا اپنی زمین میں کنواں کھودتا' یا اس میں چشمہ پھوٹ پڑتا ہے تو بلا ریب وہ دوسرے کی بہ نسبت زیادہ حقدار ہے۔ اب اس پر واجب و لازم نہیں کہ جو اس کی اپنی اور مویشیوں کی ضرورت کے بعد بقیہ پانی ہے' وہ اسے بطور عطیہ و بخشش کے دوسرے کو دے۔ عام فقہاء کی یہی رائے ہے' مگر شوکانی نے نیل الاوطار میں بیان کیا ہے "بظاہر اپنی مملوکہ زمین میں جمع ہونے والے پانی اور مباح زمین میں پائے جانے والے پانی کا کوئی فرق نہیں خواہ وہ اپنے پینے کیلئے ہو' یا غیر کیلئے' خواہ جانوروں کی ضرورت کیلئے ہو' یا زمین کو سیراب کرنے کیلئے' خواہ وہ کسی وسیع بیابان میں ہو' یا اور کسی دوسری جگہ" رہا اس آدمی کا معاملہ جس نے اپنے مشکیزے یا برتن میں پانی ذخیرہ کیا ہو تو وہ اس حدیث میں مذکور نہیں۔ وہ تو دوسرے مباحات کی طرح ہے کہ جب وہ اپنی ملکیت میں لے لیتا ہے' مثلاً لکڑیاں' گھاس اور نمک وغیرہ تو اس کا فروخت کرنا جائز ہے۔ جیسا کہ علامہ ابن القیم رحمہ اللہ نے (الھدی' ج ۴ ص ۲۵۹) میں وضاحت کی ہے۔ ﴿وعن بیع ضراب الجمل﴾ الضراب میں ضاد کے نیچے کسرہ۔ نر جانور کا اپنی مادہ سے جفتی کرنے کو کہتے ہیں' تاکہ وہ نر اس جفتی سے مادہ کو حاملہ کر دے۔ مطلب یہ ہوا کہ اس جفتی کا کرایہ اور اس کے ڈالے ہوئے پانی کی اجرت و معاوضہ لینے سے منع فرمایا ہے۔ جمہور کے نزدیک نہی تحریم کیلئے ہے اور صحیح بات بھی یہی ہے۔

(٦٦١) وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُمَا قَالَ: نَهَى رَسُولُ اللهِ ﷺ

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے نر کی جفتی کے معاوضہ کو ممنوع قرار دیا

ﷺ عَنْ عَسْبِ الْفَحْلِ. رَوَاهُ الْبُخَارِيُّ.

ہے۔ (بخاری)

لغوی تشریح: ﴿ عسب الفحل ﴾ دونوں کلمے اپنے پہلے حرف پر فتحہ کے ساتھ ہیں اور دوسرے کے سکون کے ساتھ۔ "فحل" نر حیوان کو کہتے ہیں' گھوڑا ہو' یا اونٹ' یا بکرا وغیرہ اور عسب کہتے ہیں نر کی جفتی کو' یا اس سے خارج ہونے والے پانی کو' یا اس کی نسل اور اولاد کیلئے بھی بولا جاتا ہے اور جفتی کے عوض کرایہ دینے کو بھی کہتے ہیں' جیسا کہ صاحب قاموس نے کہا ہے اور اس حدیث میں نھی کا مورد دراصل وہ معاوضہ ہے جو نر کی جفتی کے عوض لیا جاتا ہے۔

(٦٦٢) وَعَنْهُ أَنَّ رَسُولَ اللهِ ﷺ نَهَى عَنْ بَيْعِ حَبَلِ الحَبَلَةِ، وَكَانَ بَيْعاً يَتَبَايَعُهُ أَهْلُ الجَاهِلِيَّةِ، كَانَ الرَّجُلُ يَبْتَاعُ الجَزُورَ إِلَى أَنْ تُنْتَجَ النَّاقَةُ، ثُمَّ تُنْتَجَ الَّتِيْ فِي بَطْنِهَا. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ، وَاللَّفْظُ لِلْبُخَارِيِّ.

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے حبل الحبلہ کی بیع سے منع فرمایا ہے اور یہ بیع دور جاہلیت میں تھی کہ آدمی اونٹنی اس شرط پر خرید تا کہ اس کی قیمت اس وقت دے گا جب اونٹنی بچہ جنے' پھر وہ بچہ جو اونٹنی کے پیٹ میں ہے وہ (ایک آگے بچہ) جنے۔ (بخاری و مسلم اور یہ الفاظ بخاری کے ہیں)

لغوی تشریح: ﴿ حبل الحبلة ﴾ حبل اور حبلہ دونوں پر فتحہ ہے اور حبل مصدر ہے۔ مراد اس سے حمل ہے یعنی پیٹ میں جنین اور حبلہ' حابل کی جمع ہے جیسے ظلمۃ اور کتبۃ ظالم اور کاتب کی جمع ہے اور حابل جس کے پیٹ میں بچہ ہو۔ بظاہر تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ جنین کی فروخت ممنوع ہے' جبکہ وہ اپنی ماں کے شکم میں ہو اور ایک قول یہ بھی ہے کہ مادہ کے پیٹ میں جو بچہ پرورش پا رہا ہے' اس کا بچہ فروخت کرنا ممنوع ہے۔ یعنی اونٹنی کے حمل کا حمل۔ اس کی ممانعت کی وجہ یہ ہے کہ یہ بیع معدوم اور مجہول دونوں پہلو رکھتی ہے۔ اور اس پوزیشن میں ہیں کہ اس کو قبول کیا جائے' کیونکہ ایک طرح یہ دھوکے کی بیع ہے اور یہ قول بھی ہے کہ اس کے معنی یہ ہیں کہ کسی شے کی بیع اس وقت تک کہ اونٹنی بچہ جنم دے' یا اس اونٹنی کا بچہ جوان ہو کر بچے جنے۔ اس میں نھی کی وجہ یہ ہے کہ یہ بیع ایسی ہے جس کی مدت نامعلوم ہے۔

حاصل کلام: اس حدیث میں جس بیع کی ممانعت مذکور ہے' اس کی دو صورتیں بیان کی جاتی ہیں: ایک یہ کہ اس اونٹنی کے پیٹ میں جو بچہ پرورش پا رہا ہے' وہ پیدائش کے بعد جوان ہو کر جو بچہ جنے گی' اسے میں خرید تا ہوں اور اس کی قیمت اتنی آج مجھ سے لے لو اور دوسری صورت یہ ہوتی تھی کہ یہ اونٹنی میں تجھے دیتا ہوں اس قیمت پر کہ یہ جو بچہ جنے گی' اس کا بچہ مجھے دینا ہوگا۔ ظاہر ہے کہ پیٹ میں جو بچہ ہے اس کی تو کیفیت و ہیئت اور نوعیت ہی نامعلوم اور مجہول ہے' اس لئے مجہول اور نامعلوم چیز کا فروخت

کرنا' اسلام میں ممنوع ہے۔ نیز اس میں دھوکہ دہی کی بیع کا بھی اشتباہ ہے اور بیع غرر بھی اسلام میں ممنوع ہے۔ یہی مذھب ہے امام احمد رحمہ اللہ اور اسحٰق رحمہ اللہ وغیرہ کا۔ اس کی جو تفسیر وکان بیعا الخ کے ساتھ نافع یا ابن عمر رضی اللہ عنہما نے کی ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ادائیگی قیمت کی میعاد مقرر کی جاتی تھی' اس طرح کہ جو بچہ اس وقت اونٹنی کے پیٹ میں زیر پرورش ہے اس کے جوان ہونے پر جو بچہ پیدا ہو گا وہ اس اونٹ کی قیمت ہوگی۔ اس تفسیر کو امام مالک رحمہ اللہ اور امام شافعی رحمہ اللہ نے اختیار کیا ہے۔ وہ اس صورت میں ممانعت کی توجیہہ کرتے ہیں کہ رقم کی ادائیگی کی میعاد غیر متعین ہے' اس لئے ایسی بیع بھی ممنوع ہے۔

(٦٦٣) وَعَنْهُ أَنَّ رَسُولَ اللهِ ﷺ نَهَى عَنْ بَيْعِ الوَلَاۤءِ وَعَنْ هِبَتِهِ. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے ہی یہ بھی مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ولاء کے فروخت کرنے اور اس کے ھبہ کرنے سے منع فرمایا ہے۔ (بخاری و مسلم)

حاصل کلام: اس حدیث میں ولاء کے فروخت کرنے اور اسے ھبہ کرنے کی ممانعت ہے۔ ولاء وراثت کے حق کو کہتے ہیں۔ جو آزاد کرنے والے کو آزاد کردہ غلام کی طرف سے ملتا ہے۔ اہل عرب آزاد ہونے والے کی وفات سے پہلے ہی غلام کو فروخت کر دیتے' یا ہبہ کر دیتے۔ رسول اللہ ﷺ نے اسے ممنوع قرار دے دیا' تاکہ ولاء آزاد کرنے والے کے وارثوں کو ملے' یا اگر خود زندہ ہے تو وہ خود حاصل کر لے۔ لہٰذا ایسے غلام کا فروخت کرنا یا اسے ہبہ کرنا جائز نہیں۔ جمہور علماء سلف و خلف سب کا یہی مسلک ہے۔

(٦٦٤) وَعَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: نَهَى رَسُولُ اللهِ ﷺ عَنْ بَيْعِ الحَصَاةِ، وَعَنْ بَيْعِ الغَرَرِ. رَوَاهُ مُسْلِمٌ.

حضرت ابوھریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے کنکری پھینک کر تجارت کرنے اور دھوکہ کی تجارت سے منع فرمایا ہے۔ (مسلم)

لغوی تشریح: ﴿عن بیع الحصاۃ﴾ یہ مصدر کی اضافت اپنی نوع کی طرف ہے۔ مصدر کی اضافت اس کے مفعول کی طرف نہیں ہے اور کنکری پھینک کر بیع کی نوعیت یہ تھی کہ فروخت کرنے والا کہتا تھا کہ یہ کنکری پھینکو جس کپڑے پر جا لگی' وہ درہم کے عوض تمہارا اور اس کی تفسیر یہ بھی کی گئی ہے کہ وہ اپنی اتنی زمین اسے فروخت کر دے گا جہاں پھینکی ہوئی کنکری پہنچے گی اور یہ تفسیر بھی کی گئی ہے کہ وہ اپنی مٹھی میں کنکریاں بند کر کے کہتا۔ فروخت شدہ چیز کے بدلے جتنی کنکریاں میری مٹھی سے نکلیں' اتنی چیزیں میری ہوں گی' یا وہ کوئی سودا فروخت کرتا اور اپنی مٹھی میں کنکریاں بند کر لیتا اور کہتا کہ ہر کنکری کے بدلہ میرا ایک درہم اور یہ تفسیر بھی ہے کہ ایک مٹھی بند کر لیتا اور اس کے ایک ہاتھ میں کنکریاں ہوتیں اور وہ کہتا جونہی کنکریاں نیچے گریں بیع واجب ہو جائے گی اور یہ تفسیر بھی ہے کہ دونوں سودا کرتے اور ایک دوسرے سے کہتا کہ جب میں تیری طرف کنکری پھینکوں' بیع واجب ہو جائے گی اور یہ تفسیر بھی ہے کہ

بکریوں کا ریوڑ اس کے سامنے آتا اور وہ کنکریاں مٹھی میں پکڑ کر کہتا جس بکری کو یہ کنکری جا لگے وہ تمہاری اتنی قیمت کے بدلہ۔ یہ تمام صورتیں فاسد ہیں' کیونکہ مال کو ناحق و باطل طریقہ سے' نیز ایسے دھوکہ اور ایسی شرط لگا کر کھانے کو' جس میں قمار و جوئے کا اشتباہ ہے' متضمن ہے' جیسا کہ علامہ ابن قیم نے (الھدی: ج ۴' ص: ۲۶۶) میں بیان کیا ہے۔ ﴿ وعن بیع الغرر ﴾ اس میں مصدر کی اضافت اپنے نوع کی طرف ہے اور "غرر" کے غین اور راء دونوں پر فتح ہے۔ اس دھوکہ اور فریب کو کہتے ہیں جس میں یہ گمان ہو کہ جب بیع واقع ہوگی تو اس وقت رضامندی ہوگی یا نہیں اور جس کا انجام نامعلوم ہے۔ اس خطرے کی وجہ سے جس کے متعلق معلوم ہی نہیں کہ آیا یہ بیع متحقق بھی ہوگی یا نہیں۔ علامہ نووی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ دھوکہ کی خرید و فروخت سے ممانعت کتاب البیوع کے اصول میں سے ایک عظیم اصل ہے اور اس میں بے شمار اور ان گنت مسائل داخل ہیں۔ مثلاً بھاگے ہوئے غلام کو فروخت کرنا۔ معدوم و مجہول شے کی بیع۔ جسے آدمی کسی کے سپرد کرنے کی مقدرت ہی نہ رکھتا ہو اور وہ چیز جس پر بیچنے والے کی ملکیت مکمل نہ ہوئی ہو۔ کثیر پانی میں موجود مچھلی کی بیع' جانور کے تھنوں میں موجود دودھ کی بیع' پیٹ میں موجود جنین کی بیع اور مبہم (غیر واضح) غلہ کے انبار و ڈھیر میں سے بعض حصہ کی بیع۔ بہت کپڑوں میں سے کسی ایک کپڑے کی بیع اور بہت سی بکریوں میں سے کسی ایک بکری کی بیع وغیرہ' ایسی ہی دیگر مثالیں موجود ہیں۔ اس قسم کی ہر بیع باطل ہے' کیونکہ اس میں بلا ضرورت دھوکہ پایا جاتا ہے۔ معلوم رہے کہ بیع ملامسۃ' بیع منابذہ' بیع حبل الحبلۃ' بیع الحصاۃ اور عسب الفحل وغیرہ سے ملتی جلتی بیوع کی ایسی صورتیں جن کے بارے میں بالخصوص نصوص وارد ہیں' یہ سب دھوکہ کی بیع کی ممانعت میں داخل ہیں۔ لیکن خاص طور پر بیع غرر کا ذکر اس لئے کیا گیا ہے کہ یہ دور جاہلیت کی مشہور و معروف بیوع میں سے ہے۔ (شرح مسلم للنووی)

(٦٦٥) وَعَنْهُ أَنَّ رَسُولَ اللهِ ﷺ قَالَ: مَنِ اشْتَرَى طَعَاماً فَلاَ يَبِعْهُ حَتَّى يَكْتَالَهُ. رَوَاهُ مُسْلِمٌ.

حضرت ابوھریرہ رضی اللہ عنہ سے ہی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "جو شخص کوئی غلہ خریدے تو جب تک اسے ماپ نہ لے' اسے آگے فروخت نہ کرے۔" (مسلم)

لغوی تشریح: ﴿ حتی یکتالہ ﴾ یعنی جب تک اسے اپنے قبضہ میں نہ لے اور ناپ تول نہ لے۔ یعنی جب ایک شخص کوئی چیز ناپ کر لیتا ہے اور اس پر اپنا قبضہ بھی کر لیتا ہے' اس کے بعد اسے فروخت کرتا ہے تو اسے پہلی ناپ تول پر آگے فروخت کرنا اس وقت تک جائز نہیں' جب تک کہ از سر نو اسے ناپ یا تول نہ لے۔ جمہور کا یہی قول ہے۔ دوسرے شخص کو فروخت کرتے وقت نئے سرے سے اسے ناپنے یا تولنے کے حکم کی وجہ اور علت عین ممکن ہے یہ ہو کہ دوبارہ وزن کرنے سے یہ متحقق ہو جائے کہ تول و ماپ میں کوئی دھوکہ اور فریب نہیں۔ (تلخیص از سبل السلام)

(٦٦٦) وَعَنْهُ قَالَ: نَهَى رَسُولُ اللهِ ﷺ عَنْ بَيْعَتَيْنِ فِي بَيْعَةٍ. رَوَاهُ أَحْمَدُ وَالنَّسَائِيُّ، وَصَحَّحَهُ التِّرْمِذِيُّ وَابْنُ حِبَّانَ.

وَلأَبِيْ دَاوُدَ: «مَنْ بَاعَ بَيْعَتَيْنِ فِي بَيْعَةٍ فَلَهُ أَوْكَسُهُمَا أَوِ الرِّبَا».

حضرت ابوھریرہ رضی اللہ عنہ ہی سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک بیع میں دو بیعوں سے منع فرمایا ہے۔ (احمد و نسائی) اور ترمذی اور ابن حبان نے اسے صحیح قرار دیا ہے اور ابوداؤد کی روایت میں ہے کہ جس کسی نے ایک چیز کی دو قیمتیں مقرر کیں، وہ یا تو کم قیمت لے لے، یا پھر وہ سود ہو گا۔

لغوی تشریح: ﴿ عن بیعتین فی بیعۃ ﴾ اس کے دو معنی ہو سکتے ہیں: پہلا یہ کہ ایک شخص دوسرے شخص سے یوں کہے کہ میں تجھے فلاں کپڑا نقد ادائیگی کی صورت میں دس روپیہ میں فروخت کرتا ہوں اور ادھار کی صورت میں بیس روپیہ میں اور وہ اس سے دونوں میں سے کسی بیع پر الگ نہیں ہوتا۔ دوسری صورت یہ ہے کہ ایک شخص دوسرے سے کہتا ہے کہ میں اپنا یہ مکان اتنی قیمت کے عوض تمہارے ہاتھ فروخت کرتا ہوں، بشرطیکہ تو اپنا غلام مجھے اتنی رقم کے بدلہ میں بیچ دے۔ جب تیرا غلام میرے لئے واجب و ثابت ہو جائے گا تو میرا گھر تیرے لئے واجب و ثابت ہو جائے گا۔ یہ دونوں صورتیں ترمذی نے اہل علم سے نقل کی ہے۔ بعض علماء نے ایک تیسری تفسیر بھی ذکر کی ہے کہ وہ ایک ماہ کیلئے ایک دینار کے عوض ایک قفیز گندم دے گا۔ جب میعاد مقررہ پوری ہو گئی تو اس نے اس سے گندم کا مطالبہ کر دیا اور کہا کہ جو گندم تجھ پر میری ادا کرنی آتی ہے اسے تو مجھے دو ماہ کیلئے فروخت کر دے تو یہ دوسری بیع ہوئی جو پہلی بیع میں داخل ہو گئی۔ پس اس طرح یہ ایک ہی چیز کی دو بیع ہوئیں۔ دونوں نقصان کی طرف ہی پلٹیں گی۔ یہی اصل ہے۔ اگر دونوں بیع ثانی پر خرید و فروخت کرتے ہیں۔ پہلی بیع کا باہمی تقاضا کئے بغیر تو اس صورت میں دونوں سود خور ہوتے ہیں۔ یہ خطابی کا قول ہے۔ (ملاحظہ ہو عون المعبود، ج ۳، ص: ۲۹۰) اس کے علاوہ اس کی اور بھی بہت سی شکلیں ہیں۔ ﴿ فلہ اوکسھما ﴾ الخ دونوں صورتوں میں بہت کم اور بہت نقصان کی صورت میں ملے گا۔ یہ حدیث ان الفاظ سے بیان میں یحیٰی بن زکریا عن محمد بن عمرو بن علقمہ منفرد ہے۔ اپنے عام ساتھیوں کے بیان کردہ الفاظ کی مخالفت کی ہے۔ لہٰذا یہ روایت شذوذ سے خالی نہیں اور محمد بن عمرو ایسا راوی ہے جس کے بارے میں بہت سے محدثین نے کلام کیا ہے۔ لہٰذا یہ روایت ان الفاظ سے قابل استدلال نہیں ہے۔

(٦٦٧) وَعَنْ عَمْرِو بْنِ شُعَيْبٍ عَنْ أَبِيهِ عَنْ جَدِّهِ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «لاَ يَحِلُّ سَلَفٌ وَبَيْعٌ، وَلاَ شَرْطَانِ فِي بَيْعٍ، وَلاَ رِبْحُ مَا لاَ يُضْمَنُ، وَلاَ بَيْعُ مَا لَيْسَ عِنْدَكَ».

حضرت عمرو بن شعیب نے اپنے والد سے اور انہوں نے اپنے دادا سے روایت کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ "قرض اور بیع حلال نہیں اور نہ ایک بیع میں دو شرطیں حلال ہیں اور کسی چیز کا منافع حاصل کرنا اسے اپنے قبضہ میں لینے سے پہلے جائز

رَوَاهُ الخَمْسَةُ، وَصَحَّحَهُ التِّرْمِذِي وَابْنُ خُزَيْمَةَ وَالحَاكِمُ.

وَأَخْرَجَهُ فِي عُلُومِ الحَدِيْثِ، مِنْ رِوَايَةِ أَبِيْ حَنِيْفَةَ، عَنْ عَمْرٍو المَذْكُورِ، بِلَفْظِ «نَهي عَنْ بَيْعٍ وشَرْطٍ». وَمِنْ هَذَا الوَجْهِ أَخْرَجَهُ الطَّبَرَانِيُّ فِي الأَوْسَطِ، وَهُوَ غَرِيْبٌ.

نہیں اور جو تیرے (اپنے) پاس موجود نہ ہو اس کا فروخت کرنا بھی جائز و حلال نہیں۔" اسے پانچوں نے روایت کیا ہے۔ ترمذی' ابن خزیمہ اور حاکم تینوں نے اسے صحیح قرار دیا ہے۔ اور امام حاکم نے علوم الحدیث میں ابوحنیفہ" کی روایت سے مذکورہ عمرو رحمۃ اللہ علیہ کے واسطے سے ان الفاظ کے ساتھ روایت کی ہے کہ "آپ ﷺ نے بیع شرط کے ساتھ منع فرمائی ہے" (اس حدیث کو طبرانی نے اوسط میں اسی طریق سے نقل کیا ہے اور وہ غریب ہے)

لغوی تشریح : ﴿ سلف ﴾ سین' لام' دونوں پر فتحہ۔ قرض ﴿ وبیع ﴾ قرض کے ساتھ۔ یعنی ایسی بیع حلال نہیں جس میں قرض کی شرط ہو۔ بایں طور کہ وہ کہے کہ میں یہ کپڑا تیرے ہاتھ دس روپے میں فروخت کرتا ہوں۔ بشرطیکہ تو مجھے دس روپے قرض دے' یا یوں کہے کہ میں تمہیں دس روپے قرض دیتا ہوں' بشرطیکہ تم اپنا سامان مجھے فروخت کرو اور میرے سوا کسی اور کو نہ بیچو۔ ﴿ ولا شرطان فی بیع ﴾ اس کے متعلق ایک قول یہ ہے کہ اس سے مراد ایک بیع میں دو بیع ہیں اور امام احمد رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ اس کی شکل یہ ہے کہ میں یہ کپڑا تیرے ہاتھ فروخت کرتا ہوں' اس شرط پر میں ہی اسے درزی سے سلواؤں گا اور میں ہی اس کی کٹائی کروں گا۔ امام احمد رحمۃ اللہ علیہ کا یہ قول ترمذی نے ذکر کیا ہے ﴿ ولا ربح مالم یضمن ﴾ ربح کے معنی منافع اور فعل صیغۂ مجہول ہے۔ یعنی جب تک وہ اس کا مالک نہ ہو اور اسے اپنے قبضہ میں نہ لے۔ یعنی کسی سامان کا منافع حاصل کرنا اس وقت تک جائز نہیں جب تک کہ اسے خرید کر اپنے قبضہ میں نہ لے لے۔ پس جب اسے اپنے قبضہ میں لے لے گا اور وہ چیز اس کی ضمانت میں داخل ہو جائے گی تو اس وقت اس کا فروخت کرنا اور اس پر منافع لینا جائز ہے۔ ﴿ مالیس عندك ﴾ ایسی چیز کی خرید و فروخت جو فروخت کے وقت اس کی ملکیت میں نہ ہو۔ ﴿ نهی عن بیع و شرط ﴾ علامہ ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے فتاویٰ میں کہا ہے کہ یہ حدیث باطل ہے۔ مسلمانوں کی کتابوں میں اس کا کچھ بھی وجود نہیں' یہ تو منقطع حکایات میں بیان کی گئی ہے۔

راوی حدیث : ﴿ ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ ﴾ ائمہ اربعہ میں سے ایک مشہور و معروف امام۔ نعمان بن ثابت کوفی نام۔ بنو تیم اللہ بن ثعلبہ کے مولیٰ۔ ایک قول یہ بھی ہے کہ یہ ابناء فارس میں سے ہیں۔ ریشم فروش تھے۔ روایت حدیث میں ایک جماعت نے ان کو ثقہ قرار دیا ہے اور دوسرے لوگوں نے ضعیف۔ ابن مبارک رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے کہ فقہ میں میں نے ان کا مثیل نہیں دیکھا۔ اپنی خدا داد شہرت کی وجہ سے تعریف و توصیف سے مستغنی ہیں۔ فقہ' ورع' زھد اور سخاوت میں مشہور ہیں۔ ۸۰ھ میں پیدا ہوئے اور ۱۵۰ھ میں

وفات پائی۔

(٦٦٨) وَعَنْهُ قَالَ: نَهَى رَسُولُ اللهِ ﷺ عَنْ بَيْعِ الْعُرْبَانِ. رَوَاهُ مَالِكٌ، قَالَ: بَلَغَنِيْ عَنْ عَمْرِو بْنِ شُعَيْبٍ بِهِ.

حضرت عمرو بن شعیب ہی نے اپنے والد سے اور وہ اپنے دادا سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے بیع عربان سے منع فرمایا۔ (اسے مالک ؒ نے روایت کیا ہے۔ امام مالک رحمہ اللہ نے فرمایا کہ مجھے عمرو بن شعیب سے یہ روایت پہنچی ہے)

لغوی تشریح: ﴿عربان﴾ عین پر ضمہ اور "را" ساکن۔ عربان۔ بیعانہ کو کہتے ہیں۔ اس کی صورت یہ ہے کہ ایک شخص نے کسی سے پلاٹ یا مکان کا سودا کیا۔ قیمت طے ہونے کے بعد خریدار نے فروخت کنندہ کو ہزار روپیہ بیعانہ کے طور پر ادا کر دیئے اور مدت طے کر لی کہ اتنی مدت تک اگر میں نے باقی رقم ادا کر دی تو مکان میرا اور رقم کی ادائیگی کے موقع پر ہزار روپیہ بیعانہ والا وضع کر لوں گا' اگر میعاد مقررہ پر بقیہ رقم ادا نہ کر سکوں تو ہزار روپیہ بیعانہ تمہارا۔

حاصل کلام: امام شافعی رحمہ اللہ اور امام مالک رحمہ اللہ اسی روایت کی بنا پر اس بیع کو ناجائز کہتے ہیں' مگر یہ روایت قطعی بلاغات میں سے ہے۔ ابوداؤد اور ابن ماجہ میں یہ متصلاً بھی مروی ہے مگر اس کی سند میں ضعف ہے۔ اس کے برعکس حضرت عمر رضی اللہ عنہ' عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما اور امام احمد رحمہ اللہ اسے جائز قرار دیتے ہیں۔ (سبل)

(٦٦٩) وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا، قَالَ: ٱبْتَعْتُ زَيْتاً فِي السُّوقِ، فَلَمَّا اسْتَوْجَبْتُهُ لَقِيَنِيْ رَجُلٌ فَأَعْطَانِيْ بِهِ رِبْحاً حَسَناً، فَأَرَدْتُ أَنْ أَضْرِبَ عَلَى يَدِ الرَّجُلِ، فَأَخَذَ رَجُلٌ مِّنْ خَلْفِيْ بِذَرَاعِيْ فَالتَفَتُّ فَإِذَا هُوَ زَيْدُ بْنُ ثَابِتٍ، فَقَالَ: لاَ تَبِعْهُ حَيْثُ ابْتَعْتَهُ، حَتَّى تَحُوزَهُ إِلَى رَحْلِكَ، فَإِنَّ رَسُولَ اللهِ ﷺ نَهَى أَنْ تُبَاعَ السِّلَعُ حَيْثُ تُبْتَاعُ، حَتَّى يَحُوْزُهَا التُّجَّارُ إِلَى رِحَالِهِمْ. رَوَاهُ

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ میں نے بازار سے روغن (زیتون) خریدا۔ جب میرا سودا پکا و پختہ ہو گیا تو مجھے ایک آدمی ملا جس نے مجھے اچھا منافع دینے کی پیش کش کی۔ میں نے اس آدمی سے سودا طے کرنے کا ارادہ کر لیا' اتنے میں پیچھے سے کسی نے میرا بازو پکڑ لیا۔ میں نے مڑ کر دیکھا تو وہ زید بن ثابت رضی اللہ عنہ تھے۔ انہوں نے کہا جس جگہ سے تم نے سودا خریدا ہے' اسی جگہ پر اسے فروخت نہ کرنا' تاوقتیکہ اسے اٹھا کر اپنے گھر نہ لے جاؤ' کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے جہاں سے چیزیں خریدی جائیں' وہیں پر فروخت کرنے سے منع فرمایا ہے' جب تک کہ تاجر و سوداگر حضرات اس خریدے ہوئے مال و

أَحْمَدُ وَأَبُو دَاوُدَ، وَاللَّفْظُ لَهُ، وَصَحَّحَهُ ابْنُ حِبَّانَ وَالحَاكِمُ.

اسباب کو اپنے گھروں میں لے نہ جائیں۔ (اسے احمد اور ابوداؤد نے روایت کیا ہے اور یہ الفاظ ابوداؤد کے ہیں۔ ابن حبان اور حاکم نے اسے صحیح کہا ہے)

لغوی تشریح: ﴿ابتعت﴾ اشتریت کے معنی میں۔ یعنی میں نے خریدا۔ ﴿استوجبته﴾ خرید و فروخت کے معاملہ کی صورت میں وہ میری ملکیت میں آگئی ہو۔ ﴿ان اضرب علی ید الرجل﴾ میں اس سے سودا پختہ کر لوں۔ کیونکہ ہاتھ پر ہاتھ مارنا اس زمانے میں سودا طے کرتے وقت اہل عرب کی عادت تھی۔ ﴿فالتفت﴾ میں نے توجہ کی ﴿حتی تحوزہ الی رحلك﴾ یعنی اسے جمع کرے' اکٹھا کر کے اپنے مکان کی طرف منتقل کر لے۔ مطلب یہ ہے کہ اسے اپنے قبضہ میں کر لے۔ خریدار کے قبضہ کی غالب صورت یہی تھی کہ وہ خریدے ہوئے مال و متاع کو اس کے محفوظ کئے جانے کی جگہ پر لے آئے۔ ﴿السلع﴾ سین کے نیچے کسرہ اور لام پر فتحہ۔ سلعۃ کی جمع ہے سامان' مال و متاع' خریدی ہوئی چیز۔

(٦٧٠) وَعَنْهُ قَالَ: قُلْتُ: يَا رَسُولَ اللهِ! إِنِّي أَبِيْعُ الإِبِلَ بِالبَقِيْعِ فَأَبِيْعُ بِالدَّنَانِيْرِ، وَآخُذُ الدَّرَاهِمَ، وَأَبِيْعُ بِالدَّرَاهِمِ، وَآخُذُ الدَّنَانِيرَ، آخُذُ هٰذَا مِنْ هٰذِهِ، وَأُعْطِيْ هٰذِهِ مِنْ هٰذَا، فَقَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: **«لاَ بَأْسَ أَنْ تَأْخُذَهَا بِسِعْرِ يَوْمِهَا مَا لَمْ تَتَفَرَّقَا وَبَيْنَكُمَا شَيْءٌ»**. رَوَاهُ الخَمْسَةُ، وَصَحَّحَهُ الْحَاكِمُ.

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما ہی سے روایت ہے کہ میں نے عرض کیا اے اللہ کے رسول (ﷺ)! میں بقیع میں اونٹوں کی تجارت کرتا ہوں۔ دینار میں فروخت کر کے درہم وصول کرتا ہوں اور (کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ) میں فروخت تو درہم میں کرتا ہوں اور وصول دینار کرتا ہوں (یعنی) دینار کے بدلہ میں درہم اور درہم کے بدلہ میں دینار لیتا ہوں۔ اس کے عوض وہ لیتا ہوں اور اس کے بدلہ میں یہ دیتا ہوں۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "اگر اسی روز کے بھاؤ سے ان کا تبادلہ کر لو اور خرید و فروخت کرنے والوں کے ایک دوسرے سے جدا ہونے سے پہلے رقم کا کوئی حصہ کسی کے ذمہ باقی نہ رہے تو جائز ہے۔" (اسے پانچوں نے روایت کیا ہے اور حاکم نے صحیح کہا ہے۔)

لغوی تشریح: ﴿بالبقیع﴾ بقیع الغرقد مدینہ کا قبرستان مراد ہے۔ اسے قبرستان بنائے جانے سے پہلے یہ جگہ بطور تجارتی منڈی کے تھا اور ایک نسخہ میں "نقیع" بھی ہے' یعنی "باء" کی جگہ نون۔ جو مدینہ کے قریب ایک جگہ کا نام ہے۔ ﴿فابیع بالدنانیر﴾ دینار' سونے کا مروج سکہ۔ ﴿واخذ الدراھم﴾ دراھم چاندی کا سکہ۔ سونے کے سکہ کے بدلہ میں چاندی کا سکہ لے لیتا ہوں۔ ﴿بسعر یومھا﴾ سعر

کے سین کے نیچے کسرہ۔ منڈی کا مروج روزمرہ کا بھاؤ۔ فارسی میں اسے نرخ کہتے ہیں' یعنی دینار کے بدلہ میں دراھم لینے میں کوئی حرج نہیں' جبکہ ان کا تبادلہ منڈی کے روزمرہ کے نرخ کے مطابق ہو۔ ﴿ مالم تتفرقا وبينكما شئى ﴾ یعنی اس وقت تک ایک دوسرے سے جدا اور الگ نہ ہونا جب تک کہ تمہارے درمیان کسی واجب الادا چیز کی ادائیگی باقی (یعنی جدائی اور علیحدگی سے پہلے پہلے باہمی ادائیگی کر لینا) یہ حدیث اس کی دلیل ہے کہ سونے چاندی کا تبادلہ اس صورت میں جائز ہے جبکہ دست بدست ہو اور پوری ادائیگی موقع پر ہو۔ ادھار نہ ہو۔

(٦٧١) وَعَنْهُ قَالَ: نَهَى رَسُولُ اللهِ ﷺ عَنِ النَّجْشِ. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما ہی سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے بیع نجش سے منع فرمایا ہے۔ (بخاری و مسلم)

لغوی تشریح: ﴿ نجش ﴾ نون پر فتحہ اور جیم ساکن۔ نجش کی شکل یہ ہے کہ ایک آدمی سامان فروخت پڑا ہوا دیکھتا ہے' لوگ اس کی قیمت لگا رہے ہیں' فروخت کرنے والے مالک سامان سے خریدنے کی بات کرتے ہیں اور یہ شخص وہاں حاضر ہو کر اس سامان کی تعریف و توصیف کر کے اس کی قیمت میں اضافہ کرتا ہے' یعنی محض اس چیز کی قیمت بڑھانے کی خاطر زیادہ بولی دینا شروع کر دیتا ہے' جبکہ وہ اس چیز کا خریدار نہیں ہوتا' محض قیمت میں اضافہ کرنے کیلئے ایسا کرتا ہے' جس سے لوگوں کو دھوکا دینا اور فریب میں مبتلا کرنا مقصود ہوتا ہے' تاکہ چیز کی قیمت زیادہ لگے اور فروخت کنندہ سے پہلے ہی طے کر لیتا ہے اور طے شدہ بات کے مطابق اس سے کچھ وصول کر لیتا ہے' چونکہ یہ شخص حقیقت میں خریدار نہیں' بلکہ خریدار کے روپ میں دھوکہ باز ہے اور اس میں دھوکا پایا جاتا ہے۔ اس لئے شریعت نے اسے ممنوع قرار دیا ہے۔ امام نووی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ بیع بالاجماع حرام ہے۔

(٦٧٢) وَعَنْ جَابِرِ بْنِ عَبْدِ اللهِ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ نَهَى عَنِ الْمُحَاقَلَةِ، وَالْمُزَابَنَةِ، وَالْمُخَابَرَةِ، وَعَنِ الثُّنْيَا، إِلاَّ أَنْ تُعْلَمَ. رَوَاهُ الخَمْسَةُ إِلاَّ ابْنَ مَاجَهْ، وَصَحَّحَهُ التِّرمِذِيُّ.

حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے بیع محاقلہ' مزابنہ' مخابرہ اور ایک آدھ چیز مستثنیٰ (یعنی) الگ رکھنے سے منع فرمایا ہے مگر اس صورت میں (بیع استثناء) جائز ہے کہ اس کی مقدار مقرر کر لی جائے۔ (اسے ابن ماجہ کے علاوہ پانچوں نے روایت کیا ہے اور ترمذی نے صحیح قرار دیا ہے)

لغوی تشریح: ﴿ المحاقلة ﴾ بالیوں میں کھڑی کھیتی کو غلہ کے عوض فروخت کرنا' جیسے گندم کے کھیت کے بدلہ میں گندم فروخت کرنا۔ ﴿ المزابنة ﴾ درختوں پر لگے ہوئے پھل کو اسی جنس کے اتارے ہوئے خشک پھل کے عوض فروخت کرنا۔ مثلاً خشک کھجوروں کے بدلہ کھجور کے درخت پر تازہ اور تر

کھجوروں کی بیع اور انگور کے بدلہ خشک انگور (کشمش) کی فروخت۔ ان دونوں میں وجہ تحریم یہ ہے کہ دونوں کی صحیح مقدار کا علم نہیں ہو سکتا کہ تر میوہ خشک ہو کر کتنا رہ جائے گا' زیادہ کا بھی امکان ہے اور کمی کا بھی۔ دونوں صورتوں میں فریقین میں سے کسی کو نقصان ہو سکتا ہے۔ جب جنس ایک ہو تو پھر برابری ضروری ہے۔ اس صورت میں بڑھوتری اور زیادتی سود ہو گا (اور سود کسی صورت میں بھی حلال نہیں۔) ﴿المخابرة﴾ مخابرہ مزارعت کا دوسرا نام ہے' وہ یہ کہ مزارع اور مالک زمین کے درمیان پیداوار کے نصف' ثلث یا ربع پر معاملہ طے ہو جائے (کہ مزارع اپنی خدمت کے بدلہ میں کل پیداوار کا ۱/۲ یا ۱/۳ یا ۱/۴ وصول کرے گا اور باقی مالک زمین کا ہو گا۔) یہ بیع مطلقاً ممنوع نہیں' بلکہ لوگ زمین کے کسی حصہ کی پیداوار مزارع کیلئے اور کسی حصہ کی پیداوار کو مالک زمین کیلئے مخصوص کر لیتے تھے۔ بسا اوقات مزارع والا حصہ صحیح سلامت رہ جاتا اور مالک والا تباہ ہو جاتا اور کبھی اس کے برعکس ہو جاتا' اس طرح معاملہ باہمی نزاع اور جھگڑے تک پہنچ جاتا۔ اس لئے نبی ﷺ نے اس طرح کی بیع سے منع فرما دیا۔ اس طرح کا طے شدہ معاملہ کہ زمین سے جو پیداوار حاصل ہو' اس کو طے شدہ حصہ' یا مقدار میں مالک زمین اور مزارع تقسیم کریں گے' مثلاً چوتھا یا تیسرا حصہ پیداوار مزارع (کاشتکار) کا اور بقیہ سارا مالک زمین کا تو اس میں کوئی مضائقہ ہے نہ حرج۔ نبی ﷺ نے بذات خود اہل خیبر سے اسی اصول پر معاملہ طے فرمایا تھا اور کہا جاتا ہے کہ اس بیع کو مخابرہ کے نام سے موسوم کرنے کی وجہ اور سبب یہی ہے۔ ﴿الثنیا﴾ "ثا" پر ضمہ اور نون ساکن بروزن دنیا اور ایک قول یہ بھی ہے کہ "ثا" پر ضمہ اور نون پر فتحہ اور یا پر تشدید بروزن ثریا۔ استثناء سے اسم ہے اور خرید و فروخت "ثنیا" یہ ہے کہ نامعلوم مقدار کا استثناء کرنا۔ مثلاً کوئی کہتا ہے کہ میں یہ ڈھیر فروخت کرتا ہوں' مگر اس کا بعض حصہ فروخت نہیں کروں گا' اس بعض کا تعین نامعلوم ہے' یا مثلاً یہ درخت ہیں' بکریاں اور کپڑے ہیں' میں ان کو فروخت کرتا ہوں' مگر بعض کو فروخت نہیں کرتا۔ ان صورتوں میں بھی بعض کا تعین نہیں۔ ﴿الا ان تعلم﴾ ان تعلم کا تعلق آخری جز (ثنیا) سے ہے۔ اس صورت میں بیع جائز ہو گی جبکہ مستثنیٰ چیز کا علم ہو کہ کتنی ہے اور کونسی ہے؟ مثلاً فروخت کرنے والا یوں کہتا ہے کہ میں نے یہ درخت اور بکریاں اور کپڑے بجز اس درخت کے اور اس بکری کے اور اس کپڑے کے تمہیں فروخت کئے تو اس صورت میں یہ بیع صحیح ہو گی۔

(٦٧٣) وَعَنْ أَنَسٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: نَهَى رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ عَنِ الْمُحَاقَلَةِ، وَالْمُخَاضَرَةِ، وَالْمُلاَمَسَةِ، وَالْمُنَابَذَةِ، وَالْمُزَابَنَةِ. رَوَاهُ الْبُخَارِيُّ.

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے بیع محاقلہ' مخاضرہ' ملامسہ' منابذہ اور مزابنہ سے منع فرمایا ہے۔ (بخاری)

لغوی تشریح: ﴿المخاضرة﴾ یعنی پھلوں اور غلہ جات کی فروخت ان کے پکنے سے پہلے۔ ﴿

الملامسة والمنابذة ﴾ مسلم میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت میں ان دونوں کی تفسیریوں ہے کہ ملامسہ وہ بیع ہے۔ دونوں ایک دوسرے کے کپڑے کو بغیر کسی تامل کے چھوئیں اور اسی چھونے کو بیع قرار دیں اور منابذہ یہ ہے کہ دونوں ایک دوسرے کی جانب کپڑا پھینکیں' بغیر دیکھے اور اسی کو بیع قرار دیں اور بخاری و مسلم میں حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ کی روایت میں ہے کہ ان دونوں بیعوں کی تفسیر اس طرح وارد ہے کہ خریدار دن ہو یا رات دوسرے کے کپڑے کو بغیر دیکھے اور الٹ پلٹ کئے بغیر بس ہاتھ لگا دے اور اسی پر سودا طے کر لے۔ اور "منابذة " یہ ہے کہ دونوں (خریدار و فروخت کنندہ) ایک دوسرے کی جانب اپنا اپنا کپڑا پھینکیں اور یہ پھینکنا ہی دونوں کے درمیان بغیر دیکھے اور باہمی رضامندی کے ساتھ بیع قرار پائے اور محض ہاتھ لگانا اور کپڑا پھینکنا ہی دیکھنے اور ملاحظہ کرنے کے قائم مقام ہو' اس کے بعد پھر کسی کو دیکھنے کا اختیار باقی نہ رہے' یا اسے ایجاب و قبول کے قائم مقام ہی سمجھا جائے' یا مجلس کے اختیار کیلئے یہ قطعی اور حتمی ہو۔

(٦٧٤) وَعَنْ طَاوُسٍ عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «لاَ تَلَقَّوُا الرُّكْبَانَ، وَلاَ يَبِيعُ حَاضِرٌ لِبَادٍ»، قُلْتُ لاِبْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهما: مَا قَوْلُهُ ﷺ لاَ يَبِيْعُ حَاضِرٌ لِبَادٍ؟ قَالَ: لاَ يَكُونُ لَهُ سِمْسَاراً. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ وَاللَّفْظُ لِلْبُخَارِيِّ.

حضرت طاؤس نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت بیان کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "سامان تجارت لے کر آنے والے قافلوں کو آگے جا کر نہ ملو اور کوئی شہری کسی دیہاتی کا سامان بیچے۔" میں نے ابن عباس رضی اللہ عنہما سے سوال کیا کہ "شہری دیہاتی کا سامان فروخت نہ کرے" کا کیا مطلب ہے؟ انہوں نے فرمایا کہ شہری دیہاتی کا دلال نہ بنے۔ (بخاری و مسلم اور یہ الفاظ بخاری کے ہیں)

لغوی تشریح: ﴿ لا تلقوا الركبان ﴾ شہر کی منڈی میں پہنچنے سے پہلے ہی راستہ میں ان سے نہ ملو۔ "رکبان" شتر سواروں کی جماعت۔ رکب شتربانوں کو کہتے ہیں جو سفر پر ہوں۔ اس سے مراد وہ لوگ ہیں جو غلہ' خوردو نوش کی اشیاء اور دیگر استعمال کا سامان منڈیوں میں لاتے ہیں۔ خواہ وہ سوار ہو کر آئیں یا پیدل۔ گروہوں کی صورت میں آئیں یا اکیلے اکیلے۔ ان کو رکبان ان کے غالب احوال کی بنا پر کہہ دیا ہے۔ راستے میں ملنے کی صورت جسے مجمع البحار میں نقل کیا گیا ہے' وہ یہ ہے کہ شہری آدمی بدوی کو شہر کی مارکیٹ میں پہنچنے سے پہلے پہلے راستے ہی میں جا ملے تاکہ بھاؤ کے متعلق غلط بیانی کر کے اس سے سامان سستے داموں خرید لے اور اس کی اصل قیمت سے کم قیمت پر اس سے حاصل کرے۔ منع کرنے سے مقصود یہ ہے کہ فروخت کرنے والا دھوکہ دہی اور ضرر رسانی سے بچ جائے۔ غبن اور خدع سے محفوظ ہو جائے اور اسی طرح جو لوگ منڈی میں سامان خریدنے کیلئے آتے ہیں وہ لوگ فائدہ اور منافع حاصل کر لیتے ہیں' یہ تو معمول کا رواج ہے کہ قافلے اپنا ساز و سامان منڈی کے عام بھاؤ سے قدرے سستا فروخت

کرتے ہیں، نیز یہ بھی معمول ہے کہ جب مارکیٹ و منڈی میں سامان زیادہ مقدار میں آجاتا ہے تو اس کا نرخ اور بھاؤ گر جاتا ہے اور عام لوگ اس سے زیادہ نفع کماتے ہیں ﴿ ولا یبع حاضر لباد ﴾ حاضر سے مراد شہری باشندہ۔ اس میں شہروں، بڑے بڑے قصبوں اور سرسبز و شاداب علاقوں کے رہنے والے سبھی داخل ہیں اور "البادی" سے مراد بادیہ نشین، خانہ بدوش، بادیہ اور بدو دیہاتی کے معنی میں جو شہری کے مقابلہ میں ہوتے ہیں۔ علامہ نووی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ہمارے اصحاب کے نزدیک اس سے مراد یہ ہے کہ ایک اجنبی آدمی دیہات سے، یا دوسرے شہر سے ایسا ساز و سامان جس کی سبھی کو ضرورت ہے، اس روز کے نرخ کے مطابق فروخت کرنے کیلئے لے کر آتا ہے، مگر اسے شہری کہتا ہے کہ اس سامان کو میرے پاس چھوڑ دے، تاکہ میں اسے بتدریج اعلیٰ نرخ پر بیچ دوں۔ (انتھی) ﴿ ماقوله لا یبیع الخ ﴾ یعنی اس قول کا کیا مطلب ہے کہ شہری دیہاتی کا سامان فروخت نہ کرے؟ ﴿ سمسارا ﴾ سین کے نیچے کسرہ، میم ساکن، ایسا دلال جو بڑھ کر بولی دینے والا ہو۔ سبل السلام میں ہے کہ اس کے اصل معنی تو ناظم و منتظم کے ہیں جو معاملہ کا نگران و نگہبان ہو اور حفاظت کرنے والا ہو۔ پھر دوسرے کا مال معاوضہ لے کر فروخت کرنے کی وجہ سے خرید و فروخت کا نگران و محافظ کے نام سے مشہور ہو گیا۔

راوی حدیث: ﴿ طاؤس ﴾ ان کی کنیت ابوعبدالرحمٰن ہے اور نسب یوں ہے۔ طاؤس بن کیسان حمیری۔ حمیر قبیلہ والوں کے مولا ہیں۔ فارسی النسل ہیں۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ ان کا نام ذکوان ہے اور طاؤس ان کا لقب ہے۔ ثقہ ہیں۔ نہایت فاضل فقیہہ ہیں اور تیسرے طبقہ سے ہیں۔ ان کا بیان ہے کہ میں نے پچاس صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو پایا ہے۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول ہے کہ میرا گمان ہے کہ طاؤس جنتی ہے۔ عمرو بن دینار رحمہ اللہ کا قول ہے کہ میں نے ان جیسا کوئی نہیں دیکھا۔ ۱۰۶ھ میں فوت ہوئے۔

(٦٧٥) وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «لاَ تَلَقَّوُا الجَلَبَ، فَمَنْ تُلُقِّيَ فَاشْتُرِيَ مِنْهُ فَإِذَا أَتَى سَيِّدُهُ السُّوقَ فَهُوَ بِالخِيَارِ». رَوَاهُ مُسْلِمٌ.

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "باہر سے شہر میں غلہ لانے والوں کو آگے جا کر نہ ملو۔ جس کسی سے راستہ ہی میں ملاقات کر کے اس کا سامان خرید لیا گیا تو منڈی میں پہنچنے کے بعد مال کے مالک کو اختیار ہے (چاہے سودا باقی رکھے یا منسوخ کر دے)" (مسلم)

لغوی تشریح: ﴿ الجلب ﴾ جیم اور لام دونوں پر فتحہ، مصدر ہے۔ مجلوب کے معنی میں۔ کہتے ہیں جلب الشئی یعنی تجارت کیلئے ایک شہر سے دوسرے شہر میں سامان لایا۔ مراد یہاں قابل فروخت اشیاء اور ان اشیاء کے مالک ہیں۔

حاصل کلام: اس حدیث میں بھی بے خبر لوگوں سے سستے داموں اشیاء خریدنے کی ممانعت ہے۔ مسلمان، مسلمان کا خیر خواہ اور ہمدرد و غمگسار ہونا چاہیئے۔ اس طرح تو خود غرضی اور مفاد پرستی کو تقویت

ملتی ہے کہ اپنا مفاد سامنے رکھا جائے اور بے خبر لوگوں کی بے خبری سے ناجائز فائدہ اٹھایا جائے۔

(٦٧٦) وَعَنْهُ قَالَ: نَهَى رَسُولُ اللهِ ﷺ أَنْ يَبِيْعَ حَاضِرٌ لِبَادٍ، وَلاَ تَنَاجَشُوا، وَلاَ يَبِيْعُ الرَّجُلُ عَلَى بَيْعِ أَخِيْهِ، وَلاَ يَخطُبُ عَلَى خِطْبَةِ أَخِيْهِ، وَلاَ تَسْأَلُ المَرْأَةُ طَلاَقَ أُخْتِهَا، لِتَكْفَأَ مَا فِي إِنَائِهَا. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ، وَلِمُسْلِمٍ: «لاَ يَسُومُ المُسْلِمُ عَلَى سَومِ أَخِيهِ».

حضرت ابوھریرہ رضی اللہ عنہ سے ہی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرمایا کہ شہری دیہاتی کا سامان نہ بیچے اور خریدنے کا ارادہ نہیں تو بھاؤ مت بڑھاؤ۔ کسی بھائی کے سودے پر دوسرا بھائی سودا نہ کرے اور ایک بھائی کی منگنی پر دوسرا بھائی پیغام نکاح نہ دے اور کوئی عورت اپنی دوسری عورت کی طلاق کا تقاضا نہ کرے کہ جو اس کا حصہ ہے خود حاصل کر لے۔ (بخاری و مسلم) اور صحیح مسلم میں ہے کوئی شخص اپنے بھائی کے سودے پر سودا نہ کرے۔

لغوی تشریح: ﴿لا يبيع الرجل على بيع اخيه﴾ لا یبیع مضارع مرفوع اور "لا" اس پر نافیہ ہے۔ اس صورت میں معنی ہوگا کہ اپنے بھائی کی بیع پر کسی کی بیع نہیں اور مجزوم بھی ہے' اس صورت میں لانھی کا ہوگا۔ اس کی صورت یہ ہے کہ بیع خیار واقع ہوئی ہو۔ جتنی مدت اختیار کیلئے دی گئی اسی دوران ایک آدمی آجاتا ہے اور خریدار سے کہتا ہے کہ تو اس سے سودے کو فسخ کر دے اور میں تجھے اس سے ارزاں اور اس سے عمدہ اور بہترین فروخت کر دیتا ہوں۔ تو جس طرح بیع پر بیع جائز نہیں' اسی طرح شراء پر شراء بھی جائز نہیں۔ وہ بایں صورت کہ فروخت کرنے والے سے مدت خیار کے دوران یوں کہے کہ تو یہ بیع فسخ کر دے' میں تجھ سے یہی چیز اس سے زیادہ قیمت پر خرید لوں گا۔ (سبل السلام اختصار اور تبدیل کے ساتھ) ﴿ولا يخطب على خطبة اخيه﴾ خطبہ کے "خا" کے نیچے کسرہ۔ عورت سے شادی کا مطالبہ کرنا۔ یعنی جب ایک آدمی کسی عورت کو پیغام نکاح دیتا ہے' ایک دوسرے کی طرف میلان اور جھکاؤ ہو جاتا ہے اور باہمی اتفاق ہو جاتا ہے۔ بس اب صرف دونوں میں عقد نکاح باقی رہ جاتا ہے تو اس وقت اس عورت کو دوسرے کا پیغام نکاح دینا جائز نہیں۔ تاآنکہ وہ دونوں نکاح کر لیں تاکہ کسی دوسرے کیلئے اس کا دروازہ ہی بند کر دیں' یا ایک دوسرے سے الگ الگ ہو جائیں۔ اب ہر ایک کیلئے دروازہ کھلا ہے جو چاہے اس سے نکاح کر لے۔ ﴿لتكفا ما في انائها﴾ یہ کفاء الاناء سے ماخوذ ہے۔ یہ اس موقع پر بولتے ہیں جب برتن اوندھا اور پلٹ کر جو کچھ اس میں موجود ہو اسے نیچے گرا کر خالی کر دیا جائے۔ یعنی کسی اجنبی عورت کیلئے یہ جائز نہیں جو کسی مرد سے نکاح کرنا چاہتی ہو کہ اس سے پہلی بیوی کو طلاق دینے کا مطالبہ و تقاضا کرے' تاکہ جو سہولتیں اس عورت کو اپنے شوہر سے حاصل ہیں۔ نان و نفقہ' لباس اور رہن سہن کی آسانیاں وغیرہ سے اسے محروم کر کے خود حاصل کرے۔ اسی طرح کسی بیوی کیلئے بھی یہ جائز نہیں ہے کہ اپنے شوہر سے اپنی سوکن کو طلاق دینے کا تقاضا کرے۔ تاکہ وہ بلا شرکت غیرے تمام حقوق

خود حاصل کرے اور اپنی سوکن کو ان سے بلاوجہ محروم کر دے۔ اپنی سوکن کے اس طرح کے سارے حقوق حاصل کرنا' تمثیل کے رنگ میں اس کے برتن کو خالی کر کے اپنے لئے جگہ بنانے اور گنجائش نکالنے کو بیان کیا ہے۔ ﴿لا یسم المسلم علی سوم المسلم﴾ سوم اس گفتگو کو کہتے ہیں جو خریدار اور فروخت کرنے والے کے مابین خرید و فروخت پختہ کرنے کیلئے ہوتی ہے۔ سودے پر سودا کرنے کی صورت یہ ہے کہ ایک آدمی کے پاس کوئی چیز قابل فروخت ہے۔ ایک آدمی اس سے خریدنے کی بات کرتا ہے اور اتنے میں ایک اور آدمی آجاتا ہے اور کہتا ہے کہ چھوڑو اسے' میں تجھے اس سے زیادہ اچھی چیز اتنی قیمت میں دے دوں گا' یا ایسی ہی مگر اس سے سستی اور ارزاں' یا مالک سامان سے کہتا ہے کہ اسے فروخت نہ کر' میں یہی چیز تجھ سے زیادہ قیمت پر خرید لوں گا۔

(٦٧٧) وَعَنْ أَبِي أَيُّوبَ الأَنْصَارِيِّ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: سَمِعْتُ رَسُولَ اللهِ ﷺ يَقُولُ: «مَنْ فَرَّقَ بَيْنَ وَالِدَةٍ وَوَلَدِهَا فَرَّقَ اللَّهُ بَيْنَهُ وَبَيْنَ أَحِبَّتِهِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ». رَوَاهُ أَحْمَدُ، وَصَحَّحَهُ التِّرمِذِيُّ وَالحَاكِمُ، لٰكِنْ فِيْ إِسْنَادِهِ مَقَالٌ، وَلَه شَاهِدٌ.

حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا ہے کہ "جس نے ماں اور اس کے بچے کے درمیان جدائی ڈالی' اللہ تعالیٰ قیامت کے روز اس کے اور اس کے اعزاء و اقرباء کے درمیان میں جدائی ڈال دے گا۔" (اسے احمد نے روایت کیا ہے۔ ترمذی اور حاکم نے صحیح کہا ہے' لیکن اس کی سند میں کلام ہے۔ اس کا شاہد موجود ہے)

حاصل کلام: اس حدیث میں صلہ رحمی کا درس دیا گیا ہے کہ غلام اور لونڈیوں کو فروخت کرتے وقت ماؤں سے ان کے نابالغ بچوں کو جدا نہ کیا جائے۔ جدا جدا جگہ اور الگ الگ آدمیوں کے ہاتھ فروخت نہ کیا جائے' اس سے ماں کی مامتا متاثر ہوتی ہے۔ دارقطنی اور حاکم کی روایت میں نابالغ کی تصریح موجود ہے۔ جو شخص اس دنیا میں بے رحمی اور قطع رحمی کا ارتکاب کرے گا' اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اس کے قریبی اعزاء و اقرباء کے درمیان میں جدائی ڈال دے گا۔

(٦٧٨) وَعَنْ عَلِيِّ بْنِ أَبِي طَالِبٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: أَمَرَنِي رَسُولُ اللهِ ﷺ أَنْ أَبِيْعَ غُلاَمَيْنِ أَخَوَيْنِ، فَبِعْتُهُمَا، فَفَرَّقْتُ بَيْنَهُمَا، فَذَكَرْتُ ذٰلِكَ لِلنَّبِيِّ ﷺ، فَقَالَ: «أَدْرِكْهُمَا فَارْتَجِعْهُمَا، وَلاَ تَبِعْهُمَا إِلاَّ جَمِيعاً». رَوَاهُ أَحْمَدُ، وَرِجَالُهُ ثِقَاتٌ،

حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ مجھے رسول اللہ ﷺ نے حکم دیا کہ میں دو غلام بھائیوں کو فروخت کروں۔ میں نے ان دونوں کو الگ الگ آدمیوں کے ہاتھ فروخت کر دیا اور پھر آپ سے اس کا ذکر کیا تو آپ نے فرمایا "دونوں کو جا کر واپس لے آؤ اور اکٹھا ہی فروخت کرو۔" (اسے احمد نے روایت کیا ہے۔ اس کے راوی ثقہ ہیں اور اسے ابن

وَقَدْ صَحَّحَهُ ابْنُ خُزَيْمَةَ وَابْنُ الجَارُودِ وَابْنُ حِبَّانَ وَالحَاكِمُ وَالطَّبَرَانِيُّ وَابْنُ القَطَّانِ .

خزیمہ' ابن جارود' ابن حبان' حاکم' طبرانی اور ابن قطان نے صحیح قرار دیا ہے)

حاصل کلام : پہلی حدیث ماں اور بچے میں جدائی کی حرمت پر دلالت کرتی ہے' خواہ وہ علیحدگی بیع کے ذریعہ سے ہو' یا ھبہ کی صورت میں' یا دھوکہ بازی سے الگ کرنے وغیرہ کی شکل میں اور والدہ کے لفظ کا اطلاق والد پر بھی ہے' یعنی ماں باپ سے جدا نہ کیا جائے اور یہ حدیث بھائیوں کے درمیان تفریق و جدائی کی حرمت پر دلالت کرتی ہے اور قیاس کے ذریعہ ان کے ساتھ دوسرے ذوی الارحام کو بھی ملالیا گیا ہے' مگر شوکانی رحمہ اللہ کا خیال ہے کہ ذوی الارحام کو اس میں شامل کرنا محل نظر ہے' کیونکہ ان کی جدائی سے وہ مشقت و پریشانی نہیں ہوتی جو ماں اور بچے کے مابین یا بھائی' بھائی کے درمیان جدائی سے حاصل ہوتی ہے۔ لہٰذا دونوں میں واضح فرق کی وجہ سے ایک کو دوسرے کے ساتھ نہ ملایا جائے اور صرف نص پر توقف کیا جائے۔ انتہی۔

اور یہ بات بھی معلوم رہے کہ تفریق کی حرمت چھوٹے نابالغ بچے کے ساتھ مخصوص ہے۔ بالغ کی جدائی کب جائز ہے؟ اس میں اختلاف ہے۔ باعتبار دلیل راجح یہ ہے کہ جب لڑکا بالغ ہو جائے اور بچی کو ایام حیض شروع ہو جائیں' اس وقت تفریق حرام نہیں۔

(٦٧٩) وَعَنْ أَنَسِ بْنِ مَالِكٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: غَلاَ السِّعْرُ فِي المَدِيْنَةِ عَلَى عَهْدِ رَسُولِ اللهِ فقال النَّاسُ: يا رسولَ اللهِ! غَلاَ السِّعرُ، فَسَعِّرْ لَنَا، فَقَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «إِنَّ اللَّهَ هُوَ المُسَعِّرُ القَابِضُ البَاسِطُ الرَّازِقُ، وَإِنِّي لأَرْجُو أَنْ أَلْقَى اللَّهَ تَعَالَى وَلَيْسَ أَحَدٌ مِنْكُمْ يَطْلُبُنِي بِمَظْلَمَةٍ فِي دَمٍ وَلاَ مَالٍ». رَوَاهُ الخَمْسَةُ إِلاَّ النَّسَائِيَّ، وَصَحَّحَهُ ابْنُ حِبَّانَ.

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے عہد میں مدینہ منورہ میں چیزوں کا بھاؤ چڑھ گیا۔ لوگوں نے عرض کیا یارسول اللہ (ﷺ)! اشیاء کے نرخ (بڑے) تیز ہو گئے ہیں' آپ ہمارے لئے (ان کے) نرخ مقرر فرما دیں۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "نرخ کا تعین کرنے والا اللہ تعالیٰ ہے' وہی ارزاں و سستا کرتا ہے' وہی گراں کرتا ہے اور روزی دینے والا وہی ہے اور میں چاہتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ سے میں اس حال میں ملاقات کروں کہ کوئی شخص تم میں سے مجھ سے خون میں اور مال میں ظلم و ناانصافی کا مطالبہ کرنے والا نہ ہو۔" (نسائی کے علاوہ اسے پانچوں نے روایت کیا ہے اور ابن حبان نے اس کو صحیح قرار دیا ہے)

لغوی تشریح : ﴿ غلا ﴾ غلاء سے ماخوذ ہے۔ یعنی نرخ چڑھ گیا' بھاؤ بڑھ گیا۔ معمول کے اندازے سے

زیادہ ہوگیا۔ ﴿ سعر لنا ﴾ تسعیر سے امر کا صیغہ ہے۔ یعنی بھاؤ و نرخ مقرر فرما دیں اور اس کی صورت یہ ہے کہ سلطان یا اس کا نائب یا کوئی حاکم منڈی میں فروخت کرنے والوں کو احکام کے ذریعہ پابند کر دے کہ وہ اتنے نرخ سے زائد اپنی اشیاء فروخت نہ کریں۔ نرخ کے اتار چڑھاؤ' کمی و بیشی کو مصلحتاً روک دیں۔ ﴿ ان اللہ ھو المسعر ﴾ عین پر تشدید اور نیچے کسرہ۔ یعنی وہ تنہا کمی اور بیشی کرنے والا ہے ﴿ بمظلمۃ ﴾ میم پر فتحہ اور لام کے نیچے کسرہ۔ یعنی جو حق کے بغیر لیا جائے اور لام کے فتحہ کے ساتھ بھی ہے" اس صورت میں ظلم کا مصدر ہو گا۔

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ اشیاء کی قیمتوں پر سرکاری کنٹرول ممنوع ہے۔ اس سے ایک طرف اگر تجارت پیشہ حضرات کو نقصان پہنچتا ہے تو دوسری جانب تاجروں کا اشیاء کو روک لینا قحط کا سبب بن جاتا ہے۔ عوام ضروریات زندگی کی فراہمی سے مجبور ہو جاتے ہیں جس کے نتیجہ میں بلیک مارکیٹنگ کا بازار گرم ہوتا ہے۔ عوام معاشی بدحالی کا شکار ہو جاتے ہیں جس سے معاشرے میں بے چینی' اضطراب اور بدامنی جنم لیتی ہے۔

(٦٨٠) وَعَنْ مَعْمَرِ بْنِ عَبْدِ اللهِ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، عَنْ رَسُولِ اللهِ ﷺ، قَالَ: «لاَ يَحْتَكِرُ إِلاَّ خَاطِىءٌ». رَوَاهُ مُسْلِمٌ.

حضرت معمر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "خطا کار کے سوا ذخیرہ اندوزی کوئی نہیں کرتا۔" (مسلم)

لغوی تشریح: ﴿ لایحتکر ﴾ احتکار سے ماخوذ ہے یعنی غلہ کو روک لینا' فروخت نہ کرنا۔ اس انتظار میں کہ نرخ چڑھے' عوام کو اس کی شدید ضرورت ہو۔ فروخت کرنے والا اس سے مستغنی ہو۔ ﴿ الاخاطی ﴾ یعنی نافرمان' گناہ گار' خطا کار۔

حاصل کلام: اس حدیث میں ذخیرہ اندوزی کی ممانعت ہے۔ وہ اس طرح کہ ایک آدمی کوئی چیز خرید کر ذخیرہ کر لے کہ جب نرخ بڑھیں گے تو اس وقت اسے فروخت کروں گا' حالانکہ عوام میں اس کی بہت مانگ ہو۔ حدیث کے الفاظ عام ہیں' مگر جمہور نے اس سے مراد صرف انسانوں اور حیوانوں کے خورد و نوش کی چیزیں لی ہیں۔ دوسری اشیاء اس نہی سے مستثنیٰ ہیں۔ احتکار ایسی شکل میں تو بلاشبہ حرام ہے کہ اشیاء صرف کی قلت پیدا ہو جائے اور جن کے پاس یہ چیزیں ہوں وہ انہیں چھپا کر رکھ لیں۔ احتکار تجارت پیشہ حضرات کیلئے حرام ہے۔ زمیندار اپنی پیداوار روک لے تو اس کیلئے گنجائش ہے۔ مگر جب غلہ کی قلت شدت اختیار کر جائے تو پھر ان کیلئے غلہ کو روک لینا بھی جائز نہیں ہو گا۔

راوی حدیث: ﴿ معمر بن عبداللہ بن نافع بن نضلۃ بن حرثان العدوی رضی اللہ عنہ ﴾ وہ ابن ابی معمر ہیں۔ بڑے مرتبہ کے صحابی اور قدیم الاسلام ہیں۔ ہجرت حبشہ کی اور مدینہ کی طرف ہجرت میں ذرا تاخیر ہوئی تو پھر مدینہ کی جانب بھی ہجرت کی اور وہیں سکونت اختیار کی۔

(٦٨١) وَعَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُ، عَنِ النَّبِيِّ ﷺ، قَالَ: «**لاَ تُصَرُّوا الإِبِلَ وَالغَنَمَ، فَمَنِ ابْتَاعَهَا بَعْدُ فَهُوَ بِخَيْرِ النَّظَرَيْنِ بَعْدَ أَنْ يَحْلُبَهَا، إِنْ شَاءَ أَمْسَكَهَا، وَإِنْ شَاءَ رَدَّهَا وَصَاعاً مِنْ تَمْرٍ**». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ، وَلِمُسْلِمٍ: **فَهُوَ بِالخِيَارِ ثَلاَثَةَ أَيَّامٍ**. وَفِيْ رِوَايَةٍ لَهُ عَلَّقَهَا البُخَارِيُّ: «**وَرَدَّ مَعَهَا صَاعاً مِّنْ طَعَامٍ لاَ سَمْرَآءَ**». قَالَ البُخَارِيُّ: وَالتَّمْرُ أَكْثَرُ.

حضرت ابوھریرہ رضی اللہ عنہ نبی ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ آپؐ نے فرمایا "اونٹوں اور بھیڑ بکریوں کا دودھ فروخت کرتے وقت ان کے تھنوں میں روکے نہ رکھو۔ جو شخص ایسا جانور خرید لے تو اسے دو باتوں میں سے بہتر کے اختیار کرنے کا حق حاصل ہے' چاہے اس جانور کو اپنے پاس رکھ لے اور چاہے تو ایک صاع کھجور ساتھ دے کر واپس کر دے۔" (بخاری و مسلم) **اور مسلم کی روایت میں ہے کہ اسے تین دن تک اختیار ہے اور مسلم کی ایک روایت** میں ہے' جسے بخاری نے تعلیقاً نقل کیا ہے کہ "اس کے ساتھ ایک صاع کسی کھانے والی چیز سے واپس کرے۔ گندم نہیں۔" بخاری نے کہا کہ اکثر روایات میں کھجور کا ذکر ہے۔

لغوی تشریح: ﴿ لا تصروا ﴾ "تا" پر ضمہ اور صاد پر فتحہ اور "را" پر تشدید۔ تصریہ سے ماخوذ ہے۔ اس کی نوعیت یہ ہے کہ اونٹنی یا بھیڑ بکری کا دودھ تھنوں سے نہ نکالا جائے' تاکہ وہ تھنوں میں جمع ہوتا رہے اور کثیر مقدار میں معلوم ہو کہ خریدار کو دھوکہ اور فریب دیا جائے اور وہ سمجھے کہ یہ تو بڑی دودھیل جانور ہے۔ اس جھانسہ میں آکر خریدار اس کی قیمت زیادہ دینے کیلئے آمادہ ہو۔ ﴿ فمن ابتاعها بعد ﴾ بعد کا لفظ ایسا ہے جس پر ضمہ ہی آتا ہے' اسے مبنی بر ضمہ کہتے ہیں۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ مضاف الیہ نیت میں ہوتا ہے' مگر عبارت میں مذکور نہیں ہوتا اور بعد گویا اصل میں بعد ذلک ہے۔ ﴿ فھو بخیر النظرین ﴾ نظرین اس مقام پر دورائے کیلئے استعمال ہوا ہے' یعنی خریدار کو دورایوں میں سے ایک کو جسے وہ مناسب اور اچھی سمجھے اختیار کرنے کا حق حاصل ہے۔ ﴿ وصاعا ﴾ صاعا کا ضمیر منصوب پر عطف ہے' یا یہ بھی ہو سکتا ہے کہ "واؤ" مع کے معنی میں ہو۔ اس صورت میں معنی ہوگا کہ خریدار واپس کرتے وقت جانور کے ساتھ ایک صاع کھجوریں بھی دے گا۔ ﴿ سمراء ﴾ سین پر فتحہ اور میم ساکن۔ معنی گندم اور ایک صاع کھجوریں ساتھ واپس دینے کا حکم اس لئے دیا ہے کہ اس جانور سے حاصل کردہ دودھ کا معاوضہ ہو جائے' کیونکہ کچھ دودھ تو خریدار کی ملکیت میں نئی چیز ہے اور کچھ دودھ اس نے خریدا ہے۔ اب چونکہ خریدار کو یہ تمیز کرنا دشوار ہے کہ کتنا دودھ خریدا ہوا ہے اور کتنا نیا داخل ہے' چنانچہ عدم تمیز کی بنا پر اسے واپس کرنا یا اس کی قیمت واپس کرنا ممکن نہیں تھا' اس لیے شارع نے

ایک صاع مقرر فرما دیا کہ فروخت کرنے والے اور خریدار کے مابین تنازع اور جھگڑا پیدا نہ ہو۔ خریدار نے جو دودھ حاصل کیا ہے اس کا معاوضہ ہو جائے۔ قطع نظر اس سے کہ دودھ کی مقدار کم تھی یا زیادہ' (ملا علی قاری بحوالہ مرقاۃ) جمہور اہل علم تو حدیث کے ظاہر کی جانب ہی گئے ہیں اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور تابعین عظام رحمۃ اللہ علیہم نے بھی فتویٰ اسی کے مطابق دیا ہے اور کسی صحابی سے اس کی مخالفت ثابت نہیں۔ البتہ اکثر احناف نے اس مسئلہ میں ان کی مخالفت کی ہے لیکن وہ کوئی ایسی چیز پیش نہیں کر سکے جو ان کیلئے مفید ہو اور انہوں نے اس میں بڑا تشدد اختیار کیا ہے' یہاں تک کہ اسی کو انہوں نے کسوٹی بنا لیا ہے' جس پر وہ دوسروں کو جانچتے پرکھتے رہتے ہیں (اور وہ کسوٹی یہ ہے) کہ کون موافقت کر کے ان کے امام کی تعظیم کرتا ہے اور کون مخالفت کر کے ان کے امام کی توہین کرتا ہے' حتیٰ کہ انہوں نے ایک جلیل القدر صحابی رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں طعن کیا۔ یعنی حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کے متعلق انہوں نے قلت درایت اور عدم فقاہت کی پھبتی ان پر محض اس حدیث کی روایت کرنے کی بنا پر کس دی۔ غیر فقیہ اور درایت سے خالی گردان دیا۔ باوجودیکہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے بھی نہ صرف اس روایت کو بیان کیا ہے' بلکہ انہوں نے تو ایسا ہی فتویٰ بھی دیا ہے۔ جبکہ ان کے فقیہہ ہونے میں دو آدمیوں کے درمیان بھی اختلاف نہیں۔ فالی اللہ المشتکی۔

(٦٨٢) وَعَنِ ابْنِ مَسْعُودٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: مَنِ اشْتَرَى شَاةً مُحَفَّلَةً فَرَدَّهَا فَلْيَرُدَّ مَعَهَا صَاعاً. رَوَاهُ البُخَارِيُّ، وَزَادَ الإِسْمَاعِيلِيُّ: «مِنْ تَمْرٍ».

حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ جو شخص ایسی بکری خریدے جس کا دودھ تھنوں میں روک دیا گیا ہو' پھر وہ اسے واپس کرے تو اسے چاہئے کہ اس کے ساتھ ایک صاع واپس کرے۔ (بخاری) اور اسماعیلی نے اتنا اضافہ نقل کیا ہے کہ ایک صاع کھجوریں۔

لغوی تشریح: ﴿ محفلۃ ﴾ محفلہ میں "فا" پر فتحہ اور تشدید۔ وہ جانور جس کا دودھ تھنوں میں ہی زیادہ دکھانے کیلئے روک دیا گیا ہو اور محفلہ دراصل "من حفل القوم واحتفلوا" سے ماخوذ ہے۔ جب ان کی تعداد بہت جمع ہو جائے اور ہوں سب ایک ہی مقصد کیلئے اور حافل عظیم کے معنی میں بھی مستعمل ہے۔ اس کا نام محفلہ اس لئے رکھا گیا کہ دودھ اس بکری کے تھنوں میں کثیر مقدار میں جمع ہو جاتا ہے۔

حاصل کلام: حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہما کا فتویٰ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ والی روایت کی مکمل تائید کر رہا ہے اور حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی فقہ پر احناف کے اکثر مسائل کا دارومدار ہے۔ سوچ لیں اگر ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ غیر فقیہہ اور درایت سے خالی ہیں تو عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے بارے میں کیا خیال ہے؟

(٦٨٣) وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُ، أَنَّ رَسُولَ اللّٰهِ ﷺ مَرَّ

حضرت ابوھریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا گزر طعام (غلہ) کے ایک ڈھیر پر ہوا۔ آپ

عَلَى صُبْرَةٍ مِنْ طَعَامٍ، فَأَدْخَلَ يَدَهُ فِيهَا، فَنَالَتْ أَصَابِعُهُ بَلَلاً، فَقَالَ: مَا هَذَا؟ يَا صَاحِبَ الطَّعَامِ! قَالَ: أَصَابَتْهُ السَّمَاءُ، يَا رَسُولَ اللهِ! قَالَ: «أَفَلاَ جَعَلْتَهُ فَوْقَ الطَّعَامِ، كَيْ يَرَاهُ النَّاسُ، مَنْ غَشَّ فَلَيْسَ مِنِّي». رَوَاهُ مُسْلِمٌ.

نے اس میں اپنا ہاتھ داخل کر دیا۔ آپ ؐ کی انگلیوں کو نمی لگی۔ آپ ؐ نے فرمایا "اے اناج کے مالک! یہ کیا ماجرا ہے؟" اس نے عرض کیا! اے اللہ کے رسول (ﷺ)! اس پر بارش برس گئی تھی۔ آپ ؐ نے فرمایا "پھر تو نے نمی زدہ حصہ کو اناج کے اوپر کیوں نہ ڈال دیا تاکہ خریدار لوگ اسے دیکھ لیتے۔ جس نے دھوکہ دیا اس کا مجھ سے کوئی تعلق نہیں۔" (مسلم)

لغوی تشریح: ﴿ صبرۃ ﴾ صاد پر ضمہ اور با ساکن۔ اناج و غلہ وغیرہ جو ایک جگہ جمع کر دیا جاتا ہے' جیسے مٹی کا اونچا ڈھیر ہوتا ہے۔ اس کی جمع صبر آتی ہے' صاد کے ضمہ اور "با" کے فتحہ کے ساتھ اور ﴿ طعام ﴾ سے مراد اناج و غلہ وغیرہ ﴿ فنالت ﴾ محسوس کیا' پایا۔ ﴿ السماء ﴾ سے مراد یہاں بارش ہے۔ ﴿ من غش ﴾ غش سے ماضی کا صیغہ ہے اور یہ نصح یعنی خیر خواہی و ہمدردی کے متضاد ہے' یعنی خیانت اور دھوکہ ﴿ فلیس منی ﴾ تو اس کا مجھ سے کوئی تعلق نہیں۔ نووی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ الاصول میں "یاء" متکلم کے ساتھ ہی منقول ہے اور معنی اس کا ہے کہ اس نے میری ہدایت کے مطابق راہ طلب نہیں کی اور میرے علم و عمل کی اور میرے عمدہ طریقہ و راستہ کی پیروی نہیں کی۔ سفیان بن عیینہ اس طرح کی تفسیر کو ناپسند کرتے تھے اور کہتے تھے کہ اس ارشاد کی تاویل سے رک جایئے' تاکہ وہ دلوں میں زیادہ اثر انداز ہو اور زجر و توبیخ میں زیادہ مبالغہ آمیز ثابت ہو۔ (ملخصاً)

(٦٨٤) وَعَنْ عَبْدِ اللهِ بْنِ بُرَيْدَةَ، عَنْ أَبِيهِ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا، قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «مَنْ حَبَسَ العِنَبَ أَيَّامَ القِطَافِ، حَتَّى يَبِيعَهُ مِمَّنْ يَتَّخِذُهُ خَمْراً، فَقَدْ تَقَحَّمَ النَّارَ عَلَى بَصِيرَةٍ». رَوَاهُ الطَّبَرَانِيُّ فِي الأَوْسَطِ بِإِسْنَادٍ حَسَنٍ.

حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ نے اپنے والد بریدہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "جس شخص نے انگور اتارنے کے ایام میں ان کو روک لیا' تاکہ اسے کسی شراب بنانے والے کے ہاتھ فروخت کرے تو وہ جانتے بوجھتے آتش جہنم میں داخل ہو گا۔" (اسے طبرانی نے اوسط میں حسن سند سے روایت کیا ہے)

لغوی تشریح: ﴿ من حبس العنب ﴾ انگور کو روک لیا اور اسے فروخت نہ کیا۔ ﴿ ایام القطاف ﴾ قطاف کے قاف کے نیچے کسرہ اور فتحہ بھی جائز ہے۔ وہ موسم جس میں انگور اتارے جاتے ہیں اور قطف کہتے ہیں انگور کی بیل سے انگور اتارنے کو اور قطف قاف کے کسرہ سے گچھے اور خوشے کے معنی میں آتا ہے۔ قرآن مجید میں قطف کی جمع بیان ہوئی ہے ﴿ قطوفها دانية ٦٩ : ٢٣ ﴾ یعنی جنت کے خوشے جھکے

ہوئے ہوں گے۔ ﴿تقحم النار﴾ اس میں اپنے آپ کو داخل کرلیا اور بغیر دیکھے اپنے آپ کو اس میں پھینک دیا۔ ﴿علی بصیرۃ﴾ یعنی سبب دخول کا علم رکھنے کے باوجود۔

(٦٨٥) وَعَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهَا قَالَتْ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «الخَرَاجُ بِالضَّمَانِ». رَوَاهُ الخَمْسَةُ، وَضَعَّفَهُ البُخَارِيُّ وَأَبُو دَاوُدَ؛ وَصَحَّحَهُ التِّرْمِذِيُّ وَابْنُ خُزَيْمَةَ وَابْنُ الْجَارُودِ وَابْنُ حِبَّانَ وَالحَاكِمُ وَابْنُ القَطَّانِ.

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "آمدن ضمان (کفالت) کا بدلہ ہے۔" (اسے پانچوں نے روایت کیا ہے۔ بخاری اور ابوداؤد نے اسے ضعیف قرار دیا ہے۔ ترمذی' ابن خزیمہ' ابن جارود' ابن حبان' حاکم اور ابن قطان نے اسے صحیح کہا ہے)

لغوی تشریح: ﴿الخراج﴾ "خا" پر فتحہ۔ گھر کے کرایہ کی آمدن یا زمین کا ماحصل اور کرایہ۔ یعنی وہ فوائد و منافع جو فروخت شدہ چیز سے حاصل ہوں۔ خواہ وہ غلام ہو یا لونڈی' حیوان ہو یا کوئی دوسری چیز۔ ﴿بالضمان﴾ ضاد پر فتحہ۔ کفالت و ذمہ داری اور "با" اس میں محذوف سے متعلق ہے یعنی فروخت شدہ چیز کو قبضہ میں لینے کے بعد اس سے حاصل ہونے والے منافع اور فوائد خریدار کیلئے باقی رہتے ہیں' اس ضمان کے بدلہ میں جو اس پر لازم ہے' فروخت شدہ چیز کے تلف ہونے اور اس کے خرچ ہونے اور اس پر مشقت برداشت کی صورت میں اور اسی سے یہ قول ماخوذ ہے جس پر تاوان ہے۔ اس کا فائدہ و مفاد بھی اسی کیلئے ہے اور اس طرح کہ وہ ایک چیز خریدتا ہے اور ایک مدت تک اس سے استفادہ کرتا ہے' اس کے بعد اسے اس چیز کے قدیم عیب کا علم ہوتا ہے' جس کا علم فروخت کرنے والے کو نہیں تھا اور نہ ہی اس سے باخبر تھا۔ بایں صورت خریدار کیلئے اس بات کی گنجائش ہے کہ وہ فروخت شدہ چیز کو بعینہ واپس کر کے اپنی قیمت وصول کر لے۔ اس دوران خریدار نے اس چیز سے جتنا مفاد حاصل کیا' یہ اسی کا استحقاق تھا' کیونکہ اگر فروخت شدہ چیز اس سے ضائع ہو جاتی تو اس کا ذمہ دار بھی وہی ہوتا اور فروخت کنندہ پر کوئی چیز لازم نہ آتی۔ جیسا کہ ضبی نے کہا ہے۔ (ملخصاً) اور صاحب سبل السلام نے کہا ہے کہ اس کے معنی یہ ہیں کہ جب فروخت شدہ چیز کی آمدنی ہو اور گھر کے کرایہ کی آمد یا زمین کا ماحصل ہو تو (غلام) کا مالک جو اس کا ذمہ دار ہے' اس کی آمدن کا مالک ہوگا' اس کی اصل کی ذمہ داری و کفالت کی وجہ سے۔ پس جب کسی آدمی نے کوئی زمین خریدی اور اس کو استعمال بھی کیا' یا چوپایہ خریدا اور اس نے بچے کو جنم دیا' یا چوپایہ خریدا اور اس پر سوار ہوا' یا غلام خریدا' اس سے خدمت لی' پھر اس میں کوئی نقص و عیب پایا تو اس کیلئے اس غلام کو واپس کرنے کی گنجائش ہے اور جتنا فائدہ اس سے حاصل کیا ہے اس کے عوض اس پر کوئی چیز نہیں۔ اس لئے کہ اگر یہ فسخ و عقد کی مدت کے درمیان تلف و ضائع ہو جاتی تو اس کی ذمہ داری خریدار پر ہوتی۔ تو پھر اس کی آمدن کا بھی وہی حقدار ہے۔

(٦٨٦) وَعَنْ عُرْوَةَ البَارِقِيِّ رَضِيَ

حضرت عروہ بارقی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ

اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ أَعْطَاهُ دِيْنَاراً لِيَشْتَرِيَ بِهِ أُضْحِيَّةً أَوْ شَاةً، فَاشْتَرَى بِهِ شَاتَيْنِ، فَبَاعَ إِحْدَاهُمَا بِدِيْنَارٍ، فَأَتَاهُ بِشَاةٍ وَدِيْنَارٍ، فَدَعَا لَهُ بِالْبَرَكَةِ فِي بَيْعِهِ، فَكَانَ لَوْ اشْتَرَى تُرَاباً لَرَبِحَ فِيْهِ. رَوَاهُ الْخَمْسَةُ إِلاَّ النَّسَائِيَّ، وَقَدْ أَخْرَجَهُ الْبُخَارِيُّ فِي ضِمْنِ حَدِيْثٍ، وَلَمْ يَسُقْ لَفْظَهُ، وَأَوْرَدَ التِّرْمِذِيُّ لَهُ شَاهِداً مِنْ حَدِيْثِ حَكِيْمِ بْنِ حِزَامٍ.

نے ان کو قربانی کا جانور یا بکری خریدنے کیلئے ایک دینار عطا فرمایا۔ اس نے ایک دینار کے عوض دو بکریاں خریدیں۔ پھر ان دو میں سے ایک کو ایک دینار کے عوض فروخت کر دیا اور ایک بکری اور ایک دینار لے کر آپؐ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ آپؐ نے اس کیلئے اس کی تجارت میں برکت کی دعا فرمائی۔ پس وہ ایسا تھا کہ اگر مٹی بھی خرید لیتا تو اس میں بھی اسے ضرور منافع حاصل ہوتا۔ (نسائی کے علاوہ پانچوں نے اسے روایت کیا ہے اور امام بخاری رحمہ اللہ نے ایک حدیث کے ضمن میں اسے روایت ہے' مگر یہ الفاظ نقل نہیں کئے اور ترمذی نے حکیم بن حزام رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث کو اس کے لیے بطور شاہد بیان کیا ہے)

حاصل کلام: اس حدیث سے چند نہایت بنیادی چیزوں پر روشنی پڑتی ہے۔ مثلاً (۱) وکیل مؤکل کے مال میں تصرف کرنے کا پورا اختیار رکھتا ہے' جبکہ اسے مال کی وکالت سپرد کی جائے اور اسے اپنی مرضی سے استعمال کرنے کی آزادی دی جائے۔ ورنہ طے شدہ اور حدود کے اندر ہی وکیل کو کام کرنا ہوگا۔ (۲) دوسرے کا مال اسے اطلاع دیئے بغیر فروخت کرنا جائز ہے' بشرطیکہ اطلاع ملنے پر مالک رضامندی کا اظہار کرے۔ (۳) قربانی کیلئے خریدا گیا جانور فروخت کیا جا سکتا ہے اور اس کی جگہ دوسرا جانور خریدنا جائز ہے۔ (۴) جو مالک کیلئے ایسی ضرورت انجام دے اس کیلئے دعاء خیر و برکت کرنی چاہیئے۔

راوی حدیث: ﴿عروہ بارقی رضی اللہ عنہ﴾ انہیں ابن الجعد اور ابن ابی الجعد دونوں طرح بیان کیا گیا ہے اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ ان کے والد کا نام عیاض تھا۔ بارق کی طرف نسبت کی وجہ سے بارقی کہلائے۔ بارق میں "را" کے نیچے کسرہ ہے۔ یہ قبیلہ ازد کی شاخ ہے اور نسب نامہ اس طرح ہے' بارق بن عدی بن حارثہ۔ اور ایک قول یہ بھی ہے کہ بارق نامی ایک پہاڑ کے پاس فروکش ہونے کی وجہ سے بارقی کہلائے۔ مشہور صحابی ہیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان کو اپنے دور خلافت میں کوفہ کے منصب قضاء پر فائز فرمایا۔ انہوں نے کوفہ ہی میں سکونت اختیار کر لی' انہی میں شمار کئے گے اور اہل کوفہ ان سے روایت کرتے ہیں۔

(٦٨٧) وَعَنْ أَبِيْ سَعِيْدِ الْخُدْرِيِّ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ نَهَى عَنْ شِرَاءِ مَا فِيْ بُطُونِ الأَنْعَامِ

حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے چوپایوں کے پیٹ میں (پرورش پانے والے) بچے کو اس کی پیدائش سے پہلے خریدنے سے اور

حَتَّى تَضَعَ، وَعَنْ بَيْعِ مَا فِيْ ضُرُوعِهَا، وَعَنْ شِرَآءِ العَبْدِ وَهُوَ آبِقٌ، وَعَنْ شِرَآءِ المَغَانِمِ حَتَّى تُقْسَمَ، وَعَنْ شِرَآءِ الصَّدَقَاتِ حَتَّى تُقْبَضَ، وَعَنْ ضَرْبَةِ الغَائِصِ. رَوَاهُ ابْنُ مَاجَهْ وَالبَزَّارُ وَالدَّارَقُطْنِيُّ بِإِسْنَادٍ ضَعِيفٍ.

تھنوں میں (جمع شدہ) دودھ کو دوہنے سے پہلے فروخت کرنے سے اور بھاگے ہوئے غلام کو خریدنے سے اور اموال غنیمت کو ان کی تقسیم سے پہلے خریدنے سے اور صدقات کو اپنے قبضہ میں لینے سے پہلے خریدنے سے اور غوطہ لگانے والے کو اس کے ایک غوطہ کا معاوضہ لینے سے منع فرمایا ہے۔ (اسے ابن ماجہ' بزار اور دارقطنی نے ضعیف سند سے روایت کیا ہے)

لغوی تشریح: ﴿ تضع ﴾ یعنی جنے۔ ﴿ مافی ضروعها ﴾ جو کچھ تھنوں میں ہو' سے مراد دودھ ہے اور ﴿ ضروع ضرع ﴾ کی جمع ہے' جانور کے تھن کو کہتے ہیں جس طرح عورت کے پستان ہوتے ہیں' اسی طرح حیوان کے تھن ہوتے ہیں۔ ﴿ آبق ﴾ بھاگنے والا' ﴿ المغانم ﴾ مغنم کی جمع ہے۔ مغانم اور غنیمت ان اموال کو کہتے ہیں جو مسلمانوں کی افواج دوران جنگ دشمنوں سے چھینتی اور حاصل کرتی ہیں۔ ﴿ الغائص ﴾ غوص سے ماخوذ ہے۔ پانی میں نیچے اترنے کو کہتے ہیں۔ غائص غوطہ خور کو کہتے ہیں۔ غوطہ مارنے کی نوعیت اس طرح کہ غوطہ لگانے والا غوطے کے خریدار سے کہے کہ میں سمندر میں غوطہ لگاتا ہوں۔ اس غوطہ میں جتنا کچھ حاصل ہوا وہ اتنے مال کے بدلہ میں تمہارا ہے۔ اس بیع سے منع اس لئے کیا گیا ہے کہ اس میں دھوکہ اور فریب ہوتا ہے۔ معلوم نہیں ایک غوطہ میں کیا حاصل ہوتا ہے اور وہ طے شدہ مال سے کم قیمت کا ہے یا زیادہ کا۔

(٦٨٨) وَعَنْ أَبِيْ مَسْعُودٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «لاَ تَشْتَرُوا السَّمَكَ فِي المَاءِ، فَإِنَّهُ غَرَرٌ». رَوَاهُ أَحْمَدُ، وَأَشَارَ إِلَى أَنَّ الصَّوَابَ وَقْفُهُ.

حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "پانی میں موجود مچھلی کو نہ خریدو' کیونکہ یہ دھوکا ہے۔" (اسے احمد نے روایت کیا ہے اور اس طرف اشارہ بھی کر دیا ہے کہ اس روایت کا موقوف ہونا قرین صواب ہے)

حاصل کلام: اس حدیث کی رو سے پانی میں موجود مچھلی کی خرید و فروخت ممنوع ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ پانی میں صحیح طور پر معلوم ہی نہیں ہو سکتا کہ مچھلیوں کی تعداد و مقدار کتنی ہے' کونسی مچھلی ہے' عمدہ اور بہترین نسل کی ہے یا کم تر نسل کی' جسامت و ضخامت میں بڑی ہے یا چھوٹی ہے' مچھلیاں ہیں یا مگرمچھ ہیں؟ جب صحیح علم ہی نہیں تو پھر فروخت کس چیز کی؟ نہ فروخت کنندہ کے قبضہ میں ہے اور نہ اس کی ذاتی ملکیت' اگر ذاتی تالاب وغیرہ بھی ہوں تب بھی مقدار و تعداد اور تعین جنس ناممکن ہے۔

یہ حدیث موقوف ہے' نیز ضعیف بھی ہے۔ اس لئے کہ اس کی سند میں یزید بن ابی زیاد ضعیف راوی ہے اور مسیب بن رافع اور عبداللہ بن مسعود کے مابین ارسال ہے۔ لیکن اس کا شاہد بھی ہے (تلخیص)

(٦٨٩) وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا قَالَ: نَهَى رَسُولُ اللهِ ﷺ أَنْ تُبَاعَ ثَمَرَةٌ حَتَّى تُطْعِمَ، وَلاَ يُبَاعُ صُوفٌ عَلَى ظَهْرٍ، وَلاَ لَبَنٌ فِيْ ضَرْعٍ. رَوَاهُ الطَّبَرَانِيُّ فِي الأَوْسَطِ وَالدَّارَقُطْنِيُّ، وَأَخْرَجَهُ أَبُو دَاوُدَ فِي المَرَاسِيلِ لِعَكْرِمَةَ، وَهُوَ الرَّاجِحُ، وَأَخْرَجَهُ أَيضاً مَوْقُوفاً عَلَى ابْنِ عَبَّاسٍ، بِإِسْنَادٍ قَوِيٍّ. وَرَجَّحَهُ البَيْهَقِيُّ.

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے پھلوں کے (پکنے اور) کھانے کے قابل ہونے سے پہلے فروخت کرنے سے منع فرمایا ہے' نیز جانوروں کی پشت پر اون اور تھنوں میں دودھ کی فروخت کو منع فرمایا ہے۔ (اس روایت کو طبرانی نے اپنی اوسط میں اور دارقطنی نے روایت کیا ہے اور ابوداؤد نے عکرمہ کی مراسیل میں بیان کیا اور یہی راجح ہے اور اسے ابوداؤد نے ابن عباس رضی اللہ عنہما سے موقوف قوی سند کے ساتھ بھی روایت کیا ہے اور بیہقی نے اس کو ترجیح دی ہے)

لغوی تشریح: ﴿حتى تطعم﴾ باب افعال سے مضارع معلوم کا صیغہ ہے۔ معنی یہ ہے کہ پھل کھانے کے قابل ہو جائے اور اس کا کھانا عمدہ اور لذیذ ہو جائے اور یہ اسی صورت میں ہو سکتا ہے کہ پھل پکنے اور پختہ ہونے دیا جائے۔ ﴿اخرجه ابوداود فی المراسیل لعکرمة﴾ اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ روایت ابن عباس رضی اللہ عنہما تک نہیں پہنچی اور نہ انہوں نے اس کا ذکر کیا ہے۔ اس پہلو سے یہ روایت مرسل ہے۔

(٦٩٠) وَعَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ نَهَى عَنْ بَيْعِ المَضَامِينِ والمَلاقيحِ. رَوَاهُ البَزَّارُ، وَفِيْ إِسْنَادِهِ ضَعْفٌ.

حضرت ابوھریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے مضامین اور ملاقیح کی خرید و فروخت سے منع فرمایا ہے۔ (اسے بزار نے روایت کیا ہے اور اس کی سند میں ضعف ہے۔)

لغوی تشریح: ﴿المضامین والملاقیح﴾ مضامین مضمونة کی جمع ہے اور ملاقیح ملقوحة کی۔ ابن قیم رحمہ اللہ نے "الھدی" (ج ۴' ص: ۲۶۶) میں لکھا ہے کہ ابوعبید کے نزدیک ملاقیح سے مراد چارپایوں کے پیٹ میں جو بچے ہیں اور مضامین سے مراد نر اونٹ وغیرہ کی پشتوں میں منی کے قطرات' جن سے بچے بنتے ہیں۔ وہ لوگ مادہ اونٹنی کے پیٹ میں جو بچے ہوتے ہیں اور جو اونٹ وغیرہ جفتی لگاتا ہے اسے سال یا کئی سالوں کیلئے فروخت کرتے تھے۔ کسی شاعر نے کہا ہے ؎

ان المضامین التی فی الصلب ماء الفحول فی الظهور الحدب

یعنی بے شک "مضامین" سے نر اونٹوں کی کبڑی پشتوں میں منی مراد ہے۔

حاصل کلام: اس حدیث میں ان دونوں قسم کی خرید و فروخت کو ممنوع قرار دیا گیا ہے۔ اس کا سبب بیع

مجہول اور دھوکہ ہے' جو حرام ہے۔

(٦٩١) وَعَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «مَنْ أَقَالَ مُسْلِماً بَيْعَتَهُ أَقَالَ اللَّهُ عَثْرَتَهُ». رَوَاهُ أَبُو دَاوُدَ وَابْنُ مَاجَهْ، وَصَحَّحَهُ ابْنُ حَبَّانَ وَالحَاكِمُ.

حضرت ابوھریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "جو فروخت کنندہ' کسی مسلمان سے فروخت شدہ مال واپس کر لے' اللہ تعالیٰ اس کے گناہ و لغزشیں معاف فرما دے گا۔" (اسے ابوداؤد اور ابن ماجہ نے روایت کیا ہے اور ابن حبان اور حاکم نے صحیح کہا ہے)

لغوی تشریح: ﴿ اقال ﴾ اقالہ سے ماخوذ ہے۔ اس کی حقیقت یہ ہے' خرید و فروخت کرنے والے دونوں فریقوں کے مابین جو معاہدہ طے پایا ہے' اسے ختم کر دینا۔ اس کی مشروعیت پر اجماع ہے۔ ﴿ اقال اللہ عثرتہ ﴾ اللہ تعالیٰ اس کی لغزشوں اور کوتاہیوں اور خطاؤں کو معاف فرما دے گا اور ﴿ اقالہ ﴾ کی صورت یہ ہے کہ ایک آدمی کسی سے کوئی چیز خریدتا ہے۔ پھر اس میں دھوکہ کے ظاہر ہونے یا ضرورت و حاجت کے ختم ہونے اور یا کسی وجہ سے وہ نادم و پریشان ہوتا ہے تو وہ فروخت کنندہ سے التماس کرتا ہے کہ وہ اپنی فروخت کردہ چیز کو واپس لے کر اس کی قیمت واپس کر دے۔ جب فروخت کرنے والا خریدار کو ادائیگی واپس کر دے گا تب اقالہ کا عمل پایہ تکمیل کو پہنچے گا اور خریدار پر اس کا احسان ہوگا' کیونکہ بیع تو مکمل ہو چکی تھی اور خریدار اسے فسخ نہیں کر سکتا۔

٢ - بَابُ الخِيَارِ

بیع میں اختیار کا بیان

(٦٩٢) عَنِ ٱبْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا، عَنْ رَسُولِ اللهِ ﷺ قَالَ: «إِذَا ابْتَاعَ رَجُلاَنِ فَكُلُّ وَاحِدٍ مِنْهُمَا بِالخَيَارِ مَا لَمْ يَتَفَرَّقَا وَكَانَا جَمِيعاً، أَوْ يُخَيِّرُ أَحَدُهُمَا الآخَرَ، فَإِنْ خَيَّرَ أَحَدُهُمَا الآخَرَ فَتَبَايَعَا عَلَى ذَلِكَ فَقَدْ وَجَبَ البَيْعُ، وَإِنْ تَفَرَّقَا بَعْدَ أَنْ تَبَايَعَا وَلَمْ يَتْرُكْ وَاحِدٌ مِنْهُمَا البَيْعَ فَقَدْ وَجَبَ البَيْعُ». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ. وَاللَّفْظُ لِمُسْلِمٍ.

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما رسول اللہ ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ آپؐ نے فرمایا "جب دو آدمی آپس میں سودا کرنے لگیں تو جب تک وہ اکٹھے رہیں اور ایک دوسرے سے جدا نہ ہوں' ان میں سے ہر ایک کو اختیار ہے' یا ایک دوسرے کو اختیار دے دے' اگر ایک دوسرے کو اختیار دے دے' پھر اس پر سودا طے ہو جائے تو سودا پختہ ہوگیا اور اگر سودا طے کرنے کے بعد ایک دوسرے سے الگ الگ ہو جائیں اور دونوں میں سے کسی نے بھی بیع کو فسخ نہ کیا ہو تو بیع پختہ ہو جائے گی۔" (بخاری و مسلم۔ یہ الفاظ

مسلم کے ہیں)

لغوی تشریح: ﴿ باب الخیار ﴾ خیار میں خاء کے نیچے کسرہ اور یاء پر تخفیف۔ اختیار یا تخیّر سے اسم ہے۔ اختیار یہ ہے کہ آدمی اپنے معاملے میں صاحب اختیار ہو۔ چاہے اسے عملی جامہ پہنائے یا چاہے چھوڑ دے اور یہاں خیار سے یہ مراد ہے کہ سودے کو جاری رکھتا ہے' یا اسے فسخ کرنا ہے۔ بیع میں خیار کی بہت سی اقسام و انواع ہیں۔ اس باب میں مصنف نے صرف دو پر اکتفاء کیا ہے اور وہ یہ ہیں "خیار الشرط" اور "خیار المجلس" اور بالعموم انہیں سے زیادہ واسطہ پڑتا ہے اور اکثر انہی دونوں پر عمل ہوتا ہے۔
﴿ اذا ابتاع رجلان ﴾ دونوں میں سودا پختہ ہوگیا اور بیع ہر پہلو سے مکمل ہو گئی ہو صرف جدا ہونے کے سوا اور کوئی چیز باقی نہ رہی ہو۔ ﴿ مالم یتفرقا ﴾ اور ایک روایت میں ﴿ یفترقا ﴾ بھی ہے۔ معنی یہ ہے کہ اختیار کی مدت دونوں کے جدا نہ ہونے تک دراز ہے۔ ﴿ وکانا جمیعا ﴾ دونوں ایک ہی مجلس میں اکٹھے ہوں۔ یہ پہلے کا بیان اور اس کی تاکید ہے۔ باہمی اجتماع اس بات کی دلیل ہے کہ جدا اور الگ ہونے سے مراد دونوں کے بدن اور جسم ایک دوسرے سے الگ ہوں۔ گفتگو کے ذریعہ سے علیحدگی اور جدائی مراد نہیں اور بلاشبہ یہ اس کو مقتضی ہے کہ جب تک وہ ایک مجلس میں ہوں' اس وقت تک اختیار دینا واجب و لازم ہے' خواہ خاموش رہیں یا باتیں کرتے رہیں اور خواہ ایک ہی نوع کی گفتگو ہو' یا باہم مختلف پہلوؤں پر باتیں کریں۔ خطابی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اسی پر ہم نے لوگوں کے معاملہ کو پایا ہے' اہل لغت نے پہچانا ہے اور کلام کا بھی ظاہر بتاتا ہے کہ جب ﴿ تفرق الناس ﴾ (لوگ جدا جدا ہوگئے) کہا جاتا ہے تو اس سے بدنوں کا الگ ہونا مراد لیا جاتا ہے اور اس کے علاوہ گفتگو اور رائے کا الگ اور جدا ہونا اس وقت ہی سمجھا جاتا ہے جب اس کے ساتھ کوئی قید ہو اور کوئی قرینہ ہو اور اگر حدیث کی وہ تاویل کی جائے جس کی جانب امام نخعی گئے ہیں' یعنی گفتگو سے جدائی تو پھر اس حدیث کا کوئی فائدہ نہیں رہتا اور اس کے معنی ہی ساقط ہو جاتے ہیں اور یہ اس لئے ہے کہ یہ بات معلوم و معروف ہے کہ خریدار میں جب تک فروخت شدہ چیز کی قبولیت نہ پائی جائے' اس وقت تک اسے اختیار ہے۔ بعینہٖ فروخت کنندہ کا خیار اس چیز کی ملکیت سودا طے ہونے سے پہلے تک ثابت ہے اور یہ ایسی معروف بات ہے جو اپنے معنی میں بالکل ظاہر ہے' بایں طور اس حدیث میں خریدار کے اختیار کا ذکر بے معنی ہے۔ (ملخصاً) ﴿ او یخیر احدھما الاخر ﴾ یخیر تخییر سے ماخوذ ہے۔ صیغہ فعل مضارع معلوم ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اگر دونوں میں سے ایک' دوسرے کو ایک متعین مدت تک اختیار دیتا ہے تو پھر علیحدگی سے خیار ختم نہیں ہوتا' بلکہ مدت معینہ تک دراز ہو جاتا ہے اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس کے معنی یہ ہیں کہ جب ایک دوسرے کو بیع کے نافذ کرنے کا اختیار دے اور دوسرا نافذ کرنے کو علیحدگی سے پہلے منتخب کر لے تو اسی وقت بیع پکی اور پختہ ہو جائے گی اور خیار کو پھر جدائی تک باقی نہیں رکھا جائے گا۔ بلکہ جدائی کا اعتبار باطل ہو جائے گا۔ اس کی تائید رسول اللہ ﷺ کے اس ارشاد گرامی سے ہوتی ہے ﴿ فان خیر احدھما

الاخر..... الخ ﴾ گویا کہ اس نے کہا کہ بیع کے نافذ کرنے کو اختیار کریا اسے مسخ کر۔ ﴿ فتبیا بعا علی ذالک ﴾ پس دونوں نے اس پر سودا طے کر لیا ﴿ فقد وجب البیع ﴾ پس سودا پکا ہو گیا۔ یعنی بیع مکمل اور نافذ ہو گئی' خواہ دونوں اسی جگہ ہوں اور جدا نہ ہوئے ہوں۔

حاصل کلام: اس حدیث میں بیوپاری اور سوداگر کو خرید و فروخت کے رکھنے یا توڑنے کا حق دیا گیا ہے۔ اختیار یا خیار کا بھی یہی معنی ہے کہ خریدار اور فروخت کنندہ کو سودا باقی رکھنے یا توڑنے کا حق ہے۔ اس کی بہت سی انواع ہیں۔ ان میں سے دو کا بالخصوص یہاں ذکر کیا گیا ہے۔ ایک خیار مجلس جس کا اوپر ذکر ہوا ہے۔ دوسرا خیار شرط۔ یہ کہ دونوں میں سے ایک یا دونوں یہ شرط کر لیں کہ اتنی مدت تک سودے کا باقی رکھنے' یا واپس کرنے کا اختیار رہے گا۔ اگر خریدار اسے واپس کرنا چاہئے تو فروخت کنندہ کو بغیر لیت و لعل اور حیل و حجت کے واپس لینا ہو گا۔ اس کے علاوہ دو تین صورتیں مزید یہ ہیں۔ ﴿ خیار عیب ﴾ یہ کہ خریدنے والا کہے گا کہ اگر اس میں کوئی نقص و عیب ہوا تو میں اسے واپس کرنے کا حق محفوظ رکھتا ہوں"۔ ﴿ خیار رؤیت ﴾ یہ ہے کہ خریدار کہے کہ سودا تو طے ہوا' مگر میں اسے دیکھ کر ہی فیصلہ کروں گا' اسے لینا ہے یا نہیں۔ دیکھنے پر اسے یہ سودا منظور نہ ہوا تو بیع منعقد نہ ہوگی۔ "خیار تعین" یہ کہ خریدار کہے کہ ان میں سے جو چیز یا جانور مجھے پسند ہو گا' وہ لے لوں گا۔ بہر حال شریعت نے فریقین کے لئے بے شمار آسانیاں اور سہولتیں رکھی ہیں' تا کہ کسی طرح جھگڑا اور تنازع نہ ہو۔ خریدنے اور فروخت کرنے میں دونوں کی باہمی رضا مندی کو ضروری قرار دیا گیا ہے۔

(٦٩٣) وَعَنْ عَمْرِو بْنِ شُعَيْبٍ، عَنْ أَبِيهِ عَنْ جَدِّهِ، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ قَالَ: «الْبَائِعُ وَالْمُبْتَاعُ بِالْخِيَارِ حَتَّى يَتَفَرَّقَا، إِلاَّ أَنْ تَكُونَ صَفْقَةَ خِيَارٍ، وَلاَ يَحِلُّ لَهُ أَنْ يُفَارِقَهُ خَشْيَةَ أَنْ يَسْتَقِيْلَهُ». رَوَاهُ الْخَمْسَةُ إِلاَّ ابْنَ مَاجَه، وَرَوَاهُ الدَّارَقُطْنِيُّ وَابْنُ خُزَيْمَةَ وَابْنُ الْجَارُودِ، وَفِي رِوَايَةٍ: «حَتَّى يَتَفَرَّقَا مِن مَّكَانِهِمَا».

حضرت عمرو بن شعیب نے اپنے باپ سے' انہوں نے اپنے دادا سے روایت کیا ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا "خریدار اور فروخت کرنے والے کو اختیار حاصل ہے' تاوقتیکہ ایک دوسرے سے جدا ہوں' بشرطیکہ سودا اختیار والا ہو اور سودا واپس کرنے کے اندیشے کے پیش نظر جلدی سے الگ ہو جانا حلال نہیں ہے۔" (اسے ابن ماجہ کے سوا پانچوں نے روایت کیا ہے۔ نیز دار قطنی اور ابن خزیمہ اور ابن جارود نے بھی روایت کیا ہے)

اور ایک روایت میں ہے کہ "جب تک وہ اپنی جگہ سے جدا (نہ) ہو جائیں۔"

لغوی تشریح: ﴿ صفقت خیار ﴾ صفقت پر رفع ہے۔ کان کے تامہ ہونے کی وجہ سے' یعنی اگر سودے میں خیار پہلے ہی موجود ہے اور صفقۃ کو منصوب پڑھیں تو پھر کان ناقصہ ہو گا۔ اور اس کا اسم

مضمر ہو گا۔ اور عبارت اس طرح ہو گی "الا ان تکون الصفقت صفقۃ خیار" الآیہ کہ ایسا سودا ہو جس میں اختیار ہو اور اس کا مفہوم یوں ہو گا کہ سودا کرنے والوں میں سے اگر ایک نے اپنے لئے شرط لگالی تو اس کا خیار جدائی کے بعد بھی باقی رہے گا۔ جب تک خیار کی مقرر' مدت ختم نہ ہو جائے اور یہ بھی مفہوم کیا گیا ہے کہ خریدار اور فروخت کنندہ میں سے جب ایک دوسرے سے یوں کہے کہ بیع کے نفاذ کو اختیار کر لو یا اسے فسخ کرو۔ اس نے دونوں میں سے ایک منتخب کر لیا تو بیع مکمل ہو گی' خواہ ایک دوسرے سے جدا نہ ہوئے ہوں۔ یہ علامہ شوکانی کی رائے ہے۔ "خشیۃ ان یستقیلہ" اس اندیشہ کے پیش نظر کہ وہ اسے واپس کرنے کا مطالبہ کرے گا۔ اس حدیث سے خیار مجلس کے عدم ثبوت پر استدلال کیا گیا ہے۔ اس لئے کہ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اس کا مالک واپس کرنے کے سوا اور کوئی راستہ فسخ کرنے کا نہیں رکھتا اور کسی چیز کی واپسی تو اسی صورت میں معتبر ہوتی ہے جب بیع مکمل ہو جائے۔ لہٰذا اس سے تو ظاہر ہوا کہ بیع تو جدا ہونے سے پہلے پایۂ تکمیل کو پہنچ جاتی ہے۔ اس کا جواب یہ دیا گیا ہے کہ اگر استقالہ کی حقیقت یہی ہے تو پھر﴿ ولا یفارقہ خشیۃ ان یستقیلہ ﴾ کا کوئی معنی ہی نہیں' کیونکہ استقالہ مجلس عقد کے ساتھ مختص نہیں ہے اور نہ باہمی جدائی میں مانع ہے' نیز پہلی حدیث سے خیار ثابت ہے اور اس کی مدت جدائی تک وسیع و دراز ہے اور یہ بات معلوم و معروف ہے کہ جسے اختیار حاصل ہے وہ تو استقالہ کا محتاج ہی نہیں۔ پس متعین ہو گیا کہ استقالہ سے مراد فسخ بیع ہے' اس سے حقیقی معنی مراد نہیں۔

حاصل کلام: اس حدیث میں بھی خیار مجلس کا ذکر ہے۔ خیار مجلس امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ اور احمد رحمۃ اللہ علیہ اور اکثر صحابہ و تابعین کے نزدیک ثابت ہے۔ البتہ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ اور امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اس کے قائل نہیں' حالانکہ پہلی حدیث اس مسئلہ میں واضح نص کی حیثیت رکھتی ہے۔ شیخ الہند مولانا محمود الحسن دیوبندی نے کہا ہے کہ حق اور انصاف کی بات یہی ہے کہ اس مسئلہ میں امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کی بات دلائل کے اعتبار سے راجح ہے۔ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی اسی کو راجح قرار دیا ہے' مگر ہم مقلدین کو امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی تقلید کے بغیر کوئی چارہ کار نہیں۔ (تقریر ترمذی)

(٦٩٤) وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُمَا قَالَ: ذَكَرَ رَجُلٌ لِرَسُولِ اللهِ ﷺ أَنَّهُ يُخْدَعُ فِي الْبُيُوعِ ، فَقَالَ: «إِذَا بَايَعْتَ فَقُلْ: لاَ خِلاَبَةَ» . مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے پاس ایک شخص نے ذکر کیا کہ اسے بیع میں عام طور پر دھوکہ دیا جاتا ہے۔ آپؐ نے فرمایا "سودا کرتے وقت کہہ دیا کرو کہ کوئی فریب و دھوکہ نہیں ہو گا۔" (بخاری و مسلم)

لغوی تشریح: ﴿ ذکر رجل ﴾ بصیغہ مجہول ہے۔ یعنی اس کے اھل نے اس کا ذکر کیا۔ اس شخص کا نام حبان بن منقذ بن عمرو انصاری ہے۔ حبان کی "حا" پر فتحہ ہے اور ایک قول کے مطابق اس سے مراد ان کے والد تھے۔ ان کے سر میں ایک غزوہ کے دوران جو انہوں نے نبی ﷺ کے ساتھ لڑا تھا' پتھر سے شدید

زخم آگیا تھا جس کی وجہ سے ان کے (حافظے اور) عقل میں کمزوری واقع ہو گئی اور زبان میں بھی تغیر پیدا ہو گیا تھا' لیکن ہنوز تمیز کے دائرہ سے خارج نہیں ہوئے تھے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے دور خلافت تک زندہ رہے۔ اس وقت ان کی عمر ۱۳۰ سال کی ہو گئی تھی۔ جیسا کہ علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ وغیرہ نے کہا ہے۔ ﴿لاخلابة﴾ کی "خا" کے نیچے کسرہ۔ مطلب یہ تھا کہ دین میں دھوکہ و فریب نہیں' کیونکہ دین تو نصیحت و خیر خواہی کا نام ہے اور دین اسلام تو ہے ہی خیر خواہی کا نام اور لا کا کلمہ نفی جنس کیلئے ہے اور اس کی خبر محذوف ہے۔ صاحب سبل السلام نے یہ بات کہی ہے کہ ابن اسحٰق نے یونس بن بکیر اور عبد الاعلیٰ کی روایت میں اتنا اضافہ نقل کیا ہے کہ "پھر تم کو اس سودے میں جسے تو نے خریدا ہے' تین راتیں تک اختیار ہے' اگر تجھے سودا پسند ہو تو اسے رکھ لو اور اگر پسند نہ ہو تو واپس کر دو۔" یہ حدیث اس بات کی دلیل ہے کہ خرید و فروخت میں غبن کی صورت میں بھی خیار ثابت ہے۔ لیکن مطلقاً نہیں' بلکہ اس وقت جب آدمی ضعیف العقل ہو اور سامان کی قیمت سے واقف نہ ہو اور اسے دھوکہ کا اندیشہ ہو۔

حاصل کلام: اس حدیث کی روشنی میں معلوم ہوا کہ غبن فاحش کے معلوم ہونے پر خیار ثابت ہے۔ یہ رائے امام احمد رحمۃ اللہ علیہ اور امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کی ہے' مگر جمہور علماء اس کے قائل نہیں ہیں' وہ کہتے ہیں کہ حبان بن منقذ کو بالخصوص یہ اجازت اس لئے دی کہ ان کی عقل اور زبان میں کمزوری واقع ہو گئی تھی۔ جیسا کہ مسند امام احمد میں حضرت انس رضی اللہ عنہ کی حدیث میں ہے۔ - صحیح بات یہ ہے لاخلابة کی صدا لگانا بھی اپنی جگہ ایک طرح کی شرط ہے' جس سے ثابت ہو رہا ہے کہ دھوکہ اور فریب کے باوجود مشتری کیلئے خیار کا ثبوت ملتا ہے اور خیار الشرط بھی اسی کو کہتے ہیں۔ آپؐ نے جو الفاظ ان کو تلقین فرمائے ان الفاظ کی برکت سے انہیں بعد میں کبھی دھوکہ نہیں ہوتا تھا۔

٣ - بَابُ الرِّبَا

سود کا بیان

(٦٩٥) عَنْ جَابِرٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: لَعَنَ رَسُولُ اللهِ ﷺ آكِلَ الرِّبَا وَمُؤْكِلَهُ وَكَاتِبَهُ وَشَاهِدَيْهِ، وَقَالَ: **هُمْ سَوَآءٌ**. رَوَاهُ مُسْلِمٌ، وَلِلْبُخَارِيِّ نَحْوُهُ مِنْ حَدِيْثِ أَبِيْ جُحَيْفَةَ.

حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے سود لینے والے' دینے والے اور اس کے تحریر کرنے والے اور اس کے گواہوں پر لعنت فرمائی ہے۔ نیز فرمایا کہ ("گناہ کے ارتکاب میں) یہ سب مساوی اور برابر ہیں۔" (مسلم' اور بخاری میں ابوجحیفہ رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث بھی اسی طرح ہے)

لغوی تشریح: ﴿باب الربا﴾ ربا میں "راء" کے نیچے کسرہ ہے۔ ربا کے معنی زیادتی اور بڑھوتری ہے اور وہ ہے خرید و فروخت میں ایک جنس کے تبادلہ کے وقت زیادہ مقدار میں حاصل کرنا اور ہر قسم کی حرام بیع پر اس کا اطلاق ہوتا ہے اور امت کا اس کی حرمت پر اجماع ہے۔ ﴿آکل الربا﴾ سود خور۔ ضروری نہیں

جو سود کھاتا ہو اسے آکل الربا کہیں گے' بلکہ محض لینے والا بھی اس زمرہ میں شامل ہے اور کھانے کا بالخصوص ذکر اس لئے کر دیا کہ انتفاع کے انواع میں سے یہ نوع سب سے بڑی ہے۔ ﴿ موکلہ ﴾ اسے دینے والا یعنی جو لیتا ہے اسے دینے والا۔

حاصل کلام: اس حدیث میں سود کی حرمت اور لینے' دینے والے اور تحریر کرنے والے اور اس پر گواہیاں ثبت کرنے والے پر لعنت کا ذکر ہے۔ سود نص قرآنی سے حرام ہے' اس سے باز نہ آنے والوں کیلئے اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی طرف سے اعلان جنگ ہے۔ یہ ایسی لعنت ہے جس میں دنیا بھر کے لوگ گرفتار اور مبتلا ہیں۔ اس لعنت سے چھٹکارے کی صدق دل سے ہر مسلمان کو کوشش کرنی چاہئے۔

(٦٩٦) وَعَنْ عَبْدِ اللهِ بْنِ مَسْعُودٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ: «**الرِّبَا ثَلاَثَةٌ وَسَبْعُونَ بَاباً، أَيْسَرُهَا مِثْلُ أَنْ يَنْكِحَ الرَّجُلُ أُمَّهُ، وَإِنَّ أَرْبَىٰ الرِّبَا عِرْضُ الرَّجُلِ الْمُسلِمِ**». رَوَاهُ ابْنُ مَاجَهْ مُخْتَصَراً، وَالحَاكِمُ بِتَمَامِهِ، وَصَحَّحَهُ.

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے نبی ﷺ سے روایت کیا ہے کہ آپؐ نے فرمایا "سود کے تہتر درجے ہیں۔ سب سے کم تر درجہ اس گناہ کے مثل ہے کہ کوئی آدمی اپنی ماں کے ساتھ نکاح کرے اور سب سے بڑھ کر سود کسی مسلمان کی آبرو ریزی کرنا ہے۔" (اسے ابن ماجہ نے مختصراً اور حاکم نے مکمل بیان کیا ہے اور اسے صحیح بھی قرار دیا ہے)

لغوی تشریح: ﴿ ایسرھا ﴾ ہلکا اور گناہ میں سب سے کم اور قلیل۔ ﴿ اربی الربا ﴾ سب سے بڑا اور سب سے عظیم۔ ﴿ عرض الرجل المسلم ﴾ غیبت و چغلی کے ذریعہ اس کی عزت و آبرو پر حملہ آور ہونا' بہتان تراشی اور سب و شتم کرنا اور عیب جوئی اور جو چیز اسے بری محسوس ہو اس کے ذکر سے تکلیف دینا اور جو برائی اس نے نہ کی ہو' اسے اس کے سر ڈال دینا۔ یہ بیماری ہمارے زمانہ میں وبا کی طرح عام ہوگئی ہے۔ اس مرض نے لوگوں کو عاجز و درماندہ کر کے رکھ دیا ہے اور ہر طرف پھیل گئی ہے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

(٦٩٧) وَعَنْ أَبِيْ سَعِيْدٍ الخُدْرِيِّ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ قَالَ: «**لاَ تَبِيعُوا الذَّهَبَ بِالذَّهَبِ إِلاَّ مِثْلاً بِمِثْلٍ، وَلاَ تُشِفُّوا بَعْضَهَا عَلَى بَعْضٍ، وَلاَ تَبِيعُوا الوَرِقَ بِالوَرِقِ إِلاَّ مِثْلاً بِمِثْلٍ، وَلاَ تُشِفُّوا بَعْضَهَا عَلَى بَعْضٍ، وَلاَ تَبِيعُوا مِنْهَا**

حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "سونے کو سونے کے بدلہ میں فروخت نہ کرو' مگر برابر برابر اور ایک دوسرے کے وزن میں (کمی) بیشی نہ کرو۔ نیز چاندی کو چاندی کے بدلہ میں فروخت نہ کرو' مگر برابر برابر اور ایک دوسرے کے وزن میں (کمی) بیشی نہ کرو اور ان میں غیر موجود کے بدلہ میں موجود کو نہ بیچو۔"

غَائِباً بِنَاجِزٍ». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ. (بخاری و مسلم)

لغوی تشریح: ﴿ مثلا بمثل ﴾ دونوں میں میم کے نیچے کسرہ اور "ثا" ساکن ﴿ سواء بسواء ﴾ کے معنی میں' جس کے معنی برابر' برابر ہیں۔ ﴿ ولا تشفوا ﴾ اشفاف سے ماخوذ ہے' زیادہ نہ کرو' اضافہ نہ کرو۔ ﴿ الورق ﴾ "واؤ" پر فتحہ اور "را" کے نیچے کسرہ۔ چاندی۔ ﴿ غائبا ﴾ جو چیز مجلس میں موجود نہ ہو۔ ﴿ بناجز ﴾ ناجز کے معنی حاضر اور موجود۔ یہ حدیث اس پر دلیل ہے کہ سونے کا سونے سے اور چاندی کا چاندی سے مبادلہ میں کمی بیشی حرام ہے اور یہی سود کی اصل ہے۔ نیز یہ اس کی بھی دلیل ہے کہ یہ خرید و فروخت اس وقت تک صحیح نہیں تاوقتیکہ دونوں فریق برابر برابر مقدار و وزن میں چیز ایک دوسرے کے قبضہ میں نہ دے دیں۔

(٦٩٨) وَعَنْ عُبَادَةَ بْنِ الصَّامِتِ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «الذَّهَبُ بِالذَّهَبِ، وَالفِضَّةُ بِالفِضَّةِ، وَالبُرُّ بِالبُرِّ، وَالشَّعِيرُ بِالشَّعِيرِ، وَالتَّمْرُ بِالتَّمْرِ، وَالمِلْحُ بِالمِلْحِ، مِثْلاً بِمِثْلٍ، سَوَاءً بِسَوَاءٍ، يَداً بِيَدٍ، فَإِذَا اخْتَلَفَتْ هَذِهِ الأَصْنَافُ فَبِيعُوا كَيْفَ شِئْتُمْ، إِذَا كَانَ يداً بِيدٍ». رَوَاهُ مُسْلِمٌ.

حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "سونا سونے کے عوض' گندم' گندم کے عوض۔ جو' جو کے عوض۔ کھجور' کھجور کے عوض اور نمک' نمک کے عوض ایک دوسرے کی طرح' برابر برابر اور نقد بنقد (فروخت کئے جائیں۔) اگر اجناس میں اختلاف ہو تو پھر جس طرح چاہیں فروخت کریں' مگر قیمت کی ادائیگی نقد ہو۔" (مسلم)

لغوی تشریح: ﴿ اذا کان یدا بید ﴾ علامہ خطابی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ جن اشیاء میں سود کا حکم ہے خواہ وہ سونا ہے یا چاندی یا ان کے علاوہ کھانے کی اشیاء کہ ان میں بیع و شراء کی صحت کیلئے قبضہ شرط ہے۔ اگرچہ جنس مختلف ہی کیوں نہ ہو۔ لیکن صاحب سبل السلام نے کہا ہے کہ علماء کا اس پر اتفاق ہے کہ سودی اشیاء میں جنس ایک نہ ہو تو ان میں ادھار اور تفاضل جائز ہے۔ جیسے سونے کو گندم کے بدلہ اور چاندی کو جو کے بدلہ اور اس کے علاوہ دوسری ماپ وغیرہ والی اشیاء میں تفاضل جائز ہے۔ نیز اس پر بھی سب متفق ہیں کہ کسی چیز کو اسی چیز کے بدلہ میں فروخت کرنا جائز نہیں' جبکہ ان میں سے ایک ادھار ہو۔ (انتھی) یہ حدیث دلیل ہے کہ ان مذکورہ چھ اشیاء میں سود پایا جاتا ہے اور اس پر ساری امت کا اتفاق ہے۔ البتہ ان چھ کے علاوہ جمہور اس بات کے قائل ہیں کہ سود کی علت جہاں پائی جائے گی' وہ بھی سود ہی ہو گا۔ لیکن ہر کوئی نص وارد نہیں یہی وجہ ہے کہ اس میں علماء کے درمیان بہت زیادہ اختلاف پایا جاتا ہے' تاہم اہل ظاہر اس بات کے قائل ہیں کہ سود صرف سابق الذکر منصوص علیہ اشیاء میں ہوتا ہے۔

(٦٩٩) وَعَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ حضرت ابوھریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ

تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «الذَّهَبُ بِالذَّهَبِ وَزْناً بِوَزْنٍ، مِثْلاً بِمِثْلٍ، وَالفِضَّةُ بِالفِضَّةِ وَزْناً بِوَزْنٍ، مِثْلاً بِمِثْلٍ، فَمَنْ زَادَ أَوْ اسْتَزَادَ فَهُوَ رِباً». رَوَاهُ مُسْلِمٌ.

ﷺ نے فرمایا ''سونا سونے کے بدلہ میں' وزن میں برابر برابر۔ اور قسم میں ایک ہو چاندی' چاندی کے بدلہ میں' وزن میں برابر برابر' اور قسم میں ایک جیسی ہو پھر اگر کوئی زیادہ لے یا زیادہ دے پس وہ سود ہے۔'' (مسلم)

لغوی تشریح: ﴿ زاد او استزاد ﴾ زیادہ دے یا زیادہ کا مطالبہ و تقاضا کرے۔ اس حدیث میں دلیل ہے کہ جو چیزیں ماپ یا تول کر فروخت کی جاتی ہوں' ان کا تبادلہ ماپ تول کے ذریعہ کرنا جائز ہے' محض اندازہ و تخمینہ درست نہیں۔ (اور قسم میں ایک جیسا / جیسی کا مطلب ہے کہ ''قیراط'' میں دونوں برابر ہوں۔ مترجم)

(۷۰۰) وَعَنْ أَبِيْ سَعِيْدٍ الخُدْرِيِّ وَأَبِيْ هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُمَا، أَنَّ رَسُولَ اللهِ ﷺ اسْتَعْمَلَ رَجُلاً عَلَى خَيْبَرَ، فَجَاءَهُ بِتَمْرٍ جَنِيْبٍ، فَقَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «أَكُلُّ تَمْرِ خَيْبَرَ هَكَذَا؟» فَقَالَ: لاَ، وَاللهِ، يَا رَسُولَ اللهِ! إِنَّا لَنَأْخُذُ الصَّاعَ مِنْ هَذَا بِالصَّاعَيْنِ وَالثَّلاَثَةِ، فَقَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: **لاَ تَفْعَلْ، بِعِ الجَمْعَ بالدراهم، ثُمَّ ابْتَعْ بِالدَّرَاهِمِ جَنِيباً**»، وَقَالَ فِي المِيزَانِ مِثْلَ ذَلِكَ. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ، وَلِمُسْلِمٍ: «وَكَذَلِكَ المِيْزَانُ».

حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ اور حضرت ابوھریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک شخص کو خیبر پر عامل مقرر کیا۔ پس وہ آپؐ کی خدمت میں بہت عمدہ کھجوریں لے کر حاضر ہوا۔ رسول اللہ ﷺ نے اس سے دریافت فرمایا کہ ''کیا خیبر میں پیدا ہونے والی سب کھجوریں اسی طرح کی ہوتی ہیں؟'' اس نے عرض کیا نہیں۔ اے اللہ کے رسول ﷺ! خدا کی قسم! ہم دوسری کھجوریں دو صاع اور (کبھی) تین صاع دے کر یہ کھجوریں ایک صاع لیتے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ''ایسا نہ کرو۔ گھٹیا کھجوروں کو دراہم کے عوض فروخت کر کے عمدہ اور اچھی کھجوریں بھی درہموں کے عوض خریدو اور فرمایا تولنے والی اشیاء بھی اسی کی مانند ہیں۔'' (بخاری و مسلم) مسلم میں ہے کہ ''تول میں بھی اسی طرح۔''

لغوی تشریح: ﴿ استعمل رجلا ﴾ اسے عامل بنا کر بھیجا (تحصیلدار زکوٰۃ) اس آدمی کا نام سواد بن غزیہ تھا۔ سواد میں سین پر فتحہ اور واؤ پر تخفیف۔ اور غزیہ بروزن عطیہ۔ انصاری ﴿ جنیب ﴾ جید اور عمدہ۔ یہ کھجوروں میں سے خاص قسم و نوع کی کھجور تھی۔ ﴿ الجمع ﴾ جیم پر فتحہ اور میم ساکن یعنی ردی اور گھٹیا قسم کی کھجور اور ایک قول اس کے بارے میں یہ بھی ہے کہ اس سے مراد مختلف انواع کی ملی جلی

کھجوریں ہیں۔ ﴿وقال فی المیزان مثل ذلک﴾ یعنی جو چیزیں وزن کر کے فروخت کی جاتی ہیں، جب اسی جنس کے مبادلہ میں فروخت کی جائیں گی تو زیادہ مقدار میں خرید و فروخت نہیں کی جائے گی، بلکہ پہلے انہیں درہم کے عوض فروخت کیا جائے گا پھر درہم کے عوض ہی خرید کی جائیں گی۔ یہ حدیث اس بات کی دلیل ہے کہ جب کوئی چیز ہم جنس کے تبادلہ میں فروخت کی جائے گی تو اس میں کمی بیشی جائز نہیں۔ خواہ دونوں عمدگی اور گھٹیا پن کے اعتبار سے ایک دوسرے سے مختلف ہوں۔

(۷۰۱) وَعَنْ جَابِرِ بْنِ عَبْدِ اللهِ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُمَا قَالَ: نَهَى رَسُولُ اللهِ ﷺ عَنْ بَيْعِ الصُّبْرَةِ مِنَ التَّمْرِ لاَ يُعْلَمُ مَكِيْلُهَا بِالْكَيْلِ الْمُسَمَّى مِنَ التَّمْرِ. رَوَاهُ مُسْلِمٌ.

حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے کھجوروں کے کسی ایسے ڈھیر کو جس کا ماپ نہ کیا گیا ہو، کھجوروں کے معین ماپ کے بدلہ میں فروخت کرنے سے منع فرمایا ہے۔ (مسلم)

حاصل کلام: اس حدیث میں کسی چیز کے ڈھیر کی صورت میں جس کا وزن یا ماپ معلوم نہ ہو، اسے معین مقدار یا وزن کے عوض فروخت کرنے سے منع فرمایا ہے کیونکہ ڈھیر کی مقدار اور وزن معلوم نہیں، اس لئے اسے فریقین میں سے ایک کو نقصان اور دوسرے کو بلاوجہ فائدہ پہنچتا ہے، اس لئے اسے ممنوع قرار دیا گیا ہے۔ کمی و بیشی کا جہاں احتمال ہوگا، وہ بھی اسی ممانعت کے تحت شمار ہوگی۔

(۷۰۲) وَعَنْ مَعْمَرَ بْنِ عَبْدِ اللهِ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: إِنِّي كُنْتُ أَسْمَعُ رَسُولَ اللهِ ﷺ يَقُوْلُ: «**الطَّعَامُ بِالطَّعَامِ مِثْلاً بِمِثْلٍ، وَكَانَ طَعَامُنَا يَوْمَئِذٍ الشَّعِيرَ**». رَوَاهُ مُسْلِمٌ.

حضرت معمر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے سنا کرتا تھا کہ "طعام (اناج) طعام کے بدلے، ایک ہی قسم کا ہو، ان دنوں ہمارا طعام (اناج) جو ہوتے تھے۔" (مسلم)

حاصل کلام: اس حدیث کی رو سے طعام (اناج) کو اگر فروخت کرنا مقصود ہو اور وہ بھی طعام کے عوض تو اس میں برابری ضروری ہے، کمی بیشی ممنوع ہے۔ حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ کی مذکورہ روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ گندم اور جو دو الگ الگ جنس ہیں، ایک نہیں۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی بھی یہی رائے ہے، اس لئے جو اور گندم کے تبادلہ میں بھی برابری ضروری نہیں۔ مگر امام مالک رحمہ اللہ دونوں کو ایک جنس قرار دیتے ہیں اور ان میں برابری لازم سمجھتے ہیں۔

(۷۰۳) وَعَنْ فَضَالَةَ بْنِ عُبَيْدٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: اشْتَرَيْتُ يَوْمَ خَيْبَرَ قِلاَدَةً بِاثْنَي عَشَرَ دِيْنَاراً،

حضرت فضالہ بن عبید رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے خیبر کے روز ایک ہار بارہ دینار میں خریدا۔ اس میں سونا اور پتھر کے نگینے تھے۔ میں نے ان کو الگ کر

فِيهَا ذَهَبٌ وخَرَزٌ، فَفَصَلْتُهَا، فَوَجَدْتُ فِيْهَا أَكْثَرَ مِنَ اثْنَي عَشَرَ دِيْنَاراً، فَذَكَرْتُ ذٰلِكَ لِلنَّبِيِّ ﷺ، فَقَالَ: «لاَ تُبَاعُ حَتَّى تُفْصَلَ». رَوَاهُ مُسْلِمٌ	دیا تو میں نے اس میں بارہ دینار سے زیادہ سونا پایا۔ میں نے اس کا ذکر نبی ﷺ سے کیا تو آپ ؑ نے فرمایا "جب تک ان کو الگ الگ نہ کر لیا جائے' فروخت نہ کیا جائے۔" (مسلم)

لغوی تشریح: ﴿ قلادہ ﴾ قاف کے نیچے کسرہ۔ ہار جسے عورتیں گلے میں پہنتی ہیں۔ ﴿ خرز ﴾ خا اور را دونوں پر فتحہ۔ عمدہ پتھر' خرزۃ کی جمع ہے۔ فارسی میں اسے مُہرہ کہتے ہیں۔ ﴿ ففصلتھا ﴾ الگ کر دیا میں نے ان کو اس طرح کہ سونے کو مہروں سے الگ کر کے ممیز کر دیا۔

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ سونے کی بنی ہوئی کسی چیز میں کسی اور چیز کا جڑاؤ ہو تو اسے الگ کئے بغیر سونے کو فروخت کرنا جائز نہیں' کیونکہ جب تک دونوں کو الگ الگ نہیں کیا جائے گا' صحیح اندازہ نہیں ہو سکتا کہ جس کے عوض اسے فروخت کیا جا رہا ہے وہ اس کے مساوی ہے یا نہیں؟ امام شافعی رحمہ اللہ اور امام احمد رحمہ اللہ اور اکثر علماء کی یہی رائے ہے۔

(٧٠٤) وَعَنْ سَمُرَةَ بْنِ جُنْدُبٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ نَهَى عَنْ بَيْعِ الحَيَوَانِ بِالحَيَوَانِ نَسِيْئَةً. رَوَاهُ الخَمْسَةُ، وَصَحَّحَهُ التِّرْمِذِيُّ وَابْنُ الجَارُودِ.	حضرت سمرہ بن جندب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے حیوان کو حیوان کے بدلہ میں ادھار فروخت کرنا ممنوع قرار دیا ہے۔ (اسے پانچوں نے روایت کیا ہے۔ ترمذی اور ابن جارود نے اسے صحیح قرار دیا ہے)

لغوی تشریح: ﴿ نسیئۃ ﴾ یاء کے بعد ہمزہ کے ساتھ کریمۃ کے وزن پر ہے اور ادغام کی صورت میں عطیہ کے وزن پر ہوگا اور ایک قول یہ بھی ہے کہ نون پر فتحہ اور سین کے نیچے کسرہ اور ھمزہ پر فتحہ' یا کے بغیر۔ تمیز واقع ہونے کی وجہ سے منصوب ہے اور لغت میں اس کے معنی تاخیر' دیر کے ہیں۔ اس سے مراد ادھار ہے۔ یہ حدیث اس بات کی دلیل ہے کہ حیوان کے بدلہ میں حیوان کی ادھار فروخت جائز نہیں' مگر اسی باب میں آنے والی عبداللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہما کی روایت اور دیگر روایات اس کے معارض ہیں' اسی بنا پر جمہور حیوان کے بدلہ حیوان کو مطلقاً ادھار فروخت کرنے کو جائز سمجھتے ہیں' اگرچہ کمی بیشی بھی ہو اور بعض اس سے منع کرتے ہیں اور امام شافعی رحمہ اللہ نے ان دونوں کے درمیان تطبیق یوں دی ہے کہ یہاں ادھار سے دونوں طرف سے ادھار مراد ہے۔ اس لئے کہ نسیئۃ کا لفظ اس کا احتمال رکھتا ہے کہ یہ ادھار کے بدلہ ادھار بیع کی صورت ہے اور یہ کسی کے نزدیک بھی صحیح نہیں ہے۔ خطابی رحمہ اللہ نے اس تطبیق اور جمع کی صورت کو پسند کیا ہے اور کہا ہے کہ جمع کی یہ صورت اچھی اور عمدہ ہے۔ امام شوکانی رحمہ اللہ کا رجحان منع کی احادیث کی طرف ہے' مگر میرے نزدیک راجح وہی رائے ہے جسے امام شافعی رحمہ اللہ' علامہ خطابی رحمہ اللہ اور جمہور نے اختیار کیا ہے۔

(٧٠٥) وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللَّهُ	حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ میں نے

تَعَالَى عَنْهُمَا، قَالَ: سَمِعْتُ رَسُولَ اللهِ ﷺ يَقُولُ: «إِذَا تَبَايَعْتُمْ بِالعِينَةِ، وَأَخَذْتُمْ أَذْنَابَ البَقَرِ، وَرَضِيْتُمْ بِالزَّرْعِ، وَتَرَكْتُمُ الجِهَادَ، سَلَّطَ اللَّهُ عَلَيْكُمْ ذُلاًّ لاَ يَنْزَعُهُ حَتَّى تَرْجِعُوا إِلَى دِينِكُمْ». رَوَاهُ أَبُو دَاوُدَ مِنْ رِوَايَةِ نَافِعٍ عَنْهُ، وَفِي إِسْنَادِهِ مَقَالٌ، وَلِأَحْمَدَ نَحْوُهُ مِنْ رِوَايَةِ عَطَاءٍ، وَرِجَالُهُ ثِقَاتٌ، وَصَحَّحَهُ ابْنُ القَطَّانِ.

رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ جب تم عینہ کی تجارت کرنے لگو گے اور بیلوں کی دمیں پکڑنے لگو گے اور زراعت و کھیتی باڑی کو پسند کرو گے اور جہاد کو ترک کر دو گے تو (اس وقت) اللہ تعالیٰ تم پر ذلت و خواری کو مسلط کر دے گا۔ اس (ذلت) کو تم سے اس وقت تک دور نہیں فرمائے گا جب تک تم اپنے دین کی طرف پلٹ نہیں آؤ گے۔" (اسے ابوداؤد نے نافع رحمہ اللہ کی روایت سے نقل کیا ہے اور اس کی سند میں کلام ہے اور مسند احمد میں مروی عطاء رحمہ اللہ کی روایت میں بھی اسی طرح آیا ہے۔ اس کے راوی ثقہ ہیں اور ابن قطان نے اسے صحیح کہا ہے۔)

لغوی تشریح: ﴿ العینۃ ﴾ عین کے نیچے کسرہ اور "یا" ساکن۔ عینہ کی بیع یہ ہے کہ آدمی ایک چیز مقرر قیمت پر ایک مقرر وقت تک کیلئے فروخت کرے' جب یہ میعاد مقررہ مکمل ہو جائے تو خریدار سے وہی چیز کم قیمت پر خرید لے کہ زیادہ رقم اس کے ذمہ باقی رہ جائے۔ عینہ اس کا نام اس لئے رکھا گیا کہ فروخت کردہ وہی چیز اسی حالت میں حاصل ہو جائے اور اصل مال خریدار سے لوٹ کر فروخت کنندہ کے پاس پھر پہنچ جائے۔ جیسا کہ صاحب سبل السلام نے کہا ہے۔ بیع عینہ کے عدم جواز کے امام مالک رحمہ اللہ' امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ اور امام احمد رحمہ اللہ قائل ہیں۔ البتہ امام شافعی رحمہ اللہ اور ان کے اصحاب اس کے جواز کے قائل ہیں۔ (نیل الاوطار) اور امام ابن قیم رحمہ اللہ نے بیع عینہ کے عدم جواز کو بہت اچھی طرح ثابت کیا ہے۔ ﴿ اخذتم اذناب البقر ﴾ گائے کی دم پکڑنے سے کنایہ مراد ہے کہ جہاد کو ترک کر کے زراعت و کھیتی باڑی میں مشغول و مگن ہو جاؤ گے۔ زراعت سے رضامندی کا مطلب ہے کہ تمہاری زندگی کا مطمع نظر اور مقصود زندگی یہی بن کر رہ جائے گا اور ساری توانائیاں اور قوتیں اسی میں صرف ہونے لگیں گی۔ (سبل السلام) ﴿ ذلا ﴾ ذال پر ضمہ اور کسرہ دونوں ہیں۔ ذلت' ناقدری' ضعف اور مسکنت۔ ﴿ وفی اسنادہ مقال ﴾ سبل السلام میں ہے اس لیے کہ اس کی سند میں ابوعبدالرحمٰن خراسانی جس کا نام اسحٰق ہے جو عطاء خراسانی سے روایت کرتا ہے۔ اس کے متعلق امام ذہبی رحمہ اللہ نے "میزان" میں کہا ہے یہ روایت اس کی مناکیر میں سے ہے ﴿ ولاحمد نحوہ ﴾ احمد کی روایت میں اسی طرح ہے۔ مصنف کہتے ہیں میرے نزدیک جس حدیث کو ابن قطان نے صحیح قرار دیا وہ بھی معلول ہے' کیونکہ اس کے راویوں کا ثقہ ہونا اس بات کیلئے لازمی نہیں کہ یہ حدیث بھی صحیح ہو' اس لئے کہ اس میں اعمش مدلس ہے اور وہ اپنے استاد عطاء سے سماع کا ذکر ہی نہیں کرتا اور عطاء کے متعلق احتمال ہے کہ وہ عطاء خراسانی ہو تو پھر عطاء اور ابن عمر رضی اللہ عنہما

کے درمیان سے نافع کو ساقط کر دینے سے یہ ﴿ تدلیس تسویہ ﴾ ہوگی اور یوں یہ حدیث پہلی حدیث ہی بن جائے گی اور یہی قول مشہور ہے۔

حاصل کلام: اس حدیث میں بیع عینہ کا ذکر ہے' نیز زراعت و کھیتی باڑی اختیار کرنے اور جہاد کو ترک کرنے کے نتیجہ میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے ذلت و خواری مسلط کئے جانے کی خبر ہے۔ بیع عینہ میں چونکہ فروخت شدہ چیز بعینہ کم قیمت کے عوض فروخت کرنے والے کے پاس پلٹ کر واپس آجاتی ہے' اس لئے اسے عینہ کہتے ہیں۔ ایک صورت اس کی یہ ہے کہ مثلاً ایک آدمی دوسرے سے کوئی چیز ادھار مانگتا ہے' وہ جواب دیتا ہے کہ بھائی میں تمہیں یہ چیز ادھار نہیں دے سکتا۔ مگر فلاں چیز میرے پاس ہے جس کی قیمت دس روپے ہے اگر تم راضی ہو تو میں وہ چیز تجھے پندرہ روپے میں دے سکتا ہوں اور پھر دوبارہ خود ہی وہ اس سے دس روپے میں واپس خرید لے۔ اس طرح پانچ روپے خواہ مخواہ خریدار کے ذمہ قرض ہوگیا' یا یوں سمجھیں کہ کسی نے ایک کتاب ایک سال کی مدت تک کیلئے سو روپے میں خریدی اور وعدہ کیا کہ سال کے بعد سو روپیہ ادا کر دوں گا۔ مگر کسی وجہ سے وہ سو روپیہ کا بندوبست نہ کر سکا تو بیچنے والا اس سے وہی چیز ۹۰ روپے میں واپس خرید لے' اس طرح دس روپے اس کے ذمہ قرض رہ گیا۔ اس بیع میں چونکہ ایک فریق کو نقصان ہوتا ہے' اس لئے اسے ممنوع قرار دے دیا۔

راوی حدیث: ﴿ نافع ﴾ ابوعبداللہ نافع بن سرجس مدنی' عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کے آزاد کردہ غلام مراد ہیں۔ آپ ثقہ' ثبت اور مشہور و معروف فقیہہ ہیں۔ کبار تابعین میں شمار ہوتے ہیں۔ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی احادیث کا بڑا حصہ ان ہی کے گرد گردش کرتا ہے۔ ابن عمر رضی اللہ عنہما کا اپنا قول ہے کہ اللہ تعالیٰ نے نافع کے توسط سے ہم پر بڑا احسان فرمایا ہے۔ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے کہ جب میں سنتا ہوں کہ نافع' ابن عمر رضی اللہ عنہما سے حدیث بیان کرتا ہے تو پھر مجھے کسی اور سے حدیث سننے کی پروا ہی نہیں۔ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے کہ صحیح ترین سند مالک عن نافع عن ابن عمر ہے۔ ان سے کثیر مخلوق خدا نے روایت کیا ہے۔ ۱۱۷ھ یا اس کے بعد فوت ہوئے۔

﴿ عطاء ﴾ سے مراد غالباً عطاء بن ابی مسلم میسرہ خراسانی ہیں' جو مہلب بن ابی صفرہ کے غلام تھے اور ان کی کنیت ابوعثمان تھی۔ شام میں فروکش ہوگئے تھے۔ مشہور و معروف لوگوں میں سے تھے۔ ثقہ اور بڑے تہجد گزار تھے' مگر حافظہ ردی و خراب تھا اور کثیرالوہم تھے۔ ۱۳۵ھ میں ۸۵ برس کی عمر میں وفات پائی۔

(۷۰۶) وَعَنْ أَبِيْ أُمَامَةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُ، عَنِ النَّبِيِّ ﷺ، قَالَ: «مَنْ شَفَعَ لِأَخِيهِ شَفَاعَةً فَأَهْدَى لَهُ هَدِيَّةً عَلَيْهَا، فَقَبِلَهَا، فَقَدْ أَتَى بَاباً عَظِيماً مِنْ أَبْوَابِ الرِّبَا». رَوَاهُ أَحْمَدُ

حضرت ابوامامہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے ارشاد فرمایا "جس کسی نے اپنے بھائی کیلئے کوئی سفارش کی (اس کے بعد) وہ اسے کوئی تحفہ دے اور وہ اسے قبول کر لے تو وہ سود کے بہت ہی بڑے دروازے پر پہنچ گیا۔" (اسے احمد' ابوداؤد نے روایت کیا

وَأَبُو دَاوُدَ، وَفِيْ إِسْنَادِهِ مَقَالٌ.

ہے اور اس کی سند میں کلام ہے)

لغوی تشریح: ﴿ فقد اتی بابا عظیما ﴾ تو وہ سود کے بہت بڑے دروازے پر آیا۔ دونوں میں (تحفہ اور سود میں) مشابہت کی وجہ سے استعارۃ اسے سود کہا گیا ہے اور وہ یوں کہ سود بھی کسی کے مال کو بلامعاوضہ حاصل کرنے کا نام ہے اور یہاں بھی سفارش کے بدلے میں رقم لی ہے کسی چیز کے بدلے میں نہیں۔ اس روایت میں کلام کا سبب یہ ہے کہ اس کا راوی ابوعبدالرحمٰن قاسم بن عبدالرحمٰن الدمشقی متکلم فیہ ہے۔ (سبل)

(۷۰۷) وَعَنْ عَبْدِ اللهِ بْنِ عَمْرِو بْنِ العَاصِ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا، قَالَ: لَعَنَ رَسُولُ اللهِ ﷺ الرَّاشِيَ وَالمُرْتَشِيَ. رَوَاهُ أَبُو دَاوُدَ وَالتِّرْمِذِيُّ، وَصَحَّحَهُ.

حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے رشوت دینے والے اور رشوت لینے والے دونوں پر لعنت فرمائی ہے۔" (اسے ابوداؤد اور ترمذی دونوں نے روایت کیا ہے اور ترمذی نے اسے صحیح کہا ہے)

لغوی تشریح: ﴿ الراشی ﴾ رشوت دینے والا ﴿ والمرتشی ﴾ رشوت لینے والا اور رشوت کہتے ہیں باطل و ناحق طریقہ سے حصول مال کیلئے مال خرچ کرنے کو۔ رشوت رشاء سے ماخوذ ہے۔ رشاء اس رسی کو کہتے ہیں جس کے ذریعہ کنوئیں کے پانی تک پہنچتے ہیں اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ جب کوئی اپنا حق حاصل کرنے' یا اپنے اوپر ہونے والے ظلم کو دور کرنے کیلئے مال خرچ کرتا ہے تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں۔ یہ دینے والے کے حق میں رشوت شمار نہیں ہو گی' بلکہ یہ فقط لینے والے کے حق میں رشوت شمار ہو گی۔

(۷۰۸) وَعَنْهُ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ أَمَرَهُ أَنْ يُجَهِّزَ جَيْشاً، فَنَفِدَتِ الإِبِلُ، فَأَمَرَهُ أَن يَأْخُذَ عَلَى قَلَائِصِ الصَّدَقَةِ، قَالَ: فَكُنْتُ آخُذُ البَعِيْرَ بِالبَعِيْرَيْنِ إِلَى إِبِلِ الصَّدَقَةِ. رَوَاهُ الحَاكِمُ وَالبَيْهَقِيُّ، وَرِجَالُه ثِقَاتٌ.

حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہما سے ہی مروی ہے کہ نبی ﷺ نے ان کو ایک لشکر کی تیاری کا حکم دیا۔ اونٹ ختم ہوگئے۔ تو آپؐ نے ان کو صدقہ کے اونٹوں پر (ادھار اونٹ) لینے کا حکم ارشاد فرمایا راوی کہتے ہیں میں ایک اونٹ' صدقہ کے دو اونٹوں کے بدلہ لیتا تھا۔ (اسے حاکم اور بیہقی نے روایت کیا ہے اس کے راوی ثقہ ہیں)

لغوی تشریح: ﴿ ان یجھز جیشا ﴾ وہ ساز و سامان تیار کریں' جس کی لشکر کو ضرورت ہے۔ سواریاں' اسلحہ وغیرہ۔ ﴿ فنفدت الابل ﴾ نفدت میں نون پر فتحہ "فا" کے نیچے کسرہ اور دال مھملہ۔ ختم ہوگئے' کم رہ گئے۔ مطلب یہ ہے کہ ہر مجاہد کو ایک اونٹ دے دیا' مگر اس کے باوجود کچھ آدمی ایسے رہ گئے جن کو اونٹ نہ دیئے جا سکے' اس لئے کہ اونٹ کم رہ گئے تھے۔ ﴿ ان یاخذ علی قلائص' الصدقۃ ﴾

قلائص قلوص کی جمع ہے۔ قلوص کے قاف پر فتحہ ہے۔ جوان اونٹ کو کہتے ہیں۔ یعنی آپ نے ان کو حکم ارشاد فرمایا کہ "جتنے اونٹ کم رہ گئے ہیں اتنے ادھار خرید لیں کہ باقی لوگوں کو پورے آجائیں اور جب عاملین صدقہ' صدقات کے اونٹ لے کر آئیں گے' اس وقت ان کی قیمت ادا کر دینا۔" ﴿الی ابل الصدقۃ﴾ یعنی اس وقت تک ادھار جب صدقہ کے اونٹ بیت المال میں آجائیں۔ یہ حدیث حیوان کو حیوان کے بدلہ ادھار فروخت کرنے کو جائز قرار دیتی ہے۔ جبکہ ادھار ایک طرف سے ہو۔

حاصل کلام: اس حدیث سے ثابت ہوتا ہے کہ حیوانات کو قرض خرید نا جائز ہے۔ امام شافعی رحمہ اللہ' امام مالک رحمہ اللہ اور جمہور اس بیع کو جائز کہتے ہیں جبکہ احناف حیوانات کا قرض لینا جائز نہیں سمجھتے۔

(۷۰۹) وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا، قَالَ: نَهَى رَسُولُ اللهِ ﷺ عَنِ الْمُزَابَنَةِ: أَنْ يَبِيْعَ ثَمَرَ حَآئِطِهِ إِنْ كَانَ نَخْلاً بِتَمْرٍ كَيْلاً، وَإِنْ كَانَ كَرْماً أَن يَبِيْعَهُ بِزَبِيْبٍ كَيْلاً، وَإِنْ كَانَ زَرْعاً أَنْ يَبِيعَهُ بِكَيْلِ طَعَامٍ، نَهَى عَنْ ذٰلِكَ كُلِّهِ. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے بیع مزابنہ سے منع فرمایا ہے اور وہ یہ ہے کہ آدمی اپنے باغ کی تازہ کھجوریں خشک کھجوروں سے' یا تازہ انگوروں کو کشمش و منقیٰ سے ماپ کر سودا کرے اور اگر کھیتی ہو تو اس کا سودا غلہ سے کرے۔ آپؐ نے ان سب صورتوں میں ہونے والی بیع سے منع فرمایا ہے۔ (بخاری و مسلم)

لغوی تشریح: ﴿ثمر﴾ "ثاء" کے ساتھ' پھل کے معنی میں۔ ﴿کرما﴾ کاف پر فتحہ اور "را" ساکن۔ انگور کی بیل۔ اس جگہ انگور مراد ہے۔

(۷۱۰) وَعَنْ سَعْدِ بْنِ أَبِيْ وَقَّاصٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: سَمِعْتُ رَسُولَ اللهِ ﷺ، وَسُئِلَ عَنِ اشْتَرَآءِ الرُّطَبِ بِالتَّمْرِ، فَقَالَ: «أَيَنْقُصُ الرُّطَبُ إِذَا يَبِسَ؟» قَالُوا: نَعَمْ، فَنَهَى عَنْ ذٰلِكَ. رَوَاهُ الخَمْسَةُ، وَصَحَّحَهُ ابْنُ المَدِيْنِيْ وَالتِّرْمِذِيُّ وَابْنُ حِبَّانَ وَالحَاكِمُ.

حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا۔ آپؐ سے سوال کیا جا رہا تھا کہ تازہ کھجوریں خشک کھجوروں کے بدلے فروخت کی جا سکتی ہیں؟ تو آپؐ نے فرمایا کہ "کیا وہ خشک ہو کر وزن میں کم رہ جاتی ہیں؟" لوگوں نے کہا ہاں! تو آپؐ نے اس سے منع فرما دیا۔ (اسے پانچوں نے روایت کیا ہے۔ ابن مدینی' ترمذی' ابن حبان اور حاکم نے اسے صحیح کہا ہے۔)

(۷۱۱) وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ نَهَى عَنْ بَيْعِ الكَالِىءِ بِالكَالِىءِ، يَعْنِي الدَّيْنِ

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے ادھار کے بدلہ ادھار یعنی قرض کے بدلہ قرض کو فروخت کرنا ممنوع فرمایا ہے۔ (اسے اسحٰق اور بزار نے

بِالدَّيْنِ رَوَاهُ إِسْحَاقُ وَالبَزَّارُ بِإِسْنَادٍ ضَعِيفٍ ضعیف سند سے روایت کیا ہے)

لغوی تشریح: ﴿ نهی عن بیع الکالئی بالکالئی ﴾ یہ کلاء الدین کلوء فھو کالی سے ماخوذ ہے، جس کے معنی تاخیر کرنے، دیر کرنے کے ہیں۔ اور کلاتہ کے معنی ہیں کہ جب تو بھول جائے اور کبھی ہمزہ تخفیفاً نہیں پڑھتے۔ نہایہ میں اس کی تعریف یہ کی گئی ہے کہ ایک آدمی ایک مدت تک کیلئے کسی دوسرے سے ایک چیز خرید تا ہے۔ جب مدت مقررہ پوری ہوگئی تو اس کے پاس ادائیگی کیلئے کچھ نہیں۔ تو وہ کہتا ہے کہ مجھے یہ چیز مزید مدت کیلئے زیادہ قیمت پر بیچ دے، دونوں کے پاس ایسی کوئی چیز نہیں جو ان کے قبضہ میں آئے۔ یہ حدیث اس بیع کی حرمت پر دلالت کرتی ہے۔ جب وقوع پذیر ہوگی تو باطل ہوگی۔ (سبل)

حاصل کلام: اس حدیث کی رو سے ادھار کی ادھار کے بدلہ بیع ناجائز ہے۔ اس کی دو صورتیں ہیں کہ مثلاً اسلم نے احمد سے ایک سکوٹر پانچ سو روپے میں ایک سال کی مدت پر ادھار خریدا۔ جب سال بھر کی مدت پوری ہوگئی تو احمد اسلم سے کہتا ہے میں رقم کا بندوبست نہیں کر سکا۔ مجھے از سر نو چھ سو روپے میں یعنی سو روپے زائد پر فروخت کر دے۔ اس طرح گویا اسلم نے احمد کو سو روپیہ مزید مہلت کا دیا ہے۔ اصل چیز دونوں میں سے کسی کے قبضہ میں نہیں۔ دوسری صورت یہ ہے کہ زید نے خالد سے سو روپیہ لینا ہے اور صادق نے خالد سے کوئی کپڑا لینا ہے پس صادق زید سے کہے جو کپڑا میں نے خالد سے لینا ہے وہ میں تیرے پاس سو روپے میں فروخت کرتا ہوں یہ بیع بھی ناجائز ہے۔

٤ - بَابُ الرُّخْصَةِ فِي بَيْعِ العَرَايَا، وَبَيْعِ الأُصُولِ وَالثِّمَارِ

بیع عرایا، درختوں اور (ان کے) پھلوں کی بیع میں رخصت

(٧١٢) عَنْ زَيْدِ بْنِ ثَابِتٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ: أَنَّ رَسُولَ اللهِ ﷺ رَخَّصَ فِي العَرَايَا أَنْ تُبَاعَ بِخَرْصِهَا كَيْلاً. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

وَلِمُسْلِمٍ: رَخَّصَ فِي العَرِيَّةِ يَأْخُذُهَا أَهْلُ البَيْتِ بِخَرْصِهَا تَمْراً، يَأْكُلُونَهَا رُطَباً.

حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے عرایا میں رخصت دی کہ ان کو اندازہ سے ماپ کر فروخت کر دیا جائے۔ (بخاری و مسلم) اور مسلم میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے عریہ میں رخصت دی کہ گھر والے اندازے سے خشک کھجور دے کر کھانے کیلئے تازہ کھجوریں حاصل کر لیں۔

لغوی تشریح: ﴿ باب الرخصة ﴾ یاد رہے کہ اہل عرب قحط کے دنوں میں اور خشک سالی کے ایام میں اپنے باغات میں سے فقیروں اور مسکینوں کے درختوں کو چھوڑ کر ان کے پھل صدقات کی صورت میں دیا

کرتے تھے کہ فلاں کھجور کے درخت کی کھجوریں تمہاری۔ اس طرح عطیہ میں دی گئی کھجور کو "عریہ" کہتے تھے' یعنی ان کی فروخت میں اجازت کا مفہوم یہ ہے کہ مساکین ان کے باغات میں ان درختوں کا پھل کھانے جایا کرتے تھے' اس لیے ان کے داخلے سے مالک باغات کو تکلیف ہوتی تھی' یا پھر یہ ہوتا کہ مساکین اپنی ضرورت و محتاجی کی وجہ سے ان کے پکنے کا انتظار نہ کر سکتے تھے تو وہ اپنے حصہ کے پھل فروخت کر دیتے جب کہ پھل ابھی درختوں پر ہی ہوتے تھے اور ان کے بدلے خشک کھجوریں لے لیتے۔ اور مالک باغات روز مرہ کی آمدورفت کی تکلیف سے چھٹکارا حاصل کرنے کی غرض سے مسکینوں سے درختوں پر تر کھجوروں کو خشک کھجوریں دے کر خرید لیتے۔ یہ بیع بعینہ بیع مزابنہ ہی ہے۔ جب رسول اللہ ﷺ نے بیع مزابنہ کو ممنوع قرار دیا تو ضرورت و حاجت رفع کرنے کی بیع عرایا کی اجازت مرحمت فرما دی' اس شرط پر کہ کھجور کے ان درختوں پر پھل کا تخمینہ لگا کر ان کے بدلے ماپ کر اتنی کھجوریں دے دیں۔ نووی کی رائے یہ ہے کہ "عریہ" یہ ہے کہ اندازہ و تخمینہ لگانے والا کھجور کے درختوں پر موجود کھجوروں کا اندازہ لگائے اور کہے کہ یہ تر کھجوریں جو درختوں پر ہیں' یہ خشک ہو کر اتنی مقدار' یا اتنے ماپ میں رہ جائیں گی۔ مثلاً اس سے خشک ہونے کے بعد تین وسق کھجوریں حاصل ہوں گی' یا مثلاً ان کھجوروں کو اگر فروخت کرے گا تین وسق ملیں گی' اسی مجلس میں بائع اپنی قیمت اور مشتری اپنی بیع پر قابض ہو گئے۔ پس خریدار خشک کھجوریں حوالے کرے گا اور فروخت کنندہ کھجور کا درخت سپرد کر دے گا۔ یہ بیع پانچ وسق سے کم مقدار میں جائز ہے اور پانچ وسق سے زائد کی بیع جائز ہیں۔ پانچ وسق کے جواز کے بارے امام شافعی کے دو اقوال ہیں۔ اور دونوں میں صحیح ترین قول یہ ہے کہ وہ اسے جائز نہیں سمجھتے۔ بیع عریہ کی اور بہت سی صورتیں اور شکلیں ہیں ان کی یہاں گنجائش نہیں۔ بڑی کتابیں ملاحظہ کی جا سکتی ہیں۔ اور ﴿ بیع اصول ﴾ سے مراد ہے درختوں کی جڑ کا فروخت کرنا۔ اور ان کے پھلوں کی فروخت سے مراد ہے کہ درختوں کے علاوہ صرف ان کے پھلوں کی فروخت۔ ﴿ یاخذھا اھل البیت ﴾ "کھجور کے درختوں کے مالک" ﴿ بخرصھا ﴾ اندازہ لگائی گئی کھجوریں خشک رہ جانے کے بعد جتنی رہ سکتی ہوں اس کے بدلہ میں۔

(۷۱۳) وَعَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُ، أَنَّ رَسُولَ اللهِ ﷺ رَخَّصَ فِي بَيْعِ الْعَرَايَا بِخَرْصِهَا مِنَ التَّمْرِ فِيْمَا دُونَ خَمْسَةِ أَوْسُقٍ، أَوْ فِي خَمْسَةِ أَوْسُقٍ. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت ابوھریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے بیع عرایا میں اجازت و رخصت عنایت فرما دی۔ بایں صورت کہ تازہ کھجوروں کو خشک کے عوض اندازے سے فروخت کر لیا جائے' جبکہ یہ پانچ وسق کی مقدار سے کم ہوں' یا پھر پانچ وسق ہوں۔ (بخاری و مسلم)

لغوی تشریح: ﴿ فیما دون خمسة اوسق اوفی خمسة اوسق ﴾ او کے لفظ پر راوی کا شک ہے'

یعنی راوی کو شک ہے کہ یہ الفاظ فرمائے یا نہیں۔ دلائل بہرحال اس کا تقاضا کرتے ہیں کہ پانچ وسق کی فروخت بھی حرام ہے۔

حاصل کلام: اس حدیث میں پانچ اوسق سے کم یا زیادہ سے زیادہ پانچ وسق تک فروخت کی اجازت ہے۔ مگر یہ راوی کا شک ہے جس راوی نے شک کیا ہے اس کا نام داؤد بن حصین ہے۔ اس شک کی وجہ سے پانچ وسق سے کم مقدار کی فروخت ہی درست ہوگی۔ ایک وسق میں چار من ہوتا ہے تو پانچ وسق کی مقدار بیس من ہوئی۔ اس طرح گویا بیس من سے کم تک کی فروخت کی اجازت ہے۔

اس حدیث سے معلوم ہوا خرص یعنی اندازہ و تخمینہ شرع میں جائز ہے بشرطیکہ تخمینہ لگانے والا اس فن سے بخوبی واقفیت رکھتا ہو اور کسی کی رو رعایت کئے بغیر ایمان داری سے اندازہ لگاتا ہو تو ایک ہی آدمی کا تخمینہ درست تسلیم کیا جائے گا۔

(٧١٤) وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا قَالَ: نَهَى رَسُولُ اللهِ ﷺ عَنْ بَيْعِ الثِّمَارِ حَتَّى يَبْدُو صَلاَحُهَا، نَهَى البَائِعَ وَالْمُبْتَاعَ. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

وَفِيْ رِوَايَةٍ: وَكَانَ إِذَا سُئِلَ عَنْ صَلاَحِهَا، قَالَ: **حَتَّى تَذْهَبَ عَاهَتُهَا.**

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے پھلوں کو پکنے سے پہلے فروخت کرنے والے اور خریدار دونوں کو ان کی تجارت سے منع فرمایا ہے۔ (بخاری و مسلم) اور ایک روایت میں ہے کہ جب آپؐ سے پوچھا جاتا کہ پھلوں کے پکنے کی صلاحیت سے کیا مراد ہے؟ تو فرماتے "جب ان پر آفت اور نقصان کا اندیشہ نہ رہے۔"

لغوی تشریح: ﴿صلاحها﴾ پھلوں کی سرخی اور زردی۔ یعنی پکنے کی صلاحیت نمایاں ہو جائے۔ قسطلانی کا قول ہے کہ ہر چیز میں اس کے پکنے کی صلاحیت کے ظہور سے مراد ہے کہ اس میں وہ صفت پیدا ہو جائے جو غالب طور پر مطلوب ہوتی ہے۔ ﴿عاهتها﴾ اس کی آفت۔ اس پر وارد ہونے والی آفت کا اندیشہ نہ رہے۔

(٧١٥) وَعَنْ أَنَسِ بْنِ مَالِكٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ نَهَى عَنْ بَيْعِ الثِّمَارِ حَتَّى تَزْهُوَ، قِيْلَ: وَمَا زَهْوُهَا؟ قَالَ: «**تَحْمَارُّ وَتَصْفَارُّ**». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ، وَاللَّفْظُ لِلْبُخَارِيِّ.

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے پھلوں کو پکنے سے پہلے فروخت کرنا ممنوع فرمایا ہے۔ کہا گیا کہ پکنے سے کیا مراد ہے؟ ارشاد فرمایا کہ "وہ سرخ رنگ کا ہو جائے اور پھر زرد رنگ کا" (بخاری و مسلم اور یہ الفاظ بخاری کے ہیں)

لغوی تشریح: ﴿حتى تزهو﴾ کہا جاتا ہے زها النحل یزهو یہ اس وقت بولتے ہیں جب پھل درخت پر نمودار ہونا شروع ہو جائیں اور ازهى یزهى اس وقت بولتے ہیں جب وہ سرخی اور زردی اختیار کرلیں اور ایک قول یہ بھی ہے کہ دونوں کے معنی سرخ اور زرد رنگ والے ہونا مراد ہے اور یہ اشارہ

ہے پھل کے پکنے اور آفت و نقصان سے تحفظ کی طرف۔ ﴿ تحمار و تصفار ﴾ دونوں میں "را" پر تشدید ہے باب افعیلال سے ہیں۔

(٧١٦) وَعَنْهُ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ نَهَى عَنْ بَيْعِ العِنَبِ حَتَّى يَسْوَدَّ، وَعَنْ بَيْعِ الحَبِّ حَتَّى يَشْتَدَّ. رَوَاهُ الخَمْسَةُ إِلاَّ النَّسَائِيَّ، وَصَحَّحَهُ ابْنُ حِبَّانَ وَالحَاكِمُ.

حضرت انس بڑاٹھ ہی اس کے بھی راوی ہیں کہ نبی ﷺ نے انگور کو سیاہ رنگ اختیار کرنے سے پہلے اور دانے کو سخت ہونے سے پہلے فروخت کرنے سے منع فرمایا ہے۔ (اسے نسائی کے سوا پانچوں نے روایت کیا ہے۔ ابن حبان اور حاکم نے اسے صحیح کہا ہے)

لغوی تشریح: ﴿ یسود ﴾ دال پر تشدید۔ سیاہ ہو جائیں' یعنی پک جائیں اور امام مالک رحمہ اللہ نے موطا میں اتنا اضافہ کیا ہے کہ جب دانا سیاہ رنگ اختیار کرلیتا ہے تو آفت سے محفوظ ہو جاتا ہے۔ ﴿ یشتد ﴾ دانے کا سخت ہونا' سے مراد ہے اس کا قوی و مضبوط اور سخت ہونا۔

حاصل کلام: احناف اس کے قائل ہیں اور شوافع کے نزدیک وہ غلہ بالیوں میں فروخت کرنا جائز ہے جس کے دانے صاف نظر آتے ہوں جیسے چاول' جو' جوار' باجرہ اور جو غلہ نظر نہ آئے' اسے جائز نہیں سمجھتے' مثلاً گندم' مکئی' مونگ' ماش وغیرہ۔ لیکن صحیح بات یہی ہے کہ دونوں کو الگ کر کے فروخت کیا جائے۔ اس میں کسی قسم کا شبہ نہیں رہتا۔

(٧١٧) وَعَنْ جَابِرِ بْنِ عَبْدِ اللهِ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «لَوْ بِعْتَ مِنْ أَخِيكَ ثَمَراً، فَأَصَابَتْهُ جَائِحَةٌ، فَلاَ يَحِلُّ لَكَ أَنْ تَأْخُذَ مِنْهُ شَيْئاً، بِمَ تَأْخُذُ مَالَ أَخِيكَ بِغَيْرِ حَقٍّ؟» رَوَاهُ مُسْلِمٌ وَفِي رِوَايَةٍ لَهُ: أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ أَمَرَ بِوَضْعِ الجَوَائِحِ.

حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "اگر تو اپنے بھائی کے ہاتھ پھل فروخت کرے اور اسے کوئی آفت و مصیبت پہنچ جائے تو تیرے لئے اس سے کچھ بھی وصول کرنا حلال نہیں۔ بغیر کسی حق کے اپنے بھائی کا مال کیسے حاصل کرے گا؟" (مسلم) مسلم کی ایک دوسری روایت میں ہے کہ نبی ﷺ نے آفات کے مقابلہ میں قیمتیں وضع کرنے کا حکم دیا ہے۔

لغوی تشریح: ﴿ جائحۃ ﴾ وہ آفت جو پھلوں پر وارد ہوتی ہے اور ان کو برباد کر کے رکھ دیتی ہے۔ جیسے شدید بارش' ژالہ باری' ٹڈی دل' آندھی' آگ اور قحط وغیرہ۔ آسمانی اور زمینی آفات اور جو مصیبت انسانوں کے ہاتھوں پہنچ جائے' مثلاً چوری' ڈکیتی وغیرہ' اس میں علماء کا اختلاف ہے۔ ﴿ امر بوضع الجوائح ﴾ جوائح' جائحۃ کی جمع ہے۔ یعنی نبی ﷺ نے فروخت کرنے والے کو حکم فرمایا ہے کہ وہ خریدار سے اتنی قیمت وصول نہ کرے جتنی آفت کی وجہ سے ہلاک و برباد ہو چکی ہے۔ حدیث کے ظاہر

سے تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ آفات سے ہر حال میں نقصان کو وضع کیا جائے' خواہ وہ پھل پکنے سے پہلے برباد ہوئے ہوں' یا ان کے پکنے کے بعد۔ خواہ نقصان معمولی ہوا ہو' یا بہت زیادہ۔ امام مالک رحمہ اللہ کا قول ہے کہ تیسرا حصہ یا اس سے کچھ زائد وضع کیا جائے گا اور تیسرے حصہ سے کم نقصان کی صورت میں وضع نہیں کیا جائے گا۔ ابوداؤد رحمہ اللہ نے یحییٰ بن سعید سے نقل کیا ہے کہ راس المال کے تیسرے حصہ کے نقصان کی صورت میں آفت زدہ قرار نہیں دیا جائے گا۔ یحییٰ کا قول ہے کہ یہ طریقہ و سنت مسلمانوں میں جاری ہے۔

(۷۱۸) وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا، عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ: «مَنِ ابْتَاعَ نَخْلاً بَعْدَ أَنْ تُؤَبَّرَ، فَثَمَرَتُهَا لِلْبَائِعِ الَّذِي بَاعَهَا، إِلاَّ أَنْ يَشْتَرِطَ الْمُبْتَاعُ». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا "جس کسی نے کھجور کے درخت پیوند کاری کے عمل کے بعد خریدے تو اس صورت میں پھل فروخت کرنے والے کے ہوں گے۔ الّا یہ کہ خریدار پھل کی شرط کرلے۔" (بخاری و مسلم)

لغوی تشریح: ﴿من ابتاع نخلا﴾ یعنی کھجور کے درخت خریدے ﴿بعد ان توبر﴾ تابیر سے مجہول کا صیغہ ہے۔ تابیر کہتے ہیں پیوند کاری اس طرح کہ نر کھجور کا گودا لے کر مادہ کھجور کے خوشے میں رکھ دیتے ہیں۔ جب وہ خوشہ کھلتا اور پھٹتا ہے تو اللہ کے اذن سے وہ پھل زیادہ دیتا ہے۔ ﴿فثمرتها للبائع﴾ اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ کھجور کا درخت جب تک اس میں پیوند کاری نہیں کی گئی تو اس وقت تک اس کا پھل بیع میں شامل ہے اور وہ خریدار کا حق ہے۔ جمہور کی یہی رائے ہے اور امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کا یہ قول ہے کہ پیوند کاری سے پہلے اور بعد میں دونوں صورتوں میں فروخت کنندہ کا حق ہے۔ ابن ابی لیلیٰ نے کہا ہے یہ مطلقاً خریدار کا حق ہے مگر یہ دونوں احادیث کے مخالف ہیں۔

٥ - أَبْوَابُ السَّلَمِ وَالْقَرْضِ وَالرَّهْنِ — پیشگی ادائیگی' قرض اور رھن کا بیان

(۷۱۹) عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا قَالَ: قَدِمَ النَّبِيُّ ﷺ الْمَدِيْنَةَ، وَهُمْ يُسْلِفُونَ فِي الثِّمَارِ السَّنَةَ وَالسَّنَتَيْنِ، فَقَالَ: «مَنْ أَسْلَفَ فِي ثَمَرٍ فَلْيُسْلِفْ فِي كَيْلٍ مَعْلُومٍ وَوَزْنٍ مَعْلُومٍ إِلَى أَجَلٍ

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ نبی ﷺ مدینہ تشریف لائے اور اہل مدینہ پھلوں میں ایک سال اور دو سال کی قیمت پیشگی ادا کرتے تھے۔ آپؐ نے فرمایا "جو شخص پھلوں کی پیشگی دے تو اسے چاہئے کہ ماپ' تول اور مدت مقرر کے لیے دے۔" (بخاری و مسلم) اور بخاری میں "من اسلف

مَعْلُومٍ»۔ مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ، وَلِلْبُخَارِيِّ: «مَنْ أَسْلَفَ فِي شَيْءٍ»۔ «من فی ثمر» کی بجائے «من اسلف فی شئی» کے الفاظ ہیں۔ "جو شخص کسی چیز میں پیشگی دے"۔

لغوی تشریح: ﴿ ابواب السلم ﴾ .. سلم کے سین اور لام پر فتحہ ہے۔ بیع السلف کو ہی سلم کہتے ہیں' وزن اور معنی دونوں اعتبار سے۔ اور ایک قول یہ ہے کہ اہل عراق کی لغت میں سلم اور اہل حجاز کی لغت میں سلف کہتے ہیں۔ (تحفۃ الاحوذی' ج:۲' ص:۲۷۰) اور جزری نے النہایۃ میں کہا ہے کہ بیع سلم یہ ہے کہ سونے یا چاندی یا مروجہ سکہ کے بدلے میں پیشگی قیمت دیکر ایک معلوم و متعین مدت تک چیز لینے کا سودا طے کرنا۔ بالفاظ دیگر گویا تونے صاحب مال کو قیمت سپرد کر دی اور بیع سلم کر لی۔ صاحب تحفۃ الاحوذی کہتے ہیں کہ جو قیمت جلدی ادا کر دی جائے وہ "راس المال" کہلاتی ہے۔ یعنی مقررہ وقت پر سپرد کرنا اور جو چیز موجل فروخت کی جائے اسے مسلم فیہ کہتے ہیں۔ اور قیمت ادا کرنے والے کو "رب السلم" اور جسے وہ چیز فروخت کی جائے اسے "مسلم الیہ" (جس کے سپرد کی گئی) کہتے ہیں اور قیاس اس عقد کے جواز سے انکاری ہے' کیونکہ یہ صورت بھی اس ضمن میں آجاتی ہے کہ جس کے پاس مال موجود نہ ہو اور وہ اسے فروخت کرے' مگر اسے صحیح احادیث وارد ہونے کی وجہ سے جائز قرار دیا گیا ہے سورۃ البقرۃ کی آیت المداینۃ (جس میں لین دین کا مسئلہ بیان ہوا ہے) بھی اس کے جواز پر دلالت کرتی ہے۔ جیسا کہ حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے۔ اور ﴿ رھن ﴾ میں "راء" پر فتحہ اور "ھاء" ساکن۔ قرض کے بدلہ میں کوئی مال دستاویز کی بنا پر دینا۔ اس کی صورت یہ ہے کہ (مثلاً) آپ کسی آدمی سے قرض حاصل کرتے ہیں اور اس قرض کے بدلہ میں کوئی چیز اس کے پاس رکھ دیتے ہیں' تاکہ اسے اعتماد و بھروسہ رہے کہ آپ اس کا قرض ادا کر دیں گے۔ پس جونہی آپ اس کا قرض ادا کریں گے آپ کی رکھی ہوئی چیز آپ کی طرف پلٹ آئے گی۔ اس عمل کو "رھن" کہتے ہیں اور آپ "راھن" کہلائیں گے۔ اور جس کے پاس چیز رکھی گئی ہے اسے "مرتھن" کہیں گے اور رکھی چیز "مرھون" اور "رھین" کہلاتی ہے۔ ﴿ وھم یسلفون ﴾ یسلفون میں "یا" پر ضمہ ہے۔ اسلاف سے ماخوذ ہے۔ قیمت مال (فوری) ادا کرتے ہیں اور اس کے عوض مال تاخیر سے حاصل کرتے ہیں۔ ﴿ السنۃ والسنتین ﴾ دونوں منصوب ہیں' حرف جر کے محذوف ہونے کی وجہ سے جو دراصل الی السنۃ والسنتین ہے۔ ﴿ فی ثمر ﴾ سبل السلام میں ہے' ثمر۔ "ثا اور تا" دونوں طرح ہے اور وہ ثاء سے زیادہ عام ہے۔ ﴿ فی کیل معلوم ...... ﴾ اس میں اس بات کی دلیل ہے ماپ اور تول کر وزن کی جانے والی اشیاء کا ماپ اور وزن کر کے دینا واجب ہے۔ ان دونوں میں سے کسی کے بارے میں بے خبری و جہالت خرید و فروخت کو فاسد اور خراب کرنے والی ہے۔ اس میں اس بات کی دلیل بھی ہے کہ میعاد کا بھی اعتبار ہے۔ جمہور کی رائے اسی جانب ہے اور وہ کہتے ہیں کہ بیع سلم کسی حال میں بھی جائز نہیں۔ جبکہ شافعیہ کہتے ہیں کہ یہ بیع جائز ہے۔

(۷۲۰) وَعَنْ عَبْدِ الرَّحْمٰنِ بْنَ أَبْزَى، وَعَبْدِ اللهِ بْنِ أَبِيْ أَوْفَى رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُمَا، قَالاَ: كُنَّا نُصِيبُ المَغَانِمَ مع رسول الله ﷺ وكان يَأْتِيْنَا أَنْبَاطٌ من أَنْبَاطِ الشَّامِ، فَنُسْلِفُهُم فِي الحِنْطَةِ وَالشَّعِيْرِ وَالزَّبِيْبِ، - وَفِي رِوَايَةٍ «وَالزَّيْتِ» - إِلَى أَجَلٍ مُّسَمًّى، قِيْلَ: أَكَانَ لَهُمْ زَرْعٌ؟ قَالاَ: مَا كُنَّا نَسْأَلُهُمْ عَنْ ذٰلِكَ. رَوَاهُ البُخَارِيُّ.

حضرت عبدالرحمٰن بن ابزیٰ اور عبداللہ بن اوفیٰ رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ (غزوات میں شرکت کر کے) غنیمت کا حصہ لیتے تھے اور ملک شام کے نبطی جاٹوں میں سے کچھ جاٹ ہمارے پاس آئے تھے۔ ہم ان کو گندم' جو اور منقیٰ اور ایک روایت میں زیتون بھی ہے' کی پیشگی دے کر ایک مدت مقررہ تک بیع سلم کرتے تھے۔ پوچھا گیا کہ کیا وہ خود کھیتی باڑی کرتے تھے۔ تو دونوں نے جواب دیا کہ ہم نے ان سے یہ کبھی دریافت نہیں کیا تھا۔ (بخاری)

لغوی تشریح: ﴿ انباط ﴾ نبط یا نبیط کی جمع ہے' وہ لوگ جو عراق اور شام کے درمیانی ریتلی اور کنکریالی جگہ پر فروکش ہوگئے تھے۔ یہ لوگ دراصل عرب تھے' مگر عجمی باشندوں کے ساتھ شامل ہوگئے تھے۔ ان کا نسب خراب ہوگیا۔ ان کی زبانیں بگڑ گئیں۔ حضرت اسماعیل علیہ السلام کے صاحب زادے "نبیط" یا "نبایوط" کی نسل سے ہونے کی وجہ سے نباط کہلائے' یا اس وجہ سے ان کو انباط کہا گیا ہے کہ یہ زمین سے پانی نکالنے کے فن میں مہارت رکھتے تھے اور بکثرت کھیتی باڑی اور زراعت پیشہ تھے۔ شمالی حجاز میں واقع معان' بترء اور عقبہ کے نواح و اطراف میں ان کی تعمیر کردہ دہشت میں مبتلا کر دینے والی بلند و بالا عمارتوں کا انکشاف ہوا ہے۔ نیز ایسے علمی اداروں اور لائبریریوں کا پتہ چلا ہے جو ان کے شاندار تہذیب یافتہ اور مہذب ہونے پر اور ان کی سلطنت کی زبردست مضبوطی اور نہایت عمدہ اور حیرت میں ڈالنے والے فنون پر دلالت کرتے ہیں۔

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ بیع سلم کرتے وقت جنس موجود نہ بھی ہو پھر بھی بیع درست ہے البتہ یہ شرط ضرور ہے کہ اختتام مدت پر اس چیز کا دستیاب ہونا ممکن ہو' یا موجود ہو۔ ائمہ میں سے امام شافعی رحمہ اللہ اور امام مالک رحمہ اللہ کی رائے یہی ہے' البتہ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے نزدیک معاہدہ کے آغاز سے لے کر اختتام مدت معاہدہ تک وہ چیز دستیاب رہے' اس دوران کسی موقع پر اس کا فقدان نہ ہو اور ملنا دشوار و محال نہ ہو۔ پہلے ائمہ کی رائے زیادہ وزنی معلوم ہوتی ہے' کیونکہ اگر ایسی شرط ضروری ہوتی تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ضرور ان سے پوچھ لیتے کہ یہ چیز اب سے لے کر وقت ادائیگی تک بازار میں دستیاب رہے گی۔

راوی حدیث: ﴿ عبدالرحمان بن ابزی رضی اللہ عنہ ﴾ ابزیٰ کے ہمزہ پر فتحہ اور "با" ساکن اور "زا" پر فتحہ۔ قبیلہ خزاعہ سے تھے۔ صغار صحابہ میں شمار ہوتا ہے۔ قبیلہ خزاعہ کے آزاد کردہ غلام تھے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو پایا

اور آپؓ کی امامت میں نماز ادا کی۔ کوفہ میں سکونت اختیار کی۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اپنے دور خلافت میں ان کو خراسان پر عامل مقرر فرمایا اور کوفہ میں وفات پائی۔

(٧٢١) وَعَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ: «مَنْ أَخَذَ أَمْوَالَ النَّاسِ يُرِيدُ أَدَاءَهَا أَدَّى اللَّهُ عَنْهُ، وَمَنْ أَخَذَهَا يُرِيدُ إِتْلاَفَهَا أَتْلَفَهُ اللَّهُ تَعَالَى». رَوَاهُ البُخَارِيُّ.

حضرت ابوھریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا "جو شخص لوگوں کا مال (بطور قرض) لے اور اس کے ادا کرنے کا ارادہ رکھتا ہو تو اللہ تعالیٰ اس کا (قرضہ) ادا فرما دے گا اور جو شخص ان (کے) اموال ضائع کرنے کی نیت سے لے تو اللہ تعالیٰ اسے ضائع کر دے گا۔" (بخاری)

لغوی تشریح: ﴿ اتلافھا ﴾ اموال کو ضائع و ہلاک کرنا اور ان کو ادا نہ کرنا۔

(٧٢٢) وَعَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهَا قَالَتْ: يَا رَسُولَ اللهِ! إِنَّ فُلاناً قَدِمَ لَهُ بَزٌّ مِّنَ الشَّامِ، فَلَوْ بَعَثْتَ إِلَيْهِ، فَأَخَذْتَ مِنْهُ ثَوْبَيْنِ بِنَسِيْئَةٍ إِلَى مَيْسَرَةٍ، فَأَرْسَلَ إِلَيْهِ، فَٱمْتَنَعَ. أَخْرَجَهُ الحَاكِمُ والبَيْهَقِيُّ، وَرِجَالُهُ ثِقَاتٌ.

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ انہوں نے کہا "یارسول اللہ (ﷺ)! فلاں صاحب کا شام سے کپڑا آیا ہے۔ آپؐ بھی کسی کو بھیج کر دو کپڑے کشادگی تک ادھار خرید لیں۔ آپؐ نے اس کی طرف ایک آدمی کو بھیجا) مگر اس نے (ادھار دینے سے) انکار کر دیا۔ (اسے حاکم اور بیہقی نے روایت کیا ہے۔ اس کے راوی ثقہ ہیں)

لغوی تشریح: ﴿ بز ﴾ "باء" پر فتحہ اور "زاء" پر تشدید۔ کپڑا کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔ ﴿ میسرة ﴾ سین پر فتحہ اور ضمہ دونوں ہو سکتے ہیں۔ فراخی 'کشادگی' وسعت' تونگری و مالداری۔

حاصل کلام: اس حدیث کی رو سے چیز کا ادھار خریدنا جائز ہے۔ اس کپڑے بیچنے والے نے حضور ﷺ کو دینے سے انکار غالباً ذاتی عداوت و عناد کی وجہ سے کیا تھا۔ شارحینؒ نے لکھا ہے کہ وہ یہودی تھا' آپؐ کی ذات اقدس سے اسے دشمنی تھی' اس لئے اس نے انکار کیا تھا۔

(٧٢٣) وَعَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «الظَّهْرُ يُرْكَبُ بِنَفَقَتِهِ إِذَا كَانَ مَرْهُوناً، وَلَبَنُ الدَّرِّ يُشْرَبُ بنفقتِهِ إذا كان مَرْهُونًا وَعَلَى الّذِي يَرْكَبُ وَيَشْرَب النَّفَقَةُ». رَوَاهُ البُخَارِيُّ.

حضرت ابوھریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "رہن رکھے ہوئے جانور پر (اس پر اٹھنے والے) مصارف و اخراجات کے بدلے سواری کی جا سکتی ہے۔ اور دودھ دینے والے جانور کا دودھ (اس پر اٹھنے والے) مصارف کے بدلے پیا جا سکتا ہے' جبکہ وہ رہن ہو اور جو آدمی سواری کرتا ہے

اور دودھ پیتا ہے۔ اس کے اخراجات کا ذمہ دار بھی
وہی ہے۔" (بخاری)

لغوی تشریح: ﴿ الظهر ﴾ ظهر بمعنی پشت' کمر' پیٹھ۔ چوپایہ کی پشت اور ایک قول یہ بھی ہے کہ اس سے مراد مضبوط اور طاقتور اونٹ ہے ﴿ يركب ﴾ صیغہ مجہول۔ خبر ہے امر کے معنی میں اور اسی طرح ﴿ يشرب ﴾ کا معاملہ ہے۔ یعنی صیغہ مجہول ہے اور یہ خبر ہے امر کے معنی میں ﴿ لبن الدر ﴾ در کے دال پر فتحہ اور "را" پر تشدید۔ مصدر ہے' دارۃ کے معنی میں۔ دودھ والی ﴿ بنفقته ﴾ اس پر اٹھنے والے اخراجات کے بدلہ میں۔ سوار ہونے اور پینے والے سے مراد ہے جس کے پاس رھن رکھی گئی ہے۔ کیونکہ رھن رکھنے والا تو بر بنائے ملکیت ان پر سوار ہو سکتا ہے۔ اگر یہ بات نہ ہوتی تو پھر "بنفقته" کہنے کا کیا مطلب۔

حاصل کلام: اس حدیث سے ثابت ہوا کہ جب مرھونہ کی دیکھ بھال اور حفاظت کی ذمہ داری مرتھن پر ہے تو اس کے لیے اس سے انتفاع بھی جائز ہے خواہ اس چیز یا جانور کا مالک اس کی اجازت نہ دے۔ امام احمد رحمۃ اللہ علیہ اور اسحٰق رحمۃ اللہ علیہ وغیرہما کی یہی رائے ہے۔ دوسرے حضرات کہتے ہیں جس کے پاس چیز رھن رکھی گئی ہے وہ اس پر اٹھنے والے اخراجات کے بقدر اس کے دودھ اور سواری سے فائدہ لے سکتا ہے۔ ان دونوں کے علاوہ فائدہ نہیں اٹھا سکتا اور نہ اخراجات سے زیادہ فائدہ اٹھانا جائز ہے۔ جمہور علماء کا قول ہے کہ مرھونہ چیز سے کسی قسم کا فائدہ اٹھانا جائز نہیں' بلکہ سارے فوائد رھن رکھنے والا اٹھا سکتا ہے۔ اس پر جو مشقت و محنت اور مصارف ہوں گے' وہ بھی اس کے ذمہ ہوں گے' مگر یہ حدیث جمہور کے خلاف حجت ہے۔

(٧٢٤) وَعَنْهُ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «لاَ يَغْلَقُ الرَّهْنُ مِنْ صَاحِبِهِ الَّذِي رَهَنَهُ، لَهُ غُنْمُهُ وَعَلَيْهِ غُرْمُهُ». رَوَاهُ الدَّارَقُطْنِيُّ وَالحَاكِمُ، وَرِجَالُهُ ثِقَاتٌ، إِلاَّ أَنَّ المَحْفُوظَ عِنْدَ أَبِي دَاوُدَ وَغَيْرِهِ إِرْسَالُهُ.

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "مرھونہ (گروی شدہ) چیز اس کے مالک کیلئے روکی اور بند نہیں کی جائے گی۔ اس کا فائدہ بھی اسی کیلئے ہے اور تاوان کا بھی وہی ذمہ دار ہے۔" (اسے دارقطنی اور حاکم نے روایت کیا ہے' اس کے راوی ثقہ ہیں۔ ابوداؤد وغیرہ کے نزدیک اس کا مرسل ہونا محفوظ ہے)

لغوی تشریح: ﴿ لايغلق ﴾ باب سمع يسمع سے ہے۔ صیغہ معروف ہے۔ سبل السلام میں ہے کہ مرھونہ چیز روکنے سے مراد یہ ہے کہ جب وہ راھن (رہن رکھنے والا) کی ملکیت سے نکل جائے اور مرتھن (جس کے پاس رہن رکھی گئی ہو) کا اس پر قبضہ ہو جائے' اس وجہ سے کہ جو چیز اس نے قرض لی ہے وہ ادا نہ کر سکے اور وقت مقرر پر اسے چھڑا نہ سکے۔ یہ اہل عرب کی عادت تھی۔ نبی ﷺ نے اس سے

ان کو منع فرما دیا۔ ﴿ لـه غنـمـه ﴾ غین پر ضمہ اور نون ساکن۔ اس کا فائدہ اور اس میں زیادتی اسی کا حق ہے۔ ﴿ وعلیـه غرمـه ﴾ غرمہ میں غین پر ضمہ اور راء ساکن۔ اس جانور کی ہلاکت اور اس چیز کا خرچ ہو جانا دونوں کی ذمہ داری بھی اسی کی ہے۔ اس حدیث سے جمہور نے یہ استدلال کیا ہے کہ مرھونہ چیز سے کسی قسم کا انتفاع مطلقاً جائز نہیں۔ لیکن اس حدیث کو سند کے اعتبار سے حجت قرار نہیں دیا جا سکتا اور نہ معناً اس سے استدلال صحیح ہے۔

(۷۲۵) وَعَنْ أَبِيْ رَافِعٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُ أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ اسْتَسْلَفَ مِنْ رَجُلٍ بَكْراً، فَقَدِمَتْ عَلَيْهِ إِبِلٌ مِنْ إِبِلِ الصَّدَقَةِ، فَأَمَرَ أَبَا رَافِعٍ أَنْ يَقْضِيَ الرَّجُلَ بَكْرَهُ، فَقَالَ: «لاَ أَجِدُ إِلاَّ خِيَاراً رَبَاعِيًّا»، قَالَ: «أَعْطِهِ إِيَّاهُ، فَإِنَّ خِيَارَ النَّاسِ أَحْسَنُهُمْ قَضَاءً. رَوَاهُ مُسْلِمٌ.

حضرت ابورافع رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے ایک شخص سے جوان اونٹ قرض لیا' پھر آپ کے پاس صدقہ کے اونٹ آئے تو آپ نے ابورافع کو حکم دیا کہ اس شخص کو جوان اونٹ ادا کر دیا جائے۔ میں نے عرض کیا اس سے بہتر سات سالہ اونٹ موجود ہے۔ فرمایا "یہی اسے دے دو' کیونکہ بہترین آدمی وہ ہے جو ادائیگی میں سب سے اچھا ہو۔" (مسلم)

لغوی تشریح: ﴿ استسلف ﴾ قرض لیا اور ادھار لیا۔ ﴿ بكرا ﴾ "باء" پر فتحہ اور کاف ساکن۔ نوجوان اونٹ۔ ﴿ يقضى ﴾ اس آدمی کو اس کا اونٹ ادا کر دے۔ ﴿ خيارا ﴾ "خاء" کے نیچے کسرہ۔ عمدہ' اچھی' خیار چیز' جو بہتر اور افضل۔ ﴿ رباعيا ﴾ "را" پر فتحہ اور "یا" مخفف۔ سامنے کے ثنیہ اور کچلیوں کے درمیان دانتوں والا اونٹ۔ یعنی وہ اونٹ جو ساتویں سال میں قدم رکھ چکا ہو اور اس کے رباعی دانت گر چکے ہوں۔ یہ بہترین اور عمدہ اونٹ شمار ہوتا تھا اور جوان سے اچھا اور عمدہ سمجھا جاتا تھا۔

حاصل کلام: اس حدیث کی رو سے مقروض انسان اگر خودبخود اپنی آزاد رضامندی سے ادائیگیٔ قرض کے وقت واجب الادا قرض سے مقدار میں زیادہ یا بہتر اور عمدہ ادا کرے تو یہ جائز ہے۔ اگر قرض خواہ قرض دیتے وقت یہ شرط طے کرے کہ ادائیگی کے موقع پر میں تجھ سے اتنا مزید لوں گا' یا یہ کہے کہ قرض میں زیادہ عمدہ اور بہتر چیز لوں گا تو یہ سود شمار کیا جاتا ہے اور سود ہر صورت میں حرام ہے۔

(۷۲۶) وَعَنْ عَلِيٍّ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «كُلُّ قَرْضٍ جَرَّ مَنْفَعَةً فَهُوَ رِباً». رَوَاهُ الحَارِثُ بْنُ أَبِيْ أُسَامَةَ، وَإِسْنَادُهُ سَاقِطٌ. وَلَهُ شَاهِدٌ ضَعِيْفٌ عَنْ فَضَالَةَ بْنِ

حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "ہر وہ قرض جو منافع کھینچ لائے پس وہ سود ہے۔" (اسے حارث بن ابی اسامہ نے روایت کیا ہے۔ اس کی سند ساقط الاعتبار (ضعیف ہے) اور اس کا کمزور شاہد بیہقی کے ہاں فضالہ بن عبید رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے اور بخاری

عُبَيْدٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُ عِنْدَ الْبَيْهَقِيِّ، وَآخَرُ مَوْقُوفٌ عَنْ عَبْدِ اللهِ بْنِ سَلاَمٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُ عِنْدَ الْبُخَارِيِّ.

میں ایک اور موقوف حدیث عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ سے بھی مروی ہے)

لغوی تشریح : ﴿ اسناده ساقط ﴾ ساقط ضعیف کے معنی میں مستعمل ہے ایسی ضعیف کہ قابل احتجاج نہیں' اس لئے کہ اس کی سند میں سوار بن مصعب ہمدانی تھے جو نابینا موذن تھے اور وہ متروک راوی شمار کئے گئے ہیں۔

٦ - بَابُ التَّفْلِيسِ وَالحَجْرِ مفلس قرار دینے اور تصرف روکنے کا بیان

(٧٢٧) عَنْ أَبِيْ بَكْرِ بْنِ عَبْدِ الرَّحْمٰنِ، عَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: سَمِعْنَا رَسُولَ اللهِ ﷺ يَقُولُ: «**مَنْ أَدْرَكَ مَالَهُ بِعَيْنِهِ عِنْدَ رَجُلٍ قَدْ أَفْلَسَ فَهُوَ أَحَقُّ بِهِ مِنْ غَيْرِهِ**». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت ابوبکر بن عبدالرحمٰن نے حضرت ابوھریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا کہ ہم نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے سنا کہ "جو شخص مفلس کے پاس اپنی چیز بعینہ اسی حالت میں پائے تو وہ اس کا دوسرے کی بہ نسبت زیادہ حقدار ہے۔ (بخاری و مسلم)

وَرَوَاهُ أَبُو دَاوُدَ وَمَالِكٌ مِّنْ رِوَايَةِ أَبِيْ بَكْرِ بْنِ عَبْدِ الرَّحْمٰنِ مُرْسَلاً، بِلَفْظِ: أَيُّمَا رَجُلٍ بَاعَ مَتَاعاً، فَأَفْلَسَ الَّذِيْ ابْتَاعَهُ، وَلَمْ يَقْبِضِ الَّذِي بَاعَهُ مِنْ ثَمَنِهِ شَيْئاً، فَوَجَدَ مَتَاعَهُ بِعَيْنِهِ، فَهُوَ أَحَقُّ بِهِ، وَإِنْ مَاتَ الْمُشْتَرِيْ فَصَاحِبُ الْمَتَاعِ أُسْوَةُ الْغُرَمَاءِ. وَوَصَلَهُ الْبَيْهَقِيُّ. وَضَعَّفَهُ تَبعاً لأَبِيْ دَاوُدَ.

ابوداؤد اور مالک نے ابوبکر بن عبدالرحمٰن سے ان الفاظ کے ساتھ مرسل روایت بیان کی ہے کہ "کوئی آدمی اگر کوئی چیز بیچے اور خریدنے والا مفلس ہو جائے اور بیچنے والے کو اس کی قیمت میں سے ابھی کچھ بھی نہیں ملا تو (اس صورت میں) اگر وہ بعینہ اپنا مال پا لیتا ہے تو وہ اس مال کا زیادہ حقدار ہے اور اگر خریدار مر جائے تو پھر صاحب مال دوسرے قرض خواہوں کے برابر ہے۔

(بیہقی نے اسے موصول بیان کیا ہے اور ابوداؤد کی اتباع میں اسے ضعیف کہا ہے)

وَرَوَاهُ أَبُو دَاوُدَ وَابْنُ مَاجَهْ مِنْ رِوَايَةِ عُمَرَ بْنِ خَلْدَةَ، قَالَ: أَتَيْنَا أَبَا هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ فِي صَاحِبٍ لَّنَا قَدْ أَفْلَسَ، فَقَالَ: لأَقْضِيَنَّ فِيكُمْ بِقَضَاءِ رَسُولِ اللهِ ﷺ: مَنْ أَفْلَسَ أَوْ مَاتَ، فَوَجَدَ رَجُلٌ مَّتَاعَهُ بِعَيْنِهِ فَهُوَ أَحَقُّ بِهِ. وَصَحَّحَهُ الحَاكِمُ، وَضَعَّفَهُ أَبُو دَاوُدَ، وَضَعَّفَ أَيْضاً هٰذِهِ الزِّيَادَةَ فِي ذِكْرِ المَوْتِ.

ابوداؤد اور ابن ماجہ نے اسے عمر بن خلدۃ کی روایت سے بیان کیا ہے کہ ہم اپنے ایک ساتھی کے لئے جو مفلس ہوگیا تھا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کے پاس آئے تو انہوں نے کہا کہ میں تمہارے معاملے میں رسول اللہ ﷺ والا ہی فیصلہ کروں گا (اور وہ یہ تھا کہ) جو کوئی مفلس ہو جائے یا مرجائے اور کوئی آدمی اس کے پاس اپنی چیز بعینہ پالے تو وہ ہی اس کا سب سے زیادہ حقدار ہے۔ (حاکم نے اسے صحیح کہا ہے اور ابوداؤد نے ضعیف کہا ہے اور اسی طرح ابوداؤد نے اس زیادتی کو جو موت کے ذکر میں ہے' ضعیف کہا ہے)

لغوی تشریح: ﴿باب التفلیس و الحجر﴾ "تفلیس" کہتے ہیں کہ قاضی کا کسی کو مفلس قرار دینے کی منادی کرنا' تشہیر کرنا۔ اور "مفلس" کہتے ہیں جس کے پاس پیسے نہ ہوں۔ "والحجر" "حاء" پر تینوں حرکات جائز ہیں۔ معنی ہے روکنا۔ وہ اس طرح کہ حاکم مقروض کو اس کے اپنے مال میں تصرف سے منع کر دے۔ ﴿بعینہ﴾ ہو بہو۔ اس کا کوئی وصف تبدیل نہ ہوا ہو۔ تصرفات شرعیہ کی رو سے وہ چیز نہ تو معنوی طور پر ہلاک ہوئی ہو اور نہ حسی طور پر۔ ﴿افلس﴾ کنگال ہوگیا۔ ایسا شخص جس کے پاس بشمول راس المال کچھ بھی باقی نہ بچے' جیسے کہتے ہیں افلس فلان۔ فلاں مفلس ہوگیا' یعنی اس کا مال باقی نہیں رہا' قلاش ہوگیا یا ایسی حالت میں پہنچ گیا کہ اب اس کے پاس کوئی پیسہ نہیں۔ ﴿فھو احق بہ﴾ وہ شخص جس کا درحقیقت مال ہے' وہی اس مال کا زیادہ حقدار ہے۔ ﴿من غیرہ﴾ دوسرے سے' خواہ کوئی ہو۔ اس کا وارث ہو یا قرضدار و قرض خواہ ہو۔ جمہور علماء کی یہی رائے ہے' البتہ حنفیہ نے اس رائے کی مخالفت کی ہے۔ انہوں نے کہا ہے کہ جو چیز مفلس کے ہاتھ میں باقی ہے اس کا دوسرے کی بہ نسبت یہ زیادہ استحقاق نہیں رکھتا' یہ بھی دوسرے قرض خواہوں کی طرح ہے۔ یہ حضرات اس پر ایسی کوئی دلیل پیش نہیں کر سکے جو فائدہ مند ہو' بجز قیاس معکوس کے' جو نص صریح کے مقابلہ میں ہے۔ صاحب سبل السلام نے کہا ہے کہ "بعینہ" کے قول کا یہ فائدہ ہے کہ جب قرض دینے والا یا فروخت کرنے والا جب اپنی چیز اسی حالت میں نہ پائے جس حالت میں اس نے دی تھی اور اب اس میں کوئی صفت تبدیل ہو چکی ہو' یا اس میں کمی بیشی واقع ہوگئی ہو تو پھر اس صورت میں یہ صاحب ہی اس کا استحقاق نہیں رکھتے' بلکہ پھر سارے قرض خواہ میں مساوی ہوں گے۔ یعنی فروخت کر کے حصہ بقدر حصہ کے حساب سے تقسیم کی جائے گی۔ ﴿ولم یقبض الذی باعہ من ثمنہ شیئا ......﴾ اس میں اس بات کی دلیل ہے جس کی طرف جمہور گئے ہیں کہ جب خریدار فروخت کنندہ کو کچھ رقم ادا کر دے تو پھر صرف یہی فروخت کرنے والا اس رقم کا حق دار

نہیں ہوگا جو خریدار نے ادا کر دی ہے' بلکہ اس میں سارے قرض خواہ برابر کے شریک ہوں گے۔ مگر امام شافعی رحمہ اللہ کا قول یہ ہے کہ اس صورت میں بھی فروخت کنندہ ہی زیادہ استحقاق رکھتا ہے۔ یہ قول ان کا نیل الاوطار میں مذکور ہے۔ ﴿ وان مات المشتری فصاحب المتاع اسوة الغرما ﴾ اگر خریدار فوت ہو جائے تو سامان کا مالک قرض خواہوں کے مساوی ہے۔ "غرماء" غین پر ضمہ اور "راء" پر فتحہ' غریم کی جمع ہے۔ قرض خواہ' یعنی وہ شخص جس کا دوسرے پر قرض ہو ﴿ واسوة ﴾ ہمزہ پر ضمہ اور کسرہ دونوں طرح۔ یعنی وہ شخص اب سب کیلئے یکساں مساوی ہے' یعنی ان سے جس طرح ایک آدمی لے گا تو دوسرے بھی اسی طرح وصول کریں گے اور جس طرح ایک محروم رہے گا' اسی طرح دوسرے بھی محروم رہیں گے۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ افلاس اور موت میں فرق ہے۔ یہ رائے امام احمد رحمہ اللہ و امام مالک رحمہ اللہ کی ہے اور امام شافعی رحمہ اللہ کا قول ہے کہ موت اور افلاس دونوں میں کوئی فرق نہیں اور مال کا اصل مالک ہی دونوں صورتوں میں زیادہ استحقاق رکھتا ہے۔ اس کے لیے انہوں نے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے سے استدلال کیا جسے عمر بن خلدہ نے روایت کیا ہے' مگر وہ ضعیف ہے۔ جیسا کہ مصنف نے ابوداؤد کے حوالہ سے نقل کیا ہے۔ ﴿ ووصله البيهقي و ضعفه تبعا لابي داود ﴾ اور بیہقی نے اسے موصول بیان کیا ہے اور ابوداؤد کی اتباع میں اسے ضعیف کہا ہے۔ اس عبارت سے بسا اوقات یہ سمجھا جاتا ہے کہ ابوداؤد نے اسے موصول روایت نہیں کیا اور صرف بیہقی نے ہی موصول روایت کیا ہے۔ لیکن صحیح بات یہی ہے کہ ابوداؤد نے مرسل اور موصول دونوں طرح بیان کیا ہے اور اس کے آخر میں کہا ہے کہ مالک کی روایت صحیح ترین ہے۔ حالانکہ مالک کی روایت مرسل ہے۔ پس اسی سے سمجھا جاتا ہے کہ اس کا موصول ہونا ضعیف ہے۔ رہی روایت عمر بن خلدہ کی جسے مصنف نے ابوداؤد کے حوالہ سے ضعیف نقل کیا ہے۔ تو صاحب سبل السلام نے کہا ہے کہ میں نے سنن ابی داؤد کی مراجعت کی مگر مجھے عمر بن خلدہ کی روایت کی تضعیف نہیں ملی۔ مگر صاحب عون المعبود نے کہا ہے کہ اس حدیث کے آخر میں ہے کہ ابوداؤد نے کہا کون ہے جو اسے پکڑتا ہے' حاصل کرتا ہے؟ ابو المعتمر کون ہے؟ یہ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ ہم اسے نہیں جانتے۔ یہ عبارت اکثر نسخوں میں پائی گئی ہے۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ صاحب سبل السلام کو وہ نسخہ دستیاب نہیں ہوا جس میں یہ عبارت ہے۔ اسی وجہ سے انہوں نے مصنف رحمہ اللہ پر ابوداؤد کی اس روایت کو ضعیف قرار دینے کے خلاف انکار کیا ہے۔

حاصل کلام: اس حدیث میں جو مسئلہ بیان ہوا ہے اس کی نوعیت یہ ہے کہ کوئی آدمی کسی قسم کا مال خریدے اور اس کی رقم اس پر قرض ہو۔ اس کے بعد وہ مفلس و قلاش ہو جائے اور ادائیگی قرض کیلئے اس کے پاس کچھ بھی نہ بچے۔ اس صورت میں اس مال کے فروخت کرنے والے کو حق پہنچتا ہے کہ اگر اس کی فروخت کردہ چیز بعینہ موجود ہے تو وہ اسے بلاتردد حاصل کر لے۔ معاہدۂ بیع کو فسخ کر دے۔ جمہور کا یہی مذہب ہے' لیکن احناف کے نزدیک وہ تنہا اس مال کو نہیں لے سکتا' بلکہ وہ بھی عام قرض خواہوں کی طرح کا ایک قرض خواہ ہے۔ جس تناسب سے دوسرے قرض خواہوں کو قرضہ کی واپسی ہوگی اسے بھی اسی

تناسب سے قرض واپس ہو گا۔ لیکن یہ حدیث کے خلاف ہے۔

امام ابوداؤد رحمہ اللہ اور امام بیہقی رحمہ اللہ نے ابوبکر بن عبدالرحمٰن کی مرسل حدیث جسے انہوں نے موصول بیان کیا ہے اس میں ایک راوی اسماعیل بن عیاش ہے' جسے ضعیف قرار دیا گیا ہے مگر امام بخاری رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ اگر اسماعیل شامیوں سے روایت کرتا ہے تو وہ درست ہے اور اس حدیث میں اس نے حارث زبیدی شامی سے روایت کیا ہے۔ تاہم امام ابوداؤد نے مرسل کو ہی اصح اور عمر بن خلدہ کی روایت میں ابوالمعتمر کو امام ابوداؤد' طحاوی اور ابن منذر نے مجہول کہا ہے اور امام ابن ابی حاتم نے اس سے صرف ابن ابی ذئب ہی روایت کرنے والا ذکر کیا ہے۔ اسی لئے امام ابوداؤد نے اسے ضعیف قرار دیا ہے۔ (التلخیص)

راوی حدیث: ﴿ ابوبکر بن عبدالرحمان ﴾ ابو بکر بن عبد الرحمان بن حارث بن ھشام بن مغیرہ مخزومی مدنی۔ مدینہ منورہ کے قاضی تھے۔ ان کے نام کے بارے میں ایک قول یہ بھی ہے کہ ان کا نام محمد تھا اور ایک قول یہ بھی ہے کہ ان کا نام مغیرہ تھا' یہ بھی کہا گیا ہے کہ ان کا نام ابوبکر اور کنیت ابوعبدالرحمٰن ہے اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ ان کی کنیت ہی ان کا نام ہے۔ بڑے فقیہہ' عبادت گزار اور ثقہ آدمی تھے۔ تیسرے طبقہ میں شمار کیا گیا ہے۔ ولید بن عبدالملک کے دور خلافت میں وفات پائی۔ حضرت ابوھریرہ رضی اللہ عنہ سے ان کا سماع ثابت ہے۔ شعبی اور زہری وغیرہ نے ان سے روایت کیا ہے۔ ان کی وفات کے سن میں اختلاف ہے۔ ۹۳ھ یا ۹۴ھ یا ۹۵ھ۔

﴿ عمر بن خلدۃ ﴾ ابوحفص ان کی کنیت تھی۔ مدینہ منورہ کے انصار میں سے تھے۔ قاضی کے عہدہ و منصب پر فائز رہے۔ نہایت پرہیزگار' پاک دامن و عفیف' بڑے بہادر۔ حریف کے مقابل شمشیر براں' بڑے بارعب انسان تھے۔ انہوں نے حضرت ابوھریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے اور ان سے ربیعہ الرای نے اور خلدہ کے "خا" پر فتحہ۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ وہ ان کے دادا ہیں اور ان کے والد کا نام عبدالرحمٰن ہے۔

(٧٢٨) وَعَنْ عَمْرِو بْنِ الشَّرِيْدِ، عَنْ أَبِيْهِ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «لَيُّ الوَاجِدِ يُحِلُّ عِرْضَهُ وَعُقُوبَتَهُ». رَوَاهُ أَبُو دَاوُدَ وَالنَّسَائِيُّ، وَعَلَّقَهُ البُخَارِيُّ، وَصَحَّحَهُ ابْنُ حِبَّانَ.

حضرت عمرو بن شرید نے اپنے باپ شرید رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "مالدار آدمی کا ادائیگی قرض میں ٹال مٹول کرنا' اس کی بے عزتی اور سزا دینے کو حلال کرنا ہے۔" (اسے ابوداؤد اور نسائی نے روایت کیا ہے اور بخاری نے اسے تعلیق کے طور پر نقل کیا ہے اور ابن حبان نے اس کو صحیح قرار دیا ہے)

لغوی تشریح: ﴿ لی الواجد ﴾ لی کے "لام" پر فتحہ اور "یا" پر تشدید۔ ٹال مٹول' لیت و لعل' بغیر کسی عذر و رکاوٹ کے واجب الادا قرض کی رقم کو ادا کرنے سے گریز کرنا۔ "الواجد" مالدار آدمی' صاحب

ثروت انسان۔ ﴿ یحل عرضه ﴾ یحل میں "یا" پر ضمہ۔ مضارع کا صیغہ ہے۔ یعنی قرض دینے والے کیلئے ایسی صورت میں سخت کلامی اور درشتی سے پیش آنا جائز ہے اور اس کی بے عزتی اور رسوائی کرنا درست ہے۔ ﴿ عقوبته ﴾ سزا' بایں صورت کہ اسے قید کر دیا جائے۔ محبوس کر دیا جائے' یا بایں صورت کہ قاضی اس کا مال و متاع فروخت کر کے اس پر واجب الادا قرض ادا کر دے۔

حاصل کلام: اس حدیث کی رو سے مال دار اور صاحب ثروت آدمی محض اپنی خساست طبع کی وجہ سے ادائیگی، قرض میں حیلے بہانے' ٹال مٹول اور لیت و لعل کرے' جبکہ وہ آسانی سے قرض ادا کرنے کی پوزیشن میں ہو تو ایسے آدمی کو قرض خواہ زبانی کلامی بے عزت بھی کر سکتا ہے اور بذریعہ عدالت اسے سزا دلوانے کا بھی مجاز ہے۔ جمہور علماء نے تو صرف دس درہم تک کی مالیت یا مقدار کی مساوی ادائیگی میں ٹال مٹول کرنے والے شخص کو فاسق اور مردود الشہادۃ قرار دیا ہے۔ (سبل)

راوی حدیث: ﴿ عمرو ﴾ ان کی کنیت ابوالولید عمرو بن شرید (شین پر فتحہ "راء" پر کسرہ) بن سوید۔ طائف کے قبیلہ ثقیف سے تھے' اسی لئے ثقفی طائفی کہلائے۔ ثقہ تابعی ہیں۔ تیسرے طبقہ سے ہیں۔
﴿ شرید رضی اللہ عنہ ﴾ شرید بن سوید ثقفی۔ ان کا نام مالک تھا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کا نام شرید رکھا۔ اس وجہ سے یہ نام رکھا کہ وہ اپنی قوم کا ایک فرد قتل کر کے مکہ میں آگئے تھے اور پھر اسلام قبول کر لیا۔ (تلقیح لابن الجوزی) یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اس کا تعلق حضر موت سے تھا اور اس کا شمار قبیلہ ثقیف میں تھا۔ اور ایک قول یہ بھی ہے کہ انہیں اہل طائف میں شمار کیا جاتا تھا۔

(٧٢٩) وَعَنْ أَبِي سَعِيْدٍ الْخُدْرِيِّ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، قَالَ: أُصِيْبَ رَجُلٌ فِيْ عَهْدِ رَسُولِ اللهِ ﷺ فِي ثِمَارٍ ابْتَاعَهَا، فَكَثُرَ دَيْنُهُ، فَأَفْلَسَ، فَقَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «**تَصَدَّقُوا عَلَيْهِ**»، فَتَصَدَّقَ النَّاسُ عَلَيْهِ، وَلَمْ يَبْلُغْ ذٰلِكَ وَفَاءَ دَيْنِهِ، فَقَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ لِغُرَمَائِهِ: «**خُذُوا مَا وَجَدْتُمْ، وَلَيْسَ لَكُمْ إِلاَّ ذٰلِكَ**». رَوَاهُ مُسْلِمٌ.

حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں ایک آدمی کو پھلوں کی تجارت میں (کافی) نقصان ہوا جس وجہ سے اس پر قرض کا بار بہت زیادہ ہوگیا حتیٰ کہ کنگال ہوگیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "اس پر صدقہ کرو۔" لوگوں نے اس پر صدقہ کیا' مگر وہ صدقہ اتنا نہیں تھا کہ قرض پورا ادا ہو جاتا۔ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے قرض خواہوں سے فرمایا (یہی کچھ ہے) جو کچھ ملتا ہے لے لو۔ اس کے علاوہ تمہارے لئے کچھ بھی نہیں ہے۔" (مسلم)

لغوی تشریح: ﴿ لیس لکم الا ذاک ﴾ اس عبارت سے یہ بات مترشح ہو رہی ہے کہ صدقہ کا حکم جو قرض کی ادائیگی کیلئے آپؐ نے فرمایا تھا' وہ علی وجہ الاستحباب تھا' جب پھل کسی آفت کی زد میں آکر برباد ہو جائیں تو ایسی صورت میں فروخت کنندہ کے مال سے وضع کیا جائے گا' خریدار کے مال سے نہیں۔ جیسا کہ

حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی حدیث میں جو وضع الجائحة کے تحت پہلے گزر چکی ہے' میں بیان ہو چکا ہے۔ البتہ قرض' قرضدار کے حالات کے ناموافق و نامساعد ہونے کی وجہ سے بھی ساقط نہیں ہو گا۔ فی الحال اس سے ادائیگی کا تقاضا و مطالبہ مؤخر کر دیا جائے گا۔

(٧٣٠) وَعَنِ ابْنِ كَعْبِ بْنِ مَالِكٍ عَنْ أَبِيهِ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، أَنَّ رَسُولَ اللهِ ﷺ حَجَرَ عَلَى مُعَاذٍ مَالَهُ، وَبَاعَهُ فِي دَيْنٍ كَانَ عَلَيْهِ. رَوَاهُ الدَّارَقُطْنِيُّ، وَصَحَّحَهُ الحَاكِمُ، وَأَخرَجَهُ أَبُو دَاوُدَ مُرْسَلاً، وَرَجَّحَ إِرْسَالَهُ.

حضرت ابن کعب بن مالک رضی اللہ عنہ اپنے باپ سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کو ان کے مال میں تصرف سے روک دیا تھا اور اس کا مال اس قرض کی رقم کے عوض میں فروخت کر دیا جو اس کے ذمہ تھی۔ (اسے دار قطنی نے روایت کیا ہے اور حاکم نے اسے صحیح قرار دیا ہے اور ابوداؤد نے اسے مرسل روایت کیا ہے اور اس کے مرسل ہونے کو قابل ترجیح ٹھہرایا ہے)

لغوی تشریح: ﴿ حجر علی معاذ ماله ﴾ اسے اپنے مال میں تصرف سے روک دیا۔ یہ ۹ھ کی بات ہے۔ اس کے بعد ان کو یمن کی طرف بھیج دیا تھا کہ اپنے مال کا نقصان پورا کر لے۔

حاصل کلام: اس حدیث سے ثابت ہوا کہ جس آدمی پر قرض کا بار گراں آن پڑے اسے سربراہ ریاست' یا اس کا نمائندہ اس کے اپنے مال میں تصرف سے روک سکتا ہے' تاکہ قرض داروں کا قرض ادا کیا جا سکے۔ حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ جس شخص پر اس کے مال سے زیادہ قرض ہو اس کا یہی حکم ہے کہ اسے مالی تصرف کے حقوق سے عارضی طور پر معطل کر دیا جائے اور سرکاری اہلکار اس کا مال خود فروخت کر کے قرض خواہوں کو ادائیگی کر دے۔ ایسا نہ کرے گا تو اثر و رسوخ والا آدمی اس کا مال غصب کر لے گا۔ خود اسے (یعنی مالک مال) اور دوسرے قرض خواہوں کو محروم کر دے گا۔ جو باہمی دشمنی اور رقابت کا پیش خیمہ ثابت ہو گی۔

راوی حدیث: ﴿ ابن کعب ﴾ ابوالخطاب ان کی کنیت ہے۔ عبدالرحمٰن بن کعب بن مالک انصاری ان کا نام ہے۔ مدینہ کے باشندے تھے۔ کبار تابعین میں سے تھے اور ثقہ تھے۔ کہا جاتا ہے کہ عہد نبویؐ میں پیدا ہوئے اور سلیمان بن عبدالملک کے عہد خلافت میں وفات پائی۔

﴿ کعب بن مالک رضی اللہ عنہ ﴾ کعب بن مالک بن ابی کعب انصار کے قبیلہ سلیم سے تھے۔ مدینہ کے باشندے' اور شاعر تھے۔ ان شعراء میں سے ایک تھے جنہیں شعراء نبوی کے معزز و مکرم خطاب سے نوازا گیا ہے۔ بیعت عقبہ ثانیہ میں شریک تھے۔ بدر و تبوک کے ماسوا باقی تمام غزوات میں شریک رہے۔ یہ بزرگ ان تین معزز بزرگ ہستیوں میں سے ایک تھے جو غزوۂ تبوک کے موقع پر پیچھے رہ گئے تھے اور ان کی توبہ دربار الٰہی میں قبولیت کے شرف سے مشرف ہوئی تھی۔ ایک قول کے مطابق ۵۰ھ میں اور ایک قول کے

مطابق ۵۱ھ میں ستتر برس کی عمر میں وفات پائی۔ اس وقت یہ بینائی سے محروم ہو چکے تھے۔

(۷۳۱) وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا، قَالَ: عُرِضْتُ عَلَى النَّبِيِّ ﷺ يَوْمَ أُحُدٍ، وَأَنَا ابْنُ أَرْبَعَ عَشْرَةَ سَنَةً، فَلَمْ يُجِزْنِيْ، وَعُرِضْتُ عَلَيْهِ يَوْمَ الخَنْدَقِ، وَأَنَا ابْنُ خَمْسِ عَشْرَةَ سَنَةً، فَأَجَازَنِيْ. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

وَفِيْ رِوَايَةٍ لِلْبَيْهَقِيِّ: فَلَمْ يُجِزْنِيْ وَلَمْ يَرَنِي بلَغْتُ». وَصَحَّحَهُ ابْنُ خُزَيْمَةَ.

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ مجھے احد کے روز نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے روبرو پیش کیا گیا۔ اس وقت میری عمر چودہ برس تھی۔ آپؐ نے مجھے جنگ میں شرکت کی اجازت نہ دی۔ پھر خندق کے روز مجھے آپؐ کے سامنے پیش کیا گیا اس وقت میری عمر پندرہ برس تھی تو آپؐ نے مجھے شرکت کی اجازت دے دی۔ (بخاری و مسلم)

اور بیہقی کی روایت میں ہے کہ آپؐ نے مجھے اجازت نہ دی اور مجھے بالغ نہیں سمجھا۔ (ابن خزیمہ نے اسے صحیح کہا ہے)۔

لغوی تشریح: ﴿عرضت﴾ صیغہ مجہول۔ لڑائی کی جانب جانے کیلئے پیش کیا گیا۔ ﴿لم یجزنی﴾ اجازۃ سے ماخوذ ہے' یعنی مجھے لڑائی اور خرید و فروخت کرنے کے قابل نہیں سمجھا اور مجھے جنگجو اور مقاتلین کیلئے جو واجب حکم ہے میں شامل نہیں فرمایا اور نہ اپنے ساتھ نکلنے کیلئے جو حکم صادر فرمایا تھا اس میں شمار کیا اور ایک قول کے مطابق اس کے یہ معنی بھی ہو سکتے ہیں کہ آپؐ نے میرے لیے انعام نہیں لکھا۔ جائزہ کا معنی مجاہدین و غازیوں کا رزق و انعام ہے۔

حاصل کلام: اس حدیث کی رو سے تصرفات کی عمر پندرہ سال میں شروع ہو جاتی ہے' جسے قابل قبول اور قابل تسلیم سمجھا گیا ہے۔ مصنف بھی اس حدیث کو اس باب میں اسی لئے لائے ہیں کہ خرید و فروخت کس عمر کی قابل اعتبار ہے۔ گویا پندرہ سال سے پہلے بچہ اور پندرہ سال کا جوان' مردوں کے حکم میں آجاتا ہے۔ اس حدیث سے نوجوانوں کا شوق جہاد ملاحظہ ہو۔ آگے بڑھ کر خود اپنے آپ کو خدمت جہاد کیلئے پیش کرتا ہے۔ پہلی بار ناکامی کے بعد اگلے سال پھر قسمت آزمائی کرتا ہے اور اپنے عزم و ارادے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ معلوم ہوا فوج میں بھرتی کیلئے اس سے کم عمر والوں کو نہیں لینا چاہئے۔ اس سے یہ اصول بھی نکلا کہ فوج کی بھرتی کیلئے پہلے جسمانی ٹسٹ لینا چاہئے' اگر فٹ نہ ہو تو واپس بھیج دیا جائے۔

(۷۳۲) وَعَنْ عَطِيَّةَ القُرَظِيِّ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، قَالَ: عُرِضْنَا عَلَى النَّبِيِّ ﷺ يَومَ قُرَيْظَةَ، فَكَانَ مَنْ أَنْبَتَ قُتِلَ، وَمَنْ لَّمْ يُنْبِتْ خَلَّى

حضرت عطیہ قرظی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ بنو قریظہ سے جنگ کے موقع پر ہمیں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے روبرو پیش کیا گیا' جس کے زیر ناف بال اگے ہوتے تھے' اسے قتل کر دیا گیا اور جس کے نہیں اگے تھے اسے چھوڑ

سَبِيْلَهُ، فَكُنْتُ مِمَّنْ لَمْ يُنْبِتْ، فَخَلَّى سَبِيْلِيْ. رَوَاهُ الأَرْبَعَةُ، وَصَحَّحَهُ ابْنُ حِبَّانَ وَالحَاكِمُ.

دیا گیا۔ میں بھی ان میں سے تھا جس کے بال نہیں اگے تھے' لہٰذا مجھے بھی چھوڑ دیا گیا۔ (اسے چاروں نے روایت کیا ہے۔ ابن حبان اور حاکم نے اسے صحیح قرار دیا ہے)

لغوی تشریح: ﴿ یوم قریظة ﴾ ۵ھ ذی قعدہ میں غزوۂ احزاب کے فوراً بعد یہ غزوہ واقع ہوا۔ اس غزوۂ کے برپا ہونے کا سبب غزوۂ خندق کے ایام میں بنو قریظہ کی عہد شکنی اور غداری تھی اور مسلمانوں سے طے شدہ معاہدہ کو پس پشت پھینک کر عہد شکنی کا ارتکاب تھا۔ انہوں نے مسلمانوں کے ساتھ طے شدہ معاہدہ کو توڑ دیا۔ مسلمانوں کے خلاف مشرکین سے خفیہ اجلاسوں میں مشورے کئے۔ اس غزوۂ کی انتہا بنو قریظہ حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ کے حکم تسلیم کرنے پر ہوئی۔ حضرت سعد رضی اللہ عنہ کو انہوں نے اس خیال کے پیش نظر تسلیم کیا تھا کہ وہ ان سے رحم و کرم کا معاملہ کریں گے' کیونکہ بنو قریظہ اور حضرت سعد رضی اللہ عنہ کے قبیلہ اوس کے درمیان زمانہ قدیم سے حلیفانہ تعلقات تھے۔ چنانچہ جب انہوں نے حضرت سعد رضی اللہ عنہ کو فیصل تسلیم کر لیا تو انہوں نے ان کے قابل جنگ مردوں کو قتل کرنے اور ان کی عورتوں کو اور ان کے بچوں کو لونڈیاں اور غلام بنانے کا فیصلہ کیا تو ان کی یہ سزا مسلمانوں کے خلاف خفیہ سازشوں اور مشوروں اور غداری کے عین مطابق تھی۔ لہٰذا جو بالغ تھا اسے قتل کر دیا گیا اور جو نابالغ بچہ تھا' اسے چھوڑ دیا گیا اور جس کے بارے میں بالغ اور نابالغ ہونے میں شک ہوتا' اسے برہنہ کر کے ملاحظہ کیا جاتا' جس کے زیر ناف بال اگے ہوتے' بغلوں میں بال اگے ہوتے اور شرم گاہ کے اردگرد بال اگے ہوتے اسے قتل کر دیا جاتا ﴿ خلی سبیله ﴾ اس کا راستہ کھلا چھوڑ دیا جاتا' یعنی اسے قتل نہ کیا جاتا' بلکہ چھوڑ دیا جاتا۔ سبل السلام میں ہے کہ یہ حدیث دلیل ہے کہ بالوں کا اگنا بلوغت کی نشانی ہے اور جس کے یہ بال نکل آئیں ان پر احکام شرعیہ نافذ ہوں گے اور اس پر تقریباً اجماع ہے۔ امام ترمذی رحمہ اللہ نے بیان کیا ہے کہ امام احمد رحمہ اللہ اور اسحٰق رحمہ اللہ نے بالغ ہونے کی تین نشانیاں بتائی ہیں۔ عمر پندرہ سال یا احتلام۔ اگر عمر کا تعین نہ ہو سکے اور احتلام کا بھی پتہ نہ چل سکے تو پھر زیر ناف بالوں کی موجودگی بلوغت کی علامت ہے۔

راوی حدیث: ﴿ عطیه قرظی رضی اللہ عنہ ﴾ قرظی کے "قاف" پر ضمہ "را" پر فتحہ۔ بنو قریظہ کی طرف نسبت کی وجہ سے قرظی کہلائے۔ صغیر صحابی ہیں۔ ان سے ایک ہی حدیث مروی ہے۔ کہتے ہیں کہ کوفہ میں سکونت پذیر ہو گئے تھے۔ علامہ ابن عبدالبر نے کہا ہے کہ میں ان کے والد کے نام سے واقف نہ ہو سکا۔ ان سے مجاہد وغیرہ نے روایت کیا ہے۔

(۷۳۳) وَعَنْ عَمْرِو بْنِ شُعَيْبٍ، عَنْ أَبِيْهِ، عَنْ جَدِّهِ، أَنَّ رَسُولَ اللهِ ﷺ قَالَ: «لاَ يَجُوزُ لامْرَأَةٍ عَطِيَّةٌ إِلاَّ

حضرت عمرو بن شعیب اپنے باپ سے اور وہ اپنے دادا سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "کسی عورت کا اپنے شوہر کی اجازت کے بغیر

بِإِذْنِ زَوْجِهَا» .
وفي لفظ: لاَ يَجُوزُ لِلْمَرْأَةِ أَمْرٌ فِي مَالِهَا، إِذَا مَلَكَ زَوْجُهَا عِصْمَتَهَا. رَوَاهُ أَحْمَدُ وَأَصْحَابُ السُّنَنِ، إلاَّ التِّرمِذِيُّ، وَصَحَّحَهُ الحَاكِمُ.

عطیہ دینا جائز نہیں" اور ایک روایت میں ہے کہ "کسی عورت کو اپنے ذاتی مال میں کوئی معاملہ کرنے کا اختیار نہیں جب اس کا شوہر اس کی عصمت کا مالک ہو۔" (اسے احمد اور اصحاب سنن نے (ترمذی کے علاوہ) روایت کیا ہے اور حاکم نے اسے صحیح کہا ہے)

لغوی تشریح: ﴿ لا یجوز لامراۃ عطیۃ ﴾ کہ عورت کو عطیہ دینا جائز نہیں۔ امام خطابی نے فرمایا ہے کہ یہ حکم اکثر علماء نے حسن معاشرت پر اور باہم ایک دوسرے کے دل کو پاک صاف رکھنے پر محمول کیا ہے کہ اس طرح رہن سہن میں اعتماد کی فضا پیدا ہوتی ہے۔ یا اس سے غیر سنجیدہ' بے سلیقہ' رشد و ہدایت سے عاری خاتون مراد ہے' جسے اپنے نفع و نقصان کا چنداں شعور نہ ہو۔ ورنہ نبی ﷺ سے یہ ثابت ہے کہ آپؐ نے عید کے مجمع میں عورتوں کو "تصدقن" فرما کر صدقہ کی ترغیب دلائی' جس کے نتیجہ میں عورتوں نے اپنی بالیاں اور انگوٹھیاں حضرت بلال رضی اللہ عنہ کی جانب پھینک دیں اور انہوں نے اپنی چادر میں جمع کر لیں۔ ظاہر ہے کہ یہ عطیات جو اس موقع پر عورتوں نے دیئے وہ شوہروں کی اجازت کے بغیر ہی دیئے۔ (ملخصاً) ﴿ لا یجوز لامراۃ امر فی مالھا ﴾ یعنی اس کے قبضہ میں خاوند کا جو مال ہے اس میں سے خرچ کرنے کا اسے اختیار حاصل نہیں اور عورت کی طرف مال کی نسبت مجازاً ہے' کیونکہ اس کے تصرف میں دیا گیا ہے۔ اس صورت میں نہی تحریمی ہے۔ بعض علماء کرام نے کہا ہے کہ اس سے اس کا اپنا ذاتی مال مراد ہے اس صورت میں یہ ممانعت ان کی ناقصات العقل ہونے کی بنا پر ہے۔ للذا اس کیلئے مناسب نہیں کہ اپنے خاوند سے مشورہ کئے بغیر اسے خرچ کرے۔ یہ حکم ادباً اور استحباباً ہے اور یہ ممانعت نہی تنزیہی پر محمول ہے۔ (عون المعبود' ج: ۳' ص: ۳۱۷)

حاصل کلام: اس حدیث سے بظاہر تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ عورت اپنے ذاتی اثاثہ میں اپنے شوہر کی اجازت و رضامندی کے بغیر کسی قسم کا تصرف کرنے کی مجاز نہیں ہے۔ مشہور تابعی حضرت طاؤس رحمہ اللہ اسی حدیث کی روشنی میں یہ فتویٰ دیا کرتے تھے کہ کوئی عورت اپنے ذاتی مال میں بھی شوہر کی اجازت کے بغیر تصرف نہ کرے۔ امام مالک رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ عورت صرف ۳/۱ حصہ میں شوہر کی اجازت کے بغیر تصرف کر سکتی ہے' مگر باقی ائمہ ثلاثہ اور جمہور علماء عورت کے اس کے ذاتی مال میں تصرف کو جائز سمجھتے ہیں اور عورت کا ذاتی مال وہ ہے جو اسے مہر کی صورت میں شوہر کی طرف سے ملتا ہے۔ اسی طرح والدین کی طرف سے ملنے والا مال اور اس کی سہیلیوں اور رشتہ داروں کے دیئے ہوئے تحائف و عطیات وغیرہ۔ نیز اس کا تجارتی منافع بھی اس کا ذاتی مال ہے اس پر شوہر یا کسی اور کا کوئی حق نہیں۔ اس لئے وہ اسے اپنی مرضی سے صرف کر سکتی ہے۔ قرآن مجید اور احادیث میں انفاق فی سبیل اللہ کا عمومی حکم اس کا مقتضی ہے۔ تاہم عورت اگر خاوند سے مشورہ کرے' یا اس سے اجازت حاصل کرے تو یہ ان کے مابین حسن

سلوک اور باہمی اعتماد میں اضافے کا باعث ہوگا جس کی طرف اس حدیث میں اشارہ ہے۔

(٧٣٤) وَعَنْ قَبِيْصَةَ بْنِ مُخَارِقٍ الهِلاَلِيِّ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «إِنَّ المَسْأَلَةَ لاَ تَحِلُّ إِلاَّ لِأَحَدِ ثَلاَثَةٍ: رَجُلٌ تَحَمَّلَ حَمَالَةً، فَحَلَّتْ لَهُ المَسْأَلَةُ، حَتَّى يُصِيبَ قَوَاماً، ثُمَّ يُمْسِكُ، وَرَجُلٌ أَصَابَتْهُ جَائِحَةٌ اجْتَاحَتْ مَالَهُ، فَحَلَّتْ لَهُ المَسْأَلَةُ، حَتَّى يُصِيبَ قَوَاماً مِنْ عَيْشٍ، وَرَجُلٌ أَصَابَتْهُ فَاقَةٌ، حَتَّى يَقُولَ ثَلاَثَةٌ مِنْ ذَوِي الحِجَى مِنْ قَوْمِهِ: لَقَدْ أَصَابَتْ فُلاَناً فَاقَةٌ، فَحَلَّتْ لَهُ المَسْأَلَةُ». رَوَاهُ مُسْلِمٌ.

حضرت قبیصہ بن مخارق هلالی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "بے شک تین آدمیوں میں سے کسی ایک کے سوا کسی دوسرے کیلئے سوال کرنا حلال نہیں۔ ایک وہ آدمی جس نے ضمانت کا بوجھ اٹھایا ہو۔ اس کیلئے تاوان و ضمانت کی مقدار تک سوال کرنا جائز ہے اس کے بعد سوال کرنا چھوڑ دے اور ایک وہ آدمی جسے کوئی آفت پہنچی ہو اور اس نے اس کا مال تباہ و برباد کر دیا ہو اس کیلئے سوال کرنا حلال ہے تاوقتیکہ اس کیلئے گزران کی کوئی سبیل نکل آئے اور ایک وہ آدمی جو فاقہ میں مبتلا ہو' یہاں تک کہ اس کی شہادت اس کی قوم کے تین قابل اعتماد آدمی دیں۔ اس کیلئے سوال کرنا حلال ہے۔" (مسلم)

حاصل کلام: اس حدیث میں صرف تین قسم کے آدمیوں کے لئے دست سوال دراز کرنے کی اجازت ہے اور وہ بھی محدود وقت کے لئے۔ انہی میں سے ایک ضامن ہے' وہ اگر مفلس نہ بھی ہو تب بھی اسے سوال کر کے ضمانت دی ہوئی رقم کو ادا کرنا جائز ہے اور جو شخص فاقہ میں مبتلا ہے اس کیلئے تین افراد کی گواہی کا حکم استحباب اور احتیاط کے پہلو سے ہے۔ اس کی حیثیت شرط کی نہیں کہ اس کے بغیر وہ سوال ہی نہیں کر سکتا جیسا کہ عمومی ادلہ کی بنا پر علماء نے کہا ہے۔

٧ - بَابُ الصُّلْحِ

صلح کا بیان

(٧٣٥) عَنْ عَمْرِو بْنِ عَوْفٍ المُزَنِيِّ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُ، أَنَّ رَسُولَ اللهِ ﷺ قَالَ: «الصُّلْحُ جَائِزٌ بَيْنَ المُسْلِمِينَ، إِلاَّ صُلْحاً حَرَّمَ حَلاَلاً، أَوْ أَحَلَّ حَرَاماً، وَالمُسْلِمُونَ عَلَى شُرُوطِهِمْ. إِلاَّ

حضرت عمرو بن عوف مزنی رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "مسلمانوں کے درمیان صلح جائز ہے مگر ایسی صلح جائز اور درست نہیں جو حلال کو حرام یا حرام کو حلال کر دے۔ مسلمان اپنی شرائط پر قائم ہیں (ان کی تمام شرائط ٹھیک ہیں) مگر بجز اس شرط کے جن سے کوئی حلال چیز حرام ہو جائے یا حرام

شَـرْطاً حَـرَّمَ حَـلاَلاً، أَوْ أَحَـلَّ حَرَاماً». رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ، وَصَحَّحَهُ، وَأَنْكَرُوا عَلَيْهِ، لِأَنَّ رَاوِيَه كَثِيْرُ بْنُ عَبْدِ اللهِ بْنِ عَمْرِو بْنِ عَوفٍ ضَعِيفٌ، وَكَأَنَّهُ اعْتَبَرَهُ بِكَثْرَةِ طُرُقِهِ، وَقَدْ صَحَّحَهُ ابْنُ حِبَّانَ مِنْ حَدِيْثِ أَبِيْ هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُ.

چیز حلال ہو جائے۔" (اسے ترمذی نے روایت کیا ہے اور صحیح کہا ہے اور دوسرے محدثین نے ان پر انکار کیا ہے کیونکہ اس کا ایک راوی کثیر بن عبداللہ بن عمرو بن عوف ضعیف ہے۔ ایسا محسوس و معلوم ہوتا ہے کہ ترمذی نے کثرت طرق کی وجہ سے اس کو صحیح قرار دیا ہے اور ابن حبان نے اسے صحیح کہا ہے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث سے)

لغوی تشریح: ﴿ باب الصلح ﴾ صلح کی بہت سی اقسام ہیں۔ مثلاً دو لڑنے والوں کے درمیان صلح' بیوی خاوند کے درمیان صلح اور حقوق و املاک میں نزاع کو ختم کرنے کے لئے صلح اور اس مقام پر مالی معاملات کے بارے میں صلح مراد ہے کیونکہ اسی کی یہاں خرید و فروخت کے من وجہ نسبت ہے۔ اور فقہاء کرام بھی کتاب البیوع میں اس باب کو اسی بنا پر لائے ہیں۔ ﴿ والمسلمون علی شروطهم ﴾ یعنی مسلمان اپنی شرائط پر قائم ہیں یعنی ان پر ثابت قدم ہیں ان شرطوں سے پھرتے نہیں۔ ﴿ الا شرطا حرم حلالا ﴾ مگر ایسی شرط جو حلال کو حرام کر دے۔ مثلاً یہ کہ کوئی یہ شرط کرے کہ مظلوم اور پریشان حال کی مدد نہ کرے۔ فقیروں اور محتاجوں کی اعانت نہ کرے ﴿ اواحل حراما ﴾ یا حرام کو حلال کرے۔ مثلاً یہ شرط کرے کہ ظالم کی مدد کرے' باغی سے تعاون کرے یا مسلمانوں کے ساتھ جنگ کرنے کی شرط کرے۔

حاصل کلام: اس حدیث میں مسلمانوں کا ذکر اس وجہ سے ہے کہ شریعت اسلامی کے احکام کے مخاطب اور مکلف مسلمان ہی ہیں۔ ورنہ جہاں تک صلح کا تعلق ہے تو وہ اہل کتاب کے دونوں گروہوں میں یہود و نصاریٰ کے ساتھ بھی جائز ہے اور مشرکین اور دہریہ لوگوں کے ساتھ بھی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بذات خود اہل کتاب سے بھی صلح کی ہے۔ میثاق مدینہ میں یہود مدینہ کے ساتھ صلح ثابت ہے۔ نصاریٰ نجران کے ساتھ صلح ثابت ہے۔ صلح حدیبیہ میں آپ نے مشرکین مکہ سے صلح فرمائی۔ صلح کیلئے ضابطہ اور قاعدہ کلیہ یہ ہے کہ صلح شریعت اسلامیہ کے کسی حکم کے خلاف نہ ہو جس سے کوئی حرام چیز حلال ہو جائے یا حلال چیز حرام ہو جائے۔ حرام کو حلال کرنے والی شرط یہ ہے مثلاً ایک آدمی کہے کہ میں تمہاری حمایت میں فلاں صاحب کی بے عزتی لازماً کروں گا خواہ وہ بے قصور و بے گناہ ہی کیوں نہ ہو اور حلال کو حرام کی مثال یہ ہے کہ کوئی مسلمان کو ریشمی کپڑا اس شرط کے ساتھ فروخت کرے کہ وہ خود اسے ضرور پہنے گا یا یوں کہے کہ میں تیری خاطر اپنی اہلیہ سے قطع تعلق کر لوں گا۔ امام شافعی رحمہ اللہ کے سوا تینوں ائمہ کرام ہر اس صلح کو جائز قرار دیتے ہیں جو شریعت کی عائد کردہ شرائط کے مخالف نہ ہو۔ بہرحال صلح میں فریق ثانی کو مجبور کر کے صلح کرنا صحیح نہیں۔ فریقین کا رضامند ہونا ہی صلح کی صحت پر دلالت کرتا ہے۔ اور جائز شرائط کو پورا کرنا واجب ہے۔

راوی حدیث: ﴿ عمرو بن عوف رضی اللہ عنہ ﴾ عمرو بن عوف بن زید بن ملحہ المزنی (مزنی کے میم پر ضمہ اور زاء پر فتحہ) یہ کثیر بن عبد اللہ کے جد امجد ہیں' قدیم الاسلام تھے بدر میں حاضر ہوئے نبی ﷺ نے انہیں حرم مدینہ کا عامل مقرر کیا۔ بہت زیادہ رونے والے تھے۔ معاویہ رضی اللہ عنہ کے دور میں فوت ہوئے۔

﴿ کثیر بن عبداللہ ﴾ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ اور ابوداؤد رحمۃ اللہ علیہ نے ان کے بارے میں کہا ہے جھوٹے ارکان میں سے ایک رکن ہے۔ امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے اسے منکر الحدیث کہا ہے اور کہا ہے کہ یہ کچھ بھی نہیں۔ نسائی نے کہا کہ یہ ثقہ نہیں۔ ابن حبان رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے اس کے پاس اس کے باپ عن جدہ کے حوالہ سے گھڑا ہوا نسخہ ہے۔

(٧٣٦) وَعَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُ، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ قَالَ: «لاَ يَمْنَعُ جَارٌ جَارَهُ أَنْ يَغْرِزَ خَشَبَةً فِي جِدَارِهِ»، ثُمَّ يَقُوْلُ أَبُو هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُ: مَا لِيْ أَرَاكُمْ عَنْهَا مُعْرِضِيْنَ؟ وَاللهِ لأَرْمِيَنَّ بِهَا بَيْنَ أَكْتَافِكُمْ. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا "کوئی ہمسایہ اپنے ہمسایہ کو اپنی دیوار پر لکڑی گاڑنے سے منع نہ کرے۔" پھر حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے خود کہا کہ کیا وجہ ہے کہ میں تمہیں اس پر عمل پیرا ہونے سے گریز کرتے دیکھ رہا ہوں۔ اللہ کی قسم! میں تو اسے تمہارے کندھوں پر ماروں گا۔ (بخاری و مسلم)

لغوی تشریح: ﴿ یغرز ﴾ "راء" کے نیچے کسرہ۔ یغرز یضع کے معنی میں رکھے۔ ﴿ مالی اراکم عنھا ﴾ یعنی تم اس سنت سے یا اس ارشاد سے اعراض کر رہے ہو۔ یہ انہوں نے اس لئے فرمایا کہ جب یہ لوگ ان سے حدیث سنتے تو اپنے سر نیچے جھکا لیتے۔ واللہ لارمین بھا اس سنت کو یا اس ارشاد کو۔ کندھوں کے درمیان مارنے یا رکھنے سے مراد یہ ہے کہ میں اس سنت کو اعلانیہ اور کھلم کھلا عمل کرا کے چھوڑوں گا اور اس کے اعلان سے لوگوں پر حجت قائم کر کے دم لوں گا اور ایک قول یہ بھی ہے کہ ضمیر کا مرجع خشبۃ ہے اس صورت میں معنی یہ ہوگا کہ میں یہ لکڑی تمہارے کندھوں کے درمیان ماروں گا اور یہ کنایہ ہے کہ میں اس سنت کو باوجود ناپسندیدگی کے زبردستی نافذ کر کے رہوں گا۔ حضرت ابوھریرہ رضی اللہ عنہ اس وقت مدینہ طیبہ کے امیر تھے اور امیر کیلئے لازم ہے کہ وہ احکام شرعیہ کو نافذ کرے۔ علامہ الیمانی نے کہا ہے کہ حضرت ابوھریرہ رضی اللہ عنہ کے مخاطب صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نہ تھے بلکہ عام لوگ تھے جو احکام شرعیہ سے واقف نہ تھے۔

حاصل کلام: اس حدیث میں ہمسایہ کے ہمسایہ پر حقوق کی نشان دہی ہوتی ہے کہ تعمیرات کے موقع پر ایک دوسرے سے تعاون و معاونت کریں اور یہ بھی حق ہمسائیگی ہے کہ ہمسایہ ہمسائے کی دیوار پر اپنا شہتیر یا اپنا لینٹر رکھنا چاہے تو اسے کوئی رکاوٹ پیش نہ آئے۔ امام احمد رحمۃ اللہ علیہ اور اسحٰق رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک تو یہ

حکم واجب ہے۔ اگر نہ رکھنے دے گا تو گناہ گار ہوگا اور اگر ہمسایہ معاف نہ کرے تو اس گناہ کی سزا عنداللہ پاکر رہے گا۔ مگر باقی ائمہ کے نزدیک یہ نھی تنزیہی ہے مگر امام احمد رحمۃ اللہ علیہ وغیرہ کا موقف ہی راجح معلوم ہوتا ہے کیونکہ حضرت ابوھریرہ رضی اللہ عنہ کا اس پر عمل کرنے والوں پر شدید انکار اس کا مؤید ہے۔

(٧٣٧) وَعَنْ أَبِيْ حُمَيْدٍ السَّاعِدِيِّ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُ، قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «لاَ يَحِلُّ لاِمْرِئٍ أَنْ يَأْخُذَ عَصَا أَخِيهِ بِغَيْرِ طِيبِ نَفْسٍ مِّنْهُ». رَوَاهُ ابْنُ حِبَّانَ وَالحَاكِمُ فِي صَحِيحَيْهِمَا.

حضرت ابوحمید ساعدی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ''کسی کیلئے حلال نہیں کہ وہ اپنے بھائی کا عصا (لاٹھی) بھی اس کی خوشنودی و رضامندی کے بغیر لے۔'' (اسے ابن حبان اور حاکم نے اپنی اپنی صحیح میں روایت کیا ہے)

حاصل کلام: علامہ الیمانی نے کہا ہے کہ حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابوھریرہ رضی اللہ عنہ کی سابقہ حدیث کے بعد یہ حدیث ذکر کر کے دراصل اشارہ کیا ہے کہ اس میں ممانعت تنزیہی ہے جیسا کہ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا آخری قول ہے۔ مگر اس تاویل کی ضرورت تو تب ہے جب دونوں احادیث میں جمع و تطبیق مشکل ہو۔ حالانکہ یہاں تطبیق ظاہر ہے کہ حضرت ابوھریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث خاص ہے اور یہ حدیث عام ہے جس طرح زبردستی زکوۃ وصول کرنا اور بعض دیگر مالی معاملات میں زبردستی عمل جائز ہے تو یہاں حضرت ابوھریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث پر عمل بھی ہمسایہ کی ناراضگی کے باوجود جائز ہے۔ (السبل)

٨ - بَابُ الحَوَالَةِ وَالضَّمَانِ ضمانت اور کفالت کا بیان

(٧٣٨) عَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «مَطْلُ الغَنِيِّ ظُلْمٌ، وَإِذَا أُتْبِعَ أَحَدُكُمْ عَلَى مَلِيءٍ فَلْيَتَّبِعْ». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ، وَفِيْ رِوَايَةٍ لأَحْمَدَ فَلْيَحْتَلْ.

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ''مالدار آدمی کا ٹال مٹول کرنا ظلم ہے اور جب تم میں سے کسی کو مالدار آدمی کا حوالہ دیا جائے تو اسے قبول کرلینا چاہیئے۔'' (بخاری و مسلم) اور احمد کی ایک روایت میں فلیحتل (حوالہ قبول کر لے) ہے۔

لغوی تشریح: ﴿باب الحوالہ﴾ ''خاء'' پر فتحہ اور کبھی کبھار کسرہ بھی آجاتا ہے۔ ایک شخص کے ذمہ سے نکال کر دوسرے کے ذمہ قرض کو منتقل کرنا جیسا کہ کسی شخص کے ذمہ تیرا قرض ہے اور اس آدمی کا آگے کسی دوسرے پر قرض ہے چنانچہ یہ شخص کہے کہ میرے ذمہ تیرا قرض جو واجب الادا ہے وہ تو فلاں صاحب سے وصول کر لے۔ ﴿والضمان﴾ ''ضاد'' کے فتحہ کے ساتھ۔ جس کے معنی ذمہ داری اور کفالت کے ہیں۔ ﴿اذا اتبع﴾ ھمزہ پر ضمہ صیغۂ مجہول ہے۔ اپنے حق کے تقاضا کیلئے دوسرے کا تابع بنا دیا جائے اور ضمانت دی جائے۔ ﴿ملئی﴾ مالدار' صاحب ثروت' بروزن فعیل۔ اس کے آخر میں عموماً

ھمزہ ہوتا ہے اور اکثر ھمزہ کو ترک بھی کر دیتے ہیں اور "یا" پر تشدید دے دیتے ہیں۔ ﴿ فلیتبع ﴾ "تا" پر تشدید۔ صیغہ معروف۔ حوالہ کو قبول کر لینا چاہئے۔

حاصل کلام: اس حدیث میں حوالہ کا بیان ہے۔ حوالہ کے دو معنی کئے گئے ہیں ایک یہ کہ مقروض اپنے قرض میں شخصی ضمانت دے یعنی ایک شخص دوسرے سے کہے کہ فلاں صاحب کو قرض دے دو ادائیگی کا میں ذمہ لیتا ہوں اور دوسرا یہ کہ مقروض قرض خواہ کو اپنے مقروض کے سپرد کر دے۔ مثلاً زید نے خالد سے ہزار روپیہ لینا ہے اور خالد نے حمید سے ہزار روپیہ لینا ہے تو خالد زید سے کہے کہ تم میرا قرض حمید سے وصول کر لو۔ شریعت نے اس صورت کو بھی جائز رکھا ہے بشرطیکہ حمید اس بات کا اقرار کر لے کہ میں نے واقعی خالد کا قرض دینا ہے اور وہ ہزار روپیہ میں تجھے ادا کر دوں گا۔

اس حدیث کے الفاظ فلیحتل اور فلیتبع دونوں کا ماحصل ایک ہی ہے کہ اسے اس پیشکش کو قبول کر لینا چاہئے۔ یہ حکم اہل ظاہر کے نزدیک وجوب کیلئے ہے۔ مگر جمہور نے اسے استحباب پر محمول کیا ہے۔ عرب ممالک کے بنکوں میں ڈرافٹ کو "حوالہ" کہا جاتا ہے۔ اور ڈرافٹ بنا کر دینے والا بنک' رقم جمع کرانے والے کو ایک رسید جاری کرتا ہے کہ اس رسید کے ذریعہ فلاں بنک سے یہ رقم وصول کر لی جائے۔ یہ حوالہ کا جدید مروجہ نظام ہے جو کہ شریعت کی اجازت کے عین مطابق ہے۔ انشاء اللہ۔

(٧٣٩) وَعَنْ جَابِرٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: تُوُفِّيَ رَجلٌ مِّنَّا، فَغَسَّلْنَاهُ، وَحَنَّطْنَاهُ، وَكَفَّنَّاهُ، ثُمَّ أَتَيْنَا بِهِ رَسُولَ اللهِ ﷺ، فَقُلْنَا: تُصَلِّي عَلَيْهِ، فَخَطَا خُطاً، ثُمَّ قَالَ: **أَعَلَيْهِ دَيْنٌ؟** قُلْنَا: دِينَارَانِ، فَانْصَرَفَ، فَتَحَمَّلَهُمَا أَبُو قَتَادَةَ، فَأَتَيْنَاهُ، فَقَالَ أَبُو قَتَادَةَ: الدِّينَارَانِ عَلَيَّ، فَقَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «**حَقَّ الغَرِيمِ؟ وَبَرِئَ مِنْهُمَا المَيِّتُ؟**» قَالَ: نَعَمْ، فَصَلَّى عَلَيْهِ. رَوَاهُ أَحْمَدُ وَأَبُو دَاوُدَ وَالنَّسَائِيُّ، وَصَحَّحَهُ ابْنُ حِبَّانَ وَالحَاكِمُ.

حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ہم میں سے ایک آدمی فوت ہو گیا ہم نے اسے غسل دیا' خوشبو لگائی اور کفن پہنایا۔ پھر ہم اسے اٹھا کر رسول اللہ ﷺ کے پاس لے آئے اور عرض کیا کہ آپ اس کی نماز جنازہ پڑھائیں۔ آپ نے چند قدم آگے بڑھنے کیلئے اٹھائے اور دریافت فرمایا کہ "کیا اس کے ذمہ قرض ہے؟" ہم نے عرض کیا دو دینار تھے۔ یہ سن کر آپ واپس تشریف لے آئے۔ ابو قتادہ رضی اللہ عنہ نے دو دینار کی ادائیگی اپنے ذمہ لے لی۔ پھر ہم آپ کے پاس آئے تو ابو قتادہ رضی اللہ عنہ نے کہا دو دینار میرے ذمہ ہیں۔ آپ نے فرمایا "مقروض کی طرح لازم و حق ہو گیا اور میت اس سے بری الذمہ ہو گئی۔" اس نے کہا کہ ہاں! پھر آپ نے اس کی نماز جنازہ پڑھائی۔ (اسے احمد' ابوداؤد اور نسائی نے روایت کیا ہے۔

ابن حبان اور حاکم دونوں نے اسے صحیح کہا ہے)

لغوی تشریح: ﴿حنطناه﴾ تحنیط سے ماخوذ ہے یعنی غسل کے بعد میت کے جسم پر مختلف قسم کی خوشبوئیں لگانا۔ ﴿فخطا خطا﴾ چند قدم آگے چلے۔ خطا میں خاء پر ضمہ ھدی کے وزن پر خطوۃ کی جمع یعنی چند قدم آگے بڑھے کہ نماز جنازہ پڑھیں۔ ﴿فتحملهما﴾ دو دینار کے ادا کرنے کی ذمہ داری اٹھائی۔ ﴿حق الغريم﴾ مصدر ہونے کی وجہ سے منصوب ہے' شروع میں صرف استفہام محذوف ہے یعنی کیا اس کی ادائیگی تم پر اسی طرح لازم ہے اور حق ہے جس طرح مقروض پر اس کا ادا کرنا حق ہے۔

حاصل کلام: اس حدیث سے کئی مسائل معلوم ہوئے ہیں۔ (۱) میت کی جانب سے قرض ادا کرنے کی ضمانت درست ہے۔ (۲) ضمانت دینے والا آدمی ضمانت کی رقم مرنے والے کے ترکہ میں سے نہیں لے سکتا' اسے اپنی جیب خاص سے زر ضمانت ادا کرنا ہو گا۔ (۳) میت کے حقوق مالیہ جو اس پر واجب ہیں مثلاً حج' زکوٰۃ اور قرضہ کی ادائیگی وغیرہ کا مرنے والے کو فائدہ پہنچتا ہے اس کی جانب سے دوسرے کے ادا کرنے سے ادا ہو جاتے ہیں۔ (۴) قرض ہو یا دوسرے حقوق العباد جب تک ان کی ادائیگی نہ کی جائے یا حقدار یا قرض خواہ خود معاف نہ کر دے کبھی ساقط نہیں ہوتے حتیٰ کہ مرنے کے بعد بھی از خود معاف نہیں ہو جاتے۔ (۵) قرضہ لینا بہت ہی سنگین اور سخت معاملہ ہے حتی الوسع لینے سے گریز ہی کرنا چاہئے اگر لینا اشد مجبوری اور ناگزیر ضرورت ہو تو اسے جلد از جلد ادا کرنے کی فکر کرنی چاہئے۔

(٧٤٠) وَعَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، أَنَّ رَسُولَ اللهِ ﷺ كَانَ يُؤْتَى بِالرَّجُلِ الْمُتَوَفَّى عَلَيْهِ الدَّيْنُ، فَيَسْأَلُ، «هَلْ تَرَكَ لِدَيْنِهِ مِنْ قَضَاءٍ»؟ فَإِنْ حُدِّثَ أَنَّهُ تَرَكَ وَفَاءً، صَلَّى عَلَيْهِ، وَإِلاَّ قَالَ: «صَلُّوا عَلَى صَاحِبِكُمْ»، فَلَمَّا فَتَحَ اللَّهُ عَلَيْهِ الْفُتُوحَ قَالَ: **أَنَا أَوْلَى بِالْمُؤْمِنِيْنَ مِنْ أَنْفُسِهِمْ، فَمَن تُوُفِّيَ وَعَلَيْهِ دَيْنٌ، فَعَلَيَّ قَضَاؤُهُ.** مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ، وَفِي رِوَايَةٍ لِلْبُخَارِيِّ: فَمَنْ مَاتَ وَلَمْ يَتْرُكْ وَفَاءً.

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے پاس مقروض آدمیوں کے جنازے لائے جاتے تو پہلے آپؐ دریافت فرماتے تھے کہ "کیا اس نے قرضہ کی ادائیگی کیلئے کچھ چھوڑا ہے؟" اگر بتایا جاتا کہ اس نے اپنا مال چھوڑا ہے تو اس کی نماز جنازہ پڑھاتے ورنہ فرما دیتے کہ "جاؤ تم اپنے ساتھی کی نماز جنازہ پڑھ لو۔" پھر جب اللہ تعالیٰ نے فتوحات کے دروازے کھول دیئے تو آپؐ نے فرمایا کہ "میں مومنوں کو ان کی جانوں سے بھی زیادہ قریب ہوں۔ لہٰذا اب جو شخص فوت ہو جائے اور اس پر قرضہ کا بار ہو تو اس قرضہ کی ادائیگی میرے ذمہ ہے۔" (بخاری و مسلم) اور بخاری کی ایک روایت میں یہ الفاظ ہیں "جو آدمی مرگیا اور اس نے اتنا ترکہ پیچھے نہیں

چھوڑا جو قرضہ کی ادائیگی کیلئے کافی ہو۔"

لغوی تشریح: ﴿ انا اولی بالمومنین من انفسھم ﴾ میں ان کے اپنے نفسوں کی بہ نسبت زیادہ حق رکھتا ہوں اور زیادہ قریب ہوں اور میرا حکم ان کے بارے میں ایسے جاری و نافذ ہوگا جیسا کہ خود ان کا اپنا حکم ان پر نافذ و جاری ہوتا ہے۔ بعینہ ان کے ذمہ قرض کی رقم کی ادائیگی کا بھی میں زیادہ ذمہ دار اور ضامن ہوں جبکہ وہ اسے ادا نہ کر سکتے ہوں۔ تنگ دست ہوں۔ یہ اس لئے کہ بیت المال میں سب مومنوں کا حق مساوی ہے۔ بالخصوص جبکہ وہ مسکین ہو اس وقت تو زیادہ ہی استحقاق رکھتا ہے۔

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ اسلامی ریاست اپنے شہریوں کی ضروریات فراہم کرنے کی ذمہ دار ہے حتیٰ کہ اگر اس کا کوئی مسلمان شہری مقروض حالت میں فوت ہوگیا اور قرض کی ادائیگی کیلئے کوئی ترکہ نہ چھوڑ گیا ہو اور کوئی عزیز رشتہ دار اور دوست بھی ادائیگی، قرض کی ضمانت نہ دے تو اس صورت میں اس کا قرض اسلامی ریاست کے بیت المال سے ادا کیا جائے گا۔

اس حدیث سے نبی کریم ﷺ کی اپنی امت کے معذوروں' مجبوروں اور قرض داروں کے ساتھ محبت و شفقت کا پتہ چلتا ہے کہ آپؐ ان کے حق میں کتنے مہربان' ہمدرد اور غم خوار تھے۔ سربراہان مملکت کو اپنی رعایا کے ساتھ ایسا ہی شفیق و مہربان ہونا چاہئے۔

(٧٤١) وَعَنْ عَمْرِو بْنِ شُعَيْبٍ، عَنْ أَبِيهِ، عَنْ جَدِّهِ، قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «**لاَ كَفَالَةَ فِي حَدٍّ**». رَوَاهُ الْبَيْهَقِيُّ بِإِسْنَادٍ ضَعِيفٍ.

حضرت عمرو بن شعیب نے اپنے والد سے اور انہوں نے اپنے دادا سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "اللہ کی حد میں ضمانت و ذمہ داری نہیں۔ (اسے بیہقی نے کمزور سند سے روایت کیا ہے۔)

٩ - بَابُ الشِّرْكَةِ وَالوَكَالَةِ

شراکت اور وکالت کا بیان

(٧٤٢) عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «**قَالَ اللَّهُ تَعَالَى: أَنَا ثَالِثُ الشَّرِيكَيْنِ مَا لَمْ يَخُنْ أَحَدُهُمَا صَاحِبَهُ، فَإِذَا خَانَ خَرَجْتُ مِنْ بَيْنِهِمَا**». رَوَاهُ أَبُو دَاوُدَ، وَصَحَّحَهُ الحاكِمُ

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ "اللہ جل شانہ کا ارشاد گرامی ہے کہ دو شراکت کرنے والوں میں' میں تیسرا ہوتا ہوں تاوقتیکہ کوئی ایک دوسرے سے خیانت نہ کرے جونہی ان میں سے کوئی ایک خیانت کا مرتکب ہوتا ہے تو میں ان کے درمیان میں سے نکل جاتا ہوں۔" (ابوداؤد نے اسے روایت کیا ہے اور حاکم نے اسے صحیح کہا ہے)

لغوی تشریح: ﴿ باب الشرکة ..الخ ﴾ شرکة کے شین کے نیچے کسرہ اور "راء" ساکن اور شین پر فتحہ اور "راء" کے نیچے کسرہ بھی پڑھا گیا ہے۔ اور ﴿ وکالة ﴾ میں واؤ پر فتحہ اور کسرہ دونوں جائز ہیں۔ وکالت کے معنی ہیں تفویض کرنا' سپرد کرنا۔ یعنی اپنے اختیارات کسی دوسرے کو دیکر اپنا قائم مقام بنانا۔ ﴿ انا ثالث الشریکین ﴾ یعنی میں ان کے ساتھ ہوتا ہوں حفاظت کرنے' نگرانی کرنے' نزول برکت کرنے اور مال میں مدد کرنے کی صورت میں۔ ﴿ خرجت ﴾ میں ان کے درمیان سے نکل جاتا ہوں بایں صورت کہ میری حفاظت اور نگرانی اٹھ جاتی ہے۔

(٧٤٣) وَعَنِ السَّآئِبِ المَخْزُومِيِّ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، أَنَّهُ كَانَ شَرِيْكَ النَّبِيِّ ﷺ قَبْلَ البِعْثَةِ، فَجَآءَ يَوْمَ الفَتْحِ، فَقَالَ: «مَرْحَباً بِأَخِيْ وَشَرِيْكِيْ». رَوَاهُ أَحْمَدُ وَأَبُو دَاوُدَ وَابْنُ مَاجَهْ.

حضرت سائب مخزومی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ وہ آپ ﷺ کی بعثت سے پہلے آپ ﷺ کی تجارت میں شریک تھا۔ پھر وہ فتح مکہ کے موقع پر آیا تو آپ ﷺ نے فرمایا "مبارک ہو میرے بھائی اور میرے شریک۔" (اسے احمد' ابوداؤد اور ابن ماجہ تینوں نے روایت کیا ہے)

حاصل کلام: یہ حدیث بتا رہی ہے کہ بعثت نبوی سے پہلے بھی کاروبار میں شراکت کا رواج تھا۔ اسلام نے بھی اسے جاری رکھا البتہ جو نقائص دور جاہلیت میں تھے ان سے شراکت کو پاک اور صاف کر دیا۔ آپ نے بعثت سے قبل شریک تجارت کی کس قدر حوصلہ افزائی اور عزت افزائی فرمائی۔ اس لئے پرانے اور دیرینہ دوستوں کو فراموش نہیں کرنا چاہئے۔ جب ملاقات ہو تو خندہ پیشانی' کشادہ ظرفی سے ملاقات کرنی چاہئے۔

راوی حدیث: ﴿ سائب بن ابی سائب مخزومی رضی اللہ عنہ ﴾ علامہ ابن جوزی رحمہ اللہ نے اپنی "تلقیح" میں کہا ہے کہ ابوالسائب کا نام صیفی بن عائذ مخزومی تھا اور صوری نے بھی عائذ ہی بتایا ہے مگر ہمارے شیخ ابن ناصر نے عابد کو درست قرار دیا ہے اور علامہ ابن عبدالبر نے کہا ہے کہ یہ مؤلفۃ القلوب لوگوں میں سے تھے اور ان لوگوں میں سے جن کا اسلام بہت عمدہ ہے اور یہ ان لوگوں میں سے تھے جنہوں نے لمبی عمریں پائیں۔ امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے دور خلافت تک زندہ رہے۔

(٧٤٤) وَعَنْ عَبْدِ اللهِ بْنِ مَسْعُودٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: اَشْتَرَكْتُ أَنَا وَعَمَّارٌ وَسَعْدٌ فِيْمَا نُصِيْبُ يَومَ بَدْرٍ، اَلْحَدِيْثَ، وَتَمَامُهُ: «فَجَآءَ سَعْدٌ بِأَسِيرَيْنِ، وَلَمْ أَجِئْ أَنَا وَعَمَّارٌ بِشَيءٍ. رَوَاهُ النَّسَائِيُّ وَغَيْرُهُ

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے اور عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ اور سعد رضی اللہ عنہ نے شراکت کی ان چیزوں میں جو ہمیں بدر کے روز حاصل ہوئیں۔ اس حدیث کا آخری حصہ یوں ہے کہ سعد رضی اللہ عنہ اس روز دو قیدی لے کر آئے' میں اور عمار رضی اللہ عنہ کوئی بھی چیز نہ لائے۔ (اسے نسائی وغیرہ نے روایت کیا ہے)

لغوی تشریح: ﴿ الحدیث ﴾ بعض نسخوں میں باقی حدیث کا حصہ بھی ثابت ہے اور مکمل حدیث بھی مذکور ہے کہ سعد تو دو قیدی لے کر آئے اور میں اور عمار کچھ بھی نہ لائے۔ اس میں دلیل اس پر ہے کہ کسب میں شراکت جائز ہے۔ ایسی شراکت کو ﴿ شرکۃ الابدان ﴾ کہتے ہیں۔ حنفیہ اس کی صحت کے قائل ہیں اور جمہور علماء اسے باطل قرار دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ حدیث ضعیف ہے اس لئے کہ اس روایت کو ابوعبیدہ نے اپنے باپ سے روایت کیا ہے اور یہ واقعہ ہے کہ ابوعبیدہ نے اپنے والد سے کچھ بھی نہیں سنا۔ لہٰذا یہ منقطع ہے جو احتجاج کے لائق نہیں۔ اس ضعف کے باوصف اس شرکت کو اللہ تعالیٰ نے باطل قرار دیا ہے اور یہ آیت نازل فرمائی: قل الانفال للہ والرسول (۸:۱) چنانچہ اسے مجاہدین کے درمیان تقسیم کر دیا ہے۔ یہ حدیث اور اس سے پہلے کی دونوں احادیث شراکت کے مسائل سے متعلق ہیں اور آئندہ آنے والی چاروں حدیثیں کاروبار میں نیز صدقہ کی کمی پوری کرنے اور قربانی کا جانور ذبح کرنے کے مسائل پر مشتمل ہیں۔

(٧٤٥) وَعَنْ جَابِرِ بْنِ عَبْدِاللهِ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا قَالَ: أَرَدْتُ الخُرُوجَ إِلَى خَيْبَرَ، فَأَتَيْتُ النَّبِيَّ ﷺ، فَقَالَ: «إِذَا أَتَيْتَ وَكِيلِي بِخَيْبَرَ، فَخُذْ مِنْهُ خَمْسَةَ عَشَرَ وَسْقاً». رَوَاهُ أَبُو دَاوُدَ، وَصَحَّحَهُ.

حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے خیبر کی طرف جانے کا ارادہ کیا تو میں رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ آپؐ نے ارشاد فرمایا کہ "جب تو خیبر میں میرے وکیل کے پاس پہنچے تو اس سے پندرہ وسق وصول کر لینا۔" (اسے ابوداؤد نے روایت کیا ہے اور انہوں نے اسے صحیح بھی قرار دیا ہے)

حاصل کلام: یہ حدیث دلیل ہے کہ وکالت جائز ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے خود اپنا نمائندہ مقرر فرمایا تھا۔ لہٰذا مالی معاملات میں کسی کو اپنا وکیل بنانا درست ہے۔ ابوداؤد ہی میں ہے کہ حضرت جابر رضی اللہ عنہ نے عرض کیا یارسول اللہ (ﷺ)! اگر مجھ سے کوئی نشانی طلب کرے تو اسے میں کیا ثبوت پیش کروں؟ آپؐ نے فرمایا "اس کی ہتھیلی پر ہاتھ رکھ دینا۔" گویا یہ علامت و نشانی آپؐ نے پہلے سے طے کر رکھی تھی۔ اس سے معلوم ہوا کہ قرائن اور علامات کی بنیاد پر دوسرے کے مال میں تصرف جائز ہے نیز یہ بھی معلوم ہوا کہ قرینہ کی بنیاد پر کسی چیز پر قبضہ کیلئے ایلچی و قاصد کی تصدیق کی جا سکتی ہے۔

(٧٤٦) وَعَنْ عُرْوَةَ البَارِقِيِّ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، أَنَّ رَسُولَ اللهِ ﷺ بَعَثَهُ بِدِينَارٍ لِيَشْتَرِيَ لَهُ أُضْحِيَّةً، اَلْحَدِيْثِ. رَوَاهُ البُخَارِيُّ فِي أَثْنَاءِ حَدِيْثٍ، وَقَدْ تَقَدَّمَ (بِرَقْمِ ٨٠٧).

حضرت عروہ بارقی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اسے ایک دینار دے کر بھیجا تاکہ آپؐ کیلئے قربانی کا جانور خرید کر لائے۔ (بخاری نے اسے حدیث کی ابتداء میں روایت کیا ہے۔ جس کا ذکر پہلے ہو چکا ہے)

(٧٤٧) وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ

تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: بَعَثَ رَسُولُ اللهِ ﷺ عُمَرَ عَلَى الصَّدَقَةِ، اَلْحَدِيْثَ .مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ

ﷺ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو زکوٰۃ وصول کرنے پر تحصیلدار مقرر فرمایا۔ (الحدیث) (بخاری و مسلم)

حاصل کلام: اس حدیث کو یہاں وکالت کے اثبات میں نقل کیا گیا ہے۔ مکمل حدیث کا مضمون اس طرح ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ ﷺ سے عرض کیا کہ ابن جمیل رضی اللہ عنہ' حضرت عباس رضی اللہ عنہ اور خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے اپنی زکوٰۃ ادا نہیں کی۔ آپ نے فرمایا "ابن جمیل غریب و مفلس تھا۔ اللہ تعالیٰ نے اسے مالدار اور غنی کر دیا۔ اب وہ اللہ سے اسی بنا پر انتقام لیتا ہے' یہ منافق تھا۔ اس نے بعد میں توبہ کی اور سچا مسلمان بن گیا اور رہی حضرت عباس رضی اللہ عنہ کی زکوٰۃ تو وہ میرے ذمہ ہے وہ میں ادا کر دوں گا اور خالد بن ولید (رضی اللہ عنہ) کا حال تمہیں معلوم ہی ہے کہ اس نے اپنا ورثہ اور مال و متاع اللہ کیلئے وقف کر رکھا ہے تو اس سے زکوٰۃ کا تقاضا کیسا؟" اس سے معلوم ہوا کہ سربراہ مملکت زکوٰۃ وصول کرنے کی ذمہ داری کسی مناسب شخص پر ڈال سکتا ہے۔ اور اسی لئے یہ روایت یہاں ذکر کی ہے۔

(٧٤٨) وَعَنْ جَابِرٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ نَحَرَ ثَلاَثاً وَّسِتِّيْنَ وَأَمَرَ عَلِيًّا رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ أَنْ يَذْبَحَ البَاقِيَ، اَلْحَدِيْثَ. رَوَاهُ مُسْلِمٌ.

حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے تریسٹھ اونٹ خود نحر کئے اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کو فرمایا کہ باقی وہ ذبح کریں۔ (الحدیث) (مسلم)

حاصل کلام: اس حدیث سے ثابت ہوا کہ قربانی کا جانور ذبح کرنے میں بھی وکیل بنانا جائز ہے۔ جیسا کہ حضور ﷺ نے حجۃ الوداع کے موقعہ پر حضرت علی رضی اللہ عنہ کو اپنا وکیل بنایا اور انہوں نے ۳۷ اونٹ نحر کئے۔

(٧٤٩) وَعَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، فِي قِصَّةِ العَسِيْفِ، قَالَ النَّبِيُّ ﷺ: «وَاغْدُ يَا أُنَيْسُ عَلَى امْرَأَةِ هَذَا، فَإِنِ اعْتَرَفَتْ فَارْجُمْهَا»، اَلْحَدِيْثَ. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے مزدور کے قصہ میں ارشاد فرمایا تھا کہ "اے انیس! اس عورت کے پاس جاؤ اگر وہ تسلیم کرلے تو اسے سنگسار کر دو۔" (الحدیث) (بخاری و مسلم)

لغوی تشریح: ﴿العسیف﴾ مزدور۔ اجیر کے معنی میں جو عسیف کے وزن پر ہے۔ اس کا مفصل واقعہ و قصہ تو کتاب الحدود میں آگے آرہا ہے۔ اس کا خلاصہ یہ ہے کہ ایک آدمی کسی کے ہاں مزدور تھا' وہ اس کی بیوی سے زنا کر بیٹھا پھر مزدور کے باپ اور اس عورت کے خاوند نے آپس میں اس طرح مصالحت کر لی کہ مزدور ایک سو بکریاں اور ایک لونڈی عورت کے شوہر کو دے کر فارغ ہوگیا۔ اس کے بعد ان دونوں کو شرعی سزا یعنی حد کی خبر دی گئی تو دونوں نبی ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اپنا واقعہ آپ کے روبرو بیان کیا۔ آپ نے سارا واقعہ سن کر زانی مرد کو سو کوڑے اور ایک سال کی جلا وطنی کی سزا دی اور عورت

کے بارے میں فرمایا کہ ' اگر وہ جرم زنا کا اعتراف کر لے تو اس کو رجم کر دو ﴿ واغد ﴾ جاؤ۔ غدا یغدوا غدوا سے امر کا صیغہ ہے۔ یعنی صبح سویرے جانا۔ بکثرت استعمال سے مطلق جانے پر بولا جانے لگا۔ ﴿ یا انیس ﴾ انس کی تصغیر ہے اور صحیح قول کے مطابق یہ انیس بن ضحاک اسلمی تھے۔ ﴿ فارجمها ﴾ رجم سے امر کا صیغہ ہے۔ رجم پتھر مار مار کر جان سے مار دینے کو رجم کہتے ہیں۔ اس حدیث کی رو سے حدود میں بھی وکالت جائز ہے۔ اسی لئے مصنف نے اس حدیث کو اس مقام پر ذکر کیا ہے۔

١٠ - بَابُ الإِقْرَارِ — اقرار کا بیان

(٧٥٠) عَنْ أَبِيْ ذَرٍّ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ لِي رَسُولُ اللهِ ﷺ: «قُلِ الحَقَّ وَلَوْ كَانَ مُرًّا». وَصَحَّحَهُ ابْنُ حِبَّانَ فِي حَدِيْثٍ طَوِيْلٍ.

حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے مجھے ارشاد فرمایا "حق کہو خواہ کڑوا ہی کیوں نہ ہو۔" (اسے ابن حبان نے صحیح کہا ہے۔ ایک لمبی حدیث میں)

لغوی تشریح: ﴿ قل الحق ﴾ سچ کہو۔ خواہ تیری اپنی ذات کے خلاف پڑے یا دوسرے کے خلاف۔ پہلی تعبیر کے اعتبار کو ملحوظ رکھتے ہوئے مصنف نے باب الاقرار میں اسے بیان کیا ہے۔

حاصل کلام: اس حدیث میں حق گوئی کا حکم ہے کہ خواہ کتنے ہی ناگوار حالات سے دوچار ہونا پڑے مگر حق و صداقت کا دامن نہیں چھوڑنا چاہئے۔

١١ - بَابُ العَارِيَةِ — ادھار لی ہوئی چیز کا بیان

(٧٥١) عَنْ سَمُرَةَ بْنِ جُنْدُبٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «عَلَى اليَدِ مَا أَخَذَتْ، حَتَّى تُؤَدِّيَهُ». رَوَاهُ أَحْمَدُ وَالأَرْبَعَةُ، وَصَحَّحَهُ الحَاكِمُ.

حضرت سمرہ بن جندب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "جو کچھ ہاتھ نے لیا ہے جب تک اسے ادا نہ کر دے اس کے ذمہ ہے۔" (اسے احمد اور چاروں نے روایت کیا ہے اور حاکم نے اسے صحیح قرار دیا ہے)

لغوی تشریح: ﴿ باب العاریۃ ﴾ یاء پر تشدید اور تخفیف دونوں جائز ہیں دوسرے کسی کو کوئی چیز دینا کہ وہ فائدہ اٹھا کر واپس کر دے۔ ﴿ علی الید ما اخذت ﴾ ہاتھ نے جو کچھ لیا ہے اسے ادا کرنا بھی اس پر واجب ہے یعنی جس کسی نے دوسرے کا کوئی مال غصب کیا ہو یا عاریتاً لیا ہو یا ودیعت کے طور پر کسی نے اس کے پاس رکھا ہو اس کا واپس لوٹانا لازم ہے۔ ﴿ حتی تودیہ ﴾ تاوقتیکہ اس کے مالک کو واپس نہ دے دے۔

حاصل کلام: اس حدیث سے ثابت ہوا کہ جو چیز کسی سے عاریتاً لی ہو جب تک اسے اسی طرح واپس نہ

کرے وہ اس کے ذمہ واجب الادا رہتی ہے۔ ادھار لی ہوئی چیز کی ضمانت کس کی ہے؟ آیا اس کی ضمانت عاریتاً لینے والے پر ہے یا نہیں۔ اس بارے میں تین اقوال ہیں۔ پہلا قول تو یہ ہے کہ بہرصورت اس کی ضمانت اس کے ذمہ ہے خواہ ضمانت کی شرط کی ہو یا نہ کی ہو۔ حضرات ابن عباس رضی اللہ عنہما' زید بن علی رحمۃ اللہ علیہ' عطاء رحمۃ اللہ علیہ' احمد رحمۃ اللہ علیہ' اسحق رحمۃ اللہ علیہ اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کی یہی رائے ہے۔ دوسرا قول یہ ہے کہ اگر شرط ضمان نہ کی ہوگی تو اس کی ذمہ داری اس پر عائد نہیں ہوگی۔ جیسا کہ آئندہ حضرت یعلیٰ کی روایت میں آ رہا ہے۔ تیسرا قول یہ ہے کہ شرط کے باوجود بھی ضمان نہیں بشرطیکہ خیانت نہ کرے۔

(٧٥٢) وَعَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «أَدِّ الأَمَانَةَ إِلَى مَنِ ائْتَمَنَكَ، وَلاَ تَخُنْ مَنْ خَانَكَ». رَوَاهُ أَبُو دَاوُدَ وَالتِّرْمِذِيُّ، وَحَسَّنَهُ، وَصَحَّحَهُ الحَاكِمُ، وَاسْتَنْكَرَهُ أَبُو حَاتِمٍ الرَّازِيُّ.

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "جس کسی نے تمہارے پاس امانت رکھی ہو تو اسے امانت واپس کر دو اور جس نے تیرے ساتھ خیانت کی تو اس کے ساتھ خیانت نہ کر۔" (اسے ابوداؤد اور ترمذی نے روایت کیا ہے اور ترمذی نے اسے حسن قرار دیا ہے اور حاکم نے اسے صحیح کہا ہے اور ابو حاتم رازی نے اسے منکر سمجھا ہے)

لغوی تشریح: ﴿ اد تادیۃ ﴾ سے امر کا صیغہ ہے۔ ﴿ ائتمنک ﴾ جس نے تجھے امین بنایا ہے۔ ﴿ ولا تخن من خانک ﴾ جس نے تیرے ساتھ خیانت کی ہے اس کے مال پر قابو پانے کے باوجود تو اس سے خیانت نہ کر۔ اسے استحباب پر محمول کیا گیا ہے۔ اس لئے کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے۔ وجزاء سیئۃ سیئہ مثلھا (۴۲: ۴۰) برائی کی جزاء برائی کے مثل ہے۔ وان عاقبتم فعاقبوا بمثل ما عوقبتم بہ (۱۶: ۱۲۶) دونوں آیات اپنے حق کے حصول و وصول پر دلالت کر رہی ہیں۔ ابن حزم کا قول ہے کہ جس نے خیانت کی ہے اس کے مال پر قابو پانے کی صورت میں اسے اپنا حق لے لینا واجب ہے اور یہ عمل خیانت میں شمار نہیں ہے بلکہ خیانت تو اس صورت میں ہوگی کہ لینے والا اپنے حق سے زیادہ وصول کرے۔ دلائل ابن حزم کی رائے کی تائید کرتے ہیں۔ ان شاء اللہ حق بھی انہی کا قول ہے۔ ﴿ الرازی ﴾ رے کی طرف منسوب ہونے کی وجہ سے رازی کہلائے۔ رے فارس کے شہروں میں ایک مشہور و معروف شہر ہے۔

(٧٥٣) وَعَنْ يَعْلَى بْنِ أُمَيَّةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ لِيْ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «إِذَا أَتَتْكَ رُسُلِي فَأَعْطِهِمْ ثَلاَثِينَ دِرْعاً»، قُلْتُ: يَا رَسُولَ اللهِ! أَعَارِيَةٌ مَّضْمُونَةٌ، أَوْ عَارِيَةٌ مُّؤَدَّاةٌ؟

حضرت یعلیٰ بن امیہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے مجھے ارشاد فرمایا کہ "تمہارے پاس جب میرے ایلچی و قاصد آئیں تو ان کو تیس زرہیں دے دینا۔" میں نے عرض کیا اے اللہ کے رسول (ﷺ)! کیا عاریتاً جس میں ضمانت ہوگی یا اس ادھار

قَالَ: بَلْ عَارِيَةٌ مُؤَدَّاةٌ. رَوَاهُ أَحْمَدُ وَأَبُو دَاوُدَ وَالنَّسَائِيُّ، وَصَحَّحَهُ ابْنُ حِبَّانَ.

کے طور پر جو قابل واپسی ہو گا۔ آپؐ نے فرمایا "ایسا ادھار جو ادا کر دیا جائے گا۔" (اسے احمد' ابوداؤد اور نسائی نے روایت کیا ہے اور ابن حبان نے صحیح کہا ہے)

لغوی تشریح: ﴿ اعارية مضمونة اوعارية موداة ﴾ سبل السلام میں ہے کہ مضمونہ اسے کہتے ہیں کہ تلف و ضائع ہونے کی صورت میں اس کی قیمت دی جائے اور موداۃ اصل صورت میں چیز واپس کرنا اگر اس شکل میں باقی ہو۔ اگر تلف و ضائع ہو جائے تو قیمت کی ادائیگی کی ذمہ داری نہیں۔ یہ حدیث اس کی دلیل ہے کہ اگر عاریتاً لی ہوئی چیز کی ذمہ داری قبول نہ کی ہو تو تلف ہونے کی صورت میں اس کی ذمہ داری نہیں ہو گی اور یہ بات تمام اقوال سے واضح ترین ہے۔

(٧٥٤) وَعَنْ صَفْوَانَ بْنِ أُمَيَّةَ، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ اسْتَعَارَ مِنْهُ دُرُوعاً يَوْمَ حُنَيْنٍ، فَقَالَ: أَغَصْباً يَا مُحَمَّدُ (ﷺ)! قَالَ: «بَلْ عَارِيَةٌ مَضْمُونَةٌ». رَوَاهُ أَبُو دَاوُدَ وَالنَّسَائِيُّ، وَصَحَّحَهُ الحَاكِمُ، وَأَخْرَجَ لَهُ شَاهِداً ضَعِيفاً عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهما.

حضرت صفوان بن امیہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے جنگ حنین کے موقع پر اس (صفوان) سے کچھ زرہیں عاریتاً لیں۔ اس نے کہا اے محمد (ﷺ)! کیا آپؐ زبردستی غصب کر رہے ہیں؟ آپؐ نے فرمایا "نہیں! بلکہ ضمانت کے ساتھ عاریتاً لے رہا ہوں۔" (اسے ابوداؤد' نسائی نے روایت کیا ہے اور حاکم نے اسے صحیح کہا ہے اور ایک ضعیف روایت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی بھی بطور شہادت ہے)

لغوی تشریح: ﴿ اغصب ﴾ دراصل یہ اھو غصب ہے یعنی کیا یہ زبردستی ہے اور ایک نسخہ میں "غصباً" منصوب بھی ہے' اس صورت میں معنی ہو گا کیا آپؐ یہ زرہیں زبردستی چھین رہے ہیں ﴿ بل عارية مضمونة ﴾ جس کسی نے اس سے یہ استدلال کیا ہے کہ عاریۃ مضمونۃ ہے اس نے لفظ مضمونۃ سے عاریتاً کی حقیقت کو کھول کر رکھ دیا ہے یعنی عاریتاً لی گئی چیز کی شان یہ ہے کہ اس کی ضمانت ہے اگر تلف ہو جائے گی تو ادا کی جائے گی اور جس نے کہا ہے کہ عاریتاً لی ہوئی چیز کی کوئی ضمانت نہیں اس نے لفظ مضمونہ کو اس کی مخصوص صفت قرار دیا ہے۔ مطلب یہ ہو گا کہ میں تم سے یہ چیز عاریتاً اس طرح لے رہا ہوں کہ اس کی واپسی کی ضمانت ہے ایسا نہیں کہ عاریتاً بغیر کسی ضمانت کے لے رہا ہوں۔ (نیل الاوطار)

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ غیر مسلم سے بھی عاریتاً کوئی چیز لینی جائز ہے اور ضمانت پر مستعار لی ہوئی چیز کو واپس کرنا بھی ضروری ہے اگر کسی وجہ سے ضائع ہو جائے تو اس کی قیمت ادا کرنا ہو گی اور اگر عاریتاً لینے والا عمداً اسے تلف و ضائع کر دے تو اس صورت میں سب کے نزدیک اس کی قیمت ادا کرنا پڑے گی۔

راوی حدیث: ﴿ صفوان بن امیہ رضی اللہ عنہ ﴾ اس سے صفوان بن امیہ بن خلف بن وھب قرشی مراد ہیں جو مکہ کے باشندے اور قبیلہ جمحی سے تعلق رکھتے تھے۔ مؤلفۃ القلوب صحابہؓ میں سے تھے اور اشراف قریش میں ان کا شمار ہوتا تھا۔ فتح مکہ کے روز فرار ہوگئے تھے۔ ان کیلئے امان طلب کی گئی تو وہ واپس لوٹ آئے اور بعد میں حنین میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ شریک ہوئے اس وقت یہ حالت کفر میں تھے بعد میں دائرہ اسلام میں داخل ہوئے اور بہترین اسلام کا ثبوت دیا۔ جن دنوں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو بلوائیوں نے شہید کیا انہیں ایام میں یہ فوت ہوئے۔

١٢ - بَابُ الغَصْبِ — غصب کا بیان

(٧٥٥) عَنْ سَعِيْدِ بْنِ زَيْدٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، أَنَّ رَسُولَ اللهِ ﷺ قَالَ: «مَنِ اقْتَطَعَ شِبْراً مِنَ الأَرْضِ ظُلْماً، طَوَّقَهُ اللَّهُ إِيَّاهُ يَوْمَ القِيَامَةِ مِنْ سَبْعِ أَرَضِينَ». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت سعید بن زید رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "جس شخص نے ایک بالشت بھر زمین کسی سے چھین لی' اللہ تعالیٰ قیامت کے روز اتنا حصہ' زمین' ساتوں زمینوں سے اس کے گلے میں طوق بنا کر ڈال دے گا۔" (بخاری و مسلم)

لغوی تشریح: ﴿ باب الغصب ﴾ "غین" پر فتحہ اور "صاد" ساکن۔ ناحق کسی چیز کا حاصل کرنا' زبردستی کوئی چیز چھین لینا۔ ضرب یضرب باب سے ہے۔ مختار الصحاح میں ہے کہ اس کا استعمال غصبہ منہ اور غصبہ علیہ ہے چنانچہ اس کے معنی ہیں اس سے چھینا اور غصبہ علیہ کا مطلب ہے کسی پر زبردستی کرنا یا مجبور کرنا اور "اغتصاب" بھی اسی معنی میں ہے اور وانشئی غصب و مغصوب کا مطلب ہے چھینا ہوا مال۔ ﴿ اقتطع ﴾ زبردستی چھین لے۔ ﴿ شبرا ﴾ شین کے نیچے کسرہ اور "با" ساکن۔ انگوٹھے کے سرے اور چھنگلی کے سرے کے درمیان کا فاصلہ۔ یعنی بالشت بھر۔ ﴿ طوقہ ﴾ اللہ تعالیٰ اس کا طوق بنا کر گلے میں ڈال دے گا اور یہ بھی معنی کیا گیا ہے کہ ایسے آدمی کو ساتوں زمینوں تک دھنسا کر سزا دے گا اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اسے اس زمین میں گڑھا کھودنے اور اس کی مٹی کو محشر کی طرف منتقل کرنے کی سزا دی جائے گی۔

(٧٥٦) وَعَنْ أَنَسٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ كَانَ عِنْدَ بَعْضِ نِسَائِهِ، فَأَرْسَلَتْ، إِحْدَى أُمَّهَاتِ المُؤْمِنِيْنَ مَعَ خَادِمٍ لَّهَا بِقَصْعَةٍ فِيْهَا طَعَامٌ، فَضَرَبَتْ يَدَهَا فَكَسَرَتِ القَصْعَةَ، فَضَمَّهَا، وَجَعَلَ

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اپنی ازواج مطہرات میں سے کسی کے ہاں تشریف فرما تھے۔ کسی دوسری ام المومنینؓ نے اپنے خادم کے ذریعہ ایک پیالہ بھیجا جس میں کچھ کھانا تھا تو اس بیوی نے اپنا ہاتھ مارا کہ وہ پیالہ ٹوٹ گیا۔ آپؐ نے اس پیالہ کو جوڑ کر اس میں کھانا ڈال دیا اور فرمایا کہ

فِيْهَا الطَّعَامَ وَقَالَ: كُلُوا، وَدَفَعَ الْقَصْعَةَ الصَّحِيْحَةَ لِلرَّسُولِ، وَحَبَسَ الْمَكْسُورَةَ. رَوَاهُ الْبُخَارِيُّ وَالتِّرْمِذِيُّ، وَسَمَّى الضَّارِبَةَ عَآئِشَةَ، وَزَادَ: «فَقَالَ النَّبِيُّ ﷺ: «طَعَامٌ بِطَعَامٍ وَإِنَاءٌ بِإِنَآءٍ». وَصَحَّحَهُ.

"کھاؤ اور لانے والے کے ہاتھ سالم پیالہ بھیج دیا اور ٹوٹا ہوا اپنے پاس رکھ لیا۔" (بخاری و ترمذی) ہاتھ مار کر پیالہ توڑنے والی کا نام حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا لیا گیا ہے اور ترمذی نے اتنا اضافہ کیا ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا "کھانے کے بدلہ میں کھانا اور برتن کے بدلہ میں برتن" (اور ترمذی نے اسے صحیح کہا ہے)

لغوی تشریح: ﴿ احدى امهات المومنين ﴾ یہ ام المومنین حضرت زینب بنت جحش رضی اللہ عنہا تھیں جیسا کہ ابن حزم نے محلّی میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے بیان کیا ہے اور اس سے ملتا جلتا واقعہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا ہے جو انہوں نے حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا کے ساتھ کیا تھا جیسا کہ نسائی نے اسے روایت کیا ہے۔ ﴿ بقصعة صحفة ﴾ کے وزن پر پیالہ کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔ ﴿ وحبس المكسورة ﴾ یعنی ٹوٹے ہوئے پیالہ کو توڑنے والی کے ہاں رکھ دیا۔ ﴿ سمى الضاربة عائشة ﴾ یہ الفاظ ترمذی نے نقل کئے ہیں۔ یہ حدیث اس بات کی دلیل ہے کہ جو کوئی کسی دوسرے کی کوئی چیز ہلاک کرے گا' تو اسی طرح کی ادا کرنا اس کے ذمہ ہے۔ غلہ اور دانے وغیرہ میں اس کی مثل پر سب کا اتفاق ہے۔ یعنی جیسا نقصان کیا ہے اسی طرح واپس دینا لازم ہے۔ البتہ قیمت والی چیز میں اختلاف ہے اور ﴿ طعام بطعام واناء باناء ﴾ کے الفاظ دلالت کرتے ہیں کہ قیمت والی چیز بھی اسی جیسی واپس دینا اس کی ذمہ داری ہے۔ جب اس جیسی چیز دستیاب نہ ہو تو اس صورت میں اس کی قیمت ادا کرنا اس کے ذمہ ہے۔ امام شافعی رحمہ اللہ اور علمائے کوفہ کا یہی مذہب ہے اور امام مالک رحمہ اللہ کی رائے ہے کہ قیمت والی چیز کے بدلہ قیمت والی چیز دینا مطلقاً ہے مگر مالکیہ کے ہاں مشہور ہے جو چیز ماپی اور تولی جا سکتی ہے اس کی قیمت ہے ورنہ اس کی مثل واپس دینا ہوگا اور امام مالک رحمہ اللہ سے بھی ایک قول یہی منقول ہے۔

(٧٥٧) وَعَنْ رَافِعِ بْنِ خَدِيْجٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «مَنْ زَرَعَ فِي أَرْضِ قَوْمٍ بِغَيْرِ إِذْنِهِمْ، فَلَيْسَ لَهُ مِنَ الزَّرْعِ شَيْءٌ، وَلَهُ نَفَقَتُهُ». رَوَاهُ أَحْمَدُ وَالأَرْبَعَةُ إِلاَّ النَّسَآئِيَّ، وَحَسَّنَهُ التِّرْمِذِيُّ، وَيُقَالُ: إِنَّ الْبُخَارِيَّ ضَعَّفَهُ.

حضرت رافع بن خدیج رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "جس کسی نے دوسرے لوگوں کی زمین میں ان کی اجازت کے بغیر زراعت کی تو اسے اس زراعت میں سے کوئی حصہ نہیں ملے گا۔ اسے صرف وہ اخراجات ملیں گے جو اس نے خرچ کئے ہیں۔" (اسے احمد اور نسائی کے علاوہ چاروں نے روایت کیا ہے اور ترمذی نے اسے حسن کہا ہے اور کہا جاتا ہے کہ بخاری نے اسے ضعیف قرار دیا ہے)

لغوی تشریح: ﴿ فلیس لہ من الزرع ﴾ کھیتی باڑی سے جو کچھ حاصل ہو۔ وہ زمین کے مالک کا ہوگا۔ بیج بونے والے کیلئے بجز اس بیج کے کچھ نہیں جو اس نے زمین میں بویا ہے یا جو زمین میں ڈالا ہے۔ ﴿ ولہ نفقتہ ﴾ یعنی جو اخراجات زمین کو سیراب کرنے میں صرف ہوئے اسے وہی ملیں گے۔ امام احمد رحمہ اللہ ' اسحق رحمہ اللہ ' امام مالک رحمہ اللہ اور مدینہ کے اکثر علماء کا یہی مسلک ہے اور یہی راجح مذہب ہے مگر اکثر علماء کی رائے یہ ہے کہ کھیتی تو غاصب کی ہے اور اس پر زمین کا کرایہ ہے۔ مگر اس قول پر کوئی دلیل ایسی نہیں جو اس حدیث کے مقابلہ میں پیش ہو سکے۔ ﴿ ویقال ان البخاری ضعفہ ﴾ یہ قول علامہ خطابی رحمہ اللہ نے امام بخاری رحمہ اللہ سے نقل کیا ہے لیکن امام ترمذی رحمہ اللہ نے ان سے اس کے خلاف یہ نقل کیا ہے کہ میں نے محمد بن اسماعیل بخاری سے اس حدیث کے بارے میں سوال کیا تو انہوں نے فرمایا یہ حدیث حسن ہے۔

(۷۵۸) وَعَنْ عُرْوَةَ بْنِ الزُّبَيْرِ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَجُلٌ مِّنْ أَصْحَابِ رَسُولِ اللهِ ﷺ: إِنَّ رَجُلَيْنِ اخْتَصَمَا إِلَى رَسُولِ اللهِ ﷺ فِي أَرْضٍ غَرَسَ أَحَدُهُمَا فِيْهَا نَخْلاً وَالأَرْضُ لِلآخَرِ، فَقَضَى رَسُولُ اللهِ ﷺ بِالأَرْضِ لِصَاحِبِهَا، وَأَمَرَ صَاحِبَ النَّخْلِ أَنْ يُخرِجَ نَخْلَهُ: وَقَالَ: **لَيْسَ لِعِرْقٍ ظَالِمٍ حَقٌّ**. رَوَاهُ أَبُو دَاوُدَ، وَإِسْنَادُهُ حَسَنٌ. وَآخِرُهُ عِنْدَ أَصْحَابِ السُّنَنِ مِنْ رِوَايَةِ عُرْوَةَ عَنْ سَعِيْدِ بْنِ زَيْدٍ، وَاخْتُلِفَ فِيْ وَصْلِهِ وَإِرْسَالِهِ، وَفِي تَعْيِيْنِ صَحَابِيِّهِ.

حضرت عروہ بن زبیر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ ایک صحابی رسول اللہ ﷺ نے بتایا کہ دو آدمی نبی ﷺ کے پاس ایک زمین کا جھگڑا لے کر آئے۔ زمین ایک کی تھی اور کھجور کے درخت دوسرے نے لگا دیئے تھے تو آپؐ نے فیصلہ فرمایا کہ "زمین مالک کی ہے اور کھجور کے درخت لگانے والا اپنے درخت اکھاڑ لے" اور فرمایا کہ "ظالم کی رگ کا کوئی حق نہیں۔" (اسے ابوداؤد نے روایت کیا ہے۔ اس کی سند حسن ہے۔ اس حدیث کا آخری جزء اصحاب السنن نے عروہ عن سعید بن زید کے حوالہ سے روایت کیا ہے۔ اس روایت کے مرسل اور موصول ہونے اور اس کے صحابی کے تعین میں اختلاف ہے)

لغوی تشریح: ﴿ لیس لعرق ظالم حق ﴾ خطابی رحمہ اللہ نے کہا ہے اس کی صورت اس طرح کہ ایک آدمی دوسرے کی زمین میں پودے لگاتا ہے اور مالک زمین سے اجازت نہیں حاصل کرتا یا دوسرے کی زمین پر مالک زمین کی اجازت کے بغیر گھر تعمیر کر لیتا ہے تو مکان تعمیر کرنے والے کو مکان کے گرانے اور پودے لگانے والے کو پودے اکھاڑنے کا حکم دیا جائے الاّ یہ کہ مالک زمین اس کے چھوڑنے پر رضامند ہو جائے۔ اسی حدیث سے جمہور نے یہ استدلال کیا ہے کہ غاصب جب زمین پر زراعت یا پودے لگا لے تو وہ اس کھیتی باڑی اور پودوں کا مالک ہو جائے گا اور مالک زمین صرف اس زمین کا کرایہ وصول کرنے کا مستحق

ہے۔ لیکن یہ حدیث اس بارے میں صریح اور واضح نہیں ہے بلکہ یہ حدیث سابقہ حدیث کو پیش نظر رکھتے ہوئے اس پر دلالت کرتی ہے۔ غاصب کو اختیار دیا جاتا ہے کہ جو کچھ پودے وغیرہ اس نے زمین میں گاڑے ہیں وہ اکھاڑ لے یا جو اس پر مصارف اٹھے ہیں وہ لے لے۔ جمہور علماء نے جو موقف اختیار کیا ہے اس سے تو یہ ظاہر ہوتا ہے کہ رگ ظالم کا حق ہے باوجودیکہ حدیث اس استحقاق کی نفی کر رہی ہے۔

راوی حدیث: ﴿عروہ بن زبیر رحمہ اللہ﴾ ان کی کنیت ابوعبداللہ ہے۔ سلسلہ نسب یوں ہے۔ عروہ بن زبیر بن عوام بن خویلد اسدی مدنی۔ کبار تابعین میں ان کا شمار ہے۔ مدینہ منورہ کے سات فقہاء میں سے ایک ہیں اور مشہور فقیہہ ہیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی خلافت کے آغاز میں پیدا ہوئے اور ایک قول کے مطابق ۲۳ھ میں پیدا ہوئے اور صحیح روایت کے مطابق ۹۴ھ میں وفات پائی۔

(۷۵۹) وَعَنْ أَبِيْ بَكْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ قَالَ فِيْ خُطْبَتِهِ يَوْمَ النَّحْرِ بِمِنًى: «إِنَّ دِمَاءَكُمْ وَأَمْوَالَكُمْ وَأَعْرَاضَكُمْ عَلَيْكُمْ حَرَامٌ، كَحُرْمَةِ يَوْمِكُمْ هَذَا، فِي بَلَدِكُمْ هَذَا، فِي شَهْرِكُمْ هَذَا». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت ابوبکرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے قربانی کے روز منیٰ میں اپنے خطبہ کے دوران فرمایا کہ "بے شک تمہارے خون اور اموال اور تمہاری آبروئیں تم پر اسی طرح حرام ہیں جس طرح تمہارا آج کا یہ دن حرمت والا ہے جو تمہارے اس شہر میں اور تمہارے اس مہینے میں واقع ہوا ہے۔"

حاصل کلام: مصنف اس حدیث کو اگر باب الغصب کے شروع میں بیان کرتے تو بہت خوب ہوتا۔ بہرحال اس مقام پر اسے بیان کرنے سے مقصود یہ ہے کہ مسلمان کا مال غصب کرنا حرام ہے اور اس کی حرمت پر سب متفق ہیں۔

۱۳ - بَابُ الشُّفعَةِ

شفعہ کا بیان

(۷٦۰) عَنْ جَابِرِ بْنِ عَبْدِ اللهِ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا قَالَ: قَضَى رَسُولُ اللهِ ﷺ بِالشُّفْعَةِ فِي كُلِّ مَا لَمْ يُقْسَمْ، فَإِذَا وَقَعَتِ الحُدُودُ وَصُرِّفَتِ الطُّرُقُ فَلاَ شُفْعَةَ. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ، وَاللَّفْظُ لِلْبُخَارِيِّ. وَفِيْ رِوَايَةِ مُسْلِمٍ: الشُّفْعَةُ فِيْ كُلِّ شِرْكٍ، فِي أَرْضٍ، أَوْ رَبْعٍ، أَوْ حَائِطٍ، لاَ يَصْلُحُ أَن يَبِيْعَ حَتَّى يَعْرِضَ عَلَى

حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ہر اس چیز میں شفعہ کا فیصلہ دیا ہے جو تقسیم نہ ہوئی ہو مگر جب حدود بندی ہو جائے اور راستے الگ ہو جائیں تو پھر شفعہ نہیں۔ (بخاری و مسلم اور یہ الفاظ بخاری کے ہیں) اور مسلم کی ایک روایت میں ہے کہ شفعہ ہر مشترک چیز میں ہے (مثلاً) زمین میں، مکان میں، باغ میں۔ اپنے حصہ دار (شریک) کے روبرو پیش کئے بغیر کسی کیلئے چیز فروخت کرنا درست نہیں اور طحاوی میں ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ہر چیز

شَرِيْكِهِ. وَفِي رِوَايَةِ الطَّحَاوِيِّ: «قَضَى النَّبِيُّ ﷺ بِالشُّفْعَةِ فِي كُلِّ شَيْءٍ». وَرِجَالُهُ ثِقَاتٌ. میں شفعہ کا حق رکھا ہے۔ اس کے راوی ثقہ ہیں۔

لغوی تشریح: ﴿ باب الشفعة ﴾ کے شین پر ضمہ اور "فاء" ساکن ہے اور جس "فاء" کو متحرک سمجھا ہے اس نے غلطی کی ہے۔ لغت میں یہ "الشفع" سے ماخوذ ہے اس کے معنی جوڑا کے ہیں۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ "الزیادۃ" ہے اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ "اعانۃ" سے ہے اور شرعاً شفعہ کا معنی ہے کہ شریک کے حصہ کو شریک کی طرف منتقل کرنا مقرر معاوضہ کے بدلہ میں اجنبی کی طرف منتقل ہو جانا۔ (فتح الباری)

﴿ فاذا وقعت الحدود ﴾ مالک خریدار کو تقسیم کر کے دے دے اور رکاوٹیں واقع ہو جائیں اور آخری حدود متعین ہو جائیں۔ اور تقسیم کے ذریعہ ہر ایک کا حصہ نمایاں و ظاہر ہو جائے۔ ﴿ و صرفت الطرق ﴾ صرفت صیغۂ مجہول۔ "را" مخفف اور مشدد دونوں طرح ہے۔ یعنی راستے اس طرح بنائے جائیں کہ ہر ایک کا حصہ اسے حاصل ہو جائے۔ ﴿ فلا شفعة ﴾ تو شفعہ نہیں۔ یہ حدیث دلیل ہے کہ شفعہ اس جائیداد میں ہو سکتا ہے جو مشترک ملکیت میں ہو محض ہمسایہ ہونا شفعہ دائر کرنے کیلئے کافی نہیں ہے۔ ائمہ ثلاثہ امام مالک رحمہ اللہ، امام شافعی رحمہ اللہ اور امام احمد رحمہ اللہ کی رائے یہی ہے اور جمہور علماء کا بھی یہی مذہب ہے اور اقرب الی الصواب بھی یہی ہے۔ حنفیہ نے ان کی مخالفت کی ہے۔ ان کا قول ہے کہ شفعہ جس طرح مشترک جائیداد میں جائز ہے اسی طرح ہمسائیگی کی بنیاد پر بھی شفعہ جائز ہے۔ ان کی دلیل آگے آ رہی ہے۔ ﴿ فی کل شرك ﴾ شین کے نیچے کسرہ اور "را" ساکن۔ یعنی ہر وہ چیز جس میں کئی آدمی شریک ہوں۔ ﴿ ربعة ﴾ "را" پر فتحہ اور "با" ساکن۔ گھر، مسکن، رہائش گاہ اور بسا اوقات زمین پر بھی اس کا اطلاق ہوتا ہے۔ ﴿ حائط ﴾ باغ۔ خطابی نے کہا ہے کہ شفعہ زمین، گھریلو سامان، ان کے علاوہ دیگر ساز و سامان و متاع اور حیوان وغیرہ میں ہی واجب و لازم ہے۔ یہ رائے اکثر اہل علم کی ہے جیسا کہ ترمذی نے نقل کیا ہے ﴿ لا یصلح ﴾ ایک روایت میں ﴿ لا یحل ﴾ بھی مروی ہے۔ ﴿ ان یبیع ﴾ حلال نہیں یا درست نہیں حصہ دار و شریک کیلئے کہ اپنے حصہ کو اسے اطلاع دیئے بغیر فروخت کر دے۔ سیاق اس پر دلالت کرتا ہے ﴿ حتی یعرض علی شریکه ﴾ اس سے معلوم ہوا کہ شریک کے روبرو اپنا عندیہ و مدعا پیش کر دیا جائے تو پھر فروخت کرنے کی صورت میں شفعہ کا حق نہیں رہتا۔ سبل السلام میں ہے کہ علماء کا اس میں اختلاف ہے کہ جب شریک کو مطلع کر دیا جائے اور اس کے بعد اس کے علاوہ دوسرے سے سودا کر لے تو کیا شریک کیلئے شفعہ کا حق باقی رہتا ہے یا نہیں؟ ایک قول تو یہ ہے اسے اس کا حق ہے۔ پہلے اطلاع دینا اس کی صحت کے مانع نہیں ہے۔ یہ جمہور کا قول ہے مگر سفیان ثوری رحمہ اللہ اور حکم اور ابو عبید اور اہل حدیث کے ایک گروہ کی رائے یہ ہے کہ اطلاع دینے کے بعد شفعہ کا استحقاق ساقط ہو جاتا ہے۔ یہ رائے حدیث کے الفاظ کے زیادہ موافق ہے۔ رہی طحاوی کی روایت تو وہ ہر چیز خواہ منقولہ ہو

یا غیر منقولہ میں شفعہ کا تقاضا کرتی ہے۔ اگرچہ تھوڑے سے اہل علم کی رائے اس کی طرف ہے مگر دلیل کے اعتبار سے یہ قوی ہے۔ جہاں تک ضرر کا تعلق ہے وہ جیسا منقول میں متوقع ہے ویسا ہی غیر منقول میں بھی ہے۔ بہت سے شریک دوسرے کے مقابلہ میں زیادہ سخی' فراخ حوصلہ' نرم مزاج اور طبیعت کے بہت عمدہ ہوتے ہیں اور بہت سے اپنے سے پہلے کے مقابلے میں درشت مزاج اور سخت طبع ہوتے ہیں۔

(٧٦١) وَعَنْ أَبِيْ رَافِعٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ: «الجَارُ أَحَقُّ بِصَقَبِهِ». أَخْرَجَهُ البُخَارِيُّ، وَفِيْهِ قِصَّةٌ.

حضرت ابو رافع رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "ہمسایہ اپنے قریبی ہونے کی وجہ سے زیادہ حق رکھتا ہے۔" (اسے بخاری نے روایت کیا ہے اور اس بارے میں لمبا قصہ ہے)

لغوی تشریح: ﴿بسقبہ﴾ اس میں "با" سببیہ ہے اور سقب کے سین اور قاف پر فتحہ' ان دونوں کے بعد "با" اور سقب کو سین کی بجائے کبھی صاد سے (صقب) بھی پڑھا گیا ہے اور قاف پر فتحہ اور اسے ساکن کرنا بھی جائز ہے۔ قرب اور مجاورت کے معنی ہیں۔ کہنا یہ مقصود ہے کہ ہمسایہ قرب و مجاورت کی بدولت عام مسلمانوں سے خیر خواہی' بھلائی اور معاونت کا زیادہ استحقاق رکھتا ہے۔ جب یہ ہمسایہ شریک لوگوں میں سے نہ ہو تو شفعہ میں اس کے مستحق ہونے کی اس حدیث میں کوئی صراحت و وضاحت نہیں ہے۔ ﴿وفیہ قصۃ﴾ قصہ یہ ہے کہ ابو رافع رضی اللہ عنہ نے سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ سے کہا کہ میرے جو مکان تیری حویلی کے اندر ہیں تو انہیں خرید لے۔ سعد رضی اللہ عنہ نے کہا اللہ کی قسم! میں تو ان کو نہیں خریدوں گا۔ مسور جو اس وقت ان کے پاس موجود تھے نے سعد سے کہا اللہ کی قسم! تمہیں وہ ضرور خریدنے ہوں گے۔ سعد بولا اچھا تو میں بھی اللہ کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ چار ہزار سے زیادہ پر نہیں خریدوں گا وہ اس کی مرضی ہے یکمشت لے یا قسط وار۔ اس پر ابو رافع بولا میں نے پانچ صد دینار میں دیئے۔ اگر میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ ارشاد فرماتے نہ سنا ہوتا کہ ہمسایہ قرب و مجاورت کی وجہ سے زیادہ استحقاق رکھتا ہے تو میں تمہیں یہ چار ہزار میں بھی نہ دیتا۔ اب میں نے صرف پانچ صد دینار میں دیئے۔ یہ کہہ کر اسے دے دیئے۔ بخاری نے اس حدیث کو باب عرض الشفعۃ علی صاحبہا قبل البیع میں روایت کیا ہے۔ جس کسی نے ایسے ہمسایہ کیلئے جو شریک نہیں ہے کیلئے اثبات شفعہ پر استدلال کیا ہے انہوں نے کہا ہے کہ ابو رافع سعد کے شریک نہیں تھے بلکہ صرف ہمسایہ تھے اس لئے کہ سعد کے سارے مکانوں میں اس کے دو مکان تھے۔ سعد کے مکان کے ساتھ اسے حق شفعہ کا کوئی استحقاق نہیں تھا۔ میں کہتا ہوں کہ یہ استدلال دو وجہ سے درست نہیں۔ پہلی وجہ یہ ہے کہ اس حدیث سے اٹھایا ہوا ٹکڑا شفعہ کے بارے میں صریح اور واضح ہی نہیں ہے۔ لہٰذا اس کا احتمال ہے اس سے مراد یہ ہو کہ وہ ہمسایہ بھلائی' اعانت و مدد' خیر خواہی اور ایثار و ترجیح کا زیادہ حقدار ہو۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ جار کا اطلاق جس طرح ایسے پڑوسی اور قریبی پر ہوتا ہے جو شریک نہ ہو اسی طرح اس کا اطلاق شریک پر بھی ہوتا ہے۔ جیسا کہ حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی آئندہ حدیث

میں آپ ملاحظہ فرمائیں گے اور اس کا بھی احتمال ہے کہ جار سے شریک ہی مراد ہو بلکہ وہ تو اس کے اور دوسری احادیث کے درمیان تطبیق متعین کرتا ہے۔ ابورافع نے جو فعل انجام دیا ہے وہ اس کی دلیل نہیں بنتا کہ یہ شریک کے سامنے شفعہ پیش کرنے کے قبیل سے ہے۔ بلکہ اس کا امکان ہے کہ اس سے مراد ہمسایہ کے ساتھ صرف بھلائی اور ایثار ہو۔ اگر ہم تسلیم کرلیں کہ یہ شفعہ پیش کرنے کے قبیل سے ہے تو پھر زیادہ سے زیادہ یہ ہو سکتا ہے کہ ابورافع نے یہ الجار احق بسقبہ کے جملہ سے سمجھا ہے اور یہ معلوم حقیقت ہے کہ ہروہ چیز جو صحابی سمجھے وہ حجت نہیں بن سکتی بالخصوص جبکہ صحابی کا قول صحیح و صریح حدیث سے معارض ہو۔ رسول اللہ ﷺ کا یہ ارشاد کہ جب حدود متعین ہو جائیں اور راستے جدا جدا ہو جائیں تو پھر شفعہ کا حق نہیں رہتا۔ یہ ہمسایہ کیلئے شفعہ کے حق کی نفی میں صریح نص ہے اور جس نے یہ کہا ہے کہ یہ نص ہمسایہ کے اصل حق شفعہ کی نفی پر دلالت نہیں کرتی۔ نہ منطوق پر اور نہ ہی اس کے مفہوم پر۔ پس گویا اس نے منطوق اور مفہوم کا معنی ہی نہیں سمجھا۔ جب زمین اس کے مالکوں میں تقسیم کی جائے گی تو ان میں سے دونوں کم از کم ایک دوسرے کا ہمسایہ ہوگا اور یہ حدیث اس پر نص ہے کہ تقسیم کے بعد شفعہ نہیں۔ تو پھر یہ حدیث ہمسایہ کے حق میں شفعہ کی نفی کیوں نہیں کرتی ہے۔

(٧٦٢) وَعَنْ أَنَسِ بْنِ مَالِكٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «جَارُ الدَّارِ أَحَقُّ بِالدَّارِ». رَوَاهُ النَّسَائِيُّ، وَصَحَّحَهُ ابْنُ حِبَّان، وَلَهُ عِلَّةٌ.

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "مکان کا ہمسایہ اس مکان کا زیادہ حق رکھتا ہے۔" (اسے نسائی نے روایت کیا ہے اور ابن حبان نے اسے صحیح کہا ہے لیکن اس میں علت ہے)

لغوی تشریح: ﴿جار الدار احق بالدار﴾ اس حدیث سے ہمسایہ کیلئے حق شفعہ کے قائلین نے ثبوت شفعہ پر استدلال کیا ہے۔ اس کا جواب یہ دیا گیا ہے کہ اس جگہ ہمسایہ سے شریک ہمسایہ ہی مراد ہے کیونکہ دونوں احادیث میں تطبیق کا یہی تقاضا ہے "ولہ علۃ" علت یہ ہے کہ اس روایت کو دو سندوں سے روایت کیا گیا ہے۔ ایک ان میں سے حسن عن سمرہ کے طریق سے ہے اکثر محدثین کی رائے یہ ہے کہ حسن نے سمرہ سے صرف عقیقہ والی حدیث کے سوا اور کوئی حدیث نہیں سنی اور دوسرا طریق قتادۃ عن انس سے ہے اور قتادہ کے بارے میں معروف و مشہور ہے کہ وہ تدلیس کرتا ہے۔

(٧٦٣) وَعَنْ جَابِرٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «الجَارُ أَحَقُّ بِشُفْعَةِ جَارِهِ، يُنْتَظَرُ بِهَا، وَإِنْ كَانَ غَائِباً، إِذَا كَانَ طَرِيقُهُمَا وَاحِداً». رَوَاهُ أَحْمَدُ وَالأَرْبَعَةُ، وَرِجَالُهُ ثِقَاتٌ.

حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "ہمسایہ اپنے ہمسایہ کا شفعہ میں زیادہ حقدار ہے۔ اس کا انتظار بسبب شفعہ کیا جائے گا۔ اگرچہ وہ غائب ہو جب کہ دونوں کا راستہ ایک ہو۔" (اسے احمد اور چاروں نے روایت کیا ہے۔ اس کے راوی ثقہ ہیں)

لغوی تشریح: ﴿ ینتظر ﴾ صیغہ مجہول۔ ﴿ بھا ﴾ اس میں "ھا" کی ضمیر شفعہ کی جانب راجع ہے۔ ﴿ وان کان غائبا ﴾ ان وصلیہ ہے۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ غیر حاضر کا شفعہ باطل نہیں ہوتا خواہ دیر و تاخیر ہو جائے۔ ﴿ اذا کان طریقھما واحدا ﴾ نیل الاوطار میں ہے کہ یہ حدیث اس بات کی دلیل ہے کہ مجرد ہمسائیگی کے ذریعہ شفعہ ثابت نہیں ہوتا۔ بلکہ اس کے لئے مشترک راستہ ہونا ضروری و لابدی ہے۔ اس کی تائید نبی ﷺ کے اس ارشاد سے بھی ہوتی ہے کہ جب حد بندی ہو جائے اور راستے جدا جدا ہوں تو پھر شفعہ کا استحقاق نہیں رہتا۔

(٧٦٤) وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُمَا، عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ: «الشُّفْعَةُ كَحَلِّ الْعِقَالِ». رَوَاهُ ابْنُ مَاجَهْ وَالْبَزَّارُ، وَزَادَ: «وَلاَ شُفْعَةَ لِغَائِبٍ». وَإِسْنَادُهُ ضَعِيفٌ.

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا "شفعہ رسی کھولنے کی طرح ہے۔" (اسے ابن ماجہ اور بزار نے روایت کیا ہے) اور بزار نے اتنا اضافہ بھی نقل کیا ہے کہ غیر حاضر و غائب کیلئے شفعہ کا کوئی حق نہیں۔" (اس کی سند ضعیف ہے)

لغوی تشریح: ﴿ کحل العقال ﴾ الحل میں "حا" پر فتحہ اور لام پر تشدید۔ اس کے معنی ہیں کھولنا' جو مضبوط باندھنے کی ضد ہے اور عقال اس رسی کو کہتے ہیں جس سے اونٹ کو باندھا جاتا ہے۔ نیل الاوطار میں ہے کہ ابن حزم نے ابن عمر رضی اللہ عنہما سے اس حدیث کو یوں روایت کیا ہے کہ شفعہ رسی کھولنے کی مانند ہے اگر وہ اسے اسی جگہ پر مقید کر دے گا اس کا حق ثابت ہو جائے گا ورنہ ملامت اس کے سر۔ عبدالحق نے الاحکام میں ابن حزم سے اسے ذکر کیا ہے مگر ابن قطان نے ان کا تعاقب کیا ہے کہ ابن حزم نے اسے المحلّٰی میں روایت نہیں کیا۔ ممکن ہے محلّٰی کے علاوہ کسی اور کتاب میں اس کا ذکر کیا ہو۔ نیز حافظ ابن حزم نے اس میں جو اضافہ نقل کیا ہے وہ اس حدیث کے معنی کو واضح کر رہا ہے۔ اس حدیث سے استدلال کیا ہے کہ شفعہ کا استحقاق فی الفور ہے تاخیر اور دیر کی صورت میں شفعہ باطل۔ لیکن یہ حدیث ایسی نہیں ہے کہ اس سے احتجاج کیا جائے کیونکہ اس کی سند میں محمد بن عبدالرحمٰن بیلمانی ہے جو اپنے والد سے ایک ایسا نسخہ بیان کرتا ہے جو تمام تر موضوع ہے۔ اس سے استدلال بالکل جائز نہیں۔ سبل السلام میں ہے کہ بزار نے اسے ضعیف قرار دیا ہے اور ابن حبان نے کہا ہے کہ اس کی کوئی اصل نہیں اور ابو زرعہ نے کہا ہے کہ یہ منکر ہے اور بیہقی کا قول ہے کہ یہ ثابت ہی نہیں۔ اس معنی کی تمام تر احادیث بے اصل ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ شفعہ شریعت میں دفع ضرر کیلئے ہے۔ اس صورت میں یہ فوری کارروائی کا تقاضا کرتا ہے کیونکہ کہا جائے گا کہ شفعہ کرنے والے کو اور خریدار کو سودے کے درمیان میں لٹکنے کی صورت میں کس طرح ضرر و نقصان سے بچایا جا سکتا ہے اس لئے یہ بات مقتضی ہے کہ شفعہ فی الفور کیا جائے۔ مگر یہ بات فی الفور شفعہ کرنے کے اثبات میں کافی نہیں جبکہ شفعہ کے وجود میں فی الفور کی کوئی شرط نہیں۔ اس کے ثبوت کیلئے تو دلیل کی ضرورت ہے مگر اس کی کوئی دلیل نہیں۔

حاصل کلام: اس حدیث میں شفعہ کو اونٹ کے بند کھولنے سے تشبیہہ دی گئی ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ جس طرح اونٹ کا جب زانو بند کھول دیا جائے تو وہ بلا تاخیر فوراً اٹھ کر کھڑا ہو جاتا ہے اسی طرح جس وقت کوئی چیز فروخت ہو یا شفعہ کرنے والے کو اس چیز کے فروخت کئے جانے کا علم ہو اسی وقت بلا تاخیر شفعہ کر دے ورنہ تاخیر کی صورت میں اس کا شفعہ قابل قبول نہیں ہوگا اور شفعہ کا جو استحقاق اسے حاصل تھا وہ باطل ہو کر رہ جائے گا۔ یہ رائے احناف کی ہے۔ محدثین کے نزدیک تاخیر سے حق شفعہ باطل نہیں ہوتا کیونکہ شفعہ کی احادیث مطلق ہیں اور ابن عمر رضی اللہ عنہما کی یہ حدیث قابل استدلال نہیں ہے۔ نیز جب شفعہ کرنے والا کم سن ہو یا وہ اس وقت وہاں موجود نہ ہو تو بھی ان کو حق شفعہ کا استحقاق رہتا ہے جیسا کہ اوپر حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی حدیث میں ہے کہ اگر ہمسایہ اس موقع پر موجود نہ ہو تو اس کا انتظار کیا جائے۔ ظاہر ہے اگر اس کا حق شفعہ باطل ہو تا تو پھر اس کا انتظار کرنے کے کیا معنی؟

١٤ - بَابُ الْقِرَاضِ

مضاربت کا بیان

(٧٦٥) عَنْ صُهَيْبٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُ، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ قَالَ: «ثَلاَثٌ فِيهِنَّ الْبَرَكَةُ الْبَيْعُ إِلَى أَجَلٍ، وَالْمُقَارَضَةُ، وَخَلْطُ الْبُرِّ بِالشَّعِيرِ لِلْبَيْتِ، لاَ لِلْبَيْعِ». رَوَاهُ ابْنُ مَاجَهْ بِإِسْنَادٍ ضَعِيفٍ.

حضرت صہیب رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "تین کام بڑے بابرکت ہیں۔ ایک مدت مقررہ تک بیچنا اور مضاربت کرنا اور گندم میں جو ملانا گھر کیلئے' فروخت کرنے کیلئے نہیں۔" (اسے ابن ماجہ نے ضعیف سند سے روایت کیا ہے)

لغوی تشریح: ﴿ باب القراض ﴾ میں قاف کے نیچے کسرہ اور اہل حجاز لغت میں مقارضہ بولتے ہیں۔ اس کی صورت یہ ہے کہ سرمایہ ایک آدمی کا ہو اور وہ اپنا سرمایہ کسی دوسرے آدمی کو تجارت کرنے کے لئے دے اس شرط پر کہ دونوں میں طے شدہ شرائط کے مطابق منافع تقسیم ہو گا۔

حاصل کلام: اس کی سند اس لئے ضعیف ہے کہ اس میں تین راوی مجہول ہیں۔ ایک نصر بن قاسم' دوسرا عبدالرحیم بن داؤد اور تیسرا صالح بن صہیب۔ اس لئے یہ روایت ضعیف ہے۔

راوی حدیث ﴿ صہیب رضی اللہ عنہ ﴾ ابو یحییٰ صہیب بن سنان رومی۔ اصل میں عرب ہیں نمر بن قاسط بن وائل قبیلہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ رومیوں نے انہیں بچپن میں قید کر لیا تھا۔ انہی میں نشوونما پائی اس وجہ سے رومی کہلائے۔ ایک قول کے مطابق جب یہ بڑے ہوئے اور سن شعور کو پہنچے تو ان کے ہاں سے بھاگ کر مکہ میں پہنچ گئے اور عبداللہ بن جدعان کے حلیف بن گئے اور ایک قول یہ بھی ہے کہ بنو کلب نے ان کو رومیوں سے خرید لیا اور اسے مکہ میں لے آئے اور وہاں عبداللہ بن جدعان مشہور صحابی نے جو قدیم الاسلام تھے ان کو خرید لیا۔ اللہ کی راہ میں ان کو بڑی سزا دی گئی۔ پھر مدینہ کی طرف ہجرت کی اور

مدینہ منورہ ہی میں ۳۸ھ میں وفات پائی۔

(٧٦٦) وَعَنْ حَكِيمِ بْنِ حِزَامٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُ، أَنَّهُ كَانَ يَشْتَرِطُ عَلَى الرَّجُلِ، إِذَا أَعْطَاهُ مَالاً مُقَارَضَةً، أَن لاَّ تَجْعَلَ مَالِيْ فِي كَبِدٍ رَطْبَةٍ، وَلاَ تَحْمِلُهُ فِيْ بَحْرٍ، وَلاَ تَنْزِلَ بِهِ فِي بَطْنِ مَسِيْلٍ، فَإِنْ فَعَلْتَ شَيْئاً مِنْ ذٰلِكَ، فَقَدْ ضَمِنْتَ مَالِي. رَوَاهُ الدَّارَقُطْنِيُّ، وَرِجَالُهُ ثِقَاتٌ.

حضرت حکیم بن حزام رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ وہ جب کسی شخص کو مضاربت پر اپنا سرمایہ دیتے تھے تو اس سے یہ شرط کر لیا کرتے تھے کہ میرے مال سے حیوان کی تجارت نہ کرو گے اور سمندر میں لے کر بھی نہیں جاؤ گے اور سیلاب کی جگہوں میں لے کر اسے نہیں جاؤ گے۔ ان میں سے کوئی کام بھی اگر تم نے کیا تو میرے مال کے تم خود ضامن و ذمہ دار ہو گے۔ (اسے دارقطنی نے روایت کیا ہے اور اس کے راوی ثقہ ہیں)

لغوی تشریح: ﴿فی کبد رطبة﴾ اس سے مراد حیوان ہے۔ یعنی ذی روح نفس۔ ﴿بطن مسیل﴾ پانی کے بہنے کی جگہ یعنی وادی۔ ﴿ضمنت مالی﴾ میرے مال کا تو ذمہ دار و ضامن ہو گا' اگر وہ ضائع ہو گیا۔ یہ حدیث اس پر دلیل ہے کہ مالک سرمایہ مضاربت کرنے والے کو جس چیز سے چاہے روک سکتا ہے۔

وَقَالَ مَالِكٌ فِي الْمُوَطَّأِ عَنِ الْعَلاَءِ بْنِ عَبْدِ الرَّحْمٰنِ بْنِ يَعْقُوبَ، عَنْ أَبِيْهِ عَنْ جَدِّهِ: أَنَّهُ عَمِلَ فِي مَالٍ لِّعُثْمَانَ، عَلَى أَنَّ الرِّبْحَ بَيْنَهُمَا. وَهُوَ مَوْقُوفٌ صَحِيْحٌ.

امام مالک رحمہ اللہ نے مؤطا میں علاء بن عبدالرحمٰن بن یعقوب باپ اور اس کے دادا کے واسطہ سے بیان کیا ہے کہ اس نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے مال میں تجارت اس شرط پر کی تھی کہ منافع دونوں کے درمیان تقسیم ہو گا۔ (یہ حدیث موقوف صحیح ہے)

راوی حدیث: ﴿علاء﴾ ان کی کنیت ابوشبل ہے اور سلسلۂ نسب یوں ہے۔ علاء بن عبدالرحمٰن بن یعقوب جہنی۔ قبیلہ حرقہ کے آزاد کردہ غلام تھے۔ حرقہ کے "حا" پر ضمہ اور "را" پر فتحہ ہے۔ مدینہ کے باشندے تھے۔ صغار تابعین کے مشہور بزرگوں میں سے تھے۔ صدوق تھے کبھی وہم بھی ہو جایا کرتا تھا۔ امام احمد رحمہ اللہ دوسرے محدثین نے ثقہ قرار دیا ہے۔ واقدی نے کہا ہے کہ خلیفہ منصور عباس کے دور میں وفات پائی۔

﴿عبدالرحمن بن یعقوب﴾ عبدالرحمٰن بن یعقوب جہینہ قبیلہ سے ہونے کی بنا پر جہنی کہلائے اور مدینہ میں قیام پذیر ہونے کی وجہ سے مدنی کہلائے۔ اوسط تابعین کے زمرہ میں شمار ہوتے ہیں۔ انہوں نے اپنے والد کے علاوہ حضرت ابوھریرہ رضی اللہ عنہ اور حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے حدیث سنی ہے۔

﴿ یعقوب ﴾ یعقوب جھنی حرقہ کے آزاد کردہ غلام تھے۔ کبار تابعین میں شمار ہوتے تھے۔ انہوں نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے ملاقات کی اور ان سے روایت بھی کی ہے۔ یہ ان لوگوں میں سے تھے جن سے قلیل روایات مروی ہیں۔

١٥ - بَابُ الْمُسَاقَاةِ وَالإِجَارَةِ آبپاشی اور زمین کو ٹھیکہ پر دینے کا بیان

(٧٦٧) عَنِ ابْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُمَا، أَنَّ رَسُولَ اللهِ ﷺ عَامَلَ أَهْلَ خَيْبَرَ بِشَطْرِ مَا يَخْرُجُ مِنْهَا مِنْ ثَمَرٍ أَوْ زَرْعٍ. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اہل خیبر سے اس طرح معاملہ طے کیا کہ پھل اور کھیتی باڑی سے جو کچھ حاصل ہو اس میں سے آدھا تمہارا۔ (بخاری و مسلم)

وَفِيْ رِوَايَةٍ لَّهُمَا: فَسَأَلُوا أَنْ يُقِرَّهُمْ بِهَا، عَلَى أَنْ يَكْفُوا عَمَلَهَا، وَلَهُمْ نِصْفُ الثَّمَرِ، فَقَالَ لَهُمْ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «**نُقِرُّكُمْ بِهَا عَلَى ذٰلِكَ مَا شِئْنَا**»، فَقَرُّوا بِهَا، حَتَّى أَجْلاَهُمْ عُمَرُ.

اور ان دونوں کی ایک روایت میں ہے کہ اہل خیبر (یہود) نے خود آپؐ سے مطالبہ کیا کہ آپؐ ان کو یہاں ٹھہرنے دیں یعنی زمینوں پر قابض رہنے دیں۔ وہ کھیتی باڑی کریں گے اور اس کی پیداوار میں سے مسلمانوں کو آدھا حصہ دیا کریں گے۔ تو نبی ﷺ نے فرمایا ''اس شرط پر کہ ہم تمہیں جب تک چاہیں گے رہنے دیں گے۔'' یہ فرما کر ان کو ان زمینوں پر برقرار رکھا۔ یہ زمینوں پر برقرار رہے تاآنکہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان کو جلا وطن کر دیا اور مسلم کی ایک روایت میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے خیبر کے یہود کو خیبر کی کھجوریں اور زمین اسی شرط پر دی تھیں کہ وہ اپنے اموال سے ان پر کام کریں گے اور ان کیلئے ان کی پیداوار کا آدھا حصہ ہو گا۔

وَلِمُسْلِمٍ: أَنَّ رَسُولَ اللهِ ﷺ دَفَعَ إِلَى يَهُوْدِ خَيْبَرَ نَخْلَ خَيْبَرَ وَأَرْضَهَا، عَلَى أَنْ يَعْتَمِلُوهَا مِنْ أَمْوَالِهِمْ، وَلَهُمْ شَطْرُ ثَمَرِهَا.

لغوی تشریح: ﴿ باب المساقاۃ والاجارۃ ﴾ مساقاۃ کہتے ہیں کہ کھجور کے درختوں کا مالک اپنے درخت ایک آدمی کو دے کہ وہ اس میں کام کرے تاکہ وہ درختوں کی نگرانی کرے اور پھل صحیح طور پر پک جائے۔ تو پھل پکنے پر آدھا مالک کا اور آدھا کام کرنے والے کا ہو گا۔ پس دو حصوں میں سے ایک حصہ تو فی نفسہٖ درختوں کا ہے اور دوسرا عمل کا ہے جیسا مزارعت میں ہوتا ہے اور مشہور قول کے مطابق

اجارۃ میں ھمزہ کے نیچے کسرہ ہے اور یہ لغت میں اجرت کا نام ہے اور شرعاً یہ ایسا عقد ہے جس سے معلوم منافع مقصود ہو خرچ کرنے کے قابل ہو اور معلوم معاوضہ کے بدلہ مباح ہو جیسا کہ علامہ خطابی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے۔ ﴿ بشطر مایخرج ﴾ شطر کا معنی نصف۔ اس سے معلوم ہوا کہ جتنے حصہ پر اتفاق ہو وہ معلوم ہونا چاہئے مجہول نہیں۔ ﴿ یقرھم بھا ﴾ ان کو خیبر پر برقرار رکھا۔ ﴿ یکفوا ﴾ کفایت سے ماخوذ ہے۔ ﴿ فقروا ﴾ "را" پر تشدید قرار سے ماخوذ ہے۔ باب سمع اور ضرب دونوں سے آتا ہے۔ معنی اس کا یہ ہے کہ آنجناب صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو برقرار رکھا۔ ﴿ اجلاھم ﴾ ان کو جلا وطن کر دیا نکال کر۔ تیماء اور اریحاء کی طرف بھیج دیا۔ ﴿ یعتملوھا ﴾ ان زمینوں کی آباد کاری اور درستگی کیلئے جدوجہد اور مساعی کریں اور ان کو درست و ٹھیک کرنے کیلئے آلات تمام کے تمام مثلاً کلہاڑی، کدال اور دارنتی وغیرہ اپنے استعمال کریں گے۔

حاصل کلام: اس حدیث سے نصف، نصف کی بٹائی پر زمین دینا ثابت ہے۔ امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے سوا باقی ائمہ ثلاثہ اور علماء سلف و خلف مزارعت کے قائل ہیں۔

خیبر کے یہود کو آپؐ نے زمین جس شرط پر دی تھی اس کی رو سے پیداوار حاصل کرنے کیلئے جتنے کام بھی ہوتے ہیں سب ان کے ذمہ تھے۔ جیسے زمین سیراب کرنا، نہروں کی صفائی و کھدائی، گھاس پھونس سے فصل کو محفوظ رکھنا وغیرہ۔ احناف نے خیبر کے معاملہ کی جو تاویل کی ہے کہ یہ لوگ آپؐ کے غلام تھے صحیح نہیں ہے کیونکہ آپؐ کا ارشاد گرامی ہے کہ نقرکم ما اقرکم اللہ ہم تمہیں صرف اس وقت تک برقرار رکھیں گے جب تک تمہیں اللہ تعالیٰ برقرار رکھے گا۔ اس سے تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ آپؐ کے غلام نہیں تھے۔ تو پھر احناف کی یہ تاویل بھی باطل اور مردود ہے کہ وہ آپؐ کے غلام تھے۔

(٧٦٨) وَعَنْ حَنْظَلَةَ بْنِ قَيْسٍ، قَالَ: سَأَلْتُ رَافِعَ بْنَ خَدِيْجٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ عَنْ إِكْرَآءِ الأَرْضِ بِالذَّهَبِ وَالفِضَّةِ، فَقَالَ: لاَ بَأْسَ بِهِ، إِنَّمَا كَانَ النَّاسُ يُؤَاجِرُوْنَ عَلَى عَهْدِ رَسُولِ اللهِ ﷺ عَلَى المَاذِيَانَاتِ، وَأَقْبَالِ الجَدَاوِلِ، وَأَشْيَآءَ مِنَ الزَّرْعِ، فَيَهْلِكُ هٰذَا وَيَسْلَمُ هٰذَا، وَيَسْلَمُ هٰذَا وَيَهْلِكُ هٰذَا، وَلَمْ يَكُن لِلنَّاسِ كِرَآءٌ إِلاَّ هٰذَا، فَلِذٰلِكَ زَجَرَ عَنْهُ، فَأَمَّا شَيْءٌ

حضرت حنظلہ بن قیس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے رافع بن خدیج رضی اللہ عنہ سے پوچھا کہ سونے اور چاندی کے عوض زمین ٹھیکے پر دینا کیسا ہے؟ انہوں نے جواب دیا کہ اس میں کوئی مضائقہ نہیں اس لئے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں لوگ اپنی زمین اس شرط پر دیا کرتے تھے کہ جو کچھ پانی کی نالیوں اور پانی کے بہاؤ میں پیدا ہو گا اور کچھ حصہ باقی کھیتی کا وہ تو میں لوں گا۔ پھر کبھی ایسا ہوتا یہ حصہ تباہ و برباد ہو جاتا اور کبھی ایسا ہوتا کہ اس حصہ میں کچھ پیداوار ہی نہ ہوتی اور لوگوں کو ٹھیکہ اسی صورت میں حاصل ہوتا تھا۔ اسی لئے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس

مَّعْلُوْمٌ مَّضْمُونٌ، فَلاَ بَأْسَ بِهِ. رَوَاهُ مُسْلِمٌ. سے منع فرمایا تھا۔ پس اگر کوئی چیز مقرر ہو تو اس میں کوئی حرج نہیں۔ (مسلم)

وَفِيْهِ بَيَانٌ لِّمَا أُجْمِلَ فِي الْمُتَّفَقِ عَلَيْهِ مِنْ إِطْلاَقِ النَّهْيِ عَنْ كِرَآءِ الأَرْضِ. اور اس میں اس کا بھی بیان ہے جسے بخاری و مسلم نے مجمل بیان کیا ہے کہ "زمین ٹھیکے پر نہ دیا کرو۔"

لغوی تشریح: ﴿ماذیانات﴾ علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ اس میں ذال کے نیچے کسرہ ہے اور قاضی عیاض نے بعض راویوں سے صحیح مسلم کے علاوہ ذال کے فتحہ سے بھی بیان کیا ہے۔ یعنی پانی بہنے کی جگہیں اور ایک قول یہ بھی ہے کہ پگڈنڈیوں کے دونوں جانب کناروں پر اگنے والی چیزیں اور ایک قول یہ بھی ہے جو کچھ چھوٹی ندیوں کے اردگرد اُگتا ہے۔ علامہ خطابی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ یہ معرب ہے یعنی عجمی لوگ اسے اپنی بول چال میں استعمال کرتے ہیں۔ اہل عرب نے بھی اسے عربی شکل دے کر عربی میں استعمال کرنا شروع کر دیا ﴿اقبال الجداول﴾ اقبال میں همزہ پر فتحہ قبل کی جمع اور "جداول" چھوٹی ندی نالے یعنی ندیوں کے سروں اور ان کے شروع میں پیدا ہونے والی پیداوار۔ یہ حدیث مساقات و مزارعت کی جس صورت کو ممنوع قرار دے رہی ہے' وہ ہے نامعلوم پیداوار اور اس کی مقدار۔ یہ لوگ فاسد شرطیں طے کرتے تھے' ان سے منع کیا گیا ہے۔ بسا اوقات ایسا ہوتا تھا کہ ندیوں' نالوں اور پگڈنڈیوں کے گرد پیداوار کو اپنے لئے مخصوص کر لیتے جو سالم رہ جاتی تھی اور باقی فصل ساری برباد ہو جاتی تھی یعنی جو مشترک کھیتی باڑی ہوتی وہ برباد ہو جاتی کہ کچھ بھی حاصل نہ ہوتا۔ اس صورت میں دھوکہ و فریب اور کھلا کھلا خطرہ پایا جاتا ہے۔

راوی حدیث: ﴿حنظلہ رحمۃ اللہ علیہ﴾ بن قیس بن عمرو زرقی انصاری۔ اہل مدینہ کے ثقہ تابعی ہیں۔ ایک قول کے مطابق ان کو مشرف رؤیت نبویﷺ حاصل ہے۔

(٧٦٩) وَعَنْ ثَابِتِ بْنِ الضَّحَّاكِ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، أَنَّ رَسُولَ اللهِ ﷺ نَهَى عَنِ الْمُزَارَعَةِ، وَأَمَرَ بِالْمُؤَاجَرَةِ. رَوَاهُ مُسْلِمٌ أَيْضاً.

حضرت ثابت بن ضحاک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے مزارعت سے منع فرمایا ہے اور ٹھیکہ پر دینے کی اجازت مرحمت فرمائی ہے۔ (مسلم)

لغوی تشریح: ﴿بالمواجرۃ﴾ سونے یا چاندی کے عوض زمین ٹھیکہ پر دینا۔ یہ حدیث مزارعت کی ممانعت پر دلالت کرتی ہے اور بظاہر ان احادیث کے معارض و مخالف ہے جن میں اس کی اجازت دی گئی ہے مگر ابوداؤد میں حضرت عروہ کی روایت سے یہ اشکال رفع ہو جاتا ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں کہ زید بن ثابت نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ رافع بن خدیج رضی اللہ عنہ کو معاف فرمائے' میں اللہ کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ اس حدیث کا مجھے ان سے زیادہ علم ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں دو انصاری آدمی آئے۔ دونوں جھگڑ رہے تھے۔ یہ صورتحال دیکھ کر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ "اگر تمہاری یہ حالت ہے

تو پھر کھیتی باڑی ٹھیکہ پر نہ دیا کرو۔" پس رافع نے آپؐ کے ارشاد کا بس لا تکروا المزارع کا جملہ سن لیا۔ زید کی مراد یہ تھی کہ رافع نے حدیث کا پہلا حصہ نہیں سنا لہٰذا یہ مقصود کے حصول میں مخل ہوا ہے۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اس سے منع تو نہیں فرمایا بلکہ یہ فرمایا تھا کہ "تم میں سے کسی ایک کا اپنی زمین کو فائدہ اٹھانے کیلئے دینا اس سے بہتر ہے کہ وہ اس کے بدلہ میں معلوم و متعین محصول لے۔" اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ حدیث میں جو نھی ہے وہ دراصل قبل از اسلام رائج طریقہ کی ہے جو پہلی حدیث میں ذکر ہو چکی ہے۔

حاصل کلام: اس حدیث میں جو نھی وارد ہوئی ہے اسے علماء نے نہی تنزیہی پر محمول کیا ہے۔ دراصل بات یہ تھی کہ آغاز اسلام میں مہاجرین بالخصوص حاجت مند و ضرورت مند تھے۔ ان کے پاس زمین نہیں تھیں۔ انصار کے پاس زائد زمین کافی تھیں تو نبی ﷺ نے جس طرح انصار و مہاجرین میں بھائی چارہ یعنی مواخاۃ قائم فرمائی تھی۔ اسی طرح انصار کو اپنے وطن سے بے وطن بھائیوں (مہاجرین) کو بطور احسان زمینیں دلانے کیلئے حکمت کے طور پر منع فرمایا تھا کہ اپنے بھائیوں کو کوئی محصول وصول کئے بغیر زمینیں دیں۔ یہ نھی تنزیہی اب بھی بدستور موجود ہے منسوخ نہیں ہوئی یا پھر اس سے مراد وہی صورت ہوگی جس میں کسی ایک فریق کیلئے دھوکہ اور فریب کا امکان ہو۔ امر بالمواجرۃ کا جملہ اسی مفہوم کی غمازی کر رہا ہے۔ ویسے اجارہ پر دینے سے دوسرے کو آسانی اور سہولت ہوتی ہے۔ اس لئے ابتداء میں مزارعت سے منع فرما دیا تھا مگر جب زمین کی بہتات ہوگئی تو پھر یہ پابندی ختم ہوگئی۔

راوی حدیث: ﴿ ثابت بن ضحاک رضی اللہ عنہ ﴾ ابو یزید ان کی کنیت ہے۔ ثابت بن ضحاک بن خلیفہ نام ہے۔ انصاری ہیں' خزرج کے قبیلہ اشھل سے ہونے کی وجہ سے اشھلی کہلائے۔ مشہور صحابی ہیں یہ ان حضرات میں سے ایک صحابی ہیں جنہوں نے بیعت رضوان کی تھی' اس وقت یہ چھوٹے تھے۔ ایک قول کی رو سے ۴۵ھ میں وفات پائی مگر صحیح یہ ہے کہ فتنہ ابن زبیر کے دوران ۶۴ھ میں فوت ہوئے۔

(۷۷۰) وَعَنْ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا، أَنَّهُ قَالَ: اَحْتَجَمَ رَسُولُ اللهِ ﷺ، وَأَعْطَى الَّذِيْ حَجَمَهُ أَجْرَهُ، وَلَوْ كَانَ حَرَاماً لَمْ يُعْطِهِ. رَوَاهُ الْبُخَارِيُّ.

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے خود سینگی لگوائی اور سینگی لگانے والے کو اس کا معاوضہ و اجرت بھی عطا فرمائی۔ اگر یہ اجرت حرام ہوتی تو آپؐ یہ معاوضہ عنایت نہ فرماتے۔ (بخاری)

(۷۷۱) وَعَنْ رَافِعِ بْنِ خَدِيْجٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: كَسْبُ اَلْحَجَّامِ

حضرت رافع بن خدیج رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا حجام "(سینگی لگانے والا) کی کمائی خبیث ہے یعنی سینگی لگانے کا کام بہت برا

خَبِيْثٌ. رَوَاهُ مُسْلِمٌ. ہے۔" (مسلم)

لغوی تشریح: ﴿کسب الحجام خبیث﴾ گھٹیا اور رذیل پیشہ ہے۔ اس سے یہ مراد نہیں ہے کہ وہ حرام پیشہ ہے۔ لفظ خبیث مطلق طور پر بول کر اس سے رذیل اور گھٹیا مراد لیتے ہیں۔ جیسا ارشاد باری تعالیٰ ہے۔ ولا تیمموا مخبیث منہ تنفقون (۲: ۲۶۷) لہٰذا ردی مال اور گھٹیا چیز کو خبیث کے نام سے موسوم کر دیتے ہیں ورنہ وہ حرام نہیں ہے۔ جمہور علماء پیشۂ حجام کو مباح سمجھتے ہیں۔ دلیل کے اعتبار سے یہی رائے قوی اور مضبوط ہے جیسا کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی پہلی حدیث سے معلوم ہوتا ہے۔

(۷۷۲) وَعَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «قَالَ اللَّهُ عَزَّ وَجَلَّ: ثَلَاثَةٌ أَنَا خَصْمُهُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ، رَجُلٌ أَعْطَى بِيْ ثُمَّ غَدَرَ، وَرَجُلٌ بَاعَ حرًّا فَأَكَلَ ثَمَنَهُ، وَرَجُلٌ اسْتَأْجَرَ أَجِيْراً فَاسْتَوْفَى مِنْهُ وَلَمْ يُعْطِهِ أَجْرَهُ». رَوَاهُ مُسْلِمٌ.

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ "ارشاد باری تعالیٰ ہے کہ میں قیامت کے روز تین آدمیوں کا مدعی بنوں گا پہلا وہ آدمی جو میرے نام عہد و ضمانت دے کر بدعہدی کرے۔ دوسرا وہ آدمی جو ایک آزاد آدمی کو فروخت کرے اور اس کی قیمت کھائے۔ تیسرا وہ آدمی جس نے مزدور سے کام تو پورا لیا مگر اس کی مزدوری پوری نہ دی۔" (مسلم)

لغوی تشریح: ﴿اعطی بی﴾ یعنی اس نے میرا نام لے کر قسم کھائی، حلف لیا اور میرے نام سے معاہدہ کیا یا میرے نام پر کسی کو امان دی اور جو میں نے اپنے دین میں مقرر کیا ہے۔ (سبل السلام) ﴿استوفی منہ﴾ یعنی اس سے کام تو پورا اور مکمل لیا۔

(۷۷۳) وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا، أَنَّ رَسُولَ اللهِ ﷺ قَالَ: «إِنَّ أَحَقَّ مَا أَخَذْتُمْ عَلَيْهِ أَجْراً كِتَابُ اللَّهِ». أَخْرَجَهُ الْبُخَارِيُّ.

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "بے شک سب سے زیادہ مستحق کام جس کی اجرت لی جائے کتاب اللہ ہے۔" (بخاری)

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ قرآن مجید کی تعلیم، کتابت و طباعت وغیرہ کا معاوضہ لینا جائز ہے۔ امام شافعی رحمہ اللہ و مالک رحمہ اللہ اور امام اسحٰق رحمہ اللہ کی یہی رائے ہے، البتہ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے نزدیک تعلیم قرآن کی تنخواہ لینا ناجائز ہے۔ البتہ اگر کوئی آدمی کسی سے طے کئے بغیر تعلیم حاصل کرتا ہے اور ازخود اپنی مرضی سے استاذ کی مالی امداد کرتا ہے تو اسے کسی نے ناجائز نہیں کہا۔

(۷۷٤) وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "مزدور کو اس کی مزدوری اس کا پسینہ

ﷺ: «أَعْطُوا الأَجِيرَ أَجْرَهُ، قَبْلَ أَنْ يَجِفَّ عَرَقُهُ». رَوَاهُ ابْنُ مَاجَهْ.

وَفِي البَابِ عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ عِنْدَ أَبِي يَعْلَى وَالبَيْهَقِيِّ، وَجَابِرٍ عِنْدَ الطَّبَرَانِيِّ، وَكُلُّهَا ضِعَافٌ.

خشک ہونے سے پہلے ادا کر دو۔" (اسے ابن ماجہ نے روایت کیا ہے اور اس باب میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی روایت ابو یعلیٰ اور بیہقی نے بیان کی ہے اور طبرانی میں حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے مگر یہ ساری ہی روایات ضعیف ہیں۔)

(٧٧٥) وَعَنْ أَبِي سَعِيدٍ الخُدْرِيِّ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ قَالَ: «مَنِ اسْتَأْجَرَ أَجِيراً فَلْيُتِمَّ لَهُ أُجْرَتَهُ»، رَوَاهُ عَبْدُ الرَّزَّاقِ، وَفِيهِ انْقِطَاعٌ، وَوَصَلَهُ البَيْهَقِيُّ مِنْ طَرِيقِ أَبِي حَنِيفَةَ.

حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا "جو آدمی کسی مزدور کو اجرت پر کام کیلئے لگائے تو اسے اس کی پوری اجرت دینی چاہئے۔" (اسے عبدالرزاق نے روایت کیا ہے اور اس کی سند میں انقطاع ہے اور بیہقی نے اس حدیث کو ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے واسطہ سے موصول روایت کیا ہے)

لغوی تشریح: ﴿فلیتم اجرتہ﴾ مزدور کی اجرت و معاوضہ بغیر کسی کمی کے پورا دینا چاہیے اور سبل السلام مطبوعہ مطبع مصطفیٰ محمد صاحب مکتب تجاریہ مصر ١٣٥٣ھ کے ایک نسخہ میں "فلیسم" ہے جو تسمیہ سے ماخوذ ہے۔ اس صورت میں معنی ہوگا کہ مزدور کو کام پر لگانے سے پہلے مزدوری کا تعین ہونا چاہئے تاکہ عدم تعین کی وجہ سے معاملہ باہمی نزاع اور جھگڑے کی صورت اختیار نہ کر جائے۔

١٦ - بَابُ إِحْيَاءِ المَوَاتِ — بے آباد و بنجر زمین کو آباد کرنے کا بیان

(٧٧٦) وَعَنْ عُرْوَةَ عَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُمَا، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ قَالَ: «مَنْ عَمَّرَ أَرْضاً لَيْسَتْ لِأَحَدٍ فَهُوَ أَحَقُّ بِهَا»، رَوَاهُ البُخَارِيُّ. قَالَ عُرْوَةُ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ: وَقَضَى بِهِ عُمَرُ فِي خِلَافَتِهِ.

حضرت عروہ رضی اللہ عنہ نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت کیا ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا "جس کسی نے غیر آباد زمین کو آباد کیا۔ وہ اس زمین کا زیادہ حقدار ہے۔" عروہ رضی اللہ عنہ نے کہا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے دور خلافت میں اسی پر فیصلہ فرمایا۔ (بخاری)

لغوی تشریح: ﴿باب احیاء الموات﴾ "موات" کے میم پر فتحہ اور واؤ مخفف۔ ایسی زمین جو بے کار و بے آباد ہو جس کا کوئی مالک نہ ہو اور نہ کوئی کھیتی باڑھی' باغبانی یا تعمیرات کے ذریعہ اس سے فائدہ حاصل کرتا ہو۔ اور اسے آباد کرنے سے مراد اس میں کھیتی باڑی یا باغبانی یا کوئی تعمیراتی کام کرنا یا کنواں کھودنا اور اسے پختہ کر کے اس کی طرف پانی جاری کرنا۔ ﴿عمر﴾ میم پر تشدید اور تخفیف یعنی آباد کیا' تعمیر کیا۔ ﴿فھو احق بھا﴾ یہ زمین اسی کی ملکیت ہوگی خواہ وہ زمین آباد کاری کے قریب ہو یا بعید (حکمران و سربراہ)

نے اس کی اجازت دی ہو یا نہ دی ہو۔ یہ جمہور کا قول ہے مگر امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ نے مطلقاً امام کے اذن و اجازت کی شرط لگائی ہے اور امام مالک رحمہ اللہ نے یہ شرط لگائی ہے کہ صرف وہ زمین جو اہل قریہ کے قریب ہو اس کے بارے میں امام کی اجازت ضروری ہے اور قریب کا ضابطہ یہ ہے کہ آباد ہونے والوں کیلئے اپنے جانوروں کو چرانا اور ان کی حفاظت وغیرہ جس میں آسان ہو۔

حاصل کلام: اس حدیث کی رو سے بے آباد و بنجر زمین کو جو آباد کر لے وہ اسی کی ملکیت میں آجاتی ہے بشرطیکہ وہ کسی مسلمان یا ذمی کی ملکیت میں نہ ہو۔ اس میں بادشاہ وقت کی اجازت کی بھی چنداں ضرورت نہیں۔ جمہور علماء کی یہی رائے ہے البتہ امام مالک رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ امام و بادشاہ سے اس وقت اجازت لی جائے گی جبکہ وہ زمین آبادی کے قریب واقع ہوگی۔ امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کے نزدیک تو ہر صورت میں بادشاہ سے اجازت لینا ضروری ہے۔ یہ حکم بھی صرف مسلمان کے لئے ہے کافر کے لئے اس کی گنجائش نہیں ہے

(۷۷۷) وَعَنْ سَعِيْدِ بْنِ زَيْدٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُ، عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ: «مَنْ أَحْيَا أَرْضاً مَيِّتَةً. فَهِيَ لَهُ». رَوَاهُ الثَّلاَثَةُ، وَحَسَّنَهُ التِّرْمِذِيُّ، وَقَالَ: رُوِيَ مُرْسَلاً، وَهُوَ كَمَا قَالَ، واخْتُلِفَ فِي صَحَابِيِّهِ، فَقِيْلَ: جَابِرٌ، وَقِيْلَ: عَائِشَةُ، وَقِيْلَ: عَبْدُ اللهِ بْنُ عُمَرَ، وَالرَّاجِحُ الأَوَّلُ.

حضرت سعید بن زید رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا کہ "جس کسی نے بے آباد و بے کار پڑی زمین کو زندہ کیا وہ اسی کی ملکیت ہے۔" (اسے تینوں نے روایت کیا ہے اور ترمذی نے حسن کہا ہے اور یہ بھی کہا ہے کہ اسے مرسل بھی روایت کیا گیا ہے اور وہ اسی طرح ہے جس طرح کہا ہے۔ اس حدیث کے صحابی میں اختلاف ہے۔ ایک قول ہے کہ وہ حضرت جابر رضی اللہ عنہ ہیں اور کہا گیا ہے کہ وہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا ہیں اور ایک قول یہ بھی ہے کہ وہ عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما ہیں۔ مگر راجح قول پہلا ہی ہے)

لغوی تشریح: ﴿ ارضا میتۃ ﴾ میتہ میں "یا" مخفف بھی ہے اور اس پر تشدید بھی۔ یہ وہ زمین ہے جسے ابھی تک آباد نہ کیا گیا ہو۔ اسے آباد کرنے کو زندہ کرنے سے تشبیہہ دی گئی ہے اور بیکار چھوڑے رکھنے کو اس کی موت سے تعبیر کیا گیا ہے۔

حاصل کلام: ان دونوں احادیث میں زمین کو آباد کرنے اور اس میں فصل بونے' باغ لگانے' پانی محفوظ کرنے کیلئے کنواں وغیرہ کھودنے کی اجازت ہے کہ جو کوئی بے آباد زمین آباد کرے گا وہ اسی کی ملکیت ہوگی۔ گویا اسلام میں بیکار زمین پڑھی رہنے کا تصور نہیں۔ اسے بہرنوع آباد ہونا چاہئے کسی ملک کے استحکام کا بھی یہی تقاضا ہے اور اس سے انفرادی ملکیت کا بھی ثبوت ملتا ہے۔

(۷۷۸) وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُمَا، أَنَّ الصَّعْبَ بْنَ

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ مصعب بن جثامہ لیثی رضی اللہ عنہ نے ان کو بتایا کہ نبی ﷺ نے

جَثَّامَةَ اللَّيْثِيَّ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ أَخْبَرَهُ، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ قَالَ: «لاَ حِمَى إِلاَّ لِلَّهِ وَلِرَسُولِهِ». رَوَاهُ الْبُخَارِيُّ.

فرمایا کہ "اللہ اور اس کے رسول کے سوا کسی کیلئے جائز نہیں کہ وہ اپنے لئے چراگاہ مخصوص کر لے۔" (بخاری)

لغوی تشریح: ﴿ لا حمی ﴾ حمی میں "حا" کے نیچے کسرہ اور میم پر فتحہ خفیفہ۔ ﴿ محمی ﴾ یعنی چراگاہ۔ ایسی جگہ جہاں لوگوں اور جانوروں کا داخلہ ممنوع ہو تا کہ اس میں گھاس بکثرت پیدا ہو ﴿ الا للہ ورسولہ ﴾ اس جملہ کا معنی یہ ہے کہ سربراہ مملکت زمین کا کچھ حصہ مخصوص کر لیتا ہے تاکہ صدقہ کے اونٹ اور جہاد کیلئے رکھے ہوئے تیار گھوڑوں اور اپنی سواری کے اونٹوں کو جنہیں راہ خدا میں کام لانے کیلئے رکھا گیا ہو کو وہاں چرنے کیلئے رکھا جائے اور سربراہ مملکت کے علاوہ دوسرا کوئی ایسا کرنے کا مجاز نہیں۔ "نھایہ" میں ہے کہ دور جاہلیت میں رئیس لوگ جب چاہتے اونچی جگہ پر کتا لے جاتے اور وہ بھونکتا' جہاں اس کے بھونکنے کی آواز سنائی دیتی وہ ساری زمین اپنے لئے مخصوص قرار دے لیتے کہ ان کے علاوہ دوسرا کوئی اپنا جانور چرانے کا کوئی حق نہیں رکھتا اور وہ خود اس ساری زمین میں عوام کے ساتھ اپنے کو شریک سمجھتا' جہاں ان کے جانور چرتے تھے۔ نبی ﷺ نے اس قسم کی ذاتی تخصیص کو ممنوع قرار دے دیا۔ پس اس سے معلوم ہوا کہ بے آباد زمین کو آباد کر کے اسے ملکیت میں لینا اللہ اور اس کے رسول کے چراگاہ کو مخصوص کرنے کے منافی نہیں ہے۔ سب اہل اسلام کیلئے کوئی منفعت نہیں رہتی تھی اور دوسری صورت ایسی تھی جس کی منفعت سب کیلئے یکساں تھی۔ سب لوگ اس میں شامل ہوتے اور اس کی لوگوں کو ضرورت بھی تھی۔ لہٰذا اب نائبین و جانشین خلفاء جہاد کے گھوڑوں اور اونٹوں کو چرانے کیلئے کچھ زمین مخصوص کر سکتے ہیں۔ اپنی ذات کیلئے ایسا کرنا کسی کیلئے بھی جائز نہیں ہے۔

(۷۷۹) وَعَنْهُ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «لاَ ضَرَرَ وَلاَ ضِرَارَ». رَوَاهُ أَحْمَدَ وَابْنُ مَاجَهْ، وَلَهُ مِنْ حَدِيْثِ أَبِيْ سَعِيْدٍ مِثْلُهُ، وَهُوَ فِي الْمُوَطَّإِ مُرْسَلٌ.

انہی (حضرت ابن عباسؓ) سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "اپنے بھائی کو ایسا ضرر پہنچانا کہ اس کے حق میں کمی واقع ہو جائے اور پہنچائی گئی اذیت و ضرر سے زیادہ ضرر و نقصان پہنچانا جائز نہیں۔" (اسے احمد' ابن ماجہ دونوں نے روایت کیا ہے اور ابن ماجہ میں ابوسعید کے حوالہ سے اسی طرح کی حدیث منقول ہے اور وہی حدیث مؤطا میں مرسل ہے)

لغوی تشریح: ﴿ لاضرر ﴾ ضرر میں "ضاد" اور "را" دونوں پر فتحہ۔ ضرر' نفع کی ضد ہے۔ مطلب یہ ہے کہ کوئی شخص اپنے بھائی کو ایسی تکلیف و اذیت نہ دے جس سے اس کے حق میں کمی واقع ہو جائے ﴿ ولاضرار ﴾ ضرار میں ضاد کے نیچے کسرہ ہے جس کے معنی تکلیف دینا' دکھ پہنچانا۔ وہ اس طرح کہ جتنا کسی نے اسے ضرر و نقصان پہنچایا اس سے زیادہ تکلیف نہ دے۔ اس حدیث کو اس باب میں داخل کرنے سے

مصنف کے پیش نظریہ ہے کہ بے آباد زمین کو آباد کرنا اس صورت میں جائز نہیں جس سے کسی دوسرے کو نقصان اور تکلیف کا سامنا کرنا پڑے۔ یہ بات تو امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کے مذہب کی تائید میں ہے جس میں انہوں نے قریب اور بعید آباد کاری کا فرق رکھا ہے اور قریب کو باذن سربراہ مشروط رکھا ہے۔

حاصل کلام: اس حدیث میں ایک زریں اصول بیان ہوا وہ یہ کہ نہ کسی کو ضرر پہنچاؤ اور نہ ضرر کا خود شکار بنو۔ گویا کسی کو بلاوجہ ضرر و اذیت میں مبتلا کرنا ایک مسلمان کے شایان شان نہیں۔ جب کسی کو خود تکلیف دے گا تو ظاہر ہے مخالف بھی اسے اذیت دینے کی کوشش کرے گا تو اس نے گویا از خود اپنے آپ کو اذیت اور ضرر رسانی کا نشانہ و ھدف بنایا۔ یہ بات واضح رہنی چاہیئے کہ حدود الہیہ کا نفاذ و اجراء اس حدیث کے ضمن میں نہیں آتا اس لئے کہ وہ امر الٰہی کی تعمیل ہے نہ کہ اپنے وہم و گمان کی پیروی۔

(٧٨٠) وَعَنْ سَمُرَةَ بْنِ جُنْدُبٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «مَنْ أَحَاطَ حَائِطاً عَلَى أَرْضٍ فَهِيَ لَهُ». رَوَاهُ أَبُو دَاوُدَ، وَصَحَّحَهُ ابْنُ الجَارُودِ.

حضرت سمرہ بن جندب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "جس کسی نے غیر مملوکہ زمین کے اردگرد دیوار بنالی' اتنی زمین اسی کی ملکیت ہے۔" (اسے ابوداؤد نے روایت کیا ہے اور ابن جارود نے اسے صحیح قرار دیا ہے)

حاصل کلام: اس حدیث سے بھی انفرادی ملکیت نیز زمین کے اردگرد دیوار بنانا ثابت ہوتا ہے۔

(٧٨١) وَعَنْ عَبْدِ اللهِ بْنِ مُغَفَّلٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ قَالَ: «مَنْ حَفَرَ بِئْراً فَلَهُ أَرْبَعُونَ ذِرَاعاً، عَطَناً لِمَاشِيَتِهِ». رَوَاهُ ابن مَاجَه بِإِسْنَادٍ ضَعِيفٍ.

حضرت عبداللہ بن مغفل رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا "جو شخص کہیں کنواں کھودے تو وہاں مال مویشی باندھنے کیلئے چالیس ہاتھ زمین اس کی ہے۔" (اسے ابن ماجہ نے ضعیف سند سے روایت کیا ہے۔)

لغوی تشریح: ﴿ من حفر بئر ﴾ بے آباد و بنجر زمین جو کسی کی ملکیت میں نہ ہو' اس میں کنواں کھودا ﴿ فله اربعون ذراعا ﴾ وہ شخص کنوئیں کے اردگرد چالیس ہاتھ زمین کا مالک ہوگا اس لئے کہ اس جگہ کنواں کھود کر اس نے زمین کو آباد کیا اور سرسبز و شاداب کیا ہے۔ ﴿ عطنا ﴾ عین اور طاء دونوں پر فتحہ۔ جہاں اونٹ بیٹھتے ہیں اس جگہ کو کہتے ہیں نیز بکریوں کے باڑے کو بھی کہتے ہیں یعنی وہ جگہ جہاں بکریاں بیٹھتی ہیں۔

(٧٨٢) وَعَنْ عَلْقَمَةَ بْنِ وَآئِلٍ عَنْ أَبِيْهِ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ أَقْطَعَهُ أَرْضاً بِحَضْرَمَوتَ. رَوَاهُ

حضرت علقمہ بن وائل نے اپنے باپ وائل رضی اللہ عنہ سے روایت بیان کی ہے کہ نبی ﷺ نے ان کو حضر موت میں زمین بطور جاگیر عطا فرمائی۔ (اسے ابوداؤد اور

أَبُو دَاوُدَ وَالتِّرْمِذِيُّ، وَصَحَّحَهُ ابْنُ حِبَّانَ. ترمذی نے روایت کیا ہے اور ابن حبان نے اسے صحیح قرار دیا ہے)

لغوی تشریح: ﴿اقطعه﴾ یعنی اسے عطا کیا۔ "اقطاع" کے معنی ہیں زمین کا کوئی ٹکڑا کسی کیلئے معین کرنا۔ اس سے مراد یہ ہے کہ سربراہ مملکت اپنی رعیت میں سے کسی کو بے آباد زمین میں سے کچھ حصہ اسے خصوصی طور پر عنایت کرے اور وہ اسی کی مخصوص ہو جائے۔ اس زمین کے آباد کرنے کی وجہ سے وہ اسی کی ہو جائے' اس آدمی کی بہ نسبت جس نے اسے آباد نہ کیا ہو اور جاگیر دینے کی دو صورتیں ہیں' ایک تو وہ جاگیر اس کی ملکیت میں دے دی جائے اور دوسری یہ کہ صرف اس سے انتفاع کیلئے دیا جائے یعنی اس کی آمدن سے کچھ وقت تک فائدہ اٹھانے کا موقع دیا جائے۔ ﴿بحضر موت﴾ "حا" پر فتحہ اور "ضاد" ساکن اور "را" پر فتحہ اور میم پر بھی فتحہ اور قاموس میں میم پر ضمہ ہے۔ علمیت اور ترکیب دو سبب غیر منصرف پائے جانے کی وجہ سے غیر منصرف ہے۔ یہ یمن کے جنوب میں واقع ہے۔

راوی حدیث: ﴿علقمه بن وائل﴾ ان کا پورا نام علقمہ بن وائل بن حجر کندی حضرمی کوفی ہے۔ صدوق راوی ہیں۔ ابن حبان نے اسے ثقہ کہا ہے۔ اس نے اپنے باپ اور مغیرہ سے روایت کی ہے۔

(٧٨٣) وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ أَقْطَعَ الزُّبَيْرَ حُضْرَ فَرَسِهِ، فَأَجْرَى الفَرَسَ حَتَّى قَامَ، ثُمَّ رَمَى بِسَوْطِهِ، فَقَالَ: **أَعْطُوهُ حَيْثُ بَلَغَ السَّوْطُ.** رَوَاهُ أَبُو دَاوُدَ، وَفِيهِ ضَعْفٌ.

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے زبیر رضی اللہ عنہ کو اس کے گھوڑے کی دوڑ کے برابر زمین جاگیر کے طور پر عنایت فرمائی۔ جب ان کا گھوڑا ٹھہر گیا تو انہوں نے اپنا کوڑا آگے پھینک دیا۔ آپؐ نے فرمایا "جہاں تک کوڑا گرا وہاں تک زبیر کی زمین ہے۔" (اسے ابوداؤد نے روایت کیا ہے مگر اس میں ضعف ہے)

لغوی تشریح: ﴿حضر فرسه﴾ "حا" پر ضمہ اور ضاد ساکن۔ گھوڑے کی دوڑ کے برابر۔ نصب اس پر اس بنا پر آیا ہے کہ اس کا مضاف محذوف ہے یعنی ایک مرتبہ جتنا دوڑ سکے۔ ﴿حتی قام﴾ گھوڑا ٹھہر گیا اور بھاگنے' چلنے سے رک گیا۔

حاصل کلام: اس حدیث کی رو سے سربراہ کیلئے کسی آدمی کو اس کی مخصوص ملی' دینی خدمات کے اعتراف کے طور پر صلہ میں جاگیر دینا جائز ہے۔ ہاں یہ شرط ہے کہ وہ زمین کسی دوسرے کی ملکیت میں نہ ہو۔

(٧٨٤) وَعَنْ رَجُلٍ مِّنَ الصَّحَابَةِ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: غَزَوْتُ مَعَ النَّبِيِّ ﷺ، فَسَمِعْتُهُ يَقُولُ:

ایک صحابی سے روایت ہے کہ میں نبی ﷺ کے ساتھ ایک غزوہ میں شریک تھا کہ میں نے آپؐ کو ارشاد فرماتے سنا کہ "تین چیزیں ایسی ہیں جن میں

النَّاسُ شُرَكَآءُ فِي ثَلاَثٍ: فِي الكَلإِ وَالمَآءِ وَالنَّارِ. رَوَاهُ أَحْمَدُ وَأَبُو دَاوُدَ، وَرِجَالُهُ ثِقَاتٌ.

سب حصہ دار ہیں۔ گھاس' پانی اور آگ۔" (احمد و ابوداؤد اس کے راوی ثقہ ہیں)

لغوی تشریح: ﴿النار﴾ یہاں آگ سے مراد وہ ایندھن جسے لوگ حصول آگ کیلئے جلاتے ہیں اور ایک قول یہ بھی ہے اس سے مراد وہ پتھر ہیں جن سے آگ جلائی جاتی ہے جب کہ وہ کوئلہ کی صورت میں ہوتے ہیں اور بعض نے اس سے چراغ مراد لیا ہے کہ اس کے روشن ہونے سے روشنی حاصل کی جاتی ہے۔ یہ حدیث اس بات کی دلیل ہے کہ ان تینوں چیزوں میں سے کسی کو کسی بھی انسان نے مخصوص نہیں کیا مگر گزشتہ احادیث کی بنا پر امام و سربراہ کی مقرر کی ہوئی چراگاہ کا حکم اس سے مستثنیٰ ہے۔

١٧ - بَابُ الوَقْفِ — وقف کا بیان

(٧٨٥) عَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، أَنَّ رَسُولَ اللهِ ﷺ قَالَ: «إِذَا مَاتَ الإِنْسَانُ انْقَطَعَ عَنْهُ عَمَلُهُ، إِلاَّ مِنْ ثَلاَثَةٍ: إِلاَّ مِنْ صَدَقَةٍ جَارِيَةٍ، أَوْ عِلْمٍ يُنْتَفَعُ بِهِ، أَوْ وَلَدٍ صَالِحٍ يَدْعُو لَهُ». رَوَاهُ مُسْلِمٌ.

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ "جب انسان وفات پا جاتا ہے تو اس کا عمل منقطع ہو جاتا ہے مگر تین عمل ایسے ہیں جن کا اجر و ثواب اسے مرنے کے بعد بھی ملتا رہتا ہے۔ صدقہ جاریہ' علم جس سے فائدہ اٹھایا جاتا ہو' صالح اولاد جو مرنے والے کیلئے دعا کرے۔" (مسلم)

لغوی تشریح: ﴿باب الوقف﴾ لغوی معنی روکنا' محبوس رکھنا اور شرعی طور پر وقف کے یہ معنی ہیں کہ کسی چیز کی اصل محفوظ رکھتے ہوئے مباح جگہ پر خرچ کرنا اور اس سے حاصل ہونے والی آمدنی سے فائدہ اٹھانا' اسے فروخت یا ہبہ وغیرہ نہ کرنا۔ اللہ کی راہ میں دے دینا جس سے عوام فائدہ اٹھائیں۔

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ مرنے کے بعد بھی مرنے والے کو بعض اعمال کا ثواب پہنچتا ہے۔ اس حدیث میں تین چیزوں کا ذکر ہے۔ صدقہ جاریہ' ایسا صدقہ جس کو عوام کی بھلائی کیلئے وقف کر دیا جائے مثلاً سرائے تعمیر کرنا' کنواں' نل وغیرہ لگوانا' مساجد کی تعمیر کروانا' کوئی ہسپتال تعمیر کروانا' پل' سڑک بنوانا ان میں سے جو کام بھی وہ اپنی زندگی میں کر جائے یا اس کے کرنے کا ارادہ رکھتا ہو۔ وہ سب صدقہ جاریہ شمار ہوں گے علم میں لوگوں کو دینی تعلیم دینا' دلوانا' طلباء کے تعلیمی اخراجات برداشت کرنا۔ تصنیف و تالیف اور درس و تدریس کا سلسلہ قائم کر جانا' مدارس کی تعمیر' دینی کتب کی طباعت و نشر و اشاعت کا بندوبست کرنا وغیرہ۔ صالح اولاد میں بیٹا' بیٹی' پوتا' پوتی' نواسا' نواسی وغیرہ کے علاوہ روحانی اولاد بھی شامل ہو سکتی ہے جسے علم دین سے آراستہ کیا ہو۔ ان کو راہ راست اور صراط مستقیم کی روشنی دکھائی اور اسے ہمیشہ ہمیشہ کے عذاب میں گرفتار ہونے سے بچا لیا۔ صالح اولاد مرنے والے کو اپنے نیک و صالح

عمل کے ذریعہ اور نمازوں میں دعاؤں میں یاد رکھتی ہے اس کیلئے گناہوں کی معافی اور بلندی درجات کی دعا کرتی ہے۔ یہ دراصل مرنے والے کے اپنے عمل کا ثمرہ اور نتیجہ ہے جو اسے مرنے کے بعد بھی ملتا ہے۔

(٧٨٦) وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا، قَالَ: أَصَابَ عُمَرُ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ أَرْضاً بِخَيْبَرَ، فَأَتَى النَّبِيَّ ﷺ يَسْتَأْمِرُهُ فِيْهَا، فَقَالَ: يَا رَسُولَ اللهِ! إِنِّي أَصَبْتُ أَرْضاً بِخَيْبَرَ، لَمْ أُصِبْ مَالاً قَطُّ هُوَ أَنْفَسُ عِنْدِيْ مِنْهُ، قَالَ: **إِنْ شِئْتَ حَبَسْتَ أَصْلَهَا، وَتَصَدَّقْتَ بِهَا**، قَالَ: فَتَصَدَّقَ بِهَا عُمَرُ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، أَنَّهُ لاَ يُبَاعُ أَصْلُهَا، وَلاَ يُورَثُ، وَلاَ يُوهَبُ، فَتَصَدَّقَ بِهَا فِي الْفُقَرَآءِ، وَفِي الْقُرْبَى، وَفِي الرِّقَابِ، وَفِيْ سَبِيْلِ اللهِ، وَابْنِ السَّبِيْلِ، وَالضَّيْفِ، لاَ جُنَاحَ عَلَى مَنْ وَلِيَهَا أَن يَأْكُلَ مِنْهَا بِالْمَعْرُوفِ، وَيُطْعِمَ صَدِيْقاً، غَيْرَ مُتَمَوِّلٍ مَالاً. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ، وَاللَّفْظُ لِمُسْلِمٍ.

وَفِي رِوَايَةٍ لِّلْبُخَارِيِّ: تَصَدَّقَ بِأَصْلِهَا: لاَ يُبَاعُ، وَلاَ يُوْهَبُ، وَلٰكِن يُنْفَقُ ثَمَرُهُ.

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ (میرے باپ) حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو خیبر کے علاقہ میں زمین ملی تھی۔ (میرے باپ) حضرت عمر رضی اللہ عنہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں مشورہ طلب کرنے کیلئے حاضر ہوئے اور عرض کیا یارسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم)! مجھے خیبر میں کچھ زمین حاصل ہوئی ہے ایسی نفیس و قیمتی کہ اس سے پہلے کبھی بھی ایسی زمین مجھے نہیں ملی۔ میں اسے صدقہ کرنا چاہتا ہوں۔ آپؐ نے فرمایا "اگر چاہو تو اصل کو اپنے پاس روک لو اور اس کی پیداوار صدقہ کردو۔" راوی کا بیان ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس زمین کو فقیروں، قرابت داروں، غلاموں کو آزاد کرنے میں اور راہ خدا میں، راہ چلتے مسافروں اور مہمانوں کی مہمان نوازی کیلئے وقف کردیا اور وصیت بھی کردی کہ اس کا منتظم و نگہبان معروف طریقہ کے مطابق خود بھی کھا سکتا ہے اور احباب و رفقاء کو بھی کھلا سکتا ہے۔ مگر مال کو ذخیرہ بنا کر نہ رکھے۔ (بخاری و مسلم، یہ الفاظ مسلم کے ہیں) اور بخاری کی روایت میں ہے کہ اس کے اصل کو صدقہ کردیا یعنی وقف کردیا جو نہ فروخت کیا جائے گا اور نہ ھبہ کیا جائے گا لیکن اس کی پیداوار، راہ خدا میں خرچ کی جائے گی۔

لغوی تشریح: ﴿ اصاب عمر ﴾ مال غنیمت کے حصہ میں سے پایا ﴿ ارضا بخیبر ﴾ یعنی خیبر کی زمین سے، اس زمین کا نام ثمغ تھا۔ ﴿ یستامرہ ﴾ آپ سے مشورہ طلب فرمایا ﴿ انفس ﴾ نہایت عمدہ اور بہت ہی نفیس و قیمتی، گراں قدر ﴿ حبست ﴾ میں "با" پر تشدید اور تخفیف دونوں طرح، روک لے۔ ﴿ وتصدقت بھا ﴾ اس سے حاصل ہونے والا فائدہ یعنی پھل وغیرہ، صدقہ کردے ﴿ فی القربی ﴾ اس سے مراد قریبی رشتہ دار ﴿ وفی الرقاب ﴾ رقاب میں "را" کے نیچے کسرہ اور رقبۃ کی جمع ہے مراد وہ

غلام ہیں جنھوں نے پروانۂ آزادی کیلئے مالک سے رقم طے کر کے مکاتبت کر لی ہو کہ اتنی رقم ادا کر کے وہ آزاد ہو جائے گا۔ اور ممکن ہے یہ بھی مراد ہو کہ غلاموں کو خرید کر آزادی کی نعمت سے سرفراز کر دے۔ ﴿ لا جناح علی من ولیها ﴾ یعنی جو شخص ان کی نگرانی و نگہبانی اور حفاظت کا ذمہ دار بنے اس کیلئے کوئی مضائقہ نہیں کہ ﴿ ان یاکل منها بالمعروف ﴾ کہ معروف عادت و رواج کے مطابق اس سے اپنے کھانے کیلئے اور اپنی ضرورت کی حد تک لباس کیلئے لے سکتا ہے ﴿ غیر متمول مالا ﴾ یعنی مال جمع کرنے والا نہ ہو۔ گرائمر میں یہ ولیها کے فاعل سے حال واقع ہو رہا ہے۔

حاصل کلام: اس حدیث میں وقف کرنے اور پھر اسے آگے فروخت کرنے اور ہبہ کرنے سے منع فرمایا۔ یعنی جو چیز وقف کر دی جائے اسے پھر فروخت نہیں کیا جا سکتا اور نہ اسے ہبہ ہی کیا جا سکتا ہے۔ حدیث سے تو یہی معلوم ہوتا ہے مگر امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ وقف کے فروخت کرنے کو جائز سمجھتے ہیں۔ ان کے شاگرد رشید امام ابویوسف رحمہ اللہ کا قول ہے کہ اگر امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کو یہ حدیث پہنچ جاتی تو وہ اپنی رائے سے رجوع کر لیتے۔

(٧٨٧) وَعَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُ، قَالَ: بَعَثَ رَسُولُ اللهِ ﷺ عُمَرَ عَلَى الصَّدَقَةِ، اَلْحَدِيْثَ، وَفِيْهِ «فَأَمَّا خَالِدٌ، فَقَدِ احْتَبَسَ أَدْرَاعَهُ وَأَعْتَادَهُ فِي سَبِيْلِ اللهِ». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو صدقات کی وصولی پر مقرر فرما کر بھیجا۔ (الحدیث) اور اس میں ہے کہ "رہا خالد (رضی اللہ عنہ) تو اس نے اپنی تمام زرہیں اللہ کے راستے میں وقف کر دی ہیں۔" (بخاری و مسلم)

لغوی تشریح: ﴿ الحدیث ﴾ مکمل حدیث یوں ہے کہ ابن جمیل' خالد بن ولید اور عباس بن عبدالمطلب رسول اللہ ﷺ کے چچا نے زکوٰۃ نہ دی۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "ابن جمیل تو اس چیز کا بدلہ لیتا ہے کہ وہ فقیر و محتاج تھا اللہ تعالیٰ نے اسے مالدار کر دیا اور خالد رضی اللہ عنہ کا معاملہ تو یہ ہے کہ تم لوگ خالد رضی اللہ عنہ سے ناانصافی کر رہے ہو اس نے تو اپنی ساری زرہیں راہ خدا میں وقف کر دی ہیں اور عباس رضی اللہ عنہ کا معاملہ یہ ہے کہ اس کی زکوٰۃ میرے ذمہ ہے۔ میں فرض زکوٰۃ بھی دوں گا اور اتنی ہی مزید بھی۔" ﴿ ادراع ﴾ درع کی جمع ہے یعنی زرہ۔ ﴿ واعتاد ﴾ اعتد کی جمع ہے عتد کے عین اور تا دونوں پر فتحہ ہے۔ اس کے معنی ہیں جہاد فی سبیل اللہ کیلئے از قسم اسلحہ و سامان جنگ اور جانور کو تیار رکھنا۔ سبل السلام میں ہے کہ یہ حدیث اس پر دلیل ہے کہ زکوٰۃ کے مال میں سے وقف کرنا بھی صحیح ہے۔ بایں طور کہ اس رقم سے آلات حرب و ضرب جہاد فی سبیل اللہ کیلئے حاصل کئے جائیں اور یہ حدیث اس پر بھی دلالت کرتی ہے کہ ساز و سامان اور حیوان کو بھی وقف کرنا درست ہے۔ اس لئے کہ "اعتاد" کی تفسیر جہاد کیلئے گھوڑا تیار رکھنا کی گئی ہے اور یہ حدیث اس پر بھی دلالت کرتی ہے کہ زکوٰۃ کو آٹھ مصارف زکوٰۃ میں سے صرف

ایک پر خرچ کرنا جائز ہے۔

راوی حدیث: ﴿ خالد رضی اللہ عنہ ﴾ ابو سلیمان ان کی کنیت ہے۔ سلسلہ نسب یوں ہے: خالد بن ولید بن مغیرہ مخزومی قرشی۔ ان کی والدہ کا نام عصماء تھا اور انہی کو لبابہ صغریٰ بھی کہا گیا ہے۔ یہ حارث کی بیٹی تھی اور لبابہ یعنی ام فضل زوجہ عباس رضی اللہ عنہ کی چھوٹی بہن تھی۔ حضرت خالد رضی اللہ عنہ نے فتح مکہ سے پہلے ۸ھ میں اسلام قبول کیا اور ایک قول یہ بھی ہے کہ انہوں نے ۵ھ یا ۶ھ میں اسلام قبول کیا۔ فتح مکہ، غزوۂ حنین اور تبوک میں حاضر رہے اور غزوۂ موتہ کے روز ان کے ہاتھ سے نو تلواریں ٹوٹیں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو سیف اللہ کا لقب عنایت فرمایا۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے فتنۂ ارتداد کے موقع پر ان کو عامل مقرر فرمایا۔ اس کے بعد اہل فارس سے نبرد آزما ہوئے۔ پھر ان کو شام کی طرف بھیجا انہوں نے شام کا اکثر علاقہ فتح کیا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے معزول کرنے تک وہ فوج کے قائد رہے۔ معزولی کے بعد حمص جاگزیں ہوگئے۔ تادم آخریں یہیں قیام پذیر رہے۔ ۲۱ھ میں وفات پائی اور حمص سے ایک میل کے فاصلہ پر واقع ایک بستی میں ان کو دفن کیا گیا۔

١٨ - بَابُ الْهِبَةِ وَالْعُمْرَى وَالرُّقْبَى — ہبہ، عمریٰ اور رقبیٰ کا بیان

(٧٨٨) عَنِ النُّعْمَانِ بْنِ بَشِيْرٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا، أَنَّ أَبَاهُ أَتَى بِهِ رَسُولَ اللهِ ﷺ، فَقَالَ: إِنِّي نَحَلْتُ ٱبْنِيْ هٰذَا غُلاَماً كَانَ لِيْ، فَقَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: **«أَكُلَّ وَلَدِكَ نَحَلْتَه مِثْلَ هٰذَا؟** فَقَالَ: لاَ، فَقَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: **فَأَرْجِعْهُ.** وَفِيْ لَفْظٍ: فَٱنْطَلَقَ أَبِيْ إِلَى النَّبِيِّ ﷺ لِيُشْهِدَهُ عَلَى صَدَقَتِيْ، فَقَالَ: **أَفَعَلْتَ هٰذَا بِوَلَدِكَ كُلِّهِمْ؟** قَالَ: لاَ، قَالَ: **«اتَّقُوا اللّٰهَ، وَاعْدِلُوا بَيْنَ أَوْلاَدِكُمْ»**، فَرَجَعَ أَبِي فَرَدَّ تِلْكَ الصَّدَقَةَ». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ان کے والد ان کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں لائے اور عرض کیا کہ میں نے اپنا ذاتی غلام اپنے اس بیٹے کو ہبہ کر دیا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے دریافت فرمایا "کیا تو نے اپنی ساری اولاد کو اس طرح (غلام) ہبہ کیا ہے؟" اس نے کہا نہیں، تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "تو پھر اسے واپس کر لو" اور ایک روایت کے الفاظ ہیں کہ میرے والد صاحب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے کہ میرے ہبہ پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو گواہ بنائیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے دریافت فرمایا "کیا تو نے ایسا اپنی ساری اولاد کے ساتھ کیا ہے؟" اس نے جواب دیا کہ نہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا "اللہ سے ڈرو اور اپنی اولاد کے درمیان عدل و انصاف کرو۔" چنانچہ میرے والد نے وہ ہبہ واپس کر لیا۔ (بخاری و مسلم)

وَفِيْ رِوَايَةٍ لِّمُسْلِمٍ: قَالَ: فَأَشْهِدْ عَلَى هٰذَا غَيْرِيْ، ثُمَّ قَالَ: «أَيَسُرُّكَ أَن يَكُوْنُوا لَكَ فِي البِرِّ سَوَآءً» قَالَ: بلى. قال: «فَلاَ إِذَنْ».

اور مسلم کی ایک روایت میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تو پھر میرے سوا اس پر کسی اور کو گواہ بنا لو پھر آں حضور ﷺ نے فرمایا "کیا تجھے یہ پسند نہیں ہے کہ تیری ساری اولاد تیرے ساتھ یکساں بھلائی کا سلوک کرے؟" وہ بولا کیوں نہیں! آپؐ نے فرمایا "پھر تو ایسا مت کر۔"

لغوی تشریح: ﴿باب الهبة الخ﴾ ھبہ اس عطیہ و تحفہ کو کہتے ہیں جو بغیر کسی عوضانہ کے دیا جائے اور عمریٰ عین کے ضمہ اور میم ساکن حبلی کے وزن پر ہے عمر سے ماخوذ ہے جس کا معنی ایک آدمی اپنا مکان دوسرے کو دیتا اور یوں کہتا کہ میں نے یہ مکان تاحیات تجھے دیا تاحیات اسی عطیہ کو عمریٰ کہا جاتا ہے اور رقبیٰ بھی حبلیٰ کے وزن اور وہ اس طرح کہ ایک شخص دوسرے سے کہے کہ یہ مکان تیرا ہے۔ اس شرط پر اگر میں مرجاؤں تو یہ مکان تیرا اور اگر تو مرگیا تو میں مکان واپس لے لوں گا۔ گویا ہر ایک ان میں سے دوسرے کی موت کے انتظار میں رہتا اس لئے اسے رقبیٰ کہتے ہیں۔ ﴿نحلت﴾ اعطیت اور وھبت کے معنی میں ہے یعنی تو نے عطیہ دیا اور تو نے ھبہ کیا ہے۔ ﴿فارجعه﴾ اپنا ہبہ کیا ہوا غلام واپس لوٹا لے۔ ﴿ليشهد﴾ تاکہ اس ھبہ و عطیہ پر آپ کو گواہ بنائے۔ یہ اشہاد سے ماخوذ ہے یعنی ایسا اس نے اس غرض کیلئے کیا کہ وہ آپ کو شاھد و گواہ بنائے ﴿فاشهد على هذا غيرى﴾ اشهد امر کا صیغہ ہے آپ نے یہ بھی اس لئے فرمایا کہ یہ فعل آپ کی نظر میں غیر پسندیدہ تھا۔ بخاری و مسلم میں ہے کہ آپ نے فرمایا کہ میں ظلم و بے انصافی پر گواہ نہیں بنتا۔ ﴿فلا اذن﴾ تو اپنی اولاد کے درمیان عطیہ دینے میں تفریق نہ کر اور نہ ہی ایک کو دوسرے پر برتری و فضیلت دے جبکہ تیری خواہش ہے کہ تیرے ساتھ تیری اولاد کا نیکی و بھلائی میں یکساں سلوک ہو۔ یہ حدیث دلیل ہے کہ اولاد کو عطیہ دینے میں مساویانہ سلوک کرنا چاہئے۔ جب برابری اور مساوی طور پر نہ ہو تو یہ باطل ہے مگر جمہور نے اس کی مخالفت کی ہے اور کہا ہے کہ مساوی سلوک مندوب ہے۔ عطیہ وھبہ میں کسی کو زیادہ دینے سے ھبہ باطل نہیں ہوتا۔ مگرافسوس کہ کیا ترک ندب کا نام جور و ظلم رکھا جا سکتا ہے؟ کیونکہ آپؐ نے برابری نہ کرنے کو جور و ظلم قرار دیا ہے جبکہ انہوں نے عطیہ میں برابری کو مندوب کہا ہے واجب قرار نہیں دیا۔

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ اولاد میں عطیات کی مساویانہ تقسیم واجب ہے۔ امام احمد رحمہ اللہ، ثوری رحمہ اللہ اور اسحٰق رحمہ اللہ وغیرہ کا قول ہے کہ جب برابری نہ ہو تو ہبہ باطل ہے۔ رسول اللہ ﷺ کا بشیر کو یہ فرمانا کہ غلام کو واپس لے لو اسی کی تائید کرتا ہے۔ سعید بن منصور اور بیہقی میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ لڑکا اور لڑکی سب کو برابر برابر دینا چاہئے مگر جمہور علماء کے نزدیک برابری مستحب ہے، واجب نہیں۔

(۷۸۹) وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا قَالَ: قَالَ النَّبِيُّ ﷺ: «العَائِدُ فِي هِبَتِهِ كَالكَلْبِ يَقِيءُ ثُمَّ يَعُودُ فِي قَيْئِهِ». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ. وَفِيْ رِوَايَةٍ لِلْبُخَارِيِّ: «لَيْسَ لَنَا مَثَلُ السَّوْءِ، الَّذِيْ يَعُودُ فِي هِبَتِهِ كَالكَلْبِ يَقِيْءُ ثُمَّ يَرْجِعُ فِيْ قَيْئِهِ».

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا "ہبہ کر کے اسے واپس لینے والا اس کتے کی طرح ہے جو خود قے کرتا ہے اور پھر اسے کھا لیتا ہے۔" (بخاری و مسلم) اور بخاری کی ایک روایت میں ہے کہ "ہمارے لئے اس سے بری مثال اور کوئی نہیں کہ جو شخص اپنے ہبہ کو دے کر واپس لیتا ہے وہ اس کتے کی مانند ہے جو خود ہی قے کرتا ہے اور پھر اس کی طرف رجوع کرتا ہے۔"

لغوی تشریح: یہ حدیث ھبہ کردہ چیز کو واپس لینے کی حرمت پر دلالت کرتی ہے البتہ والد اس سے مستثنیٰ ہے جیسا کہ اس سے آئندہ حدیث میں ہے۔ والد نے جو ھبہ اپنی اولاد کو کیا اسے مستثنیٰ قرار دیتی ہے۔ مگر حنفیہ کا مذھب ہے کہ ھبہ کردہ چیز کو واپس لینا حلال ہے اور بعض نے اس حدیث کی یہ تاویل کی ہے کہ آنحضور ﷺ کے ارشاد گرامی کا لفظ ﴿كالكلب﴾ اس کی عدم حرمت پر دلالت کرتا ہے اس لئے کہ کتا تو غیر مکلف ہے اور اس کی اپنی قے اس کیلئے حرام نہیں ہے۔ حالانکہ جب کتا غیر مکلف ہے تو یہ کہنا صحیح نہیں ہے کہ اس کی قے اس کیلئے حلال ہے یا حرام۔ کیونکہ تحلیل و تحریم ان فروع میں سے ہے جس کا کسی کو مکلف بنایا گیا ہو۔ جیسا کہ شجر و حجر (درخت اور پتھر) کے بارے میں یہ کہنا صحیح نہیں ہے کہ وہ اندھا اور بینا ہے اس لئے کہ وہ اندھے پن اور بصارت کا محل ہی نہیں۔ لہٰذا اس حدیث میں تشبیہہ، تحلیل یا تحریم کے اعتبار سے ہی نہیں اور جب ان دونوں وجوہ میں سے کسی وجہ سے تشبیہہ کا امکان نہیں تو پھر اصل میں تحلیل یا تحریم پر دلالت باقی ہی نہیں رہتی۔ تحریم تو نص صریح سے ثابت ہوتی ہے اور اس کا مرجع بھی متعین ہوتا ہے اور جہاں تک تشبیہہ کا تعلق ہے اس سے حرام کو بہت قبیح صورت میں پیش کرنا اور اسے قابل نفرت بنانا اور اس کے نہایت برے منظر کو دکھانا مقصود ہے۔ کاش مجھے علم ہوتا کہ انسان کیسے راضی ہو جاتا ہے کہ وہ کتے کے درجہ میں گر جائے۔ پھر اس درجہ میں اتر جائے کہ پہلے قے کرے اور پھر اپنی قے چاٹ لے۔

(۷۹۰) وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ وَابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمْ، عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ: «لاَ يَحِلُّ لِرَجُلٍ مُسْلِمٍ أَنْ يُعْطِيَ العَطِيَّةَ ثُمَّ يَرْجِعَ فِيهَا، إِلاَّ الوَالِدَ فِيمَا يُعْطِي

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ اور ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا کہ "کسی مسلم مرد کیلئے حلال نہیں ہے کہ عطیہ دے کر واپس لے۔ بجز والد کے کہ وہ اپنی اولاد کو دیئے گئے عطیہ کو واپس لے سکتا ہے۔" (اسے احمد اور چاروں نے روایت کیا ہے اور

وَلَدَهُ». رَوَاهُ أَحْمَدُ وَالأَرْبَعَةُ، وَصَحَّحَهُ التِّرْمِذِيُّ وَابْنُ حِبَّانَ وَالحَاكِمُ.

ترمذی' ابن حبان اور حاکم نے صحیح قرار دیا ہے)

حاصل کلام: عطیات دینا اسلامی معاشرے میں محبت و مؤدت کی علامت ہے۔ تحفہ تحائف آپس میں دینے چاہئیں۔ دے کر واپس لینا صرف والد کے سوا باقی کسی کیلئے جائز نہیں۔ جمہور کا مذہب تو یہی ہے البتہ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک ذوی الارحام کے سوا باقی سے واپس لینا جائز ہے مگر یہ اور سابقہ حدیث ان کے موقف کے صراحتاً مخالف ہے۔

(۷۹۱) وَعَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهَا قَالَتْ: كَانَ رَسُولُ اللهِ ﷺ يَقْبَلُ الهَدِيَّةَ، وَيُثِيبُ عَلَيْهَا. رَوَاهُ البُخَارِيُّ.

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ ہدیہ و تحفہ قبول فرما لیتے تھے اور اس کے بدلہ میں کچھ عنایت بھی فرمایا کرتے تھے۔ (بخاری)

لغوی تشریح: ﴿ يثيب عليها ﴾ اس کے بدلہ و عوض میں کچھ عنایت فرماتے تھے۔ یہاں ثواب سے مراد ہے اس کے بدلہ میں دینا۔

حاصل کلام: یہ حدیث ثابت کر رہی ہے کہ تحفہ قبول کرنا اور اس کا بدلہ دینا سنت رسول مقبول ﷺ ہے بلکہ ابن ابی شیبہ میں ہے کہ آپؐ ہدیہ و تحفہ کا بدلہ بہتر صورت میں ادا فرمایا کرتے تھے۔ اگر کسی کے پاس ھدیہ دینے کی گنجائش نہ ہو تو کم از کم اس کیلئے جزاک اللہ خیراً کی دعا کا تحفہ ضرور دینا چاہئے۔ اگر کسی نے دوسرے کو تحفہ اس نیت و خیال سے دیا کہ وہ بھی ضرور تحفہ دے تو امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک یہ باطل ہے اور دوسرے کہتے ہیں کہ جائز ہے۔

(۷۹۲) وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا قَالَ: وَهَبَ رَجُلٌ لِّرَسُولِ اللهِ ﷺ نَاقَةً، فَأَثَابَهُ عَلَيْهَا، فَقَالَ: رَضِيْتَ؟ قَالَ: لاَ، فَزَادَهُ، فَقَالَ: رَضِيْتَ؟ قَالَ: لاَ، فَزَادَهُ، فَقَالَ: رَضِيْتَ؟ فَقَالَ: نَعَمْ. رَوَاهُ أَحْمَدُ، وَصَحَّحَهُ ابْنُ حِبَّانَ.

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ ایک آدمی نے رسول اللہ ﷺ کو ایک اونٹنی ہبہ کی۔ آپؐ نے اس آدمی کو کچھ ہدیہ عنایت فرمایااور دریافت فرمایا کہ "کیا تو راضی ہے؟" اس نے جواب دیا' نہیں! پھر مزید کچھ مرحمت فرما کر پوچھا کہ "اب تو خوش ہے" اس نے پھر یہی کہا کہ نہیں۔ پھر آپؐ نے اسے مزید برآں دے کر دریافت فرمایا کہ "اب تو راضی ہے؟" بولا' ہاں۔ (اسے احمد نے روایت کیا ہے اور ابن حبان نے صحیح کہا ہے)

حاصل کلام: اس حدیث سے ثابت ہوا کہ تحفہ و ہدیہ قبول کرنا اور اس کے عوض میں کوئی چیز دینا جائز

ہے۔

(۷۹۳) وَعَنْ جَابِرٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «الْعُمْرَى لِمَنْ وُهِبَتْ لَهُ». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "عمریٰ اسی کا ہے جسے ہبہ کیا گیا ہے۔" (بخاری و مسلم)

وَلِمُسْلِمٍ: أَمْسِكُوا عَلَيْكُمْ أَمْوَالَكُمْ، وَلاَ تُفْسِدُوهَا، فَإِنَّهُ مَنْ أَعْمَرَ عُمْرَى، فَهِيَ لِلَّذِيْ أُعْمِرَهَا، حَيًّا وَمَيِّتاً، وَلِعَقِبِهِ.

اور مسلم کی روایت میں ہے کہ "تم اپنے اموال کو اپنے پاس محفوظ رکھو۔ ان کو ضائع نہ کرو۔ جس شخص نے کسی کو عمریٰ کیا۔ عمریٰ اسی کا ہے جسے ہبہ کیا گیا' زندگی میں بھی اور موت کے بعد بھی اور اس کی وفات کے بعد اس کے وارثوں کیلئے ہے۔"

وَفِيْ لَفْظٍ: إِنَّمَا الْعُمْرَى الَّتِيْ أَجَازَهَا رَسُولُ اللهِ ﷺ أَن يَقُولَ: هِيَ لَكَ وَلِعَقِبِكَ، فَأَمَّا إِذَا قَالَ: هِيَ لَكَ مَا عِشْتَ، فَإِنَّهَا تَرْجِعُ إِلَى صَاحِبِهَا.

ایک اور روایت کے الفاظ ہیں جس عمریٰ کو رسول اللہ ﷺ نے جائز رکھا ہے وہ یہ ہے کہ عمریٰ دینے والا یہ الفاظ کہے کہ تیرے لئے ہے اور تیرے بعد تیری اولاد کیلئے ہے لیکن جب یہ کہے کہ جب تک تو زندہ ہے اس وقت تک تیرے لئے ہے تو' وہ اپنے دینے والے کی طرف پلٹ جائے گا۔

وَلِأَبِيْ دَاوُدَ وَالنَّسَائِيِّ: لاَ تُرْقِبُوا، وَلاَ تُعْمِرُوْا، فَمَنْ أُرْقِبَ شَيْئاً، أَوْ أُعْمِرَ شَيْئاً، فَهُوَ لِوَرَثَتِهِ.

ابوداؤد اور نسائی کی روایت میں ہے کہ "تم نہ رقبیٰ کرو اور نہ عمریٰ۔ پس جس شخص نے کوئی چیز رقبی کی یا عمریٰ میں دی تو وہ اس کے ورثاء کیلئے ہے۔"

لغوی تشریح: ﴿ العمری لمن وهبت له ﴾ وهب له کا فعل صیغہ مجہول ہے' مطلب یہ ہے کہ چیز کو لینے والا اپنے قبضہ میں پوری طرح لے گا اور پہلے کی طرف واپس نہیں کی جائے گی۔ ﴿ فهی للذی اعمرها ﴾ پس یہ چیز اس کی ملکیت ہوگی جس کیلئے عمریٰ کی گئی۔ اعمر اس جگہ بھی صیغہ مجہول ہے یعنی جس کیلئے عمریٰ کیا گیا اسی کی ملکیت ہوگی۔ ﴿ حیا و میتا ﴾ جب تک زندہ رہے گا اس پر اس کا قبضہ ہوگا اور مرنے کے بعد اس کے وارث اس کے مالک ہوں گے یعنی اولاد وغیرہ اور دینے والے کی جانب کسی صورت بھی واپس نہیں ہوگی۔ ﴿ ولعقبه ﴾ عین پر فتحہ اور قاف کے نیچے کسرہ اور اسے ساکن پڑھنا بھی جائز ہے۔ انسان کی نسلی اولاد۔ یعنی اس کی وفات کے بعد وہ اس چیز کی وارث ہوگی ﴿ انما العمری التی اجازها ﴾ وہ عمریٰ جسے رسول اللہ ﷺ نے جائز قرار دیا ہے۔ وہ یہ ہے کہ عمریٰ حاصل کرنے والا اس کا

مکمل مالک ہوگا اس طرح کہ اب وہ پہلے کی طرف پلٹ کر نہیں جائے گی۔ واضح رہے کہ عمریٰ کی تین اقسام ہیں۔ ہمیشہ ہمیش کیلئے دینا۔ وہ اس طرح کہ وہ یوں کہے کہ یہ مکان ہمیشہ کیلئے تمہارا ہے یا اس طرح کہے کہ یہ چیز تیرے اور تیرے وارثوں کیلئے ہے لہٰذا یہ اس کی ملکیت میں دینا یا ھبہ کرنا ہوگا جو پہلے کی طرف لوٹ کر نہیں آئے گا۔ دوسرا مقید وقت یعنی زندگی بھر کیلئے دینا۔ وہ اس طرح کہ وہ کہے یہ چیز تمہاری زندگی تک تمہاری ہے جب تو وفات پا جائے تو میری طرف واپس آجائے گی۔ پس اس صورت میں نہ یہ ھبہ شمار ہوگی اور نہ تملیک۔ بلکہ یہ عارضی طور پر ایک مخصوص مدت تک کیلئے عاریتاً دینا شمار ہوگا۔ مدت متعین کے اختتام پر یہ چیز پہلے کی طرف لوٹ جائے گی۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس شرط کے ساتھ عمریٰ صحیح نہیں اور ایک قول یہ بھی ہے کہ اس طرح مشروط طور پر عمریٰ کرنا صحیح ہے مگر شرط فاسد ہے اور پہلے کی طرف نہیں لوٹے گی۔ یہ دونوں اقوال مرجوح ہیں اور تیسرا بغیر کسی شرط کے دینا۔ اس کی صورت یہ ہے کہ وہ یوں کہے کہ میں نے اپنا مکان تیرے لئے عمریٰ کیا۔ اس میں اس نے نہ تو ہیشگی کی قید لگائی اور نہ زندگی بھر کی۔ جمہور نے اس صورت کو بھی رقبہ کی ملکیت پر محمول کیا ہے اور اس صورت میں بھی وہ پہلے کی طرف واپس نہیں ہوگی۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ منافع کی ملکیت کی صورت ہے' رقبہ کی ملکیت تو نہیں لہٰذا جسے یہ چیز عمریٰ کی گئی ہے اس کی موت کے بعد وہ پہلے کی طرف لوٹ آئے گی۔ جمہور کا قول راجح ہے۔ امام مالک رحمہ اللہ کا قول ہے کہ عمریٰ تمام حالات میں گھر سے فوائد و منافع کی ملکیت پر منتج ہوگا اور گھر کو زندگی بھر کی شرط پر دینے سے اس کا مالک نہیں بن سکے گا۔ ﴿ لا ترقبوا ولا تعمروا ﴾ ترقبوا اور تعمروا دونوں باب افعال سے ماخوذ ہیں۔ رقبیٰ اور عمریٰ دونوں سے منع فرمایا ہے۔ ﴿ فمن ارقب ﴾ یہاں بھی ارقب اور اعمر دونوں باب افعال سے ہیں۔ یہ اس بات کی دلیل ہے رقبیٰ کی صورت میں بھی ملکیت اسی طرح ہوتی ہے جس طرح عمریٰ میں ہوتی ہے اسے عاریتاً لینا نہیں کہتے اور جہاں تک نہی کا تعلق ہے تو وہ صرف مصالح کی طرف رہنمائی کیلئے ہے بایں معنی کہ اپنے مصالح کو پیش نظر رکھتے ہوئے ایسا کرنا تمہیں زیب نہیں دیتا لیکن اگر تم ایسا کر گزرو تو صحیح ہوگا۔

(٧٩٤) وَعَنْ عُمَرَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: حَمَلْتُ عَلَى فَرَسٍ فِيْ سَبِيْلِ اللهِ، فَأَضَاعَهُ صَاحِبُهُ، فَظَنَنْتُ أَنَّهُ بَائِعُهُ بِرُخْصٍ، فَسَأَلْتُ رَسُولَ اللهِ ﷺ عَنْ ذٰلِكَ، فَقَالَ: «لاَ تَبْتَعْهُ، وَإِنْ أَعْطَاكَهُ بِدِرْهَمٍ» اَلْحَدِيْثَ. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے ایک گھوڑا اللہ کے راستہ میں ایک آدمی کو سواری کیلئے دیا۔ اس نے اسے ناکارہ کر دیا۔ میں نے خیال کیا کہ وہ اسے سستے داموں بیچنے والا ہے۔ میں نے رسول اللہ ﷺ سے دریافت کیا کہ کیا میں اسے خرید سکتا ہوں؟ آپ ؐ نے فرمایا "تمہیں اگر یہ گھوڑا ایک درھم کے عوض بھی دے تب بھی نہ خریدو۔" (الحدیث) (بخاری و مسلم)

لغوی تشریح: ﴿ حملت الخ ﴾ میں نے گھوڑا دیا تا کہ وہ جہاد فی سبیل اللہ کیلئے اس پر سوار ہو۔ ﴿ فاضاعه ﴾ یعنی اس کی دیکھ بھال اور حفاظت میں بے پروائی و عدم توجہی کی وجہ سے وہ کمزور اور دبلا پتلا ہوگیا۔ ﴿ برخص ﴾ "را" پر ضمہ اور "خا" ساکن' غلاء کا متضاد۔ غلاء کے معنی گراں' مہنگا اور رخص کے معنی کم قیمت اور سستا۔

حاصل کلام: اس حدیث کی رو سے خیرات و صدقہ میں دی ہوئی چیز قیمتاً بھی واپس نہیں لینی چاہئے۔ بعض علماء نے اسے خریدنا حرام ٹھہرایا ہے لیکن جمہور علماء کہتے ہیں کہ یہ نھی تنزیہی ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کا خیرات کردہ گھوڑا خریدنے سے منع فرمایا کہ ایسی خاص صورتوں میں فروخت کرنے والا خریدار سے تسامح اور چشم پوشی کر جاتا ہے جس سے فروخت کنندہ کو نقصان کا اندیشہ ہوتا ہے۔ اس طرح جتنی کمی اس چیز کی قیمت میں واقع ہوگی وہ گویا اپنی خیرات کو واپس لینے کے مترادف ہوگی جو جائز نہیں۔

(٧٩٥) وَعَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُ، عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ: «**تَهَادُوا تَحَابُّوا**». رَوَاهُ الْبُخَارِيُّ فِي الأَدَبِ الْمُفْرَدِ، وَأَبُو يَعْلَى بِإِسْنَادٍ حَسَنٍ.

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "آپس میں ایک دوسرے کو ہدیہ دیا کرو اس سے باہمی محبت پیدا ہوتی ہے۔" (اسے بخاری نے الادب المفرد میں روایت کیا ہے اور ابویعلیٰ نے حسن سند سے نقل کیا ہے)

لغوی تشریح: ﴿ تهادوا ﴾ دال پر فتحہ۔ تھادیٰ سے امر کا صیغہ ہے یعنی باہمی طور پر ایک دوسرے کو ہدیہ بھیجا کرو ﴿ تحابوا ﴾ "با" پر تشدید اور امر کے جواب میں ہونے کی وجہ سے مجذوم ہے یعنی تمہارے درمیان محبت پیدا ہوگی۔

حاصل کلام: ایک دوسرے کو تحفہ دینا آپس میں محبت کا باعث ہے۔ اسلام محبت و مؤدت کا علمبردار ہے' عداوت و دشمنی کا اس میں کوئی تصور نہیں۔

(٧٩٦) وَعَنْ أَنَسٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُ، قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «**تَهَادُوا فَإِنَّ الْهَدِيَّةَ تَسُلُّ السَّخِيمَةَ**». رَوَاهُ الْبَزَّارُ بِإِسْنَادٍ ضَعِيفٍ.

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تحفے تحائف کا باہمی تبادلہ کیا کرو کیونکہ یہ ہدیہ بغض و کینہ کو نکال دیتا ہے۔" (اسے بزار نے ضعیف سند سے روایت کیا ہے)

لغوی تشریح: ﴿ تسل السخيمة ﴾ تسل باب نصر ینصر سے ہے اور سخیمۃ سین پر فتحہ اور "خا" کے نیچے کسرہ۔ یعنی کبر و نخوت اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ سین پر ضمہ اور "خا" پر فتحہ یعنی کینہ' پوشیدہ دشمنی یعنی وہ دشمنی جو دل میں بیٹھ جائے۔ معنی یہ ہوئے کہ ہدیہ کے ذریعہ بغض و کینہ اور مخفی دشمنی کو نکال دیتا ہے۔

(۷۹۷) وَعَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «يَا نِسَاءَ الْمُسْلِمَاتِ لاَ تَحْقِرَنَّ جَارَةٌ لِجَارَتِهَا وَلَوْ فِرْسِنَ شَاةٍ». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "اے مسلمان عورتو! کوئی ہمسائی اپنی ہمسائی کیلئے ہدیہ بھیجنے کو حقیر ہرگز نہ سمجھے خواہ وہ ہدیہ بکری کا کھر ہی کیوں نہ ہو۔" (بخاری و مسلم)

لغوی تشریح: ﴿ لا تحقرن ﴾ حقیر نہ سمجھے یعنی جو ہدیہ کسی کو دیا جائے اسے دینے والا حقیر تصور نہ کرے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ لوگ ہدیہ دینا ترک کر دیں گے اور جسے ہدیہ دیا گیا ہو وہ بھی اسے حقیر نہ سمجھے اگرچہ ہدیہ معمولی ہی کیوں نہ ہو۔ ﴿ فرسن ﴾ "فا" کے نیچے کسرہ اور "را" ساکن اور پھر سین کے نیچے کسرہ۔ کھر کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔

(۷۹۸) وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُمَا، عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ: «مَنْ وَهَبَ هِبَةً فَهُوَ أَحَقُّ بِهَا، مَا لَمْ يُثَبْ عَلَيْهَا». رَوَاهُ الحَاكِمُ، وَصَحَّحَهُ، وَالمَحْفُوظُ مِن رِوَايَةِ ابْنِ عُمَرَ عَنْ عُمَرَ قَوْلُهُ.

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا "جو شخص کوئی چیز ہبہ کرے وہی اس کا زیادہ مستحق ہے جبکہ اس کا بدلہ نہ دیا جائے۔" (اسے حاکم نے روایت کیا ہے اور اسے صحیح قرار دیا ہے اور صحیح یہ ہے کہ ابن عمر رضی اللہ عنہما کے حوالہ سے یہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا قول ہے)

حاصل کلام: اسی معنی کی دو روایتیں حضرت ابوھریرہ رضی اللہ عنہ اور ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہیں۔ بعض نے ان روایتوں کی بنا پر یہ قید لگائی ہے کہ جب ہدیہ کا بدلہ دے دیا گیا تو پھر ہبہ واپس لینا حرام ہے۔ مگر علامہ شوکانی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ابن جوزی فرماتے ہیں کہ حضرات ابن عمر رضی اللہ عنہما' ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ اور سمرہ رضی اللہ عنہ کی یہ روایات ضعیف ہیں۔ ان میں کوئی ایسی نہیں جسے صحیح قرار دیا جا سکے۔ طبرانی نے اپنی المعجم الکبیر میں ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مرفوع روایت بیان کی ہے کہ جس کسی نے کوئی چیز ہبہ کی وہ اس کا اس وقت تک زیادہ مستحق ہے جب تک اسے بدلہ نہ دے دیا جائے۔ اگر وہ اپنی ھبہ کردہ چیز کو واپس لے تو اس کی مثال اس جیسی ہے جو پہلے قے کرے اور پھر اسے کھائے۔ اگر یہ احادیث صحیح ہیں تو یہ اس بات میں پہلی حدیث کی مخالف ہیں۔ یعنی جو ایسے ھبہ کو واپس لینا حرام قرار دے رہی ہے جس کا بدلہ لے لیا گیا ہو۔ لہٰذا بدلہ لینے سے پہلے ھبہ کردہ چیز کو واپس لینا جائز ہے۔ علامہ شوکانی رحمہ اللہ کا یہ کلام اس پر دلالت کرتا ہے کہ وہ ان احادیث کی صحت پر مطمئن نہیں کہ ان سے پہلی حدیث کی تخصیص درست قرار دی جائے۔

١٩ - بَابُ اللُّقَطَةِ
لقطہ (گری پڑی چیز) کا بیان

(۷۹۹) عَنْ أَنَسٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ کا

عَنْهُ قَالَ: مَرَّ النَّبِيُّ ﷺ بِتَمْرَةٍ فِي الطَّرِيْقِ، فَقَالَ: «لَوْلاَ أَنِّي أَخَافُ أَنْ تَكُونَ مِنَ الصَّدَقَةِ لأَكَلْتُهَا». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

گزر راستہ میں گری پڑی ایک کھجور پر ہوا تو اسے دیکھ کر فرمایا: "اگر مجھے اس کا اندیشہ نہ ہوتا کہ شاید یہ صدقہ کی ہو' تو میں اسے ضرور کھالیتا۔" (بخاری و مسلم)

لغوی تشریح: ﴿باب اللقطة﴾ لقطہ کے لام پر ضمہ اور قاف پر فتحہ اور کہا گیا کہ اس کے ماسوا جائز نہیں۔ مگر خلیل نحوی نے بڑے دعوے کے ساتھ کہا ہے کہ "قاف" ساکن ہے اور زمخشری کے قول کے مطابق عام لوگوں کی رائے یہی ہے حالانکہ اہل عرب سے ہی سنا گیا ہے کہ اہل لغت اور محدثین اس پر متفق ہیں کہ قاف پر فتحہ ہے اور اس کے علاوہ کوئی اعراب نہیں ہے اور لقطہ زمین پر گری ہوئی چیز پکڑنے کو کہتے ہیں۔

حاصل کلام: یہ حدیث اس بات کی دلیل ہے کہ راستے میں گری پڑی چیز اگر معمولی سی ہو تو اس سے انتفاع جائز ہے اور اسے اٹھانے والے کیلئے اس کا اعلان کرتے رہنا بھی ضروری نہیں۔ بے دھیان اور غفلت میں گری ہوئی چیز کی تین اقسام ہیں۔ ایک یہ کہ وہ چیز بالکل معمولی سی ہو اور کھانے کے کام آنے والی ہو۔ اس کے بارے میں شرعی حکم یہ ہے کہ اسے اٹھا کر صاف کر کے بسم اللہ پڑھ کر نوش کر لیا جائے۔ دوسری یہ کہ وہ چیز ہو تو معمولی نوعیت کی مگر کھانے کے کام آنے والی نہ ہو اس کو تین روز تک لوگوں کے اجتماع میں اعلان کرتا رہے مثلاً معمولی چاقو' چھری' چھڑی قسم کی چیز یا چابک وغیرہ۔ تیسری یہ کہ وہ چیز قیمتی ہو اس کے بارے میں ارشاد نبوی ﷺ ہے کہ اس کا سال بھر اعلان کرائے۔ فی زمانہ اخبارات' ٹیلی ویژن' ریڈیو وغیرہ اور مساجد کے باہر بڑے بڑے جلسوں میں اعلان کرایا جا سکتا ہے اگر اشتہار کی صورت میں اسے کچھ مصارف کرنے پڑیں تو مالک لقطہ سے وصول کئے جا سکتے ہیں اگر وہ آجائے ورنہ اپنی جیب خاص سے۔ سال بھر اعلان کے بعد بھی اگر اس کا اصل مالک نہ ملے تو اسے استعمال میں لایا جا سکتا ہے پھر بھی اس کی علامات اور نشانیاں ذہن نشین کر لے یا نوٹ کر لے بعد میں بھی اگر اصل مالک آجائے تو اتنی قیمت ادا کرے یا مالک اسے خود چھوڑ دے۔

(۸۰۰) وَعَنْ زَيْدِ بْنِ خَالِدٍ الْجُهَنِيِّ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، قَالَ: جَآءَ رَجُلٌ إِلَى النَّبِيِّ ﷺ، فَسَأَلَهُ عَنِ اللُّقَطَةِ، فَقَالَ: اَعرِفْ عِفَاصَهَا وَوِكَآءَهَا، ثُمَّ عَرِّفْهَا سَنَةً، فَإِنْ جَآءَ صَاحِبُهَا، وَإِلاَّ فَشَأْنُكَ بِهَا، قَالَ: فَضَالَّةُ الغَنَمِ؟ قَالَ: هِيَ لَكَ، أَوْ

حضرت زید بن خالد جہنی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ایک آدمی نبی ﷺ کی خدمت میں آیا اور اس نے گری پڑی چیز کے بارے میں پوچھا۔ آپؐ نے فرمایا "اس کا ڈاٹ اور تسمہ خوب پہچان کے رکھو۔ سال بھر اس کا اعلان کرتے رہو پھر اگر اس کا اصل مالک آجائے تو اس کے سپرد کر دو ورنہ جو چاہو کرو۔" پھر اس نے گم شدہ بکریوں کے بارے میں سوال کیا۔

لِأَخِيْكَ، أَوْ لِلذِّئْبِ ، قَالَ: فَضَالَّةُ الإِبِلِ؟ قَالَ: مَا لَكَ وَلَهَا؟ وَمعَهَا سِقَآؤُهَا، وَحِذَآؤُهَا، تَرِدُ المَآءَ، وَتَأْكُلُ الشَّجَرَ، حَتَّى يَلْقَاهَا رَبُّهَا. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

آپؐ نے فرمایا "وہ تیری ہے یا تیرے بھائی کی یا بھیڑیئے کی۔" پھر اس نے گم شدہ اونٹ کے بارے میں پوچھا۔ آپؐ نے فرمایا "تجھے اس سے کیا سروکار اس کا پانی' اس کے جوتے اس کے پاس ہیں۔ گھاٹ پر آکر پانی پی لے گا' درختوں کے پتے کھا لے گا۔ یہاں تک کہ اس کا مالک اس کے پاس پہنچ جائے گا۔" (بخاری و مسلم)

لغوی تشریح: ﴿اعرف﴾ معرفت سے امر کا صیغہ ہے۔ ﴿عفاصها﴾ عین پر کسرہ۔ وہ برتن وغیرہ جس میں لقطہ ملے چمڑے کا ہو یا کپڑے وغیرہ کا۔ علامہ خطابی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ عفاص دراصل اس چمڑے کو کہتے ہیں جو بوتل کے منہ پر اسے بند کرنے کیلئے چڑھایا جاتا ہے۔ ﴿وكاءها﴾ وکاء میں "واؤ" کے نیچے کسرہ ہے یعنی وہ دھاگہ' رسی یا تسمہ جس سے تھیلے وغیرہ کا منہ باندھا جاتا ہے۔ ﴿ثم عرفها﴾ "را" پر تشدید۔ یہ تعریف سے امر کا صیغہ ہے یعنی لوگوں کے اجتماع گاہوں اور مجمعوں میں اس کا اعلان کرے۔ کہ جس کسی کی فلاں چیز گم ہوگئی ہو وہ مجھ سے طلب کرے۔ ﴿فان جاء صاحبها﴾ یہ شرط ہے اس کی جزا محذوف ہے کہ وہ اطلاع دے کہ اس کی تعداد کتنی ہے' اس کا بندھن کیسا ہے' اس کا تھیلا کس طرح کا ہے؟ اگر وہ ساری نشانیاں صحیح بتا دے تو وہ گری ہوئی چیز اس کے سپرد کر دے۔ جیسا کہ دوسری روایات میں اس کی صراحت آئی ہے۔ ﴿والا﴾ یعنی اگر اس کا اصل مالک سال بھر کے اعلان تک نہ آئے۔ ﴿فشانك بها﴾ شانك منصوب ہے۔ یعنی پھر اسے اپنے قبضہ میں لے لے اور اگر "شانک" کو رفعی حالت میں پڑھیں تو یہ مبتداء ہوگا اور اس کی خبر محذوف ہوگی یعنی اس کا استعمال کرنا جائز ہے' مباح ہے۔ مطلب یہ ہوا کہ سال بھر کے اعلان کے اختتام پر اس سے انتفاع کا اسے اختیار ہے کہ جس طرح چاہے اسے اپنے مصرف میں لائے اور ترمذی کی ایک روایت میں ہے کہ پھر اسے خرچ کر لے اور ابوداؤد کی روایت میں ہے کہ پھر اسے کھا لے اور ایک دوسری روایت میں یہ ہے کہ اسے اپنے مال میں شامل کر کے اپنے قبضہ میں کر لے اور جب "فشانك" کی جگہ گری ہوئی چیز پانے والا اعلان کے بعد اسے خرچ کر چکے اور بعد میں اس کا مالک بھی آجائے اور اس کی علامات وغیرہ بتلا دے تو کیا ایسی صورت میں وہ لقطہ کو واپس کرنے کا پابند ہے یا نہیں؟ روایات سے تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ اسے واپس کرنا واجب ہے چنانچہ ترمذی کی روایت میں ہے کہ سال بھر اس کا اعلان و اشتہار دے پھر اس کا بندھن اور تھیلا اور اس کا سربند وغیرہ ذہن نشین کر لے پھر اسے خرچ کر لے۔ اب اگر اس کا مالک آجائے تو وہ چیز اسے لوٹا دے اور ایک دوسری روایت میں ہے کہ سال بھر اس کا اعلان کرتا رہ اگر اسے پہچان لیا جائے تو اسے واپس کر دے ورنہ پھر اس کا سربند' تھیلا اور تعداد یاد رکھ اور اسے استعمال کر لے۔ اس کے بعد اگر اس کا مالک

آجائے تو پھر بھی اسے واپس لوٹا دے۔ ابوداؤد میں بھی یہ روایت بعض لفظی اختلاف کے ساتھ مروی ہے اور یہ تمام الفاظ اس کے متقاضی ہیں کہ سال گزرنے کے بعد بھی اصل مالک کی ملکیت باقی رہتی ہے اور جس نے وہ لقطہ اٹھایا ہو ضمانت و ذمہ داری کے بغیر اسے کھانا جائز نہیں ہے۔ ﴿ فضالة الغنم ﴾ یعنی گم شدہ بکری کا کیا حکم ہے؟ ضالة گم کردہ راہ۔ راستہ بھٹکی ہوئی۔ وہ حیوان جو آبادی سے دور ویران جگہ میں رہ گیا ہو ﴿ هی لک الخ ﴾ وہ تیرے لئے اور ترمذی کی روایت میں ہے اسے پکڑ لو۔ وہ تمہارے ہی لئے ہے۔ مطلب یہ ہے کہ سال بھر اعلان کے بعد اسے کھا سکتے ہو ﴿ او لاخیک ﴾ یعنی اگر تو نے اسے چھوڑ دیا تو تیرے جیسا تیرا کوئی دوسرا بھائی اسے پکڑ لے گا۔ پھر تو اسے کیوں چھوڑتا ہے حالانکہ تو اس کے پاس پہلے پہنچا ہے۔ ﴿ او للذئب ﴾ یعنی اگر تو نے اور تیرے جیسے دوسرے تیرے بھائی نے اسے چھوڑ دیا تو اسے بھیڑیا کھا جائے گا اور بھیڑیئے کے لئے اسے چھوڑنا اسے ضائع کرنا ہے۔ اس میں لقطہ کو لینے کی ترغیب ہے۔ ﴿ مالک ولها ﴾ یعنی تجھے اس سے کیا سروکار؟ یہ استفہام انکاری ہے۔ مطلب یہ ہوا کہ جب تیرے لئے نہیں ہے تو پھر اسے نہ پکڑ۔ ﴿ سقاء ها ﴾ سین کے نیچے کسرہ مشکیزہ تھیلا۔ اس سے اس کا اندر کا خالی حصہ مراد ہے جہاں کوئی چیز رکھی یا ڈالی جاتی ہے یعنی جب یہ اونٹ پانی کے گھاٹ پر وارد ہوگا تو اتنا پانی پی لے گا کہ دوسرے روز آنے تک یہ پانی کافی رہے گا۔ اس کے باوجود اس کے پیٹ اور اس کی اوجھ میں اتنی رطوبیت ہوتی ہے جو اس کیلئے چند ایام تک پانی سے بے نیاز رکھتی ہے ﴿ حذاء ها ﴾ "حا" کے نیچے کسرہ۔ جوتی مراد ہے یعنی اس کے پاؤں موجود ہیں جو اسے چلنے میں قوت دیتے ہیں اور دور دراز کے علاقوں کو طے کرنے میں مدد و معاون ثابت ہوتے ہیں اور دور دراز واقع پانی پر پہنچنے میں تقویت کا باعث ہیں۔ اس سے مراد یہ ہے کہ اونٹ پانے والے کو اس کا تعرض کرنے کی ضرورت نہیں کیونکہ وہ پانی کے گھاٹ پر وارد ہو جاتا ہے' درختوں کے پتے کھا لیتا ہے اور بغیر کسی نگران و محافظ کے زندہ رہ سکتا ہے اور اکثر درندوں سے اپنا دفاع بھی بخوبی کر لیتا ہے۔ پس ضروری ہے کہ اس کو چھوڑ دیا جائے کہ اس کا مالک آئے اور اسے پکڑ کر لے جائے۔

راوی حدیث: ﴿ زید بن خالد جهنی رضی اللہ عنہ ﴾ ان کی کنیت ابو عبدالرحمان یا ابو طلحہ تھی۔ مدینہ میں رہنے کی وجہ سے مدنی کہلائے۔ اکابر صحابہ میں شمار ہوتا ہے۔ فتح مکہ کے موقع بنو جهینہ کا جھنڈا ان کے ہاتھ میں تھا۔ کوفہ چلے آئے اور وہیں پر ۶۸ھ ۷۸ھ کو ۸۵ سال کی عمر میں فوت ہوئے۔

(۸۰۱) وَعَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «مَنْ آوَى ضَالَّةً فَهُوَ ضَالٌّ مَا لَمْ يُعَرِّفْهَا». رَوَاهُ مُسْلِمٌ.

حضرت زید بن خالد جہنی رضی اللہ عنہ سے ہی مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "جس کسی نے گم شدہ چیز کو اپنے ہاں پناہ دی اور اس کا اعلان نہ کیا تو وہ خود گم راہ ہے۔" (مسلم)

لغوی تشریح: ﴿ من آوی ضالة ﴾ یعنی جو اس لقطہ کو اپنے ذاتی مال میں شامل کر لے۔ ﴿ فهو ضال ﴾

وہ راہ حق اور صراط مستقیم سے بھٹکا ہوا ہے اور وہ ہدایت یافتہ نہیں۔ یہ اس صورت میں ہے جبکہ اس نے سال بھر اس کا اعلان نہ کیا ہو۔

حاصل کلام: اس حدیث میں یہ تنبیہہ ہے کہ اگر کوئی آدمی گری پڑی چیز کو اعلان کرنے کیلئے اٹھائے یا اس نیت سے اٹھائے کہ شاید ایسے آدمی کے ہاتھ نہ لگ جائے جو اس کا اعلان ہی نہ کرے اور خود ہی ہڑپ کر جائے تو اسے اٹھانے میں کوئی مضائقہ نہیں اور اگر اس کی اپنی نیت ہی ہضم کر جانے کی ہو اور اس کا اعلان وغیرہ بھی نہ کرے تو یہ آدمی خود گم کردہ راہ ہے۔ اسے چاہئے کہ گری پڑی چیز کو ہاتھ نہ لگائے' جہاں پڑی ہے پڑی رہے اور اپنی ذمہ داری سے سبکدوش رہے۔

(٨٠٢) وَعَنْ عِيَاضِ بْنِ حِمَارٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «مَنْ وَجَدَ لُقَطَةً فَلْيُشْهِدْ ذَوَيْ عَدْلٍ، وَلْيَحْفَظْ عِفَاصَهَا، وَوِكَاءَهَا، ثُمَّ لاَ يَكْتُمْ، وَلاَ يُغَيِّبْ، فَإِنْ جَاءَ رَبُّهَا، فَهُوَ أَحَقُّ بِهَا، وَإِلاَّ فَهُوَ مَالُ اللهِ يُؤْتِيهِ مَنْ يَشَاءُ». رَوَاهُ أَحْمَدُ وَالأَرْبَعَةُ إِلاَّ التِّرْمِذِيَّ، وَصَحَّحَهُ ابْنُ خُزَيْمَةَ وَابْنُ الجَارُودِ وَابْنُ حِبَّانَ.

حضرت عیاض بن حمار رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "جس کسی کو کوئی گم شدہ چیز کہیں گری پڑی ملے تو اسے چاہئے کہ دو منصف و عادل آدمیوں کو اس پر گواہ بنا لے اور خود اس کے ڈاٹ اور سربند کو خوب یاد رکھے اور پھر اسے چھپانے اور غائب کرنے کی کوشش نہ کرے۔ پھر اگر اس چیز کا اصل مالک آجائے تو وہی اس کا زیادہ حق دار ہے۔ اگر نہ آئے تو وہ اللہ کا مال ہے وہ جسے چاہتا ہے عنایت فرما دیتا ہے۔" (اسے احمد اور ترمذی کے علاوہ چاروں نے روایت کیا ہے اور ابن خزیمہ' ابن جارود اور ابن حبان نے اسے صحیح قرار دیا ہے)

لغوی تشریح: ﴿ فليشهد ذوی عدل ﴾ علامہ خطابی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس میں امر تادیب کیلئے ہے۔ ایسا نہ ہو کہ شیطان اپنے فریب کے جال میں پھانس لے اور امانت کے بعد خیانت کی طرف دعوت دے یا اس کی نیت میں خرابی پیدا ہو جائے کہ وہ اپنے ورثاء کیلئے ترکہ چھوڑ جائے اور پھر ورثاء اسے اپنے مال میں ترکہ سمجھ کر شامل کر لیں۔ ﴿ لايكتم ﴾ یعنی اسے چھپائے نہیں۔ بایں طور کہ اس کا اعلان ہی نہ کرے۔ ﴿ ولا يغيب ﴾ باب تفعیل سے۔ یعنی اسے دوسری جگہ منتقل کر کے چھپانے کی کوشش نہ کرے۔

حاصل کلام: اس حدیث کی رو سے لقطہ جب ملے اس وقت بھی اور جب مالک کے سپرد کرے اس وقت بھی گواہ بنانا واجب ہے مگر امام شافعی رحمہ اللہ کے ہاں مستحب ہے۔ اس کا بڑا فائدہ یہ ہوگا کہ خدانخواستہ یکے بعد دیگرے دو آدمی آکر اس کی ملکیت کا دعویٰ کرتے ہیں اور علامات اور نشانیاں بھی بتا دیتے ہیں تو اب یہ کس کو دے؟ اسی جھگڑے سے محفوظ رہنے کیلئے گواہ بنانا ضروری ہے کیونکہ پوری اور صحیح علامات تو

صرف مالک اصلی ہی بتا سکے گا۔ گواہوں کی موجودگی میں واپس دے کر اس جھگڑے کو ختم کر سکے گا۔

راوی حدیث: ﴿ عیاض بن حمار رضی اللہ عنہ ﴾ عیاض کے عین اور حمار کے "حا" کے نیچے کسرہ ہے۔ مشہور صحابی ہیں۔ تمیمی مجاشعی ہیں۔ انہوں نے بصرہ کو جائے سکونت قرار دے لیا تھا اور پچاس ہجری کے آخر تک زندہ رہے۔

(۸۰۳) وَعَنْ عَبْدِ الرَّحْمَنِ بْنِ عُثْمَانَ التَّيْمِيِّ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ نَهَى عَنْ لُقَطَةِ الحَاجِّ. رَوَاهُ مُسْلِمٌ.

حضرت عبدالرحمٰن بن عثمان تیمی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی ﷺ نے حجاج کی گری پڑی چیز کو اٹھانے سے منع فرمایا ہے۔ (مسلم)

لغوی تشریح: ﴿ نهى عن لقطة الحاج ﴾ اس سے مراد یہ ہے کہ حاجی کا جو سامان مکہ میں گم ہو گیا ہو۔ اسے اٹھانے کی ممانعت صرف اسے اپنی ملکیت میں لینے کی بنا پر ہے ورنہ اگر وہ اعلان کرنے کیلئے اٹھائے گا تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں کیونکہ بخاری و مسلم میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ گری پڑی چیز صرف اس کیلئے اٹھانا حلال ہے جو اس کا اعلان کرنے کا عزم رکھتا ہو۔

راوی حدیث: ﴿ عبدالرحمن بن عثمان رضی اللہ عنہ ﴾ عبدالرحمٰن بن عثمان بن عبیداللہ تیمی قرشی۔ یہ طلحہ بن عبیداللہ کے بھائی کے بیٹے ہیں۔ شرف صحابیت سے مشرف ہیں۔ ایک قول یہ بھی ہے کہ انہوں نے نبی ﷺ کا زمانہ تو پایا مگر شرف رؤیت حاصل نہیں۔ حدیبیہ کے روز اسلام قبول کیا اور ایک قول کے مطابق فتح مکہ کے موقع پر دائرۂ اسلام میں داخل ہوئے۔ ۷۳ھ میں عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما کے ساتھ لڑائی میں حصہ لیا۔

(۸۰٤) وَعَنِ الْمِقْدَامِ بْنِ مَعْدِيكَرِبَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «أَلاَ لاَ يَحِلُّ ذُو نَابٍ مِنَ السِّبَاعِ، وَلاَ الحِمَارُ الأَهْلِيُّ، وَلاَ اللُّقَطَةُ مِنْ مَالِ مُعَاهِدٍ، إِلاَّ أَنْ يَسْتَغْنِيَ عَنْهَا». رَوَاهُ أَبُو دَاوُدَ.

حضرت مقدام بن معدیکرب رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "سن لو! درندوں میں سے کچلیوں والا جانور حلال نہیں اور نہ ہی گھریلو گدھا اور ذمی کی گم شدہ گری پڑی چیز اٹھانا بھی حلال نہیں ہے۔ الا یہ کہ مالک کے نزدیک اس کی خاص اہمیت و ضرورت نہ ہو۔" (ابوداؤد)

لغوی تشریح: ﴿ ذوناب ﴾ ناب وہ دانت جو رباعیہ کے پیچھے ہوتا ہے۔ ناب کی جمع انیاب۔ کچلیوں والے درندہ سے مراد وہ جانور ہے جو چیر پھاڑ کر کھاتا ہو اور شکار کرنے اور اسے کاٹنے کیلئے اپنی کچلیوں سے مدد لیتا ہو۔ ﴿ السباع ﴾ سین کے نیچے کسرہ۔ سبع کی جمع ہے۔ سبع کی سین پر فتحہ اور "با" پر ضمہ اور فتحہ دونوں طرح جائز ہے۔ چیرنے پھاڑنے والا درندہ۔ ﴿ من مال معاهد ﴾ معاہدہ وہ ہے جس کا مسلمان حکام

سے معاہدہ ہو کہ وہ اسے امان دیتے ہیں' وہ ذمی ہی ہے اس کا بالخصوص ذکر اس لئے کیا گیا ہے کہ اسے زیادہ اہمیت دینا مقصود ہے۔

حاصل کلام: معاہد چونکہ اسلامی سلطنت میں باقاعدہ اجازت لے کر آتا ہے اور پر امن رہتا ہے' اسی لئے اس کے مال و جان کی ذمہ داری اسلامی حکومت پر ہوتی ہے۔ اس لئے اس کے مال اور مسلمان کے لقطہ میں کوئی فرق نہیں رکھا گیا۔ البتہ اگر عرف عام میں کوئی معمولی چیز ہو تو اس کی اجازت ہے۔

راوی حدیث: ﴿ مقدام رضی اللہ عنہ ﴾ مقدام کے میم کے نیچے کسرہ۔ مقدام بن معدیکرب۔ کرب کے کاف پر فتحہ اور "را" کے نیچے کسرہ اور "با" اضافت کی وجہ سے اس کے نیچے کسرہ مع تنوین جائز ہے اور مبنی ہونے کی بنا پر اس پر فتحہ بھی جائز ہے۔ بن عمرو الکندی۔ ان کی کنیت ابوکریمہ تھی یا ابویحییٰ۔ مشہور صحابی ہیں۔ شام میں فروکش ہوئے۔ ان کی حدیث شامیوں میں مشہور ہے۔ صحیح قول کے مطابق ۸۷ھ میں وفات پائی۔ اس وقت ان کی عمر ۹۱ برس تھی۔

۲۰ - بَابُ الفَرَآئِض۔ فرائض (وراثت) کا بیان

(۸۰۵) عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «أَلْحِقُوا الفَرَائِضَ بِأَهْلِهَا، فَمَا بَقِيَ فَهُوَ لِأَوْلىٰ رَجُلٍ ذَكَرٍ». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "شریعت کے مقرر کردہ حصے ان کے مستحق حصہ داروں کو ادا کر دو اور پھر جو کچھ باقی بچ جائے اسے سب سے قریبی مرد وارث کو دے دو۔" (بخاری و مسلم)

لغوی تشریح: ﴿ باب الفرائض ﴾ فرائض فریضہ کی جمع ہے اس سے مراد وہ مقرر حصہ وراثت ہے جو مرنے والے کی میراث سے کتاب و سنت کی رو سے وارثوں کو ملتا ہے' وہ حصہ آدھا' چوتھا' آٹھواں اور دو تہائی اور چھٹا حصہ ہے۔ یہ فرض سے ماخوذ ہے جس کے معنی قطعی کے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ فلاں کے لئے فرض کر دیا گیا' یہ اس وقت کہتے ہیں جب کسی کے لئے مال میں سے کوئی حصہ قطعی طور پر مقرر کر دیا گیا۔ ﴿ الحقوا ﴾ ہمزہ پر فتحہ اور "حا" کے نیچے کسرہ۔ پہنچا دو' ادا کر دو۔ ﴿ باھلھا ﴾ جن کے حصے مقرر ہیں۔ ان کو ان کے حصے دے دو اور "اہل فرائض" سے مراد وہ وہ لوگ ہیں جن کے حصے کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ ﷺ میں بیان ہوئے ہیں۔ ﴿ فما بقی ﴾ حصہ داروں کے حصے ادا کر چکنے کے بعد جو کچھ باقی بچ رہے۔ ﴿ فھو لاولی رجل ﴾ نسب کے اعتبار سے جو شخص مرنے والے کے زیادہ قریب ہو۔ ﴿ ذکر ﴾ ذکر یعنی مذکر کی قید لگانے سے تاکید مقصود ہے یا پھر اس سے مخنث کو اس زمرے سے خارج کرنا مطلوب ہے اور اس پر متنبہ کرنا مقصود ہے کہ اس باقی ماندہ مال میراث کا استحقاق اسے صرف بحیثیت مرد کے ہے۔ مرنے والے کے سب سے زیادہ قریب مطلقاً تو اس کے بیٹے ہیں۔ پھر پوتے' پڑپوتے وغیرہ پھر باپ پھر

دادا وغیرہ پھر بھائی' پھر بھتیجے' پھر چچا اور ان کی اولاد یہ تمام نسبی عصبہ ہیں۔ علامہ نووی رحمہ اللہ کا قول ہے کہ اس پر اجماع ہے کہ اہل فرائض سے جو کچھ باقی بچے وہ عصبات کیلئے ہے۔ اقرب فالاقرب کے ضابطہ کے تحت۔ جب قریبی رشتہ دار موجود ہو تو پھر اس کی موجودگی میں دور کا عصبی رشتہ دار وراثت کا استحقاق نہیں رکھتا۔

(۸۰۶) وَعَنْ أُسَامَةَ بْنِ زَيْدٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ قَالَ: «لاَ يَرِثُ الْمُسْلِمُ الكَافِرَ، وَلاَ يَرِثُ الكَافِرُ الْمُسْلِمَ». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت اسامہ بن زید رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا کہ "مسلمان' کافر کا وارث نہیں ہوگا اور نہ ہی کافر' مسلمان کا وارث ہوگا۔" (بخاری و مسلم)

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ کوئی مسلمان اپنے مرنے والے کسی کافر عزیز کا وارث نہیں ہو سکتا اور اسی طرح کوئی کافر اپنے مسلمان رشتہ دار کا وارث قرار نہیں پا سکتا۔ جمہور علماء کی یہی رائے ہے لیکن بعض کی رائے یہ ہے کہ مسلمان تو کافر کا وارث ہو سکتا ہے مگر کافر مسلمان کا کسی صورت بھی وارث نہیں ہو سکتا۔ یہ رائے حضرت معاذ رضی اللہ عنہ' معاویہ رضی اللہ عنہ' مسروق رضی اللہ عنہ' سعید بن مسیب رضی اللہ عنہ' ابراہیم نخعی رحمہ اللہ اور اسحق رحمہ اللہ وغیرہ کی ہے۔ حضرت معاذ رضی اللہ عنہ نے اس کیلئے حدیث الاسلام یعلو ولا یعلی کہ "اسلام غالب رہتا ہے مغلوب نہیں ہوتا" سے استدلال کیا ہے نیز اس سے بھی استدلال کیا گیا ہے یزید ولا ینقص کہ "اسلام میں بڑھنے کی اہلیت و صلاحیت ہے اس لئے اسلام بڑھتا ہے گھٹتا نہیں ہے۔" مگر اس عمومی حکم سے میراث کا واضح اور صاف حکم اس سے مستثنیٰ ہے کہ مسلمان کافر کا وارث نہیں ہو سکتا ہے۔ اس لئے جمہور کی رائے درست اور راجح ہے۔

(۸۰۷) وَعَنِ ابْنِ مَسْعُودٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، فِي بِنْتٍ، وَبِنْتِ ابْنٍ، وَأُخْتٍ، فَقَضَى النَّبِيُّ ﷺ «لِلاِبْنَةِ النِّصْفُ، وَلاِبْنَةِ الاِبْنِ السُّدُسُ، تَكْمِلَةَ الثُّلُثَيْنِ، وَمَا بَقِيَ فَلِلأُخْتِ». رَوَاهُ البُخَارِيُّ.

حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے بیٹی' پوتی اور بہن کی موجودگی میں فیصلہ فرمایا کہ دو تہائی پورا کرنے کیلئے بیٹی کو آدھا ترکہ اور پوتی کیلئے چھٹا حصہ ہو گا پھر جو کچھ باقی بچے وہ بہن کا۔ (بخاری)

لغوی تشریح: ﴿تکملة الثلثین﴾ اس لئے کہ پوتی بمنزلہ بیٹی ہوتی ہے۔ لہٰذا ایک بیٹی کی موجودگی میں یہ بمنزلہ دو بیٹیوں کے ہو گئیں اور دو بیٹیاں اگر ہوں تو ان کو ترکہ میں سے دو تہائی ترکہ ملتا ہے اور جب تنہا ایک بیٹی ہو تو وہ آدھا ترکہ کی مستحق ہوتی ہے اب دو تہائی پورا کرنے کیلئے چھٹا حصہ کی ضرورت ہے اور یہ اسے پوتی نے دے دیا۔ اس طرح دونوں کو جمع کر کے مجموعہ دو تہائی پورا ہو گیا جس کی دونوں

مستحق ہیں۔ ﴿ وما بقی للاخت ﴾ باقی جو بچے اس کی مستحق بہن ہے اس لئے کہ پوتی بیٹی کے ساتھ مل کر عصبہ بن گئی اور ذوالفرائض سے جو ترکہ بچ گیا اسے اس نے حاصل کر لیا۔

(۸۰۸) وَعَنْ عَبْدِ اللهِ بْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُمَا قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «لاَ يَتَوَارَثُ أَهْلُ مِلَّتَيْنِ». رَوَاهُ أَحْمَدُ وَالأَرْبَعَةُ إِلاَّ التِّرْمِذِيَّ، وَأَخْرَجَهُ الحَاكِمُ بِلَفْظِ أُسَامَةَ، وَرَوَى النَّسَائِيُّ حَدِيثَ أُسَامَةَ بِهَذَا اللَّفْظِ.

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "دو مختلف دین کے پیروکار ایک دوسرے کے وارث نہیں ہو سکتے۔" (اسے احمد اور ترمذی کے علاوہ چاروں نے روایت کیا ہے اور حاکم نے اسے ان الفاظ سے نقل کیا ہے جو اسامہ کی حدیث کے ہیں اور نسائی نے اسامہ کی حدیث کو ان الفاظ سے بیان کیا ہے (یعنی جو ابن عمر رضی اللہ عنہما کی حدیث کے ہیں)

لغوی تشریح: ﴿ اهل ملتین ﴾ دو ملتوں سے مراد دو مختلف کافرانہ ملتیں ہیں یا کفر و اسلام مراد ہے۔ جمہور اہل علم کے نزدیک اس سے مراد کفر اور اسلام ہے اور کافر آپس میں ایک دوسرے کے وارث ہو سکتے ہیں۔ صرف امام اوزاعی رحمہ اللہ حدیث کی عمومیت کی بنا پر تمام ملتوں کو اسی میں شامل کرتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ یہودی عیسائی کا اور عیسائی یہودی کا بھی وارث نہیں بن سکتا۔ علامہ الیمانی نے السبل میں کہا ہے حدیث کا ظاہری مفہوم انہی کا مؤید ہے۔ واللہ اعلم۔

(۸۰۹) وَعَنْ عِمْرَانَ بْنِ حُصَيْنٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُما قَالَ: جَآءَ رَجُلٌ إِلَى النَّبِيِّ ﷺ فَقَالَ: إِنَّ ابْنَ ابْنِيْ، مَاتَ، فَمَا لِيْ مِنْ مِيْرَاثِهِ؟ فَقَالَ: لَكَ السُّدُسُ، فَلَمَّا وَلَّى دَعَاهُ، فَقَالَ: لَكَ سُدُسٌ آخَرُ، فَلَمَّا وَلَّى دَعَاهُ، فَقَالَ: إِنَّ السُّدُسَ الآخَرَ طُعْمَةٌ. رَوَاهُ أَحْمَدُ وَالأَرْبَعَةُ، وَصَحَّحَهُ التِّرْمِذِيُّ، وَهُوَ مِنْ رِوَايَةِ الحَسَنِ البَصْرِيِّ عَنْ عِمْرَانَ، وَقِيْلَ: إِنَّهُ لَمْ يَسْمَعْ مِنْهُ.

حضرت عمران بن حصین رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ ایک آدمی نبی ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کی کہ میرا پوتا وفات پا گیا ہے۔ اس کے ترکہ میراث میں میرا حصہ کتنا ہے؟ آپؐ نے فرمایا "تجھے چھٹا حصہ ملے گا۔" پھر جب وہ جانے لگا تو اسے آپؐ نے بلایا اور فرمایا "تیرے لئے مزید چھٹا حصہ ہے۔" پھر جب وہ جانے لگا تو اس کو بلایا اور فرمایا کہ "آخری چھٹا حصہ تیرے لئے رزق ہے۔" (اسے احمد اور چاروں نے روایت کیا ہے اور ترمذی نے صحیح کہا ہے اور یہ روایت حسن بصری نے بھی عمران رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے مگر یہ کہا گیا ہے کہ حسن بصری کا عمران بن حصین رضی اللہ عنہما سے سماع ہی ثابت نہیں)

لغوی تشریح: ﴿ لک السدس ﴾ مقرر و طے شدہ حصہ میں سے چھٹا حصہ تجھے ملے گا۔ ﴿ لک سدس

آخر ﴾ تیرے لئے مزید چھٹا حصہ ہے اور یہ عصبہ کی حیثیت سے اور آخر میں "خا" پر فتحہ ہے۔ ﴿ ان السدس الاخر ﴾ آخر کے "خا" کے نیچے کسرہ۔ ﴿ طعمۃ ﴾ رزق کے معنی میں۔ اصحاب فروض کے کم ہونے کی بنا پر تجھے مقررہ حصہ سے زائد بطور رزق دیا گیا ہے۔ یہ حصہ ہر حال میں تجھے نہیں ملتا۔ طیبی نے کہا ہے کہ اس مسئلہ کی یہ صورت اس وقت ہے کہ میت نے دو بیٹیاں اپنے پیچھے چھوڑی ہوں۔ اس سوال کرنے والے کی بھی دو بیٹیاں تھیں ان کیلئے دو تہائی طے شدہ تھا مگر باقی ایک تہائی بچ گیا پس وہ بھی نبی ﷺ نے اسی سائل کو دے دیا۔ فرض حصہ کے ساتھ چھٹا حصہ میت کے دادا ہونے کی حیثیت میں۔ وہ جانے لگا تو آپؐ نے اسے دوسرا چھٹا حصہ بھی عنایت فرما دیا یہ اس لئے کیا کہ اسے یہ گمان نہ ہو کہ اس کا مقررہ حصہ ایک تہائی ہے۔

راوی حدیث: ﴿ حسن بصری رحمہ اللہ ﴾ حسن بن ابی الحسن بصری انصاری۔ انصار کے آزاد کردہ غلام تھے۔ ان کے والد کا نام یسار تھا۔ رشد و ہدایت کے ائمہ میں سے تھے۔ بالاتفاق ثقہ' فقیہہ اور علم و فضل کے مالک تھے۔ عبادت گزار' گوشہ نشین' کثیر العلم' فصیح و بلیغ' حسین و جمیل' علوم کے جامع' بلند و بالا منصب علم پر فائز تھے۔ تابعین کے تیسرے طبقہ کے سرخیل تھے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی خلافت میں ابھی دو سال باقی تھے کہ ان کی پیدائش ہوئی۔ انہوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو اپنی چشم بینا سے دیکھا ہے مگر ان سے کسی حدیث کا سماع نہیں کیا۔ رجب ۱۱۰ھ میں نوے برس کے قریب عمر پا کر فوت ہوئے۔

(۸۱۰) وَعَنِ ابْنِ بُرَيْدَةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُ، عَنْ أَبِيهِ أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ جَعَلَ لِلْجَدَّةِ السُّدُسَ، إِذَا لَمْ يَكُنْ دُونَهَا أُمٌّ. رَوَاهُ أَبُو دَاوُدَ وَالنَّسَائِيُّ، وَصَحَّحَهُ ابْنُ خُزَيْمَةَ وَابْنُ الجَارُودِ، وَقَوَّاهُ ابْنُ عَدِيٍّ.

حضرت ابن بریدہ رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے دادی کیلئے چھٹا حصہ مقرر فرمایا جبکہ درمیان میں اس کی ماں نہ ہو۔ (ابوداؤد' نسائی دونوں نے روایت کیا ہے اور ابن خزیمہ' ابن جارود نے صحیح قرار دیا ہے اور ابن عدی نے اسے قوی قرار دیا ہے)

لغوی تشریح: ﴿ للجدۃ السدس ﴾ دادی کیلئے چھٹا حصہ۔ خواہ دادی' باپ کی ماں ہو یا ماں کی والدہ ہو۔ ایک ہی ہو یا زیادہ ہوں اوپر والی ہوں یا نیچے والی۔ قرابت کی وجہ سے بعد کی قسم ساقط ہو جائے گی اور یہ حدیث اس پر دلالت کرتی ہے کہ دادی مطلقاً ماں کی وجہ سے ساقط ہو جائے گی اور اہل علم نے اس کو بھی تسلیم کیا ہے کہ باپ کی موجودگی میں دادا' پڑدادا بھی ساقط ہو جائیں گے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ' علی رضی اللہ عنہ اور زید بن ثابت رضی اللہ عنہ وغیرہ کی یہی رائے ہے۔

(۸۱۱) وَعَنِ الْمِقْدَامِ بْنِ مَعْدِيْكَرِبَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «الخَالُ

حضرت مقدام بن معدیکرب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "ماموں اس کا وارث ہو گا جس کا کوئی وارث زندہ نہ بچا ہو۔" (اس حدیث کو

وَارِثُ مَنْ لاَ وَارِثَ لَهُ». وَأَخْرَجَهُ أَحْمَدُ وَالأَرْبَعَةُ، سِوَى التِّرْمِذِيِّ، وَحَسَّنَهُ أَبُو زُرْعَةَ الرَّازِيُّ وَصَحَّحَهُ الحَاكِمُ وَابْنُ حِبَّانَ.

تخریج احمد اور چاروں نے بیان کیا ہے سوائے ترمذی کے۔ ابوزرعہ رازی نے اسے حسن کہا' حاکم اور ابن حبان نے اسے صحیح قرار دیا ہے)

لغوی تشریح: ﴿ الخال وارث الخ ﴾ یہ حدیث دلیل ہے کہ ذوالارحام بھی وراثت پاتے ہیں۔ اکثر صحابہ کرامؓ کی یہی رائے ہے۔ زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کا ایک قول ہے کہ یہ وراثت نہیں پاتے اور شوکانی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ پہلے گروہ کی دلیل یہی حدیث ہے۔ نیز اللہ تعالیٰ کے ارشاد گرامی کے عموم سے بھی ان کی تائید ہوتی ہے۔ ارشاد ہے "واولوا الارحام بعضهم اولی ببعض" اور قرابت والے ایک دوسرے کے وارث ہونے میں زیادہ حقدار ہیں۔ نیز ارشاد ربانی ہے۔ للرجال نصیب مما ترک الوالدان والا قربون' وللنساء نصیب مما ترک الوالدان والاقربون کہ جو کچھ ماں باپ اور قریبی چھوڑ گئے اس میں مردوں کا حصہ ہے اسی طرح عورتوں کا بھی حصہ ہے اس میں سے جو ماں باپ اور قریبی چھوڑ گئے ہیں۔ رجال' نساء اور اقربین کے الفاظ سب قریبی رشتہ داروں کو شامل ہیں اور یہ تخصیص کرنے والے کے دعویٰ کے خلاف دلیل ہے۔

حاصل کلام: اس حدیث کی رو سے اگر ذوالفروض اور عصبہ وارثوں میں سے کوئی زندہ نہ ہو تو پھر ماموں وارث ہوگا۔ ذوالارحام کو وارث قرار دینے میں علماء میراث میں اختلاف ہے۔ ایک بڑی جماعت تو ان کو وارث قرار دیتی ہے اور خالہ کی حیثیت بھی وہی ہے جو ماموں کی ہے۔ اگر یہ بھی نہ ہو تو پھر ترکہ بیت المال میں جمع کرا دیا جائے گا۔ جو لوگ ذوالارحام کی وارثت کے قائل نہیں ان کے نزدیک تو عصبات کی عدم موجودگی میں ترکہ بیت المال میں جمع کیا جائے گا مگر جمہور کی رائے ہی راجح ہے۔

(٨١٢) وَعَنْ أَبِي أُمَامَةَ بْنِ سَهْلٍ قَالَ: كَتَبَ مَعِيَ عُمَرُ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ إِلَى أَبِي عُبَيْدَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، أَنَّ رَسُولَ اللهِ ﷺ قَالَ: «اللَّهُ وَرَسُولُهُ مَوْلَى مَنْ لاَ مَوْلَى لَهُ، والخَالُ وَارِثُ مَنْ لاَ وَارِثَ لَهُ». رَوَاهُ أَحْمَدُ وَالأَرْبَعَةُ، سِوَى أَبِي دَاوُدَ، وَحَسَّنَهُ التِّرْمِذِيُّ، وَصَحَّحَهُ ابْنُ حِبَّانَ.

حضرت ابوامامہ بن سہل رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے میرے ذریعہ ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ کو لکھا کہ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے کہ "اللہ اور اس کا رسول ہر اس کا مولیٰ ہے جس کا کوئی مولیٰ نہ ہو اور جس کا کوئی وارث نہ ہو ماموں اس کا وارث ہے۔"

(احمد اور چاروں نے سوائے ابوداؤد کے روایت کیا ہے اور ترمذی نے اسے حسن قرار دیا ہے اور ابن حبان نے صحیح کہا ہے)

لغوی تشریح: ﴿ مولی من لا مولی لہ ﴾ یعنی جس کا کوئی ولی و سرپرست نہ ہو' جس کا کوئی والی وارث نہ ہو اور ابوداؤد میں مقدام سے مروی ہے کہ جس کا کوئی مولیٰ و سرپرست نہیں میں اس کا ولی و سرپرست میں ہوں۔ میں اس کی وراثت لوں گا اور قرض سے اسے آزاد کراؤں گا۔ اس کا معنی یہ ہے کہ

اس کا مال بیت المال میں چلا جائے گا۔ یہ حدیث بھی پہلی حدیث کی مؤید ہے جس سے ثابت ہوا کہ اولی الارحام وارث بن سکتا ہے۔

راوی حدیث: ﴿ابوامامہ بن سہل﴾ ان کا نام اسعد اور ایک قول کے مطابق سعد تھا مگر یہ اپنی کنیت سے ہی مشہور و معروف تھے۔ سلسلہ نسب یوں ہے: ابوامامہ بن سھل بن حنیف بن واھب انصاری' اوسی مدنی۔ یعنی مدینہ کے انصار کے قبیلہ اوس سے تعلق رکھتے تھے۔ نبی ﷺ کی زیارت سے بہرہ ور ہوئے مگر کچھ سماعت نہیں کر سکے۔ ۱۰۰ھ میں ۹۲ برس کی عمر میں وفات پائی۔

﴿ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ﴾ ابوعبیدہ عامر بن عبداللہ بن جراح بن ھلال قرشی فہری۔ عشرہ مبشرہ میں سے ہیں۔ قدیم الاسلام ہیں۔ دوسری ہجرت حبشہ میں شریک تھے۔ تمام غزوات بدر و احد تا تبوک میں شریک رہے۔ جنگ احد کے روز نبی ﷺ کے رخسار مبارک میں خود کے جو دو حلقے داخل ہوگئے تھے ان کو اپنے دانتوں سے کھینچ کر نکالتے وقت ان کے سامنے کے دونوں دانت گر گئے تھے۔ شام کی فتوحات میں لشکر اسلامی کی قیادت کے فرائض انجام دیئے۔ ۱۸ھ میں طاعون عمواس کے موقع پر وفات پائی۔ اس وقت ان کی عمر ۸۵ برس کی تھی۔

(۸۱۳) وَعَنْ جَابِرٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ: «إِذَا اسْتَهَلَّ ٱلْمَوْلُودُ وَرِثَ». رَوَاهُ أَبُو دَاوُدَ. وَصَحَّحَهُ ابْنُ حِبَّانَ.

حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا "جب نومولود بچہ آواز نکالے تو وہ وارث قرار پاتا ہے۔" (ابوداؤد نے روایت کیا ہے اور ابن حبان نے اسے صحیح کہا ہے)

لغوی تشریح: ﴿اذا استھل﴾ جب آواز بلند کرے۔ وہ چیخنے کی صورت میں ہو یا رونے کی صورت میں۔ "ورث" صیغہ مجہول۔ توریث سے ماخوذ ہے۔ یعنی یہ آواز اسے وارث بناتی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جب بچہ زندہ پیدا ہو پھر بعد میں فوت ہو جائے تو وہ وارث شمار ہوگا۔ پیدائش کے وقت اونچی آواز نکالنا وارث بننے کیلئے ضروری نہیں ہے۔ "استھلال" کا بالخصوص اس جگہ ذکر تو محض اس لئے کیا گیا ہے کہ عام طور پر بچہ پیدا ہونے کے بعد آواز نکالتا ہے اور یہ اس کی دلیل ہوتی ہے کہ بچہ زندہ ہے۔ للذا اگر اس کے علاوہ دوسری کسی علامت سے اس کے زندہ ہونے کا علم ہو جائے تو مثلاً چھینک مارنا' زور سے سانس لینا یا ایسی کوئی حرکت کرنا جو اس کے زندہ ہونے پر دال ہو اس کے وارث قرار پائے جانے کیلئے بس کافی ہے۔

(۸۱٤) وَعَنْ عَمْرِو بْنِ شُعَيْبٍ، عَنْ أَبِيهِ، عَنْ جَدِّهِ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «لَيْسَ لِلْقَاتِلِ مِنَ ٱلْمِيرَاثِ شَيْءٌ».

حضرت عمرو بن شعیب اپنے والد سے اور وہ اپنے دادا سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "قاتل کو مقتول کی میراث میں سے کچھ بھی نہیں ملتا۔" (اسے نسائی اور دارقطنی نے روایت کیا ہے

رَوَاهُ النَّسَائِيُّ وَالدَّارَقُطْنِيُّ، وَقَوَّاهُ ابْنُ عَبْدِ الْبَرِّ، وَأَعَلَّهُ النَّسَائِيُّ، وَالصَّوَابُ وَقْفُهُ عَلَى عَمْرٍو.

اور ابن عبدالبر نے اسے قوی قرار دیا ہے۔ مگر نسائی نے اسے معلول کہا ہے۔ دراصل یہ روایت موقوف ہے یعنی عمرو پر موقوف ہونا صحیح کہا گیا ہے)

حاصل کلام: اس حدیث کی رو سے قاتل مقتول کی میراث میں سے کچھ بھی وصول کرنے کا مستحق نہیں۔ اکثر اہل علم کی رائے یہی ہے کہ قاتل کو نہ اصل مال میں سے کچھ ملے گا اور نہ دیت میں سے۔ مگر امام مالک رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ قاتل کو دیت میں سے تو کچھ نہیں ملے گا البتہ دوسرے مال میں سے میراث لے گا۔ مگر امام مالک رحمہ اللہ کی جلالت القدر کے باوجود یہ کہے بغیر چارہ نہیں کہ ان کے پاس اپنی رائے کے حق میں کوئی مضبوط و قوی دلیل نہیں ہے۔ تاریخ شاہد ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ' حضرت علی رضی اللہ عنہ اور قاضی شریح رحمہ اللہ' امام مالک رحمہ اللہ کی رائے کے خلاف فیصلہ دیتے رہے ہیں۔

(۸۱۵) وَعَنْ عُمَرَ بْنِ الْخَطَّابِ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: سَمِعْتُ رَسُولَ اللهِ ﷺ يَقُولُ: «مَا أَحْرَزَ الْوَالِدُ أَوِ الْوَلَدُ فَهُوَ لِعَصَبَتِهِ مَنْ كَانَ». رَوَاهُ أَبُو دَاوُدَ وَالنَّسَائِيُّ وَابْنُ مَاجَهْ وَصَحَّحَهُ ابْنُ الْمَدِينِيِّ وَابْنُ عَبْدِ الْبَرِّ.

حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو ارشاد فرماتے سنا ہے "والد یا اولاد جو کچھ جمع کر کے اپنے گھر میں لائے تو وہ اس کے عصبہ کیلئے ہے خواہ عصبہ کوئی بھی ہو۔" (اسے ابوداؤد' نسائی اور ابن ماجہ نے روایت کیا ہے۔ ابن مدینی اور ابن عبدالبر نے اسے صحیح کہا ہے)

لغوی تشریح: ﴿ ما احرز الوالد الخ ﴾ جو کچھ والد یا اولاد نے جمع کیا اور حاصل کیا یا یہ معنی کہ اموال اور حقوق میں جس کا وہ استحقاق رکھتا ہے۔ ﴿ فھو ﴾ جمع کردہ مال یا جس حق کا وہ مستحق ہے۔ ﴿ لعصبتہ ﴾ اس شخص کے عصبہ مراد ہیں جس نے مال کو جمع کیا' حاصل کیا۔ ﴿ من کان ﴾ اس سے مراد وہی عصبہ ہے۔ سبل السلام میں ہے کہ والد اور اولاد کے احراز سے مراد یہ ہے کہ حقوق میں جن کا یہ استحقاق رکھتا ہے وہ حقوق وغیرہ اس کے بعد اس کے عصبہ کے ہوں گے۔ اس حدیث سے یہ استدلال کیا گیا ہے کہ ولاء کو وراثت میں تقسیم نہیں کیا جائے گا مگر یہ حدیث اپنی دلالت میں واضح اور صریح نہیں ہے بلکہ ما احرز کے تحت جو جزئیات آتی ہیں وہ بسا اوقات اس استدلال کے خلاف ہیں۔

حاصل کلام: اس حدیث میں جو مسئلہ بیان ہوا ہے وہ دراصل اس واقعہ سے تعلق رکھتا ہے کہ ایک خاتون فوت ہو گئی۔ اس کے بیٹے اس کے وارث ہوئے پھر بیٹے بھی فوت ہو گئے اور عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ ان لڑکوں کا عصبہ ہونے کی حیثیت سے ان کے وارث بنے۔ پھر اس عورت کا آزاد کردہ غلام بھی فوت ہو گیا تو عمرو بن عاص نے اس غلام کا ورثہ بھی اپنے قبضہ میں کر لیا۔ اس عورت کے بھائی نے عورت کے آزاد کردہ غلام کی میراث کا دعویٰ کر دیا۔ اس موقع پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے یہ حدیث بیان فرمائی اور اس آزاد کردہ غلام کی میراث اس خاتون کے بھائی کو دلا دی۔ واضح رہے کہ ولاء (آزاد کردہ غلام کا ترکہ)

ذوالفروض میں ورثہ کی طرح تقسیم نہیں ہوتی بلکہ سب سے قریبی عصبہ کا حصہ ہے۔ اگرچہ بعض نے اس میں اختلاف بھی کیا ہے تاہم صحیح یہی ہے کہ میراث میں تقسیم نہیں ہوتا۔

(٨١٦) وَعَنْ عَبْدِ اللهِ بْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُمَا قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «اَلْوَلَاءُ لُحْمَةٌ كَلُحْمَةِ النَّسَبِ، لَا يُبَاعُ وَلَا يُوهَبُ». رَوَاهُ الحَاكِمُ مِنْ طَرِيْقِ الشَّافِعِيِّ، عَنْ مُحَمَّدِ بْنِ الحَسَنِ، عَنْ أَبِيْ يُوسُفَ، وَصَحَّحَهُ ابْنُ حِبَّانَ، وَأَعَلَّهُ البَيْهَقِيُّ.

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "ولاء کا تعلق نسب کے تعلق کی طرح ہے۔ جسے نہ فروخت کیا جا سکتا ہے اور نہ ہبہ کیا جا سکتا ہے۔" (اسے حاکم نے بطریق شافعی محمد بن حسن سے اور انہوں نے ابو یوسف سے روایت کیا ہے۔ ابن حبان نے اسے صحیح قرار دیا ہے اور بیہقی نے اسے معلول کہا ہے)

لغوی تشریح: ﴿ الولاء ﴾ "واو" پر فتحہ اور "لا" پر مد۔ یعنی آزادی کی ولاء اور وہ آزاد کرنے والے کی میراث کا آزاد کردہ سے زیادہ حق رکھتا ہے۔ ﴿ لحمۃ ﴾ لام پر ضمہ اور "حا" ساکن معنی اس کے قرابت اور تعلق کے ہیں۔ عرب لوگ ولاء کو فروخت بھی کرتے تھے اور ہبہ بھی کر دیتے تھے جس سے منع فرما دیا گیا اور واضح کیا کہ ولاء کا تعلق نسب کے تعلق کی طرح ہے۔ یہ زائل کرنے سے بھی زائل نہیں ہوتا۔

حاصل کلام: اس حدیث میں ولاء کو نسب کے تعلق سے تشبیہہ دے کر یہ بتایا گیا ہے کہ اس کی خرید و فروخت نہیں ہو سکتی اور نہ ہی ہبہ اور نذر کی جا سکتی ہے۔ عرب معاشرے میں لوگ اسے فروخت بھی کر دیتے تھے اور ہبہ اور نذر بھی۔ رسول اللہ ﷺ نے اسے ممنوع قرار دے دیا۔

راوی حدیث: ﴿ محمد بن حسن ﴾ ان کی کنیت ابوعبداللہ تھی۔ سلسلہ نسب یوں ہے۔ محمد بن حسن بن فرقد شیبانی۔ احناف کے ایک مشہور و معروف امام ہیں۔ ١٣٢ھ واسط میں پیدا ہوئے اور کوفہ میں نشوونما پا کر پروان چڑھے۔ طلب علم کیلئے نکلے۔ بڑے بڑے اعلام سے ملاقات کی۔ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کی مجلس میں کئی سال تک رہے پھر ابو یوسف پر فقہ کا درس لیا۔ بہت سی نادر کتب تصنیف کیں اور امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے علم کو خوب پھیلایا۔ یہ احناف کے تین علمی ستونوں کے درمیان ایک ستون ہیں۔ تین سال تک امام مالک رحمہ اللہ سے علم حاصل کیا۔ امام شافعی رحمہ اللہ کا قول ہے کہ میں نے محمد بن حسن کی طرح موٹا آدمی کوئی نہیں دیکھا جو پھرتیلا اور مہربان اور اچھی صحبت والا ہو اور نہ میں نے ان سے زیادہ کسی کو خیرخواہ پایا۔ حافظہ کے اعتبار سے ان کو حدیث میں ضعیف قرار دیا گیا ہے۔ ١٨٩ھ میں رے کی "برنبویہ" نامی بستی میں وفات پائی۔

﴿ ابویوسف ﴾ ان کا نام امام یعقوب بن ابراہیم انصاری ہے۔ ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے مشہور شاگرد ہیں اور اہل عراق کے مستند فقیہہ ہیں۔ قاضی القضاۃ کے منصب پر فائز رہے ہیں۔ ان کی نشوونما کوفہ میں ہوئی اور طلب علم میں زندگی کھپا دی۔ ان کے والد ایک غریب آدمی تھے۔ امام ابوحنیفہؒ قاضی ابویوسف کو وقتاً فوقتاً

سو' سو درہم دے کر ان کی اعانت کیا کرتے تھے۔ یحیٰی بن معین کا قول ہے کہ اصحاب الرائی میں امام ابویوسف سب سے زیادہ احادیث کا علم رکھنے والے اور سب سے زیادہ فن میں پختہ تھے اور یحیٰی بن یحیٰی تمیمی کا قول ہے کہ میں نے ابویوسف کو ان کی موت کے وقت یہ فرماتے سنا کہ میں نے اپنے تمام ان فتوؤں سے رجوع کیا جو کتاب و سنت سے موافقت نہیں رکھتے اور ایک روایت میں یہ الفاظ ہیں کہ جو قرآن کے موافق ہیں اور جس پر مسلمانوں کا اجماع ہے۔ ان کے علاوہ میں اپنے تمام فتوؤں سے رجوع کرتا ہوں۔ ربیع الآخر ۱۸۲ھ میں انہتر سال کی عمر میں وفات پائی۔

(۸۱۷) وَعَنْ أَبِيْ قِلاَبَةَ، عَنْ أَنَسٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «أَفْرَضُكُمْ زَيْدُ بْنُ ثَابِتٍ». أَخْرَجَهُ أَحْمَدُ وَالأَرْبَعَةُ، سِوَى أَبِيْ دَاوُدَ، وَصَحَّحَهُ التِّرْمِذِيُّ وَابْنُ حِبَّانَ وَالحَاكِمُ. وَأُعِلَّ بِالإِرْسَالِ.

حضرت ابوقلابہ نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "تم میں سب سے زیادہ میراث کو جاننے والا زید بن ثابت رضی اللہ عنہ ہے۔" (اس حدیث کو احمد اور چاروں نے ماسوا ابوداؤد کے روایت کیا ہے۔ ترمذی' ابن حبان اور حاکم نے اسے صحیح قرار دیا ہے لیکن اسے مرسل ہونے کی بنا معلول قرار دیا گیا ہے)

لغوی تشریح: ﴿ اعل بالارسال ﴾ صیغہ مجہول۔ معلول اسے اس لئے قرار دیا گیا ہے کہ ابوقلابہ نے اگرچہ حضرت انس رضی اللہ عنہ سے بہت سی احادیث سنی ہیں مگر ان سے یہ حدیث نہیں سنی۔ اس وجہ سے یہ حدیث مرسل یعنی منقطع ہے۔

حاصل کلام: یہ دراصل ایک لمبی حدیث کا ٹکڑا ہے۔ مکمل روایت یوں ہے کہ نبی ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ "میری امت میں سب سے زیادہ رحم دل اور شفیق انسان ابوبکر رضی اللہ عنہ ہے اور دین کے معاملہ میں سب سے زیادہ سخت عمر رضی اللہ عنہ اور سب سے زیادہ حیا دار عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ' حلال و حرام کا سب سے بڑا عالم معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ اور سب سے عمدہ اور اچھا قاری ابی بن کعب اور فرائض کا سب سے بڑا عالم زید بن ثابت ہے۔" یہی وجہ ہے کہ علماء اسلام نے میراث کے اختلافی مسائل میں عموماً حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کی رائے قابل ترجیح قرار دی۔

راوی حدیث: ﴿ ابوقلابہ ﴾ قلابہ میں "قاف" کے نیچے کسرہ اور لام مخفف۔ ان کا نام عبداللہ بن زید بن عمرو یا عامر جرمی بصری ہے۔ جلیل القدر تابعی' ثقہ ہیں' فاضل آدمی ہیں۔ کتب ستہ کے راویوں میں ارسال کا ارتکاب بہت کرتے ہیں۔ منصب قضاء کو چھوڑ کر شام میں چلے گئے۔ ۱۰۴ھ یا ۱۰۶ھ یا ۱۰۷ھ میں فوت ہوئے۔

۲۱ - بَابُ الوَصَايَا
وصیتوں کا بیان

(۸۱۸) عَنِ ابْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللَّهُ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ

تَعَالَى عَنْهُمَا، أَنَّ رَسُولَ اللهِ ﷺ قَالَ: «مَا حَقُّ امْرِئٍ مُسْلِمٍ لَهُ شَيْءٌ يُرِيدُ أَنْ يُوَصِّيَ فِيهِ، يَبِيتُ لَيْلَتَيْنِ إِلاَّ وَوَصِيَّتُهُ مَكْتُوبَةٌ عِنْدَهُ» . مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

ﷺ نے فرمایا "کسی مسلمان کو یہ لائق نہیں ہے کہ وہ اپنی کسی چیز کو وصیت کرنے کا ارادہ رکھتا ہو مگر دو راتیں بھی اسی حالت میں گزار دے کہ اس کے پاس وصیت تحریری شکل میں موجود نہ ہو۔" (بخاری و مسلم)

لغوی تشریح: ﴿ باب الوصایا ﴾ وصایا' وصیت کی جمع ہے۔ جیسا کہ ہدایا ہدیہ کی جمع ہے وصیت شرعی طور پر خاص اس عہد کو کہتے ہیں جس کا تعلق مرنے کے بعد سے ہو۔ ﴿ ما حق امری مسلم ﴾ اس جملہ میں "ما" نافیہ ہے۔ یعنی مسلمان کیلئے یہ حزم و احتیاط کا تقاضا نہیں ہے اور اس کیلئے لائق و مناسب نہیں ہے۔ ﴿ لہ شئی ﴾ یہ "لامری" کی صفت ہے۔ یعنی اس کے پاس مال ہے یا کسی کا قرض ادا کرنا ہے یا اور کوئی حق ہے یا کسی کی امانت ہے۔ ﴿ یرید ﴾ یہ شئی کی صفت ہے۔ یعنی یہ شخص اس چیز میں کوئی وصیت کرنا چاہتا ہے ﴿ یبیت لیلتین ﴾ یہ ما کی خبر ہے مصدر کی تاویل کی صورت میں یعنی یہ کہ وہ دو راتیں بسر کرے اور یہ بھی جائز ہے کہ یہ صفت ہو تو اس صورت میں اس کے بعد والا استثناء خبر ہو۔ "واو" یہاں حالیہ بھی ہو سکتی ہے اور زائدہ بھی اور ایک دوسری روایت میں لیلۃ او لیلتین کے الفاظ بھی منقول ہیں اور ایک روایت میں "ثلاث لیال" بھی مروی ہے۔ الفاظ کا اختلاف اس بات کی دلیل ہے کہ وصیت میں جلدی کی جائے تاخیر نہ کی جائے۔ یعنی اس شخص کے لائق نہیں کہ اس پر ایک وقت گزرے خواہ وہ تھوڑا سا کیوں نہ ہو مگر اس کے پاس وصیت تحریری ہونی چاہئے کیونکہ اسے معلوم نہیں کہ موت کب آئے گی؟ (عون المعبود) اور ﴿ یرید ان یوصی الخ ﴾ کے الفاظ اس پر دلالت کرتے ہیں کہ وصیت کرنا مستحب ہے۔ واجب نہیں اور جمہور اہل علم کی یہی رائے ہے۔ ہاں قرض کی ادائیگی کی وصیت اور امانتوں کے واپس کرنے کی وصیت کرنا واجب ہے۔

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ وصیت ہروقت تحریری شکل میں موجود رہنی چاہئے۔ آیت میراث کے نزول سے پہلے وصیت کرنا ہر ایک کیلئے ضروری اور لازمی تھا۔ مگر جب میراث کی آیت نازل ہوئی تو یہ وصیت ختم ہو گئی۔ یعنی جو حصے قرآن میں متعین و مقرر کر دیئے گئے ہیں ان کیلئے وصیت ختم' البتہ میراث کے علاوہ اگر کوئی وصیت کرنا چاہے تو آج بھی کر سکتا ہے۔ مثلاً بیٹے کی موجودگی میں پوتے کی میراث ختم ہے مگر اس کی تعلیم و تربیت اور نگہداشت اور دیکھ بھال کیلئے تہائی مال وصیت کر سکتا ہے۔

(٨١٩) وَعَنْ سَعْدِ بْنِ أَبِيْ وَقَّاصٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قُلْتُ: يَا رَسُولَ اللهِ! أَنَا ذُوْ مَالٍ، وَلاَ يَرِثُنِيْ إِلاَّ ابْنَةٌ لِّيْ وَاحِدَةٌ،

حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے عرض کیا یارسول اللہ (ﷺ)! میں مالدار آدمی ہوں اور میری وارث صرف میری ایک ہی بیٹی ہے۔ تو کیا میں دو تہائی مال کو صدقہ و خیرات کر دوں؟

أَفَأَتَصَدَّقُ بِثُلُثَيْ مَالِيْ؟ قَالَ: لاَ، قُلْتُ: أَفَأَتَصَدَّقُ بِشَطْرِهِ؟ قَالَ: لاَ، قُلْتُ: أَفَأَتَصَدَّقُ بِثُلُثِهِ؟ قَالَ: اَلثُّلُثُ، وَالثُّلُثُ كَثِيْر، إِنَّكَ أَنْ تَذَرَ وَرَثَتَكَ أَغْنِيَآءَ خَيْرٌ مِّنْ أَنْ تَذَرَهُمْ عَآلَةً يَتَكَفَّفُونَ النَّاسَ. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

آپؐ نے فرمایا "نہیں۔" میں نے دوبارہ عرض کیا' کیا میں اپنے مال کا نصف حصہ خیرات کر دوں؟ فرمایا "نہیں۔" میں نے تیسری مرتبہ عرض کیا' تو کیا میں تہائی مال صدقہ و خیرات کر سکتا ہوں؟ آپؐ نے فرمایا "ہاں! مگر ایک تہائی بھی بہت ہے۔ تیرا اپنے ورثاء کو غنی چھوڑ جانا اس سے کہیں بہتر ہے کہ تو ان کو محتاج چھوڑے اور وہ لوگوں کے سامنے ہاتھ پھیلاتے پھریں۔" (بخاری و مسلم)

لغوی تشریح: ﴿بشطره﴾ اپنا آدھا مال۔ ﴿قال الثلث﴾ الثلث" پر نصب اور رفع دنوں جائز ہیں یعنی تہائی حصہ دے دو یا یوں فرمایا کہ تہائی حصہ تیرے لئے خیرات کرنا کافی ہے۔ ﴿والثلث كثير﴾ ثلث بہت ہے یعنی بہتر یہ ہے کہ اس سے کم کرو یا یہ کہ یہ تھوڑا نہیں بہت ہے۔ پس اس میں مزید اضافہ نہ کرو۔ ﴿ان تذر﴾ یعنی چھوڑنا اور کلمہ "ان" یا تو همزہ پر فتحہ کی صورت میں ہے اس صورت میں وہ ناصبہ ہوگا اور فعل منصوب ہوگا اور یا همزہ کے نیچے کسرہ ہو تو اس صورت میں ان شرطیہ ہوگا اور فعل مجزوم ہوگا اور اس کی جزاء "خیر" کا لفظ ہوگا اس صورت میں کہ خیر کو مقدر تسلیم کیا جائے۔ ﴿من ان تذرهم عالة﴾ یعنی ان کو محتاج و فقیر چھوڑ جاؤ گے۔ عالة عائل کی جمع ہے۔ ﴿يتكففون الناس﴾ یعنی وہ لوگوں سے فقیروں کی طرح اپنے ہاتھ پھیلا کر سوال کرتے پھریں گے۔ حضرت سعد کو یہ خیال مکہ مکرمہ میں حجة الوداع کے موقع پر آیا جبکہ ان کو گمان ہوا کہ وہ بیماری کی وجہ سے اب مر جائے گا۔ مگر اس کے بعد وہ صحت یاب ہوگئے اور زندہ رہے اور ان کے ہاں چار بیٹے ہوئے اور ایک قول یہ بھی ہے کہ اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے ان کو دس سے بھی زیادہ لڑکے اور تیرہ لڑکیاں عطا فرمائیں۔

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ صاحب مال زیادہ سے زیادہ اپنے تہائی مال کے بارے میں وصیت کر سکتا ہے اس سے زیادہ نہیں۔ الاّ یہ کہ ورثاء خود بخود اس سے زائد کی اجازت دے دیں۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ ورثاء کو محروم رکھنے کی کوشش نہیں کرنی چاہئے۔ ان کا غنی رہنا اور دست سوال دراز کرنے سے بچنا بہرنوع بہتر ہے۔

(٨٢٠) وَعَنْ عَآئِشَةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهَا، أَنَّ رَجُلاً أَتَى النَّبِيَّ ﷺ، فَقَالَ: يَا رَسُولَ اللهِ! إِنَّ أُمِّي اُفْتُلِتَتْ نَفْسُهَا، وَلَمْ تُوْصِ، وَأَظُنُّهَا

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ ایک شخص نبی ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا یارسول اللہ (ﷺ)! میری والدہ اچانک وفات پا گئی ہیں اور اس نے کوئی وصیت نہیں کی۔ میرا اس کے

لَوْ تَكَلَّمَتْ تَصَدَّقَتْ، أَفَلَهَا أَجْرٌ إِنْ تَصَدَّقْتُ عَنْهَا؟ قَالَ: نَعَمْ. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ، وَاللَّفْظُ لِمُسْلِمٍ.

بارے میں خیال ہے کہ اگر وہ کوئی گفتگو کرتی تو صدقہ (ضرور) کرتی۔ کیا اسے ثواب ملے گا اگر میں اس کی جانب سے صدقہ کر دوں؟ آپ ؐ نے فرمایا "ہاں!" (بخاری و مسلم' یہ الفاظ مسلم کے ہیں

لغوی تشریح : ﴿ ان رجلا ﴾ سے مراد حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ ہیں۔ ﴿ افتلتت نفسها ﴾ صیغہ مجہول۔ اچانک بیمار ہوگئیں اور فوراً ہی وفات پاگئیں۔

حاصل کلام : اس حدیث سے معلوم ہوا کہ والدین کی وصیت کے بغیر بھی اولاد کی جانب سے صدقہ کا ثواب والدین کو پہنچتا ہے اور بغیر وصیت صدقہ کرنا بھی جائز ہے۔

(٨٢١) وَعَنْ أَبِيْ أُمَامَةَ الْبَاهِلِيِّ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: سَمِعْتُ رَسُولَ اللهِ ﷺ يَقُولُ: «إِنَّ اللَّهَ قَدْ أَعْطَى كُلَّ ذِي حَقٍّ حَقَّهُ. فَلاَ وَصِيَّةَ لِوَارِثٍ». رَوَاهُ أَحْمَدُ وَالأَرْبَعَةُ إِلاَّ النَّسَائِيَّ، وَحَسَّنَهُ أَحْمَدُ وَالتِّرْمِذِيُّ، وَقَوَّاهُ ابْنُ خُزَيْمَةَ وَابْنُ الْجَارُودِ، وَرَوَاهُ الدَّارَقُطْنِيُّ مِنْ حَدِيثِ ابْنِ عَبَّاسٍ، وَزَادَ فِي آخِرِهِ: «إِلاَّ أَنْ يَشَاءَ الْوَرَثَةُ»، وَإِسْنَادُهُ حَسَنٌ.

حضرت ابوامامہ باہلی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو ارشاد فرماتے سنا ہے کہ "اللہ تعالیٰ نے ہر حقدار کو اس کا حق عطا فرما دیا ہے لہٰذا اب کسی وارث کیلئے کوئی وصیت نہیں۔" (اسے احمد اور چاروں نے سوائے نسائی کے روایت کیا ہے۔ احمد اور ترمذی نے اسے حسن کہا ہے' ابن خزیمہ اور ابن جارود نے اسے قوی قرار دیا ہے) اور دارقطنی نے ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کی ہے اور اس کے آخر میں اتنا اضافہ بھی کیا ہے۔ " الاّ یہ کہ اس کے وارث چاہیں" (اور ان کی اسناد حسن ہیں)

لغوی تشریح : ﴿ الا ان یشاء الورثۃ ﴾ جمہور علماء نے اس اضافہ سے قابل استدلال ہونے کی بنا پر استثناء کیا ہے کہ اگر ورثاء ازخود چاہیں تو کسی ایک کیلئے وصیت ہو سکتی ہے۔ مگر اہل ظواہر کہتے ہیں یہ جائز نہیں۔ جیسے قاتل کے حق میں وصیت جائز نہیں خواہ ورثاء اس کی اجازت دے بھی دیں لیکن اس روایت کی بنا پر راجح ترین مسلک جمہور کا ہے۔

(٨٢٢) وَعَنْ مُعَاذِ ابْنِ جَبَلٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ النَّبِيُّ ﷺ: «إِنَّ اللَّهَ تَصَدَّقَ عَلَيْكُمْ بِثُلُثِ أَمْوَالِكُمْ عِنْدَ وَفَاتِكُمْ، زِيَادَةً فِي حَسَنَاتِكُمْ». رَوَاهُ الدَّارَقُطْنِيُّ. وَأَخْرَجَهُ

حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا "اللہ تعالیٰ نے تم کو موت کے وقت تہائی مال کا صدقہ دینے کی اجازت دے کر تم پر احسان فرمایا ہے تاکہ تمہاری نیکیاں زیادہ ہو جائیں۔" (اسے دارقطنی نے روایت کیا ہے اور احمد اور

أَحْمَدُ وَالبَزَّارُ مِنْ حَدِيْثِ أَبِي الدَّرْدَآءِ، وَابْنِ مَاجَهْ مِنْ حَدِيْثِ أَبِيْ هُرَيْرَةَ، وَكُلُّهَا ضَعِيْفَةٌ، لٰكِن قَدْ يقَوِّى بَعْضُهَا بِبَعْضٍ، وَاللّٰهُ أَعْلَمُ.

بزار نے ابوالدرداء رضی اللہ عنہ کے حوالہ سے اس حدیث کی تخریج کی ہے اور ابن ماجہ نے ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کے حوالہ سے۔ مگر ساری کی ساری روایتیں ضعیف ہیں اس کے باوجود بعض' بعض کیلئے باعث تقویت ہیں) واللہ اعلم

لغوی تشریح: ﴿تصدق علیکم﴾ یعنی تمام مال کو وراثت قرار نہیں دیا بلکہ اس میں سے تہائی مال صدقہ کرنے کی اجازت دے کر تم پر احسان کیا ہے کہ اگر تم چاہو تو اتنا مال فی سبیل اللہ خرچ کر کے اپنے لئے صدقہ جاریہ بنا سکتے ہو۔

٢٢ - بَابُ الوَدِيعَةِ

ودیعت (امانت) کا بیان

(٨٢٣) عَنْ عَمْرِو بْنِ شُعَيْبٍ، عَنْ أَبِيْهِ، عَنْ جَدِّهِ، عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ: «**مَنْ أُودِعَ وَدِيعَةً فَلَيْسَ عَلَيْهِ ضَمَانٌ**». أَخْرَجَهُ ابْنُ مَاجَهْ، وَإِسْنَادُهُ ضَعِيفٌ.

حضرت عمرو بن شعیب رحمہ اللہ نے اپنے والد سے' انہوں نے اپنے دادا سے روایت کیا ہے کہ "نبی ﷺ نے فرمایا کہ جس کسی کے پاس کوئی چیز امانت کے طور پر رکھی جائے تو اس پر ضمان (ذمہ داری) نہیں ہے۔" (اسے ابن ماجہ نے روایت کیا ہے۔ اس کی سند ضعیف ہے)

لغوی تشریح: ﴿من اودع﴾ صیغہ مجہول۔ ﴿ودیعۃ﴾ اس چیز کو کہتے ہیں جسے اس کا مالک یا اس کا نائب و قائم مقام کسی دوسرے کے پاس حفاظت کیلئے کچھ عرصہ تک بطور امانت رکھے۔

حاصل کلام: یہ حدیث اس لئے ضعیف ہے کہ اس کی سند میں مثنیٰ بن صباح ایسا راوی ہے جسے امام احمد رحمہ اللہ اور نسائی نے ضعیف کہا ہے لیکن ابن معین کا قول ہے کہ مثنیٰ صالح آدمی ہے اس کی حدیث لکھی جائے اسے ترک نہ کیا جائے۔ اس حدیث کے مطابق اجماع ہے کہ امانت کی حفاظت کرنے والے پر کوئی ضمان نہیں ہے البتہ حسن بصری رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اگر امانت رکھنے والے نے اس پر ضمان کی شرط لگائی تو پھر جس کے پاس امانت رکھی گئی ہے وہ ضامن ہو گا۔

وَبَابُ قِسْمِ الصَّدَقَاتِ تَقَدَّمَ فِيْ آخِرِ الزَّكَاةِ، وَبَابُ قِسْمِ الفَيْءِ وَالغَنِيْمَةِ يَأْتِي عَقِبَ الجِهَادِ إِنْ شَآءَ اللّٰهُ تَعَالَى.

صدقات کی تقسیم کا باب کتاب الزکاۃ کے آخر میں گزر چکا ہے۔ مال فے اور مال غنیمت کی تقسیم کا باب کتاب الجہاد کے آخر میں آئے گا۔ ان شاء اللہ۔

۸۔ كِتَابُ النِّكَاحِ

نکاح کے مسائل کا بیان

(۸۲٤) عَنْ عَبْدِ اللهِ بْنِ مَسْعُودٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ لَنَا رَسُولُ اللهِ ﷺ: **يَا مَعْشَرَ الشَّبَابِ! مَنِ اسْتَطَاعَ مِنْكُمُ البَاءَةَ فَلْيَتَزَوَّجْ، فَإِنَّهُ أَغَضُّ لِلْبَصَرِ، وَأَحْصَنُ لِلْفَرْجِ، وَمَنْ لَمْ يَسْتَطِعْ فَعَلَيْهِ بِالصَّوْمِ، فَإِنَّهُ لَهُ وِجَاءٌ**». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ہمیں فرمایا "اے نوجوانوں کی جماعت! تم میں سے جسے نکاح کرنے کی استطاعت ہو اسے نکاح کرنا چاہئے کیونکہ نکاح نگاہ کو بچانے والا اور شرمگاہ کو محفوظ رکھنے والا ہے اور جسے اس کی استطاعت نہ ہو۔ اس کیلئے روزے کا اہتمام و التزام ضروری ہے اس لئے کہ روزہ اس کیلئے ڈھال ہے۔" (بخاری و مسلم)

لغوی تشریح: ﴿کتاب النکاح﴾ نکاح کے لغوی معنی ضم کرنا' ملانا' گانٹھنا' ایک دوسرے میں داخل ہونے کے ہیں اور شرعی معنی میاں بیوی کے مابین عقد جس سے وطی کرنا حلال ہوتا ہے نکاح درحقیقت عقد کا نام ہے اور مجازی طور پر وطی کے لئے مستعمل ہے اور یہی قول صحیح ہے۔ ﴿الشباب﴾ شین پر فتحہ' شاب کی جمع۔ نوجوان کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔ ان کو مخاطب ہونے سے مقصود یہ تھا کہ یہ نوجوان ہی ہیں جو عورتوں کی جانب شہوت نفسانی کا خیال رکھتے ہیں۔ ﴿الباءة﴾ همزہ اور تاء تانیث ممدودہ لغت میں اس کے اصلی معنی تو جماع کے ہیں اور یہ مباءة سے ماخوذ ہے جس کے معنی منزل کے ہیں اس لئے کہ جو آدمی کسی خاتون سے نکاح کرتا ہے تو وہ اس خاتون کو اپنی جائے قیام بنا لیتا ہے' اپنی منزل قرار دے لیتا ہے۔ اس مقام پر یا تو یہ جماع کے معنی میں ہے بایں صورت عبارت یوں ہوگی: من استطاع منكم الجماع رقدرته على مونته النكاح یعنی کہ تم میں سے جو کوئی نکاح کے مصارف و اخراجات کی استطاعت کی صورت میں جماع کی طاقت رکھتا ہو یا اس سے نکاح کے مصارف و اخراجات کی ہمت رکھنا مراد ہوگا اس صورت میں اس کے لوازمات کا نام نکاح رکھ دیا گیا ہے۔ ﴿اغض﴾ جھکانے والا'

بچانے والا اور شادی کرنے والے کی نگاہوں کو غیر عورت کی جانب اٹھنے سے روکنے والا۔ ﴿ احصن ﴾ زیادہ محفوظ رکھنے والا' حفاظت کرنے والا ﴿ وجاء ﴾ "واؤ" کے نیچے کسرہ۔ شہوت و ہوس نفسانی کو کچلنے والا' بند کرنے والا اور دراصل تو اس کا استعمال جانور کے خصیے کو دبا کر ناکارہ و بیکار کرنا اور خوب کچل دینا تاکہ نر کی قوت باہ ختم ہو جائے۔ معنی یہ ہوئے کہ روزہ سفلی جذبہ کو قطع کر دیتا ہے اور منی کے شر کو دور کر دیتا ہے۔ بس یوں سمجھئے جیسا کہ کسی جانور کو خصی کر دیا۔

(٨٢٥) وَعَنْ أَنَسِ بْنِ مَالِكٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُ، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ حَمِدَ اللّٰهَ، وَأَثْنَى عَلَيْهِ، وَقَالَ: «لَكِنِّي أَنَا أُصَلِّي، وَأَنَامُ، وَأَصُومُ، وَأُفْطِرُ، وَأَتَزَوَّجُ النِّسَاءَ، فَمَنْ رَغِبَ عَنْ سُنَّتِي فَلَيْسَ مِنِّي». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی ﷺ نے اللہ کی حمد و ثنا بیان کی اور فرمایا "لیکن میں نماز بھی ادا کرتا ہوں' سوتا بھی ہوں' روزے رکھتا بھی ہوں اور چھوڑ بھی دیتا ہوں اور میں عورتوں سے نکاح بھی کرتا ہوں۔ لہٰذا جس کسی نے میری سنت سے منہ پھیرا اس کا مجھ سے کوئی تعلق نہیں۔" (بخاری و مسلم)

لغوی تشریح: ﴿ لکنی ﴾ اس سے پہلے جو کچھ بیان ہوا اس سے پیدا شدہ وہم کو دور کیا جا رہا ہے۔ مصنف نے اختصار کے پیش نظر اسے حذف کر دیا۔ اس کا خلاصہ یہ ہے کہ تین صحابیوں میں سے ایک نے یہ عزم ظاہر کیا کہ وہ ہمیشہ روزہ رکھے گا اور دوسرے نے کہا کہ وہ رات بھر قیام کیا کرے گا اور تیسرے نے کہا کہ وہ کبھی نکاح نہیں کرے گا۔ پس جب اس عزم کی خبر نبی ﷺ کو پہنچی تو آپ ؐ نے ان سے دریافت فرمایا کہ "تم ہی تھے جنہوں نے اس طرح کہا تھا؟ سن لو اللہ کی قسم! میں تمہارے مقابلہ میں اللہ سے زیادہ ڈرتا ہوں اور تم سے زیادہ متقی و پرہیزگار ہوں۔ اس کے باوجود میں روزے رکھتا بھی ہوں اور ترک بھی کر دیتا ہوں۔ رات کو قیام بھی کرتا ہوں اور سوتا بھی ہوں۔ عورتوں سے شادیاں بھی کرتا ہوں۔ یہ میرا اسوہ ہے اب اگر کوئی ازخود اپنے اوپر پابندیاں لازم کرتا ہے اور میرے اسوہ سے روگردانی کا مرتکب ہوتا ہے تو اس سے میرا کوئی تعلق نہیں۔"

(٨٢٦) وَعَنْهُ قَالَ: كَانَ رَسُولُ اللهِ ﷺ يَأْمُرُ بِالبَاءَةِ، وَيَنْهَى عَنِ التَّبَتُّلِ نَهْياً شَدِيْدًا، وَيَقُولُ: «تَزَوَّجُوا الوَدُودَ الوَلُودَ، فَإِنِّي مُكَاثِرٌ بِكُمُ الأَنْبِيَاءَ يَوْمَ القِيَامَةِ». رَوَاهُ أَحْمَدُ، وَصَحَّحَهُ ابْنُ حِبَّانَ، وَلَهُ شَاهِدٌ عِنْدَ أَبِي دَاوُدَ

حضرت انس رضی اللہ عنہ ہی سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ ہمیشہ نکاح کرنے کا حکم ارشاد فرماتے اور تجرد کی زندگی سے سختی سے منع فرماتے اور فرماتے تھے کہ "بہت محبت کرنے اور چاہنے والی' بہت بچے جننے والی خواتین سے نکاح کرو۔ اس لئے کہ میں تمہاری کثرت کی بدولت قیامت کے روز دوسرے انبیاء ؑ پر

وَالنَّسَآئِيُّ وَابْنُ حِبَّانَ أَيْضاً مِنْ حَدِيْثِ مَعْقِلِ بْنِ يَسَارٍ.

فخر کرنے والا ہوں۔" (اسے احمد نے روایت کیا ہے اور ابن حبان نے صحیح کہا ہے نیز اس حدیث کا ایک شاہد ابوداؤد' نسائی اور ابن حبان میں معقل بن یسار رضی اللہ عنہ سے مروی ہے)

لغوی تشریح : ﴿ التبتل ﴾ عورتوں سے الگ تھلگ رہنے' نکاح نہ کرنے' ازدواجی تعلق سے کنارہ کش رہنے کو "تبتل" کہتے ہیں۔ ﴿ الودود ﴾ میں "واؤ" پر فتحہ ہے۔ ایسی عورت جو اپنے شوہر سے بے پناہ پیار و محبت کرتی ہے یا اس کا معنی ہے وہ محبوب و پسندیدہ عورت جو اپنے عمدہ اور بہترین اوصاف و خصائل' عادات و اطوار' حسن خلق کی مالک اور اپنے شوہر سے پیار کرنے والی ہو۔ ﴿ الولود ﴾ "واؤ" پر فتحہ۔ ایسی عورت جو بچے زیادہ جننے والی ہو۔ یہ چیز کنواری میں اس کے خاندان کی حالت سے معلوم کی جا سکتی ہے۔ ﴿ مکاثر ﴾ میں اپنے متبعین کی کثرت تعداد کی وجہ سے انبیاء پر فخر کرنے والا ہوں۔

(۸۲۷) وَعَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُ، عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ: «تُنْكَحُ الْمَرْأَةُ لِأَرْبَعٍ: لِمَالِهَا، وَلِحَسَبِهَا، وَلِجَمَالِهَا، وَلِدِيْنِهَا، فَاظْفَرْ بِذَاتِ الدِّيْنِ، تَرِبَتْ يَدَاكَ». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ مَعَ بَقِيَّةِ السَّبْعَةِ.

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "عورت سے نکاح چار اسباب و وجوہ سے کیا جاتا ہے۔ اس کے مال کی وجہ سے' اس کے خاندان کی وجہ سے' اس کے حسن و جمال کی وجہ سے اور اس کے دین کی بنا پر۔ پس تو دین دار سے ظفر مند ہو۔ تیرے دونوں ہاتھ خاک آلود ہوں۔" (بخاری و مسلم نیز باقی ساتوں نے بھی اسے روایت کیا ہے)

لغوی تشریح : ﴿ لحسبها ﴾ "حا" اور سین دونوں پر فتحہ۔ وہ شرف و بزرگی جو قریبی رشتہ داروں کی وجہ سے کسی کو حاصل ہوتا ہے۔ ﴿ فاظفر بذات الدین ﴾ یعنی ایسی خاتون سے نکاح کرنے میں کامیابی حاصل کرو۔ ﴿ تربت یداك ﴾ تیرے ہاتھ خاک آلودہ ہوں۔ کہا جاتا ہے "ترب الرجل" آدمی فقیر و محتاج ہوگیا۔ یہاں دعا مراد نہیں ہے بلکہ اس جگہ جدوجہد اور سعی و کوشش کیلئے ابھارنا اور برانگیختہ کرنا مقصود ہے۔

حاصل کلام : اس حدیث سے معلوم ہوا کہ شادی کیلئے بہرنوع دین دار عورت کا انتخاب کرنا چاہئے' کسی کے مال و دولت' کسی کے حسن و جمال پر فریفتہ نہیں ہو جانا چاہئے کیونکہ عورت محض بیوی نہیں ہوگی۔ بچوں کی ماں بھی ہوگی ظاہر ہے۔ وہ اپنی اولاد کی تربیت بھی اسی وقت کر سکے گی جب خود نیک اور دین سے وابستہ ہوگی۔

(۸۲۸) وَعَنْهُ أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ كَانَ إِذَا

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم

رَفَّأَ إِنْسَاناً، إِذَا تَزَوَّجَ، قَالَ: «بَارَكَ اللَّهُ لَكَ، وَبَارَكَ عَلَيْكَ، وَجَمَعَ بَيْنَكُمَا فِي خَيْرٍ». رَوَاهُ أَحْمَدُ وَالأَرْبَعَةُ، وَصَحَّحَهُ التِّرْمِذِيُّ وَابْنُ خُزَيْمَةَ وَابْنُ حِبَّانَ.

جب کسی شخص کو دیکھتے کہ اس نے شادی کی ہے تو فرماتے "اللہ تعالیٰ برکت عطاء فرمائے اور تجھ پر برکت نازل فرمائے اور تم دونوں کو بھلائی و خیر پر جمع رکھے۔" (اسے احمد اور چاروں نے روایت کیا ہے۔ ترمذی' ابن خزیمہ اور ابن حبان نے اسے صحیح قرار دیا ہے)

لغوی تشریح: ﴿ رفا ﴾ "فا" پر تشدید اور ھمزہ اور کبھی بغیر ھمزہ کے بھی آجاتا ہے یعنی اسے مبارک باد دی اور اس کے حق میں دعا فرمائی اور دور جاہلیت میں دعا دینے کا یہی طریقہ مروج تھا کہ کہتے ﴿ بالرفاء والبنین ﴾ کہ مبارک ہو اللہ اولاد سے خوش نصیب کرے۔ آپؐ نے اسے منع فرمایا دیا اور رفاء انفاق' برکت اور بڑھوتری سبھی معنی میں آتا ہے۔

(٨٢٩) وَعَنْ عَبْدِ اللهِ بْنِ مَسْعُودٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: عَلَّمَنَا رَسُولُ اللهِ ﷺ التَّشَهُّدَ فِي الحَاجَةِ «إِنَّ الحَمْدَ للهِ، نَحْمَدُهُ، وَنَسْتَعِيْنُهُ، وَنَسْتَغْفِرُهُ، وَنَعُوذُ بِاللهِ مِنْ شُرُورِ أَنْفُسِنَا، مَنْ يَهْدِهِ اللَّهُ فَلاَ مُضِلَّ لَهُ، وَمَنْ يُضْلِلْ فَلاَ هَادِيَ لَهُ، وَأَشْهَدُ أَنْ لاَّ إِلٰهَ إِلاَّ اللَّهُ، وَأَشْهَدُ أَنَّ مُحَمَّداً عَبْدُهُ وَرَسُولُهُ وَيَقْرَأُ ثَلاَثَ آيَاتٍ». رَوَاهُ أَحْمَدُ وَالأَرْبَعَةُ، وَحَسَّنَهُ التِّرْمِذِيُّ وَالحَاكِمُ.

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ہمیں حاجت و ضرورت میں یہ تشہد سکھایا کہ "سب تعریفیں اللہ ہی کیلئے ہیں۔ ہم اس کی حمد کرتے ہیں اور اسی سے مدد کے طلب گار ہیں اور اسی سے مغفرت و بخشش مانگتے ہیں اور اپنے نفسوں کے شر سے اللہ کی پناہ چاہتے ہیں۔ جسے اللہ ہدایت سے نوازے اسے پھر کوئی گمراہ کرنے والا نہیں اور جسے اللہ ہی گمراہ کرے اسے پھر کوئی ہدایت دینے والا نہیں اور میں شہادت دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور میں شہادت دیتا ہوں کہ محمد (ﷺ) اس کے بندے اور رسول ہیں۔" پھر تین آیات تلاوت فرمائیں۔ (اسے احمد اور چاروں نے روایت کیا ہے۔ ترمذی اور حاکم نے اسے حسن کہا ہے)

لغوی تشریح: ﴿ التشھد فی الحاجۃ ﴾ سبل السلام میں ہے کہ ابن کثیر نے الارشاد میں اتنا اضافہ بھی نقل کیا ہے کہ آپؐ نے یہ خطبہ حاجت و ضرورت اور نکاح وغیرہ ہر کام کیلئے سکھایا ہے۔ ﴿ ان الحمد ﴾ میں "ان" تخفیف سے پڑھا جائے تو "الحمد" پر رفع ہوگا اور "ان" پر تشدید بھی جائز ہے۔ بایں صورت "الحمد" پر فتح ہوگی اعرابی صورت میں اور اس پر رفع حکایت کے طور پر ہے۔

حاصل کلام: یہ خطبہ صرف خطبہ نکاح نہیں بلکہ یہ خطبہ رسول اللہ ﷺ نے ہر حاجت و ضرورت کیلئے

سکھایا ہے۔ علامہ الیمانی نے تو فرمایا ہے کہ نکاح کرنے والے کو خود یہ خطبہ پڑھنا چاہئے۔ مگر یہ سنت متروک ہو چکی ہے۔ جن تین آیات کا ذکر ہے، وہ یہ ہیں۔ سورۂ نساء کی پہلی آیت رقیبا تک اور سورۂ آل عمران کے گیارہوں رکوع کی پہلی آیت مسلمون تک اور سورۂ احزاب کے آخری رکوع کی آیت عظیما تک۔ اہل ظواہر اس خطبہ کو واجب قرار دیتے ہیں اور شوافع میں سے ابوعوانہ نے بھی اسے واجب کہا ہے مگر باقی علماء امت کے نزدیک مسنون ہے۔ (سبل)

(٨٣٠) وَعَنْ جَابِرٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «**إِذَا خَطَبَ أَحَدُكُمُ ٱلْمَرْأَةَ فَإِنِ اسْتَطَاعَ أَنْ يَنْظُرَ مِنْهَا إِلَى مَا يَدْعُوهُ إِلَى نِكَاحِهَا فَلْيَفْعَلْ**». رَوَاهُ أَحْمَدُ وَأَبُو دَاوُدَ، وَرِجَالُهُ ثِقَاتٌ، وَصَحَّحَهُ الحَاكِمُ. وَلَهُ شَاهِدٌ عِنْدَ التِّرْمِذِيِّ وَالنَّسَائِيِّ عَنِ المُغِيرَةِ، وَعِنْدَ ابْنِ مَاجَهْ وَابْنِ حِبَّانَ مِنْ حَدِيثِ مُحَمَّدِ بْنِ مَسْلَمَةَ.

حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "تم میں سے جب کوئی کسی عورت کو پیغام نکاح دے اگر ممکن ہو تو اس کو کچھ دیکھ لے جو اس کیلئے نکاح کا باعث ہو۔" (اسے احمد اور ابوداؤد نے روایت کیا ہے اور اس کے راوی ثقہ ہیں اور حاکم نے اس کو صحیح قرار دیا ہے۔ ترمذی اور نسائی میں مغیرہ کی روایت اس کیلئے شاہد ہے۔ ابن ماجہ اور ابن حبان میں محمد بن مسلمہ کی روایت شاہد ہے)

حاصل کلام: اس حدیث کی رو سے مرد کو چاہئے کہ جس عورت سے نکاح کا ارادہ رکھتا ہو اسے خود ایک مرتبہ دیکھ لے۔ جمہور کے نزیک ایسا کرنا مستحب ہے لازمی اور ضروری نہیں۔ اگر کسی قابل اعتماد اپنی رشتہ دار خاتون کو بھیج کر عورت کے چہرے کے رنگ و روپ، عادات و خصائل کا پتہ کرا لے تب بھی یہ ٹھیک ہے جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے ام سلیم کو بھیج کر ایک خاتون کے متعلق معلومات حاصل کی تھیں۔

راوی حدیث: ﴿محمد بن مسلمہ﴾ محمد بن مسلمہ کا شمار فضلاء صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں تھا۔ انصار کے قبیلہ حارث سے تھے اس لئے انصاری حارثی کہلاتے تھے۔ تبوک کے علاوہ تمام غزوات میں شریک رہے۔ مدینہ منورہ میں حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ کے ہاتھ پر اسلام قبول کیا۔ ۴۳ھ میں ستتر برس کی عمر میں وفات پائی۔

(٨٣١) وَلِمُسْلِمٍ عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ قَالَ لِرَجُلٍ تَزَوَّجَ ٱمْرَأَةً: **أَنَظَرْتَ إِلَيْهَا؟** قَالَ لاَ، قَالَ: **ٱذْهَبْ فَٱنْظُرْ إِلَيْهَا**.

مسلم میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے ایک شخص سے جو شادی کرنا چاہتا تھا فرمایا کہ "کیا تو نے اسے دیکھ لیا ہے؟" اس نے کہا: نہیں، آپ نے فرمایا "جاؤ اور اسے دیکھ لو۔"

حاصل کلام: اس حدیث میں امر وجوب کیلئے نہیں بلکہ جواز کیلئے ہے جیسا کہ پہلے کی حدیث سے مترشح ہو رہا ہے۔ یہ دیکھنا پیغام نکاح سے پہلے ہونا چاہئے کیونکہ پیغام نکاح کے بعد اگر جواب دے گا تو لڑکی والوں کیلئے اذیت کا باعث ہو سکتا ہے۔

(۸۳۲) وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «**لاَ يَخْطُبْ أَحَدُكُمْ عَلَى خِطْبَةِ أَخِيهِ، حَتَّى يَتْرُكَ الخَاطِبُ قَبْلَهُ، أَوْ يَأْذَنَ لَهُ الخَاطِبُ**». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ، وَاللَّفْظُ لِلْبُخَارِيِّ.

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "تم میں سے کوئی اپنے بھائی کے پیغام نکاح پر پیغام نکاح نہ دے تاوقتیکہ کہ پیغام نکاح دینے والا اس سے پہلے اسے ازخود چھوڑ دے یا پیغام نکاح دینے والا اجازت دے دے۔" (بخاری و مسلم)

حاصل کلام: اس حدیث کی رو سے پیغام نکاح پر پیغام نکاح دینا جائز نہیں مگر فاطمہ بنت قیس رضی اللہ عنہا کے واقعہ سے بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ ایک وقت میں دو تین پیغام دیئے جا سکتے ہیں کیونکہ اس خاتون کو دو پیغام نکاح پہنچے تو یہ مشورہ کیلئے حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئی اور صورتحال بیان کر کے مشورہ طلب کیا مگر یہ اس روایت کے خلاف نہیں۔ ممکن ہے دوسری بار پیغام نکاح دینے والے کو پہلے پیغام کا علم نہ ہو۔ بعض نے کہا ہے کہ منگنی طے ہو جانے کے بعد پیغام نکاح کی ممانعت ہے پہلے نہیں۔ جمہور علماء کے نزدیک یہ ممانعت تحریمی ہے اور یہی بات راجح ہے۔

(۸۳۳) وَعَنْ سَهْلِ بْنِ سَعْدٍ السَّاعِدِي رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا قَالَ: جَاءَتِ امْرَأَةٌ إِلَى رَسُولِ اللهِ ﷺ فَقَالَتْ: يَا رَسُولَ اللهِ! جِئْتُ أَهَبُ لَكَ نَفْسِي، فَنَظَرَ إِلَيْهَا رَسُولُ اللهِ ﷺ، فَصَعَّدَ النَّظَرَ فِيهَا وَصَوَّبَهُ، ثُمَّ طَأْطَأَ رَسُولُ اللهِ ﷺ رَأْسَهُ، فَلَمَّا رَأَتِ المَرْأَةُ أَنَّهُ لَمْ يَقْضِ فِيهَا شَيْئاً جَلَسَتْ، فَقَامَ رَجُلٌ مِّنْ أَصْحَابِهِ، فَقَالَ: يَا رَسُولَ اللهِ! إِنْ لَّمْ تَكُنْ لَّكَ بِهَا حَاجَةٌ فَزَوِّجْنِيهَا، قَالَ: **فَهَلْ عِنْدَكَ مِنْ شَيْءٍ؟** فَقَالَ: لاَ، وَاللهِ يَا

حضرت سہل بن سعد ساعدی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ایک عورت رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئی اور عرض کیا' اے اللہ کے رسول (ﷺ)! میں اپنے آپ کو آپ کیلئے ہبہ کرنے آئی ہوں۔ رسول اللہ ﷺ نے اسے ایک نظر دیکھا پھر نظر اوپر نیچے کر کے ذرا غور سے دیکھا اور اپنا سر نیچا کر لیا۔ جب اس عورت نے دیکھا کہ آپ نے اس بارے میں کوئی فیصلہ نہیں فرمایا تو وہ نیچے بیٹھ گئی۔ اتنے میں ایک صحابی کھڑے ہوئے اور عرض کیا یارسول اللہ (ﷺ)! اگر اس عورت کی آپ کو ضرورت نہیں تو اس سے میرا نکاح کر دیں۔ آپ نے اس سے دریافت فرمایا کہ "تمہارے پاس کوئی چیز ہے؟" اس

رَسُولَ اللهِ! فَقَالَ: **اَذْهَبْ إِلٰى أَهْلِكَ، فَانْظُرْ هَلْ تَجِدُ شَيْئاً؟** فَذَهَبَ، ثُمَّ رَجَعَ، فَقَالَ: لاَ وَاللهِ، مَا وَجَدْتُ شَيْئاً. فَقَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: **اُنْظُرْ وَلَوْ خَاتماً مِنْ حَدِيْدٍ،** فَذَهَبَ ثُمَّ رَجَعَ، فَقَالَ: لاَ وَاللهِ يَا رَسُولَ اللهِ! وَلاَ خَاتَماً مِنْ حَدِيْدٍ، وَلٰكِن هٰذَا إِزَارِيْ (- قَالَ سَهْلٌ: - مَالَهُ رِدَآءٌ -) فَلَهَا نِصْفُهُ، فَقَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: **مَا تَصْنَعُ بِإِزَارِكَ؟** إِنْ لَبِسْتَهُ لَمْ يَكُنْ عَلَيْهَا مِنْه شَيْءٌ، وَإِنْ لبِسَتْهُ لَمْ يَكُنْ عَلَيْكَ مِنْه شَيْءٌ، فَجَلَسَ الرَّجُلُ، حَتَّى إِذَا طَالَ مَجْلِسُهُ قَامَ، فَرَآهُ رَسُولُ اللهِ ﷺ مُوَلِّياً فَأَمَرَ بِهِ فَدُعِيَ به، فَلَمَّا جَآءَ، قَالَ: **مَاذَا مَعَكَ مِنَ الْقُرْآنِ؟** قَالَ: مَعِيَّ سُورَةُ كَذَا، وَسُورَةُ كَذَا، عَدَّدَهَا، فَقَالَ: **تَقْرَؤُهُنَّ عَنْ ظَهْرِ قَلْبِكَ؟** قَالَ: نَعَمْ، قَالَ: **اَذْهَبْ فَقَدْ مَلَّكْتُكَهَا بِمَا مَعَكَ مِنَ الْقُرْآنِ.** مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ، وَاللَّفْظُ لِمُسْلِمٍ. وَفِيْ رِوَايَةٍ لَّهُ: **«اَنْطَلِقْ فَقَدْ زَوَّجْتُكَهَا فَعَلِّمْهَا مِنَ الْقُرْآنِ».** وَفِي رِوَايَةٍ لِّلْبُخَارِيِّ: **«أَمْلَكْنَاكَهَا بِمَا مَعَكَ مِنَ الْقُرْآنِ».**

نے کہا: نہیں، اے اللہ کے رسول (ﷺ)! اللہ کی قسم کچھ بھی نہیں۔ آپؐ نے فرمایا "اپنے گھر جاؤ اور تلاش کرو آیا کوئی چیز تجھے ملتی ہے؟" وہ چلا گیا اور پھر واپس آکر کہنے لگا، اللہ کی قسم مجھے کوئی چیز نہیں ملی۔ رسول اللہ ﷺ نے پھر فرمایا "تلاش کرو خواہ لوہے کی انگشتری ہی ہو۔" وہ آدمی پھر گیا اور واپس آکر عرض کیا یارسول اللہ (ﷺ)! اللہ کی قسم لوہے کی انگوٹھی تک بھی میسر نہیں۔ لیکن میرا یہ ایک تہ بند ہے۔ (سہل رضی اللہ عنہ نے کہا کہ اس کے اوپر کی چادر نہ تھی۔) آدھا حصہ میں اسے دے دوں گا۔ رسول اللہ ﷺ نے اس پیشکش کو نامنظور کرتے ہوئے فرمایا "وہ خاتون تیرے اس تہ بند کو کیا کرے گی۔ اگر تو اسے زیب تن کرے گا تو اس کیلئے کیا بچے گا اور اگر وہ اسے پہنے گی تو پھر تیرے لئے اس میں سے کچھ بھی نہیں ہوگا۔" یہ سن کر وہ آدمی نیچے بیٹھ گیا اور کافی دیر تک بیٹھا رہا بالآخر وہ اٹھ کھڑا ہوا اور پیٹھ پھیر کر جاتے ہوئے اسے رسول اللہ ﷺ نے دیکھ لیا۔ آپؐ نے اسے واپس بلانے کا حکم دیا۔ جب وہ واپس آگیا تو آپؐ نے اس سے دریافت فرمایا "تجھے کتنا قرآن یاد ہے؟" اس نے اسے گن کر بتایا کہ فلاں فلاں سورت یاد ہے۔ آپؐ نے پوچھا "تم ان کو زبانی پڑھ سکتے ہو؟" وہ بولا جی ہاں! آپؐ نے فرمایا "جا میں نے تجھے اس کا مالک بنا دیا۔ اس قرآن کے بدلہ جو تجھے یاد ہے۔" (بخاری و مسلم، یہ الفاظ مسلم کے ہیں) اور ایک روایت میں ہے "جا میں نے اسے تیری زوجیت میں دے دیا۔ پس تو اسے کچھ قرآن سکھا دو" اور بخاری

میں ہے کہ "ہم نے تجھے اس کا مالک بنا دیا اس قرآن کے عوض جو تجھے یاد ہے"

وَلِأَبِيْ دَاوُدَ عَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَ، رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: مَا تَحْفَظُ؟ قَالَ: سَوْرَةَ البَقَرَةِ وَالَّتِيْ تَلِيْهَا، قَالَ: فَقُمْ، فَعَلِّمْهَا عِشْرِيْنَ آيَةً.

اور ابوداؤد میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آپ ؐ نے دریافت فرمایا "کتنا کچھ قرآن حفظ ہے؟ وہ بولا سورۃ البقرہ اور اس کے ساتھ والی سورۃ (آل عمران) آپ ؐ نے فرمایا "اٹھو اور اسے بیس آیات سکھا دو۔"

لغوی تشریح: ﴿فصعد النظر فیھا وصوبہ﴾ دونوں باب تفعیل کے صیغے ہیں یعنی اوپر نیچے سے اس عورت پر نظر دوڑائی اور پھر تھوڑا سا تامل کیا۔ "طاطا" سر نیچے جھکایا ﴿قال سھل مالہ رداء﴾ یہ جملہ معترضہ ہے۔ ﴿ان لبستہ﴾ پہلے میں یہ خطاب کا صیغہ ہے یعنی اگر تو اسے پہنے گا اور دوسرے میں غائب کا صیغہ ہے یعنی اگر وہ عورت پہنے گی۔ ﴿مولیا﴾ تولیۃ سے اسم فاعل ہے۔ پیٹھ پھیر کر واپس جانے لگا ﴿عن ظھر قلبک﴾ زبانی یاد ہے ﴿ملکتھا﴾ میں نے اس عورت کا تجھے مالک بنایا اس کی عصمت کا اور اس سے فائدہ اٹھانے کا۔ معلوم ہوا کہ تملیک کا لفظ بھی نکاح کیلئے صحیح ہے۔ ﴿بما معک﴾ "با" یہاں بدل اور مقابلہ کے معنی میں مستعمل ہے۔ پس یہ دلیل ہے کہ تعلیم قرآنی بھی مہر ہو سکتی ہے۔ اگر یہ مہر نہ ہوتا تو آپ ؐ کا اس سے دریافت فرمانا کہ تمہیں کتنا قرآن حفظ ہے' کیا معنی رکھتا ہے؟ اس مرد کو چیزوں کے تلاش کا حکم دینا یہ معنی رکھتا ہے کہ یہ اشیاء مہر بن سکتی ہیں۔ یہ اس پر دال ہے کہ معمولی چیز بھی مہر بن سکتی ہے کیونکہ لوہے کی انگوٹھی نہایت ہی کم قیمت چیز شمار ہوتی ہے۔ اسی سے یہ مسئلہ اخذ کیا گیا ہے کہ نفع بخش چیز کا مہر مقرر کرنا درست ہے اور ﴿ولو خاتما من حدید﴾ کا جملہ اس کی دلیل ہے کہ کم سے کم چیز بھی مہر میں جائز ہے۔ ﴿والتی تلیھا﴾ یعنی اس سے متصل سورۂ اور وہ ہے سورۂ آل عمران۔ اس حدیث سے بہت سے مسائل مستنبط ہوتے ہیں۔ غور و خوض اور تامل کرنے والے سے یہ مسائل پوشیدہ نہیں۔ یہ مقام تفصیل میں جانے اور شرح و بسط سے بیان کرنے کا نہیں۔

(٨٣٤) وَعَنْ عَامِرِ بْنِ عَبْدِ اللّٰهِ ابْنِ الزُّبَيْرِ، عَنْ أَبِيْهِ أَنَّ رَسُولَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ: «أَعْلِنُوا النِّكَاحَ». رَوَاهُ أَحْمَدُ، وَصَحَّحَهُ الحَاكِمُ.

حضرت عامرؒ بن عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے' انہوں نے اپنے والد سے بیان کیا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "نکاح کا اعلان کرو۔" (اسے احمد نے روایت کیا ہے اور حاکم نے اسے صحیح کہا ہے)

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ نکاح علی الاعلان کیا جانا چاہئے خفیہ اور چھپے طور پر نہیں۔ اس لئے کہ یوں میاں بیوی کے تعلقات پر کسی کو انگشت نمائی کا موقع نہیں ملتا۔

راوی حدیث: ﴿ عامر بن عبداللہ ﴾ عامر بن عبداللہ بن زبیر بن عوام اسدی قرشی مدنی۔ اپنے والد اور دیگر حضرات سے احادیث سنی ہیں۔ بڑے عبادت گزار اور مشہور ثقہ تابعین میں سے ہیں۔ ۱۲۴ھ میں وفات پائی۔

(۸۳۵) وَعَنْ أَبِي بُرْدَةَ عن أَبِيْ مُوْسَى، عَنْ أَبِيْهِ، قَالَ: قَالَ رَسولُ اللهِ ﷺ: «لاَ نِكَاحَ إِلاَّ بِوَلِيٍّ». رَوَاهُ أَحْمَد وَالأَرْبَعَةُ، وَصَحَّحَهُ ابْنُ المَدِيْنِيِّ وَالتِّرْمِذِيُّ وَابْنُ حِبَّانَ، وَأُعِلَّ بِالإِرْسَالِ.

وَرَوَى الإِمَامُ أَحْمَدُ، عَنِ الحَسَنِ، عَنْ عِمْرَانَ بْنِ الحُصَيْنِ مَرْفُوعاً: لاَ نِكَاحَ إِلاَّ بِوَلِيٍّ وَشَاهِدَيْنِ.

حضرت ابوبردہ بن ابی موسیٰ نے اپنے باپ سے روایت کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "ولی و سرپرست کے بغیر نکاح نہیں ہوتا۔" (اسے احمد اور چاروں نے روایت کیا ہے۔ امام ابن مدینی' ترمذی اور ابن حبان نے اسے صحیح قرار دیا ہے اور مرسل ہونے کی وجہ سے اسے معلول قرار دیا گیا ہے)

اور امام احمد رحمہ اللہ نے حسن سے اور انہوں نے عمران بن حصین رضی اللہ عنہ سے مرفوع روایت بیان کی ہے کہ "نکاح ولی و سرپرست اور دو گواہوں کے بغیر منعقد نہیں ہوتا۔"

لغوی تشریح: ﴿ اعل بالارسال ﴾ یعنی اسے مرسل ہونے کی وجہ سے معلول قرار دیا گیا ہے مگر یہ تعلیل درست نہیں کیونکہ امام ترمذی رحمہ اللہ نے اپنی جامع میں یہ ثابت کیا ہے کہ موصول روایت اقویٰ ہے اور راجح ہے۔ لہٰذا یہ ارسال حدیث کی صحت پر اثر انداز نہیں ہوتا اور نہ اس کے قابل احتجاج ہونے میں رکاوٹ کا باعث ہوتا ہے۔

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ ولی کی اجازت کے بغیر نکاح نہیں ہوتا۔ اس حدیث کو تیس کے قریب صحابہ رضی اللہ عنہم نے روایت کیا ہے اور اس کے بعض طرق صحیح ہیں اور بعض ضعیف ہیں۔ جمہور علماء کی بھی رائے یہی ہے کہ ولی اور دو گواہوں کے بغیر نکاح نہیں ہوتا۔ ولی سے مراد باپ ہے۔ باپ کی غیر موجودگی میں دادا پھر بھائی پھر چچا ہے اگر کسی کے دو ولی ہوں اور نکاح کے موقع پر اختلاف واقع ہو جائے تو ترجیح قریبی ولی کو ہو گی' اگر کوئی بھی ولی نہ ہو تو حدیث میں ہے کہ سربراہ مملکت اس کا ولی ہے اور اگر دونوں ولی برابر حیثیت کے ہوں اور ان میں اختلاف ہو جائے تو ایسی صورت میں حاکم ولی ہوگا۔

(۸۳٦) وَعَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهَا قَالَتْ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «أَيُّمَا امْرَأَةٍ نَكَحَتْ بِغَيْرِ إِذْنِ وَلِيِّهَا فَنِكَاحُهَا بَاطِلٌ، فَإِنْ دَخَلَ بِهَا

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "جس کسی خاتون نے اپنے ولی کی اجازت کے بغیر نکاح کیا' اس کا نکاح باطل ہے۔ پھر اگر شوہر نے اس سے (مباشرت) کی ہے تو اس

فَلَهَا الْمَهْرُ بِمَا اسْتَحَلَّ مِنْ فَرْجِهَا، فَإِنِ اشْتَجَرُوا فَالسُّلْطَانُ وَلِيُّ مَنْ لاَ وَلِيَّ لَهُ». أَخْرَجَهُ الأَرْبَعَةُ إِلاَّ النَّسَائِيَّ، وَصَحَّحَهُ أَبُو عَوَانَةَ وَابْنُ حِبَّانَ وَالحَاكِمُ.

عورت کیلئے حق مہر ہے' اس کی شرم گاہ کو حلال کرنے کے بدلہ میں۔ پھر اگر اولیاء میں جھگڑا ہو جائے تو پھر جس کا کوئی ولی نہیں اس کا ولی حاکم وقت ہے۔" (نسائی کے علاوہ اسے چاروں نایور اسے ابوعوانہ' ابن حبان اور حاکم تینوں نے صحیح قرار دیا ہے)

لغوی تشریح: ﴿ ایما امراۃ ﴾ کلمہ ﴿ ایما ﴾ ان الفاظ میں سے ہے جن میں عمومیت پائی جاتی ہے۔ جس کی بنا پر عورتوں سے ولایت مطلقاً بغیر کسی تخصیص کے سلب ہو جاتی ہے (یعنی کوئی عورت کسی صورت میں ولی نہیں بن سکتی) اس میں مالکیہ کی اس رائے کا رد ہے کہ شریف و معزز عورت تو ولی بننے کا حق رکھتی ہے اور نچلے درجہ اور مرتبہ کی عورت اس کا استحقاق نہیں رکھتی۔ ﴿ نکحت ﴾ خود اپنا نکاح کرے اور ولی سے مراد جمہور کے نزدیک وہ شخص ہے جو عصبہ میں سے نسبی طور پر سب سے زیادہ قریب ہو۔ اس کے بعد سببی رشتہ دار پھر اس کے عصبی رشتہ دار۔ جن لوگوں کے حصہ مقرر ہیں وہ اور ذوالارحام اولیاء نہیں بن سکتے۔ ﴿ بما استحل ﴾ اس میں ما مصدری معنی میں مستعمل ہے۔ یعنی فرج عورت کو تمتع کیلئے حلال کرنے کی وجہ سے ﴿ اشتجروا ﴾ اولیاء میں تنازع اور شدید اختلاف پیدا ہو جائے جو عورت کے نکاح میں مانع بن جائے تو پھر ایسی صورت میں ان اولیاء کی حیثیت نہ ہونے کے برابر ہو گئی اور کالعدم ہو جائیں گے اور ان کا حق ولایت ساقط ہو جائے گا اور یہ استحقاق حاکم وقت کی طرف منتقل ہو جائے گا۔ پس جب عقد میں اولیاء کا اختلاف و تنازع واقع ہو اور مرتبہ میں سب اولیاء مساوی ہوں تو اس کا عقد معتبر اور قابل تسلیم ہو گا جس نے پہلے عقد کرایا۔ یہ حدیث ولایت کو شرط قرار دینے کی دلیل ہے کہ عورت خود اپنا نکاح کسی صورت میں نہیں کر سکتی۔ جمہور کا یہی موقف ہے اور ان کی تائید اس باب کی احادیث سے ہوتی ہے۔ سبل السلام میں ہے کہ حاکم نے کہا کہ اس بارے میں ازواج مطہرات کی نبی ﷺ سے روایت صحیح ہے یعنی حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا' حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا اور زینب بنت جحش رضی اللہ عنہا سے اور کہا کہ اس باب میں حضرت علی رضی اللہ عنہ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے بھی مروی ہے اور اس سلسلہ میں انہوں نے تیس صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا نام لیا ہے۔ مگر حنفیہ تو ولی کی شرط کے سرے سے قائل ہی نہیں جب کہ وہ عورت اپنے کفو سے شادی کرے۔ انہوں نے اس مسئلہ کو بیع پر قیاس کرتے ہوئے یہ موقف اختیار کیا ہے مگر یہ کسے معلوم نہیں کہ قیاس کی نص کے مقابلہ میں کوئی حیثیت نہیں۔ ان احادیث میں سے بعض پر انہوں (احناف) نے ایسی بے جا گفتگو اور کلام کیا ہے۔ بعض حضرات نے جنہیں دراصل فن میں کوئی بصیرت حاصل نہیں ان احادیث پر بے بنیاد اعتراضات کئے ہیں جن کی کوئی حیثیت نہیں۔

(٨٣٧) وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، أَنَّ رَسُولَ اللهِ ﷺ قَالَ:

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "بیوہ عورت کا نکاح اس سے مشورہ

«لاَ تُنْكَحُ الأَيِّمُ حَتَّى تُسْتَأْمَرَ، وَلاَ تُنْكَحُ الْبِكْرُ حَتَّى تُسْتَأْذَنَ»، قَالُوا: يَا رَسُولَ اللهِ! وَكَيْفَ إِذْنُهَا؟ قَالَ: «أَنْ تَسْكُتَ». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

لئے بغیر نہ کیا جائے اور کنواری کا نکاح اس سے اجازت لئے بغیر نہ کیا جائے۔" انہوں نے عرض کیا یارسول اللہ (ﷺ)! اس کی اجازت کیسے ہے؟ فرمایا "اس کا خاموش رہنا۔" (بخاری و مسلم)

لغوی تشریح: ﴿ لا تنكح ﴾ صیغہ مجہول۔ یہ مبالغہ کی نفی ہے یا پھر نہی۔ ﴿ الايم ﴾ همزہ پر فتحہ اور "یاء" پر تشدید اور کسرہ۔ وزن اور معنی دونوں کے اعتبار سے ثیب کے ہم معنی ہے یعنی ثیب مراد ہے اور ثیب شوہر دیدہ عورت کو کہتے ہیں جس کا خاوند وفات پا گیا ہو یا اسے طلاق ہو گئی ہو۔ ایسی عورت کو "ایم" بھی کہتے ہیں اور ثیب بھی۔ ﴿ حتى تستامر ﴾ جب تک کہ اس سے مشورہ نہ کر لیا جائے۔ یعنی بالصراحت اس سے معلوم کیا جائے اور یہ اجازت و اذن لفظاً ہونی چاہئے اس میں خاموشی ناکافی رہے گی۔ ﴿ البكر ﴾ "باء" کے نیچے کسرہ اور کاف ساکن۔ باکرہ کنواری جس نے ابھی تک شادی نہ کی ہو۔

حاصل کلام: اس حدیث سے ثابت ہو رہا ہے کہ شریعت کی نظر میں مرد و عورت کی بہت اہمیت ہے اور عورت جسے معاشرہ میں کوئی خاص مقام نہیں دیا جاتا تھا اسے پستی سے اٹھا کر بلند مقام پر پہنچایا ہے' اس کی اہمیت کو دوبالا کیا ہے۔ شادی بیاہ کے معاملہ میں اس سے مشورہ لینا تو کجا اسے اپنے بارے میں کچھ کہنے کی اجازت تک نہ تھی۔ سربراہ و ولی اپنی مرضی سے جس سے چاہتے تھے نکاح کر دیتے تھے' اسے زبان پر لانے کی ہمت نہ تھی۔ نبی ﷺ نے عورت کو اس کا صحیح معاشرتی مقام و منصب دیا اور سرپرستوں کو حکم دیا کہ شوہر دیدہ سے مشورہ ضرور کیا جائے اور کنواری سے اس کی اجازت حاصل کی جائے۔

شوہر دیدہ کا اس کی رضا و مشورہ کے بغیر نکاح کا مطلب یہ نہیں کہ وہ بغیر ولی کے اپنا نکاح کر سکتی ہے۔

(٨٣٨) وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ قَالَ: «الثَّيِّبُ أَحَقُّ بِنَفْسِهَا مِنْ وَلِيِّهَا، وَالبِكْرُ تُسْتَأْمَرُ، وَإِذْنُهَا سُكُوتُهَا». رَوَاهُ مُسْلِمٌ.

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا "شوہر دیدہ عورت اپنے دوبارہ نکاح کے بارے میں اپنے ولی کی بہ نسبت خود زیادہ استحقاق رکھتی ہے اور کنواری سے اجازت لی جائے گی اور اس کا اذن اس کی خاموشی ہے۔" (مسلم)

وَفِي لَفْظٍ: «لَيْسَ لِلْوَلِيِّ مَعَ الثَّيِّبِ أَمْرٌ وَاليَتِيمَةُ تُسْتَأْمَرُ». رَوَاهُ أَبُو دَاوُدَ وَالنَّسَائِيُّ وَصَحَّحَهُ ابْنُ حِبَّانَ.

اور ایک روایت میں ہے کہ "شوہر دیدہ عورت کے بارے میں ولی کا کوئی اختیار نہیں اور یتیم بچیوں سے بھی مشورہ لیا جائے۔" (اسے ابوداؤد اور نسائی نے روایت کیا ہے اور ابن حبان نے اسے صحیح قرار دیا ہے)

لغوی تشریح: ﴿ الثیب احق بنفسھا من ولیھا ﴾ اس سے حنفیہ نے اپنے مذہب کی تائید میں استدلال کیا ہے کہ شوہر دیدہ کیلئے ولایت کی شرط نہیں ہے حالانکہ یہ استدلال فاسد ہے کیونکہ "احق" کا کلمہ صیغہ تفضیل ہے اور تفضیل باہمی شرکت کا متقاضی ہے تو دوسرے کا بھی اسی طرح استحقاق ہے جس طرح خود اس کا حق ہے البتہ اس کا حق زیادہ مؤکد ہے اور راجح ہے پھر اس سے ان کے مذہب کی پوری تائید نہیں ہوتی کیونکہ یہ حضرات تو ولی کے حق کو مکمل طور پر ساقط کر دیتے ہیں۔ بجز اس کے کہ وہ عورت غیر کفو میں اپنی مرضی سے نکاح کرے۔ ﴿ لیس للولی مع الثیب امر ﴾ یعنی ولی مجبور نہیں کر سکتا اور اس کی رضامندی کے بغیر اس کا نکاح نہیں کر سکتا۔

حاصل کلام: جمہور کے مذہب کی روشنی میں حدیث کا معنی واضح ہے کہ اگر ولی اس کے نکاح کا ارادہ کرتا ہے اور وہ عورت وہاں نہیں کرنا چاہتی تو اسے مجبور نہیں کیا جائے گا اور اگر وہ عورت کہیں نکاح کرنا چاہتی ہے اور ولی اسے روکتا ہے تو ولی کو مجبور کیا جائے گا کہ عورت کے فیصلہ کا احترام کرے۔ پھر اگر اولیاء عقد روکنے پر اصرار کریں تو ولی کا حق ولایت ساقط ہو جائے گا اور قاضی اس کا نکاح کر دے گا۔ یہ بات اس کی دلیل ہے کہ عورت کا حق نہایت ہی مؤکد اور قابل ترجیح ہے۔

(٨٣٩) وَعَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ: «لاَ تُزَوِّجُ الْمَرْأَةُ الْمَرْأَةَ، وَلاَ تُزَوِّجُ الْمَرْأَةُ نَفْسَهَا». رَوَاهُ ابْنُ مَاجَهْ وَالدَّارَقُطْنِيُّ، وَرِجَالُهُ ثِقَاتٌ.

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "نہ کوئی عورت دوسری عورت کا (ولی بن کر) نکاح کرے اور نہ خود اپنا نکاح کرے۔" (اسے ابن ماجہ اور دارقطنی نے روایت کیا ہے۔ اس کے تمام راوی ثقہ ہیں)

حاصل کلام: یہ حدیث اس بات کی دلیل ہے کہ عورت نہ دوسری کسی عورت کی ولی بن سکتی ہے اور نہ خود اپنی ولی بن کر اپنا نکاح کرنے کی مجاز ہے۔ جمہور علماء کی رائے یہی ہے مگر احناف کہتے ہیں کہ ایک عاقلہ بالغہ خاتون اپنا بھی اور اپنی نابالغہ بچی کا نکاح بھی کر سکتی ہے اور دوسرے کی وکیل نکاح بھی بن سکتی ہے لیکن اگر کہیں غیر کفو میں نکاح کر لے تو ولی کو تنسیخ کا اختیار بھی ہے اور امام مالک رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ صرف کمین عورت کیلئے جائز ہے مگر اس بارے میں جمہور علماء کی رائے مضبوط ہے۔ (السبل)

(٨٤٠) وَعَنْ نَافِعٍ عَنِ ابْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُمَا، قَالَ: نَهَى رَسُوْلُ اللهِ ﷺ عَنِ الشِّغَارِ، وَالشِّغَارُ أَنْ يُزَوِّجَ الرَّجُلُ ابْنَتَهُ عَلَى أَنْ يُزَوِّجَهُ الآخَرُ ابْنَتَهُ، وَلَيْسَ بَيْنَهُمَا

حضرت نافع نے ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ نبی ﷺ نے شغار سے منع فرمایا ہے اور شغار کی تعریف یہ ہے کہ ایک آدمی اپنی بیٹی دوسرے آدمی سے اس شرط پر بیاہ دے کہ وہ اپنی بیٹی اس سے بیاہ دے گا اور دونوں کا کوئی مہر مقرر نہ ہو۔ (بخاری و

صَدَاقٌ. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ، وَاتَّفَقَا مِنْ وَجْهٍ آخَرَ عَلَىٰ أَنَّ تَفْسِيرَ الشِّغَارِ مِنْ كَلَامِ نَافِعٍ.

مسلم) اور بخاری و مسلم دونوں اس پر متفق ہیں کہ شغار کی یہ تعریف نافع کی بیان کردہ ہے۔

لغوی تشریح: ﴿الشغار﴾ شین کے نیچے کسرہ۔ اصل میں تو اس پر رفع ہے۔ کہا جاتا ہے "شغر الکلب" جب کتا پیشاب کرنے کیلئے اپنا پاؤں اوپر اٹھاتا ہے اور اس مقام پر اس کا معنی ایک عورت کا عورت کے بدلہ میں نکاح جبکہ دونوں میں مہر مقرر نہ کیا جائے جیسا کہ حدیث میں اس کی تفسیر کی گئی ہے۔ یہ دور جاہلیت کے نکاحوں میں سے ایک نکاح تھا جسے شارع نے ممنوع قرار دے دیا ہے۔ تین ائمہ کرام یعنی امام مالک رحمۃ اللہ علیہ' شافعی رحمۃ اللہ علیہ اور احمد رحمۃ اللہ علیہ اس کے باطل ہونے کے قائل ہیں اور ایک گروہ نے کہا ہے مہر مثل سے یہ نکاح صحیح ہے حالانکہ یہ ان احادیث کے خلاف ہے۔

(٨٤١) وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا أَنَّ جَارِيَةً بِكْراً أَتَتِ النَّبِيَّ ﷺ، فَذَكَرَتْ أَنَّ أَبَاهَا زَوَّجَهَا وَهِيَ كَارِهَةٌ، فَخَيَّرَهَا رَسُولُ اللهِ ﷺ. رَوَاهُ أَحْمَدُ وَأَبُو دَاوُدَ وَابْنُ مَاجَهْ، وَأُعِلَّ بِالإِرْسَالِ.

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ ایک کنواری لڑکی نبی ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئی اور اس نے بتایا کہ اس کے والد نے اس کا نکاح کر دیا ہے جبکہ اسے ناپسند تھا (یہ سن کر) نبی ﷺ نے اس لڑکی کو اختیار دے دیا۔ (اسے احمد اور ابوداؤد اور ابن ماجہ نے روایت کیا ہے اور اس حدیث کو مرسل ہونے کی بنا پر معلول کہا گیا ہے)

لغوی تشریح: ﴿واعل بالارسال﴾ مگر ارسال کی یہ علت درست نہیں کیونکہ یہ موصول بھی مروی ہے اور خود مصنف رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے۔ اس حدیث میں کسی قسم کا طعن بے معنی ہے اس لئے کہ اس حدیث کے ایسے طرق ہیں جو ایک دوسرے کی تقویت کا باعث ہیں۔

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ باپ ولی ہے۔ بغیر مشورہ لئے وہ نکاح تو کر سکتا ہے مگر ایسے نکاح میں اس لڑکی کو شرعاً اختیار حاصل ہے کہ وہ اگر اس نکاح سے ناخوش ہو تو فسخ کرنے کی مجاز ہے۔

(٨٤٢) وَعَنِ الْحَسَنِ، عَنْ سَمُرَةَ، عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ: **أَيُّمَا امْرَأَةٍ زَوَّجَهَا وَلِيَّانِ فَهِيَ لِلأَوَّلِ مِنْهُمَا**. رَوَاهُ أَحْمَدُ وَالأَرْبَعَةُ، وَحَسَّنَهُ التِّرْمِذِيُّ.

حضرت حسن رضی اللہ عنہ' حضرت سمرہ رضی اللہ عنہ سے نبی ﷺ کا ارشاد بیان کرتے ہیں کہ "جس عورت کا نکاح دو ولی کر دیں تو یہ خاتون پہلے خاوند کی ہے۔" (اسے احمد اور چاروں نے روایت کیا ہے اور ترمذی نے حسن قرار دیا ہے)

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ ایک خاتون کے دو ولی جب دو مختلف آدمیوں میں سے مختلف اوقات میں نکاح کر دیں تو وہ عورت اس آدمی کی بیوی قرار پائے گی جس سے پہلے نکاح کیا گیا ہو اور

دوسرا نکاح ازخود باطل قرار پائے گا کیونکہ شریعت نے نکاح پر نکاح کو ناجائز قرار دیا ہے اور اگر دونوں نکاح بیک وقت کئے جائیں تو دونوں باطل قرار پائیں گے کوئی بھی صحیح نہیں ہوگا۔ اس میں کسی کا اختلاف نہیں ہے۔

(٨٤٣) وَعَنْ جَابِرٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ **أَيُّمَا عَبْدٍ تَزَوَّجَ بِغَيْرِ إِذْنِ مَوَالِيهِ وَأَهْلِهِ فَهُوَ عَاهِرٌ**. رَوَاهُ أَحْمَدُ وَأَبُو دَاوُدَ وَالنَّسَائِيُّ وَالتِّرْمِذِيُّ، وَصَحَّحَهُ، وَكَذٰلِكَ ابْنُ حِبَّانَ.

حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "جس غلام نے اپنے مالکوں اور اپنے اہل کی اجازت کے بغیر نکاح کیا وہ زانی ہے۔" (اسے احمد' ابوداؤد' نسائی اور ترمذی نے روایت کیا ہے اور ترمذی نے اسے صحیح کہا ہے اور اسی طرح ابن حبان نے اسے صحیح قرار دیا ہے)

لغوی تشریح: ﴿عاھر﴾ زانی اور زنا باطل ہے لہٰذا یہ نکاح کے بطلان پر دلالت کرتی ہے خواہ مالک عقد کے بعد اجازت دے دے۔ امام شافعی رحمہ اللہ اور امام احمد رحمہ اللہ دونوں کی یہی رائے ہے اور امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ اور مالک رحمہ اللہ دونوں کا قول ہے کہ اگر مالک عقد کے بعد اسے اجازت دے دے تو نکاح صحیح ہو جائے گا مگر پہلا قول راجح ہے۔

(٨٤٤) وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ أَنَّ رَسُولَ اللهِ ﷺ قَالَ: **«لاَ يُجْمَعُ بَيْنَ الْمَرْأَةِ وَعَمَّتِهَا، وَلاَ بَيْنَ الْمَرْأَةِ وَخَالَتِهَا»**. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "ایک مرد کے نکاح میں پھوپھی اور بھتیجی اور خالہ و بھانجی کو جمع نہ کیا جائے۔" (بخاری و مسلم)

(٨٤٥) وَعَنْ عُثْمَانَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: **«لاَ يَنْكِحُ الْمُحْرِمُ، وَلاَ يُنْكِحُ»**. رَوَاهُ مُسْلِمٌ. وَفِي رِوَايَةٍ لَهُ: «وَلاَ يَخْطُبُ». زَادَ ابْنُ حِبَّانَ «وَلاَ يُخْطَبُ عَلَيْهِ».

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ "احرام والا آدمی نہ خود اپنا نکاح کرے اور نہ کسی دوسرے کا نکاح کرے۔" (مسلم) اور مسلم کی ایک روایت میں ہے "اور نہ وہ پیغام نکاح دے" اور ابن حبان نے اتنا اضافہ نقل کیا ہے اور "نہ ہی اس کے پیغام نکاح پر پیغام دیا جائے۔"

لغوی تشریح: ﴿لاینکح﴾ ینکح میں "یاء" پر فتحہ یعنی خود نکاح نہ کرے کسی عورت کے ساتھ ﴿المحرم﴾ احرام بند خواہ حج کا احرام ہو یا عمرہ کا یا دونوں (حج اور عمرہ) کا۔ ﴿ولا ینکح﴾ یہاں "یا" پر ضمہ ہے یعنی نہ وہ شخص ولی یا وکیل بن کر دوسرے کا نکاح کرے ﴿ولا یخطب﴾ نہ اپنے لئے اور نہ کسی دوسرے کیلئے ﴿ولا یخطب علیہ﴾ صیغہ مجہول یعنی نہ اس کا کوئی ولی اسے پیغام نکاح دے اور

نہ ہی اس کی قریبی عزیز خاتون اس سے نکاح کا تقاضا و مطالبہ کرے۔ جمہور علماء کی رائے اس حدیث کے مطابق ہے مگر حنفیہ نے اختلاف کیا ہے۔

(٨٤٦) وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُمَا قَالَ: تَزَوَّجَ النَّبِيُّ ﷺ مَيْمُونَةَ وَهُوَ مُحْرِمٌ مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ. وَلِمُسْلِمٍ عَنْ مَيْمُونَةَ نَفْسِهَا: أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ تَزَوَّجَهَا وَهُوَ حَلَالٌ.

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ نبی ﷺ نے جب میمونہ (رضی اللہ عنہا) سے نکاح کیا تو اس وقت آپؐ حالت احرام میں تھے۔ (بخاری و مسلم) اور مسلم میں حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا کا اپنا بیان ہے کہ نبی ﷺ نے ان سے نکاح کیا تو اس وقت آپؐ حلال تھے۔

حاصل کلام: اس حدیث سے احناف نے استدلال کیا ہے کہ محرم کا نکاح کرنا جائز ہے حالانکہ اس حدیث میں ان کیلئے کوئی دلیل نہیں ہے کیونکہ یہ اکثر صحابہ کرامؓ کی روایت کے مخالف ہے۔ فرد واحد کی جانب وہم جماعت کی طرف وہم سے زیادہ قریب ہے۔ یعنی ایک آدمی کو وہم ہو جانا جماعت کے مقابلہ میں زیادہ قریب ہے اور خود صاحبِ قصہ حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے اور ابو رافع رضی اللہ عنہ جو اس رشتہ کرانے میں سفیر کے فرائض دیتے رہے ہیں' ان سے بھی منقول ہے کہ بلاشبہ نبی ﷺ اس وقت حلال تھے۔ خود صاحبِ قصہ اور سفارت کے فرائض انجام دینے والا دوسروں کی بہ نسبت زیادہ خبر رکھتا ہے اور صورت واقعہ سے زیادہ واقفیت رکھتا ہے۔ لہٰذا دونوں سے مروی روایت دوسروں کی روایت سے زیادہ لائق اعتبار ہے۔ پھر ان دنوں ابن عباس رضی اللہ عنہما نو دس برس کے بچے ہی تھے۔ پس ان دونوں کے مقابلہ میں ان کا واقعاتی صورت کو محفوظ نہ رکھنا زیادہ قرین قیاس اور لائق ہے اور پھر یہ بھی ممکن ہے کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا حضور ﷺ کو محرم کہنے کا مطلب یہ ہو کہ وہ حدود حرم میں تھے۔ اگر یہ تسلیم بھی کر لیا جائے کہ نبی ﷺ نے احرام کی حالت میں حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا سے نکاح کیا ہے تو پھر اسے ان کی خصوصیت پر محمول کیا جائے گا۔ الشیخ عبدالرحمٰن محدث مبارک پوری نے تحفۃ الاحوذی (ج: ۲' ص: ۸۹) میں اس مسئلہ میں لمبی گفتگو کی ہے اور قابل ترجیح بہرحال جمہور کا قول ہے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں قانون کلی کا بیان ہے اور حدیث ابن عباس رضی اللہ عنہما سے منقول روایت میں نبی ﷺ کے فعل کی حکایت ہے۔ جس میں بہت سے احتمالات ایسے ہیں جو صحیح صورت حال کے قریبی راستہ تک پہنچا دیتے ہیں۔ واللہ اعلم

(٨٤٧) وَعَنْ عُقْبَةَ بْنِ عَامِرٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُ، قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ: «إِنَّ أَحَقَّ الشُّرُوطِ أَنْ يُوَفَّى بِهِ، مَا اسْتَحْلَلْتُمْ بِهِ الْفُرُوجَ». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "وہ شرط پورا کئے جانے کا زیادہ حق رکھتی ہے جس کے ذریعہ تم نے عورتوں کی شرم گاہوں کو اپنے لئے حلال کیا ہے۔" (بخاری و مسلم)

حاصل کلام: اس حدیث کا مفہوم یہ ہے کہ جو شرائط سب سے زیادہ پوری کرنے کی مستحق ہیں وہ شروط

نکاح ہیں۔ کیونکہ اس کا معاملہ بڑا ہی محتاط اور نازک ہے۔ سبل السلام میں ہے کہ یہ حدیث اس بات کی دلیل ہے کہ نکاح میں شرط طے کرنا جائز ہے اور انہیں پورا کرنا ضروری ہے۔ نکاح کی شرطوں سے کیا مراد ہے اس میں اختلاف ہے۔ ایک قول یہ ہے کہ اس سے مراد ادائیگی مہر ہے کیونکہ مہر وطی سے مشروط ہے اور ایک قول یہ ہے کہ زوجیت کے تقاضا میں عورت جس چیز کی مستحق ہے اور یہ بھی کہا گیا ہے یہ وہ شرط ہے جو نکاح کیلئے آمادہ کرنے کیلئے مرد نے عورت سے طے کی ہو اور یہ شریعت میں ممنوع نہ ہو۔ سیاق حدیث کی رو سے یہی آخری رائے زیادہ مناسب معلوم ہوتی ہے۔

(٨٤٨) وَعَنْ سَلَمَةَ بْنِ الأَكْوَعِ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: رَخَّصَ رَسُولُ اللهِ ﷺ عَامَ أَوْطَاسٍ فِيْ الْمُتْعَةِ ثَلاَثَةَ أَيَّامٍ، ثُمَّ نَهى عَنْهَا. رَوَاهُ مُسْلِمٌ.

حضرت سلمہ بن اکوع رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے غزوۂ اوطاس کے موقع پر تین روز کیلئے نکاح متعہ کی اجازت دی۔ پھر اسے منع فرما دیا۔ (مسلم)

لغوی تشریح: ﴿عام اوطاس﴾ یہ عام حنین کا دوسرا نام ہے اور یہ فتح مکہ کے سال کا ہی واقعہ ہے جو ٨ھ میں ہوا۔ "اوطاس" حنین کے قریب ایک وادی کا نام ہے۔ جب مسلمانوں پر وادی حنین میں قبائل ھوازن و ثقیف ٹوٹ پڑے تھے۔ اس وقت انہوں نے مال' مویشی اور آل اولاد سب کچھ اس مقام پر اکٹھا کر لیا تھا۔ جب شکست و ہزیمت سے پالا پڑا تو سب کچھ یہیں چھوڑ کر فرار ہوگئے تو مسلمانوں نے سب کچھ اپنے قبضہ میں لے لیا اور اسے مال غنیمت بنا لیا۔ اسی وجہ سے اس سال کا نام "عام حنین" یا "عام اوطاس" پڑ گیا۔ ﴿فی المتعة﴾ متعہ کہتے ہیں کسی عورت سے ایک مقرر وقت تک کیلئے نکاح کرنے کو۔ جب مقرر وقت پورا ہو جاتا ہے تو ان کے درمیان خودبخود جدائی ہو جاتی ہے۔ یہ معلوم رہے کہ متعہ دو مرتبہ حرام ہوا اور دو ہی مرتبہ مباح و جائز ہوا۔ چنانچہ یہ غزوۂ خیبر سے پہلے حلال تھا پھر اسے غزوۂ خیبر کے موقع پر حرام کیا گیا جیسا کہ آگے آنے والی حدیث سے معلوم ہوتا ہے۔ پھر اسے فتح مکہ کے موقع پر مباح کیا گیا اور "عام اوطاس" بھی اسی کو کہتے ہیں۔ اس کے بعد یہ ہمیشہ ہمیشہ کیلئے حرام کر دیا گیا۔ جیسا کہ امام نووی رحمہ اللہ نے فرمایا ہے لیکن علامہ ابن قیم رحمہ اللہ کی رائے یہ ہے کہ متعہ غزوۂ خیبر کے موقع پر حرام نہیں کیا گیا بلکہ اس کی تحریم فتح مکہ کے سال ہوئی اور یہی رائے درست ہے اور اہل علم کے ایک گروہ کا خیال ہے کہ متعہ خیبر کے موقع پر حرام ہوا ہے اور انہوں نے صحیحین میں مروی حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کی روایت سے استدلال کیا ہے جو آگے آرہی ہے۔ انہوں نے کہا ہے کہ متعہ حرام قرار دیا گیا پھر حلال کیا گیا پھر حرام کیا گیا یعنی دو دفعہ منسوخ ہوا ہے مگر امام شافعی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ میں نے متعہ کے علاوہ اور کوئی چیز ایسی نہیں دیکھی جسے حرام کیا گیا ہو پھر حلال کیا گیا ہو پھر اسے حرام قرار دیا گیا ہو۔ مگر دوسرے لوگوں نے اس رائے کی مخالفت کی ہے۔ ان کا خیال ہے کہ صرف فتح مکہ کے سال ہی حرام کیا گیا ہے اور

اس سے پہلے مباح و جائز تھا۔ ان کا خیال یہ ہے کہ حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ نے متعہ کی حرمت اور گھریلو پالتو گدھے کی حرمت کو جمع کر دیا کیونکہ ابن عباس رضی اللہ عنہما ان دونوں کو مباح و حلال سمجھتے تھے۔ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ان دونوں کی تحریم ابن عباس رضی اللہ عنہما کی تردید میں بیان کی ہے اور پالتو گدھے کی تحریم یوم خیبر میں ہوئی تھی اور اسکی تحریم کیلئے خیبر کے دن کو بطور ظرف ذکر کیا ہے اور تحریم متعہ کو مطلق بیان کیا ہے کسی وقت و زمانہ سے مقید نہیں کیا۔ جیسا کہ مسند احمد میں صحیح سند سے منقول ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خیبر کے دن گھریلو گدھے کو حرام قرار دیا نیز عورتوں کے متعہ کو بھی حرام کیا اور ایک روایت میں "حرم متعة النساء وحرم لحوم الحمر الاهلية يوم خيبر" کے الفاظ بھی ہیں۔ یعنی یوم خیبر میں عورتوں سے متعہ اور گھریلو گدھے کا گوشت کھانا حرام کر دیا۔ جیسا کہ امام سفیان بن عیینہ سے یہ مفصل روایت مروی ہے جس سے بعض راویوں نے سمجھا کہ ان دونوں کو خیبر کے روز ہی حرام کیا گیا ہے تو انہوں نے دونوں کو خیبر کے روز سے مقید کر دیا۔ پھر بعض راویوں نے دونوں میں سے ایک کی تحریم پر اقتصار کیا اور وہ ہے گدھے کی تحریم اور اسی سے اس کو مقید کر دیا بس یہیں سے وہم نے نشوونما پائی اور رہا قصۂ خیبر تو اس روز صحابہ کرام رضی اللہ عنہم یہودی عورتوں سے تو متعہ نہیں کرتے رہے اور نہ ہی انہوں نے اس بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اجازت طلب کی اور نہ ہی کسی نے کبھی اس غزوہ میں اس کو نقل کیا ہے اور نہ ہی اس متعہ کے فعل یا اس کی تحریم کا حتمی ذکر ہے بخلاف فتح مکہ کے۔ فتح مکہ کے موقع پر متعہ کے فعل اور اس کی تحریم کا ذکر مشہور ہے اور اس کی روایت صحیح ترین روایت ہے۔ (تلخیص از زاد المعاد ج ۲ ص ۱۴۲۔ ۱۴۳) اور علامہ خطابی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ متعہ کی حرمت مسلمانوں میں اجماعی ہے۔ بجز بعض روافض کے امت مسلمہ میں ایک بھی فرد ایسا نہیں جو اس کے خلاف ہے۔

(٨٤٩) وَعَنْ عَلِيٍّ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: نَهَى رَسُولُ اللهِ ﷺ عَنِ الْمُتْعَةِ عَامَ خَيْبَرَ. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خیبر کے سال متعہ سے منع فرما دیا تھا۔ (بخاری و مسلم)

(٨٥٠) وَعَنْهُ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ نَهَى عَنْ مُتْعَةِ النِّسَآءِ، وَعَنْ أَكْلِ الْحُمُرِ الأَهْلِيَّةِ يَوْمَ خَيْبَرَ. أَخْرَجَهُ السَّبْعَةُ إِلاَّ أَبَا دَاوُدَ.

حضرت علی رضی اللہ عنہ ہی سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے عورتوں سے متعہ کرنے اور پالتو گدھوں کا گوشت کھانے سے خیبر کے روز منع فرمایا۔ (ابوداؤد کے علاوہ ساتوں نے اس روایت کو نقل کیا ہے)

(٨٥١) وَعَنْ رَبِيعِ بْنِ سَبْرَةَ، عَنْ أَبِيهِ أَنَّ رَسُولَ اللهِ ﷺ قَالَ: «إِنِّي كُنْتُ أَذِنْتُ لَكُمْ فِي الاسْتِمْتَاعِ مِنَ النِّسَاءِ، وَإِنَّ اللَّهَ قَدْ حَرَّمَ ذَلِكَ إِلَى

حضرت ربیع بن سبرہ نے اپنے باپ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "میں نے تمہیں عورتوں سے متعہ کرنے کی اجازت دے دی تھی۔ اب اللہ تعالیٰ نے اسے تا روز قیامت حرام

يَوْمِ الْقِيَامَةِ، فَمَنْ كَانَ عِنْدَهُ مِنْهُنَّ شَيْءٌ فَلْيُخْلِ سَبِيلَهَا، وَلاَ تَأْخُذُوا مِمَّا آتَيْتُمُوهُنَّ شَيْئاً». أَخْرَجَهُ مُسْلِمٌ وَأَبُو دَاوُدَ وَالنَّسَائِيُّ وَابْنُ مَاجَهْ وَأَحْمَدُ وَابْنُ حِبَّانَ.

قرار دے دیا ہے۔ لہٰذا جس کسی کے پاس ان میں سے کوئی متعہ والی عورت ہو تو وہ اس کو چھوڑ دے اور جو کچھ تم انہیں دے چکے ہو اس میں سے کچھ بھی واپس نہ لو۔" (اس روایت کو مسلم' ابوداؤد' نسائی' ابن ماجہ' احمد اور ابن حبان نے روایت کیا ہے)

لغوی تشریح: ﴿ فی الاستمتاع من النساء ﴾ عورتوں سے متعہ کے بارے میں ﴿ مما اتیتموهن ﴾ جو کچھ تم نے مہر و معاوضہ دیا ہے۔

راوی حدیث: ﴿ ربیع بن سبرہ ﴾ ربیع بن سبرہ بن معبد جھنی مدنی۔ ان کو نسائی اور عجلی دونوں نے ثقہ قرار دیا ہے۔

(٨٥٢) وَعَنِ ابْنِ مَسْعُودٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: لَعَنَ رَسُولُ اللهِ ﷺ اَلْمُحَلِّلَ وَالمُحَلَّلَ لَهُ. رَوَاهُ أَحْمَدُ وَالنَّسَائِيُّ وَالتِّرْمِذِيُّ، وَصَحَّحَهُ، وَفِي البَابِ عَنْ عَلِيٍّ، أَخْرَجَهُ الأَرْبَعَةُ إِلاَّ النَّسَائِيَّ.

حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے حلالہ کرنے والے اور جس کیلئے حلالہ کیا جائے دونوں پر لعنت فرمائی ہے۔ (اسے احمد' نسائی اور ترمذی نے روایت کیا ہے اور ترمذی نے اسے صحیح کہا ہے اور پھر اس باب میں حضرت علی رضی اللہ عنہ سے بھی روایت ہے جسے نسائی کے علاوہ چاروں نے روایت کیا ہے)

لغوی تشریح: ﴿ المحلل ﴾ تحلیل سے یہ اسم فاعل کا صیغہ ہے۔ محلل وہ شخص ہے جو طلاق دینے کی نیت سے مطلقہ ثلاثہ سے نکاح و مباشرت کرے تا کہ وہ پہلے شوہر کے لئے حلال ہو جائے۔ ﴿ والمحلل له ﴾ یہ اسم مفعول کا صیغہ ہے اس سے وہ پہلا شوہر مراد ہے جس نے تین طلاقیں دیں۔ یہ حدیث دلیل ہے کہ نکاح برائے تحلیل حرام ہے کیونکہ لعنت حرام فعل پر ہی کی جاتی ہے۔ حنفیہ کے ماسوا جمہور اس کی حرمت کے قائل ہیں۔ اس باب میں انہوں نے خبیث عمل اور برے فعل کا ارتکاب کیا کہ نیک و ابرار مسلمان تو درکنار' عام فاجر و کفار تک اسے معیوب سمجھتے ہیں۔

(٨٥٣) وَعَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «لاَ يَنْكِحُ الزَّانِي المَجْلُودُ إِلاَّ مِثْلَهُ». رَوَاهُ أَحْمَدُ وَأَبُو دَاوُدَ، وَرِجَالُهُ ثِقَاتٌ.

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "زانی جس پر حد زنا کے کوڑے برس چکے ہوں اپنے جیسی حد لگی ہوئی عورت کے سوا کسی دوسری سے نکاح نہ کرے۔" (اسے احمد اور ابوداؤد نے روایت کیا ہے اور اس کے راوی ثقہ ہیں)

لغوی تشریح: ﴿ المجلود ﴾ مجلود اس شخص کو کہتے ہیں جسے سزائے زنا میں کوڑے لگ چکے ہوں۔

سبل السلام میں ہے کہ یہ حدیث دلیل ہے کہ عورت کیلئے حرام ہے کہ وہ اس شخص سے نکاح کرے جو زانی ہو اور زانی کیلئے مجلود کی صفت بطور اغلب ہے' اسی طرح مرد کیلئے بھی حرام ہے کہ وہ ایسی عورت سے شادی کرے جو زانیہ ہو اور یہ حدیث ارشاد باری کے موافق ہے وحرم ذلک علی المومنین اور یہ مومنوں پر حرام کر دی گئی (۲۴: ۳) اس کے بعد علامہ الیمانی نے اس باب میں علماء کا اختلاف ذکر کیا ہے اور بآلاخر زانیہ سے نکاح کی حرمت کی تائید کی ہے۔

(٨٥٤) وَعَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهَا قَالَتْ: طَلَّقَ رَجُلٌ امْرَأَتَهُ ثَلاَثاً، فَتَزَوَّجَهَا رَجُلٌ، ثُمَّ طَلَّقَهَا قَبْلَ أَنْ يَدْخُلَ بِهَا. فَأَرَادَ زَوْجُهَا الأَوَّلُ أَنْ يَتَزَوَّجَهَا، فَسَأَلَ رَسُولَ اللهِ ﷺ عَنْ ذٰلِكَ، فَقَالَ: **لاَ حَتَّى يَذُوْقَ الآخَرُ مِنْ عُسَيْلَتِهَا مَا ذَاقَ الأَوَّلُ**. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ. وَاللَّفْظُ لِمُسْلِمٍ.

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ ایک مرد نے اپنی بیوی کو تین طلاقیں دے دیں۔ پھر اس عورت سے ایک دوسرے آدمی نے نکاح کر لیا اور اس سے ہم بستری کئے بغیر ہی اسے طلاق بھی دے دی۔ تو پہلے شوہر نے اس سے نکاح کرنا چاہا۔ اور رسول اللہ ﷺ سے اس کے متعلق استفسار کیا تو آپ ؐ نے فرمایا "نہیں جب تک دوسرا خاوند اس سے اسی طرح لطف اندوز نہ ہو لے جس طرح پہلا خاوند ہوا تھا۔"
(بخاری و مسلم اور یہ الفاظ مسلم کے ہیں)

لغوی تشریح: ﴿عسیلتھا﴾ عسل کی تصغیر ہے اور ﴿ذوق العسیلۃ﴾ جماع سے کنایہ ہے اور جماع کو شہد سے تشبیہہ دینے سے مقصود یہ ہے کہ جس طرح شہد کے استعمال سے لذت و حلاوت حاصل ہوتی ہے جماع سے بھی لذت و حلاوت حاصل ہوتی ہے۔ جمہور کا قول ہے کہ جماع جس سے حد واجب ہوتی ہے اور مہر دینا واجب ٹھہرتا ہے وہ ہے جس میں مرد کا حشفہ عورت کی اندام نہانی میں غائب ہو جائے۔

حاصل کلام: اس حدیث کی رو سے مطلقہ ثلاثہ عورت دوسرے سے نکاح کر لے اور دونوں میں تعلق زن و شو بھی قائم ہو جائے اور یہ دوسرا خاوند اپنی آزاد مرضی سے اسے طلاق دے یا یہ دوسرا خاوند وفات پا جائے تو پہلے خاوند سے دوبارہ نکاح عدت کے بعد ہو سکتا ہے۔ اگر دوسرے مرد سے نکاح تو ہوا مگر مباشرت و ہم بستری نہ ہوئی یا وہ مرد ہی مباشرت و مجامعت نہ کر سکا اور اس نے طلاق دے دی تو اس صورت میں پہلے شوہر سے دوبارہ نکاح درست نہیں ہوگا اور اگر دوسرا نکاح صرف حلالہ کی نیت سے کیا تو دوسرے خاوند سے نکاح ہی منعقد نہیں ہوگا۔ اس صورت میں محلل اور محلل لہ تو لعنتی قرار پاتے ہی ہیں ساتھ ہی پہلے مرد سے دوبارہ نکاح بھی حرام ہے۔

١ - بَابُ الْكَفَاءَةِ وَالْخِيَارِ کفو (مثل، نظیر اور ہمسری) اور

اختیار کا بیان

(٨٥٥) عَنِ ابْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُمَا قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ: «العَرَبُ بَعْضُهُمْ أَكْفَاءُ بَعْضٍ، وَالمَوَالِي بَعْضُهُمْ أَكْفَاءُ بَعْضٍ، إِلاَّ حَائِكاً أَوْ حَجَّاماً». رَوَاهُ الحَاكِمُ، وَفِيْ إِسْنَادِهِ رَاوٍ لَمْ يُسَمَّ، وَاسْتَنْكَرَهُ أَبُو حَاتِمٍ، وَلَهُ شَاهِدٌ عِنْدَ البَزَّارِ عَنْ مُعَاذِ بْنِ جَبَلٍ بِسَنَدٍ مُنْقَطِعٍ.

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "عرب ایک دوسرے کیلئے کفو ہیں اور موالی بھی ایک دوسرے کیلئے کفو ہیں۔ بجز جولاہے اور حجام کے۔" (اس روایت کو حاکم نے روایت کیا ہے۔ اس کی سند میں ایسا راوی ہے جس کا نام نہیں لیا گیا اور ابوحاتم نے اسے منکر قرار دیا ہے اور اس کا ایک شاہد بزار میں حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ سے مروی ہے مگر اس کی سند بھی منقطع ہے)

لغوی تشریح: ﴿باب الکفاءۃ﴾ کفاءۃ کے قاف پر فتحہ اور مدیقی مساوات' مماثلت' ہمسری اور یہ دین اور اخلاق میں معتبر ہے اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ کفو کا اعتبار چار چیزوں میں کیا گیا ہے۔ دین 'نسب' آزادی اور پیشہ وصنعت کاری۔ اور ان میں پہلا قول راجح اور اس کے قابل ترجیح ہونے پر سب کا اتفاق ہے۔ ﴿اکفا﴾ کفو کی جمع ہے کفو کے کاف پر ضمہ اور "فاء" ساکن اور اس کے بعد همزہ ہے' اس کے معنی ہیں مثل اور نظیر ﴿الموالی﴾ مولی کی جمع ہے۔ جو عرب نہ ہو اسے مولی شمار کیا گیا ہے۔ ﴿الحائک﴾ جولاہا جو کپڑا بننے کا پیشہ ور ہو۔ یہ حدیث باطل ہے۔ ابن ابی حاتم نے اپنے والد سے اس حدیث کے متعلق دریافت کیا تو اس نے جواب میں کہا کہ یہ جھوٹ کا پلندا ہے اس کی کوئی اصل نہیں اور دوسرے مقام پر کہا ہے یہ باطل ہے اور علامہ ابن عبدالبر نے کہا ہے یہ حدیث منکر ہے اور موضوع و تصنیف کردہ ہے۔ اس کے بہت سے طرق ہیں سب کے سب واہی ہیں۔ ان سب کا ذکر مصنف نے اپنی کتاب التلخیص الجبیر میں کیا ہے۔

(٨٥٦) وَعَنْ فَاطِمَةَ بِنْتِ قَيْسٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهَا، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ قَالَ لَهَا: «أَنْكِحِي أُسَامَةَ». رَوَاهُ مُسْلِمٌ.

حضرت فاطمہ بنت قیس رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے ان کو مشورہ دیا کہ اسامہ رضی اللہ عنہ سے نکاح کر لو۔ (مسلم)

حاصل کلام: شائد مصنف نے اس حدیث کو یہاں اس لئے بیان کیا ہے کہ مسئلہ کفاءت میں دین کے سوا اور کسی چیز کا اعتبار نہیں کیونکہ فاطمہ بنت قیس رضی اللہ عنہا قریش کی شاخ فہر کی معزز خاتون تھیں اور اسامہ خود بھی غلام تھے اور ان کا باپ بھی غلام تھا۔

راوی حدیث: ﴿فاطمہ بنت قیس رضی اللہ عنہا﴾ فاطمہ بنت قیس بن خالد فہریہ۔ مشہور صحابی حضرت

ضحاک رضی اللہ عنہ کی مشہور صحابیہ بہن ہیں۔ سب سے پہلی ہجرت کرنے والی خواتین میں شمار ہوتی ہیں۔ ان سے ایک پورے گروہ نے روایت کیا ہے۔ بڑی حسین و جمیل، عقلمند و دانا اور کمال ہنر کی مالکہ تھیں۔ پہلے یہ ابوعمرو بن حفص رضی اللہ عنہ کے نکاح میں تھیں، انہوں نے ان کو طلاق دے دی۔ تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کا نکاح اسامہ بن زید رضی اللہ عنہما سے کر دیا (جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مولیٰ زید کے بیٹے تھے) اور اس نکاح میں اللہ تعالیٰ نے بڑی خیر پیدا فرمائی۔ ابن (فاطمہ بنت قیس رضی اللہ عنہا) کا اپنا قول ہے کہ لوگ مجھ پر رشک کرتے تھے۔

(۸۵۷) وَعَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُ، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ قَالَ: «يَا بَنِي بَيَاضَةَ أَنْكِحُوا أَبَا هِنْدٍ وَانْكِحُوا إِلَيْهِ، وَكَانَ حَجَّاماً». رَوَاهُ أَبُو دَاوُدَ وَالحَاكِمُ بِسَنَدٍ حَسَنٍ.

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "اے بنی بیاضہ! ابوہند کا نکاح کر دو اور اس کی لڑکیوں سے نکاح کرو۔" اور یہ یاد رہے کہ ابوہند حجام تھے۔ (اسے ابوداؤد، حاکم دونوں نے حسن سند کے ساتھ روایت کیا ہے)

لغوی تشریح: ﴿ انکحوا اباھند ﴾ باب افعال سے امر کا صیغہ ہے۔ مطلب یہ ہے اپنی لڑکیاں اس کے ہاں بیاہ دو۔ ﴿ وانکحوا الیہ ﴾ باب فتح سے امر کا صیغہ۔ اس کا معنی ہے کہ اس کی لڑکیوں کو تم اپنے لئے پیغام نکاح دو۔ اسے محض اس وجہ سے خارج نہ کرو کہ وہ حجام ہے۔

حاصل کلام: اس حدیث میں ابوھند کا جو ذکر ہے ان کا نام یسار تھا۔ یہ بنو بیاضہ جو قبائل عرب میں ایک قبیلہ تھا ان کا آزاد کردہ غلام تھا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم بنو بیاضہ کو فرما رہے ہیں کہ ابوھند کا نکاح اپنے قبیلہ کی کسی عورت سے کر دو۔ اس طرح حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے نسب کے بت کو پاش پاش کر دیا۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں سے حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ جلیل القدر غنی صحابی جن کا تعلق عرب کے سب سے معزز قبیلے قریش سے تھا نے اپنی ہمشیرہ ہالہ کو بلال حبشی کے عقد نکاح میں دے کر نسب کے فخر کو توڑا اور خلیفہ ثانی حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنی لخت جگر حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے حرم میں داخلہ سے پہلے حضرت سلمان رضی اللہ عنہ پر پیش کیا تھا۔ ان مثالوں سے ثابت ہو رہا ہے کہ حسب و نسب اور حسن و جمال اپنی جگہ بڑے اہمیت کے حامل ہیں مگر دینداری کے مقابلہ میں ان کی حیثیت ثانوی ہے۔

راوی حدیث: ﴿ ابوھند رضی اللہ عنہ ﴾ ان کا نام یسار تھا اور ایک قول کے مطابق ان کا نام سالم بن ابی سالم اور ایک قول کے مطابق عبداللہ بن ھند تھا۔ یہ وہ خوش نصیب صحابی ہیں جنہوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو سینگی لگائی تھی اور بنو بیاضہ کے آزاد کردہ غلام تھے۔ حضرات ابن عباس رضی اللہ عنہما، ابوہریرہ رضی اللہ عنہ، جابر رضی اللہ عنہ اور خالد رضی اللہ عنہ نے ان سے روایت کیا ہے۔

(۸۵۸) وَعَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهَا قَالَتْ: خُيِّرَتْ بَرِيرَةُ عَلَى زَوْجِهَا حِيْنَ عَتَقَتْ. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ فِيْ

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ حضرت بریرہ رضی اللہ عنہا کو جب آزادی ملی تو اس وقت ان کو خاوند کے بارے میں اختیار دیا گیا۔ (بخاری و مسلم۔ لمبی حدیث کا

حَدِيثٍ طَوِيلٍ. ٹکڑا ہے)

وَلِمُسْلِمٍ عَنْهَا: «أَنَّ زَوْجَهَا كَانَ عبداً»، وَفِي رِوَايَةٍ عَنْهَا: «كَانَ حُرًّا»، وَالأَوَّلُ أَثْبَتُ، وَصَحَّ عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُما عِنْدَ البُخَارِيِّ: «أَنَّهُ كَانَ عَبْداً».

اور **مسلم** میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا ہی سے مروی ہے کہ بریرہؓ کا خاوند غلام تھا اور ان ہی سے ایک روایت میں ہے کہ وہ آزاد تھا۔ پہلی روایت زیادہ پختہ ہے۔ بخاری میں ابن عباس رضی اللہ عنہما سے صحیح قول یہ ہے کہ وہ غلام تھا۔

حاصل کلام: یہ حدیث دلیل ہے کہ آزاد ہونے کے بعد عورت جبکہ اس کا خاوند ہنوز غلام ہو۔ شوہر کے بارے میں خودمختار ہے۔ چاہے اس کی زوجیت میں رہے چاہے نہ رہے۔ اس پر سب کا اجماع ہے۔ اختلاف اس صورت میں ہے جبکہ وہ آزاد ہو۔ ایک قول کے مطابق عورت کیلئے کوئی اختیار نہیں' اسے اسی خاوند کی زوجیت میں رہنا ہوگا۔ یہ رائے جمہور کی ہے اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اگر وہ آزاد ہے تو اختیار کا ثبوت اس کیلئے ہے۔ اسے ابن قیم رحمہ اللہ نے اختیار کیا ہے۔ معلوم رہے کہ یہ حدیث بڑی عظیم الشان ہے۔ اپنی کتابوں میں علماء نے کئی مقامات پر اس کا ذکر کیا ہے اور خود مصنف رحمہ اللہ نے اس سے بہت سے مسائل کا استنباط کیا ہے۔ جن کی تعداد ایک سو بائیس تک پہنچتی ہے۔ (سبل السلام)

(٨٥٩) وَعَنِ الضَّحَّاكِ بْنِ فَيْرُوزَ الدَّيْلَمِيِّ، عَنْ أَبِيهِ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، قَالَ: قُلْتُ: يَا رَسُولَ اللهِ! إِنِّي أَسْلَمْتُ، وَتَحْتِي أُخْتَانِ، فَقَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «طَلِّقْ أَيَّتَهُمَا شِئْتَ». رَوَاهُ أَحْمَدُ وَالأَرْبَعَةُ إِلاَّ النَّسَائِيَّ، وَصَحَّحَهُ ابْنُ حِبَّانَ وَالدَّارَقُطْنِيُّ وَالبَيْهَقِيُّ، وَأَعَلَّهُ البُخَارِيُّ.

حضرت ضحاک بن فیروز دیلمی نے اپنے باپ سے روایت کی ہے کہ میں نے عرض کیا یارسول اللہ (ﷺ)! میں دائرۂ اسلام میں داخل ہو چکا ہوں اور میرے نکاح میں دو بہنیں ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "ان دونوں میں سے جس ایک کو چاہو' اسے طلاق دے دو۔" (اسے احمد اور چاروں نے نسائی کے علاوہ روایت کیا ہے۔ ابن حبان' دار قطنی اور بیہقی نے صحیح قرار دیا ہے۔ مگر بخاری نے اسے معلول کہا ہے)

حاصل کلام: یہ حدیث کفار کے زمانہ کفر کے نکاح کے قابل اعتبار کی دلیل ہے۔ اگرچہ وہ نکاح' اسلامی نکاح کے مخالف ہو۔ اسلام میں نکاح کی حیثیت تو یہ ہے کہ عورت کو خاوند جب تک طلاق نہ دے وہ اس کی زوجیت کے دائرہ سے باہر نہیں نکل سکتی اور یہ کہ اسلام قبول کرنے کے بعد تجدید نکاح کے بغیر ہی نکاح باقی رہتا ہے۔ یہ مذہب امام مالک رحمہ اللہ' امام شافعی رحمہ اللہ اور امام احمد رحمہ اللہ اور داؤد رحمہ اللہ کا ہے۔ (سبل السلام) فیروز دیلمی سے ترمذی میں منقول الفاظ ہیں کہ "ان دونوں میں سے جس کا چاہو' انتخاب کر لو" آنے والی حدیث کے موافق ہیں اس اعتبار سے کہ جب اس نے اپنی بیویوں میں سے بعض کا انتخاب کر لیا

کہ میں نے نکاح کیلئے فلاں فلاں عورت کو منتخب کر لیا ہے تو ان کا نکاح ثابت ہو گیا اور باقی ماندہ بیویوں کو بغیر طلاق دیئے جدائی حاصل ہو جائے گی۔ نیز یہ دونوں احادیث اس پر دلالت کرتی ہیں کہ جدائی کے وقت ترتیب نکاح غیر مؤثر ہے۔ پس مرد کیلئے ضروری نہیں ہے کہ وہ پہلی بیوی کو روک رکھے اور نہ یہ ضروری ہے کہ بیویوں میں سے پہلی چار کو روک رکھے بلکہ اسے اختیار ہے جسے چاہے روک لے اور جسے چاہے جدا کر دے۔ یہ دونوں احادیث حنفیہ کے خلاف حجت ہیں۔

راوی حدیث: ﴿ الضحاك ﴾ "حاء" پر تشدید۔ بن فیروز۔ "فاء" پر فتحہ "یاء" ساکن اور "راء" پر ضمہ۔ عجمہ اور علمیت دونوں سببوں کی وجہ سے غیر منصرف ہے۔ الدیلمی۔ "دال" پر فتحہ دیلم فارس کے مشہور پہاڑ کی طرف منسوب اور ضحاک مشہور تابعی ہیں۔ ابن حبان نے اسے ثقہ قرار دیا ہے۔ اپنے باپ سے روایت کرتے ہیں اور ان کی حدیث بصریوں کے ہاں پائی جاتی ہے۔

﴿ عن ابیہ ﴾ فیروز دیلمی رضی اللہ عنہ ابوعبداللہ فیروز دیلمی رضی اللہ عنہ۔ انہیں حمیری بھی کہا جاتا تھا حمیر میں فروکش ہونے کی وجہ سے۔ حمیر اہل فارس سے تھے اور صنعاء کے رہنے والے تھے اور یہ ان لوگوں کے وفد میں شامل تھے جو نبی ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا تھا اور یہ یمن کے مدعی نبوت کذاب عنسی کے قاتل ہیں۔ انہوں نے عنسی کو نبی ﷺ کے آخری ایام مرض الموت میں قتل کیا تھا اور حضور ﷺ کو یہ خبر اس مرض کے دوران موصول ہوئی تھی جس میں آپؐ نے وفات پائی۔ ان کی وفات حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے دور خلافت میں ہوئی۔

(٨٦٠) وَعَنْ سَالِمٍ، عَنْ أَبِيْهِ، أَنَّ غَيْلاَنَ بْنِ سَلَمَةَ أَسْلَمَ، وَلَهُ عَشْرُ نِسْوَةٍ، فَأَسْلَمْنَ مَعَهُ، فَأَمَرَهُ النَّبِيُّ ﷺ أَنْ يَتَخَيَّرَ مِنْهُنَّ أَرْبَعاً. رَوَاهُ أَحْمَدُ وَالتِّرْمِذِيُّ، وَصَحَّحَهُ ابْنُ حِبَّانَ وَالحَاكِمُ، وَأَعَلَّهُ البُخَارِيُّ وَأَبُو زُرْعَةَ وَأَبُو حَاتِمٍ.

حضرت سالم نے اپنے باپ سے بیان کیا کہ غیلان بن سلمہ رضی اللہ عنہ نے اسلام قبول کیا تو اس وقت اس کی دس بیویاں تھیں۔ ان سب نے غیلان کے ساتھ اسلام قبول کر لیا۔ پس نبی ﷺ نے غیلان رضی اللہ عنہ سے فرمایا کہ "ان میں سے چار کا انتخاب کر لو۔" (اسے احمد اور ترمذی نے روایت کیا ہے۔ ابن حبان اور حاکم نے اسے صحیح قرار دیا ہے۔ بخاری' ابوزرعہ اور ابوحاتم نے اسے معلول کہا ہے)

حاصل کلام: اس حدیث کی بنا پر ایک مسلمان کیلئے چار سے زائد بیویاں ایک ہی وقت میں رکھنا حرام ہے اور یہ حکم متعدد روایات میں منقول ہے۔ نبی کریم ﷺ کے حرم میں نو بیویاں تھیں تو یہ حضور ﷺ کیلئے خاص رعایت تھی۔ جس میں دینی اور سیاسی مصلحتیں تھیں اور یہ رعایت خود اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کو دی تھی۔ اس لئے اس پر اعتراض کرنا سراسر حماقت ہے۔

راوی حدیث: ﴿ غیلان بن سلمہ ثقفی رضی اللہ عنہ ﴾ غین پر فتحہ "یا" ساکن۔ ثقیف کے سرداروں میں

سے تھے۔ فتح طائف کے بعد اسلام قبول کیا' ہجرت نہیں کی۔ خوش الحان شاعر تھے۔ خلافت عمر رضی اللہ عنہ میں وفات پائی۔

(٨٦١) وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا قَالَ: رَدَّ النَّبِيُّ ﷺ ابْنَتَهُ زَيْنَبَ عَلَى أَبِي العَاصِ بْنِ الرَّبِيْعِ بَعْدَ سِتِّ سِنِيْنَ بِالنِّكَاحِ الأَوَّلِ، وَلَمْ يُحْدِثْ نِكَاحاً. رَوَاهُ أَحْمَدُ وَالأَرْبَعَةُ إِلاَّ النَّسَائِيَّ، وَصَحَّحَهُ أَحْمَدُ وَالحَاكِمُ.

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے اپنی بیٹی زینب رضی اللہ عنہا کو ابوالعاص کی طرف چھ سال بعد پہلے نکاح کے ساتھ واپس فرما دیا تھا۔ نیا نکاح نہیں کیا تھا۔ (اسے احمد اور چاروں نے سوائے نسائی کے روایت کیا ہے اور احمد اور حاکم نے اسے صحیح قرار دیا ہے)

لغوی تشریح: ﴿ ولم یحدث نکاحا ﴾ یحدث' احداث سے ماخوذ ہے۔ یعنی نیا اور جدید نکاح نہیں کیا۔ ایک روایت میں ہے کہ حضور ﷺ نے اپنی بیٹی کو دو سال بعد واپس فرمایا اور ایک روایت میں تین سال اور چھ سال کی مدت سے مراد حضرت زینب رضی اللہ عنہا کی ہجرت سے لے کر ابوالعاص کے دائرۂ اسلام میں داخل ہونے تک کا عرصہ ہے اور دو سال یا تین سال سے مراد وہ عرصہ ہے جب ﴿ لاھن حل لھم ﴾ کی آیت نازل ہوئی۔ اس وقت سے لے کر ابوالعاص کا مسلمان ہو کر واپس آنے تک کا وقفہ اور یہ عرصہ دو سال اور کچھ مہینے ہیں۔ لیکن اس کی تردید اس سے ہوتی ہے کہ حضرت زینب رضی اللہ عنہا نے دوسرے سن ہجری میں ہجرت کی یا تین ہجری کے آغاز میں اور ان کی وفات ٨ھ کے شروع میں ہوئی۔ ملاحظہ ہو (سبل السلام' ج: ٢' ص: ١٥٤) حضرت زینب رضی اللہ عنہا کی ہجرت اور ان کی وفات کے درمیان پانچ برس اور چند ماہ کا وقفہ ہے۔ لہٰذا ابوالعاص کا قبول اسلام اور حضرت زینب رضی اللہ عنہا کی ان کو واپسی اسی مدت کے دوران عمل میں آئی۔ ابن ھشام نے بیان کیا ہے کہ ابوالعاص نے فتح مکہ سے تھوڑا پہلے اسلام قبول کیا نیز یہ بھی بیان کیا ہے کہ ابوالعاص تاجروں کے اموال تجارت لے کر شام سے واپس آرہے تھے۔ ان اموال میں مشرکین مکہ کی امانتیں بھی تھیں جن کو مسلمانوں کے سریہ نے چھین لیا تھا۔ ابوالعاص مدینہ میں رات کے وقت داخل ہوئے اور حضرت زینب رضی اللہ عنہا نے ان کو پناہ دی۔ مسلمانوں نے چھینے ہوئے مال ابوالعاص کو واپس کر دیئے اور وہ مکہ واپس چلے گئے اور جن جن کی امانتیں تھیں ان کو واپس کر کے اسلام قبول کر لیا اور مدینہ کی طرف ہجرت کی۔ یہ قصہ تو اس کا مقتضی ہے کہ یہ صلح حدیبیہ سے پہلے کا ہو نہ کہ فتح مکہ سے پہلے کا۔ اگر یہ واقعہ فتح مکہ سے پہلے کا تسلیم کیا جائے پھر تو یہ میثاق حدیبیہ کو توڑتا ہے۔ حالانکہ اس پر سب کا اتفاق ہے کہ مسلمانوں نے معاہدۂ حدیبیہ کو نہیں توڑا۔ اس کی تائید اس سے بھی ہوتی ہے جو ہم نے اس سے پہلے بیان کیا ہے کہ حضرت زینب رضی اللہ عنہا کی وفات ٨ھ

کے اوائل میں ہوئی اور یہ معلوم شدہ حقیقت ہے کہ فتح مکہ ۸ھ کے آخر میں ہوئی ہے اگر ابوالعاص کے قبول اسلام کا وقت فتح مکہ کے قریب تسلیم کیا جائے تو پھر حضرت زینب رضی اللہ عنہا کی ابوالعاص کے ہاں واپسی کیسے ممکن ہوگی جبکہ وہ اسی سال کے اوائل میں وفات پا چکی تھیں۔ پس صحیح وہی ہے جسے علامہ ابن قیم رحمہ اللہ نے بیان کیا ہے کہ ابوالعاص نے حدیبیہ کے زمانہ میں اسلام قبول کیا تھا۔ (ملاحظہ ہو الھدیٰ' ج: ۴' ص: ۱۴) جب یہ ثابت ہوا کہ ابوالعاص نے حدیبیہ سے پہلے اسلام قبول کیا ہے تو حضرت زینب رضی اللہ عنہا کی واپسی نکاح جدید سے نہیں ہوئی۔ اس لئے کہ مشرکین پر مسلمان خواتین کو حرام قرار دینے کا معاہدہ حدیبیہ کے مکمل ہونے کے بعد نازل ہونے والی آیت میں کیا گیا ہے۔ لہٰذا اس مدت کے دوران نکاح فسخ نہیں ہوا کیونکہ اس بارے میں کوئی شرعی حکم ہی نہیں تھا۔ اس تفصیل سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ صحیح ترین روایت یہ ہے کہ حضرت زینب رضی اللہ عنہا کی واپسی تین سال بعد ہوئی تھی یعنی تین سال مکمل اور چند ماہ اس کے علاوہ۔ اس تحقیق کے بعد بہت سے اشکالات ازخود رفع ہو جاتے ہیں اور یہ واضح ہو جاتا ہے کہ ابن عباس رضی اللہ عنہما کی حدیث معنی اور متن کے اعتبار سے اسی طرح صحیح ہے جس طرح یہ سند کے اعتبار سے صحیح ہے اور عمرو بن شعیب کی آنے والی روایت معنی اور متن کے اعتبار سے اسی طرح ضعیف ہے جس طرح یہ سند کے اعتبار سے ضعیف ہے اور یہ حدیث اہل علم کے اس خیال و رائے کی تردید نہیں کرتی اور نہ اس کے معارض ہے کہ جب عورت اسلام قبول کر لے پھر اسی عدت کے دوران اس کا شوہر بھی اسلام میں داخل ہو جائے تو وہی اپنی بیوی کا زیادہ مستحق ہے۔ لیکن جب عورت اسلام قبول کر لے اور اس کا شوہر عدت کے دوران اسلام قبول نہ کرے اور عدت کی مدت بھی ختم ہو جائے تو دونوں میں جدائی واقع ہو جائے گی۔ اب اسے جدید نکاح کے ماسوا کسی صورت میں واپس نہیں کیا جائے گا۔ ہاں تو ہم یہاں ایک نہایت لطیف بحث ذکر کرتے ہیں جسے ابن قیم نے اپنی الھدیٰ' ج: ۴' ص: ۱۴' ۱۵ میں بیان کیا ہے۔ انہوں نے کہا ہے کہ احادیث میں تو کہیں عدت کا اعتبار مذکور نہیں اور نہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم ہی نے کسی خاتون سے دریافت فرمایا کہ کیا اس کی عدت ختم ہوئی ہے یا نہیں اور اس میں کوئی شک و ریب نہیں کہ مجرد اسلام ہی فرقت و جدائی کا باعث ہو تو پھر یہ علیحدگی رجعی نہیں بلکہ بائنہ ہو۔ تو پھر نکاح کے باقی رکھنے میں عدت کا کوئی اثر نہ ہو۔ اس کا اثر تو پھر دوسرے سے نکاح کرنے کی صورت میں واقع ہوتا ہے۔ اگر اسلام ان دونوں کے درمیان جدائی کو پورا کرنے والا ہو تو پھر شوہر عدت کے درمیان زیادہ استحقاق نہیں رکھتا۔ لیکن جس پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا حکم دلالت کرتا ہے وہ یہ ہے کہ نکاح موقوف ہے۔ اگر شوہر نے اس کی عدت کے اختتام سے پہلے اسلام قبول کر لیا پھر یہ اس کی بیوی رہے گی اور اگر عدت ختم ہو گئی تو پھر عورت خود مختار ہے چاہے تو نکاح کر لے اور اگر اسے انتظار کرنا پسند ہو تو انتظار کر لے۔ پھر اگر اس مرد نے اسلام قبول کر لیا تو بغیر تجدید نکاح وہ اس کی بیوی رہے گی۔ ہمارے علم میں ایک بھی آدمی ایسا نہیں جس نے اسلام لانے کی وجہ سے لازماً تجدید نکاح کیا ہو بلکہ دونوں معاملوں میں سے ایک کا واقع ہونا ضروری ہے یا تو دونوں میں جدائی و علیحدگی ہوگی اور اس خاتون کا دوسرے سے نکاح ہوگا۔ یا پھر دونوں کا

نکاح برقرار رہے گا خواہ عورت پہلے اسلام لائی ہو یا مرد اور رہا جدائی و علیحدگی کی تکمیل اور عدت کا لحاظ تو ہمیں معلوم نہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ان دونوں میں سے کسی ایک کی وجہ سے فیصلہ فرمایا ہو جبکہ آپؐ کے عہد مبارک میں باکثرت مرد اور ان کی بیویوں نے اسلام قبول کیا۔ میاں بیوی میں سے کسی کا قبول اسلام ایک سے قریب بھی تھا اور بعید بھی۔ انتھی۔ علامہ شوکانی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ کلام و گفتگو متانت و حسن کی انتہا تک پہنچی ہوئی ہے۔

راوی حدیث: ﴿ زینب رضی اللہ عنہا ﴾ زینب بنت رسول ﷺ۔ یہ حضور ﷺ کی بیٹیوں میں سب سے بڑی تھیں۔ ان کی والدہ ام المومنین حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا تھیں۔ ان سے ان کے ماموں زاد ابوالعاص بن ربیع نے نکاح کیا اور ایک بیٹا علی پیدا ہوا۔۔ وہ جب بلوغت کے قریب پہنچا تو فوت ہوگیا۔ فتح مکہ میں وہ رسول اللہ ﷺ کی اونٹنی پر سوار تھا۔ پھر ان سے امامہ رضی اللہ عنہا پیدا ہوئیں۔ حضرت زینبؓ نے بدر کے بعد ہجرت کی۔ ۸ھ کو فوت ہوئیں۔ آپؐ نے خود ان کو قبر میں اتارا۔

﴿ ابوالعاص بن ربیع رضی اللہ عنہ ﴾ ان کا نام مقسم (میم کے نیچے کسرہ "قاف" ساکن) تھا۔ پورا نسب یوں بنتا ہے مقسم بن ربیع بن عبدالعزیٰ۔ ایک قول ہے کہ ان کا نام لقیط تھا۔ وہ نبی ﷺ کے داماد تھے۔ حضرت زینب رضی اللہ عنہا ان کے نکاح میں تھیں۔ یوم بدر میں حالت کفر میں یہ قیدی بنا۔ اسے فدیہ لئے بغیر رہا کر دیا گیا اور اسے کہا گیا کہ زینب رضی اللہ عنہا کو بھی ساتھ لے جائے۔ اس نے ایسا ہی کیا اور اس کے بعد مدینہ ہجرت کی۔ آپؓ نبی ﷺ کے عزیز اور محبوب تھے۔ جنگ یمامہ میں شہید ہوئے۔

(٨٦٢) وَعَنْ عَمْرِو بْنِ شُعَيْبٍ، عَن أَبِيْهِ، عَنْ جَدِّهِ أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ رَدَّ ابْنَتَهُ زَيْنَبَ عَلَى أَبِي العَاصِ بِنِكَاحٍ جَدِيْدٍ. قَالَ التِّرْمِذِيُّ: حَدِيْثُ ابْنِ عَبَّاسٍ أَجْوَدُ إِسْنَاداً، وَالعَمَلُ عَلَى حَدِيْثِ عَمْرِو بْنِ شُعَيْبٍ.

حضرت عمرو بن شعیب رحمہ اللہ نے اپنے والد سے' انہوں نے اپنے دادا سے روایت کیا ہے کہ نبی ﷺ نے اپنی بیٹی حضرت زینب رضی اللہ عنہا کو ابوالعاص کے پاس جدید نکاح کر کے واپس بھیجا۔ (ترمذی نے کہا ہے ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی حدیث سند کے اعتبار سے عمدہ ترین ہے مگر عمل عمرو بن شعیب سے مروی حدیث پر ہے)

(٨٦٣) وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا قَالَ: أَسْلَمَتِ امْرَأَةٌ، فَتَزَوَّجَتْ، فَجَاءَ زَوْجُهَا: فَقَالَ: يَا رَسُولَ اللهِ! إِنِّي كُنْتُ أَسْلَمْتُ، وَعَلِمَتْ بِإِسْلاَمِيْ، فَانْتَزَعَهَا رَسُولُ اللهِ ﷺ مِنْ زَوْجِهَا

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ ایک عورت نے اسلام قبول کیا۔ پھر نکاح بھی کر لیا اتنے میں اس کا پہلا خاوند آگیا اور عرض کیا یارسول اللہ (ﷺ)! میں نے اسلام قبول کر لیا تھا میرے قبول اسلام کا اسے علم بھی تھا۔ نبی ﷺ نے اس (دوسرے شوہر) **سے چھین کر پہلے خاوند کی طرف**

الآخَرِ، وَرَدَّهَا إِلَى زَوْجِهَا الأَوَّلِ. رَوَاهُ أَحْمَدُ وَأَبُو دَاوُدَ وَابْنُ مَاجَهْ، وَصَحَّحَهُ ابْنُ حِبَّانَ وَالحَاكِمُ.

اسے لوٹا دیا۔ (اسے احمد' ابوداؤد اور ابن ماجہ نے روایت کیا ہے' ابن حبان اور حاکم نے صحیح کہا ہے)

حاصل کلام: اس حدیث سے ثابت ہوا کہ اختلاف دین کی وجہ سے جب میاں بیوی کے درمیان جدائی و علیحدگی واقع ہو جائے اور عورت کے ایام عدت میں مرد بھی مسلمان ہو جائے اور عورت پہلے ہی مسلمان ہو چکی ہو اور اس عورت کو مرد کے قبول اسلام کا علم بھی ہوگیا ہو تو ایسی صورت میں وہ دوسری جگہ نکاح کرنے کی قطعاً مجاز نہیں ہے۔ اگر کرے گی تو نکاح باطل قرار دیا جائے گا۔

(٨٦٤) وَعَنْ زَيْدِ بْنِ كَعْبِ بْنِ عُجْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، عَنْ أَبِيهِ، قَالَ: تَزَوَّجَ رَسُولُ اللهِ ﷺ العَالِيَةَ مِنْ بَنِي غِفَارٍ، فَلَمَّا دَخَلَتْ عَلَيْهِ، وَوَضَعَتْ ثِيَابَهَا، رَأَى بِكَشْحِهَا بَيَاضاً، فَقَالَ النَّبِيُّ ﷺ: **اَلْبَسِيْ ثِيَابَكِ، وَالْحَقِيْ بِأَهْلِكِ،** وَأَمَرَ لَهَا بِالصَّدَاقِ. رَوَاهُ الحَاكِمُ، وَفِي إِسْنَادِهِ جَمِيْلُ بْنُ يَزِيْدَ، وَهُوَ مَجْهُولٌ، وَاخْتُلِفَ عَلَيْهِ فِيْ شَيْخِهِ اخْتِلافاً كَثِيْراً.

حضرت زید بن کعب بن عجرہ اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے بنو غفار کی عالیہ نامی خاتون سے نکاح کیا۔ جب وہ حضور ﷺ کے پاس خلوت میں داخل ہوئی اور اس نے اپنا لباس اتارا تو آپؐ نے اس کے پہلو میں پھلبہری (برص) کے داغ دیکھے۔ تو نبی ﷺ نے اسے فرمایا ''اپنے کپڑے پہن لے اور اپنے میکے چلی جا'' اور آپؐ نے اس کیلئے حکم ارشاد فرمایا کہ مہر دے دیا جائے۔ (اسے حاکم نے روایت کیا ہے اور اس کی سند میں جمیل بن زید ایسا راوی ہے جو مجہول ہے اس کے استاد میں بہت اختلاف کیا گیا ہے)

لغوی تشریح: ﴿ غفار ﴾ غین کے نیچے کسرہ۔ مشہور و معروف قبیلہ۔ ﴿ بکشحھا ﴾ کاف پر فتحہ اور شین ساکن۔ وہ حصہ جسم جو پہلو اور پسلی کے درمیان واقع ہے ﴿ بیاضا ﴾ سفیدی۔ برص کی سفیدی۔ ﴿ الحقی ﴾ اللحوق سے امر کا صیغہ ہے۔ یہ حدیث دلیل ہے کہ برص کے عیب کی وجہ سے نکاح فسخ ہو سکتا ہے۔

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ طلاق بالکنایہ بھی معتبر ہے۔ آپؐ نے عالیہ کو الحقی باھلک کے الفاظ سے طلاق بالکنایہ دی۔ گویا طلاق بالکنایہ شریعت میں قابل اعتبار ہے۔ نیز یہ حدیث اس پر دلیل ہے کہ برص وہ عیب ہے جس سے نکاح فسخ ہو سکتا ہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ و عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ چار عیوب ایسے ہیں جن کی وجہ سے عورتوں کو رد کیا جا سکتا ہے۔ جنون' جذام' برص' اندام نہانی کی بیماری یا آتشک و سوزاک وغیرہ۔ لیکن یہ حدیث منقطع ہے۔ جمہور علماء باعث نفرت بیماری کی بنا پر فسخ نکاح کے قائل ہیں مگر داؤد ظاہری اور ابن حزم وغیرہ تو کسی عیب کی وجہ سے فسخ کے سرے سے قائل ہی

نہیں۔

راوی حدیث: ﴿زید بن کعب بن عجرہ﴾ ایک قول کے مطابق ان کا تعلق بنو سالم بن عوف سے ہے اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ بنو سالم بن بلی' خزرج کے حلیف سے ہے اور یہ بھی کہا گیا ہے اس کے علاوہ اور کوئی طرف نسبت ہے۔ علامہ ذہبی رحمہ اللہ نے مستدرک کی تلخیص میں ابن معین کا قول نقل کیا ہے کہ یہ ثقہ نہیں ہے حالانکہ امام ابن معین رحمہ اللہ کا قول جمیل بن زید کے بارے میں ہے۔

﴿عالیہ رضی اللہ عنہا﴾ من بنی غفار کے متعلق یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ بنی بکر بن کلاب سے تھیں اور وہ عالیہ بنت ظبیان ہے اور یہ بھی کہا گیا ہے۔ کلابیہ اور ہے اور عالیہ اور ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم عالیہ کے پاس کافی عرصہ ٹھہرے پھر اسے طلاق دے دی۔

﴿جمیل بن زید﴾ قبیلہ طے سے تعلق رکھنے کی وجہ سے طائی کہلائے۔ ابن معین اور نسائی دونوں نے کہا ہے کہ یہ ثقہ نہیں اور امام بخاری رحمہ اللہ کا قول ہے کہ اس کی حدیث صحیح نہیں۔ نیز ائمہ نے اسے ضعیف قرار دیا ہے۔

(٨٦٥) وَعَنْ سَعْيدِ بْنِ الْمُسَيَّبِ، أَنَّ عُمَرَ ابْنَ الْخَطَّابِ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: أَيُّمَا رَجُلٍ تَزَوَّجَ ٱمْرَأَةً، فَدَخَلَ بِهَا، فَوَجَدَهَا بَرْصَآءَ، أَوْ مَجْنُونَةً، أَوْ مَجْذُوْمَةً، فَلَهَا الصَّدَاقُ بِمَسِيْسِهِ إِيَّاهَا، وَهُوَ لَهُ عَلَى مَنْ غَرَّهُ مِنْهَا. أَخرَجَهُ سَعِيدُ ابْنُ مَنْصُورٍ وَمَالِكٌ وَابْنُ أَبِي شَيْبَةَ، وَرِجَالُهُ ثِقَاتٌ.

وَرَوَى سَعِيْدٌ أَيْضاً عَنْ عَلِيٍّ نَحْوَهُ، وَزَادَ: «وَبِهَا قَرَنٌ، فَزَوْجُهَا بِالخِيَارِ، فَإِنْ مَسَّهَا فَلَهَا المَهْرُ بِمَا اسْتَحَلَّ مِنْ فَرْجِهَا».

حضرت سعید بن مسیب سے روایت ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا جو شخص کسی عورت سے نکاح کرے پھر اس سے ہم بستری کرے اور اسے معلوم ہو کہ وہ مرض برص میں مبتلا ہے یا دیوانی ہے یا کوڑھ کے مرض میں مبتلا ہے تو خاوند کے اسے چھونے کی بنا پر حق مہر کی وہ مستحق ہے اور اس مہر کی رقم اس سے وصول کی جائے گی جس نے اسے دھوکہ دیا۔ (اسے سعید بن منصور' مالک اور ابن ابی شیبہ نے نکالا ہے۔ اس کے راوی ثقہ ہیں)

اور سعید نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے بھی اسی طرح روایت کیا ہے اور اس میں اتنا اضافہ کیا ہے کہ اس عورت کو مرض قرن ہو تو اس کا شوہر خود مختار ہو گا۔ اگر مرد نے اس عورت سے مباشرت کی ہو تو عورت کی شرم گاہ کو حلال کرنے کے بدلہ میں مہر دینا ہو گا۔

لغوی تشریح: ﴿برصا﴾ مرض برص میں مبتلا عورت۔ ﴿مجذومه﴾ مرض جذام میں مبتلا عورت۔ یہ خبیث مرض فساد خون کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے اس کی وجہ سے اعضاء بدن بالخصوص ہاتھوں اور پاؤں کے

اطراف سے گوشت جھڑ جاتا ہے۔ ﴿ فلها الصداق ﴾ صداق کے صاد پر فتحہ اور کسرہ دونوں طرح جائز ہے۔ یعنی اس کے لئے ہے۔ ﴿ بمسیسه ایاها ﴾ عورت کے ساتھ مرد کی مباشرت و مجامعت ﴿ وهوله ﴾ یعنی مہر خاوند کیلئے۔ ﴿ علی من غره ﴾ غرہ، جس نے اسے دھوکہ دیا۔ ﴿ منها ﴾ عورت کے اس معاملہ میں۔ اس سے مراد یہ ہے کہ خاوند اس آدمی سے مہر کی رقم وصول کرے گا جس نے اس عورت کے معاملہ میں نکاح کی ترغیب دلا کر دھوکہ دیا اور اس کا عیب مخفی رکھا اور اسے بیان نہیں کیا ﴿ قرن ﴾ قاف پر فتحہ اور "را" ساکن۔ "عفلة" کو کہتے ہیں۔ لیث نے کہا ہے کہ عفلہ اس چیز کو کہتے ہیں جو عورتوں کی اندام نہانی اور اونٹنی کی شرم گاہ میں نکل آتی ہے۔ یہ چیز مردوں کے خصیوں میں پیدا ہونے والی آما میں خصیہ کے مشابہ ہوتی ہے۔ ابن الاعرابی کا قول ہے کہ العفل کے معنی گوشت کی پیدائش یعنی ایسا گوشت جو عورت کی اندام نہانی میں ابھر آتا ہے اس کو قرن کہتے ہیں اور ابن درید نے کہا ہے العفل مردوں کی دبر میں سخت گوشت کا ابھار اور عورتوں کے رحم میں رسولی قسم کی چیز اور ابو عمرو شیبانی نے کہا ہے کہ العفل ایک گول چیز ہے جو عورت کی شرم گاہ پر نکل آتی ہے اور کہا گیا ہے یہ گول چیز باکرہ عورتوں میں نہیں ہوتی یہ عورتوں میں پیدائش کے بعد پیدا ہوتی ہے۔ ملاحظہ ہو (لسان العرب)

حاصل کلام: اس اثر سے معلوم ہوا کہ اگر عورت کا ولی و سرپرست دھوکہ سے کسی ایسے مرد کے ساتھ اس کا نکاح کر دے جو عورت دائمی مریضہ ہو، دیوانی ہو یا جذام و کوڑھ کے موذی مرض میں مبتلا ہو یا اسے پھلبہری ہو تو دھوکہ سے کرایا ہوا ایسا نکاح فسخ ہو جائے گا۔ اسی طرح اگر کسی عورت کا نکاح کسی ایسے مرد سے کر دیا جائے جو کسی موذی مرض کا شکار ہو یا کوئی دوسرا خطرناک عیب ہو تو عورت اس کا استحقاق رکھتی ہے کہ نکاح فسخ کر دے۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ وجوب مہر کیلئے صرف خلوت صحیحہ کافی ہے۔ تعلق زن و شو لازمی نہیں۔ احناف کا یہی مسلک ہے۔ نیز اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ مرد اگر ایسی عیب دار دھوکہ دہی کے ذریعہ سے نکاح میں دی گئی عورت نہ رکھنا چاہے تو اس پر ادائیگی مہر، ناحق بوجھ ہے اور اگر عورت کو نہ ملے تو اس کی حق تلفی ہے۔ اسی بنا پر حق مہر کی ادائیگی کا بوجھ عورت کے اولیاء پر ڈالا گیا ہے کیونکہ ان لوگوں نے دیدہ دانستہ دھوکہ دیا ہے۔

(٨٦٦) وَمِنْ طَرِيْقِ سَعِيْدِ بْنِ الْمُسَيَّبِ أَيْضاً قَالَ: قَضَى بِهِ عُمَرُ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُ فِيْ الْعِنِّيْنِ أَنْ يُؤَجَّلَ سَنَةً. وَرِجَالُهُ ثِقَاتٌ.

اور سعید بن مسیب کے ہی واسطہ سے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے نامرد آدمی کیلئے ایک سال کی مدت کا فیصلہ کیا۔ (اس روایت کے راوی ثقہ ہیں)

لغوی تشریح: ﴿ قضی به عمر ﴾ یعنی حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے عورت کیلئے اختیار کا فیصلہ کیا۔ ﴿ فی العنین ﴾ عنین کے عین کے نیچے کسرہ اور نون پر تشدید سکین کے وزن پر۔ اس آدمی کو کہتے ہیں جو قوت مردمی نہ ہونے کی وجہ سے عورت کے پاس جانے کی طاقت نہ رکھتا ہو اور مباشرت و مجامعت بھی نہ

کر سکتا ہو۔ ﴿ یوجل ﴾ تاجیل سے ماخوذ ہے' صیغہ مجہول ہے۔ ڈھیل دینا' تاخیر کرنا' مؤخر کرنا۔ یہ آثار اور زید بن کعب بن عجرہ کی حدیث تمام اس پر دلالت کرتے ہیں کہ ہر وہ عیب و نقص جو میاں بیوی کے درمیان نفرت کا موجب ہو اور نکاح کا مقصد بھی حاصل نہ ہو یعنی آپس میں مؤدت و رحمت پیدا نہ ہو یا وہ عیب و نقص وظیفہ زوجیت میں دخل انداز ہو' اختیار کو واجب قرار دے دیتا ہے اور فسخ نکاح کا سبب ہو جاتا ہے۔ علامہ ابن قیم رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی کتاب زاد المعاد میں اسی کو اختیار کیا ہے اور جمہور کا یہی مذہب ہے۔

٢ - بَابُ عِشْرَةِ النِّسَآءِ

عورتوں (بیویوں) کے ساتھ رہن سہن و میل جول کا بیان

(٨٦٧) عَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «**مَلْعُونٌ مَنْ أَتَى امْرَأَةً فِي دُبُرِهَا**». رَوَاهُ أَبُو دَاوُدَ وَالنَّسَائِيُّ، وَاللَّفْظُ لَهُ، وَرِجَالُهُ ثِقَاتٌ، لٰكِن أُعِلَّ بِالإِرْسَالِ.

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "جو شخص عورت سے اس کی دبر میں جماع کرے وہ لعنتی ہے۔" (اس حدیث کو ابوداؤد اور نسائی نے روایت کیا ہے اور یہ الفاظ نسائی کے ہیں اور اس کے راوی ثقہ ہیں۔ مگر اس حدیث کو مرسل ہونے کی وجہ سے معلول قرار دیا گیا ہے)

لغوی تشریح: ﴿ باب عشرۃ النساء ﴾ "عین" کے نیچے کسرہ اور "شین" ساکن۔ یعنی رہن سہن' میل جول اور باہمی مؤدت والفت کو کہتے ہیں اور اسی سے "معاشرہ" ہے یعنی ایک دوسرے کے ساتھ مل جل کر رہنا۔ ﴿ لکن اعل بالارسال ﴾ یہ معلول ہے ارسال سے' مگر یہ علت اس اعتبار سے دور ہو جاتی ہے کہ یہ حدیث متعدد طرق سے متعدد صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے مروی ہے اور اس کا مفہوم شریعت کے اصول و فروع کا مؤید ہے۔

حاصل کلام: اس حدیث کی بنا پر عورت کی دبر میں قوم لوط کا فعل کرنا حرام ہے۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا ہے کہ جس کسی نے ائمہ کی جانب اس قبیح کام کو مباح قرار دینے کو منسوب کیا ہے اس نے ائمہ پر بدگمانی' غلط گوئی اور افترا پردازی کی ہے۔ انہوں نے تو دبر سے قبل میں جماع کی اجازت دی ہے نہ کہ خود دبر میں' سننے والے کو غلط فہمی ہوئی ہے اس نے بجانب کو دبر میں سمجھ لیا ہے۔

(٨٦٨) وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «**لَا يَنْظُرُ اللَّهُ إِلَى رَجُلٍ**

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "اللہ تعالیٰ ایسے شخص کی طرف نظر رحمت سے نہیں دیکھے گا جس نے کسی مرد یا

أَتَى رَجُلاً، أَوْ امْرَأَةً فِي دُبُرِهَا». رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ وَالنَّسَآئِيُّ وَابْنُ حِبَّانَ، وَأُعِلَّ بِالوَقْفِ.

عورت سے قوم لوط کا فعل کیا ہو۔" (اسے ترمذی' نسائی اور ابن حبان نے روایت کیا ہے اور اسے موقوف ہونے کی وجہ سے معلول قرار دیا گیا ہے)

لغوی تشریح: ﴿ اتی رجلا ﴾ یعنی قوم لوط کا عمل کیا۔ ﴿ اعل بالوقف ﴾ موقوف ہونے کی بنا پر معلول کہا گیا ہے مگر سبل السلام میں ہے کہ اس مسئلہ میں اجتہاد کی کوئی گنجائش نہیں۔ اس لئے یہ اثر حکماً مرفوع ہے جبکہ اس میں وعید کا ذکر ہے اور وعید کا علم اجتہاد پر موقوف نہیں ہے۔

(٨٦٩) وَعَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ: «مَنْ كَانَ يُؤْمِنُ بِاللَّهِ وَاليَومِ الآخِرِ فَلاَ يُؤْذِ جَارَهُ، وَاسْتَوْصُوا بَالنِّسَاءِ خَيْراً، فَإِنَّهُنَّ خُلِقْنَ مِنْ ضِلَعٍ، وَإِنَّ أَعْوَجَ شَيْءٍ فِي الضِّلَعِ أَعْلاَهُ، فَإِنْ ذَهَبْتَ تَقِيمُهُ كَسَرْتَهُ، وَإِنْ تَرَكْتَهُ لَمْ يَزَلْ أَعْوَجَ، فَاسْتَوْصُوا بِالنِّسَاءِ خَيْراً». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ، وَاللَّفْظُ لِلْبُخَارِيِّ. وَلِمُسْلِمٍ: «فَإِنِ اسْتَمْتَعْتَ بِهَا اسْتَمْتَعْتَ بِهَا وَبِهَا عِوَجٌ، وَإِنْ ذَهَبْتَ تُقِيمُهَا كَسَرْتَهَا، وَكَسْرُهَا طَلاَقُهَا».

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا "جو کوئی اللہ اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتا ہے وہ اپنے ہمسایہ کو اذیت نہ پہنچائے اور عورتوں کے بارے میں بھلائی کی وصیت قبول کرو' بے شک ان کو پسلی سے پیدا کیا گیا ہے اور پسلی کا زیادہ ٹیڑھا حصہ اس کا اوپر والا ہوتا ہے۔ لہٰذا اگر کوئی اسے سیدھا کرنے کی کوشش کرے گا تو اسے توڑ بیٹھے گا اور اگر اسے اس کے حال پر چھوڑ دے گا تو وہ ہمیشہ ٹیڑھی ہی رہے گی۔ پس عورتوں کے حق میں ہمیشہ بھلائی کی وصیت قبول کرو۔" (بخاری و مسلم' یہ الفاظ بخاری کے ہیں) اور مسلم کی روایت میں ہے کہ "اگر تو اس سے فائدہ حاصل کرنا چاہتا ہے تو اس کے ٹیڑھ پن کے باوجود اس سے فائدہ اٹھا سکے گا اور اگر تو نے اسے سیدھا کرنے کی کوشش کی تو اسے توڑ بیٹھے گا اور اس کا توڑنا اسے طلاق دینا ہے۔"

لغوی تشریح: ﴿ استوصوا ﴾ ان عورتوں کے حق میں میری بھلائی کی وصیت قبول کرو۔ ﴿ ضلع ﴾ ضاد کے نیچے کسرہ اور لام پر فتحہ بھی جائز ہے اور اسے ساکن رکھنا بھی درست ہے۔ اس صورت میں یہ عیب اور جذع کے وزن پر ہوگا۔ پہلو میں واقع ہڈی یعنی پسلی کو کہتے ہیں جو خمدار و ٹیڑھی ہوتی ہے۔ ﴿ اعوج شئی ﴾ زیادہ خمدار اور ٹیڑھا حصہ۔ ﴿ اعلاہ ﴾ اس کا بالائی حصہ جو ہنسلی سے متصل ہوتا ہے۔ اگر وہ گول ہو تو نصف دائرہ کی شکل میں ہوتی ہے۔ بتلانا یہ مقصود ہے کہ عورتوں کی تخلیق میں دراصل بہت ہی ٹیڑھ ہے۔ وہ اس لئے کہ ان کی اصل تو حضرت حواء ہیں جن کو مشہور قول کے مطابق حضرت آدم علیہ السلام

کی پسلی سے پیدا کیا گیا تھا۔ مقصد یہ ہے کہ عورتوں کی سرشت و جبلت میں ٹیڑھ ہے۔ لہٰذا کوئی بھی ان کی فطری و جبلی عادت کو تبدیل نہیں کر سکتا۔ ﴿ تقیمہ ﴾ تو اسے سیدھا کرنا چاہے گا۔ اس حدیث میں عورتوں کے ساتھ حسن معاشرت و حسن سلوک سے پیش آنے کا حکم ہے اور ان کی چھوٹی موٹی خامیوں اور کوتاہیوں پر چشم پوشی اور درگزر کرنے کی تلقین ہے اور ان کی کمزوریوں اور ناروا حرکتوں کو برداشت کرنے کی تاکید ہے۔

(٨٧٠) وَعَنْ جَابِرٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: كُنَّا مَعَ النَّبِيِّ ﷺ فِي غَزَاةٍ، فَلَمَّا قَدِمْنَا المَدِيْنَةَ، ذَهَبْنَا لِنَدْخُلَ، فَقَالَ ﷺ: «أَمْهِلُوا حَتَّى تَدْخُلُوا لَيْلاً، يَعْنِي عِشَاءً، لِكَيْ تَمْتَشِطَ الشَّعِثَةُ، وَتَسْتَحِدَّ المُغِيبَةُ». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک غزوہ میں ہم نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھے۔ جب ہم مدینہ واپس پہنچ کر اپنے اپنے گھروں میں جانے لگے تو آپؐ نے فرمایا "ذرا ٹھہر جاؤ۔ رات کے وقت گھروں میں داخل ہونا۔ رات سے آنجناب صلی اللہ علیہ وسلم کی مراد عشاء کا وقت تھا۔ تاکہ پراگندہ بالوں والی اپنے بالوں میں کنگھی وغیرہ کر لے اور جس کا خاوند گھر سے باہر غائب تھا وہ اپنے جسم کے زائد بالوں کی صفائی کر لے۔" (بخاری و مسلم)

وَفِيْ رِوَايَةٍ لِلْبُخَارِيِّ: «إِذَا أَطَالَ أَحَدُكُمُ الغَيْبَةَ، فَلاَ يَطْرُقْ أَهْلَهُ لَيْلاً».

اور بخاری کی ایک روایت میں ہے کہ "تم میں سے کوئی جب لمبی مدت کے بعد واپس آئے تو اچانک رات کے وقت گھر میں داخل نہ ہو۔"

لغوی تشریح: ﴿ امہلوا ﴾ ٹھہرو ﴿ تمتشط ﴾ سر کے بالوں میں کنگھی وغیرہ کر کے ان کو درست کر لے۔ ان کو سنوار لے۔ امتشاط کے معنی کنگھی استعمال کر کے بالوں کی اصلاح و درستگی کرنا اور "مشط" بالوں کو درست اور ٹھیک کرنے کا آلہ جس کے دندانے ہوتے ہیں جسے کنگھی یا کنگھا کہتے ہیں۔ ﴿ الشعثۃ ﴾ پہلے شین پر فتحہ اور عین کے نیچے کسرہ۔ ایسی عورت جس کے سر کے بال پراگندہ اور بکھرے ہوئے ہوں اور ان میں کنگھی وغیرہ نہ کی گئی ہو۔ ﴿ تستحد ﴾ استحداد سے ماخوذ ہے۔ لوہے کے آلہ کو استعمال کر لے۔ جسے استرا کہتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ زیر ناف زائد بال صاف کر لے۔ ﴿ المغیبۃ ﴾ جس عورت کا شوہر گھر سے باہر غائب ہو۔ سفر پر ہو۔ ﴿ فلا یطرق ﴾ طروق سے نہی کا صیغہ ہے باب نصر ینصر سے۔ سفر وغیرہ سے رات کے اوقات میں واپس آنے والا جبکہ اہل خانہ کو اس کی آمد کی اطلاع ہی نہ ہو اور اس حدیث میں اس شخص کو جو بہت دیر کے بعد گھر واپس لوٹا ہو حکم ہے کہ وہ گھر آنے سے پہلے اپنی آمد کی اطلاع اہل خانہ کو کرے تاکہ ان کی آمد کا پتہ چل جائے اور بیوی اپنی زیب و آرائش کر لے اور یہ اچانک آنے کی صورت میں ممکن نہیں۔ اس لئے کہ جن عورتوں کے شوہر باہر ہوتے ہیں وہ

عموماً پراگندہ اور ناپسندیدہ حالت میں ہوتی ہیں۔ ممکن ہے کہ شوہر جب ایسی پراگندہ حالت میں اسے دیکھے گا تو اس سے نفرت پیدا ہو سکتی ہے۔ دور جدید میں تو ڈاک اور ٹیلیفون کے ذریعہ پیشگی اطلاع دی جا سکتی ہے۔ یہ اطلاع مقصد پورا کر دیتی ہے لہٰذا گھر کے قریب پہنچ کر ٹھہرنے کی اب ضرورت نہیں۔

(٨٧١) وَعَنْ أَبِيْ سَعِيْدِ الخُدْرِيِّ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «إِنَّ شَرَّ النَّاسِ عِنْدَ اللهِ مَنْزِلَةً يَوْمَ القِيَامَةِ الرَّجُلُ يُفْضِي إِلَى امْرَأَتِهِ، وَتُفْضِي إِلَيْهِ. ثُمَّ يَنْشُرُ سِرَّهَا». أَخرَجَهُ مُسْلِمٌ.

حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "قیامت کے روز اللہ تعالیٰ کے نزدیک بدترین انسان وہ ہوگا جو اپنی بیوی کے پاس پہنچے اور عورت اس کی طرف پہنچے۔ پھر وہ اس کا بھید ظاہر کرے۔" (مسلم)

لغوی تشریح: ﴿ یفضی الی امراتہ ﴾ یعنی اپنی بیوی سے جماع کرے۔ ﴿ ثم ینشر سرھا ﴾ رات کی تنہائی کی باتیں اور واقعات لوگوں میں بیان کرتا پھرے۔ وہ بات چیت کی صورت میں ہوئی ہوں یا عملی طور پر واقع ہوئی ہوں۔

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ میاں بیوی کے تنہائی کے لمحات میں ہونے والی باہمی گفتگو اور تعلقات زن و شو کے عملی واقعات دوستوں اور احباب کو بیان کرنا گناہ کبیرہ ہے۔

(٨٧٢) وَعَنْ حَكِيْمِ بْنِ مُعَاوِيَةَ، عَنْ أَبِيْهِ قَالَ: قُلْتُ: يَا رَسُولَ اللهِ! مَا حَقُّ زَوْجِ أَحَدِنَا عَلَيْهِ؟ قَالَ: «تُطْعِمُهَا إِذَا أَكَلْتَ، وَتَكْسُوهَا إِذَا اكْتَسَيْتَ، وَلاَ تَضْرِبِ الوَجْهَ، وَلاَ تُقَبِّحْ، وَلاَ تَهْجُرْ إِلاَّ فِي البَيْتِ». رَوَاهُ أَحْمَدُ وَأَبُو دَاوُدَ وَالنَّسَائِيُّ وَابْنُ مَاجَهْ، وَعَلَّقَ البُخَارِيُّ بَعْضَهُ، وَصَحَّحَهُ ابْنُ حِبَّانَ وَالحَاكِمُ.

حضرت حکیم بن معاویہ نے اپنے باپ سے بیان کیا وہ کہتے ہیں کہ میں نے عرض کیا یارسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم)! ہماری بیویوں کا ہم پر کیا حق ہے؟ ارشاد ہوا کہ "جب تو کھائے تو اسے بھی کھلائے اور جب تو پہنے تو اسے بھی پہنائے اور اس کے منہ پر نہ مارے اور نہ اسے گالی گلوچ دے اور گھر کے علاوہ اس سے الگ نہ رہے۔" (اسے احمد' ابوداؤد' نسائی اور ابن ماجہ نے روایت کیا ہے اور بخاری نے اس روایت کا بعض حصہ تعلیقاً بیان کیا ہے۔ ابن حبان اور حاکم نے اسے صحیح قرار دیا ہے)

لغوی تشریح: ﴿ زوج احدنا ﴾ زوج بغیر تا کے۔ مذکر اور مؤنث دونوں کیلئے مستعمل ہے اور تا کے ساتھ عورت کیلئے مخصوص ہے۔ ﴿ تکسوھا ﴾ پہننے کیلئے لباس دے۔ ﴿ ولا تضرب الوجہ ﴾ اور چہرے پر نہ مار کیونکہ چہرہ اعضاء انسانی میں سب سے معزز اور قابل تکریم و تشریف ہے اور لطیف اجزاء پر مشتمل ہے

﴿ ولا تقبح ﴾ تقبیح سے نہی کا صیغہ ہے۔ یعنی بیوی کو نہ تو برا بول بولے اور نہ اسے گالی گلوچ کرے اور نہ اسے قبحک الله وغیرہ کہے۔ ﴿ لاتھجر ﴾ باب نصر ینصر سے۔ معنی یہ ہے کہ نہ اسے چھوڑ اور نہ اس سے دور ہو ﴿ الا فی البیت ﴾ یعنی اپنے گھر کو چھوڑ کر دوسرے گھر میں نہ جائے یعنی جب عورت سے اظہار ناراضگی کرنا ہو تو اس کیلئے نہ خود گھر سے نکل کر دوسرے کسی مکان میں منتقل ہو اور نہ عورت ہی کو گھر سے نکالے بلکہ گھر ہی گھر میں اس سے قطع تعلق اور قطع کلام کر لے اور زن و شو کا تعلق بھی منقطع کر لے اور عورت کی طرف پشت کر کے سوئے۔ یہ حکم اس لئے دیا گیا ہے کہ یہ طریقہ ڈانٹ ڈپٹ اور زجر و توبیخ کیلئے نہایت ہی اثر انگیز ہے اور درستگی اور اصلاح کیلئے بڑا زود اثر ہے اور نبی ﷺ کے واقعہ ایلاء سے استدلال کیا گیا ہے کہ بیویوں کو ان کے گھروں میں چھوڑ کر دوسرے مکان میں رہنا جائز ہے۔ حالانکہ ان دونوں میں باہمی منافرت نہیں ہے۔ ان میں سے ہر ایک کا اپنا موقعہ و محل ہے جو ایک دوسرے سے کوئی تعلق نہیں رکھتا۔

(٨٧٣) وَعَنْ جَابِرِ بْنِ عَبْدِ اللهِ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا قَالَ: كَانَتِ الْيَهُودُ تَقُولُ إِذَا أَتَى الرَّجُلُ امْرَأَتَهُ مِنْ دُبُرِهَا فِيْ قُبُلِهَا كَانَ الْوَلَدُ أَحْوَلَ، فَنَزَلَتْ ﴿نِسَاؤُكُمْ حَرْثٌ لَكُمْ فَأْتُوا حَرْثَكُمْ أَنَّى شِئْتُمْ﴾ الآيَةَ. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ. وَاللَّفْظُ لِمُسْلِمٍ.

حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ یہود کہتے تھے کہ مرد جب اپنی بیوی سے پچھلی جانب سے قبل میں مجامعت و مباشرت کرتا ہے تو بچہ بھینگا پیدا ہوتا ہے۔ اس موقع پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی کہ عورتیں تمہاری کھیتی ہیں لہٰذا اپنی کھیتی میں جس طرح چاہو' آؤ۔ (بخاری و مسلم اور یہ الفاظ مسلم کے ہیں)

لغوی تشریح: ﴿ من دبرھا فی قبلھا ﴾ خاوند مجامعت کرے بیوی کے پیچھے سے اس کی شرم گاہ میں۔ یہ مطلب نہیں ہے کہ وہ عورت کی دبر میں جماع کرے۔ یہ تو قطعی طور پر حرام ہے۔ ﴿ احول ﴾ بھینگا' ایک آنکھ یا دونوں کے ڈیلوں سے اصل مقام نگاہ سے ہٹ کر دائیں بائیں دیکھنا بھینگا پن کہلاتا ہے۔ ﴿ انی شئتمانی ﴾ کیف کے معنی میں مستعمل ہے یعنی اپنی بیوی سے جماع ہر حالت و صورت میں کر سکتا ہے کھڑے کھڑے' بیٹھ کر' لیٹ کر' آگے سے' پیچھے سے۔ خواہ کوئی ہیئت ہو ہر ہیئت میں جماع کرنا مباح و جائز ہے۔ تمہارے اختیار و تمیز پر چھوڑ دیا گیا ہے۔ اس سے تمہارے لئے کسی قسم کا نقصان اور ضرر مترتب نہیں ہوتا۔ لیکن مقام کھیتی کے علاوہ دوسرے مقام سے بچنا اور پرہیز کرنا لازمی ہے۔ لہٰذا عورتوں کی دبر میں جماع کسی صورت میں حلال نہیں ہے کیونکہ کھیتی تو قبل ہے دبر نہیں اور یہ اس لئے بھی کہ کھیتی سے مطلوب تو کھیتی کی پیدائش ہے اور یہ مطلوب عورتوں سے اس صورت میں حاصل ہوتا ہے کہ اس کے اولاد پیدا ہو اور اولاد کی پیدائش کا محل قبل ہے' دبر نہیں۔

(٨٧٤) وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول

اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «لَوْ أَنَّ أَحَدَكُمْ إِذَا أَرَادَ أَنْ يَأْتِيَ أَهْلَهُ قَالَ: بِسْمِ اللهِ، اللَّهُمَّ جَنِّبْنَا الشَّيْطَانَ، وَجَنِّبِ الشَّيْطَانَ مَا رَزَقْتَنَا، فَإِنَّهُ إِنْ يُقَدَّرْ بَيْنَهُمَا وَلَدٌ فِي ذَلِكَ، لَمْ يَضُرَّهُ الشَّيْطَانُ أَبَداً». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

اللہ ﷺ نے فرمایا ''اگر تم میں سے کوئی اپنی بیوی کے پاس جاتے وقت یہ دعا پڑھے کہ اللہ کے نام کے ساتھ' الٰہی ہمیں شیطان سے کنارہ کش رکھ اور شیطان کو بھی اس سے دور رکھ جو تو ہمیں اولاد عطا فرمائے۔ تحقیق شان یہ ہے کہ اگر اس مجامعت سے ان کے مقدر و قسمت میں اولاد ہوگی تو شیطان اسے کبھی ضرر نہ پہنچا سکے گا۔'' (بخاری و مسلم)

لغوی تشریح: ﴿لو ان احدکم﴾ لو' یہ کلمہ تمنی کیلئے آتا ہے اور مختار مذہب کے مطابق یہ جواب کا محتاج نہیں ہوتا۔ ابن صائغ اور ابن ھشام کی یہی رائے ہے اور اسے شرطیہ قرار دینا بھی جائز ہے۔ اس صورت میں اس کا جواب محذوف تسلیم کیا جائے گا جو اس طرح ہوگا لسلم من الشیطان وہ شیطان سے صحیح و سالم رہے گا۔ ﴿جنبنا﴾ ہمیں محفوظ رکھ اور دور رکھ۔ ﴿مارزقتنا﴾ اس وقت جو اولاد تو عطا فرمائے۔ ﴿ان یقدر﴾ صیغۂ مجہول تقدیر سے ماخوذ ہے۔ ﴿لم یضرہ الشیطان﴾ اس پر شیطانی تسلط نہیں ہو سکے گا اور نہ دین کے بارے میں فتنہ میں مبتلا کر کے کفر کی جانب کھینچ لے جائے گا۔ اس سے ہر قسم کے ضرر و نقصان کی نفی نہیں ہے۔

حاصل کلام: اس حدیث میں زن شوئی کے وقت انسان کے ازلی و ابدی دشمن سے بچنے اور محفوظ رہنے کی دعا کا ذکر ہے۔ اس حدیث سے معلوم ہو رہا ہے کہ شیطان صرف ذکر الٰہی سے انسان سے جدا اور الگ ہوتا ہے بصورت دیگر وہ ہر وقت انسان کے ساتھ رہتا ہے اور کسی حالت میں بھی آدمی سے جدا اور الگ نہیں ہوتا۔

(٨٧٥) وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ: «إِذَا دَعَا الرَّجُلُ امْرَأَتَهُ إِلَى فِرَاشِهِ، فَأَبَتْ أَنْ تَجِيءَ، فَبَاتَ غَضْبَانَ، لَعَنَتْهَا المَلَائِكَةُ حَتَّى تُصْبِحَ». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ، وَاللَّفْظُ لِلْبُخَارِيِّ. وَلِمُسْلِمٍ: «كَانَ الَّذِي فِي السَّمَآءِ سَاخِطاً عَلَيْهَا، حَتَّى يَرْضَى عَنْهَا».

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا ''جب مرد اپنی بیوی کو جنسی خواہش کیلئے اپنے بستر پر بلائے اور وہ آنے سے انکار کر دے اور خاوند ناراض ہو کر رات گزارے تو فرشتے صبح تک اس عورت پر لعنت و پھٹکار بھیجتے رہتے ہیں۔'' (بخاری و مسلم' یہ الفاظ بخاری کے ہیں) اور مسلم میں ہے کہ ''جو آسمان میں ہے وہ اس پر ناراض رہتا ہے جب تک کہ خاوند بیوی سے خوش و راضی نہ ہو جائے۔''

لغوی تشریح: ﴿ الی فراشه ﴾ اپنے بستر پر بلانے سے مراد جنسی خواہش کیلئے بلائے۔ ﴿ فابت ﴾ وہ انکار کر دے اور بستر پر جانے سے رک جائے۔ ﴿ غضبان ﴾ بات سے حال واقع ہو رہا ہے۔ ایسی حالت کہ ناراض و غصہ ہو۔ ﴿ بات ﴾ ناراضگی اور غصہ کی حالت میں رات بسر کی۔ ﴿ ساخطا ﴾ ناراض و غصہ کی حالت میں۔ ﴿ حتی یرضی عنها ﴾ تاوقتیکہ شوہر بیوی سے خوش اور راضی ہو جائے۔

حاصل کلام: اس حدیث کی رو سے خاوند کی جنسی خواہش پوری کرنے سے بیوی کا (بلاوجہ) انکار کرنا کبیرہ گناہ ہے۔ یہ مرد کا عورت پر ایسا حق ہے جس کو پورا کرنا عورت پر لازمی ہے۔ لیکن مرد کو بھی عورت کی صحت اور طبیعت کا خیال رکھنا نہایت ضروری ہے۔

(٨٧٦) وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ لَعَنَ الوَاصِلَةَ وَالمُسْتَوْصِلَةَ، وَالوَاشِمَةَ وَالمُسْتَوْشِمَةَ. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ "نبی ﷺ نے سر میں بال جوڑنے اور جڑوانے والی اور جسم پر گود کر نشان بنانے والی اور اس کی خواہش کرنے والی پر لعنت فرمائی ہے۔" (بخاری و مسلم)

لغوی تشریح: ﴿ الواصلة ﴾ بالوں کے ساتھ دوسروں کے بال جوڑنے والی۔ خواہ اپنے لئے ایسا کرے یا کسی دوسرے کیلئے ﴿ والمستوصلة ﴾ وہ خاتون جو دوسرے کے بالوں کو اپنے سر کے بالوں میں جڑوانے اور لگانے کی خواہش مند ہو۔ ﴿ الواشمة ﴾ وشم سے فاعل کا صیغہ ہے۔ وشم کہتے ہیں جسم کے کسی حصہ میں سوئی سے گودے اور پھر ان سوراخوں میں سرمہ یا چونے کا پتھر یا نیل بھر کر اس جگہ کو رنگ دے تاکہ اس مقام پر نشانات اور لکیریں اور خطوط نمایاں ہو جائیں۔ ﴿ المستوشمة ﴾ جو عورت اس طرح کا کام اپنے جسم پر کروانے کی خواہش مند ہو۔ یہ حدیث دلیل ہے کہ یہ امور حرام ہیں۔ رہا یہ کہ عورت اپنے بالوں کے ساتھ حیوانی بالوں کے علاوہ چٹیا بنانے کیلئے اون' دھاگہ اور کپڑے کے ٹکڑے باندھ سکتی ہے یا نہیں تو محققین نے اس کے جواز کا فتویٰ دیا ہے بشرطیکہ ان چیزوں کا رنگ بالوں کے رنگ سے ملتا نہ ہو۔

(٨٧٧) وَعَنْ جُذَامَةَ بِنْتِ وَهْبٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهَا، قَالَتْ: حَضَرْتُ رَسُولَ اللهِ ﷺ فِي أُنَاسٍ، وَهُوَ يَقُولُ: «لَقَدْ هَمَمْتُ أَنْ أَنْهَى عَنِ الغِيْلَةِ، فَنَظَرْتُ فِي الرُّومِ وَفَارِسَ، فَإِذَا هُمْ يُغِيْلُونَ أَوْلاَدَهُمْ، فَلاَ يَضُرُّ ذٰلِكَ أَوْلاَدَهُمْ شَيئاً» ثُمَّ سَأَلُوهُ عَنِ العَزْلِ، فَقَالَ رَسُولُ اللهِ

حضرت جدامہ بنت وھب رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ میں رسول اللہ ﷺ کی خدمت اقدس میں حاضر ہوئی۔ اس وقت آپ ؐ کچھ لوگوں کے درمیان تشریف فرما تھے اور فرما رہے تھے کہ "میں نے غیلہ سے منع کرنے کا ارادہ کیا۔ فوراً میری نظر روم و فارس پر پڑی جو اپنی اولاد سے غیلہ کرتے ہیں اور یہ غیلہ ان کی اولاد کو کچھ بھی ضرر نہیں دیتا۔" پھر ان لوگوں نے عزل کے متعلق سوال کیا تو آپ ؐ نے فرمایا "یہ

ﷺ: «ذَلِكَ الوَأْدُالخَفِيُّ» . رَوَاهُ مُسْلِمٌ. **زندہ درگور کرنے کا خفیہ طریقہ ہے۔"** (مسلم)

لغوی تشریح: ﴿ هممت ﴾ میں نے ارادہ کیا۔ ﴿ الغیلۃ ﴾ غین کے نیچے کسرہ۔ خاوند کا بیوی سے ایسی حالت میں مباشرت و مجامعت کرنا جبکہ وہ گود کے بچے کو دودھ پلا رہی ہو۔ اہل عرب کا یہ عقیدہ تھا کہ غیلہ بچہ کیلئے ضرر کا سبب ہے اور اس کے اعصاب کیلئے ضرر رساں ہے اور یہ ضرر انسان کے ساتھ زندگی بھر رہتا ہے۔ جس کے نتیجہ میں بسا اوقات انسان گھوڑے سے نیچے گر پڑتا ہے اور گھوڑے کی پشت پر ثابت نہیں رہ سکتا۔ اس لئے غیلہ کے بعد عورت کا دودھ پتلا ہو جاتا ہے اور اس میں تبدیلی واقعہ ہو جاتی ہے۔ اس حدیث میں اہل فارس و روم کے تجربات کی روشنی میں عرب کے اسی عقیدہ کا ابطال ہے۔ ﴿ العزل ﴾ عین پر فتحہ اور "زا" ساکن۔ عزل یہ ہے کہ مرد عورت سے جماع کرتا ہے جب انزال کے قریب پہنچتا ہے تو عضو مخصوص کو عورت کی شرم گاہ سے باہر نکال لیتا ہے اور فرج سے باہر انزال کرتا ہے۔ ﴿ ذلک الواد الخفی ﴾ اس میں همزہ ساکن ہے۔ لڑکی کو زندہ درگور کرنا۔ یعنی عزل حقیقتاً تو درگور کرنا نہیں لیکن اس کے مشابہ ہے کیونکہ اس میں بھی حمل کو روکنے اور ضائع کرنے کی کوشش ہوتی ہے اور اس نطفہ کو تلف کرنے کی سعی ہوتی ہے جس کے جاندار نفس بننے کا امکان موجود تھا۔ لیکن یہ چونکہ حقیقی زندہ کو قطع کرنا نہیں اس لئے یہ حقیقی زندگی درگور کرنا نہیں۔ پس حدیث اس کی حرمت پر دلالت نہیں کرتی۔

راوی حدیث: ﴿ جدامہ رضی اللہ عنہا ﴾ جیم پر ضمہ۔ جیم کے بعد دال ہے۔ تقریب میں ہے کہ جدامہ بنت وھب کے بارے میں یہ بھی قول ہے کہ وہ جدامہ بنت جندل ہے۔ اسد قبیلہ سے ہونے کی وجہ سے اسدیہ کہلائی۔ عکاشہ بن محصن کی ماں جائی بہن تھی۔ مشہور صحابیہ ہے۔ سابقین میں سے ہے۔ ہجرت کے شرف سے بھی مشرف ہوئی ہیں۔ دار قطنی نے کہا ہے کہ جس نے اسے ذال کے ساتھ پڑھا ہے اس نے غلطی کی ہے۔ مکہ میں دائرہ اسلام میں داخل ہوئیں۔ اپنی قوم کو چھوڑ دیا۔ انیس بن قتادہ رضی اللہ عنہ کی زوجیت میں تھیں۔

(٨٧٨) وَعَنْ أَبِيْ سَعِيْدِ الخُدْرِيِّ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، أَنَّ رَجُلاً قَالَ: يَا رَسُولَ الله! إِنَّ لِيْ جَارِيَةً، وَأَنَا أَعْزِلُ عَنْهَا، وَأَنَا أَكْرَهُ أَنْ تَحْمِلَ، وَأَنَا أُرِيْدُ مَا يُرِيْدُ الرِّجَالُ، وَإِنَّ اليَهُودَ تَحَدَّثُ أَنْ العَزْلَ ٱلْمَوْؤُدَةُ الصُّغْرَى، قَالَ: «**كَذَبَتِ اليَهُودُ، لَوْ أَرَادَ اللَّهُ أَنْ يَخْلُقَهُ مَا اسْتَطَعْتَ أَنْ تَصْرِفَهُ**». رَوَاهُ أَحْمَدُ وَأَبُو

حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ **سے روایت ہے کہ ایک آدمی نے کہا' اے اللہ کے رسول (** ﷺ**)! میری ایک لونڈی ہے۔ میں اس سے عزل کرتا ہوں اور اس کا حاملہ ہونا مجھے پسند نہیں اور میں وہی چاہتا ہوں جو مرد چاہتے ہیں۔ یہودی کہتے ہیں کہ عزل تو چھوٹا زندہ درگور کرنا ہے۔ آپ نے فرمایا "یہود نے جھوٹ بولا ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ اسے پیدا کرنا چاہے تو اسے تو پھیر نہیں سکتا۔"** (اسے احمد' ابوداؤد نے روایت کیا ہے اور یہ الفاظ ابوداؤد کے ہیں اور نسائی اور طحاوی نے

دَاوُدَ، وَاللَّفْظُ لَهُ، وَالنَّسَآئِيُّ وَالطَّحاوِيُّ، وَرِجَالُهُ ثِقَاتٌ. بھی اسے روایت کیا ہے او اس کے راوی ثقہ ہیں)

لغوی تشریح: ﴿ الموء ودة الصغری ﴾ چھوٹا زندہ درگور کرنا' اس لئے کہ ایک جان کو ضائع کرنا اور اسے تلف کرنا ہے اگرچہ ابھی وہ وجود سے بہت دور ہے۔ ﴿ کذبت الیهود ﴾ یہود نے جھوٹ کہا ہے۔ علامہ ابن قیم رحمہ اللہ نے کہا ہے جس چیز میں نبی ﷺ نے یہود کو جھوٹا قرار دیا ہے وہ ان کا یہ خیال ہے کہ عزل کی صورت میں حمل کا تصور ہی نہیں اور انہوں نے اسے زندہ درگور کرنے کو قطع نسل کے مقام پر رکھا ہے۔ مگر میں ان کے اس نظریئے اور خیال کی تکذیب کرتا ہوں اور خبر دیتا ہوں کہ عزل حمل کو ہرگز نہیں روک سکتا جب کہ اللہ تعالیٰ اسے پیدا کرنا چاہے اور اس کا ارادہ ہی تخلیق کا نہ ہو تو پھر حقیقت میں تو وہ زندہ درگور کرنا نہیں۔ حدیث جدامہ میں بھی اسے خفیہ زندہ درگور کرنے کا نام اس لئے دیا گیا ہے۔ مرد حمل سے فرار کا راستہ اختیار کرتے ہوئے عزل کرتا ہے۔ اسی بنا پر اس کے ارادے اور قصد کو زندہ درگور کی جگہ نافذ کیا ہے۔ لیکن ان دونوں میں فرق ہے کہ زندہ درگور تو براہ راست ایک ظاہر عمل ہے اور اس میں قصد اور فعل دونوں جمع ہوتے ہیں مگر عزل کا تعلق صرف قصد و ارادے سے ہے اسی وجہ سے اسے وأد خفی کہا گیا ہے۔ اس سے دونوں احادیث میں تطبیق بھی ہو جاتی ہے۔ وہ یوں کہ جدامہ کی حدیث عزل کی تحریم پر دلالت نہیں کرتی اس میں صرف کراہت و ناپسندیدگی کا اظہار ہے۔ اس میں عزل کرنے والا تقدیر کو رد کرنے کی کوشش کرتا ہے اور دور جدید کے جو ڈاکٹر رگ کاٹ کر قوت تولید کو قطع کر دیتے ہیں تاکہ نسل کو محدود کر دیا جائے گو قوت جماع باقی رہنے دیتے ہیں۔ تو اس کو عزل پر قطعاً قیاس نہیں کیا جا سکتا۔ کیونکہ ان دونوں کے درمیان میں عظیم فرق ہے۔ عزل تو وقتی اور ظنی سبب ہے نہ کہ منع حمل کیلئے حقیقی سبب۔ اس کے باوجود عازل خود مختار ہے اگر چاہے تو یہ فعل کرے اور چاہے اسے ترک کرے اور جہاں تک رگ تولید کے کاٹ دینے کا تعلق ہے تو وہ ایسا سبب ہے جو قطعی ہے۔ نیز اس میں اللہ کی تخلیق کو بدل دینا اور جسمانی نظام کا تبدیل ہونا اور بعض قویٰ کے مطابق عمل کو باطل کرنا اور تباہ کن بیماری کی جانب پہنچا دینا ہے۔ جیسے سرطان کا مرض ہے جو کٹی ہوئی رگ کی جگہ' دل اور پھیپھڑے وغیرہ تک سرایت کر جاتا ہے۔ ہر باخبر آدمی پر اس کے برے نتائج اور آثار مخفی اور پوشیدہ نہیں۔

(٨٧٩) وَعَنْ جَابِرٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: كُنَّا نَعْزِلُ عَلَى عَهْدِ رَسُولِ اللّٰهِ ﷺ: وَالقُرْآنُ يَنْزِلُ، وَلَوْ كَانَ شَيْءٌ يُنْهَى عنهُ، لَنَهَانَا عَنْهُ القُرْآنُ. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

وَلِمُسْلِمٍ: فَبَلَغَ ذٰلِكَ نَبِيَّ اللّٰهِ ﷺ

حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ہم رسول اللہ ﷺ کے عہد میں عزل کرتے تھے اور قرآن اس وقت نازل ہو رہا تھا اگر کوئی چیز قابل ممانعت ہوتی تو قرآن ہمیں اس سے لازماً منع کر دیتا۔ (بخاری و مسلم) اور مسلم کی روایت میں ہے۔ یہ بات نبی ﷺ تک پہنچ گئی مگر آپ نے ہمیں اس سے منع نہیں فرمایا۔

فَلَمْ يَنْهَنَا عَنْهُ.

حاصل کلام: اس روایت کی رو سے عزل کا جواز ثابت ہوتا ہے۔ امام مالک رحمہ اللہ و امام شافعی رحمہ اللہ اور اہل کوفہ اور جمہور علماء اس کے جواز کے قائل ہیں۔

(۸۸۰) وَعَنْ أَنَسِ بْنِ مَالِكٍ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ كَانَ يَطُوفُ عَلَى نِسَآئِهِ بِغُسْلٍ وَاحِدٍ. أَخْرَجَاهُ، وَاللَّفْظُ لِمُسْلِمٍ.

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی ﷺ ایک ہی غسل سے ساری بیویوں کے پاس چلے جایا کرتے تھے۔ (بخاری و مسلم' یہ الفاظ مسلم کے ہیں)

حاصل کلام: اس حدیث کی رو سے مباشرت کے بعد غسل جنابت ضروری اور واجب نہیں۔ نیز یہ بھی معلوم ہوا کہ نبی ﷺ کیلئے آپؐ کی بیویوں میں باری کی تقسیم واجب نہ تھی اگر واجب ہوتی تو آپؐ ایک ہی رات میں تمام ازواج مطہرات کے پاس نہ جاتے۔ جمہور اسے واجب قرار دیتے ہیں اور اس کا جواب وہ یہ دیتے ہیں کہ یہ کام آپؐ نے اجازت لے کر کیا تھا۔ (سبل)

۳ - بَابُ الصَّدَاقِ
حق مہر کا بیان

(۸۸۱) عَنْ أَنَسٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، عَنِ النَّبِيِّ ﷺ، أَنَّهُ أَعْتَقَ صَفِيَّةَ، وَجَعَلَ عِتْقَهَا صَدَاقَهَا. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت انس رضی اللہ عنہ نے نبی ﷺ سے روایت کی ہے کہ آپؐ نے صفیہ رضی اللہ عنہا کو آزاد کیا اور اس کی آزادی کو اس کا مہر قرار دیا۔ (بخاری و مسلم)

لغوی تشریح: ﴿باب الصداق﴾ (صاد پر فتحہ اور کسرہ دونوں جائز ہیں) عورت کے مہر کو کہتے ہیں یعنی مرد نکاح کے وقت جو مال عورت کو دیتا ہے۔ یہ "صدق" سے ماخوذ ہے۔ یہ احساس و شعور دلانے کے لئے کہ مرد کو اپنی بیوی سے سچی محبت و رغبت ہے۔

حاصل کلام: یہ حدیث آزادی کو مہر مقرر کرنے کی صحت کے بارے میں بالکل واضح ہے۔ جمہور نے اس کی مخالفت کی ہے۔ مگر انہوں نے اپنے موقف پر کوئی قابل اطمینان دلیل پیش نہیں کی۔ اسی سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ کسی منفعت بخش چیز کو مہر مقرر کرنا درست ہے کیونکہ آزادی بھی منفعت ہے اور اس کی تائید میں وہ واقعہ بھی ہے جو پہلے گزر چکا ہے کہ آپؐ نے تعلیم قرآن کو مہر مقرر کیا تھا۔

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ مالیت کے علاوہ دوسری چیزیں بھی حق مہر مقرر کی جا سکتی ہیں۔ امام احمد رحمہ اللہ' امام اسحٰق رحمہ اللہ وغیرہما کا یہی موقف ہے۔

راوی حدیث: ﴿حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا﴾ ام المومنین حضرت صفیہ حی بن اخطب کی بیٹی تھیں۔ ان کا رشتہ نسب حضرت ہارون علیہ السلام برادر موسیٰ علیہ السلام سے جا ملتا ہے۔ یہ خاتون اسی خانوادۂ رسالت

سے تھیں۔ ابن ابی الحقیق کی زوجیت میں تھیں۔ جو غزوۂ خیبر میں قتل ہو گیا تھا اور حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا قیدی بن کر مدینہ آئیں تو انہیں رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے حرم کیلئے پسند فرمایا' آزاد کر کے ان سے نکاح کر لیا اور اسی آزادی کو مہر مقرر کر کے نکاح کیا۔

(۸۸۲) وَعَنْ أَبِيْ سَلَمَةَ بْنِ عَبْدِ الرَّحْمٰنِ ، أَنَّهُ قَالَ: سَأَلْتُ عَآئِشَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهَا، كَمْ كَانَ صَدَاقُ رَسُولِ اللهِ ﷺ؟ قَالَتْ: كَانَ صَدَاقُهُ لِأَزْوَاجِهِ ثِنْتَي عَشَرَةَ أُوْقِيَّةً، وَنَشًّا، قَالَتْ: أَتَدْرِي مَا النَّشُّ؟ قَالَ: قُلْتُ: لاَ، قَالَت: نِصْفُ أُوْقِيَّةٍ، فَتِلْكَ خَمْسُمِائَةِ دِرْهَمٍ، فَهَذَا صَدَاقُ رَسُولِ اللهِ ﷺ لِأَزْوَاجِهِ. رَوَاهُ مُسْلِمٌ.

حضرت ابو سلمہ بن عبدالرحمٰن رحمۃ اللہ علیہ سے روایت ہے کہ میں نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے پوچھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم (کی بیویوں) کا مہر کتنا تھا؟ فرمایا آپ کی ازواج مطہرات کا مہر بارہ اوقیہ اور ایک نش' پھر انہوں نے فرمایا' کیا تو جانتا ہے کہ نش کتنا ہوتا ہے؟ میں نے کہا نہیں' انہوں نے فرمایا آدھا اوقیہ۔ اس طرح یہ پانچ سو درہم ہوئے۔ بس یہ تھا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج مطہرات کا حق مہر۔ (مسلم)

لغوی تشریح: ﴿ اوقیہ ﴾ ہمزہ پر ضمہ اور "یا" پر تشدید۔ چاندی کے سکہ کے چالیس درہم۔ وہ آج کل کے ایک سو سینتالیس گرام کے برابر ہے۔ ﴿ النش ﴾ نون پر فتحہ اور شین پر تشدید۔ نصف اوقیہ یعنی بیس درہم۔

راوی حدیث: ﴿ ابوسلمہ بن عبدالرحمن ﴾ یہ تھے ابوسلمہ بن عبدالرحمٰن بن عوف زہری قرشی۔ ایک قول کے مطابق یہ مدینہ منورہ کے سات مشہور فقہاء تابعین میں سے ایک تھے۔ کہا جاتا ہے کہ ان کی کنیت ہی ان کا نام تھا۔ کثیر الحدیث اور وسیع روایت کرنے والوں میں سے تھے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی ایک بڑی جماعت سے حدیث رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا سماع کیا اور ان سے بھی ایک بہت بڑی جماعت نے علم اخذ کیا۔ ۹۴ھ اور ایک قول کے مطابق ۱۰۴ھ میں وفات پائی۔ اس وقت ان کی عمر ۷۰ برس تھی۔

(۸۸۳) وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا، قَالَ: لَمَّا تَزَوَّجَ عَلِيٌّ فَاطِمَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهَا، قَالَ لَهُ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «أَعْطِهَا شَيْئاً» قَالَ: مَا عِنْدِي شَيْءٌ، قَالَ: «فَأَيْنَ دِرْعُكَ الْحُطَمِيَّةُ؟» رَوَاهُ أَبُو دَاوُدَ

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ جب حضرت علی رضی اللہ عنہ نے حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا سے نکاح کیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "اسے کچھ دو۔" حضرت علی رضی اللہ عنہ نے عرض کیا' میرے پاس کچھ بھی نہیں۔ آپ نے فرمایا "وہ تمہاری حطمی زرہ کہاں ہے؟" (اسے ابوداؤد اور نسائی نے روایت کیا ہے اور حاکم نے

وَالنَّسَائِيُّ، وَصَحَّحَهُ الحَاكِمُ. اسے صحیح قرار دیا ہے)

لغوی تشریح: ﴿ لما تزوج علی فاطمۃ ﴾ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ہجرت مدینہ کے دوسرے سال ماہ رمضان میں حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا سے نکاح کیا اور رخصتی ذوالحجہ کے مہینے میں ہوئی۔ (تلقیح المفہوم' ص: ۱۵) ﴿ الحطمیۃ ﴾ "حاء" پر ضمہ اور "طاء" پر فتحہ۔ حطمہ بن محارب کی جانب منسوب ہے۔ یہ عبدالقیس قبیلہ کی شاخ تھی۔ یہ لوگ زرہیں بناتے تھے اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ حطم کی طرف منسوب ہے کیونکہ یہ تلواروں کو توڑ کر ٹکڑے ٹکڑے کر دیتی تھی۔ (ابوداؤد کی ایک اور روایت میں ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کو وہ زرہ دے دی تھی پھر تعلق زن و شو قائم کیا تھا۔ امام ابوداؤد رحمہ اللہ اور منذری نے اس پر سکوت اختیار کیا ہے۔

حاصل کلام: اس حدیث سے مسئلہ مہر کے علاوہ یہ بھی معلوم ہو رہا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو علم ماکان وما یکون حاصل نہیں تھا' اسی لئے آپ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے دریافت فرما رہے تھے کہ تمہاری حطمی زرہ کہاں ہے؟ ورنہ یوں فرماتے کہ تمہاری حطمی زرہ جو فلاں مقام پر تم نے رکھی ہوئی ہے وہ لا کر دے دو۔ نیز معلوم ہوا کہ سسر حق مہر کا مطالبہ کر سکتا ہے البتہ اس سے وہی چیز طلب کی جائے جو اس کے پاس ہو ایسی چیز کا تقاضا و مطالبہ نہ کیا جائے جو اس کے بس میں نہ ہو۔

(٨٨٤) وَعَنْ عَمْرِو بْنِ شُعَيْبٍ، عَنْ أَبِيهِ، عَنْ جَدِّهِ، قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: أَيُّمَا امْرَأَةٍ نُكِحَتْ عَلَى صَدَاقٍ أَوْ حِبَاءٍ أَوْ عِدَةٍ قَبْلَ عِصْمَةِ النِّكَاحِ، فَهُوَ لَهَا، وَمَا كَانَ بَعْدَ عِصْمَةِ النِّكَاحِ، فَهُوَ لِمَنْ أُعْطِيَهُ، وَأَحَقُّ مَا أُكْرِمَ الرَّجُلُ عَلَيْهِ ابْنَتُهُ أَوْ أُخْتُهُ». رَوَاهُ أَحْمَدُ وَالأَرْبَعَةُ إِلاَّ التِّرْمِذِيَّ.

حضرت عمرو بن شعیب نے اپنے باپ سے' انہوں نے اپنے دادا سے روایت کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "جو عورت مہر' عطیہ یا نکاح سے پہلے کسی وعدہ کی بنا پر نکاح کرے تو یہ اس عورت کا حق ہے اور جو عطیہ نکاح کے بعد دیا جائے تو وہ اسی کا ہے جسے دیا جائے اور وہ چیز جس کی وجہ سے مرد زیادہ تکریم کا مستحق ہے اس کی بیٹی یا اس کی بہن ہے۔" (اسے احمد اور ترمذی کے علاوہ چاروں نے روایت کیا ہے)

لغوی تشریح: ﴿ حباء ﴾ "حاء" کے نیچے کسرہ اور "باء" تخفیف مد کے ساتھ۔ اصل میں عطیہ کو کہتے ہیں اور یہاں مراد وہ چیز ہے جو مرد مہر کے علاوہ عورت کو دیتا ہے۔ ﴿ عدۃ ﴾ عین کے نیچے کسرہ اور "دال" مخفف ہے۔ جس چیز کا خاوند نے وعدہ کیا ہو اور ابن ماجہ میں عدۃ کی جگہ ھبۃ ہے۔ ﴿ قبل عصمۃ النکاح ﴾ یعنی عقد نکاح سے پہلے ﴿ فھولھا ﴾ پس وہ اسی عورت کا ہے یعنی وہ بالخصوص عورت کا ہے۔ اس میں کسی کا کچھ نہیں نہ عورت کے والد کا اور نہ دوسرے کسی ولی و سرپرست کا کوئی حق ہے۔ ہاں اگر عورت اپنی خوشی و رضامندی سے دینا چاہے تو ایسا کرنا جائز ہے اور ولی کا لینا بھی جائز

ہے۔ ﴿ فھو لمن اعطیہ ﴾ پس وہ اس کا حق ہے جسے دیا گیا ہو یعنی عورت کے والد یا اس کے بھائی کا یا ان دونوں کے علاوہ کسی دوسرے ولی کا ﴿ احق ما اکرم ﴾ فعل صیغۂ مجہول ہے۔ ﴿ علیہ ﴾ لاجلہ کے معنی میں استعمال ہو رہا ہے۔ (یعنی اس کی اس حیثیت کی بنا پر) ﴿ ابنتہ اواختہ ﴾ یہ خبر ہے اور اس موصول کا بیان ہے جو احق ما اکرم کے قول میں ہے اور اس میں ترغیب ہے کہ عورت کے ولی کی عزت افزائی کیلئے اسے کچھ مال دینا چاہئے اور یہ حدیث دلیل ہے کہ اگر مرد عورت کے ولی کو کچھ مال دے یا اس سے کوئی وعدہ کرے اگر تو یہ نکاح سے پہلے ہو پھر ولی اس مال کا مستحق نہیں ہے اور خواہ ولی نے اس مال کی اپنے لئے شرط لگائی ہو۔ پھر بھی عورت ہی اس کا استحقاق رکھتی ہے۔ البتہ جب نکاح کے بعد اگر کوئی چیز دی گئی ہے تو وہ اسی کا حق ہے جسے وہ دی گئی ہے خواہ وہ اس کا ولی ہو یا کوئی اور رشتہ دار یا خود وہ عورت ہی ہو اور یہ گفتگو اس کے متعلق ہے جو مہر کے علاوہ ہے۔ رہا مہر کا معاملہ تو وہ قطعی طور پر عورت ہی کا حق ہے۔

(٨٨٥) وَعَنْ عَلْقَمَةَ، عَنِ ابْنِ مَسْعُودٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُ، أَنَّهُ سُئِلَ عَنْ رَجُلٍ تَزَوَّجَ امْرَأَةً، وَلَمْ يَفْرِضْ لَهَا صَدَاقاً، وَلَمْ يَدْخُلْ بِهَا، حَتَّى مَاتَ، فَقَالَ ابْنُ مَسْعُودٍ: لَهَا مِثْلُ صَدَاقِ نِسَآئِهَا، لاَ وَكْسَ، وَلاَ شَطَطَ، وَعَلَيْهَا العِدَّةُ، وَلَهَا المِيْرَاثُ، فَقَامَ مَعْقَلُ بْنُ سِنَانٍ الأَشْجَعِيُّ، فَقَالَ: قَضَى رَسُولُ اللهِ ﷺ فِي بَرْوَعَ بِنْتِ وَاشِقٍ امْرَأَةٍ مِنَّا مِثْلَ مَا قَضَيْتَ، فَفَرِحَ بِهَا ابْنُ مَسْعُودٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُ. رَوَاهُ أَحْمَدُ وَالأَرْبَعَةُ، وَصَحَّحَهُ التِّرْمِذِيُّ، وَحَسَّنَهُ جَمَاعَةٌ.

حضرت علقمہ کہتے ہیں کہ ابن مسعود رضی اللہ عنہما سے ایسے شخص کے متعلق مسئلہ پوچھا گیا جس نے کسی عورت سے نکاح کیا اور اس کیلئے مہر مقرر نہیں کیا تھا اس سے دخول بھی نہیں کیا اور وہ فوت ہوگیا۔ ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے جواب دیا کہ اس عورت کو مہر اس کے خاندان کی عورتوں کے برابر ملے گا۔ اس میں نہ کمی ہوگی اور نہ زیادتی۔ اس پر عدت گزارنا بھی لازمی ہے اور اس کیلئے میراث بھی ہے۔ یہ سن کر معقل بن سنان رضی اللہ عنہ اٹھے اور فرمایا کہ ہماری ایک عورت بروع بنت واشق کے بارے میں حضور ﷺ نے ایسا ہی فیصلہ فرمایا تھا جیسا آپ نے کیا ہے۔ اس پر ابن مسعود رضی اللہ عنہ بہت خوش ہوئے۔ (اسے احمد اور چاروں نے روایت کیا ہے اور ترمذی نے اسے صحیح کہا ہے اور ایک جماعت نے اسے حسن قرار دیا ہے)

لغوی تشریح: ﴿ لم یفرض ﴾ "یا" پر فتحہ اور "را" کے نیچے کسرہ۔ مقرر اور طے نہیں کیا۔ ﴿ ولم یدخل بھا ﴾ اس سے جماع نہیں کیا اور نہ اس سے خلوت صحیحہ ہوئی۔ ﴿ مثل صداق نسائھا ﴾ اس کی قوم و برادری کی عورتوں کے طے شدہ مہر کی مثل ﴿ لاوکس ﴾ "واو" پر فتحہ اور کاف ساکن، یعنی نہ

کم ہوگا۔ ﴿ ولا شطط ﴾ شین اور "طا" پر فتحہ یعنی اور نہ زیادہ۔ ﴿ وعلیها العدة ﴾ اس پر عدت ہے۔ وفات کی صورت میں عدت چار ماہ دس دن ہے۔ یہ حدیث دلیل ہے کہ وفات کی صورت میں عورت مکمل مہر کی حقدار ہے خواہ اس کا تعین شوہر نے نہ کیا ہو اور نہ شوہر نے اس سے مجامعت کی ہو۔ امام احمد رحمۃ اللہ علیہ و امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا یہی مسلک ہے۔

راوی حدیث: ﴿ علقمہ ﴾ یہ علقمہ بن قیس ابی شبل بن مالک ہیں۔ بنو بکر بن نخع میں سے تھے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے انہوں نے روایت کیا ہے۔ جلیل القدر تابعی ہیں۔ ابن مسعود کی حدیث اور ان کے تلمذ کی وجہ سے مشہور ہوئے اور اسود نخعی کے چچا تھے۔ ۶۱ھ میں فوت ہوئے۔

﴿ معقل بن سنان اشجعی رضی اللہ عنہ ﴾ ان کی کنیت ابو محمد ہے۔ معقل کی میم پر فتحہ اور قاف کے نیچے کسرہ۔ بن سنان۔ سین کے نیچے کسرہ۔ مشہور صحابی ہیں۔ فتح مکہ میں شریک تھے۔ کوفہ میں فروکش ہوئے۔ ان کی حدیث کوفیوں میں مشہور ہے۔ حرہ کی لڑائی کے روز ان کو باندھ کر قتل کیا گیا۔

﴿ بروع بنت واشق رضی اللہ عنہا ﴾ بروع میں "با" کے نیچے کسرہ۔ محدثین کے نزدیک اور اہل لغت کے نزدیک "با" کے فتحہ سے۔ بنت واشق۔ واشق کے شین پر کسرہ۔ مشہور صحابیہ ہیں۔ ان کے خاوند کا نام ہلال بن مرہ رضی اللہ عنہ تھا۔ جو اس سے مجامعت سے پہلے ہی فوت ہوگیا۔

(۸۸٦) وَعَنْ جَابِرِ بْنِ عَبْدِ اللهِ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ قَالَ: «مَنْ أَعْطَى فِي صَدَاقِ امْرَأَةٍ سَوِيقاً أَوْ تَمْراً فَقَدِ اسْتَحَلَّ». أَخْرَجَهُ أَبُو دَاوُدَ، وَأَشَارَ إِلَى تَرْجِيحِ وَقْفِهِ.

حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا "جس کسی نے مہر میں عورت کو ستو یا کھجوریں دے دیں اس نے حلال کر لیا۔" (اسے ابوداؤد نے روایت کیا ہے اور اس کے موقوف ہونے کی طرف اشارہ کیا ہے اور ترجیح بھی اسی کو دی ہے)

لغوی تشریح: ﴿ سویقا ﴾ گندم کا آٹا جو بھونا ہوا ہو یا مکئی یا جو کا آٹا۔ ابوداؤد کا جو نسخہ ہمارے پاس ہے اس میں "ملا کفیه سویقا" ہے جس کے معنی ہیں ایک مٹھی بھر۔ ﴿ فقد استحل ﴾ اس نے حلال کر لیا۔ یہ حدیث دلیل ہے کہ جب نکاح کرنے والے مرد و عورت کسی مقدار مہر پر راضی ہو جائیں خواہ وہ قلیل مقدار میں ہو یا کثیر' اس کی قیمت ہو تو یہ جائز ہے اور جو مہر کی مقدار پر کم از کم دس درہم قرار دیتا ہے وہ اس حدیث کو دخول سے پہلے جو کچھ دیا جائے اس پر محمول کیا گیا ہے۔ مگر یہ باطل ہے اس کی تردید فقد استحل کے جملہ سے ہوتی ہے۔ نیز عورت کو اپنے لئے حلال کرنے کیلئے دخول سے پہلے کچھ مال ادا کرنا شرط نہیں ہے۔

(۸۸۷) وَعَنْ عَبْدِ اللهِ بْنِ عَامِرِ ابْنِ رَبِيْعَةَ، عَنْ أَبِيْهِ، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ أَجَازَ نِكَاحَ امْرَأَةٍ عَلَى نَعْلَيْنِ:

حضرت عبداللہ بن عامر بن ربیعہ نے اپنے باپ سے روایت کیا ہے کہ نبی ﷺ نے دو جوتیوں کے عوض ایک عورت کے نکاح کو برقرار رکھنے کی اجازت دی۔

أَخْرَجَهُ التِّرْمِذِيُّ، وَصَحَّحَهُ، وَخُولِفَ فِي ذٰلِكَ. (اسے ترمذی نے نقل کیا ہے اور صحیح قرار دیا ہے اور اس کے صحیح قرار دیئے جانے میں مخالفت کی گئی ہے)

حاصل کلام: اس حدیث سے یہ بھی ثابت ہو رہا ہے کہ مرد و عورت جس چیز کے بدلہ میں باہم مناکحت پر راضی ہو جائیں بس وہی ان کا مہر ہوگا۔ اس حدیث میں جس خاتون کا ذکر ہے وہ بنو فزارہ کی عورت تھی۔ حضور ﷺ نے خود اس سے دریافت فرمایا کہ "کیا تو نے جوتیوں کے بدلہ میں اپنا آپ مرد کے سپرد کر دینا پسند کر لیا ہے؟" اس نے کہا ہاں! تو آپؐ نے اس نکاح کو جائز رکھا۔

راوی حدیث: ﴿عبداللہ بن عامر بن ربیعہ رضی اللہ عنہ﴾ یہ صاحب ابو عمران عبداللہ بن عامر بن ربیعہ العدوی العنزی ہیں۔ اس کے نسب میں بہت اختلاف ہے۔ جب نبی ﷺ کی روح مبارک قبض کی گئی تو اس وقت ان کی عمر ۱۴ یا ۱۵ سال تھی۔ ۸۵ھ ایک قول کے مطابق ۹۰ھ میں وفات پائی۔

(۸۸۸) وَعَنْ سَهْلِ بْنِ سَعْدٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُمَا قَالَ: زَوَّجَ النَّبِيُّ ﷺ رَجُلاً اَمْرَأَةً بِخَاتَمٍ مِنْ حَدِيْدٍ. أَخْرَجَهُ الحَاكِمُ، وَهُوَ طَرَفٌ مِنَ الحَدِيْثِ الطَّوِيْلِ المُتَقَدِّمِ فِي أَوَائِلِ النِّكَاحِ.

حضرت سہل بن سعد رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے ایک مرد کا نکاح ایک عورت کے ساتھ کیا لوہے کی ایک انگوٹھی مہر میں دے کر۔ (اسے حاکم نے روایت کیا ہے۔ یہ کتاب النکاح کے آغاز میں مذکور طویل حدیث کا ایک ٹکڑا ہے)

حاصل کلام: حضرت سہل رضی اللہ عنہ سے مروی لمبی روایت پہلے گزر چکی ہے جس میں ایک خاتون نے اپنے آپ کو پیش کیا تھا۔ اس میں یہ نہیں تھا کہ نبی ﷺ نے لوہے کی انگشتری کے بدلہ میں اس خاتون کا نکاح کر دیا تھا۔ بلکہ اس میں یہ ہے کہ آپؐ نے نکاح کے خواہش مند کو لوہے کی انگوٹھی لانے کا حکم ارشاد فرمایا تھا اور جب وہ انگوٹھی بھی اسے نہ ملی تو اس عورت کے ساتھ اس کا نکاح قرآن پاک کی کچھ سورتوں کی تعلیم پر کر دیا۔ اگر یہ حدیث وہی ہے جو پہلے گزر چکی ہے جیسا کہ مصنف رحمہ اللہ نے خود اس کی طرف اشارہ بھی کر دیا تو پھر ان کی یہ بات کہ یہ طویل حدیث کا ٹکڑا ہے وہم سے خالی نہیں۔ الآ یہ کہ اس کی تاویل کی جائے کہ آپؐ نے لوہے کی انگوٹھی پر نکاح کی اجازت دی تھی۔ اگرچہ اس کے نہ ملنے پر عقد نہ ہوا بلکہ تعلیم قرآن کو مہر قرار دیا گیا۔ واللہ اعلم۔

(۸۸۹) وَعَنْ عَلِيٍّ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: لاَ يَكُونُ المَهْرُ أَقَلَّ مِنْ عَشْرَةِ دَرَاهِمَ. أَخْرَجَهُ الدَّارَقُطْنِيُّ مَوْقُوفاً، وَفِي سَنَدِهِ مَقَالٌ.

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ مہر دس درہم سے کم نہیں۔ (اسے دارقطنی نے موقوف روایت کیا ہے اور اس کی سند میں بھی کلام ہے)

لغوی تشریح: ﴿وفی سندہ مقال﴾ اور وہ یہ کہ اس کی سند میں داؤداودی ضعیف راوی ہے۔ دارقطنی ہی میں یہ روایت اور طرق سے منقول ہے مگر کوئی طریقہ بھی ضعف سے خالی نہیں۔

(٨٩٠) وَعَنْ عُقْبَةَ بْنِ عَامِرٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «**خَيْرُ الصَّدَاقِ أَيْسَرُهُ**». أَخْرَجَهُ أَبُو دَاوُدَ، وَصَحَّحَهُ الحَاكِمُ.

حضرت عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "بہترین حق مہر وہ ہے جس کا ادا کرنا نہایت آسان و سہل ہو۔" (اسے ابوداؤد نے روایت کیا ہے اور حاکم نے اسے صحیح کہا ہے)

لغوی تشریح: ﴿خیر الصداق ایسرہ﴾ آدمی پر اس کا ادا کرنا آسان و سہل ہو۔ یعنی وہ انسان کے مناسب حال ہو اور یہ دلیل ہے کہ مہر کی کم مقدار مستحب ہے اور جس کا ادا کرنا آسان و سہل نہ ہو وہ غیر مستحسن و غیر مستحب ہے۔

(٨٩١) وَعَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهَا، أَنَّ عَمْرَةَ بِنْتَ الجَوْنِ تَعَوَّذَتْ مِن رَسُولِ اللهِ ﷺ، حِيْنَ أُدْخِلَتْ عَلَيْهِ، تَعْنِي لَمَّا تَزَوَّجهَا، فَقَالَ: «لَقَدْ عُذْتِ بِمَعَاذٍ، **فَطَلَّقَهَا وَأَمَرَ أُسَامَةَ فَمَتَّعَهَا بِثَلَاثَةِ أَثْوَابٍ**». أَخْرَجَهُ ابْنُ مَاجَهْ، وَفِي إِسْنَادِهِ رَاوٍ مَتْرُوكٌ، وَأَصْلُ القِصَّةِ فِي الصَّحِيحِ مِنْ حَدِيثِ أَبِي أُسَيْدٍ السَّاعِدِيِّ.

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ عمرہ بنت الجون نے رسول اللہ ﷺ سے اس وقت اللہ تعالیٰ کی پناہ طلب کی جب وہ آپؐ کی خلوت گاہ میں آئی یعنی جب آپؐ سے نکاح کیا تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "تو نے ٹھیک پناہ دینے والے کی پناہ طلب کی ہے۔" پھر آپؐ نے اسے طلاق دے دی اور اسامہ رضی اللہ عنہ سے فرمایا کہ اس کو فائدے کے طور پر تین کپڑے دے دو۔ (اسے ابن ماجہ نے روایت کیا ہے۔ اس کی سند میں متروک راوی ہے۔ اس کا اصل قصہ صحیح بخاری میں ابواسید ساعدی سے مروی ہے)

لغوی تشریح: ﴿تعوذت﴾ اس نے پناہ لی۔ صحیح بخاری میں ابواسید سے مروی ہے کہ جونیہ کو رسول اللہ ﷺ کے پاس لایا گیا۔ جب اسے حضور ﷺ کی خلوت گاہ میں داخل کیا گیا تو آپؐ نے اسے فرمایا کہ "اپنے آپ کو مجھے ہبہ کر دے" تو وہ بولی ملکہ اپنے آپ کو اپنی رعایا کے ایک مرد کے سپرد کیسے کر سکتی ہے؟ آپؐ نے اپنا دست مبارک اس کی طرف بڑھایا کہ اس کا جوش ٹھنڈا ہو جائے تو وہ بولی میں تجھ سے اللہ کی پناہ پکڑتی ہوں۔ گفتگو کا یہ سیاق اس کا تقاضا کر رہا ہے کہ اس نے یہ بات یا تو اس لئے کہی کہ وہ اپنے آپ کو رسول اللہ ﷺ سے اعلیٰ و ارفع تصور کرتی تھی اور آپؐ کو اپنا ہم پلہ اور کفو نہ سمجھتی تھی اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس نے نبی ﷺ کو پہچانا ہی نہ ہو اور نہ آپؐ کے ارادے کو پہچان سکی کہ آپؐ نے اس کی جانب ہاتھ کس لئے بڑھایا۔ (بخاری کتاب الاشربہ، باب: ٣٠) میں ہے لوگوں نے اس سے پوچھا تجھے معلوم ہے کہ یہ کون تھے؟ وہ بولی مجھے تو معلوم نہیں۔ لوگوں نے اسے بتایا کہ وہ تو رسول اللہ ﷺ تھے تیرے پاس تشریف لائے تھے کہ پیغام نکاح دیں۔ وہ بولی پھر تو میں اس وجہ سے بدبخت و

بد قسمت ہوں۔ (الحدیث) ﴿لقد عذت﴾ صیغۂ مونث مخاطب۔ ﴿بمعاذ﴾ میم پر فتحہ کی صورت میں جس سے پناہ طلب کی جائے۔ یعنی تو نے اس سے پناہ طلب کی ہے جو اس پناہ دینے کا اھل ہے کہ اس سے پناہ مانگی جائے اور وہ ہے اللہ تعالیٰ کی ذات گرامی۔ ﴿فمتعها﴾ تمتیع سے ماخوذ ہے۔ یعنی اسے تین کپڑے بطور فائدہ کے عطا فرمائے۔ اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کی تعمیل میں۔ لا جناح علیکم ان طلقتم النساء مالم تمسوهن او تفرضوا لهن فريضة ومتعوهن على الموسع قدره وعلى المقتر قدره' متاعا بالمعروف' حقا على المحسنين (۲۳۶:۲) کچھ گناہ نہیں تم پر اگر طلاق دو تم عورتوں کو اس وقت کہ ان کو ہاتھ بھی نہ لگایا ہو اور نہ مقرر کیا ہو ان کے لئے مہر اور ان کو کچھ خرچ دو۔ صاحب مقدرت پر اس کے موافق اور تنگی والے پر اس کے موافق' جو خرچ کہ قاعدہ کے موافق ہے۔ لازم ہے نیکی کرنے والے پر۔

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ جس عورت کو دخول سے پہلے ہی طلاق ہو جائے ایسی مطلقہ قبل الدخول کو جس کا مہر بھی معین نہ ہوا ہو اسے کچھ مال دینا مسنون و مشروع ہے۔ علماء کی اکثریت اسے واجب کہتی ہے۔ آیت کا ظاہر بھی اسی کا مؤید ہے۔

راوی حدیث: ﴿عمرة بنت الجون﴾ عمرہ میں عین پر فتح اور میم ساکن' جون میں جیم پر فتح اور واؤ ساکن۔ اس جونیہ کے بارے میں اختلاف ہے اور اس میں بھی اختلاف ہے کہ اس روایت میں واقعی عمرہ ہی کا ذکر ہے۔ ابن جوزی اپنی کتاب "التلقیح" (ص: ۱۳) میں کہتے ہیں کہ یہ اسماء بنت نعمان بن ابی الجون بن حارث کندیہ ہیں۔ میں ابو اسید کی حدیث کے بعض طرق اس بات پر کرتے ہیں کہ یہ امیمہ بنت نعمان بن شراحیل ہے۔ امام زھری کے نزدیک یہ فاطمہ بنت ضحاک ہے۔ (التلقیح' ص: ۱۲) اور ظاہری طور پر معلوم ہوتا ہے کہ یہ سبھی ایک ہی عورت ہے۔ اور یہ اختلاف راویوں کے مختلف ہونے کی وجہ سے بڑے اور مختلف استعمال کی وجہ سے ہے۔ اور درست بات یہ ہے کہ اس کا نام امیمہ ہے۔

﴿ابواسید رضی اللہ عنہ﴾ اسد کی تصغیر۔ یہ صاحب مالک بن ربیعہ بن بدن ہیں۔ (با اور دال دونوں پر فتحہ) جو نام کی بجائے اپنی کنیت سے زیادہ مشہور تھے۔ غزوۂ بدر وغیرہ میں شریک ہوئے۔ ۳۰ھ میں وفات پائی اور ایک قول کے مطابق اس کے بعد وفات پائی۔ یہاں تک کہ مدائنی کے قول کے مطابق ۶۰ھ میں وفات پائی اور بدری صحابہ میں سے وفات پانے والے سب سے آخری صحابی ہیں۔

٤ - بَابُ الوَلِيمَةِ — ولیمہ کا بیان

(۸۹۲) عَنْ أَنَسِ بْنِ مَالِكٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ رَأَى عَلَى عَبْدِ الرَّحْمٰنِ بْنِ عَوْفٍ أَثَرَ

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ کے کپڑوں پر زرد رنگ لگا ہوا دیکھا۔ آپ نے فرمایا "یہ کیا ہے؟"

صُفْرَةٍ، فقال: «ما هذا؟» قَالَ: يَا رَسُولَ اللهِ! إِنِّيْ تَزَوَّجْتُ امْرَأَةً عَلَى وَزْنِ نَوَاةٍ مِّنْ ذَهَبٍ، قَالَ: «فَبَارَكَ اللَّهُ لَكَ، أَوْلِمْ وَلَوْ بِشَاةٍ». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ، وَاللَّفْظُ لِمُسْلِمٍ.

عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ نے کہا اللہ کے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) میں نے ایک عورت سے ایک گھٹلی کے مساوی سونا دے کر نکاح کیا ہے۔ آپ ؐ نے فرمایا "اللہ تعالیٰ تجھے برکت دے' ولیمہ ضرور کرو خواہ ایک بکری ہی ہو۔" (بخاری و مسلم' اور الفاظ مسلم کے ہیں)

لغوی تشریح: ﴿باب الولیمۃ﴾ شادی بیاہ کے موقع پر جو کھانا تیار کیا جاتا ہے۔ ﴿الولم﴾ سے مشتق ہے۔ "ولم" میں "واؤ" پر فتحہ اور "لام" ساکن۔ اس کے معنی جمع ہونے اور اکٹھا ہونے کے ہیں' میاں بیوی چونکہ اکٹھے ہوتے ہیں اس لئے اس کو ولیمہ کہتے ہیں۔ ولیمہ سنت ہے اور بعض نے اسے واجب بھی کہا ہے' اور ولیمہ کا صحیح وقت خلوت صحیحہ کے بعد ہے۔ ﴿اثر صفرۃ﴾ زرد رنگ کا اثر و نشان۔ یہ زرد رنگ زعفران سے تھا جو ان کی بیوی پر بطور خوشبو لگا ہوا تھا۔ ایسا نہیں کہ انہوں نے دیدہ دانستہ و عمداً زعفران کا رنگ لگایا تھا کیونکہ مردوں کیلئے زعفرانی رنگ اور اس کی خوشبو کا استعمال شرعاً ویسے ہی ممنوع ہے بلکہ یہ عورتوں کا (مخصوص) شعار ہے اور مردوں کو اس لئے منع کیا گیا ہے کہ عورتوں کے ساتھ مشابہت نہ ہو۔ ﴿علی وزن نواۃ من ذھب﴾ ایک قول یہ ہے نواۃ سونے کا معروف و مشہور وزن جو پانچ درہم کے برابر ہوتا ہے اور ایک قول یہ ہے کہ اس سے کھجور کی گٹھلی مراد ہے یعنی کھجور کی گٹھلی کے برابر وزن۔ پہلا قول صحیح ہے۔ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے نواۃ کا وزن تین درہم کے برابر ہوتا ہے اور نواۃ لغت میں تو کھجور کے بیج یعنی گٹھلی وغیرہ کو کہتے ہیں ﴿اولم ولو بشاۃ﴾ یہاں "لو" تقلیل کیلئے مستعمل ہے یعنی کم از کم بکری ذبح کرو۔ لیکن یہ بھی ثابت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی بعض ازواج کا ایک بکری سے کم کا ولیمہ بھی کیا ہے لہٰذا مستحب یہ ہے کہ شوہر کی مالی حیثیت و حال کے حسب حال ہو۔ یہ حدیث اس پر محمول ہے کہ عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ کی مالی حالت کے پیش نظر ایک بکری کا ولیمہ کرنا قلیل تھا۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ مطلقاً ایک بکری کم ہے۔

(٨٩٣) وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا، قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «إِذَا دُعِيَ أَحَدُكُمْ إِلَى الوَلِيمَةِ فَلْيَأْتِهَا». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ. وَلِمُسْلِمٍ: «إِذَا دَعَا أَحَدُكُمْ أَخَاهُ فَلْيُجِبْ»، عُرْساً كَانَ أَوْ نَحْوَهُ.

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "جب تم میں سے کسی کو دعوت ولیمہ پر مدعو کیا جائے تو اسے وہاں پہنچنا چاہئے۔" (بخاری و مسلم) اور مسلم کی روایت میں ہے "جب تم میں سے کسی کو اس کا بھائی مدعو کرے تو اسے اس کی دعوت کو قبول کرنا چاہئے خواہ وہ شادی ہو یا اسی طرح کی

کوئی اور دعوت۔"

حاصل کلام: یہ حدیث شادی کے موقع پر کی جانے والی دعوت ولیمہ کو منظور و قبول کرنے کو واجب قرار دیتی ہے اور جمہور کی رائے یہی ہے۔ انہوں نے یہ شرط ضرور لگائی ہے کہ وہاں تک پہنچنے میں کوئی امر مانع نہ ہو۔ مثلاً کھانا ہی مشتبہ نہ ہو یا مالداروں کو بالخصوص مدعو کیا گیا ہو یا باطل کام کیلئے تعاون و استعانت کیلئے اسے دعوت دی گئی ہو یا وہاں ایسا کام ہو جو غیر پسندیدہ اور شرعاً منکر کی تعریف میں آتا ہو۔

(٨٩٤) وَعَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولَ اللهِ ﷺ: «شَرُّ الطَّعَامِ طَعَامُ الوَلِيمَةِ يُمْنَعُهَا مَنْ يَأْتِيهَا، وَيُدْعَى إِلَيْهَا مَنْ يَأْبَاهَا، وَمَنْ لَمْ يُجِبِ الدَّعْوَةَ فَقَدْ عَصَى اللَّهَ وَرَسُولَهُ». أَخْرَجَهُ مُسْلِمٌ.

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "بدترین کھانا ولیمہ کا کھانا ہے جو آنے والے (مستحقین) کو روکتا ہو اور جو آنے سے انکاری ہو اسے مدعو کرتا ہو اور جس نے دعوت ولیمہ کو قبول و منظور نہ کیا تو اس نے اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کی۔" (مسلم)

لغوی تشریح: ﴿ یمنعها ﴾ صیغہ مجہول۔ معنی ہیں کہ اس سے روکتا ہو۔ ﴿ من یاتیها ﴾ جو برضا و رغبت شمولیت کرنا چاہتا ہو اور وہ ہیں فقراء لوگ۔ ﴿ من یاباها ﴾ یعنی جو اس میں شامل ہونے سے انکاری ہو اس سے مراد مالدار ہیں۔ یہ ہے کہ جس دعوت طعام میں فقراء اور اغنیاء دونوں کو مدعو کیا ہو۔ اس میں شر نہیں۔

(٨٩٥) وَعَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «إِذَا دُعِيَ أَحَدُكُمْ فَلْيُجِبْ، فَإِنْ كَانَ صَائِماً فَلْيُصَلِّ، وَإِنْ كَانَ مُفْطِراً فَلْيَطْعَمْ». أَخْرَجَهُ مُسْلِمٌ أَيْضاً.

وَلَهُ مِنْ حَدِيْثِ جَابِرٍ نَحْوُهُ، وَقَالَ: «فَإِنْ شَآءَ طَعِمَ، وَإِنْ شَآءَ تَرَكَ».

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے ہی مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ "جب تم میں سے کسی کو دعوت ولیمہ پر مدعو کیا جائے تو اسے منظور کرنا چاہئے۔ اگر وہ روزے سے ہو تو دعا کرے اور اگر روزے سے نہ ہو تو پھر اسے کھانا کھانا چاہئے۔" (مسلم)

اور مسلم میں حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے بھی اسی طرح کی روایت ہے اور اس میں آپ کا ارشاد ہے کہ "اگر وہ چاہے تو کھانا کھا لے اور اگر وہ چاہے تو چھوڑ دے یعنی نہ کھائے۔"

لغوی تشریح: ﴿ فان کان صائما فلیصل ﴾ اگر روزے سے ہو تو پھر اسے چاہئے کہ مہمان نوازوں کیلئے مغفرت و برکت کی دعا کرے اور یہ جمہور کا قول ہے اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ وہ نماز میں مشغول ہو

جائے تاکہ اس نماز کی برکت میں اہل خانہ اور دیگر حاضرین سب ہی شامل ہو جائیں۔

(٨٩٦) وَعَنِ ابْنِ مَسْعُودٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ: «طَعَامُ الوَلِيمَةِ أَوَّلَ يَوْمٍ حَقٌّ، وَطَعَامُ يَوْمِ الثَّانِي سُنَّةٌ، وَطَعَامُ يَوْمِ الثَّالِثِ سُمْعَةٌ، وَمَنْ سَمَّعَ سَمَّعَ اللّٰهُ بِهِ». رَوَاهُ التِّرمِذِيُّ، وَاسْتَغْرَبَهُ، وَرِجَالُهُ رِجَالُ الصَّحِيحِ، وَلَهُ شَاهِدٌ عَنْ أَنَسٍ عِنْدَ ابْنِ مَاجَهْ.

حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "ولیمہ کا کھانا پہلے روز حق ہے اور دوسرے روز سنت ہے اور تیسرے روز کھانا تو محض نمود و نمائش اور شہرت و ریاکاری ہے۔ جو شخص ریاکاری کرے گا اللہ تعالیٰ اسے اس ریاکاری کی سزا دے گا۔" (اس روایت کو ترمذی نے روایت کیا ہے اور اسے غریب بھی قرار دیا ہے۔ حالانکہ اس حدیث کے راوی صحیح کے راویوں کے ہم پلہ ہیں اور ابن ماجہ میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی روایت کی صورت میں اس کا ایک شاہد بھی موجود ہے)

لغوی تشریح: ﴿ حق ﴾ کا معنی ثابت شدہ یا واجب۔ ﴿ وطعام یوم الثانی سنۃ ﴾ اس فقرہ میں سنۃ کا معنی مروج طریقہ' لوگوں میں معروف و مشہور رواج جو منکر و ناپسندیدہ نہ ہو۔ ﴿ سمعۃ ﴾ سین پر ضمہ اور میم ساکن ریاء و دکھاوا کے معنی۔ تاکہ لوگوں دکھائے اور ان سے ریاکاری کرے۔ ﴿ ومن سمع سمع اللہ بہ ﴾ سمع میں میم پر تشدید (دونوں جگہ) یعنی جو شخص سخاوت وغیرہ کے ذریعے اپنی شہرت اور ریاکاری یا تکبر کا اظہار کرے گا۔ اللہ تعالیٰ قیامت کے روز محشر کے کھلے میدان میں اسے اس عنوان سے مشہور کرے گا کہ یہ جھوٹا اور شہرت پسند ہے۔

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ ولیمہ دو دن تک تو درست ہے مگر تیسرے دن بھی اس کا اہتمام نمود و نمائش اور ریاکاری کا باعث ہے۔ بعض حضرات نے کہا ہے کہ تیسرے دن کی ممانعت تب ہے جب کھانے والے وہی لوگ ہوں لیکن اگر ہر روز نئے لوگ مدعو ہوں تو کوئی مضائقہ نہیں۔ امام بخاری رحمہ اللہ وغیرہ تو سات دن تک بھی ولیمہ کے قائل ہیں۔ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی اس حدیث کے بارے میں حافظ ابن حجر رحمہ اللہ کا یہ کہنا کہ اس کے راوی الصحیح کے راوی ہیں یہ بات محل نظر ہے بلکہ اس باب کی دوسری احادیث بھی کلام سے خالی نہیں۔ (سبل)

(٨٩٧) وَعَنْ صَفِيَّةَ بِنْتِ شَيْبَةَ قَالَتْ: أَوْلَمَ النَّبِيُّ ﷺ عَلَى بَعْضِ نِسَآئِهِ بِمُدَّيْنِ مِنْ شَعِيرٍ. أَخرَجَهُ البُخَارِيُّ.

حضرت صفیہ بنت شیبہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے اپنی بعض بیویوں کا ولیمہ دو مد جو سے کیا۔ (بخاری)

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ مختلف شادیوں کی صورت میں ضروری نہیں کہ ولیمہ ایک ہی جیسا ہو۔ حسب حال ولیمہ کرنا چاہئے۔ آپؐ نے ولیمہ میں بکری بھی ذبح کی اور ستو اور کھجور بھی ولیمہ میں کھلائے اور حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا کے ولیمہ میں صرف دو مد جو پر اکتفا فرمایا۔

راوی حدیث: ﴿صفیہ بنت شیبہ رضی اللہ عنہا﴾ صفیہ بنت شیبہ بن عثمان بن ابی طلحہ الحجی بنو عبد الدار میں سے تھیں۔ ایک قول یہ ہے کہ انہوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا ہے اور ایک قول کے مطابق ان کی رؤیت ثابت نہیں ہے۔ ابن سعد نے بڑے دعوے سے کہا ہے کہ وہ تابعیہ تھیں۔

(٨٩٨) وَعَنْ أَنَسٍ قَالَ: أَقَامَ النَّبِيُّ ﷺ بَيْنَ خَيْبَرَ وَالمَدِيْنَةِ ثَلاَثَ لَيَالٍ، يُبْنَى عَلَيْهِ بِصَفِيَّةَ، فَدَعَوتُ المُسْلِمِيْنَ إِلٰى وَلِيْمَتِهِ، فَمَا كَانَ فِيْهَا مِنْ خُبْزٍ وَلاَ لَحْمٍ، وَمَا كَانَ فِيْهَا إِلاَّ أَنْ أَمَرَ بِالأَنْطَاعِ فَبُسِطَتْ، فَأَلْقَى عَلَيْهَا التَّمْرُ وَالأَقِطَ وَالسَّمْنَ. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ، وَاللَّفْظُ لِلْبُخَارِيِّ.

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے خیبر اور مدینہ کے درمیان تین روز تک قیام کیا۔ صفیہ رضی اللہ عنہا سے اسی مقام پر شب باشی کی تو میں نے مسلمانوں کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ولیمہ کی دعوت دی۔ بس اس دعوت میں نہ روٹی تھی اور نہ گوشت۔ اس تقریب میں بس یہی تھا کہ آپؐ کے ارشاد گرامی کے مطابق چٹائیاں بچھائی گئیں اور ان پر کھجوریں' پنیر اور مکھن چن دیا گیا۔ (بخاری و مسلم اور یہ الفاظ بخاری کے ہیں)

لغوی تشریح: ﴿یبنی علیہ بصفیہ﴾ فعل صیغہ مجہول۔ یہ کنایہ ہے بیوی سے شب باشی و ہم بستری کا۔ ﴿بالانطاع﴾ نطع کی جمع ہے۔ همزہ کے نیچے کسرہ اور "طا" پر فتحہ اور دوسری صورت میں "همزہ" اور "طاء" دونوں پر فتحہ اور "طاء" ساکن بھی منقول ہے۔ چٹائی یا پھر چرمی چادر۔ ﴿الاقط﴾ همزہ پر فتحہ اور قاف پر کسرہ یا دونوں یعنی همزہ اور قاف دونوں کے نیچے کسرہ اور اس میں ایک اور لغت بھی ہے اور اس کا معنی سخت جما ہوا دودھ جسے پنیر کہتے ہیں اور کھجور اور پنیر اور مکھن کے مجموعے کو حیس کہتے ہیں اور ترمذی اور ابوداؤد میں ہے کہ آپؐ کے ولیمہ میں ستو اور کھجور تھے۔ اس میں ستو ملا لئے۔ اس طرح وہ حیس نامی چیز سے اسے خارج نہیں کر دیتی۔

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ دوران سفر شادی کرنا جائز ہے تو سب رشتہ داروں کا شامل کرنا بھی لازمی اور ضروری نہ رہا۔ نیز ثابت ہوا کہ ولیمہ میں ایک سے زائد کھانے کی اشیاء بھی جائز ہیں۔ البتہ اس میں اسراف سے بہرنوع اجتناب ضروری ہے۔

(۸۹۹) وَعَنْ رَجُلٍ مِنْ أَصْحَابِ النَّبِيِّ ﷺ، قَالَ: إِذَا اجْتَمَعَ دَاعِيَانِ فَأَجِبْ أَقْرَبَهُمَا بَاباً، فَإِنْ سَبَقَ أَحَدُهُمَا فَأَجِبِ الَّذِيْ سَبَقَ. رَوَاهُ أَبُو دَاوُدَ، وَسَنَدُهُ ضَعِيفٌ.

اصحاب نبی ﷺ میں سے ایک صحابی سے مروی ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا "جب دو آدمیوں نے دعوت طعام دی ہو تو جس کا دروازہ متصل و قریب ہو اس کی دعوت قبول کرو اور ان میں سے جو پہلے دعوت دے اس کی دعوت قبول کر لو۔" (اسے ابوداؤد نے روایت کیا ہے' اس کی سند ضعیف ہے)

(۹۰۰) وَعَنْ أَبِيْ جُحَيْفَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «**لاَ آكُلُ مُتَّكِئاً**». رَوَاهُ الْبُخَارِيُّ.

حضرت ابوجحیفہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ "میں ٹیک لگا کر نہیں کھایا کرتا۔" (بخاری)

لغوی تشریح: ﴿ متکئا ﴾ متکئا کی تفسیر میں اختلاف ہے۔ ایک قول یہ ہے کہ چوکڑی مار کر ٹیک لگا کر ہموار زمین پر بیٹھنا اور ایک قول یہ ہے کہ اپنے بائیں ہاتھ سے زمین پر ٹیک لگانا اور ایک قول یہ بھی ہے کہ اپنے کسی ایک پہلو کے بل جھک جانا اور ایک قول یہ ہے کہ کسی طرح مضبوطی سے جم کر بیٹھ جانا۔ خطابی کا قول یہ ہے کہ عوام تو متکئا اسے سمجھتے ہیں کہ کھانے والا اپنے کسی ایک پہلو کے بل بیٹھ جائے۔ حالانکہ ایسا نہیں ہے بلکہ صحیح یہی ہے کہ اس سے مراد ہموار زمین پر مضبوطی سے ٹیک لگا کر بیٹھنا ہے اور کراہت و ناپسندیدگی کی وجہ یہ ہے کہ ٹیک لگا کر چوکڑی مار کر کھانا دنیا کے متکبرین اور مختلف اقسام کے کھانے کثرت سے کھانے والوں کی عادت ہے۔

(۹۰۱) وَعَنْ عُمَرَ بْنِ أَبِيْ سَلَمَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ لِي رَسُولُ اللهِ ﷺ: «**يَا غُلاَمُ سَمِّ اللَّهَ، وَكُلْ بِيَمِينِكَ، وَكُلْ مِمَّا يَلِيكَ**». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت عمر بن ابی سلمہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے مجھے فرمایا "اے بچے! اللہ کا نام لے کر کھانا شروع کرو اور اپنے سیدھے ہاتھ سے کھاؤ اور اپنے سامنے سے کھاؤ۔" (بخاری و مسلم)

حاصل کلام: معلوم ہوا کہ کھانا ہمیشہ بسم اللہ پڑھ کر دائیں ہاتھ سے اور اپنے سامنے سے کھانا چاہئے البتہ اگر کھانے کی اشیاء مختلف ہیں تو دل پسند چیز جہاں ہو لے سکتا ہے جیسا کہ دوسری احادیث سے ثابت ہوتا ہے۔

راوی حدیث: ﴿ عمر بن ابی سلمہ رضی اللہ عنہ ﴾ عمر بن ابی سلمہ عبداللہ بن عبدالاسد بن ہلال مخزومی۔ یہ ام المومنین حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا کے لخت جگر تھے اور نبی ﷺ نے ان کی تربیت و پرورش فرمائی تھی۔

حبشہ میں پیدا ہوئے۔ ان کی پیدائش ہجرت حبشہ اور ہجرت مدینہ کے درمیانی عرصہ میں ہوئی تھی۔ ۸۳ھ میں وفات پائی۔

(۹۰۲) وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُمَا، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ أَتَى بِقَصْعَةٍ مِّنْ ثَرِيْدٍ، فَقَالَ: «**كُلُوا مِنْ جَوَانِبِهَا، وَلاَ تَأْكُلُوا مِنْ وَسَطِهَا، فَإِنَّ الْبَرَكَةَ تَنْزِلُ فِي وَسَطِهَا**». رَوَاهُ الأَرْبعَةُ، وَهٰذَا لَفْظُ النَّسَائِيِّ، وَسَنَدُهُ صَحِيْحٌ.

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما **سے مروی ہے کہ نبی** ﷺ **کی خدمت میں ثرید سے بھرا ہوا ایک بڑا پیالہ پیش کیا گیا۔ آپ ؐ نے ہدایت فرمائی کہ "پیالے کے کناروں سے کھاؤ' درمیان سے نہ کھاؤ۔ اس لئے کہ برکت کا نزول درمیان میں ہوتا ہے۔"** (اسے چاروں نے روایت کیا ہے اور یہ لفظ نسائی کے ہیں اور اس کی سند صحیح ہے)

لغوی تشریح: ﴿ بقصعة من ثريد ﴾ قصعة بڑے پیالہ کو کہتے ہیں اور ثرید کہتے ہیں چورا کی ہوئی روٹی پر گوشت اور اس کا شوربا ڈال کر یکجا کر لینے کو۔

(۹۰۲/۱) وَعَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: مَا عَابَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ طَعَامًا قَطُّ، كَانَ إِذَا اشْتَهٰى شَيْئًا أَكَلَهُ، وَإِنْ كَرِهَهُ تَرَكَهُ. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ **سے مروی ہے کہ رسول اللہ** ﷺ **نے کبھی بھی کسی کھانے کو برا نہیں کہا۔ جب کسی چیز کی خواہش ہوتی تو تناول فرما لیتے اور اگر ناپسند فرماتے تو چھوڑ دیتے۔** (بخاری و مسلم)

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوا کھانے میں عیب نہیں نکالنا چاہئے۔ اگر طبیعت مائل ہو تو کھالیا جائے اور اگر طبائع کے موافق نہ ہو تو چھوڑ دے۔ عیب نکالنے سے کھانا تیار کرنے والے کی حوصلہ شکنی ہوتی ہے اور مہمان نواز پر اچھا اثر نہیں پڑتا نیز پکی ہوئی نعمت کی ناشکری کا مرتکب ہوتا ہے۔

(۹۰۳) وَعَنْ جَابِرٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُ، عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ: «**لاَ تَأْكُلُوا بِالشِّمَالِ فَإِنَّ الشَّيْطَانَ يَأْكُلُ بِالشِّمَالِ**». رَوَاهُ مُسْلِمٌ.

حضرت جابر رضی اللہ عنہ **نے نبی** ﷺ **سے روایت کی ہے کہ آپ ؐ نے فرمایا "بائیں ہاتھ سے نہ کھاؤ اس لئے کہ شیطان بائیں ہاتھ سے کھاتا ہے۔"** (مسلم)

(۹۰٤) وَعَنْ أَبِيْ قَتَادَةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُ، أَنَّ النَّبِيَّ قَالَ: «**إِذَا شَرِبَ أَحَدُكُمْ فَلاَ يَتَنَفَّسْ فِي الإِنَاءِ**». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ، وَلأَبِيْ دَاوُدَ عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ نَحْوُهُ وَزَادَ: «**أَوْ يَنْفُخُ فِيْهِ**» وَصَحَّحَهُ التِّرْمِذِيُّ.

حضرت ابو قتادہ رضی اللہ عنہ **سے روایت ہے کہ نبی کریم** ﷺ **نے فرمایا "تم میں سے جب کوئی مشروب پی رہا ہو تو برتن میں سانس نہ لے۔** (بخاری و مسلم) **ابن عباس** رضی اللہ عنہما **سے اسی طرح کی روایت ابوداؤد میں بھی ہے اور اس میں اتنا اضافہ ہے کہ "اس میں پھونک**

نہ مارے۔" (اور ترمذی نے اسے صحیح قرار دیا ہے)

لغوی تشریح: ﴿ فلا یتنفس ﴾ مبنی للمعلوم۔ سانس لینے سے ممانعت ہے۔ یہ اس لئے فرمایا کہ سانس برتن میں لینے سے اندیشہ ہے کہ مشروب میں سانس کے ذریعہ سانس لینے والے کا تھوک یا رال ٹپک جائے اور یہ دوسرے آدمی کی طبیعت پر ناگوار گزرے اور اس لئے بھی کہ سانس کے ذریعہ پھیپھڑے میں سے ہوا ایسی چیز خارج کر کے مشروب میں ڈال دے جو تندرست آدمی کی صحت کیلئے مضر ہو۔ یعنی جراثیم مشروب میں داخل ہو کر اسے خراب کر دیں اور مفید کے ساتھ غیر مفید شامل ہو کر یہ آمیزش شدہ مخلوط مواد صحت کی خرابی کا باعث بن جائے۔

٥ - بَابُ الْقَسْمِ - بیویوں میں باری کی تقسیم کا بیان

(٩٠٥) عَنْ عَآئِشَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهَا، قَالَتْ: كَانَ رَسُولُ اللهِ ﷺ يَقْسِمُ لِنِسَآئِهِ، فَيَعْدِلُ، وَيَقُوْلُ: «**اللَّهُمَّ هَذَا قَسْمِي فِيمَا أَمْلِكُ، فَلاَ تَلُمْنِي فِيمَا تَمْلِكُ، وَلاَ أَمْلِكُ**». رَوَاهُ الأَرْبَعَةُ، وَصَحَّحَهُ ابْنُ حِبَّانَ وَالحَاكِمُ، لٰكِنْ رَجَّحَ التِّرْمِذِيُّ إِرْسَالَهُ.

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ اپنی ازواج مطہرات کے درمیان باری تقسیم کرتے تھے اور عدل و انصاف کو ملحوظ رکھتے تھے اس کے بعد اللہ تعالیٰ کے حضور عرض کرتے تھے۔ "الٰہی جو میرے بس میں ہے اس کے مطابق میں نے یہ تقسیم کی ہے اور جو میرے بس میں نہیں تیرے اختیار میں ہے' اس میں مجھے ملامت نہ کرنا۔" (اسے چاروں نے روایت کیا ہے اور ابن حبان اور حاکم نے اسے صحیح قرار دیا ہے لیکن ترمذی نے اس روایت کے مرسل ہونے کو ترجیح دی ہے)

لغوی تشریح: ﴿ باب القسم ﴾ "قاف" پر فتحہ اور "سین" ساکن۔ بیویوں کے درمیان باری مقرر کرنا اور وہ اس طرح کہ خاوند اپنی بیویوں کے ہاں ایک ایک دن جانے کو مقرر کر دے۔ ﴿ فیعدل ﴾ عدل سے ماخوذ ہے جو جور کے مقابلہ میں آتا ہے۔ ﴿ هذا قسمی فیما املك ﴾ بیویوں کے ہاں رہنے میں حتی المقدور یہ میری تقسیم ہے۔ ﴿ فلا تلمنی ﴾ مجھے ملامت نہ کر اور نہ میرا مؤاخذہ فرمایا جس میں مجھے کوئی اختیار حاصل نہیں۔ ﴿ فیما تملك ولا املك ﴾ یعنی قلبی میلان اور محبت کے بارے میں جو ایک دوسری کیلئے کم و بیش ہوتی ہے جو انسان کی مقدرت میں نہیں اس میں میرا مؤاخذہ اور جواب طلبی نہ فرمانا۔

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ اپنی بیویوں کے درمیان عدل و انصاف پر قائم رہنا چاہئے۔ البتہ دلی میلان اگر کسی کی طرف ہو تو اس میں کوئی مؤاخذہ نہیں ہوگا۔ کیونکہ عورتیں سیرت و کردار'

اخلاق اور حسن و جمال اور عادات و خصائل کی وجہ سے مختلف ہوتی ہیں جس عورت میں حسن و جمال اور اخلاق و اوصاف اور شوہر کی فرمانبرداری زیادہ ہوگی' شوہر کا میلان قدرتی طور پر اس کی جانب زیادہ ہوگا۔

(٩٠٦) وَعَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ: «مَنْ كَانَتْ لَهُ امْرَأَتَانِ فَمَالَ إِلَى إِحْدَاهُمَا جَاءَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَشِقُّهُ مَائِلٌ». رَوَاهُ أَحْمَدُ وَالأَرْبَعَةُ، وَسَنَدُهُ صَحِيْحٌ.

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا کہ "جس شخص کی دو بیویاں ہوں اور خاوند کا میلان ایک کی طرف رہا تو قیامت کے روز وہ ایسی حالت میں آئے گا کہ اس کا ایک پہلو جھکا ہوا ہو گا۔" (اسے احمد اور چاروں نے روایت کیا ہے اور اس کی سند صحیح ہے)

لغوی تشریح: ﴿ شقه ﴾ اس کا ایک پہلو۔ ﴿ مائل ﴾ یعنی مفلوج' ترمذی میں ﴿ ساقط ﴾ کا لفظ ہے یعنی گرا ہوا۔ تحفۃ الاحوذی کے مطابق بعض روایات میں ہے کہ ایسا شوہر قیامت کے روز ایسی حالت میں آئے گا کہ وہ اپنے ایک مفلوج لٹکے ہوئے پہلو کے ساتھ آئے گا۔ دونوں بیویوں میں سے ایک کی طرف میلان و رجحان سے مراد باری کی تقسیم اور اخراجات و مصارف میں ناانصافی کرنا ہے جن میں وہ برابری کا اختیار رکھتا ہے۔

(٩٠٧) وَعَنْ أَنَسٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، قَالَ: «مِنَ السُّنَّةِ إِذَا تَزَوَّجَ الرَّجُلُ الْبِكْرَ عَلَى الثَّيِّبِ، أَقَامَ عِنْدَهَا سَبْعاً، ثُمَّ قَسَمَ، وَإِذَا تَزَوَّجَ الثَّيِّبَ، أَقَامَ عِنْدَهَا ثَلاَثاً، ثُمَّ قَسَمَ». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ، وَاللَّفْظُ لِلْبُخَارِيِّ.

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ مسنون طریقہ یہ ہے کہ جب مرد شوہر دیدہ پر کنواری بیاہ کر لائے تو اس نئی دلہن کے پاس پہلے سات روز قیام کرے پھر باری تقسیم کرے اور جب شوہر دیدہ سے نکاح کرے تو اس کے پاس تین روز قیام کرے پھر باری تقسیم کرے۔ (بخاری و مسلم اور یہ الفاظ بخاری کے ہیں)

لغوی تشریح: ﴿ اذا تزوج الرجل البکر علی الثیب ﴾ یعنی جب آدمی کے پاس پہلے سے بیوی موجود ہو پھر کنواری سے شادی کرے۔ اس حدیث سے یہ ثابت ہوا کہ نئی بیوی سے شب عروسی اس کا حق ہے اور دوسریوں پر اسے ترجیح دی جائے گی۔ یہ مدت ختم ہونے کے بعد پھر جدیدہ و قدیمہ نئی و پرانی بیویاں باریوں کی تقسیم میں مساوی استحقاق رکھتی ہیں۔

(٩٠٨) وَعَنْ أُمِّ سَلَمَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهَا، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ لَمَّا تَزَوَّجَهَا، أَقَامَ عِنْدَهَا ثَلاَثاً، وَقَالَ: «إِنَّهُ لَيْسَ بِكِ عَلَى أَهْلِكِ هَوَانٌ، إِنْ

حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ نبی ﷺ نے جب ان سے نکاح کیا تو ان کے پاس تین روز قیام کیا اور فرمایا کہ "اپنے اہل کے نزدیک تو ذلیل نہیں ہے۔ اگر چاہے تو میں تیرے لئے سات روز مقرر کر

شِئْتِ سَبَّعْتُ لَكِ، وَإِنْ سَبَّعْتُ لَكِ سَبَّعْتُ لِنِسَآئِي». رَوَاهُ مُسْلِمٌ.

کے قیام کرتا ہوں۔ پھر میں اپنی باقی سب عورتوں کے ہاں بھی سات سات روز قیام کروں گا۔" (مسلم)

لغوی تشریح: ﴿لیس بک علی اھلک ھوان﴾ میں "باء" سببیہ ہے اور اھل سے مراد اس عورت کا اپنا قبیلہ مراد ہے اور ھوان سے مراد حقیر و ذلیل۔ معنی یہ ہوا کہ تیرے سبب یا تیری وجہ سے تیرا قبیلہ ذلیل نہیں ہے اور ایک قول یہ بھی ہے کہ اس اھل سے مراد خود نبی ﷺ کی ذات گرامی ہے۔ اس صورت میں معنی یہ ہوا کہ میں نے تین روز کا عرصہ اس لئے مختصر نہیں رکھا کہ تیری ذات میری نظر میں ذلیل و حقیر ہے اور تیری ذات میں میری دلچسپی اور رغبت کم ہے بلکہ اس لئے کہ دراصل حکم یہی ہے۔ آپؐ نے حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے یہ اس لئے فرمایا کہ جب حضور ﷺ ان کے ہاں سے نکل کر تشریف لے جانے لگے تو حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا نے آپؐ کا دامن پکڑ لیا۔ ﴿سبعت لک﴾ تسبیع سے ماخوذ ہے۔ معنی یہ ہوئے کہ میں تیرے ہاں سات روز تک قیام کر سکتا ہوں اور دار قطنی کی روایت میں ہے اگر تیری منشا ہو تو یہ تین دن صرف تیرے ہاں قیام کر سکتا ہوں اور اگر تو چاہے تو سات روز مقرر کر کے قیام کروں اور اس کے آخر میں ہے میں نے عرض کیا تین روز میرے پاس خالصتاً قیام فرمائیں۔ اس حدیث میں دلیل ہے اس امر کی کہ اگر مدت مقررہ میں مزید اضافہ عورت کی طلب پر ہو تو اس کا حق ساقط ہو جاتا ہے۔ ساری بیویوں کا اس طرح استحقاق ہو گا۔

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ جب ایک آدمی کے پاس پہلے بیوی موجود ہو اور اب نئی دلہن لانا چاہتا ہو تو اگر اس نے ایسی عورت سے شادی کی جو شوہر دیدہ ہے تو اس کے ہاں تین روز قیام کرنا ہو گا اور اگر کنواری ہے تو اس کے پاس سات روز قیام کرنا ہو گا۔ اس کے بعد دونوں کے ہاں باری باری سے قیام کرنا ہو گا۔ یہ امام شافعی رحمہ اللہ اور اہلحدیث کا مسلک ہے۔ کنواری کیلئے سات روز اس لئے مقرر فرمائے کہ اس کا دل لگ جائے اور اس کی اجنبیت دور ہو جائے جبکہ شوہر دیدہ جلدی مانوس ہو جاتی ہے اور ماحول میں گھل مل جاتی ہے۔ اس لئے اس کیلئے تین روز مدت مقرر کر رکھی ہے۔ اس باب میں اور بھی صحیح احادیث منقول ہیں مگر احناف نے ان احادیث کی مخالفت کی ہے۔ قرآن مجید کو رسول اللہ ﷺ سے زیادہ اور کون جانتا اور سمجھتا ہے۔ احناف نے "فان خفتم ان لاتعدلوا" کی آیت سے دلیل لی ہے۔ حالانکہ یہ عدل کے منافی نہیں ہے۔ اس باب کی احادیث مشہور ہیں اور متعدد صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے مروی ہیں۔ لہٰذا کتاب اللہ کا تخصص ان سے جائز ہے۔

(۹۰۹) وَعَنْ عَآئِشَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهَا، أَنَّ سَوْدَةَ بِنْتَ زَمْعَةَ وَهَبَتْ يَوْمَهَا لِعَآئِشَةَ، وَكَانَ النَّبِيُّ ﷺ يَقْسِمُ لِعَآئِشَةَ يَوْمَهَا وَيَوْمَ سَوْدَةَ.

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ سودہ بنت زمعہ رضی اللہ عنہا نے اپنی باری کا دن حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو ہبہ کر دیا اور نبی ﷺ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کیلئے ان کا اپنا دن بھی اور حضرت سودہ رضی اللہ عنہا کا دن بھی تقسیم کرتے

مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

تھے۔ (بخاری و مسلم)

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ کوئی بیوی اپنی باری دوسری بیوی کو دے سکتی ہے یہ بخشش ناقابل رجوع اور ناقابل واپسی ہوگی۔ بشرطیکہ مقرر ایام کی تعیین نہ کی گئی ہو۔

(۹۱۰) وَعَنْ عُرْوَةَ قَالَ: قَالَتْ عَائِشَةُ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهَا: يَا ابْنَ أُخْتِيْ كَانَ رَسُولُ اللهِ ﷺ لاَ يُفَضِّلُ بَعْضَنَا عَلىٰ بَعْضٍ. فِي الْقَسْمِ، مِنْ مُكْثِهِ عِنْدَنَا وَكَانَ قَلَّ يَوْمٌ إِلاَّ وَهُوَ يَطُوفُ عَلَيْنَا جَمِيْعاً، فَيَدْنُو مِنْ كُلِّ امْرَأَةٍ، مِنْ غَيْرِ مَسِيْسٍ، حَتَّى يَبْلُغَ الَّتِيْ هُوَ يَوْمُهَا، فَيَبِيْتُ عِنْدَهَا. رَوَاهُ أَحْمَدُ وَأَبُو دَاوُدَ، وَاللَّفْظُ لَهُ، وَصَحَّحَهُ الحَاكِمُ.

وَلِمُسْلِمٍ عَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهَا قَالَتْ: كَانَ رَسُولُ اللهِ ﷺ إِذَا صَلَّى العَصْرَ دَارَ عَلٰى نِسَآئِهِ، ثُمَّ يَدْنُو مِنْهُنَّ. اَلْحَدِيْثَ.

حضرت عروہ رحمۃ اللہ علیہ سے روایت ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا' اے میری بہن کے لخت جگر! (بھانجے) رسول اللہ ﷺ اپنی ازواج مطہرات کی باری کی تقسیم میں کسی کو کسی پر فوقیت و فضیلت نہیں دیتے تھے۔ ہمارے پاس آپؐ کے قیام کے اعتبار سے آپؐ کا معمول تھا اور کم ہی ایسا کوئی دن ہوگا جس میں آپؐ ہمارے پاس گھومتے پھرتے نہ ہوں اور ہر بیوی کے پاس جاتے ضرور مگر کسی کو چھوتے تک نہ تھے۔ گھومتے گھومتے اس بیوی کے پاس پہنچ جاتے جس کی باری ہوتی تو رات اس کے پاس بسر فرماتے۔ (احمد وابوداؤد اور یہ الفاظ ابوداؤد کے ہیں' حاکم نے اسے صحیح کہا ہے)

اور مسلم میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نماز عصر ادا فرما کر اپنی ساری بیویوں کے ہاں تشریف لے جاتے پھر ان سے قرب بھی حاصل کرتے۔

لغوی تشریح: ﴿ يا ابن اختى ﴾ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا عروہ کو یوں مخاطب کرنا اس بنا پر تھا کہ عروہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی بہن حضرت اسماء بنت ابی بکر کے فرزند تھے۔ ﴿ لا يفضل ﴾ تفضيل سے ماخوذ ہے ﴿ فيدنو ﴾ پھر قرب حاصل کرتے یعنی ان سے محبت کا اظہار کرتے۔ ﴿ مسيس ﴾ جماع ﴿ دار ﴾ گھومے' طواف کرے۔

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ حضور ﷺ ہر روز اپنی ازواج مطہرات کی قیام گاہوں میں حالات معلوم کرنے کی غرض سے چکر ضرور لگاتے اور باہمی محبت و پیار کا اظہار کرتے۔ اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ ہر بیوی کی قیام گاہ الگ الگ ہونی چاہیے۔ اس سے پردہ داری بھی رہتی ہے۔ کم عمر بچوں کو پیار سے بلانا بھی ثابت ہو رہا ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے اپنے بھانجے کو يا ابن اختى کہہ کر

بلایا جس سے محبت اور پیار جھلکتا نظر آتا ہے۔

(۹۱۱) وَعَنْ عَآئِشَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهَا، أَنَّ رَسُولَ اللهِ ﷺ كَانَ يَسْأَلُ فِي مَرَضِهِ الَّذِيْ مَاتَ فِيْهِ: أَيْنَ أَنَا غَداً؟ يُرِيْدُ يَوْمَ عَآئِشَةَ، فَأَذِنَ لَهُ أَزْوَاجُهُ، يَكُونُ حَيْثُ شَآءَ، فَكَانَ فِيْ بَيْتِ عَآئِشَةَ. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے جس مرض میں وفات پائی اس میں دریافت فرماتے تھے کہ "کل میری باری کس کے ہاں ہے؟" ان کے پیش نظر حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا دن ہوتا تھا۔ آپؐ کی ازواج مطہرات نے اس کی اجازت دے دی کہ جہاں چاہیں رہیں۔ پس بعد میں آپؐ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے ہاں ہی رہے۔ (بخاری و مسلم)

حاصل کلام: ایک روایت میں ہے کہ آنحضور ﷺ کے مرض الموت کا آغاز حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا کے گھر سے شروع ہوا تھا۔ آخر بیماری نے اتنا کمزور اور ضعیف کر دیا کہ سب بیویوں کے گھر میں جانا دشوار ہوگیا تو حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا نے سب ازواج مطہرات سے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے ہاں مستقل قیام کی اجازت لے لی۔ انہوں نے برضا و رغبت آپؐ کو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے ہاں ٹھہرنے کی اجازت دے دی۔ یہ اجازت اس لئے طلب کی گئی کہ کسی کے ذہن میں کوئی نامناسب خیال پیدا نہ ہو جائے۔

(۹۱۲) وَعَنْهَا قَالَتْ: كَانَ رَسُولُ اللهِ ﷺ إِذَا أَرَادَ سَفَراً أَقْرَعَ بَيْنَ نِسَآئِهِ، فَأَيَّتُهُنَّ خَرَجَ سَهْمُهَا، خَرَجَ بِهَا مَعَهُ. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا ہی سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ جب کسی سفر پر روانہ ہونے کا ارادہ فرماتے تو اپنی بیویوں کے درمیان قرعہ اندازی کرتے۔ پس جس بیوی کے نام کا قرعہ نکلتا وہ آپؐ کی ہم سفر ہوتی۔ (بخاری و مسلم)

حاصل کلام: اس حدیث سے کسی مبہم معاملہ کے تصفیہ کیلئے قرعہ اندازی کا ثبوت ملتا ہے۔

(۹۱۳) وَعَنْ عَبْدِ اللهِ بْنِ زَمْعَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «لاَ يَجْلِدْ أَحَدُكُمُ امْرَأَتَهُ جَلْدَ العَبْدِ». رَوَاهُ البُخَارِيُّ.

حضرت عبداللہ بن زمعہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "تم میں سے کوئی بھی اپنی بیوی کو غلاموں کی طرح نہ مارے۔" (بخاری)

لغوی تشریح: ﴿ لایجلد ﴾ کوڑے نہ مارے۔ ﴿ جلد ﴾ باب ضرب یضرب ہے۔ "جلد" کہتے ہیں کوڑے سے مارنے کو۔ "جلد العبد" جس طرح غلام کو مارا پیٹا جاتا ہے کوڑوں سے۔ مصدر منصوب تشبیہ کیلئے لایا گیا ہے اس حدیث کے آخر میں یہ بھی ہے۔ ثم یجامعها کہ پھر اس سے جماع کرے۔ یہ مارنے کے فعل سے نفرت پیدا کرنے کیلئے لایا گیا ہے۔ ہر عقلمند اس جیسے سلوک کو پسند نہیں کرتا کہ

بیوی کو مارے پیٹے بھی اور اس سے شب باشی بھی کرے۔ البتہ اس حدیث کا سیاق اس پر دلالت کرتا ہے کہ ہلکی و خفیف مار جائز ہے۔

راوی حدیث : ﴿ عبداللہ بن زمعہ رضی اللہ عنہ ﴾ عبد اللہ بن زمعہ بن اسود بن عبدالمطلب بن اسد بن عبدالعزیٰ الاسدی حضرت سودہ بنت زمعہ کا بھائی۔ یہ مشہور صحابی ہیں۔ ان کا شمار اھل مدینہ میں ہوتا ہے۔ یوم الدار میں شہید ہوئے۔

٧ - بَابُ الخُلْعِ

خلع کا بیان

(٩١٤) عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا، أَنَّ ٱمْرَأَةَ ثَابِتِ بْنِ قَيْسٍ أَتَتِ النَّبِيَّ ﷺ، فَقَالَتْ: يَا رَسُولَ اللهِ! ثَابِتُ بْنُ قَيْسٍ مَا أَعِيبُ عَلَيْهِ فِي خُلُقٍ، وَلاَ دِيْنٍ، وَلٰكِنِّي أَكْرَهُ الكُفْرَ فِيْ الإِسْلاَمِ، فَقَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «**أَتَرُدِّينَ عَلَيْهِ حَدِيقَتَهُ؟**» فَقَالَتْ: نَعَمْ، فَقَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «**اقْبَلِ الحَدِيقَةَ وَطَلِّقْهَا تَطْلِيقَةً**». رَوَاهُ البُخَارِيُّ. وَفِي رِوَايَةٍ لَهُ: «وَأَمَرَهُ بِطَلاَقِهَا».

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ ثابت بن قیس رضی اللہ عنہ کی اہلیہ نبی ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئی اور عرض کیا۔ یا رسول اللہ (ﷺ)! میں ثابت بن قیس رضی اللہ عنہ کے اخلاق اور دین میں کوئی عیب نہیں لگاتی۔ لیکن اسلام میں کفر کو ناپسند کرتی ہوں۔ رسول اللہ (ﷺ) نے فرمایا "کیا تو اس کا باغ واپس کر دے گی؟" وہ بولی ہاں! تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "(اے ثابت)! اپنا باغ لے لو اور اسے طلاق دے دو۔" (بخاری)

وَلِأَبِيْ دَاوُدَ وَالتِّرْمِذِيِّ - وَحَسَّنَهُ -: أَنَّ امْرَأَةَ ثَابِتِ بْنِ قَيْسٍ ٱخْتَلَعَتْ مِنْهُ، فَجَعَلَ النَّبِيُّ ﷺ عِدَّتَهَا حَيْضَةً.

وَفِيْ رِوَايَةِ عَمْرِو بْنِ شُعَيْبٍ. عَنْ أَبِيْهِ، عَنْ جَدِّهِ. عِنْدَ ابْنِ مَاجَهْ: أَنَّ ثَابِتَ بْنِ قَيْسٍ كَانَ دَمِيْماً، وَأَنَّ امْرَأَتَهُ قَالَتْ: لَوْلاَ مَخَافَةُ اللهِ إِذا دَخَلَ عَلَيَّ لَبَصَقْتُ فِيْ

ابوداؤد اور ترمذی میں ہے کہ ثابت بن قیس رضی اللہ عنہ کی بیوی نے خلع کیا اور نبی ﷺ نے اس کیلئے عدت خلع ایک حیض مقرر فرمائی اور ابن ماجہ میں عمرو بن شعیب نے اپنے باپ کے واسطہ سے اپنے دادا سے روایت بیان کی ہے کہ ثابت بن قیس رضی اللہ عنہ بدصورت کالے رنگ کا آدمی تھا اور اس کی بیوی نے کہا اگر مجھے خدا کا خوف و ڈر نہ ہوتا تو جس وقت وہ میرے پاس آیا تھا میں اس کے منہ پر تھوک دیتی۔

وَجْهِهِ.

وَلِأَحْمَدَ مِنْ حَدِيْثِ سَهْلِ بْنِ أَبِي حَثْمَةَ: «وَكَانَ ذٰلِكَ أَوَّلَ خُلْعٍ فِي الإِسْلاَمِ».

اور مسند احمد میں سہل بن ابی حثمہ سے مروی ہے کہ اسلام میں یہ پہلا خلع تھا۔

لغوی تشریح: ﴿باب الخلع﴾ خلع کے "خاء" پر ضمہ اور "لام" ساکن۔ عورت کا مہر میں دیا ہوا معاوضہ واپس دیکر شوہر سے جدا اور الگ ہونا خلع کہلاتا ہے۔ یہ "خلع الثوب" سے ماخوذ ہے۔ جس کے معنی ہیں لباس اتارنا۔ کپڑا اتارنا۔ یہ اس بنا پر ہے کہ عورت مرد کے لئے اور مرد عورت کے لئے لباس ہے اور اس کا مصدر "خاء" کے ضمہ کے ساتھ آتا ہے جس کا معنی اجسام اور معانی میں جدائی اور علیحدگی کے ہیں۔ اور ایک قول یہ بھی ہے کہ یہ "خلع الثوب" خلعا سے ہے اور خلع امراتہ' خلعا وخلعۃ یعنی "خاء" پر ضمہ کے ساتھ بھی آتا ہے۔ ﴿ان امراۃ ثابت بن قیس﴾ ثابت بن قیس کی بیوی۔ اکثر روایات میں اس کا نام حبیبہ بنت سھل ہے اور بعض نے صحیح نام جمیلہ قرار دیا ہے اور بعض نے کہا ہے کہ صحیح نام مریم تھا۔ مگر پہلا قول ہی صحیح ہے اور اس کا احتمال بھی ہے کہ خلع کے واقعات متعدد ہوں اور یہ بھی احتمال ہے کہ بعض راویوں کو وہم ہوا ہو۔ ﴿ما اعیب﴾ عیب سے ماخوذ ہے اس صورت میں "یاء" کے ساتھ ہوگا اور یہ بھی مروی ہے کہ "یاء" کی بجائے "تاء" ہے اور اعیب کی بجائے اعتب ہے۔ ﴿خلق﴾ میں "خاء" اور "لام" دونوں پر ضمہ اور لام ساکن بھی منقول ہے یعنی خلق اور خلق جس کے معنی عادت اور طبیعت کے ہیں۔ مطلب یہ تھا کہ میں یہ نہیں کہتی کہ ثابت بد خلق اور دین کے اعتبار سے برا ہے ﴿ولکنی اکرہ الکفر فی الاسلام﴾ یعنی مجھے اس کا اندیشہ ہے کہ خاوند سے بغض اور بے رخی کے سبب میں حدود کو قائم نہ رکھ سکوں گی جو کہ سراسر اخلاق اسلام اور اس کے اوامر کے منافی ہیں اور یوں میں خاوند کی ناشکری کا ارتکاب کر بیٹھوں گی۔ اس نے یہ گفتگو اور خوف و اندیشہ کا اظہار اس لئے کیا کہ وہ دین کے ساتھ شدید پختہ عمل کے ساتھ ساتھ بہت خوبصورت تھی جبکہ ثابت بن قیس پست قامت اور نہایت کالے رنگ کے تھے۔ اس پر مستزاد یہ کہ وہ طبعیتاً سخت تھے اور عورتوں کو بہت مارنے والے تھے۔ ایک بار انہوں نے اپنی اسی بیوی کو اتنا مارا پیٹا کہ اس کا ہاتھ توڑ دیا۔ اسی وجہ سے اس کے دل میں اپنے خاوند کے بارے میں نفرت پیدا ہوگئی تھی۔ ﴿حدیقتہ﴾ ثابت بن قیس کا باغ' یہ باغ ثابت نے حبیبہ کو حق مہر میں دیا تھا۔ ﴿وطلقیہا﴾ تطلیقۃ سے۔ ایک طلاق دے دو۔ "طلقیہا" میں امر کا صیغہ ہے۔ ﴿الدمیم﴾ بدصورت۔ قبیح چہرے والا۔ یہ حدیث دلالت کر رہی ہے کہ عورت سے فدیہ قبول کرنے کے بعد طلاق دینے سے خلع واقع ہوگا اور ایک روایت میں ہے ﴿خذھما﴾ دونوں لے لو۔ یعنی دونوں باغ جو حق مہر میں دیئے تھے واپس لے لو اور اسے جدا کر دو اور ایک دوسری روایت میں ہے کہ ایک باغ اس عورت سے واپس لے لیا اور وہ اپنے میکے جا بیٹھی اور یہ

دلیل ہے کہ جب خاوند علیحدگی کیلئے اپنا دیا ہوا حق مہر واپس لے لے تو جدائی واقع ہو جائے گی اور بغیر طلاق دیئے نکاح فسخ ہو جائے گا۔ اسی سے اختلاف واقع ہوگیا کہ خلع طلاق ہے یا فسخ۔ ظاہر بلکہ بالکل نمایاں ہے کہ یہ فسخ ہے اس لئے کہ نبی ﷺ نے خلع کرنے والی کو صرف بطور عادت ایک حیض کا حکم فرمایا ہے اور طلاق کی عدت ایک حیض تو قطعاً نہیں ہے بلکہ اس کی عدت تین حیض ہے اور رہا طلاق کا حکم فرمانا' تو اس کے بارے میں کہا گیا ہے کہ جس عورت سے وطی کی گئی ہو طلاق کی وجہ سے مہر کی واپسی ایسی طلاق کو خلع بنا دیتی ہے۔ اسی وجہ سے کہا جاتا ہے کہ یہ طلاق لفظاً تو طلاق ہے مگر حقیقتاً فسخ ہے۔

حاصل کلام: اس حدیث سے ثابت ہوا کہ اگر بیوی کو معقول عذر ہو تو وہ حق مہر خاوند کو واپس دے کر خلع کرا سکتی ہے۔ ائمہ میں سے امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ' امام مالک رحمۃ اللہ علیہ و امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک خلع طلاق ہے اور امام احمد رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک خلع فسخ ہے۔ حق مہر سے زیادہ مال لینے میں بھی اختلاف ہے۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ اور امام مالک رحمۃ اللہ علیہ بلکہ جمہور کی رائے یہ ہے کہ جب نفرت کا اظہار عورت کی جانب سے ہو تو مرد کیلئے زیادہ لینا جائز ہے۔ مگر امام احمد رحمۃ اللہ علیہ' اسحٰق رحمۃ اللہ علیہ وغیرہ زیادہ لینے کے قائل نہیں۔

راوی حدیث: ﴿ثابت بن قیس رضی اللہ عنہ﴾ انصار کے قبیلہ خزرج سے تعلق رکھتے تھے اسی لئے انصاری خزرجی کہلائے۔ اکابر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں شمار ہوتے تھے۔ انصار اور رسول اللہ ﷺ کے خطیب تھے۔ احد اور بعد کے تمام غزوات میں شریک ہوئے اور نبی ﷺ نے ان کو جنت کی بشارت دی۔ ۱۲ھ میں یمامہ کی معرکہ آرائی میں شہید کئے گئے اور مرتبہ شہادت پر فائز ہوئے۔

٧ - بَابُ الطَّلاَقِ — طلاق کا بیان

(٩١٥) عَنِ ابْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «أَبْغَضُ الحَلاَلِ إِلَى اللهِ الطَّلاَقُ». رَوَاهُ أَبُو دَاوُدَ وَابْنُ مَاجَهْ، وَصَحَّحَهُ الحَاكِمُ، وَرَجَّحَ أَبُو حَاتِمٍ إِرْسَالَهُ.

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "حلال چیزوں میں سے اللہ تعالیٰ کے نزدیک سب سے زیادہ بری چیز طلاق ہے۔" (اسے ابوداؤد اور ابن ماجہ نے روایت کیا ہے اور حاکم نے اسے صحیح قرار دیا ہے اور ابوحاتم نے اس کے مرسل ہونے کو ترجیح دی ہے)

لغوی تشریح: ﴿باب الطلاق﴾ طلاق کے "طاء" پر فتحہ۔ لغت میں طلاق کے معنی بندھن کو کھولنا اطلاق سے مشتق ہے' جس کے معنی ہیں ارسال یعنی چھوڑ دینے اور ترک کر دینے کے بعد شرعاً نکاح کی گرہ (تعلق) کھول دینے کو کہتے ہیں۔ امام الحرمین کا قول ہے کہ جاہلیت میں بھی اس کو طلاق کہا جاتا تھا اور شرع نے بھی اسی کو برقرار رکھا۔

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ تمام اشیاء عنداللہ پسندیدہ نہیں۔ بعض باوجود حلال —

کے بھی ایسی ہیں جو اللہ تعالیٰ کو ناپسند ہیں۔ انہی میں سے ایک طلاق ہے۔ طلاق حلال ہے مگر اس لئے کہ بسا اوقات انسان مجبور ہوتا ہے اور مصلحت اسی کا تقاضا کرتی ہے کہ طلاق واقع ہو جائے اور بری اور ناپسندیدہ اس وجہ سے ہے کہ اس کی وجہ سے باہمی دشمنی اور بسا اوقات دیرینہ رقابت پیدا ہو جاتی ہے جو شیطان کی خوشی اور مسرت کا باعث ہوتی ہے۔ اس سے نہ ثواب ملتا ہے اور نہ ہی قرب الٰہی حاصل ہوتا ہے۔ اس لئے حتی الوسع اس سے اجتناب کرنا ہی بہتر ہے۔ احوال و ظروف کی بنا پر اس کی مختلف قسمیں ہیں اور مستحب و جائز بھی اور مکروہ و حرام بھی۔ جس کی تفصیل شروح احادیث اور کتب فقہ میں دیکھی جا سکتی ہیں۔

(٩١٦) وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا، أَنَّهُ طَلَّقَ امْرَأَتَهُ، وَهِيَ حَائِضٌ، فِيْ عَهْدِ رَسُولِ اللهِ ﷺ، فَسَأَلَ عُمَرُ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ رَسُولَ اللهِ ﷺ عَنْ ذٰلِكَ، فَقَالَ: «**مُرْهُ، فَلْيُرَاجِعْهَا، ثُمَّ لْيُمْسِكْهَا حَتَّى تَطْهُرَ، ثُمَّ تَحِيضَ، ثُمَّ تَطْهُرَ، ثُمَّ إِنْ شَاءَ أَمْسَكَ بَعْدُ، وَإِنْ شَاءَ طَلَّقَ قَبْلَ أَنْ يَمَسَّ، فَتِلْكَ العِدَّةُ الَّتِي أَمَرَ اللَّهُ أَنْ تُطَلَّقَ لَهَا النِّسَاءُ**». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

وَفِيْ رِوَايَةٍ لِمُسْلِمٍ: «**مُرْهُ فَلْيُرَاجِعْهَا، ثُمَّ لِيُطَلِّقْهَا طَاهِراً أَوْ حَامِلاً**».

وَفِيْ رِوَايَةٍ أُخْرَى لِلْبُخَارِيِّ: «وَحُسِبَتْ عَلَيْهِ تَطْلِيْقَةً».

وَفِيْ رِوَايَةٍ لِمُسْلِمٍ: قَالَ ابْنُ عُمَرَ: أَمَا أَنْتَ طَلَّقْتَهَا وَاحِدَةً أَوِ اثْنَتَيْنِ فَإِنَّ رَسُولَ اللهِ ﷺ أَمَرَنِي أَنْ أُرَاجِعَهَا، ثُمَّ أُمْسِكَهَا حَتَّى تَحِيْضَ

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ انہوں نے اپنی بیوی کو عہد نبوی ﷺ میں طلاق دے دی جبکہ وہ حالت حیض میں تھی۔ پس حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس کے بارے میں رسول اللہ ﷺ سے پوچھا' آپؐ نے فرمایا کہ "اسے کہو کہ رجوع کر لے اور اسے اس وقت تک روک لے کہ طہر شروع ہو جائے۔ پھر ایام آئیں پھر طہر شروع ہو پھر اگر چاہے تو اس کے بعد روک لے اور اگر چاہے تو طلاق دے۔ صحبت و مجامعت کرنے سے پہلے۔ پس یہ وہ عدت ہے جس کا اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے کہ اس میں عورتوں کو طلاق دی جائے۔" (بخاری و مسلم)

اور مسلم کی روایت میں ہے کہ اسے کہو "کہ اس سے رجوع کر لے پھر اسے چاہئے کہ طلاق ایسی حالت میں دے کہ وہ پاک ہو یا حاملہ ہو"

اور بخاری کی ایک دوسری روایت میں ہے کہ "یہ ایک طلاق شمار ہوگی"

اور مسلم کی ایک روایت میں ہے کہ ابن عمر رضی اللہ عنہما نے کہا اگر تو نے عورت کو ایک یا دو طلاقیں دی ہیں تو رسول اللہ ﷺ نے مجھے حکم ارشاد فرمایا کہ اس سے رجوع کر لوں۔ پھر اسے دوسرے حیض تک

حيضةً أُخْرَى، ثُمَّ أُمْهِلَهَا حَتَّى تَطْهُرَ، ثُمَّ أُطَلِّقَهَا قَبْلَ أَنْ أَمَسَّهَا، وَأَمَّا أَنْتَ طَلَّقْتَهَا ثَلاَثاً، فَقَدْ عَصَيْتَ رَبَّكَ فِيْمَا أَمَرَكَ بِهِ مِنْ طَلاَقِ امْرَأَتِكَ.

اپنے پاس رکھوں اور پھر اسے طہر تک مہلت دوں تب میں اسے ہاتھ لگانے سے پہلے طلاق دے دوں اور اگر تو نے اسے تین طلاقیں دے ڈالیں تو تو نے اپنی بیوی کو طلاق دینے کے معاملہ میں اپنے اللہ کی نافرمانی کی۔

وَفِيْ رِوَايَةٍ أُخْرَى: قَالَ عَبْدُاللهِ بْنُ عُمَرَ: فَرَدَّها عَلَيَّ، وَلَمْ يَرَهَا شَيْئاً، وَقَالَ: إِذَا طَهُرَتْ فَلْيُطَلِّقْ، أَوْ لِيُمْسِكْ.

اور ایک دوسری روایت میں ہے۔ عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے کہا کہ عورت کو مجھے واپس کر دیا گیا اور اس طلاق کو کچھ بھی نہ سمجھا گیا اور فرمایا گیا کہ جب عورت ایام سے پاک ہو جائے تو (ابن عمر رضی اللہ عنہما) طلاق دے یا روک لے۔

لغوی تشریح: ﴿ طلق امراته ﴾ ابن عمر رضی اللہ عنہما نے اپنی بیوی کو طلاق دے دی۔ جس خاتون کو طلاق دی اس کا نام آمنہ بنت غفار ہے یا آمنہ بنت عمار تھا اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس کا نام نوار تھا اور یہ بھی ممکن ہے کہ اس کا نام آمنہ ہو اور نوار اس کا لقب ہو۔ ﴿ مره فليراجعها ﴾ اسے کہو کہ اپنی بیوی سے رجوع کر لے۔ امام مالک رحمہ اللہ اور امام احمد رحمہ اللہ اور ایک روایت کی رو سے حضرت علی رضی اللہ عنہ نے رجوع کو واجب قرار دیا ہے جبکہ اس نے طلاق حیض کے ایام میں دی ہو۔ جمہور کے نزدیک یہ رجوع مستحب ہے اور ایک دوسری روایت میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سخت ناراض ہوئے اور یہ ناراضگی ایام حیض میں طلاق دینے کی حرمت پر دلالت کرتی ہے۔ ﴿ ثم ليمسكها حتى تطهر ﴾ پھر اسے چاہئے کہ عورت کو روکے رکھے کہ ایام حیض سے پاک ہو جائے یعنی اس حیض سے پاک ہو جائے جس میں طلاق دی ہے۔ ﴿ ثم تحيض ﴾ پھر دوسرا حیض آئے اور ﴿ ثم تطهر ﴾ دوسرے حیض سے پاک ہو جائے۔ اس کے بعد چاہے تو اسے روک لے یعنی طہر کے بعد دوسرے حیض سے پاک ہونے کے بعد۔ ﴿ وان شاء طلق ﴾ اگر چاہے تو جماع کرنے سے پہلے دوسرے طہر میں طلاق دے۔ یہ اس پر دلیل ہے کہ وہ پہلے طہر میں نہیں دوسرے طہر میں طلاق دے گا۔ ایک جماعت کا خیال ہے کہ پہلے طہر میں طلاق سے حرام ہو جائے گی اور ایک گروہ کا قول ہے کہ دوسرے طہر تک مؤخر کرنا مندوب ہے۔ انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد ﴿ ثم ليطلقها طاهرا او حاملا ﴾ سے استدلال کیا۔ پس اس میں اول اور ثانی کی قید کے بغیر مطلقاً حالت طہر میں طلاق کا جواز ہے۔ اس لئے کہ طلاق کی ممانعت تو حیض کی وجہ سے ہے۔ لہٰذا جب عورت نے طہارت جنابت حاصل کر لی تو تحریم کا سبب زائل ہو گیا تو اسی طہر میں طلاق دینا جائز ہوا۔ ﴿ فتلك العدة التى امر الله ان تطلق لها النساء ﴾ یہ وہ عدت ہے جس کا حکم اللہ تعالیٰ نے دیا ہے کہ اس کیلئے عورتوں کو طلاق دی جائے۔ اس کا ذکر ارشاد باری تعالیٰ ﴿ فطلقوهن لعدتهن ﴾ میں

ہے۔ عدۃ کے ایک معنی یہ کئے گئے ہیں کہ اس سے مراد مدت' وقت ہے۔ آپؐ کے فرمان میں ﴿ لھا ﴾ فی کے معنی میں ہے۔ معنی یہ ہوگا وہ طہر جس میں مباشرت اور جماع نہ کیا گیا ہو۔ یہ وقت ہے جس کا اللہ نے حکم دیا ہے کہ اس وقت میں عورتوں کو طلاق دی جائے اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ عدت سے معروف عدت ہی مراد ہے اور لام اس میں ابتدایہ ہے اس صورت میں معنی یہ ہوگا کہ عورتوں کو طلاق دو ان کی عدت کے اوقات کے آغاز و ابتداء میں۔ ﴿ وحسبت علیہ تطلیقۃ ﴾ فعل صیغۂ مجہول ہے اور حاسب سے مراد نبی ﷺ کی ذات گرامی ہے۔ اسے دار قطنی نے روایت کیا ہے۔ اس میں یہ بھی دلیل ہے کہ ایام حیض میں دی گئی طلاق واقع ہوگی۔ ممنوع قرار دی جانے کے باوجود وہ شمار کی جائے۔ لیکن ابن عمر رضی اللہ عنہما کا آخر میں مذکور قول اس کے معارض ہے ﴿ فردھا علی ولم یرھا شیئا ﴾ یہ قول حیض میں طلاق کے واقع نہ ہونے پر صریح و واضح دلیل ہے۔ اسی بنا پر اس طلاق کے حکم کے بارے میں علماء میں اختلاف ہے۔ اکثر علما کا مذہب یہ ہے کہ یہ طلاق واقع ہوگئی اور انہوں نے کہا ہے کہ ﴿ لم یرھا شیئا ﴾ کا قول منکر ہے کیونکہ اسے ابوالزبیر کے سوا اور کسی نے بیان نہیں کیا اور اس حکم میں دوسرے راویوں نے اس کے مخالف کہا ہے لہٰذا جب دوسرے راوی اس سے زیادہ ثقہ ہوں تو ابوالزبیر کا قول دلیل کیسے بنے گا۔ جیسا کہ ابن عبدالبر نے کہا ہے اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے کہ نافع رحمۃ اللہ علیہ ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت کرنے میں ابوالزبیر کے مقابلہ میں زیادہ پختہ ہے اور دونوں احادیث میں جو زیادہ پختہ ہے وہ زیادہ حقدار ہے کہ اس کے مطابق فیصلہ کیا جائے اور ابوداؤد کا قول ہے کہ تمام حدیثیں ابوزبیر کے قول کے خلاف ہیں اور خطابی نے کہا ہے کہ اہل حدیث کا قول ہے کہ ابوزبیر نے اس حدیث سے منکر حدیث اور کوئی روایت نہیں کی۔ انہوں نے کہا ہے کہ اگر یہ صحیح ہے تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ اسے کوئی مستقیم چیز نہیں سمجھا جو سنت میں جائز ہو اور حکم کے اختیار کرنے میں لازمی ہو۔ اگرچہ علی سبیل کراہت اس کیلئے لازمی ہے مگر ابن حزم رحمۃ اللہ علیہ اور ابن قیم رحمۃ اللہ علیہ کی رائے یہ ہے کہ طلاق واقع نہیں ہوگی۔ جو کوئی ان دونوں کے دلائل سے واقفیت بہم پہنچانا چاہے اسے المحلی لابن حزم اور زاد المعاد لابن القیم کی طرف رجوع کرنا چاہیئے۔

(۹۱۷) وَعَنْ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا، قَالَ: كَانَ الطَّلاَقُ عَلىٰ عَهْدِ رَسُولِ اللهِ ﷺ، وَأَبِيْ بَكْرٍ، وَسَنَتَيْنِ مِنْ خِلاَفَةِ عُمَرَ، طَلاَقُ الثَّلاَثِ وَاحِدَةٌ، فَقَالَ عُمَرُ: إِنَّ النَّاسَ قَدِ اسْتَعْجَلُوْا فِي أَمْرٍ كَانَتْ لَهُمْ فِيْهِ أَنَاةٌ، فَلَوْ أَمْضَيْنَاهُ

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ عہد رسالت مآب ﷺ اور دور خلافت ابی بکر رضی اللہ عنہ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی خلافت کے ابتدائی دو سال تک تین طلاقیں' ایک طلاق ہی شمار ہوتی تھیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ لوگوں نے ایسے معاملہ میں جلدی کی جس میں ان کیلئے سہولت دی گئی تھی پس چاہیئے کہ ہم اس کو نافذ کر دیں۔ لہٰذا آپؓ نے اس

عَلَيْهِمْ . فَأَمْضَاهُ عَلَيْهِمْ . رَوَاهُ مُسْلِمٌ . کو ان پر جاری کر دیا۔ (مسلم)

لغوی تشریح: ﴿ اناة ﴾ ڈھیل، سہولت۔ یعنی مراجعت کے انتظار کیلئے باقی ماندہ سہولت سے فائدہ اٹھانا۔ امام نووی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ لوگوں کیلئے گنجائش تھی کہ وہ یکے بعد دیگرے حالت طہر یعنی تین طہروں میں طلاق دیں مگر انہوں نے جلدی مچائی اور دفعتاً و یکدم تین طلاقیں دینا شروع کر دیں۔ ﴿ فلو امضیناہ علیہم ﴾ اگر ہم ان کے جلدی کرنے کی بنا پر اس کو نافذ کر دیں اور لازم قرار دے دیں تو پے درپے تین طلاقیں دینے کے مقابلہ میں یہ ان کیلئے سود مند اور نفع بخش رہے گا۔ یہ روایت دلیل ہے کہ یہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی تنہا رائے تھی جبکہ حدیث اس پر دلالت کر رہی ہے کہ تین طلاقیں اکٹھی دی جائیں تو ایک ہی واقع ہوتی ہے ۔اس مسئلہ میں علماء کے چار اقوال ہیں۔ جمہور جس میں ائمہ اربعہ اور ان کے متبعین بھی شامل ہیں، کی رائے یہ ہے کہ اکٹھی دی گئی تین طلاقیں، تین ہی واقع ہوں گی اور خاوند کیلئے رجوع کا موقع اب باقی نہیں رہے گا اور ایک گروہ کی رائے یہ ہے کہ ایک ہی وقت و مجلس میں اکٹھی دی گئی تین طلاقیں ایک واقع ہوں گی اور یہ عہد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں خلافت صدیقی میں نافذ و جاری رہی ہے تاآنکہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے طور پر اجتہاد کر کے لوگوں کو سزا دینے کیلئے تین کو تین ہی نافذ کر دیا۔ یہی فتویٰ ابن عباس رضی اللہ عنہما، زبیر بن عوام رحمۃ اللہ علیہ، عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ، علی رضی اللہ عنہ، ابن مسعود رضی اللہ عنہ، عکرمہ رحمۃ اللہ علیہ، طاؤس رحمۃ اللہ علیہ وغیرھم سے بھی منقول ہے اور اس کے مطابق بعض مالکی علماء نے اور کچھ حنفی علماء اور کچھ حنبلی اصحاب نے فتویٰ دیا ہے اور یہی مذہب صاحب مغازی محمد بن اسحٰق رحمۃ اللہ علیہ کا ہے۔ مشائخ قرطبہ کی ایک جماعت بھی اسی طرف گئی ہے جیسے محمد بن بقی بن مخلد اور محمد بن عبدالسلام الخشنی۔ فقہاء طلیطلہ کی ایک جماعت سے بھی یہی حکایت کیا گیا ہے اور اسی جماعت کی مدد و نصرت علامہ ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ نے پھر ان کے شاگرد رشید علامہ ابن قیم رحمۃ اللہ علیہ نے کی ہے اور صحیح بھی یہی ہے اس پر ہی یہ حدیث دلالت کرتی ہے اور عنقریب آنے والی رکانہ کی حدیث بھی اس کی دلیل ہے۔ اس دور میں کثیر تعداد میں اسلامی ممالک اسی پر عمل پیرا ہیں۔ تیسرا مذہب یہ ہے کہ مطلقہ سے اگر دخول ہو چکا ہو تو تین طلاقیں واقع ہو جائیں گی اور اس سے اگر دخول نہ ہوا ہو تو تین طلاقیں ایک ہی واقع ہوں گی۔ یہ ایسا مسلک ہے جس کے حق میں ایسی کوئی دلیل نہیں جس کی طرف نظر التفات کی جا سکے اور چوتھا مذہب یہ ہے کہ اکٹھی تین طلاقیں اصلاً تو واقع نہیں ہوں گی اس لئے کہ یہ بدعت ہے لہٰذا اس کے ساتھ حکم شرعی لٹکا ہوا نہیں ہے یہ تو تمام مذاہب سے کمزور ترین مذہب ہے اور بطور استدلال سب سے ردی اور بے کار ہے۔

(٩١٨) وَعَنْ مَحْمُودِ بْنِ لَبِيْدٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُ، قَالَ: أُخْبِرَ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ عَنْ رَجُلٍ طَلَّقَ امْرَأَتَهُ ثَلاَثَ تَطْلِيْقَاتٍ جَمِيْعاً، فَقَامَ

حضرت محمود بن لبید رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اطلاع دی گئی کہ ایک شخص نے اپنی بیوی کو اکٹھی تین طلاقیں دے ڈالی ہیں۔ آپ غضبناک ہو کر اٹھ کھڑے ہوئے اور فرمایا "کیا اللہ کی

غَضْبَانَ، ثُمَّ قَالَ: **أَيُلْعَبُ بِكِتَابِ اللهِ، وَأَنَا بَيْنَ أَظْهُرِكُمْ؟** حَتَّى قَامَ رَجُلٌ، فَقَالَ: يَا رَسُولَ اللهِ! أَلاَ أَقْتُلُهُ. رَوَاهُ النَّسَائِيُّ، وَرُوَاتُهُ مُوَثَّقُونَ.

کتاب سے کھیلا جا رہا ہے جبکہ میں ابھی تمہارے درمیان موجود ہوں۔" اس پر ایک آدمی کھڑا ہوا اور عرض کیا یارسول اللہ (ﷺ)! کیا میں اسے قتل نہ کر ڈالوں؟ (نسائی اور اس کے راوی ثقہ ہیں)

حاصل کلام: یہ حدیث واضح دلیل ہے کہ دفعتاً تین طلاق دینا حرام ہے۔ اس میں اس کا کوئی ذکر نہیں ہے کہ نبی ﷺ نے اس کو رجوع کی اجازت دی یا نہیں؟ اس حدیث سے طلاق کے بارے میں مختلف مذاہب میں سے کسی کی تائید نہیں ہوتی۔

راوی حدیث: ﴿ محمود بن لبید رضی اللہ عنہ ﴾ محمود بن لبید بن ابی رافع انصاری اشہلی۔ رسول اللہ ﷺ کے دور میں پیدا ہوئے۔ امام بخاری کہتے ہیں کہ وہ صحابی رضی اللہ عنہ تھے۔ ابو حاتم کہتے ہیں کہ ہم اس کی صحابیت کو نہیں جانتے تھے۔ امام مسلم نے تابعین میں ان کا ذکر کیا ہے۔ اور ان کا شمار بڑے بڑے علماء میں ہوتا ہے۔ ۹۶ھ کو وفات پائی۔

(٩١٩) وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا، قَالَ: طَلَّقَ أَبُو رُكَانَة، أُمَّ رُكَانَةَ، فَقَالَ لَهُ رَسُولُ اللهِ ﷺ: **رَاجِعِ امْرَأَتَكَ**. فَقَالَ: إِنِّي طَلَّقْتُهَا ثَلاَثاً، قَالَ: «**قَدْ عَلِمْتُ، رَاجِعْهَا**». رَوَاهُ أَبُو دَاوُدَ.

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ ابورکانہ نے اپنی بیوی کو طلاق دے دی۔ رسول اللہ ﷺ نے اسے حکم دیا کہ "ام رکانہ رضی اللہ عنہا سے رجوع کر لو۔" ابورکانہ رضی اللہ عنہ بولے میں نے اسے تین طلاق دے دی ہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا "مجھے معلوم ہے، تم اس سے رجوع کر لو۔" (ابوداؤد)

وَفِي لَفْظٍ لأَحْمَدَ: طَلَّقَ أَبُو رُكَانَةَ امْرَأَتَهُ فِي مَجْلِسٍ وَاحِدٍ ثَلاثاً، فَحَزِنَ عَلَيْهَا، فَقَالَ لَهُ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «**فَإِنَّهَا وَاحِدَةٌ**». وَفِي سَنَدِهِمَا ابْنُ إِسْحَاقَ، وَفِيهِ مَقَالٌ.

اور مسند احمد کی ایک روایت میں ہے کہ ابورکانہ رضی اللہ عنہ نے ایک ہی مجلس میں تین طلاقیں دی تھیں۔ پھر اس پر پشیمان ہوا۔ رسول اللہ ﷺ نے ابورکانہ رضی اللہ عنہ سے فرمایا "وہ تینوں طلاقیں ایک ہی ہیں۔" (ان دونوں روایتوں میں ابن اسحٰق ہے جس کے متعلق کلام ہے)

وَقَدْ رَوَى أَبُو دَاوُدَ مِنْ وَجْهٍ آخَرَ، أَحْسَنَ مِنْهُ، أَنَّ أَبَا رُكَانَةَ طَلَّقَ امْرَأَتَهُ سُهَيْمَةَ الْبَتَّةَ، فَقَالَ: وَاللهِ مَا أَرَدْتُ بِهَا إِلاَّ وَاحِدَةً، فَرَدَّهَا إِلَيْهِ النَّبِيُّ ﷺ.

اور ابوداؤد نے ایک دوسرے طریق سے اسے روایت کیا ہے جو اس سے بہتر ہے وہ یہ کہ ابورکانہ رضی اللہ عنہ نے اپنی بیوی مساۃ سہیمہ کو بالکل طلاق دے دی اور پھر کہا کہ بخدا میں نے ایک طلاق کی نیت کی تھی تو نبی ﷺ نے ام رکانہ رضی اللہ عنہا کو واپس

لوٹا دیا۔

لغوی تشریح: ﴿ ابورکانۃ ﴾ راجح بلکہ صحیح یہ ہے کہ صاحب قصہ آدمی کا نام رکانہ تھا ابو رکانہ نہیں اور اس کے باپ کا نام عبد یزید تھا۔ مسند احمد میں بھی "رکانہ ہے نہ کہ ابو رکانہ" البتہ ابوداؤد میں یہ قصہ ابو رکانہ کی طرف منسوب ہے۔ یہ وہم ہے جو مصنف کو نقل میں ہوگیا ہے۔ ﴿ طلاق البتۃ ﴾ یہ ہے کہ طلاق دینے والا ﴿ انت طالق البتۃ ﴾ کہے اور البتۃ 'البت سے ماخوذ ہے جس کا معنی قطع کرنے اور کاٹنے کے ہیں۔ گویا وہ اس طرح کہتا ہے کہ میں نے تجھے ایسی طلاق دی جس نے نکاح کو قطع کر دیا ہے' کاٹ کے رکھ دیا ہے' اب اس نے رجوع کا موقع نہیں چھوڑا۔ یہ لفظ بول کر طلاق دینے والا تین طلاقیں مراد لیتا ہے اور مراد دراصل ایک طلاق بائن ہوتی ہے۔ یہ حدیث اس کی دلیل ہے کہ اگر طلاق دینے والے کی نیت میں ایک ہی طلاق تھی تو ایک رجعی طلاق واقع ہوگی اور قسم لینے کامقصد تو یہ تھا کہ اگر اس نے تین کی نیت کی ہوگی تو تین بھی واقع ہو جائیں گی۔ لیکن یہ حدیث ضعیف ہے اور ضعیف ہونے کے ساتھ ساتھ اس میں اضطراب بھی پایا جاتا ہے۔ نیز مضطرب ہونے کے ساتھ ساتھ ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی دو احادیث کے معارض بھی ہے۔ لہٰذا اس سے استدلال قائم نہیں کیا جا سکتا۔ یہ بات ملحوظ خاطر رہے کہ قصہ رکانہ والی حدیث کئی طرق سے منقول ہے اور مصنف نے وہ سارے طرق بیان کر دیئے ہیں جیسا کہ اوپر ان کا ذکر ہوا جنہیں ابوداؤد نے روایت کیا ہے۔ یہ دونوں ہی ضعیف ہیں پہلی اس بنا پر کہ اسے ابن جریج کے واسطہ سے روایت کیا گیا ہے اس نے قال اخبرنی بعض بنی رافع عن عکرمۃ سے روایت کیا ہے اور بنو رافع کے بعض مجہول اور نامعلوم ہیں۔ لہٰذا یہ حدیث ضعیف ہے اور تیسرے نمبر والی وہ ہے جس میں طلاق البتۃ کا ذکر ہے اسے جریر بن حازم عن الزبیر بن سعید' عن عبداللہ بن علی بن زید بن رکانہ عن ابیہ عن جدہ اور اسی طرح یہ نافع بن عجیر عن رکانہ ابن عبد یزید الخ کی سند سے بھی مروی ہے' اس میں زبیر بن سعید ضعیف ہے۔ میزان الاعتدال میں ہے کہ یہ کچھ بھی نہیں۔ ﴿ لیس بشئی ﴾ اور نسائی نے کہا ہے کہ یہ ضعیف ہے اور التقریب میں ہے یہ لین الحدیث ہے اور عبداللہ بن علی بن یزید بھی ضعیف ہے۔ التقریب میں کہا ہے کہ وہ لین الحدیث اور میزان میں ہے کہ عقیلی نے کہا کہ اس کی سند میں اضطراب ہے۔ اس کی حدیث کا کوئی متابع نہیں ہے۔ رہا اس کا باپ علی بن یزید تو "الخلاصۃ" میں ہے کہ ابن حبان نے اسے ثقہ قرار دیا ہے اور امام بخاری رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس کی حدیث صحیح نہیں اور ترمذی نے امام بخاری رحمہ اللہ سے ذکر کیا کہ اس میں اضطراب ہے اور نافع بن عجیر بھی ضعیف ہے۔ علامہ ابن قیم رحمہ اللہ نے الھدیٰ میں کہا ہے کہ نافع بن عجیر مجہول ہے۔ اس کے حالات کا قطعی علم کسی کو نہیں اور نہیں علم کہ وہ کون تھا اور کیا تھا؟ اور علامہ ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے اپنے فتاویٰ ۳۳/ ۱۵ پر کہا ہے علل حدیث کے ماہر علماء اور ائمہ فقہ مثلاً امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ' امام بخاری رحمہ اللہ وغیرھما اور ابوعبید' ابومحمد بن حزم وغیرہ نے حدیث البتۃ کو قطعی ضعیف قرار دیا ہے اور واضح کیا ہے کہ اس کے

راوی ایسے لوگ ہیں جن کی نہ عدالت معلوم ہے اور نہ ضبط۔ جب اس طریق کا یہ حال ہے تو پھر وہ ضعیف ہی ہے اس کے ضعف میں کیا شک و ریب باقی رہ گیا ہے۔ رہا دوسرا طریق جسے ابوداؤد نے بیان بھی نہیں کیا۔ صرف امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ نے اسے بیان کیا ہے تو اس کے تمام راوی ثقہ ہیں۔ قابل حجت ہیں۔ ہاں محمد بن اسحٰق رحمہ اللہ کے متعلق ضرور کلام ہے اور یہ معلوم ہی ہے کہ محمد بن اسحٰق رحمہ اللہ میں تدلیس کے ماسوا اور کوئی قابل ذکر کمزوری نہیں ہے۔ اس سند میں اس نے سماع کی صراحت کر دی ہے۔ پس تدلیس کا شبہ بھی ختم ہوگیا۔ جس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ سب سے عمدہ اور صحیح ترین طریق وہی ہے جسے امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ نے روایت کیا ہے لیکن ابوداؤد نے جب یہ طریق روایت نہیں کیا تو اس نے دونوں اول اور ثالث طرق کو ملا دیا اور ثالث کو اول پر ترجیح دی اور فرمایا کہ یہ ابن جریج کے طریق سے زیادہ صحیح ہے کہ رکانہ نے اپنی بیوی کو تین طلاقیں دی تھیں کیونکہ یہ اس کے گھر والے ہیں اور اہل خانہ کو زیادہ معلومات ہوتی ہیں۔ اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ ان کے نزدیک یہ صحیح ہے بلکہ اس کے معنی یہ ہیں کہ یہ دونوں ضعیف احادیث میں قابل ترجیح ہے اور اس میں ضعف کم ہے اور نافع بن عجیر کی روایت کا مسند احمد کی روایت سے امام ابوداؤد رحمہ اللہ کے ہاں راجح ہونا امام ابوداؤد کے کلام سے ظاہر نہیں ہوتا۔ کیونکہ امام ابوداؤد نے اسے ذکر ہی نہیں کیا۔ اس ضروری وضاحت سے معلوم ہو جاتا ہے کہ اس حدیث کے بارے میں مصنف کی گفتگو دو وجہ سے مخدوش ہے۔ پہلی یہ کہ پہلے اور دوسرے طریق کو بیان کرنے کے بعد کہا ہے کہ ان دونوں احادیث کی سند میں محمد بن اسحٰق راوی ہے جس کے متعلق کلام کیا گیا ہے باوجودیکہ محمد بن اسحٰق پہلے طریق میں سرے سے موجود ہی نہیں وہ تو صرف دوسرے طریق میں ہے اور دوسری وجہ یہ کہ اس نے تیسرے طریق کو ذکر کرتے ہوئے کہا تھا کہ ابوداؤد نے ایک اور طریق سے بیان کیا ہے جو اس سے بہتر ہے۔ ظاہر ہے کہ اس کا مطلب یہی ہوگا کہ یہ طریق ابن عباس رضی اللہ عنہما کی حدیث سے بالاطلاق بہتر ہے یا دوسرے طریق سے بہترین ہے۔ جسے امام احمد رحمہ اللہ نے روایت کیا ہے اس لئے کہ ذکر کے اعتبار سے دونوں طریقوں سے زیادہ قریب ہے مگر آپ یہ معلوم کر آئے ہیں کہ صحیح اور قوی ترین طریق دوسرا ہی ہے۔ اگر مؤلف کی مراد یہ ہے کہ ابوداؤد کے نزدیک یہ ہے مگر آپ دیکھ آئے ہیں کہ ابوداؤد کے کلام کا اس سے کوئی تعلق نہیں اور اگر ان کی مراد یہ ہے کہ میرے نزدیک یہ احسن ہے تو سابقہ تفصیل کی روشنی میں یہ بھی درست نہیں۔

راوی حدیث: ﴿ ابو رکانہ رضی اللہ عنہ ﴾ رکانہ میں راء پر ضمہ ہے۔ یہ ابو رکانہ بن عبد یزید بن ھاشم بن مطلب بن عبد مناف مطلبی فتح مکہ میں شامل تھے۔ یہ بھی کہا گیا ہے اس نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے کشتی کی تھی۔ اور یہی کشتی ہی اس کے اسلام لانے کا باعث بنی۔ مدینہ چلے آئے۔ اور امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے دور خلافت کے شروع میں فوت ہوئے۔ بعض کے نزدیک ۴۲ھ میں فوت ہوئے' اور ان کی بیوی سھیمہ بنت عویمر مزنیہ ہے۔

﴿ محمد بن اسحاق ﴾ اس کی کنیت ابو عبداللہ ہے۔ پورا نام محمد بن اسحاق بن یسار مطلبی ہے۔ قیس بن مخزمہ مدنی کے غلام تھے۔ جہاد و سیر کے امام تھے۔ ۱۵۱ھ میں وفات پائی۔

(۹۲۰) وَعَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «ثَلاَثٌ جِدُّهُنَّ جِدٌّ، وَهَزْلُهُنَّ جِدٌّ: النِّكَاحُ، وَالطَّلاَقُ، وَالرَّجْعَةُ». رَوَاهُ الأَرْبَعَةُ إِلاَّ النَّسَآئِيَّ، وَصَحَّحَهُ الحَاكِمُ.

وَفِيْ رِوَايَةٍ لاِبْنِ عَدِيٍّ، مِنْ وَجْهٍ آخَرَ ضَعِيْفٍ: «الطَّلاَقُ، وَالعِتَاقُ، وَالنِّكَاحُ».

وَلِلْحَارِثِ بْنِ أَبِيْ أُسَامَةَ، مِنْ حَدِيْثِ عُبَادَةَ ابْنِ الصَّامِتِ، رَفَعَهُ: «لاَ يَجُوْزُ اللَّعِبُ فِيْ ثَلاَثٍ: الطَّلاَقِ، وَالنِّكَاحِ، وَالعِتَاقِ، فَمَنْ قَالَهُنَّ فَقَدْ وَجَبْنَ». وَسَنَدُهُ ضَعِيفٌ.

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "تین امور ایسے ہیں کہ ان کا قصد کرنا بھی قصد ہے اور ہنسی مذاق سے ان کا کہنا بھی قصد ہے۔ نکاح، طلاق اور رجوع کرنا۔" (اسے چاروں نے روایت کیا ہے بجز نسائی کے اور حاکم نے اسے صحیح کہا ہے) اور ابن عدی کی ایک دوسری ضعیف روایت میں ہے "طلاق، آزادی اور نکاح۔" اور حارث بن ابی اسامہ کی روایت جو عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ سے مرفوع مروی ہے، میں ہے کہ "تین چیزوں میں مذاق کرنا جائز نہیں طلاق، نکاح اور آزادی۔ جو آدمی ان امور کو مذاق سے بھی کہے گا تو یہ واجب ہو جائیں گے۔" (اس کی سند ضعیف ہے)

لغوی تشریح: ﴿الھزل﴾ کھیل مذاق اور ہنسی کے طور پر کچھ کہنا یا کرنا۔ جس سے حقیقت مراد نہیں ہوتی۔ ﴿الجد﴾ جیم کے نیچے کسرہ۔ ھزل کی ضد یعنی سنجیدگی۔ ﴿والرجعۃ﴾ "را" کے کسرہ اور فتحہ کے ساتھ۔ اپنی مطلقہ بیوی سے بغیر کسی شرط وغیرہ کے رجوع کرنا۔

(۹۲۱) وَعَنْ أَبِيْ هُرَيرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُ، عَنِ النَّبِيِّ ﷺ، قَالَ: «إِنَّ اللّٰهَ تَعَالَى تَجَاوَزَ عَنْ أُمَّتِي مَا حَدَّثَتْ بِهِ أَنْفُسَهَا، مَا لَمْ تَعْمَلْ، أَوْ تَكَلَّمْ». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا "اللہ تعالیٰ نے میری امت سے دل کے وسوسہ (پر گرفت و مؤاخذہ) سے درگزر فرما دیا ہے۔ اور یہ اس وقت تک نہیں ہوگا جب تک کوئی زبان سے نہ کہے اور عمل نہ کرے۔" (بخاری و مسلم)

لغوی تشریح: ﴿تجاوز﴾ معاف و درگزر کیا۔ ﴿ماحدثت بہ انفسھا﴾ جو وسوسے اور خیالات دل میں پیدا ہوتے ہیں۔

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ دل میں پیدا ہونے والے خیالات اور گزرنے والے وسوسے قابل مؤاخذہ نہیں۔ مثلاً کسی کے دل میں عورت کو طلاق دینے کا خیال آیا یا لڑکی سے نکاح کا ارادہ کرے تو محض خیالات اور ارادے سے یہ باتیں واقع نہیں ہو جاتیں نیز یہ بھی معلوم ہوا کہ زبردستی مار پیٹ کر کسی سے طلاق لے لی جائے جسے طلاق مکرہ کہتے ہیں یا اسی طرح زبردستی نکاح کرا لیا جائے تو نہ طلاق واقع ہوگی

اور نہ نکاح ہی منعقد ہو گا۔ البتہ احناف طلاق مکروہ کے قائل ہیں اور اس حدیث سے ان کے مسلک کی تردید ہے۔ اس طرح بھول اور غلطی کی طلاق بھی نہیں ہوتی۔ جمہور کا یہی مذہب ہے۔

(٩٢٢) وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا، عَنِ النَّبِيِّ ﷺ، قَالَ: «إِنَّ اللَّهَ تَعَالَى وَضَعَ عَنْ أُمَّتِي الخَطَأَ، وَالنِّسْيَانَ، وَمَا اسْتُكْرِهُوا عَلَيْهِ». رَوَاهُ ابْنُ مَاجَهْ. وَالحَاكِمُ. وَقَالَ أَبُو حَاتِمٍ: لاَ يَثْبُتُ.

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا "اللہ تعالیٰ نے میری امت سے خطا' بھول چوک اور جس پر اسے مجبور کیا گیا ہو معاف فرما دیا ہے۔" (اسے ابن ماجہ نے روایت کیا ہے اور ابو حاتم نے کہا ہے کہ یہ حدیث صحیح نہیں ہے)

لغوی تشریح: ﴿ وضع ﴾ ساقط کر دیا۔ ﴿ استکرھوا ﴾ صیغۂ مجہول۔ استکراہ سے ماخوذ ہے یعنی کسی کام کے انجام دینے پر جبرو قہر کیا گیا ہو۔ یہ دونوں احادیث اس لئے بیان کی گئی ہیں کہ بتلایا جائے کہ ایسی صورت میں طلاق واقع نہیں ہوتی۔

(٩٢٣) وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا، قَالَ: إِذَا حَرَّمَ ٱمرأته، لَيْسَ بِشَيْءٍ وَقَالَ: لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُولِ اللهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ. رَوَاهُ البُخَارِيُّ.

وَلِمُسْلِمٍ: إِذَا حَرَّمَ الرَّجُلُ عَلَيْهِ ٱمْرَأَتَهُ، فَهُوَ: يَمِيْنٌ، يُكَفِّرُهَا.

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ جب شوہر اپنی بیوی کو حرام قرار دے تو یہ کوئی چیز نہیں اور فرمایا: تمہارے لئے یقیناً رسول اللہ ﷺ کی زندگی بہترین نمونہ ہے۔ (بخاری)

اور مسلم میں ہے کہ جب مرد نے اپنی بیوی کو حرام قرار دے لیا تو وہ قسم شمار ہو گی۔ اس کا کفارہ ادا کرنا پڑے گا۔

لغوی تشریح: ﴿ لیس بشئی ﴾ یعنی حرام قرار دینے سے بیوی اس پر حرام نہیں ہو جاتی اور نہ یہ تحریم طلاق ہوتی ہے۔ اس کا یہ بھی مطلب نہیں کہ اس تحریم کا کوئی اصل حکم نہیں کیونکہ اس پر انہوں نے قرآن سے استدلال کیا ہے۔ لقد کان لکم فی رسول اللہ اسوۃ حسنۃ (٢١:٣٣) اس مسئلہ میں بہت اختلاف ہے مگر تمام اقوال میں سے عمدہ ترین قول وہی ہے جو بیان کیا گیا ہے اور اس کی تائید مسلم کی حدیث سے بھی ہوتی ہے۔

حاصل کلام: اس حدیث میں مرد کا اپنی بیوی کو اپنے اوپر حرام کرنے کو "کچھ بھی نہیں" سے ذکر کیا گیا ہے' اس کا مطلب یہ ہے کہ نہ یہ رجعی طلاق ہے اور نہ بائن اور نہ ظہار ہی۔ بلکہ یہ قسم ہے جس کا کفارہ دیا جائے گا۔ جیسا کہ مسلم کی حدیث میں ہے۔ بخاری میں بھی ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ مرد پر قسم کا کفارہ ہو گا۔ اس مسئلہ کے بارے میں اہل علم کے تیرہ اقوال منقول ہیں۔ راجح قول یہی ہے۔

امام شافعی رحمہ اللہ کے نزدیک تو کفارہ نہیں بلکہ وہ اسے لغو قرار دیتے ہیں۔ امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ اسے قسم قرار دیتے ہیں اور قسم کا کفارہ اس پر ضروری ہے۔

(٩٢٤) وَعَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهَا، أَنَّ ابْنَةَ الجَوْنِ لَمَّا أُدْخِلَتْ عَلَى رَسُولِ اللهِ ﷺ، وَدَنَا مِنْهَا: قَالَتْ: أَعُوذُ بِاللهِ مِنْكَ، فَقَالَ: «لَقَدْ عُذْتِ بِعَظِيمٍ، اِلْحَقِي بِأَهْلِكِ». رَوَاهُ البُخَارِيُّ.

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ جون کی بیٹی جب نکاح کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خلوت گاہ میں داخل کی گئی اور آپؐ اس کے قریب ہوئے تو اس نے کہا میں آپؐ سے اللہ کی پناہ پکڑتی ہوں۔ آپؐ نے فرمایا "تو نے بڑی عظیم الشان ذات کی پناہ طلب کی ہے۔ تو اپنے گھر والوں کے ساتھ جا مل۔" (بخاری)

لغوی تشریح: اس حدیث کے بیان کرنے سے مقصود یہ ہے کہ "الحقی باھلک" کہہ کر اگر طلاق مراد رکھی ہو تو طلاق شمار ہوگی۔ یہی حدیث پہلے حق مہر کے باب میں گزر چکی ہے۔ اس میں تصریح موجود ہے کہ آپؐ نے اسے طلاق دی ہے لیکن اس میں یہ وضاحت نہیں ہے کہ طلاق کس طرح دی ہے مگر اس حدیث میں اس ابہام کو دور کر دیا گیا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بصراحت طلاق نہیں دی بلکہ کنایہ سے طلاق دی اور کنایہ میں صراحت نہیں ہوتی۔

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ طلاق کنایہ بھی ہوتی ہے ایک تو طلاق صریح ہوتی ہے کہ طلاق دینے والا صریح الفاظ میں طلاق کہے کہ میں نے طلاق دی۔ یہ طلاق واقع ہو جائے گی خواہ طلاق دینے والے کی نیت طلاق کی نہ ہو کیونکہ اس میں لفظ طلاق بالکل واضح ہے اور طلاق بالکنایہ یہ ہے کہ طلاق دینے والا ایسے الفاظ کہے جن کا معنی و مفہوم طلاق بھی ہو سکتا ہے اور نہ بھی ہو سکتا ہے مثلاً شوہر نے کہہ دیا کہ تو آزاد ہے یا اس طرح کہے کہ جا اپنے میکے چلی جا وغیرہ ایسی صورت میں اس طرح کے الفاظ کہنے والے کی نیت پر منحصر ہوگا اگر اس کا ارادہ و نیت طلاق ہوگا تو طلاق واقع ہو جائے گی اور اگر ایسے الفاظ بول کر اس کا ارادہ طلاق نہ ہوگا تو پھر طلاق واقع نہیں ہوگی اگر مرد کی نیت طلاق کی ہوگی تو اس صورت میں طلاق ایک ہی واقع ہوگی اس میں کسی کا اختلاف نہیں سب اس پر متفق ہیں۔

(٩٢٥) وَعَنْ جَابِرٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «لاَ طَلاَقَ إِلاَّ بَعْدَ نِكَاحٍ، وَلاَ عِتْقَ إِلاَّ بَعْدَ مِلْكٍ». رَوَاهُ أَبُو يَعْلَى، وَصَحَّحَهُ الحَاكِمُ، وَهُوَ مَعْلُول، وَأَخْرَجَ ابْنُ مَاجَهْ

حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "نہیں طلاق، مگر نکاح کے بعد اور اسی طرح آزادی نہیں مگر ملکیت کے بعد۔" (اسے ابو یعلیٰ نے روایت کیا ہے اور حاکم نے اسے صحیح کہا ہے حالانکہ یہ معلول ہے اور ابن ماجہ نے حضرت مسور بن مخرمہ کے

عَنِ الْمِسْوَرِ بْنِ مَخْرَمَةَ مِثْلَهُ، وَإِسْنَادُهُ حَسَنٌ، لٰكِنَّهُ مَعْلُوْلٌ أَيْضاً.

واسطہ سے اسی جیسی ایک حدیث روایت کی ہے کہ جس کی اسناد تو اچھی ہیں لیکن وہ بھی معلول ہے۔

حاصل کلام: یہ حدیث اس کی دلیل ہے کہ آدمی نے جب طلاق اور عتق کو معلق کیا مثلاً یوں کہا کہ وہ عورت جس سے میں نکاح کروں اسے طلاق ہے یا یوں کہے کہ ہر وہ غلام جسے میں خریدوں تو وہ آزاد ہے۔ ان دونوں صورتوں میں وقوع کے بعد ان پر عمل نہ ہوگا یعنی نکاح کے بعد عورت پر طلاق واقع نہیں ہوگی اور خریداری کے بعد غلام بھی آزاد نہیں ہوگا بلکہ اس کا قول لغو اور ضائع ہو جائے گا۔ اس مسئلہ کی بے شمار صورتیں ہیں یہ حدیث تمام اقسام پر مطلقاً مشتمل ہے۔ اسے عام رکھا جائے گا اور ایک حال سے دوسرے حال کے درمیان کوئی فرق روا نہیں رکھا جائے گا اور یہ مسئلہ ان اختلافی مسائل میں سے ہے جو مشہور و معروف ہیں۔ جمہور تو کہتے ہیں مطلقاً یہ طلاق واقع نہ ہوگی اور حنفیہ کہتے ہیں بہرنوع یہ واقع ہو جائے گی اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ کھول کر بیان کر دیا جانا اور ایک حال سے دوسرے حال میں فرق واضح کر دینے کی صورت میں واقع ہو جائے گی۔ پس اگر کسی عورت کا نام لیا گیا ہو یا کسی گروہ کی عورت یا قبیلہ کی نشان زدگی یا مکان و زمان کی قید ہو تو طلاق اور عتاق لازم ہو جائیں گی۔ اگر یہ صورت نہ ہو تو پھر نہیں۔ پس ظاہر یہی ہے جیسا کہ ہم نے پہلے بیان کیا ہے کہ طلاق مطلقاً واقع نہ ہوگی۔

(٩٢٦) وَعَنْ عَمْرِو بْنِ شُعَيْبٍ، عَنْ أَبِيهِ، عَنْ جَدِّهِ، قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «**لاَ نَذْرَ لاِبْنِ آدَمَ فِيمَا لاَ يَمْلِكُ، وَلاَ عِتْقَ لَهُ فِيمَا لاَ يَمْلِكُ، وَلاَ طَلاَقَ لَهُ فِيمَا لاَ يَمْلِكُ**». أَخْرَجَهُ أَبُو دَاوُدَ وَالتِّرْمِذِيُّ، وَصَحَّحَهُ، وَنَقَلَ عَنِ الْبُخَارِيِّ أَنَّهُ أَصَحُّ مَا وَرَدَ فِيهِ.

حضرت عمرو بن شعیب اپنے باپ سے اور وہ اپنے دادا سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "اس نذر کی کوئی حیثیت نہیں جس کا انسان مالک نہیں اور نہ ایسے غلام کا آزاد کرنا کوئی حیثیت رکھتا ہے جس کا انسان مالک ہی نہیں اور نہ طلاق واقع ہوگی جو اس کے دینے والے کے اختیار میں نہ ہو۔" (اسے ابوداؤد اور ترمذی نے روایت کیا ہے اور ترمذی نے اسے صحیح قرار دیا ہے اور امام بخاری رحمہ اللہ کا یہ قول نقل کیا ہے۔ اس سلسلہ میں جو کچھ وارد ہے' یہ اس میں صحیح ترین ہے)

لغوی تشریح: ﴿لانذر لابن آدم الخ﴾ آدم زادہ کی نذر صحیح نہیں۔ مثلاً نبی ﷺ نے فرمایا "اگر کوئی یوں کہے کہ اس غلام کا آزاد کرنا مجھ پر لازم ہے حالانکہ جب اس نے نذر مانی تھی وہ غلام اس کی ملکیت میں نہیں تھا۔ اگر اس کا مالک بن بھی جائے تب بھی اسے آزاد نہیں کر سکتا۔"

حاصل کلام: اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہو رہا ہے کہ انسان جس چیز کا مالک ہی نہیں اس میں مالکانہ اختیارات استعمال کرنا کوئی معنی نہیں رکھتا۔ ان اختیارات کا استعمال ناقابل تسلیم ہے۔ یہ حدیث دلیل ہے

کہ اجنبی عورت پر طلاق واقع نہیں ہوتی مثلاً ایک آدمی کسی دوسری منکوحہ یا غیر منکوحہ خاتون سے کہتا ہے کہ تو مطلقہ ہے اور وہی شخص بعد ازاں کسی وقت اسی عورت سے نکاح کرنا چاہے تو علماء کا اس میں اتفاق ہے کہ وہ عورت مطلقہ تصور نہیں ہوگی لیکن کسی عورت کو اس طرح کہے کہ اگر میں تجھ سے نکاح کروں تو تجھے طلاق۔ اس صورت میں علماء و فقہاء کے تین اقوال ملتے ہیں۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ' امام احمد رحمۃ اللہ علیہ اور داؤد ظاہری رحمۃ اللہ علیہ اور چند دیگر علماء کی رائے یہ ہے کہ ایسی عورت مطلقہ نہیں ہوگی۔ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے بائیس صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے یہ قول نقل کیا ہے اور دلیل میں یہی حدیث بیان کی ہے۔ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے کہ ایسی عورت مطلقہ ہو جائے گی اور تیسرا قول امام مالک رحمۃ اللہ علیہ وغیرہ کا ہے کہ اگر کسی خاص قبیلہ یا شہر کی عورت سے کہے یا کسی دن یا مہینے کے ساتھ مخصوص کرے تو اس صورت میں طلاق واقع ہو جائے گی اور اگر عمومی طور پر کہے تو واقع نہیں ہوگی۔ غلام کے آزاد کرنے اور نذر کا حکم بھی اسی طرح ہے۔ ان اقوال میں سے اقرب الی الصواب پہلا قول ہی ہے جیسا کہ پہلے بھی بیان ہو چکا ہے۔

(٩٢٧) وَعَنْ عَآئِشَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهَا، عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ: «رُفِعَ الْقَلَمُ عَنْ ثَلاثَةٍ: عَنِ النَّائِمِ حَتَّى يَسْتَيْقِظَ، وَعَنِ الصَّغِيرِ حَتَّى يَكْبَرَ، وَعَنِ المَجْنُونِ حَتَّى يَعْقِلَ، أَوْ يُفِيقَ». رَوَاهُ أَحْمَدُ وَالأَرْبَعَةُ إِلاَّ التِّرْمِذِيَّ، وَصَحَّحَهُ الحَاكِمُ.

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا "تین آدمیوں سے قلم اٹھا لیا گیا ہے۔ سونے والا جب تک بیدار نہ ہو' بچہ جب تک بالغ نہ ہو' دیوانہ جب تک صحیح العقل نہ ہو۔" (بروایت امام احمد اور ابوداؤد' ابن ماجہ و نسائی۔ حاکم نے اس حدیث کو صحیح کہا ہے۔ ابن حبان نے بھی اس حدیث کو روایت کیا ہے)

لغوی تشریح: ﴿ اویفیق ﴾ افاقہ سے ماخوذ ہے۔ مرض جنون سے افاقہ اور صحت یابی ہو جائے۔ بایں صورت کہ اس کی عقل ٹھکانے پر آجائے۔ یہ حدیث دلیل ہے کہ ان حضرات کی دی ہوئی طلاق واقع ہو جاتی ہے۔

٨ - بَابُ الرَّجْعَةِ

(طلاق سے) رجوع کرنے کا بیان

(٩٢٨) عَنْ عِمْرَانَ بْنِ حُصَيْنٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا، أَنَّهُ سُئِلَ عَنِ الرَّجُلِ يُطَلِّقُ. ثُمَّ يُرَاجِعُ، وَلاَ يُشْهِدُ، فَقَالَ: أَشْهِدْ عَلَى طَلاَقِهَا، وَعَلَى رَجْعَتِهَا. رَوَاهُ أَبُو دَاوُدَ هٰكَذَا مَوْقُوفاً، وَسَنَدُهُ صَحِيحٌ وَأَخرَجَهُ البَيْهَقِيُّ بِلَفْظِ: (أَنَّ عِمْرَانَ بْنَ حُصَيْنٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ سُئِلَ

حضرت عمران بن حصین رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ ان سے ایسے آدمی کے بارے میں پوچھا گیا کہ جو طلاق دیتا ہے پھر رجوع کر لیتا ہے اور اس پر گواہ نہیں بناتا۔ آپؓ نے فرمایا "کہ عورت کو طلاق دیتے اور اس سے رجوع کرتے وقت گواہ مقرر کر۔" (اسے ابوداؤد نے اسی طرح موقوف روایت کیا ہے اور اس کی سند صحیح ہے امام بیہقی نے اس روایت کو ان الفاظ سے

عَمَّنْ رَاجَعَ امْرَأَتَهُ وَلَمْ يُشْهِدْ، فَقَالَ فِيْ غَيْرِ سُنَّةٍ؟ فَلْيُشْهِدِ الآنَ) وَزَادَ الطَّبَرَانِيُّ فِيْ رِوَايَةٍ (ويستغفر الله).

ذکر کیا ہے: "عمران بن حصین رضی اللہ عنہ سے اس شخص کے متعلق پوچھا گیا جو اپنی بیوی سے رجوع کرے مگر گواہ نہ بنائے؟ تو انہوں نے فرمایا: "غیر مسنون ہے اور اسے چاہیے کہ اب گواہ بنا لے۔" طبرانی نے ایک روایت میں ان الفاظ کا اضافہ کیا ہے کہ: اسے اللہ سے معافی بھی مانگنی چاہیے۔)

لغوی تشریح: ﴿ باب الرجعة ﴾ رجعۃ کی "را" کے نیچے کسرہ اور اوپر فتحہ و رجعت اور رجوع سارے معنی میں مستعمل ہے یعنی مرد کا طلاق دینے کے بعد دوران عدت بغیر نکاح کے اپنی اہلیہ کی طرف رجوع کرنا۔ ﴿ اشهد على طلاقها وعلى رجعتها ﴾ طلاق دیتے اور رجوع کرتے وقت گواہ بنانا۔ اس امر میں اختلاف ہے۔ صحیح یہ ہے کہ یہ مندوب و مستحب ہے۔

(٩٢٩) وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُمَا، أَنَّهُ لَمَّا طَلَّقَ ٱمْرَأَتَهُ، قَالَ النَّبِيُّ ﷺ لِعُمَرَ: «مُرْهُ، فَلْيُرَاجِعْهَا». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ جب انہوں نے اپنی اہلیہ کو طلاق دی تو نبی ﷺ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے فرمایا کہ "اسے کہو: "اپنی اہلیہ سے رجوع کرلے۔" (بخاری و مسلم)

٩ - بَابُ الإِيلَاءِ وَالظِّهَارِ وَالكَفَّارَةِ

ایلاء' ظہار اور کفارہ کا بیان

(٩٣٠) عَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهَا قَالَتْ: آلَىٰ رَسُولُ اللهِ ﷺ مِنْ نِسَائِهِ، وَحَرَّمَ، فَجَعَلَ الحَلَالَ حَرَاماً، وَجَعَلَ لِلْيَمِيْنِ كَفَّارَةً. رَوَاهُ التِّرمِذِيُّ، وَرُوَاتُه ثِقَاتٌ.

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اپنی بیویوں سے ایلاء کیا اور (ان کے پاس جانا) حرام کر دیا۔ چونکہ آپؐ نے حلال کو حرام کیا اس لئے قسم کا کفارہ مقرر فرمایا گیا۔ (اسے ترمذی نے روایت کیا۔ اس کے راوی ثقہ ہیں۔)

لغوی تشریح: ﴿ باب الایلاء ﴾ ایلاء الیہ سے مشتق ہے۔ الیہ میں "یا" پر تشدید ہے فعیل کے وزن پر۔ اس کے معنی قسم کھانے کے ہیں اور اس کی جمع "الایا" آتی ہے اور شرعاً ایلاء یہ ہے کہ شوہر قسم کھائے کہ وہ اپنی اہلیہ سے چار ماہ یا اس سے زیادہ مدت تک وطئی نہیں کرے گا اس پر ائمہ اربعہ سب متفق ہیں کہ اگر خاوند نے قسم کھائی کہ وہ اپنی اہلیہ سے چار ماہ سے کم مدت تک تعلق زن و شو نہیں کرے گا تو اسے ایلاء کرنے والا قرار نہیں دیا جا سکتا۔ ﴿ الى رسول الله صلى الله عليه وسلم من نسائه ﴾ رسول اللہ ﷺ نے قسم کھائی کہ وہ ایک مہینہ بھر اپنی بیویوں کے قریب بھی نہیں جائیں گے۔ اس کیلئے بہت سے اسباب تھے اور وہ یہ کہ کسی اہلیہ نے آپؐ کی راز کی بات کو فاش کر دیا جسے آپؐ

نے راز رکھنے کی ہدایت فرمائی حتیٰ کہ اللہ تعالیٰ نے اس پر آپؐ کو متنبہ فرمایا اور نان و نفقہ کے مطالبہ و تقاضا کیلئے سب بیویاں متفق ہوگئیں اور آپؐ سے اس کا مطالبہ کیا بلکہ اظہار ناراضی سے صبح سے شام تک آپؐ سے بات چیت منقطع کر لیتیں۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اور حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا نے بعض ازواج کو اپنے ساتھ ملایا اسی کے نتیجہ میں تحریم شہد کا واقعہ پیش آیا۔ یہاں تک کہ ان دونوں کو اللہ تعالیٰ نے تنبیہہ فرمائی۔ ﴿ ان تتوبا الی اللہ ﴾ اگر تم دونوں اللہ کی طرف رجوع کرتی ہو مزید یہ کہ ان ہی ایام میں آپؐ گھوڑے سے نیچے گر گئے اور آپؐ کے دائیں پہلو میں خراشیں اور چوٹیں آئیں۔ جب یہ تمام اسباب جمع ہوگئے اور آپؐ ان کی طرف سے کبیدہ خاطر ہوگئے تو آپؐ نے قسم کھائی کہ ایک مہینہ اپنی بیویوں کے قریب نہ جائیں گے۔ چنانچہ آپؐ اپنے بالاخانہ میں الگ ہو کر بیٹھ گئے مگر جب انتیس دن پورے ہوئے تو آیت تخییر نازل ہوئی۔ آپؐ نیچے ازواج مطہرات کی طرف تشریف لے آئے اور سب کو ساتھ رہنے یا نہ رہنے کا اختیار دے دیا۔ مگر سب ازواج مطہرات نے آپؐ کے ساتھ رہنا پسند کیا۔ یہ اختیار دیا جانا کسی قسم کی طلاق شمار نہیں کیا گیا کیونکہ رسول اللہ ﷺ کا ایلاء چار ماہ یا اس سے زیادہ عرصہ کا نہیں تھا تو ایسے ایلاء کو شرعی ایلاء نہیں کہا گیا اور اس پر کفارہ بھی واجب نہیں کیا۔ ﴿ وجعل الحلال حراما ﴾ اس میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی روایت کی طرف اشارہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ اپنی بیوی زینب بنت جحش کے ہاں شہد نوش فرماتے تھے اور کافی دیر اس کے ہاں ٹھہرتے۔ پس میں نے اور حفصہ رضی اللہ عنہا نے مشورہ کیا کہ ہم میں سے جس کے پاس آپؐ تشریف لائیں تو ہمیں آپؐ سے کہنا چاہئے کہ کیا آپؐ نے مغافیر کھایا ہے؟ میں آپ سے مغافیر کی بساند (بو) محسوس کر رہی ہوں۔ آپؐ نے فرمایا ”نہیں میں نے مغافیر نہیں کھایا میں نے تو زینب کے ہاں شہد پیا ہے۔ اگر ایسا ہے تو میں آئندہ اس کا اعادہ نہیں کروں گا اور میں نے قسم کھالی ہے۔ کسی کو اس کی خبر نہ دینا۔ (بخاری) اللہ تعالیٰ نے اس واقعہ کا اشارہ اس آیت میں کیا ہے۔ یا ایھا النبی لم تحرم ما احل اللہ لک (۶۶:۱-۲) پس اللہ تعالیٰ نے اس تحریم کو قسم قرار دے دیا اور اس میں کفارہ کی ادائیگی فرض کر دی۔

(۹۳۱) وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا، قَالَ: إِذَا مَضَتْ أَرْبَعَةُ أَشْهُرٍ وقفَ المُوْلِيْ، حَتَّى يُطَلِّقَ، وَلاَ يَقَعُ عَلَيْهِ الطَّلاَقُ حَتَّى يُطَلِّقَ. أَخْرَجَهُ البُخَارِيُّ.

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما **سے روایت ہے کہ جب چار ماہ گزر جائیں تو ایلاء کرنے والے کو حاکم وقت کے پاس لا کھڑا کیا جائے اور اس وقت تک اسے چھوڑا نہ جائے جب تک وہ عدالت کے روبرو طلاق نہ دے اور طلاق دیئے بغیر اس پر طلاق واقع نہ ہوگی۔ (بخاری)**

لغوی تشریح: ﴿ وقف المولی ﴾ صیغہ مجہول ۔ اس سے مطالبہ و تقاضا کیا جائے گا کہ یا تو وہ بیوی سے تعلق زن و شو استوار کر لے یا پھر طلاق دے۔

(٩٣٢) وَعَنْ سُلَيْمَانَ بْنِ يَسَارٍ قَالَ: أَدْرَكْتُ بِضْعَةَ عَشَرَ رَجُلاً مِنْ أَصْحَابِ رَسُولِ اللهِ ﷺ، كُلُّهُمْ يَقِفُونَ ٱلْمُولِي. رَوَاهُ الشَّافِعِيُّ.

حضرت سلیمان بن یسار رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کے دس سے زائد صحابہ کو پایا ہے کہ وہ ایلاء کرنے والے کو کھڑا کر کے پوچھتے تھے۔ (اسے شافعی نے روایت کیا ہے)

لغوی تشریح: ﴿بضعة عشر﴾ بضعة باء کے کسرہ کے ساتھ۔ تین سے لے کر نو تک کی تعداد بضعة کہلاتی ہے۔ اس اثر اور اس سے پہلی والی حدیث کی طرف عام صحابہ کرام اور جمہور ائمہ ثلاثہ میں امام مالک رحمہ اللہ، امام شافعی رحمہ اللہ اور امام احمد رحمہ اللہ وغیرھم گئے ہیں کہ صرف چار ماہ کی مدت گزرنے سے طلاق واقع نہیں ہوگی تاوقتیکہ ایلاء کرنے والا خود طلاق نہ دے۔ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ اور ان کے اصحاب کہتے ہیں کہ مجرد مدت ایلاء گزرنے سے طلاق واقع ہو جاتی ہے۔ بعض صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے بھی اسی طرح مروی ہے۔ آیت ایلاء کے ظاہر سے تو وہی معلوم ہو رہا ہے جس طرف جمہور کا رجحان ہے۔

(٩٣٣) وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا قَالَ: كَانَ إِيْلاَءُ الجَاهِلِيَّةِ السَّنَةَ وَالسَّنَتَيْنِ، فَوَقَّتَ اللَّهُ أَرْبَعَةَ أَشْهُرٍ، فَإِنْ كَانَ أَقَلَّ مِنْ أَرْبَعَةِ أَشْهُرٍ فَلَيْسَ بِإِيْلاَءٍ. أَخرَجَهُ البَيْهَقِيُّ.

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ جاہلیت کا ایلاء سال دو سال تک ہوتا تھا۔ اللہ عزوجل نے اس کی مدت چار ماہ مقرر فرما دی۔ اب اگر چار ماہ سے کم مدت ہو تو وہ ایلاء شمار نہیں ہوگا۔ (بیہقی)

لغوی تشریح: "فوقت الله" توقیت سے ماخوذ ہے۔ وقت مقرر کیا۔

(٩٣٤) وَعَنْهُ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا، أَنَّ رَجُلاً ظَاهَرَ مِنِ امْرَأَتِهِ، ثُمَّ وَقَعَ عَلَيْهَا، فَأَتَى النَّبِيَّ ﷺ، فَقَالَ: إِنِّي وَقَعْتُ عَلَيْهَا قَبْلَ أَنْ أُكَفِّرَ، قَالَ: «فَلاَ تَقْرَبْهَا، حَتَّى تَفْعَلَ مَا أَمَرَكَ اللَّهُ». رَوَاهُ الأَرْبَعَةُ، وَصَحَّحَهُ التِّرْمِذِيُّ، وَرَجَّحَ النَّسَآئِيُّ إِرْسَالَهُ، وَرَوَاهُ البَزَّارُ مِنْ وَجْهٍ آخَرَ عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ، وَزَادَ فِيْهِ: «كَفِّرْ وَلاَ تَعُدْ».

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما ہی سے روایت ہے کہ ایک آدمی نے اپنی بیوی سے ظہار کیا اور پھر اس سے جماع کر لیا۔ پھر نبی ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا کہ میں نے کفارہ کی ادائیگی سے پہلے ہی اپنی بیوی سے مباشرت کر لی ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا "اب اس وقت تک اس کے پاس نہ جا جب تک اللہ کا ارشاد نہ پورا کر لو۔" (اسے چاروں نے روایت کیا اور ترمذی نے اسے صحیح کہا ہے اور نسائی نے اس کے مرسل ہونے کو ترجیح دی ہے) اور بزار نے ایک اور سند کے ساتھ ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے اور اس

میں اتنا اضافہ ہے کہ "کفارہ ادا کر اور پھر اس کا اعادہ نہ کر۔"

لغوی تشریح: ﴿ قبل ان اکفر ﴾ تکفیر سے ماخوذ ہے یعنی ظہار کا کفارہ ادا کرنے سے پہلے۔ ﴿ فلا تقربها ﴾ اس سے جماع نہ کر۔ ﴿ کفر ولا تعد ﴾ تکفیر سے کفر امر کا صیغہ ہے مطلب ہے کہ کفارہ ادا کر اور کفارہ ادا کرنے سے پہلے اس سے مباشرت نہ کر۔ اکثر اہل علم اس حدیث کے ظاہر کی طرف گئے ہیں اور فرماتے ہیں کہ ایسی صورت میں ایک ہی کفارہ ادا کرنا ہوگا اور بعض حضرات کا قول ہے کہ ایسی صورت میں دو کفارے ہیں۔ یہ قول اس حدیث کے برعکس ہے۔

(٩٣٥) وَعَنْ سَلَمَةَ بْنِ صَخْرٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: دَخَلَ رَمَضَانُ، فَخِفْتُ أَنْ أُصِيبَ ٱمْرَأَتِي، فَظَاهَرْتُ مِنْهَا، فَانْكَشَفَ لِي شَيْءٌ مِّنْهَا لَيْلَةً، فَوَقَعْتُ عَلَيْهَا فَقَالَ لِي رَسُولُ اللهِ ﷺ: «حَرِّرْ رَقَبَةً». فَقُلْتُ: مَا أَمْلِكُ إِلاَّ رَقَبَتِي. قَالَ: «فَصُمْ شَهْرَيْنِ مُتَتَابِعَيْنِ»، قُلْتُ: وَهَلْ أَصَبْتُ الَّذِي أَصَبْتُ إِلاَّ مِنَ الصِّيَامِ، قَالَ: «أَطْعِمْ عَرَقاً مِنْ تَمْرٍ سِتِّينَ مِسْكِيناً». أَخْرَجَهُ أَحْمَدُ وَالأَرْبَعَةُ إِلاَّ النَّسَائِيَّ، وَصَحَّحَهُ ابْنُ خُزَيْمَةَ وَابْنُ الجَارُودِ.

حضرت سلمہ بن صخر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رمضان المبارک شروع ہوا۔ مجھے اندیشہ لاحق ہوا کہ میں اپنی بیوی سے مباشرت کر بیٹھوں گا۔ اس اندیشہ کے پیش نظر میں نے بیوی سے ظہار کر لیا۔ ایک چاندنی رات میں اس کے بدن کی کوئی چیز میرے سامنے کھل گئی تو میں اس سے مجامعت کر بیٹھا۔ رسول اللہ ﷺ نے مجھے ارشاد فرمایا کہ "(غلام) آزاد کر۔" میں نے عرض کیا میں تو اپنی گردن کے سوا دوسری کسی گردن کا مالک نہیں ہوں۔ آپؐ نے فرمایا "تو پھر پے در پے دو ماہ کے روزے رکھ۔" میں نے عرض کیا اس مصیبت میں روزے ہی کی وجہ سے تو مبتلا ہوا ہوں۔ آپؐ نے فرمایا "اچھا تو پھر کھجوروں کا ایک ٹوکرا ساٹھ مسکینوں کو کھلا دو۔" (اسے احمد اور چاروں نے ماسوا نسائی کے روایت کیا ہے۔ ابن خزیمہ اور ابن جارود نے اسے صحیح کہا ہے)

لغوی تشریح: ﴿ حرر رقبة ﴾ تحریر سے امر کا صیغہ ہے۔ غلام آزاد کر۔ خواہ غلام ہو یا لونڈی۔ ﴿ اطعم عرقا من تمر ﴾ عرق عین اور را دونوں پر فتحہ اور "را" کا سکون بھی جائز ہے۔ بڑا ٹوکرا جس میں پندرہ صاع اناج کے آنے کی گنجائش ہو۔ اس سے معلوم ہوا کہ ہر مسکین کیلئے ایک مد ہونا چاہئے اور اس حدیث میں دلیل ہے کہ ظہار کا کفارہ بالترتیب ہے۔ اس کفارہ سے دوسرے کی جانب عدول جائز نہیں

تاوقتیکہ پہلا کفارہ ادا نہ کر سکتا ہو۔

راوی حدیث: ﴿ سلمہ بن صخر رضی اللہ عنہ ﴾ سلمہ بن صخر بن سلیمان بن صمہ بیاضی۔ بیاضی میں "با" پر فتحہ بنی بیاضہ کی جانب منسوب ہے جو خزرج قبیلہ کی شاخ تھی۔ یہ صاحب ان صحابہ کرامؓ میں سے تھے جو بہت رونے والے تھے۔

١٠ - بَابُ اللِّعَانِ

لعان کا بیان

(٩٣٦) عَنِ ابْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا قَالَ: سَأَلَ فُلاَنٌ فَقَالَ: يَا رَسُولَ اللهِ! أَرَأَيْتَ أَنْ لَو وَجَدَ أَحَدُنَا ٱمْرَأَتَهُ عَلىٰ فَاحِشَةٍ كَيْفَ يَصْنَعُ؟ إِنْ تَكَلَّمَ تَكَلَّمَ بِأَمْرٍ عَظِيْمٍ، وَإِنْ سَكَتَ سَكَتَ عَلىٰ مِثْلِ ذٰلِكَ. فَلَمْ يُجِبْهُ، فَلَمَّا كَانَ بَعْدَ ذٰلِكَ أَتَاهُ، فَقَالَ: «إِنَّ الَّذِي سَأَلْتُكَ عَنْهُ قَدِ ابْتُلِيتُ بِهِ، فَأَنْزَلَ اللَّهُ الآيَاتِ فِي سُورَةِ النُّورِ، فَتَلاَهُنَّ عَلَيْهِ وَوَعَظَهُ، وَذَكَّرَهُ، وَأَخْبَرَهُ أَنَّ عَذَابَ الدُّنْيَا أَهْوَنُ مِنْ عَذَابِ الآخِرَةِ»، قَالَ: لاَ، وَالَّذِيْ بَعَثَكَ بِالحَقِّ، مَا كَذَبْتُ عَلَيْهَا، ثُمَّ دَعَاهَا فَوَعَظَهَا كَذٰلِكَ، قَالَتْ: لاَ، وَالَّذِيْ بَعَثَكَ بِالحَقِّ، إِنَّهُ لَكَاذِبٌ، فَبَدَأَ بِالرَّجُلِ، فَشَهِدَ أَرْبَعَ شَهَادَاتٍ بِاللهِ، ثُمَّ ثَنَّى بِالمَرْأَةِ، ثُمَّ فَرَّقَ بَيْنَهُمَا. رَوَاهُ مُسْلِمٌ.

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ فلاں صاحب نے سوال کیا اے اللہ کے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم)! بتائیے اگر ہم میں سے کوئی اپنی اہلیہ کو فاحشہ فعل میں مبتلا پائے تو وہ کیا کرے؟ اگر وہ اسے دوسروں سے بیان کرتا ہے تو یہ نہایت قبیح فعل ہے اور اگر خاموش رہتا ہے تو یہ بھی نہایت مشکل کام ہے۔ آپؐ نے اس کا کوئی جواب نہ دیا۔ پھر بعد میں جب وہ آیا تو اس نے کہا کہ تحقیق جو کچھ میں نے آپؐ سے پوچھا ہے' میں خود ہی اس میں مبتلا ہوا ہوں۔ پس اللہ تعالیٰ نے سورۂ نور کی آیات نازل فرمائیں۔ آپؐ نے وہ آیات اس کے سامنے پڑھیں اور اسے نصیحت فرمائی اور اللہ کی سزا یاد کرائی اور فرمایا کہ "دنیا کا عذاب آخرت کے عذاب سے بہت ہلکا ہے۔ وہ بولا نہیں قسم ہے اس ذات کی جس نے آپؐ کو حق کے ساتھ مبعوث فرمایا ہے' میں نے اس پر جھوٹا الزام نہیں لگایا ہے۔" پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس عورت کو بلوایا اور اسے بھی اسی طرح نصیحت فرمائی۔ وہ بھی بولی نہیں اس خدا کی قسم! جس نے آپؐ کو حق کے ساتھ مبعوث فرمایا ہے یقیناً وہ مرد جھوٹا ہے۔ پھر آپؐ نے اس مرد سے آغاز فرمایا۔ اس مرد نے چار قسمیں کھائیں پھر آپؐ نے عورت سے بھی

قسمیں لیں اور دونوں کے درمیان تفریق فرما دی۔

(مسلم)

لغوی تشریح: ﴿باب اللعان﴾ لام کے کسرہ کے ساتھ لاعن' یلاعن' ملاعنۃ سے مصدر ہے۔ لعان کی صورت اس طرح ہوتی ہے کہ شوہر بیوی پر زنا کی تہمت لگاتا ہے اور بیوی اس سے انکار کرتی ہے شوہر کے پاس نہ تو گواہ ہوتے ہیں اور نہ کوئی ثبوت۔ بس اب شوہر چار مرتبہ اپنی بیوی کے خلاف اللہ کی قسم اٹھا کر شہادت دیتا ہے کہ اس نے جو الزام لگایا ہے اس میں وہ بالکل سچا ہے اور پانچویں مرتبہ کہتا ہے کہ اگر وہ جھوٹوں میں سے ہو تو اس پر خدا کی لعنت اور عورت کے لئے یہ صورت کہ وہ مرد کی شہادتوں کی تردید کرے اپنی طرف سے شہادتیں دے کر یعنی وہ بھی چار مرتبہ اللہ کے نام کی قسم کھا کر شہادت دے کہ وہ یقیناً جھوٹا آدمی ہے۔ اور پانچویں مرتبہ کہے کہ اگر وہ مجھ پر الزام لگانے میں سچا ہے تو مجھ پر اللہ کا غضب ٹوٹے پس اگر عورت نے یہ شہادتیں دے دیں تو اس پر زنا ثابت نہیں ہو گا اور اس کے شوہر پر حد قذف نہیں ہو گی اور ان کے درمیان ہمیشہ ہمیشہ کے لئے جدائی واقع ہو جائے گی اور اگر عورت ان قسموں سے انکار کرے تو مرد کو سچا قرار دے کر عورت پر حد رجم جاری کی جائے گی اور اس کا نام لعان اس لئے رکھا گیا ہے کہ میاں بیوی دونوں اپنے آپ پر لعنت کرتے ہیں۔ خواہ دوسرا سچا ہی ہو لفظ غضب عورت کی جانب سے اختیار کئے جانے کا مطلب یہ ہے کہ کہ یہ فعل لعنت کو مستلزم ہے۔ پس عورت کی طرف جو گناہ منسوب ہے۔ وہ زنا ہے اس دوران مرد کا گناہ قذف (تہمت زنا) ہے۔ ﴿سال فلان﴾ اکثر روایات میں اس کی صراحت ہے کہ فلاں سے مراد عویمر عجلانی ہے اور سیاق کلام بھی اس کا مقتضی ہے کہ یہ آیات اسی کے حق میں نازل ہوئی ہیں لیکن بہت سی روایات میں ہے کہ یہ آیات ھلال بن امیہ ضمری کے سلسلہ میں نازل ہوئی ہیں۔ یہ پہلے شخص ہیں جنہوں نے لعان کیا۔ پس ﴿انزل فیک﴾ کے قول کی یہ تاویل کی جائے گی کہ ایسے مسئلہ کے بارے میں نازل ہوئی جیسا تیرا مسئلہ ہے۔ ﴿واخبره ان عذاب الدنیا﴾ عذاب دنیا سے مراد حد قذف ہے۔ جس میں اسی کوڑے سزا ہے۔ ﴿اھون﴾ آسان و سھل ترین ﴿ثم ثنی بالمراۃ﴾ تثنیۃ سے ماخوذ و مشتق ہے۔ ایک فعل و کام کے بعد دوبارہ اسی کو کرنا۔ یعنی پہلے مرد نے قسمیں کھائیں پھر عورت نے اس کے بعد ﴿ثم فرق بینھما﴾ پھر دونوں میں تفریق کرا دی۔ بہت سے علماء نے اس سے یہ استدلال کیا ہے کہ لعان کرنے والے میاں بیوی کے درمیان تفریق حاکم وقت کے بغیر نہیں ہو سکتی۔ اس کے برعکس جمہور علماء اسلام مثلاً امام مالک رحمہ اللہ و شافعی رحمہ اللہ اور احمد رحمہ اللہ اور ان کے ہم خیال علماء و متبعین نے کہا ہے کہ فقط لعان سے تفریق واقع ہو جائے گی اور فرق بینھما کے جملہ کا مطلب یہ ہے کہ اس تفریق کو نمایاں اور ظاہر فرمایا اور حکم شرع بیان فرمایا۔ یہ مطلب نہیں ہے کہ نئے سرے سے فرقت و جدائی ڈالی۔ دلیل کے اعتبار سے جمہور کا قول ہی بہتر ہے۔

(۹۳۷) وَعَنْهُ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ رسول اللہ

عَنْهُمَا ، أَنَّ رَسُولَ اللهِ ﷺ قَالَ لِلْمُتَلاَعِنَيْنِ : «حِسَابُكُمَا عَلَى اللَّهِ، أَحَدُكُمَا كَاذِبٌ، لاَ سَبِيلَ لَكَ عَلَيْهَا»، قَالَ: يَا رَسُولَ اللهِ! مَالِيْ؟ فَقَالَ: «إِنْ كُنْتَ صَدَقْتَ عَلَيْهَا، فَهُوَ بِمَا اسْتَحْلَلْتَ مِنْ فَرْجِهَا، وَإِنْ كُنْتَ كَذَبْتَ عَلَيْهَا، فَذَاكَ أَبْعَدُ لَكَ مِنْهَا». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

ﷺ نے لعان کرنے والے زوجین سے فرمایا ''تم دونوں کا حساب اللہ کے ذمہ ہے۔ دونوں میں سے ایک تو جھوٹا ہے' اب تیرا اس عورت پر کوئی حق نہیں۔'' اس نے عرض کیا اے اللہ کے رسول (ﷺ)! میرا مال مجھے دلوا دیجئے۔ آپؐ نے فرمایا ''اگر تو نے اس پر سچا الزام لگایا ہے تو پھر یہ مال اس لذت صحبت کا معاوضہ ہے جو حلال کر کے تو نے اس سے حاصل کی ہے اور اگر تو نے اس پر جھوٹا الزام لگایا ہے تو مال تجھ سے اور بھی دور ہوگیا۔'' (بخاری و مسلم)

لغوی تشریح: ﴿لا سبیل لک علیھا﴾ یعنی اب تیرے لئے اس کے ساتھ ہونا حلال ہی نہیں بلکہ وہ تو تیرے لئے ہمیشہ کیلئے حرام ہوگئی ہے۔ اس سے جمہور نے استدلال کیا ہے کہ صرف لعان ہی فی نفسہٖ فرقت کا باعث ہے۔ تفریق کرانے کی ضرورت ہی نہیں۔ ﴿مالی﴾ میرا مال سے مراد وہ مال ہے جو مہر میں دیا تھا۔

(٩٣٨) وَعَنْ أَنَسٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ قَالَ: «أَبْصِرُوهَا، فَإِنْ جَاءَتْ بِهِ أَبْيَضَ، سَبِطاً، فَهُوَ لِزَوْجِهَا، وَإِنْ جَاءَتْ بِهِ أَكْحَلَ، جَعْداً، فَهُوَ لِلَّذِي رَمَاهَا بِهِ». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا ''عورت پر نظر رکھو اگر اس نے سفید رنگ کا سیدھے بالوں والا بچہ جنم دیا تو وہ اس کے شوہر کا ہے اور اگر اس نے ایسا بچہ جنم دیا جس کی آنکھیں سرمگیں اور بال گھنگھریالے ہوں تو پھر وہ بچہ اس کا ہوگا جس کے متعلق شوہر نے اس پر تہمت لگائی۔'' (بخاری و مسلم)

لغوی تشریح: ﴿فان جاء ت بہ﴾ بہ میں ضمیر مجرور اس بچہ کی جانب راجع ہے جو لعان کے موقع پر عورت کے رحم میں پرورش پا رہا تھا۔ مطلب یہ تھا کہ اگر اس عورت نے بچے کو جنم دیا تو اس پر نظر رکھنا۔ ﴿ابیض سبطا﴾ سفید رنگ والا۔ ﴿سبطا﴾ سین پر فتحہ اور ''با'' کے نیچے کسرہ اور ساکن بھی جائز ہے۔ ایسا آدمی جس کے بال سیدھے ہوں خمدار یا گھنگھریالے نہ ہوں۔ ﴿فھو لزوجھا﴾ کیونکہ اس کا خاوند اسی وصف والا تھا۔ ﴿اکحل﴾ سرمگیں چشم۔ ایسا شخص جس کی آنکھیں سرمہ لگائے بغیر ہی سرمگیں نظر آئیں۔ ﴿جعدا﴾ جیم پر فتحہ عین ساکن۔ ایسا شخص جس کی بال گھنگھریالے ہوں۔ ﴿فھو

للذی رماھابہ ﴾ پھر یہ بچہ اس مرد کا ہے شوہر نے عورت پر جس کی تہمت لگائی ہے اور متہم کیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ پھر وہ بچہ زانی کا ہوگا۔ کیونکہ زانی مرد سرمگیں آنکھوں والا' گھنگھریالے بالوں والا' پتلی پنڈلیوں والا تھا جیسا کہ مسلم کی روایت میں ہے اور روایات میں یہ بھی صراحت ہے کہ اس عورت نے ایسی مکروہ اوصاف والا بچہ ہی جنا تھا۔ اس سے یہ دلیل معلوم ہوئی کہ قیافہ قابل اعتبار و لحاظ ہے جبکہ کوئی مانع اس پر عمل کرنے میں رکاوٹ کا باعث نہ ہو اور لعان تو موانع سے زبردست مانع ہے۔ اس لئے کہ نبی ﷺ کا فرمان ہے "اگر وہ چیز نہ ہوتی جو کتاب اللہ میں گزری ہے تو اس کی خوب خبر لیتا۔"

(٩٣٩) وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُمَا، أَنَّ رَسُولَ اللهِ ﷺ أَمَرَ رَجُلاً أَنْ يَضَعَ يَدَهُ عِنْدَ الخَامِسَةِ عَلىٰ فِيْهِ، وَقَالَ: «إِنَّهَا مُوجِبَةٌ». رَوَاهُ أَبُو دَاوُدَ وَالنَّسَائِيُّ، وَرِجَالُهُ ثِقَاتٌ.

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک شخص کو حکم دیا کہ "وہ پانچویں قسم کے وقت قسم کھانے والے کے منہ پر ہاتھ رکھ دے" اور آپؐ نے فرمایا "یہ پانچویں قسم ہلاکت و بربادی کی موجب ہے۔" (ابوداؤد و نسائی اس کے راوی ثقہ ہیں)

لغوی تشریح : ﴿ عند الخامسۃ ﴾ یعنی پانچویں شہادت کے وقت۔ ﴿ انھا موجبۃ ﴾ جدائی اور عذاب الٰہی کو واجب کر دینے والی ہے۔ اگر اس نے جھوٹ بولا اور جھوٹا بیان دیا۔

(٩٤٠) وَعَنْ سَهْلِ بْنِ سَعْدٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُ - فِي قِصَّةِ الْمُتَلاَعِنَيْنِ - قَالَ: فَلَمَّا فَرَغَا مِنْ تَلاَعُنِهِمَا، قَالَ: كَذَبْتُ عَلَيْهَا يَا رَسُولَ اللهِ! إِنْ أَمْسَكْتُهَا، فَطَلَّقَهَا ثَلاَثاً قَبْلَ أَنْ يَأْمُرَهُ رَسُولُ اللهِ ﷺ. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت سہل بن سعد رضی اللہ عنہ سے لعان کرنے والوں کے قصہ میں مروی ہے کہ جب دونوں لعان سے فارغ ہوگئے تو مرد بولا اے اللہ کے رسول (ﷺ)! اور اگر میں اب اسے روک لوں گویا میں نے اس پر جھوٹا الزام لگایا ہے پھر اس نے اس سے پہلے کہ رسول اللہ ﷺ اسے حکم ارشاد فرماتے' تین طلاقیں دے دیں۔ (بخاری و مسلم)

حاصل کلام : اس مرد نے اپنی لعان شدہ بیوی کو تین طلاقیں اس لئے دیں کہ اسے علم نہیں تھا کہ لعان بذات خود ہمیشہ کی جدائی کا موجب ہے۔ پس اس نے بیوی کو بذریعہ طلاق ہی حرام کرنا چاہا۔ لہٰذا طلاق لغو ہوئی۔ کیونکہ طلاق اپنے مقام پر واقع ہی نہیں ہوئی۔ اگر ہم کہیں کہ جدائی صرف لعان سے ہو جاتی ہے تو یہ ظاہر بات ہے اور اگر کہیں کہ تفریق حاکم و عدالت کے ذریعہ واقع ہوتی ہے تو پھر یہ معلوم شدہ ہے کہ لعان کے بعد نکاح کے باقی رہنے کا کوئی امکان نہیں اور نہ اس کے ہمیشہ رہنے کی کوئی سبیل بلکہ لعان نکاح کے تعلق کو منقطع کر دیتا ہے اور عورت ہمیشہ کیلئے حرام ہو جاتی ہے' اس لئے تین طلاقیں

مقصد لعان کو مؤکد کرنے کیلئے ہیں۔ اس قسم کے نکاح میں طلاق کا نافذ ہونا لازم نہیں کرتا کہ اس کا نفوذ اس نکاح میں بھی ہو جس نکاح کا قائم رکھنا ہمیشہ کیلئے ہو۔ لہٰذا اس شخص کا استدلال باطل ہوا جس نے اس حدیث سے طلاق ثلاثہ کے جواز پر اور ان کے یکبارگی وقوع پر استدلال کیا ہے اور جب یہ طلاق غیرت و حمیت کی بنا پر دی گئی اور ایسے مقام پر اس کا اظہار مطلوب بھی ہے اور قابل ستائش و تعریف بھی ہے اس لئے دراصل نبی ﷺ نے مجرد یہ خبر دے کر یہ طلاق لغو ہے اس ارشاد سے مدد لی کہ لا سبیل لک علیھا یعنی اب تجھے اس عورت پر کوئی اختیار نہیں تیری طلاق واقع نہیں ہوگی بلکہ وہ لغو ہو جائے گی۔ آپ اس پر ناراض و غضبناک نہیں ہوئے جس طرح اس شخص پر ہوئے تھے جس کا قصہ محمود بن لبید نے بیان کیا ہے جو کہ طلاق کے باب میں بیان ہوا ہے۔

(٩٤١) وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُمَا، أَنَّ رَجُلاً جَآءَ إِلَى النَّبِيِّ ﷺ، فَقَالَ: إِنَّ امْرَأَتِي لاَ تَرُدُّ يَدَ لاَمِسٍ، قَالَ: «**غَرِّبْهَا**»، قَالَ: أَخَافُ أَنْ تَتْبَعَهَا نَفْسِي، قَالَ: «**فَاسْتَمْتِعْ بِهَا**». رَوَاهُ أَبُو دَاوُدَ وَالْبَزَّارُ، وَرِجَالُهُ ثِقَاتٌ. وَأَخْرَجَهُ النَّسَآئِيُّ مِنْ وَجْهٍ آخَرَ عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ، بِلَفْظِ «قَالَ: «**طَلِّقْهَا**» قَالَ: لاَ أَصْبِرُ عَنْهَا، قَالَ: «**فَأَمْسِكْهَا**».

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ ایک آدمی رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا۔ اے اللہ کے رسول (ﷺ)! میری بیوی کسی کا ہاتھ نہیں جھٹکتی۔ آپؐ نے فرمایا "اسے دور کر دو۔" مجھے اندیشہ اور خوف ہے کہ میرا نفس اس کے پیچھے لگے گا۔ تو فرمایا "اس سے فائدہ اٹھاتا رہ۔" (اسے ابوداؤد اور بزار نے روایت کیا ہے اور اس کے راوی ثقہ ہیں) ابن عباس رضی اللہ عنہما سے نسائی نے دوسرے طریق سے اسے روایت کیا ہے اس کے الفاظ ہیں کہ "اسے طلاق دے دو۔" وہ مرد بولا میں تو اس کے بغیر صبر نہیں کر سکتا۔ تو آپؐ نے ارشاد فرمایا "پھر اسے روکے رکھو۔"

لغوی تشریح: ﴿لا ترد ید لامس﴾ اس کا ایک معنی تو یہ کیا گیا کہ یہ زنا سے کنایہ ہے اور دوسرا یہ معنی کیا گیا ہے کہ تبذیر مراد ہے اور یہ دوسرا معنی تو انتہائی بعید قول ہے۔ مؤلف موصوف نے تلخیص میں کہا ہے بظاہر لاترد ید لامس کا یہ معنی ہے کہ وہ جو اس سے چھیڑ چھاڑ سے تلذذ حاصل کرنا چاہتا وہ خاتون کسی کا ہاتھ نہیں روکتی تھی۔ اگر اس سے جماع مراد لیا جائے تو اسے قاذف شمار کیا جائے گا یا پھر اس خاتون کے شوہر نے اس کے حال سے یہ سمجھ لیا کہ جو اس سے زنا کا ارادہ رکھتا ہو یہ اسے منع نہیں کرتی۔ یوں نہیں کہ کوئی اجنبی مرد اس سے جرم کا مرتکب ہو جاتا تھا۔ ﴿غربھا﴾ تغریب سے امر کا صیغہ ہے۔ معنی یہ ہے کہ اسے اپنے سے دور کر دے اس سے آپؐ کی مراد یہ تھی کہ اسے طلاق دے کر فارغ کر دے۔ ﴿اخاف ان تتبعھا نفسی﴾ مجھے خوف ہے کہ میرا نفس اس کا اشتیاق رکھے گا اور میں صبر نہ

کر سکوں گا۔ ﴿ فاستمتع بھا ﴾ پھر اس کو بچانے کی غرض سے اس سے نباہ کر مبادا کہ وہ فعل زنا کا ارتکاب کر بیٹھے۔

(٩٤٢) وَعَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، أَنَّهُ سَمِعَ رَسُولَ اللهِ ﷺ يَقُولُ حِيْنَ نَزَلَتْ آيَةُ الْمُتَلاَعِنَيْنِ: «أَيُّمَا امْرَأَةٍ أَدْخَلَتْ عَلَى قَوْمٍ مَنْ لَيْسَ مِنْهُمْ فَلَيْسَتْ مِنَ اللهِ فِي شَيْءٍ، وَلَنْ يُدْخِلَهَا اللَّهُ جَنَّتَهُ، وَأَيُّمَا رَجُلٍ جَحَدَ وَلَدَهُ، وَهُوَ يَنْظُرُ إِلَيْهِ، احْتَجَبَ اللَّهُ عَنْهُ، وَفَضَحَهُ عَلَى رُؤُوسِ الأَوَّلِينَ وَالآخِرِينَ». أَخْرَجَهُ أَبُو دَاوُدَ وَالنَّسَائِيُّ وَابْنُ مَاجَهْ، وَصَحَّحَهُ ابْنُ حِبَّانَ.

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ جب لعان کرنے والوں کے بارے میں آیت نازل ہوئی تو انہوں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا آپؐ فرماتے تھے ”جو عورت کسی قوم میں ایسا بچہ لا داخل کرے جو اس میں سے نہ ہو تو اس عورت کا اللہ تعالیٰ سے کوئی تعلق نہیں اور اللہ تعالیٰ ایسی عورت کو ہرگز اپنی جنت میں داخل نہیں کرے گا اور جس مرد نے اپنے بچہ کا انکار کیا جبکہ وہ بچہ اس کی طرف دیکھ رہا ہو تو قیامت کے روز اللہ تعالیٰ اس سے پردہ فرما لے گا اور اسے اپنی پہلی اور پچھلی ساری مخلوق کے سامنے رسوا و ذلیل کرے گا۔“ (اسے ابوداؤد' نسائی اور ابن ماجہ نے روایت کیا ہے اور ابن حبان نے اسے صحیح کہا ہے)

لغوی تشریح: ﴿ ایما امراۃ ادخلت الخ ﴾ جو عورت زنا سے حاملہ ہو جائے اور شوہر کو اس کا شعور ہی نہ ہو اور وہ یہ سمجھتا رہے کہ بچہ اس کے نطفہ سے ہے۔ یہ حرمت زنا کی غلاظت پر دلیل ہے کیونکہ یہ سبب ہے بچے کو ایسی قوم میں لاگھسانے کا جو دراصل اس قوم کا نہیں ہے۔ ﴿ فلیست من اللہ ﴾ اس کا اللہ کی رحمت اور اس کے دین سے کوئی تعلق نہیں۔ ﴿ جحد ولدہ ﴾ اپنے بچہ کا خود انکار کرے اور اس کی نفی کرے۔ ﴿ وھو ینظر الیہ ﴾ جبکہ وہ بچہ اس کی طرف دیکھ رہا ہو یعنی اسے اس کا علم ہو کہ وہ اسی کا بچہ ہے یا یہ معنی کہ وہ بچہ اس مرد کی جانب دیکھ رہا ہو۔ یہ کنایہ ہے قلت شفقت اور قساوت قلبی سے۔ ﴿ احتجب اللہ عنہ ﴾ اللہ تعالیٰ اس سے حجاب فرمائے گا اور اسے اپنی رحمت سے دور کر دے گا۔ وفضحہ اور اسے رسوا و ذلیل و خوار کرے گا۔

(٩٤٣) وَعَنْ عُمَرَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، قَالَ: مَنْ أَقَرَّ بِوَلَدِهِ طَرْفَةَ عَيْنٍ فَلَيْسَ لَهُ أَنْ يَنْفِيَهُ. أَخْرَجَهُ الْبَيْهَقِيُّ، وَهُوَ حَسَنٌ مَوْقُوفٌ.

حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ جس شخص نے ایک لمحہ بھر اپنے بچہ کا اقرار کیا پھر اسے اس کی نفی کرنے کا کوئی اختیار نہیں ہے۔ (اسے بیہقی نے روایت کیا ہے اور یہ روایت حسن موقوف ہے)

لغوی تشریح: ﴿ طرفۃ عین ﴾ ”طا“ پر فتحہ' را ساکن۔ پلکوں کو بند کر کے کھولنے تک کا وقت۔ یعنی

بس اتنی مقدار کے مساوی۔

حاصل کلام: اس سے معلوم ہوا کہ جب کوئی لمحہ بھر کیلئے کسی بچے کو اپنا بچہ تسلیم کر لے اور اقرار کر لے کہ یہ بچہ واقعتاً اسی کا ہے تو پھر وہ واقعتاً ساری عمر کے لئے اسی کا ہو جاتا ہے۔ حضرت ابو ھریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ضمضم بن قتادہ صحابی بعض شبہات کی بنا پر اپنے بچہ کا انکار کرنا چاہتا تھا مگر رسول اللہ ﷺ نے اسے انکار نہیں کرنے دیا تھا۔ جیسا کہ آئندہ حدیث میں آرہا ہے۔

(٩٤٤) وَعَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، أَنَّ رَجُلاً قَالَ: يَا رَسُولَ اللهِ! إِنَّ ٱمْرَأَتِيْ وَلَدَتْ غُلاماً أَسْوَدَ، قَالَ: «**هَلْ لَكَ مِنْ إِبِلٍ؟**» قَالَ: نَعَمْ، قَالَ: «**فَمَا أَلْوَانُهَا؟**» قَالَ: حُمْرٌ، قَالَ: «**هَلْ فِيهَا مِنْ أَوْرَقَ؟**» قَالَ: نَعَمْ، قَالَ: «**فَأَنَّى ذٰلِكَ؟**» قَالَ: لَعَلَّهُ نَزَعَهُ عِرْقٌ، قَالَ: «**فَلَعَلَّ ابْنَكَ هَذَا نَزَعَهُ عِرْقٌ**». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ. وَفِيْ رِوَايَةٍ لِّمُسْلِمٍ: «وَهُوَ يُعَرِّضُ بِأَن يَنْفِيَهُ» وَقَالَ فِي آخِرِهِ: «وَلَمْ يُرَخِّصْ لَهُ فِي ٱلاِنْتِفَآءِ مِنْهُ».

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ایک شخص نے عرض کیا' اے اللہ کے رسول (ﷺ)! میری بیوی نے کالے رنگ کا بچہ جنا ہے۔ آپؐ نے اس سے پوچھا "کیا تمہارے پاس کچھ اونٹ ہیں؟" تو اس نے کہا ہاں! آپؐ نے دریافت فرمایا "ان کے رنگ کیا ہیں؟" اس نے کہا سرخ۔ آپؐ نے دریافت فرمایا "ان میں کوئی خاکستری رنگ کا بھی ہے؟" اس نے کہا ہاں! آپؐ نے دریافت فرمایا "وہ رنگ کہاں سے آگیا؟" وہ بولا کوئی رگ اسے کھینچ لائی ہوگی۔ تو آپؐ نے فرمایا "پھر تیرے اس بیٹے کو بھی کوئی رگ کھینچ لائی ہوگی۔" (بخاری و مسلم) اور مسلم کی ایک روایت میں ہے۔ وہ اس بچے کی نفی کی طرف اشارہ کر رہا تھا اور اس روایت کے آخر میں ہے کہ آپؐ نے اسے نفی کی رخصت و اجازت نہ دی۔

لغوی تشریح: ﴿ حمر ﴾ "حا" پر ضمہ اور میم ساکن۔ احمر کی جمع۔ اس کے معنی سرخ۔ ﴿ اورق ﴾ جس میں سیاہی مائل سفیدی ہو یا جس میں سیاہی تو ہو مگر سخت سیاہی نہ ہو اس طرح کہ مائل بہ خاکستر ہو۔ ﴿ لعلہ نزعہ ﴾ ممکن ہے اس نے اپنی طرف کھینچ لیا ہو۔ ﴿ عرق ﴾ عین کے نیچے کسرہ اور را ساکن۔ اصل کے معنی میں۔ یعنی یہ اپنے اصلی رنگ پر پیدا ہوا ہے یعنی اس کی دور کی جڑ اور اصل کا رنگ یہی تھا۔ ﴿ یعرض بان ینفیہ ﴾ تعریض سے ماخوذ ہے یعنی وہ بچہ کی طرف اشارہ کر رہا تھا کہ یہ اس کا بچہ نہیں ہے۔

حاصل کلام: اس حدیث میں ایک مغالطہ کی تصحیح کی گئی ہے کہ کالے رنگ نے صحابی کو مغالطہ اور اشتباہ میں مبتلا کر دیا کہ ہم میاں بیوی تو سیاہ رنگ نہیں پھر یہ بچہ اس رنگ کا کہاں سے پیدا ہوگیا۔ رسول اللہ

ﷺ کے پاس جب اس نے عندیہ اور مافی الضمیر ظاہر کیا تو آپؐ نے اسے ڈانٹ پلائی اور نہ اس کی بیوی کی صریح الفاظ میں صفائی پیش فرمائی۔ بلکہ عربوں کی ذہنی سطح پر اتر کر آپؐ نے سمجھانے کی کوشش فرمائی اور کامیاب رہے کہ سفید رنگ کے زوجین کے ہاں سیاہ رنگ بچے کی پیدائش بچے کی ماں کی بدکاری و بدچلنی پر دلالت نہیں کرتی' یہ خاندانی اثرات ہوتے ہیں جو کبھی بہت دور نسل میں نمایاں ہو جاتے ہیں۔ جس سے بچے کے نسب پر درحقیقت کوئی عیب اور نقص واقع نہیں ہوتا۔ اس سے معلوم ہوا کہ سائل کو جواب حکمت سے دینا چاہئے اور اس کی ذہنی سطح کو ملحوظ رکھ کر دینا چاہئے۔ فلسفیانہ جواب کی بجائے عام روزمرہ کی مثالوں سے دینا تفہیم مدعا کیلئے زیادہ مفید اور کارگر ہے۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ جس چیز کی حقیقت کا علم نہ ہو اسے صاحب علم سے دریافت کر لینا بہت بڑے فتنہ سے محفوظ رکھ سکتا ہے۔

١١ - بَابُ العِدَّةِ وَالإِحْدَادِ وَالاسْتِبْرَاءِ وَغَيرِ ذٰلِكَ

عدت' سوگ اور استبراء رحم کا بیان

(٩٤٥) عَنِ المِسْوَرِ بْنِ مَخْرَمَةَ، أَنَّ سُبَيْعَةَ الأَسْلَمِيَّةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهَا نُفِسَتْ بَعْدَ وَفَاةِ زَوْجِهَا بِلَيَالٍ، فَجَاءَتِ النَّبِيَّ ﷺ، فَاسْتَأْذَنَتْهُ أَنْ تَنْكِحَ، فَأَذِنَ لَهَا، فَنَكَحَتْ. رَوَاهُ البُخَارِيُّ، وَأَصْلُهُ فِي الصَّحِيحَيْنِ. وَفِي لَفْظٍ: أَنَّهَا وَضَعَتْ بَعْدَ وَفَاةِ زَوْجِهَا بِأَرْبَعِينَ لَيْلَةً.

وَفِي لَفْظٍ لِمُسْلِمٍ: قَالَ الزُّهْرِيُّ: وَلاَ أَرَى بَأْساً أَنْ تَزَوَّجَ وَهِيَ فِي دَمِهَا، غَيْرَ أَنَّهُ لاَ يَقْرَبُهَا زَوْجُهَا حَتَّى تَطْهُرَ.

حضرت مسور بن مخرمہ رحمہ اللہ تعالیٰ سے روایت ہے کہ سبیعہ اسلمیہ رضی اللہ عنہا نے اپنے شوہر کی وفات کے چند روز بعد بچہ جنا۔ وہ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئی اور نکاح کی اجازت طلب کی۔ آپؐ نے اسے نکاح کی اجازت دے دی اور اس نے نکاح کر لیا۔ (اسے بخاری نے روایت کیا ہے اور اس حدیث کی اصل بخاری و مسلم دونوں میں موجود ہے) اور ایک روایت میں ہے کہ اس نے اپنے شوہر کی وفات کے چالیس روز بعد بچے کو جنم دیا۔

اور مسلم کی روایت کے الفاظ ہیں کہ زہری نے کہا میں تو اس میں بھی کوئی مضائقہ نہیں سمجھتا کہ حالت نفاس میں ہی نکاح کر لے مگر اس کا شوہر اس کے قریب اس وقت تک نہ جائے جب تک کہ وہ نفاس سے غسل کر کے پاک و صاف نہ ہو جائے۔

لغوی تشریح: ﴿ باب العدة ﴾ عدة کے عین کے نیچے کسرہ اور دال پر تشدید ہے۔ یہ عدت اس مدت انتظار کو کہتے ہیں جو عورت اپنے شوہر کی جدائی کے بعد طلاق کی وجہ سے یا فسخ نکاح یا خاوند کی وفات کی وجہ سے گزارتی ہے اور سوگ منانے کا نام ہے اور احداد مصدر ہے "احدت المراة علی زوجها تحد فهی محدة" یعنی عورت اپنے شوہر کا سوگ مناتی ہے وہ سوگ منانے والی ہوتی ہے جب وہ خاوند کی

وفات کی وجہ سے غمزدہ اور غمگین ہوتی ہے اور حزن وملال والا لباس پہنتی ہے اور جسمانی' بدنی زیب وزینت اور آرائش ترک کر دیتی ہے۔ یہ حدت تحد فھی حادۃ سے بھی ماخوذ ہے۔ حد کے معنی دراصل تومنع کرنے اور روکنے کے ہیں اور جامع معنی یہ ہیں کہ جس خاتون کا شوہر وفات پاجائے وہ اپنے آپ کو زیب و آرائش سے روک لیتی ہے اور خوشبوؤں کا استعمال ترک کردیتی ہے۔ ﴿ نفست ﴾ صیغۂ مجہول۔ یعنی اس نے وضع حمل کیا اور نفاس والی بن گئی۔ ﴿ وھی فی دمھا ﴾ دمھا سے مراد ہے کہ وہ ہنوز نفاس کی حالت میں تھی۔ ﴿ لا یقربھا زوجھا ﴾ اس کا شوہر اس کے قریب بھی نہ پھٹکے سے مراد ہے کہ اس حالت میں اس سے لطف اندوز نہ ہو۔ یہ حدیث اس بات کی دلیل ہے کہ حاملہ کی عدت وضع حمل ہے لمبی اور طویل ہو یا مختصر اور تھوڑی۔ عام اہل علم کی یہی رائے ہے۔

حاصل کلام: اس حدیث سے حاملہ کی عدت کی مدت جس کا شوہر فوت ہوگیا ہو' ثابت ہو رہی ہے کہ وضع حمل ہے۔ اس حدیث میں جس خاتون کا ذکر ہے وہ سبیعہ رضی اللہ عنہا نامی مشہور صحابیہ ہیں۔ اس کا پہلا شوہر سعد ابن خولہ رضی اللہ عنہ حجۃ الوداع سے چند روز بعد مکہ مکرمہ میں وفات پا گیا تھا سبیعہ رضی اللہ عنہا نے سعد رضی اللہ عنہ کی وفات کے چالیس یا پچاس روز بعد یا اس سے بھی پہلے بچہ کو جنم دیا۔ اس حدیث سے معلوم ہوا کہ وہ حاملہ جس کا شوہر وفات پا گیا ہو اس کی عدت بچے کی پیدائش کے ساتھ ہی ختم ہو جاتی ہے خواہ وہ مدت چار ماہ دس دن سے کم ہو یا زیادہ۔ جمہور علماء کی یہی رائے ہے۔ ان کی دلیل یہ ارشاد باری تعالیٰ ہے۔ واولات الاحمال اجلھن ان یضعن حملھن اس آیت میں جس طرح حاملہ مطلقہ کی مدت عدت بیان ہوئی ہے اسی طرح بیوہ حاملہ عورت کی عدت بھی بیان ہوئی ہے۔ جیسا کہ اس بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صراحت فرمائی ہے جسے امام عبداللہ بن احمد نے زوائد مسند میں اور ضیاء نے المختارہ میں بیان کیا ہے۔

راوی حدیث: ﴿ سبیعہ رضی اللہ عنہا ﴾ (تصغیر کے ساتھ) بنت حارث اسلمیہ۔ بنو اسلم کی جانب منسوب ہونے کی وجہ سے اسلمیہ کہلاتی ہیں۔ مشہور و معروف صحابیہ ہیں۔ ابن سعد کے بقول یہ مہاجرات میں سے ہیں۔ یہ خاتون سعد بن خولہ کے عقد نکاح میں تھیں۔ حجۃ الوداع کے موقع پر مکہ میں اس کا چچا وفات پا گیا پھر اس نے اپنی قوم کے ایک نوجوان سے نکاح کرلیا۔ جس کا نام ابوالسنابل تھا۔

﴿ الزھری ﴾ محمد بن مسلم بن عبیداللہ بن عبداللہ بن شہاب القرشی الزھری۔ بہت بڑے عالم و فاضل۔ حجاز و شام دونوں کے مشترکہ عالم تھے۔ چوتھے طبقہ کے سرکردہ علماء کرام میں سے تھے۔ ان کی جلالت شان اور اتقان پر سب متفق ہیں۔ لیث کا قول ہے میں نے ابن شہاب ایسا جامع الصفات عالم کبھی نہیں دیکھا اور امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے کہ ابن شہاب بہت سخی انسان تھے۔ انسانوں میں ان کی نظیر و مثال نہیں ملتی۔ ۱۲۴ھ میں وفات پائی۔

(٩٤٦) وَعَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهَا، قَالَتْ: أُمِرَتْ بَرِيْرَةُ أَنْ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ بریرہ کو حکم دیا گیا کہ وہ تین حیض عدت گزارے۔ (اسے ابن ماجہ

تَعْتَدَّ بِثَلاَثِ حِيَضٍ. رَوَاهُ ابْنُ مَاجَهْ، وَرُوَاتُهُ ثِقَاتٌ، لٰكِنَّهُ مَعْلُولٌ.

نے روایت کیا ہے۔ اس کے راوی ثقہ ہیں لیکن یہ روایت معلول ہے)

حاصل کلام: اس حدیث میں حضرت بریرہ رضی اللہ عنہا کے بارے میں ذکر ہے کہ ان کو عدت تین حیض گزارنے کا حکم دیا گیا۔ حضرت بریرہ کے شوہر کا نام مغیث تھا۔ بریرہ رضی اللہ عنہا کو آزادی کی نعمت مل گئی اور مغیث ابھی تک غلامی کی زنجیر میں جکڑا ہوا تھا۔ آزادی کے بعد بریرہ رضی اللہ عنہا کو اختیار دیا گیا تو اس نے اس سے فائدہ اٹھاتے ہوئے نکاح فسخ کر دیا اب اسے بھی آزاد خواتین کی طرح عدت ماہواری گزارنی پڑی۔

(٩٤٧) وَعَنِ الشَّعْبِيِّ عَنْ فَاطِمَةَ بِنْتِ قَيْسٍ، عَنِ النَّبِيِّ ﷺ، فِي الْمُطَلَّقَةِ ثَلاَثاً لَيْسَ لَهَا سُكْنَى، وَلاَ نَفَقَةَ. رَوَاهُ مُسْلِمٌ.

شعبی نے فاطمہ بنت قیس رضی اللہ عنہا سے روایت کیا ہے کہ نبی ﷺ نے مطلقہ ثلاثہ کے متعلق فرمایا ہے کہ "اس کیلئے نہ رہائش ہے اور نہ نان و نفقہ۔" (مسلم)

لغوی تشریح: ﴿المطلقة ثلاثا﴾ جسے متفرق طور پر تین طلاقیں ہوئی ہوں۔ فاطمہ بنت قیس رضی اللہ عنہا کو اسی طرح طلاق ہوئی تھی اور یہ حدیث اس بات میں بالکل صریح ہے کہ مطلقہ ثلاثہ کیلئے نہ نفقہ ہے اور نہ رہائش۔ امام احمد رحمہ اللہ کا یہی مذہب ہے اور امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کا قول ہے کہ اس کیلئے رہائش اور نفقہ دونوں ہیں۔ امام مالک رحمہ اللہ اور امام شافعی رحمہ اللہ دونوں کی رائے ہے کہ ایسی عورت رہائش کا استحقاق تو رکھتی ہے مگر نفقہ کا نہیں۔ ان حضرات نے فاطمہ رضی اللہ عنہا کی اس حدیث سے بہت سے عذر تراشے ہیں مگر ان میں سے ایک بھی قابل اعتناء نہیں۔ امام احمد رحمہ اللہ نے اپنی مسند میں روایت کیا ہے کہ نبی ﷺ نے اس سے فرمایا کہ "مرد پر عورت کا نان و نفقہ اور رہائش اس صورت میں ہے جب طلاق رجعی ہو اور جب طلاق رجعی نہ ہو تو پھر مرد کے ذمہ نہ اس کا نان و نفقہ ہے اور نہ رہائش۔" اور نسائی کی ایک روایت میں ہے جب اس کی صورت یہ ہو کہ جب تک وہ دوسرے مرد سے نکاح نہ کرے اس وقت تک حلال نہیں ہوتی' ایسی عورت کیلئے نان و نفقہ ہے اور نہ رہائش۔ یہ دونوں روایتیں اس معاملہ میں بالکل واضح اور صریح ہیں کہ رہائش اور نفقہ اس صورت میں ساقط ہوتا ہے جب عورت کو طلاق بائنہ ہوئی ہو۔ اس کے علاوہ دوسری کسی صورت میں نہیں۔ ان احادیث سے حق واضح ہو جاتا ہے اور وہ تمام عذر باطل ہو جاتے ہیں جو احناف وغیرہ نے کئے ہیں۔ پس تمام عذر باطل ہو گئے اور صریح حق صاف اور واضح ہو گیا۔

(٩٤٨) وَعَنْ أُمِّ عَطِيَّةَ، أَنَّ رَسُولَ اللهِ ﷺ قَالَ: «لاَ تُحِدُّ امْرَأَةٌ عَلَى مَيِّتٍ فَوْقَ ثَلاَثٍ، إِلاَّ عَلَى زَوْجٍ أَرْبَعَةَ أَشْهُرٍ وَعَشْراً، وَلاَ تَلْبَسُ ثَوْباً مَصْبُوغاً، إِلاَّ ثَوْبَ عَصْبٍ، وَلاَ تَكْتَحِلُ، وَلاَ تَمَسُّ طِيباً، إِلاَّ إِذَا

حضرت ام عطیہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "کوئی عورت کسی میت پر تین روز سے زیادہ سوگ نہ منائے۔ سوائے خاوند کے' اس پر چار ماہ دس دن سوگ منائے۔ زمانہ سوگ میں رنگ دار لباس نہ پہنے لیکن رنگے ہوئے سوت کا کپڑا پہن سکتی ہے۔ سرمہ نہ لگائے' خوشبو استعمال نہ کرے۔

طَهُرَتْ، نُبْذَةً مِنْ قُسْطٍ أَوْ أَظْفَارٍ». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ، وَهٰذَا لَفْظُ مُسْلِمٍ، وَلِأَبِيْ دَاوُدَ وَالنَّسَآئِيِّ مِنَ الزِّيَادَةِ: «وَلاَ تَخْتَضِبُ». وَلِلنَّسَآئِيِّ: «وَلاَ تَمْتَشِطُ».

مگر جب ایام حیض سے پاک ہو تو تھوڑی سی عود ھندی (ایک خوشبو دار لکڑی) یا اظفار (مشک) استعمال کر سکتی ہے۔" (بخاری و مسلم۔ یہ الفاظ مسلم کے ہیں) اور ابوداؤد اور نسائی میں اتنا اضافہ ہے کہ مہندی و خضاب نہ لگائے اور نسائی میں ہے کنگھی بھی نہ کرے۔

لغوی تشریح: ﴿ ثوب عصب ﴾ فتحہ اور سکون کے ساتھ۔ یہ ترکیب اضافی ہے۔ یعنی یمنی چادریں۔ جن کا سوت بننے سے پہلے ہی اکٹھا یا جمع کر دیا جاتا ہے اور کئی جگھوں میں مضبوطی سے باندھ دیا جاتا ہے تو اس طرح بعض مقام سے سفید ہوتا ہے اور بعض جگہ سے رنگ دار۔ پھران چادروں کو ان دھاگوں کے ساتھ بنا جاتا ہے تو یہ دھاری دار تیار ہو جاتا ہے۔ ﴿ نبذة ﴾ نون پر ضمہ اور "با" ساکن۔ کسی چیز کا ٹکڑا' یہ معمولی چیز کیلئے بولا جانے لگا۔ ﴿ قسط ﴾ قاف پر ضمہ اور سین ساکن۔ خوشبو دار لکڑی جس سے دھونی دی جاتی ہے۔ ہندوستان سے عرب میں لے جائی جاتی ہے۔ ﴿ اظفار ﴾ ھمزہ پر فتحہ۔ خوشبو کی ایک قسم۔ اس کا واحد نہیں آتا اور ایک قول یہ بھی ہے کہ اس کا واحد ظفر آتا ہے۔ وہ عطر کی کالی رنگ کی چیز اس کا ٹکڑا ناخن کے مشابہ ہوتا ہے۔ امام نووی رحمہ اللہ کا قول ہے کہ اس خوشبو کی رخصت ایام حیض سے غسل کرنے والی کیلئے ہے تاکہ مکروہ بو کا ازالہ کیا جاسکے۔ اس کا استعمال خوشبو کیلئے نہیں۔

(٩٤٩) وَعَنْ أُمِّ سَلَمَةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهَا، قَالَتْ: جَعَلْتُ عَلَى عَيْنِيْ صَبِراً، بَعْدَ أَنْ تُوُفِّيَ أَبُو سَلَمَةَ، فَقَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «إِنَّهُ يَشُبُّ الوَجْهَ، فَلاَ تَجْعَلِيهِ إِلاَّ بِاللَّيْلِ، وَانْزِعِيهِ بِالنَّهَارِ، وَلاَ تَمْتَشِطِي بِالطِّيبِ، وَلاَ بِالحِنَّاءِ فَإِنَّهُ خِضَابٌ»، قُلْتُ: بِأَيِّ شَيْءٍ أَمْتَشِطُ؟ قَالَ: «بِالسِّدْرِ». رَوَاهُ أَبُو دَاوُدَ وَالنَّسَآئِيُّ، وَإِسْنَادُهُ حَسَنٌ.

حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ ابوسلمہ کی وفات کے بعد میں نے اپنی آنکھوں پر مصبر (ایک قسم کی دوائی) کا لیپ کیا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "مصبر چہرے کو صاف کرتا اور چمکاتا ہے۔ اسے صرف رات کے اوقات میں استعمال کر اور دن کو منہ سے اتار دیا کر۔ خوشبو اور مہندی والی کنگھی نہ کر۔ مہندی تو ایک قسم کا خضاب ہے۔" میں نے عرض کیا۔ تو پھر کس چیز کے ساتھ کنگھی کروں؟ فرمایا "بیری کے پتوں کو پانی میں ڈال کر اس کے ساتھ۔" (اسے ابوداؤد اور نسائی نے روایت کیا ہے اور اس کی سند حسن ہے)

لغوی تشریح: ﴿ صبرا ﴾ صاد کے فتحہ اور با کے نیچے کسرہ اور کبھی ساکن بھی ہوتی ہے۔ ایک درخت کا

سوت ہے جو انتہائی کڑوا ہوتا ہے۔ یہاں تک کہ اس کی کڑواہٹ زہر کی حد تک پہنچ جاتی ہے۔ بطور دوا دونوں آنکھوں کے اطراف پر اس کا لیپ کیا جاتا ہے۔ اگر آنکھوں کے اندر لگایا جائے تو نظر ضائع ہو جاتی ہے۔ ﴿ انه يشب الوجه ﴾ يشب باب ضرب اور نصر دونوں سے آتا ہے۔ رنگت کو نکھارتا ہے' صاف کرتا ہے' رنگ میں اضافہ کرتا ہے۔ چہرے پر رونق' جمال و خوبصورتی اس طرح نمایاں کر دیتا ہے جس طرح نوجوان کا چہرہ خوبرو اور مزین ہوتا ہے اور سوگ کے ایام گزارنے والی عورت کیلئے یہ چیزیں مستحسن نہیں اور نہ اسے زیب ہی دیتی ہیں۔

(٩٥٠) وَعَنْهَا أَنَّ ٱمْرَأَةً قَالَتْ: يَا رَسُولَ اللهِ! إِنَّ ابْنَتِيْ مَاتَ عَنْهَا زَوْجُهَا، وَقَدِ اشْتَكَتْ عَيْنَهَا، أَفَنَكْحُلُهَا؟ قَالَ: **لاَ**. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا ہی سے مروی ہے کہ ایک عورت نے عرض کیا۔ اے اللہ کے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم)! میری بیٹی کا شوہر وفات پا گیا ہے اور بیٹی آشوب چشم میں مبتلا ہو گئی ہے کیا میں اس کی آنکھوں میں سرمہ لگا سکتی ہوں؟ فرمایا "نہیں۔" (بخاری و مسلم)

لغوی تشریح: ﴿ وقد شتكت عينها ﴾ عينها پر فاعل ہونے کی بنا پر رفع ہے اور نصب اس کے مفعول ہونے کی وجہ سے۔ دوسری صورت میں فاعل کی ضمیر بنت (بیٹی) کی جانب راجع ہے۔ ﴿ افنكحلها ﴾ باب نصر اور فتح دونوں سے۔ یہ حدیث دلیل ہے کہ سوگ منانے والی عورت کیلئے سرمہ کا استعمال حرام ہے۔ ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے ایک عورت نے فتویٰ پوچھا تو انہوں نے کہا رات کے وقت لگا لو اور دن کے وقت اسے دھو ڈالو۔ جیسا کہ مؤطا وغیرہ میں ہے اور ابوداؤد کے الفاظ ہیں۔ پس تو رات کو سرمہ لگا لے اور دن میں اسے دھو ڈال۔ اس سے معلوم ہوا کہ رات میں سرمہ لگانا جائز ہے بشرطیکہ اس کی ضرورت ہو۔ تاہم اس کا ترک کرنا اولیٰ ہے۔ سرمہ کی ممانعت کا سبب یہ ہے کہ یہ خوبصورتی کا موجب ہے لہٰذا اگر سرمہ سفید ہو جس میں زینت بھی نہ ہو تو اس کا دن کے اوقات میں استعمال کرنے میں کوئی حرج نہیں۔

(٩٥١) وَعَنْ جَابِرٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، قَالَ: طُلِّقَتْ خَالَتِيْ، فَأَرَادَتْ أَنْ تَجُدَّ نَخْلَهَا، فَزَجَرَهَا رَجُلٌ أَنْ تَخْرُجَ، فَأَتَتِ النَّبِيَّ ﷺ، فَقَالَ: «**بَلْ جُدِّي نَخْلَكِ، فَإِنَّكِ عَسَى أَنْ تَصَدَّقِي، أَوْ تَفْعَلِي مَعْرُوفاً**». رَوَاهُ مُسْلِمٌ.

حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میری خالہ کو طلاق دی گئی اور اس نے دوران عدت اپنی کھجور کا پھل اتارنے کے ارادہ سے باہر جانا چاہا تو ایک آدمی نے ان کو ڈانٹا۔ وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئیں۔ آپؐ نے فرمایا "ہاں تم اپنے درختوں کا پھل توڑ سکتی ہو۔ عین ممکن ہے کہ تم صدقہ کرو یا اس ذریعہ سے کوئی دوسرا عمل خیر تمہارے ہاتھ سے

انجام پا جائے۔" (مسلم)

لغوی تشریح: ﴿ان تجد نخلها﴾ یہ کہ تم اپنے پھل توڑ لو۔ تجد کا فعل جیم اور دال کے ساتھ باب نصر ینصر سے ہے اور اس امر کا صیغہ و مخاطب جدی آتا ہے۔ جدی کے جیم پر ضمہ اور دال پر تشدید۔

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ جو عورت ایام عدت میں ہو وہ ضرورت کیلئے گھر سے باہر جا سکتی ہے اور کام کاج کر کے واپس گھر آجائے تو ایسا کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں۔

(٩٥٢) وَعَنْ فُرَيْعَةَ بِنْتِ مَالِكٍ، أَنَّ زَوْجَهَا خَرَجَ فِي طَلَبِ أَعْبُدٍ لَّهُ، فَقَتَلُوهُ، قَالَتْ: فَسَأَلْتُ رَسُولَ اللهِ ﷺ أَنْ أَرْجِعَ إِلىٰ أَهْلِيْ، فَإِنَّ زَوْجِيْ لَمْ يَتْرُكْ لِي مَسْكَناً يَمْلِكُهُ، وَلاَ نَفَقَةً، فَقَالَ: **نَعَمْ**، فَلَمَّا كُنْتُ فِي الحُجْرَةِ نَادَانِيْ، فَقَالَ: **اُمْكُثِيْ فِي بَيْتِكِ حَتَّى يَبْلُغَ الكِتَابُ أَجَلَهُ**، قَالَتْ: فَاعْتَدَدْتُ فِيْهِ أَرْبَعَةَ أَشْهُرٍ وَعَشْراً، قَالَتْ: فَقَضَى بِهِ بَعْدَ ذٰلِكَ عُثْمَانُ. أَخْرَجَهُ أَحْمَدُ وَالأَرْبَعَةُ، وَصَحَّحَهُ التِّرْمِذِيُّ وَالذُّهْلِيُّ وَابْنُ حِبَّانَ وَالحَاكِمُ وَغَيْرُهُمْ.

حضرت فریعہ بنت مالک رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ اس کا شوہر اپنے بھاگے ہوئے غلاموں کی تلاش میں نکلا۔ انہوں نے اسے قتل کر دیا۔ فریعہ کا بیان ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اپنے میکے لوٹ جانے کے متعلق دریافت کیا کیونکہ میرے شوہر نے اپنی ملکیت میں کوئی گھر نہیں چھوڑا اور نہ ہی نفقہ۔ آپ نے فرمایا "ہاں! (تم اپنے میکے جا سکتی ہو)" جب میں حجرے میں پہنچی تو آپ نے مجھے آواز دی اور فرمایا "تم اپنے پہلے مکان ہی میں اس وقت تک رہو جب تک کہ تمہاری عدت پوری نہ ہو جائے۔" فریعہ کا بیان ہے کہ میں نے پھر عدت کی مدت چار ماہ دس دن اسی سابقہ مکان میں پوری کی۔ فرماتی ہیں کہ پھر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے بھی اس کے بعد اسی کے مطابق فیصلہ دیا۔ (اسے احمد اور چاروں نے بیان کیا ہے۔ ترمذی، ذہلی، ابن حبان اور حاکم وغیرہم نے اسے صحیح قرار دیا ہے)

حاصل کلام: یہ حدیث دلیل ہے کہ جس خاتون کا شوہر وفات پا جائے تو وہ عورت اسی مکان میں عدت وفات پوری کرے گی جس میں وہ خاوند کے ساتھ رہائش پذیر تھی اور جہاں اسے خاوند کی وفات کی اطلاع موصول ہوئی ہے۔ مدت عدت کے اتمام و اختتام تک اسی مکان میں رہے گی۔ محققین علماء کا یہی مذہب ہے اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ دوسری جگہ منتقل ہونا بھی اس کیلئے جائز ہے۔

راوی حدیث: ﴿فریعہ بنت مالک بن سنان خدریہ رضی اللہ عنہا﴾ مشہور صحابی رسول حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ کی بہن تھیں۔ بیعت رضوان میں حاضر تھیں۔

(٩٥٣) وَعَنْ فَاطِمَةَ بِنْتِ قَيْسٍ قَالَتْ: قُلْتُ: يَا رَسُولَ اللهِ! إِنَّ زَوْجِيْ طَلَّقَنِيْ ثَلاَثاً، وَأَخَافُ أَنْ يُقْتَحَمَ عَلَيَّ، قَالَ: فَأَمَرَهَا فَتَحَوَّلَتْ. رَوَاهُ مُسْلِمٌ.

حضرت فاطمہ بنت قیس رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ میں نے عرض کیا' اے اللہ کے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم)! میرے خاوند نے مجھے تین طلاقیں دے دی ہیں اور مجھے اس کا اندیشہ ہے کہ کوئی میرے پاس بے جا طور پر گھس نہ آئے اور ظلم کرے۔ تو آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے اجازت مرحمت فرما دی اور وہ وہاں سے منتقل ہو گئی۔ (مسلم)

لغوی تشریح: ﴿ ان يقتحم علی ﴾ صیغہ مجہول۔ زبردستی بعض اجنبی شریر لوگ گھس آئیں اور اس سے کوئی حادثہ یا فتنہ برپا ہو جائے ﴿ فتحولت ﴾ منتقل ہو گئی۔ یعنی اپنے شوہر کے مکان سے اپنے چچا زاد بھائی عمرو بن ام مکتوم رضی اللہ عنہ کے ہاں۔

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ کسی خطرے اور اندیشے کے پیش نظر عورت دوسرے قریبی رشتہ دار کے ہاں عدت گزارنے کیلئے منتقل ہو سکتی ہے مثلاً مکان غیر محفوظ ہو۔ مکان کے گر جانے کا خوف ہو' ہمسائیوں سے اذیت رسانی کا اندیشہ ہو۔ تنہائی سے ڈرتی اور خوف کھاتی ہو وغیرہ۔

(٩٥٤) وَعَنْ عَمْرِو بْنِ الْعَاصِ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: لاَ تُلبِسُوْا عَلَيْنَا: سُنَّةُ نَبِيِّنَا، عِدَّةُ أُمِّ الوَلَدِ، إِذَا تُوُفِّيَ عَنْهَا سَيِّدُهَا، أَرْبَعَةُ أَشْهُرٍ وَعَشْرٌ. رَوَاهُ أَحْمَدُ وَأَبُو دَاوُدَ وَابْنُ مَاجَهْ، وَصَحَّحَهُ الحَاكِمُ، وَأَعَلَّهُ الدَّارَقُطْنِيُّ بِالاِنْقِطَاعِ.

حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت ہم پر خلط ملط نہ کرو کہ جب ام ولد کا سردار وفات پا جائے تو اس کی عدت چار ماہ اور دس دن ہے۔ (اس روایت کو احمد' ابوداؤد اور ابن ماجہ نے روایت کیا ہے اور حاکم نے اسے صحیح قرار دیا ہے اور دارقطنی نے اسے انقطاع سے معلول کیا ہے)

حاصل کلام: اس روایت میں ام الولد کی عدت کا بیان ہے مگر یہ روایت منقطع ہے کیونکہ اسے قبیصہ بن ذویب' عمرو بن عاص سے روایت کرتے ہیں مگر ان کا سماع عمرو سے ثابت نہیں۔ امام اوزاعی اور ظاہریہ ام الولد کی عدت چار ماہ دس دن کے قائل ہیں مگر امام شافعی رحمہ اللہ' امام احمد رحمہ اللہ اور مالک رحمہ اللہ کے نزدیک اس کی عدت ایک حیض ہے۔ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے نزدیک عدت تین حیض۔ امام شافعی رحمہ اللہ وغیرھم کہتے ہیں کہ اس کی عدت صرف ایک ماہواری اس لئے ہے کہ نہ تو وہ زوجہ ہے اور نہ مطلقہ۔ اسے تو صرف استبراء رحم کی ضرورت ہے اور وہ محض ایک ہی حیض سے ہو جاتا ہے۔ امام احمد رحمہ اللہ تو عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ کا چار ماہ دس دن کا قول سن کر تعجب کرتے اور فرماتے تھے کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی کون سی سنت ہے؟ اور فرماتے تھے کہ چار ماہ دس روز تو سنت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے مطابق آزاد عورت کی عدت ہے۔ ام ولد تو لونڈی

ہے۔ منذری رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ کے قول کی سند میں مطر بن طہمان ابورجاء وراق ہے جسے بہت سے علماء محققین نے ضعیف قرار دیا ہے۔ ضعیف کے علاوہ یہ مضطرب بھی ہے۔ اس لئے یہ قابل احتجاج و استناد نہیں۔

(٩٥٥) وَعَنْ عَآئِشَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهَا، قَالَتْ: إِنَّمَا الأَقْرَآءُ ٱلأَطْهَارُ. أَخْرَجَهُ مَالِكٌ وَأَحْمَدُ وَالنَّسَآئِيُّ، فِي قِصَّةٍ، بِسَنَدٍ صَحِيحٍ.

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ اقراء سے طہر ہی مراد ہیں۔ (اسے مالک' احمد اور نسائی نے ایک قصہ میں سند صحیح کے ساتھ نقل کیا ہے)

لغوی تشریح: ﴿ انما الاقراء الا طہار ﴾ قرآن حمید میں والمطلقات یتربصن بانفسهن ثلاثة قروء مذکور ہے اس میں لفظ قروء سے مراد طہر ہیں تو اس اعتبار سے مطلقہ عورت تین طہر عدت گزارے گی۔ یہ فتویٰ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا ہے جو قابل استدلال نہیں۔ بالخصوص جب کہ دیگر دلائل اس کے خلاف ہیں اور "قرء" بمعنی حیض بھی آتا ہے اور طہر کے معنی میں بھی مستعمل ہے اور زیادہ دلائل اسی طرف ہیں کہ اس سے حیض مراد ہے طہر نہیں۔

(٩٥٦) وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا، قَالَ: طَلاَقُ الأَمَةِ تَطْلِيْقَتَانِ، وَعِدَّتُهَا حَيْضَتَانِ. رَوَاهُ الدَّارَقُطْنِيُّ، وَأَخْرَجَهُ مَرْفُوعاً، وَضَعَّفَهُ، وَأَخْرَجَهُ أَبُو دَاوُدَ وَالتِّرْمِذِيُّ وَابْنُ مَاجَهْ مِنْ حَدِيْثِ عَآئِشَةَ، وَصَحَّحَهُ الحَاكِمُ، وَخَالَفُوهُ، فَٱتَّفَقُوا عَلىٰ ضَعْفِهِ.

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ لونڈی کی طلاق دو طلاقیں ہیں اور اس کی عدت دو حیض۔ (اسے دارقطنی نے روایت کیا ہے اور انہوں نے اسے مرفوع بھی روایت کیا ہے مگر اسے ضعیف کہا ہے۔ نیز اس روایت کی تخریج ابوداؤد' ترمذی اور ابن ماجہ نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی روایت سے کی ہے۔ حاکم نے اسے صحیح کہا ہے مگر دوسرے محدثین نے ان کی مخالفت کی ہے' وہ اس کے ضعیف ہونے پر متفق ہیں)

(٩٥٧) عَنْ رُوَيْفِعِ بْنِ ثَابِتٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ: «**لاَ يَحِلُّ لاِمْرِىءٍ يُؤْمِنُ بِاللهِ وَاليَوْمِ الآخِرِ أَنْ يَسْقِيَ مَاءَهُ زَرْعَ غَيْرِهِ**». أَخْرَجَهُ أَبُو دَاوُدَ وَالتِّرْمِذِيُّ، وَصَحَّحَهُ ابْنُ حِبَّانَ، وَحَسَّنَهُ البَزَّارُ.

حضرت رویفع بن ثابت سے مروی ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا "جو شخص اللہ اور یوم آخرت پر ایمان رکھتا ہو اس کیلئے حلال نہیں ہے کہ وہ غیر کی کھیتی کو اپنے پانی سے سیراب کرے۔" (اس کی تخریج ابوداؤد اور ترمذی نے کی ہے اور ابن حبان نے اسے صحیح قرار دیا ہے اور بزار نے اسے حسن کہا ہے)

لغوی تشریح: ﴿ ان یسقی ماء ہ ﴾ یسقی السقی سے ماخوذ ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اپنا نطفہ رحم

میں داخل کرے۔ ﴿ زرع غیرہ ﴾ غیر کی کھیتی میں اور زرع سے مراد حمل لیا ہے اور بچہ جب رحم کے ساتھ معلق ہوتا ہے تو اسے کھیتی سے تشبیہہ دی گئی ہے۔ جیسے کھیتی اگتی ہے اور زمین میں پختہ اور مضبوط ہوتی ہے۔ یعنی جب عورت دوسرے مرد کے نطفہ سے حاملہ ہو چکی ہو تو ایسی عورت سے وطی و جماع کرنا حلال نہیں اور اس کی مثال اس لونڈی کی سی ہے جسے ایک آدمی نے خریدا تو اس وقت وہ دوسرے مالک سے حاملہ تھی یا یوں سمجھیں کہ اسیر ہونے سے پہلے وہ حاملہ تھی اب ایسی لونڈی کے خریدار یا مالک و آقا کیلئے اس کے ساتھ وطی و جماع کرنا حلال نہیں ہے۔ جب تک کہ اس کا حمل وضع نہ ہو جائے۔

راوی حدیث: ﴿ رویفع بن ثابت رضی اللہ عنہ ﴾ رویفع تصغیر ہے رافع سے۔ انصار کے قبیلہ بنو مالک بن نجار سے تھے۔ ان کا شمار مصریوں میں ہوتا ہے۔ ۴۶ھ کو وفات پائی۔

(۹۵۸) وَعَنْ عُمَرَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، فِي ٱمْرَأَةِ ٱلْمَفْقُودِ، تَرَبَّصُ أَرْبَعَ سِنِيْنَ، ثُمَّ تَعْتَدُّ أَرْبَعَةَ أَشْهُرٍ وَعَشْراً. أَخْرَجَهُ مَالِكٌ وَالشَّافِعِيُّ.

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے گم شدہ' مفقود الخبر مرد کی عورت کیلئے فرمایا' اس کیلئے چار سال انتظار کرنا ہے۔ اس کے بعد چار ماہ دس دن عدت گزارے۔ (مالک و شافعی نے نکالا ہے)

لغوی تشریح: ﴿ المفقود ﴾ غائب ایسا کہ جس کے متعلق کچھ معلومات نہ ہوں کہ آیا وہ زندہ ہے یا نہیں؟ اس اثر کے مطابق امام مالک و شافعی رحمہ اللہ اور اکثر فقہاء و محدثین کا فیصلہ ہے اور ایک قول کے مطابق امام احمد رحمہ اللہ اور اسحٰق رحمہ اللہ وغیرھم بھی اسی طرف گئے ہیں۔ مگر حنفیہ اور شیعہ میں سے ھادویہ فرقہ کے لوگوں کا نظریہ یہ ہے کہ ایسی عورت اس مرد کی زوجیت سے نہیں نکل سکتی جب تک کہ اس کی موت کی خبر کی صحت یا اس کی طلاق کا ثبوت یا اس کے مرتد ہونے کا ثبوت نہ مل جائے اور موت سے ان کے نزدیک موت طبعی کی مقدار مراد ہے۔ اس میں پھر ان میں اختلاف واقع ہوا ہے ان میں سے بعض کا خیال ہے کہ اس سے مراد ساٹھ سال ہے اور ایک قول ہے کہ ستر سال اور ایک قول کے مطابق نوے برس اور ایک قول ۱۲۰ برس کا ہے اور ۱۵۰ برس سے دو سو برس تک کا قول بھی ہے اور ایک تیسری رائے بھی ہے اور وہ یہ کہ اگر غائب آدمی نے بیوی کیلئے نان و نفقہ اور دیگر حاجات و ضروریات کا سامان چھوڑا ہے تو اسے حاضر ہی سمجھا جائے گا۔ ورنہ حاکم و عدالت اس کا نکاح جب عورت عدم نان و نفقہ کی صورت میں فسخ نکاح کا مطالبہ کرے گی' فسخ کرائے گی۔ یہ بہترین و عمدہ قول ہے اور قابل توجہ ہے۔ مگر پہلا قول محققین کے نزدیک راجح ہے۔

(۹۵۹) وَعَنِ الْمُغِيْرَةِ بْنِ شُعْبَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «امْرَأَةُ الْمَفْقُودِ امْرَأَتُهُ حَتَّى يَأْتِيَهَا الْبَيَانُ». أَخْرَجَهُ

حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "مفقود الخبر مرد کی بیوی' اس کی بیوی ہے جب تک کہ گم شدہ کے متعلق واضح طور پر اطلاع موصول نہ ہو جائے۔" (دارقطنی نے اسے

الدَّارَقُطْنِيُّ بِإِسْنَادٍ ضَعِيفٍ.

ضعیف سند سے روایت کیا ہے)

لغوی تشریح: ﴿ حتی یاتیھا البیان ﴾ یعنی جب تک یہ واضح نہ ہو جائے کہ وہ زندہ ہے یا فوت ہوگیا ہے۔ ابھی مسلمان ہے یا مرتد ہوگیا ہے۔ یہ حدیث سخت ضعیف ہے اسی بنا پر محققین نے اس کے مطابق فتویٰ نہیں دیا۔ اس کی سند میں صالح بن مالک اور محمد بن فضل دونوں مجہول الحال ہیں۔ نیز سوار بن مصعب متروک اور محمد بن شرحبیل بھی متروک ہے۔ یہ صاحب مغیرہ بن شعبہ سے مناکیر اور اباطیل روایتیں بیان کرتا ہے۔

(٩٦٠) وَعَنْ جَابِرٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «لاَ يَبِيتَنَّ رَجُلٌ عِنْدَ امْرَأَةٍ، إِلاَّ أَنْ يَكُونَ نَاكِحاً، أَوْ ذا مَحْرَمٍ». أَخرَجَهُ مُسْلِمٌ.

حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "کوئی شخص کسی عورت کے پاس رات بسر نہ کرے۔ الاّ یہ کہ وہ مرد اس کا شوہر ہو یا محرم ہو۔" (مسلم)

حاصل کلام: اس حدیث کی رو سے کسی اجنبی عورت کے پاس خلوت و تنہائی میں رہنا حرام ہے۔ محرم کے پاس رہنے میں کوئی حرج نہیں۔ محرم اسے کہتے ہیں جس سے کسی صورت میں کسی وقت نکاح درست اور جائز نہ ہو۔

(٩٦١) وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا، عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ: «لاَ يَخْلُوَنَّ رَجُلٌ بِامْرَأَةٍ إِلاَّ مَعَ ذِي مَحْرَمٍ». أَخرَجَهُ البُخَارِيُّ.

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا "کوئی شخص بھی کسی عورت کے ساتھ تنہائی و خلوت اختیار نہ کرے جب تک کہ اس کے ساتھ اس کا محرم نہ ہو۔" (بخاری)

(٩٦٢) وَعَنْ أَبِي سَعِيْدٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ قَالَ فِي سَبَايَا أَوْطَاسٍ: «لاَ تُوطَأُ حَامِلٌ حَتَّى تَضَعَ، وَلاَ غَيْرُ ذَاتِ حَمْلٍ، حَتَّى تَحِيضَ حَيْضَةً». أَخرَجَهُ أَبُو دَاوُدَ، وَصَحَّحَهُ الحَاكِمُ، وَلَهُ شَاهِدٌ عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ فِي الدَّارَقُطْنِيِّ.

حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی ﷺ نے اوطاس کے قیدیوں کے متعلق فرمایا "حاملہ عورت جب تک وضع حمل نہ کر لے' اس سے جماع نہ کیا جائے نیز غیر حاملہ سے بھی اس وقت تک وطی نہ کی جائے جب تک اسے ایک ماہواری نہ آجائے۔" (اس کی تخریج ابوداؤد نے کی ہے اور حاکم نے اسے صحیح قرار دیا ہے۔ دارقطنی میں ابن عباس رضی اللہ عنہما سے بھی اس کا شاہد مروی ہے)

لغوی تشریح: ﴿ سبایا اوطاس ﴾ سبایا سبیی اور سبیۃ کی جمع ہے۔ سبیۃ اس عورت کو کہتے

ہیں جو جنگ میں اسیر ہو جائے اور اوطاس حنین کے قریب ایک وادی کا نام ہے۔ یہاں قبائل ثقیف و ھوازن کی عورتیں غزوۂ حنین کے موقع پر قید ہوئی تھیں۔

(٩٦٣) وَعَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰی عَنْهُ، عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ: «اَلْوَلَدُ لِلْفِرَاشِ، وَلِلْعَاهِرِ اَلْحَجَرُ». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ مِنْ حَدِيْثِهِ، وَمِنْ حَدِيْثِ عَآئِشَةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰی عَنْهَا فِي قِصَّةٍ، وَعَنِ ابْنِ مَسْعُوْدٍ عِنْدَ النَّسَآئِيِّ وَعَنْ عُثْمَانَ عِنْدَ أَبِيْ دَاوُدَ.

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا "بچہ اس کا ہے جس کے بستر پر پیدا ہوا اور زانی کیلئے پتھر۔" (بخاری و مسلم۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی حدیث میں ایک قصہ کے متعلق بھی اسی طرح روایت ہے اور حضرت عبداللہ بنؓ مسعود رضی اللہ عنہ سے نسائی نے اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے ابوداؤد نے یہی روایت بیان کی ہے)

لغوی تشریح: ﴿ الولد للفراش ﴾ فراش ایسی خاتون ہے جس سے شوہر مجامعت و مباشرت کر چکا ہو خواہ وہ بیوی ہو یا لونڈی لیکن فراش سے یہاں اس کا صاحب و مالک مراد ہے۔ بخاری میں ہے الولد لصاحب الفراش یہاں صاحب الفراش سے مراد خاوند اور مولیٰ ہے کیونکہ یہ دونوں عورت کو بستر پر لٹاتے ہیں اور اس کے ساتھ سوتے ہیں۔ ﴿ وللعاھر الحجر ﴾ العاھر زانی اور العھر زنا کے معنی میں مستعمل ہے۔ یعنی زانی کیلئے ناکامی و نامرادی ہے۔ بچے میں اس کا کوئی حق نہیں۔ کہا جاتا ہے کہ زانی کیلئے پتھر اور اس کے منہ میں مٹی۔ یعنی اس کیلئے سوائے ناکامی و نامرادی اور ذلت و رسوائی کے اور کچھ نہیں اور ایک قول یہ بھی ہے کہ الحجر سے مراد یہ ہے کہ اسے سنگسار کیا جائے گا۔ مگر یہ قول کمزور و ضعیف ہے کیونکہ سنگسار تو صرف شادی شدہ کو کیا جاتا ہے۔

حاصل کلام: حدیث کا معنی یہ ہے کہ عورت جب بچے کو جنم دے گی وہ کسی کی بیوی یا لونڈی ہو گی' اس بچے کا نسب اس آدمی کے ساتھ ملحق کیا جائے گا اور وہ اس کا بچہ شمار کیا جائے گا۔ میراث اور ولادت کے دیگر احکام ان کے درمیان جاری ہوں گے خواہ کوئی دوسرا اس عورت کے ساتھ ارتکاب زنا کا دعویٰ کرے اور یہ دعویٰ بھی کرے کہ یہ بچہ اس کے زنا سے پیدا ہوا ہے اور اس کے ساتھ اس بچے کی مشابہت بھی اس کے ساتھ ہو اور صاحب فراش کے ساتھ نہ ہو۔ اس ساری صورتحال کے باوجود بچہ کو صاحب فراش کے ساتھ ملحق کیا جائے گا۔ اس میں زانی کا کوئی حق نہیں ہوگا اور یہ اس صورت میں ہے جب صاحب فراش اس کی نفی نہ کرے۔ اگر مرد نے انکار کر دیا تو پھر بچہ ماں کے ساتھ ملحق کر دیا جائے گا اور اس بچہ کا نسب ماں کے ساتھ ہوگا' زانی کے ساتھ نہیں۔ جمہور نے کہا ہے کہ عورت تو صرف نکاح ہی سے فراش بن جاتی ہے۔ پھر جب چھ ماہ یا اس سے زیادہ مدت کے بعد بچے کو جنم دیتی ہے اس امکان کے ساتھ کہ خاوند نے اس کے ساتھ وطی و جماع کیا ہوگا جب فراش کا ثبوت مل جائے گا تو بچہ خاوند کے ساتھ ملحق کر دیا جائے اور اگر وطی کا امکان نہ ہو تو پھر بچہ کو اس کے ساتھ نہیں ملایا جائے گا۔ حنفیہ کہتے ہیں مجرد عقد کے بعد ہی ملا دیا جائے گا خواہ وطی کی ہو یا نہ کی ہو۔ پھر اگر مغرب کے رہنے والے نے مشرق

میں رہنے والی خاتون سے نکاح کیا اور دونوں میں سے کسی نے بھی اپنا وطن مالوف نہ چھوڑا یا عقد نکاح کے بعد طلاق دے دی پھر چھ ماہ بعد اس عورت نے بچہ کو جنم دیا تو اس صورت میں بچہ اسی مرد کے ساتھ ملحق کیا جائے گا۔ یہ قول ایسا ہے کہ اس کی تردید کی ضرورت ہی نہیں۔ امام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ اس طرف گئے ہیں کہ عورت سے دخول محقق کی معرفت ضروری اور لابدی ہے۔ ابن قیم رحمۃ اللہ علیہ اور صاحب المنار نے ان کی تائید کی ہے اور یہ بات لفظ فراش سے لغوی' عرفی اور عقلی طور پر سمجھی جا سکتی ہے۔

١٢ - بَابُ الرَّضَاعِ — دودھ پلانے کا بیان

(٩٦٤) عَنْ عَآئِشَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهَا، قَالَتْ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «لاَ تُحَرِّمُ الْمَصَّةُ وَلاَ الْمَصَّتَانِ». أَخْرَجَهُ مُسْلِمٌ.

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "ایک دو دفعہ دودھ چوسنے سے حرمت ثابت نہیں ہوتی۔" (مسلم)

لغوی تشریح : "باب الرضاع" رضاع اور رضاعت کی "را" پر فتحہ اور کسرہ دونوں جائز ہے عورت کے پستان سے بچے کا مخصوص وقت میں دودھ چوس کر پینا اور وہی سبب ہے' دودھ پینے اور پلانے والی کی حرمت کے ثبوت کا اور وہ بچہ اس کا بچہ قرار پاتا ہے۔ اب اس عورت سے ہمیشہ کے لئے اس کا نکاح حرام ہے۔ پھر یہ حرمت دودھ پینے اور پلانے والی کی اولاد میں اور دودھ پینے اور پلانے والی کی اولاد اور اس کے شوہر کی اولاد یا اس کے آقا کی اولاد جس نے اس سے وطی کی ہو گی' پر مشتمل گی۔ ﴿ لاتحرم ﴾ تحرم تحریم سے ماخوذ ہے۔ ﴿ المصۃ ﴾ مص سے ماخوذ ہے۔ جس کے معنی چوسنے کے ہیں۔ ایک دو مرتبہ چوسنا۔ یعنی تھوڑا سا پینا اور ایک روایت میں ہے ایک دفعہ پینے یا دو مرتبہ پینے سے حرمت ثابت نہیں ہوتی۔ سبل السلام میں ہے۔ رضعۃ کی حقیقت یہ ہے کہ جب بچہ ماں کے پستان منہ میں لے کر چوستا ہے پھر بغیر عارضہ کے اپنی خوشی و مرضی سے پستان کو چھوڑ دیتا ہے اسے رضعۃ کہتے ہیں۔ پستان چھوڑنا کسی عارض کی بنا پر جیسے سانس لینے کیلئے یا معمولی سا آرام حاصل کرنے کیلئے یا کسی اور چیز کیلئے جو اسے دوسری طرف مشغول کر دے پھر جلد ہی دوبارہ پینا یا چوسنا شروع کر دے' یہ دورانیہ ایک مرتبہ پینے کے عرصہ سے خارج نہیں ہو گا۔ ایک مرتبہ پینے کے ثبوت میں امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا یہ مذہب ہے اور یہ لغت کے موافق ہے۔

حاصل کلام : رضاعت کا حکم کتنا دودھ پینے سے ثابت ہوتا ہے' اس میں اختلاف ہے۔ جمہور کا قول ہے کہ یہ حکم دودھ تھوڑا پیا ہو یا زیادہ' ثابت ہو جاتا ہے۔ امام داؤد ظاہری اور ایک قول میں امام احمد' امام اسحٰق' ابوعبیدہ وغیرھم نے اس حدیث کے مفہوم کے مطابق کہا ہے کہ رضاعت کا حکم تین مرتبہ پینے سے ثابت ہوتا ہے دو دفعہ پینے سے نہیں اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ پانچ مرتبہ پینے سے رضاعت ثابت

ہوتی ہے اور انہوں نے آئندہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی روایت کے الفاظ سے استدلال کیا ہے اور ظاہر ہے کہ منطوق مفہوم سے زیادہ قوی ہوتا ہے کیونکہ عرف عام میں لوگوں میں مروج ہے کہ جب وہ یہ بولتے ہیں کہ یہ ایک یا دو سے ثابت نہیں ہوتا تو اس کا یہ مفہوم نہیں ہوتا کہ تین مرتبہ سے ثابت ہو جائے گا بلکہ اس کا مفہوم یہ ہوتا ہے کہ مطلق تعداد و کثرت کا مقتضی ہے۔ رہا جمہور کا مذہب کہ حکم رضاعت قلیل و کثیر دونوں سے ثابت ہو جاتا ہے تو انہوں نے اللہ تعالیٰ کے ارشاد

وامھاتکم اللاتی ارضعنکم (۴ : ۲۳) سے استدلال کیا ہے حالانکہ اس میں ان کیلئے کوئی دلیل نہیں۔ بلکہ ماں کا لفظ اس کا تقاضا کر رہا ہے کہ دودھ پلانے والی کی حرمت اس وقت ثابت ہوتی ہے جب اس نے تین مقدار میں دودھ پلایا ہو جس سے وہ ماں کہلانے کی مستحق بن جائے۔ اس وصف سے متصف وہی ہو سکتی ہے جس نے بچہ کو جنم دیا ہو یا جو اس کے بدن کا جز بن گیا ہو اور وہ دودھ ہے جو کہ بدن کا جز بنتا ہے اور یہ صرف مجرد رضاعت سے حاصل نہیں ہوتا بلکہ اس کے ثبوت کیلئے کافی مقدار ناگزیر ہے۔ پھر کس قدر دودھ بچے کا جزو بدن بنتا ہے' اس کی مقدار معلوم نہیں۔ اس لئے شارع نے جو مقدار مقرر کی ہے اس کی طرف رجوع کرنا ضروری ہے اور جب میں نے گہری اور عمیق نظر سے غور کیا تو دیکھا کہ رضاعت کے سلسلہ کی تمام احادیث اسی علت و سبب کے گرد گردش کرتی ہیں اور اس کیلئے بھوک کی شرط اور آنتوں کو کھولنے کی شرط اور ہڈیوں کی نشوونما اور موٹا کرنے کی شرط اور گوشت اگانے اور پیدا کرنے کی شرط اور اس رضاعت کا دو سال کے دوران ہونا اور بڑے آدمی کی رضاعت کا کوئی اعتبار نہ کیا جانا یہ تمام اسی علت و سبب کی وجہ سے ہیں۔ پس واضح ہو گیا کہ آیت قرآنیہ جمہور کے مذہب کی تائید نہیں کرتی بلکہ اس مسلک کی تائید کرتی ہے جسے امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے اختیار کیا ہے اور یہاں حدیث اور آیت قرآن میں باہم تعارض نہیں ہے بلکہ دونوں میں کلی توافق اور ہم آہنگی اور موافقت ہے۔ اگر مطلق رضاعت ہی مراد ہوتی تو پھر اس طرح کہنا چاہئے تھا النساء اللاتی ارضعنکم وہ عورتیں جنہوں نے تمہیں دودھ پلایا۔

(۹۶۵) وَعَنْهَا قَالَتْ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «**انْظُرْنَ مَنْ إِخْوَانُكُنَّ، فَإِنَّمَا الرَّضَاعَةُ مِنَ المَجَاعَةِ**». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "ضرور غور کر لیا کرو کہ تمہارے بھائی کون ہیں کیونکہ رضاعت اس وقت معتبر ہے جب دودھ بھوک کے وقت پیا جائے۔" (بخاری و مسلم)

لغوی تشریح: ﴿ انظرن من اخوانکن ﴾ انظرن امر کا صیغہ ہے مطلب ہے رضاعت کے معاملہ میں پوری تحقیق' پوری احتیاط اور بالغ نظری سے کام لیا جانا چاہئے اور اس کی علت و وجہ "فانما الرضاعة من المجاعة " سے بیان کر دی۔ یعنی وہ رضاعت جس سے حرمت ثابت ہوتی ہے وہ ہے جو بچپن میں

ہو اور دودھ اس بچے کی بھوک ختم کر دے اور اس کے ذریعہ گوشت پیدا ہو تو پھر اس عورت کی اولاد کے ساتھ حرمت میں شریک ہو جائے گا۔ پس آنے والی دونوں احادیث ہم معنی ہیں۔ "لارضاع الا ما انشز العظم وانبت اللحم" رضاعت ہڈیوں کو مضبوط بنانے اور گوشت جسم پر پیدا کرنے کا نام ہے۔ رضاعت سے حرمت اس وقت ثابت ہوتی ہے جبکہ وہ رضاعت انتڑیوں کو کھول دے۔ جیسا کہ امام ابوعبید نے کہا ہے۔ (سبل السلام)

حاصل کلام: اس حدیث میں ایک قصہ کی طرف اشارہ ہے۔ چنانچہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا بیان ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میرے پاس تشریف لائے۔ اس وقت میرے پاس ایک آدمی بیٹھا ہوا تھا۔ یہ بات آپؐ کی طبع مبارک پر گراں گزری اور میں نے چہرۂ انور پر ناراضگی کے آثار ملاحظہ کئے تو انہوں نے عرض کیا یارسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم)! یہ تو میرا رضاعی بھائی ہے۔ یہ سن کر آپؐ نے ارشاد فرمایا غور سے دیکھ لیا کرو کہ تمہارے بھائی کون ہیں؟

(٩٦٦) وَعَنْهَا قَالَتْ: جَاءَتْ سَهْلَةُ بِنْتُ سُهَيْلٍ، فَقَالَتْ: يَا رَسُولَ اللهِ! إِنَّ سَالِماً مَوْلَى أَبِي حُذَيْفَةَ مَعَنَا، فِي بَيْتِنَا، وَقَدْ بَلَغَ مَا يَبْلُغُ الرِّجَالُ، فَقَالَ: «أَرْضِعِيهِ، تَحْرُمِي عَلَيْهِ». رَوَاهُ مُسْلِمٌ.

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ سھلہ بنت سہیل رضی اللہ عنہا آئیں اور عرض کیا' اے اللہ کے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم)! سالم ابوحذیفہ کا آزاد کردہ غلام ہمارے گھر میں ہمارے ساتھ ہی رہتا ہے وہ مرد کی حد بلوغت کو پہنچ گیا ہے۔ آپؐ نے فرمایا "اسے اپنا دودھ پلا دو' تو اس پر حرام ہو جائے گی۔ (مسلم)

لغوی تشریح: ﴿ ارضعیہ ﴾ قاضی عیاض نے کہا ہے ممکن ہے سھلہ نے اپنا دودھ نکال کر پلایا ہو اور پستان کو چھونے کی نوبت ہی نہ آئی ہو اور نہ دونوں کے جسم باہم ملے ہوں۔ جیسا کہ نووی رحمۃ اللہ علیہ نے ان سے یہ ذکر کیا ہے اور سنن ابی داؤد میں ہے کہ سھلہ نے پانچ بار دودھ پلایا پس وہ اس کے بچے کی جگہ ہوگیا۔ یہ حدیث امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے مذہب کی تائید کرتی ہے کہ اس میں پانچ بار دودھ پلانے کا بیان ہے یہ پانچ بار پلایا جانا پہچانا اور ثابت شدہ ہے۔ یہ حدیث بڑی عمر کے آدمی کے دودھ پینے پر حرمت کے ثبوت پر دلالت کرتی ہے اور یہی رائے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اور داؤد ظاہری کی ہے۔ لیکن یہ پہلی حدیث کے معارض ہے نیز ام سلمہ رضی اللہ عنہا' ابن عباس رضی اللہ عنہما کی احادیث اور ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی آنے والی حدیث کے بھی معارض ہے اور یہ احادیث اس کا تقاضا کرتی ہیں کہ رضاعت دو سال کے دوران کی حرمت ثابت کرتی ہے اس کے بعد کی رضاعت نہیں۔ جمہور نے اس قصہ کا جواب یہ دیا ہے کہ یہ ان کے ساتھ مخصوص تھا۔ اس کے سوا دوسروں کی طرف اس کا حکم متعدی نہیں ہے۔ امام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے کہ رضاعت کے معاملہ میں بچپن کا اعتبار کیا جائے گا الاّ یہ کہ جب کوئی حاجت و ضرورت اس کی داعی ہو۔ جیسا کہ بڑی عمر کے آدمی کی رضاعت کا مسئلہ جسے عورت کے پاس جانا ناگزیر ہے اور عورت کا اس سے

(پردہ) کرنا بھی دشوار ہے۔ جیسا کہ سالم کا ابوحذیفہ کی بیوی کے ساتھ مسئلہ تھا اس طرح کے بڑی عمر کے آدمی کو جب ضرورت و حاجت کیلئے عورت نے دودھ پلایا تو اس مرد کا دودھ پینا موثر ہوگا اور ایسی صورت کے علاوہ دودھ پینے کی مدت بچپن کی عمر ہے۔ (سبل السلام)

راوی حدیث: ﴿ سہلہؓ رضی اللہ عنہا ﴾ سہلہ بنت سہیل بن عمرو القرشیہؓ بنو عامر بن لوی میں سے تھیں۔ قدیم الاسلام تھیں۔ اپنے شوہر ابوحذیفہ کے ساتھ حبشہ کی طرف ہجرت کی اور ان کے ہاں محمد بن ابی حذیفہ پیدا ہوئے۔

﴿ سالم رضی اللہ عنہ ﴾ سالم بن معقل۔ ابوحذیفہ کے آزاد کردہ غلام۔ ان کو ایک انصاری خاتون نے خریدا تھا۔ ان کا نام لیلیٰ بتایا گیا ہے اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس کا نام ثبیتہؓ تھا۔ ان سے پھر ابوحذیفہ نے نکاح کر لیا تھا اور سالم ان کے ساتھ ہی آیا تھا۔ ابوحذیفہ نے اسے اپنا لے پالک بنا لیا تھا اور اسے اپنا حلیف قرار دے لیا تھا۔ سالم معرکۂ بدر میں حاضر تھے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے صحابہ کو جن چار صحابہ سے قرآن سیکھنے کا حکم دیا تھا سالم مولی ابو حذیفہ ان چاروں میں سے ایک تھے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی مدینہ میں تشریف آوری سے پہلے قبا میں یہی مہاجرین کی امامت کے فرائض انجام دیتے تھے حالانکہ اس وقت حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ بھی ان مہاجرین میں شامل تھے۔

﴿ ابوحذیفہ رضی اللہ عنہ ﴾ ایک قول کے مطابق ان کا نام مھشم تھا اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ ہاشم بن عتبہ بن عبد شمس تھا۔ یہ بڑے فضلاء صحابہ کرامؓ میں سے تھے۔ غزوات بدر و احد اور ان کے بعد والے غزوات میں بھی شریک ہوئے۔ جنگ یمامہ کے روز قتل ہو کر مرتبۂ شہادت پر فائز ہوئے' اس وقت ان کی عمر ۵۳ برس تھی۔

(۹٦۷) وَعَنْهَا أَنْ أَفْلَحَ أَخَا أَبِي الْقُعَيْسِ جَاءَ يَسْتَأْذِنُ عَلَيْهَا بَعْدَ الْحِجَابِ ، قَالَتْ : فَأَبَيْتُ أَنْ آذَنَ لَهُ ، فَلَمَّا جَاءَ رَسُولُ اللهِ ﷺ : أَخْبَرْتُهُ الَّذِي صَنَعْتُهُ ، فَأَمَرَنِي أَنْ آذَنَ لَهُ عَلَيَّ ، وَقَالَ : إِنَّهُ عَمُّكِ . مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ .

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ ابوالقعیس کا بھائی افلح حجاب کے بعد حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے ہاں آنے کیلئے اجازت طلب کرتا رہا۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا اپنا بیان ہے کہ میں نے انہیں اندر آنے کی اجازت نہ دی۔ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے تو میں نے سارا واقعہ آپؐ کو سنایا جو میں نے اس کے ساتھ کیا تھا۔ آپؐ نے مجھے حکم دیا کہ "میں ان کو اپنے پاس آنے کی اجازت دے دیا کروں اور فرمایا کہ وہ تمہارا چچا ہے۔" (بخاری و مسلم)

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ جس عورت کا دودھ پی لیا جائے اس کا شوہر اس کا باپ ہوگا۔ اب جو رشتے ماں' باپ کی جانب سے حرام ہوتے ہیں وہ دودھ سے بھی حرام ہو جائیں گے۔ افلح حضرت

عائشہ رضی اللہ عنہا کا رضاعی چچا اس لئے ہوا کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے ابوالقعیس کی بیوی کا دودھ پیا تھا۔ دودھ کی پیدائش میں مرد و عورت دونوں کے نطفہ کا دخل ہوتا ہے' اس لئے رضاعت بھی دونوں کی جانب سے ہوئی۔ اس لئے حرمت بھی ثابت ہو گئی۔

راوی حدیث: ﴿ افلح ﴾ ابوالجعد ان کی کنیت اور نام افلح ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے آزاد کردہ غلام اور ایک قول یہ بھی ہے کہ یہ حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا کے آزاد کردہ غلام تھے۔ ان کا بھائی ابوالقعیس تھا۔ ایک قول ہے کہ ان کا نام جعد تھا اور ایک قول یہ ہے کہ وائل بن افلح اشعری ان کا نام تھا اور ان کے بھائی کا نام افلح تھا۔ اس طرح اس کا نام اس کے باپ کا ہم نام ہوا۔ معلوم رہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے رضاعی چچا دو تھے۔ ایک تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی ہی میں فوت ہو گیا تھا' دوسرا حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی دودھ پلانے والی کا دیور' جیٹھ تھا۔ ان کا نام افلح تھا۔ ابوالقعیس کا بھائی اور ابوالقعیس حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا رضاعی باپ تھا۔

(٩٦٨) وَعَنْهَا قَالَتْ: كَانَ فِيمَا أُنْزِلَ الْقُرْآنُ عَشْرَ رَضَعَاتٍ مَّعْلُومَاتٍ يُحَرِّمْنَ، ثُمَّ نُسِخْنَ بِخَمْسٍ مَّعْلُومَاتٍ، فَتُوُفِّيَ رَسُولُ اللهِ ﷺ وَهِيَ فِيمَا يُقْرَأُ مِنَ الْقُرْآنِ. رَوَاهُ مُسْلِمٌ.

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ قرآن میں یہ حکم نازل کیا گیا تھا کہ دس بار دودھ پینا جبکہ اس کے پینے کا یقین ہو جائے نکاح کو حرام کرتا ہے۔ پھر یہ حکم منسوخ کر دیا گیا۔ پانچ بار (یعنی دودھ پینے کے حکم) سے پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے وفات پائی' اس وقت پانچ کی تعداد قرآن میں پڑھی جاتی تھی۔ (مسلم)

لغوی تشریح: ﴿ معلومات ﴾ محقق و ثابت شدہ۔ اس سے معلوم ہوا کہ جب رضاعت مشکوک ہو تو حرمت کا فائدہ نہیں دیتی۔ ﴿ وهي فيما يقرا من القرآن ﴾ يقرا صیغہ مجہول ہے۔ نووی رحمہ اللہ نے کہا ہے اس کے معنی یہ ہیں کہ پانچ کی تعداد کا نسخ اتنی تاخیر سے ہوا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کا واقع پیش آ گیا اور بعض لوگ پھر بھی ان پانچ کی تعداد کو قرآن سمجھ کر تلاوت کرتے رہے کیونکہ آپ ؐ کی وفات کے بالکل ساتھ ہی ان کا منسوخ ہونا نازل ہوا تھا اور لوگوں کو اس کی خبر نہ ہوئی تھی۔ آپ ؐ کی وفات کے بعد جب ان کو نسخ کا علم ہوا تو انہوں نے اس سے رجوع کر لیا اور سب متفق ہو گئے کہ اب اس کی تلاوت نہیں کی جائے گی۔ پھر اس کا ذکر کیا کہ نسخ کی تین انواع ہیں۔ ان میں سے ایک تو یہ ہے کہ جس کا حکم اور تلاوت دونوں منسوخ ہوں جیسے دس مرتبہ دودھ پینے والی آیت' دوسری یہ کہ جس کی تلاوت تو منسوخ ہو مگر اس کا حکم باقی رہے۔ جیسے پانچ مرتبہ دودھ پینے کی آیت اور آیت رجم اور تیسری یہ کہ جس کا حکم تو منسوخ ہو چکا ہو مگر تلاوت اس کی باقی ہو اور ایسا تو اکثر ہے' جیسے آیت وصیت ہے۔

(٩٦٩) وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ أُرِيدَ عَلَى ابْنَةِ حَمْزَةَ، فَقَالَ: «إِنَّهَا

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو آمادہ کیا گیا کہ آپ ؐ اپنے چچا حمزہ رضی اللہ عنہ کی بیٹی سے نکاح کر لیں۔ تو آپ ؐ نے فرمایا "وہ میرے لئے

لاَ تَحِلُّ لِي، إِنَّهَا ابْنَةُ أَخِي مِنَ الرَّضَاعَةِ وَيَحْرُمُ مِنَ الرَّضَاعَةِ مَا يَحْرُمُ مِنَ النَّسَبِ ». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حلال نہیں اس لئے کہ وہ میرے رضائی بھائی کی بیٹی ہے۔ جو عورت رشتہ و نسب سے حرام ہے وہی رضاعت سے بھی حرام ہے۔" (بخاری و مسلم)

لغوی تشریح: ﴿ اريد على ابنه حمزة ﴾ ارید فعل' صیغۂ مجہول۔ اس کا معنی یہ ہے کہ ان سے کہا گیا کہ اس لڑکی سے نکاح کر لیں۔ نیل الاوطار میں ہے کہ وہ شخص جس نے اس لڑکی کا نبی ﷺ سے نکاح کے ارادہ کا اظہار کیا ہے وہ علی بن ابی طالب تھے اور حمزہ کی اس صاحبزادی کے نام میں کئی اقوال ہیں۔ مثلاً امامہ' سلمٰی' فاطمہ' عائشہ' امۃ اللہ' عمارہ اور یعلیٰ۔ یہ لڑکی نبی ﷺ کے رضاعی بھائی کی بیٹی اس طرح بنتی تھی کہ نبی ﷺ اور حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کو ثویبہ نے اپنا دودھ پلایا تھا اس طرح حضور ﷺ اور حمزہ رضی اللہ عنہ چچا بھتیجا ہونے کے ساتھ ساتھ رضاعی بھائی بھی تھے اور ثویبہ ابولہب کی آزاد کردہ لونڈی تھی۔

(٩٧٠) وَعَنْ أُمِّ سَلَمَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهَا، قَالَتْ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «لاَ يَحْرُمُ مِنَ الرَّضَاعِ إِلاَّ مَا فَتَقَ الأَمْعَاءَ، وَكَانَ قَبْلَ الفِطَامِ». رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ، وَصَحَّحَهُ هُوَ وَالحَاكِمُ.

حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "دودھ پینے کو کوئی تقسیم حرام نہیں کرتی مگر وہ قسم جو انتڑیوں کو کھول دے اور دودھ چھڑانے کی مدت سے پہلے ہو۔" (اسے ترمذی نے روایت کیا ہے اور ترمذی اور حاکم دونوں نے اسے صحیح کہا ہے۔)

لغوی تشریح: ﴿ لا يحرم ﴾ یحرم میں "را" پر تشدید مکسورہ۔ ﴿ الا مافتق الامعاء ﴾ اس جملہ میں ما موصولہ مرفوع ہے کیونکہ یہ مستثنیٰ مفرغ ہے اور امعاء مفعولیت کی وجہ سے منصوب ہے۔ مطلب یہ ہے کہ رضاعت یا دودھ جو بچے کی آنتوں کو کھول دے اس کے علاوہ اور کوئی غذا حرمت ثابت نہیں کرتی۔ اس کی صورت یہ ہے کہ دودھ بچے کی آنتوں میں رواں ہوتا ہے اور غذا کی جگہ واقع ہوتا ہے۔ یہ تبھی ہو سکتا ہے کہ دودھ ان اوقات میں پلایا جائے جو اس کی غذا بننے کے اوقات ہوں اور "امعاء" معی کی جمع ہے۔ (معی کے میم کے نیچے کسرہ عین پر فتحہ اور "یا" ساکن) پیٹ میں خوراک کی جگہ ﴿ الفطام ﴾ "فا" کے نیچے کسرہ۔ بچے کو دودھ چھڑانا۔

(٩٧١) وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا قَالَ: لاَ رِضَاعَ إِلاَّ فِي الحَوْلَيْنِ. رَوَاهُ الدَّارَقُطْنِيُّ وَابْنُ عَدِيٍّ مَرْفُوعاً وَمَوْقُوفاً، وَرَجَّحَا المَوْقُوفَ.

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ کوئی رضاعت معتبر نہیں سوائے اس رضاعت کے جو دو سال کے دوران میں ہو۔ (اسے دارقطنی اور ابن عدی نے مرفوع اور موقوف روایت کیا ہے مگر ترجیح دونوں نے موقوف کو دی ہے)

(۹۷۲) وَعَنِ ابْنِ مَسْعُودٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «لاَ رَضَاعَ إِلاَّ مَا أَنْشَزَ العَظْمَ، وَأَنْبَتَ اللَّحْمَ». أَخْرَجَهُ أَبُودَاوُدَ.

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "رضاعت وہی معتبر ہے جو ہڈیوں کی نشوونما کرے' بڑھائے اور گوشت پیدا کرے۔" (ابوداؤد)

لغوی تشریح: ﴿ما انشز العظم﴾ جو ہڈی کو مضبوط و قوی کرے۔ پختہ کرے اور اس کا حجم بڑھائے۔ یہ حدیث دلیل ہے کہ وہی رضاعت حرمت ثابت کرتی ہے جو دو سال کی عمر میں پی گئی ہو۔ اس لئے کہ بچہ اسی سے نشوونما پاتا ہے۔ اس کی ہڈیاں مضبوط اور قوی ہوتی ہیں اور گوشت بنتا ہے۔

(۹۷۳) وَعَنْ عُقْبَةَ بْنِ الحَارِثِ أَنَّهُ تَزَوَّجَ أُمَّ يَحْيَى بِنْتَ أَبِي إِهَابٍ، فَجَاءَتِ امْرَأَةٌ، فَقَالَتْ قَدْ أَرْضَعْتُكُمَا، فَسَأَلَ النَّبِيَّ ﷺ، فَقَالَ: كَيْفَ؟ وَقَدْ قِيلَ، فَفَارَقَهَا عُقْبَةُ، وَنَكَحَتْ زَوْجاً غَيْرَهُ. أَخْرَجَهُ البُخَارِيُّ.

حضرت عقبہ بن حارث رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ انہوں نے ام یحییٰ بنت ابی اہاب رضی اللہ عنہا سے نکاح کر لیا تو ایک عورت آئی اور کہنے لگی کہ میں نے تم دونوں کو دودھ پلایا ہے۔ عقبہ نے نبی ﷺ سے پوچھا تو آپؐ نے فرمایا "اب تم اسے کس طرح اپنے نکاح میں رکھ سکتے ہو جبکہ رضاعت کی اطلاع دے دی گئی ہے۔" چنانچہ عقبہ نے اس عورت کو جدا کر دیا اور اس خاتون نے دوسرے آدمی سے نکاح کر لیا۔ (بخاری)

لغوی تشریح: ﴿کیف؟ وقد قیل﴾ مطلب یہ ہے کہ اب تو اس سے لطف صحبت کیسے اٹھا سکتا ہے اور اس کے قریب کیونکر جا سکتا ہے جبکہ صورت حال یہ ہے کہ جو کچھ بیان کی گئی ہے اور ایک روایت میں ہے نبی ﷺ نے عقبہ کو اس عورت سے ممانعت کر دی۔ اس حدیث کی رو سے سلف کی ایک جماعت جس میں امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ بھی ہیں کہتے ہیں کہ رضاعت کے مسئلہ میں صرف ایک عورت کی شہادت قبول کی جائے گی مگر جمہور اس کے قائل نہیں۔ ان میں بعض نے کہا ہے کہ دودھ پلانے والی کی گواہی مزید تین عورتوں کی شہادت کے ساتھ قبول کی جائے گی بشرطیکہ معاوضہ کا مطالبہ نہ کیا گیا ہو۔ علامہ شوکانی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ تو مخفی نہیں ہے کہ نہی حقیقت حرمت پر دلالت کرتی ہے اور اسے حقیقی معنی سے اسی وقت خارج کیا جائے گا جبکہ کوئی قرینہ صارفہ ہو گا اور دودھ پلانے والی عورت کی شہادت کو قبول نہ کرنے کی دلیل اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد سے لی گئی ہے: واستشهد واشهيدين من اجالكتم (۲: ۲۸۲) لیکن یہ دلیل مفید نہیں کیونکہ عام کی بنا خاص پر واجب ہے اور اس میں کوئی شک و شبہ نہیں کہ اس حدیث نے قرآن پاک کے عام حکم کو خاص کر دیا ہے۔

راوی حدیث: ﴿ عقبہ بن حارث رضی اللہ عنہ ﴾ ابو سروعہ' سروعہ کے سین کے نیچے کسرہ۔ "را" ساکن اور "واؤ" پر فتحہ۔ عقبہ بن حارث بن عامر بن نوفل بن عبد مناف مکی۔ مشہور صحابی ہیں۔ فتح مکہ کے موقع پر مسلمان ہونے والوں میں سے ہیں۔ اس کے بعد وہ پچاس برس تک زندہ رہے۔

﴿ ام یحیی ﴾ ان کا نام غنیہ ہے۔ غین پر فتحہ' نون کے نیچے کسرہ اور "یاء" پر تشدید۔ غنیہ بنت ابی اھاب بن عویز تمیمی اور ایک قول یہ بھی ہے کہ ان کا نام زینب تھا۔

(٩٧٤) وَعَنْ زِيَادٍ السَّهْمِيِّ قَالَ: نَهَى رَسُولُ اللهِ ﷺ أَنْ تُسْتَرْضَعَ الحَمْقَى. أَخرَجَهُ أَبُو دَاوُدَ. وَهُوَ مُرْسَلٌ، وَلَيْسَتْ لِزِيَادٍ صُحْبَةٌ.

حضرت زیاد سہمی رحمہ اللہ نے بیان کیا کہ رسول اللہ ﷺ نے احمق و کم عقل عورتوں کا دودھ پلانے سے منع فرمایا ہے۔ (اسے ابوداؤد نے نکالا ہے اور یہ مرسل ہے کیونکہ زیاد کو صحابی ؓ ہونے کا شرف حاصل نہیں)

لغوی تشریح: ﴿ تسترضع الحمقی ﴾ صیغہ مجہول۔ اس سے دودھ پلانے کا مطالبہ و تقاضا کرنا اور حمقیٰ احمق سے فعلیٰ کے وزن پر زیادہ بیوقوف۔

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ غبی' کم عقل اور بیوقوف عورتوں سے دودھ نہ پلوایا جائے۔ اس کی حکمت یہ معلوم ہوتی ہے کہ دودھ میں طبیعت اور مزاج کا اثر ہوتا ہے۔ لڑکا یا لڑکی بھی اسی وجہ سے اگر کم عقل اور احمق بن جائے تو اس سے بڑی آفت اور مصیبت کیا ہوگی۔ یہ تو دین و دنیا دونوں کیلئے مضر اور نقصان دہ ہے۔ علماء اسلام میں سے امام غزالی رحمہ اللہ وغیرہ نے تو بدکار اور بے دین عورت کے دودھ پلانے سے بھی منع کیا ہے اور اس سے تو انکار مشکل ہے کہ دودھ کے اپنے طبعی اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ اگر مرضعہ صحت مند' تنومند' سیرت و کردار اور اخلاق حسنہ کی حامل ہوگی تو اس کے اثرات دودھ پینے والے بچوں پر لازماً پڑیں گے۔ اس لئے اس پہلو سے یہ بھی ارشاد گرامی بڑا قابل قدر ہے۔

راوی حدیث: ﴿ زیاد سہمی ﴾ تقریب میں ہے کہ یہ تیسرے طبقہ کا آدمی ہے۔ مرسل حدیث بیان کرتا ہے اور یہ کہا گیا ہے کہ عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ کا آزاد کردہ غلام ہے۔ صاحب اسد الغابہ اور صاحب استیعاب نے اس کا ذکر صحابہ ؓ میں نہیں کیا۔

١٣ - بَابُ النَّفَقَاتِ — نفقات کا بیان

(٩٧٥) عَنْ عَآئِشَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهَا قَالَتْ: دَخَلَتْ هِنْدٌ بِنْتُ عُتْبَةَ، اَمْرَأَةُ أَبِيْ سُفْيَانَ، عَلَىٰ رَسُولِ اللهِ ﷺ، فَقَالَتْ: يَا رَسُولَ اللهِ! إِنَّ أَبَا سُفْيَانَ رَجُلٌ شَحِيْحٌ، لاَ

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا کہ ہند بنت عتبہ' ابوسفیان کی بیوی رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئی اور عرض کیا' اے اللہ کے رسول (ﷺ)! ابوسفیان ایک کنجوس آدمی ہے۔ مجھے وہ اتنا خرچ نہیں دیتا جو میرے اور میرے بچوں کیلئے کافی ہو مگر

يُعْطِينِيْ مِنَ النَّفَقَةِ مَا يَكْفِيْنِيْ، وَيَكْفِي بَنِيَّ، إِلاَّ مَا أَخَذْتُ مِنْ مَّالِهِ بِغَيْرِ عِلْمِهِ، فَهَلْ عَلَيَّ فِيْ ذٰلِكَ مِنْ جُنَاحٍ؟ فَقَالَ: «خُذِي مِنْ مَالِهِ بِالمَعْرُوفِ مَا يَكْفِيكِ، وَيَكْفِي بَنِيكِ». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

یہ کہ میں پوشیدہ طور پر کچھ لے لوں تو ایسا کرنے میں مجھ پر کوئی گناہ ہو گا؟ آنحضرت ﷺ نے فرمایا "بھلے طریقے سے تم اتنا مال لے سکتی ہو جو تمہارے اور تمہارے بچوں کیلئے کافی ہو۔" (بخاری و مسلم)

لغوی تشریح: ﴿ باب النفقات ﴾ نفقہ کی جمع ہے "نون' فا اور قاف" تینوں پر فتحہ' انفاق سے اسم ہے نفقہ کہتے ہیں انسان کا نقدی خورد ونوش اور پینے کی اشیاء پر جو خرچ کرنا ہے۔ ﴿ شحیح ﴾ شح سے ماخوذ ہے۔ وہ لالچ و حرص جس کے ساتھ بخل بھی شامل ہو اور ﴿ معروف ﴾ سے مراد اپنی وسعت و طاقت کے مطابق خرچ کا جو اندازہ لوگوں میں متعارف ہو۔

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ خاوند اگر استطاعت کے باوجود اخراجات پورے ادا نہ کرے تو بیوی اس کو بتائے بغیر اتنا خرچہ اس کے مال سے لے سکتی ہے جو معروف کے درجہ میں آتا ہو۔ نیز یہ بھی معلوم ہوا کہ اپنا جائز حق جس طرح وصول ہو سکتا ہو' کیا جا سکتا ہے۔ ناانصافی کے ازالے کی غرض سے شکوہ و شکایت غیبت کے زمرہ میں نہیں آتی۔ خواہ وہ نقص و برائی متعلقہ شخص میں پائی جاتی ہو۔ بیوی عدالت میں اپنے شوہر کی شکایت لے جانے کی مجاز ہے۔ یہ شکایت بھی غیبت میں شمار نہیں اگر یہ غیبت کی تعریف میں آتا تو رسول اللہ ﷺ ھند کو منع فرما دیتے۔ نیز معلوم ہوا کہ عورت عدالت کے ذریعہ اپنے حقوق حاصل کرنے کی شرعاً مجاز ہے۔

راوی حدیث: ﴿ ھند بنت عتبہ بن ربیعہ بن عبد شمس رضی اللہ عنہا ﴾ اس نے فتح مکہ کے موقع پر اپنے شوہر ابوسفیان کے دائرہ اسلام میں داخل ہونے کے بعد اسلام قبول کیا۔ اس کا والد عتبہ' چچا شیبہ اور بھائی ولید غزوۂ بدر کے روز قتل ہو گئے تھے۔ یہ واقعہ اس کی طبیعت پر بڑا شاق گزرا۔ پس جب حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ شہید کئے گئے تو اس نے ان کا پیٹ چاک کر کے کلیجہ نکال کر چبایا مگر نگل نہ سکی اور باہر پھینک دیا۔ ۱۴ھ کو محرم میں وفات پائی اور اس کے علاوہ بھی مختلف سنوں کا ذکر کیا ہے۔

﴿ ابوسفیان رضی اللہ عنہ ﴾ صخر بن حرب بن امیہ بن عبد شمس۔ نبی ﷺ کے ساتھ معرکہ آرائی میں کفار کے علمبردار' قائد اور سپہ سالار فوج تھے۔ فتح مکہ کے موقع پر اسلام اس وقت قبول کیا جب حضرت عباس رضی اللہ عنہ اپنی پناہ و حفاظت میں ان کو نبی ﷺ کی خدمت میں لے جانے میں کامیاب ہوئے۔ یہ دخول مکہ سے پہلے کا واقعہ ہے۔ اس کے بعد انہوں نے قبول اسلام کو بہت عمدہ اور اچھا ثابت کیا۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے دور خلافت میں ۳۲ھ میں وفات پائی۔

(۹۷۶) وَعَنْ طَارِقٍ المُحَارِبِيِّ، قَالَ: قَدِمْنَا المَدِيْنَةَ، فَإِذَا رَسُولُ اللهِ

حضرت طارق محاربی رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ ہم مدینہ میں آئے تو رسول اللہ ﷺ منبر پر کھڑے لوگوں سے

ﷺ قَآئِمٌ عَلَى الْمِنْبَرِ، يَخْطُبُ النَّاسَ، وَيَقُولُ: «يَدُ الْمُعْطِي الْعُلْيَا، وَابْدَأْ بِمَنْ تَعُولُ، أُمَّكَ، وَأَبَاكَ، وَأُخْتَكَ، وَأَخَاكَ، ثُمَّ أَدْنَاكَ فَأَدْنَاكَ». رَوَاهُ النَّسَآئِيُّ، وَصَحَّحَهُ ابْنُ حِبَّانَ وَالدَّارَقُطْنِيُّ.

خطاب فرما رہے تھے۔ فرماتے تھے "دینے والا ہاتھ بالا و بلند ہوتا ہے۔ اور ان سے شروع کر جو تمہاری کفالت میں ہیں۔ ان میں تیری ماں' تیرا باپ' تیری بہن اور تیرا بھائی شامل ہیں پھر درجہ بدرجہ اپنے سب سے زیادہ قریبی کو دے۔" (اسے نسائی نے روایت کیا ہے اور ابن حبان اور دارقطنی نے صحیح قرار دیا ہے۔)

لغوی تشریح: ﴿ وابدا بمن تعول ﴾ یعنی خرچ کا آغاز ان سے کرو جن کا خرچہ تم پر واجب ہے۔ جب وہ خورد و نوش اور لباس وغیرہ کے محتاج ہوں۔ ﴿ امک واباک ﴾ منصوب فعل مقدر کی وجہ سے یعنی ان کا نان و نفقہ ضرور مہیا کر اور اپنے مال میں سے ان کو دے۔ ﴿ ادناک فادناک ﴾ درجہ بدرجہ قرابت کے اعتبار سے۔

راوی حدیث: ﴿ طارق بن عبداللہ محاربی رضی اللہ عنہ ﴾ صحابی ہیں۔ محارب بن خصفہ جو بنو غطفان کا قبیلہ ہے کی طرف نسبت کی وجہ سے محاربی کہلائے۔ ان سے چند احادیث مروی ہیں۔ انہوں نے ذوالمجاز میں ہجرت سے پہلے نبی ﷺ کو دیکھا تھا۔

(٩٧٧) وَعَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «لِلْمَمْلُوكِ طَعَامُهُ وَكِسْوَتُهُ، وَلاَ يُكَلَّفُ مِنَ الْعَمَلِ إِلاَّ مَا يُطِيقُ». رَوَاهُ مُسْلِمٌ.

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "غلام کا کھانا پینا اور لباس مہیا کرنا مالک پر واجب ہے اور طاقت سے بڑھ کر کام کی تکلیف نہ دی جائے۔" (مسلم)

(٩٧٨) وَعَنْ حَكِيْمِ بْنِ مُعَاوِيَةَ الْقُشَيْرِيِّ، عَنْ أَبِيْهِ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قُلْتُ: يَا رَسُولَ اللهِ! مَا حَقُّ زَوْجَةِ احَدِنَا عَلَيْهِ؟ قَالَ: «أَنْ تُطْعِمَهَا إِذَا طَعِمْتَ، وَتَكْسُوَهَا إِذَا اكْتَسَيْتَ، وَلاَ تَضْرِبِ الوَجْهَ، وَلاَ تُقَبِّحْ» - اَلْحَدِيْثُ - وَتَقَدَّمَ فِي عِشْرَةِ النِّسَآءِ.

حضرت حکیم بن معاویہ قشیری کی اپنے باپ سے روایت ہے کہ میں نے عرض کیا اے اللہ کے رسول (ﷺ)! ہم میں سے ہر ایک پر اس کی اہلیہ کا کیا حق ہے؟ آپؐ نے فرمایا "جب خود کھاؤ تو اس کو بھی کھلاؤ۔ جب خود پہنو تو اس کو بھی پہناؤ اور اس کے منہ پر نہ مارو اور اسے قبیح نہ کہو۔" (لمبی حدیث ہے جو عشرۃ النساء کے باب میں پہلے گزر چکی ہے۔)

(٩٧٩) وَعَنْ جَابِرٍ رَضِيَ اللَّهُ

حضرت جابر رضی اللہ عنہ نبی ﷺ سے حج کے بارے میں لمبی

تَعَالَى عَنْهُ، عَنِ النَّبِيِّ ﷺ، فِي حَدِيْثِ الحَجِّ بِطُوْلِهِ، قَالَ فِيْ ذِكْرِ النِّسَآءِ: «وَلَهُنَّ عَلَيْكُمْ رِزْقُهُنَّ وَكِسْوَتُهُنَّ بِالمَعْرُوفِ». أَخرَجَهُ مُسْلِمٌ.

حدیث میں بیان کرتے ہیں کہ آپؐ نے عورتوں کے بارے میں فرمایا "تم پر تمہاری بیویوں کا یہ حق ہے کہ ان کو کھانا پینا اور لباس بھلے طریقہ سے دیا کرو۔" (مسلم)

(٩٨٠) وَعَنْ عَبْدِ اللهِ بْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُمَا، قَالَ؛ قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «كَفَى بِالمَرْءِ إِثْماً أَنْ يُضَيِّعَ مَنْ يَقُوتُ». رَوَاهُ النَّسَآئِي، وَهُوَ عِنْدَ مُسْلِمٍ بِلَفْظِ «أَنْ يَحْبِسَ عَمَّنْ يَمْلِكُ قُوْتَهُ».

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "ایک انسان کیلئے یہی گناہ کافی ہے کہ جن کی روزی کا ذمہ دار و کفیل ہے ان کو ضائع کر دے۔" (نسائی) اور مسلم میں یہ الفاظ ہیں کہ "جس کی روزی کا مالک ہے اسے روک لے۔"

لغوی تشریح: ﴿ كفى بالمرء اثما ﴾ اس کے گنہگار و خطا کار ہونے کیلئے کافی ہے یا یہ معنی کہ اس کیلئے یہی گناہ کافی ہے۔ ﴿ ان يضيع ﴾ "تضيع" سے ماخوذ ہے۔ اسے چھوڑ دے۔ ایسی حالت میں کہ اسے ہلاک و ضائع کرنے والا ہو۔ ﴿ من يقوت ﴾ جس کی عیال داری کا ذمہ دار ہے' جسے روزی دیتا ہے' کھانے پینے کا بندوبست و انتظام کرتا ہے اس میں من موصولہ یضیع کا مفعول واقع ہو رہا ہے۔

(٩٨١) وَعنْ جَابِرٍ، يَرْفَعُهُ، فِي الحَامِلِ ٱلْمُتَوَفَّى عَنْهَا زَوْجُهَا، قَالَ: لاَ نَفَقَةَ لَهَا. أَخرَجَهُ البَيْهَقِيُّ، وَرِجَالُهُ ثِقَاتٌ، لَكِن قَالَ: المَحْفُوظُ وَقْفُهُ، وَثَبَتَ نَفْيُ النَّفَقَةِ فِيْ حَدِيْثِ فَاطِمَةَ بِنْتِ قَيْسٍ، كَمَا تَقَدَّمَ، رَوَاهُ مُسْلِمٌ.

حضرت جابر رضی اللہ عنہ نے اس حاملہ کے بارے میں جس کا شوہر فوت ہو گیا ہو مرفوعاً روایت کیا ہے کہ اس کیلئے نفقہ نہیں ہے۔ (اس کو بیہقی نے نکالا۔ اس کے راوی ثقہ ہیں لیکن امام بیہقی نے کہا ہے کہ اس کا موقوف ہونا ہی محفوظ ہے۔ نفقہ کی نفی فاطمہ بنت قیس رضی اللہ عنہا کی حدیث سے ثابت ہے جو پہلے گزر چکی ہے۔ اسے مسلم نے روایت کیا ہے)

حاصل کلام: اس حدیث میں دلیل ہے کہ جس حاملہ خاتون کا شوہر فوت ہو گیا ہو اس کیلئے نفقہ نہیں' تو جو غیر حاملہ ہو بالاولیٰ اس کیلئے نفقہ نہیں اور مطلقہ ثلاثہ غیر حاملہ کیلئے نہ نفقہ ہے اور نہ رہائش اور مطلقہ ثلاثہ حاملہ کیلئے نفقہ ہے رہائش نہیں۔ بیوہ غیر حاملہ کیلئے نفقہ نہیں رہائش ہے اور بیوہ حاملہ کیلئے رہائش ہے مگر نفقہ میں اختلاف ہے۔ صحیح یہ ہے کہ اس کیلئے نفقہ نہیں۔ یہ بات ذہن نشین رہے کہ نفقہ و رہائش کی بحث اس وقت تک ہے جب کہ عورت عدت میں ہو۔ عدت گزرنے کے بعد تو وہ کسی چیز کا استحقاق نہیں رکھتی۔

(٩٨٢) وَعَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «اليَدُ العُلْيَا خَيْرٌ مِنَ اليَدِ السُّفْلَى، وَيَبْدَأُ أَحَدُكُمْ بِمَنْ يَعُولُ، تَقُولُ المَرْأَةُ: أَطْعِمْنِي أَوْ طَلِّقْنِي». رَوَاهُ الدَّارَقُطْنِيُّ، وَإِسْنَادُهُ حَسَنٌ.

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "اوپر والا ہاتھ نیچے والے ہاتھ سے بہتر ہے۔ تم میں ہر کوئی اس سے آغاز و ابتدا کرے جس کی وہ عیالداری کرتا ہے۔ ایسا نہ ہو بیوی کہنے لگے کہ نان و نفقہ دو یا طلاق دو۔" (اس کو دار قطنی نے حسن سند سے روایت کیا ہے)

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ خاوند اگر بیوی کا نفقہ دیدہ و دانستہ پورا نہ کرے یا مالی حالت کی کمزوری کی وجہ سے پورا نہ کر سکے تو بیوی شوہر سے طلاق کا مطالبہ کرنے میں حق بجانب ہو گی۔

(٩٨٣) وَعَنْ سَعِيْدِ بْنِ الْمُسَيَّبِ، فِي الرَّجُلِ لاَ يَجِدُ مَا يُنْفِقُ عَلَىٰ أَهْلِهِ، قَالَ: يُفَرَّقُ بَيْنَهُمَا. أَخْرَجَهُ سَعِيْدُ بْنُ مَنْصُورٍ، عَنْ سُفْيَانَ، عَنْ أَبِيْ الزِّنَادِ، عَنْهُ، قَالَ: قُلْتُ لِسَعِيْدٍ: سُنَّةٌ؟ فَقَالَ: سُنَّةٌ. وَهٰذَا مُرْسَلٌ قَوِيٌّ.

اور حضرت سعید بن مسیب رحمۃ اللہ علیہ سے ایسے آدمی کے متعلق مروی ہے جو اپنی بیوی کو نان و نفقہ نہ دے سکے کہ ان کے درمیان علیحدگی کر دی جائے گی۔ اس روایت کو سعید بن منصور نے سفیان سے اور انہوں نے الزناد سے روایت کیا ہے کہ میں نے سعید بن مسیب سے پوچھا: کیا یہ سنت ہے؟ تو انہوں نے جواب دیا کہ ہاں سنت ہے۔ (یہ روایت مرسل قوی ہے۔)

حاصل کلام: اس روایت کی رو سے شوہر نان و نفقہ نہ دے تو میاں بیوی کو علیحدہ علیحدہ کر دیا جائے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ' عمر رضی اللہ عنہ اور ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ اور تابعین کی ایک جماعت اور فقہاء ائمہ میں سے امام مالک رحمۃ اللہ علیہ' امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ وغیرہ فسخ نکاح کا اختیار عورت کو دیتے ہیں۔ ظاھریہ کا بھی یہی قول ہے لا ضرر ولا ضرار۔والی حدیث کو بھی اس کی تائید میں پیش کیا جاتا ہے۔ احناف کا قول ہے کہ نفقہ نہ ہونے کی صورت میں فسخ نکاح کا اختیار عورت کو نہیں۔ انہوں نے دلیل میں قرآن حمید کی آیت وعن قدر علیہ رزقہ پیش کی ہے۔ مگر علامہ حافظ ابن قیم رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ جب عورت نے مرد سے نکاح کیا اس وقت مرد تندرست تھا اور مرد کی تنگ دستی کا عورت کو علم بھی تھا یا نکاح کے وقت مرد کی مالی حالت تسلی بخش تھی مگر بعد میں کسی وجہ سے تنگ دستی کا شکار ہو گیا تو ایسی صورت میں عورت کو فسخ نکاح کا اختیار نہیں۔ کیونکہ حالات بدلتے دیر نہیں لگتی۔ آج تنگ دستی ہے تو کل فراخ دستی بھی ہو سکتی۔ بصورت دیگر عورت کو حق ہو گا کہ وہ فسخ نکاح کا اختیار رکھے اور اسے استعمال کرنا چاہے تو استعمال بھی کرے۔ جن علماء و فقہاء نے عورت کو فسخ نکاح کا اختیار دیا ہے ان میں سے امام مالک رحمۃ اللہ علیہ خاوند کو ایک ماہ کا وقت دیتے ہیں اور امام

شافعی رحمہ اللہ صرف تین دن اور حماد نے ایک سال کی میعاد دی ہے۔

راوی حدیث: ﴿ **سفیان** ﴾ سفیان بن سعید بن مسروق ثوری۔ ابوعبداللہ کوفی۔ بڑے ائمہ کرام میں سے ایک ہیں۔ ان کے امام ہونے پر سب کا اتفاق ہے۔ اتقان' ضبط حفظ' معرفت اور زھد و ورع کے اوصاف سے متصف تھے۔ ۷۷ھ میں پیدا ہوئے اور بصرہ میں ۱۶۱ھ میں فوت ہوئے۔

﴿ **ابوالزناد** ﴾ عبداللہ بن ذکوان اموی۔ ان کے مولیٰ مدنی تھے۔ بڑے ائمہ میں شمار ہے۔ امام احمد رحمہ اللہ کا قول ہے ثقہ ہیں۔ امیرالمومنین ہیں۔ امام بخاری رحمہ اللہ کا قول ہے کہ ابوالزناد عن الاعرج عن ابی ھریرہ صحیح ترین سند ہے۔ ۱۳۰ھ یا ۱۳۱ھ میں وفات پائی۔

(٩٨٤) وَعَنْ عُمَرَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، أَنَّهُ كَتَبَ إِلىٰ أُمَرَآءِ الأَجْنَادِ، فِي رِجَالٍ غَابُوا عَنْ نِّسَآئِهِمْ: أَنْ يَأْخُذُوهُمْ بِأَنْ يُنْفِقُوا، أَوْ يُطَلِّقُوا، فَإِنْ طَلَّقُوا بَعَثُوْا بِنَفَقَةِ مَا حَبَسُوا. أَخرَجَهُ الشَّافِعِيُّ ثُمَّ البَيْهَقِيُّ بِإِسْنَادٍ حَسَنٍ.

حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ انہوں نے امراء لشکر کو ایسے مردوں کے بارے میں تحریر فرمایا جو فوج میں شریک رہنے کی وجہ سے اپنی بیویوں سے غائب تھے کہ وہ اپنی بیویوں کو نفقہ روانہ کریں ورنہ طلاق دے دیں۔ اگر طلاق دیں تو جتنی مدت انہوں نے روکے رکھا ہے اس کا نفقہ روانہ کریں۔ (اسے امام شافعی رحمہ اللہ اور بیہقی نے عمدہ سند سے روایت کیا ہے)

لغوی تشریح: ﴿ **امراء الاجناد** ﴾ قائدین لشکر۔ اجناد جند کی جمع ہے لشکر کو کہتے ہیں۔ یہ روایت اور پہلی دونوں احادیث اس بات کی دلیل ہیں کہ شوہر پر بیوی کا خرچہ واجب ہے۔ پھر اگر تنگ دست ہو یا ٹال مٹول سے کام لے تو عورت کو اختیار ہے اس سے علیحدگی اور فرقت کا۔ جمہور اہل علم امام مالک رحمہ اللہ' امام شافعی رحمہ اللہ اور امام احمد رحمہ اللہ اور اہل ظواہر اسی کے قائل ہیں۔ یہ جدائی اور علیحدگی فسخ ہوگی یا طلاق۔ اس میں دو قول ہیں۔ جس نے اسے طلاق ہی قرار دیا ہے اس نے کہا کہ یہ مقدمہ حاکم کے پاس لے جایا جائے گا تاکہ وہ شوہر پر لازم کرے کہ وہ نفقہ دے یا طلاق۔ پھر اگر وہ انکار کرے تو حاکم اسے طلاق رجعی دے دے۔ پھر اگر اس نے بیوی سے رجوع کر لیا تو عدالت دوسری طلاق دے دے گی۔ اب پھر اگر اس نے رجوع کر لیا تو عدالت تیسری طلاق دے گی اور جس نے اسے فسخ قرار دیا ہے۔ اس صورت میں بھی مقدمہ حاکم وقت کی عدالت میں لے جانا ناگزیر ہے تاکہ وہ اپنی تنگ دستی کا ثبوت پیش کر سکے اس کے ثبوت پیش کرنے کے بعد نکاح فسخ کیا جائے گا اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ مقدمہ حاکم کی عدالت میں لے جایا جائے گا تاکہ حاکم شوہر کو طلاق پر مجبور کرے یا نکاح فسخ کرے یا فسخ کی اس سے اجازت لے پھر اگر اس نے نکاح فسخ کیا یا فسخ کی اجازت دی تو اسے فسخ قرار دیا جائے گا طلاق نہیں۔ اس صورت میں رجوع کا حق نہیں ہوگا۔ یہ بحث الھدیٰ اور سبل السلام سے ماخوذ ہے۔ اس مقام پر اور بھی بہت سے اقوال ہیں مگر اس تفصیل کو ذکر کرنے کی ضرورت نہیں۔

حاصل کلام: حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اس تحریری فرمان کا پس منظر یہ ہے کہ ایک رات حضرت عمر رضی اللہ عنہ گشت پر تھے۔ ایک ایسے خیمہ پر سے آپ کا گزر ہوا جس میں ایک خاتون شوہر کی جدائی کی طوالت پر دردناک شعر پڑھ رہی تھی۔ وہ اشعار حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے بھی سن لئے۔ اس کا شوہر فوج میں ملازم تھا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنی بیٹی حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا سے دریافت کیا کہ ایک عورت خاوند کے بغیر کتنا عرصہ تک گزار سکتی ہے۔ حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا نے بتایا کہ چار ماہ تک۔ اس کے بعد حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے لشکر کے سپہ سالاروں کو حکم تحریر فرمایا کہ فوجیوں کو حکم دو کہ وہ چار ماہ بعد ضرور گھر آیا کریں ورنہ اپنی بیویوں کو طلاقیں دے دیں اور ساتھ ہی ان کا سابقہ نان و نفقہ بھی بھیج دیں۔

(٩٨٥) وَعَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: جَآءَ رَجُلٌ إِلَى النَّبِيِّ ﷺ، فَقَالَ: يَا رَسُولَ اللهِ! عِنْدِيْ دِيْنَارٌ؟ قَالَ: «**أَنْفِقْهُ عَلىٰ نَفْسِكَ**»، قَالَ: عِنْدِيْ؟ آخَرُ؟ قَالَ: «**أَنْفِقْهُ عَلىٰ وَلَدِكَ**»، قَالَ: عِنْدِيْ آخَرُ؟ قَالَ: «**أَنْفِقْهُ عَلىٰ أَهْلِكَ**»، قَالَ: عِنْدِيْ آخَرُ؟ قَالَ: «**أَنْفِقْهُ عَلىٰ خَادِمِكَ**»، قَالَ: عِنْدِي آخَرُ؟ قَالَ: «**أَنْتَ أَعْلَمُ**». أَخْرَجَهُ الشَّافِعِيُّ وَأَبُو دَاوُدَ، وَاللَّفْظُ لَهُ، وَأَخْرَجَهُ النَّسَائِيُّ وَالحَاكِمُ بِتَقْدِيْمِ الزَّوْجَةِ عَلَى الوَلَدِ.

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک آدمی نے نبی ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا' اے اللہ کے رسول (ﷺ)! میرے پاس ایک دینار ہے۔ آپؐ نے فرمایا "اپنے آپ پر خرچ کرو۔" اس نے عرض کیا میرے پاس ایک اور ہے؟ فرمایا "اپنی اولاد پر خرچ کرو" وہ پھر بولا میرے پاس ایک اور ہے۔ فرمایا "اپنی بیوی پر خرچ کرو۔" اس نے عرض کیا میرے پاس اور ہے۔ فرمایا "اپنے خادم پر خرچ کرو۔" وہ بولا میرے پاس اور ہے۔ فرمایا "تجھے خوب علم ہے کہ تو اسے کہاں خرچ کرے۔" (اس کی شافعی اور ابوداؤد نے تخریج کی ہے اور یہ الفاظ ابوداؤد کے ہیں اور نسائی اور حاکم نے بھی اس کی تخریج کی ہے۔ اس میں ولد سے پہلے زوجہ کا ذکر ہے)

حاصل کلام: اس حدیث میں اس کا ذکر ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ کسی کو اپنی رحمت خاص سے نوازے اور اس کے پاس خرچ کرنے کی گنجائش ہو تو اس کے مصارف کی ترتیب کیا ہونی چاہئے۔ چنانچہ فرمایا کہ سب سے پہلا حق انسان پر اس کی اپنی جان کا ہے۔ اس کے بعد اسی ترتیب کے مطابق خرچ کرے۔ جیسے اس حدیث میں ذکر کیا گیا ہے اور آخر میں جو یہ فرمایا کہ انت اعلم اور ایک دوسری روایت میں انت ابصربہ بھی ہے۔ جس کا مطلب ہے کہ تو اس کے خرچ کرنے کی جگہ کا زیادہ علم رکھتا ہے کہ کہاں اور کس کو کتنا دینا چاہئے۔

(٩٨٦) وَعَنْ بَهْزِ بْنِ حَكِيْمٍ، عَنْ حضرت بھز بن حکیم رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے باپ کے واسطہ

أَبِيهِ عَنْ جَدِّهِ، قَالَ: قُلْتُ: يَا رَسُولَ اللهِ! مَنْ أَبَرُّ؟ قَالَ: «**أُمَّكَ**»، قُلْتُ: ثُمَّ مَنْ؟ قَالَ: «**أُمَّكَ**»، قُلْتُ: ثُمَّ مَنْ؟ قَالَ: «**أُمَّكَ**»، قُلْتُ: ثُمَّ مَنْ؟ قَالَ: «**أَبَاكَ، ثُمَّ الأَقْرَبَ فَالأَقْرَبَ**». أَخْرَجَهُ أَبُو دَاوُدَ وَالتِّرْمِذِيُّ، وَحَسَّنَهُ.

سے اپنے دادا سے روایت کیا ہے کہ میں نے عرض کیا' اے اللہ کے رسول (ﷺ)! میں حسن سلوک اور بھلائی کس کے ساتھ کروں؟ آپؐ نے فرمایا "اپنی والدہ کے ساتھ۔" میں نے پھر عرض کیا۔ پھر کس سے؟ آپؐ نے پھر فرمایا "اپنی والدہ سے" میں نے پھر عرض کیا پھر کس سے؟ فرمایا "اپنی والدہ سے" میں نے پھر عرض کیا۔ پھر کس سے؟ فرمایا "اپنے والد سے اس کے بعد پھر درجہ بدرجہ زیادہ قریبی رشتہ دار سے۔" (اسے ابوداؤد اور ترمذی نے تخریج کیا اور ترمذی نے اسے حسن قرار دیا ہے)

لغوی تشریح: ﴿ ابر ﴾ بر سے ماخوذ ہے۔ متکلم کا صیغہ ہے۔ اس کے معنی احسان اور نیکی و بھلائی کے ہیں۔

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ ماں کا درجہ والد سے زیادہ ہے۔ ماں بچے کی وجہ سے جو تکلیفیں اور دکھ برداشت کرتی ہے اس وجہ سے ماں کے ساتھ حسن سلوک کی زیادہ تاکید فرمائی گئی ہے۔ عورت کمزور اور صنف نازک ہے۔ بچے بڑے ہو کر ماں کے قابو اور کنٹرول میں بہت کم رہتے ہیں۔ ماں کی بے قدری کی جاتی ہے۔ شریعت نے ماں کے ساتھ حسن سلوک کی اتنی شدت سے تاکید کی ہے اور اولاد کو احساس دلایا ہے کہ ماں کو ہر ممکن طریقہ سے زیادہ سے زیادہ آرام اور راحت پہنچانی چاہئے۔ اس کے حکم کو بے چون و چرا ماننا اور تسلیم کرنا چاہئے۔ بشرطیکہ خلاف شرع حکم نہ دے۔

١٤ - بَابُ الحِضَانَةِ

پرورش و تربیت کا بیان

(٩٨٧) عَنْ عَبْدِاللهِ بْنِ عَمْرٍو رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا، أَنَّ ٱمْرَأَةً قَالَتْ: يَا رَسُولَ اللهِ! إِنَّ ابنِيْ هٰذَا، كَانَ بَطْنِيْ لَهُ وِعَاءً، وَثَدْيِيْ لَهُ سِقَآءً، وَحِجْرِيْ لَهُ حِواءً، وَإِنَّ أَبَاهُ طَلَّقَنِيْ، وَأَرَادَ أَنْ يَنْزِعَهُ مِنِّي، فَقَالَ لَهَا رَسُولُ اللهِ ﷺ: «**أَنْتِ أَحَقُّ بِهِ، مَا لَمْ تَنْكِحِي**». رَوَاهُ أَحْمَدُ وَأَبُو دَاوُدَ،

حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ ایک خاتون رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں آئی اور عرض کیا۔ اے اللہ کے رسول (ﷺ)! یہ جو میرا لخت جگر ہے میرا پیٹ اس کیلئے برتن تھا۔ میری چھاتی (پستان) اس کیلئے مشکیزہ اور میری آغوش اس کیلئے ٹھکانہ تھی۔ اس کے والد نے مجھے طلاق دے دی ہے اور اب وہ مجھ سے اس بچہ کو بھی چھین لینا چاہتا ہے۔ آپؐ نے فرمایا کہ "جب تک تو دوسرا

وَصَحَّحَهُ الحَاكِمُ.

نکاح نہیں کرتی اس وقت تک تو ہی اس کی زیادہ حقدار ہے۔" (اسے احمد اور ابوداؤد نے روایت کیا ہے اور حاکم نے اسے صحیح قرار دیا ہے)

لغوی تشریح: ﴿ باب الحضافة ﴾ "حضافة" کی حا کے نیچے کسرہ حضانة کہتے ہیں بچے کی نگہبانی اور تربیت وپرورش کو اور مہلک ومضر چیزوں اور حالات سے بچانے اور ان سے محفوظ رکھنے کو اور یہ ماخوذ ہے۔ حضن الصبی یحضنه' سے۔ یہ باب نصر ینصر سے ہے معنی یہ ہے کہ جب بچے کو اپنے سینے سے لگایا اور اسے گود میں لیا اور اس کی تربیت کا انتظام واہتمام کیا اور حضن "حاء" کے نیچے کسرہ اور "ضاد" ساکن کی صورت میں بغل سے نیچے پسلی تک کے حصے کو کہتے ہیں۔ (جسے کوکھ کہتے ہیں) یا پھر سینے اور بازوؤں کے مابین حصہ کو کہتے ہیں۔ ﴿ وعاء ﴾ واؤ کے نیچے کسرہ اور مد۔ برتن اس حال میں کہ اس نے پیٹ میں بچے کو اٹھائے رکھا۔ ﴿ سقاء ﴾ سین کے نیچے کسرہ اور مد چمڑے سے ساختہ برتن یعنی مشکیزہ جس میں پانی اور دودھ محفوظ رکھتے ہیں یعنی دودھ پلانے کی وجہ سے اس نے اسے مشکیزہ کا نام دیا۔ ﴿ حجری ﴾ آغوش انسان' انسانی گود۔ ﴿ حواء ﴾ حواء کی "حا" کے نیچے کسرہ اور مد ہر اس چیز کا نام ہے جو دوسری چیز کو اپنی لپیٹ میں لے یا گود میں لے اور اسے اپنے ساتھ ملالے یا جمع کرلے۔ یہ تین اوصاف وہ ہیں جو صرف ماں کے ساتھ مخصوص ہیں باپ سے ان کا کوئی تعلق نہیں تاکہ ان اوصاف و ممیّزات کے توسل سے ماں کا بچے کو دودھ پلانے کی وجہ سے استحقاق اور اس کی برتری و اولیت کا اثبات ہو۔ نبی ﷺ نے اس خاتون کیلئے اس بچہ کو برقرار رکھا اور اس پر حکم مرتب فرمایا۔ علامہ ابن قیم رحمہ اللہ نے "الھدی" میں کہا ہے کہ اس میں دلیل ہے کہ احکام میں معانی اور علل کا اعتبار کیا جاتا ہے اور ان احکام کو ان معانی و علل کے ساتھ ملحق کیا جاتا ہے۔ یہ چیز فطرت سلیمہ میں جاگزیں ہوتی ہے حتیٰ کہ نسوانی فطرت و جبلت میں بھی پائی جاتی ہے اور نیل الاوطار میں ہے کہ یہ حدیث اس بات کی دلیل ہے کہ والدہ باپ کی نسبت بچے کی زیادہ مستحق ہے۔ اس وقت تک کہ کوئی مانع ماں کی طرف سے حاصل نہ ہو جیسے نکاح۔ ابن منذر نے اس پر اجماع بیان کیا ہے۔ (تلخیص) ابن حزم کے نزدیک نکاح سے تربیت و پرورش ساقط نہیں ہوتی۔ حالانکہ اس کا سقوط ہی قرین صواب ہے اور جمہور کی یہی رائے ہے۔

(٩٨٨) وَعَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُ، أَنَّ امْرَأَةً قَالَتْ: يَا رَسُولَ اللهِ! إِنَّ زَوْجِي يُرِيْدُ أَنْ يَذْهَبَ بِٱبْنِيْ، وَقَدْ نَفَعَنِيْ، وَسَقَانِيْ مِنْ بِئْرِ أَبِيْ عِنَبَةَ، فَجَآءَ زَوْجُهَا، فَقَالَ النَّبِيُّ ﷺ: «يَا غُلَامُ! هٰذَا

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ایک عورت آئی اور عرض کیا' اے اللہ کے رسول (ﷺ)! میرا شوہر مجھ سے میرا بچہ چھیننا چاہتا ہے اور یہ بچہ میرے کام کاج میں مددگار ہے اور میرے لئے ابوعنبہ کے کنوئیں سے پانی لاکر دیتا ہے۔ اسی اثنا میں اس کا شوہر بھی آگیا۔ تو نبی ﷺ نے فرمایا "اے لڑکے! یہ

أَبُوكَ، وَهَذِهِ أُمُّكَ، فَخُذْ بِيَدِ أَيِّهِمَا شِئْتَ، فَأَخَذَ بِيَدِ أُمِّهِ، فَانْطَلَقَتْ بِهِ». رَوَاهُ أَحْمَدُ وَالأَرْبَعَةُ، وَصَحَّحَهُ التِّرْمِذِيُّ.

تیرا باپ ہے اور یہ تیری والدہ۔ ان دونوں میں سے جس کا چاہے ہاتھ پکڑ لے۔" اس بچہ نے ماں کا ہاتھ پکڑ لیا اور وہ اسے لے کر چلتی بنی۔ (اسے احمد اور چاروں نے بیان کیا ہے اور ترمذی نے اسے صحیح کہا ہے)

لغوی تشریح : ﴿ بئر ابی عنبہ ﴾ عنبہ کے عین کے نیچے کسرہ اور نون پر فتحہ۔ ماں نے اپنی حاجت و ضرورت کو بچہ کی طرف ظاہر کیا اور ماں اس بارے میں بچہ ہی سے زیادہ حق رکھتی تھی اور سنن ابی داؤد میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "اس بچہ پر دونوں قرعہ ڈالو" خاوند بولا میرے بچہ کے بارے میں مجھ سے کوئی نہیں جھگڑ سکتا۔ تو نبی ﷺ نے بچے کو مخاطب کر کے فرمایا "یہ تیرا باپ ہے الخ۔" اس حدیث اور اس سے پہلے والی حدیث سے حاصل ہوا کہ بچہ جب صغر سنی میں ہو تو ماں اس کی زیادہ حقدار ہے اور جب سن شعور کو پہنچ جائے اور تربیت و پرورش کی اسے چنداں ضرورت نہ رہے تو اس صورت میں والدین کے درمیان اس بچے کو اختیار دیا جائے گا (جس کے ساتھ چاہے چلا جائے) امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ ' احمد رحمۃ اللہ علیہ ' اسحٰق رحمۃ اللہ علیہ اور عام اہلحدیث اسی طرف گئے ہیں اور انہوں نے استغناء کی عمر سات یا آٹھ سال مقرر کی ہے اور امام مالک رحمۃ اللہ علیہ اور اہل الرائے اختیار دینے کی طرف نہیں گئے۔ بلکہ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ ماں بچیوں کی زیادہ حقدار ہے تاوقتیکہ ان کا نکاح ہو جائے اور باپ لڑکوں کا زیادہ حق رکھتا ہے تاوقتیکہ وہ جوان و بالغ ہو جائیں اور اہل الرائے کا قول ہے کہ جب بچہ مستغنی ہو جائے تو باپ اس کا زیادہ حق رکھتا ہے مگر یہ حدیث اختیار کو واجب قرار دے رہی ہے جو ان کے خلاف حجت ہے۔

حاصل کلام : اس حدیث میں بچے کو اختیار دیا گیا ہے کہ وہ جس کے پاس رہنا پسند کرے اس کے پاس رہے اور اس سے پہلی حدیث میں والدہ کو زیادہ حق دیا گیا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس حدیث میں جس بچہ کا ذکر ہے وہ بڑا ہو گا اور سمجھدار ہو گا۔ اسی وجہ سے اسے اختیار دیا گیا کہ خود سوچ سمجھ کر فیصلہ کر لے۔ اس سے معلوم ہوا کہ اگر بچہ بڑی عمر کا ہو اور اپنی حفاظت میں والدین کا محتاج نہ ہو تو اسے شریعت نے اختیار دیا ہے کہ ماں باپ دونوں میں سے جس کے پاس چاہے رہے۔ یہ اختیار کتنی عمر کے بچے کو دیا جائے گا۔ فقہاء نے سات یا آٹھ سال مقرر کی ہے۔ علامہ ابن قیم رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ جس امر میں بچے کی مصلحت اور خیر خواہی ہو اسے اختیار کرنا چاہئے۔ اگر ماں باپ کے مقابلہ میں زیادہ صحیح تربیت و پرورش اور حفاظت کرنے والی ہو اور نہایت غیرت مند خاتون ہو تو ماں کو باپ پر مقدم کیا جائے گا۔ اس موقع پر قرعہ اندازی یا اختیار میں سے کسی کا لحاظ نہیں کیا جائے گا کیونکہ بچہ تو نادان' کم عقل' ناعاقبت اندیش ہوتا ہے۔ ماں باپ میں سے جو بچہ کا زیادہ خیال رکھنے والا ہو' بچہ اس کے سپرد کر دیا جائے گا۔ اگر باپ میں یہ اوصاف ماں کی بہ نسبت زیادہ ہوں تو بچہ باپ کی تحویل میں دے دیا جائے گا۔ وہی اس کی پرورش و تربیت کا ذمہ دار ہو گا۔ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ لڑکا ہو یا لڑکی دونوں ماں کے پاس رہیں گے اور احناف نے کہا کہ

لڑکی ماں کے پاس اور لڑکا باپ کے پاس رہے گا۔ قرین انصاف بات علامہ ابن قیم رحمہ اللہ کی معلوم ہوتی ہے۔

(٩٨٩) وَعَنْ رَافِعِ بْنِ سِنَانٍ أَنَّهُ أَسْلَمَ، وَأَبَتِ ٱمْرَأَتُهُ أَنْ تُسْلِمَ، فَأَقْعَدَ النَّبِيُّ ﷺ الأُمَّ نَاحِيَةً، وَالأَبَ نَاحِيَةً، وَأَقْعَدَ الصَّبِيَّ بَيْنَهُمَا، فَمَالَ إِلَىٰ أُمِّهِ، فَقَالَ: «**اللَّهُمَّ اهْدِهِ، فَمَالَ إِلَى أَبِيهِ، فَأَخَذَهُ**». أَخرَجَهُ أَبُو دَاوُدَ وَالنَّسَائِيُّ، وَصَحَّحَهُ الحَاكِمُ.

حضرت رافع بن سنان رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ وہ خود مسلمان ہوگیا اور اس کی بیوی نے اسلام قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ماں کو ایک طرف اور باپ کو دوسرے گوشے میں بٹھا دیا اور بچے کو دونوں کے درمیان میں بٹھا دیا۔ تو بچہ ماں کی جانب مائل ہوا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دعا کی ”الٰہی اس بچہ کو ہدایت دے۔“ اس پر وہ بچہ باپ کی جانب مائل ہوگیا تو باپ نے بچے کو پکڑ لیا۔ (اس کی تخریج ابوداؤد اور نسائی نے کی ہے اور حاکم نے اسے صحیح کہا ہے)

حاصل کلام: حدیث کا سیاق اس پر دلالت کرتا ہے کہ یہ بچہ چھوٹا تھا ابھی تمیز نہیں کر سکتا تھا۔ چنانچہ ”صبی“ کا لفظ اسی کا مقتضی ہے بلکہ ابوداؤد میں صاف طور پر منقول ہے کہ یہ جھگڑا ایک چھوٹے بچے کے بارے میں تھا اور وہ عورت دودھ چھڑانے والی یا اس کے مشابہ تھی۔ جب یہ بات متحقق ہوگئی کہ بچہ چھوٹا تھا اور تمیز کی اہلیت و صلاحیت نہیں رکھتا تھا تو پھر تنازع و جھگڑا بچہ کی حق حضانت کے بارے میں تھا۔ ولایت و سرپرستی میں نہیں۔ یہ حدیث دلیل ہے کہ کافر ماں کیلئے حضانت کا حق ثابت ہے لیکن اس میں یہ دلیل نہیں ہے کہ بچے کو تمیز کی اہلیت کے بعد والدین کے انتخاب میں اختیار دیا جائے گا خواہ والدین میں سے ایک مسلمان اور دوسرا کافر ہو۔

راوی حدیث: ﴿ رافع بن سنان رضی اللہ عنہ ﴾ ابوالحکم انصاری اوسی مدنی رضی اللہ عنہ۔ مشہور صحابی ہیں۔ الانساب میں ابوالقاسم بن سلام نے ان کے بارے میں کہا ہے کہ یہ عطبون کی اولاد میں سے ہیں اور وہ عامر بن ثعلبہ ہیں۔

(٩٩٠) وَعَنِ الْبَرَاءِ بْنِ عَازِبٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ قَضَى فِي ٱبْنَةِ حَمْزَةَ لِخَالَتِهَا، وَقَالَ: «**ٱلخَالَةُ بِمَنْزِلَةِ الأُمِّ**». أَخرَجَهُ البُخَارِيُّ.

وَأَخْرَجَهُ أَحْمَدُ مِنْ حَدِيثِ عَلِيٍّ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: وَالجَارِيَةُ عِنْدَ خَالَتِهَا فَإِنَّ الخَالَةَ وَالِدَةٌ.

حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حمزہ کی بیٹی کا فیصلہ اس کی خالہ کے حق میں فرمایا کہ ”خالہ بمنزلہ ماں کے ہے۔“ (بخاری) اور احمد نے اس کی تخریج حضرت علی رضی اللہ عنہ کی حدیث سے کی ہے اور کہا ہے کہ ”لڑکی اپنی خالہ کے پاس ہوگی کیونکہ خالہ ماں ہے۔“

لغوی تشریح: ﴿ فان الخالة والدة ﴾ یعنی خالہ بمنزلہ ماں۔ اس بچی کی خالہ کا نام اسماء بنت عمیس تھا اور مذکورہ بچی کا نام عمارہ تھا اور امامہ بھی کہا گیا ہے۔ ان کی کنیت ام الفضل تھی۔ یہ فیصلہ آپؐ نے اس موقع پر فرمایا تھا جب حضرت علی رضی اللہ عنہ، حضرت جعفر رضی اللہ عنہ اور زید کے درمیان جھگڑا کھڑا ہوا تھا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کا دعویٰ تھا کہ اس کا زیادہ استحقاق میں رکھتا ہوں کیونکہ یہ میرے چچا کی بیٹی ہے اور حضرت جعفر رضی اللہ عنہ کا دعویٰ تھا کہ یہ میری چچا زاد بہن بھی ہے اور اس کی خالہ میرے نکاح میں ہے اور حضرت زید رضی اللہ عنہ کا دعویٰ تھا کہ میرے بھائی کی بیٹی ہے۔ ساری روداد و قصہ سماعت فرما کر آپؐ نے اس بچی کا فیصلہ خالہ کے حق میں دے دیا۔ مشکل یہ پیش آئی کہ یہ خالہ شادی شدہ تھیں اور یہ پہلے گزر چکا ہے کہ نکاح کے بعد حق حضانت نہیں رہتا۔ اس کا جواب یہ ہے کہ حق حضانت نکاح کی صورت میں اس وقت ساقط ہوتا ہے جبکہ والدین کے مابین جھگڑا پیدا ہو کہ بچہ کس کے پاس رہے کیونکہ مطلقہ کا بغض و ناراضگی پہلے شوہر کے بارے میں زیادہ سخت و شدید ہوتا ہے پھر اکثر اوقات یوں بھی ہوتا ہے کہ دوسرے شوہر سے عورت کی محبت و دلچسپی اور شوہر کی بچے کے متعلق سختی بچے کی طرف توجہ کو کم کر دیتی ہے جس سے بچہ کے حقوق کی ادائیگی میں کوتاہی واقع ہو جاتی ہے۔

(۹۹۱) وَعَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «إِذَا أَتَى أَحَدَكُمْ خَادِمُهُ بَطَعَامِهِ فَإِنْ لَمْ يُجْلِسْهُ مَعَهُ فَلْيُنَاوِلْهُ لُقْمَةً أَوْ لُقْمَتَيْنِ». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ، وَاللَّفْظُ لِلْبُخَارِيِّ.

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "جب تم میں سے کسی کا خادم کھانا پیش کرے تو اگر وہ اس خادم کو اپنے ساتھ بٹھا کر کھانا نہ کھلائے تو پھر ایک یا دو لقمے اسے دے۔" (بخاری و مسلم۔ یہ الفاظ بخاری کے ہیں)

(۹۹۲) وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا، عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ: «عُذِّبَتِ امْرَأَةٌ فِي هِرَّةٍ سَجَنَتْهَا حَتَّى مَاتَتْ، فَدَخَلَتِ النَّارَ فِيهَا، لاَ هِيَ أَطْعَمَتْهَا، وَسَقَتْهَا، إِذْ هِيَ حَبَسَتْهَا، وَلاَ هِيَ تَرَكَتْهَا تَأْكُلُ مِنْ خَشَاشِ الأَرْضِ». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا: "ایک عورت کو بلی کے قید کرنے میں عذاب دیا گیا جس نے بلی کو اتنی دیر تک باندھے رکھا کہ وہ مر گئی۔ اس عورت کو جہنم میں ڈال دیا گیا کہ نہ تو اس عورت نے بلی کو کچھ کھلایا اور نہ پلایا بلکہ باندھ رکھا اور نہ اسے آزاد چھوڑا کہ وہ زمین کے جانور کھا لیتی۔" (بخاری و مسلم)

لغوی تشریح: ﴿ عذبت امراة فی هرة ﴾ اس جملہ میں "فی" سببیہ ہے یعنی بلی کی وجہ سے۔ ﴿ سجنتها ﴾ روکے رکھا اسے اور باندھے رکھا۔ ﴿ فدخلت النار فيها ﴾ اس کو باندھے رکھنے کی وجہ سے اسے آگ میں داخل کیا گیا۔ ﴿ خشاش ﴾ "خا" کے نیچے کسرہ کے ساتھ اور فتحہ بھی جائز ہے اور ضمہ بھی۔ حشرات الارض۔ زمین کے جانور، چڑیا وغیرہ۔

حاصل کلام: سیاق تقاضا کرتا ہے کہ اس عورت کو عذاب بلی کے کھانے پینے سے روکے رکھنے کی وجہ سے دیا گیا اور اسے بھوکا پیاسا مارنے کی وجہ سے۔ اس میں کوئی دلیل نہیں کہ بلی کو قتل کرنا حرام ہے اور نہ اس کے جواز پر اس میں بحث ہے بلکہ اس مسئلہ میں تو سکوت ہے۔ بہترین قول یہ ہے کہ جب بلی دشمنی پر اتر آئے تو اسے قتل کرنا جائز ہے۔ مصنف رحمہ اللہ اس حدیث کو اور اس سے پہلی حدیث کو اس باب میں اس لئے لائے ہیں تا کہ متکفل اور ضامن کو ان کی ذمہ داری کی عظمت اور گراں باری پر متنبہ کریں اور اس پر خبردار کریں کہ جس کی کفالت کی ذمہ داری اس پر ہے' اس کی ضروریات زندگی کا خیال و لحاظ اور اس سے ملاطفت اور حسن سلوک کفیل کے واجبات اور اس کے آداب میں ہے۔ اس کو اہمیت نہ دینا' معمولی سمجھنا اور اسے ضائع کرنا اللہ کے ہاں کبیرہ گناہ ہے۔ جس کا اس کے ہاں مؤاخذہ ہو گا اور اس وجہ سے سزا و عذاب دیا جائے گا۔

۹۔ كِتَابُ الْجِنَايَاتِ

جنایات (جرائم) کے مسائل

(۹۹۳) عَنِ ابْنِ مَسْعُودٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «لاَ يَحِلُّ دَمُ امْرِىءٍ مُسْلِمٍ يَشْهَدُ أَنْ لاَ إِلَهَ إِلاَّ اللَّهُ، وَأَنِّي رَسُولُ اللهِ إِلاَّ بِإِحْدَى ثَلاَثٍ: الثَّيِّبُ الزَّانِي، وَالنَّفْسُ بِالنَّفْسِ، وَالتَّارِكُ لِدِينِهِ الْمُفَارِقُ لِلْجَمَاعَةِ». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "کسی مسلمان کا خون حلال نہیں ہے جو شہادت دیتا ہو کہ اللہ کے سوا اور کوئی معبود و الٰہ نہیں اور میں اللہ کا رسول ہوں مگر تین شخص اس سے مستثنیٰ ہیں۔ شادی شدہ زانی اور جان کے بدلہ میں جان اور اپنے دین کو چھوڑ کر مسلمانوں کی جماعت سے علیحدہ ہونے والا۔" (بخاری و مسلم)

لغوی تشریح: ﴿كتاب الجنايات﴾ جنایات کے جیم کے نیچے کسرہ۔ جنایۃ کی جمع ہے۔ جنایہ کہتے ہیں جرم وگناہ کے ارتکاب کو۔ اسے جمع اس لئے بیان کیا گیا ہے کہ جرائم کے مختلف اقسام وانواع ہیں۔ یہ جرم دیدہ دانستہ وعمداً بھی کیا جاتا ہے اور بھول وخطا اور نادانستگی میں بھی ہو سکتا ہے' یہ جرم اعضاء بدن واطراف جسم میں بھی ہو سکتا ہے اور نفس وجان میں بھی۔ ﴿الثيب﴾ شادی شدہ' جس کی بیوی ہو۔ ایسا آدمی جب زنا کا مرتکب ہوگا تو اسے سنگسار و رجم کیا جائے گا۔ ﴿النفس بالنفس﴾ ایسے آدمی کا بطور قصاص قتل کرنا کہ جس نے دشمن کے طور پر کسی کو قتل کیا ہو اور یہ خون کا بدلہ لینے والے کے ساتھ مخصوص ہے۔ ﴿التارك لدينه﴾ تارک دین سے مراد مرتد آدمی ہے جو قبول اسلام کے بعد پھر گیا ہو۔ ﴿المفارق للجماعة﴾ مسلمانوں کی جماعت سے فارغ ہونے والا۔

(۹۹۴) وَعَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهَا، عَنْ رَسُولِ اللهِ ﷺ قَالَ: «لاَ يَحِلُّ قَتْلُ مُسْلِمٍ إِلاَّ فِي

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "کسی مسلمان آدمی کا قتل حلال و جائز نہیں بجز تین صورتوں میں سے کسی ایک کے۔ شادی

إِحْدَى ثَلَاثِ خِصَالٍ: زَانٍ مُحْصَنٌ فَيُرْجَمُ، وَرَجُلٌ يَقْتُلُ مُسْلِماً مُتَعَمِّداً فَيُقْتَلُ، وَرَجُلٌ يَخْرُجُ مِنَ الإِسْلَامِ، فَيُحَارِبُ اللَّهَ وَرَسُولَهُ، فَيُقْتَلُ، أَوْ يُصْلَبُ، أَوْ يُنْفَى مِنَ الأَرْضِ». رَوَاهُ أَبُو دَاوُدَ وَالنَّسَائِيُّ، وَصَحَّحَهُ الحَاكِمُ.

شدہ زانی' پس اسے سنگسار کیا جائے اور وہ آدمی جو دیدہ و دانستہ کسی مسلمان بھائی کو قتل کرے پس اسے قتل کیا جائے گا اور ایک وہ آدمی جو دائرۂ اسلام سے خارج ہو جائے اور اللہ اور اس کے رسول سے (لڑائی) شروع کر دے۔ پس اسے قتل کیا جائے گا یا سولی دی جائے گی یا اسے جلا وطن کیا جائے گا۔" (اسے ابوداؤد اور نسائی نے روایت کیا ہے اور حاکم نے اسے صحیح کہا ہے)

لغوی تشریح: ﴿ فیقتل ﴾ تینوں افعال صیغۂ مجہول ہیں اور نفی من الارض سے مراد جلاوطنی ہے۔ یہ سزا ہر ایک مرتد کیلئے نہیں ہے بلکہ اس مرتد کیلئے ہے جو مرتد ہونے کے بعد عملاً لڑائی شروع کر دے جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے انما جزاء الذين يحاربون الله ورسوله ويسعون في الارض فسادا ان يقتلون اويصلبوا اوتقطع ايديهم وارجلهم من خلاف او ينفوا من الارض (۵ : ۳۳) جو لوگ اللہ اور اس کے رسول سے محاربہ (لڑائی) کرتے ہیں اور زمین میں فساد کی سعی و کوشش کرتے ہیں ان کی سزا یہ ہے کہ ان کو قتل کیا جائے یا پھانسی دی جائے یا ان کے ہاتھ اور پاؤں مخالف سمتوں سے کاٹے جائیں یا جلا وطن کئے جائیں۔ رہا وہ مرتد جو ارتداد کے بعد محاربہ نہیں کرتا اسے صرف سزائے قتل ہی دی جائے گی۔

(۹۹۵) وَعَنْ عَبْدِاللهِ بْنِ مَسْعُودٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: أَوَّلُ مَا يُقْضَى بَيْنَ النَّاسِ، يَوْمَ القِيَامَةِ، فِي الدِّمَاءِ». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "قیامت کے روز لوگوں کے درمیان سب سے پہلے جن مقدمات کا فیصلہ کیا جائے گا وہ خون کے مقدمات ہوں گے۔" (بخاری و مسلم)

لغوی تشریح: ﴿ فی الدماء ﴾ دم کی جمع ہے اور جار (حرف جر) ان کی خبر ہے۔ یہ حدیث آپ ؐ کے ارشاد اول ﴿ ما یحاسب به العبد صلاته ﴾ کہ سب سے پہلے نماز کے بارے میں محاسبہ ہو گا' کے معارض نہیں ہے اس لئے کہ یہ اللہ کا حق ہے اور پہلا اس سے متعلق ہے جو بندوں کے درمیان ہے کیونکہ یہ محاسبہ کے متعلق ہے۔ پہلے کا تعلق حکم اور قضا سے ہے اور محاسبہ تو حکم سے پہلے ہوتا ہے پس پہلا درحقیقت نماز ہے۔

(۹۹۶) وَعَنْ سَمُرَةَ رَضِيَ اللَّهُ

حضرت سمرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ

تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «مَنْ قَتَلَ عَبْدَهُ قَتَلْنَاهُ، وَمَنْ جَدَعَ عَبْدَهُ جَدَعْنَاهُ». رَوَاهُ أَحْمَدُ وَالأَرْبَعَةُ، وَحَسَّنَهُ التِّرْمِذِيُّ، وَهُوَ مِنْ رِوَايَةِ الحَسَنِ البَصْرِيِّ عَنْ سَمُرَةَ، وَقَدِ اخْتُلِفَ فِيْ سَمَاعِهِ مِنْهُ.

وَفِيْ رِوَايَةِ أَبِيْ دَاوُدَ وَالنَّسَآئِيِّ: «وَمَنْ خَصٰى عَبْدَهُ خَصَيْنَاهُ». وَصَحَّحَ الحَاكِمُ هٰذِهِ الزِّيَادَةَ.

ﷺ نے فرمایا ”جس مالک نے اپنے غلام کو قتل کیا ہم اسے قتل کریں گے اور جس نے اس کا ناک' کان کاٹا ہم اس کا ناک' کان کاٹ دیں گے۔“ (اسے احمد اور چاروں نے روایت کیا ہے اور ترمذی نے اسے حسن کہا ہے۔ یہ سمرہ سے حسن بصری کی روایت ہے اور سمرہ سے حسن بصری کے سماع میں اختلاف ہے) اور ابوداؤد اور نسائی کی روایت میں ہے کہ ”جس مالک نے اپنے غلام کو خصی کیا ہم اسے خصی کر دیں گے۔“ (اس اضافہ کو حاکم نے صحیح قرار دیا ہے)

لغوی تشریح: ﴿ جدع عبده ﴾ جس مالک نے اپنے غلام کے کان' ناک' ہونٹ وغیرہ کاٹے۔ جدع دراصل ناک کاٹنے سے مخصوص ہے۔ ﴿ خصی عبده ﴾ جس مالک نے اپنے غلام کے خصیے کھینچ کر نکال دیئے اور کاٹ دیئے۔ یہ حدیث دلیل ہے کہ مالک و آقا سے غلام کے جسم اور اعضاء کا قصاص لیا جائے گا۔ البتہ اس میں فقہاء کا اختلاف ہے' ایک قول تو یہ ہے کہ آزاد کو غلام کے بدلہ میں مطلقاً قتل کیا جائے۔ اس میں کوئی فرق و امتیاز نہیں کہ غلام اس کا اپنا ہو یا دوسرے کا۔ یہ اس حدیث پر عمل کرنے کیلئے کیا جائے گا اور ایک قول یہ ہے کہ اس صورت میں قتل کیا جائے گا جبکہ غلام دوسرے کا ہو' جب اپنا غلام ہو تو اس صورت میں قتل نہیں کیا جائے گا اور ایک قول یہ ہے کہ اسے مطلقاً قتل نہیں کیا جائے گا۔ یہ آخری قول امام احمد رحمۃ اللہ علیہ' امام مالک رحمۃ اللہ علیہ' امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ اور حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ وغیرھم کا ہے۔ ان کا استدلال اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد سے ہے۔ کتب علیکم القصاص فی القتلی' الحر بالحر والعبد بالعبد (۲: ۱۷۸) انہوں نے کہا ہے۔ حدیث میں حسن بصری اور سمرہ سے انقطاع کے باوجود تاویل کی جائے گی بایں معنی کہ آپ ؐ کے ارشاد قتلناہ کا معنی اسی طرح کی سزا ہم اسے دیں گے اور جس برے طریقہ سے اس نے کیا اسی طرح ہم اس سے بدلہ لیں گے۔ اس میں لفظ قتل بطور مشاکلت استعمال ہوا ہے جیسا اللہ تعالیٰ کے ارشاد میں ہے۔ جزاء سیئۃ سیئۃ مثلھا (۴۲ : ۴۰) اس جگہ سیئت کا دوبارہ لانا بطور مشاکلت ہے۔ اسی طرح کلام رسول ﷺ میں بھی لفظ قتل بطور مشاکلت ہے۔ اس طرح عبارت بیان کرنے کا فائدہ زجر و توبیخ اور ڈرانا دھمکانا ہے۔ رہا یہ معاملہ کہ آزاد مرد کے عضو غلام کے عضو کاٹنے کے بدلہ میں کاٹا جائے تو عام اہل علم کی رائے تو یہی ہے کہ آزاد کا عضو غلام کے عضو کے بدلہ میں نہ کاٹا جائے۔ ان کے قول کا مقتضیٰ یہ ہے کہ اس حدیث کو انہوں نے زجر و توبیخ پر محمول کیا ہے۔

(۹۹۷) وَعَنْ عُمَرَ بْنِ الخَطَّابِ حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے رسول

رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُ، قَالَ: سَمِعْتُ رَسُولَ اللهِ ﷺ يَقُولُ: «**لاَ يُقَادُ الوَالِدُ بِالوَلَدِ**». رَوَاهُ أَحْمَدُ وَالتِّرْمِذِيُّ وَابْنُ مَاجَهْ، وَصَحَّحَهُ ابْنُ الجَارُودِ وَالبَيْهَقِيُّ، وَقَالَ التِّرْمِذِيُّ: إِنَّهُ مُضْطَرِبٌ.

اللہ ﷺ سے سنا کہ "**باپ سے بیٹے کا قصاص نہیں لیا جائے گا۔**" (اسے احمد' ترمذی اور ابن ماجہ نے روایت کیا ہے اور ابن جارود اور بیہقی نے صحیح قرار دیا ہے اور ترمذی نے کہا ہے کہ اس حدیث میں اضطراب ہے۔)

لغوی تشریح: ﴿ لا يقاد الوالد بالولد ﴾ یقاد قود سے ماخوذ ہے جس کے معنی قصاص کے ہیں اور قصاص کہتے ہیں مقتول کے بدلہ قاتل کو قتل کرنا۔ اس حدیث کے معنی یہ ہیں کہ ایک آدمی نے جب اپنے بیٹے کو قتل کر دیا تو اس کے بدلہ میں باپ کو قتل نہیں کیا جائے گا۔ اکثر سلف کی یہی رائے ہے کہ قصاص سے بدلہ میں باپ سے دیت وصول کی جائے گی۔

حاصل کلام: اس حدیث کی رو سے باپ کو بیٹے کے قصاص میں قتل نہیں کیا جائے گا۔ باپ کو قتل نہ کئے جانے کی وجہ یہ ہے کہ باپ بیٹے کے وجود کا سبب ہے اور بیٹا باپ کے وجود کا سبب نہیں' اس لئے بیٹا باپ کو معدوم کرنے کا حق نہیں رکھتا۔ نیز عموماً باپ کی طبیعت سے یہ بعید ہے کہ اپنے لخت جگر کو جان بوجھ کر قتل کرے۔ اگر اس سے اس گناہ و جرم کا ارتکاب ہوگا تو نادانستگی اور خطا کے طور پر ہوگا اور خطا کی صورت میں قتل میں قصاص نہیں ہوتا' دیت ہوتی ہے۔ البتہ امام مالک رحمہ اللہ کی رائے یہ ہے کہ اگر باپ بیٹے کو لٹا کر جانور کی طرح ذبح کرے تو اس صورت میں باپ سے قصاص لیا جائے گا۔ غالباً امام مالک رحمہ اللہ کے نزدیک ایسی صورت میں خطا کا احتمال نہیں رہتا۔

ترمذی رحمہ اللہ نے اس حدیث کو مضطرب کہا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کی سند میں مثنی بن صباح ہے۔ امام شافعی رحمہ اللہ کے نزدیک اس حدیث کے تمام طرق میں انقطاع ہے۔ مگر علامہ ابن حجر رحمہ اللہ نے اپنی کتاب تلخیص میں تصریح کی ہے کہ بیہقی کی روایت کے جملہ راوی ثقہ ہیں۔ لہٰذا یہ روایت صحیح ہے۔

(٩٩٨) وَعَنْ أَبِي جُحَيْفَةَ قَالَ: قُلْتُ لِعَلِيٍّ: هَلْ عِنْدَكُمْ شَيْءٌ مِّنَ الوَحْيِ، غَيْرَ القُرْآنِ؟ قَالَ: لاَ، وَالَّذِي فَلَقَ الحَبَّةَ، وَبَرَأَ النَّسَمَةَ، إِلاَّ فَهْمٌ يُعْطِيهِ اللّٰهُ تَعَالَى رَجُلاً فِي القُرْآنِ، وَمَا فِي هٰذِهِ الصَّحِيفَةِ، قُلْتُ: وَمَا فِي هٰذِهِ الصَّحِيفَةِ؟ قَالَ: اَلْعَقْلُ، وَفِكَاكُ الأَسِيرِ، وَأَنْ لاَ

حضرت ابوجحیفہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے دریافت کیا: کیا آپ لوگوں کے پاس قرآن کے علاوہ وحی کے ذریعہ نازل شدہ کوئی اور چیز بھی ہے؟ انہوں نے جواب دیا۔ اس ذات کی قسم! جس نے دانا و غلہ اگایا اور جان کو پیدا فرمایا سوائے اس فہم کے جسے اللہ تعالیٰ کسی انسان کو قرآن کے بارے میں عطا فرماتا ہے اور جو کچھ اس صحیفہ میں تحریر ہے (میرے پاس کچھ نہیں) میں نے سوال

وَأَخْرَجَهُ أَحْمَدُ وَأَبُو دَاوُدَ وَالنَّسَآئِيُّ مِنْ وَجْهٍ آخَرَ عَنْ عَلِيٍّ، وَقَالَ فِيْهِ: «اَلْمُؤْمِنُوْنَ تَتَكَافَأُ دِمَآؤُهُمْ، وَيَسْعٰى بِذِمَّتِهِمْ أَدْنَاهُمْ، وَهُمْ يَدٌ عَلىٰ مَنْ سِوَاهُمْ، وَلاَ يُقْتَلُ مُؤْمِنٌ بِكَافِرٍ، وَلا ذُوْ عَهْدٍ فِيْ عَهْدِهِ». صَحَّحَهُ الحَاكِمُ.

کیا کہ اس صحیفہ میں کیا ہے؟ انہوں نے بتایا کہ دیت کے احکام' قیدی کو آزاد کرنے کا حکم اور یہ کہ کسی مسلمان کو کافر کے بدلہ میں قتل نہیں کیا جائے گا۔ (بخاری) حضرت علی رضی اللہ عنہ کی اس روایت کو احمد' ابوداؤد اور نسائی نے ایک دوسری سند سے بیان کیا ہے اور اس میں ہے کہ ''سب مومنوں کے خون برابر ہیں اور ان میں سے ادنیٰ آدمی کی ذمہ داری کی حیثیت بڑے آدمی کے برابر ہے اور اپنے سوا وہ غیر مسلموں کے مقابلہ میں سب ایک دوسرے کے ساتھ متحد ہیں اور کوئی مومن کسی کافر کے عوض قتل نہیں کیا جائے گا اور نہ کسی معاہد (ذمی) کو اس کے زمانہ عہد میں قتل کیا جا سکتا ہے۔'' (اس روایت کو حاکم نے صحیح قرار دیا ہے)

لغوی تشریح: ﴿ هل عندكم شئی الخ ﴾ اس جملہ میں ﴿ کم ﴾ کی ضمیر جمع تعظیم کے طور پر لائی گئی ہے یا پھر یہ مراد ہو سکتا ہے کہ اس سے مراد سارے اہل بیت ہوں جن کے حضرت علی رضی اللہ عنہ سردار تھے۔ حضرت ابوجحیفہ رضی اللہ عنہ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے یہ سوال اس لئے کیا تھا کہ شیعہ کی ایک جماعت کا یہ خیال تھا کہ اہل بیت کے پاس بالخصوص حضرت علی رضی اللہ عنہ کے پاس وحی کے ذریعہ بھیجی ہوئی ایسی اشیاء ہیں جن کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اہل بیت کیلئے مخصوص قرار دیا ہے ان کے ماسوا دوسرے کسی کو ان کا علم نہیں ہے جیسا کہ مصنف رحمۃ اللہ علیہ نے فتح الباری میں کہا ہے۔ ﴿ والذی ﴾ اس میں ''واؤ'' قسم کیلئے ہے۔ ﴿ فلق الحبۃ ﴾ جس سے پھاڑ کر دانا نکالا اور اس میں سے بنا پودا اور اس کی شاخیں نکلیں۔ ﴿ وبرا النسمۃ ﴾ نسمۃ نون اور سین دونوں پر فتحہ۔ جس نے جان کو پیدا فرمایا۔ ہر چوپایہ جو جاندار ہے وہ نسمۃ میں داخل ہے۔ ﴿ الافھم ﴾ لفظ شئی سے یہ استثناء ہے اور ''لا'' کے قول میں مقدر ہے کہ ہمارے پاس کوئی چیز نہیں بجز فہم کے جو اس نے ہمیں قرآن کے متعلق عطا فرمایا ہے۔ یہ بدل ہونے کی وجہ سے مرفوع ہے۔ ﴿ وما فی ھذہ الصحیفۃ ﴾ اس میں ما موصولہ ہے اور فہم پر عطف ہے اور صحیفہ کے معنی تحریر شدہ ورق۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے جواب کا ماحصل یہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو علم دین کے سلسلہ میں لوگوں کو نظر انداز کر کے کوئی خاص چیز نہیں دی۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ اور دوسرے لوگوں کے درمیان اتنا بڑا علمی تفاوت و فرق جو وقوع پذیر ہوا ہے وہ صرف اس فہم و تدبر فی القرآن کی وجہ سے ہوا جو ان کو عطا ہوا

ہے۔ نیز اس وجہ سے کہ استنباط کے مواھب و عطایا مختلف ہیں۔ صحیفہ کو مستثنیٰ احتیاط کے طور پر کیا ہے کہ ممکن ہے کہ کسی کے خیال میں آئے کہ اس میں ایسی کوئی چیز ہے جو دوسرے لوگوں کے علم میں نہیں یا پھر اس لئے اس کا استثنا کیا ہے کہ اگر حضرت علی رضی اللہ عنہ کے پاس کوئی چیز بالخصوص ہوتی تو اس صحیفہ میں ہوتی مگر اس میں ایسی کوئی چیز نہیں جو لوگوں کے پاس نہ ہو اور بالخصوص حضرت علی رضی اللہ عنہ کے پاس ہو۔ یہ تخصیص کا بلیغ ترین انداز بیان ہے۔ ﴿العقل﴾ دیت۔ مطلب یہ ہے کہ اس صحیفہ میں دیت کے احکام اور ان کی تفصیلات ہیں ﴿وفکاك الاسیر﴾ "فا" پر فتحہ اور کسرہ دونوں جائز ہیں۔ اس صحیفہ میں غلام کو آزاد کرنے کا حکم ہے اور آزاد کرنے کی ترغیب ہے۔ ﴿وان لی یقتل مسلم بکافر﴾ کافر خواہ حربی ہو یا ذمی۔ اس کے بدلے میں مسلمان قتل نہیں کیا جائے گا۔ اکثر اہل علم کی رائے یہی ہے جس میں امام مالک رحمۃ اللہ علیہ' امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ اور امام احمد رحمۃ اللہ علیہ وغیرھم شامل ہیں مگر حنفیہ کہتے ہیں کہ کافر اگر ذمی ہوگا تو قتل کیا جائے گا مگر اس دعویٰ پر کوئی قابل اعتماد دلیل نہیں۔ پہلا مذہب ہی درست ہے۔ ﴿تتکافا دماوھم﴾ دیت اور قصاص کے سلسلہ میں ان کے خون مساوی حیثیت رکھتے ہیں۔ شریف سے کمیں کا قصاص و دیت لی جائے گی۔ بڑے سے چھوٹے کی' عالم سے جاہل کی اور عورت کی مرد سے اور اس کے برعکس تمام اصناف میں۔ یہ اس کا تقاضا کرتا ہے کہ مسلمان کو کافر کے بدلہ میں قتل نہیں کیا جائے گا کیونکہ ان دونوں کے خون برابر و مساوی نہیں ہیں۔ ﴿ویسعی بذمتھم ادناھم﴾ ذمہ کے معنی امان ہے۔ اس عبارت کا معنی یہ ہے کہ مسلمانوں میں سے جب کوئی مسلمان کسی کافر کو امان دے دے تو اس کافر کا خون بہانا تمام مسلمانوں پر حرام ہے۔ خواہ پناہ دینے والا آدمی مسلمانوں میں سے حقیر ترین آدمی ہی کیوں نہ ہو۔ مثلاً غلام ہو' ملازم ہو یا عورت ہو۔ ﴿وھم یدعلی من سواھم﴾ وہ مسلمان اپنے غیر کے مقابلہ میں سب اکٹھے ہیں یعنی اپنے دشمن کے مقابلہ میں مجتمع ہیں۔ لہٰذا مسلمانوں کیلئے حلال نہیں ہے کہ وہ ایک دوسرے کو رسوا کریں اور نظرانداز کریں اور اسے اپنے دشمن کے سپرد کر دیں اور اسے دشمن کے چنگل سے چھڑانے کی کوشش نہ کریں۔ بلکہ ان پر ایک دوسرے کی ضمانت دینا واجب ہے۔ ایک دوسرے سے باہمی تعاون کرنا' دنیا کی تمام اقوام و ملل اور ادیان کے مقابلہ میں جہاں کہیں وہ ہوں سیسہ پلائی دیوار ہوں' اس سے اسلامی ممالک و ولایات میں کفار کی کسی عہدے میں سرداری ناجائز قرار پاتی ہے کیونکہ سربراہ کا ہاتھ اپنی رعایا پر ہوتا ہے۔ ﴿ولا ذوعھد فی عھدہ﴾ ذمی جب تک اپنے عہد پر قائم رہے اور اسے نہ توڑے اس کا قتل حلال نہیں۔

(۹۹۹) وَعَنْ أَنَسِ بْنِ مَالِكٍ، رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُ أَنَّ جَارِيَةً وُجِدَ رَأْسُهَا قَدْ رُضَّ بَيْنَ حَجَرَيْنِ، فَسَأَلُوهَا، مَنْ صَنَعَ بِكِ هٰذا؟ فُلَانٌ؟

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک لونڈی ایسی حالت میں پائی گئی کہ اس کا سر دو پتھروں کے درمیان رکھ کر کچل دیا گیا تھا۔ صحابہ رضی اللہ عنہم نے اس سے دریافت کیا کہ تمہارے ساتھ ایسا کس نے کیا

فُلَانٌ؟ حَتَّى ذَكَرُوا يَهُودِيًّا فَأَوْمَأَتْ بِرَأْسِهَا، فَأُخِذَ اليَهُودِيُّ، فَأَقَرَّ، فَأَمَرَ رَسُولُ اللهِ ﷺ أَنْ يُرَضَّ رَأْسُهُ بَيْنَ حَجَرَيْنِ. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ، وَاللَّفْظُ لِمُسْلِمٍ.

ہے؟ پھر خود ہی کہا کہ فلاں نے فلاں نے' اس طرح نام لیتے ہوئے ایک یہودی کے نام پر پہنچے تو اس نے سر کے اشارہ سے کہا۔ ہاں! یہودی گرفتار کر لیا گیا۔ اس نے اس جرم کا اقرار کیا تو رسول اللہ ﷺ نے حکم دیا کہ "اس کا سر بھی دو پتھروں کے درمیان رکھ کر کچل دیا جائے۔" (بخاری و مسلم' یہ الفاظ مسلم میں ہیں)

لغوی تشریح: ﴿ رض ﴾ صیغۂ مجہول اور یہ رض سے ماخوذ ہے اور ﴿ رض ﴾ کہتے ہیں کچلنے اور توڑنے کو۔ ﴿ فاومات ﴾ اشارہ کیا اور اس حدیث میں دلیل ہے کہ مقتول کا قصاص بھاری چیزوں پتھروں وغیرہ سے لینا درست ہے۔ صرف لوہے کی چیزوں کے ساتھ قصاص لینا مخصوص نہیں۔ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے سوا باقی ائمہ متبوعین کا یہی مذہب ہے اور حدیث سے یہ بھی ثابت ہوا کہ مرد کو عورت کے بدلے میں قتل کیا جائے گا اور یہ کہ قاتل کو اسی طرح قتل کیا جائے گا جس طرح مقتول کو قتل کیا گیا۔

(١٠٠٠) وَعَنْ عِمْرَانَ بْنِ حُصَيْنٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُما أَنَّ غُلاماً لِأُنَاسٍ فُقَرَآءَ قَطَعَ أُذُنَ غُلامٍ لِأُنَاسٍ أَغْنِيَآءَ، فَأَتَوُا النَّبِيَّ ﷺ فَلَمْ يَجْعَلْ لَهُمْ شَيْئاً. رَوَاهُ أَحْمَدُ وَالثَّلاَثَةُ بِإِسْنَادٍ صَحِيحٍ.

حضرت عمران بن حصین رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ فقراء لوگوں کے ایک غلام نے امراء لوگوں کے غلام کا کان کاٹ لیا تو یہ لوگ نبی ﷺ کے پاس آئے تو آپؐ نے ان کیلئے کوئی چیز مقرر نہ فرمائی۔ (اسے احمد اور تینوں نے صحیح سند سے روایت کیا ہے)

لغوی تشریح: اس حدیث کے مفہوم میں اختلاف ہے۔ امام نسائی رحمۃ اللہ علیہ نے ﴿ سقوط القود بین المالیک فیما دون النفس ﴾ کا عنوان قائم کیا ہے کہ غلام کے مابین قتل کے علاوہ کسی جرم میں بدلہ نہیں اور خطابی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے اس کے معنی یہ ہیں کہ جرم کا مرتکب لڑکا آزاد تھا اور اس کا جرم خطا تھا اور اس کے عاقلہ فقراء تھے اور عاقلہ کی خیر خواہی ان کی طاقت و وسعت کے اعتبار سے ہے۔ ان میں سے کسی فقیر و محتاج پر کوئی چیز نہیں اور رہا غلام یعنی مملوک لڑکا تو جب وہ جرم کا ارتکاب کرے گا تو عام اہل علم کے قول کے مطابق اس کے جرم کی سزا اسی کی گردن پر ہے۔ المنتقی میں امام ابن تیمیہؒ کے دادا نے کہا کہ عاقلہ فقیر ہوں تو ان پر ذمہ داری ختم ہو جاتی ہے اور اس صورت میں قاتل سے بھی مؤاخذہ نہیں کیا جائے گا۔

(١٠٠١) وَعَنْ عَمْرِو بْنِ

حضرت عمرو بن شعیب نے اپنے والد اور انہوں نے

شُعَيبٍ، عَنْ أَبِيْهِ، عَنْ جَدِّهِ، أَنَّ رَجُلاً طَعَنَ رَجُلاً بِقَرْنٍ، فِيْ رُكْبَتِهِ، فَجآءَ إِلَى النَّبِيِّ ﷺ، فَقَالَ: أَقِدْنِيْ، فَقَالَ: حَتَّى تَبْرَأَ، ثُمَّ جآءَ إِلَيْهِ، فَقَالَ: أَقِدْنِيْ، فَأَقَادَهُ، ثُمَّ جآءَ إِلَيْهِ، فَقَالَ؛ يَا رَسُولَ اللهِ! عَرَجْتُ، فَقَالَ: **قَدْ نَهَيْتُكَ فَعَصَيْتَنِيْ، فَأَبْعَدَكَ اللّٰهُ، وَبَطَلَ عَرَجُكَ**، ثُمَّ نَهَى رَسُولُ اللهِ ﷺ أَنْ يُقْتَصَّ مِنْ جُرْحٍ حَتَّى يَبْرَأَ صَاحِبُهُ. رَوَاهُ أَحْمَدُ وَالدَّارَقُطْنِيُّ، وَأُعِلَّ بِالإِرْسَالِ.

اپنے دادا سے روایت کیا ہے کہ ایک شخص نے دوسرے کے گھٹنے میں سینگ چبھو دیا تو وہ نبی ﷺ کے پاس آیا اور عرض کیا مجھے اس سے قصاص لے کر دیں۔ آپؐ نے فرمایا ”زخم مندمل ہونے کے بعد آنا۔“ وہ پھر آپؐ کے پاس آیا اور بولا مجھے قصاص دلوائیے۔ آپؐ نے اسے قصاص دلوا دیا۔ اس کے بعد پھر آیا اور کہنے لگا اے اللہ کے رسول ﷺ میں لنگڑا ہوگیا ہوں۔ آپؐ نے فرمایا ”میں نے تجھے منع کیا تھا لیکن تو نے میری بات نہ مانی۔ اللہ تعالیٰ نے تجھے دور کر دیا اور تیرے لنگڑے پن کو باطل کر دیا۔“ پھر آپؐ نے ارشاد فرمایا کہ ”زخموں کا قصاص اس وقت تک لینا ممنوع ہے کہ جب تک زخمی آدمی صحت مند و تندرست نہ ہو جائے۔“ (اس روایت کو احمد اور دارقطنی نے روایت کیا ہے اور اسے مرسل ہونے کی وجہ سے معلول کہا ہے)

لغوی تشریح: ﴿ طعن ﴾ ماضی کا صیغہ ہے اور طعن جس کے معنی نیزہ وغیرہ سے مارنا کے ہیں۔ ﴿ اقدنی ﴾ اقادۃ سے امر کا صیغہ ہے یعنی مجھے قصاص دلوائیے یا حصول قصاص میں میرے لئے آسانی کریں۔ ﴿ حتی تبرا ﴾ یہاں تک کہ تو اس بیماری سے صحت یاب ہو جائے۔ ﴿ عرجت ﴾ ”را“ پر فتحہ۔ لنگڑا ہوگیا ہوں۔ یہ حدیث دلیل ہے کہ قصاص لینے میں زخموں کے مندمل ہونے تک تاخیر کرنی چاہئے۔

حاصل کلام: اس حدیث کی رو سے زخموں کی دیت اس وقت لی جانی چاہئے جب زخم مندمل ہو جائیں اور زخمی صحت یاب ہو جائے۔ ائمہ ثلاثہ امام مالک رحمہ اللہ، امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ اور امام احمد رحمہ اللہ کے نزدیک یہ انتظار کرنا واجب ہے اور امام شافعی رحمہ اللہ اسے مستحب کہتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ عین ممکن ہے زخم خراب صورت اختیار کر لے اور اسی بنا پر وہ عضو ضائع ہو جائے اور ان دونوں صورتوں میں دیت الگ الگ ہے۔ مذکورہ بالا واقعہ میں اس آدمی نے بے صبری اور عجلت سے کام لیا اور حضور ﷺ کی ہدایت پر عمل نہ کیا تو اسے صرف پانچ اونٹ ملے۔ مگر جب وہ خرابی زخم کی وجہ سے لنگڑا ہوگیا تو اس وقت اسے پچاس اونٹ ملتے۔ بے صبری اور عجلت پسندی اور رسول اللہ ﷺ کے فرمان پر عدم توجہ کے نتیجہ میں صرف پانچ اونٹوں پر اکتفا کرنا پڑا۔

(١٠٠٢) وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، قَالَ: اقْتَتَلَتِ امْرَأَتَانِ مِنْ هُذَيْلٍ، فَرَمَتْ إِحْدَاهُمَا الأُخْرَى بِحَجَرٍ، فَقَتَلَتْهَا وَمَا فِي بَطْنِهَا، فَاخْتَصَمُوا إِلَى رَسُولِ اللهِ ﷺ، فَقَضَى رَسُولُ اللهِ ﷺ أَنَّ دِيَةَ جَنِينِهَا غُرَّةٌ: عَبْدٌ أَوْ وَلِيدَةٌ، وَقَضَى بِدِيَةِ الْمَرْأَةِ عَلَى عَاقِلَتِهَا، وَوَرَّثَهَا وَلَدَهَا وَمَنْ مَعَهُمْ، فَقَالَ حَمَلُ بْنُ النَّابِغَةِ الْهُذَلِيُّ: يَا رَسُولَ اللهِ! كَيْفَ نَغْرَمُ مَن لاَّ شَرِبَ وَلاَ أَكَلَ؟ وَلاَ نَطَقَ وَلاَ اسْتَهَلَّ؟ فَمِثْلُ ذٰلِكَ يُطَلُّ، فَقَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «**إِنَّمَا هَذَا مِنْ إِخْوَانِ الْكُهَّانِ، مِنْ أَجْلِ سَجْعِهِ الَّذِي سَجَعَ**». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ہذیل قبیلہ کی دو عورتیں آپس میں لڑ پڑیں اور ایک نے دوسری پر پتھر دے مارا۔ اس پتھر سے وہ عورت اور اس کے پیٹ کا بچہ مرگیا تو اس کے وارث مقدمہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی عدالت میں لائے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فیصلہ فرمایا کہ "جنین کے بدلہ ایک لونڈی یا غلام ہے اور عورت کے بدلہ قاتل کے وارثوں پر دیت عائد فرما دی اور اس خون بہا کا وارث اس کی اولاد کو بنایا اور ان وارثوں کو بھی جو ان کے ساتھ تھے۔" حمل بن نابغہ ھذلی رضی اللہ عنہ نے کہا۔ اے اللہ کے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم)! ہم ایسے بچہ کا بدلہ کیسے دیں جس نے نہ پیا، نہ کھایا نہ بولا اور نہ چیخا۔ اس طرح کا حکم تو قابل اعتبار نہیں۔ آپ ؐ نے فرمایا "یہ تو کاہنوں کا بھائی معلوم ہوتا ہے کیونکہ اس نے تو کاہنوں کی سی قافیہ بندی کی ہے۔" (بخاری و مسلم)

وَأَخْرَجَهُ أَبُو دَاوُدَ وَالنَّسَائِيُّ مِنْ حَدِيثِ ابْنِ عَبَّاسٍ، أَنَّ عُمَرَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، سَأَلَ مَنْ شَهِدَ قَضَاءَ رَسُولِ اللهِ ﷺ فِي الْجَنِينِ قَالَ: فَقَامَ حَمَلُ بْنُ النَّابِغَةِ، فَقَالَ: كُنْتُ بَيْنَ امْرَأَتَيْنِ، فَضَرَبَتْ إِحْدَاهُمَا الأُخْرَى، فَذَكَرَهُ مُخْتَصَراً وَصَحَّحَهُ ابْنُ حِبَّانَ وَالْحَاكِمُ.

ابوداؤد اور نسائی نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے پوچھا کہ کون شخص جنین کے بارے میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے فیصلہ کے موقع پر حاضر تھا؟ ابن عباس رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ حمل بن نابغہ کھڑا ہوا اور بیان کیا کہ میں اس وقت ان دو عورتوں کے درمیان تھا، جب ایک نے دوسری کو پتھر دے مارا تھا، پھر مختصر حدیث کا ذکر کیا۔ (ابن حبان اور حاکم نے اسے صحیح کہا ہے)

لغوی تشریح: ﴿ امرتان من هذيل ﴾ یہ دونوں عورتیں سوکنیں تھیں اور دونوں حمل بن مالک بن نابغہ ھذلی کے نکاح میں تھیں اور ﴿ جنين ﴾ عورت کا وہ حمل جو اس کے رحم میں ہو۔ ﴿ غرة ﴾ غین پر

ضمہ "را" پر تشدید اور تنوین ﴿ عبد اوولیدۃ ﴾ یہ غرۃ کا بیان ہے غرۃ دراصل اس سفیدی کو کہتے ہیں جو گھوڑے کے چہرے پر ہوتی ہے اور ولیدۃ کے معنی لونڈی ہے۔ "اوَ" تقسیم کیلئے ہے شک و تردد کیلئے نہیں۔ ﴿ وقضی بدیۃ المراۃ علی عاقلتھا ﴾ یعنی قاتل عورت کی دیت اس کے عاقلہ پر ڈال دی۔ اس کے شوہر پر نہیں ڈالی۔ ﴿ وورثھا ﴾ توریث سے ماخوذ ہے یعنی دیت کا وارث بنایا۔ ﴿ ولدھا ﴾ مقتولہ عورت کی اولاد کو۔ ﴿ ومن معہ ﴾ ان ورثاء کو جو بیٹے کے ساتھ وارث ہوتے ہیں۔ اس کا معنی یہ ہے کہ دیت کو مقتولہ کے بچوں اور اس کے شوہر کی میراث قرار دیا۔ عاقلہ (پوری رشتہ دار) کیلئے نہیں اور ابوداؤد میں اس کی تصریح موجود ہے۔ اس میں ہے کہ مقتولہ کے عاقلہ (پوری رشتہ دار) نے عرض کیا اس کی میراث کے حق دار تو ہم ہیں تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "نہیں ایسا نہیں۔ اس کی میراث اس کے شوہر اور اس کی اولاد کا حق ہے۔" ﴿ کیف نغرم ﴾ "را" پر فتحہ۔ ہم کیسے ضمان دیں اور چٹی ادا کریں یعنی ہم دیت کیوں دیں۔ ﴿ من لاشرب الخ ﴾ یہ نغرم کا مفعول ہے۔ مقصود اس سے یہ تھا کہ وہ زندہ پیدا نہیں ہوا اور نہ اس میں زندگی کے آثار پائے گئے ہیں اور نہ اس نے پیدا ہونے کے وقت چیخ ماری۔ ﴿ استھلال ﴾ چیخ مارنا۔ مراد یہ تھا کہ وہ پیدائش کے وقت رویا بھی نہیں حالانکہ پیدائش کے وقت ہر بچہ روتا ہے۔ ﴿ فمثل ذلک یطل ﴾ یطل فعل مضارع ہے صیغہ مجہول ہے۔ مطلب یہ ہے کہ رائیگاں گیا اور ضمان قسم کی کوئی چیز نہیں رکھی جائے گی کیونکہ ضمان تو زندہ چیز کے ضائع کرنے میں ہے۔ ﴿ انما ھذا ﴾ یہ بات و گفتگو کرنے والا۔ ﴿ من اخوان الکھان ﴾ کھان کے کاف پر ضمہ اور "ھا" پر تشدید اور کاھن کی جمع ہے یعنی کاہن لوگ اپنی بے اصل اور مزین باتوں کو قافیہ بندی کے ذریعہ ترویج دیتے تھے۔ ان لوگوں کے ساتھ اسے تشبیہہ دینے سے اس شخص کی تردید مقصود تھی کیونکہ وہ مسجع و مقفع کلام کے ذریعہ وہ اس حق کا مقابلہ و معارضہ کرنا چاہتا تھا جسے نبی ﷺ نے ثابت کیا تھا اور مسجع کلام، مقفع قافیہ بند گفتگو کو کہتے ہیں۔ ﴿ کنت بین امراتین ﴾ اس سے اس کی مراد یہ تھی کہ وہ ان دونوں کا شوہر تھا۔

راوی حدیث: ﴿ حمل بن نابغہ رضی اللہ عنہ ﴾ حمل بن مالک بن نابغہ ھذلی صحابی ہیں۔ ابونضلہ ان کی کنیت تھی اور وہ بصرہ کے رہائشی تھے۔

(۱۰۰۳) وَعَنْ أَنَسٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، أَنَّ الرُّبَيِّعَ بِنْتَ النَّضْرِ - عَمَّتَهُ - كَسَرَتْ ثَنِيَّةَ جَارِيَةٍ، فَطَلَبُوا إِلَيْهَا العَفْوَ، فَأَبَوا، فَعَرَضُوا الأَرْشَ، فَأَبَوا، فَأَتَوا رَسُولَ اللهِ ﷺ، فَأَبَوا، إِلاَّ القِصَاصَ، فَأَمَرَ رَسُولُ اللهِ ﷺ بِالقِصَاصِ، فَقَالَ

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ان کی پھوپھی ربیع بنت نضر نے ایک انصاری لڑکی کے دانت توڑ دیئے۔ ربیع کے رشتہ داروں نے اس سے معافی طلب کی تو انہوں نے انکار کر دیا۔ پھر انہوں نے دیت دینے کی پیش کش کی۔ اسے بھی انہوں نے رد کر دیا اور رسول اللہ ﷺ کی عدالت میں آئے اور قصاص کا مطالبہ کیا اور قصاص کے سوا کسی بھی چیز کو

أَنَسُ بْنُ النَّضْرِ: يَا رَسُولَ اللهِ: أَتُكْسَرُ ثَنِيَّةُ الرُّبَيِّعِ؟ لاَ، وَالَّذِيْ بَعَثَكَ بِالحَقِّ، لاَ تُكْسَرُ ثَنِيَّتُهَا، فَقَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «يَا أَنَسُ! كِتَابُ اللهِ القِصَاصُ»، فَرَضِيَ القَوْمُ، فَعَفَوا، فَقَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «إِنَّ مِنْ عِبَادِ اللهِ مَنْ لَوْ أَقْسَمَ عَلَى اللهِ لأَبَرَّهُ». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ، وَاللَّفْظُ لِلْبُخَارِيِّ.

لینے سے انکار کر دیا تو رسول اللہ ﷺ نے قصاص کا فیصلہ فرما دیا۔ یہ سن کر حضرت انس بن نضر نے عرض کیا اے اللہ کے رسول ﷺ کیا ربیع کا دانت توڑا جائے گا؟ نہیں' اس ذات اقدس کی قسم جس نے آپؐ کو حق دے کر مبعوث فرمایا ہے اس کا دانت نہیں توڑا جائے گا۔ یہ سن کر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "اے انس! اللہ کا نوشتہ تو قصاص ہی ہے۔" اتنے میں وہ لوگ اس پر رضامند ہو گئے اور پھر معافی دے دی۔ پس رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "اللہ کے بندے ایسے بھی ہیں کہ اگر وہ اللہ کی قسم کھا لیتے ہیں تو اللہ تعالیٰ ان کی قسم کو پورا فرما دیتا ہے۔"

(بخاری و مسلم اور یہ الفاظ بخاری کے ہیں)

لغوی تشریح: ﴿عمته﴾ یہ بدل یا بیان ہے یعنی انس بن مالک رضی اللہ عنہ کی پھوپھی اور انس بن نضر کی بہن کی۔ ﴿ثنیۃ جاریۃ﴾ ثنیہ فعیلہ کے وزن پر ہے۔ اس کی جمع ثنایا آتی ہے یہ منہ کے اگلے دانتوں کو کہتے ہیں۔ دو دانت اوپر والے اور دو دانت نیچے والے۔ ﴿الارش﴾ کے معنی دیت۔ ﴿لا تکسر ثنیتھا﴾ اس کا دانت نہیں توڑا جائے گا۔ یہ بات انس رضی اللہ عنہ نے نبی ﷺ کے ارشاد گرامی کی تردید کیلئے نہیں کہی اور نہ آپؐ کے فرمان سے اعراض کے پیش نظر۔ یہ تو انہوں نے محض توقع اور اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم کی امید پر کہے کہ مخالف فریق کو اللہ تعالیٰ اس پر راضی فرما دے گا اور اس کے دل میں معافی کا جذبہ و داعیہ پیدا فرما دے گا اور وہ دیت لے کر قصاص کے حق سے دست بردار ہو جائے گا۔ ﴿کتاب اللہ القصاص﴾ کتاب اللہ مبتداء اور القصاص اس کی خبر ہے۔ یعنی کتاب اللہ میں اس قسم کے مقدمات میں قصاص کا حکم ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔ "السن بالسن والجروح قصاص" اس اصول کی بنیاد پر کہ سابقہ شرائع اس وقت تک ہماری شرائع ہیں تاوقتیکہ اس کے نسخ کا حکم وارد ہو یا اس ارشاد باری تعالیٰ کے مطابق وان عاقبتم فعاقبوا بمثل ماعوقبتم بہ (١٦:١٢٦) ﴿لابرہ﴾ اس میں لام تاکید کیلئے ہے قسم کے جواب میں۔ مطلب یہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ اس کی قسم توڑے بغیر پوری فرما دے گا۔

حاصل کلام: اس حدیث سے حضرت انس بن نضر کی فضیلت معلوم ہوئی کہ انہوں نے جو قسم کھائی اللہ نے اسے پورا فرما دیا۔ انہوں نے اللہ تعالیٰ پر بھرپور اعتماد اور مکمل بھروسے کی بنا پر قسم کھائی تھی جسے اللہ نے پورا کر دیا۔ نبی ﷺ کے ارشاد کی تردید اور اعراض مقصود نہ تھا۔ ایسا ہوتا تو ایک صحابی ارشاد نبوی کا نافرمان شمار ہوتا جو ایک صحابی کی شان کے کسی صورت لائق نہیں۔ نبی ﷺ کا ان کی تعریف فرمانا اس بات

کا کھلا ثبوت ہے ورنہ آپؐ نافرمان صحابی کی تعریف کیسے فرماتے۔

راوی حدیث: ﴿ ربیع بنت نضر رضی اللہ عنہا ﴾ "را" پر ضمہ با پر فتحہ اور "یا" پر کسرہ اور تشدید۔ یہ نضر بن ضمضم بن زید بن حرام کی بیٹی حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خادم خاص کی پھوپھی اور حارثہ بن سراقہ جو غزوۂ بدر میں جام شہادت نوش فرما کر خلد بریں کے مکین بن گئے تھے کی والدہ تھیں۔

﴿ انس بن نضر رضی اللہ عنہ ﴾ یہ حضرت ربیع کے بھائی اور انس بن مالک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خادم خاص کے چچا تھے۔ یہ غزوۂ بدر میں شریک نہ ہو سکے تھے۔ اس کا ان کو بڑا افسوس تھا۔ جنگ احد کے روز مشرکین کی صف کی جانب بڑھے' یہ معذرت اللہ کے حضور پیش کرتے ہوئے بڑھتے کہ مسلمانوں نے جو کردار ادا کیا ہے وہ ٹھیک نہیں اور یہ کہتے ہوئے آگے بڑھے کہ میں تو احد کے ورے جنت کی خوشبو محسوس کر رہا ہوں۔ اس کے بعد خوب لڑے اور شہید ہو گئے۔

(١٠٠٤) وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا، قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «مَنْ قُتِلَ فِي عِمِّيًّا، أَوْ فِي رِمِّيًّا بِحَجَرٍ أَوْ سَوْطٍ أَوْ عَصاً، فَعَقْلُهُ عَقْلُ الخَطأِ، وَمَنْ قُتِلَ عَمْداً، فَهُوَ قَوَدٌ، وَمَنْ حَالَ دُونَهُ، فَعَلَيْهِ لَعْنَةُ اللهِ». أَخْرَجَهُ أَبُو دَاوُدَ وَالنَّسَائِيُّ وَابْنُ مَاجَهْ بِإِسْنَادٍ قَوِيٍّ.

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "جو شخص اندھا دھند لڑائی میں قتل ہو جائے یا پتھر پھینکنے سے قتل ہو جائے یا کوڑے اور لاٹھی سے مر جائے تو اس کی دیت' خطا کی دیت ہو گی۔ جو شخص عمداً قتل کیا جائے گا تو اس کا قصاص ہے اور جو شخص قصاص لینے میں حائل ہوا تو ایسے شخص پر اللہ کی لعنت ہے۔" (اس حدیث کو ابوداؤد اور نسائی نے قوی سند سے روایت کیا ہے)

لغوی تشریح: ﴿ عمیا ﴾ عین کے نیچے کسرہ اور میم مکسور مع التشدید اور پھر "یا" پر بھی تشدید۔ یعنی جو شخص ایسی صورت حال میں قتل کیا گیا جس کے قتل کا معاملہ صاف اور واضح نہ ہو اور اس کے قاتل کی نشان دہی بھی نہ ہو سکے ﴿ او رمیا ﴾ رمی سے ماخوذ ہے۔ عمیا کے وزن پر ہے اور ترامی کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔ یعنی ایسی پوزیشن میں اس کا قتل ہوا جب لوگ تیر اندازی میں مشغول تھے اور ایک دوسرے کو مار پیٹ رہے تھے۔ ایسی صورت حال میں قاتل کی نشان دہی اور قاتل کا حال بھی معلوم نہ ہو تو ایسا قتل' قتل خطا کے زمرہ میں آتا ہے اور ابوداؤد میں الفاظ اس طرح ہیں "من قتل فی عمیا فی رمی" اس جملہ سے ظاہر ہو رہا ہے کہ دوسرا پہلے کی تفسیر ہے۔ ﴿ عصا ﴾ اور بعض نسخوں میں "عصی" عین اور صاد دونوں پر کسرہ اور "یا" پر تشدید۔ اس صورت میں یہ عصا کی جمع ہو گی۔ ﴿ عقل الخطا ﴾ یعنی قتل خطا کی دیت اور وہ سو اونٹ ہے۔ ﴿ قود ﴾ قاف اور دال دونوں پر فتحہ۔ قصاص۔ ﴿ ومن حال دونه ﴾ جو شخص قصاص لینے میں حائل ہوا اور مانع بن کر کھڑا ہوا۔

(١٠٠٥) وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ رَضِيَ

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم

اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا، عَنِ النَّبِيِّ ﷺ، قَالَ: «إِذَا أَمْسَكَ الرَّجُلُ الرَّجُلَ، وَقَتَلَهُ الآخَرُ، يُقْتَلُ الَّذِي قَتَلَهُ، وَيُحْبَسُ الَّذِي أَمْسَكَ». رَوَاهُ الدَّارَقُطْنِيُّ مَوْصُولاً وَمُرْسَلاً، وَصَحَّحَهُ ابْنُ القَطَّانِ، وَرِجَالُهُ ثِقَاتٌ، إِلاَّ أَنَّ البَيْهَقِيَّ رَجَّحَ المُرْسَلَ.

نے فرمایا "جب ایک آدمی دوسرے آدمی کو پکڑ رکھے اور دوسرا آدمی پکڑے ہوئے آدمی کو قتل کر دے تو قاتل کو قتل کیا جائے گا اور پکڑنے والے کو قید کر دیا جائے گا۔" (اسے دارقطنی نے موصولاً اور مرسلاً روایت کیا ہے اور ابن قطان نے اسے صحیح قرار دیا۔ اس کے راوی ثقہ ہیں۔ مگر بیہقی نے اس کے مرسل ہونے کو ترجیح دی ہے)

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ اگر ایک آدمی کو دو آدمی اس طرح قتل کریں کہ ایک نے پکڑ لیا اور دوسرے نے پکڑے ہوئے کو قتل کر دیا تو اس صورت میں قاتل کو قتل کیا جائے گا اور پکڑنے والے کو قید کی سزا دی جائے گی اور یہ سزا عمر قید کی ہوگی یا عدالت کی صوابدید پر ہوگی۔ احناف اور شوافع کا یہی مسلک ہے مگر امام مالک رحمۃ اللہ علیہ ' نخعی رحمۃ اللہ علیہ اور ابن ابی لیلیٰ کا قول یہی ہے کہ دونوں کو قتل کیا جائے کیونکہ دونوں اس کے قتل میں شریک ہیں اگر پکڑنے والا اسے نہ پکڑتا تو ممکن ہے وہ قاتل کے وار سے بچ کر بھاگ جاتا اور قتل نہ ہوتا چونکہ اس کے قتل میں دونوں برابر کے شریک ہیں سزا بھی دونوں کی برابر ہونی چاہئے۔ امام بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا ہے کہ یہ حدیث مرسل ہے۔

(١٠٠٦) وَعَنْ عَبْدِ الرَّحْمٰنِ بْنِ البَيْلَمَانِيِّ، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ قَتَلَ مُسْلِماً بِمُعاهَدٍ، وَقَالَ: «أَنَا أَوْلَى مَنْ وَفَّى بِذِمَّتِهِ». أَخْرَجَهُ عَبْدُ الرَّزَّاقِ هٰكَذَا مُرْسَلاً، وَوَصَلَهُ الدَّارَقُطْنِيُّ بِذِكْرِ ابْنِ عُمَرَ فِيهِ، وَإِسْنَادُ المَوْصُولِ وَاهٍ.

حضرت عبدالرحمٰن بن بیلمانی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی ﷺ نے ایک عہدی (کافر) کے بدلے ایک مسلمان کو قتل کیا اور (ساتھ ہی) فرمایا "میں ایفائے عہد کرنے والوں میں سب سے بہتر وفا کرنے والا ہوں۔" (عبدالرزاق نے اسی طرح مرسل روایت کیا ہے اور دارقطنی نے اس کو ابن عمر رضی اللہ عنہما سے موصول بیان کیا ہے لیکن اس کی سند کمزور ہے)

حاصل کلام: اس حدیث کی شدت ضعف اور حدیث "لا یقتل مسلم بکافر" کے معارض ہونے کی وجہ سے جمہور نے اس حدیث کو قابل استدلال قرار نہیں دیا۔ البتہ حنفیہ اسی طرف گئے ہیں مگر احناف اکثر اوقات صحیح حدیث پر ضعیف کو ترجیح دے دیتے ہیں۔ لہٰذا اس مقام پر جو کچھ انہوں نے کیا ہے اس پر کوئی تعجب نہیں۔

راوی حدیث: ﴿عبدالرحمن بن بیلمانی﴾ عبدالرحمٰن بن ابی زید مولیٰ عمر۔ مدنی۔ حران میں جا کر فروکش ہوئے۔ ابوحاتم کا قول ہے کہ یہ کمزور راوی ہے اور ابن حبان نے اسے ثقہ قرار دیا ہے اور

حافظ عبدالعظیم نے کہا کہ اس سے دلیل نہیں پکڑی جائے گی۔ بیلمان کی طرف منسوب ہونے کی وجہ سے بیلمانی کہلایا۔ بیلمان کے "با" پر فتحہ اور یا ساکن اور لام پر فتحہ۔

(۱۰۰۷) وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا، قَالَ: قُتِلَ غُلاَمٌ غِيْلَةً، فَقَالَ عُمَرُ: لَوِ اشْتَرَكَ فِيْهِ أَهْلُ صَنْعَآءَ لَقَتَلْتُهُمْ بِهِ. أَخرَجَهُ البُخَارِيُّ.

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ دھوکہ اور فریب دہی سے ایک غلام کو قتل کر دیا گیا۔ تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا' اگر اس کے قتل میں سارے اہل صنعاء شریک ہوتے تو میں ان سب کو قتل کر ڈالتا۔ (بخاری)

لغوی تشریح: ﴿ غیلۃ ﴾ غین کے نیچے کسرہ اور "یا" ساکن۔ اس کے معنی ہیں دھوکہ' فریب اور خفیہ طور پر کسی کو فریب دے کر ایسی جگہ لے کر چلا جائے جہاں اسے کوئی نہ دیکھتا ہو اور وہاں قتل کر دے۔ ﴿ صنعاء ﴾ مد کے ساتھ ہے۔ یہ یمن کا دارالسلطنت ہے جو قدیم ترین زمانوں سے چلا آرہا ہے۔ اہل عرب کے ہاں کثرت بیان کرنے کیلئے بطور مثال استعمال ہوتا ہے۔ جمہور علماء نے اسی اثر کو قبول کیا ہے اور کہا ہے کہ ایک آدمی کے بدلہ میں پوری جماعت کو قتل کیا جائے جبکہ یہ سارے لوگ ایک کے قتل کرنے میں عملاً شریک ہوں۔ یہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کی پہلی روایت جو ابھی گزری ہے' کے معارض و مخالف ہے کہ جب ایک آدمی کسی کو مضبوطی سے پکڑ لے اور دوسرا آدمی اس گرفتار شدہ آدمی کو قتل کر دے تو حقیقی و اصلی قاتل کو قتل کیا جائے گا اور پکڑنے والے کو قید کر دیا جائے گا۔ اکثر اوقات یہ کہا جاتا ہے کہ اشتراک سے مراد اجتماعی طور پر براہ راست قتل کرنے میں شراکت مراد ہے اور پکڑ کر روکے رکھنا قتل میں اشتراک نہیں بلکہ یہ تو تعاون و معاونت ہے۔ لہٰذا حدیث اور اثر میں باہمی کوئی مخالفت نہیں۔ لیکن اس قول کی تردید بعض طرق میں وارد حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اس قول سے ہوتی ہے۔ اگر تمام اہل صنعاء اس پر ٹوٹ پڑتے تو میں ان سب کو قتل کر ڈالتا اور صاحب سبل السلام نے لکھا ہے کہ جماعت پوری کی پوری ایک آدمی کے قتل کے بدلہ میں قتل نہیں کی جائے گی بلکہ ایسی صورت حال میں دیت واجب ہوگی پھر اس نے کہا ہے کہ ہمیں پھر ایک کے بدلہ میں جماعت کو قتل کرنا قوی معلوم ہوا اور ہم نے اس کی دلیل ضوء النہار کے حواشی میں بیان کی ہے۔

(۱۰۰۸) وَعَنْ أَبِيْ شُرَيْحٍ الخُزَاعِيِّ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «فَمَنْ قُتِلَ لَهُ قَتِيلٌ، بَعْدَ مَقَالَتِي هَذِهِ، فَأَهْلُهُ بَيْنَ خِيرَتَيْنِ، إِمَّا أَنْ يَأْخُذُوا العَقْلَ، أَوْ يَقْتُلُوا». أَخرَجَهُ أَبُو دَاوُدَ وَالنَّسَائِيُّ، وَأَصْلُهُ فِي الصَّحِيحَيْنِ مِنْ

حضرت ابو شریح خزاعی سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "کہ میرے اس خطبہ کے بعد اگر کسی کا کوئی آدمی مارا جائے تو متوفی کے ورثاء کو دو اختیار ہیں یا تو دیت لے لیں یا قاتل کو مقتول کے بدلہ میں قتل کر دیں۔" (اسے ابوداؤد اور نسائی نے روایت کیا ہے اور اس روایت کا اصل اس کے ہم معنی

حَدِيْثِ أَبِيْ هُرَيْرَةَ بِمَعْنَاهُ. صحیحین میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے)

لغوی تشریح: یہ حدیث فتح مکہ کے موقع پر خطاب کا ایک ٹکڑا ہے۔ دوران گفتگو جب آپ ؐ نے جاہلیت کے خون کو باطل قرار دیا' فرمایا پھر تم نے اے گروہ خزاعہ! ھذیل کا یہ آدمی قتل کیا ہے میں اس کی دیت لے کر چھوڑوں گا۔ الحدیث ﴿ بین خیرتین ﴾ خیرتین کی "خا" کے نیچے کسرہ اور "یا" پر فتحہ یعنی دیت لینے اور قصاص دونوں میں اسے اختیار ہے جو چاہے انتخاب کرے۔

راوی حدیث: ﴿ ابو شریح خزاعی ﴾ عمرو بن خویلد اور بعض کے نزدیک خویلد بن عمرو کعبی عدوی خزاعی ہیں۔ فتح مکہ سے پہلے اسلام قبول کیا۔ مدینہ میں ۶۸ھ کو وفات پائی۔

١ - بَابُ الدِّيَاتِ

اقسام دیت کا بیان

(١٠٠٩) عَنْ أَبِيْ بَكْرِ بْنِ مُحَمَّدِ بْنِ عَمْرِو ابْنِ حَزْمٍ، عَنْ أَبِيْهِ، عَنْ جَدِّهِ أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ كَتَبَ إِلَىٰ أَهْلِ الْيَمَنِ فَذَكَرَ ٱلْحَدِيْثَ. وَفِيْهِ أَنَّ مَنِ اعْتَبَطَ مُؤْمِناً قَتْلاً عَنْ بَيِّنَةٍ، فَإِنَّهُ قَوَدٌ، إِلاَّ أَنْ يَرْضَى أَوْلِيَآءُ الْمَقْتُولِ. وَإِنَّ فِي النَّفْسِ الدِّيَةَ: مِائَةً مِّنَ الإِبِلِ، وَفِي الأَنْفِ إِذَا أُوْعِبَ جَدْعُهُ الدِّيَةُ، وَفِي الْعَيْنَيْنِ الدِّيَةُ، وَفِي اللِّسَانِ الدِّيَةُ، وَفِي الشَّفَتَيْنِ الدِّيَةُ، وَفِي الذَّكَرِ الدِّيَةُ، وَفِي الْبَيْضَتَيْنِ الدِّيَةُ، وَفِي الصُّلْبِ الدِّيَةُ، وَفِي الرِّجْلِ الْوَاحِدَةِ نِصْفُ الدِّيَةِ، وَفِي الْمَأْمُومَةِ ثُلُثُ الدِّيَةِ، وَفِي الْجَائِفَةِ ثُلُثُ الدِّيَةِ، وَفِي ٱلْمُنَقِّلَةِ خَمسَ عَشَرَةَ مِنَ الإِبِلِ، وَفِي كُلِّ إِصْبَعٍ، مِنْ أَصَابِعِ الْيَدِ وَالرِّجْلِ عَشْرٌ مِّنَ الإِبِلِ، وَفِي

حضرت ابوبکر بن محمد بن عمرو بن حزم نے اپنے باپ کے حوالہ سے اپنے دادا سے روایت کیا ہے کہ نبی ﷺ نے اہل یمن کو لکھا' پھر حدیث بیان کی جس میں یہ تحریر تھا "جس کسی نے ایک بے گناہ مسلمان کو قتل کیا اور اس قتل کے گواہ ہوں تو اس پر قصاص لازم ہے۔ الاّ یہ کہ مقتول کے ورثاء راضی ہوں تو ایک جان کے قتل کی دیت سو اونٹ ہے اور ناک میں بھی پوری دیت ہے جبکہ اسے جڑ سے کاٹ دے اور دونوں آنکھوں اور زبان اور دونوں ہونٹوں کے عوض بھی پوری دیت ہے۔ اسی طرح عضو مخصوص اور دو خصیہ میں پوری دیت ہے اور پشت میں بھی پوری دیت ہے اور ایک پاؤں کی صورت میں آدھی دیت ہے اور دماغ کے زخم اور پیٹ کے زخم میں تہائی دیت ہے اور وہ زخم جس سے ہڈی ٹوٹ جائے اس میں پندرہ اونٹ اور ہاتھ اور پاؤں کی ہر ایک انگلی میں دس دس اونٹ دیت ہے اور ایک دانت کی دیت پانچ اونٹ اور ایسے زخم میں جس سے ہڈی نظر آنے لگے پانچ اونٹ دیت ہے اور مرد کو

السِّنِّ خَمْسٌ مِّنَ الإِبِلِ، وَفِي الْمُوضِحَةِ خَمْسٌ مِّنَ الإِبِلِ، وَإِنَّ الرَّجُلَ يُقْتَلُ بِالْمَرْأَةِ، وَعَلَىٰ أَهْلِ الذَّهَبِ أَلْفُ دِيْنَارٍ. أَخْرَجَهُ أَبُو دَاوُدَ فِي الْمَرَاسِيلِ، وَالنَّسَآئِيُّ وَابْنُ خُزَيْمَةَ وَابْنُ الْجَارُوْدِ وَابْنُ حِبَّانَ وَأَحْمَدُ، وَاخْتَلَفُوا فِي صِحَّتِهِ.

عورت کے بدلہ قتل کیا جائے گا اور جن کے پاس اونٹ نہ ہوں اور سونا ہو تو ان سے ایک ہزار دینار وصول کئے جائیں گے۔" (ابوداؤد نے اسے اپنی مراسیل میں لکھا ہے اور نسائی' ابن خزیمہ' ابن جارود' ابن حبان اور احمد نے روایت کیا ہے اور اس کی صحت میں انہوں نے اختلاف کیا ہے)

لغوی تشریح: ﴿ باب الدیات ﴾ 'دیات۔ دیت کی جمع ہے دونوں جگہ "یاء" مخفف ہے۔ اس کا اصل ودی ہے۔ واؤ کو حذف کر کے اس کے عوض تا لگا دی گئی ہے۔ جس طرح عدۃ میں تا لگا دی گئی ہے دیت اس مال کو کہتے ہیں جو مقتول کی جان کے عوض دیا جاتا ہے۔ یا اعضائے بدن کے زخموں کے بدلے دی جاتی ہے۔ ﴿ اعتبط ﴾ بغیر کسی وجہ و سبب کے قتل کرنا۔ یہ "عبط الابل واعتبطه" سے ماخوذ ہے۔ جب اونٹ کو بغیر کسی مرض اور وجہ سے ذبح کر دیا جائے۔ ﴿ قتلا ﴾ یہ مصدر ہونے کی وجہ سے منصوب ہے۔ ﴿ عن بینة ﴾ گواہ قاتل پر قائم و ثابت ہو جائیں یا خود قاتل اقرار کر لے۔ ﴿ فانه قود ﴾ قود قاف اور واؤ دونوں پر فتحہ ہے۔ تو پھر اس کا حکم قصاص ہے۔ قاتل کو مقتول کے بدلہ قتل کیا جائے گا۔ ﴿ الا ان یرضی اولیاء المقتول ﴾ الآ یہ کہ مقتول کے اولیاء و ورثاء راضی ہو جائیں کہ دیت لے لیں گے۔ یہ دلیل ہے کہ دیت قبول کرنے کا اختیار مقتول کے اولیاء کو ہے نا کہ قاتل کو۔ جمہور علماء کی رائے تو یہی ہے البتہ حنفیہ کہتے ہیں کہ مقتول کے اولیاء کو دیت لینے کا اختیار اس وقت تک نہیں ہے جب تک قاتل راضی نہ ہو جائے اور وہ اس حدیث اور اس جیسی دیگر احادیث سے خاموشی اختیار کر لیتے ہیں۔ ﴿ مائة من الابل ﴾ یہ دیت کا بیان ہے اور بدل ہونے کی وجہ سے منصوب ہے یا پھر مرفوع ہے تو اس صورت میں مبتداء محذوف ہے ﴿ اوعب جدعه ﴾ فعل صیغۂ مجہول ہے۔ معنی ہے کہ پورا ناک جڑ سے کاٹ دیا۔ ﴿ الدیة ﴾ یعنی پوری دیت ہے۔ ﴿ وفی اللسان الدیة ﴾ پوری دیت اس صورت میں جبکہ زبان کو جڑ سے کاٹ دیا گیا ہو یا اتنی زبان کاٹ دی گئی ہو کہ بات چیت اور گفتگو نہ کر سکے۔ ﴿ البیضتین ﴾ "خصتین ﴿ المامومة ﴾ ایسا زخم جو دماغ کی جڑ تک پہنچ جائے اور ﴿ ام الدماغ ﴾ دماغ کے اوپر چمڑے کو کہتے ہیں۔ ﴿ الجائفة ﴾ نیزے وغیرہ کا وہ زخم جو پیٹ یا سر کے اندر تک پہنچ جائے۔ خطابی رحمہ اللہ نے کہا ہے اگر زخم ایک جانب سے دوسری جانب نفوذ کر کے نکل جائے تو اس صورت میں دو تہائی دیت ہے اس لئے کہ اس طرح یہ دو زخم شمار ہوں گے۔ ﴿ المنقلة ﴾ قاف پر تشدید اور کسرہ۔ ایسا زخم جو ہڈی کو توڑ دے اور اسے اپنی جگہ سے نکال باہر کرے۔ ﴿ الموضحة ﴾ ایضاح سے اسم فاعل کا صیغہ ہے۔ ایسا زخم جو ہڈی کو گوشت سے ننگا کر کے اسے نمایاں اور واضح کر دے۔ ﴿ وعلی اهل الذهب الف دینار ﴾ یعنی دیت میں ہزار دینار سو اونٹوں کے بدلے۔ اس میں اختلاف ہے کہ کیا

یہ اندازہ شرعی ہے اور اصول دیت میں سے اصل ہے کہ سونے کے مالکوں پر بغیر کسی کمی و بیشی ہزار دینار متعین کئے گئے ہیں۔ خواہ اونٹ کی قیمت ارزانی اور گرانی کی وجہ سے کہیں پہنچ جائے یا وہ دیت کی قیمت کا اندازہ ہے۔ دیت میں اصل تو اونٹ ہی دینے آتے ہیں۔ پس اونٹ کی قیمت میں ارزانی اور گرانی کے مطابق سونے کی مقدار میں کمی و بیشی کی جائے گی۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ اور محققین نے دوسری رائے کو اختیار کیا ہے اور دلیل کے اعتبار سے وہی قابل ترجیح ہے اور مزید تفصیل ''مطولات'' میں ملاحظہ ہو۔

راوی حدیث: ﴿ ابوبکر بن محمد بن عمرو بن حزم انصاری ﴾ بخاری مدنی' قاضی۔ ان کا نام اور کنیت ایک ہی ہے اور ایک قول ہے کہ ان کی کنیت ابومحمد ہے' ثقہ ہیں۔ عبادت گزار ہیں۔ کتب ستہ کے راوی ہیں اور پانچویں طبقہ میں شمار ہوتے ہیں۔ ان کی اہلیہ کا بیان ہے کہ عرصہ چالیس سال سے رات کو بستر پر کمر نہیں رکھی۔ ابن معین نے ان کو ثقہ قرار دیا۔ ابن سعد کے قول کے مطابق ۱۲۰ھ میں وفات پائی۔

(۱۰۱۰) وَعَنِ ابْنِ مَسْعُودٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، عَنِ النَّبِيِّ ﷺ، قَالَ: «**دِيَةُ الخَطَإِ أَخْمَاساً، عِشْرُونَ حِقَّةً، وَعِشْرُونَ جَذَعَةً، وَعِشْرُونَ بَنَاتِ مَخَاضٍ، وَعِشْرُونَ بَنَاتِ لَبُونٍ، وَعِشْرُونَ بَنِي لَبُونٍ**» أَخْرَجَهُ الدَّارَقُطْنِيُّ. وَأَخْرَجَهُ الأَرْبَعَةُ بِلَفْظِ: «وَعِشْرُونَ بَنِي مَخَاضٍ» بَدْلَ «بَنِي لَبُونٍ»، وَإِسْنَادُ الأَوَّلِ أَقْوَى، وَأَخْرَجَهُ ابْنُ أَبِي شَيْبَةَ مِنْ وَجْهٍ آخَرَ مَوْقُوفاً، وَهُوَ أَصَحُّ مِنَ المَرْفُوعِ.

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے نبی ﷺ سے روایت کیا کہ آپؐ نے فرمایا ''قتل خطا کی صورت میں پانچ قسم کے اونٹ دیت میں وصول کئے جائیں گے۔ بیس ایسے اونٹ جن کی عمر تین سال ہو اور بیس اونٹ جن کی عمر چار سال ہو اور بیس مادہ اونٹ جن کی عمر دو سال ہو اور بیس مادہ اونٹ جن کی عمر ایک ایک سال ہو اور بیس نر اونٹ جن کی عمر ایک سال ہو۔'' (سنن دارقطنی) اور چاروں نے ان الفاظ سے ذکر کیا ہے کہ ''بیس نر اونٹ ایک سال عمر کے بدلے دو سال عمر کے'' اور پہلی کی سند قوی ہے اور ابن ابی شیبہ نے ایک اور طریق سے موقوفاً روایت کیا ہے اور اس کی سند اس مرفوع سے زیادہ صحیح ہے۔

وَأَخْرَجَهُ أَبُو دَاوُدَ وَالتِّرْمِذِيُّ مِنْ طَرِيْقِ عَمْرِو ابْنِ شُعَيْبٍ، عَنْ أَبِيْهِ، عَنْ جَدِّهِ، رَفَعَهُ: الدِّيَةُ ثَلاَثُونَ حِقَّةً، وَثَلاثُونَ جَذَعَةً، وَأَرْبَعُونَ خَلِفَةً، فِيْ بُطُونِهَا أَوْلاَدُهَا.

ابوداؤد اور ترمذی نے عمرو بن شعیب عن ابیہ' عن جدہ کے طریق سے مرفوعاً نقل کیا ہے کہ ''دیت میں تیس تین سالہ اور تیس چار سالہ اور چالیس حاملہ اونٹنیاں وصول کی جائیں گی)

لغوی تشریح: ﴿ دیة الخطا اخماسا ﴾ دیت کی ادائیگی بایں صورت واجب ہے یا یہ معنی کہ اس

طریقہ سے وصول کی جائے گی۔ قتل خطا کی دیت پانچ طرح سے لی جائے گی۔ اخماس خمس کی جمع ہے۔ خمس کی "خا" اور میم دونوں پر ضمہ ہے۔ مطلب یہ ہے کہ دیت کی وصولی کو پانچ اجزاء پر منقسم کر دیا گیا ہے ہر جزو ایک خاص نوعیت کے اونٹوں کے ساتھ مخصوص ہے اور اس کا بیان اس قول سے شروع ہوتا ہے۔ ﴿ عشرون حقة ﴾ حقه "حا" کے نیچے کسرہ اور قاف مشدد' وہ اونٹ جو اپنی عمر کے چوتھے سال میں قدم رکھ چکا ہو اور ﴿ جذعہ ﴾ جیم اور "زا" دونوں پر فتحہ۔ ایسے اونٹ کو کہتے ہیں جو اپنی عمر کے پانچویں سال میں داخل ہو چکا ہو اور ﴿ بنت مخاض ﴾ ایسی اونٹنی جو دوسرے سال میں داخل ہو چکی ہو۔ اور ﴿ بنت لبون ﴾ جو اونٹنی تیسرے سال میں داخل ہو چکی ہو ﴿ واسناد الاول ﴾ سے مراد ہے۔ سنن دارقطنی کی سند ﴿ اقوی ﴾ قوی ترین ہے۔ اس سند سے جسے چاروں نے نقل کیا ہے کیونکہ ان کی بیان کردہ سند میں خشف بن مالک ایسا راوی ہے جو مجہول ہے نیز اس میں حجاج بن ارطاۃ مدلس ہے اور عمرو بن شعیب کی حدیث کے آخر میں رسول اللہ ﷺ کا یہ ارشاد گرامی ہے ﴿ اربعون خلفة خلفة ﴾ "خا" پر فتحہ اور لام پر کسرہ۔ حاملہ اونٹنی کو کہتے ہیں۔ یہ معلوم رہے کہ ابن مسعود کی یہ حدیث دیت میں ادا کئے جانے والے اونٹوں کی عمر کے تعین میں اصل ہے اور ائمہ اربعہ نے اسی کو لیا ہے اور انہوں نے کہا ہے کہ قتل خطا کی دیت پانچ طرح سے وصول کی جائے گی۔ البتہ انہوں نے پانچویں کے تعین میں اختلاف کیا ہے۔ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے نزدیک بنو مخاض مراد ہیں اور دوسروں نے کہا ہے کہ اس سے مراد بنو لبون ہیں اور آپ نے معلوم کر لیا کہ دارقطنی کی سند قوی تر ہے اور اس میں بنو لبون ہے۔ لہٰذا وہی قابل ترجیح ہے۔ رہی عمرو بن شعیب کی وہ حدیث جو اس پر دلالت کرتی ہے کہ دیت کی وصولی تین طرح سے کی جائے گی تو وہ دراصل قتل عمد کی صورت میں مقتول کا ولی قصاص کی بجائے دیت وصول کرنے پر رضامند ہو جائے تو پھر۔ معلوم رہنا چاہئے کہ قتل کی تین انواع ہیں۔ قتل عمد' قتل خطا اور قتل شبہ عمد اور شبہ عمد سے مراد ہے ایسے آلہ سے قتل کیا جائے کہ جس سے عادتاً قتل کا امکان نہ ہو۔ جیسے لاٹھی' کوڑا وغیرہ۔ باوجودیکہ وہ قتل کرنے کا قصد و ارادہ رکھتا تھا۔ پس قتل عمد اور قتل خطا میں یہی دیت ہوگی اور ابن مسعود کی حدیث میں شبہ عمد کی دیت ہے جسے دیت مغلظة کہتے ہیں۔

(١٠١١) وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا، عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ: «إِنَّ أَعْتَى النَّاسِ عَلَى اللهِ ثَلَاثَةٌ: مَنْ قَتَلَ فِي حَرَمِ اللهِ، أَوْ قَتَلَ غَيْرَ قَاتِلِهِ. أَوْ قَتَلَ لِذَحْلِ الجَاهِلِيَّةِ». أَخْرَجَهُ ابْنُ حِبَّانَ فِي حَدِيثٍ صَحَّحَهُ.

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما نبی ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا "اللہ تعالیٰ کی سب سے زیادہ سرکشی کرنے والے لوگ تین قسم کے ہیں (ایک) جو اللہ کے حرم میں قتل کرے (دوسرا) جو اپنے غیر قاتل کو قتل کرے (تیسرا) وہ جو جاہلیت کی عداوت و دشمنی کی بنا پر قتل کرے۔" (ابن حبان نے اس کی تخریج ایک حدیث کے ضمن میں کی ہے۔ جسے انہوں نے صحیح قرار دیا

ہے)

لغوی تشریح: ﴿ اعتی الناس ﴾ عتو سے اسم تفضیل کا صیغہ ہے جس کے معنی تکبر اور سرکشی کے ہیں تو اعتی الناس کے معنی یہ ہوئے کہ وہ آدمی جو سب سے زیادہ سرکش اور سرکشی و تمرد میں سب سے بڑھا ہوا ہے اور ﴿ لذحل الجاهلية ﴾ جاہلیت کی وجہ سے انتقام لینا اور بدلے کا مطالبہ و تقاضا کرنا۔ یعنی دور جاہلیت میں کئے گئے جرم کا انتقام لینا۔

حاصل کلام: اس حدیث میں اللہ تعالیٰ کی سرکشی کرنے والے تین قسم کے آدمیوں کا ذکر ہے۔ ان میں ایک وہ بدنصیب ہے جو بلدالامین یعنی مکہ میں قتل ناحق کرتا ہے۔ قتل کرنا ویسے ہی بہت بڑا جرم و گناہ ہے مگر حرم مکہ و مدینہ میں قتل کرنا سنگین ترین جرم ہے جس سے معلوم ہوا کہ مقام و جگہ میں جرم کی سنگینی میں فرق واقع ہو جاتا ہے۔ غالباً اسی وجہ سے حضرت امام شافعی رحمہ اللہ کا قول ہے جو شخص حرم میں قتل خطا کا مرتکب ہو اس پر دیت سخت رکھی جائے اور دوسرا وہ ہے جو اصل قاتل کے علاوہ بدلے میں کسی اور کو قتل کرتا ہے۔ قاتل سے بدلہ لینا حکومت کی ذمہ داری ہے مگر جو شخص جوش انتقام میں قاتل کے رشتہ دار یا ہمشیر وغیرہ کو قتل کرتا ہے وہ دہرے جرم کا مرتکب بنتا ہے اور تیسرا وہ جو زمانہ جاہلیت کا بدلہ کسی مسلمان سے لیتا ہے، وہ بھی اللہ تعالیٰ کے نزدیک انتہائی سرکش ہے۔

(۱۰۱۲) وَعَنْ عَبْدِاللهِ بْنِ عَمْرِو بْنِ العَاصِ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا أَنَّ رَسُولَ اللهِ ﷺ قَالَ: «أَلاَ إِنَّ دِيَةَ اَلْخَطَأِ وَشِبْهِ العَمْدِ، مَا كَانَ بِالسَّوْطِ وَالعَصَا، مِائَةٌ مِنَ الإِبِلِ، مِنْهَا أَرْبَعُونَ فِي بُطُونِهَا أَوْلاَدُهَا». أَخرَجَهُ أَبو دَاوُدَ وَالنَّسَائِيُّ وَابْنُ ماجَهْ، وَصَحَّحَهُ ابْنُ حِبَّانَ.

حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "قتل خطا کی دیت شبہ عمد (کی دیت ہے) جو کوڑے اور لاٹھی سے (مارا گیا) ہو۔ اس کی دیت سو اونٹ ہے۔ ان میں چالیس اونٹنیاں ایسی ہوں گی جن کے پیٹ میں بچے پرورش پا رہے ہوں گے۔ (اسے ابوداؤد' نسائی اور ابن ماجہ نے نکالا ہے اور ابن حبان نے صحیح کہا ہے)

لغوی تشریح: ﴿ منها اربعون فی بطونها اولادها ﴾ اور باقی ساٹھ میں سے تیس حقہ یعنی تیس تین سالہ اونٹنیاں اور تیس چار سالہ جیسا کہ ابھی گزرا ہے۔

حاصل کلام: اس حدیث کو یہاں بیان کرنے سے مقصود یہ ہے کہ عمرو بن شعیب والی حدیث کی تفسیر ہو جائے کہ اس میں جو تین طرح کی دیت بیان ہوئی ہے وہ قتل خطا کی دیت نہیں بلکہ قتل شبہ عمد کی ہے۔

(۱۰۱۳) وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا، عَنِ النَّبِيِّ ﷺ، قَالَ: «هٰذِهِ وَهٰذِهِ سَوَاءٌ يَعْنِي

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا "یہ اور یہ یعنی چھنگلی اور انگوٹھا برابر ہیں۔" (بخاری)

الخِنْصَرَ وَالإِبْهَامَ». رَوَاهُ البُخَارِيُّ.

وَلِأَبِي دَاوُدَ وَالتِّرْمِذِيِّ: اَلأَصَابِعُ سَوَآءٌ وَالأَسْنَانُ سَوَآءٌ، الثَّنِيَّةُ وَالضِّرْسُ سَوَآءٌ.

وَلِابْنِ حِبَّانَ: دِيَةُ أَصَابِعِ اليَدَيْنِ وَالرِّجْلَيْنِ سَوَآءٌ، عَشْرٌ مِّنَ الإِبِلِ لِكُلِّ إِصْبَعٍ.

اور ابوداؤد اور ترمذی کی روایت میں ہے۔ سب انگلیاں برابر اور سارے دانت برابر' ثنیہ (سامنے اوپر نیچے کے دو دو دانت) اور داڑھ برابر" اور ابن حبان کی روایت میں ہے "ہاتھوں اور پاؤں کی انگلیوں کی دیت برابر ہے۔ ہر انگلی کے بدلہ دس اونٹ دیت ہے۔"

لغوی تشریح: ﴿ هذه وهذه سواء ﴾ یہ اور یہ برابر۔ یعنی دیت میں چھوٹی بڑی سب انگلیاں برابر ہیں۔ ﴿ الضرس ﴾ ضرس کے ضاد کے نیچے کسرہ اور "را" ساکن۔ اس کی جمع "اضراس" ہے۔ یہ پانچ یا چار داڑھیں ہوتی ہیں جو منہ کے دونوں اطراف میں منہ کے آخری حصہ میں ہوتی ہیں ان سے کھانا چبایا جاتا ہے۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ دیت نفع کی مقدار کے حساب سے نہیں ہوتی۔ انگوٹھا چھنگلی سے زیادہ سود مند اور نفع بخش ہوتا ہے بلکہ وہ تو تمام انگلیوں سے زیادہ منافع بخش ہوتا ہے اور اسی طرح داڑھیں دوسرے دانتوں کے مقابلہ میں زیادہ سودمند اور نفع بخش ہوتی ہیں اس کے باوجود دیت میں یہ سب برابر ہیں اور ہر ایک کی دیت دس اونٹ ہے۔

(١٠١٤) وَعَنْ عَمْرِو بْنِ شُعَيْبٍ، عَنْ أَبِيْهِ، عَنْ جَدِّهِ، رَفَعَهُ، قَالَ: مَنْ تَطَبَّبَ، وَلَمْ يَكُنْ بِٱلطِّبِّ مَعْرُوفاً، فَأَصَابَ نَفْساً فَمَا دُوْنَهَا، فَهُوَ ضَامِنٌ. أَخْرَجَهُ الدَّارَقُطْنِيُّ. وَصَحَّحَهُ الحَاكِمُ، وَهُوَ عِنْدَ أَبِيْ دَاوُدَ وَالنَّسَآئِيِّ وَغَيْرِهِمَا، إِلاَّ أَنَّ مَنْ أَرْسَلَهُ أَقْوَى مِمَّنْ وَصَلَهُ.

حضرت عمرو بن شعیب نے اپنے باپ سے اور انہوں نے اپنے دادا سے مرفوع روایت بیان کی ہے کہ "جو شخص اپنے آپ طبیب بن کر کسی کو دوائی دیتا ہے حالانکہ اسے طبابت میں مہارت نہیں اور اس (کے غلط علاج) سے کوئی آدمی قتل ہو جائے یا کوئی نقصان کسی کو پہنچ جائے تو وہ اس کا ضامن ہے۔" (اسے دار قطنی نے روایت کیا ہے اور حاکم نے صحیح قرار دیا ہے۔ ابوداؤد اور نسائی وغیرہ کے ہاں بھی یہ روایت منقول ہے مگر جن راویوں نے اس روایت کو مرسل بیان کیا ہے وہ ان راویوں سے زیادہ قوی ہیں جنہوں نے اسے موصول بیان کیا ہے)

لغوی تشریح: ﴿ من تطبب ﴾ پیشہ طبابت اختیار کیا اور مریض کو دوا دی۔ ﴿ فاصاب نفسا فما دونها ﴾ غلط علاج سے مریض کی جان یا کوئی حصہ جسم ضائع ہو جائے۔ ﴿ فهو ضامن ﴾ تو وہ اس کا

ضامن ہے اور اس پر دیت واجب ہے جو اس کے عاقلہ یعنی عصبہ پر واجب الادا ہوگی۔

حاصل کلام : اس حدیث سے معلوم ہوا اگر کوئی شخص صحیح معنوں میں طبیب نہیں مگر وہ کسی کو دوائی دیتا ہے اور اس سے جانی نقصان ہو جاتا ہے یا اعضاء بدن میں سے کوئی عضو ناکارہ ہو جاتا ہے تو اس پر اس کی دیت واجب ہوگی اور ادائیگی دیت کا بار اس کے عصبہ پر بھی پڑے گا۔ علامہ ابن قیم رحمۃ اللہ علیہ نے طبیب حاذق کیلئے بیس باتوں کا خیال و لحاظ رکھنا ضروری قرار دیا ہے پھر ان کو ایک ایک کر کے زاد المعاد میں بیان کیا ہے۔ ایسے ناتجربہ کار اور اناڑی طبیب سے نقصان کی صورت میں اس پر دیت کے واجب ہونے پر سب علماء کا اجماع ہے۔

(١٠١٥) وَعَنْهُ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ قَالَ: «فِي الْمَوَاضِحِ خَمْسٌ خَمْسٌ مِّنَ الْإِبِلِ». رَوَاهُ أَحْمَدُ وَالأَرْبَعَةُ. وَزَادَ أَحْمَدُ: «وَالأَصَابِعُ سَوَآءٌ كُلُّهُنَّ، عَشْرٌ عَشْرٌ مِّنَ الإِبِلِ»، وَصَحَّحَهُ ابْنُ خُزَيْمَةَ وَابْنُ الجَارُودِ.

عمرو بن شعیب نے اپنے والد سے' انہوں نے اپنے دادا سے روایت کی ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا "جن زخموں سے ہڈی کھل جائے ان کی دیت پانچ اونٹ ہیں۔" (اسے احمد اور چاروں نے روایت کیا ہے) **اور احمد میں اتنا اضافہ ہے۔ "تمام انگلیوں کی دیت برابر ہے یعنی ہر انگلی کی دیت دس دس اونٹ ہے۔"** (اس روایت کو ابن خزیمہ اور ابن جارود نے صحیح قرار دیا ہے۔)

لغوی تشریح : ﴿ المواضح ﴾ میم پر فتحہ موضحۃ کی جمع ہے۔ اس کے معنی و تفسیر ابھی قریب ہی گزر چکی ہے۔ یعنی ایسا زخم جس سے ہڈی کھل جائے۔ مگر ٹوٹے نہیں۔

حاصل کلام : لڑائی کے دوران چوٹ اور زخم کی صورت میں ہڈی سے گوشت الگ ہو جائے اور ہڈی واضح طور پر کھل جائے مگر ٹوٹنے سے بچ جائے تو ایسی صورت میں شوافع' احناف اور صحابہ کی ایک بڑی جماعت کا مسلک یہی ہے۔ اس پر پانچ اونٹ دیت ادا کرنا لازمی ہوگا۔ ہر ایک انگلی کی دیت دس اونٹ ہے جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔

(١٠١٦) وَعَنْهُ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «عَقْلُ أَهْلِ الذِّمَّةِ نِصْفُ عَقْلِ الْمُسْلِمِينَ» رَوَاهُ أَحْمَدُ وَالأَرْبَعَةُ. وَلَفْظُ أَبِي دَاوُدَ: «دِيَةُ ٱلْمُعَاهَدِ نِصْفُ دِيَةِ ٱلْحُرِّ». وَلِلنَّسَآئِيِّ: «عَقْلُ الْمَرْأَةِ مِثْلُ

یہ روایت بھی انہی سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "ذمیوں کی دیت مسلمانوں کی دیت کا نصف ہے۔" (اسے احمد اور چاروں نے روایت کیا ہے) **اور ابوداؤد کے الفاظ اس طرح ہیں کہ "ذمی کی دیت آزاد کے مقابلہ میں آدھی ہے" اور نسائی کی روایت میں ہے کہ "عورت کی دیت مرد کی دیت**

عَقْلِ الرَّجُلِ ، حَتَّی یَبْلُغَ الثُّلُثَ مِنْ دِیَتِهَا » . وَصَحَّحَهُ ابْنُ خُزَیْمَةَ .

کی مانند ہے۔ یہاں تک کہ دونوں کی دیت تہائی تک پہنچے۔" (اسے ابن خزیمہ نے صحیح قرار دیا ہے۔)

لغوی تشریح : ﴿ عقل المراة الخ ﴾ سبل السلام میں ہے کہ یہ حدیث اس بات کی دلیل ہے کہ عورت کے زخموں کی دیت' مرد کے زخموں کی دیت کے برابر ہے تاآنکہ تہائی تک پہنچ جائے (یعنی عورت کی دیت مرد کی دیت کے ایک تہائی درجہ تک کے برابر ہے) اور اگر زخم اس سے زیادہ ہے تو عورت کا زخم مرد کے زخم کے مخالف ہو جائے گا اور اس صورت میں مرد کی دیت سے عورت کے زخم کی دیت نصف ہوگی اور یہ اس لئے کہ عورت کی دیت مرد کے مقابلہ میں آدھی ہے۔ اس میں سب متفق ہیں کسی کا اختلاف نہیں۔ مکمل دیت کے مقابلہ میں عورت کے زخم کی دیت کا مفہوم مخالف کے اصول پر قیاس کیا جائے گا۔ فقہاء میں جمہور اس طرف ہیں اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی ایک جماعت کی رائے بھی یہی ہے اور مدنی فقہاء کا قول بھی یہی ہے اور جمہور اہل مدینہ بھی اسی کے قائل ہیں اور امام مالک رحمہ اللہ و امام احمد رحمہ اللہ کا مذہب بھی یہی ہے۔

حاصل کلام : اس حدیث کی رو سے معلوم ہوا کہ ذمی کی دیت مسلمان کی دیت سے آدھی ہے۔ ذمی اس کافر کو کہتے ہیں جو اسلامی ریاست میں بطور رعایا سکونت پذیر ہو۔ البتہ عورت کی دیت زخموں میں مرد کی دیت کے مقابلہ میں آدھی ہے بشرطیکہ اس زخم کی دیت مرد کی پوری دیت کے ثلث سے اوپر ہو۔ اسے ایک مثال سے سمجھئے کہ ایک خاتون کی تین انگلیاں کٹ گئیں ان کی دیت دس اونٹ فی انگلی کے حساب سے تیس اونٹ ہوگی اور یہاں تک مرد کے برابر ہوگی اب اس خاتون کی چار انگلیاں کٹ جائیں اور مرد کی بھی چار کٹ جائیں تو مرد کی دیت چالیس اونٹ ہوں گے اور عورت کے بیس کیونکہ چالیس سو کے تہائی سے اوپر ہے اس لئے عورت کی دیت مرد کی دیت سے نصف رہ جائے گا۔ جمہور علماء کا یہی مسلک ہے مگر احناف اور شوافع قتل اور زخموں کی صورت میں عورت کی آدھی دیت کے قائل ہیں۔

(۱۰۱۷) وَعَنْهُ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَی عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «عَقْلُ شِبهِ العَمْدِ مُغَلَّظٌ ، مِثْلُ عَقْلِ العَمْدِ ، وَلاَ يُقْتَلُ صَاحِبُهُ ، وَذٰلِكَ أَنْ يَنْزُوَ الشَّيْطَانُ فَيَكُونَ دَماً بَيْنَ النَّاسِ فِي غَيْرِ ضَغِينَةٍ ، وَلاَ حَمْلِ سِلاَحٍ » . أَخْرَجَهُ الدَّارَقُطْنِيُّ وَضَعَّفَهُ .

حضرت عمرو بن شعیب رحمہ اللہ ہی اس کے بھی راوی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "قتل شبہ کی دیت قتل عمد کی طرح دیت مغلظہ ہے۔ اس لئے قاتل کو قتل نہیں کیا جائے گا۔ ہو سکتا ہے کہیں شیطان درمیان میں دخل اندازی کرے اور بغیر کسی دشمنی اور بغیر ہتھیاروں کے کسی اور وجہ سے قتل عام شروع ہو جائے۔ (اس کی دار قطنی نے تخریج کی ہے اور اسے ضعیف قرار دیا ہے)

لغوی تشریح : ﴿ مغلظ ﴾ دیت مغلظہ یعنی پوری سو اونٹ دیت۔ ان میں سے چالیس اونٹنیاں ایسی

جو حاملہ ہوں بچے ان کے پیٹوں میں پرورش پا رہے ہوں جیسا کہ اس کی تفصیل گزر چکی ہے۔ ﴿ ینزغ الشیطان ﴾ نزغ سے ماخوذ ہے اور یہ باب نصر ینصر ہے۔ یعنی لوگوں کے درمیان خواہ مخواہ کود پڑے گا اور ان کو باہمی لڑائی اور قتل و قتال پر آمادہ اور برانگیختہ کرے گا۔ ﴿ ضغینة ﴾ کینہ' حقد' عداوت۔ ﴿ سلاح ﴾ یعنی ہتھیار سے قتل نہ ہو بلکہ پتھر یا لاٹھی وغیرہ سے ہو جس میں قصاص نہیں بلکہ دیت ہے' البتہ اس کی دیت' دیت مغلظہ ہے۔

(١٠١٨) وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا، قَالَ: قَتَلَ رَجُلٌ رَجُلاً عَلَىٰ عَهْدِ رَسُولِ اللهِ ﷺ، فَجَعَلَ النَّبِيُّ ﷺ دِيَتَهُ اثْنَيْ عَشَرَ أَلْفاً. رَوَاهُ الأَرْبَعَةُ، وَرَجَّحَ النَّسَائِيُّ وَأَبُو حَاتِمٍ إِرْسَالَهُ.

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے عہد میں ایک آدمی نے دوسرے آدمی کو قتل کر دیا تو نبی ﷺ نے اس کی دیت بارہ ہزار طے فرمائی۔ (اسے چاروں نے روایت کیا ہے' نسائی اور ابوحاتم دونوں نے اس روایت کے مرسل ہونے کو ترجیح دی ہے۔)

لغوی تشریح: ﴿ اثنا عشر الفا ﴾ بارہ ہزار سے مراد' بارہ ہزار درہم ہے اور درہم چاندی کے سکے کو کہتے ہیں اور ان کا وزن چوالیس کلوگرام ہوتا ہے اور پہلے بیان ہو چکا ہے کہ دیت میں اصل تو اونٹ ہی ہیں اور یہ معلوم رہے کہ اونٹوں کے نرخ میں کمی بیشی کی وجہ سے سونے اور چاندی کے وزن میں بھی کمی و بیشی ہوتی رہتی ہے۔

حاصل کلام: اس حدیث سے ثابت ہوا کہ اگر کسی کے پاس اونٹ نہ ہوں تو دیت نقدی کی صورت میں بھی دی جا سکتی ہے۔ وہ مروج سکہ خواہ دینار ہو یا درہم یا کاغذی سکہ۔ اونٹ کی قیمت طے کر کے اتنی نقدی ادا کی جا سکتی ہے۔

(١٠١٩) وَعَنْ أَبِي رِمْثَةَ قَالَ: أَتَيْتُ النَّبِيَّ ﷺ، وَمَعِيَ ابْنِي، فَقَالَ: «مَنْ هَذَا؟» فَقُلْتُ: ابْنِي، وَأَشْهَدُ بِهِ، فَقَالَ: «أَمَا إِنَّهُ لاَ يَجْنِي عَلَيْكَ. وَلاَ تَجْنِي عَلَيْهِ». رَوَاهُ النَّسَائِيُّ وَأَبُو دَاوُدَ، وَصَحَّحَهُ ابْنُ خُزَيْمَةَ وَابْنُ الجَارُودِ.

حضرت ابو رمثہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نبی ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ میرے ساتھ میرا بیٹا بھی تھا۔ آپؐ نے دریافت فرمایا "یہ کون ہے؟" میں نے عرض کیا۔ میرا بیٹا ہے لہٰذا آپؐ اس پر گواہ رہیں۔ آپؐ نے فرمایا "بے شک یہ تیرے گناہ و جرم کا ذمہ دار نہیں اور نہ تو اس کے گناہ و جرم کا ذمہ دار۔" (اسے نسائی اور ابوداؤد نے روایت کیا ہے اور ابن خزیمہ اور ابن جارود نے اسے صحیح کہا ہے)

لغوی تشریح: ﴿ واشهد به ﴾ اشهد میں اس کا احتمال ہے کہ یہ صیغہ طلب ہو اور معنی ہو کہ آپ گواہ

رہیں کہ میرا یہ بیٹا میرے صلب سے ہے اور اس کا بھی احتمال ہے کہ یہ متکلم کا صیغہ ہو اور وہ ثابت کر رہا ہو کہ یہ میرا بیٹا ہے۔ اس سے دراصل مقصود یہ تھا کہ جرائم کی ضمانت جاہلیت میں اس طور پر لازم ہوتی تھی کہ والد کی جگہ بیٹا اور بیٹے کی جگہ باپ پر عائد کر دی جاتی تھی۔ اس اصول کی طرف یہ صاحب اشارہ کر رہے تھے۔ اس لئے نبی ﷺ نے اس کے اس نظریئے اور خیال کی تردید میں فرمایا کہ ''وہ تیرے جرائم و گناہ کا ذمہ دار نہیں اور تو اس کے جرائم کا جواب دہ نہیں'' یعنی اگر جرم کا ارتکاب و صدور اس کی جانب سے ہوگا تو اس کی پاداش میں تجھے مؤاخذہ میں گرفتار نہیں کیا جائے گا اور اس کی ضمان تیرے سر نہیں ہوگی اور اسی طرح اس کے برعکس کہ وہ اگر مرتکب جرم ہوگا تو اس ارتکاب جرم کا بار اسی پر پڑے گا اس کے جرم کی باز پرس تم سے نہیں ہوگی۔ یہ حکم اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد گرامی میں موجود ہے لا تزر وازرۃ وزر اخری (۱۷: ۱۵) یعنی کوئی بوجھ اٹھانے والا کسی دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھائے گا۔ (اپنا بوجھ آپ ہی اٹھانا ہوگا۔ جو کرے گا سو بھرے گا)

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ قصاص اور عتاب میں مجرم کے بدلے میں کسی اور کو نہیں پکڑا جائے گا حتیٰ کہ باپ کے بدلے میں بیٹا اور بیٹے کے بدلے میں باپ سے مؤاخذہ نہیں ہوگا۔ اگر کہا جائے کہ شارع نے پھر قتل خطا اور قسامت کی صورت میں دیت کا بار عصبہ پر کیوں ڈالا ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ یہ بوجھ نہیں بلکہ یہ باہمی تعاون و امداد ہے جو بھائی چارے اور برادری کی بنیاد پر بتقاضائے طبیعت بوقت ضرورت کی جاتی ہے اور برادری کے افراد بخوشی ادا کرتے ہیں کیونکہ ہر ایک اپنے قریبی عزیز کی غمگساری میں برضا و رغبت شریک ہونا فخر سمجھتا ہے اور انسانی تمدن اور معاشرت اسی کا تقاضا کرتا ہے کہ آج اگر کسی پر افتاد پڑ گئی ہے تو اس کا سہارا بنے، کل وہ بھی اس کا شکار ہو سکتا ہے۔

راوی حدیث: ﴿ ابو رمثہ رضی اللہ عنہ ﴾ ایک قول کے مطابق ان کا نام حبیب بن حیان اور ایک دوسرے قول کے مطابق رفاعہ بن یثربی یا عمارہ بن یثربی بلوی یا تیمی تھا۔ بنو تیم الرباب سے ہونے کی وجہ سے اور ایک قول کے مطابق تمیمی ہیں امری القیس بن زید مناۃ بن تمیم کی اولاد سے ہونے کی وجہ سے۔ مشہور صحابی ہیں۔ ان کا شمار کوفی صحابہ میں ہوتا ہے اور رمثہ کا اعراب یہ ہے کہ ''را'' کے نیچے کسرہ اور میم ساکن ہے۔ نبی ﷺ سے ان کی ملاقات حجۃ الوداع کے موقع پر ہوئی۔

٢ - بَابُ دَعْوَى الدَّمِ وَالْقَسَامَةِ

دعویٰ خون اور قسامت (قسموں کو تقسیم کرنے) کا بیان

(١٠٢٠) وَعَنْ سَهْلِ بْنِ أَبِيْ حَثْمَةَ، عَنْ رِجَالٍ مِّنْ كُبَرَآءِ قَوْمِهِ، أَنَّ عَبْدَ اللهِ بْنِ سَهْلٍ وَمُحَيِّصَةَ بْنَ

حضرت سہل بن ابی حثمہ نے اپنی قوم کے بڑے بزرگوں سے روایت بیان کی ہے کہ عبداللہ بن سہل اور محیصہ بن مسعود رضی اللہ عنہما اپنی تنگ دستی کی وجہ

مَسْعُودٍ خَرَجَا إِلَى خَيْبَرَ، مِنْ جَهْدٍ أَصَابَهُمْ، فَأَتَى مُحَيِّصَةُ، فَأَخْبَرَ أَنَّ عَبْدَاللهِ بْنَ سَهْلٍ قَدْ قُتِلَ، وَطُرِحَ فِيْ عَيْنٍ، فَأَتَى يَهُودَ، فَقَالَ: أَنْتُمْ وَاللهِ قَتَلْتُمُوهُ، قَالُوا: وَاللهِ مَا قَتَلْنَاهُ، فَأَقْبَلَ هُوَ، وَأَخُوهُ حُوَيِّصَةُ، وَعَبْدُ الرَّحْمٰنِ بْنُ سَهْلٍ، فَذَهَبَ مُحَيِّصَةُ لِيَتَكَلَّمَ، فَقَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «**كَبِّرْ كَبِّرْ**»، يُرِيْدُ السِنَّ. فَتَكَلَّمَ حُوَيِّصَةُ، ثُمَّ تَكَلَّمَ مُحَيِّصَةُ، فَقَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «**إِمَّا أَنْ يَدُوا صَاحِبَكُمْ، وَإِمَّا أَنْ يَأْذَنُوا بِحَرْبٍ**»، فَكَتَبَ إِلَيْهِمْ فِي ذٰلِكَ كِتَاباً، فَكَتَبُوا: إِنَّا وَاللهِ مَا قَتَلْنَاهُ، فَقَالَ لِحُوَيِّصَةَ، وَمُحَيِّصَةَ، وَعَبْدِ الرَّحْمٰنِ بْنِ سَهْلٍ: «**أَتَحْلِفُونَ، وَتَسْتَحِقُّونَ دَمَ صَاحِبِكُمْ؟**» قَالُوا: لاَ، قَالَ: «**فَيَحْلِفُ لَكُمْ يَهُودُ**»، قَالُوا: لَيْسُوا مُسْلِمِيْنَ، فَوَدَاهُ رَسُولُ اللهِ ﷺ مِنْ عِنْدِهِ، فَبَعَثَ إِلَيْهِمْ مِائَةَ نَاقَةٍ، قَالَ سَهْلٌ: فَلَقَدْ رَكَضَتْنِيْ مِنْهَا نَاقَةٌ حَمْرَاءُ. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

سے خیبر کی طرف نکلے۔ پس محیصہ نے آ کر اطلاع دی کہ عبداللہ بن سہل رضی اللہ عنہ کو قتل کر دیا گیا ہے اور اسے ایک چشمہ میں پھینک دیا گیا ہے۔ محیصہ رضی اللہ عنہ یہود کے پاس آیا اور کہا کہ خدا کی قسم تم لوگوں نے اسے قتل کیا ہے۔ وہ بولے اللہ کی قسم ہم نے اسے قتل نہیں کیا۔ پھر محیصہ اور اس کا بھائی حویصہ اور عبدالرحمٰن بن سہل (رضی اللہ عنہم) تینوں رسول اللہ ﷺ کی عدالت میں پہنچے اور محیصہ نے گفتگو کرنی چاہی۔ تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "بڑے کو بات کرنے دو بڑے کو۔" آپؐ کی مراد تھی جو تم میں عمر میں بڑا ہے اسے بات کرنی چاہئے۔ چنانچہ حویصہ رضی اللہ عنہ نے بیان دیا پھر محیصہ بولا تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ "وہ لوگ یا تو تمہارے صاحب و ساتھی کی دیت ادا کریں گے یا جنگ کیلئے تیار ہو جائیں۔" پھر اس سلسلہ میں آپؐ نے ان کو خط تحریر فرمایا جس کے جواب میں انہوں نے لکھا کہ اللہ کی قسم ہم نے اسے قتل نہیں کیا۔ اس کے بعد آپؐ نے حویصہ، محیصہ اور عبدالرحمٰن بن سہل (رضی اللہ عنہم) سے فرمایا "کیا تم لوگ قسم کھا کر اپنے صاحب کے خون کے حقدار بنو گے؟" انہوں نے جواب دیا نہیں۔ پھر آپؐ نے ان سے دریافت فرمایا کہ "تم کو یہودی قسم دیں؟" انہوں نے جواب دیا کہ وہ تو مسلمان نہیں ہیں (اس لئے ان کی قسم کا کوئی اعتبار نہیں) پس پھر رسول اللہ ﷺ نے اس کی دیت اپنے پاس (بیت المال) سے دی اور ان کو سو اونٹنیاں بھیج دیں۔ سہل رضی اللہ عنہ نے بتایا کہ ان میں سے ایک سرخ رنگ کی اونٹنی نے

مجھے لات ماری۔ (بخاری و مسلم)

لغوی تشریح: ﴿ باب دعوی الدم والقسامة ﴾ قسامة کے "قاف" پر فتحہ اور تخفیف السین اور "اقسم" کا مصدر ہے اور یہاں اس سے مراد قسم ہے۔ اور ایک قول یہ بھی ہے کہ فقہاء کے نزدیک یہ ایمان کا اسم ہے اور اصل لغت کے نزدیک قسمیں اٹھانے والوں کے لئے نام ہے اور قسامت کی صورت یوں ہوتی ہے کہ کوئی مقتول آدمی کسی بستی یا شہر میں پایا جائے اور اس کے قاتل کا علم نہ ہو اور اس کے قتل پر کوئی گواہ بھی کھڑا نہ ہو۔ لیکن مقتول کا ولی اس کے قتل کا الزام کسی آدمی یا جماعت پر لگائے اور ان کے خلاف کمزور ثبوت ہو۔ جو ظن پر غالب آرہا ہو تو پھر مدعی سچا ہے۔ گویا مقتول ان کے محلّہ میں پایا گیا اور مقتول اور ان کے مابین دشمنی تھی تو پھر مقتول کے اولیاء سے ان کے خلاف پچاس قسمیں کھانے کا حکم دیا جائے گا پس اگر ان لوگوں نے قسمیں کھالیں تو دیت کے مستحق قرار پائیں گے جبکہ قتل خطاء یا قتل شبہ عمد ہو گا اور اگر قتل عمداً کیا گیا ہو تو امام مالک اور امام شافعی کا قدیم قول اور امام احمد اور اسحاق کے نزدیک وہ قصاص کے مستحق ہونگے۔ مگر امام ابو حنیفہ اور امام شافعی کے صحیح ترین قول کے مطابق قتل عمد میں بھی وہ دیت لینے کے مستحق ہوں گے اور جب مقتول کے اولیاء اعراض کریں اور قسم اٹھانے سے گریز کریں اور پیچھے ہٹیں تو پھر جس پر انہوں نے دعویٰ دائر کیا ہے' ان کو قسم اٹھانے کا حکم دیا جائے کہ وہ اس بات کی قسم کھائیں کہ انہوں نے قتل نہیں کیا۔ اور نہ ان کو علم ہے کہ اس کا قاتل کون ہے؟ پس اگر قسم کھالیں تو وہ بری قرار پائیں گے۔ ان پر کوئی چیز واجب نہیں ہوگی اور اگر انہوں نے قسم کھانے سے گریز کر لیا اور منہ پھیر لیا تو ان پر دیت لازم کر دی جائے گی۔ ﴿ من جهد ﴾ جهد کے جیم پر فتحہ اور ضمہ دونوں طرح۔ یعنی مشقت کی بنا پر اور تنگ دستی' گزران کی وجہ سے۔ "فاتی محیصه فاخبر" اتی اور اخبر دونوں فعل صیغہ مجہول ہیں۔ "قد قتل وطرح" دونوں صیغہ مجہول۔ طرح کے معنی ڈال دیا پھینک دیا گیا۔ "فاقبل" یعنی نبی ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا ﴿ فذهب محيصة ليتكلم ﴾ محیصہ نے گفتگو کرنی چاہی۔ اس نے صرف جلدی سے گفتگو اس لئے کرنے کا ارادہ کیا کہ یہ اس واقعہ قتل میں حاضر تھا اور اپنے بھائی حویصہ سے عمر میں چھوٹا تھا ﴿ کبر کبر ﴾ تکبیر سے صیغہ امر ہے۔ یعنی بڑے کو آگے بڑھاؤ اور بڑے کے حق میں بڑائی کا لحاظ رکھو تا کہ وہ تجھ سے پہلے بات کرے۔ ﴿ يريد السن ﴾ یہ دوران گفتگو ادراج ہے اور کبر کی تفسیر ہے۔ اس کلام سے مراد یہ تھی جو عمر میں بڑا ہے اسے بات کرنی چاہئے ﴿ اما ان يدوا صاحبكم ﴾ یعنی تمہارے مقتول بھائی کی دیت دیں گے۔ فاعل کی ضمیر یہود کی جانب راجع ہے ﴿ يدوا ﴾ "یا" پر فتحہ اور دال پر ضمہ یہ "ودی یدی دیة " باب ضرب یضرب سے مضارع کا صیغہ ہے۔ ﴿ واما ان ياذنوا ﴾ یا پھر وہ اعلان کر دیں گے ﴿ بحرب ﴾ اللہ اور اس کے رسول کے ساتھ جنگ کا۔ ﴿ فكتب اليهم ﴾ رسول اللہ ﷺ نے ان کی طرف نوشتہ تحریر فرمایا ﴿ فيحلف لكم يهود ﴾ پس یہود اپنے خلاف تمہارے دعویٰ کو قسم کھا کر باطل کر دیں گے۔ ﴿ ليسوا

المسلمین ﴾ وہ تو مسلمان ہی نہیں لہٰذا ہم ان کی قسموں پر راضی نہیں ہوں گے۔ ﴿ فوداہ ﴾ پس آپ نے خود اس کی دیت ادا فرما دی رکضتنی اونٹنی نے اپنی لات مجھے رسید کر دی اور قسم مقتول کے اولیاء کے ذمہ پس اگر وہ گریز و اعراض کریں تو پھر جن پر دعویٰ دائر کیا گیا ہے اور وہ جب قسم کھا لیں گے تو بری ہو جائیں گے اور ان پر کسی قسم کی کوئی چیز عائد نہیں ہوگی۔

حاصل کلام: اس حدیث سے قسامت کا ثبوت ملتا ہے اور قسامت یہ ہے کہ قاتل کا کسی طرح پتہ نہ چلنے کی وجہ سے مشتبہ اشخاص یا قوم سے قسم لی جائے کہ انہوں نے قتل نہیں کیا اور ان کو اس کے قاتل کا علم بھی نہیں۔ یہ رسم دور جاہلیت میں بھی تھی اسلام نے اسے جائز رکھا۔ اس میں پچاس آدمیوں کی قسمیہ شہادت ہوتی ہیں کہ ہم نے یا ہمارے قبیلہ نے یا ہمارے گاؤں نے اسے قتل نہیں کیا۔ معلوم رہے کہ یہ قسم صرف خون کے مقدمہ میں ہوتی ہے باقی حدود کے مقدمات میں قسامت ہوتی ہی نہیں۔ قسامت دونوں جانب سے ہو سکتی ہے اگر مقتول کے اولیاء و ورثاء ثبوت پیش کر دیں یا عدم ثبوت کی صورت میں قسم دے دیں کہ ہمارے مقتول کے قاتل یہی ہیں تو مدعا علیہ پر دیت لازم ہو جاتی ہے اور اگر مدعی ان دونوں باتوں سے قاصر ہوں تو مدعا علیہ یا مدعا علیہم پچاس قسمیں دے دیں تو وہ بری ہو جاتے ہیں اور قسمیں ان حضرات کی تسلیم ہوں گی جن کو مدعی منتخب کرے۔ اس حدیث سے یہ بھی ثابت ہوا کہ اجتماعی معاملات پر عمر رسیدہ کو بات پہلے کرنی چاہیے۔

راوی حدیث: ﴿ عبداللہ بن سہل رضی اللہ عنہ ﴾ عبداللہ بن سہل بن زید بن کعب بن عامر انصاری حارثی۔ خیبر میں قتل کئے گئے اور ایک چشمہ میں پائے گئے کہ ان کی گردن توڑ دی گئی تھی۔

﴿ محیصہ رضی اللہ عنہ ﴾ ابوسعید محیصہ بن مسعود بن کعب الحارثی انصاری مدنی۔ عبداللہ بن سہل مقتول کے چچا زاد بھائی۔ مشہور و معروف صحابی ہیں۔ ہجرت سے پہلے اسلام قبول کیا۔ غزوات احد و خندق اور ان دونوں کے بعد کے تمام غزوات میں بھی شریک ہوئے۔ رسول اللہ ﷺ نے ان کو فدک کی طرف بھیجا تھا تاکہ ان کو اسلام قبول کرنے کی دعوت دیں۔

﴿ حویصہ رضی اللہ عنہ ﴾ محیصہ کے بڑے بھائی ۳ھ میں اسلام قبول کیا۔ احد اور خندق بلکہ باقی تمام غزوات میں رسول اللہ ﷺ کے ساتھ شریک رہے۔

﴿ عبدالرحمٰن بن سہل رضی اللہ عنہ ﴾ یہ عبداللہ بن سہل کے بھائی تھے۔ ان کی والدہ کا نام لیلیٰ بنت نافع بن عامر ہے۔ کہا جاتا ہے کہ یہ بدر و احد اور باقی تمام غزوات و مشاہدات میں شریک رہے۔ یہ وہ صاحب تھے جن کو سانپ نے ڈس لیا تھا۔ عمارہ بن حزم نے نبی ﷺ کے ارشاد کے مطابق ان کو جھاڑ پھونک کی۔ ابن حجر رحمہ اللہ نے اصابہ میں اس بارے میں تردد کا اظہار کیا ہے اور اسے بعید تصور کیا ہے۔

(۱۰۲۱) وَعَنْ رَجُلٍ مِّنَ الْأَنْصَارِ **ایک انصاری صحابی سے روایت ہے کہ رسول اللہ** رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، أَنَّ رَسُولَ اللهِ **ﷺ نے زمانہ جاہلیت کی قسامت کو برقرار رکھا اور**

ﷺ أَقَرَّ القَسَامَةَ عَلىٰ مَا كَانَتْ عَلَيْهِ فِي الجَاهِلِيَّةِ، وَقَضٰى بِهَا رَسُولُ اللهِ ﷺ بَيْنَ نَاسٍ مِّنَ الأَنْصَارِ، فِي قَتِيْلٍ ادَّعَوْهُ عَلَى اليَهُودِ. رَوَاهُ مُسْلِمٌ.

آپ ؐ نے اس کا فیصلہ انصار کے کچھ لوگوں کے درمیان ایک مقتول کے حق میں دیا۔ جس کا دعویٰ یہودیوں پر کیا گیا تھا۔ (مسلم)

حاصل کلام: اس حدیث سے زمانہ جاہلیت کی رسم قسامت کا علم ہوتا ہے۔ پھر اسی قسامت کو آپ ؐ نے برقرار رکھا۔ قسامت کا آغاز اس طرح ہوا کہ ایک قریشی نے ایک ہاشمی کو قتل کر دیا جب معاملہ سنگین صورت حال اختیار کر گیا تو قاتل نے انکار کر دیا کہ میں نے قتل نہیں کیا۔ اس موقع پر ابوطالب نے کھڑے ہو کر تین باتیں ان کے سامنے رکھیں کہ تینوں میں سے کوئی ایک منتخب کر لو یا تو ہمیں دیت ادا کر دو یا پچاس آدمیوں کی قسمیں دے دو یا ہم تجھے قتل کریں گے' ہمارا قاتل تو ہی ہے۔ اس روز سے قتل کے بارے میں قسامت کا رواج جاری ہوا اور آج تک جوں کا توں چلا آرہا ہے۔ اگر مدعا علیھم قسمیں دے دیں تو بالاتفاق ان پر کوئی دیت نہیں۔ اس معاملہ میں شریعت نے کافر کی قسم کو بھی تسلیم کیا ہے۔ یہ معلوم رہے کہ صرف مدعی کے کہنے پر قسموں کا آغاز نہیں ہوگا تاوقتیکہ دیگر شبہات اس کی تائید نہ کریں۔ اس حدیث سے معلوم ہوا کہ دور جاہلیت کی اچھی چیز کو اسلام نے برقرار رکھا۔

٣ - بَابُ قِتَالِ أَهْلِ البَغْيِ — باغی لوگوں سے جنگ و قتال کرنا

(١٠٢٢) عَنِ ابْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «مَنْ حَمَلَ عَلَيْنَا السِّلاَحَ فَلَيْسَ مِنَّا». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "جس کسی نے ہمارے خلاف ہتھیار اٹھایا۔ اس کا ہم سے کوئی تعلق نہیں۔" (بخاری و مسلم)

لغوی تشریح: ﴿باب القتال اہل البغی﴾' بغی کی با پر فتحہ اور غین ساکن۔ اس کے معنی ہیں ظلم اور حق وصداقت سے اعراض کرنا اور اس سے مراد مسلمان امراء اور ان کے خلفاء کے خلاف ان کی مسلمان رعایا کا خروج وبغاوت۔

حاصل کلام: اسلام مسلمانوں کو باہمی اخوت' محبت اور بھائی چارہ سے رہنے کا درس دیتا ہے۔ ایک دوسرے سے خیر خواہی اور ہمدردی کی تعلیم دیتا ہے۔ ایک دوسرے سے تعاون و تناصر کا سبق پڑھاتا ہے۔ اس حدیث میں مسلمان کا مسلمان کے خلاف اسلحہ کا استعمال کرنا اسلام کی تعلیم کے سراسر خلاف ہے۔ اسی لئے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "جو آدمی ہم پر ہتھیار اٹھائے اس کا ہمارے ساتھ کوئی تعلق نہیں۔" مسلمان کا کام تو امداد باہمی ہے نا کہ لڑائی کرنا' یہ معاملہ مسلمانوں کی باغی جماعت سے ہے۔ جو لوگ معاشرے کا امن و امان غارت کرنے کی سعی کریں ان سے قرآن کی رو سے لڑائی کرنا چاہئے تاوقتیکہ وہ اپنی

باغیانہ روش سے باز آجائیں۔ قرآن مجید میں ارشاد ہے "فقاتلوا التی تبغی حتی تفی الی امر اللہ" باغی گروہ سے اس وقت تک لڑو کہ وہ اپنی باغیانہ روش سے امر الٰہی کی طرف پلٹ آئیں۔ بکثرت احادیث بھی اس کی تائید میں ہیں۔

(١٠٢٣) وَعَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُ، عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ: «مَنْ خَرَجَ عَنِ الطَّاعَةِ، وَفَارَقَ الجَمَاعَةَ، وَمَاتَ، فَمِيتَتُهُ مِيتَةٌ جَاهِلِيَّةٌ». أَخْرَجَهُ مُسْلِمٌ.

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا "جس کسی نے امام کی اطاعت سے خروج کیا اور مسلمانوں کی جماعت سے جدا و الگ ہو گیا اور اسی حالت میں اس پر موت وارد ہو گئی تو اس کی یہ موت جاہلیت کی موت ہو گی۔" (مسلم)

لغوی تشریح: ﴿ من خرج عن الطاعۃ ﴾ یعنی امیر وقت کی اطاعت یا اس خلیفہ وقت کی اطاعت سے جس کی خلافت پر سب کا اتفاق ہے۔ خواہ وہ کسی علاقہ یا کسی مملکت میں ہو۔ ﴿ وفارق الجماعۃ ﴾ اس جماعت کو خیرباد کہہ دیا جو مسلمانوں کی جماعت ہے اور اس امیر کی اطاعت پر مجتمع و متفق ہے۔

حاصل کلام: اس حدیث کی رو سے آدمی مسلمانوں کی جماعت سے بعض اختلافات کی وجہ سے الگ ہو جائے۔ صرف علیحدگی ہی اختیار کی ہو' باغیانہ روش اختیار نہ کی تو اس کے اس طرز عمل کی بنا پر اس سے لڑائی نہیں کی جائے گی۔ اور اسے اس کے حال پر چھوڑے رکھا جائے تاوقتیکہ وہ باغیانہ طرز زندگی پر نکل کھڑا ہو۔ جب وہ ایسی روش پر چلے گا تو اس سے لڑائی کی جائے گی۔ یہ معلوم رہے کہ امیر کی اطاعت اس وقت تک فرض ہے جب تک وہ کسی صریح اور بالکل واضح حکم شریعت کے خلاف حکم نہ دے اور اس کی بیعت توڑنے کی اس وقت تک اجازت نہیں جب تک کہ صریح کفر و الحاد کے اختیار کرنے کا حکم نہ دے اور خود یہ کام نہ کرنے لگے۔ پابند شرح امیر و خلیفہ کی نافرمانی بغاوت ہے۔ لہٰذا جو ایسے امیر کی اطاعت سے نکل کر مسلمانوں سے الگ ہو جائے تو ایسے آدمی کی موت جاہلیت کی موت ہو گی۔ ایسی موت کو گمراہی کی موت تو کہہ سکتے ہیں کفر کی موت نہیں۔ اس حدیث سے معلوم ہوا کہ باغی مسلمانوں سے لڑنا جائز ہے۔ مگر یہ لڑنا حکومت کا کام ہے۔ انفرادی طور پر لڑنا تو معاشرے کے امن و امان کو تہہ و بالا کرنا ہے۔ جس کی اسلامی حکومت اجازت نہیں دے سکتی۔

(١٠٢٤) وَعَنْ أُمِّ سَلَمَةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهَا، قَالَتْ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «تَقْتُلُ عَمَّاراً الفِئَةُ البَاغِيَةُ». رَوَاهُ مُسْلِمٌ.

حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "عمار کو باغی گروہ قتل کرے گا۔" (مسلم)

لغوی تشریح: ﴿ عمارا ﴾ ابن یاسر وہ ہیں۔ یاسر مشہور و معروف صحابی کا لخت جگر ﴿ الفئۃ ﴾ "فا" کے نیچے کسرہ اور ہمزہ پر فتحہ۔ معنی اس کے ہیں جماعت گروہ۔

حاصل کلام: عام مؤرخین کا خیال ہے کہ عمار کو جنگ صفین کے روز امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے ساتھیوں نے قتل کیا ہے۔ حالانکہ حقیقت کچھ اس طرح ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ اور امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کو آپس میں لڑانے والا وہی باغیوں کا گروہ تھا جس نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو قتل کیا تھا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے لشکر میں باغیوں کا وہ گروہ موجود تھا اور حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ بھی حضرت علی رضی اللہ عنہ کے لشکر میں موجود تھے۔ دوران جنگ اسی باغی گروہ نے جو مسلمانوں کو آپس میں الجھا کر ہی رکھنا چاہتا تھا' نے حضرت عمار رضی اللہ عنہ کو بھی قتل کر دیا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی پیشین گوئی بھی اسی گروہ کے بارے میں ہے۔ اسی حدیث کی آڑ میں روافض اور ان کے کئی ہمنوا حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ پر طعن و تشنیع کرتے ہیں اور اسی دروازے سے وہ صحابہ ؓ کو برا بھلا کہنے سے بھی خوف نہیں کھاتے۔ اس معاملے میں بہت سنبھل کر بات کرنی چاہئے کیونکہ یہ صحابہ کرام ؓ کا معاملہ ہے۔ جن کے اللہ نے سارے گناہ معاف کر رکھے ہیں۔

(١٠٢٥) وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «هَلْ تَدْرِي، يَا ابْنَ أُمِّ عَبْدٍ! كَيْفَ حُكْمُ اللَّهِ فِيمَنْ بَغَى مِنْ هَذِهِ الأُمَّةِ؟» قَالَ: اللَّهُ وَرَسُولُهُ أَعْلَمُ، قَالَ: «لاَ يُجْهَزُ عَلَى جَرِيحِهَا، وَلاَ يُقْتَلُ أَسِيرُهَا، وَلاَ يُطْلَبُ هَارِبُهَا، وَلاَ يُقْسَمُ فَيْئُهَا». رَوَاهُ الْبَزَّارُ وَالحَاكِمُ، وَصَحَّحَهُ، فَوَهِمَ، لِأَنَّ فِي إِسْنَادِهِ كَوْثَرَ بْنِ حَكِيمٍ، وَهُوَ مَتْرُوكٌ.

وَصَحَّ عَنْ عَلِيٍّ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ مِنْ طُرُقٍ نَحْوُهُ مَوْقُوفاً. أَخْرَجَهُ ابْنُ أَبِي شَيْبَةَ وَالحَاكِمُ.

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "اے ام عبد کے بیٹے! کیا تجھے معلوم ہے کہ اس امت کے باغی کے متعلق اللہ تعالیٰ کا کیا حکم ہے؟" انہوں نے عرض کیا اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہی بہتر جانتے ہیں۔ آپ ؐ نے فرمایا "اس کے زخمیوں کو ختم نہیں کیا جائے گا اور نہ اس کے قیدیوں کو قتل کیا جائے گا اور نہ بھاگنے والے کا پیچھا و تعاقب کیا جائے گا اور نہ ہی اس کے مال غنیمت کو تقسیم کیا جائے گا۔" (اس روایت کو بزار اور حاکم دونوں نے روایت کیا ہے اور اسے صحیح قرار دیا ہے۔ مگر یہ حاکم کا وہم ہے اس لئے کہ اس کی سند میں کوثر بن حکیم متروک راوی ہے اور حضرت علی رضی اللہ عنہ سے موقوفاً اس کی مانند کئی طرق سے مروی ہے جو صحیح ہے۔ اسے ابن ابی شیبہ اور حاکم نے نکالا ہے)

لغوی تشریح: ﴿ یا ابن ام عبد ﴾ ابن ام عبد سے مراد عبداللہ بن مسعود ہیں کیونکہ وہ اسی نام سے مشہور ہیں۔ گویا ابن عمر رضی اللہ عنہما نے ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے یا نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو حدیث بیان فرماتے سنا ہے۔ (سبل) ﴿ لایجھز ﴾ یہ اور اس کے بعد کے افعال صیغۂ مجہول ہیں۔ یعنی زخمی پر سختی نہیں کی جائے گی اور نہ اسے قتل کیا جائے گا ﴿ ولا یقسم فیئھا ﴾ باغیوں کے اموال بطور مال غنیمت تقسیم نہیں کئے

جائیں گے۔

حاصل کلام: اس حدیث کی سند میں کوثر بن حکیم ایسا راوی ہے جس کے ضعیف ہونے پر سب کا اتفاق ہے۔ باغیوں سے نبرد آزما ہونے میں کسی کا اختلاف نہیں۔ بالاتفاق ان سے جنگ جائز ہے لیکن ان کے اموال' مویشی لوٹنے اور ان کے زخمیوں کو قتل کرنے اور مفرور کا تعاقب کرنے میں اختلاف ہے۔ تفصیل کیلئے سبل السلام ملاحظہ ہو۔

راوی حدیث: ﴿کوثر بن حکیم﴾ عطاء اور مکحول سے یہ بات ثابت ہے کہ کوفی حلب میں رہتا تھا۔ ابن معین کہتے ہیں کہ یہ کوئی شے نہیں۔ اور امام احمد کہتے ہیں کہ اس کی روایات باطل ہیں۔

(١٠٢٦) وَعَنْ عَرْفَجَةَ بْنِ شُرَيْحٍ قَالَ: سَمِعْتُ رَسُولَ اللهِ ﷺ يَقُولُ: «مَنْ أَتَاكُمْ، وَأَمْرُكُمْ جَمِيعٌ، يُرِيدُ أَنْ يُفَرِّقَ جَمَاعَتَكُمْ، فَاقْتُلُوهُ». أَخرَجَهُ مُسْلِمٌ.

حضرت عرفجہ بن شریح کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا "جو شخص تمہارے پاس آئے حالانکہ تم ایک امیر پر متفق ہو اور وہ تمہاری جماعت میں تفریق پیدا کرنا چاہتا ہو تو اسے قتل کر دو۔" (مسلم)

حاصل کلام: اس حدیث سے ثابت ہوا کہ جب سب مسلمان ایک شخص کو اپنا خلیفہ و حاکم مقرر کر لیں پھر جو مسلمانوں کے مابین تفریق و تشتت کیلئے سرگرمی دکھلائے اور مسلمانوں کے درمیان اختلاف پیدا کرنے کی کوشش کرے وہ واجب القتل ہے۔

راوی حدیث: ﴿عرفجہ بن شریح رضی اللہ عنہ﴾ عین پر فتحہ' فا پر فتحہ اور را ساکن۔ بعض نے ان کے باپ کا نام صریح یا طریح اور شریک و ذریح وغیرہ بھی ذکر کیا ہے۔ اشجع قبیلہ سے ہونے کی وجہ سے اشجعی کہلائے۔ مشہور صحابی ہیں۔ کوفہ میں سکونت اختیار کی۔

٤ - بَابُ قِتَالِ الجَانِي وَقَتْلِ المُرْتَدِّ

مجرم (بدنی نقصان پہنچانے والے) سے لڑنے اور مرتد کو قتل کرنے کا بیان

(١٠٢٧) عَنْ عَبْدِ اللهِ بن عمر رَضِيَ اللهُ تعالى عنهما قال: قال رسول الله ﷺ: «مَنْ قُتِلَ دُونَ مَالِهِ فَهُوَ شَهِيدٌ». رَوَاهُ أَبُو دَاوُدَ وَالنَّسَائِيُّ

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "جو کوئی اپنے مال کی حفاظت کرتا ہوا مارا جائے تو وہ شہید ہے۔" (اسے ابوداؤد' نسائی اور ترمذی نے روایت کیا ہے اور ترمذی نے اسے صحیح کہا

وَالتِّرْمِذِيُّ، وَصَحَّحَهُ۔ ہے۔)

لغوی تشریح: ﴿باب قتال الجانی ... الخ﴾ "جانی" - جنایۃ سے ماخوذ ہے یعنی جرم اور "جانی" مجرم کو کہتے ہیں۔ ﴿المرتد﴾ - اور مرتد۔ اسلام سے پھر جانے والے کو کہتے ہیں۔ ﴿دون مالہ﴾ دون مالہ کا مطلب ہے اپنے مال کی حفاظت اور اس کا دفاع کرتے ہوئے مارا جائے۔ اس حدیث میں یہ دلیل ہے کہ جو آدمی دوسرے کا مال و متاع سلب کرنے اور چھیننے کا ارادہ رکھتا ہو اس سے لڑنا جائز ہے اور مال کا مالک اگر اس دفاعی لڑائی میں مارا جائے تو وہ شہید ہے اور اگر مال کے مالک سے حملہ آور قتل ہو جائے تو اس پر نہ قصاص ہے اور نہ دیت دینا پڑتی ہے اور نہ کسی قسم کا گناہ و جرم ہے اور اگر یہ نہ ہو تو پھر مقاتلہ کی اجازت کے کوئی معنی ہی نہیں۔ امام مسلم رحمہ اللہ نے حضرت ابوھریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت بیان کی ہے کہ ایک شخص نے عرض کیا' بتایئے اگر کوئی آدمی میرا مال حاصل کرنے کے ارادہ سے آتا ہے؟ آپؐ نے فرمایا : تم اسے مت دو۔ اس نے پھر پوچھا اگر وہ میرے ساتھ لڑائی کرے؟ تو آپؐ نے فرمایا "تم اس سے لڑو" اس نے پھر عرض کیا اگر وہ مجھے قتل کر دے؟ تو آپؐ نے فرمایا "تم شہید ہو" اس نے پوچھا اگر میں اسے قتل کر دوں؟ تو فرمایا "وہ آگ میں داخل ہو گا" یہ حکم مالی معاملات میں ہے۔ مالیات کے علاوہ دوسرے معاملات میں بھی احادیث وارد ہیں۔ ان تمام روایات کا خلاصہ یہ ہے کہ جو شخص اپنے اہل و عیال اور اپنے مال و متاع اور اپنی جان' اپنے خون اور اپنے دین کی حفاظت کرتے ہوئے قتل کر دیا جائے وہ شہید ہے۔

(١٠٢٨) وَعَنْ عِمْرَانَ بْنِ حُصَيْنٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا قَالَ: قَاتَلَ يَعْلَى بْنُ أُمَيَّةَ رَجُلاً، فَعَضَّ أَحَدُهُمَا صَاحِبَهُ، فَانْتَزَعَ يَدَهُ مِنْ فَمِهِ، فَنَزَعَ ثَنِيَّتَهُ، فَاخْتَصَمَا إِلَى النَّبِيِّ ﷺ، فَقَالَ: «أَيَعَضُّ أَحَدُكُمْ أَخَاهُ، كَمَا يَعَضُّ الفَحْلُ؟ لاَ دِيَةَ لَهُ». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ، وَاللَّفْظُ لِمُسْلِمٍ.

حضرت عمران بن حصین رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ یعلیٰ بن امیہ رضی اللہ عنہ کی ایک شخص سے لڑائی ہو گئی۔ ایک نے دوسرے کو دانتوں سے کاٹا تو اس نے اپنا ہاتھ اس کے منہ سے کھینچ کر باہر نکالا تو اس کا سامنے کا دانت ٹوٹ کر گر گیا۔ دونوں اپنا جھگڑا نبی ﷺ کی عدالت میں لے گئے۔ تو آپؐ نے فرمایا کیا تم ایک دوسرے کو اس طرح کاٹ کھاتے ہو جس طرح نر اونٹ کاٹتا ہے۔ اس کیلئے کوئی دیت نہیں۔"

(بخاری و مسلم۔ اور یہ الفاظ مسلم کے ہیں)

لغوی تشریح: ﴿فعض﴾ عض یعض باب سمع سے ہے۔ اس نے اپنے دانتوں سے اسے کاٹا۔ "فنزع" زور سے ہاتھ کھینچنے کی وجہ سے اس کے سامنے کا دانت جڑ سے اکھڑ گیا۔

حاصل کلام: اس حدیث سے ثابت ہوا کہ کسی دوسرے شخص کی طرف سے نقصان اور ضرر کو دور کرنے کیلئے اگر کوئی جرم ہو جائے تو وہ جرم قابل مؤاخذہ نہیں۔ جمہور کا یہی مذہب ہے البتہ اس کیلئے دو

شرطیں ہیں ایک یہ کہ اس تکلیف سے جسم میں درد ہوتا ہو دوسری یہ کہ اس کے بغیر جان چھڑانے اور خلاصی پانے کی کوئی دوسری صورت نظر نہ آتی ہو گویا ان دونوں شرطوں میں سے اگر کوئی بھی نہ پائی جائے تو پھر اس صورت میں دیت ہوگی۔ (السبل)

(١٠٢٩) وَعَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ أَبُو القَاسِمِ ﷺ: «لَوْ أَنَّ امْرَأً اطَّلَعَ عَلَيْكِ بِغَيْرِ إِذْنٍ، فَحَذَفْتَهُ بِحَصَاةٍ، فَفَقَأْتَ عَيْنَهُ، لَمْ يَكُنْ عَلَيكَ جُنَاحٌ». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ. وَفِي لَفْظٍ لأَحْمَدَ وَالنَّسَائِيِّ، وَصَحَّحَهُ ابْنُ حِبَّانَ: «فَلاَ دِيَةَ لَهُ وَلاَ قِصَاصَ».

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ابوالقاسم ﷺ نے فرمایا "اگر کوئی مرد تیرے گھر بغیر اجازت کے جھانکے (نظر ڈالے) اور تو کنکری مار کر اس کی آنکھ پھوڑ دے تو تم پر کوئی گناہ نہیں۔" (بخاری و مسلم) احمد اور نسائی کے الفاظ ہیں جسے ابن حبان نے صحیح کہا ہے کہ "نہ اس کی دیت ہے اور نہ قصاص۔"

لغوی تشریح: ﴿ فحذفته بحصاة ﴾ تو اسے کنکری مارے۔ ﴿ ففقات عينه ﴾ اس کی آنکھ پھوڑ کر اسے کانا بنا دے۔ اگر کوئی اس غلطی کا ارتکاب کرے اور مالک مکان کنکری مار کر اس کی آنکھ پھوڑ دیں تو اس پر نہ قصاص ہے اور نہ ہی دیت ہے۔ کیونکہ اس شخص نے دوسرے کی پردہ داری کو نقصان پہنچایا اور مالک مکان کی خلوت و تنہائی میں دخل اندازی کی ہے۔ ائمہ ثلاثہ کا یہی مذہب ہے۔ البتہ امام مالک رحمہ اللہ اس کی دیت دینے کے قائل ہیں مگر یہ صحیح نہیں۔

(١٠٣٠) وَعَنِ البَرَآءِ بْنِ عَازِبٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُمَا، قَالَ: قَضٰى رَسُولُ اللهِ ﷺ أَنَّ حِفْظَ الحَوَآئِطِ بِالنَّهَارِ عَلىٰ أَهْلِهَا، وَأَنَّ حِفْظَ المَاشِيَةِ بِاللَّيْلِ عَلىٰ أَهْلِهَا، وَأَنَّ عَلىٰ أَهْلِ المَاشِيَةِ مَا أَصَابَتْ مَاشِيَتُهُمْ بِاللَّيْلِ. رَوَاهُ أَحْمَدُ وَالأَرْبَعَةُ، إِلاَّ التِّرمِذِيَّ، وَصَحَّحَهُ ابْنُ حِبَّانَ، وَفِي إِسْنَادِهِ اخْتِلاَفٌ.

حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فیصلہ فرمایا کہ "دن کے اوقات میں باغوں کی حفاظت و نگرانی مالکان باغ کریں اور رات کے اوقات میں مویشیوں کی حفاظت و نگرانی مالکان مویشی کریں۔ رات کے اوقات میں جس قدر مویشی کسی کا نقصان کریں گے اس کا تاوان مویشیوں کے مالکان پر ہوگا۔" (اس حدیث کو احمد اور ترمذی کے علاوہ چاروں نے روایت کیا ہے اور ابن حبان نے اسے صحیح کہا ہے تاہم اس کی سند میں اختلاف ہے)

لغوی تشریح: ﴿ الحوائط ﴾ یعنی باغات۔ امام نووی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ علماء کا اس پر اجماع ہے کہ جانور دن کے اوقات میں جو نقصان کریں اس کا کوئی تاوان نہیں۔ البتہ اگر ان جانور کے ساتھ سوار ہو یا

ان جانوروں کے آگے پیچھے آدمی ہو تو اس صورت میں جمہور علماء بقدر نقصان تاوان کے قائل ہیں اور اگر نقصان رات کو کیا ہو تو امام مالک رحمہ اللہ کے قول کے مطابق بقدر نقصان تاوان و ضمان جانوروں کے مالک کو ادا کرنا ہو گا اور امام شافعی رحمہ اللہ اور ان کے اصحاب کا قول ہے کہ ضمان و تاوان اس صورت میں ہو گا جب مویشیوں کے مالک نے ان کی حفاظت میں کوتاہی و کمی کی ہو گی۔ بصورت دیگر نہیں۔ دن اور رات کے تاوان میں اس لئے فرق کیا گیا ہے کہ بالعموم باغوں کے مالک دن کے اوقات میں خود حفاظت کرتے ہیں اور مویشیوں کے مالک ان کی حفاظت رات کے اوقات میں۔ پس جس نے اس عادت کی مخالفت کی تو وہ حفاظت کی راہ و رسم سے خارج ہو گا۔ سبل السلام میں ہے کہ مالکیہ یہ قید لگاتے ہیں کہ جب مویشیوں کو ان کے چرنے کی مقررہ جگہوں میں چرنے کیلئے چھوڑا جائے تو ضمان نہیں۔ رہا اس وقت جبکہ وہ کاشت شدہ زمین میں چھوڑا جائے اور ان کے چرنے کی جگہ نہ ہو تو پھر ایسی صورت میں وہ دن اور رات میں ضامن ہوں گے۔

(١٠٣١) وَعَنْ مُعَاذِ بْنِ جَبَلٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُ - فِيْ رَجُلٍ أَسْلَمَ، ثُمَّ تَهَوَّدَ -: لاَ أَجْلِسُ حَتَّى يُقْتَلَ، قَضَاءُ اللهِ وَرَسُولِهِ، فَأُمِرَ بِهِ فَقُتِلَ. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ، وَفِي رِوَايَةٍ لِأَبِيْ دَاوُدَ: «وَكَانَ قَدِ اسْتُتِيْبَ قَبْلَ ذٰلِكَ».

حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ سے ایسے شخص کے متعلق جو پہلے اسلام لایا پھر یہودی ہو گیا' تھا مروی ہے کہ میں اس وقت تک نہیں بیٹھوں گا تاوقتیکہ اس کو قتل کر دیا جائے۔ یہ اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا فیصلہ ہے۔ چنانچہ اس کے قتل کا حکم دیا گیا اور اسے قتل کر دیا گیا۔ (بخاری و مسلم) ابوداؤد کی روایت میں ہے کہ اسے قتل سے پہلے توبہ کرنے کے لئے کہا گیا۔

لغوی تشریح: ﴿ ثم تھود ﴾ باب تفعل سے ہے۔ یعنی اسلام سے مرتد ہو کر یہودی بن گیا۔ ﴿ لا اجلس ﴾ اس حدیث میں حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کے نہ بیٹھنے کا قصہ بیان ہوا ہے جو یہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت معاذ رضی اللہ عنہ سے پہلے حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کو یمن پر عامل (گورنر) بنا کر بھیجا۔ ان کے پیچھے حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کو بھی بھیج دیا۔ جب حضرت معاذ رضی اللہ عنہ ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ اشعری کے پاس پہنچے تو انہوں نے معاذ رضی اللہ عنہ کو سواری سے نیچے اترنے کیلئے کہا اور ان کیلئے تکیہ لگایا۔ تو انہوں نے دیکھا کہ ان کے پاس ایک آدمی بندھا ہوا ہے۔ حضرت معاذ رضی اللہ عنہ نے دریافت کیا کہ یہ کون ہے یا یہ کیا ماجرا ہے؟ حضرت ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ نے کہا کہ یہ شخص پہلے یہودی تھا پھر مسلمان ہوا مگر اب پھر یہودی ہو گیا ہے اور گندے دین کی طرف پلٹ گیا ہے۔ حضرت معاذ رضی اللہ عنہ نے اس موقع پر فرمایا تھا کہ میں اس وقت تک نہیں بیٹھوں گا جب تک اسے قتل نہ کر دیا جائے گا اور ابوداؤد میں ہے کہ میں اپنی سواری سے اس وقت تک نیچے نہیں اتروں گا جب تک اسے قتل نہیں کر دیا جائے گا۔ یہ اللہ اور اس کے رسول کا فیصلہ ہے۔ یہ معنی اس صورت میں ہے جب "قضاء اللہ و رسولہ" کو مرفوع پڑھا جائے۔ اس صورت میں یہ خبر ہو گی' مبتداء

محذوف ہوگا جو اس طرح ہوگا کہ یہ اللہ اور اس کے رسول کا فیصلہ و فرمان ہے اور یہ رسول اللہ ﷺ کے ارشاد "من بدل دینہ فاقتلوہ" کی جانب اشارہ تھا اور نصب بھی جائز ہے اس صورت میں یہ مصدر ہوگا اور اس کا فعل محذوف ہوگا۔ ﴿ استتیب ﴾ صیغۂ مجہول یعنی اس سے اسلام کی جانب رجوع کرنے' پلٹ آنے کا مطالبہ کیا جائے گا۔

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ مرتد کو سزائے ارتداد سے پہلے توبہ کا موقع دیا جائے گا اور اسے توبہ کیلئے باقاعدہ کہا جائے گا۔ جمہور علماء کے نزدیک ایسا کرنا واجب ہے۔ مگر بعض دوسرے علماء اور ظاہریہ اسے واجب تسلیم نہیں کرتے۔ اس حدیث میں لفظ من عام ہے یعنی مرتد مرد ہو یا عورت دونوں کو پلٹ آنے کی دعوت دینے کے بعد ان کے انکار پر مصر رہنے کی صورت میں قتل کر دیا جائے گا۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے عہد میں بھی عورت کو اس کے ارتداد کی سزا میں قتل کیا گیا۔ اس وقت کثیر صحابہ کرامؓ موجود تھے کسی نے اعتراض نہیں کیا۔ جو اس بات کی دلیل ہے کہ مرتد کے قتل پر صحابہ کرامؓ کا اجماع ہے۔ اس واقعہ سے درج ذیل مسائل بھی ثابت ہوتے ہیں:

(۱) عاملوں (گورنروں) کا تقرر امیر ریاست کو کرنے کا حق حاصل ہے۔ (۲) ایک وقت میں دو عاملوں کا تقرر بھی جائز ہے۔ (۳) گورنر کا فرض ہے کہ مرتد کو سزائے ارتداد دے اور شرعی حدود نافذ کرے۔ (۴) اپنی تقرری کی جگہ سواری پر جانا ثابت ہے۔ (۵) مرکز سے مقرر کردہ گورنر و وزیر کا احترام بھی کرنا چاہیئے۔ (۶) شرعی سزا کے نفاذ میں تاخیر نہیں کرنی چاہیئے جبکہ تحقیق و تفتیش کی کارروائی مکمل ہو چکی ہو۔ (۷) مجرم کو جکڑنا جائز ہے۔ (۸) سزا کا اجرا و نفاذ لوگوں کی موجودگی میں کرنا چاہیئے تا کہ عبرت حاصل ہو۔

(۱۰۳۲) وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا، قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «مَنْ بَدَّلَ دِينَهُ فَاقْتُلُوهُ». رَوَاهُ الْبُخَارِيُّ.

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "جو شخص اپنا دین بدل لے اسے قتل کر دو۔" (بخاری)

حاصل کلام: یہ حدیث بھی صریح اور واضح دلیل ہے کہ مرتد کی سزا شرعاً قتل ہے۔ خواہ وہ مرد ہے یا عورت۔ اب اگر کوئی علی الاعلان مرتد ہو جائے تو عدالت اس کے ثبوت کے بعد قتل کی سزا دے گی اور اسے قتل کر دیا جائے گا البتہ اگر وہ ظاہری نہیں بلکہ اندرونی طور پر مرتد ہے اس کے ارتداد کا علم نہیں تو اسے قتل کی سزا نہیں دی جائے گی اور اگر اس کو بزور اور جبراً کلمۂ کفر کہنے پر مجبور کیا جائے تو ایسی صورت میں بھی ایسا شخص مستوجب سزا نہیں۔

(۱۰۳۳) وَعَنْهُ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا، أَنَّ أَعْمَى كَانَتْ لَهُ أُمُّ وَلَدٍ، تَشْتِمُ النَّبِيَّ ﷺ، وَتَقَعُ فِيهِ، فَيَنْهَاهَا،

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما ہی سے مروی ہے کہ ایک نابینا شخص تھا' اس کی ایک ام ولد لونڈی رسول اللہ ﷺ کو گالی دیتی اور برا بھلا کہتی تھی۔ وہ نابینا صحابیؓ

فَلاَ تَنْتَهِيْ، فَلَمَّا كَانَ ذَاتَ لَيْلَةٍ أَخَذَ الْمِعْوَلَ، فَجَعَلَهُ فِي بَطْنِهَا، وَاتَّكَأَ عَلَيْهَا، فَقَتَلَهَا، فَبَلَغَ ذٰلِكَ النَّبِيَّ ﷺ، فَقَالَ: «أَلاَ اشْهَدُوا أَنَّ دَمَهَا هَدَرٌ». رَوَاهُ أَبُو دَاوُدَ، وَرُوَاتُهُ ثِقَاتٌ.

اسے منع کرتے مگر وہ باز نہ آتی۔ ایک رات انہوں نے کدال لے کر اس کے پیٹ پر رکھ کر اس پر اپنا بوجھ ڈال کر دبایا اور اسے قتل کر دیا۔ یہ بات نبی ﷺ تک پہنچی تو آپؐ نے فرمایا ''تم گواہ رہو اس کا خون رائیگاں اور بیکار گیا۔''

(ابوداؤد۔ اس کے راوی ثقہ ہیں)

لغوی تشریح: ﴿ وتقع فيه ﴾ یہ لفظ ایسے موقع پر بولتے ہیں جب کسی پر عیب لگایا جائے اور اس کی مذمت کی جائے ﴿ المعول ﴾ میم پر کسرہ اور عین ساکن اور واؤ پر فتحہ۔ کدال جس سے زمین کھودی جاتی ہے اور ایک قول یہ ہے کہ یہ چھوٹی سی تلوار ہوتی ہے جسے آدمی اپنے کپڑوں کے نیچے چھپا سکتا ہے اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ لوہے کا دھاری دار کاٹنے والا چوڑا ہتھیار ہوتا ہے اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ ایسا کوڑا ہوتا ہے جس کے اندر چھوٹی سی یعنی پتلی تلوار ہوتی ہے۔ حملہ آور اسے اپنی کمر کے ساتھ مضبوطی سے باندھتا ہے تاکہ لوگوں کو اس کے ذریعہ دھوکہ دے سکے۔ ﴿ اتكا عليها ﴾ اس پر اپنا بوجھ ڈال دیا۔ ﴿ هدر ﴾ باطل قرار پایا۔ نہ اس کی کوئی دیت اور نہ قصاص۔

حاصل کلام: اس حدیث سے ثابت ہوا کہ رسول اللہ ﷺ کو گالی دینے والے کی سزا قتل ہے بلکہ امام ابن المنذر نے کہا ہے کہ اس پر تمام امت کا اجماع ہے کہ رسول اللہ ﷺ کو گالی دینے والا واجب القتل ہے۔ اسی طرح ذمی غیر مسلم بھی اگر یہ جرم کرے تو اس کی سزا بھی یہی ہے اور بعض علماء نے کہا ہے کہ ایسے شخص کو توبہ کی مہلت بھی نہیں دینی چاہئے۔

١٠ - كِتَابُ الْحُدُوْدِ

حدود کے مسائل

١ - بَابُ حَدِّ الزَّانِي

زانی کی حد کا بیان

(١٠٣٤) عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ وَزَيْدِ بْنِ خَالِدٍ الجُهَنِيِّ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا، أَنَّ رَجُلاً مِّنَ الأَعْرَابِ أَتَى رَسُولَ اللهِ ﷺ، فَقَالَ: يَا رَسُولَ اللهِ! أَنْشُدُكَ بِاللهِ إِلاَّ قَضَيْتَ لِيْ بِكِتَابِ اللهِ! فَقَالَ الآخَرُ - وَهُوَ أَفْقَهُ مِنْهُ -: نَعَمْ، فَاقْضِ بَيْنَنَا بِكِتَابِ اللهِ، وَائْذَنْ لِيْ، فَقَالَ: قُلْ، قَالَ: إِنَّ ابْنِيْ كَانَ عَسِيْفاً عَلَىٰ هٰذَا، فَزَنَى بِامْرَأَتِهِ، وَإِنِّي أُخْبِرْتُ أَنَ عَلَى ابْنِي الرَّجْمُ، فَافْتَدَيْتُ مِنْهُ بِمِائَةِ شَاةٍ وَوَلِيْدَةٍ، فَسَأَلْتُ أَهْلَ العِلْمِ، فَأَخْبَرُونِي أَنَّ عَلَى ابْنِي جَلْدَ مِائَةٍ وَتَغْرِيْبُ عَامٍ، وَأَنَّ عَلَى امْرَأَةِ هٰذَا الرَّجْمَ. فَقَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: **«وَالَّذِي نَفْسِي بِيَدِهِ لأَقْضِيَنَّ بَيْنَكُمَا بِكِتَابِ اللهِ، الوَلِيدَةُ وَالغَنَمُ**

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ اور زید بن خالد جہنی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک دیہاتی آدمی رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا' اے اللہ کے رسول (ﷺ)! میں آپ کو اللہ کی قسم دے کر عرض کرتا ہوں کہ آپ کتاب اللہ کے مطابق میرا فیصلہ فرمائیں اور دوسرا جو اس کے مقابل میں زیادہ سمجھدار اور دانا تھا' نے بھی کہا کہ ہمارے درمیان آپ کتاب اللہ کے مطابق فیصلہ فرمائیں اور مجھے کچھ عرض کرنے کی اجازت دیں۔ آپ نے فرمایا "بیان کرو۔" وہ بولا' میرا بیٹا اس کے ہاں مزدوری پر کام کرتا تھا' اس کی اہلیہ سے زنا کا مرتکب ہوگیا اور مجھے خبر دی گئی کہ میرے بیٹے پر رجم کی سزا ہے تو میں نے اس کے فدیے میں (بدلے میں) ایک سو بکریاں اور ایک لونڈی دے کر اس کی جان چھڑائی۔ اس کے بعد میں نے اہل علم حضرات سے دریافت کیا تو انہوں نے مجھے بتایا کہ میرے بیٹے کی سزا سو کوڑے اور ایک سال کی جلا وطنی ہے اور اس عورت کو

رَدٌّ عَلَيْكَ، وَعَلَى ابْنِكَ جَلْدُ مِائَةٍ وَتَغْرِيبُ عَامٍ، وَاغْدُ يَا أُنَيْسُ! إِلَى امْرَأَةِ هٰذَا، فَإِنِ اعْتَرَفَتْ فَارْجُمْهَا». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ، وَهٰذَا اللَّفْظُ لِمُسْلِمٍ.

سزائے رجم ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے! میں تم دونوں کے درمیان کتاب اللہ کے عین مطابق ہی فیصلہ کروں گا۔ لونڈی اور بکریاں تمہیں واپس لوٹائی جائیں گی اور تیرے بیٹے کی سزا سو کوڑے اور سال بھر کی جلا وطنی ہے۔ اے انیس! تم اس آدمی کی اہلیہ کے پاس جاؤ (اور اس سے پوچھو) اگر وہ اس کا اعتراف کرلے تو اسے سنگسار کردو۔"
(بخاری و مسلم اور یہ الفاظ مسلم کے ہیں)

لغوی تشریح: ﴿ کتاب الحدود ﴾ حدود ۔ حد کی جمع ہے۔ حد کے معنی ہیں۔ دو چیزوں کے درمیان حائل چیز جو ایک کو دوسری کے ساتھ ملنے سے مانع ہو۔ اور یہ لفظ تقدیر اور کسی مسئلے کے اختتام اور انتہاء کے لئے بھی مستعمل ہے اور شرعاً اس کا اطلاق ان احکام پر ہوتا ہے جن میں کوئی چیز مقرر و متعین ہو اور معاصی اور عقوبات پر اس کا اطلاق ہوتا ہے۔ یعنی وہ سزائیں جو معلوم گناہوں پر مقرر و متعین ہیں اور یہاں یہی آخری معنی مراد ہیں۔ ان سزاؤں کو حدود اس لئے کہا گیا ہے کہ جرم کا ارتکاب کرنے والے کو یہ سزائیں دوبارہ جرم کرنے سے روکنے کا سبب بنتی ہیں اور دوسرے شخص بھی اس سے عبرت حاصل کرتے ہیں اور جرم کے ارتکاب سے باز رہتے ہیں۔ ﴿ انشدک ﴾ باب نصر ینصر سے صیغہ متکلم ہے۔ مؤلف نے اس کے معنی یہ بیان کئے ہیں کہ میں آپ سے اللہ کے واسطہ سے سوال کرتا ہوں اور انشدک میں دراصل ضمناً اذکرک کے معنی ہیں اور "با" کو حذف کردیا گیا ہے معنی یہ ہوا کہ میں بآواز بلند آپ سے گزارش کرتا ہوں۔ پھر بعد میں ہر مطلوب مؤکد کے سلسلہ میں استعمال کیا گیا ہے خواہ آواز بلند ہو یا نہ ہو۔ ﴿ الا قضیت لی بکتاب اللہ ﴾ اس میں استثناء کے بعد فعل کا استعمال مصدری معنی میں کیا گیا ہے اور اس عبارت میں کچھ مقدر ہے اور معنی یہ ہوئے کہ میرا سوال آپ سے صرف یہ ہے کہ آپ فیصلہ کتاب اللہ کے مطابق فرمادیں یا یہ معنی کہ میں اللہ کا نام لے کر آپ سے درخواست کرتا ہوں کہ آپ فیصلہ کے علاوہ اور کوئی کام نہ کریں اور کتاب اللہ سے اس کی مراد یہ تھی کہ اللہ تعالیٰ نے اس کے بارے میں کیا حکم ارشاد فرمایا ہے اور اپنے بندوں کو کیا حکم فرض فرمایا ہے؟ ﴿ واذن لی ﴾ مجھے بیان کرنے کی اجازت مرحمت فرمائیں۔ ﴿ عسیفا علی ھذا ﴾ اس کے ہاں مزدور تھا اس کا کام کرتا تھا اور گھریلو ضروریات و حوائج میں خدمت انجام دیتا تھا۔ ﴿ فا فتدیت منہ ﴾ یعنی میں نے اپنے بیٹے کا فدیہ دے دیا سزائے رجم کے بدلے۔ ﴿ بمائۃ شاۃ وولیدۃ ﴾ یعنی اپنے بچے کی سزائے رجم کے عوض میں نے سو بکریاں اور لونڈی اس عورت کے شوہر کو دے دی ہیں۔ ﴿ جلد مائۃ ﴾ جلد کی جیم پر فتحہ

یعنی سو کوڑوں کی مار۔ یہ سزا اس کی اس لئے تھی کہ وہ شادی شدہ نہیں تھا۔ ﴿ وتغریب عام ﴾ سال بھر کی جلا وطنی و شہربدری۔ ﴿ ردعلیک ﴾ تیری طرف واپس لوٹا دی جائیں گی۔ ﴿ وراغد ﴾ غدو سے ماخوذ ہے۔ دال پر ضمہ۔ امر کا صیغہ ہے اور دراصل تو صبح سویرے جانے کیلئے ہے مگر پھر مطلق جانے کیلئے استعمال کیا جانے لگا۔ ﴿ یا انیس ﴾ انیس' انیس سے تصغیر ہے۔ ان کا اصل نام انیس بن ضحاک اسلمی تھا۔

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ شادی شدہ زانی کی سزا رجم ہے اور غیر شادی شدہ کی سزا سو کوڑے اور ایک سال کی جلا وطنی ہے۔ علمائے احناف جلا وطنی کے قائل نہیں۔ مگر یہ صریح اور صحیح حدیث ان کے خلاف ہے۔ زنا کے نتیجے میں رقم دے کر راضی نامہ کرنا بھی بہرنوع غلط ہے کہ عزت و مصلحت کا تحفظ روپے سے نہیں بلکہ حدود سے ہے۔

(۱۰۳۵) وَعَنْ عُبَادَةَ بْنِ الصَّامِتِ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «خُذُوا عَنِّي، خُذُوا عَنِّي، فَقَدْ جَعَلَ اللَّهُ لَهُنَّ سَبِيلاً، الْبِكْرُ بِالْبِكْرِ جَلْدُ مِائَةٍ وَنَفْيُ سَنَةٍ، وَالثَّيِّبُ بِالثَّيِّبِ جَلْدُ مِائَةٍ وَالرَّجْمُ». رَوَاهُ مُسْلِمٌ.

حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "(احکام شریعت) مجھ سے حاصل کر لو۔ (احکام معاشرت) مجھ سے حاصل کر لو۔ اللہ تعالیٰ نے ان عورتوں کیلئے راستہ واضح کر دیا ہے۔ کنوارہ لڑکا کنواری لڑکی سے زنا کرے تو اس کی سزا سو کوڑے اور ایک سال بھر کی جلا وطنی اور اگر شادی شدہ عورت کے ساتھ شادی شدہ زنا کرے تو اس کی سزا سو کوڑے اور رجم۔" (مسلم)

لغوی تشریح: ﴿ خذوا عنی خذوا عنی ﴾ یعنی مجھ سے زنا کا حکم حاصل کر لو۔ ﴿ فقد جعل الله لهن سبیلا ﴾ اللہ نے ان کا راستہ واضح کر دیا ہے۔ یہ آپ ؐ نے اس لئے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو زانیوں کے بارے میں امرالٰہی کا انتظار کرنے کا حکم دیا تھا چنانچہ فرمایا:

والـلاتی یاتین الفاحشہ من نسائکم فاستشهدوا علیهن اربعه منکم فان شهدوا فامسکوهن فی البیوت حتی یتوفاهن الموت اویجعل الله لهن سبیلا ۴ : ۱۵

تمہاری جو عورتیں زنا کی مرتکب ہوں تو ان کے خلاف اپنے میں سے چار گواہ لاؤ۔ اگر وہ گواہی دے دیں تو ان کو گھروں میں روکے رکھو تاوقتیکہ ان کو موت آ جائے یا اللہ تعالیٰ ان کیلئے کوئی راستہ پیدا فرما دے۔ اس آیت میں مسلمانوں کو انتظار کا حکم دیا ہے اسی بنا پر حضور ﷺ نے فرمایا کہ "مجھ سے حاصل کر لو۔" ﴿ البکر بالبکر ﴾ یعنی جب کنوارہ کنواری سے زنا کرے تو ان میں سے ہر ایک کی سزا سو کوڑے اور سال بھر کی جلا وطنی النفی کے معنی جلا وطنی ہے۔ مطلب یہ کہ اس مرد کو شہربدر کر دیا جائے اور اسی طرح ﴿ الثیب بالثیب الخ ﴾ کا معنی ہے کہ شادی شدہ لڑکا جب شوہر دیدہ عورت سے زنا کرے تو

ان میں سے ہر ایک کیلئے سو کوڑوں کی سزا اور حد رجم اور اس حدیث سے یہ معلوم ہوا کہ کنوارہ جب شوہر دیدہ سے زنا کرے تو کنوارے کی سزا تو کوڑے اور شوہر دیدہ عورت کی سزا رجم ہے۔ یہ بھی علم میں رہے کہ شادی شدہ کی حد صرف رجم ہی نہیں بلکہ پہلے کوڑے مارے جائیں پھر رجم کیا جائے گا۔ ایک گروہ کی یہی رائے ہے لیکن جمہور کے نزدیک شادی شدہ کی سزا صرف رجم ہی ہے۔ ان کی دلیل ماعز اسلمی اور غامدیہ اور یہودیہ کے واقعہ سے ہے۔ پہلی روایت بھی اسی کی مؤید ہے۔

(١٠٣٦) وَعَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، قَالَ: أَتَى رَجُلٌ مِّنَ الْمُسْلِمِيْنَ رَسُولَ اللهِ ﷺ، وَهُوَ فِي الْمَسْجِدِ، فَنَادَاهُ، فَقَالَ: يَا رَسُولَ اللهِ! إِنِّي زَنَيْتُ، فَأَعْرَضَ عَنْهُ، فَتَنَحَّى تِلْقَآءَ وَجْهِهِ، فَقَالَ يَا رَسُولَ اللهِ! إِنِّيْ زَنَيْتُ، فَأَعْرَضَ عَنْهُ، حَتَّى ثَنَّى ذٰلِكَ عَلَيْهِ أَرْبَعَ مَرَّاتٍ، فَلَمَّا شَهِدَ عَلىٰ نَفْسِهِ أَرْبَعَ شَهَادَاتٍ دَعَاهُ رَسُولُ اللهِ ﷺ، فَقَالَ: «أَبِكَ جُنُونٌ؟» قَالَ: لاَ، قَالَ: «فَهَلْ أَحْصَنْتَ؟» قَالَ: نَعَمْ، فَقَالَ النَّبِيُّ ﷺ: «اذْهَبُوا بِهِ، فَارْجُمُوهُ». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک مسلمان آدمی رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اس وقت آپؐ مسجد میں تشریف فرما تھے۔ بلند آواز سے کہنے لگا اے اللہ کے رسول (ﷺ)! میں نے زنا کیا ہے۔ آپؐ نے اس سے منہ پھیر لیا۔ وہ دوسری طرف سے گھوم کر پھر آپؐ کے سامنے آ گیا اور عرض کیا اے اللہ کے رسول (ﷺ)! میں نے زنا کیا ہے۔ آپؐ نے پھر اپنا رخ انور پھیر لیا۔ اس طرح اس شخص نے چار مرتبہ بار بار سامنے آکر اقرار کیا۔ اس طرح جب اس نے اپنے آپ پر چار مرتبہ گواہیاں دے دیں تو آپؐ نے اسے اپنے پاس بلایا اور پوچھا "کیا تو پاگل ہے؟" وہ بولا نہیں' آپؐ نے پھر فرمایا "کیا تو شادی شدہ ہے؟" اس نے کہا' ہاں! (میں شادی شدہ ہوں) تو پھر نبی ﷺ نے فرمایا "اسے لے جاؤ اور سنگسار کر دو۔" (بخاری و مسلم)

لغوی تشریح: ﴿ فتنحی تلقاء وجهه ﴾ جس طرف وہ تھا اس سے پھر کر اس جانب ہو گیا جو آپؐ کے رخ انور کے سامنے تھا۔ یہ آدمی ماعز بن مالک اسلمی تھا۔ انہوں نے ھزال اسلمی کی گود میں پرورش پائی تھی۔ اس کے قبیلہ کی ایک لڑکی سے انہوں نے زنا کا ارتکاب کیا تو ھزال نے اسے نبی ﷺ کی خدمت میں اس امید پر بھیج دیا کہ آپؐ اس کیلئے اس گناہ سے نکلنے کا کوئی راستہ پائیں گے۔ ﴿ حتی ثنی الخ ﴾ چار مرتبہ یکے بعد دیگرے آپؐ کے روبرو پیش ہوا اور یہ اقرار کرتا رہا کہ میں نے زنا کیا ہے۔ ﴿ احصنت ﴾ یہاں همزہ استفہام محذوف ہے یعنی آپ نے دریافت فرمایا کہ کیا تو شادی شدہ ہے؟

حاصل کلام: اس حدیث سے بعض نے یہ استدلال کیا ہے کہ جرم زنا کا اقرار چار مرتبہ ہے حالانکہ اس

حدیث میں تو صرف اتنا ہے کہ اس نے چار مرتبہ اقرار جرم کیا ہے۔ یہ کہاں سے معلوم ہوا کہ چار مرتبہ خود اقرار جرم شرط ہے؟ بلکہ سیاق تو اس پر دلالت کرتا ہے کہ نبی ﷺ نے تو اعراض صرف اس اقرار میں شبہ کی وجہ سے فرمایا تھا یا اس لئے فرمایا تھا کہ وہ اپنے قول سے رجوع کر لے اور جو معاملہ ابھی تک اللہ اور اس کے درمیان میں ہے' اس سے توبہ کر لے اور اسی لئے اس کے چار مرتبہ اقرار کو کافی نہیں سمجھا۔ بلکہ بعد ازاں اس کے سامنے چند سوالات بھی رکھے جن کا تعلق مختلف پہلوؤں سے تھا اور کئی شبہات نمایاں کئے اور اسے کئی کلمات کی تلقین کی جو اسے رجوع کرنے میں معاون و مددگار ثابت ہوئے۔ یہ اقرار اس لئے تھا کہ اس کا معاملہ بالکل متحقق ہو جائے اس میں کسی قسم کا شک و شبہ باقی نہ رہے۔ اس لئے اس حدیث سے اقرار جرم میں چار مرتبہ کو شرط قرار دینا محل نظر ہے۔

(١٠٣٧) وَعَنِ ابْنَ عَبَّاسِ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا، قَالَ: لَمَّا أَتَى مَاعِزُ بْنُ مَالِكٍ إِلىٰ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ لَهُ: «لَعَلَّكَ قَبَّلْتَ، أَوْ غَمَزْتَ، أَوْ نَظَرْتَ»، قَالَ: لاَ، يَا رَسُولَ اللهِ! رَوَاهُ الْبُخَارِيُّ.

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ ماعز بن مالک رضی اللہ عنہ جب نبی ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا تو آپؐ نے اس سے دریافت فرمایا۔ "شاید تو نے بوس و کنار کیا ہو یا چھیڑ چھاڑ کی ہو اور نظر بد ڈالی ہو۔" اس نے کہا' نہیں اے رسول اللہ (ﷺ)! (بخاری)

لغوی تشریح: ﴿ قبلت ﴾ تقبیل سے ہے۔ بوسہ لیا ہو گا تو نے ﴿ او غمزت ﴾ باب ضرب یضرب اور یہ آنکھ یا ابرو کے اشارہ کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ چھونے اور ہاتھ کے روکنے کے معنی میں بھی مستعمل ہے اور یہاں بھی ہاتھ سے چھیڑ چھاڑ مراد ہے اور بعض روایات سے اس کی تائید بھی ہوتی ہے۔

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ جب تک زانی صاف اور صریح الفاظ سے اقرار جرم اپنی آزادی و مرضی سے نہ کرے اور بیرونی و اندرونی کسی قسم کے دباؤ میں نہ ہو اس وقت تک اسے سنگسار کرنے کا حکم نہ دیا جائے۔

(١٠٣٨) وَعَنْ عُمَرَ بْنِ الْخَطَّابِ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، أَنَّهُ خَطَبَ، فَقَالَ: إِنَّ اللَّهَ بَعَثَ مُحَمَّداً بِالحَقِّ، وَأَنْزَلَ عَلَيْهِ الكِتَابَ، فَكَانَ فِيمَا أَنْزَلَ اللَّهُ عَلَيْهِ آيَةَ الرَّجْمِ، قَرَأْنَاهَا، وَوَعَيْنَاهَا، وَعَقَلْنَاهَا، فَرَجَمَ رَسُولُ اللهِ ﷺ، وَرَجَمْنَا بَعْدَهُ، فَأَخْشَى إِنْ

حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ انہوں نے خطاب فرمایا اور کہا کہ محمد ﷺ کو اللہ تعالیٰ نے حق و صداقت دے کر مبعوث فرمایا اور ان پر کتاب نازل فرمائی۔ جو کچھ آپؐ پر نازل فرمایا اس میں رجم کی آیت بھی نازل فرمائی تھی۔ ہم نے خود اسے پڑھا ہے اور اسے یاد بھی رکھا ہے اور اسے خوب سمجھا اور دل و دماغ میں محفوظ بھی رکھا ہے۔ پھر رسول

طَالَ بِالنَّاسِ زَمَانٌ أَنْ يَقُولَ قَآئِلٌ: مَا نَجِدُ الرَّجْمَ فِي كِتَابِ ٱللهِ، فَيَضِلُّوا بِتَرْكِ فَرِيْضَةٍ أَنْزَلَهَا اللَّهُ، وَأَنَّ الرَّجْمَ حَقٌّ فِي كِتَابِ اللهِ تَعَالىٰ عَلىٰ مَنْ زَنىٰ، إِذَا أَحْصَنَ، مِنَ الرِّجَالِ وَالنِّسَآءِ، إِذَا قَامَتِ الْبَيِّنَةُ، أَوْ كَانَ الْحَبْلُ، أَوِ ٱلاِعْتِرَافُ. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

اللہ ﷺ نے رجم کیا اور آپؐ کے بعد ہم نے بھی رجم کیا۔ مجھے اندیشہ ہے کہ کچھ زمانہ گزرنے کے بعد کہنے والے کہیں گے کہ کتاب اللہ میں ہم رجم کی سزا کا ذکر نہیں پاتے۔ اس طرح وہ ایسے فرض کے تارک ہو کر جسے اللہ تعالیٰ نے نازل فرمایا تھا' گمراہ ہو جائیں گے۔ حالانکہ رجم کی سزا کتاب میں حق ہے اس شخص کیلئے جس نے زنا کیا ہو۔ اس حالت میں جبکہ وہ شادی شدہ ہو' وہ خواہ مرد ہوں یا عورتیں جبکہ دلیل قائم ہو جائے یا حمل ہو یا خود اقرار کرے۔ (بخاری)

لغوی تشریح: ﴿ ایۃ الرجم ﴾ آیۃ کو مرفوع پڑھیں تو یہ کان کا اسم ہے اور اس کی خبر ظرف ہے۔ وہ آیت یہ تھی۔

الشیخ والشیخۃ اذا زنیا فارجموھما البتۃ نکالا من اللہ واللہ عزیز حکیم

ہم نے اسے حفظ کر لیا ﴿ وعقلناھا ﴾ ہم نے اسے خوب سمجھ لیا ﴿ ورجمنا بعدہ ﴾ رسول اللہ ﷺ کی اتباع و پیروی میں ہم نے بھی رجم کیا۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ آپؐ کے بعد اس پر اجماع ہوا ﴿ احصن ﴾ بالغ' عاقل کسی آزاد سے صحیح طور پر شادی کی ہو اور اپنی اہلیہ سے لذت صحبت حاصل کر چکا ہو ﴿ اذا قامت البینۃ ﴾ جب دلیل قائم ہو جائے یعنی چار شہادتیں مردوں کی ﴿ الحبل ﴾ یا حمل کا پایا جانا ﴿ او الاعتراف ﴾ یا پھر مجرم کا خود اقرار زنا۔

حاصل کلام: اس حدیث سے ثابت ہوا کہ زنا کا ثبوت تین طرح سے ہو سکتا ہے۔ چار شہادتیں ہوں تو جرم زنا ثابت ہو گا یا مجرم خود اقراری ہو کہ اس نے جرم کا ارتکاب کیا ہے یا عورت کا حاملہ ہونا اور اگر یہ صورت پیش آجائے کہ ایک عورت شادی شدہ بھی نہیں اور لونڈی بھی نہیں مگر حاملہ ہے تو اس صورت میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے علاوہ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ اور ان کے شاگرد کہتے ہیں کہ اس پر حد زنا نافذ ہو گی۔ مگر امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ اور امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک محض حمل سے حد جاری نہیں کی جائے گی۔ یہ حدیث مختلف صحابہ کرامؓ سے مروی ہے۔ حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ کی روایت میں ہے کہ سورۂ احزاب' سورۂ بقرہ کے برابر تھی جتنی اب موجود ہے اس کے علاوہ باقی منسوخ ہو گئی اور اس میں ہم پڑھتے رہے تھے کہ شادی شدہ مرد یا عورت جب زنا کریں تو ان کو سنگسار کر دو۔ بعد میں اس آیت کی تلاوت منسوخ ہو گئی اور حکم باقی رہا۔

(۱۰۳۹) وَعَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَ رَضِيَ

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے

اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ قَالَ: سَمِعْتُ رَسُولَ اللهِ ﷺ يَقُولُ: «إِذَا زَنَتْ أَمَةُ أَحَدِكُمْ، فَتَبَيَّنَ زِنَاهَا، فَلْيَجْلِدْهَا الحَدَّ، وَلاَ يُثَرِّبْ عَلَيْهَا، ثُمَّ إِنْ زَنَت فَلْيَجْلِدْهَا الحَدَّ، وَلاَ يُثَرِّبْ عَلَيْهَا، ثُمَّ إِنْ زَنَتِ الثَّالِثَةَ، فَتَبَيَّنَ زِنَاهَا، فَلْيَبِعْهَا، وَلَوْ بِحَبْلٍ مِنْ شَعَرٍ». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ، وَهٰذَا لَفْظُ مُسْلِمٍ.

رسول اللہ ﷺ سے سنا فرماتے تھے کہ ''جب تم میں سے کسی کی لونڈی زنا کی مرتکب ہو اور اس کا زنا نمایاں و ظاہر ہو جائے تو اسے چاہئے کہ اس لونڈی پر حد لگائے اور ملامت نہ کرے۔ (اس کے بعد) پھر اگر لونڈی زنا کا ارتکاب کرے تو اسے چاہئے کہ اس لونڈی پر حد لگائے اور اسے ملامت نہ کرے۔ (اس کے بعد) پھر اگر وہ لونڈی تیسری مرتبہ زنا کرے اور اس کا زنا ظاہر و نمایاں ہو جائے تو اسے فروخت کر دے خواہ بالوں سے بٹی ہوئی ایک رسی کے عوض میں ہی کیوں نہ ہو۔'' (بخاری و مسلم اور یہ الفاظ مسلم کے ہیں)

لغوی تشریح: ﴿فتبین﴾ پس ثابت ہو جائے۔ ﴿ولا یثرب علیھا﴾ تثریب سے ماخوذ ہے۔ ملامت کرنا' برا بھلا کہنا' ڈانٹ ڈپٹ کرنا' سختی سے جھڑکنا۔ ﴿فلیبعھا﴾ تیسری مرتبہ بھی حد قائم کرنے کے بعد پھر اسے فروخت کر دینا چاہئے۔ ﴿ولو بحبل من شعر﴾ خواہ اس کی کتنی حقیر سی قیمت لگے مثلاً بالوں کی رسی اس کی کوئی خاص قیمت نہیں ہوتی اس کے عوض فروخت کر دے اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس کے فروخت کرنے کا حکم اس احتمال کے پیش نظر دیا ہے کہ وہ لونڈی خریدار کے روبرو اپنے آپ کو پاک دامن ثابت کرے یا اس خوف کے پیش نظر کہ اسے' جب وہ دوبارہ زنا کرے گی تو اس کے وطن مالوف سے نکال باہر کیا جائے گا اور یہ وطن سے نکالا جانا اس پر شاق گزرے گا اور یہ توقع اور امید بھی ہے کہ جگہ کی تبدیلی سے حالت کی تبدیلی واقع ہو جائے کیونکہ مجاورت اطاعت اور نافرمانی میں اپنی تاثیر رکھتی ہے۔

حاصل کلام: اس حدیث کی رو سے اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کی حدیث سے جو آئندہ آنے والی ہے معلوم ہوا کہ لونڈی اور غلام پر اس کا مالک حد نافذ کر سکتا ہے اور آزاد کے مقابلہ میں ان پر آدھی سزا نافذ کی جائے گی۔ جیسا کہ اللہ سبحانہ و تعالیٰ نے فرمایا کہ ''فعلیھن نصف ما علی المحصنت من العذاب'' کہ ان پر پاک دامن آزاد عورت کی سزا سے نصف سزا ہے۔ اگر لونڈی شادی شدہ ہو تو اس پر حد نافذ کرنے میں اختلاف ہے کہ اس پر حد حکومت لگائے گی یا مالک۔ جمہور کہتے ہیں کہ اس پر اس صورت میں بھی مالک ہی حد لگائے گا اور امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کی رائے ہے کہ شادی شدہ لونڈی پر مالک حد لگانے کا مجاز نہیں کیونکہ اس صورت میں وہ صرف مالک کی لونڈی ہی نہیں دوسرے کی بیوی بھی ہے۔ اگر لونڈی کا خاوند بھی اسی مالک کا غلام ہو تو پھر مالک اس پر حد لگا سکتا ہے۔ لونڈی کیلئے ثبوت زنا کی وہی صورتیں ہیں

جو ایک آزاد شریف زادی کیلئے ہیں البتہ بعض حضرات کی یہ رائے بھی ہے کہ اگر لونڈی کے ارتکاب کی شہادتیں اور اقرار نہ ہو اور مالک کو یقین و وثوق ہو کہ لونڈی نے جرم زنا کا ارتکاب کیا ہے تو مالک اپنے یقین و وثوق کی بنیاد پر بھی حد نافذ کر سکتا ہے۔

(١٠٤٠) وعن عليٍّ رضي الله عنه قال: قال رسول الله ﷺ: «**أَقِيمُوا الحُدُودَ عَلَى مَا مَلَكَتْ أَيْمانُكُم**» رَوَاهُ أبو دَاوُدَ، وهو في مُسْلِمٍ مَوْقُوفٌ.

حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "اپنے قبضہ میں لونڈی غلام پر حدیں قائم کرو۔" (اسے ابوداؤد نے روایت کیا ہے اور مسلم میں یہ روایت موقوف ہے)

(١٠٤١) وَعَنْ عِمْرَانَ بْنِ حُصَيْنٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُما، أَنَّ ٱمْرَأَةً مِّنْ جُهَيْنَةَ أَتَتِ النَّبِيَّ ﷺ، وَهِيَ حُبْلىٰ مِنَ الزِّنَا، فَقَالَتْ: يَا نَبِيَّ اللهِ! أَصَبْتُ حَدًّا، فَأَقِمْهُ عَلَيَّ، فَدَعَا رَسُولُ اللهِ ﷺ وَلِيَّهَا، فَقَالَ: «**أَحْسِنْ إِلَيْهَا، فَإِذَا وَضَعَتْ فَأْتِنِي بِهَا**»، فَفَعَلَ، فَأَمَرَ بِهَا فَشُكَّتْ عَلَيْهَا ثِيَابُهَا، ثُمَّ أَمَرَ بِهَا فَرُجِمَتْ، ثُمَّ صَلَّى عَلَيْهَا، فَقَالَ عُمَرُ: أَتُصَلِّي عَلَيْهَا يَا نَبِيَّ اللهِ! وَقَدْ زَنَتْ؟ فَقَالَ: «**لَقَدْ تَابَتْ تَوْبَةً، لَوْ قُسِمَتْ بَيْنَ سَبْعِينَ مِنْ أَهْلِ المَدِيْنَةِ لَوَسِعَتْهُمْ، وَهَلْ وَجَدَتْ أَفْضَلَ مِنْ أَنْ جَادَتْ بِنَفْسِهَا لِلَّهِ تَعَالَى؟**». رَوَاهُ مُسْلِمٌ.

حضرت عمران بن حصین رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ جہنی قبیلہ کی ایک عورت نبی ﷺ کے پاس آئی اور وہ اس وقت زنا (کے فعل حرام) سے حاملہ تھی۔ اس نے کہا اے اللہ کے نبی (ﷺ)! میں حد کی مستحق ہوں لہٰذا آپؐ اس حد کو مجھ پر نافذ فرمائیں۔ رسول اللہ ﷺ نے اس کے ولی و سرپرست کو بلوایا اور اسے تلقین فرمائی کہ "اس کے ساتھ حسن سلوک کرو جب وہ وضع حمل سے فارغ ہو تو اسے میرے پاس لے آؤ۔" اس نے آپؐ کے فرمان کے مطابق عمل کیا۔ پھر آپؐ نے اس کے بارے میں حکم دیا۔ چنانچہ اس کے کپڑے مضبوطی سے باندھ دیئے گئے۔ پھر آپؐ نے اس کے متعلق حکم دیا اور اسے سنگسار کر دیا گیا پھر اس کی نماز جنازہ پڑھی تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ بول اٹھے 'اے اللہ کے نبی (ﷺ)! آپؐ اس کی نماز جنازہ پڑھتے ہیں حالانکہ یہ تو زنا کی مرتکب ہوئی ہے؟ آپؐ نے فرمایا "اس نے ایسی توبہ کی ہے کہ اگر اس کی توبہ اہل مدینہ کے ستر آدمیوں پر تقسیم کر دی جائے تو وہ سب پر وسیع ہو جائے گی۔ کیا تو نے اس سے بہتر آدمی دیکھا یا پایا ہے جس نے اللہ کیلئے اپنی جان کو اللہ کے سپرد کر دیا ہو۔" (مسلم)

لغوی تشریح: ﴿ ان امراۃ من جھینۃ ﴾ یہ خاتون غامدیہ کے نام سے مشہور و معروف ہے۔ جھینۃ تصغیر ہے۔ یہ بہت بڑا قبیلہ تھا اور "غامد" اس کی شاخ تھی۔ ﴿ فشکت ﴾ صیغہ مجہول۔ شدت کے وزن پر۔ مضبوطی سے اس کے جسم پر کپڑے باندھ دینا اس سے غرض یہ ہوتی ہے کہ پتھر جب اس پر پڑیں تو وہ برہنہ نہ ہو جائے یا جسم کا کوئی قابل ستر حصہ کھل نہ جائے۔ ﴿ ثم صلی علیھا ﴾ مبنی للمعلوم۔ یہ صریح نص ہے اس بارے میں کہ حضور ﷺ نے غامدیہ کی نماز جنازہ ادا فرمائی ہے۔ یہ اس قول کی تائید ہے جو امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ اور دوسرے اصحاب علم نے کہی ہے کہ جسے رجم کی سزا دی گئی ہو امام وقت اور دوسرے اصحاب فضیلت اس کی نماز جنازہ پڑھیں۔ مگر امام مالک رحمۃ اللہ علیہ اور امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے امام وقت اور اہل علم و فضل کیلئے مرحوم کا جنازہ پڑھنے کو مکروہ قرار دیا ہے البتہ عام مسلمانوں کو اس کا جنازہ پڑھنے کی اجازت ہے مگر یہ حدیث ان کے موقف کے خلاف ہے۔ ﴿ جادت بنفسھا ﴾ اس نے اپنی جان دے دی ہے اور جس طرح انسان اپنا مال دے دیتا ہے اور سخاوت کر دیتا ہے۔

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ حاملہ عورت پر زنا کی حد فوری طور پر نافذ نہیں کر دینی چاہئے۔ حمل تک بالاتفاق حد اس پر نافذ نہیں کرنی چاہئے۔ وضع حمل کے بعد بھی اگر نومولود کی پرورش کا کوئی ذمہ لے اور بچہ کو دودھ پلانے والی کا انتظام ہو تو پھر حد لگائی جائے گی۔ اگر ایسا بندوبست سردست نہ ہو سکے تو پھر دودھ چھڑانے تک نفاذ حد کا عمل مؤخر کیا جائے گا اور اگر کنواری عورت سے اس فعل کا ارتکاب ہوا ہو تب بھی وضع حمل تک حد نافذ نہیں کی جائے گی۔ اس عورت سے حسن سلوک سے پیش آنے کی تاکید ہے اس لئے کہ نادان رشتہ دار عورتیں اور بیوقوف مرد اسے طعن و تشنیع سے جینا دوبھر کر دیتے ہیں۔ شرعی سزا کے علاوہ اس قسم کا ناروا رویہ اور بے جا سلوک تو اسے جیتے جی زندہ درگور کر دینے کے مترادف ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ عورت کو رجم کرتے ہوئے اس کے ستر کا لحاظ کیا جائے۔ یہی وجہ ہے کہ علمائے امت نے مرد کو کھڑے کھڑے اور عورت کو گڑھے میں بٹھا کر سنگسار کرنے کا حکم دیا ہے۔ اس حدیث سے ثابت ہوا کہ رجم کی سزا یافتہ عورت ہو یا مرد دونوں کی نماز جنازہ پڑھنا مسنون ہے۔ جمہور علماء کے نزدیک عوام و خواص سبھی نماز جنازہ میں شریک ہوں۔ جیسا کہ پہلے ہم ذکر کر آئے ہیں۔

(۱۰۴۲) وَعَنْ جَابِرِ بْنِ عَبْدِ اللهِ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُمَا قَالَ: رَجَمَ النَّبِيُّ ﷺ رَجُلاً مِّنْ أَسْلَمَ، وَرَجُلاً مِّنَ اليَهُودِ، وَٱمْرَأَةً. رَوَاهُ مُسْلِمٌ وَقِصَّةُ رَجْمِ اليَهُودِيَّيْنِ فِي الصَّحِيحَيْنِ مِنْ حَدِيثِ ابْنِ عُمَرَ.

حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے اسلم قبیلہ کے ایک آدمی کو رجم کیا اور ایک یہودی مرد اور ایک عورت کو بھی۔ (مسلم۔ یہودی مرد و عورت کی سزائے رجم کا واقعہ ابن عمر رضی اللہ عنہما سے صحیحین میں منقول ہے)

لغوی تشریح: ﴿ رجلا من اسلم ﴾ اسلم قبیلہ کا ایک مرد اس سے مراد ماعز بن مالک اسلمی ہیں۔ ﴿

ورجلا من الیھود وامراۃ ﴾ ان میں سے یعنی یہود میں سے ہی ﴿ وقصۃ الیھودین ﴾ تثنیہ کا صیغہ ہے۔ ﴿ فی الصحیحین ﴾ یعنی بخاری و مسلم میں ان کے علاوہ یہ واقعہ مسانید اور سنن کی کتابوں میں بھی منقول ہے۔ جس کا خلاصہ یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی عدالت میں ایک یہودی مرد اور یہودی عورت کو پیش کیا گیا جنھوں نے زنا کیا تھا۔ آپؐ نے ان سے دریافت فرمایا کہ زانی کے متعلق تم لوگ تورات میں کیا حکم پاتے ہو؟ بولے ہم دونوں کا منہ کالا کر کے گدھے پر سوار کرتے ہیں اور دونوں کے منہ مخالف سمتوں میں کرتے ہیں اور دونوں کو گھماتے ہیں اور چکر لگواتے ہیں۔ آپ نے فرمایا ''اگر تم اپنے دعوے میں سچے ہو تو تورات لاؤ اور اسے پڑھو۔'' چنانچہ وہ تورات لے آئے اور اسے پڑھنا شروع کیا تاآنکہ جب وہ رجم والی آیت پر پہنچے تو اس کی تلاوت کرنے والے نوجوان نے اس آیت پر اپنا ہاتھ رکھ لیا جس میں رجم کا ذکر تھا اور آگے پیچھے سے عبارت پڑھنے لگا۔ آپؐ کے ساتھ عبداللہ بن سلام تھے۔ انہوں نے کہا، یارسول اللہ (ﷺ)! اسے فرمائیں کہ اپنا ہاتھ ذرا اٹھاؤ، اس نے اپنا ہاتھ اس جگہ سے اٹھایا تو اس کے نیچے آیت رجم موجود تھی چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے ان دونوں کو رجم کرنے کا فیصلہ فرمایا اور دونوں سنگسار کر دیئے گئے۔ علامہ ابن قیم رحمہ اللہ نے الھدیٰ میں کہا ہے کہ یہ فیصلہ اس بات کی دلیل ہے کہ اہل ذمہ جب اپنا فیصلہ کروانے کیلئے ہماری عدالت میں آئیں گے تو ہم اسلام کے حکم کے عین مطابق فیصلہ کریں گے اور اس سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ اہل ذمہ کی ایک دوسرے کے خلاف شہادت قبول کی جائے گی اور زنا میں صرف رجم کیا جائے گا۔ کوڑے کی سزا نہیں دی جائے گی۔

(۱۰۴۳) وَعَنْ سَعِيْدِ بْنِ سَعْدِ بْنِ عُبَادَةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: كَانَ فِي أَبْيَاتِنَا رُوَيْجِلٌ ضَعِيْفٌ، فَخَبُثَ بِأَمَةٍ مِّنْ إِمَآئِهِمْ فَذَكَرَ ذٰلِكَ سَعْدٌ لِرَسُولِ اللهِ ﷺ، فَقَالَ: «اضْرِبُوهُ حَدَّهُ»، فَقَالُوا: يَا رَسُولَ اللهِ! إِنَّهُ أَضْعَفُ مِنْ ذٰلِكَ، فَقَالَ: **خُذُوا عِثْكَالاً فِيهِ مِائَةُ شِمْرَاخٍ، ثُمَّ اضْرِبُوهُ بِهِ ضَرْبَةً وَاحِدَةً»، فَفَعَلُوا.**
رَوَاهُ أَحْمَدُ وَالنَّسَآئِيُّ وَابْنُ مَاجَهْ، وَإِسْنَادُهُ حَسَنٌ، لٰكِنْ اخْتُلِفَ فِي وَصْلِهِ وَإِرْسَالِهِ.

حضرت سعید بن سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ہمارے گھروں میں ایک چھوٹا سا کمزور و نحیف آدمی رہتا تھا۔ وہ ہماری لونڈیوں میں سے ایک لونڈی کے ساتھ جرم زنا میں ملوث ہوگیا۔ حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے اس کا ذکر رسول اللہ ﷺ سے کیا تو آپؐ نے فرمایا ''اسے حد لگاؤ۔'' تو سب لوگ بول اٹھے اے اللہ کے رسول (ﷺ) وہ تو نہایت ہی کمزور و لاغر ہے تو آپؐ نے فرمایا ''کھجور کے درخت کی ایک ایسی ٹہنی لو جس میں سو شاخیں ہوں۔ پھر اسے ایک ہی دفعہ اس مرد پر مار دو۔'' چنانچہ ان لوگوں نے ایسا ہی کیا۔ (اسے احمد، نسائی اور ابن ماجہ نے روایت کیا ہے اور اس کی سند حسن ہے لیکن اس کے موصول اور مرسل

ہونے میں اختلاف ہے)

لغوی تشریح: ﴿ رویجل ﴾ رجل کی تصغیر ہے۔ ﴿ فخبث ﴾ باب کرم سے ہے جس کے معنی ہیں کہ اس نے زنا کیا اور گناہ کا مرتکب ہوا۔ ﴿ عثکالا ﴾ عین کے نیچے کسرہ "ثا" ساکن بروزن قرطاس۔ خوشہ ' ٹہنی' ﴿ شمراخ ﴾ شین کے نیچے کسرہ میم ساکن۔ عثکال کے وزن پر پتلی سی ٹہنی یا شاخ جو خوشے یا ٹہنی کی جڑ میں سخت ٹہنی کے اوپر اگتی ہے۔ سبل السلام میں کہا ہے کہ یہاں عثکال سے مراد بڑی لمبی شاخ ہے جس پر چھوٹی چھوٹی شاخیں ہوں۔ یہ کھجور کی شاخ انگور کی بیل کی طرح ہوتی ہے اور ان میں سے ہر ایک شاخ کو شمراخ کہتے ہیں۔

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ غیر شادی شدہ زانی کسی شدید بیماری کی وجہ سے یا فطری و جبلی طور پر اتنا ناتواں و کمزور و نحیف ہو کہ کوڑوں کی پوری حد سے اس کے جاں بحق ہو جانے کا اندیشہ ہو تو ایسی خاص صورت میں حد میں نرمی کی جا سکتی ہے۔ البتہ تعداد میں کمی بیشی نہیں۔ جمہور علماء کی رائے یہ ہے کہ سو شاخ ٹہنی کو اس طرح مارا جائے کہ ہر شاخ اس مجرم کو لگے اور بعض کہتے ہیں کہ سو شاخ ٹہنی کو ایک مرتبہ مارنا کافی ہے' ضروری نہیں کہ ہر شاخ مجرم کو لگے اس سے سزا کا نفاذ ہو جائے گا۔ مطلب یہ ہوا کہ شرعی سزائیں مجرم کو ان سے مار دینے کیلئے نہیں ہیں بلکہ اسے عبرت دینے اور معاشرے میں امن و امان قائم رکھنے کیلئے ہیں۔

راوی حدیث: ﴿ سعید بن سعد ﴾ سعید بن سعد بن عبادہ انصاری ساعدی۔ مشہور صحابی تھے اور ایک قول کے مطابق تابعی تھے۔ ان سے تھوڑی سی احادیث مروی ہیں۔ حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ نے اپنے دور خلافت میں ان کو یمن کا والی مقرر کیا تھا۔

(١٠٤٤) وَعَنْ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ قَالَ: «مَنْ وَجَدْتُمُوهُ يَعْمَلُ عَمَلَ قَوْمِ لُوطٍ، فَاقْتُلُوا الفَاعِلَ وَالمَفْعُولَ بِهِ، وَمَنْ وَجَدْتُمُوهُ وَقَعَ عَلَى بَهِيمَةٍ فَاقْتُلُوهُ وَاقْتُلُوا البَهِيمَةَ». رَوَاهُ أَحْمَدُ وَالأَرْبَعَةُ، وَرِجَالُهُ مُوَثَّقُونَ، إِلاَّ أَنَّ فِيهِ آخْتِلاَفاً.

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا کہ "جس شخص کو تم پاؤ کہ وہ قوم لوط کے فعل کا مرتکب ہوا ہے تو فاعل اور مفعول دونوں کو قتل کر دو۔ اور جس کسی کو پاؤ کہ وہ جانوروں کے ساتھ بدفعلی کا مرتکب ہوا تو اس مرد اور اس جانور دونوں کو مار ڈالو۔" (اسے احمد اور چاروں نے روایت کیا ہے۔ اس کے راویوں کی توثیق کی گئی ہے)

لغوی تشریح: ﴿ من وجدتموہ ﴾ تمہارے علم میں یہ بات آئے کہ فلاں شخص ﴿ یعمل عمل قوم لوط ﴾ قوم لوط کا فعل کرتا ہے یعنی دبر میں غیر فطری طور پر بدفعلی کرتا ہے۔ ﴿ فاقتلوا الفاعل والمفعول بہ ﴾ تو فاعل اور مفعول دونوں کو مار ڈالو۔ خواہ شادی شدہ ہوں یا غیر شادی شدہ۔ علامہ ابن قیم رحمہ اللہ نے الهدیٰ میں بیان کیا ہے کہ ابن قصار اور ہمارے شیخ و استاد علامہ ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے کہا ہے

کہ صحابہ کرامؓ کا اس پر اجماع ہے کہ ایسے شخص کو قتل کر دو البتہ قتل کرنے کی کی کیفیت میں اختلاف ہے۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی رائے ہے کہ اونچے پہاڑ سے پھینک دیا جائے اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کی رائے میں اس پر دیوار گرا دی جائے اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی رائے میں ان دونوں کو پتھر مار کر ہلاک کر دیا جائے پس سب کا اس کے قتل کرنے پر اتفاق ہے' اگرچہ قتل کرنے کی کیفیت مختلف ہے۔ امام شافعی رحمہ اللہ کا قدیم قول بھی یہی ہے۔ امام مالک رحمہ اللہ اور احمد رحمہ اللہ کی رائے بھی اس کے قریب ہے کہ لوطی خواہ شادی شدہ ہو یا غیر شادی شدہ دونوں صورتوں میں اسے سنگسار کیا جائے گا۔ دو مذہب اس جگہ اور بھی ہیں۔ ان میں سے ایک یہ ہے کہ فعل کے مرتکب کی سزا تو زنا کی حد ہے یعنی اگر شادی شدہ ہو تو اسے رجم کیا جائے ورنہ سو کوڑے مارے جائیں گے۔ یہ امام شافعی رحمہ اللہ' امام ابویوسف رحمہ اللہ اور امام محمد رحمہ اللہ کی رائے ہے اور اس قول کی روشنی میں مفعول پر بقول امام شافعی سو کوڑے اور سال بھر کی جلا وطنی مرد ہو یا عورت' شادی شدہ ہو یا غیر شادی شدہ۔ دوسرا مذہب یہ ہے کہ دونوں پر کوئی حد نہیں بس تعزیر پر اکتفا کیا جائے گا۔ یہ رائے امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کی ہے مگر پہلا قول حدیث کے موافق ہے اور اگرچہ اس حدیث میں بعض نے کلام کیا ہے لیکن یہ سند کے اعتبار سے قابل عمل ہے۔ ان تمام اقوال میں پہلا قول راجح ہے اگرچہ اس پر فتویٰ دینے والے کم تعداد میں ہیں۔ ﴿ ومن وجد تموه وقع على بهيمة فاقتلوه ﴾ یعنی جو جانور سے بدفعلی کرے اسے قتل کر دو۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی یہ حدیث ان کے قول کے معارض ہے۔ چنانچہ انہوں نے فرمایا جس نے جانور سے بدفعلی کی اس پر کوئی حد نہیں۔ امام ترمذی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ موقوف قول ان کی مرفوع حدیث سے زیادہ صحیح ہے اور اہل علم کے نزدیک اسی پر عمل ہے اور یہی قول امام احمد رحمہ اللہ اور اسحٰق رحمہ اللہ کا ہے اور خطابی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ فقہاء کی اکثریت کا خیال ہے کہ اس پر تعزیز لگائی جائے گی۔ عطاء اور ابراہیم نخعی نے بھی یہی کہا ہے اور امام مالک رحمہ اللہ' ثوری رحمہ اللہ' امام احمد رحمہ اللہ اور اصحاب الرائی اور امام شافعی رحمہ اللہ کا بھی ایک قول اسی کے تائید میں ہے اور امام شافعی رحمہ اللہ کا دوسرا قول یہ ہے کہ ایسے مجرم کی حد' زنا کی حد ہے واقتلوا البهيمة یعنی جانور کو قتل کر دو۔ سنن ترمذی میں ہے کہ ابن عباس رضی اللہ عنہما سے کہا گیا کہ جانور کو قتل کرنے کا کیا سبب ہے کیونکہ وہ تو غیر مکلف ہے؟ تو انہوں نے جواب دیا کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس بارے میں کچھ نہیں سنا لیکن میرا خیال ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کا گوشت کھانا اور اس سے فائدہ اٹھانا مکروہ سمجھا ہے۔

(۱۰٤٥) وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا. أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ ضَرَبَ وَغَرَّبَ، وَأَبُو بَكْرٍ ضَرَبَ وَغَرَّبَ. رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ، وَرِجَالُهُ ثِقَاتٌ، إِلاَّ أَنَّهُ اخْتُلِفَ فِي وَقْفِهِ وَرَفْعِهِ.

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے (زانی کو) مارا بھی اور جلا وطن بھی کیا اور ابوبکر رضی اللہ عنہ نے مارا بھی اور جلا وطن بھی کیا۔ (اسے ترمذی نے روایت کیا ہے۔ اس کے راوی ثقہ ہیں مگر اس کے موقوف اور مرفوع ہونے کے متعلق اختلاف ہے)

لغوی تشریح : ﴿ ضرب ﴾ یعنی کنوارے زانی کی سزا سو کوڑے لگائی۔ ﴿ وغرب ﴾ تغریب سے ہے۔ مطلب یہ ہے کہ زانی کو اس کی جائے سکونت سے سال بھر کیلئے نکال باہر کیا (جلا وطن کیا) علامہ الیمانی نے سبل السلام میں کہا ہے کہ حافظ ابن حجر نے یہ روایت اس قول کی تردید میں نقل کی ہے کہ جلا وطنی کی سزا منسوخ ہے۔ کیونکہ جب خلفائے راشدین کا اس پر عمل ہے تو یہ منسوخ کیسے اور کب ہوئی؟

(١٠٤٦) وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا، قَالَ: لَعَنَ رَسُولُ اللهِ ﷺ اَلْمُخَنَّثِيْنَ مِنَ الرِّجَالِ، وَالْمُتَرَجِّلاَتِ مِنَ النِّسَآءِ، وَقَالَ: «أَخْرِجُوهُمْ مِنْ بُيُوتِكُمْ». رَوَاهُ الْبُخَارِيُّ.

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ایسے مردوں پر لعنت فرمائی جو عورتوں کا روپ دھاریں اور ایسی عورتوں پر لعنت فرمائی ہے جو مرد بنیں۔ نیز فرمایا کہ "ان کو اپنے گھروں سے نکال دو۔ (گھروں میں داخل نہ ہونے دو)۔" (بخاری)

لغوی تشریح : ﴿ المخنثین ﴾ نون کے نیچے کسرہ اور فتحہ بھی۔ ایسے مرد جو عورتوں سے عادات و اخلاق، حرکات و سکنات، طرز گفتگو اور فیشن وغیرہ میں اور ان امور میں جو عورتوں کیلئے مخصوص ہیں مشابہت پیدا کریں۔ پس اگر وہ عادات و خصلت پیدائشی و جبلی اور فطری ہوں تو اس میں کوئی ملامت نہیں اور ایسی عادت بتکلف بھی دور کرنے کی کوشش کرنا اس کیلئے ضروری اور لازمی ہے اور اگر اس نے قصداً و عمداً اختیار کی ہے تو یہ مذموم حرکت ہے۔ ﴿ المترجلات ﴾ ایسی عورتیں جو مردوں کے ساتھ تشبیہہ اختیار کریں۔ فیشن میں، ہیئت و صورت میں، چال ڈھال میں، انداز گفتگو وغیرہ میں۔ اس پر لعنت کا کیا جانا اس پر دلالت کرتا ہے کہ یہ فعل حرام ہے۔ یہ مرض ہمارے زمانہ میں وباء کی طرح عام ہوگیا ہے نہ مشرق اس سے محفوظ ہے اور نہ مغرب اس سے بچا ہوا ہے یہاں تک کہ یہ مرض نوجوان مسلمانوں کی صفوں میں چیونٹی کی چال داخل ہوگیا ہے اور ان میں سرایت کر گیا ہے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ ایسے مرد و عورتوں کو گھروں سے نکالنے کا حکم اس لئے فرمایا کہ یہ شریف گھرانوں میں فتنہ و فساد کا موجب نہ بن جائیں اور ان کی دیکھا دیکھی شریف گھرانوں میں بھی یہ مرض سرایت نہ کر جائے۔

(١٠٤٧) وَعَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «اُدْفَعُوا الْحُدُودَ مَا وَجَدْتُمْ لَهَا مَدْفَعاً». أَخْرَجَهُ ابْنُ مَاجَهْ، وَسَنَدُهُ ضَعِيفٌ.

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "حدود کو دفع کرو جہاں تک اس کے دفع کرنے کی گنجائش پاؤ۔" (اسے ابن ماجہ نے نکالا ہے اور اس کی سند ضعیف ہے)

وَأَخْرَجَهُ التِّرْمِذِيُّ وَالحَاكِمُ، مِنْ

اور اس کو ترمذی اور حاکم نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے

حَدِيْثِ عَآئِشَةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهَا، بِلَفْظِ: اَدْرَءُوا الحُدُودَ عَنِ المُسْلِمِيْنَ مَا اسْتَطَعْتُمْ. وَهُوَ ضَعِيْفٌ أَيْضاً.

وَرَوَاهُ البَيْهَقِيُّ، عَنْ عَلِيٍّ، مِنْ قَوْلِهِ، بِلَفْظِ: اَدْرَءُوا الحُدُودَ بِالشُّبُهَاتِ.

واسطہ سے بیان کیا ہے۔ جس کے الفاظ ہیں۔ ''مسلمانوں سے جہاں تک حدود کو ہٹا سکتے ہو ہٹاؤ۔'' (یہ بھی ضعیف ہے) اور بیہقی نے اسے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے واسطہ سے روایت کیا ہے۔ اس کے الفاظ ہیں۔ ''شبہات کی وجہ سے حدود کو دفع کرو۔''

لغوی تشریح: ﴿ مدفعا ﴾ یعنی دفع کرنے کی گنجائش و راستہ ادرووا یعنی دفع کرو اور شبہات سے مراد جیسے کوئی عورت یہ دعویٰ کرے کہ زانی مرد نے اس پر جبرو اکراہ کیا ہے یا یہ بیان دے کہ مجھے سوتے میں اس نے آلیا اور ایسی ہی دوسری مثالیں جن کا واقع ہونا ممکن ہے۔

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ جب حدود کے ثبوت میں کسی قسم کا شبہ پیدا ہو جائے تو حد کو موقوف کر دینا چاہئے۔ حدیث کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ مجرموں کو حدیں لگایا ہی نہ کرو بلکہ مقصد یہ ہے کہ حدود کا نفاذ اس وقت کرنا چاہئے جب جرم پوری طرح ثابت ہو جائے۔

(١٠٤٨) وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُما قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «اَجْتَنِبُوا هَذِهِ القَاذُورَاتِ الَّتِي نَهَى اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهَا، فَمَنْ أَلَمَّ بِهَا فَلْيَسْتَتِرْ بِسَتْرِ اللهِ تَعَالَى، وَلْيَتُبْ إِلَى اللهِ تَعَالَى، فَإِنَّهُ مَنْ يُبْدِ لَنَا صَفْحَتَهُ نُقِمْ عَلَيْهِ كِتَابَ اللهِ تَعَالَى». رَوَاهُ الحَاكِمُ، وَهُوَ فِي المُوطَأ مِنْ مَرَاسِيْلِ زَيْدِ بْنِ أَسْلَمَ.

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ''ان گندے کاموں سے بچو جن سے اللہ تعالیٰ نے منع فرمایا ہے اور جو شخص ان میں مبتلا ہو جائے تو اسے اللہ کے ڈالے ہوئے پردہ میں چھپے رہنا چاہئے اور اسے چاہیے کہ اللہ کی جناب میں (پوشیدہ طور پر) توبہ کر لے کیونکہ جو شخص اپنی پیٹھ ہمارے سامنے ظاہر کرے گا ہم اس پر کتاب اللہ کو نافذ و قائم کر کے چھوڑیں گے۔'' (اسے حاکم نے روایت کیا ہے اور یہ مؤطا میں زید بن اسلم سے مرسلاً مروی ہے)

لغوی تشریح: ﴿ القاذورات ﴾ قاذورۃ کی جمع ہے۔ قول و فعل کی فحش حرکتیں مثلاً زنا وغیرہ۔ ﴿ الم بها ﴾ الالمام سے ماخوذ ہے یعنی جس نے جرم کا ارتکاب کیا ﴿ من یبدلنا ﴾ مضارع مجزوم' ابداء سے۔ یعنی جو کوئی اپنا پہلو' اپنا چہرہ ہمارے سامنے ظاہر کرے گا۔ کہا جاتا ہے ﴿ ابدی صفحته ﴾ یعنی اسی نے اپنا پہلو کھول دیا۔ یعنی جو شخص اپنے جرائم کا ہمارے سامنے انکشاف کرے گا تو ہم اس پر حد قائم کر کے

چھوڑیں گے، ہرگز اسے معاف نہیں کریں گے۔
حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ بشری کمزوری کی بنا پر گناہ کا سرزد ہونا خلاف توقع نہیں۔ جب ایسا فعل سرزد ہو جائے تو انسان کو چاہئے کہ اپنا جرم اور فعل لوگوں کے سامنے بیان نہ کرتا پھرے بلکہ جب اللہ تعالیٰ نے پردہ پوشی فرمائی ہے تو اسے پردے میں ہی رہنے دے اور پوشیدہ طور پر اپنے مولیٰ و مالک کے حضور توبہ کرے اس سے معافی کا طلب گار ہو۔ لیکن اگر وہ اپنے گناہ کا برملا اظہار کرتا ہے اور اعتراف جرم کرتا ہے تو پھر وہ شرعی سزا سے کسی صورت بچ نہیں سکتا۔
راوی حدیث: ﴿ زید بن اسلم رضی اللہ عنہ ﴾ صحابی "بلوی" قبیلہ سے ہیں۔ جو بنو عجلان میں سے تھا۔ یہ بنی عمرو بن عوف انصاری کے حلیف تھے۔ بدر میں حاضر ہوئے۔ صفین میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کا ساتھ دیا۔ ہشام کلبی نے کہا ہے ان کو طلیحہ بن خویلد اسدی نے "بزاخہ" کے روز ۱۱ھ میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی خلافت کے آغاز میں قتل کیا تھا۔

٢ - بَابُ حَدِّ الْقَذْفِ

تہمت زنا کی حد کا بیان

(١٠٤٩) عَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهَا، قَالَتْ: لَمَّا نَزَلَ عُذْرِي، قَامَ رَسُولُ اللهِ ﷺ عَلَى الْمِنْبَرِ، فَذَكَرَ ذٰلِكَ، وَتَلاَ الْقُرْآنَ، فَلَمَّا نَزَلَ أَمَرَ بِرَجُلَيْنِ وَامْرَأَةٍ فَضُرِبُوا الْحَدَّ. أَخْرَجَهُ أَحْمَدُ وَالأَرْبَعَةُ، وَأَشَارَ إِلَيْهِ الْبُخَارِيُّ.

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ جب قرآن مجید میں میری برأت نازل ہوئی تو رسول اللہ ﷺ منبر پر رونق افروز ہوئے اور اس کا ذکر فرمایا اور قرآن کی تلاوت فرمائی۔ جب منبر سے نیچے تشریف لائے تو دو مردوں اور ایک عورت کے متعلق حکم دیا کہ ان کو حد لگائی جائے۔ (اس کو احمد اور چاروں نے روایت کیا ہے اور بخاری نے اس کی طرف اشارہ کیا ہے)

لغوی تشریح: ﴿ باب حد القذف ﴾ قاف پر فتحہ اور ذال پر سکون۔ تہمت زنا کو کہتے ہیں اور اس کی حد اسی کوڑے ہیں۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے۔ (والذین یرمون المحصنات ثم لم یاتوا باربعة شهداء فاجلدوهم ثمانين جلدة) (النور) "جو لوگ پاک خواتین پر تہمت زنا لگاتے ہیں۔ پھر چار گواہ پیش نہ کر سکیں تو ان کو اسی کوڑے لگاؤ۔" ﴿ لما نزل عذری ﴾ عذر سے مراد وہ آیات ہیں جن میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی برأت کا بیان ہے اور وہ سورۂ نور ۱۱ تا ۲۰ تک دس آیات ہیں۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے ان آیات کو عذر کا نام اس لئے دیا کہ یہ آیات ان پر جھوٹی تہمت سے بریت کرتی ہیں۔ جس طرح عذر معذور کو اس کے جرم سے بری قرار دیتا ہے۔ اور ان کا واقعہ افک تو مشہور و معروف ہے کہ آپ ۵ھ یا ۶ھ میں غزوۃ المریسیع سے واپس آرہی تھیں کہ صبح کی تاریکی میں ایک جگہ اپنا ہار گم کر بیٹھیں، اسے تلاش کرنے میں مشغول ہو گئیں اور قافلہ نے کوچ کر لیا اور لوگوں نے ان کا کجاوہ اٹھا کر اونٹ پر لاد دیا اور

وہ یہی سمجھتے رہے کہ آپ اس ہودج میں موجود ہیں۔ پھر جب آپ ہار کی تلاش کے بعد واپس اپنی جگہ پر تشریف لائیں تو اتنے میں صفوان بن معطل کا ادھر سے گزر ہوا جو قافلے کی گری پڑی چیزیں اٹھانے کیلئے پیچھے رکھے گئے تھے۔ انہوں نے آپ کو اپنے اونٹ پر سوار ہونے کو کہا اور خود اپنے اونٹ کی مہار پکڑ کر پیدل اونٹ کے آگے چل پڑے۔ انہوں نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے راستہ میں کوئی بات نہیں کی تا آنکہ ظہر کے وقت ان کو نبی ﷺ کی خدمت میں پہنچا دیا۔ پس رئیس المنافقین عبداللہ بن ابی نے جب ان کو دیکھا تو فوراً ان پر تہمت لگا دی۔ اس منافق نے اور اس کے ہم مشرب منافق لوگوں نے اس کو خوب مشہور کیا اور اسے لوگوں میں پھیلایا۔ یہاں تک کہ اس جرم اشاعت میں تین مخلص مومن بھی حصہ دار بن گئے اور وہ تھے حضرت حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ' مسطح بن اثاثہ رضی اللہ عنہ اور حمنہ بنت جحش رضی اللہ عنہا اور معاملہ بہت بڑھ گیا۔ قریب تھا کہ مہلک اضطرابات واقع ہو جاتے۔ ادھر حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو اس بارے میں کچھ بھی خبر نہ ہوئی۔ اس پر ایک مہینہ گزر چکا تھا پھر کہیں جا کر ان کو خبر ہوئی تھی۔ پھر انہوں نے رسول اللہ ﷺ سے اجازت طلب کی اور اپنے والد کے گھر چلی گئیں اور وہاں جا کر اس خبر کی تحقیق کی۔ جب انہیں معلوم ہوا کہ لوگ ان کے بارے میں یہ کچھ کہہ رہے ہیں تو زار و قطار رونے لگیں اور روتے روتے دو راتیں گزر گئیں اور مسلسل روتی ہی رہیں۔ پھر نبی ﷺ ان کے ہاں تشریف لے گئے اور اس معاملہ میں ان سے گفتگو فرمائی جو اس سے پہلے نہیں فرمائی تھی۔ اس موقع پر حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی برائت میں آیات نازل ہوئیں۔ ﴿امر برجلین وامراۃ﴾ دو مردوں اور ایک عورت کو حد قذف لگانے کا حکم ارشاد فرمایا۔ یہ دو مرد حضرت حسان بن ثابت اور مسطح بن اثاثہ اور عورت حضرت حمنہ بنت جحش تھیں۔ جیسا کہ ہم نے ذکر کیا ہے ان لوگوں کے اس تہمت کے پھیلانے میں حصہ لینے کی وجہ سے قذف لگائی گئی۔ ﴿فضربوا الحد﴾ فعل صیغۂ مجہول یعنی پھر ان پر حد قذف لگائی گئی۔

(١٠٥٠) وَعَنْ أَنَسِ بْنِ مَالِكٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُ، قَالَ: أَوَّلُ لِعَانٍ كَانَ فِي الإِسْلَامِ أَنَّ شَرِيْكَ بْنَ سَحْمَاءَ قَذَفَهُ هِلَالُ بْنُ أُمَيَّةَ بِامْرَأَتِهِ، فَقَالَ لَهُ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «اَلْبَيِّنَةَ، وَإِلَّا فَحَدٌّ فِي ظَهْرِكَ»، اَلْحَدِيْثَ. أَخْرَجَهُ أَبُو يَعْلَى، وَرِجَالُهُ ثِقَاتٌ، وَفِي الْبُخَارِيِّ نَحْوُهُ مِنْ حَدِيْثِ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُمَا.

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ اسلام میں لعان کا پہلا واقعہ شریک بن سحماء کا تھا۔ ان پر ھلال بن امیہ نے اپنی بیوی کے ساتھ زنا کی تہمت لگائی تھی تو رسول اللہ ﷺ نے اس سے فرمایا کہ ”گواہ لاؤ۔ ورنہ تمہاری پیٹھ پر حد لگائی جائے گی۔“ (اس حدیث کی تخریج ابو یعلیٰ نے کی ہے اور اس کے راوی ثقہ ہیں اور بخاری میں ابن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت بھی اسی طرح ہے)

لغوی تشریح: ﴿البینۃ﴾ منصوب حالت میں ہے یعنی گواہ پیش کرو اور وہ چار گواہ ہیں۔ ﴿والا فحد

فی ظهرک ﴾ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ شوہر اگر اپنی بیوی پر تہمت زنا لگائے اور گواہ پیش کرنے سے عاجز ہو تو اس پر حد واجب ہے۔ مگر یہ حد لعان سے منسوخ ہے اور ظاہر بات یہ ہے کہ جب شوہر لعان نہ کرے اور نہ ہی چار گواہ پیش کرے تو اس پر حد واجب ہے۔ جمہور کی بھی یہی رائے ہے۔

راوی حدیث: ﴿ شریک بن سحماء رضی اللہ عنہ ﴾ یہ "بلوی" قبیلہ میں سے تھے۔ انصار کے حلیف تھے۔ ہلال بن امیہ نے ان پر اپنی بیوی کے ساتھ زنا کی تہمت لگائی تھی۔ ایک قول کے مطابق یہ اپنے والد کے ہمراہ احد میں حاضر تھے اور یہ براء بن مالک کے ماں جائے بھائی تھے اور ان کے والد کا نام عبدہ بن معتب تھا اور سحماء ان کی والدہ کا نام تھا۔

﴿ ہلال بن امیہ ﴾ ان کا تعلق انصار کے قبیلہ اوس سے تھا۔ واقفی بھی کہلاتے تھے۔ مشہور و معروف صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں سے تھے۔ قدیم الاسلام تھے۔ بنو واقف کے بتوں کے بت شکن تھے۔ بدر و احد کے معرکوں میں حاضر ہوئے۔ فتح مکہ کے دن بنو واقف کا علم ان کے ہاتھ میں تھا۔ یہ ان تین صحابہ رضی اللہ عنہم میں سے ایک تھے جو معرکۂ تبوک کے موقع پر پیچھے رہ گئے۔

(١٠٥١) وَعَنْ عَبْدِاللهِ بْنِ عَامِرِ بْنِ رَبِيْعَةَ قَالَ: لَقَدْ أَدْرَكْتُ أَبَا بَكْرٍ وَعُمَرَ وَعُثْمَانَ وَمَنْ بَعْدَهُمْ، فَلَمْ أَرَهُمْ يَضْرِبُونَ الْمَمْلُوكَ فِي الْقَذْفِ إِلاَّ أَرْبَعِيْنَ. رَوَاهُ مَالِكٌ وَالثَّوْرِيُّ فِي جَامِعِهِ.

حضرت عبداللہ بن عامر بن ربیعہ سے روایت ہے کہ میں نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ و عمر رضی اللہ عنہ اور عثمان رضی اللہ عنہ اور ان کے بعد والوں کا عہد پایا ہے۔ میں نے ان کو نہیں دیکھا کہ غلاموں کو سزائے قذف میں چالیس (کوڑوں) سے زیادہ مارتے ہوں۔ (اسے مالک نے روایت کیا ہے اور ثوری نے اپنی جامع میں بیان کیا ہے)

حاصل کلام: عبداللہ بن عامر جو ابوعمران کی کنیت سے مشہور ہیں۔ سات قاریوں میں سے ایک مشہور و معروف قاری ہیں۔ تابعین کے طبقہ دوم میں ثقہ حافظ تھے۔ اس حدیث کی رو سے غلام اور لونڈی کی حد آزاد مرد و عورت سے آدھی ہے۔ مثلاً زنا کی حد میں ان پر پچاس کوڑے ہیں۔ رجم کی حد نہیں ہے کیونکہ سزائے موت کا نصف تو ممکن ہی نہیں۔ لہٰذا آدھی سزا ہے اور وہ پچاس کوڑے ہیں اور اسی طرح حد قذف کا نصف چالیس کوڑے ہیں۔ جمہور اہل علم کا بھی یہی مسلک ہے۔ نص قرآن سے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ لونڈیوں کے حق میں ہے مگر غلام بھی اس میں شامل ہیں کیونکہ سورۂ نور میں استثناء میں غلام اور لونڈی دونوں شامل ہیں۔

(١٠٥٢) وَعَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «مَنْ قَذَفَ مَمْلُوكَهُ يُقَامُ عَلَيْهِ الحَدُّ يَوْمَ القِيَامَةِ، إِلاَّ أَنْ يَكُونَ كَمَا

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ "جو شخص اپنی مملوک پر زنا کی تہمت لگائے اس پر قیامت کے روز حد لگائی جائے گی۔ الا یہ کہ وہ اسی طرح ہو جس طرح کہ اس نے

قَالَ» . مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ. کہا ہے (یعنی وہ تہمت سچی ہو)۔" (بخاری و مسلم)

لغوی تشریح: ﴿ يقام عليه الحد يوم القيامة ﴾ اس حدیث سے معلوم ہوا کہ جو کوئی اپنے غلام پر تہمت لگاتا ہے تو دنیا میں اس مالک پر کوئی حد نہیں ہے۔ اسے سزا قیامت کے روز اللہ رب العالمین ہی دیں گے اور اگر تہمت سچی ہوگی تو پھر مالک بری الذمہ ہے اور غلام کو جرم کی سزا دی جائے گی۔

٣ - بَابُ حَدِّ السَّرِقَةِ — چوری کی حد کا بیان

(١٠٥٣) عَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهَا قَالَتْ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «لاَ تُقْطَعُ يَدُ سَارِقٍ إِلاَّ فِي رُبْعِ دِينَارٍ فَصَاعِداً» . مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ، وَاللَّفْظُ لِمُسْلِمٍ. وَلَفْظُ الْبُخَارِيِّ: «تُقْطَعُ يَدُ السَّارِقِ فِي رُبْعِ دِينَارٍ فَصَاعِداً».

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "کسی چور کا ہاتھ نہ کاٹا جائے مگر بسبب چوتھائی دینار یا اس سے کچھ زائد چوری کرنے پر (کاٹا جائے)۔" (بخاری و مسلم۔ یہ الفاظ مسلم کے ہیں) اور بخاری کے الفاظ ہیں "چور کا ہاتھ چوتھائی دینار اور اس سے زائد پر کاٹا جائے گا۔"

وَفِي رِوَايَةٍ لأَحْمَدَ: «اقْطَعُوا فِي رُبْعِ دِينَارٍ، وَلاَ تَقْطَعُوا فِيمَا هُوَ أَدْنىٰ مِنْ ذٰلِكَ» .

اور احمد کی روایت ہے "چوتھائی دینار میں ہاتھ کاٹ دو اور اس سے کم قیمت کی چوری پر نہ کاٹو۔"

لغوی تشریح: ﴿ باب حد السرقة ﴾ سرقة میں سین اور را پر فتحہ اور سرقة کہتے ہیں کسی محفوظ جگہ ومقام سے کسی ایسی چیز کو خفیہ طور سے لے لینا کہ اس کا لینا جائز ودرست نہ ہو۔ ﴿ فصاعدا ﴾ یہ حال واقع ہونے کی وجہ سے منصوب ہے۔ اس کا استعمال کبھی فا سے ہوتا ہے اور کبھی لفظ ثم سے لیکن "واؤ" سے کبھی استعمال نہیں ہوتا اور اس کا معنی ہے خواہ اس سے زیادہ ہو۔ ﴿ ادنى من ذلك ﴾ اس سے کم تر ہو۔

حاصل کلام: اس حدیث سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ جب تک نصاب سرقہ مکمل نہ ہو چور کا ہاتھ نہیں کاٹا جائے گا۔ یہی رائے جمہور علماء کرام کی ہے۔ مگر حسن بصری' ظاہریہ اور خوارج نے آیت کو مطلق دیکھ کر قلیل وکثیر ہر چوری پر قطع ید کی سزا کو واجب قرار دیا ہے جو صحیح نہیں۔ اس لئے کہ حدیث قرآن مجید کا بیان اور اس کی توضیح و تشریح ہے۔ حدیث سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ تکمیل نصاب کی صورت ہی میں قطع ید کی سزا دی جائے گی۔ اس لئے جمہور کی رائے ہی صحیح ہے کہ نصاب سرقہ پورا ہونے سے پہلے قطع ید کی سزا نہیں دی جا سکتی۔ البتہ نصاب کے بارے میں مختلف اقوال ہیں جن میں زیادہ مشہور دو قول ہیں۔ پہلا یہ کہ سونے میں نصاب ایک دینار کا چوتھا حصہ اور چاندی میں تین درہم۔ یہ رائے فقہاء حجاز اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ وغیرہم کی ہے اور دوسرا یہ کہ دس درہم نصاب ہے اس سے کم میں قطع ید کی سزا

نہیں دی جا سکتی۔ امام سفیان ثوری اور احناف کا یہی قول ہے۔ پہلے گروہ نے اسی متفق علیہ اور صحیح ترین حدیث کو لیا۔ ایک دینار کا وزن چار ماشہ سونا اور درہم ساڑھے تین ماشہ چاندی۔ گویا چوتھائی دینار اور تین درہم ہم وزن ہیں۔ اس سے کم قیمت کی چوری پر قطع ید کی سزا نافذ نہیں ہوگی۔ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا استدلال حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی حدیث سے ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دور میں ایک ڈھال جس کی قیمت دس درہم تھی پر چور کا ہاتھ کاٹا گیا۔ مگر یہ روایت صحیح بخاری و مسلم کے درجہ و مرتبہ کو نہیں۔ ڈھال کی قیمت اس کی حیثیت کے مطابق مختلف ہوتی ہے۔ بخاری و مسلم میں حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ڈھال کی چوری میں ہاتھ کاٹا جس کی قیمت تین درہم تھی جیسا کہ آئندہ حدیث میں آرہا ہے۔ اس لئے امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ وغیرہ محدثین ہی کا موقف درست ہے کہ ربع دینار یا تین درہم چاندی کے برابر چوری کرنے پر ہاتھ کاٹا جائے گا۔ جس کی قیمت تین درہم تھی۔ یہ ربع دینار والی پہلی روایت کے منافی نہیں ہے کیونکہ ان دنوں میں چوتھائی دینار تین درہم کے مساوی تھا جیسا کہ ہم پہلے ذکر کر آئے ہیں۔
جمہور کا مسلک اس حدیث اور سابقہ حدیث کے مطابق ہے۔ البتہ ان میں ان دونوں احادیث پر عمل کرنے میں معمولی اختلاف ہے۔ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ احمد رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے کہ چور کا ہاتھ تبھی کاٹا جائے گا جب چوتھائی دینار یا تین درہم چوری کرے۔ سونے یا چاندی کے علاوہ کسی چیز کی چوری کرے تو اس کا نصاب تین درہم کے حساب سے ہوگا۔ مگر امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ نصاب سونے کے دینار کا چوتھائی حصہ ہے یا جو ربع دینار کی قیمت ہو اور اس کی تائید اس سے ہوتی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ "قطع ید کی سزا ربع دینار کی چوری میں ہے" پھر فرمایا کہ "اس سے کم قیمت کی چوری میں ہاتھ نہیں کاٹا جائے گا" اور تین درہم چوتھائی دینار کے قائم مقام ہیں اصل نصاب سرقہ صرف چوتھائی دینار ہے۔

(١٠٥٤) وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ قَطَعَ فِي مِجَنٍّ ثَمَنُهُ ثَلاَثَةُ دَرَاهِمَ. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ڈھال کی چوری میں ہاتھ کاٹنے کی سزا دی ہے۔ اس کی قیمت تین درہم تھی۔ (بخاری و مسلم)

(١٠٥٥) وَعَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «لَعَنَ اللَّهُ السَّارِقَ، يَسْرِقُ الْبَيْضَةَ فَتُقْطَعُ يَدُهُ، وَيَسْرِقُ الحَبْلَ فَتُقْطَعُ يَدُهُ». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ أَيْضاً.

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "لعنت ہو اللہ تعالیٰ کی اس چور پر جو انڈا چوری کر کے اپنا ہاتھ کٹوا لیتا ہے۔ نیز رسی چوری کرتا ہے اور اپنا ہاتھ کٹوا لیتا ہے۔" (بخاری و مسلم)

حاصل کلام: اس حدیث سے ظاہریہ نے استدلال کیا ہے کہ قطع ید کی سزا قلیل و کثیر دونوں میں ہے کوئی متعین و مقرر نصاب پر نہیں۔ حالانکہ اس حدیث میں یہ دلیل نہیں ہے' اس لئے کہ حدیث کا مقصد یہ ہے کہ چوری کا عمل قابل نفرت ہے۔ چور ان معمولی اشیاء کے عوض اپنے ہاتھ سے محروم ہو جاتا ہے۔

اس میں یہ وضاحت تو نہیں کہ جب وہ رسی یا انڈہ چوری کرے گا نہ کہ ان کی قیمت ربع دینار کی قیمت کو نہ پہنچے تب بھی ہاتھ کاٹ دیا جائے گا۔ چور جب معمولی سی حقیر اشیاء اٹھانے لگے تو پھر چوری اس کی عادت بن جائے گی اور یہ عادت اس کو اتنی بڑی چیزیں اٹھانے کی بھی جرأت دلا دے گی جن کی قیمت اسی نصاب تک پہنچ جاتی ہے کہ وہ ہاتھ کاٹا جا سکتا ہے۔

(١٠٥٦) وَعَنْ عَآئِشَةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهَا أَنَّ رَسُولَ اللهِ ﷺ قَالَ: «أَتَشْفَعُ فِي حَدٍّ مِنْ حُدُودِ اللهِ تَعَالَى؟» ثُمَّ قَامَ، فَخَطَبَ، فَقَالَ: «أَيُّهَا النَّاسُ! إِنَّمَا أَهْلَكَ الَّذِينَ مِنْ قَبْلِكُمْ أَنَّهُمْ كَانُوا إِذَا سَرَقَ فِيهِمُ الشَّرِيفُ تَرَكُوهُ، وَإِذَا سَرَقَ فِيهِمُ الضَّعِيفُ أَقَامُوا عَلَيْهِ الحَدَّ». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ، وَاللَّفْظُ لِمُسْلِمٍ. وَلَهُ مِنْ وَجْهٍ آخَرَ عَنْ عَآئِشَةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهَا قَالَتْ: كَانَتِ ٱمْرَأَةٌ تَسْتَعِيرُ ٱلْمَتَاعَ، وَتَجْحَدُهُ فَأَمَرَ النَّبِيُّ ﷺ بِقَطْعِ يَدِهَا.

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "کیا تو اللہ کی مقرر کردہ حدود میں سے ایک حد میں سفارش کرتا ہے؟" یہ فرماتے ہوئے آپؐ کھڑے ہوئے پھر خطبہ دیا اور ارشاد فرمایا "لوگو! بے شک تم سے پہلے لوگ اس وجہ سے ہلاک و تباہ ہوئے کہ جب ان سے کوئی معزز آدمی چوری کرتا تو اسے چھوڑ دیتے اور جب ان میں کوئی کمزور آدمی چوری کرتا تو اس پر حد نافذ کر دیتے۔" (بخاری و مسلم اور یہ الفاظ مسلم کے ہیں) اور مسلم میں ایک اور سند حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا ہی سے منقول ہے کہ ایک عورت لوگوں سے (ادھار) چیزیں مانگا کرتی تھی اور پھر انکار کر دیتی تھی۔ پس اس عورت کے ہاتھ کاٹنے کا نبی ﷺ نے حکم صادر فرمایا۔

لغوی تشریح: ﴿ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال﴾ نبی ﷺ نے یہ ارشاد حضرت اسامہ بن زید رضی اللہ عنہما سے مخاطب ہو کر فرمایا جب انہوں نے فاطمہ نامی مخزوم قبیلہ کی ایک چور عورت سے سزا کو ساقط کرانے کیلئے سفارش کی تھی۔ یہ حدیث واضح دلیل ہے کہ حدود میں کسی کی سفارش کرنا جائز نہیں۔ ﴿کانت امراہ تستعیر المتاع﴾ یعنی جو سامان ادھار لیتی تھی۔ اس سے امام احمد رحمہ اللہ' اسحٰق رحمہ اللہ اور ظاہریہ نے پھر استدلال کیا جو عاریتاً چیز لے کر انکار کرے اس کا قطع ید واجب ہے۔ مگر جمہور کی رائے ہے کہ انکار پر ہاتھ نہیں کاٹا جائے گا۔ مخزومیہ خاتون کا قصہ کئی سندوں سے مروی ہے۔ اکثر میں ہے کہ وہ چوری کرتی تھی اور بعض میں یہاں تک صراحت ہے کہ اس نے نبی ﷺ کے گھر سے چادر چوری کی تھی۔ پس قطع ید تو صرف چوری کی وجہ سے ہے۔ رہا اس کے عاریتاً لے کر انکار کرنے والا واقعہ تو وہ اس کی عادت بن گیا اور اس سے وہ مشہور ہو گئی ایسے جیسے وہ قبیلہ مخزوم سے ہونے کی وجہ سے مخزومیہ مشہور ہو گئی۔ اس وجہ سے نہیں کہ قطع ید کی سزا عاریتاً لی ہوئی چیز کے انکار کرنے کی وجہ سے واقع ہوئی۔

(١٠٥٧) وَعَنْ جَابِرٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ: «لَيْسَ عَلَى خَائِنٍ وَلاَ مُخْتَلِسٍ وَلاَ مُنْتَهِبٍ قَطْعٌ». رَوَاهُ أَحْمَدُ وَالأَرْبَعَةُ، وَصَحَّحَهُ التِّرْمِذِيُّ وَابْنُ حِبَّانَ.

حضرت جابر رضی اللہ عنہ نبی ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ آپؐ نے فرمایا "خیانت کرنے والے، چھین کر لے جانے والے اور اچک کر لے جانے والے کیلئے قطع ید کی سزا نہیں ہے۔" (اسے احمد اور چاروں نے روایت کیا ہے۔ ترمذی اور ابن حبان نے اسے صحیح قرار دیا ہے)

لغوی تشریح: ﴿خائن﴾ خائن اسے کہتے ہیں جو خفیہ طور پر مال لے لے اور مالک کے روبرو خیر خواہی کا اظہار کرے اور مرقاۃ شرح مشکوٰۃ میں کہا ہے کہ خائن وہ ہے جسے کوئی چیز بطور ادھار یا امانت سپرد کی جائے اور وہ اس پر قبضہ کر لے اور کہے کہ وہ چیز ضائع ہو گئی ہے۔ ﴿مختلس﴾ اچانک کسی سے چیز اچک کر لے جانے والا جو مال کو بڑی پھرتی اور سرعت سے چھین کر رفو چکر ہو جائے۔ ﴿منتهب﴾ علی الاعلان جبراً اور بزور کسی سے مال چھین لینے والا۔

(١٠٥٨) وَعَنْ رَافِعِ بْنِ خَدِيْجٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: سَمِعْتُ رَسُولَ اللهِ ﷺ يَقُولُ «لاَ قَطْعَ فِي ثَمَرٍ، وَلاَ فِي كَثَرٍ». رَوَاهُ أَحْمَدُ وَالأَرْبَعَةُ وَصَحَّحَهُ أَيْضاً التِّرْمِذِيُّ وَابْنُ حِبَّانَ.

حضرت رافع بن خدیج رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو ارشاد فرماتے سنا: "پھل اور درخت خرما کے گوند میں ہاتھ کاٹنے کی سزا نہیں ہے۔" (اسے احمد اور چاروں نے روایت کیا ہے۔ ترمذی اور ابن حبان نے بھی اسے صحیح قرار دیا ہے)

لغوی تشریح: ﴿کثر﴾ کاف اور ثا دونوں پر فتحہ۔ درخت خرما کا گوند جو چربی کی طرح رنگت میں سفید اور ذائقہ و مزہ میں گری کی طرح کھجور کے تنے کے وسط میں پایا جاتا اور کھایا جاتا ہے۔ اس حدیث کے ظاہری معنی و مفہوم سے امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ اور ان کے اصحاب نے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ جو پھل ابھی درخت پر ہوں اور تر ہوں وہ محفوظ جگہ میں ہوں یا غیر محفوظ جگہ میں ان کی چوری میں قطع ید کی سزا نہیں ہے۔ پھر اسی پر قیاسات کرنے کو کہا ہے کہ گوشت، دودھ، مشروبات، روٹیاں وغیرہ کھانے کی اشیاء میں بھی قطع ید کی سزا نہیں ہے۔ مگر جمہور نے غیر محفوظ کی قید لگائی ہے۔ انہوں نے یہ قید اس حدیث اور عبداللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہما کی تین احادیث کے بعد آنے والی حدیث میں تطبیق پیدا کرنے کی غرض سے لگائی ہے اور انہوں نے کہا کہ اہل مدینہ کی غالب عادت تھی کہ اپنے باغات کو محفوظ و مامون جگہ سے خارج سمجھتے تھے۔

(١٠٥٩) وَعَنْ أَبِي أُمَيَّةَ الْمَخْزُومِيِّ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: أُتِيَ رَسُولُ اللهِ ﷺ بِلِصٍّ قَدِ

حضرت ابو امیہ مخزومی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے پاس ایک ڈاکو لایا گیا۔ اس نے چوری کا اعتراف کیا مگر سامان اس کے پاس نہ پایا گیا تو

اعْتَرَفَ اعْتِرَافاً، وَلَمْ يُوْجَدْ مَعَهُ مَتَاعٌ، فَقَالَ لَهُ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «مَا إِخَالُكَ سَرَقْتَ»، قَالَ: بَلىٰ، فَأَعَادَ عَلَيْهِ مَرَّتَيْنِ أَوْ ثَلاَثاً، فَأَمَرَ بِهِ، فَقُطِعَ، وَجِيءَ بِهِ، فَقَالَ: «اَسْتَغْفِرِ اللَّهَ، وَتُبْ إِلَيْهِ». فَقَالَ: أَسْتَغْفِرُ اللَّهَ، وَأَتُوبُ إِلَيْهِ. فَقَالَ: «اَللَّهُمَّ تُبْ عَلَيْهِ» ثَلاَثاً. أَخْرَجَهُ أَبُو دَاوُدَ، وَاللَّفْظُ لَهُ، وَأَحْمَدُ وَالنَّسَائِيُّ. وَرِجَالُهُ ثِقَاتٌ.

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "میں خیال نہیں کرتا کہ تو نے چوری کی ہوگی۔" اس نے کہا۔ جی ہاں! میں نے کی ہے۔ آپؐ نے دو یا تین مرتبہ اسی طرح دھرایا' اس نے اقرار کیا تو اس کے ہاتھ کاٹنے کا حکم صادر فرمایا۔ چنانچہ اس کا ہاتھ کاٹ دیا گیا۔ اس کے بعد اسے آپؐ کی خدمت میں لایا گیا۔ آپؐ نے اسے تلقین فرمائی کہ "اللہ سے اپنے گناہ کی بخشش مانگ اور اس سے توبہ کر۔" اس نے کہا میں اللہ سے بخشش و مغفرت طلب کرتا ہوں اور اس کے حضور توبہ کرتا ہوں۔ آپؐ نے تین مرتبہ اس کے حق میں اللہ سے دعا فرمائی کہ "الٰہی اس کی توبہ قبول فرما۔" (اس حدیث کی تخریج ابوداؤد نے کی ہے۔ الفاظ بھی اسی کے ہیں نیز احمد اور نسائی نے بھی اسے روایت کیا ہے اور اس کے راوی ثقہ ہیں۔)

وَأَخْرَجَهُ الحَاكِمُ، مِنْ حَدِيْثِ أَبِيْ هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، فَسَاقَهُ بِمَعْنَاهُ، وَقَالَ فِيهِ: اَذْهَبُوا بِهِ فَاقْطَعُوهُ، ثُمَّ احْسِمُوهُ. وَأَخْرَجَهُ الْبَزَّارُ أَيْضاً، وَقَالَ: لاَ بَأْسَ بِإِسْنَادِهِ.

اور حاکم نے ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے اس حدیث کی تخریج کی ہے۔ اس میں آپؐ نے فرمایا کہ "اسے لے جاؤ اور ہاتھ کاٹ دو پھر اسے داغ دینا۔" اور اسی کے ہم معنی ذکر ہیں۔ (اسے بزار نے بھی روایت کیا ہے اور کہا ہے کہ اس کی سند میں کوئی نقص نہیں ہے۔)

لغوی تشریح: ﴿ما اخالک﴾ ہمزہ کے نیچے کسرہ اور مضارع کا صیغہ ہے۔ معنی ہے میرا گمان و خیال نہیں ہے۔ احسمو حسم سے ماخوذ ہے۔ امر کا صیغہ ہے باب ضرب یضرب سے۔ مقام قطع کو آگ سے داغنا تاکہ خون بہنے کی جگہیں اور راستے بند ہو جائیں۔

حاصل کلام: اس حدیث سے ثابت ہوا کہ جس نے عدالت کے روبرو چوری کا ایک بار اعتراف کر لیا ہو گو اس سے مال و متاع برآمد نہ ہوا ہو تو اس کی سزا قطع ید ہے۔ قطع ید کے بعد گرم تیل میں ہاتھ رکھنا یا کوئی اور طریقہ اختیار کرنا ضروری ہے تاکہ خون بہنا بند ہو جائے۔ اگر بروقت اس کا یہ مداوا نہ کیا جائے جس کے نتیجے میں خون بہہ کر وہ جاں بحق ہو گیا تو اس کی دیت بیت المال پر پڑ جائے گی۔ اکثر علماء تو چور

ایک ہی اقرار و اعتراف کو کافی سمجھتے ہیں مگر امام احمد رحمہ اللہ اور اسحٰق کے نزدیک چور کے دو مرتبہ اعتراف پر چوری ثابت ہوتی ہے۔ مذکورہ بالا حدیث سے پہلے گروہ کی تائید ہوتی ہے۔

راوی حدیث: ﴿ ابوامیہ مخزومی رضی اللہ عنہ ﴾ ان کا تعلق حجاز سے ہے۔ مشہور صحابی ہیں لیکن ان سے ایک ہی حدیث مروی ہے۔ حماد بن مسلمہ نے کہا ہے کہ وہ مخزومی ہیں اور ھمام بن یحییٰ نے کہا ہے کہ ان کا تعلق انصار سے تھا۔

(١٠٦٠) وَعَنْ عَبْدِ الرَّحْمٰنِ بْنِ عَوْفٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، أَنَّ رَسُولَ اللهِ ﷺ قَالَ: «لاَ يُغَرَّمُ السَّارِقُ إِذَا أُقِيمَ عَلَيْهِ اَلْحَدُّ». رَوَاهُ النَّسَائِيُّ، وَبَيَّنَ أَنَّهُ مُنْقَطِعٌ، وَقَالَ أَبُو حَاتِمٍ: هُوَ مُنْكَرٌ.

حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "جب چور پر حد قائم کر دی جائے گی تو پھر مال کی ضمانت اس پر نہیں۔" (اسے نسائی نے روایت کیا ہے اور خود ہی واضح کر دیا کہ یہ منقطع ہے اور ابوحاتم نے اسے منکر کہا ہے)

لغوی تشریح: ﴿ لایغرم ﴾ تغریم سے ماخوذ ہے صیغہ مجہول ہے۔ اس حدیث کے حکم میں اختلاف ہے۔ چنانچہ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ نے کہا ہے اگر چور کے پاس چوری شدہ مال برآمد ہوا تو اس سے لے لیا جائے گا ورنہ اس پر حد نافذ کرنے کے بعد اسے چھوڑ دیا جائے گا اور اس پر کوئی ضمانت نہیں ہوگی اور سبل السلام میں ہے کہ امام شافعی رحمہ اللہ' امام احمد رحمہ اللہ اور دوسرے اہل علم کے مطابق اسے منافق قرار دیا جائے گا۔ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ سے بھی ایک قول یہی منقول ہے کیونکہ نبی ﷺ کا ارشاد گرامی ہے کہ "ہاتھ ضامن ہے اس چیز کا جسے اس نے لیا تاوقتیکہ اسے ادا نہ کر دے۔" انہی عبدالرحمٰن کی یہ حدیث ضعف کی بنا پر قابل استدلال نہیں۔ اللہ تعالیٰ کا بھی ارشاد ہے کہ آپس میں باطل طریقہ سے اپنے اموال نہ کھاؤ۔ (٢: ١٨٨) اور رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے کہ "کسی مسلم مرد کا مال حلال نہیں الاّ یہ کہ وہ اپنی طیب نفس سے کھانے کی اجازت دے۔" نیز اس لئے بھی کہ اس میں دو حق جمع ہوگئے۔ ایک اللہ کا حق اور دوسرا آدمی کا حق۔ ہر ایک حق اپنے واجب ہونے کا تقاضا کرتا ہے۔ نیز اس پر اجماع ہے کہ جب اصل مال اپنی حالت میں موجود ہو تو وہ لے لیا جائے گا جب وہ مال اس کی ضمان میں نہ پایا جائے گا تو دوسرے اموال واجبہ پر اس کو قیاس کیا جائے گا۔ اس قول کی قوت کسی پر مخفی نہیں ہے۔

(١٠٦١) وَعَنْ عَبْدِاللهِ بْنِ عَمْرِو بْنِ العَاصِ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهما، عَنْ رَسُولِ اللهِ ﷺ، أَنَّهُ سُئِلَ عَنِ التَّمْرِ المُعَلَّقِ، فَقَالَ: «مَنْ أَصَابَ بِفِيهِ، مِنْ ذِي حَاجَةٍ، غَيْرَ مُتَّخِذٍ خُبْنَةً، فَلاَ شَيْءَ عَلَيْهِ،

حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہما نے رسول اللہ ﷺ سے روایت کیا ہے کہ آپؐ سے درخت پر لٹکی ہوئی کھجور کے متعلق دریافت کیا گیا۔ آپؐ نے فرمایا "جو شخص بھوکا ہو وہ کھانے کیلئے توڑ لے مگر کپڑے میں نہ بھرے تو اس پر کوئی سزا نہیں اور جو شخص کپڑے میں ڈال کر نکل جائے تو اس پر تاوان

وَمَنْ خَرَجَ بِشَيْءٍ مِنْهُ فَعَلَيْهِ الغَرَامَةُ وَالعُقُوبَةُ، وَمَنْ خَرَجَ بِشَيْءٍ مِنْهُ بَعْدَ أَنْ يُؤْوِيَهِ الجَرِينُ، فَبَلَغَ ثَمَنَ المِجَنِّ، فَعَلَيْهِ القَطْعُ». أَخْرَجَهُ أَبُو دَاوُدَ وَالنَّسَائِيُّ وَصَحَّحَهُ الحَاكِمُ.

بھی ہے اور سزا بھی اور جو شخص ایسی صورتحال میں کھجوریں لے جائے کہ مالک نے توڑ کے محفوظ جگہ میں ڈھیر کر لیا ہو اور ان کی قیمت ایک ڈھال کی قیمت کے مساوی ہو تو اس پر قطع ید کی سزا نافذ ہو گی۔" (اسے ابوداؤد اور نسائی نے تخریج کیا ہے اور حاکم نے اسے صحیح قرار دیا ہے)

لغوی تشریح: ﴿ الثمر ﴾ ثا اور میم دونوں پر فتحہ۔ یعنی پھل ﴿ المعلق ﴾ درختوں پر لگے ہوئے' لٹکے ہوئے۔ ﴿ بفیه ﴾ منہ سے کھائے۔ ﴿ خبنة ﴾ کپڑے کا پلو' مطلب ہے کہ کپڑے میں باندھ کر نہ لے جائے۔ ﴿ الغرامة ﴾ اسی کی طرح کا تاوان و ضمان۔ ﴿ والعقوبة ﴾ بطور سزا اور عبرت چند کوڑے۔ یوویه اکٹھا کرتا ہے' جمع کرتا ہے۔ ﴿ الجرین ﴾ جیم پر فتحہ اور را کے نیچے کسرہ۔ کھجوروں کے خشک کرنے کی جگہ و مقام۔ جیسے گندم کیلئے کھلیان ہوتا ہے۔

حاصل کلام: اس حدیث میں جو کچھ بیان ہوا ہے اس کی مختلف صورتیں ممکن ہیں۔ مثلاً پھل درخت کے اوپر ہی ہیں ابھی تک توڑنے کی نوبت نہیں آئی ایک بھوکا مسافر پھل توڑ کر کھا کر اپنی بھوک دفع کر لیتا ہے تو ایسی صورت میں ایسے آدمی پر بالاتفاق نہ کوئی جرمانہ و تاوان عائد ہو گا اور نہ ہی اسے چوری کی سزا کا مستوجب قرار دیا جائے گا لیکن اگر پھلوں کو پہلے درختوں سے اتارے' پھر شکم سیر بھی ہو جائے مزید برآں کپڑے میں ڈال کر ساتھ لے جانے کی بھی تیاری کرے تو ایسی صورت میں اس پر جرمانہ و تاوان بھی عائد ہو گا اور سزا بھی دی جائے گی۔ بیہقی میں روایت ہے کہ جرمانہ مسروقہ مال کی قیمت سے دوگنا ہو گا اور سزا زیادہ سے زیادہ دس کوڑے اور اگر مالک نے پھل درختوں سے اتار کر ڈھیر کر لئے ہوں اور اس ڈھیر کی نوعیت محفوظ سامان کی ہو اور اس میں سے چوری کی صورت میں بشرطیکہ اس کی قیمت نصاب تک پہنچ جائے تو اس میں قطع ید کی سزا نافذ ہو گی۔ اس حدیث سے ثابت ہوا کہ مالی جرمانہ بھی جائز ہے۔ نیز جمہور اہل علم نے سزائے قطع ید میں مال کے محرز و محفوظ کی جو شرط لگائی ہے ان کا استدلال بھی اسی حدیث سے ہے۔

(١٠٦٢) وَعَنْ صَفْوَانَ بْنِ أُمَيَّةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ قَالَ لَهُ - لَمَّا أَمَرَ بِقَطْعِ الَّذِيْ سَرَقَ رِدَآءَهُ فَشَفَعَ فِيْهِ -: «هَلاَّ كَانَ ذٰلِكَ قَبْلَ أَنْ تَأْتِيَنِي بِهِ؟» أَخْرَجَهُ أَحْمَدُ وَالأَرْبَعَةُ، وَصَحَّحَهُ ابْنُ الجَارُودِ وَالحَاكِمُ.

حضرت صفوان بن امیہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی ﷺ نے ان سے فرمایا' جب انہوں نے اس آدمی کے بارے میں سفارش کی جس نے چادر چرائی تھی اور اس کے قطع ید کا حکم آپ ؐ نے فرمایا تھا کہ "میرے پاس لانے سے پہلے تمہیں اس پر رحم و ترس کیوں نہ آیا۔" (اسے احمد اور چاروں نے روایت کیا

ہے اور ابن جارود اور حاکم دونوں نے اسے صحیح قرار دیا ہے)

حاصل کلام: یہ چوری کا واقعہ یوں ہے کہ صفوان بن امیہ مقام بطحاء یا مسجد حرام میں لیٹے ہوئے تھے ایک آدمی آیا اور صفوان کے سر کے نیچے سے اس کی چادر کھینچ لی۔ اسے گرفتار کر کے نبی ﷺ کی عدالت میں پیش کیا گیا۔ آپؐ نے اس کا ہاتھ کاٹنے کا حکم صادر فرمایا تو صفوان بولا میں نے اسے معاف کیا اور درگزر کیا۔ آپؐ نے فرمایا "یہ تو نے میرے پاس لانے سے پہلے کیوں نہیں کیا؟" پھر آپؐ نے اس کا ہاتھ کاٹ دیا۔ اس حدیث میں یہ مسئلہ ہے کہ جب مقدمہ عدالت و حاکم کے پاس چلا جائے تو پھر معافی کی کوئی گنجائش نہیں۔

(١٠٦٣) وَعَنْ جَابِرٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُ، قَالَ: جِيءَ بِسَارِقٍ إِلَى النَّبِيِّ ﷺ، فَقَالَ: «**اقْتُلُوهُ**»، فَقَالُوا: إِنَّمَا سَرَقَ يَا رَسُولَ اللّٰهِ! قَالَ: «**اقْطَعُوه**»، فَقُطِعَ، ثُمَّ جِيءَ بِهِ الثَّانِيَةَ، فَقَالَ: «**اقْتُلُوهُ**»، فَذَكَرَ مِثْلَهُ، ثُمَّ جِيءَ بِهِ الثَّالِثَةَ، فَذَكَرَ مِثْلَهُ، ثُمَّ جِيْءَ بِهِ الرَّابِعَةَ كَذٰلِكَ، ثُمَّ جِيءَ بِهِ الخَامِسَةَ فَقَالَ: «**اقْتُلُوهُ**». أَخْرَجَهُ أَبُو دَاوُدَ وَالنَّسَآئِيُّ، وَاسْتَنْكَرَهُ، وَأَخْرَجَ مِنْ حَدِيْثِ الحَارِثِ بْنِ حَاطِبٍ نَحْوَهُ، وَذَكَرَ الشَّافِعِيُّ أَنَّ القَتْلَ فِي الخَامِسَةِ مَنْسُوخٌ.

حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ کے پاس ایک چور کو لایا گیا تو آپؐ نے فرمایا کہ "اسے قتل کر دو۔" لوگوں نے عرض کیا اے اللہ کے رسول (ﷺ)! اس نے چوری کی ہے۔ آپؐ نے فرمایا "تو پھر اس کا ہاتھ کاٹ دو" چنانچہ اس کا ہاتھ کاٹ دیا گیا۔ پھر دوبارہ اسے پیش کیا گیا تو پھر آپؐ نے فرمایا "اسے مار ڈالو۔" پھر اسی طرح ذکر کیا گیا۔ پھر اس کو تیسری بار لایا گیا تو پھر اسی طرح ذکر کیا۔ پھر چوتھی مرتبہ گرفتار کر کے پیش کیا گیا تو اسی طرح ذکر کیا۔ پھر پانچویں مرتبہ گرفتار کر کے پیش کیا گیا تو آپؐ نے فرمایا کہ "اسے قتل کر دو۔" (اس کو ابوداؤد اور نسائی نے روایت کیا ہے اور اسے منکر قرار دیا ہے اور نسائی نے حارث بن حاطب کی حدیث سے اسی طرح اور شافعی رحمہ اللہ نے ذکر کیا ہے کہ پانچویں مرتبہ مار ڈالنا منسوخ ہے)

حاصل کلام: اس حدیث میں جرم چوری میں قتل کی سزا بیان ہوئی ہے۔ مگر یہ حدیث ضعیف ہے بلکہ امام ابن عبدالبر نے کہا ہے کہ یہ روایت منکر اور بے اصل ہے اور تمام اہل علم کا اتفاق ہے کہ یہ قابل عمل نہیں۔

راوی حدیث: ﴿ حارث بن حاطب جمحی قرشی ﴾ حبشہ میں پیدا ہوئے۔ عبداللہ بن زبیر کی طرف سے مکہ میں ٦٦ھ میں والی مقرر ہوئے اور چھ سال کام کیا مروان کی امارت مدینہ کے دوران ان کے

ساتھ بھی کافی تعاون کیا۔ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے دور میں وفات پائی۔

٤ - بَابُ حَدِّ الشَّارِبِ وَبَيَانِ الْمُسْكِرِ

شراب پینے والے کی حد اور نشہ آور چیزوں کا بیان

(١٠٦٤) عَنْ أَنَسِ بْنِ مَالِكٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ أُتِيَ بِرَجُلٍ قَدْ شَرِبَ الخَمْرَ، فَجَلَدَهُ بِجَرِيْدَتَيْنِ نَحْوَ أَرْبَعِيْنَ. قَالَ: وَفَعَلَهُ أَبُو بَكْرٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، فَلَمَّا كَانَ عُمَرُ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، ٱسْتَشَارَ النَّاسَ، فَقَالَ عَبْدُ الرَّحْمٰنِ بْنِ عَوْفٍ: أَخَفُّ ٱلْحُدُودِ ثَمَانُونَ، فَأَمَرَ بِهِ عُمَرُ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ کے پاس ایک آدمی لایا گیا جس نے شراب پی رکھی تھی۔ پس اس شخص کو دو چھڑیوں سے چالیس کے لگ بھگ کوڑے لگائے گئے۔ راوی کا بیان ہے کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے بھی یہ سزا دی۔ جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا دور خلافت آیا تو انہوں نے صحابہؓ سے مشورہ کیا۔ حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ نے کہا کہ ہلکی ترین سزا اسی کوڑے ہیں۔ چنانچہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اسی کا حکم صادر فرمایا۔ (بخاری و مسلم)

وَلِمُسْلِمٍ عَنْ عَلِيٍّ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ فِي قِصَّةِ الوَلِيْدِ بْنِ عُقْبَةَ: جَلَدَ النَّبِيُّ ﷺ أَرْبَعِيْنَ، وَأَبُو بَكْرٍ أَرْبَعِيْنَ، وَعُمَرُ ثَمَانِيْنَ، وَكلٌّ سُنَّةٌ، وَهٰذَا أَحَبُّ إِلَيَّ. وَفِي هٰذا الحَدِيْثِ أَنَّ رَجُلاً شَهِدَ عَلَيْهِ أَنَّهُ رَآهُ يَتَقَيَّأُ الخَمْرَ، فَقَالَ عُثْمَانُ إِنَّهُ لَمْ يَتَقَيَّأْهَا حَتَّى شَرِبَهَا.

اور مسلم میں ولید بن عقبہ کے قصہ میں حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے چالیس اور ابوبکر رضی اللہ عنہ نے چالیس اور عمر رضی اللہ عنہ نے اسی کوڑے سزا دی اور ہر ایک سنت ہے اور یہ مجھے زیادہ محبوب ہے اور اس حدیث میں یہ بھی ہے کہ ایک آدمی نے ولید کے خلاف شہادت دی کہ اس نے ولید کو شراب کی قے کرتے دیکھا ہے۔ اس پر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے فرمایا اس نے شراب پی نہ ہوگی تو قے کیسے ہوگی۔

لغوی تشریح: ﴿ باب حد الشارب ﴾ یعنی شراب پینے والا' شراب پینے کی حد اسی کوڑے ہے۔ ﴿ بجریدتین ﴾ شاخ خرما۔ کھجور کی چھڑی۔ اس کو جریدہ اس لئے کہتے ہیں کہ اس پر سے پتے جھڑ چکے ہوتے ہیں اور صاف ہوتی ہے۔ ﴿ نحو اربعین ﴾ ایک قول تو اس کی تفسیر میں یہ ہے کہ ہر ایک چھڑی

سے بیس مرتبہ مارا گیا ہوگا اور دونوں کی مجموعی تعداد چالیس ہوگی اور ایک قول یہ ہے کہ دونوں چھڑیوں کو اکٹھا کر کے چالیس مرتبہ مارا ہوگا اس طرح یہ اسی کی تعداد ہوگی۔ بظاہر پہلا معنی ہی متعین معلوم ہوتا ہے بلکہ دوسری روایات بھی اسی کی موید ہیں۔ ﴿ اخف الحدود ثمانون ﴾ حدود میں ہلکی اور خفیف ترین سزا اسی کوڑے ہیں اور یہ قذف کی سزا ہے۔ یہ حدیث اس پر دلالت کرتی ہے کہ نبی ﷺ کے عہد سعادت میں شراب نوشی کی حد متعین نہیں تھی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے صحابہ کرامؓ سے مشورہ لیا اور ایک مقررہ حد یعنی اسی کوڑے متعین کر دیئے کیونکہ بعض اطراف و نواحی میں لوگ شراب نوشی میں کچھ زیادہ منہمک ہوگئے تھے اور اس کی سزا کو بے وزن و حقیر سمجھتے تھے جیسا کہ خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کی تحریر سے ثابت ہے۔ فقہاء کے درمیان اس کی حد کے بارے میں اختلاف رہا ہے کہ وہ چالیس کوڑے ہیں یا اسی۔ مگر نبی ﷺ کے فعل کو اخذ کرنا زیادہ مناسب اور اولیٰ ہے۔ ﴿ فی قصۃ الولید بن عقبۃ ﴾ اور وہ یہ ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے دور خلافت میں ولید بن عقبہ پر شراب نوشی کا اتہام لگا۔ حمران اور ایک دوسرے آدمی نے اس کے خلاف گواہی دی۔ ان میں سے ایک نے تو یہ گواہی دی کہ میں نے ان کو شراب پیتے دیکھا ہے اور دوسرے نے یہ گواہی دی کہ میں نے اسے شراب کی قے کرتے دیکھا ہے۔ اس پر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے کہا کہ جب تک شراب پی نہ ہو اس وقت تک قے کیسے کر سکتا ہے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے بحیثیت خلیفہ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے کہا کہ اس پر حد لگائیں۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے حسن رضی اللہ عنہ سے کہا کہ تم اس پر حد لگاؤ۔ حضرت حسن رضی اللہ عنہ نے کہا جو اس کے گرم کا والی ہوا وہی اس کے سرد کا بھی والی بنے۔ یعنی جو آدمی خلافت کی نرمی اور لذت سے لطف اندوز ہوا ہے وہی اس کی شدت اور کڑوی صورت کو بھی اختیار کرے۔ ان کا مقصد یہ تھا کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اور ان کے اعزاء و اقرباء میری نسبت زیادہ ولایت و اختصاص رکھتے ہیں تو پھر ان کو ہی خلافت کی بری بھلی اور گندی باتوں اور حالات سے نپٹنا چاہئے۔ چنانچہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے عبداللہ بن جعفر رضی اللہ عنہ سے کہا کہ تم اسے حد لگاؤ۔ انہوں نے کوڑا پکڑا اور حد نافذ کر دی اور حضرت علی رضی اللہ عنہ شمار کرتے جاتے تھے جب چالیس پر پہنچے تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا' بس تیرے لئے یہ کافی ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے چالیس (کوڑے) ہی لگائے تھے۔

راوی حدیث: ﴿ ولید بن عقبہ بن ابی معیط رضی اللہ عنہ ﴾ قرشی حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی ماں کی جانب سے بھائی تھے۔ فتح مکہ کے روز مسلمان ہوئے۔ قریش کے ظریف' حلیم' بہادر اور ادیب لوگوں میں سے تھے۔ طبع زاد شعراء میں سے تھے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے ان کو کوفہ کا گورنر بنا دیا۔ شراب نوشی کے الزام پر ان کو اس منصب سے معزول کر دیا۔ قتل عثمان رضی اللہ عنہ کے بعد فتنہ سے الگ تھلگ ہو کر بیٹھ گئے۔ رقہ میں مقیم ہوئے اور وہیں وفات پائی اور بلیخ میں دفن ہوئے۔

(۱۰۶۵) وَعَنْ مُعَاوِيَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ، أَنَّهُ قَالَ

حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے نبی ﷺ سے روایت کیا ہے کہ آپؐ نے شرابی کے متعلق فرمایا "جب وہ شراب

فِي شَارِبِ الخَمْرِ: «إِذَا شَرِبَ فَاجْلِدُوهُ، ثُمَّ إِذَا شَرِبَ الثَّانِيَةَ فَاجْلِدُوهُ، ثُمَّ إِذَا شَرِبَ الثَّالِثَةَ فَاجْلِدُوهُ، ثُمَّ إِذَا شَرِبَ الرَّابِعَةَ فَاضْرِبُوا عُنُقَهُ». أَخْرَجَهُ أَحْمَدُ وَهٰذَا لَفْظُهُ، وَالأَرْبَعَةُ، وَذَكَرَ التِّرْمِذِيُّ مَا يَدُلُّ عَلىٰ أَنَّهُ مَنْسُوخٌ، وَأَخْرَجَ ذٰلِكَ أَبُو دَاوُدَ صَرِيحاً عَنِ الزُّهْرِيِّ.

پئے تو اسے کوڑے مارو۔ پھر دوبارہ شراب نوشی کرے تو پھر کوڑے لگاؤ۔ پھر جب تیسری مرتبہ شراب پئے تو پھر کوڑے لگاؤ۔ مگر جب چوتھی دفعہ شراب نوشی کرے تو اس کی گردن اڑا دو۔" (اسے احمد نے بیان کیا ہے اور یہ الفاظ اسی کے ہیں اور چاروں نے بھی روایت کیا ہے اور ترمذی نے جو کچھ ذکر کیا ہے وہ تو اس پر دلالت کرتا ہے کہ اس کا قتل کرنا منسوخ ہے اور ابوداؤد نے بالصراحت زہری سے اس کی تخریج کی ہے)

حاصل کلام: اس حدیث سے بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ شرابی کو قتل کی سزا دی جا سکتی ہے۔ اہل ظواہر اور علامہ ابن حزم کی یہی رائے ہے مگر جمہور نے قتل کو منسوخ کہا ہے اور اس کی ناسخ ابوداؤد میں امام زھری کی روایت ہے کہ آنجناب ﷺ نے چوتھی بار شراب نوشی پر قتل نہیں کیا تھا صرف کوڑوں کی سزا پر اکتفا فرمایا تھا بلکہ امام شافعی رحمہ اللہ نے اجماع نقل کیا ہے کہ شراب پینے والے شخص کیلئے کسی صورت بھی موت کی سزا نہیں ہے۔

(١٠٦٦) وَعَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «إِذَا ضَرَبَ أَحَدُكُمْ فَلْيَتَّقِ الوَجْهَ». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "جب تم میں سے کوئی حد لگائے تو چہرے کو بچائے۔" (بخاری و مسلم)

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ سزا دیتے وقت چہرے پر مارنے کی ممانعت ہے۔ اسی طرح بچوں اور زیردستوں کو اگر کسی امر مجبوری کی وجہ سے مارنے کی نوبت آجائے تو چہرے پر مارنے سے اجتناب کرنا چاہئے۔ چہرہ شرف انسانی کا ترجمان ہے۔ شرابی کی سزا کے موقع پر سر میں مٹی ڈالنا اور زجر و توبیخ کرنا بھی جائز ہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے ابن ابی شیبہ نے نقل کیا ہے کہ ایک حد میں ﴿ فوطدی اخصیتین ﴾ پر مارنے سے بھی منع فرمایا ہے البتہ سر پر مارنے کو بعض نے جائز رکھا ہے۔

(١٠٦٧) وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُمَا قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «لاَ تُقَامُ الحُدُودُ فِي المَسَاجِدِ». رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ وَالحَاكِمُ.

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "مسجدوں میں حدود نہ لگائی جائیں۔" (ترمذی مستدرک حاکم)

حاصل کلام: اس حدیث کی رو سے مساجد میں حدود قائم نہیں کرنی چاہئیں کیونکہ مساجد صرف اللہ کی

عبادت و بندگی کیلئے ہوتی ہیں اور اللہ تعالیٰ کی رحمت کے نزول کی جگہیں ہیں۔ ایسی پاکیزہ اور رحمت کی جگہوں پر اگر حدود کا اجراء کیا جائے تو اندیشہ ہے کہ خون سے مسجد کی بے حرمتی ہو اور جہاں نزول رحمت ہو وہاں حدود اللہ کا انتقام لیا جائے تو یہ اس کے مقام و مرتبہ کے منافی ہے۔ حرم مکہ میں اگر کوئی مجرم پناہ گزیں ہو جائے تو اسے وہاں سے نکلنے کیلئے مجبور کرنے کیلئے اس کا کھانا پینا بند کر دیا جائے تا کہ وہ ازخود مجبور ہو کر باہر نکلنے پر مجبور ہو اور اسے قتل کر کے حرم میں خونریزی سے اجتناب کیا جائے۔

(١٠٦٨) وَعَنْ أَنَسٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: لَقَدْ أَنْزَلَ اللَّهُ تَحْرِيمَ الخَمْرِ، وَمَا بِالْمَدِيْنَةِ شَرَابٌ يُشْرَبُ إِلاَّ مِنْ تَمْرٍ. أَخرَجَهُ مُسْلِمٌ.

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے شراب کو حرام قرار دیا ہے تو مدینہ میں اس وقت صرف کھجور سے تیار کردہ شراب پی جاتی تھی۔ (مسلم)

حاصل کلام: اس حدیث کے بیان کرنے کا مقصد و مدعا یہ ہے کہ محض انگور سے کشید کردہ شراب ہی حرام نہیں ہے بلکہ ہر چیز سے تیار کردہ شراب حرام ہے جو نشہ آور ہو اور انسان کی عقل کو ڈھانپ لے اور انسان اپنے حواس کھو بیٹھے۔ اس کی تائید آئندہ احادیث سے بھی ہوتی ہے۔

(١٠٦٩) وَعَنْ عُمَرَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: نَزَلَ تَحْرِيمُ الخَمْرِ وَهِيَ مِنْ خَمْسَةٍ: مِنَ العِنَبِ، وَالتَّمْرِ، وَالعَسَلِ، وَالحِنْطَةِ، وَالشَّعِيْرِ، وَالخَمْرِ مَا خَامَرَ العَقْلَ. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ تحریم شراب کا حکم نازل ہوا اور وہ پانچ چیزوں سے تیار کی جاتی تھی۔ انگور، کھجور، شہد، گندم، جو سے اور خمر (کی تعریف یہ ہے کہ) ہر وہ چیز ہے جو عقل کو ڈھانپ لے۔ (بخاری و مسلم)

حاصل کلام: اس حدیث میں پانچ چیزوں سے شراب تیار کرنے کا ذکر ہے کیونکہ اس دور میں عموماً انہی سے شراب تیار کی جاتی تھی۔ خمر یعنی شراب اسے کہتے ہیں جو عقل کو ڈھانپ لے اور حواس پر غالب آجائے۔ اس لئے یہ صورت جس میں بھی پائی جائے وہ حرام ہوگی خواہ وہ کھجور یا انگور وغیرہ سے تیار ہوئی ہو یا کسی دوسری چیز سے۔

(١٠٧٠) وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا، عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ: «كُلُّ مُسْكِرٍ خَمْرٌ، وَكُلُّ مُسْكِرٍ حَرَامٌ». أَخرَجَهُ مُسْلِمٌ.

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما نے نبی ﷺ سے روایت بیان کی ہے کہ "ہر نشہ آور چیز خمر ہے اور ہر نشہ آور چیز حرام ہے۔" (مسلم)

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ ہر نشہ آور چیز حرام ہے وہ عصیر کی شکل میں ہو یا نبیذ کی یا

کسی اور شکل و صورت میں ہو۔

(۱۰۷۱) وَعَنْ جَابِرٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، أَنَّ رَسُولَ اللهِ ﷺ قَالَ: «مَا أَسْكَرَ كَثِيرُهُ فَقَلِيلُهُ حَرَامٌ». أَخْرَجَهُ أَحْمَدُ وَالأَرْبَعَةُ، وَصَحَّحَهُ ابْنُ حِبَّانَ.

حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "جس چیز کی کثیر مقدار نشہ آور ہو اس کی قلیل مقدار بھی حرام ہے۔" (اس کی تخریج احمد اور چاروں نے کی ہے اور ابن حبان نے اسے صحیح کہا ہے)

حاصل کلام: اس حدیث سے ثابت ہوا کہ جس کا کثیر استعمال نشہ آور ہو اس کا قلیل استعمال بھی حرام ہے۔ مگر احناف اور کوفہ و بصرہ کے علماء کا خیال ہے کہ انگور اور کھجور کے سوا جو شراب نشہ دینے کی مقدار تک نہ پہنچے وہ حلال ہے لیکن یہ حدیث صراحتاً ان حضرات کے اس قول کی تردید کرتی ہے۔

(۱۰۷۲) وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا قَالَ: كَانَ رَسُولُ اللهِ ﷺ يُنْبَذُ لَهُ الزَّبِيبُ فِي السِّقَاءِ، فَيَشْرَبُهُ يَوْمَهُ، وَالغَدَ، وَبَعْدَ الغَدِ، فَإِذَا كَانَ مَسَاءُ الثَّالِثَةِ شَرِبَهُ، وَسَقَاهُ، فَإِنْ فَضَلَ شَيْءٌ أَهْرَاقَهُ. أَخْرَجَهُ مُسْلِمٌ.

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ کیلئے منقیٰ کو مشکیزے میں ڈال کر نبیذ تیار کیا جاتا تھا۔ آپؐ اس کو اس روز بھی اور دوسرے اور تیسرے روز بھی نوش فرماتے تھے۔ جب تیسرے روز کی شام ہوتی تو اسے نوش فرماتے اور دوسرے کو پلا دیتے اور باقی ماندہ کو گرا دیتے۔ (مسلم)

لغوی تشریح: ﴿ینبذ﴾ صیغہ مجہول۔ یعنی منقیٰ سے نبیذ تیار کی جاتی اور ﴿زبیب﴾ خشک کشمش کو اور ﴿سقا﴾ چمڑے کے مشکیزہ کو کہتے ہیں۔ ﴿فان فضل﴾ یعنی تیسرے روز شام کو پینے کے بعد بھی وہ اگر بچ جاتی تو اسے گرا دیتے مبادا اس میں نشہ نہ پیدا ہو جائے۔

حاصل کلام: اس حدیث سے ثابت ہوا کہ آپؐ نبیذ استعمال فرماتے تھے مگر جب اس میں نشہ کی کیفیت کا گمان اور اندیشہ محسوس ہوتا تو اسے گرا دیتے نہ خود استعمال فرماتے اور نہ ہی کسی دوسرے کو تحفہ دیتے۔ اس حدیث کا قطعاً یہ مفہوم نہیں کہ نبیذ کا استعمال تین دن تک بہرنوع جائز ہے بلکہ مقصد یہ ہے کہ نشہ سے پہلے تو اس کا استعمال جائز ہے بعد میں نہیں۔ خواہ وہ موسم کے لحاظ سے دوسرے روز ہی پیدا ہو جائے۔

(۱۰۷۳) وَعَنْ أُمِّ سَلَمَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهَا، عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ: «إِنَّ اللَّهَ لَمْ يَجْعَلْ شِفَاءَكُمْ فِيمَا حَرَّمَ عَلَيْكُمْ». أَخْرَجَهُ البَيْهَقِيُّ، وَصَحَّحَهُ

حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا نے نبی ﷺ سے روایت بیان کی ہے کہ آپؐ نے فرمایا: "اللہ عزوجل نے جو چیز تمہارے لئے حرام قرار دے دی ہے اس میں تمہارے لئے شفا نہیں رکھی۔" (اسے بیہقی نے تخریج

ابْنُ حِبَّانَ. کیا ہے اور ابن حبان نے اسے صحیح قرار دیا ہے)

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ کسی نشہ آور چیز میں اللہ تعالیٰ نے حقیقی شفا نہیں رکھی۔ اس لئے ان کا برائے علاج استعمال بھی ناجائز ہے۔

(١٠٧٤) وَعَنْ وَآئِلٍ الحَضْرَمِيِّ، أَنَّ طَارِقَ ابْنَ سُوَيْدٍ سَأَلَ النَّبِيَّ ﷺ عَنِ الخَمْرِ يَصْنَعُهَا لِلدَّوَآءِ، فَقَالَ: «إِنَّهَا لَيْسَتْ بِدَوَاءٍ، وَلَكِنَّهَا دَاءٌ». أَخْرَجَهُ مُسْلِمٌ وَأَبُو دَاوُدَ وَغَيْرُهُمَا.

حضرت وائل بن حضرمی سے روایت ہے کہ طارق بن سوید رضی اللہ عنہ نے نبی ﷺ سے شراب کے بارے میں پوچھا کہ وہ اسے دوا کیلئے بناتے ہیں۔ آپ نے فرمایا "یہ دوا بالکل نہیں بلکہ یہ بیماری ہے۔" (اسے مسلم اور ابوداؤد و غیرہما نے تخریج کیا ہے)

حاصل کلام: شراب کو بطور دوا استعمال کرنا حرام ہے۔ یہ بذات خود بیماری ہے شفا نہیں ہے۔

راوی حدیث: ﴿طارق بن سوید حضرمی رضی اللہ عنہ﴾ صحابی ہیں۔ سوید بن طارق بھی کہا جاتا ہے۔ جعفی بھی کہا جاتا تھا۔ ان سے یہی ایک حدیث مروی ہے۔ اہل کوفہ نے ان سے روایت کیا ہے۔

٥ - بَابُ التَّعْزِيرِ وَحُكْمِ الصَّائِلِ — تعزیر اور حملہ آور (ڈاکو) کا حکم

(١٠٧٥) عَنْ أَبِي بُرْدَةَ الأَنْصَارِيِّ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، أَنَّهُ سَمِعَ رَسُولَ اللهِ ﷺ يَقُولُ: «لاَ يُجْلَدُ فَوْقَ عَشْرَةِ أَسْوَاطٍ إِلاَّ فِي حَدٍّ مِنْ حُدُودِ اللهِ تَعَالَى». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت ابوبردہ انصاری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ انہوں نے رسول اللہ ﷺ کو ارشاد فرماتے سنا "حدود اللہ میں سے کسی حد کے سوا دس کوڑوں سے زیادہ سزا نہ دی جائے۔" (بخاری و مسلم)

لغوی تشریح: ﴿باب التعزیر﴾ سزا کو کہتے ہیں۔ جو حد سے کم ہوتی ہے اور یہ حسب حال قول و فعل دونوں طرح سے دی جاتی ہے' یہ عذر سے ماخوذ ہے جس کے معنی ہیں منع کرنا اور روکنا اور اس کا یہ نام اس لئے رکھا گیا ہے کہ قبیح فعل کو دوبارہ کرنے سے روک دیتی ہے۔ ﴿لا یجلد﴾ صیغہ نفی کی صورت میں مجہول اور صیغہ نہی کی صورت میں یہ مجزوم ہوگا۔ ﴿فوق عشرۃ اسواط﴾ ایک روایت میں "فوق عشرۃ جلدات" اور ایک دوسری روایت میں "فوق عشر ضربات" کے الفاظ ہیں اور تینوں کا مطلب ایک ہی ہے کہ دس کوڑوں سے زیادہ نہ مارے جائیں۔ یہ حدیث حنفی' مالکی اور شافعی حضرات کے مخالف ہے' اس لئے کہ ان حضرات نے دس کوڑوں سے زیادہ سزا دینا جائز رکھا ہے۔ اس مسئلہ میں لمبی تفصیل ہے جس کا اس مقام پر بیان کا موقع نہیں۔ راجح بات وہی ہے جس پر یہ حدیث دلالت کر رہی ہے کہ دس کوڑوں سے زائد کی سزا جائز نہیں۔

راوی حدیث: ﴿ ابوبردہ رضی اللہ عنہ ﴾ بلوی قبیلہ سے تھے۔ شرف صحابیت سے سرفراز تھے۔ ان کا نام ھانی بن نیار رضی اللہ عنہ تھا۔ بدر وغیرہ میں شریک ہوئے۔ ۴۱ھ یا ۴۲ھ یا ۴۵ھ میں فوت ہوئے۔

(۱۰۷۶) وَعَنْ عَآئِشَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهَا أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ قَالَ: «أَقِيلُوا ذَوِي الْهَيْئَاتِ عَثَرَاتِهِمْ إِلاَّ الْحُدُودَ». رَوَاهُ أَحْمَدُ وَأَبُو دَاوُدَ وَالنَّسَآئِيُّ وَالْبَيْهَقِيُّ.

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا "صاحب عز و شرف لوگوں کو بجز حدود الٰہی، ان کی لغزشیں درگزر کر دیا کرو۔" (اسے احمد، ابوداؤد، نسائی اور بیہقی نے روایت کیا ہے)

لغوی تشریح: ﴿ اقیلوا ذوی الھیئات ﴾ اقیلوا سے ماخوذ ہے۔ یعنی صاحب شرف و صلاح اور مروت والے حضرات کو ان کی لغزشیں معاف کر دیا کرو۔ ان کی لغزشوں اور کوتاہیوں پر گرفت نہ کرو اور ﴿ عثرة ﴾ کے معنی لغزش کے ہیں۔

(۱۰۷۷) وَعَنْ عَلِيٍّ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، قَالَ: مَا كُنْتُ لأُقِيْمَ عَلَىٰ أَحَدٍ حَدًّا فَيَمُوتَ، فَأَجِدَ فِيْ نَفْسِيْ، إِلاَّ شَارِبَ ٱلْخَمْرِ، فَإِنَّهُ لَوْ مَاتَ وَدَيْتُهُ. أَخْرَجَهُ الْبُخَارِيُّ.

حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں کسی پر ایسی حد نافذ نہیں کروں گا کہ وہ اس سے مرجائے اور میں اس کا غم اپنے دل میں محسوس کروں سوائے شرابی کے اگر وہ سزا میں جاں بحق ہو جائے تو میں اس کی دیت ادا کروں گا۔ (بخاری)

لغوی تشریح: ﴿ لاقیم ﴾ مضارع پر نصب "ان" کے مقدر ہونے کی وجہ سے اور یہ "ان" ناصبہ لام مکسورہ کے بعد ہے۔ اس لام کو گرائمر میں لام جحود کہتے ہیں۔ ﴿ فیموت ﴾ اور وہ مرجائے سزا کی وجہ سے۔ مضارع منصوب ہے۔ ﴿ فاجد ﴾ نفی کے جواب میں واقع ہونے کی وجہ سے منصوب واقع ہوا ہے۔ معنی ہوگا مجھے افسوس اور تاسف ہوگا۔ ﴿ ودیتہ ﴾ میں اس کی دیت ادا کروں گا۔

حاصل کلام: حضرت علی رضی اللہ عنہ نے شرابی کی سزا میں مرجانے کی صورت میں دیت کا جو فرمایا ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے شرابی کی سزا مقرر نہیں فرمائی۔ اس لئے شرابی کا سزا سے مرجانا قتل خطا کے زمرے میں آجاتا ہے اور قتل خطا میں دیت دینا لازم ہے اور جمہور علماء کا بھی یہی خیال ہے کہ تعزیر کی صورت میں وہ شخص مرجائے تو سربراہ مملکت پر اس کی دیت ادا کرنا ضروری ہے۔

(۱۰۷۸) وَعَنْ سَعِيْدِ بْنِ زَيْدٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «مَنْ قُتِلَ دُونَ مَالِهِ فَهُوَ شَهِيدٌ». رَوَاهُ ٱلأَرْبَعَةُ، وَصَحَّحَهُ

حضرت سعید بن زید رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "جو شخص اپنے مال و متاع کی حفاظت کرتا ہوا مارا جائے، وہ شہید ہے۔" (اسے چاروں نے روایت کیا ہے اور ترمذی نے اسے صحیح قرار دیا

التِّرْمِذِيُّ. ہے)

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ مال لوٹنے والے کو ہر طرح اور ہر ممکن طریقہ سے دفع کرنا اور اس کا مقابلہ کرنا جائز ہے بلکہ بعض نے تو اپنا دفاع کرنا واجب قرار دیا ہے۔ اس دفاعی کشمکش میں ڈاکو کو اگر مالک قتل کر دیتا ہے تو قاتل پر نہ قصاص ہے اور نہ دیت۔ اس کا قتل رائیگاں گیا۔ اسی طرح جو کوئی اپنے دین و ایمان کا تحفظ اور اپنے اہل و عیال کی حفاظت میں خود قتل ہو جائے تو مرتبہ شہادت اور اگر دوسرے کو قتل کر دیا تو قصاص و دیت معاف۔ اس سے اندازہ لگا لیں کہ اسلام نے جان' مال اور عزت کی حفاظت کو کتنی اہمیت دی ہے۔

(۱۰۷۹) وَعَنْ عَبْدِ اللهِ بْنِ خَبَّابٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، قَالَ: سَمِعْتُ أَبِي يَقُولُ: سَمِعْتُ رَسُولَ اللهِ ﷺ يَقُولُ: «تَكُونُ فِتَنٌ، فَكُنْ فِيهَا عَبْدَ اللهِ المَقْتُولَ، وَلاَ تَكُنِ القَاتِلَ». أَخْرَجَهُ ابْنُ أَبِي خَيْثَمَةَ وَالدَّارَقُطْنِيُّ، وَأَخْرَجَ أَحْمَدُ نَحْوَهُ عَنْ خَالِدِ ابْنِ عُرْفُطَةَ.

حضرت عبداللہ بن خباب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے اپنے والد کو بیان کرتے سنا وہ کہتے تھے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو ارشاد فرماتے ہوئے سنا ہے کہ "میرے بعد فتنے رونما ہوں گے۔ اے اللہ کے بندے! تو ان میں مقتول بن جانا' قاتل نہ بننا۔" (اس کو ابن ابی خیثمہ اور دارقطنی نے نکالا ہے اور احمد نے اسی طرح خالد بن عرفطہ سے روایت کیا ہے)

لغوی تشریح: ﴿ فتن ﴾ فتنۃ کی جمع ہے اور یہاں اس سے مراد قتل نفوس اور خونریزیاں ہیں اور اس حدیث میں ارشاد ہے کہ فتنوں کے دور میں الگ ہو کر بیٹھ جانا اور اس میں حصہ نہ لینا ہے۔ مگر یہ اس وقت ہے کہ جب دو گروہ بغیر حق و استحقاق کے باہم لڑ پڑیں یا پھر یہ کہ اس لڑائی میں حق کی وجہ آدمی کو معلوم نہ ہو سکے جب اسے معلوم ہو جائے کہ حق فلاں کے ساتھ ہے تو پھر حق کی مدد اور باطل کے دفع کرنے میں تگ و دو اور دوڑ دھوپ اس پر واجب ہے کیونکہ ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

فقاتلوا التی تبغی حتی تفی الی امر اللہ (۴۹:۹)

مگر جب اس پر کوئی ہجوم کر لے اور اسے قتل کرنا چاہے یا اس کا مال و متاع لوٹنا چاہے یا ایسی ہی کوئی دوسری صورت رونما ہو جائے تو اس حدیث کی رو سے اسے اپنے آپ کو اس کے سپرد کر دینا چاہئے اور ایک رائے یہ بھی ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے ارشاد کے مطابق اس سے لڑنا چاہئے اور اس دفاعی و حفاظتی لڑائی میں اگر وہ مارا جائے گا تو رتبۂ شہادت پا لے گا۔ بظاہر یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ ان دونوں امور میں سے جو مصالح کے موافق ہو اسے اختیار کر لے۔

راوی حدیث: ﴿ عبداللہ بن خباب ﴾ مدنی ہیں۔ ثقہ تابعین میں شمار ہوتا ہے۔ ۲۷ھ کو نہروان کے راستے پر حضرت علی رضی اللہ عنہ کے خلاف بغاوت کے بعد خارجیوں نے انہیں قتل کیا۔ اور ان کے قتل کے بعد وہ ان کے گھر گئے اور ان کی بیوی کا پیٹ پھاڑا اور اس کے بیٹے کو قتل کر دیا۔ یہی واقعہ مشہور جنگ' جنگ

نھروان کا باعث بن گیا' جس میں حضرت علیؓ اور ان کے ساتھیوں کے ہاتھوں سارے خارجی قتل ہو گئے۔ صرف سات بچے جو بعد میں اٹھنے والے بڑے فتنے کے لیے جراثیم ثابت ہوئے۔

﴿ خباب ﴾ خباب میں باء پر تشدید۔ خباب بن ارت بن جندلہ تمیمی۔ اللہ کے راستے میں شادی نہ کرنے والوں میں سے ایک تھے۔ بدری صحابی ہیں۔ جنگ صفین سے واپسی پر کوفہ میں ۳۷ھ کو ۷۳ سال کی عمر میں فوت ہوئے۔

﴿ خالد بن عرفطہ رضی اللہ عنہ ﴾ قضاعی عذری ہیں۔ عذرہ قبیلہ سے تھے۔ شرف صحابیت سے بہرہ ور تھے۔ کوفہ پر حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کی جانب سے حاکم تھے۔ ۶۱ھ میں وفات پائی اور یہ کہا گیا ہے کہ مختار بن ابی عبید نے یزید کی موت کے بعد ان کو قتل کر دیا۔ یہ ۶۴ھ کی بات ہے۔

١١۔ كِتَابُ الْجِهَادِ

مسائل جہاد

(١٠٨٠) عَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «مَنْ مَاتَ، وَلَمْ يَغْزُ، وَلَمْ يُحَدِّثْ نَفْسَهُ بِهِ، مَاتَ عَلَى شُعْبَةٍ مِنْ نِفَاقٍ». رَوَاهُ مُسْلِمٌ.

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ”جو شخص ایسی حالت میں مر گیا کہ اس نے نہ کبھی جہاد میں حصہ لیا اور نہ کبھی اس کے دل میں یہ خیال آیا اور نہ اس کی خواہش و تمنا پیدا ہوئی تو اس کی موت نفاق کے شعبہ پر ہوئی۔“ (مسلم)

لغوی تشریح: ﴿کتاب الجهاد﴾ ’جہاد لغت میں مشقت اور کوشش کو کہتے ہیں اور شرعاً دین اسلام کی حفاظت و حمایت اور کلمۃ اللہ کو بلند وبالا کرنے کی غرض سے قتال اور باغیوں سے لڑنے میں اپنی پوری جدوجہد کرنا اور سعی وکوشش صرف کرنا جہاد کہلاتا ہے۔ ﴿ولم یغز﴾ غزو سے ماخوذ ہے معنی اس کے یہ ہیں کہ اس نے دشمنان دین سے کبھی لڑائی نہیں کی۔ ﴿ولم یحدث نفسه به﴾ اور نہ اس کے خیال میں یہ چیز وارد ہوئی اور نہ اس کے دل میں اس کی نیت تھی کہ وہ اس کا وقت آنے پر اور قتال کے ممکن ہونے پر ان سے لڑے گا۔

حاصل کلام: اس حدیث کی رو سے کم از کم جہاد فی سبیل اللہ کی پختہ نیت رکھنا واجب ہے۔ اگر جہاد فی سبیل اللہ میں عملاً شریک ہونے کا موقع میسر آجائے تو اس میں شریک ہونے سے گریز نہ کرے بلکہ ایسے موقع کو سعادت سمجھے اور اگر موقع میسر نہیں آتا تو پھر موقع کے انتظار میں رہے گویا کہ حسب موقع ہر وقت ایک مومن پر جہاد فی سبیل اللہ فرض ہے اور اسلامی زندگی اسی جذبۂ قربانی سے وابستہ ہے۔ اگر ایک مومن اپنا نصب العین ہی فراموش کر دے تو پھر مومن اور کافر میں کیا فرق رہ جاتا ہے۔ مومن کا تو فرض منصبی ہی کلمۃ اللہ کی سربلندی ہے اگر وہ اپنے حقیقی فرض سے تغافل برتے گا تو اپنے آپ پر ظلم کرے گا۔

(١٠٨١) وَعَنْ أَنَسٍ رَضِيَ اللَّهُ

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے

تَعَالَى عَنْهُ، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ قَالَ: «جَاهِدُوا الْمُشْرِكِينَ بِأَمْوَالِكُمْ، وَأَنْفُسِكُمْ، وَأَلْسِنَتِكُمْ». رَوَاهُ أَحْمَدُ وَالنَّسَآئِيُّ، وَصَحَّحَهُ الحَاكِمُ.

فرمایا "مشرکین سے اپنے مالوں' اپنی جانوں اور اپنی زبانوں سے جہاد کرو۔" (اسے احمد اور نسائی نے روایت کیا ہے اور حاکم نے اسے صحیح قرار دیا)

لغوی تشریح: ﴿الجهاد باللسان﴾ جہاد باللسان زبان سے جہاد یہ ہے کہ کافروں پر حجت قائم کر دی جائے۔ ان کو توحید الٰہی کی جانب دعوت دی جائے اور ان کی ھجو کی جائے اور اس طرح ان کو رسوا اور ذلیل کیا جائے کہ ان کی ہمتیں بیٹھ جائیں اور لڑائی سے بزدلی دکھائیں اور میدان میں نہ آئیں۔

حاصل کلام: اس حدیث سے ثابت ہوا کہ خدا کے باغیوں' سرکشوں' ملحدوں اور بے دین لوگوں کے خلاف جہاد فی سبیل اللہ کیلئے خود کو ہر لحہ مستعد رکھے۔ اس سلسلہ میں مال خرچ کرے' زبان سے جہاد کرے' کافروں پر توحید و رسالت اور آخرت کو تسلیم کرنے پر دلائل پیش کرے۔ آج کے دور میں میڈیا ایسا مؤثر اور عالم گیر ہتھیار ہے کہ لڑنے کی نوبت آنے سے پہلے ہی اذہان و خیالات اور نظریات کو یکسر تبدیل کر کے رکھ دیا جاتا ہے۔ شعرو شاعری اور اچھے مضامین کے ذریعہ اس جہاد میں حصہ لینا اس دور کی اہم ترین ضرورت ہے۔

(١٠٨٢) وَعَنْ عَآئِشَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهَا، أَنَّهَا قَالَتْ: قُلْتُ: يَا رَسُولَ اللهِ! عَلَى النِّسَآءِ جِهَادٌ؟ قَالَ: «نَعَمْ، جِهَادٌ لاَ قِتَالَ فِيهِ، هُوَ الحَجُّ وَالعُمْرَةُ». رَوَاهُ ابْنُ مَاجَهْ، وَأَصْلُهُ فِي البُخَارِيِّ.

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ میں نے عرض کیا اے اللہ کے رسول (ﷺ)! کیا خواتین پر بھی جہاد ہے؟ فرمایا "ہاں! جہاد ہے جس میں لڑائی نہیں۔ وہ ہے حج اور عمرہ۔" (اسے ابن ماجہ نے روایت کیا ہے اور اس کی اصل بخاری میں ہے)

حاصل کلام: اس حدیث میں مذکور ہے کہ خواتین کا جہاد لڑنا' مارنا نہیں بلکہ ان کیلئے حج اور عمرہ جہاد ہے۔ جہاد میں انسان کو سفری صعوبتیں' مشقتیں' تکلیفیں برداشت کرنا پڑتی ہیں' مال خرچ کرنا پڑتا ہے۔ حج و عمرہ میں بھی ان سب مشقتوں سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ اس لئے خواتین کو حج و عمرہ کا ثواب جہاد کے برابر ملتا ہے۔ اسی بنا پر حج و عمرہ کو خواتین کیلئے جہاد قرار دیا گیا ہے گویا خواتین پر جہاد بالسیف فرض نہیں۔ اس کا ثواب اسے حج اور عمرہ ادا کرنے کی صورت میں مل جاتا ہے۔

(١٠٨٣) وَعَنْ عَبْدِاللهِ بْنِ عَمْرٍو رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا قَالَ: جَآءَ رَجُلٌ إِلَى النَّبِيِّ ﷺ يَسْتَأْذِنُهُ فِي

حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ ایک شخص نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور وہ جہاد میں شرکت کی اجازت طلب کر رہا تھا۔

الجِهَادِ، فَقَالَ: «أَحَيٌّ وَالِدَاكَ؟» فَقَالَ: نَعَمْ، قَالَ: «فَفِيهِمَا فَجَاهِدْ». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

آپؐ نے فرمایا "کیا تیرے والدین بقید حیات ہیں؟" وہ بولا ہاں! آپؐ نے فرمایا "پس ان دونوں (کی خدمت) میں جدوجہد کرو۔" (بخاری و مسلم) مسند احمد

وَلِأَحْمَدَ وَأَبِيْ دَاوُدَ مِنْ حَدِيْثِ أَبِي سَعِيْدٍ نَحْوُهُ، وَزَادَ: «ارْجِعْ، فَاسْتَأْذِنْهُمَا، فَإِنْ أَذِنَا لَكَ، وَإِلاَّ فَبِرَّهُمَا».

اور ابوداؤد میں ابوسعید کی روایت بھی اسی طرح منقول ہے۔ اس میں اضافہ ہے کہ آپؐ نے فرمایا "واپس چلے جاؤ' ان سے اجازت طلب کرو۔ پھر اگر وہ دونوں تجھے اجازت دے دیں تو درست ورنہ ان کے ساتھ نیکی اور حسن سلوک کرو۔"

لغوی تشریح: ﴿ فبرهما ﴾ امر ہے "بر" سے باب سمع ہے یعنی اچھا سلوک کر۔

حاصل کلام: اس حدیث سے والدین کی اہمیت و فضیلت معلوم ہوتی ہے کہ اسلام کی نظر میں جہاد جیسا فریضہ بھی والدین کی رضامندی کے بغیر ادا نہیں کیا سکتا۔ آج کا نوجوان والدین کو خاطر میں لانے کیلئے تیار ہی نہیں۔ اپنی من مانی کرتا ہے' اپنی رائے کا پابند کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ والدین کی رضامندی کو اتنی اہمیت اس لئے دی گئی ہے کہ جہاد سب پر تو فرض کفایہ ہے اور والدین کی اطاعت فرض عین ہے۔ ظاہر ہے کہ فرض عین کو فوقیت حاصل ہے۔

(١٠٨٤) وَعَنْ جَرِيْرٍ البَجَلِيِّ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ: «أَنَا بَرِيْءٌ مِنْ كُلِّ مُسْلِمٍ يُقِيمُ بَيْنَ المُشْرِكِينَ». رَوَاهُ الثَّلاَثَةُ، وَإِسْنَادُهُ صَحِيْحٌ، وَرَجَّحَ البُخَارِيُّ إِرْسَالَهُ.

حضرت جریر بجلی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "میں ہر اس مسلمان سے بری الذمہ ہوں جو مشرکین میں قیام پذیر ہو۔" (اسے تینوں نے روایت کیا ہے اور اس کی سند صحیح ہے مگر بخاری نے اس کے مرسل ہونے کو ترجیح دی ہے)

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ جب مسلمان کفار کے درمیان مقیم ہوں اور مجاہدین کے ہاتھوں ان کا قتل ہو جائے تو مجاہدین پر اس کا کوئی گناہ نہیں۔ اس فعل پر ان کو مجرم قرار نہیں دیا جائے گا۔ حالات کے تقاضا کے مطابق مشرکین کے گھروں اور علاقوں سے ہجرت کرنا واجب ہے۔

راوی حدیث: ﴿ جریر بجلی رضی اللہ عنہ ﴾ ان کی کنیت ابو عمرو ہے۔ سلسلہ نسب یوں ہے۔ جریر بن عبداللہ بن جابر بجلی۔ بجیلہ قبیلہ سے ہونے کی وجہ سے بجلی کہلائے۔ بجلی کے "با" پر فتحہ اور جیم ساکن۔ ۱۰ھ میں دائرۂ اسلام میں داخل ہوئے نبی ﷺ نے ان کے اعزاز کیلئے کپڑا بچھایا اور ان کو ذی الخلصہ بت کو منہدم کرنے کیلئے بھیجا گیا۔ انہوں نے اسے گرا دیا۔ آپ کے زمانہ میں ان کو یمن پر عامل مقرر کیا گیا۔ ان کا کہنا تھا کہ جب سے میں نے اسلام قبول کیا اس روز سے آپ نے مجھ سے حجاب نہیں کیا اور مجھے ہمیشہ

مسکراتے ہوئے دیکھا۔ ان کی جوتی کا سائز ایک ہاتھ کے برابر تھا۔ مدائن کی فتح کے موقع پر حاضر تھے اور جنگ قادسیہ میں ان کو فوج کے میمنہ پر متعین کیا گیا ان کو اس امت کا یوسف کہا گیا ہے۔ ۵۲ھ میں یا ۵۴ھ میں وفات پائی۔

(۱۰۸۵) وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُما قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «لاَ هِجْرَةَ بَعْدَ الفَتْحِ، وَلَكِنْ جِهَادٌ وَنِيَّةٌ». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "فتح (مکہ) کے بعد ہجرت نہیں لیکن جہاد اور نیت باقی ہے۔" (بخاری و مسلم)

لغوی تشریح: "لا هجرة بعد الفتح" ﴿ فتح مکہ کے بعد ہجرت نہیں کا مطلب یہ ہے کہ مکہ سے بالخصوص مدینہ کی طرف ہجرت نہیں ہے اس لئے کہ جب مکہ دارالسلام بن گیا تو اب دارالسلام میں ایک شہر سے دوسرے شہر کی طرف ہجرت کا کوئی فائدہ نہیں۔ اس سے یہ مراد نہیں کہ مکہ سے خروج جائز نہیں بلکہ اس کا مقصد یہ ہے کہ اب مکہ سے ہجرت کرنا واجب نہیں اور نہ ہی اب اسے ہجرت کا ثواب ملے گا۔ (فتح الباری) البتہ دارالکفر سے دارالسلام کی طرف ہجرت قیامت تک باقی رہے گی جیسا کہ بعض احادیث سے ثابت ہوتا ہے ﴿ ولكن جهاد ونية ﴾ امام نووی رحمہ اللہ نے کہا ہے' اس کا معنی یہ ہے کہ وہ بھلائی اور خیر جو ہجرت کے انقطاع پر منقطع ہو چکی ہے اس کا حصول جہاد اور صالح نیت کے ذریعہ ممکن ہے۔

(۱۰۸٦) وَعَنْ أَبِي مُوسَى الأَشْعَرِيِّ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «مَنْ قَاتَلَ لِتَكُونَ كَلِمَةُ اللهِ هِيَ العُلْيَا فَهُوَ فِي سَبِيلِ اللهِ» مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "جو شخص اس نیت سے لڑا کہ اللہ کا کلمہ بلند ہو تو وہ اللہ کی راہ میں لڑنے والا ہے۔" (بخاری و مسلم)

(۱۰۸۷) وَعَنْ عَبْدِ اللهِ بْنِ السَّعْدِيِّ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «لاَ تَنْقَطِعُ الهِجْرَةُ مَا قُوتِلَ العَدُوُّ». رَوَاهُ النَّسَائِيُّ، وَصَحَّحَهُ ابْنُ حِبَّانَ.

حضرت عبداللہ بن سعدی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "جب تک دشمنوں سے جنگ جاری رہے گی ہجرت بھی جاری رہے گی۔" (اسے نسائی نے روایت کیا ہے اور ابن حبان نے صحیح کہا ہے)

حاصل کلام: مندرجہ بالا تینوں احادیث کا مطلب یہ ہے کہ آغاز اسلام کے وقت چونکہ مسلمانوں کی تعداد بہت کم تھی اور مرکز مدینہ منورہ کو مضبوط اور طاقتور کرنا تھا اس لئے یہ مقصد ہجرت کے بغیر حاصل ہونا نہایت ہی دشوار اور مشکل تھا۔ اس لئے ہجرت ایک مسلمان کیلئے فرض تھی۔ ابن جریر کی حدیث میں

اس کی طرف اشارہ ہے۔ پھر ایک وقت آیا کہ مکہ فتح ہوگیا تو اس کے بعد مختلف قبائل پے در پے دائرہ اسلام میں داخل ہونے لگے اور اسلامی ریاست کی توسیع ہوگئی۔ تو مدینہ میں ہجرت کر کے آنا فرض نہ رہا جیسا کہ ابن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت میں ہے۔ اب یہ صورت حال پیدا ہوگئی ہے کہ اگر کوئی شخص دارالکفر میں اسلام کے مطابق زندگی بسر کرنے میں دشواری محسوس کرتا ہو تو اس کو دارالسلام کی جانب ہجرت کرنا اب بھی فرض ہے۔ ابن سعدی کی حدیث کا یہی مطلب و مفہوم ہے یعنی فتح مکہ کے بعد مدینہ طیبہ کی طرف ہجرت کا حکم منسوخ ہوگیا ہے اور دارالسلام کی طرف ہجرت کا حکم اب بھی باقی ہے اور ہمیشہ باقی رہے گا۔

راوی حدیث: ﴿ عبداللہ بن سعدی رضی اللہ عنہ ﴾ صحابی تھے۔ قرشی اور عامری تھے۔ واقدی نے کہا ہے کہ ان کی وفات ۵۷ھ میں ہوئی اور سعدی کا نام عمرو یا قدامہ یا عبداللہ بن وقدان تھا۔

(۱۰۸۸) وَعَنْ نَافِعٍ قَالَ: أَغَارَ رَسُولُ اللهِ ﷺ عَلَىٰ بَنِي الْمُصْطَلِقِ، وَهُمْ غَارُّونَ، فَقَتَلَ مُقَاتِلَتَهُمْ، وَسَبَى ذَرَارِيَهُمْ. حَدَّثَنِي بِذٰلِكَ عَبْدُ اللهِ ابْنُ عُمَرَ. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت نافع رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے بنو مصطلق پر شب خون مارا تو اس وقت یہ لوگ بے خبر و غافل تھے۔ پس آپؐ نے ان کے لڑائی کرنے والوں کو قتل کیا اور ان کی اولاد کو قیدی بنالیا۔ یہ مجھ سے عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے بیان کیا۔ (بخاری و مسلم)

لغوی تشریح: ﴿ اغار علی بنی المصطلق ﴾ بنی المصطلق پر ٹوٹ پڑے' شب خون مارا۔ یہ بڑا مشہور قبیلہ بنو خزاعہ کی شاخ تھی۔ ﴿ غارون ﴾ "را" پر تشدید اور بے خبر و غافل لوگ۔ ﴿ مقاتلتھم ﴾ یعنی جنگ کے قابل لڑنے والے لوگ۔ ان میں بچے' بوڑھے' عورتیں شامل نہیں۔ ﴿ وسبی ذراریھم ﴾ ان کی اولاد اور عورتوں کو قیدی بنالیا۔ یہ معرکہ ۶ھ شعبان میں واقع ہوا۔ جو غزوۂ مریسیع کے نام سے بھی مشہور ہے۔ مریسیع کے میم پر ضمہ اور "را" پر فتحہ۔ یہ چشمہ تھا جو جدہ اور رابغ کے درمیان واقع تھا۔ قدید کے قریب بنی المصطلق اس مقام پر آباد تھے۔ رسول اللہ ﷺ کو اطلاع موصول ہوئی کہ یہ لوگ آپؐ سے جنگ کرنا چاہتے ہیں تو آپؐ نے ان کو راتوں رات جالیا اور ایسا شب خون مارا کہ ان کے دس آدمی قتل کر دیئے اور باقی مردوں اور عورتوں کو قید کر لیا۔ اس لڑائی میں مسلمانوں کا ایک آدمی بھی شہید نہ ہوا۔ اسی معرکہ میں حضرت جویریہ رضی اللہ عنہا قید ہوئیں۔ یہ دراصل حضرت ثابت بن قیس بن شماس کے حصہ میں آئی تھیں۔ ثابت نے ان سے مکاتبت کر لی' رسول اللہ ﷺ نے جویریہ کی مکاتبت خود ادا فرما کر ان سے شادی کرلی۔ جب لوگوں نے سنا کہ آپؐ نے جویریہ کو اپنے حرم میں داخل فرمالیا ہے تو لوگوں نے ان کے قیدیوں کو آزاد کر دیا۔ ان کی شادی کی وجہ سے ان کے اہل خانہ کے سو افراد آزاد ہوئے۔ پس حضرت جویریہ رضی اللہ عنہا اپنی قوم کیلئے بہت بابرکت ثابت ہوئیں۔ یہی وہ غزوۂ ہے جس میں واقعہ افک رونما ہوا۔ اس واقعہ

کی کچھ تفصیل پہلے گزر چکی ہے۔

(۱۰۸۹) وَعَنْ سُلَيْمَانَ بْنِ بُرَيْدَةَ، عَنْ أَبِيْهِ قَالَ: كَانَ رَسُولُ اللهِ ﷺ إِذَا أَمَّرَ أَمِيْراً عَلىٰ جَيْشٍ أَوْ سَرِيَّةٍ، أَوْصَاهُ فِي خَاصَّتِهِ بِتَقْوَى اللهِ، وَبِمَنْ مَّعَهُ مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ خَيْراً، ثُمَّ قَالَ: «اغْزُوا بِسْمِ اللهِ فِي سَبِيلِ اللهِ، قَاتِلُوا مَنْ كَفَرَ بِاللهِ، اَغْزُوا، وَلاَ تَغُلُّوا، وَلاَ تَغْدِرُوا، وَلاَ تُمَثِّلُوا، وَلاَ تَقْتُلُوا وَلِيداً، وَإِذَا لَقِيتَ عَدُوَّكَ مِنَ الْمُشْرِكِينَ، فَادْعُهُمْ إِلَى ثَلاَثِ خِصَالٍ، فَأَيَّتَهُنَّ أَجَابُوكَ إِلَيْهَا فَاقْبَلْ مِنْهُمْ، وَكُفَّ عَنْهُمْ: ادْعُهُمْ إِلَى الإِسْلاَمِ، فَإِنْ أَجَابُوكَ فَاقْبَلْ مِنْهُمْ، ثُمَّ ادْعُهُمْ إِلَى التَّحَوُّلِ مِنْ دَارِهِمْ إِلَى دَارِ الْمُهَاجِرِينَ، فَإِنْ أَبَوْا فَأَخْبِرْهُمْ أَنَّهُمْ يَكُونُونَ كَأَعْرَابِ الْمُسْلِمِينَ، وَلاَ يَكُونُ لَهُمْ فِي الْغَنِيمَةِ وَالْفَيْءِ شَيْءٌ إِلاَّ أَنْ يُجَاهِدُوا مَعَ الْمُسْلِمِينَ، فَإِنْ هُمْ أَبَوْا، فَاسْأَلْهُمُ الْجِزْيَةَ، فَإِنْ هُمْ أَجَابُوكَ، فَاقْبَلْ مِنْهُمْ، فَإِنْ هُمْ أَبَوْا فَاسْتَعِنْ بِاللهِ تَعَالَى وَقَاتِلْهُمْ، وَإِذَا حَاصَرْتَ أَهْلَ حِصْنٍ، فَأَرَادُوكَ أَنْ تَجْعَلَ لَهُمْ ذِمَّةَ اللهِ وَذِمَّةَ نَبِيِّهِ فَلاَ تَفْعَلْ، وَلَكِنِ اجْعَلْ لَهُمْ ذِمَّتَكَ، فَإِنَّكُمْ أَنْ تَخْفِرُوا ذِمَمَكُمْ أَهْوَنُ مِنْ

حضرت سلیمان بن بریدہ اپنے باپ سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ جب کسی لشکر یا سریہ کا امیر مقرر فرماتے تو اسے بالخصوص خدا خوفی اور اپنے مسلمان ساتھیوں کے ساتھ بھلائی اور خیر کی نصیحت فرماتے۔ اس کے بعد فرماتے "اللہ کے نام کے ساتھ' اس کے راستہ میں جہاد کرو ان لوگوں سے جو خدا کے منکر و کافر ہیں۔ لڑائی کرو' خیانت نہ کرنا' دھوکہ نہ دینا اور مثلہ نہ کرنا' بچوں کو قتل نہ کرنا۔ مشرک دشمن سے جب ملاقات ہو تو ان کو لڑائی سے پہلے تین چیزوں کی دعوت پیش کرو۔ ان میں سے جسے وہ قبول کرلیں اسے قبول کرلو اور ان سے لڑائی نہ کرو۔ پہلے ان کو اسلام کی دعوت پیش کرو۔ پس اگر وہ اس کو تسلیم کرلیں تو اسے قبول کرلو۔ پھر ان کو دعوت دو کہ وہ اپنے گھربار چھوڑ کر (دارالسلام) مہاجرین کے ملک کی طرف ہجرت کرکے آجائیں۔ اگر وہ انکار کریں تو ان کو خبردار کردو کہ ان کے حقوق بدوی مسلمانوں کے برابر ہوں گے اور ان کیلئے مال غنیمت اور اموال فے میں سے کچھ بھی نہیں ملے گا۔ الاّ یہ کہ وہ مسلمانوں کے ساتھ مل کر جہاد میں شریک ہوں۔ اگر اس سے انکار کریں تو ان سے جزیہ لو۔ اگر وہ اسے تسلیم کرلیں تو اسے بھی قبول کر لو اور اگر وہ انکار کریں تو اللہ سے مدد طلب کرو اور ان سے لڑائی شروع کردو اور جب تم کسی قلعہ کا محاصرہ کرلو اور وہ تم سے اللہ اور اس کے نبی کا ذمہ و عہد لینا چاہیں تو انہیں یہ ذمہ نہ دو بلکہ تم اپنا عہد و

أَنْ تَخْفِرُوا ذِمَّةَ اللهِ، وَإِذَا أَرَادُوكَ أَنْ تَنْزِلَهُمْ عَلَى حُكْمِ اللهِ فَلاَ تَفْعَلْ، بَلْ عَلَى حُكْمِكَ، فَإِنَّكَ لاَ تَدْرِي أَتُصِبُ فِيهِمْ حُكْمَ اللهِ أَمْ لاَ». أَخْرَجَهُ مُسْلِمٌ.

ذمہ ان کو دے دو۔ (اس کے خلاف نہ کرنا۔) اس لئے کہ اگر تم اپنے عہد و ذمہ کو توڑتے ہو تو یہ اللہ کی پناہ کو توڑنے سے بہت خفیف و ہلکا ہے اور جب یہ چاہیں کہ تو ان کو اللہ کے حکم و فیصلہ پر اتارے تو ایسا نہ کرنا بلکہ اپنے حکم و فیصلہ پر اتارنا کیونکہ تجھے علم نہیں کہ تو اللہ کے فیصلہ پر پہنچ بھی سکے گا یا نہیں۔" (مسلم)

لغوی تشریح: ﴿ امر امیرا ﴾ امر فعل ماضی ہے۔ باب تفعیل سے۔ مطلب یہ ہے کہ اسے امیر لشکر بنایا اور لشکر کی قیادت پر مقرر کیا۔ ﴿ سریۃ ﴾ سین پر فتحہ' را کے نیچے کسرہ اور "یا" پر تشدید۔ لشکر کا حصہ' چھوٹا لشکر اور اہل مغازی کی اصطلاح میں سریہ اس مہم کو کہتے ہیں جس میں رسول اللہ ﷺ بذات خود شریک نہ ہوئے ہوں۔ ﴿ فی خاصتہ ﴾ بالخصوص اپنے حق میں۔ ﴿ ومن معہ ﴾ خاصتہ پر اس کا عطف ہے۔ معنی ہے کہ آپ قائد لشکر کو ان کے ساتھی مسلمانوں کے ساتھ خیر خواہی و بھلائی کی وصیت فرماتے تھے۔ ﴿ ولا تغلوا ﴾ باب نصر ینصر۔ غلول سے ماخوذ ہے یعنی مال غنیمت میں خیانت نہ کرو۔ ﴿ ولا تغدروا ﴾ غدر سے ماخوذ ہے یعنی عہد شکنی نہ کرو۔ ﴿ ولا تمثلوا ﴾ ضرب اور نصر دونوں سے آتا ہے یعنی مثلہ نہ کرو۔ مثلہ کہتے ہیں مقتول کے اعضاء بدن ناک' کان اور عضو مخصوص وغیرہ کو الگ الگ کاٹنا۔ ﴿ ولیدا ﴾ بچہ۔ مراد یہاں یہ ہے کہ وہ بچہ جو ابھی سن بلوغ کو نہ پہنچا ہو اور وہ احکام شریعت کا مکلف نہ ہو۔ ﴿ الی ثلاث خصال ﴾ خصال خصلۃ کی جمع ہے۔ تین امور میں سے کسی ایک کی طرف دعوت دو۔ ﴿ وکف عنھم ﴾ باب نصر' کف سے امر کا صیغہ ہے۔ ان سے لڑائی سے رک جاؤ۔ ﴿ ثم ادعھم الی التحول ﴾ پھر ان کو ہجرت کرنے اور منتقل ہونے کی دعوت دو اور یہ پہلی خصلت کی تکمیل ہے ﴿ فان ھم ابوا فاخبرھم ﴾ یعنی قبول اسلام کے بعد اگر وہ ہجرت کرنے سے انکار کریں۔ ﴿ الغنیمۃ ﴾ جہاد اور جنگ کے بعد کافروں کے وہ اموال جو مسلمانوں کے ہاتھ آئیں۔ ﴿ الفئی ﴾ وہ اموال جو بغیر جہاد اور لڑائی کے مسلمانوں کے ہاتھ آئیں۔ ﴿ فان ھم ابوا فاسالھم الجزیۃ ﴾ یہ تینوں خصلتوں میں سے دوسری خصلت ہے۔ مطلب ہے کہ یہ قبول اسلام سے انکاری ہوں تو پھر ان سے جزیہ کا مطالبہ کرو۔ جزیہ کی جیم کے نیچے کسرہ اور "زا" ساکن ہے۔ اسلامی مملکت میں ذمیوں سے ان کی حفاظت ان کے خون کے تحفظ اور ان کے اموال و اعراض کی حفاظت کے عوض جو کچھ لیا جائے اسے جذیہ کہتے ہیں۔ ﴿ فان ھم ابوا فاستعن باللہ ﴾ یہ تیسری خصلت ہے یعنی اگر وہ جزیہ دینے سے انکار کریں تو پھر اللہ سے مدد طلب کرتے ہوئے ان سے لڑو۔ ﴿ اھل حصن ﴾ حصن کے معنی قلعہ کے ہیں۔ ﴿ فارادوک ﴾ پھر وہ اپنے آپ کو تیرے سپرد کرنا چاہیں بشرطیکہ تو ان کو اللہ کے ذمہ و ضمان اور اس کے عہد

و امان کی ذمہ داری دے۔ ﴿ تخفروا ذممکم ﴾ یہ باب ضرب اور نصر دونوں سے ہے۔ باب افعال سے بھی آتا ہے یہ کہ اپنے عہد وپیان کو توڑ دیں۔ ﴿ ان تنزلهم ﴾ باب افعال سے۔ جنگ کے دوران نزول سے مراد ہے اپنے آپ کو حوالہ کر دینا' سپرد کر دینا۔ یعنی جب وہ غیر مشروط طور پر بغیر کسی معین شرط اور پختہ عہد کے اپنے آپ کو تیرے حوالہ کرنے پر تیار ہوں تو فبھا۔ ورنہ مجرد اللہ کے حکم کے مطابق تم سے معاملہ کا مطالبہ کر لیں تو تو ایسا نہ کرنا کیونکہ تمہیں کیا معلوم کہ اللہ نے ان کے بارے میں کیا فیصلہ کیا ہے؟

حاصل کلام: حدیث اصول جہاد کے بڑے معتبر اصول پر مشتمل ہے۔ جو معمولی سے غور و تامل سے واضح ہو جاتے ہیں۔ فقہاء کی رائے اکثر مسائل میں مختلف ہے۔ اس موقع پر تفصیل اور طویل بحث میں جانے کی چنداں ضرورت و حاجت نہیں بلکہ نصوص کو علی الاطلاق لینا بحث و مباحثہ کی طرف جھکاؤ سے کہیں بہتر اور اولیٰ ہے۔

(۱۰۹۰) وَعَنْ كَعْبِ بْنِ مَالِكٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُ أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ كَانَ إِذَا أَرَادَ غَزْوَةً وَرَّى بِغَيْرِهَا . مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت کعب بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ جب کسی غزوہ پر جانا چاہتے تو توریہ (غیر سے چھپانے) سے کام لیتے۔ (بخاری و مسلم)

لغوی تشریح: ﴿ وری ﴾ توریہ سے ہے' توریہ کے معنی یہ ہیں کہ اشارہ کسی اور طرف اور جانا کسی اور طرف۔ مقصد اس سے یہ ہوتا تھا کہ جاسوس اور مخبر کو معلوم نہ ہو سکے کہ کدھر کا پروگرام ہے تاکہ دشمن پہلے ہی محتاط نہ ہو جائے۔ مثلاً جانا جنوب کی طرف ہوتا تھا اور دریافت احوال شمال یا مشرق یا مغرب کے کرتے تھے تاکہ دشمن کو بے خبری اور حالت غفلت میں جا لیں اور جاسوس کو صحیح اطلاع کا حصول ممکن ہی نہ رہے۔ دشمنان اسلام کے خلاف اس قسم کی حکمت عملی اصطلاحاً توریہ ہے' اسے دھوکہ نہیں کہا جا سکتا۔

(۱۰۹۱) وَعَنْ مَعْقِلٍ، أَنَّ النُّعْمَانَ بْنَ مُقَرِّنٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: شَهِدْتُ رَسُولَ اللهِ ﷺ، إِذَا لَمْ يُقَاتِلْ أَوَّلَ النَّهَارِ أَخَّرَ القِتَالَ حَتَّى تَزُولَ الشَّمْسُ، وَتَهُبَّ الرِّيَاحُ وَيَنْزِلَ النَّصْرُ. رَوَاهُ أَحْمَدُ وَالثَّلَاثَةُ، وَصَحَّحَهُ الحَاكِمُ، وَأَصْلُهُ فِي البُخَارِيِّ.

حضرت معقل سے روایت ہے کہ حضرت نعمان بن مقرن رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ میں نبی ﷺ کے ساتھ لڑائیوں میں شریک ہوتا رہا ہوں۔ آپؐ جب دن کے آغاز میں لڑائی شروع نہ کرتے تو پھر زوال آفتاب کے بعد لڑائی شروع کرتے۔ موافق ہوائیں چلتی تھیں اور مدد کرتی تھیں۔ (اسے احمد اور تینوں نے روایت کیا ہے اور حاکم نے اسے صحیح کہا ہے اور اس کی اصل بخاری میں ہے)

لغوی تشریح: ﴿ وتھب الریاح ﴾ نصرت کی ہوائیں چلتی تھیں۔ ایک اور روایت میں ہے کہ اس موقع پر کہا جاتا تھا کہ نصرت کی ہوائیں چلتی ہیں اور مومنین اپنی نمازوں میں اپنے لشکروں کیلئے دعا مانگتے ہیں۔

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ جنگ کا آغاز علی الصبح یا دوپہر کے بعد کرنا چاہئے۔

راوی حدیث: ﴿ نعمان بن مقرن رضی اللہ عنہ ﴾ مزن قبیلہ کی طرف نسبت کی وجہ سے مزنی کہلائے۔ صدیق و فاروق رضی اللہ عنہما کے عہد خلافت میں لشکر کے امیروں میں ایک یہ ہوتے۔ انہوں نے اپنے سات دوسرے بھائیوں کے ساتھ ہجرت کی۔ اصبہان کے فاتح تھے۔ ۲۱ھ میں نہاوند کے معرکہ میں شہید ہوئے۔ (مقرن کی راء پر کسرہ اور تشدید ہے۔ محدث کے وزن پر)۔

(١٠٩٢) وَعَنِ الصَّعْبِ بْنِ جَثَّامَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: سُئِلَ رَسُولُ اللهِ ﷺ عَنِ الذَّرَارِيِّ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ، يُبَيِّتُونَ، فَيُصِيبُونَ مِنْ نِّسَآئِهِمْ وَذَرَارِيِّهِمْ، فَقَالَ: «هُمْ مِنْهُمْ». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت صعب بن جثامہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ سے مشرکین کے بچوں کے متعلق پوچھا گیا کہ ان کے گھر والوں پر شب خون مارا جاتا ہے تو ان کی عورتوں اور بچوں کو بھی مار دیتے ہیں۔ آپ نے فرمایا وہ بھی ان میں سے ہیں۔ (بخاری و مسلم)

لغوی تشریح: ﴿ عن الذراری ﴾ ذریہ کی جمع ہے۔ اس سے مراد مشرکین کی اولاد ہے اور ان کی عورتیں بھی۔ ﴿ یبیتون ﴾ صیغۂ مجہول۔ تبییت سے ماخوذ ہے۔ تاریکی شب میں غارت گری کرنا جسے شب خون مارنا کہتے ہیں۔ ﴿ فیصیبون ﴾ شب خون مارنے والے دن عورتوں اور ان کی اولاد کو رات کی تاریکی میں قتل کرتے تھے کہ ایسے میں ان پر اچانک حملہ آوروں کے ٹوٹ پڑنے سے اپنا تحفظ دشوار اور مشکل تھا۔ ﴿ ھم منھم ﴾ اس حالت میں وہ (بچے) بڑوں کے حکم میں تھے اور یہ مراد نہیں ہے کہ قصداً ان کا قتل مباح تھا بلکہ مراد یہ ہے کہ ان کی اولاد (بچوں) کو پامال کرنے کے علاوہ ان کے والدین تک پہنچنا ممکن نہیں تھا۔ پس جب ان بچوں کو اپنے والدین کے ساتھ مخلوط ہونے کی وجہ سے قتل کیا گیا تو اس صورت میں ان کا قتل بھی جائز ہوگا جیسا کہ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ کا خیال ہے۔

حاصل کلام: اس سے پہلے ایک حدیث میں دوران جہاد بچوں کے قتل کرنے سے منع کیا گیا ہے اسی بنا پر امام مالک رحمہ اللہ اور اوزاعی رحمہ اللہ وغیرہ کا خیال ہے کہ جہاد میں کفار کے بچوں کو بہر آئینہ قتل نہ کیا جائے۔ مگر امام شافعی رحمہ اللہ' امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ اور جمہور نے صرف عمداً اور قصداً ان کو قتل کرنے سے منع کیا ہے۔ رات کی تاریکی میں جب کفار تک پہنچنے میں اس کے بغیر چارہ نہ ہو تو اس ناگزیر اور مجبوری کی صورت میں ان کا قتل بھی جائز ہے کہ یہ بھی ان میں سے ہیں جیسا کہ اس مفصل حدیث سے ثابت ہوتا ہے۔

(١٠٩٣) وَعَنْ عَآئِشَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهَا، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ قَالَ

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ نبی ﷺ نے اس شخص سے فرمایا جو بدر کے دن آپ کے ساتھ

لِرَجُلٍ تَبِعَهُ فِي يَوْمِ بَدْرٍ: «ارْجِعْ، فَلَنْ أَسْتَعِينَ بِمُشْرِكٍ». رَوَاهُ مُسْلِمٌ.

شامل ہوگیا تھا ”واپس چلا جا میں مشرک سے مدد کا طالب نہیں ہوں۔“ (مسلم)

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ آپؐ نے مشرک سے جنگ میں تعاون لینے سے صاف انکار کر دیا تھا۔ اس واقعہ کی تفصیل یوں ہے کہ جنگ بدر کی طرف آپؐ تشریف لے جا رہے تھے۔ حرہ پر جب پہنچے تو ایک مشرک آپؐ کے ساتھ آملا۔ وہ جرأت و بہادری میں مشہور تھا مگر اس نے آتے ہی عرض کیا کہ میں آپؐ کے ساتھ مل کر غنیمت کے حصول کیلئے شامل ہوا ہوں۔ آپؐ نے فرمایا ”اللہ پر ایمان رکھتا ہے یا نہیں؟“ اس نے کہا نہیں۔ اس وقت حضور ﷺ نے فرمایا کہ ”میں کسی مشرک سے مدد کا طلبگار نہیں ہوں۔“ جب وہ دائرۂ اسلام میں داخل ہوگیا تو اسے اجازت مرحمت فرما دی۔ یہاں پھر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کافر سے مدد لینا جائز ہے یا نہیں۔ ایک جماعت کا خیال تو یہی ہے کہ امداد لینا ناجائز ہے۔ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ اور ان کے اصحاب کی رائے ہے کہ بوقت ضرورت امداد لینا جائز ہے جیسا کہ آپؐ نے جنگ حنین کے موقع پر صفوان بن امیہ وغیرہ سے اسلحہ کی امداد لی تھی اور قینقاع کے یہودیوں سے بھی امداد لی تھی۔ بہرحال اسلحہ کی امداد اور افرادی امداد دونوں کی شدید ضرورت و حاجت کے موقع پر لینے کی گنجائش ہے۔

(۱۰۹٤) وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ رَأَى امْرَأَةً مَقْتُولَةً فِي بَعْضِ مَغَازِيهِ، فَأَنْكَرَ قَتْلَ النِّسَاءِ وَالصِّبْيَانِ. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے کسی غزوہ میں ایک عورت کو دیکھا کہ اسے قتل کیا گیا ہے تو اس کے بعد آپؐ نے عورتوں اور بچوں کے قتل سے منع فرما دیا۔ (بخاری و مسلم)

لغوی تشریح: ﴿ مغازیه ﴾ مغازی سے مراد غزوات ہیں اور مغزی کی جمع ہے اور غزو کے معنی میں مستعمل ہے۔ جس کے معنی لڑائی و جنگ کے ہیں۔ عورت کے قتل کرنے کی حرمت پر سب کا اتفاق ہے ہاں اگر وہ شریک جنگ ہو کر لڑے تو ایسی عورت کا قتل جائز ہے۔

(۱۰۹۵) وَعَنْ سَمُرَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «اقْتُلُوا شُيُوخَ الْمُشْرِكِينَ، وَاسْتَبْقُوا شَرْخَهُمْ». رَوَاهُ أَبُو دَاوُدَ، وَصَحَّحَهُ التِّرْمِذِيُّ.

حضرت سمرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ ”مشرکین کے تجربہ کار و ماہر عمر رسیدہ لوگوں کو قتل کر دو اور بلوغت کی عمر کو نہ پہنچنے والوں کو باقی رہنے دو۔“ (اسے ابوداؤد نے روایت کیا ہے اور ترمذی نے اسے صحیح کہا ہے)

لغوی تشریح: ﴿ شیوخ ﴾ طاقتور و جاندار، تجربہ کار و ماہر لوگ۔ اس سے وہ لوگ مراد نہیں ہوتے جو بہت بوڑھے ہوں جن میں لڑنے کی قوت و طاقت ہی نہ ہو اور نہ صاحب رائے ہوں۔ ﴿ شرخهم ﴾

شین پر فتحہ اور "را" ساکن۔ ایسے نوعمر جو ہنوز بالغ نہ ہوئے ہوں۔ پس بچوں اور عورتوں کو قتل کرنا حرام ہے۔

حاصل کلام: اس حدیث سے ثابت ہوا کہ دشمنان اسلام کے ان بوڑھوں کو قتل کرنا جائز ہے جو جنگی مہارت و تجربہ اور جسمانی و ذہنی قوت رکھتے ہوں اور نابالغ بچوں کو قتل کرنے سے اجتناب کیا جائے گا۔ ویسے بھی نوخیز نسل سے زیادہ امید رکھی جا سکتی ہے کہ وہ دائرۂ اسلام میں جلد داخل ہو کر اسلام کے پھیلانے میں مدد و معاون ثابت ہوں گے جبکہ معمر و عمر رسیدہ لوگوں سے اس کی امید کم ہی ہوتی ہے۔

(١٠٩٦) وَعَنْ عَلِيٍّ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُ، أَنَّهُمْ تَبَارَزُوا يَوْمَ بَدْرٍ. رَوَاهُ الْبُخَارِيُّ، وَأَخْرَجَهُ أَبُو دَاوُدَ مُطَوَّلاً.

حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ انہوں نے بدر کے روز ان (کافروں) کو دعوت مبارزت دی۔ (بخاری) اور ابوداؤد میں یہ حدیث طویل ہے)

لغوی تشریح: ﴿ انھم ﴾ سے خود حضرت علی رضی اللہ عنہ، حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ اور عبیدہ بن حارث رضی اللہ عنہ مراد ہیں۔ ﴿ تبارزوا ﴾ مبارزت کی صورت اس طرح ہوتی تھی کہ باقاعدہ لڑائی کے آغاز سے پہلے دونوں طرف سے دو یا زیادہ نوجوان فریق مخالف کے نوجوانوں کو دعوت لڑائی دیتے اور اس دوران اپنی جوانمردی و بہادری کا اظہار کرتے اور پھر انفرادی جنگ آزمائی ہوتی۔ اس جنگ آزمائی میں چاہے جس فریق کے بہادر کام آجاتے اس کے بعد تو پھر دونوں طرف سے باقاعدہ جنگ کیلئے صف بندی کی جاتی اور لشکر کے عام لوگوں میں جنگ شروع ہو جاتی۔ متذکرہ بالا مبارزت جو اس حدیث میں مذکور ہے کا نتیجہ یہ ہوا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ولید بن عتبہ کو قتل کر دیا اور حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ نے شیبہ بن ربیعہ کو قتل کر دیا اور حضرت عبیدہ بن حارث رضی اللہ عنہ اور عتبہ بن ربیعہ کے درمیان چوٹوں کا تبادلہ ہوا اور اسی اثناء میں حضرت علی رضی اللہ عنہ اور حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ عتبہ پر پل پڑے اور دونوں نے اس کا کام تمام کر دیا اور حضرت عبیدہ رضی اللہ عنہ کو دونوں اٹھا لائے مگر ان کی ران کا کاری زخم بہتا رہا کہ وادی صفراء میں مدینہ کی جانب واپسی کے موقع پر فوت ہو گئے۔ دونوں فریقوں کی محاذ آرائی میں احادیث مختلف ہیں مگر اس پر سب کا اتفاق ہے کہ مبارزی جنگ میں جن صحابہ کرامؓ نے جوہر شجاعت دکھائے وہ مذکورہ بالا ہی تھے۔

(١٠٩٧) وَعَنْ أَبِي أَيُّوبَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: إِنَّمَا نَزَلَتْ هٰذِهِ الآيَةُ فِينَا مَعْشَرَ الأَنْصَارِ، يَعْنِي قَوْلَهُ تَعَالَى ﴿وَلاَ تُلْقُوا بِأَيْدِيكُمْ إِلَى التَّهْلُكَةِ﴾ قَالَهُ رَدًّا عَلىٰ مَنْ أَنْكَرَ عَلىٰ مَنْ حَمَلَ عَلىٰ صَفِّ الرُّومِ حَتَّى دَخَلَ فِيهِمْ. رَوَاهُ الثَّلاَثَةُ، وَصَحَّحَهُ

حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ یہ آیت ہمارے حق میں نازل ہوئی "اپنے ہاتھوں اپنے آپ کو ہلاکت میں نہ ڈالو"۔ یہ حضرت ابو ایوب رضی اللہ عنہ نے ان لوگوں سے بطور تردید فرمایا تھا جنہوں نے رومیوں کی صفوں پر حملہ کیا تھا اور ان کی صفوں میں جا گھسے تھے۔ (اسے تینوں نے روایت کیا ہے۔ ترمذی، ابن حبان اور حاکم تینوں نے اسے صحیح قرار دیا ہے)

التِّرْمِذِيُّ وَابْنُ حِبَّانَ وَالحَاكِمُ.

لغوی تشریح: ﴿معشر الانصا﴾ یہ اختصاص کی بنا پر منصوب ہے۔

حاصل کلام: اس واقعہ کی تفصیل یوں ہے کہ اسلم بن ابو عمران بیان کرتے ہیں کہ ہم قسطنطنیہ میں تھے کہ رومیوں کا ایک بڑا فوجی لشکر ان کے مقابلہ کیلئے سامنے آیا تو مسلمانوں میں سے ایک مجاہد نے ان پر حملہ کر دیا۔ ان کی صفوں میں آگے گھس جاتا اور واپس آجاتا اس کی بہادری اور جوانمردی کے جوہر دیکھ کر لوگوں نے بصدا بلند سبحان اللہ کہنا شروع کر دیا کہ اپنے ہاتھوں آپ ہی ہلاکت کے منہ میں ڈال دیا ہے۔ اس موقع پر حضرت ابوایوب رضی اللہ عنہ نے فرمایا لوگو! تم اس آیت کی تاویل اس مرد کی کارکردگی میں کر رہے ہو حالانکہ یہ آیت ہمارے متعلق یعنی گروہ انصار کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔ ہم وہ لوگ ہیں کہ جب اللہ تعالیٰ نے اپنے دین کو غلبہ بخشا اور اس کے مددگاروں کی تعداد کثیر ہوگئی تو ہم نے مخفی و پوشیدہ طور پر کہا کہ ہمارے اموال تو ضائع ہوگئے اگر ہم ان میں ٹھہرے رہتے اور ان کو دوست رکھتے تو ان میں سے کچھ بھی ضائع نہ ہوتا۔ تو اس موقع پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی۔ پس اس ہلاکت سے مراد ہمارا اپنے ارادوں پر قائم رہنا تھا۔ (سبل السلام)

(١٠٩٨) وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا قَالَ: حَرَّقَ رَسُولُ اللهِ ﷺ نَخْلَ بَنِي النَّضِيرِ، وَقَطَّعَ. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے بنو نضیر کے کھجوروں کے درخت نذر آتش کروا دیئے اور کٹوا دیئے۔ (بخاری و مسلم)

لغوی تشریح: ﴿حرق﴾ تحریق سے ماخوذ ہے۔ بنو نضیر یہود کا قبیلہ تھا۔ مدینہ منورہ کے جنوب مشرق میں رہائش پذیر تھے اور نبی ﷺ کے ساتھ ان کا معاہدہ بھی تھا مگر انہوں نے اپنا معاہدہ توڑ دیا اور آپ کے قتل کے درپے ہو گئے۔ آپ نے پندرہ دن تک ان کا محاصرہ کئے رکھا اس کے بعد ان کو مدینہ منورہ سے جلا وطن کر دیا۔ یہ واقعہ ۴ھ میں ربیع الاول کے مہینے میں پیش آیا۔

حاصل کلام: اس حدیث سے ثابت ہوا کہ ناگزیر جنگی ضرورت کی بنا پر پھلدار درختوں کو جلوانا یا کٹوانا جائز ہے۔ مگر عام حالات میں بلا ضرورت ان کو کاٹنے سے آپ نے منع فرمایا ہے۔

(١٠٩٩) وَعَنْ عُبَادَةَ بْنِ الصَّامِتِ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «لاَ تَغُلُّوا، فَإِنَّ الغُلُولَ نَارٌ وَعَارٌ عَلَى أَصْحَابِهِ فِي الدُّنْيَا وَالآخِرَةِ». رَوَاهُ أَحْمَدُ وَالنَّسَائِيُّ، وَصَحَّحَهُ ابْنُ حِبَّانَ.

حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "خیانت (غنیمت کے مال میں) نہ کرو کیونکہ یہ (خیانت) دنیا میں بھی عار ہے اور آخرت میں بھی عار۔" (اسے احمد اور نسائی نے روایت کیا ہے اور ابن حبان نے صحیح کہا ہے)

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ خیانت دنیا و آخرت دونوں جہاں میں عار اور ذلت و رسوائی کا باعث ہے۔ ایک مسلمان مجاہد کو دیانت دار ہونا چاہئے۔ بددیانت اور خائن نہیں ہونا چاہئے۔ اس کا مقصد مال و متاع کا حصول نہیں بلکہ اس کی رضا اللہ اور اعلائے کلمۃ اللہ کا حصول ہو اور جب تک وہ اس اصول کو اپنائے رکھے گا دنیا و آخرت میں کامیاب ہوگا ورنہ ذلت و رسوائی اس کا مقدر بنے گی۔

(١١٠٠) وَعَنْ عَوْفِ بْنِ مَالِكٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ قَضَى بِالسَّلَبِ لِلْقَاتِلِ. رَوَاهُ أَبُو دَاوُدَ، وَأَصْلُهُ عِنْدَ مُسْلِمٍ.

حضرت عوف بن مالک رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی ﷺ نے فیصلہ فرمایا کہ "ساز و سامان (غازی) قاتل کیلئے ہے۔" (اس کو ابوداؤد نے روایت کیا ہے اور اس کی اصل مسلم میں ہے)

لغوی تشریح: ﴿السلب﴾ سین اور لام دونوں پر فتحہ۔ سلب سے جمہور کے نزدیک لڑنے مرنے والے کافر کا لباس اور سامان جنگ وغیرہ ہے۔ امام احمد رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک سواری کا جانور اس سلب میں داخل نہیں ہے اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک سامان حرب ہی مراد ہے۔

(١١٠١) وَعَنْ عَبْدِ الرَّحْمٰنِ بْنِ عَوْفٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ - فِي قِصَّةِ قَتْلِ أَبِي جَهْلٍ - قَالَ: فَٱبْتَدَرَاهُ بِسَيْفَيْهِمَا، حَتَّى قَتَلَاهُ، ثُمَّ ٱنْصَرَفَا إِلَىٰ رَسُولِ اللهِ ﷺ، فَأَخْبَرَاهُ، فَقَالَ: «أَيُّكُمَا قَتَلَهُ؟ هَلْ مَسَحْتُمَا سَيْفَيْكُمَا؟» قَالَا: لَا، قَالَ: فَنَظَرَ فِيهِمَا، فَقَالَ: «كِلَاكُمَا قَتَلَهُ» فَقَضَى ﷺ بِسَلَبِهِ لِمُعَاذِ بْنِ عَمْرِو بْنِ الجَمُوحِ. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ سے ابوجہل کے قتل کے قصہ میں مروی ہے کہ دونوں اپنی اپنی تلوار لے کر ابوجہل کی طرف ایک دوسرے سے آگے بڑھے اور انہوں نے اسے قتل کر دیا۔ اس کے بعد وہ رسول اللہ ﷺ کی طرف پھرے اور آپؐ کو ابوجہل کے قتل کی خبر دی۔ آپؐ نے دریافت فرمایا کہ "تم دونوں میں سے کس نے اسے قتل کیا؟" نیز دریافت فرمایا کہ "کیا تم نے تلواریں صاف کر لی ہیں؟" دونوں بولے نہیں۔ عبدالرحمٰن نے کہا کہ آپؐ نے ان دونوں کی تلواروں کو ملاحظہ کیا اور فرمایا "تم دونوں نے اسے قتل کیا ہے۔" پس رسول اللہ ﷺ نے ابوجہل کا ساز و سامان معاذ بن عمرو بن جموح کو دینے کا فیصلہ فرمایا۔ (بخاری و مسلم)

لغوی تشریح: ﴿فابتدراه﴾ ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی کوشش کی۔ اس میں تثنیہ کی ضمیر سے معاذ بن عمرو بن جموح اور معوذ بن عفراء مراد ہیں۔ دونوں عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ کے دائیں بائیں تھے۔ ﴿حتی قتلاه﴾ تاآنکہ انہوں نے ابوجہل کا کام تمام کر دیا۔ ان دونوں ہی سے پہلی ضرب معاذ بن عمرو

بن جموح رضی اللہ عنہ نے ماری۔ یہ ابوجہل کی تاک میں تھے جیسے ہی ان کو فرصت نے موقع دیا باز کی طرح جھپٹ کر ابوجہل پر حملہ آور ہوئے پھراس نے ایسی ضرب ماری کہ اس کے قدم سمیت آدھی پنڈلی بھی کاٹ کر جدا کر دی تو ابوجہل مرگی والے شخص کی طرح لڑکھڑا کر زمین پر آرہا اور خون میں لت پت ہوگیا۔ اس کے بعد معوذ بن عفراء رضی اللہ عنہ کا ادھر سے گزر ہوا تو اس نے نیزہ دے مارا جس سے وہ تڑپ تڑپ کر مرگیا۔ معرکہ کے اختتام پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس معاملہ کی تحقیق کا حکم صادر فرمایا۔ لوگوں نے اس کی تفتیش کی تو معلوم ہوا کہ عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے ابوجہل کو ایسی کشمکش کی حالت میں پایا کہ ہنوز آثار زندگی باقی تھے تو وہ ابوجہل کے سینے پر اپنا پورا وزن ڈال کر جھکے اور اس کا سرتن سے جدا کر دیا اور اسے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں لے کر حاضر ہوئے۔ جب آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے دیکھا تو فرمایا "یہ (ابوجہل) اس امت کا فرعون ہے۔" رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ابوجہل کا لباس اور سامان جنگ معاذ بن عمرو بن جموح رضی اللہ عنہ کو دینے کا فیصلہ فرمایا' اس کی وجہ یہ تھی کہ اس کے دوسرے دوست و رفیق معوذ بن عفراء جو ابوجہل کے قتل میں ان کے شریک تھے وہ خود بعد میں اسی معرکہ کے دوران شہید ہو چکے تھے۔ لہٰذا معاذ بن عمرو رضی اللہ عنہ کے سوا کوئی حق دار باقی نہیں رہا تھا۔ پھر بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تمام سامان انہیں نہیں دیا تھا بلکہ اس کا زیادہ تر حصہ دیا تھا اور ابوجہل کی تلوار عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کو دینے کا فیصلہ فرمایا تھا جیسا کہ ابوداؤد نے حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے۔

راوی حدیث: ﴿ معاذ بن عمرو بن جموح رضی اللہ عنہ ﴾ یہ انصار کے قبیلہ خزرج کے فرد تھے۔ سلمی کہلاتے تھے۔ بیعت عقبہ اور غزوۂ بدر میں شریک ہوئے۔ انہوں نے ہی ابوجہل کا پاؤں اور اس کا سرتن سے جدا کیا تھا۔ عکرمہ بن ابی جہل نے ان کو چوٹ لگائی کہ ان کا ہاتھ کٹ کر لٹک گیا بالکل جدا نہیں ہوا تو انہوں نے پاؤں تلے دبا کر کھینچ کر اسے جدا کر دیا اور پھینک دیا اور باقی سارا وقت اکیلے ہاتھ سے لڑتے اور داد شجاعت دیتے رہے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے دور خلافت میں وفات پائی۔ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ کے موقف سے تو ظاہر ہوتا ہے کہ یہ صاحب ابن عفراء کے علاوہ اور کوئی تھے کیونکہ ابن عفراء کا نسب تو اس طرح ہے۔ معاذ بن حارث بن رفاعہ نجاری۔

(١١٠٢) وَعَنْ مَكْحُولٍ، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ نَصَبَ الْمَنْجَنِيْقَ عَلَىٰ أَهْلِ الطَّآئِفِ. أَخْرَجَهُ أَبُو دَاوُدَ فِي الْمَرَاسِيْلِ، وَرِجَالُهُ ثِقَاتٌ، وَوَصَلَهُ الْعُقَيْلِيُّ بِإِسْنَادٍ ضَعِيفٍ عَنْ عَلِيٍّ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ.

حضرت مکحول سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اہل طائف پر منجنیق نصب کی۔ (اسے ابوداؤد نے اپنی مراسیل میں تخریج کیا ہے اور اس کے راوی ثقہ ہیں مگر عقیل نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے ضعیف سند کے ساتھ موصول قرار دیا ہے)

لغوی تشریح: ﴿ منجنیق ﴾ میم پر فتحہ پھر ساکن پھر فتحہ پھر کسرہ پھر ساکن۔ جنگی آلہ و ہتھیار۔ جس کے ذریعہ بڑے بڑے پتھر مضبوط قلعوں کی دیواروں کو گرانے اور بڑی اونچی اور پختہ عمارتوں کو منہدم کرنے

کیلئے پھینکتے تھے۔

حاصل کلام : اس سے معلوم ہوا کہ دشمن کو نیست و نابود کرنے یا ان کا زور توڑنے اور عسکری قوت کمزور کرنے کیلئے نئے نئے طریقہ ہائے جنگ اور جدید سامان حرب و ضرب استعمال کرنے چاہئیں اور مسلمانوں کو سامان حرب نئے سے نئے ایجاد کرنے چاہئیں۔ آج کے دور میں ایٹم بم اور دیگر تباہ کن اور ہیبت ناک ہتھیار بھی تیار کرنے چاہئیں کہ دشمن پر مسلمانوں کا رعب و دبدبہ قائم ہو اور آسانی سے ان پر جنگ مسلط نہ کی جا سکے۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اہل طائف کے خلاف رسول اللہ ﷺ نے خود حصہ لیا۔ نیز معلوم ہوا کہ دشمن اگر قلعہ بند ہو جائے تو گولہ باری سے بچے' عورتیں اور معذور لوگ بھی قتل ہو جائیں تو کوئی مضائقہ نہیں۔

راوی حدیث : ﴿ مکحول ﴾ دمشق کے باشندے' شام کے فقیہہ۔ بڑے صاحب علم۔ ابوحاتم کا قول ہے کہ شام میں ان سے بڑا فقیہہ میرے علم میں نہیں ہوا۔ ۱۱۳ھ میں انہوں نے وفات پائی۔

(۱۱۰۳) وَعَنْ أَنَسٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُ، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ دَخَلَ مَكَّةَ، وَعَلَىٰ رَأْسِهِ ٱلْمِغْفَرُ، فَلَمَّا نَزَعَهُ جَآءَهُ رَجُلٌ، فَقَالَ: ابْنُ خَطَلٍ مُتَعَلِّقٌ بِأَسْتَارِ الكَعْبَةِ، فَقَالَ: «اقْتُلُوهُ». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ مکہ میں داخل ہوئے تو اس وقت آپؐ کے سر پر خود تھا۔ جب آپؐ نے اسے سر سے اتارا تو آپؐ کے پاس ایک آدمی آیا' اس نے کہا کہ ابن خطل کعبہ کے پردوں کے ساتھ چمٹا ہوا ہے۔ آپؐ نے فرمایا "اسے قتل کر دو۔" (بخاری و مسلم)

لغوی تشریح : ﴿ المغفر ﴾ منبر کے وزن پر۔ لوہے سے بنی ہوئی ٹوپی جسے خود کہتے ہیں۔ ﴿ ابن خطل ﴾ خطل کے "خا" اور "طا" دونوں پر فتحہ۔ اس کا نام دور جاہلیت میں عبدالعزیٰ یا عبداللہ تھا۔ ﴿ باستار الکعبۃ ﴾ استار ستر کی جمع ہے یعنی کعبہ کے پردے۔ ﴿ اقتلوہ ﴾ اسے قتل کر دو۔ اس لئے کہا گیا کہ یہ پہلے مسلمان تھا اسے زکوٰۃ کی وصولی پر مقرر کیا گیا تو اس نے اپنے خادم مسلمان کو قتل کر دیا اور خود مشرک' مرتد ہو گیا۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس کی دو لونڈیاں تھیں جو نبی ﷺ کی ہجو گاتی تھیں۔ ان میں سے ایک کو تو قتل کر دیا گیا اور دوسری کیلئے امان طلب کی گئی اور وہ مسلمان ہو گئی۔ ابن خطل کا شمار ان نو آدمیوں میں تھا جن کے قتل کا نبی ﷺ نے فتح مکہ کے روز حکم دیا تھا اور کہا تھا کہ اگر یہ لوگ خانہ کعبہ کے پردوں سے چمٹے ہوئے مل جائیں تو پھر بھی ان کو قتل کر دو۔ ان میں سے چار تو قتل ہوئے اور باقیوں نے اسلام قبول کر لیا۔

حاصل کلام : اس حدیث سے معلوم ہوا کہ مرتد اور آنحضرت ﷺ کے بارے میں توہین آمیز رویہ رکھنے والے کو پناہ دینے والے کی سزا قتل ہے۔ اگرچہ وہ بیت اللہ کے پردہ میں ہی چھپا ہوا ہو۔

(۱۱۰٤) وَعَنْ سَعِيْدِ بْنِ جُبَيْرٍ حضرت سعید بن جبیر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول

رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُما، أَنَّ رَسُولَ اللهِ ﷺ قَتَلَ يَوْمَ بَدْرٍ ثَلاَثَةً صَبْراً. أَخْرَجَهُ أَبُو دَاوُدَ فِي المَرَاسِيْلِ، وَرِجَالُهُ ثِقَاتٌ.

اللہ ﷺ نے بدر کے روز تین آدمیوں کو باندھ کر قتل کیا۔ (اسے ابوداؤد نے اپنی مراسیل میں نقل کیا ہے۔ اس کے راوی ثقہ ہیں)

لغوی تشریح: ﴿ صبرا ﴾ صاد پر فتحہ اور "با" ساکن۔ یعنی قتل کرنے کیلئے انسان کو باندھا۔ وہ تین آدمی جن کو اس طرح قتل کیا گیا ان میں سے ایک طعیمہ بن عدی لیکن اس کے بارے میں مشہور ہے کہ وہ لڑائی کے دوران مارا گیا تھا۔ دوسرا نضر بن حارث اور تیسرا عقبہ بن ابی معیط تھا۔ ان دونوں کو جاتے ہوئے راستہ میں قتل کیا گیا۔ پہلے کو مقام صفراء پر اور دوسرے کو مقام الظبیۃ پر۔

راوی حدیث: ﴿ سعید بن جبیر ﴾ سعید بن جبیر کبار تابعین میں شمار ہوتے ہیں۔ یہ آخری آدمی تھے جنہیں حجاج ثقفی نے قتل کروایا تھا۔ یہ حدیث و تفسیر کے امام تھے۔ خلیفہ کا اپنا بیان ہے کہ میں سعید بن جبیر کے قتل کے موقع پر حاضر تھا جب ان کا سر جدا کیا گیا تو انہوں نے لا الٰہ الا اللہ' لا الٰہ الا اللہ کہا جب تیسری مرتبہ لا الٰہ الا اللہ کہنے لگے تو مکمل نہ کر سکے۔ رضی اللہ عنہ۔ میمون بن مھران کا بیان ہے کہ سعید بن جبیر فوت ہو گیا لیکن روئے زمین پر ایسا ایک بھی فرد نہیں جو ان کے علم کا محتاج نہ ہو۔ ان کو ۹۰ھ میں قتل کیا گیا اس وقت وہ بڑھاپے کی عمر میں تھے۔

(١١٠٥) وَعَنْ عِمْرَانَ بْنِ حُصَيْنٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، أَنَّ رَسُولَ اللهِ ﷺ فَدَى رَجُلَيْنِ مِنَ المُسْلِمِيْنَ بِرَجُلٍ مِّنَ المُشْرِكِيْنَ. أَخْرَجَهُ التِّرْمِذِيُّ، وَصَحَّحَهُ، وَأَصْلُهُ عِنْدَ مُسْلِمٍ.

حضرت عمران بن حصین رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے مشرکین کے ایک قیدی مرد کے بدلہ میں دو مسلمان مردوں کو چھڑوایا۔ (اس کی تخریج ترمذی نے کی ہے اور اسے صحیح قرار دیا ہے اور اس کی اصل مسلم میں ہے)

حاصل کلام: اس حدیث سے ثابت ہوا کہ اسیران جنگ کا تبادلہ درست ہے۔ جمہور علماء کے رائے بھی یہی ہے مگر امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک تبادلہ درست نہیں۔ ان کی رائے میں قیدی کو مار ڈالنا یا غلام بنالینا چاہئے حالانکہ جب صحابہؓ نے بنو عقیل کے ایک آدمی کو گرفتار کیا تو بنو ثقیف نے دو صحابہؓ کو گرفتار کر لیا۔ بنو ثقیف' بنو عقیل کے حلیف تھے۔ مشرکین نے صحابہ کرامؓ کو رہا کر دیا اور حضور ﷺ نے اس مشرک کو چھوڑ دیا۔ یہ جمہور کی واضح دلیل ہے۔

(١١٠٦) وَعَنْ صَخْرِ بْنِ العَيْلَةِ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ قَالَ: «**إِنَّ القَوْمَ إِذَا أَسْلَمُوا أَحْرَزُوا دِمَاءَهُمْ وَأَمْوَالَهُمْ**». أَخْرَجَهُ أَبُو دَاوُدَ، وَرِجَالُهُ مُوَثَّقُونَ.

حضرت صخر بن عیلہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "جب لوگ اسلام قبول کر لیتے ہیں تو اپنے خون اور اپنے مال محفوظ کر لیتے ہیں۔" (اس کو روایت ابوداؤد نے کیا ہے اور اس کے راوی ثقہ

ہیں)

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ جب کوئی غیر مسلم مسلمان ہو جائیں تو ان کا خون بہانا اور مال و متاع لوٹنا دونوں حرام ہیں۔ گویا حربی جب اپنی آزاد مرضی سے بغیر کسی بیرونی دباؤ کے اسلام میں داخل ہو تو پھر اس کا مال منقول جائیداد کی صورت میں ہو یا غیر منقول دونوں طرح حرام ہے۔

راوی حدیث: ﴿صخر بن عیلہ رضی اللہ عنہ﴾ صخر کے صاد پر فتحہ اور "خا" ساکن۔ احمسی کہلاتے تھے۔ ابو حازم ان کی کنیت تھی۔ شرف صحابیت سے بہرہ ور تھے۔ ان سے یہی حدیث مروی ہے۔

(۱۱۰۷) وَعَنْ جُبَيْرِ بْنِ مُطْعِمٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ قَالَ فِي أُسَارَىٰ بَدْرٍ: «لَوْ كَانَ الْمُطْعِمُ بْنُ عَدِيٍّ حَيّاً، ثُمَّ كَلَّمَنِي فِي هَؤُلَاءِ النَّتْنَى، لَتَرَكْتُهُمْ لَهُ». رَوَاهُ الْبُخَارِيُّ.

حضرت جبیر بن مطعم رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اسیران بدر کے متعلق فرمایا "اگر مطعم بن عدی بقید حیات ہوتا پھر وہ میرے پاس آکر ان مرداروں کے متعلق بات چیت کرتا تو میں ان کو اس کی خاطر چھوڑ دیتا۔" (بخاری)

لغوی تشریح: ﴿اسارى﴾ ہمزہ پر ضمہ "اسیر" کی جمع معنی قیدی۔ ﴿ثم كلمنى﴾ پھر وہ مجھ سے بات چیت کرتا یعنی ان کی سفارش کرتا۔ ﴿فى هولاء النتنى﴾ ان مرداروں کے بارے میں۔ نتنی نتن کی جمع ہے۔ معنی اس کے ہیں سڑی ہوئی بدبو دار چیز جیسے زمن سے زمنیٰ آتا ہے اسی طرح نتن سے نتنی ہے اور نتن کے معنی نہایت ہی بری بدبو۔ بری بدبو سے ان کی تعریف کرنے سے ان کے عقائد کی خرابی و خباثت اور گندگی مراد ہے۔ جو ان کے کفر پر قائم رہنے سے ان کو حاصل ہوئی ہے۔ ﴿لتركتهم له﴾ محض مطعم کی سفارش کی وجہ سے بغیر کسی فدیہ کے ان کو رہا کر دیتا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اس نے نبی ﷺ جب اہل طائف سے مایوس ہو کر واپس مکہ مکرمہ تشریف لائے تو اس نے آپ کو اپنی پناہ میں لیا تھا اور اس موقع پر مشرکین سے آپؐ کا دفاع بھی کیا۔ اس کے اسی احسان کی وجہ سے نبی ﷺ نے اس کو محبوب و دوست رکھا کہ اگر آج مطعم بن عدی زندہ ہوتا اور وہ ان سڑی ہوئی لاشوں کے متعلق مجھ سے سفارش کرتا تو میں اس کے احسان کے بدلہ میں ان کو رہا کر دیتا اور اس کا بدلہ چکا دیتا۔

حاصل کلام: حضور ﷺ کے عمل سے یہ ثابت ہوا کہ احسان کا بدلہ دینا مسنون ہے۔ خواہ کافر کا احسان ہی کیوں نہ ہو۔ مسلمان کے احسان کا بدلہ دینا تو بطریق اولیٰ ہے۔ اچھے کام میں کسی کیلئے سفارش کرنا بھی جائز ہے اور جائز کام کی سفارش کو قبول بھی کرنا مسنون ہے۔

(۱۱۰۸) وَعَنْ أَبِي سَعِيدٍ الْخُدْرِيِّ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: أَصَبْنَا سَبَايَا يَوْمَ أَوْطَاسٍ لَهُنَّ أَزْوَاجٌ، فَتَحَرَّجُوا، فَأَنْزَلَ اللَّهُ تَعَالَى

حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ اوطاس کے دن کچھ لونڈیاں ہمارے ہاتھ لگیں جن کے شوہر زندہ تھے۔ مسلمانوں نے ان کے خاوندوں کی موجودگی کو باعث حرج سمجھا تو اس موقع پر

﴿وَالْمُحْصَنَاتُ مِنَ النِّسَاءِ إِلاَّ مَا مَلَكَتْ أَيْمَانُكُمْ﴾ اَلْآيَةَ. أَخرَجَهُ مُسلِمٌ.

تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی "تم پر خاوند والی عورتیں حرام ہیں، مگر وہ جن کے تم مالک ہوئے ہو۔" (مسلم)

لغوی تشریح: ﴿فتحرجوا﴾ یعنی انہوں نے گمان کیا کہ ان لونڈیوں کے ساتھ وطی کرنا گناہ اور باعث حرج ہے۔ پس انہوں نے لونڈیوں سے لطف صحبت اٹھانے سے اجتناب کیا۔

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ جنگ میں جو عورتیں گرفتار ہو جائیں گرفتاری سے ہی ان کا پچھلا نکاح ٹوٹ جاتا ہے۔ حمل سے ہوں تو وضع حمل کے بعد اور اگر غیر حاملہ ہوں تو ایک ماہواری کے بعد لطف صحبت اٹھایا جا سکتا ہے۔ یہ کوئی ضروری نہیں کہ وہ مسلمان بھی ہوں۔ مسلمان ہوں یا غیر مسلم۔ باقاعدہ سرکاری تقسیم کے بعد جو لونڈی جس کے حصہ میں آئے وہ اس سے بعینہ اسی طرح لطف اٹھا سکتا ہے جس طرح اپنی منکوحہ بیوی سے لطف اندوز ہو سکتا ہے۔

(١١٠٩) وَعَنْ ابْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا قَالَ: بَعَثَ رَسُولُ اللهِ ﷺ سَرِيَّةً، وَأَنَا فِيهِمْ، قِبَلَ نَجْدٍ، فَغَنِمُوا إِبِلاً كَثِيرة، فَكَانَتْ سُهْمَانُهُمْ اثْنَي عَشَرَ بَعِيراً، وَنُفِّلُوا بَعِيراً بَعِيراً. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے نجد کی طرف ایک سریہ روانہ فرمایا، میں بھی اس میں موجود تھا بہت سے اونٹ مال غنیمت میں حاصل ہوئے۔ ان میں سے ہر ایک کے حصہ میں بارہ بارہ اونٹ مال غنیمت کے طور پر آئے اور پھر انہیں ایک ایک اونٹ زائد دیا گیا۔ (بخاری و مسلم)

لغوی تشریح: ﴿قبل نجد﴾ نجد کی جانب۔ قبل کے قاف کے نیچے کسرہ اور "با" پر فتحہ۔ ﴿سھمانھم﴾ سین پر ضمہ۔ سہم کی جمع جس کے معنی نصیب اور حصہ کے ہیں۔ ﴿نفلوا﴾ صیغہ مجہول۔ تنفیل سے ماخوذ ہے (باب تفعیل) معنی ان کو بطور نفل دیا گیا اور نفل کہتے ہیں کہ غازی کو مال کے حصہ سے جو چیز زائد دی جائے۔

حاصل کلام: اس حدیث سے ثابت ہوا کہ غازی کو مال غنیمت میں سے مقرر حصہ کے علاوہ زائد مال بھی دیا جا سکتا ہے۔ البتہ اس میں اختلاف ہے کہ یہ زائد حصہ مال غنیمت میں سے ہوگا یا خمس میں سے یا خمس الخمس میں سے۔ صحیح بات یہی معلوم ہوتی ہے کہ وہ اصل غنیمت میں سے دیا جائے گا۔ اب رہا یہ سوال کہ اس اضافی حصہ کی مقدار کتنی ہوگی اس پر اتفاق ہے کہ سربراہ و امام یہ حصہ غنیمت کے تیسرے حصہ سے زائد دینے کا مجاز نہیں۔

(١١١٠) وَعَنْهُ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَسَمَ رَسُولُ اللهِ ﷺ يَوْمَ خَيْبَرَ لِلْفَرَسِ سَهْمَيْنِ، وَلِلرَّاجِلِ

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے ہی مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے خیبر کے روز گھڑ سوار کو دو حصے اور پیدل کو ایک حصہ دیا۔ (بخاری و مسلم، یہ الفاظ بخاری

سَهْماً . مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ، وَاللَّفْظُ لِلْبُخَارِيِّ. وَلِأَبِيْ دَاوُدَ: أَسْهَمَ لِرَجُلٍ وَلِفَرَسِهِ ثَلاَثَةَ أَسْهُمٍ، سَهْمَيْنِ لِفَرَسِهِ، وَسَهْماً لَّهُ.

کے ہیں) اور ابوداوَد کی روایت میں ہے کہ آپؐ نے پیدل مرد مجاہد کیلئے ایک حصہ اور گھڑ سوار کیلئے تین حصے۔ دو حصے اس کے گھوڑے کے اور ایک حصہ اس کا اپنا۔

حاصل کلام: اس حدیث سے گھوڑ سوار کیلئے تین حصے اور پیدل کیلئے صرف ایک حصہ ہے۔ گھوڑے کا حصہ اس لئے زیادہ رکھا گیا کہ اس کی خوارک اور اس کی دیکھ بھال پر کافی خرچ اٹھ جاتا ہے۔

(۱۱۱۱) وَعَنْ مَعْنِ بْنِ يَزِيْدَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: سَمِعْتُ رَسُولَ اللهِ ﷺ يَقُولُ: «**لاَ نَفْلَ إِلاَّ بَعْدَ الْخُمُسِ**». رَوَاهُ أَحْمَدُ وَأَبُو دَاوُدَ، وَصَحَّحَهُ الطَّحَاوِيُّ.

حضرت **معن بن یزید** رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے سنا ہے "حصہ سے اضافی طور پر جو کچھ دیا جائے گا وہ پانچواں حصہ نکال کر دیا جائے۔" (اسے احمد اور ابوداوَد نے روایت کیا ہے اور طحاوی نے اسے صحیح قرار دیا ہے)

حاصل کلام: یہاں دو مسائل قابل غور ہیں۔ ایک یہ کہ یہ اضافی و زائد حصہ مال غنیمت میں سے دیا جائے گا یا خمس میں سے؟ اس حدیث میں ان دونوں باتوں پر دلالت کرنے والی چیز نہیں بلکہ زیادہ سے زیادہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ غنیمت کو پانچ حصوں میں نفلی حصہ دینے سے پہلے تقسیم کیا جائے گا۔ حالانکہ صحیح احادیث سے دو امر کا جواز ثابت ہے۔ دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ کیا اضافی حصہ خمس سے پہلے دیا جانا جائز ہے یا نہیں؟ اس حدیث کے ظاہر سے تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ اس کا کوئی جواز نہیں لیکن دوسری حدیث جسے ابن عمر رضی اللہ عنہما سے ابھی بیان کیا گیا ہے وہ اس کے جواز پر دلالت کرتی ہے۔ اس میں یہ تصریح موجود ہے کہ ان کو نفلی حصہ خمس نکالنے سے پہلے دیا گیا۔ ملاحظہ ہو سنن ابی داوَد مع شرح عون المعبود (ج ۳، ص: ۲۲)

راوی حدیث: ﴿معض بن یزید﴾ معض بن یزید بن اخنس سلمی خود صحابی بھی ہیں اور باپ بھی صحابی ہے۔ فاتح دمشق ہیں۔ کوفہ میں رہائش اختیار کی۔ جب مصر میں آئے تو پھر دمشق میں منتقل ہو گئے۔ مرج راھط کی جنگ میں ضحاک بن قیس کے ساتھ ۶۴ھ میں شامل ہوئے اور شہید ہو گئے۔ یہ بات بھی سامنے آئی ہے کہ وہ حضرت معاویہؓ کے ساتھ ان کی لڑائیوں میں شریک رہے۔

(۱۱۱۲) وَعَنْ حَبِيْبِ بْنِ مَسْلَمَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: شَهِدْتُ رَسُولَ اللهِ ﷺ، نَفَّلَ الرُّبُعَ فِي الْبَدْأَةِ، وَالثُّلُثَ فِي الرَّجْعَةِ. رَوَاهُ أَبُو

حضرت **حبیب بن مسلمہ** رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا تو آپؐ نے سریہ میں پہلی مرتبہ جانے پر چوتھا حصہ زائد عطا فرمایا اور دوبارہ جانے پر تیسرا حصہ۔ (اسے ابوداوَد نے

دَاوُدَ، وَصَحَّحَهُ ابْنُ الجَارُودِ وَابْنُ حِبَّانَ وَالحَاكِمُ. روایت کیا ہے اور ابن جارود' ابن حبان اور حاکم نے صحیح کہا ہے)

لغوی تشریح : ﴿ نفل الربع ﴾ یعنی خمس کے بعد غنیمت کے چوتھا حصہ بطور نفل عطا فرمایا۔ ﴿ فی البداءة ﴾ بداءة میں "با" پر فتحہ اور دال ساکن همزہ پر فتحہ۔ سفر کے آغاز پر جب لشکر اسلامی دشمن کی جانب رواں دواں ہوا۔ مطلب اس کا یہ ہے کہ جب اس صورت حال میں سارے لشکر سے الگ دشمن پر حملہ آور ہونے کیلئے دستہ نکلے اور دشمن پر جا پڑے اور کامیاب و کامران غنائم لے کر واپس لوٹے تو اس دستہ کو اس کا چوتھائی حصہ دیا جائے گا اور باقی غنائم کو سارے لشکر میں تقسیم کر دیا جائے گا۔ ﴿ والثلث فی الرجعة ﴾ یعنی تیسرا حصہ اس صورت میں دیا جائے گا کہ لشکر اسلامی فتح یاب ہو کر وطن واپس آ رہا ہے اور راستہ میں اس لشکر میں سے ایک دستہ دوبارہ دشمن پر حملہ کرنے کیلئے الگ ہو کر چلا جائے اس صورت میں دشمن پر حملہ آور ہونا پہلے حملے کی نسبت زیادہ مشکل ہوتا ہے کیونکہ حریف اب چوکنا ہو چکا ہوتا ہے اور اس صورت حال میں خطرات زیادہ ہوتے ہیں کیونکہ دشمن ہر طرح سے ہوشیار اور محتاط ہو جاتا ہے اور مقابلہ کرنا اتنا آسان نہیں رہتا۔

راوی حدیث : ﴿ حبیب بن مسلمہ ﴾ ابو عبدالرحمان حبیب بن مسلمہ فہری مکی۔ صحابی ہیں۔ حبیب روم کے نام سے جانے جاتے ہیں کیونکہ رومیوں کے لیے ان کی بہت سی خدمات ہیں۔ ارمینیہ کے والی بنے اور ۴۱ھ یا ۴۲ھ میں فوت ہوئے۔

(۱۱۱۳) وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا قَالَ: كَانَ رَسُولُ اللهِ ﷺ يُنَفِّلُ بَعْضَ مَنْ يَبْعَثُ مِنَ السَّرَايَا لِأَنْفُسِهِمْ خَاصَّةً، سِوَى قِسْمِ عَامَّةِ الجَيْشِ. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ بعض فوجی دستوں کو بالخصوص غنیمت کے حصہ کے علاوہ کچھ مزید دیا کرتے تھے۔ یہ عام فوجی کی تقسیم میں شامل نہیں ہوتا تھا۔ (بخاری و مسلم)

حاصل کلام : اس حدیث سے معلوم ہوا کہ رسول اللہ ﷺ ہر فوجی کو تو یہ نفلی حصہ عنایت نہیں فرمایا کرتے بلکہ صرف مخصوص فوجیوں کو کسی خاص مصلحت کی وجہ سے دینا مناسب خیال فرماتے پھر جن فوجی جوانوں کو یہ حصہ دیتے ان کو بھی مساوی طور پر نہ دیتے بلکہ خدمت اور مصلحت کے لحاظ سے کم و بیش دیتے تھے۔ اس سے معلوم ہوا کہ آج بھی خاص خدمات انجام دینے والے فوجیوں کو سربراہ مملکت خصوصی انعامات دے سکتا ہے۔ مثلاً مختلف قدر و قیمت کے تمغے' نشانات' نقد انعام وغیرہ۔ اس سے نوجوانوں کی حوصلہ افزائی ہوتی ہے۔

(۱۱۱٤) وَعَنْهُ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: كُنَّا نُصِيبُ فِي مَغَازِينَا

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما ہی سے روایت ہے کہ ہمیں غزوات میں شہد' انگور ہاتھ آتے تو ان کو کھا پی لیتے

الْعَسلَ وَالعِنَبَ فَنَأْكُلُهُ، وَلاَ نَرْفَعُهُ. رَوَاهُ البُخَارِيُّ، وَلِأَبِي دَاوُدَ «فَلَمْ يُؤْخَذْ مِنهُمُ الخُمُسُ»، وَصَحَّحَهُ ابْنُ حَبَّانَ.

اٹھا کر نہیں لے جاتے تھے۔ (بخاری) اور ابوداؤد کی روایت میں ہے کہ ان کھانے والے حضرات سے خمس وصول نہیں کیا جاتا تھا اور ابن حبان نے اسے صحیح کہا ہے۔

حاصل کلام: اس حدیث سے یہ معلوم ہوا کہ دوران جنگ مجاہدوں کے ہاتھ کھانے پینے کی اگر کچھ چیزیں آجائیں تو انکو وہیں کھانے پینے کی حد تک استعمال کر سکتے ہیں البتہ اٹھا کر کہیں لے جانے کی ان کو اجازت نہیں۔ خورد و نوش کے علاوہ اگر دشمن کے جانور اور ہتھیار قبضہ میں آجائیں تو انکو جنگ کیلئے استعمال کر سکتے ہیں مگر جنگ کے اختتام پر مال غنیمت میں واپس جمع کرانا واجب ہے۔

(١١١٥) وَعَنْ عَبْدِاللهِ بْنِ أَبِيْ أَوْفَىٰ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: أَصَبْنَا طَعَاماً يَوْمَ خَيْبَرَ، فَكَانَ الرَّجُلُ يَجِيءُ، فَيَأْخُذُ مِنْهُ مِقْدَارَ مَا يَكْفِيْهِ، ثُمَّ يَنْصَرِفُ. أَخرَجَهُ أَبُو دَاوُدَ، وَصَحَّحَهُ ابْنُ الجَارُودِ وَالحَاكِمُ.

حضرت عبداللہ بن ابی اوفیٰ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ خیبر کے روز ہمیں کھانے کی اشیاء ہاتھ آئیں تو ہر آدمی آتا اور اس میں سے اپنی ضرورت کے مطابق کھانے کیلئے حاصل کر لیتا تھا پھر واپس چلا جاتا۔ (اسے ابوداؤد نے نقل کیا ہے ابن جارود اور حاکم دونوں نے اسے صحیح قرار دیا ہے)

حاصل کلام: اس سے بھی معلوم ہوا کہ خورد و نوش کی چیزیں کھانے پینے کی حد تک ہر سپاہی تقسیم سے پہلے لے سکتا ہے' اس پر اس سے کوئی باز پرس نہیں ہوگی۔

(١١١٦) وَعَنْ رُوَيْفِعِ بْنِ ثَابِتٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «مَنْ كَانَ يُؤْمِنُ بِاللهِ وَالْيَوْمِ الآخِرِ فَلاَ يَرْكَبْ دَابَّةً مِنْ فَيْءِ المُسْلِمِينَ، حَتَّى إِذَا أَعْجَفَهَا رَدَّهَا فِيهِ، وَلاَ يَلْبَسْ ثَوْباً مِنْ فَيْءِ المُسْلِمِينَ، حَتَّى إِذَا أَخْلَقَهُ رَدَّهُ فِيهِ». أَخرَجَهُ أَبُو دَاوُدَ وَالدَّارِمِيُّ. وَرِجَالُهُ لاَ بَأْسَ بِهِمْ.

حضرت رویفع بن ثابت رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "جو کوئی اللہ پر ایمان اور یوم آخرت پر یقین رکھتا ہے تو وہ مسلمانوں کے مال غنیمت کے گھوڑے پر سوار نہ ہو مگر یہ کہ جب وہ کمزور ہو جائے تو اسے واپس کر دے اور مسلمانوں کے مال غنیمت سے کوئی کپڑا نہ پہنے حتیٰ کہ جب وہ بوسیدہ و پرانا ہو جائے تو اسے واپس بیت المال میں جمع کرا دے۔" (اسے ابوداؤد اور دارمی نے روایت کیا ہے اور اس کے سب راوی ایسے ہیں جن میں کوئی حرج نہیں)

لغوی تشریح: ﴿ من فی المسلمین ﴾ یعنی مشترک مال غنیمت۔ ﴿ اعجفھا ﴾ کمزور دبلا کر دے۔

﴿ اخلقه ﴾ اسے بوسیدہ و پرانا کر دے۔

حاصل کلام: اس حدیث سے ثابت ہوا کہ غنیمت میں حاصل شدہ کپڑوں اور گھوڑوں کو میدان جنگ میں ضرورت کے وقت استعمال میں لایا جا سکتا ہے بعد میں ان کو استعمال کرنا ممنوع ہے۔ بعض نے وقتی طور پر استعمال کرنے کیلئے بھی سپہ سالار کی اجازت کو شرط قرار دیا ہے کہ جب تک سالار لشکر کی اجازت نہ ہو اس وقت تک کسی طرح استعمال نہیں کر سکتا۔

(١١١٧) وَعَنْ أَبِيْ عُبَيْدَةَ بْنِ الجَرَّاحِ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: سَمِعْتُ رَسُولَ اللهِ ﷺ يَقُولُ: «**يُجِيرُ عَلَى الْمُسْلِمِينَ بَعْضُهُمْ**». أَخْرَجَهُ ابْنُ أَبِي شَيْبَةَ وَأَحْمَدُ، وَفِيْ إِسْنَادِهِ ضَعْفٌ.

حضرت ابوعبیدہ بن جراح رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے کہ "مسلمانوں میں سے کوئی بھی پناہ دینے کا مجاز ہے۔" (اس روایت کو ابن ابی شیبہ اور احمد نے نقل کیا ہے۔ اس کی سند میں ضعف ہے۔

وَلِلطَّيَالِسِيِّ مِنْ حَدِيْثِ عَمْرِو بْنِ العَاصِ قَالَ: يُجِيْرُ عَلَى الْمُسْلِمِيْنَ أَدْنَاهُمْ.

اور طیالسی میں عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ "مسلمانوں کا ادنیٰ آدمی بھی پناہ و امان دے سکتا ہے"

وَفِي الصَّحِيْحَيْنِ عَنْ عَلِيٍّ قَالَ: ذِمَّةُ الْمُسْلِمِيْنَ وَاحِدَةٌ، يَسْعَى بِهَا أَدْنَاهُمْ. زَادَ ابْنُ مَاجَهْ وَمِنْ وَجْهٍ آخَرَ «وَيُجِيْرُ عَلَيْهِمْ أَقْصَاهُمْ».

اور صحیحین کی حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت میں ہے کہ "تمام مسلمانوں کی پناہ ایک ہی ہے جس کیلئے ان کا ادنیٰ آدمی بھی سعی کر سکتا ہے۔" ابن ماجہ نے ایک اور طریقے سے اتنا اضافہ نقل کیا ہے۔ "ان کا بہت دور کا آدمی بھی پناہ دے سکتا ہے"

وَفِي الصَّحِيْحَيْنِ مِنْ حَدِيْثِ أُمِّ هَانِيءٍ «قَدْ أَجَرْنَا مَنْ أَجَرْتِ».

اور صحیحین میں ام ہانی رضی اللہ عنہا کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "ہم نے بھی امان دی جسے تو نے امان دی۔"

لغوی تشریح: ﴿ يجير ﴾ یہ اجارۃ سے ماخوذ ہے۔ امان دینا۔ ﴿ على المسلمين ﴾ یہاں علی نفوذ اور وجوب کیلئے ہے یعنی وہ اپنی امان کو ان پر نافذ کر سکتا ہے تو اس کی اس امان کی رعایت کرنا ان کیلئے واجب ہے۔ ﴿ ادناهم ﴾ ان کا ادنیٰ مرتبہ کا آدمی یا صرف وہی تنہا آدمی۔ ان کا حقیر اور کم حیثیت کا مالک آدمی مثلاً غلام، مزدور اور عورت وغیرہ۔ ﴿ ذمة المسلمين واحدة ﴾ مسلمانوں کی دی ہوئی امان ایک جیسی ہے۔ لہٰذا کسی مسلمان کیلئے جائز نہیں ہے کہ اس کی دی ہوئی پناہ و امان کو کوئی توڑ دے خواہ کوئی ہو۔ ﴿ يسعى بها ادناهم ﴾ یعنی اس کا عمل پناہ و امان دینا ثابت ہو اس کی پناہ سے۔ ﴿ اقصاهم ﴾ گھر کے دور ہونے کے اعتبار سے۔ معنی اس کا یہ ہے کہ جب کوئی مسلمان میدان کارزار سے بہت ہی دور

رہتا ہے اور وہ کافر کو امان دے تو دوسرے مسلمانوں پر اس کافر کی حفاظت و رعایت کرنا واجب ہے اور اس ذمہ کو توڑنا حلال نہیں ہے۔ ﴿ قد اجرنا من اجرت ﴾ مخاطب کے صیغہ کے ساتھ کہ جسے تو نے امان دی اسے ہم نے امان دی۔ یہ ارشاد آپؐ نے حضرت ام ھانی رضی اللہ عنہا کو اس موقع پر فرمایا' جب انہوں نے آپؐ کو اس کی اطلاع دی کہ اس نے دو آدمیوں کو جو اس کے سسرالی رشتہ دار تھے' پناہ دی ہے۔ مگر ان کے بھائی علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ نے اپنی بہن کی امان کو جائز نہ رکھا اور ان دونوں کو قتل کرنا چاہا اور اس حدیث سے ثابت ہوا کہ مرد ہی نہیں عورت کی امان بھی جائز ہے۔ عام فقہاء کرام کا یہی موقف ہے۔

راوی حدیث: ﴿ ام ھانی رضی اللہ عنہا ﴾ یہ ابوطالب کی صاحبزادی' حضرت علی رضی اللہ عنہ کی ہمشیرہ تھیں۔ ان کا نام فاختہ تھا اور ھند نام بھی بتایا گیا ہے۔ فتح مکہ کے موقع پر مسلمان ہوئی تھیں۔

(۱۱۱۸) وَعَنْ عُمَرَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُ، أَنَّهُ سَمِعَ رَسُولَ اللهِ ﷺ يَقُولُ: لأُخْرِجَنَّ اليَهُودَ وَالنَّصَارَى مِنْ جَزِيرَةِ العَرَبِ، حَتَّى لاَ أَدَعَ إِلاَّ مُسْلِماً». رَوَاهُ مُسْلِمٌ.

حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ انہوں نے سنا' رسول اللہ ﷺ فرما رہے تھے کہ "میں یہود و نصاریٰ کو جزیرۃ العرب سے باہر نکال کر دم لوں گا۔ یہاں تک کہ عرب میں مسلمانوں کے علاوہ کسی ایک کو بھی نہیں چھوڑوں گا۔" (مسلم)

لغوی تشریح: ﴿ لادع ﴾ میں نہیں چھوڑوں گا اور جزیرۃ العرب سے مراد بحر ھند' بحر شام' پھر دجلہ و فرات نے جتنے علاقے پر احاطہ کیا ہوا ہے یا طول کے لحاظ سے عدن ابین کے درمیان سے لے کر اطراف شام تک کا علاقہ اور عرض کے اعتبار سے جدہ سے لے کر آبادی عراق کے اطراف تک۔ جیسا کہ قاموس میں ہے۔

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ نبی کریم ﷺ کی خواہش تھی کہ جزیرۃ العرب سے کافروں اور یہود و نصاریٰ کو باہر نکال دیں۔ اپنی زندگی میں اس پر پوری طرح عمل نہ کیا جا سکا پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضور ﷺ کی خواہش اور آپؐ کے حکم کہ عرب میں دو دین نہ رہیں' پر عمل درآمد کیا اور اپنے دور خلافت میں یہودیوں اور عیسائیوں کو جزیرۂ عرب سے جلا وطن کر دیا۔

(۱۱۱۹) وَعَنْهُ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: كَانَتْ أَمْوَالُ بَنِي النَّضِيْرِ مِمَّا أَفَاءَ اللّٰهُ عَلىٰ رَسُولِهِ، مِمَّا لَمْ يُوْجِفْ عَلَيْهِ الْمُسْلِمُونَ بِخَيْلٍ وَّلاَ رِكَابٍ، فَكَانَتْ لِلنَّبِيِّ ﷺ خاصَّةً، فَكَانَ يُنْفِقُ عَلىٰ أَهْلِهِ نَفَقَةَ سَنَةٍ، وَمَا بَقِيَ يَجْعَلُهُ فِي الكُرَاعِ وَالسِّلاَحِ،

حضرت عمر رضی اللہ عنہ ہی سے روایت ہے کہ بنو نضیر کے اموال' ان اموال میں سے ہیں جو اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول کی طرف پلٹا دیئے ہیں۔ جن پر مسلمانوں نے نہ گھوڑے دوڑائے اور نہ اونٹ۔ یہ اموال خالص نبی ﷺ کیلئے تھے۔ آپؐ ان اموال میں سے اپنی بیویوں پر سال بھر خرچ کرتے تھے اور جو باقی بچ رہتا اس سے گھوڑے اور اسلحہ برائے جہاد فی سبیل

عُدَّةً فِي سَبِيْلِ اللهِ عَزَّ وَجَلَّ. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ. اللہ کی تیاری کیلئے خرید فرماتے۔ (بخاری و مسلم)

لغوی تشریح: ﴿ مما افاء الله ﴾ یہ گرائمر میں کانت کی خبر ہے۔ افاء کے معنی ہیں عطا فرمایا۔ ﴿ مما لم یوجف ﴾ نہیں دوڑائے اور نہ بھگائے۔ "ایجاف" سے ماخوذ ہے۔ تیز رفتاری کے معنی میں۔ ﴿ رکاب ﴾ راء کے نیچے کسرہ ﴿ الابل ﴾ یعنی اونٹ اور ﴿ ایجاف الخیل والرکاب ﴾ یہ کنایہ ہے لڑائی سے۔ یعنی بغیر جنگ و جدال اور لڑائی کے بنو نضیر کے اموال حاصل ہوئے۔ ﴿ فکانت للنبی صلی الله علیه وسلم خاصة ﴾ یہ آپؐ کیلئے خاص تھا۔ مال غنیمت نہ تھا کہ مجاہدین میں تقسیم کیا جاتا۔ ﴿ الکراع ﴾ کاف پر ضمہ۔ بہت سے گھوڑوں کیلئے استعمال ہوتا ہے یعنی گھوڑوں کی جماعت۔ ﴿ عدة ﴾ جنگ کی تیاری کیلئے۔ ان کے یہ اموال گھروں اور کھجور کے درختوں کی شکل میں تھے۔ ان اموال میں اکثر تو مہاجرین کو دے دیا گیا اور کچھ مال دو حاجت مند انصاری آدمیوں کو بھی دیا۔ ان دونوں کے علاوہ دوسرے کسی انصاری کو کچھ نہیں دیا گیا اور کچھ کھجور کے درخت آپؐ نے اپنے لئے بھی مخصوص فرمالئے اور یہ وہی تھے جن میں سے آپؐ اپنے اہل و عیال پر خرچ فرماتے تھے۔

حاصل کلام: بنو نضیر۔ مدینہ منورہ میں آباد یہودیوں کا بہت بڑا قبیلہ تھا۔ ان کے ساتھ نبی ﷺ کا معاہدہ تھا۔ انہوں نے بقول بعض غزوۂ بدر کے چھ ماہ بعد اور بقول ابن اسحٰق احد اور بئر معونہ کے بعد عہد شکنی کا ارتکاب کیا۔ تنبیہہ اور یاددہانی کے باوجود وہ باز نہ آئے تو رسول اللہ ﷺ نے ان پر چڑھائی کر دی اور ان کا محاصرہ کرلیا۔ بالآخر محاصرہ کی تاب نہ لاکر اپنے گھربار اور مال چھوڑ کر جلا وطن ہوگئے اور بغیر کسی قسم کی لڑائی کے ان کے اموال آپؐ کے ہاتھ آگئے اور یہ اموال فے قرار پائے اس لئے کہ لڑائی تو سرے سے ہوئی ہی نہیں۔ اس لئے بحیثیت فوجی تو کسی کا کوئی حصہ بنتا ہی نہیں تھا۔ تاہم اس کا اکثر حصہ مہاجرین میں تقسیم کیا اور دو انصاری صحابہ کو بھی حسب ضرورت عطا فرمایا اور باقی مال نبی ﷺ اپنے اہل و عیال اور قرابت داروں پر خرچ کرتے۔ آپؐ کے بعد آپؐ کے خلفاء نے بھی اسی پر عمل کیا۔ آپؐ کے قرابت داروں کا اور ازواج مطہرات کا روزینہ' یتامٰی اور مساکین اور مسافروں کے اخراجات وغیرہ پر صرف کرتے رہے۔ اگر کچھ بچ رہتا تو اس سے جہاد فی سبیل اللہ کی تیاری کیلئے گھوڑے اور اسلحہ خریدتے۔

(۱۱۲۰) وَعَنْ مُعَاذٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: غَزَوْنَا مَعَ رَسُولِ اللهِ ﷺ خَيْبَرَ، فَأَصَبْنَا فِيْهَا غَنَماً، فَقَسَمَ فِيْنَا رَسُولُ اللهِ ﷺ طَآئِفَةً، وَجَعَلَ بَقِيَّتَها فِي المَغْنَمِ. رَوَاهُ أَبُو دَاوُدَ، وَرِجَالُهُ لاَ بَأْسَ بِهِمْ.

حضرت معاذ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ہم نے نبی ﷺ کے ہمراہ غزوۂ خیبر لڑا۔ اس میں ہمارے ہاتھ کچھ بکریاں غنیمت میں آئیں۔ ان میں سے کچھ ہم میں تقسیم کر دیں اور باقی کو غنیمت کے اموال میں شامل فرما دیا۔ (اسے ابوداؤد نے روایت کیا ہے اور اس کے راوی ایسے ہیں جن میں کوئی حرج نہیں)

حاصل کلام: یہ حدیث اس چیز کی دلیل ہے کہ خمس سے پہلے اصل مال غنیمت سے نفلی طور پر مال دیا جا

سکتا ہے۔

(۱۱۲۱) وَعَنْ أَبِيْ رَافِعٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ: «إِنِّي لاَ أَخِيسُ بِالعَهْدِ، وَلاَ أَحْبِسُ الرُّسُلَ». رَوَاهُ أَبُو دَاوُدَ وَالنَّسَائِيُّ، وَصَحَّحَهُ ابْنُ حِبَّانَ.

حضرت ابورافع رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "بے شک میں نہ تو عہد شکنی کرتا ہوں اور نہ قاصدوں و سفیروں کو قید کرتا ہوں۔" (اسے ابوداؤد اور نسائی نے روایت کیا ہے اور ابن حبان نے اسے صحیح قرار دیا ہے)

لغوی تشریح: ﴿لا اخیس﴾ میں معاہدہ شکنی اور غداری نہیں کرتا۔

حاصل کلام: اس حدیث کی رو سے عہد شکنی اور غداری کرنا اسلام کی رو سے درست نہیں ہے۔ دراصل قصہ یوں ہے کہ ابورافع اسلام قبول کرنے سے پہلے کافروں کی جانب سے آپؐ کے پاس سفیر کی حیثیت سے آئے۔ آپؐ کا روئے انور اور رخ منور دیکھتے ہی وہ دائرۂ اسلام میں داخل ہونے کی سعادت سے بہرہ ور ہوگئے۔ پھر عرض کیا کہ یارسول اللہ! اب میرا دل واپس جانے کیلئے تیار نہیں ہے لہٰذا آپؐ مجھے یہیں روک لیں تو اس موقع پر آپؐ نے فرمایا "لا اخیس" میں عہد شکنی اور غداری نہیں کر سکتا۔ اس سے معلوم ہوا کہ سفیروں کو بخیر و عافیت واپس بھیجنا حکومت کا ذمہ ہے۔ اگرچہ وہ خود رکھنے کی درخواست کرے' اسے بھی واپس کر دینا چاہئے کیونکہ سفیر و قاصد جس کے پاس آتا ہے گویا اس کی امان میں آتا ہے۔ اسلام نے سفیر کے احترام کا درس دیا ہے خواہ کافر ہو یا مسلمان۔

(۱۱۲۲) وَعَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُ، أَنَّ رَسُولَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ: «أَيُّمَا قَرْيَةٍ أَتَيْتُمُوهَا، فَأَقَمْتُمْ فِيهَا، فَسَهْمُكُمْ فِيهَا، وَأَيُّما قَرْيَةٍ عَصَتِ اللّٰهَ وَرَسُولَهُ، فَإِنَّ خُمْسَهَا لِلّٰهِ وَرَسُولِهِ، ثُمَّ هِيَ لَكُمْ». رَوَاهُ مُسْلِمٌ.

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ "تم جس بستی میں بھی آؤ اور اس میں قیام رکھو تو اس میں تمہارا حصہ ہے اور جو بستی اللہ اور اس کے رسول کی نافرمان ہو تو اس کا خمس اللہ اور اس کے رسول کا ہے پھر وہ بھی تمہیں میں تقسیم ہوگا۔" (مسلم)

لغوی تشریح: ﴿ایما قریۃ اتیتموھا﴾ جس بستی میں تم قیام کرو' بغیر کسی لڑائی و قتال کے۔ ﴿فسھمکم فیھا﴾ اس میں تمہارا حصہ بھی اسی طرح ہے۔ جس طرح مسلمانوں میں سے ایک عام مسلمان کا حصہ ہے کیونکہ اس وقت وہ مال فئے ہے۔ مال غنیمت نہیں تاآنکہ وہ لشکر میں بالخصوص تقسیم نہ کر دیا جائے۔ ﴿وایما قریۃ عصت اللہ ورسولہ﴾ جس بستی والے اللہ اور اس کے رسول کے نافرمان ہوں اور تم اس بستی کو لڑ کر فتح کرو تو وہ غنیمت ہو جائے گی۔ خمس نکالنے کے بعد تمہارے درمیان تقسیم کر دی جائے گی۔

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ اموال فئے میں سے خمس نہیں نکالا جاتا ہے جو لوگ اس کے

قائل ہیں یہ حدیث ان کے نظریئے کی تردید ہے۔ ابن منذر کا قول ہے کہ ہمیں معلوم نہیں کہ امام شافعی رحمہ اللہ سے پہلے کوئی مال فئے میں خمس کا قائل ہوا ہو۔ اس میں پہلی بستی سے مراد وہ بستی ہے جہاں لڑائی نہ ہو۔ اس میں مجاہدین کا حصہ دوسرے مسلمانوں کے مساوی ہے اور دوسری بستی سے مراد وہ بستی ہے جہاں لڑائی ہو۔ اس میں پانچواں حصہ نکال کر باقی مجاہدین میں تقسیم کر دیا جائے گا۔ اس حدیث سے معلوم ہوا کہ خمس اللہ اور اس کے رسول کا ہے۔ آخر کار وہ بھی مسلمانوں کے مصالح میں خرچ ہو گا۔

١ - بَابُ الجِزْيَةِ وَالهُدْنَةِ — جزیہ اور صلح کا بیان

(١١٢٣) عَنْ عَبْدِ الرَّحْمٰنِ بْنِ عَوْفٍ، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ أَخَذَهَا، يَعْنِي الجِزْيَةَ، مِنْ مُجُوسِ هَجَرَ. رَوَاهُ البُخَارِيُّ، وَلَهُ طَرِيْقٌ فِي المُوَطَّإِ، فِيْهَا انْقِطَاعٌ.

حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ہجر کے مجوسیوں سے جزیہ لیا تھا۔ (اسے بخاری نے روایت کیا ہے اور مؤطا میں اس حدیث کی ایک اور سند ہے جس میں انقطاع ہے)

لغوی تشریح: ﴿باب الجزیة﴾ جزیہ کی جیم کے نیچے کسرہ اور زا ساکن۔ یہ وہ معاوضہ ہوتا ہے جو اہل ذمہ سے ان کے دار السلام میں رہنے' ان کے خون اور اموال کی حفاظت کے بدلہ میں لیا جاتا ہے۔ ﴿الهدنة﴾ ھاء پر ضمہ اور دال ساکن۔ اس اتفاق کو کہتے جو جنگ کے لئے ایک خاص مدت تک دو حکومتوں کے درمیان طے پاتا ہے۔ ﴿المجوس﴾ وہ لوگ جو آگ کی عبادت و پرستش کرتے ہیں۔ ﴿وھجر﴾ ھا اور جیم دونوں پر فتحہ۔ یہ بہت بڑے شہر کا نام ہے۔ جو بحرین یعنی الاحساء کا دارالخلافہ تھا۔ معجم البلدان میں ہے کہ ھجر بحرین کا سب سے بڑا شہر ہے اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ بحرین کا تمام کنارہ ہی ہجر ہے اور یہی بات درست ہے۔

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ مجوسی مشرکوں سے جزیہ وصول کیا جائے گا۔ جزیہ صرف اہل کتاب پر نہیں جیسا کہ بعض اہل علم کا خیال ہے بلکہ دیگر مشرکین سے بھی جزیہ وصول کیا جائے گا۔ مؤطا کی روایت میں انقطاع اس بنا پر ہے کہ امام مالک رحمہ اللہ نے اسے امام ابن شہاب زھری سے مرسلاً روایت کیا ہے۔

(١١٢٤) وَعَنْ عَاصِمِ ابْنِ عُمَرَ، عَنْ أَنَسٍ، وَعَنْ عُثْمَانَ بْنِ أَبِيْ سُلَيْمَانَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُمْ أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ بَعَثَ خَالِدَ بْنَ الوَلِيْدِ إِلٰى أُكَيْدِرِ دَوْمَةَ الجَنْدَلِ فَأَخَذُوهُ، فَأَتَوا بِهِ فَحَقَنَ دَمَهُ وَصَالَحَهُ عَلَى الجِزْيَةِ.

عاصم بن عمر رحمہ اللہ حضرت انس رضی اللہ عنہ اور حضرت عثمان بن ابی سلیمان رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کو دومہ الجندل کے حکمران اکیدر کے پاس بھیجا۔ خالد رضی اللہ عنہ نے اسے گرفتار کر لیا اور اسے لے کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ آپؐ نے اس کا خون نہ

رَوَاهُ أَبُو دَاوُدَ.　بہایا اور اس سے جزیہ پر مصالحت کرلی۔ (ابوداؤد)

لغوی تشریح: ﴿وعن عثمان﴾ ان سے روایت کرنے والا بھی عاصم ہے۔ جیسا کہ امام نووی رحمہ اللہ نے صراحت کی ہے۔ ﴿بعث خالد بن الولید﴾ خالد بن ولید کو بھیجا۔ آپؐ نے انہیں غزوۂ تبوک کے ایام میں بھیجا تھا۔ ﴿الی اکیدر﴾ یہ صاحب اکیدر بن عبدالملک کندی۔ جو دومۃ الجندل کے فرمانروا تھے اور اکیدر کے ہمزہ پر ضمہ اور کاف پر فتحہ "یا" ساکن اور دال کے نیچے کسرہ اور دومۃ کے دال پر ضمہ اور "واؤ" ساکن اور جندل کے جیم پر فتحہ اور نون ساکن اور ﴿دومۃ الجندل﴾ غربی نجد کے شمال میں وادی سرحان میں ایک شہر کا نام ہے۔ ﴿فحقن دمہ﴾ اس کا خون نہیں بہایا بلکہ اس کی حفاظت کا عہد دیا۔

حاصل کلام: اس حدیث سے ثابت ہوا کہ عرب اہل کتاب سے بھی جزیہ لینا جائز ہے۔ اکیدر عرب کا ایک عیسائی رئیس تھا اور غسانی قبیلے سے تعلق رکھتا تھا۔ (سبل) قاضی ابویوسف عربی سے جزیہ لینے کے قائل نہیں مگر امام مالک رحمہ اللہ، امام شافعی رحمہ اللہ وغیرہ عربی و عجمی مشرک سے جزیہ لینے کے قائل ہیں۔

راوی حدیث: ﴿عاصم بن عمر﴾ ابوعمر عاصم بن عمر بن قتادہ بن نعمان انصاری، تابعی تھے۔ کثیر الحدیث تھے۔ علم کے راوی۔ مغازی و سیر کے علم سے بہرہ ور تھے۔ ان کی وفات کے بارے میں مختلف اقوال ہیں۔ ۱۱۹، ۱۲۰، ۱۲۱، ۱۲۷، ۱۲۹ھ وغیرہ

﴿عثمان بن ابی سلیمان﴾ عثمان بن ابی سلیمان بن جبیر بن مطعم، مکہ کے قاضی تھے۔ امام احمد رحمہ اللہ، ابن معین رحمہ اللہ اور ابوحاتم رحمہ اللہ نے ان کو ثقہ قرار دیا ہے۔ عثمان تابعی ہیں اور عاصم نے یہ روایت حضرت انس رضی اللہ عنہ سے متصلاً اور عثمان سے مرسلاً بیان کی ہے۔

(۱۱۲۵) وَعَنْ مُعَاذِ بْنِ جَبَلٍ قَالَ: بَعَثَنِي النَّبِيُّ ﷺ إِلَى الْيَمَنِ فَأَمَرَنِي أَنْ آخُذَ مِنْ كُلِّ حَالِمٍ دِيْنَاراً، أَوْ عِدْلَهُ مُعَافِرِيًّا. أَخْرَجَهُ الثَّلاَثَةُ، وَصَحَّحَهُ ابْنُ حِبَّانَ وَالْحَاكِمُ.

حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ مجھے نبی ﷺ نے یمن کی طرف بھیجا اور فرمایا کہ "میں ہر بالغ سے ایک دینار بطور جزیہ وصول کروں یا پھر اس کے برابر معافری کپڑا لوں۔" (اس کی تخریج تینوں نے کی ہے، ابن حبان اور حاکم نے اسے صحیح قرار دیا ہے)

لغوی تشریح: ﴿حالم﴾ بالغ۔ ﴿عدلہ﴾ عین کے نیچے کسرہ اور فتحہ بھی ہے۔ معنی ہیں مثل، اس جیسا ﴿معافریا﴾ کپڑا جو معافر کی جانب منسوب ہونے کی وجہ سے معافری کہلایا اور معافر یمن کا ایک شہر ہے یا ہمدان کا قبیلہ۔ یہ حدیث کتاب الزکاۃ کے تحت گزر چکی ہے۔

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ جزیہ کی سالانہ مقدار ایک دینار یا اسی کے برابر کوئی اور چیز فی کس ہوگی۔ امام احمد رحمہ اللہ اور امام شافعی رحمہ اللہ کا یہی مسلک ہے۔ البتہ امام شافعی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ایک دینار کم از کم جزیہ ہے۔ اس سے زیادہ بھی لیا جا سکتا ہے اور جزیہ صرف بالغ آزاد مرد سے ہی لیا جائے گا۔

(السبل)

(١١٢٦) وَعَنْ عَآئِذِ بْنِ عَمْرٍو الْمُزَنِيِّ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ: «الإِسْلاَمُ يَعْلُو، وَلاَ يُعْلَى» أَخْرَجَهُ الدَّارَقُطْنِيُّ.

حضرت عائذ بن عمرو المزنی رضی اللہ عنہ نے نبی ﷺ سے روایت کیا ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا "اسلام غالب رہتا ہے مغلوب نہیں ہوتا۔" (سنن دارقطنی)

حاصل کلام: اس حدیث میں خبر و اطلاع بھی ہے اور پیشین گوئی بھی کہ اسلام ہمیشہ غالب بن کر رہنے کیلئے آیا ہے' مغلوب بن کر رہنے کیلئے نہیں۔ لہٰذا اہل اسلام کو چاہئے کہ نظریاتی اور عملی طور پر اسے غالب رکھنے کی کوشش کرتے رہیں۔ اسلام کی صحیح تبلیغ و اشاعت کریں۔ اس کے مطابق پہلے خود اپنی عملی زندگی ڈھالیں تاکہ ان کے عمل و کردار اور اخلاق و اطوار سے متاثر ہو کر غیر مسلم دائرۂ اسلام میں داخل ہوں۔ اس حدیث کو ھدنہ کی تمہید اور ابتداء کے طور پر ذکر کیا گیا ہے کہ باہمی مصالحت میں اگر بفرض محال کوئی شرط و دفعہ بظاہر اسلام کے ماننے والے کے مفاد کے خلاف بھی معلوم ہو تو پریشان ہونے اور گھبرانے کی ضرورت نہیں ہے۔ اسلام اللہ کا پسندیدہ دین ہے۔ وہ اسے ہمیشہ سربلند و بالاتر اور اعلیٰ و غالب رکھے گا۔ اس کے ماننے والے اگر اس کے مطابق عمل کریں گے تو سرخرو ہوں گے اور اللہ تعالیٰ اسلام اور اہل اسلام کی نصرت و مدد فرمائے گا۔ اسلام کا دلائل و براھین کے اعتبار سے سب پر غالب رہنا تو ایک مسلمہ حقیقت ہے۔

راوی حدیث: ﴿عائذ بن عمرو مزنی رضی اللہ عنہ﴾ ابو ان کی کنیت تھی۔ بصرہ میں فروکش ہو گئے تھے۔ صالح صحابہ میں سے تھے۔ بیعت رضوان میں حاضر تھے۔ یزید ابن معاویہ کے عہد میں وفات پائی۔

(١١٢٧) وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُ أَنَّ رَسُولَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ: «لاَ تَبْدَءُوا الْيَهُودَ وَالنَّصَارَى بِالسَّلاَمِ، وَإِذَا لَقِيتُمْ أَحَدَهُمْ فِي طَرِيقٍ فَاضْطَرُّوهُ إِلَى أَضْيَقِهِ». رَوَاهُ مُسْلِمٌ.

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "یہود و نصاریٰ کو سلام پہلے نہ کیا کرو اور جب تمہارا ان میں سے کسی سے آمنا سامنا ہو جائے تو اسے راستہ کی تنگ جانب جانے پر مجبور کر دو۔" (مسلم)

لغوی تشریح: ﴿فاضطروہ﴾ ان کو مجبور کر دو بایں طور کہ ان کیلئے صدر راستہ نہ چھوڑو۔ اسے رسوا و ذلیل کرنے کیلئے۔

حاصل کلام: اس حدیث کی رو سے مسلمان کا یہود و نصاریٰ اور مجوس وغیرہ کو پہلے سلام کہنا حرام ہے۔ جمہور سلف کی رائے یہی ہے مگر کچھ لوگ جن میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما بھی شامل ہیں کہتے ہیں ذمی اہل کتاب کو پہلے سلام کہنا جائز ہے لیکن یہ درست نہیں۔ نیز ان سے راستہ میں ملاقات ہو جائے تو ان کیلئے

راستہ بھی نہ چھوڑنا چاہئے۔ اس سے ان کو یہ احساس دلانا مقصود ہے کہ وہ چھوٹے لوگ ہیں اور چھوٹے ہی بن کر رہیں۔ اس سے یہ مطلب نہ نکالنا چاہئے کہ اسلام انسان' انسان کے مابین امتیاز پیدا کرتا ہے۔ یہ تو اصول کی بات ہے کہ جو لوگ دین فطرت کو قبول کرنے سے انکاری ہیں ان کا مقام و مرتبہ بہرحال وہ نہیں ہو سکتا جو ماننے والوں کا ہے۔

(١١٢٨) وَعَنِ الْمِسْوَرِ بْنِ مَخْرَمَةَ وَمَرْوَانَ أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ خَرَجَ عَامَ الْحُدَيْبِيَةِ، فَذَكَرَ الْحَدِيْثَ بِطُولِهِ، وَفِيْهِ: «**هٰذَا مَا صَالَحَ عَلَيْهِ مُحَمَّدُ بْنُ عَبْدِاللهِ، سُهَيْلَ بْنَ عَمْرٍو: عَلٰى وَضْعِ الْحَرْبِ عَشَرَ سِنِيْنَ، وَيَأْمَنُ فِيْهَا النَّاسُ، وَيَكُفُّ بَعْضُهُمْ عَنْ بَعْضٍ**». أَخْرَجَهُ أَبُو دَاوُدَ وَأَصْلُهُ فِي الْبُخَارِيِّ.

وَأَخْرَجَ مُسْلِمٌ بَعْضَهُ مِنْ حَدِيْثِ أَنَسٍ، وَفِيْهِ: أَنَّ مَنْ جَآءَنَا مِنْكُمْ لَمْ نَرُدَّهُ عَلَيْكُم، وَمَنْ جَآءَكُمْ مِنَّا رَدَدْتُمُوهُ عَلَيْنَا، فَقَالُوا: أَنَكْتُبُ هٰذَا؟ يَا رَسُولَ اللهِ! قَالَ: «**نَعَمْ إِنَّهُ مَنْ ذَهَبَ مِنَّا إِلَيْهِمْ فَأَبْعَدَهُ اللّٰهُ، وَمَنْ جَآءَنَا مِنْهُمْ فَسَيَجْعَلُ اللّٰهُ لَهُ فَرَجاً وَمَخْرَجاً**».

حضرت مسور بن مخرمہ اور مروان رضی اللہ عنہما دونوں سے روایت ہے کہ نبی ﷺ حدیبیہ کے سال نکلے۔ راوی نے لمبی حدیث بیان کی ہے اور اس میں یہ مذکور ہے کہ یہ وہ (دستاویز) ہے جس پر محمد بن عبداللہ (ﷺ) نے سہیل بن عمرو سے صلح کی ہے کہ دس سال جنگ بند رہے گی۔ اس عرصہ میں لوگ امن سے رہیں گے اور ان میں سے ہر ایک (جنگ سے) اپنا ہاتھ روکے رکھے گا۔ (ابوداؤد اور اس کی اصل بخاری میں ہے) اور مسلم نے اس حدیث کا کچھ حصہ حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے اور اس میں ہے کہ تم میں سے جو کوئی ہمارے پاس آئے گا اسے ہم واپس نہیں کریں گے اور ہمارا کوئی آدمی تمہارے پاس آجائے تو تم اسے ہمارے پاس واپس لوٹا دو گے۔ انہوں نے عرض کیا اے اللہ کے رسول (ﷺ)! کیا ہم یہ لکھ لیں؟ آپؐ نے فرمایا۔ "ہاں! جو شخص ہم میں سے ان کے پاس چلا جائے گا اسے اللہ تعالیٰ نے دور کر دیا اور ان میں سے جو ہمارے پاس آئے گا تو اللہ تعالیٰ اس کیلئے ضرور کشائش اور کوئی راستہ نکال دے گا۔"

لغوی تشریح: ﴿عام الحدیبیۃ﴾ یہ واقعہ ذوالقعدہ بروز پیر ٦ھ میں پیش آیا جب آپؐ عمرہ کرنا چاہتے تھے۔ حدیبیہ "حا" پر ضمہ اور دال پر فتحہ اور "یا" ساکن اور اس کے بعد "یا" مخففہ اور مشددہ بھی کہا گیا ہے۔ جدہ کے راستہ میں مکہ کے قلب سے دس میل کے فاصلہ پر ایک جگہ کا نام ہے۔ حدیبیہ نام کا ایک کنواں تھا جس سے اس کا نام حدیبیہ پڑ گیا۔ ﴿فذکر الحدیث بطولہ﴾ اس حدیث میں حدیبیہ کی

جانب جانے کا قصہ ہے۔اہل مکہ نے آپؐ کو عمرہ کرنے سے روک دیا تھا پھر چند شرائط پر مصالحت کر لی تھی۔ ان شروط میں سے وہ شرط بھی تھی جسے مؤلف نے بیان کیا ہے۔ ﴿ سهيل بن عمرو ﴾ یہ کفار کی جانب سے نمائندہ تھے۔ ﴿ وضع الحرب ﴾ لڑائی کو چھوڑ دیا۔ ﴿ يكف ﴾ روکتا ہے۔ ﴿ من جاء منكم ﴾ یہ شرط مسلمانوں کے خلاف پڑی تھی یعنی جو آدمی مسلمانوں کے کیمپ سے بھاگ کر کافروں کے کیمپ میں چلا جائے گا اسے کفار واپس نہیں کریں گے اور اہل مکہ میں سے جو کوئی مسلمانوں کے ہاں پناہ لے گا وہ اسے کافروں کی جانب لوٹا دیں گے۔ ﴿ انكتب هذا؟ ﴾ کیا اسے قلمبند کر لیا جائے۔ اس میں استفہام انکاری ہے اور بظاہر رسوائی جو اس میں محسوس ہوتی ہے اس پر اظہار تعجب ہے۔ "فرجا" فا اور را دونوں پر فتحہ۔ فراخی اور کشادگی' کشائش۔

راوی حدیث: ﴿ مروان رضي الله عنه ﴾ اس سے مروان بن حکم اموی مراد ہے۔ ابو عبدالملک کنیت تھی۔ حضرت معاویہ رضي الله عنه کی طرف سے مدینہ منورہ کے گورنر مقرر ہوئے۔ یزید کی وفات کے بعد عبداللہ بن زبیر رضي الله عنه نے خلافت کے بارے میں دلچسپی لی اور اس کے بیٹے معاویہ کی معزولی کے بعد مصر اور شام پر والی بن گئے۔ ان کی وفات دمشق میں ۶۵ھ میں ہوئی۔

﴿ سهيل بن عمرو رضي الله عنه ﴾ سہیل بن عمرو کا شمار قریش کے سرکردہ شرفاء و رؤسا میں ہوتا تھا۔ ان کے عقلاء اور خطباء میں سے ایک تھے۔ بدر کے روز قید ہوئے اس وقت کافر تھے۔ فتح مکہ کے روز اسلام قبول کیا۔ فتنہ ارتداد کے موقع پر قریش ان کی وجہ سے اسلام پر ثابت قدم رہے۔ ۱۴ھ میں یرموک کے موقع پر قتل ہو کر مرتبہ شہادت پر فائز ہوئے یا ان کی وفات مرج صفر میں یا طاعون عمواس میں ۱۸ھ میں ہوئی۔

(۱۱۲۹) وَعَنْ عَبْدِ اللهِ بْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُما عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ: «مَنْ قَتَلَ مُعَاهِداً لَمْ يَرَحْ رَائِحَةَ الجَنَّةِ، وَإِنَّ رِيحَهَا لَيُوجَدُ مِنْ مَسِيرَةِ أَرْبَعِينَ عَاماً». أَخْرَجَهُ البُخَارِيُّ.

حضرت عبداللہ بن عمرو رضي الله عنهما نے نبی ﷺ سے روایت کی ہے کہ "جس کسی نے عہدی کو قتل کیا وہ جنت کی خوشبو نہیں پائے گا اور جنت کی خوشبو چالیس برس کی مسافت سے پائی جاتی ہے۔" (بخاری)

لغوی تشریح: ﴿ لم يرح ﴾ یرح کے "را" پر فتحہ ہے۔ نہیں پا سکے گا۔ نہیں سونگھ سکے گا۔ ﴿ رائحة الجنة ﴾ جنت کی خوشبو۔

حاصل کلام: اس حدیث سے ثابت ہوا کہ کسی ذمی اور معاہد کو بلاوجہ اور کسی شرعی حق کے بغیر قتل کرنا حرام ہے۔ نیز یہ بھی معلوم ہوا کہ ایسے مسلمان قاتل سے دنیا میں قصاص نہیں لیا جاتا' اس لئے اخروی سزا بیان کی۔ معاہد دراصل وہ آدمی ہے جو مسلم علاقہ کا باشندہ نہ ہو۔ غیر مسلم حکومت میں سکونت رکھتا ہو اور امان لے کر اسلامی حکومت کے علاقہ میں آیا ہو۔ اس کے قتل پر اس حدیث میں بڑی سخت وعید ہے کہ وہ جنت کی خوشبو تک نہ پائے گا اور جنت کی خوشبو چالیس برس کی مسافت تک پائی جاتی ہے۔

٢ - بَابُ السَّبق وَالرَّمي گھڑ دوڑ اور تیراندازی کا بیان

(١١٣٠) عَنِ ابْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُمَا قَالَ: سَابَقَ النَّبِيُّ ﷺ بِالخَيْلِ الَّتِيْ قَدْ أُضْمِرَتْ، مِنْ الحَفْيَآءِ، وَكَانَ أَمَدُهَا ثَنِيَّةَ الوَدَاعِ، وَسَابَقَ بَيْنَ الخَيْلِ الَّتِيْ لَمْ تُضْمَرْ، مِنَ الثَّنِيَّةِ إِلىٰ مَسْجِدِ بَنِي زُرَيْقٍ، وَكَانَ ابْنُ عُمَرَ فِيْمَنْ سَابَقَ. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ. زَادَ البُخَارِيُّ «قَالَ سُفْيَانُ: مِنَ الحَفْيَآءِ إِلىٰ ثَنِيَّةِ الوَدَاعِ خَمْسَةُ أَمْيَالٍ، أَوْ سِتَّةٌ، وَمِنَ الثَّنِيَّةِ إِلىٰ مَسْجِدِ بَنِي زُرَيْقٍ مِيْلٌ».

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے تیار شدہ گھوڑوں کی "حفیاء" سے "ثنیۃ الوداع" تک دوڑ کرائی اور جو گھوڑے تیار نہیں تھے ان کو "ثنیۃ" سے لے کر "بنی زریق" کی مسجد تک دوڑایا اور ابن عمر رضی اللہ عنہما بھی مسابقت میں شریک تھے۔ (بخاری و مسلم) اور بخاری میں اتنا اضافہ ہے کہ سفیان رحمہ اللہ نے بیان کیا کہ "حفیاء" سے "ثنیۃ الوداع" کا فاصلہ پانچ یا چھ میل ہے اور "ثنیۃ" سے "مسجد بنی زریق" تک کا فاصلہ ایک میل ہے۔

لغوی تشریح: ﴿ باب السبق ﴾ سبق کے سین پر فتحہ اور "با" ساکن مصدر بمعنی مسابقۃ الخیل یعنی گھڑ دوڑ' اسے "رھان" بھی کہتے ہیں اور "رمی" یعنی تیراندازی کا مقابلہ' نشانہ بازی کا مقابلہ۔ ﴿ اضمرت ﴾ صیغہ مجہول اور اضمار اور تضمیر یہ کہ پہلے گھوڑے کو خوب بکثرت چارہ کھلا کر موٹا تازہ کرتے ہیں اور خوب توانا اور قوی کرتے ہیں پھر اس کی خوراک کم کرنا شروع کرتے ہیں اور میدان میں دوڑاتے اور چکر لگواتے ہیں تا کہ اس کا جسم مضبوط اور سخت جان ہو جائے اور جسم کا ڈھیلا پن سخت ہو جائے اور عربوں کے ہاں تضمیر کا یہ عمل چالیس روز تک ہوتا تھا۔ ﴿ من الحفیاء ﴾ "حا" پر فتحہ اور "فا" ساکن ممدودہ اور کبھی قصر یعنی بغیر مد کے بھی پڑھ لیتے ہیں۔ مدینہ کے باہر ایک جگہ کا نام اور اس فقرے میں کلمہ "من" سے مراد غایت کی ابتداء ہے۔ ﴿ امدھا ﴾ ہمزہ اور میم دونوں پر فتحہ۔ اس سے غایت مراد ہے۔ ﴿ ثنیۃ الوداع ﴾ یہ بھی مدینہ منورہ سے باہر ایک مقام ہے اور ثنیۃ "ثا" پر فتحہ نون کے نیچے کسرہ اور "یا" پر تشدید۔ یہ عقبہ کی طرف جانے والا راستہ ہے۔ الوداع کی جانب اسے مضاف کیا گیا ہے اس لئے کہ مہمانوں کو اس جگہ سے الوداع کہا کرتے تھے۔

حاصل کلام: اس حدیث سے جہاد کی تیاری کیلئے گھڑ دوڑ' تیر اندازی اور نیزہ بازی کا جواز ثابت ہوتا ہے۔ اس دور میں یہی چیز عموماً جنگ میں کام آتی تھی۔ آج کے دور میں ٹینک' بکتربند گاڑیاں چلانے کی تعلیم حاصل کرنی چاہئے۔ تیر و نیزے کی جگہ بندوق' توپ اور جدید جنگی تربیت حاصل کرنی چاہئے۔

(١١٣١) وَعَنْهُ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ نبی ﷺ

عَنْهُ أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ سَابَقَ بَيْنَ الخَيْلِ، وَفَضَّلَ القُرَّحَ فِي الغَايَةِ. رَوَاهُ أَحْمَدُ وَأَبُو دَاوُدَ، وَصَحَّحَهُ ابْنُ حِبَّانَ.

نے گھوڑوں کے درمیان مسابقت کرائی اور نوجوان گھوڑوں کی حد میں فرق ملحوظ رکھا۔ (اسے احمد اور ابوداؤد نے روایت کیا اور ابن حبان سے صحیح کہا ہے)

لغوی تشریح: ﴿فضل القرح فی الغایۃ﴾ نوجوان گھوڑے کی غایت (فاصلہ) زیادہ دور اور لمبا رکھا' دوسرے کی بہ نسبت اور فعل تفضیل سے مبنی للفاعل ہے اور قرح کے قاف پر ضمہ اور "را" پر تشدید اور فتحہ' قارح کی جمع۔ نوجوان گھوڑے کو کہتے ہیں جس کی عمر پوری و مکمل اور جس کی کچلیاں نمایاں ہو چکی ہوں۔ غایت میں یہ فضیلت و فرق اس لئے رکھا گیا ہے کہ نوجوان' تندرست و توانا اور قوی الجثہ گھوڑا دوسرے کے مقابلہ میں زیادہ لمبی دوڑ کا متحمل ہو سکتا ہے جبکہ کمزور اور ضعیف اس کی سکت نہیں رکھتا۔

حاصل کلام: اس حدیث سے ثابت ہوا کہ جانوروں کا بھی بہت خیال اور لحاظ رکھنا چاہئے۔ جتنی ہمت و طاقت کا جانور ہو اس سے اس کے مطابق کام و خدمت لی جانی چاہئے۔ ہمت و طاقت سے زیادہ کام لینا درست نہیں۔

(۱۱۳۲) وَعَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «لاَ سَبْقَ إِلاَّ فِي خُفٍّ، أَوْ نَصْلٍ، أَوْ حَافِرٍ». رَوَاهُ أَحْمَدُ. وَالثَّلاَثَةُ، وَصَحَّحَهُ ابْنُ حِبَّانَ.

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "دوڑ کا مقابلہ صرف اونٹ اور گھوڑوں میں ہے اور ہار جیت صرف تیراندازی کے مقابلہ میں۔" (اسے احمد اور تینوں نے روایت کیا ہے اور ابن حبان نے اسے صحیح کہا ہے)

لغوی تشریح: ﴿لاسبق﴾ سبق کے "سین" اور "با" دونوں پر فتحہ۔ دوڑ کے مقابلہ میں جو مالی انعام وغیرہ رکھا جائے۔ مطلب یہ ہے کہ مسابقت میں مال لینا حلال نہیں ہے۔ ﴿الا فی خف﴾ سوائے اونٹ کے۔ ﴿او نصل﴾ یا تیراندازی کے ﴿او حافر﴾ یا گھڑدوڑ میں۔ سبل السلام میں ہے کہ یہ حدیث دلیل ہے کہ مقررہ انعام کی صورت میں دوڑ کا مقابلہ کرانا جائز ہے۔ ﴿جعل﴾ کے جیم پر ضمہ' معنی انعام۔ اگر انعام دوڑ کے مقابلہ میں حصہ لینے والوں کے علاوہ اور کسی کی جانب سے ہے جیسے امام جیتنے والے کو کوئی انعام دے تو یہ حلال ہے۔ بغیر کسی خوف و تردد کے اور اگر یہ انعام کسی مقابلہ میں حصہ لینے والے کی جانب سے ہو تو یہ حلال نہیں' یہ قمار و جوا ہے۔ انعام میں مال لینا مذکورہ بالا کاموں میں حلال ہے۔ اس لئے کہ یہ جنگ کی تیاری و تربیت اور ٹریننگ ہے اور جہاد کیلئے قوت تیار کرتا ہے۔ جو ایسی صورت میں نہ ہو اس پر مال لینا قمار ہے۔ جس سے اجتناب کیا جانا چاہئے۔ جیسے پرندوں اور کبوتروں کی دوڑ اور مینڈھوں کو لڑا کر انعام حاصل کیا جاتا ہے۔

(۱۱۳۳) وَعَنْهُ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ: «مَنْ أَدْخَلَ فَرَساً بَيْنَ

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نبی ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ آپؐ نے فرمایا "جس شخص نے دو گھوڑوں کے

فَرَسَيْنِ ، وَهُوَ لاَ يَأْمَنُ أَنْ يَسْبَقَ فَلاَ بَأْسَ بِهِ، فَإِنْ أَمِنَ فَهُوَ قِمَارٌ» رَوَاهُ أَحْمَدُ وَأَبُو دَاوُدَ، وَإِسْنَادُهُ ضَعِيفٌ.

درمیان تیسرا گھوڑا داخل کیا لیکن اس شخص کو یہ یقین نہ تھا کہ یہ گھوڑا آگے بڑھ جائے گا۔ اس میں کوئی حرج نہیں لیکن اگر اس شخص کو یہ یقین تھا کہ یہ تیسرا گھوڑا بڑھ جائے گا تو یہ جوا ہو جائے گا۔" (اسے احمد اور ابوداؤد نے روایت کیا ہے اور اس کی سند ضعیف ہے)

لغوی تشریح: ﴿ان یسبق﴾ صیغۂ مجہول۔ یعنی وہ تو پیچھے رہ جائے گا اور دوسرا آگے بڑھ جائے گا۔ ﴿فان امن﴾ اگر اسے پیچھے رہنے اور آگے بڑھنے کا یقین ہو تو ﴿فھو قمار﴾ وہ قمار و جوا ہے۔ قمار کے قاف کے نیچے کسرہ۔ پس مسابقت سے غرض و غایت یہ ہوتی ہے کہ گھوڑے کی قوت و طاقت کا صحیح اندازہ ہو جائے جب غرض پوری نہ ہو تو بے سود ہونے کی وجہ سے اسے ناجائز قرار دے دیا گیا۔

(١١٣٤) وَعَنْ عُقْبَةَ بْنِ عَامِرٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: سَمِعْتُ رَسُولَ اللهِ ﷺ، وَهُوَ عَلَى المِنْبَرِ، يَقُولُ: ﴿وَأَعِدُّوا لَهُمْ مَا اسْتَطَعْتُمْ مِنْ قُوَّةٍ وَمِنْ رِبَاطِ الخَيْلِ﴾ ٱلآيَة، أَلاَ! إِنَّ القُوَّةَ الرَّمْيُ، أَلاَ! إِنَّ القُوَّةَ الرَّمْيُ، أَلاَ! إِنَّ القُوَّةَ الرَّمْيُ». رَوَاهُ مُسْلِمٌ.

حضرت عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا اور وہ منبر پر کھڑے یہ (آیت) پڑھ رہے تھے۔ (ترجمہ) "تم جو کچھ اپنی قوت سے کافروں کے (مقابلہ) کے لئے تیار کر سکتے ہو تیار کرو اور گھوڑوں کے باندھنے سے۔" اور (فرماتے تھے) "خبردار! قوت تیراندازی ہے۔ خبردار! قوت تیر اندازی ہے۔ خبردار! قوت تیراندازی ہے۔" (مسلم)

لغوی تشریح: ﴿اعدوا﴾ اعداد سے امر کا صیغہ ہے۔ اعداد تیاری کو کہتے ہیں مستقبل کیلئے کسی چیز کا تیار کرنا۔ ﴿ما استطعتم﴾ ما عام ہے حالات و ظروف اور اوضاع کے حسب حال انسان کے تمام ممکنات اس میں شامل ہیں۔ ﴿رباط الخیل﴾ "راء" کے نیچے کسرہ۔ اس کے معنی اصل میں روکنے اور جمع رکھنے کے ہیں پھر اسے خاص طور پر سرحدوں کی حفاظت اور سرحدوں پر واقع شہروں کی حفاظت کیلئے قیام کرنے کو رباط کہا جانے لگا۔ تفسیر المنار (ج ١٠، ص: ٦٩) میں علامہ رشید رضا نے کہا ہے کہ اس سے مراد یہ ہے کہ امت مسلمہ کی مستقل آرمی ہونی چاہئے جو اپنا دفاع کرنے کیلئے ہروقت تیار و مستعد رہے جس وقت بھی دشمن اچانک دھوکہ سے حملہ آور ہو۔ اسی وقت اسے ناکوں چنے چبانے کے لئے میدان کار زار میں سینہ سپر ہو کر کھڑی ہو جائے۔ اس کے گھوڑ سواروں کا دستہ چاک و چوبند ہو اور تیز رفتاری و سبک رفتاری سے سرحدوں پر رونما ہونے والے واقعات کی اطلاع، سرحدی شہروں اور دیہاتوں پر واقع

ہونے والے واقعات کی خبراور ہر طرف سے دارالخلافہ میں تیز گامی سے پہنچانے کیلئے تیار رہیں۔ ﴿ الا ان القوة الرمی ﴾ سن لو کہ قوت تیراندازی میں ہے۔ تفسیرالمنار (ج ۱۰' ص: ۷۰) میں ہے کہ اس حدیث میں رمی سے مراد ہر وہ چیز ہے جس کو پھینک کر دشمن کو نشانہ بنایا جا سکے' تیر ہے' نیزہ ہے' منجنیق کے ذریعہ گولہ باری ہے' جنگی جہازوں کے ذریعہ گولہ باری ہے یا بندوق کے ذریعہ اور توپ کے ذریعہ گولے پھینکنا وغیرہ ہے۔ اگرچہ یہ تمام اسلحۂ حرب نبی ﷺ کے عہد سعادت میں متعارف نہیں تھا مگر لفظ رمی سب کو شامل ہے۔ اگر آپؐ اسے معروف تیروں سے مقید کر دیتے تب بھی مقصود یہی پھینکنے والی چیز مراد ہوتی۔ حالانکہ آپؐ نے تیر کے پھینکنے کا ذکر نہیں کیا ہے ہمیں کیا معلوم شاید اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول ﷺ کی لسان مبارک پر ان الفاظ کو جاری فرما دیا ہو جس میں عمومیت کا معنی پایا جاتا ہے کہ ہر دور میں آپؐ کی امت کیلئے عمومیت پر دلالت کرتا ہے کہ وہ اس دور میں حسب ضرورت اسے مارنے کے معنی میں استعمال کر سکے۔

۱۲- كِتَابُ الأَطْعِمَةِ

کھانے کے مسائل

(۱۱۳۵) عَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ: «كُلُّ ذِي نَابٍ مِنَ السِّبَاعِ فَأَكْلُهُ حَرَامٌ». رَوَاهُ مُسْلِمٌ.

وَأَخْرَجَهُ مِنْ حَدِيْثِ ابْنِ عَبَّاسٍ، بِلَفْظِ: «نَهَى». وَزَادَ: «وَكُلُّ ذِيْ مِخْلَبٍ مِّنَ الطَّيْرِ».

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نبی ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ آپ ؐ نے فرمایا "درندوں میں سے ہر کچلی والے کا کھانا حرام ہے۔" (مسلم)

ابن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت میں جسے مسلم نے روایت کیا ہے یہ الفاظ ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے منع فرمایا ہے اور اتنا اضافہ ہے کہ "پرندوں میں ہر اس پرندے کا کھانا حرام ہے جو پنجوں میں گرفت کر کے کھائے۔"

لغوی تشریح: ﴿کتاب الاطعمة﴾ طعام کی جمع ہے یہاں یہ بیان کرنا اور بتانا مقصود ہے کہ کھانے کی اشیاء میں سے حلال کیا ہے اور حرام کیا ہے۔ ﴿کل ذی ناب من السباع﴾ ناب اس دانت کو کہتے ہیں جو رباعیہ کے پیچھے ہوتا ہے اور رباعیہ ثنایا کے ساتھ ہی ہوتے ہیں (جسے ہم کچلیاں کہتے ہیں) اور "سباع" سبع کی جمع ہے سبع کی سین پر فتحہ اور "با" پر ضمہ ہے۔ وہ جانور جو چیر پھاڑ کرنے والا ہو اور کچلیوں والے جانوروں سے مراد وہ درندہ ہے جس کی کچلیاں ہوں اس کے ذریعہ سے وہ شکار کرنے میں قوت کا باعث ہوتی ہیں۔ مثلاً شیر، بھیڑیا، چیتا اور تیندوا وغیرہ۔ (تحفہ الاحوذی، ج ۲، ص: ۳۵) ابن سینا کا قول ہے کہ ایک حیوان میں کچلی اور سینگ اکٹھے پیدا نہیں ہوتے۔ ﴿بلفظ نھی﴾ یعنی درندوں میں ہر کچلی والا جانور کھانے سے منع فرمایا۔ ﴿ذی مخلب﴾ مخلب کے میم کے نیچے کسرہ اور "خا" ساکن اور لام پر فتحہ۔ جس کے معنی پنجہ یا چنگل کے ہیں۔ جس طرح انسان کے ناخن ہوتے ہیں اور مراد یہ ہے کہ پرندہ پنجے کے ذریعہ سے شکار میں تقویت حاصل کرتا ہے جیسے چیل، شکرا، شاہین اور باز وغیرہ۔

حاصل کلام: اس حدیث میں حرمت کی ایک جامع علامت بیان کی گئی ہے اور وہ یہ کہ ہر چیرنے

پھاڑنے والا درندہ چوپایہ دوسرے الفاظ میں گوشت خور جانور حرام ہے اور ہر وہ پرندہ جو پنجے میں پکڑ کر کھاتا ہو حرام ہے۔ اس اصول کو امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ' امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اور امام احمد رحمۃ اللہ علیہ اور داؤد ظاہری رحمۃ اللہ علیہ نے تسلیم کیا ہے مگر اس کے باوجود درندوں کی حقیقت میں اختلاف ہے۔ لہٰذا امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک گوشت خور جانور جیسا بھی ہو وہ "سبع" ہے۔ اس اعتبار سے بلی وغیرہ بھی سباع میں شامل ہے۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک سباع وہ درندہ ہے جو انسان پر حملہ آور ہو جیسے شیر' بھیڑیا' چیتا وغیرہ۔ بجو اور لومڑی نہیں۔ اس لئے کہ یہ آدمی پر حملہ نہیں کرتے۔ اسی طرح پنجے سے شکار اور پنجہ سے پکڑ کر کھانے والا پرندہ بھی حرام ہے جیسے عقاب' باز' شکرا' شاہین وغیرہ۔ جمہور علماء کا قول یہی ہے لیکن امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے انہیں مکروہ کہا ہے حرام نہیں کہا البتہ چیل اور گدھ کو خباثت کی وجہ سے حرام قرار دیا ہے۔

(١١٣٦) وَعَنْ جَابِرٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: نَهَى رَسُولُ اللهِ ﷺ يَوْمَ خَيْبَرَ عَنْ لُحُومِ الحُمُرِ الأَهْلِيَّةِ، وَأَذِنَ فِي لُحُومِ الخَيْلِ. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ، وَفِي لَفْظٍ لِلْبُخَارِيِّ: «وَرَخَّصَ».

حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خیبر کے روز گھریلو گدھوں کے گوشت کھانے سے منع فرمایا تھا اور گھوڑوں کے گوشت کی اجازت دی تھی۔ (بخاری و مسلم) اور بخاری کی روایت میں ہے "اذن" کے بجائے "رخص" کا لفظ ہے جس کے معنی ہیں کہ آپ نے رخصت دی۔

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ خیبر کے روز گھریلو گدھوں کا گوشت کھانا حرام قرار دیا گیا۔ اس سے پہلے اس کی اجازت تھی تو گویا احکام بتدریج نافذ کئے گئے ہیں۔ حرام کئے جانے کی وجہ جیسا کہ بخاری میں بھی آیا ہے کہ یہ ناپاک و پلید حیوان ہے۔ جمہور علماء' صحابہ و تابعین وغیرہ اس طرف گئے ہیں۔ نیز یہ بھی معلوم ہوا کہ گھوڑے کا گوشت حلال ہے۔ رخصت اور اذن کا لفظ غالبًا اس لئے فرمایا کہ گھوڑوں کی کمی کی وجہ سے تنزیہی طور پر ممنوع قرار دیا تھا پھر رخصت دے دی۔ زید بن علی' امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ اور امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے شاگردان رشیدین یعنی صاحبین اور امام احمد رحمۃ اللہ علیہ اور اسحٰق بن راھویہ رحمۃ اللہ علیہ اور سلف و خلف کے سب علماء اس کی حلت کے قائل ہیں لیکن امام مالک رحمۃ اللہ علیہ اور ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک گھوڑے کا گوشت حرام ہے مگر یہ اور اسی موضوع کی دوسری احادیث صریحاً ان کے خلاف ہیں۔

(١١٣٧) وَعَنِ ابْنِ أَبِي أَوْفَى رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: غَزَوْنَا مَعَ رَسُولِ اللهِ ﷺ سَبْعَ غَزَوَاتٍ، نَأْكُلُ الجَرَادَ. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت ابن ابی اوفیٰ رضی اللہ عنہ نے کہا کہ ہم نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمراہ سات غزوات لڑے ہیں۔ ہم ٹڈی دل کھاتے رہے ہیں۔ (بخاری و مسلم)

لغوی تشریح: ان احادیث میں کچھ جانوروں کی حلت و حرمت نام بنام بیان کی گئی ہیں۔ ٹڈی بھی انہی میں

سے ہے۔ اس کی حلت پر تقریباً سب کا اتفاق ہے۔

(١١٣٨) وَعَنْ أَنَسٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ - فِي قِصَّةِ الأَرْنَبِ - قَالَ: فَذَبَحَهَا فَبَعَثَ بِوَرِكِهَا إِلىٰ رَسُولِ اللهِ ﷺ، فَقَبِلَهُ. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے خرگوش کے قصہ کے متعلق روایت ہے کہ (ابوطلحہ) نے اسے ذبح کیا اور اس کی ران رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں پیش کی۔ جسے آپؐ نے قبول فرمالیا۔ (بخاری و مسلم)

لغوی تشریح: ﴿ فی قصۃ الارنب ﴾ حضرت انس رضی اللہ عنہ نے بیان کیا کہ ہم نے ایک خرگوش کو بھگایا اس وقت ہم مر الظھران کے مقام پر تھے۔ لوگ دوڑے اور پکڑنے کی کوشش کی۔ خرگوش دوڑتے دوڑتے تھک گیا۔ درماندہ ہوگیا تو میں نے اسے پکڑ لیا اور ابوطلحہ رضی اللہ عنہ کے پاس لے آیا۔ انہوں نے اسے ذبح کر کے ران نبی ﷺ کی خدمت میں بھیج دی جسے آپؐ نے شرف قبولیت سے نوازا۔ ﴿ ورك ﴾ "واوٌ" پر فتحہ اور "را" کے نیچے کسرہ اور کبھی کبھار ساکن بھی پڑھ لیا جاتا ہے ورک کہتے ہیں ران کے اوپر والے حصہ کو۔

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ خرگوش حلال ہے۔ اگر حلال نہ ہوتا تو آپؐ اسے قبول نہ فرماتے۔

(١١٣٩) وَعَنِ ابْنَ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا قَالَ: نَهَى رَسُولُ اللهِ ﷺ عَنْ قَتْلِ أَرْبَعٍ مِّنَ الدَّوَآبِّ: النَّمْلَةِ، وَالنَّحْلَةِ، وَالهُدْهُدِ، وَالصُّرَدِ. رَوَاهُ أَحْمَدُ وَأَبُو دَاوُدَ، وَصَحَّحَهُ ابْنُ حِبَّانَ.

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے جانوروں میں سے چار کو مارنے سے منع فرمایا ہے۔ چیونٹی، شہد کی مکھی، ھد ھد اور ممولا۔ (اسے احمد اور ابوداؤد نے روایت کیا ہے اور ابن حبان نے اسے صحیح کہا ہے)

لغوی تشریح: ﴿ من الدواب ﴾ دواب دابۃ کی جمع ہے۔ ہر اس جانور کو کہتے ہیں جو زمین پر رینگتا ہے۔ ﴿ الصرد ﴾ عمر کے وزن پر۔ ایسا پرندہ جس کا سر، چونچ اور پر بڑے بڑے ہوتے ہیں۔ اس کا پیٹ سفید رنگ کا اور پشت سبز رنگ کی ہوتی ہے اور چھوٹے چھوٹے پرندوں کا شکار کرتا ہے۔

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ آپؐ نے جن کے مارنے سے منع فرمایا ہے وہ حرام ہیں۔ جمہور علماء کرام کا بھی یہی فیصلہ ہے۔

(١١٤٠) وَعَنِ ابْنِ أَبِي عَمَّارٍ قَالَ: قُلْتُ لِجَابِرٍ: الضَّبُعُ صَيْدٌ هِيَ؟ قَالَ: نَعَمْ، قُلْتُ: قَالَهُ رَسُولُ

حضرت ابن ابی عمار رحمہ اللہ سے روایت ہے کہ میں نے جابر رضی اللہ عنہ سے دریافت کیا کہ کیا بجو (چرگ) بھی شکار ہے؟ انہوں نے کہا ہاں! میں نے پھر پوچھا،

اللهِ ﷺ؟! قَالَ: نَعَمْ. رَوَاهُ أَحْمَدُ وَالأَرْبَعَةُ، وَصَحَّحَهُ الْبُخَارِيُّ وَابْنُ حِبَّانَ.

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے؟ انہوں نے کہا ہاں! (اسے احمد اور چاروں نے روایت کیا ہے اور بخاری اور ابن حبان نے اسے صحیح قرار دیا ہے)

لغوی تشریح: ﴿الضبع﴾ ضاد پر فتحہ اور "با" پر ضمہ۔ معروف اور جانا پہچانا جانور ہے جو قبروں کو کھودنے (پھاڑنے) کا شوقین ہے۔ فارسی زبان میں اسے ﴿کفتار﴾ اور ہندی زبان میں بجو کہتے ہیں۔ نیل الاوطار میں ہے کہ اس کا معاملہ بھی حیران کن اور عجب ہے کہ وہ ایک سال نر ہوتے ہیں اور ایک سال مادہ۔ حالمہ وہ بحالت نر ہوتی ہے اور بحالت مادہ بچے کو جنم دیتی ہے۔ ﴿صيدهي؟﴾ یہاں پر حرف استفہام حذف ہے اور مقصود یہ تھا کہ کیا اس کا کھانا حلال ہے؟ اس لئے کہ شکار شرعاً اس جانور کا ہے جس کو کھانے کیلئے شکار کیا جاتا ہے۔ اس حدیث کی بنا پر امام شافعی رحمہ اللہ، امام احمد رحمہ اللہ اور اسحٰق رحمہ اللہ کے نزدیک بجو حلال ہے اور نیل الاوطار میں ہے کہ امام شافعی رحمہ اللہ نے فرمایا، صفا اور مروہ کے درمیان ہمیشہ سے لوگ اس کی خرید و فروخت کرتے اور اسے کھاتے ہیں اور کوئی کسی پر اعتراض نہ کرتا۔ اس کے برعکس امام مالک رحمہ اللہ اور امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ اس کو حرام کہتے ہیں کہ یہ درندہ ہے۔ اس کا جواب یہ دیا گیا ہے کہ اس کی کچلیاں نہیں ہوتیں اور کسی درندے کے حرام ہونے کیلئے اس کا کچلیوں والا اور درندہ ہونا ضروری ہے یعنی اس میں دونوں وصف پائے جانے چاہیں اور یہ جواب بھی دیا گیا ہے کہ حدیث کے عموم سے یہ مخصوص ہے۔

راوی حدیث: ﴿ابن ابی عمار﴾ ان کا نام عبدالرحمٰن بن عبداللہ بن ابی عمار القرشی المکی ہے۔ کثرت عبادت کی وجہ سے ان کا لقب "القس" یعنی راھب و پادری تھا۔ امام نسائی رحمہ اللہ نے انہیں ثقہ قرار دیا ہے۔

(۱۱٤۱) وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا أَنَّهُ سُئِلَ عَنِ الْقُنْفُذِ، فَقَالَ: ﴿قُلْ لاَ أَجِدُ فِيمَا أُوحِيَ إِلَيَّ مُحَرَّماً﴾ الآيَةَ فَقَالَ شَيْخٌ عِنْدَهُ: سَمِعْتُ أَبَا هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ يَقُولُ: ذُكِرَ عِنْدَ النَّبِيِّ ﷺ، فَقَالَ: «إِنَّهَا خَبِيثَةٌ مِنَ الْخَبَائِثِ». أَخْرَجَهُ أَحْمَدُ وَأَبُو دَاوُدَ، وَإِسْنَادُهُ ضَعِيفٌ.

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ ان سے سیہہ (خار پشت) کے متعلق دریافت کیا گیا۔ انہوں نے جواب میں اللہ کا فرمان سنایا "(اے رسول!) کہہ دے کہ میں اس میں کوئی حرام چیز نہیں پاتا جو میری طرف وحی کی گئی ہے" اس کے پاس ایک بزرگ بیٹھے تھے، انہوں نے کہا میں نے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے سنا ہے کہ اس کا ذکر نبی ﷺ کے پاس کیا گیا تو آپ ؐ نے فرمایا "خبیث جانوروں میں سے ایک خبیث جانور ہے۔" (اس کی روایت احمد اور ابوداؤد نے

کی ہے اور اس کی سند ضعیف ہے)

لغوی تشریح: "لتفنفذ" قاف پر ضمہ' نون ساکن' فا پر ضمہ۔ ایک خار دار جانور جو جسامت میں بلی کے برابر ہوتا ہے جس کے جسم پر تکلے کی طرح کانٹے ہوتے ہیں اور خطرہ کے موقع پر ان کو پھیلا کر ان میں چھپ جاتا ہے۔ جسے سیہہ اور خار پشت بھی کہتے ہیں۔ ﴿ انھا خبیثۃ من الخبائث ﴾ کہ وہ خبیث جانوروں میں سے ہے اس لئے وہ حرام ہے اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی ہے "یحل لھم الطیبات ویحرم علیھم الخبائث" (۷ : ۱۵۷) کہ وہ ان کیلئے طیبات کو حلال اور خبائث کو حرام قرار دیتے ہیں۔ اس لئے ہر وہ جانور حرام ہے جو خبیث ہے اور ایک نسخہ میں ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ ارشاد فرمایا ہے کہ یہ جانور ایسا ہے تو یہ لازماً ایسا ہی ہے جیسا آپ نے فرمایا۔

حاصل کلام: اس حدیث سے خار پشت یعنی سیہہ کی حرمت ثابت ہوتی ہے۔ امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ اور امام احمد رحمہ اللہ کی یہی رائے ہے۔ مگر یہ حدیث ضعیف ہے جیسا کہ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے صراحت کی ہے۔ امام مالک رحمہ اللہ اور ابن ابی یعلیٰ کا خیال ہے کہ یہ حلال ہے کیونکہ حرمت کی کوئی دلیل صحیح نہیں۔ واللہ اعلم۔ (سبل)

(١١٤٢) وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُما قَالَ: نَهَى رَسُولُ اللهِ ﷺ عَنِ الجَلاَّلَةِ وَأَلْبَانِهَا. أَخْرَجَهُ الأَرْبَعَةُ إِلاَّ النَّسَائِيَّ، وَحَسَّنَهُ التِّرْمِذِيُّ.

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے گندگی خور جانور کے گوشت کھانے اور اس کے دودھ پینے سے منع فرمایا ہے۔ (نسائی کے علاوہ اسے چاروں نے روایت کیا ہے اور ترمذی نے اسے حسن قرار دیا ہے)

لغوی تشریح: ﴿ الجلالۃ ﴾ لام پر تشدید ہے یعنی گندگی خور جانور۔ خواہ وہ اونٹ ہو یا گائے' بکری ہو یا مرغی۔ یہ حدیث اس کی دلیل ہے۔ خطابی نے کہا ہے کہ ایک حدیث میں یہ مروی ہے کہ گائے گندگی خور ہو تو اسے چالیس روز چارہ کھلایا جائے۔ تو اس کے بعد اس کا گوشت کھایا جا سکتا ہے۔ شارح ترمذی نے تحفۃ الاحوذی (ج ۳' ص : ۸۹) میں ابن رسلان کی شرح السنن سے نقل کیا ہے کہ بند کر کے رکھنے کی کوئی معین و مقرر مدت نہیں ہے اور بعض کی یہ رائے ہے کہ اونٹ' گائے کیلئے چالیس روز اور بکری کیلئے سات روز اور مرغی کیلئے تین روز کی مدت ہے۔ اسی رائے کو المھذب اور التحریر میں پسند کیا گیا ہے اور سبل السلام میں ہے۔ وقت کی تعیین کے سلسلہ میں مخالفین کی مخالفت کی کوئی وجہ معلوم نہیں ہو سکتی۔

(١١٤٣) وَعَنْ أَبِيْ قَتَادَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ - فِي قِصَّةِ الحِمَارِ الوَحْشِيِّ -: فَأَكَلَ مِنْهُ النَّبِيُّ ﷺ. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت ابو قتادہ رضی اللہ عنہ سے حمار وحشی کے قصہ کے سلسلہ میں مروی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کا گوشت تناول فرمایا۔ (بخاری و مسلم)

حاصل کلام: اس حدیث سے ثابت ہوا جنگلی گدھا حلال ہے اور اس کی حلت پر اجماع ہے۔ (السبل)

حضرت ابو قتادہ رضی اللہ عنہ کی یہ حدیث پہلے کتاب الحج میں باب الاحرام کے تحت تفصیلاً گزر چکی ہے۔

(١١٤٤) وَعَنْ أَسْمَآءَ بِنْتِ أَبِيْ بَكْرٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهما قَالَتْ: نَحَرْنَا عَلٰى عَهْدِ رَسُولِ اللهِ فَرَساً فَأَكَلْنَاهُ. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت اسماء بنت ابی بکر رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ ہم نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں گھوڑا ذبح کیا اور اسے ہم نے کھایا بھی۔ (بخاری و مسلم)

حاصل کلام: اس حدیث میں گھوڑے کا گوشت کھانا حلال ہے۔ جیسا کہ اس سے پہلے بھی حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے اس باب کے شروع میں گزر چکا ہے۔

(١١٤٥) وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُما قَالَ: أُكِلَ الضَّبُّ عَلٰى مَآئِدَةِ رَسُولِ اللهِ ﷺ. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دستر خوان پر سوسمار (سانڈا) کو کھایا گیا۔ (بخاری و مسلم)

لغوی تشریح: ﴿الضب﴾ زمین پر رینگنے والا چھوٹا سا جانور جو گرگٹ کے مشابہ ہوتا ہے۔ ھندی زبان میں اسے سانڈ کہتے ہیں اور فارسی میں سوسمار۔ اس کے بارے میں کہا گیا ہے کہ یہ جانور پانی نہیں پیتا بلکہ صرف نسیم اور ہوا کی خنکی پر اکتفا کرتا ہے اور چالیس روز بعد صرف ایک قطرہ پیشاب کرتا ہے اور موسم سرما میں یہ جانور اپنے بل سے باہر نہیں آتا۔ کہا جاتا ہے کہ اس کے ذکر کی دو فرعیں ہوتی ہیں۔ سوسمار کا گوشت قوت جماع انتہائی زیادہ کر دیتا ہے جب اس کے گوشت کے ٹکڑے تلے جائیں تو ان میں روغن برآمد ہوتا ہے جو کہ عضو مخصوص مردانہ پر ملنے سے اس کے امراض کا بہترین علاج ہے اور مرد کی قوت مردمی اور شباب و جوانی عود کر آتی ہے۔ اہل عرب بالعموم اور اہل نجد بالخصوص کثرت سے اس کا گوشت کھاتے تھے اور جہاں تک اس بات کا تعلق ہے کہ مشہور ہے کہ ضب سے مراد گوہ ہے یہ صحیح نہیں ہے وہ تو گرگٹ ہے اور حرام ہے۔ یہ حدیث ضب کے کھانے کے جواز کی دلیل ہے اور جمہور کا قول بھی یہی ہے۔

حاصل کلام: اس حدیث سے ثابت ہوا کہ ضب حلال ہے' جمہور علماء کی یہی رائے ہے بعض نے اسے حرام اور بعض نے اسے مکروہ بھی کہا ہے اور دلیل کے لئے ابوداؤد کی روایت پیش کی ہے کہ آپ ؐ نے "ضب" کھانے سے منع فرمایا۔ مگر صحیحین کی یہ حدیث اور اس موضوع کی دوسری احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ ممانعت حرمت کی نہیں کراہت کی ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خود ضب نہیں کھائی البتہ صحابہ کرام ؓ کو کھانے سے منع نہیں فرمایا بلکہ صحیح مسلم میں ہے کہ آپ ؐ نے فرمایا "اسے کھاؤ یہ حلال ہے لیکن یہ میرا کھانا نہیں ہے۔" جو اس بارے میں واضح نص ہے کہ ممانعت زیادہ کراہت پر مبنی ہے' حرمت پر قطعاً نہیں۔

(١١٤٦) وَعَنْ عَبْدِ الرَّحْمٰنِ بْنِ

حضرت عبدالرحمٰن بن عثمان قرشی رضی اللہ عنہ سے مروی

عُثْمَانَ الْقُرَشِيِّ، أَنَّ طَبِيْباً سَأَلَ رَسُولَ اللهِ ﷺ عَنِ الضِّفْدَعِ يَجْعَلُهَا فِي دَوَاءٍ، فَنَهَى عَنْ قَتْلِهَا. أَخرَجَهُ أَحْمَدُ، وَصَحَّحَهُ الحَاكِمُ.

ہے کہ ایک طبیب نے رسول اللہ ﷺ سے مینڈک کے بطور دوا استعمال کے بارے میں دریافت کیا تو آپؐ نے اس کے قتل کرنے سے منع فرمایا۔ (اسے احمد نے روایت کیا ہے اور حاکم نے اسے صحیح کہا ہے)

حاصل کلام: اس حدیث کی رو سے مینڈک دوا میں استعمال کرنے کی غرض سے مارنا بھی ممنوع ہے۔ اس سے ثابت ہوا کہ یہ حرام ہے۔ بیہقی میں ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ مینڈک کو مت مارو کہ اس کی آواز تسبیح ہے۔

١ - بَابُ الصَّيدِ وَالذَّبَآئِحِ

شکار اور ذبائح کا بیان

(١١٤٧) وَعَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «من اتَّخَذَ كَلْباً إلاَّ كَلْبَ مَاشِيَةٍ، أَوْ صَيْدٍ، أَوْ زَرعٍ، انْتُقِصَ مِنْ أَجْرِهِ كُلَّ يَوْمٍ قِيرَاطٌ». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "جس کسی نے مال مویشی کے تحفظ کیلئے (رکھے گئے کتے) یا شکاری کتے یا زراعت کی دیکھ بھال و حفاظت کرنے والے کتے کے علاوہ دوسرا کوئی کتا (شوقیہ طور پر) رکھا تو اس کے ثواب میں سے ہر روز ایک قیراط ثواب کم ہو جاتا ہے۔ (بخاری و مسلم)

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ دل کے بہلاوے اور شوق فضول کی تسکین کیلئے کتا رکھنا ممنوع ہے البتہ شکار کیلئے، کھیتی باڑی اور جانوروں کی دیکھ بھال اور نگرانی و حفاظت کیلئے رکھنے کی اجازت ہے اور اس کے شوقیہ رکھنے کی وجہ سے یومیہ ایک قیراط ثواب میں کمی واقع ہوتی ہے۔

(١١٤٨) وَعَنْ عَدِيِّ بْنِ حَاتِمٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، قَالَ: قَالَ لِيْ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «إِذَا أَرْسَلْتَ كَلْبَكَ فَاذْكُرِ اسْمَ اللهِ عَلَيْهِ، فَإِنْ أَمْسَكَ عَلَيْكَ فَأَدْرَكْتَهُ حَيًّا فَاذْبَحْهُ، وَإِنْ أَدْرَكْتَهُ قَدْ قُتِلَ، وَلَمْ يَأْكُلْ مِنْهُ فَكُلْهُ، وَإِنْ وَجَدْتَ مَعَ كَلْبِكَ كَلْباً

حضرت عدی بن حاتم رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے مجھے ارشاد فرمایا کہ "جب تو اپنا شکاری کتا جانور کے شکار کیلئے چھوڑے تو اس پر اللہ کا نام پڑھ لیا کرو (بسم اللہ پڑھ لیا کرو) پھر اگر وہ شکار کو تمہارے لئے روک لے اور تو اسے زندہ پالے تو اسے ذبح کر لو اور اگر تو شکار کو مردہ حالت میں پائے اور کتے نے ابھی تک اس میں سے کچھ نہ کھایا ہو تو

غَيْرَهُ، وَقَدْ قُتِلَ، فَلاَ تَأْكُلْ. فَإِنَّكَ لاَ تَدْرِي أَيُّهُمَا قَتَلَهُ، وَإِنْ رَمَيْتَ بِسَهْمِكَ فَاذْكُرِ اسْمَ اللهِ، فَإِنْ غَابَ عَنْكَ يَوْماً فَلَمْ تَجِدْ فِيهِ إِلاَّ أَثَرَ سَهْمِكَ فَكُلْ إِنْ شِئْتَ، وَإِنْ وَجَدْتَهُ غَرِيقاً فِي الْمَاءِ فَلاَ تَأْكُلْ». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ، وَهٰذَا لَفْظُ مُسْلِمٍ.

تم اسے کھا سکتے ہو اور اگر تو اپنے کتے کے ساتھ دوسرا کوئی کتا بھی پائے اور جانور مردہ حالت میں ملے تو پھر اسے نہ کھا کیونکہ تجھے معلوم نہیں کہ ان دونوں میں سے کس نے اسے مارا ہے اور اگر تو اپنا تیر چھوڑے تو اس پر بسم اللہ پڑھ۔ پھر اگر شکار تیری نظروں سے ایک روز تک اوجھل رہے اور اس میں تیرے تیر کے سوا دوسرا کوئی زخم کا نشان نہ ہو تو پھر اسے تو کھا لے۔ اگر تیری طبیعت کھانے کی طرف مائل ہو اور اگر شکار کو پانی میں ڈوب کر مرا ہوا پائے تو اسے نہ کھا۔" (بخاری و مسلم) اور یہ الفاظ مسلم کے ہیں)

لغوی تشریح: ﴿کلبک﴾ سدھایا ہوا کتا وہ ہوتا ہے کہ مالک جب کتے کو شکار پر جھپٹنے کیلئے ابھارے تو وہ اس کی تلاش میں نکل کھڑا ہو اور جب ڈانٹ پلائے تو فوراً رک جائے اور جب شکار کر لے تو اسے مالک کیلئے روکے رکھے۔ خود نہ کھائے۔ یہ تیسری صفت کے شرط ہونے میں اختلاف ہے۔ ﴿فان امسک علیک﴾ اور اگر وہ تمہارے لئے روکے رکھے بایں طور کہ خود اس میں سے کچھ نہ کھایا ہو۔

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ کھانے کیلئے یا منافع حاصل کرنے کیلئے شکار کرنا جائز ہے۔ شکار شکاری کتے سے کیا جائے یا شکاری پرندوں سے سب جائز ہے اور ان کا کھانا حلال ہے۔ اس کی دو شرطیں ہیں ایک یہ کہ کتے کو چھوڑتے وقت بسم اللہ ضرور پڑھی جائے دوسرا یہ کہ کتا تربیت یافتہ یعنی سدھایا ہوا ہو سدھایا ہوا کتا اگر اس شکار میں سے کچھ کھا لے تو شکار حرام ہوگیا۔ اس کا کھانا جائز نہیں رہا۔ اگر شکار کردہ جانور صحیح سالم حالت میں ہے تو اسے کھانا جائز ہے۔ اس موقع پر یہ بات بھی سامنے رہنی چاہئے کہ اگر کتے نے شکار اپنے دانتوں سے پکڑا ہے اور وہ مرگیا ہے تو اس کا کھانا حلال ہے اور اگر کتے کے جسم کی ضرب سے مرے تو حرام ہے۔ پھر اگر وہ شکار آدمی کے پہنچنے تک بقید حیات ہو تو اسے ذبح کرنا چاہئے اور اگر مرچکا ہو تو وہ کھانا حلال ہے۔ نیز اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ شکاری کتے کو مالک نے خود پڑھ کر چھوڑا ہو۔ اگر ازخود شکار پر ٹوٹ پڑا اور شکار مار بھی لیا تو ایسا شکار بھی حلال نہیں ہوگا۔ جمہور علماء کی یہی رائے ہے۔ مگر ایک گروہ کی رائے یہ بھی ہے کہ کتے کا سدھایا ہوا ہونا شرط ہے۔ مقصد و ارادہ سے چھوڑنا شرط نہیں۔

اسی طرح اس حدیث سے شکار کی دوسری چیز نیزہ اور تیر سے شکار کرنا بھی ثابت ہے۔ تیر چھوڑتے وقت بھی اللہ کا نام لینا ضروری ہے۔ پس ثابت ہوا کہ بسم اللہ کہنا ایسے شکار کیلئے واجب ہے البتہ اگر بھول

جائے اور بسم اللہ نہ پڑھے تو بھی کوئی مضائقہ نہیں۔ جائز ہے۔ یہ رائے امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کی ہے اور امام مالک رحمہ اللہ اور ایک روایت کی رو سے امام احمد رحمہ اللہ اور صحابہ کرام میں سے ابن عباس رضی اللہ عنہما کی رائے یہ ہے کہ اگر دیدہ و دانستہ اور عمداً چھوڑنے کی صورت میں بھی ایسے شکار کا کھانا حلال ہے اور ظاہریہ کی رائے تو یہ ہے کہ متروک التسمیہ شکار کا کھانا حرام ہے۔ اگرچہ بھول کر نہ پڑھا گیا ہو۔ قول راجح یہ معلوم ہوتا ہے کہ مسلمان کا وہ ذبیحہ جس پر یقین ہو کہ اللہ کا نام نہیں لیا گیا نہ کھایا جائے اور شک کی صورت میں اگر ذبح کرنے والا پکا مسلمان ہو تو بسم اللہ پڑھ کر کھا لینا چاہئے اور جو پرندہ تیر کی ضرب کھا کر پانی میں جا گرے تو اسے نہ کھایا جائے اس لئے کہ اس کی موت واقع ہونے میں شک پیدا ہو گیا ہے کہ آیا وہ تیر لگنے سے مرا ہے یا پانی میں ڈوبنے کی وجہ سے جاں بحق ہوا ہے۔ اس شک کی وجہ سے اسے نہ کھانا ہی قرین صواب ہے۔

راوی حدیث: ﴿عدی بن حاتم رضی اللہ عنہ﴾ عدی بن حاتم طائی۔ قبیلہ "طے" سے ان کا تعلق تھا اور باپ کی طرح نہایت سخی تھے۔ ۷ھ میں شعبان کے مہینے میں نبی ﷺ کی خدمت میں وفد کی صورت میں حاضر ہوئے۔ جب عرب مرتد ہوئے تو یہ اپنی قوم سمیت اسلام کی حقانیت و صداقت پر ثابت قدم رہے۔ پہلا صدقہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے پاس جو پہنچا وہ عدی اور اس کی قوم کا صدقہ تھا۔ فتح مدائن میں حاضر تھے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ لڑائیوں میں ان کے ساتھ رہے۔ جنگ جمل کے موقع پر ان کی آنکھ ضائع ہو گئی تھی۔ سخاوت اور جود و کرم میں ان کی مثالیں بڑی مشہور و معروف ہیں۔ ایک سو بیس برس تک زندہ رہے اور ۶۸ھ میں وفات پائی۔

(۱۱۴۹) وَعَنْ عَدِيٍّ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، قَالَ: سَأَلْتُ رَسُولَ اللهِ ﷺ عَنْ صَيْدِ الْمِعْرَاضِ فَقَالَ: «إِذَا أَصَبْتَ بِحَدِّهِ فَكُلْ، وَإِذَا أَصَبْتَ بِعَرْضِهِ فَقُتِلَ فَإِنَّهُ وَقِيذٌ، فَلاَ تَأْكُلْ». رَوَاهُ الْبُخَارِيُّ.

حضرت عدی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے بغیر پھل کے تیر کے شکار کے متعلق سوال کیا تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "اگر دھار کی جانب سے تو مارے تو پھر کھا اور اگر چوڑائی کی طرف سے مارے اور جانور مر جائے تو ایسے جانور کو "موقوذ" (چوٹ سے مرنے والا جانور) کہتے ہیں۔ لہٰذا اسے نہ کھا۔ (بخاری)

لغوی تشریح: ﴿المعراض﴾ میم پر کسرہ اور عین ساکن۔ یہ ایسے تیر کو کہتے ہیں جس کا پھل نہ ہو اور یہ بھی کہتے ہیں کہ یہ لکڑی ہوتی ہے جس کے دونوں اطراف پتلے اور درمیانی حصہ موٹا و مضبوط ہوتا ہے اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ ایسی لاٹھی جس کے دونوں طرف لوہا ہوتا ہے۔ شکاری اسے شکار پر پھینکتا ہے۔ یہ آخری تعریف سیاق حدیث کے زیادہ مشابہ معلوم ہوتی ہے۔ ﴿اذا اصبت بحدہ فکل﴾ جب تو اس کا شکار دھار کی طرف سے کرلے تو اسے کھالے اگر وہ جانور ذبح کرنے سے پہلے بھی جاں بحق ہو گیا کیونکہ

ایسا جانور پھر مذبوح کے حکم میں ہوتا ہے۔ ﴿ بعرضه ﴾ عرضه عین پر فتحہ اور "را" ساکن۔ جس کی ایک طرف لوہا لگا ہوا نہ ہو۔ ﴿ فانه وقیذ ﴾ وقیذ موقوذ کے معنی میں ہے وہ جانور جسے لاٹھی یا پتھر یا ایسی چیز جس سے لوہا لگا ہوا نہ ہو سے مارا جائے' وہ حرام ہے اس لئے کہ وہ درحقیقت ذبح نہیں کی گئی اور حکماً بھی اسے مذبوح قرار نہیں دیا جا سکتا۔

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ شکار میں یہ اصول ہے کہ اگر تو جانور کسی تیز چیز سے زخمی ہو کر خون بہہ جانے کی وجہ سے مرے تو اس کا کھانا جائز و حلال ہے اور اگر کسی چیز کی ضرب و چوٹ سے مرے تو اس کا کھانا حرام ہے۔ قرآن و حدیث دونوں سے یہ ثابت ہے۔

(١١٥٠) وَعَنْ أَبِيْ ثَعْلَبَةَ، رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ: «إِذَا رَمَيْتَ بِسَهْمِكَ، فَغَابَ عَنْكَ، فَأَدْرَكْتَهُ: فَكُلْهُ، مَا لَمْ يُنْتِنْ». أَخْرَجَهُ مُسْلِمٌ.

حضرت ابو ثعلبہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا "جب تو اپنے تیر سے شکار کرے اور وہ شکار تیری نظروں سے اوجھل ہو جائے۔ بعد میں پھر تو اسے پالے تو جب تک وہ بدبودار نہ ہو کھالے۔" (مسلم)

لغوی تشریح: ﴿ مالم ینتن ﴾ باب افعال سے ہے یعنی جب تک اس میں بدبو پیدا نہ ہو۔

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ اگر کسی پرندے کا شکار کیا اور وہ زخم کھا کر ایسی جگہ جا گرا کہ شکاری کی نظروں سے اوجھل ہوگیا۔ بعد ازاں پھر مل گیا۔ اگر وہ پانی میں مردہ حالت میں ملا ہو پھر تو حرام ہے اگر زندہ مل جائے تو اسے ذبح کر لیا جائے اور اگر خشکی پر مردہ حالت میں ملا ہو اور اس کے جسم پر تیر کے نشان کے علاوہ اور کوئی نشان نہ ہو تو وہ حلال ہے۔ مگر جب اس میں تعفن اور بدبو پیدا ہو جائے تو وہ قطعی حرام ہے۔

(١١٥١) وَعَنْ عَآئِشَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهَا: أَنَّ قَوْماً قَالُوا لِلنَّبِيِّ ﷺ: إِنَّ قَوْماً يَأْتُوْنَنَا بِاللَّحْمِ لاَ نَدْرِيْ أَذَكَرُوا اسْمَ اللهِ عَلَيْهِ، أَمْ لاَ؟ فَقَالَ: «سَمُّوا اللَّهَ عَلَيْهِ أَنْتُمْ، وكُلُوهُ». رَوَاهُ الْبُخَارِيُّ.

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ کچھ لوگوں نے نبی ﷺ سے پوچھا کہ لوگ ہمارے پاس گوشت لاتے ہیں جس کے متعلق ہمیں معلوم نہیں کہ وہ گوشت کس طرح کا ہوتا ہے آیا اس پر اللہ کا نام لیا گیا ہوتا ہے یا نہیں؟ آپؐ نے فرمایا "تم اس پر اللہ کا نام لو اور کھالو۔" (بخاری)

حاصل کلام: اس حدیث سے یہ معلوم ہوا کہ مسلمان کو مسلمان کے متعلق حسن ظن رکھنا چاہئے نیز یہ کہ جب تک حتمی اور یقینی طور پر کسی چیز کے بارے میں معلوم نہ ہو جائے کہ وہ حرام ہے محض شبہات کی بنا پر اسے حرام قرار نہیں دیا جانا چاہئے بالخصوص جبکہ وہ چیز کسی مسلمان بھائی کے پاس ہو۔

(١١٥٢) وَعَنْ عَبْدِاللهِ بْنِ مُغَفَّلٍ حضرت عبداللہ بن مغفل مزنی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے

الْمُزَنِيِّ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، أَنَّ رَسُولَ اللهِ ﷺ نَهَى عَنِ الخَذْفِ، وَقَالَ إِنَّهَا: «لاَ تَصِيدُ صَيْداً، وَلاَ تَنْكَأُ عَدُوًّا، وَلَكِنَّهَا تَكْسِرُ السِّنَّ، وَتَفْقَأُ العَيْنَ». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ، وَاللَّفْظُ لِمُسْلِمٍ.

کہ رسول اللہ ﷺ نے کنکریاں (سنگریزے) مارنے سے منع فرمایا اور فرمایا "کہ نہ ہی تو یہ شکار کر سکتا ہے اور نہ ہی دشمن کو بھگا کر دور کر سکتا ہے بلکہ یہ کسی کا دانت توڑے گا یا آنکھ پھوڑے گا۔" (بخاری و مسلم اور یہ الفاظ مسلم کے ہیں)

لغوی تشریح: ﴿ الخذف ﴾ خاء پر فتحہ ذال ساکن۔ وہ کنکری یا سنگریزے کا پھینکنا ہے۔ درمیان اور شہادت والی انگلی سے یا انگوٹھے اور شہادت والی انگلی سے۔ ﴿ انها ﴾ یعنی وہ سنگریزہ جو خذف سے سمجھا گیا ہے ﴿ لاتنکا ﴾ باب فتح سے ہے وہ زخمی نہیں کرتی ﴿ تفقا ﴾ یعنی وہ آنکھ کو نقصان دیتی اور اندھا کر دیتی ہے۔

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ کنکری لگنے سے جانور مرجائے تو اس کا کھانا حلال نہیں۔ اس شغل کا فائدہ کم اور نقصان کا احتمال زیادہ ہے اس لئے "خذف" سے منع فرمایا گیا ہے۔ اسی ضمن میں یہ بھی معلوم ہوا کہ غلیل سے مارا ہوا جانور و پرندہ بھی حلال نہیں کیونکہ وہ بھی خذف کی طرح چوٹ و ضرب سے مرتا ہے۔ اسی طرح بندوق کی گولی سے مارا ہوا پرندہ بھی جمہور کے نزدیک حلال نہیں۔ مگر علامہ الیمانی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں اس دور میں بندوق کی گولی کیل کی طرح جسم کو کاٹتی ہے اس لئے بندوق سے کیا ہوا شکار حلال ہے۔ (السبل)

(١١٥٣) وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهما، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ قَالَ: «لَا تَتَّخِذُوا شَيْئاً فِيهِ الرُّوحُ غَرَضاً». رَوَاهُ مُسْلِمٌ.

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا "کسی ذی روح چیز کو نشانہ بنا کر نہ مارو۔" (مسلم)

لغوی تشریح: ﴿ غرضا ﴾ غین اور "را" دونوں پر فتحہ۔ نشانہ بنا کر تیر مارنا۔

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ کسی جانور کو باندھ کر تیر وغیرہ مارنا حرام ہے کیونکہ اس سے اسے شدید تکلیف ہوتی ہے اور شریعت اسلامیہ جانور تک کو اذیت اور تکلیف دینے کے حق میں نہیں ہے۔

(١١٥٤) وَعَنْ كَعْبِ بْنِ مَالِكٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ أَنَّ امْرَأَةً ذَبَحَتْ شَاةً بِحَجَرٍ، فَسُئِلَ النَّبِيُّ ﷺ عَنْ ذٰلِكَ، فَأَمَرَ بِأَكْلِهَا. رَوَاهُ مُسْلِمٌ.

حضرت کعب بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک عورت نے پتھر سے ایک بکری کو ذبح کر دیا۔ نبی ﷺ سے اس کے کھانے کے متعلق پوچھا گیا تو آپ ﷺ نے اسے کھانے کا حکم فرمایا۔ (مسلم)

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ ذبح چھری وغیرہ کے علاوہ بھی اور چیزوں سے ہو سکتا ہے۔ ایک روایت میں ہے کہ یہ پتھر نوکدار تھا جس سے خون بہہ گیا تھا۔ نیز یہ بھی معلوم ہوا کہ مسلمان عورت کا ذبیحہ حلال ہے اور اس کا کھانا بلا کراہت جائز ہے۔

(١١٥٥) وَعَنْ رَافِعِ بْنِ خَدِيْجٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ: «مَا أَنْهَرَ الدَّمَ وَذُكِرَ اسْمُ اللهِ عَلَيْهِ، فَكُلْ، لَيْسَ السِّنَّ وَالظُّفُرَ، أَمَّا السِّنُّ فَعَظْمٌ، وَأَمَّا الظُّفُرُ فَمُدَى الحَبَشَةِ». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت رافع بن خدیج رضی اللہ عنہ نے نبی ﷺ سے روایت کیا ہے کہ "جو چیز خون کو بہا دے اور اسے اللہ کا نام لے کر ذبح کیا گیا ہو تو اس جانور کو کھا لو۔ ذبح کرنے کا آلہ دانت اور ناخن نہیں کیونکہ دانت تو ہڈی ہے اور ناخن حبشیوں کی چھری ہے۔" (بخاری و مسلم)

لغوی تشریح: ﴿ ما انھر الدم ﴾ جو چیز خون بہا دے' جاری کر دے اور چلا دے اور کلمہ "ما" عام ہے اس میں تلوار' چھری' تیز پتھر' لکڑی' شیشہ' سرکنڈا' بانس' ٹھکری' تانبے یا لوہے کی ساختہ چیزیں شامل ہیں۔ ﴿ فمدی ﴾ مدی کی جیم پر ضمہ اور کسرہ دونوں درست ہیں۔ مدیۃ کی جمع ہے۔ چھری کو کہتے ہیں۔ ناخن کے ساتھ ذبح کرنے میں کفار سے تشبیہہ ہے ناخن سے گلے کو گھونٹنے کے سوا اور کوئی مقصد حاصل نہیں ہو سکتا جو ذبح کی صفت میں نہیں آتا۔ سبل السلام میں ہے کہ یہ حدیث مطلق دانت اور ناخن سے ممانعت پر دلالت کرتی ہے۔ دانت و ناخن خواہ انسان کا ہو یا کسی اور جانور کا الگ اور جدا ہو یا جسم کے ساتھ لگا ہوا ہو خواہ لوہے سے بنایا ہو۔

(١١٥٦) وَعَنْ جَابِرِ بْنِ عَبْدِاللهِ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا قَالَ: نَهَى رَسُولُ اللهِ ﷺ أَنْ يُقْتَلَ شَيْءٌ مِّنَ الدَّوَآبِّ صَبْراً. رَوَاهُ مُسْلِمٌ.

حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے کسی جانور کو باندھ کر قتل کرنے سے منع فرمایا ہے۔ (مسلم)

حاصل کلام: باندھ کر قتل کرنے کا معنی یہ ہے کہ کسی جاندار کو زندہ باندھ کر اسے نشانہ لگا کر مارا جائے کہ وہ جاں بحق ہو جائے۔ جہاں تک باندھ کر ذبح کرنے کا تعلق ہے تو وہ جائز ہے۔ وہ باندھ کر قتل کرنے کے ضمن میں نہیں آتا۔

(١١٥٧) وَعَنْ شَدَّادِ بْنِ أَوْسٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «إِنَّ اللَّهَ كَتَبَ الإِحْسَانَ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ، فَإِذَا قَتَلْتُمْ

حضرت شداد بن اوس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "اللہ عزوجل نے ہر چیز پر احسان کرنا فرض قرار دیا ہے لہٰذا جب تم قتل کرو تو عمدہ و اچھے طریقے سے قتل کرو اور جب تم کسی

فَأَحْسِنُوا الْقِتْلَةَ، وَإِذَا ذَبَحْتُمْ فَأَحْسِنُوا الذِّبْحَةَ، وَلْيُحِدَّ أَحَدُكُمْ شَفْرَتَهُ، وَلْيُرِحْ ذَبِيحَتَهُ». رَوَاهُ مُسْلِمٌ.

جانور کو ذبح کرنے لگو تو احسن طریقہ سے ذبح کرو اور تم میں سے ہر کسی کو چاہئے کہ اپنی چھری کو تیز کر لے اور اپنے ذبیحہ یا مقتول کو آرام پہنچائے۔" (مسلم)

لغوی تشریح: ﴿ القتلة ﴾ قتلۃ اور ذبحۃ کا ایک ہی وزن ہے۔ قتلۃ کے قاف اور ذبحۃ کے ذال کے نیچے کسرہ ہے۔ یہ قتل اور ذبح کی ایک قسم ہے۔ ﴿ ولیحد ﴾ اس میں لام' امر کا ہے اور یحد احداد سے ہے جس کا معنی ہے تیز کرنا اور لوہے کی دھار کو باریک و رقیق کرنا۔ ﴿ شفرته ﴾ شین پر فتحہ اور "فا" ساکن چھری کے معنی میں۔ ﴿ لیرح ﴾ اراحۃ سے ماخوذ ہے۔ معنی ہے آرام پہنچانا سبل السلام میں ہے کہ یہ آرام چھری کو تیز کرنے' خون جلدی بہانے اور احسن طریقہ سے ذبح کرنے میں ہے۔

(۱۱۵۸) وَعَنْ أَبِيْ سَعِيْدٍ الْخُدْرِيِّ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُ، قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «ذَكَاةُ الجَنِينِ ذَكَاةُ أُمِّهِ». رَوَاهُ أَحْمَدُ، وَصَحَّحَهُ ابْنُ حِبَّانَ.

حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "ماں کے ذبح کرنے سے اس کا پیٹ کا بچہ ازخود ذبح ہو جاتا ہے۔" (اسے احمد نے روایت کیا ہے اور ابن حبان نے صحیح کہا ہے)

لغوی تشریح: ﴿ ذکاة الجنین ﴾ مبتداء ہونے کی بنا پر مرفوع واقع ہوا ہے اور اس کی خبر بعد میں آرہی ہے۔ ذبح اور "نحر" کی طرح ذکوٰۃ کا ایک ہی مطلب ہے اور جنین وہ بچہ جو ابھی تک ماں کے شکم میں ہے۔ معنی یہ ہے کہ جنین جب ماں کے ذبح کئے جانے کے بعد بچہ مردہ برآمد ہوا ہو تو ایسے جنین کا کھانا حلال ہے اسے از سر نو ذبح کی ضرورت نہیں۔ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے علاوہ تمام اہل علم کی یہی رائے ہے۔ امام صاحب رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ اسے از سر نو ذبح کیا جائے گا مگر یہ حدیث ان کے سراسر خلاف ہے۔

(۱۱۵۹) وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُمَا، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ قَالَ: «المُسْلِمُ يَكْفِيهِ اسْمُهُ، فَإِنْ نَسِيَ أَنْ يُسَمِّيَ حِينَ يَذْبَحُ فَلْيُسَمِّ ثُمَّ لِيَأْكُلْ». أَخْرَجَهُ الدَّارَقُطْنِيُّ، وَفِيْهِ رَاوٍ فِي حِفْظِهِ ضَعْفٌ، وَفِي إِسْنَادِهِ مُحَمَّدُ بْنُ يَزِيْدَ بْنِ سِنَانٍ، وَهُوَ صَدُوْقٌ ضَعِيْفُ الحِفْظِ، وَأَخْرَجَهُ عَبْدُ الرَّزَّاقِ بِإِسْنَادٍ صَحِيْحٍ إِلَى ابْنِ عَبَّاسٍ، مَوْقُوفاً عَلَيْهِ. وَلَهُ شَاهِدٌ عِنْدَ أَبِيْ دَاوُدَ، فِي مَرَاسِيْلِهِ: بِلَفْظِ: «ذَبِيْحَةُ المُسْلِمِ حَلَالٌ، ذَكَرَ اسْمَ

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا "مسلم کیلئے اللہ تعالیٰ کا نام ہی کافی ہے۔ پس اگر ذبح کے وقت تکبیر ذبح بھول گیا ہو تو پھر بسم اللہ پڑھ کر کھا لے۔" دارقطنی اس کی سند میں ایک ایسا راوی ہے جس کے حافظہ میں ضعف ہے اور اس کی سند میں محمد بن یزید بن سنان ہے وہ ہے تو صدوق مگر حافظہ اس کا بھی ضعیف و کمزور ہے اور عبدالرزاق نے ابن عباس رضی اللہ عنہما سے صحیح سند کے ساتھ نقل کیا ہے جو موقوف ہے) اس کے شواہد ابوداوٗد کی مراسیل میں موجود ہیں۔ ان الفاظ کے ساتھ کہ "مسلم کا ذبیحہ حلال

اللهِ عَلَيْهَا أَمْ لَمْ يَذْكُرْ». وَرِجَالُهُ مُوَثَّقُونَ.

ہے۔ اس ذبیحہ پر اللہ کا نام لیا گیا ہو یا نہ لیا گیا ہو۔" (اس کے راوی سب کے سب ثقہ ہیں)

حاصل کلام: یہ حدیث اس بات کی دلیل ہے کہ بھول کر تکبیر ذبح چھوٹ جائے تو جانور حلال ہے مگر یہ احادیث ان صحیح احادیث کا مقابلہ نہیں کر سکتیں جن سے ذبیحہ پر تکبیر پڑھنا واجب ثابت ہے۔ البتہ یہ احادیث تکبیر کے وجوب کو کمزور کر دیتی ہے اور "متروك التسميه" کے نہ کھانے کو ورع و تقویٰ کے باب میں لے جاتی ہے۔ (السبل)

راوی حدیث: ﴿محمد بن یزید بن سنان﴾ یہ صاحب تمیمی بھی ہیں اور جزری رھاوی بھی۔ ان کی کنیت ابوعبداللہ تھی۔ ابوحاتم نے کہا ہے کہ آدمی تو صالح تھا مگر پختہ نہیں تھا اور ابوداؤد نے کہا ہے وہ کچھ بھی نہیں تھا اور امام نسائی رحمہ اللہ نے کہا ہے وہ قوی نہیں تھا اور ابن حبان رحمہ اللہ نے اسے ثقات میں شمار کیا ہے۔ ۲۲۰ھ میں فوت ہوئے۔

٢ - بَابُ الأَضَاحِي

(احکام) قربانی کا بیان

(١١٦٠) عَنْ أَنَسِ بْنِ مَالِكٍ، رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ كَانَ يُضَحِّي بِكَبْشَيْنِ أَمْلَحَيْنِ أَقْرَنَيْنِ، وَيُسَمِّي، وَيُكَبِّرُ، وَيَضَعُ رِجْلَهُ عَلَىٰ صِفَاحِهِمَا. وَفِي لَفْظٍ: «ذَبَحَهُمَا بِيَدِهِ» مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ. وَفِي لَفْظٍ: «سَمِينَيْنِ». وَلأَبِي عَوَانَةَ فِي صَحِيحِهِ: «ثَمِينَيْنِ» بِالْمُثَلَّثَةِ بَدَلَ السِّينِ. وَفِي لَفْظٍ لِمُسْلِمٍ: «وَيَقُولُ بِسْمِ اللهِ وَاللَّهُ أَكْبَرُ».

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ دو مینڈھے، چتکبرے، سینگوں والے قربانی کرتے تھے اور بسم اللہ پڑھتے اور تکبیر کہتے اور ان کے پہلوؤں پر اپنا پاؤں مبارک رکھتے تھے اور ایک روایت میں آیا ہے کہ ان دونوں کو اپنے دست مبارک سے ذبح کیا (بخاری و مسلم) اور ایک روایت میں ہے کہ وہ خوب موٹے تازے تھے اور ابوعوانہ کی صحیح میں "ثمینین" سین کی جگہ ثاء ہے۔ یعنی وہ قیمتی تھے اور مسلم کے الفاظ ہیں کہ آپ نے بسم اللہ، واللہ اکبر کہا۔

وَلَهُ مِنْ حَدِيثِ عَائِشَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهَا، أَمَرَ بِكَبْشٍ أَقْرَنَ، يَطَأُ فِي سَوَادٍ، وَيَبْرُكُ فِي سَوَادٍ، وَيَنْظُرُ فِي سَوَادٍ، لِيُضَحِّيَ بِهِ، فَقَالَ: اشْحَذِي الْمُدْيَةَ، ثُمَّ أَخَذَهَا

اور مسلم میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی روایت میں ہے کہ آپ نے حکم دیا کہ سینگوں والا مینڈھا ہو جس کے پاؤں کالے ہوں اور پیٹ کا حصہ بھی سیاہ ہو اور آنکھیں بھی سیاہ ہوں تاکہ آپ اس کی قربانی کریں۔ آپ نے فرمایا "عائشہ چھری تیز کرو۔" پھر

فَأَضْجَعَهُ، ثُمَّ ذَبَحَهُ، وَقَالَ: بِسْمِ اللهِ، اللَّهُمَّ تَقَبَّلْ مِنْ مُحَمَّدٍ، وَآلِ مُحَمَّدٍ، وَمِنْ أُمَّةِ مُحَمَّدٍ ثُمَّ ضَحَّى بِهِ. ﷺ

آپ ؐ نے چھری کو پکڑا اور مینڈھے کو پچھاڑا۔ پھر اسے ذبح کیا اور فرمایا "اللہ کے نام سے۔ اسے اللہ! محمدؐ اور آل محمدؐ اور امت محمدؐ (کی طرف) سے قبول فرما۔"

لغوی تشریح: ﴿باب الاضاحی﴾ اضاحی میں "حا" کے نیچے کسرہ اور "یا" مشدد ہے یہ ﴿اضحیۃ﴾ کی جمع ہے جس کے معنی قربانی کے ہیں۔ امام نووی نے کہا ہے کہ ﴿اضحیۃ﴾ میں چار لغات ہیں اور یہ اس ذبح شدہ جانور کو کہتے ہیں جو قربانی کے روز ذبح کیا جاتا ہے۔ پہلی اور دوسری لغت کے اعتبار سے اضحیۃ اور اضحیۃ کے ضمہ اور کسرہ سے پڑھا گیا ہے اور اس کی جمع اضاحی آتی ہے اور اضاحی میں "یا" پر تشدید بھی ہے اور تخفیف بھی اور تیسری لغت کے اعتبار سے ضحیۃ اور اس کی جمع ضحایا آتی ہے اور چوتھی لغت کے اعتبار سے اضحاۃ ہمزہ فتحہ کے ساتھ اور اس کی جمع ہے اضحیٰ ارطاۃ اور ارطیٰ کے وزن پر اور اسی وجہ سے اس دن کو یوم الاضحیٰ کہتے ہیں۔ ﴿بکبشین﴾ کبش بھیڑ کے نر کو کہتے ہیں۔ یعنی مینڈھا خواہ عمر کتنی ہی ہو۔ اس میں اختلاف ہے۔ ایک قول یہ ہے کہ دوندا ہو یعنی جس کے دو دانت نکل آئے ہوں اور ایک قول یہ ہے کہ چوگا یعنی جس کے چار دانت نکل چکے ہوں۔ ﴿املحین﴾ اس جانور کو کہتے ہیں جس کے جسم پر سیاہ بال ہوں مگر سفید بال زیادہ ہوں۔ ﴿اقرنین﴾ دونوں کے دو خوبصورت اور مناسب سینگ ہوں۔ ﴿ویسمی ویکبر﴾ یعنی بسم اللہ واللہ اکبر کہتے۔ ﴿صفحاھما﴾ صاد کے نیچے کسرہ کا پہلو اور ایک قول ہے کہ "صفحۃ" کی جمع ہے اور چہرے کے عرض کو کہتے ہیں اور ایک قول کے مطابق گردن کے اردگرد کا حصہ ﴿سیمنین﴾ سین کے ساتھ سمانۃ سے ماخوذ ہے یعنی موٹے تازے تھے، کمزور نہیں تھے۔ ﴿ثمینین﴾ "ثا" کے ساتھ معنی قیمتی۔ قیمتی اس وقت تک نہیں ہو سکتے جب تک کہ خوب موٹے تازے نہ ہوں۔ ﴿یطا﴾ چلتا ہو (پاؤں) ﴿فی سواد﴾ یعنی ٹانگیں سیاہ باقی سفید۔ ﴿یبرک فی سواد﴾ بروک سے ماخوذ ہے۔ سینے کا وہ حصہ جو زمین سے جا لگتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ مینڈھے کا پیٹ اور سینہ سیاہ ہو۔ ﴿وینظر فی سواد﴾ آنکھوں کے اردگرد کا حصہ سیاہ ہو۔ ﴿اشحذی﴾ تیز کر کے لاؤ۔

حاصل کلام: اس حدیث سے حسب ذیل مسائل ثابت ہوتے ہیں۔ (۱) رسول اللہ ﷺ نے قربانی مدینہ طیبہ میں بھی کی ہے۔ (۲) مینڈھا جو چت کبرا، موٹا تازہ اور قیمتی ہوتا اس کی قربانی آپؐ کو محبوب تھی۔ (۳) قربانی سے پہلے چھری خوب تیز کر لینی چاہئے۔ (۴) ذبح جانور کو پہلو کے بل لٹا کر کرنا چاہئے۔ (۵) ذبح سے پہلے مسنون دعا اور تکبیر پڑھنی چاہئے۔ (۶) اہل خانہ کی طرف سے ایک جانور قربانی کرنے سے سنت ادا ہو جاتی ہے۔ (۷) قربانی اپنے ہاتھ سے ذبح کرنی چاہئے گو اس میں نیابت بھی جائز ہے۔

(۱۱۶۱) وَعَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَ رَضِيَ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ

اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «مَنْ كَانَ لَهُ سَعَةٌ وَلَمْ يُضَحِّ فَلاَ يَقْرَبَنَّ مُصَلاَّنَا». رَوَاهُ أَحْمَدُ وَابْنُ مَاجَهْ، وَصَحَّحَهُ اَلْحَاكِمُ لٰكِن رَجَّحَ الأَئِمَّةُ غَيْرُهُ وَقْفَهُ.

ﷺ نے فرمایا "جس شخص میں قربانی کرنے کی طاقت ہو اور وہ قربانی نہ کرے تو وہ ہماری عید گاہ میں نہ آئے۔" (اسے احمد اور ابن ماجہ نے روایت کیا ہے اور حاکم نے اسے صحیح قرار دیا ہے اور دوسرے ائمہ نے اس حدیث کو موقوف قرار دیا ہے)

حاصل کلام: اس حدیث سے بعض نے قربانی کے وجوب پر استدلال کیا ہے مگر یہ استدلال صحیح نہیں۔ اولاً تو یہ روایت مرفوع نہیں بلکہ موقوف یعنی حضرت ابوھریرہ رضی اللہ عنہ کا قول ہے۔ ثانیاً یہ وجوب میں صریح نہیں یہ اسی طرح ہے جیسے حدیث میں ہے کہ جس نے لہسن کھایا ہو وہ ہماری مسجد میں نہ آئے۔ جمہور کے نزدیک یہ حکم صرف استحباب کی تاکید کیلئے ہے۔ اس کے علاوہ بھی جن دلائل سے قربانی کے وجوب پر استدلال کیا جاتا ہے وہ صحیح اور صریح نہیں ہیں۔ صحیح یہی ہے کہ قربانی سنت ہے بلکہ شعار اسلام سے ہے۔

(١١٦٢) وَعَنْ جُنْدُبِ بْنِ سُفْيَانَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: شَهِدْتُ الأَضْحَى مَعَ رَسُولِ اللهِ ﷺ، فَلَمَّا قَضَى صَلاَتَهُ بِالنَّاسِ نَظَرَ إِلىٰ غَنَمٍ قَدْ ذُبِحَتْ، فَقَالَ: «مَنْ ذَبَحَ قَبْلَ الصَّلاَةِ فَلْيَذْبَحْ شَاةً مَكَانَهَا، وَمَنْ لَمْ يَكُنْ ذَبَحَ فَلْيَذْبَحْ عَلَى اسْمِ اللهِ». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت جندب بن سفیان رضی اللہ عنہ نے بیان کیا کہ میں عید قربان میں رسول اللہ ﷺ کے ساتھ تھا۔ جب رسول اللہ ﷺ لوگوں کو نماز پڑھا چکے تو دیکھا کہ ایک بکری ذبح کی ہوئی ہے۔ آپؐ نے فرمایا کہ "جس کسی نے نماز سے پہلے ہی اسے ذبح کر دیا ہے وہ اس کی جگہ دوسری بکری ذبح کرے اور جس نے ذبح نہیں کیا اسے بسم اللہ پڑھ کر ذبح کرنا چاہئے۔" (بخاری و مسلم)

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ قربانی کے جانور کو ذبح کرنے کا صحیح وقت نماز عید کے بعد ہے۔ اگر کسی نے نماز کی ادائیگی سے پہلے ہی جانور ذبح کر دیا تو اس کی قربانی نہیں ہوئی' اسے دوبارہ قربانی کرنی چاہئے۔ قربانی کا انتہائی وقت کیا ہے اس میں اختلاف ہے۔ امام مالک رحمہ اللہ اور امام احمد رحمہ اللہ کے ہاں ذوالحجہ کی ١٢ تاریخ کی شام تک اس کا آخری وقت ہے اور امام شافعی رحمہ اللہ کے نزدیک ذوالحجہ کی ١٣ تاریخ کی شام تک۔ داؤد ظاہری اور تابعین کی ایک جماعت کے نزدیک منیٰ میں بارہ ذوالحجہ کی شام تک اور غیر منی میں یوم النحر کی شام تک صرف ایک روز اور ایک جماعت کی رائے یہ بھی ہے کہ ذوالحجہ کے آخری دن تک۔ حافظ ابن قیم رحمہ اللہ نے زاد المعاد میں اور حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے امام شافعی رحمہ اللہ کے موقف کو دلیل

کے اعتبار سے راجح قرار دیا ہے کہ ایام تشریق یعنی ۱۳ ذوالحجہ تک قربانی جائز ہے۔

راوی حدیث : ﴿ جندب بن سفیان رضی اللہ عنہ ﴾ جندب بن عبداللہ بن سفیان رضی اللہ عنہ بجیلہ قبیلہ سے ہونے کی وجہ سے بجلی کہلائے اور علقی بھی۔ اور علقی بجیلہ کی شاخ تھی۔ شرف صحابیت سے مشرف تھے۔ بسا اوقات اپنے دادا کی طرف منسوب کئے جاتے تھے۔ پہلے کوفہ میں تھے پھر بصرہ میں تشریف لے گئے۔ ۶۰ھ کے بعد وفات پائی۔

(١١٦٣) وَعَنِ الْبَرَآءِ بْنِ عَازِبٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُما، قَالَ: قَامَ فِيْنَا رَسُولُ اللهِ ﷺ فَقَالَ: «**أَرْبَعٌ لاَ تَجُوزُ فِي الضَّحَايَا: الْعَوْرَاءُ الْبَيِّنُ عَوَرُهَا، وَالْمَرِيضَةُ الْبَيِّنُ مَرَضُهَا، وَالْعَرْجَاءُ الْبَيِّنُ ضَلَعُهَا، وَالْكَبِيرَةُ الَّتِي لاَ تُنْقِي**». رَوَاهُ أَحْمَدُ وَالأَرْبَعَةُ، وَصَحَّحَهُ التِّرْمِذِيُّ وَابْنُ حِبَّانَ.

حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ ہمارے درمیان کھڑے تھے تو آپ نے فرمایا "چار قسم کے جانور قربانی میں جائز نہیں۔ یک چشم جانور جس کا یک چشم ہونا بالکل صاف طور پر معلوم ہو اور وہ بیمار جانور جس کی بیماری واضح ہو اور لنگڑا جانور جس کا لنگڑا پن نمایاں اور ظاہر ہو اور وہ جانور جو نہایت ہی بوڑھا ہوگیا ہو جس کی ہڈیوں میں گودا نہ رہا ہو۔" (اسے احمد اور چاروں نے روایت کیا ہے ترمذی اور ابن حبان نے اسے صحیح قرار دیا ہے)

لغوی تشریح : ﴿ العوراء ﴾ اس جانور کو کہتے ہیں جس کی آیک آنکھ کی بصارت جاتی رہی ہو۔ ﴿ البین ﴾ ظاہر اور واضح ﴿ عورھا ﴾ عین اور واؤ دونوں پر فتحہ جس کی دونوں آنکھوں میں سے ایک کی بینائی نہ ہو۔ ﴿ والمریضۃ البین مرضھا ﴾ بیمار ہو عموماً چارہ نہ کھاتی ہو اور اس کا مرض اس کے گوشت کے ناقص اور خراب ہونے کی وجہ سے واضح اور نمایاں ہو۔ ﴿ العرجاء ﴾ اس جانور کو کہتے ہیں جس کے ایک پاؤں میں چوٹ آئی ہو اور اس وجہ سے چل پھر نہ سکتا ہو گویا لنگڑا ہو۔ ﴿ ضلعھا ﴾ ضاد اور لام پر فتحہ اور لام پر سکون بھی جائز ہے۔ معنی اس کا لنگڑا پن اس کا لنگڑا پن ظاہر ہو جس وجہ سے وہ جانور چل پھر نہ سکے یا چراگاہ میں دوسرے جانوروں کے ساتھ مل کر چرنے کیلئے نہ جا سکے۔ ﴿ التی لا تنقی ﴾ تنقی باب الافعال سے ہے یعنی لاغر اور کمزور ہونے کی بنا پر اس کی ہڈیوں میں مینخ اور گودا نہ رہا ہو۔

حاصل کلام : یہ حدیث اس بات کی دلیل ہے کہ مذکورہ بالا چاروں عیب والا جانور قربانی کے لائق نہیں۔ ان میں سے ایک عیب والا جانور بھی قربانی کیلئے جائز نہیں ہے اور اسی طرح کا دوسرا کوئی عیب یا جو اس سے بھی قبیح ہو۔ عیب کے واضح اور نمایاں ہونے کی قید اس چیز کی مقتضی ہے کہ قربانی کے جانوروں میں معمولی نوعیت کا کوئی نقص و عیب قابل گرفت نہیں۔ معاف ہے' قابل درگزر ہے۔

(١١٦٤) وَعَنْ جَابِرٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ

حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "نہ ذبح کرو مگر دو دانتا (دوندا) لیکن

ﷺ: «لاَ تَذْبَحُوا إِلاَّ مُسِنَّةً، إِلاَّ أَنْ يَعْسُرَ عَلَيْكُمْ، فَتَذْبَحُوا جَذَعَةً مِنَ الضَّأْنِ». رَوَاهُ مُسْلِمٌ.

مشکل اور دشواری پیش آجائے تو عمدہ دنبہ جو چھ ماہ کا ہو ذبح کرو۔" (مسلم)

لغوی تشریح: ﴿مسنة﴾ میم پر ضمہ اور سین کے نیچے کسرہ اور نون مشدد۔ اس جانور کو کہتے ہیں جس نے اپنے دونوں سامنے کے نیچے والے دانت گرا دیئے ہوں اور ان کی جگہ دو چھوٹے دانت نکل چکے ہوں۔ ﴿ان یعسر﴾ قربان کرنا دشوار اور مشکل ہو جائے بایں طور کہ اس عمر کا جانور بآسانی دستیاب نہ ہو یا اتنا گراں ہو کہ قوت خرید اجازت نہ دیتی ہو۔ ﴿جذعة﴾ جیم اور ذال پر فتحہ۔ مؤلف رحمہ اللہ نے فتح الباری میں کہا ہے کہ یہ وہ جانور ہے جس کی چوپایوں میں معین عمر ہوتی ہے۔ بھیڑ کا جذعہ وہ ہے جس کی عمر سال کی ہو اور یہ جمہور اہل علم کا قول ہے اور ایک قول یہ بھی ہے کہ اس سے کم عمر بھی ہوتی ہے اور یہ کہا گیا ہے کہ اس کی عمر چھ ماہ ہو اور آٹھ ماہ بھی کہی گئی ہے اور دس ماہ بھی بیان کی گئی ہے اور وکیع سے منقول ہے کہ اس کی عمر چھ یا سات ماہ اور ابن الاعرابی سے منقول ہے کہ ابن شابین چھ سے لے کر سات ماہ کی عمر کو جذعہ قرار دیتے ہیں اور ابن ھرمین آٹھ ماہ سے دس ماہ تک اور بکری کا جذعہ وہ ہے جو سال پورا کر کے دوسرے سال میں قدم رکھ چکا ہو اور گائے جو تین سال مکمل کر چکی ہو اور اونٹ میں جو پانچویں برس میں داخل ہو چکا ہو۔

حاصل کلام: اس حدیث میں صراحت ہے کہ بھیڑ کا جذعہ تب جائز ہے جب دو دانتا جانور میسر نہ ہو۔ لیکن جمہور کی رائے یہ ہے کہ بھیڑ کا جذعہ مطلق طور پر جائز ہے اور انہوں نے اس حدیث کو استحباب اور افضلیت پر محمول کیا ہے۔ لیکن اس صریح روایت کے الفاظ ان کے مخالف ہیں' صحیح یہی ہے کہ جانور دو دانتا ہو تو ذبح کرنا چاہئے اگر وہ دستیاب نہ ہو یا قوت خرید نہ ہو تو بھیڑ کا جذعہ جائز ہے اور "جذعہ" بھی ایک سال کا ہونا چاہئے۔ جیسا کہ اکثر ائمہ لغت نے کہا ہے۔

(١١٦٥) وَعَنْ عَلِيٍّ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: أَمَرَ رَسُولُ اللهِ ﷺ أَنْ نَسْتَشْرِفَ العَيْنَ وَالأُذُنَ، وَلاَ نُضَحِّيَ بِعَوْرَاءَ، وَلاَ مُقَابَلَةٍ، وَلاَ مُدَابَرَةٍ، وَلاَ خَرْقَاءَ، وَلاَ شَرْقَاءَ». أَخْرَجَهُ أَحْمَدُ وَالأَرْبَعَةُ، وَصَحَّحَهُ التِّرْمِذِيُّ وَابْنُ حِبَّانَ وَالحَاكِمُ.

حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ہمیں حکم دیا کہ ہم قربانی والے جانور کی آنکھ' کان اچھی طرح دیکھ لیں۔ جو جانور یک چشم ہو یا اس کے کان کا سامنے والا یا پیچھے والا حصہ کٹ کر لٹک گیا ہو یا کان درمیان سے کٹا ہوا ہو یا دانت گر پڑے ہوں تو ایسے جانور قربانی نہ کئے جائیں۔ (اسے احمد اور چاروں نے نکالا ہے ترمذی' ابن حبان اور حاکم نے اسے صحیح قرار دیا ہے)

لغوی تشریح: ﴿نستشرف﴾ ہم گہری نظر سے دیکھ لیں۔ ﴿ولا مقابلة﴾ "با" پر فتحہ اور قاموس

میں ہے کہ یہ ایسی بکری ہے جس کے کان آگے سے کٹے ہوں اور لٹکے ہوئے ہوں۔ ﴿ مدابرۃ ﴾ "با" پر فتحہ یہ ایسی بکری جس کے کان پیچھے سے کٹے ہوں اور پیچھے سے لٹک رہے ہوں۔ ﴿ خرقاء ﴾ یہ ایسی بکری ہے جس کے کان میں گول سوراخ ہو اور خرق کے معنی سوراخ کے ہیں۔ ﴿ شرقاء ﴾ لمبائی میں جس کے کان کٹے ہوئے ہوں اور خرقاء کے بارے میں یہ بھی ہے کہ وہ جانور جس کے کان عرض میں کٹے ہوئے ہوں۔

(۱۱۶۶) وَعَنْ عَلِيِّ بْنِ أَبِيْ طَالِبٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: أَمَرَنِيْ رَسُولُ اللهِ ﷺ أَنْ أَقُومَ عَلَىٰ بُدْنِهِ، وَأَنْ أَقْسِمَ لُحُومَهَا وَجُلُودَهَا وَجِلاَلَهَا عَلَى الْمَسَاكِيْنَ، وَلاَ أُعْطِي فِي جِزَارَتِهَا شَيْئاً مِنْهَا. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے مجھے حکم ارشاد فرمایا کہ میں قربانی کے اونٹوں کی نگرانی و حفاظت کروں۔ یہ حکم دیا کہ میں ان کا گوشت اور چمڑا اور جھول کو مساکین و غرباء پر تقسیم کر دوں اور قصاب کو اس سے کچھ بھی نہ دوں۔ (بخاری و مسلم)

لغوی تشریح: ﴿ علی بدنۃ ﴾ بدن "با" پر ضمہ اور دال ساکن۔ بدنۃ کی جمع۔ اصل میں تو اونٹ کو کہتے ہیں اور گائے کو بھی اس میں شامل کیا گیا ہے۔ ﴿ جلالھا ﴾ جل کی جمع ہے۔ جیم پر ضمہ اور لام پر تشدید۔ سردی وغیرہ سے بچنے کیلئے جو کپڑا جانور پر ڈالا جائے اسے "جل" کہتے ہیں۔ ﴿ جزارتھا ﴾ جیم پر ضمہ اس اجرت و معاوضہ کو کہتے ہیں جو قصاب ذبح کے بدلہ میں وصول کرتا ہے۔

حاصل کلام: اس حدیث میں قربانی کے جن اونٹوں کا ذکر ہے حجۃ الوداع کے موقعہ پر رسول اللہ ﷺ کے وہ اونٹ تھے جنہیں حضرت علی رضی اللہ عنہ یمن سے لائے تھے ان کی تعداد ایک سو تھی۔ اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ قربانی کا گوشت' اس کا چمڑا اور اس سے متعلق سامان پالان' رسی وغیرہ سب کچھ خیرات کر دینا چاہئے اور قصاب کو اجرت تک اس گوشت میں سے نہیں دی جا سکتی۔ اجرت و معاوضہ الگ سے دینا چاہئے۔

(۱۱۶۷) وَعَنْ جَابِرِ بْنِ عَبْدِاللهِ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُما قَالَ: نَحَرْنَا مَعَ رَسُولِ اللهِ ﷺ عَامَ الْحُدَيْبِيَةِ اَلْبَدَنَةَ عَنْ سَبْعَةٍ، وَالبَقَرَةَ عَنْ سَبْعَةٍ. رَوَاهُ مُسْلِمٌ.

حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ صلح حدیبیہ کے موقع پر ہم نے رسول اللہ ﷺ کے ساتھ اونٹ اور گائے کو سات سات آدمیوں کی جانب سے نحر کیا۔ (مسلم)

حاصل کلام: سات افراد کی طرف سے اونٹ یا گائے ذبح کرنے کا یہ ضابطہ و اصول ھدی کے جانوروں کیلئے ہے جبکہ قربانی میں اونٹ دس افراد کی طرف سے بھی جائز ہے۔ چنانچہ ترمذی میں ابن عباس رضی اللہ عنہما

سے روایت ہے کہ ہم سفر میں نبی ﷺ کے ساتھ تھے۔ قربانی کا وقت آگیا تو ہم گائے میں سات آدمی شریک ہوئے اور اونٹ میں دس آدمی۔ یہ روایت نسائی اور ابن ماجہ میں بھی ہے۔

٣ - بَابُ العَقِيقَةِ — عقیقہ کا بیان

(١١٦٨) عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُمَا، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ عَقَّ عَنِ الحَسَنِ وَالحُسَيْنِ كَبْشاً كَبْشاً. رَوَاهُ أَبُو دَاوُدَ، وَصَحَّحَهُ ابْنُ خُزَيْمَةَ وَابْنُ الجَارُودِ وَعَبْدُ الحَقِّ، لٰكِن رَجَّحَ أَبُو حَاتِمٍ إِرْسَالَهُ، وَأَخْرَجَ ابْنُ حِبَّانَ مِنْ حَدِيثِ أَنَسٍ نَحْوَهُ.

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ نبی ﷺ نے حسن رضی اللہ عنہ اور حسین رضی اللہ عنہ کی طرف سے ایک ایک مینڈھے سے عقیقہ کیا۔ (اسے ابوداؤد نے روایت کیا ہے' ابن خزیمہ' ابن جارود اور عبدالحق نے اسے صحیح کہا ہے لیکن ابوحاتم نے اس کے مرسل ہونے کو ترجیح دی ہے۔ نیز ابن حبان نے حضرت انس رضی اللہ عنہ کے حوالہ سے اسی طرح روایت کیا ہے)

لغوی تشریح: ﴿باب العقیقۃ﴾ عقیقۃ کے عین پر فتحہ۔ اس ذبیحہ کو کہتے ہیں جو نومولود کی طرف سے ذبح کیا جاتا ہے اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اصل میں عقیقہ ان بالوں کو کہتے ہیں جو شکم مادر میں نومولود کے سر پر نکلتے ہیں۔ اس حالت میں نومولود کی طرف سے جو بکری ذبح کی جاتی ہے اسے عقیقہ کہتے ہیں۔ کیونکہ اس بال کو نومولود کے سر سے ذبح کے وقت مونڈ دیا جاتا ہے اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ عقیقہ "عق" سے ماخوذ ہیں اور عق کے معنی پھاڑنے اور کاٹنے کے ہیں۔ نومولود کی طرف سے ذبح کی جانے والی بکری کو عقیقہ کا نام اس لئے دیا گیا ہے کہ اس کے اعضاء کو ٹکڑے کر دیا جاتا ہے اور پیٹ کو چیر پھاڑ دیا جاتا ہے۔

﴿عق﴾ کا معنی ہے ذبح کیا۔ ﴿کبشا کبشا﴾ ان دونوں میں سے ہر ایک کی جانب سے ایک ایک مینڈھا۔ اس حدیث میں دلیل ہے کہ لڑکے کی جانب سے ایک ہی جانور پر اکتفاء جائز ہے اور تعداد اس میں شرط کے طور پر نہیں بلکہ مستحب ہے۔

راوی حدیث: ﴿حسین رضی اللہ عنہ﴾ حضرت حسن رضی اللہ عنہ کا مختصر تذکرہ کتاب الصلوٰۃ کے باب صفۃ الصلوٰۃ کے تحت ہو چکا ہے اور حضرت حسین رضی اللہ عنہ' حضرت حسن رضی اللہ عنہ کے بھائی تھے اور ان سے تقریباً ایک سال چھوٹے تھے۔ دونوں رسول اللہ ﷺ کے نواسے تھے اور آپ کی خوشبو تھے۔ ۶۱ھ عاشورہ کے دن سرزمین عراق کے میدان کربلا میں شہید ہوئے۔ اس وقت ان کی عمر ۵۴ سال تھی۔ تعریف و توصیف سے مستغنی ہیں۔

(١١٦٩) وَعَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهَا، أَنَّ رَسُولَ اللّٰهِ أَمَرَهُمْ أَنْ يُعَقَّ عَنِ الغُلَامِ شَاتَانِ

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اپنے صحابہ رضی اللہ عنہم کو حکم دیا کہ وہ لڑکے کی طرف سے دو بکریاں ایک جیسی اور لڑکی کی طرف سے ایک

مُكَافِئَتَانِ ، وَعَنِ الجَارِيَةِ شَاةٌ. رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ، وَصَحَّحَهُ، وَأَخْرَجَهُ أَحْمَدُ وَالأَرْبَعَةُ عَنْ أُمِّ كُرْزٍ الْكَعْبِيَّةِ نَحْوَهُ.

بکری عقیقہ کریں۔ (اسے ترمذی نے روایت کیا ہے اور اسے صحیح قرار دیا ہے' احمد اور چاروں نے ام کرز کعبیہ سے اسی طرح روایت کیا ہے)

لغوی تشریح: ﴿ ان یعق ﴾ صیغہ مجہول ﴿ مکافئتان ﴾ "فا" کے نیچے کسرہ۔ یہ بھی قول ہے کہ ایک جیسی ہوں۔ ایک دوسری کی تقریباً ہم عمر ہوں اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ ایسی ہوں جیسی قربانی اور زکوۃ میں دی جاتی ہیں اور یہ بھی قول ہے کہ دونوں ایک دوسری کی مثل ہوں۔

حاصل کلام: یہ جمہور کے نزدیک مستحب ہے البتہ اس حدیث سے ثابت ہوا کہ عقیقہ میں لڑکے کی طرف سے دو اور لڑکی کی طرف سے ایک بکری ذبح کرنی چاہئے۔ البتہ امام مالک رحمہ اللہ دونوں میں فرق کے قائل نہیں مگر یہ حدیث ان کے خلاف ہے اور مطلقاً ﴿ شاۃ ﴾ کے لفظ سے یہ کہا گیا ہے کہ عقیقہ کے جانور میں قربانی کے جانور کی شرائط نہیں ہیں لیکن اس کیلئے مساوی اور متقارب کی قید اس کا تقاضا کرتی ہیں کہ اس میں کھلا ہوا نقص اور عیب نہ ہو۔ لہٰذا قربانی کے جانور میں شارع نے جن نقائص و عیوب سے بچنے اور پرہیز کرنے کی ہدایت فرمائی ہے ان کا لحاظ رکھا جائے۔ اس جانور کا مسنہ ہونا کسی بھی حدیث سے ثابت نہیں البتہ لفظ ﴿ شاۃ ﴾ اس کا تقاضا کرتا ہے کہ وہ بکری کا بچہ نہ ہو بلکہ بڑی عمر کا ہو جسے شاۃ (بکری) کہا جاتا ہے۔

راوی حدیث: ﴿ ام کرز کعبیہ رضی اللہ عنہا ﴾ خزاعہ قبیلہ سے تھیں اس لیے خزاعیہ کہلائیں۔ شرف صحابیت سے مشرف تھیں۔ ان سے کئی احادیث منقول ہیں۔ کرز کے کاف پر ضمہ اور "راء" ساکن ہے۔

(١١٧٠) وَعَنْ سَمُرَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، أَنَّ رَسُولَ اللهِ ﷺ قَالَ: «كُلُّ غُلَامٍ مُرْتَهِنٌ بِعَقِيقَتِهِ، تُذْبَحُ عَنْهُ يَوْمَ سَابِعِهِ، وَيُحْلَقُ وَيُسَمَّى». رَوَاهُ أَحْمَدُ وَالأَرْبَعَةُ وَصَحَّحَهُ التِّرْمِذِيُّ.

حضرت سمرہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "ہر بچہ اپنے عقیقہ کے عوض رہن (گروی) ہوتا ہے۔ پیدائش کے ساتویں روز اس کا عقیقہ کیا جائے۔ سر کے بال منڈائے جائیں اور اس کا نام رکھا جائے۔" (اسے احمد اور چاروں نے روایت کیا ہے اور ترمذی نے اسے صحیح کہا ہے)

لغوی تشریح: ﴿ مرتھن ﴾ اسم مفعول کا صیغہ ہے۔ رہن رکھا ہوا۔ خطابی کا قول ہے کہ ﴿ مرتھن ﴾ کے مفہوم میں اختلاف ہے اور سب سے عمدہ بات وہ ہے جو امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ نے فرمائی ہے کہ یہ شفاعت کے متعلق ہے۔ یعنی جب بچہ کا عقیقہ نہ کیا گیا ہو اور وہ بچہ فوت ہو جائے تو وہ اپنے والدین کے حق میں سفارش نہیں کرے گا اور یہ بھی قول ہے کہ عقیقہ ناگزیر اور لازمی ہے اس کے کئے بغیر کوئی چارہ کار نہیں اور بچے کو رھن سے تشبیہہ دی گئی ہے جس طرح رھن مرتھن کے ہاتھ میں ہوتا ہے اور اس کی ادائیگی ضروری ہوتی ہے' اسی طرح بچے کی طرف سے عقیقہ بھی ضروری ہے۔ توجیہہ سے ان حضرات

کی تائید ہوتی ہے جو عقیقہ کو واجب قرار دیتے ہیں اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ وہ اپنے بالوں کی گندگی و ناپاکی میں مرھون ہے۔ اس لئے حدیث میں ہے کہ اس سے گندگی کو دور کرو۔ ﴿ یوم سابعۃ ﴾ یعنی ساتویں روز عقیقہ کرو اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اگر ساتواں روز گزر جائے تو پھر چودھویں روز وہ بھی گزر جائے تو پھر اکیسویں دن عقیقہ کیا جائے۔ اس بارے میں ایک حدیث بھی مروی ہے مگر وہ ضعیف ہے۔

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ بچے کی پیدائش کے ساتویں روز بچے کے سر کی پیدائشی آلائش صاف کر کے یعنی اس کے سر کے بال اتروا کر بچے کو نہلایا جائے۔ اس کی طرف سے عقیقہ کیا جائے اور اس کا نام بھی رکھا جائے

۱۳۔ كِتَابُ الأَيْمَانِ وَالنُّذُوْرِ

قسموں اور نذروں کے مسائل

(۱۱۷۱) عَنِ ابْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُمَا، عَنْ رَسُولِ اللهِ ﷺ، أَنَّهُ أَدْرَكَ عُمَرَ بْنَ الخَطَّابِ فِي رَكْبٍ، وَعُمَرُ يَحْلِفُ بِأَبِيْهِ، فَنَادَاهُمْ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «أَلاَ! إِنَّ اللّٰهَ يَنْهَاكُمْ أَنْ تَحْلِفُوا بِآبَائِكُمْ، فَمَنْ كَانَ حَالِفاً فَلْيَحْلِفْ بِاللهِ أَوْ لِيَصْمُتْ» مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما رسول اللہ ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ آپ ؐ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو ایک کارواں میں اپنے باپ کی قسم اٹھاتے سنا تو نبی ﷺ نے انہیں بلا کر فرمایا ”اللہ نے تمہیں تمہارے آباء و اجداد کی قسم کھانے سے منع فرمایا ہے۔ پس اب جو قسم کھانا چاہے تو اسے اللہ کے نام کی قسم کھانی چاہئے ورنہ خاموش رہے۔“ (بخاری و مسلم)

لغوی تشریح: ﴿ کتاب الایمان ﴾ ہمزہ پر فتحہ۔ یمین کی جمع ہے۔ لغت میں ہاتھ کو کہتے ہیں اور حلف (قسم) پر اس کا اطلاق اسی لئے کیا گیا ہے کہ جو لوگ قسم کھاتے تھے تو ہر ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑ لیتا تھا اور شرعاً کسی شے کو پختہ اور مؤکد کرنے کے لئے اللہ کا ذاتی نام یا صفاتی لے کر قسم کھانا اور ﴿ النذور ﴾۔ نذر کی جمع ہے اور اس کا اصل تو ”انذار“ ہے جس کے معنی ڈرانے کے ہیں۔ امام راغب فرماتے ہیں کہ انذار کے معنی کسی حادثہ کی وجہ سے غیر واجب چیز کو اپنے اوپر واجب کر لینے کے ہیں۔ ﴿ فی رکب ﴾ ”را“ پر فتحہ اور کاف ساکن۔ راکب کی جمع۔ مطلب ہے کہ ایک قافلہ و کارواں میں تھے اور وہ کارواں کسی غزوہ میں جا رہا تھا۔ ﴿ فلیحلف باللہ ﴾ اللہ کے نام و صفات کی قسم کھانی چاہئے۔ ﴿ اولیصمت ﴾ یا پھر خاموش رہے۔ صمت نصر ینصر کے وزن پر ہے۔ لام اس میں امر کا ہے۔ ﴿ ولا بلانداد ﴾ انداد سے یہاں بت مراد ہیں۔ انداد ند کی جمع۔ ند کے نون کے نیچے کسرہ اور دال مشدد، مثل کے معنی میں۔ صنم کو ند کہا گیا ہے اس لئے کہ مشرکین نے اسے اللہ کے ساتھ مستحق عبادت بنا لیا تھا۔ یہ حدیث دلیل ہے کہ غیر اللہ کے نام کی قسم کھانا حرام ہے۔ ترمذی میں ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ”جس کسی نے غیر اللہ کی قسم کھائی اس نے کفر یا شرک کا ارتکاب کیا۔“ ابوداؤد اور احمد نے

بایں الفاظ روایت نقل کی ہے کہ "جس کسی نے غیر اللہ کی قسم کھائی اس نے شرک کیا اور یہ اس بنا پر ہے کہ کسی چیز کی قسم کھانا اس کی عظمت کا مقتضی ہوتا ہے اور عظمت فی الحقیقت صرف اللہ ہی کیلئے ہے۔" قدیم ترین زمانے سے لوگوں کا یہ اعتقاد و نظریہ چلا آرہا ہے کہ جس کے نام کی قسم کھائی جائے اس کا قسم کھانے والے پر تسلط اور غلبہ ہوتا ہے اور وہ مافوق الاسباب بھی نفع و نقصان دینے کی قدرت و طاقت رکھتا ہے۔ پس جب قسم کھانے والا اپنی قسم پوری کرتا ہے تو جس کی قسم کھائی گئی ہوتی ہے وہ خوش ہوتا ہے اور اسے نفع دیتا ہے اور فائدہ پہنچاتا ہے اور جب قسم اٹھانے والا اپنی قسم پوری نہیں کرتا تو وہ اس پر ناراض ہوتا ہے اور اسے نقصان اور ضرر پہنچاتا ہے۔ لاریب ایسا اعتقاد غیر اللہ کے بارے میں رکھنا کھلا شرک و کفر ہے اور غیر اللہ کے نام کی قسم اور غیر اللہ کے نام کی نذر شرک کا باعث ہے۔ پس جب کوئی اس اعتقاد کے ساتھ قسم کھائے تو اس نے حقیقت میں شرک کا ارتکاب کیا اور جب قسم کھائے اور یہ اعتقاد و نظریہ نہ ہو تو پھر اس نے شرک کے اسباب میں سے ایک سبب کا ارتکاب کیا۔ شریعت نے اسباب شرک سے بھی اسی طرح منع کیا ہے جیسے شرک سے منع فرمایا ہے۔

وَفِيْ رِوَايَةٍ لأَبِيْ دَاوُدَ وَالنَّسَائِيِّ عَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُ مَرْفُوعاً: «لاَ تَحْلِفُوْا بِآبَائِكُمْ، وَلاَ بِأُمَّهَاتِكُمْ، وَلاَ بِالأَنْدَادِ، وَلاَ تَحْلِفُوا بِاللهِ إِلاَّ وَأَنْتُمْ صَادِقُونَ».

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے ابوداؤد اور نسائی کی ایک مرفوع روایت میں ہے: "اپنے باپ دادوں، اپنی ماؤں اور اللہ کے شریکوں کی قسم نہ کھاؤ۔ اللہ کی قسم بھی صرف اس حالت میں کھاؤ کہ جب تم سچے ہو۔"

(١١٧٢) وَعَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «يَمِينُكَ عَلَى مَا يُصَدِّقُكَ بِهِ صَاحِبُكَ». وَفِيْ رِوَايَةٍ: «اَلْيَمِيْنُ عَلٰى نِيَّةِ الْمُسْتَحْلِفِ». أَخرَجَهُمَا مُسْلِمٌ.

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "تیری قسم اس پر واقع ہوتی ہے کہ تمہارا ساتھی تجھ کو سچا سمجھے" اور ایک روایت میں ہے "قسم کا دارومدار قسم لینے والے کی نیت پر ہے۔" (ان دونوں احادیث کی روایت مسلم نے کی ہے)

لغوی تشریح: ﴿يصدقك﴾ تصدیق سے ماخوذ ہے۔ ﴿صاحبك﴾ سے یہاں مدمقابل ساتھی مراد ہے اور معنی یہ ہے کہ وہ اس پر واقع ہونے والا ہے اور توریہ اس میں اثر انداز نہیں ہوگا۔ پھر اگر قسم کھانے والا اپنے دل میں قسم لینے والے کی نیت کے خلاف نیت و ارادہ رکھے تو وہ اپنی قسم توڑنے سے نجات و چھٹکارا نہیں پائے گا۔

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ قسم کھانا جائز ہے اور قسم کا اعتبار تب ہوگا جب مدعی کی مراد کے مطابق قسم کھائی جائے۔

(١١٧٣) وَعَنْ عَبْدِ الرَّحْمٰنِ بْنِ

حضرت عبدالرحمٰن بن سمرہ سے مروی ہے کہ رسول

سَمُرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «وَإِذَا حَلَفْتَ عَلَى يَمِينٍ، فَرَأَيْتَ غَيْرَهَا خَيْراً مِنْهَا، فَكَفِّرْ عَنْ يَمِينِكَ وَائْتِ الَّذِي هُوَ خَيْرٌ». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ. وَفِي لَفْظٍ لِلْبُخَارِيِّ: «فَأْتِ الَّذِي هُوَ خَيْرٌ، وَكَفِّرْ عَن يَمِيْنِكَ». وَفِي رِوَايَةٍ لأَبِي دَاوُدَ: «فَكَفِّرْ عَنْ يَمِيْنِكَ. ثُمَّ ائْتِ الَّذِيْ هُوَ خَيْرٌ». وَإِسْنَادُهَا صَحِيْحٌ.

اللہ ﷺ نے فرمایا "جب تم کسی کام پر قسم کھاؤ اور اس کام کے خلاف کو بہتر دیکھو تو قسم کا کفارہ ادا کر دو اور جو بہتر ہے وہ کر لو۔" (بخاری و مسلم) اور بخاری کے الفاظ یہ ہیں کہ "جو کام بہتر ہے اسے کرو اور قسم کا کفارہ ادا کرو۔" اور ابوداؤد کی روایت میں اس طرح ہے کہ "اپنی قسم کا کفارہ دے کر وہ کام کرو جو بہتر ہے۔" (دونوں احادیث کی سند صحیح ہے)

لغوی تشریح: ﴿ کفر ﴾ تکفیر سے امر کا صیغہ ہے۔ مطلب ہے کہ اس کا کفارہ ادا کر۔ ﴿ وات ﴾ اتیان سے امر کا صیغہ ہے یعنی کرو۔ حدیث کے الفاظ مجموعی طور پر قسم توڑنے کی صورت میں کفارہ کی ادائیگی پہلے بھی اسی طرح جائز بتاتے ہیں جس طرح اس کے بعد جائز بتاتے ہیں۔ جمہور کا یہی مسلک ہے مگر حنفیہ کے نزدیک قسم توڑنے کا کفارہ قسم توڑنے سے پہلے ادا کرنا کسی حالت میں درست نہیں ہے۔ مگر ابوداؤد رضی اللہ عنہ کی یہ حدیث ان کے خلاف حجت ہے۔ جس میں کفارہ کے بعد "ثم" کے لفظ سے امر خیر کا حکم ہے اور "ثم" کا لفظ ترتیب کا مقتضی ہے۔

راوی حدیث: ﴿ عبدالرحمن بن سمرہ رضی اللہ عنہ ﴾ ان کی کنیت ابوسعید ہے۔ شرف صحابیت سے مشرف ہیں۔ فتح مکہ کے موقع پر دائرۂ اسلام میں داخل ہوئے۔ بجستان اور کابل کے فاتح ہیں۔ بصرہ میں سکونت پذیر ہوئے۔ ۵۰ھ یا بعد میں وفات پائی۔

(١١٧٤) وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُمَا، أَنَّ رَسُولَ اللهِ ﷺ قَالَ: «مَنْ حَلَفَ عَلَى يَمِينٍ، فَقَالَ: إِنْ شَاءَ اللّٰهُ، فَلاَ حِنْثَ عَلَيْهِ». رَوَاهُ أَحْمَدُ وَالأَرْبَعَةُ، وَصَحَّحَهُ ابْنُ حِبَّانَ.

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "جو کسی کام پر قسم کھائے اور ساتھ ہی انشاء اللہ کہے تو اس قسم کو توڑنے کا کفارہ نہیں ہے۔" (اسے احمد اور چاروں نے روایت کیا ہے اور ابن حبان نے اسے صحیح قرار دیا ہے)

حاصل کلام: اس حدیث کی رو سے قسم کھانے والا ساتھ ہی اگر انشاء اللہ کہہ دے تو ایسی قسم توڑنے پر کفارہ نہیں ہوگا کیونکہ قسم کو جب مشیت الٰہی سے مقید کر دیا جائے تو بالاتفاق وہ قسم منعقد نہیں ہوتی لہذا جب منعقد نہ ہوئی تو پھر اس کے توڑنے کے کفارہ کا کیا سوال۔

(۱۱۷۵) وَعَنْهُ، قَالَ: كَانَتْ يَمِيْنُ النَّبِيِّ ﷺ: «لاَ، وَمُقَلِّبِ الْقُلُوبِ». رَوَاهُ الْبُخَارِيُّ.

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ نبی ﷺ کی قسم کے الفاظ یہ ہوتے تھے "نہیں، قسم ہے دلوں کے بدلنے والے کی۔" (بخاری)

لغوی تشریح: ﴿لا﴾ پہلی بات اور گفتگو کی نفی اور تردید کیلئے ہے۔ ﴿ومقلب القلوب﴾ یہاں "واؤ" قسمیہ ہے اور مقلب اسم فاعل کا صیغہ ہے۔ اللہ تعالیٰ مراد ہیں اور تقلیب قلوب سے مراد ہے دل کا ایک رائے سے دوسری رائے کی جانب پھرنا۔

حاصل کلام: اس حدیث میں رسول اللہ ﷺ کے قسم کھانے کا انداز و طریقہ بیان ہوا ہے کہ آپؐ پہلے جو گفتگو یا بات ہو رہی ہوتی تھی اگر درست نہ ہوتی تو پہلے لفظ ﴿لا﴾ سے اس کی تردید اور نفی فرماتے پھر اللہ کے صفاتی نام سے قسم کھاتے۔ اس سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کے اسماء صفاتی سے بھی قسم کھانی جائز ہے۔ خواہ اس صفت کا تعلق آپ کی ذات سے ہو جیسے علم اور قدرت خواہ صفت فعلی سے ہو جیسا کہ قہر اور غلبہ وغیرہ۔

(۱۱۷۶) وَعَنْ عَبْدِاللهِ بْنِ عَمْرٍو رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُما قَالَ: جَاءَ أَعْرَابِيٌّ إِلىٰ النَّبِيِّ ﷺ، فَقَالَ: يَا رَسُولَ اللهِ! مَا الكَبَآئِرُ؟ - فَذَكَرَ الحَدِيْثَ، وَفِيْهِ - «اليَمِيْنُ الغَمُوسُ» - وَفِيْهِ - قُلْتُ: وَمَا اليَمِيْنُ الغَمُوسُ؟ قَالَ: «الَّتِي يُقْتَطَعُ بِهَا مَالُ امْرِئٍ مُسْلِمٍ، هُوَ فِيهَا كَاذِبٌ». أَخْرَجَهُ البُخَارِيُّ.

حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ نبی ﷺ کی خدمت میں ایک دیہاتی آیا اور آپؐ سے پوچھا کہ کبیرہ گناہ کونسے ہیں؟ پھر اس نے ساری حدیث بیان کی۔ اس حدیث میں جھوٹی قسم کا ذکر بھی تھا۔ میں نے عرض کیا جھوٹی قسم کونسی ہے؟ آپؐ نے فرمایا "جھوٹی قسم یہ ہے کہ اس کے ذریعہ کسی مسلمان کا مال اڑا لیا جائے حالانکہ وہ اس میں سراسر جھوٹا ہو۔" (بخاری)

لغوی تشریح: ﴿ما الكبائر﴾ کبائر کبیرہ کی جمع ہے۔ یعنی بڑے بڑے گناہ اور ذنوب۔ ﴿اليمين الغموس﴾ جھوٹی قسم۔ ﴿غموس﴾ کے غین پر فتحہ فعول کے وزن پر اور غمس سے ماخوذ ہے۔ غمس کے معنی ہیں پانی میں غوطہ کھانا، ڈوب جانا، اس کا نام غموس اس لئے رکھا گیا ہے کہ اس کا ارتکاب کرنے والا انسان گناہ میں غرق ہو کر انجام کار دوزخ کی آگ کا ایندھن بن جاتا ہے۔

(۱۱۷۷) وَعَنْ عَآئِشَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهَا، فِيْ قَولِهِ تَعَالَى ﴿لاَ يُؤَاخِذُكُمُ اللَّهُ بِاللَّغْوِ فِي أَيْمَانِكُمْ﴾

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ، انہوں نے ارشاد اللہ تعالیٰ کے "اللہ تعالیٰ تم سے تمہاری لغو قسموں کا مؤاخذہ نہیں کرتا" کی تفسیر میں فرمایا، اس

قَالَتْ: هُوَ قَوْلُ الرَّجُلِ: لاَ، وَاللهِ، وَبَلَى، وَاللهِ، أَخْرَجَهُ الْبُخَارِيُّ، وَأَوْرَدَهُ أَبُو دَاوُدَ مَرْفُوعاً.

سے مراد انسان کا یہ کہنا ہے لا، واللہ (نہیں، بخدا) اور وبلی، واللہ ہاں اللہ کی قسم۔ (اس کی تخریج بخاری نے کی ہے اور ابوداؤد نے اسے مرفوعاً روایت کیا ہے)

لغوی تشریح: ﴿اللغو﴾ ایسی بے فائدہ و بے ثمرہ بات جس کا کوئی اعتبار نہ ہو اور قسم میں لغو یہ ہے کہ آدمی دلی ارادے کی پختگی کے بغیر ہی قسم کھائے بلکہ زبان پر یونہی جاری ہو جائے۔ جسے ہم تکیہ کلام کہتے ہیں کہ بات بات پر قسم کھا جانا۔

(۱۱۷۸) وَعَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «إِنَّ لِلَّهِ تِسْعَةً وَتِسْعِينَ اسْماً مَنْ أَحْصَاهَا دَخَلَ الْجَنَّةَ» مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ. وَسَاقَ التِّرْمِذِيُّ وَابْنُ حِبَّانَ ٱلأَسْمَآءَ، وَالتَّحْقِيْقُ أَنَّ سَرْدَهَا إِدْرَاجٌ مِنْ بَعْضِ الرُّوَاةِ.

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "بے شک اللہ تعالیٰ کے ایک کم سو (ننانویں) نام ہیں۔ جس نے ان کو ضبط رکھا وہ جنت میں داخل ہو گا۔" (بخاری و مسلم) ترمذی اور ابن حبان نے وہ نام بھی بیان کئے ہیں اور تحقیق سے یہ ثابت ہے کہ اصل حدیث میں اسماء کی تفصیل نہیں ہے بلکہ کسی راوی نے اپنی طرف سے ان کو درج کر دیا ہے)

لغوی تشریح: ﴿من احصاها﴾ اور ایک روایت میں ﴿من حفظها﴾ ہے اور یہ حفظ دراصل احصی کی تفسیر ہے اور یہ بھی قول ہے کہ اس کا معنی یہ ہے کہ جس نے ان اسماء کو پوری طرح ذہن و حافظہ میں محفوظ کر لیا اور ان تمام اسماء سے اللہ تعالیٰ کی تعریف کی تو جو ثواب ان کے پڑھنے کے بدلہ میں دینے کا اللہ تعالیٰ نے وعدہ فرمایا وہ اس آدمی کیلئے واجب ہو جاتا ہے اور یہ بھی کہا گیا ہے جس کسی نے اس کے مقتضاء کے مطابق عمل کیا۔ اس باب میں اس حدیث کو لانے سے مقصود یہ بتانا ہے کہ جس کسی نے ان اسماء کے ساتھ قسم کھائی تو وہ قسم منعقد ہو جائے گی۔

(۱۱۷۹) وَعَنْ أُسَامَةَ بْنِ زَيْدٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «مَنْ صُنِعَ إِلَيْهِ مَعْرُوفٌ، فَقَالَ لِفَاعِلِهِ: جَزَاكَ اللَّهُ خَيْراً، فَقَدْ أَبْلَغَ فِي الثَّنَاءِ». أَخْرَجَهُ التِّرْمِذِيُّ، وَصَحَّحَهُ ابْنُ حِبَّانَ.

حضرت اسامہ بن زید رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "جس کسی سے نیکی اور اچھا برتاؤ کیا جائے اور وہ اس کرنے والے سے کہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کو جزائے خیر سے نوازے تو اس نے اس کا پورا حق شکریہ ادا کر دیا۔" (اس کو ترمذی نے روایت کیا ہے اور ابن حبان نے اسے صحیح کہا ہے)

لغوی تشریح: ﴿ صنع ﴾ صیغۂ مجہول۔ ﴿ معروف ﴾ احسان، عمدہ سلوک اور بھلائی و نیکی۔ ﴿ ابلغ فی الثناء ﴾ یعنی اس نے اس کی تعریف کا پورا پورا حق ادا کر دیا۔ سبل السلام میں ہے کہ اس حدیث کا اس باب میں ذکر کرنا (یعنی باب الایمان والنذور میں) غیر متعلق اور غیر موافق ہے۔ دراصل اس کے بیان کرنے کی اصل جگہ اور مقام باب الادب الجامع ہے۔

(١١٨٠) وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُمَا، عَنِ النَّبِيِّ ﷺ، أَنَّهُ نَهَى عَنِ النَّذْرِ، وَقَالَ: «إِنَّهُ لاَ يَأْتِي بِخَيْرٍ، وَإِنَّما يُسْتَخْرَجُ بِهِ مِنَ الْبَخِيلِ». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما نے نبی ﷺ سے روایت کیا ہے کہ آپؐ نے نذر ماننے سے منع کیا اور فرمایا کہ "نذر سے کوئی خیر و بھلائی حاصل نہیں ہوتی صرف بخیلی و کنجوسی کا مال اس طریقہ سے نکال لیا جاتا ہے۔" (بخاری و مسلم)

حاصل کلام: نذر سے منع کرنا دراصل افضل کی طرف راہنمائی کرنا ہے اور صدقہ و خیرات وغیرہ کا مطلوب کے حصول سے معلق کرنا کسی صاحب عظمت و مروت کے شان کے شایان نہیں ہے۔ یہ عمل تو ایسا بخیل آدمی کرتا ہے جو کبھی خرچ نہیں کرتا۔ اگر کرتا ہے تو اس کے عوض افضل چیز کی خواہش کرتا ہے اور یہ ایسا شخص کرتا ہے جس کا دل صدقہ و خیرات کرنا نہیں چاہتا۔ الاّ یہ کہ جب اس کا ناطقہ بند اور حالات تنگ ہو جاتے ہیں تو حالات کی درستگی کیلئے صدقہ و خیرات کی نذر مانتا ہے۔ جب یہ مقصد حاصل ہو جاتا ہے تب صدقہ کرتا ہے ورنہ خیرات نہیں کرتا۔ مثلاً وہ کہتا ہے کہ اگر اللہ نے مجھے میرے مرض سے شفا بخش دی یا میرے مریض کو صحت و تندرستی سے نواز دیا تو میں اتنا مال راہ خدا میں خرچ کروں گا۔ اتنا مال خرچ کرنا میرے ذمہ ضروری و لازمی ہے اور وہ مال تب خرچ نہیں کرتا جب اسے اس مرض سے صحت و تندرستی مل جاتی ہے۔ اگرچہ کرتے وقت بھی دل کی گھٹن موجود ہوتی ہے۔ لہٰذا نذر سے منع اس لئے کیا گیا ہے کہ اس میں ایسا کمینہ پن ہے جو کسی پر مخفی نہیں ہے۔ علاوہ ازیں نذر ماننے والا یہ اعتقاد رکھتا ہے کہ اسے نذر ماننے کی صورت میں وہ چیز حاصل ہو جائے گی جسے اللہ تعالیٰ نے مقدر نہیں فرمایا لیکن اگر اس کا یہ اعتقاد نہ ہو تو نذر ماننے کی اجازت ہے۔

(١١٨١) وَعَنْ عُقْبَةَ بْنِ عَامِرٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ: «كَفَّارَةُ النَّذْرِ كَفَّارَةُ يَمِينٍ». رَوَاهُ مُسْلِمٌ، وَزَادَ التِّرْمِذِيُّ فِيهِ: «إِذَا لَمْ يُسَمِّهِ». وَصَحَّحَهُ.

حضرت عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "نذر کا کفارہ قسم توڑنے کا کفارہ ہی ہے۔" (مسلم) ترمذی نے اتنا اضافہ کیا ہے کہ "جب اس کا نام نہ لے" (اور اسے صحیح بھی قرار دیا ہے)

وَلِأَبِيْ دَاوُدَ مِنْ حَدِيْثِ ابْنِ عَبَّاسٍ مَرْفُوعاً: «مَنْ نَذَرَ نَذْراً لَمْ

اور ابوداؤد میں ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مرفوع روایت میں ہے کہ "جس کسی نے کوئی نذر مانی اور اس کا

يُسَمِّهِ فَكَفَّارَتُهُ كَفَّارَةُ يَمِيْنٍ، وَمَنْ نَذَرَ نَذْراً فِي مَعْصِيَةٍ فَكَفَّارَتُهُ كَفَّارَةُ يَمِيْنٍ، وَمَنْ نَذَرَ نَذْراً لاَ يُطِيْقُهُ فَكَفَّارَتُهُ كَفَّارَةُ يَمِيْنٍ». وَإِسْنَادُهُ صَحِيْحٌ إِلاَّ أَنَّ الحُفَّاظَ رَجَّحُوْا وَقْفَهُ.

نام نہیں لیا تو اس کا کفارہ' قسم کا کفارہ ہے اور جس نے معصیت کی نذر مانی ہو تو اس کا کفارہ بھی کفارۂ قسم ہی ہے اور جس نے ایسی نذر مانی جس کی طاقت وہ نہیں رکھتا تو اس کا کفارہ بھی قسم کا کفارہ ہی ہے۔" (اس کی سند صحیح ہے مگر حفاظ حدیث نے اس روایت کے موقوف ہونے کو راجح بتایا ہے)

وَلِلْبُخَارِيِّ مِنْ حَدِيْثِ عَائِشَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهَا: «وَمَنْ نَذَرَ أَنْ يَعْصِيَ اللَّهَ فَلاَ يَعْصِهِ».

اور بخاری میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ "جس نے اللہ کی نافرمانی کرنے کی نذر مانی تو وہ اللہ کی نافرمانی نہ کرے۔"

وَلِمُسْلِمٍ مِنْ حَدِيْثِ عِمْرَانَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ: «لاَ وَفَاءَ لِنَذْرٍ فِي مَعْصِيَةٍ».

اور مسلم میں عمران سے مروی ہے کہ "گناہ و معصیت کی نذر کو پورا نہ کرنا چاہئے۔"

لغوی تشریح: ﴿ كفارة يمين ﴾ یعنی قسم کا کفارہ' قسم کا کفارہ ارشاد الٰہی کے مطابق دس مساکین کو اوسط درجہ کا جو خود کھاتے ہیں وہ کھانا کھلانا یا کپڑے دینا یا غلام آزاد کرنا۔ پس جو شخص یہ نہ پائے تو اسے تین روزے رکھنے ہوں گے۔ یہ ہے تمہاری قسموں کا کفارہ جب تم قسم اٹھاؤ۔ (۵ - ۸۹) ﴿ اذا لم يسمه ﴾ یعنی جب نذر ماننے والا نہ تو نذر کا نام لے اور نہ اسے معین کرے بلکہ مطلقاً نذر مانے بایں قول کہ میں نے کوئی نذر مانی یا یوں کہے کہ مجھ پر نذر لازم ہے اور اس نذر کا تعین نہ کرے کہ وہ روزہ ہے یا کوئی اور عمل ہے۔ یہ حدیث معصیت کی نذر میں کفارہ کے واجب ہونے کا تقاضا کرتی ہے۔ امام احمد رحمۃ اللہ علیہ اور اسحٰق بن راھویہ رحمۃ اللہ علیہ کی یہی رائے ہے مگر جمہور علماء نے ان دونوں کی مخالفت کی ہے اور اس باب میں مذکورہ احادیث کا انہوں نے یہ جواب دیا ہے کہ وہ ضعیف ہیں مگر شارح ترمذی نے تحفۃ الاحوذی (ج ۲' ص:۳۶۷) میں کہا ہے کہ اس حدیث کے بہت سے طرق ہیں۔ ان سے حجت پکڑ جا سکتی ہے۔

(۱۱۸۲) وَعَنْ عُقْبَةَ بْنِ عَامِرٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: نَذَرَتْ أُخْتِيْ أَنْ تَمْشِيَ إِلىٰ بَيْتِ اللهِ حَافِيَةً، فَأَمَرَتْنِي أَنْ أَسْتَفْتِيَ لَهَا رَسُولَ اللهِ ﷺ فَاسْتَفْتَيْتُهُ. فَقَالَ النَّبِيُّ ﷺ: «لِتَمْشِ وَلْتَرْكَبْ». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ، وَاللَّفْظُ لِمُسْلِمٍ.

حضرت عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میری بہن نے بیت اللہ تک ننگے پاؤں چل کر جانے کی نذر مانی اور اس نے مجھے حکم دیا کہ میں اس کے لیے (اس معاملہ میں) رسول اللہ ﷺ سے دریافت کروں چنانچہ میں نے آپؐ سے فتویٰ طلب کیا تو نبی ﷺ نے فرمایا "پیدل بھی چلے اور سوار بھی ہو لے۔" (بخاری و مسلم۔ یہ الفاظ مسلم کے ہیں)

وَلِأَحْمَدَ وَالأَرْبَعَةِ، فَقَالَ: «إِنَّ اللَّهَ لاَ يَصْنَعُ بِشَقَاءِ أُخْتِكَ شَيْئاً، مُرْهَا فَلْتَخْتَمِرْ، وَلْتَرْكَبْ، وَلْتَصُمْ ثَلاَثَةَ أَيَّامٍ».

مسند احمد اور چاروں میں ہے کہ آپؐ نے فرمایا "اللہ تعالیٰ تیری بہن کو تکلیف و مشقت میں مبتلا کر کے کیا کرے گا۔ اسے حکم دو کہ چادر اوڑھ لے اور سوار ہو جائے اور تین دن کے روزے رکھ لے۔"

لغوی تشریح: ﴿حافية﴾ یعنی ننگے پاؤں۔ ترمذی اور ابوداؤد کی روایت میں ہے کہ اس نے یہ بھی نذر میں کہا کہ وہ اوڑھنی نہیں لے گی۔ اوڑھنی سے عورت اپنا سر ڈھانپتی ہے۔ ﴿بشقاء اختك﴾ شقاء کے شین پر فتحہ' تکان اور مشقت و تکلیف دے کر ﴿فلتختمر﴾ دوپٹہ اوڑھ لے۔ اس لئے کہ عورت کا سر بھی پردہ ہے اور اس کا کھولنا معصیت ہے اور معصیت کی نذر کو پورا کرنا ضروری نہیں۔ ﴿ولتصم ثلاثة ایام﴾ اور تین دن کے روزے رکھ لے۔ معصیت کی نذر میں کفارہ کے وجوب کے جملہ دلائل میں سے یہ بھی ایک دلیل ہے۔

حاصل کلام: اس حدیث کی رو سے اگر کسی نے بیت اللہ شریف کی طرف پیدل یا ننگے پاؤں چل کر جانے کی نذر مانی ہو تو ایسی نذر کا پورا کرنا ضروری اور لازمی نہیں۔ خواہ چل کر جانے سے عاجز بھی نہ ہو۔ امام شافعی رحمہ اللہ کی یہی رائے ہے۔

(١١٨٣) وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا قَالَ: اسْتَفْتَى سَعْدُ بْنُ عُبَادَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ رَسُولَ اللهِ ﷺ فِي نَذْرٍ كَانَ عَلَىٰ أُمِّهِ، تُوُفِّيَتْ قَبْلَ أَنْ تَقْضِيَهُ، فَقَالَ: «اقْضِهِ عَنْهَا». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ ﷺ سے اس نذر کے متعلق پوچھا جو اس کی والدہ پر تھی اور وہ اسے پوری کرنے سے پہلے ہی وفات پا گئی تھی۔ آپؐ نے فرمایا "تو اس کی طرف سے پوری کر دے۔" (بخاری و مسلم)

حاصل کلام: اس حدیث سے ثابت ہوا کہ حقوق واجبہ مالیہ کو پورا کرنا میت کے وارثوں کے ذمہ واجب ہے اور اس کیلئے میت کی طرف سے اسے پورا کرنے کی وصیت ضروری نہیں' ورثاء کو از خود ہی اپنی ذمہ داری کا احساس ہونا چاہئے۔ ورثاء میں اولاد بالخصوص اسے پورا کرنے کی زیادہ ذمہ دار ہے۔

راوی حدیث: ﴿سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ﴾ قبیلہ خزرج کے سردار تھے۔ تمام غزوات میں انصار کا علم ان کے ہاتھ میں ہوتا تھا۔ سخی سردار تھے۔ عربی لکھنا جانتے تھے۔ پیراکی اور تیر اندازی کے ماہر تھے۔ اسی لئے ان کو کامل (یعنی ہر فن مولا) کہتے تھے۔ کثرت سے صدقہ و خیرات کرنے والے تھے۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی بیعت کئے بغیر مدینہ سے نکل گئے تھے۔ ان کو جن نے دمشق کے مضافات حوران میں ۱۴ھ یا ۱۵ھ یا ۱۶ھ میں قتل کر دیا گیا تھا۔

(١١٨٤) وَعَنْ ثَابِتِ بْنِ

حضرت ثابت بن ضحاک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ

الضَّحَّاكِ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، قَالَ: نَذَرَ رَجُلٌ عَلَىٰ عَهْدِ رَسُولِ اللهِ ﷺ أَنْ يَنْحَرَ إِبِلاً بِبُوَانَةَ، فَأَتَى رَسُولَ اللهِ ﷺ، فَسَأَلَهُ، فَقَالَ: «هَلْ كَانَ فِيهَا وَثَنٌ يُعْبَدُ»؟ قَالَ: لاَ. قَالَ: «فَهَلْ كَانَ فِيهَا عِيْدٌ مِّنْ أَعْيَادِهِمْ»؟ فَقَالَ: لاَ. فَقَالَ: «أَوْفِ بِنَذْرِكَ، فَإِنَّهُ لاَ وَفَاءَ لِنَذْرٍ فِي مَعْصِيَةِ اللهِ، وَلاَ فِي قَطِيعَةِ رَحِمٍ، وَلاَ فِيمَا لاَ يَمْلِكُ ابْنُ آدَمَ». رَوَاهُ أَبُو دَاوُدَ وَالطَّبَرَانِيُّ، وَاللَّفْظُ لَهُ، وَهُوَ صَحِيْحُ ٱلإِسْنَادِ. وَلَهُ شَاهِدٌ مِّنْ حَدِيْثِ كَرْدَمٍ عِنْدَ أَحْمَدَ.

رسول اللہ ﷺ کے عہد مبارک میں ایک آدمی نے بوانہ کے مقام پر اونٹ ذبح کرنے کی نذر مانی۔ وہ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور اس کے متعلق پوچھا۔ تو آپؐ نے دریافت فرمایا "کیا اس جگہ بت تھا کہ جسے پوجا جاتا رہا ہو؟" اس نے کہا نہیں۔ آپؐ نے پوچھا "کیا وہاں ان کا کوئی میلہ تو نہیں لگتا تھا؟" اس آدمی نے کہا نہیں۔ تو پھر آپؐ نے فرمایا "اپنی نذر پوری کر۔ وہ نذر پوری نہیں کرنی چاہئے جس میں اللہ کی نافرمانی ہو یا قطع رحمی ہو اور جس کا پورا کرنا اس آدم کے بیٹے کے بس میں نہ ہو۔" (ابوداؤد' طبرانی اور یہ الفاظ طبرانی کے ہیں اور اس کی سند صحیح ہے اور مسند احمد میں کردم کی حدیث اس کی شاہد ہے)

لغوی تشریح: ﴿ ببوانۃ ﴾ پہلی "با" حرف جار ہے اور بوانۃ کی "با" پر ضمہ ہے اور فتحہ بھی کہا گیا ہے اور واؤ پر تخفیف۔ بوانہ شام اور دیار بکر کے درمیان واقع ہے اور ایک قول یہ بھی ہے کہ مکہ کے زیریں اور یلملم سے آگے جگہ ہے اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ ینبع کے آگے پھیلا ہوا پہاڑ یعنی میناء المدینہ ہے۔ یہ نذر ماننے والا شخص کردم تھا' اس کے اولاد نرینہ نہ ہوئی تھی۔ اس نے نذر مانی کہ اگر اس کے ہاں اولاد نرینہ ہوئی تو وہ بوانہ کے سر پر کئی بکریاں ذبح کرے گا۔ یہ حدیث دلیل ہے مباح کاموں میں نذر جائز ہے۔ بتوں کی جگہ یا کفار کے میلے ٹھیلوں کے مقام پر نحر و ذبح کرنا جملہ معاصی میں سے ہے اگرچہ اللہ کی رضا کے سوا اور کوئی مقصد نہ ہو اس لئے کہ اس میں ان کے شرک کے مظاہر اور ان کے دین کے شعار کی ترویج پائی جاتی ہے۔

راوی حدیث: ﴿ کردم رضی اللہ عنہ ﴾ کاف پر فتحہ اور راء ساکن۔ بن سفیان ثقفی۔ ان سے ان کی بیٹی میمونہ رضی اللہ عنہا اور عبداللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ نے روایت کیا ہے۔

(١١٨٥) وَعَنْ جَابِرٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، أَنَّ رَجُلاً قَالَ يَوْمَ الْفَتْحِ: يَا رَسُولَ اللهِ! إِنِّي نَذَرْتُ - إِنْ فَتَحَ اللَّهُ عَلَيْكَ مَكَّةَ - أَنْ أُصَلِّيَ

حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ایک شخص نے فتح مکہ کے روز آپؐ کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا' اے اللہ کے رسول (ﷺ)! میں نے نذر مانی تھی کہ اگر اللہ تعالیٰ نے آپؐ کے ہاتھوں مکہ فتح کر

فِيْ بَيْتِ المَقْدِسِ. فَقَالَ: **صَلِّ هَاهُنَا**. فَسَأَلَهُ، فَقَالَ: **صَلِّ هاهنا**، فَسَأَلَهُ فَقَالَ **فَشَأْنَكَ إِذَنْ**. رَوَاهُ أَحْمَدُ وَأَبُو دَاوُدَ، وَصَحَّحَهُ الحَاكِمُ.

دیا تو میں بیت المقدس میں نماز پڑھوں گا۔ آپؐ نے فرمایا "یہیں پڑھ لو۔" اس نے پھر پوچھا تو آپؐ نے فرمایا "یہیں پڑھ لو۔" اس نے پھر سوال کیا تو آپؐ نے فرمایا "تیری مرضی۔" (مسند احمد' ابوداؤد اور حاکم نے اسے صحیح قرار دیا ہے)

لغوی تشریح: ﴿ صل ههنا ﴾ اس جگہ پڑھ لو سے مراد مسجد حرام ہے۔ اس حدیث میں اس بات کی دلیل ہے کہ جس جگہ نذر پوری کرنے کی منت مانی ہو جب اس سے افضل جگہ پوری کر لی جائے تو نذر پوری ہو جائے گی بلکہ سیاق تو اسی کا مقتضی ہے کہ افضل مکان کو ترجیح حاصل ہے اگرچہ وہ جگہ نذر کی جگہ سے الگ ہو۔ ﴿ شانك ﴾ منصوب ہے معنی لازم پکڑے۔ ﴿ اذا ﴾ تنوین کے ساتھ معنی ہے کہ جب تو یہاں نماز پڑھنے سے انکاری ہے تو پھر جو تمہارا جی چاہے وہ کرو یا یہ معنی ہوگا کہ جو نذر تو نے بیت المقدس میں نماز پڑھنے کی مانی ہے وہیں جا کر پڑھو۔

(١١٨٦) وَعَنْ أَبِيْ سَعِيْدٍ الخُدْرِيِّ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ: «**لاَ تُشَدُّ الرِّحَالُ إِلاَّ إِلَى ثَلاَثَةِ مَسَاجِدَ: مَسْجِدِ الحَرَامِ، وَمَسْجِدِ الأَقْصَى، وَمَسْجِدِي هَذَا**». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ، وَاللَّفْظُ لِلْبُخَارِيِّ.

حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ نے نبی ﷺ سے روایت کیا ہے کہ آپؐ نے فرمایا "تین مساجد کے سوا اور کسی کیلئے زیارت کی غرض سے سفر نہ کیا جائے۔ مسجد حرام' مسجد اقصیٰ اور میری مسجد۔" (بخاری و مسلم۔ یہ الفاظ بخاری کے ہیں)

حاصل کلام: یہ حدیث باب الاعتکاف کے آخر میں پہلے گزر چکی ہے۔ اس جگہ اسے دوبارہ لانے کا غالباً مقصد یہ ہے کہ نذر کیلئے ان تین مقامات مقدسہ کے علاوہ اور کسی جگہ کو نذر پوری کرنے کیلئے متعین و مقرر نہ کیا جائے۔ (سبل السلام) یہ اشارہ اس طرف بھی ہے کہ ان تین مساجد میں سے کسی ایک جانب سفر کی نذر تو جائز ہے اور کسی جگہ کیلئے نہیں۔

(١١٨٧) وَعَنْ عُمَرَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، قَالَ: قُلْتُ: يَا رَسُولَ اللهِ! إِنِّيْ نَذَرْتُ فِي الجَاهِلِيَّةِ أَنْ أَعْتَكِفَ لَيْلَةً فِي المَسْجِدِ الحَرَامِ. قَالَ: **أَوْفِ بِنَذْرِكَ**. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ، وَزَادَ البُخَارِيُّ فِي رِوَايَةٍ: فَاعْتَكِفْ لَيْلَةً.

حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے عرض کیا اے اللہ کے رسول (ﷺ)! میں نے جاہلیت کے زمانہ میں نذر مانی تھی کہ میں مسجد حرام میں ایک رات اعتکاف کروں گا۔ آپؐ نے فرمایا "پھر اپنی نذر کو پورا کرو۔" (بخاری و مسلم) اور بخاری نے اپنی روایت میں اتنا اضافہ کیا ہے۔ پھر انہوں نے ایک

رات اعتکاف کیا۔

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ کافر نے حالت کفر میں جو نذر مانی تھی۔ اسلام لانے کے بعد اس کا پورا کرنا ضروری ہے۔ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ' امام ابن جریر طبری رحمۃ اللہ علیہ اور شوافع کی ایک جماعت کی رائے یہی ہے مگر جمہور کے نزدیک کافر کی نذر منعقد ہی نہیں ہوتی تو پوری کرنے کا کیا سوال۔ بعض مالکیہ نے یہ تاویل کی ہے کہ ممکن ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو بطور استحباب نذر پوری کرنے کا حکم ارشاد فرمایا ہو۔

١٤۔ كِتَابُ الْقَضَاءِ

قاضی (جج) وغیرہ بننے کے مسائل

(١١٨٨) عَنْ بُرَيْدَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «الْقُضَاةُ ثَلاَثَةٌ، اثْنَانِ فِي النَّارِ، وَوَاحِدٌ فِي الجَنَّةِ: رَجُلٌ عَرَفَ الحَقَّ فَقَضَى بِهِ فَهُوَ فِي الجَنَّةِ. وَرَجُلٌ عَرَفَ الحَقَّ فَلَمْ يَقْضِ بِهِ، وَجَارَ فِي الحُكْمِ فَهُوَ فِي النَّارِ. وَرَجُلٌ لَمْ يَعْرِفِ الحَقَّ، فَقَضَى لِلنَّاسِ عَلَى جَهْلٍ فَهُوَ فِي النَّارِ». رَوَاهُ الأَرْبَعَةُ، وَصَحَّحَهُ الحَاكِمُ.

حضرت بریدہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "قاضی کی تین اقسام ہیں' دو دوزخی ہیں اور ایک جنتی۔ ایک وہ شخص جس نے حق کو پہچانا اور اس کے مطابق فیصلہ کیا وہ جنتی ہے اور دوسرا وہ جس نے حق کی پہچان کر لی مگر فیصلہ حق کے ساتھ نہ دیا بلکہ فیصلہ میں ظلم کیا وہ دوزخی ہے اور تیسرا وہ جس نے نہ حق کو پہچانا نہ حق کے ساتھ فیصلہ کیا بلکہ اس نے لوگوں میں جہالت و نادانی سے فیصلہ کیا وہ بھی دوزخی ہے۔" (اسے ابوداؤد' ترمذی' نسائی اور ابن ماجہ نے روایت کیا ہے اور حاکم نے اسے صحیح قرار دیا ہے)

لغوی تشریح: ﴿جار فی الحکم﴾ فیصلہ میں جور و ظلم کیا ﴿علی جھل﴾ قضی کے فاعل سے حال ہے۔ یعنی لوگوں کا فیصلہ جہالت و نادانی سے کیا۔ اس کا ظاہر تو یہی ہے کہ وہ دوزخی ہے۔ اگرچہ اس کا فیصلہ حق کے موافق ہو کیونکہ فقضی للناس علی جھل کے قول کا اطلاق اس پر ہوتا ہے جس نے حق کے مطابق فیصلہ کیا مگر وہ خود اپنے فیصلہ سے جاہل و نادان ہے۔

حاصل کلام: اس حدیث میں عدالت میں فیصلہ کرنے والوں کی اقسام بیان ہوئی ہیں جنہیں قاضی یا جج کہا جاتا ہے۔ ان میں سے دو قسم کے قاضی تو ایسے ہیں جو دوزخ کا ایندھن بننے والے ہیں۔ ایک حق کو نہ جاننے اور پہچاننے والا اور دوسرا حق کو جان پہچان کر اس پر عمل پیرا نہ ہونے والا۔ اس میں اس کی بددیانتی کو بھی دخل ہو سکتا ہے۔ تفتیش و تحقیق میں سستی و لاپرواہی بھی ہو سکتی ہے اور دوزخ سے بچنے والا قاضی وہ ہے جو حق کو پہچان کر حق دار کو اس کا حق دیتا ہے کسی ملامت کرنے والے کی ملامت کی پروا

نہیں کرتا۔ اس سے معلوم ہوا کہ جاہل شخص کو عہدہ قضاء پر بٹھانا درست نہیں بلکہ غیر مجتہد کا جج بننا اور بنانا دونوں ناجائز ہے۔

(۱۱۸۹) وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «مَنْ وَلِيَ الْقَضَاءَ فَقَدْ ذُبِحَ بِغَيْرِ سِكِّينٍ». رَوَاهُ أَحْمَدُ وَالأَرْبَعَةُ، وَصَحَّحَهُ ابْنُ خُزَيْمَةَ وَابْنُ حِبَّانَ.

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "جس شخص کو منصب قضاء پر فائز کیا گیا (سمجھ لو) کہ اسے بغیر چھری کے ذبح کر دیا گیا۔" (اسے احمد اور چاروں نے روایت کیا ہے۔ ابن خزیمہ اور ابن حبان نے اسے صحیح قرار دیا ہے)

لغوی تشریح: ﴿ من ولی القضاء ﴾ تولیہ سے ماخوذ ہے۔ مجہول کا صیغہ ہے یعنی جسے قاضی بنایا گیا۔ ﴿ بغیر سکین ﴾ ایک قول کے مطابق ذبح کا معنوی مفہوم مراد ہے اس لئے کہ اگر اس نے صحیح فیصلہ دیا تو اہل دنیا اس کے درپے آزار ہوں گے۔ اگر غلط فیصلہ دیا تو آخرت میں عذاب میں مبتلا ہو گا اور ایک قول یہ ہے کہ یہ تعبیر اس لئے اختیار کی گئی ہے کہ اسے خبردار اور متنبہ کیا جائے کہ اس ہلاکت سے مراد اس کے دین کی بربادی و تباہی ہے' بدن کی نہیں یا یہ کہ چھری سے ذبح کرنے میں مذبوح کیلئے راحت ہوتی ہے اور بغیر چھری کے گلہ گھونٹنے یا کسی اور طرح سے زیادہ تکلیف کا باعث ہوتا ہے۔ لہٰذا اس کے ذکر سے ڈرانے اور خوف دلانے میں مبالغہ کا بیان ہے۔ مگر یاد رہے کہ گلہ گھونٹنے کو ذبح کرنا نہیں کہتے۔

(۱۱۹۰) وَعَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «إِنَّكُمْ سَتَحْرِصُونَ عَلَى الإِمَارَةِ، وَسَتَكُونُ نَدَامَةً يَوْمَ الْقِيَامَةِ، فَنِعْمَتِ الْمُرْضِعَةُ، وَبِئْسَتِ الْفَاطِمَةُ». رَوَاهُ الْبُخَارِيُّ.

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ ہی سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "بے شک تم لوگ ضرور حکومت کی حرص و خواہش کرو گے اور وہ قیامت کے روز لازماً باعث ندامت ہو گی۔ پس اچھی ہے دودھ پلانے والی ماں اور بری ہے دودھ چھڑانے والی ماں۔" (بخاری)

لغوی تشریح: ﴿ الامارۃ ﴾ ہمزہ کے نیچے کسرہ۔ معنی ولایت' حکومت' سربراہی۔ یہ ہر حکومت و ولایت کو شامل ہے۔ امامت عظمیٰ سے لے کر چھوٹی سے چھوٹی سربراہی و ولایت تک۔ ﴿ فنعمت المرضعۃ ﴾ اچھی دودھ پلانے والی دنیا میں اس لئے کہ یہ دودھ مال و دولت' جاہ و منصب اور عزت و کرامت کی صورت میں۔ حکم کے نافذ کرنے اور لوگوں کو دبا کر رکھنے کی صورت میں۔ حکومت و امارت کو مرضعہ سے تشبیہہ اس لئے دی گئی ہے کہ یہ بھی اسی طرح منافع بخش اور سود مند رہتی ہے جس طرح دودھ پلانے والی بکثرت دودھ دیتی ہے۔ ﴿ وبئست الفاطمۃ ﴾ فاطمۃ فطم سے ماخوذ ہے اور فطم کہتے ہیں بچے کے دودھ چھڑانے کو اور اس سے مراد قیامت کے روز تاوان ہے جو امارت پر مرتب ہو گا۔ یعنی امارت امیر کو محروم کرتی ہے اور اسے خیرات اور منافع سے الگ رکھتی ہے اور اسے تباہی کے گڑھوں اور

تاوان کے گرداب میں پھنسا کر گرا دیتی ہے اور یہ عام امراء کے حالات کے نقطۂ نظر سے ہے۔

حاصل کلام: اس حدیث میں امارت و سرداری سے بچنے اور اجتناب کی طرف متوجہ کیا گیا ہے کیونکہ دوسری حدیث میں ہے کہ حکومت و سربراہی دنیا میں ملامت اور حکومت سے فارغ ہوتے ہی ندامت و پشیمانی ہے اور آخرت میں باعث عذاب ہے۔ جس وقت حکومت کی کرسی پر براجمان ہوتا ہے تو عزت و توقیر ملتی ہے، دولت و ثروت ہاتھ آتی ہے، عوام ماتحت ہوتے ہیں، ان پر حکم چلتا ہے۔ ٹھاٹھ باٹھ جمتے ہیں۔ ایسی صورت میں بڑی اچھی لگتی ہے۔ مگر جب بدعنوانیوں اور بداعتدالیوں کا احتساب اس دنیا ہی میں شروع ہوتا ہے تو پچھتاوے کے سوا کچھ ہاتھ نہیں آتا اور آخرت کے حساب و کتاب کی سختی تو ایسی ہوگی جس کا اس دنیا میں تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ اسی خوف کے پیش نظر امت مسلمہ کے صلحاء اس سے کوسوں دور رہنے کی کوشش کرتے رہے حتیٰ کہ سزائیں بھگتیں مگر اس منصب پر بیٹھنے سے صاف انکار کر دیا اور یہ مراد بھی ہو سکتی ہے کہ حکومت اور سرداری کی ابتداء بڑی خوبصورت ہے مگر اس کا انجام خطرناک ہے۔ ابتداء میں انسان عیش و عشرت پاتا ہے جیسے عورت جب تک دودھ پلاتی ہے تو بچہ خوش رہتا ہے مگر جب دودھ چھڑاتی ہے تو بچے کو ناگوار گزرتا ہے۔

(۱۱۹۱) وَعَنْ عَمْرِو بْنِ الْعَاصِ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُ، أَنَّهُ سَمِعَ رَسُولَ اللهِ ﷺ يَقُولُ: «**إِذَا حَكَمَ الحَاكِمُ فَاجْتَهَدَ ثُمَّ أَصَابَ فَلَهُ أَجْرَانِ، وإِذَا حَكَمَ فاجْتَهَدَ ثُمَّ أَخْطَأَ فَلَهُ أَجْرٌ**». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ انہوں نے رسول اللہ ﷺ کو ارشاد فرماتے ہوئے سنا کہ "**جب کوئی حاکم فیصلہ کرتے وقت پوری جدوجہد کرے اور صحیح فیصلہ کرنے میں کامیاب بھی ہو جائے تو اسے دگنا ثواب ملتا ہے اور جب وہ فیصلہ کرنے میں جدوجہد تو پوری کرے مگر صحیح فیصلہ کرنے میں خطا کر جائے تو اسے ایک اجر ملے گا۔**" (بخاری و مسلم)

لغوی تشریح: ﴿فاجتهد﴾ خوب غور و خوض کر لے۔ ﴿فاصاب﴾ اور اس کی کوشش اور جدوجہد اللہ کے حکم و فیصلہ کے موافق ہو جائے۔ ﴿فله اجران﴾ تو اسے دو اجر ملیں گے ایک جدوجہد کا اور دوسرا صحیح نتیجہ تک پہنچنے کا۔ ﴿فله اجر﴾ اسے ایک اجر اس کی جدوجہد اور سعی و کوشش کا جو اس نے تلاش حق میں صرف کی کیونکہ اس کا اجتہاد عبادت ہے اور غلطی و خطاء پر اجر نہیں دیا جاتا بلکہ اس سے صرف اس کے گناہ معاف کر دیئے جاتے ہیں۔ علامہ خطابی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ اس شخص کیلئے ہے جو اجتہاد کے تمام آلات و ذرائع کا جامع، اصول اجتہاد سے واقف اور قیاس کی تمام اقسام کا عالم ہو اور جو شخص اجتہاد کا اہل نہ ہو وہ تو جان بوجھ کر اس مسئلہ میں الجھتا ہے لہٰذا غلطی و خطا کی صورت میں اسے معذور قرار نہیں دیا جائے گا بلکہ وہ گناہ گار ہے جیسا کہ ابھی شروع کی حدیث کے تحت رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ قاضی تین قسم کے ہوتے ہیں۔ الخ۔ نیز علامہ خطابی نے کہا ہے کہ ان کا تعلق ان

فروعات سے ہے جو مختلف وجوہ کا احتمال رکھتی ہیں مگر جو اصول کے مسائل ہیں اور ان کا تعلق ارکان شریعت اور ایسے امہات الاحکام سے ہے اور جو مختلف وجوہ کے احتمال نہیں رکھتے اور نہ ہی ان میں تاویل کی گنجائش ہے۔ ان میں غلطی کرنے والا خطا کار ہے اور غیر معذور ہے اور ان میں اس کا فیصلہ مردود ہے۔ جیسا کہ علامہ ملا علی قاری نے المرقاۃ میں ذکر کیا ہے۔ لیکن صحیح یہ ہے کہ اصولی مسائل میں ہی اس کا غلط فیصلہ مردود نہیں بلکہ مجتہد نے جس مسئلہ میں بھی غلطی کی ہو اور منشاء شریعت کی مخالفت کی ہو وہ مردود ہے خواہ اس کا تعلق اصول سے ہو یا فروع سے۔

(١١٩٢) وَعَنْ أَبِيْ بَكْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، قَالَ: سَمِعْتُ رَسُولَ اللهِ ﷺ يَقُولُ: «لاَ يَحْكُمْ أَحَدٌ بَيْنَ اثْنَيْنِ وَهُوَ غَضْبَانٌ». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت ابو بکرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے سنا ہے "تم میں سے کوئی بھی دو آدمیوں کے درمیان فیصلہ غصے کی حالت میں نہ کرے۔" (بخاری و مسلم)

لغوی تشریح: ﴿ وھو غضبان ﴾ بغیر تنوین یہ غیر منصرف ہے۔ دو اسباب کی بنا پر ایک وصف اور دوسرا الف اور نون زائدہ۔ معنی ہے حالت غضب۔ اس لئے کہ ایسی حالت میں وہ اجتہاد پر قدرت نہیں رکھتا اور دونوں کے مسئلہ میں غور و فکر صحیح طور پر نہیں کر سکتا۔ اسی پر قیاس کرتے ہوئے ہر اس حالت میں جو فکر انسانی میں تشویش کا باعث ہو فیصلہ کرنا درست نہیں۔ مثلاً بھوک' پیاس' زیادہ شکم سیری' اونگھ اور نیند کا غلبہ وغیرہ۔ بظاہر تو یہ نہی تحریمی ہے مگر جمہور نے اسے کراہت پر محمول کیا ہے مگر راجح قول پہلا ہی ہے کہ یہ حرام ہے۔

(١١٩٣) وَعَنْ عَلِيٍّ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «إِذَا تَقَاضَى إِلَيْكَ رَجُلاَنِ فَلاَ تَقْضِ لِلأَوَّلِ حَتَّى تَسْمَعَ كَلاَمَ الآخَرِ، فَسَوْفَ تَدْرِي كَيْفَ تَقْضِي». قَالَ عَلِيٌّ: فَمَا زِلْتُ قَاضِياً بَعْدُ. رَوَاهُ أَحْمَدُ وَأَبُو دَاوُدَ وَالتِّرْمِذِيُّ، وَحَسَّنَهُ وَقَوَّاهُ ابْنُ المَدِيْنِيِّ، وَصَحَّحَهُ ابْنُ حِبَّانَ، وَلَهُ شَاهِدٌ عِنْدَ الحَاكِمِ مِنْ حَدِيْثِ ابْنِ

حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "جب دو آدمی تیرے پاس فیصلہ کیلئے آئیں تو کسی ایک کے حق میں فیصلہ نہ کرو جب تک دوسرے کی بات نہ سن لو۔ اس سے تمہیں معلوم ہو جائے گا کہ تم نے فیصلہ کیسے کرنا ہے۔" حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا' اس دن سے میں اسی طرح فیصلہ کرتا ہوں۔ (اسے احمد' ابوداؤد' ترمذی نے روایت کیا ہے اور ترمذی نے اسے حسن قرار دیا ہے اور ابن مدینی نے اسے قوی کہا ہے اور ابن حبان نے اسے صحیح کہا ہے اور اس کا شاہد حاکم کے ہاں ابن عباس رضی اللہ عنہما کی حدیث سے ہے)

عَبَّاسٍ .

لغوی تشریح: ﴿ تقاضی ﴾ حاکم تسلیم کریں اور مقدمہ برائے فیصلہ پیش کریں۔ ﴿ فلا تقض للاول ﴾ مقدمہ لانے والوں میں سے پہلے یعنی مدعی کے حق میں فیصلہ نہ دے دو تاوقتیکہ دوسرے فریق مدعا علیہ کی بات سن لو۔ ﴿ فسوف تدری کیف تقضی ﴾ اس سے تمہیں معلوم ہو جائے گا کہ تم نے فیصلہ کیونکر کرنا ہے۔ اور ابوداؤد کی روایت میں ہے کہ یہ زیادہ مناسب اور بہتر ہے کہ فیصلہ تیرے روبرو واضح ہو جائے گا۔ ﴿ بعد ﴾ یعنی بعد کے دال پر ضمہ ہے کیونکہ اس وقت کسی کی طرف مضاف نہیں ہو رہا ہے مگر نیت میں مضاف الیہ ہے۔ یعنی رسول اللہ ﷺ کا انہیں بلانے اور تعلیم دینے کے بعد۔

حاصل کلام: اس حدیث سے ثابت ہوا کہ قاضی کو فریقین کے دلائل سماعت کرنے کے بعد فیصلہ دینا چاہئے اگر وہ اس کے خلاف عمل کرے گا تو یہ حرام ہوگا۔ فریقین کی بات اور دلائل سماعت کر کے فیصلہ دینا واجب ہے محض ایک فریق کے دلائل سن کر فیصلہ کر دینا باطل ہے اس کا کوئی اعتبار نہیں۔ رہا یہ سوال کہ اگر فریق ثانی خاموش رہے عدالت کے روبرو کچھ نہ کہے' نہ اقراری ہو نا انکاری یا فریق ثانی عدالت کی طلبی کے باوجود عدالت میں بیان دینے کیلئے حاضر ہی نہ ہو یا لیت و لعل سے کام لے تو کیا ایسے فریق کے خلاف یک طرفہ ڈگری دی جا سکتی ہے یا نہیں؟ قرین صواب بات یہی معلوم ہوتی ہے کہ پھر عدالت یک طرفہ فیصلہ دینے کی مجاز ہوگی۔ (سبل)

(١١٩٤) وَعَنْ أُمِّ سَلَمَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهَا قَالَتْ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «إِنَّكُمْ تَخْتَصِمُونَ إِلَيَّ، وَلَعَلَّ بَعْضَكُمْ أَنْ يَكُونَ أَلْحَنَ بِحُجَّتِهِ مِنْ بَعْضٍ، فَأَقْضِيَ لَهُ عَلَى نَحْوِ مَا أَسْمَعُ مِنْهُ، فَمَنْ قَطَعْتُ لَهُ مِنْ حَقِّ أَخِيهِ شَيْئاً فَإِنَّمَا أَقْطَعُ لَهُ قِطْعَةً مِنَ النَّارِ». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا کہتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "بے شک تم لوگ اپنے جھگڑے میرے پاس لے کر آتے ہو اور تم میں سے بعض اپنے دلائل بڑی خوبی و چرب زبانی سے بیان کرتا ہے تو میں نے جو کچھ سنا ہوتا ہے اسی کے مطابق اس کے حق میں فیصلہ کر دیتا ہوں۔ پس جسے اس کے بھائی کے حق میں سے کوئی چیز دوں تو میں اس کیلئے آگ کا ٹکڑا کاٹ کر دے رہا ہوں۔" (بخاری و مسلم)

لغوی تشریح: ﴿ تختصمون ﴾ فیصلہ کیلئے اپنے مقدمات اور اپنے تنازعات میرے پاس لاتے ہو۔ ﴿ الحن ﴾ لحن سے اسم تفضیل ہے۔ باب سمع سے۔ معنی ہے سمجھ' زیادہ معرفت حاصل کرنا' زیادہ پہچاننا۔ معلوم ہوا کہ جب وہ زیادہ فطین و سمجھدار ہوگا۔ وہ اپنی دلیل دوسرے کے مقابلہ میں زیادہ بلیغ طریقہ سے پیش کر سکے گا۔ ﴿ فمن قطعت لہ ﴾ جس کے حق میں فیصلہ کر کے دے دوں۔ یہ حدیث اس پر دلیل ہے کہ ظاہر بیانات کی روشنی میں فیصلہ واجب ہے۔ حاکم کا فیصلہ حقیقت میں کسی چیز میں کوئی تبدیلی پیدا نہیں کر سکتا اور نفس الامر میں نہ حرام کو حلال کر سکتا ہے اور نہ حلال کو حرام۔ جمہور بھی اسی طرف گئے

ہیں۔ مگر امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ قاضی کا فیصلہ ظاہری اور باطنی دونوں طرح نافذ ہو جاتا ہے مثلاً ایک جج جھوٹی شہادت کی بنیاد پر فیصلہ دیتا ہے کہ فلاں عورت فلاں کی بیوی ہے باوجودیکہ وہ خاتون اجنبی ہے اس مرد کیلئے حلال ہو جائے گی حالانکہ اس کی قباحت اور اس کا باطل ہونا کسی پر مخفی نہیں۔

(۱۱۹۵) وَعَنْ جَابِرٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: سَمِعْتُ رَسُولَ اللهِ ﷺ يَقُولُ: «كَيْفَ تُقَدَّسُ أُمَّةٌ لاَ يُؤْخَذُ مِنْ شَدِيدِهِمْ لِضَعِيفِهِمْ». رَوَاهُ ابْنُ حِبَّانَ، وَلَهُ شَاهِدٌ مِّنْ حَدِيثِ بُرَيْدَةَ عِنْدَ الْبَزَّارِ. وَآخَرُ مِنْ حَدِيثِ أَبِي سَعِيدٍ عِنْدَ ابْنِ مَاجَهْ.

حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا ہے کہ "وہ امت کیسے پاک ہو سکتی ہے جس میں طاقت ور سے کمزور کا حق نہ دلوایا جا سکے۔" (اسے ابن حبان نے روایت کیا ہے اور بزار کے ہاں بریدہ رضی اللہ عنہ کی حدیث اس کی شاہد ہے اور اس کا ایک اور شاہد ابن ماجہ میں حضرت ابو سعید رضی اللہ عنہ سے بھی مروی ہے)

لغوی تشریح: ﴿تقدس﴾ باب کرم سے فعل معلوم ہے یعنی گناہوں سے کیسے پاک ہوگی اور کیسے بابرکت ہوگی۔ ﴿من شدیدھم﴾ جب ظلم کیا جائے تو طاقتوروں سے ظلم کا بدلہ لیا جائے۔ سبل السلام میں ہے کہ اس سے مراد ہے کہ وہ امت جو قوی سے کمزور کو انصاف نہیں دلوا سکتی اور اس کا جو حق بنتا ہے وہ لے کر نہیں دیتی تو وہ گناہوں سے کیسے پاک ہو گی۔ لہٰذا کمزور کی مدد کرنا واجب ہے یہاں تک کہ قوی سے کمزور کا حق لیا جائے۔

حاصل کلام: اس حدیث کی رو سے طاقتور سے کمزور کا حق دلانا فرض ہے اگر کسی حکومت کے کارندے اور حاکم کمزور کو اس کا جائز حق دلوانے میں دیدہ دانستہ کوتاہی کے مرتکب ہوں اور قوم ان سے پوچھ نہ سکے اور ان کے ہاتھ پکڑ کر ان کو جواب دہی پر مجبور نہ کر سکے تو پھر ساری قوم مجبور شمار ہوگی کیونکہ آج کے دور میں ان کا انتخاب اور چناؤ عوام ہی اپنے ووٹوں سے کرتے ہیں۔ کرسی عدالت اور کرسی اقتدار پر براجمان کرانے والے یہی عوام ہی ہیں۔ لہٰذا عوام کو اپنے بچاؤ کی خاطر حکمرانوں پر غلط اقدام کی برملا مخالفت کرنی چاہئے اور ان کو راہ راست پر لانے کیلئے ہر ممکن تدبیر بروئے کار لانی چاہئے۔ گویا جو غریب و کمزور کا ہمدرد نہیں وہ آخرت میں جواب دہی کیلئے تیار رہے۔

(۱۱۹٦) وَعَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهَا قَالَتْ: سَمِعْتُ رَسُولَ اللهِ ﷺ يَقُولُ: «يُدْعَى بِالقَاضِي العَادِلِ يَوْمَ القِيَامَةِ، فَيَلْقَى مِنْ شِدَّةِ الحِسَابِ مَا يَتَمَنَّى أَنَّهُ لَمْ يَقْضِ

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے سنا ہے "قیامت کے روز عادل قاضی کو حساب کیلئے طلب کیا جائے گا وہ اپنے حساب کی شدت کو محسوس کر کے آرزو کرے گا کہ کاش وہ دنیا میں دو شخصوں کے درمیان اپنی عمر میں

بَيْنَ اثْنَيْنِ فِي عُمُرِهِ». رَوَاهُ ابْنُ حِبَّانَ، وَأَخرَجَهُ البَيْهَقِيُّ، وَلَفْظُهُ «فِي تَمْرَةٍ».

ایک فیصلہ بھی نہ کرتا۔" (اسے ابن حبان نے روایت کیا ہے اور بیہقی نے اس کو نقل کیا ہے۔) اس میں اتنا اضافہ ہے کہ "کبھی ایک کھجور کا بھی فیصلہ نہ کرتا۔"

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ قاضی کا عدالت الٰہی میں بڑا سخت احتساب ہوگا۔ اس لئے جس کے ذمہ انصاف ہو اسے چاہئے کہ وہ انصاف کرے ورنہ اپنے کئے کی سزا پائے گا۔

(۱۱۹۷) وَعَنْ أَبِي بَكْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ: «لَنْ يُفْلِحَ قَوْمٌ وَلَّوْا أَمْرَهُمُ امْرَأَةً». رَوَاهُ البُخَارِيُّ.

حضرت ابوبکرہ رضی اللہ عنہ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کی ہے کہ آپؐ نے فرمایا "ایسی قوم ہرگز فلاح نہیں پا سکتی جو عورت کو اپنا حاکم و فرمانروا بنا لے۔" (بخاری)

لغوی تشریح: ﴿ ولوا ﴾ تولیہ سے ماخوذ ہے۔ یعنی اپنے امور مملکت کا اس کو والی بنا لیں۔ یہ ہر امارت کیلئے عام ہے امارت عظمٰی سے لے کر چھوٹے سے چھوٹے منصب پر بولا جاتا ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ ارشاد اس موقع پر فرمایا تھا جب آپؐ کو خبر پہنچی کہ اہل فارس نے کسریٰ کی بیٹی کو اپنا حاکم و فرمانروا بنا لیا ہے۔ بنت کسریٰ وہی بوران بنت پرویز تھی۔ اسے اہل فارس نے اس وقت اپنا حاکم بنایا جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات مقدسہ کے آخری ایام تھے۔ جب مملکت فارس کے تخت کی چولیں متزلزل ہو رہی تھیں گردش ایام اور حوادث زمانہ نے ان کو ہلا کر رکھ دیا تھا۔ شیرویہ قباذ نے اپنے باپ کسریٰ پرویز کو قتل کر دیا اور ۷ھ میں تخت پر قابض ہوا اور ۹ھ میں وہ وفات پا گیا۔ عوام نے اردشیر کو جو ہنوز بچہ تھا فرمانروائے مملکت بنا لیا اسے ایک سربرآوردہ قائد نے قتل کر دیا جس کا نام شہر براز تھا۔ پھر وہ خود تخت نشین ہوا مگر چالیس روز بعد اسے بھی موت کے گھاٹ اتار دیا گیا اور بوران نامی شہزادی کو ۹ھ یا ۱۰ھ کے اوائل میں سربراہ مملکت بنا لیا۔ حدیث میں اس کی طرف اشارہ ہے۔

حاصل کلام: اس حدیث سے ثابت ہوا کہ عورت کی سربراہی موجب بربادی ہے۔ تاریخ اسلام میں اس کا کہیں ذکر نہیں۔ عہد رسالت کے بعد امہات المومنین میں سے بھی کسی کو یہ منصب نہیں سونپا گیا۔ جب عورت گھر کی سربراہ نہیں تو ملک کی باگ ڈور اس کے ہاتھ میں کس طرح دی جا سکتی ہے۔

(۱۱۹۸) وَعَنْ أَبِي مَرْيَمَ الأَزْدِيِّ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ: «مَنْ وَلاَّهُ اللَّهُ شَيْئاً مِنْ أَمْرِ المُسْلِمِينَ، فَاحْتَجَبَ عَنْ حَاجَتِهِمْ وَفَقْرِهِمُ احْتَجَبَ اللَّهُ دُونَ حَاجَتِهِ».

حضرت ابو مریم ازدی رضی اللہ عنہ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا ہے کہ آپؐ نے فرمایا "جس شخص کو اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کے کسی کام کا حاکم بنا دیا اور وہ پردہ میں رہا۔ ان کی ضروریات اور ان کی حاجات پوری کرنے میں' اللہ تعالیٰ بھی پردہ میں رہے گا اس کی

أَخْرَجَهُ أَبُو دَاوُدَ وَالتِّرْمِذِيُّ.

حاجت سے۔" (ابوداؤد اور ترمذی)

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ سرکاری اہل کار کو عوام کی ضروریات کا خیال رکھنا چاہئے۔ اسے اس منصب پر اس لئے فائز نہیں کیا گیا کہ خود تو دربانوں کے پہرے میں بنگلے میں میٹھی نیند سوئے اور غریب بے چارے مارے مارے پھریں۔ اس سے داد رسی کیلئے آئیں تو دربان اندر جانے ہی نہ دیں کہ صاحب اس وقت مصروف ہیں۔ جو حاکم ایسا رویہ اپنی رعایا کے ساتھ روا رکھے گا۔ اللہ تعالیٰ قیامت کے روز اس کی حاجت روائی و مشکل کشائی نہیں فرمائے گا۔

راوی حدیث: ﴿ ابو مریم ازدی رضی اللہ عنہ ﴾ ازدی' اسدی دونوں طرح مشہور ہیں' حضرمی بھی کہتے ہیں۔ شرف صحابیت سے مشرف تھے۔ شام میں حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے پاس آگئے تھے۔ ان کو یہ حدیث بیان کی۔

(١١٩٩) وَعَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: لَعَنَ رَسُولُ اللهِ ﷺ الرَّاشِيَ وَالْمُرْتَشِيَ فِي الْحُكْمِ. رَوَاهُ أَحْمَدُ وَالأَرْبَعَةُ، وَحَسَّنَهُ التِّرْمِذِيُّ، وَصَحَّحَهُ ابْنُ حِبَّانَ، وَلَهُ شَاهِدٌ مِنْ حَدِيْثِ عَبْدِاللهِ بْنِ عَمْرٍو عِنْدَ الأَرْبَعَةِ إِلاَّ النَّسَائِيَّ.

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فیصلے میں رشوت دینے والے اور رشوت لینے والے پر لعنت فرمائی ہے۔ (اسے احمد اور چاروں نے روایت کیا ہے اور ترمذی نے اسے حسن قرار دیا ہے اور ابن حبان نے اس کو صحیح قرار دیا ہے۔ نسائی کے علاوہ چاروں کے ہاں عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما کی حدیث اس کی شاہد ہے)

حاصل کلام: اس حدیث میں رشوت لینے اور دینے والے دونوں پر لعنت فرمائی ہے تو گویا رشوت لینا اور دینا کبیرہ گناہ ہے کیونکہ اس کے ذریعے حقوق العباد پر کھلے بندوں دن رات ڈاکہ ڈالا جاتا ہے۔ ایسے معاشرے میں لوگ ایک دوسرے کے خیر خواہ' ہمدرد اور غمگسار کیسے ہو سکتے ہیں؟

(١٢٠٠) وَعَنْ عَبْدِاللهِ بْنِ الزُّبَيْرِ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُما قَالَ: قَضَى رَسُولُ اللهِ ﷺ أَنَّ الْخَصْمَيْنِ يَقْعُدَانِ بَيْنَ يَدَيِ الْحَاكِمِ. رَوَاهُ أَبُو دَاوُدَ، وَصَحَّحَهُ الْحَاكِمُ.

حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے حکم دیا کہ جھگڑا کرنے والے دونوں حاکم کے روبرو بیٹھیں۔ (اسے ابوداؤد نے روایت کیا ہے اور حاکم نے اس کو صحیح قرار دیا ہے۔)

حاصل کلام: اس حدیث میں دو باتوں کی طرف توجہ دلائی گئی ہے ایک یہ کہ عدالت میں مدعی اور مدعا علیہ دونوں کو یکساں سلوک کا مستحق سمجھا جائے۔ کسی سے امتیازی سلوک روا نہ رکھا جائے۔ دوسرا یہ کہ مدعی اور مدعا علیہ دونوں حاکم کے سامنے بیٹھ کر بیان دیں' کھڑے ہو کر بیان نہ دیں۔

١ - بَابُ الشَّهَادَاتِ شہادتوں (گواہیوں) کا بیان

(۱۲۰۱) عَنْ زَيْدِ بْنِ خَالِدٍ الْجُهَنِيِّ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ قَالَ: «أَلاَ أُخْبِرُكُمْ بِخَيْرِ الشُّهَدَاءِ؟ هُوَ الَّذِي يَأْتِي بِشَهَادَتِهِ قَبْلَ أَنْ يُسْأَلَهَا». رَوَاهُ مُسْلِمٌ.

حضرت زید بن خالد جہنی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا "کیا میں تمہیں خبر نہ دوں کہ بہترین گواہ کون سے ہیں؟ وہ جو کہ بغیر گواہی طلب کئے ازخود ہی گواہی دے۔" (مسلم)

لغوی تشریح: ﴿ باب الشهادات ﴾ شہادت کی جمع ہے۔ کسی چیز کی صحت کی خبر واطلاع دینا۔ اپنی آنکھوں دیکھے حال اور مشاہدے کی بناء پر۔ مؤلف اسے جمع اس لئے لائے ہیں کہ اس کی بہت سی انواع واقسام ہیں۔ ﴿ قبل ان یسالها ﴾ فعل صیغۂ مجہول۔ یعنی گواہی طلب کئے بغیر ہی گواہی ازخود دے۔ بایں صورت کہ اس کے پاس کسی انسان کی شہادت کا حق تھا اور اس انسان کے علم میں بھی نہ ہو کہ وہ گواہ ہے۔ اس کے پاس آئے اور باخبر کرے کہ وہ اس کا گواہ ہے یا اس کے پاس طلاق یا عتاق یا وقف یا وصیت یا ایسے ہی دوسرے معاملہ کی شہادت ہے۔ اس پر لازم ہے کہ وہ قاضی کے پاس اسے لے جائے اور اعلان کرے تاکہ فی الحقیقت معاملات کی جو پوزیشن ہے وہ مکمل ہو جائے۔ اللہ تعالیٰ نے اداء شہادت کا حکم ارشاد فرمایا ہے اور اسے چھپانا گناہ قرار دیا ہے۔ ارشاد ہے: ولا تکتموا الشهادة ومن یکتمها فانه آثم قلبه (۲: ۲۸۳) "کہ گواہی کو مت چھپاؤ جو اسے چھپاتا ہے وہ گناہ گار ہے۔" اور فرمایا: واقیموا الشهادة (۶۵: ۲) "اور شہادت کو پورا کرو۔"

(۱۲۰۲) وَعَنْ عِمْرَانَ بْنِ حُصَيْنٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُما قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «إِنَّ خَيْرَكُمْ قَرْنِي، ثُمَّ الَّذِينَ يَلُونَهُمْ، ثُمَّ الَّذِينَ يَلُونَهُمْ، ثُمَّ يَكُونُ قَوْمٌ يَشْهَدُونَ، وَلاَ يُسْتَشْهَدُونَ، وَيَخُونُونَ وَلاَ يُؤْتَمَنُونَ، وَيَنْذِرُونَ وَلاَ يُوفُونَ، وَيَظْهَرُ فِيهِمُ السِّمَنُ». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت عمران بن حصین رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "میرا زمانہ، تمہارے تمام زمانوں سے بہتر ہے۔ پھر اس کے بعد والا۔ پھر اس کے بعد والا۔ اس کے بعد ایسے لوگ پیدا ہوں گے جو گواہی دیں گے اور ان سے گواہی طلب نہیں کی جائے گی۔ وہ خائن ہوں گے، امین نہیں ہوں گے۔ نذر مانیں گے مگر پورا نہیں کریں گے اور ان میں موٹاپا ظاہر و نمایاں ہوگا۔" (بخاری و مسلم)

لغوی تشریح: ﴿ قرنی ﴾ قرنی سے مراد ایسے زمانے کے لوگ جنہوں نے مجھے پایا اور مجھ پر ایمان لائے اور وہ صحابہ کرام ؓ ہیں۔ ﴿ ثم الذین یلونهم ﴾ یعنی پھر وہ لوگ ہیں جو ان کے مرتبہ کے قریب ہوں گے یا ایمان میں ان کی پیروی کریں گے یا ان کے زمانہ سے متصل ہوں گے بایں طور کہ انہوں نے ان کو پایا ہوگا اور ان سے استفادہ کیا ہوگا اور وہ تابعین کرام ہیں۔ ﴿ یشهدون ولا یستشهدون ﴾ یشهدون

پہلا صیغہ معروف اور دوسرا مجہول ہے یعنی وہ ایسے لوگ ہوں گے کہ قبل اس کے کہ ان سے شہادت طلب کی جائے' ازخود شہادت دیں گے۔ یہ حدیث بظاہر پہلی حدیث کے معارض معلوم ہوتی ہے اس لئے کہ اس حدیث سے ازخود شہادت دینے کی مذمت ہوتی ہے جبکہ پہلی حدیث میں اس کی مدح و تعریف کی گئی ہے۔ تعارض اس طرح دفع ہو جاتا ہے کہ مذمت مطلقاً ازخود شہادت پیش کرنے کی نہیں بلکہ جلدی سے ایسی شہادت دینے کی وجہ سے ہے جس سے جھوٹ ثابت کر سکیں اور باطل طریقہ سے کھا پی سکیں اور لوگوں کے حقوق پر ڈاکہ ڈال کر ہضم کر سکیں۔ جو شخص سیاق حدیث میں ذرا غور و تامل کرے گا وہ یہ کھلا ہوا فرق پا لے گا۔ ان دونوں احادیث کا خلاصہ یہ ہوا کہ طلب سے پہلے ازخود شہادت دینا بہتر اور عمدہ طریقہ ہے جبکہ یہ شہادت حقوق کے تحفظ کیلئے دی گئی ہو اور قبیح اس صورت میں ہے کہ حقوق کو ہڑپ کر جانے کی نیت ہو۔ ﴿ السمن ﴾ سین کے نیچے کسرہ اور میم پر فتحہ۔ لاغرپن کی ضد۔ یعنی موٹاپا۔ یعنی ان لوگوں کا مطمع نظر دنیا ہی ہو' دین نہ ہو۔ پھر یہ لوگ خوب کھائیں پئیں کہ بدنوں پر چربی چڑھ جائے اور جسم موٹے اور بھاری بھرکم ہو جائیں۔

حاصل کلام: اس حدیث میں بہترین زمانہ کی پیش گوئی ہے۔ سب سے بہتر زمانہ آپؐ کا عہد مبارک ہے۔ اس کے بعد صحابہ کرامؓ پھر تابعین کرام کا جس سے صحابہ کرامؓ اور تابعین عظام کی فضیلت ثابت ہوتی ہے۔ یہ فضیلت جمہور علماء کے نقطہ نظر سے فرداً فرداً بھی ہو سکتی ہے اور بحیثیت مجموعی بھی۔ لیکن اصحاب بدر اور حدیبیہ ہر اعتبار سے افضل ہیں۔ اس حدیث میں لفظ قرن آیا ہے۔ قرن کہتے ہیں زمانہ کی ایک مدت اور عرصہ کو جس کی حد دس سال سے لے کر ایک سو بیس سال بتائی گئی ہے۔ مگر صحیح ترین بات یہ ہے کہ ایک زمانہ کے لوگوں کا مقصود و مطلوب امور میں شریک ہونا مراد ہے اور اس حدیث میں بھی غالباً اسی معنی کی طرف اشارہ معلوم ہوتا ہے۔

(۱۲۰۳) وَعَنْ عَبْدِاللهِ بْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «لاَ تَجُوزُ شَهَادَةُ خَائِنٍ وَلاَ خَائِنَةٍ، وَلاَ ذِي غِمْرٍ عَلَى أَخِيهِ، وَلاَ تَجُوزُ شَهَادَةُ القَانِعِ لِأَهْلِ البَيْتِ». رَوَاهُ أَحْمَدُ وَأَبُو دَاوُدَ.

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "خائن مرد و عورت کی گواہی جائز نہیں اور دشمن اور کینہ ور شخص کی اپنے بھائی کے خلاف بھی گواہی جائز نہیں اور جو شخص کسی دوسرے کے زیر کفالت ہو اس کی گواہی کفیل خاندان کے حق میں جائز نہیں ہے۔" (مسند احمد و ابوداؤد)

لغوی تشریح: ﴿ ولا ذی غمر ﴾ غین کے نیچے کسرہ اور میم ساکن ہے۔ حقد و کینہ اور عداوت و دشمنی۔ ﴿ علی اخیه ﴾ اپنے مسلمان بھائی کے خلاف۔ پس کسی دشمن کی شہادت اس کے دشمن کے خلاف جائز نہیں۔ ﴿ القانع ﴾ سے مراد گھر کا خادم اپنی ضروریات کی تکمیل اور اہل خانہ کی خدمت کیلئے کٹ کر رہ

گیا ہو۔ جیسے خادم، تابع دار اور مزدور اس کی شہادت اہل خانہ کے حق میں قابل قبول نہیں، اس لئے کہ وہ شہادت دے کر اپنا فائدہ حاصل کرے گا اور یہ تہمت کا مقام ہے۔

حاصل کلام: اس حدیث سے خائن، دشمن اور کینہ ور کی شہادت ناجائز ہے۔ اسی طرح جو شخص کسی کے زیر کفالت ہو اس کی گواہی بھی اس شخص اور اس کے اہل خانہ کے حق میں قبول نہیں تاکہ جانب داری کا شبہ نہ رہے۔

(١٢٠٤) وَعَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، أَنَّهُ سَمِعَ رَسُولَ اللهِ ﷺ يَقُولُ: «لاَ تَجُوزُ شَهَادَةُ بَدَوِيٍّ عَلَى صَاحِبِ قَرْيَةٍ». رَوَاهُ أَبُو دَاوُدَ وَابْنُ مَاجَهْ.

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ انہوں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا کہ "صحرا نورد بدو (دیہاتی) کی گواہی شہری کے حق میں قابل قبول نہیں۔" (ابوداؤد و ابن ماجہ)

لغوی تشریح: ﴿ البدوی ﴾ بادیہ نشین۔ دیہات کا باشندہ۔ علامہ ابن کثیر رحمہ اللہ نے نہایہ میں کہا ہے کہ شہری کے حق میں دیہاتی کی شہادت کو اس وجہ سے ناپسند اور مکروہ قرار دیا گیا ہے کہ اس میں دین کے بارے میں سختی اور احکام شرع سے ناواقفیت ہوتی ہے اور اس وجہ سے قابل قبول نہیں کہ وہ لوگ شہادت کو اچھی طرح ضبط نہیں رکھ سکتے۔ سبل السلام میں ہے کہ اکثریت نے ان کی شہادت کو قبول کیا ہے اور اس حدیث کو ایسے دیہاتیوں پر محمول کیا ہے جن کی عدالت ثابت نہ ہو۔ کیونکہ اکثر و بیشتر ان کی عدالت معروف نہیں ہوتی۔

(١٢٠٥) وَعَنْ عُمَرَ بْنِ الخَطَّابِ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، أَنَّهُ خَطَبَ فَقَالَ: إِنَّ أُنَاساً كَانُوا يُؤْخَذُونَ بِالوَحْيِ فِي عَهْدِ رَسُولِ اللهِ ﷺ، وَإِنَّ الوحْيَ قَدِ انْقَطَعَ، وَإِنَّمَا نَأْخُذُكُمْ الآنَ بِمَا ظَهَرَ لَنَا مِنْ أَعْمَالِكُمْ. رَوَاهُ البُخَارِيُّ.

حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ انہوں نے خطبہ دیا اور فرمایا کہ عہد نبوی ؐ میں لوگوں کا مؤاخذہ وحی کے ذریعہ ہوتا تھا۔ اب وحی کا نزول بند ہو چکا ہے اب ہم تمہارا مؤاخذہ تمہارے اعمال کے مطابق کریں گے جیسے وہ ہمارے روبرو ظاہر ہوں گے۔ (بخاری)

حاصل کلام: اس اثر سے معلوم ہوا کہ رسول اللہ ﷺ پر وحی آتی تھی اور آپ ؐ کی وفات کے بعد یہ سلسلہ منقطع ہوگیا گویا نبوت کی تکمیل ہوگئی۔ اب نہ کوئی نیا نبی و رسول آئے گا اور نہ وحی آسمان سے نازل ہوگی۔ اب اگر کوئی اس بات کا دعویٰ کرتا ہے کہ اس پر آسمان سے وحی نازل ہوتی ہے تو وہ سراسر دروغ گو، کذاب اور مفتری اور دائرۂ اسلام سے خارج ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا مقصود یہ ہے کہ عہد رسالت مآب ﷺ میں تو لوگوں کے بارے میں معلومات کا ذریعہ وحی الٰہی تھی مگر اب ایک شخص کے ظاہری حالات و اعمال کو دیکھ کر فیصلہ کریں گے اگر اس کے ظاہری اعمال و احوال شک و شبہ سے محفوظ ہیں تو وہ قابل

اعتبار ہے ورنہ نہیں۔

(١٢٠٦) وَعَنْ أَبِيْ بَكْرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُ، عَنِ النَّبِيِّ ﷺ، أَنَّهُ عَدَّ شَهَادَةَ الزُّوْرِ فِي أَكْبَرِ الْكَبَآئِرِ. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ فِيْ حَدِيْثٍ طَوِيْلٍ.

حضرت ابوبکرہ رضی اللہ عنہ نے نبی ﷺ سے روایت کیا ہے کہ آپؐ نے جھوٹی گواہی کو بڑے گناہوں میں شمار کیا ہے۔ (بخاری و مسلم کی لمبی حدیث میں ہے)

حاصل کلام: اس حدیث کی رو سے معلوم ہوا کہ کبیرہ گناہ بہت سے ہیں مثلاً اللہ کے ساتھ کسی کو شریک ٹھہرانا، والدین کی نافرمانی کرنا، میدان کارزار سے بلاوجہ فرار، پاک دامن خاتون کی عصمت پر تہمت لگانا وغیرہ کے علاوہ جھوٹی گواہی دینا، کبیرہ گناہ وہ ہے جس کی شریعت نے سزا مقرر کی ہو یا عذاب آخرت کی وعید دی گئی ہو۔ عدالتوں میں جھوٹی گواہی کا سلسلہ اگر بند ہو جائے تو انصاف نہایت ارزاں اور جلد مل جائے۔ عدالتی نظام کے فساد کی جڑ جھوٹی گواہی ہے مزید برآں رشوت۔ اس نظام کو ان دو بڑی خرابیوں سے پاک کر دیا جائے تو معاشرہ میں امن و سلامتی کی بہاریں آجائیں۔

(١٢٠٧) وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُمَا، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ قَالَ لِرَجُلٍ: «تَرَى الشَّمْسَ؟» قَالَ: نَعَمْ. قَالَ: «عَلَى مِثْلِهَا فَاشْهَدْ، أَوْدَعْ». أَخْرَجَهُ ابْنُ عَدِيٍّ بِإِسْنَادٍ ضَعِيفٍ، وَصَحَّحَهُ الْحَاكِمُ فَأَخْطَأَ.

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے ایک آدمی سے فرمایا "تو سورج کو دیکھتا ہے؟" اس نے عرض کیا جی ہاں! آپؐ نے فرمایا "اس طرح کی روشن شہادت ہو تو گواہی دے ورنہ چھوڑ دے۔" (اسے ابن عدی نے ضعیف سند سے نکالا ہے اور حاکم نے اسے صحیح کہا ہے مگر غلطی کی ہے)

حاصل کلام: اس حدیث کی رو سے گواہی اس وقت دینی چاہئے جب اس کے روز روشن کی طرح ہونے کا یقین ہو ورنہ گواہی سے اجتناب بہتر ہے۔ محض گمان اور ظن کی بنیاد پر گواہی دینا درست نہیں۔

(١٢٠٨) وَعَنْهُ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُ أَنَّ رَسُولَ اللّٰهِ ﷺ قَضَى بِيَمِيْنٍ وَشَاهِدٍ. أَخْرَجَهُ مُسْلِمٌ وَأَبُو دَاوُدَ وَالنَّسَآئِيُّ، وَقَالَ: إِسْنَادُهُ جَيِّدٌ.

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما ہی اس کے راوی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک قسم اور ایک گواہ کی بنیاد پر فیصلہ فرمایا۔ (اس کی روایت مسلم، ابوداؤد اور نسائی نے کی ہے اور کہا ہے کہ اس کی سند عمدہ ہے)

لغوی تشریح: ﴿بیمین و شاھد﴾ یہ اس صورت میں ہے جبکہ مدعی کے پاس صرف ایک گواہ ہو تو مدعی سے دوسرے گواہ کی جگہ قسم کو قبول کر لیا جائے۔ امام مالک رحمہ اللہ، امام شافعی رحمہ اللہ، احمد رحمہ اللہ اور اسحٰق بن راھویہ رحمہ اللہ اور جمہور امت اسی طرف گئے ہیں اور انہوں نے کہا ہے کہ مالی معاملات میں ایک گواہ اور ایک قسم جائز ہے البتہ غیر مالی معاملات میں ان کے نزدیک دو گواہوں کا ہونا ناگزیر اور لازمی ہے۔ رہے

امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ تو ان کے نزدیک مالی معاملات ہوں یا غیر مالی معاملات دونوں میں دو گواہوں کا ہونا لابدی ہے (ضروری و لازمی ہے) اس باب کی تقریباً تیس کے قریب احادیث ان کے خلاف حجت ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے جس ارشاد سے انہوں نے استدلال کیا ہے وہ یہ ہے۔ واشھدوا ذوی عدل منکم (٦٥ : ٢) اور اللہ کا فرمان : واستشھدوا شھیدین من رجالکم الخ (٢ : ٢٨٢) اس سے ان کا استدلال کامل نہیں بالخصوص جبکہ وہ مفہوم مخالف کے قائل نہیں۔ علامہ ابن قیم رحمۃ اللہ علیہ نے اعلام الموقعین (ج ١، ص : ٣٢-٣٨) میں اس موضوع پر سیر حاصل بحث کی ہے جو قابل ملاحظہ ہے۔

(١٢٠٩) وَعَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ مِثْلَهُ. أَخْرَجَهُ أَبُو دَاوُدَ وَالتِّرْمِذِيُّ، وَصَحَّحَهُ ابْنُ حِبَّانَ.

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے بھی اسی طرح کی ایک روایت ہے۔ (اس کی تخریج ابوداؤد اور ترمذی نے کی ہے اور ابن حبان نے اسے صحیح کہا ہے)

٢ - بَابُ الدَّعْوَى وَالبَيِّنَاتِ

دعویٰ اور دلائل کا بیان

(١٢١٠) عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ قَالَ: «لَوْ يُعْطَى النَّاسُ بِدَعْوَاهُمْ لَادَّعَى نَاسٌ دِمَاءَ رِجَالٍ وَأَمْوَالَهُمْ، وَلَكِنَّ اليَمِينَ عَلَى المُدَّعَى عَلَيْهِ». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

وَلِلْبَيْهَقِيِّ بِإِسْنَادٍ صَحِيحٍ: «البَيِّنَةُ عَلَى المُدَّعِي، وَاليَمِيْنُ عَلَى مَنْ أَنْكَرَ».

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "اگر لوگوں کو محض ان کے دعوے کرنے سے حق دے دیا جائے تو لوگ دوسرے لوگوں کے خون اور ان کے اموال کا دعویٰ کریں گے لیکن مدعا علیہ کے ذمہ قسم لازم ہے۔" (بخاری و مسلم) اور بیہقی نے صحیح سند سے روایت کیا ہے کہ گواہ مدعی کے ذمہ اور قسم اس کے ذمہ جو اس کا انکار کرے۔

لغوی تشریح : ﴿ باب الدعوی والبینات ﴾ ' بینات ۔ بینۃ کی جمع ہے اس کی با پر فتحہ ہے اور یا مکسورہ پر تشدید ہے۔ اس کے معنی واضح دلیل و ثبوت کے ہیں۔ اس کو بینۃ اس لئے کہتے ہیں کہ وہ حق کو صاف اور واضح طور پر ظاہر کرتی ہے اور اس سے مراد وہ دلیل ہے جس سے مدعا واضح ہو جاتا ہے۔

حاصل کلام : اس حدیث میں قضا کا ایک اہم اصول بیان کیا گیا ہے کہ مدعی اپنا دعویٰ دلائل سے ثابت کرے اور گواہ پیش کرے یا مدعا علیہ' مدعی کے دعویٰ کی خود تصدیق کر دے کہ اس کا بیان درست ہے۔ اگر ایسا نہ ہو سکے تو مدعا علیہ۔ دعویٰ کے خلاف اپنے دلائل عدالت کے روبرو پیش کرے اگر وہ ایسا نہ کر سکے تو پھر مدعا علیہ قسم دے۔ جمہور کا یہی مذہب ہے۔

(١٢١١) وَعَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ عَرَضَ

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک قوم پر قسم پیش کی تو وہ قسم کھانے پر فوراً

عَلٰى قَوْمٍ اليَمِيْنَ فَأَسْرَعُوا، فَأَمَرَ أَنْ يُسْهَمَ بَيْنَهُمْ فِي اليَمِيْنِ، أَيُّهُمْ يَحْلِفُ . رَوَاهُ البُخَارِيُّ.

تیار ہوگئے تو آپؐ نے حکم فرمایا کہ "ان لوگوں میں قرعہ اندازی کی جائے کہ کون ان میں سے قسم کھائے گا۔" (بخاری)

لغوی تشریح: ﴿ فاسرعوا ﴾ یعنی دونوں فریق ایک دوسرے سے آگے بڑھ کر قسم اٹھانے کیلئے تیار ہوگئے۔ ﴿ فامرهم ان يسهم ﴾ صیغہ مجہول۔ یعنی قرعہ اندازی کی جائے۔ پس قرعہ جس کے نام کا نکلا وہ حلف اٹھائے، قسم کھائے۔ ابوداؤد نے حضرت ابوھریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت بیان کی ہے وہ اس حدیث کے معنی کی صحیح تفسیر ہے کہ دو آدمیوں نے کسی مال و متاع کے سلسلہ میں جھگڑا نبی ﷺ کی عدالت میں پیش کیا۔ دونوں میں سے کسی کے پاس بھی گواہ نہیں تھا تو نبی ﷺ نے فرمایا کہ "قسم کے بارے میں تم دونوں قرعہ اندازی کرو کہ کون قسم اٹھائے۔"

حاصل کلام: جس مقدمہ کی نوعیت ایسی ہو کہ فریقین مدعی ہوں اور دونوں باہم مدعا علیہ بھی ہوں بالفرض دیگر حتمی اور یقینی طور پر اس کا علم نہ ہو سکے کہ مدعی کون ہے اور مدعا علیہ کون تو ایسی صورت میں دونوں کو قسم دینے کا حق پہنچتا ہے۔ اگر ان میں سے کوئی قسم سے انکاری ہو تو فریق مخالف قسم دے کر مال اپنے قبضہ میں لے لے گا اور اگر دونوں فریق قسم اٹھانے پر آمادہ ہوں تو پھر ایسی صورت میں قرعہ اندازی کی جائے گی۔ قرعہ جس کے نام نکلے وہ قسم دے کر مال لے جانے کا مستحق قرار پائے گا۔

(۱۲۱۲) وَعَنْ أَبِيْ أُمَامَةَ الحَارِثِيِّ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ، أَنَّ رَسُولَ اللهِ ﷺ قَالَ: «مَنِ اقْتَطَعَ حَقَّ امْرِئٍ مُسْلِمٍ بِيَمِينِهِ فَقَدْ أَوْجَبَ اللّٰهُ لَهُ النَّارَ، وَحَرَّمَ عَلَيْهِ الجَنَّةَ». فَقَالَ لَهُ رَجُلٌ: وَإِنْ كَانَ شَيْئاً يَسِيْراً يَا رَسُولَ اللهِ؟ قَالَ: «وَإِنْ كَانَ قَضِيباً مِنْ أَرَاكٍ». رَوَاهُ مُسْلِمٌ.

حضرت ابوامامہ حارثی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "جس کسی نے اپنے مسلمان بھائی کا حق اپنی قسم کے ذریعہ مارا۔ اس کیلئے اللہ تعالیٰ نے دوزخ واجب کر دی ہے اور اس پر جنت حرام قرار دے دی ہے۔" ایک شخص نے عرض کیا، اے اللہ کے رسول (ﷺ)! اگرچہ کوئی حقیر و معمولی چیز ہو؟ آپؐ نے فرمایا کہ "اگرچہ درخت پیلو کی ایک شاخ ہو۔" (مسلم)

لغوی تشریح: ﴿ القضيب ﴾ شاخ، ٹہنی، ﴿ والاراك ﴾ ھمزہ پر فتحہ مشہور و معروف درخت ہے جس کے پتے اونٹ بڑے شوق سے کھاتے ہیں۔ اردو زبان میں اسے پیلو کا درخت کہتے ہیں۔

راوی حدیث: ﴿ ابوامامہ رضی اللہ عنہ ﴾ یہ صاحب ابوامامہ بن ثعلبہ انصاری حارثی تھے۔ ان کے نام میں بہت اختلاف ہے۔ صحیح یہ ہے کہ ان کا نام ایاس بن ثعلبہ تھا۔ یہ بنو حارث بن خزرج یا ایک قول کے مطابق بلوی تھے۔ انصار کے حلیف تھے اور قدماء صحابہ کرام میں سے تھے۔ اپنی والدہ کی تیمار داری کی وجہ سے غزوۂ بدر میں شریک نہ ہو سکے۔

(۱۲۱۳) وَعَنِ الْأَشْعَثِ بْنِ قَيْسٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ أَنَّ رَسُولَ اللهِ ﷺ قَالَ: «مَنْ حَلَفَ عَلَى يَمِينٍ، يَقْتَطِعُ بِهَا مَالَ امْرِئٍ مُسْلِمٍ، هُوَ فِيهَا فَاجِرٌ، لَقِيَ اللَّهَ وَهُوَ عَلَيْهِ غَضْبَانُ». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت اشعث بن قیس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "جو شخص قسم کھا کر کسی دوسرے کا مال اڑا لے اور وہ اس میں جھوٹا ہو تو اللہ تعالیٰ سے ایسی حالت میں ملاقات کرے گا کہ وہ اس پر سخت ناراض ہو گا۔" (بخاری و مسلم)

راوی حدیث: ﴿ اشعث بن قیس رضی اللہ عنہ ﴾ اشعث بن قیس بن معدیکرب' کندی ابو محمد ان کی کنیت تھی۔ کوفہ میں فروکش ہوئے۔ یوم یرموک میں ان کی ایک آنکھ ضائع ہو گئی۔ بڑے سخی' مہربان انسان تھے۔ قسم کھائی اور اس کا کفارہ پندرہ ہزار دیا۔ آزر بائیجان کے والی بنے۔ صفین میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ تھے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی وفات کے چالیس روز بعد وفات پائی۔ اس وقت ۶۳ برس کے تھے۔

(۱۲۱٤) وَعَنْ أَبِي مُوسَى رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، أَنَّ رَجُلَيْنِ اخْتَصَمَا فِي دَابَّةٍ، وَلَيْسَ لِوَاحِدٍ مِّنْهُمَا بَيِّنَةٌ، فَقَضَى بِهَا رَسُولُ اللهِ بَيْنَهُمَا نِصْفَيْنِ. رَوَاهُ أَحْمَدُ وَأَبُو دَاوُدَ وَالنَّسَائِيُّ، وَهٰذَا لَفْظُهُ، وَقَالَ: إِسْنَادُهُ جَيِّدٌ.

حضرت ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ دو آدمیوں کا ایک جانور کے بارے میں جھگڑا ہوا۔ ان میں سے کسی کے پاس کوئی دلیل نہیں تھی تو آپ ؐ نے اس جانور کو ان دونوں کے درمیان آدھا آدھا دینے کا فیصلہ فرمایا۔ (اسے احمد' ابوداؤد اور نسائی نے روایت کیا ہے' یہ الفاظ نسائی کے ہیں۔ اس کی سند عمدہ اور اچھی ہے)

حاصل کلام: علامہ خطابی نے کہا ہے' ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس اونٹ یا جانور کو دونوں نے اپنے ہاتھ میں پکڑ رکھا تھا۔ تب ہی نبی ﷺ نے ان دونوں کو آدھے آدھے کا مستحق قرار دیا۔ اگر یہ بات نہ ہوتی۔ یعنی ان دونوں کے علاوہ وہ کسی تیسرے آدمی کے قبضے میں ہوتا تو صرف دعوے سے وہ دونوں حقدار نہ بن سکتے تھے۔ ملا علی قاری نے کہا ہے کہ یہ بھی احتمال ہے کہ وہ جانور کسی تیسرے آدمی کے پاس ہو جس کا ان دونوں کے ساتھ کوئی تنازعہ نہ ہو۔

(۱۲۱۵) وَعَنْ جَابِرٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ قَالَ: «مَنْ حَلَفَ عَلَى مِنْبَرِي هَذَا بِيَمِينٍ آثِمَةٍ تَبَوَّأَ مَقْعَدَهُ مِنَ النَّارِ». رَوَاهُ أَحْمَدَ وَأَبُو دَاوُدَ وَالنَّسَائِيُّ، وَصَحَّحَهُ ابْنُ حِبَّانَ.

حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا "جس کسی نے میرے اس منبر پر کھڑے ہو کر جھوٹی قسم کھائی تو اس نے اپنا ٹھکانا جہنم میں بنا لیا۔" (اسے احمد' ابوداؤد اور نسائی نے روایت کیا ہے اور ابن حبان نے اسے صحیح قرار دیا ہے)

لغوی تشریح: ﴿ آثمۃ ﴾ جھوٹی قسم جو موجب گناہ ہو۔ اس حدیث میں تنبیہہ ہے کہ جو مقام جتنا مرتبہ

و فضیلت والا ہوگا وہاں ارتکاب گناہ کا عذاب بھی بہت زیادہ ہوگا۔ اسی طرح اوقات جن کی فضیلت بیان ہوئی ہے مثلاً عصر کے بعد اور جمعہ کے دن' رات میں جو گناہ کیا جائے گا اس کی سزا بھی زیادہ اور سخت ہوگی۔

(١٢١٦) وَعَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «ثَلاَثَةٌ لاَ يُكَلِّمُهُمُ اللَّهُ يَوْمَ القِيَامَةِ، وَلاَ يَنْظُرُ إِلَيْهِمْ، وَلاَ يُزَكِّيهِمْ، وَلَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ: رَجُلٌ عَلَى فَضْلِ مَاءٍ بِالفَلاَةِ يَمْنَعُهُ مِنِ ابْنِ السَّبِيلِ. وَرَجُلٌ بَايَعَ رَجُلاً بِسِلْعَةٍ بَعْدَ العَصْرِ، فَحَلَفَ لَهُ بِاللهِ: لَأَخَذَهَا بِكَذَا وَكَذَا، فَصَدَّقَهُ، وَهُوَ عَلَى غَيْرِ ذَلِكَ. وَرَجُلٌ بَايَعَ إِمَاماً لاَ يُبَايِعُهُ إِلاَّ لِلدُّنْيَا فَإِنْ أَعْطَاهُ مِنْهَا وَفَى، وَإِنْ لَمْ يُعْطِهِ مِنْهَا لَمْ يَفِ». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "تین آدمی ایسے ہیں کہ قیامت کے روز اللہ تعالیٰ ان سے کلام نہیں کرے گا اور نہ ان کی جانب نظر (رحمت) کرے گا اور نہ ان کو گناہوں سے پاک کرے گا بلکہ ان کیلئے درد ناک عذاب ہوگا۔ پہلا وہ آدمی جو ایک مسافر کو جنگل میں بچے ہوئے پانی سے روکتا ہے اور دوسرا وہ آدمی جو عصر کے بعد کسی چیز کا دوسرے سے سودا کرتا ہے اور اللہ کی قسم کھاتا ہے کہ اس نے اس چیز کو اتنے اتنے میں خریدا ہے حالانکہ حقیقت ایسے نہ تھی اور وہ خریدار اس کو سچ مان گیا اور تیسرا وہ شخص جس نے دنیاوی غرض کے لئے کسی بادشاہ کی بیعت کی اگر بادشاہ اس کو کچھ دیتا ہے تو وہ وفا کرتا ہے اور اگر وہ اس کو کچھ نہیں دیتا (یعنی دنیا کا مال) تو وہ وفا نہیں کرتا۔) (بخاری و مسلم)

لغوی تشریح: ﴿علی فضل ماء﴾ اپنی ضرورت و حاجت سے زائد پانی۔ ﴿بالفلاة﴾ ایسا وسیع صحراء کہ جو کسی کی ملکیت میں نہ ہو اور پھر بھی وہ پانی کو روک لے اور کسی دوسرے کو نہ دے۔ ﴿بسلعة﴾ سین کے نیچے کسرہ اور لام ساکن سامان تجارت۔ ﴿فصدقة﴾ خریدار اس کی قسم کے پیش نظر اسے سچا سمجھے۔ ﴿وهو على غير ذلك﴾ سامان فروخت کرتے وقت درحقیقت ایسا نہ ہو بلکہ جھوٹا ہو۔ ﴿وفى﴾ اپنا عہد وفا پورا کرے اور اپنی بیعت سمع و طاعت کو نبھائے۔

حاصل کلام: اس حدیث کی رو سے زائد از ضرورت پانی کو روک لینا اور ضرورت مندوں کو لینے نہ دینا۔ عصر کے بعد جھوٹی قسم کھا کر مال فروخت کرنا اور دنیوی غرض کیلئے حاکم وقت کی تائید کرنا۔ رب کائنات کی سخت ناراضی کا موجب ہے اور رحمت الٰہی سے محرومی کا باعث ہے۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ گناہ کی حیثیت جس طرح کسی افضل مکان کی وجہ سے دوچند ہو جاتی ہے اسی طرح افضل وقت میں بھی اس کی

حیثیت بڑھ جاتی ہے۔

(۱۲۱۷) وَعَنْ جَابِرٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، أَنَّ رَجُلَيْنِ اخْتَصَمَا فِي نَاقَةٍ، فَقَالَ كُلُّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا: نُتِجَتْ عِنْدِيْ، وَأَقَامَا بَيِّنَةً، فَقَضَى بِهَا رَسُولُ اللهِ ﷺ لِمَنْ هِيَ فِي يَدِهِ.

حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ دو آدمی ایک اونٹنی کا مقدمہ عدالت نبویؐ میں لائے۔ ان میں سے ہر ایک کا یہ دعویٰ تھا کہ اونٹنی نے بچہ میرے ہاں جنا ہے اور دونوں نے اپنے اپنے گواہ بھی پیش کئے۔ پس رسول اللہ ﷺ نے اس شخص کے حق میں فیصلہ صادر فرمایا جس کے قبضہ میں اونٹنی تھی۔

لغوی تشریح: ﴿نتجت﴾ بچہ جنا۔ بناء للمفعول۔ اس حدیث سے ثابت ہوتا ہے کہ قبضہ موافق شہادت مدعی کیلئے وجہ ترجیح ہے اور یہ کہ دونوں کے دلائل میں تعارض ہو تو ایک کے حق میں فیصلہ نہیں دیا جاسکتا۔ الآیہ کہ قابل ترجیح پہلو ہو اور قبضہ قابل ترجیح ہے۔

(۱۲۱۸) وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ رَدَّ الْيَمِيْنَ عَلَىٰ طَالِبِ الْحَقِّ. رَوَاهُمَا الدَّارَقُطْنِيُّ، وَفِيْ إِسْنَادِهِمَا ضَعْفٌ.

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے مدعی پر قسم ڈال دی۔ (ان دونوں احادیث کو دار قطنی نے روایت کیا ہے اور دونوں کی سند میں ضعف ہے)

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ مدعاعلیہ عدم ثبوت یا عدم شہادت کی صورت میں قسم اٹھانے سے بھی انکار کردے تو ایسی صورت میں مدعی سے قسم کھانے کیلئے کہا جائے گا اگر وہ قسم کھالے گا تو متنازعہ فیہ چیز اسے دے دی جائے گی۔

(۱۲۱۹) وَعَنْ عَائِشَةَ رَضِیَ اللهُ تَعَالٰی عَنْهَا، قَالَتْ: دَخَلَ عَلَيَّ النَّبِيُّ ﷺ ذَاتَ يَوْمٍ مَسْرُوْرًا، تَبْرُقُ أَسَارِيْرُ وَجْهِهِ، فَقَالَ: **«أَلَمْ تَرَ أَنَّ مُجَزِّزاً الْمُدْلِجِيَّ نَظَرَ آنِفاً إِلَىٰ زَيْدِ بْنِ حَارِثَةَ وَأُسَامَةَ بْنِ زَيْدٍ، فَقَالَ: هٰذِهِ الْأَقْدَامُ بَعْضُهَا مِنْ بَعْضٍ»**. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ ایک روز نبی ﷺ خوش و خرم میرے ہاں تشریف لائے۔ آپؐ کا رخ انور چمک رہا تھا۔ آپؐ نے فرمایا کہ "کیا تجھے معلوم نہیں کہ مجزز مدلجی نے ابھی زید بن حارثہ اور اسامہ بن زید (رضی اللہ عنہم) کو دیکھ کر کہا ہے کہ یہ پاؤں ایک دوسرے کا جزء ہیں۔" (بخاری و مسلم)

لغوی تشریح: ﴿تبرق﴾ "را" پر ضمہ باب نصر۔ چمک رہے تھے' روشن تھے۔ ﴿اساریر﴾ اسرار کی جمع ہے اور اسرۃ اور اسرار سر کی جمع ہے۔ سین کی زیر اور ضمہ دونوں جائز ہیں اور "راء" پر تشدید اور اسرۃ کی جمع سرر سرد کے سین اور را دونوں پر فتحہ۔ اساریر جمع الجمع ہے۔ چہرے کے خطوط جو پیشانی پر جمع ہو جاتے ہیں اور کبھی بکھر بھی جاتے ہیں۔ ﴿مجزز﴾ اسم فاعل کا صیغہ ہے باب تفعیل سے اور کبھی

اسے اسم مفعول بھی کہہ دیتے ہیں۔ یہ صاحب ابن اعور بن جعدہ تھے۔ یہ علم قیافہ کے عالم تھے۔ ابن یونس نے ان کا ذکر ان لوگوں میں کیا ہے جو فتح مصر میں حاضر تھے۔ ان کو مجزز اس لئے کہا جاتا تھا کہ زمانہ جاہلیت میں جب کوئی قیدی قید ہو کر آتا تو اس کی پیشانی کے بال کاٹ دیتا تھا اور اسے آزاد کر دیتا۔ ﴿ مدلجی ﴾ بنو مدلج کی جانب نسبت کی وجہ سے مدلجی کہلائے۔ مدلج باب افعال سے اسم فاعل کا صیغہ ہے۔ نسب یہ ہے مدلج بن مرہ بن عبد مناف بن کنانہ۔ مشہور و معروف قبیلہ ہے۔ قیافہ کا علم اس قبیلہ میں اور بنو اسد میں پایا جاتا تھا اور عرب ان کو اس سے جانتے پہچانتے تھے۔ ﴿ هذه الاقدام بعضها من بعض ﴾ ان دونوں کے مابین نسبی تعلق ہے اور یہ بات اس نے اس وقت کہی جب اس نے اسامہ اور زید کو اکٹھے لیٹے ہوئے دیکھا۔ دونوں کے چہرے اور سر چادر سے ڈھانپے ہوئے تھے اور قدم دراز تھے اور کھلے ہوئے تھے۔ آپ ؐ کی مسرت و انبساط اور خوشی کی وجہ یہ تھی کہ کچھ لوگ اسامہ رضی اللہ عنہ کے سیاہ رنگ ہونے کی وجہ سے ان کے نسب میں طعن کرتے تھے۔ کیونکہ ان کا باپ زید سفید رنگ کا تھا۔ باوجودیکہ طعن کا کوئی بہت بڑا مقام نہیں تھا کیونکہ ان کی والدہ ام ایمن کالے رنگ کی حبشی خاتون تھیں۔ اس حدیث سے معلوم ہوا ثبوت نسب کے سلسلہ میں قیافہ شناسی سے کام لیا جا سکتا ہے اور فیصلہ کرنے میں مددگار ثابت ہو سکتا ہے اور عدالت اسے تسلیم کرتی ہے۔

راوی حدیث: ﴿ مجزز مدلجی رضی اللہ عنہ ﴾ بنو مدلج سے ہونے کی وجہ سے مدلجی کہلائے۔ دور جاہلیت میں ان کی قیافہ شناسی مسلمہ تھی۔ ان کو مجزز اس لیے کہا گیا ہے کہ یہ قیدی بنائے اور ان کی پیشانی بال کاٹ دیئے گئے۔ مجزز محدث کے وزن پر ہے۔ مجزز بن اعور بن جعدہ کنانی مدلجی۔

١٥ - كِتَابُ الْعِتْقِ

آزادی کے مسائل

(١٢٢٠) عَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «أَيُّمَا امْرِىءٍ مُسْلِمٍ أَعْتَقَ امْرَأً مُسْلِماً اسْتَنْقَذَ اللَّهُ بِكُلِّ عُضْوٍ مِنْهُ عُضْواً مِنْهُ مِنَ النَّارِ». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

وَلِلتِّرْمِذِيِّ - وَصَحَّحَهُ - عَنْ أَبِي أُمَامَةَ: أَيُّمَا ٱمْرِىءٍ مُسْلِمٍ أَعْتَقَ ٱمْرَأَتَيْنِ مُسْلِمَتَيْنِ كَانَتَا فِكَاكَهُ مِنَ النَّارِ. وَلِأَبِيْ دَاوُدَ مِنْ حَدِيْثِ كَعْبِ ابْنِ مُرَّةَ: أَيُّما امْرَأَةٍ مُسْلِمَةٍ أَعْتَقَتِ ٱمْرَأَةً مُسْلِمَةً كَانَتْ فِكَاكَها مِنَ النَّارِ.

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "جس مسلمان نے کسی مسلمان غلام کو آزاد کیا اللہ تعالیٰ اس کے ہر عضو کو اس کے ہر عضو کے بدلے جہنم کی آگ سے آزاد فرما دے گا۔" (بخاری و مسلم) اور ترمذی میں ابوامامہ کی روایت ہے جسے ترمذی نے صحیح قرار دیا ہے کہ "جس مسلمان مرد نے دو مسلمان لونڈیوں کو آزاد کیا تو وہ دونوں اس مرد کے دوزخ سے آزاد ہونے کا سبب بن جائیں گے۔" اور ابوداؤد میں کعب بن مرہ کی روایت میں ہے کہ "جو مسلمان خاتون کسی مسلمان لونڈی کو آزاد کرے گی تو وہ اس کے جہنم سے آزاد ہونے کا موجب ہوگی۔"

لغوی تشریح: ﴿کتاب العتق﴾ عین کے کسرہ کے ساتھ اور "تاء" کے سکون کے ساتھ۔ آزادی دینا یعنی صرف اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل کرنے کے لئے کسی غلام کو آزاد کرنا۔ ﴿استنقذ﴾ جس نے بچایا، نجات دی۔ ﴿کانتا فکاکہ﴾ "فا" پر لغوی طور پر فتحہ اور کسرہ دونوں ہیں یعنی دونوں لونڈیاں آزادی بخشنے والے کی خلاصی و رہائی کا موجب بن جائیں گی۔ ﴿معتق﴾ کی "تا" کے نیچے کسرہ ہے۔ آزاد کرنے والا ﴿من النار﴾ یعنی ان دونوں کا آزاد کرنا نار جہنم سے اس کی خلاصی و رہائی کا سبب ہوگا۔

حاصل کلام: اس حدیث سے ثابت ہوا کہ کسی مسلمان غلام کو نعمت آزادی سے بہرہ ور کرنا بخشش و مغفرت اور جہنم سے آزادی کا موجب ہے اور رسول اللہ ﷺ نے مختلف انداز میں اس کی بڑی ترغیب دی ہے۔ یہ انسانیت پر نبی ﷺ کا بہت بڑا احسان ہے کہ آپؐ نے عہد غلامی کی زنجیروں سے انسانوں کو آزادی کی غیر مترقبہ نعمت سے نوازا ہے اور غلاموں کے حقوق سے خبردار کیا ہے ورنہ غلاموں کو تو جانوروں سے بھی بدتر حالات سے دوچار ہونا پڑتا تھا۔

راوی حدیث: ﴿کعب بن مرہ رضی اللہ عنہ﴾ بعض مرہ بن کعب بھی کہتے ہیں۔ پہلے بصرہ آئے پھر اردن منتقل ہو گئے۔ اور وہیں ۵۷ھ یا ۵۹ھ کو وفات پائی۔

(۱۲۲۱) وَعَنْ أَبِيْ ذَرٍّ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: سَأَلْتُ النَّبِيَّ ﷺ: أَيُّ العَمَلِ أَفْضَلُ؟ قَالَ: «**إِيمَانٌ بِاللهِ، وَجِهَادٌ فِي سَبِيلِهِ**». قُلْتُ: فَأَيُّ الرِّقَابِ أَفْضَلُ؟ قَالَ: «**أَغْلَاهَا ثَمَناً، وَأَنْفَسُهَا عِنْدَ أَهْلِهَا**». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے نبی ﷺ سے پوچھا کہ بہترین عمل کونسا ہے؟ آپؐ نے فرمایا کہ "اللہ پر ایمان لانا اور اس کے راستہ میں جہاد کرنا۔" میں نے عرض کیا کونسا غلام آزاد کرنا افضل ہے؟ فرمایا "وہ غلام جو قیمت میں زیادہ گراں اور مالکوں کی نظروں میں زیادہ نفیس و محبوب ہو۔" (بخاری و مسلم)

لغوی تشریح: ﴿ای الرقاب الفضل﴾ یعنی کسی غلام کا آزاد کرنا زیادہ ثواب کا باعث ہے؟ ﴿انفسها﴾ افعل التفضیل نفاست سے ہے۔ یعنی مالکوں کی نظروں میں زیادہ نفیس اور زیادہ پسندیدہ اور زیادہ معزز۔

(۱۲۲۲) وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «**مَنْ أَعْتَقَ شِرْكاً لَهُ فِي عَبْدٍ، فَكَانَ لَهُ مَالٌ يَبْلُغُ ثَمَنَ العَبْدِ، قُوِّمَ عَلَيْهِ قِيمَةَ عَدْلٍ، فَأَعْطَى شُرَكَاءَهُ حِصَصَهُمْ، وَعَتَقَ عَلَيْهِ العَبْدُ، وَإِلاَّ فَقَدْ عَتَقَ مِنْهُ مَا عَتَقَ**». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "جو شخص مشترکہ غلام میں سے اپنا حصہ آزاد کر دے اور اس کے پاس مزید اتنا مال بھی ہو کہ غلام کو خرید کر آزاد کر سکے تو انصاف سے اس کی قیمت مقرر کر کے دوسرے شرکاء کو ان کے حصہ کی قیمت ادا کر دے تو یہ غلام اس کی طرف سے آزاد ہو گا۔ ورنہ جتنا کچھ آزاد ہوا سو ہو چکا۔" (بخاری و مسلم)

وَلَهُمَا عَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ: «**وَإِلاَّ قُوِّمَ عَلَيْهِ، وَاسْتُسْعِيَ غَيْرَ مَشْقُوقٍ عَلَيْهِ**». وَقِيْلَ: إِنَّ السِّعَايَةَ مُدْرَجَةٌ فِي

دونوں نے ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے یہ الفاظ نقل کیے ہیں: "ورنہ اس کی قیمت لگائی جائے گی اور اس پر مشقت ڈالے بغیر اسے آزادی حاصل کرنے کا موقع دیا

الخَبَرِ. جائے گا۔" (اگلی عبارت کا مفہوم لغوی تشریح میں دیکھیں)

لغوی تشریح: ﴿ شـركـا ﴾ شین کے نیچے کسرہ اور "را" ساکن۔ معنی اس کے حصہ اور نصیب کے ہیں۔ ﴿ یبلغ ثمن العبد ﴾ یعنی غلام کی باقی قیمت۔ ﴿ قوم ﴾ صیغۂ مجہول۔ تقویم سے ماخوذ ہے۔ اس غلام کی عدل و انصاف سے قیمت طے کروائی جائے گی۔ ﴿ فاعطی شرکاء ہ ﴾ الخ یہ آزاد کرنے والا باقی شرکاء کو ان کے حصے کی قیمت ادا کرے گا اور یہ غلام پورے کا پورا اس کی جانب سے آزاد ہو جائے گا۔ یہ خبر ہے مگر امر کے معنی میں۔ مطلب یہ ہوا کہ اس آدمی پر اس غلام کا آزاد کرنا لازمی اور ضروری ہے اس سے جائے پناہ کوئی نہیں۔ ﴿ والا ﴾ یعنی اگر آزاد کرنے والے کے پاس مال نہ ہو۔ ﴿ فقد عتق الخ ﴾ عتق کی تا پر فتحہ ہے مطلب یہ ہے کہ پھر جتنا اس نے اپنا حصہ آزاد کیا ہے وہ آزاد ہو جائے گا اور باقی اسی طرح غلام رہے گا۔ ﴿ والا قوم علیہ واستسعی الخ ﴾ قوم اور استسعی دونوں صیغۂ مجہول ہیں۔ اس کا معنی یہ ہے کہ اگر آزاد کرنے والے کے پاس مزید اتنا مال نہیں ہے جو اس کی پوری قیمت کے برابر ہو تو پھر غلام کو کما کر لانے کی زحمت دی جائے گی اور اسے تکلیف دی جائے گی کہ وہ اتنا مال تلاش کرے جو دوسرے شریک کے حصہ کے برابر ہو جب غلام وہ حصہ مالک کے سپرد کر دے گا تو آزاد ہو جائے گا۔ ﴿ الاستسعاء ﴾ سے یہاں یہی مراد ہے۔ (اسی مادہ سے السعایہ بھی آتا ہے کہ جس کا معنی ہے "چغلی" کہا جاتا ہے کہ: "چغلی خبر میں لپٹی ہوئی ہوتی ہے۔")

اس مسئلہ میں فقہاء کا اختلاف ہے۔ بعض نے تو پہلی حدیث کو لے لیا کہ غلام کا بقیہ حصہ غلام ہی رہے اور اس سے سعی، کسب نہیں کرائی جائے گی اور کچھ نے کہا کہ نہیں اس میں کوئی حرج نہیں حالانکہ فقد عتق منه ما عتق کا جملہ کسب کے منافی نہیں ہے۔ اس قول کا خلاصہ یہ ہے کہ تمام شرکاء حصص میں سے صرف ایک کے حصہ کے آزاد کرنے سے فی الفور غلام پورا آزاد نہیں ہو گا۔ بلکہ اس کی حیثیت ایسے مکاتب کی ہو گی جس نے اپنی کتابت کا کچھ حصہ تو ادا کر دیا ہے اور کچھ ابھی باقی ہے۔ یہی رائے امام بخاری رحمہ اللہ کی ہے۔ اس قول کے حق میں دلیل موجود ہے کہ وہ غلام باقی حصے میں غلام ہی رہے اور مستقبل میں ہمیشہ رہے گا اور یہ کہ جتنا حصہ غلامی سے آزاد ہو چکا ہے اس میں کسب سعی کی ضرورت نہیں۔ ﴿ وقیل ان السعایۃ مدرجۃ فی الخبر ﴾ سبل السلام میں ہے کہ اس میں کوئی کلام نہیں کہ یہ جملہ بھی مرفوع روایت ہوا ہے۔ مدرج فی الخبر اور کہا گیا ہے غلام کیلئے حدیث میں سعی و کسب کا ذکر مدرج ہے مگر سبل السلام میں ہے کہ اس میں کوئی کلام نہیں کہ یہ جملہ بھی مرفوع روایت ہوا ہے۔ جب تک اس پر مضبوط دلیل قائم نہ ہو اسے مدرج نہیں کہا جا سکتا۔

(۱۲۲۳) وَعَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «لاَ يَجْزِي وَلَدٌ وَالِدَهُ إِلاَّ أَنْ

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "کوئی بیٹا باپ کیلئے کافی نہیں۔ الا یہ کہ باپ غلام ہو تو وہ اسے خرید کر آزاد کر دے۔"

يَجِدَهُ مَمْلُوكاً فَيَشْتَرِيَهُ، ثُمَّ يُعْتِقَهُ». (مسلم)

رَوَاهُ مُسْلِمٌ.

لغوی تشریح: ﴿ لا یجزی ﴾ "یا" پر فتحہ، معنی ہے کہ نہیں کافی ہوگا۔ ﴿ فیعتقہ ﴾ اس میں "فا" تعقیب سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ محض خریدنے سے آزاد نہیں ہوگا بلکہ خرید کر اسے پھر آزاد کرے۔ ظاہریہ حضرات نے اس کا یہی معنی لیا ہے اور جمہور نے کہا ہے کہ وہ صرف خریدنے سے آزاد ہو جائے گا لیکن جب کہ خریدنا ہی اس کی آزادی کا سبب ہے تو مجازی طور پر اس کی طرف منسوب کر دیا ہے ان کی دلیل آنے والی حدیث ہے۔

(١٢٢٤) وَعَنْ سَمُرَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ قَالَ: «مَنْ مَلَكَ ذَا رَحِمٍ مَحْرَمٍ فَهُوَ حُرٌّ». رَوَاهُ أَحْمَدُ وَالأَرْبَعَةُ، وَرَجَّحَ جَمْعٌ مِّنَ الحُفَّاظِ أَنَّهُ مَوْقُوفٌ.

حضرت سمرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا "جو شخص کسی قرابت دار کا مالک ہو جائے تو وہ غلام آزاد ہے۔" (اسے احمد اور چاروں نے روایت کیا ہے اور محدثین کی ایک جماعت نے اسے موقوف قرار دیا ہے)

لغوی تشریح: ﴿ ذا رحم ﴾ رحم کے "را" پر فتحہ اور "حا" کے نیچے کسرہ۔ وہ جگہ جہاں بچہ ماں کے پیٹ میں پرورش پاتا ہے پھر اس کا استعمال قرابت کیلئے کیا جانے لگا۔ پس وہ تعلق جو تیرے اور اس کے درمیان حرمت نکاح کو واجب کرتا ہے۔ ﴿ محرم ﴾ قیاس کے اعتبار سے اس پر نصب ہے لیکن دراصل جار کی وجہ سے مجرور ہے اور "محرم" کے میم پر فتحہ اور "حا" ساکن اور "را" پر فتحہ اور محرم کو صیغہ مفعول بھی کہا گیا ہے اس صورت میں یہ تحریم سے ماخوذ ہوگا اور محرم کہتے ہیں جس کے ساتھ نکاح حرام ہو مثلاً باپ، بھائی، چچا اور اس ضمن میں دوسرے رشتہ دار۔ ﴿ فھو حر ﴾ یہاں حر سے مراد ہے وہ قرابت دار خواہ مرد ہو یا عورت۔ اس کی ملکیت کے بسبب وہ آزاد ہو جائے گا۔

حاصل کلام: یہ حدیث بقول محدثین موقوف ہے مگر اس باب میں اور احادیث بھی مروی ہیں جن میں سے ایک کو ابن قطان اور ابن حزم نے صحیح قرار دیا ہے۔ اس حدیث کی رو سے جن تعلق داروں کا باہم نکاح نہیں ہو سکتا ان میں غلامی اور آقائی کا تعلق بھی ایسا ہے جس کی وجہ سے نکاح نہیں رہ سکتا۔ (السبل)

(١٢٢٥) وَعَنْ عِمْرَانَ بْنِ حُصَيْنٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُما، أَنَّ رَجُلاً أَعْتَقَ سِتَّةَ مَمَالِيْكَ لَهُ، عِنْدَ مَوْتِهِ، لَمْ يَكُن لَّهُ مَالٌ غَيْرَهُمْ، فَدَعَا بِهِمْ رَسُولُ اللهِ ﷺ، فَجَزَّأَهُمْ أَثْلاَثاً، ثُمَّ

حضرت عمران بن حصین رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ ایک آدمی نے اپنی موت کے وقت اپنے چھ غلام آزاد کر دیئے۔ ان غلاموں کے علاوہ اس کی کوئی اور جائیداد نہیں تھی۔ رسول اللہ ﷺ نے ان کو طلب فرمایا اور ان کے تین حصے کئے پھر ان میں سے قرعہ

أَقْرَعَ بَيْنَهُمْ، فَأَعْتَقَ ٱثْنَيْنِ، وَأَرَقَّ أَرْبَعَةً، وَقَالَ لَهُ قَوْلاً شَدِيْداً. رَوَاهُ مُسْلِمٌ.

اندازی فرمائی۔ پھر آپؐ نے دو غلاموں (ایک تہائی) کو آزاد فرما دیا اور باقی چار کو غلام رہنے دیا اور آزاد کرنے والے کے حق میں سخت کلمہ بھی فرمایا۔ (مسلم)

لغوی تشریح: ﴿ فجزاهم اثلاثا ﴾ جزا کی "زا" پر تشدید۔ معنی ہے کہ ان کو تقسیم کیا تین حصوں میں۔ ہر ایک حصہ کو دو غلاموں سے منسلک کر دیا۔ ﴿ ارق ﴾ "قاف" پر تشدید ارقاق سے ماضی کا صیغہ ہے۔ باقی چاروں پر غلامی کا حکم بدستور باقی رکھا۔ ﴿ وقال له قولا شديدا ﴾ آزاد کرنے والے کے فعل و عمل کو ناپسند کرنے اور مکروہ سمجھنے کی وجہ سے اسے سخت الفاظ سے یاد فرمایا اور ابوداؤد میں ہے کہ اس کے بارے میں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "اگر میں اس کی تدفین سے پہلے موجود ہوتا تو اسے مسلمانوں کے قبرستان میں دفن نہ کیا جاتا۔" سبل السلام میں ہے کہ اس حدیث سے معلوم ہوا کہ بیماری کا صدقہ وصیت کا حکم رکھتا ہے اور وہ ترکہ کے تیسرے حصہ میں نافذ ہوگا۔

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ مرنے کے وقت صدقہ کی حیثیت وصیت کی ہوتی ہے اور وہ شرعاً ترکہ کی ایک تہائی وصیت کرنے کا مجاز ہے اس سے زائد نہیں اور اگر مرنے والا مرض الموت میں اس کے خلاف صدقہ یا وصیت کر گیا تو اس کی اصلاح کی جائے گی اور وہ نافذ العمل نہیں ہوگا۔

(١٢٢٦) وَعَنْ سَفِيْنَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: كُنْتُ مَمْلُوكاً لِأُمِّ سَلَمَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهَا، فَقَالَتْ: أَعْتِقُكَ، وَأَشْتَرِطُ عَلَيْكَ أَنْ تَخْدِمَ رَسُولَ اللهِ ﷺ مَا عِشْتَ. رَوَاهُ أَحْمَدُ وَأَبُو دَاوُدَ وَالنَّسَآئِيُّ وَالحَاكِمُ.

حضرت سفینہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں ام سلمہؓ کا غلام تھا' انہوں نے مجھے کہا کہ میں تجھے اس شرط پر آزاد کرتی ہوں کہ تو رسول اللہ ﷺ کی تاحیات خدمت بجالاتا رہے۔ (اسے احمد' ابوداؤد' نسائی اور حاکم نے روایت کیا ہے)

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ آزادی کا پروانہ مشروط طور پر بھی دینا جائز ہے اور غلام سے تاحیات کسی کی خدمت کی شرط لگانا بھی درست ہے۔

(١٢٢٧) وَعَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهَا، أَنَّ رَسُولَ اللهِ ﷺ قَالَ: «إِنَّمَا الوَلَاءُ لِمَنْ أَعْتَقَ». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ فِيْ حَدِيْثٍ طَوِيْلٍ.

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "(ولاء) اسی کا حق ہے جو اسے آزاد کرے۔" (بخاری و مسلم یہ لمبی حدیث کا ٹکڑا ہے)

لغوی تشریح: ﴿ الولاء ﴾ ولاء کے "واؤ" پر فتحہ اور آخر پر مد ہے یعنی عتق کی ولاء اور وہ یہ ہے کہ آزاد شدہ غلام جب فوت ہو جائے تو اس کے ترکہ کا حق آزاد کرنے والے کو پہنچتا ہے۔ یہ حدیث مفصل

طور پر کتاب البیوع میں اس سے پہلے گزر چکی ہے۔

(۱۲۲۸) وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُمَا قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «الْوَلَاءُ لُحْمَةٌ كَلُحْمَةِ النَّسَبِ، لَا يُبَاعُ وَلَا يُوهَبُ». رَوَاهُ الشَّافِعِيُّ، وَصَحَّحَهُ ابْنُ حِبَّانَ وَالْحَاكِمُ، وَأَصْلُهُ فِي الصَّحِيحَيْنِ بِغَيْرِ هٰذَا اللَّفْظِ.

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "ولاء بھی نسب کی طرح ایک جز و تعلق ہے جسے نہ فروخت کیا جا سکتا ہے اور نہ ہبہ کیا جا سکتا ہے۔" (اسے شافعی نے روایت کیا ہے اور ابن حبان اور حاکم نے اسے صحیح قرار دیا ہے اور صحیحین میں اس کا اصل ہے جس کے الفاظ یہ نہیں)

لغوی تشریح: لحمۃ لام پر ضمہ اور فتحہ دونوں درست ہیں۔ کپڑے کے بانا کو کہتے ہیں اور سبل السلام میں ہے کہ اس کو تعلق نسب سے تشبیہہ دینے کے معنی یہ ہیں کہ میراث جس طرح نسب میں جاری ہوتی ہے اسی طرح ولاء میں بھی جاری ہوتی ہے جیسے کپڑے کے بانے کو تانے کے ساتھ ملا دیتے ہیں تو ایک ہی چیز بن جاتی ہے۔

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ آزاد کرنے والے کو ولاء اسی طرح ملتی ہے جس طرح نسب کے قریبی کو میراث ملتی ہے۔ جس طرح باپ بیٹے اور بھائی بھائی کا ایسا تعلق ہے جو ناقابل فروخت ہے اور ہبہ بھی نہیں ہو سکتا اسی طرح ولاء نہ فروخت کیا جا سکتا ہے اور نہ ہبہ۔ جمہور علماء کا یہی مسلک ہے۔ ولاء اس میراث کو کہتے ہیں جو شرعاً آزاد کرنے والے کو اپنے آزاد کردہ کی وجہ سے ملتا ہے۔

١ - بَابُ المدبَّرِ وَالمُكَاتَبِ وَأُمِّ الوَلَدِ

مدبر' مکاتب اور ام ولد کا بیان

(۱۲۲۹) عَنْ جَابِرٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُ، أَنَّ رَجُلاً مِّنَ الْأَنْصَارِ أَعْتَقَ غُلَاماً لَّهُ عَنْ دُبُرٍ، وَلَمْ يَكُنْ لَهُ مَالٌ غَيْرُهُ، فَبَلَغَ ذٰلِكَ النَّبِيَّ ﷺ، فَقَالَ: «مَنْ يَشْتَرِيهِ مِنِّي؟» فَاشْتَرَاهُ نُعَيْمُ بْنُ عَبْدِ اللهِ بِثَمَانِمِائَةِ دِرْهَمٍ، مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ. وَفِي لَفْظٍ لِلْبُخَارِيِّ: فَاحْتَاجَ.

حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک انصاری نے اپنا ایک غلام مرتے وقت آزاد کر دیا۔ اس کی ملکیت صرف یہی مال تھا۔ یہ بات نبی ﷺ تک پہنچی تو آپؐ نے فرمایا "کون ہے جو اس غلام کو مجھ سے خریدتا ہے؟" نعیم بن عبداللہ رضی اللہ عنہ نے آپؐ سے اسے آٹھ سو درہم میں خرید لیا۔ (بخاری و مسلم) اور بخاری کے الفاظ یہ ہیں پس وہ محتاج ہوا۔

وَفِي رِوَايَةٍ لِّلنَّسَائِيِّ: وَكَانَ عَلَيْهِ دَيْنٌ فَبَاعَهُ بِثَمَانِمِائَةِ دِرْهَمٍ، فَأَعْطَاهُ، وَقَالَ: «اقْضِ دَيْنَكَ».

اور نسائی کی روایت میں ہے کہ اس پر قرض تھا پس آپؐ نے اسے آٹھ سو درہم کے عوض فروخت کیا اور اسے دے کر فرمایا "اپنا قرض ادا کر۔"

لغوی تشریح: ﴿ باب المدبر ﴾ تدبیر سے اسم مفعول کا صیغہ ہے اور "مدبر" اس غلام کو کہتے ہیں جسے اس کا مالک یوں کہدے کہ میری وفات کے بعد تو آزاد ہے۔ ﴿ والمکاتب ﴾ یہ اسم مفعول ہے مکاتب اس غلام کو کہتے ہیں جو اپنے آقا و مالک سے ایک مقرر مال پر معاہدہ کر لے کہ جب وہ طے شدہ رقم ادا کر دے گا تو آزاد ہو جائے گا اس عقد کو مکاتب کہتے ہیں۔ ﴿ ام الولد ﴾ اس لونڈی کو کہتے ہیں جس کی اس کے مالک سے اولاد پیدا ہوئی ہو۔

حاصل کلام: یہ حدیث کتاب البیوع میں مختصر گزر چکی ہے اور یہ اس بات کی دلیل ہے کہ غلام کو مدبر کرنا درست ہے اور جمہور کہتے ہیں کہ اس کو تیسرے حصے میں سے تدبیر کیا جا سکتا ہے سارے راس المال سے نہیں۔ اس حدیث سے "بولی" دینا جائز ثابت ہوا۔ یعنی ایک چیز کو فروخت کرنے کیلئے کہنا کہ کون اس چیز کو خریدتا ہے؟ ایک نے کہا میں اسے اتنے میں خریدتا ہوں۔ دوسرے نے کہا میں اتنے میں خریدتا ہوں۔ اس طرح گاہک قیمت بڑھاتے جاتے ہیں۔ مالک جب دیکھتا ہے کہ اب اس کی قیمت ٹھیک لگ گئی ہے تو وہ اسے فروخت کر دیتا ہے۔ آج کل منڈیوں میں عام طور پر سودا جات اسی طرح فروخت ہو رہے ہیں اور یہ طریقہ جائز ہے۔

راوی حدیث: ﴿ نعیم بن عبداللہ رضی اللہ عنہ ﴾ ان کا لقب نخام تھا۔ نون پر فتحہ اور "خا" پر تشدید۔ قریش کے قبیلہ عدی سے تھے۔ قدیم الاسلام تھے۔ شروع میں اپنا ایمان مخفی رکھا۔ انہوں نے ہجرت کا ارادہ کیا تو بنو عدی نے کہا یہاں سے نہ جاؤ چاہے کسی بھی دین پر قائم رہو کیونکہ یہ بیوگان و یتامیٰ پر خرچ کرتے تھے پھر انہوں نے صلح حدیبیہ والے سال ہجرت فرمائی۔ عہد صدیقی یا فاروقی میں فتح شام کے موقع پر شہادت پائی۔

(۱۲۳۰) وَعَنْ عَمْرِو بْنِ شُعَيْبٍ، عَنْ أَبِيهِ، عَنْ جَدِّهِ، عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ: «الْمُكَاتَبُ عَبْدٌ، مَا بَقِيَ عَلَيْهِ مِنْ مُكَاتَبَتِهِ دِرْهَمٌ». أَخْرَجَهُ أَبُو دَاوُدَ بِإِسْنَادٍ حَسَنٍ. وَأَصْلُهُ عِنْدَ أَحْمَدَ وَالثَّلَاثَةِ، وَصَحَّحَهُ الْحَاكِمُ.

حضرت عمرو بن شعیب اپنے باپ سے اور وہ اپنے دادا سے روایت کرتے ہیں کہ نبی ﷺ نے فرمایا "مکاتب اس وقت تک غلام ہی ہے جب تک اس کی مکاتبت سے ایک درہم بھی باقی ہے۔" (اسے ابوداؤد نے حسن سند سے نکالا ہے اور اس کی اصل احمد اور تینوں کے ہاں ہے اور حاکم نے اسے صحیح کہا ہے)

لغوی تشریح: ﴿ المکاتب عبد ﴾ جس پر غلام ملوک کے احکام جاری ہوں گے۔

حاصل کلام: اس حدیث کا خلاصہ یہ ہے کہ "مکاتب" جب تک کتابت کی رقم ادا نہ کر سکے اس وقت تک وہ غلام ہی رہے گا۔ جمہور علماء کا یہی مذہب ہے۔

(۱۲۳۱) وَعَنْ أُمِّ سَلَمَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهَا قَالَتْ: قَالَ رَسُولُ اللهِ

حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "جب تم میں سے کسی کے پاس

ﷺ: «إِذَا كَانَ لإِحْدَاكُنَّ مُكَاتَبٌ، وَكَانَ عِنْدَهُ مَا يُؤَدِّي، فَلْتَحْتَجِبْ مِنْهُ». رَوَاهُ أَحْمَدُ وَالأَرْبَعَةُ وَصَحَّحَهُ التِّرْمِذِيُّ.

مکاتب ہو اور اس کے پاس اتنا مال ہو کہ ادا کر کے آزاد ہو سکتا ہے تو پھر (عورت کو) اس سے پردہ کرنا چاہئے۔" (اسے احمد اور چاروں نے روایت کیا ہے اور ترمذی نے اسے صحیح قرار دیا ہے)

حاصل کلام: اس حدیث سے ثابت ہوا کہ مکاتب کے پاس زر کتابت ادا کرنے کیلئے رقم کا بندوبست ہو جائے تو مالکہ کو اس سے پردہ کرنا چاہئے۔ حالانکہ مالکہ غلام سے پردہ کرنے کی پابند نہیں ہوتی۔ یہ امر استحباب اور تورع کیلئے ہے کیونکہ اوپر والی حدیث میں ہے کہ مکاتب جب تک پوری زر کتابت ادا نہ کر دے وہ اس وقت تک غلام ہی کے حکم میں رہتا ہے۔ اس حدیث سے ثابت ہوا کہ پردہ ایک مسلمان خاتون کیلئے ضروری ہے جب مکاتب سے پردہ کا حکم ہے تو دوسروں سے کیوں نہیں۔ اس سے یہ مسئلہ بھی معلوم ہوا کہ عورت غلام کو دیکھ سکتی ہے۔

(۱۲۳۲) وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ قَالَ: «يُودَى الْمُكَاتَبُ بِقَدْرِ مَا عَتَقَ مِنْهُ دِيَةَ الحُرِّ، وَبِقَدْرِ مَارَقَّ مِنْهُ دِيَةَ العَبْدِ». رَوَاهُ أَحْمَدُ وَأَبُو دَاوُدَ وَالنَّسَائِيُّ.

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا کہ "مکاتب" جتنا آزاد ہے اس قدر آزاد کی دیت ادا کرے گا اور جتنا غلام ہے اس قدر غلام کی۔" (اسے احمد' نسائی اور ابوداؤد نے روایت کیا ہے)

لغوی تشریح: ﴿ یودی المکاتب ﴾ یودی فعل مضارع "یا" پر ضمہ اور واؤ ساکن دال پر فتحہ صیغہ مجہول ودی یدی دیہ سے معنی ہے مکاتب کی دیت دے گا۔ ﴿ بقدر ما عتق منہ ﴾ وہ حصہ جس کے ادا کرنے کے بعد وہ آزاد ہوتا ہے۔ "دیہ الحر دیہ منصوب ہے یعنی آزاد کی دیت۔ ﴿ وبقدر مارق منہ ﴾ غلام کی دیت دی جائے گی جس قدر غلام رہ گیا ہے۔ مثلاً جب مکاتب کو قتل کر دیا گیا جب کہ اس نے آدھی زر کتابت ادا کر دی تھی تو اس صورت میں قاتل آدھی دیت آزاد کی اور آدھی غلام ہونے کی دے گا۔ علامہ خطابی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ عام فقہاء کا قول یہ ہے کہ مکاتب جب تک پورا زر کتابت ادا نہ کر دے اس وقت تک وہ بار اس کے ذمہ ہے۔ جہاں تک ہمارا مبلغ علم ہے علماء میں سے سوائے ابراہیم نخعی کے اس حدیث پر کسی نے فتویٰ نہیں دیا البتہ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے بھی ایک قول یہی ہے اور جب حدیث کی صحت ثابت ہو تو اس پر عمل واجب ہے بشرطیکہ وہ منسوخ نہ ہو اور نہ اس کے معارض کوئی دوسری حدیث ہو جو اس سے بہتر ہو۔

حاصل کلام: اس حدیث میں مکاتب کے قتل کئے جانے کی صورت میں دیت کا مسئلہ بیان ہوا ہے۔ جب مکاتب قتل ہو جائے اور وہ اپنی نصف زر کتابت ادا کر چکا ہو تو اس صورت میں قاتل نہ آزاد کے سو اونٹ ادا کرے گا اور نہ غلام کے آدھے بلکہ جب وہ آدھی رقم کتابت دے چکا ہے تو پھر قاتل پر ۷۵ اونٹ

ذاجب الادا ہوں گے۔

(١٢٣٣) وَعَنْ عَمْرِو بْنِ الحَارِثِ، أَخِي جُوَيْرِيَةَ أُمِّ المُؤْمِنِيْنَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْها قَالَ: مَا تَرَكَ رَسُولُ اللهِ ﷺ عِنْدَ مَوْتِهِ دِرْهَماً، وَلاَ دِيْنَاراً، وَلاَ عَبْداً، وَلاَ أَمَةً، وَلاَ شَيْئاً، إلاَّ بَغْلَتَهُ البَيْضَاءَ، وَسِلاَحَهُ، وَأَرْضاً جَعَلَهَا صَدَقَةً.

رَوَاهُ البُخَارِيُّ.

حضرت عمرو بن حارث رضی اللہ عنہ ام المومنین حضرت جویریہ رضی اللہ عنہا کے بھائی سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اپنی وفات کے وقت نہ کوئی درہم میراث میں پیچھے چھوڑا اور نہ دینار اور نہ کوئی غلام اور نہ لونڈی اور نہ کوئی اور چیز۔ بس ایک سفید خچر' اپنا اسلحہ جنگ اور کچھ تھوڑی سی زمین جسے آپؐ نے صدقہ کر دیا تھا۔ (بخاری)

لغوی تشریح: ﴿ ولا امۃ ﴾ یہ بات سب کو معلوم ہے کہ آپؐ نے ام ابراھیم حضرت ماریہ قبطیہ رضی اللہ عنہا کو اپنے پیچھے چھوڑا تھا پھر ولا امۃ کہنا کیسے درست ہوا جبکہ ان کی وفات تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دور خلافت میں ہوئی ہے۔ اس کا جواب اس حدیث کی روشنی میں یہ ہے کہ چونکہ وہ ام ولد تھیں' اس لئے وہ لونڈی نہ رہیں۔ اسی بنا پر مصنف رحمۃ اللہ علیہ نے اس باب میں اس حدیث کو بیان کیا ہے اور رہی وہ تھوڑی سی زمین جسے آپؐ نے صدقہ کر دیا تھا۔ اس کی صورت یہ تھی کہ آپؐ کو اپنی زندگی میں تین زمینیں حاصل ہوئی تھیں۔ بنو نضیر کے کھجور کے باغ' خیبر کی زمین اور فدک کی زمین' بنو نضیر کی کھجوریں تو آپؐ کیلئے خصوصی طور پر تھیں۔ اکثر آپؐ نے ان میں سے مہاجرین کو عطا فرما دی تھیں۔ اور تھوڑی سی ان میں سے بطور وقف برائے ضروریات ناگہانی روک لی تھیں اور یہ وہی صدقہ تھا جو حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کی اولاد کے قبضہ و تصرف میں رہا۔ جیسا کہ ابوداؤد میں ہے۔ رہا خیبر کی زمین کا معاملہ تو اسے آپؐ نے تین ہزار چھ سو حصوں میں تقسیم کر دیا۔ اس کا نصف ایک ہزار آٹھ سو' اسے آپؐ نے غزوۂ خیبر میں شریک مجاہدین میں تقسیم کر دیا۔ اس تقسیم میں دوسرے کسی مسلمان کی طرح رسول اللہ ﷺ کا بھی حصہ تھا اور دوسرا نصف حصہ الگ رکھا وہ بھی ایک ہزار آٹھ سو تھا یہ حصہ آپؐ نے اپنی اور مسلمانوں کی ناگہانی ضروریات کیلئے وقف کر دیا۔ رہا فدک کا حصہ تو یہ آپؐ کیلئے مخصوص تھا اسے آپؐ نے مسافروں کیلئے وقف و مخصوص کر دیا تھا۔

حاصل کلام: اس حدیث سے نبی ﷺ کی دنیا سے بے رغبتی ثابت ہوتی ہے۔ کیونکہ تریسٹھ کے لگ بھگ لونڈی غلام آپؐ کے قبضہ میں آئے۔ آپؐ نے ان سب کو آزاد کر دیا اور اپنے پیچھے کوئی میراث نہیں چھوڑی بلکہ آپؐ نے فرمایا کہ "انبیاء ؑ کا گروہ درہم و دینار میراث میں نہیں چھوڑتے جو ترکہ چھوڑتے ہیں وہ سب صدقہ ہوتا ہے۔"

راوی حدیث: ﴿ عمرو بن حارث رضی اللہ عنہ ﴾ یہ صاحب ابن حارث بن ابی ضرار بن حبیب خزاعی مصطلقی

تھے۔ یعنی قبیلہ خزاعہ کی شاخ مصطلق سے تھے۔ شرف صحابیت سے مشرف تھے۔ ان سے یہی ایک حدیث مروی ہے۔

(١٢٣٤) وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «**أَيُّمَا أَمَةٍ وَلَدَتْ مِنْ سَيِّدِهَا فَهِيَ حُرَّةٌ بَعْدَ مَوْتِهِ**». أَخْرَجَهُ ابْنُ مَاجَهْ وَالحَاكِمُ بِإِسْنَادٍ ضَعِيفٍ، وَرَجَّحَ جَمَاعَةٌ وَقْفَهُ عَلَىٰ عُمَرَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ.

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ''جس لونڈی نے اپنے آقا و مالک کے نطفہ سے بچہ جنا تو وہ مالک کی وفات کے بعد آزاد ہے۔'' (اس کی روایت ابن ماجہ اور حاکم نے ضعیف سند سے کی ہے اور ایک جماعت نے اس کے حضرت عمر رضی اللہ عنہ پر موقوف ہونے کو ترجیح دی ہے)

حاصل کلام: اس حدیث اور پہلی صحیح حدیث سے ثابت ہے کہ ام ولد اپنے آقا کی وفات کے بعد از خود آزاد ہو جاتی ہے۔ یہ روایت اس وجہ سے ضعیف ہے کہ اس کی سند میں حسین بن عبداللہ ہاشمی بہت ہی کمزور و ضعیف راوی ہے۔

(١٢٣٥) وَعَنْ سَهْلِ بْنِ حُنَيْفٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، أَنَّ رَسُولَ اللهِ ﷺ قَالَ: «**مَنْ أَعَانَ مُجَاهِداً فِي سَبِيلِ اللهِ، أَوْ غَارِماً فِي عُسْرَتِهِ، أَوْ مُكَاتَباً فِي رَقَبَتِهِ، أَظَلَّهُ اللَّهُ يَوْمَ لاَ ظِلَّ إِلاَّ ظِلُّهُ**». رَوَاهُ أَحْمَدُ وَصَحَّحَهُ الحَاكِمُ.

حضرت سھل بن حنیف رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ''جس شخص نے مجاہد فی سبیل اللہ کی اعانت و مدد کی یا تنگی حالات میں کسی مقروض سے تعاون کیا یا کسی مکاتب کو اس کے زر کتابت کی ادائیگی میں ہاتھ بٹایا کہ وہ آزاد ہو جائے تو ایسے شخص کو اللہ تعالیٰ اس روز سایہ عطا فرمائے گا جس روز اس کے سایہ کے ماسوا کوئی سایہ نہیں ہو گا۔'' (اسے احمد نے روایت کیا ہے اور حاکم نے اسے صحیح کہا ہے)

لغوی تشریح: ﴿الغارم﴾ جس پر قرض کا بار ہو یعنی مقروض۔ دراصل لغت میں غارم ایسے شخص کو کہتے ہیں جو کسی دوسرے کا ضامن بنے۔ جس کا ضامن بنے وہ اپنے ذمہ کی رقم وغیرہ ادا نہ کر سکے اور ضامن کو وہ رقم ادا کرنی پڑے تو یہ ضامن بھی غلام کہلائے گا۔ تہی دست ہو تو ایسے مقروض کو بھی غلام کہتے ہیں پھر ہر ایک مقروض پر یہ لفظ بولا جانے لگا۔

حاصل کلام: اسلام خیر خواہی' مواساۃ اور باہمی ہمدردی کا درس دیتا ہے۔ برے وقت اور خراب حالات میں ایک دوسرے سے تعاون کی تلقین و ترغیب دیتا ہے۔ اسی کی روشنی میں اس حدیث میں مقروض کو بار قرض سے سبکدوش کرانے اور مجاہد فی سبیل اللہ کی ضروریات پوری کرنے کی ترغیب ہے کہ قیامت کے

روز جب کوئی سایہ دار چیز نہیں ہوگی اللہ تعالیٰ اسے سایہ نصیب کریں گے۔

۱۶۔ كِتَابُ الْجَامِعِ

متفرق مضامین کی احادیث

۱ - بَابُ الْأَدَبِ

ادب کا بیان

(۱۲۳٦) عَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «حَقُّ الْمُسْلِمِ عَلَى الْمُسْلِمِ سِتٌّ، إِذَا لَقِيتَهُ فَسَلِّمْ عَلَيْهِ، وَإِذَا دَعَاكَ فَأَجِبْهُ، وَإِذَا اسْتَنْصَحَكَ فَانْصَحْهُ، وَإِذَا عَطَسَ فَحَمِدَاللَّهَ فَشَمِّتْهُ، وَإِذَا مَرِضَ فَعُدْهُ، وَإِذَا مَاتَ فَاتَّبِعْهُ». رَوَاهُ مُسْلِمٌ.

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "ایک مسلمان کے دوسرے مسلمان پر چھ حقوق ہیں۔ جب ملاقات ہو تو' تو اسے سلام کہہ اور جب دعوت پر مدعو کرے تو دعوت قبول کر اور جب نصیحت طلب کرے تو اسے نصیحت کر اور چھینک مار کر الحمد لله کہے تو اس کے جواب میں تو یرحمك الله کہہ اور جب وہ بیمار ہو جائے تو اس کی عیادت کر اور جب وفات پا جائے تو اس کے جنازہ میں شرکت کر۔" (مسلم)

لغوی تشریح: ﴿كتاب الجامع﴾ اس میں مختلف موضوعات پر بحث کی گئی ہے مثلاً آداب' اخلاق' نیکی و خیر خواہی' زہد و تقویٰ اور اذکار مسنونہ کا وغیرہ۔ ﴿ست﴾ صرف چھ حقوق پر منحصر ہی نہیں ہے' بلکہ اس سے کم و بیش بھی ہو سکتے ہیں۔ ﴿فشمته﴾ امر ہے تشمیت سے اور وہ اس طرح کہ چھینک مارنے والا الحمد للہ کہے تو جواب میں یرحمك الله کہے۔ ﴿فعطس فحمد الله﴾ کے قول کا مفہوم یہ ہے کہ اگر چھینک مارنے والا الحمد للہ نہ کہے تو سامع پر اس کا جواب دینا ضروری نہیں۔ ﴿فعده﴾ یہ عیادۃ سے امر ہے اور باب نصر سے ہے۔ ﴿فاتبعه﴾ اس کی اتباع سے مراد ہے کہ اس کے جنازے کے پیچھے پیچھے چل۔

حاصل کلام: اس حدیث میں مسلمان کے مسلمان پر چھ حقوق بیان ہوئے ہیں۔ مسلم کی ایک روایت میں پانچ کا ذکر بھی ہے' اس میں خیر خواہی کا ذکر نہیں اور ایک حدیث میں یہ بھی ہے کہ جب وہ تجھے کسی معاملہ پر قسم اٹھوائے تو حق ہونے کی صورت میں قسم دے۔ اس سے معلوم ہوا کہ ان چھ حقوق کا ادا کرنا ہر مسلمان پر بعض علماء کے نزدیک واجب ہے اور بعض کے نزدیک مستحب ہے۔ مگر ظاہر حدیث کے الفاظ سے ان حقوق کی ادائیگی واجب ہی معلوم ہوتی ہے۔

(١٢٣٧) وَعَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ: «اُنْظُرُوا إِلَى مَنْ هُوَ أَسْفَلُ مِنْكُمْ، وَلاَ تَنْظُرُوا إِلَى مَنْ هُوَ فَوْقَكُمْ، فَهُوَ أَجْدَرُ أَنْ لاَ تَزْدَرُوا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "ہمیشہ اپنے سے غریب کو دیکھو اور اپنے سے امیر کی طرف نہ دیکھو اور یہ اس کیلئے زیادہ مناسب ہے (اس لیے) کہ تم اللہ کی کسی نعمت کو حقیر نہ سمجھو گے۔" (بخاری و مسلم)

لغوی تشریح: ﴿لا تنظروا الی من هو فوقکم﴾ اپنے سے اوپر سے مراد مال و دولت میں، جاہ و حشمت میں اور دنیوی امور و معاملات میں بالا و برتر۔ ﴿اجدر﴾ زیادہ مناسب، زیادہ لائق اور زیادہ مستحق۔ ﴿ان لا تزدروا﴾ حقیر اور معیوب نہ سمجھو اور یہ اس لئے کہ انسان جب اپنے سے فروتر کی طرف دیکھتا ہے تو قناعت کرتا ہے، شکر ادا کرتا ہے اور جب اپنے سے بالاتر کی طرف دیکھتا ہے تو حرص و لالچ اور حسد کرتا ہے اور جس نعمت میں وہ اس وقت ہوتا ہے اسے حقیر تصور کرتا ہے۔

(١٢٣٨) وَعَنِ النَّوَّاسِ بْنِ سَمْعَانَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: سَأَلْتُ رَسُولَ اللّٰهِ ﷺ عَنِ الْبِرِّ وَالإِثْمِ، فَقَالَ: «الْبِرُّ حُسْنُ الْخُلُقِ، وَالإِثْمُ مَا حَاكَ فِي صَدْرِكَ وَكَرِهْتَ أَنْ يَطَّلِعَ عَلَيْهِ النَّاسُ». أَخْرَجَهُ مُسْلِمٌ.

حضرت نواس بن سمعان رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے نیکی اور گناہ کے متعلق سوال کیا تو آپؐ نے ارشاد فرمایا "نیکی اچھے اخلاق کا نام ہے اور گناہ وہ ہے جو تیرے سینے میں کھٹکے اور تو ناپسند سمجھے کہ لوگ اس پر مطلع ہو جائیں۔" (مسلم)

لغوی تشریح: ﴿ما حاك فی صدرك﴾ تیرے سینے میں اضطراب پیدا کرے اور تو اسے انجام دینے میں تردد اور تذبذب میں مبتلا ہو کہ اس کے کرنے میں ملامت ہوگی یا اسے اس خوف اور ڈر کے پیش نظر چھوڑ دے کہ اللہ تو دیکھ رہا ہے۔

حاصل کلام: اس حدیث میں نیکی اور گناہ کی حقیقت کے بارے میں بیان ہوا کہ نیکی یہ ہے کہ لوگوں کے ساتھ خندہ پیشانی سے پیش آئے۔ ان سے دوستی رکھے، ان پر مشقت نہ ڈالے، ان کے کام آئے، ان کے بوجھ اٹھائے، ان سے برا سلوک نہ کرے۔ ہاتھ، زبان سے ان کے ساتھ دست درازی نہ کرے۔ بلاوجہ آپے سے باہر نہ ہو جائے۔ حتی الوسع درگزر اور عفو سے کام لے۔ مؤاخذہ اور گرفت کا رویہ اختیار نہ کرے وغیرہ اور گناہ یہ ہے کہ دل میں کھٹک اور شبہ رہے کہ نہ جانے یہ کام اللہ کی نظر میں کیسا ہے۔ دل میں تسلی و تشفی نہ ہو۔ اس دنیا میں نیکی اور گناہ کی کشمکش جاری ہے اور جاری رہے گی۔ نیکی اور برائی کو پہچاننے کا یہ بہترین نسخہ ہے۔

راوی حدیث: ﴿نواس بن سمعان رضی اللہ عنہ﴾ نواس میں واؤ پر تشدید اور سمعان میں سین پر فتحہ یا کسرہ۔ بن خالد کلابی عامری۔ بنو کلب سے تعلق تھا۔ شامی صحابہؓ میں ان کا شمار ہوتا ہے۔ کہا گیا ہے کہ ان کے باپ نے نبیؐ کے پاس ان کو بلانے کے لئے ایک وفد بھیجا۔ نبیؐ کو جوتے ہدیئے میں بھیجے جنہیں آپؐ نے قبول فرمالیا۔

(١٢٣٩) وَعَنِ ابْنِ مَسْعُودٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ: قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «إِذَا كُنْتُمْ ثَلاَثَةً فَلاَ يَتَنَاجَ اثْنَانِ دُونَ الآخَرِ، حَتّى تَخْتَلِطُوا بِالنَّاسِ، مِنْ أَجْلِ أَنَّ ذَلِكَ يُحْزِنُهُ». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ، وَاللَّفْظُ لِمُسْلِمٍ.

حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "جب تم تین ہو تو دو آدمی تیسرے کو الگ کر کے سرگوشی نہ کریں تاوقتیکہ وہ لوگوں کے ساتھ مل جل نہ جائیں کیونکہ اس طرح یہ چیز اسے غمگین اور رنجیدہ خاطر کرتی ہے۔" (بخاری و مسلم اور یہ الفاظ مسلم کے ہیں)

لغوی تشریح: ﴿التناجی﴾ سرگوشی کو کہتے ہیں۔

حاصل کلام: اس حدیث میں ساتھی کو نظر انداز کر کے کانا پھوسی اور سرگوشی کو ممنوع قرار دیا گیا ہے۔ جس سے انسانی جذبات و احساسات کا احترام ملحوظ رکھنے کا سبق ملتا ہے کہ ایسا کام انجام نہ دیا جائے جس سے دوسرے کو تکلیف ہوتی ہو اور اسے خیال گزرے کہ یہ مجھے اپنا نہیں بلکہ غیر تصور کرتے ہیں یا اسے کھٹکا اور اندیشہ پیدا ہو سکتا ہے کہ یہ دونوں میرے خلاف ساز باز کر رہے ہیں اور مجھے دھوکہ دینے کی کوشش کر رہے ہیں۔ اس سے دوسرے کے جذبات و احساسات کو ٹھیس پہنچتی ہے اس لئے جماعتی زندگی میں کانا پھوسی اور سرگوشی' کرنا منع فرمایا گیا ہے۔

(١٢٤٠) وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُما قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «لاَ يُقِيمُ الرَّجُلُ الرَّجُلَ مِنْ مَجْلِسِهِ ثُمَّ يَجْلِسُ فِيهِ، وَلَكِنْ تَفَسَّحُوا وَتَوَسَّعُوا». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "کوئی آدمی کسی کو اس کی جگہ سے اٹھا کر خود اس جگہ نہ بیٹھے۔ اگر جگہ کی کمی ہو تو حلقہ مجلس وسیع اور کشادہ کر لے اور اس میں توسیع کر لے۔" (بخاری و مسلم)

لغوی تشریح: ﴿ولكن تفسحوا﴾ یعنی اہل مجلس سکڑ کر قریب قریب ہو جائیں۔ تفسحوا اور توسعوا تقریباً ہم معنی ہیں۔

حاصل کلام: اس حدیث میں مجلسی آداب کی تعلیم دی گئی ہے کہ اگر مجلس میں جگہ کی کمی واقع ہو رہی ہے اور لوگوں کی آمد بدستور جاری ہے تو پہلے نشستوں پر بیٹھے ہوئے لوگ ذرا سکڑ جائیں' ایک دوسرے کے قریب ہو جائیں یا مجلس کو ذرا اور وسیع کر لیا جائے تاکہ آنے والے حضرات بھی بیٹھ سکیں۔ البتہ یہ نہیں ہونا چاہئے کہ ایک آدمی کسی ضرورت کے پیش نظر اپنی نشست چھوڑ کر ذرا دیر کیلئے باہر جائے تو

دوسرا اس کی جگہ پر قبضہ جما لے یہ حکم ہر جگہ کیلئے یکساں ہے خواہ یہ مسجد میں ہو یا مجلس احباب میں یا کہیں دوسرے مقام پر ہو۔

(١٢٤١) وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُمَا، قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «إِذَا أَكَلَ أَحَدُكُمْ طَعَاماً فَلاَ يَمْسَحْ يَدَهُ حَتَّى يَلْعَقَهَا أَوْ يُلْعِقَهَا». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "جب تم میں سے کوئی کھانا کھائے تو اپنا ہاتھ چاٹنے یا چٹوانے سے پہلے (رومال وغیرہ سے) صاف نہ کرے۔" (بخاری و مسلم)

لغوی تشریح: ﴿ یلعقھا ﴾ باب سمع یسمع سے۔ خود اپنی زبان سے اپنا ہاتھ چاٹ کر صاف کرے۔ ﴿ او یلعقھا ﴾ باب افعال سے اپنے علاوہ کسی دوسرے سے مثلاً غلام سے، خادم خانہ سے یا اپنے بیٹے وغیرہ سے۔ اس کی وجہ و علت یہ ہے کہ انسان کو اس کا علم نہیں کہ کھانے کے کس حصہ میں برکت ہے۔

حاصل کلام: اس حدیث میں کھانا نوش کرنے کے آداب میں سے ایک ادب کی طرف توجہ دلائی گئی ہے کہ کھانا کھانے کے بعد ہاتھ کو رومال وغیرہ سے صاف کرنے سے پہلے انگلیوں کو اپنی زبان سے چاٹ کر یا دوسرے کسی سے چٹوا کر صاف کرنا چاہئے۔ عین ممکن ہے کہ ہاتھ پر لگے ہوئے کھانے ہی میں برکت ہو۔ دوران کھانا ہاتھوں کو رومال وغیرہ سے صاف کرتے رہنا یا انگلیوں سے چاٹنے سے پہلے صاف کرنا بہرنوع خلاف سنت ہے۔

(١٢٤٢) عَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «لِيُسَلِّمِ الصَّغِيرُ عَلَى الكَبِيرِ، وَالمَارُّ عَلَى القَاعِدِ، وَالقَلِيلُ عَلَى الكَثِيرِ». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ. وفي رواية لمسلم: والراكب على الماشي.

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "چھوٹا بڑے کو، راہ چلتا بیٹھے کو اور تھوڑے زیادہ تعداد والوں کو سلام کہا کریں۔" (بخاری و مسلم) اور مسلم کی ایک روایت میں ہے کہ سوار، پیدل کو سلام کرے۔"

حاصل کلام: اس حدیث میں باہمی ایک دوسرے کو سلام کہنے کے بارے میں آداب کا ذکر ہے۔ چنانچہ فرمایا "کم عمر والا بڑی عمر والے کو پہلے سلام کرے۔" اس سے بڑے کی عزت و توقیر مقصود ہے اور آنے والے کو حکم ہے کہ بیٹھے ہوئے کو سلام کرے، اس کی حکمت و علت یہ معلوم ہوتی ہے کہ آنے والے سے ضرر و نقصان کا اندیشہ ہو سکتا ہے مگر جب وہ پہلے سلام کرے گا تو اس سے گویا خطرہ کا اندیشہ ختم ہو گیا اور فرمایا کہ سوار پیدل چلنے والوں کو سلام کریں کیونکہ سواری پر بیٹھا ہوا انسان ذرا بڑائی کے زعم اور تکبر میں مبتلا ہو جایا کرتا ہے، اس کے ازالہ کیلئے حکم فرمایا کہ "سوار پہلے سلام کرے اور اپنی تواضع اور محبت کا

اظہار کرے۔" اسی طرح کم تعداد' زیادہ تعداد والوں کو سلام کریں اس میں کثرت کو قلت پر فوقیت اور افضلیت کی طرف اشارہ ہے۔ گویا اسلام نے حفظ مراتب کا اہل اسلام کو سبق دیا ہے جس پر ماشاء اللہ یہ امت عمل پیرا ہے۔

(١٢٤٣) وَعَنْ عَلِيٍّ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «يُجْزِىءُ عَنِ الجَمَاعَةِ - إِذَا مَرُّوا - أَنْ يُسَلِّمَ أَحَدُهُمْ، وَيُجْزِىءُ عَنِ الجَمَاعَةِ أَنْ يَرُدَّ أَحَدُهُمْ». رَوَاهُ أَحْمَدُ وَالبَيْهَقِيُّ.

حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "جب ایک جماعت کسی کے پاس سے گزرے تو ان میں سے ایک آدمی کا سلام کہہ دینا کافی ہے اور جماعت میں سے ایک آدمی کا جواب دینا کافی ہے۔" (مسند احمد' سنن بیہقی)

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ سلام کہنا اور اس کا جواب دینا فرض کفایہ ہے۔ جماعت میں سے ایک فرد اگر جواب دے گا تو تمام کی طرف سے ادائیگی ہو جائے گی۔

(١٢٤٤) وَعَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «لاَ تَبْدَءُوا اليَهُودَ وَالنَّصَارَى بِالسَّلاَمِ، وَإِذَا لَقِيتُمُوهُمْ فِي طَرِيقٍ فَاضْطَرُّوهُمْ إِلَى أَضْيَقِهِ» أَخْرَجَهُ مُسْلِمٌ

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "یہود و نصاریٰ کو پہلے سلام مت کرو اور جب ان سے راستہ میں مڈ بھیڑ ہو جائے تو انہیں تنگ راستہ کی طرف مجبور کر دو۔" (مسلم)

(١٢٤٥) وَعَنْهُ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ: «إِذَا عَطَسَ أَحَدُكُمْ فَلْيَقُلْ: الحَمْدُلِلَّهِ، وَلْيَقُلْ لَهُ أَخُوهُ: يَرْحَمُكَ اللَّهُ. فَإِذَا قَالَ لَهُ: يَرْحَمُكَ اللَّهُ، فَلْيَقُلْ لَهُ: يَهْدِيكُمُ اللَّهُ وَيُصْلِحُ بَالَكُمْ». أَخْرَجَهُ البُخَارِيُّ.

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے نبی ﷺ سے روایت کیا ہے کہ آپؐ نے فرمایا "جب تم میں سے کسی کو چھینک آئے تو اسے الحمد لله (سب تعریف اللہ کے لئے ہے) کہنا چاہئے اور اس کا بھائی اسے یرحمك الله (اللہ تجھ پر رحم کرے) کہے۔ جب وہ یرحمك الله کہہ دے تو پھر چھینک مارنے والا جواباً کہے یهديكم الله ويصلح بالكم۔ اللہ تمہیں ہدایت دے اور تمہارا حال درست فرمائے۔ (بخاری)

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ چھینک کا جواب دینا چاہئے بشرطیکہ چھینک مارنے والا پہلے الحمدللہ کہے اور یہ جواب تین بار تک چھینک آئے تو دینا چاہئے اس سے زیادہ ہو تو جواب نہیں دینا چاہئے

کیونکہ آپؐ نے فرمایا ہے کہ ”تین سے زیادہ چھینکیں زکام کی علامت ہیں۔“ (ابوداؤد)

(١٢٤٦) وَعَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «لاَ يَشْرَبَنَّ أَحَدُكُمْ قَائِماً». أَخرَجَهُ مُسْلِمٌ.

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ ”تم میں سے کوئی کھڑے کھڑے پانی نہ پیئے۔“ (مسلم)

حاصل کلام: اس حدیث میں کھڑے کھڑے پانی پینے کی ممانعت ہے۔ اس ممانعت کو جمہور علماء نے نہی تنزیہی پر محمول کیا ہے لیکن ابن حزم کا قول ہے کہ کھڑے ہو کر پانی پینا حرام ہے اور بعض علماء اسے مکروہ قرار دیتے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ سے آب زم زم کھڑے ہو کر پینا ثابت ہے غالبًا اسی بنا پر جمہور نے کھڑے ہو کر پینے کی ممانعت کو نہی تحریمی پر محمول نہیں کیا۔

(١٢٤٧) وَعَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «إِذَا انْتَعَلَ أَحَدُكُمْ فَلْيَبْدَأْ بِالْيَمِينِ، وَإِذَا نَزَعَ فَلْيَبْدَأْ بِالشِّمَالِ، وَلْتَكُنِ الْيُمْنَى أَوَّلَهُمَا تُنْعَلُ، وَآخِرَهُمَا تُنْزَعُ». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ ”جب تم میں سے کوئی جوتا پہننے لگے تو پہلے دائیں پاؤں میں پہنے اور جب اتارے تو پہلے بائیں پاؤں سے اتارے اور چاہیے کہ دائیں پاؤں میں جوتا پہلے پہنے اور دونوں پاؤں میں سے آخر میں دائیں پاؤں سے جوتا اتارے۔“ (بخاری و مسلم)

لغوی تشریح: ﴿الانتعال﴾ جوتے پہننا۔

حاصل کلام: اس حدیث کی رو سے ہر باعث تکریم اور موجب عزت کام کا آغاز دائیں طرف سے ہونا چاہئے اور ہر کم اہمیت والا کام بائیں جانب سے شروع کیا جائے۔ مثلاً جوتا پہننا‘ کنگھی کرنا‘ وضو کرنا‘ قمیض و شلوار یا پاجامہ وغیرہ پہننا دائیں طرف سے اور جوتا اتارنا‘ استنجا کرنا وغیرہ بائیں جانب سے۔ اسی طرح مسجد میں داخل ہوتے ہوئے پہلے دایاں پاؤں اور نکلتے وقت بایاں پاؤں باہر نکالنا چاہئے۔

(١٢٤٨) وَعَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «لاَ يَمْشِ أَحَدُكُمْ فِي نَعْلٍ وَاحِدَةٍ، وَلْيُنْعِلْهُمَا جَمِيعاً، أَوْ لِيَخْلَعْهُمَا جَمِيعاً». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ”تم میں سے کوئی بھی ایک جوتا پہن کر نہ چلے پھرے یا تو دونوں یکجا پہنے یا پھر دونوں اتار دے۔“ (بخاری و مسلم)

لغوی تشریح: ﴿لينعلهما﴾ امام نووی رحمہ اللہ نے اس کا ضبط اس طرح کیا ہے کہ حرف مضارع یعنی یا پر ضمہ ہے اور اسے باب افعال سے مانا ہے اور تثنیہ کی ضمیر دونوں پاؤں کی جانب راجع ہے اگرچہ ان دونوں کا ذکر نہیں ہے۔ لیکن اس تکلف کی چنداں ضرورت ہی نہیں کیونکہ وہ باب فتح سے بھی جوتا پہننے کے معنی میں آتا ہے۔ ﴿او ليخلعهما﴾ دونوں پاؤں سے اتار لے یہ نووی رحمہ اللہ کی تفسیر کی رو سے

ہے اور یہ معلوم ہے کہ ضمیر کا نعلین کی جانب مرجع زیادہ فصیح ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے ﴿ اخلع نعلیک ﴾ اپنے جوتے اتار دو۔

حاصل کلام: اس حدیث کی رو سے ایک جوتا پہن کر نہ چلنا چاہئے۔ دونوں پہنے یا دونوں اتار دے۔ بعض علماء نے اس کی حکمت یہ بیان کی ہے کہ جوتے پہننے سے مقصود دونوں پاؤں کو تکلیف دہ چیزوں مثلاً کانٹا وغیرہ سے بچانا ہوتا ہے جب کہ ایک پاؤں ننگا ہوگا تو مقصد حاصل نہیں ہوگا اور بعض نے کہا ہے کہ یہ شیطان کے چلنے کا طریقہ ہے۔ (سبل) سیدھی سی بات ہے کہ ایک پاؤں میں جوتا اور دوسرا ننگا لئے پھرنا شائستگی اور تہذیب کے بھی منافی ہے۔

(۱۲۴۹) وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «لاَ يَنْظُرُ اللَّهُ إِلَى مَنْ جَرَّ ثَوْبَهُ خُيَلاَءَ». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "اللہ تعالیٰ اس شخص کی طرف نظر رحمت سے نہ دیکھے گا جو تکبر سے اپنا کپڑا پاؤں کے نیچے اور پیچھے گھسیٹتا پھرے۔" (بخاری و مسلم)

لغوی تشریح: ﴿ الخیلاء ﴾ "خا" پر ضمہ اور کسرہ بھی اور "یا" پر فتحہ۔ اس کے معنی تکبر، عجب، تفاخر اور اترانا وغیرہ۔

حاصل کلام: اس حدیث سے مردوں کیلئے ٹخنوں سے نیچے چادر وغیرہ کا لٹکانا حرام ہے۔ کیونکہ یہ متکبرین کی علامت ہے۔

(۱۲۵۰) وَعَنْهُ أَنَّ رَسُولَ اللهِ ﷺ قَالَ: «إِذَا أَكَلَ أَحَدُكُمْ فَلْيَأْكُلْ بِيَمِينِهِ، وَإِذَا شَرِبَ فَلْيَشْرَبْ بِيَمِينِهِ، فَإِنَّ الشَّيْطَانَ يَأْكُلُ بِشِمَالِهِ، وَيَشْرَبُ بِشِمَالِهِ». أَخْرَجَهُ مُسْلِمٌ.

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "جب بھی تم میں سے کوئی کھانا کھائے تو اسے اپنے دائیں ہاتھ سے کھانا چاہئے اور جب کوئی مشروب نوش کرے تو اسے دائیں ہاتھ سے نوش کرنا چاہئے۔ اس لئے کہ شیطان اپنے بائیں ہاتھ سے کھاتا ہے اور بائیں ہی سے پیتا ہے۔" (مسلم)

حاصل کلام: اس حدیث کی رو سے کھانا پینا دائیں ہاتھ سے ہونا چاہئے۔ بلاوجہ اپنے بائیں ہاتھ سے کھانا پینا حرام ہے اور شیطان سے مشابہت ہے۔

(۱۲۵۱) وَعَنْ عَمْرِو بْنِ شُعَيْبٍ، عَنْ أَبِيهِ، عَنْ جَدِّهِ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «كُلْ، وَاشْرَبْ، وَالبَسْ، وَتَصَدَّقْ، فِي غَيْرِ

حضرت عمرو بن شعیب رحمہ اللہ نے اپنے باپ سے اور انہوں نے اپنے دادا سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "کھا، پی اور لباس پہن اور صدقہ کر لیکن اسراف اور فخر کے بغیر۔" (اس کو ابوداؤد اور

سَرَفٍ وَلاَ مَخِيلَةٍ». أَخْرَجَهُ أَبُو دَاوُدَ وَأَحْمَدُ، وَعَلَّقَهُ الْبُخَارِيُّ.

احمد نے روایت کیا ہے اور بخاری نے اسے معلق بیان کیا ہے۔)

لغوی تشریح: ﴿ السرف ﴾ سین اور "را" دونوں پر فتحہ، ہر عمل اور فعل میں حد اعتدال سے تجاوز کرنا اور انفاق میں زیادہ مشہور ہے اور مخیلۃ بروزن عظیمۃ کے معنی ہیں تکبر، عجب۔

حاصل کلام: اس حدیث میں اسراف اور تکبر سے منع کیا گیا ہے خواہ اس کا تعلق کھانے پینے سے ہو، لباس سے ہو یا صدقہ و خیرات سے۔ یہ دونوں بہر آئینہ ناجائز ہیں۔ شیخ عبداللطیف بغدادی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ حدیث انسان کے دینوی و اخروی مصالح کی جامع ہے۔ کیونکہ اسراف ہر جگہ نقصان کا باعث ہے۔ زیادہ کھانے سے صحت برباد ہوتی ہے اور معیشت پر بھی اس کے برے اثرات مرتب ہوتے ہیں اور تکبر کرنے والا دنیا میں دوسروں کی نظروں میں بھی مبغوض ہوتا ہے اور آخرت میں ذلت اور رسوائی اس کا مقدر بنتی ہے۔ (سبل)

٢ - بَابُ الْبِرِّ وَالصِّلَةِ

نیکی اور صلہ رحمی کا بیان

(١٢٥٢) عَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «**مَنْ أَحَبَّ أَنْ يُبْسَطَ لَهُ فِي رِزْقِهِ، وَأَنْ يُنْسَأَ لَهُ فِي أَثَرِهِ، فَلْيَصِلْ رَحِمَهُ**». أَخْرَجَهُ الْبُخَارِيُّ.

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "جس کسی کو یہ پسند ہے کہ اس کے رزق میں کشادگی و کشائش ہو اور عمر دراز ملے تو اسے صلہ رحمی کرنی چاہئے۔" (بخاری)

لغوی تشریح: ﴿ باب البر ﴾ "باء" کے نیچے کسرہ بھلے اور نیک کام میں وسعت پزیری۔ یہ ہر قسم کی برائیوں سے بچنے اور ہر قسم کی بھلائیوں کے اکتساب سے حاصل شدہ تمام نیکیوں اور بھلائیوں کو جمع کرنے والے کو کہتے ہیں اور اس کا اطلاق اس خالص عمل پر ہوتا ہے جو دم واپس تک مسلسل ولگاتار ہوتا رہے۔ ﴿ والصلۃ ﴾ مصدر ہے۔ قطع کی ضد ہے۔ معنی اس کے ملانا، جوڑنا، صلہ رحمی کرنا، اور صلہ رحمی کنایہ ہے قریبی رشتہ داروں سے احسان اور حسن سلوک کا، صلہ رحمی یعنی جوڑنے سے قریبی رشتہ دار نسبی اور سسرالی دونوں مراد ہیں۔ ان کے ساتھ نرمی اور شفقت سے پیش آنا اور ان پر مہربانی کرنا اور قطع رحمی صلہ رحمی کی ضد ہے۔ ﴿ ان یبسط ﴾ صیغہ مجہول۔ رزق میں توسیع و کشادگی پیدا ہو، ﴿ ان ینسا ﴾ یہ بھی صیغہ مجہول۔ یعنی اضافہ ہو۔ ﴿ فی اثرہ ﴾ یعنی اس کی عمر میں، مدت اجل میں، عمر میں اضافہ کے معنی یہ ہیں کہ اسے نیک کاموں اور اطاعت و فرمانبرداری کی توفیق سے نوازا جائے گا اور اس کی زندگی اور ایام زندگی میں برکت ڈالی جائے گی اور اس کا ذکر جمیل اس کی وفات کے بعد بھی باقی رہے گا اور ایک قول یہ بھی ہے کہ یہ عمر میں اضافہ حقیقت میں ہے اللہ کے علم کی طرف نسبت کے اعتبار سے نہیں بلکہ فرشتے

کے علم کے اعتبار سے ہے جسے انسان کی عمر پر مقرر کیا گیا ہے۔ مثلاً یہ کہا جاتا ہے کہ فلاں صاحب کی عمر سو برس کی ہوگی اگر وہ صلہ رحمی کرے گا اور اگر قطع رحمی کرے گا تو ساٹھ برس ہوگی۔ حالانکہ اللہ کے علم میں ہے کہ وہ صلہ رحمی کرے گا یا قطع رحمی۔ جو علم الٰہی میں ہے اس میں کوئی ردوبدل اور تغیر نہیں ہوگا اور جو فرشتے کے علم میں ہے اس میں کمی بیشی کا امکان ہے۔ پہلی تاویل راجح ہے۔

(١٢٥٣) وَعَنْ جُبَيْرِ بْنِ مُطْعِمٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «**لاَ يَدْخُلُ الجَنَّةَ قَاطِعٌ**» يَعْنِي قَاطِعَ رَحِمٍ. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت جبیر بن مطعم رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "جنت میں قطع رحمی کرنے والا داخل نہیں ہوگا۔" (بخاری و مسلم)

حاصل کلام: اس حدیث میں قطع رحمی کے انجام سے خبردار کیا گیا ہے کہ ایسا آدمی جنت میں داخل نہیں ہوگا۔ قطع رحمی کبیرہ گناہ ہے اور جنت میں داخل نہ ہونے کا مفہوم یہ ہے کہ اس جرم کا مرتکب فی الفور جنت میں نہیں جائے گا بلکہ اپنے اس گناہ کی سزا کے بعد ہی جنت میں جائے گا۔

(١٢٥٤) وَعَنِ ٱلْمُغِيْرَةِ بْنِ شُعْبَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، أَنَّ رَسُولَ اللهِ ﷺ قَالَ: «**إِنَّ اللَّهَ حَرَّمَ عَلَيْكُمْ عُقُوقَ الأُمَّهَاتِ، وَوَأْدَ البَنَاتِ، وَمَنْعاً وَهَاتِ، وَكَرِهَ لَكُمْ قِيلَ وَقَالَ، وَكَثْرَةَ السُّؤَالِ، وَإِضَاعَةَ المَالِ**». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ "اللہ تعالیٰ نے تم پر ماؤں کی نافرمانی، لڑکیوں کو زندہ درگور کرنا اور احسان سے باز رہنا اور دوسروں کے سامنے ہاتھ پھیلانا حرام فرما دیا ہے اور کثرت سے باتیں کرنا اور کثرت سے سوال اور مال کو ضائع کرنا ناپسند کیا ہے۔" (بخاری و مسلم)

لغوی تشریح: ﴿ عقوق ﴾ عین پر ضمہ۔ ﴿ عق ﴾ سے ماخوذ ہے جس کے دراصل معنی قطع کرنے، پھاڑنے کے ہیں اور عق والدہ الخ۔ اس وقت بولتے ہیں جب بچہ اپنے والد کو اذیت و تکلیف دے اور اس کی نافرمانی اور اس کے خلاف خروج و بغاوت کرے۔ اس سے مراد ہے کہ اپنے قول و فعل سے اپنے والدین کو اذیت دے اور اس میں عرف کے مطابق نرمی نہ ہو۔ ﴿ واد ﴾ اس میں ھمزہ ساکن ہے۔ بچی کو زندہ درگور کرنا۔ ﴿ منعا وھات ﴾ منع کے معنی روکنا یعنی اموال اور حقوق میں سے واجبات بھی ادا کرنے سے باز رہنا اور ھات میں تا کے نیچے کسرہ ہے اور یہ امر مجذوم ہے اور اس سے مراد ہے ایسا مال طلب کرنا جس کے طلب کرنے کا اسے استحقاق نہ ہو۔ مطلب ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مالدار آدمی کیلئے بخل اور سوال کرنا حرام قرار دیا ہے۔ "قیل وقال" بہت زیادہ باتیں کرنا، کثرت کلام اور لایعنی و بے معنی جھگڑا اور مجادلہ اور لوگوں کے معاملات و حالات، ان کے حکایات اور تصرفات کے بارے میں باتوں میں مشغول رہنا۔

(١٢٥٥) وَعَنْ عَبْدِاللهِ بْنِ عَمْرٍو حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ نے نبی ﷺ سے

رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا، عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ: «رِضَا اللهِ فِي رِضَا الوَالِدَيْنِ، وَسَخَطُ اللهِ فِي سَخَطِ الوَالِدَيْنِ» أَخْرَجَهُ التِّرْمِذِيُّ، وَصَحَّحَهُ ابْنُ حِبَّانَ وَالحَاكِمُ.

روایت کیا ہے کہ آپ ؐ نے فرمایا ''اللہ تعالیٰ کی رضامندی والدین کی رضامندی میں ہے اور اللہ تعالیٰ کی ناراضگی والدین کی ناراضگی میں ہے۔'' (اسے ترمذی نے نکالا ہے اور ابن حبان اور حاکم نے اسے صحیح قرار دیا ہے)

حاصل کلام: اس حدیث میں والدین کو راضی رکھنے اور ان کی ناراضی سے بچنے کا حکم ہے لیکن اگر والدین ایسے کام کا حکم دیں جس میں اللہ تعالیٰ کی نافرمانی ہو تو پھر ان کی اطاعت ناجائز ہے۔ ایسی صورت میں ان کی ناراضی کی پرواہ نہیں کرنی چاہئے جیسا کہ دوسری احادیث میں اس کی صراحت موجود ہے۔

(١٢٥٦) وَعَنْ أَنَسٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ: «والَّذِي نَفْسِي بِيَدِهِ لاَ يُؤْمِنُ عَبْدٌ حَتَّى يُحِبَّ لِجَارِهِ أَوْ لِأَخِيهِ مَا يُحِبُّ لِنَفْسِهِ». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت انس رضی اللہ عنہ نے روایت کیا ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا ''مجھے اس ذات اقدس کی قسم' جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے کوئی بندہ اس وقت تک مومن نہیں ہو سکتا جب تک وہ اپنے ہمسایہ یا اپنے بھائی کیلئے بھی وہی پسند نہ کرے۔ جو اپنے لیے پسند کرتا ہے'' (بخاری و مسلم)

حاصل کلام: اس حدیث میں تکمیل ایمان کیلئے ایک شرط بیان ہوئی ہے اور وہ یہ ہے کہ انسان جو چیز اپنے لئے پسند اور محبوب رکھے اپنے ہمسائے یا اپنے بھائی کیلئے بھی وہی چیز محبوب رکھے۔ اگر اس کی خواہش ہے کہ اس کی عزت و توقیر کی جائے تو اس کی اپنے ہمسایہ اور بھائی کیلئے بھی یہی سوچ ہونی چاہئے اگر اس کے دل میں یہ تمنا ہو کہ وہ امن و امان اور سلامتی سے رہے۔ تو اپنے بھائی کے لئے بھی ایسی سوچ ہی ہونی چاہئے کہ وہ بھی امن و امان اور سلامتی سے رہے۔۔ جن افراد میں ایسی سوچ ہوگی وہ معاشرہ امن و سلامتی کا گہوارہ ہوگا۔ ترقی کی منزلیں طے کرے گا۔ معاشرے کا ہر فرد اپنی جگہ جب ایسے جذبات و احساسات رکھے گا تو لامحالہ معاشرہ میں سکون و اطمینان ہوگا۔ بے چینی اور اضطراب نہیں ہوگا۔ ہر ایک دوسرے کا خیر خواہ اور ہمدرد ہوگا۔ اچھے معاشرے کا بھی یہی طرۂ امتیاز ہے۔

(١٢٥٧) وَعنِ ابْنِ مَسْعُودٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: سَأَلْتُ رَسُولَ اللهِ ﷺ أَيُّ الذَّنْبِ أَعْظَمُ؟ قَالَ: «أَنْ تَجْعَلَ للهِ نِدًّا، وَهُوَ خَلَقَكَ»، قُلْتُ: ثُمَّ أَيٌّ، قَالَ: «ثُمَّ أَنْ تَقْتُلَ

حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے سوال کیا' کون سا گناہ سب سے بڑا ہے؟ آپ ؐ نے فرمایا ''یہ کہ تو اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی کو شریک بنائے۔ حالانکہ وہ تیرا خالق ہے۔ میں نے عرض کیا پھر کونسا؟ آپ ؐ نے فرمایا ''یہ کہ تو اپنی

وَلَدَكَ خَشْيَةَ أَنْ يَأْكُلَ مَعَكَ». قُلْتُ: ثُمَّ أَيٌّ؟ قَالَ: ثُمَّ أَنْ تُزَانِيَ بِحَلِيْلَةَ جَارِكَ. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

اولاد کو اس ڈر سے قتل کرے کہ وہ تمہارے ساتھ مل کر کھائیں گے۔" میں نے پھر عرض کیا کہ پھر کون سا؟ آپؐ نے فرمایا "یہ کہ تو اپنے ہمسایہ کی اہلیہ سے زنا کرے۔" (بخاری و مسلم)

لغوی تشریح: ﴿ندا﴾ نون کے نیچے کسرہ اور دال پر تشدید۔ اس کے معنی ہیں شریک، ساجھی اور اصل میں اس کے معنی ہیں نظیر، مثیل، پناہ کنندہ۔ ﴿حلیلۃ جارک﴾ ہمسایہ کی اہلیہ، قتل اور زنا مطلقاً کبیرہ گناہ ہیں لیکن قتل ولد اور ہمسایہ کی بیوی سے منہ کالا کرنا، عظیم ترین اور فحش ترین افعال ہیں کیونکہ دوسروں کے مقابلہ میں ان دونوں کا حق زیادہ ہے کہ ان کے حقوق کا خیال و لحاظ رکھا جائے اور ان کو تحفظ فراہم کیا جائے۔ جب باڑھ ہی کھیت کو کھانے لگ جائے تو اس کھیت کا پھر اللہ ہی حافظ ہے۔

(١٢٥٨) وَعَنْ عَبْدِ اللهِ بْنِ عَمْرِو بْنِ العَاصِ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُمَا، أَنَّ رَسُولَ اللهِ ﷺ قَالَ: «مِنَ الكَبَائِرِ شَتْمُ الرَّجُلِ وَالِدَيْهِ»، قِيْلَ: وَهَلْ يَسُبُّ الرَّجُلُ وَالِدَيْهِ؟ قَالَ: «نَعَمْ يَسُبُّ أَبَا الرَّجُلِ فَيَسُبُّ أَبَاهُ، وَيَسُبُّ أُمَّهُ فَيَسُبُّ أُمَّهُ». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "کبیرہ گناہوں میں سے اپنے والدین کو گالی دینا ہے۔" کہا گیا کہ کیا کوئی شخص اپنے ماں باپ کو بھی گالی دیتا ہے؟ آپؐ نے فرمایا "ہاں! کہ وہ کسی آدمی کے باپ کو گالی گلوچ کرتا ہے تو وہ اس کے باپ کو گالی گلوچ کرتا ہے اور وہ اس کی والدہ کو گالی دیتا ہے تو وہ اس کی والدہ کو گالی دیتا ہے۔" (بخاری و مسلم)

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ کسی کام کیلئے سبب بننا گویا خود اس کام کو انجام دینا ہے۔ بالفاظ دیگر حرام چیز کے اسباب بھی حرام ہوتے ہیں۔ اگر اسباب کو عملی جامہ پہناتے وقت مسبب کی نیت نہ بھی ہو پھر بھی ان کا ارتکاب جرم ہے۔ نیز اس سے مترشح ہوتا ہے کہ کسی کام کا اگر نتیجہ حرام ہو تو وہ کام بھی حرام ہے۔ اس لئے اگر اپنے والدین کو گالی سے بچانا ہے تو دوسرے کے والدین کو گالی نہ دو اور نہ ہی ان کو برا بھلا کہو۔

(١٢٥٩) وَعَنْ أَبِيْ أَيُّوبَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُ، أَنَّ رَسُولَ اللهِ ﷺ قَالَ: «لاَ يَحِلُّ لِمُسْلِمٍ أَنْ يَهْجُرَ أَخَاهُ فَوْقَ ثَلاَثِ لَيَالٍ. يَلْتَقِيَانِ فَيُعْرِضُ هَذَا وَيُعْرِضُ هَذَا،

حضرت ابو ایوب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ "کسی مسلمان کیلئے یہ حلال نہیں ہے کہ وہ اپنے بھائی سے تین روز سے زیادہ قطع تعلق رکھے۔ جب دونوں کا آمنا سامنا ہو تو یہ اپنا منہ ادھر کر لے اور وہ ادھر کر لے۔ دونوں میں بہتر

وَخَيْرُهُمَا الَّذِي يَبْدَأُ بِالسَّلَامِ». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

انسان وہ ہے جو سلام میں پہل کرے۔" (بخاری و مسلم)

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر دو مسلمان بھائیوں کی ناراضی ذاتی نوعیت کے معاملات کی وجہ سے ہو تو ایسی صورت میں تین روز سے زیادہ دن ناراض رہنا جائز نہیں ہے لیکن اگر ناراضی کی وجہ دینی معاملہ ہو تو اس کیلئے غالبًا کوئی حد نہیں ہے۔ صحابہ کرامؓ سے تادم زیست قطع روابط کا ثبوت بھی ملتا ہے۔ دینی ناراضی تو عین ایمان کی علامت ہے۔ علت ناراضی موجود ہے' اس وقت تک قطع تعلق درست ہے جب وہ سبب دور ہو جائے تو ناراضی کو بھی ختم کر دینا چاہئے کیونکہ مومن صادق کے ہاں باہم تعلقات کا سبب دین ہے' دنیا نہیں۔

(١٢٦٠) وَعَنْ جَابِرٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «كُلُّ مَعْرُوفٍ صَدَقَةٌ». أَخرَجَهُ البُخَارِيُّ.

حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ "ہر بھلائی صدقہ ہے۔" (بخاری)

لغوی تشریح: ﴿ المعروف ﴾ بھلائی کا ہر کام۔ دوسری حدیث جو آگے بیان ہو رہی ہے اس کیلئے ایک نص ہے۔

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ صدقہ صرف مال خرچ کرنے کا نام ہی نہیں بلکہ ہر نیکی صدقہ ہے۔ ترمذی اور ابن حبان میں ابوداؤد سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "تیرے اپنے بھائی کے روبرو مسکرانا بھی صدقہ ہے اور اس کی اچھے کام کی طرف رہنمائی کرنا اور غیر شرعی کام سے روکنا بھی صدقہ ہے اور گم کردہ راہ گیر کو راستہ بتانا بھی صدقہ ہے یہاں تک کہ راستہ سے ہڈی اور کانٹے کا اس نیت سے دور کرنا کہ راہ چلتے مسافر کیلئے باعث اذیت و تکلیف ہو گا' صدقہ ہے۔ اپنے ڈول سے دوسرے بھائی کے ڈول میں کچھ پانی ڈال دینا بھی صدقہ ہے۔"

(١٢٦١) وَعَنْ أَبِيْ ذَرٍّ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «لاَ تَحْقِرَنَّ مِنَ المَعْرُوفِ شَيْئاً، وَلَوْ أَنْ تَلْقَى أَخَاكَ بِوَجْهٍ طَلْقٍ».

حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "کسی بھلے کام کو حقیر اور معمولی نہ سمجھو۔ خواہ اپنے بھائی سے خندہ و کشادہ روئی سے بات کرنا ہی کیوں نہ ہو۔"

لغوی تشریح: ﴿ بوجه ﴾ تنوین کے ساتھ۔ ﴿ طلق ﴾ اس میں لام ساکن ہے۔ طلیق بروزن امیر آتا ہے اور طلق کتف کی طرح طلق کہتے ہیں خندہ پیشانی کو یعنی اپنے بھائی سے ملاقات کے وقت چہرہ مسکراتا' ہنستا' کھلتا ہو۔

(١٢٦٢) وَعَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ

انہی سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا

اللهِ ﷺ: «إِذَا طَبَخْتَ مَرَقَةً فَأَكْثِرْ مَآءَهَا، وَتَعَاهَدْ جِيرَانَكَ». أَخرَجَهُمَا مُسْلِمٌ.

"جب تم شوربا پکاؤ تو اس میں ذرا پانی زیادہ ڈال لیا کرو اور اپنے ہمسایہ کا بھی خیال رکھا کرو۔" (ان دونوں احادیث کو مسلم نے روایت کیا ہے)

لغوی تشریح: ﴿ المرقۃ ﴾ میم' را اور قاف پر فتحہ۔ وہ پانی جس میں گوشت کو جوش دے کر ابالا جاتا ہے اور وہ چکناہٹ والا ہو جاتا ہے۔ ﴿ تعاھد ﴾ صیغۂ امر کے ساتھ۔ خیال رکھو اور ﴿ جیران ﴾ جار کی جمع جس کے معنی ہمسایہ و پڑوسی کے ہیں۔

حاصل کلام: اس حدیث سے ہمسایہ سے حسن سلوک کا حکم ہے حتیٰ کہ فرمایا اگر گوشت پکانے کی نوبت آگئی ہے تو بجائے قورمہ اور بھنا ہوا پکانے کے اس میں ذرا پانی زیادہ ڈال کر شوربا تیار کر لیں اور اس میں سے ہمسایہ کے ہاں بھی بھیج دیں' ہمسایہ اگر غریب ہو تو آپ ؐ کا یہ ارشاد وجوب کیلئے ہوگا اور اگر امیر ہو تو پھر استحباب پر محمول ہوگا۔ ایک دوسری حدیث میں نبی ﷺ کا ارشاد ہے کہ "جبریل علیہ السلام جب میرے پاس تشریف لاتے تو مجھے حق ہمسایہ کی پرزور تلقین کرتے رہتے حتیٰ کہ مجھے گمان ہونے لگا کہ کہیں ہمسایہ کو وارث نہ بنا دیا جائے۔

(١٢٦٣) وَعَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «مَنْ نَفَّسَ عَنْ مُسْلِمٍ كُرْبَةً مِنْ كُرَبِ الدُّنْيَا نَفَّسَ اللَّهُ عَنْهُ كُرْبَةً مِنْ كُرَبِ يَوْمِ القِيَامَةِ، وَمَنْ يَسَّرَ عَلَى مُعْسِرٍ يَسَّرَ اللَّهُ عَلَيْهِ فِي الدُّنْيَا وَالآخِرَةِ. وَمَنْ سَتَرَ مُسْلِماً سَتَرَهُ اللَّهُ فِي الدُّنْيَا وَالآخِرَةِ، وَاللَّهُ فِي عَوْنِ العَبْدِ مَا كَانَ العَبْدُ فِي عَوْنِ أَخِيهِ». أَخرَجَهُ مُسْلِمٌ.

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ "جو کوئی دنیا کی مصیبتوں اور سختیوں میں سے کسی مسلمان کی مصیبت کو دور کرے گا اللہ تعالیٰ قیامت کے روز' قیامت کی سختیوں میں سے اس کی کوئی سختی دور فرما دے گا اور جو کوئی کسی تنگ دست کیلئے دنیا میں آسانی پیدا کرے گا تو اللہ تعالیٰ دنیا و آخرت میں اس کیلئے آسانی پیدا فرمائے گا اور جو کوئی کسی مسلمان کے عیب پر پردہ ڈالے گا اللہ تعالیٰ دنیا و آخرت میں اس کی پردہ پوشی فرمائے گا اور اللہ تعالیٰ اس وقت تک بندے کی مدد میں رہتا ہے جب تک وہ بندہ اپنے بھائی کی مدد کرتا رہے گا۔" (مسلم)

لغوی تشریح: ﴿ نفس ﴾ تنفیس سے ماخوذ ہے' کشادہ کرتا ہے' دور کرتا ہے اور تکلیف کے بندھن سے کھول کر آزاد کر دیتا ہے۔ ﴿ کربۃ ﴾ کاف پر ضمہ اور "را" ساکن۔ اس کی جمع ﴿ کرب ﴾ کاف کے فتحہ سے آتی ہے یعنی مشقت' حزن اور پریشانی۔

(١٢٦٤) وَعَنِ ابْنِ مَسْعُودٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «مَنْ دَلَّ عَلَى خَيْرٍ فَلَهُ مِثْلُ أَجْرِ فَاعِلِهِ». أَخْرَجَهُ مُسْلِمٌ.

حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "جو کوئی خیر و بھلائی کا راستہ بتائے اس کو بھی نیکی پر عمل پیرا ہونے والے کے برابر ثواب ملتا ہے۔" (مسلم)

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ نیک عمل کی راہنمائی کرنے والے کو اتنا ہی اجر و ثواب ملے گا جتنا اس نیکی پر عمل کرنے والے کو ملے گا۔ یہ راہنمائی براہ راست ہو یا بالواسطہ کہ دوسرے کسی عالم کی طرف رجوع کا اشارہ کیا جائے۔ دونوں کو شامل ہے۔

(١٢٦٥) وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا، عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ: «مَنِ اسْتَعَاذَكُمْ بِاللهِ فَأَعِيذُوهُ، وَمَنْ سَأَلَكُمْ بِاللهِ فَأَعْطُوهُ، وَمَنْ أَتَى إِلَيْكُمْ مَعْرُوفاً فَكَافِئُوهُ، فَإِنْ لَمْ تَجِدُوا فَادْعُوا لَهُ». أَخْرَجَهُ الْبَيْهَقِيُّ.

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما نے نبی ﷺ سے روایت کیا ہے کہ "جو کوئی تم میں سے اللہ کے نام سے پناہ طلب کرے تو اس کو پناہ دو اور جو کوئی اللہ کے نام پر تم سے سوال کرے تو اس کو دو اور جو کوئی تم سے حسن سلوک و احسان کرے تو اس کو بدلہ دو اگر پورا بدلہ دینے کی طاقت و وسعت نہ ہو تو پھر اس کے حق میں دعا کرو۔" (سنن بیہقی)

لغوی تشریح: ﴿ من استعاذكم بالله ﴾ اس کے معنی یہ ہیں کہ جو کوئی اللہ کے نام سے پناہ طلب کرے کسی ایسے کام کے بارے میں جو اس پر واجب نہ ہو تو وہ پناہ دے دے اور جس کا اس سے مطالبہ کیا گیا کہ وہ اسے انجام دے تو اسے چھوڑ دے۔ اسی طرح مصائب یا ناپسندیدہ کاموں میں اللہ کے نام سے پناہ کا طالب ہو تو اسے پناہ دینا واجب ہے۔ ﴿ فكافئوه ﴾ امر کا صیغہ ہے معنی ہے کہ اسے اس کے احسان سے اچھی جزا دو۔

حاصل کلام: اس حدیث میں اللہ کے نام پر پناہ طلب کرنے والے کو پناہ دینے اور اللہ کا نام لے کر سوال کرنے والے کو کچھ نہ کچھ ضرور دینے اور احسان کا بدلہ احسان سے دینے کی تاکید ہے۔ اللہ کے نام سے سوال کرنے والے کو حتی الوسع کچھ نہ کچھ دینا چاہئے۔ مگر دست سوال دراز کرنے والے کو کلام ہے کہ اللہ کا واسطہ دینے سے بچنا چاہئے۔ حضرت ابوموسیٰ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "ملعون ہے وہ جو اللہ کا نام لے کر سوال کرے اور وہ بھی ملعون ہے جس سے اللہ کے نام پر سوال کیا جائے اور وہ کچھ بھی نہ دے بشرطیکہ وہ سوال کسی بری چیز کا نہ ہو۔" بہرحال اللہ تعالیٰ کا نام لے کر سوال کرنا دوسرے کو بھی مشکل میں ڈال دیتا ہے اس لئے بڑی احتیاط کی ضرورت ہے۔

٣ - بَابُ الزُّهْدِ وَالْوَرَعِ — دنیا سے بے رغبتی اور پرہیز گاری کا

بیان

(۱۲۶۶) وَعَنِ النُّعْمَانِ بْنِ بَشِيْرٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا قَالَ: سَمِعْتُ رَسُولَ اللهِ ﷺ يَقُولُ - وَأَهْوَى النُّعْمَانُ بِإِصْبَعَيْهِ إِلىٰ أُذُنَيْهِ - : «إِنَّ الحَلاَلَ بَيِّنٌ، وَإِنَّ الحَرَامَ بَيِّنٌ، وَبَيْنَهُمَا مُشْتَبِهَاتٌ، لاَ يَعْلَمُهُنَّ كَثِيرٌ مِنَ النَّاسِ، فَمَنِ اتَّقَى الشُّبُهَاتِ فَقَدِ اسْتَبْرَأَ لِدِينِهِ وَعِرْضِهِ، وَمَنْ وَقَعَ فِي الشُّبُهَاتِ وَقَعَ فِي الحَرَامِ. كَالرَّاعِي يَرْعَى حَوْلَ الحِمَى يُوشِكُ أَنْ يَقَعَ فِيهِ. أَلاَ! وَإِنَّ لِكُلِّ مَلِكٍ حِمىً، أَلاَ! وَإِنَّ حِمَى اللهِ مَحَارِمُهُ. أَلاَ! وَإِنَّ فِي الجَسَدِ مُضْغَةً إِذَا صَلَحَتْ صَلَحَ الجَسَدُ كُلُّهُ، وَإِذَا فَسَدَتْ فَسَدَ الجَسَدُ كُلُّهُ، أَلاَ! وَهِيَ القَلْبُ».

مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا اور نعمان اپنی دونوں انگلیوں کو اپنے کانوں کی طرف لے گئے ”حلال بھی واضح ہے اور حرام بھی ان دونوں کے درمیان شبہات ہیں۔ لوگوں کی اکثریت ان کو نہیں جانتی۔ پس جو کوئی شبہات سے بچ گیا تو اس نے اپنے دین اور اپنی عزت و آبرو کو بچالیا اور جو شبہات میں پڑ گیا وہ حرام میں پھنس گیا۔ جیسے چرواہا کہ چراگاہ کے گرد مویشی چراتا ہو تو کبھی نہ کبھی مویشی چراگاہ میں چلے جاتے ہیں۔ خبردار! ہر بادشاہ کی چراگاہ ہوتی ہے۔ خبردار! حرام چیزیں اللہ کی چراگاہ ہے۔ خبردار! جسم میں گوشت کا ایک ٹکڑا ہے جب وہ درست ہو تو سارا جسم درست ہوتا ہے اور جب وہ بگڑ جائے تو سارا جسم بگڑ جاتا ہے۔ سن لو! وہ ٹکڑا دل ہے۔“ (بخاری و مسلم)

لغوی تشریح: ﴿ باب الزھد ﴾ زھد کے ”زاء“ پر ضمہ اور ھا ساکن۔ رغبت ودلچسپی کی ضد‘ کتاب وسنت کے تقاضا کے عین مطابق دنیوی رغبت ودلچسپی سے کنارہ کشی اور اسے ترک کرنا۔ ﴿ والورع ﴾ واؤ اور راء دونوں پر فتحہ اور را کو ساکن پڑھنا ہی جائز ہے۔ اس کے معنی میں گناہوں سے دور رہنا معاصی اور شبہ میں ڈالنے والی چیزوں سے اجتناب کرنا۔ ﴿ اھوی النعمان باصبعیہ ﴾ دونوں انگلیوں کو لمبا کیا‘ دراز کیا اور اونچا اٹھایا۔ یعنی اشارہ کیا کہ ان کانوں نے ارشاد نبوی کو سنا ہے۔ ﴿ الحلال بین ﴾ بین میں ”یا“ پر تشدید اور نیچے کسرہ ہے۔ مطلب ہے کہ حلال بالکل واضح و نمایاں ہے‘ دلیل کی بنا پر اس کی حلت میں کوئی شک نہیں یا اصل کی بنیاد کی وجہ سے اس سے جزئیات کا استخراج ممکن ہے۔ ﴿ والحرام بین ﴾ حرام بھی واضح ہے دلیل کی بنا پر اس کی حرمت میں کوئی شبہ نہیں‘ جیسے مردار ہے‘ خون ہے یا ہر مسئلہ کی

بنیاد سے استنباط ہو جیسے ہر نشہ آور چیز حرام ہے۔ ﴿ متشبهات ﴾ اس "با" پر کسرہ ہے۔ ایسے امور جو خلط ملط ہوں' ملے جلے اور مخلوط ہوں اس وجہ سے کہ ان کی ایک جہت حلال سے ہے اور ایک حرام سے اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ جو حرام کی وجہ سے مشتبہ ہیں یعنی جس سے حرمت صحیح ثابت ہو۔ ﴿ فقد استبرا لدينه ﴾ اس نے اپنے دین میں برأت حاصل کر لی لہٰذا شرعاً وہ مذموم نہیں۔ ﴿ وعرضه ﴾ اور بچا لیا محفوظ کر لیا یعنی اپنی عزت و آبرو کو لوگوں کے طعن و ملامت سے بچا لیا۔ ﴿ ومن وقع فی الشبهات وقع فی الحرام ﴾ حرام میں جا گھسا اور حرام میں گرنے کے قریب پہنچ گیا۔ تشبیہہ اس تاویل کی موید ہے۔ ﴿ الحمی ﴾ حاء کے نیچے کسرہ اور میم پر فتحہ مقصورہ ایسی چراگاہ جو بادشاہ اپنے لئے مخصوص کر لیتا ہے کہ صرف اس کے چرواہے ہی یہاں جانور چرا سکیں گے۔ پس جو کوئی اور چرواہا اس میں داخل ہوا یا اس میں جانور چرائے تو اسے سزا کیلئے پیش کیا جائے گا لهذا جو سلامتی چاہتا ہے وہ اس میں داخل ہونے کے خوف سے قریب ہی نہ جائے۔ اس تشبیہہ کا یہی مفہوم ہے ﴿ مضغة ﴾ میم پر ضمہ' ضاد ساکن۔ گوشت کا ٹکڑا۔ اس حدیث کا درجہ و مرتبہ کسی پر مخفی نہیں۔ ائمہ کا اس پر اجماع ہے کہ یہ ان احادیث میں سے ہے جن پر قواعد اسلام گردش کرتے ہیں۔

حاصل کلام: یہ حدیث اصول اسلام میں سے شمار کی گئی ہے۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ حلال اور حرام چیزیں تو واضح ہیں ان میں کسی قسم کا اشتباہ نہیں ہے البتہ مشتبہات ایسی چیزیں ہیں جن کی حرمت واضح نہیں یا جن کے بارے میں دلائل دونوں جانب قریب قریب مساوی ہوں۔ اس قسم کے مسائل سے بچنا چاہئے اور ظن و تخمین سے کام نہیں لینا چاہئے۔ نیز اس میں بتایا گیا ہے کہ بدن کی اصلاح اور اس کے بگاڑ کا انحصار دل پر ہے۔ پورے جسم میں اس کی وہی حیثیت ہے جو بادشاہ کی ہے' تمام اعضاء بدن اس کی رعیت اور عوام ہیں۔ اگر بادشاہ نیک ہو تو رعایا بھی نیک ہوگی اور جب بادشاہ برا ہو تو رعایا بھی بری ہوتی ہے۔

(١٢٦٧) وَعَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «تَعِسَ عَبْدُ الدِّينَارِ وَالدِّرْهَمِ وَالْقَطِيفَةِ، إِنْ أُعْطِيَ رَضِيَ، وَإِنْ لَمْ يُعْطَ لَمْ يَرْضَ». أَخرَجَهُ البُخَارِيُّ.

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "برباد ہو گیا سونے' چاندی اور خلعت کا بندہ اگر اسے یہ ملیں تو راضی رہتا ہے اور اگر نہ دی جائیں تو ناراض ہو جاتا ہے۔" (بخاری)

لغوی تشریح: ﴿ تعس ﴾ سمع اور فتح کے باب سے ہے' ہلاک و برباد ہو گیا۔ ﴿ القطيفة ﴾ وہ کپڑا جس کے پھندنے ہوں اور ﴿ عبد الدينار الخ ﴾ سے مراد یہ ہے کہ وہ ان اشیاء پر حریص اور ان کی وجہ سے فتنہ میں ایسا مبتلا ہو کہ انہی کی فریفتگی اور شیفتگی میں گم ہو گیا ہو' اس کی زندگی کا مقصد بجز ان کو جمع کرنے اور ذخیرہ کرنے اور پھندنے دار چادر زیب تن کر کے فخر کے ساتھ اکڑ کر چلنے کے سوا کچھ بھی نہ

ہو۔ رہا وہ شخص جو ان اشیاء کو بس حق کی حد تک حاصل کرے اور جہاں ان کا حق ہو وہیں ان کو رکھے اور خرچ کرے تو یہ اس ضمن میں نہیں آتا اگرچہ اس کے پاس کتنا ہی مال جمع ہو جائے۔ ﴿ رضی ﴾ دنیوی مال و متاع سے اللہ سے راضی ہو جاتا ہے۔

(١٢٦٨) وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُمَا قَالَ: أَخَذَ رَسُولُ اللهِ ﷺ بِمَنْكِبِيَّ، فَقَالَ: «كُنْ فِي الدُّنْيَا كَأَنَّكَ غَرِيبٌ أَوْ عَابِرُ سَبِيلٍ»، وَكَانَ ابْنُ عُمَرَ يَقُولُ: إِذَا أَمْسَيْتَ فَلاَ تَنْتَظِرَ الصَّبَاحَ، وَإِذَا أَصْبَحْتَ فَلاَ تَنْتَظِرَ المَسَاءَ، وَخُذْ مِنْ صِحَّتِكَ لِسَقَمِكَ، وَمِنْ حَيَاتِكَ لِمَوْتِكَ. أَخْرَجَهُ البُخَارِيُّ.

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے میرے کندھے پکڑ کر فرمایا" (اے ابن عمر!) دنیا میں ایک اجنبی یا راہ چلتے مسافر کی طرح رہ۔" اور ابن عمر رضی اللہ عنہما کہا کرتے تھے' جب تو شام کرے تو صبح کا انتظار نہ کر اور جب صبح کرے تو شام کا منتظر نہ رہ اور اپنی تندرستی کے وقت اپنی بیماری کا کچھ سامان کر اور زندگی میں موت کی تیاری کر۔ (بخاری)

لغوی تشریح: ﴿ بمنکبی ﴾ مفرد اور تثنیہ دونوں طرح مروی ہے۔ میم پر فتحہ اور کاف کے نیچے کسرہ' بازو اور کندھے کے ملنے کی جگہ۔ ﴿ غریب ﴾ جو اپنے وطن سے دور ہو۔ بسا اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایک انسان کسی شہر میں مقیم ہوتا ہے لیکن وہاں اس کی کوئی بہت زیادہ جان پہچان نہیں ہوتی بلکہ وہ لوگوں سے وحشت زدگی محسوس کرتا ہے' حدیث میں دراصل یہی شخص مراد ہے۔ ﴿ عابر سبیل ﴾ ایسا آدمی جو ہمیشہ سفر پر رہے' راستے طے کرتا رہے۔ نہ اپنے شہر میں اور نہ کسی دوسرے میں ٹھہرتا ہی نہیں۔ ﴿ خذ من صحتک الخ ﴾ اپنی صحت کے وقت اپنی بیماری کیلئے کچھ سامان کرے۔ اس ﴿ السقم ﴾ سین اور قاف پر فتحہ' جس کے معنی بیماری اور مرض کے ہیں اور سین پر ضمہ اور میم ساکن بھی پڑھا گیا ہے۔ اس صورت میں بھی معنی بیماری اور مرض کے ہیں۔ ابن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے تھے کہ اپنی صحت کے ایام میں اطاعت و فرمانبرداری اور صدقہ و خیرات کے کام اتنے کر لے کہ جو تجھے ایام بیماری میں نفع دیں اور تاخیر کی وجہ سے عمل میں جو کمی و کوتاہی رہ گئی ہے اس کا سدباب ہو جائے اور اس کمی کو پورا کر دے۔

حاصل کلام: اس حدیث میں دنیا کی بے ثباتی اور اس کے فانی ہونے کا بیان ہے اور زندگی بسر کرنے کا ایک اصول بتایا گیا ہے کہ دنیا میں انسان کو کس خیال سے رہنا چاہئے۔ دنیا انسان کا گھر نہیں بلکہ مسافر خانہ ہے جیسے مسافر اپنی اصل منزل کی جانب رواں دواں ہے' راستے کی چیزوں سے قلبی تعلق وابستہ نہیں کرتا' اس کا مطمع نظر اپنی منزل مقصود تک پہنچنا ہے۔ دنیا میں بھی ایک انسان کو بس اسی طرح رہنا چاہئے کہ معلوم نہیں کب رخت سفر باندھنے کا حکم صادر ہو جائے۔

(١٢٦٩) وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ رَضِيَ

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ

اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُمَا قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ، «مَنْ تَشَبَّهَ بِقَوْمٍ فَهُوَ مِنْهُمْ». أَخْرَجَهُ أَبُو دَاوُدَ، وَصَحَّحَهُ ابْنُ حِبَّانَ.

ﷺ نے فرمایا "جس کسی نے دوسری قوم سے مشابہت پیدا کی پس وہ انہی میں سے ہے۔" (اسے ابوداؤد نے روایت کیا ہے اور ابن حبان نے اسے صحیح کہا ہے)

حاصل کلام: یہ حدیث تشبہ بالکفار کی حرمت کی دلیل ہے اور اسی سے علماء نے غیر مسلموں کا فیشن اپنانے کو مکروہ قرار دیا ہے یہ "تشبیہہ" کا باب بڑا وسیع ہے۔ اس میں عبادات' عادات و اطوار خوردونوش' ملبوسات' زیب و زینت' آداب و رسومات رجحانات اور میل جول سب شامل ہے اور حدیث میں ان تمام چیزوں کی ممانعت ہے اگر اس مقام پر تنگی داماں کا خوف نہ ہوتا تو ہم یہاں ان کی نصوص بالتفصیل بیان کرتے۔ علامہ ناصرالدین البانی نے اپنی "حجاب المراۃ المسلمۃ" کے صفحہ ۷۸'۱۰۹ طبع ثانی میں اس موضوع پر نہایت عمدہ بحث کی ہے۔

(۱۲۷۰) وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُمَا قَالَ: كُنْتُ خَلْفَ النَّبِيِّ ﷺ يَوْماً فَقَالَ: «يَا غُلَامُ! احْفَظِ اللّٰهَ يَحْفَظْكَ، احْفَظِ اللّٰهَ تَجِدْهُ تُجَاهَكَ، وَإِذَا سَأَلْتَ فَاسْأَلِ اللّٰهَ، وَإِذَا اسْتَعَنْتَ فَاسْتَعِنْ بِاللّٰهِ». رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ، وَقَالَ: حَسَنٌ صَحِيحٌ.

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ ایک دن میں نبی ﷺ کے پیچھے (کھڑا) تھا۔ آپؐ نے فرمایا "اے لڑکے! تو اللہ (کے احکام) کی حفاظت کر اللہ تعالیٰ تیری نگہبانی کرے گا۔ تو اللہ کی طرف دھیان رکھ' تو اس کو اپنے سامنے پائے گا اور جب تو کچھ مانگے تو (صرف) اللہ تعالیٰ سے مانگ اور جب تو مدد طلب کرے تو (بس) اللہ سے مدد مانگ۔" (ترمذی نے اسے روایت کیا ہے اور حسن صحیح کہا ہے)

لغوی تشریح: ﴿احفظ اللہ﴾ یہ امر کا صیغہ ہے۔ معنی ہے کہ اللہ کو یاد کر اور اس کے اوامر پر عمل پیرا رہ کر ان کو یاد رکھ اور اس کے نواھی سے اجتناب کر کے اسے یاد رکھ اور اس کے مقرر کردہ حدود سے تجاوز اور تعدی نہ کر کے اس کو یاد رکھ۔ ﴿تجاھک﴾ اپنے روبرو اور سامنے پائے گا اور وہ دونوں جہانوں میں شر سے محفوظ رکھے گا۔

حاصل کلام: اس حدیث میں خالص توحید کی بہترین انداز میں تعلیم دی گئی ہے۔ اللہ تعالیٰ کو یاد رکھنے سے مراد یہ ہے کہ اس کے مقررہ کردہ حدود اور اس کے اوامر و نواھی کا ہر وقت پوری طرح خیال رکھے۔ خود بھی ان سے بچنے کی کوشش کرتا رہے اور دوسروں کو بھی اس کی تلقین کرے اور اللہ کی حفاظت کا مطلب ہے کہ وہ ایسے بندے کو دنیوی مصائب و آلام سے بچائے گا۔ ان سے بچنے کا راستہ سجھائے گا۔ قیامت کے روز جہنم کی آگ سے محفوظ رکھے گا۔ مسند امام احمد میں ہے کہ آپؐ نے فرمایا "ساری دنیا والے مل کر بھی تیرا کچھ بگاڑنا چاہیں' نقصان پہنچانا چاہیں تو نہ کچھ بگاڑ سکتے ہیں اور نہ نقصان

پہنچا سکتے ہیں اور نہ تیرا کچھ سنوار سکتے ہیں کیونکہ یہ سارے مل کر صرف اتنا نفع ہی پہنچا سکیں گے جو اللہ نے تیرے لئے لکھ دیا ہے اور اگر نقصان پہنچانا چاہیں تب بھی صرف اتنا ہی پہنچا سکیں گے جتنا اللہ نے لکھ دیا ہے۔ اس میں نہ یہ ازخود کمی کر سکتے ہیں اور نہ بیشی۔ کیونکہ تقدیر لکھنے والی قلمیں خشک ہو چکی ہیں اور دفتر لپیٹ کر بند کر دیئے گئے ہیں۔ اب ان میں اضافہ یا کمی بیشی کا کوئی امکان نہیں۔"

(۱۲۷۱) وَعَنْ سَهْلِ بْنِ سَعْدٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: جَآءَ رَجُلٌ إِلَى النَّبِيِّ ﷺ فَقَالَ: يَا رَسُولَ اللهِ! دُلَّنِيْ عَلىٰ عَمَلٍ إِذَا عَمِلْتُهُ أَحَبَّنِيَ اللَّهُ، وَأَحَبَّنِيَ النَّاسُ. فَقَالَ: «ازْهَدْ فِي الدُّنْيَا، يُحِبُّكَ اللَّهُ، وَازْهَدْ فِيمَا عِنْدَ النَّاسِ، يُحِبُّكَ النَّاسُ». رَوَاهُ ابْنُ مَاجَهْ وَغَيْرُهُ، وَسَنَدُهُ حَسَنٌ.

حضرت سہل بن سعد رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک آدمی نبی ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا۔ اے اللہ کے رسول (ﷺ)! مجھے ایسا عمل ارشاد بتایئے کہ جب میں وہ عمل کروں تو اللہ مجھے اپنا محبوب بنا لے اور لوگ بھی مجھ سے محبت کریں۔ آپؐ نے اس کے جواب میں فرمایا "دنیا سے بے نیاز و بے رغبت ہو جا اللہ تجھے محبوب رکھے گا اور لوگوں کے پاس جو کچھ ہے اس سے بھی بے نیاز ہو جا لوگ بھی تجھے محبوب رکھیں گے اور پسند کریں گے۔"

(اسے ابن ماجہ وغیرہ نے روایت کیا ہے اور اس کی سند حسن ہے)

حاصل کلام: اس حدیث میں محبوب جہاں بننے کا گر بتلایا گیا ہے کہ انسان دنیا اور اہل دنیا سے بے نیاز ہو کر بس اللہ تعالیٰ ہی کا ہو جائے اور دنیا کی طمع اور لالچ میں نہ پڑے۔ شیخ الاسلام امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے اپنی کتاب اقتضاء الصراط المستقیم کے ص ۸۲ پر فرمایا ہے کہ یہ حدیث کم از کم تشبیہہ با لکفار کی حرمت کی متقاضی ہے۔ اگرچہ اس حدیث کا ظاہری مضمون تشبیہ' با لکفار کی صورت میں کفر کا تقاضا کرتا ہے جیسا کہ ارشاد ربانی میں ہے "ومن یتولھم منکم فانہ منھم" کہ جو انہیں دوست رکھتا ہے وہ انہی میں سے ہے اور یہ عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما کے بیان کی نظیر ہے جس میں انہوں نے فرمایا کہ "جس نے مشرکین کے علاقہ میں اپنی بیوی سے رخصتی کے بعد شب عروسی کی اور ان کے نیروز و مہر جان ایام منائے اور ان کے ساتھ مشابہت کرتا رہا حتیٰ کہ وفات پا گیا تو ایسے آدمی کا حشر قیامت کے روز انہی کے ساتھ ہوگا۔" اسے تشبہ مطلق پر محمول کیا گیا ہے جو کفر کو واجب کر دیتا ہے اور تشبہ کے بعض پہلوؤں کی حرمت کا مقتضی ہے اور کبھی ان میں شمار ہونا اس قدر مشترک پر محمول ہوتا ہے جس میں بہرحال تشبیہہ کے ساتھ مشابہت ہوتی ہے۔ اگر وہ کفر ہو یا معصیت یا ان کا شعار ہو تو اس کا بھی حکم وہی ہوگا۔ بہرحال تشبیہہ کی حرمت ایسی علت و سبب کا تقاضا کرتی ہے جس میں تشبہ ہو اور تشبہ عام ہے۔ اس میں گو اپنی غرض مطلوب تھی مگر جب اصل عمل تو غیر سے ماخوذ ہے۔ مگر جس نے کوئی کام کیا اور وہ اتفاقاً غیر کے

عمل کے مشابہ ہے اور دونوں نے ایک دوسرے سے کچھ اخذ نہیں کیا تو اس کا کفار کے ساتھ تشبہ ہونا محل نظر ہے۔ لیکن اس سے بھی منع ہی کیا جاتا ہے تا کہ یہ ان کے ساتھ تشبیہہ کا ذریعہ نہ بن جائے اور اس لئے بھی کہ اس میں کفار کی مخالفت ہے جیسا کہ داڑھی کو رنگنے اور مونچھوں کو صاف کرنے کا حکم ہے حالانکہ نبی ﷺ کا ارشاد ہے کہ بڑھاپے کا رنگ تبدیل کرو اور یہود سے مشابہت اختیار نہ کرو۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ بالوں کو نہ رنگنے میں ان کے ساتھ تشابہ ہمارے ارادہ اور عمل کے بغیر بھی ہو جاتا ہے اور یہ اتفاقی طور پر ان سے عملی موافقت کی بڑی واضح مثال ہے۔ پھر علامہ ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے اس نھی کی انتہائی غایت اپنی قلبی بصیرت کی روشنی میں ذکر کی ہے کہ یہاں ظاہر اور باطن میں مضبوط ربط و تعلق ہے اور تشبہ بالکفار ان کے ساتھ دوستی اور باہمی مودت کا سبب بنتا ہے حالانکہ تعلق ممنوع ہے اور دین میں مداھنت اختیار کرنے کا موجب ہے اور اس سے ان کے اخلاق اور خبیث عادات اپنے تمامتر نقصانات کے ساتھ ساتھ جو اللہ کے غضب کا بھی موجب ہیں مسلمانوں کی صفوں میں سرایت کر جاتی ہیں اور یہ اس دور کی چشم دید حقیقت ہے جسے ہم دونوں آنکھوں سے مشاہدہ کرتے ہیں اور دونوں کانوں سے سنتے ہیں۔

(١٢٧٢) وَعَنْ سَعْدِ بْنِ أَبِيْ وَقَّاصٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: سَمِعْتُ رَسُولَ اللهِ ﷺ يَقُولُ: «إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ العَبْدَ التَّقِيَّ الغَنِيَّ الخَفِيَّ». أَخْرَجَهُ مُسْلِمٌ.

حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو ارشاد فرماتے سنا: "اللہ تعالیٰ ایسے بندے کو دوست و محبوب رکھتا ہے جو پرہیزگار، بے نیاز اور گمنام ہو۔" (مسلم)

لغوی تشریح: ﴿التقی﴾ جو امور واجب ہیں اور حلال ہیں ان پر عمل پیرا ہو اور جو حرام ہیں ان سے اجتناب کرے۔ ﴿الغنی﴾ اس سے مراد دل کا غنی ہونا ہے یعنی لوگوں کے پاس جو کچھ ہے اس میں اسے کوئی طمع و دلچسپی نہ ہو اگرچہ اس کا اپنا ذاتی مال کتنا ہی کم کیوں نہ ہو۔ ﴿الخفی﴾ وہ شخص جس کی عبادت کا حال کسی کو معلوم نہ ہو۔ پردۂ اخفاء میں رہے اور اس کی پرہیزگاری کا ریا و شہرت کے ظن و گمان سے دور رہنے کی وجہ سے بھی کسی کو علم نہ ہو۔

(١٢٧٣) وَعَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «مِنْ حُسْنِ إِسْلَامِ الْمَرْءِ تَرْكُهُ مَا لَا يَعْنِيهِ». رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ، وَقَالَ: حَسَنٌ.

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ "آدمی کا لایعنی چیزوں کو چھوڑ دینا اس کے اسلام کے اچھا ہونے کی دلیل ہے۔" (اسے ترمذی نے روایت کیا ہے اور اسے حسن قرار دیا ہے)

لغوی تشریح: ﴿مالا یعنیہ﴾ جو اہم اور مفید نہیں۔

حاصل کلام: اس حدیث کو نبی ﷺ کے ارشادات میں جوامع الکلم کی حیثیت حاصل ہے۔ دنیا میں انسان

کا مقصد حیات اللہ تعالیٰ کی عبادت ہے۔ ایک مومن صادق کے ایمان کا تقاضا ہے کہ وہ بے مقصد اور بے فائدہ کام سرانجام ہی نہ دے۔ وہ یہاں وقت کاٹنے کیلئے نہیں بلکہ اللہ کی عبادت اور رضا جوئی حاصل کرنے کیلئے آیا ہے۔ اس لئے جو اعمال مقصد حیات کے منافی' اصلاح دین کے مخالف ہیں وہ سب بے کار اور لایعنی ہیں۔ مالک کا سچا غلام ان کاموں میں اپنا وقت ضائع نہیں کرتا جو مالک کو ناپسند اور اس کی رضا کے منافی ہوں۔

(١٢٧٤) وَعَنِ الْمِقْدَامِ بْنِ مَعْدِيْكَرِبَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «مَا مَلأَ ابْنُ آدَمَ وِعَاءً شَرًّا مِنْ بَطْنٍ». أَخرَجَهُ التِّرْمِذِيُّ، وَحَسَّنَهُ.

حضرت مقدام بن معدیکرب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "وہ بدترین برتن جو انسان بھرتا ہے وہ اس کا پیٹ ہے۔" (اس کی روایت ترمذی نے کی ہے اور اسے حسن قرار دیا ہے)

حاصل کلام : اس حدیث میں بسیار خوری کو بدترین خصلت قرار دیا گیا ہے۔ بسیار خوری بہت سے دینی اور دنیاوی مفاسد اور خرابیوں کی جڑ ہے۔ ایسا آدمی صرف کھانے پینے کی فکر میں رہتا ہے اور بسا اوقات وہ یہ بھی تمیز نہیں کرتا کہ جس کھانے سے پیٹ بھر رہا ہے' وہ حلال ہے یا نہیں۔ بسیار خوری امراض معدہ کا باعث بھی ہے اور دل و دماغ پر بھی اس کے برے اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ مسند بزار میں ہے کہ بسیار خور قیامت کے دن بھوکا ہوگا۔ اس لئے یہ عادت دنیا و آخرت دونوں کی خرابی کا باعث ہے۔ امام غزالی رحمہ اللہ نے احیاء العلوم میں بسیار خوری کے دس نقصانات کا اور بقدر کفایت کھانے کے دس فوائد کا تذکرہ کیا ہے جو قابل ملاحظہ ہے۔

(١٢٧٥) وَعَنْ أَنَسٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «كُلُّ بَنِي آدَمَ خَطَّاءٌ، وَخَيْرُ الْخَطَّائِينَ التَّوَّابُونَ». أَخرَجَهُ التِّرْمِذِيُّ وَابْنُ مَاجَهْ، وَسَنَدُهُ قَوِيٌّ.

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "آدم کا ہر بیٹا خطا کار ہے اور بہترین خطا کار وہ ہیں جو بہت زیادہ توبہ کرنے والے ہوں۔" (اسے ترمذی اور ابن ماجہ نے روایت کیا ہے اور اس کی سند قوی ہے)

حاصل کلام : اس حدیث سے معلوم ہوا کہ ہر آدم زادہ خطا و گناہ کا پتلا ہے۔ انبیا کرامؑ کے علاوہ کوئی بھی انسان معصوم نہیں۔ مگر آدمیت کا تقاضی ہے جب کبھی خطا سرزد ہو فوراً حضرت آدم علیہ السلام کی طرح توبہ و استغفار کرے۔ شیطان کی طرح گناہ پر اصرار نہ کرے۔

(١٢٧٦) وَعَنْ أَنَسٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "خاموشی حکمت و دانائی ہے لیکن اس پر

ﷺ: «الصَّمْتُ حِكْمَةٌ، وَقَلِيلٌ فَاعِلُهُ». أَخْرَجَهُ الْبَيْهَقِيُّ فِي الشُّعَبِ بِسَنَدٍ ضَعِيفٍ. وَصَحَّحَ أَنَّهُ مَوْقُوفٌ مِنْ قَوْلِ لُقْمَانَ الْحَكِيمِ.

عمل پیرا ہونے والے تھوڑے ہی ہوتے ہیں۔" (اسے بیہقی نے شعب الایمان میں ضعیف سند کے ساتھ روایت کیا ہے اور صحیح بات یہ ہے کہ یہ لقمان حکیم کا قول ہے)

حاصل کلام: اس حدیث میں خاموش و مہربلب رہنے کو حکمت و دانائی اور عقلمندی و دانش مندی قرار دیا گیا ہے۔ ساتھ ہی فرمایا کہ اس پر عمل پیرا ہونے والے اور اسے اختیار کرنے والے تھوڑے ہی ہوتے ہیں۔ یہ گو حضرت لقمان عبدالسلام کا قول ہے مگر بہت سی احادیث میں خاموشی کی تائید اور فضول گوئی کی مذمت ہے۔ چنانچہ ایک حدیث میں ہے کہ "جو خاموش رہا اس نے نجات پائی۔" ایک حدیث میں ہے "جو کوئی بات کرے تو اسے چاہئے کہ ہمیشہ اچھی بات کرے ورنہ خاموش رہے۔"

٤ - بَابُ التَّرْهِيبِ مِنْ مَسَاوِىءِ الْأَخْلَاقِ

برے اخلاق و عادات سے ڈرانے اور خوف دلانے کا بیان

(۱۲۷۷) عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ: «إِيَّاكُمْ وَالْحَسَدَ، فَإِنَّ الْحَسَدَ يَأْكُلُ الْحَسَنَاتِ، كَمَا تَأْكُلُ النَّارُ الْحَطَبَ». أَخْرَجَهُ أَبُو دَاوُدَ، وَلِابْنِ مَاجَهْ مِنْ حَدِيثِ أَنَسٍ نحوه.

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "اپنے آپ کو حسد سے بچاؤ اس لئے کہ حسد نیکیوں کو اس طرح کھا جاتا ہے جس طرح آگ لکڑیوں کو کھا جاتی ہے۔" (اس کی تخریج ابوداؤد نے کی ہے اور ابن ماجہ میں بھی حضرت انس رضی اللہ عنہ سے اسی طرح مروی ہے)

لغوی تشریح: ﴿باب الترھیب﴾ خوف دلانا' ڈرانا اور ﴿من مساوی﴾ میم پر فتحہ مساوۃ کی جمع۔ معنی برائی۔ اور یہ برائی قولی اور فعلی دونوں طرح کی۔ ﴿الاخلاق﴾ خلق "خاء" اور "لام" دونوں پر ضمہ معنی عادت و خصلت۔ ﴿ایاکم والحسد﴾ حسد اس میں منصوب ہے' تحذیر کیلئے۔ یعنی حسد سے بچو اور ڈرو اور حسد یہ ہے کہ دوسرے کے پاس نعمت کو ناپسند و مکروہ سمجھے اور اس نعمت کے زوال کی تمنا و خواہش کرے لیکن اگر وہ ایسی تمنا کرے کہ فلاں کے پاس جو نعمت ہے وہ مجھے بھی مل جائے اس میں یہ خواہش و تمنا نہ پائی جائے کہ اس سے وہ زائل ہو جائے تو اسے اصطلاح شرع میں غبطہ یعنی رشک کہتے ہیں۔ یہ رشک دینی امور میں مطلوب ہے اور دنیوی امور میں معاف ہے۔

حاصل کلام: حسد کبیرہ گناہ ہے۔ شیطان کی پہلی نافرمانی حسد کی بنا پر تھی۔ قابیل نے ھابیل (اپنے بھائی) کو حسد کی بنا پر قتل کیا۔ حضرت یوسف ؑ کے خلاف ان کے بھائیوں کی کارگزاری اسی حسد کے نتیجہ میں

تھی۔ علمائے یہود بلکہ عبداللہ بن ابی منافق کی رسول اللہ ﷺ سے عداوت کا باعث بھی یہی حسد تھا۔ اس کی شناعت پر متعدد روایات مروی ہیں۔ یہ غیر مومنانہ عادت ہے اسی لئے آپؐ نے بڑی سختی سے اس سے بچنے کا حکم فرمایا ہے۔

(١٢٧٨) وَعَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «لَيْسَ الشَّدِيدُ بِالصُّرَعَةِ، إِنَّما الشَّدِيدُ الَّذِي يَمْلِكُ نَفْسَهُ عِنْدَ الغَضَبِ». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے ہی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ”کسی کو پچھاڑ دینا بہادری نہیں ہے۔ بہادر تو وہ ہے جو غصہ میں اپنے آپ کو قابو میں رکھے۔“ (بخاری و مسلم)

لغوی تشریح: ﴿الشديد﴾ شجاع، قوی اور بہادر ﴿الصرعة﴾ صاد پر ضمہ اور عین پر فتحہ، ایسا آدمی جو اکثر اوقات اپنی قوت سے لوگوں کو پچھاڑ لیتا ہو۔

حاصل کلام: اس حدیث میں اپنے حریف اور دشمن کو معاف کر دینا، اس سے درگزر کرنے کی فضیلت کا بیان ہے کہ آدمی طاقت کے باوجود غصہ کی حالت میں مدمقابل سے انتقامی کارروائی نہ کرے اور ایسے نازک موقع پر اپنے آپ کو قابو میں رکھے۔ حقیقت یہ ہے کہ نفس کا جہاد کفار کے خلاف جہاد سے بھی مشکل ہے۔ اس بنا پر رسول اللہ ﷺ نے غصہ کے موقع پر اپنے نفس پر قابو پا لینے کو تمام لوگوں سے زیادہ طاقت ور اور قوی شمار کیا ہے۔

(١٢٧٩) وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «الظُّلْمُ ظُلُمَاتٌ يَوْمَ القِيَامَةِ». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ”ظلم، قیامت کے روز بہت سی تاریکیوں اور اندھیروں کا باعث ہے۔“ (بخاری و مسلم)

حاصل کلام: اس حدیث میں ظلم سے بچنے کا حکم ہے اور خبردار کیا گیا ہے کہ اس دنیا میں جو ظلم کرے گا وہ قیامت کے روز بہت سے اندھیروں میں بھٹکتا پھرے گا اور یہ ظلم اپنی تمام اقسام پر مشتمل ہے۔ یعنی ظلم جان پر ہو، مال میں ہو، کسی کی عزت و آبرو پر ہو، حقوق اللہ میں ہو یا حقوق العباد میں ہو بہرنوع ظلم ہے اور حرام ہے۔

(١٢٨٠) وَعَنْ جَابِرٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «اتَّقُوا الظُّلْمَ، فَإِنَّ الظُّلْمَ ظُلُمَاتٌ يَوْمَ القِيَامَةِ. وَاتَّقُوا الشُّحَّ فَإِنَّهُ أَهْلَكَ مَنْ كَانَ قَبْلَكُمْ». أَخْرَجَهُ

حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ”ظلم سے بچو کیونکہ ظلم قیامت کے روز اندھیرے اور تاریکیاں ہوں گی۔ نیز بخیلی سے بھی بچو۔ تم سے پہلے گزرے ہوئے لوگ اسی سے ہلاک ہوئے ہیں۔“ (مسلم)

مُسْلِمٌ.

حاصل کلام: اس حدیث میں بھی ظلم سے منع کیا گیا ہے کہ قیامت کے روز یہ تاریکیوں اور اندھیروں کی شکل میں سامنے آئے گا۔ جہاں روشنی اور نور کی ضرورت ہوگی وہاں تاریکیوں اور اندھیروں سے پالا پڑے گا۔ نیز اس میں لالچ و کنجوسی سے بچنے کا بھی حکم ہے اور ﴿ شح ﴾ حصول مال کا لالچ اور اس کی حرص کے ساتھ ساتھ اس کے خرچ کرنے میں بخل اور کنجوسی کو کہتے ہیں اور یہی حرص و بخل ہمیشہ خون ریزی اور بد عملی کا باعث بنتا ہے جس سے حدیث میں خبردار کیا گیا ہے۔ (سبل)

(١٢٨١) وَعَنْ مَحْمُودِ بْنِ لَبِيْدٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «إِنَّ أَخْوَفَ مَا أَخَافُ عَلَيْكُمُ الشِّرْكُ الأَصْغَرُ: الرِّيَاءُ». أَخْرَجَهُ أَحْمَدُ بِإِسْنَادٍ حَسَنٍ.

حضرت محمود بن لبید رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "سب سے زیادہ خوف تمہارے لئے مجھے شرک اصغر کا ہے اور وہ ریاکاری ہے۔" (امام احمد نے اسے سند حسن کے ساتھ نکالا ہے)

لغوی تشریح: ﴿ الریاء ﴾ "راء" کے نیچے کسرہ۔ غیر اللہ کا لحاظ کر کے، نیکی و اطاعت کرنا اور نافرمانی و معصیت چھوڑنا ریاء ہے یا کسی دنیوی مقصد کیلئے نیکی کرنا اور گناہ کو ترک کرنا اور لوگوں کو اطلاع دینا کہ میں فلاں کام کر رہا ہوں یا یہ خیال کرے کہ اس کے عمل سے لوگ باخبر ہو جائیں۔ اس میں دنیوی غرض و مقصد ہو۔ رضائے الٰہی کا شائبہ تک بھی نہ ہو۔

حاصل کلام: ریاء کاری انسان کی گفتگو اور بات چیت میں ہو سکتی ہے اور عمل و فعل میں بھی اور اس سے ریاء کار کا مقصد غیر اللہ کو خوش کرنا ہو۔ اس کی دو قسمیں ہیں ایک یہ کہ لوگوں کو دکھا کر کوئی کام انجام دے اور دوسرا یہ کہ اگر کسی نے نہ دیکھا تو خود لوگوں کو بتا دے کہ میں نے یہ کام کیا ہے اسے سمعہ کہتے ہیں اور پہلی کو ریاء، یہ دونوں ہی حرام ہیں۔ اللہ تعالیٰ اور رسول اللہ ﷺ نے ان کی بہت مذمت فرمائی ہے اور اسے منافق کی علامت قرار دیا ہے۔ اس میں کوئی نیک عمل قبول نہیں ہوتا۔ اس لئے اس سے ہر ممکن طریقہ سے بچنے کی کوشش کرنی چاہئے۔

(١٢٨٢) وَعَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «آيَةُ الْمُنَافِقِ ثَلاثٌ، إِذَا حَدَّثَ كَذَبَ، وَإِذَا وَعَدَ أَخْلَفَ، وَإِذَا اؤْتُمِنَ خَانَ». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ. وَلَهُمَا مِنْ حَدِيْثِ عَبْدِاللهِ ابْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا:

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "منافق کی تین نشانیاں ہیں۔ جب بات کرے تو جھوٹ بولے اور جب وعدہ کرے تو وعدہ خلافی کرے اور جب اس کے پاس امانت رکھی جائے تو اس میں خیانت کرے۔" (بخاری و مسلم) اور دونوں کے ہاں عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کی روایت میں ہے کہ

«وَإِذَا خَاصَمَ فَجَرَ». ”جب لڑتا ہے تو گالی بکتا ہے۔“

لغوی تشریح: ﴿ آیۃ المنافق ﴾ یعنی منافق کے نفاق کی نشانی۔ ﴿ خاصم ﴾ جھگڑا کرتا ہے' لڑتا ہے۔ ﴿ فجر ﴾ سب و شتم کرتا ہے' گالی گلوچ پر اتر آتا ہے۔ ان تمام امور کا مرتکب ہونا نفاق عملی ہے اور یہ نفاق کی ایک قسم ہے اور دوسری قسم نفاق اعتقادی ہے اور وہ یہ ہے کہ ایمان کا تو اظہار کرے مگر باطن میں کفر بھرا ہوا ہو۔

حاصل کلام: اس حدیث میں منافق کی چار علامات بیان کی گئی ہیں اور مسلم میں ان الفاظ کا اضافہ بھی ہے کہ اگرچہ وہ نماز بھی پڑھتا ہو اور روزے بھی رکھتا ہو نیز یہ دعویٰ بھی کرتا ہو کہ میں مسلمان ہوں۔ امام نووی رحمہ اللہ نے فرمایا ہے کہ اکثر محقق علماء کی رائے یہی ہے کہ یہ کام اعتقادی منافقوں کے ہیں اور جب ایک سچا مومن اپنے اندر یہ صفات پیدا کرے گا تو منافق جیسا بن جائے گا' ایسے شخص پر منافق کا لفظ مجازی طور پر بولا جائے گا۔

(١٢٨٣) وَعَنِ ابْنِ مَسْعُودٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «سِبَابُ الْمُسْلِمِ فُسُوقٌ، وَقِتَالُهُ كُفْرٌ». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ”مسلمان کو گالی دینا فسق ہے اور اسے قتل کرنا کفر ہے۔“ (بخاری و مسلم)

لغوی تشریح: ﴿ السباب ﴾ سین کے نیچے کسرہ' گالی دینا۔ ”سب“ کے باب مفاعلہ کا مصدر ہے۔

حاصل کلام: اس حدیث میں مسلمان کا مسلمان کو گالی دینا فسق قرار دیا گیا اور ”فسق“ آدمی کا اللہ کی اطاعت سے باہر نکل جانے کو کہتے ہیں۔ چونکہ اسلام میں مسلمان کو گالی دینا ممنوع ہے اور گالی دینے والا حکم الٰہی سے باہر نکل جاتا ہے' اس لئے ایسے شخص کو فاسق کہا گیا ہے۔ اگر کوئی شخص مسلمان کا قتل جائز سمجھتا ہو اور اسلام کی وجہ ہی سے اس سے لڑتا ہو تو اس کے کفر حقیقی پر سب کا اتفاق ہے اور اگر دونوں باتیں نہ ہوں تو اس پر کفر کا اطلاق مجازی طور پر ہوگا۔ صحیح مسلم میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ”میری امت کے سب لوگ عافیت میں رکھنے کے قابل ہیں مگر جو لوگ کھلے عام ظاہری طور پر گناہ کا ارتکاب کریں' وہ لوگ اس کے مستحق نہیں۔“ علماء میں فاسق کے فسق سے آگاہ کرنے میں اختلاف ہے۔ طبرانی میں بسند حسن مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ”تم لوگ کب تک بدکار لوگوں کا حال بیان کرنے سے باز رہو گے۔ اس کی توہین اور ہتک کرو۔“ اس حدیث کی روشنی میں فاسق کے فسق کو اگر اس لئے ظاہر کیا جائے کہ لوگ اس کے شر سے محفوظ رہ سکیں تو بالکل جائز ہے۔

(١٢٨٤) وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «إِيَّاكُمْ وَالظَّنَّ، فَإِنَّ الظَّنَّ

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ”بدگمانی سے بچو کیونکہ بدگمانی بہت بڑا جھوٹ ہے۔“ (بخاری و مسلم)

أَكْذَبُ الحَدِيثِ». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

لغوی تشریح: ﴿ایاکم والظن﴾ یہاں ظن منصوب اس وجہ سے آیا ہے کہ تحذیر مقصود ہے اور تحذیر کہتے ہیں ڈرانے اور خوف زدہ کرنے کو اور ظن سے مراد برا گمان ہے اور یہ قابل مذمت ہے اور اطلاق کے وقت مذمت کا پہلو ہی ذہن میں آتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اچھے گمان کا حکم فرمایا ہے جیسا کہ ارشاد ہے:۔

ولولا اذ سمعتموہ ظن المئومنون والمئومنات بانفسھم خیرا (۱۲:۲۴)

حاصل کلام: ظن کو بہت بڑا جھوٹ اس لئے کہا گیا ہے کہ انسان اپنے دل ہی دل میں گمان و ظن کی پرورش کرتا رہتا ہے۔ پھر اسے زبان پر لاتا ہے جس کی حقیقت کچھ بھی نہیں ہوتی۔ اس لئے علماء نے اسے تہمت قرار دیا ہے اور تہمت لگانا بہت بڑا گناہ ہے۔ گویا ظن کا دوسرا نام تہمت ہے اور تہمت کبیرہ گناہ ہے اور گناہ کبیرہ توبہ کے بغیر قابل معافی نہیں ہوتا۔ اس لئے اس سے پرہیز کرنا چاہئے کیونکہ جس معاشرے میں بدگمانیاں پرورش پائیں گی وہاں حسن ظن نام کی کوئی چیز پنپ نہیں سکتی۔ اس معاشرے کے افراد کے درمیان اعتماد کی فضا پیدا نہیں ہو سکتی۔ ایک دوسرے کو مشکوک نگاہوں سے دیکھا جائے گا۔ یہ معاشرے کی تعمیر و ترقی کی علامت نہیں بلکہ زوال و تخریب کی نشانی ہے۔ صالح معاشرہ میں بدگمانی کے جراثیم کو پنپنے نہیں دیا جانا چاہئے۔

(۱۲۸۵) وَعَنْ مَعْقِلِ بْنَ يَسَارٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: سَمِعْتُ رَسُولَ اللهِ ﷺ يَقُولُ: «مَا مِنْ عَبْدٍ يَسْتَرْعِيهِ اللَّهُ رَعِيَّةً يَمُوتُ يَوْمَ يَمُوتُ وَهُوَ غَاشٌّ لِرَعِيَّتِهِ إِلاَّ حَرَّمَ اللَّهُ عَلَيْهِ الجَنَّةَ». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت معقل بن یسار رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے سنا ہے کہ ''جس بندے کو حاکم بنا کر رعیت اس کے سپرد کر دی جائے اگر اسے ایسی حالت میں موت آئے کہ رعیت و عوام میں انصاف نہ کرتا رہا ہو' خیانت کا ارتکاب کرتا رہا ہو تو ایسے حاکم پر اللہ تعالیٰ اپنی جنت حرام کر دیتا ہے۔'' (بخاری و مسلم)

لغوی تشریح: ﴿یسترعیہ اللہ رعیۃ﴾ جسے اللہ راعی' حاکم' سربراہ اور لوگوں پر امیر مقرر فرما دے اور رعیت کی را پر فتحہ اور عین کے نیچے کسرہ اور ''یاء'' پر تشدید۔ اس کی جمع رعایا۔ را پر فتحہ۔ رعایا سے مراد عوام الناس ہیں۔ جو امیر کے سامنے سرنگوں اور تابع فرمان رہیں۔ ﴿غاش﴾ شین پر تشدید۔ اسم فاعل کا صیغہ ہے۔ خیانت کرنے والا جو لوگوں کے حقوق پوری طرح ادا نہ کرے۔

حاصل کلام: سربراہ مملکت اور امیر کو چاہئے کہ اپنی رعایا کے ساتھ حسن سلوک سے پیش آئے۔ ہر ایک کو انصاف مہیا کرے۔ کسی سے ناانصافی نہ کرے اور نہ دوسرے سے ناانصافی ہونے دے۔ ان کے کاموں میں آسانی اور نرمی پیدا کرے۔ انہیں مشکلات اور مشقتوں میں نہ ڈالے۔ عوام کے معمولی قصور پر مؤاخذہ نہ کرے' درگزر اور معافی کا رویہ اپنائے' ان کو حتی الوسع ہر قسم کی سہولتیں فراہم کرے' ان کے

مال پر ہاتھ صاف نہ کرے، عزت و ناموس پر ڈاکہ نہ ڈالے، ٹیکسوں کی بھرمار سے عوام کا جینا دشوار نہ کرے، ان کو چوروں، ڈاکوؤں اور دہشت گردوں سے تحفظ مہیا کرے۔ اس کی بجائے اگر وہ عوام کا خون چوستا ہے تو ایسے حاکموں کیلئے اس حدیث میں شدید وعید ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کو اپنی جنت میں داخل نہیں فرمائے گا۔ جنت کا حرام ہونا صاف بتا رہا ہے کہ رعیت کو دھوکہ دینا گناہ کبیرہ ہے۔ اس لئے اگر حاکمین اور امراء چاہتے ہیں کہ جنت میں داخلہ مل جائے تو انہیں ایسے فعل سے باز رہنا چاہیئے۔

(١٢٨٦) وَعَنْ عَآئِشَةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْها قَالَتْ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «اللّٰهُمَّ: مَنْ وَلِيَ مِنْ أَمْرِ أُمَّتِي شَيْئاً فَشَقَّ عَلَيْهِمْ فَاشْقُقْ عَلَيْهِ». أَخْرَجَهُ مُسْلِمٌ.

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "یا الٰہی! میری امت میں سے جو شخص کسی کام کا والی و سربراہ بنایا جائے اور وہ لوگوں کو مشقت میں مبتلا کرے تو تو اس پر سختی فرما۔" (مسلم)

لغوی تشریح: ﴿فشق علیھم﴾ لوگوں کو مشقت اور تکلیف میں مبتلا کرے تو تو بھی اس کے ظلم اور جور کی وجہ سے اس پر سختی فرما۔

حاصل کلام: اس حدیث میں ظالم حکمرانوں کے حق میں اللہ کے رسول نے بددعا فرمائی ہے۔ ظاہر ہے نبی کی بددعا اپنا اثر دکھائے بغیر نہیں رہ سکتی ہے۔ اس سے بچنے کا واحد ذریعہ یہ ہے کہ حاکم اپنی رعایا پر شفقت اور نرمی سے پیش آئے۔ ان سے عفو و درگزر کا معاملہ کرے اور اگر وہ چاہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ میرے ساتھ محبت کا معاملہ کرے تو اسے اپنی رعایا سے بھی محبت کا معاملہ کرنا چاہیئے اور ناروا ظلم و ستم سے باز آجائے۔

(١٢٨٧) وَعَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «إِذَا قَاتَلَ أَحَدُكُمْ فَلْيَجْتَنِبِ الوَجْهَ». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "جب تم میں سے کوئی لڑائی کرے تو منہ پر مارنے سے اجتناب کرے۔" (بخاری و مسلم)

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ باہم لڑائی جھگڑے میں مارتے وقت منہ (چہرے) کو بچانا چاہیئے۔ ایک حدیث میں ہے کہ "جب کوئی کسی کو مارے تو چہرے پر مت مارے" یہ اس بات کی دلیل ہے کہ چہرے پر مارنا حرام ہے۔ یہ مارنا حدود و تعزیرات میں ہو یا تادیب کے طور پر۔ حتیٰ کہ جانوروں کے چہرے پر مارنے سے بھی گریز کرنا چاہیئے۔

(١٢٨٨) وَعَنْهُ، أَنَّ رَجُلاً قَالَ: يَا رَسُولَ اللهِ! أَوْصِنِي. قَالَ: «لاَ تَغْضَبْ». فَرَدَّدَ مِرَاراً، وَقَالَ: «لاَ

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے ہی مروی ہے کہ ایک آدمی نے رسول اللہ ﷺ سے عرض کیا مجھے کوئی نصیحت فرمائیں۔ آپؐ نے فرمایا کہ "غصہ مت کیا

تَغْضَبْ». أَخْرَجَهُ البُخَارِيُّ.

کرو۔" اس نے یہی سوال چند مرتبہ کیا۔ آپؐ نے ہر مرتبہ یہی جواب ارشاد فرمایا کہ "غصہ نہ کیا کرو" (بخاری)

حاصل کلام: اس حدیث میں غصہ سے بچنے کی تاکید ہے۔ بہت سے ظالمانہ کام انسان غصہ میں کر بیٹھتا ہے اور بعد میں اکثر نادم و پریشان ہوتا ہے۔ علامہ ابن التین فرماتے ہیں کہ اس حدیث میں دنیا و آخرت کی بھلائیاں جمع کر دی گئی ہیں کیونکہ غصہ کی حالت میں انسان نرمی اور رحم دلی کی صفات سے خالی ہو جاتا ہے۔ قطع رحمی کا سبب بنتا ہے اور دوسرے مسلمان کو ایذا دینے کے درپے ہو جاتا ہے اور یہ وہ امور ہیں جو انسان کی دنیا و آخرت میں بربادی کا باعث بنتے ہیں اور اگر ان سے اجتناب کرے تو دنیا و آخرت میں فلاح و فوز کا سبب بنتے ہیں۔ علامہ خطابی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ غصہ سے بچنے کا مقصد یہ ہے کہ ان اسباب سے اجتناب کیا جائے جو غصہ کا باعث بنتے ہیں کیونکہ غصہ تو ایک طبعی و فطری معاملہ ہے اور انہی اسباب میں سے ایک سبب وہ تکبر بھی ہے۔ بعض علماء نے کہا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے سائل کے مزاج کے پیش نظر فرمایا کہ غصہ نہ کیا کرو۔ کیونکہ وہ بات بات پر غضب ناک ہو جاتا تھا۔ مسند امام احمد میں ہے کہ وہ سائلہ جاریہ بنت قدامہ تھیں اور ایک حدیث میں ہے کہ وہ سائل سفیان بن عبداللہ الثقفی تھے۔

(١٢٨٩) وَعَنْ خَوْلَةَ الأَنْصَارِيَّةِ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهَا قَالَتْ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «إِنَّ رِجَالاً يَتَخَوَّضُونَ فِي مَالِ اللهِ بِغَيْرِ حَقٍّ، فَلَهُمُ النَّارُ يَوْمَ القِيَامَةِ». أَخْرَجَهُ البُخَارِيُّ.

حضرت خولہ انصاریہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "کچھ لوگ اللہ کے مال میں ناحق دخل انداز ہوتے ہیں۔ قیامت کے روز ایسے لوگوں کیلئے جہنم کی آگ ہے۔" (بخاری)

لغوی تشریح: ﴿یتخوضون﴾ یہ خوض سے ماخوذ ہے اور خوض کہتے ہیں پانی میں داخل ہونے کو۔ یعنی اللہ کے مال میں وسعت اختیار کرتے ہیں۔ خورد و نوش کی صورت میں' نئی نئی چیزوں کی خریداری اور جدید ملبوسات کی شکل میں۔ یہ اشارہ ہے کہ ایسے لوگ بغیر استحقاق کے یہ چیزیں حاصل کرتے ہیں یا یہ معنی ہے کہ وہ لوگ اپنے استحقاق سے زائد حاصل کرتے ہیں کیونکہ توسع بقدر ضرورت و حاجت کے حصول سے حاصل نہیں ہوتا۔

حاصل کلام: اس حدیث میں ناحق اللہ کا مال لینے والوں کیلئے جہنم کی وعید ہے۔ اللہ کے مال سے کیا مراد ہے۔ اللہ کے مال میں بیت المال بھی آتا ہے اور صدقات وغیرہ بھی۔ بیت المال میں سے سرکاری آدمی کا اپنی جائز ضروریات کی حد تک مال لینا تو اس کا حق ہے' اس کے علاوہ دوسرے مقامات پر خرچ کرنا یا خود

استحقاق سے زیادہ حاصل کرنا اور اس کا مالک بن بیٹھنا' جائز نہیں اور نہ غیر سرکاری آدمی کیلئے کسی طور پر مال لینا درست ہے۔ حاکم چونکہ بیت المال کا محافظ و نگران ہوتا ہے اس لئے اس کا اس میں سے استحقاق سے زائد مال لینا حرام اور جہنم کا موجب ہے۔

راوی حدیث: ﴿ خولہ رضی اللہ عنہا ﴾ یہ خولہ بنت ثامر ہیں جن کا تعلق انصار سے تھا۔ اس لئے انصاریہ کہلائیں۔ ابن عبدالبر کا قول ہے کہ یہ خاتون قیس بن فہد کی بیٹی تھیں ان کا لقب ثامر تھا۔ مؤلف اسد الغابہ کا رجحان بھی اسی طرف ہے۔ اس صورت میں بنو مالک بن نجار کی وجہ سے نجاریہ بھی ہوتی ہیں۔ ان کی کنیت ام محمد المطلب تھی اور یہ سید الشہداء حمزہ بن عبدالمطلب کی زوجیت میں تھیں۔ جب یوم احد میں ان کو شہید کر دیا گیا تو نعمان بن عجلان انصاری زرقی رضی اللہ عنہ نے ان سے شادی کر لی تھی۔

(١٢٩٠) وَعَنْ أَبِيْ ذَرٍّ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، عَنِ النَّبِيِّ ﷺ، فِيمَا يَرْوِيهِ عَنْ رَبِّهِ، قَالَ: **«يَا عِبَادِي! إِنِّي حَرَّمْتُ الظُّلْمَ عَلَى نَفْسِي، وَجَعَلْتُهُ بَيْنَكُمْ مُحَرَّماً، فَلاَ تَظَالَمُوا»**. أَخْرَجَهُ مُسْلِمٌ.

حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ نے نبی ﷺ سے روایت کیا' ان خبروں کے متعلق جو آپ اللہ تعالیٰ سے بیان فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا "اے میرے بندو! میں نے ظلم کو اپنے اوپر حرام کر لیا ہے اور تمہارے درمیان بھی حرام کر دیا ہے۔ لہٰذا تم ایک دوسرے پر ظلم نہ کرو۔" (مسلم)

حاصل کلام: یہ حدیث حدیث قدسی ہے۔ حدیث قدسی وہ ہوتی ہے جس کے الفاظ اللہ رب العزت کے ہوں اور انہیں رسول اللہ ﷺ نے بیان فرمایا ہو۔ اس حدیث کی رو سے ظالم کیلئے کسی قسم کی رو رعایت نہیں اور اسلوب بیان یہ ہے کہ جب میں ظلم نہیں کرتا تو تم بھی باہم ایک دوسرے پر ظلم سے باز آجاؤ۔ ظلم عقلاً و نقلاً برا عمل ہے۔ جس کے بارے میں فیصلہ یہ ہے کہ "وقد خاب من حمل ظلمها" اس لئے ظالم کی نہ یہ دنیا نہ وہ دنیا۔ وہ خسارے ہی خسارے میں رہے گا۔

(١٢٩١) وَعَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، أَنَّ رَسُولَ اللهِ قَالَ: **«أَتَدْرُونَ مَا الغِيبَةُ؟»** قَالُوا: اَللَّهُ وَرَسُولُهُ أَعْلَمُ. قَالَ: **«ذِكْرُكَ أَخَاكَ بِمَا يَكْرَهُ»**. قَالَ: أَفَرَأَيْتَ إِنْ كَانَ فِي أَخِي مَا أَقُولُ؟ قَالَ: **«إِنْ كَانَ فِيهِ مَا تَقُولُ فَقَدِ اغْتَبْتَهُ، وَإِنْ لَمْ يَكُنْ فِيهِ فَقَدْ بَهَتَّهُ»**. أَخْرَجَهُ مُسْلِمٌ.

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "تمہیں معلوم ہے کہ غیبت کسے کہتے ہیں؟" صحابہ رضی اللہ عنہم نے عرض کیا اللہ اور اس کا رسول ﷺ ہی بہتر جانتے ہیں۔ آپ نے فرمایا "غیبت یہ ہے کہ تو اپنے بھائی کا ذکر برائی سے کرے۔" کسی نے عرض کیا جو بات میں کہتا ہوں اگر وہ میرے بھائی میں پائی جائے تو۔ آپ نے جواب میں ارشاد فرمایا "جو کچھ تم اپنے بھائی کے متعلق کہتے ہو

اگر وہ اس میں پائی جاتی ہے تو اس کی تو نے غیبت کی اور اگر وہ بات جو تم اس کے متعلق کہتے ہو اس میں موجود ہی نہیں تو اس پر تو نے بہتان تراشی کی ہے۔" (مسلم)

لغوی تشریح: ﴿ الغيبه ﴾ غین کے نیچے کسرہ اور یا ساکن۔ اس کی تفسیر تو حدیث میں موجود ہے۔ نووی رحمہ اللہ نے فی الاحکام میں غزالی کی پیروی میں کہا ہے' غیبت یہ ہے کہ کسی آدمی کا تذکرہ اس طور پر کیا جائے جو اسے ناپسند ہو خواہ بدن انسان میں پایا جائے یا اس کے دین میں' اس کی دنیا' اس کے نفس' اس کے اخلاق و عادات' اس کے مال' اس کے والد' اولاد' بیوی' خادم' اس کی حرکات' اس کی خندہ پیشانی' اس کی خشک مزاجی وغیرہ سے' یہ ساری چیزیں اس کے برے ذکر میں شمار ہوں گی۔ خواہ یہ ذکر الفاظ میں ہو یا اشارہ و کنایہ میں۔ (سبل) ﴿ اغتبته ﴾ اس پر عیب لگایا۔ عیب جوئی کی اس کی یعنی اس کی غیبت کی۔ ﴿ بهته ﴾ با اور ھا پر فتحہ اور تا پر تشدید اور فتحہ۔ بہتان سے صیغہ مخاطب ہے یعنی اس پر بہتان تراسی کی اور اس پر جھوٹ باندھا۔

حاصل کلام: اس حدیث میں غیبت کی قباحت و شناعت بیان ہوئی ہے۔ غیبت بالاتفاق حرام ہے اور کبیرہ گناہ ہے۔ قرآن میں غیبت کرنے کو مردہ بھائی کے گوشت کھانے سے تشبیہہ دی گئی ہے کیونکہ غیبت کرنے والا اپنے مسلمان بھائی کی غیر موجودگی میں اس کی عزت پر حملہ کرتا ہے اور اس کی دل آزاری کا باعث بنتا ہے۔

(۱۲۹۲) وَعَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «لاَ تَحَاسَدُوا، وَلاَ تَنَاجَشُوا، وَلاَ تَبَاغَضُوا، وَلاَ تَدَابَرُوا. وَلاَ يَبِعْ بَعْضُكُمْ عَلَى بيع بَعْضٍ، وَكُونُوا عِبَادَ اللهِ إِخْوَاناً، الْمُسْلِمُ أَخُو الْمُسْلِمِ، لاَ يَظْلِمُهُ وَلاَ يَخْذُلُهُ، وَلاَ يَحْقِرُهُ، التَّقْوَى هٰهُنَا»، وَيُشِيرُ إِلَى صَدْرِهِ، ثَلاَثَ مَرَّاتٍ، «بِحَسْبِ امْرِىءٍ مِنَ الشَّرِّ أَنْ يَحْقِرَ أَخَاهُ الْمُسْلِمَ، كُلُّ الْمُسْلِمِ عَلَى الْمُسْلِمِ حَرَامٌ دَمُهُ

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے ہی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "ایک دوسرے سے حسد نہ کرو اور قیمتیں نہ بڑھاؤ۔ ایک دوسرے سے بے رخی نہ اختیار کرو۔ ایک دوسرے کی پیٹھ پیچھے غیبت نہ کرو۔ ایک دوسرے کے سودے پر سودا نہ کرو۔ اللہ کے بندو! آپس میں بھائی بھائی بن جاؤ۔ مسلمان' مسلمان کا بھائی ہے۔ نہ اس پر ظلم کرتا ہے اور نہ اسے بے یار و مددگار چھوڑتا ہے اور نہ اسے حقیر ہی سمجھتا ہے" اپنے سینہ کی طرف تین مرتبہ اشارہ کر کے فرمایا کہ "تقویٰ یہاں ہے۔ کسی آدمی کیلئے بس اتنا ہی گناہ کافی ہے کہ وہ اپنے مسلمان بھائی کو حقیر

وَمَالُهُ وَعِرْضُهُ». أَخْرَجَهُ مُسْلِمٌ. سمجھے۔ ہر مسلمان پر دوسرے مسلمان کا خون' مال اور آبرو حرام ہے۔" (مسلم)

لغوی تشریح: ﴿ولا تناجشوا﴾ یہ نجش سے ماخوذ ہے اور نجش یہ ہوتا ہے کہ ایک آدمی کسی سامان کی قیمت بولی دے کر بڑھاتا ہے۔ اس کا مقصد سودا خریدنا نہیں ہوتا محض دوسرے خریداروں کو دھوکہ دینا مقصود ہوتا ہے کہ وہ اس کی دیکھا دیکھی سامان کی قیمت میں اضافہ کر دیں اور اصلی قیمت سے کہیں زیادہ قیمت وصول ہو جائے۔ کتاب البیوع میں اس پر بحث گزر چکی ہے۔ ﴿ولا تدابروا﴾ ایک دوسرے کو نہ چھوڑیں کہ ایک آدمی اپنے مسلمان بھائی سے بے رخی کرے اور اس کی جانب سے منہ موڑ لے اور اسی طرح دوسرا بھی منہ موڑ لے۔ ﴿ولا یبغ﴾ غین کے ساتھ' اس کا معنی ہے کہ ظلم نہ کرے اور ایک نسخہ میں عین کے ساتھ بھی آیا ہے۔ کتاب البیوع میں اس کی تفصیل گزر چکی ہے۔ ﴿لا یخذله﴾ ذال پر ضمہ۔ یہ خذلان سے ماخوذ ہے۔ یعنی کسی کی مدد سے ہاتھ کھینچ لینا اور اعانت نہ کرنا۔ امام نووی رحمہ اللہ کا قول ہے' اس کے معنی یہ ہیں کہ جب ظالم کے ظلم کے دفع کرنے کیلئے مدد طلب کی جائے تو اس صورت میں اس کی اعانت و مدد کرنا چاہئے بشرطیکہ مدد کرنا ممکن ہو اور کوئی عذر شرعی بیچ میں لاحق نہ ہو۔ ﴿بحسب امری من الشر﴾ انسان کیلئے بس یہی کافی ہے یعنی اس کی اخلاقی برائی کیلئے بس یہی کافی ہے کہ وہ اپنے مسلمان بھائی کو حقیر سمجھے۔ ﴿بحسب امریٔ﴾ مبتداء ہے اور "باء" اس میں زائد ہے اور ﴿ان یحقر﴾ اس کی خبر ہے۔

حاصل کلام: اس حدیث میں اچھے مسلم معاشرہ میں افراد میں کس طرح باہمی برتاؤ اور رہن ہونا چاہئے' کا جامع بیان ہے۔ اس حدیث میں حسد جیسی مہلک بیماری جو نیکیوں کو جلا کر خاکستر کر دیتی ہے سے بچنے کی تلقین کی گئی ہے اور معاشی اعتبار سے ایک سودے کی قیمت صرف مالک کو فائدہ پہنچانے کی غرض سے بڑھانا بھی اچھے اخلاق کا مظاہرہ نہیں ہے کیونکہ خریدار بھی تو اس کا بھائی مسلمان ہے' اسے نقصان پہنچانا کہاں کی شرافت ہے۔ بغض نہ رکھا کرو' اس سے باہمی محبت میں بڑا فرق واقع ہوتا ہے اور ایک دوسرے پر زیادتی' سرکشی اور ظلم نہ کرو بلکہ آپس میں بھائی بھائی بن کر رہو۔ ایک دوسرے کے خیر خواہ بنو۔ کوئی کسی کو ضرر و نقصان نہ پہنچائے اور نہ ایک دوسرے کے عیب تلاش کرے' نہ کسی کو حقیر جانے اور نہ ہی خود کو بڑا سمجھے کیونکہ بڑا سمجھنا اور دوسرے بھائی کو حقیر سمجھنا تکبر ہے' جو انتہائی خطرناک بیماری ہے۔ ہر مسلمان پر خواہ چھوٹا ہو یا بڑا' امیر ہو یا غریب دوسرے مسلمان کا خون' مال اور عزت حرام ہے۔ کوئی کسی کی جان مال اور عزت سے مت کھیلے۔

(۱۲۹۳) وَعَنْ قُطْبَةَ بْنِ مَالِكٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: كَانَ رَسُولُ اللهِ ﷺ يَقُولُ: «اللَّهُمَّ جَنِّبْنِي حضرت قطبہ بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ یہ دعائیہ کلمات فرمایا کرتے تھے "الٰہی! مجھے برے اخلاق' برے اعمال' بری خواہشات

مُنْكَرَاتِ الأَخْلاَقِ، وَالأَعْمَالِ، وَالأَهْوَاءِ، وَالأَدْوَاءِ». أَخْرَجَهُ التِّرْمِذِيُّ، وَصَحَّحَهُ الحَاكِمُ وَاللَّفْظُ لَهُ.

اور بری بیماریوں سے بچا۔" (اس کو ترمذی نے روایت کیا ہے اور حاکم نے اسے صحیح کہا ہے اور یہ الفاظ اسی کے ہیں)

لغوی تشریح: ﴿ جنبنی ﴾ بچنے اور دور رکھنے کی دعا ہے۔ جنبنی تجنیب سے ماخوذ ہے جس کا معنی ہے مجھ سے دور فرما دے یا مجھے دور رکھ۔ ﴿ منکرات الاخلاق ﴾ ایسے اخلاق اور عادات جو عادتاً اور شرعاً ناپسندیدہ ہوں۔ ﴿ والاھواء الاخلاق ﴾ پر اس کا عطف ہے اور ھویٰ کی جمع ہے اور ھویٰ کہتے ہیں ایسی خواہش نفس کو جس میں کسی ایسے مقصد کی طرف نظر نہ ہو جسے شرع نے پسندیدہ قرار دیا ہو۔ ﴿ والا دواء ﴾ اس کا عطف بھی الاخلاق پر ہے اور یہ داء کی جمع ہے' معنی اس کے بیماری اور مرض کے ہیں اور منکرات الامراض ان بیماریوں کو کہتے ہیں جو پرانی اور دیرینہ ہوں' جن سے نفرت کی جاتی ہو اور دور رہا جاتا ہو مثلاً برص' جذام کے امراض ہیں یا مہلک امراض جن سے عموماً موت واقع ہو جاتی ہے جیسے ذات الجنب کا مرض ہے۔ ہیضہ' طاعون اور فالج وغیرہ۔

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ برے اخلاق' برے اعمال' بری خواہشات اور بری بیماریوں سے ہر وقت اللہ سے محفوظ رہنے کی دعا کرتے رہنا چاہئے کیونکہ ان امور سے اللہ کی توفیق ہی سے بچا جا سکتا ہے۔

راوی حدیث: ﴿ قطبہ بن مالک رضی اللہ عنہ ﴾ قطبہ بن مالک بن ثعلبہ سے ہونے کی وجہ سے ثعلبی کہلائے اور ثعلبہ بن سعد بن ذبیان میں ذبیان کی طرف نسبت کر کے ذبیانی کہلاتے تھے' کوفہ سے تعلق تھا اور ان کے بھتیجے زیاد بن علاقہ نے ان سے احادیث نقل کی ہیں۔

(١٢٩٤) وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا، قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «لاَ تُمَارِ أَخَاكَ، وَلاَ تُمَازِحْهُ، وَلا تَعِدْهُ مَوْعِداً فَتُخْلِفَهُ». أَخْرَجَهُ التِّرْمِذِيُّ بِسَنَدٍ ضَعِيفٍ.

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "اپنے مسلمان بھائی سے جھگڑا مت کرو اور نہ اس سے مذاق کرو اور اس سے ایسا وعدہ بھی نہ کرو جس کی بعد میں خلاف ورزی کرو۔" (اسے ترمذی نے کمزور سند سے روایت کیا ہے)

لغوی تشریح: ﴿ لا تمار ﴾ "تاء" پر ضمہ مماراۃ سے ماخوذ ہے' جس کے معنی ہیں مجادلہ نہ کرو' جھگڑا نہ کرو۔ سبل السلام میں ہے مراء کی حقیقت یہ ہے کہ غیر کے کلام و گفتگو میں طعن کرنا' محض خلل ڈالنے کی غرض سے۔ اس غرض کے سوا کہ اس سے کہنے والے کی تحقیر مقصود ہو اور کوئی مقصد و غرض نہ ہو اور اپنی امتیازی شان اس پر مسلط کرنا ہو۔ ﴿ ولا تمازحہ ﴾ یہ "مزاح" سے ماخوذ ہے اور "مزاح" خوش طبعی کرنے اور ٹھٹھا مزاق کرنے کو کہتے ہیں۔ علامہ نووی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ "وہ مزاح ممنوع ہے جس

میں افراط ہو اور جو ہمیشہ کیا جاتا رہے کیونکہ مزاح سے ہنسی اور سنگ دلی پیدا ہوتی ہے' اللہ کے ذکر سے غفلت پیدا ہوتی ہے اور دین کے حقیقی مسائل سے فکر ہٹ جاتی ہے بلکہ اکثر اوقات یہ مذاق ایذاء رسانی کا باعث بنتا ہے اور اس سے بے شمار بغض و کینہ جنم لیتا ہے' انسان کا وقار اور ہیبت و رعب جاتا رہتا ہے اور جو انسان ان خطرات سے محفوظ رہتا ہے' وہ مزاح مباح ہے اور ایسا مزاح کبھی کبھی رسول اللہ ﷺ نے بھی کیا ہے جس سے مخاطب کا دل خوش ہو جاتا اور اس کی محبت میں اضافہ ہو جاتا۔ اس لئے ایسا مزاح مستحب ہے۔ یہ مسئلہ خوب سمجھ لو کیونکہ اس کی بہت ضرورت رہتی ہے۔

(١٢٩٥) وَعَنْ أَبِيْ سَعِيْدِ الْخُدْرِيِّ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «خَصْلَتَانِ لاَ تَجْتَمِعَانِ فِي مُؤْمِنٍ: الْبُخْلُ وَسُوءُ الْخُلُقِ». أَخْرَجَهُ التِّرْمِذِيُّ، وَفِي سَنَدِهِ ضَعْفٌ.

حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "دو خصلتیں ایسی ہیں جو کسی مومن میں جمع نہیں ہو سکتیں۔ بخل اور سوء خلق۔" (اسے ترمذی نے نکالا ہے اور اس کی سند میں ضعف ہے)

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ مومن کامل بدخلق اور بخیل نہیں ہو سکتا۔ ایمان تو حسن خلق اور ایک دوسرے کی خیر خواہی کا نام ہے۔ جب یہ دونوں عنقاء ہیں تو کامل ایمان کا مدعی کیونکر ہو سکتا ہے۔

(١٢٩٦) وَعَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «الْمُسْتَبَّانِ مَا قَالاَ فَعَلَى الْبَادِىءِ، مَا لَمْ يَعْتَدِ الْمَظْلُومُ». أَخْرَجَهُ مُسْلِمٌ.

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "گالی گلوچ کرنے والے دو آدمیوں میں سے ابتداء کرنے والے پر بار گناہ ہے تاوقتیکہ مظلوم زیادتی نہ کرے۔" (مسلم)

لغوی تشریح: ﴿المستبان﴾ اس میں "باء" پر تشدید ہے اور باب افتعال سے اسم فاعل ہے یعنی ایک دوسرے کو سب و شتم کرنے والے دو آدمی۔ ﴿فعلى البادى﴾ گناہ کا بار اس شخص پر ہے جس نے گالی دینے میں پہل کی اور جواب میں گالی دینے والا اس زمرہ میں نہیں آتا۔ اس جرم کا سارا گناہ اس کے سر ہے کیونکہ وہی اس کا سبب بنا ہے۔ ﴿مالم يعتد﴾ تاوقتیکہ وہ حد سے تجاوز نہ کرے۔ اگر وہ حد پھلانگ گیا یعنی اس نے جواباً زیادہ گالی دی اور گالی کا آغاز کرنے والے کو زیادہ ستایا اور اذیت دی تو اس کی ایذا رسانی اس کے گناہ کے ساتھ شامل ہو جائے گی اور بسا اوقات ایسا بھی امکان ہے کہ ابتداء کرنے والے سے اس کا گناہ زیادہ ہو جائے۔

(١٢٩٧) وَعَنْ أَبِيْ صِرْمَةَ رَضِيَ حضرت ابوصرمہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ

اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «مَنْ ضَارَّ مُسْلِماً ضَارَّهُ اللَّهُ، وَمَنْ شَاقَّ مُسْلِماً شَاقَّ اللَّهُ عَلَيْهِ». أَخْرَجَهُ أَبُو دَاوُدَ وَالتِّرْمِذِيُّ، وَحَسَّنَهُ.

ﷺ نے فرمایا "جس نے کسی مسلمان کو ضرر پہنچایا' اللہ تعالیٰ اسے ضرر دے گا اور جس نے کسی مسلمان کو مشقت میں مبتلا کیا اللہ تعالیٰ اسے مشقت اور مصیبت میں مبتلا فرمائے گا۔" (اس حدیث کو ابوداؤد اور ترمذی نے روایت کیا ہے اور ترمذی نے اسے حسن قرار دیا ہے)

لغوی تشریح: ﴿ من ضار مسلما ﴾ یعنی جس کسی نے مسلمان کو مالی و جانی نقصان اور عزت و آبرو میں ناحق تکلیف دی اللہ تعالیٰ اسی جیسی تکلیف و مشقت بطور مجازات اس پر ڈال دے گا اور اسے اس میں مبتلا فرما دے گا۔ ﴿ من شاق ﴾ جس نے مسلمان سے ناحق جھگڑا کیا اللہ تعالیٰ اس پر مشقت ڈال دے گا۔ (نازل فرما دے گا)

حاصل کلام: اس حدیث میں مسلمان کو تکلیف دینے' اذیت پہنچانے سے خبردار کیا گیا ہے کہ جو آدمی کسی مسلمان کو تکلیف دیتا ہے' اس پر ظلم کرتا ہے اور اس سے بغیر کسی وجہ سے ناحق جھگڑا کرتا ہے' اللہ تعالیٰ اس پر مشقت نازل کر دیتا ہے۔

راوی حدیث: ﴿ ابوصرمہ رضی اللہ عنہ ﴾ قبیلہ مازن سے تعلق رکھتے تھے' اس لئے مازنی کہلائے۔ ان کا نام مالک بن قیس تھا یا قیس بن مالک۔ بدر وغیرہ غزوات میں حاضر رہے۔ ان سے چند احادیث مروی ہیں۔

(١٢٩٨) وَعَنْ أَبِي الدَّرْدَاءِ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «إِنَّ اللَّهَ يَبْغَضُ الفَاحِشَ البَذِيءَ». أَخْرَجَهُ التِّرْمِذِيُّ، وَصَحَّحَهُ.

حضرت ابوالدرداء رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "بے شک اللہ تعالیٰ بغض رکھتے ہیں۔ بد خو' فحش گو سے۔" (اسے ترمذی نے صحیح سند سے روایت کیا ہے)

(١٢٩٩) وَلَهُ مِنْ حَدِيثِ ابْنِ مَسْعُودٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ - رَفَعَهُ -: «لَيْسَ المُؤْمِنُ بِالطَّعَّانِ، وَلاَ اللَّعَّانِ، وَلاَ الفَاحِشِ، وَلاَ البَذِيْءِ». وَحَسَّنَهُ، وَصَحَّحَهُ الحَاكِمُ، وَرَجَّحَ الدَّارَقُطْنِيُّ وَقْفَهُ.

انہیں (ابو درداء) سے حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی ایک مرفوع روایت میں ہے' کہ "ایک مومن بہت طعن کرنے والا' بہت لعنت کرنے والا' فحش گوئی کرنے والا اور بے حیاء نہیں ہوتا" (ترمذی نے اس حدیث کو حسن کہا ہے اور حاکم نے اسے صحیح قرار دیا ہے)

لغوی تشریح: ﴿ البذی ﴾ بذاء سے فعیل کے وزن پر۔ قبیح گفتگو اور فحش گوئی کو کہتے ہیں جو مومن کی صفات و اوصاف میں سے نہیں ہے۔ ﴿ الطعان' اللعان ﴾ دونوں میں عین پر تشدید ہے' مطلب بہت

لعن کرنے والا' بہت لعنت کرنے والا۔ مگر یہاں زیادت کا مفہوم مراد نہیں ہے کیونکہ لعنت کرنا تو حرام ہے خواہ قلیل ہو یا کثیر۔ (سبل السلام)

حاصل کلام: ان دونوں احادیث سے معلوم ہوا کہ ایک مومن کامل کیلئے لائق نہیں کہ وہ بد خو' فحش گو اور لعن و طعن کرنے والا ہو۔ البتہ اس سے وہ عمل یا شخص مستثنیٰ ہے جسے خود اللہ تعالیٰ اور رسول اللہ ﷺ نے ملعون قرار دیا ہے۔ مثلاً کافر' شراب پینے والا' حلالہ کرنے والا وغیرہ۔

راوی حدیث: ﴿ ابوالدرداء رضی اللہ عنہ ﴾ بڑے جلیل القدر اور نہایت عابد و زاھد صحابی تھے۔ ان کا نام عویمر بن زید یا ابن مالک بن عبداللہ بن قیس تھا۔ انصار سے تعلق رکھتے تھے۔ خزرج قبیلہ سے تھے۔ بدر کے روز اسلام قبول کیا۔ احد میں شریک ہوئے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان کو بدری اصحاب میں شامل فرمایا تھا۔ انہوں نے جمع قرآن کی خدمت انجام دی۔ دمشق کے والی رہے۔ ان کے فضائل بے شمار ہیں۔ ان کے اقوال زریں میں سے ایک قول یہ ہے کہ ایک لمحہ کی شہرت طویل حزن و ملال سے دوچار کر دیتی ہے۔ ۳۲ھ میں وفات پائی۔

(۱۳۰۰) وَعَنْ عَآئِشَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهَا قَالَتْ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «لاَ تَسُبُّوا الأَمْوَاتَ، فَإِنَّهُمْ قَدْ أَفْضَوْا إِلَى مَا قَدَّمُوا». أَخْرَجَهُ البُخَارِيُّ.

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "فوت شدگان کو گالی نہ دو کیونکہ انہوں نے جو کچھ کیا تھا اس تک وہ پہنچ چکے ہیں۔" (بخاری)

حاصل کلام: اس حدیث میں کسی بھی مرنے والے کو برا کہنے اور گالی دینے سے منع فرمایا گیا ہے کیونکہ مردے کو گالی دینے کی وجہ سے اس کے لواحقین کو اذیت پہنچ سکتی ہے جو باہمی دشمنی اور عداوت کا باعث بن سکتی ہے ویسے بھی یہ لغو اور فضول سی بات ہے ورنہ مرنے والا اپنے مالک کے پاس پہنچ چکا ہے' اب اس کا معاملہ اس کے سپرد ہے' سزا دے یا نہ دے۔ کسی کے گالی دینے سے اسے کیا فرق پڑے گا۔ پھر یہ کونسی شرافت ہے کہ جو جوابی کاروائی کی پوزیشن ہی میں نہیں ہے اسے گالی گلوچ کرنے سے سوائے اپنے نفس کو تسلی دینے کے کیا حاصل ہے۔

(۱۳۰۱) وَعَنْ حُذَيْفَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «لاَ يَدْخُلُ الجَنَّةَ قَتَّاتٌ». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "چغل خور جنت میں داخل نہیں ہو گا۔" (بخاری و مسلم)

لغوی تشریح: ﴿ قتات ﴾ قاف پر فتحہ اور تاء پر تشدید۔ "نمام" کے معنی میں یعنی چغل خور جو کسی انسان کی یا کسی قوم کی بات دوسرے انسان یا قوم کے پاس اس طریقہ سے نقل کرے کہ دونوں میں فساد برپا ہو جائے اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ "نمام" اور "قتات" میں لطیف سا فرق ہے۔ نمام اس آدمی کو کہتے

ہیں جو لوگوں کے ساتھ باتیں کرنے میں شریک ہو پھران کے خلاف چغل خوری کرے اور ان کی گفتگو کو آشکارا کرے جسے وہ افشا کرنا ناپسند کرتے ہوں اور قتات اس آدمی کو کہتے ہیں جو دوسروں کی بات ان کی بے خبری میں سنے پھر چغل خوری کرے اور ان کی بات کو آگے نقل کردے۔ علامہ نووی رحمہ اللہ نے کہا ہے یہ سب کچھ اس صورت میں ہے جبکہ اس کے آگے نقل کرنے میں شرعی مصلحت نہ ہو۔ ورنہ یہ مستحب ہے یا واجب ہے۔ مثلاً کسی آدمی کو پتہ چل گیا کہ ایک شخص دوسرے آدمی پر ظلم کرنا' ایذاء دینا چاہتا ہے تو اسے چاہئے کہ اس شخص کو ڈرائے' دھمکائے کہ ایسا نہ کرے اور جس پر ظلم کرنا چاہتا ہے' اسے جا کر بتائے کہ وہ ہوشیار و محتاط رہے اور اسی طرح جس نے سربراہ مملکت یا اس کے کسی نمائندے کو اس سے مطلع کر دیا تو اس سے منع نہیں کیا گیا۔ یعنی ایسا کرنا جائز ہے۔ ترمذی نے کہا ہے کہ چغلی کے حرام ہونے پر امت کا اجماع ہے اور یہ کبیرہ گناہ ہے۔

(١٣٠٢) وَعَنْ أَنَسٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «مَنْ كَفَّ غَضَبَهُ كَفَّ اللَّهُ عَنْهُ عَذَابَهُ». أَخْرَجَهُ الطَّبَرَانِيُّ فِي الأَوْسَطِ. وَلَهُ شَاهِدٌ مِنْ حَدِيْثِ ابْنِ عُمَرَ عِنْدَ ابْنِ أَبِي الدُّنْيَا.

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "جس کسی نے اپنے غصے کو روک لیا اللہ تعالیٰ اس سے اپنا عذاب روک لے گا۔" (اسے طبرانی نے الاوسط میں نکالا ہے۔ ابن عمر رضی اللہ عنہما کی حدیث اس کی شاہد ہے جسے ابن ابی الدنیا نے نقل کیا ہے)

حاصل کلام: اس حدیث میں غصہ پر قابو پانے کی فضیلت ہے۔ اپنے زیر دستوں اور خردوں کی کسی غلطی پر غصہ نہ کھانا بلکہ انہیں معاف کر دینا اللہ تعالیٰ کے عذاب سے بچنے کا ذریعہ ہے۔

(١٣٠٣) وَعَنْ أَبِي بَكْرٍ الصِّدِّيْقِ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «لاَ يَدْخُلُ الجَنَّةَ خَبٌّ، وَلاَ بَخِيلٌ، وَلاَ سَيِّءُ المَلَكَةِ». أَخْرَجَهُ التِّرْمِذِيُّ، وَفَرَّقَهُ حَدِيْثَيْنِ، وَفِي إِسْنَادِهِ ضَعْفٌ.

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "دھوکہ باز' بخیل اور بد خلق آدمی جنت میں داخل نہیں ہوگا۔" (ترمذی نے اس کو روایت کیا اور اس نے اسے دو احادیث کی صورت میں الگ الگ بیان کیا ہے اور اس کی سند میں ضعف ہے)

لغوی تشریح: ﴿لا یدخل الجنۃ﴾ یعنی آغاز ہی میں جنت میں داخل نہیں ہوگا یا یہ معنی ہیں کہ پہلے کوئی سزا اور عذاب اگر ہے تو اسے بھگتے بغیر جنت میں نہیں جا سکے گا۔ ﴿خب﴾ خاء پر فتحہ اور باء پر تشدید۔ دھوکہ باز جو دھوکہ و فریب سے لوگوں میں فساد اور خرابی پیدا کرے۔ ﴿ولہ سئی الملکۃ﴾ ملکۃ کے میم اور لام پر فتحہ "ملک" کے معنی میں ہے۔ ﴿سیئی الملکۃ﴾ جو اپنے غلاموں سے برا سلوک کرے اور یہ بھی جائز ہے کہ ملکۃ کو پختہ عادت کے معنی میں لیا جائے تو اس صورت میں

سئي الملكة کا معنی ہوگا۔ بدخلق اور بدعادت آدمی۔

حاصل کلام: اس حدیث میں ہے کہ دھوکہ دینے والے، بخیل اور بد اخلاق کے بارے میں فرمایا گیا ہے کہ وہ جنت میں نہیں جائیں گے بلکہ وہ اپنے ان گناہوں کا خمیازہ بھگت کر ہی جنت میں جائیں گے۔

(١٣٠٤) وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «مَنْ تَسَمَّعَ حَدِيثَ قَوْمٍ، وَهُمْ لَهُ كَارِهُونَ، صُبَّ فِي أُذُنَيْهِ الآنُكُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ». يَعْنِي الرَّصَاصَ. أَخرَجَهُ البُخَارِيُّ.

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "جو کوئی کسی قوم کی بات سننے کی سعی کرے جبکہ وہ اسے ناپسند کرتے ہوں تو قیامت کے روز اس کے دونوں کانوں میں سیسہ ڈالا جائے گا۔" آنک کا معنی سیسہ ہے۔ (بخاری)

لغوی تشریح: ﴿من تسمع﴾ باب تفعیل سے ماضی کا صیغہ ہے اور اس میں تکلف پایا جاتا ہے، معنی اس کے یہ ہیں کہ جو شخص کسی قوم کی بات سننے میں بڑی سعی و جدوجہد کرتا ہے یعنی چھپ کر مخفی طور پر بات سننے کی کوشش کرتا ہے اور رہی یہ بات کہ اس کے کان میں لوگوں کی بات بغیر کسی تکلف و اہتمام اور بغیر اس کی کوشش اور جدوجہد کے پڑ جائے تو اس پر اس سلسلہ میں کوئی مؤاخذہ نہیں لیکن اس کا مخفی رکھنا اور اسے نہ پھیلانا اس پر واجب ہے۔ جب کہ وہ ناپسندیدہ نہ ہو اور کسی فساد کا سبب نہ بن رہی ہو۔ ﴿صب﴾ صیغۂ مجہول یعنی اس کے کانوں میں انڈیلا جائے، ڈالا جائے گا ﴿الانک﴾ ھمزہ پر مد اور نون پر ضمہ۔ بمعنی سیسہ۔

حاصل کلام: اس حدیث میں اس بات کی ممانعت ہے کہ آدمی کسی دوسرے آدمی یا قوم کے راز و خفیہ باتیں جو دوسرے کے روبرو بیان کرنا وہ نہیں چاہتے، بڑے اہتمام، توجہ اور کوشش سے سننے کی ٹوہ میں لگا رہے۔ ایسے آدمی کے کانوں میں قیامت کے روز پگھلا ہوا سیسہ ڈالا جائے گا۔ یہ مجلسی آداب میں سے ایک ادب ہے جسے ملحوظ رکھنا چاہیے۔ امام بخاری رحمہ اللہ نے اپنی کتاب "الادب المفرد" میں یہ روایت نقل کی ہے کہ سعید مقبری سے مروی ہے کہ ابن عمر رضی اللہ عنہما کسی صاحب سے گفتگو کر رہے تھے یہ صاحب بھی ان کے قریب کھڑے ہوگئے تو ابن عمر رضی اللہ عنہما نے ان کے سینے پر تھپڑ رسید کیا اور فرمایا کہ جب دو آدمی الگ سے بات چیت کر رہے ہوں تو ان کی باتیں نہ سنا کرو۔ یہ ممنوع ہے۔ بہرحال کسی کی راز داری میں مداخلت درست نہیں۔

(١٣٠٥) وَعَنْ أَنَسٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «طُوبَى لِمَنْ شَغَلَهُ عَيْبُهُ عَنْ عُيُوبِ النَّاسِ». أَخرَجَهُ البَزَّارُ بِإِسْنَادٍ حَسَنٍ.

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "اس شخص کو مبارک ہے جس کو اپنے عیب نظر آئیں اور دوسرے لوگوں کے عیوب نظر نہ آئیں۔" (اس روایت کو بزار نے حسن سند سے نکالا ہے)

لغوی تشریح: ﴿ طوبی ﴾ کے "طاء" پر ضمہ اور مقصورہ ہے طیب سے اسم ہے یا جنت کے ایک ایسے درخت کا نام ہے جس کے سایہ میں سوار ایک سو سال تک چلتا رہے گا مگر وہ سایہ ختم نہ ہوگا۔ اس سے مراد یہ ہے کہ درخت اس آدمی کیلئے ہے جو دوسروں کے عیب تلاش کرنے سے پہلے اپنے عیبوں پر نظر رکھتا ہے اور دوسروں کے عیوب بیان کرنے سے اجتناب کرتا ہے۔ ان سے ازالہ کی کوشش کرتا یا اس پر پردہ پوشی کرتا ہے۔

حاصل کلام: اس حدیث میں ایسے شخص کی خوش بختی کا ذکر ہے جو اپنے عیوب سے سروکار رکھتا ہے۔ دوسروں کے عیوب سے اسے کوئی دلچسپی نہیں ہوتی۔ اگر لوگوں کے عیوب اس کے علم میں آجائیں تو ان پر پردہ ڈالتا ہے اور دوسرے لوگوں کے سامنے بیان کرنے سے اجتناب کرتا ہے اور اپنے عیوب کو دور کرنے کی فکر اسے دامن گیر رہتی ہے۔ ایسے شخص کیلئے خوشی اور مقام مسرت ہے یا اسے قیامت کے روز اللہ تعالیٰ انعام میں بہت بڑا سایہ دار درخت نصیب فرمائے گا۔

(١٣٠٦) وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «مَنْ تَعَاظَمَ فِي نَفْسِهِ، وَاخْتَالَ فِي مِشْيَتِهِ لَقِيَ اللَّهَ وَهُوَ عَلَيْهِ غَضْبَانُ». أَخرَجَهُ الحَاكِمُ، وَرِجَالُهُ ثِقَاتٌ.

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "جو کوئی اپنے آپ کو بڑا آدمی سمجھے اور اکڑ کر چلے وہ اللہ سے ایسی حالت میں ملاقات کرے گا کہ وہ اس پر غضب ناک ہوگا۔" (حاکم نے اسے نکالا ہے اور اس کے راوی ثقہ ہیں)

لغوی تشریح: ﴿ تعاظم فی نفسه ﴾ اپنے جی میں خیال کرتا ہے کہ وہ کوئی بڑا آدمی ہے اور وہ ایسی تعظیم کا استحقاق رکھتا ہے جو دوسرا نہیں رکھتا۔ ﴿ اختال ﴾ اکڑ کر چلنا، تکبرانہ چال چلنا۔

حاصل کلام: اس حدیث میں تکبر سے چلنے کو خدا کی ناراضگی اور غضب ناکی کا سبب قرار دیا گیا ہے۔ سچی بات یہی ہے کہ ایسی چال ایسے لوگ ہی چلتے ہیں جن کے دماغ میں بڑا ہونے کا سودا سمایا ہوتا ہے۔ علامہ نووی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ تکبر یہ ہے کہ اپنے آپ کو بلند و بالا سمجھتے ہوئے لوگوں کو حقیر جانا جائے اور حق بات کا انکار کر دے۔ ابن حجر مکی رحمہ اللہ نے زواجر میں کہا ہے کہ تعاظم اور تکبر دو طرح کا ہوتا ہے ایک باطن اور دوسرا ظاہر۔ حدیث کا پہلا جملہ باطن کو دوسرا جملہ ظاہر کو بیان کر رہا ہے اور دونوں ہی کبیرہ گناہ ہیں اور شرعاً حرام ہیں۔ ترمذی کی ایک روایت میں ہے کہ جس کے دل میں ذرہ برابر تکبر ہوگا، وہ جنت میں نہیں جا سکتا۔

(١٣٠٧) وَعَنْ سَهْلِ بْنِ سَعْدٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «العَجَلَةُ مِنَ الشَّيْطَانِ». أَخرَجَهُ التِّرمِذِيُّ، وَقَالَ: حَسَنٌ.

حضرت سہل بن سعد رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "جلد بازی و عجلت پسندی شیطانی کام ہے۔" (اس کو ترمذی نے روایت کیا ہے اور اسے حسن قرار دیا ہے)

لغوی تشریح: ﴿ العجلۃ ﴾ عین اور جیم پر فتحہ۔ کسی کام کو انجام دینے میں جلدی کرنا۔ سرعت اور تیزی سے کام کرنا۔ یہ قابل مذمت حرکت ہے اس لئے کہ ایسا کرنے سے امور کے انجام پر غور و فکر کرنے اور ان میں خوب چھان بین کرنے کی نوبت نہیں آتی اور اسی کے نتیجہ میں انسان ہلاکت کے کنارے پر پہنچ جاتا ہے اور یہ شیطان کا دھوکہ و فریب اور اس کی وسوسہ اندازی ہے جس سے بہر نوع بچنا چاہئے۔

(۱۳۰۸) وَعَنْ عَآئِشَةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهَا قَالَتْ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «الشُّؤْمُ سُوءُ الْخُلُقِ». أَخْرَجَهُ أَحْمَدُ، وَفِي إِسْنَادِهِ ضَعْفٌ.

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "بد خلقی نحوست ہے۔" (اس کو احمد نے روایت کیا ہے اور اس کی سند ضعیف ہے)

لغوی تشریح: ﴿ الشوم ﴾ شوم، یمن اور برکت کی ضد ہے۔ اس کے شین پر ضمہ اور همزہ ساکن ہے اور آسانی سے پڑھا جاتا ہے یا پھر واؤ میں تبدیل ہو جاتا ہے۔

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ کوئی نحوست یا مصیبت جو انسان پر وارد ہوتی ہے اس کا اصل سبب بد خلقی ہے۔ نیز یہ بھی کہ بد خلقی اور خوش خلقی انسان کے اختیار میں ہے اگر چاہے تو بد خلقی کی راہ اختیار کر لے اور چاہے تو خوش خلقی کی شاہراہ پسند کر لے۔ بد خلقی کا انجام نحوست ہے اور خوش خلقی کا انجام خیر و برکت ہے۔

(۱۳۰۹) وَعَنْ أَبِي الدَّرْدَآءِ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «إِنَّ اللَّعَّانِينَ لاَ يَكُونُونَ شُفَعَاءَ وَلاَ شُهَدَاءَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ». أَخْرَجَهُ مُسْلِمٌ.

حضرت ابوالدرداء رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "بلاشبہ لعنت کرنے والے قیامت کے روز نہ سفارش کرنے والے ہوں گے اور نہ گواہی دینے والے۔" (مسلم)

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ باکثرت لعنت کرنے والے ایسے لوگوں کی سفارش قبول نہیں فرمائے گا اور نہ ایسے لوگوں کی شہادت قبول کی جائے گی۔ اس قبولیت شہادت کا بعض نے تعلق دنیا سے بتایا ہے کہ چونکہ ایسے لوگ فاسق ہوتے ہیں' اس لئے ان کی شہادت دنیا میں قبول نہیں کی جائے گی اور بعض نے کہا ہے کہ یہ لوگ قیامت کے روز انبیاء کرام ؑ کی تبلیغ دین پر شہادت نہیں دے سکیں گے اور بعض نے کہا ہے کہ یہ اللہ کی راہ میں مارے جائیں تب بھی شہادت کے مرتبہ کو نہیں پا سکیں گے۔ (سبل)

(۱۳۱۰) وَعَنْ مُعَاذِ بْنِ جَبَلٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «مَنْ عَيَّرَ أَخَاهُ

حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "جو شخص کسی مسلمان کو کسی گناہ کی عار دلائے گا تو وہ خود وہ کام کر کے مرے گا۔"

بِذَنْبٍ لَمْ يَمُتْ حَتَّى يَعْمَلَهُ». أَخْرَجَهُ التِّرْمِذِيُّ، وَحَسَّنَهُ، وَسَنَدُهُ مُنْقَطِعٌ. (اس کو ترمذی نے نکالا ہے اور اسے حسن قرار دیا ہے حالانکہ اس کی سند میں انقطاع ہے)

لغوی تشریح: ﴿عیر﴾ تعییر سے ماضی کا صیغہ ہے یعنی اسے عار کی طرف منسوب کیا اور اسے برا کہا تاکہ اس کو ذلیل و رسوا کرے۔

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ کسی کو برسرعام عیب یاد دلا کر اس کی تذلیل و تحقیر کرنا گناہ ہے اور جو شخص ایسا کردار ادا کرے وہ عمل مکافات کیلئے بھی تیار رہے حالانکہ مسلمان بھائی کے عیب پر تو پردہ ڈالنے کی تلقین ہے کہ جو آج کسی کے عیب کی پردہ پوشی کرے گا اللہ تعالیٰ قیامت کے روز اس کے عیوب چھپا دے گا۔

(۱۳۱۱) وَعَنْ بَهْزِ بْنِ حَكِيمٍ، عَنْ أَبِيهِ، عَنْ جَدِّهِ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «وَيْلٌ لِلَّذِي يُحَدِّثُ فَيَكْذِبُ لِيُضْحِكَ بِهِ الْقَوْمَ، وَيْلٌ لَهُ، ثُمَّ وَيْلٌ لَهُ». أَخْرَجَهُ الثَّلَاثَةُ، وَإِسْنَادُهُ قَوِيٌّ.

حضرت بہز بن حکیم اپنے باپ سے اور انہوں نے اپنے دادا سے روایت کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "ہلاکت ہے اس شخص پر جو جھوٹی باتیں سنا کر لوگوں کو ہنسائے۔ اس پر ہلاکت ہے۔ پھر اس پر ہلاکت ہے۔" (اسے تینوں نے قوی سند کے ساتھ روایت کیا ہے)

حاصل کلام: جھوٹ بولنا تو قرآن و سنت کی روشنی میں ویسے ہی حرام اور گناہ کبیرہ ہے مگر اس حدیث سے معلوم ہوا کہ جھوٹ بیان کر کے لوگوں کو ہنسانا اور ان کی دلچسپی و دل لگی کا سامان مہیا کرنا بھی حرام ہے کیونکہ خوشی کا اظہار تو کسی اچھی بات پر ہونا چاہئے نا کہ جھوٹی بات پر۔ جو شخص ایسے جرم کا مرتکب ہو اسے روک دینا چاہئے یا کم از کم جھوٹ کی اس مجلس کو چھوڑ دینا چاہئے۔

(۱۳۱۲) وَعَنْ أَنَسٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ: «كَفَّارَةُ مَنِ اغْتَبْتَهُ أَنْ تَسْتَغْفِرَ لَهُ». رَوَاهُ الْحَارِثُ بْنُ أَبِي أُسَامَةَ بِإِسْنَادٍ ضَعِيفٍ.

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "جس کی تو نے غیبت کی ہو اس کا کفارہ یہ ہے کہ تو اس کیلئے اللہ سے مغفرت طلب کرے۔" (اسے حارث بن ابی اسامہ نے ضعیف سند سے روایت کیا ہے)

حاصل کلام: یہ حدیث دلیل ہے کہ غیبت کے گناہ کو دور کرنے کیلئے استغفار کافی ہے۔ لیکن علماء کا قول ہے کہ یہ اس صورت میں ہے جبکہ آدمی کا اتا پتا معلوم نہ ہو جس کی غیبت کی گئی ہے۔ اگر معلوم ہو جائے تو پھر اس سے معافی کے بغیر چارہ نہیں۔

(۱۳۱۳) وَعَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللَّهُ

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ

تَعَالَى عَنْها قَالَتْ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «أَبْغَضُ الرِّجَالِ إِلَى اللهِ الأَلَدُّ الخَصِمُ». أَخرَجَهُ مُسْلِمٌ.

ﷺ نے فرمایا "بندوں میں اللہ کے نزدیک سب سے مبغوض بندہ وہ ہے جو سب سے زیادہ جھگڑالو ہو۔" (مسلم)

لغوی تشریح: ﴿الالد﴾ ہمزہ پر فتحہ اور لام پر فتحہ اور دال پر تشدید۔ سخت جھگڑالو اور ﴿الخصم﴾ کے "خا" اور صاد پر فتحہ اس کا معنی بھی جھگڑنے والا۔

حاصل کلام: لڑنے جھگڑنے میں شدت اور سختی کرنا شریف لوگوں کا کام نہیں۔ یہ ان لوگوں کا کام ہے جو عنداللہ سب سے زیادہ مبغوض ہیں۔ شدت اور سختی دونوں حرام ہیں مگر اپنے حقوق کے حصول کیلئے جائز حد تک جھگڑنا جائز ہے۔

٥ - بَابُ التَّرْغِيبِ فِي مَكَارِمِ الأَخْلَاقِ

مکارم اخلاق (اچھے عمدہ اخلاق) کی ترغیب کا بیان

(١٣١٤) عَنِ ابْنِ مَسْعُودٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «عَلَيْكُمْ بِالصِّدْقِ، فَإِنَّ الصِّدْقَ يَهْدِي إِلَى البِرِّ، وَإِنَّ البِرَّ يَهْدِي إِلَى الجَنَّةِ، وَمَا يَزَالُ الرَّجُلُ يَصْدُقُ، وَيَتَحَرَّى الصِّدْقَ حَتَّى يُكْتَبَ عِنْدَ اللهِ صِدِّيقاً، وَإِيَّاكُمْ وَالكَذِبَ، فَإِنَّ الكَذِبَ يَهْدِي إِلَى الفُجُورَ، وإن الفُجُورَ يَهْدِي إِلَى النَّارِ، وَمَا يَزَالُ الرَّجُلُ يَكْذِبُ، وَيَتَحَرَّى الكَذِبَ حَتَّى يُكْتَبَ عِنْدَ اللهِ كَذَّاباً». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "سچائی کو لازم پکڑو کہ سچ نیکی کی طرف راہنمائی کرتا ہے اور نیکی جنت کی جانب رہنمائی کرتی ہے اور آدمی ہمیشہ سچ بولتا ہے اور سچ کی تلاش میں رہتا ہے تاآنکہ اسے اللہ کے ہاں صدیق لکھا جاتا ہے اور جھوٹ سے بچو۔ جھوٹ گناہ کی جانب لے جاتا ہے اور گناہ آتشیں جہنم کی جانب لے جاتا ہے اور آدمی ہمیشہ جھوٹ بولتا رہتا ہے اور جھوٹ میں کوشش کرتا رہتا ہے تو اسے اللہ کے ہاں جھوٹا لکھا جاتا ہے۔" (بخاری و مسلم)

لغوی تشریح: ﴿باب الترغیب﴾ "مکارم" مکرمۃ کی جمع ہے مکرمۃ کے میم اول پر فتحہ کاف ساکن اور "را" پر ضمہ ہے شریفانہ کام کو کہتے ہیں۔ ﴿علیکم بالصدق﴾ اس کا معنی صدق کو لازم پکڑنے اور اختیار کرنے کے ہیں اور صدق نام ہے واقعہ کے مطابق کام یا بات کرنے کا۔ ﴿فان الصدق﴾ یعنی صدق کو لازم پکڑنے اور اس پر مداومت اختیار کرنا ﴿یتحری الصدق﴾ صدق کے سلسلہ میں انتہائی کوشش اور جدوجہد۔ ﴿صدیقا﴾ صاد کے نیچے کسرہ اور دال پر تشدید۔ صدق میں مبالغہ کو کہتے

ہیں۔ انتہائی سچ بولنے والا۔ اس حدیث میں سچ بولنے والے کے حسن خاتمہ اور اس کے برے انجام سے مامون و محفوظ ہونے کی طرف اشارہ ہے۔ ﴿ الفجور ﴾ "فاء" پر ضمہ اس کے معنی ہیں فساد کی جانب میلان رکھنا اور معاصی کی طرف لپکنے کو فسق و فجور کہتے ہیں اور یہ شرر و برائی کیلئے جامع نام ہے۔ ﴿ حتی یکتب عنداللہ کذابا ﴾ مؤلف نے فتح الباری شرح بخاری میں کہا ہے کہ کتابت سے مراد یہاں اس کے بامیں فیصلہ کرنا ہے اور ملاء اعلیٰ سے دونوں مخلوق کیلئے اس کا اظہار کرنا ہے۔

(١٣١٥) وَعَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، أَنَّ رَسُولَ اللهِ ﷺ قَالَ: «إِيَّاكُمْ وَالظَّنَّ، فَإِنَّ الظَّنَّ أَكْذَبُ الحَدِيثِ». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "بدگمانی سے بچو۔ بدگمانی سب سے بڑا جھوٹ ہے۔" (بخاری و مسلم)

حاصل کلام: دونوں احادیث میں جھوٹ سے بچنے اور ہمیشہ سچائی کو اختیار کرنے کا حکم ہے۔ سچائی کا آخری ثمرہ و نتیجہ جنت ہے اور جھوٹ کا نتیجہ خالق کائنات کی ناراضگی کی صورت میں دوزخ ہے۔ گویا اس حدیث میں اشارہ ہے کہ جو کوئی اپنی تمام باتوں میں سچ اختیار کرتا ہے اور سچائی کو اپنی زندگی کا عین مقصد سمجھتا ہے تو سچائی اس کی زندگی کا جزو لاینفک بن جاتا ہے اور اس کا نتیجہ جنت ہے۔

(١٣١٦) وَعَنْ أَبِيْ سَعِيْدٍ الخُدْرِيِّ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «إِيَّاكُمْ وَالجُلُوسَ بِالطُّرُقَاتِ»، قَالُوا: يَا رَسُولَ اللهِ! مَا لَنَا بُدٌّ مِنْ مَجَالِسِنَا، نَتَحَدَّثُ فِيْهَا، قَالَ: «فَأَمَّا إِذَا أَبَيْتُمْ فَأَعْطُوا الطَّرِيقَ حَقَّهُ»، قَالُوا: وَمَا حَقُّهُ؟ قَالَ: «غَضُّ البَصَرِ، وَكَفُّ الأَذَى، وَرَدُّ السَّلَامِ، وَالأَمْرُ بِالمَعْرُوفِ، وَالنَّهْيُ عَنِ المُنْكَرِ». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "راستوں (اور گلی کوچوں) میں بیٹھنے سے بچو۔ صحابہ نے عرض کیا' راستوں پر بیٹھے بغیر ہمارا گزارہ نہیں کیونکہ ہم وہاں بیٹھ کر باتیں کرتے ہیں۔ آپ نے فرمایا "پس اگر تم نہیں مانتے تو راستہ کا حق ادا کرو۔" انہوں نے عرض کیا اس کا حق کیا ہے؟ فرمایا "آنکھوں کو نیچے رکھنا۔ اذیت رسانی نہ کرنا اور سلام کا جواب دینا۔ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرنا۔" (بخاری و مسلم)

لغوی تشریح: ﴿ ایاکم والجلوس ﴾ منصوب اس لئے ہے کہ اس سے مقصود ڈرانا اور خبردار کرنا ہے یعنی اس سے خوف کھاؤ' ڈرو اور محتاط رہو۔ ﴿ مالنا بد ﴾ بد کے "باء" پر ضمہ اور دال پر تشدید۔ کوئی چارا جائے فرار نہیں۔ ﴿ لا بدمنه ﴾ وہاں کہا جاتا ہے جہاں اس کے بغیر کوئی چارہ نہ ہو اور جس کے سر انجام دیئے بغیر گزارہ نہ ہو معنی یہ ہوا کہ ضرورت و حاجت ہمیں راستوں پر بیٹھنے کیلئے مجبور کرتی ہے۔

پس اس سے ہمارے لئے کوئی کشادگی و فراخی کی گنجائش نہیں۔ ﴿ فان ابیتم ﴾ پس اگر تم لوگوں کے راستوں میں بیٹھنے سے باز نہیں آئے تو پھر راستہ کا حق ادا کرو اور وہ یہ کہ اپنی نظروں کو غیر محرم پر پڑنے سے بچاؤ۔ ﴿ کف الاذی ﴾ راہ گیروں کو اذیت دینے سے رک جاؤ اور دوسری روایات میں راستے کے حق کے بارے میں مزید بیان بھی ہے کہ راستہ کی راہنمائی کرے' مصیبت زدہ کی فریاد رسی کرے' گم کردہ راہ مسافر کو راہ راست دکھائے۔ جب کوئی چھینک آنے کے بعد الحمد للہ کہے تو اس کا جواب (یرحمك الله) دے۔

حاصل کلام: اس حدیث میں راستوں میں جہاں سے لوگ گزرتے ہوں بیٹھنا اور قصہ گوئیاں کرنا ممنوع ہے۔ گلی کوچوں میں بیٹھنا' راہ چلنے والوں کیلئے راستہ تنگ کرنا کونسی شرافت ہے۔ راستوں پر خواتین کا آنا جانا بھی رہتا ہے۔ لامحالہ ان کیلئے مشکل پیدا ہوتی ہے ان کے علاوہ ٹریفک کے مسائل ہیں اور اگر راستے پر بیٹھنا مجبوری ہو تو پھر اس کے حقوق کی ادائیگی ضروری ہے جیسا کہ اوپر بیان ہو چکا ہے۔

(١٣١٧) وَعَنْ مُعَاوِيَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «مَنْ يُرِدِ اللَّهُ بِهِ خَيْراً يُفَقِّهْهُ فِي الدِّينِ». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "اللہ تعالیٰ جس شخص سے بھلائی و خیر کا ارادہ فرماتا ہے اسے دین کی سمجھ عطا فرماتا ہے۔" (بخاری و مسلم)

لغوی تشریح: ﴿ الفقه فی الدین ﴾ قواعد اسلام کا سیکھنا' کتاب و سنت کے حلال و حرام کی معرفت حاصل کرنا۔ رہا ائمہ کے تخریج شدہ اقوال کی معرفت تو اسے اس امام کے مذہب کی فقہ کہیں گے۔ یہ فقہ فی الدین نہیں ہے۔

(١٣١٨) وَعَنْ أَبِي الدَّرْدَاءِ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «مَا مِنْ شَيْءٍ فِي المِيزَانِ أَثْقَلُ مِنْ حُسْنِ الخُلُقِ». أَخْرَجَهُ أَبُو دَاوُدَ وَالتِّرْمِذِيُّ، وَصَحَّحَهُ.

حضرت ابوالدرداء رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "اچھے خلق سے زیادہ کوئی اور چیز ترازو میں وزنی نہیں ہے۔" (اسے ابوداؤد اور ترمذی نے روایت کیا ہے اور ترمذی نے اسے صحیح قرار دیا ہے)

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ قیامت کے روز ترازو بھی ہوں گے جن میں اعمال تولے اور وزن کئے جائیں گے اور ترازو میں سب سے وزنی چیز انسان کے عمدہ اخلاق ہوں گے۔ اس سے اچھے اور بہترین اخلاق کی اہمیت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

(١٣١٩) وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «الحَيَاءُ مِنَ الإِيمَانِ».

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "حیا ایمان کا جزء ہے۔" (بخاری و مسلم)

مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

لغوی تشریح: ﴿الحیاء﴾ لغوی طور پر حیا کے معنی ہیں، کسی عیب کے ڈر سے طبیعت میں تغیر و انکساری پیدا ہونا اور شرعاً یہ ایسی خصلت و عادت ہے جو برے اور بدنام کام سے بچنے کا موجب و باعث ہوتی ہے اور حقدار کے حق میں کوئی کوتاہی و کمی کرنے سے روکتی ہے اور حیا اگرچہ ایک طبعی خصلت ہے لیکن اسے شرعی طور پر استعمال کرنے ہی کیلئے جاننے اور نیت کرنے کی ضرورت ہے۔ اس لئے اس کو ایمان کا جزء اور شاخ قرار دیا گیا ہے اور کبھی کلیتاً کسبی بھی ہوتا ہے اور اسے ایمان کا جزء قرار دینے کے معنی یہ ہیں کہ صاحب حیا کو اس کا حیا گناہوں کے ارتکاب سے باز رکھتا ہے۔ جس طرح کہ ایمان گناہوں سے روکنے کا سبب ہوتا ہے، اسی طرح حیا بھی انسان کو معاصی و گناہوں سے بچنے میں مدد و معاون ثابت ہوتا ہے بلکہ یوں سمجھیں کہ ڈھال کا کام دیتا ہے۔ (سبل السلام)

(١٣٢٠) وَعَنْ أَبِيْ مَسْعُوْدٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: «إِنَّ مِمَّا أَدْرَكَ النَّاسُ مِنْ كَلَامِ النُّبُوَّةِ الأُولَى: إِذَا لَمْ تَسْتَحِ فَاصْنَعْ مَا شِئْتَ». أَخْرَجَهُ الْبُخَارِيُّ.

حضرت ابو مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "پہلی نبوت کے کلام میں سے لوگوں کو جو کچھ ملا ہے، اس میں سے یہ بھی ہے کہ جب تو شرم نہ کرے تو جو چاہے کر۔" (بخاری)

حاصل کلام: پہلے نبوت کے کلام سے مراد وہ بات ہے جس پر سب انبیاء کا اتفاق ہے۔ یہ چیز ان کی شریعتوں کی طرح منسوخ نہیں ہوئی۔ اس حدیث سے معلوم ہوا کہ پہلی شریعتوں کی کچھ باتیں ایسی ہیں جو منسوخ نہیں۔ ان میں ایک یہ ہے کہ "جب تو شرم و حیا نہ کرے تو جو چاہے کر" بے حیائی سے روکنے کا جب یہ ذریعہ نہیں تو انسان بے حجابی میں جو چاہے گا، کرے گا۔ بعض نے کہا ہے کہ اس کا مفہوم یہ ہے کہ کوئی بھی کام کرنے سے پہلے دیکھ لو اگر وہ ایسا ہو کہ اس سے حیاء کی جائے تو اسے چھوڑ دو۔ (سبل)

(١٣٢١) وَعَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: «الْمُؤْمِنُ الْقَوِيُّ خَيْرٌ وَأَحَبُّ إِلَى اللّٰهِ مِنَ الْمُؤْمِنِ الضَّعِيفِ، وَفِي كُلٍّ خَيْرٌ، احْرِصْ عَلَى مَا يَنْفَعُكَ، وَاسْتَعِنْ بِاللّٰهِ، وَلَا تَعْجِزْ، وَإِنْ أَصَابَكَ شَيْءٌ فَلَا تَقُلْ: لَوْ أَنِّي فَعَلْتُ كَذَا كَانَ كَذَا وَكَذَا، وَلَكِنْ

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "قوی مومن اچھا، اللہ کے ہاں زیادہ محبوب ہے ضعیف و کمزور مومن سے۔ ہر مومن میں بھلائی و اچھائی ہے۔ جو چیز تیرے لئے منافع بخش ہے اس کی حرص و لالچ کر۔ مدد صرف اللہ سے طلب کر، عاجز و درماندہ بن کر نہ بیٹھ اور اگر تجھے چیز حاصل ہو تو اس طرح مت کہو کہ اگر فلاں کام میں نے اس طرح سرانجام دیا ہوتا تو اس سے مجھے یہ اور یہ فوائد

قُلْ: قَدَّرَ اللَّهُ، وَمَا شَاءَ فَعَلَ، فَإِنَّ «لَوْ» تَفْتَحُ عَمَلَ الشَّيْطَانِ». أَخرَجَهُ مُسْلِمٌ.

حاصل ہوتے۔ بلکہ اس طرح کہا کرو کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی تقدیر میں جو چاہا۔ کیونکہ لفظ "لو" یعنی اگر شیطان کے عمل کا دروازہ کھولتا ہے۔" (مسلم)

لغوی تشریح: ﴿ فـان لـو ﴾ "لو" کا لفظ کسی کام کے مراد اور مقصود کے خلاف واقع ہونے پر بولا جاتا ہے۔ مثلاً کوئی آدمی کہتا ہے اگر میں اس طرح کرتا تو اس کا نتیجہ لازماً اس طرح ہوتا جیسا کہ حدیث بالا میں مذکور ہے۔ ﴿ تفتح عمل الشيطان ﴾ یہ شیطان کا عمل کھول دیتا ہے۔ یعنی اچھے کام کے ہاتھ سے نکل جانے پر شیطان اسے شدت حرص اور حسرت و افسوس پر ابھارتا ہے اور قضاء و قدر پر عدم رضامندی پر مائل کرتا ہے اور اس میں تقدیر کو بدلنے کے امکان کا گمان دلاتا ہے۔

حاصل کلام: اس حدیث میں لفظ "لو" جس کے معنی "اگر" کے ہوتے ہیں کے استعمال سے منع فرمایا گیا ہے اور بعض احادیث سے اس کے استعمال کی گنجائش نظر آتی ہے۔ لهذا یہ ممانعت تنزیہی ہے' تحریمی نہیں۔ قاضی عیاض وغیرہ کی یہی رائے ہے۔ مگر بعض علماء نے کہا ہے کہ اگر "لو" کے بارے میں یہ عقیدہ رکھا جائے کہ اگر میں فلاں کام اس طرح انجام دیتا تو یقیناً اس کا نتیجہ اس طرح برآمد ہوتا اس طور پر لفظ "لو" کا استعمال حرام ہے اور اگر یہ عقیدہ ہو کہ وہی ہو کر رہنا تھا جو ہو چکا ہے اور ہوگا بھی وہی جو تقدیر الٰہی میں ہے تو ایسی صورت میں لفظ "لو" کا استعمال درست ہوگا' ممنوع نہیں ہوگا۔ اسی طرح اگر دین اسلام کی تابعداری نہ کرنے پر تاسف کی صورت میں "لو" کہتا ہے تو یہ بھی جائز ہے۔ دوسرے اس حدیث میں قوی و مضبوط مومن کو اللہ تعالیٰ ضعیف و کمزور کے مقابلہ میں محبوب رکھتا ہے کیونکہ جہاد میں قوت و طاقت کی ضرورت ہے۔ تندرست و صحت مند آدمی بیمار و کمزور آدمی کے مقابلہ میں دین کی خدمت بھی زیادہ کر سکتا ہے اور عبادت بھی زیادہ اور غرباء و مساکین اور ضرورت مندوں اور حاجت مندوں کی خدمت بھی زیادہ کر سکتا ہے۔ لیکن قوت و ہمت کے باوجود انسان تبھی کچھ کر سکتا ہے جب اللہ تعالیٰ کی مدد شامل حال ہو۔ اس لئے اس میں حکم ہے کہ بہرنوع اللہ تعالیٰ سے مدد طلب کرو۔ وہی تمہارا کارساز ہے۔

(١٣٢٢) وَعَنْ عِيَاضِ بْنِ حِمَارٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «إِنَّ اللَّهَ تَعَالَى أَوْحَى إِلَيَّ أَنْ تَوَاضَعُوا، حَتَّى لاَ يَبْغِيَ أَحَدٌ عَلَى أَحَدٍ، وَلاَ يَفْخَرَ أَحَدٌ عَلَى أَحَدٍ». أَخرَجَهُ مُسْلِمٌ.

حضرت عیاض بن حمار رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ "اللہ تعالیٰ نے مجھ پر وحی نازل فرمائی ہے کہ تواضع و انکساری کرو۔ یہاں تک کہ کوئی دوسرے پر زیادتی نہ کرے اور نہ کوئی دوسرے پر فخر کرے۔" (مسلم)

لغوی تشریح: ﴿ التـواضـع ﴾ تذلل و انکساری۔ یہ کبر کی ضد ہے۔ متکبر وہ شخص ہے جو دوسروں کے

مقابلہ میں اپنے آپ کو بڑا اور ممتاز سمجھتا ہے۔ احکام الٰہی کی بغاوت کرتا ہے اور فسق و فجور میں مبتلا ہو جاتا ہے اور لوگ اس سے اس وجہ سے نفرت کرتے ہیں۔ جب تواضع تکبر کی ضد ہے تو تواضع کے آثار بھی اس کے مخالف ہوں گے۔

حاصل کلام: اس حدیث میں تواضع و انکساری اختیار کرنے کی تلقین و ترغیب ہے۔ باوجود بلند مرتبہ اور بلند شان ہونے کے' انسان کا اپنے آپ کو دوسروں کے مقابلہ میں بڑا نہ سمجھنا اور لوگوں کو حقیر تصور نہ کرنا تواضع ہے۔ تواضع و انکساری سے انسان دوسرے انسانوں کو اپنا دوست اور ہمنوا بنا لیتا ہے اور تکبر و نخوت سے لوگوں کو اپنے سے دور کر لیتا ہے۔

(١٣٢٣) وَعَنْ أَبِيْ الدَّرْدَاءِ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ: «**مَنْ رَدَّ عَنْ عِرْضِ أَخِيهِ بِالغَيْبِ رَدَّ اللَّهُ عَنْ وَجْهِهِ النَّارَ يَوْمَ القِيَامَةِ**». أَخْرَجَهُ التِّرْمِذِيُّ، وَحَسَّنَهُ، وَلِأَحْمَدَ مِنْ حَدِيثِ أَسْمَاءَ بِنْتِ يَزِيْدَ نَحْوُهُ.

حضرت ابوالدرداء رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "جس شخص نے اپنے بھائی کی عدم موجودگی میں اس کی آبرو کی حفاظت کی اللہ تعالیٰ قیامت کے روز اس کے چہرے کو آتش جہنم سے محفوظ رکھے گا۔" (اس کو ترمذی نے روایت کیا ہے اور حسن قرار دیا ہے اور مسند احمد میں اسماء بنت یزید رضی اللہ عنہا کی حدیث بھی اسی طرح ہے)

لغوی تشریح: ﴿من رد عن عرض اخیه﴾ اس کا مطلب ہے کہ جس نے اپنے بھائی کی عدم موجودگی میں اس کا دفاع کیا اور اس کی آبرو کی حفاظت کی ﴿بالغیب﴾ ایسی صورت میں جب اس کا بھائی موجود نہیں تھا' غیر حاضر تھا۔

حاصل کلام: اس حدیث میں اس مسلمان کی بڑی فضیلت کا بیان ہے جو اپنے مسلمان بھائی کی عدم موجودگی میں اس کی عزت و آبرو کی حفاظت کرتا ہے اور اس کا دفاع کرتا ہے بلکہ یہ دفاع واجب ہے کیونکہ یہ انکار منکر کے باب میں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ایک حدیث میں دفاع نہ کرنے والے کی مذمت بھی آئی ہے۔ پھر اس دفاع سے غیبت وغیرہ کرنے والے کی حوصلہ شکنی ہوتی ہے آئندہ وہ اس سے اجتناب کرے گا اور جس کا دفاع کیا ہے' اس سے بھائی چارہ اور محبت پیدا ہوتی ہے۔

راوی حدیث: ﴿اسماء بنت یزید رضی اللہ عنہا﴾ یہ یزید بن سکن کی صاحب زادی تھیں۔ قبیلہ اشہل سے تھیں اس لئے اشھلیہ کہلاتی تھیں۔ خواتین کی خطیبہ تھیں۔ یرموک میں شریک ہوئیں۔ اس روز اس نے اپنے خیمہ کی لکڑی سے نو دشمنوں کو قتل کیا۔

(١٣٢٤) وَعَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «**مَا نَقَصَتْ صَدَقَةٌ مِنْ مَالٍ**،

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "صدقہ و خیرات کسی مال میں کمی واقع نہیں کرتا اور اللہ اس شخص کو جو درگزر کرتا ہے'

وَمَا زَادَ اللّٰهُ عَبْداً بِعَفْوٍ إِلاَّ عِزًّا، وَمَا تَوَاضَعَ أَحَدٌ لِلّٰهِ إِلاَّ رَفَعَهُ اللّٰهُ تَعَالَى». أَخْرَجَهُ مُسْلِمٌ.

نہیں بڑھاتا مگر عزت میں اور نہیں تواضع کرتا کوئی بھی اللہ کیلئے مگر اللہ تعالیٰ اس کو بلند کرتا ہے۔" (مسلم)

لغوی تشریح: ﴿ مازاد الله رجلا بعفو ﴾ اللہ اس شخص کو جو عفو و درگزر کرتا ہے نہیں بڑھاتا۔ یعنی اس کا کسی شے کے معاف کرنے کی وجہ سے یا انتقام و بدلہ لینے کی قوت و طاقت کے باوجود اسے معاف کر دینے کی وجہ سے۔ ﴿ الا عزا ﴾ مگر عزت۔ دنیا میں۔ کیونکہ عفو و درگزر کی صفت سے پہچانا گیا اس نے تو دلوں میں بہت بڑا مقام پیدا کر لیا یا پھر آخرت میں بھی عزت عطا فرمائے گا بایں طور کہ اس کے ثواب میں اضافہ فرما دے گا یا عزت و توقیر دنیا اور آخرت دونوں میں عطا فرمائے گا۔ ﴿ وما تواضع احد لله ﴾ اور نہیں تواضع کرتا کوئی بھی اللہ کیلئے۔ یعنی اس طرح کہ وہ خود جس مرتبہ اور منصب کا مستحق ہے اپنے آپ کو اس سے نیچے اتار لے اس امید و توقع کے پیش نظر کہ اللہ کا قرب نصیب ہو جائے اس کے سوا کوئی دوسری غرض و مقصد نہ ہو۔

حاصل کلام: اس حدیث میں مکارم اخلاق کی تین چیزوں کا ذکر ہے اور تینوں اخلاق فاضلہ کی جڑ ہیں۔ اور وہ صدقہ' عفو و درگزر اور تواضع ہیں۔ جس انسان میں یہ تینوں وصف پائے جائیں گے وہ شخص اللہ تعالیٰ کا محبوب ہو گا اور مخلوق خدا بھی اس سے محبت کرے گی۔

(١٣٢٥) وَعَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ سَلاَمٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ: «يَا أَيُّهَا النَّاسُ! أَفْشُوا السَّلاَمَ، وَصِلُوا الأَرْحَامَ، وَأَطْعِمُوا الطَّعَامَ، وَصَلُّوا بِاللَّيْلِ، وَالنَّاسُ نِيَامٌ، تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ بِسَلاَمٍ». أَخْرَجَهُ التِّرْمِذِيُّ، وَصَحَّحَهُ.

حضرت عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "لوگو! سلام کو عام کرو اور صلہ رحمی کرو اور کھانا کھلاؤ۔ رات کو قیام کرو جب دوسرے لوگ سوتے ہوں' جنت میں سلامتی کے ساتھ داخل ہو جاؤ گے۔" (اسے ترمذی نے نکالا ہے اور صحیح کہا ہے)

لغوی تشریح: ﴿ افشوا ﴾ افشاء سے امر کا صیغہ ہے جس کے معنی پھیلانا' عام کرنا کے ہیں۔ ﴿ صلوا الارحام ﴾ وصل سے امر کا صیغہ ہے۔ ﴿ نیام ﴾ نون کے نیچے کسرہ اور یہ نائم کی جمع ہے یعنی سونے والے۔

حاصل کلام: اس حدیث میں جن امور کو موجبات جنت قرار دیا گیا ہے ان میں تین کا تعلق انسانوں کے ساتھ باہمی پیار اور محبت سے ہے اور ایک کا اللہ تعالیٰ کی عبادت سے' گویا اشارہ ہے کہ جس کا تعلق اللہ اور اللہ کے بندوں سے درست ہوا وہ جنت میں جائے گا اور یہ بھی کہ جو ان امور خیر کی پابندی کرے گا اس کیلئے جنت کے حصول کا راستہ آسان ہو جائے گا' وہ نیکی کی شاہراہ پر چل نکلے گا اور برائیوں سے

اجتناب کرے گا۔

(۱۳۲۶) وَعَنْ تَمِيْمٍ الدَّارِيِّ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «الدِّينُ النَّصِيحَةُ»، ثَلاَثاً، قُلْنَا: لِمَنْ هِيَ يَا رَسُولَ اللهِ؟ قَالَ: «لِلهِ، وَلِكِتَابِهِ وَلِرَسُولِهِ، وَلأَئِمَّةِ الْمُسْلِمِيْنَ وَعَامَّتِهِمْ». أَخْرَجَهُ مُسْلِمٌ.

حضرت تمیم داری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "دین (دین اسلام) وعظ و نصیحت کا نام ہے" تین مرتبہ یہ ارشاد فرمایا۔ ہم نے عرض کیا' اے اللہ کے رسول (ﷺ)! یہ نصیحت کا حق کس کے لیے ہے؟ فرمایا "اللہ کیلئے' اس کی کتاب کیلئے اور اس کے رسول کیلئے اور مسلمانوں کے آئمہ کیلئے اور ان کے عام لوگوں کیلئے۔" (مسلم)

لغوی تشریح: ﴿ الدین النصیحۃ ﴾ یعنی دین کا عمود و ستون اور اس کو قائم رکھنے کا پیانہ اور اس کا پایۂ خیر خواہی و نصیحت ہے۔ علامہ جزری نے النھایہ میں کہا ہے کہ نصیحت بڑا جامع کلمہ ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ اس شخص سے بھلائی کا ارادہ کرنا جس کی خیر خواہی مطلوب و مقصود ہو اور ناممکن ہے کہ اس معنی کو ایک ہی لفظ میں ادا کیا جاسکے جو دوسرے معنی کو بھی اپنے اندر جمع کئے ہوئے ہو اور "نصح" کا لغت میں تو دراصل معنی خلوص ہے۔ کہا جاتا ہے نصحتہ تو اس کے معنی ہیں "نصحت لہ" یعنی میں نے اس کی خیر خواہی کی اور اللہ سے خیر خواہی کے معنی یہ ہیں کہ عقیدہ صحیح ہو کہ اس کے سوا اور کوئی مستحق عبادت نہیں ہے اور نہ ہی اور کوئی معبود و مالک ہے اور اس کی عبادت میں بھی اخلاص ہو اور اس کی کتاب کی خیر خواہی سے مراد ہے کہ اس کتاب کی تصدیق کی جائے اور اس میں جو تعلیم ہے اس کے مطابق عمل کیا جائے اور اس کے رسول کی خیر خواہی یہ ہے کہ اس کی رسالت و نبوت کو بصدق قلب تسلیم کیا جائے اور اس کے حکم کی بلا چون و چرا تعمیل کی جائے اور جس سے اس نے روکا ہو اس کام سے رک جائے اور ائمہ کی خیر خواہی یہی ہے کہ حق کے معاملہ میں ان کی بات مانی جائے اور ان کے خلاف بلاوجہ خروج نہ کیا جائے اور عام مسلمانوں کی خیر خواہی سے مراد ہے کہ اچھے کاموں کی طرف ان کی راہنمائی کی جائے۔

راوی حدیث: ﴿ تمیم داری رضی اللہ عنہ ﴾ ان کی کنیت ابورقیہ ہے۔ نام تمیم بن اوس بن خارجہ داری۔ ۹ھ میں اسلام قبول کیا۔ بیت المقدس میں سکونت اختیار کی۔ جساسہ کی اطلاع نبی ﷺ تک انہوں نے پہنچائی تھی۔ ابن سیرین کا قول ہے کہ سارا قرآن حفظ کیا اور ایک رات میں سارا قرآن تلاوت کر لیتے تھے اور ابونعیم کا قول ہے کہ تمیم وہ پہلے صحابی ہیں جس نے مساجد میں دیا روشن کیا تھا۔ ۴۰ھ میں وفات پائی۔

(۱۳۲۷) وَعَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «أَكْثَرُ مَا يُدْخِلُ الجَنَّةَ تَقْوَى

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "جو چیز اکثر جنت میں جانے کا سبب بنے گی وہ اللہ کا ڈر اور حسن خلق ہے۔" (اسے ترمذی

اللهِ وَحُسْنُ الخُلُقِ». أَخرَجَهُ التِّرمِذِيُّ وَصَحَّحَهُ الحَاكِمُ.
نے نکالا ہے اور حاکم نے اسے صحیح کہا ہے)

حاصل کلام: اس حدیث میں تقویٰ اور حسن خلق اختیار کرنے والوں کو دخول جنت کا مژدہ سنایا گیا ہے۔ تقویٰ کے معنی یہ ہیں کہ اوامر پر عمل کرنا اور منہیات و نواہی سے رک جانا اور حسن خلق' اچھے عمل و کردار کا نام ہے اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اسلام میں تقویٰ اور حسن خلق کا کیا مقام و مرتبہ ہے اور اس کی کتنی اہمیت و فضیلت ہے اور یہ بھی معلوم ہو گیا کہ جنت مخلوق ہے اور موجود ہے۔

(١٣٢٨) وَعَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «إِنَّكُمْ لاَ تَسَعُونَ النَّاسَ بِأَمْوَالِكُمْ، وَلَكِنْ لِيَسَعْهُمْ مِنْكُمْ بَسْطُ الوَجْهِ وَحُسْنُ الخُلُقِ». أَخرَجَهُ أَبُو يَعْلىٰ وَصَحَّحَهُ الحَاكِمُ.

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "تم لوگوں میں رسائی مال کے ذریعہ پیدا نہیں کر سکتے اس لئے تمہیں چاہئے کہ حسن خلق و کشادہ روئی سے لوگوں کے اندر رسائی پیدا کرو۔" (اسے ابو یعلیٰ نے روایت کیا ہے اور حاکم نے اسے صحیح کہا ہے)

لغوی تشریح: ﴿ لا تسعون ﴾ یہ الواسع سے ماخوذ ہے اسی طرح ﴿ یسعهم ﴾ بھی اسی "الوسع" سے ہے۔ مطلب یہ ہے کہ تم مال خرچ کر کے لوگوں تک رسائی حاصل نہیں کر سکتے کیونکہ لوگوں کی تعداد زیادہ اور مال کم ہے۔ لیکن یہ کام تم خندہ روئی اور خندہ پیشانی سے کر سکتے ہو لہٰذا اسی کو اپنے اوپر لازم کر لو نیز نرم پہلو اور نرم رویہ سے بھی اسے پورا کر سکتے ہو۔ اس کے برعکس سختی سے اور درشتگی سے یہ کام پایہ تکمیل تک نہیں پہنچ سکتا۔ (سبل السلام)

(١٣٢٩) وَعَنْهُ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَىٰ عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «المُؤْمِنُ مِرْآةُ أَخِيهِ المُؤْمِنِ». أَخرَجَهُ أَبُو دَاوُدَ بِإِسْنَادٍ حَسَنٍ.

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ "مومن اپنے مومن بھائی کا آئینہ ہے۔" (اس کو ابوداؤد نے روایت کیا ہے' اس کی سند حسن ہے)

لغوی تشریح: ﴿ المومن مراۃ اخیه المومن ﴾ المراۃ کے میم کے نیچے کسرہ اور ھمزہ پر مد ہے۔ مطلب یہ ہے کہ آئینہ جس طرح اپنے دیکھنے والے کے محاسن اور نقائص بلا کم و کاست اس کے سامنے رکھ دیتا ہے' اسی طرح ایک مومن اپنے دوسرے مومن بھائی کیلئے آئینہ کی طرح ہے کہ وہ اپنے بھائی کو عیوب اور نقائص پر متنبہ کر کے اسے خبردار کر دیتا ہے کہ اپنی اصلاح کر لے۔ یہ کام آئینہ صرف اپنے دیکھنے والے کو ہی بتاتا ہے' دوسرے کے روبرو چغلی نہیں کھاتا اور آئینہ اتنا عیب و نقص ہی بتاتا ہے جتنا دیکھنے والے کے چہرے مہرے میں ہوتا ہے' اس میں اپنی جانب سے کمی بیشی نہیں کرتا اور اس کے سامنے بیان کرتا ہے' اس کی عدم موجودگی اور پیٹھ پیچھے نہیں کرتا۔ اسی طرح ایک مومن کو اپنے مومن بھائی کے

سامنے اس کے عیوب بیان کرنے چاہئیں' اس کی غیر موجودگی میں نہیں اور اتنے عیوب ہی بیان کرنے چاہئیں جتنے حقیقت میں اس میں پائے جاتے ہوں' اس میں اپنی جانب سے کمی بیشی نہ کرے۔ آئینہ ٹکڑے ہو کر بھی اپنے دیکھنے والے کے عیوب ہر ٹکڑے میں وہی دکھاتا ہے جو اس میں پائے جاتے ہیں' اسی طرح مومن کو اپنے بھائی سے ناراض ہو کر بھی اپنے مومن بھائی کے عیوب اتنے ہی بیان کرنے چاہئیں جتنے فی الواقع اس میں پائے جاتے ہیں۔ آئینہ ٹوٹ کر اپنی اصلیت کھو نہیں دیتا' اسی طرح مومن کو اپنی اصلیت کھو نہیں دینی چاہئے اور مومن کو اپنے عیوب پر تنبیہہ کو اپنے لئے سچی خیر خواہی اور حقیقی ہمدردی سمجھنا چاہئے۔

(۱۳۳۰) وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُما قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «الْمُؤْمِنُ الَّذِي يُخَالِطُ النَّاسَ وَيَصْبِرُ عَلَى أَذَاهُمْ خَيْرٌ مِنَ الَّذِي لاَ يُخَالِطُ النَّاسَ وَلاَ يَصْبِرُ عَلَى أَذَاهُمْ». أَخرَجَهُ ابْنُ مَاجَهْ بِإِسْنَادٍ حَسَنٍ، وَهُوَ عِنْدَ التِّرْمِذِيِّ، إِلاَّ أَنَّهُ لَمْ يُسَمِّ الصَّحَابِيَّ.

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "جو مومن لوگوں سے میل جول رکھتا ہے اور ان کی جانب سے اذیت رسانی پر صبر کرتا ہے وہ اس مومن سے بہتر اور اچھا ہے جو لوگوں سے ملتا جلتا نہیں اور ان کی جانب سے اذیت رسانی پر صبر بھی نہیں کرتا۔" (اس حدیث کو ابن ماجہ نے حسن سند کے ساتھ روایت کیا ہے۔ نیز یہ حدیث ترمذی میں بھی ہے مگر اس نے صحابی رضی اللہ عنہ کا نام نہیں لیا)

حاصل کلام: اس حدیث میں اس آدمی کو بہتر قرار دیا گیا ہے جو لوگوں میں مل جل کر رہتا ہے ان سے میل ملاقات رکھتا ہے۔ دین کی تبلیغ کرتا ہے۔ ان کے دکھ سکھ میں شریک ہوتا ہے۔ تبلیغ دین کے سلسلہ سے ان کی جانب سے جو تکلیف اور اذیت پہنچتی ہے اس کو صبر و تحمل سے برداشت کرتا ہے' اس لئے کہ یہ تکلیف اسے دین کی وجہ سے دی گئی ہے۔ لہٰذا وہ اس شخص سے بدرجہا بہتر ہے جو لوگوں میں آتا جاتا نہیں' ان سے میل ملاقات نہیں رکھتا۔ نہ وہ دین کی تبلیغ کرتا ہے اور نہ ہی ان کے دکھ سکھ میں شریک ہوتا ہے' نہ کسی سے تعاون لیتا ہے اور نہ دیتا ہے۔ البتہ جو آدمی ایذا رسانی کو برداشت نہیں کر سکتا بلکہ اس سے اس کی اپنی دینداری کے خراب ہونے کا اندیشہ ہے تو ایسی صورت میں اس شخص کیلئے عزلت اور کنارہ کشی کی گنجائش ہے۔ امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے احیاء العلوم میں اس پر سیر حاصل بحث کی ہے۔

(۱۳۳۱) وَعَنِ ابْنِ مَسْعُودٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «اللَّهُمَّ كَمَا حَسَّنْتَ خَلْقِي، فَحَسِّنْ خُلُقِي». رَوَاهُ أَحْمَدُ، وَصَحَّحَهُ ابْنُ

حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "الٰہی جس طرح تو نے میری تخلیق کو خوب اچھا بنایا ہے' اس طرح میرے اخلاق کو اچھا اور حسین بنا دے۔" (اسے احمد نے روایت کیا

حِبَّانَ. ہے اور ابن حبان نے اسے صحیح کہا ہے)

لغوی تشریح: ﴿حسنت﴾ تحسین سے ماخوذ اور مخاطب کا صیغہ ہے۔ ﴿خلقی﴾ "خا" پر فتحہ اور لام ساکن اور دوسرے میں "خا" اور "لام" دونوں پر ضمہ ہے۔

حاصل کلام: یہ دعا رسول اللہ ﷺ عموماً آئینہ دیکھنے کے موقع پر کیا کرتے تھے۔ آپؐ تو تخلیق اور اخلاق کے لحاظ سے کائنات میں سب سے افضل و اعلیٰ تھے۔ آپؐ کی یہ دعا دراصل اس نعمت کے دوام کیلئے اور امت کو تعلیم دینے کیلئے تھی۔

٦ - بَابُ الذِّكْرِ وَالدُّعَاءِ — ذکر اور دعا کا بیان

(١٣٣٢) عَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «يَقُولُ اللَّهُ تَعَالَى: أَنَا مَعَ عَبْدِي مَا ذَكَرَنِي وَتَحَرَّكَتْ بِي شَفَتَاهُ». أَخْرَجَهُ ابْنُ مَاجَهْ، وَصَحَّحَهُ ابْنُ حِبَّانَ، وَذَكَرَهُ الْبُخَارِيُّ تَعْلِيقاً.

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ میں اپنے بندے کے اس وقت تک ساتھ رہتا ہوں جب تک وہ مجھے یاد کرتا ہے اور میرے لئے اس کے ہونٹ ہلتے رہتے ہیں۔" (اس کو ابن ماجہ نے نکالا ہے اور ابن حبان نے اسے صحیح کہا ہے اور بخاری نے اسے تعلیقاً بیان کیا ہے)

لغوی تشریح: ﴿باب الذکر﴾ یعنی اللہ کا ذکر زبان سے اور دل سے۔ ﴿والدعاء﴾ دعا کہتے ہیں اللہ سے خیر طلب کرنا۔ دعا کبھی ضائع نہیں جاتی' بلکہ دعا مانگنے والے کے لئے تین میں سے ایک چیز ضرور حاصل ہوتی ہے۔ یا یہ کہ اللہ تعالیٰ دعا کو بعینہٖ شرف قبولیت سے نوازتے ہیں یا یہ کہ اس دعا کو مانگنے والے کے لئے آخرت میں ذخیرہ بنا دیتا ہے یا یہ کہ اس سے کسی برائی و مصیبت کو دور کر دیتا ہے۔

حاصل کلام: اس حدیث میں ذکر کی فضیلت بیان ہوئی ہے۔ اللہ کے ذکر کا فائدہ یہ ہے کہ ذاکر کو اللہ تعالیٰ کی معیت نصیب ہوتی ہے۔ ذکر اللہ تعالیٰ کی توحید' اس کی ثناء' تحمید و تمجید وغیرہ کے کلمات کو دل اور زبان پر جاری رکھنے کا نام ہے۔ محض دل میں ان کلمات کا ہونے کا کوئی معنی نہیں جب تک کہ زبان بھی دل کی ہمنوا نہ ہو اور صرف زبان سے ادا کرنا اور دل اس سے بے خبر رہے' اس سے بھی کوئی خاص فائدہ حاصل نہیں ہوتا۔ جب دل اور زبان ہم آہنگ ہوں اور ایک دوسرے کے ہمنوا ہوں تو مطلوب حاصل ہوتا ہے اور یہی اللہ کے ہاں محبوب ہے۔ دعا اور ذکر میں طلب کا فرق ہے' دعا میں طلب ہوتی ہے' ذکر میں نہیں۔ دعا کی فضیلت میں بہت سی احادیث منقول ہیں۔ حافظ ابن قیم رحمہ اللہ کی "الوابل الصیب" اس سلسلے میں بہترین کتاب ہے۔ اہل ذوق اس کی مراجعت فرمائیں۔

(١٣٣٣) وَعَنْ مُعَاذِ بْنِ جَبَلٍ حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول

رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «مَا عَمِلَ ابْنُ آدَمَ عَمَلاً أَنْجَى لَهُ مِنْ عَذَابِ اللهِ مِنْ ذِكْرِ اللهِ». أَخْرَجَهُ ابْنُ أَبِي شَيْبَةَ وَالطَّبَرَانِيُّ بِإِسْنَادٍ حَسَنٍ.

اللہ ﷺ نے فرمایا "ابن آدم کا کوئی عمل اللہ کی یاد سے بڑھ کر عذاب الٰہی سے نجات دینے والا نہیں۔" (اسے ابن ابی شیبہ اور طبرانی نے حسن سند کے ساتھ نکالا ہے)

لغوی تشریح: ﴿انجی﴾ نجاۃ سے افعل تفضیل کا صیغہ ہے۔ معنی ہے کہ اس سے زیادہ باعث نجات اور کوئی عمل نہیں۔

حاصل کلام: اس حدیث میں بھی ذکر الٰہی کی فضیلت بیان ہوئی ہے کہ ذکر الٰہی عذاب الٰہی سے نجات کا سب سے بڑا سبب ہے۔ جس طرح ذکر الٰہی اخروی عذاب سے بچاتا ہے اسی طرح دنیوی مصائب و آلام سے بھی محفوظ رکھتا ہے۔ کفار سے نبرد آزمائی کے موقع پر ثابت قدم رہنے کیلئے ذکر الٰہی کا حکم ہے کہ اللہ کا بہت ذکر کرو اور جیسا کہ اوپر بیان ہوا ہے کہ جو اللہ کا ذکر کرتا ہے اللہ اس کے ساتھ اس وقت تک رہتا ہے جب تک وہ بندہ یاد رکھتا ہے۔ جہاد میں جب بندہ اللہ کو یاد رکھتا ہے تو اس کی معیت اسے نصیب ہو جاتی ہے اور میدان کار زار میں بندۂ مومن کامیاب و کامران رہتا ہے۔

(١٣٣٤) وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «مَا جَلَسَ قَوْمٌ مَجْلِساً يَذْكُرُونَ اللَّهَ فِيهِ إِلاَّ حَفَّتْهُمُ الْمَلاَئِكَةُ، وَغَشِيَتْهُمُ الرَّحْمَةُ، وَذَكَرَهُمُ اللَّهُ فِيمَنْ عِنْدَهُ». أَخْرَجَهُ مُسْلِمٌ.

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "کوئی قوم کسی مجلس میں نہیں بیٹھتی کہ وہ اس میں اللہ کا ذکر کرتی ہو مگر فرشتے ان کو گھیر لیتے ہیں اور ان کو اللہ کی رحمت ڈھانک لیتی ہے اور اللہ تعالیٰ ان کا ذکر اپنے ہاں فرشتوں میں فرماتا ہے۔" (مسلم)

لغوی تشریح: ﴿حفتهم﴾ وہ فرشتے ان کو گھیر لیتے ہیں جو راستوں میں گھومتے پھرتے ہیں اور اہل ذکر کو تلاش کرتے پھرتے ہیں۔ ﴿غشيتهم﴾ ان کو ڈھانپ لیتی ہے۔ ان کو چھپا لیتی ہے۔

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ اہل ذکر کی مجلسیں اور اجتماعات بڑی شان رکھتے ہیں۔ حدیث میں مذکور ہے کہ ذکر الٰہی تمام اعمال سے بہتر ہے' بعض مشائخ نے کہا ہے کہ زبان کا ذکر تسبیح و تحمید' تلاوت قرآن مجید وغیرہ ہے۔ آنکھوں کا ذکر اللہ کے خوف سے اشکبار ہونا' کانوں کا ذکر کلام الٰہی اور خیر خواہی کا کلمہ پوری توجہ سے سننا' ہاتھوں کا ذکر راہ خدا میں ہاتھوں سے خیرات کرنا' جسم و بدن کا ذکر اس کی حرکات و سکنات کا ہمیشہ اللہ کیلئے ہونا' دل کا ذکر یہ کہ صرف اللہ کا خوف اور امید و رجاء رکھنا اور روح کا ذکر ہے کہ اپنا سب کچھ اللہ کے حوالہ کرنا اور قضاء الٰہی پر رضامند رہنا۔ اس طرح گویا انسان مجسم ذکر الٰہی بن کر رہ جاتا ہے اور یہی دراصل مطلوب و مقصود ہے۔

(١٣٣٥) وَعَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «مَا قَعَدَ قَوْمٌ مَقْعَداً لَمْ يَذْكُرُوا اللَّهَ فِيهِ، وَلَمْ يُصَلُّوا عَلَى النَّبِيِّ ﷺ إِلاَّ كَانَ عَلَيْهِمْ حَسْرَةً يَوْمَ القِيَامَةِ». أَخْرَجَهُ التِّرْمِذِيُّ، وَقَالَ: حَسَنٌ.

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ ہی سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "نہیں بیٹھتی کوئی قوم کسی مجلس میں کہ انہوں نے اس مجلس میں اللہ کا ذکر کیا اور نہ نبی ﷺ پر درود بھیجا مگر وہ مجلس ان کیلئے قیامت کے روز باعث حسرت و ندامت ہوگی۔" (اسے ترمذی نے نکالا ہے اور اسے حسن قرار دیا ہے)

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ ہر مجلس میں اللہ کا ذکر ضرور ہونا چاہئے اور نبی ﷺ پر درود ضرور بھیجنا چاہئے مگر درود و سلام کا جو رواج ہمارے دور میں شروع ہوا ہے' اس کا وجود عہد رسالت اور دور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں نظر نہیں آتا۔ یہ لوگوں کی اپنی ایجاد ہے اگر تو وہ اسے مسنون سمجھ کر باعث اجر و ثواب سمجھتے ہیں تو یہ بدعت ہے۔ اجتماعی ذکر میں درس و تدریس اور تعلیم و تعلم سب سے بہتر طریقہ ہے۔ اکٹھے ایک جگہ بیٹھ کر اپنے طور پر ذکر الٰہی اور درود پڑھنے میں بھی کوئی حرج نہیں۔

(١٣٣٦) وَعَنْ أَبِي أَيُّوبَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «مَنْ قَالَ: لاَ إِلَهَ إِلاَّ اللَّهُ، وَحْدَهُ، لاَ شَرِيكَ لَهُ، لَهُ المُلْكُ، وَلَهُ الحَمْدُ، بِيَدِهِ الخَيْرُ، يُحْيِي وَيُمِيتُ، وَهُوَ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ، عَشْرَ مَرَّاتٍ، كَانَ كَمَنْ أَعْتَقَ أَرْبَعَةَ أَنْفُسٍ مِنْ وَلَدِ إِسْمَاعِيلَ». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت ابوایوب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "جو کوئی دس مرتبہ ان کلمات کو کہے کہ "اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی معبود نہیں وہ ایک ہے اس کا کوئی شریک نہیں' بادشاہت اسی کی ہے' سب تعریف اسی کے لئے ہے' سب بھلائی اسی کے ہاتھ میں ہے' وہی زندہ کرتا ہے' وہی مارتا ہے' وہ ہر چیز پر قادر ہے۔" تو وہ اس شخص کی مانند ہوگیا جس نے اولاد اسماعیل سے چار بہترین و نفیس ترین غلاموں کو آزاد کیا۔ (بخاری و مسلم)

لغوی تشریح: ﴿ من ولد اسماعیل ﴾ یعنی حضرت اسماعیل علیہ السلام کی اولاد اور نسل میں سے اور ولد کی واؤ پر ضمہ ہے اور لام ساکن ہے اور دونوں پر فتحہ بھی جائز ہے اور ولد کا لفظ واحد' تثنیہ اور جمع سب پر یکساں بولا جاتا ہے اور یہ حقیقت معلوم ہے کہ اولاد اسماعیل علیہ السلام میں سے کسی کو نعمت آزادی سے سرفراز کرنا بہت فضیلت رکھتا ہے بہ نسبت دوسرے کسی کے آزاد کرنے سے۔

(١٣٣٧) وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «مَنْ قَالَ: سُبْحَانَ اللَّهِ

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "جس کسی نے سبحان اللہ وبحمدہ (پاک ہے اللہ اپنی تعریفوں کے ساتھ) سو

وَبِحَمْدِهِ، مِائَةَ مَرَّةٍ، حُطَّتْ عَنْهُ خَطَايَاهُ، وَإِنْ كَانَتْ مِثْلَ زَبَدِ الْبَحْرِ». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

مرتبہ کہا اس کی خطائیں محو کر دی جاتی ہیں۔ خواہ وہ سمندر کی جھاگ کے مساوی ہی کیوں نہ ہوں۔" (بخاری و مسلم)

لغوی تشریح: ﴿ حطت ﴾ صیغہ مجہول۔ یعنی محو کر دی جائیں گی۔ عفو و درگزر اور بخشش کے ذریعہ زائل کر دی جائیں گی۔ ﴿ وان كانت مثل زبد البحر ﴾ اگرچہ وہ سمندر کی جھاگ کے برابر ہوں۔ یہ کثرت گناہ سے کنایہ ہے اور "زبد" زا اور باء دونوں پر فتحہ۔ پانی کے اوپر آنے والا مادہ جسے جھاگ کہتے ہیں اور یہاں خطایا سے صغیرہ گناہ مراد ہیں۔ کبیرہ گناہ مراد نہیں' وہ تو توبہ کے بغیر معاف نہیں ہوتے۔

(۱۳۳۸) وَعَنْ جُوَيْرِيَةَ بِنْتِ الْحَارِثِ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهَا قَالَتْ: قَالَ لِي رَسُولُ اللهِ ﷺ: «لَقَدْ قُلْتُ بَعْدَكِ أَرْبَعَ كَلِمَاتٍ لَوْ وُزِنَتْ بِمَا قُلْتِ مُنْذُ الْيَوْمِ لَوَزَنَتْهُنَّ: سُبْحَانَ اللهِ وَبِحَمْدِهِ، عَدَدَ خَلْقِهِ، وَرِضَاء نَفْسِهِ، وَزِنَةَ عَرْشِهِ، وَمِدَادَ كَلِمَاتِهِ». أَخْرَجَهُ مُسْلِمٌ.

حضرت جویریہ بنت حارث رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے مجھ سے فرمایا: "میں نے تیرے بعد چار کلمے ایسے ادا کئے ہیں کہ اگر ان کلمات کا تیرے کلمات سے موازنہ کیا جائے' جو تو نے شروع وقت سے لے کر اب تک پڑھے ہیں' تو یہ کلمات وزن میں بڑھ جائیں گے۔" وہ کلمات یہ ہیں۔ "اللہ پاک ہے اپنی حمد کے ساتھ اپنی مخلوق کی تعداد کے برابر۔ اس کے نفس کی رضا اور اس کے عرش کے وزن۔ (رواہ مسلم) اس کے کلمات کی روشنائی کے برابر۔"

لغوی تشریح: ﴿ ما لقد قلت بعدك ﴾ بعدك کے کاف کے نیچے کسرہ ہے کیونکہ اس سے مراد حضرت جویریہ رضی اللہ عنہا ہیں اور وہ مؤنث ہیں۔ بعدك سے مراد ہے کہ تمہارے پاس سے جانے کے بعد۔ اس کی تفصیل یوں ہے کہ نبی ﷺ ان کے پاس سے نکل کر باہر تشریف لے گئے تھے۔ حضرت جویریہ رضی اللہ عنہا اپنی نماز پڑھنے کی جگہ بیٹھی ذکر الٰہی میں مصروف رہیں۔ آپؐ تقریباً نصف النہار کے قریب واپس تشریف لائے تو وہ اپنی جگہ بیٹھی ذکر میں مصروف تھیں۔ آپؐ نے فرمایا کہ "تم ابھی تک اسی حالت میں بیٹھی پڑھ رہی ہو؟ انہوں نے عرض کیا جی ہاں! تو نبی ﷺ نے اس وقت یہ ارشاد فرمایا "لقد قلت بعدك الخ" ﴿ لووزنت ﴾ صیغہ غائب مجہول ﴿ لوزنتهن ﴾ یعنی یہ کلمات تمہارے کلمات پر ترجیح پا جائیں گے۔ یعنی وزن میں بڑھ جائیں گے۔ ﴿ زنة عرشه ﴾ زنہ کا اصل' وزن ہے جیسے عدة صلة اور هبة ہے۔ ان کا اصل وعد' وصل اور وهب ہے اور اس حدیث میں دلیل ہے کہ جب کلمات عظیم ہوں گے تو ان کا اجر و ثواب بھی زیادہ ہوگا۔

راوی حدیث: ﴿ جویریہ بنت حارث رضی اللہ عنہا ﴾ امہات المومنین میں سے ایک تھیں۔ غزوۂ مریسیع میں اسیر ہوئیں۔ ثابت بن قیس بن شماس کے حصہ میں آئیں۔ انہوں نے ان سے مکاتبت کر لی۔ مکاتبت کی رقم رسول اللہ ﷺ نے ادا فرما کر ان کو اپنی زوجیت میں لے لیا۔ اس پر لوگوں نے ان کے تمام قیدیوں کو رہا کر دیا کہ یہ اب رسول اللہ ﷺ کی سسرالی رشتہ دار بن گئی ہیں۔ یہ خاتون ان کے قبیلے اور قوم کیلئے سب سے زیادہ باعث برکت ثابت ہوئیں۔ ۵٦ھ میں وفات پائی۔

(۱۳۳۹) وَعَنْ أَبِيْ سَعِيْدِ الْخُدْرِيِّ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «الْبَاقِيَاتُ الصَّالِحَاتُ: لاَ إِلَهَ إِلاَّ اللّٰهُ، وَسُبْحَانَ اللهِ، وَاللّٰهُ أَكْبَرُ، وَالحَمْدُلِلّٰهِ، وَلاَ حَوْلَ وَلاَ قُوَّةَ إِلاَّ بِاللهِ». أَخرَجَهُ النَّسَائِيُّ، وَصَحَّحَهُ ابْنُ حِبَّانَ وَالحَاكِمُ.

حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا (آنے والے الفاظ) باقیات صالحات ہیں یعنی "اللہ کے سوا کوئی الٰہ نہیں، اللہ پاک ہے، بلند شان والا ہے اور وہی سب سے بڑا ہے اور ہر خوبی اللہ کیلئے ہے اور برائی سے پھرنے اور نیکی کی قوت اللہ کی مدد کے بغیر ممکن نہیں۔" (اسے نسائی نے نکالا ہے اور ابن حبان اور حاکم نے اسے صحیح قرار دیا ہے)

لغوی تشریح: ﴿ الباقیات الصالحات ﴾ یعنی باقیات صالحات میں سے ہیں اور ان اعمال سے مراد ایسے اعمال ہیں کہ جن کا اجر و ثواب عامل کیلئے ہمیشہ ہمیش باقی رہتا ہے۔ ہر وہ کام جس کا تعلق اللہ کی اطاعت اور اعمال خیر سے ہو وہ باقیات صالحات میں سے ہیں۔ اس حدیث میں ان کلمات کو بالخصوص ذکر کیا ہے کیونکہ یہ ایمان باللہ کا نچوڑ اور خلاصہ ہیں اور ایمان اللہ تمام بھلائیوں اور اچھائیوں کا منبع و مرکز ہے۔ ایمان باللہ کے بغیر کوئی بھلائی و اچھائی شمار نہیں ہے۔ پس یہ کلمات گویا باقیات صالحات کی جڑ ہیں۔ ﴿ لاحول ولا قوۃ الا باللہ ﴾ علامہ نووی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اہل لغت کا قول ہے کہ حول سے مراد حرکت اور حیلہ ہے یعنی اللہ کی مشیت کے بغیر نہ کوئی حرکت کر سکتا ہے اور نہ حیلہ سازی کر سکتا ہے اور یہ بھی قول ہے کہ لاحول کا معنی ہے کہ شر کو دفع کرنے کی قوت اور خیر کو حاصل کرنے کی طاقت بھی اللہ کے سوا کسی اور کو نہیں ہے اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اللہ کی نافرمانی سے پھرنے کی طاقت اللہ کے تحفظ اور حفاظت کے بغیر ناممکن ہے اور اللہ کی اطاعت پر قوت بھی اس کی اعانت کے بغیر نہیں۔ یہ قول عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے منقول ہے اور یہ سارے اقوال قریب المعنی ہیں۔

(۱۳٤۰) وَعَنْ سَمُرَةَ بْنِ جُنْدُبٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «أَحَبُّ الكَلاَمِ إِلَى اللهِ أَرْبَعٌ، لاَ يَضُرُّكَ بِأَيِّهِنَّ بَدَأْتَ:

حضرت سمرہ بن جندب رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "اللہ کے نزدیک سب سے محبوب و پسندیدہ کلام یہ چار الفاظ ہیں۔ ان میں سے خواہ کسی سے ابتدا کرے تجھے کوئی ضرر نہیں پہنچے گا۔

سُبْحَانَ اللهِ، وَالحَمْدُ للهِ، وَلاَ إِلَهَ إِلاَّ اللَّهُ، وَاللَّهُ أَكْبَرُ». أَخرَجَهُ مُسْلِمٌ.

(وہ یہ ہیں) "اللہ پاک ہے' بلند و بالا شان کا مالک ہے۔ سب تعریفیں اللہ کیلئے ہیں۔ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں ہے اور اللہ سب سے بڑا ہے۔" (مسلم)

(۱۳٤۱) وَعَنْ أَبِيْ مُوْسَى الأَشْعَرِيِّ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ لِيْ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «يَا عَبْدَ اللهِ بْنَ قَيْسٍ! أَلاَ أَدُلُّكَ عَلَى كَنْزٍ مِنْ كُنُوزِ الجَنَّةِ؟ لاَ حَوْلَ وَلاَ قُوَّةَ إِلاَّ بِاللهِ». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ. زَادَ النَّسَائِيُّ: «وَلاَ مَلْجَأَ مِنَ اللهِ إِلاَّ إِلَيْهِ».

حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے مجھے مخاطب ہو کر فرمایا "اے عبداللہ بن قیس! کیا میں تجھے جنت کے خزانوں میں سے ایک خزانہ نہ بتاؤں؟ جو یہ ہے کہ برائی سے منہ موڑنا اور نیکی پر زور سوائے اللہ کی مدد کے (ممکن) نہیں ہے۔ (بخاری و مسلم) اور نسائی میں اتنا اضافہ ہے کہ "اللہ کے سوا کہیں پناہ نہیں۔"

لغوی تشریح: ﴿ الملجاء ﴾ پناہ گاہ' جائے تحفظ۔ امام نووی رحمہ اللہ نے کہا ہے اس کلمہ کا جنت کا خزانہ ہونا اس وجہ سے ہے کہ اس کلمہ میں اپنے آپ کو اللہ کے سپرد کرنا ہے اور اس کیلئے سر تسلیم خم کرنے کا اعتراف ہے اور اس کا اعتراف ہے کہ اس کے سوا اور کوئی صانع نہیں ہے۔ اس کے ارادے کو کوئی رد کرنے والا نہیں ہے اور اس معاملہ میں بندے کا کوئی اختیار نہیں اور یہاں کنز کا معنی ہے کہ جنت میں اس کا ثواب ذخیرہ ہوگا اور وہ بہترین و نفیس ہوگا ایسے ہی جیسے سارے اموال چھپا کر رکھا ہوا مال زیادہ نفیس اور قیمتی ہوتا ہے۔

حاصل کلام: اس حدیث میں بھی لاحول ولا قوۃ الا باللہ کی فضیلت کا بیان ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ جتنی چیز نفیس اور قیمتی ہوتی ہے اتنی ہی اس کی حفاظت اور دیکھ بھال اہتمام سے کی جاتی ہے۔ اسے چھپا کر رکھا جاتا ہے اور یہ کلمات تو جنت کا خزانہ ہیں۔ اس لئے ان کی بھی محافظت کرنی چاہئے اور کثرت سے انہیں پڑھنا چاہئے۔

(۱۳٤۲) وَعَنِ النُّعْمَانِ بْنِ بَشِيْرٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ: «إِنَّ الدُّعَاءَ هُوَ العِبَادَةُ». رَوَاهُ الأَرْبَعَةُ وَصَحَّحَهُ التِّرْمِذِيُّ.

حضرت نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا: بے شک دعا ہی عبادت ہے۔ (اسے چاروں نے روایت کیا ہے اور ترمذی نے اسے صحیح کہا ہے)

وَلَهُ مِنْ حَدِيْثِ أَنَسٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ، مَرْفُوعاً، بِلَفْظِ: «الدُّعَاءُ مُخُّ العِبَادَةِ».

اور ترمذی میں حضرت انس رضی اللہ عنہ کی روایت میں "الدعا مخ العبادۃ" کے الفاظ ہیں یعنی دعا مغز عبادت ہے۔

اور ترمذی میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے

وَلَهُ مِنْ حَدِيْثِ أَبِيْ هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُ، رَفَعَهُ: «لَيْسَ شَيْءٌ أَكْرَمَ عَلَى اللهِ مِنَ الدُّعَآءِ». وَصَحَّحَهُ ابْنُ حِبَّانَ وَالحَاكِمُ.

کہ اللہ کے نزدیک دعا سے زیادہ کوئی چیز معزز و مکرم نہیں۔ (ابن حبان اور حاکم دونوں نے اسے صحیح قرار دیا ہے)

لغوی تشریح: ﴿ ان الدعا هو العبادة ﴾ یعنی دعا ارکان عبادت میں سے سب سے عظیم اور اس کے اہم ترین اجزاء میں سے ہے۔ جیسا کہ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے کہ "حج تو عرفہ کا نام ہے" ﴿ مخ العبادة ﴾ عبادت کا مغز ہے' سے مراد ہے کہ دعا عبادت کا خلاصہ اور اصل ہے اور مخ کے میم پر ضمہ اور خا پر تشدید ہے اور مخ ہر چیز کے خالص حصہ کو کہتے ہیں۔ اسی لئے دماغ کو مغز کہتے ہیں۔

حاصل کلام: اس حدیث میں دعا کو عبادت قرار دیا گیا ہے اس کا مطلب ہوا کہ غیر اللہ سے جو دعائیں برائے قضاء حاجات و مشکلات کی جاتیں ہیں وہ گویا غیر اللہ کی عبادت کرتے ہیں' اسی لئے غیر اللہ سے دعا مانگنا شرک ہے۔ دعا کی تاثیر کا اندازہ تو اس سے لگا لیں کہ طبرانی میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ بعض اوقات اس طرح ہوتا ہے کہ آسمان سے کوئی مصیبت و بلا نازل ہو رہی ہوتی ہے اور آدمی اتفاق سے اس موقع پر رب کائنات کے حضور دست بدعا ہوتا ہے تو فضاء آسمانی میں دونوں کی مڈ بھیڑ ہو جاتی ہے اور ایک دوسرے سے لپٹ جاتی ہیں' اس طرح دعا گویا نازل ہونے والی مصیبت کو راستہ ہی میں روک لیتی ہے اور اس پر نازل نہیں ہونے دیتی۔

(١٣٤٣) وَعَنْ أَنَسٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُ، قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «الدُّعَاءُ بَيْنَ الأَذَانِ وَالإِقَامَةِ لاَ يُرَدّ». أَخْرَجَهُ النَّسَآئِيُّ وَغَيْرُهُ، وَصَحَّحَهُ ابْنُ حِبَّانَ وَغَيْرُهُ.

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "اذان اور اقامت کے درمیان دعا رد نہیں کی جاتی"۔ (اس کو نسائی وغیرہ نے روایت کیا ہے اور ابن حبان وغیرہ نے اسے صحیح قرار دیا ہے)

حاصل کلام: استجابت دعا کے مختلف اوقات ہیں۔ ان میں ایک وقت اذان و اقامت کے درمیان کا وقت ہے۔ اس لئے کہ نمازی کی اس وقت توجہ اللہ تعالیٰ کی طرف ہوتی ہے' وہ نماز کے انتظار میں ہوتا ہے۔ اس لئے اس وقت کو فضول باتوں میں ضائع نہیں کرنا چاہئے۔

(١٣٤٤) وَعَنْ سَلْمَانَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «إِنَّ رَبَّكُمْ كَرِيمٌ، يَسْتَحِي مِنْ عَبْدِهِ إِذَا رَفَعَ إِلَيْهِ يَدَيْهِ أَنْ يَرُدَّهُمَا

حضرت سلمان رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "تمہارا پروردگار بڑا شرم و حیا والا' سخی و کریم ہے۔ جب بندہ اس کے حضور اپنے ہاتھ پھیلاتا ہے تو اسے اس کے ہاتھوں کو خالی لوٹاتے

صِفْراً». أَخْرَجَهُ الأَرْبَعَةُ إِلاَّ النَّسَائِيَّ وَصَحَّحَهُ الحَاكِمُ.

شرم آتی ہے"۔ (نسائی کے سوا چاروں نے اسے روایت کیا ہے اور حاکم نے اسے صحیح قرار دیا ہے)

لغوی تشریح: ﴿حی﴾ فعیل کے وزن پر۔ حیاء سے ماخوذ ہے اور معنی ہے شرم و حیاء والا۔

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ ہاتھ اٹھا کر دعا کرنا جائز ہے اور یہ آداب دعا کا ایک ادب ہے۔ اللہ کی بارگاہ میں اٹھے ہوئے بندۂ محتاج کے ہاتھ خالی واپس نہیں کئے جاتے۔ دعائے استسقاء کے وقت رسول اللہ ﷺ اپنے دونوں ہاتھ عام معمول سے ہٹ کر زیادہ ہی بلند فرماتے تھے۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے کہ دعا کیلئے ہاتھ اٹھانے کی جو نفی ہے' اس سے مراد استسقاء کی طرح رفع الیدین میں مبالغہ کرنے کی نفی ہے۔

(١٣٤٥) وَعَنْ عُمَرَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: كَانَ رَسُولُ اللهِ ﷺ إِذَا مَدَّ يَدَيْهِ فِي الدُّعَآءِ لَمْ يَرُدُّهُمَا حَتَّى يَمْسَحَ بِهِمَا وَجْهَهُ. أَخْرَجَهُ التِّرْمِذِيُّ. وَلَهُ شَوَاهِدُ مِنْهَا حَدِيْثُ ابْنِ عَبَّاسٍ عِنْدَ أَبِيْ دَاوُدَ وَغَيْرِهِ، وَمَجْمُوعُهَا يَقْتَضِيْ أَنَّهُ حَدِيْثٌ حَسَنٌ.

حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ جب دعا کیلئے ہاتھ اٹھایا کرتے تو ان کو اس وقت تک واپس نہ لوٹاتے جب تک کہ چہرے پر پھیر نہ لیتے۔ (اسے ترمذی نے نکالا ہے اور اس کے کئی شواہد ہیں' ان میں ایک ابوداؤد وغیرہ کے ہاں ابن عباس رضی اللہ عنہما کی حدیث ہے اور ان کا مجموعہ تقاضا کرتا ہے کہ یہ حدیث حسن ہے)

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ دعا مانگنے کے بعد اپنے دونوں ہاتھوں کو اپنے چہرے پر ملنا یا پھیر لینا چاہئے۔ اس کی وجہ یہ بیان کی گئی ہے کہ دعا کے وقت اللہ کی جناب میں اٹھے ہوئے ہاتھ رحمت الٰہی سے لبریز ہو جاتے ہیں تو اس رحمت کو شکریہ کے ساتھ چہرے پر مل لیا جاتا ہے' اس لئے کہ چہرۂ اعضاء جسم میں سب سے اشرف عضو ہے۔ نیز چہرہ سارے جسم کا ترجمان نمائندہ ہے' جب نمائندے کو یہ شرف مل گیا تو باقی اعضاء ازخود اس میں شامل ہو جائیں گے۔ اس حدیث کی سند میں حماد بن عیسیٰ جہنی ضعیف راوی ہے۔ لیکن اس کے دوسرے شواہد موجود ہیں جن کی بناء پر حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے اس روایت کو حسن قرار دیا ہے۔

(١٣٤٦) وَعَنِ ابْنِ مَسْعُودٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «إِنَّ أَوْلَى النَّاسِ بِي يَوْمَ القِيَامَةِ أَكْثَرُهُمْ عَلَيَّ صَلاَةً». أَخْرَجَهُ

حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "قیامت کے روز سب سے زیادہ میرے قریب وہ لوگ ہوں گے جو مجھ پر زیادہ درود پڑھنے والے ہوں گے۔" (ترمذی۔ ابن حبان نے اسے

التِّرْمِذِيُّ، وَصَحَّحَهُ ابْنُ حِبَّانَ. صحیح کہا ہے)

لغوی تشریح: ﴿ اولی الناس ﴾ یعنی میرے سب سے زیادہ قریب اور میری شفاعت کے سب سے زیادہ مستحق۔

حاصل کلام: قیامت کے روز رسول اللہ ﷺ کی مصاحبت اور قرب کا ذریعہ آپ ؐ پر باکثرت درود شریف پڑھنا ہے۔ اس حدیث سے امام ابن حبان رحمہ اللہ نے استدلال کیا ہے کہ اس میں حضرات محدثین رحمہم اللہ کی عظمت شان واضح ہوتی ہے کہ جو بولتے، لکھتے دن رات رسول اللہ ﷺ پر درود شریف پڑھتے ہیں۔ درود کے مختلف الفاظ احادیث میں منقول ہیں۔ سب سے افضل درود ابراهیمی ہے جو نماز میں پڑھا جاتا ہے۔ اس کی مزید تفصیل جلاء الافہام اور القوی البدیع میں موجود ہے۔

(١٣٤٧) وَعَنْ شَدَّادِ بْنِ أَوْسٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «سَيِّدُ الاسْتِغْفَارِ أَنْ يَقُولَ العَبْدُ: اللَّهُمَّ! أَنْتَ رَبِّي، لاَ إِلَهَ إِلاَّ أَنْتَ، خَلَقْتَنِي، وَأَنَا عَبْدُكَ، وَأَنَا عَلَى عَهْدِكَ وَوَعْدِكَ مَا اسْتَطَعْتُ، أَعُوذُ بِكَ مِنْ شَرِّ مَا صَنَعْتُ، أَبُوءُ لَكَ بِنِعْمَتِكَ عَلَيَّ، وَأَبُوءُ لَكَ بِذَنْبِي، فَاغْفِرْ لِي، فَإِنَّهُ لاَ يَغْفِرُ الذُّنُوبَ إِلاَّ أَنْتَ». أَخْرَجَهُ البُخَارِيُّ.

حضرت شداد بن اوس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "سید الاستغفار یہ ہے کہ بندہ یوں کہے "اے اللہ! تو میرا مالک و مربی ہے۔ تیرے سوا اور کوئی الٰہ نہیں، تو نے مجھے پیدا فرمایا اور میں تیرا بندہ ہوں اور اپنی بساط بھر تیرے عہد اور وعدے پر قائم ہوں۔ جس برائی کا میں ارتکاب کر چکا ہوں اس سے تیری پناہ پکڑتا ہوں۔ تیرے جو مجھ پر احسان ہیں ان کا میں اعتراف کرتا ہوں اور تیرے روبرو اپنے گناہوں کا اقرار کرتا ہوں۔ پس مجھے معاف فرما دے کہ تیرے سوا گناہوں کو معاف کرنے والا اور کوئی بھی نہیں ہے۔" (بخاری)

لغوی تشریح: ﴿ انا علی عھدک ﴾ عہد سے مراد وہ میثاق ہے جو اللہ تعالیٰ نے ازل میں ہر انسان سے لیا تھا یا پھر وہ عہد مراد ہے جو ہر مومن کے ایمان لانے کے ساتھ ہی لازم ہو جاتا ہے اور ایمان اللہ تعالیٰ کی اطاعت کو اس کے ساتھ خالص کرنے کے عہد کا نام ہے۔ ﴿ ووعدک ﴾ یہ عہد کی تاکید ہے یا پھر اس سے مراد جزاء کا وعدہ ہے جو اللہ تعالیٰ نے کیا ہے۔ یعنی قیامت کے روز کئے جانے والے وعدے پر یقین رکھنے والا۔ ﴿ ابوء لک ﴾ میں تیرے حضور اپنے گناہوں کا اعتراف کرتا ہوں۔ اسی طرح تمام حدیث کے متعلق ارشاد نبوی ہے کہ جس کسی نے اس دعا کو دل میں یقین رکھتے ہوئے پڑھا اور شام سے پہلے وفات پا گیا تو وہ اہل جنت میں سے ہے اور جس کسی نے رات کو اس پر یقین رکھتے ہوئے پڑھا اور وہ صبح سے پہلے فوت ہو گیا تو وہ بھی اہل جنت میں سے ہے۔

(۱۳۴۸) وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُمَا قَالَ: لَمْ يَكُنْ رَسُولُ اللهِ ﷺ يَدَعُ هٰؤُلَاءِ الكَلِمَاتِ، حِيْنَ يُمْسِيْ وَحِيْنَ يُصْبِحُ: «اللّٰهُمَّ! إِنِّيْ أَسْأَلُكَ العَافِيَةَ فِي دِيْنِيْ وَدُنْيَايَ وَأَهْلِيْ وَمَالِيْ، اللّٰهُمَّ اسْتُرْ عَوْرَاتِيْ، وَآمِنْ رَوْعَاتِيْ، وَاحْفَظْنِيْ مِنْ بَيْنِ يَدَيَّ، وَمِنْ خَلْفِيْ، وَعَن يَمِيْنِيْ، وَعَنْ شِمَالِيْ، وَمِنْ فَوْقِيْ، وَأَعُوذُ بِعَظَمَتِكَ أَنْ أُغْتَالَ مِنْ تَحْتِيْ». أَخْرَجَهُ النَّسَائِيُّ وَابْنُ مَاجَهْ، وَصَحَّحَهُ الحَاكِمُ.

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ ان کلمات کو صبح و شام کبھی بھی نہیں چھوڑتے تھے' اے الٰہی! میں تجھ سے عافیت کا طلبگار ہوں۔ اپنے دین' اپنی دنیا' اپنے اہل و عیال اور اپنے مال میں۔ الٰہی! میرے عیوب پر پردہ پوشی فرما دے اور مجھے امن میں رکھ خوف و ڈر سے اور میرے آگے' پیچھے' دائیں' بائیں اور اوپر سے حفاظت فرما اور میں تیری عظمت کی پناہ لیتا ہوں کہ میں نیچے سے ہلاک کیا جاؤں" (اسے نسائی اور ابن ماجہ نے روایت کیا ہے اور حاکم نے صحیح کہا ہے)

لغوی تشریح: ﴿ یدع ﴾ چھوڑتے' ترک کرتے۔ ﴿ عوراتی ﴾ عیوب اور گناہ۔ یہ دنیا و آخرت میں بدنی اور دینی تمام گناہوں کو شامل ہے۔ ﴿ روعاتی ﴾ یہ روعۃ کی جمع ہے۔ جس کا معنی گھبراہٹ ہے ﴿ اغتال ﴾ صیغۂ مجہول۔ اغتیال سے متکلم کا صیغہ ہے۔ کسی چیز کو مخفی طور پر حاصل کرنا' پکڑنا' گرفت کرنا' نیچے سے گرفت کرنے سے مراد ہے زمین میں قارون کی طرح دھنسا دینا یا فرعون کی طرح پانی میں غرق کر دینا۔

حاصل کلام: اس حدیث میں چھ اطراف سے اللہ کی پناہ طلب کی گئی ہے کیونکہ انسان اوپر' نیچے' دائیں' بائیں چاروں اطراف سے اپنے دشمنوں میں گھرا ہوا ہے' یہ دشمن اس کے انسانوں میں سے بھی ہیں اور جن و شیاطین میں سے بھی اور بالخصوص زمین میں دھنس جانے یا ڈوب جانے سے پناہ طلب کی ہے نیز اس میں دین کی سلامتی' گناہوں سے بچنا' دنیا کی سلامتی' اہل و عیال کی سلامتی' مال و دولت کی سلامتی نیز آفات و مصائب ظاہری اور باطنی سے محفوظ رہنے اور بیماریوں اور تکالیف سے بچنے کی دعا ہے کہ وہی قادر مطلق ہے' اس کی جب تک کرم نوازی نہ ہو انسان نہ اپنے دشمنوں سے محفوظ رہ سکتا ہے اور نہ ہی گناہوں سے بچ سکتا ہے۔

(۱۳۴۹) وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُمَا قَالَ: كَانَ رَسُولُ اللهِ ﷺ يَقُولُ: «اللّٰهُمَّ إِنِّي أَعُوذُ بِكَ مِنْ زَوَالِ نِعْمَتِكَ، وَتَحَوُّلِ

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ فرمایا کرتے تھے "اے اللہ! میں تیری نعمت کے زوال سے پناہ طلب کرتا ہوں۔ تیری عطا کردہ عافیت کے چلے جانے اور عذاب کے اچانک نازل ہونے اور

عَافِيَتِكَ، وَفُجَاءَةِ نِقْمَتِكَ، وَجَمِيعِ سَخَطِكَ». أَخْرَجَهُ مُسْلِمٌ.

ہر قسم کی ناراضگی و غصہ سے پناہ طلب کرتا ہوں" (مسلم)

لغوی تشریح: ﴿التحول﴾ منتقل ہونا اور ﴿فجاءة﴾ فا پر ضمہ الف ممدودہ کے ساتھ رحمت کے وزن پر آتا ہے۔ اس کا معنی اچانک ہے اور ﴿نقمة﴾ کے نون پر فتحہ اور قاف ساکن اور ایک قرأت کے مطابق قاف کے نیچے کسرہ اور نون کے نیچے بھی کسرہ اور قاف ساکن۔ انتقام سے اسم ہے اور یہ مکافات عقوبت کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔

حاصل کلام: اللہ کی عطا کردہ نازل شدہ نعمتیں عموماً اپنے گناہوں کی شامت کی وجہ سے زائل ہو جاتی ہیں' اس لئے زوال نعمت سے پناہ دراصل برے اعمال سے پناہ مانگنا ہے۔

(١٣٥٠) وَعَنْ عَبْدِ اللهِ بْنِ عَمْرٍو رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُمَا قَالَ: كَانَ رَسُولُ اللهِ ﷺ يَقُولُ: «اللَّهُمَّ! إِنِّي أَعُوذُ بِكَ مِنْ غَلَبَةِ الدَّيْنِ، وَغَلَبَةِ الْعَدُوِّ، وَشَمَاتَةِ الأَعْدَاءِ». رَوَاهُ النَّسَآئِيُّ، وَصَحَّحَهُ الحَاكِمُ.

حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ فرمایا کرتے تھے "الٰہی! میں تجھ سے قرض کے غلبہ' دشمن کے غالب آنے اور اعداء کے خوش ہونے سے تیری پناہ مانگتا ہوں"۔ (نسائی نے اسے روایت کیا ہے اور حاکم نے اسے صحیح کہا ہے)

لغوی تشریح: ﴿الدين﴾ دال پر فتحہ اس کے ہیں۔ قرض' ادھار۔ ہر ایسی چیز از قسم مال جو تجھ پر دوسرے کی واجب الادا ہو اور ﴿شماتت﴾ کے شین پر فتحہ۔ جس کے معنی اس خوشی اور مسرت کے ہیں جو مصیبت کے وقت دشمن کو حاصل ہوتی ہے۔

(١٣٥١) وَعَنْ بُرَيْدَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: سَمِعَ النَّبِيُّ ﷺ رَجُلاً يَقُولُ: اللَّهُمَّ! إِنِّي أَسْأَلُكَ بِأَنِّي أَشْهَدُ أَنَّكَ أَنْتَ اللَّهُ، لاَ إِلٰهَ إِلاَّ أَنْتَ، الأَحَدُ الصَّمَدُ، الَّذِيْ لَمْ يَلِدْ وَلَمْ يُوْلَدْ، وَلَمْ يَكُنْ لَّهُ كُفُؤاً أَحَدٌ. فَقَالَ: «لَقَدْ سَأَلَ اللَّهَ بِاسْمِهِ الَّذِي إِذَا سُئِلَ بِهِ أَعْطَى، وَإِذَا دُعِيَ بِهِ أَجَابَ». أَخْرَجَهُ الأَرْبَعَةُ وَصَحَّحَهُ ابْنُ حِبَّانَ.

حضرت بریدہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے ایک آدمی کو یہ کلمات کہتے ہوئے سنا' الٰہی! میں آپ سے سوال کرتا ہوں اس لئے کہ میں گواہی دیتا ہوں کہ تیرے سوا کوئی الٰہ نہیں ہے اور عبادت کے لائق تیرے سوا کوئی نہیں۔ تو تنہا ہے اور بے نیاز ہے جس سے نہ کوئی پیدا ہوا نہ وہ کسی سے پیدا ہوا اور نہ کوئی اس کا ہمسر و ساجھی ہے"۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "اس شخص نے اللہ تعالیٰ کے اس اسم مبارک کے ذریعہ سے مانگا ہے کہ جب بھی اس کے ذریعہ طلب کیا جائے تو وہ عطا فرماتا ہے اور جب دعا

کی جاتی ہے تو اسے قبول فرماتا ہے۔" (اسے ابوداؤد' ترمذی' نسائی اور ابن ماجہ نے روایت کیا ہے اور ابن حبان نے اسے صحیح کہا ہے)

لغوی تشریح: ﴿الصمد﴾ الصمد اس سردار کو کہتے ہیں جس میں سرداری اور بزرگی کے تمام انواع موجود ہوں اور یہ بھی قول ہے کہ ایسا سردار جس کی طرف تمام ضروریات و حاجات میں رجوع کیا جاتا ہے اور مرغوب و پسندیدہ چیزوں کیلئے پسند کیا گیا ہو اور مصائب کے موقع پر جس سے مدد و اعانت مانگی جاتی ہو۔ پریشانیوں کے دور کرنے کیلئے اس کی طرف رجوع کیا جاتا ہو اور ایک قول یہ بھی ہے کہ الصمد وہ سردار جو اپنے افعال و صفات میں ہر پہلو سے کامل ہو اور ایک قول یہ بھی ہے کہ اپنی مخلوق کے فنا ہونے کے بعد خود باقی رہنے والا ہو۔ علاوہ ازیں اس کے اور بھی معانی ہیں۔ "والکفو" کاف پر ضمہ اور واؤ مخفف۔ اس کے معنی شبیہہ' مثیل اور نظیر ہے۔

حاصل کلام: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ دعا کے وقت ان کلمات کو پڑھنا چاہئے کیونکہ یہ قبولیت دعا کا ذریعہ ہیں۔

(١٣٥٢) وَعَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: كَانَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: إِذَا أَصْبَحَ، يَقُولُ: «اللّٰهُمَّ! بِكَ أَصْبَحْنَا، وَبِكَ أَمْسَيْنَا، وَبِكَ نَحْيَا، وَبِكَ نَمُوتُ، وَإِلَيْكَ النُّشُورُ». وَإِذَا أَمْسَى قَالَ مِثْلَ ذٰلِكَ، إِلاَّ أَنَّهُ قَالَ: «وَإِلَيْكَ الْمَصِيرُ». أَخْرَجَهُ الأَرْبَعَةُ.

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' جب صبح ہوتی رسول اللہ ﷺ کہتے "اے اللہ! تیرے ذریعہ سے ہم نے صبح کی اور تیرے ذریعہ سے شام کی اور تیرے ہی ذریعے ہماری زندگی ہے اور تیرے ہی ذریعہ ہماری موت ہے اور تیری ہی طرف دوبارہ اٹھنا ہے۔" جب شام ہوتی تب بھی یہ دعا پڑھتے اور "الیک النشور" (تیری طرف اٹھایا جانا ہے) کی بجائے "والیک المصیر" (تیری طرف واپس آنا ہے) کے الفاظ ادا فرماتے۔ (اسے چاروں (ابوداؤد' ترمذی' نسائی اور ابن ماجہ) نے روایت کیا ہے)

لغوی تشریح: ﴿اللهم بك اصبحنا﴾ اس میں "باء" محذوف کے متعلق ہے اور وہ اصبحنا کی خبر ہے۔ یہاں عبارت محذوف و مقدر ماننا ضروری ہے۔ عبارت اس طرح ہوگی ﴿اصبحنا متلبسين بتوفيقك﴾ یعنی ہم نے تیری حفاظت کے ساتھ چپکتے' لپٹتے ہوئے صبح کی یا یہ معنی ہوگا کہ ہم نے تیری نعمتوں سے اپنے آپ کو ڈھانپتے ہوئے صبح کی یا یہ معنی بھی ہو سکتا ہے کہ ہم نے تیرے ذکر میں مشغول رہتے ہوئے صبح کی یا یہ معنی بھی ہو سکتا ہے کہ ہم نے تیرے نام سے مدد طلب کرتے ہوئے صبح کی یا یہ

معنی کہ ہم نے تیری توفیق کے شامل حال ہوتے ہوئے یا پھر یہ معنی بھی ہو سکتا ہے کہ ہم نے تیری عطا کردہ قوت و ہمت کی بدولت حرکت کرتے ہوئے صبح کی۔ ﴿ وبک نحی وبک نموت ﴾ یعنی زندگی اور موت تو ہی دیتا ہے۔ تیرے زندگی عطا فرمانے سے زندہ ہیں اور موت وارد کرنے سے مرجائیں گے۔ ﴿ والیک النشور ﴾ یہ جملہ "نشر المیت نشورا" سے ماخوذ ہے۔ یعنی موت کے بعد دوبارہ زندہ ہو کر اٹھنا۔ ﴿ المصیر ﴾ مرنے کے بعد زندہ ہو کر اس کی جانب لوٹنا۔

حاصل کلام: اس حدیث سے ثابت ہوا کہ جو انعام بھی انسان کو حاصل ہے وہ سب اللہ کی جانب سے ہے اس میں کسی ولی، کسی فرشتے حتیٰ کہ کسی نبی کا بھی دخل نہیں ہے۔ یہ سب خود اسی کے محتاج ہیں۔ نیز یہ بھی معلوم ہوا کہ نیند اور موت کا بڑا گہرا تعلق ہے۔ انسان کا نیند سے بیدار ہونا ایک طرح کا موت کے بعد دوبارہ زندہ ہونا ہے۔ اسی وجہ سے شام کے ذکر میں مصیر کا لفظ ہے، اس لئے کہ وہ نیند کا وقت ہے اور صبح اٹھنے کا وقت ہے۔ اسی مناسبت سے اس وقت الیک النشور کے الفاظ لائے گئے ہیں۔

(١٣٥٣) وَعَنْ أَنَسٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: كَانَ أَكْثَرُ دُعَاءِ رَسُولِ اللهِ ﷺ: «رَبَّنَا آتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً، وَفِي الآخِرَةِ حَسَنَةً، وَقِنَا عَذَابَ النَّارِ». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ بکثرت یہ دعا مانگا کرتے تھے، اے ہمارے آقا و مولا! ہمیں دنیا میں بھی بھلائی عطا فرما اور آخرت میں بھی بھلائی سے سرخرو فرما اور ہمیں آگ کے عذاب سے بچا" (بخاری و مسلم)

لغوی تشریح: ﴿ قنا ﴾ قاف کے نیچے کسرہ۔ دعائیہ صیغہ وقی یقی سے۔ اس میں نون ضمیر متکلم کا ہے، معنی ہے ہمیں محفوظ رکھ، ہمیں بچا۔

حاصل کلام: اس حدیث میں جس دعا کا ذکر ہے اسے نبی ﷺ بکثرت پڑھا کرتے تھے۔ یہ دعا سب کی جامع ہے۔ قاضی عیاض نے کہا ہے کہ دنیا و آخرت کے جملہ مطالب اس میں آگئے ہیں۔ اس میں لفظ حسنہ میں دنیا کے اعتبار سے نیک عمل، نیک اولاد، وسعت رزق اور علم نافع، صحت و عافیت وغیرہ سب کچھ شامل ہے۔ صرف ایک لفظ حسنہ کہہ کر دنیا کی جملہ بھلائیں طلب کر لیں اور آخرت کیلئے یہی لفظ بول کر دخول جنت کی طلب کر لی اور وہاں کی گھبراہٹ سے امن و سلامتی اور حساب و کتاب کی آسانی طلب کر لی اور آگ کے عذاب یعنی جہنم کے عذاب سے پناہ کی درخواست کر دی۔ گویا اس مختصر مگر جامع دعا میں دنیا و آخرت کی ساری نعمتیں مانگ لیں اور دوزخ کے عذاب سے پناہ و نجات طلب کر لی۔

(١٣٥٤) وَعَنْ أَبِي مُوسَى الأَشْعَرِيِّ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: كَانَ النَّبِيُّ ﷺ يَدْعُو «اللَّهُمَّ اغْفِرْ لِي خَطِيئَتِي وَجَهْلِي وَإِسْرَافِي

حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ دعا فرمایا کرتے تھے "الٰہی! میری خطا معاف فرما دے۔ نیز میری نادانی و جہالت کے کاموں کو بخش دے۔ میرے کام میں مجھ سے جو زیادتیاں سرزد

فِي أَمْرِي، وَمَا أَنْتَ أَعْلَمُ بِهِ مِنّي، اللَّهُمَّ اغْفِرْ لِي جِدِّي وَهَزْلِي، وَخَطَئِي وَعَمْدِي، وَكُلُّ ذَلِكَ عِنْدِي، اللَّهُمَّ اغْفِرْ لِي مَا قَدَّمْتُ، وَمَا أَخَّرْتُ، وَمَا أَسْرَرْتُ، وَمَا أَعْلَنْتُ، وَمَا أَنْتَ أَعْلَمُ بِهِ مِنِّي، أَنْتَ المُقَدِّمُ، وَأَنْتَ المُؤَخِّرُ، وَأَنْتَ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

ہوئیں ان کو بھی اور جو کچھ میرے بارے میں تیرے علم میں ہے ان سب کو بھی معاف فرما دے۔ اے اللہ! مجھ سے ارادتاً یا غیرارادی طور پر جو کچھ صادر ہوا اس کی مغفرت فرما دے۔ خواہ وہ میری لغزش ہو یا ارادے سے ہو یہ سب میری ہی جانب سے ہوا ہے۔ اے اللہ! جو کچھ میں کر چکا ہوں یا جو آئندہ کروں گا اور جو میرا پوشیدہ ہے یا جو مجھ سے ظاہر ہوا ہے اور جو کچھ بھی میرے متعلق تیرے علم میں ہے وہ سب بخش دے۔ تو ہی پہلے ہے اور تو ہی بعد میں اور تو ہی ہر شے پر قدرت رکھنے والا ہے۔ (بخاری و مسلم)

لغوی تشریح: ﴿ جدی ﴾ یعنی جو میں نے سنجیدگی سے کئے ہیں۔ ﴿ وما اسررت ﴾ جو میں نے خفیہ طور پر کئے۔

حاصل کلام: اس قسم کی جتنی دعائیں نبی ﷺ سے ثابت ہیں۔ یہ آپؐ نے امتثال امر کیلئے مانگی ہیں کیونکہ آپؐ تو معصوم عن الخطاء تھے یا امت کو تعلیم دینے کی غرض سے مانگی ہیں۔ بعض روایات میں ہے کہ یہ دعا نبی ﷺ تشہد کے آخر میں پڑھتے اور بعض میں ہے کہ سلام پھیرنے کے بعد۔ عین ممکن ہے کہ دونوں طرح آپؐ نے یہ دعا پڑھی ہو کبھی سلام سے پہلے کبھی سلام کے بعد۔

(١٣٥٥) وَعَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: كَانَ رَسُولُ اللهِ ﷺ يَقُولُ: «اللَّهُمَّ! أَصْلِحْ لِي دِينِي الَّذِي هُوَ عِصْمَةُ أَمْرِي، وَأَصْلِحْ لِي دُنْيَايَ الَّتِي فِيهَا مَعَاشِي، وَأَصْلِحْ لِي آخِرَتِي الَّتِي إِلَيْهَا مَعَادِي، وَاجْعَلِ الحَيَاةَ زِيَادَةً لِي فِي كُلِّ خَيْرٍ، وَاجْعَلِ المَوْتَ رَاحَةً لِي مِنْ كُلِّ شَرٍّ». أَخْرَجَهُ مُسْلِمٌ.

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ فرمایا کرتے تھے ”اے اللہ! میرے لئے دین درست رکھنا جس میں میرے کام کا بچاؤ ہے۔ میرے لئے میری دنیا کو درست فرما جس میں میری زندگی ہے اور میرے لئے میری آخرت درست فرما جس کی طرف مجھے لوٹ کر جانا ہے۔ میری زندگی کو ہر عمل خیر کی زیادتی کا سبب بنا اور موت کو میرے لئے ہر برائی سے راحت بنا دینا“ (مسلم)

لغوی تشریح: ﴿ معادی ﴾ یعنی جس میں موت کے بعد میرا لوٹنا' میرا رجوع کرنا۔ ﴿ اجعل الحياة

زیادة لی ﴾ یعنی زیادتی کا سبب بنا۔

حاصل کلام: اس دعا میں بھی دین و دنیا اور آخرت کی بھلائی کی درخواست کی جا رہی ہے کہ ایک مومن صادق یہی سمجھتا ہے کہ اس دنیا کی بھلائی بھی خالق کائنات کے اختیار میں ہے اور آخرت کی بھلائی کا بھی وہی تنہا مالک ہے۔ اس سے کوئی یہ نتیجہ اخذ نہ کرلے کہ موت مانگنا درست ہے بلکہ اس حدیث میں تو موت کے بعد پیش آنے والے حالات سے سلامتی اور امن کی درخواست کی ہے۔ دنیا کی تکلیفیں اور مصائب تو موت کے ساتھ ہی اختتام پذیر ہو جاتی ہیں' اب آگے کے مصائب شروع ہوتے ہیں ان مصائب سے سلامتی اور امن کی دعا ہے۔

(١٣٥٦) وَعَنْ أَنَسٍ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ قَالَ: كَانَ رَسُولُ اللهِ ﷺ يَقُولُ: «**اللَّهُمَّ انْفَعْنِي بِمَا عَلَّمْتَنِي، وَعَلِّمْنِي مَا يَنْفَعُنِي، وَارْزُقْنِي عِلْماً يَنْفَعُنِي**». رَوَاهُ النَّسَائِيُّ وَالحَاكِمُ.

حضرت انس رضی اللہ عنہ **سے مروی ہے کہ رسول اللہ** ﷺ **یہ دعا فرمایا کرتے تھے "اے اللہ! جو علم تو نے مجھے عطا فرمایا ہے اسے میرے لئے نافع بنا دے اور مجھے ایسا علم عطا فرما جو میرے لئے نفع بخش ہو اور مجھے نفع والا علم دے"** (اسے نسائی اور حاکم نے روایت کیا ہے۔)

وَلِلتِّرْمِذِيِّ مِنْ حَدِيْثِ أَبِيْ هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ نَحْوُهُ، وَقَالَ فِي آخِرِهِ: «**وَزِدْنِيْ عِلْماً. اَلْحَمْدُ للهِ عَلىٰ كُلِّ حَالٍ، وَأَعُوذُ بِاللهِ مِنْ حَالِ أَهْلِ النَّارِ**». وَإِسْنَادُهُ حَسَنٌ.

اور ترمذی میں ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ **سے بھی اسی طرح مروی ہے۔ اس کے آخر میں اتنا اضافہ ہے" اور میرے علم میں اضافہ فرما۔ ہر حال میں اللہ کا شکر ہے اور میں اہل دوزخ کے حالات سے پناہ مانگتا ہوں۔"** (اس کی اسناد اچھی ہیں)

حاصل کلام: اس حدیث میں جو دعا منقول ہے اس میں ایسے علم کیلئے درخواست کی گئی ہے جو دنیا و آخرت دونوں میں منافع بخش اور سود مند ہو۔ جو علم آخرت تباہ کر دے اس کی دعا کرنا مومن کو زیب نہیں دیتا کیونکہ مومن کے نزدیک اخروی کامیابی و کامرانی بنیادی چیز ہے۔ نافع علم وہ علم ہے جس سے ایمانی قوت میں اضافہ ہو اور عمل کرنے کی رغبت پیدا ہو۔ دنیاوی علوم کی درخواست دنیاوی امور کی اصلاح اور بہتری کیلئے کرنا جائز ہے۔ اس سے انسان کے ایمان باللہ میں اضافہ ہوگا۔ ان علوم میں بھی اہل ایمان کو برتری حاصل ہونی چاہئے ورنہ دنیاوی اعتبار سے کفار کا تسلط اور غلبہ ہوگا۔ جیسا آج یہی صورت حال ہے کہ ٹیکنالوجی اور سائنسی علوم میں غیر مسلم بہت آگے نکل چکے ہیں اور وہی آج دنیا کی قیادت کے دعویدار بنے بیٹھے ہیں اسی زور پر جہاں چاہتے ہیں انقلاب اور تبدیلی لے آتے ہیں۔ اہل اسلام کو ان میدانوں میں بھی اپنی برتری اور فوقیت کا سکہ منوانا چاہئے۔

(١٣٥٧) وَعَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللَّهُ **حضرت عائشہ** رضی اللہ عنہا **سے روایت ہے کہ نبی** ﷺ **نے**

تَعَالَى عَنْهَا، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ عَلَّمَهَا هٰذَا الدُّعَآءَ: «اللَّهُمَّ! إِنِّي أَسْأَلُكَ مِنَ الخَيْرِ كُلِّهِ، عَاجِلِهِ وَآجِلِهِ، مَا عَلِمْتُ مِنْهُ وَمَا لَمْ أَعْلَمْ، وَأَعُوذُ بِكَ مِنَ الشَّرِّ كُلِّهِ عَاجِلِهِ وَآجِلِهِ، مَا عَلِمْتُ مِنْهُ وَمَا لَمْ أَعْلَمْ، اللَّهُمَّ! إِنِّي أَسْأَلُكَ مِنْ خَيْرِ مَا سَأَلَكَ عَبْدُكَ وَنَبِيُّكَ، وَأَعُوذُ بِكَ مِنْ شَرِّ مَا عَاذَ مِنْهُ عَبْدُكَ وَنَبِيُّكَ، اللَّهُمَّ! إِنِّي أَسْأَلُكَ الجَنَّةَ، وَمَا قَرَّبَ إِلَيْهَا مِنْ قَوْلٍ أَوْ عَمَلٍ، وَأَعُوذُ بِكَ مِنَ النَّارِ، وَمَا قَرَّبَ إِلَيْهَا مِنْ قَوْلٍ أَوْ عَمَلٍ، وَأَسْأَلُكَ أَنْ تَجْعَلَ كُلَّ قَضَآءٍ قَضَيْتَهُ لِيْ خَيْراً». أَخْرَجَهُ ابْنُ مَاجَهْ، وَصَحَّحَهُ ابْنُ حِبَّانَ وَالحَاكِمُ.

ان کو یہ دعا سکھائی ”الٰہی! میں تجھ سے ہر طرح کی بھلائی طلب کرتی ہوں۔ جلدی وصول ہونے والی ہو یا دیر سے ملنے والی۔ جس کو میں جانتی ہوں یا نہیں جانتی۔ اور ہر برائی سے میں تیری پناہ مانگتی ہوں‘ جلدی آنے والی ہے یا دیر سے‘ جس کا مجھ علم ہے یا وہ میرے علم میں نہیں ہے۔ اے اللہ! میں تجھ سے وہ خیر طلب کرتی ہوں جس کا تیرے بندے اور نبی نے سوال کیا تھا اور اس شر سے پناہ طلب کرتی ہوں جس سے تیرے بندے اور نبی نے پناہ مانگی تھی۔ اے اللہ! میں تجھ سے جنت کا اور ایسے عمل اور قول کا سوال کرتی ہوں جو جنت سے قریب کرنے والے ہیں اور تیری پناہ طلب کرتی ہوں جہنم سے اور ہر اس عمل اور قول سے جو اس جہنم کے قریب کر دے اور میں بات کا سوال کرتی ہوں کہ تو نے جو فیصلہ میرے حق میں کیا ہے اس کو میرے حق میں بہتر بنا دے۔“ (اسے ابن ماجہ نے نکالا ہے اور ابن حبان اور حاکم نے اسے صحیح کہا ہے)

لغوی تشریح: ﴿ عاجلة ﴾ جو چیز جلدی میں حاصل ہو جانے والی ہو۔ یہاں دنیا کی بھلائی مراد ہے۔ ﴿ آجلة ﴾ جو ذرا دیر و تاخیر سے ملنے والی ہو۔ اس سے مراد آخرت میں حاصل ہونے والی بھلائی ہے۔ ﴿ عاذ ﴾ پناہ طلب کی‘ امان طلب کی۔ ﴿ وما قرب اليها ﴾ تقریب سے ماخوذ ماضی کا صیغہ ہے۔ یعنی جو اس کے قریب کر دے۔

حاصل کلام: یہ بھی جامع ترین دعاؤں میں سے ایک دعا ہے۔ جس میں مختلف اشیاء کے طلب اور استعاذہ کے بعد بآلاخر عرض کی کہ میں ہر اس بھلائی کا خواستگار ہوں جس کی طلب رسول اللہ ﷺ نے کی ہے اور ہر اس برائی سے پناہ چاہتا ہوں جس سے رسول اللہ ﷺ نے پناہ چاہی ہے‘ جس میں دنیا و آخرت کی کوئی چیز باقی نہیں رہتی۔

(١٣٥٨) وَأَخْرَجَ الشَّيْخَانِ عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهُ

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ”دو کلمے ہیں جو رحمٰن کو بڑے پیارے ہیں۔

قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «كَلِمَتَانِ حَبِيْبَتَانِ إِلَى الرَّحْمٰنِ خَفِيْفَتَانِ عَلَى اللِّسَانِ ثَقِيْلَتَانِ فِي الْمِيْزَانِ: سُبْحَانَ اللهِ وَبِحَمْدِهِ سُبْحَانَ اللهِ الْعَظِيْمِ».

زبان پر ہلکے ہیں۔ ترازو میں بھاری ہیں۔ (وہ یہ ہیں) "اللہ پاک ہے' ساتھ اپنی تعریف کے۔ اللہ پاک ہے' عظمت والا۔" (بخاری و مسلم)

لغوی تشریح: ﴿ ثقیلتان ﴾ دونوں کلمے وزنی ہیں۔ ان کے وزنی ہونے کا سبب یہ ہے کہ ان دونوں کلموں میں سے ہر ایک باوجود اپنے حروف کے قلیل ہونے اور الفاظ کے خوشگوار ہونے کے توحید کے جملہ پہلوؤں پر محیط و حاوی ہیں۔ ﴿ سبحان الله ﴾ کا کلمہ اللہ کی ذات و صفات اور اعمال میں ہر عیب و نقص سے پاک ہونے کا تقاضا کرتا ہے اور کلمہ ﴿ وبحمده ﴾ اس کیلئے کمال کی تمام صفات کو لازم و واجب قرار دیتا ہے کیونکہ حمد و تعریف مطلق اور عام ہے۔ کسی مخصوص امر پر نہیں ہے اور مطلق حمد اسی کا حق ہے جس میں کمال کے تمام تر اوصاف پائے جاتے ہیں اور ﴿ العظیم ﴾ کا لفظ دوسرے کلمہ میں وہی فائدہ دے رہا ہے جو پہلے کلمہ میں "بحمده" دے رہا ہے کیونکہ عظمت بھی مطلق ہے۔ اس کی مستحق بھی وہی ذات ہے جس میں عظمت و کمال کے جملہ اوصاف پائے جائیں۔ پھر عظمت و کمال حقوق و عادات میں غیر کی شرکت کی نفی کرتے ہیں لہٰذا اللہ تعالیٰ کا ہر عیب و نقص سے پاک ہونا اور تمام صفات کمالیہ سے متصف ہونا اور اس کی توحید کا کامل اظہار ہے۔ توحید ہی اصل الاصول ہے اور ہر مطلوب کی انتہا ہے جس طرح جوہر بڑا قیمتی اور عظمت شان والا ہوتا ہے۔ حجم میں چھوٹا اور وزن میں زیادہ ہوتا ہے۔ اسی طرح یہ دونوں کلمے باوجود حروف کے قلیل ہونے کے ان کا وزن بھاری ہے۔

حاصل کلام: اس حدیث میں دو کلموں کا ہلکا و وزنی ہونا یہ معنی رکھتا ہے کہ زبان سے ان کا ادا کرنا سہل و آسان ہے۔ کلمے بڑی آسانی سے ہر ایک کی زبان پر رواں ہو جاتے ہیں کسی دقت کا سامنا نہیں کرنا پڑتا اور ان کے بھاری ہونے کا معنی یہ ہے کہ جس طرح نیکی کے مشکل اعمال وزن میں بھاری ہوں گے اسی طرح یہ آسانی سے پڑھے جانے والے کلمات بھی میزان اعمال میں بھاری اور ثقیل ہوں گے۔ اس حدیث سے ثابت ہوا کہ قیامت کے روز اعمال کا جسم ہوگا اور اعمال کو تولا اور وزن کیا جائے گا۔ اس حدیث سے اللہ عزوجل کی وسعت رحمت کا بھی پتہ چلتا ہے کہ وہ اپنے نیک و مخلص بندوں کے تھوڑے اعمال کے بدلہ میں اجر و ثواب زیادہ عطا فرمائے گا۔ یہ محض اس کا فضل و کرم اور مہربانی ہے۔ اس کی رحمت ہر چیز پر حاوی ہے۔

قَالَ مُصَنِّفُهُ - الشَّيْخُ الإِمَامُ العَالِمُ العَامِلُ العَلاَّمَةُ قَاضِي القُضَاةِ شَيْخُ الإِسْلاَمِ أَمْتَعَ اللَّهُ بِوُجُودِهِ الأَنَامَ - فَرَغَ مِنْهُ مُلَخِّصُهُ أَحْمَدُ بْنُ عَلِيِّ ابْنُ

بلوغ المرام کے مصنف' قاضی القضاۃ علامۃ الدھر شیخ الاسلام (اللہ ان کے علم سے خلق کثیر کو نفع حاصل کرنے کی توفیق عطا فرمائے) احمد بن علی بن محمد بن حجر رحمہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ وہ اس

مُحَمَّدِ بْنِ حَجَرٍ فِيْ حَادِيَ عَشَرَ
شَهْرِ رَبِيْعِ الأَوَّلِ سَنَةَ ثَمَانٍ
وَعِشْرِيْنَ وَثَمَانِمِائَةٍ، حَامِداً للهِ تَعَالىٰ
وَمُصَلِّياً عَلىٰ رَسُوْلِهِ ﷺ وَمُكَرِّماً
وَمُبَجِّلاً وَمُعَظِّماً.

کتاب کی تصنیف سے ۱۱ / ۳ / ۸۲۸ ھ کو اللہ
ذوالجلال کا شکر ادا کرتے ہوئے اور رسول اللہ
ﷺ پر درود و سلام پڑھ کر آپ ؐ کی تعظیم و تکریم
کرتے ہوئے فارغ ہوئے۔

اللہ تعالیٰ مؤلف، شارح اور ہم سب کو اپنی وسیع تر رحمت سے حصہ وافر عطا فرمائے۔ انبیاء کرام، شہداء، صحابہ کرام اور سلف صالحین کی رفاقت و معیت عطا فرمائے۔ آمین یا رب العالمین۔

وآخر دعوانا ان الحمدللہ رب العالمین

جرح و تعدیل یا تخریج احادیث میں مذکور ائمہ محدثین کے مختصر حالات زندگی

ائمہ سبعہ

(۱) امام احمد ابن حنبل رحمۃ اللہ علیہ: آپ ان چار ائمہ میں سے ایک ہیں، جو اطراف عالم میں پیشوا اور رہنما مانے جاتے ہیں۔ آپ کا نام ابو عبداللہ احمد بن محمد بن حنبل شیبانی ہے۔ ربیع الاول ۱۶۴ھ میں پیدا ہوئے اور بروز جمعہ بارہ ربیع الاول ۲۴۱ھ وفات پائی۔ آپ دین اسلام میں آزمائش اور ثابت قدمی کے اعتبار سے سب سے بڑے عالم ہیں۔ آپ کو دس لاکھ احادیث یاد تھیں۔ کہا جاتا ہے کہ آپ کی وفات کے روز بیس ہزار عیسائی، یہودی اور پارسی دائرۂ اسلام میں داخل ہوئے تھے۔

(۲) امام محمد بن اسماعیل بخاری رحمۃ اللہ علیہ: آپ حدیث میں محدثین کے امام تھے، آپ کا نام ابو عبداللہ محمد بن اسماعیل بن ابراھیم بن مغیرہ بن بردزبہ (باء پر فتح راء ساکن، دال پر کسرہ اور زاء پر کسرہ ہے) جعفی بخاری ہے۔ یاد رہے کہ جعفی کی نسبت ولاء اسلام کی ہے نہ کہ ولاء رق و غلامی کی، کیونکہ آپ کے جد امجد مغیرہ، یمان جعفی کے ہاتھوں مسلمان ہوئے تھے اور بخارا میں آنے پر ان کے طرف منسوب ہوئے۔ آپ شوال ۱۹۴ھ میں پیدا ہوئے اور ۲۵۶ھ عیدالفطر کی رات کو وفات پائی۔ آپ فن حدیث میں اللہ تعالیٰ کی ایک نشانی تھے اور آپ کی کتاب الجامع الصحیح، اللہ تعالیٰ کی کتاب قرآن مجید کے بعد صحیح ترین کتاب ہے، جو کسی تعارف کی محتاج نہیں۔

(۳) امام مسلم بن حجاج رحمۃ اللہ علیہ: آپ بڑے ائمہ محدثین میں سے ایک تھے، آپ کا نام مسلم بن حجاج قشیری نیسا پوری تھا۔ آپ ۲۰۴ھ کو پیدا ہوئے اور رجب ۲۷۱ھ میں وفات پائی۔ آپ کی کتاب الصحیح، صحیح بخاری کے بعد صحیح ترین کتاب ہے۔ آپ نے امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ اور دیگر کبار ائمۂ حدیث سے سماع کیا۔

(۴) امام ابو داؤد سلیمان بن اشعث رحمۃ اللہ علیہ: آپ کبار ائمہ محدثین میں سے ایک ہیں، آپ کا نام ابو

داؤد سلیمان بن اشعث بن اسحاق ازدی بحستانی (سین کے فتح اور کسرہ اور جیم کے کسرہ کے ساتھ) ہے۔ آپ سنن ابو داؤد کے مصنف ہیں' آپ ۲۰۲ھ میں پیدا ہوئے اور بروز جمعہ ۱۵ شوال ۲۷۶ھ میں اپنے خالق حقیقی سے جا ملے۔ آپ فن حدیث میں اس قدر نمایاں ہوئے کہ یہ کہا جانے لگا کہ امام ابو داؤد کے لیے حدیث اس طرح آسان اور نرم ہو گئی ہے جس طرح حضرت داؤد علیہ السلام کے لیے لوہا نرم ہو گیا تھا۔ آپ فرماتے ہیں "میں نے نبی ﷺ کی پانچ لاکھ احادیث لکھی ہیں' سنن میں موجود احادیث انہی پانچ لاکھ سے ہی میں نے منتخب کی ہیں۔"

(۵) امام ابو عیسیٰ محمد بن عیسیٰ ترمذی رحمۃ اللہ علیہ : ترمذی: تاء پر تینوں حرکات جب کہ میم پر ضمہ اور کسرہ دو حرکتیں ہیں' یہ دریائے جیحون (آمو دریا) کے مشرقی کنارہ پر واقع ایک قدیم شہر کی طرف نسبت ہے۔ آپ کا نام ابو عیسیٰ محمد بن عیسیٰ بن سورہ ترمذی ہے۔ آپ "جامع الترمذی" کے مصنف ہیں۔ آپ ۲۰۹ھ کو پیدا ہوئے اور ۱۳ رجب ۲۷۹ھ کو وفات پائی۔ آپ اپنی جامع کے بارے میں رقم طراز ہیں کہ "جس کے گھر میں یہ جامع موجود ہو' گویا اس کے گھر میں باتیں کرتا ہوا نبی موجود ہے۔" آپ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کے تیار کردہ اور فیض یافتہ شاگرد ہیں اور امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ اپنی وفات کے بعد خراسان میں کوئی ایسا جانشین نہیں چھوڑ کر گئے' جو علم و حفظ اور ورع و زہد میں امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ کا مثیل ہو۔ آپ اپنے استاد امام بخاری کی وفات پر روتے روتے نابینا ہو گئے اور برسوں نابینا رہنے کے بعد اپنے خالق حقیقی سے جا ملے۔

(۶) امام ابو عبدالرحمٰن احمد بن شعیب نسائی رحمۃ اللہ علیہ : نسائی : (نون کے فتح اور الف ممدودہ اور مقصورہ ساتھ) خراسان میں واقع نساء نامی شہر کی طرف نسبت ہے۔ آپ کا نام ابو عبدالرحمٰن احمد بن علی بن شعیب بن علی الحافظ ہے۔ آپ السنن المجتبیٰ کے مصنف ہیں۔ آپ ۲۱۵ھ کو پیدا ہوئے اور ۳۰۳ھ کو وفات پائی' آپ نے فن حدیث میں اس قدر نمایاں مقام حاصل کیا کہ حفظ و اتقان میں بے مثال گردانے جانے لگے۔ صحیح بخاری اور صحیح مسلم کے بعد دیگر تمام سنن کی بنسبت سب سے کم ضعیف احادیث آپ کی سنن میں ہیں۔ آپ نے مصر میں سکونت اختیار کرنے کے بعد دمشق کا رخ کیا اور وہاں کتاب "الخصائص فی فضل علی رضی اللہ عنہ" کی تصنیف کی' جس پر لوگوں نے آپ کو روندا اور مار پیٹ کر مسجد سے باہر پھینک دیا' پھر آپ کو مکہ مکرمہ پہنچایا گیا۔ جہاں حدیث کا یہ روشن چراغ زخموں اور ضربوں کی تاب نہ لا کر اپنے خالق حقیقی سے جا ملا۔

(۷) امام محمد بن یزید بن ماجہ رحمۃ اللہ علیہ : آپ بڑے ائمہ محدثین میں سے ایک ہیں۔ آپ کا نام ابو عبداللہ محمد بن یزید بن ماجہ قزوینی ہے۔ آپ سنن کے مصنف ہیں۔ آپ کی ۲۰۷ھ کو پیدائش اور رمضان ۲۷۳ یا ۲۷۵ھ کو وفات ہوئی۔ اور "ماجہ" جیم کی تخفیف کے ساتھ اور اس کے آخر میں ھاء ساکن ہے' تاء نہیں۔ آپ نے امام مالک کے ساتھیوں سے سماع کیا اور ایک بڑی تعداد میں مخلوق نے آپ سے

روایت کی۔ اور آپ کی سنن میں ضعیف بلکہ منکر احادیث کی ایک بڑی تعداد موجود ہے۔

ائمہ سبعہ کے علاوہ دیگر ائمۂ حدیث

* **اسحاق بن راھویہ** : آپ امام اور بہت بڑے حافظ حدیث ہیں۔ آپ کا نام ابو یعقوب اسحاق بن ابراھیم تمیمی حنظلی مروزی ہے۔ آپ نیساپور کے رہنے والے' وہاں کے عالم بلکہ اہل مشرق کے بھی شیخ تھے' ابن راھویہ کے نام سے مشہور تھے۔ امام احمدؒ فرماتے ہیں "عراق میں اسحاق بن راھویہ کا کوئی مثیل میں نہیں جانتا۔" امام ابو زرعہ رازی فرماتے ہیں "امام اسحاق بن راھویہ سے بڑھ کر کوئی حافظ حدیث نہیں دیکھا گیا۔" امام ابو حاتم فرماتے ہیں "اسحاق بن راھویہ تعجب کی حد تک ضابط و پختہ کار اور اغلاط سے پاک اور حافظہ کے مالک تھے۔" آپ ۱۶۶ھ میں پیدا ہوئے۔ ایک قول کے مطابق ۱۶۱ھ میں پیدا ہوئے اور ۱۵ شعبان ۲۳۸ھ کی رات کو فوت ہوئے۔

* **احمد بن ابراھیم اسماعیلی** رحمۃ اللہ علیہ : آپ امام' حافظ' مستند عالم اور شیخ الاسلام تھے۔ آپ کا نام ابوبکر احمد بن ابراھیم بن اسماعیل بن عباس اسماعیلی جرجانی ہے' اپنے علاقے میں شوافع کے بڑے امام تھے۔ بلاد عجم میں منفرد اور بے مثال تھے۔ آپ سے ایک معجم روایت کی جاتی ہے' آپ نے الصحیح اور دیگر کثیر کتب تصنیف کیں' جن میں سے ایک مسند عمرؓ بھی ہے' جس کا خود آپ نے دو جلدوں میں اختصار کیا۔ امام حاکم کہتے ہیں "اسماعیلی اپنے زمانے کے منفرد' بے مثال' محدثین و فقہاء کی سرداری' شرافت اور سخاوت میں ان سب کے سرخیل تھے' اور علماء' محدثین و فقہاء اور ان میں سے بلند پایہ اہل عقول کے درمیان ان کے بارے میں کوئی اختلاف نہیں۔ آپ ۲۷۷ھ میں پیدا ہوئے اور ۹۴ سال کی عمر پا کر رجب ۳۷۱ھ میں اپنے مالک حقیقی سے جا ملے۔

* **احمد بن عمرو بزار** رحمۃ اللہ علیہ : آپ امام' حافظ اور بہت بڑے علامہ تھے۔ آپ کا نام ابوبکر احمد بن عمرو بن عبدالخالق بصری ہے۔ آپ کبار ائمہ میں سے ایک اور "المسند الکبیر" اور "العلل" کے مصنف تھے۔ آپ نے امام طبرانی اور دیگر ائمہ سے علم حاصل کیا' اور ۲۹۲ھ کو آپ کی وفات ہوئی۔ بزار باء کے فتح اور زاء کی شد کے ساتھ ہے اور الف کے بعد بغیر نقطہ کے راء ہے۔

* **احمد بن حسین بیہقی** رحمۃ اللہ علیہ : البیہقی : باء کے فتح کے ساتھ اس کے بعد یاء ساکن ہے۔ یہ نیساپور کے قریب ایک بیہق نامی شہر کی طرف نسبت ہے۔ آپ نامور امام' حافظ اور علامہ تھے۔ آپ کا نام ابوبکر احمد بن حسین ہے۔ شعبان ۳۸۴ھ میں پیدا ہوئے اور آٹھ جمادی الاولیٰ ۴۵۸ھ کو وفات پائی۔ آپ کبار ائمۂ حدیث اور بڑے فقہاء شافعیہ میں سے تھے' آپ نے ایسی ایسی تصنیفات لکھیں جن کی قرون اولیٰ میں کوئی مثال نہیں ملتی' جن میں سے چند ایک درج ذیل ہیں : السنن الکبریٰ' السنن الصغریٰ' المبسوط اور الاسماء و الصفات۔ امام ذہبی فرماتے ہیں "امام بیہقی کی تالیفات ایک ہزار جزء کے لگ بھگ ہیں۔"

* **عبداللہ بن علی بن الجارود** رحمۃ اللہ علیہ : ابن الجارود ایک بلند پایہ امام' حافظ اور ناقد تھے۔ آپ کا نام ابو محمد عبداللہ بن علی بن جارود نیساپوری ہے۔ مکہ مکرمہ میں براجمان ہوئے۔ "المنتقیٰ فی الاحکام" کے مصنف اور علماء ثقات' مستندین اور قراء میں سے ایک تھے۔ اور ۳۰۷ھ کو وفات پائی۔

* **ابو حاتم محمد بن ادریس رازی** رحمۃ اللہ علیہ : آپ امام اور بہت بڑے حافظ تھے۔ آپ کا نام ابو حاتم محمد بن ادریس بن المنذر حنظلی رازی ہے۔ آپ ۱۹۵ھ میں پیدا ہوئے اور شعبان ۲۷۷ھ میں وفات پائی۔ آپ فن حدیث کے نامور محدثین اور کبار ائمۂ جرح و تعدیل میں سے ایک تھے۔

* **حارث بن ابو اسامہ** رحمۃ اللہ علیہ : آپ کا نام ابو محمد حارث بن ابی اسامہ محمد بن داھر تمیمی بغدادی ہے۔ آپ حافظ اور المسند کے مصنف تھے۔ البتہ اپنی مسند کو مرتب نہیں کر سکے۔ ابراھیم حربی اور ابو حاتم نے انہیں ثقہ قرار دیا ہے۔ امام دار قطنی کہتے ہیں کہ صدوق ہیں۔ آپ ۱۸۶ھ میں پیدا ہوئے اور ۹۷ سال کی عمر پا ۲۸۲ھ میں عرفہ کے روز فوت ہوئے۔

* **ابو عبداللہ الحاکم** رحمۃ اللہ علیہ : امام ابو عبداللہ امام المحققین تھے۔ آپ کا نام ابو عبداللہ محمد بن عبداللہ الحاکم نیساپوری ہے اور ابن البیع (باء کے فتح اور مکسور یاء کی تشدید کے ساتھ) سے معروف تھے۔ اور المستدرک علی الصحیحین کے مصنف تھے۔ ۳۲۱ھ میں پیدا ہوئے اور صفر ۴۰۵ھ میں وفات پائی۔ آپ نے دو ہزار یا اس کے لگ بھگ مشائخ سے سماع کیا۔ تقویٰ اور دیانت کے ساتھ ساتھ آپ فائق اور بلند پایہ کتابوں کے مصنف بھی تھے۔

* **ابوحاتم محمد بن حبان** رحمۃ اللہ علیہ : آپ ائمۂ اعلام میں سے ایک ہیں۔ آپ کا نام ابو حاتم محمد بن حبان (حاء کے کسرہ اور باء کی تشدید کے ساتھ) بن احمد بن حبان البستی ہے۔ بستی باء کے ضمہ اور سین کے سکون کے ساتھ' یہ بجستان کے شہروں میں سے ایک شہر بست کی طرف نسبت ہے' جہاں آپ کی پیدائش ہوئی۔ آپ حفاظ آثار و احادیث' فقہاء دین اور تشنگان علم کے لیے ھادی و مرجع تھے۔ اور آپ امام ابن خزیمہ رحمہ اللہ کے جلیل القدر شاگردوں میں سے ایک تھے اور اسی کے عشرے میں داخل ہو کر ۳۵۴ھ میں سمرقند کے اندر اپنے خالق حقیقی سے جا ملے۔

* **محمد بن اسحاق بن خزیمہ** رحمۃ اللہ علیہ : آپ شیخ الاسلام' حافظ کبیر اور بڑے ائمۂ حدیث میں سے ایک تھے۔ خزیمہ' تصغیر کے ساتھ ہے۔ ۲۲۳ھ کو نیساپور میں پیدا ہوئے اور ۳۱۱ھ کو اسی نیساپور میں وفات پائی۔ خراسان کے اندر اپنے زمانے میں امامت و حفظ کی آپ پر انتہاء تھی۔ اور آپ کی تصنیفات ۱۴۰ سے متجاوز ہیں۔

* **ابن ابی خیثمہ** رحمۃ اللہ علیہ : آپ امام' حافظ اور محقق عالم تھے۔ آپ کا نام ابوبکر احمد بن ابی خیثمہ زھیر بن حرب نسائی بغدادی ہے۔ اور التاریخ الکبیر کے مصنف ہیں۔ امام دار قطنی فرماتے ہیں "ثقہ اور معتبر ہیں۔"

خطیب بغدادی فرماتے ہیں۔ ''ابن ابی خیثمہ ثقہ' عالم' متقن و ضابط' حافظ' تاریخ میں بصیرت رکھنے والے اور ادب کے راوی تھے۔'' امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ اور ابن معین سے علم حدیث حاصل کیا اور ۹۴ سال کی عمر پا کر جمادی الاولیٰ ۲۸۹ھ میں اپنے خالق حقیقی سے جا ملے۔

* **علی بن عمر دار قطنی رحمۃ اللہ علیہ** : دار قطنی : راء کے فتح اور قاف کے ضمہ کے ساتھ۔ بغداد کے ایک بڑے محلّہ دار قطن کی طرف نسبت ہے۔ حافظ کبیر اور بے مثال امام تھے۔ آپ کا نام ابوالحسن علی بن عمر بن احمد بن مھدی بغدادی ہے۔ ۳۰۶ھ کو پیدا ہوئے اور آٹھ ذوالقعدہ ۳۸۵ھ میں وفات پائی۔ آپ اپنے زمانے کے منفرد و بے مثال اور اپنے وقت کے امام تھے۔ ان کے زمانے میں جاہ و حشمت' علم حدیث اور معرفت علل اسماء الرجال کی آپ پر انتہاء تھی۔

* **امام دارمی رحمۃ اللہ علیہ** : سمرقند میں آپ کو شیخ الاسلام' حافظ حدیث اور امام کا مقام حاصل تھا۔ آپ کا نام ابو محمد عبداللہ بن عبدالرحمٰن بن فضل بن بھرام تمیمی دارمی سمرقندی ہے۔ آپ ''المسند العالی'' کے مصنف تھے۔ آپ نے حرمین' خراسان' شام' عراق اور مصر میں علم حدیث کا سماع کیا۔ آپ سے امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ' ابو داؤد' ترمذی' نسائی اور دیگر ائمہ حدیث نے احادیث روایت کیں۔ آپ عقل و فضل کی بلندیوں کو چھوتے تھے اور دیانت' حلم' اجتھاد' عبادت اور دنیا سے بے رغبتی میں ضرب المثل تھے۔ ۱۸۱ھ میں پیدا ہوئے اور ۲۵۵ھ آٹھ ذوالحجہ ترویہ کے دن اس دنیا فانی سے کوچ کر گئے۔

* **ابو داؤد طیالسی رحمۃ اللہ علیہ** : آپ بہت بڑے حافظ حدیث تھے۔ آپ کا نام سلیمان بن داؤد بن جارود بصری' اور فارسی الاصل' آل زبیر کے آزاد کردہ اور بڑے ائمہ حدیث میں سے ایک تھے۔ فلّاس اور ابن مدینی فرماتے ہیں ''میں نے طیالسی سے بڑھ کر کوئی حافظ نہیں دیکھا۔'' ابن مھدی فرماتے ہیں ''آپ تمام لوگوں سے بڑھ کر سچے تھے'' آپ نے ایک ہزار اساتذہ سے احادیث لکھیں اور اسی سال کی عمر پا کر ۲۰۴ھ میں اللہ تعالیٰ سے جا ملے۔

* **ابن ابی الدینا رحمۃ اللہ علیہ** : آپ محدث' عالم اور صدوق تھے۔ آپ کا نام ابوبکر عبداللہ بن محمد بن عبید بن سفیان بن ابی الدنیا قرشی اموی بغدادی ہے۔ آپ قریش کے آزاد کردہ غلام تھے' متعدد کتابوں کے مصنف تھے۔ آپ نے خلفاء و امراء کی اولاد میں سے ایک جماعت کو ادب و علم سکھایا اور معتضد باللہ کو بھی آپ ہی نے ادب و اخلاق کی تربیت دی۔ ۲۰۸ھ کو پیدا ہوئے اور جمادی الاول ۲۸۱ھ میں وفات پائی۔

* **امام ذھلی رحمۃ اللہ علیہ** : آپ امیر المومنین فی الحدیث' شیخ الاسلام اور حافظ نیساپور تھے۔ آپ کا نام ابو عبداللہ محمد بن یحییٰ بن عبداللہ بن خالد بن فارس ہے۔ آپ بنو ذھل کے آزاد کردہ غلام تھے۔ آپ نے حرمین' شام' مصر' عراق' ری' خراسان' یمن اور جزیرۂ عرب میں علماء کی ایک بڑی جماعت سے سماع کیا اور علم حدیث میں نمایاں مقام حاصل کیا۔ خراسان میں علم کے بہت بڑے شیخ اور استاد تھے۔ امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا ''میں نے محمد بن یحییٰ ذھلی سے بڑھ کر زھری کی احادیث کو جاننے والا کوئی شخص نہیں دیکھا۔''

آپ ۱۸۰ھ کے بعد پیدا ہوئے اور ربیع الاول ۲۵۸ھ کو رحلت فرما گئے۔

* **ابو زرعہ رازی** رحمۃ اللہ علیہ : آپ بہت بڑے محدث اور حافظ تھے۔ آپ کا نام ابو زرعہ عبیداللہ بن عبدالکریم بن یزید بن فروخ رازی قرشی ہے۔ آپ قریش کے آزاد کردہ اور ائمۂ جرح و تعدیل اور کبار محدثین میں سے ایک تھے۔ امام مسلم' ترمذی' نسائی' ابن ماجہ اور دیگر محدثین نے آپ سے حدیث روایت کی ہے۔ امام ذہبی فرماتے ہیں "ابو زرعہ رازی نے حرمین' عراق' شام' جزیرۂ عرب' خراسان اور مصر میں بہت سے ائمہ سے سماع کیا ہے۔ آپ حفظ و ذھانت' دین و اخلاص اور علم و عمل کے اعتبار سے زمانے کے نامور لوگوں میں سے ایک تھے۔" ۶۴ سال کی عمر پا کر ۲۶۴ھ کے آخری دن اس دنیا فانی سے کوچ کر گئے۔

* **سعید بن منصور** رحمۃ اللہ علیہ : آپ کا نام سعید بن منصور بن شعبہ مروزی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ آپ طالقانی پھر بلخی تھے۔ مکہ مکرمہ میں براجمان ہوئے۔ سنن کے مصنف ہیں۔ امام احمد بن حنبل نے آپ کی تعریف کی اور عظیم الشان قرار دیا ہے۔ حرب کرمانی فرماتے ہیں "سعید بن منصورؒ نے اپنے حافظہ سے ہمیں دس ہزار احادیث املاء کروائیں۔" اور نوے کی دھائی میں پہنچ کر ۲۲۷ھ کو رمضان کے مہینے میں مکہ مکرمہ میں وفات پائی۔

* **ابن السکن** رحمۃ اللہ علیہ : آپ حافظ' امام اور قابل اعتماد عالم تھے' آپ کا نام ابو علی سعید بن عثمان السکن (سین اور کاف کے فتح کے ساتھ) بغدادی ہے۔ فن اور روایت حدیث کا اہتمام کیا' احادیث جمع کیں اور تصنیفات کی شکل دی۔ اور ۲۹۴ھ میں پیدا ہوئے اور ۳۵۳ھ کو وفات پائی۔

* **محمد بن ادریس شافعی** رحمۃ اللہ علیہ : آپ ان چار ائمہ میں سے ایک ہیں' جو اطراف عالم میں رہنما اور پیشوا قرار پائے۔ آپ کا نام ابو عبداللہ محمد بن ادریس بن عباس بن عثمان بن شافع بن سائب بن عبید بن عبد یزید بن ھاشم بن مطلب بن عبد مناف قرشی مکی ہے۔ مصر میں رہائش اختیار کی۔ ۱۵۰ھ میں پیدا ہوئے اور جمعہ کی رات ۲۰۴ھ آخر رجب میں اپنے خالق حقیقی سے جا ملے۔ غزۃ میں پیدا ہوئے' مکہ مکرمہ پہنچائے گئے اور مصر میں وفات پائی۔ آپ امت کے پیشوا' ساتھیوں میں منفرد اور مغرب و مشرق میں سب سے بڑے عالم تھے۔ علوم و فنون میں نمایاں مقام حاصل کیا اور اصول فقہ کے بانی اور موجد بنے۔ آپ کے جد امجد شافع صحابی تھے اور جوانی میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ملاقات کی۔

* **ابو بکر ابن ابی شیبہ** رحمۃ اللہ علیہ : آپ حافظ اور بے مثال شخصیت کے حامل تھے۔ آپ کا نام ابو بکر عبداللہ بن محمد بن ابی شیبہ ابراهیم بن عثمان بن حواسی عنسی (ان کے آزاد کردہ) کوفی ہے۔ آپ مسند' مصنف اور دیگر کتب کے مصنف تھے' علم حدیث میں چٹان کی مثل تھے۔ امام ابو زرعہ' امام بخاری' امام مسلم' امام ابو داؤد اور دیگر ائمۂ حدیث نے آپ سے احادیث روایت کیں۔ ماہ محرم ۲۳۵ھ میں فوت ہوئے۔

* **سلیمان بن احمد طبرانی** رحمۃ اللہ علیہ : آپ قابل حجت اور دنیا کے لیے مستند امام تھے۔ آپ کا نام ابوالقاسم سلیمان بن احمد بن ایوب بن مطیر لخمی طبرانی ہے۔ آپ نے ایک ہزار یا اس سے زیادہ مشائخ سے احادیث روایت کیں۔ طلب حدیث میں شام سے کوچ کیا اور ۳۳ سال سفر میں گزارے۔ آپ متعدد، مفید اور عجیب و غریب کتب کے مصنف ہیں، جن میں آپ کی درج ذیل تین معاجم، المعجم الکبیر، المعجم الاوسط اور المعجم الصغیر قابل ذکر ہیں۔ آپ ۲۶۰ھ میں شام کے علاقہ طبریہ میں پیدا ہوئے اور اصبہان میں مقیم ہوئے اور ۲۸ ذی القعدہ ۳۶۰ھ کو اصبہان ہی میں وفات پائی۔

* **احمد بن محمد طحاوی** رحمۃ اللہ علیہ : آپ امام وقت، علامہ اور حافظ تھے۔ آپ کا نام ابو جعفر احمد بن محمد سلامہ بن سلمہ ازدی، حجری، مصری، طحاوی، حنفی ہے۔ طحا: مصر کی ایک بستی کا نام ہے۔ آپ شروع میں شافعی تھے اور اپنے ماموں مزنی سے پڑھا کرتے تھے، ایک دن مزنی نے انہیں یہ کہا کہ اللہ کی قسم آپ کی طرف سے تو کچھ بھی نہیں آیا۔ جس پر وہ ناراض ہو کر ابن ابی عمران حنفی کی طرف منتقل ہو کر حنفی بن گئے اور مذھب احناف کے اثبات کے لیے بڑے متشدد واقع ہوئے اور اپنے مذھب کے لیے اخبار و احادیث تیار اور جمع کرنے اور دوسروں کے ہاں ضعیف قرار پانے والی احادیث سے استدلال کرنے میں بڑا تکلف کیا۔ اور بقول امام بیہقی مختلف تاویلات کے ذریعے سے احادیث کو ضعیف قرار دینے کے درپے ہوئے۔ ان کی مشہور ترین تصانیف میں سے ایک معانی الآثار ہے۔ ۲۲۸ھ میں پیدا ہوئے۔ جب کہ ایک دوسرے قول کے مطابق ۲۳۷ھ میں پیدا ہوئے۔ اور اوائل ذی القعدۃ ۳۲۱ھ میں اس دنیا فانی سے کوچ کر گئے۔

* **ابن عبدالبر** رحمۃ اللہ علیہ : آپ امام، علامہ، شیخ الاسلام اور حافظ مغرب تھے۔ آپ کا نام ابو عمر یوسف بن عبداللہ بن محمد بن عبدالبر بن عاصم نمری قرطبی ہے۔ آپ حفظ واتقان میں اپنے زمانے میں موجود اہل علم کے سردار تھے۔ انساب اور اخبار میں بڑے ماہر تھے۔ ابن حزم فرماتے ہیں "فقہ الحدیث کے متعلق بحث و تکرار کرنے میں میں قطعاً ان کا کوئی مثیل نہیں جانتا، چہ جائے کہ کوئی ان سے اچھا اور بڑھ کر ہو۔" آپ متعدد کتب کے مصنف ہیں، جن میں الاستیعاب آپ کی مشہور ترین تصنیف ہے۔ ربیع الثانی ۳۶۸ھ میں پیدا ہوئے اور ۹۵ سال عمر پا کر جمعہ کی رات آواخر ربیع الثانی ۴۶۳ھ میں وفات پائی۔

* **عبدالحق** رحمۃ اللہ علیہ : آپ حافظ، علامہ اور حجت ہیں اور آپ کا نام ابو محمد عبدالحق بن عبدالرحمٰن بن عبداللہ بن حسین بن سعید ازدی اشبیلی ہے۔ آپ بجایہ میں آباد ہوئے، اسی میں اپنے علم کی اشاعت کی، کتب تصنیف کیں اور شہرت پائی اور بجایہ ہی میں خطیب مقرر ہوئے۔ آپ فقیہہ، حافظ حدیث اور علل کے عالم اور رجال کے جاننے والے تھے۔ آپ خیر و صلاح، زھد و ورع اور لزوم سنت کے ساتھ آراستہ تھے اور حصول دنیا میں پیچھے اور ادب و شعر میں دلچسپی رکھنے میں آگے تھے۔ ۵۱۰ھ میں پیدا ہوئے اور ربیع الثانی ۵۸۱ھ کو بجایہ میں وفات پائی۔

* **عبدالرزاق بن ھمام** رحمۃ اللہ علیہ : آپ امام اور بہت بڑے حافظ حدیث تھے۔ آپ کا نام ابوبکر عبدالرزاق بن ھمام بن نافع حمیری صنعانی ہے۔ آپ قبیلہ حمیر کے آزاد کردہ تھے۔ اہل علم کا ماویٰ اور مرجع تھے' امام احمد' اسحاق' ابن معین اور ذھلی نے آپ سے روایات لیں' آخری عمر میں نابینا ہوئے اور حافظہ تبدیل ہو گیا۔ ۸۵ سال کی عمر پا کر شوال ۲۱۱ھ میں اس دنیا فانی سے کوچ کر گئے۔

* **عبداللہ بن عدی** رحمۃ اللہ علیہ : آپ شہرہ آفاق امام اور بہت بڑے حافظ حدیث تھے۔ آپ کا نام ابو احمد عبداللہ بن عدی جرجانی ہے۔ آپ ابن القصار کے نام سے بھی مشہور تھے۔ آپ کبار علماء اور ائمہ جرح و تعدیل میں سے ایک تھے۔ ۲۷۹ھ میں پیدا ہوئے اور جمادی الثانی ۳۷۵ھ میں وفات پائی۔

* **محمد بن عمرو العقیلی** رحمۃ اللہ علیہ : آپ امام اور حافظ حدیث تھے۔ آپ کا نام ابو جعفر محمد بن عمرو بن موسیٰ بن حماد عقیلی ہے۔ آپ عظیم المرتبت' عظیم الشان عالم اور کتاب الضعفاء الکبیر اور دیگر بہت سی کتب کے مصنف ہیں اور حافظہ میں بڑے بلند تھے اور حرمین میں قیام کیا۔ اور ۳۲۲ھ میں وفات پائی۔

* **علی بن مدینی** رحمۃ اللہ علیہ : آپ جرح و تعدیل کے امام' حافظ وقت اور اہل حدیث کے پیشوا تھے۔ آپ کا نام ابو الحسن علی بن عبداللہ بن جعفر بن نجیح سعدی (بنو سعد کے آزاد کردہ) مدینی ہے۔ امام بخاری' امام ابو داؤد اور دیگر کثیر ائمہ حدیث نے آپ سے روایت کیا۔ ابن مھدی فرماتے ہیں "علی بن مدینی حدیث رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو سب سے زیادہ جاننے والے تھے۔ امام بخاری فرماتے ہیں: علی بن مدینی کے سوا میں نے کسی کے پاس اپنے آپ کو حقیر اور کم تر نہیں سمجھا۔" ۱۶۱ھ میں پیدا ہوئے اور ۲۳۴ھ کو سامرا میں اپنے خالق حقیقی سے جا ملے۔

* **ابو عوانہ یعقوب بن اسحاق** رحمۃ اللہ علیہ : آپ محدث اور حافظ تھے' آپ کا نام یعقوب بن اسحاق بن ابراھیم بن زید نیساپوری اسفرائینی ہے' آپ ائمہ کبار میں سے ایک اور المسند الصحیح المخرج علی مسلم کے مصنف تھے۔ طلب حدیث کے لیے آپ نے زمین کے اطراف و اقطار کا سفر کیا' آپ نے بہت سے شیوخ و ائمہ سے احادیث روایت کیں۔ جیسا کہ آپ سے بھی بہت سے علماء نے احادیث روایت کیں۔ آپ نے پانچ حج کیے۔ ۳۱۶ھ میں فوت ہوئے اور اسفرائین میں آپ کی قبر بہت مشہور ہے' لوگ اس کی زیارت کے لیے جاتے ہیں۔

* **علی بن محمد ابن القطان** رحمۃ اللہ علیہ : آپ کا نام ابو الحسن علی بن محمد بن عبدالملک فاسی ہے' آپ بہت بڑے حافظ' امام' ناقد اور علامہ تھے۔ قرطبہ میں پیدائش ہوئی اور فاس میں قیام کیا۔ آپ روایت حدیث کے سب سے زیادہ اصحاب علم و بصیرت اور اسماء الرجال کے سب سے بڑے حفاظ میں سے ایک تھے۔ اور متعدد کتب کے مؤلف تھے۔ ۵۲۲ھ میں پیدا اور ربیع الاول ۶۲۸ھ میں فوت ہوئے۔

* **امام مالک** رحمۃ اللہ علیہ : آپ امت کے چار پیشواؤں و رہنماؤں میں سے ایک' دارالھجرت مدینہ طیبہ کے

امام، امت کے فقیہہ اور اہل حدیث کے سردار تھے۔ آپ کا نام ابو عبداللہ مالک بن انس بن مالک بن ابی عامر اصبحی ہے۔ اصبحی آپ کے نویں دادا ذوا صبح کی طرف نسبت ہے اور اصبح یمن کے سب سے بڑے فضل و شرف والے قبائل میں سے ایک قبیلہ ہے، آپ ۹۳ھ یا ۹۴ھ میں پیدا ہوئے اور ربیع الاول ۱۷۹ھ میں حدیث کا یہ روشن چراغ اس دار فانی سے رخصت ہوا۔ آپ نے نو سو سے زائد مشائخ سے علم حدیث حاصل کیا، جب کہ آپ سے لوگوں کی اتنی بڑی جماعت نے حدیث بیان کی جو احاطۂ تحریر میں نہیں لائی جا سکتی اور آپ کے شاگردوں میں سے ایک امام شافعی بھی ہیں۔

* **محمد بن اسحاق ابن مندہ:** آپ کا نام ابو عبداللہ محمد بن اسحاق بن محمد بن یحییٰ بن مندہ (میم کے فتح، نون کے سکون اور دال کے فتح کے ساتھ) آپ بڑے ائمہ اور حفاظ حدیث میں سے ایک امام اور چلتے پھرتے حافظ حدیث تھے۔ آپ کا شمار ان محدثین میں ہوتا ہے جو کثیر الحدیث ہونے میں مشہور ہیں۔ طلب حدیث کے لیے آپ نے بلاد عالم کا سفر کیا، اور جب آپ واپس لوٹے تو آپ کے پاس کتابوں کی چالیس گٹھڑیاں تھیں۔ آپ کے اساتذہ اور شیوخ کی تعداد ایک ہزار سات سو تھی۔ ۳۱۰ھ میں پیدا ہوئے اور آخر ذی القعدۃ ۳۹۵ھ میں ہیشگی کے گھر آخرت کی طرف کوچ کر گئے۔

* **ابو نعیم اصفہانی** رحمۃ اللہ علیہ: آپ مشہور حافظ حدیث تھے۔ آپ کا نام احمد بن عبداللہ بن احمد بن اسحاق بن موسیٰ بن مہران اصفہانی رحمۃ اللہ علیہ ہے۔ نعیم: تصغیر کے ساتھ ہے۔ آپ بلند پایہ ائمۂ محدثین اور کبار حفاظ میں سے ایک تھے۔ آپ نے بڑے بڑے نامور فضلاء سے اور بڑے بڑے فضلاء نے آپ سے علم حاصل کیا۔ آپ متعدد کتب کے مصنف تھے۔ جن میں سے المستخرج علی صحیح البخاری۔ المستخرج علی صحیح مسلم اور حلیۃ الاولیاء قابل ذکر ہیں۔ اور حلیۃ الاولیاء ان کی بہترین کتب میں سے ایک کتاب ہے، کہا جاتا ہے کہ جب یہ کتاب نیساپور پہنچی تو اہل نیساپور نے اسے چار سو دینار میں خرید لیا۔ آپ رجب ۳۳۴ھ میں پیدا ہوئے اور صفر یا ایک قول کے مطابق بیس محرم ۴۳۰ھ کو اصبہان میں وفات پائی۔

* **ابو یعلیٰ احمد بن علی** رحمۃ اللہ علیہ: آپ کا نام احمد بن علی بن مثنی بن یحییٰ بن عیسیٰ بن ہلال تمیمی ہے، آپ جزیرۂ عرب کے محدث، حافظ اور المسند الکبیر کے مصنف ہیں، آپ مشہور ارباب صدق و امانت اور دین و حلم میں سے ایک تھے۔ سمعانی کہتے ہیں "میں نے حافظ اسماعیل بن محمد بن فضل سے یہ فرماتے ہوئے سنا کہ میں نے متعدد مسانید مثلاً مسند العدنی اور مسند ابن منیع وغیرہ پڑھیں، یہ سب نہریں ہیں، جب کہ مسند ابی یعلیٰ اس دریا کی مانند ہے جو مجمع الانہار ہو (یعنی جہاں سب نہریں اکٹھی ہوتی ہوں) آپ شوال ۲۱۰ھ میں پیدا ہوئے اور ۳۰۷ھ میں وفات پائی۔

بلوغ المرام
اُردو ترجمہ
"بلوُغ المرام" ابوالفضل شہاب الدین احمد ابن حجر العسقلانی رحمہُ اللہ کی وہ لاثانی کتاب ہے جو مختصر ہونے کے باوجود جامعیت اور افادیت کے اعتبار سے مسلمہ ہے- مسائل واحکام کا یہ نہایت اہم مجمُوعہ علماء اور طلباء کے لئے یکساں مفید اور اہمیت کا حامل ہونے کی وجہ سے دنیا بھر کے مدارس اسلامیہ و دینیہ میں داخل نصاب ہے- برّصغیر کے نامور علماء کرام نے اس اہم کتاب کو اردو زبان میں ڈھالا- کم و بیش ہر حدیث کے نیچے پہلے لغوی تشریح اور پھر حاصل کلام کے نام سے شرح لکھی تاکہ ہر حدیث کی وضاحت ہو جائے اور جو احکامات اس حدیث سے مستنبط ہوتے ہیں ان کی تشریح ہو جائے- اس کتاب کا مطالعہ ہر مسلمان کے لئے نہایت مفید رہے گا-